www.pakistanipoint.com
پاکستانی پوائنٹ
اردو ادب کی بہترین ویب سائٹ
ایک رابطہ اپنوں سے

آمُرزش

(اوّل)

نوشین ناز اختر

القریش پبلی کیشنز

سرکلر روڈ چوک اُردو بازار لاہور

فون: 042-37652546 , 042-37668958

www.alqurash.com E.mail:info@alqurash.com

معیاری اور خوبصورت کتابیں

بااہتمام محمد علی قریشی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

باراوّل 2010ء

مطبع .... نیئر اسد پریس لاہور

کمپوزنگ .... کلاسکس گرافکس

قیمت .... [redacted]/- روپے

اپنی بڑی سرکار، پیارے اللہ جی کے نام!

کہ مجھے زندگی کا سارا سُکھ اور پیار،

تمام اچھے لفظ اور سارے خوب صورت رشتے

انہی سے ملے۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ........

میرے رب نے یہ کائنات بہت حسین بنائی ہے۔ وہ حُسن جو دیکھتی آنکھوں کو مسحور کر دے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ حُسن، یہ رعنائیاں سب عارضی ہیں، ایک دن مٹ جاتی ہیں، فنا ہو جاتی ہیں۔ لیکن ایک شے ہے اس کائنات میں، جو کبھی نہیں مٹتی۔ وقت کے ساتھ جس کی آب و تاب میں اضافہ ہوتا ہے اور جو رہتی دنیا تک یاد رہ جانے والی صفت ہے۔ اور وہ صفت کسی انسان کے اندر چھپا حُسن ہے، جسے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، جو آپ کو خود اپنے ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ اور مختلف صورتوں میں سامنے آتا ہے۔ اور نوشین ناز اختر نے اپنے باطن کے حُسن کو صفحۂ قرطاس پر بکھیر کے ہمیشہ کے لئے امر کر دیا ہے۔

نوشین ایک ایسی ہستی کا نام ہے، جو آپ سب کے سامنے ایک افسانہ نگار یا ناول نگار کی حیثیت سے آئی ہے۔ مگر میرے لئے وہ ایک اچھی دوست اور بہن اور سب سے بڑھ کر ایک اچھی انسان ہے۔

کیا عجب بات ہے کہ میں آج تک نوشین سے ملی نہیں، اُسے دیکھا نہیں، مگر ہمارے درمیان جو ربط ہے، وہ صدیوں کے رشتے بھی نہیں بنا پاتے۔ آج سے تقریباً پانچ سال قبل جب میں ''ماہنامہ نازنین ڈائجسٹ'' کی مدیرہ کے فرائض سرانجام دے رہی تھی تو نوشین سے ٹیلی فونک گفتگو ہوئی تھی اور یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔

نوشین سے گفتگو سے بہت پہلے سے میں اُس کی تحریروں کی مداح تھی۔ اُس کی تحریروں میں زندگی کے جو رنگ دوڑتے ہیں، احساسات کی جو خوب صورتی نظر آتی ہے، وہ اسے اپنی دوسری ہم عصر تحریر نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ اُس نے کبھی بھی اپنے افسانے یا ناول کی بنت کے لئے بناوٹی باتوں کا سہارا نہ لیا، نہ ہی کبھی اس نے اپنے ناول یا افسانے کو طول دینے کے لئے لفظوں میں رنگینیاں پروئی ہیں۔ وہ لکھتی ہے زندگی کا سچ، رشتوں کی خوب صورتی، ٹوٹتے اور جڑتے تعلقات کی کسک اور آسودگی........اس کا کینوس وسیع ہے، جس میں وہ زندگی کے سبھی اتار چڑھاؤ کو سمو دیتی ہے۔ اس کا قلم نہ صرف زندگی کی حقیقتیں بیان کرتا ہے بلکہ اس کا سامنا کرنے کی جرأت بھی عطا کرتا ہے۔

''آمرزش'' نوشین کا وہ ناول ہے، جس کے ابتدائی مراحل نوشین نے میرے ساتھ طے کئے۔ وہ اس طرح کہ میں، نازنین ڈائجسٹ میں تھی اور میری پہلی درخواست پر ہی اُس نے اس ناول کی ابتداء کی تھی اور یہ میرے لئے ایک اعزاز ہے۔ اور پھر اس کے بعد جب تک میں، نازنین سے منسلک رہی، ''آمرزش'' کی سطر سطر میری نظروں سے گزر کے طباعت کے مراحل کو پہنچی۔ اور شاید اسی لئے اس ناول سے میری گہری وابستگی اور اپنائیت کا ایک رشتہ ہے، جسے نوشین کی محبت نے مزید مضبوط کر دیا ہے۔

''آمرزش'' انسانی رشتوں میں گندھا ایک ایسا احساس ہے، جو پڑھنے والے کو لمحہ بہ لمحہ مختلف کیفیات سے دوچار کرتا ہے۔ نوشین نے اس ناول میں انسان کی فطرت اور جبلت کی اچھی طرح عکاسی کی ہے۔ ناول کے دو مرکزی کردار ولی اور نگینہ زندگی کی قدروں اور محبت کی پاکیزگی کے علمبردار ہیں، جن کے ذریعے نوشین نے لوگوں کو یہ بتایا ہے کہ بدی خواہ کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو، زندگی کی سچی اقدار اور محبت کے پاکیزہ جذبوں سے نہیں جیت سکتی۔ اس ناول میں رشتوں کے جو رنگ ہیں، وہ ان خودغرض اور بے حس لوگوں کے لئے ایک مثال ہے، جو مادیت پرستی میں رشتوں کو روند کے گزر جاتے ہیں، لیکن ان کا انجام ایک بھیانک تنہائی اور بے نام و بے وقار زندگی ہوتی ہے۔ لیکن جو رشتوں کی پاکیزگی کو سمجھتے ہیں اور ان کی پاس داری کرتے ہیں، ان کے لئے زندگی جنت ہوتی ہے اور وہ دوسروں کے لئے ہمیشہ ہمیشہ ایک مثال بن کے رہتے ہیں۔

نوشین کی تحریروں میں اُس کے اندر کا حُسن جھلکتا ہے، جو اُسے مزید حسین بناتی ہے اور میں سمجھتی ہوں، فنکار خواہ کوئی بھی ہو، کیسا بھی ہو، اگر اس کا باطن حسین ہے تو وہ ہمیشہ ایک خوب صورت، جاندار، باوقار اور بے مثال تخلیق کا مالک بنے گا۔ اور نوشین اس تعریف میں بلاشبہ پوری اُترتی ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ.........

نزہت سمن
جرنلسٹ، ڈرامہ رائٹر
سابق مدیرہ نازنین ڈائجسٹ

نوشین ناز اختر کا اندازِ تحریر

گذشتہ 22 سال سے پاکیزہ کی مدیرہ ہونے کے باعث مجھے ہر طرح کے افسانے پڑھنے کو ملتے ہیں۔ شوخ، چنچل، سنجیدہ، ڈرامائی، اصلاحی، علامتی...... غرض رنگا رنگ اندازِ تحریر کی کہانیاں پڑھنا میرا روز مرہ کا ایک کام ہے، جسے میں خوشی خوشی کرتی ہوں کہ پڑھنا اور لکھنا میرے شوق و ذوق بھی ہیں۔

نوشین ناز اختر نے آج سے پانچ یا چھ سال پہلے ماہنامہ پاکیزہ میں لکھنا شروع کیا اور میں ان کا اندازِ تحریر اور پیغام تحریر دیکھ کر خاصی متاثر ہوئی۔

نوشین کے افسانے ہوں، ناولٹ ہوں یا ناول...... تمام اس سچائی کا مظہر ہیں کہ اچھی بات کو آگے بڑھایا جائے اور بری بات، رسم یا عادت کی سرزنش کی جائے۔ اور یوں بھی ہر اچھا خیال اور اچھی فکر امانت ہوتی ہے اور اسے عام کرنے سے معاشرے میں روشنی پھیلتی ہے اور ذہن کے جالے صاف ہوتے ہیں۔

کسی بھی ناول کا پہلا وصف بیانیہ کو دلچسپ انداز میں پیش کرنا ہوتا ہے کیونکہ اگر ناول دلچسپی سے جب تک پڑھا نہیں جائے گا تو بقیہ اوصاف اس میں دب کر رہ جائیں گے۔

لکھنے والے میں یہ مقناطیسی قوت ہونی چاہئے کہ وہ اپنے قلم کے زور پر اپنے بنائے ہوئے ماحول میں پہنچا دیں، اور یہ ہنر نوشین ناز اختر کو بھی حاصل ہے کہ وہ منظر نگاری اس خوب صورتی سے کرتی ہیں کہ پڑھنے والے بھی اس منظر کا حصہ بن جاتے ہیں۔

نوشین ناز اختر معروف و مقبول ادیب اختر عباس کی بیگم ہیں، جو دانشور، استاد اور صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے ادیب بھی ہیں۔ اُن کی شخصیت اور تحریروں کے اثرات بھی نوشین کی تحریروں میں نظر آتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مثبت امید اور نیک جستجو اُن کی تحریروں کی شناخت ہیں۔

''آمرزش'' نوشین ناز کا بے حد خوب صورت ناول ہے۔ اس کی کہانی اور کردار زندگی اور سچائی سے بھرے ہوئے ہیں۔ آمرزش اصل میں معافی اور بخشش ہے۔ جہاں نام میں جدت ہے، وہیں یہ الفاظ بھی دل کو چھوتے ہیں۔

''آمرزش'' اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ مجھے دلی اُمید ہے کہ اس کو پڑھ کر آپ اسے بہت دیر تک یاد رکھیں گے۔ کیونکہ نوشین اپنی ہر تحریر میں مقصدیت کو مقدم رکھتی ہیں۔

دلی دعا ہے کہ وہ اسی طرح اپنی تحریروں سے سماجی مسائل حل کرتی رہیں۔

دعا گو
انجم انصار
مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ

''اے اللہ! تُو ہی مدد کر۔ تُو ہی بچانے والا ہے۔''

عائشہ بی بی نے فکرمندی سے چاروں جانب دیکھا تھا۔ ''آگ لگ گئی...... آگ لگ گئی......'' ہر طرف یہی چیخ و پکار تھی۔ حویلی عبداللہ کے لوگ خوف و ہراس سے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ چاروں جانب سے آگ نے گھر کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔

تب ہی ولی کا ہاتھ تھامے اور نگینہ کو گود میں اُٹھائے اُن کی بوڑھی کمزور اماں چھت کی طرف بھاگیں۔

جوں جوں وہ سیڑھیاں چڑھتے اوپر جا رہے تھے، واپسی کا راستہ ختم ہو رہا تھا۔ آگ اُن کا پیچھا کرتے ہوئے اوپر آ رہی تھی۔

چھت پر جب وہ تینوں پہنچے تو حویلی چاروں طرف سے جل رہی تھی۔ تب ہی اماں نے آنکھیں آسمان کی طرف اٹھا کر دیکھا۔

''سائیں! تیری رضا میں ہم راضی ہیں۔ اے ربّ سچے! جو تیرا حکم، سر آنکھوں پر۔ سائیں! اس حویلی کے مالک اور مالکن جس قدر نیک روح تھے، تُو جانتا ہے۔ بی بی نے ان کو مجھے تھماتے ہوئے کہا تھا کہ یہ اس حویلی کی آخری اولاد اور وارث ہیں۔ پر ہم چھوٹے لوگ، ہماری کیا مجال کہ اپنے نام اور وارث کو بچانے کی کوشش کریں، بس رہے اللہ کا نام اور اس کے محبوب کا نام، اس رہتی دنیا تک!...... بے شک! تُو ہمیشہ رہنے والا ہے۔ اے اللہ سائیں! یہ معصوم ابھی بالکل پاک ہیں، تیری فطرت کی طرح! تُو ان کی حفاظت کرنا اور ان کی زندگی بچالینا۔''

''جائیں اماں! ان کو کوشش کر کے یہاں سے نکالنے کی کوشش کریں۔''

بی بی (عائشہ عبداللہ) نے بچے ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا تھا۔

چاروں جانب آگ اور سیّد سرفراز علی کے آدمیوں نے حویلی کو گھیر رکھا تھا، اُن کا خوف۔ ایسے میں کوئی کیسے مدد کو آتا؟

''آیا اماں!...... امی کہاں ہیں؟'' معصوم ولی نے آیا اماں سے پوچھا تھا۔

''جاؤ ولی!'' آیا اماں نے بڑھتی آگ کی لپٹوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ولی میرے چاند!'' ساتھ ہی اماں نے اس کی طرف دیکھا...... ''نگینہ کو اُٹھالو۔''

سات سالہ معصوم ولی نے حیرانگی کے باوجود اپنی بہن کو تھام لیا۔

تب ہی آیا اماں اسے ایک کنارے کی طرف لے آئیں۔

WWW.PAKISTANIPOINT.COM
پاکستانی پوائنٹ
PAKISTANIPOINT

"جاؤ ولی! نیچے کود جاؤ۔ اور یاد رکھنا، اپنی بہن کو نہ چھوڑنا۔ یہ تمہاری امی نے کہا تھا۔ اللہ کی امان، میری آنکھوں کے نور! جاؤ......" آپا اماں نے لپکتے شعلوں کے آگے ڈھال کی طرح کھڑے ہو کر بچوں کو بچایا تھا......لیکن پھر بھی تپش سے ولی کی آنکھوں میں آنسو بہہ رہے تھے۔

"جاؤ......!"

ولی نے حیرانگی سے اماں کو دیکھا، بھڑکتے شعلوں نے ان کی جانب لپکنا شروع کر دیا تھا۔ ویسے ہی جیسے امی کو نیچے شعلوں نے گھیر رکھا تھا۔ اور وہ تینوں اتفاق سے اماں کے ساتھ تھے۔ جب وہ وہاں آئے تو آگ نے ہر جگہ کو گھیر لیا تھا۔ اندر امی بابا تھے، لیکن انہوں نے بھی وہاں سے چلے جانے کو کہا تھا۔

"آپا اماں!" ولی نے نیچے دیکھ کر خوف زدہ ہو کر انہیں پکارا۔ وہ اُسے اتنی اُونچائی سے کودنے کو کیوں کہہ رہی تھیں۔ "آپا اماں!" ولی کی آواز میں خوف اور حیرانگی دونوں موجود تھے۔

"ولی! جاؤ......تجھے سب سے بڑی اور رحمٰن ذات کے سپرد کیا۔"

"آپا اماں......! آپ امی بابا کو بھی بچا لو گی ناں؟" ولی نے معصومیت سے سوال کیا تھا۔

"ہاں......جاؤ......اب تم کو اپنی امی جان کا کہا ماننا ہے۔"

اور وہ اپنی امی جان کا کہا ماننے والا پیارا بیٹا تھا۔

دھک دھک کرتے دل کے ساتھ نگینہ گڑیا کو تھامے اُس نے آنکھیں بند کر کے چھلانگ لگا دی تھی۔

اندھیرے میں گم ہوتے ہوئے ذہن کے باوجود اُس نے نگینہ گڑیا کا وجود مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔ ہر طرف اندھیرے نے اُسے گھیرا تو وہ آنکھیں بند کرتا چلا گیا......!

❖❖○❖❖

سارے گاؤں میں دکھ اور تاسف کی لہر پھیلی ہوئی تھی۔ حویلی میں موجود ہر فرد جل کر مر چکا تھا۔ نہ مالک، نہ نوکر، نہ ہی کوئی جانور بچا تھا۔

سب راکھ میں مل گیا تھا۔

ظالموں نے زندہ وجودوں کو آگ لگا کر بڑا ظلم کمایا تھا۔ کتنے اچھے اور نیک لوگ تھے۔ سائیں عبداللہ، کیسا جوان اور کردار کا پکا سچا آدمی تھا۔

حق......ہاہ! ایسے اچھے لوگوں کے ساتھ اتنا برا کیوں ہوا؟ گاؤں کا ہر فرد سوگ میں تھا......ہر شخص کا دل اس ظلم پر پھٹ رہا تھا۔ لیکن سیّد سرفراز کے ڈر سے کوئی کچھ کر نہ سکا تھا۔

آہ......سب ختم ہو گیا......ہر جانب سرگوشیاں تھیں۔ سب ختم ہو گیا!

کیا؟ واقعی سب ختم ہو گیا؟ ہوا نے چلتے چلتے رُک کر حیرت سے پوچھا تھا۔

ارے نہیں!......وہ مسکرا کر آگے چل دی۔

سب کچھ اتنی جلدی اور ایسے ہی تو ختم نہیں ہو جاتا۔

❖❖○❖❖

جب اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے اپنے آپ کو مٹی کے ڈھیر پر پایا۔

اُس کے کپڑوں میں کانٹے گھسنے کی وجہ سے جسم میں زخم ہو گئے تھے۔ سارا جسم بری طرح دُکھ رہا تھا۔ پھر بھی اُس نے آنکھیں کھولتے ہی نگینہ کو تلاش کیا......وہ بے سُدھ اوندھی پڑی تھی۔

"نگینہ گڑیا!"

اُس نے بہن کو بہ مشکل گھسیٹ کر اُٹھایا۔ نگینہ کو رُک رُک کر سانس آ رہی تھی۔

سات سالہ ولی ایک دم سے گھبرا گیا تھا۔ اماں نے کہا تھا کہ بہن کو نہ چھوڑنا، خیال رکھنا۔ لیکن اب میں کیا کروں......اس کی سانسوں کو کیا ہو رہا ہے؟......تب ہی وہ اُسے لئے بھاگتا چلا گیا۔ نہ کسی راستے کی اسے خبر تھی، نہ علم تھا۔ یہ حویلی کی پچھلی طرف واقع ایک پگ ڈنڈی تھی، جو جنگل کی طرف جاتی تھی۔ وہاں مکمل ویرانی تھی۔ ایسی اُجاڑ جگہ، انسانی وجود کہاں سے نظر آتے؟

سوکھا بھورا گھاس بڑھ کر سرکنڈے بن چکا تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھنے پر کوئی نظر نہ آیا۔ لیکن وہ بھاگتا چلا گیا۔ جب بہت دیر تک بھاگنے کے باوجود اُسے کوئی نظر نہ آیا تو وہ پتھر پر بیٹھ کر اونچی آواز میں رونے لگا۔ اپنے وجود کے زخموں کی تکلیف اور بہن کی پریشانی کی وجہ سے اُس کے رونے میں شدت آ گئی تھی۔

تب ہی پودوں کی سرسراہٹ اُسے سنائی دی۔ لیکن وہ اس قدر معصوم اس ویرانی میں موجود کسی خطرے کو محسوس بھی نہ کر سکتا تھا۔ کوئی جانور، کوئی بے رحم انسانی وجود اُسے کس قدر نقصان دے سکتا تھا۔ وہ غیر محفوظ ہونے کے احساس سے ہی بے نیاز تھا۔

ولی کو تو بس رونا آ رہا تھا۔

نہ امی ہیں، نہ ہی بابا جانی کہ میں اور گڑیا بیمار ہیں......کون ہم کو دوا پلائے گا؟ کون ہمارا خیال کرے گا؟ امی!......اماں!" وہ سسک رہا تھا۔

"کون ہے؟" ایک دم سے ولی کو اپنے پیچھے سے آواز آئی۔

ولی نے سسکیاں لیتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

"میں......میں، ولی!"

"ولی؟......تُو ولی ہے؟......تُو اگر ولی نہ ہوتا تو کون ہوتا؟" انہوں نے ولی کے معصوم چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تُو واقعی ولی ہے۔" تجھ سے قریب "دوست" اور کون ہو گا؟" اب اُن کی نظر اُس کی کم عمری پر تھی۔

"اے اللہ کے دوست (ولی)! اے معصوم اور پاکیزہ روح! اے بخت والے! تُو یہاں کیسے؟"

وہ آگے بڑھے۔ "پیارے بیٹے! تیرا نام ولی ہے؟" پاس آ کر اُس کے قد کے برابر آ کر بیٹھتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

"ہاں جی! میں ولی ہوں......میں عبدالولی ہوں۔ اور یہ میری بہن نگینہ گڑیا۔ یہ بیمار ہے......"

ولی کی سوچ اتنی معصوم تھی کہ وہ صرف یہی سوچ سکتا تھا کہ بہن بیمار ہے۔ ولی نے اُن کی آواز کے اندر مہربانی اور شفقت کو محسوس کرتے ہوئے فوراً اُن کو اپنا مسئلہ بتایا تھا۔

"اے اللہ کے دوست! آ جاؤ......تُو تو میرے لئے ہی آیا ہے ناں؟......تیری مہربانی، میرے

لئے اعزاز ہے، اور........"

وہ ادھوری بات کر کے اس کے ہاتھوں سے گڑیا کو لے کر اسے دیکھنے لگے تھے۔

کوئی پریشان کن بات ضرور تھی جو ایک دم سے ولی کو ان کے مہربان چہرے پر نظر آئی تھی۔

"بابا جی! گڑیا ٹھیک ہو جائے گی ناں؟" ولی نے پریشانی سے پوچھا۔

"میری کیا مجال جو کہہ دوں اور بولوں کہ "کام ہو جائے گا........ بات بن جائے گی........ یہ تو ہونے کی بات تو صرف اُس کے بس میں ہے۔ وہ ہی کہہ سکتا ہے۔ انہوں نے دھیمے سے کہا۔

"آؤ! میرے پیارے مہمان!........ آؤ دیکھتے ہیں کہ اُس کی، اُس اللہ جی کی کیا رضا ہے........ وہ کیا چاہتا ہے۔ ہم کو تو بس اُس کی رضا میں راضی رہنا ہے۔"

وہ اُسے تھامے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

❖❖○❖❖

موسم سارے ہی اُترے تھے
رنگ، خوشبو، روشنی
سب ہی تھے
رنگ برنگی تتلیاں
مسکراتے پھول!
ان رنگوں، خوشبو کو
اس روشنی، تتلیوں کو
ان سب پھولوں کو
میں اپنی جھولی میں
بھر لینا
چاہتی ہوں
لیکن........
وہاں........
اب کچھ نہ تھا
بس ہر جانب........
سسکیاں تھیں
موسم، رنگ، پھول، خوشبو، تتلیاں!
سب........
اُڑ گئے تھے!
کہ
میری تو

اپنی جھولی میں
چھید تھے!

"شاہ جی! آپ کے لئے بہتر یہ ہی ہوگا کہ آپ کوئی بچہ گود لے لیں۔ آپ بیگم صاحبہ کی بات مان لیں، ورنہ وہ یوں ہی دھیرے دھیرے زندگی سے دور ہوتی جائیں گی۔" لیڈی ڈاکٹر نے روشن آراء کے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر کو ملازم کے ساتھ رخصت کر کے جب وہ اپنے بیڈ روم میں داخل ہوئے تو ایک دم گھرے تاسف نے ان کو گھیر لیا تھا۔ ان کے دل و جان کی روشنی بے سُدھ پڑی تھی۔

"روشن آرا!!"

جس کو وہ ہمیشہ روشنی ہی کہا کرتے تھے، ان کی زندگی کی پہلی اور آخری محبت اور عشق تھا۔

بے پناہ حُسن کی مالک روشن آرا جس کی رنگت ایسے تھی جیسے میدے میں سیندور گھلا ہو۔ آنکھوں کی گہرائیوں میں کہیں ان کا اپنا وجود بھی تو ڈوب گیا تھا۔

لمبے گھنے، سیاہ بال جو ڈبل بیڈ پر آخری کونے تک بکھرے ہوئے تھے، بے پناہ خوب صورت وجود جو سانچے میں ڈھلا ہوا تھا، یوں جیسے کوئی پرستان کی پری راستہ بھول کر اس دنیا میں آ گئی ہو۔

جتنی وہ خوب رو تھی، اس سے کئی گنا وہ خوب سیرت تھی۔ ایسا اخلاق کہ بیگانے کو اپنا کرے۔ اور اتنی حیادار کہ کبھی اپنے سسر کے سامنے بھی بے پردہ نہ گئی تھی۔

روشن آرا نے جہاں ان کی زندگی کو مکمل کیا تھا، وہاں وہ اس کو مکمل کرنے سے قاصر تھے۔ بلڈ گروپ ان کا ایسے اختلاف کر رہا تا کہ بچہ اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی یا پھر اگر آ جاتا تو بھی وہ ابنارمل ہوتا تھا۔

ان ساری حقیقتوں کو جانتے ہوئے بھی روشن آرا نے بڑے سے بڑا رسک لیا۔

تیسری بار جب وہ خوش تھی کہ چھ ماہ گزر گئے ہیں، ٹھیک ٹھاک! اب وہ صحت مند، نارمل بچے کی پیدائش کے لئے دن رات اپنے سجدے لمبے کرتی جا رہی تھی........ تو ایک دن نوکرانی بھاگتی ہوئی آئی۔

"بی بی جی........ بی بی جی! وہ، بڑے شاہ جی اور بڑی بی بی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔"

وہ بے خود، بھاگتی ہوئی سیڑھیاں اُتری۔ بس ذرا سا پاؤں خم کھا گیا تھا۔ اور پھر اُن کی تو دنیا ہی خم کھا گئی تھی۔

ساس، سسر کے جنازے اُٹھے، لیکن وہ ہسپتال میں بے ہوش پڑی تھیں۔ ایک ننھی زندگی کو کھو دینے کے بعد ان کے اندر اس دنیا میں دوبارہ ہوش میں آنے کا حوصلہ نہیں رہا تھا۔

'آہ! میری جھولی میں چھید'

روشن آرا بے ہوش ہو چکی تھیں اور خطرے کی حدود میں جا کھڑی ہوئیں۔ زندگی سے ناراضی، احمد شاہ کے لئے تینوں صدمے بڑے تھے۔ لیکن رضائے الٰہی سے کوئی منکر کیسے ہوا؟

جو زندہ تھی، وہ اہم تھی!

جو چلے گئے، اُن کو جانا ہی تھا۔

ماں باپ کے جنازے کے بعد وہ ہسپتال میں موجود تھے۔

''روشن!........روشن!........پلیز، اب تم مجھ کو اکیلا چھوڑ کر نہ جانا۔ میں بہت کمزور ہو گیا ہوں....... یوں، جیسے میری جڑیں ہی کٹ گئی ہوں اور میں کھوکھلے درخت کی طرح ڈھے جاؤں گا۔''

احمد شاہ آنکھوں کو مسلتے ہوئے کراہ رہے تھے۔ اُن کے آنسو بھی اب ختم ہو گئے تھے، اُن کے غم پر رونے کے لئے۔ اتنے بڑے غم کے لئے اُن کے آنسو کم پڑ گئے تھے۔

ہسپتال کے کوریڈور میں بیٹھے بیٹھے ان کی کمر کے ساتھ ساتھ اعصاب بھی شل ہو رہے تھے۔

دور کہیں مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔

یوں لگا، جیسے اس طوفان میں کہیں کوئی پکڑنے والا، سہارا دینے والا موجود ہو........تب ہی وہیں، فرش پر اپنی چادر بچھا کر وہ اس بڑی پاک ذات کے آگے جھک گئے تھے۔

اور وہ، جو بے نیاز ہے! وہ ہی سب سے بڑا رحمٰن بھی تو ہے۔ احمد شاہ دعا کے لئے جب سجدے میں گئے تو ان کو یوں لگا جیسے کسی ''دوست'' نے بڑھ کر ان کا سر اپنے کندھے پر رکھ لیا ہو، ان کے آنسو چن لئے ہوں۔ اسی وقت نرس باہر نکلی۔

''مبارک ہو شاہ صاحب! یور وائف از ناؤ آؤٹ آف ڈینجر۔ (اب آپ کی بیوی خطرے سے باہر ہے) اُن کی بلیڈنگ بھی بند ہو گئی ہے۔ ہارٹ بیٹ بھی نارمل ہو گئی ہے.......کوئی دو گھنٹے وہ انتہائی نگہداشت میں رہیں گی، پر ہم ان کو روم میں شفٹ کر دیں گے۔''

احمد شاہ نے وہیں شکرانے کے نفل ادا کئے۔ احمد شاہ کا صبر اللہ پیارے کو بھی بھایا.......جس شخص نے صبح اپنے والدین اور بچے کو قبر میں لٹایا تھا، اسے اس طرح اپنی جانب صبر سے جھکنے پر نوازا گیا تھا۔

احمد شاہ ہر چیز کھو کر پھر بھی پا گئے تھے۔ نواز دیئے گئے تھے۔

❖❖O❖❖

لیکن روشن آرا کے دل میں تو ہر وقت ہوک اُٹھتی رہتی تھی۔ اُسے ہر جانب بچوں کے ہنسنے، رونے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔

''شاہ جی!........یہ........یہ آوازیں میرے وجود کو آ کر چھوتی کیوں نہیں؟........یہ کیوں مجھ سے دُور بھاگتی ہیں؟........شاہ جی! میرے ہاتھ دُکھنے لگے ہیں۔ دیکھیں، کوئی زندگی کا لمحہ پھسل گیا ہو، کوئی ایسے میری طرح خالی دامن ہوتا ہے؟'' وہ اپنی جھولی آگے پھیلا کر دیکھتیں۔

''شاہ جی! میں بہت منحوس ہوں۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر روتیں۔ ''کوئی بچہ مجھے ماں کہنے کے لئے راضی ہی نہیں.......مجھے ماں ہونے کا احساس نہیں دیتا۔ لیکن یہ جو ممتا کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہے!''

انہوں نے اپنا سینہ مسلا۔

''شاہ جی! میرے بچے کہاں ہیں؟ شاہ جی! میرے بچے.......تین بار وہ آنا چاہتے تھے، تینوں بار وہ مجھ سے ناراض ہو گئے۔ آپ اللہ جی سے کہیں ناں کہ وہ مجھے معاف کر دے، میرے بچے مجھے واپس کر دے۔''

روشن آرا نیم پاگلوں کی طرح بی ہیو کرنے لگی تھیں۔

''اللہ اللہ لوری!
دودھ کی کٹوری!
دودھ میں بتاشا
اللہ اللہ لوری!''

''سو جا میرے منے!'' وہ بڑے سے Stffed گڈے کو تھپک تھپک کر سلاتیں۔

شاہ جی نے بہت مشکل سے ان کو پکڑ کر نیند کی گولی کھلا کر لٹایا اور ڈاکٹر زارا کو کال کیا۔

وہ ابھی ابھی چیک اپ کر کے گئی تھیں۔ انہوں نے روشن آرا کے لئے بچہ ایڈاپٹ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ ورنہ وہ اس کیفیت سے پاگل ہو سکتی تھیں، یا اس اعصابی تناؤ سے موت واقع ہو سکتی ہے۔ ویسے بھی وہ کون سا زندہ معلوم ہوتی تھیں۔

روشن آرا کا علاج صرف بچہ ہی تھا۔

احمد شاہ وہیں روشن آرا کے پاس کرسی پر بیٹھ گئے۔

ذہن کسی فیصلے کی جانب یکسوئی دے رہا تھا.......

❖❖O❖❖

نگینہ نے بہت دیر بعد آنکھیں کھولی تھیں۔ بچی ہوش میں آتے ہی رونے لگ گئی۔

''آہ! ہم ظالم ہیں۔ بے شک ہم ظلم کرتے ہیں۔ اللہ! تیری رحمت کی ناشکری کرتے ہیں۔ اے میری پیاری بیٹی! تُو غم نہ کر۔ ''وہ'' مہربان ہے.......لے، یہ دودھ پی۔ تیرے نصیب کی یہ نعمت ہے۔''

بابا جی نے، جن نے.......جن کو ولی نے بابا جی پکارا تھا.......نگینہ کے منہ میں چمچ سے گرم دودھ ڈال رہے تھے۔ بابا جی کے ہاتھوں کی نرمی اور ان کے وجود کی محبت نے بے قرار بچی پر اثر کیا تھا۔ بچی پُرسکون ہو کر سونے لگی تھی۔

''تیری تو نیند میں بھی ''عبادت'' شامل ہے۔ ہم تیری عبادت میں خلل کیوں ڈالیں؟'' وہ بچی کے پاس سے دھیرے سے بے آواز اُٹھ کر ولی تک آ گئے تھے۔

''اے میرے اللہ کے پیارے دوست!'' اُنہوں نے پیار سے اسے پکارا۔

''میں پیارا دوست نہیں ہوں۔ میں ولی ہوں.......میرا نام عبدالولی ہے، بابا جی!'' ولی نے بہن کو پُرسکون سوتے دیکھ کر ہشاش بشاش ہو کر بتایا۔ گرم گرم دودھ اور رات کی روٹی نے اُس کے اندر توانائی بھر دی تھی۔

بابا جی دھیرے سے مسکرائے۔

''تُو ہی سچا ولی ہے.......سچ بولنے والا.......یہ ہم ہی ہیں، جو ساری عمر جھوٹے رہتے ہیں۔''

''بابا جی! کیا کوئی بڑی سیڑھی ہے آپ کے پاس؟'' ولی نے ساری جھونپڑی میں نظر دوڑائی کہ اُسے بڑی سی سیڑھی مل جائے، لیکن اُسے سارے منظر میں ایک چارپائی، دو چوکیاں، چند برتن، جانماز اور کتابوں کی ایک الماری نظر آئی تھی۔

''کیا کرو گے بیٹا! سیڑھی کا؟'' بابا جی نے سوال کیا تھا۔

"وہ، میں.........میں اپنی اماں اور بابا جانی کو لے کر آؤں گا.........وہاں ہمارے گھر میں آگ جو لگی ہے۔"

"کہاں؟" بابا جی نے سوال کیا۔

"وہ ناں، وہاں پر........" اور دھیرے دھیرے ولی نے اپنی سوچ کے لحاظ سے بات سمجھائی تھی۔

جوں جوں وہ بتاتا گیا، بابا جی کے چہرے پر تفکر کی لہریں نمودار ہوتی گئیں۔

"اے اللہ کے پیارے دوست! تم آرام کرو.........تم ذرا فکر نہ کرو۔ وہ ذات ہے ناں۔ اللہ جی کی سب سے بڑی ذات۔ وہ ذات ستر ماؤں سے بھی زیادہ چاہنے والی ہے۔ وہ کبھی تم کو اکیلا اور بے آسرا نہ کرے گا۔"

❖❖O❖❖

"السلام علیکم بابا جی!"

رحیم خان نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔

"وعلیکم السلام! اللہ تعالیٰ تجھ پر اپنی رحمت کی نگاہ رکھے۔" بابا جی نے دونوں بکریوں کا دودھ نکال لیا تھا۔ اب برتن کو ڈھانپ کر، سائیڈ پر رکھ کر بکریوں کے آگے چارہ ڈال رہے تھے۔

"اس بار اللہ نے مجھے اپنی نعمت سے نوازا ہے، بابا جی!" رحیم خان کے چہرے پر خوشی چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔

"شکر الحمدللہ! اُس اللہ کی سب مہربانی ہے۔" بابا جی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ ہے تیرے صبر کا انعام و اکرام۔ تُو نے اللہ کی دی ہوئی رحمت کو سر آنکھوں پر رکھا تو تیری بیٹی کے بعد اُس نے تجھے اپنی نعمت سے بھی نواز دیا.........بس اتنا یاد رکھنا، اللہ سوہنے کو بیٹیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والے اتنے پسند ہیں کہ جنت جیسی مشکل چیز آسان بنا دی ہے۔ اچھے والدین کے لئے یہ نعمت حاصل کرنا بہت آسان ہے۔"

"جی بابا جی! مجھے آپ کی بات کیسے بھول سکتی ہے.........دوسری بیٹی کی پیدائش پر بچی کی پھوپھی اور دادی جب پھوٹ پھوٹ کر روئی تھیں تو آپ نے کیسی پیاری بات بتائی تھی اُن کو اور مجھے بس سکون ہو گیا تھا کہ رحیم خان! اللہ بڑے دل والوں اور اپنے پسندیدہ بندوں کو بیٹیاں دیتا ہے۔ چھوٹے دل والوں کو نہیں دیتا، کمینوں کو نہیں دیتا!.........آہ! کیسے میرے دل کی چبھن ایک دم سے نکل گئی تھی۔ میرا دل اپنے بڑے مرتبے پر خوش ہوا تھا......... پر اللہ نے فاطمہ بی بی، آمنہ بی بی کے بعد مریم بی بی سے مجھ جیسے بندے کو نوازا۔ مجھے شہر میں شاہ جی کے ہاں نوکری ملی، میری تنخواہ اتنی تھی کہ میں نے دو بہنوں کو بیاہا اور آج اللہ نے بیٹا بھی دے دیا۔" رحیم خان بہت خوش تھا۔

ہمارے پیارے نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو تین بیٹیوں کو اچھا پال پوس کر اچھی جگہ ان کی شادی کرے گا، وہ قیامت کے روز میرے اتنا قریب ہو گا۔ پھر آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ کی دو انگلیوں کو کھڑا کر کے دکھایا۔

"بابا جی! اگر آپ جیسا استاد ہم کو نہ ملتا تو ہمارا سارا گاؤں صدیوں کی جاہلیت والی سوچ میں پھ

آپ نے نہ صرف سارے گاؤں کے بچوں کو قرآن پاک پڑھایا بلکہ ہر ذہن میں اچھائی کا بیج بھی ... آج ہمارے گاؤں میں جو بہتری کی فضا ہے، صرف اور صرف آپ کی وجہ سے ہے۔" رحیم خان نے ...ال کیا تھا۔

"یہ سب صرف اور صرف اللہ کا کرم ہے۔ وہ جسے چاہے، ہدایت دے دے۔"

بابا جی نے پاس ہی پڑے چھوٹے سے برتن میں دودھ نکال کر رحیم خان کو دیا۔

"لو رحیم خان! تمہاری قسمت کی نعمت ہے۔ اللہ کا شکر ادا کر کے لے لو۔"

دودھ نیم گرم اور میٹھا تھا۔ بابا جی نے ابھی تازہ دوہا تھا۔

"شکریہ بابا جی!" رحیم خان نے برتن منہ کو لگاتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کے لئے یہ گھر کے بنے ...ے لڈو لایا ہوں۔ میری گھر والی نے بڑے شوق سے آپ کے لئے بنا کر دیئے ہیں۔" رحیم خان ...اسٹیل کا بند منہ والا بڑا سا ڈبہ آگے کرتے ہوئے کہا۔

"تم جانتے ہو میں اتنی ثقیل غذا کھاتا نہیں ہوں۔" بابا جی نے نرم مسکراہٹ سے جواب دیا۔ "لیکن ...ج میرے ہاں مہمان آئے ہیں، اسی لئے اللہ نے ان کی قسمت کا رزق بھیجا ہے۔" بابا جی نے دودھ کا ...ن اٹھا کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"مہمان؟" رحیم خان نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، رحیم خان!.........میرے بہت معزز اور بخت والے مہمان۔" بابا جی نے قدم تیزی سے ...ھائے تھے۔

رحیم خان نے حیرت سے ساتھ چلتے چلتے سوچا، کون ہو سکتا ہے؟ بابا جی کو تو ہم سالوں سے اکیلا ...یکھ رہے ہیں۔

"رحیم خان! سنا ہے، گاؤں میں بہت افسوس ناک واقعہ ہوا ہے۔" بابا نے چلتے چلتے رُک کر پوچھا۔

"جی، بابا جی! کوئی بارہ تیرہ دن پہلے بہت افسوس ناک واقعہ ہوا۔ سارا گاؤں ان دنوں سوگ میں ...ا رہا۔ اب بھی زندگی معمول پر نہیں آئی۔ لوگ ڈرے سہمے پھرتے ہیں.........آہ! بڑی حویلی تو جل کر ...م ہو گئی۔ ایسا ظلم! کوئی نہ بچ پایا.........اتنی زمینیں، کوئی وارث نہ بچا۔ ظالموں نے بہت ظلم کمایا.........ب جل........."

رحیم خان کا جملہ اُس کے منہ میں رہ گیا۔ بابا جی نے اس مٹی سے بنے کمرے کا دروازہ کھول دیا تھا، ان دو حقیقتیں دنیا کے بے خبروں کو اس سب سے بڑی ذات کی بڑائی کا یقین دلا رہی تھیں۔

"کہ میں واحد ہوں.........میرا کوئی شریک نہیں......... میں جسے چاہتا ہوں، زندگی اور رزق عطا کرتا ...وں۔"

مارنے والوں سے بڑی ذات، بچانے والے کی ہے!

ولی اور نگینہ بے خبر سو رہے تھے۔

"یہ.........یہ........." رحیم خان کو الفاظ نہ مل رہے تھے۔

یہ گاؤں چھوٹا سا تھا۔ آس پاس بھی جو گاؤں تھے، چھوٹے چھوٹے تھے۔ اور یہ سب گاؤں سیّد

عبداللہ کی جاگیر میں آتے تھے۔ اور ان کے بچوں کو سب ہی پہچانتے تھے۔ خاص کر وملہ کو۔

"ہاں، یہ عبدالولی ہی ہے۔ عبداللہ حویلی سے بچ جانے والے دو بچے۔" بابا جی نے رحیم خان کے سر پر بم پھوڑا تھا۔

"یہ...... یہ معجزہ ہے!" رحیم خان نے حیرت اور بے یقینی سے ہونٹ پھڑپھڑائے تھے۔

"ہاں! اللہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ اُس کو کچھ کرنے کے لئے کسی وضاحت دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ اُس کی دنیا ہے۔ وہ جو چاہے، وہ کرے گا......"

بابا جی نے ململ کی اپنی چادر کو پھاڑ کر چار ٹکڑوں میں تقسیم کیا تھا۔ اب وہ نگینہ کے نیچے بچھے گیلے کپڑے کو نکال کر چادر کا خشک ٹکڑا بچھا رہے تھے۔

"بابا جی! آپ یہ سب...... یہ سب کیسے کر رہے ہیں؟ بچوں کی گندگی میں ہاتھ ڈال رہے ہیں۔"

رحیم خان تڑپ ہی اٹھا تھا۔ اس کی نظر میں بابا جی کا مقام بہت بڑا تھا۔

"یہ تو معصوم، پاک جانیں ہیں۔ ہم بڑوں کے عملوں کو جو نجاستیں لگی ہوتی ہیں، ان کو ہم بھول جاتے ہیں اور ان معصوموں کے کام کرنے کو حقیر جانتے ہیں۔ یہ سامنے نظر آنے والی نجاست، دل کی نجاست کے سامنے کچھ نہیں...... رحیم خان! تم کو نہیں لگتا کہ تمہیں ان بچوں کی حفاظت اور کسی مناسب ٹھکانے کی تلاش میں اس بوڑھے آدمی کی مدد کرنی چاہئے؟"

بابا جی کی نظروں اور زبان پر پہلی بار سوال تھا۔ اور رحیم خان ان کی بات کیسے ٹال سکتا تھا۔

"بابا جی! وہ سیّد سرفراز بہت بڑا آدمی ہے۔" رحیم خان کے ڈر کو زبان ملی تھی۔

"نہ، رحیم خان...... نہ!...... بڑا لفظ صرف اور صرف اُس ذات کے ساتھ سجتا ہے۔ ہم کم ظرف لوگ ہیں...... عملوں کے چھوٹے، حوصلوں کے چھوٹے اور دلوں کے چھوٹے! سب سے بڑا صرف اللہ ہے...... پر کیا کہتے ہو، رحیم خان! ان اللہ کی پیاری رحمتوں کے متعلق؟...... بے شک اُس مولا کی کرم ہے ہم پر، تب ہی تو ان معصوموں کی میزبانی کا شرف ہم کو حاصل ہوا۔" بابا جی نے آہستگی سے کہا۔

"بابا جی! آپ کا کہا سر آنکھوں پر...... میرا تو اپنا دل ان معصوموں پر ہونے والے ظلم پر رو رہا ہے۔ کیا زمانہ ہے! ظلم کی انتہا ہے۔ بھائی نے بھائی کو مار ڈالا۔" رحیم خان نے افسردگی سے کہا۔

"نہ رحیم خان! نہ۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ ہر عمل کی جواب دہی ہے۔"

سرع الخیر ثوابا البر د صلة الرحمه واسرع الشر عقوبة البقی و قطیعة الرحمه

"اگر نیکوکاری اور صلہ رحمی کا ثواب واجر دوسری نیکیوں سے بہت جلد مل جاتا ہے تو "ظلم" اور قطع رحمی کی سزا دوسرے گناہوں کی نسبت بہت جلد مل جاتی ہے۔"

"کوئی ظلم کرے تو وہ یہ نہ بھولے کہ اللہ رحمٰن، اللہ جبار بھی اور قہار بھی ہے۔ یہ ایسے غضب روپ ہیں اس کے کہ زمین دیکھے تو ریزہ ریزہ ہو جائے...... یہ تو انسان ہی سرکش ہے، جو جانتے بوجھتے بھی خود کے لئے آگ کے بڑے بڑے گڑھے کھود لیتا ہے۔" بابا جی نے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

اب وہ مٹکے سے پانی لے کر ہاتھ دھو رہے تھے۔

"بابا جی! ابھی تو سیّد سرفراز اور اُس کے آدمی ان بچوں کو زندہ نہیں چھوڑیں گے، اگر خدانخواستہ ان کو کوئی سن گن مل گئی۔ ہم کو بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ ویسے تو یہاں تک آنا اُن کے بس کی بات نہیں ہے۔ لیکن شیطان کے مکر کی اور ظالم کے ظلم کی کوئی حد جو نہیں ٹھہری۔ احتیاط لازم ہے۔ آج میں واپس شاہ جی کے پاس جا رہا ہوں۔ شہر جاتے ہی ان سے ذکر کروں گا...... وہ بڑے رحم دل مالک ہیں۔ کوئی نہ کوئی تو سبیل نکلے گی۔ بچوں کا اس علاقے سے نکلنا بہت ضروری ہے۔ کسی کی بھی نظر پڑتی ہے تو بہت مشکل ہوگی۔ خطرہ ان کی جانب ہر لمحے کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔" رحیم خان نے آہستگی سے کہا۔

"رحیم خان! اللہ نے تیرے اوپر بڑا کرم کیا ہے۔ تُو اپنے نام کی طرح زندگی کے لئے خوش قسمتی کا عنوان بن سکتا ہے۔" بابا جی نے اُس کے کندے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"بابا جی! میں پوری کوشش کروں گا۔" رحیم خان بولا۔

"فی امان اللہ!...... تم خیر سے جاؤ اور خیر سے واپس آؤ۔ جس مالک نے ان کو چاروں جانب بھڑکتی آگ سے بچا کر اس ویرانے میں زندگی دی، وہی سب سے بہتر جانتا ہے۔ بے شک وہ ہی اُن کی حفاظت کرے گا۔ تم بس ان بچوں کے لئے کوئی مستقل ٹھکانہ دیکھو۔ جو ان کے شایانِ شان ہو۔ یہ بہت معصوم اور اللہ کا تحفہ ہیں۔ ہم کو ان کی قدر کرنی ہے۔" بابا جی نے سوئے ہوئے بچوں کو شفقت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

❖❖○❖❖

"میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ بیگم صاحبہ کا علاج صرف بچہ ہے۔" ڈاکٹر زارا نے احمد شاہ سے کہا۔ وہ ابھی ابھی روشن آرا کو نیند کا انجکشن دے کر باہر آئی تھیں۔

"جی، جی! میں اس معاملے میں......" احمد شاہ پریشان گہرا سانس لے کر بولے۔ "میں سوچ رہا ہوں، اس مسئلے کے بارے میں، اللہ نے چاہا تو کچھ نہ کچھ حل تو نکلے گا۔" ڈاکٹر زارا کو گیٹ تک چھوڑتے ہوئے احمد شاہ نے دھیمی آواز میں کہا۔

"یہ جتنا جلد ہو جائے، اتنا ہی بیگم صاحبہ کے لئے بہتر ہوگا۔" ڈاکٹر زارا نے کہہ کر گاڑی اسٹارٹ کی۔

"السلام علیکم، شاہ جی!" رحیم خان نے احمد شاہ کو مخاطب کیا، جو نہ جانے کن سوچوں میں گم، بت بنے کھڑے تھے۔

"وعلیکم السلام، رحیم خان! کیسے ہو؟ مبارک ہو اللہ نے تمہیں، تمہاری خواہش کو نوازا۔" احمد شاہ کو صرف ایک پل لگا تھا، اپنی پہلی حالت میں واپس آتے۔ یہ ان کی بہت ساری خوبیوں میں سے نمایاں خوبی تھی۔

"شاہ جی! آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" رحیم خان نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"خیر ہے، تمہارا بچہ ٹھیک تو ہے؟ اور رقم تو نہیں چاہئے؟" احمد شاہ سب ملازموں کے لئے مہربان مالک تھے۔

"جی، اللہ کا کرم ہے...... مجھے کچھ اور کہنا تھا۔" رحیم خان کا حوصلہ بڑھا تھا۔

"چلو، پھر اندر چل کر تسلی سے سنتے ہیں تمہاری بات۔" احمد شاہ کی ہمیشہ سے عادت تھی، وہ اپنے ہر ملازم کی بات اور مسئلے پر ذاتی توجہ دیتے تھے۔

"اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے شاہ جی! آپ ہم غریبوں کو بھی اتنی عزت دیتے ہیں۔" رحیم خان کا دل خوش ہوا تو دل سے دعا نکلی۔

"شاہ جی! وہ، میرے گاؤں میں......" رحیم خان جوں جوں بتاتا جا رہا تھا، احمد شاہ کے چہرے پر سوچ کی لکیریں نمایاں ہو رہی تھیں۔

"بابا جی کا کہا میرے لئے حکم کی طرح ہے۔ آپ کی مہربانی ہوگی، اگر آپ ان معصوموں کو وہاں سے نکالنے اور کسی اچھے ادارے میں رکھوانے میں مدد کریں گے۔" رحیم خان نے گزارش کی۔

"رحیم خان! اولاد صرف اولاد ہوتی ہے۔ سگی، سوتیلی نہیں۔ کیا تم ہماری اس بات کی لاج رکھو گے کہ کبھی اس راز سے پردہ نہ اُٹھے؟"

اور رحیم خان نے بہت عقیدت سے اس انسان کو دیکھا تھا جو فرشتوں جیسا دل رکھتا تھا۔

ان بچوں کے متعلق ساری تفصیل سن کر احمد شاہ نے رحیم خان سے صرف یہ جملہ کہا تھا۔ جس میں ان بچوں کے مستقبل کی روشنی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

❖❖○❖❖

جانے کیوں، احمد شاہ کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ بچے ان کے گھر کی خوش بختی بنیں گے۔

تب ہی تو وہ روشن آرا کی طبیعت کے بہانے سے کوئی دو مہینے سے یہیں تھے۔ ورنہ وہاں ابوظہبی میں اُن کا شپ پندرہ دن سے پھنسا پڑا تھا۔ اور وہ چاہتے ہوئے بھی جا نہ پا رہے تھے۔

"رحیم خان! ہم ابھی گاؤں چلتے ہیں...... لیکن تمہیں مجھ سے وعدہ کرنا ہوگا، تاعمر رازداری کا۔ میں ان بچوں کو اپنی اولاد کی جگہ دینا چاہتا ہوں۔ بولو، کیا کہتے ہو؟" احمد شاہ نے فیصلہ کن انداز میں پوچھا۔ رحیم خان نے بے یقینی سے دیکھا کہ ایسی خوش قسمتی کی وہ توقع بھی نہیں کر رہا تھا۔

"شاہ جی! ہماری تو جان بھی آپ پر قربان۔ اس ناچیز کی زبان کبھی نہ کھلے گی۔" رحیم خان کی باچھیں کھل رہی تھیں۔ "لیکن ایک مسئلہ ہوگا، شاہ جی! وہ بچے خطرے میں ہیں۔ بہتر ہوگا ایسے میں نہ کسی کو معلوم پڑے گا نہ خبر ہوگی، اگر ہم رات کے اندھیرے میں سفر کر کے ان کو لائیں۔" رحیم خان نے تشویش کو سنبھالتے ہوئے مشورہ دیا۔

"ٹھیک ہے۔" احمد شاہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا اور اندر کی جانب بڑھ گئے۔

❖❖○❖❖

"وہ سامنے......" رحیم خان نے جیپ ایک کچے سے گھر بلکہ جھونپڑی کے آگے روکتے ہوئے کہا۔

"یہیں بابا جی رہتے ہیں...... اس طرف گاؤں ہے کچھ اونچائی پر۔ اس کے پیچھے جنگل شروع ہو جاتا ہے اور یہاں گھنے جنگل میں بڑے جانور بھی ہیں اور گاؤں کے پاس کم گھنے جنگل سے نیل گائے اور رات کو سؤر زیادہ آتے ہیں۔ اکثر فصلوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ مرحوم عبداللہ صاحب نے جنگل کی طرف بڑے بڑے نوکیلے لوہے کی باڑ لگوائی تو خاصا تحفظ حاصل ہو گیا ہے۔" رحیم خان، احمد شاہ کو ساتھ ساتھ

تفصیل بتاتا آگے بڑھنے لگا۔

"آ جاؤ!" دستک دینے پر ایک مہربان آواز سنائی۔ "آؤ! دروازہ کھلا ہے۔"

احمد شاہ حیران ہوئے کہ بچے اتنے خطرے کے باوجود کھلے دروازے کے گھر میں کیسے محفوظ رہ گئے؟ لیکن جلد ہی ان کو اپنے خیال کا جواب مل گیا تھا۔

کوئی نہ سمجھ میں آنے والی کشش تھی، ان بزرگ میں۔ وہ نظریں جھکا کر اپنا مدعا بیان کرنے لگے۔

"ہوں! تو کیا صرف دل کا اصرار ہے یا دماغ نے بھی ساتھ دیا اس نیک کام کے لئے؟" بابا جی نے خاصا عجیب سا سوال کیا تھا۔

احمد شاہ جو چوکی پر کچھ فاصلے پر بیٹھے تھے، ایک دم ان کے قریب ہو کر بیٹھ گئے۔

"محترم بزرگ! گو کہ یہ میرے دل کی شدید آرزو ہے، لیکن دماغ نے بھی آمادگی دی ہے تو یہ فیصلہ کیا ہے۔ یہ دنیا کی دولت دنیا میں رہ جانی ہے۔ ہماری کیا مجال کہ کسی مال یا اولاد کو اپنا وارث جانیں۔ لافانی صرف وہ ایک اللہ کی ذات ہے۔ صرف اس کا نام باقی رہے گا، اُس کی مرضی اور اُس کی حکومت رہے گی۔ پھر بھی وہ ہی نوازنے والا ہے۔ اُس مالک نے ہر نعمت عطا کی۔ دنیا کی کسی آسائش سے دور نہیں رکھا۔ لیکن یہ دولت، یہ مال میری بیوی کی گود نہیں بھر سکتے...... وہ ادھوری ہے۔ یہ دکھ اسے دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔ میں اپنی دولت، اپنی اچھائی، اپنا نام جو باری تعالیٰ نے مجھے دے رکھا ہے، اس دل کی ساری محبت کے ساتھ میں ان بچوں کو دینے کا عہد کرتا ہوں...... آپ اگر اجازت دیں تو یہ دو پھول میرے گھر کی خوش بختی بنیں۔ ممتا کی ماری ماں کے دل کا سکون بنیں۔ اس دنیا میں کوئی چیز ایسی نہ ہوگی، جو اللہ کی مرضی سے اسے میسر نہ ہوئی ہو۔ بس اولاد کے معاملے میں اللہ کی رضا ہے ناں! بے شک ہم بے بس ہیں۔ لیکن وہ بے نیاز کتنا بھی ہو...... وہ مہربان سب سے بڑا ہے۔ میں کوئی گارنٹی نہیں دے سکتا، آخر بشر ہوں۔ لیکن جتنی میری ذات کی سچائی ہے اور ظرف ہے، میں وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی آپ کو شرمندہ نہ کروں گا۔"

احمد شاہ نے اتنی لمبی چوڑی بات کر کے بہت آس سے ان کی جانب دیکھا تھا۔

"پیارے بیٹے! اللہ رحمٰن تمہارے رزق، اخلاق اور دین کے فہم میں اضافہ کرے، تمہیں اپنی رحمت میں رکھے۔ میں بھلا کون ہوں، گارنٹی مانگنے والا؟ یہ تو اُس کا مال ہے، وہی حفاظت کرے گا۔" بابا جی دھیمے سے بولے۔ "لیکن کل کو یہ جوان ہوئے اور کیونکہ سچ کسی نہ کسی طرح سامنے آ ہی جاتا ہے، یہ اپنی پہچان کے لئے بے صبرے اور بے قرار ہوئے تو تم کو بہت حوصلے سے کام لینا ہوگا۔

ہمارے پیارے نبی ﷺ کا فرمان ہے کہ:

العاریة مؤداة والمنحة مردودة

(مستعار لی ہوئی چیزیں لوٹا دی جاتی ہیں)

پیارے بیٹے! اولاد چاہے سگی ہو یا پرائی، لیکن خون کے رشتے سے بندھی ہو یا پرائے خون کی، اس کے لئے ماں باپ...... صرف ماں باپ ہوتے ہیں۔ کسی امتیاز کے بغیر۔ دوسرے یہ اللہ کی امانت ہوتی ہے، وہ جب چاہے واپس لے لے، اس کی رضا پر خوش ہونا چاہئے۔"

اور پھر اس اندھیری رات میں اک ستارہ جگمگایا تھا، مسکرایا تھا........اس خوش بختی کے ستارے کو سب نے مبارک باد دی تھی کہ ابھی بھی اس دنیا میں انسان بستے ہیں، اپنے ہونے کے معنی کو پورا کرتے ہیں کہ ابھی زندگی کی اُمید باقی تھی۔

❖❖○❖❖

کوئی لکھت پڑھت کے بغیر ایک معاہدہ ہوا تھا۔ جس کے گواہوں میں رحیم خان اور وہ مہربان بزرگ تھے یا پھر اُس جنگل کی سرسراتی ٹھنڈی ہوائیں تھیں۔

سوتے ہوئے بچوں کو اُٹھا کر گاڑی میں لٹایا تو احمد شاہ نے ایک دم بابا جی کے ہاتھ عقیدت سے تھام لئے۔

''محترم بزرگ! شکریہ کا کوئی لفظ نہیں ملتا۔ آپ تو بڑے ہیں........میرے لئے دعا کیجئے گا کہ میں سرخرو ہوں۔''

تب ہی پچھلی سیٹ پر لیٹے ولی کی آنکھ کھلی تھی، سوتے سے اُٹھ کر اُس کی سمجھ میں پہلے تو کچھ نہ آیا........لیکن حواسوں میں آتے ہی اُس نے اپنی بہن کو تلاش کیا جو کہ احمد شاہ کی گود میں میٹھی نیند سو رہی تھی۔ احمد شاہ نے ننھے وجود کو اپنی گرم چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔

''بابا جی!........ بابا جی!........ بابا جی!'' ولی نے بوکھلا کر شور مچا دیا تھا۔

تینوں نفوس نے چونک کر گاڑی کے اندر بے چین ولی کی جانب دیکھا تھا۔

''بابا جی! ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' ولی نے بابا جی کے پاس آتے سوال کیا۔

''پیارے بیٹے! اللہ تمہارا سفر مبارک کرے۔ خیر سے جاؤ! تمہاری ماں تمہارا راستہ تک رہی ہے۔''
بابا جی نے شفقت سے ولی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''اماں........اماں کو آگ سے نکال لیا کیا سب نے؟'' ولی نے ایک دم پُرجوش ہو کر ان سے پوچھا تھا۔

''احمد شاہ بیٹے! بچہ اپنوں کی پہچان رکھتا ہے۔ اُمید ہے کہ تم اس معاملے کو معاملہ فہمی کے سپرد کرو گے۔ زبردستی کی گئی تو یہ معصوم ہے، یہ عمر ہی ایسی کچی ہوتی ہے۔ ذرا سا دباؤ پڑے تو وجود چٹخ جاتا ہے۔ ٹوٹے نہ بھی تو........تو پھر بھی بال آ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اسے پیار سے سمجھانا۔ بچہ پیار اور توجہ کا بھوکا ہوتا ہے۔ اس کی بھوک کو مٹانا، اس کی بھوک کا خاطر خواہ انتظام کرنا۔'' بابا جی نے دھیمے دھیمے اُن کو زندگی کا کتنا قیمتی راز بتایا تھا۔

احمد شاہ نے ان کا ہاتھ تھام کر یقین دلایا۔

''ولی........!'' وہ ولی کی جانب متوجہ ہوئے۔ ''ولی بیٹا! یہ احمد شاہ ہیں۔ میں اللہ رحمٰن اور اس کے پیارے محبوب ﷺ کے بعد تم کو ان کے سپرد کرتا ہوں۔ یہ بہت اچھے انسان ہیں۔ ان کی ہمیشہ عزت کرنا، پیار اور مان کے ساتھ رہنا۔ تم بہت پیارے بیٹے ہو، ہر بات مانتے ہو۔ کہو اپنے بابا جی کی بات مانو گے ناں؟''

ولی جو اُن سے بہت مانوس ہو گیا تھا، کسی مسمریز ہوئے وجود کی طرح خاموشی سے پہلے احمد شاہ کو

دیکھا۔ کچھ چہروں میں ان کی ذات کی نرمی کا اتنا عکس ہوتا ہے کہ خوامخواہ اُن کی بات ماننے کو دل چاہتا ہے۔

''جی بابا جی! میں آپ کی بات مانوں گا۔'' ولی نے ایک دم بہت سنجیدگی سے حامی بھری۔

''بیٹا! تم کو بتاؤں کہ اُس مہربان ذات نے تمہارے لئے کتنے اچھے دوست بھیجے ہیں........بس اتنا یاد رکھنا کہ تمہاری اماں تمہاری راہ تک رہی ہے اور تمہارے بابا جانی تم کو لینے آئے ہیں۔ ابھی تمہارا معصوم ذہن بہت سوال اُٹھائے گا، تم ان کو دوست جانو۔ یہ تم کو ان شاء اللہ ہمیشہ محبت ہی دیں گے۔''

''بابا جی! آپ ہمارے ساتھ نہیں آئیں گے؟'' ولی نے بہت آس سے اُن کی جانب دیکھا تھا۔

''دیکھو پیارے بیٹے! ابھی تم کو اکیلے جانا ہو گا۔ تمہاری اور تمہاری بہن کی زندگی کو محفوظ کرنا ضروری ہے۔ تم نہیں جانتے کہ انسان کتنا بڑا ظالم ہے۔ اپنے ہی ہاتھوں اپنا (انسانیت) کا خون کر دینے والا اور ظلم کمانے والا۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ یہ دنیا ایک پل کا سودا ہے........بس، پل میں ختم ہو جانے والی۔ پیارے بیٹے! تم کو اس ماحول سے دور جانا ہو گا۔ ہم یہاں سے نکل نہیں سکتے۔ اُس کا حکم یہی ہے کہ ہم تنہائی میں رہیں۔ تم کبھی کبھی ہم سے ملنے آ جایا کرنا۔ کیوں احمد شاہ! آپ ہم پر اس مہربانی کا بوجھ تو نہ لیں گے؟'' بابا جی نے مدھم لہجے میں کہا۔

''کیسی بات کرتے ہیں، محترم بزرگ! میں ان شاء اللہ تعالیٰ ان دونوں کو آپ سے ملواتا رہوں گا۔'' احمد شاہ نے جواب دیا۔

''جیتے رہو........خیر سے جاؤ........اللہ تمہارے سب رستوں کی خیر کرے۔''

بابا جی نے ولی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

معصوم ولی کو یہ سب بڑی بڑی باتیں پوری سمجھ تو نہ آئیں لیکن وہ احمد شاہ سے مانوسیت محسوس کر رہا تھا۔

رات کے اندھیرے میں جیپ بہت تیزی سے اُونچائی، اُترائی پر بھاگتی جا رہی تھی۔ بہت اندھیرا تھا۔ لیکن وہاں اِک تارے نے چمک کر اندھیرے میں ملاوٹ کر دی تھی۔ روشنی کی ابتداء کر دی تھی۔

❖❖○❖❖

صبح کی روشنی ہر طرف آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی، جب وہ ''روشن وِلا'' پہنچے تھے۔

روشن آرا اپنے کمرے میں جانماز پر لمبے سجدے میں بیٹھی تھیں........ جب احمد شاہ نے دروازہ کھولا تو بھی اپنی محویت سے نہ نکل پائی تھیں۔

''روشنی! روشنی! دیکھو، تمہارے لئے کون آیا ہے۔''

احمد شاہ نے ایک بازو میں نگینہ کو تھاما ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے ولی کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔

روشن آرا نے آنسوؤں سے تر اپنا چہرہ اُٹھایا تو بے یقینی سے دیکھتی رہ گئیں........دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔

یا اللہ ...اُن کا دل پکار رہا تھا۔

کیا........ یہ یہ منظر میرے ہی لئے ہے؟

''روشنی! دیکھو، تمہارا بیٹا اور بیٹی آئے ہیں۔ کیا تم ان کو ملو گی نہیں؟''
احمد شاہ نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے یقین دلایا۔

''شاہ جی!'' روشن آرا کی آنکھیں بے یقینی اور خوشی سے بھر آئی تھیں۔ احمد شاہ مسکرائے تھے۔

اب وہ دیوانہ وار ولی اور نگینہ کو پیار کر رہی تھیں۔ ولی نے اپنے سامنے موجود خوب صورت سی اس پری کو دیکھا۔ وہ بالکل اماں کی طرح پیار کر رہی تھیں۔

کچھ تھا اُن کے لمس میں، جو اُس کو اُن کے سینے سے الگ نہ ہونے دے رہا تھا۔ ہاں، یہی تو وہ لمس تھا، جو وہ کئی دنوں سے تلاش کر رہا تھا۔

''شاہ جی! یہ تو .... یہ تو واقعی میرے ہی بچے ہیں۔'' روشن آرا کبھی ہنستی اور کبھی روتی تھیں۔

''روشن آرا! .... اللہ رحمٰن کی ذات بہت مہربان ہے۔ دیکھو، یہ سب اس کی رحمت ہے۔'' احمد شاہ، روشن آرا کے چہرے پر زندگی دیکھ کر شکر ادا کر رہے تھے۔

❖❖O❖❖

''لیکن ہم سب پاکستان چھوڑ کر کیوں جا رہے ہیں؟'' روشن آرا نے کپڑے کو تہہ لگاتے ہوئے سوال کیا تھا۔

''چھوڑ کر نہیں، کچھ عرصے کے لئے جا رہے ہیں۔ ان بچوں کو اچھا مستقبل دینے کے لئے ان کے ماضی کو یہیں چھوڑ کر جانا ہو گا....... میرے خاندان میں کوئی نہیں ہے جو آ کر سوال کرے۔ البتہ تم اپنے چچا زاد بھائی اور اپنی بہن کو کیا جواب دو گی؟ ہم کو فوراً نکلنا ہو گا۔ وہاں جا کر تم بچوں کی پیدائش کا بتا دینا۔'' احمد شاہ ضروری کاغذات سمیٹ رہے تھے۔

''لیکن ولی اور نگینہ تو کافی بڑے بچے ہیں۔ کیا راز کھل نہ جائے گا؟'' روشن آرا نے سوال کیا۔

''جب بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو ایک سے لگتے ہیں۔ پھر جو ہم بتائیں گے، وہی اُن کو ماننا پڑے گا۔ اس لئے تو اتنی احتیاط سے یہاں سے جا رہے ہیں۔ باقی اللہ کی ذات مالک ہے۔ وہ ہی ہر بات کا پردہ رکھنے والا ہے۔'' احمد شاہ نے روشن آرا کو تسلی دی تھی۔

''جیسے آپ کی مرضی۔'' روشن آرا تو اولاد جیسی نعمت پا کر ہر قربانی دینے کو تیار تھیں۔

❖❖O❖❖

''یہ تمہاری آپا کو کیا سوجھی، وطن چھوڑ کر پرائے دیس میں بسنے کی؟'' انور جاوید نے حُسن آرا سے سوال کیا تھا۔ ''اور ہم کو بتائے، ملے بغیر چل دیئے۔ ٹھیک ہے، بڑے لوگ ہیں۔ روشن آرا اتنے رئیسوں میں بیاہی گئی، لیکن بھائی سے تو مل کر جانا چاہئے تھا ناں۔''

انور جاوید صاحب نے چائے کا کپ رکھ کر اپنی اس خاموش طبع بیوی کو بولنے پر اُکسایا۔ لیکن وہ پھر بھی نہ بولیں، خاموشی سے اُون سلائیوں میں گم تھیں۔

''میں محترمہ! آپ سے بات کر رہا ہوں....... ان دیواروں سے نہیں۔'' انور جاوید صاحب نے چڑ کر کہا۔

''میں اب آپ کی باتوں کا کیا جواب دوں؟'' حُسن آرا نے اُون سلائیاں گود میں رکھ کر بہت تحمل

سے پوچھا۔

''میں پوچھ رہا ہوں کہ تمہاری آپا یہ اچانک سات سمندر پار کیوں جا بسیں؟'' انور جاوید صاحب بہت مشکل آدمی تھے، بہت مشکل سے ہی کسی کی جان اور بات چھوڑا کرتے تھے۔

''آپا پھر سے دوسرے جی سے تھیں۔ آپ تو جانتے ہیں، ہر بار کیا قیامت گزرتی ہے۔ اس بار وہ وہاں کے ڈاکٹروں کی زیر نگرانی علاج اور بچے کی پیدائش کروانا چاہتے تھے۔'' حُسن آرا نے رٹا رٹایا سبق سنا دیا۔

وہ انور جاوید صاحب کو کبھی بھی مطمئن نہ کر پائی تھیں۔ ویسے بھی اُس نے سچ ہی کہا تھا۔ جو آپا نے کہا وہ آگے بتا دیا تھا۔

''اچھا....... لیکن میں نے تو سنا تھا کہ اب اُن کے ہاں اولاد مشکل سے ہو گی۔ مطلب، اب ممکن نہیں تھا۔ لیکن یہ پھر سے کیا نیا سلسلہ ہے؟'' انور جاوید صاحب کو واقعی مطمئن کرنا ناممکن تھا۔

''انور صاحب! اوپر اللہ بیٹھا ہے۔ یہ آپ ہر بار کیسے بھول جاتے ہیں۔'' حُسن آرا نے غصے سے کہا۔ ناممکن کو ممکن کرنا صرف اللہ کے ہی بس میں ہے ناں....... اور پھر وہ اگر میری بہن ہے تو آپ کی بھی تو چچا زاد بہن ہے۔ اُن کے غم اور خوشی سے تعلق صرف میرا تو نہیں ہے۔ ہر وقت مجھے کیوں کٹہرے میں کھڑا کرتے ہیں؟''

حُسن آرا کی اپنی حالت ٹھیک نہ تھی۔ پانچ سال میں تین بچے آ چکے تھے اور اب چوتھے کی آمد تھی۔ چچی نہ ہوتیں تو کیا کرتیں۔

''ارے تم سے تو بات کرنا بیکار ہے۔'' وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ''لیکن مجھے دال میں کچھ کالا لگتا ہے۔'' وہ واپس مڑ کر بولے۔

''جن کی آنکھوں اور دلوں پر کالی پٹی بندھی ہو، اُن کو تو ویسے بھی ہر چیز کالی دکھائی دیتی ہے۔'' یہ بات حُسن آرا کہہ نہ سکی تھیں۔ ہاں، منہ ہی منہ میں بڑبڑائی تھیں۔

''اب دیکھنا کیسے ہمیں وہاں جا کر بھول جائیں گی، تمہاری وہ پیاری بہنا۔ بس منہ دیکھے کی ساری محبت تھی۔'' انور صاحب نے اب اصل میں اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے تھے۔

روشن آرا کی طرف سے ہر مہینے جو ہزاروں میں رقم بطور تحفہ مل جاتی تھی، اب اُس کے ملنے کے امکان کم تھے۔

''آپ فکر نہ کریں، ہماری محبت ایسی کچی نہیں ہے۔ وہ میری بہن ہیں۔ پھر اپنی اکلوتی بہن کو وہ کیسے بھول سکتی ہیں؟'' حُسن آرا نے انور صاحب کو کچھ تسلی کرائی تھی۔

''اللہ جانے یہ آدمی کس مٹی سے بنا ہے۔'' مسکان نے زِچ ہوتے ہوئے کہا۔

''کیوں، تم کو کیا کرنا ہے، اس کی مٹی سے؟ تم تو غالباً ٹیکسٹائل میں ماسٹر کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔ سکلپچر (Sculpture) رکھا ہوتا تو یہ مٹی اور مٹی کی خاص قسم پر تڑپتی سلگتی تو تمہاری بات سمجھ میں بھی آتی تھی۔'' سائرہ نے مسکراتے ہوئے اُس جلتی پر اور تیل چھڑکا۔

''سائرہ، پلیز! میں پہلے سے تنگ بیٹھی ہوں۔'' مسکان نے غصے اور بے بسی سے کہا۔ ''اچھا تو یہ بات ہے۔ پہلے بتایا ہوتا، میں تھوڑا اُدھر کھسک کر بیٹھتی ہوں......لو، اب تو تم تنگ نہیں بیٹھی ناں؟'' سائرہ نے مسکان کو مزید ستاتے ہوئے کہا۔

''سائرہ! دیکھو، تم تو مجھ کو نہ ستاؤ۔ دیکھو میں......میں......میرا وجود اندر تک سُلگ رہا ہے۔ ایک دنیا میرے حُسن، ذہانت اور اسٹیٹس سے متاثر ہے اور وہ......ولی کا بچہ مجھے کیسے اگنور کر کے گزر جاتا ہے۔ یہ آخر اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟'' مسکان نے مٹھیاں ایک دم غصے سے بھینچ لیں۔

''مسکان ڈیئر! دنیا تو اس کے کیریکٹر اور ذہانت کی بھی دیوانی ہے......تم مان جاؤ کہ مسٹر عبدالولی ہے تو کمال کا بندہ۔ میرا تو ایسے مشکل بندے سے فرسٹ ٹائم واسطہ پڑا ہے۔'' سائرہ نے تعریفی انداز میں کہا۔

مسکان نے بے بسی سے سائرہ کو دیکھا......وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی۔

مسکان جب سے کالج آئی تھی، تب سے صرف ایک ہی بندے کا نام سنا تھا۔

وہ تھا، ولی!

فائن آرٹ کے اسپیکشن میں ڈرائنگ کا ذکر ہے تو عبدالولی کی زبردست ''لائن'' کی دھوم تھی۔

''کمال کی ''لائن'' ہے، ایسی ڈرائنگ کرتا ہے کہ مزہ آ جاتا ہے۔ تم اُس کے اسکیچز دیکھو۔ اس قدر میچوز ہیں کہ سرفراز نے اس بار گیلری میں صرف اُس کے اسکیچ ہی ماؤنٹ کروا کر لگائے تھے۔ ارے، لوگ اچھے کلرز، اچھا آرٹ پیپر، اسکالرز شیٹ ڈھونڈ کر ڈرائنگ کرتے ہیں کہ اُن کی ڈرائنگ اچھی لگے۔ اس کا تاثر اچھا پڑے۔ ایک یہ ولی کی ڈرائنگ ہے۔ اس کی ڈرائنگ اس قدر اچھی ہے کہ خالی نیوز پیپر پر اُس کا کام بولتا ہے۔ سر بٹ نے گیلری میں کھڑے ہو کر پارٹ ون کے طالب علموں کو تحریک دینے کے لئے ایک ایک اسکیچ کو ڈسکس کیا تھا۔''

اُس روز بھی پہلی بار مسکان چونکی، جب Sculpture (مجسمہ سازی) کی ورکشاپ میں سر وحید بھی عبدالولی کے گرویدہ نظر آئے۔

(Realistic) حقیقی اور (Abstraction) ایبسٹریکشن ہے۔ یہ لڑکا ایسی فارم (شکل) نکالتا ہے کہ نظر آتا ہے کہ کسی بورن آرٹسٹ کا کیا ہوا کام ہے۔''

سر وحید نے عبدالولی کا بنایا اسکلپچر طالب علموں کو بطور نمونہ دکھایا۔

''اس کی خاصیت یہ ہے کہ یہ چاروں جانب سے اپنی فارم کو برقرار رکھتا ہے۔ اس کو ہر جانب سے دیکھا جا سکتا ہے۔''

''واؤ......!'' سائرہ نے مسکان کو بھی متوجہ کیا۔ ''یہ والا دیکھو، کس قدر حسین ہے۔'' سائرہ نے ایک اور مجسمے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''مائی گاڈ! اس قدر بڑا ہے۔ جانے کتنے عرصے میں بنا ہو گا۔'' لڑکے لڑکیوں کی اُس کے کام سے متاثر آوازیں باقاعدہ سنائی دے رہی تھیں۔

سلک پرنٹنگ، بلاک پرنٹنگ ہر شعبے میں اُس کے کام کا نام تھا۔ کئی طالب علم تو ایک دم جیلس ہو جاتے کہ آخر یہ کام اتنی جلدی اور عمدہ کیسے کر لیتا ہے۔

حالانکہ عبدالولی کا شعبہ تو ڈیزائننگ تھا لیکن پہلے دو سالوں میں ہر طالب علم ہر شعبے میں تھوڑا تھوڑا کام ضرور کرتا ہے۔ پھر تھرڈ ایئر میں اپنے مین سبجیکٹ میں تھیسز کرنا ہوتا ہے۔ عبدالولی نے تو ہر ہر شعبے میں اس قدر نمایاں کام کیا تھا کہ وہ کالج کا مشہور طالب علم بن چکا تھا۔

اور مسکان! جو خود بہت ذہین طالب علم تھی، اپنے ساتھیوں میں اُس کا کام سب سے اچھا تھا، اُسے پہلے تو کام کے سلسلے میں ہر مرحلے پر عبدالولی کی مثال کا سامنا تھا۔ اور پھر جانے کب اُس کے دل پر لاب لگی تھی۔ اور اب اُسے ولی کے تصور اور اپنے دل کی سرکشی کا سامنا تھا۔

ایسے میں عبدالولی کی بے نیاز اور لئے دیئے رہنے والی شخصیت اس کو بہت متاثر کرتی تھی۔

''مجھے ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے......؟'' مسکان اپنے آپ میں کھوئی کھوئی خود سے بولی۔ ''میرا دل اس کی جانب کیوں مائل رہتا ہے؟...... یہ احساس کیا ہے؟......اس احساس کا کیا مطلب ہے؟'' وہ خود سے سوال بنی بیٹھی تھی۔

''مسکان! سائرہ! تم لوگ ادھر بیٹھی ہو؟'' عرفان اُن کا کلاس فیلو اُن کے پاس آیا۔ ''اُدھر سر بٹ نے نیا ٹاپک دے دیا ہے، السٹریشن کا۔'' عرفان نے خبر دی۔

''اوہ مائی گاڈ!'' سائرہ نے لپ اسٹک بند کر کے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ''میں تو بھول ہی گئی تھی۔ اور عرفان! تم نے بھی یاد نہ دلایا۔'' سائرہ نے اپنی لاپروائی کو کوستے ہوئے غائب الدماغ مسکان کی بھی خبر لی۔

''اچھا، کیا ٹاپک دیا ہے؟'' مسکان نے عرفان سے پوچھا۔

''از ہر چہ ہست محبت دگر ہر چہ ہست لا''

یعنی ''جو کچھ بھی ہے، محبت ہے۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں!''

عرفان نے نوٹ بک سے پڑھ کر بتایا۔

''ذرّہ سے لے کر صحرا تک، قطرہ سے لے کر دریا تک، گل سے لے کر گلستان تک، ستاروں سے

لے کر کہکشاں تک، زمین سے لے کر آسمان تک، شجر سے لے کر حیوان تک، حشرات سے لے کر انسان تک! ہر چیز محبت کے جال میں پھنسی ہوئی ہے۔ جو چاہے بناؤ۔ کام اچھا ہونا چاہئے۔ سر کا آج کا لیکچر۔'' عرفان نے مسکراتے ہوئے مسکان کے کھوئے کھوئے چہرے کا طواف کیا۔

از ہر چہ ہست محبت دگر ہر چہ ہست لا!

جو کچھ بھی ہے، محبت ہے۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں........تو کیا میرے اندر کے اس سرکش احساس کا نام محبت ہے؟

مسکان کے اندر بجلی کی رو گزری۔

تو کیا مسکان کو ولی سے واقعی محبت ہوگئی ہے؟

❖❖○❖❖

رات کے پچھلے پہر
سب جہانوں کا خدا
دے رہا تھا یہ صدا
کوئی پکارے مجھے
دوڑ کر اس کی سنوں
کوئی مانگے تو سہی
جھولیاں بھر بھر کے دوں
کوئی ''توبہ'' تو کرے
معاف میں جھٹ سے کروں
اور ہم سب نیند میں
اس صدا سے بے خبر
اس خدا سے بے خبر
جنتوں کی چاہ میں
خواب دیکھتے رہے
اور سورج کی تپش
اپنے گھر تک آگئی
اپنے سر تک آگئی

''ترنم!........اوترنم!'' چاندنی بائی نے دروازہ کھول کر لائٹ آن کی۔ لیکن سارا کمرہ خالی تھا۔

''اُفوہ! کہاں ہے یہ لڑکی؟........ چندا! پارٹی کا ٹائم ہوگیا ہے۔'' چاندنی بائی نے ڈریسنگ کا دروازہ بجایا۔

ترنم نے جلدی جلدی چادر لپیٹ کر الماری میں چھپائی کہ کہیں چاندنی بائی کو بھنک پڑ گئی کہ وہ نماز پڑھ رہی تھی تو وہ اُس کی چمڑی اُدھیڑ کر رکھ دیتی۔

''ترنم!........اتنی دیر چندا؟........کمال گورمانی باہر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

چاندنی بائی نے اپنے لہجے میں شیرینی گھولتے ہوئے اسے دوبارہ آواز دی۔

''آ رہی ہوں آپا!'' ترنم کو بولنا دُشوار ہو رہا تھا۔

ہونہہ........آ گیا، گِدھ!

پہلے شراب میں ڈوبے گا، پھر بندروں کی طرح ناچے گا اور پھر میری بوٹی بوٹی نوچے گا۔

یا اللہ! تُو کہاں ہے؟........کیا میری توبہ کے پَر ٹوٹے ہیں جو کبھی تم تک آ نہیں پاتی؟

اے اللہ! تُو مجھے موت ہی دے دے۔'' ترنم نے صدقِ دل سے دُعا کی تھی۔

پھر جب کمال گورمانی کا منحوس ہاتھ اُس کے نازک سنگِ مرمر جیسے بدن پر پھر رہا تھا، جیسے کوئی سانپ رینگ رہا ہو۔

آہ! پچھتاوے نے آہ بھری تھی۔

ابھی اِس سانپ کا ڈسنا اُس کو سہنا تھا۔ آہ، مرجانا میری قسمت میں کہاں؟........ترنم نے سسکاری بھرتے ہوئے سوچا۔

رات بھر سانپ اُسے ڈستا رہا اور پچھتاوے کے زہر نے اُس کے بدن کو نیلوں نیل کر دیا۔ کسی کے زہر پھیل جائے تو وہ مر جاتا ہے۔ آہ، میری قسمت! میں تو زہر پھیلنے کے بعد بھی مری نہیں۔

سسکیاں اُس کے اندر بین کرنے لگیں۔

❖❖○❖❖

''چھوٹے شاہ صاحب آئے ہیں۔'' ماسی نذیراں پھولے سانس کے ساتھ روشن آرا کے کمرے میں اطلاع دینے آئی۔

''اللہ سوہنے کا کرم! اللہ کی امان میرے بچے کو........کدھر ہے نذیراں! میرا بچہ؟'' روشن آرا نے بےتابی سے پوچھا۔

اُسی لمحے ولی کمرے میں داخل ہوا آتے ہی اُس نے روشن کے ہاتھوں پر بوسہ لیا اور اُن کو آنکھوں سے لگائے سیدھا کھڑا ہوا تو روشن نے لپک کر اُس کو سینے سے لگا لیا۔

''اماں صدقے!'' روشن آرا کے لہجے میں بے انتہا پیار تھا۔

''کیسی ہیں، اماں جانی؟'' ولی اُن کو ساتھ لگائے لگائے بیڈ تک آیا اور اُن کو بٹھا کر خود اُن کے قدموں میں بیٹھ گیا تھا۔

''کیا کرتے ہو بچے؟ اوپر آ کر بیٹھو۔'' روشن آرا نے پیار سے اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''میری پیاری اماں جان! پلیز، اتنے دنوں بعد تو آیا ہوں........ مجھے میری جنت سے دُور کیوں کرتی ہیں؟'' وہ اُن کے پاؤں دبانے لگا۔

''پگلا۔ ابھی تک بچوں کی طرح کرتا ہے۔'' روشن آرا کی آنکھوں میں اپنے بیٹے کی تابعداری پر بے انتہا روشنی بھر آئی تھی۔

''اماں جانی! میں نے آپ کو بہت مس کیا۔'' ولی نے لاڈ سے کہتے ہوئے اپنا سر اُن کی گود میں رکھ دیا۔

''میری جان! میں بھی تو تم دونوں بہن بھائی کے بغیر بولائی بولائی پھرتی ہوں۔ ہر لمحہ، ہر پل تم دونوں میں دل اٹکا رہتا ہے۔'' روشن آرا نے جواب دیا۔ ''کہو، کیسی جا رہی ہے پڑھائی؟ اور یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟ اتنے کمزور ہوتے جا رہے ہو۔'' روشن آرا نے اس پر دکھ، پیار اور فکر بھری نظر ڈالی۔

ہلکی ہلکی شیو اُس کی سفید رنگت پر بہت نمایاں ہو رہی تھی۔ اُس کی ہلکی نیلی سرمئی آنکھوں میں رت جگے کی سرخی تھی۔ وہ اپنے ڈھیلے ڈھالے حلیے میں بھی اپنی خوب صورتی اور مردانہ وجاہت کی وجہ سے بہت بھلا لگ رہا تھا۔

روشن آرا نے اپنی نظر جھکا لی۔ مائیں تو اپنے باپ کے لئے انعام کی طرح ہوتی ہیں اور یہ وہ جانتی تھیں کہ ان کا بیٹا کیسے ان کے لئے کسی انعام سے کم نہ تھا۔

''اماں جانی! بابا سائیں کا فون آیا تھا؟'' ولی نے کسی خیال سے چونک کر پوچھا۔

''ہاں! وہ آج شام آئیں گے۔ نگینہ کی فلائٹ بھی ڈائریکٹ نہ تھی۔ لندن کی فلائٹ کچھ دیر کے لئے کویت رُکی تھی اور وہیں سے دونوں کا اکٹھے پروگرام سیدھا کراچی کا بنا۔ صبح جب وہ پاکستان پہنچی ہے تو تب سے اب تک کوئی پانچ فون کر چکی ہے۔ تمہارے بابا کو تو وہاں کوئی ضروری کام تھا، جبکہ نگینہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اُڑ کے یہاں پہنچ جائے۔ اب باپ بیٹی دونوں کراچی سے اسلام آباد، شام کی فلائٹ سے آ رہے ہیں۔''

''واہ، زبردست! اس بار تو میرا وِیک اینڈ شاندار گزرے گا۔'' ولی کے چہرے پر بڑی جاندار مسکراہٹ اور خوشی کی روشنی دَر آئی تھی۔ ''اماں جانی! نگینہ تقریباً آٹھ ماہ بعد واپس آ رہی ہے ناں؟'' ولی نے پوچھا۔

''ہاں!........ مجھ سے پوچھو، میں نے کیسے تم لوگوں کے بغیر دن گزارے ہیں۔''

روشن آرا نے بہت محبت سے اُس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر کہا۔

❖❖O❖❖

''تم وِیک اینڈ پر اپنے گھر جانے کا پروگرام رکھتی تھیں نا؟........ پھر گئیں کیوں نہیں؟'' سائرہ نے فون اپنی گود میں رکھا اور اپنی ٹانگیں سمیٹ کر صوفے پر ہی بیٹھ گئی۔

''بس، دل نہیں کر رہا تھا۔'' مسکان نے سستی سے کہا۔

''او کے، پھر شام میں ملتے ہیں۔'' سائرہ نے کہا۔

''اوں، ہوں........ آج نہیں۔ آج موڈ نہیں ہے۔'' مسکان بہت بیزار تھی۔

''اللہ تم کو ہدایت دے۔ اور جب تم کو ہدایت حاصل ہو جائے تو مجھے فون کر دینا۔'' سائرہ نے کھٹاک سے فون رکھ دیا۔

'افسوس مسکان بی بی! آپ ہیرو سے زیرو ہو گئیں۔' مسکان نے خود کو، کوسا۔ 'کہاں گیا آپ کی اپنی ذات کا غرور؟ کہاں گیا آپ کا ٹیلنٹ، مسٹر ولی کے آگے؟'

مسکان تو خود اپنے پیچھے اچھا ریکارڈ چھوڑ کر آئی تھی۔

جن دنوں داخلے کے ٹیسٹ کی تیاری کے لئے وہ سر جواد کی اکیڈمی میں پریکٹس کر رہی تھی تو روز ہی سر سے اپنے کام کی تعریف سننا اور سب طالب علموں کو حسد اور فکر میں مبتلا کرنا اُسے بہت پسند تھا۔

پھر ٹیسٹ میں اُس کا اے پلس تھا تو انٹرویو میں جیوری نے اُس کے آئی کیو کے ہی بیس میں سے اٹھارہ نمبر دیئے تھے۔ حالانکہ ہر طالب علم نے تقریباً جو ایوریج لیا تھا، وہ بارہ نمبر تھے۔ اس چیز نے مسکان کو اوور کانفیڈنس کر دیا تھا۔

لیکن یہاں آ کر اُسے اندازہ ہوا کہ یہاں اُس سے بھی بڑے بڑے ''جن'' موجود ہیں۔ ہر کوئی، کسی نہ کسی فیلڈ میں ہیرو ضرور تھا۔ لیکن ان سب میں جو ٹاپ پر تھا، وہ ان جنوں کا بھی سردار لگتا تھا۔ کیونکہ ہر چیز میں اُس کا کام ری مارک ایبل تھا۔ وہ اُس کے شعبے میں نہ ہوتے ہوئے بھی اُس کے لئے چیلنج تھا۔

پہلی بار جب وہ اُسے اور اُس کی تعریف کو نظر انداز کر کے صرف تھینکس کہتے ہوئے آگے نکل گیا تو مسکان کو ایک دم بہت ساری انسلٹ فِیل ہوئی تھی۔

اور پھر آئندہ دنوں میں اُس پر انکشاف ہوا کہ اُس کا یہ انداز ہر خاص اور عام کے لئے تھا۔ سوائے (ٹی۔ٹو) کے جو کہ کالج کا سب سے پرانا طالب علم تھا۔ اُس کے ساتھ کے طالب علم پڑھ کر یہاں کالج میں پڑھا رہے تھے، جبکہ وہ آج تک اپنا گریجویشن ہی مکمل نہ کر پایا تھا۔

(ٹی۔ٹو) اُس کا لقب تھا، جس کا مطلب بہت پرانا مجسمہ تھا۔ نام تو اصلی اُس کا افضل خان تھا، جس کا کم ہی کسی کو پتہ تھا۔ وہ ڈیپارٹمنٹ کے بینچ پر بیٹھا رہتا تھا۔ ہر لڑکی کو لفٹ دینا اور اُن کی اسائنمنٹ میں مدد کرنا ہی اُس کا مقصد تھا۔ اُس کی عبدالولی جیسے جینئس کے ساتھ کس طرح دوستی ہوئی، ہر ایک کے لئے حیران کن بات تھی۔

اور مسکان ہر بار خود سے عہد کرتی کہ عبدالولی اُس کے راستے میں نہ آئے۔ لیکن وہ اپنے دل کا کیا کرتی، جو بار بار ولی ہی رستے میں آ کھڑا ہوتا تھا۔ ایسے میں وہ خود کو بہت بے بس محسوس کرتی تھی۔ یک طرفہ پسندیدگی اُس کے لئے مشکلات کھڑی کر رہی تھی۔

''از ہر چہ ہست محبت دگر چہ ہست لا!'' کوئی اُس کے اندر سرگوشی کر رہا تھا۔ (جو کچھ بھی ہے، محبت ہے۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔)

❖❖O❖❖

رات کے پچھلے پہر سب جہانوں کا خدا دے رہا تھا یہ صدا۔ کوئی پکارے مجھے، دوڑ کر اس کی سنوں۔ کوئی مانگے تو سہی، جھولیاں بھر بھر کے دوں۔ کوئی توبہ تو کرے، معاف میں جھٹ سے کروں۔ اور ہم سب نیند میں، اس صدا سے بے خبر، اس خدا سے بے خبر جنتوں کی چاہ میں، خواب دیکھتے رہے۔

اور سورج کی تپش........ اپنے گھر تک آ گئی۔

اپنے سر تک آ گئی۔

''آہ! میں جاگ ہی نہ پاتی، اور اب........ اب تو نیند ہی نہیں آتی ہے۔'' ترنم نے کہا۔

''ترنم! فار گاڈ سیک، مجھے نیند آ رہی ہے۔ اگر یہ تمہارا روز کا سبق پورا ہو گیا ہو جو کہ تم نے کوئی پچاس

بار با آواز بلند دوہرایا ہے تو کیا میں دو گھڑی نیند لے لوں؟ اُف، سارا بدن ٹوٹ رہا ہے۔ یہ نیو ایئر پارٹیاں بھی ناں.......تھکا دیتی ہیں۔" ماہ رخ نے لمبی جمائی لیتے ہوئے ترنم سے کہا۔

"اور پلیز، تم بھی سو جاؤ۔ تم تو رات کا پرندہ ہو .... جانے سوئے بغیر تمہارا گزارا کیسے ہو جاتا ہے۔" ماہ رخ نے بیزاری سے کہا۔

ماہ رخ وہاں رہنے والی لڑکیوں میں سب سے زیادہ نخریلی تھی۔ جانے کیا وجہ تھی، وہ ترنم کو اپنے کمرے میں برداشت کرتی تھی۔ ورنہ وہاں رہنے والی باقی لڑکیوں کے ساتھ روز اُس کی کسی نہ کسی بات پر جھڑپ ضرور رہتی تھی۔

کم بخت حسین اتنی تھی کہ شعلہ ہی تو تھی، جو جھلسائے بغیر دم نہ لیتی تھی۔

اُس کے حُسن، اُس کی خوب صورت اداؤں کی ٹکر کا یہاں سوائے ترنم کے، کوئی دوسرا فی الحال نہ تھا۔

ترنم کے حُسن میں سوز اور اُداسی، جبکہ ماہ رخ کا حُسن پارہ تھا، شریر و شوخ تھا۔

"ماہ رخ! کیا تم اس زندگی سے خوش ہو؟" ترنم نے ماہ رخ کی جانب منہ موڑ کر پوچھا۔

ماہ رخ نے اُسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ اُس کا نیند سے برا حال تھا، جبکہ ترنم کا سونے کا کوئی پروگرام نہ تھا۔

"ایک تو یہ جو تمہیں کبھی نیک پروین بننے کا دورہ پڑتا ہے ناں، زہر لگتا ہے مجھے۔ خود بھی ڈسٹرب ہوتی ہو اور اس رات میرا سونا بھی محال کر دیتی ہو۔" ماہ رخ نے چڑ کر جواب دیا۔ "اور اس زندگی اور اُس زندگی سے کیا مراد ہے، تمہاری؟.......اب بس، یہ ہی زندگی ہے۔ ہماری ماؤں کی بھی یہی زندگی تھی۔ ہماری بھی ایسی ہی گزرے گی۔" ماہ رُخ نے لمبی سی جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"نہیں.......نہیں.......نہیں، ماہ رخ!....... میری ماں کی زندگی ایسی نہ تھی۔ بالکل بھی ایسی نہ تھی۔" ترنم کا سانس پھولنے لگا۔

دُور کہیں دھیرے دھیرے کلامِ پاک پڑھنے کی آواز اُس کی سماعت سے ٹکرائی تو اُس کی روح تک کو جھنجھنا کر رہ گئی۔

"نہیں ماہ رخ!" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ "میری ماں ایسی نہیں تھی۔" ترنم ایک دم اُٹھ کر ماہ رخ کے پاس آ بیٹھی۔ اب اُس کا ہاتھ تھامے، منّت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "ماہ رخ! کہہ دو ناں، کہ میری ماں ایسی نہیں تھی۔" ترنم اپنے آپ میں نہ تھی۔

"اوکے، اوکے.......تم پلیز! لیٹ جاؤ۔" ماہ رخ نے بہت مشکل سے اپنے چہرے کی بیزاری کو روک کر کہا۔

"وہ ایسی نہیں تھی۔ تم تو جانتی ہو ناں۔" ترنم لیٹتے لیٹتے پھر پوچھ رہی تھی۔

"ہاں ہاں، جانتی ہوں۔ تم یہ نیند کی دوا لو۔" ماہ رخ نے اُسے زبردستی دوا کھلا کر زیرو پاور کا بھی بلب بند کر دیا۔

'میری ماں تو پاکیزہ روح تھی.......شرم و حیا کا پیکر!.......کسی غیر محرم نے آج تک اُس کی صورت نہ دیکھی تھی۔ میری ماں ایسی.......نہیں تھی۔' ترنم کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔

لیکن آنسو ابھی بھی اُس کے کانوں تک جا کر ٹکے ہوئے تھے، جو خوابوں میں بھی اُس کی ماں کی یاد کی سرگوشیاں کریں گے۔

❖❖○❖❖

کہتے ہیں کہ سولہواں سال ہر لڑکی کے لئے ارمان اور بہاروں کا سال ہوتا ہے۔ اس کی جوانی بند کلی کی طرح ہوتی ہے۔ دھیمی دھیمی خوشبو دیتی ہے، پاس سے ہر گزرنے والے کو چونکا دیتی ہے۔ اور ترنم، جو کل کی "ایمان فاطمہ" تھی، اُس کو تو پندرھویں سال میں ایسی اُٹھان ملی تھی کہ محلے کی عورتیں حیرانگی سے خدیجہ بی بی سے پوچھتی تھیں۔

"خدیجہ بی بی! یہ ایمان فاطمہ ہی ہے؟.......کل کی بات ہے، یہ تو گڑیاں پٹولے لئے پھرا کرتی تھی۔ خیر سے کتنی سوہنی گوی ہو گئی ہے!"

اور خدیجہ بی بی کی پریشان نظریں بچوں کے ساتھ پٹھو گول گرم کھیلتی ایمان فاطمہ کا پیچھا کر رہی تھیں۔

لڑکیاں اور خاص کر خوب صورت لڑکیاں، اتنی جلدی کیسے جوان ہو جاتی ہیں؟

اتنی جلدی کیسے نظروں میں آ جاتی ہیں؟

ننھی لڑکی
ساحل کے اتنے نزدیک
ریت سے اپنا گھر نہ بنا
کوئی سرکش موج ادھر آئی تو
تیرے گھر کی بنیادیں تک بہہ جائیں گی
اور پھر اُن کی یاد میں تُو
ساری عمر اُداس رہے گی

ایمان فاطمہ نہیں جانتی تھی کہ ساحل اور سرکش موج کسی دن اُس کے ریت کے گھر ہی کو نہیں، اُسے بھی بہا کر لے جائے گی۔

ایمان فاطمہ کو سب سہیلیاں پری فاطمہ کہہ کر پکارا کرتی تھیں۔ اُس کی سمندر رنگ، کانچ آنکھیں اماں پر تھیں۔ کمر سے نیچے گھیرے بھورے بال بھی خدیجہ بی بی جیسے تھے۔ میدے جیسی رنگت تو دونوں ماں باپ سے لی تھی۔ لیکن جانے اُس کی شوخ، کانچ جیسی ہنسی کس پر گئی تھی۔

دونوں اماں اور ابا اکثر چونک کر دیکھتے تھے۔ یہ اتنی متوجہ کرنے والی خوب صورت، سہنی پرائی پرائی سی کہاں سے آن بسی تھی۔ ایمان فاطمہ کا یہ چمکتا دمکتا روپ، اماں کو بہت خوف زدہ رکھتا تھا۔ اماں تو اُسے ہر جگہ جانے کے لئے برقعے میں رکھتی تھیں کہ کہیں کسی کی نظر نہ پڑ جائے، نظر نہ لگ جائے!

لیکن اماں کی ساری تدبیریں رائیگاں ہی چلی گئیں۔

❖❖○❖❖

چڑیا کتنی دیر سے چیخ رہی تھی
اُس کا گھونسلا کب کا بکھر چکا تھا

اِک کوّا
اُس کا انڈا، بچہ لے اُڑا تھا
اے کوّے
میں "بے خبر" ماں نہ تھی
پھر تُو نے ایسا کیوں کیا؟
چڑیا چیخ رہی تھی
احتجاج کر رہی تھی
سوال کر رہی تھی
کوّے نے کائیں کائیں
کر کے قہقہہ لگایا
میں صرف بے خبر ماؤں ہی کے
انڈے بچے ہی نہیں لے اُڑتا
میں......!
گھونسلے سے باہر آ جانے والے
بچوں کو بھی لے اُڑتا ہوں

سردیوں کا موسم شروع ہونے والا تھا۔ بارش نہ ہونے کی وجہ سے ہر جانب گلے خراب، زکام، نزلہ بخار وغیرہ کا وائرس عام تھا۔

ایمان فاطمہ تو تھی ہی نازک سی، جھٹ سے بخار نے آ لیا۔ ایسا بخار آیا کہ بچی سُدھ بُدھ کھو بیٹھی۔ اماں نے گھبرا کر ابا سے کہا۔

وہ بولے کہ بڑے ڈاکٹر کے پاس جانے کی تو ہماری ہمت نہیں ہے۔ پانچ سو وہ دیکھنے کی فیس لے گا اور تین چار سو کی دوائی لکھ دے گا، جو اُن کی استطاعت میں نہ تھی۔

"یہاں، گلی کے نکڑ پہ نیا کلینک کھلا ہے۔ اور سنا ہے، دس بیس روپے میں دوائی اور ٹیکہ دونوں ہی لگ جاتے ہیں۔ وہاں ہی لے چلو۔" ابا نے کہا۔

اماں فوراً اُسے برقع اوڑھا کر، سہارا دے کر کلینک لے آئیں۔

باری آنے پر اماں نے ڈاکٹر کو ساری تفصیل بتائی۔

"مجھے لگتا ہے کہ گلے کے انفیکشن کی وجہ سے بخار ہے۔ چلیں، منہ کھولیں اور گلا دکھائیں۔" ڈاکٹر نے پیشہ ورانہ انداز میں کہا۔

"اماں......!" ایمان فاطمہ منمنائی کہ وہ تو پردے میں تھی۔ نقاب اُتارنے کی اجازت اُسے ابا اماں، دونوں کی طرف سے نہ تھی۔

اماں شش و پنج میں تھیں کہ کیا کریں؟ لیکن ایمان فاطمہ کی اتنے دن کی بگڑی حالت دیکھ کر وہ اُسے نقاب اُلٹنے کی اجازت دے کر باہر دیکھنے لگیں کہ کوئی جاننے والی عورت نہ دیکھ لے۔ آج تک اُن کے

گھر کی خواتین کسی کے سامنے تک نہ ہوئی تھیں......

ڈاکٹر، جو یہی کوئی چونتیس سال کا ہو گا، اب بیزار نظروں سے ان نقاب پوش بیبیوں کو دیکھ رہا تھا۔

ایمان نے نقاب اُلٹ دیا۔ بیماری کے باوجود اُس کا چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا، اپنا سحر پیدا کر رہا تھا۔

ڈاکٹر جی، جو کئی سال ڈاکٹر کے ہاں کمپاؤنڈر رہ کر اپنا یہ کلینک کھول چکے تھے۔ اس چھوٹی سی بستی میں کم پڑھے لکھے لوگ تھے۔ اُس نے فائدہ اُٹھا کر ایم بی بی ایس کا بورڈ لگا لیا تھا۔ اب وہ دن رات ادھر اُدھر مریض دیکھتا اور پیسہ کما رہا تھا۔ ڈاکٹر گلزار کے نام کی تختی لگا رکھی تھی۔ وہ زندگی میں شارٹ کٹ چاہتا تھا، ہر وہ کام کرتا تھا، جس سے پیسہ حاصل ہو سکتا۔ چاہے اُسے انسانی زندگیوں ہی سے کیوں نہ کھیلنا پڑے۔

اب جب ایمان نے نقاب جو اُلٹ دیا تھا تو کئی پل کے لئے وہ بالکل بے خود اُسے تکنے لگا۔

ایمان پر اُس کی بے ایمان نظر پڑ گئی تھی۔

اُف خدایا! کیا یہ اسی جہان کی لڑکی ہے؟......اس قدر خوب صورت اور معصوم!

ڈاکٹر گلزار نے بہت گہری نظر اور مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتے ہوئے سوچا۔

❖❖❖○❖❖❖

"مکڈونلڈ کے اُوپر کی فلور عبدالولی کی ڈیزائن کی ہوئی ہے۔" سر احمد نے گلبرگ کی برانچ کے متعلق کلاس کو بتایا۔

"انہوں نے اس کو بدلنا تھا۔ پروجیکٹ میرے پاس آیا تھا اور میں سوائے ولی کے کسی اور کا نام سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ لیکن ولی نے تو حیران ہی کر دیا......اس قدر خوب صورت اور فینٹسی ماحول اُس نے وہاں دیا ہے کہ بے اختیار منہ سے تعریف نکلتی ہے۔"

سر احمد، ولی کی تعریفوں کے پُل بے جا نہ باندھ رہے تھے۔ اُس کا کام واقعی تعریف اور دیکھنے کے قابل تھا۔ اُس نے اتنے نئے اور خوب صورت آئیڈیاز کے ساتھ ہر ہر کارنر سجایا تھا کہ مزہ آ گیا۔

سر احمد اُس کی تعریف کر رہے تھے، جو خیر سے آج کلاس میں آئے ہی نہ تھے۔

"یار! عبدالولی کی تو پانچوں اُنگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہے۔ تعریف اور امپریشن الگ بن رہا ہے اور ہر کام اُس کو مل جاتا ہے۔ پیسہ الگ سے مل رہا ہے۔ وہ کلاس میں پڑھنے آئے یا نہ آئے، ٹیچرز کی گڈ بک میں ہمیشہ رہتا ہے۔ یہ ہم ہی اُلو کے پٹھے ہیں، جو کلاس پڑھنے آ گئے ہیں۔" ماجد نے اسد کو غصے سے کہا۔

ماجد اور اسد، کالج کے آوارہ لڑکوں میں سے تھے۔ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں پنگا لئے رکھتے۔ اور عبدالولی سے تو وہ بہت خار کھاتے تھے۔ وہ اُن کا حریف جو تھا۔ ہر کام جو اُنہیں لگتا کہ وہ حاصل کر لیں گے، وہ ولی کو خود بخود مل جاتا تھا۔ اسی طرح بہت سے طالب علم، ولی سے حسد کرتے تھے۔ ولی کا کام اور لئے دینے والا انداز اکثر کو تپا دیتا تھا۔

اسد کسی گہری سوچ میں تھا، ولی کچھ زیادہ ہی دردِ سر بنتا جا رہا ہے۔ اسد نے بھی ماجد کی ہاں میں

ہاں ملائی۔

''وہ نہر کی ڈیکوریشن کا کام بھی اِس ولی کے بچے نے ہتھیا لیا تھا۔ پورے ساٹھ ہزار کا کام تھا۔ اِس دردِ سر کے لئے ایک آدھ ''گولی'' ضرور استعمال ہونی چاہئے۔'' اسد نے کہا۔

دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر عجیب طرح سے مسکرائے تھے۔

❖❖○❖❖

جھوٹے یار دی یاری جیویں رُکھ کھجور
دُھپ لگے تے چھاں نہ دیوے ، بھُک لگے پھل دُور! '

(ایسے لوگوں سے دوستی تو کھجور کے درخت جیسی ہے کہ دُھوپ لگے تو سایہ نہ دے، بھوک لگے تو پھل پہنچ سے دُور)

''آہ!...... محبت اِک دھوکا، اِک فریب۔ کیوں، مسٹر گورمانی!'' ترنم نے نشے میں ڈوبی ہوئی کیفیت میں دیوانوں کی طرح ہنستے ہوئے پوچھا۔

''ہاں سائیں، تم ٹھیک بولتی ہو۔ ٹھیک بولتی ہو۔'' مسٹر گورمانی نے نشے میں دُھت، خوب سر ہلا ہلا کر اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''اے ترنم! تم تو خود پوری کی پوری نشے کی بوتل ہو۔ آج تم نے ہم کو کیوں پلایا؟'' کمال گورمانی نے ایک پیگ مزید بنایا اور غٹاغٹ چڑھا گیا۔

''مسٹر گورمانی! تم ناں! تم...... تمہاری کمپنی کو بھولنے کے لئے ضروری ہے کہ میں ہوش میں نہ ہوں...... ہونہہ، گھِن آتی ہے مجھے تم سے۔'' ترنم نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''ہا، ہا، ہا...... تم ترنم، ہونے کو تو ہماری کال پہ ہماری گرل ہو۔ ہا، ہا...... وہ کیا کہتے ہیں، کال گرل! لیکن ہم کو تم سے بڑی ہی ویسی خوشبو آتی ہے۔ تم بڑی مختلف ہو، اسی لئے تو کمال گورمانی کو کئی ذائقوں کے بعد بھی تمہارا ذائقہ نہیں بھولتا۔ ہم جب بھی اِدھر کو آتا ہے، تم، تمہارا یہ خوب صورت جسم ہم کو تمہاری طرف ضرور لے آتا ہے۔''

'آہ! میری بدقسمتی جانے کن کن ہاتھوں اور لکھی جانی ہے۔' ترنم نے ہوش وحواس کی دنیا سے نکلتے ہوئے اِک آخری بات سوچی تھی۔ وہ بے سُدھ گری پڑی تھی اور ایک گِدھ اُس کے مُردہ وجود کو بھنبھوڑ رہا تھا۔

بدقسمتی کو تو انسان خود بلاتا ہے۔ لیکن وہ کیا اب کبھی خوش بختیوں کی دنیا میں واپسی کی حق دار نہ ٹھہرے گی؟

❖❖○❖❖

''بیٹا! تم بائی ایئر چلے جاتے۔ رحیم خان تمہاری گاڑی لے آتا۔ میں فکر مند رہوں گی۔'' روشن آرا نے فکرمندی سے عبدالولی سے کہا، جو بابا سائیں کی تحفہ میں دی ہوئی گاڑی لاہور لے جانا چاہتا تھا۔

''اماں جانی! صرف چار گھنٹے کا سفر ہے۔ یوں موٹر وے سے پہنچ جاؤں گا۔'' عبدالولی نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

''اچھا بیٹا! جیسے تم خوش...... اللہ کی امان میں...... جن راستوں سے جاؤ، اُن کی خیر ہو۔ میں لاہور سے تمہاری کال کا انتظار کروں گی۔''

روشن آرا نے دعاؤں اور محبتوں سے بیٹے کو گیٹ پر رخصت کیا۔ نہ جانے کیوں اُن کا دل گھبرا رہا تھا۔ جانے ماؤں کے دلوں میں اللہ جی نے کیسے راڈار لگائے ہوتے ہیں، اپنی اولاد پر آنے والی کوئی انہونی اُن کو پہلے سے سگنل دینے لگتی ہے۔

❖❖○❖❖

''ترنم! سُدھر جاؤ...... اُس گورمانی کے بچے کو گئے تین دن ہو گئے اور تم یہیں ہوٹل میں پڑی ہو۔ ہاں آپا کا تمہاری فکر سے برا حال ہے۔''

ماہ رخ نے اپنی گاڑی موٹر وے پر ڈال دی تھی۔ وہ اسلام آباد تقریباً ہر دوسرے تیسرے دن چکر لگاتی تھی۔ اب تو راستے اور راستے میں آنے والے ہر پوائنٹ کی پہچان ہو گئی تھی۔

''ہونہہ، فکر! میری فکر...... تم کو کیسی کیسی پریشانیاں تنگ کرتی ہیں...... ماہ رخ! جب تم ذرا اپنی عمر کے اس حصے کو چھونے لگو گی، جہاں تم بے بی سے بالی کہلانے لگو گی، پھر دیکھنا کون تمہاری فکر کرتا ہے۔'' ترنم بے رحمی سے ہنستی چلی گئی۔

''اُف توبہ، تم کس قسم کی باتیں کرلیتی ہو؟'' ماہ رخ کو جھرجھری ہی تو آ گئی۔

''ماہ رخ! تمہارا اور میرا انجام بس اُنیس بیس کے فرق کے ساتھ ہوگا۔ لیکن یاد رکھنا، ہو گا برا ہی۔'' ترنم کو ہنستے ہنستے پتہ ہی نہ چلا کہ کب اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''ترنم! دیکھو، آپا ہمارا کتنا خیال رکھتی ہے۔ اب تو کالج میں ہم پڑھتے ہیں۔ ہر طرح کی آزادی ہے۔ اور اتنا تو بینک بیلنس ہے۔'' ماہ رخ نے آخری جملہ ذرا سرگوشی میں کہا تھا۔ کیونکہ ماہ رخ نے اُس کا اور اپنا اکاؤنٹ کچھ عرصہ ہی پہلے کھلوایا تھا۔ چندا بائی کو اس کی ذرا بھی خبر نہ تھی۔

'آہ! یہ آزادی...... آزادی...... کیسے پَر کاٹے تمہاری آپا نے کہ کبوتری اُڑنا ہی بھول گئی۔'

ترنم نے اپنا سر سیٹ کی پشت پر ٹکا دیا۔ اُس کے سنہری سلکی بال اُڑ اُڑ کر اُس کے چہرے کو چھو رہے تھے۔ کسی آرائش کے بغیر بھی وہ بہت حسین دکھائی دیتی تھی۔

ہیرے کی لونگ، دھوپ سے سات رنگی شعاعیں اُس کے چہرے پر پھینک رہی تھی۔ وہ تو اِک نظر دیکھنے میں یوں لگتا تھا کہ کسی دیس کی شہزادی اپنا راستہ بھول گئی ہو۔ ماہ رخ نے ایک گہری نگاہ اُس پر ڈال کر تاسف سے سوچا۔

'ہاں ترنم! تم کو واقعی غلط جگہ ملی ہے۔ تم تو کسی اور ہی مٹی کا خمیر ہو۔ یہاں کی چمک دمک تمہارے وجود کو بجھا کر رکھ دیتی ہے۔ تم جانے کیوں، ہم میں سے نہیں لگتیں۔'

''اُف......!'' ماہ رخ نے بڑی مشکل سے تیز رفتار گاڑی کو بریک لگائی تھی۔

''کیا ہوا؟'' ترنم نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

''وہ دیکھو، سامنے۔'' ماہ رخ نے کچھ پریشانی سے سامنے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''اوہ، مائی گاڈ!'' ترنم کہتے ہوئے گاڑی سے باہر نکلنے لگی۔

”کیسی حرکتیں کرتی ہو؟ جانے کون ہے؟“ ماہ رخ نے اُسے روکا۔ ”کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔ ماہ رخ! تم کو معلوم ہے کہ وہ بے چارہ خون سے لت پت پڑا ہے، وہ ہمارا کیا بگاڑے گا؟ چلو نکلو باہر، دیکھیں زندہ بھی ہے کہ نہیں۔“ ترنم نے اُسے بھی زبردستی اُترنے پر مجبور کیا۔

”ترنم! یہ تو زندہ ہے۔ لیکن دیکھو، کس طرح بے چارے کا خون بہہ رہا ہے۔“ ماہ رُخ نے اُس پر جھکے جھکے کہا۔ ”لگتا بھی کسی اچھی فیملی سے ہے۔“ ماہ رخ کو اُس کے خون سے بھیگے کپڑے دیکھ کر لگ رہا تھا کہ کسی نے اُس کو لوٹ کر زخمی کر کے یہاں پھینک دیا ہے۔

”تم.......تم یہ دوپٹہ پورا کا پورا اس کے کندھے سے لپیٹ دو۔“ ترنم اپنے بیگ سے اپنا دوپٹہ اُٹھا لائی۔ اتنے جوان آدمی کا وزن وہ نازک اندام کہاں اُٹھا پا رہی تھیں۔ ترنم بھی اُس کو سیدھا کرتے کرتے ہانپنے لگی تھی۔

”دیکھو، کوئی ٹرک، گاڑی وغیرہ کوئی بھی گزرے تو مدد مانگتے ہیں۔“ ترنم نے فکرمندی سے اُس نوجوان کو دیکھا، جس کا چہرہ تیزی سے پیلا پڑتا جا رہا تھا۔

”ایک تو تمہاری سمجھ نہیں آتی۔ اچھا بھلا جا رہے تھے۔ تم خود مصیبت مول لیتی ہو۔ اب پولیس ہم سے اُلٹے سیدھے سوال کرے گی۔ اور آپا وہاں کتنا پریشان ہو رہی ہوں گی۔“ ماہ رخ نے بیزاری سے کہا۔ وہ اب پیپر سوپ کو گیلا کر کے اچھی طرح ہاتھوں پر مل مل کر اپنے ہاتھ دھو رہی تھی۔

”کمال ہے، پچھلے بارہ منٹ سے یہاں کوئی بھی نہیں گزرا۔ اور دیکھو، کیسے اس کا خون بہے جا رہا ہے۔“ ترنم نے اُس کے جواب میں فکرمندی سے کہا تو ماہ رخ صرف سر ہلا کر رہ گئی۔

”لو، وہ آ گئے جن کا ڈر تھا۔“ ماہ رخ نے برا سا منہ بنا کر موٹر وے پولیس کی کار کو دیکھتے ہوئے اطلاع کی۔

”تھینکس گاڈ! کوئی آیا تو سہی۔“

ترنم کے پُرسکون چہرے کو دیکھتے ہوئے ماہ رُخ کو اپنا غصہ دبانا مشکل ہو گیا تھا۔ پولیس والوں کی انکوائری سے وہ ہمیشہ بچتی تھی، اور اب وہ اُن کے سروں پر آ کھڑے ہوئے تھے۔

❖❖○❖❖

”آپا! میں کہہ رہی ہوں ناں کہ بس کل ہم آ رہے ہیں۔ کچھ گھومنے کا موڈ تھا۔“

وہ چاندنی بائی کو کسی طرح مطمئن نہیں کر پا رہی تھی۔ ماہ رخ نے زِچ ہو کر اپنا موبائل آف کر دیا۔

”ہم کو تو بالکل بچہ بنا رکھا ہے۔ ایک گھنٹہ بھی اِدھر اُدھر ہو جاؤ تو گوشمالی ہو جاتی ہے۔“ وہ غصے میں بڑبڑا رہی تھی۔

”اور سنو!“ وہ ایک دم ترنم کی جانب پلٹی۔ ”ایک تو ناں، پتہ نہیں تمہیں مجھ سے اتنا لگاؤ کیوں ہے، جو تمہارے کہنے پر مصیبتیں پال لیتی ہوں۔ اب نہ وہ محترم ہوش میں آتے ہیں اور نہ پولیس والے ہم کو جانے دیتے ہیں.......اچھا خاصا کل میرا زینت کی پارٹی میں جانے کا موڈ تھا۔ لیکن تم نے کباڑا کروا دیا۔“ ماہ رُخ مسلسل اُسے سنا رہی تھی۔

”اور یہ پولیس تم کو معلوم ہے، کیسے کیسے سوال بار بار کر رہی ہے، جیسے ہم نے ہی تو اس کو گولی مار کر وہاں گرایا تھا۔ اور مزے کی بات ہے کہ گولی مار کر اُسے بچانے کے لئے وہاں کھڑے بھی تھے۔“

”ماہ رخ! تم ملک رحمٰن کو فون ملاؤ، میں بات کروں گی۔“ ترنم بھی پولیس والوں کی تفتیش سے کچھ گھبرا گئی تھی۔ اُن کے اصل کے ساتھ کل اُن کی تصویریں اخبار میں آ جاتیں تو وہ آپا کے عتاب سے بالکل بچ نہ پاتیں۔ اور یہ خبر کالج وغیرہ میں الگ مصیبت کا سبب بنتی۔

”جی، ملک صاحب! آپ کے شہر میں ہیں اور آپ کی پولیس ہی آپ کے اور ہمارے درمیان کھڑی ہے.......کیسی مشکل، جناب! آپ کس مرض کی دوا ہیں.......جی، جی.......سی ایم ایچ ہی ہے۔ بس، ہمدردی کبھی کبھی جرم بن جاتی ہے.......جی ہاں.......جی، جی.......ضرور تشریف لائیے گا.......جی بالکل.......ہاں، وہاں آپا پریشان ہو رہی ہیں۔ ہمارے یہاں سے نکلنے کا جلدی بندوبست کر دیں.......جی اچھا.......اوکے، پھر حیدری صاحب کے فنکشن میں ہی ملاقات ہو گی۔ اوکے، بائے۔“ ترنم نے موبائل آف کر دیا۔

ماہ رخ بیزاری سے بیٹھی کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ چھوٹا سا کمرہ تھا یہ ہسپتال کا، جہاں باہر پولیس کا سپاہی پہرہ دے رہا تھا۔ اُسے اِس خوامخواہ کی قید سے سخت کوفت ہو رہی تھی۔

ابھی دس منٹ بھی نہ ہوئے تھے کہ ایک نرس اور انسپکٹر اکٹھے اندر داخل ہوئے۔

”معافی چاہتا ہوں، بی بی! آپ کو خوامخواہ زحمت دی۔ آپ جا سکتی ہیں۔“

ماہ رخ نے تو فوراً گاڑی کی چابیاں اُٹھا کر اُسے چلنے کا اشارہ کیا۔

”ایک منٹ، انسپکٹر صاحب!“ ترنم نرس کی جانب پلٹی۔ ”اب تک اُسے کیوں ہوش نہیں آیا؟“

”ہاں، ہوش تو آ گیا ہے، لیکن کچھ غنودگی میں ہے۔ تم اُس کا ملنا مانگتا؟“ کالی سیاہ کرسچین لڑکی نے اُن خوب صورت پریوں کو دلچسپی سے دیکھا۔

”ہاں، بس اِک نظر۔“ ترنم تیزی سے اُس کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

”اُف، ترنم! فار گاڈ سیک! چلو یہاں سے۔ دوائیوں کی بُو سے مجھے ابکائی آ رہی ہے۔“ ماہ رخ نے انتہائی بے بسی سے ترنم سے کہا۔

”دیکھو ینگ مین! تم کو کون دیکھنے آیا ہے۔ یہی وہ ینگ لیڈیز ہیں، جنہوں نے تم کو بچایا تھا۔“ نرس نے زخمی کو تھوڑا متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ اُس کا دماغ ہر چیز سمجھ رہا تھا، لیکن اُس سے اپنی آنکھیں کھولنا دُشوار ہو رہا تھا۔

بہت مشکل سے اُس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو ایک نہایت حسین چہرے کو اپنے اوپر پریشانی سے جھکے پایا۔

”کیا نام ہے، آپ کا؟“ وہ بار بار پوچھ رہی تھی۔

درد کی ایک تیز لہر اُس کے سارے وجود میں اُٹھی۔ ”آہ!“

”کیا نام ہے، آپ کا؟“

”عبدالولی۔“ بے ہوش ہونے سے پہلے اُس کے ہونٹ تھرتھرائے تھے۔

❖❖○❖❖

'کتنی مختلف آنکھیں تھیں........اور کتنی اُداس سی!'

عبدالولی کو ہوش میں آتے آتے بھی تقریباً پورا دن لگ گیا تھا۔ لیکن ہوش میں آتے ہی جیسے اُس کے ذہن نے آخری منظر اسکرین پر روشن کر دیا۔ وہ آنکھیں........ گہری جھیل جیسی یا ڈری ہوئی ہرنی جیسی آنکھیں۔ لیکن اتنی اُداس کیوں تھی؟ اور وہ کون تھی؟

"سنو نرس! وہ لڑکی کون تھی؟" اُس نے نرس سے پوچھا۔

نرس نے مڑ کر اُس کی جانب دیکھا۔ ترنم جاتے جاتے اُس کرسچین نرس کو خاصی رقم دے کر گئی تھی کہ وہ مریض کا خیال رکھے اور اپنا موبائل نمبر دے گئی تھی کہ اگر خدانخواستہ کوئی سیریس حالت ہو تو اُسے ضرور انفارم کرے۔

"سر! وہ میڈم تو فرشتہ تھا، تمہارے لئے۔ اُس نے تمہاری جان بچائی اور تم کو خاص کیئر میں رکھنے کے لئے ہم کو سروس چارج دیا۔ اتنا انعام دیا ہے۔"

"میں اُس لڑکی کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ کیا کوئی نمبر ہے، رابطے کے لئے؟" عبدالولی نے نرس سے پوچھا۔

"سر! تم پہلے اپنے گھر اور اپنے لوگوں کو انفارم کرو، پھر کوئی اور طرف سوچنا۔" نرس نے اُسے اہم بات یاد دلائی۔

"اوہ میرے اللہ! اماں جانی میرے فون کے انتظار میں پریشان ہو رہی ہوں گی۔ اب تو تقریباً دو دن ہونے کو ہیں۔ پورا گھر بہت پریشانی میں ہوگا۔" ولی نے فکر مندی سے سوچتے ہوئے نرس سے فون کرنے کو کہا۔

"تم ہم کو نمبر دو، ہم بات کر دیتا ہے۔ یہاں تم تک فون لانا تو ممکن نہیں ہے۔" نرس نے ہمدردی سے کہا۔ (اور یہ ہمدردی، ترنم کی دی ہوئی رقم کی وجہ سے ہی تھی)

❖❖○❖❖

"ترنم جان! "مشی" سے کتنی بار فون آ چکا کہ تمہاری آج وہاں اپائنٹ منٹ تھی۔ دیکھو ناں، تمہارا چہرہ کتنا مرجھایا ہوا ہے۔ جاؤ میری جان! آج وہاں وزٹ کر لو۔ اور ہاں، آج تم فل باڈی ویکس کروا لینا، پرسوں کی پارٹی کے لئے۔ میں نے اپنی سب بیٹیوں کے لئے بہت خوب صورت لباس تیار کروائے ہیں۔" چاندنی بائی نے اُس کے بدن کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اوکے، میں ذرا ماہی کو دیکھ لوں، آخر اتنا لمبا فون کس کا آ گیا؟"

ترنم نے دُکھی نظروں سے اُسے باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔

'بیٹیاں تو ماؤں کا سب سے قیمتی خزانہ ہوتی ہیں، جسے وہ لاکھ پردوں میں چھپا کر، سنبھال کر رکھتی ہیں۔ تم........ تم کیسے ہم کو بیٹی پکار سکتی ہو، جو اُن کو سرِعام ننگے لباس پہنا کر، اُن کی عصمت کا ہر روز سودا کرتی ہو؟ تم........ تم تو حرافہ ہو۔ کاش! میں تم کو اور تمہارے اس سارے سسٹم کو برباد کر سکتی۔' ترنم نے نفرت سے سوچا۔

❖❖○❖❖

"نگینہ! اب بس بھی کرو، بیٹا! بھائی کو اس طرح رو رو کر پریشان نہ کرو۔"

احمد شاہ نے دونوں ماں بیٹی کو اس طرح لگاتار روتے دیکھ کر صرف نگینہ سے کہا، تا کہ کچھ تو کمی آئے۔ وہ دونوں مسلسل آدھے گھنٹے سے آنسو بہائے جا رہی تھیں۔

"شاہ جی! میں، شکرانے کے نفل ادا کرنا چاہتی ہوں........ اُس ذات کریم نے مجھے کسی بھی مشکل آزمائش سے بچائے رکھا۔ شکر اللہ کا، اُس نے میرے بیٹے کی زندگی لوٹا دی۔" روشن آرا نے اپنے آنسو اپنی چادر میں جذب کرتے ہوئے کہا۔

"بابا سائیں! آپ کا گفٹ، وہ گاڑی بھی چلی گئی۔" ولی نے تاسف اور شرمندگی سے کہا۔

"دیکھو بیٹا! گاڑیاں تو ایسی ہزاروں تم پر قربان۔ لیکن آخر وہ لوگ کون تھے؟ کیا کوئی ڈاکو یا کوئی دشمن؟ لیکن ہمارا کون دشمن ہو سکتا ہے؟" احمد شاہ کسی گہری سوچ ہی میں تھے۔

"بابا سائیں! مجھے نہیں معلوم، وہ لوگ کون تھے۔ البتہ جب میں ہوش میں تھا تو مجھے وہم سا ہے کہ اُن میں سے ایک نے قہقہہ لگاتے ہوئے میرا نام لیا تھا۔"

احمد شاہ نے چونکتے ہوئے اُسے دیکھا۔

'کون ہو سکتا ہے؟........ ہم نے تو اپنی زندگی کے خوب صورت اور بہترین سال، اپنے وطن سے دُور رہ کر گزارے ہیں کہ کوئی دوست بنے نہ بنے، لیکن کوئی دشمن تو ہرگز نہ بنے........ آخر وہ کون تھے؟'

❖❖○❖❖

"لوگوں میں طاقت کی نہیں، ارادے کی کمی ہوتی ہے۔ شاہ بلوط کا درخت اُگانے والے اِس کا سوچتے ہیں۔ ننھے سے بیج سے وہ پودا سر اُٹھاتا ہے کہ سو سال تک پھر اس کا سر جھکانا ممکن نہیں رہتا........ ککڑی بو کر شاہ بلوط کا انتظار کرنے والے کو کبھی کامیابی ملتی ہے، نہ کامیابی کی خبر........ وہ ہمیشہ مایوسی کے گڑھے میں بیٹھے اسی کو گہرا اور گہرا کرتے جاتے ہیں........ یہاں تک کہ ان مایوس روحوں کو واپسی کا بلاوا آ جاتا ہے۔ اور اگر زندگی رہے بھی تو اس مایوس اور نامراد پرندے کی طرح ہوتی ہے، جو قوتِ پرواز ہی کھو بیٹھا ہو اور پل پل مر رہا ہو۔"

بابا جی نے خاموش، سر جھکائے، احمد شاہ کے کندھے پر اپنے ضعیف ہاتھ سے دباؤ ڈال کر اپنے یقین کے الفاظ ان کے دل میں اُتارتے ہوئے کہا۔

"احمد شاہ! تُو نے شاہ بلوط بویا ہے۔ تیرا سر ہمیشہ اونچا رہے گا۔ تُو کیوں فکر کرتا ہے؟ وہ کہانی، جو اتنے سال پرانی ہو کر بھی اپنی آگ کی تپش رکھے ہوئے ہے، لگتا ہے ابھی اس کا اختتام باقی ہے۔" بابا جی نے تسبیح کے دانے کو گرا کر آہستگی سے کہا۔

"تم جانتے ہو، تم کو اللہ رحیم کریم نے بہت بڑے اعزاز سے بخشا ہے۔ ایسی نیکی کی توفیق تو اُس کو ہی ملتی ہے، جو اُس کی خاص نظرِ کرم میں ہو۔ اے میرے پیارے بیٹے! اتنا یاد رکھنا، بڑے اعزاز والوں کو ہمیشہ آزمائش بھی بڑی ملتی ہے۔ ہمارے نبی ﷺ اور اولیاءؒ سب آزمائے گئے ہیں۔ ہم تو پھر اُن کے پیروں کی خاک ہیں........ آزمائش اگر وہ لیتا ہے تو جان لو کہ وہ تم کو کتنا اپنے قریب رکھتا ہے۔ ورنہ بہت سینکڑوں اور کروڑوں میں ہیں، جو اپنی زندگی میں مست اور مگن ایسے رہتے ہیں کہ بلاوا آ جاتا ہے

اور معلوم پڑتا ہے، آخر میں وہ تو کلاس سے بھاگے بچے کی طرح، اُس کی نظر خاص سے دُور زندگی میں کچھ حاصل کئے بغیر جا رہے ہیں۔''

''بابا جی! میں کہاں کسی قابل ہوں۔ عام بشر ہوں۔ میرا دل بھی اولاد کی محبت کی وجہ سے دھڑکتا ہے۔ اُس کی تکلیف پر لرزتا ہے۔ آپ میرے لئے اور میرے اہل و عیال کے لئے دُعا کیجئے گا........ میں نے تنکا تنکا کر کے اُن کے دماغوں کو، دلوں کو، روحوں کو اکٹھا کیا ہے۔ ماضی اس طرح سے اُن کو بکھیرنے کا سوچے گا، میں......میں بہت تکلیف محسوس کرتا ہوں۔'' احمد شاہ نے کچھ بے بسی سے کہا تھا۔

''پیارے بیٹے! ہم ماضی کو اپنا پچھلا حصہ جان کر آگے بھاگتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں جانتے کہ ماضی کی ڈور ہمیشہ سے حال باندھ کر بھاگتا ہے۔ اور کبھی کبھی اُس کو اپنے وجود کی پہچان کے لئے پیچھے مڑ کر دیکھنا پڑتا ہے۔'' بابا جی نے بہت پیار سے احمد شاہ کو حقیقت کا آئینہ دکھایا تھا۔

احمد شاہ کو ایک دم گہری شرمندگی نے آن گھیرا۔ اپنی اولاد سے محبت نے کچھ دیر کے لئے اُن کو اپنا وعدہ بھلا دیا تھا۔

''محترم بزرگ! میں اپنے اللہ اور رسول ﷺ کے بعد آپ سے معافی چاہتا ہوں........ میں بس بہت عام انسان ہوں، لیکن ان شاء اللہ! امانت دار رہوں گا۔ آئندہ کے لئے ان بچوں کے لئے، جو آپ کا حکم ہوگا، ویسا ہی ہوگا۔''

احمد شاہ کے شرمندہ لہجے پر بابا جی کی مسکراہٹ بے ساختہ تھی۔

''احمد شاہ! تم اللہ کی مہربانی ہو۔ ہم دیکھتے ہیں اور مانتے ہیں، واقعی تم اللہ کی مہربانی ہی ہو۔ عبدالولی اور نگینہ کیسے ہیں، اب؟'' بابا جی نے پوچھا۔

''عبدالولی اب گھر آ گیا ہے۔ اور نگینہ بھی ٹھیک ہے۔ بس، بھائی کی دیوانی ہے۔ اُس کی تکلیف پر وہ بہت اذیت میں رہی ہے۔''

''ہوں!'' بابا جی نے مسکراتے ہوئے ہنکارا بھرا۔

آج وہ کافی عرصے بعد بولے تھے۔ وہ خاصے ضعیف ہو گئے تھے۔ بے وجہ گفتگو تو وہ پہلے بھی نہ کرتے تھے، اور اب تو وہ بہت کم بولا کرتے تھے۔

احمد شاہ کا اتنا فکر مند اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونا، اُن کو لمبی چوڑی گفتگو کرنے پر مجبور کر گیا تھا۔

''احمد شاہ! اُس نیک بخت کا کیا حال ہے؟........ ہمارا دل چاہتا ہے کہ اُس بڑے دل والی کو خود سلام کر کے آئیں۔''

''استغفر اللہ........ بابا جی! ایسی بے ادبی کیوں؟ وہ خود آپ سے ملنے آنا چاہتی ہے۔ آپ کی اجازت کے بغیر تو میں اُسے یہاں نہ لا سکتا تھا۔ وطن واپس آتے ہی وہ آپ سے ملنے کو بے چین تھی۔''

''احمد شاہ! تم اگر برا نہ مناؤ تو بچوں اور اُس نیک بخت کو ہم سے کبھی کبھی ملوا دیا کرو۔ ہم اب جلتے بجھتے چراغ ہیں، ہمیں ان میں........ ان بچوں میں اپنے شہید بچوں کا عکس نظر آتا ہے۔'' بابا جی کی آواز اپنے آخری جملے پر بالکل سرگوشی میں تبدیل ہو گئی تھی، جس کو احمد شاہ سن نہ پائے۔

احمد شاہ نے آگے بڑھ کر اُن کے ہاتھوں کا بوسہ لیا۔

''محترم بزرگ! ہم ان شاء اللہ جلد ہی سب آپ کے پاس آئیں گے۔''

❖❖○❖❖

''کیا کر رہی ہو، مسکان! کل آخری تاریخ ہے، جمع کروانے کی۔ اور تم ابھی تک ویسی کی ویسی بیٹھی ہو........ سربٹ نے تمہاری جان نکال لینی ہے۔ پتہ ہے ناں، وہ کتنے سخت ہیں، اپنے کام کے متعلق؟'' سائرہ نے مسکان کا کندھا ہلا کر اُسے متوجہ کیا۔ جانے وہ کس جہان میں کھوئی ہوئی تھی۔

''ہوں........؟'' مسکان نے نہ سمجھ آنے والے انداز میں پوچھا۔

''مسکان! تمہارا وہ جوس کا ایڈ، اُس کا پوسٹر تیار ہو گیا؟'' سائرہ نے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''سائرہ! وہ........ وہ عبدالولی، بیس دن ہو گئے، کالج نہیں آ رہا۔'' جواب میں مسکان نے اُلٹا جواب دیا۔

''تم یوں کرو، کوئی تخلیقی سا آئیڈیا لے کر عبدالولی کی گمشدگی پر پوسٹر ڈیزائن بنا لو۔ تم کو یہ جوس کا ٹاپک سُوٹ نہیں کر رہا........ حد ہو گئی ہے، لیلیٰ بننے کی۔'' سائرہ باقاعدہ غصے سے بولی اور خفا ہو کر منہ موڑ کر بیٹھ گئی۔

''ارے! تم........ تم کیوں خفا ہو رہی ہو؟'' مسکان نے معصومیت سے پوچھا۔

''مسکان! اللہ کا واسطہ ہے، حواسوں میں رہا کرو۔ پوچھتی کچھ ہوں، جواب کچھ آتا ہے۔'' سائرہ نے اپنی خفگی بھول کر فکر مندی سے کہا۔

''میں........ میں کیا کروں، سائرہ؟ جانے کیا چیز ہے جو مجھے بس اُس کی جانب کھینچتی ہے۔'' مسکان نے بے بسی سے کہا۔

''او کے! لیکن تم ایسی بے خود نہ رہا کرو۔ یہاں تو رائی کا پہاڑ بننے میں دیر نہیں لگتی........ لوگوں کو صرف ٹاپک چاہئے ہوتا ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو۔'' سائرہ نے اُسے حاضر دماغ ہونے کا کہا تھا۔ کیونکہ یہاں، ڈیپارٹمنٹ میں فساد بنتے دیر ہی کتنی لگتی تھی۔

''ہوں۔'' مسکان نے بے بس مسکراہٹ کے ساتھ حامی بھری۔

''چلو، پھر کچھ کام کر لو۔ تم نے کوئی فوٹو گراف لی تھی؟'' سائرہ نے پوچھا۔

''ہاں........ وہ، فرسٹ ایئر کی سومیہ کو ماڈلنگ کا شوق بھی ہے اور اُس کا چہرہ بھی فوٹو جینک ہے۔ میں نے اُس کی فوٹو گرافی کر کے رکھی ہے۔ بس، یہ جوس کے ڈبے کی ٹرانسپیرنسی اتنی مزے کی نہیں آئیں۔ شاید لائٹ کا کچھ مسئلہ تھا۔''

مسکان نے فائل نکال کر اپنا کام سائرہ کو دکھایا۔

''وہ کوئی مسئلہ نہیں۔ تم فوٹو شاپ میں لے جا کر اسے لائٹ دے دینا۔ کچھ ڈرامیٹک بھی ہو جائے گا۔'' سائرہ نے آئیڈیا دیا جو کہ واقعی زبردست تھا۔ کمپیوٹر کا فائدہ بہت ہوتا ہے۔ جو کام دوبارہ ٹرانسپیرنسی سے کرنا پڑتا ہے، وہ بغیر کسی مزید محنت کے کمپیوٹر سے ہو جاتا ہے۔

''ٹھیک ہے۔ اس کا بیک گراؤنڈ مرج (ملا) کر دیتے ہیں۔'' مسکان نے فوراً اُسے خیال پیش کیا۔

بے شک وہ محنتی اور قابل اسٹوڈنٹ تھی۔

بہت جلد اپنی اُداسی سے نکل کر وہ کام کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔

اور یہی سائرہ چاہتی تھی کہ کسی طرح مسکان، حواسوں میں رہے۔ ورنہ اُس کی بے خودی اکثر چلتا پھرتا اشتہار بنا دیتی تھی۔

❖❖○❖❖

"یار! تم کس قدر بے وفا اور بے حس انسان ہو؟ اتنا کچھ گزر گیا اور یار لوگوں کو کوئی خبر ہی نہیں؟" [illegible] نے ناراضگی سے ولی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس یار! میری کوتاہی جان کر مجھے اب معاف کر دو۔" ولی کو اپنی جان چھڑانی مشکل ہو گئی تھی۔ کیونکہ وہ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے اُس کی جان کھا رہا تھا۔

"اچھا بتاؤ، کیا کھاؤ گے؟" ولی نے اُس کا دل پسند موضوع چھیڑا۔

"تمہارے فریج اور تمہارے خانساماں کا موڈ دیکھ کر بتایا جا سکتا ہے۔" وہ فٹافٹ اُٹھ کر باہر نکلا اور ولی مسکرا دیا اور آنکھیں موند کر بیڈ سے سر لکا دیا۔

ذہن کے پردے پر دو سبز کاہی آنکھیں جھلملائی تھیں۔ کون؟

اُس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

آج یہ کوئی چوتھی بار ایسا ہوا تھا کہ اُسے دو آنکھیں بار بار ڈسٹرب کر رہی تھیں۔

"چکن چاؤمن، فرائیڈ رائس، نگیٹس اور بس، فرنی سے کام چل جائے گا۔" ٹی ٹو، نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ اُس کے پیچھے اندر آتے خانساماں کے چہرے پر ناگواری تھی۔ عبدالولی نے بڑی مشکل سے مسکراہٹ چھپائی۔

"سر! یہ آپ کے دوست جو مینیو کہہ رہے ہیں، یہ تو بیگم صاحبہ نے مجھے لکھ کر نہیں دیا تھا۔" خانساماں نے عبدالولی سے پوچھا۔

"یار! وہ میرے لئے نہیں ہے۔ تم میرے لئے بغیر گھی کا قیمہ بناؤ، جو اماں جان کہہ گئی تھیں۔" ولی نے کہا۔

"لیکن سر! پھر یہ سب کس کے لئے؟" خانساماں، ٹی ٹو، کو لفٹ کروانے کے موڈ میں نہ تھا۔ کیونکہ ٹی ٹو، جب بھی آتا تھا، ہر گھنٹے کے بعد کچھ نہ کچھ اُس سے نہ صرف بنواتا بلکہ نقص بھی نکالتا تھا۔ اُس سے ولی کے نخریلے کک کو سخت چڑ تھی۔

"یار عاشق! جاؤ، بناؤ۔ مہمان کے لئے ہی بنے گا۔" ولی نے خانساماں کو ٹالا۔ خانساماں عجیب عجیب شکلیں بناتا باہر کو مڑ گیا۔

"یار! یہ........ یہ مسکان کا کیا چکر ہے؟" ٹی ٹو، نے آنکھیں مٹکا کر پوچھا۔

"کون مسکان؟........ کون سا چکر؟" ولی نے نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا چکر؟ اچھا جی!........ ارے، اُس چکر کے متعلق پوچھ رہا ہوں، جس کے چکر میں مسکان بی بی تین سو چکر تو میرے پاس لگا چکی ہیں۔ ولی کالج نہیں آ رہے؟........ ولی خیریت سے ہیں؟........ ولی

لب آئیں گے؟"

ٹی ٹو نے زنانہ آواز میں نقل اُتاری۔

"اب آپ بھولے بادشاہ بن کر پوچھ رہے ہیں کہ کون مسکان؟" ٹی ٹو، نے باقاعدہ چڑ کر کہا۔ اُسے اگر وہم ہو جاتا کہ کوئی اس سے بات چھپا رہا ہے تو وہ یوں ہی چڑا کرتا تھا۔

"بائے گاڈ۔ آئی ڈونٹ نو۔" ولی نے نفی میں سر ہلایا۔

"آر یو شیور؟" ٹی ٹو، نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

"آف کورس!" ولی نے بے نیازی سے کہا۔

"پوزیٹو؟" ٹی ٹو، نے پوچھا۔

"بس، Positive........ اس میں شک کی گنجائش نہیں۔" ولی نے جواب دیا۔

"اچھا! پھر وہ حسینہ کیوں اتنی بے قرار تھی؟ ویسے بائی داوے، یار! کالج کی آدھی حسینائیں تمہارے لئے بے قرار ہیں۔ ٹی ٹو، نے کہا۔

"اور باقی کی آدھی؟" ولی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"باقی کی آدھی .... یار! اپنی بھابھیز کے متعلق ایسے تھوڑی بات کرتے ہیں؟" ٹی ٹو، نے شرمانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے پوچھا۔

"مائی گاڈ! آدھا کالج .... ٹی ٹو! حد ہے یار۔" ولی نے کہا۔

"تو کیا ہوا، آدھا کالج میں نے تمہارے لئے چھوڑ دیا ہے۔" ٹی ٹو، نے دریا دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

یا اللہ! یہ کیا انسان ہے؟

"یار! تم باقی کا آدھا کالج بھی اپنے پاس رکھو۔" مجھے کسی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بلکہ میں شاید کسی لڑکی میں انٹرسٹڈ نہیں ہو سکتا۔" ولی نے صاف الفاظ میں جواب دیا۔

"کیوں؟........ کیا تم لڑکوں میں دلچسپی رکھتے ہو؟" ٹی ٹو، نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی۔

"لاحول ولا........ تم سے تو بات ہی کرنا سو کا گھاٹا ہے۔ تم یہ کارنیٹو کھاؤ۔" ولی نے جھک کر چھوٹے فریج سے آئس کریم نکال کر اسے دی۔ اُسے ٹی ٹو کا منہ بند رکھنے کا ایک ہی طریقہ نظر آیا تھا، جو کہ بے حد کارگر تھا۔

ٹی ٹو نے لپک کر آئس کریم پکڑی اور کھانی شروع کر دی۔

اب کمرے میں خاموشی تھی۔ ولی نے سکون کا سانس بھرا۔

'یہ مسکان کون ہے؟' اُس کے ذہن نے سوال کیا، اور ولی نے کندھے اُچکا دیئے۔

❖❖○❖❖

ون، ٹو، تھری، فور........ یس! تھوڑا سا اور........ جی، تھوڑا سا اور جھکیں۔ ماہی بے بی! واہ، کیا فگر ہے آپ کا۔ اس کا خیال رکھنا ہی چاہئے۔" جمی نے خوشامدی لہجے میں کہا۔

"جھوٹے! ابھی تم ترنم کی بھی یوں ہی تعریف کر رہے تھے۔" ماہ رخ نے ایروبکس کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ، بے بی! تم کس سے جیلس ہوگئیں؟ وہ تو کبھی بھی مقابلہ پر آتی ہی نہیں۔" جمی نے واقعی سچ کہا تھا۔ ترنم تیز میوزک میں بیزار سے موڈ میں شاید زبردستی ورزش کر رہی تھی۔

چاندنی بائی اپنی لڑکیوں کی فٹنس کا خاص خیال رکھتی تھی۔ اس کے لئے کوچ ڈیلی آتا تھا۔

اب بھی جمی، جو کہ ان کا کوچ بھی تھا، پندرہ لڑکیوں کو ایروبکس کی ورزش کروا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ کبھی اُن کی کمر کو پکڑ کر، کبھی ان کو کندھوں سے تھام کر اپنے سارے مزے کرتا تھا۔ جہاں چاہتا، چھوتا تھا۔

"Sleper کے ساتھ مومنٹ کریں۔ لیس، لیس!........ جلدی جلدی، تیزی سے۔ پندرہ کیلوری فی منٹ کے حساب سے برن کرنی ہے۔ جتنا ہارٹ بیٹ کا ریٹ بڑھے گا، کیلوری اتنی ہی برن ہوگی۔" جمی سب کو Motivate کر رہا تھا۔

"گڈ........ وری گڈ!" وہ سامنے سے آ کر سائیڈ پر کھڑا ہوگیا، جہاں ترنم کو باآسانی دیکھ سکتا تھا۔

یاقوتی ہونٹ، اُداس سا چہرہ، اس قدر پُرکشش تھا کہ وہ باوجود کوشش کے، اُسے نظرانداز نہ کر پاتا تھا۔

جانے کیسے، ترنم نے اُس کے دل میں اس قدر نرم گوشہ حاصل کر لیا تھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ وہ کن لڑکیوں کو ایروبکس کروانے آتا ہے اور ان لوگوں کا کیا کام ہے۔ پھر بھی جانے اس ترنم کے اندر کیسی مقناطیسی کشش تھی، کہ اُس کا من اُس کی ہی جانب کھنچا رہتا تھا۔

❖❖❖O❖❖❖

"یا اللہ! یہ پڑھنا بھی کس قدر دشوار ہے ناں؟" ماہی نے کتابیں گھاس پر پھینک کر کہا۔

چاندنی بائی نے سب لڑکیوں کو بہت اچھے کالجوں میں داخل کروایا تھا، تا کہ اُن کی زبان اور اُٹھنے بیٹھنے کا خاص اہتمام ہو سکے۔ ویسے تو سیلف گرومنگ کے لئے ایک ٹیچر بھی آتی تھی، لیکن کالج کی تعلیم اور ڈگری ان لڑکیوں کے ریٹس میں مزید اضافہ کر دیتی تھی۔

"ارے، یہ اُس کام سے زیادہ دُشوار تھوڑی ہے، جو راتوں کو ہم کو کرنا پڑتا ہے؟" ترنم نے اُداسی سے کہا۔

"سامنے پھدکتی چڑیوں کو غور سے دیکھتی ترنم، حسب عادت پھر اُداس ہوگئی۔

دو چڑیائیں اپنے بچے کو دانہ چگنا سکھا رہی تھیں۔ کل کو یہ بچہ پھر سے اُڑ جائے گا اور ماں باپ دیکھتے رہ جائیں گے۔ ترنم کے اندر گھٹن بڑھنے لگی۔

"پلیز ترنم! واپس آ جاؤ........ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ ایک تو یہ جمی کے بچے نے اس قدر سخت ڈائٹ چارٹ بنا کر دیا ہے کہ ہر وقت، ہر چیز کے لئے ترستے رہو۔ چلو، چل کر حلیب والوں کا گڈ ڈے (جوس) پیتے ہیں۔" ماہ رخ نے ترنم کو اُٹھایا۔ وہ اس قدر نرم و نازک اور کامنی سی تھی، پھر بھی ہر وقت ڈائٹ کانشس رہتی تھی۔

"اب یہ ایپل جوس میں ایک سو بیس اور اورنج میں زیادہ ہیں۔ ہائے، میں یہ ایپل جوس مزید نہیں پی سکتی۔" ماہ رخ نے منہ بسورا۔

ترنم اُس کا چہرہ دیکھ کر کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

اُس کی ہنسی اس قدر پیاری تھی کہ آس پاس موجود کئی لڑکیوں نے مڑ کر دیکھا تھا۔ ہنسی کی کھنک میں

یہ خاص بات ضرور تھی۔

"السلام علیکم! میں بھی آپ کی ہی کلاس میں ہوں۔ مجھے یہاں کالج آئے سات دن ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک دوستی نہیں ہوئی، کسی سے۔ کیا میں، آپ لوگوں کا گروپ جوائن کر سکتی ہوں؟" اس لڑکی نے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ آگے ہاتھ بڑھایا۔

"گروپ؟........ ارے، ہم تو صرف دو ہی ہیں۔ ہمارا کوئی گروپ نہیں ہے۔" ترنم نے اُسے نظرانداز کیا۔ کیونکہ وہ کسی بھی خاندانی لڑکی پر اپنا سایہ نہ ڈالنا چاہتی تھی۔ ناپاک سایہ!

"ارے کیوں نہیں جوائن کر سکتی؟ خوب صورتی میری کمزوری ہے اور تم تو میری کمزوری کو پورا کرتی ہو۔" ماہ رخ نے بے باک قہقہہ لگا کر اُس شرمیلی اور بہت پیاری سی لڑکی کو کہا اور وہ جواب میں بس مسکرائی تھی۔

ترنم نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔

یہ........ یہ لڑکی........ اس کا چہرہ کس قدر شناسا سا تھا۔

میں نے اس کو کہیں دیکھا تھا........ یا........ یا اس کی شکل کسی سے ملتی ہے۔

ترنم نے ذہن پر زور ڈالا۔ کہاں........؟

ایک دم اُس کے ذہن میں جھماکہ ہوا۔ اُس کی نظروں میں خون میں لت پت اُس نوجوان کا چہرہ گھوم گیا، جس کو انہوں نے ہسپتال پہنچایا تھا۔

"جی، میرا نام نگینہ ہے۔" نگینہ نے اپنے سنہری ریشمی بال چہرے سے ہٹاتے ہوئے کہا جو کہ اُڑ اُڑ کر اُس کے چہرے پر آ رہے تھے۔

اُس کے سنہری بال اُس کے چہرے کو بہت مختلف اور خوب صورت لک دے رہے تھے۔

"ہوں، نگینہ........ یعنی انگوٹھی کے لئے موتی۔" ماہ رخ نے اسٹرا جوس میں ڈالتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"ایسا ہی سمجھ لو۔" نگینہ سادگی سے بولی۔

"تمہارے کون سے سبجیکٹ ہیں؟" ترنم نے پوچھا۔

"انگلش لٹریچر، ایجوکیشن اور فائن آرٹ رکھا ہے........ ایکچولی، میرے بھائی بھی آرٹ کالج میں پڑھتے ہیں۔ اس لئے بس بھائی کے شوق شوق میں، میں نے بھی یہ مضمون رکھ لیا۔" نگینہ نے تفصیل سے جواب دیا۔

"اوہ! تو تمہارا سبجیکٹ میں تو ترنم سے تعلق رہے گا۔ میں نے تو ایجوکیشن کے ساتھ آسان سے مضمون رکھے ہیں۔ اب یہ انگلش لٹریچر وغیرہ کون پڑھے؟" ماہ رخ نے منہ بنا کر کہا۔

"ارے واقعی! آپ کے، میرے سیم سبجیکٹ ہیں؟" نگینہ نے خوش دلی سے ترنم سے کہا۔

ترنم نے مختصر سی مسکراہٹ اُچھال کر دوسری جانب دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ کسی بھی صورت اس پیاری سی لڑکی کو اپنی قربت سے بچائے رکھنا چاہتی تھی۔

وہ کالج کی ہر لڑکی کو بہت اونچے درجے پر پرکھتی تھی۔ اور اسے ان کے چہروں اور جسموں سے بہت پاکیزہ خوشبو آتی تھی۔ جبکہ اسے اپنے آپ سے ہمیشہ گھن آتی تھی۔ خوب صورت جسم، جس کو ہر روز کوئی نہ

کوئی گدھ نوچتا تھا۔

کالج میں ایڈمیشن، ترنم نے دوسری بار لیا تھا۔ پہلے ایڈمیشن لیتے ہی اُسے کسی وڈیرے سے کال آئی تھی اور مسلسل اُس جانور کے ساتھ پانچ ماہ رہ کر کوٹھی اور کار لے کر آئی تھی۔ اس لئے پڑھائی کا برائے نام تسلسل ختم ہو گیا تھا۔

اب پھر دوبارہ اُس نے ایڈمیشن لیا تھا۔ اور اب تو ماہ رخ بھی اس کے ساتھ تھی۔

''او کے، پھر ملاقات ہو گی۔'' نگینہ، ماہ رخ سے باتیں کرتی کرتی ترنم کی طرف مڑی۔

''او کے......!'' ترنم بس دھیرے سے بولی تھی۔ وہ حسب عادت پچھتاوے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

وہ لڑکیوں کے اُجلے چہرے اور مسکراہٹوں کو حسرت سے دیکھتی تھی کہ یہ لڑکیاں کس قدر خوش قسمت ہیں۔ گھر سے اپنے ماں باپ کی دعائیں لے کر نکلی ہوں گی۔ گھر واپس آنے تک اُن کی ماؤں کی دعاؤں نے ان کا پیچھا کیا ہو گا......اور میں کس قدر ظالم نکلی۔ میں نے بد دعاؤں کو اپنے پیچھے لگا لیا......مجھ جیسا کوئی بدقسمت ہو گا، جس نے اپنے ہنستے مسکراتے گھونسلے کو آگ لگا لی۔

دو آنسو چپ چاپ اُس کی آنکھوں کے کنارے پر آ نکلے تھے۔ اُس نے بڑی مشکل سے ان کو ضبط کیا۔ کیونکہ ماہ رخ سے چھپانا مشکل ہو جاتا تھا اور ماہ رخ واقعی اس کے لئے بہت کیئرنگ تھی۔

❀

''کیوں وہم کرتے ہیں؟ وہ مولا کریم، وہ رحمان ذات ہمیشہ آپ کے ساتھ کرم کرے گی۔ ہم نے تو سی غیر کے ساتھ بھی تلخ کلامی نہیں کی، پھر ہمارا دشمن کون ہو سکتا ہے؟'' روشن آرا نے احمد شاہ کو تسلی دی۔

''لیکن عبدالولی کے حادثے کے بعد بے چینی تنگ کرتی ہے۔'' احمد شاہ نے بیڈ سے سر ٹکاتے ئے کہا۔

''بس، وہ ایک حادثہ ہی تھا۔ بھول جائیں۔ میرے بچے کو اللہ کی امان۔ وہ خیر سے ہے۔'' روشن آرا نے احمد شاہ کو پھر تسلی دی۔

''ارے، تم تو میرے والا کام (تسلی دینے کا) کرنے لگی ہو۔'' احمد شاہ مسکرائے۔

''کیوں نہ کروں؟ اگر پارٹنرز میں سے کوئی ایک رُکنے لگے تو دوسرے ساتھی کا فرض ہے کہ وہ اپنے اتھی کا ہاتھ اور مضبوطی سے تھام لے۔ ہاتھ چھوڑنے والے تو خود بھی تنہا رہ جاتے ہیں۔'' روشن آرا کی ھیں اپنے شوہر کی محبت کے لئے بے انتہا چمکیں۔

''آپ جیسا رفیقِ زندگی میرے لئے دنیا میں انعام ہے۔ آپ مجھے ہمیشہ ساتھ پائیں گے۔'' انہوں نے محبت سے اپنے شوہر کا ہاتھ تھاما۔ جو احمد شاہ نے اپنے لبوں سے لگا لیا۔ روشن آرا اُن کے لئے واقعی ندگی کی حرارت جیسی تھیں۔

❖❖○❖❖

''ولی! تم نے ہمیشہ سے وہ کام کرنا ہوتا ہے جو کوئی اور نہ کرے۔'' ٹی ٹو نے اسے اتنا مختلف کام رتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

''بس یار! آخری سال ہے، دل کرتا ہے کہ ہر قسم کا تجربہ کروں۔ ہر میڈیم میں کام کر کے دیکھوں۔'' لی نے ''کولاج'' کے لئے فوٹو گرافی بھی کر رکھی تھی۔

''او کے، گڈ لک!'' ٹی ٹو جیسے نکمے طالب علم نے فوراً ہتھیار پھینک دیئے۔ وہ کسی بھی کام میں محنت ر سکتا تھا۔ اُسے صرف اپنا آپ تخلیقی کہلوانے کا شوق تھا، کام کا نہیں تھا۔ ''تمہارا ڈسپلے کدھر لگ رہا ہے؟......اپنے کالج کی گیلری میں؟'' ٹی ٹو نے سوال کیا۔

''نہیں، میں الحمرا میں ڈسپلے دے رہا ہوں۔'' ولی نے اسپرے گن سے کلر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

''ہاں جی۔ امیر لوگ ہو تم، چاہے اپنے ڈسپلے پیرس میں دو، تم کو کون سا فرق پڑنے والا ہے۔'' ٹی ٹو نے حسب عادت اُسے امیر ہونے کا طعنہ دیا۔

''میرے باپ نے جو کچھ حاصل کیا ہے، وہ محنت سے اور ایمان داری سے حاصل کیا ہے۔ اور میں بھی ''پلیٹ سجنے'' کا انتظار کرنے والا آدمی نہیں ہوں، ٹی ٹو!'' ولی کے لہجے میں بے انتہا مضبوطی تھی۔

ولی نے احمد شاہ سے ہر اچھی خوبی لی تھی اور اس پر ولی کو فخر بھی تھا کہ وہ ایک غیر معمولی اوصاف رکھنے والے شخص کا بیٹا تھا۔

''عبدالولی شاہ......... سن آف احمد شاہ۔ کبھی بھی اپنے والد کو شرمندہ نہ کرے گا....... میں ہر کام بہت لگن اور ایمان داری سے کرنے کا قائل ہوں۔'' عبدالولی نے ٹی ٹو کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

ٹی ٹو دل ہی دل میں اُس کی بات کا قائل ہو گیا تھا۔ تین راتوں کا رت جگا اُس کی آنکھوں میں واضح تھا۔

''یہ بالکل درست ہے، جو ''محنت'' کا بیج بوتا ہے، صرف وہ ہی کامیابی کا پھل حاصل کرتا ہے۔''

''تمہارے کام کا ٹاپک کیا ہے؟'' ٹی ٹو، نے اپنے نکتے پن کی شرمندگی مٹانے کے لئے پوچھا۔

''محبت۔''

عبدالولی نے ٹرائی ٹرے سے شیٹ نکال کر سکھانے کے لئے، کلپ کرتے ہوئے جواب دیا۔

❖❖○❖❖

پس چہ باشد عشق، دریائے عدم
در شکستہ عقل را آنجا قدم

(عشق کیا ہے؟ فنا کا دریا ہے۔ وہاں عقل کے پاؤں ٹوٹ جاتے ہیں)

پندرہ منٹ سے زیادہ ہو گئے ہوں گے۔ وہ بت سی بنی اسی تصویر کے پاس کھڑی تھی۔

کالاج ورک میں آرٹسٹ نے بے حد خوب صورت ایبسٹرکشن میں اس شعر کو پورٹریٹ کیا تھا۔

''ترنم! آئی ایم گیٹنگ بور۔'' ماہ رخ نے بیزار سے انداز میں کہا۔

''چلو بھی...... آج میرا پارلر اپائنٹمنٹ بھی ہے۔'' ماہ رُخ نے اُسے کھینچا۔

''آں...... ہاں...... چلو!'' ترنم کھوئی کھوئی سی اُس کے ساتھ چلتی جا رہی تھی۔ تبھی اُس کی کر سے زور کی ٹکر ہوئی۔

''سوری...... آئی ایم ریئلی سوری!'' ٹکرانے والے نے ترنم کا ہینڈ بیگ اُٹھا کر اُسے تھمایا۔

ترنم یک ٹک اُسے دیکھے جا رہی تھی۔ شاید وہ مسمریزم میں تھی۔

''سوری مس!'' وہ ایک بار پھر کہتا آگے نکل گیا۔ بغیر ٹھٹکے، بغیر رکے! ایک نگاہ کے بعد دوسری نگا سنبھال کر نکل گیا تھا۔

حیرت ہے۔ کیسا بور لڑکا تھا؟'' ماہ رخ نے بھی حیرت کا اظہار کیا۔ کیونکہ اُن دونوں کو جنسِ مخالف نہیں بے خود ہو کر دیکھتی تھی، بلکہ عورتوں کا حال بھی ایک سا ہوتا تھا۔

دونوں کا غیر معمولی حُسن ایک بار تو ضرور رُکنے پر مجبور کرتا تھا۔ گیلری میں تقریباً سب ہی لوگوں توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔

''کیا آدمی تھا...... بالکل بھی نہیں دیکھا۔'' ماہ رخ کو باقاعدہ محسوس ہوا تھا۔ اسے اپنا آپ دکھا لڑکے پیچھے لگانا بہت پسند تھا۔

''ہاں۔ وہ ''آدمی'' تھا۔'' ترنم نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''ان جانوروں کی دنیا میں، آدمی۔ ''آدمی ہونا کس قدر خاص بات ہے ناں؟'' ترنم نے سوال کیا۔

''اُف! تم کس طرح کی ٹیڑھی باتیں کرتی ہو، جلیبی کی طرح مشکل۔ براہِ مہربانی کبھی ٹو دا پوائنٹ بھی بات کر لیا کرو۔'' ماہ رخ نے چڑ کر وہیں اُسے لیکچر پلا دیا۔

''اچھا بابا! چلو۔'' ترنم نے آس پاس متجسس نظروں کو محسوس کر کے اُسے چلنے کا اشارہ کیا۔

❖❖○❖❖

ماں کی محبت!

خود سردی میں ٹھٹھرتی اپنی چادر میں اپنے بچے کو لپیٹے۔ یہ قربانی صرف اور صرف ماں کی ہو سکتی ہے۔

ماں کی محبت، بچے کی محبت، محبوبہ کا محبوب کے لئے پجارن کا روپ، آسمان کی زمین کے لئے محبت!

یہ سارا ٹاپک محبت پر ہی گھومتا تھا۔ ترنم نے ایک بار پھر تصویروں پر نظر دوڑائی۔

آج مسلسل تیسرا دن تھا اُسے یہاں آتے، جاتے۔ کیوں وہ ایک ایک تصویر کے پاس گھنٹوں کھڑی ہوتی تھی؟ پھر اکثر وہ ''ماں کی محبت'' کے ٹاپک پر بنی تصویر کے پاس ٹک جاتی تھی۔ کبھی اُس تصویر کے پاس کھڑی ہو جاتی، جس کا بیک گراؤنڈ گہرا نیلا تھا اور روشنی کا گولا اُس اندھیرے میں سے نکل رہا تھا۔ روشنی کے کئی رنگ تھے۔

اس تصویر میں کوئی شکل وغیرہ نہ تھی لیکن رنگوں کا جادو دیکھنے والے کو جکڑ لیتا تھا۔

''یار! یہ ''قیامت'' روز یہاں آتی ہے، چار چار گھنٹے کھڑے گزار دیتی ہے۔ ہو نہ ہو، یہ تمہارے چکر میں ہے۔'' ٹی ٹو نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''ٹی ٹو! لڑکیوں کو صرف ایک ہی نظریے پر نہ پرکھا کرو۔ خدا کے لئے کسی کو چھوڑ دیا کرو۔'' ولی کا ایک ہاتھ پینٹ کی جیب میں تھا، دوسرے سے وہ بار بار اپنے ماتھے پر آئے بالوں کو پیچھے کر رہا تھا۔

''تم...... تمہاری نظر ٹھیک ہے؟'' ٹی ٹو نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''کیوں؟'' ولی نے پوچھا۔

''تم کو واقعی یہ مخلوق نظر نہیں آتی، جو تمہارے اردگرد منڈلاتی رہتی ہے۔'' ٹی ٹو نے دروازے سے اندر آتی مسکان کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اور تمہیں...... تمہیں صرف یہ لڑکیاں دکھائی دیتی ہیں۔'' ولی نے کہا۔ ''یار! یہ لڑکیاں قابلِ احترام ہوتی ہیں۔ تم اس بات کا خیال کیوں نہیں رکھتے؟'' ولی نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا ان کو دیکھنے سے احترام ختم ہو جاتا ہے؟'' ٹی ٹو نے اُس کی بات اڑائی تھی۔

''بالکل! ان کے معصوم چہروں پر بار بار غلط اور گندی نگاہ ڈالنے سے ہم ان کو کس قدر بے کشش کر دیتے ہیں۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔'' ولی نے اپنی طرف سے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''اوہ، اللہ کے بندے! ان کو چاہئے ناں کہ یہ لوگ پیسٹری بن کر نہ نکلیں، نہ تمہاری ہماری رال ٹپکے۔'' ٹی ٹو نے اپنے مؤقف پر زور دیا۔

''پہلے جملہ درست کر لو۔ صرف تمہاری رال۔'' ولی نے برا مناتے ہوئے کہا۔

''اوکے۔'' ٹی ٹو نے ولی کا موڈ خراب دیکھ کر فوراً سوری کہا۔ ''لیکن یار! تم کیا آدمی ہو؟'' ٹی ٹو پھر چھیڑنے سے باز نہ آیا۔

''ہاں ....صرف آدمی۔'' عبدالولی کا لہجہ ٹھوس تھا۔

اور اُن کی پشت پر کھڑی ترنم نے جی بھر کر اُس کے خوبرو سراپے کو دیکھا۔ اُس کی باتیں، اُس کے خیالات کتنے بلند تھے۔ اپنی آنکھوں سے دل میں اُتارتے، وہ اسے دیکھے جا رہی تھی، تبھی ولی نے مُڑ کر اسے دیکھا۔

''کیا آپ ہر جگہ، ہر تصویر، ہر شخص کو اتنے ہی غور سے دیکھتی ہیں؟''

ولی کا سوال اس قدر اچانک تھا کہ ترنم سے کوئی بہانہ نہ بن پا رہا تھا۔ وہ تو سمجھتی تھی کہ وہ نوٹس لئے بغیر ہی گزر جاتا ہے۔ اور اب بھی وہ ہرگز بے خبر نہ تھا۔

یہ ولی کی واقعی خاص عادت تھی کہ وہ صرف ایک نظر میں ایک ہی چیز پر غور کر لیتا تھا۔ کوئی چیز یا منظر اُس کی عام سی نگاہ سے بچ نہ پاتا تھا۔

''وہ، میں .... میں آپ سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔'' ترنم نے کچھ نہ سوجھتے، بہانہ گھڑا۔

''کیا؟ میری پینٹنگز آپ کو بہت پسند آئی ہیں، کیا ان کے متعلق؟'' ولی نے عام سی نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔ اب کے ایک بار پھر ترنم چونکی۔

وہ ہرگز ''بے خبر'' نہ تھا۔ حیرت ہے، پھر بھی یہ۔ مجھے کیوں نہ محسوس ہوا کہ یہ متوجہ ہے۔ ترنم نے حیرت سے پھر سوچا۔

''نہیں.... میں تو صرف یہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ آپ پر جن لوگوں نے حملہ کیا تھا، کیا وہ پکڑ لئے گئے؟''

اس بار چونکنے کی باری ولی کی تھی۔

ولی عام فہم اور یادداشت رکھنے والا لڑکا نہ تھا، بلکہ اُس کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ اُس کے ذہن کے پردے پر وہ اُداس آنکھیں چمکیں۔

''لیکن اگر آپ کچھ دیر وہاں ٹھہرتیں تو میں اپنے محسن کا شکریہ تو ادا کر سکتا۔'' ولی کے سپاٹ چہرے پر بہت نرم سی مسکراہٹ آئی۔ ''میں آپ کا مقروض ہوں۔'' وہ مزید گویا ہوا۔

ترنم اب حیران ہرگز نہ ہوئی تھی۔ بے شک وہ ایک غیر معمولی ذہن کا مالک لڑکا تھا۔ اسی لئے تو اس نے کوئی عام سوال، جیسے ''آپ ہی وہ تھیں، جس نے مجھے بچایا؟ نہ کیا تھا بلکہ پہچان کر بہت شستہ انداز میں شکریہ ادا کیا تھا۔

''میں شکریہ کہنے کی قائل نہیں ہوں۔'' ترنم نے کہا۔ جانے کیوں، اُس کا دل اُس سے بات کرنے کو چاہ رہا تھا، اس لئے اُسے وہ تنگ کرنے کے موڈ میں کھڑی ہوگئی۔

''تو ....تو آپ کے اُس اتنے بڑے اور اچھے عمل کے لئے میں کیسے شکریہ ادا کروں؟'' ولی نے بھی دلچسپی سے پوچھا۔

دور کھڑی مسکان کچھ سن تو نہ پا رہی تھی، لیکن ولی کے چہرے پر پہلی بار کسی لڑکی کے لئے مسکراہٹ، مسکان کو بے چین کر گئی تھی۔

''میرے لئے........ کیا آپ میرے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں؟'' ترنم نے پوچھا۔

''بالکل۔ میں اپنی محسن کا شکریہ عملی یا زبانی جیسے وہ چاہے، ادا کرنا چاہتا ہوں۔ آپ میری اور مجھ سے جڑی زندگیوں کے لئے بہت احسان کر گئی ہیں۔'' ولی دھیمے اور مضبوط لہجے میں گویا ہوا۔

''کیا آپ، میرے لئے دعائے خیر کر سکتے ہیں؟'' ترنم نے کھوئے کھوئے لہجے میں پوچھا۔

''جی........؟'' ولی کو اُس کے انداز اور بات نے چونکا دیا۔

''جی!........ جی ہاں! میں اس رُوئے زمین کی وہ واحد لڑکی ہوں، جس کے لئے کوئی ہاتھ دعا کے لئے نہیں اُٹھتا۔ یہاں تک کہ میری اپنی دعاؤں کے پاؤں ٹوٹے ہیں۔'' ترنم کی آواز رُندھی ہوئی تھی۔

جانے وہ کس کیفیت میں تھی کہ وہ خود نہ جان سکی کہ کیسے ایک لمحے میں وہ ایک اجنبی کے سامنے عیاں ہوگئی۔

''تو کیا آپ، میرے لئے دعائے خیر کریں گے؟'' ترنم نے جھکے سر کو اُٹھایا تو وہاں کا ابر آلود موسم غائب تھا۔ اب وہاں چمکتی دُھوپ جیسی مسکراہٹ تھی۔

''ارے!'' ولی دل ہی دل میں چند پل میں بدل جانے والے موسم پر حیران ہوا۔ ''میرے والد صاحب اکثر ایک شعر پڑھا کرتے تھے، جس کا مطلب ایک حدیث شریف میں ہے'' کہ اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتے، لیکن تمہارے قلوب کو دیکھتے ہیں۔'' یعنی

مابروں راتنگر وقال را
مادروں رانگریم و حال را

''تو مس........!'' ولی نے رک کر سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ترنم۔'' ترنم نے کسی مسمریزم میں جواب دیا۔

''تو ہاں مس ترنم! اصل شے ''قلب ہے۔'' ولی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''میں کہاں انکار کرتی ہوں؟ واقعی، بات ساری اس قلب کی ہے۔ انسان اس قلب کی ہی تو ہوس، سیاہ کاری اور سرکشی تا عمر بھگتا کرتا ہے۔ میں کہاں انکار کرتی ہوں۔'' ترنم کہہ کر رکی نہیں اور ولی حیران نظروں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

پہلے اُس کی نظروں میں حیرانی تھی، پھر ایک دم بڑی جاندار مسکراہٹ اُس کے لبوں پر آن ٹھہری۔

''کچھ خاص اور بالکل انوکھا ہے اس لڑکی میں ....واقعی بات ہے اس لڑکی میں!'' ولی ایک بار پھر مسکرایا۔

دور کھڑی مسکان، ولی کے چہرے کو کسی اہم کتاب کی طرح پڑھتی جزی طرح چونکی تھی۔

اُس کا دل بے اختیار ڈوبا تھا۔

ولی کو پہلی بار کسی لڑکی کے لئے یوں مسکراتے دیکھا تھا۔

مسکان کو وہاں کھڑا رہنا دوبھر لگا۔ اُس نے سائرہ کا ہاتھ بہت مضبوطی سے تھام لیا۔

''آر یو آل رائٹ؟'' سائرہ نے فکرمندی سے پوچھا۔

''یس!'' مسکان نے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

لیکن وہ اپنے دل کا کیا کرتی جو'نو، نو' کی آوازیں لگاتا نیچے، اور نیچے ڈوبا جا رہا تھا۔

❖❖○❖❖

مسکان! تمہیں پتہ ہے، پرسوں جو اسائنمنٹ جمع کروائی تھی، اُس کے نمبرز کی لسٹ لگ گئی ہے۔" سائرہ تیزی سے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ "ارے، تمہیں پتہ ہے، کدھر لگی ہے؟" سائرہ نے پوچھا۔ کیونکہ وہ خود تو آج کل Sculpture کی ورکشاپ لے رہی تھی۔ شاید ابھی ابھی وہ کالج آئی تھی۔

"نہیں......" مسکان کھوئے کھوئے انداز میں بیٹھی پنسل پکڑے اسکیچ بک پر آڑی ترچھی لائنز لگا رہی تھی۔

"نہیں؟......لیکن کیوں نہیں جانتی تم؟ ....تم تو صبح سے کالج آئی بیٹھی ہو، پھر لسٹ دیکھنے کیوں نہ گئیں؟" سائرہ باقاعدہ اُس سے پوچھ گچھ کرنے لگی۔

"بس، دھیان نہیں گیا اور پتہ بھی نہیں چلا۔" مسکان نے لاپروائی دکھائی۔

"اور منی ایچر کی کلاس لی تم نے؟......سر نے ٹریسینگ پاس کر دی تمہاری؟" سائرہ نے اکٹھے دو سوال کیئے۔

"نہیں۔" مسکان کی طرف سے کورا جواب آیا۔

"نہیں؟ لیکن کیوں؟" سائرہ نے بے حد پریشانی سے پوچھا۔ مسکان بہت لائق اور محنتی لڑکی تھی۔ اُس کی اس قدر بے پروائی اُسے کلاس میں نمبرز میں نیچے لاسکتی تھی۔ یہاں تو ہر اسائنمنٹ کے بعد فیصلہ ہو جاتا تھا، کون کتنے پانی میں ہے۔

"پلیز! کچھ تو بولو۔" سائرہ نے اسے پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔

ہر روز سفر کرتی ہوں میں دیکھ کے اُس کو
وہ شام کا تارا مجھے بھٹکائے بہت ہے

"مسکان!" سائرہ کی آنکھیں دُکھ سے پھیل گئیں۔ "میری جان! یہ تم نے کیا روگ پال لیا ہے؟ وہ تمہاری اس شدت سے بے خبر ہے اور تم اس شدت میں خود کو جلا رہی ہو۔ پلیز! تم اپنے آپ کو سنبھالو۔" سائرہ نے اس کے کندھوں پر اپنا بازو حمائل کرتے ہوئے کہا۔

"سائرہ! میں کیسے اپنے آپ کو سنبھالوں؟ جب جب کسی چیز کا سہارا لے کر خود کو بہلا کر کھڑی ہوتی ہوں، میرا دل مجھے پھر اسی کی جانب دھکیلتا ہے...... یہ لمحے، یہ دن بس یوں ہی لڑھکتے، بھٹکتے گزر رہے ہیں اور وہ پتھر، بے خبر ہے۔ اُس کی بے خبری میری موت کی خبر ہوتی جا رہی ہے۔" مسکان کا ضبط چھوٹ گیا تھا۔ وہ باقاعدہ رونے لگی۔

سائرہ نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ شکر تھا، ابھی جو دو اسٹوڈنٹس اپنا لاکر کھولے سامان نکال رہے تھے، باہر جا چکے تھے اور کمرہ خالی تھا۔

"پلیز مسکان! ایسے نہ کرو۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔" سائرہ نے مسکان کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"پھر ....پھر کیا کروں میں؟ وہ مجھے ہمیشہ اگنور کر دیتا ہے۔" مسکان نے بے بسی سے پوچھا۔

"آخر ایسی کیا بات ہوئی، جو تم اپنے ضبط کا دامن چھوڑ بیٹھی ہو؟" سائرہ نے پوچھا۔

"میں گرافک اسٹوڈیو گئی تھی۔ وہاں وہ پہلے سے موجود اپنی پلیٹ کی ایچنگ کر رہا تھا۔ میں نے جا کر اُس سے ہائے، ہیلو کی اور اُس کے کام کی تعریف بھی کی۔ میں ...... میں صرف اُس سے بات کرنا اور مزید ملنے کا بہانہ چاہتی تھی۔ لیکن وہ کس مٹی کا بنا ہے؟........ اتنا سپاٹ، میری باتوں کا ٹو دا پوائنٹ جواب دے کر اپنے کام میں اس طرح سے مگن ہوا کہ جیسے میں وہاں تھی ہی نہیں۔" مسکان کے رونے میں تیزی آ گئی تھی۔

"میری شخصیت اس طرح اگنور کرنے والی تو ہرگز نہیں ہے۔ کالج کے کتنے ہی لڑکے میرے اسٹیٹس، میری ذہانت اور میری خوب صورتی کی وجہ سے توجہ مانگتے ہیں۔ لیکن وہ ولی اتنا پوز کیوں کرتا ہے؟........ اُس دن گیلری میں کیسے اُس سبز آنکھوں والی لڑکی سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہا تھا۔" مسکان کے لہجے میں جلن کی بُو تھی۔

"دیکھو مسکان! یہ ون سائیڈ محبت، بڑا خوار کرتی ہے۔ میرا خیال ہے، تم حقیقت پسند بنو اور اُس کی جان چھوڑ دو۔" سائرہ نے اُسے مخلصانہ مشورہ دیا۔

"نہیں، یہ ممکن نہیں ہے۔ میں اپنے آپ کو بہت بے بس پاتی ہوں۔" سائرہ کے اتنا سمجھانے کے باوجود مسکان کا جواب بہت ہوپ لیس تھا۔

"تو پھر کیا ممکن ہے؟" سائرہ نے زِچ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے اپنی محبت پر یقین ہے، وہ بے ثمر نہیں رہے گی۔" مسکان کی آنکھوں میں بہت عجیب سی چمک تھی، جیسے اُسے کوئی راستہ سوجھ گیا ہو۔

❖❖○❖❖

"میرا خیال ہے کہ میرا چہرہ بہت فوٹو جینک ہے۔" ماہ رخ نے آئینہ کے آگے کھڑے ہو کر کہا۔

"یہ خیال اچانک کیسے تشریف لایا؟" ترنم نے اپنی کتابوں کو سمیٹ کر رکھتے ہوئے پوچھا

"وہ کالج کا فوٹو گرافر ہے ناں، ماجد۔ اُس نے کہا ہے۔" ماہ رخ نے جواب دیا۔

"تم تو جانتی ہو، اندر کی بات۔ وہ فوٹو گرافر کم، بلیک میلر زیادہ ہے۔ معصوم، شریف لڑکیوں کی مینا بازار میں تصویریں اُتار کر اُن کی تصویریں کیسے کیسے استعمال کرتا ہے۔" ترنم نے دُکھ اور غصے سے کہا۔

وہ جس جگہ موجود تھیں، وہ جگہ ہر کرپٹ آدمی کی راہ گزر تھی۔ اس لئے اُنہیں دو نمبر آدمیوں کی ہر پل خبر رہتی تھی۔

"تم میری جان! یہ کیسے بھول جاتی ہو کہ ہم شریف لڑکیاں نہیں ہیں۔" ماہ رخ نے اُس کا مذاق اُڑایا۔ "اور جس چیز کا خطرہ ان شریف چوزیوں (کالج کی ڈری سہمی لڑکیوں کو ماہ رخ ایسے ہی بلاتی تھی) کو ہوتا ہے، وہ ہمیں نہیں ہو سکتا........ بھئی، یہ تو ہمارا فیملی بزنس ہے۔" ماہ رخ اپنی ایک آنکھ دبا کر ہنسی۔

"پھر ہم تو........"

"پلیز! چپ ہو جاؤ۔" ترنم نے ماہ رخ کا جملہ کاٹ کر کہا۔ "میں، تم میں سے نہ تھی۔" اُس کی آواز کسی گہری کھائی سے آئی تھی۔

''تم چاہے مانو یا نہ مانو، لیکن اب تم ہم میں سے ہی ہو۔ اور تم کبھی اپنے آپ کو اس زندگی اور ہم سے الگ نہیں کر پاؤ گی۔'' ماہ رخ نے غصے سے کہا۔

ترنم کا سارا وجود لرز رہا تھا۔ اُس نے فوراً پانی کا گلاس چڑھایا۔

''سوری ترنم! میں، تم کو ہرٹ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن تم ہر وقت ان شریف زادیوں کے غم اور طرف داری میں مبتلا نہ رہا کرو۔'' ماہ رخ نے اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''میں بولتا ہوں ، مجھ پر الزام ہے بغاوت کا
میں چپ رہوں تو بڑی بے بسی سی ہوتی ہے''

ترنم نے افسردگی سے کہہ کر اپنا ہاتھ چھڑایا اور بیڈ سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندھ لیں۔

''ترنم! سوری۔'' ماہ رخ بولی۔

''پلیز ماہ رخ! میری طبیعت بہتر نہیں ہے۔ تم کچھ دیر مجھے اکیلا چھوڑ دو۔'' ترنم کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔

''اوکے......'' ماہ رخ نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ترنم کو پھر پچھتاوے کا دورہ پڑا تھا۔

❖❖○❖❖

''چاندنی بائی! تم کیوں مائنڈ کرتی ہو؟'' ماجد نے شرارت سے پھر اُس کی چڑ ''بائی'' ساتھ لگا کر کہا۔

''دیکھو لڑکے! خبردار جو مجھے یوں بلایا۔ میڈم چاندنی بولا کرو۔'' چاندنی بائی آج کل کانشس ہو گئی تھی۔ اب اپنے ساتھ وہ بائی کے بجائے ''میڈم'' لگا کر خوش ہوتی تھی۔ میڈم چاندنی کے تیور بگڑتے دیکھ کر ماجد نے بات پلٹی۔

''اوکے میڈم! آئندہ غلطی نہ ہو گی۔''

''ٹھیک ہے، لاؤ تصویریں۔ ماہی بتا رہی تھی کہ کئی لڑکیاں چھوٹے شہروں اور گاؤں سے پڑھنے آئی ہیں اور ہاسٹل میں ہیں۔ ہمارے لئے خوش آئند بات یہ ہے کہ وہ شہر کی آب و ہوا دیکھ کر آپے سے باہر ہو گئی ہیں۔ فیشن اور ہاسٹل کی آزادی نے اُن کو اپنے راستے سے ہٹا دیا ہے۔ اب بھٹکانا ہمارا کام ہے۔''

وہ بڑا مکروہ قہقہہ لگا کر ہنسی۔

''اچھے سے، خوب صورت لڑکے کھڑے کرو کالج کے باہر۔ گاڑی وغیرہ بھی مل جائے گی۔'' میڈم چاندنی نے مزید حکم دیا۔

''لیکن میڈم! کالج کا چوکیدار ذرا سخت ہے۔ بہت پوچھتا ہے کہ یہاں کیوں کھڑے ہو؟ میری بات ذرا الگ ہے۔ میں تو اُن کے کالج کے فنکشن میں تصویریں اُتارتا ہوں، اس لئے میرے آنے جانے پر پابندی نہیں ہے۔'' ماجد نے اپنی پرابلم بتائی۔

''چھوٹی عقل کی بڑی پریشانیاں!'' میڈم چاندنی نے طنز کیا۔ ''ارے کہہ دیں کہ اپنی بہنوں کو پک کرنے آتے ہیں۔ دکھانے کو ماہی یا ترنم کو بھی کبھار برقع چادر اوڑھ کر اُن کے ساتھ آ جائیں گی...... ویسے اس سال اکٹھی چھ لڑکیاں میں کالج میں داخل کروانے والی ہوں۔ اسی طرح تو ہمارا کام بڑھے گا میڈم چاندنی مسکرائی۔ ''کون سا کسی کی ماں نے آ کر اپنی بچیوں کی خبر لینی ہوتی ہے۔''

اُس کی مسکراہٹ نہایت خطرناک تھی۔

جانے کتنی ہی لڑکیاں اور گھر اُس کے ہاتھوں برباد ہوئے تھے۔ صرف اور صرف بے خبر ماؤں کی وجہ سے۔

❖❖○❖❖

''پورے قد سے جو کھڑا ہوں تو یہ بڑا ہے کرم
مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا
دست گیری میری تنہائی میں تُو نے ہی تو کی
میں تو مر جاتا اگر ساتھ نہ ہوتا تیرا''

بابا جی کی شیریں آواز کسی جادو کی طرح دونوں کو جکڑے کھڑی تھی۔ بابا جی جانماز بچھائے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے، دھیرے دھیرے بولتے کتنی ہی دیر سے مگن بیٹھے تھے۔

احمد شاہ اور روشن آرا احترام سے دروازے کے پاس چپکے کھڑے تھے۔

''السلام علیکم، احمد شاہ!'' بابا جی نے مڑے بغیر کہا۔

''وعلیکم السلام! لیکن آپ کو کیسے خبر ہوئی؟'' احمد شاہ نے حیرانی سے پوچھا۔

بابا جی بس دھیرے سے مسکرائے تھے۔

''اس نیک بخت کو بٹھاؤ، احمد شاہ! یہ ہمارے لئے بہت اہم مقام رکھتی ہے۔'' بابا جی نے چٹائی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

اس چھوٹے سے کمرے میں کوئی کرسی، موڑھا وغیرہ کچھ بھی نہ تھا۔ لیکن روشن آرا کو وہ اپنی جگہ پھر بھی بجی سی لگی تھی۔ اللہ کے پیارے بندے سے بجی ہوئی۔

''آؤ، پیاری بیٹی!'' بابا جی نے روشن آرا کے احترام میں کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''پلیز بابا صاحب! آپ شرمندہ نہ کیا کریں۔'' روشن آرا نے شرمندگی سے کہا۔ بابا جی کا یوں اُن کو پروٹوکول دینا۔ وہ اکثر شرمندہ ہو جاتی تھیں۔

''نہ پیاری بیٹی! تم کو ہم کیسے شرمندہ کر سکتے ہیں؟ تم نے تو وہ کام کیا ہے جو ''تمہارا اصل'' ہے۔ اپنے ''اصل'' کا حق ادا کیا۔ تم تو بہت اہم ہو، اُس رحمٰن کریم کی نظر میں۔ پھر ہم کون ہوتے ہیں کہ تمہارے شایانِ شان سلوک نہ کریں۔'' وہ دھیمے دھیمے اور رُک رُک کر بولے۔

''بابا جی! گاؤں کے بچے کیوں پڑھانا کم کر دیئے؟'' احمد شاہ ابھی جو خبر سن کر آ رہے تھے، سوال کر اُٹھے۔

''بس بیٹا! بڑھاپا مجھے اتنا دور چلنے سے معذور کر دیتا ہے۔'' انہوں نے مزید دھیمی آواز میں جواب دیا۔

''تو پھر آپ گاؤں کے بچوں کو یہاں، اپنے پاس بلا کر پڑھا دیا کریں۔ یہ سب کا اصرار بھی ہے۔'' احمد شاہ نے کہا۔

''نہ بیٹا جی! میں کیسے یہ بے ادبی کر سکتا ہوں؟ میں اہم نہیں ہوں، جو خلق خدا کو تنگ کر کے یہاں،

اتنی دور بلاؤں۔ بس، جب تک خود میں ہمت تھی تو میں خود جایا کرتا تھا۔ اب ہمت بے وفائی کرتی ہے۔ میں ان بچوں کو اس جنگل سناٹے میں بلانے کے حق میں نہیں ہوں۔'' وہ مزید گویا ہوئے۔

''لیکن گاؤں والے اپنی 'لڑکیوں اور بچوں' کے معاملے میں آپ کے سوا کسی پر بھروسہ نہیں کرتے اور انہوں نے مجھے سفارش کے لئے مجبور کیا ہے۔'' احمد شاہ نے کہا۔

''اُن کے لئے اللہ تعالیٰ جلد کسی اُستانی کا بندوبست کر دیں گے۔ ویسے میری ایک دو شاگردہ کچھ نہ کچھ بوجھ اُٹھا رہی ہیں۔'' بابا جی نے تسلی کے انداز میں بتایا۔

''بابا جی! پھر بھی اُن کو کوئی تسلی ضرور دیں۔ ویسے ہی کچھ ان کی بے چینی ختم کرنے کے لئے وعدہ کر لیں کہ کچھ عرصے بعد آپ پھر سے پڑھانا شروع کر دیں گے۔'' احمد شاہ نے پھر سفارش کی تھی۔ جس طرح رحیم خان اور کچھ لوگوں نے ان سے اصرار کیا تھا کہ بابا جی راضی ہو جائیں، احمد شاہ بھی بابا جی سے اصرار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

(''اللہ کے نزدیک یہ بڑی بیزاری کی بات ہے کہ تم وہ بات کہو جس کے مطابق عمل نہ کرو'')

بابا جی نے نظریں جھکائے جھکائے ایک آیت پڑھی تھی۔

''پیارے بیٹے! اس آیت میں وعدہ اور قول دونوں کی طرف اشارہ ہے۔ وعدہ اور قول کہہ کر پورے نہ کئے جائیں تو وہ رحمٰن کریم پسند نہیں کرتا ہے۔''

''میں معافی چاہتا ہوں، بابا جی! بس اُن کے چھوٹے ہوتے دلوں نے مجھے ایسا کہنے پر مجبور کیا تھا۔ میں ایک بار پھر معافی چاہوں گا۔'' احمد شاہ میں یہ بہت پیاری ادا تھی کہ وہ بہت جلد غلط کو غلط مان لیتے تھے۔ ہٹ دھرمی سے غلط پر جمے بیٹھے نہ رہتے تھے۔

بابا جی نے مسکراتے ہوئے تسبیح کے دانے گرائے تھے۔ ''احمد شاہ! تمہارا ماننے والا عمل اگر مجھ جیسے بندے کو اتنا خوش کر دیتا ہے تو اللہ رحمٰن کی نظر میں کس قدر دل پسند ہو گا، جانتے ہو؟'' بابا جی کی نظریں ابھی بھی جھکی ہی ہوئی تھیں۔

''آپ بس میرے لئے اور میرے خاندان کے لئے دعائے خیر کرتے رہا کریں۔ ہمیں آپ کی دعاؤں سے بہت ڈھال رہتی ہے۔'' احمد شاہ نے محبت سے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ ''آپ کے پاس آ کر، آپ سے دعائیں لے کر ہمیں اپنے والدین کی کمی کا احساس کچھ کم ہو جاتا ہے۔'' وہ مزید گویا ہوئے۔

''احمد شاہ! تم نے ولی اور نگینہ کے لئے ہم سے کہا تھا۔ ہم اُن سے ملنے کو بے چین ہیں۔ چھ سال ہو گئے اُن سے ملے ہوئے۔ پہلے ہم میں ہمت تھی اور صحت تھی، لمبا سفر کر کے اُن کو مل آتے تھے۔ اب تم اُن سے ملاقات کرا دو گے تو ہم تمہارے بہت شکر گزار ہوں گے۔'' بابا جی کی آواز میں عاجزی اور تڑپ دونوں بہت نمایاں تھیں۔

''کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟ اُن کے معاملے میں تو ہم دونوں آپ کے مشکور ہیں کہ آپ نے ہمارے سُونے، تڑپتے دلوں کو زندگی دی۔ میں ان شاء اللہ، بہت جلد ان دونوں کو لاؤں گا۔'' احمد شاہ نے وعدہ کیا۔

''میں منتظر رہوں گا۔'' بابا جی نے کہا۔

اور وہاں سے گزرتی ہوا نے سرگوشی کی تھی۔

''سنو اے زمین! تم پر جن کا حق اور خون باقی ہے، وہ جلد آئیں گے۔ تم اُن کو مایوس نہ کرنا۔ اس مٹی میں اُن کی جڑیں ہیں........ وہ آئیں گے۔''

''میں منتظر رہوں گی۔'' زمین نے پلٹ کر جواب دیا۔ ''میں بہت برسوں سے منتظر ہوں۔ کیونکہ میں کسی کا حق اپنے پاس نہیں رکھتی!!''

❖❖○❖❖

''ہم مومن بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ مومن ہونا اور مسلمان ہونا اس طرح نہیں ہے کہ جیسے کوئی آدمی چینی یا جاپانی یا گورا یا کالا ہوتا ہے کہ جیسا بھی ہو، وہ چینی اور جاپانی ہی رہتا ہے، یا کالا اور گورا ہی رہتا ہے۔'' بابا جی سانس لینے کو رُکے۔

''تم سب نے برسوں مجھ سے قرآن پاک کی تعلیم لی ہے۔ تم لڑکیوں کو خاص طور پر میرا پڑھانے کا مقصد تھا کہ ایک لڑکی، ایک پورے خاندان کے لئے فلاح کا راستہ ہو........ اب تم کو اپنا آپ مسلمان ثابت کرنا ہے، تا عمر!........ صرف مسلمان پیدا ہونے سے انسان مسلمان نہیں رہتا۔ بلکہ ہمارے لئے اللہ پر ایمان بھی ہونا چاہئے۔ مسلمان کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے اللہ کی غلامی اختیار کر لی۔ اللہ نے ہمیں اپنا ملازم بنا لیا اور ہمیں غلامی اور ملازمت کے فرائض انجام دینے ہیں۔''

بابا جی ایک بار پھر سانس لینے کو رُکے۔

''بہ حیثیت استاد، میں حرفِ آخر نہیں ہوں۔ تم سب کی سب اپنے اندر کی اچھائی اور علم کو آگے بڑھاؤ........ تم، زینب بی بی! بیاہ کر دوسرے گاؤں جاؤ گی۔ تم وہاں پر تعلیم دو تو وہاں پر دائرہ بڑھے گا۔ اس طرح گاؤں کی باقی چھوٹی بچیوں اور بچوں کے لئے تم سب مل کر کچھ کرو۔ اللہ تعالیٰ برکت دیں گے۔ یوں گھبرا جانا، دل چھوٹا کرنا اچھی بات نہیں ہے۔'' بابا جی نے گاؤں سے آئی اپنی شاگردوں اور کچھ بزرگ لوگوں کو سمجھایا۔

''لیکن بابا جی! آپ کی طرح ہماری باتوں میں تاثیر کہاں سے آئے گی؟'' رضیہ نے آگے بڑھ کر کہا۔

''تاثیر عمل سے آتی ہے۔ تم اللہ کی بات پر عمل کرو۔ تمہارے کہے میں اور بولنے، کرنے میں برکت اور تاثیر آئے گی۔'' بابا جی نے اسے سمجھایا۔

''لیکن بابا جی........!'' رحیم خان، جو کہ کچھ دن کی چھٹی پر آیا تھا، کچھ کہنے لگا تو بابا جی نے مسکراتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔

''بس، تم وہ کرو جو اللہ رحمٰن کہتے ہیں۔

(اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، رکوع اور سجدہ کرو، اپنے رب کی بندگی کرو اور نیک کام کرو۔ اسی سے توقع کی جا سکتی ہے کہ تم کو فلاح نصیب ہو)

اس میں ہمارے آقا نے چار باتیں کہی ہیں۔ ان کو مانتے جاؤ، تم لوگ۔ پہلی بات رکوع و سجدہ سے

متعلق ہے۔ رکوع کے معنی ہیں، خدا کے آگے جھک جانا اور سجدے کے معنی نماز میں پیشانی اللہ کے آگے ٹیک دینا۔“

وہ پھر سانس لینے کو رکے۔

”اس کے علاوہ ہر بات میں بھی اپنا آپ اُس بڑی ذات کے آگے جھکا دو۔ فلاح تم کو خود سے نصیب ہو جائے گی........ میں مسجد اور مدرسے سے الگ نہیں ہوا۔ بس، میں چاہتا ہوں کہ نئی نسل اپنا کام سنبھال لے۔“ انہوں نے تحمل اور نرمی سے اپنی بات کو سمجھایا۔

اور جب سات آٹھ لڑکیوں، عورتوں اور بارہ مردوں کا قافلہ اونچائی اُتر کر گاؤں کی طرف مڑ رہا تھا، اُن کے دلوں میں اِک نئی روشنی تھی۔ کچھ دن پہلے بابا جی کی مدرسے اور مسجد میں غیر حاضری سے جو بے چینی اُن کے دلوں میں آن بسی تھی، اب رخصت ہو چکی تھی۔

”اللہ اکبر........ اللہ اکبر........“ عصر کی اذان عبداللہ نے دی تھی، جو بہ مشکل چوبیس سال کا تھا اور جو کچھ دن سے بابا جی کے کہنے پر اذان دینے لگا تھا۔ لیکن سب ناراض تھے۔ لیکن آج سب کے قدم تیزی سے مسجد کی طرف بڑھے تھے۔ کیونکہ بابا جی نے اُن کو سمجھا دیا تھا کہ ”دین کے لئے عمر کا زیادہ ہونا ضروری نہیں، اچھے عمل کا زیادہ ہونا ضروری ہے۔“

❖❖O❖❖

”عبدالولی........ یہ کون ہے؟“ مسکان کے بابا سائیں نے ماتھے پر بل ڈال کر مسکان کے گارڈ سے پوچھا۔

”سائیں! یہ لڑکا وہاں کالج میں پڑھتا ہے۔ بی بی کی باتوں میں اپنی سہیلیوں سے اُس کا اکثر ذکر آتا ہے۔ غلام نبی نے دھیمی آواز میں بتایا۔ اُس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

مسکان اپنی اتنی کڑی نگرانی کے متعلق نہ جانتی تھی۔ وہ خود بے خبر تھی۔

”کیا اُن میں دوستی ہے؟“ بابا سائیں کڑے تیوروں سے پوچھ رہے تھے۔

”نہیں سائیں! دوستی ابھی نہیں ہوئی۔ بس اُس لڑکے کا ذکر زیادہ ہوتا ہے۔“ غلام نبی نے سچائی سے بتایا۔

”ہوں!“ انہوں نے پُرسوچ ہنکارا بھرا۔ ”تم جا سکتے ہو۔“ انہوں نے اسے واپس کیا۔

عبدالولی........ یہ نام کتنا شناسا ہے! کس کا تھا؟........ اب وہ کچھ اور سوچ رہے تھے۔

❖❖O❖❖

پنک کلر کا مختصر سا ٹاپ اور لانگ اسکرٹ، شرٹ نیوی بلیو کلر کی تھی۔ میڈم چاندنی نے یہ ڈریس خاص طور پر ترنم کو بھجوایا تھا۔ آج بڑی خاص پارٹی کو گھیرنا تھا۔ پچھلے پندرہ دن سے ترنم فارغ تھی۔ ایک دم ڈیوٹی لسٹ میں اپنا نام دیکھ کر اُسے پھر ہمیشہ والی بے چینی نے آن گھیرا۔

”تم نے ڈیوٹی لسٹ میں اپنا نام دیکھ لیا تھا تو پارلر جا کر ویکس وغیرہ کیوں نہیں کروایا؟“ میڈم چاندنی اس کے سر پر کھڑی چلا رہی تھی۔ کام کے معاملے میں وہ کسی کو ڈھیل نہ دیا کرتی تھی۔

”وہ........ وہ، میری کچھ طبیعت خراب تھی۔“ ترنم نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

آج اُس کا روزہ تھا۔ وہ شعبان کے سارے روزے رکھ رہی تھی۔ اُسے یاد پڑتا تھا کہ اماں ہمیشہ اس مہینے کے روزے، بہت اہتمام سے رکھتی تھیں۔

”آپ ﷺ ہمیشہ اس مہینے میں زیادہ سے زیادہ روزے رکھتے تھے۔ اس مہینے عمر کے پتے جھڑتے ہیں اور ہمارے پیارے نبی ﷺ کا فرمان ہے کہ وہ اس لئے اس مہینے زیادہ تر روزے سے ہوتے ہیں تاکہ اگر موت کا فرشتہ آئے تو وہ اپنے اللہ کے سامنے روزے کی حالت سے ہوں۔“

اماں، سادہ سی، کم پڑھی عورت تھیں۔ لیکن وہ اپنے مذہب سے بہت لگاؤ رکھتی تھیں۔ ایمان فاطمہ (ترنم) کو بھی زیادہ سے زیادہ اچھی بات اور عمل کی طرف کھینچتی تھیں۔

آہ! لیکن وہ کیسے ہمیشہ کے لئے اپنے ایک قدم سے ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ ہو گئی تھی۔ اور اب وہ اپنے محور سے باہر ہاتھ پاؤں مارتے اِدھر اُدھر لڑھک رہی تھی تو کوئی عبادت، کوئی دعا کسی بھی ٹِک کی طرح کام نہ کرتی کہ اُسے دوبارہ محور میں پہنچا دے۔

وہ نافرمان تھی اور اپنے کئے کی سزا بھگت رہی تھی۔

”ترنم!“ میڈم چاندنی کی آواز میں نہایت سختی تھی۔ ترنم کی خود سے اور کام سے لاپروائی اُسے بہت دن سے نظر آ رہی تھی اور یہ وہ کسی طور پر معاف کرنے کو تیار نہ تھی۔

”اگر تمہارا حال یوں ہی رہا تو پھر سزا کے طور پر جان کے حوالے کر دوں گی، تمہیں۔ وہ تمہیں رستے پہ لے آئے گا۔“ میڈم چاندنی کی دھمکی نہ صرف خوف ناک تھی، بلکہ کارگر بھی تھی۔

ڈیوڈ جان، اُس کا وحشی گندا سا کارندہ تھا۔ جو لڑکی اُس کے حوالے کی جاتی، اُس کے جسم کی بوٹی بوٹی نوچتا تھا۔ دن رات بستر پر رکھتا تھا۔ روح اور جسم گھائل کر کے رکھ دیتا کہ دنوں کوئی لڑکی بغاوت کا نہ سوچتی تھی۔ اس لئے جب جان کے حوالے کوئی لڑکی سات دن کے لئے کی جاتی، وہ تیسرے چوتھے دن ہر کام کے لئے راضی ہو جاتی تھی۔ کوئی بھی لڑکی اُس خبیث سانڈ کے ساتھ گزارا نہ کر پاتی تھی۔ میڈم چاندنی نے اس طرح کے وحشی نما سانڈ کئی پال رکھے تھے۔

”نہ........ نہیں میڈم! میں معافی چاہتی ہوں، اگر........ اگر کوئی شکایت ہو۔“ ترنم نے اپنا حلق تھوک سے تر کرتے ہوئے کہا۔ بہرحال وہ جان کو کسی طور پر جھیل نہیں سکتی تھی، جو چار آدمیوں کے برابر بداسلوک کرتا تھا۔

میڈم چاندنی کے چہرے پر بہت مکروہ مسکراہٹ در آئی۔

”گڈ! مجھے تمہاری سمجھ داری سے یہ ہی اُمید تھی........ چلو اُٹھو! پارلر جاؤ اور رات گیارہ بجے کلائنٹ کے ساتھ تمہاری اپائنٹ منٹ، پی سی میں ہے۔ رُوم نمبر سولہ میں۔ اور ہاں........“ وہ جاتے جاتے پلٹی۔

”جمی نے تمہاری شکایت کی تھی کہ تم اپنا ورک آؤٹ پورا نہیں کرتیں۔ ایروبکس کی کلاس سے جلدی نکل جاتی ہو۔ آئندہ مجھے ان بے پروائیوں کی خبر نہ ملے۔“ میڈم چاندنی نے انگلی اُٹھا کر تنبیہہ کی تھی۔

اور ترنم نے مرے مرے انداز میں اثبات میں سر ہلایا تھا۔

اُن کے کمرے سے نکلتے ہی ترنم بستر پر ڈھیر ہو گئی۔

آہ! یہ میری سزائے زندگی کب ختم ہو گی؟........ میں، خوابوں کے پیچھے بھاگتی بھاگتی کن ننگی حقیقتوں

کے بیچ آن کھڑی ہوئی! جہاں میری روح، جسم دونوں روز روز بے لباس ہوتے ہیں ......اور جہاں دل برباد ہوتا ہے!

❖❖○❖❖

سفر آسان لگتا تھا
دلِ برباد تجھ کو یہ سفر آسان لگتا تھا
اِدھر تُو سوچتا تھا اور اُدھر
آنکھوں سے کوئی خواب چہرہ آن لگتا تھا
مگر خوابوں میں رہنا
خواب جیسی بے حقیقت خوشبوئے صحرا میں رہنا ہے
کناروں سے جو ہو محروم
اس دریا میں رہتا ہے
دلِ برباد ہم نے تو کہا تھا
یہ سفر آسان لگتا ہے
مگر!
مگر آنکھیں بدن سے چھین لیتا ہے!

آہ......! دو آنسو لڑھک کر اُس کی آنکھوں سے اُس کے خوب صورت چہرے پر آن ٹھہرے۔
جیسے کوئی دعا منظوری اور نامنظوری کے بیچ میں آ کر کچھ پل کو ٹھہرتی ہے۔
جانے اُس کے یہ آنسو کب منظور ہونے تھے۔

❖❖○❖❖

''آخر کیا ہوا اُسے جو اتنے روز سے وہ کالج نہیں جا رہی؟'' مسکان کے بابا سائیں نے مسکان کی آیا اماں سے پوچھا۔

''سائیں! بی بی کھوئی کھوئی رہتی ہے۔ نہ کھاتی ہے، نہ پیتی ہے۔ اب تو کچھ روز سے بخار بھی مسلسل ہے۔ دوا کھانے میں بھی ضد کرتی ہے۔'' آیا اماں نے باقاعدہ شکایت لگاتے ہوئے کہا۔

''تم میری اُس سے بات کراؤ۔'' اُس کے لہجے میں بے انتہا پریشانی تھی۔

''جی بابا سائیں!'' مسکان کی تھکی تھکی آواز فون پر سنائی دی۔

''کیوں ستاتی ہو؟ اپنا خیال کیوں نہیں کرتیں؟'' مسکان کے بابا، جو اپنے علاقے میں بہت مشہور تھے، اپنی اولاد کے لئے تڑپ اُٹھے تھے۔

''نہیں، بابا سائیں! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں ٹھیک ہوں۔'' مسکان کی آواز میں کچھ ایسا ضرور تھا، جس پر وہ مزید بے چین ہو گئے تھے۔

''دیکھو مسکان! تم میں اور بلال میں میری جان اٹکی رہتی ہے۔ بلال کو لے کر میں پہلے سے ہی بہت پریشان رہتا ہوں۔ (بلال کو بچپن سے ہی عجیب سی بیماری تھی۔ وہ اکثر اپنے سارے بدن کو جلتا محسوس کرتا۔ اس دورے کے دوران وہ پاگلوں کی طرح اپنے کپڑے پھاڑ دیتا۔ لیکن اُس کے بدن کی جلن تب ختم نہ ہوتی جب تک وہ تڑپ تڑپ کر بے ہوش نہ ہو جاتا) ایسے میں تمہاری طرف سے خیریت کی خبر نہیں آئے گی تو تم اپنے بابا کو بہت پریشان کرو گی۔'' وہ دکھ سے بولے۔

''نہیں بابا سائیں! میں وعدہ کرتی ہوں کہ اپنا خیال رکھوں گی۔'' مسکان نے اُن کی پریشانی کا خیال کرتے ہوئے وعدہ کیا۔

''اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتاؤ!'' وہ مزید گویا ہوئے۔

''نہیں، تھینک یو پاپا! کبھی ضرورت ہوئی تو آپ کو ہی بتاؤں گی۔'' مسکان کے چہرے پر بھولی بھٹکی مسکان آئی تھی۔ ''یو آر بیسٹ ان دی ورلڈ، بابا!'' مسکان نے واپس اپنے پرانے موڈ میں کہا۔

بابا سائیں کے دل پر جو بوجھ کچھ دیر پہلے آن ٹھہرا تھا، اُس کے لہجے سے ایک دم سرک گیا تھا۔

''یس، آئی ایم۔'' اُن کا قہقہہ فون پر سنائی دیا۔

اور یہ صرف اُن کا اپنا دل جانتا تھا کہ اُن کا قہقہہ کس قدر بے جان اور کھوکھلا تھا۔

❖❖○❖❖

''ارے! گاڑی بدل لی تم نے۔ اُس نئی ''ہنڈا'' کا کیا بنا؟'' سائرہ نے ڈرائنگ بورڈ اور اپنا بیگ لیتے ہوئے پوچھا۔ ''مجھے تو معلوم ہی نہیں ہونا تھا، اگر وہ تمہارا ڈراؤنا سا ٹریڈ مارک (ڈرائیور) اس گاڑی میں نظر نہ آتا۔'' سائرہ نے حسبِ عادت اُس کے ڈرائیور سے چڑتے ہوئے اس کا مذاق اُڑایا۔

''بدلی تو نہیں۔ لیکن یہ نیا ماڈل، بابا سائیں نے گفٹ کیا ہے۔'' مسکان نے بے پروا انداز میں جواب دیا۔

''کیوں؟'' سائرہ نے پوچھا۔ ''اوہ مائی گاڈ!........ سوری یار! میں بھول گئی، آج تمہارا برتھ ڈے ہے۔'' سائرہ نے خود ہی یاد کرتے ہوئے سر پر ہاتھ مارا تھا۔ ''سوری یار! ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔''

''رہنے دو۔ تم کو یاد نہیں تھا تو زبردستی کی یہ وِش مجھے نہیں چاہئے۔'' مسکان نے منہ بنا کر اپنا رخ بدل لیا۔

''ارے، تم خفا ہو گئیں؟ واقعی یار، میں بھول گئی تھی، تمہاری برتھ ڈے۔ کیونکہ میں کہیں اور مصروف تھی۔'' سائرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کہاں؟'' مسکان نے رُوٹھے رُوٹھے لہجے میں کہا۔

''کسی کی سرپرائز برتھ ڈے پارٹی میں، جو کہ آج رات زینوا میں ٹھیک آٹھ بجے شروع ہو گی۔'' سائرہ نے سرپرائز دھماکا کیا۔

''کیا؟'' مسکان کی سمجھ نہ آنے پر مسکرائی تھی۔

''ہاں!'' سائرہ اُس کے گلے لگ گئی۔ ''ہیپی برتھ ڈے یو ٹو جانو!''

''تھینکس!'' مسکان نے کہا۔

''تمہارا خیال تھا کہ میں اپنی بارہ سالہ دوستی میں تمہارا برتھ ڈے بھول گئی۔ ویری فنی!'' سائرہ نے مصنوعی غصہ دکھایا۔

"تم نے رات بارہ بجے فون جو نہ کیا، ہمیشہ کی طرح۔" مسکان نے کہا۔

"ارے یار! کبھی کبھی زندگی کے ذائقے بدل بدل کر لینے چاہئیں۔" سائرہ نے اپنی جینز کی جیب سے وِش کارڈ نکال کر مسکان کو تھمایا۔

"اتنا بڑا کارڈ لانے کی کیا ضرورت تھی؟" چھوٹے سے، منی سے کارڈ کو دیکھ کر مسکان نے سائرہ کا مذاق اُڑایا تھا۔

"یہ اتنا چھوٹا اس لئے ہے کیونکہ رات تمہارے لئے ایک بڑا سرپرائز گفٹ ہے، جس کو دیکھتے ہی تم شاید خوشی سے پاگل ہو جاؤ۔" سائرہ نے تجسس پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" مسکان نے پوچھا۔

"انتظار!..... میری جان! تھوڑا سا انتظار۔ ابھی تو چلو تم گرافک اسٹوڈیو۔ سر اکمل کی اسائنمنٹ دینی ہے۔" سائرہ نے اسے اٹھایا۔ جبکہ مسکان سوچ رہی تھی، ایسا کیا تحفہ ہے جو سائرہ اتنا سسپنس پھیلا رہی ہے۔

❖❖○❖❖

تم جو پل بھر کو ٹھہر جاؤ تو یہ لمحے بھی
آنے والے کئی لمحوں کی امانت بن جائیں
تم جو ٹھہر جاؤ تو یہ رات، یہ مہتاب
یہ سبزہ، یہ گلاب اور ہم دونوں کے خواب
سب کے سب ایسے مبہم ہوں کہ حقیقت ہو جائیں
تم ٹھہر جاؤ کہ عنوان کی تعبیر ہو تم
تم سے تلخیٔ اوقات کا موسم بدلے
رات تو کیا بدلے گی، حالات تو کیا بدلیں گے
تم جو ٹھہر جاؤ تو میری ذات کا موسم بدلے

مسکان کے لبوں پر مسکراہٹ آ کر چپک گئی۔ بلیک کلر میں اُس کا رُوپ دمک رہا تھا۔ وہ خوشی کے رنگ اُس کی شخصیت کو غیر معمولی بنا رہے تھے، جو ولی کو اپنی برتھ ڈے پارٹی پر دیکھ کر اُس کے چہرے پر چھا گئے تھے۔

"تم تو کہتے تھے کہ تم کسی مسکان کو نہیں جانتے۔ اور آج بمعہ گفٹ کے اُس کی پارٹی میں آئے ہو۔" ٹی ٹو نے ولی کو جا پکڑا۔

ولی خوش دلی سے مسکرایا۔ "میں مسکان کے بلانے پر نہیں آیا، یار! وہ دیکھو، طارق کو۔ اُدھر۔" ولی نے اشارہ ایک لمبے سے نوجوان کی طرف کیا۔ "یہ میرا بہت پرانا دوست ہے اور اس نے ہی اپنی بہن کی برتھ ڈے پر مجھے بلایا تھا۔" ولی نے ٹی ٹو کو وضاحت کی، جو کہ پارٹی میں ولی کو دیکھ کر چونک گیا تھا۔

"لو........ یہ اُس کی سگی بہن تو نہیں ہے۔" ٹی ٹو نے اعتراض کیا۔ "چوتھی جانب سے تم کو ریفرنس سے بلانے کا تُک؟" ٹی ٹو باقاعدہ تحقیق کرنے کھڑا تھا۔

"کم آن، یار! مجھے بھی یہاں آ کر پتہ چلا۔ کچھ عجیب تو لگا، لیکن ہو سکتا ہے واقعی ان کے ریلیشن شپ اتنے پرانے اور پکے ہوں کہ اس نے سگے بھائی کی طرح اس کی برتھ ڈے پارٹی ارینج کی ہو۔" ولی نے بے پروائی سے کندھے اُچکائے۔

اُس کی یہ بے نیازی اُس کی شخصیت کو کچھ مغرور اور بہت پُرکشش تاثر دیتی تھی۔

"لیکن جس طرح کوئین آف نائٹ کی نظریں تمہارا طواف کر رہی ہیں، وہ تمہارے حلقۂ محبت میں بری طرح گرفتار ہے۔" ٹی ٹو نے ڈرامائی انداز میں مسکان کی بے قراری اعلان کی تھی۔

"یار! اپنی اُردو ٹھیک کر لیا کرو۔ یہ حلقۂ محبت کیا چیز ہے؟" ولی نے ویٹر سے فریش لیمن کا گلاس پکڑتے ہوئے پوچھا۔

اور ٹی ٹو سب کچھ بھلائے اُدھر بڑھا تھا۔

ولی نے سر جھٹکا۔

ولی بہت خوب صورت، کرسٹل کا ڈول پیس لایا تھا۔ مسکان نے ریپر تھوڑا سا کھول کر وہیں دیکھ لیا تھا اور اسے اپنے پرس میں ڈال لیا تھا۔

"یار! تم میری سسٹر سے ملے؟" طارق نے پاس آ کر پوچھا۔

"میں ان کو جانتا ہوں۔ ہمارے کالج کی ذہین طالبہ ہیں۔" ولی نے چکن نگیٹس کا ایک پیس منہ میں اُلتے ہوئے کہا۔

مسکان، جس کا سارا دھیان ولی پر تھا، اُس کی بات پر چونک گئی۔

بظاہر بے نیازی کا تاثر دینے والا ولی ہرگز بے خبر نہ تھا۔ اس کا مطلب، ولی نے مجھے نوٹس کیا!!

مسکان کے چاروں جانب پھول کھل گئے تھے۔

❖❖○❖❖

رات کا ایک بج رہا تھا، جب وہ ٹی ٹو کو ڈراپ کر کے اپنے گھر کی جانب مڑا تھا۔

لاہور میں تو ساری رات مین سڑکوں پر رونق رہتی ہے۔

البتہ جب وہ اپنی رہائشی کالونی کی طرف مڑا تو کچھ سناٹا تھا۔

ہلکے ہلکے میوزک سے محظوظ ہوتا وہ درمیانی رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا، جب ایک موڑ پر اُسے اچانک بریک لگانی پڑی۔

گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں وہ سامنے گرے وجود کا اندازہ کر سکتا تھا۔ وہ کوئی لڑکی تھی۔ پاس ہی اُس کا دوپٹہ گرا پڑا تھا۔

وہ اس خیال میں تھا کہ آیا وہ جا کر اُسے دیکھے کہ نہ دیکھے۔

ولی اِسی شش و پنج میں تھا کہ وہ کیا کرے! کیا اُسے باہر نکل کر دیکھنا چاہیے، ہوسکتا ہے کہ کسی کو اُس کی مدد کی ضرورت ہو!

دوسری سوچ اُسے اس معاملے سے دور رہنے پر اُکسا رہی تھی۔ ''وہ کیا کہتے ہیں ناں کہ پہلا دل میں آنے والا خیال اللہ کی جانب سے ہوتا ہے اور دوسرا تیسرا وسوسوں سے بھرا شیطانی خیال ہوتا ہے۔ ولی باہر نکل آیا تھا، اُس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اُس وجود کو سیدھا کیا۔

اسٹریٹ لائٹ اور اُس کی گاڑی کی ہیڈ لائٹس اُسے واضح منظر دکھا رہی تھیں۔

ولی بے اختیار چونکا کیونکہ وہ اُسے جانتا تھا۔

یہ وہ ہی لڑکی تھی، جو اُس روز اُسے اگزیبیشن کے دوران ملی تھی، ولی نے اُسے ہلایا کہ شاید وہ بے ہوش ہے۔

لیکن لڑکی بالکل بے سدھ تھی۔ تنگ چھوٹی کُرتی اور پٹیالہ شلوار سوٹ میں ملبوس یہ لڑکی خود سے بے خبر سڑک پر گری ہوئی تھی۔

کُرتے کے گریبان کے پہلے دو بٹن ٹوٹے ہوئے تھے اور وہ خود بھی کچھ زخمی تھی، گاڑی کی لائٹس اُس کے جسم کے مدوجزر بہت نمایاں کر رہی تھیں۔ ولی کو اُسے اِس بیچ راستے میں چھوڑنا بہت خطرناک لگا۔

کچھ سوچتے ہوئے اُس نے اُسے اُٹھا کر گاڑی میں لٹایا۔

پھولوں کی طرح ہلکی پھلکی، خوشبو سے مہکی مہکی خود سے بے خبر لڑکی ولی کو متوجہ کر رہی تھی۔ اُس کی حِسِ شامہ بہت لطیف سا اثر چھوڑ رہی تھی۔

لیکن وہ ولی تھا۔ اُس نے احمد شاہ سے کردار کی بلندی کے لیے حفاظتی دیواریں کھڑی کرنا سیکھا تھا۔

پہلی نظر بے شک غیر ارادی تھی اور وہ جائزہ لے چکی تھی لیکن وہ اپنی ارادی نظر سنبھال چکا تھا۔

اُس کے چہرے پر ویسے ہی تاثرات آ ٹھہرے، جو اُس کے نین نقش کا حصّہ لگتے تھے۔

''بے نیازی کے تاثرات''!

اُس کی گاڑی کا رخ اپنے دوست کے بھائی کے پرائیویٹ کلینک کی جانب تھا۔

اُس کا دماغ بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ نیکی اُس کے گلے پڑ سکتی ہے، ایک خوبصورت بلا اُس کی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بے ہوش پڑی تھی۔

اور سامنے سے آتی پولیس پیٹرولنگ کار دیکھ کر ولی کے ماتھے پر پُرسوچ لکیریں اُبھر آئی تھیں۔

پولیس پیٹرولنگ کار اُس کی جانب ہی بڑھ رہی تھی! کسی پریشانی کی طرح! اے اللہ بدمزگی سے بچانا! اُس نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔

❖❖❍❖❖

بی بی اتنی رات ہو چکی ہے آپ کا سونے کا ارادہ نہیں ہے؟ آیا اماں نے مُسکان کے کمرے میں جھانک کر پوچھا۔ مُسکان کے چہرے پر خوشی کے اِتنے رنگ اُترے ہوئے تھے کہ وہ نظر لگ جانے کی حد تک خوبصورت لگ رہی تھی۔

آیا اماں باقاعدہ چونکی تھیں۔

مُسکان بی بی بہت رات ہو گئی ہے! اب سو جائیں خود ہی تو کہتی ہیں کہ منگل کو آپ کی پہلی کلاس ڈرائنگ کی ہوتی ہے جلدی اٹھایا کروں آپ کو۔ لیکن اتنی دیر سے آپ اگر سوئیں گی تو پھر اُٹھیں گی کب؟

آیا اماں نے اُس کے نہ سونے پر لمبا چوڑا لیکچر دے دیا اور مزید کے موڈ میں لگتی تھیں۔

اچھا اماں! لائٹ بند کر کے نائٹ بلب آن کر دیں۔ مسکان نے نائٹ گاؤن اتار کر سائیڈ پر پھینکا اور چادر خود پر اوڑھ لی۔

سو جانا! وہ جاتے جاتے بھی نصیحت کرنا نہ بھولی تھیں۔ لیکن مُسکان کی نیند تو اُڑ چکی تھی۔ اُس نے پھر سے ولی کا دیا ڈول پیس نکال کر دھیرے دھیرے اُسے چھوا۔

اُس کے لب پھر سے کِھل کِھل اُٹھے تھے۔

تمہیں سوچوں تو ایسا لگتا ہے
کہ چودھویں رات کا چاند
میرے دل کے آنگن میں اُتر کر
روشنی سی بھر رہا ہو
تمہیں سوچوں تو ایسا لگتا ہے
کہ کوئی میٹھا سا احساس
میرے تَن مَن کو بھگو گیا ہو
میرے اندر میلہ سا لگ گیا ہو
میرا ادھورا پن مِٹ گیا ہو
میری دنیا
میری کائنات
میرا جہان مکمل ہو گیا ہو
مجھے سب کچھ مل گیا ہو

اُس کی مدھری مُسکان اُس کے دل کے بھید کھول رہی تھی

مُسکان نے ڈول پیس اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر آنکھیں موند لی تھیں اور اک چہرہ چھم سے پھر سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ اب ساری رات خوابوں کی دنیا میں رنگ کُھلنے تھے۔

❖❖❖○❖❖❖

اتنی رات ہوگئی ہے، بھائی بھی بس ناں!

بہت غیر ذمہ دار ہوتا جارہا ہے، نگینہ نے چینل پر چینل بدلتے ہوئے سوچا۔

رات کے دو بج رہے تھے اور ولی کی کوئی خیر خبر نہ تھی۔ اُس کے سیل فون سے بھی کوئی جواب نہیں آرہا تھا۔

نگینہ کو پہلے غصّے نے اور پھر فکر پریشانی نے بھی گھیرنا شروع کردیا تھا۔

بھائی کہاں ہیں آپ؟

نگینہ ٹی وی لاؤنج میں چک پھیریاں کاٹ رہی تھی۔

اللہ جی بھائی کو خیر خیریت سے رکھنا اور وہ جلدی گھر آجائیں، اُس نے شدّت سے دُعا کی۔ اب وہ پھر سے فون ملا رہی تھی۔

''ہیلو! میں نگینہ بات کررہی ہوں۔''

''ارے آپ کو بتانے کی ضرورت نہ تھی میں آپ کی آواز پہچانتا ہوں۔'' وہاں سے بہت خوش دلی سے کہا گیا۔ ''خیریت ہے ناں! ہماری یاد کیسے آگئی؟'' وہ بولے۔

''وہ، وہ طارق بھائی میں نے اس لیے فون کیا تھا کہ بھائی ابھی تک گھر نہیں آئے۔ مجھے بہت فکر ہورہی ہے۔'' نگینہ نے کہا۔ اب وہ ننھے منّے بچّے تھوڑی ہیں کہ آپ ان کی فکر کریں۔ آجائیں گے گھر۔ آپ خود کو ریلیکس رکھیں اور سوجائیں۔'' وہاں سے مفت مشورہ آیا۔

طارق جان بوجھ کر ٹو دی پوائنٹ بات نہ کررہا تھا وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرکے اس دشمنِ جاں کی آواز کو کچھ دیر اور سننا چاہتا تھا۔

''طارق بھائی! میں نے آپ کے اس طرح کے مشورے کی خاطر فون نہیں کیا تھا۔ آپ بتائیں کہ آپ بھائی سے کسی طرح رابطہ کرسکتے ہیں یا نہیں؟'' نگینہ کی تپتی سُلگتی آواز پر طارق کے لب کھل اُٹھے۔

وہ تصور میں اُس کے چہرے کی سرخی دیکھ سکتا تھا۔

نگینہ بہت دھیمے مزاج اور دھیمی آواز میں بات کرنے کی عادی تھی، دھیما بولنا تو روشن آرا بیگم سے سیکھا تھا۔

لیکن جب وہ غصہ کرتی تب بھی اتنا دھیما بولتی کہ مخاطب کو لگتا کہ وہ غصہ میں نہیں ہے، اس کا یہ دھیما سا غصہ اُسے ہمیشہ سے دلچسپ لگتا تھا۔ ''اوکے! میں دیکھتا ہوں ویسے بھی میری گاڑی خراب ہے میں خود راستے میں پھنسا ہوا ہوں۔'' طارق نے نگینہ سے وعدہ کیا کہ وہ خود ولی سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ میں آپ کے فون کی منتظر رہوں گی! نگینہ نے کہا۔

زہے نصیب! طارق منہ ہی میں بڑبڑایا۔

ہوں۔ کیا کہا! مجھے آواز نہیں آئی، وہ بولی۔

کچھ نہیں! آپ اطمینان رکھیں، میں دیکھتا ہوں، مسٹر عبدالولی اچانک کہاں لاپتہ ہوگئے ہیں!

طارق بھائی پلیز ذرا جلدی! نگینہ کی آواز میں بے چینی بہت نمایاں تھی۔ بے فکر رہیں، جواب میں طارق نے اُسے تسلی دی۔

❖❖❖○❖❖❖

پولیس کی موبائل عین اُس کی گاڑی کے آگے آرکی تھی۔

ولی کی پیشانی پر بل گہرے ہوگئے تھے، بہر حال اب اُنہے ہر طرح کی صورت حال کا سامنا کرنا ہی تھا۔

اور یہ صورتِ حال خاصی مشکل بھی ہوسکتی تھی اور جب لائٹ بلیو شرٹ اور ڈارک بلیو پینٹ میں ملبوس طارق کو اپنی گاڑی کی جانب آتے دیکھا تو اُس کی جان میں جان آئی، ورنہ آج یہ نیکی اُس کے گلے میں پڑنے والی تھی۔

ولی! کہاں ہو تم؟ گھر میں نگینہ پریشان ہے تمہارا سیل فون بھی بند پڑا ہے! اور پھر اچانک ہی اُس کی زبان کو بریک لگ گئی تھی۔ پچھلی سیٹ پر لیٹا وجود بہت نمایاں تھا پھر گاڑی کی لائٹس میں فوراً نظر پڑی تھی۔

یہ۔ یہ کیا ہے؟ طارق نے کن اَکھیوں سے پولیس موبائل میں بیٹھے اپنے ایس پی دوست کو بھی دیکھا کہ وہ بھی یہ منظر دیکھ چکا تھا۔ لیکن وہ شاید کسی سے موبائل فون پر بزی تھا کیونکہ فاصلہ کم تھا اس لیے خطرہ زیادہ تھا۔ تم لائٹس آن رکھو، میں پہلے ان سے نمٹ کر آتا ہوں۔ طارق نے ولی کے چہرے کی پریشانی کو پڑھ لیا تھا۔

''دوستی سچی اور پُرانی ہو تو یوں ہی چہرے کے تاثرات گفتگو کرتے ہیں۔'' زبان سے باقاعدہ کہنے کی ضرورت تو محسوس ہی نہیں ہوتی۔ طارق کا یوں بغیر کسی پُوچھ گُچھ کے ولی کی مدد کرنا اُن کے مضبوط رشتے کو ظاہر کرتا تھا۔

یار اسلم راؤ تم چلو! تمہاری لفٹ کا بہت شکریہ۔ مجھے میرا دوست مل گیا ہے اور یہ ہمارے ہی بلاک میں رہتا ہے، میں اس کے ساتھ چلتا ہوں۔ طارق نے فٹافٹ ان کو ٹالنے کی کوشش کی تھی۔ اور جب تک ان کی گاڑی چلی نہ گئی، ولی اور طارق دونوں ٹینس رہے۔

بہر حال ہماری پولیس آج بھی بات کا بتنگڑ بنانے میں بہت مشہور ہے۔

چلیں؟ ولی نے بس اتنا ہی کہا تھا۔ طارق گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا اُس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا تھا نہ ہی کوئی سوال کیا تھا۔ اُن کی دوستی کا رشتہ اس قدر گہرا تھا کہ سوالوں جیسی بے اعتباری ان میں نہ آئی تھی۔

بلآخر اس خاموشی کو ولی نے ہی توڑا۔

''تمہارے فنکشن سے واپسی پر میں نے ٹی ٹو کو اُس کے گھر ڈراپ کیا اور واپسی میں یہ لڑکی بے ہوش سڑک پر پڑی تھی، اس کے ساتھ شاید کوئی حادثہ ہوا ہے۔''

میرا دل نہیں کیا کہ اسے بیچ راستے میں چھوڑ دوں! ولی کے لہجے میں کچھ بے بسی سی تھی۔

جی بالکل! آپ اسے کیوں چھوڑ کر آتے بیچ رستے میں۔ خیر سے آپ اس کے ''دینی بھائی'' جو

ہوئے۔ طارق کا لہجہ تپا ہوا تھا۔ ولی اتنی ٹینس Situation میں بھی بے اختیار مسکرادیا۔ صرف ''دیلی بھائی'' ہونا کافی نہیں ہوتا یار! میں اسے جانتا ہوں اس کا احسان ہے مجھ پر۔ ولی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مسٹر ولی! یہ صرف آپ ہی ہوسکتے ہیں جو اس کریٹکل حالت میں بھی مسکرا سکتے ہیں۔

''گاڑی میں بم لیے پھر رہے ہیں اور موصوف مُسکرا مُسکرا کر بیچاری خوش مزاجی کو بے حال کیے جارہے ہیں۔'' طارق کا پارہ نیچے آ ہی نہیں رہا تھا۔ تمہیں اگر اعتراض ہے تو میں تمہیں پہلے ڈراپ کردیتا ہوں تا کہ اس بم کا میں خود ہی سامنا کروں اور اس کی تباہ کاریوں کے اثرات میں اکیلے ہی فیس کروں۔ ولی نے مصنوعی ناراضگی سے کہا۔

یار مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے! لیکن یار دیکھو ناں زمانہ کس ڈگر پر جارہا ہے۔ تم تو بہت محتاط انسان ہو پھر یہ حماقت کیسے کی؟

اگر ہمدردی کا بخار چڑھ ہی گیا تھا تو پولیس کو وہیں سے فون کرتے تا کہ جو کچھ کرنا ہوتا وہ خود کرتی۔ لڑکی کا معاملہ ہے! مشکل بلکہ ٹھیک ٹھاک مشکل ہوسکتی ہے۔ طارق نے ولی کو باقاعدہ سمجھایا۔

اوکے یار! ہوگئی جلد بازی! اب اس کو پہلے کسی ڈاکٹر کو دکھا لیتے ہیں۔ ولی نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

جی ہاں! رات کے آخری پہر ڈاکٹر صاحب آپ ہی کے تو انتظار میں ریڈ کارپٹ بچھائے، پھولوں کا گلدستہ لیے کھڑے ہوں گے کہ کب مسٹر عبدالولی ایک اعلیٰ پائے کی ''نیکی'' اٹھائے لائیں اور وہ بھی اس نیکی میں اپنا حصہ ڈال دیں۔ طارق کا تو غصے سے میٹر گھوما ہوا تھا۔

عبدالولی کا قہقہہ بے ساختہ تھا غصے میں تمہاری حسِ مزاح کچھ زیادہ شائستہ نہیں ہوجاتی! ولی نے اُسے چھیڑا۔ میں جانتا ہوں یار ڈاکٹر کو دکھانے کا مسئلہ ہوگا اسی لیے اپنے ایک دوست کے بھائی کی کلینک پر جارہا ہوں۔ اپنے دوست کو میں فون کرچکا ہوں امید ہے وہ بھی وہاں آجائے گا۔ ولی نے طارق کو رام کرتے ہوئے کہا۔

ہاں کسی دوست کو آرام سے جینے نہ دینا، آدھی رات کو اُسے بھی اُٹھا بٹھایا۔ طارق کے لہجے میں اب تپش نہ تھی، ولی کے لیے وہ یوں ہی کیئرنگ تھا۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی وہ بہت کیئر اور فکر سے ہینڈل کرتا تھا۔

کم آن یار! کوئی مسئلہ نہیں ہوگا، مجھے بس یہی لگا کہ اسے اٹھا کر ڈاکٹر تک لے چلوں اور پھر اسے اس کے گھر چھوڑ دوں، جانے بیچاری کے ساتھ کیا مسئلہ ہوا تھا۔ ولی نے بے نیازی سے کہا۔

''راج ہٹ بالک ہٹ، تریاہٹ جوگی ہٹ!'' (راجہ، بچہ، عورت اور فقیر جو دل میں آئے کرتے ہیں کسی کی نہیں مانتے) طارق نے لمبی سانس کھینچ کر کہا۔ جواب میں ولی کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

تم مجھے راجا کہہ رہے ہو، ولی نے پوچھا۔ ''نہیں ہرگز نہیں! میں تمہیں بچہ کہہ رہا ہوں! طارق نے جُھلس کر تصحیح کی۔

گاڑی میں ایک بار پھر قہقہہ اُبھرا اور یہ دونوں کا مشترکہ قہقہہ تھا۔ ولی نے طارق کے ہاتھ پر ہاتھ مارا، طارق نے بول کر بھڑاس نکال لی تھی، اب وہ بھی ہلکا پھلکا تھا۔

❖❖○❖❖

میں دوائی بھی دے دیتا ہوں اور انجکشن بھی لگا دیتا ہوں انشا اللہ بہت جلد آرام آجائے گا۔ ڈاکٹر گلزار کا چہرا اور لہجہ ایک دم بہت نرم ہوگیا تھا۔

ایمان گھبراہٹ سے اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ ڈاکٹر گلزار کی نظریں ایمان کے بے انتہا خوبصورت ہاتھوں میں الجھ کر رہ گئی تھیں، سفید سفید مومی انگلیاں، گلابی ہتھیلیاں! ڈاکٹر گلزار باوجود کوشش کے خود کو بے نیاز نہ رکھ پایا تھا۔ بس پھر تو یہ شروعات تھی۔

ڈاکٹر گلزار کی مہربانیاں ایمان پر بہت بڑھ گئیں۔ وہ ہر کام چھوڑ کر اُسے اٹینڈ کرتا تھا اور وہ دِنوں میں ٹھیک بھی ہوگئی لیکن اس کے ساتھ بہت کچھ ''ناٹھیک'' ہوکر رہ گیا تھا۔

ایمان کے قدم بہک چکے تھے وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ راستے منزل کی جانب نہیں اندھیری دلدل کی جانب جاتے ہیں۔

ڈاکٹر جی کی بے قراریاں اُسے بھی چین نہ لینے دیتی تھیں۔

وہ بہانے بہانے سے اُس کے گھر کے گرد چکر کاٹتا رہتا تھا گلی میں منڈلاتا رہتا تھا کسی نہ کسی ذریعے سے اُسے خط ضرور پہنچادیا کرتا تھا۔

یہ خط کسی نشے کی طرح ایمان کے اندر اُتر کر اُسے اپنا عادی بنارہے تھے۔ کبھی کبھی انسان محبت کے نام پر خودغرضی کی انتہاؤں پر جا کھڑا ہوتا ہے۔ خودغرضی کی ایسی انتہا جہاں ہر طرف شیشے لگی دیواریں اُسے صرف اپنا آپ دکھاتی ہیں۔ اُسے اپنے عکس کے علاوہ کچھ سُوجھتا بھی نہیں ہے۔''

حالانکہ اصل محبت کا مطلب تو صرف دینا ہوتا ہے قربانی دینے کا نام! لیکن ایمان کے اندر موجود بغاوت نے سر اٹھانا شروع کردیا تھا۔ اسے کسی رشتے یا اپنے والدین کی عزت کا کوئی خیال نہ تھا۔

خیال تھا تو بس اتنا کہ اُسے ڈاکٹر جی کے سنگ اپنی زندگی گزارنی ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر جی کہتے ہیں کہ میں ''رانی'' جیسی نظر آتی ہوں اور مجھے رانی جیسا ہی رہنا چاہیے۔ یہ ماحول یہ زندگی میرے قابل نہیں ہے۔ ایسے میں اُسے ''چھاؤں'' جیسے والدین بھول گئے تھے اور وہ جسے روشنی سمجھتی تھی، وہ تو تپتی دھوپ تھی اور وہ بے خبر اُس کا دل بے خبر اسی تپتی دھوپ کے جھوٹے رنگوں کی جانب لپکتا تھا۔ اندھا دھند!!

❖❖○❖❖

ایمان۔ ایمان پتر! عصر کا ویلا (وقت) ہورہا ہے تو اپنے بال باندھ لے۔ خدیجہ بی بی نے کٹ کٹ کرتی مرغیوں کو دانا ڈالتے ہوئے کہا۔

توبہ ہے اماں! اب اپنی مرضی سے بال بھی کُھلے نہیں رکھے جاسکتے! یہ آپ کے اصول پھندے کی طرح میرا دم دبا دیتے ہیں۔ ایمان بڑبڑائی۔

نہ پُتر ایسے تُو خار نہ کھا! تیرے بھلے کو دھیان کرتی ہوں اماں نے پیار سے کہا۔ اُن کا تحمل کم ہی ختم ہوتا تھا۔

اس میں میرا کیا بھلا ہے؟ ایمان بھڑکی۔ ''تُو تو میرا سب سے قیمتی مال ہے تیرا دھیان نہ کروں گی تو کس کا کروں گی؟ خدیجہ بی بی نے سوکھی روٹی کا چُورا بنا کر مرغیوں کی تھالی میں ڈال دیا تھا۔

ہمارے پاس کوئی ہار موتی قیمتی ہوتا ہے اُسے ہم جندھروں (تالوں) میں چھپا چھپا کر رکھتے ہیں، پھر دھیاں (بیٹیاں) تو بہت قیمتی ہوتی ہیں کسی لال موتی کی طرح اور پاکیزہ! ان کو بھی بڑے دھیان سے رکھنا ہوتا ہے۔

کسی چندرے کی میلی نظر نہ پڑ جائے۔ خدیجہ بی بی نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اُس کے غصّے کو دباتے ہوئے کہا۔

اماں اس چار دیواری میں کم از کم اتنا روکا ٹوکا نہ کریں تنگ آ جاتی ہوں۔ ایمان نے ماں کا اچھا موڈ دیکھ کر دل کی بات کہی۔

''اوں ہونہہ! کنواری لڑکی ہو یا پکے آم کی خوشبو! دونوں باہر سے گزرتے بندے کو اپنے ہونے کا بتا دیتی ہیں!''

خدیجہ بی بی اب بھی اپنے کہے پر ڈٹی ہوئی تھیں۔

یعنی اماں اپنے ہی گھر میں قید ہو جاؤ! ایمان نے بُرا سا منہ بنایا ''نہ اسے قید نہیں کہتے، قرینہ کہتے ہیں!''

بچیاں گھر میں ہوں یا باہر! ڈھکی چھپی دھیمی ہی اچھی لگتی ہیں۔ خدیجہ بی بی نے ڈربے سے مرغیوں کے تازہ دیئے گرم گرم انڈے اکٹھے کر کے پیالے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

ہونہہ! یہ قرینہ نہیں ہے یہ تو قید ہی ہے! ایمان کا باغی دل تو بہرہ ہوا پڑا تھا۔ اُسے کہاں کچھ سنائی دیتا تھا اماں کی باتیں اُس تک نہیں اترتی تھیں۔

❖❖○❖❖

میں تیری منزلوں کے نشاں سے
بہت دُور آگے نکل گیا
نہ سنبھل سکا بہت دیر تلک
یونہی بے سبب بھٹکتا رہا
تیرے نور کی وہ روشنی
میرے آس پاس بکھرتی رہی
میں نا اہل میں بے خبر!
کیوں دیر تک سویا رہا
مجھے آگہی کا شعور دے
مجھے تازگی کا سرُور دے
تیری راہ میں کھڑا ہوا ہوں
میرے راستے کی دھول ہٹا دے
الٰہی مجھے اپنے قرب سے نواز دے!

ابا کی آواز میں رقت تھی۔ آنکھوں میں آنسو اور ہاتھ دعا کے لیے اٹھے ہوئے تھے۔

ایمان نے کسمسا کر آنکھیں پھر سے بند کر لیں۔ ایک تو ابا ناں! روز اتنی سویرے اللہ جانے کن نا کردہ گناہوں کی معافی مانگتے رہتے ہیں۔ ایمان منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ بہر حال ابا سے وہ ڈرتی تھی، اُس نے کروٹ لے کر رضائی کے اندر منہ چھپا لیا۔ اتنا اچھا خواب دیکھ رہی تھی، وہ ڈاکٹر گلزار کے سنگ دُور بہت دُور دوڑی چلی جا رہی تھی اور ڈاکٹر گلزار کی شوخیاں، گستاخیاں! لیکن ابا کی آواز نے اُسے جگا کر اُس کا خواب توڑ دیا تھا۔ اللہ جانے یہ ابا کیسے اپنی اتنی مزے کی نیند اور گرم بستر چھوڑ کر تہجد کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں؟

اُس نے نیند سے بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ سوچتے ہوئے کہا لیکن وہ اپنے سوال کا جواب کبھی نہ پا سکتی تھی۔

''کیوں کہ سو جانے والے ہمیشہ کھو دیتے ہیں، خیر کا لمحہ ہو یا کامیابی کی روشنی ہو، دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔''

❖❖○❖❖

یہ بے ہوش نہیں ہیں! ڈاکٹر نے اُس کا مکمل چیک اپ کر کے کہا۔ ڈاکٹر کی بات سن کر ولی اور طارق دونوں ہی پریشان ہو گئے۔ یہ بے ہوش نہیں ہیں تو پھر؟ طارق نے پہلے سوال کیا۔

اندھیرے میں وہ ٹھیک سے دیکھ نہ پایا تھا لیکن روشنی میں یہ حقیقت بہت واضح تھی کہ وہ نہایت ہی خوبصورت فتنہ تھی۔

''دراصل یہ ڈرگز کے زیر اثر بے ہوش ہیں! ڈاکٹر کی بات کسی بم کی طرح ولی کو لگی۔''

وہ اپنے دل کی گواہی کا کیا کرتا، جو اُس بات کو ماننے سے انکار کر رہا تھا، اُسے یہ لڑکی اچھی لگتی تھی۔ کیا واقعی؟ طارق بھی حیران تھا۔

بالکل! لڑکی نے اوور ڈوز لی ہوئی ہے! میں کرتا ہوں اس کا کچھ! ڈاکٹر کہہ کر کمرے سے باہر نکلا تو طارق نے ولی کو کڑی نظروں سے گھور کر دیکھا۔

یہ ایڈیٹ لڑکی تمہاری جاننے والی ہے؟ حیرت ہے! طارق نے کہا۔ کم آن یار! مجھے بہت کچھ تو اس کے متعلق نہیں پتا لیکن اس نے جب میرے اوپر شوٹنگ (فائرنگ) ہوئی تھی مجھے بچایا تھا۔ اس کا یہ احسان مجھ پر بہت بڑا تھا۔ ولی بولا۔

اوہ! تو یہ ہے وہ حسینہ! طارق کے چہرے پر ملے جُلے تاثرات تھے۔ شوخی اور فکر دونوں کا امتزاج کتنا انوکھا لگتا ہے۔

اوکے! ہم اس کے پاس ہی ٹھہرتے ہیں، تم نگی کو فون کر دو بیچاری پریشان ہو رہی تھی۔ طارق ان کا بچپن کا دوست تھا اس لیے ولی کی طرح نگینہ کو وہ بھی نگی ہی کہتا تھا۔

میرے موبائل کی بیٹری ڈاؤن ہو گئی تھی، شاید اسی لیے بند ہو گیا تھا۔ ولی نے بتایا۔

''لو اس سے بات کر لو۔ میں ذرا ڈاکٹر صاحب کے تیور درست کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ طارق موبائل فون اُسے پکڑا کر باہر نکلا۔

❖❖○❖❖

''ایمان باجی یہ آپ کے لیے!'' ہمسائے کے بھولے نے ہاتھ میں دبا اک پرچہ اُس کے سامنے کیا۔

ایمان نے اِدھر اُدھر دیکھ کر جھٹ سے وہ کاغذ اُس کے ہاتھ سے لے کر دبوچ لیا۔

اچھا!

تو چل! ایمان نے اُسے بھگایا۔ بچہ ڈاکٹر گلزار سے دس روپے رشوت لے چکا تھا اُسے بھی یہ پیسے خرچنے کی جلدی تھی۔ وہ چھلانگیں مارتا بھاگ گیا۔

ایمان نے دوڑ کر کمرے کا دروازہ بند کرلیا۔ دروازہ بند کرنے سے پہلے وہ اماں کو دیکھنا نہ بھولی تھی، جو کہ مگن انداز میں ایک دوپٹے پر پھول کاڑھ رہی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ان کی پرسوز، دھیمی اور بہت نیچی آواز سن سکتی تھی۔

ایمان نے کمرے کا دروازہ بند کرکے مٹھی میں دبا اپنے ہاتھ کے پسینے سے نم کاغذ کھولا۔

کچھ ہی لمحوں بعد اُس کے چہرے پر سرخی جھلک رہی تھی، سانسوں کی رفتار بہت تیز ہوچکی تھی۔

ڈاکٹر گلزار کے بے باک لفظ اُس کی کچی عمر کے پودے کو کسی کیڑے کی طرح کھا رہے تھے۔ کم عمری کی معصومیت کی اپنی ہی خوبصورتی ہوتی ہے، چھوٹی بچیاں اپنی معصومیت کھودیں تو ایک دَم کسی محرومی کا احساس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر گلزار کے ننگے اور بے باک لفظ اُس کے حُسن کی خوبصورتی ایک طوفان میں بہائے لے جارہے تھے۔

باہر اماں کی پرسوز آواز گونج رہی تھی۔

لا الہ الا ہُو، لا الہ الا ہُو\
ایک طلب ہے ایک ہی خُو لا الہ الا ہُو\
اب تُو ہی تُو اور تُو ہی تُو لا الہ الا ہُو\
تیری عبادت کیا کہنا، تیری حقیقت کیا کہنا\
ہوگئی دنیا قبلہ رو لا الہ الا ہُو\
اٹھ گئے آنکھوں سے پردے راز کُھلے سب جلوؤں کے\
مجھ سے اب کیا دُور ہے تُو لا الہ الا ہُو\
مجھ کو اپنی ہستی کا، چل جائے اک روز پتہ\
سامنے جب ہو میرے تُو لا الہ الا ہُو\
لا الہ الا ہُو، لا الہ الا ہُو!

اماں کی آواز سُن کر ایک پَل کو ایمان فاطمہ کو لگا یہ سب غلط ہے لیکن دوسرا پَل اُسے پھر بہا لے گیا تھا۔

وہ ہرگز نہ ان بہکاوؤں میں بہکتی اگر اُس میں اپنے والدین سے اور ان کی اچھی **Values** (اقدار) کے ساتھ وفاداری ہوتی۔ کھوٹ خود کے اندر ہو تو ہی برائی حاوی ہوسکتی ہے۔ ورنہ پکی اور اونچی دیواروں کو کم ہی کوئی پھلانگ سکتا ہے۔

خودغرضی، بے حسی ہی بے وفائی کے پودے کو جنم دیتی ہے اور یہ پودا ایسا جھاڑ کانٹے جیسا ہوتا ہے کہ

ساری اچھائی کا پانی چُوس لیتا ہے اور آس پاس کی ساری زمین کو بنجر کردیتا ہے۔

اسی لیے تو بے وفا آدمی ہو، عورت ہو یا اولاد! وہ ہمیشہ اکیلے اور بنجر ہی رہ جاتے ہیں۔'' بے وفا پتوں کو ہریالی کبھی نصیب نہیں ہوتی۔ ایمان نے ایک بار پھر وہ کاغذ نکال کر پڑھا اور پھر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اب وہ اپنے چہرے کو اُس کے ایک ایک نقش کو چھو کر دیکھ رہی تھی ایسے کہ پہلی بار اسے ان سب کی ''خبر'' ہوئی ہو۔

اس لیے بعض اوقات ایسی خبر انسان کو مستقبل سے ''بے خبر'' کردیتی ہے۔ بے خبروں اور بدنصیبوں کی لائن میں لا کھڑا کردیتی ہے۔

❖❖○❖❖

لے پُتر یہ تیرے نئے جوڑے اور یہ ہیں تیرے جوتے! تیرے ابا جی تیرے ہار بُندے کے لیے تیس ہزار الگ سے دے گئے تھے۔ خدیجہ بی بی نے پاؤں سے چپل اتار کر برقعے کی ڈوری کھولتے ہوئے کہا۔ ایمان نے کھولتے خون کے ساتھ ان دو تین شاپرز پر نظر ڈالی۔ اماں اتوار بازار سے چھانٹ چھانٹ کر (ٹوٹوں) پیسوں سے اُس کے لیے کپڑے اور سو روپے کی چپل خرید کر لائی تھیں جس پر سفید نگ لگے ہوئے تھے اماں نے اپنی سی کوشش کرکے کپڑوں کے کھلتے رنگ تلاش کیے تھے۔ چپل بھی نازک سی تھی۔

لیکن ایمان کے ماتھے پر بَل تھے۔

کیا ہوا؟ اماں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا، اماں کا چونکنا لازمی تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے یہ ہی ایمان تھی جو لپک کر اِن چیزوں کو پکڑتی تھی، اس کے لیے یہ چیزیں بہت اہم ہوتی تھیں۔

اب وہ ہی ایمان منہ بنائے اُن پر نظر ڈالے، چھوئے بغیر اتنے فاصلے پر بیٹھی تھی۔ اُس کی یہ حرکت اماں کو حیران کرنے کے لیے کافی تھی۔ ہونہہ! مجھے نہیں چاہیے یہ ''سی'' کلاس چیزیں! ایمان نے غصے سے کہا۔

سی کلاس! یہ کیا ہوتا ہے؟ اماں نے حیرانی سے پوچھا۔ ایمان کو وہ اسکول باقاعدگی سے بھیجتی تھیں لیکن وہ خود سوائے قرآن پاک کے کچھ نہ پڑھ لکھ سکتی تھیں۔

اماں! یہ ٹکے ٹکے کی گھٹیا سستی چیزیں! ایمان نے شاپرز کو دور دھکیلتے ہوئے کہا۔

ایمان کی بات سمجھتے ہی اماں کے ماتھے پر بَل پڑ چکے تھے۔ استغفار کر ایمان، اُس رب جی کا شکر ادا کر! ایسی ناشکری نہیں کرتے۔ اماں نے دھیمی لیکن سخت آواز میں کہا۔ وہ بھی تو لوگ ہوتے ہیں، جن کو پہننے کو کپڑا نہیں جُڑتا! کھانے کو دانہ نہیں رہنے کو چھت نہیں ہے۔

''ہم رب جی کا لاکھ بار بھی شکر کریں تو کم ہے۔ اُس سوہنے رب جی نے ہم کو ہر چیز سے نواز رکھا ہے۔ صدقے جاؤں اُس رحمان جی کہ ہم کبھی بھوکے نہیں سوئے۔ تین وقت کا رج رج کھاتے ہیں، گرمی سردی کا لتا کپڑا، رہنے کو اپنا ٹھار (ٹھکانا) ہے۔ میں تو کہتی ہوں اللہ سوہنے نے بڑا ہی چنگا (اچھا) رکھا ہے۔ شکر الحمدللہ!

لاکھوں سے بہتر! ہمیشہ سے بہتر ہیں! شکر الحمدللہ!

آخر میں اماں نے بڑے جذب سے شکر الحمدللہ کہا تھا اور صرف دیکھنے والی آنکھ دیکھ سکتی تھی کہ اُن کا رُوم رُوم پوری سچائی سے شکر گزار تھا۔

ہونہہ! اللہ ہی جانے آپ کو کِس بات کا اِتنا اطمینان اور خوشی چڑھی رہتی ہے کہ ہر وقت شکر ہی کرتی رہتی ہیں!

آخر ہم کِس بات پر اتنا شکر ادا کرتے ہیں؟

اس غریبی پر جو تَن نہ ڈھانپے! جو پیٹ نہ بھرے! بس اس پر شکر ادا کرتے ہیں!..کیا دیا ہے آخر آپ کے رب جی نے ہمیں؟

یہ دو مرلے کا گھر! دَم گھٹتا ہے میرا!

یہ، یہ کپڑے! ایمان نے پاگلوں کی طرح کپڑے شاپرز سے نکال کر تخت پر اُچھالے!

یہ داغ لگے، ڈورا آئے سَستے سے سوٹ! ہونہہ! جب ساری دنیا تھان سے اچھا کپڑا خرید کر لے جاتی ہے "تو میری اماں شکر ادا کرنے کے لیے بچ جانے والا وہ کپڑا جو نقص زدہ ہوتا ہے، خریدنے چل پڑتی ہیں۔"

سارا اچھا تھان سب کے لیے اور یہ بچ جانے والے پیس میرے لیے۔ کیا میں اس قابل ہوں اماں؟ دیکھو اماں باہر نکل کر لوگ اپنی اولاد کی آسائشوں کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے ایک آپ لوگ ہیں، تین وقت سبزی دال پکا کر، کھلا کر شکر شکر کی گردان کے سِوا کرتے کیا ہیں آپ۔!

ایمان! اماں کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ چُپ!

یہ کیا بک بک کر رہی ہے؟ یہ تجھے آخر کیا ہوگیا ہے؟ اماں کی آواز میں رنج و غم تھا، حیرانگی تھی! آج سے پہلے ان کی یہ ہی بیٹی ہر حال میں مست و مگن رہتی تھی۔

اُس کو ناشکری کے کیڑے نے کب کھانا شروع کیا؟ اپنی بے خبری پر اُن کو دُکھ بھی ہوا تھا۔ کیا ہوا ہے تجھے پُتر؟

یہ سب کچھ تو ہمیشہ سے ہے پھر اب تجھے ہر چیز بُری، کم، سستی اور گھٹیا کیسے لگنے لگی؟

اماں کی آنکھیں اُس کے وجود میں چبھ رہی تھیں وہ ان ساری باتوں کی وجہ جان لینا چاہتی تھیں۔

ایمان چُپ چاپ تخت پر بیٹھی اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے کچی زمین پر جانے کیا بنا رہی تھی۔ "بھلے پیروں سے بنائی آڑی ترچھی لکیریں ہوں یا خواب! کبھی اچھی تعبیر اور تصویر نہیں بن پاتی۔"

یہ گھر ہمارا اپنا ہے دو کمرے اوپر ہیں پھر ویڑا (صحن) ہے۔ غسل خانہ ہے نیچے یہ ویڑا، باورچی خانہ اور تیرے ابا کا کمرہ! دیکھ کتنا کھلا اور زیادہ گھر ہے، ہم دو جیوں (افراد) کے لیے۔ پھر اس میں تیرا دَم کیوں گھٹنے لگا؟ اماں اُس سے جواب نہ پا کر اُسے سمجھانے بیٹھ گئیں۔ گلی ہماری بند ہے، اس لیے صاف ستھری بھی ہے، سارے بال بچے باہر کھیڈ تے (کھیلتے) ہیں۔ کیسی اچھی سوہنی جگہ ہے ہمارا محلّہ! اب اماں نے گھر کے علاوہ محلّے اور جگہ کی صفتیں بھی بیان کرنی شروع کر دیں۔

اور دیکھو ساری گلی میں زیادہ تر لوگ کرائے پر رہتے ہیں۔ ہمارا تو اپنا ٹھار ہے۔ سارے محلّے کی عورتیں بچے زیادہ تر محنت مزدوری کرتے ہیں۔ ہم کیسے عیش سے گھر میں رہتی ہیں۔ تجھے اسکول بھیجا

ہوں۔ بتا سارے محلّے میں کوئی کُوی (لڑکی) اسکول تک گئی ہے کبھی!

تیرے ابا جی نے تجھے لڑکی ذات ہوتے ہوئے بھی تیرے ہر طرح کے لاڈ اُٹھائے ہیں۔ تیری میٹرک کے لیے وہ ہی ہمیشہ خواب دیکھتے ہیں! وہ کہتے ہیں جب تیری میٹرک ہوجائے گی تو ہماری ایمان ساری برادری میں سے پہلی پڑھی لکھی کڑی ہی نہیں ہوگی بلکہ میٹرک بھی سب سے پہلے تیری ہوگی۔ دیکھ جو کچھ تیرے حصّے آیا، وہ دیا کبھی کسی اور کو ملا؟

تجھے تو رب جی کا لاکھاں بار شکر ادا کرنا چاہیے۔ اللہ سوہنے نے تیرے لیے ہمیشہ اچھا رکھا ہے۔ پھر تُو کس بات پر خفا ہے؟

تیری سوچ میں ایسی باتیں کس نے ڈالی ہیں؟ اماں نے کھوجتی نظروں سے اُسے دیکھا۔

اب کے ایمان باقاعدہ بوکھلا گئی تھی، کسی۔ کسی نے بھی نہیں!

لیکن اماں! وہ جو کچھ کہنا چاہ رہی تھی، وہ خدیجہ بی بی کو مزید تپا سکتا تھا۔ ایمان نے اپنی بات کو حلق میں ہی دبالیا۔

کچھ نہیں اماں۔ چھوڑیں بس میرا دل ہی مجھے تنگ کرتا ہے! اس بار ایمان کے لہجے میں سچائی اور بے بسی ...لوں نمایاں تھیں۔

کیا ہوا تیرے دل کو؟ اماں اُسے اتنی آسانی سے کہاں چھوڑنے والی تھیں۔ بس اماں شاید میرے ...اب بڑے اور دل چھوٹا پڑ گیا ہے!

ایمان بغیر کسی مصلحت کے بولی تھی وہ واقعی خود کو بہت بے بس محسوس کر رہی تھی۔

نہ پُتر! اپنے دل کو خواہشوں سے چھوٹا نہ کر!

یہ دل چھوٹا بڑا نہیں ہوتا، خواہشیں اگر اوقات سے بڑی کرنے لگیں تو تب یہ کم پڑ جاتا ہے۔ تو ان ...اہشوں کو سر پر نہ سوار کرنا کبھی! یہ سر پر سوار ہو کر ہمیشہ سر جھکا دیتی ہیں!"

من مارنا سیکھ!

یہ ہی بھلے کی بات ہے! اماں عصر کی اذان سُن کر بالکل خاموش ہوگئی تھیں وہ اپنی ہر بات اور کام ...ان کی آواز سُن کر چھوڑ دیا کرتی تھیں۔

ایمان ان کو ان کی کیفیت کی حالت میں چھوڑ کر چپکے سے وہاں سے اٹھ آئی۔ آپ کو محبت ہے اپنی ...گی کی ان باتوں سے آپ اذان کی آواز سُن کر وجد میں آجاتی ہیں۔

تو پھر کیا میں بھی اپنی محبت کی آواز کو نہ سنوں!

جو مجھے زندگی کا احساس دیتی ہے! پھر اماں آخر میں ہی کیوں اپنا مَن ماروں!

نہ ماننے والے تو ہمیشہ ریوڑ سے نکلی سرکش بھیڑوں کی طرح ہوتے ہیں۔ لاکھ گھیر گھیر کر ریوڑ میں ...الی لائیں وہ موقع ملتے ہی پھر باہر کو بھاگتے ہیں۔

جہاں "باہر" اُن کے لیے عافیت تو ہرگز نہیں ہوتی!

❖❖○❖❖

...ہتی آنکھوں میں چبھ رہی تھی! ترنم نے ایک بار پھر سے آنکھیں بند کرنا چ... تھیں۔ لیکن سامنے

صوفے پر نیم دراز نیند میں گم شخص کو دیکھ کر ایک دم حواسوں میں آ گئی

میں کہاں ہوں؟ اور اور یہ شخص؟ یہ۔؟

بہت ساری باتیں اُس کے ذہن میں آئیں اور گزشتہ رات کا قصّہ بھی اُس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا۔

آفاقی اُسے پک کر کے اور میڈم کو پے منٹ کر کے اُسے گھر لے گیا تھا۔ لیکن جب وہ ٹھیک ٹھاک نشہ کر چکے تو باہر ایک دم شور مچ گیا تھا۔

آفاقی کا ملازم بھاگتا ہوا اندر آیا۔ صاحب! وہ، وہ بڑی بی بی آ گئی ہیں!

اس اطلاع نے آفاقی کا نشہ سارا اُڑن چھو کر ڈالا تھا لیکن وہ، وہ تو میری بیٹی کے پاس گئی تھی؟ آفاقی بہت پریشان اور بوکھلایا ہوا تھا۔

آفاقی خیر سے نانا بن گیا تھا لیکن بُری لت اور عورت نہ چھوڑ پایا تھا۔ آج وہ بُری طرح پھنس گیا تھا۔

کچھ دیر پہلے جس کو بڑی منتوں سے چاندنی میڈم سے لے کر آیا تھا، اب وہ ہی لڑکی اُس کو زہر لگ رہی تھی کہ وہ اسے کس طرح چھپائے۔؟

پچھلے دروازے سے ترنم کو باہر کر ڈالا۔ ترنم کا چھوٹا سا ہینڈ بیگ، جس میں اُس کی "ضروری" اشیا ہوتی تھیں وہیں رہ گیا تھا۔ خالی ہاتھ وہ اب سڑک پر تھی، آفاقی پر تین حرف ڈالتے ہوئے وہ اُسے جی بھر کر گالیاں دے رہی تھی۔ نشہ اُس پر چڑھ رہا تھا، اُسے اپنے آپ پر قابو پانا بہت دشوار ہو رہا تھا۔ نہ اس وقت اُس کے پاس گاڑی تھی نہ بیگ!

اپنے ٹھکانے پر پہنچنا اُسے بہت مشکل لگ رہا تھا۔

دماغ بھی ماؤف ہو رہا تھا۔ آفاقی کو جی بھر کر گالیاں دیتے ہوئے اُس نے دھیرے دھیرے چلنا شروع کر دیا۔

تب ہی دو لڑکے اُس کے پیچھے لگ گئے تھے۔ ترنم کو اُن سے "خاص وجہ" کا خطرہ نہ تھا یہ رہائشی علاقہ تھا شور مچانے پر کوئی نہ کوئی مدد مل سکتی تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ ابھی بھی آفاقی کا پہنایا ڈائمنڈ ہار پہنے ہوئے تھی، جس کے لیے میڈم کی خاص ہدایت تھی۔ کیونکہ وہ ڈیل سے پہلے تحفے کا پوچھ لیتی تھی۔ ہار کے چلے جانے کا مطلب چاندنی میڈم کی ناراضگی تھی، جس کی وہ متحمل نہ ہو سکتی تھی اور اسی لیے جب لڑکے چھینا جھپٹی کر رہے تھے تو ترنم نے اپنی سی کوشش کر کے مزاحمت بھی کی تھی لیکن اُس کا سر کسی چیز سے ٹکرایا اور وہ بالکل بے خبر ہو گئی تھی۔

اب ہوش میں آتے ہی سامنے سوئے شخص نے اُس کے سارے حواس جگا دیے تھے۔ وہ یک ٹک اُسے دیکھے جا رہی تھی۔ کسرتی بدن! لگتا ہے باقاعدگی سے جم جاتا ہے۔ چہرے کے جاذب نظر نقوش سے لگتا ہے ماں باپ دونوں خوبصورت ہیں۔

لیدر کی جیکٹ صوفے کی ایک جانب پڑی تھی، لباس کا سلیقہ بھی ہے!" وہ لیٹے لیٹے اُس کا جائزہ لے رہی تھی۔"

گزشتہ پانچ سالوں سے وہ ہر رات کسی نہ کسی کے ساتھ تھی، لیکن اس طرح کی کشش وہ کہیں غا

لی تھی یہ ہماری پانچویں ملاقات ہے! اس نے خود کلامی کی۔ پہلی ملاقات کے بعد ہی تم کبھی ذہن سے نہ نکل پائے تھے۔ میں تین بار صرف اور صرف تم کو دیکھنے کے لیے آرٹ گیلری گئی تھی۔

لیکن میں تم میں کشش محسوس کرنے کے باوجود تمہارے آس پاس نہیں رہنا چاہتی تھی!

آج ٹھیک تین ماہ بارہ دن بعد تم پھر سے نظر آ گئے ہو! تمہاری آنکھوں کا میں سامنا نہیں کر سکتی!" جو میری اس حالت پر سوال کریں گی!"

تم کیسے "اپنے سے اجنبی ہو!"

جس سے میں اپنی زندگی کا یہ گلا سڑا حصّہ چھپانا چاہتی ہوں! ولی کے گھنے بالوں کا گچھا اُس کے ماتھے پر آن گرا تھا۔ ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھے وہ کسی معصوم بچے کی طرح بے آواز سو رہا تھا۔ ترنم ننگے پاؤں اس کے قریب آئی بہت جی بھر کر اُس پر ایک نظر ڈالی۔

"تم ساحر ہو! تمہاری جھکی حیا دار نگاہ نے تمہارے کردار کی مضبوطی نے، مجھے بہت پہلے یعنی آج سے تین ماہ بارہ دن پہلے جکڑ لیا تھا۔"

میرا جی چاہ رہا ہے کہ تمہارے بالوں کو سنوار دوں!

لیکن میں اس قابل ہرگز نہیں ہوں! میں تمہیں چھونے کی گستاخی کیسے کر سکتی ہوں؟ ترنم اُسی خاموشی سے پیچھے ہٹی۔

"اُس نے سارے کمرے میں نظر دوڑائی۔ آخر اُسے اپنی مطلوبہ چیز مل ہی گئی۔

جناب عبدالولی صاحب!

ہے تو یہ غیر اخلاقی حرکت! لیکن کیا کریں کسی اخلاق اور تہذیب کے زمرے میں ہم جیسے لوگوں کا ذکر نہیں ہے! چار لفظ کا شکریہ کہاں آپ کی دی ہوئی توجہ اور رات کا حق ادا کر پائے گا۔ پھر بھی میں آپ کی احسان مند رہوں گی۔

آپ کے کسی سوال کا سامنا میں کر نہیں پاؤں گی۔ جس نشے کی حالت میں میں آپ کو ملی تھی، اس سے میرے اچھی لڑکی نہ ہونے کا ثبوت تو آپ کے سامنے ہے۔ ہم جیسے راستوں میں ملنے والے لوگوں کی کوئی منزل نہیں ہوتی! بہت سارے شکریے اور اچھی دعاؤں کے ساتھ اجازت چاہتی ہوں!

بے نشاں منزلوں کی مسافر!

ولی کتنی ہی دیر سے اس خط کو پکڑے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ وہ جوتے جرابیں اُتار کر صوفے پر لیٹا تھا۔ اُٹھا تو یہ خط اُس کے پاس پڑا تھا البتہ اُس کے جوتوں میں سے جرابیں غائب تھیں۔

ترنم ننگے پاؤں تھی، جاتے ہوئے وہ اُس کی جرابیں پہن گئی تھی شاید!

عجیب طرح کی کیفیت کا وہ شکار تھا۔ کیسی اُلجھی اور عجیب سی لڑکی تھی، کیسے بنا بتائے چلی گئی تھی!

اب بس بھی کرو یار! جس کی وجہ سے ہم یہاں تھے وہ تو بڑے مزے سے اُڑن چھو ہو گئی۔ اب کیا ولی کا وقت بھی خراب کرنے کا پروگرام ہے!

طارق جو ابھی ابھی گرما گرم چائے لے کر آیا تھا، اندر کی صورتِ حال دیکھ کر حیرانی اور غصہ سے بولا۔

اسے کہتے ہیں نیکی کر دریا میں ڈال! طارق نے کہا۔
یار کہاوت سچویشن پر جائے نہ جائے لیکن تم بولو گے ضرور۔ ولی نے مسکراتے ہوئے گرم کپ چائے کا پکڑ لیا۔ ویسے اچھی ہے! ولی مسکرا کر بولا۔ کیا لڑکی؟ طارق ابھی تک شاید خود کو حیرانی سے نکال نہ پایا تھا۔ نہیں یار یہ چائے! ولی نے ڈسپوزیبل گلاسوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اُس کے چہرے پر بہت جاندار مسکراہٹ تھی۔ ایسے مت مسکراؤ تم، زہر لگتے ہو! طارق نے جل کر کہا۔ جواب میں ولی کھل کر ہنسا۔

چلو غصہ تھوکو! گھر چل کر تم کو نگی کے ہاتھوں کے گرم پراٹھے کھلاؤں گا۔ یار اماں جان کے بعد صرف نگی کے ہاتھ کا ذائقہ ہے، جو مجھے پسند ہے۔ ولی نے کہا اور طارق کے تو مَن کی مراد بر آئی تھی۔
صبح صبح اپنا مَن پسند منظر دیکھنے کو مل رہا تھا۔ اُس کے کڑے تیور ایک دَم خوشگوار تاثرات میں بدل گئے تھے۔

❖❖○❖❖

نگیٹو ایریاز سے شیپ (Shape) نکالیں، سر بٹ نے ڈرائنگ کی کلاس میں نیا اسائمنٹ دیا تھا۔
چارکول پینسل سے بنایہ اسکیچ بہت دلچسپ تھا۔ اس میں لائن کا استعمال نہیں ہوتا تھا اس ڈرائنگ میں شکل کو دیکھنے کے لیے کاغذ کے سفید حصے کو غور سے دیکھنا پڑتا تھا۔ نگیٹو ایریاز سے اس طرح کام کیا جاتا تھا کہ ڈارک پورشن خالی جگہ میں شکل (شیپ) بناتے تھے۔
سائرہ سامنے پڑے ''کرسی میزوں'' کو، جو کہ ایک دوسرے پر رکھے ہوئے تھے۔ بڑے بیزار انداز میں دیکھ رہی تھی۔
کیا ہوا! مُسکان نے کٹر سے اپنی پینسل کی نوک بناتے ہوئے پوچھا ''یار یہ سر بٹ کا دل نہیں بھرتا گزشتہ تین ماہ سے یہ کرسیوں میزوں کا پہاڑ بنا کر ڈرائنگ کروا رہے ہیں۔'' کبھی پین اینڈ انک کبھی پینسل اور آج یہ نگیٹو ایریاز! تنگ آ گئی ہوں میں سر کے یہ پسندیدہ ماڈلز کے ڈھیر کو بناتے ہوئے۔ سائرہ نے جل کر اونچی آواز میں کہا۔
اوہ ریئلی! آپ کام کرتے ہوئے تنگ آ گئی ہیں تو وائے ناٹ! آپ آج کی کلاس آف کر لیں۔ سر بٹ کی آواز نے سائرہ کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔
اس کے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ کب سر اس کے سرہانے آ کھڑے ہوئے تھے۔
نو سر! وہ۔ میں یہ کہہ رہی تھی، سائرہ سے کوئی بات نہ بن پا رہی تھی۔
کیا؟ سر بٹ بڑی فرصت سے اُس کے پاس پڑے اسٹول پر آ کر بیٹھ گئے تھے۔
آئی ایم سوری سر! سائرہ نے کوئی جائے پناہ نہ پا کر فوراً کہا۔ ایک چیز اپنے ذہن میں رکھنا کہ دنیا میں کوئی چیز بور اور پُرانی نہیں ہوتی۔
''کوئی بھی ماڈل نیا اور پرانا کبھی نہیں ہوتا۔ ایک بچہ کسی میز کو ڈرا (Draw) کرتا ہے تو اس کا دیکھنے کا Imagination بالکل مختلف ہوتا ہے اور جوں جوں ہم بڑے ہوتے ہیں تو ہم ہر روز ایک چہرے کو مزید اچھا اور مختلف بناتے ہیں۔'' سر بٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم اگر تین چار ماہ سے ان چیزوں

ارائنگ کر رہی ہو تو یہ اب تمہارے اندر کے آرٹسٹ کا کام ہے کہ وہ کیسے اس میں سے بہت نیا انوکھا اینگل تلاش کرتا ہے اور کتنا Creative تم کچھ بنا سکتی ہو۔'' انہوں نے سائرہ کو بڑے پتے کی بات بتائی تھی۔

''ارے بچو! جس دن تم نے صرف ان کرسی میزوں کے ڈھیر کی ڈرائنگ کرنی سیکھ لی، اُس دن ہی تم ارائنگ سیکھ لو گے۔ یہ بات تم کو ابھی نہیں پتا چلے گی۔''
جب کام کرنا سیکھ لو گے تو پھر مجھے بتانا کہ کیا محسوس کرتے ہو۔ سر بٹ نے مسکراتے ہوئے سب طالب علموں سے کہا اور سر بٹ کی کسی بات سے وہ انحراف اس لیے نہیں کر سکتے تھے کہ سر بٹ نے بہت ال اسٹوڈنٹ کالج کو دیئے تھے۔
''زندگی میں موجود ہر چیز بہت سالوں سے ہے بس اسے دیکھنے اور بنانے والے کی آنکھ اور اینگل نیا اور مختلف ہونا چاہیے۔ وہ پھر سے گویا ہوئے، لوگ برسوں سے محبت پر لکھتے آ رہے ہیں لیکن ہر شخص کی ہت کی کہانی'' ہمیں الگ نظر آتی ہے۔ ہے ناں؟ سر بٹ نے سائرہ سے پوچھا۔
یس سر! سائرہ نے دھیمے سے جواب دیا۔
بس تم بھی میرے اس پسندیدہ کرسیوں میزوں کے ڈھیر یعنی ماڈلز سے اپنا اینگل اور بالکل نیا اینگل ''اسر بٹ کہہ کر اگلے اسٹوڈنٹ کی جانب بڑھ گئے۔
سر لائٹ اس کارنر پر زیادہ پڑ رہی ہے! کہیں سے آواز آئی تھی اور سر بٹ اُن اساتذہ میں سے تھے، اپنے اسٹوڈنٹس کو بٹھا کر خود کام کیا کرتے تھے۔ اب وہ لائٹ کو خود ہی موو (حرکت) کر کے پوچھ رہے تھے یار اب ٹھیک ہے؟ ''جب لیڈر اچھا اور اپنے کام سے وفادار ہو تو اسے ساتھی بھی قابل مل ہی جاتے ہیں!'' مُسکان کو سر بٹ کی پہلی کلاس میں کہی بات یاد آ گئی
الکل سر! یو آر رائٹ! مُسکان دل ہی دل میں بولی۔ سر بٹ کی کلاس کا کام مہینوں میں نہیں دِنوں میں ال میں آ جاتا تھا اور اس میں صرف ان کی پرسنل لگن اور محنت کا دخل تھا۔
اور لگن، محنت تو ایسی جادو اثر کنجیاں ہیں، جو بڑے بڑے زنگ لگے کند ذہنوں کو بھی کھول دیتا ہیں۔'' مُسکان سائرہ کو بہت انہماک سے کام کرتے دیکھ کر مسکرائی تھی۔

❖❖○❖❖

لہا کیوں ہوتا ہے کہ انسان چھوٹی چھوٹی باتوں میں جب اپنی روٹین بدلتا ہے تو سب سے پہلے پکڑ اُس کی ماں کی نظر ہی کرتی ہے۔
لمان کا کھویا کھویا انداز اور دھیرے دھیرے آپوں آپ مسکرانا اور دن بدن اس کا نکھرے جانا کسی لمی اُس کے دل کا نہ لگنا! خدیجہ بی بی کو پہلے چونکا گیا، پھر فکر مند کر گیا تھا۔
اُن پڑھ ضرور تھیں لیکن زندگی کی گہرائیاں پڑھ چکی تھیں۔
لمھ تھا ضرور مختلف!
اچونک چونک کر اپنی بند کلی کو روز بروز کھلتے دیکھ کر سوچتی تھیں۔ لیکن آخر کیا؟ کیونکہ کوئی ت ان کی نظر میں نہ آ سکی تھی۔

اکثر وہ چپکے سے ایمان کے پاس بیٹھ کر اُسے کھوجتی تھیں۔ ایمان نے اماں کی باخبری کا الارم سُن لیا تھا۔ وہ بہت رازداری اور چالاکی سے خطوط اور تحفے سنبھال کر رکھتی تھی لیکن یہ چالاکی آخر کب تک چل سکتی تھی۔ اماں گرمیوں کے کپڑے نکالنے کے لیے بڑے صندوق کو کھولے بیٹھی تھیں۔

یہ پینڈورا باکس ہی تو تھا جو اچانک کھل گیا تھا۔ اماں کے بدن میں تو جیسے جان ہی باقی نہ رہی تھی۔ ان پڑھ ضرور تھیں لیکن خط پر بنے دل اور اُس میں ترازو تیر اور ٹپکتے خون اور خوشبو بھرے لفافے نے صرف ان کے حواس ہی اُڑا کے نہیں رکھے تھے۔ بلکہ صندوق کے بالکل نیچے پڑی سونے کی چین نے اُن کے کمرے میں موجود آکسیجن بھی جذب کرلی تھی۔ اُن سے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔

ایمان! اُن کے ہونٹوں سے ایمان کا نام سِسکاری کی طرح اُبھرا تھا۔

''اتنا بڑا دھوکا! میری اپنی بیٹی دھی رانی نے دیا۔''

میری اپنی اولاد ایسا کرے گی؟ ایسا تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

بے اعتباری سی بے اعتباری تھی۔ اس رشتے پر اعتبار نہیں تو پھر کس پر کرے! اُن کو یوں لگ رہا تھا کہ کمرے کی چھت دیواریں سب اُن کے وجود پر آن گری ہوں!

''ایمان! میری تربیت کے رنگ اتنے کچے کیسے نکل آئے؟'' اماں کے لہجے میں صدیوں کی تھکن تھی۔

''ارے تجھے کبھی پرایا دَھن جان کر آدھی محبت نہ دی، ہم نے تجھے ہمیشہ ''دھی رانی'' کہا اور بنا کر رکھا۔ ''بول پھر تُو نے ایسا کیسے کیا؟'' اماں نے سِسکتے ہوئے پوچھا۔

ایمان سر جھکائے اپنے ناخنوں سے سستی سے نیل پالش کھرچ رہی تھی۔

''ارے میں نے تو تیرے دوپٹے کو کچے رنگ کبھی نہ رنگے تھے کہ یہ تیرے سر کی اوڑھنی ہے۔ تیری تربیت میں میں نے ہمیشہ پکے سچے اصولوں کو برتا تھا۔''

''پھر...... کیسے تُو ہماری عزت کے ساتھ کھیلنے کو تیار ہوگئی؟'' اماں کی آواز میں کچھ سختی در آئی تھی۔

''بول کہاں کمی رہ گئی میری محبت میں؟''

''میری تربیت میں؟ میری دعاؤں میں؟ یا۔ یا تیری قسمت میں!'' اماں نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

''ہونہہ! تنگ آ گئی ہوں، اس زندگی سے، ہر وقت شُکر شُکر کی گردان کرتے ہوئے۔ آپ نے ہمیشہ زندگی کے رنگوں خوشیوں اور آسائشوں کو قربان کیا ہے!''

''اور یہ گھر نہیں ہے بلکہ قربان گاہ ہے۔ اور میرے والدین قربانی دینے والے عظیم لوگ!''

''دم گھٹنے لگا ہے میرا!'' ایمان نے تقریباً چلاّتے ہوئے کہا۔

اماں تو یوں ساکت و جامد بیٹھی تھیں، جیسے اُن کے جسم سے روح پرواز کرگئی ہو۔ اور یہ سچ ہی تھا ایمان فاطمہ کی محبت اور اعتبار اُن کے اندر ایک روح کی طرح تو تھا۔ اور آج یہ روح ہاتھ چھڑا کر دور نکل گئی تھی۔

پیچھے بے جان جسم اور دل باقی رہ گیا تھا۔

''تیرا دم گھٹنے لگا ہے؟'' اماں کی آواز کسی گہری کھائی سے آتی سنائی دی۔

''اور جن ہَواؤں میں تُو ہے۔ سوچ جب انہوں نے رخ بدلا تو تیرا کیا ہوگا؟'' اماں ایمان کے بہکے قدموں کا یقین کر کے اب اُس سے اُس کا انجام پوچھ رہی تھیں۔ وہ ماں تھیں، اولاد ناسور بھی بن جائے لیکن ماں اُسے کاٹ کر نہیں پھینکتی، چاہے اُس کا زہر اُسے موت کی سوغات ہی دے جائے۔''

''نہیں بدلیں گے ہَواؤں کے رخ! یقین رکھیں۔ ڈاکٹر جی مجھ سے شادی کریں گے۔'' ایمان نے آج بے شرمی اور بے خوفی کی ساری حدیں پار کرلی تھیں۔

''کوئی عام ماں ہوتی تو تیری اس بات پر زبان کھینچ لیتی یا جوتا پکڑ کر کھال کھینچ لیتی! لیکن ایمان میں نے تو تجھے دن رات چاہا ہے اتنی محبت کی۔ خوراک کا دسواں حصہ کسی کتے کو ڈالو تو...... تو وہ بھی اپنے

مالک اور گھر کو نہیں چھوڑتا۔ دل نہیں توڑتا۔"

"پھر...... پھر تو نے ایسا کیوں سوچ لیا۔" اماں نے دونوں آنکھوں کو اپنے ہاتھوں سے چھپالیا تھا۔

"وہ اس منظر کو کبھی دیکھنا نہیں چاہتی تھیں لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہمیشہ سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ انسان کہیں چھپ نہیں سکتا۔"

"اماں! آخر میں نے ایسا کیا برا چاہ لیا؟"

"وہ شادی کرنا چاہتا ہے مجھ سے۔ کیا پسند کی شادی جرم ہے؟ جو آپ مجھ پر یوں الزام لگائے جاتی ہو۔"

ایمان پر ڈاکٹر جی کی پڑھائی پٹیاں اثر دکھا رہی تھیں۔ ورنہ یہ ہی ایمان اماں کے چہرے کے ہر اتار چڑھاؤ کو مانتی تھی۔ والدین کی خوشی میں خوش رہتی تھی۔

جانے کیوں اس ڈاکٹر نے ہمارے گھر کی خوشیوں کو نظر لگادی۔ اماں نے دکھ سے سوچا۔

"پسند کی شادی جرم نہیں ہے! لیکن تو اپنی عمر دیکھ تیرا علم تیرا تجربہ کتنا کم ہے۔"

"اولاد اگر آگ مانگے تو کیا والدین اولاد کے ہاتھ اور جھولی میں انگارے ڈال دیں گے؟" اماں کے لہجے میں اب مضبوطی تھی۔

وہ ایمان کی بے اعتباری کے شاک سے نکل کر اب فیصلہ کن لہجے میں بول رہی تھیں۔

"یہ تو بھول جا کہ تُو اپنا نقصان سوچے گی اور ہم عمل میں تیرا ساتھ دیں گے۔ میں تیری ماں ہوں، تیرا نقصان نہیں سوچوں گی۔"

"اور تُو یہ بھی اچھی طرح جان لے کہ میں اُس بے جوڑ کے آدمی کے حوالے تجھے ہرگز نہ کروں گی جس کی نہ ماں کا پتا نہ باپ کا۔" اماں نے نہایت سختی سے اُسے تنبیہ کی تھی۔

"اور خبردار اگر کوئی رابطہ اُس سے آئندہ کیا۔

تیرے باپ کو خبر ہوگئی تو میری طرح سمجھانے نہیں بیٹھے گا۔ شریف آدمی کا آخری ضبط اور حد اُس کی غیرت ہوتی ہے کوئی اُسے للکار بیٹھے یا کھیلنے کی کوشش کرے تو وہ اُسی عام سے شریف آدمی سے مارا جاتا ہے۔" اماں نے سختی سے کہا۔

"اور تو اچھی طرح جان لے تیرا باپ شریف اور غیرت مند آدمی ہے!" اماں کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ ایمان کا باغی دل کچھ دیر کو سہم سا گیا۔

❖❖○❖❖

پارٹ ٹو والوں کی اینورسری تھی صبح کالج میں کیک کاٹا گیا اور ہلّہ گلّہ کیا گیا۔ سارے کالج کو رات میں **Invite** کیا گیا تھا۔ وہ مختلف پروگرامز اور گیمز وغیرہ کرنے کا پروگرام رکھتے تھے۔ تقریباً سب ہی طلبہ کا رات کو فنکشن میں آنے کا موڈ تھا۔ کالج میں ہر اسٹوڈنٹ ہر وقت کچھ نیا کرنے اور مستی کے موڈ میں نظر آتا تھا۔

مُسکان اور سارہ کی تو اپنی کلاس کا فنکشن تھا۔ مُسکان نے نہ آنے کے لیے لُولے لنگڑے بہانے بنائے تو سارہ باقاعدہ اُس سے لڑ پڑی۔ "اللہ کے واسطے اس قدر قنوطی نہ ہوتی جاؤ! یہ ہی تو دن ہیں

انجوائے کرنے کے، دن رات کلاس کے پروجیکٹ پر محنت کرتے کرتے ایک ہی روٹین سے تم تھک نہیں جاتیں؟" سارہ بولی۔

"بس میں اب تمہارا کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔" سارہ خود بھی اُس کے ساتھ ہی گھر آ گئی اور اکٹھے تیار ہونے کا پروگرام بنایا۔

مُسکان کے وارڈ روب میں اتنے خوبصورت اور قیمتی لباس دیکھ کر سارہ کو بے انتہا غصہ آیا۔ "یہ سب اللہ بچے دینے کے لیے رکھے ہیں؟ اِن کو پہنتی کیوں نہیں؟" مُسکان بے نیازی سے بیٹھی کیوٹکس لگاتی رہی۔

"یہ...... یہ ہاں! یہ پنک اور گرے والا۔ اوں نہیں! اس سے تو زیادہ یہ رائل بلیو والا خوبصورت ہے۔" سارہ خود ہی سوٹ نکالتی اور خود ہی ریجیکٹ کر رہی تھی۔

"ٹھیک ہے فائنل! تم یہ رائل بلیو والا پہنو، سارہ بالآخر فیصلے پر پہنچ ہی گئی۔"

"میم! اگر آپ فیصلہ لے چکی ہوں تو میں کوئی ڈریس پہن لوں؟" مُسکان نے عاجز آتے ہوئے پوچھا۔ کیونکہ سارہ گزشتہ ایک گھنٹے سے الماری میں منہ دیئے کھڑی تھی اور فیصلہ نہ کر پا رہی تھی۔

"ہاں یہ لو...... کیا اس کے ساتھ میچنگ جوتا ہے؟" سارہ کو نئی پریشانی لاحق ہوئی۔

"ہے بھئی ہے...... تم فکر نہ کرو!" مُسکان نے کہتے ہوئے اپنی فل سائز وارڈروب کے ساتھ بنے شوریک کا پٹ کھولا تو سارہ کا منہ ایک دم کُھلا رہ گیا۔

"واؤ...... اتنی کلیکشن!

"تم شاپنگ کی اس قدر شوقین لگتی تو نہیں ہو!" سارہ نے کوئی سو کے قریب مُسکان کے جوتے دیکھے جن کو کبھی پہنتے سارہ نے مُسکان کو نہ دیکھا تھا۔

"یار یہ سب کچھ بابا جانی کرتے ہیں!" مُسکان نے بے نیازی سے کہا۔ "میں نے اماں کو کبھی دیکھا تو نہیں ہے لیکن وہ بھی اگر زندہ ہوتیں تو مجھ سے بابا جانی سے زیادہ پیار نہ کر پاتیں۔" مُسکان کے لہجے میں اپنے بابا جانی کے ذکر پر بہت پیار تھا۔ اُس کے لہجے میں اپنے بابا کے لیے بے انتہا فخر در آیا۔

"مجھے کس چیز کی ضرورت ہے! بابا کو مجھ سے پہلے خبر ہو جاتی ہے۔ وہ دنیا کے سب سے اچھے باپ ہیں!"

"میری ضرورت سے زیادہ میرے لیے خریداری کرتے ہیں، کس فیشن کا جوتا کپڑا زیادہ چل رہا ہے وہ مرد ہو کر جانتے ہیں شاید اس لیے کہ انہوں نے خود کو میرے لیے ماں بھی بنایا ہے۔ یہ سب کچھ بابا کی خوشی ہے اور تم ٹھیک کہتی ہو کہ میں واقعی ان چیزوں کی بہت زیادہ شوقین نہیں ہوں۔" مُسکان نے مسکراتے ہوئے سارہ سے کہا۔

"مُسکان۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو! باپ واقعی بہت اہم ہوتے ہیں ناں زندگی میں؟"

سارہ کے لہجے میں، آنکھوں میں حسرت ہلکورے لے رہی تھی۔ "ہاں! کیونکہ آج میں جو کچھ ہوں صرف بابا کی وجہ سے، وہ میرے لیے خواب دیکھتے ہیں اور ان کو پورا کرنے کے لیے سرتوڑ کوشش کرتے

ہیں۔" مسکان سارہ کی آنکھوں میں آن بیٹھی ڈھیر سی حسرت سے بے خبر بولی۔

"کس قدر خوبصورت احساس ہے ناں 'باپ' کا ہونا!" سارہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی، جس پر پہلی بار مسکان چونکی تھی۔

"آئی ایم سوری سارہ! میں اپنے ہی خیال میں جانے کیا کیا کہہ گئی" مسکان نے معذرت کی۔ "نہیں مسکان! اس میں تمہارا کیا قصور؟ ہر باپ میرے باپ جیسا بزدل اور بے وفا تھوڑی ہوتا ہے!" سارہ کا لہجہ رندھ گیا۔

مسکان نے فوراً اُسے گلے لگالیا۔ یہ واحد ٹاپک تھا، جو سارہ جیسی کھلنڈری اور پیاری لڑکی کو دکھی کردیتا تھا۔ "دیکھو اگر یوں بسورنے لگیں تو میں نہیں جارہی!" مسکان نے سارہ کی توجہ ہٹانے کے لیے ایک دم موڈ خراب کرکے کہا۔

"اچھا پلیز اب موڈ ٹھیک کرلو اور پاری سی بلی بن کر دکھاؤ" مسکان نے اپنی بہنوں کی طرح عزیز سہیلی کو Relax کرنے کی کوشش کی۔

جواب میں سارہ آنسوؤں میں مسکرائی، یوں جیسے چمکتی دھوپ میں ٹھنڈی ہوا کی لہر محسوس ہوئی ہو۔

❖❖○❖❖

"یہ گیم سب کے لیے ہے! ہال میں موجود سب لڑکے لڑکیوں کو اس ہارٹ کی شیپ میں بنے کارڈ بائے نیم دیا جائے گا۔"

پارٹ ٹو کے فاخر اور تانیہ نے مائیک پر اعلان کیا۔ پھر ہال میں موجود سب لڑکے لڑکیوں کو دل کی شکل کے کارڈ دیئے گئے۔ یہ دل Imbosed بنائے گئے تھے اور بڑے سائز کے ہونے کی وجہ سے بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ اِن دلوں کے پیچھے ہر لڑکے اور لڑکی کا نام لکھ کر اُن کو دے دیا گیا تھا۔ بے شک پارٹ ٹو والوں نے بہت محنت اور پیسے لگائے تھے، اس نئے اور Creative کھیل کو کھیلنے کے لیے۔

"اوکے گائز! کیا آپ سب کو اپنے اپنے "دل" مل گئے ہیں؟" تانیہ نے باآواز بلند سب سے پوچھا۔ جواب میں سب اسٹوڈنٹس نے خوشی سے نعرے لگا کر جواب دیا۔

"اوکے! تو پھر آج کی رات اپنے اپنے دل سنبھال لیجیے گا کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی آپ کا دل چھین کر اپنا کرلے۔" فاخر نے ڈرامائی انداز میں ایک ہاتھ اٹھا کر کہا۔

ہر طرف سے قہقہے بلند ہوئے۔ کیونکہ "یہ ہے دل کا معاملہ!" فاخر اور تانیہ کمپیئرنگ کررہے تھے، اکٹھے بولے۔

اس سارے گیم میں کوئی بھی لڑکا کسی لڑکی کے پاس جاکر...... فاخر بولا اور کوئی بھی لڑکی کسی لڑکے کے پاس جاکر اُس کا دل چھین سکتی ہے۔ اس کا دل جیت سکتی ہے" تانیہ نے سنسنی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کو بس یہ کرنا ہوگا کہ جس کا دل آپ کو چاہیے اُس سے سوال کرنے ہیں اور جس کا دل ہوا اُسے اپنا "دل" بچانے کے لیے اُس سوال کا جواب جھوٹ یعنی نفی...... صرف نو (NO) میں دینا ہے۔" فاخر نے پُرجوش انداز میں کہا۔

"جیسے میں فاخر سے کہوں گی۔ فاخر تم دنیا کے سب سے بڑے گدھے ہو!" تانیہ نے فوراً فاخر پر حملہ کردیا۔

"ہرگز نہیں!" فاخر نے آنکھیں نکال کر تانیہ سے کہا۔

"وہ تو تم ہو! لاؤ اپنا دل۔" تانیہ نے ہنستے ہوئے فاخر کے ہاتھ میں اُس کے نام کا دل پکڑتے ہوئے کہا۔ "لو تمہارا دل میں نے چھین لیا۔" تانیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

جواب میں فاخر نے کھسیانا ہوکر حاضرین سے کہا۔ "اوکے! تو ڈیئر فرینڈز! اپنے اپنے دل سنبھال لیں۔"

"یہ نہ ہو کہ آپ بھی میری طرح پہلی بال پر ناک آؤٹ ہوجائیں۔" فاخر کی بات پر ہر جانب سے ہُرے کے نعرے لگنے لگے۔ گیم شروع ہوچکا تھا۔

کئی لڑکیاں اور کئی لڑکے دل جیت کر اسٹیج پر آکر اُن ہارنے والے لڑکے لڑکیوں کا نام اناؤنس کرچکے تھے جن سے وہ دل چھین کر لائے تھے۔

بڑی دلچسپ سچویشن پیدا ہوچکی تھی۔ اور ہر کوئی اپنا آپ بچا رہا تھا۔

مسکان اور سارہ ایک طرف کافی کے کپ پکڑ کر کھڑی تھیں۔

"یہ تانیہ اور فاخر کے شیطانی دماغ نے کہاں لا پھنسایا!" مسکان نے کہا۔

سارہ البتہ ساری سچویشن سے مزہ لے رہی تھی۔

"اے مسکان! وہ دیکھ پرنس آف دا نائٹ!" سارہ نے مسکان کو ٹہوکا دیا۔

"کون؟" مسکان نے اپنے سنہری بال پیچھے کرتے ہوئے پوچھا۔

"کون ہوسکتا ہے؟ وہ ہی ہے تمہارا عبدالولی!" سارہ نے چبا چبا کر کہا۔

مسکان کی ہارٹ بیٹ یکدم تیز ہوگئی۔ سارہ کے یوں "تمہارے" کہنے پر۔

ہلکی ہلکی شیو عبدالولی کی سنہری رنگ پر بہت اچھی لگ رہی تھی۔ گھنے بال آج اُس نے جل لگا کر سیٹ کیے تھے اور بلیک سوٹ پہنا تھا۔

سوٹ تو تقریباً سب لڑکوں نے پہنے تھے لیکن مسکان اپنے دل کا کیا کرتی، جسے صرف ولی ہی سب میں نمایاں لگ رہا تھا۔

ولی خاص تھا وہ بہت سارے لوگوں میں الگ سا نظر آتا تھا۔ لیکن مسکان کی نظروں نے تو اُسے خاص الخاص بنادیا ہے۔

"اے...... کدھر چل دیئے کھڑے کھڑے؟" سارہ نے اُسے باقاعدہ پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔

"واپس آجاؤ تمہاری خیالی گاڑی کا پیٹرول ختم ہوجائے گا۔" سارہ نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ اس کی یہ خوش مزاجی شاید اردگرد کے چنچل ماحول کی وجہ سے بھی تھی۔

"سارہ! ولی میں کچھ بہت خاص ہے ناں؟"

"دیکھو کتنی لڑکیاں اُس کا دل چھیننے کے لیے ٹرائی کرچکی ہیں!" مسکان نے ولی کو یک ٹک دیکھتے ہوئے دھیمے سے کہا۔

''ہاں دیکھ رہی ہوں اِن کو بھی اور تم کو بھی۔'' سائرہ نے شرارت سے مُسکان کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔
''اچھا تم میرے ساتھ چلو۔'' اچانک ہی سائرہ نے مُسکان کا ہاتھ پکڑ کر اُسے کھینچا اور جب وہ عین ولی اور ٹی ٹو کے پاس جا کر رُکی تو مُسکان نے ایک بھرپور خفا سی نظر سائرہ پر ڈالی۔
لیکن سائرہ لگتا تھا کہ کچھ سننے کے موڈ میں نہ تھی۔
''ہیلو!'' سائرہ نے کھنکتی ہوئی آواز میں ولی کو مخاطب کیا۔
''وعلیکم ہیلو! کیسی ہیں سائرہ آپ؟'' ولی نے سائرہ کو خوش دلی سے جواب دیتے ہوئے ایک اچٹتی نظر مُسکان پر بھی ڈالی تھی۔
مُسکان کی ہارٹ بیٹ پھر مِس ہونے لگی۔
وہ ولی سے اکثر ملی تھی۔ لیکن آج اُس کا سامنا کرتے ہوئے اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔
وہ اپنی کلاس کی غیر معمولی ذہین اور پُراعتماد لڑکی تھی لیکن ولی کے معاملے میں اُس کا اپنا دل چور تھا، اس لیے اُس کی ساری خود اعتمادی بھک سے اُڑ جاتی تھی۔
''آج آپ بہت اچھے لگ رہے ہیں!'' سائرہ نے بلا جھجک ولی کی تعریف کی۔ ولی کی مسکراہٹ بے ساختہ تھی۔
کیونکہ ٹی ٹو منہ ہی منہ میں پچیس (25) بدبدایا تھا۔
ٹی ٹو مسلسل ولی کے پاس آ کر باتیں کرنے اور اُس کی تعریف کرنے والی لڑکیوں کی کاؤنٹنگ کر رہا تھا۔
''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' سائرہ کے تیز کانوں نے ٹی ٹو کا جملہ سُن لیا تھا۔
''مطلب آپ سلیس اردو میں پسند کریں گی کہ آسان انگلش میں؟'' ٹی ٹو نے جواباً شوخی سے پوچھا۔
''اے انکل آپ حد سے باہر بات کریں گے تو مشکل ہوگی!'' سائرہ نے شعلہ برساتی نظروں سے ٹی ٹو کو دیکھتے ہوئے غصے سے کہا۔
''کم آن بے بی! میں کیوں حد سے باہر آؤں گا، حد کے پاس تو خود آپ چل کر آئی ہیں۔'' ٹی ٹو بھی کہاں رکنے والا تھا۔ فوراً بولا۔
''ارے...... ارے یہ اتنے ٹھنڈے موسم میں آگ کیوں بھڑکنے لگی؟'' عبدالولی نے عین وقت پر سفید جھنڈی لہرائی۔
''ہونہہ...... یہ آپ اپنے انکل سے پوچھیں۔'' سائرہ باقاعدہ پھنکاری۔ ٹی ٹو کے چہرے پر بہت دلفریب مسکراہٹ دَر آئی تھی۔ لفظ ''انکل'' پر۔
اُسے یہ لڑتی بھڑتی لڑکی ایک دم بہت اچھی لگی تھی۔
''اوکے! میرا خیال ہے کہ ٹی ٹو تم محترم خاتون سے سوری کرلو۔'' عبدالولی نے اپنی مسکراہٹ زبردستی روکتے ہوئے کہا۔ ورنہ یہ بات طارق تک جاسکتی ہے!
''اور اِن کو کہیں کہ اپنے الفاظ بھی واپس لیں۔'' سائرہ نے اصرار کیا۔
''اوکے بے بی! پچیس نہیں بلکہ چوبیس لڑکیاں کرلیتے ہیں۔'' ٹی ٹو نے خلافِ توقع فوراً صلح کا جھنڈا

لہرا کر اپنی گنتی واپس لی۔
''اور یہ مجھے بے بی کیوں کہہ رہے ہیں؟'' سائرہ جس مقصد کے لیے آئی تھی اُسے بھول کر ٹی ٹو سے اُلجھ کر بولی۔
''کیوں کہ آپ مجھے مسلسل ''انکل'' کہہ رہی ہیں، اس رشتے کے ناطے میں نے آپ کو بے بی کہا۔'' ٹی ٹو نے بہت شائستہ لہجے میں جواب دیا۔
''وہ...... وہ تو۔'' سائرہ نے انگلی اٹھا کر کچھ کہنے کی کوشش کی تھی۔
''سائرہ!'' مُسکان نے سائرہ کو دبے دبے لہجے میں ڈانٹا۔ ''کنٹرول یور سیلف۔'' مُسکان نے باقاعدہ اُسے گھورتے ہوئے کہا۔
ولی نے اُس بار اُسے بہت غور سے دیکھا تھا۔ مُسکان کے چہرے پر بہت سے رَنگ تھے۔ خفگی، غصہ، پریشانی! اُسے ایک دَم اپنے روکھے پن کا احساس ہوا تھا۔
لیکن وہ خود کا کیا کرتا۔ یہ بے نیازی اُس کی شخصیت کا خاصا تھی اور اکثر لڑکیاں اس سے ہرٹ ہوجاتی تھیں۔
''اور ولی! کل آپ نے فون پر مجھے مُسکان کے ہی متعلق کہا تھا ناں؟''
''کہ آپ کو اِس سے محبت ہوگئی ہے!'' سائرہ نے دھماکہ کیا۔ باقی کے تینوں نفوس دم بخود ہو کر رہ گئے تھے۔
''سوری! کیا میں نے آپ کو فون کیا تھا؟'' ولی کے لہجے میں ایک دم سنجیدگی دَر آئی۔
''بالکل! کیا آپ نے مجھے فون نہیں کیا تھا؟'' سائرہ نے حیران ہوتے پوچھا۔
''نہیں...... بالکل نہیں!'' ولی نے نہ سمجھتے ہوئے جواب دیا۔
''کیا آپ مُسکان سے محبت نہیں کرتے؟'' سائرہ بولی۔
''ہرگز نہیں! جب میں نے آپ کو فون کیا ہی نہیں تو میں ایسی بات کیوں کروں گا۔''
ولی کے اِنکار پر مُسکان کے چہرے کی ایک دَم رنگت بدل گئی۔
''حیرت ہے ولی۔ آپ اپنی بات سے مُکر رہے ہیں۔'' طارق کی وجہ سے میں آپ کو بھی ہمیشہ بھائیوں کی طرح چاہتی ہوں، آپ میرے سامنے اپنی بات سے کیونکر مُکر سکتے ہیں؟ سائرہ نے نہایت سنجیدگی سے ولی کو دیکھتے ہوئے کہا۔
''اب آپ یہ بھی کہیں گے کہ یہ انگوٹھی بھی آپ نے مجھے مُسکان کو دینے کے لیے نہیں دی تھی۔'' سائرہ نے بیگ سے ایک انگوٹھی نکال کر تینوں کے سامنے لہرائی۔
مُسکان کو تو اپنی ٹانگوں پر کھڑے رہنا دشوار لگ رہا تھا۔ اور ٹی ٹو کا منہ کُھل کر رہ گیا تھا۔
''ہرگز نہیں! میں نے آپ کو ایسی کوئی چیز نہیں دی!'' ولی کے ماتھے پر شکنیں نظر آنے لگی تھیں۔
''بے شک سائرہ آپ میرے لیے طارق کی نسبت کی وجہ سے بہت محترم بھی ہیں لیکن آپ نے جو کچھ کہا، وہ جھوٹ ہے اور میں اسے بالکل نہیں مانتا۔'' عبدالولی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
''تو آپ مانتے ہیں ناں کہ میں نے اب تک جو کہا وہ جھوٹ تھا۔'' سائرہ کی آواز ابھی تک ہشاش

بشاش تھی۔

''جی ہاں!'' ولی نے کچھ منہ بنا کر کہا۔

''اور یہ انگوٹھی آپ نے مجھے مُسکان کے لیے نہیں دی!'' سائرہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''جی ہاں میں نے نہیں دی۔'' ولی نے سائرہ کے یوں ہنسنے پر حیرانی سے اُسے دیکھا۔

''لیکن مسٹر عبدالولی! بے شک آپ ہمیں انگوٹھی نہ دیں لیکن آپ کو ''اپنا دل'' ہمیں دینا ہوگا۔ کیونکہ آپ گیم ہار گئے ہیں۔

سائرہ کی مسکراہٹ ہلکے سے قہقہے میں بدل گئی تھی۔

''اوہ میرے اللہ! آپ کتنی بڑی اداکارہ ہیں!'' ٹی ٹو اپنے آپ کو کہنے سے بالکل نہ روک سکا۔

ولی ساری بات سمجھ کر بے اختیار مسکرایا۔ اُس نے سائرہ کے ڈرامے کو نہ سمجھنے پر کچھ خفت بھی محسوس کی تھی۔ ''بے انتہا ذہانت رکھنے والے بھی اکثر چُوک جاتے ہیں۔''

''تو لائیے اپنا دل۔'' سائرہ نے ہاتھ بڑھایا۔

ولی نے دل شیپ کا بنا بڑا سا کارڈ، جس پر اُس کا نام لکھا تھا۔ اُس کی طرف بڑھا دیا۔

''آں...... لیکن یہ دل! آپ کو اپنا دل مُسکان کو دینا ہوگا کیونکہ یہ آئیڈیا مُسکان کا تھا۔'' سائرہ نے ایک دم پینترا بدلا اور مُسکان کو لگ رہا تھا کہ ضرور سائرہ کی کافی میں نشہ تھا کیونکہ اُس کی ان بہکی حرکتوں پر مُسکان کا دل سائرہ کا سر پھاڑنے کو کر رہا تھا۔

''اوکے! مس مُسکان: یہ لیں یہ دل آپ کا ہوا!'' ولی نے خوشدلی سے کہا۔

مُسکان کا اپنا دل ولی کے یوں کہنے پر سرپٹ دوڑنے لگا تھا۔ اتنا بے قابو کہ مُسکان کا چہرہ ایک دَم بلش ہوگیا اور اُس نے لرزتے ہاتھوں سے ولی کا دل تھاما۔

اُسی پَل فلش چمکا۔ اسد نے اُن کی تصویر کھینچ لی تھی اب اسد اور ماجد بے باکی سے ہنس رہے تھے۔

''یہ کیا ہے اسد؟'' ولی نے سختی سے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں! تم دل دے رہے تھے، ہم نے اس یادگار پَل کو ہمیشہ کے لیے قید کرلیا۔'' اسد نے بے خوفی سے کہا۔

''تم کون ہوتے ہو یوں ہماری تصویر لینے والے؟'' ولی نے بہت کنٹرول کے ساتھ کہا۔ اُس کا ایک بار بھی غصے سے ان لڑکوں سے بھڑنا مُسکان کے لیے پریشانی کا باعث بن سکتا تھا۔

سارے کالج میں خوامخواہ اسکینڈل بن سکتا تھا اس لیے ولی نے نہایت تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔

''ہم...... ڈیئر کلاس فیلو! ہم تمہارے ڈیئر کلاس فیلو لگتے ہیں۔'' ماجد نے بدتمیزی سے جواب دیا۔

''دیکھو ماجد تمیز سے یہ کیمرے کا رول ہمارے حوالے کردو!'' ٹی ٹو نے کہا۔

''اوئے ہوئے! یہ بچہ بھی بولتا ہے!'' اسد اور ماجد ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولے۔

''تم شرافت سے ہماری بات نہیں مانو گے؟'' ولی نے خونخوار نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

اوں...... ہوں!'' دونوں یک زبان ہوکر بولے اُن کا ایک ایک تاثر غصہ دلانے والا تھا۔

''ابھی نہیں ملے گی یہ تصویر۔ ابھی تو اس پر کام کرنا ہے!'' ہمارے ڈیزائنر ہونے کا کیا فائدہ ہوگا۔ اسد کے

لہجہ میں دھمکی تھی۔

''تیری تو طبیعت میں ابھی صاف کر دیتا ہوں۔'' اچانک ہی ٹی ٹو آگے بڑھ کر گتھم گتھا ہوگیا۔

''سائرہ...... مُسکان! تم دونوں مجھے ایک سیکنڈ کے اندر یہاں سے غائب نظر آؤ۔'' ولی نے سختی سے اِن کو باہر کی طرف دھکیلا۔

مُسکان اور سائرہ بدحواسی میں ہال سے باہر آ گئیں۔ اندر ایک شور برپا تھا۔

مُسکان نے سائرہ کو خوفزدہ نظروں سے دیکھا۔

ولی نے اُن کا نام اس جھگڑے میں نہ آئے، اس لیے ان کو وہاں سے چلے جانے کو کہا تھا۔

لیکن اندر سے آنے والی آوازیں مُسکان کے قدموں میں زنجیر ڈال رہی تھیں۔ مُسکان کا ڈرائیور کم باڈی گارڈ ان کو دیکھتے ہی الرٹ ہوکر گاڑی کا دروازہ کھول کر کھڑا ہوگیا تھا۔

''چلو!'' سائرہ نے زبردستی مُسکان کو کھینچ کر اندر بٹھایا۔

''سائرہ...... وہ۔؟'' مُسکان ڈرائیور کی موجودگی میں بے بس تھی اور کوشش کر رہی تھی کہ اُس کے آنسو باہر نہ آئیں۔

''چُپ...... گھر جا کر بات کریں گے۔'' سائرہ نے ڈرائیور کو بیک ویو مرر سے اُن کی جانب غور سے دیکھتے ہوئے دیکھا تو مُسکان کا ہاتھ دبا کر چُپ رہنے کا اشارہ کیا۔

❖❖○❖❖

''چلو یار غصہ تھوکو! مٹی ڈالو...... رات گئی بات گئی۔'' ماہ رخ نے واکنگ ٹریک کی اسپیڈ بڑھاتے ہوئے کہا۔

ترنم اور وہ دونوں اس وقت جم میں ورزش کر رہی تھیں۔ ماہ رخ کو اپنے فگر کا بہت خیال رہتا تھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے میں اُس بڈھے آفاقی کو اتنی آسانی سے معاف کردوں گی؟'' ترنم کا چہرہ کچھ ہانپنے اور کچھ غصے سے تمتما رہا تھا۔

''لیکن یار وہ گزشتہ دو ہفتوں سے بلا ناغہ تم سے معافی مانگنے آرہا ہے، اب اُس پر رحم کرلو۔'' ماہ رخ چاندنی میڈم کے کہنے پر سفارش کر رہی تھی۔

خود شروع میں چاندنی میڈم کو آفاقی پر بہت غصہ تھا لیکن ابھی کل ہی وہ ہیروں کا ایک اور بیش قیمت سیٹ دے کر گیا تھا اسے ترنم کے ہار کی چوری کی خبر مل گئی تھی، اب وہ اسے منانے کے لیے پورا سیٹ لے کر آیا تھا جس پر چاندنی میڈم کا موڈ بحال ہوا تھا اور ترنم کا غصہ اتارنے کی ڈیوٹی ماہ رخ کی لگائی تھی۔

اور اب وہ ترنم کا مسلسل دماغ کھا رہی تھی۔

''چلو بس!'' ترنم نے واکنگ ٹریک کا بٹن بند کر کے چلنے کا اشارہ کیا۔ ''لیکن وہ آفاقی۔'' ماہ رخ نے شرارت سے کہا۔

''بھاڑ میں جائے۔ ترنم نے تولیے سے پسینہ صاف کر کے غصے سے تولیہ پھینکا۔ ارے جس آگ کو وہ لگا چکا ہے، اُس کے بعد ہر بھاڑ، آگ کم پڑے گی۔'' ماہ رخ نے بے باکی سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''ماہی! تم...... تم کاش ذرا ڈھکا چھپا بولو تو کتنا اچھا لگے۔'' ترنم نے نارمل لہجے میں کہا تھا وہ شاہ تو لیے کے ساتھ ہی اپنا غصہ بھی پھینک چکی تھی۔ ویسے بھی اُس بُری رات کی ''صبح'' کتنی یادگار تھی۔

''اُسے وہ ساحر پھر سے ملا تھا۔ اوکے! لیکن اب تم دوبارہ آفاقی سے موڈ نہ بنانا، یہ آپا کا بھی پیغام ہے۔'' ماہ رخ نے چاندنی میڈم کی ہدایت بھی پہنچادی تھی۔

''ہونہہ۔'' ترنم نے سر جھٹکا۔

''پیسے کی پجارن جس کا غصہ، خوشی ہر چیز پیسوں سے بڑھتی کم ہوتی ہے۔ اللہ جانے یہ اتنا ناجائز پیسہ اس کی ہوس کیوں پوری نہیں کردیتا۔ اس کو اور کتنا چاہیے۔ اس اور کے لیے جانے اور کتنی زندگیاں برباد کرے گی۔'' ترنم نے کھڑے ہوتے ہوئے سوچا۔

❖❖○❖❖

''واہ بیٹا یہ تو بہت خوربصورت ہے!''

''گڈ! بہت عمدہ!'' احمد شاہ نے کتنے ہی لفظوں میں نگینہ کے کولاج ورک کی تعریف کی تھی۔

''نہیں بابا...... میں تو ویسے ہی بھائی کے کام سے متاثر ہوکر یونہی کوشش کررہی تھی۔''

نگینہ بے حد شرمیلی تھی۔ اب بھی اپنی تعریف پر سرخ پڑگئی تھی۔

''بیٹا تم نے یہ لینڈ اسکیپ بہت خوبصورت بنایا ہے۔'' احمد شاہ نے اسے یقین دلایا۔

''بابا! میں نے تو ایویں سا بنایا ہے کبھی بھائی کا کام دیکھیں۔ بھائی کا تو کام بولتا ہے۔'' نگینہ نے معصومیت سے اپنی تعریف پر اِنکار کیا۔

''لیکن میری جان! آپ کے بھائی نے چار سال اس کام کی تربیت حاصل کی ہے جبکہ آپ نے کبھی ایسی ٹیکنیک کی تربیت نہیں لی۔ پھر بھی صرف دیکھ دیکھ کر اتنا اچھا کام کیا ہے۔'' یہ بہت بڑی بات ہے۔

''میں آپ کے کام کی نمائش کراؤں گا۔'' احمد شاہ اپنے بچوں کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور کام کو ہمیشہ بڑھ چڑھ کر سیلیبریٹ کرتے تھے۔

''بابا آپ بھی ناں!'' نگینہ شرماسی گئی۔

''اچھا چلو میں آپ کو ایک بہت مشہور قصہ سناتا ہوں۔'' احمد شاہ یوں ہی باتوں ہی باتوں میں اپنی اولاد کی تربیت کرتے تھے۔ ان کو خوداعتمادی دیتے تھے۔

''اچھا تو میں آپ کو کچھ بتا رہا تھا۔ مشہور امریکی موسیقار اور مینجمنٹ کنسلٹنٹ مائیکل جونز اب سے کچھ سال پہلے ایک معمولی ہوٹل میں آرکسٹرا بجانے کا کام کرتا تھا۔ اگرچہ اس نے اپنا ذاتی میوزک بھی تیار کرا رکھا تھا لیکن وہ بہت کم اپنا میوزک بجاتا تھا۔ وہ اکثر اوقات مشہور امریکی گلوکاروں کے مشہور گانوں کی دُھنیں بجاتا تھا۔ ایک دن وہ حسبِ معمول میوزک بجانے میں مصروف تھا کہ ایک بوڑھا شخص اس کے پاس آیا ایک کرسی قریب گھسیٹی اور بیٹھ کر بڑے انہاک سے میوزک سننے لگا۔ اس کے اس طرح توجہ دینے سے مائیکل ذرا کنفیوژ ہوگیا۔ بوڑھے نے انتہائی مہربان انداز میں اشارے سے اس سے اپنا کام جاری رکھنے کی درخواست کی۔

اچانک بوڑھے نے اسے ٹوکا اور کہا۔ ''وہ میوزک جو تم پہلے بجارہے تھے۔ کس فلم کا ہے؟''

''وہ کسی فلم کا گیت نہیں بلکہ میری اپنی بنائی ہوئی دُھن ہے''

''مائیکل نے جھجکتے ہوئے قدرے شرمساری سے کہا۔''

''لیکن تم اتنے شرمندہ کیوں ہورہے ہو؟ میں تمہارے پاس مشہور فلموں کے گانے سننے نہیں آیا تھا بلکہ تمہارے ذاتی گانے کے میوزک نے ہی مجھے تمہاری طرف چلے آنے پر مجبور کیا۔'' بوڑھا آدمی بولا۔

تعریف سننے کے بعد بھی مائیکل کو لگا، جیسے یہ بوڑھا محض اس کا دل رکھنے کے لیے اس کے کام کو سراہ رہا ہے۔

''لیکن وہ تو بہت عام سا گیت ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ اتنا اچھا ہے کہ اسے سب کے سامنے بجایا جائے۔'' مائیکل نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''اس لمحے بوڑھے نے بڑے مضبوط، پروقار اور جادوئی لہجے میں مائیکل کی گہری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔''

''اگر تم خود اپنا میوزک نہیں بجاؤ گے تو پھر کون بجائے گا۔''

''آگہی کی اک نئی لہر اس کے پورے جسم میں سرایت کرگئی۔ بوڑھے کے اس طلسماتی جملے کا سحر ٹوٹا تو اس نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ آرکسٹرا پر اس کی اپنی پسندیدہ دُھن پر جھوم رہے تھے۔ اور بوڑھا اسی باوقار انداز میں اپنی نشست پر واپس جارہا تھا۔''

''اگر تم خود اپنا میوزک نہیں بجاؤ گے تو پھر کون بجائے گا'' مائیکل نے بوڑھے کے الفاظ دہرائے تھے، جسے اب وہ دور جاتے ہوئے شکر گزار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''اس ایک جملے نے مائیکل جونز کی پوری زندگی کی سمت بدل کر رکھ دی۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کے اندر کے ''بیج'' پر نشوونما کے نئے دَر کھول دیے ہوں۔ اس وقت مائیکل جونز نے تہیہ کیا کہ وہ آئندہ صرف اپنی دُھنیں بجائے گا۔''

''آج مائیکل جونز ایک نامور موسیقار اور کارپوریٹ ٹرینر ہے اور دنیا کی اہم ترین کمپنیوں میں تخلیقی صلاحیت کی نشوونما پر ٹریننگ دیتا ہے۔''

''بیٹا جو خود کو پہچان لیتا ہے، وہ ہی پہچانا جاتا ہے۔ خود کی قدر کرنا کامیابی کی پہلی سیڑھی ہے! احمد شاہ نے رسان سے نگینہ کو بتایا۔''

''خود کو اور خود کی صلاحیتوں کو کبھی کم اور شرمندگی کا باعث نہیں سمجھنا چاہیے۔''

احمد شاہ کے الفاظ نگینہ کے اندر ہمیشہ کی طرح زندگی دوڑا رہے تھے۔

''باباجانی میں اور بھائی ایسے تھوڑا ہی آپ پر اتنا فخر کرتے ہیں۔ آپ دنیا کے سب سے اچھے بابا ہیں۔'' نگینہ نے معصومیت سے کہا۔

نگینہ کا اعتراف احمد شاہ کے اندر اطمینان کی لہر دوڑا گیا تھا۔ ''اے اللہ! تو مجھے ان بچوں کے معاملے میں سرخرو رکھنا۔'' وہ ہمیشہ دل میں یہ ہی دعا کرتے تھے۔

''بابا آپ نے کبھی اپنی بات ہم پر نہیں ٹھونسی۔ آپ نے ہمیشہ اتنے پیار سے سمجھایا ہے کہ وہ بات ہمارے اندر جذب ہوکر ہماری ذات کا حصہ بن جاتی ہے۔'' نگینہ نے اپنا سر اِن کے شانے پر ٹکاتے

ہوئے کہا۔

"میرے پیارے بیٹے اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ آپ تو میری آنکھوں کا نور ہو۔" احمد شاہ نے پیار سے اُس کا سر تھپتھپایا۔

"اور بھائی کیا ہے آپ کے لیے" نگینہ نے شوخی سے پوچھا۔ "وہ میری آنکھیں ہیں!" احمد شاہ ہنستے ہوئے بولے۔

"بابا جانی اِٹس ناٹ فیئر۔" نگینہ بولی۔

"میری جان! تم دونوں ہماری جان ہو اور لازم وملزوم ہو۔" احمد شاہ نے اُسے پیار سے سمجھایا۔

اُسی پل فون پر بیل ہوئی۔ نگینہ نے سی ایل آئی پر نمبر دیکھ کر احمد شاہ کو بلایا۔ "بابا جانی لاہور سے کال ہے، گھر سے ہے آپ بھائی سے بات کریں گے؟" نگینہ نے کہتے ہوئے فون اٹھالیا۔ آج کل وہ ویک اینڈ پر اپنے اماں بابا سے ملنے آئی تھی۔

فون سنتے ہی اُس کا چہرہ ایک دم پریشان ہوگیا۔

"کیا بات ہے بیٹا؟" احمد شاہ ایک پل کے ہزارویں حصے میں الرٹ ہوگئے تھے۔ عبدالولی کو گولی لگنے کے حادثے کے بعد وہ خاصے فکرمند رہنے لگے تھے۔

"وہ...... بابا وہ۔" نگینہ نے حلق تر کرتے ہوئے بمشکل بولنے کی کوشش کی۔

"طارق بھائی کا فون تھا۔ عبدالولی بھائی اسپتال میں ہیں، کالج کے کچھ لڑکوں سے اُن کی لڑائی ہوگئی ہے!" نگینہ نے جو کچھ بتایا تھا، احمد شاہ کا دل ماننے کو تیار نہ تھا۔ "میرا بیٹا کسی سے لڑائی نہیں کرسکتا!"

"میرے بیٹے کی نیچر غصے والی تو ہے نہیں۔ لیکن آخر کیا معاملہ ہوا؟"

اُن کا دل ایک دم پریشان ہوا تھا۔ وہ فوراً لاہور روانگی کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔

"ولی میری جان! اللہ تم کو اپنی حفظ وامان میں رکھے۔"

ان کا دل یہ دعا تسبیح کی طرح پڑھ رہا تھا۔ گاڑی لاہور کی جانب تیزی سے رواں دواں تھی اور مختلف سوچیں بھی اُسی رفتار سے اِن کو اُلجھا رہی تھیں۔

"آخر میرے بچے کا کون دشمن ہے؟" یہ سوال اُن کے ذہن میں گھوم رہا تھا۔

❖❖○❖❖

وہ گہری نیند میں تھی لیکن باہر کی آوازوں کا شور اسے شعور میں لے آیا تھا۔ اچانک نیند ٹوٹنے پر اُس نے اپنے اِرد گرد دیکھا پھر باہر سے آتی آوازوں کو سنتے ہوئے پیروں میں چپل ڈال کر باہر ہی کا رخ کیا۔

باہر خالہ جی جی بڑے زور وشور سے کوئی کہانی اماں کو سنارہی تھیں۔ گلی میں بھی باتوں کا شور تھا۔

"ارے میں تو خدا لگتی کہوں گی کہ وہ لڑکی تو تھی ہی ایسی۔ دیکھ لو آج کیا دن دکھا گئی ہے ماں باپ کو۔" خالہ جی جی جو محلے کی بی بی سی کہلاتی تھیں۔ خدیجہ بی بی کو جانے کس کے متعلق بتارہی تھیں۔

چھوٹا سا گھر اور چھوٹا سا کچن اور گھر کی آوازیں ایک جگہ سے دوسری جگہ فوراً بھاگی آتی تھیں۔ سب کچھ سنائی دیتا تھا۔

"کتنا بھی کہے وہ درزن ریحانہ! لیکن دیکھوناں وہ ڈاکٹر جی تو اپنے کلینک پر ہی بیٹھا ہے!" خالہ جی کے جملے نے ایمان کو چونکا دیا۔

"یہ ڈاکٹر جی کا ذکر کہاں سے آیا؟" ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ خالہ کا دوسرا جملہ بھی کانوں میں آگھسا اور وہ گھبرا کر ہر کام چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اگر درزن کی گُوی کو ڈاکٹر بھگا کرلے گیا تھا تو ڈاکٹر واپس کیوں آیا؟ اور پھر گُوی کہاں ہے؟"

"اور ڈاکٹر درست کہتا ہے کہ اگر اُس نے یہ کام کیا ہوتا تو وہ بھی تو گُوی کے ساتھ بھاگ جاتا۔"

خالہ جی جی کی باتیں ایسی مبہم نہ تھیں کہ ایمان کو سمجھ نہ آتیں۔

"لیکن وہ ریحانہ درزن تو پٹ رہی ہے کہ اُس کی گُوی کو اس ڈاکٹر نے پیچھے لگایا ہوا تھا۔ درزن کہہ رہی تھی کہ اُس کی کڑی ہر وقت ڈاکٹر کی باتیں کرتی تھی، اپنی بہنوں کے ساتھ۔ پھر وہ ہر وقت اُس کے کلینک جاتی تھی۔ کبھی چھپ کر اور کبھی سامنے، پھر یہ ڈاکٹر اُسے تحفے بھی دیتا تھا اور کچھ روز سے اُس کی گُوی نے ڈاکٹر کے ساتھ ویاہ (بیاہ) کی ضد شروع کردی تھی۔ جس پر اُس کے نشئی ابے نے کل اس کو مارا تھا۔"

"اور پھر وہ گُوی راتوں رات پُھر ہوگئی۔ توبہ توبہ کیا زمانہ آگیا ہے!"

خالہ جی جی نے اپنے گال پیٹتے ہوئے کہا۔

ایمان نے دروازے کا سہارا لے رکھا تھا۔ ورنہ اُس کی ٹانگوں میں جان نہ تھی۔

"ویسے آپا خدیجہ!" خالہ جی جی کو ہر ایک کو آپا باجی کہنے کا خبط تھا۔ خدیجہ بی بی خالہ جی جی سے کہیں چھوٹی تھیں۔

"اُس درزن کی بات میں بھی دم ہے۔ میں نے خود اُس گُوی اور ڈاکٹر کو ایک دوبار گلی میں ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔" خالہ جی جی نے زرد ہوتی رنگت والی خدیجہ بی بی کے پاس کھسکتے ہوئے کہا۔

"خالہ جی جی آپ چائے پییں گی۔" اماں کی کمزور سی آواز بلند ہوئی۔ وہ شاید خالہ جی جی کو موضوع سے ٹالنا چاہ رہی تھیں۔

"ارے چائے بھی پی لیں گے۔" خالہ جی جی نے اطمینان سے ٹانگیں چارپائی پر چڑھاتے ہوئے کہا۔

"تیری گڑیا نظر نہیں آرہی؟" خالہ جی جی نے نظریں اِدھر اُدھر گھماتے ہوئے پوچھا۔

"دوپہر کھانے کے بعد سوگئی تھی، کمرے میں ہے۔" اماں کی آواز بھی ہوئی تھی۔

کیونکہ خالہ جی جی تو آہٹوں سے داستان سن لیتی تھی، اس قدر گھاگ اور تیز خاتون تھیں کہ اُن کی نظر اور زبان سے کم ہی کوئی بچ پاتا تھا۔

"اللہ نیک نصیب کرے اور نیکی کی ہدایت دے رکھے۔ آج کل کی اولاد تو آزمائش ہے آزمائش!"

خالہ جی جی کی باتیں خدیجہ بی بی کا دل بٹھائے جارہی تھیں۔

اور اندر کھڑی ایمان فاطمہ دوہری سوچ میں تھی۔ دل اس سچائی کو مان کے نہ دے رہا تھا۔ اور دماغ جو لہ رہا تھا دل کا شور اُسے سننے نہ دے رہا تھا۔

''آخر سچ کیا ہے؟''

''میرے ڈاکٹر جی تو ایسے نہیں ہیں!''

''پھر انہوں نے قسم کھا کر کہا تھا وہ صرف اور صرف مجھے چاہتے ہیں۔''

نادان دل اور کچی عمر! جھوٹی قسموں کو معتبر سمجھ بیٹھا تھا ایک عجیب سا انتشار تھا، جو اُس کے سارے وجود کو گھیرے ہوا تھا۔

❖❖○❖❖

''ٹیک اٹ ایزی مُسکان!'' سائرہ کی اپنی حالت بھی کچھ بہت اچھی نہ تھی لیکن وہ پھر بھی مُسکان کو ہمت دلا رہی تھی۔

جو گھر آتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ وہ تو شکر تھا کہ آپا اماں عشاء کے بعد نوافل لمبے چوڑے پڑھا کرتی تھیں۔ اس وقت وہ اپنے کمرے میں مشغول تھیں ورنہ اُن کی نظروں اور سوالوں سے بچنا ناممکن تھا۔

سائرہ نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا تھا اور جگ سے پانی نکال کر پہلے خود پیا پھر مُسکان کے لیے لے کر آئی۔

''یار پلیز مجھے کچھ سوچنے دو گی!'' سائرہ ان حالات اور پھر مُسکان کے بری طرح رونے سے اندر تک گھبرائی ہوئی تھی۔

''میں لالہ کو فون کرتی ہوں۔'' سائرہ نے کہا۔

''لیکن......لیکن! لالہ یہ سب جان کر بہت خفا ہوں گے۔'' سائرہ کہہ کر خود ہی ٹھہر گئی۔

سائرہ کے موبائل پر گھر کا نمبر آ رہا تھا۔ مُسکان ابھی تک سسکیاں لے رہی تھی، سائرہ نے گلا صاف کر کے فون آن کیا۔

''جی آنی! میں مُسکان کی طرف آ گئی تھی۔ جی۔ جی بس تھوڑی دیر میں نکلتی ہوں۔'' سائرہ نے نہایت فرماں برداری سے جواب دیا۔

''آنی! وہ...... وہ لالہ کدھر ہیں؟'' سائرہ نے کچھ رُکتے ہوئے پوچھا۔

''اچھا تو ان کو فون دیں۔'' آنی کے بتانے پر کہ طارق گھر پر ہی ہے۔ سائرہ نے پَل میں فیصلہ کر لیا تھا۔

''لالہ! وہ۔'' سائرہ نے دھیرے دھیرے ساری بات طارق کو بتا دی

''کیا! اوہ میرے اللہ! تم کو کالج سے نکلتے ہی مجھے انفارم کرنا چاہیے تھا۔ طارق نے اُسے سخت سُست سناتے ہوئے کہا۔

''لالہ! مُسکان کا باڈی گارڈ سُن لیتا تو مُسکان کے بابا تک خبر چلی جاتی خوامخواہ کی مزید پریشانی ہوتی۔'' سائرہ نے صفائی دی تھی۔

مُسکان رونا دھونا سب بھول کر سائرہ کی جانب متوجہ تھی۔

''آپ پلیز ولی اور اُس کے دوست کی خیریت پتا کریں۔'' سائرہ نے فکر مندی سے کہا۔ ولی، طارق

ا بہت گہرا دوست تھا اس کے علاوہ آج تک اس پر سائرہ نے توجہ نہ دی تھی۔

پھر کالج میں اپنے سینئر کی جگہ دیکھ کر اسے بس اپنائیت کا احساس ہوتا تھا۔ ہیلو ہائے اور بس! لیکن ب سے مُسکان کا دل ولی کے لیے مختلف انداز میں دھڑکنا شروع ہوا تھا، اس نے ولی کو خاص نوٹس میں لانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن آج...... آج اُسے مُسکان کی بات سے سو فیصد یقین ہو گیا تھا کہ عبدالولی میں اصل کوئی خاص بات ہے!

اُس بھلے لڑکے نے اُن کی عزت کی خاطر کتنا بڑا خطرہ مول لے لیا اور اِن کو وہاں سے ہٹا دیا تھا۔

سائرہ کو ایک دم اپنے دل میں ولی کے لیے نرم گوشہ اور بے انتہا احترام و عزت محسوس ہوئی۔

اسد لوگوں کا گروپ خاصا بڑا اور بدمعاش قسم کے لڑکے لڑکیوں پر مشتمل تھا۔ سائرہ کی فکر اور مُسکان کا الیف سے رونا بے شک بے جا نہ تھا۔

''سائرہ! ولی ٹھیک ہے ناں!'' مُسکان نے سرخ ہوتی آنکھیں اٹھا کر پوچھا۔ ''پلیز دعا کرو یوں رو الرنگ نہ کرو۔ لالہ پتا کر کے اطلاع دیتے ہیں۔''

سائرہ نے خود کو بے انتہا تھکا محسوس کیا تھا۔ وہ وہیں مُسکان کے بستر پر بیٹھ گئی۔

''ولی! اللہ آپ کو اپنی حفظ و امان میں رکھیں!'' مُسکان نے آنکھیں بند کر کے دعا کی۔

تبھی سائرہ کے موبائل کی بیل بجی۔ طارق کے نمبر کے ساتھ سائرہ نے مختلف میوزک فیڈ کیا ہوا تھا۔ اس کی مختلف ٹون طارق کے فون کا بتا دیتی تھی۔

''جی لالہ......! اوہ میرے خدایا!'' سائرہ نے ہونٹ کاٹتے ہوئے فون بند کر دیا۔

''کیا...... کیا ہوا؟'' مُسکان نے بے قراری سے پوچھا۔

''وہ دونوں ہسپتال میں ہیں۔ اُن میں سے کسی ایک کے سر پر شدید چوٹ آئی ہے اور وہ بے ہوش ہے۔ لالہ کو ولی کے کسی دوست سے پتا چلا ہے۔ لالہ ہسپتال پہنچ کر صحیح صورتحال بتائیں گے۔'' سائرہ نے پریشانی سے اپنا ماتھا مسلا۔

''ہسپتال میں ہیں۔ شدید چوٹ آئی ہے!''

مُسکان کا دل بری طرح ڈوبا تھا۔ مسکان کو اپنا بی پی گرتا ہوا محسوس ہوا۔ ''یہ سب تمہارا قصور ہے، نہ تم اس فتنہ کھیل کو کھیلتیں نہ یہ نوبت آتی!''

مُسکان نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا۔ سائرہ نے شرمندگی سے نظریں جھکا لیں۔ ''اوہ میرے خدایا!'' ولی کی تکلیف پہ میرا دل کیوں ڈوبا جا رہا ہے؟ مُسکان تقریباً ڈھے گئی۔

''ماہی اور کتنا وقت برباد کرو گی؟'' ترنم نے بیزاری سے پوچھا۔ اُسے یہاں آنا ہمیشہ برا لگتا تھا۔
کوٹھی بھی میڈم چاندنی کے اڈوں میں سے ایک تھی۔ بہت خوبصورت سیٹ یہاں پر لگائے گئے تھے ا
یہ سیٹ یہاں پر مختلف گانوں پر ڈانس کرنے کے لیے لگائے جاتے تھے۔

میڈم چاندنی آج کل کوئل کو ٹرینڈ کر رہی تھیں وہ ایسا قیامت خیز رقص کرتی تھی کہ سامنے والے آدمی کا دل دھڑکنا بھول جاتا تھا۔

آج ماہ رخ، ترنم کو یہاں مجبور کر کے لائی تھی۔ ماجد اُس کا فوٹو شوٹ کرنا چاہتا تھا اور ماہ رخ کو شروع سے ترنم سے لگاؤ تھا۔ اس لیے وہ اپنے ہر کام میں ترنم کو ضرور زبردستی شامل کرتی تھی۔

ماہ رخ کوئی ڈھائی دو گھنٹے پارلر میک اپ کروانے میں گزار کر آئی تھی اور اب پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے وہ لوگ ماجد کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہی تھیں جو کوئل کا ڈانس ریکارڈ کر رہا تھا۔

کوئل نے نہ ہونے کے برابر لباس پہن رکھا تھا۔ وہاں پر موجود لائٹ بوائے وغیرہ خود بھی بے قا ہوئے جا رہے تھے۔ کوئل کو لچر اور بیہودہ ڈانس کروانے میں میڈم چاندنی کا اسپیشل ڈانس بوائے مدد کر ر تھا۔

ترنم کا سر بری طرح دکھنے لگا تھا، اب یہ سب کچھ اُس کے لیے نیا نہ تھا۔ لیکن پھر بھی اُسے ہر بار سب کچھ بہت تکلیف دہ لگتا تھا۔ مچھلی پانی سے دور رہ کر مر جاتی ہے۔ تڑپتی ہے اور ترنم نے اپنے پانی خود چھوڑا تھا۔ اب وہ دن رات بس تڑپتی رہتی تھی۔ اب اُسے نہ پانی ملتا تھا اور نہ معافی کہ وہ آسانی سے مر ہی سکے۔ یہ تڑپنا اُس کے اپنے فیصلے کی وجہ سے تھا۔ ''اور بعض فیصلے۔ سزائے موت کے ہوتے ہیں ایسی موت، جس کے پیچھے بھاگنے سے بھی موت نہیں ملتی۔

ماہ رخ مزے سے جوس کا ایک ایک سپ لیتے کوئل کا ڈانس دیکھ رہی تھی۔ ترنم نے تاسف سے ا رخ کو دیکھا تھا۔

کوئل نے اب ڈانس کرتے کرتے خود پر ڈھیروں پانی ڈال کر ناچنا شروع کر دیا تھا اور ایسے ایسے پوز کیمرے کو دے رہی تھی کہ جو دیکھتا وہ اس گناہ بے لذّت کا عادی ہو جاتا۔

یہ ویڈیو گانے اسی مقصد کے لیے ریکارڈ کیے جاتے تھے کہ نوجوان لڑکوں اور مردوں کو پہلے ان عادی بنایا جائے، جب وہ پوری طرح اس کے عادی ہو جاتے تھے تو ان کو بہت سستے داموں میں لو کلاس کی کال گرلز مہیا کر کے گندے سیکس میں ملوث کیا جا رہا تھا۔

یہ ایسا زہر تھا، جو نسلوں کو گھن کی طرح کھا رہا تھا۔

ماہ رخ جب فوٹو شوٹ کروا رہی تھی تو ترنم بور ہو کر کوٹھی میں اِدھر اُدھر گھومنے لگی۔ کہیں کوئی لائٹ بوائے وغیرہ ملتا تو بہت ہوس بھری نظروں سے اُسے دیکھتا تھا۔ عجیب گھگھیائے انداز میں سلام کرتا۔ ترنم کو ان سب سے کراہیت آتی تھی۔ ترنم اُن کی پہنچ سے دور تھی۔ ''ترنم اور ماہ رخ میڈم چاندنی کے ایسے خوبصورت ہیرے تھے، جو بہت اپر کلاس کو سرو کیے جاتے تھے۔'' اس لیے یہ سب لوگ ہمیشہ للچائی نظروں سے ترنم اور دوسری ہائی کلاس کال گرلز کو دیکھتے تھے۔

ترنم ماجد کے کمرے میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اُس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا وہ آنکھیں موند کر لیٹی ہی تھی کہ ماجد اور کسی اور لڑکے کی آواز پر اُس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

آوازیں دوسرے کیبن سے آ رہی تھیں اور بہت واضح تھیں۔ ''چل یار دس ہزار میں ڈن کر اب اتنی سی معلومات کے لیے تو ہمیشہ پیسے بٹورتا ہے۔'' یہ ماجد کے ساتھ موجود قاسم کی آواز تھی۔ کیونکہ ماجد اُسے قاسم کہہ کر بلا رہا تھا۔

قاسم اچھرہ میں ویڈیو شاپ چلا رہا تھا اور غلاظت بھری فلموں کو مہیا کرنے میں بہت مشہور تھا۔ اُس نے کئی ہوٹل اور ڈھابے کے مالکان سے ڈیل کر رکھی تھی۔ وہ گندی اور فحش فلموں کی ریکارڈنگ کر کے ان کو بہت سستے داموں بیچتا تھا کیوں کہ اس کام کو کروانے کا پیسہ میڈم چاندنی اُسے ٹھیک ٹھاک دیتی تھیں۔ ان کی ہدایت پر وہ ان چھوٹے چھوٹے ہوٹل اور ڈھابے کے مالکوں کو سستے داموں سی ڈیز اور ویڈیوز سیل کرتا تھا کہ اُس کی ڈیمانڈ روز بروز بڑھ رہی تھی۔

اور پھر رات کو تھکے ہارے مزدور، گیراج میں کام کرنے والے چھوٹے کم عمر لڑکے اور دیہاڑی دار مزدور مرد، لڑکے سب دس دس روپے دے کر اس گناہ بے لذت میں ملوث ہوتے تھے۔ ڈھابے اور چھوٹے ہوٹلوں کے مالک ان قیامت خیز اور گندگی سے بھرپور مناظر کو دکھاتے ہوئے یہ بھول جاتے کہ ان مناظر کو دیکھنے والے کتنے نو عمر اور کچے ذہن باقاعدہ مجرم بن رہے ہیں۔ ان کو نہ اپنی نسل و قوم کا خیال رہتا ہے اور نہ اللہ یاد رہتا ہے۔

''یا اللہ یہ چاندنی چڑیل کیسے بُرائی کو ہر طرف سرپرستی دے رہی ہے۔ جہنم کی آگ کو اور کتنا بھڑکائے گی؟'' ترنم نے سینڈل پیروں میں ڈالے اور اُٹھ کھڑی ہوئی اُس سے یہاں رکنا دوبھر ہو رہا تھا۔ وہ باہر آئی تو باہر کا منظر اُس سے بھی زیادہ ناقابلِ برداشت ہو رہا تھا۔ ماہ رخ لباس کے نام پر دھجیاں لگائے فوٹو شوٹ کروا رہی تھی۔

ترنم کا اس سارے ماحول میں دَم گھٹنے لگا تھا۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی باہر نکل آئی۔ گیٹ سے باہر اُسے فوراً رکشا مل گیا تھا۔

''کہاں جانا ہے بی بی؟'' رکشا ڈرائیور نے پوچھا۔

''پہلے انارکلی اتار دو۔'' ترنم نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ انارکلی سے چادر خریدی اُسے اوڑھ کر جب وہ دوبارہ رکشے میں بیٹھی تو رکشے والے نے خاصی مشکوک نظروں سے اُسے دیکھا تھا۔

''اب کہاں جانا ہے آپ کو؟'' رکشے والے کا لہجہ ایک دم بدل گیا تھا۔ لیکن ترنم کو کوئی پروا نہیں تھی۔ داتا دربار چلو! ترنم نے سکون سے بیٹھتے ہوئے کہا تو رکشے والے کو یہ لڑکی ایک بار پھر مشکوک

لگی تھی۔

مغرب کا وقت قریب تھا۔ جب وہ داتا صاحب کے دربار پہنچی تو مغرب کی اذان سنائی دے رہی تھی۔

رکشے والے کو پانچ سو کا نوٹ تھما کر باقی پیسے واپس لیے بغیر وہ رش میں گم ہوگئی تھی۔

رکشے والا حیرت سے اپنے ہاتھ میں موجود نوٹ کو دیکھتا رہ گیا۔ پھر کسی خیال کے آتے ہی اُس نے نوٹ اونچا کر کے دیکھا۔ نوٹ واقعی اصلی تھا۔ کیسی عجیب لڑکی تھی، اُس نے کہتے ہوئے واپس رکشا موڑ لیا۔

❖❖○❖❖

"مُسکان پلیز مجھے معاف کردو!" سائرہ بہت اچھی لڑکی تھی، جہاں اُس کی غلطی ہوتی تھی وہاں فوراً معافی مانگ لیتی تھی۔

پلیز مُسکان۔ تم ٹھیک تو ہوناں۔" سائرہ ایک دم کہتے کہتے رُکی تھی۔ مُسکان کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا پڑ چکا تھا۔ سائرہ نے دوڑ کر روم فریج سے جوس نکال کر کھولا اور مُسکان کو پکڑایا۔ "پلیز مُسکان کچھ ان ٹیک لوتا کہ تم بہتر محسوس کرسکو۔" سائرہ نے زبردستی جوس اُسے پلاتے ہوئے کہا تھا۔

مُسکان کو ایک دم ٹھنڈا جوس پی کر سردی لگنے لگی تھی۔ "سائرہ ہیٹر آن کردو۔" مُسکان نے اپنا سر بیڈ کی ٹیک سے لگاتے ہوئے نقاہت سے کہا تھا۔

"مُسکان!" سائرہ نے دھیرے سے اُسے پکارا۔

"ہوں!" مُسکان نے آنکھیں موندے موندے جواب دیا۔

"تم ولی سے محبت کرنے لگی ہوناں" سائرہ نے اُسے بہت غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ "کیا واقعی تم ولی کے لیے اتنی سنجیدہ تھیں؟" "یہ کیسا سوال ہے؟" مُسکان نے ایک دم آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔

"وہ سوال جو تمہارے چہرے نے پوچھنے پر مجبور کردیا ہے۔" سائرہ نے دھیرے سے اُس کا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔

"کیا ہے میرے چہرے پر؟" مُسکان نے اپنے ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھوا تھا۔

"تمہارے چہرے پر لکھا ہے کہ۔" سائرہ ایک پَل کو رُکی تھی۔ "سیلاب!"

"کیا؟ مطلب؟" مُسکان نے نہ سمجھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"تم نے دیکھا ہے ناں ٹی وی پر جب سیلاب آتے ہیں تو اپنے سامنے آنے والی ہر چیز کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتے ہیں۔"

"اس محبت کے طوفانی سیلاب نے تم سے تمہارا رویہ تمہاری ذات کا بھرم چھین لیا ہے مُسکان! تم اور تمہارے جذبات سب پر عیاں ہونے لگے ہیں۔"

"میں نے سنا تھا کہ اس محبت کے سیلاب میں آپ کی انا ڈوب جاتی ہے۔ آپ ڈوب جاتے ہیں۔ فنا ہوجاتے ہیں۔"

مُسکان کہاں گئی تمہارے اندر کی انا پرست خوددار لڑکی۔" سائرہ نے حیرت سے مُسکان کی روئی

روئی آنکھوں میں دیکھتے پوچھا۔

"ایک پتھر سے ٹکرا کر ختم ہوگئی ہے!" مُسکان نے بہت آہستگی سے کہا اتنا آہستہ کہ سائرہ بمشکل سن پائی تھی۔ مُسکان اعتراف کررہی تھی۔

"اوہ میرے خدایا!" سائرہ نے دُکھ سے کہا۔

"مُسکان میری جان میں تو آج تک تمہاری ولی کے لیے **Feelings** ایک شدید **Infactuation** سمجھتی رہی تھی۔"

"مُسکان واپس آجاؤ! یک طرفہ محبت ایسے ہی کاٹتی ہے جیسے زنگ آلود چھری، جو جب جب لگتی ہے نہ مارتی ہے نہ چھوڑتی ہے۔" سائرہ نے باقاعدہ سمجھاتے ہوئے کہا۔ بس اس بات کو یہاں تک رہنے دو۔ مذاق اور دل لگی بڑھ جائے تو انسان خود مذاق بن کر رہ جاتا ہے اور دل لگی۔ دل کی لگی بن جاتی ہے۔"

"تمہارا ولی میں دلچسپی لینا مجھے بس اتنا لگتا تھا کہ یہ دوستی اور وقتی جھکاؤ ہے لیکن آج تمہارا یوں ولی کے لیے بے قرار ہونا تمہارے پاگل پن کو ظاہر کررہا ہے۔" سائرہ اُسے روک لینا چاہتی تھی کہ "یہ راہ پُر خار لہولہو کردیتی ہے۔"

"تو کیا تم نے بھی مجھے اُن لڑکیوں میں شامل کرلیا، جو ہر سال کپل بناتی اور بدلتی ہیں؟ اور پھر بڑی آسانی سے آگے بڑھ جاتی ہیں۔ نہیں سائرہ، میں ایسی نہیں ہوں۔ سال بھر دوستی ایک دوسرے کا دم بھرنا، ڈیٹ پر جانا، تحفے لینا دینا اور پھر اگلے سال کوئی اور۔ تم اپنی دوست کو بس اتنا جان سکیں؟" مُسکان نے تاسف سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میری زندگی میں آج تک کوئی لڑکا نہیں تھا۔ نہ دوست کی صورت اور نہ ہی کسی اور صورت اور جب میں نے ولی کو اپنی زندگی میں اہم جانا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ میں کوئی "کھیل تماشے" میں ملوث نہ تھی۔ پھر تم نے مجھے کالج کی عام لڑکیوں میں کیوں شامل کیا؟"

مُسکان نے سائرہ سے پوچھا تھا۔

"دوست تو اپنے دوست کی ذات کے ہر رنگ کو پہچانتے ہیں۔ تمہاری میرے متعلق یہ رائے۔ یہ کیسی دوستی ہے؟" مُسکان کو واقعی دلی دُکھ تھا کہ سائرہ نے اُسے کیسے نان سیریس اور جھوٹی ہر روز افیئر اور پیئر بدلنے والی لڑکی سمجھا۔

سائرہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اُسی پَل موبائل کی بیل سنائی دی۔ فون طارق کا تھا۔ سائرہ چھلانگ لگا کر آئی تھی اور فون لپک کر آن کیا۔

❖❖○❖❖

"میں خود تمہارے اندر جینے لگا ہوں! کیا تم ایسا کام کرنے لگو گے، جس سے میری زندگی شرمندہ ہونے لگے۔"

"میرے سارے خواب تمہاری صورت میں ہیں۔ میں نے تم پر بہت محنت کی ہے۔ محنت تو ہر باپ کرتا ہے اپنے بچوں کے لیے لیکن میں نے تمہاری جسمانی تعلیم کے ساتھ کردار اور ذہن کی تربیت کے لیے دن رات ایک کیے ہیں!"

''کیا میری تربیت کا اثر اتنا غیر پائیدار تھا کہ آج یہ سب کچھ ہوا؟''

''کیا تمہاری صورت میں خواب دیکھنا میری غلطی بن گئی؟'' احمد شاہ کا لہجہ بے انتہا دُکھ لیے ہوئے تھا۔

وہ لمبے سے کوریڈور میں رکھے ایک بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔

ولی کے ماتھے اور بازو پر بینڈیج ہوئی تھی۔ وہ سر جُھکائے بیٹھا تھا۔اُن کے درمیان طویل خاموشی آن ٹھہری، بہت دیر دونوں اپنے آپ میں گم بیٹھے رہے تھے۔لیکن احمد شاہ نے اچانک ہی مڑ کر دیکھا تھا۔

کیوں کہ ولی سر جُھکائے زار و قطار رو رہا تھا۔آنسو ٹپ ٹپ کرتے نیچے گر رہے تھے۔احمد شاہ کے دل کو ایک دم کچھ ہوا تھا۔ وہ تڑپ کر اُس کی جانب مڑے تھے۔

چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا قد اُن کا مضبوط سا بیٹا۔ آج ان کے جملوں کی وجہ سے ڈھے گیا تھا۔

''بابا! بابا جانی!'' ولی شدّت ضبط سے اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔وہ ان کے ہاتھ تھام کر ان کے گھٹنوں کے پاس نیچے بیٹھ گیا۔''بابا جانی بے شک اس سارے معاملے میں میری غلطی نہیں تھی۔ لیکن بابا میں بغیر کسی وضاحت کے آپ سے معافی مانگتا ہوں۔'' ولی سسکا تھا۔

''میں زندگی میں کوئی پَل، کوئی دن وہ نہیں جینا چاہتا، جس کی وجہ سے آپ کو میری وجہ سے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔آئی پرامس بابا!

''پلیز فار گیو می!''

ولی نے اُن کے ہاتھوں پر بوسہ لیتے ہوئے کہا۔

بس اب اور نہیں احمد شاہ نے اُسے اُٹھا کر گلے لگایا تھا۔ولی تو ان کا اتنا تابعدار بیٹا تھا۔اُس کے آنسو تو ان کو پگھلا گئے تھے۔

''تم آج بھی میری سب سے بڑی مضبوطی ہو۔لیکن کیا کروں باپ ہوں ناں! یہی مضبوطی میری سب سے بڑی کمزوری بھی ہے۔''

''میں بہت خود غرض ہوں شاید۔ میں اپنی اولاد کو ہمیشہ پرفیکٹ خانے میں دیکھنا چاہتا ہوں۔اتنے مکمل انسان، جو سب کے لیے آسانیوں اور خوشی کا باعث بنیں، ہمارے لیے صدقہ جاریہ بنیں۔''

''اس لیے میں تمہاری پہلی غلطی کو بھی سہہ نہ پایا۔'' احمد شاہ نے اسی دھیمے لہجے میں جواب دیا جو اُن کی شخصیت کا خاصہ تھا۔

''ولی!'' کسی نے اُسے پکارا تھا دونوں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تھا۔

''انکل کیسے ہیں آپ؟'' یہ طارق تھا، جو ابھی ابھی سارا معاملہ رفع دفع کروا کر آیا تھا۔سول پولیس میں اُس کی خاصی دوستی تھی۔

''ٹھیک ہوں بیٹا، آپ کیسے ہیں؟'' احمد شاہ نے پیار سے اُس کے کندھے کو سہلایا تھا۔طارق نے ان کے لمس پر اپنے اندر کرنٹ سا محسوس کیا تھا۔''

وہ جب جب احمد شاہ سے ملتا، ان کی شفقت طارق کے اندر پیاس بڑھا دیتی تھی۔اُسے بے چین

کردیتی تھی۔ باپ کے لمس اور شفقت کے لیے اُس کا دل ہمکنے لگتا تھا۔

''کیا ہوا کہاں کھو گئے آپ۔'' احمد شاہ نے اس سے پوچھا۔

''اوں۔سوری انکل میں شاید کچھ سوچنے لگا تھا۔'' طارق کو اپنی آواز اجنبی لگی تھی۔

''بعض لوگ اتنے محبت کرنے والے ہوتے ہیں کہ وہ بے حس مردہ کو بھی چھو کر اُس کے اندر محبت کے احساس کو اجاگر کر دیتے ہیں۔'' اور احمد شاہ انہی لوگوں میں سے تھے۔ ہر پل ٹھنڈی چھاؤں کی طرح۔

''آر یو آل رائٹ؟'' احمد شاہ نے فکر مند لہجے میں پوچھا۔

انہیں یہ بچہ ہمیشہ اچھا لگتا تھا۔ اُس کا چہرہ بہت جانا پہچانا سا لگتا تھا۔ عجیب سی انسیت کا احساس ہوتا تھا اُس سے مل کر۔

''جی۔ جی میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' طارق نے منٹوں میں اپنے آپ کو سنبھالا تھا۔''یار ولی۔ ٹی ٹو کو ہوش آ گیا ہے۔'' طارق نے ولی کو مخاطب کر کے اطلاع دی تھی۔ ''اور اُس لڑکے اسد کو؟'' ولی نے جواباً پوچھا۔

''وہ۔ وہ تو ڈراما کر رہا تھا۔ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔'' طارق کے ماتھے پر بَل آ گئے تھے۔

اسد کی گھٹیا حرکت مُسکان اور سائرہ کے لیے کسی طور پر معاف نہ کیے جانے والی تھی۔ طارق نے بہت مشکل سے اپنے آپ پر کنٹرول کیا تھا۔ ورنہ اُس کا بھی دِل چاہتا تھا کہ وہ اُن لڑکوں کی دُرگت بنا کر رکھ دے۔

''تمہارے کالج کے ریکٹر اور ڈین دونوں میرے اچھے دوستوں میں سے ہیں۔ بہرحال تم سب کا نام کالج سے خارج ہونے سے بچ گیا ہے۔ کالج کا آخری سال ہے، اِسے اُلجھ کر لڑ کر گزارنے کے بجائے پڑھائی میں گزار دو۔ کچھ بننے کے یہ دن واپس نہیں آتے ہیں۔ زندگی کوئی ویڈیو یا سی ڈی فلم تھوڑا ہی ہے جب چاہا، جہاں سے چاہا ریوائنڈ کر کے دیکھ لی۔ ''آج'' پھر کبھی نہیں آتا ہے۔ امید ہے تم لوگ آپس میں اچھے کلاس فیلوز کی طرح رہو گے۔'' احمد شاہ نے سب لڑکوں کو ایک وقت میں نصیحت کی تھی۔ بظاہر اسد اور ٹی ٹو دونوں شرمندہ لگ رہے تھے۔ پھر ڈین کی موجودگی میں دونوں طرف سے معافی نامہ لکھ کر دیا گیا اور یوں احمد شاہ نے ایک بڑھتی ہوئی دشمنی کو روکا۔

ورنہ جو کچھ وہ اسد وغیرہ کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے وہ خطرناک تھا، کیا میں اُمید رکھوں کہ آئندہ آپ لوگ ولی اور اُس کے دوستوں کو تنگ نہیں کرو گے۔ احمد شاہ نے ڈین صاحب کی موجودگی میں اسد سے پوچھا اور اسد نے چار و ناچار ہامی بھری تھی۔

❖❖○❖❖

جانے کتنی دیر ہو گئی تھی۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی تھی۔

مغرب کی نماز کے بعد وہاں پر لا الٰہ الا اللہ کا ورد ہونے لگا، جانے کیسا وجد تھا، جو ماحول کی ہر شے پر طاری ہو گیا تھا۔ ٹپ ٹپ آنسو گرتے اُس کی گردن اور پھر قمیض کو بھگو رہے تھے۔

''کیوں یہاں چپ چاپ بیٹھی ہے؟ داتا کے دربار پر آ کر کیا سفارش کروائے بغیر جائے گی؟ ارے اللہ بیلا ... گنوانی ہے؟'' وہاں پر موجود ایک فقیرنی تھی شاید۔ لیکن وہ فقیرنی نہ تھی اُس کی آنکھوں،

زبان اور ہاتھ میں صدا کا کشکول نہ تھا۔ بلکہ اُس کے وجود میں عجیب سی چمک تھی۔

''ویلا۔؟ (وقت)''

''ویلا تو میں کب کا گنوا چکی۔ بھلا کھوئی ہوئی چیزیں کبھی ملتی ہیں؟'' ترنم نے اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو دیکھتے ہوئے کہا وہ اپنے آپ میں نہ تھی۔ ''کھوئی ہوئی چیزیں مل جاتی ہیں پُتر اگر اُن کو ڈھونڈا جائے۔ یہ تو ڈھونڈنے والے کی لگن اور سچائی پر ہے کہ وہ اپنی چیز کو ڈھونڈ نکالے۔'' وہاں سے بڑی گہری بات آئی تھی۔

''لیکن میں نے تو نہ صرف چیزیں کھودی ہیں بلکہ ہر رشتہ ہر تعلق کھودیا ہے۔ اماں میں کیسے ان کو حاصل کرسکتی ہوں؟''

''میں ناشکری ہوں، جس سے ہر چیز چھین لی گئی۔ ناقدروں کے ساتھ تو ایسا ہی ہوتا ہے ناں!'' ترنم افسردگی سے مسکرادی تھی۔

''دنیا کا ہر رشتہ ٹوٹ جاتا ہے گم ہوجائے یا روٹھ جائے لیکن ایک رشتہ ہے، جو کبھی نہیں گم ہوتا، وہ ہے بندے تے ربّ دا رشتہ!

تو اپنے اس رشتے کو منالے پُتر ے سارے تعلق رشتے خود ہی من جائیں گے۔ جا داتا کے دربار پر آئی ہے۔ ربّ سچے کے پاس، پیارے نبی کے پاس اپنی دعا کی سفارش داتا سے کروالے۔ کہیں ویلا نہ نکل جائے۔''

وہ اونچا اونچا بولتی آگے عورتوں کے رش میں گم ہوگئی۔

❖❖○❖❖

ترنم جیسے نیند سے جاگی تھی۔ اُس نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا تھا۔ وہ لمبی اونچی عورت اُسے کہیں دکھائی نہ دی تھی۔

''کیا کہہ گئی ہے وہ عورت؟''

''کون تھی وہ عورت اور اُس نے مجھے ہی کیوں ایسا کہا؟''

اس کے ذہن میں بیک وقت کئی سوال جاگ اُٹھے تھے۔

''ہونہہ! بے خبر مجھے جانے کیا کیا کہہ گئی۔ بھلا۔ بھلا۔ مجھے معافی مل سکتی ہے؟ مجھ جیسی لڑکی کو معافی؟''

''مجھے؟''

''بھلا میری دعا کو سفارش مل سکتی ہے؟''

''جس کی دعاؤں کے پر ٹوٹے ہیں، جو اوپر وہاں ربّ سچے کے پاس جا نہیں سکتیں۔''

''آہ! اپنے گھونسلوں کو چھوڑ کر اُڑنے والے پنچھیوں کے پر شاید ایسے ہی ٹوٹ جاتے ہیں۔''

بے سمت راہوں میں پرواز بھرنے والے پرندے ہمیشہ یوں ہی رُلتے ہیں۔

''آہ! نہ میری دعاؤں کے پر ہیں نہ پاؤں، جو سننے والے تک جاسکیں! یہ پاؤں غلط راہوں پر قدم ڈالتے وقت اپنی ساری کشتیاں جلا آئے تھے۔'' ترنم اپنے ہی گھٹنوں پر اپنا سر پٹخ رہی تھی۔

''بھلا مجھ سے ربّ سچے کیسے من سکتے ہیں؟ بھلا مجھے کیسے معافی مل سکتی ہے! میں تو راندۂ درگاہ ہوں!''

''میں۔ میں تو راندہ درگاہ ہوں۔ پھر بھلا میرا یہاں کیا کام؟''

''باہر نکالے ہوئے لوگوں کو تو یہاں آنے کا کوئی حق نہیں، پھر میں کیوں یہاں اپنے ناپاک وجود کو لے کر چلی آئی۔''

ترنم اپنے آپ میں نہ تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح بھاگتی دربار کی سیڑھیاں اُترتی چلی گئی۔ اُس کے ارد گرد آوازوں کا ہجوم تھا۔ یہ آوازیں آہستہ آہستہ بلند ہونے لگی تھیں۔ وہ لاکھ کانوں پر ہاتھ رکھتی لیکن یہ آوازیں اُس کا پیچھا کرتی اُس سے آ کر چمٹ گئی تھیں۔

یہ پُرسوز آواز کس کی تھی؟

لا الہ الا ہو، لا الہ الا ہو

ایک طلب ہے ایک ہی ھُو لا الہ الا ہو

اب تو ہی تو اور تو ہی تو لا الہ الا ہو۔ اس آواز کے ساتھ ایک اور آواز مل گئی تھی۔

''نہیں۔'' ترنم نے کانوں پر سختی سے اپنے ہاتھ رکھ لیے۔

''میں تیری منزلوں کے نشاں سے
بہت دُور آگے نکل گیا
نہ سنبھل سکا بہت دیر تلک
یونہی بے سبب بھٹکتا رہا
تیرے نور کی وہ روشنی
میرے آس پاس بکھرتی رہی
میں نا اہل میں بے خبر!
کیوں دیر تک سویا رہا
مجھے آگہی کا شعور دے

آواز اُس کے کانوں سے گزر کر اُس کے سارے وجود میں گونجنے لگی تھی۔ ترنم کا سارا وجود پسینے سے شرابور ہوگیا تھا۔

ترنم نے متوحش نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ارد گرد لوگوں کا ہجوم تھا۔ اُسے اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

اچانک یہ آوازیں بین میں بدل گئیں۔

ترنم کو یوں لگا کہ اِن درد بھرے بینوں سے اُس کا دل پھٹنے کے قریب ہے۔ اُس نے قریبی ستون کو تھامنا چاہا تھا لیکن ستون آگے بھاگ گیا تھا۔ وہ بے اختیار ہوکر لہرا کر گری تھی۔

آنکھوں اور دماغ پر اندھیرا چھانے سے پہلے اُس نے ایک بہت میٹھی آواز سنی تھی۔ یہ آواز۔ وہ اس آواز کی گود میں سر رکھنا چاہتی تھی۔ جانے کتنی صدیاں بیت گئی تھیں اس آواز کو سنے ہوئے۔

''لمّاں۔'' اُس نے اس آواز کو پکڑنا چاہا۔

''ایمان پُتر اُٹھ جا'' ویلا'' نکل گیا تو کیا فائدہ؟'' آواز بالکل قریب سے سنائی دی تھی۔

''ایمان۔ایمان۔ایمان پُتر!'' آواز دُور ہورہی تھی۔زندگی دُور جارہی تھی۔روشنی دُور جارہی تھی۔

''لمّاں۔'' بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ اُس کے ہونٹ کپکپائے تھے۔''لمّاں۔''

کتنی ہی دیر گزر چکی تھی وہ گم صم بیٹھی تھی اس کے ہاتھ میں موجود کاغذ اُس کے مساموں سے نکلے پسینے سے بھیگ کر گیلا ہو چکا تھا۔لیکن اُس کے الفاظ ابھی تک اس کے اندر شور مچارہے تھے۔

اس کے گم سُم وجود میں جو شور مچا تھا، اس سے وہ خود کو بے حد بےبس محسوس کررہی تھی۔

''کیا۔کیا میں ایسا کرپاؤں گی؟'' اُس نے جیسے خود سے سوال کیا تھا۔

اُس کی منہ زور خواہش اب اُس کی ضد بنتی جارہی تھی۔ لمّاں کی ہر وقت کی روک ٹوک اور یہ گھر اُسے اب قید کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

ڈاکٹر جی کے سنگ زندگی گزارنے کا خواب اس قدر خوش کُن تھا کہ وہ اس خواب کی بھیانک تعبیر تک نہ دیکھ سکتی تھی۔

''ایمان۔ایمان پُتر۔'' لمّاں کی آواز پر وہ ہڑ بڑا کر کھڑی ہوئی تھی۔ ہاتھ کی گرفت کاغذ پر مزید مضبوط ہوگئی تھی اُس نے اپنے ہاتھ کو دوپٹے کے پیچھے چھپالیا تھا۔اُس کا سارا وجود خوف سے دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔

''جی لمّاں!'' ایمان نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''یہ دیکھ ماسی زبیدہ کتنا سوہنا منڈا (لڑکا) تیرے لیے ڈھونڈ کر لائی ہے۔ابھی تو میں تیری بس منگنی کروں گی۔تین ورے بعد تیرا دیاہ (بیاہ) کروں گی۔ابھی تو میری گڑیا کے کھیلنے کے دن ہیں۔''

لمّاں جان بُوجھ کر ہر بات کو بھول رہی تھیں۔ان کا خیال تھا کہ ایمان کا دھیان بٹ جائے گا تو وہ اپنی لاحاصل ضد سے دست بردار ہوجائے گی۔ وہ اُسے ایک بار پھر اپنی بھولی بھالی گڑیوں سے کھیلتی معصوم سی ایمان دیکھنا چاہتی تھیں۔

لیکن وہ نادان لڑکی۔ گڈیوں پٹولوں سے ہاتھ چھُڑا بیٹھی تھی اپنے بچپن کے انمول لمحوں کو گنوا بیٹھی تھی۔وقت سے پہلے جینے والے بہت جلد اختتام پر آ کھڑے ہوتے ہیں۔ایسے میں بچن کے جگنو، جوانی کی مسکراہٹیں اور خوشیاں وہ حاصل نہیں کرپاتے ہیں۔

''تو یقین نہیں کرے گی کہ رب سوہنے نے ہم پر کتنا کرم کیا ہے۔وہ پرسوں جو دو عورتیں اچانک آئی تھیں ناں! تمہاری ایک جھلک دیکھتے ہی راضی ہوگئی تھیں۔لڑکا بارہ جماعت پاس ہے اور دبئ گیا ہوا ہے۔بارہ ہزار روپے تنخواہ ہے۔''

''بارہ ہزار روپے۔اتنے ڈھیر سارے روپے کماتا ہے!''

''میری دھی رانی عیش کرے گی عیش۔ربّ تیرا شکر ہے۔'' خدیجہ بی بی کے چہرے پر خوشی کی کرنیں رقصاں تھیں۔

ایمان نے ان کے چہرے کو یوں دیکھا، جیسے وہ کسی اور ہی سیارے کی زبان بول رہی ہوں۔

''ہونہہ۔بارہ جماعتیں پڑھا ہوا۔بارہ ہزار کمانے والا شہزادہ!'' ایمان نے تنفّر سے سوچا۔

اُس کی نظروں کے سامنے ڈاکٹر گلزار کی بڑی سی گاڑی گھوم گئی تھی۔ ڈاکٹر جی نے خود اُسے بتایا تھا کہ لاہور میں یہ بہت بڑی ساری ان کی کوٹھی ہے۔ یہ تو یہاں وہ انسانیت کی خدمت کی خاطر کلینک کرتے تھے۔غریبوں کے لیے ان کے دل میں بہت درد تھا۔

''کہاں ڈاکٹر گلزار اور کہاں یہ بارہ کے ہندسے والا۔'' ایمان اندر ہی اندر کھول رہی تھی۔

''کیوں پُتر خوش ہے ناں؟''

''نہیں! میں خوش نہیں ہوں اور جو میری خوشی ہے وہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔'' ایمان کے لہجے میں بے انتہا گستاخی تھی۔

''تم اگر انگاروں کو جھولی میں ڈال کر خوش ہوگی تو بھول جاؤ میں تجھ کو ایسی خوشی حاصل کرنے نہ دوں گی، جو تیری آگ ہو۔'' خدیجہ بی بی نے ٹھوس لہجے میں کہا تھا۔

''تو پھر جو آپ چاہتی ہیں وہ بھی نہیں ہوگا۔'' ایمان کی آواز غصّے سے پھٹنے کو تھی۔

''ہوگا تو وہی جو میں اور تیرے ابا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ ہم تیرا بھلا چاہتے ہیں۔'' خدیجہ بی بی ایک ایک لفظ پر زور دیتی وہاں سے اٹھ گئیں۔

''یہ تو وقت بتائے گا کہ اب کیا ہوگا۔''

کچھ دیر پہلے خط میں لکھے الفاظ جو اُسے ناممکن لگ رہے تھے۔ وہ اچانک ممکن نظر آنے لگے تھے۔

❖❖○❖❖

''تم بہت مختلف ہو! کچھ بہت سا مختلف ہے تمہارے مزاج میں۔تم کو اکثر بہت ساری باتوں میں حالات سے ہٹ کر ری ایکٹ کرتے دیکھا ہے۔''

ٹُی ٹو نے بہت غور سے ولی کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ اس وقت دو تکیوں کے سہارے بیٹھا چائے پی رہا تھا۔آج ڈاکٹرز نے دو دن بعد اُسے کوئی چیز پینے کو دی تھی۔

''کیا مختلف ہے؟'' ولی کے چہرے پر مسکراہٹ کی کرن ایک پَل کو چمکی تھی۔ ''کیا میرے سر پر سینگ ہیں؟'' ولی مسکرایا۔

''دیکھو تمہیں ان باتوں پر غصہ نہیں آتا ہے ناں، جن پر ایک نارمل انسان کو آتا ہے۔'' ٹُی ٹو نے ولی کے چہرے پر سے نظریں اٹھائے بغیر کہا تھا۔

''ٹُی ٹو تم غلط سوچتے ہو۔نارمل آدمی کو ہی تو غصہ نہیں آتا ہے۔''

''غصّہ۔رویوں کی ابنارملیٹی کو کہا جاتا ہے۔'' ولی نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

''ولی تم نے ان ناپسندیدہ لڑکوں سے نہ صرف دوستی کرلی ہے بلکہ کل تم ماجد کی بھی خبر لینے اپنے بابا کے ساتھ گئے تھے۔ یہ اتنا کچھ میرے لیے ہضم کرنا مشکل ہے۔کیا واقعی تم نے اُن لڑکوں کو معاف کردیا ہے؟ جنہوں نے ناصرف تمہارے ساتھ بدتمیزی کی۔ بلکہ تمہیں اور مجھے زخمی کردیا۔تم ایسا کیسے کرسکتے ''

ٹُی ٹو کی ناراضگی اور غصّہ ابھی تک ختم نہ ہوا تھا۔

"میں ایسا کرسکتا ہوں ٹی ٹو، کیوں کہ ایسا میرے بابا چاہتے ہیں۔" ولی کا لہجہ بہت مضبوط تھا۔

"تو کیا تمہاری کوئی مرضی نہیں ہے۔" ٹی ٹو نے غصّے سے کہا تھا۔ اُس کے دل میں ابھی تک اُن لڑکوں کو مزا چکھانے کی حسرت موجود تھی۔

"ہاں ہے ناں میری مرضی ......میری مرضی یہ ہے کہ میں بابا جانی کی مرضی سے جیوں۔ اور یہ خسارے کا سودا کبھی نہیں رہا ٹی ٹو۔" ولی کے چہرے پر بے انتہا طمانیت تھی۔

"تم کیا شروع سے۔ آئی مین ہمیشہ سے ایسے ہی اتنی ہموار شخصیت کے مالک ہو؟" ٹی ٹو کے لہجے میں بے انتہا حیرت تھی۔

ولی سے اُس کی دوستی پانچ سال پرانی تھی۔ ٹی ٹو اپنی طبیعت کے لا اُبالی پن کی وجہ سے ولی کی شخصیت کے ان مختلف پہلوؤں کی خوشبو نہ لے سکا تھا۔

ولی بہت کھل کر مسکرایا تھا۔ "میں تم کو شیخ سعدی کی ایک حکایت سناتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں ایک دفعہ میں غسل خانے میں گیا تو وہاں گاچنی مٹی پڑی ہوئی تھی لیکن اس سے گلاب اور عطر کی خوشبو اس قدر آرہی تھی کہ پورا غسل خانہ معطر تھا۔ میں نے پوچھا تو ہے تو نری گاچنی مٹی لیکن یہ تیرے اندر سے گلاب کی خوشبو کیسے؟"

"اس نے معلوم ہے کیا جواب دیا؟" ولی نے ٹی ٹو کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

جمال ہم نشیں درمن اثر کرد
وگرنہ من ہمہ خاکم کہ ہستم

"میں پھولوں، خوشبوؤں کے پاس ایک مدت پڑی رہی ورنہ میں جانتی ہوں کہ میری حقیقت تو صرف یہ ہے کہ میں پاؤں تلے آنے والی مٹی ہوں۔"

"تو مسٹر افضل خان میں عبدالولی زندگی بھر نہیں بھول سکتا کہ سیّد احمد شاہ پھول اور عطر ہیں اور میرے اندر اور میری شخصیت کی ساری خوبصورتیاں میرے والد احمد شاہ اور میری والدہ روشن آرا کی وجہ سے ہیں۔"

"کیوں کہ عبدالولی صرف ایک گاچنی مٹی تھا۔ پاؤں تلے آنے والی مٹی۔" عبدالولی کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔

اور ٹی ٹو جو کچھ کہنے جارہا تھا، ولی کا چہرہ دیکھ کر چپ رہ گیا۔

"یہ ولی کیسی بات کرگیا ہے؟" سننے والے نے حیرانی سے سوچا۔

لیکن کہنے والے کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کچھ حقیقتوں کو کبھی بھول نہیں سکتا۔ کبھی جھٹلا نہیں سکتا۔

بچپن کے کچھ سوال تھے، جو ولی آج تک حل نہ کرپایا تھا۔ اُسے اکثر بے چینی ہوتی تھی۔ لیکن ماں باپ کی بے لوث محبت ہر سوال پر، ہر بے چینی کی آگ پر ٹھنڈے میٹھے پانی کے چھینٹے ثابت ہوجاتی تھی۔

اُن کی بے لوث محبت کے سامنے باقی کچھ باقی نہ رہتا تھا۔

❖❖○❖❖

ایک دفعہ کا ذکر ہے
اک چڑیا تھی
اُس کا ایک پیارا سا بچہ تھا
چڑیا کو اپنا بچہ جان سے پیارا تھا
روز چڑیا دانہ تلاش کرنے باہر جایا کرتی تھی
اپنے بچے کو اس نصیحت کے ساتھ
کہ جو بچے آہلنے سے نکل جائیں
تو چیل انہیں پکڑ کر لے جاتی ہے
اور پھر
کبھی وہ اپنی ماں کی آغوش
اپنے گھر، اپنے آہلنے میں واپس نہیں آسکتے
گھر سے باہر موت ہے
گھر کے اندر اور ماں کی بات میں زندگی ہے
لیکن وہ چڑیا کا بچہ نادان نکلا
اور پھر وہ ایک دن گھر سے جا نکلا
اور پھر اُسے چیل جھپٹ کر لے گئی

کہانی سناتے سناتے امّاں کا چہرہ ایک دم پریشانی سے متغیر ہوجاتا ہے۔

ایمان کی آنکھ ایک دم کھلی تھی۔ وہ جھٹکے سے سیدھی ہو بیٹھی تھی۔ اُس نے خواب میں امّاں کو دیکھا تھا۔ اپنے آپ کو چھوٹا سا۔ امّاں کی گود میں کہانی سنتے دیکھا تھا۔

ایمان کے اندر ایک دم بے چینی اور پریشانی کے طوفان کا ریلا اُٹھا تھا۔ یہ کیفیت اس قدر شدید تھی کہ اُس سے سانس لینا دشوار ہوگیا تھا۔ اُس نے اپنی دائیں جانب دیکھا تھا۔ وہاں گہرا اندھیرا دکھائی دیا تھا۔ ٹرین چھک چھک کرتی بھاگی چلی جارہی تھی۔

کچھ گھنٹے پہلے جس بے خوفی سے وہ ہر حد اور دہلیز پار کر آئی تھی وہ بے خوفی ایک دم غائب ہوگئی تھی۔

وہ اب عجیب سی پریشانی اور خوف میں مبتلا ہوچکی تھی۔

سامنے والی سیٹ پر ڈاکٹر جی بیٹھے تھے۔ جس شخص کی خاطر اُس نے ہر حد پار کی تھی وہ اُس کے سامنے بیٹھا تھا۔ پھر وہ پریشان کیوں تھی۔

پھر۔ پھر یہ بے چینی کیوں تھی؟

سانس لینا دشوار کیوں ہو رہا تھا؟

اور دل کس انہونی کے ڈر سے ڈوب رہا تھا۔ جسے وہ بے خوفی اور خود غرضی سے ہر دہلیز اور رشتے کو چھوڑ آئی تھی، اُسے خسارے کا اندازہ نہ تھا۔

اُس کا دل جو کسی مقناطیس کی طرح ڈاکٹر گلزار کی طرف بھاگتا تھا اور جو صرف اور صرف اپنی محبت کی طرف داری میں بولتا تھا۔ اب وہ ہی دل چیخ چیخ کر بول رہا تھا کہ وہ غلط کر بیٹھی ہے۔

کہیں کچھ ایسا غلط ہے، جو اُس کی نظروں سے اوجھل تھا۔

''کیا ہوا جانو تم اٹھ گئیں۔ تمہیں پیاس تو نہیں لگی؟'' ڈاکٹر گلزار کے لہجے میں بے انتہا محبت اور شیرینی گھلی ہوئی تھی۔

''نہیں!'' اُس نے زبان ہونٹوں پر پھیرتے دھیمے سے جواب دیا۔

وسوسے ایک بار پھر کچھ دیر کو چپ ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر گلزار پر اندھا اعتبار جو تھا۔

اندھے اعتبار ہمیشہ اندھی کھائیوں میں دھکیل دیتے ہیں۔

اُس کی عمر کم تھی، تجربہ کم تھا لیکن اُس کے ایک قدم نے اُسے ایک بڑے امتحان میں لا کھڑا کر دیا تھا۔ جس سے وہ بالکل بے خبر تھی۔

اُس نے بھی تو اپنی ماں کے اندھے اعتبار اور اعتماد کو آج چکنا چور کر دیا تھا۔ صبح سویرے اُس نے اپنے چند کپڑے اور کچھ اہم چیزیں ایک شاپر میں ڈال کر باتھ روم میں گندے کپڑوں کی ایک بالٹی میں چھپا دیے تھے۔ اور اماں ابا کے سوتے ہی وہ باہر نکل آئی تھی۔ باہر ڈاکٹر گلزار اپنی گاڑی لیے جانے کب سے کھڑا تھا۔ آندھی طوفان کی طرح گاڑی بھگاتا وہ اُسے ریلوے اسٹیشن لے آیا تھا۔

وہاں گاڑی کی چابی ایک دوست کے حوالے کی اور اُسے لے کر ٹرین میں آ بیٹھا۔

دس پندرہ منٹ بعد گاڑی رینگتی ہوئی جب بھاگنے لگی تو اُس کے گھبرائے گھبرائے وجود کو دیکھ کر گلزار نے اُسے بے انتہا تسلیاں دیں۔ وعدے کیے اور اپنی محبت کا پھر سے یقین دلایا۔ دھیرے دھیرے وہ کچھ نارمل ہو گئی تھی۔ مختلف باتیں سوچتے اُسے شاید نیند کا جھونکا آیا تھا۔

اور تب اُسے یہ خواب دکھائی دیا تھا۔ امّاں کا پریشان چہرہ ابّا کی جھکی ہوئی گردن۔ اُسے پل پل پریشانی اور عجیب سی پشیمانی کی طرف دھکیل رہی تھیں۔

''ایمان۔ کیا تم نے ٹھیک کیا ہے؟'' اُس کے اندر سوال اُگا تھا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ سوال تناور درخت بن کر اُس کے سارے وجود میں پھیل گیا تھا۔

❖❖○❖❖

''دل پریشان بہت رہتا ہے!'' آسیہ نے آہستہ سے کہا تھا۔

''بیٹا دل کی ہر پریشانی صرف اللہ رحمان کی ذات دور کر سکتی ہے۔ تم اللہ کے سپرد کر دو پھر دیکھنا!

سب بچے بچیاں اُن سے قرآن پاک پڑھ چکے تھے۔

بابا جی کا شفیق اور پیار بھرا رویہ ہی تھا، جس نے اس دور دراز کے گاؤں کی بچیوں کو بھی بہت اعتماد دیا تھا۔

بچیاں جوان لڑکیوں میں بدل گئیں لیکن آج بھی وہ اپنے من کی بات کرنے کے لیے بابا جی کے پاس آتی تھیں۔

''بابا جی۔ سوچتی ہوں آخر کب تک۔ کب تک میں اپنا آپ بچا پاؤں گی۔'' آسیہ کے لہجے میں ...

... بول رہا تھا۔

''اُسے جب دَورہ پڑتا ہے تو وہ بے قابو ہو جاتا ہے۔ میرے ابو سیّد سرفراز کے اتنے زیادہ مقروض ہیں کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس نوکری سے انکار نہیں کر سکتی ہوں۔'' آسیہ اب باقاعدہ رو پڑی تھی۔

سترہ اٹھارہ سال کی یہ لڑکی سیّد سرفراز کی حویلی میں کام کرتی تھی اور اُس کے فرائض میں سیّد سرفراز کے بیٹے بلال کے کام شامل تھے۔

''بلال صاحب کو جب دورہ پڑتا ہے تو وہ اپنے کپڑے پھاڑ دیتے ہیں۔ اپنے سامنے کی ہر چیز کو نوچ کھسوٹ دیتے ہیں چاہے سامنے انسان ہی کیوں نہ ہو۔''

آسیہ روتے ہوئے بتا رہی تھی۔

''کیسا دورہ پڑتا ہے؟ بچّے کو کیا بیماری ہے؟'' بابا جی نے تحمل سے آسیہ کی بات سنتے ہوئے پوچھا تھا۔

''بابا جی اُن کو اکثر ایسا لگتا ہے کہ ان کا سارا پنڈا (جسم) جل رہا ہے اور جلن اتنی بڑھتی ہے کہ وہ ... چیختے چلاتے اپنے سارے کپڑے پھاڑ دیتے ہیں، ایسے میں کتنے ہی انجکشن لگ کر نیند کی صورت ... بیچارے کو آرام آ پاتا ہے۔'' آسیہ نے سنسنی خیز لہجے میں بتایا۔

''یہ بیماری کب سے ہے؟'' بابا جی کی آواز میں کچھ غیر معمولی پن تھا۔

''وہ جی تب سے، جب سے بلال صاحب چھوٹے سے تھے۔ شروع شروع میں کبھی کبھار ایسی حالت ہوتی تھی۔ لیکن بابا جی اب تو بیچارے کو اکثر مہینے یا ہفتے بعد دورہ پڑ جاتا ہے۔'' آسیہ نے پوری ... کھولتے ہوئے بتایا۔

''آہ! سزا کا عمل شروع ہو چکا ہوتا ہے!''

''انسان کس قدر بے خبر ہے۔ وہ ''بجتے الارم'' کو بھی نہیں سن پاتا ہے۔''

بابا جی اتنی دھیمی آواز میں بولے تھے کہ آسیہ سن نہ پائی تھی۔

''جو انسان بوتا ہے۔ وہ ہی حاصل کرتا ہے! منفی رویے، منفی زندگی، حاصل جمع کو بھی منفی کر دیتی ہے۔ اور ہاتھ میں سوائے پچھتاوے کے کچھ نہیں آتا ہے۔''

بابا جی اتنا دھیرے بول رہے تھے کہ جیسے خود سے باتیں کر رہے ہوں۔ آسیہ حیرت سے بابا جی کو تک رہی تھی۔ معافی مانگ لینا ہی انسان کے حق میں بہتر ہے۔ اپنے ربّ کی طرف پلٹ آنا ہی سب سے اہم ہے۔

جہاں یہ ساری سزائیں برحق ہیں وہاں سب سے اہم سچائی یہ ہے کہ اللہ رحمان کریم کی ذات بہت معاف کرنے والی اور رحمان ہے۔

''ہمارے گناہ کتنے بڑے ہی کیوں نہ ہوں لیکن اللہ جی کی رحمت سے بڑے اور سوگنا نہیں ہو سکتے۔''

بابا جی کی باتیں آسیہ کو فوری سمجھ تو نہیں آ رہی تھیں لیکن جانے ان باتوں اور ان کے لہجے میں کیا تھا کہ اس کے بے قرار دل کو ایک دم قرار آ گیا تھا۔

''بابا جی۔ آپ کہتے ہیں تو آج میں خود سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں اپنی ساری پریشانیاں اللہ کے

سپرد کرتی ہوں۔'' آسیہ نے کہا۔

''اے اللہ کی رحمت۔ تو جان لے کہ انسان اللہ کی بڑائی مانے یا نہ مانے وہ بڑا ہے۔ اور ہمیشہ رہے گا۔''

''اپنے معاملات اللہ کے سپرد کرنا اُس پر یقین کرنا ہمارے ہی فائدے کے لیے ہے۔''

''ضرورت مند ہم ہوتے ہیں۔ عاصی ہم ہیں۔ وہ تو بہت بڑی اور کریم ذات ہے!'' باباجی نے آسیہ کے یقین اور بات کو درست کرتے ہوئے کہا تھا۔ آسیہ نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''باباجی۔ بلال صاحب کا کوئی مکمل علاج شہر میں نہیں ہو سکتا؟'' آسیہ نے معصومیت سے پوچھا تھا۔

''پیاری بیٹی! پہلے مریض آگہی تو حاصل کرلے کہ اُسے مرض کس وجہ سے ہے پھر ہی علاج کرایا جائے گا۔ پہلے بے خبر کو خبر تو ہو جائے۔''

باباجی کی باتیں اتنی مبہم بھی نہ تھیں کہ آسیہ سمجھ نہ پاتی۔

سید سرفراز کی سفاکی کی داستان وہ اپنے ماں باپ سے سنتی آئی تھی۔ آسیہ کی نظروں کے سامنے بلال کا چیختا چلاتا اور تڑپتا وجود گھوم گیا تو اُس نے بے اختیار جھرجھری لی تھی۔

❖❖○❖❖

''آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' ایمان نے سہمی ہوئی آواز میں ڈاکٹر گلزار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''یار وہ میرے دوست اور اُس کی بیوی نے ہمیں لینے آنا تھا ان کو ہی دیکھ رہا ہوں۔'' ڈاکٹر گلزار نے نظریں اِدھر اُدھر دوڑاتے ہوئے کہا۔

''اچھا تم یہاں بیٹھو میں دیکھ کر آتا ہوں۔'' ڈاکٹر گلزار نے اُسے ایک بینچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

''نہ۔ نہیں۔ میں اکیلی یہاں نہیں بیٹھوں گی۔ میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔'' ایمان نے ڈر اور خوف سے اپنی انگلیاں مروڑتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں اس رش میں کہاں دھکیلتا پھروں۔ تم یہاں بیٹھو میں بس ابھی آیا۔'' ڈاکٹر گلزار نے اُسے زبردستی بٹھاتے ہوئے تسلی دی تھی۔

''آ۔ آپ جلدی آنا!'' ایمان نے تھوک سے اپنا حلق تر کرتے ہوئے کہا۔

''یار۔ مجھ پر بھروسا ہے ناں!'' گلزار نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا تھا۔

''آپ پر ہی تو اب بھروسا ہے۔ آپ میرے بھروسے کو کبھی نہ توڑنا!''

ایمان نے بہت آس سے ڈاکٹر گلزار کو دیکھا تھا۔

''اچھا تم پریشان نہ ہونا میں آ رہا ہوں۔'' ڈاکٹر گلزار عجلت میں کہتے ہوئے ریلوے اسٹیشن کی بھیڑ میں گم ہو گئے۔

کتنی ہی دیر گزر گئی تھی شاید بیس منٹ یا آدھا گھنٹا! لیکن ایمان کو یوں لگ رہا تھا کہ ایک ایک لمحہ ایک ایک صدی کے برابر ہے۔ اُس کی سانسوں کی رفتار بے ترتیب ہو چکی تھی۔

صبح کاذب کا وقت ہو چلا تھا، ہوا میں خنکی تھی، اُسے سردی محسوس ہو رہی تھی۔

پلیٹ فارم پر دو تین گاڑیاں آکر رکی تھیں اور پلیٹ فارم پر اچھا خاصا رش تھا۔ کئی لوگ اُسے گھورتے

ہوئے گزرے تو اُسے اپنے وجود میں کپکپاہٹ محسوس ہوئی تھی۔

''یا اللہ کدھر رہ گئے ہیں ڈاکٹر جی!'' ایمان نے گھبرا کر اِدھر اُدھر نظریں دوڑائی تھیں۔

''ایمان۔ تم ایمان ہی ہو ناں؟'' ایک بہت خوبصورت لڑکی نے اُس کے سامنے آ کے پوچھا۔

''آ...... آپ کون ہیں؟'' ایمان نے نقاب اوڑھی ہوئی تھی۔ جس سے اُس کے چہرے کے تاثرات چھپے ہوئے تھے۔ لیکن اُس کی آنکھوں کا بے تحاشا خوف اُس کے جذبات کو عیاں کر رہا تھا۔

''میں...... میں ڈاکٹر گلزار کے دوست کی بہن ہوں۔ وہ لوگ گاڑی میں تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ میں تمہیں لینے آئی ہوں۔''

اُس بے انتہا خوبصورت لڑکی نے ایمان کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں ڈاکٹر جی کے ساتھ جاؤں گی۔ پھر یہ ہمارا سامان بھی تو ہے۔'' ایمان نے ڈاکٹر گلزار کے بیگز کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے۔ پریشان نہ ہو۔ تم چلو اب دیر ہو رہی ہے۔'' لڑکی نے جیسے اُس کی بات سنی ہی نہ ہو اور اسے اُٹھنے پر اصرار کیا ساتھ ہی بیگ اُٹھا لیا۔

''اگر یہ لڑکی ڈاکٹر جی کے دوست کی بہن نہ ہوتی تو اسے میرا نام کیسے پتا چلتا؟'' ایمان نے خود کو تسلی دی تھی۔

''اچھا باجی لیکن ڈاکٹر جی خود کہاں ہیں؟'' ایمان نے اپنے کپڑوں کا شاپر مضبوطی سے پکڑتے ہوئے پوچھا تھا۔ جس میں دو تولے کا ننھا منا سا سونے کا سیٹ تھا۔ جو اماں نے پیسہ پیسہ جوڑ کر ایمان کی شادی کے لیے بنایا تھا۔ اس کے علاوہ وہ گھر کے خرچ کے تین ہزار بھی چرا لائی تھی۔

لیکن وہ نادان بھول گئی کہ وہ کیا چیز چوری کر لائی تھی۔ پیسے سونے ہر چیز کا نعم البدل ہے۔ ہر چیز کا نقصان پورا ہو جاتا ہے۔ لیکن اولاد اور عزت کا نقصان کوئی پورا نہیں کر سکتا ہے۔

''تمہارے ڈاکٹر صاحب تمہارا گاڑی میں انتظار کر رہے ہیں۔'' لڑکی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔

ساری عمر اماں نے اُسے کسی قیمتی لال ہیرے کی طرح چھپا چھپا کر رکھا تھا۔

اُس کی معصومیت کو کبھی زمانے کی ہوا نہیں لگنے دی تھی۔ لوگ اور ان کے رویے۔ زمانہ۔ اُسے ان کی پہچان بالکل نہ تھی۔

لیکن اُس کی اونچی خواہشوں نے اُس کی معصومیت کی دیوار پھلانگ لی تھی۔ اور آج وہ خواہشوں کے پیچھے بھاگتی ہزاروں میل دور اماں ابا اور اپنے آنگن کو چھوڑ کر اتنے اجنبی لوگوں کے درمیان تھی۔

''کہاں ہیں ڈاکٹر جی؟'' ایمان نے کار کے پاس پہنچ کر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تھی۔

''تم گاڑی میں بیٹھو۔ آ رہے ہیں، تمہارے ڈاکٹر جی!'' لڑکی کا لہجہ کچھ بدلا ہوا تھا۔ لیکن ایمان جان پائی تھی۔

اگر اس کے اندر ''پہچان'' کی صلاحیت ہوتی تو وہ یوں اپنے گھر کی چار دیواری اور جان چھڑکنے والے ماں باپ کو چھوڑ کر نہ آتی۔

وہ سادہ لوح ماں باپ جن کی محبت کا مرکز صرف اور صرف ایمان تھی۔ جب زندگی کا مرکز ختم ہو جائے بے وفائی کر ڈالے تو پیچھے کیا بچتا ہے۔

"یہ۔ یہ گاڑی کیوں چلادی۔" ایمان نے گاڑی کے ایک دم چلنے پر گھبرا کر پوچھا تھا۔

"وہ۔ ڈا۔ ڈاکٹر جی کہاں ہیں باجی؟"

خوف سے ایمان کی آواز پھٹ رہی تھی۔

"تمہارے ڈاکٹر جی؟ ارے وہ تو کب کے واپسی کی گاڑی میں واپس جا چکے ہیں۔"

لڑکی کے لہجے میں اطمینان ہی اطمینان تھا۔

لڑکی کے انکشاف نے ایمان کو ایک دم پتھر کا بنا دیا تھا۔ لیکن اگلے ہی پل وہ بلک بلک کر رو دی تھی۔

"باجی ڈاکٹر جی مجھے چھوڑ کر واپس کیوں چلے گئے؟" اس کا دل سامنے کی حقیقت کو ماننے کو تیار نہ تھا۔ اس لیے اُس نے ایک بار پھر اس سے پوچھا تھا۔

"کیوں کہ انہیں تو جانا ہی تھا۔" لڑکی نے اطمینان سے جواب دیا۔

"لیکن۔ وہ۔" ایمان نے گھبراہٹ سے دائیں بائیں دیکھا تھا۔ کار کے شیشوں کے باہر مناظر تیزی سے دوڑ رہے تھے۔

"لیکن وہ مجھے کیوں چھوڑ گئے۔ اور آ...... آپ مجھے کہاں لے کر جا رہی ہیں؟" ایمان نے پوچھا۔

گاڑی چلاتا ہوا بڑی بڑی مونچھوں والا ڈرائیور اُسے خوفزدہ کر رہا تھا۔

"ارے احمق لڑکی۔ تمہیں کیا ابھی تک نہیں پتا چل سکا کہ ڈاکٹر گلزار تمہیں کیوں چھوڑ گیا ہے!" لڑکی نے نہایت سفاکی سے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں!" ایمان کے منہ سے صرف ایک لفظ نکلا۔

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھریں اُس لڑکی سے سوال کر رہی تھیں۔ "کیوں کہ...... وہ تمہیں ہمارے ہاتھوں بیچ گیا ہے!"

ایمان کے چاروں طرف شاید بم دھماکے ہوئے تھے۔ اور اس کا سارا وجود ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔

"کیا! بیچ گئے ہیں؟ مجھے۔" ایمان کے مردہ وجود سے مری مری آواز سوال بن کر نکلی تھی۔

"ہاں! پچاس ہزار نقد میں۔ پچیس ہزار وہ پہلے لے چکا تھا۔" ایک اور بم دھماکا ہوا تھا۔

یا شاید تیز رفتار گاڑی اُسے کچلتی آگے نکل گئی تھی۔ لیکن پھر وہ ایک دم نیند سے جاگی۔

"با۔ باجی۔ آپ کو اللہ جی کا واسطہ، مجھے اتار دیں میں اپنے گھر واپس چلی جاؤں گی۔"

"میرے اماں ابا بڑے اچھے ہیں وہ میری بھول کو معاف کر دیں گے۔" ایمان گڑگڑانے لگی تھی۔

"واپس! تم نہیں جانتی کہ تمہیں خریدنے والے کون سے ہاتھ ہیں۔ جہاں آنے کے ایک سو راستے ہیں لیکن واپس جانے کا ایک بھی راستا نہیں ہے۔"

"ہاں صرف ایک کھڑکی ہے، جہاں موت کے ذریعے باہر کودا جا سکتا ہے۔" لڑکی کے لہجے میں ایک دم یاسیت در آئی تھی۔

"میں۔ کچھ نہیں جانتی۔ مجھے واپس جانا ہے۔" ایمان نے تقریباً چلاّتے ہوئے کہا تھا۔

"رکو۔ روکو گاڑی۔" ایمان نے گاڑی کے دروازے کے لاک کھولنے کی کوشش کی تھی۔

لیکن گاڑی کے آٹو میٹک لاک کھولنا ایمان کے بس میں کہاں تھا۔

"باجی...... باجی رحم کرو ناں! ایمان نے دروازے کے ساتھ زور آزمائی کرتے ہوئے اس لڑکی سے منت بھرے لہجے میں کہا...... آپ کو اللہ جی کا واسطہ۔"

"سوری ایمان...... مجھے افسوس ہے! لڑکی نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔" روتے روتے ایمان کا نقاب کھل گیا تھا۔

لڑکی جس کا نام فرزانہ تھا، اُسے ایمان کی کم عمری اور بھولپن پر بے انتہا ترس آیا تھا۔ لیکن وہ خود بھی بے بس تھی۔

"افسوس تمہارا حسن ہی تمہارا دشمن بن کر رہ گیا!" ضروری نہیں کہ اچھی شکلیں ہی اچھے مقدر حاصل کر سکیں۔

"مجھے واپس جانا ہے! دروازہ کھولو! مجھے میرے گھر واپس جانا ہے!" ایمان نے ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے کہا۔

"ایمان اب تم کبھی واپس نہیں جا سکتی۔" لڑکی نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ ایمان نے اُس لڑکی کو پھٹی پھٹی نگاہوں کے ساتھ دیکھا تھا۔

ایمان کو یوں لگ رہا تھا کہ اُس کا سانس بند ہو گیا ہے۔ اور منظر دھندلے ہو چکے ہیں۔ دور سے کہیں اُسے دو آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

"ایمان۔ ایمان پتر!"

شفیق آوازیں دور جا رہی تھیں۔

چھوٹے سے آنگن میں سہیلیوں سے کھیلتی وہ تتلی کی طرح اُڑتی چھوٹی سی ایمان۔ اس کا آنگن دور جا رہا تھا۔ ابا کا پیار بھرا سینہ اور ان کا لمس، سب منظر بھاگتے دور جا رہے تھے۔

اماں کے ساتھ چارپائی پر لیٹی ایمان تاروں بھرے آسمان کے نیچے کہانیاں سنتے، خواب بنتے وہ منظر دور جا رہا تھا۔

بچپن، معصومیت، جوانی کی اوّلین بہار، گھر آنگن، چھاؤں جیسے ماں باپ، سب منظر تیزی سے دور بھاگ کر غائب ہو چکے تھے۔

ایمان نے دھندلی آنکھوں کے ساتھ۔ پوری طاقت کے ساتھ سانس لینے کی کوشش کی تھی لیکن بے سود رہا تھا۔ وہ سانس لے نہیں پا رہی تھی۔

"اماں...... ابا!" اُس کے ہونٹ ایک پکار لیے ذرا سا کپکپائے۔

ایمان ایک دم ہوش حواس سے بیگانہ ہو کر گاڑی کی سیٹ پر لڑھک گئی تھی اور گاڑی تیزی سے اندھیروں کی جانب بڑھ رہی تھی۔ ایسے اندھیرے جہاں صرف کھائیاں، گہرائیاں اور اُترائی تھیں۔

❖❖○❖❖

"سوری یار۔ مُسکان کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔" اس لیے میں اس کے پاس رک گئی تھی۔

سائرہ نے اپنی خالا سے معذرت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

”دیکھو سائرہ۔ تم اور طارق مجھے بے حد عزیز ہو اور تمہاری کوئی بھی بے پروائی میں برداشت نہیں کرسکتی ہوں۔“ آنی کا غصّہ کم ہونے کو آ ہی نہیں رہا تھا۔

”ساری رات اور آج کا سارا دن تم نے مُسکان کی طرف اور طارق نے ولی کی طرف گزارا۔ یعنی دونوں بہن بھائی کو دوست سہیلی اپنی آنی سے زیادہ عزیز ہو گئے۔“ آنی نے خفگی سے کہا۔

”ارے بابا رے۔ بابا رے!“

”یہاں کے موسم کا ٹمپریچر تو بہت زیادہ ہے۔“ سائرہ نے آنی کے کندھوں کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے کہا۔

”میری پیاری سی جانو آنی۔ پلیز سوری معاف کردیں۔ آئندہ احتیاط کروں گی۔“ سائرہ کے اندر یہ بہت خوبصورت عادت تھی کہ وہ اپنی غلطی کو غلطی مان لیتی تھی۔ ضد کرکے اس پر بیٹھی نہ رہتی تھی۔

”اچھا اب زیادہ مسکہ نہ لگاؤ۔“ نیلوفر نے سائرہ کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اوہ میری سویٹ جانو آنی۔ آپ کی یہ ہی بات تو سب سے اچھی ہے کہ آپ بہت سوفٹ ہو، بالکل موم کی طرح۔ ہمیشہ مان جاتی ہو۔“ سائرہ نے خوشی سے کہا۔ بے شک اُسے اپنی آنی سے بے حد پیار تھا۔

”اچھا اب جاؤ اور جا کر فریش ہو جاؤ۔ آج میں نے تمہاری پسند کا شاشلِک اور چائنیز رائس بنوائے ہیں۔“ نیلوفر نے سائرہ کو فریش اپ ہونے کے لیے اُٹھایا۔

سائرہ اپنا ہینڈ بیگ اور موبائل لے کر اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

”ہونہہ۔ نیلوفر۔ اور موم!“

نیلوفر نے ایک تنفر سے سوچا تھا۔

”میری جان سائرہ تم کبھی نہیں جان پاؤ گی کہ نیلوفر موم نہیں بلکہ ایک چٹان ہے۔“

”ایسی چٹان جس سے جو ٹکرائے گا، پاش پاش ہو جائے گا۔ جیسے تمہارا باپ شہریار آج مجھ سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو چکا ہے۔“

”تم نے تو میرا موم روپ دیکھا ہے۔ تم مر کر بھی کبھی کسی کا یقین نہ کرو گی کہ تمہاری آنی کتنی سخت عورت ہیں۔“

”تم لوگ کبھی جان نہ پاؤ گے کہ تمہارا باپ کس کی وجہ سے تم لوگوں سے اتنا دور ہے اور۔ کتنا تڑپتا ہے۔“ اس خیال کے ساتھ ہی وہ آپ ہی آپ مُسکرانے لگیں۔ ایسی مسکراہٹ جو زہر کی طرح زندگی کو چھین کر مار دے۔

❁

”یہ بیماری کب سے ہے؟“ بابا جی کی آواز میں کچھ غیر معمولی پن تھا۔

”وہ جی تب سے جب سے بلال صاحب چھوٹے سے تھے۔ شروع شروع میں کبھی کبھار ایسی حالت ہوتی تھی۔ لیکن بابا جی اب تو بیچارے کو اکثر مہینے یا ہفتے بعد دورہ پڑ جاتا ہے۔“ آسیہ نے پوری آنکھیں کھولتے ہوئے بتایا۔

”آہ! سزا کا عمل شروع ہو چکا ہوتا ہے!“

”انسان کس قدر بے خبر ہے۔ وہ ”بجتے الارم“ کو بھی نہیں سن پاتا۔“

بابا جی اتنی دھیمی آواز میں بولے تھے کہ آسیہ سن نہ پائی تھی۔

”انسان جو بوتا ہے۔ وہ ہی حاصل کرتا ہے! منفی رویے، منفی زندگی، حاصل جمع کو بھی منفی کر دیتی ہے۔ اور ہاتھ میں سوائے پچھتاوے کے کچھ نہیں آتا۔“

بابا جی اتنا دھیرے بول رہے تھے کہ جیسے خود سے باتیں کر رہے ہوں۔ آسیہ حیرت سے بابا جی کو تک رہی تھی۔ معافی مانگ لینا اور اپنے ربّ کی طرف پلٹ آنا ہی سب سے بہتر ہے۔

جہاں یہ ساری سزائیں برحق ہیں وہاں سب سے اہم سچائی یہ ہے کہ اللہ رحمٰن کریم کی ذات بہت معاف کرنے والی اور رحمان ہے۔

”ہمارے گناہ کتنے بڑے ہی کیوں نہ ہوں لیکن اللہ جی کی رحمت سے بڑے اور سو گنا نہیں ہو سکتے۔“ بابا جی کی باتیں آسیہ کو فوری سمجھ تو نہیں آ رہی تھیں لیکن جانے ان باتوں اور ان کے لہجے میں کیا تھا کہ اس کے بے قرار دل کو ایک دم قرار سا آ گیا۔

”بابا جی۔ آپ کہتے ہیں تو آج میں خود سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں اپنی ساری پریشانیاں اللہ کے سپرد کرتی ہوں۔“ آسیہ نے کہا۔

”اے اللہ کی رحمت...... تو جان لے کہ انسان اللہ کی بڑائی مانے یا نہ مانے وہ بڑا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اپنے معاملات اللہ کے سپرد کرنا اُس پر یقین کرنا ہمارے ہی فائدے کے لیے ہے۔ ضرورت مند ہم ہوتے ہیں۔ عاصی ہم ہیں۔ وہ تو بہت بڑی او کریم ذات ہے!“ بابا جی نے آسیہ کے یقین او رجات کو درست کرتے ہوئے کہا۔ آسیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

”بابا جی۔ بلال صاحب کا مکمل علاج شہر میں نہیں ہوسکتا؟“ آسیہ نے معصومیت سے پوچھا۔

”پیاری بیٹی! پہلے مریض آگہی تو حاصل کرلے کہ اُسے مرض کس وجہ سے ہے پھر ہی علاج کروایا

جائے گا۔ پہلے بے خبر کو خبر تو ہو جائے۔'' بابا جی کی باتیں اتنی مبہم بھی نہ تھیں کہ آسیہ سمجھ نہ پاتی۔

سیّد سرفراز کی سفا کی کی داستان وہ اپنے ماں باپ سے سنتی آئی تھی۔ آسیہ کی نظروں کے سامنے بلال کا چیختا چلاتا اور تڑپتا وجود گھوم گیا تو اُس نے بے اختیار جھرجھری لی۔

❖❖○❖❖

ہمارے بس میں اگر اپنے فیصلے ہوتے
تو ہم کبھی کے گھروں کو پلٹ گئے ہوتے

''آہا بابا جی! یہ کیا ہے؟'' اس نے خوشی سے اُس خوبصورت ڈیکوریشن پیس کو چھو کر پوچھا۔

''یہ تتلی ہے!'' اس کے بابا نے اسے پیار سے بتا کر واپس اپنی گود میں بٹھالیا، وہ خوبصورت پیس کو توڑ سکتی تھی۔

اس وقت وہ اپنے مالک کی کوٹھی میں آئے بیٹھے تھے۔ مالک کی بیگم اچھی کڑھائی اور ڈیزائن کی شوقین تھی۔ اور ان کی بیوی ایسے خوشنما پھول کاڑھتی تھی کہ کچھ پَل کو حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ مالکن ان کی بیوی کے ہنر کی قدردان تھی اور عام لوگوں سے زیادہ معاوضہ دیتی تھی۔ اس لیے اکثر وہ ان کو بلاوا بھیجتی تھی اور وہ کپڑے لینے دینے کوٹھی آجایا کرتے تھے۔

اس وقت بھی وہ اپنی سات آٹھ سالہ پیاری سی بچی کے ساتھ اس عالیشان ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔

''بابا...... بابا جی!'' ان کی بیٹی نے اِن کو پکار کر متوجہ کیا۔

''بابا جی کیا تتلی بھی کبھی شیشے کی ہوتی ہے؟'' معصوم ذہن نے معصوم سا سوال کیا۔

''بیٹا تتلیاں تو رنگوں کی ہوتی ہیں۔ یہ تو مصنوعی بنائی گئی ہے۔'' باپ نے پیار سے اپنی بیٹی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''بابا جی...... جب جب میں تتلی کو پکڑنا چاہتی ہوں۔ تتلی اُڑ کیوں جاتی ہے؟''

''اس لیے کیوں کہ تمہاری چاہت 'خواہش ہی غلط ہے۔'' بابا نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''لیکن بابا مجھے تتلیاں اچھی لگتی ہیں۔'' وہ مُصر تھی۔

''ہر اچھی لگ جانے والی چیز کو حاصل کرنا درست نہیں ہے۔'' بابا کی بات نے اُس کے اندر غیر اطمینانی بھر دی تھی۔

وہ شروع سے ہی شاید ایسی تھی، جب اس کی بات پوری نہ ہوتی تو سوال اور خواہش اُسے بے چین کر دیتی تھی۔ تتلیاں پکڑ کر رکھنے کی خواہش ان میں سے ایک تھی۔

''لیکن بابا...... میں تتلی کو ایک بار پکڑ کر چھوڑ دوں گی۔'' اس نے ایک دَم باپ کی گود سے نکلنے کی کوشش کی۔

''نہیں بیٹا وہ تتلی تو مصنوعی ہے!'' بابا نے لپک کر پھر اُسے قابو کرلیا۔

''لیکن مجھے ایک بار اُسے پکڑ کر چھو کر دیکھنا ہے۔'' اس کے لہجے میں ضد نمایاں تھی۔

اور ہر خواہش کو پکڑ کر چھو لینے کی ''تمنا اور ضد'' نے اس کے ہاتھوں سے اس کی زندگی کی خوبصورت

چیزیں اور رنگ چھین لیے تھے۔

''بابا، اماں، معصومیت، گھر آنگن سب کچھ...... سب کچھ اب اُسے ہر وقت جاگتے سوتے یا دین حقیقت کی طرح دکھائی دینے لگی تھیں۔ ایسے میں وہ اس منظر کو بے خودی کے عالم میں چُھو کر محسوس کرنا چاہتی تو یہ پانی کے بلبلے کی طرح غائب ہو جاتے تھے۔ وہ ان آوازوں، منظروں کو پکڑنے اور محسوس کرنے کی کوشش کرتی تو سب کچھ ختم ہو جاتا تھا۔

اب بھی اُس نے بابا کے ہاتھ کو تھامنے کی کوشش کی تھی اور سارا منظر بُلبلے کی طرح پھوٹ کر غائب ہو گیا۔

''بابا......!'' وہ تڑپ کر اٹھی۔

ایک بار پھر اُس نے اس لمبی اونچی عورت کو اپنے قریب بیٹھے دیکھا تھا۔ اس نے اپنے اِرد گرد نظر دوڑا کر دیکھا تو اسے یاد آیا کہ وہ دربار کی سیڑھیوں پر بے ہوش ہو کر گری تھی اور اب وہ سفید سنگ مرمر کے ٹھنڈے فرش پر لیٹی ہوئی تھی۔ پاس میں وہی عورت آنکھیں موندے تسبیح کے دانے گرا رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی اور فضا میں خنکی کا احساس نمایاں تھا۔ اس خاموشی کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد کبوتروں کی غٹر غوں، غٹر غوں توڑ رہی تھی۔

اُس نے اپنے ارد گرد نظر دوڑائی تو اُسے زیادہ تر عورتیں اپنے دوپٹوں، چادروں میں سوتی نظر آئیں۔ دربار میں یہ خواتین شاید باہر کے شہروں سے آئی زائرین تھیں۔ کیوں کہ ہر طرف خاموشی اور تنہائی سی تھی۔

''تم اٹھ گئی ہو تو جاؤ پتر وضو کر آؤ۔ تہجد کا ویلا ہونے والا ہے۔ اُس رب سچے اللہ سوہنے کے آگے سر جھکا کر فریاد کرتے ہیں وہ بڑی سننے والا ہے۔'' اس عورت کی شفیق آواز نے اُسے اپنے خیالوں سے چونکا دیا، وہ ترنم سے یوں مخاطب تھی، جیسے اسے ہمیشہ سے جانتی ہو اور ان کے درمیان یہ مکالمہ اور منظر روز کا ہو۔

''میں...... میں اللہ سے اتنی شرمندہ ہوں کہ میرا منہ نہیں بنتا کہ میں اس کے آگے حاضر ہوؤں۔'' ترنم نے نقاہت سے کہا۔ اس کے لہجے میں بے انتہا بے بسی تھی۔

''میں...... اس قابل نہیں ہوں اماں کہ مجھے معافی مل سکے۔ میری فریاد سنی جاسکے۔'' دو آنسو اس کی خشک آنکھوں سے پھر بہہ نکلے۔

''پتر تو ایسا نہ بول!...... پیر کامل (ﷺ) آکھدے (کہتے) نیں کہ رب سچے کو یوں نا امیدی کرن والا کافر ہوندا اے۔ اک آس دا رشتہ، اک امید دا رشتہ صرف اُس کے ساتھ سے نہیں ٹوٹنا چاہیے۔ اور رب سوہنا بڑا مہربان اے! بڑا رحیم ہے! اے ساری صفتاں (خوبیاں) خود اُس نے بتائی ہیں۔ تو اس کو ان ناموں سے پکار اپنی معافی کی درخواست بول وہ معاف کرن (کرنے) والا ہے۔ اُس نے ہی معافی دینی ہے، اُس نے ہی بخشش دینی ہے۔ منگن (مانگنے) والے کو دیتا ضرور ہے۔''

''جب تک تو فریاد لے کر اُس کے بوئے (دروازے) کو کھٹکھٹائے گی نہیں تو دروازہ کیسے کھلے گا؟''

اس عورت کے چہرے پر ایک دِھیمی نرم سی مسکراہٹ در آئی تھی۔

ترنم کسی مسمریزم میں تھی۔ اُسے اتنے سالوں بعد پہلی بار کوئی روزن دکھائی دیا تھا۔ ہَوا کا تازہ جھونکا محسوس ہوا تھا۔

"چل اُٹھ پتر ویلا نہ لنگھ جاوے۔ (وقت نہ گزر جائے)

ترنم اس جملے پر ایک دم چونکی۔ اس کے وجود کے اندر اماں کا یہ جملہ اکثر بازگشت کرتا تھا اور اُسے ہمیشہ بے چین رکھتا تھا۔

"یہ ویلا بڑا ہی قیمتی ہے۔"

"جب زیادہ خاموشی ہو تو ایک سوئی گرے تو اس کی آواز بھی سنائی دے جاتی ہے۔ ایسے میں اللہ سوہنے کو پکارو تو کتنی زیادہ ہماری آواز آسانی سے سنائی دے گی اُسے۔ خاص نگاہ مل جائے گی۔ اس ویلے جب سارا جگ سوتا ہے اور ہر طرف خاموشی ہوتی ہے تو رب سوہنا پہلے عرش پر آ کر پکارتا ہے کہ ہے کوئی منگن والا۔ ہے کوئی فریاد کرنے والا۔ میں اس کی جھولی بھر دوں گا، میں اس کی سنوں گا ایسے میں جب ہم اس کو پکارتے ہیں تو وہ ضرور سنتا ہے۔ یہ اس کا وعدہ ہے، تو اپنا یقین پکا کر لے، اپنی آس کی ڈوری مضبوط کر لے پھر دیکھنا تجھے تیرے مطلب کی چیز کیسے ملتی ہے۔"

"پتر...... پہلے اس رب سے رشتہ تو بنا۔ اپنا رشتہ پکا کر فیر (پھر) تم دیکھنا مولا کتنا مہربان ہے۔" اُس عورت کی شفیق آواز ترنم کے نقاہت بھرے وجود میں کسی توانائی کی طرح داخل ہو رہی تھی۔

"اُٹھ پتر جب اتنی خاموشی میں سوئی گرنے کی آواز سنائی دے جاتی ہے۔ تو تُو بھی فائدہ اٹھا لے۔"

ترنم مسمریزم میں چلتی وضو کے لیے لگے نلکوں کے پاس بیٹھ گئی۔ جب وضو کر کے اُس نے دو رکعت نفل نماز کی نیت کی تو اُس کے روئیں روئیں میں ایک عجیب سی لہر دوڑنے لگی، اک رقت طاری ہوئی کہ ہچکی بندھ گئی، وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے بالکل بے خبر ہو گئی۔

وہ آج پہلی بار دروازے پر آن کھڑی ہوئی تھی۔

اُس دروازے پر جو سب سے بڑی سرکار کا دروازہ تھا۔ وہ اپنے اندر ہمت مجتمع کر رہی تھی کہ وہ اس دروازے پر دستک دے سکے۔

آج پہلی بار دو رکعت نفل نماز آنسوؤں شرمندگی کے ساتھ اُس نے شروع کی تھی۔ یہ سفر کی ابتدا تھی۔ واپسی کا سفر کٹھن ضرور ہے لیکن چاہنے والوں کے لیے ناممکن ہرگز نہیں ہوتا۔ سلام پھیر کر اس نے اپنے ساتھ بیٹھی مہربان ہستی کو دیکھا، جو نرم مسکراہٹ کے ساتھ اُسے ہی تک رہی تھی۔

"دعا مانگا کر پتر!"

"دعا بھی عبادت ہے۔ بلکہ بڑا اہم حصہ ہے!"

ترنم نے آنسوؤں کا گولا نگلتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا، اس کے اندر کہیں روشنی کا گزر شروع ہوا تھا۔ آنسو اس قدر بہہ رہے تھے کہ منظر دھندلا ہونے لگا تو ترنم نے صرف اک پل کو آنسو صاف کیے اور جب نگاہ اٹھا کر سامنے دیکھا تو ششدر رہ گئی کیوں کہ اگلے ہی پل میں اب وہاں پر کوئی نہ تھا۔

"وہ مہربان عورت! وہ اماں کہاں گئی؟"

اس نے اِرد گرد نگاہ دوڑائی۔ لیکن وہاں کوئی نہ تھا اُسی پل موذن نے فجر کی اذان دی۔

"اللہ اکبر...... اللہ اکبر۔" ترنم کے اندر وہ لفظ کسی شفا کی طرح، کسی تریاق کی طرح اُتر رہے تھے۔ اُس کے زہر وجود...... بیمار وجود کو شفا کی امید ہو چلی تھی۔ وہ ہر جانب دیکھ رہی تھی۔ کچھ عورتیں اُٹھ کر وضو خانے کی طرف جا رہی تھیں لیکن جسے اس کی نگاہ تلاش کر رہی تھی وہ کہیں نہ تھی۔

"کیا میں نے کوئی خواب دیکھا تھا۔" ترنم نے بے خودی میں خود سے سوال کیا۔

اگر یہ خواب تھا تو اس "نائیٹ میئر" جیسی زندگی میں پہلی بار کوئی اچھا خواب تھا۔ اُس نے اک طمانیت بھرا گہرا سانس لیا۔ بے اختیار اس نے دعا کی۔

"اے اللہ مجھے معاف کر دینا۔ بے شک تو مہربان ہے!" آج پہلی بار اس کی ٹوٹے پیروں والی دعاؤں کو اپنے ساتھ پروں کا احساس ہوا تھا۔

❖❖○❖❖

میڈا عشق وی توں
میڈا دین وی توں ایمان وی توں
میڈا جسم وی توں میڈی روح وی
میڈا قلب وی توں جند جان وی توں
میڈا ذکر وی توں میڈا فکر وی توں
میڈا ذوق وی توں وجدان وی توں

کمرے میں ایک ہی گانا بار بار سنائی دے رہا تھا۔ مسکان نے بیسیوں بار سی ڈی **Repeat** کی تھی۔

آج اُس نے کچھ نہ کھایا تھا۔ دل ہر چیز سے اُچاٹ ہو گیا تھا۔ عجیب سی بے بس کیفیت میں سارا دن گزرتا تھا اور راتیں اس پر اور بھی بھاری تھیں۔

راتیں خواب لے کر آتی تھیں۔ وہ خوش رنگ خواب جو اس کے دل پسند ہوتے ہوتے زندگی کا مرکز بن گئے تھے۔ لیکن ساری رات خوابوں میں رہتے رہتے وہ دن کی حقیقت کو دیکھتی تو بے بسی سے رونے کو دل کرتا۔

ولی کی بے نیازیاں، بے خبریاں...... اک دن اُسے مار ڈالیں گی۔

"اُسے آخر خبر کیوں نہیں ہوتی؟" وہ اکثر اپنی طلب سے شکوہ کرتی۔

"اگر...... اے طلب تیری شدت زیادہ اور سچی ہے تو اُسے خبر کیوں نہیں ہوتی؟" وہ بے چین ہو کر کھڑکی کے پاس چلی آئی۔ پھر اُس نے یہ کھڑکی پوری کھول دی، تیز ہَوا کے جھونکے نے اُسے چھوا تھا۔

بابا نے یہ بنگلہ خاص طور پر اُس کے لیے ڈیزائن کروایا تھا۔

مسکان حُسن اور خاص کر قدرتی حُسن کی بے حد شوقین تھی۔ اس کی آرٹسٹک فطرت کو اس کے بابا نے بنا کہے محسوس کیا تھا۔ زندگی میں ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز میں بابا نے اس کی پسند کا خیال رکھا تھا۔

وہ بابا کے اتنے لاڈ پیار سے بھی بگڑی اولاد نہ ثابت ہوئی تھی۔ بابا کے لاڈ پیار نے اُسے اپنی پسند کو حاصل کرنے کا عادی بنا دیا تھا لیکن اس کے علاوہ اس میں کوئی قابل ذکر خاصیت نہ تھی۔ اور آج اس کی ذات کی ساری خوبیاں اس کی ذات کی ایک خامی کی وجہ سے پس منظر میں چلی گئی تھیں۔

میڈی وحشت جوش جنوں وی توں
میڈا گریہ آہ و فغاں وی توں
جے یار فرید قبول کرے
سرکار وی تو سلطان وی توں

گانے کے بول اس کے اندر بولنے لگے تھے۔

وہ تھک کر راکنگ چیئر پر آ بیٹھی۔ آنکھیں موندھے وہ اردگرد سے بے نیاز پھر سے گانے کے لفظوں میں کھو چکی تھی۔

اس پل مسکان کا چہرہ ایک کھلی کتاب بنا ہوا تھا۔

اس کے ہر راز سے پردہ اٹھاتے ہوئے۔

آپا اماں اس کے کھانے کی ٹرالی لے کر آئی تھیں، بے آواز دروازہ کھول کر جب وہ اندر داخل ہوئیں تو ان کا دل دھک سے رہ گیا۔

عورت کے اندر اللہ نے اک خاص الارم رکھا ہے۔

نظر کو پڑھ لینے کا وصف!

اور آپا اماں نے ساری عمر مسکان کو ماں بن کر پالا تھا۔ وہ ایک عورت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماں بھی تھیں۔

اور ماں تو زیادہ الرٹ اور باخبر رہتی ہے۔

مسکان کے کمرے کی فضا اور اس کے چہرے نے چغلی کھائی تھی اور ان کو صرف اک پل لگا تھا ساری سچائی جاننے کے لیے۔

''مسکان میری جان تم کو اپنے قدم روکنے ہوں گے۔''

''تمہارے بابا تمہاری زندگی کی ہر تمنا کو حقیقت میں بدل سکتے ہیں۔ لیکن محبت کے جُرم کو وہ خواب میں بھی معاف نہیں کر سکتے!۔'' آپا اماں کی آواز اور گفتگو پر مسکان ایک دم چونک کر کھڑی ہوئی۔

''آپا اماں!'' مسکان کے لہجے میں بے انتہا حیرانگی بول رہی تھی۔

''کیا اس کے دل کا راز...... راز نہیں رہا؟ مسکان بے حد پریشان نظر آنے لگی۔

''آپا اماں...... وہ...... میں۔!'' مسکان نے تھوک نگل کر خوفزدہ آنکھوں سے ان کو دیکھا۔

وہ جہاں سے تعلق رکھتی تھی۔ وہاں کی روایات سے بے خبر ہرگز نہ تھی۔ لیکن وہ کیا کرتی جانے کیوں ساری دنیا کو چھوڑ کر اس کا دل صرف اور صرف ولی کی جانب بھاگتا تھا۔

ایسے میں اُسے ولی کا وجود ایک بڑے مقناطیس کی طرح لگتا تھا۔ اور خود اپنا وجود لوہے کے ایک چھوٹے سے ذرے کی طرح...... جس کو اپنی جگہ پر اپنی حیثیت کے ساتھ قائم رہنا نہ آتا تھا۔ جو مقناطیس کو دیکھ کر ہی اس کی جانب بھاگنے لگتا تھا۔

وہ اپنے ہی وجود سے بے بس ہونے لگی تھی۔ ایسے میں اُسے اپنی ہر خاندانی روایت بھول جاتی تھی۔

''آپا اماں...... میں نے جان بوجھ کر اس رستے پر قدم نہیں رکھے۔'' وہ بے بسی سے اپنا آپ ان پر

ھول گئی تھی۔

''مسکان......! یہ رستہ خواب نگر تک تو جاتا ہے لیکن حقیقت میں اس رستے کی کوئی منزل نہیں ہے۔ تمہیں خود کو روکنا ہوگا۔'' آپا اماں کے لہجے میں بے انتہا سختی تھی۔

''آپا اماں...... اس رستے کی تو میں اکیلی مسافر ہوں اُسے تو خبر بھی نہیں۔'' مسکان نے ایک اور انکشاف کیا۔

''وہ کون ہے! اور اُسے اس کی خبر ہے یا نہیں تم کو یہ سب بھولنا ہوگا۔'' آپا اماں نے اُسے وارننگ دی۔

''آپا اماں...... میں بہت بے بس ہو جاتی ہوں۔ نا چاہتے ہوئے بھی میں بے بس ہو جاتی ہوں۔'' مسکان نے آس سے ان کے چہرے کو دیکھا۔

''سزا...... بہت بڑی سزا ملتی ہے۔ تم اپنے بابا کو نہیں جانتیں، تاریخ ان کی دی ہوئی سزاؤں سے آج بھی آنسوؤں سے بھری پڑی ہے۔''

''جس جرم کی تم مرتکب ہونے جا رہی ہو، اس کی سزا ہر ایک کے لیے ایک جیسی ہے۔ چاہے اس جرم کو کرنے والا ان کا قریبی ہو یا دور کا ہو۔''

''کوئی رشتہ، کوئی خون کا تعلق اس سزا کو روک نہیں سکتا!'' آپا اماں کا جملہ اور لہجہ کئی رازوں اور دکھوں کا گواہ تھا۔ وہ راز اور وہ دکھ، جن سے مسکان بالکل بے خبر تھی۔ اسی لیے تو اُسے اپنے بابا کا اصل چہرہ کبھی نظر نہ آیا تھا۔

''اس کے بابا کا چہرہ...... اصل چہرہ...... اک سفاک اور سنگ دل انسان کا چہرہ۔''

❖❖○❖❖

''کہاں تھی تم ساری رات؟'' ماہ رخ نے ترنم کو رنگے ہاتھوں پکڑا۔

''بس ایسے ہی گھومتے پھرتے نکل گئی تھی۔'' ترنم نے اپنی آنکھوں پر اپنا بازو رکھ لیا تھا۔ وہ کچھ سننے اور دیکھنے کے موڈ میں نہ تھی۔ ابھی ابھی چاندنی میڈم کا آدمی اُسے واپس لایا تھا۔

وہ جانے اور کتنی دیر لارنس گارڈن میں بیٹھی رہتی۔ وہ تو آگسٹن نے اُسے پکڑ کر جھنجھوڑا تھا تو وہ اپنے خیالوں سے نکلی تھی۔

''میم آپ کے بتائے بغیر جانے پر پریشان تھیں۔ ان کو آپ کی بہت فکر تھی۔'' آگسٹن کے جملے پر وہ تقریباً ایک منٹ ہنستی رہی، یہاں تک کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''تمہاری میم کو میری پریشانی تھی؟'' ترنم نے اس سے یوں پوچھا، جیسے اُس نے ترنم کو کوئی لطیفہ سنایا ہو۔ آگسٹن جو میڈم چاندنی کے گروہ میں کچھ نیا تھا وہ حیرانگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ لڑکی اُسے ہمیشہ عجیب سی لگتی تھی۔

یہ حقیقت تھی کہ میڈم نے کوئی بیسیوں فون کیے تھے کہ ترنم کا کچھ پتا چلا اور یہ لڑکی مذاق سمجھ رہی تھی۔ آگسٹن نے سر جھٹکا۔

''ترنم.....کدھر کھوگئی ہو؟ میں تم سے پوچھ رہی ہوں آخر تم کہاں تھی؟ جب میں فوٹو شوٹ کروا رہی جب تک تو تم میرے ساتھ ہی تھیں پھر اچانک کہاں غائب ہوگئیں؟'' ماہ رخ اُسے اتنی آسانی چھوڑنے والی نہ تھی۔

''یار اب آگئی ہوں، اب تو معاف کردو۔'' ترنم نے بیزار ہوکر کروٹ بدلی۔ اب تک کتنے ہی لوگو کو وہ جواب دے کر آئی تھی۔

''دفع..... ہوجاؤ۔ معلوم نہیں میں ہی کیوں تمہاری فکر میں ہلکان ہورہی ہوں۔'' ماہ رخ کہا برداشت کرنے والی تھی۔

''جانے کیوں مجھے تم سے اتنی انسیت ہے اور میرے دل میں شاید تھوڑی سی محبت بھی ہے تمہار لیے..... اور تم! مہارانی کے تو مزاج ہی نہیں ملتے ہیں۔'' ماہ رخ نے غصے سے ہاتھ میں پکڑا کشن اُ دے مارا۔ ترنم اتنے بُرے موڈ کے باوجود ایک دم مسکرادی۔

''ایک تو کم بخت مسکراتی اتنا خوبصورت ہے کہ بندہ ناراض بھی نہیں رہ سکتا ہے۔'' ماہ رخ نے تڑا چٹکی کاٹتے ہوئے کہا۔

اب کہ ترنم باقاعدہ کھلکھلائی تھی۔

''اے! خیر تو ہے؟ آج میری پیاری بنّو کے چہرے پر بڑی پیاری مسکان ہے! رات کدھر تھی؟'' رخ نے اس کے پہلو میں لیٹتے اُسے گدگدایا۔

''چھوڑو یار ان سب باتوں کو۔ تم بتاؤ آج کالج گئی تھیں؟'' ترنم نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں گئی تھی۔ لیکن تمہاری پریشانی میں دل نہیں لگا اور میں نے کوئی کلاس اٹینڈ نہیں کی۔''

''میرا تو بہانہ ہے جناب..... آپ تو کبھی کبھی ہی کلاس روم کو عزت بخشتی ہیں۔'' ترنم نے اُ چھیڑا۔

''اچھا تمہیں آج مزے کی ایک خبر سناؤں۔'' ماہ رخ نے کسی بات پر چسکا لیتے ہوئے کہا۔

''کیا خبر ہے؟'' ترنم نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ ہماری کلاس کی چوچی سی، بونگی سی سعدیہ تھی ناں؟'' ماہ رخ نے اُسے یاد دلایا۔

''ہاں کیا ہوا اُسے؟'' ترنم نے پوچھا۔

''بڑی نیک پروین بنی پھرتی تھی، ہر جگہ کھڑے ہوکر مذہب پر بھاشن سنایا کرتی تھی۔ اب بی بی خود بھی دونمبری بنی ہوئی ہے۔'' ماہ رخ نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔

''دونمبری؟'' ترنم نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ارے یار جب لڑکی ان چھوئی ہوتو ایک نمبر..... ڈبہ پیک ہوتی ہے ناں!'' ماہ رخ اتنی عمدہ تشب مسکراتے ہوئے بولی۔

ترنم کے چہرے پر سایہ سا گزر گیا۔

''وہ اپنا وسیم ہے ناں! اُس نے پھانسی ہے یہ بونگی بونتر!'' ماہ رخ کو سعدیہ کی واجبی سی شکل بالکل نہ تھی۔

''وسیم اُسے پہلے محبت بھرے خط اور تحائف دیتا رہا۔ پھر میڈم اس کے ساتھ گھومنے لگی۔ پچھلے مہینے وہ اسے فورٹریس والے ہوٹل میں لے گیا۔ ارے وہ ہی لکڑی کے کیبنوں والا جہاں کی چائے تین سو روپے کی ہے اور ہر کیبن پر ویٹر پاؤں بجاتا جاتا ہے تاکہ اندر والے الرٹ ہوجائیں۔'' ماہ رخ کو باقاعدہ ہنسی آرہی تھی۔

''وہاں اُس نے وسیم کے ساتھ مزے اُڑائے پھر اس سے شادی کی ڈیمانڈ کرنے لگی۔''

''بھلا جب شادی کے بغیر مرد کو مزہ مل رہا ہو تو شادی کی بلا سر پر کون سوار کرے؟''

''وہ تو وسیم کے ساتھ چپکو ہوگئی۔ پھر یہ وسیم ہی تھا، جس نے اپنے شاطر دماغ سے اس سے پیچھا چھڑایا۔'' ماہ رخ ایک لڑکی کی تباہی کی خبر بھی چسکے لے کر سنا رہی تھی۔ یہ یہاں کی ٹریننگ کا حصہ تھا۔

''کوئی ہفتہ پہلے وہ اُسے شادی کے بہانے لے گیا اور اُسے بے ہوش کرکے اپنے یار دوستوں کو بھی عیش کروائی اور اس کی مووی بھی بنائی۔ جب چڑیا کے پر ہی کٹ گئے تو اُس نے کہاں پھڑ پھڑانا تھا۔''

''چلو وسیم کی تو عیش ہوگئی، ساٹھ ستر ہزار میں یہ مووی بکی ہے۔ بونگی پر سرمایہ کاری خالی نہیں گئی۔'' ماہ رخ نے روم فریزر سے جوس نکال کر منہ کو لگاتے ہوئے کہا۔

ترنم کو یوں لگا، جیسے اس کو سانس لینا مشکل ہوجائے گا۔

''لیکن یار ایک بات عقل میں نہیں آتی کہ ہماری فیلڈ میں شکل اور جسم کا خوبصورت ہونا لازم کہا جاتا ہے تو پھر جب آپا (میڈم چاندنی) نے ان کم شکل لڑکیوں کو بزنس میں لانا نہیں ہوتا تو پھر ان کو پھانسنے کے لیے لڑکوں پر سرمایہ کیوں خرچ کرتی ہیں؟'' ماہ رخ کو اکثر یہ بات کھٹکتی تھی، آج اس نے ترنم سے ظاہر بھی کرلی تھی۔

ترنم کے وجود میں سنسنی سی پھیل گئی۔ وہ میڈم چاندنی کے کچھ رازوں سے بے خبری میں باخبر ہوگئی تھی۔

''آپا کا تعلق کسی غیر ملکی ایجنسی سے تھا۔ اور اس طرح کے سوشل پرابلم کری ایٹ کرنے کا اُسے باقاعدہ پیسہ ملتا تھا۔''

''کم عمر، کم شکل لڑکیوں کی سی ڈیز آج کل عام بک رہی تھیں۔ ماؤں کی عدم دلچسپی اور بے خبری کی وجہ سے یہ ننھی منی کلیاں کچلی جارہی تھیں۔ اچھی شکل کی لڑکیوں کے لیے میڈم لمبی انویسٹمنٹ کرتی تھی کیوں کہ ان کو تو باقاعدہ اپنے پاس رکھتی تھی۔''

میڈم چاندنی اور اس کے گروہ کے لڑکے ایسے شیطان تھے جو ہر بہکی لڑکی کو مزید بہکا لے جاتے تھے۔ ان سے صرف وہ لڑکیاں بچ رہی تھیں، جن کے والدین ان کی خبر رکھتے تھے۔

''کیا خیال ہے یار..... آخر میڈم ان بونگیوں پہ بھی یکساں انویسٹ منٹ کر رہی ہیں۔ کیوں؟'' ماہ رخ نے اپنا سوال دہرایا۔

''میں..... میں کیا کہہ سکتی ہوں۔'' ترنم نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

میڈم چاندنی کے ہاتھ بہت لمبے تھے، کوئی اس کے چنگل سے کہاں بچ کر نکل سکتا تھا۔ ایسے میں اس کے راز سے پردہ اٹھانے والے کی بھی خیر نہیں ہوتی تھی۔ اور اگر کبھی کسی کو کوئی بھنک بھی ملتی تو وہ ترنم ہی

کی طرح چپ ہو جاتا تھا۔

❖❖○❖❖

"پلیز سر...... پلیز۔"

ساری کلاس میں اس قسم کی ہی آوازیں آ رہی تھیں۔ سر بٹ نے اسائنمنٹ کی جو ڈیٹ دی تھی۔ آج وہ ڈیٹ تھی اور آدھی سے زیادہ کلاس نے کام نہیں کیا ہوا تھا۔

"وہ تو ثانیہ کو روک کر سر نے صبح صبح کہا کہ آج ڈیڑھ بجے میں Exernal کو لے آؤں گا۔ تم لوگ گیارہ بجے تک اپنا ڈسپلے لگا دینا۔"

ثانیہ کے تو مانو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ وہ تو خود ابھی تک قلم کا رول کرواتی پھر رہی تھی۔ کہاں ڈسپلے کی باتیں کر رہے تھے۔

وہ تقریباً بھاگتی ہوئی کلاس میں گئی۔ سمیرا، کاشف لوگوں کا گروپ حسب معمول سموسے اور بوتلیں اڑا رہا تھا۔ ساتھ ہی دنیا جہاں کے ٹاپکس پر گپ شپ ہو رہی تھی۔

سائرہ اور مسکان البتہ کام کر رہی تھیں۔ باقی کے بھی کچھ لوگ سلو موشن میں لگے ہوئے تھے، سب لا بے فکر تھے۔

لیکن اُس نے سر کا پیغام دے کر سب کی بے فکریاں اُڑا دی تھیں۔

"اوہ نو! مارے گئے!" ہر طرف سے یہ جملے بلند ہوئے۔ پھر کچھ دیر بعد سمیرا اور کاشف ساری کلاس لے کر سر کے سامنے کھڑے تھے اور ڈسپلے کی ڈیٹ آگے بڑھانے کا اصرار کر رہے تھے۔

"نو...... نو! میں تم لوگوں کو تقریباً ایک ویک زیادہ دے چکا ہوں۔" سر بٹ بہت اصولی آدمی تھے، کم ہی کسی کی سنا کرتے تھے۔

"سر ابھی کل ہم نے فوٹوگرافی کی اسائنمنٹ کی ہے۔ ابھی اس اسائنمنٹ کو تو ہم نے ٹھیک سے دا بھی نہیں۔" سمیرا نے نزاکت سے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ گفتگو میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد یہ احتجاجی سر چیخیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔

"تو ڈیئر تم لوگ ویسے ہی نمبر دیکھ لینا۔" سر بٹ نے بے نیازی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سر ٹائم ہی کم تھا۔ اتنے کم ٹائم میں پورا اشتہار تیار کرنا کتنا مشکل ہے!" ماریہ نے بھی گفتگو میں لے ڈالا۔

لڑکے کم بول رہے تھے، لڑکیاں زیادہ بول رہی تھیں ان سب کا خیال تھا، جیسے دوسرے مرد ٹیچر کے لڑکی ہونے کی گنجائش دے دیتے ہیں اس طرح سر بٹ بھی مان جائیں گے۔

لیکن وہ نہیں جانتی تھیں کہ ان کا پالا کس سے پڑا ہے۔

"ٹائم کم ہو یا زیادہ...... بیٹا جی ٹائم کو مینج کرنا سیکھو۔" سر بٹ نے باقاعدہ ان کو نصیحت کی۔

طلبہ کا یہ لاپروائی کا رویہ ان کو بہت برا لگتا تھا۔

"تم لوگ اپنا اتنا قیمتی وقت بغیر سوچے سمجھے بلیک ہول میں ڈالتے رہتے ہو۔ ابھی تم میں سے انارکلی میں شاپنگ یاد آ گئی تو سارا گروپ خریداری کرنے نکل پڑے گا یا شام میں الحمرا میں کوئی فنکشن

سب ایک دوسرے کو گھسیٹ گھسیٹ کر لے جائیں گے۔"

"اور تم بیٹا ماریہ ڈانس کی ورکشاپ بھی لے رہی ہو۔ مہاراج کا لیکچر اٹینڈ کرنے کے لیے تمہارے پاس وقت ہوتا ہے۔ لیکن ہفتے میں تین دن کمپیوٹر کلاس میں تم کم ہی آتی ہو؟"

"میں آنکھیں رکھتا ہوں اور سب دیکھ رہا ہوتا ہوں کہ کون کیا کر رہا ہے۔ اس لیے میرے آگے یہ لولے لنگڑے بہانے چل نہیں سکتے۔"

"ایک دن میں صرف چوبیس گھنٹے ہی ہوتے ہیں لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے کچھ لوگ ایک دن میں ڈھیر سارے کام مکمل کر لیتے ہیں جبکہ دوسرے لوگ اپنی تمام کوشش کے باوجود کچھ بھی خاص نہیں کر پاتے۔ یہی گھنٹے تو دونوں قسم کے لوگوں کو یکساں دستیاب ہیں پھر کیوں چند لوگوں کے لیے یہ گھنٹے خوشیوں اور کامیابیوں کے پیامبر اور کچھ کے لیے پچھتاووں، مایوسیوں اور ناکامیوں کی تلخ یاد بن کر رہ جاتے ہیں۔"

"کامیاب لوگ اپنے کام کو روز ایک مقرر وقت پر کرتے ہیں اور یوں تھوڑا تھوڑا کام آخری دن مکمل شکل میں سامنے آ جاتا ہے۔ تم لوگ عبدالولی کی مثال لے لو۔" سر بٹ نے ولی کا ذکر کیا، مسکان جو بے خیالی میں کھڑی سر کی باتیں سن رہی تھی، ایک دم دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

"میرے ٹیچنگ کیریئر میں ولی وہ واحد طالب علم ہے، جس کو میں نے آف ڈیز میں بھی ریلیکس نہیں دیکھا۔ وہ ہر روز اور مسلسل کام کرنے کا عادی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے نہ صرف اپنے شعبے میں قابل ذکر کام کیا بلکہ اس نے ہر شعبے کے کام کو اپنی لگن سے سیکھ لیا ہے۔"

"اور یہی ہنر جب وہ اپنے اسائنمنٹ میں استعمال کرتا ہے تو سب کے روٹین ورک میں اس کا کام ایک دم واضح طور پر قابل قدر نظر آتا ہے۔ اور آج جب وہ فائنل ایئر میں آ چکا ہے پھر بھی کسی کلاس میں اس کی پہلی پوزیشن کا ریکارڈ نہیں ٹوٹا۔ اس نے آج تک کوئی ڈسپلے لیٹ نہیں دیا۔ اور اس کے ساتھ اور بھی کام سیکھے ہیں۔ وہ بھی آپ جیسا طالب علم ہے۔ اگر وہ اتنا کچھ اتنے سے وقت میں کر سکتا ہے تو آپ لوگ صرف اپنا کام...... صرف اپنا کام اس وقت میں کیوں مکمل نہیں کر سکتے؟" سر بٹ نے پوری کلاس پر نظریں دوڑائی تھیں، ساری کلاس ہی شرمندگی سے سر جھکائے کھڑی تھی۔ البتہ مسکان کو سر کا عبدالولی کے متعلق ذکر کرنا بہت اچھا لگا تھا۔ اس کا حال تو یہ تھا، جہاں ولی کا ذکر ہوتا وہ وہاں ہی ٹھہر جاتی تھی۔

وہ اور اس کی چاہت دھیرے دھیرے دیوانگی کی جانب بڑھ رہے تھے۔

"او کے میں تم لوگوں کو کل چار بجے تک کا ٹائم دیتا ہوں اس سے زیادہ میں تم لوگوں کے ساتھ تعاون نہیں کر سکتا۔" سر بٹ کہہ کر نکل گئے۔

"اے مسکان! اللہ کے واسطے واپس حواسوں میں آ جاؤ!" سائرہ نے اسے باقاعدہ بازو سے پکڑ کر ہلایا۔

"جہاں ولی بھائی کا ذکر ہو تم تو کسی حدیث کی طرح سننے کھڑی ہو جاتی ہو۔ اتنی ہی شدت اللہ سے اگر دعا کرو تو تمہارے سارے بگڑے کام سدھر جائیں۔" سائرہ کی بات میں بڑا دم تھا۔ مسکان نے اسے چونک کر دیکھا۔

"میرا اللہ مجھے معاف کر دے۔ میں جانتی ہوں کہ ساری شدتیں صرف اور صرف اللہ کی

محبت Deserve کرتی ہیں۔ لیکن اللہ مجھے معاف کریں میں اس اللہ کے بندے کی محبت میں خود کو بے بس محسوس کرتی ہوں۔" مسکان نے دھیرے سے اپنے سنہری بالوں کو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔ لیکن اُس کے بال کچھ اور لٹوں کو اپنے ساتھ لیے آگے آ جاتے تھے۔ ایسے میں اس کا روشن کرن سا چہرہ ایک دم بہت موہنا لگتا تھا۔ لائٹ گرین دوپٹے اور پاجامے کے ساتھ اُس نے ڈارک گرین کائی کلر کا کُرتہ پہن رکھا تھا۔ اللہ نے اُسے بے پناہ خوبصورت بنایا تھا کتنے ہی لڑکے سنجیدگی سے اُس کی جانب بڑھے لیکن اس نے آج تک کسی کو لفٹ نہ کروائی تھی۔ لیکن ولی کے معاملے میں اس کی سب تدبیریں فلاپ ہو گئی تھیں۔

"السلام علیکم مسکان!" سائرہ اور مسکان دونوں نے چونک کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔

"ارے تم!" سائرہ کے چہرے پر خوشی تھی۔

"مائی گاڈ یہ تم ہو سمعان علوی!" مسکان کے چہرے پر جانے کتنے عرصے بعد سچی خوشی کی کرنیں بکھری تھیں۔

"یس میم...... آئی ایم بیک!" سمعان نے بھرپور نگاہوں سے مسکان کا جائزہ لیا۔

"لیکن سنیں تم کو کس نے بتایا کہ ہم یہاں ہیں۔" سائرہ سے اپنی خوشی چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔

"بہت آسان سی بات ہے میں نے گھر آنٹی کو فون کیا تھا۔" سمعان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اے میرے اللہ...... میں کیسے یقین کروں کہ تم واقعی واپس آ گئے ہو۔" سائرہ کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ تم کو پانی میں پھینکنا چاہیے، شاید تم کو یقین آ جائے۔" سمعان نے شرارت سے سائرہ کی چھوٹی سی پونی کھینچتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں اب زیادہ اترانے کی ضرورت نہیں ہے۔" سائرہ کا ایک دم سے موڈ خراب ہو گیا۔ سمعان اتنے دنوں بعد آیا تھا لیکن سائرہ کو بالکل توجہ نہ دے رہا تھا۔ بلکہ مسلسل مسکان کو دیکھ رہا تھا۔

"اے لٹل گرل! موڈ خراب نہیں کرتا ہے میں فلائٹ سے سیدھا اِدھر آ رہا ہوں، باہر میرا ڈرائیور سامان لے کر کھڑا ہے۔"

"اب تم لوگ اتنی عزیز نہ ہوتیں تو میں گھر جانے کے بجائے یہاں آتا۔" سمعان نے سائرہ کا نازک ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"سنی ہمارے ساتھ گھر چلو!" سائرہ کو واقعی خود پر کنٹرول نہ ہو رہا تھا۔

"یار امی مار ڈالیں گی۔ پہلے تو میں ان سے ملے بغیر اِدھر آ گیا ہوں۔ اوپر سے کچھ اور دیر ہو گئی تو میری خیر نہیں۔"

"نہ رے بابا!"

"اچھا یوں کرتے ہیں کہ کل شام میں ملتے ہیں۔" وہ ہاتھ ہلاتا چلا گیا۔

لیکن سائرہ ابھی تک اُدھر دیکھے مسکرا رہی تھی۔ مجھے تو جناب کہہ رہی تھیں۔ وہ کیا بڑی بڑی نصیحتیں تھیں خود کو تو دیکھو کیسے پورا گلستان چہرے پر کھل گیا ہے۔" مسکان نے اُسے چھیڑا۔

"ارے نہیں یار...... ایسی کوئی بات نہیں ہے!" وہ مکر رہی تھی۔

"وہ ہمارا بچپن کا دوست ہے اور دور کا کزن بھی لگتا ہے۔"

"دیکھتے ہیں کہ یہ دور کے کزن کتنے قریبی نکلتے ہیں۔ ارے میری جان وہ کیا کہتے ہیں ناں! تم بے شک بولو کچھ نہیں، پھر بھی۔"

از هرچه هست محبت

دگر هرچه هست لا!

"جو کچھ بھی ہے محبت ہے اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔" مسکان کہہ کر بھرپور مسکرائی، اس کے موتیوں جیسے دانت کسی لڑی کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

"میں اب تمہارے بیان پر حامی بھرنے سے تو رہی۔" سائرہ نے بے نیازی دکھاتے ہوئے سامان اٹھایا اور اُسے چلنے کا اشارہ کیا۔

"تم مانو یا نہ مانو...... از ہر چہ ہست محبت دگر ہر چہ ہست لا!" مسکان نے گنگناتے ہوئے کہا۔ اور اس نے مسکراتے ہوئے سر کو جھٹکا۔

❖❖○❖❖

"ارے آپ خالہ جانی!" غزالہ نے تقریباً خوشی سے چیخ ماری۔

جواب میں روشن آرا دھیمے سے مسکرائیں۔

"السلام علیکم خالہ جانی!" غزالہ اب اپنی حیرت اور خوشی پر قابو پا چکی تھی۔ اُسے فوراً سلام کا خیال آیا، تو ہی اُس نے انہیں اندر آنے کا راستہ دیا۔

"وعلیکم السلام! جیتی رہو!" روشن آرا بیگم تو سراپا دعا تھیں۔ انہوں نے اُسے بہت پیار سے دعا دی۔ اللہ جی کچھ لوگوں کو خیر اور محبت بانٹنے کے لیے اُتارتے ہیں۔ روشن آرا ان ہی لوگوں میں سے تھیں۔ بے حد نرم مزاج، دھیما بولنے اور مسکرانے والی، ہر وقت اللہ سے اچھا گمان رکھنے اور پانے والی۔

"اماں خالہ آئی ہیں۔" غزالہ تقریباً بھاگتی اندر گئی۔

"آپا آئی ہیں؟" حسن آرا جو اب زیادہ تر بیمار رہنے لگی تھیں، اس وقت بھی نڈھال سی لیٹی تھیں۔ بہن کے آنے کی خبر سن کر ایک دم الرٹ ہو کر بیٹھ گئیں۔

روشن آرا کے اندر داخل ہوتے ہی وہ تقریباً دوڑ کر ان کے گلے جا لگیں۔

"آپا کیسی ہیں آپ؟" حسن آرا کی آواز ابھی تک شدت جذبات کی وجہ سے رندھی ہوئی تھی۔

"شکر الحمدللہ! اللہ کا بہت کرم ہے۔" روشن آرا اُسی پلنگ پر بیٹھ گئیں، جس پر حسن آرا لیٹی ہوئی تھیں۔ پلنگ اتنا پرانا اور خستہ حال تھا کہ ہر وقت چوں چوں کا میوزک سناتا تھا۔ حسن آرا کچھ شرمندہ سی ہو گئیں۔

"ارے غزالہ! خالہ کے لیے کرسی لاؤ۔ آپا آپ اِدھر کیوں بیٹھ گئیں؟" حسن آرا اتنے عرصے کے بعد بہن کی گھر میں آمد پر کچھ بوکھلا سی گئی تھیں۔ غزالہ دوڑ کر کرسی لے آئی۔

"ارے بیٹھو حسن آرا...... تم کن تکلفات میں پڑ گئی ہو۔" روشن آرا بیگم نے بہن کو پُرسکون کرنے کی

کوشش کی۔

''وہ آپا۔'' حسن آرا واقعی چاہتی تھیں کہ اپنی بہن کو سب سے اچھی جگہ پر بٹھائیں۔ لیکن اُن کا گھر اور اس کی چیزیں پکار پکار کر کہنے لگی تھیں کہ اس گھر کے مرد کام چور ہیں۔

''حُسن آرا تمہاری رنگت تو بالکل خراب ہو کر رہ گئی ہے۔ کیا ہوا طبیعت تو اچھی رہتی ہے؟'' روشن آرا نے فکرمندی سے پوچھا۔

''ہاں خالہ...... امی اپنا بالکل خیال نہیں رکھتیں۔'' کتنی ہی تکلیف کیوں نہ آجائے دوائی نہیں لے جاتیں۔ کہتی ہیں ان پیسوں سے بچوں کی فیس چلی جائے گی۔ ہر بار بہانہ کر کے اپنی صحت مزید خراب کر لیتی ہیں۔'' غزالہ کو بے حد بولنے کی عادت تھی۔ وہ عموماً ہر بات اگل دیتی تھی۔ حُسن آرا بیٹی کی باتوں پر بے حد شرمندگی محسوس کر رہی تھیں۔ بہن کے سامنے بے شک ان کی معاشی بدحالی چھپی ہوئی نہ تھی۔ لیکن وہ کبھی اس طرح اپنا بھرم توڑتی نہ تھیں۔

''حُسن آراء!'' روشن آرا کے لہجے میں بے حد افسوس تھا۔

''کچھ بھی ایسا نہیں ہے آپا۔ یہ یوں ہی بک بک کرتی رہتی ہے۔ چلو جا کر خالہ کے لیے چائے لاؤ اور کھانے کی تیاری کرو۔ علیزے اسکول سے آتی ہوگی۔ وہ آکر کھانا بنالے گی۔'' حُسن آرا نے غزالہ کو وہاں سے بھگایا۔

''علیزے اسکول کس لیے جاتی ہے؟ اُس نے تو ماشاءاللہ بی ایس سی میں ایڈمیشن لیا تھا ناں!'' روشن آرا ایک اور خبر پر پریشان ہو چکی تھیں۔

''نوکری کے لیے جاتی ہے۔ میں نے تو بہت منع کیا لیکن مانی ہی نہیں، کہتی ہے کہ پرائیویٹ بی اے کرلے گی۔'' حسن آرا بیگم کی آواز بہت مدھم ہوگئی تھی۔ بہن کے سامنے ایک کے بعد ایک گھر کے حالات کھلتے چلے جارہے تھے۔

''حُسن آرا! تم نے یہ سب مجھ سے چھپا کر مجھے پرایا بنایا ہے۔'' روشن آرا کو واقعی دلی تکلیف ہوئی تھی۔

وہ کوئی چھ سات سال بعد ان کے گھر آئی تھیں۔ ہر ماہ تھوڑی سی رقم وہ بچوں کے تحفے کے طور بھجواتی تھیں۔ لیکن بہن کے گھر کی حالت اس قدر ابتر ہوگی اس کی ان کو بے حد تکلیف ہوئی تھی۔

''آپا...... آپ یوں ناراض نہ ہوں، میں خود کو بے حد شرمندہ محسوس کرتی ہوں، جب جب آپ کے پیسوں کو استعمال کرتی ہوں۔ ایسے میں اور اپنے مسائل آپ کے سامنے سجا کر مجھے تو جینے کی کوئی راہ نہ مل پاتی۔'' حُسن آرا نے بے بسی سے کہا۔

''کیوں ایسی باتیں کر کے مجھے تکلیف دیتی ہو۔'' روشن آرا نے بہن کو اپنے ساتھ لگا کر کہا۔

''تم میری بہن ہو، ایک ہی ماں کی کوکھ میں ہم نے ٹانگیں پساریں۔ تیرے ساتھ میری خوشیوں زیادہ درد کے رشتے ہیں۔ پھر تو نے کیسے خود سے مجھے الگ کیا؟'' روشن آرا نے چھوٹی بہن کے بیمار کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

حُسن آرا جو کچھ دیر پہلے بے حد نقاہت محسوس کر رہی تھیں، بہن کو سامنے پا کر اپنے اندر اک عجیب

خوشی اور توانائی محسوس کرنے لگیں۔

اُن کی بہن اُن کا واحد میکہ تھیں۔ زندگی کے ہر دور میں، ہر مشکل میں وہ ان کو سہارا دینے کے لیے موجود تھیں اور کبھی کوئی احسان نہ جتایا تھا۔

''علیزے نے کہیں دور جاب شروع کی ہے؟'' روشن آرا نے چائے پیتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں پاس ہی ہے۔ پیدل کا راستہ سمجھو یہ ہی کوئی بیس منٹ کا فاصلہ ہے۔'' حُسن آرا نے کیک پیس کی پلیٹ ان کے آگے کرتے ہوئے کہا۔

''اور منزہ؟'' روشن آرا نے حُسن آرا کی سب سے بڑی بیٹی کے متعلق پوچھا۔

منزہ جتنی شکل کی اچھی تھی، اتنی ہی زبان کی کڑوی۔ اپنے والدین سے اکثر شکوے شکایات کرتی نظر آتی تھی۔

''آہ! اس لڑکی نے تو میرا دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے۔ ہر وقت من مانی کرتی رہتی ہے۔ اب یہ ہی دیکھ لو اچھی خاصی پڑھائی چھوڑ کر پارلر جانے لگی ہے۔ وہاں کام سیکھے گی۔ اپنا کمائے گی!'' حُسن آرا بے حد دکھی تھیں۔

''بیٹیاں تو ویسے بھی بہت نازک ہوتی ہیں اور اگر حسین ہوں تو ان کی دیکھ بھال کی ضرورت اور شدید ہو جاتی ہے۔ اب جب جب یہ گھر سے نکل کر جاتی ہیں، میرا دم اٹکا رہتا ہے۔'' حسن آرا نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''اچھا یوں فکر نہ کرو اللہ کی ذات بہتر کرے گی۔ بھائی میاں اور کاشف نظر نہیں آرہے کدھر ہیں؟ اور وہ چھوٹا گڈو کیا اسکول گیا ہوا ہے؟'' روشن آرا نے پوچھا۔

''کاشف تو یونیورسٹی گیا ہے اور ان کے ابا بس آنے والے ہوں گے۔ گڈو اسکول سے سیدھا ٹیوشن جاتا ہے وہ لیٹ آئے گا۔''

''السلام علیکم امی!'' اُسی پل نقاب اوڑھے علیزے داخل ہوئی۔

''ارے خالہ......!''

''اسلام علیکم خالہ جانی۔'' وہ آگے بڑھ کر روشن آرا سے لپٹ گئی۔

''جیتی رہو۔ اللہ تمہیں دین و دنیا کی خوشیاں دے۔'' روشن آرا نے علیزے کے معصوم و روشن چہرے کو پیار سے دیکھتے ہوئے دعا دی۔

علیزے حُسن آرا کی سب سے دھیمے مزاج کی بیٹی تھی۔

اس کی پیاری اور خوبصورت عادات کی وجہ سے روشن آرا علیزے کو بے حد پسند کرتی تھیں۔

''ارے میں بھی کتنی بُری ہوں۔ اتنی دیر سے اپنا ہی دکھڑا روئے جاتی ہوں۔ میں نے بچوں کا تو پوچھا ہی نہیں۔ نگینہ اور ولی کیسے ہیں۔'' حُسن آرا، روشن آرا کی علیزے پر خاص نگاہ کو ہمیشہ محسوس کرتی تھیں۔ اور اب دل میں خوش گمانی کا پودا بڑا ہونے لگا تھا۔

''شکر الحمدللہ دونوں خیریت سے ہیں۔ اب تو نگینہ بھی ادھر آگئی ہے۔ اس نے بھی یہاں داخلہ لے لیا ہے اس وجہ سے ہم سب اب ادھر شفٹ ہو رہے ہیں۔ بیٹے سے زیادہ بیٹی کو ماں کی زیادہ ضرورت

ہوتی ہے۔ اس لیے شاہ جی کی خواہش ہے کہ ہم یہاں لاہور آ جائیں تا کہ بچی سکون سے پڑھ سکے۔"

روشن آرا کے چہرے پر اپنے بچوں کے ذکر پر روشنی سی بکھر گئی تھی۔

"ماشاءاللہ اب تو خاصی بڑھی ہوچکی ہوگی۔ میں نے اُسے کوئی سات سال پہلے دیکھا تھا، جب آپ سب حج کر کے ہم لوگوں سے ملنے آئے تھے۔"

سات سال پہلے شاہ جی، روشن آرا، نگینہ اور ولی انگلینڈ سے سیدھا سعودی عرب حج کے لیے گئے تھے اور وہاں سے پاکستان چند دنوں کے لیے ان سب سے ملنے آئے تھے۔

حُسن آرا کی نگاہوں میں وہ خوبصورت سی بچی گھوم گئی، جو احمد شاہ کا ہاتھ نہیں چھوڑتی تھی۔ ہر وقت باپ کے ساتھ لگی رہتی تھی۔

"میں تم سب سے ملواؤں گی ان کو۔ ابھی تو میں اکیلے ہی تم سے ملنے آئی تھی۔" روشن آرا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سنا ہے آج ہمارے چھوٹے سے گھر میں بڑے بڑے لوگ آئے ہیں۔" کمرے میں انور صاحب نے داخل ہوتے ہوئے کہا۔

اتنے برسوں بعد بھی ان کا طنزیہ لہجہ نہ بدلا تھا۔

"السلام علیکم بھائی میاں!" روشن آرا نے آگے بڑھ کر ان سے پیار لیا۔

"خوش رہو!" انور صاحب کے منہ سے بڑی مشکل سے الفاظ ادا ہوئے، جیسے ان لفظوں سے ملا دکھنے لگا ہو۔

"آج ہم غریبوں کے گھر کی راہ کیسے بھول گئی۔" انور صاحب نے دوسری کرسی پر ٹکتے ہوئے کہا۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں بھائی میاں۔ کوئی اپنے بہن بھائی کو بھی بھول سکتا ہے؟" روشن آرا انور صاحب کی اُکھڑی اور سخت طبیعت سے خوب واقف تھیں اس لیے نہایت تحمل سے ان سے مخاطب تھیں۔

"بہت عرصے سے باقاعدہ ملاقات نہیں ہو پا رہی تھی۔ آج جب میں لاہور آئی تو بہن سے ملنے کا بہت جی کیا۔" روشن آرا بہن کی وجہ سے وضاحتیں دینے پر مجبور تھیں۔ "تمہارے میاں نہیں آئے۔"

"وہ کیوں آئیں گے اتنے بڑے آدمی جو ہوئے۔" انور صاحب کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

"بھائی میاں انسان اپنے قد یا دولت سے بڑا نہیں ہوتا، اپنے کرموں سے بڑا بنتا ہے۔ اللہ ہم سے راضی رہیں آپ سب بہن بھائیوں کی دعا چاہیے۔"

روشن آرا کا دھیما پن اور رویہ بڑے بڑوں کا غصہ ختم کر دیتا تھا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ جب روشن آرا کچھ دیر بعد اٹھنے لگیں تو انور صاحب نے بصد اصرار ان کو کھانے پر روکا تھا۔

آتے ہوئے انہوں نے علیزے کو بلا کر پچیس ہزار دیئے۔ "تم نے ایف ایس سی میں بورڈ میں ٹاپ کیا لیکن میں یہاں نہ تھی یہ تمہارا انعام ہے۔ کوئی سونے کی بریسلیٹ وغیرہ بنوالینا اپنی خالہ کی طرف سے۔ اللہ نے اتنی شاندار کامیابی دی تھی تمہیں اور تم نے کیا کیا۔؟ میری خواہش تھی تم میڈیکل میں جاتیں۔" روشن آرا نے علیزے کو اس کی بچپن کی خواہش یاد دلائی۔

"خالہ بعض اوقات خواہشیں رشتوں سے چھوٹی پڑ جاتی ہیں۔ میری ماں اور ان کی زندگی میرے لیے بہت اہم ہے۔ ان کی صحت اور علاج کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑا تو میں محنت سے نہ گھبراؤں گی، ہر کام کروں گی۔" علیزے کے لہجے میں عزم تھا۔

روشن آرا کو وہ خوددار سی بیٹی بہت پیاری لگی۔ لیکن ساتھ ہی وہ پریشان ہوگئی تھیں کہ آخر ان کی بہن کو کیا بیماری ہوگئی ہے۔ کوئی بھی ٹھیک سے نہ بتا رہا تھا۔

"اور خالہ یہ بہت زیادہ ہیں۔ آپ کی دعائیں ہی بہت ہیں۔" علیزے کو خالہ کی دی اتنی ساری رقم بالکل اچھی نہ لگ رہی تھی۔

"ارے رکھ لو، جب وہ اتنے پیار سے دے رہی ہیں تو۔" انوار صاحب فوراً بول پڑے۔ جانے اُن کی یہ بیٹی کس پر پڑی تھی، اس کی خودداری ان کو بہت بری طرح کھٹکتی تھی۔

"ہاں بیٹا یہ رکھو...... یہ انعام تمہاری کامیابی سے چھوٹا ہے۔ تم نے تو واقعی مجھے حیران کر دیا تھا۔ غزالہ نے جب تمہارے رزلٹ کارڈ اور سرٹیفکیٹ کی فوٹو کاپی مجھے ارسال کی تھی تو یقین مانو کتنے ہی عرصے مجھے اک عجیب سی خوشی اور فخر نے گھیرے رکھا تھا۔ اپنے بچے جب کامیاب ہوتے ہیں تو بڑوں کی زندگی بڑھتی ہے۔" روشن آرا کا علیزے کی جانب غیر معمولی جھکاؤ سب ہی محسوس کرنے لگے تھے۔

"پھر بھی خالہ...... یہ زیادہ ہیں۔" علیزے بولی۔

"ارے رکھ لو جب پیار سے وہ دے رہی ہیں۔" انور صاحب کو علیزے پر غصہ آیا تھا۔

حُسن آرا اور علیزے نے ایک بیزار سی نظر انور صاحب پر ڈالی۔

"یہ آدمی کبھی نہیں بدل سکتا۔" حُسن آرا نے دل ہی دل میں آہ بھری۔

❖❖○❖❖

"یہ کیا ہے؟" نگینہ نے حیرت سے اتنے بڑے ڈبے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کھول کر دیکھ لو۔" طارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ ہی بتا دیں۔" نگینہ نے جلدی جلدی ریپر کو پھاڑتے ہوئے بے تابی سے کہا۔

"ارے...... ارے۔ دھیرے سے یار!" طارق نے اس کی جلد بازی پر اُسے ٹوکا۔

"طارق کیا ہے یہ؟" ولی نے بھی دلچسپی دکھائی۔

طارق نے مسکراتے ہوئے ولی کو آنکھ سے چپ رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

"دیکھیں ناں آنی طارق بھائی نے کتنی مشکل پیکنگ کی ہے۔" نگینہ نے ڈبے کی مختلف پٹیوں کو اتارتے ہوئے نیلوفر سے کہا۔

"یہ بچے بھی ناں بس ہر وقت سرپرائز دینے میں لگے رہتے ہیں۔" نیلوفر نے دھیمی آواز میں روشن آرا سے کہا۔ طارق نے سر کھایا ہوا تھا میرا اور سائرہ کا کہ چلو نگینہ کا برتھ ڈے ہے۔ اور یہاں آ کر وِش بھی نہیں کرنے دیا کہ پہلے وہ اپنا تحفہ دیکھ لے۔ نیلوفر نے مسکراتے ہوئے روشن آرا کو بتایا۔

سائرہ باقاعدہ نگینہ کی مدد کر رہی تھی، اتنے بڑے ڈبے کو کھولنے میں۔ دل ہی دل میں وہ حیران تھی۔ بھائی نے کب یہ تحفے خریدے اور پیک کیے۔ اس کا سنجیدہ سا بھائی صرف اپنے گھر والوں یا اس فیملی میں لوسٹ رہتا تھا یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہ تھی۔ اب رات بارہ بجے وہ ولی بھائی کے گھر رونق لگا کر بیٹھے

ہوئے تھے۔

آخر کار ڈبہ کھل ہی گیا۔ اس میں بہت خوبصورت سبز آنکھوں اور سنہری بالوں والی گڑیا تھی، اس کی گو میں سفید فر والی خوبصورت بلی تھی۔ ان دونوں کا سائز اتنا بڑا تھا کہ اور یجنل لگتی تھیں۔ ساتھ میں ہیپی برتھ ڈے کا کارڈ تھا۔

''تھینک یو طارق بھائی...... لیکن اب میں بڑی ہوگئی ہوں۔ اب گڑیا سے نہیں کھیلتی۔'' نگینہ نے باقاعدہ احتجاج کیا۔

''میں بھی یہ چاہتا ہوں تم جلدی جلدی بڑی ہو جاؤ۔'' طارق دل ہی دل میں بولا، تا کہ تم کچھ تو میری نگاہ جان پاؤ۔ میری پاکیزہ محبت کی خوشبو کو محسوس کر سکو۔ طارق نے صرف اک نگاہ دیکھ کر نگاہ موڑ لی۔

جو دل میں رہتے ہیں وہ اور ان کی عزت بہت اہم ہوتی ہے۔ اور نگینہ طارق کی اولین خواہشوں میں تھی۔

''ہمیں تو تم واقعی ابھی تک گڑیا ہی لگتی ہو۔'' نیلوفر بیگم نے پیار سے نگینہ کو دیکھتے ہوئے گلے لگا کر کہا۔

''سالگرہ مبارک ہو گڑیا!'' ولی نے بھی تحفہ بہن کے سامنے کیا۔

''یہ کیا ہے؟''

''کھول کر دیکھو۔'' ولی نے بھی اصرار کیا۔

''اللہ کرے میری عمر کے مطابق کوئی چیز ہوں۔'' نگینہ نے بھولپن سے کہا۔ ڈبے کو کھولتے ہی وہ خوشی سے چیخ پڑی۔ ''بھائی آپ کی چوائس بہت نفیس ہے۔''

وہ وائٹ گولڈ میں بہت خوبصورت لاکٹ تھا، جس پر چھوٹے چھوٹے نگینوں سے نگینہ لکھا ہوا تھا سائرہ کو بھی وہ بہت پسند آیا تھا۔ اس نے فوراً اسے نگینہ کے گلے میں ڈال دیا۔

آج سے پہلے روشن آنٹی کی فیملی سے زیادہ تر طارق اور نیلوفر آنی ملتے تھے وہ کبھی کبھار ہی آتی تھی طارق بھائی تو بہت زیادہ ان لوگوں کے قریب تھے لیکن اب وہ صرف صرف مسکان کی وجہ سے ولی اس کی فیملی کو زیادہ توجہ دینے لگی تھی۔

''اماں جان میرا تحفہ؟'' نگینہ نے روشن آرا سے پیار لیتے ہوئے سوال کیا۔

''ہماری جانب سے تحفہ تمہیں صبح ملے گا۔ تمہارے بابا صبح چھ بجے کی فلائٹ سے آرہے ہیں۔'' روشن آرا نے ساتھ ہی اطلاع دی۔

''یار طارق کل نگی کی سالگرہ پارٹی بابا جانی آواری میں دے رہے ہیں۔ سب سے پہلے تمہیں دعوت دے رہا ہوں پھر نہ منہ بنا لینا۔'' ولی نے طارق کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''اور ہاں، سب لوگ سن لیں کہ میں اب بڑی ہوگئی ہوں، اب مجھے بڑوں والے تحفے دیا کریں۔'' نگینہ نے روٹھے روٹھے لہجے میں بچوں کی طرح کہا تو طارق کا دل اس پر نثار ہونے لگا۔ ولی اور طارق دونوں اس کی باتوں پر ہنسنے لگے۔

''کیوں بھائی میں نے لطیفہ سنایا ہے۔'' نگینہ کو ان کی ہنسی اچھی نہ لگی۔

''نہیں بالکل نہیں، تم تو واقعی بڑی ہوگئی ہو۔'' ولی نے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے اپنی معصوم سی کلا

ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

رات کے وقت
میرے دل پہ
تیری یاد کا ہاتھ
اتنی نرمی سے اُترتا ہے
کہ جیسے شبنم
اک چٹکتی ہوئی نورستہ کلی پہ اُترے

بہت ہی خوبصورت ہینڈ رائیٹنگ میں یہ نظم طارق نے کارڈ پہ لکھی تھی اور آخر میں ''وِدلو'' تمہارا طارق لکھا ہوا تھا۔

یہ کارڈ اس نے نگینہ کو لکھا تھا، ہر سال کی طرح۔ لیکن اس نے یہ کارڈ نگینہ کو ہرگز نہیں دینا تھا۔ ہر سال کی طرح یہ کارڈ بھی دوسرے کارڈز کے ساتھ اُس نے بند کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ بہت ایمانداری ان کارڈز اور اپنے جذبوں کی حفاظت کرتا آرہا تھا۔ اُسے اس پل کا بہت چاہ سے انتظار تھا، جب لمحہ اس گھر میں اس کے کمرے میں جائز و قانونی طور پر اس کے قریب ہوگی اور وہ اپنی محبت کا اظہار کرے گا۔

اقرار محبت کرے گا۔

باہر دروازے پر دستک نے اُنہیں چونکا دیا۔

''بھائی آپ کا فون ہے۔'' سائرہ نے نیند سے بھری آنکھوں اور آواز سے کہا۔ اور ساتھ ہی کارڈ لس اُسے تھما دیا۔

فون کان پر لگاتے ہی وہ الرٹ ہوگیا۔

ڈائریکٹر صاحب کی جانب سے ارجنٹ کال تھی۔

وہ خفیہ فورس کی ایک بہت ذمہ دار پوسٹ پر تھا۔ اُسے کسی بھی وقت کال کیا جا سکتا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ جینز پینٹ کے ساتھ ہلکی نیلی شرٹ پہنے کوٹ میں اپنا ریوالور رکھے تیزی سے تیار ہو چکا تھا۔

گاڑی کی چابیاں اور موبائل اُٹھا کر وہ باہر نکلا۔

''اسلم دروازہ بند کر لو۔ اور آنی کو بتا دینا، میں ضروری کام سے جا رہا ہوں۔'' اُس نے اسلم کو ہدایات دیں۔

سائرہ نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے اُسے جاتے دیکھا۔ ''اللہ کے سپرد بھائی خیر سے جائیں اور خیر سے آئیں، اللہ کی امان میں۔'' سائرہ نے دل ہی دل میں اُسے دعائیں دی۔

❖❖○❖❖

''اس لڑکی نے خودکشی کرنے سے پہلے تفصیلات بھی لکھی ہیں، جو ہمیں راستہ ڈھونڈنے میں مدد دیں گی۔'' ڈائریکٹر صاحب نے طارق کے سامنے فائل رکھتے ہوئے کہا۔

WWW.PAKISTANIPOINT.COM
پاکستانی پوائنٹ
PAKISTANIPOINT
ایک رابطہ اپنوں سے

''کالج کی لڑکیوں کی سی ڈیز کی زیادہ Demand ہے۔ یہ کام جو اپنی مرضی سے کر رہی ہیں، اس کی وجہ بھی بلیک میلنگ ہی ہے جو لڑکیوں کے خودکشی کے کیس بڑھ رہے ہیں۔''

''شریف لوگ تو منہ چھپا کر بیٹھ گئے ہیں۔ ان سے کیا تعاون ملے گا اس کی امید بھی کوئی نہیں ہے۔''

''طارق تم میرے بہترین آفیسر ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس فائل پر کام کرو۔''

''جی سر!'' طارق کی الرٹ آواز کمرے میں گونجی۔ طارق نے فائل کھول کر صفحے پر نظر دوڑائی، لڑکی کا نام سعدیہ تھا۔ عمر اٹھارہ سال تھی۔ بازار میں اس کی نیوڈ سی ڈی عام تھی۔ لڑکی نے خودکشی کرنے سے پہلے کچھ انکشافات کئے تھے۔ طارق نے خط پڑھتے ہی دکھ سے پہلو بدلا۔

''ہمارے معاشرے کا یہ ننگا پہلو، یہ تکلیف دہ گلاسڑا سچ نہایت بھیانک تھا۔ یہ سب کچھ ایک پلاننگ کے تحت ہو رہا تھا۔ لڑکی کا لکھا ہوا ایک ایک لفظ آنسوؤں اور شرمندگی میں ڈوبا ہوا تھا۔'' طارق کے سینے سے اک گہری سانس خارج ہوئی۔

''میں وعدہ کرتا ہوں سعدیہ تمہاری روح سے کہ آج بھی اس ملک کے کچھ بیٹے غیرت رکھتے ہیں۔ میں تمہارے خون کو ضائع نہ جانے دوں گا، میں وعدہ کرتا ہوں اس ملک میں ان ناسوروں کو ایسی عبرت ناک سزا دلواؤں گا کہ یہ لوگ ہمارے ملک پر نگاہ ڈالنا بھول جائیں گے۔ یہ لوگ ہماری اقدار کو کھوکھلا کر کے ہمارے وجود کو صفحۂ ہستی سے مٹانا چاہتے ہیں۔ تو یہ لوگ جان لیں کہ ہماری اقدار ہی ہم کو بچائیں گی۔'' طارق کی سوچ اس کے چہرے پر عیاں تھی۔

ڈائریکٹر صاحب نے طمانیت بھرا سانس لیا۔ بے شک انہوں نے ایک درست آدمی کے ہاتھوں میں یہ فائل دی تھی۔

میں نے سن رکھا تھا یہ
عشق کا روگ نرالا ہے
اب مجھ کو معلوم ہوا ہے
جان سے مارنے والا ہے

''یار کہاں گم ہو؟'' سائرہ نے پنسل سے آڑھی ترچھی لائنز بناتی مُسکان کو متوجہ کیا۔

''نہیں نہیں! تم سر بٹ کا پتا کرنے گئی تھی ناں، کیا آج فوٹوگرافی کی کلاس ہوگی؟'' مُسکان نے خود کو ...ا کرتے ہوئے پوچھا۔

''آ رہے ہیں، دیکھو کیا موڈ بنتا ہے۔ آؤٹ ڈور کرنی ہے اور آج لائٹ اتنی اچھی بھی نہیں ہے۔ کل ...ب اچھی تھی، کل ہی آؤٹ ڈور کر لیتے تو اچھا تھا۔'' سائرہ نے اپنے کندھے سے لٹکا کیمرا اور بیگ ...ر احتیاط سے ڈیسک پر رکھتے ہوئے کہا۔

کلاس میں اس وقت کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی، ہر کوئی اپنی اپنی بولی بول رہا تھا۔ سائرہ ...ایک نظر مُسکان پر ڈالی، وہ ایک بار پھر کھو چکی تھی۔ وہ اس منظر کا حصہ ہرگز نہ تھی۔ اپنی چاہت اور ...ال کے پیچھے بھاگتے بھاگتے وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے آہستہ آہستہ رشتہ توڑتی جا رہی تھی۔ وہ ...میں ہوتے ہوئے بھی غیر حاضر رہتی تھی۔ اتنی ذہین اور ٹیلنٹڈ لڑکی کا یہ حال اب ٹیچرز کی نظر میں بھی ...آ رہا تھا۔

''مُسکان...... مُسکان!'' سائرہ نے اُسے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

''خدا کی بندی! ہوش و حواس قائم رکھا کرو۔'' سائرہ چڑ گئی تھی۔

''ک...... کیا ہوا؟'' مُسکان ابھی تک بے خیالی میں تھی۔

''ا میرے اللہ! اس لڑکی کا کیا بنے گا۔ ابھی کوئی پندرہ منٹ کی تقریر سر بٹ کر کے گئے ہیں اور اس ...نے ذرا بھی نہیں سنا۔''

''سر بٹ کیا کہہ کر گئے ہیں؟'' مُسکان نے معصومیت سے پوچھا۔

''...حد ہو گئی۔ تمہاری قوتِ سماعت اور آنکھوں کی روشنی مشکوک ہو گئی ہے۔ اور براہِ مہربانی جو سر کہہ کر ...ہیں اسے سن کر آپے سے باہر نہ ہو جانا۔'' سائرہ نے ساری کلاس کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا تو اپنا اور ...ان کا سامان بھی سمیٹنا شروع کر دیا۔

''سر بٹ آج پارٹ ون والوں کے پیپر لے رہے ہیں۔ آج وہ فارغ نہیں ہیں اور پرسوں فوٹوگرافی اسٹوڈیو میں ایم ایف اے والوں کا ویک شروع ہو جائے گا، اس لیے ہمیں ہر صورت آج کام کر کے کل Developing اور Printing کرنی ہے تاکہ مارکنگ ٹائم پر ہو سکے۔ پس سر نے اپنی غیر موجودگی میں اپنے چہیتے اسٹوڈنٹ مسٹر عبدالولی کو ہماری مدد کے لیے بھیجا ہے۔ وہ آج کا آؤٹ ڈور اور ان ڈور کا سارا کام بھی کروائے گا اور کل Developing اور Printing بھی کروائے گا۔ اور تم خدا کے واسطے کچھ اپنی اور زیادہ میری عزت کا خیال کرتے ہوئے بد حواسی کے مظاہرے پیش کرنا بند کر دینا۔ دیکھو ساری کلاس میں بات پھیل سکتی ہے۔'' سائرہ نے نہایت سنجیدگی سے اُسے سمجھایا۔

مُسکان جواب میں کِھل اٹھی۔ سائرہ نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ''اس صدی میں یہ لیلیٰ کہاں سے آ گئی ہے۔''

''مجھے لگتا ہے میں اتنی دیر سے بھینس کے آگے بین بجا رہی تھی۔'' سائرہ نے جل کر کہا۔

مُسکان بجائے برا ماننے کے مدھر سُروں سے ہنسی۔ سائرہ نے حیرت سے مُسکان کے کِھلے ہوئے چہرے کو دیکھا، کہاں کچھ دیر پہلے وہ ویران اور مرجھائے وجود کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اب کیسے اس کے اندر کا موسم ہی بدل گیا تھا۔ پودا ہرا بھرا ہو گیا تھا۔

سائرہ نے بے حد فکرمندی سے ایک بار پھر مُسکان کو دیکھا وہ بڑبڑائی تھی۔ ''مُسکان بنا سوچے سمجھے دوڑے چلی جا رہی ہے، اتنا آگے نکل کر وہ کیسے انکار برداشت کر سکے گی۔ کیسے ''نہ'' سن پائے گی؟ زندگی بھلا کب یک طرفہ رویوں سے چل پائی ہے۔ اسے کیسے سمجھا پاؤں گی!''

❖❖○❖❖

کس قدر ٹوٹ رہی ہے مری وحدت مجھ میں
اے مرے وحدتوں والے مجھے یکجا کر دے
میرے ہر کام میں بس تیری رضا شامل ہو
جو ترا حکم ہو وہ میرا ارادہ کر دے
مجھ کو وہ علم سکھا جس سے اُجالے پھیلیں
مجھ کو وہ اسم پڑھا جو مجھے زندہ کر دے
ضائع ہونے سے بچا لے مرے معبود مجھے
یہ نہ ہو وقت مجھے کھیل تماشا کر دے
میں مسافر ہوں سو رستے مجھے راس آتے ہیں
میری منزل کو مرے واسطے رستہ کر دے
میری آواز تری حمد سے لبریز رہے
بزمِ کونین میں جاری مرا نغمہ کر دے

آنسوؤں سے لبریز لہجے سے یہ دعا بابا جی مانگ رہے تھے۔ اور بابا جی کے انتظار میں بیٹھے احمد شاہ جانے کہاں گم سر جھکائے ہاتھ جھولی میں سمیٹے بیٹھے تھے۔

بابا جی نے دعا کے لیے اُٹھے ہاتھ منہ پر پھیرتے ہوئے پیچھے بیٹھے احمد شاہ کو دیکھا۔

''السلام علیکم احمد!'' بابا جی نے انہیں سلام کیا۔

احمد شاہ ہڑبڑا کر اٹھے تھے۔ ''السلام علیکم بابا جی!'' بدلے میں جواب دینے کے، وہ خود بھی بابا جی کو لام کرنے لگے۔

''وعلیکم السلام جیتے رہو۔ اللہ تمہیں ایمان کی سلامتی کے ساتھ دین و دنیا کی خوشیاں عطا کرے۔ امین۔''

بابا جی کی دعائیں اور ان کے لہجے کی مٹھاس کسی ٹھنڈے میٹھے چشمے کی پھوار کی طرح بدن کو لگتی تھیں ور اندر کی بے چینی کو پرسکون کر دیتی تھیں۔

''بابا جی...... عبدالولی اور نگینہ آئے ہیں۔'' احمد شاہ نے مؤدب لہجے میں اطلاع دی۔

''احمد شاہ...... اللہ رحمٰن تم سے ہمیشہ خوش رہیں۔ تم نے اس بوڑھے کی خوشی کا بے حد سامان کیا ہے۔'' ا کی آواز خوشی سے کپکپا رہی تھی۔

''وہ دونوں نیک بخت کدھر ہیں؟'' بابا جی کی نگاہیں دونوں کو تلاش کر رہی تھیں۔

''باہر ہیں، مجھے اچھا نہ لگا کہ آپ کی عبادت میں خلل ڈالوں اس لیے ہم سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' احمد شاہ نے محبت بھری نگاہ اُن پر ڈالتے ہوئے کہا۔

اس کمزور سے بزرگ میں سے محبت اور کشش کی جانے کیسی شعائیں نکلتی تھیں کہ جو بھی یہاں آتا تھا ان کا گرویدہ ہو کر رہ جاتا تھا۔

بابا جی اور احمد شاہ باہر نکل آئے۔ عبدالولی گلے میں کیمرا لٹکائے قدرتی نظاروں کی تصویریں لے رہا تھا جبکہ نگینہ جیپ کا دروازہ کھول کر باہر پاؤں لٹکائے کچھ کھانے میں مصروف تھی۔

''آہا...... بابا جی آ گئے ہیں!'' نگینہ نے بچوں جیسی خوشی سے چلاتے ہوئے کہا اور دوڑ کر اُن کے اس جا پہنچی۔

بابا جی نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ اُن کی آنکھیں نم تھیں۔

''احمد شاہ...... یہ ہمارا بہت معصوم بچہ ہے اس کا خاص خیال رکھنا، اس کا دل کسی نازک پھول کی طرح ہے۔ برے رویوں کے ہاتھ نہیں لگنے چاہیے۔ یہ اس کے لیے اچھا نہیں ہے! اللہ رحمٰن اسے حفظ و امان میں رکھے۔''

بابا جی کی بات پر نگینہ نے کوئی نوٹس نہ لیا البتہ احمد شاہ چونکے تھے۔ اس سے پہلے بھی بابا جی مختلف مواقع پر ذومعنی باتیں کر چکے تھے اور احمد شاہ ان کی کہی بات کو کبھی عام نہ لیتے تھے۔ بابا جی کی اس بات کا کیا مطلب ہے؟ وہ اندر سے اُلجھے ہوئے تھے۔

''محترم بزرگ! میں معذرت چاہتا ہوں کہ میں آپ کی بات کو سمجھ نہیں سکا۔'' احمد شاہ نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔

''پیارے بیٹے! اللہ رحمٰن نے ہر روح کو شفاف پیدا کیا ہے اور ہم سب اس دنیا میں آنے کے بعد دنیا داری اور اس کے دھندوں سے اس کو آلودہ کر لیتے ہیں۔ لیکن ہم میں سے کچھ ایسی معصوم اور سادہ

دل روحیں بھی ہوتی ہیں جو اپنے مَن کی آنکھ سے دنیا دیکھتی ہیں۔ چونکہ ان کا مَن سچا ہوتا ہے اس لیے ان کے لیے ساری دنیا سچی اور اچھی ہوتی ہے۔ ایسے میں اگر ان کو برے رویوں اور لوگوں کا سامنا کرنا پڑے تو وہ سنبھل نہیں پاتے۔ ہمارا یہ بہت پیارا بچہ ہے! دیکھو اس کی آنکھیں کس قدر شفاف ہیں اس کے من کی طرح۔ اللہ رحمٰن نے تم جیسے مہربان ماں باپ کا ساتھ ان دونوں کو نوازا ہے۔ یہ تمہارا فرض بنتا ہے کہ تم ان کا دھیان خیال ذرا زیادہ کرو۔" بابا جی ایک بار پھر اپنی بات کو گول مول کر چکے تھے۔ ان کی گفتگو اگرچہ واضح نہیں ہوتی تھی تو کچھ ایسی مبہم بھی نہ ہوتی کہ پیغام چھپا رہ جائے۔

بہرحال احمد شاہ اتنا ہی جان پائے تھے کہ نگینہ چونکہ بیٹی ہے، اس لیے اس کا خیال اور دھیان بابا جی کی نظر میں زیادہ اہم ہے۔

"اسلام علیکم بابا جی!" ولی نے جُھک کر پہلے بابا جی سے پیار لیا پھر ان کے ہاتھوں پر بوسہ دیا۔ ایسا وہ بچپن سے احمد شاہ کو کرتے دیکھتا آیا تھا۔ پہلے پہل ان کی دیکھا دیکھی کرتے کرتے، لیکن اب وہ بھی بابا جی کے ساتھ خاص محبت کا رشتہ اپنے دل میں محسوس کرنے لگا تھا۔

"وعلیکم السلام جیتے رہو۔ اللہ رحمٰن تمہیں ایمان کی سلامتی کے ساتھ دین و دنیا کی خوشیاں عطا کریں۔" بابا جی نے اسے گلے لگا کر دعا دی۔

"ہمارا پیارا بیٹا تصویریں بنا رہا تھا۔" بابا جی نے پوچھا۔

"جی بابا جی! معلوم نہیں کیوں میں جب جب یہاں آتا ہوں، مجھے یہ جگہ اپنی طرف کھینچتی ہے، یہاں اس کے راستوں میں عجیب سی کشش اور مانوسیت ہے۔" ولی کی بات پر احمد شاہ کے چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا۔

"میں اکثر سوچتا ہوں...... اکثر مجھے ایک خواب آتا ہے لیکن وہ خواب ادھورا ہوتا ہے مجھے کچھ یاد نہیں آتا۔" ولی نے اپنی بے چینی آج واضح کر دی تھی، جس کو وہ اکثر محسوس کرتا تھا۔

"پھر مجھے خیال آتا ہے کہ شاید...... شاید اس کی ساری وجہ آپ ہیں، آپ سے محبت ہی مجھے اس جگہ کی طرف کھینچتی ہے۔ یقیناً یہ آپ کے تعلق کے علاوہ اور کیا بات ہو سکتی ہے!" ولی خود میں گم بول رہا تھا۔

احمد شاہ اور ڈرائیور رحیم خان کے تنے ہوئے اعصاب ایک دم ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ ولی جن سِروں کو پکڑ نہیں پاتا تھا۔ اس کا مرکز یہ ہی تو جگہ تھی۔ شکر تھا کہ ولی اپنی الجھن کو کسی اور آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ بابا جی کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ احمد شاہ کی بے چینی ان کی نظروں سے چھپ نہ سکی تھی۔

"احمد شاہ! مستعار لی ہوئی چیز لوٹا دی جاتی ہے۔"

احمد شاہ کو سالوں پہلے انہوں نے یہ ہی بات کہی تھی۔ آج بھی احمد شاہ کل کی طرح ان کی اس بات پر بے حد پُرسکون ہوئے تھے۔

"بے شک آپ نے مجھے درست یاد دلایا! آپ بھی میرے لیے دعا کیجیے گا، اللہ تعالیٰ مجھے ثابت قدمی عطا کرے۔" احمد شاہ نے ان سے گزارش کی۔ ولی اور نگینہ اُن دونوں کی گفتگو بالکل سمجھ نہیں پا رہے تھے۔

"اللہ رحمٰن تم پر ہمیشہ رحمت رکھے۔ تم نے ہمیشہ اچھائی کا ساتھ دیا ہے اور اپنے عمل کو اچھے رستے پر

[...]ہا ہے۔ تم اللہ کی طرف سے نوازے گئے ہو اور بے شک تم خسارے میں کبھی نہ رہو گے۔ خوشی اور [...]لون تم کو ہی ملے گا۔" بابا جی کی دعا میں خوش خبری تھی۔ احمد شاہ کے رہے سہے وسوسے بھی بھاپ بن کر [...]ا گئے۔

[...]دوپہر کا کھانا رحیم خان کی بیوی نے بنا کر بھیجا تھا۔ کھانا سادہ لیکن نہایت لذیز تھا۔ بابا جی تو کھانا [...]لاتے ہی نوافل کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ "میں تم سب کو عصر سے پہلے اُٹھا دوں گا۔ لمبے سفر سے [...]ئے ہو، آرام کر لو۔ رحیم خان تم کو اگر زحمت نہ ہو تو اپنے گھر سے ایک دو بستر لے آؤ۔" بابا جی کی بات [...]رحیم خان تڑپ ہی اُٹھا۔

"کیسی بات کرتے ہیں۔ آپ کا کہا میرے لیے حکم جیسا ہے، میں ابھی گھر سے لے آتا ہوں۔" رحیم [...]مان نے فوراً کہا۔

"کاکا! میں بھی ساتھ چلوں گی۔ میں فاطمہ اور خدیجہ آپی سے ملوں گی۔" نگینہ نے معصوم سے لہجے [...]ں کہا۔

"جیسے بابا جی کہیں!" رحیم خان جھجک رہا تھا۔

"لے جاؤ رحیم خان! بچی اپنا ہان (ساتھی) مانگتی ہے۔ یہاں وہ اکتا جائے گی۔" بابا جی نے دھیمی [...]کراہٹ سے کہا۔

"ہُرّے! بابا جی آپ بہت اچھے ہیں۔" نگینہ ایک دم خوش ہو گئی۔ ولی اور احمد شاہ بھی دھیمے سے [...]کرائے۔

"بابا جانی اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی کچھ گھوم پھر آؤں؟" ولی احمد شاہ سے اجازت لے رہا تھا۔ [...]شاہ ایک پَل کو سوچ میں پڑ گئے لیکن دوسرے ہی پَل وہ سنبھل چکے تھے۔

"اولاد اور کبوتر شاید دونوں ہی اُڑان مانگتے ہیں۔ پنجرے میں ہر وقت بند رکھنے سے وہ گھبرا جاتے [...]ہ اور موقع دیکھ کر بھاگ جاتے ہیں۔ دونوں کو اپنی ڑان اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اور اگر ان کو اُڑنے کا [...]لم دیا جائے تو وہ واپس اپنے ہی گھر کی چھت پر آ کر بیٹھتے ہیں۔"

[...]احمد شاہ کب تک ولی کو پابند کر سکتے تھے۔ بے شک ولی ان کا بے حد تابعدار بیٹا تھا لیکن اگر اولاد [...]دار ہو تو ان کو آزمائش اور بے جا پابندی میں رکھنے کے حامی وہ ہرگز نہ تھے۔

"جاؤ بیٹا...... لیکن دھیان کرنا، تم یہاں اجنبی ہو۔" احمد شاہ نے اُسے اجازت کے ساتھ ساتھ محتاط [...]ی کی تاکید کی۔

"مجھے کیوں یہ جگہ اجنبی نہیں لگتی؟" وہ سوچنے لگا۔ ولی کیمرا لیے جیپ میں آ بیٹھا اور سوچنے لگا کہ [...]س طرف جانا چاہیے۔ رحیم خان اور نگینہ دوسری گاڑی میں گئے تھے۔ وہ آسانی سے گھنٹا دو گھنٹا [...]پھر سکتا تھا۔ یہاں فی الحال گاڑی کی ضرورت نہ تھی۔

[...]وہ خود حیران تھا کہ وہ دس پندرہ منٹ بعد آخر اس جگہ کے پاس ہی کیوں آ کر رُکتا ہے۔

[...]ایک کھنڈر نما عمارت تھی۔ اس عمارت کے آگے ایک باغیچہ بھی تھا، جو جانے کب کا اُجڑ چکا تھا۔ [...]جانب اک عجیب سی اداسی تھی۔ ولی کو یوں لگنے لگا جیسے اس ویرانی، اداسی سے اس کا اک عجیب سا

رشتہ ہے، کچھ نہ سمجھ میں آنے والی کیفیت سے وہ گزر رہا تھا۔

مختلف خستہ حال جھروکوں اور دروازوں کی تصویریں اُس نے لے لی تھیں۔ سامنے ہی سیڑھیاں تھیں لیکن چند ایک زینوں کے علاوہ تمام سیڑھیاں تباہ ہو چکی تھیں۔

ولی کا بے حد دل چاہا کہ وہ اوپر جائے۔ وہ اوپر سے نیچے کا نظارہ کرنا چاہتا تھا۔

"یہ...... یہ سیڑھیاں...... کتنی جانی پہچانی جگہ ہے۔" سوچتے سوچتے اس کا سر دُکھنے لگا۔

جانے کیسے ایک دم اس کی آنکھوں کے سامنے آگ کے شعلے سے لپکے وہ ایک دم آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر پیچھے یوں ہٹا، جیسے واقعی آگ اس کی جانب بڑھی ہو۔

بس کچھ پَل لگے تھے، منظر غائب تھا۔ اور ولی کا ہاتھ فضا میں معلق ہی رہ گیا۔ آگ غائب تھی، تپش باقی تھی۔

یہ جگہ......؟ وہ آگ......؟ کچھ ادھورے خواب سے منظر۔ سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔

"یا اللہ یہ کیا بھید ہے؟"

"آخر کیا چیز ہے، کیا بات ہے، جو سامنے ہوتے ہوئے بھی دکھائی نہیں دے رہی۔" وہ سوچتے سوچتے ایک جھروکے میں آ کر بیٹھ گیا، اس کا شدت سے دل چاہا کہ کوئی اس کے سوالوں کے جواب دے کر اس اُلجھن کو حل کر دے۔

"کون ہو تم؟ کیا کچے پر جیپ تمہاری کھڑی ہے؟ وہاں سے سائیں زبیر کی گاڑی نے گزرنا ہے تم اپنی گاڑی ہٹاؤ۔" وہ آدمی اُس سے بات کرتا کرتا ایک دم چُپ ہو گیا، وہ سودائیوں کی طرح اُس کا چہرہ تکے جا رہا تھا۔

"کیا ہوا چاچا؟ ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟ میں گاڑی ہٹا لیتا ہوں۔" ولی کو اُس شخص کا یوں اتنی محویت سے دیکھنا عجیب سا لگا تھا۔

"سائیں...... سائیں عبداللہ؟" اس شخص نے اپنے حلق کو تھوک سے تر کرتے ہوئے کہا تھا۔

وہ سید سرفراز کے خاص بندوں میں سے تھا۔

اس وقت وہ خوف و حیرت سے کھڑا تھا۔

"ہاں...... سامنے وہی سید عبداللہ کھڑے تھے۔ وہی قد، رنگت، آنکھیں! کیا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ وہ شخص ایک دم گھبرا گیا اور پھر اُلٹے پیروں بھاگا۔

"سا...... سائیں عبداللہ۔!" وہ تیز تیز دوڑتا بولتا بھاگ گیا۔

ولی نے اس کی اس حرکت کو حیرانگی سے دیکھا۔ اس ویرانے میں کوئی ملا بھی تو اُسے عبداللہ کہہ کر بھاگ کیوں گیا؟ یہاں کے لوگ کتنے عجیب سے ہیں۔

"اور یہ سائیں عبداللہ کون ہے؟" اُس نے اپنے آپ سے سوال کیا تھا۔

❖❖○❖❖

"سنی بیٹا مجھے خوشی ہو گی اگر تم میری ایڈ ایجنسی جوائن کرو گے۔" قاسم محمود علوی نے چائے کا کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"ڈیڈی...... میں اپنا کام خود سے شروع کرنا چاہتا ہوں۔ ان فیکٹ...... میں اپنے آپ کو آزمانا چاہتا ہوں کہ میں خود کتنے پانی میں ہوں۔" سمعان نے دبے دبے جوش کے ساتھ کہا۔

"اوکم آن سنی! تمہیں رُلنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ دنیا کی ریت چلی آئی ہے۔ باپ کی بنائی ہوئی کا وارث اُس کا بیٹا ہی ہوتا ہے۔ ہم نے اس رستے کے کانٹے صاف کرتے کرتے بہت وقت ضائع کیا۔ کبھی ڈھنگ سے اپنے بچوں کے پاس بیٹھنے کا موقع تک نہ ملا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم زندگی جینے کے بجائے اس سروائیول کے گیم میں جُت جاؤ۔ تمہیں تو میری زندگی کی بھی خوشیاں جینی ہیں۔" ڈیڈی کا لہجہ ایک دم پُرجوش ہو گیا۔

"تھینکس ڈیڈی...... یور آر اے گریٹ فادر۔" سمعان نے محبت سے ان کے کندھے کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری ماں کدھر ہے؟" قاسم صاحب نے پوچھا۔

"وہ بواجی سے صابن سے دھلے برتن دلوا رہی ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ صابن سے سبزی دھلوا چکی ہیں۔ میں کچن سے لے کر پانی پی رہا تھا۔ اتنی زیادہ ڈانٹ پڑی کہ کیا بتاؤں کہ صابن سے ہاتھ دھوئے بغیر میں نے فریج کھول کر پانی کی بوتل کو ہاتھ لگا دیے اور میں دھلے ہوئے گلاس کو دھوئے بغیر کیوں استعمال کر رہا ہوں۔ ڈیڈی اللہ کے واسطے مجھے تو دستانے لا دیں۔ ہر تھوڑی دیر بعد مما سے جھاڑ پڑ جاتی ہے۔ گندے ہاتھ...... گندے ہاتھ!" سنی نے بے بسی سے کہا۔

"بس دو چار مہینوں میں ہی تمہارا یہ حال ہو گیا۔ ہم بھی تو ہیں، جو ستائیس سالوں سے اس محکمہ صفائی کے ساتھ جی رہے ہیں۔" قاسم علوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ کی تو مجبوری ہے، وہ آپ کی بیوی ہیں۔" سنی نے شرارت سے کہا۔

"ٹھہرو صاحبزادے تمہاری ماں کو بلاتا ہوں تاکہ تمہارے نادر خیالات آ کر سن لیں۔" قاسم صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ارے بابا رے! معاف کریں۔ میں اس وقت ڈانٹ کی کوئی کلاس لینے کے موڈ میں نہیں ہوں۔" سمعان نے گاڑی کی چابیاں پکڑتے ہوئے کہا۔

"کہاں کی تیاریاں ہیں؟" ڈیڈی نے پوچھا۔

"آنی کی طرف جا رہا ہوں۔" سمعان کی نظروں میں مُسکان کی شبیہ لہرائی۔

صبح ہی سائرہ نے بتایا تھا کہ مُسکان آج ویک اینڈ پر اُس کے ساتھ ہو گی۔ یہ خبر اس قدر خوشگوار تھی کہ صبح سے اس کا موڈ بھی بے حد خوشگوار ہو گیا تھا۔ اُسی پَل سے اُس کا دل مُسکان سے ملنے کو مچلا تھا۔ یہ وہ ہی جانتا تھا کہ یہ بیچ کے تین چار گھنٹے کس قدر مشکل سے کٹے تھے۔

❖❖○❖❖

کیسا ہوتا ہے
اپنوں سے بچھڑنے کا سانحہ
محسوس کرنا چاہو

تو ذرا دیکھنا بھی غور سے
کسی خزاں میں
مضبوط شاخوں سے گرتے
سوکھے، زرد، بے جان
تنہا تنہا پتوں کو

''ترنم تمہاری تو آج اپوائنٹ منٹ ہے فاروق صاحب سے، اور تم ابھی تک ویسے ہی بیٹھی ہو۔ ما
مشی سے فیشل ہی کرالو ذرا چہرے پر رونق آ جائے گی۔'' ماہ رخ نے سر پر بینڈز رولر لگا رکھے تھے ا
ہاتھ میں آئینہ لے کر اپنے آئی بروز کے شیپ چیک کر رہی تھی۔

''میں آج سرخ رنگ کی میکسی پہن رہی ہوں، کیا میں تمہارا پرلز کا سیٹ پہن جاؤں؟ ذرا اچھی میچ
رہے گی۔ ماہ رخ کی اب ساری توجہ اپنے خوبصورت پیروں پر تھی، جن پر بلیچ لگا رکھا تھا۔ میں نے پلا
کیور تو کروا رکھا تھا لیکن یہ کم بخت روز روز کالج جا کر میرے پیروں کا حال خراب ہو جاتا ہے۔''

ماہ رخ مسلسل بول رہی تھی۔ ترنم اس کے کسی سوال کا جواب نہیں دے رہی تھی اس کی اس کو کوئی پر
نہ تھی۔ وہ عادی تھی ترنم کی بلکہ اسے ہمیشہ اچھا ہی لگتا تھا۔ ترنم میں بے حد برداشت اور لچک تھی۔
لڑکیوں سے اُس کی کبھی نہ بنی تھی۔

ترنم ایک اچھی سامع ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد خیال اور پیار کرنے والی لڑکی تھی۔ اس لیے ماہ
تو پانی بھی ترنم کے بغیر حلق سے نہ اترتا تھا۔

''اے تنو! بول جا اب......! کیا گونگے کا گڑ کھا کر بیٹھی ہو؟'' ماہ رخ اب بول بول کر تھک گئی تھی۔

''نہیں......تم بولو ناں، میں سن رہی ہوں۔'' ترنم کی آواز میں بے حد ترنم تھا۔ اُس کو آواز اللہ
اس قدر پیاری دی تھی اور جب جب وہ بولتی سامنے والا اس کے لفظوں کو بھول کر اُسے سنتا تھا۔

''کیا میں پاگل ہوں، جو دیواروں سے باتیں کروں تم میری کسی بات کا جواب تک نہیں دیتیں۔''
رخ نے ناراضگی سے منہ موڑا۔

''ارے تم ناراض نہ ہوا کرو، تم جانتی ہو ناں کہ میں کبھی کبھی موجود نہیں ہوتی، میں تو بچھڑی ہوئی ہ
ہوں۔ خود کو کب کا کھو چکی ہوں۔ جب میں ہوں ہی نہیں تو پھر یہ ناراضگیاں کیسی؟'' ترنم اپنے آپ
مگن بول رہی تھی۔

ماہی نے ایک نظر اُس پر ڈالی اور گہرا سانس لے کر رہ گئی۔

''اللہ جانے تم ایسی ہو کر بھی کیسے کلائنٹ حاصل کر لیتی ہو۔ اصولاً تمہاری اوٹ پٹانگ باتوں
چہرے کی بیزاری دیکھ کر انہیں بھاگ جانا چاہیے۔'' ماہی نے نیل فائلر اُٹھا کر اپنے ناخن فائل کر
ہوئے کہا۔

''میری جان......تم کن ہواؤں میں ہو۔ یہ گدھ کب ہمارے چہروں کو دیکھتے ہیں یا کب ان کو ہ
باتوں اور دل سے لگاؤ ہوتا ہے۔ ان کو تو اپنی ہوس پوری کرنے کے لیے ایک جسم کی ضرورت ہوتی
ہمارے بے روح جسم! اور مردار کھانے والے یہ گدھ! ہاہا...... ہاہا۔ اور تمہاری مہذب زبان میں کلا

''ترنم کے لبوں پر ہنسی تھی مگر آنکھیں نم تھیں۔

''ترنم تم کو پانی دوں۔ !!'' ماہی نے تھوڑا بیزار ہوتے پوچھا۔ وہ ترنم کی اس طرح کی باتوں سے گھبرا
جاتی تھی۔ اس نے پانی کا گلاس ترنم کو تھمایا۔

''کوئی ایسا پانی ہے، جو اس وجود کی غلاظت کو دھو سکے؟'' ترنم نے ماہ رخ کی آنکھوں میں آنکھیں
ڈال کر پوچھا۔ ماہی کو اس کی آنکھوں سے بے حد خوف محسوس ہوا۔

''تم پانی پی لو۔ آج تمہاری طبیعت اچھی نہیں لگتی۔'' ماہی کی آواز میں خوف تھا۔ ''ویسے تو تمہاری
طبیعت کم ہی اچھی ہوتی ہے۔''

''ماہی میں اکثر سنتی تھی کہ دل سے شرمندہ آنسو وہ واحد پانی ہے، جو روح کی غلاظت دھو دیتا ہے! یہ
میرے ابا جی کہا کرتے تھے۔ میں اکثر ابا جی کو روتے ہوئے دعا مانگتے دیکھی تھی!!'' ترنم کی آواز سرگوشی
میں بدل گئی تھی۔

''ماہی کیا اتنے سالوں میں اتنے ڈھیر سارے شرمندہ آنسو اتنے بھی طاقتور نہ تھے جو اس غلاظت کو
دھو سکتے؟''

''ترنم...... ہوش میں آؤ! آپا نے تمہاری یہ اوٹ پٹانگ گفتگو سن لی تو وہ ہمیں جان (Jhon) کے
حوالے کر دے گی۔'' ماہی نے اسے باقاعدہ جھنجوڑ ڈالا۔

''ماہی میں کیا کروں؟ مجھ بدنصیب سے تو موت بھی منہ موڑے کھڑی ہے، کوئی پروانہ آزادی، کوئی
پروانہ معافی، کوئی خبر آمرزش، میرے لیے کیوں نہیں سنائی دیتی؟'' ترنم چہرے پر ہاتھ رکھ کر پھوٹ پھوٹ
کر رو دی۔

❖❖○❖❖

ہم نے اپنی زندگی میں کر لیا شامل تمہیں
اس سے بڑھ کر اور کیا کرتے تمہارے واسطے

سارے بیڈ پر تصویریں بکھری پڑی تھیں۔ جو تصویروں میں ماڈل تھی، اُس سے مُسکان کا دلی تعلق بھلا
کیا ہو سکتا تھا۔ یہ تصویریں اس کی فوٹوگرافی اسائنمنٹ کی تھیں۔ وہ کتنی دیر سے ان تصویروں کو دیکھتے
ہوئے مسکرا رہی تھی۔

اس اسائنمنٹ کے دوران ولی نے اس سے کتنی ڈھیر ساری باتیں کی تھیں۔ بے شک یہ باتیں ساری
کام کے متعلق تھیں لیکن مُسکان کو ولی کا خود پر توجہ دینا بہت اچھا لگا تھا۔

جب تقریباً ساری کلاس کام کر چکی تھی اور ان کے رول کی Developing باقی تھی۔ ولی کیسے اسپیشلی
ان کے اور سائرہ کے لیے دیر تک ٹھہرا تھا۔ ڈارک روم میں ولی کے اتنا قریب رہ کر کام کرتے وہ اپنے
دل کی تیز دھڑکنوں کو بہت واضح سنتی رہی۔

وہ اتنے اندھیرے میں بھی بتا سکتی تھی کہ بات کرتے وقت ولی کے لبوں پر کتنی بار ہلکی سی مسکراہٹ آئی
تھی۔ بات کرتے وقت کیسے ولی کا ایک ایک نقش بولتا تھا اور کیسے وہ بے خیالی میں اپنے ماتھے پر آئے
بالوں کو ایک ادا سے پیچھے کرتا تھا۔

مُسکان کے لبوں پر اتنی خوبصورت مسکراہٹ تھی کہ اندر آتی آیا اماں ٹھٹک کر رہ گئیں۔

''مُسکان بٹیا! آج اتنے دنوں بعد بہت خوش ہو! اللہ تمہیں ہمیشہ ہنستا مسکراتا رکھے۔'' آیا اماں نے دودھ کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

''آیا اماں آپ ٹھیک کہتی ہیں کہ میں واقعی آج بہت خوش ہوں۔'' مُسکان کے لہجے سے خوشی جھلک رہی تھی۔

''کیا میری بیٹی مجھے بتائے گی کہ وہ اتنی کیوں خوش ہے؟'' آیا اماں کے سوال پر مُسکان کے چہرے کا ایک دم رنگ بدلا۔

''وہ ...... وہ آیا اماں! مجھے اس والی کلاس اسائنمنٹ میں سب سے زیادہ نمبر ملے ہیں۔'' مُسکان نے بوکھلاتے ہوئے کہا۔

''تم کہتی ہو تو میں مان لیتی ہوں۔ میں نے بے شک تم کو پالا ہے، جنم نہیں دیا۔ لیکن بیٹا۔! ماں تو ماں ہی ہوتی ہے۔ اولاد کے دل کے ہر موسم اور رنگ کو جانتی ہے۔'' آیا اماں نے اُسے زیادہ کریدنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ انہوں نے جانے کتنے دنوں بعد مُسکان کو مسکراتے اور خوش دیکھا تھا۔

مُسکان نے ان کے جاتے جاتے ہاتھ تھام لیا تھا۔

''آیا اماں! میں نے اپنی ماں کو صرف تصویروں میں دیکھا ہے۔ ماں کیا ہوتی ہے اور کیسی ہوتی ہے اس کا تصور تو آپ کی ذات کی وجہ سے ہی ملا ہے۔'' مُسکان کے لہجے میں بے حد سچائی تھی۔

آیا اماں کے اندر تک ٹھنڈک اُتر گئی۔ والدین سے اظہار محبت اور بروقت اظہار محبت اُن کی خوشی میں ہی نہیں اُن کی عمر میں بھی اضافہ کرتا ہے۔

''چھوٹی بی بی! بڑے سائیں اور چھوٹے سائیں آئے ہیں۔'' ملازمہ نے اندر آ کر اطلاع دی۔

''بابا جانی اور بھائی آئے ہیں؟'' مُسکان کے چہرے کی خوشی دگنی ہوگئی تھی وہ دوپٹہ اُٹھا کر تقریباً بھاگتی ہوئی باہر نکلی لیکن اپنے بابا جانی کے سامنے آتے ہی اُس کی رفتار مدھم ہوگئی تھی۔ لاکھ وہ اپنے بابا جانی کی سب سے لاڈلی تھی لیکن ان کا رُعب ساری اولاد پر یکساں تھا۔

مُسکان سمیت سب ہی بابا جانی کے سامنے بے حد مؤدب رہتے تھے۔ اور یہ تکلف کی دیوار اُس بابا جانی کی خود ساختہ تھی۔

''السلام علیکم بابا جانی!!'' مُسکان نے آگے بڑھ کر پیار لیا۔ بابا جانی نے اسے گلے لگا کر پیار کیا۔

'میرا پیارا بیٹا کیسا ہے؟'' انہوں نے اسے ساتھ لگائے لگائے پوچھا۔

''ایک دم فائن...... بابا آپ نے اس بار اتنے ڈھیر سارے دنوں بعد چکر لگایا ہے۔ میں آپ ناراض ہوں۔'' مُسکان نے لاڈ سے ان کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''ارے چندا اُدھر زمینوں کے اتنے بکھیڑے ہوتے ہیں۔ نکلتے نکلتے بھی کتنے ہی کام پیچھے آ جاتے ہیں۔'' انہوں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

کلف لگی ان کی شلوار قمیض کھڑ کھڑ کر رہی تھی۔ اونچا لمبا قد، بڑی بڑی ہلکی سرمئی آنکھیں، جن میں ہر وقت سرخی رہتی تھی، ان کی شخصیت میں مزید دبدبا پیدا کرتی تھی۔

مُسکان نے بے حد پیار بھری نگاہ باپ پر ڈالی۔ اُسے اپنے بابا بے حد اچھے لگتے تھے۔

''چندا! بھائی سے نہیں ملو گی؟'' بابا جانی نے دور بیٹھے اپنے آپ میں گم اس کے بھائی کی طرف اشارہ کیا۔

''کیسے ہیں بھیا؟'' مُسکان نے بھائی کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ بلال نے اپنی سرخ سرخ آنکھیں اس پر گاڑ دی تھیں۔ نک سک سے تیار بلال دُور سے بیٹھا نارمل لگتا تھا۔ لیکن جیسے ہی اس کی آنکھوں کی وحشت کو دیکھا جاتا تو ایک دم کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوتا تھا۔

''جب آگ سے ایک انگلی چھو جائے تو دنوں چھالا دُکھتا ہے۔ لیکن میرا تو سارا جسم آگ میں جلتا ہے اور کسی کو میرے چھالے نظر ہی نہیں آتے، کوئی مجھے اس آگ سے نکالتا نہیں ہے نہ بچانے آتا ہے تو میں کیوں کر ٹھیک ہو سکتا ہوں؟ میں ایسے میں کیسا ہو سکتا ہوں؟''

بلال اس وقت جانے کس ذہنی رو میں تھا وہ بے حد نارمل طریقے سے باتیں کر رہا تھا۔ آج تو حد یہ تھی کہ وہ اپنی تکلیف اور اس کی حد کو بھی بتا رہا تھا۔

''بھیا اللہ سب ٹھیک کر دیں گے!'' مُسکان نے پیار سے اُس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''ہونہہ! خراب سب کچھ ہم کریں گے اور ٹھیک اللہ کریں گے۔'' بلال بلند سرگوشی میں بولا۔ اُس کے اندر میں پھر سے بے چینی نے سر اُٹھایا تھا۔

''بھیا آپ کے لیے کیا منگواؤں۔ کیا کھائیں گے؟'' مُسکان نے اس کی توجہ ہٹانے کو پوچھا۔

''تم میرے اس جلتے سلگتے جسم کے لیے کہیں سے ٹھنڈک و سکون لا سکتی ہو تو وہ لا دو! لاؤ...... لاؤ دو میرا سکون۔'' بلال ایک دم چیخنے لگا۔

''میں مر رہا ہوں...... آہ! میں جل رہا ہوں۔'' باہر سے دو نوکر بھاگتے ہوئے آئے لیکن وہ اُن کے قابو میں نہ آ رہا تھا۔

''صادق...... چھوٹے سائیں کو انجکشن دے دو۔ لمبے سفر سے بچہ تھک گیا ہے۔''

مُسکان پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے بھائی کو تڑپتے دیکھ رہی تھی۔ کبھی اس کا یہ بھائی کتنا خوش مزاج اور پیارا ہوا کرتا تھا۔ اب تو اس کی آنکھوں میں پہچان کی شبیہہ تک نہ ہوتی تھی۔

''بابا جانی...... یہ تھکن نہیں ہے، بھیا کو کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھائیں۔'' وہ بضد ہوئی۔

''ہوں......!'' بابا جانی نے ہنکارا بھرا۔ ان کے سنجیدہ چہرے پر عجیب سی بے چینی تھی۔ بلال کو کمرے میں لے جایا جا چکا تھا۔ اور اب اس کی آوازیں بھی سنائی نہ دے رہی تھیں اس کا مطلب تھا کہ وہ نیند میں چلا گیا ہے۔ بلال تو نیند میں چلا گیا تھا۔ لیکن بلال کی عبرت سامنے ہوتے ہوئے بھی سید سرفراز ابھی جاگے نہ تھے۔

ان کے ظلم کی دھاک آج بھی اپنے دس گاؤں پر جاری تھا۔ اتنے عرصے میں انہوں نے اپنی زمینوں کی تعداد دگنی چوگنی کر لی تھی لیکن وہ جان ہی نہ پائے کب اُن کا پیارا بیٹا اپنا سارا سکون کھو بیٹھا تھا وہ اور ان کا ضمیر سوئے ہوئے تھے۔

بلال کو زبردستی سلا دیا جاتا تھا لیکن جب جب وہ جاگتا تھا، اُس کی حالت اُن کو کوڑوں کی طرح

تکلیف دیتی تھی۔ اچھے سے اچھے ڈاکٹر کو دکھانے کے باوجود اُس کی حالت سنبھلنے کے بجائے بگڑتی جارہی تھی۔

''آخر اس کا علاج کہاں کرواؤں؟'' بابا جانی نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

اندر آتی آپا اماں کے چہرے پر بڑی عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

''سید سرفراز......! سب سے بڑا ڈاکٹر تو ایک ہی ہے۔ ساری شفا اور علاج اس سب سے بڑے ا کے پاس ہی ہے لیکن ہر ایک کو کہاں اتنی توفیق ملتی ہے کہ وہ اُس کے پاس جاسکے۔ اور رو کر، مانگ کر پاسکے!'' آپا اماں دل ہی دل میں کہتی اُن تک جا پہنچی۔

''السلام علیکم!'' آپا اماں کی آواز بے حد مدھم تھی۔

''ہوں۔'' سید سرفراز ایک دم چونک گئے۔

''آں...... ہاں۔ وعلیکم السلام...... کہو نفیسہ بیگم، ٹھیک تو ہو۔ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟'' انہوں نے بنا دیکھے اُسی اکڑی ہوئی گردن کے ساتھ پوچھا۔

''شکریہ! آپ کی کرم نوازیاں ہمیشہ بہت رہی ہیں! اب کسی اور کرم نوازی کی گنجائش نہیں ہے۔'' اماں کا لہجہ معمول سے مختلف تھا۔

''ہوں۔ ٹھیک ہے!'' پھر بھی تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو کہنا!'' سید سرفراز آپا اماں کے کڑ لہجے کو اکثر پی جاتے تھے۔ آپا اماں ایک کڑی نظر اُن پر ڈال کر باہر نکل گئیں۔ مُسکان کو بچپن سے ا بات عجیب سی لگتی تھی کہ بابا جانی جو کسی ملازم کو جوتے کی نوک پر بھی نہ رکھتے تھے، آخر آپا اماں کا ڈھیل کیوں دے دیا کرتے تھے، جیسے ان سے دبتے تھے۔ بہت سارے سوالوں کے ساتھ یہ سوال ا اکثر اُسے تنگ کرتا تھا۔

آپا اماں اس کوٹھی کی کُل مختار تھیں۔ ان کے پرسنل اکاؤنٹ بھی تھے۔ اتنی صاحب حیثیت ہو کر ا کی ملازم کیسے ہوسکتی تھیں؟ پھر بابا جانی اور آپا اماں دونوں کے رویے آپس میں عجیب سے تھے۔ ا تھا تصویر کے پس منظر میں، جو اُسے آج تک دکھائی نہ دیا تھا نہ دے رہا تھا۔

❖❖○❖❖

''یہ دیکھو...... کیسی ہے؟'' کاشف نے گولڈ کی موٹی سی چین منزہ کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

''اللہ کتنی خوبصورت ہے! اور بھاری بھی کس قدر ہے اس کا مطلب مہنگی بھی ہوگی۔'' منزہ نے ہاتھوں میں لے کر اُس کا وزن کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن بھائی یہ آئی کہاں سے؟'' یہ سوال منزہ سے نہیں بلکہ علیزے کی جانب سے آیا تھا۔ منزہ تو تک چین کو دیکھنے میں مگن تھی۔

''بھئی ہے ہماری بھی کوئی چاہنے والی!'' کاشف نے گردن اکڑاتے ہوئے کہا۔

''بھائی!'' علیزے کے لہجے میں تنبیہہ تھی۔

''بھائی آپ کا لڑکیوں سے تحفے لینا۔ یہ سب بہت بُری بات ہے۔'' علیزے نے ناگواری سے کے ہاتھ میں موجود چین کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں کوئی اُن سے زبردستی کہتا ہوں کہ مجھے تحفے دیں یا میں نے ان کے سر پر کوئی گن رکھی ہوتی ہے! یہ سب کچھ وہ اپنی مرضی سے دیتی ہیں۔'' کاشف بات کرتے کرتے کمرے کی دیوار سے لٹکے شیشے کے سامنے کھڑا ہو کر اپنا جائزہ لینے لگا۔

''بھائی اللہ نے آپ کو بے حد اچھی شکل دی ہے۔ یہ اللہ کی رحمت ہے۔ آپ شکر گزار ہوں اور اتنا ہی اچھا اپنا کردار بنائیں تاکہ آپ دین و دنیا میں اچھے اور کامیاب انسان بن سکیں۔'' علیزے نے کاشف کو سمجھانے کی ایک کوشش کی تھی۔

''اوئے...... ملانی صاحبہ! دن میں کوئی وقت تو چھوڑ دیا کرو ہم مظلوم قوم سے خطاب کیے بغیر۔ اتنی بار تو اس گھر میں کھانا نہیں ملتا جتنا، تمہارا نیکی اور بھلائی پر لیکچر ملتا ہے۔ کبھی تو ان کی جان چھوڑ دیا کرو۔'' کاشف نے اُس کا مذاق اُڑایا۔ منزہ اور کاشف اس بھونڈے مذاق پر ہنس رہے تھے۔

''بھائی! آپ یہ بھی تو سوچیں جس سے آپ فلرٹ کرتے ہیں، وہ بھی کسی کی بہن ہوگی۔'' علیزے نے اُس کو غیرت دلانے کی کوشش کی۔

''ہاں ہوگی...... کیوں نہیں! لیکن وہ میری بہن تو نہیں ہے ناں!'' کاشف نے ہنستے ہوئے منزہ کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

''بہنوں کے بھائی تو بہت محتاط ہوتے ہیں۔ ہر وقت ڈرنے والے کہ اُن کا کوئی غیر محتاط قدم اُن کی بہنوں کے لیے کانٹوں کا رستہ نہ بن جائے۔ آپ کیسے بھائی ہیں؟ علیزے نے دکھ و تاسف سے کہا۔

''ارے بابا۔ میں تو تم لوگوں کا گریٹ بھائی ہوں، بالکل بھی دقیانوسی نہیں ہوں۔ پھر دیکھو اپنے تحائف بھی تم لوگوں سے بانٹ لیتا ہوں۔'' وہ بولا۔

بعض لوگوں نے اپنے دل و روح پر تالے لگائے ہوتے ہیں۔ اچھی اور بھلائی کی بات اُن کے کانوں سے ہی پلٹ آتی ہے کوئی خیر کی بات اُن کے دل و دماغ تک کم ہی اُتر پاتی ہے۔ کاشف بھی بالکل ایسے ہی لوگوں میں سے تھا۔ خود پسند، بے حد لالچی اور خود غرض...... اللہ نے اس قدر پیاری شکل دے رکھی تھی کہ لڑکیاں اُس کی جانب کھنچی چلی آتی تھیں اور وہ اپنی پرسنیلٹی کا غلط فائدہ اٹھاتا تھا۔ گفٹ بٹورنا، لڑکیوں سے اچھی جگہ ڈنر، لنچ لینا اُس کا پسندیدہ مشغلہ تھا اور اس مشغلے میں کوئی حائل ہو، یہ اُس کو ہرگز پسند نہ تھا۔ اس لیے گھر میں اُس کی اگر منزہ سے بہت بنتی تھی تو علیزے سے ہرگز نہ بنتی تھی۔ لیکن علیزے بھی اپنے نام کی ایک تھی وہ ہر وقت ہر غلط بات پر بہن اور بھائی کو ٹوکتی تھی۔ اس کا ایمان تھا کہ اگر وہ غلط پر خاموش رہتی ہے تو وہ بھی غلط میں شامل ہوجائے گی۔ اور زندگی میں غلط راستہ ہرگز اُس کی چوائس نہ تھا۔ اُس کی شفاف آنکھیں اور روح بہت الگ اور سچے راستوں کے حامی تھے۔ بے شک وہ حُسن آرا اور انور صاحب کی سب اولادوں سے بے حد مختلف تھی۔ اُسے اپنی کم معاشی حیثیت پر کبھی شرمندگی نہ ہوتی تھی۔ اچھے حالات کی وہ بھی خواہش مند تھی لیکن اپنی دعاؤں اور کوششوں کے ذریعے وہ اسے حاصل کرنا چاہتی تھی۔ کاشف اور منزہ کی طرح اپنی شکلوں کو کیش کروانے کے کسی شارٹ کٹ پر ایمان ہرگز نہ رکھتی تھی۔

سیدھا راستہ بے شک لمبا اور دشوار ہوتا ہے لیکن منزل کو پانے والے ہی تو اس راستے کے راہی ہوتے

ہیں! یہ اس کا یقین تھا۔

❖❖○❖❖

"کیا آپ کو میری کوئی بات بُری لگی ہے؟ میں جب بھی آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں آپ مجھے نظرانداز کرتی ہیں پہلے مجھے محسوس نہیں ہوتا تھا لیکن اب اکثر میں غور کرتی ہوں کہ آپ مجھ سے ہی بات کرنے سے کتراتی ہیں۔ ٹھیک ہے اگر آپ مجھ سے دوستی نہیں رکھنا چاہتیں تو مجھے بتادیں۔ لیکن...... اس طرح میں ہرٹ ہوتی ہوں۔" نگینہ کی آواز بھرا گئی۔

"آج تک سب میرے دوست رہے ہیں۔ میں ہمیشہ سب کے ساتھ اچھی رہی ہوں، میری ہمیشہ خواہش رہی ہے کہ مجھ سے کسی کو دکھ نہ پہنچے۔ کیا میں نے آپ کو ہرٹ کیا ہے؟ مجھے ایک بار وجہ ضرور جاننی ہے۔ میں جتنے پیار سے آپ کی طرف بڑھتی ہوں، آپ اُس سے دُگنا چوگنا سرد مہری کا رویّہ دکھاتی ہیں...... کیوں۔۔؟ کم سے کم وجہ تو مجھے معلوم ہو۔" نگینہ نے چپ چاپ بیٹھی ترنم سے پوچھا۔

ترنم اُس پیاری سی شفاف لڑکی کو دیکھتی رہ گئی۔ ترنم کو اکثر اُس میں کسی کی جھلک دکھائی دیتی تھی، ترنم کو یہ لڑکی بہت زیادہ اچھی لگتی تھی، وہ اپنے ناپاک وجود کا سایہ تک اُس پر پڑنے نہ دینا چاہتی تھی اس لیے اُسے اگنور کرتی تھی۔ لیکن آج اس معصوم اور پیاری سی لڑکی نے اتنی سادگی سے اُسے گھیرا کہ وہ پھنس کر رہ گئی تھی۔

"نہیں نگینہ...... تم بہت اچھی ہو۔ تمہارا تو رتی بھر بھی قصور نہیں ہے۔ مشکل یہ ہے کہ میں تھوڑی سی بھی اچھی نہیں ہوں۔" ترنم کی آواز میں بے حد دکھ تھا۔

چھوڑتا نہیں دل کو ایک سخت پچھتاوا
کتنا پانی لگتا ہے اک گناہ کو دھونے میں

تم پلیز میرے رویے کا برا نہ مانا کرو۔ میں کوئی ایسی اہم نہیں ہوں، جس کے رویوں اور دوستی کی تم پروا کرو۔" کہتے کہتے ترنم کا لہجہ ایک دم سخت ہوگیا۔

وہ کسی طور نگینہ کو اپنے قریب نہ آنے دینا چاہتی تھی۔ لیکن ماہ رخ کی حُسن پرست طبیعت اور آپا کی ہدایات کہ خوبصورت لڑکیوں کو اپنے حلقہ دوستی میں شامل کرو۔ جس کی وجہ سے کالج کی بہت پیاری اور موہنی صورتیں اب اُن کے اردگرد رہنے لگی تھیں۔ ماہ رخ جس قدر موڈی تھی اُس سے زیادہ دوست رکھنے کا فن جانتی تھی۔ اسی وجہ سے وہ پاپولر شخصیت کے طور پر کالج کی لڑکیوں کی نظر میں تھی۔

نگینہ کا ان کے قریب آنے میں بھی ماہی کا ہاتھ تھا۔ لیکن یہ بے حد سادہ لڑکی زیادہ تر ترنم کو بلاتی تھی۔ ترنم کو اس کی بے حد بھولی اور معصوم صورت بار بار اُسے خود سے دور رکھنے پر مجبور کرتی تھی۔

"ہم تو وہ بُرا دائرہ ہیں، جس کے پاس سے بھی نہیں گزرنا چاہیے یہ تم لوگوں پر فرض ہے کہ تم ہم لوگوں سے بچ کر رہو۔" ترنم نے بہکے بہکے انداز میں کہا۔

نگینہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ کوئی اس طرح بھی خود کو برا کہتا ہے؟ اُس کا بے حد معصوم ذہن بوکھلا کر رہ گیا۔

"ترنم! آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟" نگینہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"میری بات غور سے سنو۔" ترنم اونچے چبوترے پر بیٹھی نگینہ پر جھکی، اُس کے وجود سے مخمور کردینے والی خوشبو اُٹھ رہی تھی، جو ترنم کی طرح ہی سحر انگیز تھی۔ "تم مجھ سے ایک دن کے فاصلے پر رہو اور ماہ رخ سے تو ہمیشہ ایک صدی کے فاصلے پر! یہ تمہارے لیے سب سے اچھا ہے۔ اور اچھے لوگوں کو برے لوگوں سے بہت بچنا چاہیے۔" ترنم نے نگینہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"جی!" نگینہ نے حیرانی و معصومیت سے کہا۔

"ہاں جی!" ترنم نے سیدھے ہوتے ہوئے کہا اور وہاں سے چل دی۔

نگینہ اُس کی باتوں پر غور کرتی، اُلجھی اُلجھی نگاہوں سے اُسے جاتے دیکھتی رہ گئی۔

❖❖○❖❖

"بھیا یہ والا نہیں، وہ سبز نگینوں والا دکھاؤ!" اس کی آواز میں بے حد خود اعتمادی تھی اس کے علاوہ خوشیوں کے وہ سارے رنگ، جو اُس کے چہرے پر دکھائی دے رہے تھے۔ اُس نے اُس عام سی لڑکی کو بے حد جاذب نظر بنادیا تھا۔

ترنم جو کتنی ہی دیر سے عدم دلچسپی سے بیٹھی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی اس کومل آواز پر متوجہ ہوئی۔

یہ ایک بہت بڑی جیولری شاپ تھی۔ ترنم اس وقت منسٹر کے بیٹے کے ساتھ یہاں موجود تھی۔

خاور عمر میں کم تھا۔ ترنم کے عشق کا بھوت اُس پر نیا نیا سوار ہوا تھا۔ میڈم چاندنی اُس کی اس دیوانگی اور ناتجربے کاری کو زیادہ سے زیادہ کیش کرانے کے موڈ میں تھی۔ اس لیے وہ خاور کو مسلسل ترنم کو شاپنگ کروانے بھیج رہی تھی۔

آج نکلتے ہوئے میڈم نے خاور کے کانوں میں ڈالا تھا کہ ترنم کو ڈائمنڈ اور وائٹ گولڈ کی جیولری بہت پسند ہے اور وہ پاگل دیوانہ ترنم کو سیدھا جیولر کے پاس لے آیا۔ سارے راستے خاور کی حماقت بھری باتیں اور دست درازیاں ترنم کو کوفت میں مبتلا کرتی رہیں۔

یہاں جیولر کے ہاں آکر بھی اُس کی کوفت میں کمی نہ ہوئی تھی۔ تب ہی اُس نے یہ کومل سی آواز سنی تھی۔

وہ لڑکی اپنے باپ بھائی اور ماں کے ساتھ یقیناً اپنی شادی کی جیولری خریدنے آئی تھی۔ ماں نے بہت پیار سے مانگ ٹیکا اس کی مانگ پر لگا کر اُسے دیکھا۔ ترنم کے جسم پر جیسے کوڑے برسنے لگے، منظر گڈمڈ ہونے لگے۔

ماں کی دعاؤں سے اُس کی لڑکی کی مانگ درخشاں ہونے جارہی تھی۔ باپ کی خوشی اُس لڑکی کے ہر گہنے میں خوشیاں بھر رہی تھی۔ بھائی کا مان اُس لڑکی کے قدم زمین پر مضبوط کرنے والا تھا۔ مانگ ٹیکا، چوڑیاں، پازیب ہر ہر گہنہ دعاؤں سے بھرا پڑا تھا۔

ایک وہ تھی، جس نے دعاؤں بھری چھاؤں پر خود لات ماری تھی۔

اب بد دعائیں کسی چڑیل کا روپ دھارے اُس کے تعاقب میں تھیں وہ چاہ کر بھی ان سے پیچھا چھڑا پارہی تھی۔ ترنم نے اک رشک بھری نظر اُس لڑکی پر ڈالی۔

"ہم جیسے لوگوں کے ساتھ اتنا ہی برا ہونا چاہیے۔" اُس نے خود کو پھٹکارا۔

''ترنم جانو! دیکھو یہ والا سیٹ تم پر بہت اچھا لگے گا۔'' خاور اُسے بلا رہا تھا۔

''ویسے ترنم پر ہر گہنہ ہی اپنی قیمت پر بڑھوالیتا ہے۔'' وہ شوخی سے اُس پر جھکا۔

''اُلو کا پٹھا!'' اک سرد نگاہ اُس پر ڈالتے ہوئے ترنم منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

''کیا کہا؟ تم مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی؟''

''ہاں میں تمہاری تعریف کر رہی تھی۔ کیا ٹیسٹ پایا ہے تم نے!''

''میری تعریف؟'' خاور کو اپنے پکے سانولے رنگ کا شدید کمپلیکس تھا۔

''کیوں؟'' وہ خوش ہونے کے بعد پریشان ہوگیا۔

''وہ اس لیے کہ تمہاری چوائس بہت اچھی ہے۔'' ترنم ایک دم سنبھلی۔ میڈم چاندنی نے اس لڑکے کے ذریعے جو جو کام کروانے تھے، اس کی با قاعدہ فائل بنا کر ترنم کو دے رکھی تھی۔ بہر حال اُس کی جاب ہی لڑکے کو ہر حال میں خوش کرنا اور رکھنا تھا۔ اور اُس سے سارے کام کروانے تھے۔

''بے شک میری چوائس بہت اچھی ہے! خاص طور پر ڈائمنڈز کے لیے!'' اُس نے ترنم کا سفید کبوتر جیسا ہاتھ اپنے گہرے سانولے ہاتھوں میں دبوچ کر معنی خیز انداز میں کہا۔

ترنم نے سر جھکا کر اُسے یہ تاثر دیا کہ وہ اس کی باتوں پر شرما رہی ہے۔

''احمق اعظم...... گدھا!'' وہ بڑبڑائی۔

''اوہ...... مائی لو! تم کس قدر مختلف ہو۔ تمہاری یہ حیادار ادائیں مجھے اپنا آپ بھلا دیتی ہیں، میں تمہارا دیوانہ ہوگیا ہوں۔''

''گدھے۔ کیا سارے ڈائیلاگ آج ہی ختم کر دینے ہیں۔'' ترنم نے ایک خوبصورت مسکراہٹ اُس پر اُچھالتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔

''میرا خیال ہے اب چلتے ہیں۔'' ترنم نے سیلز بوائے کی مسکراہٹ دیکھتے ہوئے اُٹھنا چاہا۔

''او کے! تم جو کہو، بس وہ ہوگا۔'' خاور نے سیٹ پیک کرنے کو کہا۔ عشق کا بھوت اُس کے سر پر کھڑا ناچ رہا تھا۔ وہ کسی غلام کی طرح ترنم کے اشاروں پر چل رہا تھا۔ ترنم خاور کو بل جمع کرواتے چھوڑ کر ونڈو کی طرف آ گئی۔ ویسے بھی اس مرحلے سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔

ونڈو بہت خوبصورت ڈیزائن کی گئی تھی۔ ساری ونڈو میں سمندر کا منظر دکھایا گیا تھا۔ نیلے اور سبز بیک گراؤنڈ' ریتیلا فرش' نیلی اور سبز روشنیاں سمندر کے اندر کا خوبصورت منظر پیش کر رہی تھیں۔ بڑے بڑے شیل بنا کر اُس میں موتی اور جیولری سجا کر پیش کی گئی تھی۔ ایک مرمیڈ لائف سائز کی بنا کر رکھی گئی تھی۔ اس جل پری نے ایک ادا سے ایک بہت خوبصورت ہار پکڑ رکھا تھا۔ خود بھی اس نے بے حد خوبصورت وائٹ گولڈ پہن رکھا تھا۔ نیلی سبز گھومتی روشنیاں جب اُس جل پری پر پڑتیں تو اس کی آنکھوں میں ہلکی سی جنبش محسوس ہوتی تھی اور یوں لگتا تھا کہ سچ مچ کی جل پری سمندر کی تہہ میں بیٹھی کسی خزانے کا خوبصورت ہار دیکھ رہی ہو۔

''Spell bounds یہ بہت خوبصورت، حیران کن اور سحر انگیز ہے، جس کسی آرٹسٹ نے یہ آئیڈیا سوچا اور اُسے اتنے خوبصورت انداز میں پیش کیا، وہ کمال کا تخلیق کار ہے!'' ترنم نے پاس آ کر کھڑے

شاپ کے اونر سے کہا۔

''یس میڈم! آپ کی طرح ہمارا ہر کسٹمر ہماری اس ونڈو ڈیزائن کو بہت پسند کرتا ہے۔''

''ان فیکٹ اگر اسے باہر سے دیکھا جائے تو یہ اور کمال کا تاثر دیتی ہے۔ اس کے ماحول اور منظر نے جیولری کا ڈسپلے بہت خوبصورت بنا دیا ہے۔'' اونر خود بھی اپنی اس ونڈو ڈیزائن سے بے حد خوش اور ...ن تھا۔

''کیا میں اُس بنانے والے آرٹسٹ کا نام جان سکتی ہوں؟'' ترنم نے پوچھا۔

''کیوں نہیں! یہ دیکھیں، ڈسپلے کے کارنر پر اُس کا نام لکھا ہے۔ یہ بھی طالب علم ہے لیکن کام بے استادوں جیسا ہے۔''

...م کی نظریں نام پر چپکی رہ گئی تھیں۔ اس کا مردہ دل ایک دم دھڑکنے لگا تھا۔

...الولی! بے شک وہ عبدالولی کا ہی بنایا ہوا ڈسپلے تھا۔ وہ اس کے دستخط بہت اچھی طرح پہچانتی تھی۔

...کمال میرے اندر زندگی دوڑا دیتا ہے، اے مہربان اجنبی! کیا تم جانتے ہو کہ زمانہ جسے ساحرہ کہتا ...تمہارے سحر میں جکڑی جا چکی ہے۔ اور تم بے خبر ہو اس سے بڑا ظلم کیا ہوگا۔

...لو ڈارلنگ...... میں اس وقت تنہائی چاہتا ہوں، جہاں میں تم کو اپنے ہاتھوں سے یہ جیولری ...ں۔ اور پی سی سے اچھی جگہ فوراً کہاں ملے گی۔ اسی لیے میں نے آج وہاں کمرا بک کروایا ہے۔''

...جملہ ترنم کو اپنی اوقات میں لے آیا تھا۔ ایک جملے نے اسے اس جلتی بھیانک حقیقت میں لا پھینکا ...ایک کال گرل ہے۔ اور کال گرل کو کسی سے محبت نہیں ہو سکتی اور نہ ہی کال گرل سے کوئی محبت ...ہے وہ تو صرف خوش وقتی کے لیے ہے، جس کی اُسے قیمت ملتی ہے۔ وہ کسی بے جان وجود کی ...اور کے ساتھ کھنچتی چلی گئی۔ خاور کو اُس نے جتنے ڈرنک بنا کر دیے اتنے ہی اُس نے خود چڑھائے ...لشہ اُسے ہر خیال سے بیگانہ کرتا تھا۔ لیکن جانے کیوں اب نشہ بھی زیادہ کارگر نہ ثابت ہوتا تھا، ...ٹیا نیا تھا۔ اس لیے دو تین ڈرنک کے بعد ہی لڑکھڑانے لگا۔

...ے خاور! تم مجھے یہاں کیوں لائے؟'' ترنم نے نشے میں پوچھا۔

...وں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔'' وہ ٹھیک سے بول بھی نہ پا رہا تھا۔

...نہیں، نہیں۔!! تم کو تو صرف میرا جسم چاہیے۔ رات ختم بات ختم۔'' ترنم نے طنزیہ لہجے میں

...تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟'' خاور پر مزید نشہ ہو رہا تھا۔

...سچی! میں سچی باتیں کرتی ہوں! ہاہا۔ ہاہا!''

...تم ایسی بھی باتیں کرتی ہو، مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔'' خاور نے ہاتھ بڑھا کر اُسے اپنی طرف کھینچا۔

...ہہ!'' ترنم نے نشیلی نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

...مسٹر خاور، سن آف اے منسٹر۔ یہ تمہارا پورا تعارف ہے۔ تم بالکل غلط لڑکی میں الجھ رہے ہو۔'' وہ ...کرسی پر بیٹھ گئی اور گلاس تمام کر لبوں کو لگا لیا۔

...ر دونوں ہاتھوں کی گٹھڑی بندھی ہے

نگاہیں خجل ہیں
زبانیں ورق ہوگئی ہیں
ہم وہی ہیں
جو اپنے گناہوں کی پاداش میں
رات دن ایک دیوار کو چاٹتے ہیں
ہم اس اُمید پر جی رہے ہیں
کہ شاید دیوار گر جائے
ہم سرخرو ہوں
ہمارے گناہوں کی سب داستانیں
جو ہر اینٹ پر ثبت ہیں
منہدم ہوں
مگر...
مگر ایسا ہوتا نہیں ہے
یہ دیوار ہر صبح ہم کو
عجب فتح مندی سے
للکارتی ہے
کہاں ہیں مرے ڈھانے والے گنہگار، آئیں، پھر آزمائیں۔
شب و روز اپنی زبانوں کے بوسیدہ خنجر مرے جسم پر آزمائیں۔

ہاہا۔ ہا!" ترنم بولتے بولتے ہنسنے لگی۔ وہ اتنا ہنسی کہ آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

"تو مسٹر خاور...... تم کو کہاں وہ کچھ ملے گا، جو تمہاری عمر کے لڑکے چاہتے ہیں۔ محبت...... جھوٹی محبت ہی سہی لیکن قسمیں، ایسی وفاؤں کے وعدے میرے پاس نہیں ہیں۔ تم بھی باقی گدھوں کی طرح مردہ جسم کو بھنبھوڑو، اپنے پیسے پورے کرو اور جاؤ۔" ترنم خود میں نہ تھی۔

"کیوں مسٹر! ارے تم تو گئے کام سے!" ترنم خاور کے نشے میں بے سدھ بے ہوش وجود کو دیکھتے ہوئے بولی۔

اور پھر جانے اُسے کیا ہوا، وہ ہنستی چلی گئی۔

ہنستے ہنستے ایک دم کمرا سسکیوں سے بھر گیا۔ اب وہ دو زانو بیٹھی اونچی آواز میں رو رہی تھی۔

خاور کرسی پر بے ہوش پڑا تھا نہ وہ کچھ سن سکتا تھا اور نہ اس ساؤنڈ پروف کمرے سے باہر کوئی اُس کی آواز سن سکتا تھا۔

❖❖○❖❖

"گناہ کائنات کی بیماری ہے۔ جس طرح موت سے پہلے انسان بیماریوں کی زد میں آتا ہے اور بیماری انتہا کو پہنچ جانے کے سبب آدمی لاعلاج ہوجاتا ہے تو موت آجاتی ہے۔ اسی طرح قیامت اس

وقت برپا ہوگی، جب شرک، کفر، فسق و فجور ناجائز اور غلط کاموں کی انتہا ہوجائے گی۔

"بہت ساری جانوں اور عزتوں کی قربانی دے کر ہم نے یہ ملک حاصل کیا ہے۔ ہمیں اپنے ملک سے ان ناسوروں کا خاتمہ کرنا ہے، جو ہمارے ملک کی جڑوں کو کاٹ رہے ہیں۔" طارق نے اپنی بات کے اختتام پر کمرے میں موجود نفوس کے چہروں کو دیکھا۔

ڈائریکٹر صاحب نے اُسے چھ قابل اور ذہین جوان دیے تھے تاکہ وہ اپنے کام کو مکمل کر سکے۔ طارق بہت سخت ٹریننگ اور امتحان کے بعد اس مقام تک پہنچا تھا۔ اس کے اندر کی حب الوطنی ہی اس کی اصل Strength تھی۔ وہ ہمیشہ ہر کیس سے پہلے اپنی ٹیم کے جوش و جذبے کو اُبھارتا تھا۔ آج کی یہ میٹنگ بھی اس سلسلے کی کڑی تھی۔

"کیاں میں یقین کروں کہ ہم سب اپنے ملک و قوم کی حفاظت کی خاطر اپنی جان تک لڑا دیں گے؟" طارق نے سوال کیا۔

"انشاء اللہ!" کمرے میں چھ نوجوان یک زبان ہو کر بولے۔ اور انشاء للہ کی گونج اور مضبوطی آنے والے دنوں میں بہت سارے لوگوں کے لیے خطرہ تھی۔

"ہم بہت ساری غلط باتوں پر اکثر بلبلا کر بول اُٹھتے ہیں ناں کہ اس ملک کا اتنا بیڑا غرق ہونے کے باوجود اللہ جانے کس وجہ سے یہ ابھی تک قائم ہے۔ کس طرح یہ بچا ہوا ہے؟ تو اس کی وجہ صرف چند لوگوں کا یقین ہے! وہ برائی سے لڑنے اور ملک کو بچانے کے لیے اپنی جان قربان کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ چند لوگ جو اتنے سارے لٹیروں کا سامنا کر رہے ہیں ان کے یقین اور ایمان کی طاقت بہت اعلیٰ ہے، جو آج تک یہ ملک قائم و دائم ہے۔ اگر برائی ہر وقت متحرک ہے تو اچھائی بھی اپنی جنگ لڑ رہی ہے۔ یہ سروائیول کا گیم وہی جیتے گا جو دائیں ہاتھ والوں میں شامل ہو کر اپنی مضبوطی بڑھائے گا!" طارق نے اپنا دایاں ہاتھ سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔" چھ لوگوں کا عزم کمرے میں ایک بار پھر گونجا۔

"اوکے تو پھر اپنے کام کی شروعات کرتے ہیں" طارق نے ایک بریف کیس کھولا۔ لیپ ٹاپ کے ساتھ ملٹی میڈیا آن کر کے لائٹیں آف کر دی گئیں۔ یہ سب کچھ باقاعدہ منصوبے کے ساتھ ہو رہا ہے اس کا ٹارگٹ یہ ہے کہ ہمارے ملک کو بم سے نہیں تباہ کرنا بلکہ اس کی تہذیب اور اقدار کو اس قدر ڈیمج کرنا ہے کہ ہمارا ملک خود بخود ختم ہوجائے!"

طارق کا انکشاف ایک اوپن سیکرٹ تھا۔ پاکستان کی تہذیب تباہ کردو، یہ خود تباہ ہوجائے گا!" آرڈر "یہ ہے ان کے مشن کا سلوگن۔ اسکرین پر انگریزی حروف میں یہ تحریر چمک رہی تھی۔

اس کام کے لیے انہوں نے باقاعدہ اپنے کارکنوں کو تربیت دے کر ہمارے ملک میں لانچ کیا ہے۔ ان کارکنوں کو ملک کے اہم شعبوں میں اعلیٰ عہدوں پر تقرر کروایا گیا تھا۔ یہ لوگ غیر ملکی ہیں، یہ پتا کرنا بہت مشکل ہے کیوں کہ ان کے جعلی برتھ سرٹیفکیٹ انہوں نے بنوائے ہوئے ہیں۔ اس ملک کی نیشنلٹی حاصل کرنا تو ویسے بھی آسان ترین کام ہے۔ "بظاہر مسلمان ناموں کے ساتھ یہ کام کرنے والے زیادہ تر غیر مسلم ہیں۔" طارق نے ایک اور انکشاف کیا۔ اُس نے اپنی Presentation سے پہلے ٹھیک ٹھاک

کام کیا تھا۔

ان لوگوں نے سب سے پہلے یہاں آ کر پیسے دے کر زیادہ سے زیادہ غدار لوگ خریدے ہیں اور اپنا نیٹ ورک اس قدر پھیلا لیا اور مضبوط کر لیا ہے کہ اس مشن کو پورا کرتے ہوئے ہمارے سامنے بہت سارے ایسے نام بھی آ سکتے ہیں، جن کا معاشرے میں مقام اور عزت ہے، جو ہماری نظروں میں اور ملک کے بڑے ہیں۔

"اوکے گائز...... پہلے تو ہم اُن اہم شعبوں کا ذکر کریں گے، جن کو ٹارگٹ کیا گیا ہے۔ ان میں ایجوکیشن، میڈیا اور بطور خاص الیکٹرانک میڈیا قابل ذکر ہے۔ ہمارا ملک بلکہ کوئی بھی ملک سیاست پر بیس نہیں کرتا بلکہ اپنے ایجوکیشن سسٹم پر بیس کرتا ہے۔ ہمارے ملک میں الیکٹرانک میڈیا کو آہستہ آہستہ آزادی دے کر جو کلچر پیش کیا جا رہا ہے، اس کی ایجوکیشن ہماری تینوں نسلوں پر 20 فیصد، 40 فیصد اور 80 فیصد کے حساب سے اثر کر چکی ہے۔

"بیس پرسنٹ والا گروپ اولڈ ایج گروپ کے قریب ہے۔ فورٹی پرسنٹ والا گروپ مڈل ایج گروپ ہے! اور ہمارا کل، ہمارا کُل سرمایہ ہماری نئی نسل...... وہ ایٹی پرسنٹ والا گروپ ہے۔ ان کا مشن 80 پرسنٹ ابھی حاصل کر چکا ہے۔ یہ ان کا کہنا ہے۔ باقی بیس پرسنٹ رہ گیا ہے! ہماری لڑائی اس بیس پرسنٹ کے لیے نہیں ہے، ہماری لڑائی ہمارے 80 پرسنٹ کے لیے ہے جو ہمارا کل ہے! ہمارا اسی فیصد کل ان کے ہاتھوں میں جا چکا ہے اور حیرت کی بات ہے ہم ہر روز سکون سے سوتے ہیں اور پیٹ بھر کر کھاتے ہیں! حیرت کی بات ہے کہ نہ ہماری نیند اُڑی ہے اور نہ ہی چین حرام ہوا ہے۔

"میں سب کو ان کے لیے مخصوص کردہ شعبے کی فائل دے رہا ہوں۔ آئندہ سے ہم کچھ کوڈ ورڈ کے ساتھ ایک دوسرے سے رابطہ کریں گے۔ ہر شخص کو اپنے ٹاسک کا کوڈ ورڈ اور مشن الگ سے دیا جائے گا کسی کو اپنے دوسرے ساتھی کے کام اور اس کی حد کی خبر نہیں ہوگی، آپ الگ الگ آفس میں رپورٹ کیا کریں گے۔

"اینی کوئسچن؟" طارق کی بارُعب آواز کمرے میں گونجی۔

"نو سر۔"

"کوئی شک؟"

"نو سر۔"

❖❖○❖❖

ہر صبح کو
ہر اُجالے کو
حاصل کرنے کے لیے
اندھیرے کاٹنے ہوں گے
اور
صبح اُسے ہی ملے گی

اس کی ہی جھولی میں طلوع ہوگا
میرے میں بھی
کی آس میں سفر کرے گا
نہ چھوڑے گا
نہ چھوڑے گا

تو روشنی ہے!

وقت تھا۔ تقریباً سب ہی اسٹوڈنٹ گھروں کو جا چکے تھے، اس لیے سارے کالج میں خاموشی
ان کو اپنا اسائنمنٹ ہر صورت آج ہی پورا کرنا تھا۔ کل وہ گاؤں جا رہی تھی۔ بابا سائیں خاص
لیے دو دن سے رُکے ہوئے تھے۔

روم میں وہ اپنے لائف سائز Souvenir پر کام کر رہی تھی۔ لیکن کام تھا کہ پورا ہونے میں
رہا تھا۔ سائرہ کو آنی کے ساتھ ضروری کام تھا، اس لیے وہ رک نہ سکی۔ اس لیے وہ
Scul روم میں اکیلی کام میں محو تھی۔

صاحب...... میرے ڈائی کا کیا بنا؟"

میں گونجنے والی آواز بے اختیار مُسکان کا دل دھڑکا گئی۔ مُسکان نے بے اختیار اپنا سر اٹھا کر
سفید شرٹ اور نیلی جینز میں ہلکی ہلکی بڑھی شیو کے ساتھ بھی وہ دل میں اترے جا رہا تھا۔ اس
اسے ہمیشہ سے نمایاں بناتا تھا۔

بھیا تم لوگ تو ماسٹر صاحب کو مشین سمجھتے ہو کہ بٹن دبایا اور کام ہو گیا۔ بھیا، ڈائی کو بننے اور
وقت لگتا ہے۔" بوڑھے ماسٹر صاحب نے اپنی عادت کے مطابق اونچا بولتے ہوئے کہا۔

ماسٹر صاحب خفا نہ ہوں، میں انتظار کر لیتا ہوں۔" ولی نے نرم لہجے میں کہا اور وہیں پڑے
پر بیٹھ گیا۔

آپ! السلام علیکم!" ولی نے خوشگوار لہجے میں مُسکان کو مخاطب کیا۔ مُسکان کے تو اردگرد
ل اٹھے تھے۔ ولی نے دو سالوں میں پہلی بار اُسے خود سے بلایا تھا۔ نہ صرف بلایا تھا
کر ایک شناسا مسکراہٹ بھی اُچھال چکا تھا۔

السلام، آپ کیسے ہیں؟"

پ!" ولی اس وقت بہت ایزی موڈ میں تھا۔ اس کی نگاہوں کی ہر وقت کی اجنبیت بھی اس
مُسکان کو یہ سب کچھ خواب لگ رہا تھا۔

رہی ہیں؟" ولی نے اس کے Monument کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

آخری ڈیٹ تین دن بعد کی ہے۔ میں آج رات اپنے گھر جا رہی ہوں، اس لیے اس کو ہر
کرنا ہے۔" مُسکان نے کام کرتے ہوئے کہا۔

...... اس کا تو ابھی کافی کام رہتا ہے۔" ولی نے Monument کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''ہاں جی...... یہ تو ہے۔''مُسکان کو بھی کام آج مکمل ہوتا نظر نہ آ رہا تھا۔
''کیا یہ والا بھی آپ کا ہے؟'' ولی نے Souvenir کی جانب اشارہ کیا۔
''جی!'' مُسکان کچھ کنفیوژ ہو گئی تھی۔ شاید اُس کا کام زیادہ اچھا نہیں ہے۔ وہ سوچنے لگی۔
''یہ بہت عمدہ ہے!'' ولی نے اُسے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔
''مُسکان کا ایک دم سیروں خون بڑھ گیا۔
''آپ کو میرا کام اچھا لگا؟'' مُسکان حیرت کی ٹرانس میں تھی۔
''آف کورس! اچھا کام تو خود بولتا ہے۔'' ولی نے نظر اٹھا کر مُسکان کو نہیں دیکھا تھا، اس کی
توجہ Souvenir کی جانب تھی۔ اگر وہ صرف ایک بار نظر اٹھا کر دیکھتا تو بت بن جاتا۔ جن نظروں
وہ اُسے دیکھ رہی تھی، اُس سے تو پتھر بھی پگھل جاتا۔ لیکن مُسکان کی قسمت میں شاید یک طرفہ محبت
لکھا تھا تبھی تو ولی نے ایک بار بھی نظر اُٹھا کر اُسے نہ دیکھا تھا۔
ولی! جو اس کی سانسوں میں دھڑکتا تھا۔ اُس کے بے حد قریب کھڑا اُس کے ہی کام کو پکڑے
اوزار سے ٹھیک کر رہا تھا۔ ولی کے وجود سے اٹھنے والی خوشبو اُس کے اعصاب پر چھا رہی تھی۔
ایک بار...... کیا ایک بار میری طرف نہ دیکھو گے؟ دل نے دہائی دی تھی۔ اگر میری محبت سچی
ایک بار مجھے دیکھے گا۔ اُس کا دل فلمی سچویشن کی طرح شرطیں باندھنے لگا۔
''اگر آپ چاہیں تو میں کچھ وقت آپ کے ساتھ مدد کر دیتا ہوں۔'' ولی نے اُس کے لائف
Monument کے لیے آفر کی۔ وہ اب بھی سر جھکائے Monument کی ڈرائنگ دیکھ رہا تھا۔
''آپ نے پیمائش میں کچھ گڑبڑ کر دی ہے مس مُسکان۔'' ولی نے Monument کو اور
ڈرائنگ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ مُسکان نے ایک گہرا سانس خارج کیا۔
وہ دھیرے سے مسکرا دی۔ وہ اپنے دل کی شرطوں اور باتوں پر سر جھٹک کر رہ گئی تھی۔
''تو کیا مجھے اس کو دوبارہ سے بنانا پڑے گا؟'' مُسکان نے کچھ پریشانی اور غائب دماغی سے
''ارے نہیں...... یہ اچھا ہے۔ فری ہینڈ میں بن کر زیادہ امپریسو ہے لیکن میڈم ملیحہ پیمائش
کاؤنٹ کرتی ہیں۔ یوں کریں اپنے کاغذ پر پیمائش بدل دیں۔'' ولی نے اس کا مسئلہ منٹوں میں حل
تھا۔
''آپ کا بے حد شکریہ! آپ نے اتنے اہم پوائنٹ کی جانب میری توجہ دلائی۔'' مُسکان
بھرے لہجے میں کہا۔
''ارے شکریہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے جو آفر کی ہے وہ برقرار ہے۔ میں آپ
میں مدد کروا دیتا ہوں۔ آج میں بھی ہر اسائنمنٹ جمع کروانے کے بعد فارغ ہوں آپ کی
ہو جائے گی اتنے میں میری ڈائی بھی تیار ہو جائے گی۔'' ولی کا دوستانہ لہجہ، اس کی مدد کی آفر!
ایک خوش فہمی میں مبتلا کر رہی تھی۔ ہر وقت ریزرو سا رہنے والا ولی آج کتنا مہربان تھا۔ آج پہلی
اُس سے بات کر رہا تھا۔
تو کیا......! کیا اُس کی خاموش محبت کی تپش نے پتھر کو پگھلا دیا ہے؟ کیا اس کی پرزور دعا

اں کا رُخ موڑ دیا ہے؟ کیا واقعی ایسا ہونے جا رہا ہے؟
ہا سوچتے ہی اُس کے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہو گئی۔ کیا واقعی۔ میری دعاؤں کو قبولیت ملنے والی

ال اُسے خوش فہمی کی دنیا کی جانب کھینچ رہا تھا۔ خوش رنگ دنیا کی جانب!

مرے فکر و عمل کا سلسلہ
اب رُک نہیں سکتا
میں راہِ حق میں کٹ سکتا ہوں
لیکن جھک نہیں سکتا
حسین ابن علی کے راستے کا
اک مسافر ہوں
میں نیزے پر تو سج سکتا ہوں
لیکن بِک نہیں سکتا
مُرا جذب دروں
میرا محافظ بھی ہے رہبر بھی
میں گردِ راہ بن سکتا ہوں
لیکن تھک نہیں سکتا

"لالہ! آپ آخر اتنے دن کدھر تھے؟ نہ کوئی فون نہ کوئی خبر۔ کوئی ایسے کرتے ہیں۔" سا[رہ] سے لپٹی پوچھ رہی تھی۔

طارق کی شیو بڑھی ہوئی تھی، رنگت بھی سنولا گئی تھی وہ پہلے سے خاصا کمزور لگ رہا تھا۔

"میری گڑیا کیسی ہے؟" طارق نے ہاتھ میں پکڑا سفری بیگ ملازم کو تھماتے ہوئے پوچھا۔

"آپ میرا سوال حسب معمول پی رہے ہیں۔" سائرہ نے منہ پھلایا "ارے! یہاں [تو] خراب ہے، لو طارق میاں! تمہاری تو خیر نہیں۔" طارق نے گہری سانس لیتے صوفے سے ٹیک

"ہاہ! ایسٹ اور ویسٹ...... ہوم از بیسٹ!" طارق نے باقاعدہ ٹانگیں پھنسا دی تھیں۔

"لالہ! آخر کہاں تھے آپ؟" سائرہ سے برداشت نہ ہو رہا تھا اتنے دن طارق کی غیر حا[ضری] بے حد ڈسٹرب تھی۔

"یار دوستوں کے ساتھ شمالی علاقہ جات کی سیر کا پروگرام بن گیا تھا۔ بس مزے کر کے آ[یا ہوں] میں آنی کو بتا کر گیا تھا کہ میرا رابطہ ہونا مشکل ہوگا، اس لیے فکر نہ کیجیے گا۔" طارق نے ہلکے [پھلکے انداز] میں جواب دیا تا کہ سائرہ یقین کر لے۔

جبکہ اصل حقیقت یہ تھی کہ وہ تو ٹریننگ پر گیا ہوا تھا۔ پندرہ روز کا ریفریشر کورس ساری ٹیم کرنے گئی تھی، کسی بھی خطرناک مشن سے پہلے ان کی ٹریننگ اور فٹنس کا امتحان ہوتا تھا۔

اتنی کڑی مشقت کی وجہ سے اس کا رنگ سنولا گیا تھا لیکن وہ اس مشقت سے تھکا ہرگز نہ تھا بلکہ اس کا پُرجوش چہرہ اس کے چہرے کے نقوش کو مزید مقدس بنا رہا تھا۔

"ویری فنی! آپ نے اگر کہا کہ فکر نہ کرنا تو ہم فکر کرنا بند کر دیں گے۔" سائرہ نے باقاعدہ اُسے گھیرا۔

"یار اتنے لمبے سفر سے آیا ہوں ابھی معاف کر دو۔" طارق نے بے چارگی دکھائی۔

"ایک شرط پر۔" سائرہ نے فوراً موقعے کا فائدہ اُٹھایا۔

"آپ میری سالگرہ فارم ہاؤس میں منائیں گے، وہاں ہم سب کی پکنک بھی ہو جائے گی اور آپ سارا وقت ہمارے ساتھ بھی رہیں گے۔ بولیں منظور؟"

"اوں...... یار کہاں پھنس گیا ہوں! ایک بات بتاؤ کیا ساری لڑکیاں اتنی ہی خود غرض ہوتی ہیں۔" طارق نے شرارت سے پوچھا۔

"لالہ......!" سائرہ نے ایک دم موڈ خراب کر لیا۔

"ارے یار پلیز...... اب تم سن ساٹھ کی فلموں کی ہیروئنز کی طرح آنسو نہ بہانے بیٹھ جانا، جیسا تم کہو گی میں تیار ہوں، اپنے وقت کی قربانی دینے پر۔ آخر ایک مجبور بھائی جو ہوا!" طارق نے مصنوعی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"بڑے خراب ہیں آپ......" سائرہ نے اپنی مسکراہٹ روکتے ہوئے کہا۔

"جیسا بھی ہوں بس تیرا ہی عکس ہوں!" طارق گنگنایا۔

"کیا بات ہے لالہ! وہاں کوئی پہاڑی حسینہ تو نہیں ٹکرا گئی تھی؟" سائرہ نے قریب ہوتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ زیادہ تیز نہیں ہوتی جا رہی ہو۔" طارق نے اس کی چھوٹی سی پونی کھینچی۔

[...]پی بات تھی۔ سائرہ کی بات پر نگینہ کا معصوم سا چہرہ چھم سے اس کے سامنے لہرا تھا۔ اس کے چہرے پر [...] جاندار مسکراہٹ تھی۔

"ہائے اللہ لالہ...... چھوڑیں!" سائرہ چلائی۔

"پہلے کہو کہ آئندہ سے میں ہمیشہ اپنے لالہ سے حدِ ادب میں رہوں گی۔" طارق نے بھی شرط باندھی۔

"اچھا پہلے چھوڑیں۔" سائرہ نے بال چھڑاتے ہوئے کہا۔

"لو......" طارق نے ہاتھ ہٹا لیا۔

"لالہ......" سائرہ نے شرارت سے کہا۔

"فرمائیں جی!" طارق بولا۔

"میں اس بارے میں سوچوں گی۔" سائرہ ہنستی ہوئی دور صوفے پر جا بیٹھی۔

"بے ایمان۔" طارق بڑبڑایا۔

"لالہ میں مُسکان کو وہاں ساتھ لے کر چلوں گی بلکہ میری برتھ ڈے کے سارے مہمان وہیں تو آ ئیں

گے۔'' سائرہ نے کہا۔

''یوں کرتے ہیں کہ بس اپنے کچھ فیملی فرینڈز کو مدعو کر لیتے ہیں اس طرح رات ٹھہرنے کا انتظام کروادیتا ہوں۔'' طارق نے سوچتے ہوئے کہا۔

''چلیں یہ بھی ٹھیک ہے لیکن میری برتھ ڈے پر ہلّہ گلّہ ضرور ہونا چاہیے، مجھے سیریس اور سوئے ہوئے فنکشن زہر لگتے ہیں۔'' سائرہ نے مطالبہ کیا۔

''ٹھیک ہے تم بھی کیا یاد کروگی۔ میں وَلی کو مناتا ہوں۔ کیا غضب کا وائلن اور گٹار بجاتا ہے، آوا میں تو اسی کی جادو ہے۔'' طارق نے پلان بتایا۔

''ہم رات کو بون فائر بھی کریں گے۔'' سائرہ نے پُرجوش ہوتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے جو مرضی کر لینا۔'' طارق نے اسے اجازت دی۔

''میں ابھی مسکان کو بتاتی ہوں۔'' سائرہ اچھلتی ہوئی فون کی طرف لپکی۔

لو.... اب اس نے دو گھنٹے سے پہلے فون نہیں چھوڑنا۔'' چل یار طارق پہلے آنی سے مل لے اور تو بھی دو گھنٹے کی نیند لے لے۔

لیکن ایک بہت بڑا مسئلہ تھا کہ مسکان کو آپا اماں کیسے اجازت دیں گی۔

''تم یہ بات مجھ پر چھوڑ دو میں اور آنی آئیں گے تمہاری طرف، تمہاری آپا اماں سے بات کرنے۔'' سائرہ نے مسکان کو تسلی دی۔

''ویسے تو تمہارے لیے صرف میرا ہونا ہی کافی ہونا چاہیے تھا لیکن میری سالگرہ کی کمنگ اٹریکشن ہے کہ وَلی بھائی وِد فیملی آئیں گے۔'' سائرہ نے چٹخارے لے کر کہا۔

مسکان کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگنے لگیں۔ دِل کی دھڑکن حسبِ معمول اس دشمنِ جاں کے نام سرپٹ بھاگنے لگی، فون پکڑے رکھنا مشکل ہونے لگا۔

''سائرہ ہم کچھ دیر میں بات کرتے ہیں۔ آپا اماں مجھے بلا رہی ہیں ان کا پیغام آیا ہے۔'' مسکان نے خود پر قابو نہ پاتے دیکھ کر بہانہ بنایا۔

''اوکے! میں فون رکھتی ہوں، شام میں ہم تمہاری طرف آئیں گے۔'' سائرہ نے فون رکھتے ہوئے کہا۔

مسکان اپنے بیڈ پر گرنے کے انداز میں آلیٹی، گزشتہ ملاقات اس کے اندر خوابوں کے پودوں کو سرسبز کر رہی تھی۔ مسکان کے چہرے پر بہت مدھر مُسکان تھی۔

اُس شام رات تک وَلی اس کے ساتھ رہا اس کے کام میں ہاتھ بٹاتے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے ہوئے اس کے بے حد قریب بیٹھا تھا۔

بے شک وہ اپنے کام میں بے حد ماہر تھا۔ جو کام مسکان کو دو دن سے پہلے ختم ہوتا دکھائی نہ دے رہا تھا وہ وَلی کی مدد سے چند گھنٹوں میں تکمیل کے مراحل میں آ گیا تھا۔

مسکان کے Soviniour کے فائنل ٹچ رہ گئے تھے۔ اس نے ذرا سختی سے کٹر پر اوزار مارا تو اس کا اپنا ہاتھ زخمی ہوگیا۔

''کیا کرتی ہو یار!'' وَلی کا بے تکلفی سے ادا کیا جانے والا جملہ خوش گمانیوں کے دروازے کھول رہا تھا۔ اس نے جیب سے اپنا رومال نکالا اور کہا اس پر یہ باندھ لیں۔

''یہ میں اس لیے دے رہا ہوں کیوں کہ لڑکیوں کے پرس میں رومال کے بجائے ہمیشہ ٹشو پیپر نکلتے ہیں۔'' وَلی نے وضاحت کی۔

مسکان نے اسے چونک کر دیکھا۔ واقعی اس کا خیال بالکل درست تھا۔ مسکان نے آج تک پرس میں رومال نہ رکھا تھا۔

''کیا یہ بات صرف میرے لیے ہے؟ کوئی پھول اس کے اندر کھلا۔'' یہ چند گھنٹے مسکان کی زندگی کے قیمتی ترین لمحات تھے۔

وہ دن میں جانے کتنی بار اس رومال کو نکال کر دیکھتی تھی، اس نے رومال کو دھویا نہیں تھا۔ اس میں سے اس دشمنِ جاں کی مہک آتی تھی۔

وہ ان خوابوں کے پیچھے اندھا دھند بھاگنے لگی تھی۔

محبت انسان کو اس قدر بدل دیتی ہے۔ یہ اسے دیکھ کر جانا جاسکتا تھا۔ جب وہ بابا کے پاس حویلی میں تھی تو بے حد ضدی، انا پرست اور من مانی کرنے والی لڑکی تھی لیکن وَلی سے ملنے کے بعد اُس نے اپنی ذات کے یہ مشکل ترین قلعے ہار دیے تھے۔

وہ محبت سے عشق کی جانب بڑھ رہی تھی، جس کی سرحد پر سب سے پہلے اپنی خودی کی ذات فنا ہوتی ہے۔

مسکان ایسے میں جب سامنے دیکھتی تھی تو اُسے کبھی آئینے میں اپنا عکس نظر نہ آیا تھا بلکہ ہر جانب اس کے محبوب کا عکس ہوتا تھا۔

میں پیار تو کرتا ہوں
اظہار نہیں کرتا
اظہار سے ڈرتا ہوں
انکار سے ڈرتا ہوں
میں خواب نہیں تکتا
تعبیر سے ڈرتا ہوں
میں اپنے پیروں کی
زنجیر سے ڈرتا ہوں
مٹی میں ملا جوگی
توقیر سے ڈرتا ہوں
سائے کی طلب ہے اور
دیوار سے ڈرتا ہوں
اظہار نہیں کرتا

انکار سے ڈرتا ہوں!

وہ دَلی کو چاہنے لگی تھی اس کی خبر اُسے خود دیر سے ہوئی، جب اس نے اپنے اندر اپنے آپ کے بجائے کسی اور کو رہتے بستے دیکھا تو حیران رہ گئی۔ وہ اور اس کا پس منظر محبت جیسے جذبے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

محبت تو آزاد لوگ کرتے ہیں۔ روایات میں جکڑے لوگ محبت کریں گے تو خودکشی ہی کریں گے۔

اور وہ تو دو دو سُولیوں پر چڑھی ہوئی تھی۔ روایات کی سُولی اور دَلی کی بے خبری، بے نیازی کی سُولی ا ہر پل دَم اٹکا رہتا تھا۔

اور وہ جو محبوب تھا جانے کیوں ہر پَل اُسے اپنے سے دور کھڑا نظر آتا تھا اور جب کبھی وہ اس کی قربت کا سوچتی تو یوں ہی اس کا دِل بے قابو ہوکر سرپٹ بھاگا کرتا تھا۔

دَلی کا سامنا کرتے اس پر گھبراہٹ طاری ہوجاتی تھی اور جب وہ نظر نہ آتا تو اس کی سانس رکنے لگتی۔

یا اللہ!

یہ کیا احساس ہے؟

کیا محبت ایسی ہوتی ہے۔

ہر وقت اندر آگ لگائے رکھتی ہے؟

سارے منظر غائب ہوجاتے ہیں اور بس وہ اور وہی دکھائی دیتا ہے!

یا اللہ! آخر کب تک میں اس سُلگن کو اکیلے سہوں گی!

اے اللہ! تو اس کے مَن کے دروازے کھول دے!

اے اللہ! وہ جو اس جذبے سے بے نیاز ہے اس کے مَن میں بھی یہ جذبہ اُتار دے۔ اللہ اب یہ بے قراری سہی نہیں جاتی!

اللہ! تو وَلی کے مَن میں محبت جگادے، اس کے دِل کو اس درد سے روشناس کرادے۔ پلیز اللہ میاں، وَلی کو محبت ہوجائے۔

مسکان نے اس قدر جذب سے دعا مانگی کہ اس کی دعا قبولیت کی حد پر کھڑی ہوکر مسکرانے لگی۔

یہ انسان کیسا پاگل ہے کہ کامل دعا بھی نہیں کرتا اور پھر دوش قبول کرنے والے کو دیتا ہے۔

مسکان نے وَلی کو محبت ہوجانے کی دعا کی تھی۔ لیکن یہ دعا نہ کی تھی کہ یہ محبت وَلی کو مسکان سے ہی ہو۔

❖❖○❖❖

دیتے آئے ہیں میرے درد کی قیمت مجھ کو
اتنے ہمدرد ہیں کیوں لوگ نہ جانے میرے

ٹھیک ہے ملک صاحب! اب آپ ہمارے پرانے قدر دان ہیں۔ آپ کی کہی کیوں ہم موڑیں گے۔ اجی آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ اوکے بائے۔" چاندنی میڈم نے موبائل آف کرکے لڑکیوں کی جانب

"تم چاروں کی ڈیمانڈ آئی ہے...... ملک صاحب کے کچھ غیر ملکی اور پڑھے لکھے دوست پارٹی میں ہیں ان کو کمپنی دینے کے لیے نفیس اور پڑھی لکھی لڑکیاں چاہیں۔ دیسی لڑکیاں نہ ہوں وہ کم بخت ایسے کہہ رہا تھا، جیسے خود تو امریکا میں پیدا ہوا ہو۔" چاندنی میڈم نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"ترنم، ماہی، سلونی، پری اور انیتا.... تم لوگ پرسوں رات کی پارٹی کے لیے تیار رہنا۔ مائیکل اور ملن تم لوگوں کے ساتھ جائیں گے۔ پہلے پے منٹ لینی ہے اور پھر لڑکیاں ڈراپ کرنی ہیں۔ کم بخت ہاڑی کرنے والے لوگ عورت کو بھی جانور جانتے ہیں۔ پچھلی بار میں نے بڑا نقصان اُٹھایا تھا۔ اور فاخرہ ڈانس کے لیے گئی تھیں اور پے منٹ بھی اسی کی ہوئی تھی۔

لین بعد میں وہ لڑکیوں سے غیر اخلاقی حرکتوں پر اتر آئے، ریشم تو پولیس میں رپورٹ لکھوانے پہنچ ل، آگے سے وہ پولیس والا بولا کہ تمہارا کیا گیا؟ تم تو دھندہ ہی یہ کرتی ہو پھر کس بات کی رپورٹ! اگر کال گرل کو اس کی مرضی کے بغیر لے جایا جائے گا تو کیا اس کی عزت نہیں لٹتی؟" چاندنی میڈم اپنے لہجے میں بے حد درد سمو کر کہا، جیسے وہ ان سب لڑکیوں کی بے حد ہمدرد ہو۔ ترنم کو دِل ہی دِل ہی آرہی تھی۔

"اگر یہ ہی بھیڑیے پیسے دے کر لڑکی کی بوٹی بوٹی نوچ لیں تو وہ جائز ہے۔"

"ہونہہ! پیسے کی بندریا! جہاں سکہ گرا، وہیں ڈگڈگی پر ناچے گی!"

"آپا یہ وینیو (Venue) اتنی دور ہے اور سفر بھی بائے روڈ! ہائے میں تو تھک جاؤں گی۔" پری نے الت سے کہا۔

پری بمشکل اٹھارہ سال کی تھی لیکن اس کی ادائیں اتنی قاتل تھیں اوپر سے کم عمر بھولا سا سوہنا سا ..... کہ اس کی دنوں میں ڈیمانڈ بڑھ گئی تھی۔

پری اسی ماحول کی پروردہ تھی اس کی ماں فلموں میں ایکسٹرا کا کام کرتی تھی، معمولی شکل صورت رکھنے الی ماں کی بیٹی کا رنگ روپ بڑا سنہرا تھا۔ ماں نے اس کی اُٹھان دیکھتے ہی چاندنی میڈم کے ہاں اُسے لی کروادیا۔ اب اس کے اندھیرے دنوں کو اس کی بیٹی کے سنہرے روپ نے سُونا کردیا تھا۔

پھر اس کی ماں کا برسوں کا خواب کہ وہ ہیروئن بنتی! لیکن ساری عمر پروڈیوسروں کے ہاتھ کھلونا بن کر ی اُسے کبھی سائیڈ ہیروئن کا رول نہ ملا۔ ایسے میں اس نے تھک ہار کر ایک میک اپ مین سے شادی لی۔ پری کے پیدا ہوتے ہی شکیلہ کو آس لگ گئی کہ اب دن پھر جائیں گے۔ پری تین سال کی تھی شوہر جو نشہ کرتا تھا، کسی سے نشے میں لڑ پڑا اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

ایسے میں شکیلہ نے لو (LOW) درجے کی کال گرل کی زندگی گزاری تھی۔ اب پری سے میڈم ندنی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے سپر اسٹار بنا کر دم لیں گی۔ اب جیسا میڈم کہتی تھیں وہ ان کے اشاروں لتی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے اپنی اہمیت کا بھی احساس تھا اس لیے اس کے نخرے بھی زیادہ ۔ ماہی آپا کی سب سے لاڈلی لڑکی تھی لیکن پری کے آجانے پر ماہی کو اکثر اپنی اہمیت میں کمی کا ماس ہوتا تھا۔ اس لیے پری اور ماہی کی اکثر دُھواں دھار لڑائیاں ہوتی تھیں۔

"اوہ مائی گاڈ! یہ سرفراز میں کس قدر جہالت ہے۔" عبداللہ نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

"تم میرے پیچھے آؤ، میں وہاں پہنچتا ہوں۔" سیّد عبداللہ نے ایڑ لگا کر گھوڑا آگے بڑھایا۔

"منشی! روکو اس سارے تماشے کو۔" سیّد عبداللہ کی آواز پر ایک دم حویلی کے بندوں کے ہاتھ رک گئے۔

"سائیں عبداللہ!"

"سائیں عبداللہ آ گیا ہے اب دیکھنا سب ٹھیک ہو جائے گا۔" مجمع میں سرگوشیاں ہوئیں۔

"لیکن سائیں! یہ چھوٹے سائیں کا حکم ہے۔" منشی نے گھبراتے ہوئے اپنی مجبوری بتائی۔

"یہ کون سا طریقہ ہے وصولی کرنے کا۔" عبداللہ نے نیچے اُترتے ہوئے کہا۔

"اس بیچارے کو کیا جان سے مارنا تھا؟" سیّد عبداللہ نے لہولہان میرو کو سہارا دے کر بٹھایا۔

"کوئی پانی لاؤ اس غریب کے لیے!" عبداللہ نے آواز دی، دینو کی بیوی کٹورے میں پانی بھر لائی۔

"اللہ تجھے ہمیشہ خوش رکھے۔ آج تو نے اس مائی کے بیٹے کو بچا کر بڑا احسان کیا ہے رب سائیں تجھے لمبی حیاتی دے۔" میرو کی ماں نے برستی آنکھوں کے ساتھ اسے دعا دی۔

"دیکھو کتنا اچھا ہے، بھلا اپنے مزارعوں کو بھی کوئی یوں اپنے ہاتھوں سے اُٹھاتا ہے۔" ہر جانب اس کے لیے توصیف تھی۔

"سائیں! اب میں چھوٹے سائیں کو کیا جواب دوں گا؟" منشی سیّد سرفراز سے بہت ڈرتا تھا۔

"اس سے کہہ دینا کہ میں نے منع کیا تھا اور اگر پیسے کی اتنی ضرورت ہے تو تم ابھی میرے ساتھ چلو بیس ہزار میں دے دیتا ہوں۔"

"سائیں! پچیس کا میرا اناج ٹھیکیدار خرید رہا ہے تم دس ہزار ہم سے کل لے لو، باقی دس ہزار میں بعد دے دوں گا۔" دینو نے آگے بڑھ کر فٹافٹ کہا۔

"اور اُوپر کا پیسہ پندرہ ہزار تمہارا باپ دے گا۔ سائیں کو دیکھ کر زیادہ ہوشیاری دکھاتا ہے اصل یہ بتا دیا اُوپر کا نہیں بتایا۔" منشی نے دینو کو لتاڑا۔

"سائیں پچھلے پانچ برس سے دو ہزار مہینہ دے رہا ہوں، گھر کی حالت اتنی خراب ہے کہ نہ پوچھو۔ کچھ بھی پیچھے نہیں بچ رہا، اتنا پیسہ دے کر بھی اصل پیسے کا ایک روپیہ آج تک میں ادا نہیں کر پایا۔" دینو روتے ہوئے کہا۔

"یا میرے اللہ اتنی کرپشن! وہ بھی میرا بھائی کر رہا ہے۔" سیّد عبداللہ کو دِلی دُکھ ہوا۔

"منشی! اس کا سارا پیسہ میں ادا کروں گا، تم سرفراز سے فی الحال کوئی بات نہیں کرو گے ورنہ بات بتنگڑ بنے گا۔" عبداللہ نے منشی کو خاص ہدایت دی۔

"جی سائیں!" منشی کی مری مری آواز نکلی، وہ ملازم تھا اور دو مالکوں کے درمیان اسے اپنا وجود پھنسا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ اگر سیّد سرفراز کو نہ بھی سارے واقعہ کی خبر کرے لیکن یہ بات کسی نہ کسی سے سیّد سرفراز تک تو جانی ہی تھی اور اس کے بعد اس کی اپنی کم بختی آنی تھی۔

سیّد سرفراز اور سیّد عبداللہ باپ کی طرف سے سگے بھائی تھے لیکن ان کی مائیں سوتیلی تھیں۔ سرفراز

ریحانہ بی بی کی اولاد تھا اور اکلوتا تھا۔ عبداللہ سے پانچ سال چھوٹا تھا۔ وہ ریحانہ بی بی کے ہاں سترہ سال بعد پیدا ہوا تھا۔ تھا تو وہ بڑی بی بی کا بیٹا لیکن دیر سے پیدا ہونے کی وجہ سے وہ چھوٹا بیٹا کہلاتا تھا۔

زلیخا بی بی سے سدرہ بی بی، مریم بی بی اور سیّد عبداللہ تھے۔ زلیخا بی بی ست بھرائی تھیں اور اپنے ساتھ اس گاؤں لائی تھیں اس لیے اولاد اور مال کے معاملے میں بے حد خوش قسمت تھیں۔ سیّد عبداللہ، سیّد عبدالوہاب کا وَلی عہد بنا تھا۔ زلیخا بی بی بے حد خوب صورت اور خوب سیرت تھیں۔ یہ وصف ان کی اولادوں میں بھی پایا جاتا تھا۔

زلیخا بی بی کا پلڑا بھاری دیکھ کر ریحانہ بی بی نے ساری عمر زلیخا بی بی سے بیر پالا اور یہ بغض اپنے بیٹے کے دماغ میں بھی ڈالا تھا۔ سیّد سرفراز نہایت اڑیل اور بدتمیز تھا۔ تعلیم میں اس کا دِل نہ لگا، جوں جوں وہ جوان ہوا ماں کی شہ، طاقت اور دولت کا استحقاق دیکھ کر وہ مزید خودسر ہوتا چلا گیا۔ سیّد عبدالوہاب اس کے معاملے میں کم ہی بولا کرتے تھے۔ بہرحال اس نے زمینوں کا کام بے حد اچھے طریقے سے سنبھال رکھا تھا اس لیے اس کے کئی غلط شوق وہ نظرانداز کر دیتے تھے۔

❖❖ O ❖❖

"بھائی صاحب کو میرے کسی کام میں دخل دینے کی ضرورت کیا ہے۔" سرفراز نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔

ذرا اماں کر! دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، میں تو پورا شریکہ لیے بیٹھی ہوں۔"

"کچھ بھی ہو اماں جان! میں کسی کی بھی دخل اندازی اپنے کام میں پسند نہیں کرتا۔" سیّد سرفراز کا غصہ نیچے ہی نہیں آ رہا تھا۔ "دیکھ تو یوں ہر بات میں اس طرح کی اڑی کرے گا تو وہ اپنی زمینوں کا کام تیرے پاس رہنے دے گا کیا؟ ابھی تک وہ اپنی زمینوں سے دور ہے اُس کو دِلچسپی ہی نہیں ہے۔ لیکن اس زمین کا اصل وارث تو وہ ہی ہے ناں! یہ اُس کی ماں کی زمین ہے اس میں تیرا ذکر بھی نہیں ہے لیکن عبداللہ کی عدم دِلچسپی کی وجہ سے زمینوں کے سارے معاملے تیرے ہاتھ میں ہیں، سال بھر کا مال نفع تیرے پاس جمع ہوتا رہا ہے اس کا حساب کبھی کسی نے نہیں لیا تو اگر یوں بات بات پر اُس سے اُلجھے گا تو تیرا ہی نقصان ہے۔" ریحانہ بی بی نے بیٹے کے غصے کو کم کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن اماں جان میں کسی کے زیر رہ کر جی نہیں سکتا۔" سیّد سرفراز نے اُلجھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر پُتر اس کے لیے ذہن لڑا، جو تیرے پاس ذہن ہے وہ عبداللہ کے پاس نہیں۔" ریحانہ بی بی نے خود ہی بیٹے کو غلط راہ دکھائی۔

"کیا یہ سب کچھ میرا ہو سکتا ہے؟" سیّد سرفراز کو ہر وقت عبداللہ کے نام کی لٹکی تلوار سے ڈر لگتا تھا۔

"سیّد عبداللہ کے نام کے دس گاؤں کی زمین پر وہ اپنا حق سمجھتا تھا ہر وقت ان زمینوں کو اپنے نام منتقل کرنے کے منصوبے بناتا رہتا تھا۔ مجھے کسی بھی طرح زمینیں حاصل کرنی ہیں۔ کر تو میں شاید بہت پہلے لیتا۔ بس بابا سائیں کا لحاظ آ جاتا ہے۔ پھر بابا سائیں کا کیا پتا کہ اپنی زمینوں سے مجھے ہی بے دخل کر دیں۔ یہ کام ایسے کرنا ہوگا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔" سیّد سرفراز کا شیطانی دماغ تیزی سے تانے بانے بُن رہا تھا۔

❖❖○❖❖

''اے زبیدہ! تیرا دھیان کدھر ہے؟'' مریم بی بی نے زبیدہ کو ہلا کر پوچھا۔ سیّد سرفراز ابھی ابھی زنان خانے سے ہو کر گیا تھا۔

زبیدہ کے چہرے پر کتنے ہی خوبصورت رنگ آن ٹھہرے تھے۔ سیّد سرفراز کی بولتی نظریں بتاتی تھیں کہ آگ برابر کی لگی ہے۔ وہ ملک احتشام (سپرنٹنڈنٹ) جج کی بیٹی تھی۔ سیّد عبدالوہاب ملک احتشام کے بڑے گہرے دوست تھے۔ ملک احتشام جب جب گاؤں اپنے والدین سے ملنے آتے تو سیّد عبدالوہاب کی حویلی آنا کبھی نہ بھولتے تھے۔ سدرہ بی بی اور مریم بی بی دوسرے گاؤں میں موجود اسکول سے میٹرک کر کے اب گھر بیٹھی تھیں۔ ان کے لیے پردے والی خاص گاڑیوں کا انتظام کیا جاتا تھا۔

ان سے ملنے ان کی سہیلیاں ہمیشہ خود حویلی آتی تھیں۔ یوں زبیدہ کے گھر آنے جانے پر ان پر کوئی پابندی نہ تھی۔

لیکن زبیدہ کا دِل سیّد سرفراز کی وجہ سے حویلی میں زیادہ لگتا تھا۔ تین چار ماہ بعد جب بھی اس کے ابا گاؤں آتے وہ ضرور آیا کرتی تھی۔ آج تک اسے دور ہی دور سے جانتی تھی، اس کی عادت اور شہرت سے بے خبر تھی۔ اور انجانی راہ پر چل نکلی تھی۔

وہ کیا کرتی سیّد سرفراز کو دیکھتے ہی اس کا دِل دھڑکنا بھول جاتا تھا۔

جن بھرپور نظروں سے وہ اُسے دیکھتا تھا۔ وہ نظریں اور ان کی تپش اُسے میلوں دور بیٹھے بھی سلگایا کرتی تھی۔

اے زبیدہ تیرا دھیان کدھر ہے میں کتنی دیر سے تم سے پوچھ رہی ہوں کہ ایف اے میں تو نے مضمون کیا رکھے ہیں۔ مریم بی بی جس کو پڑھنے کا بے حد شوق تھا لیکن خاندانی روایات کے خلاف بابا سائیں نے میٹرک ہی کروا دیا تھا یہ کیا کم تھا۔ اب مزید کی ضد کرنے کی اس میں جرأت نہ تھی لیکن گزشتہ چار سال سے وہ مزید تعلیم کے لیے اپنے دِل کی آرزو کو دبا نہ پائی، اس لیے جب جب زبیدہ شہر سے آتی تھی وہ کرید کرید کر اس کی تعلیمی سرگرمیاں اسکول و کالج کی باتیں پوچھا کرتی تھی۔

میں نے انگلش لٹریچر رکھا ہے ساتھ ایجوکیشن اور فارسی۔ انگلش لٹریچر کے ساتھ میرے اندر مزید مشکل مضمون رکھنے کا حوصلہ نہ تھا۔

''انگلش لٹریچر...... واہ! تمہارے کتنے مزے ہیں۔'' مریم بی بی نے حسرت سے کہا۔

''خاک مزے ہیں۔ یہاں کس کا دِل تھا اتنا روکھا مضمون پڑھنے کو، ابو نے پھنسا دیا مجھے، خود جو اتنی موٹی موٹی کتابیں پڑھتے رہتے ہیں۔'' زبیدہ نے منہ بنا کر کہا۔

اس کا من پڑھائی میں بالکل نہ لگتا تھا اور جہاں لگتا تھا وہاں وہ دوڑ دوڑ کر آیا کرتی تھی۔ لیکن ابھی تک نظروں کے نرم گرم تبادلے کے سوا کوئی بات نہ ہو سکی تھی۔ زبیدہ کا دِل چاہتا تھا کہ سیّد سرفراز کے بابا اس کے کہنے پر جلد از جلد اس کا ہاتھ مانگ لیں۔

''وہ سیدھی سادی لڑکی تھی۔ سیدھے سادے خواب دیکھا کرتی تھی۔ محبت اور پھر شادی...... بچے اور پھر گھر۔''

لیکن سیّد سرفراز کا دماغ تو ہر بات کو نفع نقصان میں تولتا تھا۔ وہ اپنے بابا سائیں کی طرح ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا، جو ساتھ ڈھیروں زمین لائے۔

زبیدہ اُسے بہت پسند تھی۔ اس کے دِل میں اُسے دیکھ کر کھد بد ہونے لگتی تھی۔ مکھن ملائی جیسی زبیدہ کے پاس حُسن تو تھا لیکن اتنی ڈھیروں زمین نہ تھی اس لیے آج تک اس نے زبیدہ کو کبھی اپنے جذبوں سے آگاہ نہ کیا تھا۔

''کیا مصیبت ہے لڑکی اتنی سوہنی ہے کہ دِل و دماغ سے اُترتی ہی نہیں۔'' وہ اسے دیکھ کر خود کو جھڑکتا اور الٹا جاتا۔

''کاش اس کے پاس ڈھیری زمین بھی ہوتی۔''

❖❖○❖❖

''مما پلیز بس کریں۔ کتنی بار ہاتھ دھوئیں گی ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔'' سمعان نے ماں کو ٹوکا وہ لوگ کھانا کھانے باہر جا رہے تھے اتنے دن بعد وہ ماں باپ کے ساتھ اچھا وقت گزارنا چاہتا تھا۔!

مما کے ساتھ اس کا رشتہ اتنا گہرا کبھی نہ ہو سکا تھا۔ اس کے بچپن سے ہی وہ اپنے مسائل میں گھری رہی تھیں۔ سمعان اور اس کی ضرورتوں پر کم ہی اُن کی توجہ جاتی تھی۔ سمعان اُکتا کر باپ کے پاس چلا جاتا۔ یوں آہستہ آہستہ وہ ان کا ہی ہو کر رہ گیا۔

''ارے کدھر ہو تم لوگ مجھے باہر گاڑی میں بٹھا کر سکھا دیا۔'' ڈیڈی جھنجلاتے ہوئے اندر آئے۔ لیکن یہاں کا منظر دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئے۔

سمعان نے بھی بے بسی سے کندھے اُچکائے۔ جبکہ مما ان کے تاثرات سے بے نیاز مسلسل صابن سے ہاتھ دھو رہی تھیں۔ بار بار ہاتھ دھونے سے اُن کے ہاتھوں کی جلد خشک ہونے لگی تھی۔

''زبیدہ یار...... بس کرو! بچہ کب سے کھڑا ہے چلو بند کرو پانی، ہو گئے صاف تمہارے ہاتھ۔'' قاسم علوی صاحب نے آگے بڑھ کر انہیں کندھوں سے تھام کر باہر کی طرف موڑا۔

''لیکن قاسم! دیکھو میرے ہاتھ گندے ہیں مجھے تو لگتا ہے کہ میں ٹھیک سے نہائی نہیں ہوں، میرا جسم بھی گندا ہو رہا ہے۔ تم لوگ ابھی ٹھہرو میں نہا کر آتی ہوں۔'' زبیدہ بیگم واپس جانے کو مڑیں تو سمعان کا دِل بالکل اُتر گیا۔

''اوہ نو...... ناٹ اگین! یعنی کہ آج کا ڈنر کینسل۔'' سمعان بڑبڑایا۔

''ارے...... ارے محترم خاتون! تم فرسٹ کلاس ہو اور بس مزید کچھ کہے بغیر تم ہمارے ساتھ چل رہی ہو۔'' قاسم علوی نے پیار سے زبیدہ بیگم کو اپنے ساتھ باہر کی جانب بڑھایا۔

''لیکن قاسم! میں وہ......'' وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھیں لیکن قاسم صاحب اس وقت اگر ان کی سن لیتے تو سمعان کا موڈ خراب ہو جاتا۔

''اچھا میرا کپڑا تو لے لو۔'' انہوں نے سفید چادر کی طرف ان کی توجہ دِلائی، جسے وہ ہر مقام پر بچھا کر بیٹھتی تھیں۔

''مما! ہوٹل میں کیوں مذاق بنوانا ہے۔'' سمعان نے جل کر کہا۔ زبیدہ بیگم کے چہرے پر سایا لہرایا اور

ان کا چہرہ اُتر کر رہ گیا۔

''سمعان! خبردار جو تم نے آئندہ ایسی بات کی، کیا آج تک مجھے کوئی شرمندگی ہوئی ہے جو اب تمھیں ہونے لگی۔'' قاسم صاحب نے اسے لتاڑا۔

''سوری ڈیڈ! بٹ مجھے کہنے دیں یو آر گریٹ مین۔'' سمعان نے ان کے گلے لگ کر سرگوشی میں کہا۔

''بدمعاش!'' وہ ہنسے۔

❖❖○❖❖

جب بھی رات کو گھر آتا ہوں
اپنے دروازے پہ دستک دیتے لمحے
اکثر میری سوچ یہ مجھ سے کہتی ہے
آج تُو دروازہ کھولے گی
مجھ کو دیکھ کر مُسکائے گی
میرا ماتھا چومے گی
شرمائے گی
گھر میں داخل ہو کر میں بھی کوئی شرارت کردوں گا
تُو خود میں سمٹ کر رہ جائے گی
میں بھی کتنا پاگل ہوں ناں
کیا کیا سوچا کرتا ہوں
میں بھی کتنا پاگل ہوں ناں......!!

''لالہ! کس خیال میں گم ہیں؟'' سائرہ نے گیراج کی لائٹ آن کر کے پوچھا۔

دس پندرہ منٹ پہلے طارق کی گاڑی اندر آئی تھی لیکن جب طارق اندر نہ آیا تو سائرہ کو فکر ستائی۔ طارق گاڑی سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیے جانے کس خیال پر مسکرا رہا تھا۔ سائرہ نے اُسے مخاطب کر کے چونکا دیا۔ مگر وہ ابھی تک اس پری رو کے خیال میں تھا آنکھیں کھول کر بھی وہ فوری طور پر حال میں واپس نہ آسکا۔ سائرہ نے طارق کی خالی نگاہیں دیکھیں۔ وہ دیکھ تو اُسے رہا تھا لیکن اس کا دماغ ابھی تک کہیں اور تھا۔

''لالہ! کیا نیند میں ہیں۔'' سائرہ مسکراتی ہوئی پاس آ کھڑی ہوئی۔

''جاگتے میں خواب دیکھنے لگے ہو۔ طارق میاں تمہارا کیس تو روز بہ روز سیریس ہوتا جارہا ہے۔'' طارق نے خود کو سرزنش کی اور سائرہ کی جانب دیکھ کر مسکرایا۔

''تم نے نگی اور آنٹی کو اپنی جانب سے فورس کر کے بلانا تھا؟'' طارق نے سائرہ سے پوچھا تو وہ بے اختیار ہنس پڑی۔

''میں آپ کی بہن ہوں بھائی کے دِل میں کیا پک رہا ہے مجھے نہ خوشبو آئے گی۔'' وہ سوچ کر گئی۔

''میں نے نگی کو انوائیٹ تو کیا۔ لیکن!'' سائرہ کہہ کر چپ ہوگئی۔

''لیکن کیا؟ وَلی تو ضرور آئے گا، نگی کو ساتھ آنے میں کیا پرابلم ہوگا۔'' طارق کی بے خودی اس کا راز فاش کرنے لگی۔

''روشن آنٹی نہیں آپائیں گی اس لیے وہ کچھ گھبرا رہی تھی۔'' سائرہ نے تجسس پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب وہ نہیں آئے گی؟'' طارق کا لہجہ بلکہ اس کا روشن چہرہ بجھ گیا۔

''نہیں میں نے ایسا تو نہیں کہا۔'' سائرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''روشن آنٹی نے میرے اصرار پر اسے آنے کے لیے آمادہ کرلیا ہے۔'' سائرہ نے طارق کے کندھے سے لگ کر کہا۔ طارق کا چہرہ روشن ہوگیا۔ تیز ہوا سے طارق کے سلکی بال اڑ رہے تھے۔ سائرہ کا دوپٹہ پھڑ پھڑا رہا تھا۔

''لالہ......'' سائرہ نے طارق کے کندھے پر سر رکھ کر کہا۔ اونچے لمبے طارق کے کندھوں تک وہ بمشکل آتی تھی۔ اسے اپنا بانکا سجیلا اور محبت سے بھرا بھائی، جان سے پیارا تھا۔

''ہوں...... بولو۔'' طارق سکون سے کھڑا تھا، جیسے وہ ابھی یہاں سے جانا نہ چاہتا ہو۔ تیز ہوا رات کی رانی کی خوشبو کو لیے اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ ماحول بے حد معطر تھا۔

''لالہ آپ نگینہ سے محبت کرتے ہیں ناں۔'' سائرہ نے دھماکہ کیا طارق نے چونک کر اسے دیکھا۔

''یہ کیسا سوال ہے؟''

''ارے لالہ...... میں آپ کی اکلوتی بہن ہوں کیا مجھ سے بھی پردہ ہے۔'' سائرہ نے خفگی سے پوچھا۔

''لیکن تم نے یہ بات کیا دیکھ کر پوچھی؟'' طارق بے حد الرٹ ہوگیا تھا۔ وہ راز جو برسوں سے وہ دِل میں چھپائے بیٹھا تھا، آج کیسے منظر عام پر آ گیا؟

''لالہ! اتنا سنجیدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ میرے لالہ کی آنکھیں صرف ایک ہی فرد کے نام پر جگمگاتی اور روشن ہوتی ہیں بلکہ ان کے آگے ایک سو ساٹھ پاور بلب کی روشنی کم پڑ جاتی ہے اور وہ ہے نگینہ!'' سائرہ نے اس کا راز افشا کرتے ہوئے کہا۔

''تم بہت تیز ہوگئی ہو۔'' طارق نے اس کی چھوٹی سی پونی زور سے کھینچی۔

''اوں ہوں۔ اس طرح آپ میری بات کو پلٹیں نہیں۔'' سائرہ نے کہا۔

''کون سی بات۔'' طارق نے مکرتے ہوئے پوچھا۔

''لالہ......!'' سائرہ نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا۔

''ہاں سائرہ!'' طارق نے مسکراتے ہوئے پوچھا وہ اب خود کو سنبھال چکا تھا۔

''لالہ......!''

''کیا سائرہ؟'' طارق اُسے کنفیوژ کر رہا تھا۔

''لالہ آپ ٹھیک سے بتاؤ نگینہ آپ کو کیسی لگتی ہے۔'' سائرہ نے زچ ہو کر پوچھا۔

''اگر میں غلط سے بتاؤں تو تم کیا کرو گی۔'' طارق اب اُسے تنگ کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے میں خود ہی پتا کرلوں گی، نہ بتاؤ۔'' سائرہ دھب دھب پاؤں مارتی اندر چلی گئی۔

طارق کا قہقہہ بے ساختہ تھا!

سائرہ پلٹ کر مسکرائی۔

"لالہ! آپ مانو یا نہ مانو! لیکن آپ کی آنکھوں کی روشنی اور مسکراہٹ نگینہ ہی ہے۔" سائرہ یقین سے بولی اور ہنستے ہوئے اندر چلی گئی۔

"دِل کے محرم کا بھرم بڑا ہی خاص اور اہم ہوتا ہے، ایسے کیسے اس کا نام سرِعام کردیں۔ جب تک میں اُسے قانونی طور پر حاصل نہ کرلوں اسے کیسے اپنے نام کے ساتھ موضوع بنا سکتا ہوں! مجھے وہ اور اس کی عزت بے حد عزیز ہے، انشاء اللہ اسے عزت کے ساتھ اس گھر میں لاؤں گا۔" طارق جاگتی آنکھوں سے جو خواب دیکھتا ہے وہ ضرور پورا ہوگا۔ اس کے دِل کا یقین اس کی آنکھوں میں جھلک رہا تھا۔

❖❖○❖❖

"روشن... ہماری بیٹی تو ماشاء اللہ بڑی ہوگئی ہے۔" احمد شاہ نے محبت سے نگینہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹیاں جلدی بڑی ہوجاتی ہیں شاہ جی۔" روشن آرا نے نگینہ پر آیت الکرسی پڑھ کر پھونکتے ہوئے کہا۔

نگینہ مُسکان کی برتھ ڈے پارٹی میں جانے کے لیے تیار تھی۔ سی گرین کلر کی لانگ اسکرٹ اور کالر والی کریم کلر کی شرٹ کے ساتھ اُسی کلر کے امتزاج والا بڑا سا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ پیروں تک یہ لانگ اسکرٹ لہنگے جیسا لگ دیتا تھا۔ اسکرٹ پر جھلمل کرتے بڑے بڑے ستارے لگے ہوئے تھے۔ ساتھ ہم رنگ ہلکی سی جیولری اور چوڑیاں پہن رکھی تھیں البتہ چہرہ کسی بھی قسم کے میک اپ سے پاک تھا۔ اللہ نے اسے حسن کے ساتھ جو معصومیت دے رکھی تھی، وہ اس کے حُسن کو سب سے الگ بناتی تھی۔

"اماں جان! اجازت ہے؟" عبدالولی نے آگے جھک کر پیار لیتے ہوئے کہا۔

"خیر سے جاؤ خیر سے آؤ تمہارے ہر رستے کی خیر ہو۔" انہوں نے اس کا ماتھا چوم کر دعا دی۔ عبدالولی کے پیروں تک میں ٹھنڈک اُتر گئی۔

احمد شاہ اور روشن آرا وہ مہربان ہستیاں تھیں جن کو کوئی چھو بھی جائے وہ بس پیار بن کر رہ جاتا تھا۔

"عبدالولی تم کس طرف سے جارہے ہو؟" روشن آرا نے پوچھا۔

"اماں جان خیریت! کوئی کام ہے تو بتایے۔" عبدالولی ایک دم الرٹ ہوگیا۔

احمد شاہ نے دِل میں اس کی اس تابعداری پر جی بھر کر اللہ رحمان کا شکر ادا کیا۔ کل کا لگایا پودا چھاؤں دینے لگا تھا۔

"محسن آرا کی طبیعت کچھ اچھی نہیں ہے۔ میں اس کی خیریت پوچھنے جانا چاہتی ہوں۔ تمہارے بابا ابھی کسی میٹنگ کے لیے نکل جائیں گے تم لوگ بھی جارہے ہو، میرا دِل اپنی بہن کو دیکھنے کو کرتا ہے۔" روشن آرا بیگم نے مدھم لہجے میں کہا۔

"ارے بچوں کو جانے دو۔ میں کریم بخش کو تمہارے لیے چھوڑ جاتا ہوں۔" احمد شاہ نے فوراً ڈرائیور پیش کیا۔

"شاہ جی آج ہی تو آپ کا دور کا چشمہ بننے گیا ہے، کل صبح دس بجے ملے گا۔ آپ تو پلیز ڈرائیو کرنے کا رسک نہ لیجیے گا۔" روشن آرا بیگم نے ان کی فکر کرتے ہوئے کہا۔

"یہ صابر میاں کو بھی اسی ہفتے چھٹی پر جانا تھا۔" احمد شاہ نے دوسرے ڈرائیور کا نام لیا۔

"میں ہوں ناں۔" وَلی بولا۔

"ارے بابا جانی ڈونٹ وری...... اس خوبصورت ماہ جبیں کا ڈرائیور بننا کون کافر پسند نہیں کرے گا۔" ولی نے شرارت سے کہا۔

"بہت شریر ہوگئے ہو ماں سے مذاق کرتے ہو۔" روشن آرا نے وَلی کے پیار سے دھپ لگائی۔

"اماں جان اُٹھیں ناں آپ ہمارے ساتھ جائیں گی۔" نگینہ نے بھی ان کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"ٹھیک ہے بیگم صاحبہ! ہم آپ کو پک کرنے خود آئیں گے، بس آپ ایک فون کردیجیے گا۔" احمد شاہ نے محبت سے کہا۔

"روشن آرا کی خوشی اور تشکر سے آنکھیں بھر آئیں۔ اللہ نے کس قدر پیار کرنے والی اولاد اور خیال کرنے والے شوہر سے ان کو نوازا تھا۔ چلو ٹھیک ہے میں اندر سے چادر اور پرس لے آؤں۔" روشن آرا اندر جانے کو بڑھیں۔

"اماں جان۔" وَلی نے پکارا!

"ہوں!" روشن آرا جاتے جاتے متوجہ ہوئیں۔

"آپ نے بابا جانی سے اجازت لے لی تھی اس بات کی؟" وَلی نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"پگلا ہے تو بھی۔ اگر وہ تمہارے شوق کے لیے گٹار، بانسری، وائلن، پیانو جیسی چیزیں اکٹھی کرسکتے ہیں تو وہ تمہیں ان کو بجانے سے کیوں روکیں گے؟" روشن آرا نے پوچھا۔

"لیکن انہوں نے یوں یاروں دوستوں میں بجانے کی اجازت نہیں دی اور میں ان کی اجازت کے بغیر چانس لینا بھی پسند نہیں کروں گا۔" وَلی نے سنجیدگی سے کہا۔

اندر سے احمد شاہ اپنا موبائل اور بریف کیس لے کر برآمد ہوئے۔ وَلی اور روشن آرا نہیں جانتے تھے کہ احمد شاہ ان کی گفتگو سن چکے ہیں۔ وَلی نے آنکھوں سے ماں کو باپ سے بات کرنے کو کہا۔

"سنیے! وَلی کے دوست اس سے گٹار وغیرہ سننے کی فرمائش کررہے ہیں۔" روشن آرا نے جلدی جلدی باہر کی جانب جاتے احمد شاہ کو پکارا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو۔" روشن آرا کہہ کر چپ ہوگئیں۔ احمد شاہ بے حد سنجیدہ تھے وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے وَلی کے پاس آئے۔

"تم کو میوزک اچھا لگتا ہے تم اکثر بہت گم ہوکر وائلن اور گٹار بجاتے ہو۔ تمہارے اندر اس روپ کو میں نے تب دیکھا تھا، جب تم بمشکل گیارہ سال کے تھے۔ لندن میں ایک پارٹی میں تم پہلے اس پارٹی میں موجود شخص کو غور سے پیانو بجاتے دیکھتے رہے اور جب وہ بجاچکا تو تم جانے کس سحر میں تھے اس کے جانے کے بعد وہاں بیٹھ گئے اور ہو بہو تم نے اس کی بجائی دھن بجائی تھی۔ وہاں موجود ہر فرد حیران تھا تو میں پریشان! تم اپنے اسکول میں میوزک کلاس لیتے تھے وہاں کے اسکول میں میوزک بچوں کے لیے ضروری ہے میں جانتا تھا۔ لیکن تم اتنا پرفیکٹ پیانو بجاؤ گے یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں تمہارے شوق کو دیکھ کر بے حد ڈسٹرب ہوا تھا۔" احمد شاہ دھیرے سے بولے۔ وَلی کے چہرے پر سایا لہرایا

گیا۔ نگینہ نے بھی سہم کر باپ کو دیکھا۔

اس رات میں سو نہ سکا تھا!

مجھے شاک لگا تھا!

میرے والد گدی نشین رہے تھے۔ سارا خاندان اپنے مذہب اور روایات کے لیے جیتا آیا تھا اور یہ میری اولاد کس رخ کی جانب جا رہی ہے؟ یہ سوال مجھے بے حد ڈسٹرب کرنے لگا۔

''تمہارے چہرے پر آیا وجد بھی مجھے بھولتا نہ تھا، میں ان ہی دنوں پاکستان کام سے آیا تھا۔ زمینوں پر لڑائی کی وجہ سے ہمارے کئی مزارعے مارے گئے تھے۔ پولیس تھانے کا چکر تھا میں کسی طور اپنے سے جڑے افراد کو اگنور نہیں کرسکتا تھا فوراً گاؤں گیا۔'' احمد شاہ کچھ لمحے سانس لینے کو رکے کمرے میں موجود تینوں نفوس ہمہ تن گوش تھے۔

گاؤں کے معاملات نپٹا کر میں بہت تھک گیا تھا۔ گھر آیا تو فون پر تم بیتابی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ پیٹرز اینڈ کیتھرائین میں ان دنوں تم پڑھ رہے تھے۔ تم نے بڑے جوش سے بتایا کہ تم میوزک کے مقابلے میں اوّل آئے ہو۔ میں جو پہلے ہی بہت تھکا ہوا تھا ایک دم سے یہ بات سن کر ڈھے گیا۔ میں نے فون رکھ دیا۔ میں تم سے بہت ساری توقعات رکھنے لگا تھا۔'' وَلی جو اِن کی باتیں سن رہا تھا اس کا چہرا بالکل بجھ چکا تھا وہ کبھی خواب میں بھی نہ سوچ سکتا تھا کہ بابا جانی کو اس کا یہ شوق نہایت ناپسند ہوگا۔

''وہ رات نہایت مشکل تھی صبح سویرے ہمارے گھر میں اس مسئلے کا حل ایک بہت بابرکت ہستی لے کر آئی۔ بابا صاحب، اسلام آباد کسی سے ملنے آئے اور تم لوگوں سے ملنے کی خواہش انہیں وہاں بھی لے آئی۔ میں جو بھرا بیٹھا تھا میں نے فوراً ہی اس مسئلے کو ان کے سامنے رکھا۔ تم جانتے ہو ان کے ایک ہی جملے نے میرے اندر تک ٹھنڈک اُتار دی تھی اور میں ہمیشہ کے لیے مطمئن ہوگیا۔'' احمد شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بچے کے زور کو اگر راہ نہ ملے تو وہ کسی دن آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑتا ہے۔ بڑا نقصان کرتا ہے تو اس کے اندر کے زور کو اتنی راہیں دے دے کہ اس کے اندر کا پانی کتنے ہی حصوں میں بٹ کر بالکل پرسکون ہوجائے۔''

''یہ بات اس قدر بڑی تھی اور اس میں اس قدر سچائی تھی کہ اس کے اثرات میں نے تم میں دیکھے۔ میں نے تمہیں ہر طرح کا میوزک انسٹرومنٹ لاکر دیا تم اس کو بجاتے اور خوش ہوتے۔ پھر میں نے تمہیں رائیڈنگ کلب میں ممبر شپ دلوائی، تم نے گھڑ سواری سیکھی۔ پھر میں نے تمہیں سوئمنگ میں داخلہ دلایا، سوئمنگ سیکھنے لگے۔ جب اتنا کچھ تمہارے اردگرد تھا تو تمہارا میوزک کے لیے کریز کم ہوگیا! میں جیتنے لگا۔''

پھر پینٹنگ نے تمہیں سب کچھ بھلادیا۔ تمہارا جنون دوسری جانب مڑ گیا، میں مطمئن تھا۔

وَلی تم اب بھی اکثر میوزک بجاتے ہو۔ میں اکثر سنتا ہوں، بہت مدھر بجاتے ہو، مجھے اچھا لگتا ہے، میں جس بات سے ڈرتا تھا کہ تم اور تمہارا جنون کہیں اس کے اردگرد نہ رہ جائے۔ اللہ نے اس سے ہمیں بچالیا ہے۔

''تم جانتے ہو کہ مجھے تمہارا یہ شوق سب کے سامنے پسند نہ تھا تم نے کبھی اس کو پروفیشن بنانے کا نہیں ... اور اگر آج تم یہ سب سن کر پھر سے اپنے اندر کے زور کو روک لو گے میری ہی خاطر سہی...... تو ...ارے اندر آتش فشاں بن سکتا ہے۔ اور میں سالوں سے بنایا ہوا یہ گیم یوں بگڑنے نہیں دے سکتا۔''

...ولی نے گہرا سانس خارج کیا۔ اس سارے دورانیے میں وہ فیصلہ کرچکا تھا کہ وہ آئندہ کبھی میوزک ...ہاتھ نہیں لگائے گا۔

''تم اپنا ہر شوق پورا کرو میری طرف سے اجازت ہے۔ لیکن شوق کو پروفیشن سے دور رہنا چاہیے کیوں ...ان پہچان نہیں بنتے جبکہ پروفیشن پہچان اور نام ضرور دیتے ہیں۔ اور میں تمہاری بہت روشن پہچان ...چاہتا ہوں۔'' انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''شکریہ بابا سائیں۔'' وَلی کا بجھا ہوا چہرہ ایک دم روشن ہوگیا۔

''انشاء اللہ میری جانب سے آپ کو کبھی شکایت نہیں ہوگی۔'' وَلی کا لہجہ بے حد مضبوط تھا۔

احمد شاہ بے اختیار مسکرائے۔ ان کی اتنی لمبی چوڑی تمہید ضائع نہ گئی تھی، انہوں نے دروازہ کھول کر کبوتر ...انے کی اجازت دے دی تھی ساتھ ہی اپنی محبت کی وہ ان دیکھی زنجیر بھی باندھ دی تھی، جو اسے موڑ ...ان کے پاس ہی لے کر آتی تھی۔

''ہم چلیں بابا جانی؟'' نگینہ اور وَلی اجازت کے لیے کھڑے تھے۔ وَلی کی تابعداری ان کا سیروں ...خون بڑھا دیتی تھی۔

''فی امان اللہ!'' انہوں نے اجازت دی۔

روشن آرا، نگینہ دونوں سر پر آنچل ڈالے لمبے چوڑے وَلی کے ساتھ باہر نکل رہی تھیں۔ کتنا مکمل تھا ...ان کا خاندان!''

...ان کا دل اپنے برسوں پہلے کے فیصلے پر آج بے حد مطمئن تھا۔

❖❖○❖❖

''کاشف آیا نہیں ابھی تک یونیورسٹی سے، شام کے پانچ بج رہے ہیں۔'' حسن آرا نے پریشانی سے ...سویں بار پوچھا تھا۔

''نہیں امی جی! لیکن پلیز آپ فکر کر کے اپنا بی پی مزید ہائی نہ کرلیجیے گا۔'' علیزے نے ماں کو فکر سے ...

''لیکن بیٹا اس کی یونیورسٹی تو دو بجے ختم ہوجاتی ہے پھر یہ لڑکا روز کدھر نکل جاتا ہے۔ جانے اُس نے ...کھایا ہوگا کہ نہیں؟'' وہ ابھی تک کاشف کے لیے پریشان ہورہی تھیں۔

''امی آپ بھی کس قدر بھولی ہیں۔ جس کو روز کوئی نہ کوئی لڑکی لنچ پر اچھے اچھے ہوٹلوں میں کھانا ...ئے، وہ بھلا گھر کی دال سبزی کے لیے بھوکا رہے گا؟'' علیزے نے کلس کر سوچا۔

''دیکھو تو بیٹا شاید دروازہ بجا ہے۔'' امی بضد تھیں۔

''گڈو!'' علیزے نے گڈو کو آواز دی لیکن وہ اور غزالہ اوپر چڑھے ساتھ والے بچوں کے ساتھ کھیل ...رہے تھے۔ رہی منزہ تو وہ پارلر سے سات بجے آتی تھی اور اُسے ابا لینے جاتے تھے اس لیے اس وقت

علیزے کو ہی اپنے اسکول کی کاپیاں جو وہ چیک کرنے کے لیے گھر اُٹھا لائی تھی بار بار چھوڑ کر امی کی آہٹوں پر دروازہ کھولنا پڑتا تھا۔ دوبارہ دروازے پر جا کر دیکھ آئی تھی باہر کوئی نہ تھا۔

اب پھر امی کی خاطر وہ دروازے پر آئی تھی۔

دھڑ سے دروازہ کھلا۔ آنے والے کا ہاتھ بیل پر جاتے جاتے رُک گیا۔

آتشی گلابی لینن کی پھولوں والی قمیص اور گلابی رنگ کی شلوار اور دوپٹہ اوڑھے وہ بالکل گڑیا لگ رہی تھی۔

دونوں نفوس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

"جی آپ کون؟" وَلی کے کانوں نے بے حد سریلی آواز کے جواب میں پوچھا۔

وہ دروازے کے فریم میں کھڑی اس تصویر کو دیکھ رہا تھا۔

پہلی بے اختیار نظر کے بعد وہ حسبِ عادت اپنی دوسری نظر سنبھال چکا تھا۔

"میرا نام عبدالولی شاہ ہے۔ کیا حُسن خالہ ہیں؟" وَلی نے گہری نگاہ ڈال کر اس سے پوچھا۔

اُس کا گھمبیر لہجہ۔ اس کے چہرے کی سنجیدگی اور وجاہت علیزے کا دِل دھڑکا گئی۔

"حُسن خالہ!" علیزے نے مسکراتے ہوئے زیرِ لب دہرایا۔

اس کے دائیں بائیں مسکراتے ہوئے ڈمپل پڑتے تھے۔ وَلی اس کی اتنی خوبصورت مسکراہٹ پر چونکا۔

"امی کو اس سے پہلے اتنے انوکھے انداز سے کبھی کسی نے نہیں بلایا۔" اس نے کہتے ہوئے راستہ

"خالہ اندر ہیں ناں؟" وَلی نے اندر قدم رکھے بغیر پوچھا۔

"اس قدر محتاط انداز۔" علیزے کو وہ بہت اچھا لگا۔

"جی ہیں۔" علیزے خود پر قابو پا کر دھیرے سے بولی۔

"ٹھیک ہے میں پہلے اماں جان کو بتا آؤں۔" وہ واپس گلی کی نکڑ پر کھڑی گاڑی کی طرف مڑا۔

تھوڑی دیر بعد روشن آرا اور نگینہ کو لیے وہ پھر سے آن موجود تھا۔ حُسن آرا کے تو ہاتھ پھول رہے تھے ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان لوگوں کو آنکھوں کی پلکوں پر بٹھالیں۔

"علیزے جلدی سے گڈو سے کچھ بازار سے منگواؤ!" انہوں نے پرس سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر علیزے کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

فی الحال کاشف کی پریشانی ان کے ذہن سے نکل گئی تھی۔

"خالہ ابھی مجھے اور نگینہ کو اجازت دیں، میرا وعدہ ہے ہم دونوں کسی دن پورے دن کے واسطے آپ کے لیے آئیں گے۔" وَلی نے اُٹھتے ہوئے شائستہ انداز میں اجازت لی۔

"ارے! دو گھڑی بیٹھو گے بھی نہیں؟" شائستہ بیگم نے جی بھر کر عبدالولی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میرا وعدہ ہے، بیٹھوں گا بھی اور آپ کے ہاتھ کی گاجر کھیر بھی کھاؤں گا۔ اماں جان آپ کے پکے پکوان کی بے حد تعریف کر کے ہمارے اندر آپ کے ہاتھ کا ذائقہ چکھنے کا شوق خوب پیدا ہیں۔"

"امی کا ہاتھ بہت بھاری ہے بھائی میاں۔" گڈو نے شرارت سے کہا۔

"عبدالولی کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ نگینہ بھی دھیرے سے مسکرادی اور اندر آتی علیزے کا دِل پھر تیزی سے دھڑکا۔"

"کیا رُکیں گے نہیں؟" علیزے نے ان کے ساتھ ساتھ چلتے دروازے کے پاس آ کر پوچھا۔

"آپ کے ہاں دروازے کے پاس آ کر رکنے کے لیے کہتے ہیں۔" عبدالولی کی ساری بے نیازی اس لڑکی کو بس ایک بار دیکھنے سے ہی کہیں غائب ہوگئی تھی۔

علیزے کی شرمندگی سے رنگت سرخ پڑ گئی تھی۔

عبدالولی نے بہت غور سے اس کے چہرے کے رنگوں کو دیکھا یہ سرخ اور سفید رنگت میں کس قدر خود کھل ہے، بار بار بھی سرخ پڑ جاتی ہے کبھی سہم کر سفید۔" عبدالولی نے سوچا۔

"اچھا اجازت دیں اللہ حافظ۔" نگینہ نے گلے لگتے ہوئے کہا۔

"اس شرط پہ کہ تم دوبارہ آؤ گی ہم سے ملنے۔" علیزے نے شگفتگی سے کہا۔

"صرف نگینہ؟" عبدالولی خود نہ جان پارہا تھا کہ اُسے اس لڑکی سے اس قدر اپنائیت کیوں محسوس ہو رہی ہے، جو یوں وہ اپنے مسائل سے ہٹ کر اپنائیت سے اُسے مخاطب کر رہا ہے۔

"جی!" علیزے نے حیرت سے اس کی بولتی آنکھیں دیکھیں۔ اُسے اپنا وجود برف کی طرح پگھلتا محسوس ہو رہا تھا۔

"آ... آپ بھی ضرور آئیے گا۔" وہ نگاہ جھکا کر بمشکل بولی، عبدالولی اُسے دیکھ کر بھرپور مسکرایا۔

"میں ضرور آؤں گا۔" معنی خیز لہجہ علیزے کی رہی سہی جان نکال چکا تھا۔ جانے وہ کتنی دیر تک وہاں کھڑی رہی تھی جبکہ وہ دونوں کب کے جا چکے تھے۔

جانے انجانے میں عبدالولی نے زندگی میں ہمیشہ روشن آرا اور ان کی خوبیوں کو آئیڈیلائز کیا تھا۔

اے میں کسی کی بے حد جھلک تھی۔

اس کی زندگی میں بہت ساری خوبصورت لڑکیاں آئی تھیں اور وہ سب اس کے ساتھ کی متقاضی تھیں لیکن عبدالولی کے دِل کی دیواریں بہت اونچی تھیں آج تک کوئی لڑکی ان دیواروں کو پھلانگ نہ سکی۔ لیکن علیزے نے اس کے قلعے جیسی شخصیت کے پھاٹک پر پہلی دستک دی تھی، جو اندر تک سنائی دے گئی۔

ولی ابھی تک اس کیفیت کو پہچان نہ پایا تھا۔ یہ علیزے تھی!

کیوں کہ وہ بالکل روشن آرا کا عکس تھی۔ بے حد حیادار اور دھیمی!

اور کہیں آسمانوں میں اک دعا بے حد مسکرائی تھی!

"اے اللہ! پلیز تو وَلی کے من میں محبت جگا دے۔ اس کے دِل کو اس درد سے روشناس کرا دے۔

اے اللہ میاں وَلی کو بھی محبت ہو جائے!" دعا بہت دِل سے مانگی گئی تھی۔

دعا قبول ہوگئی تھی!

❖❖○❖❖

"یہ کیسا شور ہے؟" سیّد سرفراز اپنی عینک کی کمانی درست کرتے آگے بڑھے۔

''سائیں میں برباد ہوگئی۔ میری دولت میرا خزانہ تو میرا بیٹا ہی تھا وہ مرگیا، دیکھیں ظالموں نے ظلم کیا ہے، ہائے میرا معصوم سا بچہ۔'' وہ عورت چیخ چیخ کر بین کر رہی تھی۔

''یہ سب کیسے ہوا؟'' سیّد سرفراز نے اپنے ایک آدمی سے پوچھا۔

''سائیں! اپنے مہمان خانے کے پاس جو ہمارا کنواں ہے لاش اس کے پاس سے ملی ہے۔ کسی بچے کے ساتھ زیادتی کرکے اسے مار ڈالا۔'' ریاض جو سیّد سرفراز کے با اعتبار بندوں میں شامل تھا اس نے پوری رپورٹ دی۔

''ہوں!'' سیّد سرفراز نے ہنکارا بھرا۔

''ہمارے ڈیرے کے پاس سے لاش برآمد ہوئی ہے معاملہ پولیس تک نہیں جانا چاہیے۔ تھانے چائے پانی بھیج دو۔'' سیّد سرفراز نے سوچتی ہوئی نگاہوں سے سامنے عورت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''جو حکم سائیں!'' ریاض نے تابعداری سے کہا۔

اور یہ بتاؤ ڈیرے پر کیا کوئی تھا کل پرسوں میں؟'' سیّد سرفراز نے اُس سے بڑا مشکل سوال پوچھ لیا۔ ریاض نے نگاہ چرالی۔

''سائیں وہ۔'' وہ اٹکا۔

''ریاض مجھے درست بات بتاؤ!'' سیّد سرفراز نے ڈانٹ کر اس سے پوچھا۔

''وہ سائیں زبیر اور ان کے شہری دوست دو دن سے ڈیرے پر ہی تھے۔'' ریاض نے دھماکہ کیا لیکن بے حد سرگوشی میں بولا کہ دور کھڑے افراد میں سے کوئی نہ سن سکا۔

سیّد سرفراز نے لاٹھی زور سے زمین پر ماری! وہ چھڑی کا استعمال کچھ عرصے سے کرنے لگے تھے، ان کی صحت خاصی گر گئی تھی۔

''یہ بات کسی کے کانوں میں نہیں پڑنی چاہیے۔'' سیّد سرفراز نے سرگوشی میں کہا ان کے لہجے میں اتنی قدر سختی تھی کہ ریاض کو خوف سے کپکپی شروع ہوگئی۔

''جی سائیں! کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔'' اس نے فوراً تابعداری دکھائی۔

''اور ہاں۔ سنو!'' وہ رک کر مڑے۔

''جی سائیں!'' ریاض ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھا۔

''اس مائی کو کچھ دے دلا کر اس کا منہ بند کرو۔ اسے کہو یہ چیخنا چلانا بند کرے۔ جو مر گیا اب اس کے رونے سے واپس تو آئے گا نہیں! اس کے کفن دفن کی فکر کرے، بلکہ یہ نیکی ہم کما لیتے ہیں تم کفن دفن ہماری طرف سے کر دینا۔'' وہ نہایت سفاکی سے کہتے ہوئے چلے گئے۔

عورت ابھی تک اپنے دس گیارہ سال کے بچے کو گود میں لے کر رو رہی تھی۔ اس کا سر بار بار آسمان کی طرف یوں اُٹھتا، جیسے وہ انصاف مانگ رہی ہو۔

''آہ! ظالموں نے میری زندگی کی روشنی چھین لی! میرا سہارا چھین لیا۔'' وہ مسلسل بین کر رہی تھی سارے گاؤں میں اس کی سسکیاں اور فریاد گونجتی رہی لیکن کوئی بھی اس کی مدد کو آگے نہ بڑھا۔

''کیا اس گاؤں میں کوئی مرد کا بچہ نہیں ہے جو میرا ساتھ دے سکے مجرموں کو ڈھونڈنے اور پولیس میں

رپٹ لکھوانے میں میری مدد کرے۔'' وہ پاگلوں کی طرح ہر ایک کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی لیکن کسی کی جرأت نہ تھی کہ اس معاملے میں پڑے۔

''اچھا تو تم سب اپنے اپنے دروازے بند رکھو، میں سب سے بڑا دروازہ اب کھٹکھٹاؤں گی، جس کو کسی سے ڈر نہیں لگتا! جو سب کی سنتا ہے۔'' مائی صغراں نیم پاگلوں کی طرح بول رہی تھی۔

دیکھنا مجھے ایک روز انصاف ضرور ملے گا۔ یہ ایک ماں کا یقین ہے! پھر وہ نہیں بولی اور بس چپکے سے اپنے بیٹے کی میت کے پاس بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ لوگ جنازہ اُٹھا کر لے گئے۔

اور وہ مائی صغراں جو صبح سے ہر شخص کو پکڑ پکڑ کر بولتی رہی تھی۔ جانے اسے کس طرح کی اور کیوں چپ لگ گئی تھی۔

❖❖○❖❖

''کیا ساری دنیا کی لڑکیاں ختم ہوگئی ہیں! جو تم اس منحوس لت میں مبتلا ہوگئے ہو۔'' سیّد سرفراز کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ جبکہ زبیر پر باپ کی کسی بات کا اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے ڈرگ کی ہیوی ڈوز لے رکھی تھی اور اس وقت وہ ہواؤں میں اُڑ رہا تھا۔

سیّد سرفراز کی ساری گفتگو اور غصے کے تیور بھی اُسے محسوس نہیں ہو رہے تھے۔

''کم عقل! میں تم سے بات کر رہا ہوں۔ سیّد سرفراز نے اُسے غصے سے جھنجوڑا۔

وہ آنکھیں بند کیے، زمین پر لڑھک گیا۔ اب وہ دو تین گھنٹوں کے لیے ہوش سے بے گانہ ہو چکا تھا۔ سیّد سرفراز کا بی پی شوٹ کرنے لگا۔

''آخر یہ دونوں کے دونوں ایسے کیوں ہوگئے ہیں۔ بیس گاؤں کے مالک سیّد سرفراز کے وارث اس قدر نااہل اور بدفطرت!'' سیّد سرفراز نے دکھ سے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

''اتنی زمین کون سنبھالے گا؟ میں شریکوں کے حوالے تو کرنے سے رہا، آخر کیا وجہ ہے جس کی وجہ سے یہ اس حال میں آگئے ہیں؟'' وہ اپنے آپ سے سوال کر رہے تھے۔

آج تک اپنے ظالمانہ، سفاکانہ عمل ان کے ذہن میں بالکل نہ آئے تھے۔ کیوں کہ وہ خود کو شروع سے درست سمجھتے آرہے تھے۔ اور ایسے غلط آدمیوں کو اپنی درست چیزیں غلط ملتی ہیں تو وہ یوں ہی تڑپ اُٹھتے ہیں۔

❖❖○❖❖

''تمہاری جرأت کیسے ہوئی تم یہاں دوبارہ فون کرو'' نیلوفر بیگم فون پر چلاّ اُٹھیں۔

''مجھے تم سے بات کرنے کا شوق نہیں، اپنے بچوں سے مطلب ہے میں ان کا باپ ہوں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولے۔

''ہونہہ باپ! باپ تب کہاں تھا، جب وہ دنیا میں بالکل اکیلے رہ گئے تھے۔'' نیلوفر نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

''تمہاری وجہ سے میرا رابطہ میری بیوی اور بچوں سے ٹوٹا تھا۔ اس لیے میں جان نہ سکا کہ کب میری بیوی میرے بچوں کو دنیا میں اکیلے چھوڑ گئی۔'' ان کے لہجے میں بے حد تاسف تھا۔

''اور اب تم ان سے ملنا چاہتے ہو۔'' نیلوفر نے قہقہہ لگایا۔

''صرف ملنا ہی نہیں میں ان کو اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں، میرے بچے مجھے واپس کر دو۔'' انہوں نے فریادی لہجے میں کہا۔

''بچے اب بچے نہیں رہے جناب! اب وہ باشعور ہو گئے ہیں اور اپنے باپ سے بے حد نفرت کرتے ہیں۔'' نیلوفر نے اپنی باتوں سے ان کو توڑا۔

''آج... آج سائرہ کا جنم دن ہے ناں!'' وہ بے تابی سے بولے۔

''ہاں... اور اس کی سالگرہ کے دن اس کے بھگوڑے باپ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ نہایت سفاکی سے بولیں۔

''کیوں؟ میں اس کا باپ ہوں!''

''ہاں ہو، لیکن وہ اپنے باپ سے نفرت کرتی ہے۔''

''اب ان دونوں کے لیے ان کی ''آنی'' ہی سب کچھ ہے۔ تم اب فون رکھ دو اور مان لو کہ تم نیلوفر سے ہمیشہ کے لیے ہار گئے ہو۔'' نیلوفر بیگم فون رکھ کر ہذیانی انداز میں ہنستی چلی گئیں۔

تم ہار گئے ہو! ہاں شہباز علی تم ہار گئے ہو۔
ایک دن تم نے نیلوفر کو ٹھکرا کر اسے توڑا تھا۔
آج میں نے تم کو توڑ کر چکنا چور کر دیا ہے۔
شہباز علی میں جیت گئی ہوں!
تم ہار گئے ہو!

وہ مسلسل ہنسے جا رہی تھیں۔ ایسی ہنسی جس میں تباہیوں کا جنون چھپا تھا۔

❀

تمہیں خبر ہے؟
میں ایک شب چاندنی کے سائے میں کھو گئی تھی
پھر اپنی رفتارِ تیز کا اعتبار لے کر مہیب جنگل میں سو گئی تھی
کہ منزلوں کے تمام نقشے بھی سامنے تھے
مگر میں انجان ہو گئی تھی
مرے خدایا!
ترے بنائے ضابطے توڑ توڑ کر خود بکھر گئی ہوں
گزشتہ عمرِ عزیز کا ایک ایک پل رائیگاں رہا ہے
اب اپنے فیصلے کے لمحے کو رو رہی ہوں
''جو میں نے تیری رضا کے حق میں نہیں لکھا تھا''
جو میں نے ابلیسِ نفس کے نام کر دیا تھا
میں گمراہی کے شدید احساس کے تلے ہوں
یہ بوجھ اُٹھائے میں تھک گئی ہوں
مجھے تُو اپنے کرم سے مولا!
وہ ایک لمحہ دوبارہ دے دے
بدل سکوں فیصلہ میں اپنا
وہ راہ پا لوں
جو ہر پیمبر کی زندگی کی شبوں میں تارے پرو گئی تھی
میں ایک شب چاندنی کے سائے میں کھو گئی تھی!

اس کے آنسو تو یوں لگتا تھا کہ سانسوں کے ساتھ رشتہ باندھ چکے ہیں۔ کبھی آنکھوں سے بہہ کر نظر آتے تھے تو کبھی آنکھوں سے اوجھل دِل پر برسات کرتے تھے۔ اُس کا چہرا آنسوؤں سے تر تھا۔

وہ ڈریسنگ روم کا دروازہ بند کر کے چادر بچھا کر دو رکعت نفل پڑھ کر ایک بار پھر ربِّ عظیم، مالکِ کریم کے سامنے سر جھکائے بیٹھی تھی۔

''اے اللہ جی پلیز!'' آنسو لفظ بننے نہیں دے رہے تھے اور اُس مالک عظیم ربِّ رحیم کو کسی لفظ اور

جملے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

"وہ علیم ہے۔ وہ جاننے والا ہے! ہر دل کا حال وہ جانتا ہے۔ بے شک وہ دُعائیں قبول کرنے والا ہے، یہ تو باری کی بات ہے! کب باری آتی ہے۔"

"یہ تو یقین کی بات ہے! شدّت کی بات ہے، کب انسان اپنی شدّتیں برت کر اپنے لیے معافی حاصل کرلیتا ہے!"

"اے ترنم دیر ہورہی ہے!" ماہ رُخ نے باہر سے دروازہ دھڑ دھڑایا۔ ترنم نے اپنی آنکھیں اور چہرا دوپٹے سے صاف کیا۔ چادر کا گولا بنا کر الماری میں پھینکا اور دروازہ کھول دیا۔

"ارے! تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟" ماہی کی آواز حیرت اور غصّے سے پھٹنے لگی۔ ترنم کی خاطر وہ پہلے ہی بے حد لیٹ ہو چکی تھی۔

"اور یہ تم اندر بند ہو کر رو رہی تھی کیا؟" ترنم کی چوری اُس کی سرخ آنکھوں سے پکڑی جارہی تھی۔

"میرا لینس ٹوٹ کر آنکھ میں پھنس گیا، جس کی وجہ سے آنکھوں سے پانی بہا ہے۔" ترنم نے گلا کھنکار کر بہانہ سنایا۔

"اوہ مائی گاڈ! تم اب ٹھیک ہو؟" ماہی نے فکر سے پوچھا۔ جانے اس لڑکی میں کیا خاص کشش تھی، جو ماہی کو ہر وقت اپنی جانب کھینچتی تھی، اُسے اُس کا خیال وفکر کرنے پر مائل کرتی تھی۔

"ہاں ٹھیک ہوں!" ترنم نے بے نیازی سے کہا۔ اُس کی ایک ایک حرکت سے لگ رہا تھا کہ اُسے جانے کی کوئی جلدی نہیں۔

"اے ترنو! تمہاری کمپنی کی خاطر میں سب کے ساتھ نہیں گئی اب تم پلیز آپا سے ڈانٹ نہ پڑوا دینا، راستا دُور کا ہے فارم ہاؤس وغیرہ ہے۔ جاتے جاتے دیر لگے گی پھر وہاں جا کر تیار ہونے میں ٹائم لگے گا۔ پلیز تم جلدی کرو۔ ایک تو ہمارے حصّے میں جو ڈرائیور آیا ہے وہ الگ سُست عظیم ہے!" ماہی جلدی جلدی بولتی ساتھ ساتھ ترنم کا سامان اکٹھا کرنے لگی۔

"اس کے ساتھ کی جیولری؟" ماہی نے کالی میکسی اُس کے سامنے لہرا کر پوچھا۔

"میرے بیگ میں ہے۔" ترنم نے بے زاری سے جواب دیا۔

"جلدی...... جلدی کرو!" ماہی اُسے اور اُس کے سامان کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے باہر لے کر آئی۔ سامنے کا منظر ماہی کے لیے مزید کوفت بھرا تھا۔

آصف اُن کا ڈرائیور جس کی عمر اکیس بائیس سال تھی کھڑا آنسو بہا رہا تھا۔

"لو یہاں کیا آفت ٹوٹ پڑی، جو یہ بونگا جذباتی سین بنا رہا ہے!" ماہی نے سامان گاڑی کے پاس رکھتے ہوئے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

"تمہیں کیا ہوا ہے آصف؟" ترنم نے نرم لہجے میں پوچھا۔

وہ تو شاید انتظار میں بیٹھا تھا۔ فوراً پھٹ پڑا اُس کے آنسوؤں میں اب آواز بھی شامل ہوگئی تھی۔

"پلیز آصف رونا بند کر کے بتاؤ کیا بات ہے۔" ترنم نے نرمی سے اُس سے کہا۔

"با...... باجی جی!"

"ہیں؟ کس کو باجی کہا؟" ماہی نے غرّاتے ہوئے کہا۔

"تمہارا ہمارا کیا رشتہ!" وہ بدلحاظی سے بولی۔

ترنم نے تاسّف سے ماہی پر نظر ڈالی۔

"ہم تم کسی رشتے کے قابل ہی کہاں ہیں۔" وہ صرف سوچ کر رہ گئی۔

"وہ۔ میڈم جی!" آصف ایک دم بوکھلا کر بولا۔

"یہ میڈم وغیرہ تم آپا کو کہا کرو۔" ماہی اب بھی راضی نہ تھی۔

"بے بی میری امّاں بے حد بیمار ہیں۔ مجھے اُن کی دوا لانی تھی لیکن میڈم پہلی سے پہلے پیسے اور چھٹی اں دے رہیں، میری امّاں مرجائے گی بے بی۔" وہ جلدی جلدی اس ڈر سے بولا کہ کہیں ماہی پھر اُس النے نہ دے۔

"ٹھیک ہے، یہ تو آپا کی اپنی مرضی ہے! ہم کیا کرسکتے ہیں۔" ماہی کی دوٹوک بات پر آصف کی ت ایک بار پھر رونی ہوگئی۔

"تمہارا گھر کہاں ہے؟" ترنم نے ماہی کی بات نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔ جواب میں اُس نے لی ایک گنجان آبادی کا نام لیا۔

"لو پہلے تمہاری امّاں کے لیے دوائی لے لیتے ہیں، پھر تم ہمیں فنکشن میں لے چلنا۔" ترنم نے لہ سنایا۔

"ترنم! یہ سب کیا ہے؟" ماہی نے چیختے ہوئے کہا۔

"تم بیٹھو میری جان! غصّہ کرنے سے تمہارے چہرے پر جلد جھریاں پڑ جائیں گی۔" ترنم نے ماہی کو ے کہا کہ اُس کا موڈ مزید خراب نہ ہو۔

"ترنم تم میری محبت کا ناجائز فائدہ اُٹھاتی ہو!" ماہی نے گاڑی سے باہر کا منظر دیکھ کر ناک بھوں ھائی۔

آصف نے جن گلیوں کے باہر گاڑی کھڑی کی تھی، وہاں سے گندی نالیوں سے گندی بدبو کے ے اُٹھ رہے تھے۔

"ہمارا تو کام ہی محبت کا ناجائز فائدہ اُٹھانا ہے میری جان!" ترنم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اُس کی راہٹ بالکل یوں تھی، جیسے روشنی کی کوئی کرن چمکی ہو۔

"تم کمبخت ہو ایک حسین بلا! مسکرا کر جان نکال دیتی ہو!" ماہی نے پھولے پھولے چہرے سے کہا۔

"اچھا اب تم اُترو! ہم آصف کی امّاں کا حال چال پوچھ آتے ہیں۔" ترنم کی نئی فرمائش پر ماہی کو ل ہی لگ گئی۔

"تمہارا تو دماغ بالکل اُلٹ گیا ہے، جو ٹکے ٹکے کے ڈرائیوروں کو منہ لگاتی ہو۔ تم ہی جاؤ مجھے نہیں ا۔" ساتھ ہی اس نے کانوں پر ہیڈفون لگالیا۔ ماہی نے اتنی اونچی آواز میں کہا تھا کہ آصف کے ے کا رنگ ہی ایک دم بدل گیا۔

"ٹھیک ہے تم بیٹھو ہم آتے ہیں۔" ترنم نے آصف کی شکل پہ آئی بے چارگی دیکھ کر جلدی سے

اُترتے کہا۔

جوں جوں وہ آگے بڑھتے جارہے تھے گلیاں تنگ و تاریک ہوتی جارہی تھیں، جانے سورج کی کرنیں کیسے یہاں تک پہنچ جاتی تھیں۔ جگہ جگہ کوڑے کے ڈھیر ماحول میں بُو پھیلانے کا باعث بن رہے تھے۔ دونوں جانب چلتی نالیاں اس ماحول کو کراہت آمیز بنانے میں مرکزی کردار ادا کررہی تھیں۔ یہ سب کچھ باہر سے آنے والے کو فوری محسوس ہوتا تھا۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی ترنم نے ناک پر [illegible] کرلیا۔

"کب سے بیمار ہے تمہاری امّاں اور کیا بیماری ہے اُسے؟" ترنم نے اپنا دھیان اُس غلاظت بھرے ماحول سے ہٹانے کے لیے آصف سے گفتگو شروع کردی۔

"جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے باجی، اُسے ہر پَل بیمار ہی دیکھا ہے!" آصف کی آواز میں بے چارگی تھی۔ وہ ایک دروازے کے سامنے آکر رُکے جس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ پردے کا اصلی رنگ جانے کیا تھا۔ اس وقت وہ اس قدر میل سے بھرا ہوا تھا کہ اُس کا رنگ کالا پڑ گیا تھا۔

آصف نے پردہ ہٹا کر ترنم کو اندر آنے کا راستا دیا۔

تاریک و تنگ چھوٹی سی گلی سے گزر کر اب وہ چند فٹ کے صحن میں داخل ہوئے۔ گھر کی فضا بھی سیلن زدہ تھی۔ ترنم نے زندگی میں پہلی بار ایسا ماحول دیکھا تھا۔ اُس کا دِل ایک دم متلایا۔

اُس کا اپنا گھر کس قدر صاف ستھری گلی میں تھا۔ کھڑکیوں اور صحن سے سورج گزر کر اُن کے حصے کی روشنی اور زندگی بانٹ کر جاتا تھا۔ ایسی تنگ و تاریک بدبودار گلیوں کو اُس نے کبھی تصور میں بھی نہ دیکھا تھا۔

آصف کے گھر کے سامنے اُس کا وہ ننھا منا سا گھر کسی محل سے کم نہ تھا۔ اور وہ کس قدر بدنصیب تھی اپنے محل جیسے مضبوط گھر کو تباہ کرکے خود بھی تباہیوں کے راستے پر آگئی تھی۔

ترنم کے دِل سے بے اختیار ہوک اُٹھی۔

"باجی تم یہاں رُکو!" آصف کمرے کی چوکھٹ پر کھڑا اُسے روک رہا تھا۔

آصف نے موم بتی جلائی اور پھر اُسے جہاں لے کر گیا۔!

وہاں ترنم کے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

جیسے اُس نے کسی قبر میں پاؤں رکھ دیا ہو۔

ترنم کا جی بے اختیار متلانے لگا۔ اُس سے وہاں کھڑا ہونا دوبھر ہوگیا۔ زندہ وجود کو کیڑے مکوڑوں کے ساتھ دیکھنا واقعی بہت ہمت کی بات ہے۔

پاس پڑی بالٹی اُلٹیوں سے بھری ناقابل برداشت بو پھیلا رہی تھی۔ آصف کی ماں جانے کتنے عرصے سے بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔

اُس کے "بیڈسور" ہوچکے تھے۔ اور اُن میں کیڑے پڑ چکے تھے۔ کچھ کمرے میں موجود کیڑے اُس کے زندہ وجود کو نوچ رہے تھے۔

"یہ... یہ تم نے اپنی ماں کو کس حال میں رکھا ہوا ہے؟" ترنم نے ناک پر دوپٹا رکھے رکھے آصف سے

مخاطب کیا۔

"یوں تو یہ مرجائے گی!" ترنم کو باقاعدہ جُھرجُھریاں آرہی تھیں۔

"یہ نہیں مرے گی باجی! پہلے مجھے مارے گی پھر مرے گی!" آصف نے دِل کے پھپھولے پھوڑتے ہوئے کہا۔

"پچھلے آٹھ سال سے یہ بستر سے اُٹھ نہیں سکی، لیکن جانے کیوں یہ مر بھی نہیں سکی!" آصف کی آواز غصے سے پھٹ رہی تھی۔

وہ ساتھ لائی دوائی پانی میں گھول کر اُس کا منہ کھول کر ڈال رہا تھا۔ جواب میں وہ عورت جس طرح غوں غاں کررہی تھی وہ بہت دِل دہلادینے والی تھی۔

"کیا یہ بول نہیں سکتی؟" ترنم نے ساری کارروائی دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ اپنے زمانے کی مشہور گائیکہ تھی!" آصف نے اپنی جیب سے رومال نکال کر اُس کا منہ پونچھا۔

"گانا گاتی تھی، جسم بیچتی تھی، یہ پیشے میں طوائف ہے!" آصف کی آواز برف کی طرح سرد ہوگئی۔

اس نے اِک نفرت بھری نگاہ اُس عورت پر ڈالی، جو اُس کی ماں تھی، جس کے لیے کچھ گھنٹے پہلے وہ [illegible]یوں سے رو رہا تھا۔

"اس کی آواز! جس میں جادو تھا۔ وہ کب کا ٹوٹ چکا ہے اور جس جسم کو بیچ کر یہ کھاتی تھی۔ آج وہ جسم کیڑے کھارہے ہیں۔ پہلے انسانی کیڑے کھاتے تھے اب ـ !" آصف شاید اپنے حواسوں میں نہ تھا۔

"میرا باپ سینما ہال کا لائٹ مین تھا۔ ایسا لائٹ مین، جس کی زندگی میں کسی قسم کی روشنی کا گزر نہ ہوا تھا" آصف ہلکے سے یوں ہنسا جیسے وہ کسی لطیفے سے لطف اندوز ہوا ہو۔

"وہ ساری عمر اِسے بے ہدایتی کہتا رہا، کہتا تھا آج تُو حرام کھائے گی کل تجھے یہ کھاجائے گا!" کیسا اچھا آدمی تھا میرا باپ جو زندہ ہوتا تو اپنے کہے کو سچ ہوتے دیکھ بھی لیتا۔" عورت نے غوں غوں کرکے شور شروع کردیا تھا۔ آصف کو اپنی بات روکنی پڑی۔

"امّاں چُپ کرکے دوا پی لے مجھے کام پر جانا ہے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" آصف نے ماں کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ عورت کی غوں غوں میں کچھ کمی آگئی۔

"سب سُنتی ہے، سب سمجھتی ہے اس لیے میرا کہا اِسے بُرا لگتا ہے!" آصف تھوڑا سا مسکرایا اُس کی مسکراہٹ چٹخے شیشے جیسی تھی۔ ترنم کے رونگٹے کھڑے ہوگئے ایک عبرت ناک انجام اُس کے سامنے موجود تھا۔

"جب میں چھوٹا تھا تو یہ سرخی پوڈر لگا کر گہنے پہن کر خوشبو لگا کر نکل جایا کرتی تھی۔ جگہ جگہ چپّے چپّے پہ اس نے چند سو روپوں کے لیے اپنی مرضی سے خود کو بیچا۔ یہ واقعی بے ہدایتی تھی۔

کاش! یہ گھروں میں جھاڑو پوچھا لگا کر چند سکّے کماسکتی، محنت اور جائز زندگی گزار کر اپنے بدن میں حلال کی بُو بسالیتی تو آج یہ کیڑے اس کے بدن کو چھونے کی ہمت نہ کرتے۔ لیکن اسے وہ طریقہ ہمیشہ [illegible] اور آسان لگتا تھا۔

"باجی! میرا باپ مجھے اکثر کہتا تھا کہ آسان لگنے والے راستے کا انجام بڑا دُشوار ہوتا ہے! وہ اُس عورت سے محبت کر بیٹھا تھا لیکن اس عورت نے اُس کی قدر نہ کی۔"

"میرا باپ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ جس آسان راستے پر اماں چلی تھی وہاں سے جگہ جگہ کے غلیظ مردوں کی بیماریاں بھی اُٹھالائی۔ اور پھر جب یہ بیمار ہوئی تو سب اُس کے پاس سے بھاگ گئے۔ لیکن میں ایسا بد بخت ہوں، جو چاہ کر بھی اِس سے بھاگ نہیں سکتا!" آصف کی آواز میں ایک بار پھر نفرت گونجنے لگی۔

وہ بیک وقت نفرت اور محبت جیسے جذبے میں مبتلا تھا۔ کبھی اُسے اپنی ماں کی محبت تڑپاتی تھی تو کبھی نفرت رُلاتی تھی۔

عورت کے منہ سے رال ٹپک رہی تھی۔ جگہ جگہ چلتے کیڑے اور ماحول کی بدبُو! یہ سب ترنم کی توقع اور برداشت سے زیادہ تھا۔

ترنم دوڑتی ہوئی باہر نکلی۔ اُسے بے اختیار اُبکائی آگئی وہ اندھوں کی طرح گرتی پڑتی گھر سے نکلی، جانے کتنی دیر وہ باہر گلی میں کھڑی اُلٹیاں کرتی رہی۔

"باجی پانی لے لو!" آصف شاید گاڑی سے پانی کی بوتل نکال لایا تھا۔ ترنم نے کُلیاں کیں اور دو گھونٹ پانی پیا۔ اس کا سر بے حد چکرا رہا تھا۔

ایک زندہ قبر!

ایک زندہ انجام!

"تو کیا مرنے کے بعد اسے ناقابلِ برداشت عذاب نہ ہوگا؟" گاڑی کی سیٹ کے ساتھ سر ٹکائے آنکھیں موندھتے ہوئے یہ خیال اُسے کسی ناگ کی طرح ڈسنے لگا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی تو آنکھیں بند کیے شاید ماہی سو رہی تھی ایک دم چونک کر اُٹھ بیٹھی۔

"ہوگئی مزاج پُرسی؟" ماہی کا لہجہ جلتا ہوا تھا۔

"مزاج درست ہوگئے ہیں!" ترنم زیرِ لب بولی کہ ماہی سن ہی نہ سکی۔

"اب دیکھنا ہم لیٹ ہوجائیں گے، چلو تمہاری ضد تو پوری ہوچکی ہے۔ دُعا کرنا کہ ہم آپا سے نا جائیں۔"

"وہ کم بخت پری 'چڑیل' ہر وقت ہماری شکایت کے بہانے تلاشتی ہے!" ماہی کی پری سے ہر وقت اَن بَن رہتی تھی اس لیے وہ اُسے کبھی چڑیل تو کبھی ڈائن جیسے ناموں سے پکارتی تھی۔

ترنم اس قدر نڈھال ہوچکی تھی کہ ماہی کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اُس سے بولا تک نہ جارہا تھا۔

"دیکھو میری جان! تم فکر نہ کرو ہمیں دیر نہیں ہوگی ہر کام میں اللہ کی مصلحت ہوتی ہے، ہر کام اللہ کی ذات کرتی ہے اور اللہ ہمیشہ اچھا ہی کرتا ہے!" ترنم جانے کن حواسوں میں تھی۔ وہ بے حد ان کنسرن فرد کے ساتھ اس طرح کی باتیں کر رہی تھی، جس کو ان باتوں سے کوئی سروکار اور یقین نہ تھا۔ ماہی جانے مزید کیوں نہ بولی بس اُس کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ در آئی تھی۔ ماہی آنکھیں موندھے ترنم کو غور سے دیکھنے لگی۔

"یہ طوائف ہے۔ یہ بات یہ کیوں بھول جاتی ہے!"

ھی کوئی طوائف عورت بن سکی ہے؟ بہت ناممکن سی بات ہے۔ ہاں عورت ضرور طوائف بن سکتی

رت سے طوائف تک کا راستہ وَن وے ہے، جہاں واپسی کا کوئی راستہ نہیں، پھر یہ مُلّانی کیوں لتی ہے۔ ٹکڑوں میں جیتی جیتی کسی دن یہ پاگل ہوجائے گی!" ماہی نے پہلی بار ترنم کے لیے اتنے حقیقت سے سوچا تھا۔

دیکھ لیتے ہیں ترنم بے بی کہ تمہارا اللہ ہماری دیر کرنے میں کون سی بھلائی لیے بیٹھا ہے۔" ماہی ندھے اُچکاتے ہوئے سوچا۔

کی طرح وہ آپا سے کبھی بے خوفی نہ دکھا پاتی تھی۔ ترنم کو تو خود کی پروا نہ تھی، وہ ہر انجام سے بے ٹ پٹانگ حرکات کرتی تھی۔ جب کہ ماہی کے دِل میں چاندنی میڈم کا بے حد خوف تھا وہ اُس کی کا اندازہ کئی بار کر چکی تھی۔ وہ چاندنی میڈم کی حکم عدولی یا حکم میں دیر کرنے کا مطلب جانتی تھی اس بے حد بے چین تھی۔ وہ ہر صورت فنکشن میں ویل ان ٹائم پہنچنا چاہتی تھی لیکن فی الحال اُسے ایسا ہوتا ر آرہا تھا۔

❖❖○❖❖

بر پکی ہے؟" طارق نے محتاط آواز میں فون پر پوچھا۔

جی سر! خبر بالکل پکی ہے۔ وہ لڑکا، جس کی وجہ سے لڑکی نے خودکشی کی تھی اُسی گینگ کا کارندہ ہے۔ رات وہ اس فنکشن میں لڑکیاں سپلائی کرنے اور رقم لینے آرہا ہے۔" طارق کے اسسٹنٹ فیصل کی اطلاع دی۔

میں چیف سے بات کرتا ہوں، تم ریڈ کا انتظام سول پولیس سے کرو۔ لیکن چارج ہم ہی سنبھالیں میں فی الحال اُن لوگوں کی نفری درکار ہوگی۔ مجھے ہر صورت یہ لڑکے لڑکیاں چاہئیں۔" طارق نے آرڈر دیتے ہوئے کہا۔

"اوکے سر! میں گھنٹے تک آپ سے دوبارہ رابطہ کرتا ہوں۔" فیصل نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔

ارق اور اُس کی ٹیم کے پاس اسپیشل فون سیٹ تھے، جو آپس میں رابطے کے لیے تھے، انھیں ٹریس کرنا ن تھا۔

"لالہ یہ سب کیا ہے؟ آج میری برتھ ڈے ہے۔" سائرہ نے روہانسی ہوتے ہوئے کہا۔

"ر میرا جانا بے حد ضروری ہے! لیکن میرا وعدہ رہا میں تمہارے کیک کاٹنے کے وقت تک پہنچ جاؤں گا۔"

ل نے جلدی سے اپنا دوسرا لانگ شوز بھی بند کرتے ہوئے کہا۔

"لالہ! میں آپ سے سخت خفا ہوں۔ آپ کبھی ہمیں وقت نہیں دیتے۔" سائرہ کا موڈ بھائی کے جانے کر ہی آف ہوگیا تھا۔

"دیکھو مسکان! سمعان آنٹی وغیرہ ادھر ہی ہیں، کچھ دیر میں وَلی اور اُس کی فیملی بھی آجائے گی تم سب ساتھ انجوائے کرو۔ میں واپس آجاؤں گا۔"

س احمد سے کہو کہ گھوڑوں پر زین ڈال دے اور تم سب کو رائیڈنگ وغیرہ کروادے جب تک تم

انجوائے کرتے ہو میں واپس آ جاؤں گا۔
''لالہ آپ نے ہمیں بچہ سمجھ لیا ہے، گھوڑ سواری سے بہلائیں گے۔'' سائرہ کی گندمی رنگت سرخ ہو رہی تھی۔ وہ واقعی اُداس ہو رہی تھی۔
''پلیز بچے! کہا ناں آ رہا ہوں۔'' طارق نے تیزی سے اپنی جیپ کی چابیاں اُٹھا کر باہر نکلتے کہا
آج کی ریڈ بہت اہم تھی اس سلسلے میں پہلی کڑی سامنے آ رہی تھی۔ طارق فوراً وہاں پہنچنا چا
تا کہ یہ آپریشن اُس کی موجودگی میں ہو۔ اتفاق یہ تھا کہ وہ اُس مقام سے بے حد قریب تھا۔ اُن کا
ہاؤس اُس مقام کے پاس ہی تھا۔
''سر! آج کے فنکشن میں بہت سی بیوروکریٹ شخصیات بھی ہیں اور کچھ فارنرز بھی!'' فیصل نے ا
سے ملتے ہی پریشانی سے بتایا۔
''ہم یہ ریڈ نہیں کر پائیں گے۔'' طارق کے ماتھے پر پُرسوچ لکیریں تھیں۔
''کون کون ہے اندر؟'' طارق نے پوچھا۔
فیصل نے جن شخصیات کا نام لیا، وہ واقعی طارق کو سوچ میں ڈال گئی تھیں۔
''ایک تو یہ ہمارا سسٹم ہی پورا انوالو ہے۔ ہم اِن کی وجہ سے بے بس ہو جاتے ہیں۔'' طارق نے
اپنے دوسرے ہاتھ پر مارتے ہوئے کہا۔
''لیکن مجھے ہر صورت وہ لڑکے لڑکیاں چاہئیں۔'' طارق نے پُرسوچ انداز میں کہا۔
''فیصل تم ڈیرے کو چاروں جانب سے گھیرو میں تم کو کچھ دیر میں درست صورت حال سے مطلع کر
گا۔'' طارق نے فوراً ایک دوسرا راستا سوچا۔ وہ خود سے اندر جانے کا ارادہ کر چکا تھا۔
اندر تو الگ سے اک جنت آباد تھی۔ لان میں جگہ جگہ رنگین فوارے چل رہے تھے۔ شراب اور ا
وافر مقدار میں موجود تھا۔ دُکھ کی بات تو یہ تھی اس محفل کو اٹینڈ کرنے والے سبز جھنڈے والی گاڑیوں
بیٹھ کر آئے تھے۔
ان میں چار افراد بے حد اہم پوسٹوں پر تھے۔ طارق کو وہ فوراً نظر آ گئے کیوں کہ وہ اسپیشل پہا
میں تھے اور رنگین تتلیوں میں گھرے ہوئے تھے۔
''اسکیوزمی سر! اگر آپ بُرا نہ مانیں تو اپنا دعوتی کارڈ دکھائیں گے۔'' ایک درمیانی عمر کا آدمی ج
اِس تقریب کا منتظم تھا، اُس کے پاس آ کر پوچھ رہا تھا۔
''جی بالکل! میرے پاس کارڈ ہے آپ ذرا اِدھر چل کر دیکھیے!'' طارق نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔
اُسے کسی ایسے بندے کی ہی تلاش تھی جو اُس کی مدد کر سکتا ہو۔ اور وہ بندہ خود اس کے پاس
آ گیا تھا۔
طارق نے اُسے اپنا کارڈ دکھایا تو اُس کے چہرے پر ایک دم سے ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ لیکن
یکدم مطمئن نظر آنے لگا، جس کی وجہ اس تقریب میں اہم شخصیات کا ہونا تھا۔ جن کی وجہ سے پولیس
کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔
''میرا خیال ہے آپ غلط جگہ آ گئے ہیں۔ ہم نے آپ کو مدعو نہیں کیا۔ لیکن چوں کہ آپ

یہاں میں آ چکے ہیں تو ہم آپ کی تواضع کیے بغیر جانے نہیں دیں گے۔'' اب وہ شخص بے حد اعتماد سے
ا
طارق کی مسکراہٹ بے حد جاندار تھی۔
''اگر آپ چاہتے ہیں کہ کچھ دیر بعد آپ ہمارے خاص مہمانوں میں شامل نہ ہوں تو آپ ہمارے
ساتھ تعاون کیجیے۔'' طارق کے لہجے میں ایسا کچھ تھا ضرور جس سے مقابل ایک دم ڈر گیا۔
''دیکھیں آپ ہمیں یوں نہیں ڈرا سکتے۔ میں نے کہا ناں آپ غلط جگہ پر آئے ہیں۔'' اُس شخص کی
آواز اس بار کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔
''میں آپ کے فنکشن میں آنے کی معذرت چاہتا ہوں بس آپ تعاون کریں، آپ کو نقصان نہ
ہو۔'' طارق نے ایک اور پتا پھینکا۔
''کیسا تعاون؟'' اس بار اُس شخص کا جملہ اور لہجہ دونوں پسپا تھے۔

❖❖○❖❖

محبت میں یہ ہوتا ہے
کبھی انسان ہنستا ہے
کبھی انسان روتا ہے
محبت میں یہ ہوتا ہے
کہ وہ لمحہ بھی آتا ہے
کہ اُٹھتے بیٹھتے انسان
کسی نشے میں رہتا ہے
یہ ایسا تیر ہے گویا
جو دل کے پار ہوتا!

سمعان علوی کی گھمبیر آواز ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔ سائرہ کی نظر میں سمعان کے لیے بے خودی تھی
مسکان اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اُس کا دِل خالص انتظار بن کر دھڑک رہا تھا۔ عبدالولی
ابھی تک نہ پہنچا تھا۔
مسکان نے جس طرح آیا امّاں کی منت سماجت کر کے یہاں آنے کی اجازت لی تھی۔ اُسے اب اپنا
یہ مقصد لگ رہا تھا۔ اُس کا کسی چیز میں دِل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ اوپر سے سمعان بے حد رومانی
اشعار سنائے جا رہا تھا۔ لگتا تھا آج وہ اپنا پورا انتخاب سنانے کے موڈ میں ہے۔
سمعان کے معنی خیز لفظ کسی پیٹرول کی طرح کام کر رہے تھے اور وہ با قاعدہ اندر سے جلنے لگی تھی۔
ایسی بے قراری اور بے چینی تھی کہ بار بار گھٹن کا احساس ہونے لگتا تھا۔ دِل بھر بھر آتا تھا۔ وہ
اورنج اور مسٹرڈ رنگ کے کُرتے پاجامے میں ملبوس تھی۔ ساتھ ہم رنگ بالیاں پہنے کھلے سنہری بالوں کے
ساتھ سمعان کو باربی ڈول لگ رہی تھی۔
''مسکان اس باربی ڈول کی آنکھوں کی چمک کیوں ماند ہے؟'' سمعان کو بے چینی سی ہونے لگی تھی

سمعان کو یہ لڑکی شروع سے اپنی اپنی لگتی تھی۔ اُسے اس میں خاص طرح کی کشش محسوس ہوا
اُسے اپنی یہ کشش اور مائل ہونا محبت ہی لگا کرتا تھا۔

''تم کافی لوگی یا چائے؟'' سردی بڑھ رہی تھی۔ سائرہ نے ہاتھ ایک دُوسرے سے رگڑتے
مُسکان سے پوچھا۔

''کافی!'' مُسکان نے کہا۔

''کمال ہے لڑکیاں کافی تو نہیں پیتیں۔'' سمعان نے چھیڑنے کے انداز میں کہا۔

''اور کتنی لڑکیوں کو تم جانتے ہو؟'' سائرہ نے کڑے تیوروں سے پوچھا۔

''صرف ایک! اور وہ میرے ساتھ ہروقت رہتی ہے!'' سمعان نے مصنوعی ڈرنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

''کون ہے وہ؟'' سائرہ نے غور سے اُسے دیکھتے پوچھا۔

''دنیا کی سب سے خوب صورت اور حسین! اور وہ لڑکی ہیں میری ڈیئرسٹ مام، میری ماما۔'' سمعان نے ہنستے ہوئے کہا۔

سائرہ لب بھینچ کر اپنی مسکراہٹ روکنے لگی۔

''تم ایک دم ڈراما ہو!'' وہ کہہ کر اندر کی جانب بڑھ گئی۔

اُسی پَل وَلی کی گاڑی اندر داخل ہوئی۔ گارڈ نے مین پھاٹک کھول دیا۔ لان میں خنکی بڑھ رہی تھی۔ مُسکان کسی بھی شال وغیرہ سے بے نیاز بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کا دِل بہت تیزی سے دھڑکنے لگا۔ سارے دورانیے میں اُسے پہلی بار اپنے دِل کی دھڑکن کا احساس ہوا تھا۔

''اُس کے ساتھ ایک بے حد خوب صورت لڑکی تھی۔'' مُسکان کو بے چینی نے گھیرلیا۔

''ارے وَلی بھائی!'' سائرہ ملازم کے ساتھ چائے اور کافی کے مگ اُٹھوائے باہر آئی اور گرم جوشی سے نگینہ سے بولی۔

''شکر ہے تم آئی ہو!'' سائرہ نے نگی کے گلے لگتے ہوئے کہا۔

''تمہارے بغیر کسی کی آنکھوں کی روشنی کم ہوجاتی۔'' اُس نے نگی کے کان میں سرگوشی کی۔ کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں سائرہ کو دیکھا۔

جواب میں سائرہ کھلکھلادی۔ وہ پیار سے نگی کا ہاتھ تھامے مُسکان کی طرف بڑھی۔

''یہ نگی ہے، وَلی بھائی کی اکلوتی لاڈلی بہن! اور یہ مُسکان میری اکلوتی لاڈلی دوست!'' سائرہ نے دونوں کا آپس میں تعارف کروایا۔

مُسکان نے اطمینان بھری سانس لیتے ہوئے نگینہ کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

''مجھے تم بہت اچھی اور اپنی سی لگی ہو!'' مُسکان نے واقعی اپنے دِل کی بات کہی۔

''مجھے بھی آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔'' نگی کی آواز بے حد مدھم اور دھیمی تھی۔ وہ دھیما بولتی تھی۔

''ارے سائرہ میرا یار کدھر ہے؟'' وَلی کو طارق کی کمی بے حد محسوس ہورہی تھی۔

''یہ تو آپ خود اُن سے پوچھیے گا۔'' سائرہ کی آواز میں ایک دم ناراضگی جھلکنے لگی۔

وَلی نے نہ سمجھنے کے انداز میں سائرہ کا رویّہ دیکھا۔

''کم آن وَلی بھائی! اس ناراض حسینہ کو چھوڑیں اس کا پارہ تو ہروقت ہائی رہتا ہے۔'' سمعان نے ہنستے ہوئے کہا۔

''آپ مجھ سے ملیں، میں طارق کا بہت دُور کا نہایت قریبی کزن ہوں۔'' سمعان نے اپنی فطری خوش مزاجی سے تعارف کروایا۔ وَلی کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ در آئی۔

''میں وَلی ہوں اور طارق کا بچپن کا دوست۔'' وَلی نے سمعان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''میں جانتا ہوں۔ طارق آپ کا بہت ذکر کرتا ہے۔'' سمعان نے وَلی کو چائے کا کپ پکڑاتے ہوئے کہا۔

''اگر میں کافی لے لوں تو آپ کو اعتراض تو نہ ہوگا۔'' وَلی نے سمعان سے کہا۔

''میں کیوں اعتراض کروں گا۔ جس معزز خاتون کے لیے بن کر آئی ہے آپ اُن سے پوچھ لیں۔'' سمعان نے کندھے اُچکاتے مُسکان کی جانب اشارہ کیا۔

مُسکان کتنی دیر سے اُس کے متوجہ ہونے کا انتظار کررہی تھی۔ وہ اُسے ایک بار پھر نہایت اجنبی اور دُور محسوس ہوا، اس کی انا پر بہت کاری ضرب پڑی۔ وہ جب سے آیا تھا، اُس نے ایک بار بھی اُس کی جانب نہ دیکھا تھا۔

''ارے آپ بھی ہیں! السلام علیکم!'' وَلی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''ہونہہ کیسی سلامتی بھیجتے ہو، سب کچھ جب تم نے تباہ کردیا ہے!'' مُسکان اندر سے تڑپی۔

''ظاہر ہے جہاں سائرہ ہوگی وہاں مُسکان ضرور ہوگی۔'' سائرہ نے کافی کا مگ وَلی کو تھمایا۔

''رئیس احمد چائے تھرماس میں ہے تم کپ اور لے آؤ۔'' سائرہ نے ملازم سے کہا۔

''آپ بھی سائرہ جی کے ساتھ بھائی کے کالج میں پڑھتی ہیں؟'' نگی نے اپنی معصوم آنکھیں پھیلا کر مُسکان سے تجسّس وشوق سے پوچھا۔

''ہاں قسمت سے!'' مُسکان نے جلتے ہوئے کہا اور ایک سرد آہ بھری۔

''اس کا مطلب آپ بھی آرٹسٹ ہیں!'' نگی نے خوشی سے کہا۔

''ظاہر ہے آرٹ کالج میں آرٹسٹ ہی ہوں گے۔ ڈاکٹر تو نہیں ہوسکتے۔'' سمعان نے اپنی طرف سے مذاق میں کہا۔ نگی کا شرم سے چہرا سرخ ہوگیا۔

''سمعان! اِٹ از بیڈ جوک!'' سائرہ نے سخت لہجے میں کہا۔

''آئی ایم سوری خواتین! اس وقت ہم تعداد میں کم ہیں۔ مجھے واقعی چپ رہنا چاہیے۔'' سمعان نے ایک بار پھر ڈرنے کی مصنوعی اداکاری کی۔

''تم بھی ناں!'' سائرہ نے اُسے کڑی نظروں سے دیکھا۔

''کیا شخص ہے ناراض ہونے اور غصہ بھی نہیں کرنے دیتا۔'' وہ دِل میں بولی۔

❖❖○❖❖

"مریم بی بی کدھر ہیں؟" زنان خانے کے باہر یہ آواز سیّد سرفراز کی تھی۔ وہ شاید کسی ملازم سے اُس کی بابت پوچھ رہا تھا۔

"وہ جی اپنے کمرے وچ ہیں۔" ملازمہ نے جواب میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔" ساتھ ہی اس کے قدموں کی آواز قریب آ گئی۔

مریم کے کمرے میں موجود زبیدہ کا دِل بوکھلا گیا اُس کا سرخ ہوتا رنگ اُس کے دِل کی کیفیت بیاں کر رہا تھا۔

"آپ؟" وہ اُس کے پاس آ کر رُک گیا۔

زبیدہ کو سر پر آنچل سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔

"جی! وہ مریم بڑی بی بی کی بات سننے اُن کے کمرے میں گئی ہے۔" زبیدہ نے زلیخا بی بی کی جانب اشارہ کیا۔

"تم کب آئیں؟" سیّد سرفراز نے اُس کا سر سے پاؤں تک بھرپور جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"آج ہی آئی ہوں۔" زبیدہ نے انگلیاں چٹخاتے ہوئے جواب دیا۔

"آج ہی آئی ہو اور آج ہی حویلی آ گئیں، تمہارا بہت دِل لگتا ہے حویلی میں۔" سیّد سرفراز نے اُس کے نہایت قریب ہو کر پوچھا۔ یہاں تک کہ زبیدہ کو اُس کے وجود سے اُٹھتی خوشبو اپنے گرد حصار باندھتی محسوس ہوئی۔

"وہ! میں مریم سے ملنے آئی تھی۔" زبیدہ نے تھوک سے حلق تر کرتے ہوئے بمشکل کہا۔

"زبیدہ!" سیّد سرفراز کا اُسے یوں بلانا سر سے پیر تک گھبراہٹ میں مبتلا کر گیا۔

"مجھے کیوں لگا کہ تم صرف مریم بی بی کے لیے نہیں آتیں، کیا میں اُسے اپنی خوش فہمی کہوں؟" سیّد سرفراز اِس دودھ مکھن جیسی لڑکی کو دیکھ کر ہمیشہ اپنے حواس کھونے لگتا تھا۔

زبیدہ نے وہاں سے نکلنے کی کوشش کی لیکن وہ اُس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔

"پلیز مجھے جانے دیجیے!" زبیدہ سے سرفراز کی اتنی قربت برداشت کرنا دوبھر ہو رہا تھا۔

"پہلے تم میرے سوال کا جواب دو!" سید سرفراز نے نشیلی نگاہوں سے اُس نشے کی بند بوتل جیسی لڑکی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"زبیدہ!" باہر مریم کی آواز سنائی دی۔ سید سرفراز ایک دم بوکھلا کر پیچھے ہٹا، یہی حال زبیدہ کا تھا۔ سید سرفراز کے پہلو سے سکڑ کر نکلی اور بھاگ کر دروازے تک آئی پھر ایک دم پلٹی۔

"شاہ جی! انسان خوش فہم بے شک نہ ہو لیکن اُسے خوش گمان ضرور ہونا چاہیے!" یہ کہہ کر وہ دھیرے سے مسکرائی اُس کے دونوں گالوں میں بھنور پڑ گئے۔" سیّد سرفراز کو اُس کا یوں شاہ جی کہنا بے حد بھلا اُسے ایک دم سے گدگدی ہوئی۔

اُس کے دِل میں اس خوش رنگ تتلی کو چھونے کی خواہش بے حد زور آور ہو گئی تھی۔ لیکن وہ ایک سرد آہ بھر کر رہ گیا۔ وہ تتلی کچھ سنے بغیر ہی بھاگ گئی تھی۔

"تم کس راہ کی طرف جانے لگے ہو؟" دماغ نے اُسے فوراً ڈانٹا۔ یہ تمہاری راہ گزر تو ہو سکتی ہے لیکن

تمہاری منزل مقصود ہرگز نہیں۔

تمہارا خواب کہ تم طاقت اور دولت میں اپنے خاندان میں سب سے زیادہ بڑے ہو وہ خواب زبیدہ کی بدولت میں ادھورا رہ جائے گا! یہ خیال سیّد سرفراز کے لیے اس قدر خوف ناک تھا کہ اس خیال نے اُس کے دماغ سے زبیدہ کا سارا نشہ بھگا دیا۔

"نہیں! سید سرفراز کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرے گا۔" اور یوں سیّد سرفراز نے دِل کی ہر بات کو رد کر دیا۔

سیّد سرفراز کے لیے چھوٹی امی کی طرح کوئی آٹھ دس گاؤں ساتھ لانے والی ہی ہوگی۔ بچپن سے اُس کی ماں نے جو معیار اُسے بتایا تھا اُس کا ذہن اُسی کے گرد گھوما کرتا تھا۔

ریحانہ بی بی نے ساری عمر زلیخا کو اپنے سے زیادہ اہم محسوس ہوتے دیکھا تھا۔ اور اُسے ہمیشہ لگتا تھا کہ زلیخا چوں کہ ڈھیروں زمین اپنے ساتھ لائی ہے اس لیے وہ آتے ہی چھا گئی ہے۔ اُس نے اپنے بیٹے کے دِل میں زمین و جائیداد کی محبت اور اہمیت پیدا کر دی تھی۔ جو عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتے بڑھتے جنون بننے لگی تھی۔

اور جنون تو ہمیشہ تباہیاں ہی پیدا کرتے ہیں۔

❖❖○❖❖

دِل کے صحرا میں کوئی آس کا آہو لکھ دے
میرے حصّے میں فقط پیار کی خوشبو لکھ دے

زبیدہ کتنی ہی دیر سے آپ ہی آپ مسکرائے جا رہی تھی۔ وہ اِرد گرد کے ماحول سے بالکل کٹی بیٹھی تھی۔ جب سے وہ حویلی سے آئی تھی اُس کی کچھ ایسی ہی حالت تھی۔ چاند نے لان کے کتنے ہی چکر لگا لیے تھے کہ زبیدہ کو وہ متوجہ کر سکے لیکن وہ لڑکی جانے کن خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی، متوجہ ہو ہی نہیں رہی تھی۔ بالآخر وہ اُس کے سر پر جا کھڑا ہوا۔

"زبیدہ بیڈمنٹن کھیلو گی؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"نہیں چاند بھائی! میرا کھیلنے کا بالکل موڈ نہیں ہے۔" زبیدہ نے بلاوجہ مسکراتے ہوئے کہا، آج تو بغیر وجہ کے ہی مسکان اُس کے ہونٹوں پر آ ٹھہری تھی۔

"تم جب سے حویلی سے واپس آئی ہو بہت بدلی بدلی لگ رہی ہو۔" وہ اُس کے فنگر ٹپس پر تھی۔ کب اُس کا موڈ اچھا ہوتا ہے کب خراب! وہ سب سے باخبر رہتا تھا۔

"چاند بھائی آپ نے ایسا کیوں کہا؟" زبیدہ کے چہرے کی بوکھلاہٹ بے حد واضح تھی جس بات کو وہ سینت سینت کر رکھ رہی تھی وہ کیسے کسی کے سامنے آ سکتی ہے۔ اُس کا دِل بے اختیار گھبرایا۔

"وہ اس لیے کہ تم جب سے آئی ہو بہت چپ چپ ہو۔" یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔

"اور کیا؟" زبیدہ نے اپنی خوبصورت آنکھوں کو تقریباً پورا کھولتے ہوئے پوچھا۔

"اور تم بلاوجہ مسکرائے جا رہی ہو۔" چاند یہ کہہ کر اُس کی جانب غور سے دیکھنے لگا۔

"توبہ ہے آپ تو ڈرا کر رکھ دیتے ہیں!" زبیدہ نے سکون بھرا گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کیا میں تم کو ڈراؤنا لگتا ہوں؟" چاند میاں بے حد سادہ تھے انہوں نے جلدی سے پوچھا۔

"ارے نہیں! میں وہ والا ڈراؤنا نہیں کہہ رہی بلکہ دوسرا۔ اچھا چھوڑیں ان باتوں کو، چچی امی کا کیا حال ہے؟" زبیدہ نے بات کا رُخ اپنی جانب سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہی ہیں۔ اُن کا بلڈ پریشر جب جب بڑھتا، ہے سر کا درد شدت اختیار کر جاتا ہے۔" چاند میاں نے گہری سانس بھر کے کہا۔

"جب سے چچا ابو فوت ہوئے ہیں، چچی امی زندگی اور دُنیا والوں سے کٹ کر رہ گئی ہیں، آپ کیوں نہیں سمجھاتے اُن کو۔ اس طرح تو وہ اپنی صحت مزید تباہ کرلیں گی۔" زبیدہ نے نہایت فکر مندی سے پوچھا۔

کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس قدر عقل مند باتیں کرنے والی لڑکی سیّد سرفراز کے سامنے بالکل ہی عقل و ہوش کا دامن چھوڑ دیتی ہے۔ شاید اسی لیے محبّت کو اندھا کہا جاتا ہے، جو بینائی رکھنے کے باوجود کچھ نہیں دیکھ پاتی۔

"اماں کو میں نے کئی بار کہا ہے لیکن وہ ابو کے بعد بس اُن کے کمرے کی ہی ہو کر رہ گئی ہیں۔" چاند میاں کے لہجے میں بے حد تاسّف تھا۔

"تم سناؤ تمہارے دادا دادی کا کیا حال ہے۔" چاند نے پوچھا۔

"چاند بھائی! یہ زیادتی ہے آپ ایسے کیوں کہتے ہیں؟ وہ آپ کے بھی تو دادا دادی ہیں۔" زبیدہ نے تنبیہی انداز میں کہا۔

"وہ میرے دادا دادی کیسے ہو سکتے ہیں زبیدہ! انھوں نے ابو کو عاق کر دیا تھا۔ آج تک میری ماں کو بہو نہیں مانا تو میں کیسے اُن کا پوتا کہلا سکتا ہوں۔" چاند کا لہجہ بے حد ٹوٹا ہوا تھا۔

"زبیدہ ایک دم تڑپ اُٹھی وہ بیحد نرم دِل تھی۔"

"چاند بھائی! کہہ دینے سے خون کے رشتے نہیں ٹوٹتے۔"

"زبیدہ رشتے نبھانے سے بنتے ہیں!" چاند میاں جو سب کی نظر میں بہت سادہ اور بے ضرر تھے۔ بہت گہری بات کہہ گئے تھے۔

"یہ تو تایا ابو کا بڑا پن اور محبت ہے جنہوں نے میرے ابو کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑا۔ ابو کی وفات کے بعد امی مجھ سے لاپروا ہو گئیں تب تایا ابو ہی نے میری تعلیم و تربیت پر توجہ دی۔ آج میری تعلیم تایا ابو کی مہربانیوں کی وجہ سے جاری ہے۔" چاند میاں بے شک سادہ انسان تھے لیکن احسان فراموش ہرگز نہ تھے۔

"تایا ابو نے ہر مقام پر ہمارا ہاتھ تھاما ہے میں نہ صرف اُن کی بے حد عزّت کرتا ہوں بلکہ میں اُن سے بے حد محبّت کرتا ہوں۔ اگر کبھی میں اُن کے کسی کام آپاؤں تو میں اِسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوش قسمتی جانوں گا۔" چاند کا لہجہ بے حد سچا اور کھرا تھا۔

اُس کا لہجہ بتاتا تھا کہ وہ ملک احتشام کے لیے جان تک نچھاور کر سکتا ہے۔

❖❖○❖❖

طارق نے بہت حکمت عملی سے سارا کام کیا تھا۔ ورنہ اُن اہم حکومتی شخصیات کی موجودگی میں ریڈ ممکن ہی نہیں تھی۔ طارق نے جس بندے کو پکڑا تھا، وہ سارے فنکشن کے انتظام کا کرتا دھرتا تھا۔

"طارق نے اُسی کے ذریعے میزبان کو اطلاع کروائی کہ وہ سب چاروں جانب سے گھیرے جا چکے ہیں۔ اگر وہ لوگ اُن سے تعاون کریں گے تو طارق اور اُس کی ٹیم مطلوبہ بندوں کو گرفتار کرے گی۔ اگر وہ تعاون نہیں کریں گے تو طارق کے پاس اتھارٹی لیٹر ہے کہ وہ جائے وقوعہ پر سب کی گرفتاریاں لے لے۔" یہ طارق نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا۔ اُس کی قسمت اچھی تھی کہ یہ تیر درست نشانے پر بیٹھا تھا۔ میزبان بہت بُری طرح گھبرا گیا۔

طارق نے اُسے اور اُس کے اہم مہمانوں کو ایک الگ کمرے میں بٹھا دیا اور میزبان کے اُس خاص بندے کی مدد سے آپریشن مکمل کیا۔

جن لڑکوں کو وہ پکڑنے آیا تھا وہ اسلحے سے لیس تھے، انہوں نے فوری گرفتاری نہ دی، دس پندرہ منٹ وہ باقاعدہ فائرنگ کرتے رہے۔ لیکن طارق نے ڈیرے کے دوسرے راستے سے اُن کو جالیا اُن کا ایک بندہ نہایت زخمی تھا۔

اُن کے ساتھ موجود کال گرلز نے بہت زیادہ شور مچایا تھا، وہ پہلے دھمکیوں اور گالیوں کا استعمال کرتی رہیں پھر اُن کے ساتھ ایک بڑی عمر کی نائیکہ نے باقاعدہ منت سماجت کرنی شروع کر دی۔ لیکن طارق نے نہایت سختی سے اُن کو ڈانٹتے ہوئے بند گاڑی میں لوڈ کروا دیا۔

"سر! یہ نائیکہ اور اس کی آٹھ لڑکیاں دوسری پارٹی کی ہیں جب کہ جس پارٹی کی ہمیں تلاش تھی اس کی دو لڑکیاں کم ہیں۔" فیصل نے اطلاع دی۔

"ساتھ میں یقیناً کوئی نہ کوئی اُن کا بندہ بھی ہوگا۔ تم تلاش کرو یہیں کہیں ہوں گی ہم اتنی دیر سے موجود ہیں وہ کہاں نکل کر جا سکتی ہیں۔" طارق نے فیصل کو ایک بار پھر ڈیرے کے اندر بھیجا۔

"سر! ہم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے، وہاں کوئی نہیں ہے۔" فیصل نے کوئی بیس منٹ بعد آ کر اطلاع دی۔

"ہماری اطلاع کے مطابق وہ لڑکیاں بھی اپنے اڈے سے نکلی تھیں لیکن حیرت ہے وہ کہاں غائب ہو گئیں! ہو سکتا ہے ہمارے سول اسٹاف میں سے کسی نے مخبری کر دی ہو۔" فیصل نے اپنا شک ظاہر کیا۔

"نہیں یار! اگر انہوں نے مخبری کرنی ہوتی تو یہ اندر جو موٹی موٹی آسامیاں بیٹھی ہیں، سب سے پہلے ان کو اطلاع ہوتی اور یہ لوگ بھاگتے جبکہ وہ بہت بُری طرح گھبرائے ہوئے ہیں اس کا مطلب ہے کہ وہ بے خبر تھے۔" طارق نہایت ذہین تھا وہ دُور کی کوڑی لایا۔

"تو پھر وہ لڑکیاں کہاں گئیں؟" فیصل نے شاید خود سے باآواز بلند سوال کیا۔

"بس یار! یقیناً ان کی قسمت اچھی ہوگی۔" طارق نے پسٹل اپنی جیکٹ میں واپس رکھتے ہوئے کہا۔

اُسی پل گھڑی پر اُس کی نظر پڑی، رات کے سوا آٹھ ہو رہے تھے۔ وہ جو اتنی دیر سے سائرہ کو بھولا ہوا تھا فرصت ملتے ہی یاد آیا کہ وہ کس آفت کی برتھ ڈے سے غیر حاضر ہے۔ اُس نے پریشانی سے ماتھا مسلا۔

"یار فیصل تم ایک فیور کرو گے؟" طارق نے فیصل سے درخواست کرتے ہوئے کہا۔

"سر پلیز! آپ کہیے یوں شرمندہ تو نہ کریں۔" فیصل نے الرٹ ہوتے ہوئے کہا۔

تم ان سب کو سیدھا اسپیشل سیل لے جانا، سول تھانے لے جانے کی ضرورت نہیں ہے، پندرہ منٹ میں ان کے لیے سفارشی فون شروع ہو جائیں گے اور ہماری ساری محنت اکارت جائے گی۔ میں انشاء اللہ صبح آؤں گا تم اس سارے معاملے کو سنبھال لو گے ناں؟" طارق نے پوچھا۔

"سر! ایس ایچ او صاحب کو سنبھال لیں۔ یہ گرفتاریاں وہ اپنی ملکیت سمجھ رہے ہیں کافی دیر سے فون کر رہے ہیں وہ ہمیں۔" فیصل نے اصل صورت حال بتائی۔

"یار اُن کی تو رال ٹپکنی ہی ہے! اُن کو تو ان کی صورت میں پیسہ نظر آ رہا ہے لیکن ہمیں تو خاص مقصد کے لیے یہ گرفتاریاں درکار تھیں۔ تم ان کو لے کر چلو میں ایس ایچ او صاحب کو سنبھالتا ہوں۔" طارق نے عجلت میں گھڑی کی جانب دیکھا۔

گھڑی آٹھ بیس بجا رہی تھی۔ وقت تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ یا اللہ اب تو سائرہ کے غصے سے تُو ہی بچا سکتا ہے۔ مجھے آخر ان ایس ایچ او صاحب سے بھی تو کچھ دیر سر کھپانا ہوگا۔

کچھ دیر پہلے اپنی ٹیم کو لیڈ کرتا مختلف حکمت عملیاں بناتا وہ ریزرو اور سنجیدہ سا طارق بہن کے لیے بے حد سوفٹ تھا۔ محبتیں انسان کی کمزوری ہوتی ہیں، ہر شخص کسی نہ کسی طرح رشتوں میں بندھا ہوتا ہے اور کچھ رشتے اگر اُن کی زندگیاں مضبوط بناتے ہیں تو وہ ہی ان کو کمزور کر دیتے ہیں۔

طارق کی زندگی میں بھی بہن کا رشتہ اُس کی کمزوری تھا۔

❖❖○❖❖

"اب تم کیک کاٹ بھی لو! بھوک سے میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔" سمعان نے سائرہ سے کہا۔

سائرہ پہلے ہی بے حد آف موڈ میں بیٹھی تھی، ایک دم رو پڑی۔ تقریباً سب ہی لوگ گھبرا گئے۔ مسکان اور نگینہ نے اُسے گلے لگا کر بمشکل چپ کروایا۔

"تم تو بہت بہادر لڑکی ہو اتنی سی بات پر رو پڑیں اگر زیادہ بھوک لگی ہے تو ہم تھوڑا بہت کھا لیتے ہیں۔" وَلی نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

"نہیں! میں بھوک کی وجہ سے نہیں رو رہی؟" سائرہ نے اپنی بھیگی پلکیں اُٹھا کر کہا۔

"وَلی کو ایک دم وہ نگینہ کی طرح لگی۔ کیا سب لڑکیاں اتنے ہی چھوٹے دِل کی مالک ہوتی ہیں۔" وَلی نے دِل ہی دِل میں سوچا۔

"تو پھر تم کیوں روئی تھیں۔" وَلی نے اُس کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

سائرہ کے بالکل ساتھ مسکان بیٹھی تھی اُس کا دِل تو لگتا تھا کہ سینہ توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

"اپنے بھائی کی وجہ سے پریشان ہو؟" وَلی نے سائرہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار سے پوچھا۔

"لالہ ہمیشہ یوں ہی کرتے ہیں۔ اُن کی نظر میں میری کوئی اہمیت نہیں ہے نکل گئے مجھ سے بھی اہم کام نمٹانے۔" سائرہ نے روئی روئی آواز میں شکوہ کیا۔

"دیکھو تم میرے دوست کو غلط سمجھ رہی ہو۔ وہ ایک وقت میں بہت جگہوں میں پھنسا ہوتا ہے، اور پھر میں بھی تو تمہارا بڑا بھائی ہی ہوں۔" وَلی نے اُسے کول ڈاؤن کرتے ہوئے کہا۔

"دھت تیرے کی! یہ وَلی بھی عجیب انسان ہے، کبھی کسی لڑکی کے پاس جا کر بیٹھا بھی تو اُسے بھی بہن بنا لیا۔" ٹی ٹو نے مونگ پھلی چھیلتے ہوئے با آواز بلند کہا۔

"ہر کوئی آپ کی طرح تھوڑا ہی ہوتا ہے۔" سائرہ کی ایک اور دوست منزہ نے جل کر کہا۔

"واقعی ہر کوئی میری طرح ہینڈسم نہیں ہو سکتا۔" ٹی ٹو نے شان بے نیازی سے کہا۔

"اللہ رے خوش فہمیاں۔" حنا نے جل کر کہا۔

"ایکسکیوزمی! کیا آپ مجھ سے مخاطب ہیں۔" ٹی ٹو نے باقاعدہ اُن کی جانب مُڑ کر پوچھا۔

"حنا اور منزہ اُس کی اتنی جرأت پر ایک دم بوکھلا گئیں۔" جواب میں ٹی ٹو نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"میں واقعی بہت ہینڈسم ہوں، لڑکیوں کی بولتی میرے سامنے یوں ہی بند ہو جاتی ہے۔" ٹی ٹو نے شرارت سے اُن کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

حنا اور منزہ نے باقاعدہ غصے سے ہونہہ کہہ کر رُخ موڑ لیا۔

اسی پَل باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ اور یہ ہارن طارق کی جیپ کا تھا۔ سائرہ کا مُرجھایا ہوا چہرہ ایک دم کِھل گیا لیکن دوسرے ہی پَل وہ منہ بنا کر کھڑے سے بیٹھ گئی۔ وَلی نے بہت دِلچسپی سے اُس کا چہرہ دیکھا۔

"شاید ساری بہنیں اتنی ہی لاڈلی ہوتی ہیں۔" وہ سائرہ کا سر تھپتھپاتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو مائی ڈیئر سسٹر! اب کیک کاٹ لو ورنہ تمہاری ناراضگی میں باقی بھوکے رہ جائیں گے۔" وَلی نے ہلکے پھلکے انداز میں اُسے سمجھایا۔

"سوری حضرات۔ ارے یہاں تو خواتین بھی ہیں۔" طارق نے ہال میں داخل ہوتے بلند آواز میں کہا۔

"اور ایک خاتون تو بے حد غصے میں ہیں۔" طارق نے سائرہ کو دیکھتے ہوئے کہا، سائرہ نظر پھیر کر کھڑی تھی۔

"کم آن سائرہ! یہ سب بعد میں کر لینا تمہارے کیک کاٹنے نے آج تو لٹکا کر رکھ دیا ہے۔" حنا نے بھی سمجھایا۔

"پلیز سائرہ موڈ ٹھیک کر لو۔" طارق نے بھی کان میں آ کر سرگوشی کی۔

سائرہ میں سب سے اچھی خوبی اُس کا غلط بات پر سوری کرنا اور دُرست بات کو مان لینا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کا حلقہ احباب بے حد زیادہ تھا۔

سائرہ نے تالیوں کی گونج میں کیک کاٹا۔ اُس کے بعد پُرتکلف کھانا تھا طارق نے بہترین دو تین ڈش منگوائے تھے۔ لان میں باربی کیو کا الگ انتظام تھا، ساتھ سبز چائے کا دور چلا، سب ہی نے بے حد انجوائے کیا۔

دعا، حنا، منزہ، ٹی ٹو، کاشف وغیرہ سائرہ کے کالج سے آئے تھے۔ سب ہی اپنے اپنے گھروں میں دور

تین دِن کا کہہ کر آئے تھے کیوں کہ سائرہ نے پلان کر کے اپنی برتھ ڈے کے بہانے پکنک کا پروگرام بنا تھا۔

''بھئی کھانا تو ہوگیا لیکن ہم میں سے کوئی بھی نہیں سوئے گا۔ آج رات ہم بون فائر کریں گے، بار روز روز مل بیٹھنے کا موقع کہاں ملتا ہے۔'' ٹی ٹو نے باآواز بلند تجویز پیش کی۔

''ویسے ٹی ٹو صاحب کی تجویز پر غور کیا جاسکتا ہے۔'' طارق نے نگی کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے ہاں میں ہاں ملائی۔ سارے دورانیے میں ایک بار بھی اُس کے سر سے دوپٹا نہ سرکا تھا۔

''سر پر دوپٹا اس کی تربیت کا حصّہ تھا۔ اچھی تربیت ہو تو دوپٹے شاید یوں ہی گوند سے سر پر چپکے رہتے ہیں۔'' طارق کے دِل میں نگی کی ادا کسی ٹھنڈک کی طرح اُتری تھی۔

''لیکن ہم کریں گے کیا؟'' سمعان نے پوچھا۔

''مجھے پتا تھا کہ یہ بور ترین سوال تم ہی کر سکتے ہو۔'' سائرہ نے گرم شال نگینہ اور مُسکان کو تھماتے ہوئے کہا۔

مُسکان اور نگینہ کو بالکل اندازہ نہ تھا کہ رات میں یہاں ٹھنڈ اِس قدر بڑھ جاتی ہے۔

''یہاں کھلی جگہ ہے ناں پھر چھتیں بہت اُونچی ہیں، اس وجہ سے یہ جگہ بے حد ٹھنڈی ہوجاتی ہے۔'' سب اپنے اپنے مشورے ایک دوسرے کو دے رہے تھے۔'' سائرہ مُسکان اور نگینہ کو اندر لے آئی تاکہ سب کے لیے گرم شالز اور بیٹھنے کے لیے دریاں نکالی جاسکیں۔

''ہم چھوٹے ہوتے تھے تو امی اور خالہ کے ساتھ اکثر یہاں آتے تھے۔ نانا ابو نے یہ فارم ہاؤس امی کو گفٹ کیا تھا۔ آنی کا خیال تھا کہ اس فارم ہاؤس کو بیچ دینا چاہیے لیکن امی نہیں مانتی تھیں۔ یہاں نانا ابو کے ہاتھ کے لگائے درخت ہیں، جس گھوڑی سے نانا ابو پیار کرتے تھے وہ تو کب کی مر چکی لیکن اُس کے بچّوں کے بھی بچّے ہیں۔ پہلے نانا ابو کی وجہ سے امی اِس فارم ہاؤس کو نہ بیچتی تھیں، اب طارق بھائی امی کے بعد اس جگہ کو بیچنے کے حق میں نہیں ہیں۔''

''امی جب جب اُداس ہوتی تھیں وہ یہاں آتی تھیں، گھنٹوں وہ اُس برگد کے درخت کے پاس بیٹھ کر جانے کیا سوچا کرتی تھیں۔ امی اپنے آخری دِنوں میں یہاں آگئی تھیں۔ یہ اُن کا کمرا ہے۔'' سائرہ نے ایک لاکڈ کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ پہلے نانا ابو کا کمرا تھا۔ امی کی ڈیتھ کے بعد آنی نے یہ کمرا ہمیشہ کے لیے بند کروادیا تھا۔ اب بس ہمارا خاص ملازم رئیس احمد اس کو صفائی کرنے کے لیے کھولتا ہے۔'' سائرہ نے رنگین شیشوں والے دروازے پر یوں پیار سے ہاتھ پھیرا، جیسے وہ کوئی جاندار چیز ہو۔

''مجھے یہاں امی کی خوشبو آتی ہے۔'' سائرہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

''سائرہ! جو اپنے چلے جاتے ہیں وہ مر کر بھی ہمارے دِلوں میں زندہ رہتے ہیں۔ میری آیا اماں کہتی ہیں کہ اچھی اولاد والدین کا صدقہ جاریہ ہوتی ہے۔ ہمیں اتنا اچھا انسان بننا چاہیے کہ ہمارے ماں باپ کی روحوں کے لیے ہمارے اعمال تاعمر کے لیے صدقہ جاریہ بن جائیں۔'' مُسکان نے مدھم لہجے میں کہا۔

جواب میں سائرہ نے روئی روئی آنکھوں کے ساتھ مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ ایسا کرتے وقت وہ

مُسکان کو کسی معصوم پیاری بچّی کی طرح لگی۔

''نگینہ بے حد خاموش تھی۔ وہ بے حساس لڑکی تھی کسی کو بھی دُکھی دیکھ کر وہ خود سے اُداس ہو جاتی تھی، ساری عمر اُس نے والدین اور بھائی کا بے حد پیار پایا تھا۔ غم دُکھ کیا ہوتے ہیں، وہ ان سے دُور تھی اور کبھی جو کسی کو کسی تکلیف میں مبتلا دیکھتی تو بے حد دُکھی ہو جاتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ایسے احساس میں کیا کرنا چاہیے۔''

وہ شروع سے کم گو رہی تھی پھر روشن آرا نے کبھی کسی تکلیف کا احساس اُسے نہ ہونے دیا تھا لیکن وہ اپنی طبیعت میں بے انتہا حساسیت رکھتی تھی، اس لیے وہ سائرہ کو دُکھی دیکھ کر بے حد دُکھی ہوگئی تھی۔

''سائرہ! چلو کچھ گرم شالز وغیرہ کا انتظام کرلیں ورنہ سارا وقت یہیں گزر جائے گا۔'' مُسکان نے اُس کی توجہ بٹانے کے لیے کہا۔

''ہاں چلو!'' سائرہ انہیں لیے اسٹور روم میں آگئی۔ بے حد صاف اسٹور روم میں پیٹیاں اور بکس پڑے تھے، جیسے یہاں کسی کی مستقل رہائش ہو۔ مُسکان نے اپنی حیرت کا اظہار بھی کردیا تھا۔

سائرہ نے مسکراتے ہوئے چابیوں کا گچھا رئیس احمد سے لیا۔ بس یار نانا ابو کے بعد یہ کام امی اپنی نگرانی میں یوں کرواتی تھیں، جیسے یہاں کسی کو آنا ہو۔ نانا ابو کے دور میں اُن کے یار دوست اُن کے پاس رہنے آتے تھے اس لیے وہ ڈھیروں بستر بنوا کر رکھتے تھے۔ انہوں نے ہر طرح کے موسم کا بستر بنوا رکھے تھے۔

''یہاں آٹھ بیڈروم ہیں تم دیکھو گی کس طرح ہر بیڈروم ہر طرح کی سہولت سے مزّین ہے۔ یہ سب امی نے نانا ابو کے بعد مینٹین رکھا ہے۔'' سائرہ آج یادوں کی بھول بھلیوں میں گم تھی۔ وہ بار بار ماں اور نانا کا ذکر لے کر بیٹھ جاتی تھی۔

رئیس احمد کی مدد سے اُن کو اپنے مطلب کی کافی چیزیں مل گئی تھیں۔ لڑکے لکڑیاں اکٹھی کر کے مٹی کا تیل اُن پر ڈالنے کا مشورہ دے رہے تھے۔

''یار پیٹرول ڈالنا پڑے گا۔ پھر ہی تم لوگوں کے بون فائر کا ارمان پورا ہوسکتا ہے۔'' وَلی نے ٹی ٹی اور سمعان سے کہا جو زور وشور سے بحث میں مصروف تھے۔

آگ کے اردگرد دریاں بچھا کر سب بیٹھ گئے۔ سب نے مختلف گیمز کھیلنے کا مشورہ دیا۔ شعر وشاعری کی ٹانگیں بازو توڑے گئے۔ پھر پہیلیاں بوجھی گئیں۔

ٹی ٹو نے سب سے زیادہ ڈراوَنی کہانی سنانے والے کے لیے انعام کا اعلان کیا۔ اُس کے ساتھ ہی سب نے ایک سے بڑھ کر ایک گپ ماری۔ نگینہ اور حنا بے حد سہمی ہوئی تھیں۔ نگینہ تو مُسکان کے ساتھ بیٹھی تھی وہ اُس کے اندر گھسے جارہی تھی۔

''کم آن یار! ایسے ہی جھوٹے قصّے سُنا رہے ہیں۔'' مُسکان نے نگی کا نرم نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

وَلی نے طارق کو کوئی اشارہ کیا تھا طارق بے حد چپکے سے اُٹھ کر اندر آگیا۔ پھر چڑیل کی آواز لڑکی اور لڑکے کے بے حد قریب سنائی دی۔ ''ٹی ٹو نے سنسنی خیز انداز میں اپنی کہانی جاری رکھی ہوئی تھی۔

''ایکچوئلی وہ چڑیل نہیں تھی۔'' ٹی ٹو نے تھوڑا رُکتے ہوئے کہا۔

''تو پھر وہ کون تھی۔'' منزہ نے بچوں کی طرح کہانی میں گم ہوتے پوچھا تھا۔

''یار چڑیلیں اتنی خطرناک نہیں ہوتیں، خطرناک تو بدروحیں ہوتی ہیں۔'' ٹی ٹو کی بات پر سب لڑکیاں سہم گئیں۔

وہ بدروح تھی، جو لڑکے کو ملی تھی۔ لڑکی نے کہا تم گھبراؤ نہیں، چڑیل ہوتی تو وہ کبھی انسانی شکل میں نظر نہ آتی!

لڑکا مطمئن ہو گیا لیکن لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا وہ دراصل کچھ اس طرح نظر آتی! ساتھ ہی لڑکے کی جان ہی نکل گئی کیوں کہ اُس کے ساتھ موجود لڑکی ایک بدروح کی شکل اختیار کر گئی تھی۔

اُس نے اپنا ہاتھ لڑکے کی گردن پر رکھ کر کہا کہ بدروح کے ہاتھ ایسے ہوتے ہیں۔ ایک نہایت ہی ڈراؤنا ہاتھ ایک دم اُس کے سامنے آ گیا۔ ٹی ٹو نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

''کیا ایسا ہاتھ...؟'' ٹی ٹو کو اپنے پیچھے سے آواز سنائی دی۔

ٹی ٹو نے پیچھے مُڑ کر دیکھا ایک نہایت ڈراؤنا ہاتھ اُس کے سامنے تھا۔ ٹی ٹو سے ایک لفظ بھی نہ بولا گیا کیوں کہ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ لڑکیوں کی چیخیں بے ساختہ تھیں۔

''ارے۔ ارے کاؤن ڈاؤن! یہ میں ہوں۔'' طارق نے سر سے چادر اُتار کر کہا۔

''یہ تو بہت بہادر بنا سب کو ڈرا رہا تھا اس کو کیا ہوا؟'' منزہ اور سائرہ نے ٹی ٹو کے سر پر کھڑے ہو کر پوچھا۔

''یار دیکھو کہیں اسے دِل کا دورہ نہ پڑ گیا ہو۔'' سمعان نے واپس اپنے حواسوں میں آ کر کہا۔ ہر ایک کی طرح وہ بھی ایک پَل کو ڈر گیا تھا۔

''ٹی ٹو اُٹھو۔'' وَلی نے پانی کے چھینٹے مار کر اُسے ہوش دِلایا۔

''وہ۔ چڑیل۔ نہیں بدروح۔'' ٹی ٹو نے بدحواس ہو کر کہا۔

''چلی گئی وہ بدروح! لیکن جاتے جاتے وعدہ لے کر گئی ہے کہ آئندہ آپ جھوٹی کہانیاں سُنا کر دوسروں کو تنگ نہیں کریں گے۔'' سائرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ویسے وہ بدروح یہ کھڑی ہے۔'' سائرہ نے طارق کی جانب اشارہ کیا۔

ٹی ٹو کو ساری بات سمجھ آ گئی تھی۔ وہ بے حد شرمندہ تھا۔

''تم بہتر محسوس کر رہے ہو؟'' طارق نے سوری کر کے کہا۔

''اٹس او کے یار۔'' ٹی ٹو ابھی تک بے حد شرمندگی میں گھرا ہوا تھا۔

''تم یہ شال لے لو، بُری طرح کانپ رہے ہو۔'' وَلی نے اُسے اپنی شال تھمائی، جسے ٹی ٹو نے بے حد خاموشی سے تھام لیا۔

طارق نے لکڑیوں پر مزید پیٹرول چھڑکا تو الاؤ مزید روشن ہو گیا تھا۔ وَلی نے طارق کے اصرار پر اپنا وائلن نکال کر بے حد خوبصورت دُھن بجائی۔

ماحول پر بے حد سحر طاری تھا۔

مُسکان کو لگ رہا تھا کہ وہ اور وَلی ایک دُوسرے کے پاس موجود ہیں، ان کے سوا وہاں کوئی نہیں۔ وہ آپ دھیرے دھیرے گم ہوتے محسوس کر رہی تھی۔

چونکی تو تب، جب لڑکوں نے خوب شور مچا کر وَلی کو داد دی۔ ''یار وَلی کوئی فوک دُھن ہو جائے یہ الف کی فرمائش تھی۔''

وَلی نے فوک دُھن بجائی تو سب لڑکے آگ کے گرد چکر لگا لگا کر دھمال سا ڈالنے لگے، کسی کو کچھ نہ ہوش تھا۔

لیکن ہر کوئی اپنا اپنا اظہارِ خوشی سے کر رہا تھا۔ طارق نے سنجیدہ سے ٹی ٹو کا ہاتھ پکڑ کر اُسے بھی اُٹھایا۔ بالآخر ٹی ٹو کا موڈ ٹھیک ہو ہی گیا۔

''ساز کے ساتھ آواز نہ ہو تو مزہ نہیں آتا ہے۔ وَلی یار کچھ بہت اسپیشل قسم کا ہو جائے۔'' طارق نے التجا کی۔

وَلی کچھ دیر سوچ میں پڑ گیا تھا۔

''آج تمہاری خوشی کی خاطر یہاں ہوں۔ تم جو کہو گے، وہ ماننا تو پڑے گا۔'' وَلی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وَلی نے اپنا گٹار باکس کھول کر اُس میں سے اپنا گٹار نکالا۔

یہ شام پھر کبھی نہیں گی

اس شام کو...... اس ساتھ کو

تم امر کر دو!

امر کر دو!

وَلی نے جنید جمشید کا گیت سنایا۔

سائرہ، مُسکان سمیت وہاں ہر کوئی حیران تھا کہ وَلی کی آواز بے حد خوبصورت تھی۔ اُس کی آواز کے ساتھ ساتھ اُس کے گانے کا انداز بے حد میچور تھا کہ سانس نہیں ٹوٹتا تھا۔

وَلی گیت مکمل کر چکا تھا۔ ونس مور، ونس مور کی آوازیں ارد گرد سے آ رہی تھیں۔

''کمال ہے یار! یہاں ہاتھ دیا تھا۔ لوگ پورا بازو مانگ رہے ہیں۔'' وَلی نے طارق کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''کم ان یار! آج تم کسی طرح نہیں بچ سکتے۔'' ٹی ٹو نے کہا۔

''ٹھیک ہے پہلے کافی ہو جائے۔'' وَلی تو آج لگتا تھا کہ خوش اخلاقی کی ساری حدیں پھلانگ دیں گا۔ مُسکان نے حیرت سے وَلی کو دیکھا تھا۔ اور یہ سچ تھا کہ وَلی نے اپنے خاص دوستوں کے علاوہ کسی کو بے تکلف ہونے کی اجازت نہ دی تھی۔

''او کے۔ پھر کافی ہو جائے پہلے۔'' طارق نے ہاتھ ایک دُوسرے کے ساتھ مَس کرتے ہوئے گرم کیا۔

''رئیس احمد! رئیس احمد۔'' طارق نے رئیس احمد کو آواز دی، جو پھاٹک کی جانب سے چلا آ رہا تھا اور

وہ اکیلا نہ تھا۔

''اُس کے ساتھ دو خواتین اور ایک مرد تھا۔'' طارق نے حسبِ عادت انہیں مشکوک نظروں دیکھا۔

رئیس احمد تیز تیز چلتا طارق کے پاس گیا۔

''صاحب ان لوگوں کی گاڑی ہمارے فارم ہاؤس کے پاس خراب ہوگئی ہے یہ شخص ان بیبیوں ڈرائیور ہے۔ یہ بیبیاں کالج میں پڑھتی ہیں، اپنے والدین سے ملنے قریبی گاؤں آئی تھیں۔ صبح ہاسٹل ہے ان کو لیکن راستے میں ان کی گاڑی خراب ہوگئیں۔ بچیاں اس جنگل میں پریشان ہو رہی تھیں۔ آ اگر اجازت دیں تو ان کو رات گزارنے کی یہاں اجازت دے دی جائے۔'' رئیس احمد بے حد مہ آدمی تھے۔ وہ تو پوری اُن کی سفارش بن کر آئے تھے۔

آصف نے رئیس احمد اور طارق کو باتوں میں مشغول دیکھا، وہ بے حد گھبرایا ہوا تھا۔

رئیس احمد کو تو وہ ایک من گھڑت داستان سے قائل کر چکا تھا لیکن سامنے جو شخص تھا، وہ آصف اوسان خطا کر گیا تھا۔ کچھ گھنٹے پہلے جس شخص سے وہ بھاگے تھے، وہ سامنے تھا۔

''کیا ہوا آصف۔'' ترنم نے آصف کا گھبرایا ہوا چہرا دیکھ کر پوچھا۔

''یہ تو پولیس کے آدمی کا گھر ہے۔ ہم تو بے بی پھنس گئے۔'' آصف نے روہانسی آواز میں کہا۔

ترنم اور ماہی نے گھبرا کر چادروں میں منہ چھپالیا۔

''کون ہیں یہ لوگ۔'' تقریباً سب ہی اُن کی جانب متوجہ ہوگئے تھے۔

''تنو! وہ دیکھو ہمارے بچاؤ کا راستہ۔'' ماہی نے ترنم کو نگی کی جانب متوجہ کیا۔ ماہی ایک دم تیزی نگی کی طرف بڑھی۔

''اے لڑکی رکو وہیں۔'' طارق نے اُسے نگی کے پاس جاتے دیکھ کر ٹوکا۔

''ارے۔! نگینہ تم؟''

''کیا سرپرائز ہے۔'' ماہی نگی کے یوں گلے جا کر لگی جیسے برسوں سے بچھڑی ہو۔

''ارے آپ۔'' نگی نے بھی حیرت بھری خوشی کا اظہار کیا۔ طارق کے ماتھے کے بَل ایک دم ہوگئے تھے۔

''ہاں ہماری گاڑی خراب ہوگئی ہے، ترنم بھی ساتھ ہے ہمارے۔'' ماہی نے بے حد لگاوٹ سے کہا

''واقعی!'' نگی خوشی سے آگے بڑھی، اُسے ترنم ہمیشہ سے پسند تھی۔

''ایک منٹ نگی تم ان کو کیسے جانتی ہو؟'' وَلی نے ماہی کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ میری بہت اچھی کلاس فیلو ہیں۔'' نگی نے جواب دیا۔ دُور کھڑی ترنم کا دِل شدّت سے دھڑکا، وہ جو حواسوں پر سوار تھا، وہ دُشمن جاں ایک بار پھر سامنے تھا۔

''تو یہ بات طے ہے مسٹر عبدالولی میں جتنا بھی تم سے بھاگ لوں تم میرے سامنے ضرور آ ؤ گے۔''

''زندگی تو قسمت کا نام ہے! زندگی میں اتفاق اور اتنے سارے اتفاقوں کی کہاں گنجائش ہوتی تمہارے بار بار سامنے آنے کو میں اتفاق کہوں یا پھر اس بدقسمت کی خوش قسمتی۔'' وہ زیرِ لب بولی،

لہ اس اندھیرے میں جیسے روشنیوں کی برسات ہر طرف ہونے لگی ہو۔

طارق کے دِل میں شک کا بانس ابھی سوکھا نہیں تھا۔ وہ آنے والی لڑکیوں کو ایک مختلف نگاہ سے دیکھ اتھا، اسی لیے اُس کا ہاتھ اپنے موبائل کی طرف لحہ بہ لحہ بڑھ رہا تھا۔

"طارق!" ولی نے اُسی پل طارق کو پکارا، طارق جو کسی خیال کے تحت اپنے اسسٹنٹ سے کچھ پوچھنے جا رہا تھا رُک کر وَلی کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"نگی کہہ رہی ہے کہ یہ لوگ اُس کی کلاس فیلوز ہیں۔" وَلی نے کچھ سوچتے ہوئے طارق سے کہا۔

وَلی کی بات نے طارق کے چہرے کی شکنیں ایک دم ختم کر دیں۔ ترنم بھی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اُن کے پاس پہنچ گئی، آصف کے چہرے پر ہوائیاں البتہ اب بھی اُڑ رہی تھیں۔

"آپ؟" اس بار وَلی نے چونک کر ترنم سے پوچھا۔

ترنم کے پیچھے کچھ فاصلے پر لکڑیوں کے ڈھیر سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ ہوا کا رُخ شاید بدلا تھا اسی لیے شعلے ایک دم بلند ہو کر تیز روشنی کر گئے، اُسی پل وَلی نے اُسے دیکھا، پس منظر میں جلتی ہوئی آگ اور سامنے سنہری رنگت والی وہ گڑیا سی لڑکی کسی پینٹنگ کا حصہ لگ رہی تھی، اس لڑکی کی آنکھوں میں عجیب طرح کی تپش تھی۔

"بھائی! آپ ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟" نگی نے سوال کیا، مسکان کا دل بے اختیار ڈوبا، اُسے وہ لڑکی جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ ایک دم اُسے یاد آیا کہ پہلی بار اُس نے اس لڑکی کو وَلی کی تصویروں کی نمائش میں دیکھا تھا۔ تب بھی وَلی اُس سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہا تھا۔ یہ بات بہت پُرانی تھی لیکن محبت کرنے والے شاید کبھی بھی کوئی بات نہیں بھولتے ہیں۔

"جی میں اُنھیں جانتا ہوں۔" وَلی نے ایک گہری نگاہ ترنم پر ڈالتے ہوئے کہا، ترنم سے نظر ملانا دشوار ہو رہا تھا، اُس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ فوری طور پر کیا کہے۔

اُن کی آخری ملاقات جس طرز پر ختم ہوئی تھی وہ خاصی شرمندگی کا باعث تھی۔ وَلی نے اُسے نشے میں دھت سڑک سے اُٹھا کر ہسپتال پہنچایا تھا اور وہ کسی شکریے کے بغیر اُنھیں بتائے وہاں سے بھاگ گئی تھی۔

"کیسے؟" سائرہ نے بھی دلچسپی سے ان دو بے حد خوب صورت لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"دینی بھائی ہونے کے ناتے؟" طارق نے مسکراتے ہوئے وَلی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تو تم اُنھیں پہچان گئے ہو؟" وَلی نے دھیمی آواز سے طارق سے پوچھا۔

"کیا کروں بھائی، میری نوکری ہی ایسی ہے کہ ایک بار جو شکل دیکھ لوں، خاص کر کچھ مشکوک اشکال وہ میرے دماغ کے کمپیوٹر پر ہمیشہ کے لیے فیڈ ہو جاتی ہیں، خاتون نے تو ہماری ساری رات برباد کی

ل" طارق نے آخری جملہ باآواز بلند کہا تھا، جسے صرف ترنم سمجھ سکتی تھی۔

"لالہ کیا کہے جا رہے ہیں، میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔" سائرہ نے پوچھا۔

"تم کیوں اپنے چھوٹے سے دماغ پر بوجھ ڈالتی ہو، جاؤ بن بلائے مہمانوں کو کچھ کھلاؤ پلاؤ۔" طارق نے سائرہ کے ساتھ ساتھ ترنم اور ماہی کو بھی گرہ لگائی۔

"میرا چھوٹا دماغ ہے؟" سائرہ ساری بات بھول کر بولی۔

"پیاری بہنا! چھوٹے دماغ پر ہی اکتفا کر لو ورنہ دیکھ لو سب سے بڑا دماغ صرف بندر کا ہوتا ہے!" ولی نے ہنستے ہوئے کہا۔ اُس کی ہنسی میں وہاں پر موجود سب لوگوں کی دبی دبی ہنسی بھی شامل تھی۔

"لالہ! آپ سے تو میں بعد میں پوچھوں گی۔" سائرہ نے باقاعدہ اُسے دھمکی دی۔

"آپ آیئے ہمارے ساتھ وہاں آگ کے پاس بیٹھتے ہیں، یہاں بہت ٹھنڈ ہے" سائرہ اُن دونوں کو اُن کے گروپ کی جانب لے آئی۔

"واؤ! کون ہیں یہ؟" منزہ نے اپنے دونوں ہاتھ آپس میں رگڑتے ہوئے دِل چسپی سے پوچھا۔ وہ ان لڑکیوں کے غیر معمولی حُسن سے متاثر ہوئی تھی۔

"پہلے ان کو کمبل میں جگہ دو، پھر بتاتی ہوں کون ہیں' سائرہ نے ترنم اور ماہی کو بٹھاتے ہوئے کہا، سارے دورانیے میں وہ دونوں بالکل چپ تھیں۔ ماہی ان سب کی ترنم سے جان پہچان پر حیران ہو رہی، ابھی تک اُسے ترنم سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ورنہ وہ تو فوراً جاننا چاہتی تھی کہ ترنم ان لوگوں کو کیسے جانتی ہے۔ کیوں کہ اُن کے حلقۂ احباب میں مخصوص لوگ ہی شامل ہوتے تھے۔

"ترنم! یقین مانو آپ کو یہاں دیکھ کر ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ بے حد خوشی بھی ہو رہی ہے۔" ... نے ترنم کا نازک سا ہاتھ تھام کر کہا۔

... احمد کافی لے آیا، لڑکوں نے کافی اور لڑکیوں نے چائے لی تھی۔ ترنم کو اسٹرانگ قسم کی کافی کی ... سے طلب ہو رہی تھی، صبح سے اعصاب مسلسل ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہے تھے۔

"اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو مجھے کافی دے دیں۔" ترنم نے پہلی بار کوئی جملہ کہا تھا۔

"اس میں مائنڈ کرنے والی کون سی بات ہے؟" سائرہ نے اخلاق نبھاتے ہوئے کہا۔

"آپ نگی کے ساتھ پڑھتی ہیں؟" مسکان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"جی ہاں! نگینہ ہماری بہت اچھی دوست بھی ہے۔" ماہ رخ نے مزید کہا، وہ دِل ہی دِل میں شکر ادا ... تھی کہ وہ آج پولیس کے ہاتھوں بال بال بچی تھیں۔ ترنم کا ڈرائیور آصف کے ساتھ اُس کی ماں ... جانا بظاہر ان کو لیٹ کروا گیا تھا لیکن یہی دیر اُن کو بچا گئی تھی۔ ورنہ جانے اب تک اُن کا کیا حال ... کیوں کہ آصف بتا رہا تھا کہ چھاپہ بے حد خفیہ تھا۔ باقی کی لڑکیاں کہاں لے جائی گئیں کوئی نہ جانتا ... جس مشکل سے وہ پولیس سے چھپ کر وہاں سے بھاگے تھے یہ تو وہی جانتے تھے۔ ماہ رخ اور ترنم ... طور پر اس طرح کی سچویشن کا سامنا کبھی نہیں کرنا پڑا تھا۔ چاندنی میڈم اپنی لڑکیوں کو کہیں بھیجنے سے پہلے پوری طرح انویسٹی گیشن کرتی تھی۔ ویسے بھی ہر ماہ وہ پولیس کو ایک بھاری رقم دیتی تھی تاکہ

ریڈ نہ صرف اچانک تھی بلکہ کسی خطرے کی شروعات لگتی تھی۔ ورنہ اتنی بڑی پارٹی اور اتنی اہم شخصیات کی موجودگی میں ریڈ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

''مجھے آپا کو اطلاع کردینی چاہیے!'' ماہی نے ساتھ بیٹھی ترنم سے سرگوشی کی۔

''کوئی حماقت نہ کرنا، آصف کہہ تو رہا تھا کہ وہ پولیس کا آدمی ہے، اُسے کسی قسم کا شک ہوگیا تو ... جائیں گے۔'' ترنم نے بے حد سرگوشی میں کہا۔

''کیا باتیں ہورہی ہیں؟'' منزہ نے دل چسپی سے پوچھا۔ اُس کا ان خوبصورت لڑکیوں سے ... کرنے کو دِل چاہ رہا تھا۔

''آپ لوگ یہاں پکنک پر آئے لگتے ہیں۔'' ماہ رخ نے اُس کی بات پلٹتے ہوئے کہا۔

''بس کچھ پکنک جیسا ہی پروگرام بن گیا تھا، دراصل سائرہ کی آج سال گرہ تھی۔'' منزہ نے کہا۔

''آپ میں سے سائرہ کون ہے؟'' ماہی نے پوچھا۔

''یہ ہیں جناب آج کا برتھ ڈے بے بی۔'' منزہ نے سائرہ کی جانب اشارہ کیا۔

''سال گرہ مبارک ہوسائرہ آپ کو۔'' ماہی نے بے حد شائستہ انداز میں کہا۔ سارا وقت اُسے ... سے فائدہ اُٹھانے کے متعلق سکھایا جاتا تھا۔ کس طرح آپ اپنا کام نکلواسکتے ہیں یہ ماہی سے زیادہ ... جانتا ہوگا؟

''شکریہ!'' سائرہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

''یار وَلی یہ خوبصورت بلائیں کون ہیں؟'' ٹی ٹو نے وَلی سے پوچھا۔

''ذرا سنبھل کر، ان بلاؤں کا آسیب نہ ہوجائے تم پر۔'' سمعان نے شرارت سے کہا۔

''ہا۔ ہا۔ ایسی بلائیں ہوں تو ان کے چمٹنے کی تمنا بھلا کون کافر نہ کرے گا۔'' ٹی ٹو نے باقا... بھری۔

''لو! اِدھر کوئی خوب صورت لڑکی دیکھی نہیں اور یہ اپنے بھائی صاحب پھیلے نہیں۔'' ولی نے مسکرا... ہوئے کہا۔

''تو تم مانتے ہوناں کہ لڑکیاں خوب صورت ہیں۔'' ٹی ٹو جانے کیا باور کروانے جارہا تھا۔

''کیوں میری آنکھیں نہیں ہیں؟'' وَلی نے پوچھا۔

''ہیں، بلکہ بے حد خوبصورت آنکھیں ہیں لیکن تمہیں آج تک دور، قریب کی کوئی لڑکی نظر ... آتی تھی۔ اس لیے آج تک میں اس گمان میں رہا کہ تمہاری لڑکی والی آئی سائیڈ کم زور ہے۔'' ٹی ... دانت چمکاتے ہوئے کہا۔

''یہ لڑکی والی آئی سائیڈ کیا بلا ہے۔'' طارق گو کچھ اُلجھا ہوا تھا لیکن پھر بھی اُن کی باتوں میں ... تھا۔

''ارے لڑکیوں کو دیکھنے والی نگاہ! کم از کم وَلی کے پاس نہیں ہے، میں اتنے سالوں سے ا... ساتھ ہوں۔'' ٹی ٹو نے کچھ چڑ کر کہا۔ اکثر وَلی کی وجہ سے اُس کا چانس مس ہوجاتا تھا۔ جواب م... ... بے اختیار ہنسا تھا۔ دُور بیٹھی مسکان کا دِل تو شاید دھ...

...ول گیا تھا۔

...ب کے چہرے کا ایک ایک تاثر دِل میں نقش ہو جاتا ہے اور وہ وَلی تھا اُس کی پہلی محبت اُس کا ...ان! جو ہمیشہ ایک سے سنجیدہ تاثر کے ساتھ اُسے دکھائی دیتا تھا۔ مسکان کا کتنا دِل چاہتا تھا کہ کبھی ...ل اور وہ اُسے دیکھتی جائے کہ آخر وہ ہنستے ہوئے کیسا لگتا ہے، کسی بھی شخص کی ہنسی اُس کے اندر کا ...ہوتی ہے۔ وہ اس آئینے میں وَلی کا عکس دیکھنا چاہتی تھی۔ جو رازوں کی طرح ایک راز تھا، وہ اُس ...ل کا بھید جاننا چاہتی تھی۔ اور آج جب وہ ہنسا تو وہ دیوانوں کی طرح ہر بات سے بے خبر اُسے تکے ...ی۔ وَلی اگر ایک بار اُس کی آنکھوں میں وہ عکس دیکھ لیتا تو شاید وہ بھی نگاہ پلٹنا بھول جاتا۔

...ال وہ کسی پجارن کی طرح ہی تو اُسے دیکھ رہی تھی۔

...جانے کیوں بے اختیار ہنسی، ہنستے ہنستے وَلی کے ذہن کے پردے پر ایک عکس لہرایا تھا۔

...روازے کے فریم میں کھڑی، گلابی کپڑوں میں ملبوس گلابی رنگت والی ایک لڑکی! جو بہت خوبصورت ...اہٹ رکھتی تھی۔ وَلی نے مسکراتے ہوئے بے اختیار سر جھٹکا، مجھے وہ کہاں سے یاد آ گئی؟

''کیا مسٹر عبدالولی کی نگاہ میں بھی کوئی لڑکی آ گئی ہے؟'' کوئی اندر سے شرارت سے بولا تھا۔

...اتنے عرصے سے سینت سینت کر رکھا جانے والا دل عبدالولی بہت مشکل سے ہی کسی کو دے پاتا، شاید ...لیے اُس نے اس خیال پر بھی بے اختیار سر جھٹکا، تھا جیسے وہ کچھ ماننا نہ چاہ رہا تھا۔ سوچنا نہ چاہ رہا

''میرا خیال ہے اب محفل برخاست کی جائے، سردی اور رات دونوں زیادہ ہوگئی ہیں۔'' طارق نے ...لن انداز میں اعلان کیا۔

''تمہارا خیال بالکل درست ہے۔'' وَلی نے اُٹھنے میں پہل کی۔

''چلیں میں آپ لوگوں کو آپ کا کمرا دکھادوں۔'' سائرہ نے ترنم اور ماہ رخ سے کہا۔

''وہ ہمارا ڈرائیور بھی ہے اُس کا بھی کچھ انتظام ہوجاتا تو۔'' ترنم کو واقعی آصف کی بے حد فکر تھی۔

...وہ بھولا بھالا لڑکا بے حد پسند آیا تھا۔ سچ بولتا، سچائیوں کا سامنا کرتا ہوا وہ بے حد کھرا انسان تھا۔

''وہ تو کب کا رئیس احمد کے ساتھ جاکر سوچکا ہے۔'' سائرہ نے اُس کی فکر کم کی۔

''اچھا بھئی شب بخیر! پھر صبح ملاقات ہوگی۔'' ساری لڑکیاں کہتیں اپنے اپنے کمروں کو ہولیں۔

ماہ رخ اور ترنم کو جیسے ہی کمرے میں تنہائی ملی۔ ماہ رخ نے اپنے موبائل کا چارجر نِکال کر موبائل ...ج ہونے لگادیا اس سارے وقت میں وہ میڈم سے رابطہ نہ کر پائی تھی اب وہ صحیح صورت حال اُن کو ...یہاں سے جلد از جلد نکلنا چاہ رہی تھی۔ خطرہ اب بھی ان کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ ترنم جوتوں سمیت ...بڑے رنگین پایوں والے پلنگ پر لیٹی تھی، جیسے اُسے کسی کی فکر نہ ہو۔

''آج تو بال بال بچے ہیں۔'' ماہ رخ نے بیگ سے فیس واش اور ٹوتھ برش نکالتے ہوئے کہا۔

''ارے جو ایک بار اس بند گلی میں آجاتا ہے، وہ تو ہمیشہ کے لیے پھنس کر رہ جاتا ہے، ویسے تم کس ...بچنے کی باتیں کررہی ہو؟'' ترنم نے بہکے بہکے لہجے میں کہا۔

''اوہ مائی گاڈ! تم نے ڈرگ لی ہے ناں؟'' ماہ رخ اُس کے بہکے بہکے لہجے پر چونکی

"اب میں تم کو کہاں سنبھالتی پھروں گی!" ماہ رخ کو اُس پر بے حد غصہ آیا۔

ترنم جب حقیقت اور زندگی سے فرار چاہتی تھی تو وہ بھرپور نشہ کرتی تھی خاص طور پر جس بے حد دُکھی ہوتی۔ اُسے یہ لت اپنے ایک کلائنٹ سے ہی پڑی تھی۔ اُسے اپنی موجودہ زندگی جو پر بھول جاتی تھی یہ نشہ اکثر اسے بہت بڑا سہارا محسوس ہوتا تھا۔

"ترنم میں تم سے بات کر رہی ہوں، کیوں لی تم نے یہ ڈوز؟" ماہ رخ بے حد ناراض تھی۔

"وہ بار بار میرے سامنے آ جاتا ہے، میں اُسے دیکھنا نہیں چاہتی، میں اُسے سوچنا نہیں چا کیوں وہ میری ان کانٹوں بھری زندگی میں چلا آتا ہے؟" ترنم اپنے حواسوں میں نہ تھی اور ماہ رخ ٹوٹی پھوٹی گفتگو سمجھنے سے قاصر تھی۔

"کون چلا آتا ہے؟" ماہ رخ نے نہ سمجھنے کے انداز میں پوچھا۔

"وہ... وہ ساحر!" وہ جوان بھیڑیوں کی دنیا میں مجھے انسان کی طرح ملا تھا۔ وہ جو نہ میرا جسم ہے نہ چہرہ۔! اُس کی نگاہ پلٹ کر واپس نہیں آتی۔ میں تو پہلے ہی دُکھوں کی مسافر ہوں، پھر میں اُس کی اس ایک ادا اور چھوٹے سے لمحے کی قیدی ہوگئی؟ بولو ماہی! میری سزائیں پہلے کیا کم تھیں؟ دیوانوں کی طرح بول رہی تھی۔

"مجھے اِس دِل نے ہمیشہ خوار ہی کیا ہے!" ترنم آنسوؤں کے ساتھ رو رہی تھی۔

"یہ سرابوں کے پیچھے بھاگنے کا عادی ہے اور میرے پاؤں دیکھو تو کیسے چھالوں سے بھرے ترنم نے اپنے نرم گلابی پاؤں دیکھتے ہوئے یوں کہا، جیسے ماہی اُس کے آبلے دیکھ سکتی ہو۔

"پلیز ترنم! تم سو جاؤ، دو تین گھنٹے کی نیند ہی اب تمہارا حل ہے!" ماہ رخ نے اُسے زبردستی کر لائٹ آف کر دی اور خود موبائل لے کر کوئی نمبر ملانے لگی۔

"کہاں ہو تم لوگ، کب سے تمہارا موبائل ٹرائی کر رہی ہوں؟" میڈم اُس کی آواز سنتے ہی دھا جواب میں ماہ رخ نے اب تک کے سارے حالات سنا دیے۔ "ٹھیک ہے تم لوگ ریڈی رہو، بندے اسی ایریا میں تم لوگوں کو تلاش کر رہے ہیں۔ تم مجھے ٹھیک سے اس جگہ کا محل وقوع بتاؤ تا کہ کو انفارم کرسکوں۔" میڈم نے اُسے فوراً حکم دیا۔ ماہ رخ، ترنم کی محبت میں پھنس گئی تھی۔

ترنم کی حالت اور حرکت اگر بتاتی تو میڈم کے عتاب سے ترنم کو کوئی نہ بچا سکتا تھا اور ترنم کو اس میں اُٹھا کر لے جانا ماہی کے بس کی بات نہ تھی۔

"آپا! وہ ترنم کو لگتا ہے رستے میں کھائے برگر سے فوڈ پوائزن ہوگیا ہے، سارے راستے اُلٹیاں رہی اور یہاں تک آتے آتے تقریباً بے ہوش ہوگئی ہے۔ وہ تو یہ لوگ اچھے نکلے کسی ڈاکٹر کا شاید! اُسے فوراً انجکشن دیا ہے۔ وہ سو رہی ہے ہمارا فوراً یہاں سے نکلنا ناممکن ہے۔" ماہی کے دما جو الٹ پلٹ بات آئی اُس نے اُس کا بہانا بنا دیا۔ وہ تو شکر ہے میڈم چاندنی فوراً مان گئیں و شاطر عورت کے آگے کوئی بہانا نہیں بنا سکتا۔

"ٹھیک ہے تین چار گھنٹوں تک مجھے دوبارہ اطلاع کرو ترنم کی حالت کیسی ہے، تم لوگو

ماہی نے بے حد شکر ادا کیا۔ آج تو واقعی قسمت اچھی تھی، جو ہر جگہ سے وہ مسلسل بچ رہی تھیں۔ ماہ رخ نے گھڑی میں وقت دیکھا اور دو تین گھنٹے کی نیند لینے کا فیصلہ کیا تا کہ وہ اپنے اعصاب کو کچھ پُرسکون کرسکے۔

ماہ رخ نے ایک نظر ترنم پر ڈالی وہ غنودگی میں تھی۔ لیکن مسلسل کچھ نہ کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ ماہ رخ نے گہرا سانس خارج کیا۔

"جانے تمہارا انجام کیا ہے، جب سے تمہیں دیکھا ہے، تم اس ماحول اور اس حقیقت سے بھاگنے کی بار بار کوشش کر رہی ہو، ہر وقت ایک مسلسل اذیت بنا رکھا ہے زندگی کو، کاش تم اپنے آپ کی قیمت جان لیں اور میری طرح تمہارا اپنا پرسنل بینک اکاؤنٹ ہوتا۔ لیکن جانے تم آخر ایسی کیوں ہو؟ ہر وقت اِک مسلسل اذیت میں گھری ہوئی۔" ماہ رخ اس سے زیادہ نہ سوچ پائی کیوں کہ نیند کی مہربان آغوش نے اُسے خود سے بے خبر کر دیا تھا۔ جب کہ ساتھ پڑا وجود کبھی ہنسنے لگتا تھا، کبھی سسکیاں بھرنے لگتا تھا۔

❖❖○❖❖

"تیرے ویر جیسا پاگل میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا!" نفیسہ نے اپنی تیکھی ناک چڑھاتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ کیا بُرائی ہے میرے ویر میں، سوائے اِس کے کہ وہ تجھے چاہتا ہے۔" رانی نے جلدی جلدی گولیرہ چولھے سے اُتارا، جسے اُبال آ چکا تھا۔ اب وہ پرات میں رکھے چاولوں کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔

"ارے میں سیّد سرفراز سے اُلجھنے والی بات کا ذکر کر رہی ہوں۔"

"بس نی کرشدھی! کیا آگ کے آگے بیٹھے بیٹھے پگھلنا ہے۔" امّاں نے رانی کو چولھے کے آگے سے ہٹانے کی کوشش کی، جو اتنے گرم موسم میں بھی سارا کھانا پکانے کے بعد صرف بھائی کی فرمائش پوری کرنے کے چکر میں دوبارہ چولھا گرم کیے گُڑ والے میٹھے چاول بنا رہی تھی۔ نفیسہ نے ماسی صابراں کے آنے پر بات منہ میں ہی روک لی۔

"امّاں تُو چھاں (چھاؤں) میں جا کر بیٹھ، کیوں اِدھر بار بار گرمی کھانے کو آ جاتی ہے۔" رانی نے ماں کو پیار سے وہاں سے ہٹایا، چولھے کا سارا کام تقریباً وہ خود کرنے لگی تھی۔ اُس کی ہر وقت خواہش رہتی کہ امّاں کم سے کم کام کرے، امّاں کے دل کی ٹھنڈک اُس کے دونوں بچے تھے۔ رانی اور میرو بے حد پیار کرنے والے اور بے حد تابع دار! لیکن میرو میں بس ایک ہی خرابی تھی، وہ غصّے میں بہت جلدی آ جایا کرتا تھا۔

"بس جلدی جلدی دَم لگا کر تو بھی دو گھڑی آ کر آرام کر لے، دیکھ دونوں سہیلیوں کا رنگ کیسے چولھے کی (سینک) سے لال گلال ہو رہا ہے۔" امّاں دونوں کو وہاں سے جلدی آنے کا کہہ کر احاطے میں چلی گئیں، یہ چولھا احاطے کے ساتھ ہی بنایا گیا تھا۔ تندور اور بڑا چولھا زیادہ تعداد میں کھانا بنانے کے کام آتا تھا۔

"میرا تو رنگ ایویں سا ہے کیا لال ہوگا، بے چارہ لیکن نفیسہ تُو جا کر آئینہ ضرور دیکھنا کیسے میدے میں سندور گھلا جا رہا ہے۔" رانی نے نفیسہ کو چھیڑا۔

"چل نی! ایسی کوئی حور پری نہیں ہوں میں، یہ تیری نگاہ کا پیار ہے جو یوں بولتا ہے۔" نفیسہ نے پاس پڑی کھوپرے کی گری کاٹتے ہوئے کہا۔

''نہیں نفیسہ! سچ کہوں، اپنی پوری برادری میں تیرے جیسی سوہنی کُڑی کوئی نہیں ہے۔ ایویں نہیں ویر تیرا دیوانہ ہے۔'' رانی نے سچائی سے اقرار کیا۔

''ہیں تیرے جیسی کسی کی اتنی پیاری آنکھیں، ایک ایک آنکھ سوا سوا لاکھ کی ہے۔''

''رانی گرمی تیرے دماغ کو چڑھ گئی ہے، جو یوں تو اپنی سہیلی کو اپنے سر چڑھا رہی ہے، اس کا نخرہ کیا کم ہے۔ بڑی زمین داری ہے اس کے بابا سائیں کی، ہم سے چار پانچ گنا زیادہ زمین ہے تو نخرہ اُسی حساب کا ہے۔'' میرو جانے کب اُن کے پیچھے آ کھڑا ہوا تھا۔ رانی کی بات سُن کر اُس نے وہ باتیں دوہرائیں، جو نفیسہ کو ہمیشہ بُری لگتی تھیں۔

''تم نے کب مجھے نخرے کرتے دیکھا ہے؟'' نفیسہ نے بُرا مان کر کہا۔

میرو کے سانولے چہرے پر مسکراہٹ بڑی بے ساختہ تھی۔ اُسے نفیسہ رُوٹھی رُوٹھی بڑی پیاری لگتی تھی۔ بے حد سادہ اور معصوم سی لڑکی میرو کی زندگی کب بن گئی، یہ وہ بھی نہ جانتا تھا۔

رانی نے چاول دَم لگاتے ہوئے دونوں کو دیکھا اور سر جھکا کر مسکراتے ہوئے دیگچے کا ڈھکن بند کیا اور کھڑے ہو کر پتھر کی کونڈی اُس پر رکھی تا کہ چاولوں کو اچھا سا دَم دے سکے۔

''یہ کیا ہے ویرے؟'' رانی نے میرو کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے مٹکے کی جانب اشارہ کر کے پوچھا۔

''میرا آج کنویں پر جانا ہوا تھا۔ وہیں بالٹی میں آم ڈال کر میں نے کنویں میں لٹکا دیے تا کہ ٹھنڈے ہو جائیں اور میری بہن ٹھنڈے ٹھنڈے آم کھا سکے۔'' میرو بات تو رانی سے کر رہا تھا لیکن نگاہیں نفیسہ کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ رانی ہولے سے ہنس دی۔

''کس کو احمق بناتے ہو پیارے بھائی، کیا میں نہیں جانتی کہ آم کسے زیادہ پسند ہیں اور جمعرات کو کون ہمارے گھر آتا ہے۔'' رانی کا صاف اشارہ نفیسہ کی جانب تھا، جو جمعرات کو اپنی اماں کے ساتھ ماسی صابراں کے ہاں آتی تھیں اور یہاں سے وہ اکٹھی ہو کر درگاہ جاتی تھیں۔

ماسی صابراں اور نفیسہ کی ماں کو درگاہ میں دیا جلانا ہوتا تھا اور رانی، نفیسہ کو آپس میں ڈھیروں باتیں کرنا ہوتی تھیں۔ نفیسہ رانی کی بات پر ایک دَم سرخ پڑ گئی۔

''چل جو تیرا جی چاہے کہہ لے اب کیا میں تیری باتوں کا بُرا مناؤں گا۔'' میرو نے اپنے کندھے پر رکھے رومال سے پسینا پونچھتے ہوئے نرمی سے جواب دیا۔

''نفیسہ تُو ذرا چاولوں کے پاس بیٹھ میں ابھی آتی ہوں۔'' رانی ایک دم اُٹھ کر اندر کی جانب چلی گئی۔

''ارے یہ کہاں چل دی؟'' نفیسہ میرو کی موجودگی میں شرم و حیا سے گھبرا رہی تھی۔

''مجھ سے بہت پیار کرتی ہے اور میرا خیال بھی بہت کرتی ہے۔'' میرو نے مسکراتے ہوئے نفیسہ کو جواب دیا۔

''مطلب؟'' نفیسہ نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

''مطلب وہ جانتی ہے کہ میرو کا نفیسہ سے دو گھڑی بات کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔'' میرو رانی کی چھوڑی ہوئی چوکی پر بیٹھ گیا۔

نفیسہ نے سر اُٹھا کر اُسے نہ دیکھا بلکہ تنکا لیے کچی زمین پر آڑھی ترچھی لکیریں بناتی رہی۔

''میں اتنی گرمی میں یہاں تمہارے پاس بیٹھا ہوں اور تو میری جانب دیکھتی بھی نہیں ہے۔'' میرو کے لہجے میں شکوہ تھا۔

''تو تمہیں کون کہتا ہے کہ یہاں چولھے کے پاس آ کر بیٹھو۔'' نفیسہ نے روٹھے لہجے میں کہا۔

''ارے پگلی جانتی بھی ہے تیری خاطر یہاں بیٹھا ہوں۔'' میرو نے پیار بھری نگاہ اُس کے سرخ سفید چہرے پر ڈالی۔

''جب میں نخرے والی ہوں تو کیوں مجھ سے بات کرتے ہو۔'' نفیسہ کو میرو کی یہ بات ہمیشہ کی طرح بُری لگی۔ میرو کی مونچھوں تلے مسکراہٹ بے حد جان دار تھی۔

''اچھا چھوڑو غصہ، یہ دیکھو تمہارے لیے میں کیا لایا ہوں۔'' میرو نے سبز اور گہری سرخ چوڑیاں اُس کے سامنے لہرائیں۔

''دو سیٹ تمہارے ہیں اور دو تیری سہیلی کے۔'' میرو نے چوڑیاں اس کی گود میں ڈال دیں۔

''اچھا! یہ بتاؤ تم کب عقل سیکھو گے؟'' نفیسہ نے اُس کا خوشگوار موڈ دیکھتے ہوئے اصل بات کرنی چاہی۔

''کیا مطلب؟'' میرو نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

''یہی کہ تم سیّد سرفراز سے کیوں اُلجھے، اُس دن اگر سیّد عبداللہ ہمیں رستے میں نہ ملتا تو جانے تیرا کیا حال ہوتا۔'' نفیسہ کا لہجہ بے حد فکر مند تھا۔ اُسے میرو کے غصّے سے ہمیشہ ڈر لگا کرتا تھا۔

''اچھا تو اُن کو اپنی مرضی کرنے دیتا اور باقی کا سال کیسے گزرتا؟ ہمارے گھر فاقوں تک نوبت آنے لگی تھی۔''

''لیکن تمہیں آرام سے اُن سے بات کرنی چاہیے تھی، آخر وہ اس گاؤں کے سب سے بڑے زمین دار ہیں، اپنے سے زیادہ طاقت ور سے اُلجھنا حماقت ہے۔'' نفیسہ نے اپنی سی کوشش کی تھی اُسے سمجھانے کی۔

''نہیں نفیسہ! یہ سراسر ظالم کا ساتھ دینے والی بات ہے، یہ ہی وجہ ہے کہ ہماری حالت آج تک نہیں بدلی وہ لوگ روز بہ روز امیر ہوتے جا رہے ہیں اور ہمارے پاس جو کچھ ہمارا اپنا تھا وہ بھی ہم سے چھینا جا رہا ہے۔ ہماری آنے والی نسلیں اور اُن کی نسلیں صرف غلام بن کر رہ جائیں گی۔ بابا سائیں ایک سال سے اُن کا پیسہ اُتار رہے ہیں۔ آئندہ دس سالوں میں بھی وہ اصل رقم اُتار نہ پاتے، آج وہ زبردستی ہمارا اناج اُٹھا کر لے جاتے تو کل یقیناً ہماری زمین کے بکنے کی باری آتی۔ پھر کیا رہ جاتا ہمارے پاس؟'' میرو نے نفیسہ سے سوال کیا۔

''لیکن میرو تمہیں اگر کچھ ہو جاتا تو چاچا دینو تو اپنی زندگی کی سب سے بڑی پونجی کھو دیتے۔'' نفیسہ کو میرو کی جرأت ابھی تک حماقت لگ رہی تھی۔

''نفیسہ میں غلط کو درست اور درست کو غلط کبھی نہیں کہوں گا!'' میرو نے حتمی لہجے میں جواب دیا۔

''میں پڑھا لکھا نہیں ہوں لیکن میاں جی سے قرآن پاک پڑھتے ہوئے میں نے زندگی کا غلط درست

بھی سیکھا ہے۔ کیا فائدہ ہمارے مسلمان ہونے کا اگر ہم عمل کے ہی کچے ہوں۔ سُود ہمارے مذہب میں
حرام ہے! بابا سائیں کو ان لوگوں نے قرض دیتے ہوئے سُود کے متعلق کچھ نہ بتایا تھا اور خالی انگوٹھا لگوایا
تھا۔ دھوکے سے ہم ان لوگوں کے جال میں پھنس کر رہ گئے۔ میں آج بھی سید عبداللہ کا احسان مند ہوں
کہ وہ ان وحشیوں میں انسانیت کی پہچان ہے۔ میں اگر زندگی میں کبھی اُس کے کام آسکا تو مجھے بے حد
خوشی ہوگی۔" میرو کے چہرے پر سچائی تھی اور یہ میرو کی سچائی اور سادگی ہی تھی، جس پر نفیسہ کا دل مائل
ہوگیا تھا۔ میرو گاؤں کے باقی نوجوانوں سے خاصا مختلف تھا۔

اُس میں خودداری، انا، غیرت کے ساتھ ساتھ کردار کی سچائی موجود تھی۔ شاید اُس کی وجہ سے میاں
کامیاں جی (جو گاؤں کے امام مسجد بھی تھے) کی محبت تھی۔ میاں جی گوشہ نشین آدمی تھے۔ زیادہ گفتگو
نہیں کرتے تھے لیکن بچوں کو قرآن پاک اور دینی تعلیم سالوں سے دے رہے تھے۔ میرو اُن کے
طالب علموں میں شامل تھا۔ میاں جی کی محبت میں اُس نے بہت کچھ سیکھا تھا، جو اُس کی شخصیت کو سب
سے نمایاں بناتا تھا ورنہ گاؤں کے زیادہ تر نوجوان شاہ جی کے آگے سوائے ہاتھ جوڑنے اور گھگھیانے
کے کچھ نہ کرتے تھے۔ شاہ جی کی غلط سے غلط بات وہ ہمیشہ درست مانتے تھے۔

"لیکن میرو۔" نفیسہ شاید کچھ کہنے جارہی تھی۔

"بس نفیسہ تم مجھے اس معاملے میں کبھی مجبور نہ کرنا۔" وہ رومال سے ماتھے پر آیا پسینا پونچھ کر لمبے لمبے
ڈگ بھرتا اندر چلا گیا۔

"ارے! اِسے کیا ہوا؟" رانی نے باہر نکلتے ہوئے پوچھا۔

"جو ہمیشہ سے ہوتا ہے ضد اور غصہ!" نفیسہ نے بے بسی سے جواب دیا۔

"اللہ تمہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے۔" اُس نے دِل سے دُعا دی۔

❖❖○❖❖

"اِس وقت یہ کون ہے؟" عبدالولی نے گھڑی اُٹھا کر دیکھی، رات کے ساڑھے تین بجے تھے۔ باہر
لان سے کسی لڑکی کے سسکنے کی آواز آرہی تھی۔ وَلی ایک دَم سے الرٹ ہوگیا، کمرے میں موجود ٹو اور
کاشف دونوں ہی گہری نیند میں تھے۔ وَلی بہت محتاط نیند سوتا تھا۔ معمولی سا کھٹکا تک وہ سُن لیتا تھا
جب کہ باہر تو باقاعدہ سسکیوں اور کچھ بولنے کی آواز آرہی تھی۔

عبدالولی نے بستر سے شال لے کر لپیٹی اور چپل پہن کر دبے پاؤں باہر نکل آیا، آواز پیچھے درختوں
سے آرہی تھی۔ عبدالولی کو جو کمرا دیا گیا تھا اُس کی کھڑکی پیچھے لان میں کھلتی تھی۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ
آواز وَلی کے کمرے تک آئی تھی۔

"کون ہے وہاں؟" جوں جوں قریب پہنچ رہا تھا وہ واضح طور پر آواز کو سن سکتا تھا۔

یہ جو زندگی کا سراب ہے
اے خدا!
یہ میرے لیے تو عذاب ہے
مجھے بخش دے

اے میرے خدا
بھلا کب تلک میں سہوں بتا
یہ عذاب جاں جو ہے سوختہ
میں نے مانا مجھ سے خطا ہوئی
مجھے زندگی جو عطا ہوئی
اسے میں نے اپنے ہی ہاتھ سے
یوں گنوادیا کہ ہوئی فنا
"میری ذات ذرّہ بے نشاں"

وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی بلک رہی تھی بنا کسی گرم کپڑے اور دوپٹے کے، وہ شاید اپنے حواسوں میں نہ
تھی۔ کھلے بال اُڑ کر اس کا چہرہ ڈھانپ چکے تھے۔

اے خدا!
مجھے کوئی ایسا سراغ دے
کہ تیرا نشاں پاسکوں

اس کی آواز میں بے حد کرب تھا۔ وَلی ٹھٹک کر رُک گیا۔

مجھے کوئی ایسی تو راہ سجھا
کہ میں خود کو راہ پہ لاسکوں
میری تشنہ روح کو قرار دے
میری بگڑی دنیا سنوار دے
میرے مالک اتنی سزا بہت ہے
مجھے کچھ خوشی تو ادھار دے!

اب وہ ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپائے رو رہی تھی۔

وَلی کسی سحر میں مبتلا دھیرے دھیرے چلتا اُس کے پاس آ کر رُکا، اُس کی آواز کے درد نے وَلی کو جکڑ
لیا۔ وَلی گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کچھ پَل اُسے دیکھتا رہا۔

وہ اُسے ہمیشہ یوں ہی بکھری ہوئی ملتی تھی آخر کس بات کا دُکھ تھا اُس لڑکی کو؟ کیوں اس کی بے حد
خوبصورت آنکھیں آنسوؤں میں ڈوبی رہتی تھیں۔ وہ اُسے نہیں جانتا تھا۔ وہ اجنبی ہوکر بھی اکثر جانی
پہچانی لگتی تھی۔ موٹروے پر جب ماجد اور اسد اُس کو گولیاں مار کر لہولہان کر کے اُس کی گاڑی چھین کر لے
گئے تھے۔ جب اُسے لگا تھا کہ زندگی اب اُس سے بے حد فاصلے پر کھڑی ہے تو موت کی جانب قدم
بڑھاتے ہوئے جو آخری زندگی کی آواز تھی، وہ اِسی لڑکی کی تھی۔

اس لڑکی نے اُس کی جان بچائی تھی۔ جب وہ ہوش میں آیا تھا تو سب سے پہلے جو عکس اُس کے
ذہن میں لہرایا تھا۔ وہ اسی لڑکی کی اُداس آنکھوں کا تھا۔

دوسری بار وہ اُسے اپنی تصویروں کی نمائش آرٹ گیلری میں ملی تھی۔ اور اپنی باتوں سے چونکاتی ہوئی

اچانک غائب ہوگئی تھی۔

تیسری بار وہ اُسے بکھری ہوئی سڑک پر ملی تھی اور ہسپتال سے اچانک غائب ہوگئی تھی۔ جاتے ہوئے وہ اک اُلجھی ہوئی تحریر چھوڑ گئی تھی۔

اور آج چوتھی بار وہ ایک بار پھر بے حد بکھری اور اذیت میں مبتلا نظر آئی تھی۔ اس سارے عرصے میں وہ جب جب اُس سے ملا، اُس کے چہرے کی ہر وقت نم اور سوگوار آنکھیں اُسے متوجہ کرتی تھیں۔

"سنو! اچھی لڑکی کیا میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں؟" وَلی نے بے حد نرم لہجے میں اُسے مخاطب کیا۔

اُس نے ایک دم چونک کر سر اُٹھایا گہری جھیل سی آنکھیں رو رو کر سرخ ہو رہی تھیں۔ اُس کا سارا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اور بال آنسوؤں سے گیلے ہوکر چہرے پر چپک گئے تھے۔

سامنے وہی دشمنِ جاں بیٹھا تھا، جو ایک بار پھر اُسے سرابوں میں دھکیل رہا تھا۔ ہاں وہ خواب نہ تھا واقعی عبدالولی اُس کے سامنے بیٹھا تھا۔ اُس کے اتنا پاس کہ وہ ہاتھ لگا کر اُسے چھو سکتی تھی۔

"اچھی لڑکی؟ کیا مجھے گالی دے رہے ہیں؟" ترنم نے روئی روئی آواز میں کہا۔

"میں تمہیں گالی کیوں دوں گا؟ مجھے بتاؤ تم کو کیا پرابلم ہے، ہوسکتا ہے میں تمہاری مدد کرسکوں۔" وَلی واقعی اُس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔

"آپ مجھے جانتے ہی کتنا ہیں، جو مجھے اچھی لڑکی کہہ کر میری مدد کرنے پر تیار ہیں؟ جس کشتی کے اندر اتنے سوراخ ہوں کہ وہ گنے نہ جاسکتے ہوں وہ پانی میں ضرور ڈوبتی ہے! اُسے کوئی نہیں بچاسکتا، پھر میری مدد آپ کیسے کرسکتے ہیں؟" ترنم نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

مجھے تو ہر صورت ڈوب کر غرق ہوجانا ہے!
میں انجام عبرت ہوں! میں مقام عبرت ہوں!

"مجھے کوئی مدد بچا نہیں سکتی۔" ترنم نے بہکے بہکے لہجے میں کہا۔

وَلی اُس کی باتوں پر مزید اُلجھ گیا، اُسے شک تھا کہ لڑکی اپنے حواسوں میں نہیں ہے۔ شاید اُس نے نشہ استعمال کیا تھا۔ پچھلی بار وہ اُسے نشے میں بے ہوش ملی تھی۔

"آپ پلیز اُٹھیے یہاں سے، اتنی ٹھنڈ میں آپ نے مرنا ہے کیا؟" وَلی نے سہارا دے کر اُسے اٹھایا۔

"ارے ایسی خوش قسمت نہیں ہوں میں، میری سزا نے تو لگتا ہے کہ آبِ حیات پی رکھا ہے نہ میری سزا ختم ہوگی اور نہ میں مروں گی۔" اب وَلی کو یقین ہو چلا تھا کہ وہ اپنے حواسوں میں نہیں۔

"تم مجھے ہمیشہ ہی ایسے کیوں نظر آتی ہو؟ تمہارے اندر ایسی کون سی تکلیف ہے جو تمہاری زبان، آنکھیں ہر وقت بیان کرتی ہیں!" وَلی نے اپنی شال اُس کے سرد وجود کے گرد لپیٹ کر پوچھا۔

سفید چست شارٹ شرٹ اور چوڑی پاجامے میں وہ رات کے اس پل قیامت ڈھا رہی تھی۔ وَلی نے بے اختیار نگاہ پھیر لی۔

وَلی کا یوں نگاہ پھیرنا ترنم سے نہ چھپا تھا۔ وہ بے شک ذہنی ابتری میں مبتلا تھی لیکن اپنی پسندیدہ شخصیت کے پاس کھڑی اس کے وجود سے آتی خوشبو کے حصار میں جکڑی اُس کی نگاہ پڑھ سکتی تھی۔

"تم ایسے ہی تو مجھے اتنے خاص نہیں لگتے ہو!" ترنم نے بے اختیار سوچا تھا۔

"تمہارے گھر والے یہیں کہیں پاس میں رہتے ہیں ناں؟ تمہارا ڈرائیور بتا رہا تھا کہاں ہے تمہارا گھر، تمہارے گھر والے، تمہارے ماں باپ، بہن بھائی؟" وَلی اُس کے دکھ کا کھوج لگانا چاہتا تھا۔

"میرا کوئی گھر نہیں ہے اور میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔" ترنم نے سسکی بھرتے ہوئے کہا۔

وَلی اُس کی بات پر مزید اُلجھ گیا، کیا یہ دنیا میں بالکل اکیلی ہے؟ لیکن یہ اچھے کالج میں پڑھتی ہے اس کا رکھ رکھاؤ بولتا ہے کہ اچھے کھاتے پیتے گھرانے کی ہے۔

"میں نہیں مانتا کہ تم بے آسرا ہو!"

"کیا تم بروکن فیملی سے تعلق رکھتی ہو؟" وَلی نے دھیرے دھیرے اُس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

اُس کے کالج میں اکثر لڑکے لڑکیاں بے حد امیر اور بروکن فیملیز سے تعلق رکھتے تھے اور اکثر ابنارمل رویے اپناتے تھے۔ وَلی کے دماغ میں بھی ترنم کے لیے یہ ہی بات آئی تھی۔ یقیناً یہ حساس لڑکی ہوم فیملی سے ہے!

ہم بروکن فیملی! ٹوٹے ہوئے خاندان سے تعلق! کیا واقعی میں ٹوٹے ہوئے خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ ترنم کی مسکراہٹ ٹوٹی کرچیوں جیسی تھی۔

"اچھا تمہارا نام کیا ہے؟" وَلی نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ترنم!" وہ کوریڈور کی جانب بڑھتے ہوئے بولی۔

"میں تمہارا پورا نام، آئی مین تمہارا سرنیم کیا ہے؟" وَلی کے لیے وہ لڑکی اُلجھی گتھی بنتی جا رہی تھی۔

"بھائی عبدالرحمان صاحب نماز کا وقت ہوگیا ہے! باہر آجائیے۔" ترنم کے کانوں میں ایک بھولا بھٹکا [illegible]۔

"عبدالرحمان"! ابا اور اُن کے دوست رزاق اکٹھے مسجد کے لیے نکلتے تھے۔ رزاق چاچا روز پانچ وقت گھر کے دروازے کے باہر یہ ہی جملہ پکارتے تھے اور ابا سر پر ٹوپی لیے باہر بھاگتے تھے، جیسے چند منٹ لیٹ چلے گئے تو کچھ کھودیں گے۔

"میں نے تمہارے ابو کا نام پوچھا ہے؟" وَلی نے گم سم خیالوں میں کھوئی ترنم سے پوچھا۔

"میرے ابو کا نام؟" ترنم کو یوں لگا جیسے اُس کے سارے زخم اُدھڑ گئے ہوں اور اُن میں ناقابل برداشت درد شروع ہوچکا ہو۔

"میرے ابا کا نام؟"

"اپنے ابا کا پاک نام مجھ جیسی غلاظت سے بھری لڑکی اپنی زبان پر بھی لائے تو بھی گناہ ہی ہوتا ہے۔ آپ کو کیسے ابا کا نام اپنی زبان سے بتاسکتی ہوں۔" ترنم نے سسکتے ہوئے سوچا۔

"مسٹر عبدالولی میری ذات "ذرہ بے نشاں" ہے۔ بغیر جڑ کے بھی مرا ہوا پودا دیکھا ہے آپ نے؟ نہیں دیکھا تو مجھے دیکھ لیجیے، میں ہی وہ مرا ہوا پودا ہوں۔" وہ کہہ کر اندر کی جانب مڑ گئی۔

وَلی ایک دم کانپا، تیز ٹھنڈی ہَوا کا جھونکا اُس کے وجود سے ٹکرایا تھا۔ وَلی کو وہ لڑکی بھی برف کی مانند لگی۔

''کیسی عجیب پہیلی سی لڑکی ہے!'' وہ ہاتھ ایک دوسرے کے ساتھ رگڑتا اپنے کمرے کی جانب بڑھا۔

❖❖○❖❖

لتاں جان اُس کے کمرے کے باہر ٹھہر گئی تھیں، سیّد عبداللہ بے حد مگن انداز میں پیانو بجا رہے تھ سنہری گھنے بالوں کا گچھا ماتھے پر گرا تھا۔ کمرے میں بے حد مدھر سُر بکھرے ہوئے تھے۔ سیّد عبداللہ انداز میں بے حد بے خودی سی تھی، وہ چُپ چاپ اُسے اپنی پسندیدہ مصروفیت میں مگن دیکھتی رہیں۔

سیّد عبداللہ کو اچانک کمرے میں کسی اور کی موجودگی کا احساس ہوا، انہوں نے ہاتھ روک کر پیچھے مڑ دیکھا۔ اور ماں پر نظر پڑتے ہی فوراً احتراماً کھڑے ہوگئے۔

''السلام علیکم اماں جان!'' انہوں نے پیار لینے کے لیے آگے سر بڑھایا۔

''وعلیکم السلام! جیتے رہو اللہ تمہیں دین دُنیا کی خوشیوں سے نوازے۔'' انہوں نے اُس کے سر کندھے پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''لتاں جان آپ نے مجھے اپنے کمرے میں بلوا لیا ہوتا، میں وہاں حاضر ہوجاتا۔'' سیّد عبداللہ تابعداری سے کہا۔

''جیتے رہو! میرا دِل چاہ رہا تھا کہ میں اپنے بیٹے سے خود مل کر آؤں۔'' وہ مسکراتے ہوئے وا مسہری پر بیٹھ گئیں۔ سید عبداللہ نیچے قالین پر بیٹھ کر اُن کے پیروں میں بیٹھ گئے اور سر اُن کی گود میں دیا۔

''اُوپر آجاؤ کیوں زمین پر بیٹھ کر تھکتے ہو۔'' لتاں جان نے پیار سے کہا۔

''مجھے آپ کے پاس بیٹھنا اچھا لگ رہا ہے۔'' وہ وہیں بیڈ کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

''عبداللہ تم نے جتنا پڑھنے کی خواہش کی، تمہارے بابا سائیں نے تمہاری خواہش کا احترام کرکے تمہا اتنا ہی پڑھایا تمہیں باہر کے ملک پڑھنے بھیجا تاکہ تم دِل میں کوئی حسرت نہ پال سکو۔'' وہ کہتے کہتے تھوڑ دیر کو ٹھہر گئیں۔

''جی لتاں جان! میں آپ دونوں کا بے حد مشکور ہوں، واقعی میں نے جو چاہا آپ نے مجھے ہے۔'' سید عبداللہ نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

''اب بیٹا تمہارے بابا سائیں اور میرے کچھ ارمان ہیں، ہماری خواہش ہے کہ تم زمینوں معاملات میں دلچسپی لو اور میں نے تمہارے لیے ایک بہت پیاری سی لڑکی دیکھ رکھی ہے، میری آنکھ تمہارے سر پر سہرا سجا دیکھنا چاہتی ہیں۔'' سیّد عبداللہ بے اختیار مسکرائے، ہر ماں کی طرح اُن کو اُس شادی کا بے حد ارمان تھا۔

''لتاں جان! اگر میں نے کوئی گوری میم پسند کر رکھی ہو تو؟'' سید عبداللہ نے شرارت سے کہا۔

''ہو ہی نہیں سکتا، میرا بیٹا بے حد تابع دار ہے وہ کبھی ایسا کر ہی نہیں سکتا۔'' لتاں جان کے لہجے میں بے یقین تھا۔

''تو پھر جو لڑکی آپ نے دیکھ رکھی ہے، وہ ہی آپ کی بہو بنے گی۔'' سید عبداللہ نے اُن کے ہاتھوں پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

م پوچھو گے نہیں میں نے کس کو پسند کیا ہے۔'' لتاں نے پوچھا۔

کل!'' سید عبداللہ نے واقعی انکار کر دیا۔

اں جان کو اپنے تابع دار بیٹے پر بے حد فخر محسوس ہوا، اُن کے دِل کے کسی گوشے میں یہ خدشہ کبھی ر اُبھارتا تھا کہ عبداللہ اتنا پڑھ لکھ کر اپنی برادری میں کیسے کسی لڑکی سے شادی کرے گا۔

ن آج انہیں اُن کے خون نے، شرمندہ نہ ہونے دیا تھا۔ لتاں جان نے نہایت سوچ بچار کے بعد ا میں سب سے پڑھی لکھی لڑکی کا انتخاب کیا تھا۔

شہ اُن کے دیور کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بے حد سلجھی ہوئی اور نرم طبیعت کی مالک! اُن کے دیور نے بہت ہ پہلے سرگودھا میں زمینیں خریدی تھیں اور وہیں کسی لڑکی سے شادی کر لی تھی، جس سے عائشہ پیدا ہ لڑکی عائشہ کی پیدائش کے فوراً بعد مالک حقیقی سے جا ملی تھی۔ پھر سیّد صداقت علی نے دوبارہ الہ کی۔ عائشہ ہی اُن کی ہمیشہ مرکز نگاہ رہی۔

لہ کو انہوں نے پڑھایا تھا۔ اُس کی بہترین تربیت کی تھی لیکن اندر سے وہ اپنی خاندانی سوچ سے نہ لے تھے۔ اُن کی شدید خواہش تھی کہ بیٹی اپنے ہی خاندان میں بیاہی جائے۔ اور جب اُن کے سب ے بھائی کا بیٹا عبداللہ اپنی تعلیم مکمل کرکے پاکستان آیا تو انہوں نے اپنے بھائی کے ساتھ برسوں کی ا ختم کرکے اپنی بیٹی عائشہ کا رشتہ سیّد عبداللہ سے دیا۔ سیّد نوازش علی نے اتنا عرصہ بھائی کی جدائی کاٹی ہ دل سے اِس رشتے کے لیے راضی تھے۔ البتہ لتاں جان بیٹے کی مرضی جاننے کے بعد اور لڑکی کو لیر کوئی بھی فیصلہ کرنے سے گھبرا رہی تھیں۔

ن آج عبداللہ نے اُن کا مان بڑھا دیا تھا۔ ویسے بھی عائشہ ایسی لڑکی تھی، جسے دیکھ کر اُن کے دِل لک پڑ گئی تھی۔ حُسن میں یکتا، سیرت میں بے مثال شرم و حیا کا پیکر، وہ کہیں سے بھی نہ لگتی تھی کہ لے باہر تعلیم حاصل کی ہے۔ یقیناً یہ اُس کے باپ کی تربیت ہی تھی، جس کی وجہ سے اُس نے کبھی ایات سے ہٹ کر خود کو نہ ڈھالا تھا بلکہ جس طرح سیّد صداقت علی اُس سے کہتے وہ ویسی ہی بنتی

بداللہ تم دیکھنا عائشہ کے ساتھ بے حد خوش رہو گے اگر تم نے اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ ماں کے ہ پر رکھا تو کبھی کسی خوشی میں کمی نہ پاؤ گے۔'' وہ مسکراتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

عبداللہ بھی ماں کے احترام میں فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔

ں اب ایک اور خواہش پوری کردو۔ جلد از جلد تم زمینوں کے معاملات بھی سنبھالو، یہ سب کچھ ہے عبداللہ!

رے بابا سائیں نے جو زمین میرے نام دی تھی۔ وہ سب تمہاری ہے۔'' لتاں جان اکثر سیّد لی کے تیور دیکھ کر گھبرا جاتی تھیں۔ وہ دِل سے چاہتی تھیں کہ اُن کا بیٹا اپنی زمینوں کی دیکھ بھال

اں جان! بابا سائیں اور سرفراز ہیں ناں اِن معاملات کو دیکھنے والے۔'' سیّد عبداللہ ہمیشہ اس سے بھاگتے تھے۔

’’بے شک! اللہ رکھے وہ دونوں موجود ہیں۔ لیکن کیا تم ہم لوگوں سے کٹ کر رہنا چاہتے ہو؟‘‘ لمّاں جان کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ سیّد عبداللہ تڑپ اُٹھے۔

’’لمّاں جان پلیز! کبھی ایسا خیال دِل میں لایئے گا بھی نہیں۔ تعلیم مجھے میری جڑوں اور میری زمین سے کبھی الگ نہیں کرسکتی، میں آئندہ سے زمینوں پر جاؤں گا اور جو بابا سائیں چاہیں گے ویسا ہی کروں گا۔‘‘ سیّد عبداللہ نے ماں کے ہاتھ تھام کر یقین دلایا

’’جیتے رہو! اللہ تمہارا اقبال بلند رکھے۔‘‘ لمّاں جان نے بے حد دِل سے اُسے دُعا دی۔

❖❖○❖❖

’’کدھر تھیں تم؟‘‘ ماہ رخ نے تقریباً غراتے ہوئے پوچھا۔

’’یہیں تھی میں نے کہاں جانا ہے، اب تو ہر راستا بند ہوچکا ہے۔‘‘ ترنم نے تھکے تھکے لہجے میں جواب دیا۔

’’ترنم! میں نے آصف کے موبائل پر اُسے انفارم کردیا ہے وہ ہمارا گیٹ پر انتظار کررہا ہے۔ جلدی سے اپنے جوتے وغیرہ پہن لو، مین روڈ پر مارک اور صادق ہمارا انتظار کررہے ہیں۔‘‘ ماہ رخ نے جلدی جلدی اپنا اور ترنم کا ننھا منا بیگ اُٹھا کر باہر کی جانب رُخ کیا۔

ترنم نے گہرا سانس خارج کیا۔ میڈم چاندنی کے ہاتھ واقعی بے حد لمبے تھے، چند گھنٹوں میں ہی اُن کے کارندے اُن تک آن پہنچے تھے۔

ترنم نے کچھ سوچ کر وَلی کی شال اپنے ساتھ ہی رکھ لی اس گرم شال سے اُس کی خوشبو وہ شدت سے محسوس کرسکتی تھی۔

’’ماہ رخ ہم اپنے میزبانوں سے اجازت لے کر بھی تو نکل سکتے تھے ناں!‘‘ ترنم کا تیز تیز قدم اُٹھا کر چلنے سے سانس پھولنے لگا تھا۔

’’میزبان نے کون سا ہمیں دعوتی کارڈ ارسال کیے تھے، بن بلائے مہمان اگر اچانک واپس چلے جائیں تو میزبان کو اکثر خوشی ہی ہوتی ہے۔‘‘ ماہ رخ نے لمبے لان کو تقریباً دوڑتے ہوئے کراس کیا۔

’’باجی ہماری گاڑی کا کیا بنے گا؟‘‘ آصف نے پریشانی سے اُن سے پوچھا۔

’’اُس کی فکر نہ کرو وہ راستے میں کھڑی ہے، مارک اور صادق اُسے ٹھیک کر چکے ہیں۔‘‘ ماہ رُخ نے اُسے گیٹ کھولنے کا کہا، بڑا سا گیٹ جب اُس کی کنڈی کھولی گئی تو دور تک اُس کی چوں چوں ہوئی۔

’’آرام سے اُن کا نوکر جاگ جائے گا۔‘‘ ماہ رُخ نے آصف کو ڈانٹا۔

’’وہ تو ویسے بھی جاگ جائے گا۔‘‘ آصف نے تسلی سے کہا، جیسے اُسے رئیس احمد کے روز کا معمول پتا ہو۔

’’کیوں اُٹھ جائے گا؟‘‘ ماہ رخ نے فکر سے پوچھا۔

’’باجی وہ نمازی آدمی ہے، ابھی کچھ ہی دیر میں اذان ہوجائے گی۔‘‘ آصف نے اطمینان سے گیٹ کھول کر کہا۔

ترنم کا سر بے حد بھاری ہورہا تھا۔ نشہ تو اب اُس پر چند گھنٹے ہی اثر کرپاتا تھا البتہ بہت شدت سے

کی وجہ سے سر پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔ ترنم نے باہر نکلنے سے پہلے پیچھے مُڑ کر اُس عمارت کو ...ہاں ایک ایسا شخص موجود تھا، جس کے لیے جینے کو دِل چاہتا تھا۔

...میں مزید نہیں چل سکتی۔‘‘ بہت دُور تک پیدل چلنے کے بعد ترنم نے انکار کردیا اُسی پَل درختوں ...سے چار آدمی باہر نکل آئے۔ فوری طور پر دونوں لڑکیاں اور آصف ایک دم سہم گئے لیکن جیسے ہی ...ریب آئے تو ماہ رخ نے پُرسکون سانس لیا۔

...ای کہاں کھڑی ہے مارک؟‘‘ ماہی نے دونوں بیگ اُسے تھماتے ہوئے پوچھا۔

...ھر ذرا پیچھے۔‘‘ وہ کہہ کر آگے بڑھا، وہاں دو گاڑیاں کھڑی تھیں ماہ رخ تو ٹانگیں پھیلا کر تقریباً لیٹ ...جب کہ ترنم باہر کھڑکی سے سر ٹکائے جانے کن سوچوں میں تھی۔ سورج کو یوں نکلتے جانے اُس نے ...ے بعد دیکھا تھا۔

...دگی کہاں لے آئی ہے تمہیں!‘‘ وہ خود سے بولی۔

...کن زندگی کو دوش دے کر تم بری الذمہ نہیں ہوسکتیں۔ یہ تمہاری ہی منہ زور خواہشیں تھیں، جو ...زندگی کو اس موڑ پر لے آئیں۔‘‘

...اج تم مہنگے لباس پہنتی ہو، ڈائمنڈ سے کم جیولری تمہارے پاس نہیں پھر بھی تم کس قدر ناخوش ہو، ...ہارے کا سودا کیا ہے تم نے۔‘‘

...نسان کس قدر عاقبت نااندیش ہے وہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کی جب ناشکری کرتا ہے تو ہمیشہ خالی ...ہ جاتا ہے بالکل میری طرح۔‘‘ ترنم نے اپنے ہاتھوں کی جانب نگاہ ڈالتے ہوئے سوچا۔

...کی گاڑیاں ایک بہت بڑی عمارت کے باہر آ کر رُکی تھیں، ترنم نے یہ جگہ پہلے نہ دیکھی تھی۔

...ہ رخ یہ کون سی جگہ ہے؟‘‘ ترنم نے عمارت کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

...ے ہم آج ’’حیرت کدہ‘‘ آ گئے!‘‘ ماہی نے جوتے کا اسٹریپ لگاتے ہوئے کہا۔

...یرت کدہ! کیا مطلب ہے تمہارا؟‘‘ ترنم نے اُلجھن سے پوچھا۔

...ے بابا! تم اندر چل کر دیکھو، واقعی تم کو یہ جگہ کسی حیرت کدے سے کم نہیں لگے گی، یہاں کا نام ...ہی حیرت کدہ رکھا ہے۔‘‘ ماہی نے گیٹ کی جانب بڑھتے ہوئے کہا جہاں دو گارڈ الرٹ کھڑے ...رڈز نے پہلے مارک اور صادق کے وہ خاص شناختی کارڈ دیکھے، جو یہاں داخل ہونے کے لیے ...تھے۔

...کارڈز کس لیے؟‘‘ ترنم نے سوال کیا۔

...ہستہ بولو، یہاں جگہ جگہ کیمرے اور اسپیکرز سیٹ ہیں۔‘‘ ماہی نے ترنم کے کان میں سرگوشی کی، ...تین عدد خطرناک کتے گھوم رہے تھے۔ ترنم کو اتنے بڑے بڑے کتے دیکھ کر بے اختیار جھرجھری

...دروازے کے اندر کمپیوٹرائزڈ سسٹم لگا ہوا تھا۔ ترنم کو جلد ہی مارک اور صادق کے وہ مخصوص شناختی ...کا مقصد سمجھ آ گیا۔ مارک نے پہلے کارڈ داخل کیا اور پھر داخل ہونے والے افراد کی تعداد ٹائپ

''پہلے تم میرے ساتھ چلو۔'' مارک نے ماہ رخ سے کہا۔

''لیکن ہم ساتھ اکٹھے کیوں نہیں داخل ہوسکتے؟'' ماہی نے ذرا ناز وادا سے پوچھا۔

''کیوں کہ ہر دروازے کے سر پر خطرناک لیزر سسٹم ہے، ہر کارڈ صرف دو افراد کے لیے ہی ہے، تیسرے بندے کی تو کھوپڑی پگھل کر رہ جائے گی یعنی یہاں سے نہ کوئی باہر جاسکتا ہے اور نہ اندر داخل ہوسکتا ہے، کوئی بھی چالاکی یقینی موت کا سبب بن سکتی ہے۔'' مارک نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''واؤ، گریٹ!'' بظاہر ماہ رخ نے مسکرا کر اتنے خوفناک سسٹم کی تعریف کی تھی لیکن اُس کا اپنا اندر تک خشک ہوگیا تھا۔ ترنم صادق کے ساتھ داخل ہوئی۔

وسیع کوریڈور سے گزرنے کے بعد وہ ایک بار پھر ایک بہت بڑے دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ مارک نے آگے بڑھ کر کچھ کوڈ نمبرز ملائے تو دروازہ ایک دَم کھل گیا۔

دروازے کو کراس کر کے وہ ایک بڑے ہال کمرے میں داخل ہوگئے، جس کے آٹھ دروازے تھے۔ یہ ہال کمرا گولائی میں بنایا گیا تھا۔ اُن کی دیواروں پر رنگین شیشے لگے ہوئے تھے۔ ہر دروازے پر مختلف رنگوں کی روشنیاں پورے ہال میں عجیب سحر انگیز تاثر پیدا کررہی تھیں۔ ترنم کو ایک پَل کو لگا کہ وہ کسی اور ہی جہان میں آ گئی ہے چھت کے ساتھ آٹھ منزلوں والا بڑا سا جھومر لگا ہوا تھا، جس کے درمیان میں ایک سا رِنگ لٹک رہا تھا۔

ہال کے بالکل درمیان میں ایک گول میز تھی جو دھیرے دھیرے گھوم رہی تھی۔ اس کے اوپر لائف سائز کرسٹل کا بنا ڈیکوریشن پیس تھا۔ یہ برہنہ لڑکی کی شبیہہ تھی اُس پر پڑتی نیلی روشنی یوں لگ رہی تھی جیسے وہ آبشار سے نہارہی ہو، کرسٹل جس اسٹینڈ پر گھوم رہا تھا وہ چار اسٹیپ پر بنا ہوا تھا۔ لڑکی کے ہاتھ میں گول دائرہ نما چھلا سا تھا جس کے اندر سے بلو کلر کی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ مارک اور صادق ایک سبز رنگ والے دروازے کے پاس آکر رکے اور کوڈ نمبر ملانے لگے۔

ترنم نے ویسے ہی دھیان سے دیکھا تو مارک نے پہلے جی (G) اور پھر تین ملایا۔ داخلی دروازے سے اس دروازے کا نمبر تیسرا ہی تھا۔ پھر صادق نے نمبر آٹھ ملا دیا اور ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ اب وہ اندر داخل ہوچکے تھے۔ جی کا مطلب یقیناً گرین تھا کیوں کہ دروازے پر گرین روشنی ہی روشن تھی۔

سامنے ایک اور ہال کمرا تھا۔ یہاں سے بڑی بڑی سیڑھیاں اُوپر کو جاتی تھیں۔ یا اللہ! یہ ہم کہاں آگئے ہیں۔ ترنم کا دِل اس خوب صورت پنجرے نما محل سے گھبرانے لگا تھا۔ مارک نے اُن کو وہاں رکھے مغلیہ طرز کے تخت نما صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود سامنے بنے دروازوں میں سے ایک دروازے میں جا کر گم ہوگیا۔

''ماہی ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟'' ترنم نے ماہ رخ کے کان میں سرگوشی کی۔

''یہ تو میں بھی نہیں جانتی!'' ماہ رُخ خود بھی کچھ گھبراہٹ کا شکار تھی۔ کوئی بیس منٹ بعد ایک دروازے سے ایک بہت خوب صورت عورت داخل ہوئی، چھوٹے سے سیلولیس بلاؤز کے ساتھ شیفون کی ساڑھی میں وہ دور سے کم عمر لڑکی دکھائی دی تھی۔

سرخ رنگ کی لپ اسٹک اُس کی گوری رنگت پر بے حد نمایاں تھی، سرخ ساڑھی کے ساتھ سرخ ہائی ہیل سینڈل اُس کے پیروں میں بہت دیدہ زیب لگ رہی تھی۔

اس کے بال سونے کی تاروں جیسے سنہری اور آنکھیں سبز رنگ کی تھیں یا پھر لینز لگائے گئے تھے۔ ماہ رخ اور ترنم دونوں اس خوب صورت بَلا کو محویت سے دیکھ رہی تھیں۔

پاس آنے پر بھی ترنم اُس کی صحیح عمر کا اندازہ نہ لگا پائی بظاہر تو وہ چالیس سال تک کی لگتی تھی۔

''تو یہ ہیں وہ لڑکیاں، جن کا ذکر چاندنی نے کیا تھا۔'' اُس نے پاس آکر ماہ رخ اور ترنم کا بہ غور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''صادق! پتا چلا کون ہے وہ کالی بھیڑ؟ جس کی وجہ سے راتوں رات چاندنی کے ٹھکانے پر ریڈ ہوا۔'' اُس نے وہیں ایک صوفے پر ٹکتے ہوئے صادق سے پوچھا۔

''میڈم! سب کچھ اس قدر اچانک ہوا کہ ہمیں فوراً وہ جگہ چھوڑنی پڑی بس کچھ لڑکیاں بچ پائی ہیں۔ لڑکیاں جو چھاپے کے دوران پکڑی گئی ہیں فی الحال پولیس اُن کو کہاں لے کر گئی ہے پتا نہیں چل سکا۔ میڈم چاندنی نے اسی لیے فوری طور پر باقی لڑکیاں اِدھر شفٹ کی ہیں تاکہ کچھ روز میں وہ اصل بندے کا پتا لگا سکیں، یہاں لڑکیاں نہ صرف محفوظ ہیں بلکہ کوئی غدار ہے تو فوراً پکڑی جائے گی۔'' صادق نے تفصیل سے جواب دیا۔

''یہاں تو کسی چڑیا کی جرأت نہیں ہے کہ راگنی کے محل میں پَر بھی مار سکے، تم بے فکر ہوکر جاؤ۔'' اُس نے جواب میں کہا، شاید اُس کا نام راگنی تھا۔

''ہیلو لڑکیو! جا کر آرام کرو، تم سے پھر بات ہوگی۔'' اُس نے اپنے بال جھٹک کر کہا، ساتھ ہی اُس نے میز پر رکھی ایک ریموٹ نما چیز پکڑ کر کوئی بٹن دبایا، تب ہی ایک لڑکی منی اسکرٹ پہنے کمرے میں داخل ہوئی۔

''یس میڈم!'' وہ اُس کے قریب آکر تابع داری سے بولی۔

''ان کو اِن کے روم میں لے جاؤ اور ان کے کھانے پینے کا بندوبست کرو۔'' راگنی نے اُسے حکم دیا۔

اسی پَل اُن کے موبائل کی بیل بج اُٹھی، نمبر دیکھ کر سب کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔ لڑکی انہیں سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔

''جی! واجد بخاری صاحب کیسے بندی کو یاد کرلیا۔'' وہ کسی سے فون پر چہک رہی تھی، ترنم نے ایک بار مُڑ کر دیکھا، وہ بے حد مگن انداز میں صوفے سے ٹیک لگائے باتوں میں مصروف تھی۔

''ارے یہ چھوٹے موٹے وزیر تو سمجھیں ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہیں، کون سی فائل چاہیے آپ کو'' ترنم نے مزید اُوپر جانے سے پہلے اُن کا آخری جملہ سُنا تھا۔

یہ تو میڈم چاندنی کی بھی ماں لگتی ہے۔ ترنم کو پہلی ہی نظر میں اندازہ ہوگیا تھا کہ اُن کا ٹاکرا کسی بہت ہی چالاک اور پاورفل شخصیت سے پڑا ہے۔

مختلف راہ داریاں مُڑ کر وہ ایک کمرے کے پاس پہنچ گئیں، جس پر ایک سو دو لکھا تھا۔ ان کے ساتھ آئی لڑکی نے اپنی اسکرٹ سے چابیوں کا گچھا نکال کر ایک چابی کمرے کے لاک کو لگا کر دروازہ کھول

دیا۔

کمرا تھا کہ کسی شاندار ہوٹل کا سویٹ، بے حد خوب صورت فرنیچر سے سجایہ کشادہ کمرا بے حد آرام دہ تھا۔

''بے بی! اگر تم لوگوں کو نہانا مانگتا تو میں نہانے کا ارینج کر دیتا ہے!'' لڑکی نے اُن سے پُوچھا۔

''اب تم اتنے پیار سے کہہ رہی ہو تو میں تو ضرور نہاؤں گی۔'' ماہی نے اپنے بالوں کا کیچر کھول کر بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اوکے بے بی!'' وہ انٹرکام کی طرف بڑھی۔

''کیتھی بے بی لوگ نہائیں گے تم آجاؤ۔'' اتنا کہہ کر اُس نے فون رکھ دیا۔ ترنم جو فوراً بیڈ پر لیٹ گئی ہوگئی تھی، حیرت سے سوچ رہی تھی کہ کیتھی نے آکر یہاں کیا کرنا ہے۔

چند ہی منٹوں میں ایک سانولی سی لڑکی پہلی لڑکی کی طرح منی اسکرٹ پہنے اندر داخل ہوئی، اُس کے ہاتھ میں ٹرالی تھی جس پر مختلف قسم کے لوشنز وغیرہ رکھے نظر آرہے تھے۔

''گڈ مارننگ بے بی!'' اُس نے آتے ہی کہا۔

''گڈ مارننگ!'' ماہی نے خوش مزاجی سے جواب دیا۔

اتنے میں کیتھی ٹرالی لے کر باتھ روم میں گھس گئی، ترنم نے نیچے رکھے سلیپر پاؤں میں ڈالے۔ خرگوش کی شکل کے بنے سلیپر بے حد آرام دہ تھے۔ اتنے نرم کہ ترنم کو اپنے پیروں میں گدگدی سی ہوئی۔

''بے بی! بریک فاسٹ میں تم کیا لینا مانگتا؟'' پہلے والی لڑکی نے سوال کیا۔

''کیا ہے بریک فاسٹ میں؟ ماہی نے دل چسپی سے پوچھا۔

''اینی تھنگ یو وانٹ! میں آپ کو لاکر دے گی۔'' لڑکی نے تابع داری سے کہا۔

''ٹھیک ہے تم آج ہمیں اپنی پسند سے ناشتا کروادو، ہم تو آج بالکل مہمان بننے کے موڈ میں ہیں کل سے تمھیں باقاعدہ بتا دیا کریں گے۔'' ماہی نے کہا۔

''اوکے بے بی! تم باتھ لے لو اتنے میں تمہارا بریک فاسٹ آجائے گا۔'' لڑکی کہہ کر باہر نکل گئی۔

''تم بھی نہاؤ گی؟'' ماہی نے ترنم سے پوچھا جو پیر لٹکائے بیٹھی تھی۔

''ہاں میں گرم پانی سے نہاؤں گی میرے سر میں شدید درد ہے۔'' ترنم نے اپنا سر دباتے ہوئے

''تمھیں کس نے کہا تھا کہ تم وقت بے وقت ڈوز استعمال کیا کرو۔'' ماہ رخ نے اُسے باقاعدہ اپنے موبائل فون کو مسلسل ملانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن فون پر سگنل بالکل نہیں آرہے تھے۔

''یہاں فون کیوں نہیں چل رہا؟'' ماہی نے چڑ کر باآواز بلند کہا۔

''یہاں پر کوئی بھی نیٹ ورک کام نہیں کرتا بے بی!'' وہ سانولی سی لڑکی باہر آکر بولی۔

''لیکن کیوں؟'' ماہی نے چڑ کر پوچھا۔

''کیوں کہ یہاں موبائل کے سگنل پہنچ نہیں پاتے۔'' سانولی لڑکی نے ایک خوشبو دار آئل ماہی کے سر کا مساج کرتے ہوئے جواب دیا۔

''لیکن نیچے تو تمہاری میڈم موبائل سن رہی تھی۔'' ترنم نے اُس کے مساج کا مزہ لیتے ہوئے کہا۔

''وہ خاص قسم کا موبائل ہے جو گہرائی ہو یا اُونچائی سگنل ریسیو کرلیتا ہے۔'' اُس کے ہاتھ بے حد مہارت سے چل رہے تھے۔ ماہی کو یہ سُن کر خاصی مایوسی ہوئی، اُس کا تو اپنے کئی دوستوں سے فون پر لمبی لمبی گفتگو کیے بغیر گزارہ نہ تھا۔

''ارے کیتھی تمہارے ہاتھ میں تو جادو ہے۔'' ترنم کے تھکے ہوئے اعصاب ایک دم پُرسکون ہونے لگے۔

''ابھی بے بی میں نے اروما آئل آپ کے باتھ ٹب میں ڈالا ہے اُس سے نہا کر آپ پھولوں کی طرح مہکو گے اور ہلکے پھلکے ہو جاؤ گے۔''

''تھینکس کیتھی!'' ترنم کہہ کر باتھ لینے گھس گئی۔

باتھ روم تھا کہ پورا کمرا، ایک جانب خاص طور پر اسٹیم لینے کے لیے شیشے کا کیبن بنایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ میگزین کا ریک رکھا ہوا تھا ہلکے میوزک کے ساتھ نہانا ترنم کو خاصی عیاشی لگ رہا تھا یہ اِن کی لیے تو خاصی توپ چیز لگتی ہیں۔ ماہی صحیح کہتی تھی کہ یہ ''حیرت کدہ'' ہے۔ ترنم نہا کر واقعی ہلکی پھلکی ہوگئی تھی۔

ترنم گلابی رنگ کے باتھ گاؤن میں باہر نکلی تو ماہی سر کا مساج کروا کر اپنے پیروں کا مساج کروا رہی تھی۔ پاس ہی ناشتے کی ٹرالی رکھی تھی۔

''بے بی! میں تمہارے لیے پانی تیار کر رہی ہوں۔'' کیتھی ایک بار پھر باتھ روم میں گھس گئی۔

''ترنم ناشتا شروع کرو تب تک میں نہا آتی ہوں۔'' ماہی نے اپنے لیے بھیجا گیا باتھ گاؤن اُٹھا کر ترنم سے کہا۔

ناشتے میں اورنج اور پائن ایپل جوس تھے۔ بوائل ایگ، ٹوسٹ، چکن آملیٹ وغیرہ سے ٹرالی بھری ہوئی تھی۔

ترنم کو تو ایک کپ چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی اُس نے ایک گرم کپ چائے کا لیا، ساتھ ایک بوائل ایگ اور کپڑے تبدیل کر کے بیڈ پر گر گئی۔

کیتھی نے جانے پانی میں کیسے کیسے خوشبو دار آئل ڈالے تھے کہ اُس کے سارے اعصاب بے حد پُرسکون ہو گئے تھے۔ اور اب نیند سے اُس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

جب ماہی نہا کر باہر نکلی تو ترنم کو بے خبر سوتے پایا۔

''لو یہ تو گئی کام سے۔'' وہ ناشتا کرتے ہوئے خود سے بولی۔

راگنی میڈم کے ہاں جانے کتنے دن ہمیں رہنا ہوگا؟ ماہی نے اورنج جوس کا سِپ لیتے ہوئے سوچا۔

وہ یہاں ایک دو بار مختلف پارٹیوں کے سلسلے میں پہلے بھی آچکی تھی، اُس نے راگنی میڈم کو بہت سخت پایا تھا۔

وہ اگر اپنی لڑکیوں کو شہزادیوں کی طرح رکھتی تھی تو کام بھی بے حد مشکل لیتی تھی۔ مختلف اعلیٰ عہدے داروں سے مختلف فائلوں کے متعلق راز اُگلوانا ان کا کام تھا۔

اگر کوئی لڑکی کسی اسائنمنٹ میں ناکام ہو جاتی تھی تو اُسے راگنی میڈم کے عتاب کا سامنا کرنا پڑتا

”ہم تو بھئی آپا کے ساتھ خوش ہیں ہمیں یہ راگنی وغیرہ سوٹ نہیں کرتی۔ اللہ کرے جلد یہاں جان چھوٹ جائے۔“ ماہی کو اپنی آزادی بے حد عزیز تھی لیکن فی الحال یہ محل نما پنجرہ ہی اُن کا ٹھ جہاں نہ آنا آسان تھا اور جانا تو بالکل ناممکن تھا۔

❖❖○❖❖

”لالہ کدھر ہیں رئیس احمد؟“ سارہ شال لپیٹے باہر نکلی تو طارق کی جیپ غائب تھی۔

”بٹیا وہ تو رات ہی واپس کسی کام سے چلے گئے تھے۔“ رئیس احمد کے الفاظ سارہ کا موا کر گئے۔

”کب گئے تھے وہ؟“ سارہ لان میں بچھی کین کی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھتے ہوئی بولی۔

”جب آپ لوگ کمروں میں سونے گئے تو اُن کا کوئی ضروری فون آ گیا، جسے سنتے ہی وہ چلے گئے“

”بٹیا تمہارے لیے کچھ کھانے کو لاؤں، آج میں نے خانساماں کو باورچی خانے جلدی بھیج دیا کہ کے لیے بڑھیا سا ناشتا بناؤ۔“ رئیس احمد نے اپنی کارگزاری بھی فوراً گوش گزار کی۔

”نہیں ابھی کچھ نہیں۔“ سارہ نے سستی سے آنکھیں بند کرتے ہوئے اُسے جانے کو کہا۔

”اللہ کی ذات آپ کو اپنی امان میں رکھے لالہ۔“ سارہ دل سے طارق کے لیے دعا گو تھی۔ اپنی نیندیں حرام کیے کن کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ اسی پل اُس کے موبائل کی بیل بج اُٹھی۔ آنی کا تھا سارہ کا چہرہ ایک دم کھل اُٹھا۔

”ویری گڈ مارننگ مائی لعل ڈول!“ آنی کی پیار بھری آواز نے سارہ کی ساری سستی بھگا دی تھی

”آنی! اب میں چھوٹی نہیں رہی بڑی ہو گئی ہوں، کل میں نے اپنی بیسویں سالگرہ کا کیک کاٹا۔“ سارہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میرے لیے تو تم چھوٹی سی گڑیا ہی رہو گی، جو میرے بغیر سوتی تک نہ تھی۔“ آنی کی آواز ایک اُداس ہو گئی۔

”آنی! اِٹس ناٹ فیئر، میں نے آپ کو کتنی بار کہا آپ ہمارے ساتھ چلیں، میری ہر خوشی آپ بغیر ادھوری ہے لیکن آپ جانے کیوں فارم ہاؤس آنے سے ہمیشہ گھبراتی ہیں۔“ سارہ کی آواز میں تھا۔

”میری جان تم لوگوں کی ینگ پارٹی میں، میں مس فٹ تھی ورنہ میں اپنی جان کی سالگرہ مس کر تھی؟ اینی ہاؤ ہم نے آج یہاں تمہاری برتھ ڈے پارٹی سے ذرا مختلف منانے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں اپنی فیکٹری ورکرز کو آج لنچ فری دینے کا ارادہ کیا ہے اور سب میں چھوٹے موٹے گفٹس بھی بانٹنے ارادہ ہے۔“

”اوہ! آنی یو آر ریئلی گریٹ! جتنا آپ مجھ سے اور لالہ سے پیار کرتی ہیں۔ لگتا ہی نہیں ہے کہ ہماری ماسی نہیں ماں ہیں مجھے واقعی خود پر فخر ہوتا ہے کہ آپ ہماری آنی ہیں۔“ سارہ کا اعتراف آنی کو مزید تقویت دے رہا تھا۔ انہوں نے ساری عمر خود کو اچھا اور بڑا دکھانے میں گزاری تھی۔ آج ا

اکارت نہ گئی تھی۔ سارہ اور طارق دونوں اُن کی مٹھی میں تھے۔

”اچھا بیٹا! انجوائے یور سیلف، میں فون رکھتی ہوں۔“ آنی فون بند کرنے سے پہلے کہا۔

”اللہ حافظ آنی!“ سارہ آنی کی آواز سن کر ایک دم فریش ہو گئی تھی۔

”یہ لڑکیاں کدھر ہیں، جو رات کو آئی تھیں؟“ مسکان نے باہر آتے ہی پوچھا، ساری رات اُسے یوں کے متعلق تجسس رہا تھا۔ صبح وہ ان کے کمرے میں گئی تو اُن کے بستر خالی تھے۔

”بی بی! وہ لوگ لگتا ہے تڑکے ہی نکل گئے۔“ رئیس احمد ناشتے کی ٹرے اُٹھا کر نزدیک آیا۔

”چلے گئے؟ لیکن ہم سے ملے بغیر! بھئی سارہ مجھے تو وہ لڑکیاں مشکوک سی لگی ہیں۔“ مسکان نے ابرو اُٹھا کر کہا۔

”بی بی! اُن کا ڈرائیور رات سونے سے پہلے کہہ رہا تھا کہ وہ لوگ شاید سویرے نکل جائیں، اس لیے اب صبح وہ مجھے نظر نہیں آیا اور اُس کی گاڑی بھی غائب تھی تو میں سمجھ گیا کہ بچہ لوگوں کو جلدی تھی اس لیے نکل گئے۔“ رئیس احمد نہایت سادہ آدمی تھے، اُن کی سوچ بھی بہت سادہ تھی۔ مسکان کو اُن لڑکیوں کے جانے سے بے حد سکون محسوس ہوا تھا۔ جانے کیوں اُسے اس لڑکی ترنم کی آنکھوں سے بے حد وحشت ہوتی رہی تھی وہ وَلی کو جس طرح بے خودی سے دیکھتی تھی، مسکان کا دل چاہ رہا تھا کہ اُس کی آنکھیں نوچ لے، اچھا ہوا چلی گئی۔ مسکان بے اختیار مسکرائی۔

”سمعان وغیرہ اُٹھے کہ نہیں؟“ مسکان نے چائے کپ میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”وہ لوگ تو لگتا ہے پورا اصطبل بیچ کر سو گئے ہیں، میں نے رئیس احمد کو بھیجا تھا انہیں اُٹھانے کو فی الحال ان میں سے کوئی اُٹھنے کو تیار نہیں ہے۔“ سارہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہ لو، نگی اور منزہ بھی آ گئی ہیں میرا خیال ہے ہم لڑکیاں تو ناشتا کر لیں، مردانہ پارٹی بعد میں ناشتا کر لے گی۔“ سارہ نے ساتھ ہی رئیس احمد کو آواز دے کر مزید ناشتا لانے کو کہا۔ نگی گہرے سرخ شلوار قمیض میں گلاب کی کلی لگ رہی تھی۔

”لالہ آپ کی پسند ہے تو لاجواب!“ سارہ نے دل ہی دل میں نگینہ کی نظر اُتارنے کا سوچا۔

”ہم تھوڑی دیر بعد باغ میں چلیں گے۔ وہاں کینو، فروٹر اور گریپ فروٹ کے درخت ہیں، کچھ پیڑ امرود کے بھی ہیں۔ فی الحال تو فروٹر کے درختوں پر بہت پھل آیا ہوگا کچھ دنوں بعد فروٹر کا زور کم ہو جائے گا تو کینو مالٹے کے درخت بھر جائیں گے۔“ سارہ نے سب لڑکیوں کو ناشتے کے بعد ساتھ چلنے کو تیار کر لیا۔

”سارہ! طارق بھائی بتا رہے تھے کہ تم گھڑ سواری بہت اچھی کر لیتی ہو، مجھے بھی رائیڈنگ دیکھنی ہے۔“ نگینہ نے بے حد شوق سے اظہار کیا۔

”ہائے سارہ کس قدر مزا آتا ہے ناں رائیڈنگ میں؟ میں بھی بیٹھوں گی۔“ مسکان نے بھی ضد کی۔

”او کے! تو پہلے رائیڈنگ ہو جائے۔“ سارہ اُن کے لیے اصطبل کی جانب بڑھی۔

”واؤ! یہ بلیک گھوڑا کتنا خوبصورت ہے۔“ مسکان نے بے حد اُونچے اور صحت مند گھوڑے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن افسوس، تم اس پر سواری نہیں کر سکتیں۔ یہ گھوڑے مردوں کے لیے مخصوص ہیں۔ ہم صرف ان پر

سواری کر سکتے ہیں۔" سائرہ نے چھوٹے قد والے دو گھوڑوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اٹس ناٹ فیئر! میرا دِل تو اس بلیک بیوٹی پر آ گیا ہے، میں اس پر سواری کروں گی۔'' بہت عرصے بعد مسکان پہلے والی ضدی مسکان نظر آئی تھی۔

''تمہیں رائیڈنگ آتی بھی ہے؟'' سائرہ نے مسکان کو چھیڑا، جس طرح کچھ دیر پہلے وہ رائیڈنگ کے متعلق شوق کا اظہار کر رہی تھی۔ اُس سے تو لگتا تھا کہ مسکان نے قریب سے بھی گھوڑا نہ دیکھا ہو۔

''دیکھ لیتے ہیں۔'' مسکان کہہ کر اُن گھوڑوں کی جانب بڑھی، جو لڑکیوں کی رائیڈنگ کے لیے تیار کیے گئے تھے۔

''مائی گاڈ! یہ تو چھپی رستم نکلی۔'' منزہ نے مسلسل مونگ پھلی کھاتے ہوئے کہا، مسکان کسی ماہر کی طرح گھوڑا دوڑا کر چکر کاٹ رہی تھی۔

''ارے بھئی! میرے بابا سائیں کا اپنا کلیکشن ہے، عربی نسل کے بے حد خوبصورت گھوڑے ہیں اُن کے پاس۔'' مسکان نے چھلانگ کر گھوڑے سے اُترتے ہوئے کہا۔

''اب تو میڈم مجھے اِس بلیک بیوٹی پر سواری کرنے کی اجازت دے دو۔'' مسکان واقعی اُس خوبصورت گھوڑے پر سواری کرنے کو بے حد بے چین تھی۔

''او کے! جیسے تمہاری مرضی۔'' سائرہ نے اُسے اجازت دے دی۔

''بی بی! گھوڑا اتھرا ہے! میری مانو تو کسی اور گھوڑے پر سواری کرلیں، یہ سوائے طارق باؤ کے، کسی کو اپنی پیٹھ پر بیٹھنے نہیں دیتا۔'' ملازم نے باگیں مسکان کو تھمانے سے پہلے سائرہ سے کہا۔

''ارے کچھ نہیں کہتا یہ مجھے۔'' مسکان نے ہیلمٹ پہنتے ہوئے ملازم کا مذاق اُڑایا۔

''لیکن بی بی! اگر آپ مان جائیں تو اچھا ہے، جانور کا کیا پتا کب اپنا مزاج بگاڑے اور نقصان پہنچا دے۔'' ملازم ابھی تک مسکان کے اس گھوڑے پر سواری کے لیے آمادہ نہ تھا۔

''ارے عطا محمد! پلیز دے دو، اُس کے ابا کا اپنا اتنا بڑا اصطبل ہے ظاہر ہے اناڑی تھوڑا ہی ہے۔'' سائرہ نے مطمئن لہجے میں کہا۔

''آپ کو ڈر نہیں لگتا، جب گھوڑے پر بیٹھتی ہیں، میں تو اِسے ہمیشہ لڑکوں کی سواری سمجھتی رہی ہوں۔'' نگینہ نے معصومیت سے مسکان سے پوچھا۔

''ڈر کیسا! یہ بے چارے گھوڑے ہمارا کیا کرلیں گے۔'' مسکان نے گھوڑے پر بیٹھتے ہوئے ایڑ لگائی لیکن اگلے ہی پَل مسکان کے چہرے پر پریشانی تھی۔ گھوڑا ہَوا میں اُچھل رہا تھا۔ وہ مسکان کو سوار کرنے پر تیار نہ تھا یوں لگتا تھا کہ کسی پَل وہ اُسے زمین پر پٹخ دے گا۔

''عطا محمد! کچھ کرو۔'' سائرہ چلّائی، نگینہ کا تو رنگ فق ہو گیا تھا۔

''بی بی! گھوڑا ابدک گیا ہے، وہ کہیں اپنی ٹانگوں کے نیچے کسی کو نہ دے دے، میں بہر حال کوشش کرتا ہوں۔'' عطا محمد نے ایک مضبوط رسّے کا پھندا بنا کر گھوڑے کے گلے میں ڈالنے کی کوشش کی تو گھوڑا مسکان سمیت بھاگ کھڑا ہوا۔

''یا میرے اللہ خیر!'' نگینہ ایک دم چیخی۔

"بھائی! بھائی...... وہ مسکان۔'' نگینہ نے سامنے سے آتے وَلی کو مسکان کی جانب متوجہ کیا۔

"کیا ہوا عطا محمد؟'' وَلی بھاگتا ہوا قریب آیا۔

"سائیں گھوڑا ابدک گیا ہے!'' عطا محمد رو دینے کو تھا۔

"اوہ میرے اللہ! وَلی ایک دَم تیزی سے دوسرے گھوڑے کی جانب بڑھا، اُس پر زین موجود تھی۔ ...ل نے پیٹرز اینڈ کیتھرائن میں بیسٹ رائیڈر کا کئی بار ٹائٹل جیتا تھا وہ بڑی تیزی سے گھوڑا لے کر مسکان ...پیچھے گیا۔

"مسکان مجھے ہاتھ دو۔'' وَلی نے اُس کے قریب پہنچ کر کہا، اُس کا گھوڑا مسلسل بھاگ رہا تھا۔

"نہیں میں گر جاؤں گی!'' مسکان نے روتے ہوئے کہا۔

"بیوقوف لڑکی کیا سارا دن اس پر بیٹھے رہنے کا ارادہ ہے، مجھے ہاتھ دو۔'' وَلی نے تقریباً چیختے ہوئے ...ہا۔

بس ایک لمحہ لگا تھا، وَلی نے بجلی کی تیزی سے مسکان کو کھینچ کر پکڑ لیا اور اُونچا کر کے اپنے آگے بٹھا ...ا۔

بلیک بیوٹی تو بھاگتی واپس چلی گئی تھی، لیکن مسکان وَلی کے بازوؤں میں اپنے حواسوں میں نہ تھی وہ ...ں کے کندھے سے لگی مسلسل رو رہی تھی۔ وَلی نے گھوڑے کو روک دیا۔

لیکن مسکان اس بات سے بے خبر کہ جس انسان کی آہٹوں پر اُس کا دِل دھڑکتا تھا۔ اُس کی موجودگی ...ں اُس سے بات نہیں ہوتی تھی۔ اُس کے سینے سے لگی رو رہی تھی۔

''پلیز ٹیک اٹ ایزی!'' وَلی نے نرمی سے اُسے الگ کیا اور خود اُتر کر اُسے بھی اُترنے میں مدد دی۔

مُسکان کو ایک دَم اپنی حالت کا احساس ہوا، شرم سے اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

''تھینکس!'' مُسکان نے اُتر کر بہ مشکل کہا، اُس کے دِل کی رفتار اُس کے اپنے ہی قابو میں نہ تھی۔ ...ی وہ موت کو چھو کر آئی تھی۔

''مسکان آپ ٹھیک ہو؟'' نگینہ سب سے پہلے دوڑتی ہوئی اُن کے پاس پہنچی۔

''ہوں!'' مُسکان سے بولا تک نہ جا رہا تھا۔

''آپ سے عطا محمد نے کتنا کہا تھا ناں کہ اُس اتھرے گھوڑے پر نہ بیٹھو پھر آپ نے کیوں ضد کی، ...ر آپ کو کچھ ہو جاتا؟'' نگینہ نے فکر مندی سے کہا۔

''بعض لوگوں کو خودکشی کا شوق ہوتا ہے۔'' وَلی نے مسکان کا شرمندہ چہرہ دیکھ کر اُسے مزید شرمندہ ...یا۔

''طارق تم سب کی ذمّے داری مجھے سونپ کر گیا ہے، اگر مجھے اندازہ ہوتا کہ لڑکیاں اتنی زیادہ حماقت ...رتی ہیں تو میں فوراً انکار کر دیتا۔''

''آئی ایم سوری! مجھ سے غلطی ہو گئی۔'' مسکان نے سب کے سامنے اعتراف کیا۔

''مسکان بی بی! ذرا ایک پَل کو سوچیں کہ اگر اللہ نے آپ کی زندگی مزید نہ رکھی ہوتی تو کیا آپ یہ ...لٹا پلٹا جملہ بولنے کے قابل ہوتیں، البتہ ڈاکٹر باہر نکل کر ضرور کہتے کہ آئی ایم سوری۔'' وَلی نے تقریباً

ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”وَلی بھائی کسی پر احسان کر کے اُسے یوں نہیں ڈانٹتے۔“ نگینہ نے مسکان کا اُترا چہرہ دیکھ کر کہا۔

وَلی سر جھٹکتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

”وَلی!“ مسکان نے پیچھے سے آواز دی، وَلی نے سر گھما کر سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

”وَلی! مجھے نئی زندگی دینے کا بے حد شکریہ!“ مسکان نے ایک جذب سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اِٹس او کے!“ وہ دھیرے سے مسکرایا تو مسکان کو یوں لگا، جیسے ہڈیوں میں اُترتی برف جیسی سردی میں نرم چمکیلی دھوپ آ نکلی ہو۔

”لیکن پلیز میں آپ کو آل ویز ویلکم نہیں کہہ سکتا۔“ اُمید ہے آپ دوبارہ کبھی اجنبی گھوڑے کی سواری کی ضد نہیں کریں گی، کیوں کہ میں ہر دَم آپ کے پاس تو نہیں ہو سکتا!“ وَلی کہہ کر مڑا۔

”اللہ کرے تم ہمیشہ میرے پاس رہو۔“ مسکان نے دل سے دعا کی۔

”رئیس احمد پلیز! گرما گرم چائے پلوایئے۔“ وَلی نے سامنے سے آتے رئیس احمد سے کہا۔

”وَلی میں نے زندگی میں کچھ نہیں مانگا کیوں کہ مجھے ہمیشہ بِنا مانگے ہی سب کچھ ملتا رہا ہے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار اگر کسی کے لیے تمنا کی ہے تو وہ تم ہو، تمہارا ساتھ اور تمہاری محبت۔“ مسکان نے اونچے لمبے چوڑے وَلی کی پشت دیکھتے ہوئے بہت پیار سے سوچا۔

”اور اگر تم مجھے نہ ملے تو میں مر جاؤں گی!“ کوئی بہت یقین سے اُس کے اندر سے بولا۔

”تمہیں ہمیشہ میرے ساتھ رہنا ہی ہوگا، ان ہاتھوں کی لکیروں میں تمہیں میرا مقدر بننا ہی ہوگا۔“ ایک دَم مسکان سرفراز علی کی آنکھوں میں جنون اُتر آیا تھا۔

❖❖❖○❖❖❖

”پلیز مجھے جانے دو! میری ماما، پاپا مجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کے پریشان ہو رہے ہوں گے۔“

پلیز مجھے جانے دو!“ رو رو کر اُس کی آواز پھٹنے کو تھی۔ ترنم جو سو سو کر تھک گئی تھی، کمرے سے باہر نکل آئی، سامنے کا منظر خاصا پریشان کن تھا۔

اسکول یونیفارم میں تیرہ چودہ سالہ صحت مند لڑکی بلک بلک کر رو رہی تھی، اُس کے پاس ہی کیتھی لب کاٹ رہی تھی۔

”بچہ! میں تمہاری مدد کبھی نہیں کر سکتا۔“ کیتھی کے لہجے میں درد تھا۔ تم کو اب یہیں رہنا ہوگا، یہاں سے واپس جانے کا کوئی ایک راستا بھی نہیں ہے۔

”نہیں مجھے گھر جانا ہے!“ لڑکی مزید چیخنے چلانے لگی۔

ترنم کے چہرے پر بے حد کرب تھا۔ پہلی بار وہ بھی یوں ہی گھر جانے کو بے چین ہوئی تھی اور پھر اُس کے پَر ہمیشہ کے لیے کاٹ دیے گئے تھے۔ لیکن اس لڑکی کی عمر بے حد کم تھی اسکول یونیفارم پر اسکول کا بیج لگا ہوا تھا۔ شکل سے وہ کسی بہت اچھے گھرانے کی لگتی تھی۔

”روزی تم اس کو اس کے کمرے میں لے جاؤ۔“ ایک دم کمرے سے میڈم راگنی نکلی اُن کے ساتھ ایک نہایت خرانٹ قسم کی ملازمہ تھی۔

”نہیں میں نہیں جاؤں گی!“ لڑکی زمین پر سے اُٹھنے کو تیار نہ تھی۔ روزی اُسے گھسیٹتے ہوئے اندر لے گئی۔

”کیتھی مارک کو بلاؤ اِس لڑکی کی شوٹنگ آج ہی ہوگی، مجھے سی ڈیز جلد سے جلد مارکیٹ میں دینی ہیں۔ تمہیں تو پتا ہے میں بزنس میں زبان کی کتنی پکی ہوں۔“ میڈم راگنی ٹک ٹک اپنی ہیل بجاتی ہوئی چلی گئی۔ ترنم کو لگا کہ وہیں زمین میں گڑ گئی ہو۔

کیتھی جھکے کندھوں کے ساتھ وہاں سے جانے لگی تو ترنم نے اُسے روک لیا۔

”اِس لڑکی... میرا مطلب ہے اِس بچی کی شوٹنگ کس چیز کی کرنی ہے؟“ ترنم کا لہجہ آس نراش لیے ہوا تھا۔ دِل میں جو بُرا گمان آ رہا تھا کاش وہ نہ ہو۔

”تم تو خود اِسی سیٹ اپ کا حصّہ ہو بے بی! تمہارا یہ سوال کچھ عجیب سا ہے۔“ کیتھی نے استہزائیہ لہجے میں جواب دیا۔

”میں جاننا چاہتی ہوں پلیز! مجھے میرے سوال کا جواب دو!“ ترنم نے بے بسی سے درخواست کی۔

”آج اس معصوم کو بھیڑیے نوچیں گے اور اس بچی کی معصومیت کے قتل کی سی ڈیز ہر محلّے میں بکے گی۔ موبائل فونز پر کالج کے لڑکے اس کو دیکھیں گے۔ بس یا کچھ اور سننا چاہتی ہو۔“ کیتھی نے سرد لہجے میں کہتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

اور ترنم وہیں دیوار کے پاس کسی کٹے ہوئے پیڑ کی طرح دھم سے زمین پر گر گئی۔ اُس کی آنکھوں میں دو بے بس آنسو تھے!

''یار وہ رات والی پریاں کہاں چلی گئیں؟........ میں نے ساری رات اُن کے ساتھ خواب گزاری۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ اس خواب کی تعبیر اتنی بُری ہوگی تو میں سوتا ہی نہ......آہ! کیا لڑکیاں تھیں'' ٹی ٹو حسبِ معمول اپنی ہی ہانکے جا رہا تھا۔

''دونوں اتنی پیاری تھیں کہ چوائس مشکل ہو رہی تھی۔'' وَلی نے بمشکل اپنی مسکراہٹ روکی۔

''ہیں! تم واقعی کمال آدمی ہو! یک نہ شد دو شد! تمھیں واقعی دو دو لڑکیوں کو اکٹھے دیکھنا، سوچنا اچھا لگتا ہے؟'' سمعان نے حیرانگی سے پوچھا۔

''دیکھو میری دو آنکھیں ہیں، میں ایک آنکھ سے ایک لڑکی پر بھرپور نگاہ ڈال سکتا ہوں اور دوسری آنکھ سے کسی بھی دوسری لڑکی کو بھرپور توجہ دے سکتا ہوں۔'' ٹی ٹو نے تیسری بار بوائل انڈا اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا، سمعان اُس کی خوش خوراکی پر حیران ہو رہا تھا۔

''یقیناً تمہارے دو دماغ ہوں گے ایک سے ایک لڑکی کو سوچ سکتے ہو گے اور دوسرے سے دوسری لڑکی کو۔'' سمعان نے شرارت سے آنکھ دبا کر وَلی کو اشارہ کیا ساتھ ہی ٹی ٹو کی پلیٹ میں دو کباب ایک اور بوائل انڈا ڈال دیا۔

''بندر جو ہوئے تم۔'' سمعان نے زیرِ لب کہا۔

''بالکل۔ بالکل!'' ٹی ٹو نے منہ انڈے سے بھرتے ہوئے جوش و خروش سے اُوپر نیچے اثبات میں سر ہلایا۔

وَلی اور سمعان کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ ٹی ٹو نے نہ سمجھنے کے انداز میں اُنھیں دیکھا۔

''تم کیوں ہنس رہے ہو؟'' ٹی ٹو نے مشکوک نظروں سے اُنھیں گھورتے ہوئے پوچھا۔

''ویسے ہی یار تمہاری حوصلہ افزائی کے لیے۔'' اس بار وَلی نے بمشکل اپنی ہنسی روکتے ہوئے کہا۔

''کس معاملے میں؟'' ٹی ٹو کھانے کے دوران ہمیشہ توجہ اِدھر اُدھر کرتے بُرا لگتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنی پلیٹ صاف کر کے فوراً چائے کا کپ لبوں سے لگا لیا۔

''یہی لڑکیوں کے معاملے میں''۔ کاشف نے فریج ٹوسٹ نکال کر اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے گفتگو میں حصہ لیا۔

''ویسے یار تم شادی کیوں نہیں کر لیتے، اس طرح تم روز روز نئی نئی لڑکیوں پر وقت ضائع کرنے سے بچ جاؤ گے''۔ کاشف نے نہایت ایمان داری سے اسے مشورہ دیا۔

''کاشف تُو کیوں کسی لڑکی کو برباد کروانے کا سوچ رہا ہے''؟

''لو کر لو گل۔ یہ ضرور کسی نہ کسی لڑکی پر مستقل بددُعا کا حصّہ بننے جا رہا ہے، ٹی ٹو کے ساتھ کوئی بھی لڑکی شادی کر کے پچھتائے گی۔'' سمعان نے وَلی کے قریب ہو کر سرگوشی کی۔ جواب میں وَلی نے پیار سے سمعان کو گھورا۔

''دیکھو محبت ضرور کرو۔ ٹھیک ٹھاک افیئر چلاؤ لیکن جیسے ہی لڑکی شادی کے لیے سنجیدہ ہو کر گلے کا پھندا بننے کا ارادہ کرے تو فوراً اسے باجی جان بنا کر ٹاٹا، بائے بائے کر دینا چاہیے۔ ورنہ یہ پھندہ ساری عمر گلا دباتا ہے''۔ ٹی ٹو نے اپنے نادر خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''اگر مجھے بھی کچھ عرض کرنے کی اجازت ہو تو میں کچھ کہنا چاہتا ہوں''۔ ٹی ٹو نے گلا کھنکار کر کے کہا۔

''تم کب سے اتنے سلیقہ مند ہو گئے؟ تم کھاتے اور بولتے تو ہمیشہ بغیر اجازت کے ہو''۔ وَلی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یار کبھی کبھی پوچھ لینے سے تم لوگوں کا دل بڑا ہو جاتا ہے ناں۔'' ٹی ٹو مُنہ پھاڑ کر بولا۔

''چلیے اپنی عرض ختم کر لیجیے پھر ذرا باغ میں جانے کا ارادہ ہے''۔ سمعان نے کسی شہنشاہ کی طرح ٹی ٹو کو اجازت دی۔

''بیوی کے متعلق ارشاد کیا ہے!'' ٹی ٹو نے گلا صاف کیا۔

''ایک منٹ! پہلے تم واضح کر دو کہ کس کی بیوی کے متعلق۔'' سمعان نے اُسے بیچ میں ٹوکتے ہوئے کہا۔

''سب کے متعلق! آئی مین جنرل بیویوں کے متعلق! جنرل ٹاپک پر۔'' ٹی ٹو نے وضاحت کی۔

''ہرگز نہیں! تمھیں ہم چاروں کی بیویوں یعنی تمہاری بھابیوں کو نکالنا ہوگا۔'' سمعان نے باقاعدہ سنجیدہ ہو کر کہا۔

''اوکے۔ اوکے! اب میں کچھ کہہ لوں۔'' ٹی ٹو نے بدمزا ہو کر کہا۔

''ویسے ہر بیوی ''جنرل'' بیوی ہوتی ہے رعب جماتی آنکھیں دکھاتی۔'' ٹی ٹو بڑبڑایا۔

''بجا فرمایا!'' کاشف اور سمعان یک زبان ہو کر بولے۔

کون کہتا ہے جان ہے بیوی — ارے بھائیو صبر کا امتحان ہے بیوی

ٹی ٹو نے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر غائبانہ داد سمیٹتے ہوئے کہا۔

پھیکا پکوان جہاں سے ملتا ہے — ایسی اونچی دُکان ہے بیوی
دوستوں سے ہے اس کو اتنا بیر — جانے کیوں بدگماں ہے بیوی
سورما ہوں گے گھر سے باہر ہم — مگر! گھر میں تو پہلوان ہے بیوی
ہائے صبر کا امتحان ہے بیوی!

ٹی ٹو نے اِک سرد آہ کھینچتے ہوئے کہا۔

''میں شادی جیسے امتحان میں اس لیے نہیں پڑ سکتا! یارو! یہ بات تو سب سمجھتے ہیں، جانتے ہیں کہ میں امتحانات میں ہمیشہ فیل ہو جاتا ہوں۔'' ٹی ٹو کی بات پر سب لڑکوں کا مشترکہ قہقہہ بلند ہوا۔

کچھ فاصلے پر بیٹھی سب لڑکیوں نے چونک کر اُدھر دیکھا۔ وَلی کا ہنسنے سے اور کچھ دُھوپ میں بیٹھنے سے چہرہ سرخ ہو کر دمکنے لگا تھا۔ مُسکان اُسے محویت سے دیکھے گئی۔ اُس پل اُسے اپنے محبوب کا چہرہ بے حد شناسا لگا۔

اُسے یاد آیا کہ وَلی کی مشابہت اُس کے مرحوم تایا سے ہے، ایک بار اس نے آیا اماں کے پاس کچھ تصویریں دیکھی تھیں، ان میں سے ایک خوبرو نوجوان کی تصویر بھی تھی، جو گھوڑے پر سوار بے اختیار ہنس رہا تھا۔

”یہ کس کی تصویر ہے آیا اماں؟“ مُسکان نے تجسس سے پوچھا تھا۔ وہ شروع سے ہی حُسن پرست تھی اور اُسے اس انکل کی تصویر بے حد اچھی لگی تھی۔

”یہ ایک فرشتے کی تصویر ہے!“ آیا اماں کی آواز رندھ گئی تھی۔

”کیا فرشتے نظر آتے ہیں؟“ مُسکان نے حیرت سے پوچھا تھا۔

”ہاں! کیوں کہ وہ روشنی کی طرح ہوتے ہیں جو اندھیروں کو اُجالوں میں بدل دیتے ہیں۔“ آیا اماں نے تصویریں جلدی جلدی واپس اُسی لکڑی کے چھوٹے سے بکس میں رکھ دی تھیں، جو انہیں بے حد عزیز تھا جسے چھونے کی اجازت مُسکان کو بھی نہ تھی۔

آج وَلی کو اتنے کھلے دل سے ہنستے دیکھ کر اسے وہ خوبرو نوجوان یاد آ گیا تھا، جس کے متعلق مُسکان کے بار بار پوچھنے پر آیا اماں نے بتایا تھا کہ یہ اُس کے بابا کے بھائی کی تصویر ہے جو اب اس دنیا میں نہ تھا۔

”کہاں کھوئی رہتی ہو؟“ سائرہ نے اُسے ٹوکا مُسکان ایک دَم سر جھٹک کر مسکرائی۔

”میں بھی کتنی پاگل ہوں ناں! کس کی مشابہت کس سے ملا رہی ہوں۔“ اس نے دِل ہی دِل میں سوچا۔

وہ دن مُسکان کی زندگی کا بے حد خوبصورت دن تھا۔ درختوں سے پھل اُتار کر کھاتے اور نگی سے ڈھیروں باتیں کرتے، اُس نے نگی سے پکی دوستی کر لی تھی۔ نگی نے اُسے اپنے گھر کے ہر فرد کے متعلق بتایا۔ اس دوران جب جب وَلی کا ذکر آتا مُسکان کے دل کی دھڑکن بے حد تیز ہو جاتی تھی۔

مُسکان نے باتوں ہی باتوں میں وَلی کی پسند ناپسند پوچھی، نگی جب جب کوئی اور بات کرتی مُسکان اُسے گھیر گھار کر اپنے دل پسند ٹاپک پر لے آتی۔

اُس کا دل ہی نہ بھرتا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ نگی یوں ہی وَلی کو موضوعِ گفتگو بنائے رکھے، وہ تو سائرہ نے مُسکان کو اُس کی حماقت پر ٹوکا تو تب مُسکان باز آئی تھی۔

”مُسکان دیکھو میری جان! نگی بے شک بے حد معصوم اور سادہ ہے لیکن باقی کی لڑکیاں، لڑکوں کے ساتھ پڑھتی ہیں اور وہ بالکل اُلّو نہیں ہیں، اس لیے مہربانی فرما کر اپنے آپ میں رہو۔“ سائرہ نے اُسے سائیڈ پر لے جا کر اچھی خاصی ڈانٹ پلائی۔

”ہائے! یہ دلِ ناداں مانتا نہیں ہے!“ مُسکان نے مسکراتے ہوئے سرد آہ کھینچی تو جواباً سائرہ نے اُس کی کمر پر اچھی خاصی دھپ لگائی۔

”سدھر جاؤ ہیر، لیلیٰ کی جانشین! یہ راہ پُرخار تم جیسی رئیس زادیوں کے لیے نہیں ہے۔ یہ بڑا کٹھن راہ ہے، یہیں رُک جاؤ۔“ سائرہ نے اُسے باتوں ہی باتوں میں سمجھانے کی کوشش کی۔

”میری جان یہ ون وے ہے، اب پلٹنا ناممکن ہے۔“ مُسکان کا لہجہ ایک دَم ہٹیلا ہو گیا، مُسکان کی جنون کی سرحدوں کو چھونے لگی تھی سائرہ اُس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر فکرمند ہو گئی۔

”اللہ ہی تم پر رحم کرے گا بی بی! لیکن خدارا اپنی کلاس فیلوز کے سامنے تو محتاط رہو، معلوم ہے ناں تم اپنے کالج میں تو نقطے کی تصویر بن جاتی ہے!“ سائرہ کی تنبیہ پر مُسکان نے اثبات میں سر ہلایا۔

دوپہر کا کھانا بے حد شاندار تھا۔ رئیس احمد نے فارم کی تازہ مچھلی فرائی کروائی تھی۔ لڑکوں نے تو ڈٹ کر کھایا ہی لیکن لڑکیاں بھی اپنی ڈائیٹنگ بھول کر اس لذیذ لنچ میں ٹھیک ٹھاک بد پرہیزی کر گئیں۔

”یار سوئیٹ ڈش میں کچھ نہیں ہے؟“ ٹی ٹو نے حسبِ عادت سوئٹ ڈش تلاش کی تو سوائے تازہ پھلوں کے کچھ نہ نظر آیا۔

”صاحب! کیا کھانا چاہیں گے؟“ رئیس احمد کسی بوتل کے جن کی طرح فوراً حکم کی تعمیل کے لیے حاضر تھے۔

”کوئی کھیر، فرنی یا کسٹرڈ وغیرہ ہو جائے۔“ ٹی ٹو کو تو اللہ موقع دے فرمائش کرنے کا۔ اُس کی لسٹ بڑی ہوتی تھی۔

”ہاں رئیس انکل! آپ کھیر فرنی ضرور بنوائیے گا لیکن صرف ٹی ٹو کے لیے، ہمیں فش کھا کر اُوپر سے دودھ کی بنی چیز کھا کر ”ڈب کھڑبا“ نہیں بننا۔“ منزہ نے چڑ کر ٹی ٹو کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ ٹی ٹو نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔ اس سے پہلے کہ بدمزگی ہوتی وَلی نے سفید جھنڈی لہرائی۔

”یار فش کے اُوپر دودھ یا دودھ کی بنی چیز نہیں کھاتے ورنہ پھلبہری ہو جاتی ہے۔“

”اوہ!“ ٹی ٹو کے ہونٹ سیٹی بجانے کی طرح گول ہو گئے۔

”شکریہ مِس! مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کو میری اتنی پروا ہے۔“

”اللہ رے خوش فہمیاں!“ منزہ نے منہ بنا کر بلند آواز میں کہہ کر منہ موڑ لیا۔

”یار اب چلنے کی تیاری ہے اور وَلی طارق کا کہیں اتا پتا نہیں ہے۔“ سمعان نے کہا۔

”وہ واقعی کسی اہم کام میں پھنس گیا ہوگا۔“ وَلی نے طارق کی ہمیشہ کی طرح سائیڈ لی۔

”سائرہ بہن! آپ ساتھ چلنا چاہیں تو ہمارے ساتھ چلیں۔“ وَلی نے سائرہ سے پوچھا۔

”مجھ پر مُسکان کی ذمے داری ہے، پہلے مجھے اسے گھر ڈراپ کرنا ہے بلکہ اس کا ہاتھ آیا اماں کے ہاتھ میں تھمانا ہے، دیکھ لیں اگر آپ کو زحمت نہ ہو؟“ سائرہ نے ساری صورتحال سامنے رکھ دی۔

”تم لوگوں کو میں ڈراپ کر دوں گا۔“ سمعان نے کہا۔

”ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔“ سائرہ نے کہا۔ لیکن یہ سمعان کی بدقسمتی تھی یا مُسکان کی خوش قسمتی کہ سمعان کی گاڑی عین وقت پر ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ اُس میں نئی بیٹری ڈلتی پھر ہی وہ چل سکتی تھی۔ یہ مرض رئیس احمد نے تشخیص کیا تھا۔

"یہ کھٹارا لانے کی ضرورت کیا تھی؟" سائرہ نے منہ بنا کر سمعان کی اس پرانی لیکن چہیتی گاڑی متعلق کہا، جسے وہ اتنی ساری گاڑیوں میں بھی اہمیت دیتا تھا۔ مجبوراً سمعان گاڑی وہیں چھوڑ کر ان ساتھ ہولیا۔

مسکان کو وَلی کی قربت کے کچھ اور پل کسی قیمتی سرمائے کی طرح لگ رہے تھے۔

"پہلے مسکان کو ڈراپ کر دیتے ہیں۔" شہر میں داخل ہوتے ہی سائرہ نے کہا۔

"اوکے!" وَلی نے مسکان کے گھر کا پتا پوچھ کر گاڑی مسکان کے گھر کے راستے پر ڈال دی۔

مسکان وَلی کے بالکل پیچھے بیٹھی تھی، اُس کی نظریں بار بار اُس کی پشت کو چھوتی تھیں۔ کبھی کبھی چوری چوری بیک مرر میں وَلی کا جھلکتا چہرہ دیکھتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اُسے اس بے خودی پر کس طرح قابو پانا ہے۔" سائرہ نے زور سے اُسے چٹکی بھری...

"اوئی!" مسکان کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"مسکان آپ ٹھیک ہیں؟" وَلی کے خیال میں گھوڑے دوڑانے والے حادثے میں شاید مسکان کو چوٹ آئی تھی اور وہ شاید اسی لیے درد سے کراہ رہی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں۔" مسکان کے دل نے بے قابو ہونے کی کوشش کی تو وہ نظریں جھکا کر رہ گئی۔

اُس کا ہاتھ بے اختیار اپنے پرس میں گیا، وہاں ایک خوبصورت چین پڑی تھی۔ یہ چین اُس کپڑوں میں اُلجھ کر اُس وقت رہ گئی تھی، جب وہ وَلی کے بے حد قریب تھی۔

اِس چین میں شاید وَلی کے سینے کے سنہرے بال پھنسے ہوئے تھے۔ مسکان کا دِل بے ایمان ہو گیا اسے واپس لوٹانے کا ارادہ ترک کر بیٹھی۔

اِس سے اُسے وَلی کا لمس محسوس ہوتا تھا۔ یہ گولڈ کی چین اور اس میں پڑا لاکٹ بہت مختلف طرز ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ خاص طور پر ڈیزائن کر کے بنوایا گیا ہے۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ لاکٹ وَلی کے لیے کس قدر اہم تھا۔ وہ بس اتنا جانتی تھی کہ یہ لاکٹ اُس پاس وَلی کی نشانی ہے، جسے واپس کرنے کا فی الحال اُس کا کوئی موڈ نہ تھا۔

"وَلی بھائی اندر آئیں ناں۔ مسکان کی آپا امّاں بے حد اچھی ہیں آپ اُن سے مل کر خوش ہو کریں گے۔" سائرہ نے اُسے اندر آنے کی دعوت دی۔

"اگر یہ دعوت مسکان دیتیں تو شاید میں اندر آجاتا، سوری میں بن بلائے کہیں نہیں جاتا۔" وَلی اپنے ازلی بے نیاز اسٹائل میں کہا۔

مسکان کو اُس وقت اپنے آپ پر بے حد غصہ آرہا تھا جو وقت پر کوئی بات کرنے کے قابل ہی نہ تھی۔ جانے کیوں وہ کوشش کے باوجود وَلی کے سامنے کم ہی بول پاتی تھی۔

"پلیز نگینہ، وَلی اندر آیئے۔" مسکان نے معذرتی لہجے میں کہا۔

"اس وقت مجھے واقعی جلدی ہے مسکان! آئندہ کبھی آنا ہوا تو میں وعدہ کرتا ہوں دروازے واپس نہ جاؤں گا۔" وَلی نے فوراً کہا۔ وہ جلد از جلد فارغ ہو کر طارق کے پاس پہنچنا چاہتا تھا، جس راستے میں SMS آیا تھا کہ وہ ہسپتال میں ہے۔ اسی وجہ سے وَلی پر عجلت سوار تھی۔

"پلیز! سائرہ جلدی کریں۔" وَلی نے سائرہ کو کہا تو وہ دونوں مسکان کا مختصر سامان اور کیمرا لے کر چلی گئیں۔ اُن کے جاتے ہی وَلی نے گاڑی سے باہر نکل کر طارق کا نمبر ملایا۔

"خیریت ہے ناں؟" وَلی نے فکر مندی سے پوچھا۔

"ہاں یار خیریت سے ہوں، لیکن لگتا ہے ایک دو دن تمہارا مہمان بننا پڑے گا کچھ زخم ہیں۔ اگر فوراً جاتا ہوں تو آنی اور سائرہ فکر مند ہو جائیں گی اور یہاں ہسپتال میں کچھ وجوہات کی بنا پر رُکنا نہیں ہا۔" طارق کی نقاہت بھری آواز موبائل پر سنائی دی۔

"یار تمہارے لیے میرے گھر کے دروازے ہمیشہ کے لیے کھلے ہیں، فکر نہ کرو میں سائرہ کو ڈراپ کے تمہاری ہی طرف آرہا ہوں۔" وَلی نے طارق کو تسلی دی، اس وقت وہ گاڑی کے ساتھ ٹیک ائے کھڑا تھا۔ آپا امّاں نے اُوپر کھڑے ہوئے اچانک نگاہ باہر ڈالی تو کچھ پل شاک کی کیفیت میں لی رہ گئیں۔

یا اللہ! کیا کسی کی اس قدر مشابہت بھی ہو سکتی ہے؟ نیچے کھڑا لڑکا کوئی پچیس چھبیس سال کا ہوگا۔ ہو ہو عبداللہ کی کاپی تھا۔

آپا امّاں کو اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہنا دُشوار ہو گیا وہ ٹیرس پر پڑی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"سید عبداللہ کی دردناک موت کو کئی برس بیت گئے تھے۔ پھر یہ کون تھا؟ جو اُس کا چہرہ، قد قامت لے نیچے کھڑا تھا۔" اُن سے سانس لینا دُشوار ہو رہا تھا۔

"آپا امّاں! آپ یہاں بیٹھی ہیں جبکہ ہم آپ کو سارے گھر میں تلاش کر چکے ہیں۔" سائرہ جلدی سے بولتی مسکان کے ساتھ اُن کے پاس آئی۔

"آپ۔ ٹھیک ہیں؟" مسکان نے پریشانی سے اُن کا اُترا ہوا چہرہ دیکھا۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں، مجھے تھوڑا سا پانی پلاؤ۔" اُن کی آواز میں نقاہت تھی۔ سائرہ بیڈروم کی طرف تیزی سے بڑھی اور جلدی سے پانی کا گلاس بھر کر اُن تک لائی۔ پانی پی کر آپا امّاں کی طبیعت کچھ بہتر ہوئی۔

"آپ کو کیا ہوا ہے؟" سائرہ نے پوچھا اُسی پل نیچے سے تیز ہارن کی آواز آئی۔

"آپا امّاں آپ اگر ٹھیک نہیں ہیں تو ڈاکٹر کی طرف چلتے ہیں۔" مسکان نے فکر مندی سے پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں، اب میری فکر نہ کرو تم جاؤ شاید تمہاری ہی گاڑی نیچے کھڑی ہے۔" آپا امّاں نے سائرہ کا چہرہ بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں جی ہمارے بہت اچھے فیملی فرینڈز ہیں۔ طارق بھائی کے بے حد قریبی دوست بھی ہیں، ساتھ میں آنی کی بہن بھی ہیں انہیں ذرا جلدی تھی ورنہ میں اندر لے کر آتی۔" سائرہ عجلت میں اپنا ہینڈ بیگ اُٹھائے رہی تھی۔ آپا امّاں نے ایک گہرا سانس کھینچا۔

"اگر آپ کی طبیعت ٹھیک ہو تو مجھے اجازت دیں۔" سائرہ نے گاڑی کا ہارن ایک بار پھر سنا تو اُن سے جانے کی اجازت مانگی۔

"ادھر آؤ بیٹا! میں تو ٹھیک سے تمہیں پیار کر کے سالگرہ کی مبارک باد بھی نہ دے سکی۔" آیا امّاں
کر بیڈروم تک آئیں، الماری کھول کر اُس میں سے ایک بہت خوبصورت شال نکالی، جس پر
کڑھائی کی ہوئی تھی۔

"واؤ! اِٹس ریئلی بیوٹی فل!" سائرہ کو واقعی شال بے حد پسند آئی تھی۔

"تھینک یو آیا امّاں!" سائرہ نے آسمانی کلر کی شال اُسی وقت اپنے گرد لپیٹ کر کہا۔

"جیتی رہو! اللہ نیک نصیب کرے۔" آیا امّاں نے بہت دل سے اُسے دُعا دی۔

"ویسے آپ نیک نصیب کس کو کہتی ہیں آیا امّاں؟" سائرہ شرارت سے بولی اور جواب مسکا
کان میں سرگوشی میں دیا۔

"وہ گھونچو سمعان علوی ہے ناں، وہ ہی تمہارا نیک نصیب ہے۔"

"تم مجھ سے پٹو گی۔" سائرہ نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! مائیں تو بیٹیوں کے پیدا ہوتے ہی اُن کے نیک نصیب کی دُعائیں شروع کر دیتی ہیں۔ بیٹا
صورت کتنی ہی کیوں اچھی نہ ہو اگر اُس کے نصیب بُرے ہوں تو ماں باپ تو زندہ درگور ہو جاتے
آیا امّاں کی آواز کسی غم پر رندھ گئی۔ بس کچھ پَل لگے تھے اُن کو سنبھلنے میں وہ پھر سے مسکرا دی تھیں۔

"جاؤ بیٹا! آپ کو بہت دیر ہو گئی ہے۔" انہوں نے لڑکیوں کی توجہ فوراً خود سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"اللہ حافظ آیا امّاں!" سائرہ کہتی ہوئی تیزی سے باہر نکلی۔

"سوری وَلی بھائی! مجھے تھوڑی سی دیر ہو گئی۔" سائرہ نے گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

"خاتون اگر یہ آپ کی "تھوڑی" سی دیر تھی تو "زیادہ" کون سی ہو گی؟" وَلی نے گاڑی اسٹا
کرتے ہوئے کہا۔

"سوری بھائی!" سائرہ نے مُسکراتے ہوئے دوبارہ کہا۔

"اِٹس او کے بہنا! اب بار بار سوری کر کے تنگ تو نہ کرو۔" وَلی نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا آپ بھی کبھی تنگ ہوتے ہیں؟" سائرہ نے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے پوچھا۔ اِس کا مط
ہے کہ!

تمہارے اس سوال کی کوئی وجہ اور پس منظر ضرور ہے۔ وہ وَلی تھا بے حد ذہین اور شارپ ذہن
والا وہ بات کی تہہ تک فوراً پہنچ جاتا تھا۔

"وہ اِس لیے کہ آپ سارے کالج میں "آئرن مین" کہلاتے ہیں۔" سائرہ نے سچائی سے
دیا۔

"بھائی آپ نے ہمیں تو اپنے اس خطاب کے متعلق کبھی نہیں بتایا۔" نگینہ نے بھی دل چسپ
گفتگو میں حصّہ لیا۔ وَلی کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"مائی ڈیئر سسٹرز! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں بھی گوشت پوست کا انسان ہوں اور دل رکھتا
لیکن یہ شارع عام نہیں ہے کہ ہر کوئی یہاں سے گزر سکے۔ یہ بس کسی ایک کے لیے مخصوص ہو گا۔"
نے کبھی کسی کے سامنے اتنا کھل کر جواب نہ دیا تھا۔ آج وہ بے حد مختلف موڈ میں تھا۔

"بھئی وَلی بھائی جیسے بہت کم مرد حضرات ایسے خیالات رکھتے ہیں۔" سائرہ نے صاف گوئی سے کہا۔

"ہم ہیں لیکن یہ قبیل ہے تو ضرور، بس ہم بھی اُنھی میں سے ایک ہیں۔" وَلی نے سائرہ کے گھر کے باہر
روکتے ہوئے کہا۔

"میں نے اگر طارق بھائی اور آپ کو نہ دیکھا ہوتا تو شاید نہ مانتی لیکن آپ دونوں کی کئی باتیں آپس
اس طرح ملتی ہیں، جیسے ایک دوسرے کا جھوٹا کھا کر بڑے ہوئے ہوں۔" سائرہ نے اِس حقیقت کو
ہوئے کہا۔

"طارق صرف میرا دوست ہی نہیں وہ مجھے بھائیوں کی طرح عزیز ہے اگر اُس کی عادتیں مجھ سے ملتی
تو یہ میرے لیے واقعی بہت فخر کی بات ہے۔ طارق جیسے شخص کا دوست کہلانا اور اُس جیسی عادتوں کا
واقعی قابلِ فخر بات ہے وہ اِس دور میں بھی مردِ مجاہد ہے!" وَلی نے جملے کا آخری حصّہ منہ میں ہی
اور گاڑی آگے بڑھالی تھی۔ اُس کا رُخ ہسپتال کی جانب تھا۔ جہاں سے اُسے طارق کو پک کرنا

وَلی اپنے دوست کے بہت سے رازوں کا امین تھا۔ طارق کی محب الوطنی اُس سے ڈھکی چھپی نہ
یہ جذبہ حب الوطنی ہی تھا، جو اُس نے اپنے لیے ایک مختلف کیریئر کا انتخاب کیا تھا۔ جب سے وہ
لینڈ میں آیا تھا، ہمیشہ اپنے ملک کی خاطر ہر طرح کی محنت و قربانی کے لیے تیار رہتا تھا۔ اب کچھ
سے وہ جانے کس پراجیکٹ میں انوالو تھا، جس کی وجہ سے اُسے دن رات اور یہاں تک کہ اپنی
تک کی پروانہ تھی۔

میں دُعا کرتا ہوں کہ طارق تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو اور اللہ تمہیں اپنی حفظ امان میں رکھے۔"
نے سچے دل سے اُسے دُعا دی اور گاڑی ہسپتال کے سامنے روک دی۔

"یہاں کیا کام ہے بھائی؟" نگینہ نے حیرت سے پوچھا۔

"تم سکون سے بیٹھو میں ابھی آتا ہوں۔" وہ اُسے حیران و پریشان چھوڑ کر اندر چلا گیا۔

یہاں کون ہے؟ نگینہ کو بے اختیار گھبراہٹ کا احساس ہوا۔

❖❖○❖❖

"آخر سحرش جا کہاں سکتی ہے؟" ڈاکٹر خالد پرویز کی جھنجلاتی آواز فون پر گونجی۔

"تم اُس کی سہیلیوں کے گھر پتا کرو تب تک میں پیشنٹ نمٹا کر آتا ہوں۔" ساتھ ہی فون بند ہو چکا

مسز ثانیہ خالد کئی پَل چُپ کی چُپ رہ گئی تھیں۔

"ارے بہو میں کہتی ہوں کہ تم کیسے ماں باپ ہو، جوان بچی گھر سے لاپتا ہے اور ابھی تک تم دونوں
دھرے بیٹھے ہو۔" مسز ثانیہ کو پہلی بار اپنی ساس کا سحرش کے لیے لفظ جوان بچی نہ بُرا لگا تھا نہ ہی اُن
کوفت کا احساس ہوا تھا۔ بلکہ ثانیہ کا بھولا بھالا چہرہ اور بھرا بھرا وجود اُن کی آنکھوں کے سامنے لہرایا
بُرے بُرے وسوسے پہلی بار اُن کو سانس لینا دوبھر کر رہے تھے۔ آج سے پہلے ماں جی کی روک
اُسے دقیانوسی لگتی تھی۔

تانیہ کا سلیولیس، چھوٹے چھوٹے ٹاپ اور فٹ جینز پہننا نہ کبھی خالد کو بُرا لگا تھا نہ اُسے خود کو
تھا۔ ’’بچوں کو زمانے کے ساتھ چلنا چاہیے!‘‘ اُس کا اپنا ہی یہ قول آج اُس کے مُنہ پر طمانچے کی طرح
تھا۔

’’اگر زمانہ آگ میں کودے گا تو کیا تم آگ میں چھلانگ لگادوگی۔‘‘ ماں جی اُس کی ایسی باتوں پر
چِڑ کر کہتی تھیں۔

سحرش کی کس کس سے زیادہ دوستی ہے؟ وہ تو ایسی بے خبر ماں تھی یہ تک نہ جانتی تھی۔ سحرش کو
آزادانہ ماحول دے کر وہ خود کو ایک بہترین ماں ثابت کرنے جارہی تھی۔ لیکن! اب وہ اگر کسی کو
بھی تو کس کے بَل بوتے پر کہتی۔

’’بہو! میں کہتی ہوں، چُپ بیٹھنے سے کچھ نہیں ہوگا اُسے تلاش کرو۔‘‘ ماں جی نے بے چینی سے
ہوئے کہا۔

’’ماں جی! وہ اسکول سے کہاں گئی کسی کو نہیں پتا۔ میں نے اسکول کی پرنسپل سے بھی پُوچھ لیا ہے
کی قریبی دوستوں سے بھی لیکن کوئی کچھ نہیں جانتی۔ ڈیڑھ بجے کے بعد کسی نے اسے نہیں دیکھا۔‘‘
تانیہ خالد کی آواز رندھ گئی تھی۔

’’اور تم تو میرے بار بار کہنے پر تین چار بجے اُس کا پتا کرنے نکلی تھیں۔ ارے لڑکی اتنی دیر سے
تھی تم نے ذرا فکر نہ کی۔‘‘ انہوں نے کڑے تیوروں سے کہا۔

’’وہ اکثر اپنی کسی دوست کے ساتھ بک شاپ چلی جاتی تھی یا پھر کبھی مارکیٹ! میں نے سوچا
اُسے دیر ہوجاتی ہے آج بھی شاید شاپنگ پر گئی ہو۔‘‘ مسز تانیہ کی آواز شرمندگی سے بھری ہوئی تھی۔

’’شاباش بہو! تیرہ چودہ سال کی بچی کو تم اتنی آزادی دیتی ہو کہ وہ کسی بھی دوست کے ساتھ
کے بعد جاکر شاپنگ کرنے نکل جائے۔ اگر وہ تمہاری نظر میں بچی تھی تو بھی اِس لحاظ سے تو اُسے
گھومنے کی قطعی اجازت نہیں دینی چاہیے تھی۔ گھر میں جب ڈرائیور ہے، جو اُسے لاتا اور چھوڑتا ہے
کیوں نہیں ساتھ جاتا تھا۔ اُسے کیوں وہ واپس بھیج دیتی تھی۔ وہ کس کے ساتھ آتی تھی تم نے کبھی
کی، دیکھنے کی زحمت نہ کی۔ بی بی مرغی بھی اپنے چوزوں کا اتنا خیال کرلیتی ہے کہ اُن کو اپنے پَروں
چھپائے پھرتی ہے۔ کیا انسان کا بچہ مُرغی کے چوزوں سے بھی گیا گزرا ہوتا ہے؟‘‘ ماں جی تو آج کم
بخشنے کو تیار نہ تھیں۔ اُن کے خاندان میں بیٹیوں اور بیٹوں میں یہ واحد لڑکی تھی، باقی سب کے ہاں لڑ
ہی تھے۔ سحرش پھوپھیوں، چچاؤں اور ماں باپ کی بے حد لاڈلی تھی۔ وہ نہ صرف اکلوتے ہونے کی
سے ہر ایک سے توجہ حاصل کرلیتی تھی بلکہ وہ بے حد حَسین بھی تھی جس کی وجہ سے پرائے بھی اُس
دیئے بغیر نہ گزر سکتے تھے۔

دادی کا پوتی کے لاپتا ہونے پر بے حد حال بُرا تھا۔ مسز تانیہ نے اپنے بھائی کو دوبارہ فون کیا جو
کی تلاش میں نکلے ہوئے تھے۔

’’نہیں باجی! ابھی تک کوئی خبر نہیں مل سکی۔‘‘ مسز تانیہ کے چھوٹے بھائی سلطان کی آواز میں
تھی۔ مسز تانیہ نے فون کاٹ کر دوبارہ ڈاکٹر صاحب کو ملایا وہ گھر کے لیے نکل چکے تھے۔

’’اللہ! میری غلطیاں معاف کردے، بس ایک بار مجھے موقع دے دے، میری بچی خیریت سے گھر
آئے۔ آئندہ میں کبھی لاپروائی نہ برتوں گی۔‘‘ مسز تانیہ خالد نے دل سے دُعا کی۔

کے شوہر بہت اچھے اور بڑے ڈاکٹر تھے۔ صبح کے وقت وہ سرکاری ہسپتال میں ہوتے تو شام میں
پرائیویٹ کلینک پر ہوتے جو کسی چھوٹے سے ہسپتال سے کم نہ تھا۔ دولت اُن کے گھر کی باندی تھی۔
کے تین بچے تھے، سب سے بڑی سحرش جو تقریباً چودہ سال کی تھی اُس سے چھوٹا ریحان بارہ
برہان جو نو سال کا تھا۔

ان کے لیے میڈ تھی، جو اُن کے سارے کام کرتی تھی۔ اِس کے علاوہ تین چار ملازم ہر کام کے
ے۔ ایسے میں اُن کو اپنی زندگی بے حد فارغ لگتی تھی۔ انہوں نے ایک کالج میں لیکچرار کے طور پر
دے دی۔ اِس طرح اچھے لباس اور جیولری کی روز نمائش بھی ہوجاتی، ایک آدھ کلاس پڑھا کر
ان سے گپ شپ کرکے اچھا ’’وقت‘‘ بھی گزر جاتا۔ وہ وقت جو صرف اور صرف اُن کے بچوں کا
تھا۔ ان کو خود اعتمادی دینے کے چکر میں وہ اپنے بچوں کو بے حد ضدی بنا چکی تھیں۔
ان کے اندر بے حد باغیانہ خیالات تھے وہ بے حد ضدی بھی تھی۔ لیکن مسز تانیہ نے آج تک اِن
کی پروانہ کی تھی۔

آج تو ضمیر نے اُنھیں کٹہرے میں لاکھڑا کیا تھا۔

خالد پرویز گھر آچکے تھے۔ ساری صورت حال سُن کر وہ بے حد بے حال ہو رہے تھے۔ پھولوں
اس نازک گڑیا میں اُن کی جان تھی۔ سحرش اُن کا پہلا اور آخری عشق تھی۔ ساری اولاد میں سب
زیادہ اُن کو اپنی بیٹی ہی سے پیار زیادہ تھا۔ وہ بنا کچھ کہے بدحواسوں کی طرح اُس کی تلاش میں باہر
لیکن جاتے جاتے جن نظروں سے وہ اپنی بیوی کو دیکھ کر گئے تھے۔ اُس سے مسز خالد لرز کر رہ
انھیں اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا وہ لہرا کر گری تھیں...

❖❖○❖❖

اُس کو لگتا تھا کہ وہ مرچکی ہے۔
اگر وہ مرچکی ہے تو پھر اُس کی آنکھیں کیوں کھلی تھیں وہ سارا بھیانک منظر دیکھنے کے لیے۔
وہاں کے ساؤنڈ پروف کمروں کے ہوتے ہوئے بھی وہ اُس بچی کی دل دوز چیخوں سے نہ بھاگ پائی
بالکل سامنے والا کمرا ہی تو اُس کا تھا۔ تھوڑے سے کھلے دروازے سے وہ اس قیامت کو دیکھ اور
بالکل مرچکی تھی۔ وہ شاید چیختے ہوئے وہاں موجود تینوں بھیڑیوں کو الرٹ کردیتی اگر پیچھے سے کیتھی
کے مُنہ پر ہاتھ رکھ کر اُسے کھینچ نہ لیتی، وہ اُسے کھینچ کر اُس کے کمرے میں لے آئی، ماہ رخ بے
بے خبر سو رہی تھی۔

بی بی کیا مرنے کا ارادہ ہے؟‘‘ کیتھی نے کچھ غصّے اور کچھ استہزائیہ انداز میں کہا۔
وہ!وہ... ‘‘ترنم کی گھٹی گھٹی آواز اُس کے مُنہ سے نکلنا مشکل ہوگئی۔ آنسوؤں نے سارا منظر دھندلا
تھا۔
جانتی ہوں!‘‘ کیتھی نے تھکے تھکے انداز میں کہا اور وہیں کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

"وہ ابھی اسکول کی بچی تھی!" کیتھی نے بے حد دُکھ سے آنکھیں بند کیں اور اُس بچی کا ذکر یوں
جیسے وہ مرچکی ہو۔
"میں اگر چاہتی بھی تو اُسے یہاں سے نکال نہ پاتی، یہاں اگر کوئی اُس کی ہمدردی کرتا تو م
دونوں کو ہی ملنی تھی۔ یہاں اِس پنجرے میں باہر کو کوئی دروازہ نہیں جاتا ہے۔ پھر...... پھر اُس نے مرنا
تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اب وہ ایک کربناک موت کے ساتھ مرے گی!" کیتھی اِس قدر بے حسی
بول رہی تھی۔ اُس کے اعصاب روز یہ منظر دیکھ دیکھ کر بالکل ختم ہوگئے تھے۔ اُسے بھی اپنا وجود مرا
تھا۔
"کیتھی! تین تین مرد اُس چھوٹی سی بچی کو! آہ!"
ترنم پھر سسکنے لگی۔ اُس کی مووی بنائی جارہی تھی۔ اس ظلم کی مووی بن رہی تھی۔ ترنم بین کے ا
میں بولی۔
"ہاں! یہ مووی جگہ جگہ مُنہ مانگے دام بکے گی! نیٹ پر شوقین ذہنی مریضوں کی تو یہ غذا ہے۔ کم
روتے چلاتے برباد ہوتے دیکھنا اتنی اذیّت میں دیکھنا کسی کسی کا کمال ہوتا ہے۔" کیتھی اچانک ہنسنے لگی
"کیتھی اگر یہ مووی بازار میں جائے گی تو ان بھیڑیوں کے چہرے پہچانے تو جائیں گے۔" ترنم
آس سی ہوئی۔
"نہیں بے بی! ان کے چہرے غیر واضح کردیئے جاتے ہیں جسم اور چہرہ تو صرف اُس مظلوم کا
گا!" کیتھی نے اُٹھتے ہوئے کہا۔
"کہاں جارہی ہو؟" ترنم نے بے چینی سے پوچھا۔
"ابھی کچھ دیر بعد ہمیں بلوا کر اُس کے ٹکڑے اکٹھے کرنے کو کہا جائے گا۔ ڈیوٹی پر جارہی
بے بی۔" کیتھی کی آواز سپاٹ تھی۔
"ٹکڑے! مطلب کیا ہے تمہارا؟" ترنم نے خوف سے پوچھا۔
"بے بی اس قبیل کی ہوکر بھی تم بڑی معصوم باتیں کرتی ہو۔" کیتھی نے ہنستے ہوئے کہا۔
"ارے وہ زندہ بھی ہوئی تو بھی کرچی کرچی ہوچکی ہوگی، میں نے جانے کتنی ہی خون بھری چا
اُس بستر سے اُٹھائی ہیں، مجھے اپنا آپ کسی گورکن کی طرح لگنے لگا ہے، کبھی یہ بچیاں موقعے پر مرجاتی
کبھی ایک دو روز بعد! اور اگر مرنا نصیب میں نہ ہو تو ساری عمر کے لیے وہ اس ذبح خانے میں
ہونے کے لیے رہ جاتی ہیں اور جب وہ کام کی نہیں رہتیں تو وہ بھی میری طرح گورکن بن جاتی ہیں
کیتھی سپاٹ و سرد لہجے میں کہتی باہر نکل گئی۔ اور ترنم اور ابھی کچھ دیر پہلے نیند سے اُٹھی ماہ رخ پھٹی
آنکھوں سے اُسے جاتا دیکھتی رہ گئی!
"کیا ہوا ترنم؟" ماہ رخ نے پریشانی سے پوچھا۔
"ایک اور قتل!" ترنم نے بے دردی سے لب کاٹتے ہوئے کہا۔

❖❖○❖❖

"یار یہ...... یہ کیا ہے، یہ چھوٹا موٹا زخم ہے؟" وَلی طارق پر برس رہا تھا۔

"گولی چھو کر گزر گئی، لگی تو نہیں ہے۔ سب کچھ آل رائٹ ہے۔" طارق نے ہشاش لہجہ بناتے
ہوئے کہا۔
"تم کبھی نہیں سُدھرو گے۔" وَلی نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔
طارق کا بازو رِنگ سپوٹر سے لٹکا ہوا تھا۔ ماتھے پر بھی پٹی بندھی ہوئی تھی اور طارق بضد تھا کہ معمولی زخم
ہے۔
"ہائے اللہ جی! یہ کیا ہوا ہے آپ کو؟" نگینہ نے گھبرا کر طارق سے پوچھا۔
"کچھ خاص نہیں، بس معمولی زخم ہیں۔" طارق کے لہجے میں نقاہت بے حد واضح تھی۔ گاڑی تک وہ
ولی آیا تھا اُس نے ویل چیئر لینے سے انکار کردیا تھا۔ لیکن یہاں تک آتے آتے اُس کا سانس پھولنے لگا۔
"توبہ طارق بھائی! آپ بھی کمال کرتے ہیں یہ معمولی زخم ہیں! رنگت کس قدر پیلی پڑ رہی ہے
اور آپ کو کوئی احساس ہی نہیں۔" نگینہ کا لہجہ بے حد فکر مند تھا۔ طارق کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اُس کی
آنکھیں بھاری ہورہی تھیں۔
ولی نے نگینہ کو چُپ رہنے کا اشارہ کیا۔ نگینہ نے فکر بھری نگاہ طارق پر ڈال کر ایک گہرا سانس لیا۔
ل کا حساس دل ایک دَم بے چین ہوگیا تھا۔

❖❖○❖❖

"جی میڈم! آپ نے مجھے بلایا تھا!" ماہ رخ راگنی کے بلاوے پر ایک لڑکی کی نگرانی میں یہاں تک
ائی گئی تھی۔
"تم لوگوں کو چاندنی نے لیپ ٹاپ وغیرہ ہینڈل کرنا سکھائے تھے۔" راگنی اس وقت بلیک ساڑھی
میں تھی۔ حسبِ معمول اُس کے وجود کا ایک ایک حصّہ قیامت ڈھا رہا تھا۔
"جو لڑکیاں بیورو کریسی کو سرو کرنے کے لیے تیار کرنی ہوتی ہیں اُن کی ٹریننگ میں سب کچھ شامل
ہوتا ہے۔" ماہ رخ نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
یہ لمبی سی ڈائننگ ٹیبل شیشے کی بنی ہوئی تھی جس کو دو پلرز سہارا دیئے ہوئے تھے۔ پلرز کے شیپ
درخت کے تنے جیسے تھے اسی طرح کی کرسیوں کی شیپ بھی درخت کے تنے جیسے تھی۔ چوبیس کرسیوں
والی اس لمبی سی ڈائننگ ٹیبل پر راگنی اکیلی ایک بڑے سے کاک ٹیل گلاس میں "سرخ" رنگ کا مشروب
لیے بیٹھی تھی۔ سامنے اُس کے لیپ ٹاپ کھلا تھا اور اُس کے موبائل سے کنیکٹ تھا۔ وہ انٹرنیٹ
استعمال کررہی تھی۔
"کیا لوگی؟" راگنی نے اُس سے پوچھا۔
"تھینک یو میڈم! یہاں ہر گھنٹے دو گھنٹے بعد ملازمہ کچھ نہ کچھ سرو کرجاتی ہے۔ آپ واقعی بے حد مہمان
نواز ہیں۔" ماہ رُخ نے خوش آمدانہ انداز میں کہا۔
"مہمان تو تم لگتا ہے میری مستقل ہوجاؤ گی۔ چاندنی بہت بُری طرح زخمی ہے اُس کی تقریباً ساری
لیاں میرے ہاں ہیں، کچھ عرصے کے لیے وہ انڈر گراؤنڈ چلی گئی ہے۔ اور میرا اُصول ہے کہ نہ میں خود
ت کی کھاتی ہوں نہ کسی کو کھلاتی ہوں، تب تک تم لوگ میرے لیے کام کرو جب تک تم لوگوں کے لیے

اوپر سے کوئی آرڈر نہیں آجاتا ہے۔'' میڈم راگنی نے لیپ ٹاپ کے بٹن دباتے ہوئے کہا۔ وہ [illegible]
توجہ سے کسی فائل کو دیکھ رہی تھی۔

''میڈم جیسے آپ کہیں!'' ماہ رخ نے بظاہر بے نیازی سے کہا لیکن وہ اندر سے بے چین ہو گئی [illegible]
میڈم راگنی کی پہنچ سے وہ باخبر اور اُس کی طاقت سے بخوبی واقف تھی۔

''ٹھیک ہے تم اپنے کمرے میں چلو، دو گھنٹے تک میں تمہارا اسائنمنٹ تم سے ڈسکس کروں گی۔ [illegible]
ہاں وہ تمہارے ساتھ جو خاموش خاموش سی لڑکی ہے، وہ کچھ مشکوک لگ رہی ہے۔'' راگنی غضب کی [illegible]
رکھتی تھی ترنم کو اُس نے ایک نظر میں ہی پہچان لیا تھا۔ چاندنی میڈم کے ساتھ ترنم عرصے سے تھی، اس [illegible]
ذہنی کیفیت اکثر پرابلم کرتی تھی۔ اِس بات سے وہ بخوبی آگاہ تھی لیکن چوں کہ اُس نے اپنے ہاں ہر [illegible]
کے پَر کاٹ رکھے تھے اس لیے اُسے ایسے پرابلم سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ میڈم چاندنی کو ہر لڑکی کو کا[illegible]
کروانے کا فن آتا تھا۔ پھر وہ اپنی لڑکیوں کے ساتھ مہربان بھی بہت تھیں۔ ماہ رخ شروع سے اُس [illegible]
ساتھ تھی اس لیے ایک دَم میڈم راگنی کے ساتھ پر کچھ اپ سیٹ ہوگئی تھی۔

''نہیں میڈم! وہ خاصے کام کی لڑکی ہے۔ پھر آپ جانتی ہیں کہ ہمارے ہاں کسی مشکوک فرد کو نہیں [illegible]
جاتا۔'' ماہ رُخ نے صاف گوئی سے کہا۔

''او کے! اب تم جا سکتی ہو۔'' راگنی نے سنجیدگی سے کہا۔ ماہ رُخ نے ایک گہرا سانس لیا۔

''جانے اس قید خانے سے کب آزادی حاصل ہوگی۔'' ماہ رُخ نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سوچا۔
اُسے اپنے موبائل کے نہ چلنے کا بے حد دُکھ تھا۔ لمبی لمبی کالز اٹینڈ کرنا اُس کا دل پسند مشغلہ تھا۔

''دیکھتے ہیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔'' ماہ رخ نے کندھے جھٹکتے ہوئے خود کلامی کی، جیسے [illegible]
نے ہر بات کو اپنے کندھوں سے اُتار پھینکا ہو۔

❖❖○❖❖

میں نے اِس طور سے چاہا تجھے اکثر جاناں
جیسے مہتاب کو بے انت سمندر چاہے
جیسے سورج کی کرن سیپ کے دِل میں اُترے
جیسے خوشبو کو ہَوا رنگ سے ہٹ کر چاہے
میں نے اِس طور سے چاہا تجھے اکثر جاناں!
میرا ہر خواب میرے سچ کی گواہی دے گا
وسعتِ دید نے تجھ سے تیری خواہش کی ہے
میری سوچوں میں کبھی دیکھ سراپا اپنا
میں نے دُنیا سے الگ تیری پرستش کی ہے

کمرے میں چوڑیوں کی ہلکی ہلکی گونج طارق کو کسی سُریلے میوزک کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ طا[illegible]
نے آنکھوں کی ہلکی سی جھری کھول کر اِک چور نگاہ نگی پر ڈالی۔ وہ سرگوشیوں میں ملازمہ کو ہدایت د[illegible]
رہی تھی۔

''دیکھو بھائی کو ساری رات بخار رہا ہے۔ وَلی بھائی اور اماں جان ساری رات اِن کے سرہانے [illegible] رہے ہیں۔ تم یوں کرو کہ ٹھنڈا پانی برتن میں لے آؤ۔'' طارق کا دل پسند منظر سامنے تھا، جسے اکثر [illegible] کھلی آنکھوں سے اپنے اردگرد چلتے پھرتے دیکھتا تھا آج سچ میں اُس کے سرہانے کھڑی تھی۔
جانے اُس کے وجود کی خوشبو تھی یا پھر وہ خوشبو ہی ایسی استعمال کرتی تھی۔ بے حد دھیمی اور مسحور کُن خوشبو [illegible] لمینہ سے آرہی تھی۔

طارق کا دل چاہا کہ اِک گہری سانس لے کر اِس خوشبو کو اپنے اندر اُتار لے، نگینہ نے آگے بڑھ کر اُس [illegible] کے ماتھے کو چھوا!

اُس پَل طارق کو لگا کہ نرم روئی جیسا ہاتھ اُس کی جلتی پیشانی پر کسی پھوار کی طرح، کسی ٹھنڈک کی [illegible] طرح آلگا ہو۔ نا چاہتے بھی طارق نے آنکھیں کھول دیں۔

''کیسی طبیعت ہے طارق بھائی۔'' نگی اُس کے سرہانے سے اُٹھ کر کرسی پر جا بیٹھی۔

''طبیب ایسا ہو تو کون مریض اچھا ہونا چاہے گا!'' طارق نے اِک سرد آہ کھینچ کر کہا۔

''طارق بھائی کیا آپ کا ڈاکٹر اچھا نہیں ہے۔'' نگینہ کے چہرے پر بے حد معصومیت تھی۔

طارق کی ہنسی بے اختیار تھی، وہ سی کر کے رہ گیا ہنسنے سے اُس کے سر کی چوٹ میں اچانک درد ہوا تھا۔

''تم اگر اِس قدر معصوم روح نہ ہوتیں تو شاید تم سب سے اِس قدر الگ اور پیاری نہ ہوتیں!'' طارق [illegible] زیرِلب بولا، آواز اس قدر کم تھی کہ نگینہ سمجھ نہ پائی۔

''آپ ہنس کیوں رہے ہیں، میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہے؟'' نگینہ نے کچھ بُرا مانتے ہوئے کہا۔ طارق [illegible] بلا وجہ کے ہنسنا اُسے عجیب سا لگا تھا۔

''معذرت چاہتا ہوں اے نیک دل خاتون!'' طارق نے بمشکل اپنی مسکراہٹ روک کر کہا۔

''طارق بھائی آپ سچی سے ایک بات بتائیں گے؟'' نگینہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''بولو! تمہارے سامنے تو میں کبھی جھوٹ بول ہی نہیں سکتا۔'' طارق کی نگاہ اُس کے چاند سے [illegible] چہرے کا مسلسل طواف کر رہی تھی۔

''کیا آپ واقعی پولیس میں ہیں؟ اور یہ کہ آپ کو یہ زخم گولی لگنے سے آئے ہیں۔'' نگینہ کے سوال پر طارق نے اپنے اندر بے حد بے چینی محسوس کی، وہ آن دی ریکارڈ فری لانس صحافی کے طور پر کام کرتا تھا۔

صحافی کے طور پر اُس نے کارڈ بھی چھپوا رکھا تھا۔ خفیہ میں نوکری کی وجہ سے اُسے اِن سب احتیاطوں کو اپنے اوپر ضرور لازم کرنا پڑتا تھا۔ لیکن نگینہ کو کس نے بتایا؟

''تم سے ایسا کس نے کہا؟'' طارق نے اُس کی بلوری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''وہ وَلی بھائی سے بابا سائیں آپ کے متعلق پوچھ رہے تھے، کیوں کہ وَلی بھائی کسی سے کچھ بھی کہہ لیں لیکن بابا سائیں سے کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے۔'' نگینہ نے ملازمہ کے ہاتھ سے ٹھنڈے پانی کا پیالہ پکڑتے ہوئے کہا۔

''تم جاؤ اور طارق بھائی کے لیے یخنی بناؤ اُس میں لہسن ثابت ڈال دینا۔ تھوڑا سا زیرہ وغیرہ ایک

پوٹلی میں باندھ کر ڈالنا۔ امّاں جان کہہ رہی تھیں کہ اس سے فائدہ ہوگا اور ایک ٹیبل اسپون زیتون
ڈال کر قیمے کو اچھی طرح بھوننا۔" نگینہ نے نہایت مدھم آواز میں ملازمہ کو ہدایات دیں جو، امّاں
سونے سے پہلے نگینہ کو دے کر گئی تھیں۔

طارق ایک بار پھر ہر بات بھلا کر اُسے دیکھے گیا۔ نگینہ کا اُس کا یوں خیال رکھنا اُسے بے حد اچھا
رہا تھا۔ وہ جو سپنوں میں ہر پل بستی تھی، آج قسمت سے کچھ دیر کو ہی سہی لیکن وہ اُس کے پاس
تھی۔ طارق کو اپنے دِل کی بے خودی بے حد محسوس ہو رہی تھی۔

"طارق بھائی میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے کیا آپ مجھے جواب نہیں دینا چاہ رہے؟" نگینہ
کُھل کر پوچھ لیا۔

"ابھی تم کہہ رہی تھی کہ وَلی بھائی تمہارے بابا سے کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے تو پھر اُس نے میرے
متعلق بھی جو کہا ہوگا، سچ ہی کہا ہوگا۔" طارق نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

"واؤ! یہ کتنا ایکسائٹنگ ہے۔" نگینہ نے ٹھنڈے پانی میں بھیگی پٹی اُس کے ماتھے پر رکھتے ہوئے
طارق کو بے حد سکون محسوس ہوا اُس نے آنکھیں موندھ لیں۔ اُسے اندر سے خوشی ہوئی کہ نگینہ
اُس کے شعبے کو پسند کیا۔

"مجھے بچپن سے پولیس مین بہت اچھے لگتے تھے۔" نگینہ اپنی ہی دُھن میں مگن تھی۔

"میں چوں کہ خود بے حد ڈرپوک ہوں تو مجھے جب پہلی بار امّاں نے بتایا کہ پولیس ہماری حفاظت
کرتی ہے تو مجھے پولیس مین بہت اچھے لگنے لگے، تحفظ دینے والے ہمارے معاشرے کے محافظ
لیکن مجھے اکثر ایک بات اب عجیب سی لگتی ہے کہ ہمارے اردگرد جتنے لوگ ہیں وہ پولیس کو ناپسند کر
ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے طارق بھائی؟" طارق نے اس معصوم روح کو دیکھا جس کو ماں باپ اور بھائی
محبت کا بے حد مضبوط قلعہ میسّر تھا۔ غم، تکالیف اور معاشرتی پریشانیاں ہمیشہ اُس سے دور رہی تھیں۔
صرف وہ ہی مانتی اور جانتی تھی، جو اُسے اُس کے والدین بتاتے تھے۔ کالج میں جا کر جب وہ طرح طرح
کے تبصرے اور کہانیاں سنتی تو یوں اُس کے ذہن میں ڈھیروں سوالات اُگنے لگتے تھے۔

"پولیس کا شعبہ بُرا نہیں ہے، کچھ بُرے لوگوں کی وجہ سے بدنام ضرور ہوگیا ہے لیکن جس طرح
اچھائی کے ساتھ لگی ہے اُسی طرح اچھائی بھی بُرائی کے ساتھ لگی ہوتی ہے۔ جہاں بہت سارے لوگ
کر کرپشن پھیلا رہے ہیں وہاں مٹھی بھر اچھے لوگوں کی سچائی اور جذبہ اِس اتنے بڑے سسٹم پر حاوی ہو
ہے۔

یہ جنگ تب تک جاری رہے گی، جب تک اچھائی، بُرائی پر مکمل طور پر حاوی نہ ہو جائے۔ اور
یقین ہے۔ "گھپ اندھیرے کو چیرنے کے لیے تو ایک دیا بھی کافی ہوتا ہے۔" طارق نے نگینہ
آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ نگینہ کے چہرے پر ایک دم بے حد آسودہ مسکراہٹ دَر آئی۔

"طارق بھائی آپ بہت اچھے ہیں!" نگینہ نے بے حد سچائی سے کہا۔

طارق کا دل کھل اُٹھا، بے شک نگینہ نے ایسا کچھ نہ کہا تھا جو ذو معنی ہو، اُس کا اظہار بے حد
تھا۔ لیکن طارق کے سامنے اظہار کرنے والی اُس کی دل کی دھڑکنوں میں بسنے والی شخصیت تھی، جس

لی سی بات اُس کو بے حد اہم لگا کرتی تھی۔

"میں دیکھ کر آتی ہوں کہ آپ کے لیے کچھ کھانے کو تیار ہو چکا ہے کہ نہیں تاکہ آپ کو کچھ کھلا کر
ابن دی جا سکے۔" نگینہ نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

طارق نے گہری سانس لے کر اپنے اردگرد بکھری خوشبو کو اندر اُتارا، نگینہ کا سوال واقعی بے جا نہ تھا۔
ہر سسٹم اس وقت کرپشن میں ملوث تھا۔ ایسے میں سب سے پیش پیش لا اینڈ آرڈر کا سسٹم تھا، جس
کے لا اینڈ آرڈر میں کرپشن آ جائے اُس ملک کی بنیادیں تک کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔

لیکن طارق جیسے بہت سے لوگ تھے، جو اِس وطن عزیز کے لیے جان تک کی قربانی دینے سے گریز نہ
کرتے تھے۔ اور صرف انہی افراد کے جذبے اور جان نثاری کی وجہ سے یہ ملک ابھی تک قائم و دائم تھا۔
طارق نے صدق دل سے وطن عزیز اور اسلامی معاشرے کی سلامتی کی دُعا کی۔

خدا کرے کہ مری ارضِ پاک پر اُترے
وہ فصلِ گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو
خدا کرے نہ کبھی ختم سرِ وقارِ وطن
اور اس کے حُسن کو تشویش ماہ و سال نہ ہو
ہر ایک فرد ہو تہذیب و فن کا اوجِ کمال
کوئی ملول نہ ہو کوئی خستہ حال نہ ہو
خدا کرے مرے اِک بھی ہم وطن کے لیے
حیات جرم نہ ہو زندگی وبال نہ ہو

طارق نے بے حد چھوٹی عمر میں اپنے حصّے کی ذمّے داری کو محسوس کر لیا تھا۔ اُس کی پرورش کا پہلا
اس کے نانا ابو کے ہاں گزرا تھا۔ وہ بے حد محبّ الوطن اور پڑھے لکھے انسان تھے۔ پاکستان کو انہوں
اپنی آنکھوں کے سامنے بنتے دیکھا تھا۔ اس کی بنیادوں میں ہزاروں مسلمانوں کا خون بسا تھا۔
جانے کتنی عورتوں اور جوان بچیوں کی عصمت سے آج اِس ملک کی عورتیں ایک محفوظ زندگی جینے کے
ل ہوئی تھیں۔

وہ طارق کو گود میں بٹھائے اُس زمانے میں ان خون بھری داستانوں کو سنایا کرتے تھے، جب لوگ
ان کو پریوں کی کہانیاں سنایا کرتے ہیں۔ انہوں نے طارق کے اندر بچپن سے اِس وطن کی مٹی کی قدر
جگائی تھی۔ اور آج کا طارق اپنے نانا ابو کے خوابوں کی سچی تعبیر ہی تو تھا۔ ایسی تعبیر، جس پر سینہ پھلا کر
محسوس کیا جا سکتا تھا۔

❖❖○❖❖

جس حال میں سحرش ڈاکٹر خالد پرویز کو ملی وہ اسے دیکھ کر سُن ہو گئے تھے۔ انہیں لگتا تھا کہ اُن کے
دل دھڑکنا بند ہو چکا ہے پھر بھی وہ جانے کیوں زندہ کھڑے تھے۔ اُن کی آنکھیں بند کیوں نہ ہو رہی
تھیں وہ یہ منظر کبھی نہ دیکھنا چاہتے تھے۔ دوزخ کیا ہوتی ہے اور اُس کی آگ کیسے جھلساتی ہے وہ ہی
جان سکتے تھے۔

کیسے اُن کی جنت جیسی زندگی جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھلسنے لگ گئی تھی۔ اُن کی لاڈلی اور پیاری حسین بیٹی اِس قدر ابتر حالت میں اُن کے سامنے تھی کہ کچھ پَل کو وہ اُسے پہچان بھی نہ سکے تھے۔

تھانے سے فون آیا تھا کہ ایک بچی ایک ویران بے آباد کالونی سے ملی ہے، وہ آ کر شناخت کرلیں۔

ڈھیروں وسوسے اُن کے ساتھ سفر کرتے آئے تھے۔ لیکن اُن کا ذہن اِس کرب ناک تصور کو جگہ نہیں دے پا رہا تھا۔

سحرش کی نبض بے حد دھیمی چل رہی تھی۔ برہنہ اور خون سے بھرا وجود چیخ چیخ کر گزرے دن کی داستان سنا رہا تھا۔

ایمبولینس جا چکی تھی۔ سحرش کے ماموں ایمبولینس میں ساتھ بیٹھ کر ہسپتال جا چکے تھے۔ لیکن وہ کسی کٹے درخت کی طرح وہیں ڈھے گئے، دو حولداروں نے انہیں سہارا دے کر لٹایا۔ درد کی شدید لہروں نے انہیں گھیرے میں لپیٹ لیا۔ ایس ایچ او نے کسی سے اُن کی گاڑی ڈرائیو کرکے لانے کو کہا۔ انہیں کسی بات کی خبر نہ تھی۔

وہ سامنے کھڑی موت کی دہلیز کو فوراً پار کرلینا چاہتے تھے لیکن موت بھی اُن سے دور تھی۔ وہ زندگی اور موت کے بیچ کسی بھنور میں تھے۔ اُن کی بے حد تمنا تھی کہ وہ کبھی واپس زندگی کو نہ دیکھیں تا کہ وہ کسی ایسے منظر کو نہ دیکھ سکیں جو ہر اذیّت، درد سے زیادہ تھا۔

”اوئے حولدار محمد صادق اس کو کیا ہوا ہے؟“ ایس ایچ او نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے پوچھا۔

”سائیں مجھ کو تو لگتا ہے کہ اِسے ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ دیکھو اِس کی آنکھیں کیسے اُبل اُبل کر باہر آ رہی ہیں۔“ محمد صادق نے کہا۔

”اوئے اس کو بھی ہسپتال لے چلو، مجھے تو لگتا ہے کہ آج کا دن پورا برباد ہو جانا ہے۔“ ایس ایچ او نے بے زار لہجے میں کہا۔ کوئی مچھلی کی طرح تڑپ کر جان گنوا رہا تھا اور ایس ایچ او کو اپنے دن کی پڑی تھی۔

”بھائی صاحب کی حالت اچھی نہیں ہے!“ مسز تانیہ خالد کے بھائی اسد نے اٹکتے ہوئے کہا۔

خود اسد بھائی کی حالت بہت بُری تھی، وہ گھنٹوں میں بوڑھے ہو کر رہ گئے تھے۔ سحرش اِس وقت انتہائی نگہداشت میں تھی۔ ڈاکٹرز اُس کے متعلق بھی خاص پُر اُمید نہ تھے، اُس پر ڈاکٹر خالد پرویز کی حالت دگرگوں تھی۔ انہیں ایک ہی دن میں دو ہارٹ اٹیک ہو چکے تھے۔

وہ اکثر کہتے تھے کہ سحرش اُن کا دل ہے اور اُن کے دو بیٹے اُن کی آنکھیں ہیں۔

اور آج سحرش کی تکلیف پر اُن کا دل تڑپ رہا تھا۔ زندگی کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ مسز تانیہ کا وجود بے روح، خالی خالی آنکھوں سے بھائی کو تک رہا تھا اس سارے معاملے میں سب سے زیادہ وہ خود قصوروار تھیں۔ مائیں تو گھر کی دہلیز، حدود ہوتی ہیں۔ انہوں نے کبھی اپنا فرض ادا کر کے نہ دیکھا تھا۔ زندگی میں خود کی ذات اس قدر اہم ہو گئی تھی کہ وہ اپنے ہی وجود کے حصّوں کو بھول گئی تھیں۔ بچے بھی نازک پھولوں کی طرح ہوتے ہیں ایک مالی بھی اپنے پھولوں کی خوب صورتی اور حفاظت کے لیے کاٹ چھانٹ کرتا ہے اور وہ سگی ماں ہو کر اِس قدر لاپروا تھیں کہ جان ہی نہ سکیں، دیکھ ہی نہ پائیں کہ اُن کے بچے خود رو

[پودو]ں کی طرح پل رہے ہیں۔

ان کی لاپروائی کی وجہ سے، ایک بے خبر ماں ہونے کی وجہ سے آج اُن کا گھر تباہی کے دہانے پر کھڑا [تھا]

[سح]رش نے کچھ دیر پہلے آنکھیں کھولی تھیں اور اپنی نادانی کا اقرار کیا تھا کہ کیسے وہ اسکول سے باہر [کس]ی ایک لڑکے کو دوست بنا بیٹھی تھی۔ اور آخری بار اُسی کے ساتھ گھومنے نکلی تھی اور وہ دھوکے سے [اُسے] ایک جہنم میں لے گیا۔

[جیس]ے ہی اُس نے اُس جگہ کا ذکر کیا وہ ایک دَم چیخیں مارنے لگی۔ کچھ ہی پل میں وہ ہوش و حواس سے [بیگان]ہ ہو گئی، بے ہوشی میں بھی وہ باپ کو ماں کو مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ تانیہ بیگم کو یوں لگ رہا تھا کہ اُن کا [دل ک]سی آرے میں آ کر کٹ کٹ کر ختم ہو رہا ہے۔

”یا میرے اللہ! اولاد کا دُکھ، اُس کی تباہی کس قدر ناقابل برداشت ہے!“ ماں جی اس سارے [عرص]ے میں ایک بار بھی نہ بولی تھیں، یوں لگتا تھا، جیسے انہیں سکتہ ہو گیا ہے!

”اسد بھائی اُس لڑکے کا کچھ پتا چل سکا؟“ مسز تانیہ خالد کی چھوٹی بہن سدرہ نے پوچھا۔

”سحرش کی ایک دوست نے اُس لڑکے کا حلیہ بتایا ہے۔ فی الحال پولیس کا آرٹسٹ وہ حلیہ لکھ کر لے [گیا] ہے! لیکن سدرہ اتنا بڑا نقصان جو ہوا ہے، وہ کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ بے شک ہم اُس لڑکے کو کتنی ہی [کڑی] سزا دلوا دیں۔“ اسد بھائی کا لہجہ بے حد تھکا ہوا تھا۔

”[پ]ھر میڈیا۔! ایسی باتوں کو بہت اُچھالتا ہے۔ فی زمانہ انصاف حاصل کرنے کا مطلب ہے کہ کیچڑ [میں پ]تھر پھینکنا، جو اپنے ہی وجود کو داغ دار کر دیتا ہے۔ جانے قسمت نے اور کتنے امتحان رکھے ہیں؟“ [اسد ب]ھائی نے اِک تھکی تھکی نگاہ اپنی بہن پر ڈالی اور ڈاکٹر سے ملنے اُس کے کمرے کی جانب چل دیئے۔

❖❖○❖❖

”علیزے!“ حُسن آرا نے پالک کے پتے چنتے چنتے ایک دَم رُک کر پاس بیٹھی اسکول کی کاپیاں چیک [کرت]ی علیزے کو مخاطب کیا۔

”جی امی!“ علیزے نے ہاتھ میں پکڑے پین کا کیپ بند کر کے پوچھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اپنا [کا]م روک کر ماں کی بات پہلے سنتی تھی۔ شاید یہ ہی وجہ تھی کہ حُسن آرا کے دل میں علیزے کا ایک الگ [مقا]م تھا۔

”اپنی نگینہ کتنی پیاری بچی ہے ناں؟“ حُسن آرا نے کسی تصور میں کھوئے کھوئے کہا۔

”جی امی! اور بے حد سادہ بھی ہے، خالہ اور اُن کی فیملی میں اپنی امارت کا رتی بھر بھی غرور نہیں ہے [جیسے] خالہ یہاں آ کر ہمارے ساتھ کسی فرق کے بغیر گھل مل جاتی ہیں اُسی طرح اُن کے بچے بھی ملتے [ہیں]“ علیزے نے ماں کو تفصیل سے جواب دیا۔ وہ اپنی ماں کے چھوٹے سے چھوٹے سوال کو بھی بے [حد اہم]یت دیتی تھی۔ بڑے دونوں بہن بھائی ابّا کی طرح خود غرض تھے۔ امی کے پاس سوائے پیسوں کے [مطا]لبے کے کم ہی کوئی بات کرنے آتے تھے۔ اور چھوٹے بہن بھائی ابھی شعور سے کافی دور تھے ایسے [میں ع]لیزے حُسن آرا کی ایسی سہیلی کا کردار ادا کرتی تھی، جس سے اُس کی ماں اپنے دل کی تقریباً ہر بات

کرلیتی تھی۔

"علیزے! اپنا کاشف اتنا لاپروا اور کام چور نہ ہوتا تو میں آپا سے نگی کے رشتے کی بات کرتی۔" حسن آرا بیگم کے لبوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ تھی۔

علیزے نے چونک کر ماں کو دیکھا وہ ایسا خواب دیکھ رہی تھیں جس کی کوئی تعبیر نہ تھی۔

"امی جان! کاشف بھائی کتنے بھی قابل اور لائق فائق ہوتے پھر بھی نگی ہمارے گھر آپ کی بہو بن کر نہیں آ سکتی تھی۔ ہمارے درمیان امیری اور غریبی کی بہت واضح لکیر ہے، کیا ہوا کہ خالہ اور اُن کی فیملی ہم سے بہت اچھی طرح ملتے ہیں لیکن رشتے ناتے امی اپنے برابر کے لوگوں میں اچھے لگتے ہیں۔ ٹاٹ میں مخمل کا پیوند کبھی اچھا لگا ہے!" دھیرے دھیرے اپنی ماں کو سمجھاتی علیزے اس وقت اپنی ماں کی ہمدرد اور دوست بنی بیٹھی تھی۔ اُس کی باتوں سے حسن آرا کچھ دیر پہلے والے خواب سے باہر نکل آئیں۔ انہوں نے ایک گہری سانس بھری۔

"تم ٹھیک کہتی ہو علیزے! یہ بات بجائے تمہارے سوچنے کے مجھے سوچنی چاہیے تھی۔ لیکن کیا کروں میں ایک ماں بھی ہوں ناں! کاشف میرا پہلا بیٹا ہے مجھے بے حد عزیز بھی ہے، بے شک اُس نے میرے خواب کبھی پورے نہ کیے لیکن میرے دل میں اُس کے لیے ارمان تو ہمیشہ رہیں گے۔ نگی کو دیکھ کر، اُس کے اتنے اچھے سبھاؤ کو دیکھ کر ہر بیٹے کی ماں کا دل للچائے گا کہ یہ چاند اُس کے آنگن میں اُتر کر اپنی چاندنی بکھیرے۔ میں جانتی ہوں کہ میری خواہش بے حد ناممکن ہے، وہ یقیناً کسی بہت بڑے گھر کی بہو بنے گی۔" حسن آرا بیگم کا لہجہ نا چاہتے ہوئے بھی کچھ اُداس تھا۔

"امی گڈو کدھر ہے؟" علیزے نے ماں کی توجہ بٹانے کے لیے سوال کیا۔

"چڑھا ہوگا اُوپر پتنگ لے کر۔" حسن آرا کا لہجہ ایک دَم بے زار ہوگیا۔ بیٹے دونوں ہی اُن کے کہنے میں نہ تھے۔

"امی کتنی بار کہا ہے اسے پتنگ اُڑانے کے لیے اوپر جانے نہ دیا کریں۔" علیزے نے کاپیوں کا ڈھیر سائیڈ پر رکھ کر اوپر کی جانب جاتے ہوئے کہا۔

اوپر گڈو حسبِ معمول خود سے بے گانہ ڈور اور پتنگ سے اُلجھا ہوا تھا۔

"گڈو کے بچے چلو نیچے!" علیزے نے باقاعدہ اپنی چپل اُتار لی تھی۔

"مارے گئے...... ہٹلر آگئی!" گڈو ڈور چھوڑ کر نیچے بھاگا۔

"ٹھہرو آج میں تمہارا اس پتنگ بازی کا سارا بھوت نکالتی ہوں۔" علیزے ننگے پاؤں نیچے کی جانب بھاگی، نیچے آتے ہی وہ کسی سے بُری طرح ٹکرا گئی۔ دو مضبوط ہاتھوں نے اُسے تھام لیا، کچھ پَل کو علیزے کا سر بُری طرح گھوم کر رہ گیا حواس قابو میں آئے تو وہ ایک دَم شرم سے سُرخ پڑ گئی۔ وَلی اُسے تھامے دھیمی سی مسکراہٹ لبوں پر لیے بے حد شرارتی نگاہوں سے تک رہا تھا۔

"وہ میں... وہ گڈو..." علیزے کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ ہاتھ میں پکڑی چپل کو اُس نے بے اختیار پیچھے چھپا لیا۔

"آپ... آپ کب آئے؟" علیزے نے چپل گرا کر اپنا دوپٹا درست کیا، اُسے کچھ پَل لگے تھے،

...اسنبھالنے میں۔

"جب آپ آ کر ٹکرائیں!" جانے کیوں وَلی کے سارے خول اِس لڑکی کے سامنے چٹخنے لگتے تھے۔ علیزے کا چہرہ ایک دَم پھر سُرخ پڑ گیا۔ نگاہ بے اختیار جُھک گئی، وَلی کی مسکراہٹ بے اختیار تھی۔

"علیزے!" برآمدے سے حسن آرا کی آواز آئی۔

"جی امی!" علیزے نے جواب دیا، میں آ رہی ہوں۔

"آپ پلیز آیئے ناں!" علیزے نے وَلی سے نگاہ ملائے بغیر کہا۔

اندر تخت پر نگی حسن آرا کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ حسن آرا کا چہرہ بے حد کِھلا ہوا تھا۔ وَلی نے ...ک کر اُن سے پیار لیا۔

"جیتے رہو! اللہ تمہاری ماں کے دل کی ٹھنڈک صدا قائم رکھے۔" حسن آرا نے وَلی کے ماتھے پر بوسہ ...تے ہوئے کہا۔

"خالہ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" وَلی کا طرزِ تخاطب علیزے کو ہمیشہ بے حد مختلف لگا کرتا تھا۔

"ٹھیک ہوں!"

"تم بتاؤ آپا اور بھائی صاحب کیسے ہیں؟" حسن آرا بیگم نے علیزے کو کچھ لانے کا اشارہ کرتے وَلی سے ...کہا۔

"شکر الحمد اللہ! دونوں خیریت سے ہیں۔ امّاں جان اور بابا سائیں کل سے گاؤں گئے ہوئے ہیں، ...اں میں کچھ معاملات اُن کے منتظر تھے بابا سائیں کے اصرار پر امّاں جان بھی ساتھ گئی ہیں۔ جانے ... پہلے نِگی نے اُن سے یہاں آنے کی اجازت لے لی تھی۔ میں نے اپنے ایک مہمان دوست کو پہلے ...ان کے گھر ڈراپ کیا تاکہ تسلی سے کچھ وقت ہم آپ کے ساتھ گزار سکیں اور اس طرح ہمارا وعدہ بھی ...را ہو جائے گا۔" وَلی اپنی عادت کے برخلاف حسن آرا سے بے حد تفصیل سے بات کر رہا تھا۔

"جگ جگ جیو! تم نے اپنی غریب خالہ کا دل بڑھا دیا۔" حسن آرا کی خوشی واقعی دیدنی تھی۔

"علیزے!" حسن آرا بیگم کی ساری نقاہت ایک دَم اُڑن چھو ہوگئی تھی۔ انہوں نے پالک کی ٹوکری ...سائیڈ پر رکھ کر علیزے کو آواز دی اور پھر بنا انتظار کیے خود ہی کچن میں آ گئیں۔

"بچے پہلی بار ہمارے گھر اتنی دیر کو آئے ہیں۔ میرا دل کر رہا ہے کہ اُن کو اچھا سا کھانا کھلاؤں۔ تم ...گڈو کو بلواؤ میں پیسے دیتی ہوں تم ضرورت کا سامان منگوا لو۔" حسن آرا بیگم خوشی میں یہ بالکل بھول گئیں ...تھیں کہ یہ مہینے کی آخری تاریخیں چل رہی ہیں آج کی دعوت اگلے دس دن اُن کو بے حد پریشان کر سکتی ...تھی۔ لیکن وہ سب کچھ بھلائے بے حد خوش تھیں۔

علیزے نے بغور اپنی ماں کو دیکھا، چائے کے برتن سیٹ کرتے ہوئے اُس کے ہاتھ رُک گئے۔

"امی! آپ یوں ہی خوش رہا کریں، جانے کتنے دنوں بعد میں نے آپ کے چہرے پر مسکراہٹ ...دیکھی ہے۔"

حسن آرا بیگم نے مُڑ کر اِک نرم نگاہ اُس پر ڈالی۔ انہیں علیزے اِس گھر میں اُن کے صبر کا پھل لگتی ...تھی۔ اُن کی نرم نگاہ میں اس نیک روح کے لیے دُعا تھی۔

''ذرا جلدی کرنا! میں اُن کو کھانا کھلائے بغیر جانے نہ دوں گی۔'' وہ مسکراتے ہوئے پلٹیں، علیزہ کے ہاتھ اور دماغ دونوں تیزی سے کام کررہے تھے۔

امی کی خوشی کی خاطر اُس نے اپنے کچھ ضروری کاموں کے لیے رکھے پیسے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا وہ باہر آئی تو حُسن آرا بیگم اور اُس کی چھوٹی بہن غزالہ، نگی سے گفتگو میں مگن تھیں۔ وَلی علیزے رکھی کاپیوں میں سے ایک کاپی ہاتھ میں پکڑے پینسل سے اسکیچ بنارہا تھا۔

علیزے نے اُس کے سامنے چائے رکھتے ہوئے کاغذ پر سرسری نگاہ ڈالی تو بے اختیار ٹھٹک گئی۔ ا نے چند ہی منٹوں میں سامنے بیٹھی تینوں خواتین کے بے حد خوبصورت کمپوزیشن میں اسکیچ بناڈالے تھے وَلی نے لاشعوری طور پر سامنے کاغذ پینسل دیکھ کر ڈرائنگ شروع کردی تھی۔

''آپ تو بہت اچھا اسکیچ بنالیتے ہیں۔'' علیزے نے اُس کے سامنے کبابوں کی پلیٹ رکھتے ہو کہا۔

''بس ایسے ہی! کاغذ پینسل دیکھ کر میں شاید رہ نہیں پایا۔'' وَلی نے سادگی سے اعتراف کرتے ہو ایک کباب اُٹھا کر اپنی پلیٹ میں ڈال لیا۔

''لیکن سوری! جانے میں نے کس کی ورک بک خراب کردی۔'' وَلی نے اُلٹ پلٹ کر کاپی کے شرو میں نام پڑھا۔ یہ علیزے کی ہی ورک بک تھی جو وہ کل ہی لائی تھی۔ اسکول کے متعلق شیڈول اور لیکچ وغیرہ لکھنے کے لیے اُسے ورک بک کی ضرورت تھی اس لیے اُس نے ایک اچھی سی ورک بک خریدی تھ اب وہ وَلی کے ہاتھوں میں تھی۔

''نہیں کوئی خاص ضروری نہیں ہے آپ اسے استعمال کرلیں۔'' علیزے نے کھلے دل سے آفر کی۔

''لے لیں بھائی جان! اپنی ہٹلر آپا کاپی کتابوں کے لیے نہایت کنجوس ثابت ہوئی ہیں اگر وہ اتفاق سے آپ پر مہربان ہو ہی گئیں ہیں تو آپ اس قدر نادر موقع ہاتھ سے جانے نہ دیجیے گا۔'' گڈو نے شرارت سے بھانڈا پھوڑا۔ علیزے اپنی لکھنے پڑھنے کی چیزیں کبھی کسی کو نہیں دیتی تھی۔

''اِٹس مائی ہیئر! اگر آپ نے ہمیں کسی قابل سمجھا!'' وَلی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کون کہہ سکتا تھا کہ یہ وہ ہی عبدالولی ہے جس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ مسکرانے میں نہایت کنجوس ہے۔ اُسی پَل باہر دروازے کی بیل بجی، علیزے دروازے کی جانب بڑھی۔

''کون آیا ہے؟ باہر یہ لمبی سی گاڑی کھڑی ہے!'' یہ منزہ تھی جو ابھی ابھی بیوٹی پارلر سے آئی تھی۔ و ایک پارلر میں کام کرتی تھی۔ منزہ بے حد ضدّی اور خود غرض تھی۔ کاشف کی طرح وہ بھی زندگی میں کسی نہ کسی شارٹ کٹ کی تلاش میں رہتی تھی۔

''امی کے مہمان ہیں!'' علیزے نے اُس کے پُرجوش چہرے پر نگاہ ڈال کر بے نیازی سے کہا۔

''کون؟ روشن خالہ؟ یقیناً وہ ہی ہوں گی ہمارے خاندان میں سوائے اُن کے کوئی اتنا امیر نہیں۔'' منزہ ذرا اونچا بولتی آگے بڑھی، علیزے کو اپنی بہن کی لالچی طبیعت اور اُس کے اونچا بولنے پر بے حد شرمندگی محسوس ہوئی، وہ صحن میں رُکنے کے بجائے سیدھا کچن میں چلی آئی۔

باہر صحن سے منزہ کے مسلسل بولنے اور چہکنے کی آواز آرہی تھی۔

''جانے کب اِس کی سوچ بڑی ہوگی کب یہ میچور ہوگی؟'' علیزے نے تاسّف سے سر جھٹکا۔

سارا دن تقریباً کچن میں ہی اُس کا گزرا۔ نگینہ مسلسل اُس کے پاس آکر بیٹھی رہی، علیزے نے اُسے ی ہی بار کہا تھا کہ وہ باہر چلی جائے لیکن وہ کم ہی اُٹھ کر باہر گئی۔ وہ علیزے کو ہر کام کرتے بے حد لچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

''میں بھی کافی کچھ بنالیتی ہوں، امّاں جان میری بہت حوصلہ افزائی کرتی ہیں لیکن میں نے کبھی آٹا ں گوندھا اور نہ ہی کبھی روٹی پکائی، جب خان چاچا روٹیاں پکاتے ہیں تو مجھے اکثر یہ جادو لگتا ہے کہ پیڑے سے آٹے سے ایک دَم گول گول روٹیاں بن جاتی ہیں۔'' نگینہ کی باتوں میں بے حد معصومیت علیزے کو اپنی یہ کزن بہت اچھی لگی تھی۔

''تمہارا گھر تو بہت بڑا ہے اور ملازم بھی بہت سارے ہیں ہر کام کے لیے الگ الگ ملازم ہیں پھر تم چیزیں سیکھنے کی کیا ضرورت ہے؟'' علیزے کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی تھوڑی سی تلخی گھل گئی۔

''علیزے! امّاں جان کہتی ہیں کہ کیا امیر آدمی کے ساتھ بھوک نہیں لگی ہوتی ہے؟ اور اگر کوئی خدمت موجود نہ ہو تو انسان کو محتاج ہو کر نہیں بیٹھنا چاہیے اُسے خود کا کام ضرور کرنا آنا چاہیے اِس لیے امّاں مجھے اکثر کچھ نہ کچھ پکانا سکھاتی ہیں۔

ی بات ہے کہ امّاں جان کے ہاتھ میں بے حد ذائقہ ہے۔ وہ چپلی کباب اور بریانی جب پکاتی ہیں ا آجاتا ہے یہ بھائی کی پسندیدہ ڈشز ہیں۔ میں نے امّاں جان کو خود اپنے ہاتھوں سے بھائی کے کھانے پکاتے دیکھا ہے۔'' علیزے کو اُس کی سوچ سُن کر بے حد خوشی ہوئی۔

''امّاں جان کہتی ہیں کہ جب کوئی گھر کی عورت گھر والوں کو پکا کر کھلاتی ہے تو کھانے میں پیار اور ں شامل کرکے اُسے بابرکت بنادیتی ہیں، اِس طرح صحت کے ساتھ دلوں میں تعلق مضبوط ہوتا '' نگینہ کو اپنے والدین کی بتائی ہر بات کسی سبق کی طرح ہر وقت یاد رہتی تھی۔

''واقعی تمہارے خیالات سُن کر مجھے اپنی خالہ کی تربیت پر فخر ہو رہا ہے انہوں نے اپنے بچوں کو Val کی تعلیم دی ہے جو انہیں ہمیشہ زندگی میں آسانیاں اور خوشیاں دیں گی۔'' علیزے نے کھلے ے اعتراف کیا۔

ب اُس کی خود کی بہن تھی، جس نے آج تک انڈا تک نہ اُبالا تھا، منزہ کا خیال تھا کہ وہ ان کاموں لیے نہیں بنی۔

ں طرح اللہ نے اُسے شہزادیوں جیسی شکل صورت دی ہے وہ بہت اچھے سیٹ اپ کو Deserve ہے۔

چھوٹے موٹے کام اُس کی شخصیت کے لائق نہیں۔ ایک نگی تھی، محلوں جیسے گھر میں رہنے کے باوجود سادہ اور عاجزی لیے ہوئے۔

فرق تو یقیناً تربیت کی وجہ سے ہی تھا۔ اُن کے گھر میں امی کے بجائے زیادہ ابو کے خیالات گونجتے جس طرح کے خیالات اُس کے ابو کے تھے وہ علیزے کو کبھی پسند نہ رہے تھے۔

کھانا تیار کر کے علیزے نے چھوٹی سی ٹیبل پر برتن سجانے شروع کیے تو دور بیٹھے وَلی نے جو منزہ کی باتوں پر ہوں ہاں کر رہا تھا اور بے حد بے زار نظر آ رہا تھا۔ اُس نے سب کے ساتھ مل بیٹھ کر کھانے کی خواہش کی۔

"وہ بیٹا معذرت کے ساتھ! ہم لوگوں کے ہاں اتنی بڑی میز کہاں ہے کہ سب افراد پورے آ سکیں ہم تو سب نیچے دستر خوان پر کھانا کھاتے ہیں۔" حُسن آرا بیگم نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"خالہ ہم کون سا مریخ سے اُترے ہیں، جو زمین پر نہیں بیٹھ سکتے، پلیز آپ ہمارے ساتھ اس طرح کے تکلفات نہ برتیں۔ اس طرح اجنبیت کا احساس بڑھتا ہے۔" وَلی نے رسان سے کہا۔

حُسن آرا بیگم کا چہرہ ایک دم پُرسکون ہو گیا منزہ البتہ بے حد بے چین نظر آ رہی تھی۔ امی کو کیا ضرورت تھی اس طرح سچ بولنے کی۔ اُسے وَلی بے حد پسند آیا تھا۔

وہ نہ صرف بے حد خوبرو تھا بلکہ وہ منزہ کی کوالٹیز پر پُورا اُترتا تھا۔ وہ اتنی بڑی جائیداد کا تنہا وارث تھا جس کا ذکر اکثر ابو گھر میں کرتے تھے۔ منزہ کے دل میں وَلی کو پانے کی خواہش پکی ہو گئی تھی۔

فی الحال اُسے یہ بات ناممکن لگ رہی تھی لیکن اُسے اپنے حُسن پر بے حد بھروسا تھا۔ جو اس ناممکن کو ممکن بنا سکتا تھا۔

لیکن اِس سب کے لیے اُس کا وَلی سے مسلسل ملنا ضروری تھا۔ جو فی الحال اُس کے ذہن میں نہ آیا تھا کہ وَلی سے مزید ملاقاتوں کا سلسلہ کس طرح بڑھایا جائے۔

کھانا بے حد اچھے ماحول میں کھایا گیا، گڈو اور وَلی آپس میں باتیں کرتے رہے، آج تو گڈو غزالہ کا بھی ریکارڈ توڑ رہا تھا۔ اُن کے گھر میں سب سے زیادہ گفتگو کرنے والی غزالہ تھی اور اتنی ہی پیٹ کی ہلکی بھی تھی۔ حُسن آرا بیگم اپنی ساری بیماری بھولے بیٹھی تھیں۔

علیزے برتن رکھتے اُٹھاتے جب جب ماں پر نظر ڈالتی، ماں کے چہرے کو بے حد روشن پاتی تھی۔

"اگر آپ لوگوں کے آنے سے میری ماں کو اس قدر خوشی ہوتی ہے تو میں مہمان داری کا بار برداشت کرنے کو تیار ہوں۔" علیزے نے دل ہی دل میں سوچا۔

حُسن آرا بیگم دروازے تک وَلی اور بنکیہ کو رخصت کرنے گئیں۔ علیزے وہیں تخت پر سیدھی ہو کر لیٹ گئی بلکہ اُس نے گاؤ تکیہ سیدھا کر کے لیٹنے کے لیے جگہ بنائی۔

"ہائے اللہ آج تو تھکن سے حال ہی بُرا ہو گیا ہے۔" علیزے کو نیند بھی بے حد آ رہی تھی۔ نیند سے اُس کی آنکھیں بوجھل ہو کر سُرخ ہو رہی تھیں۔

"یہاں نگی کا ہینڈ بیگ پڑا ہو گا!" یہ وَلی کی آواز تھی۔ علیزے اُچھل کر بیٹھ گئی تھی۔

"آئی ایم سوری! میں نے شاید آپ کو ڈرا دیا۔" وَلی نے شائستہ لہجے میں معذرت کر ڈالی۔

"اِٹس او کے!" علیزے خوش اخلاقی سے مسکرائی۔ مسکراتے ہوئے اُس کے گالوں پر بھنور پڑتے تھے۔ بے شک وہ بے حد خوبصورت مسکراہٹ رکھتی تھی۔

وَلی نے چونک کر اُسے دیکھا۔ سرخ ہوتی آنکھیں، گلاب جیسی رنگت، گہری سیاہ آنکھیں اور اُس کی گھنیری پلکیں! تھکن اور نیند سے چہرے پر بہت خوبصورت تاثر اُبھر آیا تھا۔

"یا اللہ! کیا میں پہلی بار خوبصورت چہرہ دیکھ رہا ہوں یا پھر آج سے پہلے ایسا چہرہ مجھے دکھائی ہی نہیں دیا جو مجھے متوجہ کر سکے۔" وَلی نے زندگی میں پہلی بار شاید کسی لڑکی کو اتنے غور سے دیکھا تھا۔

آج تک اُسے عادت تھی خود کو مرکز نگاہ بنے رہنے کی، کوئی اُس کا بھی مرکز نگاہ ہو سکتا ہے اِس کے متعلق اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ وَلی نے بے اختیار ہر خیال سے چھٹکارا پانے کے لیے سر کو جھٹکا۔

"علیزے! میں چلتا ہوں!" علیزے نے اُسے غور سے دیکھا۔

اب چونکنے کی باری علیزے کی تھی۔ وہ اُسے اُس کے نام سے مخاطب کر کے گیا تھا اور اُس کی آواز ...ں سے بھاری ہو رہی تھی۔ علیزے کا دل دھڑکا۔ کیا واقعی ایسا تھا یا پھر اُس کا وہم تھا۔ نیند سے بند ...لی آنکھوں سے اُس نے سوچا۔ تھکن اِس قدر تھی کہ وہ مزید کچھ اور نہ سوچ پائی۔

منزہ اُن لوگوں کو رخصت کر کے جب برآمدے میں آئی تو علیزے بے خبر سو رہی تھی۔

منزہ کی نگاہ اتفاقاً اُس نوٹ بک پر پڑی جس پر وَلی اسکیچنگ کرتا رہا تھا۔ منزہ وہیں کرسی پر بیٹھ کر ...بک کھول کر دیکھنے لگی۔

ایک دو اسکیچز کے بعد مسلسل کچھ اسکیچز تھے۔ پہلا خاکہ صرف آنکھوں کا تھا۔ مختلف اینگلز سے بنائی ...لی آنکھیں تھیں۔

دوسرے صفحے پر آنکھیں ناک منہ بنائے تھے لیکن چہرہ ادھورا تھا۔ تیسرے صفحے پر بھی ادھورا چہرہ تھا ...ن بے حد خوبصورت خاکہ بنا ہوا تھا۔ منزہ کا خون ایک دم اکٹھا ہو کر شریانوں میں کھولنے لگا۔

یہ...... یہ مختلف اینگلز کے خاکے علیزے کے چہرے کے تھے کیوں کہ آخری خاکے میں وَلی نے ...ال پر ایک نمایاں تِل بنایا تھا۔ اور یہ تِل سوائے علیزے کے کسی کے نہ تھا۔

تو اِس کا مطلب تھا کہ وَلی سارا دن علیزے کو دیکھتے اُس کی تصویریں بناتا رہا، ہر صفحے پر اُدھورے ...ز! منزہ کو منہ چڑھا رہے تھے۔

منزہ نے سارے صفحے ایک ایک کر کے اکٹھے کیے اور پرزے پرزے کر دیئے۔ اتنے عرصے بعد اگر ...لی منزہ کو پسند آیا تھا وہ بھی کسی اور کو نہیں اُس کی اپنی ہی بہن کے متعلق احساسات رکھتا تھا۔

تو اِس کا مطلب ہے کہ وَلی۔ علیزے میں انٹرسٹڈ تھا۔ لیکن یہ تو اُن کی پہلی ملاقات تھی یا پھر شاید ...ری!

کیا مجھے اِس رُخ پر سوچنا چاہیے؟ منزہ نے سوچا۔ کیا واقعی وَلی کو علیزے میں دل چسپی ہے یا پھر میرا ...م؟

لیکن کچھ دیر پہلے اسکیچ پر بنا تِل ہر سوال پر حاوی ہو گیا تھا۔ منزہ نے اِک قہر بھری نگاہ سوئی ہوئی ...ے کے چہرے پر ڈالی۔

"سوتے میں جانے وہ کس بات پر دھیمے سے مسکرا رہی تھی۔ اگر یہ تمہاری مسکراہٹ وَلی کے لیے ہے ...ے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہارے چہرے سے نوچ لوں گی۔" منزہ نے سگی بہن ہونے کے باوجود ...ہت سفاکی سے سوچا۔

ڈاکٹر خالد پرویز کا موبائل فون سُنتے ہی اُن کی حالت بگڑنے لگی ۔ چار روز پہلے ہی تو وہ آئی سی یو سے پرائیویٹ روم میں شفٹ ہوئے تھے۔

اُنھیں زیادہ تر موبائل سُننے نہ دیا جاتا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے سب ہی اُن کے روم سے نکلے تھے۔ ڈاکٹر خالد کسی سے کوئی بات نہ کرتے تھے بس چُپ چاپ سب کی سُنتے رہتے تھے۔

ابھی جب موبائل کی مسلسل بیل بجی تو انھوں نے فون اُٹھا کر کان سے لگالیا۔

جو خبر انھوں نے سُنی تھی وہ ایک بار پھر اُن کی برداشت سے باہر تھی۔ انھوں نے سینڈ کا بٹن دبا کر کے وہ کلپ اوپن کیا، جو ابھی ابھی اُن کے موبائل پر کسی نے بھیجا تھا۔

یہ سحرش کے بلیو پرنٹ تھے۔

ڈاکٹر خالد کی سانسیں ایک دَم اکھڑنے لگیں۔ آنکھیں اُبل کر باہر آ گئیں، اُن کے بدن نے ایک زور کا جھٹکا کھایا۔

اُن کی روح نے اِس وجود سے چھٹکارا پالیا تھا جو اتنے بڑے غم کے بوجھ سے کچل کر چکنا چور ہوچکا تھا۔

مسز خالد نڈھال سی سر پر دوپٹا لیے اندر آئیں تو اُن کی چیخیں نکل گئیں وہ واپس باہر بھاگیں، ڈاکٹرز بلانے کے لیے۔ ڈاکٹرز نے آ کر اُن کے ساتھ جڑی مشینوں کو دیکھا جو بالکل بے آواز ہوگئی تھیں۔ دس منٹ وہ اپنی سی کوششیں کرتے رہے لیکن بے روح جسم سے زندگی کو کہاں سے بلایا جاسکتا ہے۔

''ہی از نو مور!'' ڈاکٹرز نے کہہ کر اُن کی بے حد باہر نکلی آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر بند کرنے کی کوشش کی لیکن آنکھیں پھر بھی اَدھ کھلی رہ گئی تھیں۔

ثانیہ بیگم کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر ڈھے گئیں، ڈاکٹر خالد پرویز کی اَدھ کھلی آنکھیں ابھی کے وجود کے آرپار ہورہی تھیں...''

❀

''آخر کیا چاہتے ہیں آپ؟'' مسز ثانیہ خالد نے تھکے تھکے لہجے میں پوچھا۔

''آپ کا تھوڑا سا تعاون!'' طارق نے بے حد نرم لہجے میں جواب دیا۔

''طارق صاحب! میں آپ سے پہلے بھی گزارش کرچکی ہوں کہ پلیز ہمیں تنگ نہ کریں، یہ گھر اب وجودوں سے نہیں بستا، یہ قبرستان بن چکا ہے، ہم مرے ہوئے لوگ بھلا کیا کسی سے تعاون کریں گے۔'' مسز ثانیہ شاید اپنے حواسوں میں نہ تھیں۔ وہ خلا میں جانے کیا تلاش کرتے بول رہی تھیں۔

''پلیز آپ میری بات تو سنیں!'' طارق کا دِل بے حد دُکھا تھا۔

''زمانے کی اتنی باتیں سُنی ہیں طارق صاحب کہ میرے کان بہرے ہوگئے ہیں، پلیز آپ یہاں سے چلے جائیں!'' مسز ثانیہ نے تیزی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

طارق لب بھینچ کر رہ گیا۔ جس سانحے سے یہ خاندان گزرا تھا، اُس سے اِن کے گھر کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ ڈاکٹر خالد کی موت کے بعد اُن کی والدہ کو فالج کا اٹیک ہوا، وہ نہ بول سکتی تھیں اور نہ حرکت کرسکتی تھیں۔

میڈیا میں سحرش کی خبریں بہت مرچ مسالے سے لگی تھیں لیکن لوگ ابھی تک اُسے خبر کی طرح ہی تلس کرتے تھے، اُس سے کسی کو کوئی ہمدردی نہ تھی۔ اب تو خان دان والے بھی اُن سے گھبراتے تھے۔

اور سحرش خود کسی زندہ لاش کی طرح تھی۔ نہ وہ بولتی تھی نہ سُنتی تھی، بس چُپ چاپ لیٹی رہتی تھی۔ ماں زبردستی ایک دو نوالے کھلادیتی تو کھالیتی ورنہ گھنٹوں بنا کھائے پیے رہتی، اُس کے زندہ ہونے کا ثبوت صرف اُس کی سانسیں تھیں جو ابھی تک چل رہی تھیں۔ سحرش کے دونوں بھائیوں کو اُن کے ماموں اپنے ساتھ باہر لے گئے تھے کیوں کہ وہ بچے بے حد گھبرائے ہوئے تھے۔ لوگوں کی طرح طرح کی باتیں اور رویے اُن کی ذہنی حالت تباہ کررہے تھے۔ اسد ماموں نے بہتر یہ ہی جانا کہ بچے اُس ماحول سے، اِس کہانی سے دُور رہ کر ہی اچھی زندگی پاسکتے ہیں۔ جانے سے پہلے وہ سحرش کا کیس بند کروا کر گئے تھے کیوں کہ اُنھیں انصاف کے بجائے بدنامی مِل رہی تھی۔ بیوہ بہن اِس بدنامی کے بڑھتے ہوئے پودے کے سائے تلے زندگی نہ گزار سکتی تھی۔ انھوں نے بہتر یہ ہی جانا کہ اُنھیں چُپ ہوجانا چاہیے کیوں کہ سحرش کے مجرموں کو پکڑوانے کی ہمت اُن میں ختم ہوچکی تھی۔

جہاں سول پولیس اِس کیس کو روز کا معمول جان کر بند کرچکی تھی وہاں طارق اِس کیس میں خاص دل

چسپی لے رہا تھا۔ وہ جس اسائنمنٹ پر کام کر رہا تھا، یہ کیس بھی اُسی کی کڑی تھا۔ اور طارق جیسا ا
جس کام میں ہاتھ ڈالتا تھا، اُسے اُس کے انجام تک ضرور پہنچاتا تھا۔

مسز تانیہ خالد کے ہاں جانے وہ کتنے چکر لگا چکا تھا لیکن وہ ہر بار اُسے مایوس کر دیتی تھیں۔ مگر طارق کا ہی حوصلہ تھا کہ وہ مستقل مزاجی سے یہاں آ رہا تھا۔ شروع شروع میں وہ صرف اِس لیے یہا آتا تھا کہ سحرش کے ذریعے اُسے کچھ انفارمیشن مل جائے گی، لیکن جیسے جیسے وہ اِس گھر کے افراد حالات سے شناسا ہوا، اُس کی ہمدردی بھی اُن کے ساتھ ہو گئی۔

اب وہ دِل سے چاہتا تھا کہ سحرش اور اُس کے خاندان کو تباہ کرنے والوں کو ایسا سبق سکھائے کہ سب کے لیے عبرت بن کر رہ جائیں، لیکن اِس کے لیے اُسے مسز تانیہ اور سحرش کے تعاون کی ضرو تھی جو فی الحال ناممکن نظر آ رہا تھا۔ لیکن وہ بھی طارق تھا اپنے نام اور ارادوں میں بے حد پکا، اُس زندگی میں ہر ناممکن اپنے ربّ پر یقین رکھنے کی وجہ سے ممکن کر دکھایا تھا۔

❖❖○❖❖

احمد شاہ کتنی دیر سے سجدے میں گرے ہوئے تھے۔ اِس وقت سورج بس طلوع ہونے والا تھا۔ ا وادی کی خوب صورتی اُن کو اپنے رب سے مزید قریب کر دیتی تھی۔ وہ فجر کی نماز پڑھنے کے لیے یہا آئے تھے ہوا میں بے حد خنکی تھی۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ میں، قریب بہنے والے جھرنے کے مدھم شور م ہم آواز میں اللہ سبحان کی ثناء تھی۔ احمد شاہ نے گہری سانس کھینچ کر ماحول کی تازگی و پاکیزگی کو محسوس کیا بادلوں کی اوٹ سے سورج طلوع ہو رہا تھا۔ آسمان پر اتنے سارے اور خوب صورت رنگ بکھر ہوئے تھے کہ احمد شاہ کے لبوں سے بے ساختہ سبحان اللہ نکلا۔

”اللہ تعالیٰ نے کن کن نعمتوں اور خوب صورتیوں سے ہم کو نوازا ہے، یہ ہم ہی ہیں پھر بھی ہر ا ناشکری کرتے ہیں!“ احمد شاہ خود سے ہی مخاطب ہوئے۔ اُسی پل سامنے اُن کی نظر پڑی روشن آرا ا ملازم کے ساتھ اُدھر ہی کی جانب آ رہی تھیں۔ ملازم کے ہاتھ میں چھوٹی سی کین کی بنی باسکٹ تھی۔

”السلام علیکم!“ روشن آرا بیگم نے قریب آ کر کہا۔

”وعلیکم السلام!“ احمد شاہ نے جواب دیا اُن چہرے پر ایک دم روشنی بکھر گئی۔ شریک سفر جب رفیق کی طرح رہے تو یہ سفر ہمیشہ راحت اور خوشی کا باعث بنتا ہے، روشن آرا نے اُن کی زندگی مکمل کی تھی۔ ا اِس قدر خوب صورت عادات کی مالک تھیں کہ انہوں نے احمد شاہ کی زندگی خوشیوں سے بھر دی تھی۔

”آپ یہاں تھے میں نے سوچا آج ناشتہ بھی اِدھر ہی کر لیا جائے۔“ روشن آرا نے چھوٹی سی چٹا کھول کر بچھائی۔

”ہماری بیگم کی سوچ بھی اُن کی طرح زبردست ہوتی ہے۔“ احمد شاہ نے گرم گرم چائے کپ م انڈیل کر پہلے ملازم کو دی اور پھر دوسرے کپوں میں چائے ڈالی۔

ملازم نہ نہ کرتا رہا لیکن روشن آرا بیگم نے ایک پلیٹ میں اُس کا ناشتہ ڈال کر اُسے زبردستی تھما ا ملازم کی آنکھوں میں اِس عزت افزائی پر نمی بھر آئی!

”بیگم صاحبہ! اللہ سائیں آپ کو ہمیشہ خوش رکھے، آج آپ کے اِس عمل نے مجھے خرید لیا ہے م

ب سمجھا کیوں میرے بابا مجھے شہر جا کر چپڑاسی کی نوکری کرنے نہیں دیتا، وہ ہمیشہ آپ لوگوں کی بہت ریف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آپ کے ہاں نوکری نہیں بادشاہی مل جاتی ہے کیوں کہ عزت ہی غریب الں کی سب قیمتی شے ہوتی ہے اور آپ لوگ نوکر کو بھی اپنے جیسا انسان سمجھتے ہو۔ صاحب آپ لوگ ل بہت اچھے ہو۔“ صدیق نے بے حد سچائی سے کہا۔

”صدیق بیٹا! اُس اللہ کے ہاں جب کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہے سوائے اُس کے جس کے اعمال بڑے وں تو پھر ہم کون ہیں یا ہماری استطاعت کیا ہے کہ اس طرح کی تفریق کریں۔“ احمد شاہ کا نرم لہجہ صدیق کے اندر تک اُترتا چلا گیا۔

احمد شاہ کا یہ ہی رویّہ تھا جو لوگوں کو اپنا بنا لیتا تھا۔ کبھی زمینوں پر کوئی معاملہ خراب ہوتا تو اُن کے جانثار لہ آگے آگے ہوتے تھے۔

احمد شاہ عزت اور پیار دے کر وفاداری خریدتے تھے۔ وفاداری، نوکر کا مالک کے ساتھ ایسا رشتہ ہے یسے دے کر خریدا نہیں جا سکتا۔

”شاہ جی میرا بہت دِل کرتا ہے کہ میرے ولی کی دلہن جلد از جلد آ جائے۔“ روشن آرا نے اچانک ہی پی خواہش کا اظہار کیا، جب صدیق خاصے فاصلے پر جا کر بیٹھ گیا۔

”ارے! اِس معاملے میں تو آپ بھی روایتی ماں نکلیں، نیک بخت اُسے اپنی تعلیم مکمل تو کرنے دو۔“ مد شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”شاہ جی! بیٹوں کی مائیں شاید میری طرح ہی اپنے بیٹے کے سر پر سہرا جلد از جلد سجانا چاہتی ہوں ی۔“ روشن آرا بھی مسکرا دیں۔

”آپ سے اپنے دِل کی ایک بات کہوں؟“ روشن آرا بیگم نے کچھ رکتے ہوئے کہا۔

”کہو روشن! تم نے کب سے اپنے دِل کی بات مجھ سے دُور رکھنی شروع کر دی، تمہاری ہر بات میرے لیے بے حد اہم ہے۔“ احمد شاہ نے نرمی سے اُن کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”حسن آرا کی بیٹی علیزے مجھے شروع سے ہی بے حد عزیز رہی ہے۔ اُسے دیکھتے مجھے اپنے بیٹے کا خیال آ جاتا ہے کہ کاش وہ میری بہو بنے، دونوں کی جوڑی بے حد شاندار رہے گی۔ علیزے نہ صرف خوب صورت ہے بلکہ اُس بچی میں بے حد اچھی عادتیں پائی جاتی ہیں۔ اُس کی مسکراہٹ اتنی پیاری ہے کہ یوں لگتا ہے زندگی میں پھول کِھل رہے ہوں۔“ روشن آرا بے خودی میں کہتی دھیرے دھیرے بول رہی تھیں۔ تصور میں یقیناً اُن کے علیزے کا موہنا سا چہرہ تھا۔

احمد شاہ نے کچھ چونکتے ہوئے انہیں دیکھا۔ روشن آرا کے چہرے کے تاثرات سے لگتا تھا کہ وہ اپنی خواہش کے معاملے میں خاصی آگے نکل گئی ہیں۔ یقیناً وہ دِل ہی دِل میں اُس بچی کو اپنی بہو تصور کر چکی تھیں۔

”روشن! تمہاری خواہش سر آنکھوں پر! مجھے تمہاری بہن کے گھر رشتہ جوڑ کر بے حد خوشی ہو گی لیکن ہمیں اِس معاملے میں کچھ حقیقت پسندی سے کام لینا چاہیے، ولی جس ادارے میں پڑھ رہا ہے وہاں اُس کے ساتھ بے حد خوب صورت اور ذہین بچیاں بھی پڑھتی ہیں۔ ایسے میں اُن میں سے اُس کا کسی

کے لیے پسندیدگی رکھنا کچھ عجب نہ ہوگا ہمیں اُس کی خوشی اور پسند کا خیال ضرور رکھنا چاہیے، انسان کو کے معاملے میں ہاتھ ذرا کھینچ کر رکھنا چاہیے، چاہے سامنے اولاد ہی کیوں نہ ہو، زیادہ توقعات کبھی دل دُکھا دیتی ہیں۔'' احمد شاہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''شاہ جی! ولی کی تابعداری ہی نے مجھے اس مقام پر کھڑا کیا ہے کہ میں اُس کے لیے خواب سکوں۔'' روشن آرا بیگم کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔

''اللہ کرے کہ وہ تمہاری توقع پر پورا اُترے لیکن روشن دور بدل رہا ہے، بدلتے زمانے کے ساتھ کی جنریشن اپنی زندگی کا ہر فیصلہ خود کرنا چاہتی ہے۔'' احمد شاہ ان کو ہر طرح کی سچویشن کے لیے تیار چاہتے تھے۔

''میرا ولی کبھی نہیں بدل سکتا وہ میرا مان ہے، وہ ہمیشہ میرے دِل کی ٹھنڈک بنتا رہا ہے آج تک اُس نے میرا کہا نہیں ٹالا، پھر میں اُس کی ماں ہوں اُس کی پسند ناپسند کا معیار جانتی ہوں۔ شاید یہ ہی وجہ کہ علیزے کے لیے میرا دِل بے حد یکسو ہوا، مجھے لگا کہ ولی کبھی کسی کو پسند کرے گا تو وہ یقیناً علیزے ہی ہوگی۔'' روشن آراء بیگم نے آس سے احمد شاہ کی جانب دیکھا۔

''روشن آرا بیگم! آپ اتنی پُر اعتماد ہیں تو ہم کون ہوتے ہیں اعتراض کرنے والے! بس آپ سے میری گزارش ہے کہ کبھی کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے بچوں کی رائے اور پسند ضرور پوچھیں۔'' احمد شاہ کی گزارش میں بھی تھوڑا تھوڑا حکم کا عنصر پایا جاتا تھا اور یہ شاید اِس لیے تھا کہ وہ اپنی بات پر اصرار کر رہے تھے۔ اُن کا اصرار بھی دراصل دُوراندیشی لیے ہوا تھا۔

''ٹھیک ہے میں پہلے ولی سے اُس کی پسند پوچھوں گی۔'' روشن آراء احمد شاہ کی تائید پاتے ہی بے حد مطمئن ہوگئیں۔

''ایک بات اور دھیان میں رکھیے گا کہ ولی کا لاسٹ سمیسٹر چل رہا ہے، آپ اِس طرح کی ساری گفتگو اُس کے امتحانوں کے بعد کیجیے گا میں نہیں چاہتا کہ اُس کے سالوں کی محنت اب جب کہ پھل پانے والی ہے کوئی بھی بات اُس کی توجہ بٹادے۔'' احمد شاہ نے روشن آرا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا بھی یہ ہی خیال ہے، آپ فکر نہ کریں جیسے آپ کہیں گے، انشاء اللہ ویسا ہی ہوگا۔ علیزے والی بات فی الحال ہم دونوں تک محدود رہے گی۔'' روشن آراء بیگم نے شوہر کی بات پر ہمیشہ کی طرح سر تسلیم خم کیا۔ احمد شاہ کو اُن کی یہ بات بے حد بھاتی تھی کہ روشن آرا بیگم کبھی کسی بات کو ضد نہ بناتی تھیں ہمیشہ مان جاتی تھیں۔

اور یہ بات ہمیشہ درست رہی ہے کہ ماننے والا ہمیشہ پاتا ہے کھوتا نہیں ہے اور روشن آرا بیگم مان کر ہمیشہ پاتی ہی رہی تھیں۔

❖❖○❖❖

دردگر آدمی ہوتا
تو گریباں پکڑ کر کہتے

اس طرح رہتے ہیں بے چین دلوں کے اندر؟
اس طرح کرتے ہیں بیماروں سے؟
دِل میں رہنا ہے تو کچھ ٹھیک سے رہنا سیکھو
ہم تمہیں سہتے ہیں کچھ تم بھی تو سہنا سیکھو
ایک تھوڑی سی خوشی آئے تو جل جاتے ہو!

کیتھی کی آواز میں جو سوز تھا، وہ ترنم کو کس قدر مانوس لگا تھا۔ اس تڑپ سے وہ آشنا تھی اِس کیفیت کو وہ خود سے جھیل رہی تھی۔

''کیا ہوا کیتھی! کیوں اِس قدر افسردہ ہو؟'' ترنم نے بے حد دل سوزی سے پوچھا۔

''جانے بے بی تم میں ایسی کون سی بات ہے، جو مجھے تمہاری طرف متاثر کرتی ہے، تم سے اپنے دل کی بات کہنے کو کہتی ہے۔'' کیتھی نے گہری سانس لیتے ہوئے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ وہ اس وقت ترنم کا پیڈی کیور کر رہی تھی اُس کے مساج کرتے ہوئے ہاتھ رُک چکے تھے۔ چہرے پر جذبات کا ہجوم تھا۔ جانے وہ کس طرح خود پر ضبط کر رہی تھی۔

''کیتھی تم مجھ سے اپنے دل کی بات کر سکتی ہو، تم جانتی ہو انسان کا سب سے بڑا دُکھ یہ نہیں ہوتا کہ کوئی اُس کی بات سُننے کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ ہوتا ہے کہ سُننے والے تو موجود ہوں لیکن اُس کی بات کو سمجھنے والا کوئی نہ ہو، تمہارے درد کو میں سمجھ سکوں گی کیوں کہ میں خود اِس سے کتنے ہی سالوں سے لڑ رہی ہوں۔'' ترنم نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''بس بے بی! اپنی زندگی بالکل بے کار لگنے لگی ہے۔ اکثر سوچتی ہوں یہاں اِس دنیا سے جا کر گاڈ کا سامنا کیسے کروں گی؟ میری گرینی ریگولر چرچ جایا کرتی تھی وہ ایک مذہبی عورت تھی۔ میں اُس سے اکثر ہر سنڈے پر بحث کرتی تھی کہ تمہارے گاڈ کو تمہارے چرچ آنے کا کیا فائدہ ہے۔ جوانی کا شروع دور تھا، سوچ اور جذبات بے حد بے لگام تھے۔'' کیتھی کی آواز میں دُکھ تھا۔

''پتا ہے بے بی! وہ میری باتوں کا بُرا منائے بغیر مسکرا دیتی تھی۔ وہ کہتی کہ میں کب کہتی ہوں کہ میرے چرچ جانے سے گاڈ کو کوئی فائدہ ہوتا ہے۔ میں تو اپنے فائدے کے واسطے جاتی ہوں۔ گاڈ فائدے نقصان سے الگ ہے، یہ چیزیں تو انسان کے ساتھ لگی ہیں۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کون کیسا مال خرید کر اس دنیا سے لے جاتا ہے۔ فائدے والا یا پھر نقصان والا! تب میرے کو یہ سب باتیں Rediculous لگا کرتی تھیں۔ آج مجھے اپنی زندگی Rediculous لگتی ہے۔''

ٹاپ کی سیڑھی چڑھنے کی دُھن میں میں نے کبھی پیچھے مُڑ کر نہ دیکھا کہ میرے پیچھے واپسی کی کوئی سیڑھی بھی بچی ہے یا نہیں! میں نے بے حد نقصان والا مال خرید لیا۔ اب یہ مال یہاں سے گارڈ کے پاس کیسے لے جاؤں، کیسے اپنے لیے ہیون کا سودا کروں؟

ہیون! اِس ہیون نے مجھے کتنا خوار کیا ہے! اسے میں دنیا میں حاصل کرنے کے چکر میں ہیل (Hell) میں آ بیٹھی ہوں اور یہاں سے ہیل ٹو ہیل (جہنم کا جہنم تک) کا ہی رستہ نکلتا ہے۔ اس دُنیا کے ہیل سے وہاں کے بڑے ہیل تک کا ٹرانسفر! بے بی میرے کو یہ ساری چیزیں نہ جینے دیتی ہیں نہ مرنے دیتی ہیں

کیونکہ میں جانتی ہوں کہ میں انوسینٹ نہیں ہوں، میں اِس راہ پر اپنی مرضی سے چلی تھی۔ میرا خیال تھا کہ کچھ عرصے بعد خوب پیسا بنا کر واپس اپنی دنیا میں عیش کرنے چلی جاؤں گی لیکن میں ون وے ٹریک میں پھنس گئی ہوں! جہاں واپسی کا راستا نہیں ہے اور آگے کا راستا میرے لیے طے کرنا بے حد کٹھن ہے جو موت کی طرح ہے لیکن ایسی موت جو نجات کے بجائے مستقل رہتی ہے۔'' کیتھی تقریباً ڈھے کر کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

''کچھ سالوں سے لگتا ہے کہ گریٹی کی روح میرے اندر آ گئی ہے، آگہی مجھے تڑپاتی ہے بے بی! میری یوزلیس زندگی میرا سب سے بڑا پچھتاوا ہے کاش میں بھی اچھی زندگی اور اچھائی کا راستا اختیار کرنے کی آزادی رکھتی!'' کیتھی نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

''کیتھی! اِس سارے معاملے میں، میں تم کو کیا تسلی دوں یا پھر امید دلاؤں تمہارا اور میرا درد مشترک ہے۔'' ترنم نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے زندگی میں معافی کا انتظار ہے! یہ واحد اُمید ہے جس کے جھولے سے لٹکی میں اِس (جہنم) کو پار کرنے کا خواب دیکھتی ہوں، مجھے لگتا ہے کہ زندگی میں جہاں جہاں اللہ ہے وہاں آمرزش ضرور ہے۔ بس ہمیں اپنی زندگیوں میں اللہ کو جگہ دینی ہوگی، میں جانتی ہوں اور اس چیز کا احساس مجھے بے کچلتا ہے کہ مجھ جیسی نجس اور ناپاک کے ساتھ وہ پاک ذات کیسے رہ سکتی ہے۔ لیکن پھر بھی جب جب میں مایوسی سے نڈھال ہو جاتی ہوں، میرے دل میں پھر آس ہونے لگتی ہے کہ مجھے بھی شاید کبھی معافی مل جائے!

''بس یہ ہی جلتی بجھتی آس کی چنگاری اِس برف جیسے قبرستان میں زندگی کی مدّت کا پتا دیتی ہے، آس بندھاتی ہے، امید دلاتی ہے۔ تم بھی اپنے دل میں اِس چنگاری کو ٹٹول کر ڈھونڈو۔ شاید تمہیں بھی کوئی آس کا جھولا مل جائے جس پر سوار ہو کر تم (ہیل ٹو ہیل) جہنم سے جہنم کے راستے سے نکل سکو۔'' ترنم کو پہلی بار کوئی ایسا ملا تھا، جسے وہ تسلی دے رہی تھی۔

تسلی دیتے ہوئے اُسے پہلی بار محسوس ہوا کہ اُس کے خود کے اندر جو مرتی ہوئی آس کی چنگاری ہے وہ ایک دم بھڑکی ہے اُس کے اندر روشنی آ گئی تھی۔ پہلی بار اُسے محسوس ہوا کہ یقین بانٹنے سے یقین بڑھتا ہے اُسی طرح جیسے مایوسی اور بے یقینی بانٹنے سے بے یقینی بڑھتی ہے۔ ترنم یہ جانتی تھی کہ جس آمرزش کی تلاش میں وہ تڑپ رہی ہے، یقین اُس کی پہلی سیڑھی ہے۔

انجانے میں ہی سہی وہ پہلی سیڑھی پر قدم رکھ چکی تھی۔

❖❖○❖❖

منزلیں بھی اُس کی تھیں
راستا بھی اُس کا تھا
ایک میں اکیلی تھی
قافلہ بھی اُس کا تھا

''وزیراں! یہ کون بیٹھا تھا میری کرسی پر؟'' وہ غصّے سے کھڑی کانپ رہی تھیں، سمعان اپنے کمرے سے باہر نکلتا نکلتا ٹھٹکا۔ وزیراں کھڑی کانپ رہی تھی۔

''وہ بی بی جی! میرے کوملوم نہیں میں تو کچن میں تھی۔'' وزیراں کی گھٹی گھٹی آواز سنائی دی۔

''کم آن ماما! پلیز ایزی ہو جائیں، زیادہ غصّے سے آپ کا بی پی بڑھ جائے گا۔'' سمعان نے ماں کو کام کرنے کی کوشش کی۔

''نہیں سمعان! اس کی جرأت کیسے ہوئی کہ کسی کو میری کرسی پر بیٹھنے کی اجازت دے۔'' زبیدہ بیگم کا وہم جانے کیسا تھا جو کوئی دور نہیں کر سکتا تھا۔ انہیں ہر وقت وہم ستاتا تھا کہ کوئی انہیں یا اُن کی چیزوں کو چھولے گا تو وہ ناپاک ہو جائیں گی۔

ماما پلیز کول ڈاؤن! آپ کی طبیعت بگڑ جائے گی۔ سمعان بھاگ کر کمرے سے اُن کی سفید چادر اُٹھا لایا اور اُسے کرسی پر بچھا دیا تا کہ وہ اُس پر بیٹھ سکیں پھر اُن کو وہاں پیار سے بیٹھا کر اپنے ہاتھ دھو کر پانی کا گلاس لایا اور ماں کو پانی پلایا۔ وہ سالوں سے اپنے باپ کو یہ کام بے حد صبر سے کرتا دیکھتا آ رہا تھا۔ قاسم علوی صاحب شاید اِس وقت گھر پر نہ تھے ورنہ تو زبیدہ بیگم کو کبھی غصّے میں آنے نہ دیتے۔

''ماما آپ ٹھیک ہیں ناں؟'' سمعان نے پریشانی سے پوچھا۔ زبیدہ بیگم کی رنگت بے حد پیلی پڑ رہی تھی۔

''ہاں میں ٹھیک ہوں!'' زبیدہ بیگم کو اپنی ہی آواز جھوٹی لگ رہی تھی۔

کتنے برس بیت گئے تھے۔ وہ اِس عذاب سے نکل نہ پائی تھیں، کبھی کبھی اُن کے دل میں خیال آتا تھا کہ اُن کی حالت جس وجہ سے ہے کیا اُس وجہ کی پکڑ کبھی خدا نہیں کرے گا اور جس گندگی سے اُن کا جسم اُن کی روح لتھڑ چکی تھی کیا کبھی اُن کو اِس سے نجات مل سکے گی؟

سمعان نے غور سے اپنی ماں کو دیکھا وہ ایک بار پھر اپنے آپ میں کھو چکی تھیں۔ اُس کی ماں اُسے ہمیشہ یوں ہی اگنور کر کے تنہا کر دیتی تھیں۔ بچپن سے ہی وہ اپنی ماں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ترستا رہا تھا لیکن جانے اُن کا رویّہ اُس کے ساتھ دھوپ چھاؤں جیسا کیوں تھا۔

کبھی کبھی وہ نگاہ بھر کر پیار سے اُسے دیکھتی تو وہ کھل اُٹھتا تھا لیکن جب جب وہ خود سے اُن کی جانب بڑھتا وہ ایک دم اجنبی بن جاتیں اُن کا رویہ اِس قدر اجنبی ہوتا، جیسے وہ اُن کا سگا بیٹا نہ ہو بلکہ کوئی دشمن ہو۔ ایسے میں سمعان کو وہ ہمیشہ اپنے سے میلوں دُور محسوس ہوتی تھیں۔

''ماما ایسی کیوں ہیں؟'' سمعان نے اپنے کندھے پر دباؤ محسوس کیا وہ پیچھے مُڑے بغیر جان گیا تھا کہ یہ اُس کے باپ کا شفقت بھرا لمس ہے۔ اُس نے بے اختیار سوال کیا تھا۔ یہ وہ سوال تھا، جو وہ بچپن سے باپ سے کرتا آیا تھا۔

''وہ جیسی بھی ہیں تمہاری ماں ہیں، تم اُن کے وجود کا حصّہ ہو، وہ کبھی بھی تم کو خود سے الگ نہیں کر سکتیں!'' قاسم علوی کا دِلاسا سمعان کو ہمیشہ کی طرح سہارا دے گیا تھا۔

''ڈیڈی پلیز! مجھے ایک بار پھر کہنے دیں کہ آپ دنیا کے سب سے اچھے باپ ہیں۔'' سمعان نے عقیدت سے باپ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ قاسم علوی کے چہرے پر بہت بے چین مسکراہٹ در آئی۔ انہوں

نے بے اختیار اپنا ہاتھ مسلا۔ آج سامنے کھڑے لڑکے نے انہیں دنیا کے سب سے اچھے باپ کا رتبہ دے دیا تھا۔ کیا وہ کبھی حقیقت جان کر بھی اِسی طرح اُن کا بنا رہے گا؟ یہ سوال اکثر اُن کے گرد اتنا شور کرتا کہ سمعان کا ہر اچھا تبصرہ اور محبت دینے لگتی تھی۔

اندیشے، وسوسے ایسی چیزیں ہیں جو ہر خوشی کی خوشبو اور ذائقہ اُڑا کر اُسے بے رنگ، بے ذائقہ کر کے رکھ دیتے ہیں۔

”ڈیڈی! آپ بھی ماما کی طرح کھو گئے ہیں۔ ارے بابا! کبھی اِس بیٹے کا خیال بھی رکھ لیا کریں کہ ایسے میں بے حد تنہا پڑ جاتا ہے۔“ سمعان نے محبت بھرا شکوہ کیا۔

”اچھا تمہارا آفس کیسا جا رہا ہے؟“ قاسم علوی نے سمعان کی توجہ بٹائی۔

”ایک دم فرسٹ کلاس اینڈ بورنگ!“ سمعان نے منہ بنا کر کہا۔

”ارے! وہ کیوں؟“ قاسم علوی نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ اِس لیے کہ آپ کے منیجر صاحب مجھے بچوں کی طرح Treat کرتے ہیں۔ ڈیڈی! میں باہر سے تعلیم حاصل کر کے آیا ہوں جب کسی کو اُس کی تعلیم مکمل ہونے کی ڈگری مل جاتی ہے تو اِس کا مطلب ہے کہ اب وہ بڑا ہو گیا ہے اور عملی زندگی میں خود سے فیصلے لے سکتا ہے۔ پلیز ڈیڈی مجھے ٹرینیز والے سلوک سے بچائیں، ورنہ خواجہ صاحب میرے ٹیلنٹ کو زنگ لگا دیں گے۔“ سمعان کو تو موقع ملا تھا کہ اپنے دل کی بھڑاس نکال سکے۔

”ارے تم تو اکتائے بیٹھے ہو، میں نے خواجہ صاحب کے حوالے اس لیے تمہیں کیا تھا کہ تم اُن کے تجربات سے کچھ سیکھ سکو۔ وہ ایجنسی کے پرانے ملازم اور بے حد قابل و محنتی انسان ہیں۔“ قاسم علوی نے اُسے پیار سے سمجھایا۔

”لیکن ڈیڈی وہ کون سا بھاگے جا رہے ہیں اُن سے دھیرے دھیرے جو سیکھنا ہوا میں سیکھ لوں گا لیکن ابھی میں خود سے کوئی پراجیکٹ ہینڈل کرنا چاہتا ہوں، مجھے اپنے آپ کو منوانے کے لیے موقع تو دیں۔“ سمعان نے ضد بھرا اصرار کیا۔

”او کے! اگر تم اِس طرح خوش ہو تو ہماری ایڈ ایجنسی کا اگلا کلائنٹ تم حاصل کرو گے اور اُس کا پروجیکٹ بھی خود ہینڈل کرو گے۔“ سمعان نے تو صرف پراجیکٹ بنانے کا کام مانگا تھا۔ ڈیڈی نے تو سب سے مشکل مرحلہ بھی اُس کے ذمے میں ڈال دیا یعنی کلائنٹ حاصل کرنا!

”او کے ڈیڈی! میں کرلوں گا۔“ سمعان نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ اس اوکھلی میں وہ خود سر دینے پر بضد تھا۔ تو اب ڈرنا کیسا؟

قاسم علوی نے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر بمشکل اپنی مسکراہٹ چھپائی، آخر وہ اُس کے باپ تھے!

❖❖○❖❖

جو اِس کے چہرے پہ رنگِ حیا ٹھہر جائے
تو سانس، وقت، سمندر، ہوا ٹھہر جائے

مسکرائے تو ہنس ہنس پڑیں کئی موسم
گنگنائے تو بادِ صبا ٹھہر جائے
میں اُس کی آنکھوں میں جھانکوں تو جیسے جم جاؤں
آنکھ جھپکے تو چاہوں ذرا ٹھہر جائے

طارق نہا کر باہر نکلا، سامنے بیڈ پر ایک خاکی کلر کا لفافہ پڑا ہوا تھا۔ طارق نے بے اختیار لفافے کی طرف ہاتھ بڑھایا لفافہ کھولتے ہی وہ مبہوت کھڑا رہ گیا۔ یہ نگینہ کا انلارج فوٹو تھا۔ سائرہ نے اُسے سیپیا (Sl...) کی Technique میں Develope کیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ سائرہ نے اپنی فوٹو گرافی کا ماہر اِس تصویر پر آزمایا ہو۔ نگینہ بے شک بہت خوب صورت لڑکی تھی لیکن اِس تصویر میں تو بالکل ...ہیں جا رہی تھی۔ وہ کسی اپسرا سے کم نہ لگ رہی تھی، سائرہ نے بہت ڈرامائی لائٹ میں یہ تصویر لی ...۔ نگینہ کی آنکھیں کسی کانچ کی طرح جگمگا رہی تھیں۔ ہونٹوں کے نیچے ننھا سا تل بے حد واضح تھا، ...ل کے چہرے پر بہت دلفریب مسکراہٹ تھی۔

”کیوں بھائی گفٹ کیسا لگا؟“ سائرہ نے شرارت سے پیچھے سے آ کر پوچھا۔

”یہ تم نے لی ہے! واقعی تم تو ماہر فوٹو گرافر ہو گئی ہو۔“ طارق نے سائرہ کی شرارت کو ٹالا، وہ اپنی بات ...تھا۔ ناممکن تھا کہ وہ اپنے دِل کی خبر کسی کو لگنے دیتا۔

”لالہ! اِٹس ناٹ فیئر! بہن سے آپ دِل کی بات چھپا رہے ہیں، میں نے تو آج تک کوئی راز آپ ...نہیں چھپایا لیکن آپ کبھی مجھے کچھ نہیں بتاتے۔“ سائرہ نے طارق کا منہ دیکھ کر منہ بنایا۔

”میری جان! جب کچھ ہوگا تو سب سے پہلے میں تم کو ہی بتاؤں گا۔“ طارق نے تصویر کو دھیرے ...لفافے میں ڈال کر بیڈ پر رکھ دیا اور اپنے بالوں میں برش کرنے لگا۔

”اچھا آپ یہ سب چھوڑیں بس میرے سوال کا جواب دیں۔“ سائرہ ایزی چیئر پر بیٹھ کر جھولنے لگی۔

”وہ کیا؟“ طارق نے آفٹر شیو ہاتھوں پر مل کر چہرے پر لگایا، کمرے میں بے حد دلفریب خوشبو پھیل ...گئی۔ وہ مخصوص برانڈ کے پرفیوم اور آفٹر شیو استعمال کرتا تھا۔

”یہ ہی کہ آپ کو نگینہ کیسی لگتی ہے؟“ سائرہ نے پوچھا۔

”لڑکی لگتی ہے!“ طارق نے اپنی شرٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے شرارت سے کہا۔

”لالہ میں پوچھ رہی ہوں کہ بحیثیت لڑکی وہ آپ کو کیسی لگتی ہے؟“ سائرہ نے تحمل سے پوچھا۔

”ظاہر ہے وہ ایک اچھی لڑکی ہے تو اچھی ہی لگتی ہے۔“ طارق نے اپنی مسکراہٹ دبا کر کہا۔

”کیا سب سے اچھی لگتی ہے؟“ سائرہ نے پرجوش ہو کر پوچھا۔

”ڈیئر سسٹر! مجھے اِس وقت نہایت اہم میٹنگ کے لیے نکلنا ہے، آپ اپنا کسوٹی کسوٹی کا پروگرام کچھ ...توی کر دیں۔“ طارق نے صاف بچتے ہوئے کہا اور کوٹ پکڑ کر باہر نکلنے کی تیاری کی۔

”لالہ! چکنے صابن کی طرح ہاتھوں سے پھسل پھسل کر بھاگتے ہیں۔ دال میں کچھ کالا ہے! آپ مانیں ...ں۔“ سائرہ نے بھائی کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔

”یہ دال کالی ہے یا پیلی! تم دِل لگا کر سوچو، پلیز مجھے جانے دو۔ میرے باس بڑے سخت ہیں خوامخواہ

نوکری ہاتھ سے جائے گی۔" طارق کو سائرہ سے جان چھڑانا مشکل ہوگیا تھا جتنا وہ اس بات کو راز رکھنا چاہتا تھا وہ اِسے کھولنے پر اصرار کررہی تھی۔

"لالہ! کوئی اتنا بھی پکا نہ ہو! مجھے اِس قدر شوق ہے کہ نگینہ میری بھابی بنے۔ لیکن آپ ہیں کہ کچھ بتاتے ہی نہیں۔" سائرہ نے زِچ ہوکر کہا۔

"یار میں بوڑھا ہوگیا ہوں یا پھر بدصورت ہوں جو تمہیں ماؤں کی طرح میری شادی کی فکر ستارہی ہے۔" طارق نے عجلت میں رُکتے ہوئے کہا۔

"لالہ پلیز بتایے ناں نگینہ آپ کو کیسی لگتی ہے؟" سائرہ نے اُس کا رستہ روک کر اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"زندگی لگتی ہے، دِل کی دھڑکن لگتی ہے!" طارق نے دل ہی دل میں کہا۔

"اچھی لگتی ہے! میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔" طارق کے چہرے پر نہ چاہتے ہوئے بھی بہت دلفریب مسکراہٹ در آئی تھی۔

"لالہ بہت زیادہ اچھی لگتی ہے ناں؟" سائرہ نے سرگوشی میں پوچھا۔

طارق کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ اُس نے سائرہ کی چھوٹی سی پونی کھینچتے ہوئے اُسے راستے سے ہٹایا۔ اللہ حافظ! شام کو ملاقات ہوگی۔ وہ کہتا ہوا رُکا نہیں۔

"سائرہ کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اللہ آپ کی ہنسی ہمیشہ قائم دائم رکھیں، آپ کی ہنسی اتنی جاندار یقیناً نگینہ کی وجہ سے ہے، میں جانتی ہوں۔" سائرہ نے یقین سے کہا۔

"لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ آپ کے دل کی خبر جانتی نہیں اور آپ دینے کو تیار نہیں ہیں۔ کیا بنے گا آپ دونوں کا؟ سائرہ وہیں ایزی چیئر پر بیٹھ گئی، کوئی نہ کوئی چکر تو چلانا ہوگا، ورنہ اتنی اچھی لڑکی ہاتھ سے نکل جائے گی۔" سائرہ گہری سوچ میں گم ہوگئی تھی۔

❖❖○❖❖

دیکھا اُسے تو آنکھ میں اُترے ہزار خواب
بکھرے ہوئے ہیں چاروں طرف بے شمار خواب
حرفِ یقین خاک کی صورت بکھر گیا
پھر دِل کو دے گیا ہے تیرا انتظار خواب
اِس وحشت وجنون کا کوئی نہیں علاج
پاگل یہ دِل جو دیکھتا ہے بار بار خواب

مسکان کا دِل کسی کام میں نہ لگ رہا تھا۔ جانے یہ کیسی تڑپ تھی، جو نہ کچھ کرنے دیتی تھی اور نہ سوچنے دیتی تھی۔ ولی کی چین ہاتھوں میں پکڑے وہ گم سم بیٹھی تھی جو مُسکان کی بے چینیوں کو عروج دے رہی تھی۔

"اگر تم مجھے نہ مِل سکے تو میں مرجاؤں گی۔" مُسکان نے بیڈ پر لیٹتے ہوئے خود سے کہا۔

"جانے تم میں ایسا کیا ہے، جو مجھے بے بس کرکے تمہاری طرف کھینچتا ہے، مجھے لگتا ہے کہ کوئی انہونی طاقت ہے جو مجھے تمہاری طرف دھکیلتی ہے۔ تم میری محبت کے ساتھ ساتھ میرا جنون کب بن گئے مجھے پتہ ہی نہ ہوسکی۔" مسکان نے چین کو لبوں سے یوں لگا کر بوسہ دیا جیسے وہ کوئی متبرک شے ہو۔ اندر آتی آپا اماں نے اُس کا جملہ سُنا تھا لیکن اُس کی یہ حرکت نہ دیکھ پائی تھیں۔

"مسکان!" اُن کی آواز برف کی طرح ٹھنڈی ٹھار تھی۔ مسکان کا دِل ایک دم خوفزدہ ہوگیا، وہ تو ہمیشہ نرم لہجے میں بات کرتی تھیں۔ آج اُن کے لہجے میں یہ سختی کیوں در آئی؟

"جی آپا اماں!" مسکان نے بے اختیار چین مٹھی میں دبا کر ہاتھ پیچھے کرلیا۔

"تم کچھ روز سے کیا سوچ رہی ہو اور تم میں کیا تبدیلی آئی ہے، میں اِس سے بے خبر نہیں ہوں۔ بے شک میں نے تمہیں جنم نہیں دیا لیکن میں نے تمہیں اتنی سی کو پالا ہے۔" انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔

"تمہاری ماں جنتی عورت تھی۔ اُس نے اپنے ہاتھوں سے تمہیں مجھے سونپا تھا، ایک شیر خوار بچی کو میرے حوالے کیا تھا۔ مجھ پر اُسے اعتبار تھا تو اُس نے یہ قدم اُٹھایا تھا میں اُس کا اعتبار اپنے مرتے دم نہیں توڑوں گی اور تمہیں کسی ایسی راہ پر چلنے کی اجازت نہ دوں گی، جس سے تمہیں تکلیف پہنچے، تمہیں اس راستے سے واپس مُڑنا ہوگا، یہ میرا حکم ہے۔" آپا اماں نے سختی سے کہا۔

"لیکن کیوں آپا اماں؟" مسکان تڑپ کر بولی۔

"اُس لیے کہ یہ اچھے خاصے انسان کو دیوانگی عطا کردیتا ہے پھر وہ نہ خود کا رہتا ہے اور نہ واپسی کا راستہ ملتا ہے!" آپا اماں کے لہجے میں زندہ غم بین کررہے تھے۔

"میں تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی کیوں کہ اس راستے میں صرف تکلیف کا ساتھ رہتا ہے!" آپا اماں نے اُس کی آنکھوں میں غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ میرا دُکھ یا تکلیف نہیں ہے، وہ تو میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے آپا اماں!" مسکان نے پرزور اصرار کیا۔

"جب زندگی کی سب سے بڑی خوشی مل نہ پائے تو وہ زندگی کا سب سے بڑا دُکھ اور روگ بن جاتی ہے۔" آپا اماں نے ٹھوس لہجے میں کہتے ہوئے اُسے ٹوکا۔

"کیوں؟ کیوں نہ مل پائے گی میری خوشی؟" مسکان نے غصے سے پوچھا۔

"اس لیے کہ تمہارے بابا سائیں ایسا ہونے نہیں دیں گے۔"

"کیوں وہ مجھ سے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی چھینیں گے جب کہ انہوں نے ہمیشہ میری چھوٹی چھوٹی خوشیوں تک کا بے حد خیال رکھا ہے۔" مسکان کے لہجے میں مان بول رہا تھا۔

"تمہیں اِس حقیقت کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ وہ تمہیں چاند سورج تو لاکر دے دیں گے لیکن اِس خوشی کو تمہاری زندگی میں داخل ہونے کی اجازت نہ دیں گے۔ اس لیے میرے بچے میں چاہتی ہوں کہ تم اِس راستے پر اتنا دور نہ نکلو کہ واپسی پر تمہاری جان کانٹوں میں اُلجھ کر رہ جائے۔"

آپا اماں نے پہلی بار ذرا نرمی سے کہا ورنہ وہ تو اس بات کو لے کر بے حد سختی سے مسکان کے ساتھ

پیش آئی تھیں۔

''آیا امّاں! اب بہت دیر ہو چکی، میں اِس راستے پر اتنی دُور نکل آئی ہوں کہ اُس کے بغیر میرا دم نکل جائے گا۔'' مسکان کی بات پر آیا امّاں کا دِل بے اختیار ڈوبا، انہیں لگتا تھا کہ یہ آواز بازگشت کی طرح واپس مُڑ کر ماضی سے حال میں آئی ہے۔

''کیا نام ہے اُس کا؟'' آیا امّاں کی آواز کسی کنویں سے سُنائی دی۔

''ولی! عبدالولی احمد شاہ!'' مسکان نے اپنے ناخنوں کو دیکھتے ہوئے دھیمے سے کہا۔

''آیا امّاں پہلے تو بے اختیار چونکی تھیں لیکن پورا نام سُن کر بے اختیار انہوں نے گہرا سانس لیا۔

''تمہارے ساتھ پڑھتا ہے؟'' انہوں نے غور سے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی!'' مسکان نے اِس بار بھی سر نہ اُٹھایا تھا۔

''کیا وہ بھی تمہیں اتنا ہی چاہتا ہے جتنا تم اُسے چاہتی ہو؟'' آیا امّاں کا سوال مسکان پر کسی کاری ضرب کی طرح لگا۔

''وہ... اُسے ابھی میرے دِل کی خبر نہیں ہے۔'' مسکان کا لہجہ کم زور سا تھا۔

''کیا؟'' آیا امّاں نے حیرانی سے اُسے دیکھا۔

''مُسکان یہ کیا پاگل پن ہے؟'' آیا امّاں نے اُسے باقاعدہ ڈانٹا۔

''آیا امّاں! وہ ایسا ہی ہے، بے حد بے خبر اور بے نیاز جانے کیوں اُسے اپنے اردگرد کی خبر نہیں ہوتی۔'' مسکان نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

''مُسکان! تمہاری اتنی شدّت اور دیوانگی دیکھ کر میں نے یہ رسک لینے کا سوچا تھا کہ میں تم سے کہہ کر لڑکے کو گھر بلوا کر بات کر لیتی ہوں۔ اُن کا گھرانہ دیکھ لیتی ہوں تاکہ تمہارے بابا تک بات پہنچنے سے پہلے میں اُن کو کسی طور پر راضی کر سکوں۔ لیکن تم یہ کیا بتا رہی ہو؟ یہ تو سراسر حماقت ہے۔'' آیا امّاں نے اُسے ڈانٹا۔

''آیا امّاں! پلیز میرا ساتھ دیں، ورنہ میں مر جاؤں گی۔ اُس کی بے نیازی مجھے بابا سائیں کے کسی فیصلے سے پہلے مار دے گی۔''

''مسکان بیٹا پاگل نہ بنو، اگر وہ تمہیں پسند نہ کرتا ہو تو تم زبردستی کیسے اُس کی زندگی میں شامل ہو جاؤ گی؟'' آیا امّاں نے اِس بار اُسے سمجھایا۔

''لیکن پھر اُسے کس نے حق دیا تھا کہ میری زندگی میں زبردستی داخل ہو کر میری اچھی خاصی زندگی کو ڈسٹرب کر دے۔'' مسکان نے بچوں کی طرح ضد کی۔

''آیا امّاں اگر وہ مجھے نہ ملا تو کچھ نہ بچے گا۔'' مسکان کے لہجے کا جنون آیا امّاں کو چونکا گیا۔

مسکان دیوانگی کی جس حد پر جا کھڑی ہوئی تھی۔ اِس سے وہ بے خبر تھیں۔

''تو پھر اُسے کیسے تمہاری شدّت کی خبر ہوگی؟'' آیا امّاں نے تھکے تھکے لہجے میں پوچھا۔

''مجھے یقین ہے اپنی پاکیزہ محبت پر اور اِس کی شدت پر، وہ ایک نہ ایک دِن ضرور میرے جذبوں کو جان لے گا۔'' مسکان کی بات پر آیا امّاں کا دِل سر پیٹنے کو کر رہا تھا۔

سکان کی خود ساختہ سوچیں اور خوش گمانیاں اگر سچ ثابت نہ ہوئیں تو۔!

مسکان کا کیا ہوگا؟ یہ ایسا سوال تھا، جس پر اُن کا دِل کسی گہری کھائی میں ڈوبنے لگا تھا۔

❖❖○❖❖

ہوٹل کا بہت بڑا سوئیٹ تھا۔ ماہ رُخ کے ہاتھ پُھرتی سے کام کر رہے تھے۔ میڈم راگنی نے اُسے ں کے جس بندے کے پاس بھیجا تھا، وہ ماہ رخ کے ساتھ عیش کر کے اب شراب کے نشے میں دھ پڑا تھا۔

راغ کا اپنا اُصول تھا کہ وہ پلاتی تھی اور خود بہت کم، صرف ساتھ دینے کو پیتی تھی اور کبھی بھی نشے اٹ نہ ہوتی تھی۔ ماہ رخ نے پرس سے زپ ڈرائیو نکالی اور اُس کے لیپ ٹاپ سے لگادی۔ پاس واس سے نشے کی حالت میں پوچھ چکی تھی، اُس نے اپنے پاس موجود زپ ڈرائیو میں لیپ ٹاپ ود نہایت اہم اور سیکرٹ فائل کاپی کر لی تھی۔ ماہ رُخ نے نہایت اطمینان سے اپنا کام ختم کیا اور بائل پر کسی کو مِس کال دی۔ باہر دروازے پر ہلکی سی ناک ہوئی، ماہ رُخ نہایت اطمینان سے چلتی دروازے تک گئی اور دروازہ کھول دیا۔

ام سروس میڈم!'' بیرے نے اُسے چمکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ں یہاں رکھ دو۔'' ماہ رُخ نے اُسے کافی سائیڈ پر رکھنے کو کہا، بیرے نے پھرتی سے ٹرالی گھسیٹی ل کی چھوٹی سی چمکیلی طشتری میز پر رکھ دی۔

ے میڈم! ہیوا نائس ڈے!'' اُس نے جھک کر کہا۔ یہ بیروں کا خاص انداز ہوتا تھا ٹِپ کی ارنے کا۔

لو۔!'' ماہ رُخ نے پانچ سو روپے کے نوٹ کو گول کر رکھا تھا، وہ اُسے دیتے ہوئے مسکرائی۔

تھنکس میڈم!'' بیرے نے بہت احتیاط سے نوٹ پکڑ لیا، اُس میں زِپ ڈرائیو موجود تھی۔

ارخ جب یہاں پہنچائی گئی تھی تو اُس کی اچھی خاصی تلاشی ہوئی تھی اور جب اُس نے یہاں سے نا تھا تو بھی اِسی مرحلے سے گزرنا تھا۔ میڈم راگنی کے ہاتھ بے حد لمبے تھے۔ اُس نے روم کے تھرو پہلے ماہ رخ تک زپ ڈرائیو پہنچوائی پھر منگوا بھی لی تھی۔ یوں نہایت صفائی سے وہ بہت لے اُڑی تھی۔ وہ یہ کام اِس قدر ہوم ورک اور پلاننگ کے ساتھ کرواتی تھی کہ دُوسرا آدمی ہاتھ ملتا رہ جاتا تھا۔

م راگنی بے حد خطرناک عورت تھی۔ وہ بڑے بڑے افسروں کو اپنی لڑکیوں کے ذریعے کاٹھ کا اُلّو تی۔

عزیز کے اِس قدر اہم راز دُشمنوں کے ہاتھ لگتے جا رہے تھے اور حکومت کے آدمی بے حد تھے کہ آخر غداری کون کر رہا ہے، کئی افسروں کو معطل بھی کیا گیا، انکوائریز بھی کی گئیں لیکن! زم یا مجرم سامنے نہیں آ رہا تھا۔

کار ننگ آ کر یہ کیس خفیہ کے حوالے کر دیے گئے تھے۔ اس معاملے میں نہایت احتیاط برتی گئی یک آدھ شخص کے علاوہ کوئی نہ جانتا تھا کہ اِن کیسز کو کون ہینڈل کر رہا ہے۔

طارق کے ڈائریکٹر صاحب نے جب یہ کام طارق کو سونپا تو اُنہوں نے اُسے خود سے ٹیم بنا
اور اُس ٹیم کے ارکان کے متعلق فائلز بے حد سیکرٹ تھیں۔ فی الحال ادارے میں کوئی نہ جانتا تھا
کے ارکان میں کون کون شامل ہے ماسوائے طارق اور ڈائریکٹر کے۔ طارق جوں جوں کیس کی
کررہا تھا۔ بڑے بڑے نام سامنے آرہے تھے۔ طارق نے مختلف لوگوں میں اُلجھنے کے بجائے بڑا
تک پہنچنے کا ارادہ کیا تھا۔ میڈم چاندنی تک پہنچنے کے بعد اُسے اندازہ ہوا کہ اتنے بڑے سسٹم کو
کے باوجود وہ اِس سارے سسٹم میں ایک نہایت معمولی کارندہ تھی۔ اُس کے اُوپر بھی بگ باس
جانے اِن بگ باسز کا بگ باس کون تھا، جو انہیں اِس ملک کی معاشرتی، ثقافتی اور مذہبی جڑیں کا
ٹاسک دیتا تھا۔

یہ کام بے حد ہوشیاری سے ہورہا تھا اور انداز سلو پوائزننگ کا سا تھا۔ اب جب کہ بات بے حد
لگی تھی تو اعلیٰ ترین سطح کے ذمّے دار اور حساس لوگوں کو فکر ستانے لگی تھی۔ اس طرح بہت سارے بڑا
باخبر کیے بغیر اس آپریشن کا حکم دیا گیا تھا۔

❖❖○❖❖

''واہ! کیا عیش ہیں، کدھر کی تیاریاں ہیں؟'' منزہ نے کاشف کو نک سک سے تیار دیکھ کر پوچھا۔
کاشف نے نہایت فراخ دِلی اور بے رحمی سے خود پر پرفیوم چھڑکتے ہوئے اپنے پیچھے کھڑی ا
دیکھا۔

''ایک اسپیشل ڈنر ہے!'' کاشف کی مسکراہٹ نہایت معنی خیز تھی۔ وہ بے حد وجاہت کا مالک تھ
اپنی اس خوب صورتی کو ٹھیک ٹھاک کیش کروا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کی معصومیت اور خوب صو
لڑکیاں مرتی ہیں اور اُس کے نزدیک تتلیوں کی طرح چلی آتی ہیں۔ لیکن وہ خوش رنگ پھول تو تھ
مگر اُس میں رس نہ تھا۔ وہ اِن لڑکیوں کا صرف استعمال کرتا، کچھ وقت دِل لگی کرتا اور پھر اپنا دامن ا
کر اُن سے جان چھڑا لیتا تھا۔

''اوہ! کون ہے وہ خوش نصیب؟'' منزہ نے دل چسپی سے پوچھا، علیزے کی طرح اُسے کاشف
سرگرمیوں پر کوئی اعتراض نہ ہوتا تھا بلکہ جس طرح وہ خود ہر وقت زندگی میں کسی نہ کسی شارٹ کر
تلاش میں رہتی تھی، اُسے کاشف کا بھی یوں کرنا جائز لگتا تھا۔ وہ اکثر اپنے نظریات کا اظہار با آوا
کرتی نظر آتی تھی۔

جو زندگی ہمارے پاس ہے ہم اس سے بہت کہیں زیادہ کے حق دار ہیں۔ یہ ان کا خیال تھا م
زندگی اُن کے لائق نہیں ہے اِس لیے انہیں ہر وہ راستا اختیار کرنا چاہیے، جس سے وہ جلد از جلد
خوشیوں تک پہنچ سکیں۔

منزہ اور کاشف نے کبھی نہ سوچا تھا کہ زندگی کسی کے لائق نہیں بنتی بلکہ خود کو اُس کے لائق بنا
ہے۔ لیکن وہ دونوں ہی اس بات کو نہ مانتے تھے۔

''ہے ایک امیرزادی! شکل وصورت تو بالکل واجبی سی ہے لیکن محترمہ کا دِل بے حد کھلا ہے۔ پیسہ
کرنے میں بے حد فراخ دِل ہے، کل اُس نے مجھے لبرٹی سے مہنگے ترین یہ شرٹ پینٹ خرید کر گفٹ

ا آج ویلیج میں ڈنر دے رہی ہے۔'' کاشف نے پُر جوش لہجے میں بتایا۔
الی احمق ہے میلے میں بیٹھ کر رومانس کرے گی۔'' منزہ نے نیل فائلر سے اپنے ناخن فائل کرتے
کہا۔
ا میں تو سُنا ہے کھانے پینے والوں کا بے حد رش ہوتا ہے، پی سی وغیرہ میں اچھا سا ماحول تو مِل
دو گھڑی میٹھی باتیں کرنے کو۔'' منزہ کو واقعی اُس لڑکی کی حماقت پر ہنسی آرہی تھی۔
یار! میٹھی باتیں صرف اِن لڑکیوں کا گزرا نہیں ہے آج کی لڑکی عملی محبت کا اظہار زیادہ پسند کرتی
'' کاشف نے آنکھ دبا کر خباثت سے کہا۔ اِس کے لیے پرویز میرے دوست کا فلیٹ زندہ باد،
یار ہے، اپنے تو ہر معاملے وہ خوب کام آتا ہے۔
اُف کی باتوں اور لہجے سے ذرا بھر بھی نہ لگ رہا تھا کہ اُس میں اتنی بھی غیرت اور سوچ ہے کہ وہ
طرح کی گفتگو اپنی بہن سے کررہا ہے۔
میرے بھائی کے کریڈٹ پر ایسی کتنی لڑکیاں ہیں؟'' منزہ نے نیل پالش لگانے کے لیے پیروں
اں میں چھوٹے چھوٹے ٹشو پیپر کے ٹکڑے رکھتے ہوئے پوچھا۔
ا لڑکیوں کی بھی بہت ساری قسمیں ہوتی ہیں، کچھ ذرا پہلے کھل جاتی ہیں اور کچھ بعد میں۔ بے
ا نخرہ کریں لیکن سالیاں ساری کی ساری ہاتھ لگاتے پگھل کر جھولی میں گر آتی ہیں۔ یہ تو میرے
ل بلندی ہے کہ میں ہی احتیاط کرلیتا ہوں ورنہ وہ تو شادی سے پہلے ہی صرف شادی کے نام پر
ل کی طرح آن گرتی ہیں۔'' کاشف نے نہایت سفا کی سے کمینٹس پاس کیے، اندر آتی علیزے
ے پر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔
ا کی ڈھکی چھپی سرگرمیوں سے وہ کچھ باخبر تو تھی لیکن بھائی کے نظریات اور اعمال اس قدر گرے
ہوں گے، اس کا اُسے اندازہ نہ تھا۔ اُس پر وہ یہ ساری گفتگو بے حد بے خوفی اور بے باکی سے
نا رہا تھا۔
ر یہ والی لڑکی کس قسم سے تعلق رکھتی ہے؟'' منزہ نے قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے پوچھا۔
بھی چپکو قسم کی ہے، جلدی جان نہیں چھوڑے گی لیکن اِس میں سب سے بڑی خوبی ہے کہ دبا کر
کرتی ہے اور ماتھے پر بالکل بل نہیں ڈالتی۔'' کاشف نے اپنے نزدیک اُس کی خوبی گنوائی۔
پھر کیا برائی ہے اگر وہ تمہاری زندگی میں شامل ہوجائے، امیر ہے تو یقیناً تمہارے لیے اور
کیریئر کے لیے کچھ کرے گی۔'' کاشف کا اگلا کمینٹ اُس سے بھی خطرناک تھا۔
ے سے اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہنا مشکل ہوگیا تھا۔
ہاں میں اور کہاں وہ سونیا رحمانی عام سی شکل کی لڑکی! ارے میں تو اُس سے شادی کروں گا جو امیر
بنک بیلنس میں بھی اور حُسن میں بھی۔ ارے اپنی نسل میں پیوند تھوڑی لگانا ہے، میرے بچے میری
ب صورت اور حسین وجمیل ہوں گے۔'' کاشف کے لہجے میں اُس حسن و جوانی کا غرور بول رہا
ب سے ناپائیدار شے تھی۔
بھائی! اُن بچوں کی آپ کو فکر ہے جن کا دُنیا میں نام ونشان نہیں ہے۔ واقعی آپ بڑی دور تک

سوچتے ہیں لیکن کبھی آپ نے اپنے اِن اعمالوں کے متعلق سوچا جو چھوٹے چھوٹے ہوتے کتنے بڑے ہوگئے ہیں کہ آپ ایک بُرے انسان بن کر رہ گئے ہیں۔'' علیزے غصّے سے کانپتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

''شرم سے سر جھک کر رہ گیا ہے کہ میرا بھائی اس قدر گری ہوئی سوچ کا مالک ہے!'' علیزے کی آواز جذبات میں رندھ گئی تھی۔ خود پر قابو پانے کے لیے وہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔

''لو آ گئی ملانی بی بی!'' منزہ نے یوں مُنہ بنایا، جیسے کوئی بے حد کڑوی گولی منہ میں آ گئی ہو، علیزے کی سچی باتیں واقعی اُسے کڑوی گولی کی مانند لگا کرتی تھیں جنہیں نگلنا بے حد دُشوار تھا۔

''علیزے! میں نے کبھی تمہارے کسی معاملے میں ٹانگ نہیں اڑائی، اس لیے میں تمہیں کبھی اجازت نہ دوں گا کہ تم میرے متعلق اس طرح یوں باتیں کرو۔'' کاشف نے تقریباً دھاڑتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر پہلے ہنس ہنس کر باتیں کرنے والا کاشف ایک دم غائب ہوگیا تھا، کاشف کا اصل روپ بدصورت روّیہ ہی تھا۔ علیزے کا دل اُس کے دھاڑنے پر سہم سا گیا۔

''کیا ہوگیا ہے، کیوں یوں چلا رہے ہو؟'' حسن آرا بیگم کاشف کی اونچی آواز سُن کر گھبرا کر بھاگی اندر آئی۔

''کچھ نہیں امی! یہ آپ کی بیٹی خوامخواہ میری ماں بننے کی کوشش کر رہی ہے، جب آپ نے آج تک مجھے کسی بات کے لیے روکا ٹوکا نہیں تو پھر یہ کون ہے جو میرے معاملات میں بولے۔'' کاشف اب تک صرف اپنے لیے اچھا ہی اچھا سُنا تھا۔ حقیقتاً اُسے علیزے کا یوں بُرا بھلا کہنا بے حد بُرا لگا تھا۔

''کاش میں تم سے اتنی محبت نہ کرتی کہ تم کو کسی بُرے کام میں مبتلا دیکھ کر بھی چُپ رہتی۔ بچے! بے شک میں گھر سے کبھی باہر نہیں نکلی لیکن اپنی اولاد کے رنگ تو سب سے پہلے ماں کو ہی نظر آتے ہیں، اولاد کس رنگ میں رنگی جا رہی ہے ماں اُس سے کبھی بے خبر نہیں ہوتی میں تم پر سختی نہ کرسکی تو اس میں تمہارے باپ کے نظریات حائل تھے ورنہ سب سے پہلے تمہیں پکڑنے والی میں ہوتی۔'' حسن آرا جانے کب کی بھڑاس باہر نکال رہی تھیں۔

کاشف نے ہاتھ میں پکڑا پرفیوم زور سے دیوار پر دے مارا، پرفیوم کرچی کرچی ہوگیا کمرہ تیز خوشبو سے بھر گیا۔ پانچ ہزار کا یہ پرفیوم سونیا نے اُسے کچھ دن پہلے گفٹ کیا تھا۔ مالِ مفت دِلِ بے رحم! کاشف کو اِس کی قدر کہاں سے ہوسکتی تھی۔ اُس نے تو اپنا سارا غصّہ اِس پر نکال دیا تھا۔ سارا موڈ خراب کر کے رکھ دیا ہے!

''اِس گھر میں تو دو گھڑی کوئی چین و سکون سے نہیں گزار سکتا، امی پہلے تو آپ بھی ایسی نہ تھیں، علیزے کی بچی نے آپ کو میرے خلاف پٹیاں پڑھائی ہیں اس کو تو میں بعد میں دیکھوں گا۔'' وہ علیزے کو خونخوار نگاہوں سے گھورتا باہر نکل گیا۔ علیزے کا دل بے حد تیز خوشبو سے متلانے لگا تھا، اُسے کبھی بھی پسند نہ کرتا تھا۔ وہ اُس کے متعلق ہمیشہ سچ بولتی تھی جو اُسے بے حد بُرا لگتا تھا۔ منزہ کی طرح نہ وہ اُس کی غلط باتوں پر خوش ہوتی تھی اور نہ ہی چھوٹی کی طرح بھائی کی مہنگی مہنگی چیزوں پر خوش ہوتی تھی۔ اس لیے کاشف کو وہ ہمیشہ ناپسند رہی تھی۔

''مجھے ایک گلاس پانی کا پلواؤ علیزے!'' حسن آرا بیگم کی نقاہت بھری آواز نے دونوں بہنوں کو چونکا دیا تھا۔

''امی طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟'' علیزے بے حد گھبرا گئی تھی، منزہ دوڑ کر پانی لے آئی۔

''اُس کے پاس وہ کیا کہتے ہیں بغیر تار والا جو فون ہے اُس پر اُسے فون کرو، غصّے سے گھر سے باہر گیا ہے کہیں کچھ اُلٹا سیدھا نہ کر لے۔'' کاشف اُن کی پہلی اولاد تھی اور اُن کو بے حد عزیز تھی اُس کی ذرا سی ناراضی اُن کی جان کھینچ لیتی تھی۔

''امی جان! اگر آپ اپنی چہیتی بیٹی کو ایک بار ٹھیک سے سمجھا دیں کہ وہ یوں کاشف سے نہ اُلجھا کرے تو نہ وہ اِس طرح غصّے سے گھر سے نکلے گا اور نہ آپ کی طبیعت اُس کے لیے پریشان ہوگی۔'' منزہ دھپ دھپ پاؤں مارتی باہر نکل گئی، علیزے شرمندگی سے قصور وار سر جھکا کر کھڑی تھی۔ حسن آرا بیگم ہاتھ میں پانی کا گلاس لیے بے بسی سے منزہ کو جاتا دیکھتی رہ گئیں۔

''یہ... یہ میری اولاد اِس قدر باغی ہوگئی ہے کہ وہ کچھ سننے کو تیار ہی نہیں!'' حسن آرا بیگم نے دُکھ سے کہا۔

''آئی ایم سوری امی! اِس سارے معاملے میں میرا ہی قصور ہے۔'' علیزے کو ماں کے بلڈ پریشر کی فکر لاحق تھی۔ اُس نے جلدی سے معافی مانگی۔

حسن آرا بیگم نے اُس کی جانب غور سے دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھری۔

''تمہیں دیکھ کر مجھے توانائی ملتی ہے کہ میں بالکل ناکام ماں نہیں ہوں، تم واقعی میری سب سے اچھی بیٹی ہو۔'' حسن آرا کا اقرار علیزے کی روح تک کو ٹھنڈا کر گیا۔

❖❖○❖❖

''ارے، ارے ٹھہر جاؤ، کدھر بھاگے جا رہے ہو۔'' رانی کے ہاتھوں سے چھوٹا سا میمنا چھوٹ کر آگے جا رہا تھا۔ رانی، جو بڑے سکون سے اُسے اٹھائے ماسی صابراں کے گھر سے لا رہی تھی۔ اِس پگڈنڈی پر چڑھتے ہی وہ بُری طرح بدک گیا اور اُس کی گود سے نکل کر بھاگنے لگا۔

کم بخت تیری ٹانگیں کمزور ہیں اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھے گا۔ رانی نے اُسے پکڑنے کی کوشش میں چلاتے ہوئے کہا۔

کتنے دن سے وہ انتظار میں تھی کہ کب ماسی صابراں کی بکری بچے دے اور وہ ماسی صابراں کو اُن کا وعدہ یاد دلائے کہ ایک چھوٹا سا میمنا اُسے بھی دے۔ چار پانچ روز پہلے نفیسہ نے پیغام بھجوایا تھا کہ آ کر اپنی امانت لے جاؤ۔ اور آج میرو اُسے نفیسہ کے ہاں چھوڑ کر آگے کھیتوں پر نکل گیا تھا۔ واپس جانا تو اُسے شام کو تھا میرو کے ساتھ لیکن میمنے کو دیکھتے ہی اُس کا دِل فوراً گھر جا کر ماں کو دکھانے کو کیا۔ ماسی صابراں سے بہت مشکل سے اجازت لے کر وہ واپس آئی تھی۔ وہ اُسے اکیلے بھیجنے پر تیار نہ تھیں۔

''کوئی بات نہیں ماسی بیس منٹ کا تو سارا فاصلہ ہے۔'' رانی میمنے کو فوراً گھر لے جانا چاہتی تھی۔

''لیکن میرو کہیں بُرا نہ منائے۔'' ماسی ہچکچائی۔

''پہلے کیا میں کبھی اکیلے گھر نہیں گئی؟'' رانی نے ٹھنک کر پوچھا۔

''پہلے کی بات اور تھی، پہلے تو چھوٹی تھی اب تُو اور نفیسہ بڑی ہوگئی ہو، یوں لمبے راستوں میں اکیلے جانا اچھی بات نہیں۔'' ماسی نے اُسے سمجھایا۔

''پیاری ماسی جانے دو۔'' رانی کی ضد پر انہیں اُسے اجازت دینی ہی پڑی۔

اب میمنا اُس کے ہاتھ سے نکل کر بھاگا تو وہ تیزی سے اُس کے پیچھے بھاگی، بھاگتے ہوئے اُس کا سر سے دوپٹہ پھسل گیا تھا۔ گندمی رنگت میں سرخی آ گئی تھی اچانک ہی اُسے رکنا پڑا، سامنے جیپ آ کر رکی تھی۔ رانی کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔

یہ جیپ سید سرفراز کی تھی اور اُسے سید سرفراز سے بے حد ڈر لگتا تھا۔ سید سرفراز نے اُس کے بھرے بھرے وجود کو بے حد معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ رانی کا ہاتھ بے اختیار اپنے دوپٹے کی طرف گیا اُس نے جلدی سے اپنا سینہ ڈھانپا اور گھبراہٹ میں دوبارہ واپسی کے راستے پر مڑ گئی۔

''کون ہے یہ منشی؟'' سید سرفرار کی سرسراتی آواز پر منشی چونکا۔

''وہ سائیں! میرو کی بہن ہے۔'' منشی نے جھٹ اطلاع دی۔

''میرو کی بہن!'' سید سرفراز کی نگاہوں میں ابھی تک رانی کا بھرا بھرا جسم اور ہونٹوں پر لرزتا نمایاں تل گھوم رہا تھا۔

''منشی! میرو کی طرف تو اپنا خاصا حساب نکلتا ہے ناں!'' سید سرفرار نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''جی سائیں! وہ تو بڑے سائیں عبداللہ نے ادا کر دیا تھا۔'' منشی کو رانی کی معصومیت اور جوانی سے ہمدردی ہوئی تھی، اِس لیے وہ سید سرفراز کی توجہ بٹانا چاہتا تھا۔

''منشی اُس کی اس حرکت کا ہی تو حساب نکلتا ہے۔'' سید سرفراز نے غصّے سے کہا۔

''جی، جی سائیں!'' منشی نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی۔ اُس کی جرأت نہ تھی کہ وہ کبھی سید سرفراز کی کسی بات سے اختلاف کرے۔

''تو پھر منشی مجھے اپنا قرض واپسی چاہیے اور ''پہلے سود چاہیے!'' پھر ہی میرو کی عقل ٹھکانے لگے گی ورنہ اِس طرح کے باغیوں سے ہمارے لیے روز نئے مسائل کھڑے ہوں گے۔

''منشی اب یہ تمہاری ڈیوٹی ہے کہ کب تم سود جلد سے جلد لے کر آتے ہو۔'' سید سرفراز کا کام منشی کو خاصا بھاری پڑ گیا تھا۔ جب سے اُس کے ہاں اپنی بیٹی پیدا ہوئی تھی، وہ سید سرفراز کے اِن کاموں سے گھبرانے لگا تھا۔

''جی سائیں جو آپ کا حکم!'' منشی کی آواز خاصی کمزور تھی۔

❖❖○❖❖

''ارے کیا ہوا؟ ابھی تو کچھ دیر پہلے تم گئی تھی اور اب!'' نفیسہ کا جملہ اُس کے منہ میں ہی رہ گیا۔ رانی کی اُڑی اُڑی رنگت اور چڑھا ہوا سانس اُسے پریشان کر گیا۔

''نی اُڑیے بھول تجھے کیا ہوا؟'' نفیسہ نے گھبرا کر اُسے ہلا کر پوچھا۔

''پانی!'' رانی کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اُس سے بولنا دُشوار ہو رہا تھا۔ نفیسہ دوڑ کر پانی کا برتن پکڑ لائی، ...انی نے نہایت بے صبری سے سارے کٹورے کا پانی پی لیا۔

''اب بول بھی چکو کیا ہوا تیرے ساتھ جو یوں بے حال ہو رہی ہے۔'' نفیسہ نے اندر کمرے کی جانب ...ا کہیں اماں سوتے میں نہ اُٹھ آئیں۔

''وہ میمنا بھاگ گیا تھا تو۔'' رانی کی سانس اب تک پھولی ہوئی تھی۔

''کیا ایک میمنے کے بھاگنے سے تم اتنا ڈر گئی ہو؟'' نفیسہ نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں! وہ راستے میں سید سرفراز کی گاڑی سے ٹکرا گئی تھی۔ قسم سے نفیسہ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں ...مجھے یوں گھور رہا تھا، جیسے کھا ہی جائے گا۔'' رانی نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

رانی کا ڈر جانا، سہم جانا بالکل جائز تھا۔ سید سرفراز کی سرگرمیاں ڈھکے چھپے انداز میں سب ہی جانتے ...لیکن کسی کی اتنی ہمت نہ ہوتی تھی کہ جا کر اُس کا ہاتھ یا گریبان پکڑ سکے۔

''تجھے کہا بھی تھا کہ میرو کا انتظار کر لے لیکن تیرے سر پر جب کوئی بات سوار ہوتی ہے تو تُو کب کسی ...ملتی ہے، سونے پہ سہاگہ تجھے ہی وہ ''بلا'' ٹکرانی تھی۔'' نفیسہ نے پریشانی سے کہا۔

''اب کیا ہوگا نفیسہ؟'' رانی نے معصومیت سے پوچھا۔

''اب کیا ہونا ہے، کچھ بھی نہیں ہوگا۔ شکر ہے تو بچ کر نکل آئی، آئندہ احتیاط کرنا کہ اکیلے باہر نہ ...۔ تجھے موچی مشتاق کی بیٹی زرینہ تو یاد ہوگی کیسی اُونچی لمبی جوان تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ کمیوں کی بیٹی ...اور خالی سوکھی روٹیوں سے اتنی جوان نکلی تھی۔ نہ دُودھ نہ مکھن جیسی نعمتیں تھیں لیکن پھر بھی کیسے سرخ و ...تھی۔ اِن شاہوں کی حویلی میں کام کرنے جاتی تھی۔ سُننے میں آیا کہ شہر سے سید سرفراز کے دوست ...کے لیے آئے تھے۔ اُنہوں نے مرغابی شکار کیا کرنی تھی اُس معصوم کا شکار کر ڈالا۔ تین دن بعد ...یں سے اُس کی لاش ملی تھی۔ موچی مشتاق کی جرأت نہ تھی کہ وہ سید سرفراز کا نام کھل کر تھانے والوں ...سامنے لے سکتا۔ بیچارا بیٹی کے غم میں تین ماہ بعد ہی اِس دنیا سے چلا گیا۔ پیچھے سے سید سرفراز نے ...ں کے اٹھارہ انیس سال کے چھوکرے کو اچھی تنخواہ پر اپنا ملازم رکھ لیا۔ لو جی کہانی ختم!

اب وہ کیسے اُس کے خلاف کچھ بول سکتے ہیں بلکہ احسان مند رہتے ہیں کہ باپ کے مرنے کے بعد ...راز صاحب نے سر پر ہاتھ رکھا تو اُن کی حالت بدل گئی۔'' نفیسہ کے اندر اِس شخص کے لیے بے انتہا ...ت تھی۔ نفیسہ کے ہاتھ میں ہوتا تو اِس شخص کو کڑی سے کڑی سزا دلواتی۔

رانی کا چہرہ گھبرایا دیکھ کر نفیسہ نے ایک دم گفتگو کا رُخ موڑ دیا، چل مٹی ڈال اُس کم بخت پر۔ بھول جا ...ب کچھ اور کسی کو کچھ کہنے بتانے کی ضرورت نہیں، اب تُو مجھے بتا کہ تجھے اگر میں ایک اور میمنا دے ...ں تو خوش ہو جائے گی۔'' نفیسہ نے رانی کا موڈ ٹھیک کرنے اور اُس کا دھیان بٹانے کے لیے اُس کا ...ا پسند موضوع چھیڑا۔

''دینا ہے تو وہ ہلکے بھورے رنگ کی دھاری والا دے دے جو تُو قبضہ کر کے بیٹھی ہے۔'' رانی نے ...ہ کے پسند کیے ہوئے میمنے کا ذکر کیا۔

''اچھا چل تُو لے لے، میری اُس پر پہلے سے نیت تھی۔'' نفیسہ نے فراخ دلی سے کہا اور دِل ہی دِل

میں شکر کیا کہ سہیلی کا دھیان واقعی بٹ گیا تھا۔ لیکن جانے کیوں خود نفیسہ کا دِل کسی انہونی کے ہونے سے ڈر رہا تھا۔ وہ اپنی اس کیفیت کو خود سے بھی چھپا رہی تھی۔

❖❖○❖❖

''مبارک ہو بیٹے کی منگنی!'' ریحانہ بی بی نے بظاہر خوش ہو کر زلیخا بی بی کو بیٹے کی منگنی کی مبارک دی لیکن اندر اُس کے حسد سے آگ لگی ہوئی تھی۔

''خیر مبارک! خیر سے تمہیں بھی مبارک ہو، آخر وہ تمہارا بھی تو بڑا بیٹا ہے۔'' زلیخا بی بی اِس وقت اس قدر خوش تھیں کہ ریحانہ بیگم کی آنکھوں میں موجود حسد و جلن کو دیکھ ہی نہ پائیں۔

''ہاں کیوں نہیں!'' ریحانہ بیگم نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

ویسے صداقت بھائی کو اچانک سید نواز ش علی نے یوں کیسے معاف کر دیا۔'' ریحانہ بیگم کو ابھی تک عبداللہ اور عائشہ کی بات ٹھہرنا ہضم نہ ہو رہا تھا۔ بے حد خوب صورت اور زمین والی لڑکی اُن کی بے خبری کی بنا پر آج اُن کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔

سید عبداللہ کی زمینوں میں مزید اضافہ اُسے مزید طاقتور بنانے والا تھا اور یہ ریحانہ بیگم اور سید سرفراز کو ہرگز منظور نہ تھا اس لیے اس رشتے کا سب سے زیادہ دُکھ انہیں ہوا تھا۔ جس طرح کی بہو کے خواب انہوں نے اپنے بیٹے سرفراز کے لیے دیکھے تھے۔ وہ لڑکی زلیخا بی بی کو بغیر کسی محنت کے مل گئی تھی۔

''اب تم بیٹیوں کے رشتے بھی دیکھو اُن کا بھی حق ہے کہ وہ بھی اچھی زندگی گزاریں۔'' ریحانہ بیگم نے وہ موضوع چھیڑ دیا جو زلیخا بی بی کی دُکھتی ہوئی رگ تھا۔

ابھی کچھ دیر پہلے جو زلیخا بی بی کے چہرے پر خوشیوں کے رنگ تھے، اب وہاں پریشانی اور تفکرات کے سائے لرز رہے تھے۔

زلیخا بی بی جانتی تھی کہ پوری برادری میں سدرہ بی بی اور مریم بی بی کے جوڑ کا کوئی لڑکا نہ تھا۔ ایسے میں جب وہ باہر کے خان دان میں لڑکی نہ دیتے تھے تو زلیخان بی بی کا بیٹیوں کے لیے فکر مند ہونا جائز تھا۔

''تم کہو تو میں اپنے میکے میں بات کروں، میری بھابی کا بھائی ہے، بھابی بہت عرصے سے اُس کا نکاح کرنا چاہتی ہیں۔ خیر سے اتنی زمین ہے کہ سات نسلیں بنا کام کیے کھا سکتی ہیں۔''

''لیکن! لیکن وہ تو شادی شدہ ہے اور عمر میں سدرہ بی بی سے دوگنا ہی ہوگا۔'' زلیخا بی بی نے دُکھ سے کہا۔

''تو کیا ہوا؟ مرد تو چار شادیاں کر سکتا ہے پھر وہ کون سا شوقیہ شادی کرنا چاہتا ہے۔ اُسے اپنے خان دان کا وارث چاہیے، بے اولاد تو کوئی بھی مرنا نہیں چاہے گا۔'' ریحانہ بیگم نے نہایت سفاکی سے کہا۔

''پھر تم بھی تو آئیں تھی اِس حویلی میں، میں نے کبھی تم کو سوکن سمجھا؟'' ریحانہ بی بی نے دوغلے پن کی انتہا کرتے ہوئے پوچھا۔ زلیخا بی بی کچھ پل کو چپ سی رہ گئی، اپنی اتنی پیاری اور کم عمر بیٹی کے لیے اس طرح کے رشتے انہیں بے حد تکلیف دے رہے تھے۔

''میری بات اور تھی۔ سید نوازش علی مجھ سے سات آٹھ سال بڑے تھے پھر میرے بے حد قدر دان تھے۔'' زلیخا بی بی نے وہ بات کی جس کی جلن ریحانہ بیگم کو سب سے زیادہ تھی۔

''دیکھ تو زلیخا بیگم! برادری میں کوئی اور لڑکا ہے نہیں، یہ نہ ہو کہ بیٹیاں ساری عمر گھر کی دہلیز پر ہی بیٹھی رہ جائیں۔'' ریحانہ بی بی کا جملہ اور وار بے حد کاری تھا۔

زلیخا بی بی بیٹے کی ساری خوشی بھول کر ڈھے گئیں، اُن کی آنکھوں کے سامنے سدرہ بی بی اور مریم بی بی کے معصوم چہرے گھوم رہے تھے۔

''میری بچیوں کا مستقبل کیا ہوگا؟'' زلیخا بی بی کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک کر اُن کی چادر میں جذب ہو گئے تھے۔ یا اللہ کوئی فرشتہ ہی بھیج دے، جو آج تک اِس خان دان میں نہیں ہوا کہ لڑکی خان دان سے باہر نہیں بیاہی گئی وہ معجزہ میری بیٹیوں کے ساتھ ہو جائے، میری بیٹیوں کے گھر آباد ہو جائیں اُن لڑکوں کے ساتھ جو اُن کے قدر دان بھی ہوں۔'' زلیخا بی بی نے صدق دل سے دُعا کی اور ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک ماں دُعا کرے اور وہ قبول نہ ہو!

❖❖○❖❖

''ارے نیک بخت سنتی ہو! ٹیلی گرام آیا ہے فیصل آ رہا ہے!'' نفیسہ کے بابا گھر کے دروازے سے ہی اونچی آواز میں بولتے آ رہے تھے۔ خوشی سے اُن کے پاؤں زمین پر پڑ نہ رہے تھے۔

''سچ سچ!'' صابراں بی بی کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو رواں ہو گئے۔

''ہاں وہ پرسوں لاہور اُترے گا اور اُس کے اگلے دن سویرے گاؤں پہنچ جائے گا۔'' بابا نے ٹیلی گرام کو یوں محبت بھری نظروں سے دیکھا، جیسے وہ فیصل کا ٹیلی گرام نہ ہو بلکہ خود فیصل ہو۔

''پورے چھ برس بعد میں اُسے دیکھوں گی!'' صابراں نے ہاتھوں کی پوروں پر برس گنتے ہوئے کہا۔

''ہاں ولایت کی پڑھائی آسان تھوڑی ہے۔ وہ بہت بڑا ڈاکٹر بن کر آ رہا ہے۔'' بابا کی آواز میں فخر تھا۔ وہ گاؤں کے پہلے شخص تھے، جن کی بیٹی مڈل پاس تھی اور بیٹے شہر تک جا کر پڑھے تھے۔ انہوں نے اپنی ساری کمائی اور طاقت اپنے بچوں کو پڑھانے میں لگا دی تھی۔

بڑا بیٹا شہر میں وکیل تھا اور دن رات محنت سے وہ آہستہ آہستہ اپنا مقام بنا رہا تھا اور چھوٹا بیٹا آج ڈاکٹر بن کر آ رہا تھا۔ نذیر احمد کو یوں لگ رہا تھا کہ وہ ایک بار پھر سے جوان ہو گیا ہو۔

''بابا اب ویر کی شادی کر دو۔ صادق بھائی اور فیصل بھائی دونوں کی اکٹھی ہی کر دو، گھر میں بھابیاں آ جائیں گی تو میرا اکیلا پن تو ختم ہو جائے گا۔'' نفیسہ نے ٹھنک کر فرمائش کی۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن تیرے ویر پہلے تیرے ہاتھ پیلے کریں گے پھر گھوڑی چڑھیں گے یہ وہ پہلے دن سے کہتے آ رہے ہیں۔'' صابراں بی بی نے بیٹی کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

نفیسہ باپ کی موجودگی میں اپنی شادی کے ذکر پر بے حد شرما گئی۔ اماں آپ بی ناں! وہ ادھوری بات چھوڑ کر اندر بھاگی، صابراں بی بی اور نذیر احمد دونوں ہی ہنس پڑے۔ خوشیاں اُن کے آنگن میں بس اُترنے ہی والی تھیں۔

❖❖○❖❖

لگتا تو مجھے بھی عجیب سا ہے لیکن کیا کروں تیرے تایا جی اور تائی جی نے خود اپنے منہ سے کہا ہے کہ تمہیں اپنے ولایت جانے سے پہلے اُن کی جانب چھوڑ دوں۔ بھابی نے پہلی بار مجھے کچھ کہا اِس لیے

میں انکار نہ کرسکا۔

''لیکن بابا جان۔'' عائشہ ہچکچا رہی تھی۔

''اوہ بیٹیا رانی! وہ پہلے تیرے تایا جی کا گھر ہے پھر تیری سسرال ہے۔'' سید نوازش علی نے عائشہ سر پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''میرے لیے تو تیری خوشی اہم ہے اگر تو نہیں جانا چاہتی تو میں بھابی سے معذرت کرلیتا ہوں۔'' نوازش علی کی تو جان تھی بیٹی کے اندر۔

''نہیں بابا جان! اگر آپ کو یہ سب ٹھیک لگتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' عائشہ نے تابعداری کہا۔

''جیتی رہو!'' سید نوازش علی نے بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

وہ دِل کے مرض کی وجہ سے انگلینڈ بائی پاس کے لیے جارہے تھے، بھابی نے اصرار کیا تھا کہ ا عرصے کے لیے عائشہ کو اُن کے ہاں حویلی میں چھوڑ جائیں۔ جس پر عائشہ ہچکچاہٹ کا شکار تھی لیکن باپ تائی جان کے اصرار پر اُس نے وہاں رہنے کی حامی بھرلی تھی۔

❖❖○❖❖

''آیا امّاں یہ میری امی کی تصویر ہے ناں؟'' مسکان آیا امّاں کی الماری صاف کررہی تھی تب ہی ا البم اُس کے ہاتھ آ لگا تھا۔ اُس میں ایک تصویر اُس کے بابا سائیں کی تھی، جس کے ساتھ ایک عو کھڑی تھی گود میں زبیر بھائی اور بلال بھائی تھے۔ مسکان نے ایک آدھ بار اِس عورت کی تصویر کے البم میں دیکھی تھی۔ وہاں کی ایک بوڑھی ملازمہ نے بتایا تھا کہ یہ اس کی ماں ہے۔ مُسکان کا کتنا چاہا تھا کہ کاش یہ تصویر کچھ واضح اور بڑی ہوتی تاکہ وہ صحیح سے اپنی ماں کو دیکھ سکتی۔

لیکن آج اچانک ہی اُسے اتنی بڑی اور واضح تصویر مل گئی تھی اور اُس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی بڑے پُرجوش انداز میں آیا امّاں سے پوچھ رہی تھی۔

''ہاں! یہ تمہاری امی کی تصویر ہے۔'' آیا امّاں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ اِس وقت بستر پر لیٹی آرام کررہی تھیں۔ آج بی پی ہائی ہونے کی وجہ سے اُن کی طبیعت خراب تھی۔ مُسکان انھیں زبردستی بستر پر لٹا کر آرام کرنے کو کہا تھا۔

''آیا امّاں! ایک بات پوچھوں؟'' مسکان نے غور سے تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''پوچھو۔'' آیا امّاں نے آنکھوں سے ہاتھ ہٹا کر کہا۔

''میری شکل کس سے ملتی ہے، نہ بابا سائیں سے ملتی ہے نہ امی جان سے پھر میرے فیچرز کس ہیں۔ دیکھیں ناں زبیر بھائی ہو بہو بابا سائیں کی کاپی ہیں اور بلال بھائی بالکل امی کی طرح لگتے ہیں میری شکل، کس پر ہے؟'' مسکان نے تجسس سے پوچھا آیا امّاں کے چہرے پر سایہ لہرایا گیا۔

''ضروری نہیں بیٹا کہ بچے ماں باپ کی ہی شکل لے کر پیدا ہوں، وہ اپنے ددھیال، ننھیال کسی جاسکتے ہیں۔'' آیا امّاں نے اُس کو اطمینان تو دلا دیا خود اُن کے دل میں بے حد بے چینی بڑھ گئی تھی۔

''واقعی یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔'' مُسکان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں آپ کے لیے گرم دُ

لے کر آتی ہوں۔ مُسکان کہہ کر باہر نکل گئی۔

لیکن اُس کا سوال نفیسہ بیگم کو ماضی میں لے نکلا تھا۔

''صائمہ بی بی! تم آخر عائشہ بی بی کی تصویر میں کیا دیکھتی رہتی ہو؟'' نفیسہ اکثر صائمہ بی بی کو عائشہ بی بی کی تصویر کے سامنے کھڑے دیکھتی تو سوال کرتی تھی۔

''سید سرفراز کبھی بھی اِس عورت کو نہیں بھولا وہ ہر مقام پر میرا اِس کے ساتھ موازنہ کرتا ہے۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ کتنی خوش قسمت عورت ہے جو یہاں نہ رہتے ہوئے بھی ہر وقت یہاں رہتی ہے۔ اور میں! میں یہاں رہتے ہوئے بھی سرفراز کو نظر نہیں آتی۔'' صائمہ بی بی نے یاسیت سے کہا۔

وہ اُس وقت حاملہ تھی، کہتے ہیں کہ آپ جیسا تصور کرو بچہ ویسی ہی شکل لے کر پیدا ہوتا ہے۔

صائمہ بی بی، عائشہ بی بی کے متعلق اتنا سوچتی تھیں کہ جب مسکان پیدا ہوئی تو ہر کوئی حیران تھا کہ وہ ایک روپ سارا عائشہ بی بی جیسا لے کر پیدا ہوئی تھی۔ جوں جوں وہ بڑی ہوئی اُس کی مشابہت بھی زیادہ واضح ہوتی گئی۔

آج مسکان کا سوال نفیسہ بیگم کو چونکا گیا تھا۔ ہم لاکھ ماضی سے نظریں چرائیں، جان چھڑائیں یہ ہمیشہ ساتھ رہتا ہے۔ جب کبھی ہم پیچھے مُڑ کر دیکھیں یہ اپنے سارے رنگوں کے ساتھ موجود ہوتا ہے اور نفیسہ بیگم کے لیے اُن کا ماضی تو کسی ناسور کی طرح تھا۔ جس کو وہ چاہتے ہوئے بھی کاٹ کر پھینک نہ سکتی تھیں۔

''نفیسہ بیگم کے سر میں درد مزید بڑھ گیا تھا۔ یادیں کسی سانپ کی طرح ڈستی تھیں۔ کاش! کاش یہ یادیں بھی اُن لوگوں کی طرح مُردہ ہو جاتیں، جو اِن میں موجود تھے۔ ان زندہ یادوں سے اُن کا اپنا وجود مُردہ ہو کر رہ گیا تھا۔ نفیسہ بیگم تو آج سے چوبیس سال پہلے مرگئی تھی۔ اُن کی موت کو تو عرصہ گزر گیا تھا لیکن یہ ماضی کا دور اس قدر زیادہ تھا کہ اُن کے مردہ وجود تک کو تڑپا دیتا تھا۔

❖❖○❖❖

''ڈیٹ شیٹ آگئی ہے! یار میری تو تیاری بالکل نہیں ہے میں اِس بار پیپر نہیں دے رہا۔'' ٹی ٹو نے با آواز بلند اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ وہ اِس وقت گرافک اسٹوڈیو میں تھے۔ ولی اپنی کسی اسائمنٹ کے لیے پرنٹ نکال رہا تھا۔

''اِس بار پیپر نہیں دے رہا بلکہ یوں کہو ہمیشہ کی طرح اِس بار بھی تم پیپر نہیں دے رہے۔'' ولی نے سنجیدگی سے اُس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ٹی ٹو چپ کر کے نیڈل سے پلیٹ پر لائنز لگانے لگا۔

''کیوں یار افضل! تم کیوں اپنے کیریئر اور زندگی کے لیے اتنے غیر سنجیدہ ہو؟'' عبدالولی نے سارے کام چھوڑ کر اُس کے پاس کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

ٹی ٹو جانے کتنے سال سے اپنا وقت ضائع کررہا تھا اُس کے جونیئر سینئر بن کر کب کے پاس آؤٹ کر گئے تھے لیکن وہ یہاں ہی تھا، غیر سنجیدہ زندگی گزارتے ہوئے۔ کالج کے لڑکے لڑکیوں نے اُسے ایک قدیم مجسّمے کا نام ٹی ٹونک دے رکھا تھا۔

"اگر میں یہاں سے چلا گیا تو کوئی دنیا میں بالکل اکیلا رہ جائے گا۔" ٹی ٹو نے ٹھہرے ہوئے
میں جواب دیا۔

"جب تک میرے پاس پڑھائی کا بہانہ ہے میں اِس ملک، اِس شہر میں اپنے دادا کے پاس ر
ہوں اور اگر میں چلا گیا تو اُن میں جینے کی تمنا بالکل ختم ہوجائے گی۔ اور وہ شخص ہمیشہ کے لیے تنہائی
درد کو لیے سو جائے گا۔"

"نہیں ولی! میں اپنے والدین کی طرح بے حس نہیں ہوسکتا۔ میرے والد پندرہ سال پہلے دادا جی
کر گئے تھے وہ بھی خالہ کی شادی تھی ورنہ شاید نہ آتے۔ پندرہ سال سے دادا جی، پاپا کا انتظار روز
کرتے ہیں جیسے بچوں کو صبح اسکول بھیج کر مائیں دوپہر سے گھنٹہ پہلے ہی انتظار کرنے لگتی ہیں۔ اُن
آنکھوں میں میری وجہ سے روشنی رہنے لگی ہے میں کیسے اُن میں اندھیرا کردوں؟" ٹی ٹو نے ہاتھوں
گراتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم تعلیم ختم کرکے یہاں جاب کرکے بھی تو رہ سکتے ہو۔" عبدالولی نے کہا۔

"نہیں! وہ مجھے صرف پڑھنے کے لیے یہاں چھوڑ سکتے تھے، ہمیشہ سیٹل ہونے کے لیے ہرگز نہیں
اگر میں زبردستی رہ بھی جاؤں تو وہ دادا کو مجبور کریں گے کہ مجھے واپس بھیج دیں۔ اس لیے میرے
فوری شارٹ کٹ یہی تھا کہ میں اپنی تعلیم اور کیریئر کو مذاق بنالو۔" عبدالولی نے حیرت سے کالج
سب سے غیر سنجیدہ لڑکے کو دیکھا جس کے متعلق ہر طالب علم اور ٹیچر کی رائے تھی کہ وہ نہایت لا
انسان ہے۔

"کوئی یوں بھی اپنی زندگی کے ساتھ کھیل کر کسی کی زندگی میں روشنی بھر سکتا ہے؟" عبدالولی کو ایک
سے اپنے فیصلے پر بے حد فخر محسوس ہوا، جس لڑکے کی ساری کالج سے دوستی نہ تھی وہ صرف اُس کا دو
بنا، عبدالولی کے نہایت گنے چنے دوست تھے لیکن سب میں ایک ہی اہم بات کامن تھی۔ وہ زندگی
ویلیوز کو اہمیت دیتے تھے۔

افضل خان عرف عام ٹی ٹو میں آج کسی کو کچھ خاص نظر نہ آیا تھا۔ بلکہ اکثر لوگ حیران ہوتے تھے
عبدالولی جیسے لائق فائق لڑکے کے ساتھ کالج کے سب سے نکمے کی دوستی کیسے ہوگئی۔ عبدالولی کو پہلے
روز ٹی ٹی میں اٹریکشن نظر آئی تھی اور یوں مزاجوں کے مختلف ہونے کے باوجود وہ دوست تھے، میر
دوستوں میں کچھ خاص ہونا بے حد اہم ہے۔

"تم جانتے ہو ٹی ٹو! تم میں بھی ایک بہت خاص بات ہے کہ تم ایک بہت اچھے بیٹے ہو!" عبدا
نے اُداس بیٹھے ٹی ٹو کا ہاتھ تھام کر اُسے گلے لگالیا۔

❖❖○❖❖

احمد شاہ اور روشن آرا بیگم بائے روڈ گھر واپس آرہے تھے۔ اونچے نیچے راستے جب ختم ہوگئے
سیدھی سڑک آنے پر روشن آرا بیگم نے اپنی سیٹ کے ساتھ ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

احمد شاہ اور رحیم خان اپنی کسی باتوں میں مصروف تھے۔ اچانک گاڑی رُکی اور ساتھ ہی گاڑی

ٹی چھاگئی۔ روشن آرا بیگم نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

احمد شاہ اور رحیم خان سامنے دیکھ رہے تھے۔ راستے میں کسی کی گاڑی خراب ہوگئی تھی اور وہ شخص ہاتھ
اشارے سے انہیں مدد کے لیے روک رہا تھا۔

رحیم خان کے گاڑی روکنے پر وہ بڑے بڑے قدم اُٹھاتا اُن کی جانب بڑھا۔ پلیز میری گاڑی کو کچھ
لم ہوگیا ہے اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو مجھے کچھ دور موجود ایک پیٹرول پمپ تک لفٹ دے دیں وہاں
کسی مکینک کا پتہ شاید مل سکے۔ اُس شخص نے شائستہ انداز میں اپنا مسئلہ بتایا تھا۔ لیکن جیسے ہی اُس
نظر احمد شاہ پر پڑی وہ چونک کر بولا۔ "احمد شاہ یہ تم ہی ہو ناں؟

اور احمد شاہ کو بس ایک پَل لگا تھا پہچان کی منزل طے کرنے میں۔

''یہ تم ہی ہوناں احمد شاہ؟'' اجنبی آدمی نے آگے بڑھ کر کہا۔

''شہباز... شہباز علی تم!'' احمد شاہ فوراً دروازہ کھول کر باہر نکلے۔شہباز علی نے فوراً احمد شاہ کو گلے لیا۔

''کتنا وقت بیت گیا ہے تم بالکل نہیں بدلے۔'' شہباز علی نے احمد شاہ کا صحت مند چہرہ اور پُرسکو آنکھیں دیکھتے ہوئے کہا اور یہ سچ ہی تو تھا۔ گزرے وقت نے اُن کے سر میں بس کہیں کہیں چاندی جگہ دی تھی۔ وہ آج بھی اُسی طرح خوبرو تھے، جیسے آج سے سالوں پہلے نظر آیا کرتے تھے۔ یہ انسا کے اندر کا سکون ہی تو ہوتا ہے جو چہروں کے نقش کو کم ہی بدلنے دیتا ہے۔احمد شاہ نے ہمیشہ وہ کام جس سے اُن کے اندر کو ہمیشہ سکون ملتا تھا وہ لوگوں کے لیے ہمیشہ خوشی کا باعث بنتے تھے۔

''تم کچھ بوڑھے نظر آرہے ہو۔'' احمد شاہ نے شہباز علی کے تھکے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں! اپنوں سے دُوریاں انسان کو وقت سے پہلے بوڑھا کر دیتی ہیں۔'' انہوں نے گہری سانس بھر کہا لیکن پھر فوراً ہی سنبھل کر احمد شاہ کی جانب متوجہ ہوئے۔

''کیا مجھے لفٹ ملے گی؟'' وہ شگفتہ لہجے میں احمد شاہ سے مخاطب تھے۔

''اتنے عرصے بعد بھی تمہاری تکلف کرنے کی عادت ختم نہیں ہوئی، چلو تم اندر بیٹھو تمہاری گاڑی ہا ڈرائیور ٹھیک کروا کر لے آئے گا۔'' احمد شاہ نے محبت بھری دھونس سے کہا۔

''اچھا ذرا رُکو میں گاڑی سے اپنا بیگ لے آؤں۔'' شہباز علی اپنی گاڑی کی جانب بڑھے اور ایک چھوٹا سا سفری بیگ اور بریف کیس تھامے اُن کے پاس آئے۔

''رحیم خان! تم گاڑی ٹھیک کروا کر گھر آجانا، یہ لو چابیاں اور پیسے۔'' احمد شاہ نے شہباز علی کی گاڑ کی چابیاں رحیم خان کو تھماتے ہوئے کہا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

''یار شہباز! تمہاری بھابی بھی پیچھے بیٹھی ہیں۔'' احمد شاہ نے بتایا۔

''السلام علیکم بھابی جان!'' شہباز علی نے لمحہ بھر کو گردن موڑ کر کہا۔

''وعلیکم السلام!'' روشن آرا بیگم نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

''بھابی کتنے عرصے بعد ہم مل رہے ہیں آپ نے پہچانا اِس گمشدہ دیور کو...!'' شہباز علی نے پوچھا۔

''دیور نہیں ہے یہ تمہارا جیٹھ ہے اِسے ہمیشہ عمر کم بتانے کا شوق تھا۔'' احمد شاہ کے لہجے میں ہلکی شرارت تھی۔

''بالکل نہیں! تم مجھ سے بڑے ہو یہ سب جانتے ہیں، چاچا سائیں نے مجھے تمہاری عمر بتا رکھی تھی۔'' شہباز علی کے اصرار پر روشن آرا کے چہرے پر مسکراہٹ در آئی۔

''یار چاچا اور چاچی جان کیسے ہیں؟'' شہباز علی نے شوق سے پوچھا۔

''اُن دونوں کا ایک حادثے میں انتقال ہوگیا۔'' احمد شاہ کا لہجہ اُداسی سے بھر گیا، ماں باپ کی کمی وہ شدت سے محسوس کیا کرتے تھے لیکن اللہ کی رضا میں ہمیشہ راضی رہا کرتے تھے۔لیکن کبھی ان کی یاد مدھم ہو پاتی تھی۔

''اوہ! یہ تو بے حد دُکھ والی خبر سنائی ہے، وہ دونوں فرشتہ صفت ہستیاں تھیں، بے شک اُن کے جانے کے بعد ایک خلا سا محسوس ہوتا ہوگا۔'' شہباز علی خود بھی اُداس ہوگئے۔

احمد شاہ کی والدہ بے حد محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ اُن کے جانے پر اُن کی بے حد مہمان نوازی کیا کرتی تھیں، احمد شاہ کی طرح اُن سے پیار کیا کرتی تھیں۔

''ہاں یہ خلا دُنیا کی کوئی نعمت پُر نہیں کر سکتی، لیکن جب بلاوا اُس مالک دو جہاں کا ہو تو ہمیں اُس کی رضا میں ہی راضی ہونا چاہیے۔'' احمد شاہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''تم سناؤ کہاں ہوتے ہو آج کل؟'' احمد شاہ نے گاڑی دھیان سے چلاتے ہوئے پوچھا۔

''نگر نگر گھوم کر مسافر آخر اپنے گھر ہی آتا ہے، میں بھی اِس بے مقصد فرار اور سفر سے تھک کر واپس اپنے وطن آگیا ہوں، بہت سال اپنوں سے دُوری کاٹی ہے اب برداشت نہیں ہوتا، یہاں گھر لینے کا ارادہ ہے فی الحال ہوٹل میں ٹھہروں گا۔'' شہباز علی نے کہا۔

''ہمارے ہوتے ہوئے تم ہوٹل میں ٹھہرو گے، تمہیں شرم نہ آئے گی؟'' احمد شاہ نے خفگی سے کہا۔

''واقعی یہ سچ ہے کہ اتنا لمبا مہمان بننے میں مجھے شرم تو ضرور آنی چاہیے۔ جانے کتنے دنوں میں مجھے کوئی اچھا گھر ملتا ہے تم پلیز مروت نہ کرو اتنے دِن کا مہمان تو وبالِ جان کہلانے لگتا ہے۔'' شہباز علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہم تنگ ہوں گے یا نہیں، یہ طے کرنے والے تم کون ہوتے ہو؟ بس آج سے تم ہمارے ساتھ رہو گے اگر پرائیویسی کا مسئلہ ہے تو تمہارا انتظام انیکسی میں کروا دیتا ہوں اب میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گا۔'' احمد شاہ نے حتمی لہجے میں کہا۔

''تمہاری محبت کے آگے تو میں ہمیشہ ہی بے بس رہا ہوں، تمہیں یاد ہوگا میں تمہاری حویلی ایک دن کے لیے آتا تھا اور پندرہ پندرہ دن رہ کر جاتا تھا۔'' شہباز علی کہیں دور ماضی میں کھو گئے تھے۔

''بس تو پھر یہ طے پا گیا کہ تم آج سے ہمارے ساتھ رہو گے۔'' احمد شاہ نے مسکراتے ہوئے گیئر بدلا۔

''اب میں مزید کیا کہوں۔'' شہباز علی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''گڈ! یہ ہوئی ناں اچھے بڑوں والی بات۔'' احمد شاہ نے کہا۔

''نو... نو! یہ بات تو میں کبھی نہیں مانوں گا تم بڑے تھے اور رہو گے۔'' شہباز علی نے فوراً ٹوکا۔

جواب میں احمد شاہ کا دھیما سا قہقہہ گاڑی میں اُبھرا۔

’’روشن آرا یہ مانے یا نہ مانے تم اِس کو جیٹھ جی ہی بلانا۔‘‘

’’بھابی! دیکھ لیں اِس عمر میں بھی یہ اپنی عمر چھپاتا ہے۔‘‘ شہباز علی نے روشن آراء کو بھی گفتگو میں شامل کیا۔

’’میں تو آپ کو بھائی صاحب کہوں گی کیوں کہ میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔‘‘ روشن آرا نے اُن کی تکرار کا نقطہ ہی مٹا دیا۔

’’ہاں بڑا بھائی!‘‘ احمد شاہ نے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔

’’بھابی کا بڑا بھائی بن کر مجھے خوشی ہوگی۔‘‘ شہباز علی نے خوشی سے کہا۔ جواب میں روشن آرا دھیما سا مسکرائیں۔

گاڑی احمد شاہ کے وسیع و عریض بنگلے کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ احمد شاہ کے ہلکے سے ہارن پر ہی گارڈ نے الرٹ ہو کر گیٹ کے ساتھ بنے چھوٹے سے واچ روم کی کھڑکی سے منہ باہر نکال کر دیکھا اور چوکیدار کو گیٹ کھولنے کی وِسل دی۔ چوکیدار نے دوڑ کر دروازہ کھول دیا اور بڑھ کر سلام کیا، گاڑی کے رُکنے پر اندر سے ملازم دوڑتا ہوا آیا اور مؤدب ہو کر احمد شاہ کا دروازہ کھولا۔

’’صادق یار! وہ انیکسی کو ٹھیک کروادو ہمارے مہمان رہیں گے۔‘‘

گھر کا سیٹ اپ اِس قدر منظم تھا کہ کبھی کوئی کونہ کھدرا بھی صفائی کے بغیر نہ رہتا تھا۔ خالی انیکسی کی بھی روز صفائی ہوتی تھی، وہاں کے دونوں کمروں کی چادریں صوفوں کے کور ہفتے بعد بدل دیے جاتے تھے۔

’’چلو یار! تمہاری بھابی کے ہاتھ کی گرما گرم چائے پیتے ہیں۔‘‘ احمد شاہ نے شہباز علی کو اندر آنے کی دعوت دی۔ تب ہی گاڑی کا ہارن بجا اور گیٹ کھلنے کے ساتھ ہی ایک جیپ اندر داخل ہوئی۔ جیپ سے ولی اور طارق باہر نکل کر اُن کی جانب بڑھے تو روشن آرا بیگم یوں بے قرار ہو کر آگے بڑھیں، جیسے وہ سالوں روز بعد نہیں سات مہینوں بعد ولی سے مل رہی ہوں۔

’’السلام علیکم!‘‘ ولی اور طارق نے قریب آ کر مشترکہ سلام کیا۔

’’وعلیکم السلام، جیتے رہو۔‘‘ روشن آرا بیگم نے باری باری دونوں کے سروں پر پیار دیا۔

’’کیسی ہیں امّاں جان!‘‘ ولی تو باقاعدہ اُن کے سینے سے جالگا تھا۔

’’شکر الحمدللہ!‘‘ روشن آرا بیگم نے پیار سے ولی کی کمر سہلاتے ہوئے کہا۔

’’السلام علیکم!‘‘ طارق نے باری باری احمد شاہ اور شہباز علی کو سلام کیا۔ شہباز علی تو جانے کس کیفیت میں تھے وہ طارق کو یک ٹک دیکھے چلے جارہے تھے۔ طارق نے چونک کر اُن کو دیکھا۔ (یہ صاحب! مجھے کیوں گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں؟) طارق نے سوچا!

’’ولی اِن سے ملو یہ میرے بہت اچھے دوست ہیں اور بہت قابل ڈاکٹر۔‘‘ احمد شاہ نے ولی سے شہباز علی کا تعارف کروایا۔

’’یار یہ میرا بیٹا عبدالولی ہے اور یہ اُس کا دوست طارق ہے۔‘‘ احمد شاہ کے الفاظ مجسمہ بنے شہباز علی چونکا گئے، طارق کو دیکھتے ہی اُنھیں اُس کے چہرے میں کسی کی جھلک نظر آئی تھی۔ جسے وہ اپنا وہم سمجھ رہے تھے۔ لیکن اُس کا نام اُنھیں اپنی زندگی میں روشنی کی کرن لگا تھا۔

’’آپ کا پورا نام کیا ہے بیٹے!‘‘ شہباز علی نے اُس پر سے نگاہ ہٹائے بغیر پوچھا۔

’’طارق علی!‘‘ طارق نے جواب دیا۔ شہباز علی کا دِل دھڑکنا بھول گیا۔

’’لگتا ہے ان کی کوئی بیٹی ہے، جس کے لیے تم اُنہیں پسند آ گئے ہو، دیکھو تمہیں کیسے واری صدقے نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں!‘‘ ولی نے طارق کے کان میں سرگوشی کی۔

’’میں ان کو قربانی کا بکرا نظر آتا ہوں!‘‘ طارق نے ولی کو خفگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

’’اچھا انکل میں چلتا ہوں، مجھے کچھ کام ہے۔‘‘ طارق کو اب شہباز علی کی نگاہیں اُلجھن میں ڈال رہی تھیں۔

’’ارے رکو بیٹے! چائے تو پی کر جاؤ۔‘‘

’’پھر کبھی آنٹی جان! مجھے بے حد ضروری کام سے کہیں پہنچنا ہے۔‘‘ طارق نے کہہ کر اجازت لی۔

’’اوکے ولی... اوکے انکل! پھر ملاقات ہوگی۔‘‘ اللہ حافظ طارق کہہ کر جیپ کی جانب بڑھا۔

جیپ باہر نکل کر غائب ہوچکی تھی۔ روشن آرا بیگم اور ولی اندر جاچکے تھے لیکن شہباز علی وہیں ساکت کھڑے تھے۔ احمد شاہ کو وہ نارمل نہ لگ رہے تھے۔

’’کیا بات ہے شہباز؟ پریشان لگ رہے ہو؟‘‘ احمد شاہ نے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

’’چلو اندر چلتے ہیں، تم یہاں کیوں کھڑے ہوگئے؟‘‘ احمد شاہ حیران ہو کر پوچھ رہے تھے۔

’’یہ... یہ لڑکا؟‘‘ شہباز علی نے احمد شاہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

’’کون؟ طارق! ہاں وہ ولی کا دوست ہے!‘‘ احمد شاہ نے نہ سمجھتے ہوئے جواب دیا۔

’’یہ طارق علی ہے نا؟ اِس کے نانا کا نام راشد ملک ہے نا؟ شہباز علی کی آواز میں آس و نراش دونوں ہی تھے۔

’’راشد ملک؟‘‘ احمد شاہ نے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

’’شاید! یہ نام میں نے سُن رکھا ہے لیکن کنفرم کیے بغیر میں کچھ بتا نہیں سکتا، لیکن یار! تم کیوں اتنی بے تابی سے پوچھ رہے ہو؟‘‘ احمد شاہ نے پوچھا۔

’’کیوں کہ میرا دل پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ ہی میرا لختِ جگر ہے۔‘‘ شدّت جذبات سے شہباز علی کی آواز بھاری ہوگئی۔

’’تو کیا... یہ بچہ...! تمہارا ہے؟‘‘ احمد شاہ نے گیٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

’’احمد شاہ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ یہ ہی میرا کھویا ہوا لال ہے، دُعا کرو اِس مسافر کو اب اُس کی منزل مل جائے، ایک باپ کی تڑپ کیا ہوتی ہے، تم سے بہتر کون جان سکتا ہے، تم بھی تو ایک باپ ہی ہو احمد شاہ پلیز میرے لیے دُعا کرو میں نگری نگری گھوما ایک تھکا ہوا انسان ہوں۔‘‘ شہباز علی نے کہا۔

’’اُس سب سے بڑی ذات پر یقین رکھو شہباز علی وہ تمہیں تمہارے اپنوں سے ضرور ملوائے گا۔‘‘ احمد شاہ نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

’’انشاء اللہ!‘‘ شہباز علی کی آنکھوں کے سامنے چھ فٹ اونچا مضبوط کاٹھی والا وہ سراپا لہرایا، جس کی آنکھیں بالکل سارہ جیسی تھیں۔ سارہ! جو اُن کی زندگی تھی اور اُن کی زندگی ایک سفاک دِل والی عورت کی

سازش کا شکار ہوگئی تھی۔ نیلوفر! میں تمہیں کبھی معاف نہ کروں گا!'' انہوں نے اپنے دل کے اندر اُ ہوئے لاوے کو بہ مشکل دباتے ہوئے کہا، کچھ لوگ بھی تو گرم لاوے کی طرح ہی ہوتے ہیں، جو ہر جلا کر راکھ کر دیتے ہیں۔

❖❖○❖❖

''بی بی جی! ایک بات کہوں آپ سے؟'' بشیراں نے زلیخا بی بی کے پاؤں دباتے ہوئے کہا۔

''ہوں!'' زلیخاں بی بی آج کل بے حد چپ چاپ اور نڈھال رہتی تھیں۔ سدرہ بی بی اور مریم کی جوانی اُن کو گھن کی طرح کھائے جارہی تھی۔ دِن رات وہ بیٹیوں کو غور سے دیکھتی رہتی تھیں۔ اِس میں تو ہر لڑکی کے خوابوں کی ایک دنیا ہوتی ہے اور اِس دنیا میں وہ کبھی اکیلی نہیں ہوتی بلکہ ایک ساتھی ہے وہ ہی اُس کے خوابوں کا مرکز ہوتا ہے۔

''کیا میری بیٹیوں کا حق نہیں ہے کہ اُن کو بھی جیون ساتھی ملے؟''

''آہ!'' وہ آہ بھر کر رہ جاتیں، اِس معاملے میں اُن کو ذرّا بھر صبر نہ آتا تھا۔ اب بھی کچھ دیر پہلے بی بی نہا کر بال سکھا کر اُن کے پاس بیٹھ کر گئی تھی ہر چیز اللہ نے اُسے نوازی تھی۔ موہنی سی شکل و صو قد کاٹھ بے حد دل کش پھر... پھر یہ محرومی کیوں تھی؟ اس سوچ نے اُن کی ساری توانائی چھین لی تھی۔ بے حد نڈھال ہو کر لیٹ گئیں۔

''بی بی جی! وہ نہر پار پیر سائیں کا مزار ہے! آج تک وہاں جس نے جو مانگا ہے، پیر سائیں سفارش قبول ہوتی ہے اور بندے کی مُراد پوری ہو جاتی ہے۔

پیر سائیں اللہ کے بڑے اچھے بندے ہیں اُن سے جس دُعا کی سفارش کرواؤ قبول ہوتی ہے۔ وہاں منت کا دیا جلاتے ہیں آپ بھی بڑی بی بی اور چھوٹی بی بی کو لے کر وہاں منت کا دیا جلاؤ، سائیں ہماری بیبیوں کے لیے اچھے جوان سر کا سایہ دے گا۔'' بشیراں نے تیز تیز بولتے ہوئے کہا۔

زلیخا بی بی بے حد دل گرفتہ بیٹھی تھیں۔ بشیراں عام حالات میں یہ بات کرتی تو وہ شاید اُسے ڈانٹ چپ کروادیتیں لیکن اس وقت اُن کو بشیراں کی یہ بات ڈوبتے کو تنکے کا سہارا لگی تھی۔ وہ آس جو دھیرے دھیرے مرتی جارہی تھی، جس سے اُن کے اندر زندگی کی رمق ختم ہوتی جارہی تھی۔ وہ اچانک زندہ ہو کی امید جاگی تھی۔

''شاید ہوسکتا ہے کہ منت مانگ لوں تو کوئی معجزہ ہی ہو جائے!'' یہ سوچ اُن کے بے جان وجود پھر سے توانائی لے آئی تھی۔

''بشیراں! صادق محمد سے کہو کہ گاڑی تیار کرے بیبیوں کو درگاہ جانا ہے۔'' زلیخا بی بی نے فوراً ہوئے بشیراں کو حکم دیا۔

''لمّاں جان! آپ بھی کس کی باتوں میں آرہی ہیں۔'' سدرہ بی بی، زلیخا بی بی کی بات سُن کر ہنس چلی گئی۔ یہ الگ بات تھی کہ اُس کی ہنسی میں ٹوٹے کانچ کا درد شامل تھا۔

''بس تم دونوں میرے ساتھ چل رہی ہو، میں ظہر کی نماز پڑھ کر آرہی ہوں تم دونوں تیار رہنا۔'' بی بی اُن کو حکم دیتی باہر نکل گئیں۔

''ہونہہ! منت کا دیا! اب اِن اندھیروں میں کوئی بھی منت کا دیا کیا روشنی کرے گا۔'' سدرہ بی بی نے کمر سے نیچے جاتے بالوں کو پراندے میں ڈال کر جھٹکتے ہوئے سوچا۔

''امّاں تم ہمارے اندھیروں میں روشنی کہاں سے لاؤ گی؟''

❖❖○❖❖

''اللہ کتنا اچھا موسم ہو رہا ہے۔'' نفیسہ نے خوشی سے بادلوں سے گھرے آسمان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''خاک اچھا موسم ہے، ساری دُھول مٹی آنکھوں میں گھسی چلی آرہی ہے۔'' فیصل نے تیز ہَوا سے حال ہوتے ہوئے کہا۔

''ویرے! تم ولایت میں جا کر کچھ زیادہ نازک نہیں بن گئے! تمہیں اگر یاد ہو تو اِسی دھول مٹی اور ان کے تم کِس قدر دیوانے تھے۔ وہاں جا کر انگریزوں کی طرح نخریلے ہوگئے ہو۔'' نفیسہ نے کچی پگڈنڈی پر تیز تیز چلتے ہوئے کہا۔ جواب میں فیصل دھیرے سے مسکرادیا۔

''کبھی انسان اپنی جڑوں سے الگ ہو کر جی پایا ہے؟ مجھے ہمیشہ سے خیال رہا ہے کہ مجھے اپنے وطن، گاؤں واپس جانا ہے، مجھے اپنا گاؤں اِس کا ماحول اور اپنے لوگ ہر جگہ سے عزیز ہیں۔ ہاں تمہاری بات کچھ درست ہے کہ باہر رہ کر میں اِن موسموں کا کم عادی نہیں رہا لیکن بہنا! کچھ روز میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' فیصل نے خوش دلی سے اپنے گھنے اُڑتے بالوں کو ماتھے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''ویرے! اب تو تم بڑے ڈاکٹر بن گئے ہو، تم پھر شہر چلے جاؤ گے اور ہم ہمیشہ کی طرح تمہاری شکل دیکھنے کو ترستے رہ جائیں گے۔'' نفیسہ نے رُک کر فکر مندی سے بھائی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اوہ میری چھوٹی سی چھوٹے دِل والی بہنا! میں نے اگر جانا ہوتا تو واپس ہی کیوں آتا؟ میں انشاء اللہ یہاں اپنے گاؤں میں چھوٹا سا ہسپتال بناؤں گا، مجھ پر اِس مٹی کا اِس زمین کا بے حد قرض ہے جو مجھے یہاں کے لوگوں کی خدمت کر کے اتارنا ہے۔'' فیصل کی یقین دہانی نے نفیسہ کے سب وسوسوں کو بھاپ کی طرح اُڑادیا۔

''اچھا تم یہ بتاؤ کہ یہ لمّاں کن عقیدوں کو پامال کر بیٹھی ہیں، ہر جمعرات کو تم لوگ درگاہ پر دیا جلانے جاتے ہو یہ سب کیا ہے؟ دنیا چاند پر پہنچ گئی اور ایک یہ ہمارے لوگ ہیں جو کنویں کے مینڈک بنے بیٹھے ہیں۔'' آج ماسی صابراں کی طبیعت خراب تھی، اِس لیے انہوں نے فیصل کو زبردستی نفیسہ کے ساتھ درگاہ پر بھیجا تھا وہ ہر جمعرات کو درگاہ پر حاضری ضرور دیتی تھیں۔

''یہ سب کچھ آپ لمّاں سے کہنا، بہرحال مجھے پہلے رانی کو لینے اُس کے گھر جانا ہے وہ بھی درگاہ جانے کے لیے میرے انتظار میں بیٹھی ہوگی۔''

''مائی گاڈ! کیا یہاں کی ساری عورتیں اتنے ہی کم زور عقیدے کی ہیں!'' فیصل نے واقعی پریشان ہو کر پوچھا۔

''مجھے نہیں پتا! آپ بہت مشکل باتیں کرنے لگے ہو۔'' نفیسہ نے فیصل کی بے زاری دیکھ کر موضوع بدل دیا۔

رانی اپنے گھر کے دروازے کے پاس ہی کھڑی تھی۔ فیصل کو دیکھ کر اُس کی سانولی رنگت میں سُرخی

جھلک پڑی، بار بار انگلیوں پر چادر کا کونا لپیٹنا اس کے اندر کے اضطراب کو واضح کر رہا تھا۔

''یہ فیصل آج یہاں کیسے؟'' رانی نے نفیسہ سے ملتے ہوئے ہلکی سی سرگوشی میں پوچھا۔

''تمہیں میرا آنا اچھا نہیں لگ رہا تو تم دونوں اکیلی چلی جاؤ۔'' فیصل درگاہ جانا نہ چاہ رہا تھا۔ چھڑا کر نکلنا چاہتا تھا۔

''ارے! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' رانی نے گھبراتے ہوئے کہا۔

''چلیں چلتے ہیں... موسم تو آگے ہی خراب ہو رہا ہے۔'' رانی نے فوراً ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

ہَوا میں بے حد تیزی آ گئی تھی۔ فیصل منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ ابھی انہوں نے نہر کا پُل ہی کیا تھا کہ بارش زوروں کی شروع ہوگئی ساتھ ہی بادلوں نے سورج کو اس طرح ڈھانپ لیا کہ اُجالا رات کے اندھیرے میں بدل گیا۔ رانی نے ڈر کر نفیسہ کا بازو زور سے پکڑ لیا۔

''اب جلدی چلو!'' فیصل پھاڑ کھانے کو دوڑا تھا۔

جب وہ درگاہ پہنچے تو اچھے خاصے بھیگ چکے تھے۔ نفیسہ اور رانی عورتوں کے حصّے کی جانب بڑھ گئیں جس کو چقوؤں سے الگ کیا گیا تھا۔ فیصل مردانے میں آ گیا، پھر جانے اُسے کیا سوجھی وہ برآمدے کی سیڑھیوں میں آ کر بیٹھ گیا۔ بارش کا رُخ دوسری جانب تھا۔ اُس پر ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی جو اتنی گرمی کے بعد بہت بھلی لگ رہی تھی۔ سامنے بوڑھا برگد ہَوا سے اِدھر اُدھر جھوم رہا تھا اور اُس کے نیچے کا سائیں لوک پیروں میں گھنگھرو باندھے اُس سے زیادہ تیز جھوم رہا تھا۔ ہَوا اُس کے لمبے چولے کُرتے میں بھر کر اُسے غبارہ سا بنا گئی تھی لیکن وہ اِن سب سے بے خبر اپنے دائرے میں گھومنے میں گم تھا۔ اُسی پَل درگاہ میں چار خواتین بھاگتی ہوئی برآمدے کی طرف آئیں، ہَوا اُن کے کپڑوں اور چادروں سے چھیڑ خانی کر رہی تھی۔ اُوپر سے تیز بارش جو آنکھوں میں گھسی چلی جا رہی تھی۔ سیڑھیوں سے پہلے کا فرش کچا تھا۔ پاؤں زمین میں دھنستے تھے۔ بس سیڑھیاں اور اندر سے درگاہ پکی اینٹوں سے بنی ہوئی تھی۔ فیصل نے لاشعوری طور پر اُن کو دیکھا، دو نے چہرے چادروں میں چھپائے ہوئے تھے جبکہ دو کھلے تھیں۔

''ہائے اللہ! میرے پاؤں گندے ہوگئے!'' بے حد سُریلی اور نخریلی آواز برآمدے کی سیڑھیوں کے پاس آ کر اُبھری۔

''بشیراں سامنے کنویں سے تھوڑا پانی لا کر بی بی کے پاؤں دُھلا دو۔'' ایک باوقار آواز نے کھلے منہ والی عورت سے کہا۔ وہ یقیناً اُن کی ملازمہ تھی۔

''بی بی آپ چھوٹی بی بی کو لے کر زنانے میں جاؤ، میں سدرہ بی بی کے پاؤں دھلا کر لاتی ہوں'' بشیراں نے کہا۔

''ٹھیک ہے جلدی آنا!'' وہ بھی شاید بارش کی تیزی سے گھبرا کر اندر چلی گئیں کیوں کہ ہَوا اپنے رُخ کو بدل کر اب بارش کا پانی برآمدے میں پھینک رہی تھی۔

''بی بی آپ ذرا اِدھر ستون کے پیچھے ہو جاؤ، بارش سیدھی آپ پر پڑ رہی ہے۔'' بشیراں نے کہا۔

''اب خیال آ رہا ہے ہماری پریشانی کا، تب نہ آیا جب امّاں جان کو اُلٹی سیدھی پٹیاں پڑھا کر ا

لے کر آئیں، اب جاؤ پانی لاؤ، میرے سارے پاؤں گندے ہوگئے ہیں۔'' سدرہ کی سریلی آواز فیصل کو متوجہ کر لیا تھا۔

بشیراں ڈانٹ کھا کر باہر بھاگی، سدرہ اور مریم کو سید نوازش علی نے اس قدر پیار اور نازوں سے پالا تھا کہ انہوں نے کبھی ننگا پاؤں زمین پر نہ رکھا تھا۔ سدرہ تو زیادہ نازک اندام تھی۔ کبوتر کی طرح پاؤں ذرا جو گندے ہو جاتے تو وہ بے چین ہو جاتی تھی۔

فیصل نے دل چسپی سے اِس بھیگی لڑکی کو دیکھا، جو گاؤں میں رہ کے مٹی سے گھبراتی تھی۔

فیصل ایک دَم مسکرا دیا، وہ خود بھی تو گارے مٹی سے گھبرا جاتا تھا۔ سدرہ کی نظر اپنی جانب تکتے فیصل پر پڑی، اُس کا دل بے حد تیزی سے دھڑکا۔ وہ گاؤں کے جوانوں سے بے حد مختلف تھا۔ اُس کا حُلیہ پھر بے حد خوب رو بھی تھا۔ زندگی میں پہلی بار کوئی مرد یوں اکیلے میں اُس کے قریب بیٹھا تھا۔ نہ صرف بیٹھا تھا بلکہ اُس کا بھرپور جائزہ بھی لے رہا تھا۔ سدرہ نے بے چینی سے رُخ بدل لیا لیکن ہَوا کو اُس کی یہ حرکت پسند نہ آئی وہ شرارت سے اُس کے کپڑوں میں گھسی چلی آ رہی تھی۔ سدرہ نے بے اختیار قمیص کے دامن پر ہاتھ رکھے لیکن جس ہاتھ سے وہ چادر سے منہ چھپائے کھڑی تھی وہ چھوٹنے سے اُس کا چہرہ ایک دم کھل گیا، چادر پھڑ پھڑا کر فیصل کے منہ پر آئی۔ فیصل کو ایک دَم موتیے کی خوشبو نے آ گھیرا۔

''موتیا!'' اُس نے پکارا، ساتھ ہی چہرے سے چادر ہٹا کر اُسے دیکھا اور پھر ایک دَم مبہوت رہ گیا۔ دراز قد، دراز بالوں کے ساتھ سامنے بے حد خوب صورت آنکھوں والی ڈری سہمی لڑکی کھڑی تھی۔

''کچھ پَل جادو اثر ہوتے ہیں، اپنا کام دکھا جاتے ہیں۔'' اور اِس پَل نے دونوں کے دلوں پر سحر کر دیا تھا۔ فیصل بے خود اُسے دیکھتا ہاتھ میں چادر کا کونا تھامے اُس کی جانب بڑھا۔

''یہ لیں۔'' اُس نے آگے بڑھ کر چادر اُسے تھمائی، جو بالکل بے جان ہو کر رہ گئی تھی۔

سدرہ کے ہاتھ اور ہونٹ لرز رہے تھے۔ اُس نے بے جان ہوتے وجود کے ساتھ چادر کو پھر سے لپیٹ لیا۔ فیصل کو یوں لگا کہ چاند پھر سے بادلوں میں چھپ گیا ہو، سدرہ کانپتی ٹانگوں کے ساتھ ستون کی اوٹ میں ہوگئی۔

فیصل اِس قدر بے خود تھا کہ وہ چاہتے ہوئے بھی وہاں سے ہٹ نہ سکا بلکہ کچھ فاصلے پر بنی سیڑھیوں پر دوبارہ بیٹھ گیا اِس بات سے بے خبر کہ وہ بارش میں بُری طرح بھیگ رہا تھا۔

''لو بی بی! پانی! پاؤں دھو لو۔'' بشیراں ہانپتی ہوئی پانی کی مٹکی اُٹھائے اس کے پاس پہنچی۔

سدرہ نے اپنے پاؤں جوتی سے نِکال کر سامنے کر کے شلوار کا پائنچہ اونچا کر دیا۔ بشیراں نے جلدی جلدی پانی سے اُس کے پاؤں دھوئے پھر جوتی دھو کر اُس کے پیروں میں پہنا دی۔ سدرہ کے پاؤں کی نرم گلابی ایڑی دیکھ کر فیصل کے دل میں بے اختیار خیال آیا کہ اِن پیروں میں پازیب کس قدر اچھی لگے گی۔

سدرہ نے چور نگاہوں سے فیصل کی جانب دیکھا۔ وہ اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ سدرہ سے اپنے دل کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا، جو عجیب طرح سے دھڑک رہا تھا۔

''چلو بی بی چلیں!'' بشیراں نے اُسے بلا کر چونکا دیا۔

''آ... ہاں چلو۔'' وہ اندر کی جانب بڑھیں، فیصل نے اُسے بے چینی سے واپس جاتے دیکھا۔
نے بھی اُسی پَل مُڑ کر اُسے دیکھا۔

''موتیا!'' وہ دھیرے سے پکارا۔

''ہوں!'' سدرہ نے بے اختیار پھر پلٹ کر دیکھا۔

''موتیا!'' فیصل پھر بولا، وہ شاید اُس کا نام پوچھ رہا تھا۔

''سدرہ بی بی جلدی چلو!'' بشیراں جو آگے بڑھ چکی تھی زور سے بولی، بارش نے بے چاری کا حال کر دیا تھا۔ اُسے اندر جانے کی جلدی تھی۔

''نہیں سدرہ!'' سدرہ کو جانے کیا ہوا وہ رُک کر بولی۔

''نہیں! موتیا ہو تم!'' فیصل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

سدرہ گھبرا کر اندر بھاگی لیکن فیصل کو لگا کہ جو چیز اتنے سالوں سے اُس کے دائیں جانب دھڑک دل کا احساس دلاتی تھی۔ وہ اب لگتا تھا کہ وہاں نہیں ہے۔ وہ چُپ چاپ کھڑا ابھی تک وہیں دیکھ رہا جہاں سے سدرہ اندر گئی تھی۔

''آگ کے قریب گھی رکھو اور کہو کہ گھی پگھلے گا نہیں!
آگ کے نزدیک پیٹرول رکھ دو اور کہو کہ پیٹرول آگ پکڑے گا نہیں!
بارش میں کسی کو دھکیل دو اور کہو کہ یہ بھیگے گا نہیں!
کسی کے زور سے چاقو گھونپو اور کہو کہ خون نکلے گا نہیں!'' فیصل نے مُڑ کر دیکھا، یہ سائیں لوک تھا اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''کیا مطلب ہے بابا؟'' فیصل نے برآمدے کے اندر جاتے ہوئے پوچھا، بابا نے اپنا ایک پاؤ زور سے زمین پر مارا۔ گھنگھروؤں کی چھن چھن کی آواز دُور تک گئی۔

''محبت! یہ سب محبت کا کھیل ہے، یہ محبت کی جگہ ہے یہاں کا سے بھی محبت کے گرد بھاگتا ہے اپنی خواہشوں کی محبت کا دیا جلاتا ہے اور کوئی اپنے دِل کا دیا جلاتا ہے ہر کوئی اپنی اپنی چاہ کو پانے یہاں آتا ہے!'' سائیں لوک نے ہنستے ہوئے کہا۔

دھن دے جی راکھیے جی رے رکھیے لاج
جیو لاج دھن دیجیے اِک پربت کے کاج
پربت کرے ایسی کرے جیسے راسی ڈور
گلا پھنساوے اپنا لاوے نِر جھکور

(محبت کا سبق ڈول اور رسی سے سیکھو، ڈول گلے میں پھندا ڈال کر پانی لاتا ہے)

فیصل کے دل پر سائیں لوک کی باتیں جادو کی طرح اثر کر رہی تھیں۔

''محبت بہت قیمتی شے ہے پُتر!'' سائیں لوک نے اُس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ ہوئے کہا۔

''جان، عزت اور دولت دے کر بھی ملے تو لے لو۔ محبت وہ نہیں ہوتی کبھی ہو جائے، کبھی سو جا محبت تو وہ ہے جو روم روم میں بس جائے۔ محبت کی نشانی تو یہ ہے کہ جو پریم رس پی لیتا ہے وہ خوشی خو

رے دیتا ہے۔'' سائیں لوک نے کہہ کر اپنا ڈنڈا اُٹھا کر جھومنا شروع کر دیا۔ فیصل کتنی ہی دیر اُس کا انتظار کرتا رہا کہ وہ کچھ کہے، لیکن سائیں لوک پھر سے بے نیاز اور مگن ہو چکا تھا۔ اُس کے پاؤں اِک سی لے میں اُٹھ کر زمین پر آ رہے تھے۔ وہاں نہ ساز تھا نہ آواز لیکن یوں لگ رہا تھا کہ وہ کسی خاص دُھن پر ناچ رہا ہے اور یہ دُھن صرف اُسے ہی سنائی دے رہی تھی۔

''جو پریم کا رس پی لیتا ہے وہ خوشی خوشی سر دے دیتا ہے!'' فیصل کے گرد جیسے سائیں لوک کے لفظ اپنے لگے تھے۔

''کیا مجھے محبت ہو گئی ہے؟'' فیصل نے بے اختیار سوچا، ساتھ ہی دو بھوری آنکھیں اُس کے ذہن کے پردے پر اُبھریں۔

موتیا! وہ مسکراتا ہوا اندر چلا گیا، جہاں رانی اور نفیسہ اُس کے انتظار میں کھڑی تھیں۔

❖❖○❖❖

''ماشاء اللہ! ماشاء اللہ! میری دھی رانی آئی ہے!'' زلیخا بی بی آگے بڑھ کر عائشہ سے ملیں۔

''السلام علیکم!'' عائشہ نے آگے بڑھ کر اُنھیں سلام کیا اور سر جھکا کر اُن سے پیار لیا۔

''وعلیکم السلام! جیتی رہو، اللہ سائیں تمہیں ہمیشہ خوش رکھے آباد رکھے۔'' زلیخا بی بی نے دل سے اُسے دُعائیں دیں۔

''تمہارے بابا کی طبیعت کیسی ہے؟'' زلیخا بی بی نے عائشہ سے پوچھا، جس کے صبیح چہرے پر اُداسی نے ڈیرا ڈال دیا تھا۔

''وہ ٹھیک نہیں ہیں، مجھے وہ صحیح طرح سے کچھ نہیں بتاتے لیکن جس طرح اُن کی صحت گر رہی ہے اِس سے صاف لگتا ہے کہ معاملہ بہتری کی جانب نہیں ہے۔ تائی جان میرا دل بے حد گھبراتا ہے میں نے تو ماں بھی نہیں دیکھی، میری زندگی کا قیمتی ترین اثاثہ میرے بابا ہیں۔ اللہ اُن کو صحت تندرستی لمبی زندگی دیں۔'' عائشہ کے لفظ لفظ میں باپ کے لیے محبت جھلک رہی تھی۔

''ربّ سائیں سے دُعا کرو، دُعا تقدیر بدلتی ہے، یہ ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے، اللہ تمہارے باپ کو لمبی حیاتی دے۔ وہ تیری اور تیرے بچوں کی خوشیاں اُسے دیکھنا نصیب کرے، تُو دِل نہ تھوڑا کر سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' زلیخا بی بی نے اُسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

عائشہ کے اندر تک سکون اُتر آیا۔ ماں کا لمس اور اُس کی آغوش کی خوشبو کیسی ہوتی ہے، یہ وہ نہ جانتی تھی لیکن زلیخا بی بی کے سینے سے ممتا بھری خوشبو نے اُسے ایک دَم پُرسکون کر دیا تھا۔ اُسے اپنے بابا کا فیصلہ ایک دَم بہت اچھا لگا، زلیخا بی بی جیسی پیار کرنے والی، خیال کرنے والی ساس واقعی کسی بھی لڑکی کی خوش قسمتی ہی ہو سکتی تھی۔

''امّاں جان کدھر ہیں بشیراں؟'' سید سرفراز علی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا، سامنے ہی عائشہ بیٹھی تھی اُس نے گھبرا کر منہ موڑ لیا۔

''شاید یہ سید عبداللہ ہے!'' اس سوچ نے اُس کی نگاہ زمین میں گاڑ دی۔

''السلام علیکم بڑی امّاں!'' سید سرفراز کی نگاہ عائشہ پر تھی لیکن سلام وہ زلیخا بی بی کو کر رہا تھا۔

''وعلیکم السلام! جیتے رہو۔'' زلیخا بی بی نے جواب دیا۔

''کون ہے یہ اپسرا؟'' سید سرفراز کی کم زوری خوب صورتی اور عورت تھی اور یہ لڑکی تو بالکل الگ سی تھی۔ حالاں کہ کچھ عرصے سے وہ زبیدہ کے متعلق سوچتا تھا کہ وہ بالکل الگ سی لڑکی ہے۔

''بڑی اماں مہمان کدھر سے آئے ہیں؟'' سید سرفراز کی بے باکی اکثر زلیخا بی بی کو چبھتی تھی۔ لیکن اِس وقت وہ عائشہ کی وجہ سے بے حد خوش گوار موڈ میں تھیں۔

''آجاؤ سرفراز! اپنی بھرجائی کو سلام کرو، یہ عبداللہ کی منگ ہے۔'' یہ سن کر عائشہ کے تنے ہوئے اعصاب پرسکون ہوگئے۔

''بھائی صاحب کی منگ میری بھرجائی؟'' سید سرفراز نے چونکتے ہوئے کہا۔

''لیکن یہ منگنی کب ہوئی کہ مجھے خبر ہی نہ ہوئی۔'' سرفراز کو اپنی لاعلمی پر واقعی دُکھ ہوا تھا۔ جانے کیا بات تھی کہ سید سرفراز یہ خبر سُن کر بے حد بے چین ہوگیا۔

''السلام علیکم! کیا نام ہے آپ کا؟'' سید سرفراز نے سامنے آتے ہوئے پوچھا اور دل کا ملال بے حد بڑھ گیا۔ ہر اچھی اور نایاب چیز بھائی عبداللہ کے حصّے میں ہی کیوں آتی ہے۔ وہ بِنا نظر ہٹائے اسے دیکھے گیا۔ عائشہ ایک لڑکی تھی اور لڑکی مرد کی ہر نگاہ پہچانتی ہے، یہ راڈار تو اللہ نے ہمیشہ سے اُس کے اندر رکھا ہے۔

عائشہ نے سلام کا جواب تو دے دیا لیکن اُس کے دِل پر ناگواری سی چھا گئی تھی۔ اکلوتا دیور وہ بھی نظر کا بُرا...!

اُس کا دل بے حد بُرا ہوا تھا۔

❖❖○❖❖

گزر رہی ہے زندگی
نہ آس ہے نہ بے خودی
نہ بے قراریاں ہیں اب
نہ جستجو کوئی رہی
کہاں پر ہوں میں کیا پتا
میں چل رہی ہوں بس یوں ہی
نہ جانے کس خیال میں
یہ اشک بھی ہیں تھم گئے
اور دل میں اِک سوال ہے
بس اتنا مجھ کو یاد ہے
میں تھک گئی ہوں بے سبب
نہ جانے کیسے کس گھڑی میں
مر گئی ہوں بے سبب

بے شک بہت سارا گزر گیا تھا لیکن وہ کچھ پلوں میں قید ہوکر رہ گئی تھیں۔ وہ بے رحم عمل! جو اُن کی زندگی کا رُخ بدل گئے تھے جو کسی آسیب کی طرح اُن کی خوشیوں سے چمٹ گئے تھے۔ اب اِس زندگی میں کوئی روشنی نہ تھی بس اِس آسیب کا سایہ ہی رہ گیا تھا۔ زخموں کو اگر پالا جائے تو وہ ناسور بن کر روگ بن جاتے ہیں۔

جانے کون سا پہر تھا، وہ یوں ہی بے چین پھر رہی تھیں۔ اتنے ٹھنڈے موسم میں بِنا کوئی گرم لیے وہ برف ہوتے اعصاب کے ساتھ کھڑکی میں کھڑی تھیں۔ چاند پورا تھا اُس کی روشنی میں بھوتوں کی طرح لگ رہے تھے۔ انہوں نے جھرجھری لی، اچانک ہی سارے درخت ایک ہی شکل اختیار کر گئے تھے وہ شکل جو اُنھیں کبھی نہ بھولتی تھی، جس کی وجہ سے اُن کو اپنا آپ بے حد لگنے لگتا تھا۔ دھیرے دھیرے اُس چہرے نے اُن کی جانب آنکھیں گاڑ کر قہقہے لگانے شروع کیے۔ زبیدہ بیگم نے ایک بڑی سی چیخ ماری اور لہرا کر گر گئیں۔

''زبیدہ!'' قاسم علوی آدھے سوئے جاگے اُن کی جانب بڑھے۔

''چھوڑ دو! چھوڑ دو! مجھے چھوڑ دو...!'' وہ بے ہوشی میں مسلسل کسی سے لڑ رہی تھیں۔

''میں نے تو تم سے سچی محبت کی تھی! تم... تم میرے ساتھ دھوکا کیسے کر سکتے ہو؟'' یہ وہ سوال تھا، جو سالوں سے یوں ہی دہرا رہی تھیں۔ قاسم صاحب نے گہرا سانس کھینچا!

''زبیدہ بس کردو اِس سوال کو خود سے پوچھنا! اِس سوال کے چکروں میں تم ہم سے بہت دُور ہو چکی ہو ان دیواروں کے باہر تم کو کوئی بھی دکھائی نہیں دیتا، پلیز واپس آجاؤ!'' انہوں نے زبیدہ بیگم کے دھان وجود کو اُٹھا کر بیڈ پر لٹاتے ہوئے کہا۔

''بہت سارا وقت گزر گیا ہے، دیکھو زندگی کے بے حد قیمتی سال تمہارے اِس پچھتاوے میں گزر گئے اب میں تھکنے لگا ہوں، جوانی ختم ہو چکی ہے بڑھاپا آنے کو تیار کھڑا ہے، کیا تم اب بھی واپس نہ آؤ گی؟'' زبیدہ بیگم سے بے حد خاموش محبت کرنے والے قاسم علوی آج اپنے شکوے کو آواز دے گئے تھے۔ ساری زندگی دھوپ کی طرح گزری تھی۔ کچھ عرصے سے اُن کو شدید طلب ہونے لگی تھی کہ چھاؤں کا سایہ ملے اور وہ بھی دو گھڑی آرام کرلیں۔

''کاش تم لوٹ آؤ!'' انہوں نے دُکھتے سر کے ساتھ آنکھیں بند کرتے ہوئے دُہرایا، اُن کے جسم کا ایک حصّہ دُکھنے لگا تھا۔ روح اور جسم کی طلب نے اُن کو جب بے حال کر دیا تو انہوں نے کروٹ لے کر زبیدہ بیگم کو دیکھا۔

''زبیدہ تم کو جلد واپس ہونا ہوگا، زندگی کی یہ دھوپ اب ناقابلِ برداشت ہوگئی ہے، میں تھکنے لگا ہوں!'' ایک گہرا سانس اُن کے سلگتے وجود سے نکلا جب کہ زبیدہ بیگم خود سے بیگانہ اُن سے بیگانہ ہوش و حواس سے دُور گہری غنودگی میں چلی گئی تھیں۔

❖❖○❖❖

وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا' اب اس کا حال بتائیں کیا
کوئی مہر نہیں کوئی قہر نہیں' پھر سچا شعر سنائیں کیا

ایک ہجر جو ہم کو لاحق ہے، تادیر اِسے دہرائیں کیا
وہ زہر جو دِل میں اُتار لیا، پھر اِس کے ناز اُٹھائیں کیا

''مائی گاڈ! یہ ترنم تو چھپی رستم نکلی! اِس کی آواز میں کس قدر سوز ہے، کس قدر سحر ہے۔'' پارو
کہا۔ نیو ایئر پارٹی کی تیاریاں ہو رہی تھیں جب ترنم نے ہال میں قدم رکھا تو مونا وہاں شوقیہ بیٹھی سا
گانا سُنا رہی تھی بلکہ سب ہی باری باری کچھ نہ کچھ سُنا رہے تھے۔ ترنم کی باری آنے پر وہ وہاں سے ا
چاہ رہی تھی لیکن ماہ رخ نے اُسے زبردستی روک لیا اور گانے پر مجبور کیا۔

اب وہ جس خوب صورت آواز سے غزل سُنا رہی تھی۔ سب لڑکیوں کے لیے حیران کن تھا۔

اِک آگ غم تنہائی کی، جو سارے بدن میں پھیل گئی
جب جسم ہی سارا جلتا ہو، پھر دامنِ دل کو بچائیں کیا

وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا...!

دو آنسو موتیوں کی طرح اُس کی خوب صورت آنکھوں سے ٹپکے، ترنم نے آنکھیں ایک دَم کھ
ولی کا مسکراتا ہوا چہرہ اُس کے سامنے تھا۔ اُس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

واؤ! ونس مور... ونس مور! سب لڑکیوں نے کورس میں اصرار شروع کر دیا تھا۔ ترنم کا دِل کانوں م
دھڑکنے لگا۔

''یا اللہ! مجھے محبت کی اس دلدل سے بچا!'' ترنم نے گھبرا کر کانوں پر ہاتھ رکھے۔

''ونس مور... ونس مور۔'' لڑکیوں نے تالیاں بجا بجا کر شور مچایا۔

''نہیں... نہیں! وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر ہال سے باہر بھاگی۔ دروازے پر وہ میڈم راگنی سے ٹکرا
ٹکراتی بچی۔

''سوری میڈم!'' وہ اپنے آپ پر قابو پا کر بولی۔ اُس کی آواز ابھی تک رندھی ہوئی تھی۔

''اِٹس او کے! بٹ آر یو آل رائٹ؟'' میڈم راگنی نے اُس کی سرخ ہوتی آنکھوں کو دیکھتے ہو
پوچھا۔

''یس۔'' وہ گھبرا کر وہاں سے نکلی اور تقریباً بھاگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔

''یہ ابھی کون گا رہا تھا۔'' میڈم راگنی نے ہال میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ہم سب ہی کچھ نہ کچھ گا رہے تھے میڈم!'' پارو نے ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں! میں ابھی کی بات کر رہی ہوں، یہ غزل کون گا رہا تھا۔'' میڈم راگنی نے وہاں ایک لڑکی
خالی کی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''وہ... وہ تو اپنی ترنم تھی۔'' ماہ رخ نے کہا۔

''اِس لڑکی ترنم کی آواز میں تو واقعی بہت ترنم ہے۔ میں حیران ہوں کہ چاندنی لڑکیوں کا در
استعمال نہیں کرتی رہی۔ ہر ہیرے کی الگ الگ چمک ہوتی ہے یہ جوہری پر منحصر ہوتا ہے کہ کس ہیر
کس طرح تراش کر اُس کی چمک اور شکل کو سامنے لاتا ہے۔ ہمارے ہاں شاعرانہ مزاج رکھنے والی
نازک لڑکیاں بیورو کریسی میں خاص مقام رکھتی ہیں۔ پڑھے لکھے ماحول میں ایسی لڑکیاں بے حد

ملی ہیں۔ ماہ رخ تم اُسے میرے پاس بھیجو! آج کل ایک آفیسر بہت مشکل ثابت ہو رہا ہے اُسے
انے کے لیے بہت خاص طرح کی لڑکی چاہیے، میرا خیال ہے ترنم ہی وہ رائیٹ گرل ہے!'' میڈم
گنی نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔

''ماہ رخ وہ تمہاری دوست ہے نا!'' اچانک ہی میڈم راگنی نے اُس سے سوال کیا۔

''جی...!'' ماہ رخ اندر سے کچھ گھبرائی۔

''راز کے معاملے میں اِس لڑکی کا پیٹ کیسا ہے؟'' میڈم راگنی نے پُرسوچ انداز میں پوچھا۔

''اوہ!'' ماہی نے پُرسکون ہوتے ہوئے گہرا سانس لیا۔

''بہت گہری ہے میڈم! مشکل کام بھی کر لیتی ہے۔'' ماہ رُخ نے گارنٹی دی۔

''اِس کا مطلب ہے میں ایک بہت اہم پروجیکٹ کا کام اِن سے لے سکتی ہوں۔'' میڈم راگنی کے
ے پر نہایت شاطر مسکراہٹ تھی۔

''منشی میں نے تم کو لڑکی لانے کو کہا تھا!'' سید سرفراز اِس وقت نشے میں دُھت تھا۔ اُسے لطف کے عروج پر دوہرے نشے کی ضرورت ہوتی تھی اور یہ نشہ وہ عورت کے وجود سے حاصل کرتا تھا۔ چاہے اس کے لیے کسی غریب مزارے کی عزت ہی کیوں نہ داؤ پر لگتی۔

''وہ.... وہ سائیں!'' منشی نے تھوک سے حلق تر کرتے ہوتے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

''کیا... ؟'' سید سرفراز زور سے دھاڑا۔

''وہ جی میں نے تو منظورے کو پیسے دے کر بندوبست کرنے کا کہہ رکھا تھا لیکن عین وقت پر لڑکی آ سکی!'' منشی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ سید سرفراز نشے میں بالکل وحشی جانور بن جاتا تھا۔

''منشی! تم وہ میرو کی بہن کا پتا کرو، کم بخت اتنی جوانی لیے اَن چھوئی کب تک پھرے گی۔'' سید سرفراز کا قہقہہ بے حد مکروہ تھا۔

''جی سائیں...!'' منشی کی مری مری آواز نکلی۔

جب سے اُس کے اپنے گھر بیٹی پیدا ہوئی تھی، اُسے لڑکیاں سپلائی کرنے کا کام نہایت گھٹیا لگنے لگا تھا۔

''کم بخت نے دلال بنا کر رکھ دیا ہے، اچھا ہوتا جو میں شہر جا کر کوئی مزدوری کر لیتا، لوگوں کی دُعاؤں سے تو بچ جاتا، جس لڑکی پر اِس آدمی کی نگاہ پڑ جاتی ہے وہ تو زندگی بھر کے لیے میلی ہو جاتی ہے۔'' منشی سید سرفراز کو نشے میں دُھت چھوڑ کر بڑبڑاتا باہر نکل آیا۔

❖❖○❖❖

''سچ مچ! خبر تو واقعی خوشی والی ہے میرو کی ماں!'' میرو کے باپ دین محمد نے لسی کا گلاس ہاتھ میں تھامتے ہوئے کہا۔

''بس اُس ربّ سائیں کے ہاں دیر ہو سکتی ہے اندھیر نہیں۔'' میرو کی ماں نے اپنے شوہر کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''لیکن ایک بات جو تھوڑی مسئلے والی ہے، وہ یہ کہ دائی نے کہا ہے کہ بشریٰ نو مہینے بڑے آرام سے رہے، کوئی بھاری کام تو دُور کی بات ہے اُس نے اُسے گھر کے عام کاموں سے بھی روک دیا ہے اللہ نے سولہ سال بعد یہ خوش خبری دکھائی ہے۔ بشریٰ تو بہت خوش ہے لیکن ویر الٰہی بخش بڑا ڈرا ہوا ہے۔ دائی نے کہا ہے کہ بشریٰ کی احتیاط ہی بچے کی زندگی بچا سکے گی۔'' میرو کی ماں نے اپنے دیور اور دیورانی کے متعلق بتاتے ہوئے فکر کا اظہار کیا۔

''اللہ سائیں سب خیر کرے گا۔'' دینو نے بھی فکر مندی سے دُعا دی۔ سولہ سال پہلے بھائی کے ہاں اللہ نے خوش خبری دکھائی تھی۔ جڑواں لڑکے تھے لیکن بشریٰ اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے بچوں سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ جب سے آج تک اُس کی گود خالی تھی۔

''الٰہی بخش نے رانی کو اپنے ہاں بھیجنے کا کہا ہے۔'' میرو کی ماں نے چنگیر اور لسّی کا گلاس اُٹھاتے ہوئے کہا۔

''تقریباً سال بھر کی ہی بات بن جائے گی۔ اتنا لمبا کہاں رانی کو اکیلے چھوڑوں۔'' میرو کی ماں گھبرا رہی تھی۔

''اوہ نیک بخت! وہ اُس کے سگے چاچا چاچی کا گھر ہے پھر ساتھ والا گاؤں ہے۔ تو اللہ کا نام لے کر اُسے وہاں چھوڑ کر آ...''

''اگر بشریٰ کے ساتھ دوبارہ کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو ساری عمر کے لیے ہمارا نام بدنام ہو جائے گا کہ مشکل وقت میں بھائی بھائی کے کام نہ آ سکا۔ اب بشریٰ کے میکے میں بھی کوئی نہیں ہے ورنہ اور بات تھی۔'' دین محمد نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

''رانی رہ لے گی تو نے رانی سے پوچھا۔'' دین محمد کو ساتھ ہی بیٹی کی فکر ستائی۔

''سوائے نفیسہ کی جدائی کے اُسے اور کوئی بات نہیں تنگ کرتی، وہ تو سُن کر بڑی خوش ہے ویسے بھی بشریٰ رانی کو دھیوں کی طرح چاہتی ہے، کیسے ہر تہوار پر اُس کے کپڑے جوڑوں کے ساتھ ہار بُندے لاتی ہے، رانی کا پراندہ خود اپنے ہاتھ سے بناتی ہے۔ اللہ اُسے اپنی اولاد بھی دے۔'' میرو کی ماں نے دل سے اپنی دیورانی کو دُعا دی۔

''تو پھر ٹھیک ہے رانی کو کہو کہ اپنا سامان تیار کر لے میں بخشو کو تانگے کا کہہ آتا ہوں کہ سویرے تڑکے اپنا تانگہ لے آئے۔ سویرے سویرے نکلیں گے تو دھوپ تیز ہونے سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔'' دین محمد چارپائی سے اُٹھا اور صحن میں بنے کھرے میں ہاتھ دھونے لگا۔

''کہاں جا رہی ہے رانی؟'' میرو نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

''بشریٰ کو اللہ نے خوش خبری دی ہے اب کچھ عرصہ رانی وہیں رہے گی۔'' ماں نے میرو کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا کہ کہیں بیٹے کو کوئی اعتراض نہ ہو۔ وہ اپنی بہن کے بغیر کھانا تک نہیں کھاتا تھا۔

''اماں کیا جانا ضروری ہے؟ اپنا گھر رانی کے بغیر بہت سُونا ہو جاتا ہے۔'' میرو نے وہی بات کی، جس کا ڈر ماں کو تھا۔

''رانی جب بیاہ کر جائے گی تو تیرا کیا بنے گا؟ ارے پگلے بہنوں کے ساتھ اتنا پیار نہیں پالتے، پرایا دھن ہوتی ہیں یہ دھی رانیاں! اِک دن ان کو بابل کا گھر چھوڑ کر جانا ہوتا ہے۔'' ماں نے موضوع بدل دیا اور میرو کا ذہن اصل بات سے ہٹ گیا۔

''اماں ہم رانی کی شادی قریب ہی کریں گے، میری ایک ہی بہن ہے۔'' میرو نے چارپائی پر لیٹتے ہوئے کہا۔

''اللہ سب خیر کرے گا، جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں اللہ میرا دھی کے نصیب چنگے کرے۔'' میرو کی ماں نے بیٹی کے لیے دُعا کرتے ہوئے کہا۔

❖❖○❖❖

''یہ کس کا کمرا ہے؟'' عائشہ نے پیانو کی چکنی سطح پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی ایک بٹن دبا دیا۔ کمرے میں ایک دَم ساز کی آواز اُبھری۔

''عبداللہ سائیں کا ہے یہ کمرا۔'' بشیراں نے اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ پھرتی سے کمرے کی جھاڑ پونچھ کرتے ہوئے کہا۔

''یہاں اتنی دُور جہاں تعلیم ہی بہ مشکل پرائمری تک تصور کی جاتی ہے، تمہارے عبداللہ سائیں نے اپنا لندن آباد کر رکھا ہے۔'' عائشہ نے کمرے کی سجاوٹ اور فرنیچر دیکھتے ہوئے کہا۔

''بی بی جی! یہ ساری باتیں ہمارے لیے خواب ہوسکتی ہیں لیکن آپ بڑے لوگوں کے لیے تو عام سی بات ہے میں بھی جب اِس کمرے میں آتی ہوں تو اس نیلی روشنی پھینکنے والے بُت کو حیران ہوکر دیکھتی ہوں۔'' بشیراں نے خوب صورت مجسّمے کو دیکھتے ہوئے کہا، جس کی آنکھوں میں اصلی ہیرے لگے ہوئے تھے جو دِن میں مختلف اور رات میں مختلف رنگت اختیار کرلیتے تھے۔

''یہ دیکھیں کتنی بڑی تصویر ہے جیسے اصلی ہو۔'' بشیراں نے دیوار پر لٹکی ایک میورل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، جس کے قدرتی مناظر واقعی اصلی کا گمان ظاہر کررہے تھے۔

''تمہارے عبداللہ سائیں کے مزاج تو بڑے آرٹسٹک قسم کے ہیں۔'' عائشہ نے وہیں راکنگ چیئر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کون سے مزاج ہیں بی بی جی؟'' بشیراں نے نہ سمجھنے کے انداز میں پوچھا۔ عائشہ بشیراں کے انداز پر ہنس پڑی، کمرے میں بہت مترنم ہنسی کی گونج اُبھری تھی۔ سید عبداللہ کے قدم دروازے پر ہی رُک گئے۔

''وہ جی جیسے بھی ہیں، سب سے اچھے ہیں اللہ اُن کو وڈی حیاتی دے، بڑے نیک طبیعت کے ہیں اپنے عبداللہ سائیں۔ آج تک کسی کو نگاہ بھر کر نہیں دیکھا۔ نوکرانیوں کو کبھی اکیلے میں اپنے پاس نہیں بلایا۔'' بشیراں نے وہ خوبیاں گنوائیں، جو یہاں کے مردوں میں ناپید تھیں۔ ایسے میں سید عبداللہ تو اُن کو بے حد اچھا لگا کرتا تھا جو نگاہ اور زبان دونوں کا بے حد اچھا تھا۔

عائشہ کے اندر بے حد طمانیت کا احساس اُترا وہ آنکھیں بند کرکے مسکرا دی۔ سید عبداللہ نے بغور اُسے دیکھا گڑیا جیسا سراپا، اُجلی رنگت نین نقش بے حد پُرکشش تھے۔ سر پر دوپٹا جمائے وہ اُسے نہایت پاکیزہ روح لگی۔

''واقعی امّاں جان! آپ کی پسند کی داد دینی پڑے گی، شاید ایسی ہی شریکِ زندگی کا تصور میرے ذہن میں تھا۔'' سید عبداللہ مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔

''سلام سائیں!'' بشیراں نے ماتھے تک ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

''وعلیکم السلام ماسی! کیسی ہو؟'' سید عبداللہ کی آواز پر عائشہ ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''ربّ کا لاکھ شکر ہے۔'' ماسی بشیراں مالک کی اتنی سی نگاہ پر بھی بے حد خوش ہوگئی تھی۔

''السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟'' سید عبداللہ نے عائشہ کی گھبراہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

''وعلیکم السلام!'' عائشہ فطری طور پر شرمیلی تھی۔ اِس وقت بھی سید عبداللہ کا سامنا کرتے ہوئے وہ بے حد گھبراہٹ کا شکار تھی، جس کو سید عبداللہ نے شدت سے محسوس کیا۔

''چچا جان کی کوئی خیر خیریت معلوم ہوئی۔'' سید عبداللہ نے اُسے نارمل کرنے کے لیے سادہ سی گفت شروع کی۔

''جی... جی ہاں! بابا سائیں کا خط بھی آیا تھا۔ پھر شہر میں ہمارے ایک وکیل انکل ہیں ان کے دفتر بابا ایما کی خیریت کا فون بھی آ گیا تھا۔'' عائشہ کی آواز بے حد نرماہٹ لیے ہوئے تھی شاید اُس کی شخصیت کی سب سے بڑی کشش ہی اُس کی آواز اور چہرے کی نرماہٹ تھی۔

''یہاں آپ کو کسی قسم کی تکلیف تو نہیں؟'' سید عبداللہ جب اُس کے سامنے آ کر بیٹھے تو عائشہ کو نگاہ اُٹھانا محال ہوگیا۔ اُس نے بے شک گریجویشن تک تعلیم حاصل کی تھی لیکن سید نوازش علی نے اُس کی تربیت اِس حویلی کی روایات کو مدنظر رکھ کر کی تھی، جس کی وجہ سے عائشہ کے اندر خاص طرح کا حجاب پیدا ہوا تھا۔ جو زلیخا بی بی کو بے حد پسند تھا۔

''جی... جی بالکل نہیں!'' عائشہ نے کمرے میں نگاہ دوڑائی، بشیراں جانے کب چپکے سے کمرے سے جا چکی تھی۔

''آپ پلیز ایزی ہوجائیں۔ مجھے یوں لگ رہا ہے، جیسے میں آپ سے گن پوائنٹ پر گفتگو کررہا ہوں آپ سوائے جی ہاں اور جی نہیں کہ کچھ بول کر نہیں دے رہیں۔'' سید عبداللہ کے بے حد نرم لہجے نے عائشہ کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے کردیے تھے۔

بابا سائیں نے کیوں سید عبداللہ ہی کا انتخاب اُس کے لیے کیا آج وہ جان گئی تھی۔ بابا سائیں نے یہ رشتہ خود سے دینے سے پہلے سید عبداللہ کے کردار و مزاج کی چھان پھٹک لندن میں موجود اپنے دوست سے کروائی تھی۔ عائشہ میں اُن کی زندگی تھی اور وہ اپنی زندگی کو قدر دان ہاتھوں میں دینا چاہتے تھے۔

''اچھا آپ کو کتابوں میں دل چسپی ہے؟'' سید عبداللہ نے اُس کی پسند کی بات پوچھی، جس پر وہ بغیر جھجک کے بول سکتی تھی۔

''جی بالکل ہے۔ مجھے اردو اور انگلش ادب دونوں پڑھنا بے حد پسند ہے میرے بابا سائیں نے میرے شوق کو مدنظر رکھتے ہوئے میرے لیے ایک چھوٹی سی لائبریری بنوا رکھی ہے اور مجھے وہ چھوٹی سی لائبریری کسی جنت سے کم نہیں لگتی۔'' عائشہ بے حد روانی سے بول رہی تھی۔

سید عبداللہ نے اپنی مسکراہٹ پر بہ مشکل قابو پایا آخر وہ عائشہ کو بولنے پر آمادہ کرچکے تھے۔

''کن کن رائٹرز کو آپ پڑھنا زیادہ پسند کرتی ہیں؟'' سید عبداللہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

''قرۃ العین حیدر، امرتا پریتم اور جمیلہ ہاشمی کو میں نے زیادہ پڑھا ہے۔ جمیلہ ہاشمی کا ''دشت سوس'' میرا پسندیدہ ناول ہے۔ انگلش لٹریچر چوں کہ میں نے کالج میں بھی رکھا تھا، اِس لیے میرے پاس تقریباً

سب ہی اچھے رائٹرز کا انتخاب ہے۔"

"گڈ! میرا اپنا خیال ہے کہ کتاب بہترین دوست ثابت ہوتی ہے ہمیں اچھی بری رائے بنانے کے قابل بناتی ہے۔ مجھے اچھا لگے گا اگر آپ سدرہ آپی اور مریم کو بھی اپنی پسند میں شریک کریں۔ خاندانی روایات کی وجہ سے اُن کی تعلیم کا سلسلہ بند ہو گیا ہے، اِس چیز کو میں پسند نہیں کرتا لیکن بڑوں کے آگے بول بھی نہیں سکتا۔"

"مریم کو تو خاصا انٹرسٹ ہے پڑھنے میں۔" سید عبداللہ اِس طرح اپنے دل کی بات کرتے والا اہمیت دیتے بے حد اچھے لگ رہے تھے۔

"جی مجھے اندازہ ہے کیوں کہ مریم کو بے حد شوق ہے پڑھنے کا اِس لیے وہ مجھ سے کالج کے وہاں کی پڑھائی کے متعلق بہت سوالات کرتی ہے لیکن ساتھ ہی وہ اِس بات سے ڈرتی ہے کہ بابا جانے اُس کے شوق کو کس نظر سے دیکھیں۔" عائشہ نے بھی اتنے دِنوں میں جو بات محسوس کی تھی وہ کہہ دی۔

"اِس میں بھی ہمارے ہی سیٹ اپ کی غلطی ہے مردانہ، زنان خانہ بنا کر ہمیں پابند کر دیا گیا ہے بہنیں مجھ سے ملنے سے پہلے ملازمہ کو بھجوا کر مجھ سے وقت لیتی ہیں اور پھر جا کر ملاقات ہوتی حالاں کہ میں اُن کا سگا بھائی ہوں، وہ جب چاہیں میرے پاس آ سکتی ہیں۔ اب ایسے میں وہ کیا سوچتی ہیں میں نہیں جان سکتا!" سید عبداللہ کو واقعی اپنی بہنوں سے بے حد پیار تھا وہ اُن سے دوست بن کر رہنا چاہتا تھا لیکن وہ جب بھی اُن کے پاس آتی تھیں، ڈری سہمی ہی رہتی تھیں۔

"اِس معاملے میں اگر آپ میری مدد کریں گی تو مجھے بے حد اچھا لگے گا۔" سید عبداللہ نے پلکوں کا فاصلہ مٹایا تھا۔

"مطلب؟" عائشہ نے پوچھا۔

"میری دونوں بہنوں کے دلوں میں میرے متعلق گمان درست کرنے میں اور ہمارے درمیان اعتماد پیدا کرنے میں کہ وہ اپنے دِل کی ہر بات مجھ سے شیئر کریں۔" سید عبداللہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"انشاء اللہ تعالیٰ! مجھے آپ اس معاملے میں اپنے ساتھ پائیں گے۔" عائشہ نے کہا اور ساتھ ہی جانے کے لیے دروازے کی جانب مڑی۔

"عائشہ!" سید عبداللہ نے اُسے پیچھے سے پکارا۔ سید عبداللہ کا گھمبیر لہجہ عائشہ کی کانوں کی لویں تک سرخ کر گیا۔

"جی!" وہ واپس پلٹی۔

"میں چاہوں گا کہ صرف اِس معاملے میں ہی نہیں آپ میرے ساتھ زندگی کے ہر معاملے میں رہیں۔ کہیے دوستی منظور؟" سید عبداللہ نے اپنی شفاف ہتھیلی آگے پھیلا دی۔

عائشہ کے سارے وجود کو گھبراہٹ نے گھیرے میں لے لیا۔

"جی!" وہ بہ مشکل اتنا ہی کہہ پائی۔

"اوں ہوں... ایسے نہیں! ہاتھ تھام کر وعدہ کریں۔"

عائشہ نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ سید عبداللہ کے ہاتھ میں تھما دیا، جسے سید عبداللہ نے گرم جوشی سے دبا کر چھوڑ دیا، پھر عائشہ وہاں رُکی نہیں بلکہ تقریباً دوڑتی ہوئی وہاں سے نکلی۔

کمرے میں آ کر اپنی اتھل پتھل سانسوں کو کتنی ہی دیر وہ سنبھالتی رہی۔ سامنے آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے وہ بے اختیار شرما گئی، چہرے پر کیسے انوکھے حسین رنگ تھے۔ عائشہ نے بے اختیار اپنے سینے پر ہاتھ رکھا جہاں دل کی دھڑکن ایک ہی نام الاپ رہی تھی... عبداللہ کا نام!

"تمہیں عبداللہ اچھا لگا؟" کوئی اندر سے پوچھ رہا تھا۔

"ہوں... بہت اچھا! یوں لگتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو صدیوں سے جانتے ہوں، اِک عجیب سی اپنائیت کا احساس ملتا ہے اُس کو دیکھ کر، سُن کر۔" اُس نے اعتراف کیا۔

عائشہ نے آنکھیں موندھیں، تھوڑا گردن جھکائے بیٹھی تھی، سر سے آنچل ڈھلک چکا تھا۔ بالوں کی لمبی ڈھیلی چوٹیاں سینے پر آن گری تھیں۔ اِس وقت اُس کے چہرے پر اتنے رنگ تھے کہ وہ کسی مصور کا خوب صورت شاہکار لگ رہی تھی۔

سید سرفراز علی بنا آہٹ کیے، دستک دیے کھلے دروازے کو پار کرتا اندر آ گیا، عائشہ نے کسی دوسرے وجود کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی فوراً آنکھیں کھول دیں۔ اُس کی آنکھوں میں سُرخ ڈورے تھے اور اتنے خوب صورت رنگ تھے جیسے پہلی رات کی دلہن کی آنکھوں میں سحر ہوتا ہے جو جکڑ لیتا ہے، اپنی طرف بلاتا ہے۔ سید سرفراز علی اُس ایک پل میں قید ہو گیا تھا۔ عائشہ کی آنکھوں نے رنگ بدلے اور وہاں ناگواری نے جگہ لے لی۔

سید سرفراز نے غالباً اُس کے چہرے کے ناگوار تاثرات نہ دیکھے تھے۔ وہ نہایت بے باکی سے وہاں کھڑا تھا۔ عائشہ نے اپنا رُخ موڑ کر آنچل ٹھیک کیا۔

"بھائی سرفراز! میرا خیال ہے کہ آپ اس حویلی کی روایات بہ خوبی جانتے ہوں گے۔ آپ بنا دستک دیے، اجازت لیے آج تو میرے کمرے میں آ گئے آئندہ جرأت نہ کیجیے گا۔ میں سید نوازش علی کی بیٹی ہوں اور اِس طرح کی گستاخیاں میں برداشت کرنے والی نہیں ہوں۔" پہلی ملاقات میں عائشہ سید سرفراز کی بدنظری جان چکی تھی۔ آج اُس نے سید سرفراز کے قدموں کو یہیں پر روکنے کا فیصلہ کیا تھا۔ عائشہ کے رویّے سے لگ ہی نہ رہا تھا کہ یہ ہی وہ چھوئی موئی سی عائشہ ہے، جو ابھی کچھ دیر پہلے سید عبداللہ کی قربت سے گھبرا کر بھاگی تھی۔

"بھرجائی تو تم ہماری بعد میں بنوگی، پہلے تو تم ہماری کزن لگتی ہو پھر اتنی غیریت کیوں؟" سید سرفراز نے بنا نگاہ ہٹائے کہا۔

"بھائی سرفراز! میں آپ سے پہلی اور آخری بار کہہ چکی ہوں کہ مجھے اِس طرح کی باتیں نہایت ناپسند ہیں۔ اگر آپ اپنی حدود میں رہ کر مجھ سے ملیں گے تو میں بھی پہلے اچھی بہن بنوں گی اور پھر آپ کی بھرجائی!" عائشہ جتا کر باہر نکل آئی۔ سید سرفراز نے اُس کی متوازن چال کو دیکھا!

"بہت خوب...!" پہلی بار کوئی لڑکی نظر آئی ہے، جو بات کرتی ہے تو مقابل کو پسپا کر کے رکھ دیتی ہے۔ ایسا ہیرا تو صرف سید سرفراز کی انگوٹھی کے قابل ہے۔

بہت خوب! وہ اپنے آپ ہی ہنستا چلا گیا اُسے قریب سے جاننے والے جانتے تھے کہ اُس کی اس ہنسی میں وہ جنون شامل ہوتا تھا، جو کسی طوفان کے اٹھنے کی خبر دیتا تھا۔

❖❖○❖❖

''یار یہ ''مائم'' کا کیا کھڑاک ہے؟'' ٹی ٹو نے اسٹوڈیو میں داخل ہوتے ہوئے ولی سے پوچھا۔

''یار کشمیر ڈے آرہا ہے اور میں اِس ایونٹ پر کچھ خاص طرح کا پیغام دینا چاہتا ہوں، جو دلوں پر اثر کر جائے، تم شروع سے دیکھتے آرہے ہو کہ ایسے موقعوں پر عام طور پر ملی نغمے اور تقریریں کر کے ایک روٹین بھگتالی جاتی ہے میں اِس روٹین کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔'' ولی نے جوش سے کہا۔

''لیکن یار ایگزام سر پر کھڑے ہیں ایسے میں تم کیسے یہ سارا مینج کر پاؤ گے؟'' ٹی ٹو نے اپنی جیکٹ سے مونگ پھلی نِکال کر ولی کو دی اور پھر خود بھی منہ بھرنے لگا۔

''وہ سب ہوگیا ہے میں ہر کام پلاننگ سے کرتا ہوں اِس لیے میرے کام میری پڑھائی پر اثر انداز نہیں ہوتے۔'' ولی کچھ غلط بھی نہ کہہ رہا تھا۔ آج تک اُس کی غیر تعلیمی سرگرمیاں اُس کی تعلیم پر اثر انداز نہ ہوسکی تھیں۔

''تم اِسے کالج میں کررہے ہو یا پھر کہیں اور...؟'' ٹی ٹو نے پوچھا۔

''میں اِسے الحمرا میں کرنے کا پروگرام رکھتا ہوں، جی سی کالج کوئی انگلش ڈراما کررہا ہے۔ میں نے اُن سے بات کرلی ہے کہ وہ ہر کالج کے آرٹ ڈیپارٹمنٹ سے لڑکے لڑکیوں اور ٹیچرز کو انوائیٹ کریں۔ اِس طرح ان ٹکٹس کے پیسوں کو کشمیر فنڈ میں جمع کروادیا جائے گا اور مہمان خصوصی تم تو جانتے ہی ہو کہ پہلے کوئی نہ کوئی گورنر یا وزیر ہوتا ہے اِس طرح یہ فنکشن بہت زبردست ہوجائے گا۔'' ولی کی ہر بات پروفیشنل تھی۔ وہ آئندہ دنوں میں عملی زندگی میں قدم رکھنے کو بالکل تیار تھا۔

''گڈ! تو میرا یار ہمیشہ کی طرح تیاری میں ہے۔'' ٹی ٹو کو تسلی ہوگئی، ابھی جو کچھ دیر پہلے وہ نوٹس بورڈ پر ''مائم'' ڈراما کا دعوت نامہ پڑھ کر آیا تھا اُس سے کچھ فکر مند ہوگیا تھا۔ لیکن ایسا کیسے ہوسکتا تھا کہ کسی کام میں عبدالولی پڑے اور وہ کام زبردست نہ ہو۔

❖❖○❖❖

''بابا سائیں اور لمّاں جان آپ کو ضرور آنا ہے! یہ سارا مائم میں **Direct** کررہا ہوں، اِس کے سیٹ ڈیزائننگ سے لے کر میوزک تک پر میں نے خود کام کیا ہے۔ پلیز بابا سائیں آپ کو آنا ہوگا پھر میرا لاسٹ پروگرام ہے اُس کے بعد کالج تو ختم ہوجائے گا۔'' عبدالولی نے بلاآخر احمد شاہ کو مناہی لیا۔

''اوکے! ہم لوگ ضرور آئیں گے۔'' احمد شاہ اور روشن آرا نے ہامی بھرلی۔

''اگر تمہیں بُرا نہ لگے تو بیٹا میں بھی اِس پروگرام میں آنا چاہوں گا۔'' شہباز علی نے ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ انہیں احمد شاہ نے روز کی طرح شام کی چائے کے لیے پیغام بجھوایا تھا۔ وہ اِسی لیے آئے تھے لیکن ولی کی بات سُن کر انہیں دوبارہ سے طارق سے ملنے کی آس ہوئی تھی اس لیے انہوں نے پروگرام میں شامل ہونے کا کہا تھا۔

''ضرور انکل! مجھے بے حد خوشی ہوگی۔'' عبدالولی نے خوش دلی سے کہا۔

''تمہارا وہ دوست طارق بھی اس پروگرام میں شامل ہے؟'' شہباز علی سے زیادہ دیر اپنے دل کی بات چھپائی گئی۔

''طارق! ارے نہیں انکل! وہ تو کسی اور فیلڈ سے ہے۔ ہاں البتہ طارق کی بہن سائرہ اور اُس کی دوست مسکان اِس میں کام کررہی ہیں۔ آج خود سائرہ اپنا اور اپنی دوست کا نام لکھوانے آئی تھی۔'' عبدالولی نے سرسری انداز میں کہا۔

''سائرہ...!'' شہباز علی کے ہونٹ بدبدائے، انہوں نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری، جیسے وہ کسی آبِ حیات کی خبر سُن رہے ہوں۔

''تو میرے دل کی گواہی سچی تھی، وہ میرے ہی بچے ہیں۔'' شہباز علی ایک دَم بیٹھے سے اُٹھ کھڑے ہوئے اُن کی بے چینی کسی سے چھپ نہ سکی۔

''کیا ہوا انکل! آپ کی طبیعت ٹھیک ہے۔'' ولی نے بھی فکر مندی سے پوچھا۔

''آں... ہاں! میں... ٹھیک ہوں۔'' وہ شاید خود میں ہی نہ تھے۔ وہ ایک دَم باہر چل دیے۔

''شہباز تم مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے؟'' احمد شاہ تیز قدموں سے اُن کے پیچھے ہولیے۔

''احمد شاہ! یہ میرے ہی بچے ہیں، میں نہ کہتا تھا کہ میرا دل کہتا ہے کہ طارق میرا بیٹا ہے۔'' شہباز علی نے تڑپتے ہوئے کہا۔

''اوہ! تو مجھے اِس لیے طارق کا چہرہ جانا پہچانا لگتا تھا۔'' احمد شاہ نے اُس احساس کو لفظ دے ہی دیے جو طارق سے مل کر ہوتا تھا۔

''چلو تم آؤ ہم آرام سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں تمہارا اِس طرح اپ سیٹ ہونا تمہاری صحت کے لیے خطرناک ہوسکتا ہے۔'' شہباز علی، احمد شاہ کو بتا چکے تھے کہ وہ ہارٹ پیشنٹ ہیں۔

''چائے ہماری انیکسی میں ہی آجاتی ہے۔'' احمد شاہ انہیں لیے انیکسی کی جانب بڑھے۔

شہباز علی جوں جوں اپنی کہانی سناتے جارہے تھے اِک عجب سا درد اُن کے نقوش کا حصہ بنتا جارہا تھا۔

''اوہ! تو تم نے اپنے بچوں سے پہلے ملنے کی کوشش کیوں نہ کی؟'' احمد شاہ کو ساری بات سُن کو حقیقتاً دکھ ہوا تھا۔

''سارہ کی وجہ سے...! وہ اِس قدر بدگمان ہوچکی تھی کہ وہ میری شکل دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ پھر اگر میں سارہ سے بچے بھی چھین لیتا تو اُس بیچاری کے پاس کیا بچتا! اِس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ سارہ جو ایک سازش کا شکار ہوکر مجھ سے دُور ہوگئی ہے کبھی سچائی جانے گی تو خود کو بہت اکیلا محسوس کرے گی۔ پس تنہائی و جدائی کا کڑوا گھونٹ میں نے خود پینے کا سوچا۔''

''لیکن وہ نیلوفر! اُس بے ایمان عورت نے مجھے خبر ہی نہ ہونے دی کہ سارہ اِس دنیا میں نہ رہی تھی اور بچے اُس کے زیرِ سایہ خود کو یتیم و مسکین سمجھتے رہے۔ اب سے چار سال پہلے میری ایک پیشنٹ آئی وہ سارہ کی گہری دوست تھی اُس سے مجھے معلوم ہوا کہ جس کی خاطر میں نے بن باس کاٹا وہ تو جانے کب سے منوں مٹی تلے جاسوئی تھی۔ اور میں نے اتنے سال صدیوں کی طرح کاٹے! لیکن اب مجھ سے

برداشت نہیں ہوتا میں اپنے بچوں سے ہر صورت ملنا چاہتا ہوں۔'' شہباز علی کی بے قراری دیکھی نہ جارہی تھی۔

''شہباز... اللہ نے تم سے تمہارے بچے ملوانے تھے، اس لیے تم میرے ہاں آئے۔ تم اِسے اتفاق نہ سمجھو! یہ ہی اللہ کی رضا ہے اب اُسی ذات پر بھروسا رکھو اور صبر سے کام لو۔ تم انشاء اللہ اپنے بچوں سے ملو گے اور باعزت طریقے سے ملو گے۔'' احمد شاہ کی تسلی، شہباز علی کے اندر توانائی کی طرح اُتر رہی تھی۔

❖❖○❖❖

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم
دِل کی آزادی شہنشاہی شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے؟ دل یا شکم؟

جو اپنے رازق کو نہ پہچانے اِس کا شکر گزار نہ ہو اس پہ تکیہ نہ کرے اسے پھر ملوک کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔ اور اگر تو اِس خالق اور رازق کو پہچان لے، اِس سے جڑ جائے تو دنیا کے بڑے بڑے بادشاہ جیسے دارا اور جمشید تھے، وہ تیرے تابع ہوں گے۔ تیرے فقیر اور پیروکار ہوں گے۔

دل کی آزادی ہی اصل شہنشاہی ہے۔ فکر و نگاہ کی خود مختاری اور آزادی کے برعکس جو پیٹ سے سوچتے ہیں اسی کے گرد اِن کی ساری سوچیں گھومتی ہیں۔ اصل میں وہ پیٹ بھرے کا سامان، مفادات وقتی حصول نہیں، موت کا ساماں ہے۔

اِس بات کا فیصلہ کہ تو کون کون سا طرزِ عمل اور طرزِ زندگی اختیار کرے، تُو نے ہی لینا ہے۔ دِل کی آزادی اور سوچ و فکر کی خود مختاری ہو سکتی ہے اور پھر وقتی دنیاوی مفادات اور کم نظری کا فیصلہ کر کے وہ گھٹیا زندگی گزار سکتا ہے۔

''یہ تو ہوگا ہمارے مائم کے اسٹارٹ کا تھیم اِس کے کیریکٹرز کا سٹیو مز پر خاص توجہ دینی ہے۔ ڈفرنٹ سورس آف لائٹ سے ڈراما کری ایٹ ہوگا۔'' ولی اسٹیج پر بیٹھا سب طالب علموں کو بریفنگ دے رہا تھا جو جو مائم میں حصّہ لے رہے تھے۔

''بیک گراؤنڈ کی آواز ہمیں بے حد پاورفل چاہیے۔ اس کے لیے میں نے ایک ریڈیو کے ڈی جے سے رابطہ کیا ہے، جو رات میں غزل ٹائم کرتا ہے۔ اُس کی آواز میں واقعی خاص طرح کا جادو ہے۔'' ولی کی باتوں کو سب ہی بہت غور سے سُن رہے تھے لیکن مُسکان کا حال حسبِ معمول تھا۔ وہ ولی کو یک ٹک دیکھے جارہی تھی۔

''مسکان! خدا کے لیے حواسوں میں رہا کرو۔'' سائرہ نے مسکان کو ہلا کر کہا۔

''سائرہ! ولی کچھ عرصے بعد کالج سے چلا جائے گا تو میرا کیا بنے گا؟ اُسے نہ دیکھوں تو میرا تو سانس رُکنے لگتا ہے، جیسے کسی نے مجھے فلاسک میں بند کر دیا ہو۔'' مُسکان نے بے بسی سے کہا۔

''مسکان اپنے آپ میں رہو، کس ڈگر پر چل پڑی ہو، تمہارا انجام کیا ہوگا کبھی سوچا ہے۔'' سائرہ۔ سب اسٹوڈنٹس کو باہر نکلتے دیکھ کر ذرا اونچی آواز میں کہا۔

ہال میں کوئی نہ تھا۔ سائرہ نے اب باقاعدہ مسکان کی کلاس لینے کا سوچا۔

تم سے جب بھی ملوں تم سے کہنا چاہوں
میں تو ہر پل تیرے ساتھ رہنا چاہوں
سائے کا کیا بھروسا سورج ڈھلے تو چھپ جائے
میں تو بن کے لہو تیری رگوں میں بہنا چاہوں

ان نے ایک دَم اسٹیج پر کھڑے ہو کر بلند آواز میں نہایت جذب سے کہا۔

ائرہ! اِس دیوانی پاگل جوگن کو کہنے دو اُس کے دل کی بات کہ وہ محبت کرتی ہے۔ بے حد محبت ہے، ہاں وہ عبدالولی سے محبت کرتی ہے۔ ایسی محبت جو عشق کی حدوں میں شامل ہو کر جنون بن گئی

اگر وہ مجھے نہ ملا تو میں مرجاؤں گی اور مرنے سے پہلے اگر میری دُنیا تباہ ہوگئی تو میں سب کچھ تباہ مروں گی۔''

گل لڑکی نیچے اُترو!'' سائرہ نے غصّے سے مُسکان کو کہا، جو اپنے حواسوں میں بالکل نہ تھی۔

جیسے لوگ ہی خودکشی کرتے ہیں۔'' سائرہ نے جل کر کہا۔

الکل میں خودکشی کرلوں گی اگر مجھے میرا محبوب نہ ملا۔'' مسکان نے بلند آواز میں کہا۔

سکان!'' سائرہ نے مصنوعی خفگی سے اُسے گھورا۔

ائی لو یو، ولی! آئی لو یو ولی!'' مسکان نے ایک دَم آنکھیں بند کر کے جنونی انداز میں کہا۔ مُسکان! کی عجیب سی آواز اُس کے کانوں میں پڑی، جس میں بے حد گھبراہٹ شامل تھی۔

کیا ہوا؟ سچ بولنے دو سائرہ۔ اِس لاوے کو باہر آنے دو جس میں میں جل رہی ہوں۔'' مسکان کہتے یک دَم رُک گئی اُسے لگا کہ وہ کسی جھولے پر سوار ہو، جہاں آسمان و زمین دونوں گھوم رہے تھے۔

ان واقعی اُس کے پیروں تلے سے کھسک گئی تھی کیوں کہ وہاں ہال کے دروازے کے بیچوں بیچ لی کھڑا تھا۔

شرمندگی سے جان نکلنا کیا ہوتا ہے مسکان کو پہلی بار پتا چلا تھا۔
بھرم کا پردہ ایسے چاک ہوگا! سائرہ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔
مسکان کی رنگت خطرناک حد تک پیلی پڑگئی تھی، جیسے اُس نے ولی کے بجائے کسی بھوت کو دا ہو۔

"ولی بھائی!" سائرہ کی مری مری آواز نکلی، اُس نے سب سے پہلے اپنے حواس قابو کیے، ولی فی الحال بے تاثر تھا۔ سائرہ اندازہ نہ کر پارہی تھی کہ ولی اُن کی کس قدر گفتگو سُن چکا ہے اور اگر چکا تھا تو اُس کے تاثرات کیا تھے؟

"مسکان آر یو آل رائیٹ؟" سائرن نے فکرمندی سے دھیمی آواز میں اُس سے پوچھا۔ مسکان یوں لگ رہا تھا کہ کچھ دیر پہلے وہ اتنا کچھ بول چکی ہے کہ اب وہ مزید کچھ نہیں بول سکتی۔ وہ کسی پُتلے کی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔ ولی دھیرے دھیرے چلتا اُن کے قریب آرہا تھا۔ اُس کے قدم آہٹ کھلے ہال کی وجہ سے بے حد واضح تھی۔ مسکان نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں خود سائرہ کا عجب طریقے سے گھبرا رہا تھا۔

"یہ میں آپ لوگوں کے لے آؤٹ لایا ہوں، اِن کو آپ غور سے پڑھ بھی لیں اور Visual بھی بنالیں تا کہ پرفارم کرنے میں آسانی رہے۔" ولی کا ٹھہرا ہوا پُرسکون لہجہ سائرہ اور مُ دونوں کو چونکا گیا۔ اُس کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہ تھا کہ اُس نے کچھ خاص سُن رکھا ہو۔

"جی ٹھیک ہے!" سائرہ نے ہونٹوں پر زبان پھرتے ہوئے کہا۔

"اور ہاں! آپ لوگوں کو خاص احتیاط کرنا ہوگی کیوں کہ اسپاٹ لائٹ آپ لوگوں پر زیادہ رہے" ولی نے مُڑتے مُڑتے پلٹ کر کہا۔

"کیوں کہ کبھی کبھی ذرا سی بے احتیاطی بڑے نقصان سامنے لاتی ہے!" ولی نے مسکان کے رُکتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ مسکان نے چونک کر اُسے دیکھا، ولی نے ایک بے حد گہری نگاہ ڈالی۔ مُسکان کے سرد وجود پر مزید برف گری تھی۔ لیکن اگلے ہی پل وہ اپنے پُرانے لہجے میں آ گیا تھا۔

"مرکزی کردار بے حد اہم ہوتا ہے! وہ مرکزی خیال کے گرد گھومتا ہے اور باقی سارے کردار اُ گرد گھومتے ہیں۔ تم لوگوں پر بے حد ذمّے داری ہے! اُمید ہے تم لوگ مجھے مایوس نہیں کرو گے۔"

"جی انشاء اللہ!" سائرہ نے یقین دلایا۔

"او کے! پھر شام میں ملتے ہیں الحمرا ہال میں ریہرسل کے لیے!" ولی رُک رُک کر بولا۔

"او کے!" جواب سائرہ ہی نے دیا تھا۔

"اب کیوں سانپ سونگھ گیا؟" سائرہ نے تقریباً دھاڑتے ہوئے کہا۔

"آجاؤ حواسوں میں محترم جا چکے ہیں۔" سائرہ نے اُسے باقاعدہ جھنجوڑا۔

"کیوں...... کیوں مسکان! تم اِس قدر بے خود ہوچکی ہو کہ تمہیں کسی بات کے نتیجے کی پرواہی نہیں ہوتی؟"

"سائرہ میں اُس سے سچی محبت کرتی ہوں، میں واقعی اُس کے بنا نہیں رہ سکتی یہ محبت کب اتنی شدت اختیار کرگئی مجھے پتا ہی نہ چل سکا اور اب۔ اب سائرہ میں اُس پتھر کے بغیر نہیں رہ سکتی!" مُسکان کا اعتراف سائرہ کو سُن کر گیا۔

"تم جانتی ہو کہ ولی بھائی بے حد مختلف مزاج اور کردار کے ہیں انہوں نے کبھی تم کو نگاہ بھر کر نہیں دیکھا۔ پھر مسکان یہ ناممکن کیسے ممکن ہوگا؟ دو اشخاص تب ہی مِل کر زندگی شروع کر سکتے ہیں، جب دونوں جانب یکساں آمادگی ہو، ون سائڈڈ محبت روگ کے علاوہ کچھ نہیں ہوتی!" سائرہ نے بے حد دُکھ سے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"کیوں! مجھ میں کیا کمی ہے، جو وہ میرے وجود سے اور میری محبت سے انکار کرے گا؟" مسکان کے لہجے میں اُس کی ازلی ضد نمایاں تھی کہ آج تک وہ جو چاہتی رہی ہے اُس نے پایا تھا۔ پھر وہ اپنی زندگی کی اتنی بڑی خواہش سے کیسے دست بردار ہوسکتی تھی۔

"مسکان فرض کرو اگر ولی بھائی بھی تمہارے لیے ویسے ہی محسوس کرنے لگیں، جیسے تم محسوس کرتی ہو، کیا تمہارے بابا سائیں مان جائیں گے؟" سائرہ کے سوال نے واقعی مُسکان کو ہوش دلایا تھا۔

"انہوں نے زندگی میں کبھی میری بات نہیں ٹالی، وہ تو بنا کہے میری ہر ضرورت، ہر خواہش کو جان لیتے ہیں پھر وہ کیوں اختلاف کریں گے؟" مسکان شاید خود سے سوال کررہی تھی۔

"بیٹیوں کی محبت باپ کے لیے غیرت کا سوال بن جاتی ہے! ایسے میں باپ اولاد کے بجائے اپنی نسوں کی بنی عزت اور خاندان دیکھتا ہے، ایسا اکثر میرے نانا ابو کہا کرتے تھے۔"

"بڑوں کی باتیں تجربوں کا نچوڑ ہوتی ہیں اُن کی باتیں وقت گزرنے کے ساتھ سمجھ میں آتی ہیں۔" سائرہ نے مسکان کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں! میرے بابا جان ایسے نہیں ہیں۔" مسکان شاید خود کو یقین دلا رہی تھی۔

"اور یہ جو ہر وقت تمہارے ساتھ ڈرائیور نما باڈی گارڈ رہتا ہے، گھر میں آپا امّاں ہیں تمہارے پل پل سے باخبر رہنے کے لیے، کیا یہ ساری باتیں تمہارے بابا کے مزاج کو واضح نہیں کرتیں؟ تمہیں ہر چھوٹی سی سرگرمی کے لیے گھر سے اجازت درکار ہوتی ہے، بغیر اجازت کے تم دس پندرہ منٹ گھر سے باہر نہیں جاسکتیں، ایسے میں تمہارا زندگی کے لیے کیا جانے والا اتنا بڑا فیصلہ کون مانے گا؟" سائرہ نے اُسے خوابوں کی دنیا سے کھینچ کر حقیقت میں لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"بابا سائیں کو میری بات ماننی ہوگی، ہر صورت ماننی ہوگی۔ اگر وہ میری بات نہیں مانیں گے تو میں

اپنی جان دے دوں گی۔ سائرہ میں خودکشی کرلوں گی!'' مُسکان کے اندر کی بے انتہا ضدی لڑکی نے
کوحیران کردیا۔

سائرہ نے اُس کی آنکھوں میں عجیب طرح کا جنون دیکھا جو اُس کے لفظوں کی سچائی کی گواہی
رہا تھا۔

''میرے اللہ! اِس لڑکی کا کیا بنے گا؟'' سائرہ اُسے کچھ کہتے کہتے رُک گئی... مُسکا اِس وقت
کے بالکل کنارے پر کھڑی تھی۔ اُسے کسی کا مشورہ سمجھ نہ آتا تھا۔ جس اُڑان کے لیے وہ بے چین تھی
اُسے کھائی میں بھی گرا سکتی تھی۔

''کیا واقعی محبت اندھی بہری ہوتی ہے؟ کہ انسان کو اپنا اچھا بُرا نظر آنا، سنائی دینا بند ہوجاتا ہے؟''
سائرہ نے مُسکان سے دھیرے سے پوچھا۔

''محبت! سائرہ محبت بس اِک آگ ہے جس میں دھیمے دھیمے سلگنا مزہ دیتا ہے اور اس آگ میں
سے انسان چاہ کربھی نہیں نکل سکتا۔'' مُسکان نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

''کیا کہوں تمہیں؟ یہ محبت تو نہیں ہے اچھی خاصی خود اذیتی ہے۔'' سائرہ نے چڑ کر کہا۔

جواب میں مُسکان جنونی سی ہنسی ہنستی چلی گئی۔

دِل جہاں لے جائے، دِل کے ساتھ جانا چاہیے
اِس سے بڑھ کر اور کوئی رہنما ہوتا نہیں

اب مُسکان، سائرہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ رہی تھی۔

''چاہے یہ دِل تمہیں خوار ہی کیوں نہ کرے؟'' سائرہ نے کہا۔

''کہا نا! تم سے یہ دِل جہاں لے جائے، دِل کے ساتھ جانا چاہیے۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی رہنما
ہوتا نہیں ہے!'' مسکان نے اپنی بات پر اصرار کیا۔

''بھاڑ میں جائے ایسا نا سمجھ دل جو تباہیوں کی جانب رہنمائی کرے۔'' سائرہ نے بیگ اُٹھا کر کھڑے
ہوتے ہوئے کہا۔ یہ واضح اشارہ تھا کہ اب اُن کو یہاں سے چلنا چاہیے۔

''کیسی تباہی؟'' مُسکان نے معصومیت سے پوچھا۔

''ابھی جو ولی بھائی تمہاری کھلم کھلا بکواس سُن لیتے تو کیا تمہارا بھرم رہ جاتا اور کیا تمہارا امپریشن
پڑتا۔'' سائرہ کی بات پر مُسکان کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ گئی تھی۔

واقعی بعض سچائیاں ہر رنگ چوس لیتی ہیں۔ مسکان چاہے مانتی یا نہ مانتی آج کی یہ سچائی اُس کے لیے
بے حد شرمندگی کا باعث تھی۔ وہ ولی کو بے حد چاہتی تھی لیکن اِس طرح کا اظہار تو وہ خود بھی نہیں چاہتی
تھی۔ پہلا اظہار اگر مرد کی جانب سے ہو اِسی میں لڑکی کی عزت ہوتی ہے۔

❖❖()❖❖

میں اُداس رستہ ہوں شام کا' مجھے آہٹوں کی تلاش ہے
یہ ستارے سب ہیں بجھے بجھے، مجھے جگنوؤں کی تلاش ہے

وہ جو ایک دریا تھا آگ کا، بس راستوں سے گزر گیا
ہمیں کب سے ریت کے شہر میں نئی بارشوں کی تلاش ہے

(لم کی آواز اُس کی شکل کی طرح بے حد خوب صورت تھی۔ مبشر حسن بہت گہری نظروں سے اس کا
لے رہے تھے۔ یہ نیو ایئر پارٹی میڈم راگنی نے دی تھی شہر کی کریم اور بیوروکریٹ، وزیر آج
اس پارٹی میں شامل تھے۔ اِس قدر ٹھنڈ میں بھی میڈم راگنی سلیولیس بلاؤز اور باریک سی ساڑھی
بے حد متحرک تھی۔ کالا اور سرخ رنگت اُس کا پسندیدہ تھا لیکن آج وہ سی گرین کلر میں زمرد کی طرح
رہی تھی۔ آج کی پارٹی کے لیے میڈم راگنی نے ٹاپ کے پارلرز سے بیوٹیشنز بلوا کر اپنی لڑکیوں کو
کروایا تھا۔

ان کے آؤٹ فٹس شہر کے مہنگے ترین ڈیزائنر نے ڈیزائن کیے تھے۔ خود وہ ڈیزائنر بھی اِس پارٹی میں
وی کے ساتھ شامل تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اگر اُس کے بازوؤں میں شہر کی ٹاپ کلاس ماڈل رقص
رہی تھی تو اس کی بیوی کسی اور کے ساتھ اِسی کوٹھی کے ایک لگژری روم میں مصروف تھی۔ اِن لگژری بیڈ
کا انتظام خود میڈم راگنی نے کروایا تھا۔ آج بہت سے سال بھر کے رُکے کام سال کے آخر میں
ہانے تھے۔ یہ پارٹی میڈم راگنی کی ایسی انوسٹمنٹ، تھی جس کا منافع اُسے سال بھر کھانا تھا۔

ماہ رُخ بیک لیس اسکن ٹائٹ وائٹ میکسی میں تھی۔ جب وہ چلتی تو اُس کی میکسی پر لگے پرلز رقص
نے لگتے وہ آج کسی جل پری کی طرح لگ رہی تھی۔ اُس کے اسائمنٹ میں آج ایک وزیر تھا اس
وہ مسلسل اُس کے ساتھ تھی۔ اِسی طرح ہر لڑکی کسی نہ کسی پر مقرر تھی۔ بظاہر دلوں کو لبھاتی، جذبات کو
ائی یہ تتلیاں اِن آفیسرز پر فدا نظر آ رہی تھیں لیکن اندر سے وہ جن خطرناک عزائم پر کام کر رہی تھیں
ملک کے لیے نہایت خطرناک تھے۔ میڈم راگنی غیر ملکی کمپنیوں اور ایجنسیوں کو بے حد مہنگے داموں یہ
بیچا کرتی تھی۔ رنگ و روشنی کی یہ محفل صبح تین بجے تک جاری رہنا تھی اور اس روشن رات میں آج
کی سیاہیاں پھیلنی تھیں، اس سے سب بڑے باخبر ہونے کے باوجود بے خبر بنے بیٹھے تھے۔ یوں لگتا تھا
ائی اپنی مرضی سے تباہ ہونے کو تیار ہے، مبشر حسن میڈم راگنی کو بے حد مُف ٹائم دے رہا تھا۔ وہ کم
ت جس عہدے پر تھا وہاں وہ میڈم راگنی کی بے حد اہم فائلز دبا کر بیٹھا تھا عورت اُس کی کمزوری نہیں
! یہ بات وہ بار ہا باور کروا چکا تھا۔ لیکن میڈم راگنی کا اپنا ایک نظریہ تھا۔

وہ کیسا مرد ہے جس کی کمزوری عورت نہیں تھی! ہر مرد کی کمزوری عورت ہی ہوتی ہے۔ یہ الگ بات
، کہ ہر مرد کی ٹائپ الگ ہوتی ہے اور میرے پاس ہر ٹائپ کی عورت ہے! میں اِس مبشر حسن کا دعویٰ
کردوں گی، یہ کوئی پہلا مرد نہیں ہے پھر بعض مردوں کو مردانگی جھاڑنے کی بیماری ہوتی ہے لیکن بعد
یہ ہی مرد کسی چابی کے گڈے کی طرح ہمارے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ اور یہ بھی ناچے گا! ضرور
چے گا! بس کچھ ٹائم لگے گا اور آج اِس دعوے کو سچ ثابت کرنے کے لیے اس نے ترنم کا انتخاب کیا
۔ انہوں نے اپنی تقریباً ساری لڑکیوں کے جسم کی نمائش کا خاص خیال رکھ کر اُن کے لباس بے حد
یاں رکھوائے تھے۔ مگر ترنم کے لیے لباس کے معاملے میں خاص خیال رکھا تھا کہ وہ سیکسی ضرور نظر
ئے لیکن عریاں ہرگز نہیں! بعض مرد ڈھکی چیز پسند کرتے ہیں اور انہوں نے اندازہ کرلیا تھا کہ مبشر حسن

ان ہی میں سے ایک ہے۔ ترنم کو بہت زیادہ وقت نہیں لگا مبشر حسن کی نظروں میں آنے میں۔ تھوڑی دیر پہلے جو نا قابلِ شکست قلعہ بنا بیٹھا تھا وہ ترنم کے سامنے ہار چکا تھا۔ ترنم تو اپنے مزاج سے فوراً ہاتھ نہیں آتی تھی۔ میڈم راگنی نے ترنم کی اِس خاص ادا کو استعمال کیا تھا اور مبشر حسن کے پاس یوں بیٹھا تھا، جیسے سدھایا ہوا گھوڑا!

"تم اِن سب سے مختلف ہو!" مبشر حسن نے چھوٹا پیگ ترنم کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔ شراب اور ترنم کے وجود کا نشہ اُس کے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

"اچھا!" ترنم کی ہنسی استہزائیہ تھی۔

"میں نے تو آپ کے متعلق بھی کچھ ایسا ہی سُنا تھا۔" ترنم کا لہجہ بے حد چُبھتا ہوا تھا۔

"کیا؟" مبشر حسن نے اگلا گلاس بھی لبوں سے لگالیا۔ اب آہستہ آہستہ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو رہا تھا اور وہی چابی کا گڈا بننے جا رہا تھا، جس کے متعلق وہ ایک سال سے انکار کر رہا تھا۔

حالات کی چکی میں قلندر نہیں مرتا
ٹوٹے بھی ستارہ تو زمیں پر نہیں گرتا
گرتے ہیں سمندر میں سبھی شوق سے دریا
لیکن کسی دریا میں سمندر نہیں گرتا

تمہارے متعلق سب خیالات غلط ہو گئے ہیں! تم بھی اوریجنل آدمی نہ نکلے! اور آ گئے خود سے گر دام میں پھنسنے کے لیے! ترنم کی زبان آگ اگل رہی تھی لیکن مبشر حسن کو شاید کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔ اُس کی بھٹکی نگاہیں ترنم کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ ترنم نے ایک حقارت بھری نگاہ اُس پر ڈالی۔

"ترنم ڈارلنگ!" میڈم راگنی کی خوشی بھری آواز اُس کی پشت پر اُبھری۔

"مبشر صاحب کو بیڈروم میں لے چلو، یہ تھک گئے ہوں گے۔" میڈم راگنی نے ترنم کو وہ خاص اشارہ دیا جس سے ترنم کی جان جاتی تھی۔

"ہوں مبشر صاحب آرام کرنا چاہیں گے؟" میڈم راگنی نے نشے سے مدہوش ہوتے ہوئے مبشر سے پوچھا۔

"ضرور۔ اگر میزبان ترنم ہو تو؟" مبشر حسن نے بے باکی سے ہنستے ہوئے کہا۔

"گزشتہ ایک سال سے میری اتنی لڑکیوں کو ریجیکٹ کر چکا تھا، جیسے ولی ہو!" میڈم راگنی مُنہ ہی میں بڑبڑائی، البتہ اُس کے چہرے کی خوب صورت مسکراہٹ قائم تھی۔

"جاؤ ترنم ڈارلنگ! یہ ہمارے خاص مہمان ہیں ان کو اتنا خوش کرو کہ یہ ہمارے ریگولر مہمان بن جائیں۔" میڈم راگنی نے واضح اشارہ دے دیا تھا۔

"ہا۔ ہا۔ ہے۔ ہے۔" مبشر حسن نہایت بے ڈھنگے انداز میں ہنسا تھا۔

ترنم کو اُس سے بے حد کراہیت محسوس ہوئی تھی۔

"مبشر صاحب آپ کی ٹیبل پر ہمارا بہت سارا کام رُکا پڑا ہے۔" میڈم راگنی نے اپنے دونوں بازو

مبشر حسن کے برابر جھک کر کہا۔ یہ کہتے ہوئے وہ اُن سے مزید قریب آ گئیں۔

"جائے گا! ہو جائے گا۔" مبشر حسن نے ترنم کو اپنے نزدیک کھینچتے ہوئے کہا۔

"...لا۔" میڈم راگنی کا جواب میں فاتحانہ قہقہہ ترنم کو آگ لگا گیا، تمہارا یہ سارا گڈ ہمارے مستقبل کو ...ے گا۔ کاش! کاش! کوئی واقعی مردِ قلندر آ جائے، جو اس سسٹم کو اگر توڑ نہیں سکتا تو کم از کم اُسے ...کی شروعات ضرور بن جائے۔" ترنم نے مبشر حسن کے بھٹکتے ہاتھوں سے اپنے آپ کو چھڑانے کی ...کرتے ہوئے سوچا لیکن مبشر حسن اِس وقت جانور بن چکا تھا۔ ترنم کو اندازہ ہو گیا تھا کہ آج رات ...وع ہونے سے پہلے اُس کی بوٹی بوٹی نوچی جانے والی ہے۔ کاش جس طرح آج سال کی آخری ...ہے، میری زندگی کی بھی آخری رات ہو جائے اِس گناہ کی آخری رات ہو جائے! لیکن شاید ابھی ...الی باقی تھی اس لیے اُس کی زندگی باقی تھی۔ سردی کا قہر باہر پھیل رہا تھا لیکن شراب و شباب کے ...مست نیو ایئر کو ویلکم کرنے کے لیے سب ناچ رہے تھے۔ گذشتہ سال نے جاتے جاتے آہ بھر کر ...اری ہچکی بھرنی تھی۔ وہ اپنے دامن میں بے گناہوں کے خون کے چھینٹے، انسانیت کا قتل اور تہذیب ...تی سانسوں کا دُکھ لے کر روانہ ہو رہا تھا۔ اِس سال کو بھی ہم رتی بھر خوشی نہ دے سکے تھے۔ جیسے ہی ...ا سے چُور چُور سال نے آخری ہچکی بھری، لائٹس جو کچھ دیر کے لیے آف کی گئی تھیں آن ہو گئی تھیں ...لوگ سے چیخ رہے تھے، چلا رہے تھے میوزک کی تیز آواز کے ساتھ رقص کرنے والوں کے قدم تیز ...ہو گئے تھے۔ وہاں بنے کوریڈور اور اوپر کی منزل میں لگژری بیڈروم تیار تھے۔ کچھ دیر بعد ساتھ ہی ہر ...رے کے باہر ڈونٹ ڈسٹرب کا کارڈ لٹک رہا تھا۔ تتلیوں نے بہت ناچ لیا تھا اب چابی کے گڈوں کی باری تھی!

❖❖○❖❖

...لی ڈرائیونگ کرتے ہوئے بے حد بے چین تھا۔ کچھ دیر پہلے کے مناظر اور الفاظ اُسے بے ڈسٹرب ...رہے تھے۔ سائرہ اور مسکان کے سامنے تو وہ اپنے تاثرات چھپا گیا تھا۔ اس حد تک چھپا گیا تھا کہ ...یہ ہی گمان ہوا تھا کہ ولی نے کچھ نہیں سُنا لیکن اب وہ چاہ کر بھی وہ منظر نہ بھلا پا رہا تھا۔ مسکان کا ...اسٹیج پر کھڑے ہو کر آنکھیں بند کر کے با آواز بلند دیوانہ وار اظہار! ولی کی خاموش جھیل جیسی دل کی ...میں بے چین پتھر کی طرح آ کر لگا تھا۔ وہ صنفِ مخالف کے لیے بے حد کشش رکھتا تھا اور وہ اس ...بات کو بہت پہلے سے جانتا بھی تھا۔

اُس کا اسٹیٹس، اُس کی ذہانت! یہ اِس کشش کے مزید لوازمات تھے۔ لیکن اِن ساری حقیقتوں کے ...اد جو خول اُس نے خود پر چڑھا رکھا تھا اُس سے ہمیشہ تسلی رہتی تھی کہ کوئی بھی لڑکی اُس کے واضح ...اب کے بعد آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کر سکتی۔ لیکن مُسکان؟ اُس کا اظہار، وہ صرف کسی سے انسپائر ...نے کا اثر نہ تھا۔ اُس کے لہجے میں اُس کے لفظوں میں جنون بول رہا تھا۔ وہ کس مقام پر کھڑی تھی یہ ...کے چہرے کے رنگوں سے پتا چل رہا تھا۔ مجھ سے کہاں چوک ہوئی؟ اب وہ خود سے سوال کر رہا ...میرے رویے اور لفظوں میں کہاں لچک آئی کہ اُس نے اتنا بڑا گمان پال لیا؟ عورت اُس کی نظروں ...بے حد قابلِ احترام تھی۔ یہ بات اُس کی تربیت میں شروع دن سے ڈالی گئی تھی۔ لڑکیوں سے وقت

گزارنے کے لیے دوستی کرنا اُسے عورت کی توہین لگا کرتا تھا۔ اِس لیے اُس نے خود پر ایک خول چڑھا تھا تا کہ کوئی لڑکی کبھی بھی کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔

"لیکن مسکان! پھر اُسے آج تک معلوم کیوں نہ ہوسکا؟" ولی نے بے چینی سے گاڑی موڑی، اُسے خود بھی نہ پتا چل سکا کہ کب اُس کی گاڑی علیزے کی گلی کے باہر آ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا حُسن خالہ کے گھر کے پاس آ رُکا تھا۔ اُس کا دل اِس وقت ایک چہرہ دیکھنے کو شدت سے مچل رہا تھا بیل پر ہاتھ رکھ کر جیسے ہی اُس نے ہٹایا دروازہ کھل گیا تھا۔ سامنے کوئی سراب نہ تھا اُس کے دل نے جس چہرے کی تمنا کی تھی، وہ سامنے تھا۔ بے حد پاکیزہ، حیا آلود چہرہ! دروازہ علیزے نے کھولا تھا۔ سر پر میرون گرم شال ڈالے اُس کی گوری رنگت دمک رہی تھی۔

تیرے بغیر یہ دِل میرا کہیں نہ لگے
تجھ کو تُجھ سے چُرالوں اگر بُرا نہ لگے
اگر تم پر مرنا ہے تو اِس طرح مروں
دل تو کیا دھڑکن کو بھی پتہ نہ لگے

"ارے آپ؟ السلام علیکم!" علیزے نے خوش دلی سے کہا، ولی شاید کسی خواب کی کیفیت سے جاگا تھا۔ دل جو بے سکون تھا اُسے ایک دم قرار آ گیا۔

سارے سوالوں کا جواب مل گیا تھا۔ ولی ہر بار علیزے سے ملنے کے بعد ایک خاص قسم کے احساس سے دوچار ہوتا تھا اور اُسے رد کرتا تھا۔ وہ بے چینی علیزے کو دیکھ کر سکون میں ڈھل گئی تھی۔

"نگینہ، خالہ خالو کیسے ہیں؟ آپ ٹھیک ہیں؟ پلیز اندر آئیے نا!" علیزے نے اُس کی گہری نظروں سے گھبرا کر کہا اور ساتھ ہی اُسے اندر آنے کو راستہ دیا۔

"آپ کیسی ہیں؟" ولی کے تلاطم میں کمی آ گئی تھی۔ اس لیے اُس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

"جی ٹھیک ہوں، پلیز آپ اندر آئیے نا!" علیزے کو اپنی ماں کا پروٹوکول یاد تھا، جو وہ خالہ اور اُن کے بچوں کو دیکھ کر ہمیشہ دیتی تھیں۔ اِس لیے علیزے کو ولی کا دروازے پر زیادہ دیر کھڑا ہونا گراں گزر رہا تھا۔

"نہیں بس میں چلتا ہوں!" ولی کے یوں اچانک واپس مُڑنے پر علیزے باقاعدہ بوکھلا گئی تھی۔

"سنیے!" وہ گھبرا کر بولی۔

ولی کو اُس کا یوں پکارنا بے حد بھایا۔

"جی سنائیے۔" وہ شوخی سے بولا۔

"آپ اندر نہیں آئیں گے کسی سے نہیں ملیں گے؟" علیزے کو ولی کا یوں اچانک آ کر مُڑ جانا بے حد عجیب سا لگ رہا تھا۔

"وہ تو میں مل لیا۔ جس سے ملنے آیا تھا اُسی سے مل کر جارہا ہوں۔" ولی نے تھوڑا جھک کر اس کے قریب آ کر کہا۔ علیزے بُری طرح بوکھلا گئی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟ کیا سکتہ ہوگیا ہے؟" پیچھے سے منزہ کی آواز آئی، ولی تو کتنی ہی دیر ہوئی جاچکا

لیکن اُس کا ذو معنی لہجہ، بولتی آنکھیں علیزے کو ساکت کرگئی تھیں۔ وہ وہیں کھڑی رہ گئی۔

"دروازے پر کون تھا؟" منزہ نے اُسے ہلا کر پوچھا۔

"ولی تھے۔" علیزے نے کھوئے کھوئے لہجے میں جواب دیا۔ منزہ کو چار سو چالیس واٹ کا جھٹکا لگا۔

"کون ولی؟ روشن آرا خالہ کا بیٹا؟" منزہ نے تفتیشی انداز میں پوچھا تو علیزے ایک دم جیسے جاگ ل۔

"ہاں! وہ ہی تھے۔" اب علیزے نے اپنے لہجے میں بے نیازی دکھانے کی کوشش کی۔

"لیکن وہ اندر کیوں نہیں آئے، دروازے سے ہی کیوں مُڑ گئے؟" منزہ کو بات سے بات نکالنے کی ات تھی۔

"مجھے کیا معلوم؟" علیزے دروازہ بند کرکے کمرے میں آ گئی۔

"تمہیں نہیں معلوم! یہ کیا جواب ہوا، آخر کیا کہہ رہے تھے، کچھ کہے بغیر کیسے جاسکتے ہیں بغیر وجہ کے تو الی نہیں آتا۔" منزہ نے اُس کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"میں کیا کہوں۔" امی کا پوچھ رہے تھے۔ میں نے کہا گھر میں نہیں ہیں وہ چلے گئے۔" علیزے نے اونچی آواز میں کہا۔ اب وہ کیا کہتی کہ وہ واقعی بنا کچھ کہے سُنے چلا گیا اور جو کہہ کر گیا تھا بھلا وہ کسی ایسا بتاتی کہ...

"تم جیسا بے وقوف دنیا میں کوئی ہوگا۔" اب منزہ کو علیزے پر غصہ آنے لگا تھا۔

"امی آئیں گی پتا چلنے پر کتنا دُکھ محسوس کریں گی۔" منزہ کو واقعی ولی کے یوں جانے کا بے حد دُکھ تھا۔

"کوئی اندر نہ آئے تو کیا میں ہاتھ پکڑ کے لے آؤں۔" ہاتھ میں اُٹھائے کپڑے علیزے پہلے ہی پشان تھی اُس نے بے حد چڑ کر جواب دیا اور باہر چل دی جنھیں وہ دھونے کے لیے نکال رہی تھی۔

"احمق" منزہ نے تکیے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

جب کہ باہر سرف میں کپڑے بھگوتی علیزے ابھی تک اُلجھی بیٹھی تھی، کیا واقعی ولی صرف مجھ سے ملنے ل دور آئے تھے! لیکن وہ مجھ سے ملنے کیوں آئے تھے؟ کچھ ایسا احساس اُسے گھیرنے لگا تھا، جسے الحال وہ کوئی نام نہ دے پا رہی تھی۔

❖❖○❖❖

"کیا بات ہے میری جان! کچھ ڈسٹرب ہو؟" روشن آرا بیگم نے کمرے کی لائٹ آن کرتے ہوئے ا۔

"نہیں کچھ ایسے ہی۔" ولی کے پاس اُن کے سوال کا جواب نہ تھا۔ اِس لیے ادھورا جملہ بہ مشکل بول

"ماں ہوں تمہاری، میرے دِل کے ریڈار پر اپنی اولاد کے ماتھے کی ایک ایک شکن نوٹ ہوجاتی ہے، اں ہی کیا، جو اولاد کے دِل کے موسم کو نہ جان سکے۔" روشن آرا بیگم نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

"ولی کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے۔ کچھ پل اُس نے سوچ کر ساری بات روشن آرا

سے کہہ ڈالی۔‘‘

’’تمہیں وہ لڑکی مسکان پسند ہے؟‘‘ روشن آرا جان ہی نہ پائیں کہ کب اُن کی آواز بے جان ہوگئی تھی۔ احمد شاہ کا خیال کہیں درست ہی نہ ہونے جارہا ہو، اُن کا دل علیزے کے لیے اس قدر یکسو تھا کہ ولی کے ساتھ کوئی اور لڑکی دیکھنا اُن کے لیے مشکل تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اولاد پر جبر کی بھی قائل نہ تھیں۔

’’نہیں امّاں جانی! میں نے کبھی اُسے اِس نگاہ سے نہیں دیکھا اور شاید دیکھ بھی نہ پاؤں۔‘‘ ولی نے نہایت سچائی سے کہا۔

روشن آرا بیگم نے بے اختیار طمانیت بھرا سانس لیا۔

’’کیا تمہیں کوئی اور پسند ہے؟‘‘ انہیں ایک اور وسوسہ ستا رہا تھا۔

’’ارے نہیں امّاں جانی۔‘‘ ولی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ’’اِٹس ٹو ارلی۔ ابھی تو مجھے اپنا بزنس سیٹ کرنا ہے پھر کہیں اِن مسئلوں میں اُلجھا جاسکتا ہے۔‘‘ ولی نے اپنی پلاننگ بتائی۔ روشن آرا ایک دم کھل کر مسکرائی تھیں۔

’’پھر پرابلم کیا ہے؟‘‘ اب وہ اُس کی پریشانی کی وجہ جاننا چاہتی تھیں۔

’’وہ ایک بہت اچھی لڑکی ہے، اس کا اس طرح خود کو میرے لیے خوار کرنا مجھے بے حد دُکھ دے رہا ہے۔ میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ کوئی لڑکی دلی و ذہنی طور پر میری وجہ سے تباہ ہو۔‘‘ ولی نے سچائی سے کہا۔

’’لیکن اِس سارے معاملے میں تم کہیں انوالو نہیں ہو، میرا نہیں خیال کہ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت ہے، پھر ایسی باتیں جو خود کے بس میں نہ ہوں وہ اُس سب سے بڑی ذات کے حوالے کردینی چاہیے، وہ جو بہتر چاہے گا وہ ہوجائے گا۔‘‘ روشن آرا نے اُسے تسلی دی۔

’’آئی تھنک آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں میرے پریشان ہونے سے مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔‘‘ ولی نے ماں کی گود میں سر رکھتے ہوئے کہا۔

’’ویسے ایک بات پوچھوں؟‘‘ روشن آرا کسی خیال کے تحت مسکرا اُٹھیں۔

’’حکم میری پیاری امّاں جان!‘‘ ولی نے اپنی جلتی آنکھوں پر اُن کے ہاتھ رکھ کر سکون محسوس کرتے ہوئے کہا۔

’’اگر مجھے تمہارے لیے کوئی لڑکی پسند ہو تو کیا تم میری پسند کو قبول کرلو گے؟‘‘ روشن آرا کی جھجک ولی کو بُری طرح محسوس ہوئی تھی۔

ایک پَل کو بھی ولی کو اپنے دل کی کسی خواہش کا خیال نہ آیا تھا۔ اُس کے نزدیک اپنے ماں باپ کی بات ہر چیز سے اہم تھی۔

’’اماں جان! آپ چاہے میرے لیے کوئی لولی لنگڑی پسند کرلیں مجھے یقین ہے وہ دُنیا کی بہترین لڑکی ہوگی، کبھی بھول کر بھی آپ میرے متعلق کسی وسوسے کا شکار نہ ہوں۔‘‘ ولی نے اپنے دل پر اُبھرتی علیزے کی شبیہہ کو دباتے ہوئے کہا۔

’’اللہ نہ کرے کہ میں اپنے چاند جیسے روشن دل رکھنے والے بیٹے کے لیے کوئی لولی لنگڑی پسند کروں،

ماں تو وہ بھی بے حد پیاری بچی ہے، علیزے کو شروع سے میں تمہارے لیے پسند کرتی آرہی ہوں۔‘‘ روشن آرا بیگم کے الفاظ ولی کے دل پر کسی ٹانک کی طرح اُترے۔

ولی بے اختیار مسکرایا، اُس نے آنکھیں نہیں کھولی تھیں بلکہ اُسی طرح روشن آرا بیگم کی گود میں سر رکھے رہا۔ ایک حیا آلود چہرہ چھم سے اُس کے تصوّر میں آگیا۔

’’میں نے کہا تھا ناں امّاں جان! آپ کی پسند کی ہوئی لڑکی دُنیا کی بہترین لڑکی ہوگی۔‘‘ ولی کے لہجے سے خوشی چھلک رہی تھی۔

’’تو تم کو علیزے کیسی لگتی ہے؟‘‘ روشن آرا بیگم نے اُمید سے پوچھا۔

’’جیسی آپ کو لگتی ہے!‘‘ ولی نے دامن بچایا۔

’’مجھے تو بے حد اچھی لگتی ہے۔‘‘ روشن آرا بیگم نے ہنستے ہوئے کہا۔

’’مجھے بھی۔‘‘ ولی نے دل ہی دل میں کہا۔

❖❖○❖❖

’’اللہ تعالیٰ اور انسان کے درمیان ایک ہی حجاب حائل ہے اور اُس کا نام نفس ہے‘‘ میاں جی نے الی چھوٹی لکڑیاں اکٹھی کرتے ہوئے کہا۔ میرو بے حد دھیان سے اُن کی باتیں سُن رہا تھا ساتھ ساتھ ان کی مدد کے لیے وہ بھی لکڑیاں اکٹھی کر رہا تھا۔

’’میاں جی اِن تینوں گاؤں کی واحد ہستی تھے، جو بچوں کو قرآن پاک کی تعلیم دے رہے تھے۔ گاؤں میں تعلیم کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ لوگوں میں مذہب کا شعور بے حد کم تھا ایسے میں کمزور عقیدہ لوگ فتوں، عاملوں پر بے حد یقین رکھتے تھے۔

’’میاں جی! میری چاچی کے ہاں بہت عرصے بعد اولاد کی اُمید جاگی ہے اور اُس نے منت مان لی ہے کہ گاؤں کی جمعدارنی ’’چوڑا‘‘ نام ہے اُس کا وہ اپنی بیٹی کو اُس عیسائی عورت کی گود میں ڈال کر اس کا نام سے ہی پکارے گی اگر لڑکا ہوا تو اُس کے میاں کا نام ’’لبھا‘‘ ہے۔ وہ اپنے لڑکے کا نام جمعدارنی کے میاں لبھے کے نام پر رکھ لے گی۔ میاں جی کیا ایسا کرنا درست ہوگا؟ میرو کو اپنے گاؤں کے اس طرح کے رسم و رواج ہمیشہ سے بُرے لگتے تھے۔

’’استغفراللہ! ہمارے پیارے آقا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جب کوئی بچہ پیدا ہو تو اس کا بامعنی اور اچھا نام رکھو اور سات دن بعد اُس کا عقیقہ کرو۔‘‘ میاں جی نے وہیں ایک ٹیلے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

’’میاں جی ہمارے گاؤں کے لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں؟‘‘ میرو نے معصومیت سے پوچھا۔

’’اپنے سب سے بڑے مالک سے دوری کے سبب، اُن کے پاس علم اور یقین کی کمی ہے۔‘‘ میاں جی کے لہجے میں تاسف تھا۔

’’یہ اللہ رحمٰن و کریم پر یقین ہی ہے، جو ہمیں ہر مشکل سے نکالتا ہے، اللہ پر یقین نہ کرنے والے اپنے راستے سے نکل کر ہمیشہ یوں ہی بھٹکتے رہتے ہیں۔‘‘

’’پھر ایسا کیا کیا جائے کہ ہمارے لوگ اس طرح کی بدعت سے بچ جایا کریں۔‘‘ میرو نے سب

لکڑیوں کا گٹھا بنا کر اپنے کندھے پر اُٹھالیا تھا۔ میاں جی بھی ساتھ ہی کھڑے ہو گئے۔

''ان سب باتوں سے عملی انکار کیا جائے، عمل ہی ان بے بنیاد رسموں کو توڑے گا۔''

''لیکن میاں جی! کس میں اتنی ہمت ہے کہ اپنے بڑوں کے آگے کھڑا ہو جائے؟'' میرو واقعی ان بنیاد رسموں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

''تم بنو! ہاں تم بنو بارش کا پہلا قطرہ! تمہیں دیکھ کر بہت سارے لوگ سامنے آئیں گے، جو ان رسو سے بے زار ہوں گے لیکن اپنی کم ہمتی کے باعث اُن میں سامنے آنے کی ہمت نہ ہو گی۔'' میاں جی اُسے ہمت دلائی۔

''میں؟ لیکن میاں جی میں کیا کر سکتا ہوں؟'' میرو نے حیرانی سے پوچھا۔

''تم اپنے عمل کے ذریعے انکار کر سکتے ہو، تم اپنے گھر سے شروعات کر سکتے ہو اپنے چچا کے بچے کا بدل کر۔ بظاہر یہ معمولی سی بات لگتی ہے لیکن تبدیلی کا عمل چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں سے ہی ہوتا ہے۔ کیا تم میں عمل کی ہمت ہے؟'' میاں جی کا سوال میرو کے اندر سوئے ہوئے جذبے کو جگا رہا تھا۔

''آپ ہی تو کہتے ہیں کہ انسان اللہ کی مدد سے سب کچھ کر سکتا ہے انشاء اللہ میں بھی اللہ کی مدد۔ کوشش کروں گا۔'' میرو کے لہجے سے سچائی چھلک رہی تھی۔

''انشاء اللہ! اللہ تمہاری مدد فرمائے۔'' میاں جی نے ساتھ ہی اُسے دعا دی۔ اُسی پل سامنے دھول کے بگولے اُڑاتا کوئی گھوڑے پر سوار آیا۔ میرو نے بازو پکڑ کر میاں جی کو سائیڈ پر کیا۔ گھوڑ سینہ تانے گردن اکڑائے اُن کے پاس سے گزر گیا لیکن کچھ دور جا کر واپس پلٹا، میرو کے ماتھے پر نا گواری کی لکیریں اُبھر آئی تھیں۔ یہ سیّد سرفراز تھا، جو اپنی زمینوں کا دورہ کر کے لوٹا تھا۔ گھوڑے پر وہ جب میلوں اپنی زمین کا سفر کرتا تو زمینوں کا بڑھتا سفر اُسے مزید تکبر میں مبتلا کر دیتا۔ ''سید سرفراز زمینوں کا اکلوتا مالک ہے!'' وہ یہ جملہ مسلسل دُہراتا، ایسے میں وہ سید عبداللہ، اپنی بہنوں اور اپنے باپ شخص کو بھول جاتا تھا۔ لالچ اُسے گھیر لیتا تھا۔

''کدھر جا رہے ہو میرو!'' سید سرفراز نے گھوڑے کو گول دائرے میں چکراتے ہوئے پوچھا۔

''میاں جی کو مسجد تک چھوڑنے جا رہا ہوں۔'' میرو نے نہایت ضبط سے کہا۔ ماں باپ کی دی ہوئی نہ ہوتی تو میرو بھی یوں سید سرفراز سے عاجزی سے بات نہ کرتا۔ یہ وہ ہی جانتا تھا کہ کس دل سے وہ سرفراز کے سامنے بات کرتے ہوئے اپنی آواز اور نگاہ نیچی رکھتا تھا۔

''ہا۔ ہا۔ ہا۔'' سید سرفراز میرو کے تاثرات سے لطف اندوز ہوا۔

''اور کیا حال ہے تمہارا مولوی؟'' سید سرفراز کے لہجے میں بے انتہا بدتمیزی تھی۔

''الحمدللہ!'' میاں جی نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

''سنا ہے بڑے بچے اکٹھے کر کے درس ورس دیتا ہے تو؟'' سید سرفراز نے گھوڑے کو اس طرح گھ کہ ساری دُھول مٹی میاں جی اور میرو کے چہرے پر آئی، دونوں نے بے اختیار اپنے ہاتھ آنکھوں رکھے۔

''ہا۔ ہا۔ ہا۔'' سید سرفراز نے بے ڈھنگے انداز میں قہقہہ لگایا

''اوئے میرو! یہ بات کبھی اپنے ذہن سے نہ نکالنا کہ جو بھی ہماری طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھے گا ایسے ہی لی میں خوار ہو گا یہ... یہ جو تیرا باغی چہرہ ہے نا سب بولتا ہے!'' سید سرفراز نے ہاتھ میں پکڑی چھڑی میرو کی ٹھوڑی سختی سے چھوئی۔ میرو نے سلگتی سانسوں کے ساتھ اُسے دیکھا۔

''اوئے! نگاہ نیچی کر۔'' سید سرفراز دھاڑا، میرو شاید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ میاں جی نے اس کا ہاتھ تھام ر روکا۔

''تیری اکڑ تو میں شوں کر کے نکال دوں گا۔ تُو سید سرفراز کو نہیں جانتا کہ جو اُس کے سامنے سر اُٹھاتا اُس کا سر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جھک کر رہ جاتا ہے۔ ہونہہ!'' سید سرفراز نے ایک تضحیک بھرا ہنکارا بھر گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اُس کے جاتے ہی ہر طرف دھول تھی۔ میرو نے غصے سے مٹھائیاں بھینچ لیں۔

''بیٹا غصہ پی جانے والا اپنے نفس پر فتح حاصل کر لیتا ہے، تُو کیوں اِس غصے کے آگے ہارتا ہے!'' اں جی نے دھیرے سے اس کا کندھا دبا کر تسلی دی۔

''میاں جی! ہم اگر غریب ہیں تو کیا ہماری کوئی عزت نہیں ہے؟'' میرو نے سلگ کر پوچھا۔

''ے کیوں نہیں ہے، لیکن لوگوں کے اچھے بُرے رویے آپ کی عزت کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ انسان کو ل کرنا چاہیے کہ اُس کے عمل کو سے بس اللہ رحمٰن کے سامنے باعزت رکھیں۔''

''جی!'' میرو نے بہ مشکل خود پر قابو پا کر کہا۔

''چلو بیٹا پھر گھر چلیں!'' میاں جی نے پوچھا۔

''جی چلیں۔'' میرو ڈھیلی سی چال چلتا آبادی کی طرف چل دیا لیکن اُس کا دِل بے حد ٹوٹا ہوا تھا اور لے ہوئے دل اکثر بڑے خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔

❖❖○❖❖

ا کون ہے
یں کون ہوں، سب لوگ ہیں
ھڑے ہوئے
ن زہر ہیں
ے مہر ہیں، سب شہر ہیں
ے ہوئے
رے لیے
رے بہت سے عہد ہیں
الے ہوئے
رے لیے
ے بہت سے خواب ہیں
ٹے ہوئے

چلے جاؤ یہاں سے، سب چلے جاؤ تم سب ناپاک لوگ جان بوجھ کر میری چیزوں کو ہاتھ لگا کر

ناپاک کرتے ہو، ناپاک! غلیظ!'' زبیدہ بیگم کا تنفس بگڑنے لگا تھا۔

سمعان اندر آیا تو اُس کے سر میں پتھر کا ڈیکوریشن پیس لگا تھا۔ وہ سر تھام کر بیٹھتا چلا گیا، قاسم علوی اُس کے پیچھے ہی داخل ہوئے تھے۔ وہ بھی گھبرا کر سمعان کے اوپر جھکے تھے۔ سمعان کے سر سے خون بھل بھل باہر نکل رہا تھا۔

''سمعان!'' قاسم علوی بے حد گھبرائے تھے۔

''زبیدہ! اسٹاپ دِس آل نان سنس۔'' قاسم علوی نے چلّا کر کہا، زبیدہ بیگم کا ہاتھ فضا میں اُٹھا ہوا تھا ایک دم نیچے گر پڑا، ابھی تک انہیں اپنی کی ہوئی کارگزاری سمعان کے ماتھے پر نظر نہ آئی تھی۔ وہ اس قدر غصّے میں پاگل ہو رہی تھیں کہ سامنے اُن کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''تم کیسی ماں ہو؟'' زندگی میں پہلی بار قاسم صاحب کی زبان پر شکوہ آیا تھا۔

''اُٹھو سمعان جلدی سے!'' قاسم علوی کے لہجے میں بے حد تڑپ تھی، سمعان کی ساری شرٹ اُس کے خون سے بھیگ رہی تھی۔

''اُٹھو بیٹا! انہوں نے اُسے سہارا دے کر اُٹھایا۔ اور تم زبیدہ بس کر دو! یہ ناپاکی کا وہم تمہارے دماغ میں کسی کینسر کی طرح پھیل گیا ہے۔ ناپاکی، ناپاکی! خدا کے لیے اب بس کر دو!'' قاسم علوی دُکھ سے کہتے سمعان کو سہارا دے کر باہر نکل گئے اور زبیدہ بیگم بے اختیار نیچے بیٹھتی چلی گئیں اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ واقعی میرا وہم کینسر بن گیا ہے، یہ مجھے مار کر ہی دم لے گا۔ لیکن... لیکن ناپاکی تو ہے نا، میرے وجود کے ساتھ لگ گئی ہے۔ وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئیں اُن کا رُخ باتھ روم کی طرف تھا، جہاں انہوں نے اب گھنٹوں مل مل کر نہانا تھا اُس گندگی کو اُتارنے جو اُن کے وجود کو لگ گئی تھی۔

❖❖○❖❖

کچھ کہنے کچھ سننے کو دِل چاہتا ہے
تجھے دِل کی بات بتانے کو دِل چاہتا ہے
سوچا اپنی بے بسی بیان کر ہی ڈالوں
پر ابھی اِسے اور بڑھانے کو دِل چاہتا ہے

ولی نے برش پیلٹ Palatt میں رکھ کر پاس پڑے اسٹول پر بیٹھ کر پینٹنگ کو غور سے دیکھا، علیزے کی تصویر تھی، جو سفید دوپٹہ اوڑھے ہوئی تھی۔ اُس کا آدھا چہرہ دوپٹے کی اوٹ سے نظر آ رہا تھا ڈارک بلیو بیک گراؤنڈ میں بنا یہ پورٹریٹ بہت ہی خوب صورت بنا ہوا تھا، جیسے چاندنی رات میں چاند چمک رہا ہو، علیزے کے چہرے پر بنا تِل بے حد نمایاں تھا۔ ولی کو پتا بھی نہ چل سکا کہ کب وہ اتنا خود ہوا تھا کہ تین گھنٹے مسلسل کینوس کے سامنے کھڑے رہ کر اُس نے وہ چہرہ بنایا تھا، جو اُسے اپنے دل خبر دے گیا تھا کہ عبدالولی کی زندگی میں بھی کوئی بے حد اہم ہو گیا ہے۔

''اوں!'' ولی کو اپنی پشت پر کھانسے کی آواز آئی۔

''یہ تمہارا تخیل ہے یا پھر حقیقت؟'' طارق بلیک لیدر کی جیکٹ اور لانگ شوز پہنے پوری تیاری میں آ رہا تھا۔

''نہ سلام نہ دُعا! پولیس کی طرح آتے ہی تفتیش شروع کر دی۔'' ولی خوش دِلی سے مسکراتے ہوئے اس سے بغل گیر ہوا۔

''کیسے ہو، کہاں تھے اتنے دن؟ تمہارا سیل بھی بند تھا۔ تم تو اچانک ہی منظر سے غائب ہو جاتے ہو اور تمہاری یاد آئے تو تمہیں کہاں ڈھونڈا جائے؟'' ولی نے کرسی اُس کے لیے خالی کی جس پر اُس کی اسکیچ بُک رکھی ہوئی تھی۔

''ارے۔ ارے! تم نے تو سوالات کی بمباری شروع کر دی کہ جواباً سننے کو کچھ تیار نہیں ہو۔'' طارق نے اپنی جیکٹ اُتار کر کرسی کے ساتھ لٹکا دی۔ اس کی بیک بیلٹ کے ساتھ لٹکا موزر بے حد نمایاں تھا۔

''یار رابطے میں رہا کرو۔'' عبدالولی واقعی اُسے مِس کر رہا تھا۔ دِل کی دنیا میں ایسی زبردست تبدیلی آئی تھی کہ وہ فوراً اسے اپنے فاسٹ فرینڈ سے شیئر کرنا چاہ رہا تھا۔

''بس یار کچھ بے حد مصروفیت کا سامنا تھا۔'' طارق نے اپنی جلتی آنکھوں پر ہاتھ رکھے، وہ بے حد تھکا ہوا تھا۔ وہ تین راتوں سے مسلسل جاگ رہا تھا۔ عبدالولی نے انٹرکام پر کافی اور سینڈوچ کا کہا۔ انٹرکام کا ڈائریکٹ کچن سے رابطہ ہو جاتا تھا۔

''خانساماں نے دس منٹ میں آنے کو کہا ہے تب تک تم اِدھر ریسٹ کر لو۔'' عبدالولی نے سائیڈ پر بنے فوم بیڈ کی جانب اشارہ کیا جو اُس نے اسٹوڈیو میں رکھا ہوا تھا۔ جب رات گئے وہ کام کرتے تھک جاتا تو یہیں پر سو جایا کرتا تھا جن دِنوں وہ کسی اسائنمنٹ پر کام کر رہا ہوتا تھا وہ زیادہ تر وقت اپنے اسٹوڈیو میں گزارتا تھا۔ ایسے میں کھانا چائے اس کے لیے یہیں آتی تھی۔

''یار یہ تو بے حد نیکی کی ہے۔'' طارق نے ایک سیکنڈ نہیں لگایا لیٹنے میں، وہ بے حد تھکا ہوا تھا۔ عبدالولی نے پیار بھری نگاہ اُس پر ڈالی، طارق اُسے بھائیوں کی طرح عزیز تھا۔ اُس پر وہ بہترین عادات کا مالک تھا۔ طارق کو چند پل لگے تھے بے خبر ہونے میں، سوتے میں اُس کا چہرہ بے حد معصوم نظر آ رہا تھا۔

عبدالولی نے اونچے لمبے طارق پر کمبل ڈال کر اسٹوڈیو میں زیرو پاور کا بلب آن کیا اور خود باہر نکل گیا۔

''آپ نے کافی کے دو کپ منگوائے تھے، کیا کوئی مہمان آیا ہے؟'' نگینہ ہاتھ میں اپنی سیامی بلّی تھامے کوریڈوز میں عبداللہ کو ملی۔

''ہاں طارق آیا ہوا ہے اور میرے اسٹوڈیو میں آرام کر رہا ہے کسی کو ڈسٹرب نہ کرنے دینا، میں کچھ دیر کے لیے اپنے کمپیوٹر پر ہوں۔ آج مجھے اپنے تھیسز کے کچھ لے آؤٹ نکالنے ہیں۔'' عبدالولی یہ کہتے ہوئے تیزی سے کمرے کی جانب بڑھا۔

''مانو رانی! شی، چپ شور نہیں کرنا طارق بھائی آرام کر رہے ہیں۔'' نگینہ نے اپنے بازوؤں میں تھامی بلی سے کہا، جو مسلسل میاؤں میاؤں کہہ کر کھیلنے کے لیے مچل رہی تھی۔ یہ وقت وہ نگینہ کے ساتھ کھیل کر گزارتی تھی۔ اُسی پل فون کی بیل بجی، نگینہ نے بلّی کو زمین پر چھوڑا اور خود کوریڈور میں رکھا فون اُٹھالیا۔ کچھ دیر بعد جب وہ فون سے فارغ ہوئی تو بلّی غائب تھی۔ نگینہ نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو بلی سامنے

بنے اسٹوڈیو کے دروازے سے اندر گھس گئی تھی۔

''اوہ مائی گاڈ! وہ بلی کے پیچھے بھاگی۔ رانی رُکو۔ لیکن نٹ کھٹ بلی جسے سارے گھر میں گھومنے کی عادت تھی اندر جا چکی تھی۔ بھائی کہہ رہے تھے کہ طارق بھائی کو ڈسٹرب نہیں کرنا اس خیال کے تحت کہ نگینہ بے حد تیزی سے اسٹوڈیو میں داخل ہوئی۔ باہر روشنی سے ایک دم اندھیرے میں آ کر نگینہ کو کچھ نظر نہ آیا۔ لیکن جیسے ہی اُس کی آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں وہ نہایت تیزی سے طارق کی جانب بڑھی، رانی بڑے مزے سے اُس کے کمبل میں گھس گئی تھی۔

''رانی باہر نکلو۔'' نگینہ نے گھبرا کر اُسے پکڑنا چاہا لیکن شرارتی رانی اُچھل کر دوسری جانب ہوگئی، نتیجے میں نگینہ اپنا وزن نہ سنبھال نہ پائی اور سیدھی بے چارے بے سُدھ سوئے طارق پر جا گری۔ طارق ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ نگینہ شرمندگی سے فوراً پرے ہوگئی۔

''کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں؟'' طارق نے اپنی نیند بھری آنکھوں کو ملتے ہوئے خود سے با آواز بلند سوال کیا۔

''لیکن یہ کس قدر حسین خواب ہے۔'' طارق کا لہجہ بھاری ہو رہا تھا اس کے وجود سے اُٹھنے والی پرفیوم کی خوشبو نگینہ کو عجیب سا احساس دلا رہی تھی۔ وہ بے حد گھبرا گئی تھی۔

''سوری طارق بھائی! یہ جو رانی ہے نا بہت شرارتی اور بدتمیز ہے اس کی وجہ سے آپ کی نیند ڈسٹرب ہوئی ہے۔'' نگینہ نے سرگوشی میں یوں کہا، جیسے ابھی بھی وہاں کوئی سویا ہو۔

''کون رانی؟'' طارق نے حیرت سے اُس بے خبر حُسن کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ میری بلّی!'' نگینہ نے رانی کو پکڑ کر سامنے کرتے ہوئے کہا۔

''کیا بات ہے، آپ کی بلّی کا نام تو خاصا شاہانہ ہے کسی ریاست کی رانی مہارانی کی طرح۔'' طارق کا دل نگینہ سے بات کرنے کو چاہ رہا تھا اس لیے وہ اِدھر اُدھر کی غیر ضروری باتیں کر رہا تھا۔

''مجھے واقعی رانی کی طرح لگتی ہے اپنے مزاج میں اپنی مرضی کی مالک۔'' نگینہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ اُس کے سنہری بال آج ڈھیلی ڈھالی چوٹیوں سے باہر نکل آئے تھے اور اُس کے چہرے پر گرے ہوئے تھے طارق کو اِس منظر سے نگاہ ہٹانا دُشوار ہو رہا تھا ہلکی روشنی میں معصوم سی نگینہ طارق کو بے چین کر گئی۔

''نگینہ!'' طارق نے بھاری آواز میں اُسے مخاطب کیا شدت جذبات سے اُس کی آواز میں بھاری پن بے حد نمایاں تھا۔

''جی طارق بھائی!'' نگینہ نے پوچھا۔

''پلیز تم یہاں سے جاؤ۔'' طارق نے ایک دم بے رُخی سے کہا۔

''تمہارا یہاں کھڑا ہونا میرے لیے کسی امتحان سے کم نہیں۔'' انہوں نے دِلی جذبات چھپاتے ہوئے کہا۔

''جی بھائی۔'' نگینہ خود طارق کی نیند ڈسٹرب ہونے پر شرمندہ تھی۔

''سوری میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا!'' وہ جاتے جاتے بولی۔

''تم مجھے ہمیشہ بے حد ڈسٹرب کرتی ہو۔'' طارق نے بے حد مدھم آواز میں کہا۔

نگینہ تو جا چکی تھی لیکن اُس کے وجود کی خوشبو ابھی تک وہاں تھی۔

''اے خوشبو جیسی لڑکی، اے معصوم رنگوں سے گندھی لڑکی! کاش میں تم کو بتا سکوں کہ تم میرے لیے کتنی اہم ہو۔'' طارق نے گہری سانس بھر کر تکیے پر سر گراتے ہوئے کہا۔ اب وہ چاہ کر بھی نہ سو سکتا تھا۔

❖❖○❖❖

دیوار پہ لرزہ ہے تو دَر کانپ رہا ہے
بچھڑے ہو تو اُجڑا ہوا گھر کانپ رہا ہے
تم آنکھ کی پتلی میں چھپے سچ کو بھی دیکھو
مُجرم تو نہیں ہے وہ اگر کانپ رہا ہے
ویران ہے اِس درجہ ترے بعد مرا دِل
اِس شہر میں آتے ہوئے ڈر کانپ رہا ہے
اِک میں کہ جُدائی نے مجھے کردیا ساکت
اِک تو ہے کہ صدمے سے اُدھر کانپ رہا ہے
آنگن کو پلٹ نہ جاؤں نہ میں چھوڑ کے اُس کو
صحرا میں مرا خواب سفر کانپ رہا ہے
یا تو مری بینائی پہ ہے خوف مسلط
یا نہر کے پانی میں شجر کانپ رہا ہے
بجھنے نہیں دوں گا میں کبھی ہجر کے صدمے
دل میں تری یادوں کا شرر کانپ رہا ہے

''اب کیسا محسوس کر رہے ہو شہباز علی؟'' احمد شاہ نے ڈاکٹر کے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے پوچھا۔

''اتنے عرصے بعد خوشی اِس قدر ملی احمد شاہ کہ میرا کمزور دل اُسے برداشت نہیں کر پایا۔'' شہباز علی کی آواز میں صدیوں کی تھکان نمایاں تھی۔ آج صبح وہ عبدالولی کے مائم کی ریہرسل دیکھنے الحمرا چلے گئے تھے۔ سفید روشنی میں سفید لباس پہنے، جو لڑکی اسٹیج پر کھڑی تھی وہ بلاشبہ سارہ نہ تھی لیکن بالکل سارہ کی پرچھائیں تھی۔ وہ سائرہ تھی اُن کی بیٹی۔ شہباز علی واقعی اچانک ملی خوشی سنبھال نہ پائے تھے۔ سائرہ کو دیکھ کر سارہ کی یاد شدت سے اُن کا دل دُکھا گئی تھی وہ کھڑے کھڑے گر گئے تھے۔ احمد شاہ بے حد گھبرا گئے سب لڑکے لڑکیاں بھی گھبرا کر اُن کے گرد کھڑے ہوگئے۔ عبدالولی نے جلدی سے شہباز علی کو اُٹھا کر گاڑی تک پہنچایا۔

احمد شاہ چونکہ حقیقت سے آگاہ تھے اِس لیے بے حد پریشان تھے۔

ڈاکٹر کے ذریعے انہیں معلوم ہوا کہ شہباز علی دل کے مریض ہیں اور کوئی بھی اچانک خوشی یا صدمہ اُن کے لیے خطرے کا باعث ہو سکتا ہے، ڈاکٹر انہیں مختلف انجکشن لگا کر چلا گیا تھا۔ شہباز علی دو تین گھنٹے دواؤں کے زیرِ اثر سوتے رہے۔ احمد شاہ اُن کے پاس ہی رُکے ہوئے تھے۔ نیند میں شہباز علی مسلسل

PAKISTANIPOINT

سائرہ، سائرہ اور طارق کو پکارتے رہے تھے۔ احمد شاہ کا دِل شہباز علی کے لیے بے حد دُکھا تھا۔ اِس نے بے حد مسافت کاٹی تھی اور اب وہ تھکنے لگا تھا۔ وہ حق دار تھا کہ اولاد کی خوشیاں اب اُسے ضرور ملیں ابھی شہباز علی کے ہوش میں آنے کے بعد ڈاکٹر انہیں چیک کر کے گیا تھا اور گھر لے جانے کی اجازت دے دی تھی۔

''شہباز تم کب سے اتنے کمزور ہو گئے؟'' احمد شاہ نے اُن کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔

''بظاہر بڑے بڑے مضبوط درخت اچانک گر پڑتے ہیں انہیں بھی میری طرح شاید جُدائی کا روگ لگ جاتا ہوگا۔'' شہباز علی نے بے حد نقاہت بھرے لہجے میں کہا۔

''احمد شاہ! اپنی بیٹی کو دیکھ کر یہ دِل اتنا خوش ہوا کہ بجائے اُسے بڑھ کر گلے لگاتا ایک دم کمزور پڑ گیا احمد شاہ میں اپنے بچوں کو اپنی پہچان کے ساتھ فوری ملنا چاہتا ہوں، پلیز میری مدد کرو۔ احمد شاہ پلیز'' شہباز علی کسی بچے کی طرح مچلے۔

''ہمت سے کام لو، میں دیکھتا ہوں کہ میں فوری طور پر کیا کر سکتا ہوں۔'' احمد شاہ نے شہباز علی کو تسلی دی جو ایک پل ضائع کیے بغیر اپنے بچوں سے فوراً ملنا چاہتے تھے، انہیں گلے لگا کر اپنی برسوں کی پیاس بجھانا چاہتے تھے۔

❖❖○❖❖

دھن دے، جی راکھیے جی دے رکھیے لاج
جیو لاج دھن دیجیے اک پربت کے کاج
پربت کرے ایسی کرے جیسے راسی ڈور
گلا پھنسا وے اپنالا وے نیر جھکور

آسمان پر ستارے ٹنکے ہوئے لگ رہے تھے۔ گاؤں میں باہر سونے کا رواج تھا۔ نفیسہ نے سب بستر باہر لگائے تو فیصل سے پوچھ کر اُس کا بستر بھی باہر کھلے آنگن میں لگا دیا، سب سو چکے تھے جب فیصل کھوئے کھوئے انداز میں لیٹا ہوا تھا۔ سفید کبوتر جیسے پاؤں بار بار اُس کے ذہن میں آ رہے تھے. کوئی اتنے خوب صورت پاؤں بھی رکھ سکتا ہے؟ پھر وہ خود ہی ہنس دیا۔ یہ سب تو اللہ کی بنائی ہوئی چیز ہیں لیکن اُس لڑکی میں خاص طرح کی کشش تھی۔ لندن میں اُس نے پتلی، سبز آنکھوں والا بے حد دیکھا تھا لیکن کوئی اُسے اپنی طرف نہ کھینچ سکا تھا اور کل وہ بھوری آنکھوں کے سحر میں جکڑ گیا تھا۔ کچھ واقعی جادو جیسے ہوتے ہیں جکڑ لیتے ہیں، فیصل اُسے دوبارہ دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ کون تھی وہ نہ جانتا تھا لیکن اُسے دیکھ کر خاص طرح کی اُنسیت کا احساس ہوا تھا۔ وہ اُس کے لیے اجنبی ہرگز نہ تھی، یوں جیسے شروع سے اُس کے دِل کی مکین ہو۔ گاؤں کی گوری پر تمہارا دل آ گیا؟ فیصل نے کروٹ لیتے ہوئے سے سوال کیا۔ تم جو گاؤں کی دھول مٹی سے گھبراتے تھے، کبھی کم پڑھی لکھی لڑکی تمہاری بیوی بنے گی تم سوچا تک نہ تھا۔ شاید وہ بالکل اَن پڑھ ہو، لیکن... لیکن تمہارے دل کی ساری فیور اُس کے ساتھ. ایسا کیا خاص تھا جو مجھے اُس کی جانب کھینچ رہا ہے، پہلی نظر کی محبت جس پر میں اعتبار نہ کرتا تھا اُس کا شکار میں خود ہو گیا ہوں، میرا دل کس قدر بے چین ہے، اُسے دیکھنے کے لیے، فیصل ایک دم چارپائی

اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ کون ہے؟ کہاں سے آئی تھی؟ میں اُس کے متعلق کچھ بھی تو نہیں جانتا، فیصل کو ایک دم پیاس کا احساس جاگا تھا۔ رات کی چاندنی ہر سُو پھیلی ہوئی تھی، وہیں صحن میں پانی کے مٹکے بھر کر رکھے جاتے تھے، اُس پر مٹی کے آب خورے موجود ہوتے تھے۔ فیصل نے پانی لینے کے لیے مٹکے کے ڈھکن کو اٹھایا، مٹکے کے منہ پر امّاں یا نفیسہ میں سے کسی نے موتیے کے پھول پُرو کر ہار بنا کر ڈالا ہوا تھا، جس کی ہلکی بھینی خوشبو ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ موتیے کی خوشبو نے اُس اَن جانی لڑکی کی یاد میں شدت پیدا کر دی تھی۔ فیصل نے نہایت بے دِلی سے دو گھونٹ پانی پیا۔

سدرہ بی بی کے بال بے حد لمبے تھے اس لیے زلیخا بی بی اُس کے لیے دو تین قسم کے تیل ملا کر اُس کی چوٹی کرتی تھیں اِن تیلوں کی خوشبو مل جُل کر پھولوں جیسی ہو جاتی تھی، اِس لیے سدرہ میں سے ہر وقت خاص طرح کی خوشبو کا احساس ملتا تھا۔ فیصل جب اُس سے ملا تھا تو یہ خاص طرح کی خوشبو اُسے بھی متوجہ کر گئی تھی۔ اِسی لیے تو اُس نے اُسے بے اختیار ''موتیے'' کے نام سے پُکارا تھا۔

''موتیا! کون ہو تم؟ میں تم سے فوراً ملنا چاہتا ہوں۔ جب سے تم مِلی ہو مجھے اپنا آپ تمہارے بغیر ادھورا لگنے لگا ہے۔'' ڈاکٹر فیصل نے بے اختیار اپنی بے بسی کا اظہار کر ڈالا۔

''پتر سوئے نہیں؟ خیر تو ہے، تیرا جی اچھا ہے؟'' ماسی صابراں نے بیٹے کو چارپائی پر پاؤں لٹکا کر بیٹھے دیکھا تو خود اُن کی نیند بھاگ گئی تھی۔

''کچھ نہیں امّاں! میں ٹھیک ہوں۔'' فیصل نے ماں کی پریشانی کے خیال سے فوراً چارپائی پر لیٹتے ہوئے کہا۔

''تیری آواز اور شکل ایک دم کیسے پریشان ہو گئی ہے، جب سے تُو درگاہ سے آیا ہے چُپ چُپ ہے، تُو سات سمندر پار سے آیا تو تیرے مزاج کی تبدیلیاں میری انگلیوں کی پوروں میں تھیں۔ میں ماں ہوں تیری ساری رمزیں جانتی ہوں، کیا بات ہے پُتر کیوں اتنا کھویا کھویا سا ہے، کیا اپنی ماں سے بھی چھپائے گا؟'' ماسی صابراں نے اُس کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''میں کیا بتاؤں امّاں؟ جب مجھے خود بھی ٹھیک سے نہیں پتا کہ میں کس بات کو لے کر اتنا بے چین ہوں۔'' فیصل نے بے بسی سے کہا، یہ دل کی لگی تھی وہ کیسے اتنی جلدی اقرار کر لیتا پھر جب وہ اُس لڑکی کے اصل نام تک سے واقف نہ تھا تو وہ امّاں کو کیا بتاتا۔

''اللہ خیر کرے، میرے گھبرو جوان اتنے قابل پُتر کو نظر تو نہیں لگ گئی؟'' ماسی صابراں کو پُرانا وہم ستایا، اس گاؤں کا کوئی لڑکا دسویں بھی نہ کر سکا تھا۔ ایسے میں واحد اُن کے بیٹے تھے، جو نہ صرف پڑھ گئے تھے بلکہ بے حد قابل ثابت ہوئے تھے۔ فیصل بے حد قابل ڈاکٹر تھا یہ حقیقت بے شک ابھی وہ پوری طرح نہ جانتی تھیں لیکن اپنی اولاد کو سارے گاؤں میں واحد پڑھا لکھا پا کر جہاں اُن کا سر فخر سے بلند ہوتا تھا وہاں دل وسوسوں سے پریشان ہو جاتا تھا۔

''فیصل پُتر اِدھر میرے پاس آ۔'' انہوں نے سر پر دوپٹہ لے کر آیت الکرسی اور چاروں قُل پڑھ کر اس پر پھونکے۔ چل شاوا میرا بیٹا کلمہ شریف پڑھ کر آنکھیں بند کر کے سو جا، انشاء اللہ بڑی اچھی نیند آئے گی۔'' انہوں نے اُس کے ماتھے پر پیار کرتے ہوئے کہا، فیصل کے اندر تک واقعی ٹھنڈک اُتر آئی

تھی۔ وہ بے اختیار مسکرا دیا۔

"تھینک یو لتاں! تم بہت سادہ اور اچھی ہو واقعی مائیں ٹھنڈی چھاؤں ہوتی ہیں۔" فیصل نے سے اعتراف کیا۔

"اللہ تجھے وڈی حیاتی دے، بھاگ لگائے۔" ماسی صابراں کا تو ہر سانس اُسے ہمیشہ دعائیں ہی تھا۔

فیصل کو بس کچھ پل لگے پرسکون نیند میں گم ہوتے۔

❖❖○❖❖

"لتاں جان! عائشہ جیسی لڑکی تو آپ کے بیٹے کی دلہن بننی چاہیے تھی۔" سید سرفراز نے کڑے تیوروں سے کہا۔

"پتر! عائشہ کے باپ نے اپنی مرضی سے عبداللہ کو پسند کیا ہے، پھر مجھے بہت دیر سے اِس رشتے کے متعلق پتا چلا۔" ریحانہ بی بی نے کہا۔

"مجھے کچھ معلوم نہیں! آپ کچھ بھی کرو اور یہ رشتہ روکو۔" سید سرفراز کے لہجے میں ضد تھی۔

"اگر تجھے لڑکی امیر چاہیے تو اُس کا انتظام میں نے کرلیا ہے۔ میری چچا زاد کی بیٹی ہے بہت ساری زمین لائے گی، عائشہ سے بھی دوگنی زمین ہے اُس کی۔" ریحانہ بی بی نے بیٹے کو لالچ دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن لتاں جان! وہ عائشہ تو نہ ہوگی۔" سید سرفراز کی آنکھوں کے سامنے عائشہ کا مغرور چہرہ لہرا گیا۔ اُس کی ادائیں اُس کی غیرت کو للکارتی تھیں۔ وہ ضد بنتی جا رہی تھی اُس کی، جن نگاہوں سے وہ اُسے دیکھتی تھی وہ سید سرفراز کو آگ لگا دیتی تھیں۔ آج تک عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھنے والا سید سرفراز عائشہ کی اُٹھی گردن اور متوازن چال کو اپنی توہین سمجھنے لگا تھا۔

"لیکن پتر یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ سید نواز اور سید عاشق علی دونوں نے اپنی مرضی سے رشتہ طے کیا ہے وہ بھلا کیسے اِس رشتے کو توڑنے دیں گے۔" ریحانہ بی بی نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"لتاں کوئی چکر چلائیں، کچھ کریں لیکن وہ لڑکی صرف اور صرف میری ہونی چاہیے۔" سید سرفراز بولا ضد کر کے چل دیا، جیسے ریحانہ بی بی سے وہ کوئی کھانے پینے کی چیز مانگ رہا ہو۔ ریحانہ بی بی نے پریشانی سے اپنا ماتھا مسلا، کیا کروں اِس لڑکے کا؟ اُلٹی ضد پکڑ کر بیٹھ گیا ہے اس کے باپ چچا سے میں کیسے اس کے بارے میں کہوں، بات ہی ایسی تھی کہ وہ بے حد پریشان تھیں کیوں کہ وہ جانتی تھیں کہ سید سرفراز علی بے حد ضدی ہے۔ جب تک اُس کی بات نہ مانی جائے وہ چین سے بیٹھتا ہے نہ بیٹھنے دیتا ہے۔ اگر وہ کچھ نہ کر سکیں تو بھی وہ ضرور کچھ نہ کچھ کرے گا، چاہے اس کا نقصان کچھ بھی ہوتا۔

بشیراں حقہ تازہ کر لائی تھی۔ انہوں نے حقہ کو منہ لگایا تو اُس کی گڑگڑ کی آواز کمرے میں پھیل گئی۔ انہوں نے بے دلی سے حقے کی نالی سائیڈ پر رکھ دی، اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکلنا چاہیے اب اُن کا شاطر ذہن مختلف منصوبے بنانے میں مصروف ہوگیا تھا۔

❖❖○❖❖

"کیا بات ہے بی بی چپ چپ ہیں؟ نہ آج آپ کبوتروں کو دانہ ڈالنے آئیں اور نہ ہی کمرے سے

کسی کام سے باہر نکلیں۔" عذرا جو سدرہ بی بی کی خاص ملازمہ تھی، اُس نے پوچھا۔ اِس وقت وہ سدرہ بی بی کے لمبے بال کھولے اُن میں تیل لگا کر چوٹی کر رہی تھی۔ یہ اُس کے روز کے معمول میں شامل تھا۔ سید نوازش علی نے بیٹیوں کو بہت پیار سے رکھا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ ان کے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے الگ سے ملازمائیں رکھ چھوڑی تھی۔ انہیں ان کی ہر چیز کی پرواتھی سوائے اُن کی شادیوں کے، جب جب اُن کی شادی کی بات ہوتی تو وہ خاموش ہوجاتے تھے۔ تب انہیں نہ کوئی بیٹی یاد رہتی تھی اور نہ اُس کی ضروریات یاد رہتی تھیں۔

"بس ایسے ہی!" سدرہ بی بی نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"بی بی میں تو اُس روز حویلی نہیں آئی تھی سُنا ہے آپ درگاہ گئی تھیں بڑی بی بی کے ساتھ، کیا آپ نے بھی وہاں دیا جلایا تھا؟" عذرا نے شوق سے پوچھا۔

"منت کا دیا؟" سدرہ بی بی ابھی بھی کھوئی کھوئی سی تھی۔

"ہاں بی بی! اگر تم نے منت کا دیا جلایا ہے تو تمہیں ہر جمعرات کو وہاں ضرور جانا ہوگا۔ ورنہ!!!" عذرا نے اُسے ڈراتے ہوئے کہا۔

"جب تک منت نہ پوری ہو آپ ضرور جانا۔" عذرا اصرار کر رہی تھی۔

میں کیا کروں گی وہاں جا کر، اُس روز بھی لتاں جان کے مجبور کرنے پر میں اور مریم گئے تھے۔ سدرہ چوٹی مکمل ہوتے ہی لیٹ گئی، وہ سارا سارا دن کمرے میں لیٹی رہتی تھی۔ ہر وقت اُس اجنبی کا خیال کسی سہانے خواب کی طرح اُس کے گرد رہتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار کسی مرد کی نگاہ اُس پر پڑی تھی اور شاید اس نے بھی پہلی بار اتنے قریب سے کسی مرد کو دیکھا تھا۔ پھر اُس کی نگاہیں کس قدر بولتی تھیں۔ سدرہ کے من میں گدگدی ہونے لگتی تھی۔

کچھ نئے پن کا کچھ انوکھا سا احساس اُس کے گرد رہتا تھا، جو اُسے بے حد سکون و مزہ دے رہا تھا۔ جب سب سامنے کے جائز دروازے بند کردیے جائیں تو ایسے میں انسان زندگی میں بے حد حبس محسوس کرتا ہے تب ہمیشہ چور کھڑکیاں کبھی کھلیں تو تازہ ہوا کا جھونکا لگتی ہیں۔ سدرہ بھی اتنی پابندیوں میں جہاں کسی غیر مرد کا ذکر ممنوع تھا اپنے خیالات کی دنیا ایک اجنبی مرد کے تصور سے بسا چکی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے جناب؟" عائشہ نے اُس کے کمرے میں اچانک داخل ہوکر پوچھا، سدرہ یوں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی، جیسے کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔

"سوری! میں نے شاید تم کو ڈرا دیا۔" عائشہ نے شرمندگی سے کہا۔

"ارے نہیں عائشہ!" سدرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آؤ ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو۔" سدرہ کو عائشہ بے حد پسند آئی تھی، اُسے عائشہ سے بات کر کے ہمیشہ اچھا لگتا تھا۔

"آپی آپ کے بال کس قدر خوب صورت ہیں۔" عائشہ نے سدرہ کی لمبی کمر سے بھی نیچے چوٹی دیکھ کر بے اختیار کہا۔

"ہاں لیکن اِن کو سنبھالنا بے حد مشکل کام ہے۔" لتاں جان ہر ہفتے انہیں لسی سے دھلاتی ہیں پھر آملہ ریٹھا سیکا کائی کو پسوا کر میرے بال اُس سے دھوتی ہیں پھر بال گھنٹے دو گھنٹے بعد سوکھ جائیں تو اپنا بنایا

خاص تیل لگاتی ہیں، تب جا کر انہیں باندھنے کی اجازت ملتی ہے ایسے میں سارا دن ان بالوں کی د
ہوجاتا ہے، سچ مانو تو میرا دِل اِن سے اُکتا جاتا ہے، یہ اکیلے مجھ سے نہ سنبھلتے ہیں اور نہ سلجھتے ہیں اہم
خاصا مسئلہ ہیں یہ، صرف ان کی ظاہری خوب صورتی پر نہ جانا۔'' سدرہ نے نہایت تفصیل سے جواب دیا،
باتیں کرنے کے لیے اُن دونوں بہنوں کے پاس آپس کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ زبیدہ کے علاوہ کوئی سہیلی
تھی ایسے میں عائشہ کا سدرہ کو بلانا سدرہ کو بے حد اچھا لگا تھا۔

''آپی آپ کتنا پڑھی ہیں؟'' عائشہ نے اُن کے پلنگ پر پاؤں اُٹھا کر بیٹھتے ہوئے پوچھا یہ پلنگ رنگی
پایوں والا تھا اور بے حد اونچا تھا۔ مسہری کی شکل کی طرح بے حد خوب صورت تھا۔

''میں نے میٹرک کیا ہے۔'' جب کہ مریم نے ایف اے کا کورس چوری چھپے منگوایا ہے اُسے پڑھنے
بے حد شوق ہے ابھی وہ سب سے چھوٹی ہے شاید اس لیے اُسے اپنے شوق پر قابو پانا نہیں آتا، اس لیے
اماں جان اکثر اس کی بات مان لیتی ہیں۔'' سدرہ کے لہجے میں بے حد یاسیت تھی۔ ''کچھ عرصے بعد جب
اُسے ذرا شعور آجائے گا تو ساری ضدیں بھول جائے گی کیوں کہ یہاں صرف اور صرف مردوں کے
شوق، مردوں کی خوشی مقدم جانی جاتی ہے، ہم کیا چاہتے ہیں اور ہماری کیا خواہشیں ہیں، اِس سے کسی
کوئی سروکار نہیں۔''

''لیکن تعلیم تو آپ کا بنیادی حق ہے۔'' عائشہ نے اُلجھتے ہوئے کہا۔

''ہونہہ بنیادی حق! بنیادی حقوق تو بہت سے ہیں لیکن اُن کے متعلق بات کرنا گناہ ہے اور سزا موت
ہے۔'' سدرہ کے دِل میں پہلی بار اتنی شدّت سے شادی کا خیال آیا تھا اپنے گھر اور بچوں کا خواب مچا
تھا اس لیے وہ اپنے دل کی اصل بات بتائے بغیر دُکھی ہو کر بول رہی تھی۔

''آپی آپ کیسی باتیں کررہی ہیں؟'' عائشہ نے گھبرا کر پوچھا۔

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں عائشہ۔ اس حویلی کی بیٹیوں کو کپڑے گہنے دے کر بہلانے کی کوشش کی جاتی
ہے اور ہمیشہ بے حد پیار دیا جاتا ہے لیکن اگر اس کے ساتھ کا برادری میں بَر نہ ملے تو وہ ساری عمر اِس
حویلی میں گزار دیتی ہے، ایسے میں وہ اگر بولے گی تو اُسی نازوں پلی بیٹی کی زبان کاٹ دی جائے گی۔''
سدرہ کا لہجہ بے حد پُراسرار تھا۔ عائشہ کا دِل بے اختیار گھبرانے لگا، بابا نے اُسے تو کبھی ایسا کچھ نہیں بتایا
تھا۔ بڑی حویلی اُن کی حویلی جیسی ہی ہے یہی انہوں نے کہا تھا۔ اُن کی حویلی تو بے حد اچھے ماحول کی تھی
اس نے خود تعلیم حاصل کی تھی اور اُس کی شادی بھی ہو رہی تھی، پھر یہ سدرہ آپی کس قسم کی باتیں کررہی
ہیں؟

''تمہیں شاید میری باتوں پر یقین نہیں ہے۔'' سدرہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

''آؤ میرے ساتھ!'' سدرہ عائشہ کو کھینچتی ہوئی لمبے لمبے دالان پار کر کے حویلی کی پچھلی جانب لے آئی
یہاں الگ سے کمرے بنے ہوئے تھے درمیان میں صحن تھا۔ صحن میں ایک کنواں تھا اور ایک بوڑھا
درخت! یوں لگتا تھا کہ وہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے ہمراز ہوں، وہاں عجیب سی ویرانی کا
احساس ہوتا تھا۔ خشک پتے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ عائشہ کو اتنی خاموشی، اتنی ویرانی سے ایک دم
جھرجھری سی آگئی۔

''یہ تم مجھے کہاں لے آئیں آپی؟'' عائشہ بے حد گھبرائی ہوئی تھی۔

''یہ زندہ قبرستان ہے۔'' سدرہ نے مری مری آواز میں کہا، ساتھ ہی سامنے بند دروازے کو کھول دیا،
کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ فوری طور پر عائشہ کو کچھ دکھائی نہ دیا سامنے مسہری کے پائے کے ساتھ ایک
ضعیف بوڑھی عورت سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اُن کے اندر آنے پر اُس نے سر اُٹھا کر اُن کی جانب دیکھا اُس
کی آنکھوں میں اِس قدر وحشت اور درد تھا کہ عائشہ کا دِل بے اختیار ڈوبنے لگا۔

''کون ہے یہ؟'' عائشہ نے دھیمے سے پوچھا۔

''یہ فاطمہ ہے۔'' مرحوم کو مرے ہوئے بیس سال ہو گئے ہیں، نہ جانے یہ حویلی کے لوگ اسے دفناتے
کیوں نہیں ہیں۔'' سدرہ نے اُس عورت کے کھچڑی بنے بالوں کو اُس کے چہرے سے پیچھے کرتے ہوئے
کہا۔

''مطلب؟ مطلب کیا ہے تمہارا؟'' عائشہ نے خوف زدہ نگاہوں سے اس عورت کو دیکھتے ہوئے
پوچھا۔

''یہ تمہاری اور ہماری پھوپھو فاطمہ ہیں۔'' سدرہ نے دھماکہ کیا۔

''جانتی ہو یہ ہماری دادی کی عمر کی دکھائی دینے والی عورت اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی
اور لاڈلی تھی۔ اور آج یہ کیسی دکھائی دیتی ہیں ایک چلتا پھرتا مردہ۔ کبھی ہماری ماؤں کے ہر وقت مہندی
سے رنگے ہاتھ دیکھنا، ہیرے سونے کی موٹی موٹی انگوٹھیوں سے لدے پھندے ہوئے اور اِس غریب کی
سوکھی چمرخ انگلیاں دیکھو! اور ہاں اُس کے ہاتھ دیکھو، یہاں جو قسمت کی لکیر ہوتی ہے نا؟ وہ تک مٹادی
گئی ہے۔'' سدرہ کی آواز ایک دم پھٹنے لگی تھی۔

''اِدھر آؤ اِدھر! اس کو پاس سے دیکھو، تم ڈر کیوں رہی ہو؟ یہ بے زبان تو کچھ بول بھی نہیں سکتی اُس
کی زبان تو آج سے بیس سال پہلے کاٹ دی گئی تھی۔ حویلی کی کوئی بیٹی اپنے حق کے لیے بول نہیں سکتی یہ
گناہ یہ بے چاری کر بیٹھی تھی اور تم جانتی ہو اس کی زبان اس کے سگے بھائی نے کاٹی تھی، سگے بھائی نے
اپنے ہاتھوں سے۔'' سدرہ ایک دم اُٹھ کر وہاں رکھی چھوٹی سی میز کے پاس جا کر پھلوں کی ٹرے میں سے
چھری نکال لائی تھی۔

''ایسے کاٹ دی گئی ہوگی'' سدرہ نے اپنی زبان نکال کر چھری سامنے کرتے ہوئے کہا۔ عائشہ کو وہ
ایک دم ابنارمل لگی۔

عائشہ نے گھبرا کر اُس سے چھری کھینچ لی کہ کہیں وہ واقعی اپنی زبان نہ کاٹ بیٹھے۔

''ہا۔ ہا۔ ہا۔'' عائشہ تم ڈر کیوں رہی ہو، تم جانتی ہو کہ اس کی زبان کس نے کاٹی تھی۔ سید عاشق علی
نے کاٹی تھی۔ تمہارے باپ نے جس کو تم کسی دیوتا کی طرح پوجتی ہو جن کے متعلق تمہارا خیال ہے کہ وہ
بہت اچھے باپ ہیں، بہت آزاد خیال ہیں جو لڑکیوں کو تعلیم دلانے کے حق میں ہیں۔ تم کس خوش فہمی میں
تھیں اگر تمہارے ہاں کا بَر اِس برادری میں نہ ہوتا تو تم نے بھی یہیں آنا تھا۔ لیکن تم خوش قسمت نکلیں
کیوں کہ تمہیں بچانے کے لیے عبداللہ بھائی جو تھے۔ اگر تمہاری بیٹیوں کے لیے کسی عبداللہ کا جنم نہ ہوا تو
پھر تم کیا کرو گی۔''

”عائشہ؟“ سدرہ کا سوال عائشہ کے وجود کا سارا خون نچوڑ گیا تھا۔

”کیا تم ہمارے بعد اپنی بیٹیوں کو اِس کمرے میں آباد نہ کرو گی؟ تم کو کرنا پڑے گا، یہاں کی روایت یہی ہے!“ سدرہ ایک دم ہنسنے لگی۔

”نہیں۔“ عائشہ نے ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹائے۔

”ہاں ایسا ہی کرنا ہوگا۔“ سدرہ ہنستی چلی گئی۔ عائشہ کو وہاں ایک دم آکسیجن کی کمی کا احساس ہوا اُس سے سانس لینا دوبھر ہوگیا تھا۔

”نہیں!“ وہ اُلٹے قدموں باہر بھاگی۔

اور سدرہ کے بین کرتے قہقہے کسی بھوت کی طرح اُس کا پیچھا کر رہے تھے۔

❁

اِک ساعت گراں ہوں، مجھے بھول جایئے
بیتا ہوا سماں ہوں، مجھے بھول جایئے
جو میرے ساتھ وقت گزارا، وہ خواب تھا
میں نقش بے نشاں ہوں، مجھے بھول جایئے
یہ قصرِ زرنگار مبارک ہو آپ کو
خستہ سا اِک مکاں ہوں، مجھے بھول جایئے

”تم نے میری بات کو غیر سنجیدہ لیا ہے!“ ترنم نے ٹوٹے کانچ جیسی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

مبشر حسن آج بلیک ڈنر سوٹ میں ملبوس تھا اور اپنی عمر سے خاصا کم دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی سانولی رنگت اَن جانے سے جوش کی وجہ سے دمک رہی تھی۔ وہ ترنم کے حُسن کو نظروں ہی نظروں میں پیتے ہوئے مدہوش ہوا جا رہا تھا۔ ہوٹل کی یہ میز مبشر حسن نے آج کے ڈنر کے لیے خاص طور پر بک کروائی تھی۔

”تم واقعی ایک نشہ ہو، تمہیں کوئی کیسے چھوڑ سکتا ہے؟“ مبشر حسن نے دِل ہی دل میں کہا۔

”مبشر صاحب پڑاؤ کبھی منزل نہیں ہوا کرتے۔“ ترنم نے فریش لائم کا گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

”لیکن تم سے مل کر مجھے احساس ہوا کہ تم ہی میری منزل ہو۔“ مبشر حسن نے جذباتی انداز میں کہا۔

”آپ تو خاصے سمجھ دار دکھائی دیتے ہیں، کیوں جانتے بوجھتے اِن انگاروں کو جھولی میں ڈالنا چاہتے ہیں؟“ ترنم نے غور سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں کچھ نہیں جانتا! تم ہی وہ لڑکی ہو جس کے لیے میں سالوں سے سرگرداں تھا، میں یہ شادی ہر صورت کرنا چاہتا ہوں۔“

”ارے۔ ارے مبشر صاحب! ہم تو ہیں ہی عزت کے معاملے میں خالی ہاتھ، کچھ اپنی عزت کی پروا کیجیے۔ یہ زمانہ آپ جیسی شخصیتوں کی اس طرح کی لاپروائیوں کو خبروں میں اُچھالنے لگتا ہے۔ کیوں خسارے کا سودا کرنا چاہتے ہیں؟“

”تم سے شادی کیا خسارے کا سودا ہے؟“

”جو ہر رات کی دُلہن ہوتی ہیں، اُن کی کبھی شادیاں نہیں ہوتیں، آپ یہ بات کیوں نہیں سمجھ لیتے؟“

ترنم نے کچھ بے زار ہوتے ہوئے کہا۔ خود کو اپنی ہی زبان سے بُرا کہنا اِس آئینے کو دیکھنا خاصا تکلیف دہ عمل تھا اس کے لیے۔

"میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں، دوبارہ پھر کہہ رہا ہوں کہ میں جب سے تم سے ملا ہوں، مجھے احساس ہوا کہ تم ہی وہ لڑکی ہو، جس کے لیے میری روح پیاسی پھرتی تھی۔ سالوں کی تلاش تم پر آ کر ختم ہوئی ہے۔"

"حیرت ہے کہ اِس تلاش کے دوران آپ نے شادی بھی کی اور بچے بھی پیدا کر لیے، کیا آپ عورتوں کو ٹیسٹ کرتے رہتے ہیں؟"

"وہ عورت، جو آپ کے گھر میں موجود ہے، وہ بے چاری آپ کی تلاش کے دوران کون سا پڑاؤ تھی؟ اُس کا کیا قصور ہے؟" ترنم سے اس طرح کی باتوں کی توقع مبشر حسن کو رتی بھر نہ تھی۔ اُس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا تو ایک رنگ جا رہا تھا۔

"منزل تک جانے کے لیے آپ لوگ بہت سے پڑاؤ ڈال لیتے ہیں، وہاں شادی کر لیتے ہیں، بچے پیدا کر لیتے ہیں اور وہ عورت جب آپ کو ہمیشہ کے لیے اپنی منزل مان لیتی ہے تو آپ کو کوئی اور عورت اپنی منزل نظر آنے لگتی ہے۔"

"مبشر صاحب! بُرا نہ مانیے گا۔ ہم دونوں مفاد کے رشتے سے جڑے ہیں۔ میں اگر آپ کی راتوں کی تنہائی دُور کرتی ہوں تو بدلے میں آپ کے قلم سے آپ کے خوب صورت آٹو گراف، مختلف فائلز پر ہوتے ہیں، غرض کے رشتوں میں کوئی مستقل رشتہ پیدا نہیں ہوسکتا!" ترنم نے اپنے خوب صورت کھلے ریشمی بالوں کو پیچھے کر کے ذرا جھک کر مبشر حسن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کی ماں نہیں ہوں، جو آپ کو اِس عمر میں بھی اچھے بُرے کی تمیز سکھاؤں، آپ اپنا اچھا بُرا خود سمجھیں! یہ آپ کے حق میں بہتر ہوگا۔ مجھے آپ سے نہ محبت ہے اور نہ ہمدردی! میرے لیے آپ کوئی نہیں ہیں ہاں البتہ کل رات جب آپ ایک معصوم عورت کا حق مجھ پر لُٹا کر گہری نیند میں سوئے ہوئے تھے تو ایک بے چاری عورت کا فون آیا تھا، جسے اپنے شوہر کی بے وفائی سے غرض نہ تھی بلکہ وہ اپنے بچوں کے باپ کی خیر خیریت جاننا چاہتی تھی۔" ترنم نے دُکھ سے گہری لمبی سانس بھری۔

"میرے آپ کوئی نہیں ہیں لیکن اُس عورت کے سب کچھ ہیں مبشر صاحب! جس کرسی پر آپ بیٹھے ہیں وہاں فائدے، منافع کی باتیں ہوتی ہیں اور سکھائی جاتی ہیں۔ آپ اپنی زندگی کا سودا بھی منافع بخش کریں! یہ وہ مشورہ ہے، جو میں آپ کے ساتھ اچھا وقت گزارنے پر آپ کے لیے سچے دل سے دے رہی ہوں ورنہ آپ جانتے ہیں کہ ہمارا تعلق عورتوں کی اُس بُری قسم سے ہے، جو گھروں کو تباہ تو کر سکتی ہیں بنا نہیں سکتیں۔" ترنم نے اپنا پرس اُٹھایا اور چلنے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلتی ہوں مبشر صاحب! تھینکس فار نائس ڈنر!" ترنم نے میز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا پھر مسکراتی ہوئی متوازن چال چلتی باہر نکل گئی۔ مبشر حسن کتنی ہی دیر اُس جل پری جیسی لڑکی کی پشت کو دیکھتے رہے یہاں تک کہ وہ باہر نکل کر غائب ہوگئی لیکن اس کی خوش بو اب بھی اُن کے اطراف میں پھیلی ہوئی تھی۔

"ترنم!" اِک آہ کی طرح اُس کا نام اُن کے لبوں سے ادا ہوا تھا۔

"میں ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کہ تم ہی وہ لڑکی ہو، جس کی مجھے برسوں سے تلاش تھی جو... جو صرف دلوں کو وقتی طور دھڑکانا ہی نہیں جانتی بلکہ ہمیشہ کے لیے دھڑکن بن کر دِل میں بس جاتی ہے۔" مبشر حسن کے فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ انہوں نے فون کانوں سے لگا لیا فون اُن کے گھر سے تھا۔

"ہاں ٹھیک ہوں، تم لوگوں نے کھانا کھا لیا کیا؟" مبشر کو اپنی آواز بے حد اجنبی لگ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے پھر میرا انتظار کرو۔ تیار ہو جاؤ ہم سب باہر ڈنر کرتے ہیں۔" مبشر حسن نے موبائل بند کر کے ایک گہری سانس لی، آج ایک عورت ایک مردہ ہوتی عورت کو اُس کی زندگی لوٹا گئی تھی۔ ایک شخص کو اُس کے ہی گھر کا راستا بتا گئی تھی۔

"ترنم! واپسی کا راستا مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں۔ تمہارے لیے میرے احساسات مزید شدت اختیار کر گئے ہیں۔ تمہارے ساتھ بتایا وقت ہمیشہ اچھی یاد کی طرح میرے ساتھ رہے گا!" مبشر حسن نے اپنے دل میں اُداسی محسوس کرتے ہوئے خود سے کہا۔

"کبھی کبھی تتلیاں بھی ہاتھوں پر خوش رنگ، رنگ چھوڑ جاتی ہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔"

❖❖○❖❖

"زہے نصیب! آج تو مجھے کچھ بانٹنا چاہیے، میری دوست کو آج میرا خیال کیسے آ گیا؟" میڈم راگنی نے اُٹھتے ہوئے میڈم چاندنی کا استقبال کیا۔

"کچھ اپنے ہی مسائل میں اُلجھ کر رہ گئی تھی۔ بگ باس کی ہدایت پر فوراً انڈر گراؤنڈ جانا پڑا، اُس کم بخت خفیہ کے بندے نے جانے کیسے ہماری ساری تنظیم کے گرد دائرہ سخت کر دیا تھا۔ وہ تو جب پانی سر سے اوپر ہوا تو ہمیں خبر ہوئی۔" میڈم چاندنی نے سگریٹ سلگا کر لبوں سے لگا لیا۔

"خیر ہمارے سارے بڑوں کی مجھ سمیت بچت ہوگئی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہماری بہت قیمتی لڑکیاں ہمارے ہاتھوں سے نکل گئیں، جس کا مجھے بے حد دُکھ ہے۔ ابھی تو مجھے اپنا ٹھکانہ پھر سے مضبوط کرنا ہے پھر مجھے اُس بندے سے بدلہ ضرور لینا ہے۔ ایسا بدلہ کہ وہ ساری زندگی یاد رکھے گا۔" میڈم چاندنی نے غصّے سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔

"تم کیوں پریشان ہو رہی ہو۔" میڈم راگنی نے میڈم چاندنی کو تسلی دی۔

"ارے ایک ایک لڑکی پر میرا لاکھوں روپیہ لگا ہے۔ خریدنے سے لے کر ان کو پالش کرنے تک میں نے کبھی سرمایہ نہیں دیکھا۔"

"سچ کہو تو کسی ماں کی طرح میں نے اپنی ہر لڑکی کو ناز و نعم سے تیار کیا تھا۔ کم بخت اُس بندے نے میری آدھی سے زیادہ لڑکیوں کو جیل بھجوا دیا۔ اتنے نازک وجود جھونک کر رکھ دیے ہیں۔" میڈم چاندنی نے ٹرے سے خاص مشروب اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"نام کیا ہے اُس بندے کا؟" میڈم راگنی نے اُس شخص کے اتنے کارنامے سُنے تو خود کو الرٹ رکھنے کے لیے فوراً اُس کا نام پوچھا۔

"طارق! طارق احمد علی!" میڈم چاندنی نے یوں منہ بنایا، جیسے منہ میں کوئی گولی رکھ لی ہو۔

''تمہیں اُس کا اوپر سے بندوبست کرنا تھا اُس کا ٹرانسفر کروادیتیں۔ اُس کے بڑوں سے مل کر اُل
بند کردیتیں۔'' میڈم راگنی کو اِس طرح خفیہ کے ایک معمولی سے بندے سے ڈرنا اچھا نہ لگا۔
''بتایا نا، اُس کم بخت نے اِس ہوشیاری سے گھیرا تنگ کیا کہ ہمیں احساس تک نہ ہوا۔ وہ تو ہمار
کچھ بے حد وفا دار دوست سول پولیس میں ہیں، جنہوں نے عین موقعے پر اطلاع دے کر ہمیں بچالیا''
میڈم چاندنی گزشتہ مہینوں کی ٹینشن کا سوچ کر دوبارہ سے ٹینس ہوگئیں۔
''ہوں! تو بندہ واقعی ہوشیار نکلا! مجھے اُس کا پورا بائیو ڈیٹا لا کردو، ابھی اُس کا بندوبست کردیتے ہیں''
میڈم راگنی نےکہا۔
''بہت پتا کروایا ابھی تک پوری معلومات نہیں ملیں۔ اِن خفیہ والوں کی یہ بات مجھے بہت بُری لگتی ہے
کہ یہاں لوگ بکتے نہیں ہیں انہیں خریدنے کے لیے پیسے کے ساتھ ساتھ بے حد محنت بھی کرنا پڑتی ہے
اب اِس بندے کا پتا کروانے کے لیے کنویں میں بانس ڈلوانے کی کسر باقی رہ گئی ہے۔ اِن لوگوں کی
انوکھی منطق ہے۔ کام خفیہ کے لیے کرتے ہیں لیکن فرنٹ ڈیسک پر ان کی ملازمتیں مختلف شعبوں میں
ہیں۔ اِن کی نقلی نوکریوں کی وجہ سے یہ نہ پہچانے جارہے ہیں اور نہ ان کی پراپر پکڑ ہوتی ہے۔''
''اچھا چھوڑو، مارو گولی دیکھ لیں گے اُسے بھی! ایسے کتنے سورما ہمارے پیچھے دُم ہلائے پھیرتے ہیں
ایسا مزہ چکھائیں گے اسے کہ ساری وطن پرستی یا بڑے لوگوں کے بقول حب الوطنی سب بھول جائے
گا۔'' میڈم چاندنی کو میڈم راگنی نے بے حد تسلی دیتے ہوئے کہا۔
''تم سناؤ میری باقی لڑکیاں کیسی جارہی ہیں۔'' میڈم چاندنی اصل بات پر آ گئی۔
میڈم راگنی کی ایک دو لڑکیوں پر نظر تھی لیکن میڈم چاندنی کے واپسی کے مطالبے پر وہ اندر ہی اند
سے بدمزہ ہوگئی، اس نے اپنے اتنے اچھے ہیروں کو صرف اور صرف جسم فروشی پر لگادیا تھا۔ چاندنی ا
بیک گراؤنڈ بازارِ حُسن سے تھا۔ اُس کی پہنچ جسم فروشی اور فلموں تک ہی تھی، اِس سے ہی وہ اتنا کمالیتی تھ
کہ اِس سے آگے اُس نے سوچا نہ تھا۔ پندرہ سال پہلے راگنی نے چاندنی کو اپروچ کرکے اپنے گروہ میں
شامل کیا تھا۔
پورنوگرافی، لچر ڈانسز کی ویڈیوز وغیرہ نہایت سستے داموں چھوٹے چھوٹے ہوٹلز اور نیٹ کیفوں میں
مہیا کرنے کا پراجیکٹ چاندنی کو ملا تھا، جسے اُس نے نئی طرز سے بے حد کامیابی سے کیا تھا۔ وہ ان
کیسٹس کو بے شک نہایت سستے داموں بیچتی تھی لیکن بگ باس ہر اسائنمنٹ مکمل ہونے پر بے حد پیسہ
دیتے تھے یہ بگ باس کون تھے ڈائریکٹ میڈم چاندنی بھی نہ جانتی تھی۔ اُسے تو بس آرڈر ملتا تھا۔ اس
کے علاوہ چاندنی اپنے اسٹائل کو کبھی بدل نہ سکی تھی، وہ لڑکیاں اُٹھوا کر یا پھر ورغلا کر بھی حاصل کرتی تھی۔
اِس گناہ کی دلدل میں کوئی ایسا طریقہ نہ تھا، جو یہ چھوڑتی ہو۔
''اچھا تم میری لڑکیوں کی کارکردگی سے خوش تو رہیں؟'' چاندنی نے راگنی سے پوچھا۔
''ہاں اِن میں کچھ تو بالکل میرے ٹیسٹ کی ہیں اِن فیکٹ میں تم سے ان کی ڈیل کرنا چاہتی ہوں۔''
میڈم راگنی نے موقع دیکھ کر بات کرنا چاہی۔
''میرا تو پہلے بڑا نقصان ہوگیا ہے۔''

''میں نے ایک بہت اہم لڑکی کھوئی ہے، اِس سارے پروجیکٹ کے دوران اُس کا نام پَری تھا۔''
''کم بختوں نے جانے کہاں غائب کردی، اب میں فوری طور پر تم کو لڑکیاں نہیں دے پاؤں گی، ہاں
ال کے آنے پر میرا وعدہ ہے کہ تمہیں بالکل اچھی لڑکیاں دوں گی۔ خوب صورت کو مستقل رکھنا اور کم
ال کی بے شک پورنز بنا کر ختم کر ڈالنا۔'' چاندنی اس طرح بات کررہی تھی، جیسے وہ بھیڑ بکریوں کے
ل بات کررہی ہو۔
''لڑکی بھی انسان ہوتی ہے یہ وہ کبھی خیال نہیں کرتی۔'' ترنم نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔
''ماہ رخ تم نے اپنی بندریا کی باتیں سُنی ہیں!'' ترنم اور ماہ رخ جو اچانک ہی ہال کمرے کی جانب
ل تھیں میڈم چاندنی اور راگنی کی گفتگو سُن کر رُک گئی تھیں۔ ماہ رخ تو اِس لیے بھی رُکی تھی کہ وہ میڈم
ل کے اِس بند قلعے سے جلد از جلد نکلنے کی راہ چاہتی تھی۔
''یہ باتیں نئی نہیں ہیں البتہ نئی بات یہ ہے کہ اِس بند قلعے سے رہائی ملنے کے آثار نظر آرہے ہیں۔''
ماہ رخ نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔
''ہونہہ! ایک بڑی جیل سے دوسری چھوٹی جیل میں ٹرانسفر کو تم رہائی کہتی ہو۔'' ترنم نے سیڑھیاں
ے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔
''ویسے یار یہ میڈم چاندنی واقعی پیسے کی بندریا ہے، جہاں پیسا دیکھا وہاں ناچنا شروع کردیا۔'' ترنم
استہزائیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔
''ترنم!'' ماہ رخ نے مصنوعی گھوری گھورتے ہوئے اُسے کہا۔ جواباً ترنم کھل کھلا کر ہنستی چلی گئی، جیسے
ا نے کوئی بہت بڑا لطیفہ سُن لیا ہو پھر اچانک ہی اُسے اپنی ہنسی کو بریک لگانے پڑے، سامنے ادھ
ے دروازے سے ہلکی ہلکی چیخوں کی آواز آرہی تھی۔
''کیا ایک اور سحرش؟'' ترنم نے سہمی سہمی نگاہوں سے ماہ رخ کو دیکھا۔ دونوں ہی چپ چاپ کمرے
جانب بڑھیں، ترنم نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھولا، سامنے کا منظر دیکھ کر اُس کی بے اختیار
لی۔ کیتھی ایک لڑکی کے پاس بیٹھی اس کے دوا لگارہی تھی۔ اُس لڑکی کا سارا چہرہ تیزاب سے جھلس کر
ک ہوچکا تھا، گلے سڑے گوشت کے لوتھڑے نما چہرے کو دیکھنا ترنم اور ماہ رخ کے بس سے باہر تھا۔
''یہ... یہ کون ہے؟'' ماہ رخ نے سہمی سہمی آواز میں پوچھا۔
''کیتی آرا!'' کیتھی نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔
''کیا! یہ کیتی آرا ہے؟'' دونوں کی دبی دبی چیخ نکلی ترنم تو لہرا کر ماہ رخ کے بازو میں جھول گئی۔ ماہ
ا نے پریشانی سے ترنم کو سنبھال کر وہاں موجود صوفہ کم بیڈ پر لٹادیا۔ پھر اس نے ڈرتے ڈرتے بے حد
ا سے کیتی آرا کو دیکھا۔
''مائی گاڈ!'' ابھی کچھ روز پہلے نیو ایئر پارٹی میں وہ حسین تتلی سب کی آنکھوں کا مرکز بنی اِدھر اُدھر گھوم
ل تھی تب اُس کی خوب صورتی لوگوں کے ہوش اُڑا رہی تھی۔ آج اُس کی بے حد بھیانک، بدصورت
ل ہوش اُڑا رہی تھی۔
''اِس کے ساتھ یہ حادثہ کیسے ہوا؟'' ماہی نے کیتھی سے پوچھا۔

''حادثہ نہیں ہوا بلکہ اِسے یہاں سے بھاگنے کی سزا ملی ہے۔'' کیتھی نے برف جیسے سرد لہ
جواب دیا۔

''سزا؟'' ماہی نے ایک دم خشک لبوں پر زبان پھیری۔

میڈم راگنی سخت تھیں اِس کا اندازہ تو اُسے تھا لیکن اِس قدر ظالم اور سخت ہوں گی، یہ بات
خون خشک کرگئی۔ ماہی نے بے حد پریشان ہوکر پہلے گیتی آرا کو دیکھا پھر بے ہوش پڑی ترنم کو
میں پہلی بار ماہی کو احساس ہوا کہ وہ اِن لوگوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیاں ہیں۔ اگر وہ اُن کی مر
نہیں چلیں گی تو وہ کسی بھی لمحے ڈور کھینچ کر انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بے کار بنادیں گی یا پھر گیتی آ
طرح بدصورت بنا کر عبرت بنادیں گی۔ ماہ رُخ کو اپنا سانس رُکتا محسوس ہورہا تھا۔

❖❖○❖❖

''باجی کیا واقعی سورج ہاتھ کی مٹھی کے گرد گھومتا ہے؟'' غزالہ نے گاجریں کش کرتی ہوئی علیزے
پوچھا۔

''کیا مطلب؟'' علیزے کا گلابی رنگ گاجریں کش کرنے سے مزید سُرخ ہورہا تھا۔

''باجی میری سہیلی رابعہ بتارہی تھی کہ جب پاکستان میں مٹھی کے اِس طرف سورج ہوتا ہے تو
اندھیرے میں ڈوبا ہوتا ہے اور جب مٹھی کے اِس طرف سورج چلا جاتا ہے جہاں امریکہ ہے تو پا
میں اندھیرا ہوجاتا ہے۔'' غزالہ نے معصومیت سے کہا۔ علیزے بے اختیار مسکرادی۔

''اور وہ یہ بھی کہہ رہی تھی کہ ہاتھ کی مٹھی کے اوپر پاکستان موجود ہے اور نیچے امریکا! باجی کیا و
اُلٹے چلتے ہوں گے؟'' غزالہ کی پریشانی پر علیزے کو اپنا قہقہہ دبانا مشکل ہوگیا۔

''واقعی بے چارے امریکی چلتے تو اُلٹے ہی ہیں، اُن کے کام کون سے سیدھے ہیں۔'' علیزے
ہنستے ہنستے کہا۔

''باجی آپ میرا مذاق اُڑا رہی ہیں، میری بات کو آپ سنجیدگی سے نہیں لے رہیں!'' غزالہ نے
دم روٹھ کر مُنہ پھلا لیا۔

''ارے میری پیاری بہنا! تم کیوں ناراض ہورہی ہو تم تو میری بے حد ذہین بہن ہو۔'' علیزے
اُسے فوراً منایا۔

''پھر آپ میری باتوں پر ہنسیں کیوں؟'' غزالہ کی خفگی بس ایک آدھ پل سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔

''یار ویسے تمہاری پیاری پیاری شکل دیکھ کر دِل خوش ہوجاتا ہے۔'' علیزے نے کش کی ہوئی گا
کچن میں لے جاتے ہوئے کہا۔ اُسی پل باہر بیل ہوئی، دروازہ گڈو نے کھول دیا تھا۔ گھر میں حسن آ
تھیں وہ محلے میں میلاد شریف میں گئی تھیں۔ علیزے نے سوچا کہ شاید ماں گھر آگئی ہے وہ فوراً کچن
باہر چلی آئی۔ آج صبح صبح ابو گجریلا بنانے کا حکم دے گئے تھے، علیزے اُسی کی تیاری میں کچن م
ہوئی تھی لیکن جب علیزے باہر آئی تو آنے والی لڑکی کو حیرت سے دیکھنے لگی۔ فوری طور پر اُسے خیا
کہ یہ شاید منزہ کی دوست ہے۔

''آپ ... آپ کون؟'' علیزے نے سانولے سے رنگ والی پرکشش نقوش کی حامل اُس لڑکی

ا۔

''کاشف کا گھر ہے؟'' اُس نے بجائے علیزے کے سوال کا جواب دینے کے، خود سوال کرڈالا۔

''بھلا اِس لڑکی کو کاشف بھائی سے کیا کام؟'' علیزے کی حیرت بجا تھی وہ تو اُسے منزہ کی دوست سمجھ
لی۔

''جی یہ کاشف کا گھر ہے۔'' علیزے نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

اوہ پورے کا گھر کا جائزہ لینے لگی۔ علیزے کو اُس کی نِگاہوں سے کوفت ہونے لگی تھی۔

''یہ ایکسرے مشین کون ہے؟'' علیزے نے بےزاری سے سوچا۔

''کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ کون ہیں؟ اور آپ کو کِس سے ملنا ہے؟''

''مجھے کاشف سے ملنا ہے وہ دو دِن سے یونیورسٹی نہیں آیا!'' لڑکی نے پھر بھی اپنا تعارف نہ کروایا۔

''تو آپ کاشف بھائی کی کلاس فیلو ہیں!''

''حیرت ہے اتنی ماڈرن ہے کہ ایک کلاس فیلو کا پتا کرنے اُس کے گھر پہنچ گئی۔'' علیزے لڑکے، لڑکی
بے تکلفی سے ناآشنا تھی۔ اُس کی پرورش ہی حسن آرا نے اپنے ماحول کے مطابق کی تھی۔

''صرف کلاس فیلو نہیں ہوں اُس کی خاص الخاص دوست ہوں بلکہ یوں کہیں کہ واحد دوست ہوں اور
وہ...'' وہ جانے کیا کہنے جارہی تھی کہ کاشف بھائی اُوپر سے سیڑھیاں اُترتے نظر آگئے۔

''کاشی یار! تم اتنے دن سے کہاں تھے؟'' وہ بے حد بےتابی سے اُس کی جانب بڑھی تھی۔

کاشف اُسے اچانک اپنے گھر دیکھ کر باقاعدہ بوکھلا گیا تھا، بے شک گھر میں ہر وقت وہ اپنی من مانی
کرتا رہتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُسے اپنے گھر کے ماحول کا بھی پتا تھا۔ امی کو پتا چلتا تو وہ یقیناً اُس
کی گت بنادیتیں۔

''تم تانیہ! یہاں؟'' کاشف کو اِس وقت وہ کسی بھوت سے کم نہیں لگی تھی۔ گھبراہٹ اور کچھ خوف اُس
کے چہرے پر نمایاں تھا۔ کاشف نے چور نِگاہوں سے کچن کے دروازے پر کھڑی علیزے اور غزالہ کو
دیکھا۔

''ہاں تم دو دن سے یونیورسٹی نہیں آئے تو میں بے حد پریشان ہوگئی تھی، بڑی مشکل سے تمہارا
ایڈریس ملا۔'' وہ بےتکلفی سے کاشف کے بے حد قریب جا کھڑی ہوئی۔

''وہ دراصل میری طبیعت کچھ خراب تھی۔'' کاشف کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اُسے دھکے دے کر گھر
سے باہر نِکال دے۔

''کم بخت چیونگم ہی ہوگئی ہے!'' کاشف منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

''اور تمہیں دیکھ کر تو میری طبیعت مزید خراب ہونے والی ہے، چلو کہیں باہر چل کر بات کرتے ہیں۔''
وہ اُسے زبردستی باہر لے گیا۔

''ارے! لیکن میں تو انکل آنٹی سے بھی مل کر جاؤں گی۔'' تانیہ نے دروازے میں رُکتے ہوئے کہا۔

''تانیہ میرے والدین تمہارے کلاس فیلو نہیں ہیں، جن کی خیر خیریت پوچھے بغیر تمہارا گزارہ نہ ہو۔''
کاشف نے کچھ سخت لہجے میں سرگوشی کی۔

''کیسی باتیں کرتے ہو کاشی؟ آخر میں بھی تو تمہیں اپنے پیرنٹس سے ملوا چکی ہوں اور مجھے بھی لگتا کہ یہی رائٹ ٹائم ہے کہ میں بھی اُن سے مِلوں۔'' تانیہ نے اصرار کیا۔

''لیکن تم رائٹ پرسن ہرگز نہیں ہو!'' کاشف نے اُس کی سانولی رنگت کو حقارت سے دیکھتے سوچا، کہاں میں رات کو بھی سورج کی طرح چمکتا دمکتا ہوا اور کہاں تم دِن میں بھی لوڈ شیڈنگ! کاشف نے دِل ہی دِل میں کہا۔

تانیہ اگر کاشف کے نادر خیالات سے آگاہ ہو جاتی تو یقیناً بے ہوش ہو جاتی۔

''اچھا ہوا کاشف اسے لے کر گھر سے نِکل گیا۔ جاتے جاتے بتا رہا تھا ابو امی دونوں گھر ہیں!'' کاشف نے سچ ہی کہا تھا۔ اگر امی ابو گھر میں ہوتے بھی تو وہ اُسے اُن سے مِلواتا بھی نہیں۔

''چلو چندا باہر کہیں چلتے ہیں، جہاں کچھ پرائیویسی بھی ہو!'' کاشف کی گمبھیر آواز تانیہ کی کمزوری کاشف کو دیکھ کر کچھ ایسی شدتیں اُس کے دِل میں سمندر کی لہروں کی طرح چڑھتی تھیں کہ اُس کا چاہتا تھا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اُس میں سما جائے۔ اُس کی فیملی بے حد ماڈرن تھی، شریکِ زندگی پورا پورا حق دیا جاتا تھا۔ تانیہ کاشف کو اپنا لائف پارٹنر چُن چکی تھی یہ بات اُس کے گھر والے تھے۔ تانیہ کا خیال تھا کہ اب یہ بات کاشف کے گھر والوں کو بھی جاننی چاہیے۔

''ٹھیک ہے کہیں باہر چلتے ہیں۔'' تانیہ یوں ہی ہر بات میں کاشف کے ساتھ سرنڈر کر جاتی کاشف اور تانیہ تو باہر چلے گئے لیکن علیزے ابھی تک حیرت سے وہاں کھڑی تھی۔

''یہ کاشف بھائی کون سا کھیل، کھیل رہے ہیں؟'' وہ بچی نہ تھی کہ تانیہ کے لب و لہجے اور نِگاہوں جھلکتی ہوئی شدتیں محسوس نہ کر سکتی۔

''باجی!'' غزالہ نے علیزے کو ہلا کر آواز دی۔

''ہوں!'' علیزے کھوئی کھوئی سی تھی۔

''باجی یہ کاشف بھائی کی سہیلی تھی۔'' غزالہ نے بے حد معصومیت سے پوچھا۔

''سہیلی! اچھا مزے کا لفظ ہے۔'' علیزے استہزائیہ ہنسی ہنس دی۔

''کاشف بھائی! بہنوں کے بھائی تو ہر قدم اتنی احتیاط سے رکھتے ہیں کہ اُن کے قدموں کی لغزش اُن کی بہنوں کے مستقبل پر اثر انداز نہ ہو جائے۔ لیکن آپ کے قدم تو غلط راستے کی جانب بھاگ رہے ہیں! کبھی بھائی بھی ایسے لاپروا ہوتے ہیں؟''

''اور کیا اچھے انسان بھی ایسا کرتے ہیں؟ کسی کا دِل اور زندگی سے کھلونے کی طرح کھیل جانا یہ لوگوں کا کام تو نہیں ہے۔'' علیزے دُکھ سے سوچتی اندر کچن میں آ گئی جہاں کش کی ہوئی گاجریں مرحلے کے انتظار میں تھیں۔ لیکن علیزے کا دِل بالکل اُچاٹ ہو چکا تھا۔

''باجی!'' غزالہ اُس کے پیچھے ہی چلی آئی۔ علیزے نے چونک کر غزالہ کو دیکھا، جس کا چہرہ آنکھیں سوالوں سے بھری پڑی تھیں۔

''جاؤ بیٹا باہر کا دروازہ بند کر آؤ!'' علیزے نے اُسے ٹالا، غزالہ تو چلی گئی لیکن علیزے اپنے دِل کرتی جس کے وسوسے ٹالنا بے حد مشکل ہو رہا تھا۔

❖❖○❖❖

جانے کیوں ہر امتحان کے لیے
زندگی کو ہمارا پتا یاد ہے

شہباز علی نے بے حد دُکھ سے سائرہ کی باتیں سُنی تھیں۔

سب کو خوشیاں مل جاتی ہیں
میرا حصّہ کیوں کھو جاتا ہے

وہ ایک بار پھر سرد آہ بھر کر بولے۔

''تم یوں اپنے دِل کو نہ لگاؤ وہ ناسمجھ بچی ہے پھر خالہ نے جو بتایا ہوگا، وہ ہی اُس کے ذہن میں پختہ ہوا ہوگا!'' احمد شاہ نے شہباز علی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''جو خود دِل کا ٹکڑا ہوں، اُن کی باتیں یوں ہی دِل دُکھا دیتی ہیں۔'' شہباز علی کی طبیعت پھر سے خراب ہو گئی تھی۔ آج سائرہ، نگینہ سے ملنے آئی تھی۔ احمد شاہ نے باتوں ہی باتوں میں اُس کے والد کا ذکر کیا تو وہ پہلے تو ہونٹ کاٹتی رہی پھر ایک دم غصّے سے بولی۔

''میرا باپ بے شک زندہ ہے لیکن وہ ہمارے لیے مر چکا۔ انکل پلیز اگر آپ اِسے گستاخی نہ جانیں میری آپ سے درخواست ہے کہ آئندہ مجھ سے اُس شخص کے متعلق بات نہ کیجیے گا۔'' سائرہ کا دوٹوک پاس بیٹھے شہباز علی نے بھی سُنا تھا اور تب سے لے کر اب تک وہ جو نڈھال پڑے تھے، جیسے کسی نے اُن کی ساری توانائی نچوڑ لی ہو۔ بعض سخت الفاظ بھی تو ایسے زہریلے ہوتے ہیں، جو انسان کی رَگوں سے خون نچوڑ لیتے ہیں۔

احمد شاہ کی کتنی تسلیوں کے باوجود شہباز علی ہمت چھوڑتے جا رہے تھے۔ پہلے یہ فکر تھی کہ بچے کہاں ہوں گے، کیسے اُن سے ملوں گا؟ اب اگر بچے مل گئے ہیں تو کیسی بے بسی ہے کہ میں بڑھ کر انہیں اپنے سینے سے نہیں لگا سکتا اُن کے ماتھے پر بوسہ نہیں دے سکتا۔ درد بھری آہ ایک بار پھر اُن کے لبوں سے نکلی۔ اب ایک اور امتحان پہاڑ کی طرح ہمارے بیچ حائل ہے، وہ ہے اُن کی بدگمانی، جو پہاڑ کی طرح ہو چکی ہے۔

''بولو احمد شاہ! میں اِس پہاڑ کو کیسے سر کر پاؤں گا؟ میں جو ایک تھکا ہوا، بوڑھے ہوتے حوصلوں والا انسان ہوں کیسے یہ سب کر پاؤں گا اور... اور جو مجھے میرے بچے نہ ملے تو یہ جو میری گنی چنی سانسیں ہیں شاید وہ بھی بہت جلد پوری ہو جائیں گی۔'' شہباز علی رُک کر گہرے گہرے سانس لینے لگے مسلسل بولنے سے وہ ہانپنے لگے تھے۔ احمد شاہ نے سائیڈ ٹیبل سے گلاس اُٹھا کر پانی بھر کر جلدی سے شہباز علی کو دیا جو انہوں نے فوراً لبوں سے لگا لیا۔

احمد شاہ نے اپنے دِل میں شہباز علی کے لیے بے حد درد محسوس کیا۔

''شہباز پلیز تم تکیہ سیدھا کر کے سونے کی کوشش کرو۔''

''یار زندگی نے تو ساری نیندیں چھین لی ہیں لگتا ہے اب ابدی نیند ہی کچھ آرام دے پائے گی۔'' شہباز علی کا دِل دُکھ سے پھٹنے کو تھا۔ جب تک انسان اپنی مرضی سے صبر کرتا ہے تو اُس کی برداشت بھی

بڑھ جاتی ہے اور جب انسان کو جبری [illegible] ہے تو اُس کی برداشت کا برتن چھوٹا پڑ جاتا ہے۔ وہ زور خواہش اُس میں سے چھلک کر بہنے [illegible] تی ہے! شہباز علی جب تک بے خبر تھے کہ سارا دنیا میں نہیں ہے وہ اپنے بچوں کی دوری کسی روگ کی طرح مسلسل سہتے رہے لیکن جیسے ہی انہیں پتا چلا جس کی خوشی کی خاطر وہ نگر نگر آوارہ پھرتے رہے وہ اِس دنیا میں نہیں ہے تو اپنے بچوں سے ملنے کی خواہش ہر چیز پر حاوی ہوگئی۔

اور آج انہیں لگتا تھا کہ اگر اُن کے بچے جلد از جلد اُن سے نہ ملے تو وہ شاید مزید جی بھی نہ پائیں۔

''شہباز علی پلیز! مجھے کچھ وقت دو شاید میں درست صورت حال جان کر تمہیں کچھ بتا سکوں، ممکن ہے کوئی ایسا موڑ بن جائے کہ بچے اپنی بدگمانیاں ختم کر کے اپنے باپ سے ملنے کو تیار ہو جائیں۔'' احمد علی کی تسلی شہباز علی کو آخری اُمید کی طرح دکھائی دی۔

❖❖○❖❖

کبھی یوں بھی ہو کہ تم ہم سے سرِ عام ملو
سرِ عام ملو اور ہر شام ملو
میں وفا کے رستے پر قدم قدم چلا کروں
اور تم ہر رستے پہ مجھے ہر گام ملو
میں ہستی ذات میں اپنی جب جب اُتروں
تم مجھے، مجھ سے ہر دم ہم کلام ملو
میں صحرائے محبت کی بنوں پیاس کبھی
تو تم بن کے چاہت کا جام ملو
میری راتوں میں اماوس کے اندھیرے جب جب اُتریں
تب تم بن کے ماہ تمام ملو

مسکان جانے کتنی دیر سے ہاتھ کی مٹھی میں عبدالولی کی چین پکڑے کھوئے کھوئے انداز میں بیٹھی تھی کبھی وہ آپ ہی آپ مسکرا دیتی اور کبھی مسکراتے مسکراتے بیچ میں اُس کی مسکراہٹ کا تسلسل ٹوٹ جاتا اور وہ پھر سے کھو جاتی۔

دروازہ پر اچانک دستک سے وہ ایک دم ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑی ہوئی، جیسے کسی نے اُسے چوری کرتا ہوا ہوئے پکڑ لیا ہو یہ سچ ہی تھا کہ اُس نے چوری چوری اُنھی خوابوں کی ایک دنیا بنالی تھی اور وہ اِس دنیا میں کھو کر بہت خوش رہنے لگی تھی۔

سید سرفراز علی گرم شال لیے ہمیشہ کی طرح سفید کپڑوں میں ملبوس اندر داخل ہوئے۔ اندر آتے ہی اُن کی مخصوص خوشبو بھی ساتھ ہی آئی تھی۔ وہ بہت اچھی قسم کا پرفیوم استعمال کرتے تھے۔

''السلام علیکم بابا سائیں!'' مسکان کی بوکھلاہٹ میں مزید اضافہ ہوا، آج تک اُن سے اپنے دل کی ہر بات شیئر کرنے والی بیٹی پہلی بار زندگی میں کوئی کام اپنے باپ سے چھپا کر رہی تھی۔ یہی وجہ تھی مسکان کے چہرے کے اجنبی رنگ سید سرفراز جیسے بندے کو چونکا گئے۔

''وعلیکم السلام پتر! کیا حال ہے میری رانی بیٹی کا؟'' سید سرفراز نے اُسے گلے لگا کر پوچھا۔ ساتھ ہی اور اُس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔

''میری بیٹی رانی کس بات پر، پریشان ہے؟'' مسکان کا سانس ایک دم بے ترتیب ہو گیا۔

''کچھ بھی تو نہیں ہے؟'' وہ گہرا سانس لے کر بولی، جیسے اپنے آپ کو Manage کرنا چاہتی ہو۔

''کچھ تو بات ہے، میری بیٹی رانی کے چہرے کا ایک ایک رنگ مجھے پتا ہے وہ کب پریشان ہے کب نہیں۔'' سید سرفراز کا دعویٰ کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا وہ اپنی بیٹی سے بے انتہا محبت کرتے تھے جانے رب سائیں نے اُن کے کٹھور اور پتھر دل میں اُن کی بیٹی کی اتنی شدید محبت کیوں ڈال دی تھی۔ جو شخص کسی سے پیار سے بات نہ کرتا تھا، وہ مسکان کو بے حد پیار کرتا تھا۔

''بابا سائیں میں نے پہلے کبھی آپ سے کچھ چھپایا ہے کیا؟ اب بھی اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو سب سے پہلے آپ ہی کو آ کر بتاؤں گی۔'' مسکان نے ایک دم ہلکا پھلکا ہو کر کہا، دل کا راز جو اپنے سے چھپائے بیٹھی تھی کیسے وہ سب پر عیاں کر دیتی۔ اُس کے دل کو ولی کے اقرار کا انتظار تھا وہ اپنی محبت کو با عزت دیکھنا چاہتی تھی۔

''مجھے اپنی بیٹی پر خود سے زیادہ اعتبار ہے۔'' سید سرفراز نے فخر سے کہا اندر داخل ہوتی آپا اماں کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ در آئی۔

''کبھی کبھی اعتبار اندھی کھائی ثابت ہوتے ہیں سید سرفراز!'' مُسکان نے چونک کر انہیں دیکھا، وہ بابا سائیں کے ساتھ اسی طرح اکثر بے حد کڑوی باتیں کر جاتی تھیں۔

''آؤ نفیسہ بیگم! کیا حال ہے تمہارا؟'' سید سرفراز علی جانے کیوں اُن کی کسی کڑوی بات کا پلٹ کر جواب نہ دیتے تھے۔

''جن کا ماضی عبرت ناک بن چکا ہو اُن کا حال کیسا ہونا چاہیے؟'' آپا اماں نے چبھتی ہوئی نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ آپا اماں کو بابا سائیں کے آ جانے پر کیا ہو جاتا ہے، کیسی بہکی بہکی باتیں کرنے لگتی ہیں۔'' مسکان نے کچھ کوفت زدہ ہو کے سوچا۔

سید سرفراز نے انہیں یوں دیکھا، جیسے آپا اماں کی بات سُنی ہی نہ ہو۔

''میں بلال کو لے کر آیا تھا۔ اُس کے سائیکاٹرسٹ سے آج شام کا وقت تھا تم بھی اُس سے مل لو۔ تمہارا بہت پوچھ رہا تھا۔'' انہوں نے آپا اماں سے کہا۔

''سید سرفراز اُسے دوا سے زیادہ دُعا کی ضرورت ہے تمہاری سزا اگر وہ معصوم بچہ بھگت رہا ہے تو تمہاری توبہ اُسے اِس مصیبت سے نکال بھی دے گی۔'' آپا اماں نے نہایت سنجیدگی سے مشورہ دیا۔

''تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ بچوں کے سامنے اول فول نہ بولا کرو۔'' سید سرفراز علی جانے کیسے خلاف معمول آج اتنی دیر سے برداشت کیے بیٹھے تھے اب ایک دم غصے سے آگ بگولا ہو کر بولے۔ لیکن آپا اماں کے چہرے کے تاثرات پر کچھ اثر نہ ہوا تھا۔

''میں نے تمہارے ایسے ایسے بُرے روپ دیکھے ہیں کہ تمہارا چھوٹا موٹا غصہ مجھ پر اب کوئی اثر

نہیں کرے گا؟ آپا امّاں نے دِل ہی دِل میں سوچا۔

''بابا سائیں میں بلال بھائی سے مِل کر آتی ہوں!'' مسکان نے باپ کا موڈ دیکھتے ہوئے وہاں سے کھسک جانا ہی بہتر سمجھا۔

''سید سرفراز احمد! اَب بیٹی بڑی ہوگئی ہے اس کی شادی کردو۔'' آپا امّاں نے باہر جاتی مسکان کو دیکھتے ہوئے کہا، جس کی چال میں خاص طرح کی لچک آ گئی تھی جیسے وہ بن پیے نشے میں ہو۔ اور یہ نشہ کس چیز کا تھا وہ بہت اچھی طرح جانتی تھیں۔

''ابھی اُس کی عمر ہی کیا ہے!'' سید سرفراز نے بے تکلفی سے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''یہ ہی عمر ہوتی ہے شادی کی، آم پک کر خوش بو دینے لگ جائے تو کچھ دن بعد وہ گل سڑ جاتا ہے۔ اِسی طرح لڑکیوں کے خواب بھی خوش بو دینے لگتے ہیں اگر وقت پر تعبیر نہ ملے تو وہ بھی گل سڑ جاتے ہیں۔'' آپا امّاں کھوئے کھوئے لہجے میں بولیں۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' سید سرفراز گرج کر بولے۔

''مطلب یہ ہے کہ یہ سدرہ بی بی یا مریم بی بی نہیں ہے، تمہاری بیٹی ہے کیا اِس کی قسمت بھی وہ اندھا کنواں ہے؟ اِس کے مستقبل کا کچھ سوچو!'' آپا امّاں مسکان سے بے حد پیار کرتی تھیں آج وہ سید سرفراز کو قائل کرنا چاہتی تھیں۔

''تم کیوں بھول رہی ہو کہ میری بیٹی بعد میں ہے، پہلے حویلی کی بیٹی ہے وہ!'' سید سرفراز کی بات پر آپا امّاں کو لگا کہ اُن کا دھڑکتا دِل ڈوب رہا ہے۔

''تو کیا تم نے مسکان کو اُس زندہ قبرستان میں دفنانے کے لیے اتنے ناز و نعم سے پالا تھا؟'' آپا امّاں کو بولنا مشکل ہوگیا۔

''اُس کے جوڑ کا خاندان میں کوئی نہیں ہے لیکن سید اسد علی نے مسکان کے لیے پیام دیا ہے۔'' سید سرفراز نے اپنے ایک دُور پرے کے کزن کا حوالہ دیا۔

''وہ؟ وہ مسکان کی باپ کی عمر کا شخص... سید سرفراز! میں سمجھتی تھی کہ بیٹی کی محبت تمہیں اور تمہاری کھوکھلی روایات کو بدل دے گی لیکن...'' آپا امّاں نے نہایت تاسف سے انہیں دیکھا۔

''دیکھو نفیسہ! وقت سے پہلے کسی بات پر بے وقوف ہی پریشان ہوتے ہیں ابھی بچی دوسرے سال میں پڑھ رہی ہے، دو سال ابھی مزید ہیں، ویسے بھی سید اسد علی پہلے اپنی بیٹی کی شادی کرے گا پھر اپنی کرے گا، اتنا وقت تو لگ ہی جانا ہے۔'' سید سرفراز علی نے نہایت آرام سے جواب دیا۔

''اس کی بیٹی کہاں جارہی ہے؟ اُس کا بیاہ کہاں ہو رہا ہے؟'' آپا امّاں نے کڑی نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میرا اپنا خیال بلال کے لیے ہے وہ ذرا ٹھیک ہولے پھر میں بات کروں گا۔''

''یا میرے اللہ! اِس شخص کو کوئی نہیں بدل سکتا نہ اولاد کی محبت، نہ اولاد کی آزمائش۔'' آپا امّاں نے بے اختیار اپنا دِل تھام لیا۔

زمین بڑھانے کی حرص کیسا خوف ناک روگ ہے، جو رشتوں اور انسانوں دونوں ہی کو نگل جاتا ہے۔

''سید سرفراز تمہارے ظلم کی کوئی حد بھی ہے؟'' آپا امّاں برسوں بعد ایک بار پھر بہت کڑے تیوروں والی سے بات کر رہی تھیں۔

''نفیسہ۔'' سید سرفراز دھاڑے۔

''مت بھولو تم کس سے بات کر رہی ہو اپنا لہجہ اور آواز دبا کر بات کرو تمہیں اپنی اوقات نہیں بھولنی چاہیے۔'' سید سرفراز کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ ہورہی تھیں۔

''اور ایک بات تم کیوں بار بار بھول جاتی ہو کہ مسکان میری اولاد ہے۔ تم نے صرف اُسے پالا ہے اُس کے متعلق جو مرضی فیصلہ کروں یہ میرا حق ہے۔'' سید سرفراز علی پاؤں پٹختے باہر نکل گئے۔

''یا میرے اللہ! بعض نسلوں کی قسمت تک کو گھن لگ جاتے ہیں آج مجھے اندازہ ہوگیا۔ بڑی حویلی کی اماں کی قسمت کبھی نہیں بدل سکتی۔ لیکن کیا میں یہ سب کچھ مسکان کے ساتھ ہونے دوں؟''

''نہیں! میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گی۔''

''بیس سال پہلے جو نفیسہ سید سرفراز کے لیے حلق کا کانٹا بن گئی تھی آج ایک بار پھر وہ کسی معصوم کے لیے دوبارہ سے کھڑی ہوگی۔ یہ میرا خود سے وعدہ ہے۔''

''سید سرفراز! کائی زدہ جھیل کے پانی کی طرح جس عورت کو تم نے رکھ چھوڑا تھا۔ تم دیکھو گے کہ اتنے برسوں میں اِس کے اندر جو لاوا پک رہا ہے وہ تمہاری جھوٹی انا کو تہس نہس کر کے رکھ دے گا۔'' آپا امّاں مٹھیاں بھینچ کر با آواز بلند کہا۔

❖❖○❖❖

کسی کو کیوں پکاروں غیر سے امداد کیوں مانگوں
مری فریاد سننے کو مرا اللہ کافی ہے
کسی کے آستانے پر جھکاؤں سر، نہیں ممکن
جبین عجز کے سجدے کو اک درگاہ کافی ہے
تلاشِ پیر و مرشد میں پریشان گھومنے والو!
ہدایت کے لیے ذاتِ رسول ﷺ اللہ کافی ہے
کسی شجرے کی کیا حاجت، یہ ملفوظات کیا شے ہیں
جو علم و بصیرت تو کتاب اللہ کافی ہے
یہ شہر کے فتووں کی مجھ کو کیا ضرورت ہے
تمیزِ حق و باطل کو دِل آگاہ کافی ہے

کوئی کل کی مسز ثانیہ اور آج کی مسز ثانیہ کو دیکھتا تو بالکل پہچان نہ پاتا۔ مچھلی پتھر چاٹ کر واپس آئی

زندگی، جو وہ پہلے جی کر آئی تھیں، انہیں لگتا تھا کہ وہ تو ایک پشیمانی کا دور تھا۔ وہ بالکل بدل گئی تھیں۔ شوہر کی اتنی بُری موت اور بیٹی کی بربادی نے اُن کی بند آنکھیں کھول دی تھیں لیکن اِن کھلی آنکھوں بربادی کا منظر دیکھنا بے حد دُشوار تھا۔ سحرش ایک مرے ہوئے پھول کی طرح آخری سانسیں لیتی

اُن کی زندگی کا سب سے بڑا روگ تھی۔ طارق کے بار بار آنے اور اصرار پر انہوں نے بڑی مشکل
طارق کو سحرش سے ملنے کی اجازت دے دی تھی لیکن پہلی بار انہیں یہ احساس ہوا کہ انہوں نے زندگی ا
کوئی اچھا قدم اُٹھایا تھا۔

سحرش کی پتھر جیسی آنکھوں میں ہلکی سی حرکت، زندگی کی اُمید بن کر اُبھری تھی۔

طارق دو، دو گھنٹے اُس کے پاس بیٹھا اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہتا تھا مگر وہ پتھر کا بُت بنی چپ چا
بیٹھی رہتی تھی۔ لیکن ایک دِن جب طارق بہت دنوں بعد اُس سے ملنے آیا تو سحرش کے پتھر وجود ا
ردِعمل تھا اور یہیں سے مسز ثانیہ خالد نے ایک انہونی سی خواہش پال لی تھی سحرش اور طارق کے ا
ہونے کی۔ انہیں لگتا تھا کہ یہ واحد شخص تھا، جو اُن کی مری ہوئی بیٹی کے وجود میں روح پھونک سکتا ہے

''لیکن کیا سحرش کے داغ دار وجود کو طارق جیسا ہیرا صفت لڑکا اپنی زندگی میں شامل کر لے گا
ناممکن تھا!''

''لیکن کیا اُن کی خود کی واپسی کبھی ممکن تھی؟''

''بالکل نہیں! تو آج اگر وہ ٹھوکر کھا کر بھی واپس آئی تھیں تو یہ ناممکن کا شیشہ آخر ٹوٹ ہی گیا تھا
پس انہوں نے یہ ناممکن دعا اور خواہش اللہ رحمان سے کرنی شروع کر دی تھی اُن کے سجدے اور دعا
گریہ زاری بنتی جا رہی تھیں۔

''بیگم صاحبہ باہر طارق صاحب آئے ہیں!'' ملازمہ نے اندر آ کر انہیں پیغام دیا۔

''یہ طارق کے آنے کا مخصوص وقت تھا۔''

''سحرش کیا کر رہی ہے؟'' انہوں نے جاءنماز لپیٹ کر ملازمہ سے پوچھا۔

''بیگم صاحبہ میں کچھ دیر پہلے اُن کو وہیل چیئر پر بٹھا کر لان میں گھمانے گئی تھی وہ وہیں ہیں اور طا
صاحب بھی وہیں ہیں۔'' سحرش کا زندگی سے تعلق توڑنے کی وجہ سے وہ بالکل بے جان لوگوں کی طر
رہتی تھی، نہ وہ خود سے چلتی تھی نہ کھاتی تھی نہ پیتی تھی اور نہ ہی نہاتی تھی۔ مسز ثانیہ خود ہی اُس کے سار
کام کرتی تھیں اگر وہ اُسے کہیں بٹھا کر بھول جاتیں تو وہ گھنٹوں بغیر ہلے وہاں ایک ہی اینگل میں بیٹ
رہتی تھی اِس لیے مسز ثانیہ اُسے گھمانے کے لیے وہیل چیئر کا استعمال کرتی تھیں۔

''ٹھیک ہے تم چائے لے کر لان میں آ جاؤ میں بھی وہاں آتی ہوں۔'' مسز ثانیہ آنسوؤں سے بھر
چہرے کو اپنی چادر سے صاف کرتے ہوئے بولیں۔

''جی اچھا!'' ملازمہ نے ایک تاسف بھری نگاہ اپنی مالکن پر ڈالی، جس کی آنکھوں سے اُس نے آ
کبھی خشک ہوتے نہ دیکھے تھے۔

''طارق بیٹا! تم کیوں روز چلے آتے ہو؟ تمہاری آمد تمہارے کام کا حصّہ اِس لیے بھی نہیں بن سکتی
سحرش تمہارے کسی کام کی نہیں ہے وہ اِس قدر ذہنی طور پر تباہ ہو چکی ہے کہ اُسے برسوں لگیں گے ٹھ
ہونے میں۔'' مسز ثانیہ خالد آج اُس کے بار بار آنے کو کوئی نام دے دینا چاہتی تھیں۔

طارق کچھ پَل کو چپ کھڑا رہ گیا۔ وہ اِس وقت سحرش کے سامنے خوب صورت طوطوں کا پنجرہ
کھڑا تھا پہلے تو سحرش نے نگاہ اُٹھا کر بھی انہیں نہیں دیکھا تھا۔ پھر اچانک ہی اُس کی نظریں اُن طوطوں
ں کے ساتھ حرکت کرنے لگی تھیں اور یہ نہایت مثبت ردِعمل تھا۔ کہاں وہ ساکن نظروں سے گھنٹوں
ا رہتی تھی۔

''آنٹی! میں خود نہیں جانتا کہ میں یہاں بغیر کسی غرض کے کیوں چلا آتا ہوں، پہلے پہل تو میں کیس
لیے سحرش سے انفارمیشن حاصل کرنے آتا تھا۔ پھر جب پہلی بار میں سحرش سے ملا تو مجھے خود شرمندگی
نے لگی اِس معاشرے کا حصّہ ہونے کی وجہ سے میں خود کو بھی سحرش کی حالت کا ذمّے دار سمجھتا ہوں۔
اور سحرش کا انسانیت کا بھی تو رشتہ ہے۔'' طارق نے سچائی سے کہا۔

''لیکن بیٹا! کیا سحرش کو تم دھیرے دھیرے اپنا عادی نہیں بنا رہے؟ وہ تمہارے آنے پر ردِعمل کا اظہار
تی ہے کیا تمہاری ہمدردی سحرش کا ساری عمر خیال رکھ سکتی ہے؟'' مسز ثانیہ خالد کا سوال بے شک اپنے
بہت سارے سوال رکھتا تھا۔ وہ بہت آس سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔

''آنٹی پلیز! میری نیک نیتی پر شک نہ کریں آپ اللہ پر اعتبار رکھیں۔ وہ ان شاءاللہ سحرش کے ساتھ
اچھا کرے گا۔'' طارق نے نہایت سچائی سے جواب دیا۔

سز خالد کچھ کہتے کہتے رُک گئیں۔ اب بات اللہ کے اعتبار پر تھی اور وہ بندوں سے بات کہہ کر گنوانا
ں چاہتی تھیں۔

''ٹھیک ہے بیٹا! میں اپنے اللہ سے ہی آئندہ سوال کروں گی۔'' انہوں نے دِل ہی دِل میں کہا۔

❖❖○❖❖

''کہاں جا رہی ہو؟'' سید سرفراز نے بے باکی سے اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''زبیدہ کو یوں لگا کسی آگ نے اُسے چھو لیا ہو اور وہ کسی موم کی طرح پگھل رہی ہو۔

''شاہ جی ہاتھ چھوڑیئے۔'' زبیدہ کی آواز میں گھبراہٹ کم تھی البتہ شرم سے اُس کا چہرہ لال ہو رہا تھا۔

''یوں بھاگنا ہی ہوتا ہے تو پھر کیوں بہانے بہانے حویلی آتی ہو؟'' سید سرفراز کو وہ دودھ مکھن جیسی
ی دُور دُور سے دیکھنا حماقت لگنے لگی تھی اب وہ اُسے چکھنا چاہتا تھا۔ زبیدہ کے والد سید سرفراز کے بابا
ئیں کے بے حد اچھے دوستوں میں سے تھے یہی وجہ سید سرفراز کو زبیدہ کے قریب جانے سے روکتی
ں۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی زبیدہ کے معاملے میں محتاط ہو جاتا لیکن زبیدہ کی بے تابی، بار بار حویلی کے
ر لگانا، آنکھوں ہی آنکھوں میں ڈھیروں پیام لیے وہ سید سرفراز کو کسی تازہ پیسٹری کی طرح خود کی
ف متوجہ کرتی تھی۔

وہ لوگ جو عورت کا احترام نہیں کرتے ہیں اُن کی نظر میں عورت کا دِل یا اُس کی محبت ہرگز نہیں آتی
ں اُن کی نگاہ صرف اور صرف اُن کا وجود دیکھتی ہے۔ اُن کو صرف اُن کے جسم کی طلب ہوتی ہے۔

''کیسا بہانہ شاہ جی؟'' زبیدہ نے اپنی کالی سیاہ آنکھیں اُٹھا کر معصومیت سے پوچھا۔ وہ بے حد معصوم
ی تھی اپنے دِل کی بے تابی پر اُس نے سچے دِل سے اقرار کر لیا تھا۔ بس اُس کی یہ ہی خطا تھی۔

''مجھ سے ملنے کا بہانہ۔'' سید سرفراز نے مخمور لہجے میں کہا۔ وہ بے حد قریب کھڑی اُس پر نشہ طاری
کر رہی تھی۔

''شاہ جی!'' زبیدہ کی آواز اُس کے حلق میں پھنسنے لگی حیا کے کتنے ہی رنگوں نے اُس کے خوب

صورت چہرے کا احاطہ کر رکھا تھا۔

"ہاں جی!" سید سرفراز اِس نشے کی بند بوتل کو فوراً پینے کی طلب اپنے اندر شدت سے محسوس کر رہا تھا۔

"میرا ہاتھ چھوڑیے! دُکھ رہا ہے۔" سید سرفراز کے آہنی سانولے ہاتھوں میں زبیدہ کا سفید ہاتھ دبے سرخ پڑنے لگا تھا۔ اُسے تکلیف محسوس ہونے لگی تھی۔

"سید سرفراز کبھی چھوڑنے کے لیے ہاتھ نہیں پکڑتا۔" سید سرفراز کا گمبھیر لہجہ زبیدہ کی رہی سہی جان بھی نکال گیا۔

"بشیراں، مریم کہاں ہے؟" زلیخا بی بی کی آواز کہیں قریب سے آرہی تھی جس کا مطلب تھا وہ ادھر ہی آرہی تھیں۔

"شاہ جی مہربانی کریں میرا ہاتھ چھوڑیے بڑی بی بی آرہی ہیں۔" زبیدہ نے تقریباً روتے ہوئے گھبراہٹ سے اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

"ایک شرط پر اگر تم ڈیرے پر آؤ مجھ سے ملنے کے لیے!"

"میں وہاں اُس ویرانے میں اکیلی کیسے آؤں گی؟" زبیدہ نے قدموں کی چاپ قریب سنتے ہوئے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم آؤ گی نہیں تو میں جاؤں گا نہیں۔ بس میں یہیں ہی کھڑا ہوں۔" سید سرفراز نے ضد سے کہا۔ وہ دل سے چاہتا تھا کہ زبیدہ فوراً حامی بھرے تاکہ وہ فوراً یہاں سے نکل سکے۔ بی بی زلیخا کا سامنا وہ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن یہ شہر کی لڑکیاں، توبہ کس قدر نخرہ کرتی ہیں۔

"ٹھیک ہے میں آؤں گی! اب خُدا کے لیے میرا بازو چھوڑیں اور یہاں سے جائیں۔" زبیدہ نے ہتھیار پھینک کر کہا۔

"شاباش! اب چڑیا دام میں آئی نا!" سید سرفراز نے مکروہ ہنسی ہنستے ہوئے سوچا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔

زبیدہ وہیں بے دم ہو کر زمین پر بیٹھ گئی اُس کی ٹانگوں میں کھڑے ہونے کی رتی بھر سکت نہ تھی۔ سانسوں کی بے ترتیبی اور دِل کی دھڑکن کا تیز ہونا، یہ سب مل کر اُسے بدحواس کر گئے تھے۔

"ارے زبیدہ پُتر کیا ہوا؟" بی بی زلیخا مریم اور بشیراں کے ساتھ سامنے سے آرہی تھیں۔ اُسے یوں بیٹھے دیکھ کر بے حد پریشانی سے آگے بڑھیں۔ زبیدہ کا حال اِس قدر بُرا تھا کہ اُس سے فوری طور پر ایک لفظ تک نہ بولا گیا۔

"پُتر کیا ہوا؟ ایسے کیوں راہ داری میں بیٹھی ہے؟ تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" انہوں نے زبیدہ کی پیلی پھٹک رنگت دیکھ کر سوال کیا ساتھ ہی اُسے اُٹھا کر کھڑا کیا۔

زبیدہ پھر بھی کچھ نہ بول سکی۔ وہ بہت معصوم اور کمزور اعصاب کی لڑکی تھی۔ اُس میں کسی قسم کا دوغلا پن اور تیزی طراری نہ تھی۔ سید سرفراز کی بے باکی، کھلم کھلا اظہار اور ساتھ ہی ملنے کا مطالبہ سب کچھ ایک دم ایک ساتھ ہوا تھا۔ جو اُس سے فوری برداشت نہ ہوا۔

حیا اور بزدلی دونوں اُس کی شخصیت کا حصّہ تھے۔ کسی بھی قسم کے حالات پر قابو کیسے پایا جاسکتا ہے، وہ یہ جانتی تھی نہ وہ گہرا سوچتی تھی اور نہ ہی گہرے راز پال سکتی تھی۔ اُس نے تو سید سرفراز سے معصوم سی محبت کی تھی، جس کی آخری حد بس شادی ہی تھی۔

"پُتر بولتی کیوں نہیں؟" زلیخا بی بی نے اُسے کمرے میں بٹھا کر پانی کا گلاس دیا، جسے زبیدہ نے نہایت بے صبری سے پی لیا۔

"خالہ جان! میرا دِل ایک دم گھبرا گیا تھا اور چکر سا آ گیا تھا۔" آخر کار زبیدہ نے بہانہ بنایا۔

"بشیراں جا، جا کر لیموں میں نمک چینی ڈال کر شکنجی بنا کر لا، کُڑی کے دِل کو گرمی پڑی ہے گرمی بھی تو بہت ہے..." زلیخا بی بی نے فوراً بشیراں کو حکم دیا۔

"کیا ہوا تمہیں؟"

"کیا تمہیں سچ میں اتنی گرمی لگی کہ تمہارے چہرے کے رنگ اِس بُری طرح اُڑ گئے۔" مریم بی بی نے سوال کیا۔

"لگتا تو ایسے ہی ہے کہ تم نے کسی جن بھوت کو دیکھ لیا ہو۔" مریم نے زبیدہ کے کان میں سرگوشی کی۔

"مریم میرا دِل سچی میں بہت گھبرا رہا ہے۔" زبیدہ نے پسینے پسینے ہوتے چہرے کے ساتھ کہا۔

"ارے بابا رے!" مریم نے اُسے فوراً پنکھا جھلنا شروع کر دیا۔

"تم لیٹ جاؤ اس سے تھوڑا بہتر محسوس کرو گی۔" مریم نے ہمدردی سے کہا اُسے اپنی یہ سہیلی بہت عزیز تھی۔ ایک زبیدہ ہی تو تھی، جو خود آ کر اُن سے مل جاتی تھی ورنہ اِس بند حویلی سے باہر نکلنا اُن کے لیے ممکن نہ تھا۔

"ہاں۔ ہاں پُتر لیٹ جاؤ ورنہ جج صاحب کہیں گے کہ اُن کی بیٹی کو بیمار کر کے بھیج دیا۔" زلیخا بی بی نے پیار سے اُس کے بکھرے بال سمیٹتے ہوئے کہا۔

"جی!" زبیدہ نے سعادت مندی سے کہہ کر آنکھیں موند لیں، وہ اِس وقت تنہا رہنا چاہتی تھی۔ زلیخا بی بی اُسے شربت کا گلاس پلا کر باہر نکل گئیں مریم بھی اُن کے ساتھ ہی باہر نکل گئی۔

"شاہ جی! کس مشکل میں میری محبت کو ڈال دیا ہے؟ آپ کے قریب آتی ہوں تو موم کی طرح پگھلنے لگتی ہوں۔ اور دُور رہ کر بنا آگ کے ہی سلگتی رہتی ہوں۔" زبیدہ کا دِل عجیب سی کشمکش کا شکار ہو رہا تھا۔

❖❖○❖❖

"کیا بات ہے پُتر! مجھے بشیراں نے بتایا کہ تمہیں بہت تاپ (بخار) چڑھا ہوا ہے، میں تمہاری خبر لینے آرہی تھی تو راہ میں زبیدہ مل گئی۔ اپنے جج صاحب کی بیٹی ہے بچپن سے یہاں آ جا رہی ہے میری بچیوں سے بہت پیار اور دوستی ہے اکثر دو دو دن رہ کر جاتی ہے اُس کے دل کو گرمی پڑ گئی۔ نمانی ہے بھی تیری طرح نازک سی، میں نے جلدی جلدی شربت بنوا کر پلوایا تب جا کر بچی کے دل کو سکون ہوا۔" زلیخا بی بی نے عائشہ کے بستر کے پاس پڑی دو کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"پُتر تمہیں تو بہت تاپ ہے؟" زلیخا بی بی نے عائشہ کا ماتھا چھوا اور پھر بخار کی شدت محسوس کر کے

فوراً گھبرا کر کہا۔

''کیا بات ہے بولتی کیوں نہیں؟'' عائشہ کی نم آنکھیں دیکھ کر زلیخا بی بی نے پریشانی سے پوچھا۔

''تائی جی!''

''کیا؟'' عائشہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح اُن سے سوال کرے۔

''کیا بات ہے بیٹا؟ کیا پوچھنا چاہتی ہے؟''

''اس حویلی میں اگر بیٹیوں کے بَر برادری سے نہ ملیں تو کیا انہیں اکیلے کمرے میں الگ سے بند کرا جاتا ہے؟'' عائشہ نے ٹوٹے پھوٹے بے ربط انداز میں سوال کیا۔

زلیخا بی بی کچھ پَل کو بالکل چُپ کی چُپ رہ گئیں، اندر آتی مریم کو دیکھ کر انہوں نے آہ کے انداز میں سانس لیا۔

''مریم پُتر تو ذرا اپنے کمرے میں جا کر زبیدہ کی خبر تو لے۔'' زلیخا بی بی نے مریم کو وہاں سے ہٹایا۔

''بیٹا! یہ کون سی نئی بات ہے۔'' زلیخا بی بی نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔

''تو کیا یہ سچ ہے؟'' عائشہ نے ہراساں نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں یہ خونی سچ اِس حویلی کی سب سے بڑی بدصورتی ہے، تم اِس حویلی کی بڑی بہو بننے جا رہی ہو تمہیں ان سب باتوں کو ذہن نشین کر لینا چاہیے، مجھے حیرت ہے کہ سید عاشق علی نے تمہیں اِس بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا؟''

''تائی جی! کیا سدرہ آپی اور مریم کا جوڑ خاندان میں موجود ہے؟'' عائشہ نے نقاہت بھرے انداز میں پوچھا۔

زلیخا بی بی کے کلیجے کو ہاتھ پڑا تھا۔ یہ ایسا سوال تھا، جو اُن کی زندگی کا روگ بنتا جا رہا تھا، جن بیٹیوں کو نازوں سے پالا پوسا تھا کیسے اُن کو بند دیواروں کی زینت بنا دیتیں۔

''بس پُتر! قسمت کی بات ہے کہ تیرے جوڑ کے لیے اِس گھر میں دو دو بَر تھے اور میری دونوں بیٹیوں کے لیے کوئی ایک بَر بھی خاندان میں موجود نہیں ہے۔'' زلیخا بی بی کا بات کرتے کرتے یوں سانس چڑھ گیا، جیسے وہ کوئی لمبی مسافت طے کر کے آئی ہوں۔

''تو کیا آپ سدرہ آپی اور مریم کی شادی کبھی نہیں کریں گی؟'' عائشہ اِس کڑی حقیقت کو سُن کر بے حد دُکھی ہو رہی تھی۔ کل کو اُس کی بیٹی ہوئی تو کیا وہ بھی اتنی ہی بے بس ہو جائے گی کہ اُس کا جائز حق تک اُسے نہ دلا سکے گی۔

زلیخا بی بی نے ایک دم سسکی بھری۔

''ایک ماں کبھی نا اُمید نہیں ہوتی، شاید یہ ہی وجہ ہے کہ میں ہمیشہ ناممکن کی دعا کرنے بیٹھ جاتی ہوں۔ یہ سچ ہے کہ سدرہ اور مریم کی شادی کی دُعا ایک ناممکن دُعا ہی ہے! میری پھول جیسی بیٹیاں اِس حویلی میں بند ہو کر مُرجھا جائیں گی، اِس حقیقت کو میں جانتی ہوں لیکن میں ماننا نہیں چاہتی۔'' وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو دیں، عائشہ جو پہلے ہی بھری بیٹھی تھی، وہ بھی اُن کے دُکھ میں شامل ہو گئی۔

یہ آنسو کسی کی ...گی چھن جانے پر تھے، اِس حویلی کی بیٹیوں کی قسمت پر بہائے جا رہے تھے۔

''کاش اے رب سائیں! کوئی معجزہ ہو جائے میری سدرہ، مریم کا کوئی جوڑ پیدا ہو جائے۔'' زلیخا بی بی ہمیشہ کی طرح ناممکن اور ایک بے بس سی دُعا کر رہی تھیں۔

❖❖○❖❖

موسم بے حد حسین تھا بالکل اُسی طرح جس طرح اُس کے دل میں گھٹن تھی۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھتی اور ...ی بے چینی سے ٹہلنے لگتی لیکن دل کی بے چینی میں فرق نہ پڑتا تھا۔ بہت سارے دِن اُس اجنبی کے ...ار میں اُس نے گزار دیے تھے، اُس کے دِل کو بہانہ مل گیا تھا کہ وہ صرف اِس تصور سے بہلتا رہے گا ...ن یہ سدرہ کی خام خیالی ثابت ہوئی تھی۔ ہر بڑھتے پَل اُس کی بے چینی میں اضافہ ہونے لگا تھا اُس کا ...تصور سے زیادہ مانگنے لگا تھا اور یہاں سے وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہی تھی۔ جب بے چینی ...ے لگی تو وہ گھبرا کر باہر آ گئی۔

صغراں اتنی گرمی میں بیری کے درخت تلے بیٹھی چکی پر آٹا پیسنے بیٹھی ہوئی تھی۔ قریب ہی اُس کی بڑی ...ی اپنے سانولے سانولے ہاتھوں سے سوکھی ہوئی سرخ مرچوں کی ڈنڈیاں اُتار رہی تھی۔ صغراں نے ...ا آٹا پیسنے کے بعد مرچیں پیسنی تھیں۔ صغراں کی بیٹی گوگی جب جب ہاتھ جھٹک کر صاف مرچیں الگ ...تی تو اُس کی سانولی کلائیوں میں پڑی سُرخ اور سبز چوڑیاں چھنک اُٹھتیں۔ سدرہ کے دل پر اِن ...ڑیوں کی کھنک کاری ضرب کی طرح پڑ رہی تھی۔ گوگی کی کچھ عرصے پہلے شادی ہوئی تھی۔ اُس نے اِس ...ر شدید گرمی میں بھی ریشمی قمیض شلوار پہن رکھی تھی پسینے سے نچڑتے کپڑوں میں بھی وہ نہایت سکون ...ے کام میں مصروف تھی۔ سدرہ کو اپنا آپ بالکل تہی دامن لگا کہ وہ اِس قدر مہنگے اور نرم لباس پہن کر بھی ...وگی کے سکون کا ایک فیصد بھی نہ حاصل کر سکتی تھی۔

اُسے گوگی اپنے سے کہیں زیادہ خوش قسمت لگی، جو سستا سا لباس پہنتی تھی مگر پھر بھی کسی کی توصیف اُس کے چہرے کی خوشی کا باعث بن جاتی تھی۔

گوگی نے چاندی کے جھمکے اور ناک میں لونگ بھی پہن رکھا تھا یہ واحد زیور اُس کے پاس تھا۔ تیل ...ں چپڑے بال اور ان بالوں سے بہتا تیل اُس کی سُرمہ بھری آنکھوں تک آ جانے سے اُس کا چہرہ ...یب مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ مٹی سے بھرے پاؤں اور اُس میں پڑی پازیب بہت بدنما لگ رہے تھے۔

''سلام بی بی جی!'' گوگی کو وہ اتنے غور سے دیکھ رہی تھی۔ گوگی نے کام کرتے کرتے چونک کر اُس کی ...انب دیکھا اور جھٹ اُسے سلام کر دیا۔

''سلام بی بی جی!'' اب صغراں نے بھی اُسے چکی روک کر سلام کیا۔

''کیسی ہو ماسی؟'' سدرہ نے سَر کے اشارے سے سلام کا جواب دے کر پوچھا۔

''سب آپ لوگوں کا کرم ہے۔ اللہ بڑی بی بی کو سلامت رکھے، ہم غریبوں کا بہت خیال کرتی ہیں۔''

''یہ گوگی ہے نا؟ اِس کی تو شادی ہو گئی تھی پھر یہ تمہارے ساتھ کیسے؟'' سدرہ نے کھڑے کھڑے ...چھا۔

''ہاں جی یہ گوگی ہی ہے! خیر سے دُوسرے جی سے ہے میں اِسے کچھ دِنوں کے لیے اپنے ہاں لائی ...دں ورنہ اُس کا بندہ تو اِسے آنے ہی نہیں دیتا۔'' ماسی صغراں نے کہا۔

"کیوں کیا اِس کا شوہر اچھا آدمی نہیں ہے جو اِس پر پابندیاں لگاتا ہے؟"

"او نہیں بی بی جی! وہ تو اس کے پیچھے سودائی ہے سودائی! اُس کی خاطر اپنی بے بے سے طعنے سُن گا رن مریدی کے، لیکن اِس کو میکے میں رات نہیں رہنے دیتا۔" ماسی صغراں نے ہنستے ہوئے کہا۔

سدرہ نے حیرانی سے گوگی کا سانولا چہرہ دیکھا، جو اَن دیکھے خوب صورت رنگوں سے ایک دم خوب صورت ہوگیا تھا۔

"کسی کی محبت کا اعجاز بدصورت چہروں کو خوب صورت کرسکتا ہے، سدرہ بی بی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔"

"کیا کرتا ہے تمہارا شوہر؟" سدرہ نے کھوئے کھوئے انداز میں پوچھا۔

"اپنا کام ہے جی اُس کا، ہماری طرح تیرے میرے گھروں میں مزدوری کی ضرورت نہیں ہے۔ مٹی کے برتن بناتا ہے۔" گوگی نے نہایت فخر سے کہا، جیسے اُس کا شوہر مٹی کے برتن نہ بناتا ہو کہیں کا بادشاہ ہو۔

گوگی کے باپ بھائی سارا خاندان جانے کتنی نسلوں سے حویلی کے خدمت گار تھے۔ ایسے میں اِس کے شوہر کا اپنا کام ہونا واقعی اُن سب کے لیے بڑی خاص بات تھی۔

"گوگی جیسے ماسی بتارہی ہے کہ وہ تجھے رات تک رہنے بمشکل سے دیتا ہے کیا واقعی وہ تجھ سے اتنا پیار کرتا ہے؟ سدرہ کے لہجے میں بے حد حسرت تھی۔

"ہاں جی!" گوگی نے شرما کر سَر جھکالیا۔

"اُف اللہ! اِس قدر رنگ؟" سدرہ کو گوگی کے چہرے کے اتنے سارے خوب صورت رنگوں سے ایک دم حسد ہوا۔

"کیوں! کیوں رب سائیں اتنی ناانصافی؟ کیا فائدہ اِس رنگ روپ کا جس کو کوئی دیکھنے والا نہ ہو، سراہنے والا۔" سدرہ کے دل میں ایک دم اِس قدر تپش بڑھی کہ بے اختیار اُس نے اپنے دِل کو مسل ڈالا۔

"بی بی جی آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟ آپ گرمی میں کیوں باہر نکل آئیں؟ چل گوگی فٹا فٹ بی جی کو پانی لاکر پلا۔" صغراں نے سدرہ کی اُڑی اُڑی رنگت دیکھ کر کہا۔

"آپ اپنے کمرے میں چل کر بیٹھو اگر بڑی بی بی کو خبر ہوگئی تو وہ ہم سب سے ناراض ہوں گی۔ صغراں نے گھبرا کر سدرہ کو فوراً اندر جانے کا کہا۔ اتنے سخت موسم حویلی کی مالکنیں کیسے جھیل سکتی تھیں سدرہ مرے مرے قدموں سے اپنے کمرے کی جانب مُڑگئی۔ گوگی پانی لینے دوڑی تھی۔

"بی بی جی پانی پی لو!" گوگی بڑے سے سلور کے گلاس میں شکر اور ستو گھول کر لائی تھی، سدرہ نے بڑے سے آئینے میں اپنا عکس دیکھا، پھل پک کر تیار ہوچکا تھا۔ لیکن وہاں کوئی نہ تھا جو اِس پھل کی قدر کرسکتا۔

"ناگن کی طرح بل کھاتی لمبی موٹی چٹیا، دودھ کی طرح سفید رنگت، کالی بھنور سی بڑی بڑی آنکھیں اونچا لمبا قد! لیکن یہ سب بے کار تھا اُس سے اچھی تو گوگی تھی، جو کالے سانولے رنگ کے باوجود پیا

کی رانی تھی، جس کی کوکھ میں پلنے والا بچہ اُس کی تکمیل کرنے والا تھا۔ اُسے دنیا کا سب سے بڑا درجہ دلانے والا تھا۔ ماں کا درجہ!" گوگی کے مکمل وجود کے سامنے سدرہ کو اپنا وجود نہایت نامکمل لگا۔

"تم ایک نامکمل عورت ہو اور رہوگی!" کوئی نہایت سفاکی سے اُس کے اندر سے ہنسا تھا۔

"بی بی جی پانی پی لو!" گوگی، سدرہ کی گھورتی نظروں سے کچھ گھبرا کر بولی، سدرہ نے ایک دَم اُس کے ہاتھ سے گلاس پکڑ کر آئینے پر دے مارا۔ اُس آئینے میں اُس کا نامکمل وجود شیشے کی کرچیوں میں بکھرے جارہا تھا۔ سدرہ پر ایک دم جنون سوار ہوگیا تھا۔

"تم... تم میرا مذاق اُڑانے اِس کمرے میں چلی آئی ہو نا؟" سدرہ ایک دم گوگی پر جھپٹی اور نوچ کر اس کے جھمکے اُتار پھینکے، گوگی کی درد اور گھبراہٹ سے چیخیں نکل گئیں۔ سدرہ پر جانے کیا جنون سوار ہوگیا تھا وہ گوگی پر پل پڑی۔

"ہائے میں مرگئی!" ماسی صغراں نے روتے ہوئے گوگی کو سدرہ کے چُنگل سے چھڑایا۔

"رحم بی بی جی! یہ نمانی دوسرے جی سے ہے بی بی جی معاف کردو۔" ماسی صغراں گوگی کی ڈھال بن گئی تھی۔

بی بی زلیخا اور ریحانہ بی بی دونوں ہی دوڑی آئیں۔ انہوں نے بہ مشکل سدرہ کو سنبھالا تھا۔

"دیکھو! دیکھو اِس ماں کو، یہ اپنی اولاد کی خاطر ڈھال بن گئی ہے۔" سدرہ نے چیخ کر زلیخا بی بی سے کہا۔

"تم کیسی ماں ہو؟" سدرہ کی آنکھیں پھٹنے کی حد تک پھیل رہی تھیں۔

"سدرہ پتر!" زلیخا بی بی نے اُس کے ہاتھ چومتے ہوئے اُسے سنبھالنے کی کوشش کی۔

"تم ہی میری دُشمن ہو، تم نے مجھے ایک بیٹی کیوں پیدا کیا۔" سدرہ کو ہانپتے ہانپتے ایک دَم سے اپنے اعصاب جکڑے ہوئے محسوس ہوئے، ساتھ ہی اُس کے ہاتھ پاؤں مُڑ گئے، دانتوں کے بیچ میں زبان آگئی، سدرہ کو بہت بُرا دورہ پڑا تھا۔

"ہائے میری بچی!" زلیخا بی بی اُسے سنبھالتے سنبھالتے بے سُدھ ہونے لگیں۔

کچھ دیر پہلے والی بنی ٹھنی زلیخا بی بی کے بال بکھر چکے تھے اور وہ پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر سدرہ کو ہوش میں لانے کی کوشش کررہی تھیں۔ جب کہ ریحانہ بی بی کے لبوں پر نہایت استہزائیہ مسکراہٹ تھی اور چہرے پر بے انتہا سکون۔ اِس دُکھ بھرے منظر سے اُن کے دل کو بے حد خوشی مل رہی تھی۔

"مریم، مریم!" زلیخا بی بی نے مریم کو پکارا، جو سکتے کی کیفیت میں بہن کی خراب حالت کو دیکھ رہی تھی۔

"مریم جا، جا کر عبداللہ کو بُلا کر لا!" مریم میں جیسے دوبارہ سے جان پڑی تھی، وہ باہر مردانے کی طرف بھاگی۔ بشیراں اور جنتے نے بڑی مشکل سے سدرہ کے دانت کھول کر اُس کے منہ میں پانی ڈالا، جنتے نے اِس پڑی سدرہ کی جوتی اُس کی ناک کے پاس کی تو زلیخا بی بی نے تڑپ کر اُسے ڈانٹا۔

"یہ کیا کررہی ہو؟"

"بی بی جی! وہ میں تو چھوٹی بی بی کو ہوش میں لانے کے لیے..." جنتے نے شرمندہ ہوکر کہا۔

"ہٹاؤ اسے!" زلیخا بی بی نے جنتے کو درشت لہجے میں کہا۔

"میری پھولوں سے نازک گڑیا کبھی ننگے پاؤں نہیں چلی، کبھی جوتی کو ہاتھ تک نہیں لگایا اور تم اُس کی ناک پر جوتی رکھ رہی ہو!"

"ابھی تو شروعات ہے! آگے دیکھنا کہ تمہیں کیسی سزا بھگتنی پڑے گی... آخر کو تم نے اِس حویلی کو اولاد جیسی نعمت دی تھی نا۔ اب اُسی اولاد کا بیڑا غرق ہوتے دیکھو گی۔" ریحانہ بی بی نے دِل ہی دِل میں ہنستے ہوئے کہا۔

"امّاں جان! بھائی تو مردانے میں نہیں ہیں۔" مریم گھبرائی گھبرائی واپس آئی۔

سدرہ بے ہوش تھی اُس کا جسم اپنی پہلی حالت میں واپس آ گیا تھا۔ زلیخا بی بی نے ایک سرد آہ بھری وہ دھیرے دھیرے سدرہ کا سر دبا رہی تھیں۔

"میری بچی کو جانے کِس کی نظر لگ گئی، اچھی بھلی تو تھی۔" وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔

"بی بی جی! ہماری بی بی ماشاءاللہ سے چاند کا ٹکڑا ہیں مجھے تو لگتا ہے کہ کوئی سایہ وغیرہ ہو گیا ہے۔" جنتے نے اپنی رائے دی۔

"بی بی جی بُرا نہ مانو تو نہر پار جو درگاہ ہے وہاں سے بی بی کو دم کروا دیں یا پھر تعویذ لے آئیں۔" بشیراں کا تو سارا اعتقاد درگاہ کے گرد گھوما کرتا تھا۔

"تم کتنے بھی تعویذ کر لو یا پھر دَم دُرود کر لو بچی پر ان جھوٹی تسلیوں کا اثر نہ ہوگا۔ آخر آج ابتدا ہو گئی ہے جو اِس حویلی میں رہنے والی لڑکیوں کی قسمت میں ہوتی ہے۔"

"تمہیں یاد ہے ناں زلیخا بی بی! فاطمہ بھی شروع شروع میں یوں ہی ہاتھ پاؤں چھوڑ کر بے ہوش ہو جایا کرتی تھی۔" ریحانہ بی بی نے نہایت سفاکی سے کہا۔

"لیکن میں اپنی سدرہ کو ایسا نہیں بننے دوں گی۔ میں اُس کی ماں ہوں میں اُس کی تنہائی بانٹوں گی میں اُسے اکیلا رہنے ہی نہیں دوں گی۔" زلیخا بی بی نے سدرہ کے ماتھے پر بوسہ لیتے ہوئے کہا۔

"کیا تم اُس کی گود ہری کر سکتی ہو، کیا تم اُسے ایک گھر، شوہر اور بچے لا کر دے سکتی ہو؟" ریحانہ بی بی نے سفاکی سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"کسی بھی لڑکی یا لڑکے کی بنیادی ضرورتوں سے ہم کیسے انکار کر سکتے ہیں۔ گھر بار، شوہر اور بچوں سے زندگی رواں دواں رہتی ہے یہ نہ ہوں تو زندگی کی موت ہو جاتی ہے! بیٹیوں کے متعلق تم نے کیا سوچا ہے؟ تمہیں تو بس بیٹے کی شادی کا ارمان ہے۔" ریحانہ بی بی ناخواندہ تھیں لیکن اِس وقت وہ کسی پڑھے لکھے انسان کی طرح بات کر رہی تھیں۔ یہ اور بات تھی کہ اُن کی باتوں نے تسلی کے بجائے فکر کو مزید بڑھا دیا تھا۔

زلیخا بی بی نے زندگی میں پہلی بار اپنے آپ کو بے حد بے بس محسوس کیا تھا، ریحانہ بی بی بے شک سوت تھیں لیکن آج اُن کی باتیں زلیخا بی بی کو حقیقت پر مبنی لگی تھیں۔

"مجھے عبداللہ اور سید نوازش علی سے اِس سلسلے میں بات کرنا ہوگی۔" انہوں نے مصمم ارادہ کرتے ہوئے سوچا۔ اُن کا دل بے حد گھبرا رہا تھا کہ یہ ایسا مسئلہ تھا جس کے متعلق بنا کہے ہی فیصلہ سامنے تھا۔

"نہیں! میں ایک ماں ہوں اور ماں کمزور نہیں ہوتی!" انہوں نے خود کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"کیا میں صغراں سے بھی گئی گزری ہوں، جو اپنی بچی کے لیے ڈھال بن گئی تھی۔ نہیں مجھے ہر صورت اِس بات کو کرنا ہوگا۔" وہ اِس بات کی وجہ سے آنے والے طوفان کو ابھی سے دیکھ سکتی تھیں لیکن وہ صرف ایک بار اپنی سی کوشش کرنا چاہتی تھیں۔

❖❖○❖❖

"ہاں بھئی نوجوان! کِس لیے آئے ہو؟" سید نوازش علی نے پاس کھڑے ملازم کے ہاتھوں میں تین کتوں کی زنجیریں تھمائیں۔

"بخشو! یہ اپنا شیرو کچھ سست ہے اِس کو شہر سے ڈاکٹر بلوا کر دکھاؤ۔"

"کتوں کو شیر کہنے والے کتنے عقل مند ہو سکتے ہیں؟ جانے بابا مجھے یہاں کیوں لے آئے۔" فیصل نے بے زاری سے سوچا۔

"سائیں یہ میرا بیٹا ہے، ولایت سے پڑھ کر آیا ہے آپ کی مہربانی سے..." فیصل کے باپ نے اُس کی آمد کرتے ہوئے کہا۔ فیصل کو اپنے باپ کا یہ لہجہ بالکل پسند نہ آیا تھا۔

"اوئے تجھے ہماری برابری کا شوق ہونے لگا ہے! تو اپنے پتر کو شہر پڑھنے بھیج سکتا تھا، یہ ولایت کیوں بھیجا اور ہمیں کیوں نہ بتایا۔" سید نوازش علی نے غصّے سے چلاتے ہوئے کہا۔

فیصل کا باپ تھر تھر کانپنے لگا۔ واقعی فیصل کی تعلیم اور ولایت روانگی اُس نے گزشتہ پانچ سال سے چھپا رکھی تھی۔ لیکن اب وہ کب تک چھپاتا؟ یہ بات زیادہ دِن تک چھپ نہ سکتی تھی گاؤں کا کوئی بھی حاسد شخص جا کر سید نوازش علی کو خبر دے سکتا تھا اور انجام کس قدر بُرا ہو سکتا تھا وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اس لیے آج وہ خود ہی اپنے بیٹے کو یہاں لے آیا تھا تاکہ کچھ معافی تلافی کر کے بات کو سنبھالا جائے۔

"قسم لے لو شاہ جی! میں ایسی گستاخی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ لڑکا شروع ہی سے پڑھنے کا شیدائی تھا کچھ سال پہلے یہ شہر پڑھنے گیا تو ہم سے رابطہ بالکل توڑ دیا ہم بہت تڑپے، بلکے لیکن اِس بدبختوں والے کا کہیں پتا نہ چلا۔ میری گھر والی تو اِس کی جدائی میں بستر سے لگ گئی تھی۔" فیصل کا باپ ہاتھ جوڑے خوشامد کرتے ہوئے بول رہا تھا، فیصل کو اپنا آپ کسی کینچوے کی طرح لگا۔

"کوئی سال ڈیڑھ سال بعد اِس کا خط آیا کہ یہ اپنے کسی امیر کبیر دوست کی مہربانی سے ولایت چلا گیا ہے۔ اب ہم غریب لوگ کیسے یقین کر لیتے کہ کوئی خوامخواہ اتنا مہربان ہو کہ اتنا پیسا کسی اجنبی پر خرچ کر ڈالے، ہم ہمیشہ یہ ہی سوچتے رہے کہ یہ کہیں شہر کی رونقوں میں گم ہو گیا ہے اور ہم سے جھوٹ بول رہا ہے۔ بس شاہ جی یہ ہی غلطی ہم سے ہوئی کہ ہم نے آ کر آپ کو اصل بات نہ بتائی، بیٹے کی جدائی ہم غریبوں کا دُکھ تھا آپ کو میں اپنے مسئلے سُنا کر پریشان نہ کرنا چاہتا تھا۔" فیصل کے باپ نے اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی مانگی تو فیصل کو اپنا آپ اور اپنا باپ دونوں کسی کیڑے مکوڑے کی طرح لگے جن کا اپنا کوئی وجود نہ تھا، جن کو زندہ رہنے کی اجازت حاصل کرنا پڑتی تھی۔

اگر ماں نے گھر میں قسم دے کر نہ بھیجا ہوتا تو وہ کب کا یہاں سے نکل چکا ہوتا۔

"آپ تو ہمارے سرکار ہو آپ ہماری یہ غلطی معاف کر دو، ہماری کہاں جرأت کہ ہم آپ کی برابری

کر سکیں۔" فیصل کا باپ ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔

سید نوازش علی نے بہ غور دونوں کا جائزہ لیا۔

سیدوں کے بیٹوں سے زیادہ تعلیم حاصل کرنے کا جرم بے شک اُس لڑکے نے کیا تھا۔ لیکن اُس کے باپ کے رویے سے لگ رہا تھا کہ وہ اُن سے کبھی بغاوت نہ کرے گا۔ یہ سید نوازش علی کو بالکل منظور نہیں تھا کہ گاؤں کے لوگ، جنھیں وہ اپنی رعایا سمجھتے تھے۔ وہ کبھی بھی ترقی کر سکیں۔

تعلیم جو شعور دیتی ہے وہ شعور حاصل کر کے برابری کر سکیں۔

"کیوں کیا پڑھ کر آئے ہو؟" سید نوازش علی نے فیصل سے سوال کیا۔

"السلام علیکم بابا سائیں!" اُسی پل سید عبداللہ وہاں چلے آئے۔

"وعلیکم السلام پتر! کدھر تھے پرسوں سے نظر ہی نہیں آئے۔" سید نوازش علی کی آنکھوں کی روشنی سید عبداللہ کو دیکھ کر بڑھ گئی تھی۔

"بس بابا سائیں شہر گیا ہوا تھا، کچھ شاپنگ وغیرہ کی ہے۔" سید عبداللہ نے کہا۔

"میرے پتر کے شوق بھی نرالے ہیں، بجائے کوئی گھوڑا یا اعلیٰ نسل کا کتا وغیرہ خریدنے کے رنگ خریدنے شہر گیا تھا۔" سید نوازش علی کو سید عبداللہ کا Painting کرنے کا شوق کوئی خاص پسند نہ تھا لیکن اُن کے ہاں بیٹوں کو کبھی کسی بات سے روکنے ٹوکنے کا رواج نہ تھا۔

"لڑکے تو باپ کی شان ہوتے ہیں اور انہیں ہر کام کرنے کی اجازت تھی۔"

"بابا سائیں آپ واقعی بے حد اچھے ہیں اپنی ناپسندیدگی کے باوجود آپ نے میرے شوق پر بھی پابندی نہیں لگائی۔" سید عبداللہ نے نہایت نرم لہجے میں جواب دیا۔

سید نوازش علی نے اسے شفقت پدری سے دیکھتے ہوئے اپنے ساتھ لگالیا۔

"تم تو میری آنکھوں کی روشنی ہو، تمہیں بھلا میں کیسے ناراض کر سکتا ہوں۔" اُن کا کھلم کھلا اظہار اُن کی سید عبداللہ کے ساتھ بے حد محبت کو واضح کر رہا تھا۔

"ہاں بھئی لڑکے بتایا نہیں کیا پڑھ کر آئے ہو؟" سید نوازش علی کا غصہ سید عبداللہ کی وجہ سے جھاگ کی طرح بیٹھ چکا تھا۔

"ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر کے آیا ہے!" فیصل کے باپ نے سر جھکا کر اپنے جرم کا اقرار کیا۔

"کیا؟" سید نوازش علی نے ایک دم بھڑک کر کہا، شدید غصے سے وہ ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا اب وہ نفرت سے کانپ رہا تھا۔

ہدالولی دو راتیں مسلسل کالج کے اسٹوڈیو میں کام کرنے کے بعد بے حد تھکا ہوا گھر واپس آرہا تھا، ں کی چار سال کی محنت تھی، وہ جس طرح شان دار کامیابیوں کے ساتھ پہلے امتحان پاس کرتا آیا تھا ار بھی اپنا رکارڈ قائم رکھنا چاہتا تھا اس کے ساتھ وہ بے حد یونیک کام کر کے سب کو چونکانا بھی چاہتا ہی وہ اپنے کام کے لیے نہ دن دیکھ رہا تھا اور نہ ہی رات! مسلسل دو دن کام کرنے سے وہ بے حد گیا تھا پھر نگینہ اور اماں جان کے مسلسل فون اور اصرار نے اُسے مجبور کیا کہ وہ گھر کا چکر لگائے ُرا ہوموسم کا اتنی شدید سردی میں اچانک بارش پر وہ خود بھی بوکھلا گیا تھا اُس نے گاڑی کا ہیٹر آن ا ایک دم سکون رگوں میں اُتر آیا، عبدالولی کے دل میں شدت سے خواہش اُبھری کہ وہ گرما گرم پیے، عبدالولی نے گاڑی فوراً "زینوا" کی جانب موڑی۔ وہاں کی کافی اُسے بے حد پسند تھی۔ ں سے تیزی سے بھاگتے ہوئے عبدالولی دروازے تک گیا۔ دربان نے فوراً بڑھ کر دروازہ کھول ندر کا ماحول بے حد گرم اور پُرسکون تھا۔ دھیمی دھیمی موسیقی اور ییلو لائٹ نے مل کر عجب پُرفسوں بنا رکھا تھا۔

ہدالولی نے سارے ہال میں نگاہ دوڑائی، ہال میں موجود تقریباً ساری ٹیبلز مصروف تھیں، عبدالولی ں کو رگڑتے ہوئے اپنی مخصوص ٹیبل کی جانب بڑھا۔

ارے آپ؟" عبدالولی، جو وہاں کسی کو بیٹھے دیکھ کر دوسری میز کی جانب مڑ رہا تھا اسے پیچھے سے شناسا سا آواز سنائی دی۔ عبدالولی نے مڑ کر دیکھا، وہ ترنم تھی۔

حیرت ہے جب یہ لڑکی میرے ذہن سے نکلنے لگتی ہے تو پھر اس کا سامنا ہو جاتا ہے!" عبدالولی کے نے خود کلامی کی۔

پہچانا آپ نے؟" ترنم نے اُسے یک ٹک دیکھتے ہوئے پوچھا۔

جی میں نے پہچان لیا ہے! میری یادداشت خاصی اچھی ہے لیکن آپ کہاں تھیں؟ آپ کے ساتھ جب ملاقات ہوتی ہے آپ اچانک سامنے آتی ہیں اور بنا بتائے غائب ہو جاتی ہیں۔ اب اِس کے تعلق کو کیا نام دیا جائے۔" عبدالولی نے دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں ڈالتے ہوئے کہا، وہ اِس طرح تھا جیسے ابھی مُڑ جائے گا۔ ترنم نے عبدالولی کا بے حد عجلت بھرا انداز دیکھا تو جلدی ڑی ہوگئی اُس کے دل میں عبدالولی کو دیکھنے اور سُننے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔

کاش یہ پل یہیں رُک جائیں!"

"سب سوالوں کے جواب کھڑے کھڑے ہی مانگیں گے، پلیز بیٹھیے نا۔" ترنم نے منت بھرے میں کہا۔

عبدالولی جو آگے بڑھ رہا تھا جانے کیا سوچ کر رُک گیا، بند راز کی طرح تجسس سے بھری یہ لڑکی کے لیے ہمیشہ توجہ کا باعث بن جاتی تھی، وہ خلافِ عادت اُس کی جانب متوجہ ہو جاتا تھا۔

"اگر آپ کو بُرا نہ لگے تو پلیز بیٹھیے۔" ترنم نے نہایت آس بھرے لہجے میں کہا۔

"پلیز۔!" عبدالولی نے اُسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"چائے یا کافی؟" ترنم نے آدابِ میزبانی نبھاتے ہوئے پوچھا۔

"صرف کافی! اور پلیز آرڈر میں کروں گا، مجھے پرسنلی خواتین کا میزبان بنا پسند نہیں ہے۔" عبا نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

"لڑکیاں بغیر مجبوری کے ڈرائیونگ کریں یا پھر بل بھریں مجھے کبھی اچھا نہیں لگا۔" عبدالولی نے ہی وضاحت کر دی۔

"میرا دل یوں ہی تمہاری طرف نہیں کھنچتا، تم خالص مرد ہو! خودداری اور انا لیے، غیرت مند اور حد مضبوط کردار کے مالک! عبدالولی تم واقعی چاہے جانے کے قابل ہو!" ترنم نے دل ہی دل میں سو

"زہے نصیب!" ترنم نے دھیمی سی مسکان کے ساتھ کہا۔

"ویسے تو میں ہر بار زبردستی کی ذمّے داری اور مہمان بنی ہوں آپ کی۔" ترنم نے پچھلی ملاقا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن میرا سوال اب بھی موجود ہے کہ آپ اتنا عرصے کہاں رہیں اور پچھلی بار بھی بنا بتائے گئیں؟" عبدالولی نے ویٹر کو کافی اور کچھ اسنیکس کا آرڈر دیتے ہوئے ترنم سے پوچھا۔

ترنم کو بے اختیار وہ بون فائر والی رات یاد آ گئی اور اُس رات کا وہ پہر بھی، جب وہ اپنے آپ م تھی اور ولی کے سامنے کھلتی چلی گئی تھی۔ ولی کی اوڑھائی ہوئی شال آج بھی کسی قیمتی سرمائے کی اُس کے پاس تھی۔

"بے جڑ کے پودے کو کہیں بھی رکھ دیں، وہ کہاں اپنا کوئی ٹھکانا بنا پایا ہے ولی صاحب!" ترنم طویل گہرا سانس لیتے ہوئے رُک کر اُسے دیکھا۔

"عبدالولی صاحب! ہم بھی بے جڑ پودے ہیں، جہاں حالات جاتے ہیں وہیں رہ جاتے ہیں آپ کو بنا بتائے جانا بھی ان ہی حالات کی وجہ سے تھا۔ جو لوگ اپنا قصور مانتے ہوں انہیں معافی جانی چاہیے، ہمارے لیے بھی خاص معافی کی گنجائش دل میں رکھ لیں۔" ترنم نے بے حد اُداسی سے ک عبدالولی نے اُس کی آنکھوں میں تیرتی اُداسی دیکھ کر بے حد بے چینی محسوس کی۔

"اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو مجھے اپنے متعلق کچھ بتائیں! ہم جب بھی ملے ہیں ہمیشہ ہماری ملاقا اختتام اجنبیوں کی طرح ہی ہوا۔" عبدالولی آج جانے کس موڈ میں تھا، جو بے حد نرم لہجے میں بات تھا اُس کی شخصیت کا سخت خول اِس لیے بھی کچھ نرم پڑ گیا تھا کہ اب اُسے اپنا دل سنبھال سنبھال کر کی ضرورت نہ تھی۔ علیزے کے لیے خاص طرح کی فیلنگس کو وہ نام دے چکا تھا، وہ اور اُس کا دل دا

بے حد مطمئن رہنے لگے تھے۔

"عبدالولی صاحب! پلیز بھرم رہنے دیں!" ترنم نے بے حد منت بھرے لہجے میں کہا۔

"بعض لوگوں کے سامنے ہمیشہ دل چاہتا ہے کہ بھرم رہ جائے، چاہے جھوٹا ہی کیوں نہ ہو۔" ترنم نے بے حد اُداسی سے کہا۔ ولی کچھ کہتا کہتا چپ ہو گیا۔

"آئینہ دیکھنا اتنا آسان نہیں ہوتا، خاص طور سے بدصورت لوگوں کے لیے خود کو آئینے میں دیکھنا بے حد مشکل ہوتا ہے!" ترنم نے سامنے رکھا پانی کا گلاس لبوں سے لگا لیا اور گھونٹ گھونٹ کر کے پینے لگی جیسے وہ اپنے اندر کے لاوے کو اندر ہی اندر پی رہی ہو۔

"ہم اگر شناسا سے اجنبی رہیں تو بھی میرے لیے بہت کافی ہے!" ترنم بات کرتے کرتے رُکی۔

"شناسا سے اجنبی!" عبدالولی نے زیرِ لب دُہرایا۔

"جی ہاں! اس پہچان میں رشتہ نہیں ہوتا نہ نفرت کا اور نہ محبت کا، لیکن انسان دوستی ضرور ہوتی ہے!" نم نے گرم اسکارف سر پر لپیٹتے ہوئے کہا۔

"خدا کی قسم اگر میرا تعارف اِس قدر شرم ناک نہ ہوتا تو میں آپ جیسے اچھے انسان کے لیے سوال کا وث کبھی نہ بنتی۔" وہ مزید گویا ہوئی۔

"آپ کے تعارف میں ایسی کون سی شرم ناک بات ہے، جو آپ مجھے نہیں بتا سکتیں؟"

"عبدالولی صاحب! جن انسانوں کے ساتھ محترم رشتے نہ ہوں اور کوئی شخص محترم رشتہ اُس سے بنانا چاہے، میں بھی اُسی قبیل سے تعلق رکھتی ہوں۔" وہ اپنے آپ میں نہ تھی۔

"میں... میں ایک بُری لڑکی ہوں!" اتنا کہنے میں ہی ترنم کا سانس مزید پھولنے لگا، وہ ایک دم اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں نے آپ سے درخواست کی تھی ناں! کہ میرے اِس جھوٹے بھرم کو رہنے دیتے!" وہ چیخ ی۔ ترنم کا تنفس بے حد بے ترتیب ہو رہا تھا آنسوؤں کی لڑی چہرے کو بھگوتے گردن سے اسکارف میں جذب ہو رہی تھی۔

ولی کے تو ایک دم چودہ طبق روشن ہو گئے اُس کے لیے ترنم کا یہ ردِعمل نہایت غیر متوقع تھا۔ اُس نے ارد گرد نظر دوڑائی کسی پل اچھا خاصا ڈراما بن سکتا تھا۔ اُس کے تو خواب خیال میں بھی نہ تھا کہ یہ چھوٹی سی ملاقات باقاعدہ سین کری ایٹ کر دے گی۔

"آپ... آپ پلیز بیٹھ جائیے، لوگ ہماری جانب متوجہ ہو رہے ہیں۔" عبدالولی نے دبی دبی آواز میں کہا۔

اُس جیسا مضبوط اعصاب کا مالک انسان بھی اِس وقت بوکھلا گیا تھا۔ ترنم نے نہایت زخمی نظروں سے اُسے دیکھا۔

"ٹوٹے ہوئے شیشے کو کوئی اور کتنا توڑ سکتا ہے! لیکن پھر بھی جانے کیوں بعض لوگوں کے سامنے ٹوٹنا اچھا نہیں لگتا! کاش... کاش آپ سمجھ سکتے! آپ میرے لیے کیا ہیں۔" وہ کہہ کر تقریباً بھاگتی ہوئی باہر نکلی۔

وہ اپنے آپ میں نہ تھی، اِسی لیے اپنا پرس بھی ٹیبل پر چھوڑ گئی، عبدالولی کے تو باقاعدہ پسینے چھوٹ گئے تھے۔ ایک گہری سانس لے کر اُس نے اپنے اعصاب کنٹرول کرنے کی کوشش کی، اچانک اُس کی نظر سامنے پڑے ترنم کے ہینڈ بیگ اور موبائل پر پڑی۔

''اوہ مائی گاڈ! وہ احمق لڑکی گھر کیسے جائے گی۔'' ولی نے جلدی جلدی والٹ سے پیسے نکال کر ٹیبل پر رکھے اور ترنم کا بیگ اور موبائل لے کر اُس کے پیچھے بھاگا۔ اِس اچانک ملاقات اور اُس کے انجام پر وہ خاصا بوکھلا گیا تھا، اس سے پہلے کبھی ایسی پہیلی نما لڑکی سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔

''یار عبدالولی! تیرا ساری زندگی کا وہ ہی اُصول اچھا تھا کہ اِس ''لڑکی مخلوق'' سے ہمیشہ بچ کر نکل جاؤ، یہ تو واقعی نہ سمجھ میں آنے والی مخلوق ہے۔ اَب میں نے کون سا پہاڑ توڑ دیا تھا، جو وہ یوں روتے ہوئے اِس سردی کی بارش میں نکل گئی۔'' عبدالولی بڑبڑاتا ہوا باہر نکل کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سامنے سڑک پر وہ احمق ڈولتے قدموں کے ساتھ جا رہی تھی۔

''یار یہ کیا چیز ہے؟'' ولی نے ماتھا مسلا۔ اُس کی آنکھوں میں اُلجھن تھی۔

عبدالولی نے جھنجلا کر اُس کے اور اپنے فاصلے کو دیکھا اور فوراً گاڑی میں آ بیٹھا۔ اُس لڑکی کا تو دماغ خراب تھا، جو اِس قدر تیز بارش میں بھیگتے ہوئے واک کرنے کا پروگرام بنائے بیٹھی تھی لیکن خود اُس کا اپنے ایگزام کے قریب ہونے کی وجہ سے بیمار ہونے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ عبدالولی نے گاڑی عین ترنم کے پاس جا کر روکی۔

''محترمہ اندر آ کر بیٹھیں ورنہ اِس سردی میں بے موت ماری جائیں گی۔'' عبدالولی نے خاصی کوشش سے اپنے لہجے کو سخت ہونے سے روکا۔ ترنم کچھ پل اُسے غائب الدماغی سے یوں دیکھتی رہی، جیسے اُسے پہچاننے میں دقت ہو رہی ہو، بارش کا پانی آنسوؤں میں مل رہا تھا۔ اُس سے پوری طرح آنکھیں بھی نہ کھولی جا رہی تھیں۔

''ایسے خوش قسمت نہیں ہیں ہم کہ ہمیں موت جیسی مہربان آغوش پناہ دے، اِس لیے آپ بے فکر ہو کر جائیے۔'' ترنم نے خاصی بے اعتنائی سے کہا۔

سردی کی شدّت سے ترنم کے ہونٹ اور ناک نیلے پڑتے جا رہے تھے، عبدالولی کو لگا کہ یہ لڑکی بس کچھ پل میں مر جائے گی، اُس کا سارا لباس بھیگ چکا تھا۔

ولی نے نہایت غصّے سے اُسے دیکھا اور تیزی سے باہر نکل کر اُسے تقریباً دھکا دے کر گاڑی میں بٹھایا اور خود دوسری جانب آ کر بیٹھ گیا لیکن اِس ساری کارروائی کے دوران وہ خود بھی بُری طرح بھیگ گیا تھا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اُسے سردی کی شدّت کا احساس ہوا اور ساتھ ہی اُس کا موڈ بھی بے حد آف ہو گیا۔

''ضد کرتی لڑکیاں مجھے زہر لگتی ہیں! میں نے ساری عمر اپنی ماں اور بہن کو بے حد نرم مزاج دیکھا ہے، کبھی کسی بات پر ضد اور بحث نہیں کی لیکن جانے آپ کیسی لڑکی ہیں، ہر بات پر کوئی نہ کوئی جملہ حاضر ہوتا ہے۔ اَب انسان کتنی دور تک اپنی عقل کے گھوڑے دوڑائے، ہر ہر بات اور جملے کا سِرا پکڑنے کے لیے؟'' عبدالولی بِنا اُسے دیکھے غصّے سے نان اسٹاپ بول رہا تھا۔

''لڑکیوں کو بس سیدھا سادہ ہونا چاہیے اور سیدھی سادی باتیں کرنی چاہئیں۔ خُدا کی قسم آپ کی اُلجھی

گفتگو سُن کر ہمت جواب دینے لگتی ہے کہ...'' ولی نے گاڑی ڈرائیو کرتے کرتے منہ موڑ کر دیکھا اور اچانک زبان اور گاڑی دونوں کو بریک لگانی پڑی۔

ترنم ہوش وحواس سے بیگانہ بے سُدھ پڑی تھی۔

''اوہ نو! یا میرے اللہ کہاں پھنس گیا ہوں۔''

عبدالولی کو آج کی رات برباد ہوتی نظر آ رہی تھی، وہ بے حد تھکا ہوا تھا اُس پر اِس اجنبی لڑکی کو ہمیشہ ہی کیوں ملتا تھا ہر بار وہ اُسے بکھرے وجود کے ساتھ ملتی تھی اور اُسے نہ چاہتے ہوئے بھی اِس لڑکی کو سنبھالنا پڑ جاتا تھا۔

''اَب اِسے کہاں لے جاؤں؟'' ولی نے اُس کے نیلے پڑتے چہرے کو دیکھ کر پریشانی سے سوچا۔ ماتھے پر گہری سوچیں لیے وہ خاصی تیز رفتاری سے گاڑی چلا رہا تھا۔ گھر کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے اُس نے گہری سانس لی۔ بہر حال اُسے اَب ہر بات کا جواب دینا ہی تھا۔ چوکیدار نے دروازہ کھول دیا۔ ولی تیز رفتاری سے گاڑی اندر گیراج میں لے گیا۔

''یا اللہ مدد!'' اُس نے بے اختیار دُعا کی۔

''آئندہ سے اپنے اُصول نہیں توڑوں گا نہ میں اِس سے بات کرتا، نہ یہ مشکل گلے پڑتی۔'' عبدالولی نے سیٹ پر بے سُدھ وجود کو دیکھتے ہوئے دِل ہی دل میں کہا۔

''اماں جان اور نگینہ کہاں ہیں؟'' ولی نے ملازم سے پوچھا۔ وہ اپنے اندر شدید بے چینی محسوس کر رہا تھا۔

''بڑی بی بی تو بڑے صاحب کے ساتھ اپنی بہن کی طرف گئی ہیں اُن کی طبیعت خراب تھی اور وہ ہسپتال میں ہیں اور چھوٹی بی بی آپ کا انتظار کر رہی تھیں شاید اُوپر کمرے میں چلی گئی ہوں۔'' بوڑھے ملازم نے کہا، وہ منتظر کھڑا تھا کہ اُسے اگلا حکم سنایا جائے تاکہ وہ اپنا کام مکمل کر کے سونے کے لیے جائے۔

''بابا آپ سونے کے لیے جائیں، میں نگی سے مل کر آتا ہوں۔'' ولی نے رِسٹ واچ پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا گھڑی رات کے ساڑھے گیارہ بجا رہی تھی۔

''صاحب کھانا؟'' ملازم اپنی ڈیوٹی ادا کرنا چاہتا تھا۔

''نہیں بابا! آپ جا کر آرام کریں۔'' ولی نے تیزی سے موبائل پر نمبر ملاتے ہوئے کہا۔

''جی بابا سائیں میں گھر آ گیا ہوں!'' ولی نے سلام کرنے کے بعد احمد شاہ کو اطلاع دی۔

''کتنی دیر مزید لگے گی؟'' عبدالولی نے فکرمندی سے پوچھا، حسن خالہ کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ وہ ہسپتال میں ایڈمٹ تھیں۔

''چلیں ٹھیک ہے!''

''او کے! جی میرا کل واپس جانے کا پروگرام ہے آپ فکر نہ کریں، بس آپ اپنا خیال رکھیے گا!'' ولی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بول رہا تھا اُس کے ایک ایک عضو سے بے چینی ٹپک رہی تھی۔

''بھائی کہاں رہ گئے تھے؟'' نگی شال اوڑھے فَر والے سلیپر پہنے سامنے کھڑی تھی۔

"رہ نہیں گیا تھا یار! پھنس گیا تھا بلکہ ابھی تک پھنسا ہوا ہوں۔" عبدالولی اُس کا ہاتھ پکڑے باہر نکل آیا۔

"کہاں لے کر جا رہے ہو بھائی؟ باہر اتنی زیادہ سردی ہے۔" نگی نے کپکپاتے ہوئے کہا۔

"بھائی یہ؟ یہ..." نگی نے گاڑی کے اندر بے سُدھ وجود کو حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم اِسے جانتی ہو، تم نے ہی تو بتایا تھا کہ یہ تمہاری کلاس فیلو تھی۔" عبدالولی نے گہرا سانس لے کر کہا۔

"لیکن یہ آپ کو کہاں سے ملی؟ اور... اور اسے ہوا کیا ہے؟" نگی نے گاڑی کے اندر ایک بار جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"پہلے اس کو باہر نکالو، کہیں سردی سے مر ہی نہ جائے پھر تمہیں تفصیل سے بتاتا ہوں کہ محترمہ کیسے خوامخواہ ہر بار ٹکر جاتی ہیں۔" ولی نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"بھائی! میرے اکیلے کی بس کی بات نہیں ہے!" نگی نے ترنم کو باہر نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا تم ہٹو میں دیکھتا ہوں۔" ولی نے آگے بڑھ کر ترنم کو بازوؤں میں اُٹھا لیا۔

"میں اپنا کمرا کھول دیتی ہوں۔" نگی یہ کہہ کر اندر بھاگی، عبدالولی ترنم کے پھولوں جیسے وجود کو اندر لے آگیا۔ تیز روشنی میں ایک دم اُس کی نگاہ ترنم کے چہرے پر پڑی، ولی جیسا مضبوط انسان بھی کچھ لڑکھڑا گیا تھا۔

بے حد معصوم چہرہ جو جانے اپنے اندر کس داستان کا دُکھ لیے خاموش تھا۔ بدن سے چپکا لباس، اسکارف سے بے نیاز لمبے بال اور بند آنکھیں۔

ولی نے فوراً نگاہ اُس پر سے ہٹالی، ہر نظر قیمتی ہوتی ہے، جذبوں کے اظہار کے لیے امانت ہوتی ہے، ہر نگاہ ہر کسی کے لیے نہیں ہوتی ہے۔

"بھائی اِدھر لٹا دیں۔" نگی وارڈ روب سے اپنے کپڑے نکالتے ہوئے مصروف انداز میں بولی۔

عبدالولی نے جھک کر اُسے بیڈ پر لٹایا اور جب پلٹ کر کھڑا ہونے لگا تو ترنم کا ہاتھ مضبوطی سے اُس کی کلائی پکڑے ہوئے تھا۔ ولی نے مُڑ کر اُسے دیکھا، وہ بے ہوشی میں کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ اس نے غور سے اُسے سُننے کی کوشش کی، جانے وہ کیا کہنے جا رہی تھی۔ لیکن اُس کی گفتگو میں مسلسل ولی کا نام آ رہا تھا۔ عبدالولی کو اُس کا لمس کچھ عجیب سی بے چینی دے رہا تھا عبدالولی نے نرمی سے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔

"نگی تم اس کا لباس بدل دو اور ہیٹر چلا کر کمرا گرم کر دو۔" عبدالولی اپنے اندر کے احساسات دباتے ہوئے باہر نکل آیا۔ اُس کے اپنے گیلے کپڑے بھی اُسے پریشان کر رہے تھے وہ فوراً اپنا لباس تبدیل کرنا چاہتا تھا۔ کپڑے بدلنے کے بعد اُسے کافی کی شدید طلب ہوئی۔

کچن میں کھڑے کافی بناتے ہوئے اُس کا دماغ ایک بار پھر ترنم کی جانب بھٹکا۔

"میں ایک بُری لڑکی ہوں!" ترنم کا جملہ اُس کے دماغ میں گونجا۔

"وہ ایک بُری لڑکی ہے! لیکن کس قسم کی بُری لڑکی! بہ ظاہر تو وہ معصوم چہرہ ایک اچھی لڑکی نظر آتی ہے۔" عبدالولی نے گرم گرم کافی کا سپ لیتے ہوئے سوچا۔

"لیکن ایک بُری لڑکی تمہارے گھر کیا کر رہی ہے؟" عبدالولی کا دِل کافی سے ایک دم اُچاٹ ہو گیا۔ اس نے مگ سامنے شیلف پر رکھ دیا۔

"آپ نہیں جانتے آپ میرے لیے کیا ہیں!" ترنم کا جملہ اُس کے گرد گونجا۔

"عبدالولی! اَب اِس لڑکی کے متعلق جاننا ضروری ہو گیا ہے، بابا سائیں اور اماں جان اگر کچھ پوچھیں گے تو کیا بتاؤ گے؟"

"یہ کیا معمّا ہے، آخر کون ہے یہ لڑکی؟" عبدالولی نے اوپر نگی کے کمرے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ارادہ آج اُس کے متعلق ہر بات جان لینا چاہتا تھا لیکن اِس کے لیے اُس کے ہوش میں آنے کا انتظار بے حد ضروری تھا۔

❖❖○❖❖

زندگی میں تو سبھی پیار کیا کرتے ہیں
میں تو مر کر بھی مری جان تجھے چاہوں گا
تو ملا ہے تو یہ احساس ہوا ہے مجھ کو
یہ مری عمر محبت کے لیے تھوڑی ہے
اِک ذرا سا غمِ دوراں کا بھی حق ہے جس پر
میں نے وہ سانس بھی تیرے لیے رکھ چھوڑی ہے
تجھ پہ ہو جاؤں گا قربان تجھے چاہوں گا
میں تو مر کر بھی میری جان تجھے چاہوں گا

طارق راکنگ چیئر پر جھولتے ہوئے گیت میں گم تھا۔

"طارق کیا بات ہے آج میرا بیٹا کچھ خاموش خاموش سا ہے!" آنی نے اندر داخل ہو کے اسے بہ غور دیکھتے ہوئے کہا، طارق نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور ریموٹ کنٹرول سے سی ڈی بند کر دی۔

"آئیے آنی! آج تو آپ وقت سے پہلے گھر آ گئیں خیریت تھی؟" طارق نیلوفر کی باقاعدگی کو سالوں سے دیکھتا آ رہا تھا آج خلاف توقع اُسے گھر دیکھ کر اُس کا سوال کرنا عجب نہ تھا۔

"تم سے ملنے کے لیے میری جان! صرف تم سے ملنے کے لیے آج میں گھر رُکی ہوں۔" نیلوفر نے ساڑھی کا آنچل سنبھال کر سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"جب تم رات میں آتے ہو تو میں سو رہی ہوتی ہوں اور صبح میں تم سو رہے ہوتے ہو یا پھر گھر ہی نہیں ہوتے، تم سے تو ملاقات کے لیے ٹائم کو باقاعدہ پلان کرنا پڑتا ہے۔" آنی کے لہجے میں شکوہ تھا۔

"سوری آنی! آج کل میں کچھ زیادہ مصروف تھا۔" طارق نے نگاہ چُراتے ہوئے کہا۔ سحرش کی ذمے داریوں میں وہ بے حد گم تھا، جس کی وجہ سے گھر پر پوری طرح سے وقت نہیں دے پا رہا تھا۔

"اِٹس او کے میری جان! مجھے تم پر پورا ٹرسٹ ہے آخر کو تم میری تربیت ہو!" نیلوفر نے فخر سے کہا۔

یہ الگ بات تھی کہ طارق اور سائرہ کی تربیت میں زیادہ تر عمل دخل اُن کے مرحوم نانا کا تھا لیکن نیلا
نے اُن دونوں بچوں پر ہمیشہ اپنا حق جتایا تھا۔

''اچھا طارق جان! میں تم سے جو خاص بات کرنے آئی تھی کہیں وہ بھول نہ جاؤں۔'' نیلوفر نے
رسٹ واچ پر نگاہ دوڑائی، وہ اپنا پَل پَل بے حد حساب کتاب سے گزارتی تھیں۔

''جی حکم کریں آنی۔'' طارق نے تابع داری سے کہا۔

''طارق! تم مسز ہمدانی اور اُن کی فیملی کو تو جانتے ہوگے لاسٹ ٹائم میں نے افطار پارٹی میں اُن سے اور اُن کی دونوں بیٹیوں، لائبہ اور تمنا سے ملوایا تھا۔ مجھے تو دونوں لڑکیاں بے حد پسند ہیں میرا اُن کے لیے تمہارا خیال ہے اگر تم گرین سگنل دو تو میں بھی بات آگے بڑھاؤں، مسز ہمدانی خود بھی باتوں باتوں میں تمہارے لیے مجھ سے بات کر چکی ہیں۔'' آنی نے طارق کا چہرہ ٹٹولتے ہوئے کہا اس کا چہرہ بے حد سنجیدہ تھا۔

''آنی! آر یو سیریس؟'' طارق نے پوچھا۔

''یس آئی ایم سیریس!'' آنی نے سنجیدگی سے کہا۔

''یعنی میری آنی میرے لیے اکٹھی دو، دو لڑکیوں کو فائنل کر رہی ہیں، میرے اندر آپ کو آخر کیا نظر آیا کہ دو، دو لڑکیاں اکٹھی۔'' طارق کا چہرہ سنجیدہ تھا لیکن لہجہ بے حد شرارتی تھا۔

''طارق! میں اُن میں سے کوئی ایک لڑکی منتخب کرنے کو کہہ رہی ہوں۔'' آنی نے مصنوعی خفگی سے اُسے گھورا۔

''آنی! آپ اتنی دُور دُور کیوں لڑکیاں تلاش کر رہی ہیں؟ آپ کی تو ماشاءاللہ قریب کی نظر بہت اچھی ہے۔'' طارق نے ہنسی ہنسی میں دل کی بات کہنے کی کوشش کی۔

''مجھے باتوں میں نہ اُلجھاؤ، مسز ہمدانی کی فیملی شہر کی بارسوخ اور امیر ترین فیملی ہے اگر کوئی اور ہم پلّہ لوگ ہیں تو کھل کر بتاؤ۔'' آنی نے کچھ بے چینی سے پہلو بدلا، آج تک طارق نے اُن کی کہی کسی بات سے انکار نہ کیا تھا مگر آج اُس کی باتوں میں اُس کی اپنی مرضی کی خواہش جھلک رہی تھی۔

''آنی! کیا مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے؟'' سائرہ جو نہ جانے کب وہاں آ کھڑی ہوئی تھی درمیان میں بولی۔ طارق واقعی گڑبڑا گیا۔ سائرہ بہت پہلے اُس کے دل کی بات جان گئی تھی۔

''تم دونوں مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو؟'' آنی نے کچھ ناراض ہوتے ہوئے شکوہ کیا۔

''نہیں آنی! ہماری جرأت ہے کہ اپنی عزیز از جان آنی سے کچھ چھپائیں۔'' سائرہ نے اُن کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''پھر مجھے کھل کر بتاؤ اُس لڑکی کا نام!'' آنی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ویسے تو لالہ نے آج تک میرے سامنے بھی اپنی پسندیدگی کا اقرار نہیں کیا، لیکن کیا کروں میں اُن کی بہن ہوں اور بھائی کو اِس مشکل دوراہے سے نکلنے میں مدد دینا میری مجبوری ہے۔'' سائرہ بات تو کر رہی تھی آنی سے لیکن نظریں طارق کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

''لالہ میں آنی کو بتا دوں، اجازت ہے؟'' سائرہ نے شرارت سے کہا۔

''یار طارق! اگر تمہاری مشکل اتنی آسانی سے حل ہو رہی ہے تو اَب بات کھلنے دو۔'' طارق نے دل ہی دل میں کہا۔ نگی سے برسوں کی محبت چھوٹے سے پودے سے تناور درخت میں تبدیل ہوگئی تھی اور اب یہ درخت اظہار مانگتا تھا۔

''آنی اُس کا نام نگینہ ہے!'' آخر سائرہ نے وہ دھماکہ کر ہی دیا، جو بہت برسوں سے ایک بند راز تھا۔

نیلوفر کے تنے اعصاب ایک دم ڈھیلے ہوگئے۔

''نگینہ تو مسز ہمدانی کے خاندان سے زیادہ دولت مند خاندان سے تعلق رکھتی تھی، طارق کی پسند اُن کی شرائط پر پورا اُتر رہی تھی، وہ ایک دم سے مطمئن ہوگئیں۔''

''کیا سائرہ درست کہہ رہی ہے؟'' آنی نے طارق سے کنفرم کرنا چاہا۔ طارق جیسا آدمی ایک دم کھِل کھِلا کر ہنس دیا، منہ سے اُس نے کچھ بھی نہ کہا تھا لیکن اُس کی جان دار ہنسی سب اقرار کر گئی تھی۔

''او کے! تو پھر... مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں ہے میری تو دیکھی بھالی لڑکی ہے!'' آنی نے فوری طور پر اُٹھتے ہوئے کہا۔

''مسز ہمدانی کو تو بے حد جلدی تھی لیکن نگی ابھی پڑھ رہی ہے، روشن آرا بھابی کا تو ابھی ارادہ ہے کہ اسے گریجویشن ضرور کروائیں اس کا مطلب ہے کہ ابھی اتنی جلدی مچانے کی ضرورت نہیں۔'' آنی خود ہی ٹہلا کرتی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''لیکن بہر حال میں جلد ہی موقع دیکھ کر یہ بات اُن کے کانوں سے ضرور نکال دوں گی، لڑکی اور خاندان بے حد اچھا ہے۔ لوگ تو ایسے خاندان پر ہمیشہ نظر رکھے بیٹھے ہوتے ہیں۔'' آنی نے حسبِ عادت ہر بات کو جمع تفریق کر کے اُس کا فائدہ نِکالتے ہوئے سوچا۔

''کیوں طارق تمہارا کیا خیال ہے؟'' آنی نے جاتے جاتے اُس سے بھی رائے لی۔

''بڑے ہی نیک خیالات ہیں۔'' سائرہ اتنی آواز میں بولی کہ سرگوشی صرف طارق تک سنائی دی تھی۔

''آنی! آپ کے فیصلے اور حکمت عملی ہمیشہ پرفیکٹ ہوتے ہیں، جو آپ کو بہتر لگے وہ کریں۔'' طارق نے نیلوفر کے کندھے پر بازو حمائل کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن طارق جان! مجھے تم سے اِس بات کا گِلہ ہمیشہ رہے گا کہ تم نے اپنے دل کی بات اور وہ بھی اس قدر اہم بات مجھے نہیں بتائی۔''

''سوری! لیکن آنی بعض اوقات کچھ باتیں خود کو کنفرم کرتے کرتے بھی تو ٹائم لگ جاتا ہے نا؟'' طارق نے آنی کو اُن کا سکھایا ہوا اُصول بتایا۔

''گڈ! تم اگر یوں ہی ہر قدم پر پلس، مائنس کو مدِ نظر رکھو گے تو کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرو گے۔'' آنی ایک کامیاب بزنس وومن تھیں، وہ حاصل جمع کو بہت اہمیت دیتی تھیں۔

سائرہ نے نہایت کوفت سے بھائی اور خالا کو دیکھا۔

''او کے ڈیئرز! رات کھانے پر ملاقات ہوگی۔'' وہ اپنی ساڑھی کا آنچل سنبھالتے ہیل کی ٹھک ٹھک کے ساتھ باہر نکل گئیں۔

''بھائی اور وہ بھی میرا؟ اِس طرح کی باتیں کرے یقین نہیں آتا!'' سائرہ نے کچھ خفگی سے طارق کو

دیکھتے ہوئے کہا۔

"کم آن لِٹل سسٹر! تم تو آنی کی نیچر جانتی ہو اگر اُن کی ٹون اور اسٹائل میں رہ کر بات کی جائے تو ہمیشہ خوش رہتی ہیں اور وہ اُسی بات کو کامیابی جانتی ہیں۔" طارق نے سائرہ کا دل صاف کرنے کی کوشش کی۔

"لالہ! آپ واقعی بہت تیز ہوگئے ہیں۔" سائرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ جواباً طارق بھی دھیرے سے مسکرادیا۔

"لیکن لالہ! اَب تو زبان سے اپنی چُھپی ہوئی بلکہ سات پردوں میں چھپا کر رکھی محبت کا اظہار کر ہی دیں۔" سائرہ نے اصرار کیا۔

"کیا یہ ضروری ہے؟"

"یار مشرقی لڑکے کو اتنا مجبور تو نہ کرو، بتاؤ اظہار کرنا ضروری ہے؟" طارق نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے معصومیت سے سوال کیا۔

"میرے سامنے تو اتنا ضروری نہیں ہے جتنا نگی کے سامنے ضروری ہے۔"

"لیکن اُسے تو تب بتایا جائے، جب وہ کچھ مزید سمجھ دار ہوجائے، نگاہ اور چہرہ پڑھنے کے قابل ہوجائے ابھی تو وہ ظالم حسینہ بھائی بھائی کہہ کر "بھائی چارے" کے رشتے کو ہی پکّا کرتی رہتی ہے۔" طارق نے جس بے بسی سے کہا تھا۔ سائرہ کا قہقہہ کسی فوارے کی طرح پھوٹا تھا۔

"واقعی نگینہ آج کل کی لڑکیوں سے ذرا مختلف ہے بے حد معصوم اور سادہ۔ اِس میں اُس کے گھر کے ماحول کا بھی دَخل بھی ہے کیوں کہ روشن آنٹی نے کبھی اُس پر غیر ضروری بات کا بوجھ نہیں ڈالا، ہر وقت اُسے پروں میں چھپائے رکھتی ہیں، جب تک انسان کے سامنے مسائل نہ آئیں وہ خود مختار ہوکر اُن کو حل نہ کرے، تب تک چہرے پڑھنا نہیں آتا۔" سائرہ نے سنجیدگی سے تجزیہ کرتے ہوئے کہا۔

"ارے! کہیں مَیں حیرت سے بے ہوش نہ ہوجاؤں۔ میری بہن اِس قدر سمجھ دار ہے اور مجھے معلوم ہی نہیں۔" طارق نے واقعی اُسے توصیفی نظروں سے دیکھا۔

"لالہ آپ تو آج کل جانے کہاں گم رہتے ہیں، گھر میں رہیں تو گھر والوں کی خبر رہے۔" سائرہ نے شکوہ کیا۔

طارق کا دھیان ایک دم پھر تقسیم ہوگیا تھا اُسے سحرش کے خیال نے بے چین کردیا وہ چھوٹی سی لڑکی واقعی ہمدردی کے قابل تھی۔ طارق نے گھڑی پر نگاہ ڈالی آج اُسے سحرش سے بھی ملنے جانا تھا۔

"اچھا سائرہ جان! تم ایک اچھا سا سینڈوچ بنوادو ساتھ میں چائے، مجھے فوراً ایک ضروری کام سے نکلنا ہوگا۔" طارق نے وارڈ روب کھول کر لباس کا انتخاب کرتے ہوئے کہا۔

"لو ہوگئیں شروع آپ کی مصروفیات!" سائرہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے کچھ بیزاری سے کہا۔

"یوں لگتا ہے کہ میرا بھائی ہی دُنیا کا مصروف ترین آدمی ہے جو اپنی زندگی کے اتنے خوب صورت پہلو پر بات کرنے کے لیے بھی وقت نہیں نکال سکتا۔"

"کم آن سائرہ!" طارق نے ایک پَل کو رُک کر کہا۔

"کچھ چیزیں، کچھ رشتے جب تک لیگل نہ ہوجائیں تب تک اُن پر بات کرنے اور اظہار کرنے میں لطف نہیں آتا۔" طارق ایک بند کتاب جیسی شخصیت رکھتا تھا، زندگی میں جینے کے اُصول اُس کے اپنے ہی تھے۔

"لالہ! آپ اور آپ کے دوست ولی میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ آپ لوگوں کے دِل میں کیا اور کیا چل رہا ہوتا ہے کبھی پتا نہیں چلتا۔" سائرہ نے بے اختیار کہا۔

"خیریت آج ولی کو کیوں شامل تفتیش کرلیا؟" طارق کے کان ایک دم کھڑے ہوگئے، وہ اپنی بہن کے لیے بے حد حساس تھا۔

"ایسے ہی بھائی صاحب!" شاید ہر وقت لڑکیوں کو اُس کے متعلق "آئرن مین" آئرن مین کہتے سُن کر یہ خیال آیا ہے۔ وہ بھی بھائی بے حد خاموش سے انسان ہیں اُن کے دِل میں کیا ہے کبھی اندازہ نہیں ہوا۔" سائرہ کو ولی کا اُس دِن ڈراما ہال میں کھڑے باتیں سننا یاد آ گیا لیکن اُس نے کیا سُنا تھا وہ اُس کے چہرے سے بالکل جان نہ پائی تھی۔

"اچھا مزے کا لفظ ہے آئرن مین!" طارق نے بے حد ریلیکس ہوتے ہوئے کہا۔ بہن کی نگاہوں میں بے حد سادگی تھی۔ وہ یقیناً ایک عمومی سی بات کررہی تھی۔

"انگلینڈ میں جتنے سال ہم دونوں پڑھتے رہے ہیں ہمیں کسی گرل فرینڈ کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، ہم نے اُس دور کو بے حد انجوائے کیا ہے۔ گھڑسواری، تیراکی اور کرکٹ! بس یہی ہماری سرگرمیاں تھیں اس پورے عرصے میں کسی لڑکی کی گنجائش نہ تھی۔ میرا نہیں خیال کہ لڑکی سے دوستی کرنا اور اُسے جھوٹے خواب دکھانا اچھی بات ہے۔" طارق نے بے حد وضاحت سے جواب دیا۔

"اَب تو ایک سینڈوچ اور چائے کا کپ مِل ہی جانا چاہیے ہمشیرہ صاحبہ!" طارق نے باتھ روم کی جانب بڑھتے ہوئے یاددہانی کروائی۔

"بس دومنٹ لالہ!" سائرہ کہہ کر باہر نکلی۔

"آئرن مین! کیا نام رکھا ہے ولی یار تیرا لڑکیوں نے۔" طارق مسکرایا اور ایک وہ تمہاری بہن کوئین بینٹ کبھی کوئی نگاہ نہیں جان پاتی۔

"اچھا یار طارق! اُمید پر دُنیا قائم ہے اَب ایک بے خبر سے دل لگا ہی لیا ہے تو انتظار کرو۔" وہ خود ہی بڑبڑایا۔

طارق کی نگاہوں میں نگی کا معصوم چہرہ لہرایا تو ساتھ ہی سحرش کا چہرہ بھی نگاہوں میں آ گیا۔ طارق نے ایک دم اپنے اندر بے چینی محسوس کی لیکن یہ بے چینی کیوں تھی، وہ جان نہیں پایا۔

❖❖○❖❖

میڈم چاندنی بپھری ہوئی ناگن بنی ہوئی تھی۔

"جون کچھ پتا چلا اُس طارق کے خاندان کے متعلق؟" میڈم چاندنی نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔

"آپ کے لیے ایک کام کی خبر ہے۔" جون نے ہنستے ہوئے کہا۔ اُس کے مکروہ چہرے پر خباثت

ٹیک رہی تھی یقیناً اُس کے شیطانی دماغ میں کچھ چل رہا تھا۔

''بولو!'' میڈم چاندنی نے راکھ ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے بے چینی سے پوچھا۔

''اُس کی بس ایک ہی بہن ہے اور جو اُسے جان سے پیاری ہے!'' جون نے جملہ مکمل کر ل قہقہہ لگایا۔

''پتا کرو اُس کی بہن کی کیا عمر ہے اور وہ کہاں رہتی ہے؟'' میڈم چاندنی کا چہرہ جوش سے دمکنے

''اِس طارق کے بچے کو ایسا سبق سکھاؤں گی کہ ہاتھ جوڑ کر ہماری فائلیں واپس کر کے جائے گا میری طاقت اور غصّے کا اندازہ نہیں ہے، جتنا کم بخت مجھے نقصان پہنچا چکا ہے اِس کا خمیازہ تو اُسے ہوگا۔'' میڈم چاندنی نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔

''اوکے میڈم! جیسا آپ کہیں ویسا ہی ہوگا۔'' جون نے بے حد تابع داری سے کہا۔

''اور ہاں! وہ کالج والی لڑکیوں کا سلسلہ کہاں تک گیا؟ میں اِن لڑکیوں کے لباس سے لے کر ہر کا خرچا اِس لیے نہیں برداشت کرتی کہ یہ اپنی عیاشیوں میں وقت برباد کریں، مجھے رزلٹ چاہیے مہینے لڑکیاں پہنچ جانی چاہئیں۔ کاروبار تو ویسے ہی کرائسس میں جارہا ہے میں مزید کوئی کوتاہی بردا نہیں کروں گی۔'' میڈم چاندنی نے دوٹوک انداز میں حکم دیا۔

''اوکے میڈم!'' جون نے سر ہلا کر کہا۔

''اور ہاں! یہ طارق والا معاملہ فوراً حل ہونا چاہیے، یہ لڑکا تو حلق کا ایسا کانٹا بنتا جارہا ہے جو نہ جاسکتا ہے اور نہ اُگلا جاسکتا ہے۔'' میڈم چاندنی نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

''آپ فکر نہ کریں میں جتنی جلدی ہوسکا سب معلومات اکٹھی کرلاؤں گا۔'' جون نے کہا۔

اور یہ تو چاندنی جانتی تھی کہ جس کام کو جون کے سپرد کیا جائے وہ کام ضرور ہوتا ہے۔

''طارق! اب تم اپنی خیر مناؤ اور دیکھو کہ تم نے کس بَلا سے پنگا لیا ہے۔'' میڈم چاندنی نے دل دل میں کہا۔

❖❖○❖❖

''مُسکان! نماز پڑھ لی تم نے؟'' آپا امّاں نے مسکان کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا اُسے فجر کے لیے اُٹھانے آئی تھیں جب دو تین آوازوں پر بھی مسکان نے جواب نہ دیا تو وہ فکر مندی سے آگے بڑھیں۔

مُسکان نیند میں گُم مسلسل کسی کا نام لے رہی تھی آپا امّاں نے قریب ہوکر اُسے دیکھا۔

''ولی؟'' آپا امّاں نے زیرِلب دُہرایا کیوں کہ مُسکان مسلسل ایک ہی نام پکارے جارہی تھی اُس ہاتھ میں سونے کی زنجیر دبی ہوئی تھی۔ آپا امّاں نے دبے پاؤں آگے بڑھ کر آرام سے وہ زنجیر اُس ہاتھ سے نکال لی۔

آپا امّاں کو لگا کہ آسمان اُن کے سر پر آن گرا تھا یا زمین اُن کے پیروں تلے سے کھسک گئی تھی۔ اُس لاکٹ کو بہت اچھی طرح پہچانتی تھیں۔

''یہ... یہ لاکٹ تو سید عبداللہ کا تھا!'' اُن کی سانس رُکنے لگی۔

''لیکن ایسا لاکٹ تو کسی کے پاس بھی ہوسکتا ہے!'' دِل نے اُن کو تسلی دی۔ انہوں نے کانپتے ہاتھوں اس مخصوص قسم کے لاکٹ کو کھولا۔

''اوہ میرے خدایا!'' وہ پاس پڑی کرسی پر گر پڑیں۔

اندر بی بی عائشہ اور سید عبداللہ کی تصویر موجود تھی! انہیں لگا کہ ہر جانب بم دھماکے ہورہے ہیں اور اسی ان یہ گھر بھی تباہ ہوگیا اور اُن کا وجود اُس ملبے میں دب گیا ہے۔

''سید عبداللہ تو آج سے بیس سال پہلے... تو پھر یہ لاکٹ کہاں سے آیا؟'' انہوں نے خوف زدہ وں سے سوئی ہوئی مُسکان کو دیکھا۔

''اور یہ لاکٹ مسکان کے پاس کہاں سے آیا؟'' اُن کے ذہن میں کچھ روز پہلے والا وہ لڑکا گھوم گیا دیکھ کر انہیں سید عبداللہ کا گمان ہوا تھا۔

وہ انہیں ہو بہو سید عبداللہ جیسا لگا تھا لیکن انہوں نے اُسے اپنا گمان جان کر نظر انداز کردیا تھا حالاں تنہائی میں اکثر انہیں وہ چہرہ ڈسٹرب کرتا تھا لیکن وہ اُسے اپنا وہم اور نظر کا دھوکا ہی گمان کرتی رہی ں۔

لیکن یہ لاکٹ ایک حقیقت تھا، جسے وہ اگنور نہیں کرسکتی تھیں اور یہ کیسی سلگتی ہوئی حقیقت تھی، جس سے کے ہاتھ ہی نہیں روح تک جل رہی تھی۔

❖❖○❖❖

''تمہیں میں نے ڈیرے پر بلایا تھا۔'' سید سرفراز نے حویلی کی راہ داری میں ہی زبیدہ کا ہاتھ تھام کر ا۔

زبیدہ ایک دم بوکھلا گئی۔ سید سرفراز کے یوں اچانک آجانے سے وہ ہمیشہ بوکھلا جاتی تھی۔

''شاہ جی!'' زبیدہ حیا سے سُرخ پڑگئی۔ سید سرفراز کا لمس اب اُسے ایک لطیف سا احساس دے رہا

''آج میں ڈیرے پر تمہارا انتظار کروں گا اور تمہیں آنا ہوگا اِس بار وعدہ کر کے توڑا تو پھر کبھی تم سے تک نہیں کروں گا۔'' سید سرفراز نے پیار بھری دھمکی دی۔

زبیدہ نے تڑپ کر اُسے دیکھا وہ اُس کی خاموش محبت تھا وہ اُسے کس طرح ناراض کرسکتی تھی۔

''بولو آؤ گی نا!'' سید سرفراز نے اُس کے ہاتھ کو مزید دباتے ہوئے پوچھا۔

''ہوں!'' زبیدہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

سید سرفراز نے دھیمے سے اُس کے گالوں کو چھوا اور ساتھ ہی اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''میں انتظار کروں گا!'' اُس نے گمبھیر لہجے میں ایک بار پھر کہا۔

زبیدہ تقریباً بھاگتی ہوئی وہاں سے گئی، سید سرفراز نے ایک گہری سانس لے کر اُس کی خوش بو کو اندر اُس پر ابھی سے نشہ طاری ہونے لگا تھا۔

''سید سرفراز! تمہارے آئندہ دن اچھے گزرنے والے ہیں۔'' اُس نے اپنے آپ سے کہا۔

ہونہہ! یہ بی بی عائشہ خود کو کیا سمجھتی ہے؟

وہ اگر دیکھے کہ کیسے سید سرفراز کے ایک بار کہنے پر لڑکیاں بھاگی چلی آتی ہیں۔'' سید سرفراز کو ابھی عائشہ کی کہی باتیں نہ بھولی تھیں جانے اُس لڑکی کی نگاہوں میں اتنی بے باکی، خود اعتمادی دیکھ کر اُسے اپنی انسلٹ کیوں محسوس ہوتی تھی۔ اُسے آج تک ڈری سہمی لڑکیاں ہی ملی تھیں، ایسے میں عائشہ کا رویہ اُس کی انا اور اُس کی غیرت کو مزید تنگ کرتا تھا۔ زبیدہ کی جانب فوراً جھکاؤ بھی اس لیے تھا کہ اُسے اپنی انا کی تسکین چاہیے تھی اور چاہے اِس تسکین میں کسی کی زندگی تباہ ہو جائے اُسے کسی کی پروا کب تھی۔

سید سرفراز کو تڑپتے سسکتے انسان اور جانور بے حد پسند تھے وہ اپنے اندر خاص طرح کی تسکین محسوس کرتا تھا جب کوئی بے بس مزارع یا ملازم اُس کے آگے گڑگڑاتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو سب سے بڑا اور خود مختار سمجھتا تھا۔ سب اُس کے رحم و کرم پر ہیں۔ طاقت کا نشہ ایسا تھا کہ جتنا بھی بڑھتا اتنا ہی اُسے لطف آتا تھا۔

وہ نہایت اکڑ کے ساتھ وہاں سے چل دیا، کلف لگے کھڑکھڑاتے کپڑے دور تک آواز پیدا کرتے گئے۔

''کون ہے، جو سید سرفراز کے سامنے کھڑا ہو سکے؟'' وہ ہنکارا بھر کر بولا۔

❖❖○❖❖

''امّاں جان! آپ نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا؟'' سید عبداللہ نے فکرمندی سے پوچھا۔

''تم سے اِس حویلی کی روایات ڈھکی چھپی تو نہیں ہیں!'' زلیخا بی بی نے آہ بھر کر کہا۔

''لیکن میں ان باتوں کو نہیں مانتا! یہ تو نہایت غیر انسانی سلوک ہے۔'' سید عبداللہ نے تڑپ کر کہا۔

''لیکن یہ پشتوں سے چلا آ رہا ہے، باپ اور بھائی اپنے ہاتھوں سے اپنی بیٹیوں کو قربان کرتے آئے ہیں یہ زمینیں ہمیشہ بیٹیوں کا خون مانگتی آئی ہیں۔ میرا اگر کوئی بھائی ہوتا تو آج میری بھی شادی نہ ہوتی لیکن میں اپنے باپ کی تین بیویوں سے اکلوتی اولاد تھی، میرے بابا سائیں کے لاکھ چاہنے کے باوجود کوئی اور اولاد نہ ہو سکی اور پھر میری شادی تمہارے بابا سائیں کے ساتھ ہوئی جو پہلے سے شادی شدہ تھے، مجھے ساری عمر سوکن کا خطاب ملا۔ تمہاری بڑی ماں ہمیشہ مجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھتی رہیں لیکن میں پھر بھی خوش ہوں، مجھے تنہائی کاٹنے کے لیے دیواریں نصیب میں نہیں لکھی گئیں۔ میری گود میں تمہاری صورت میں اور مریم، سدرہ کی صورت میں اولاد تھی۔ رب سائیں نے میری زندگی تم لوگوں کے وجود سے ہری بھری کر دی اور میں ہر بات بھول گئی۔'' زلیخا بی بی نے گہرا سانس لیا۔

''اولاد ایسی نعمت ہے، جو ہر عورت کو مکمل کر دیتی ہے اُس کے من کے خالی پن کو بھر دیتی ہے! سدرہ اور مریم کے جوڑ کے بَر خاندان میں نہیں ہیں لیکن ....'' زلیخا بی بی کچھ کہتے کہتے رُک گئیں۔

''امّاں جان، لیکن کیا؟'' عبداللہ نے بے چینی سے پوچھا۔

''لیکن تمہاری بڑی امی کے میکے میں ایک دو خاندان ایسے ہیں، جہاں رشتہ ہو سکتا ہے۔'' اس کا ذکر اُس نے خود سے کیا تھا۔

زلیخا بی بی کچھ کہتے کہتے پھر رُک گئیں۔

''تو پھر یہ تو اچھی بات ہے اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔'' عبداللہ نے نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔

''وہ پہلے سے شادی شدہ مرد ہیں اور عمر میں بھی بہت بڑے ہیں!'' زلیخا بی بی نے آخر وہ بات کہہ ڈالی جو وہ اتنی دیر سے نہ کہہ پا رہی تھیں۔

''اوہ مائی گاڈ!'' سید عبداللہ نے باقاعدہ اپنا سر تھام لیا۔

''امّاں جان پلیز! میری پھول سی بہنوں کے متعلق آپ کیا سوچ بیٹھی ہیں، اگر بابا سائیں میری بہنوں سے لاپروا ہیں تو آپ بھی تو اُن کے لیے ایک مشکل زندگی کا انتخاب سوچ جا رہی ہیں کیا... کیا یہ انصاف ہے؟'' سید عبداللہ کی گوری رنگت ایک دم غصّے سے سُرخ پڑ گئی۔

''کم از کم وہ اِن دیواروں کی قید سے بچ جائیں گی میں تو کچھ کم عذاب والا راستا دیکھ رہی ہوں۔ اُن کے پاس اچھی زندگی کا راستا ہے ہی نہیں تو پھر ایسے میں کچھ کم عذاب والا راستا زندگی کی کچھ خوشیاں اُن کی جھولی میں ڈال سکتا ہے، اُن کو اولاد مل سکتی ہے، گھر داری کی مصروفیت مل سکتی ہے، یہ بہت کافی ہوگا اُن کے لیے۔'' زلیخا بی بی نے آخری سطح کو سوچ کر یہ فیصلہ کیا تھا۔ اپنی نند کی عبرت ناک زندگی اُن کو اِس طرح کا فیصلہ لینے پر مجبور کر گئی تھی۔

''پلیز امّاں جی!'' سید عبداللہ شدتِ جذبات سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''یہ سب کیا ہے؟ آج گاؤں کے ایک آدمی پر بابا سائیں اِس بات پر غصّہ ہو رہے تھے کہ وہ ولایت سے تعلیم حاصل کر کے کیوں آیا؟ حالاں کہ انہیں تو اِس بات پر فخر ہونا چاہیے تھا کہ اُن کے گاؤں کا کوئی اِس قدر تعلیم حاصل کر کے آیا ہے لیکن انہوں نے اِس بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔'' سید عبداللہ یہ کہتے کہتے پھر رُک کے۔

''میں... میں تو صرف یہ سمجھتا رہا تھا کہ یہاں صرف دوسرے لوگوں کے حقوق کی پامالی کی جاتی ہے لیکن نہیں، یہاں تو اپنے ہی گھر کی بیٹیوں کو بھی کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ یہ سب کیا ہے؟'' سید عبداللہ آج بڑی مشکل سے فیصل کو سید نوازش علی کے عتاب سے بچا کر آیا تھا، سارے راستے وہ اپنے بابا سائیں کے رویے پر کڑھتا آیا تھا اور گھر آ کر اِس موضوع کو سننے کے بعد اُس کے اعصاب ایک دم جواب دے گئے تھے۔

''پتر! یہ تو ہماری پشتوں سے چلا آ رہا ہے اور اِس سارے نظام کو آج تک کوئی بدل نہیں سکا۔'' زلیخا بی بی نے بیٹے کو سنبھالنے کی کوشش کی وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اُن کا بیٹا غصّے میں اپنے باپ سے اُلجھ پڑے اور اِس طرح سدرہ، مریم کا مسئلہ بھی اُلجھ جائے۔

''لیکن میں ایسے کسی نظام کو نہیں مانتا، جو انسان کو انسان نہ سمجھے!'' سید عبداللہ نے ماتھے پر تیوری ڈالتے ہوئے کہا۔

''پتر! تو اگر اِس طرح غصّہ کرے گا تو تیری بہنوں کی بات بگڑ سکتی ہے، تو یہ کیوں نہیں سمجھتا؟'' زلیخا بی بی نے منت کرتے ہوئے اُس کے غصّے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ سید عبداللہ نے گہرا سانس لے کر اپنے آپ کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔

''خود اچھی جگہ کروں گا چاہے اس کے لیے مجھے کسی سے بھی ٹکر لینی پڑے، یہ میرا خود سے وعدہ ہے

اور آپ سے بھی، میں اس ظلم کو روکوں گا۔'' یہ بات کرتے ہوئے اور کہتے ہوئے سید عبداللہ کو علم نہ تھا کہ سید نوازش علی اور اس کے اصولوں سے ٹکرانا اس قدر آسان نہیں ہے، بہتے دھارے کے ساتھ بہتا جا پانی صاف ہو یا گدلہ! ہمیشہ آسان ہوتا ہے۔ اس کی مخالف سمت تیرنے کے لیے مضبوط قوت ارادی ہی نہیں مضبوط اعصاب کی بھی بے حد ضرورت ہوتی ہے۔

جاگیرداروں اور زمینداروں کے ہاں نسل در نسل سے ماننے والے، اطاعت کرنے والے ہی ہوتے ہیں وہ چاہے اولاد ہو یا ملازم۔ ہر دو صورتوں میں ان کی سوچیں اور صورتیں اکثر اپنے بڑوں کی پیروی کرنے اور رضا پانے کی جستجو میں ویسی ہی ہو جاتی ہیں۔ سید عبداللہ کی صورت اور سوچ دونوں ان کی اپنی تھیں، یہ اُس کی مضبوطی بھی تھی اور کمزوری بھی۔

❖❖○❖❖

سید نوازش علی گھوڑے پر سوار ہو کر ڈیرے سے نکلے ہی تھے کہ اُن کی نظر جورے کے بیٹے پر پڑی پانچ چھ سال کے بچے میں ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ اسے دوبارہ دیکھا بھی جاتا، ننگے پاؤں، بدن پر صرف ایک لمبی سی قمیص، جس کے کف اور گریبان کے بٹن کھلے تھے۔ بٹن ہوتے ہی نہیں کوئی بند کم کرتا۔ قمیص کا دامن بچے کی ایڑیوں کو چھو رہا تھا اور اس نے قمیص کے نیچے کوئی نیکر بھی نہیں پہنی ہوئی تھی بغیر دھلے منہ پر کہیں کہیں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اس کی نظر میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا کہ جس پر غصہ آتا غصہ کیا جاتا، مگر سید نواز علی جو اپنی زمینوں کے معمول کے دورے پر ابھی نکلے ہی تھے غصے سے آگ بگولا ہو گئے۔ گھوڑے کے ساتھ ساتھ چلنے والے دونوں ''کمیوں'' نے ان کے مزاج کی سختی محسوس کی اور بھاگ کر باگیں پکڑ لیں۔ سید نوازش علی بجلی کی طرح تڑپ کر گھوڑے کی پیٹھ سے زمین پر آئے، ان کی آنکھیں آگ برسا رہی تھیں، نتھنے پھول رہے تھے اور نگاہیں بدستور بچے کے گندے ہاتھوں پر مرکوز تھیں جو کچھ کھا رہا تھا۔ کام کرنے والے کمی مزدوروں کے بچے اسی طرح گلیوں اور ڈیروں پر گندے ہاتھوں میں کچھ نہ کچھ کھاتے پیتے نظر آتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ سید نوازش علی انہیں دیکھتے ہوئے بھی لاتعلقی اختیار کر لیتے تھے۔ ڈیروں کا کلچر ایسے ہی معمولات سے بنا ہوتا ہے، جس پر نہ وڈیرے اور زمینداروں کو اعتراض ہوتا ہے اور نہ انہیں کسی کی صفائی ستھرائی سے غرض ہوتی ہے اور نہ تہذیب و تمدن کی تعلیم ان کا مطمع نظر ہوتا ہے۔ ان کے اختیار و اقتدار کی گاڑی کے پُرزے ہر وقت رواں رہنے چاہئیں اپنی اپنی جگہوں پر اپنی اپنی حدود میں، اپنے اپنے دائروں اور مخصوص کاموں میں۔ جورا اپنے باپ دادا کی طرح ان کا ملازم اور وفادار تھا اس کے ذمّے ڈیرے کا کوئی کام نہیں تھا۔ نہ مہمانوں کی دیکھ بھال کا، نہ صفائی ستھرائی کا، اسے باقی لوگوں کے ساتھ بیٹھنے اور میل ملاپ بڑھانے کی اجازت بھی نہ تھی۔ ان کا کام ڈیرے کی پچھلی جانب ایک باڑے میں تھا، جس میں ایک قطار میں تین مسلسل کمرے بنے ہوئے تھے، ان کمروں تک سب کی رسائی نہیں تھی۔ جورا انھی پر تعینات تھا دوسرے نوکروں کے لیے یہ ایک طرح سے علاقہ غیر تھا۔ جب جب سید نوازش علی کو شکار پر جانا ہوتا تو جورے کو آواز پڑتی اور وہ جھکائے، آنکھیں زمین پر گاڑے حاضر ہو جاتا، اس لمحے اس کا پورا بدن کان بنا سید نوازش علی کی آواز لگا ہوتا کہ جانے کس لمحے کوئی حکم آئے اور وہ اسے بجا لائے، جس میں لمحے بھر کی تاخیر نہ کر بیٹھے،

یا کبھی ہوتا کہ شہر سے کوئی خاص مہمان آئے ہوتے تو جورے کو آواز پڑتی۔ یہ آواز کوئی نہ کوئی کمّا، کوئی (کمّ)ی دیتا اور جورا بھاگتے ہوا حاضر ہو جاتا۔ جورے کو یاد نہیں کہ کبھی سید نوازش علی نے خود اسے نام لے کر اپنی زبان سے بلایا اور پکارا ہو۔

''جورے۔'' یہ آواز سید نوازش علی کے منہ سے کسی گولی کی طرح نکلی اور جلتے انگارے کی طرح (جور)ے کے کانوں تک اپنی پوری حدت اور شدت سے پہنچی تھی۔

پکارے جانے کے انداز میں غصّے اور نفرت کی کچھ ایسی شدت تھی کہ جس جس نے سنا بھاگتا ہوا (آ)یا۔ جورا سر جھکائے حکم کا منتظر تھا مگر وہاں آج اس کے لیے کوئی حکم نہیں ایک سوال تھا۔

''بچوں کو کھانا دے دیا؟''

''جی سرکار۔'' جورا منمنایا۔

''کوئی کمی بیشی۔''

''نہیں سرکار۔'' چھوٹا لیلا تھا۔ پورے کا پورا ڈال دیا ہے۔

''تمہیں یاد ہے بچے تمہارے سپرد کرتے ہوئے کیا کہا تھا؟''

''جی سرکار! آپ نے کہا تھا، سر چھپانے کو گھر، کھانے کو سبزی، فصل اور پہننے کو کپڑا لتّا سب ملے گا مگر (ت)م اور تمہاری اولاد بھی وہ نہیں کھاؤ گے جو یہ بچے کھائیں گے۔''

یہ چھ بچے تھے، جو جورے کے حوالے کیے گئے تھے ان کے الگ الگ نام تھے۔ سائزوں اور رنگوں (کا) فرق کسی کی پہچان بھلانے نہیں دے سکتا تھا۔ یہ کسے ہوئے جسموں والے شکاری کتے تھے، جو سید (نواز)ش علی کو کتنے ہی انسانوں سے زیادہ عزیز تھے۔

ان کی خوراک، علاج، دیکھ ریکھ کا وہ اس قدر خیال رکھتے کہ بعض نوکروں کو رشک آتا مگر ایسی بات (زبا)ن پر کوئی نہ لا سکتا تھا۔

''تاجو! جاؤ جورے کے گھر اور اس کے چولھے اور برتنوں کو دیکھ کر آؤ، کیا پکا ہے؟''

''سرکار!'' جورا ہاتھ جوڑ کر زمین پر گرا۔

''مجھ وفادار پر شک نہ کریں، برسوں کی خدمت میں کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ آج اس قدر (بدظ)ن کیوں ہیں؟''

''مائی باپ! میں تو سوتے میں بھی آپ کے حکم کے خلاف جانے کی جرأت نہیں کر سکتا، میں کیا (میر)ے چاروں بچے اور بیوی آپ ہی کا دیا کھاتے اور پہنتے ہیں، ہم میں سے کوئی بھی آپ کے حکم سے (باہر ن)ہیں۔'' جورا زمین پر گرا فریاد کر رہا تھا۔ اس کے منہ سے نکلے لفظ بے وقعت اور بے مطلب تھے کیوں (کہ) جس نے سننا تھا وہی نہیں سُن رہا تھا۔

پھر ایک دم سب کی نظریں اِدھر اُٹھ گئیں، جہاں سے تاجو ایک کالی مٹی کی بنی ہانڈی اُٹھائے آ رہا تھا (ا)یک عورت اس کے دامن سے لپٹ رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح ہانڈی اس سے چھین لے مگر (ایسا کر)نے پر قادر نہ تھی۔ وہ لمحہ آن پہنچا تھا، جو جورے کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا، جس کا وہ سوچ کر ہی (کا)نپے جا رہا تھا۔

"سرکار! ہانڈی میں گوشت کی ایک بوٹی پڑی ہے۔" اس ایک جملے نے ڈیرے کے باہر کھڑے کمی اور مزارعوں میں ایک سراسیمگی دوڑا دی۔

کچھ انہونی ہو چکی تھی۔ کچھ انہونی ہونے والی تھی۔

"مائی باپ! مجھے قسم ہے آپ کے احسانوں کی میں نے حکم عدولی نہیں کی۔ میں نے تو پچھلے ہا سال سے گوشت کی بوٹی چکھ کے نہیں دیکھی، میری بیوی نے جب سے وہ بیاہ کر میرے پاس آئی ہے کبھی گوشت کھایا یا نہ کبھی مانگا اس کے سامنے میں ہر دوسرے دن بکرا ذبح کرتا ہوں، سارے کا سارا کے پنجروں میں ڈالتا ہوں اپنے گھر لانے، پکانے کا تو ہم نے کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کیا۔ میں جانتا یہ بوٹی ہانڈی میں کیسے آئی، کس نے پکائی۔"

سید نوازش علی کے منہ سے گالیوں کی ایک بوچھاڑ یوں نکلی، جیسے کسی اسٹین گن سے گولیاں نکلتی ہیں

"جورے!"

"جاؤ اس کے "بال" کو اُٹھا لاؤ، ایک بوٹی ابھی تک اس کے ہاتھ میں ہوگی۔

ٹھہرو! اِدھر لانے کی ضرورت نہیں ہے اسے جنگلے کے اندر پھینک آؤ۔

یہی طے تھا، یہی کہا تھا میں نے کہ جس روز جس نے میرے بچوں کی خوراک کو ہاتھ لگایا اس کو کے پیچھے جانا ہوگا۔ میرے شکاری بچوں کی خوراک بننے کے لیے۔

"تم نے پندرہ سال تعمیل کی... زندہ رہے، تعمیل کرتے رہو گے جیتے رہو گے، مگر تمہارے بال نے کھائی، اسے اَب ان کی بوٹی بننا پڑے گا۔" جورے کی بیوی اور جورے کی چیخوں سے ڈیرہ گونج رہا وہ سید نوازش علی کے قدموں میں گرنا چاہتے تھے اسے منانا چاہتے تھے مگر ڈر اور خوف کے مارے اس قدموں کو بھی چھو نہیں سکے۔

تاجوان کے سامنے لحہ لحہ ڈیرے سے باہر جا رہا تھا۔ تاجو اس لمحے ایک کتا، ایک کارندہ نہیں، موت فرشتہ تھا، جو موت بن کر ان کے بیٹے کی طرف بڑھ رہا تھا اور وہ دونوں جانتے تھے کہ سید نوازش علی حکم کو ٹالنے، روکنے اور بدلوانے کی طاقت کسی میں نہیں۔

فیصلہ سنا کر سید نوازش علی دوبارہ گھوڑے کی طرف بڑھے، وہ مرتے بچے کی چیخیں نہیں سننا چاہتے اور جانتے تھے کہ ان کے شکاری کتے اس بچے کو یوں چیر پھاڑ دیں گے، جیسے کسی خرگوش کو کھاتے ہیں۔

سید سرفراز حویلی سے نکلا تو ذہن میں صرف زبیدہ کا سراپا گھوم رہا تھا آج اس سے انتظار مشکل تھا۔ کب رات ہوگی، کب ملاقات ہوگی۔ وہ خلافِ معمول ملاقات کی تفصیلات طے کر رہا تھا۔ زبیدہ معصومیت سے زیادہ اس کے شہری حسن اور نکھار پہ اس کا دل آیا ہوا تھا۔ اَب تک کی ہوئی چند ملکی ملاقاتوں اور اشاروں سے وہ یہ تو بہ خوبی جان گیا تھا کہ زبیدہ کے دل میں اس کے لیے پسندیدگی ہے، اسے وڈیرے حق نواز کا بیٹا یاد آ رہا تھا جس نے ایک بار کالج کا منہ دیکھا تھا اور وہاں کی کہا سناتے نہ تھکتا تھا اسی نے بتایا تھا کہ ہمیشہ لڑکی کی آمادگی اور مسکراہٹ ہی مسئلے حل کرتی ہے اور مسئلے بھی یہی کرتی ہے۔ کسی اور نے لقمہ دیا تھا۔

سید سردار نے سوچتے ہوئے ڈیرے کا رخ کیا اسے یاد آ رہا تھا کئی سال پہلے زبیدہ جب پہلی بار

الله کے ساتھ حویلی آئی تھی تو کیسے ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی پھرتی تھی اس کے والد جج تھے اور سید ازش علی کے گہرے دوستوں میں شامل تھے۔ ان بالادست طبقوں کے لوگ دوستیوں کو ہمیشہ گہرا کرنے کا سوچتے ہیں اور خاندانی طور پر ملنے کو ترجیح دیتے ہیں اسی دوران زبیدہ کی مریم بی بی سے دوستی بھی ہو گئی۔ اُن دنوں شاید وہ اسکول کی آخری کلاسوں میں سے کسی جماعت میں تھی اور اَب ایف اے کی طالبہ بن چکی تھی۔ یہی عمر ہوتی ہے جب لڑکی کچی کلی جیسی ہوتی ہے۔ ادھ کھلی اور کھلنے کو بے تاب، اس عمر لڑکیوں کو خواب دیکھنے کا نیا نیا شوق ہوتا ہے مگر سلیقہ نہیں آتا اس لیے اکثر ایسے خواب دیکھ بیٹھتی ہیں ان کی تعبیر کبھی خوشیاں اور خوب صورتیاں نہیں لاتی۔

اچانک ڈیرے سے سید نوازش علی کو نکلتے دیکھ کر سید سرفراز کے قدم ذرا تیز ہو گئے۔

قریب پہنچ کر ابھی وہ باپ سے سلام دعا کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ سید نوازش علی کی آواز آئی۔

"اچھا ہوا، یہ تم ہو سرفراز!"

جاؤ دیکھو! میں نے راجو کم ذات کو شکاری کتوں کا گوشت اپنے بیٹے کو کھلانے کی سزا دی ہے۔ یہ واقعہ رت کے طور پر سب ملازموں کو بھی یاد رہے اور آس پاس کے گوٹھ گراں تک بھی اس کا تذکرہ پہنچے۔ بنداریاں اور ڈیرے داریاں دہشت اور اسی طرح کے فوری انصاف سے ہی قائم رہتی ہیں۔ تمہارے دانے ایک بار کتوں کے رکھوالے کو ایسی ہی حرکت پر سب گاؤں والوں کے سامنے بھوکے کتوں کے گے ڈلوا دیا تھا پچیس تیس سال پہلے، پھر کسی ملازم کو جرأت نہیں ہوئی۔ اب یہ واقعہ تمہارے آنے والے وں میں حوالہ بنا رہے گا۔ بس دھیان رکھنا تمہارے بھائی سید عبداللہ تک اس کی بھنک تب تک نہ پہنچے ب تک جانور ہڈیاں چبا کر نہ چھوڑ دیں۔

میں راجو اور اس کی بیوی کو روتے چھوڑ آیا ہوں جب فیصلے پر عمل کروانا ہو تو پھر آنکھیں نہیں ملاتے، نظر انداز کرتے ہیں۔ حکمرانی کے لیے رونے والے ضروری ہوتے ہیں۔ وہ روئیں گے تو دوسروں کو نا ہوں گے۔

انسانوں کا معاملہ ہاتھی کے بچوں جیسا ہوتا ہے پاؤں میں ایک بار سختی اور رعب کی زنجیر ڈل جائے تو نسلوں کے پاؤں سے اس کے داغ اور نشان نہیں جاتے، پھر ہر بار سختی نہیں کرنی پڑتی، کبھی مسکرا دو تو ئی دنوں، ہفتوں خوش رہتی ہے، تذکرے کرتے ہیں کہ سرکار کا مزاج اچھا ہے۔"

سید سرفراز کو لگا موقع اچھا ہے سید عبداللہ کے حوالے سے باپ سے دو چار باتیں کرلوں، جونہی اس بات کرنے کے لیے منہ کھولا سید نوازش علی نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ وہ بغیر کسی کام کے وقت گزاری اپنے ناروا فیصلے پر عمل در آمد کے انتظار میں تھے۔

سید سرفراز حیران رہ گیا، جب اس نے دیکھا کہ جورے اور اس کی بیوی کو کئی نوکروں نے جکڑا ہوا اور راجو کتوں کے کمروں کے آگے خالی احاطے میں کھڑا تھا۔ شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار، ہر سطح پر دہوتے ہیں۔ انہوں نے جورے اور اس کی بیوی کو تڑپنے کی بھی اجازت نہ دی، بے شک وہ ان تھا مگر اس وقت وہ سرکار کی طرف سے فیصلے پر عمل در آمد کے لیے متعین تھے۔

اجو واپس آیا تو کانپ رہا تھا اس نے سید سرفراز کے پاؤں چھو لیے اور دھاڑیں مار کر رو پڑا۔

''اللہ جانے اس لڑکی کو کیا ہوگیا ہے؟'' زبیدہ کی دادی نے اُس کے دادا سے فکرمندی سے کہا۔

''تین روز سے بخار میں جل رہی ہے، دیکھو ہوش میں نہیں ہے۔'' دادی نے ٹھنڈے پانی کی پٹیاں اس کے ماتھے پر رکھتے ہوئے کہا۔

''تم اس کے باپ کو خبر کرواؤ تاکہ وہ اِسے شہر کے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھادے یہاں حکیم کی دوائیوں میں اور کتنا اثر ہوگا!'' دادی نے زبیدہ کے دادا کو شہر اطلاع کرنے پر اصرار کیا۔

''لیکن اچھی بھلی لڑکی کو اچانک ہوا کیا؟'' دادا ابھی تک پریشان تھے۔ زبیدہ کی رنگت زرد پڑ گئی تھی، آنکھوں کے نیچے واضح حلقے موجود تھے، تین دن کے بخار نے اُسے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔

''پتا نہیں! بڑی حویلی گئی تھی آتے ہی بستر میں گھس گئی۔ میں ماسی سے گندم صاف کروا رہی تھی تب میں نے دھیان نہ دیا لیکن جب تین چار گھنٹے کمرے سے نہ نکلی تو پریشان ہوگئی۔ جا کر دیکھا تو یہ بے سُدھ پڑی تھی۔'' دادی نے ایک سانس میں ساری کہانی کہہ ڈالی۔

''اچھا! میں کسی بندے کو بھیجتا ہوں، شہر جا کر اس کے باپ کو اطلاع کر آئے۔'' دادا نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اُٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں ذرا جلدی کرو۔ اللہ خیر کرے بن ماں کی بچی ہمارے ہاں اگر چار دن رہنے آجاتی ہے تو بے چاری کو یوں کسی بیماری کو تو نہیں سونپا جاسکتا۔ اس کا باپ کیا کہے گا کہ ہم اس کا خیال بھی نہیں کر سکتے۔'' دادی نے زبیدہ کے چہرے پر آئی لٹ کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

''شاہ!

''نہیں! یہ سب ٹھیک نہیں ... یہ ٹھیک نہیں!'' زبیدہ ایک بار پھر نیم غنودگی میں وہ ہی الفاظ دُہرا رہی تھی جو گزشتہ تین راتوں سے مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔

جب انسان کسی کو ٹوٹ کر چاہتا ہے تو اُس پر اندھا اعتبار بھی کرنے لگتا ہے۔ اور کبھی کبھی اس اندھے اعتبار کی وجہ سے پاؤں ایسی گہرائی میں جا گرتے ہیں، جو اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پاتال میں گرا دیتے ہیں اور انسان کی زندگی میں تمام عمر ایک پچھتاوا رہ جاتا ہے۔

دادی نے زبیدہ کو غور سے دیکھتے ہوئے اُس کے کہے الفاظ پر بھی غور کرنے کی کوشش کی۔

''زبیدہ کیا کہہ رہی ہے؟ کیا ٹھیک نہیں ہے؟'' دادی نے زیرِلب پوچھا، یہ سوال اُن کا خود سے تھا لیکن کچھ ایسا ضرور تھا جو اُن کے لیے پریشانی کا باعث تھا۔ یہ پریشانی اُن کے دل کو ستا رہی تھی لیکن وہ

ں پریشانی کے سرے کو پکڑ نہ پا رہی تھیں۔ انہوں نے ایک بار پھر پریشانی سے زبیدہ کی جانب دیکھا۔

❖❖○❖❖

''چاند میاں! زبیدہ کی طبیعت بہت خراب ہے تم اُسے فوراً لے آؤ، گاڑی بڑی والی لے جانا۔'' تایا ا نے کتابوں میں کھوئے ہوئے چاند میاں سے کہا۔

''گاؤں؟'' چاند نے حیرت سے پوچھا۔

گاؤں میں دادا، دادی رہتے تھے، جنہوں نے آج تک اسے اور اس کی ماں کو قبول نہ کیا تھا وہ ان کی ل دیکھنا تک پسند نہ کرتے تھے۔ گاؤں تو اُن کے لیے ممنوعہ علاقہ تھا ایسے میں تایا جی اُسے کیسے گاؤں ے کا کہہ سکتے تھے۔

''ہاں بیٹا! تم ہی زبیدہ کو گاؤں سے لاؤ گے، میں اپنے بعد صرف تم پر بھروسا کرتا ہوں، مجھے بہت اری مقدمے کا فیصلہ سنانا ہے ایسے میں، میں فوراً گاؤں نہیں جاسکتا۔ اور ابا جی نے گاؤں سے بندہ ا ہے زبیدہ کو شدید بخار ہے، وہاں کوئی ڈاکٹر نہیں ہے جو اُس کا باقاعدہ علاج کرسکے۔'' جج صاحب اصل وجہ بتاتے ہوئے کہا۔

''لیکن وہ دادا جی؟'' چاند نے اپنا سوال اُدھورا ضرور چھوڑا تھا پھر بھی جج صاحب اُس کا مطلب سمجھ اتھے۔

''تم نے جانا اور آنا ہے، میں تم کو وہاں رُکنے کے لیے مجبور نہیں کر رہا۔'' جج صاحب خود بھی جانتے کہ ابا جی چاند میاں کے ساتھ کوئی بد اخلاقی ضرور کریں گے اس لیے وہ خود نہیں چاہتے تھے کہ چاند ں میں رُکے۔

''ٹھیک ہے تایا جان! میں چلا جاتا ہوں۔'' چاند نے ہمیشہ کی طرح تابع داری سے کہا۔

''تایا جان کیا وجہ ہے کہ اس دور میں بھی آپ کا گاؤں ڈاکٹر جیسی سہولت سے محروم ہے؟'' چاند نے ال کیا۔

''وہ اس لیے کہ وہاں کے مالک ایسا نہیں چاہتے''۔ جج صاحب نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

''کیوں! وہاں کے مالک بیمار نہیں پڑتے؟ سید نواز ش علی تو آپ کے بہت اچھے دوست ہیں آپ اُن ، کہیں کہ وہاں کوئی چھوٹی موٹی ڈسپنسری کا انتظام کریں۔'' چاند نے اپنی جانب سے بہترین حل بتایا۔

''بیٹا! انسان جیسی چیز پر انہوں نے اپنی اجارہ داری جما رکھی ہے۔ ہسپتال، ڈسپنسری وغیرہ تو بہت بڑی د ہے وہ اپنے گاؤں میں کسی قسم کی سہولت نہیں چاہتے۔ اُن کا خیال ہے کہ سہولت اُن کے اس تصور کو ر کر دے گی کہ وہ ''انسان'' ہیں اور یہ کہ زندگی کی بنیادی سہولتیں اُن کا بھی حق ہے۔'' جج صاحب نہایت تاسف سے کہا۔

''کیوں! وہاں رہنے والے انسانوں کو نہیں پتا کہ وہ انسان ہیں؟ تایا جان یہ کیا بات ہوئی۔''

''وہاں رہنے والے سالوں سے غلامی کی زندگی گزار رہے ہیں جو اُن کے غلام نہیں ہیں انھیں وہ ت سے زیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہاں رہنے والے ڈرے سہمے لوگ زندگی کے بنیادی حقوق ہولتوں کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتے۔ وہاں آگہی کی روشنی اور تازہ ہَوا کے آگے سب سے بڑی

رکاوٹ سید نوازش علی کا خود کا وجود ہے اُس کا خاندان ہے۔'' جج صاحب نے سچائی سے جواب دیا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا کہ لوگ ایسی بھی زندگی گزارتے ہیں۔'' چاند نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''اچھا بیٹا! تم ابھی نکل جاؤ، میں بھرجائی کو خود بتادوں گا۔'' جج صاحب نے اپنا چشمہ رومال سے رگڑتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے میں چلا جاتا ہوں!'' چاند کے دل میں رتی بھر آمادگی نہ تھی لیکن تایا کا کہا اُس کے لئے ہمیشہ حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ ڈھیلے قدم اُٹھاتا، اپنے کمرے کی جانب بڑھا تاکہ لباس تبدیل کرسکے۔

''زبیدہ! جانے گاؤں میں ایسا کیا رکھا ہے جو تم بھاگ بھاگ کر وہاں جاتی ہو۔'' چاند نے کڑھتے ہوئے سوچا۔

زبیدہ کی بے نیازیاں اکثر اُس کا دِل جلایا کرتی تھیں۔ اُس کی خاموش محبت کو کبھی بھی زبیدہ نے محسوس نہ کیا تھا۔

❖❖○❖❖

سفر نہایت تھکا دینے والا تھا۔ وہ چار یا پانچ گھنٹے مسلسل گاڑی چلاتا آیا تھا کیوں کہ اُسے دوپہر تک وہاں پہنچنا تھا اور پھر شام سے پہلے وہاں سے نکلنا بھی تھا۔ گاؤں پہنچ کر اُس نے گاڑی روک دی۔

''ملک نواز کا گھر کہاں ہے؟'' اُس نے دو خواتین سے پوچھا جو سر پر چادر کا گٹھر اُٹھائے جارہی تھیں۔ گاؤں میں صرف دو تین ہی گھرانے بے حد خوش حال تھے اس وجہ سے وہ بے حد نمایاں بھی تھے۔

''ملکاں دے گھر جانا اے؟'' پکی عمر کی پکے رنگ والی عورت نے دُوپٹے سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے پوچھا۔

''جی!'' چاند نے مختصر جواب دیا۔

''تسی کون؟'' آگے سے مزید سوال ہوا۔

''میں؟'' چاند کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔ وہ بھلا کیسے کہہ سکتا تھا کہ وہ ملک نواز کا سگا پوتا ہے، زبیدہ کے والد تو دادی کے پہلے شوہر کی اولاد تھے پھر بھی ملک نواز زبیدہ کو ہی اپنی پوتی مانتے تھے اور زبیدہ کے والد کو ہی اپنا بیٹا کہتے تھے۔ اپنے سگے بیٹے کی نافرمانی کو وہ آج تک معاف نہ کرسکے تھے اور یہ ناراضی اُس کے اور اُس کی ماں کے حصے میں آگئی تھی۔

''میں ملک نواز کا رشتے دار ہوں۔'' چاند نے اٹکتے ہوئے کہا۔

''تو پھر اس والی گلی مُڑ جاؤ۔ وہاں جو پکی حویلی ہوگی جس کا ہرے رنگ کا بڑا سا پھاٹک ہے وہ ملکوں کا گھر ہے۔'' عورت نے اپنی تسلی کرنے کے بعد چاند کو گھر کا پتا بتایا۔

زندگی میں، رشتوں میں، رویوں میں اگر خوشیاں چاہیں تو معافی کس قدر ضروری ہے، آمرزش کس قدر ضروری ہے۔ آمرزش جو زندگی کی نوید ہے، آمرزش جو روشنی کا رستہ ہے! آمرزش جو ٹوٹے ہوئے راستوں میں پل ہے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑتی ہے!'' چاند میاں نے آسمان پر اُڑتے پرندوں کو دیکھ کر گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''دادا! کاش آپ جان سکتے کہ میرے اندر آپ کے پیار کی کمی کی وجہ سے کتنا بڑا خلا آگیا ہے۔ میں آپ کے گلے سے لگ کر اپنے بابا کا لمس محسوس کرنا چاہتا ہوں!'' چاند نے پانی کی بوتل منہ سے لگائی، پانی بھی بے حد گرم تھا گرم پانی کے گھونٹ اندر تک تلخی اور بے چینی بڑھا گئے۔

''بعض اوقات کچھ رشتے بھی تو گرم پانی کے گھونٹ بن جاتے ہیں۔'' اُس نے لکڑی کے بڑے پھاٹک کی زنجیر بجاتے ہوئے سوچا۔ وہ اس دہلیز تک آتو گیا تھا لیکن اُس کو پار کرنے کی، وہاں کی چھاؤں میں بیٹھنے کی اُس کو اجازت بالکل نہ تھی۔

''کس سے ملنا ہے جی؟'' ملازم نے باہر آکر پوچھا۔

''جج صاحب نے زبیدہ بی بی کو لینے بھیجا ہے۔ اندر جاکر اطلاع کردیں۔''

''آپ کا نام کیا ہے صاحب؟'' ملازم نے سوال کیا۔

دادی کے پہلے شوہر علوی تھے جج صاحب کے ساتھ اُن کے باپ کا نام لگتا تھا۔ جب وہ اس دنیا میں آیا تو باپ دادا کی شفقت سے محروم ہوچکا تھا اُس کو جج صاحب نے اپنا نام دیا تھا۔ یہ اُس پر اُن کا سب سے بڑا احسان تھا۔

''میرا نام قاسم علوی ہے!'' اُس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ملازم ایک دم چونکا۔

''جی میں اندر اطلاع کردیتا ہوں۔'' ملازم نے اندر کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

''کون ہے صادق علی؟'' ملک نواز نے کڑکتے لہجے میں پوچھا۔ اُن کی چھڑی کی ٹِک ٹِک اور آواز دونوں ایک ساتھ چاند میاں کے کانوں تک پہنچی تھیں۔

''جی وہ... قاسم علوی صاحب آئے ہیں شہر سے زبیدہ بی بی کو لینے۔'' ملازم نے اٹکتے ہوئے اطلاع دی۔

ملک نواز کی چھڑی پر گرفت ایک دم کمزور پڑ گئی۔

''اندر جاکر بڑی بی بی کو اطلاع دو کہ زبیدہ کو تیار کرکے فوراً بھیج دیں، میں زیادہ دیر تک اُس لڑکے کا وجود اپنے گھر کے باہر بھی برداشت نہیں کرسکتا۔'' ملک نواز نے اپنے کمزور لہجے پر قابو پاتے ہوئے اُسی گونج دار آواز میں کہا۔

چاند نے تھک کر جیپ کی سیٹ پر سر ٹکادیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ایسے ہی سلوک کی توقع رکھتا تھا۔ لیکن پھر بھی اُسے بے حد دُکھ ہورہا تھا۔

ملک نواز نے ملازم کے اندر جاتے ہی اِدھر اُدھر دیکھا پھر چوروں کی طرح آگے قدم بڑھائے۔ پھاٹک کے ادھ کھلے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔

''وہ کتنا تھکا ہوا تھا، گندمی رنگت گرمی کی حدت سے سرخ ہورہی تھی، وہ اپنی عمر سے زیادہ سنجیدہ لگ رہا تھا۔ نین ونقش میں وہ ملک نواز سے کس قدر ملتا تھا! وہ اُن کا خون تھا۔'' اُن کے دِل میں ہوک سی اُٹھی۔ دِل چاہا کہ بڑھ کر سینے سے لگالیں، ٹھنڈے کمرے میں بٹھائیں، میٹھا ٹھنڈا پانی پلائیں، ہر وہ پکوان پکوائیں، جو اُسے پسند ہو۔ وہ ایک قدم آگے بڑھے۔

''ملک صاحب آپ کو بڑی بی بی بُلا رہی ہیں۔'' پیچھے سے ملازم کی آواز نے قدم روک دیے اور اُن

کی جھوٹی انا کی دُنیا میں واپس انہیں کھینچ لیا۔

''اچھا تم چلو میں آ رہا ہوں!'' وہ ایک دم بے حد تھک سے گئے تھے انہوں نے مُڑ کر اُس پر ایک پیاسی نگاہ ڈالی، وہ ابھی تک اپنے آپ میں گم بیٹھا تھا۔

''صادق!'' انہوں نے کڑکتی آواز میں ملازم کو پکارا۔

''جاؤ اُسے ٹھنڈا شربت پلاؤ! ہمارے دروازے پر دشمن بھی آئے تو سوکھے مُنہ نہیں جاتا۔'' انہوں نے اُسے سناتے ہوئے کہا۔ چاند نے مُڑ کر دیکھا لیکن وہ اپنی سُنا کر اندر جا چکے تھے۔

''جی ملک جی!'' صادق ایک بار پھر اُلٹے قدموں مُڑا۔

چاند نے ایک افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ شربت کا گلاس تھام لیا۔ ٹھنڈے پانی میں شکر اور ستو گھولے گئے تھے۔ صادق اُسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا جو گلاس تھامے جانے کس سوچ میں گم تھا۔

''صاحب!'' صادق کی آواز پر وہ ایک دم چونک گیا۔

''پانی پی لو!''

''واپس لے جاؤ چاچا!'' چاند نے گلاس واپس کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن کیوں! اتنی دور سے آئے ہو، پیاس سے حال بُرا تو ہوگا؟'' صادق نے گلاس لینے کے لیے ہاتھ نہ بڑھایا۔

''لے لو چاچا! اگر پلانے والے کی آمادگی نہ ہو تو پینے والا پانی پی کر بھی پیاسا رہ جاتا ہے! پھر ایسے پانی کا کیا فائدہ؟'' چاند نے گلاس اُسے تھما دیا۔

اُسی پَل ملازمہ کے سہارے زبیدہ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ باہر آئی۔ چاند نے ایک دم آگے بڑھ کر اُسے تھام لیا اور بہت احتیاط سے گاڑی میں لا کر بٹھایا، جیسے وہ کانچ کی بنی ہو۔

''چلیں زبیدہ؟'' چاند نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہوں!'' زبیدہ نے نقاہت سے جواب دیا۔

گاڑی کی رفتار ذرا تیز ہوئی تو ہَوا کے گرم تھپیڑے چہرے پر پڑنے لگے۔ چاند نے ایک دم گاڑی روک دی، زبیدہ جو بے خبر سو رہی تھی ایک دم جاگ گئی۔

''کیا ہوا؟'' زبیدہ نے سرخ آنکھیں کھول کر پوچھا۔

''کچھ نہیں؟ گرمی زیادہ ہے، میں جیپ کی چھت بند کر رہا ہوں۔'' اوپن جیپ کو چاند نے دیکھتے ہی دیکھتے کوَر کرتے ہوئے کہا۔

زبیدہ نے اثبات میں سر ہلا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

پھر وہ ایک دم چونک گئی اُس کے نقاہت بھرے وجود میں ایک بجلی دوڑ گئی، وہ ڈیرے کے پاس امڑے تھے اور ابھی ابھی اُس کے سامنے سید سرفراز جیپ سے اُتر کر اندر گیا تھا۔

''چاند!'' زبیدہ نے سرسراتے لہجے میں اُسے پُکارا۔

''ہوں!'' چاند گاڑی اسٹارٹ کرنے کے لیے برابر میں آ بیٹھا۔

''مجھے ذرا کچھ دیر کے لیے اندر جانا ہے!'' زبیدہ کی ایک دم فرمائش پر چاند حیران ہوا۔

''یہاں کیا ہے؟'' چاند نے حیرت سے پوچھا۔

''میری دوست مریم یہاں آئی ہوئی ہے اور یہ گاڑی اُسی کی ہے میں جانے سے پہلے اُس سے ملنا اتی ہوں۔'' زبیدہ نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

چاند کچھ ہچکچایا۔ لیکن آج تک اُس نے زبیدہ کی کوئی بھی بات نہ ٹالی تھی۔

''لیکن میں تمہیں اکیلے کیسے جانے دوں؟ یہ جگہ بھی خاصی سنسان ہے!'' چاند نے اعتراض کیا۔

''پلیز چاند! بس پانچ منٹ میں واپس آجاؤں گی۔'' زبیدہ نے مزید پوچھنا اور رُکنا گوارا نہ کیا اور پ سے اُتر کر آگے بڑھ گئی۔

''زبیدہ رُکو میں ساتھ چلتا ہوں۔'' چاند نے جیپ کو لاک کرتے ہوئے اُسے آواز دی۔

''نہیں! تم یہاں رُکو! اور پلیز تم میرے پیچھے نہ آنا، میں پانچ منٹ میں واپس آجاؤں گی۔'' زبیدہ نے ایک دم چیخ کر کہا۔

زبیدہ کے لہجے اور چہرے پر اس قدر تناؤ تھا کہ چاند کے بڑھتے ہوئے قدم ایک دم سے رُک گئے۔

زبیدہ تقریباً بھاگتی ہوئی اندر گئی کچھ روز پہلے یہ جگہ اُسے خوابوں کی جگہ لگتی تھی، جہاں وہ اور اُس کا ابوں کا شہزادہ ملنے والے تھے۔ لیکن وہ خواب ایک دم ڈراؤنی تعبیر میں بدل جائیں۔ گے اُس نے سوچا ل نہ تھا۔ ایک پَل بس ایک پَل! اُس کمزور پَل جب اُس کے قدم ڈگمگا گئے تھے اور وہ سید سرفراز کی ہت درازی کو روک نہ سکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ سید سرفراز کا کمرا کون سا ہے اس لیے وہ دبے قدموں اسی وری بیڈروم کی جانب بڑھی، جہاں اس کا سب کچھ لٹ گیا تھا۔

اندر قہقہوں کی آواز آ رہی تھی اور ان میں ایک آواز سید سرفراز کی بھی تھی۔ اُس پَل اُس کا دھیان ہری آوازوں پر ہرگز نہیں گیا تھا وہ صرف سید سرفراز کی آواز کو سُن رہی تھی وہ صرف اُس سے بات کرنا اہتی تھی اُس نے کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھولا۔ اندر ایک دم سناٹا چھا گیا۔

سید سرفراز کے دو تین دوست شراب سے شغل کر رہے تھے۔ سید سرفراز کے ماتھے پر بَل ایک دم نمایاں اگئے۔

''اوہو! یار تم تو کہہ رہے تھے کہ آج لڑکی کا انتظام نہیں ہے! پھر یہ گوری گوری ملائم سی مکھن کی ڈلی ان ہے؟'' سید سرفراز کے اوباش دوستوں میں سے ایک نے اپنی گندی نگاہوں سے زبیدہ کا طواف رتے ہوئے کہا۔

زبیدہ کو اپنے حلیے اور اپنی پوزیشن کی پروا ہرگز نہ تھی۔ وہ اس پَل کچھ دیکھ اور سمجھ نہیں پا رہی تھی، اُس نگاہیں صرف سید سرفراز پر تھیں۔

''شاہ!'' زبیدہ نے اپنے سوکھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''تم یہاں کیوں آئی ہو؟ میں نے تمہیں بلایا تو نہیں تھا۔'' سید سرفراز نے دبے دبے لہجے میں کہا یہ ب بات تھی کہ اُس کا لہجہ چنگاریوں سے بھرا تھا۔ اُس کا بس چلتا تو زبیدہ کو نگاہوں سے بھسم کر دیتا۔

''شاہ! مجھے تم سے بات کرنی ہے!'' زبیدہ نے جلدی سے کہا۔

''کر لینا۔ کچھ باتیں ہم سے بھی ہو جائیں۔'' سید سرفراز کے دوستوں میں سے ایک آگے بڑھا۔

"چوہدری غضنفر!" سید سرفراز نے اشارے سے اُسے روکا۔

"کیا ہوا یار؟ ہم تو ہمیشہ مل بانٹ کر کھاتے ہیں۔" سید سرفراز کے دوست نے ہنستے ہوئے کہا۔

سید سرفراز کی نگاہوں میں کچھ ایسا تھا کہ وہ رُک گیا۔

"تم چلو باہر...!" سید سرفراز اُسے باہر دھکیلتے ہوئے لے آیا۔

"کیا بات کرنی ہے؟ اور یوں بنا بلائے مُنہ اُٹھا کر کیوں آ گئی ہو؟ یہاں طرح طرح کے لوگ آ ہیں۔" سید سرفراز پھنکار کر بولا۔ وہ اگر سید نوازش علی کے دوست کی بیٹی نہ ہوتی تو وہ کبھی لحاظ نہ کرتا۔

"شاہ!" زبیدہ کے لب لرزے۔

"اُس دن جو کچھ..." زبیدہ کے حلق میں لفظ اٹکنے لگے۔

سید سرفراز نے ماتھے پر بَل ڈال کر اُسے دیکھا۔

"میرا مطلب ہے جو کچھ ہمارے بیچ ہوا، وہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔" زبیدہ نے سوکھے لبو پھیرتے نگاہیں چُراتے ہوئے کہا۔

"تو تم یہاں یہ کہنے آئی ہو!" سید سرفراز نے بے پروائی سے کہا۔

زبیدہ نے زخمی نظروں سے اُسے دیکھا وہ کتنا بدلا بدلا لگ رہا تھا۔ یا وہ تھا ہی ایسا، وہ اُس کی اص نہ جان سکی تھی۔

"شاہ پلیز!"

"اُس دن میں نے کوئی زبردستی تو نہ کی تھی!" یہ سب کچھ سید سرفراز کہہ رہا تھا، جس کا پاگلوں انداز ہر بند توڑ گیا تھا۔

"شاہ! اَب ہمیں شادی کر لینی چاہیے!" زبیدہ نے ہانپتے ہوئے کہا۔ بے شک اُسے اتنا کہنے بے حد دشواری ہوئی تھی۔

"کیا کہا تم نے؟" سید سرفراز نے ایسے پوچھا، جیسے اُسے اس بات کی سمجھ نہ آئی ہو۔

"یہی کہ اَب ہمیں شادی کر لینی چاہیے۔!" زبیدہ نے منت بھرے انداز میں کہا۔

"شا... شادی۔" سید سرفراز کا قہقہہ بے ساختہ تھا جیسے اُس نے کوئی بہت بڑا لطیفہ سنا ہو۔

"شاہ! تم ایسے، کیسے ہنس رہے ہو؟ جب ایک لڑکی کسی کو اپنا سب کچھ سونپ دیتی ہے تو ساری ع اُس کی رہتی ہے۔" زبیدہ نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

"زبیدہ! تم تو پڑھی لکھی شہر کی لڑکی ہو، تم نہیں جانتیں کہ ہم لوگ خاندان سے باہر شادی کرتے۔" سید سرفراز نے زبیدہ سے خاصا دِل رکھنے والا بہانہ بنایا ورنہ اُس کا تو دِل کر رہا تھا کہ صاف اُس سے یہاں سے نکل جانے کو کہے۔

"لیکن ... پھر تم نے میرے ساتھ وہ سب کچھ...؟" زبیدہ کے حلق میں آنسوؤں کے گولے لگے۔

"وہ سب کچھ تمہاری مرضی سے ہوا تھا!" سید سرفراز نے سفاکی سے کہا۔

"شاہ! تم میری محبت کا یوں مذاق نہیں اُڑا سکتے؟" زبیدہ چلائی۔

"چلاؤ نہیں، اور یہاں سے چلی جاؤ۔ اور ہاں تمہارے لیے اچھا ہوگا کہ تم میرے اور اپنے بیچ اُس اد کو بھول جاؤ۔" سید سرفراز نے ہر بات سے مکرتے ہوئے کہا۔

"سید سرفراز! تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے؟" زبیدہ نے اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا پھر وہ آگے بڑھ کر اُسے جھنجوڑنے لگی۔

"تمہارے لیے اچھا یہ ہی ہوگا، چپ چاپ ہر بات کو پی جاؤ۔" سید سرفراز نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تم برابر کے شریک ہو! اور میں سب کو بتا دوں گی۔" زبیدہ نے دھمکی دی۔

"میرا کیا جائے گا؟ بدنامی تمہاری ہی ہوگی اور میں اگر نہ مانوں تو تم کیسے ثابت کرو گی۔ میں تمہارے اور اپنے بابا کی دوستی کا لحاظ کر رہا ہوں، ورنہ میں ہر لڑکی پر یوں اپنا وقت برباد نہیں کرتا۔" سید سرفراز نے واپس مڑتے ہوئے کہا۔

"شاہ! میری بات سنو!" زبیدہ اُس کی جانب لپکی۔

"زبیدہ!" سید سرفراز دھاڑا۔

"چلی جاؤ یہاں سے..." اُس نے اپنا بازو چھڑا کر زبیدہ کو دھکا دیا۔

زبیدہ لڑکھڑاتے ہوئے دور جا گری لیکن زمین پر گرنے سے پہلے دو ہاتھوں نے اُسے تھام لیا۔ زبیدہ نے آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے سر اُوپر اُٹھا کر دیکھا۔ وہ چاند تھا۔ بے حد سنجیدہ!

چاند نے بڑی کڑی نظروں سے سید سرفراز اور زبیدہ کو دیکھا۔

"چاند! وہ..." زبیدہ سے مزید کوئی بات نہ ہو رہی تھی۔

"چلو زبیدہ..." چاند نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"چاند مجھے بات کرنے دو!" زبیدہ منمنائی۔

"چلو" چاند نے اُس کے بازو کو سختی سے تھام کر باہر کا رُخ کیا۔

زبیدہ بے جان قدموں سے لڑھکتی ہوئی اُس کے ساتھ جیپ تک آئی اور بے دم ہو کر سیٹ پر آ پڑی۔ چاند نے جس تیز رفتار سے گاڑی چلانی شروع کی تو گھر آ کر بریک لگایا۔ سارے راستے وہ مسلسل گاڑی چلاتے آیا تھا۔ ہونٹ بھینچے، ماتھے پر گہری سوچ کی لکیریں لیے وہ سامنے ہی دیکھتا آیا تھا۔ اُس نے ایک پَل کو بھی مُڑ کر زبیدہ کو نہ دیکھا نہ اُس سے کوئی بات کی تھی۔ زبیدہ کچھ دیر تو ہوش میں رہی پھر بخار کی شدت سے بے سُدھ ہو گئی۔ لیکن چاند نے مُڑ کر اُسے نہ دیکھا۔

گاڑی پارک کر کے اُس نے باہر آتی ملازمہ کو زبیدہ کو اندر لے جانے کو کہا۔ جاتے جاتے ایک نگاہِ غلط اُس نے زبیدہ پر ڈالی۔ سبز کپڑوں میں اُس کا چہرہ ہلدی کی طرح پیلا ہو کر بے حد نمایاں ہو رہا تھا۔

"زبیدہ! تم سے میری محبت اس قدر پاکیزہ تھی! تم خود جس قدر معصوم اور پاکیزہ تھیں میں کیسے مان وں کہ جس لڑکی کو میں بچپن سے پیار کرتا آیا وہ..." وہ سر جھٹکتا تقریباً بھاگتا ہوا اپنے کمرے میں آیا۔ س کا سارا وجود جل رہا تھا وہ بے حد سلگ رہا تھا اُس نے باتھ روم میں گھس کر شاور کھول دیا کپڑوں سمیت جانے وہ کتنی دیر بھیگتا رہا۔ آخر تھک ہار کر وہ فرش پر بیٹھ گیا۔

"کیوں؟ کیوں خوشیاں مجھے راس نہیں آتیں، کیوں رشتے مجھے راس نہیں آتے؟ کیوں میرا ہر راہ بننے سے پہلے ہی بگڑ جاتا ہے؟" چاند نے پاس پڑا جوتا شیشے پر دے مارا۔ باتھ روم کا شیشہ چکنا چور ہو گیا بالکل اُس کے دِل کی طرح!

اور پہلی بار چاند زندگی کے اِس مذاق پر دھاڑیں مار کر رو دیا۔

❖❖○❖❖

"وے جورے جا، جا کر میرے لال کو لے آ!" جورے کی بیوی کا رو رو کر گلا خشک ہو گیا تھا۔ جورا سر جھکائے چپ چاپ یوں بیٹھا تھا، جیسے وہ بے جان بُت ہو۔

"وے جورے! تو بولتا کیوں نہیں؟ جورے!" جورے کی بیوی بین کرتے کرتے ادھ موئی ہو رہی تھی۔

"ایک بوٹی، صرف ایک بوٹی میرے بچے نے کھائی تھی اتنے سالوں سے ایک اوجڑی تک ہم نے نہ پکائی تھی چھ مہینے سے میرا بچہ ایک بوٹی صرف ایک بوٹی مانگ رہا تھا۔ ہائے میں کرموں جلی اِن ہاتھوں سے میں نے اُسے موت پکا کر دی!" جورے کی بیوی نے زور سے ہاتھ دیوار پر دے مارے۔

"میرا بچہ! میرا لال! ہائے..." وہ منہ اونچا کر کے بچوں کی طرح رو رہی تھی۔

"میرا بچہ!

"وے جورے تو بولتا کیوں نہیں، ہمارا بچہ انسان کا بچہ تھا! کیا انسان کا بچہ کتوں سے بھی گیا گزرا تھا؟ ہائے اُن کتوں کے آگے میرے بچے کو ڈال دیا! میرا بچہ!" وہ پھر منہ اونچا کر کے رونے لگی۔

"ہم تو کتوں سے بھی کم تر ہیں۔ کاش ہم کتے ہی ہوتے، کوئی ہمارے بچے کو یوں نہ مارتا!" جورے کی ماں ہذیان بکنے لگی۔

جورے نے ایک دم سر اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ کوئی بارہ گھنٹے بعد اُس نے اپنی پوزیشن بدلی تھی۔

کاش ہم کتے ہی ہوتے!

"ہائے ربّا! میرا لال! تو مجھے بھی اُٹھا لے! بڑا درد ہے، نہیں برداشت ہوتا یہ درد۔" جورے کی بیوی نے پاس پڑی کچی ہانڈی اُٹھا کر دیوار پر دے ماری۔

"بول جورے بول! تجھے میرے سوالوں کا جواب دینا ہو گا۔ تو اگر آج نہ بولا تو قیامت کے دِن تو میرا جواب دہ ہو گا۔ بول کہاں ہے میرا پتر؟ کہاں ہے وہ؟"

"ارے ظالم اُس کی تو ہڈیاں تک وہ کتے کھا گئے۔ ہائے میں مر کیوں نہیں جاتی! بول جورے!" جورے کی بیوی نے اُسے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

"بھوں، بھاؤں، بھوں!" جورا ایک دم بھونکنے لگا۔

"جورے؟" جورے کی بیوی نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

"بھوں۔ بھوں!" جورا کتوں کی طرح بھونکتے بھونکتے غرّانے لگا۔ پھر کتوں کی طرح منہ اونچا کر کے کتوں کی آواز میں رونے لگا، جورے کی بیوی کا سانس سینے میں ایک دم اٹک گیا۔

جورا اپنے حواس کھو چکا تھا لیکن اُس کا وجود بین کر رہا تھا، احتجاج کر رہا تھا، انصاف مانگ رہا تھا۔ ظالم کی رسی کتنی ہی کیوں نہ دراز ہو، اِک دِن پھندا اُس کے گلے میں ضرور پھنستا ہے۔

"تیرا بیڑا غرق ہو سید نوازش علی! تو نے جو آگ اِس ماں کے دِل میں لگائی ہے وہ آگ تیری نسلوں کو لگے، تجھے خوشیاں کبھی راس نہ آئیں، تیرے گھر بھی آگ لگے، تو بھی بیٹوں کا درد اُٹھائے!" جورے کی بیوی منہ اُٹھائے، سسکتے ہوئے سید نوازش کو بد دُعائیں دے رہی تھی، جب کہ جورا منہ اوپر اُٹھائے کتوں کی طرح رو رہا تھا، بلک رہا تھا۔ آج ایک انسان نے اپنی پہچان کھو دی تھی اور اللہ کا عذاب کسی لاوے کی طرح سید نوازش علی کا منتظر تھا۔

❖❖○❖❖

"کیا ہوا شاہ صاحب؟" زلیخا بی بی نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ ابھی ابھی ملازمہ انہیں سید نوازش علی کا بلاوا دے کر گئی تھی۔

"وہ..." سید نوازش علی جو بے چینی سے کمرے میں چکر لگا رہے تھے ایک دم رُک گئے۔

"وہ سید عاشق علی کی طبیعت انگلینڈ میں خراب ہو گئی ہے، ہمارے شہر والے بنگلے میں اُس کا فون آیا تھا شہر سے بندہ ابھی خبر لے کر آیا ہے۔"

"پھر؟" زلیخا بی بی نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"اُس کا کہنا ہے کہ عبداللہ اور عائشہ کا فوراً نکاح کر دیں۔" سید نوازش علی نے وہ اہم اطلاع اُن کو دی جس کو بتانے کے بعد انہوں نے زلیخا بی بی کو بلایا تھا۔

"کب تک یہ کام کرنے کا ارادہ ہے؟" زلیخا بی بی نے پوچھا۔ وہ جانتی تھی کہ سید نوازش علی اُسے صرف اطلاع دے رہے ہیں۔

"آج شام ہی نکاح ہو گا۔ تم کوئی رونق میلا کرنا چاہتی ہو تو کر لو۔"

"ہاں! لڑکیوں کو شگن میں پچیس پچیس تولے سونے کا سیٹ ہماری طرف سے دینا، آخر اُن کے ویر کی پہلی خوشی ہے۔" سید نوازش علی نے خوشی سے کہا۔

"تم ابھی شہر چلی جاؤ، دو گھنٹے میں بچیوں کے اچھے سے کپڑے لے آؤ۔ ہاں عائشہ کے لیے اچھا سا جوڑا لانا تمہیں جو کچھ کرنا ہے اِن چند گھنٹوں میں ہی کرنا ہے۔" سید نوازش علی نے ہتھیلی پر سرسوں جماتے ہوئے کہا۔

"شاہ جی! وقت اتنا کم ہے سب کچھ کیسے ہو گا۔ اگر کل شام کا وقت رکھ لیں تو!" زلیخا بی بی جانتی تھیں کہ انہیں رائے دینے کا حق نہیں پھر بھی وہ کہے بنا نہ رہ سکیں۔

"نہیں! ہم نے جو کہا ہے ویسے ہی ہو گا۔" سید نوازش نے اٹل لہجے میں کہا۔

زلیخا بی بی نے گہری سانس لی، اَب اُن کے پاس جادو کی چھڑی تو تھی نہیں جو اتنے کم وقت میں یہ سب کچھ ہو سکتا۔ پھر بھی وہ اچھا جی کہہ کر باہر آ گئیں۔

عائشہ کے لیے انہوں نے سُرخ رنگ کا وہ لباس نکالنے کا سوچا جو انہوں نے بہت چاؤ سے سدرہ کے

لیے بنوایا تھا۔

''اللہ کرے میری سدرہ، مریم پر بھی ایسا خیر کا وقت آئے تو میں اِس سے بھی پیارا جوڑا تیار کرواؤں گی کہ دنیا دیکھے گی۔'' وہ خود کو تسلیاں دیتی ہوئی کپڑے نکال رہی تھیں۔

''امّاں جان آپ نے ہمیں بلایا؟'' مریم، سدرہ کے ساتھ اُن کے کمرے میں داخل ہوئی۔

زلیخا بی بی اپنے سامنے اٹیچی کیس کھولے بیٹھی تھیں۔ پاس ہی اُن کے زیورات کے ڈبے پڑے تھے۔

''آؤ لڑکیوں! تمہارا انتظار تھا۔'' ریحانہ بی بی جو ایزی چیئر پر بیٹھی جھول رہی تھیں انہوں نے جواب دیا، ریحانہ بی بی کا رُواں رُواں سلگ رہا تھا ابھی سید سرفراز کو خبر نہ ہوئی تھی، ابھی تو اُس کی طوفانی طبیعت کا سامنا باقی تھا۔ ریحانہ بی بی نے لاکھ چاہا کہ یہ رشتہ ٹوٹ جائے لیکن سید نوازش علی کے یوں اچانک فیصلہ لینے پر وہ کچھ بھی نہ کرسکیں۔ اَب اُن کی سازشی طبیعت مختلف پلان سوچ رہی تھی۔ جب وہ کچھ نہ کر پاتیں تو اپنی باتوں سے سامنے والے کو اِس قدر اذیت دیتیں کہ سامنے والا ہمیشہ تڑپتا رہتا تھا۔

''بڑی امی خیریت ہے کس بات کی تیاری ہے؟'' مریم نے ریحانہ بی بی سے پوچھا، جو چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ لیے بیٹھی تھیں۔

''تمہارے بھائی کی شادی ہورہی ہے!'' ریحانہ بی بی نے جواب مریم کو دیا تھا لیکن وہ چہرہ سدرہ کا دیکھ رہی تھیں۔ سدرہ کا چہرہ ایک دم فق ہوگیا۔ شادی بیاہ، ڈھولک کی آواز سے سدرہ کی طبیعت گھبرانے لگتی تھی۔

''سدرہ بیٹا اِدھر بیٹھو!'' زلیخا بی بی نے اُسے منت بھرے لہجے میں اپنی جانب پکارا۔

سدرہ چپ چاپ اُن کے پاس آ بیٹھی۔

''دیکھو، یہ کپڑے میں نے تم دونوں کے لیے نکالے ہیں۔ اگر تم کو پسند نہیں ہیں تو بتادو پھر میں تم جا کر خرید لاؤں گی۔ شام میں نکاح ہے اور وقت بہت تھوڑا ہے۔'' زلیخا بی بی جلدی جلدی کہتے مسلسل سدرہ کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

سدرہ بالکل گم صم تھی، جیسے وہ اپنے آپ میں نہ ہو۔ زلیخا بی بی کا دِل گھبرانے لگا اُن کے لیے تو بیٹیاں دونوں برابر تھے۔

''بیٹا! میں پوچھ رہی تھی کہ کون سے کپڑے پسند ہیں۔'' زلیخا بی بی نے ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا، کیوں کہ وہ سدرہ کی آنکھوں میں عجیب طرح کی وحشت دیکھ رہی تھیں۔

''کپڑے!''

''امّاں... یہ کپڑے نہیں، یہ تو خون ہے خون! اس میں فاطمہ پھوپو کا خون لگا ہوا ہے۔'' سدرہ نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''بیٹا... یہ'' زلیخا بی بی کہتے کہتے رُک گئیں کیوں کہ سدرہ قہقہے لگا کر ہنسنے لگی تھی۔

''امّاں میرے بھائی کی شادی ہے! میرے بھائی کی شادی!'' سدرہ ہنستے ہنستے رونے لگی۔

اُسی پل عائشہ بھی اندر داخل ہوئی۔ اُسے بھی زلیخا بی بی نے کپڑے اور زیور پسند کرنے کے لیے بلایا تھا۔

''عائشہ!'' سدرہ اُس کی جانب متوجہ ہوئی۔

''عائشہ تیری شادی ہورہی ہے مبارک ہو، تجھے مبارک ہو! اَب تیرے ہاتھوں میں مہندی لگے گی، تو دلہن بنے گی۔ تیرے لیے اِس چار دیواری کا قید خانہ، نہ ہوگا۔ مبارک ہو تمہیں عائشہ!'' سدرہ نے عائشہ کو تھام کر کہا۔

''تم اَب مکمل ہوجاؤ گی! میری یا مریم کی طرح ادھوری عورت نہ کہلاؤ گی۔ تمہارے بھی پیارے پیارے بچے ہوں گے، تمہیں کوئی چاہنے والا ہوگا۔ کوئی نہ کوئی قدر دان ہوگا لیکن... لیکن میں تمہیں دُعا دوں گی کہ تمہاری کوئی بیٹی نہ ہو، تمہیں بیٹی کا درد نہ ملے۔'' سدرہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

عائشہ تو ایک دم سہم گئی، اُس سے تو کچھ بولا ہی نہ گیا۔

''آپی! تم بھائی کی شادی پر خوش نہیں ہو؟'' مریم نے حیرت سے پوچھا۔

''میں خوش ہوں، بہت خوش ہوں!'' سدرہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

''لیکن مریم! کیا خوشیاں صرف بھائیوں کے لیے ضروری ہیں؟''

''بے ادب لڑکی! تم میں رتی بھر حیا نہیں؟ تمہیں ہر وقت اپنی شادی کی پڑی رہتی ہے۔ شادی، شادی۔''

''کیا بات ہے سدرہ تم سے اپنی جوانی سنبھالی نہیں جارہی؟'' ریحانہ بی بی نے ایک دم غصے سے اٹھتے ہوئے اُس کے پاس آ کر کہا۔

''یہ آپ کس طرح کی باتیں کررہی ہیں؟'' زلیخا بی بی نے تڑپ کر ریحانہ بی بی سے کہا۔

''ٹھیک کہہ رہی ہوں زلیخا، اپنی بیٹی اور اُس کے جذبات کو سنبھالو، ایسا نہ ہو کل کو یہ کوئی گل کھلائے اور میرے بھائیوں کے ہاتھ اپنے گندے خون سے رنگ دے۔ تم اِس کو روکو۔'' ریحانہ بی بی نے زلیخا بی بی سے غصے سے کہا۔

''آپ میری بیٹیوں کو گندا خون کہہ رہی ہیں؟'' زلیخا بی بی کی آواز بھی اِس بار بلند ہوگئی۔

''جو بیٹیاں اِس طرح کی حرکت کریں اُن کو یہی کہا جاتا ہے یہاں؟'' ریحانہ بی بی نے بے خوف انداز میں کہا۔

زلیخا بی بی تو تھک کر یوں بیٹھ گئیں، جیسے اَب دوبارہ کبھی اُٹھ نہ سکیں گی۔ بیٹیاں اُن کی کمزوری بن گئی تھیں۔ زلیخا بی بی کو یوں ہاتھ پاؤں چھوڑتے دیکھ کر عائشہ اور مریم دونوں فوراً اُن کی جانب بڑھیں۔

''تائی جان! آپ کو پانی دوں؟'' عائشہ نے اُن کے ٹھنڈے ہاتھ مسلتے ہوئے پوچھا۔ سدرہ بھی کچھ حواسوں میں آئی تھی۔

''امّاں جان! معاف کردیں میری وجہ سے آپ پریشان ہوگئیں۔'' سدرہ کو اچانک اپنی بے بسی پر بے حد شرمندگی ہوئی، پہلے کبھی اُس کے جذبات اِس قدر بے قابو نہ ہوئے تھے لیکن جب سے وہ فیصل کو چاہنے لگی تھی اُس کے تصوّر کا ہیولا بھرپور شکل کے ساتھ اُس کے سامنے آ گیا تھا۔ ایسے میں جب زندگی کوئی نوید سناتی نظر نہ آتی تو وہ بے حد گھٹن محسوس کرتی اور بے اختیار ایک وحشت سی اُس پر طاری ہوجاتی، اُس وحشت میں ہی وہ اول فول بولنے لگتی تھی۔

"بیٹا! کون ماں ہوگی، جو اپنی اولاد کی خوشیاں نہ چاہے گی؟ تم میری جانب سے کبھی بدگمان نہ ہو تمہاری ماں خود بڑی بے بس ہے!" زلیخا بی بی نے ہانپتے ہوئے سدرہ سے کہا۔

"لیکن اِس کمزور ماں کی دُعائیں وہ رب سوہنا ضرور سنے گا۔" زلیخا بی بی نے دھیرے سے کہا۔

"انشاءاللہ!" عائشہ نے با آواز بلند کہا۔

"ہرگز نہیں! ریحانہ بی بی نے یہ دل ہی دل میں کہا اور فوراً کمرے سے باہر نکل گئیں۔ وہ سب اِس خوشی کے موقع پر دل آزاری چاہتی تھیں اُن کا کام ہوگیا تھا۔ اِن سب کو دُکھی کرکے اُن کا دل ٹھنڈا ہوگیا تھا۔

"ہونہہ! تم لوگوں کو کبھی خوشیاں راس نہ آئیں گی!" ریحانہ بی بی نے تنفر سے سوچا۔ ابھی وہ راہ میں تھیں کہ سید سرفراز غصّے سے پھنکارتا اُن کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"امّاں جان! میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ عائشہ کی شادی آپ کو مجھ سے کروانی ہے!" سید سرفراز نے حسبِ معمول اپنی ضد دُہرائی۔

"پاگل ہوگئے ہو لڑکے!" ریحانہ بی بی نے زِچ ہوکر کہا۔

"اچھا اندر چلو! اندر چل کر بات کرتے ہیں!" ریحانہ بی بی نے یوں سرِ راہ بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔

"امّاں جان! آپ نے آخر کچھ کہا کیوں نہیں؟" سید سرفراز نے ناراضی سے کہا۔

"کرنے کے لیے مناسب وقت اور موقعے کی تلاش تھی اور تمہارے بابا کے اچانک فیصلے نے بات کرنے ہی نہ دیا۔" ریحانہ بی بی نے اپنی مجبوری بتائی۔

"ٹھیک ہے پھر مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا!" سید سرفراز پھنکارتے ہوئے ایک دم باہر نکل گیا۔

"لیکن تم کروگے کیا؟" ریحانہ بی بی نے پریشان ہوکر پیچھے سے آواز دی۔

"جو میرا دِل چاہے گا!" سید سرفراز کہہ کر رُکا نہیں باہر نکل گیا۔ ریحانہ بی بی نے دہل کر دِل پر ہاتھ رکھا۔

"اِس لڑکے کے تیور اچھے نہیں لگتے!" وہ خود سے بولیں۔

❖❖○❖❖

"مجھے بے حد خوشی ہے کہ ہمارے گاؤں میں کوئی پڑھا لکھا نوجوان بھی ہے۔" سید عبداللہ نے فیصل سے کہا۔

اُس روز فیصل کو سید نوازش علی سے بچانے والا عبداللہ ہی تھا۔ پھر عبداللہ نے خود فیصل کو بلایا اُسے پڑھا لکھا نوجوان بے حد پسند تھا۔ دو تین ملاقاتوں میں وہ فیصل سے بے حد بے تکلف ہوگیا تھا اور اُن میں دوستی ہوگئی تھی اور سید عبداللہ کو فیصل سے خاص طرح کا لگاؤ ہوگیا تھا۔

"لیکن آپ کے والد صاحب کو دیکھ کر نہیں لگتا کہ انہیں اِس طرح کی خوشی محسوس ہوئی ہو۔" فیصل نہ چاہتے ہوئے بھی لہجہ تلخ ہوگیا۔

"کم آن یار! اُن کے خیالات سے تو سب واقف ہیں۔ ویسے از نائس مین!" سید عبداللہ نے اپنے باپ کا دفاع کرتے ہوئے کہا۔

"تو اپنے نائس باپ سے ہسپتال یا چھوٹی سی ڈسپنسری کی اجازت تو لے کر دکھائیں۔" فیصل نے دل ہی دل میں کہا۔

"میرا دِل چاہتا ہے کہ اپنے گاؤں میں بھی میڈیکل ایڈ کی سہولت میسّر ہو۔" سید عبداللہ نے جھاڑیوں کو ایک بڑی سی چھڑی سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ وہ اِس وقت واک کرتے کرتے گاؤں سے دُور نکل آئے تھے۔ فیصل کے دِل میں جو کچھ دیر پہلے سید عبداللہ کے لیے بدگمانی آگئی تھی، اُسے اُس پر شرمندگی ہوئی، سید عبداللہ بے شک دل کا بہت اچھا انسان تھا۔

"تم اِس سلسلے میں کیا کہتے ہو؟" سید عبداللہ نے اُس سے اُس کی دلی رائے مانگی۔

"میری تو خود دلی آرزو ہے کہ میں یہاں پریکٹس کروں۔" فیصل نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے تم رف سا پلان بنا کر مجھے دو، میں اپنی زمین پر ایک چھوٹا سا ہسپتال بنانا چاہتا ہوں۔" سید عبداللہ نے فوراً کہا۔

"مجھے بے حد خوشی ہے کہ آپ جیسا انسان ہمارے گاؤں میں موجود ہے!" فیصل نے گرم جوشی سے اُس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

سید عبداللہ بھی خوش دِلی سے مسکرایا۔

"تم مجھے ایک دم اپنے سے لگے ہو، میری خواہش ہے کہ تم ہمیشہ میرے اچھے دوستوں میں شامل رہو۔" سید عبداللہ نے اپنی دِل کی بات واضح کی۔

"انشاءاللہ!" فیصل نے کہا۔

اُسی پَل ایک سنسناتی ہوئی گولی سید عبداللہ کے بازو کو چیرتی ہوئی گئی۔ سید عبداللہ تڑپ کر نیچے گرا۔

"عبداللہ!" فیصل نے چیخ کر اُسے پکارا۔

پھر اُس پر مسلسل فائرنگ شروع ہوگئی۔ فیصل، عبداللہ کی ڈھال بن کر اُسے بچاتا ہوا دُور لے آیا پھر ایک بڑے سے پتھر کی اوٹ میں ہوکر اُس نے سید عبداللہ کو لٹادیا۔ حملہ آور منہ پر کپڑا باندھے شکاری کتوں کی طرح اُن کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔

"یار سلطان! میں نے بڑا تاک کر عبداللہ شاہ کا نشانہ لیا تھا، اُس کا بچنا مشکل ہے! تم بے فکر ہوکر لو۔" اُن میں سے ایک آدمی نے کہا۔

سید عبداللہ کی درد سے چیخیں نکل رہی تھیں، جنہیں فیصل کے ہاتھ نے دبا کر رکھا تھا۔

"لیکن یار! شاہ صاحب کا حکم ہے کہ سید عبداللہ بچ نہ پائے۔" دوسرے نے کہا۔

"اوئے میرا نشانہ بڑا ظالم ہے۔" دوسرے نے اکڑ کر کہا۔

"لیکن وہ دونوں گئے کہاں؟" پہلے نے سوال کیا۔

ابھی وہ سوال کر ہی رہے تھے کہ سامنے سے دو جیپیں آتی نظر آئیں، جو حویلی ہی کی تھیں۔ انہوں نے اِس سے بھاگنا بہتر سمجھا۔

فیصل نے اُن کو بھاگتے دیکھ کر فوراً سید عبداللہ کو کندھوں پر اُٹھایا اور راستے میں آ کھڑا ہوا۔ اُسے فوراً سید عبداللہ کو ہسپتال پہنچانا تھا۔ جیپیں اُن کے پاس آ رُکیں۔

''اوئے جوان! کون ہو تم؟'' جیپ سے ایک آدمی نے اُتر کر پوچھا اور پھر اُس کا سوال منہ میں ہی رہ گیا۔ سید عبداللہ خون میں لت پت سامنے تھا۔

''سائیں!'' آدمی نے گھبرا کر سید عبداللہ کو دیکھا اور جیپ کی جانب بڑھ گیا۔

''کیا ہوا رمضان؟'' جیپ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی زلیخا بی بی اور سدرہ بی بی جو شہر جا رہی تھیں، انہوں نے پوچھا۔

''بی بی جی! وہاں تو سید عبداللہ زخمی حالت میں راستے میں پڑے ہوئے ہیں۔'' رمضان نے گھبرا کر کہا۔

''میرے اللہ! زلیخا بی بی گھبرا کر باہر نکل آئیں پیچھے ہی سدرہ بھی گھبرا کر چلی آئی۔ دونوں نے بڑی بڑی چادروں میں نقاب کر رکھے تھے۔

''میرا بچہ! اِسے کیا ہوا؟'' زلیخا بی بی سید عبداللہ کو خون میں لت پت دیکھ کر رونے لگیں۔

''انہیں فوراً ہسپتال لے جانے کی ضرورت ہے ورنہ زیادہ خون بہنے سے اِن کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔'' فیصل نے نگاہ اُٹھا کر کہا اور پھر ٹھٹک کر رہ گیا، جسے وہ کتنے دنوں سے تصور میں سوچتا رہا تھا بے شک وہ ہی لڑکی اُس کے سامنے تھی، وہ اُن خوب صورت پیروں کو نہیں بھول سکا تھا، اُس کی مخصوص خوشبو کو نہیں بھول سکتا تھا۔

''موتیا!'' اُس نے زیرِ لب دُہرایا۔

سدرہ بھی سامنے فیصل کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ بس ایک پَل کو دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں پھر فیصل کا دھیان فوراً سید عبداللہ کی جانب مڑ گیا۔

''مہربانی کر کے جلدی سے انہیں اُٹھا کر گاڑی میں ڈالیں۔'' فیصل نے رمضان اور دوسرے آدمی کی مدد سے سید عبداللہ کو گاڑی میں لا کر لٹایا۔

''شہر جانے میں دو ڈھائی گھنٹے تو لگیں گے لیکن تب تک خون زیادہ بہہ جائے گا۔ آپ میرے گھر رُکیں پہلے میں اِن کو کچھ فرسٹ ایڈ دے دوں۔'' فیصل نے اُن لوگوں سے کہا۔

''جلدی کرو بیٹا! میرے بچے کا خون بہت بہہ رہا ہے۔'' زلیخا بی بی نے کہا۔

زلیخا بی بی، سدرہ اور سید عبداللہ تینوں کو ایک ہی جیپ میں لا کر بٹھایا گیا تھا۔ زلیخا بی بی کو حکم تھا کہ سدرہ یا مریم اکیلے سفر ہرگز نہیں کریں گی۔ جگہ تنگ ہو گئی تھی لیکن مجبوری تھی آپ پلیز جگہ دیں میں اِن کا خون روکنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' فیصل نے آگے بڑھ کر کہا۔

''بیٹا میں اپنے بچے کے ساتھ خود رہنا چاہتی ہوں اور بیٹی کو دوسری گاڑی میں اکیلے بٹھانے کا حکم نہیں ہے تم بھی اِدھر آ جاؤ۔'' یہ سیٹیں آمنے سامنے تھیں۔ فیصل اندر آ کر بیٹھا تو رمضان نے پیچھے کا دروازہ بند کر دیا جس سے اندر روشنی ایک دم کم ہو گئی۔ سید نواز علی نے گھر کی عورتوں کے سفر کے لیے خاص طور پر گاڑی میں پردے لگوا رکھے تھے ایسے میں اندر بیٹھنے والا باہر نہ دیکھ سکتا تھا اور نہ ہی باہر والے کو اندر

انسان کا پتا چلتا تھا۔

فیصل کے گھٹنے مسلسل سدرہ سے مَس کر رہے تھے۔ سدرہ کے اندر برقی رو دوڑنے لگی تھی کچھ بھائی کی وجہ سے وہ پریشان تھی۔ اُس پر فیصل کی موجودگی اور اُس کا ہلکا سا لمس اُسے بوکھلا گیا تھا۔

فیصل کے لیے کسی کا قرب نئی بات نہ تھی لیکن وہ لڑکی اُس کے خوابوں کی لڑکی تھی، جو بے حد اہم تھی مگر اس کا ذہن مسلسل سید عبداللہ میں اُلجھا ہوا تھا، ایسے میں اُس کی مکمل توجہ سید عبداللہ پر تھی۔ فیصل نے لڑکی کا ایک پردہ کھینچ دیا تھا۔

''آپ کے پاس کوئی کپڑا ہوگا۔''

''یہ رومال کام آئے گا؟'' سدرہ نے پرس سے رومال نکال کر پوچھا۔

''یہ تو بہت چھوٹا ہے!'' فیصل نے رومال ہاتھ میں پکڑ کر کہا۔

''بیٹا! تم میرا یہ دوپٹا استعمال کر لو، میں نے چادر تو اوڑھ رکھی ہے۔'' زلیخا بی بی نے اپنے گلے کا دوپٹا نکال کر دیا۔

فیصل نے اُن کی نگاہ بچا کر رومال اپنی جیب میں ڈال لیا اور دوپٹے سے سید عبداللہ کا بہتا ہوا خون روکنے کی کوشش کرنے لگا۔

''سائیں تمہارا گھر یہ ہی ہے نا؟'' ڈرائیور نے گاڑی فیصل کے گھر کے سامنے روک کر پوچھا۔

''ہاں!'' فیصل تیزی سے گاڑی سے اُترا۔

''کون ہیں یہ لوگ؟'' فیصل کی ماں سوال کرتے کرتے رُک گئی، پیچھے کھڑی گاڑیوں کو وہ پہچانتی تھی اس لیے اُس نے دونوں نقاب پوش عورتوں کو اندر آنے کو راستا دیا۔

''اماں جان! یہ سید عبداللہ کی امی ہیں، سید عبداللہ پر کسی نے حملہ کیا ہے گولی لگنے سے بہت خون بہہ گیا ہے۔'' فیصل نے رمضان کی مدد سے سید عبداللہ کو اندر لٹایا اور اپنا میڈیکل باکس نکال کر سید عبداللہ کو فرسٹ ایڈ دینے لگا۔

زلیخا بی بی اور سدرہ جب فیصل کی ماں کے ساتھ اندر داخل ہوئیں تو دونوں ملازم احتراماً باہر نکل گئے۔

سدرہ غور سے فیصل کے تیزی سے چلتے ہاتھ دیکھ رہی تھی۔ عجیب بات تھی اُسے بھائی کی پریشانی بالکل تھی جیسے فیصل کی موجودگی پر اُسے بے حد حوصلہ تھا کہ وہ سب کچھ سنبھال لے گا۔ ابھی ابھی اُس نے اُن کو بتایا تھا کہ وہ ڈاکٹر ہے یہ خبر سدرہ کے لیے بے حد خوش کن تھی۔ فیصل نے سید عبداللہ کو پین کلر انجکشن لگایا اور پھر میڈیکل باکس بند کر کے گہری سانس لی۔

''میں نے زخم چیک کیا ہے گولی بازو اور کندھے دونوں کو چھو کر گزر گئی ہے، خون بند ہو گیا ہے میں نے انجکشن بھی لگا دیا ہے اَب اِن کو ہسپتال لے جانے کی ضرورت تو نہیں ہے اگر آپ اپنی تسلی کرنا چاہیں تو اِن کو شہر لے جائیں۔'' فیصل نے اپنے ہاتھوں سے دستانے اُتارتے ہوئے اُن سے کہا۔

''اللہ تیرا شکر ہے!'' زلیخا بی بی نے بے اختیار اللہ کا شکر ادا کیا۔

''بی بی جی! آپ یہاں بیٹھ جاؤ۔'' فیصل کی ماں نے انہیں پاس بچھی چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ دونوں وہاں بیٹھ گئیں۔

''آپ جیسے بڑے لوگوں کو بٹھانے کے لیے ہمارے گھر ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو آپ کے قابل ہو'' فیصل کی ماں نے کہا تو فیصل کے ماتھے پر بَل پڑ گئے۔ جب اُس کے ماں باپ اس طرح گریہ زاری کرتے تو اُسے اپنا آپ اشرف المخلوقات کے بجائے کینچوا لگنے لگتا تھا۔

''یہ لسّی پی لیں۔'' نفیسہ چاندی کی چمکتی ٹرے میں بڑے بڑے لسّی کے گلاس لے کر اندر آئی۔ شدید گرمی میں سب کو بے حد پیاس کا احساس ہو رہا تھا۔

زلیخا بی بی نے تکلف بھی نہ کیا اور شکریہ کہہ کر گلاس تھام لیا۔ سدرہ نے ماں کی شکل دیکھی پھر اس نے بھی گلاس تھام لیا۔ زلیخا بی بی نے چہرے سے نقاب اُتار دی اور گھونٹ بھرنے لگیں۔

سدرہ نے چہرہ موڑ کر گلاس منہ کو لگایا اور دھیرے دھیرے گھونٹ بھرنے لگی۔ سدرہ کے ہاتھ کانپنے لگے، کسی کی نظروں کی تپش اُسے بوکھلائے دے رہی تھی۔

بہت کچھ میں نے کہنا ہے
بہت کچھ تو نے کہنا ہے
دِلوں میں جتنے جذبے ہیں
لبوں تک اِن کو لانا ہے
مگر یہ ماجرا کیا ہے
کہ ہم خاموش بیٹھے ہیں
نہ مجھ سے بات ہوتی ہے
نہ تم اظہار کرتی ہو
تمہیں معلوم ہے سب کچھ
جو میرے دِل میں پنہاں ہے
تمہارے دِل کی کیفیت سے
میں آگاہ ہوں لیکن
مجھے خاموش رہنا ہے
تمہیں خاموش رہنا ہے
مگر یہ کب تلک ہوگا
ہمیں خاموش لمحوں نے
جدا گر کر دیا تو پھر؟
مجھے تم سے گلہ ہوگا
تمہیں مجھ سے گلہ ہوگا
ہمیں اَب ہجر کے لمحات سے خود کو بچانا ہے۔
دلوں میں جتنے جذبے ہیں لبوں پر ان کو لانا ہے۔

سدرہ کو احساس ہو رہا تھا کہ فیصل اُسے بہت غور سے دیکھ رہا ہے۔ بے شک وہ دونوں خاموش تھے

لیکن اُن کی نگاہیں بول رہی تھیں۔

''بیٹا! تمہارا بہت بہت شکریہ۔ تم نے ہمارے خاندان پر وہ احسان کیا ہے جو ہم تا عمر اُتار نہیں سکتے، تم نے نہ صرف حویلی کے وارث کو بچایا ہے بلکہ ایک ماں کو دوبارہ زندگی عطا کی ہے۔'' زلیخا بی بی نے فیصل کے کندھے پر ہاتھ پھیر کر اُسے پیار کیا۔

''بولو میں تمہارے لیے کیا کروں، میں تمہاری بے حد احسان مند ہوں۔'' زلیخا بی بی نے کہا۔

''آپ یوں مجھے شرمندہ نہ کریں، میں ایک ڈاکٹر ہوں اور انسانی جان بچانا میرا پہلا فرض ہے۔'' فیصل نے زلیخا بی بی کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''پھر آپ میری ماں جیسی ہیں! میں آپ سے صرف دُعا کا طالب ہوں۔''

''اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے، تم اپنے ماں باپ کی آنکھوں کی ہمیشہ ٹھنڈک بنے رہو۔'' زلیخا بی بی نے اس کے سر پر پیار کرتے ہوئے دُعا دے ڈالی۔

''اور میری خوشی آپ کے پہلو میں بیٹھی ہے مجھے وہ چاہیے!'' فیصل نے سدرہ کی پشت کو نگاہ بھر کر دیکھا اور دل ہی دل میں کہا۔

''آج میرے بیٹے کا نکاح تھا، جانے کس دشمن کو آگ لگی ہے، جو میرے بچے کو جان سے مارنے کی کوشش کی۔'' زلیخا بی بی نے کہا۔

''گھر میں ڈھولک رکھی ہوئی ہے خوشیاں منائی جا رہی ہیں تم نے آج ہماری خوشیوں کو بچایا ہے۔ اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔'' زلیخا بی بی نے کہا۔

اُسی پَل باہر جیپ رُکنے کی آواز آئی۔ ساتھ ہی کسی کے اُونچا اُونچا بولنے کی آواز بھی آئی تھی۔ زلیخا بی بی اِس آواز کو اچھی طرح پہچانتی تھیں یہ سید نوازش علی کی آواز تھی۔ زلیخا بی بی نے آدمی بھیج کر انہیں اطلاع کروائی تھی۔

''کس کی موت آئی ہے جس نے میرے بیٹے پر گولی چلائی ہے!'' وہ اندر داخل ہوتے ہوئے بولے۔

''کیسا ہے عبداللہ؟ چلو اُٹھاؤ اِسے ہسپتال لے کر چلیں۔'' انہوں نے فکر مندی سے کہا۔

''اَب اللہ کے کرم اور اِس بچے کی مہربانی سے عبداللہ خطرے سے باہر ہے ورنہ پہلے تو بے حد خون بہہ رہا تھا۔'' زلیخا بی بی نے آگے بڑھ کر صحیح صورتِ حال بتائی۔

''جوان! ہم تمہارے احسان مند ہیں اور ہم کسی کا احسان نہیں رکھتے، بولو تمہیں کیا چاہیے؟'' سید نوازش علی نے تنفر سے کہا۔

''شکریہ شاہ صاحب!'' فیصل نے کڑوا گھونٹ بھر کر جواب دیا۔ اُسے یہ شخص بے حد بُرا لگتا تھا ہر انسان کو یوں مخاطب کرتا جیسے وہ اُن کا خدا ہو۔

''نہیں جوان! ہم تمہیں انعام دینا چاہتے ہیں، سید نوازش علی اگر دشمنوں کے لیے موت ہے تو اپنے وفاداروں کے لیے بادشاہ آدمی ہے۔'' سید نوازش علی نے حسبِ عادت گردن اکڑا کر کہا۔

''استغفر اللہ!'' فیصل دل ہی دل میں بولا۔

"مہربانی ہے آپ کی، لیکن اگر آپ کا اصرار ہے تو میں وقت آنے پر کبھی آپ سے کچھ مانگ لوں گا۔" فیصل نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں اپنے قول سے کبھی نہیں مکرتا تم کو جو چیز چاہیے بلا جھجک مانگ لینا۔" سید نوازش علی نے بے نیازی سے کہا۔

"چلو رمضان! چھوٹے شاہ کو گاڑی میں لٹاؤ۔" سید نوازش علی نے سب کو چلنے کا اشارہ کیا۔

"اور ہاں! آج میرے بیٹے کا نکاح تھا لیکن اب تو کل پر بات چلی گئی، تم کل شام ہمارے خاص مہمانوں میں شریک ہو، تم اپنے خاندان کے ساتھ ضرور آنا۔" سید نوازش علی نے اُسے عزت بخشی۔

"جی ضرور!" فیصل نے سید عبداللہ جو نیم بے ہوشی میں تھا اُسے سہارا دے کر اُٹھایا۔

جب سب باہر نکل گئے تو زلیخا بی بی نے ایک بار پھر اُس کے سر پر پیار کیا۔

"جیتے رہو، سدا رہو!" وہ کہہ کر نکلیں، پیچھے ہی سدرہ نکلنے لگی۔ لیکن ایک دم سدرہ کا دم نکل گیا اُس کی چادر کو پیچھے سے کسی نے پکڑ لیا تھا۔ سدرہ نے فیصل کی بے باکی پر حیرت سے پیچھے مڑ کر اُسے غصیلی نظروں سے دیکھا۔

جواباً فیصل نے ایک دم دونوں ہاتھ اُٹھا کر سامنے کر دیے۔ اُس کے چہرے پر ایک بہت معنی خیز اور پیاری مسکراہٹ تھی۔

"میں بھلا بلا اجازت یہ گستاخی کیسے کر سکتا ہوں!" فیصل نے کہا، سدرہ کی چادر کا کونا دروازے میں اٹک گیا تھا۔ فیصل نے آگے بڑھ کر اُس کی چادر چھڑائی۔

"شکریہ!" سدرہ کہہ کر مڑنے لگی۔

"سنو موتیا! جس طرح میرا دل تمہیں روکنے کو بے چین ہے اُسی طرح یہ گھر بھی تمہیں روک رہا ہے۔" فیصل نے بے حد جذب سے کہا۔

"میں اب چلتی ہوں!" سدرہ نے دھیمی آواز میں کہا۔

"کیا کوئی جانتا ہے کہ وہ کسی کے دل پر چل کر واپس جا رہا ہے۔" فیصل پھر سے بے ساختہ گویا ہوا۔

سدرہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اُٹھا کر اُسے دیکھا اُس کا دل اِس قدر تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ یوں لگتا تھا پسلیاں توڑ کر باہر آ جائے گا۔

سدرہ بے حد تیزی سے باہر نکلی۔ یہ دو ڈھائی منٹ کی ملاقات تھی اور یہ سدرہ نہ جانتی تھی کہ یہ ملاقات اُس کی ساری زندگی پر محیط ہونے والی ہے، حویلی کی تاریخ بدلنے والی تھی۔

❖❖○❖❖

حویلی میں جہاں میراثن آ کر شگن کے گیت گا رہی تھی، وہیں گاؤں کی لڑکیاں گھیرا بنائے بیٹھی تھیں۔ بشیراں دوڑتی ہوئی اندر آئی۔ اُس کے چہرے کی ہوائیاں بتا رہی تھیں کہ اُس کے پاس خیر کی خبر نہ تھی۔

"کیا ہوا ہے؟ کیوں، یوں بوکھلائے پھر رہی ہو۔" ریحانہ بی بی جو بڑے سے پنگوڑے میں گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھی تھیں، ماتھے پر تیوری ڈال کر پوچھا۔

"سائیں عبداللہ کو کسی نے گولی ماری ہے اور سائیں نوازش علی گولی مارنے والے کو اپنے شکاری کتے لے کر ڈھونڈنے گئے ہیں۔" بشیراں نے پاس آ کر بے حد دھیمی آواز میں کہا۔

"ہائے میں مر گئی!" ریحانہ بی بی ایک دم اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اُن کے یوں اُٹھنے سے گیت گاتی میراثن ایک دم چُپ ہو گئی، ساتھ ہی سب لڑکیاں عورتیں فوراً ریحانہ بی بی کی جانب متوجہ ہو گئیں۔

"کچھ نہیں ہوا! تم کیوں چُپ ہو گئیں! خوشی کا موقع ہے چل کوئی اچھا سا سہرا گا۔" بشیراں نے فوراً بات سنبھالی۔ میراثن کی آواز سے خاموشی ٹوٹ گئی۔

ریحانہ بی بی تقریباً بھاگتی ہوئی اندر آ گئیں۔

"عبداللہ کو کہاں گولی لگی؟ اور کہاں ہے وہ؟" ریحانہ بی بی سید سرفراز کے کمرے کی جانب بڑھیں۔

"گولی تو جانے کہاں لگی تھی لیکن وہ اب خیریت سے ہیں۔" بشیراں نے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"سرفراز!" ریحانہ بی بی نے اندر داخل ہو کر اُسے آواز دی۔ اِس وقت وہ بھلا کب اپنے کمرے میں ملتا ہے۔ ریحانہ بی بی نے اُسے کمرے میں نہ پا کر خود ہی کو جواب دیا۔ وہ فوراً مردانے میں بھاگیں! جہاں سرفراز کسی آدمی سے باتیں کر رہا تھا۔

"تم جاؤ!" سید سرفراز نے ماں کو آتے دیکھ کر کہا۔

"لیکن سائیں۔" وہ کچھ کہتے کہتے رُکا۔

"تم کو جیسا کہا ہے وہ کرو۔" سید سرفراز غرایا۔

آدمی جی اچھا کہہ کر بے حد تیزی سے باہر نکلا۔

"اماں جان! آپ یہاں مردانے میں بغیر پردے کے کیا کر رہی ہیں؟" سید سرفراز نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔

"ماں کے لیے تم کو بڑی غیرت ہے اور تم جو کر چکے ہو، اُس کے متعلق کچھ خیال ہے؟" ریحانہ بی بی نے کڑے تیوروں سے کہا۔

"کس کے متعلق پوچھ رہی ہیں؟" سید سرفراز نے نگاہ چُراتے ہوئے پوچھا۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کس کے متعلق پوچھ رہی ہوں؟ ماں ہوں تمہاری! تمہارے دل میں کیا اُگ رہا ہے اور تم کیا کاٹتے ہو، میں سب جانتی ہوں۔" ریحانہ بی بی نے دھیرے لیکن کڑی آواز میں کہا۔

"جب جانتی ہیں تو پوچھتی کیوں ہیں؟" سید سرفراز نے بے چینی سے کہا۔

"اِس لیے کہ تمہارا باپ شکاری کتوں کے ساتھ مجرم کو ڈھونڈنے نکلا ہے اور تھوڑی دیر میں وہ لوگ پکڑے جائیں گے اور تمہارا نام سامنے آ جائے گا۔" ریحانہ بی بی نے فکر مندی سے کہا۔

"اگر وہ لوگ پکڑے گئے تو بھی میرا نام نہیں لیں گے۔" سید سرفراز نے اطمینان سے کہا۔

"تمہارے باپ کے پالے اُن خونخوار شکاری کتوں کے سامنے تو بڑے بڑے بول اُٹھتے ہیں، کون ہے جو موت کو گلے لگانا چاہے گا۔" ریحانہ بی بی نے سید سرفراز کو غور سے دیکھتے ہوئے سوچا، ایسا کیا نظام تھا، جو اُس کے بیٹے نے کر رکھا تھا۔

"ماں میری! بس میں نے اگر رقم لگائی ہے تو ساتھ ایسا انتظام بھی کیا ہے کہ وہ کبھی منہ نہیں کھولیں گے، موت کو گلے لگالیں گے ورنہ اُن کے خاندانوں کی خیر نہیں ہے۔" سید سرفراز نے ماں کو یقین دلایا۔

"لیکن میرا دل ڈر رہا ہے، تم سید نوازش علی کے غصّے کو نہیں جانتے وہ تو بال کی کھال اُتارنے والا شخص ہے اُس کا عتاب، اُس کا غصّہ بڑا ظالم ہے۔" ریحانہ بی بی نے فکرمندی سے ہاتھ مسلتے ہوئے کہا۔

"امّاں جان! آپ بات کو بس یہیں ختم کردیں ہم نہیں جانتے کہ عبداللہ پر کس نے حملہ کروایا ہے اور ہاں میں خود اپنے بھائی کے دشمنوں کو ڈھونڈنے نکل رہا ہوں۔" سید سرفراز نے مکاری سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا...!" ریحانہ بی بی نے پہلے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا پھر سمجھ کر ایک دم اطمینان سے مسکرانے لگیں۔

"اور تم فکر نہ کرو میں عائشہ سے سوگنا بہتر لڑکی تمہارے لیے لاؤں گی۔" ریحانہ بی بی نے اُسے تسلی دی۔

"ہونہہ! عبداللہ نہ بچتا تو آج کے بعد وہ صرف میری ہوتی۔ اَب میرے لیے جو بھی لڑکی ہو لیکن عائشہ تو ہرگز نہ ہوگی۔" سید سرفراز سر جھٹکتے ہوئے باہر نکلا۔

"توبہ ہے اِس لڑکے کا غصّہ کسی دن کوئی چاند نہ چڑھادے۔ اَب جاکر اداکاری کرنی پڑے گی سید نوازش علی کے سامنے۔" ریحانہ بی بی نے افسردہ سا چہرہ بنا کر خود سے کہا۔

❖❖○❖❖

"شاہ صاحب! کم بخت مرگیا لیکن کچھ بولا نہیں۔" سید نوازش علی کے منشی نے اندر آکر کہا۔

"اُسے تڑپا تڑپا کر مارنا تھا۔" سید نوازش علی نے غصّے سے چلّاتے ہوئے کہا۔

"سائیں ہمارے کتوں نے اُس کی بوٹی بوٹی کردی تھی۔" منشی نے مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"اُس بندے کے خاندان کا پتا کرو اور دھیان رکھنا اُس کے خاندان میں کوئی ذی بچہ بچ نہ پائے، اُن کی روح تک تڑپ کر رہ جائے کہ اُس نے کس پر حملہ کیا تھا۔ سید نوازش علی کے کلیجے پر ہاتھ ڈالنے والا مرنے کے بعد بھی تڑپتا رہے گا۔"

"جناب جیسا آپ کا حکم!" منشی نے سر جھکا کر کہا۔

سید نوازش علی نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔ کیوں کہ وہ ہی یہاں قانون بھی تھا اور آرڈر بھی، اُسے روکنے والا کوئی نہ تھا کیوں کہ اُس کے اِرد گرد ایسے بزدل اور کم عقل لوگ بستے تھے، جو اپنی جان و مال کی حفاظت تک تو کرنہ سکتے تھے البتہ نوازش علی کے لیے جان دینے پر آمادہ رہتے تھے۔

"اوئے بخشو! میرے پتر کی خوشی ہے کوئی ڈھول تاشوں کا، کوئی موج میلے کا بندوبست کرو۔" سید نوازش علی نے بدلے کا بوجھ اُترنے کے بعد ایک دم جوش سے کہا۔

سید نوازش علی کا یہ روز کا معمول تھا وہ کسی کے گھر موت کا اندھیرا کر کے اپنے ہاں چراغاں کیا کرتا

تھا۔ کمرے میں نڈھال سا عبداللہ بے حد دُکھی تھا۔ ابھی ابھی منشی اُسے بھی اُس کے مجرم کی موت کی خوش خبری سنا کر گیا تھا۔

"اِس قدر گندا سسٹم ہے! مجھے اور میرے بچوں کو، میری بہنوں کو اس سسٹم کا حصّہ نہیں بننا۔" اُس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا۔

"نسل در نسل حکم رانی اور ظلم اَب ختم ہو جانا چاہیے۔" سید عبداللہ نے حتمی طور پر فیصلہ کیا۔

لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اگر یہاں سید نوازش علی کی حکم رانی ختم بھی کردی جائے تو بھی یہاں کے رہنے والے خود کو آزاد محسوس نہ کرسکیں گے۔ اُن کے دِل و دماغ اِس غلامی میں رہنے کے عادی ہوگئے تھے کیوں کہ وہاں اس علم کی روشنی نہ تھی، جو انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کا احساس دیتی ہے۔ دنیا کے خالق اور مالک سے جوڑتا ہے اور انسانوں کے خوف سے آزاد کرتا ہے۔

❖❖○❖❖

تیرے در سے آس بہت ہے، اللہ سائیں دیکھ
قطرہ قطرہ پیاس بہت ہے، اللہ سائیں دیکھ
میرے نام کی ایک خوشی تُو اس جھولی میں ڈال
دُکھ جس کے پاس بہت ہے اللہ سائیں دیکھ

سدرہ کتنی دیر سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ گہرے سبز رنگ کے کپڑوں پر شیشوں والی میرون چادر اوڑھے وہ تازہ گلاب لگ رہی تھی۔ باہر ڈھول پیٹنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ درگاہ کے اندر چپ چاپ بیٹھی اُس والی سرکار سے مانگ رہی تھی، جو سب کو دینے والا تھا۔

ریحانہ بی بی، زلیخا بی بی، مریم اور وہ درگاہ پر شکرانے کی چادر چڑھانے آئی تھیں۔ کل بھائی عبداللہ کی جان بچ جانے پر بڑی امّاں نے شکرانے کی چادر چڑھانے کی منت مانی تھی اور آج صبح صبح وہ لوگ درگاہ پہنچ گئے تھے۔ ریحانہ بی بی نے غریبوں میں کپڑے تقسیم کرنے کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔ سید نوازش علی، ریحانہ بی بی کا فکرمندانہ رویہ دیکھ کر بے حد خوش ہوئے تھے کہ وہ بھی سید عبداللہ کو سگی اولاد کی طرح چاہتی تھیں۔

باہر ڈھول کی تھاپ پر ملنگ بابا گھنگھرو باندھے مست ہوکر گول دائرے میں ناچ رہا تھا۔ اُس کے پاؤں یوں لگتا تھا کہ پانی میں تیر رہے ہوں، زمین پر نہ پڑ رہے ہوں۔

سدرہ نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ سامنے جھروکے پر، جس پر ہری جھنڈیاں اور ہار پھول لٹک کر اُلجھ چکے تھے۔ وہاں سے باہر صحن کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا ملنگ کے گرد بہت سارے بچے کھڑے تھے اُن کے لیے ملنگ کا ناچ کسی تماشے سے کم نہ تھا۔

سدرہ نے حیرت سے دیکھا کہ نہ ڈھول بجانے والے کے ہاتھ رُک رہے تھے اور نہ ہی ملنگ کے پاؤں! یوں لگتا تھا کہ اُن دونوں میں کوئی رشتہ تھا ایک جذبے کا رشتہ تھا، دِل کی لگی کا رشتہ تھا دونوں ہی اپنے اپنے دل کی سلگن پر تڑپ رہے تھے۔ یہ وہ تڑپ تھی جو عشق کے راستے میں بہت خوار کرتی ہے۔

سدرہ چپکے سے باہر نکل آئی صحن میں کوئی مَرد نہ تھا۔ وہ کسی مسمریزم کے زیرِ اثر تھی۔ اُس کی نگاہ درویش کے پیروں پر ٹکی تھی کوئی جنون، لاوے کی صورت بند توڑ کر باہر آنے کو مچل رہا تھا۔ سدرہ خود اپنی اِس کیفیت کو سمجھ نہ پا رہی تھی۔

''موتیا!'' اُسے لگا کہ ہَواؤں نے سرگوشی کی ہو، یہ آواز تو ہر وقت اُس کے کانوں میں گونجتی تھی سدرہ نے اُسے اپنا وہم جان کر نظرانداز کردیا۔

''موتیا!'' اِس بار آواز بے حد قریب تھی۔ سدرہ نے مُڑ کر دیکھا تو فیصل سچ مچ کھڑا تھا۔

''یہ بالکل درست ہے کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ میں جانے کس کام سے نکلا تھا لیکن میرے دل کی بے چینی کے ہاتھوں جانے کب میرے قدم اِس راستے کی جانب مڑ گئے اور پھر میں نے دیکھا میرے دل کی بے چینی نے یہاں لا کھڑا کیا۔'' فیصل اُس کو بہ غور دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم میری بے چینی اور میرے جذبے کی شدّت کا اندازہ یہاں سے لگالو کہ میں تمہیں تمہاری اس خیمہ نما چادر میں بھی پہچان لیتا ہوں۔'' فیصل ایک قدم اور بڑھا۔

سدرہ بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹی۔

''تمہاری خوش بو مجھے تمہارے ہونے کا پتا دے دیتی ہے!''

''خدا کے واسطے آپ یہاں سے جائیں اگر کسی نے دیکھ لیا تو قیامت آجائے گی۔'' سدرہ نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور جو قیامت میرے دِل کی دُنیا میں برپا ہے اُس کا کیا؟'' فیصل نے نہایت بے بسی سے کہا۔

''آپ... آپ نہیں جانتے کہ آپ کے جذبوں نے ایک غلط لڑکی کا انتخاب کرلیا ہے! میں بالکل خالی ہاتھ ہوں اور روایات میں پھنسی ہوئی لڑکی، بھلا کیسے اِس طرح...'' سدرہ کی بات ادھوری رہ گئی اُسے شک گزرا کہ سامنے جھروکے میں بڑی امی کھڑی ہیں۔

''مجھے میری بڑی امّاں نے دیکھ لیا ہے!'' سدرہ نے خوف زدہ لہجے میں کہا اور ادھوری بات چھوڑ کر اندر بھاگ گئی۔ فیصل مایوس سا ہو کر برگد کے نیچے آ بیٹھا۔

''وہ چلی گئی؟'' فیصل نے پیچھے مُڑ کر سوال کرنے والے کو دیکھا۔

یہ وہ ہی فقیر تھا، جو اُس روز اُسے بارش میں ملا تھا۔

''ہاں!'' فیصل نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔ یک طرفہ جذبے، محبت یوں ہی انسان کو تھکا دیتے ہیں

''تم اُس کو چاہتے ہو نا؟'' فقیر آج بالکل نارمل انسانوں کی طرح باتیں کررہا تھا۔

''ہاں!'' فیصل نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کیا وہ بھی تم کو چاہتی ہے۔'' فقیر کے سوال پر فیصل نے گہری سانس بھری۔

''میں نہیں جانتا۔ لیکن میں جاننا چاہتا ہوں میں بے حد پریشان ہوں کہ اللہ نے میرے دل میں اُس لڑکی کی اِس قدر شدّت سے محبت کیوں ڈالی، جو ہر لحاظ سے میری پہنچ سے دُور ہے۔'' وہ پاگل سا فقیر اُس کے بے ضرر ہونے کی وجہ سے فیصل اپنا دِل اُس کے سامنے کھولتا چلا گیا۔

''سنو میری بات۔'' فقیر نے اُس کے پاس ہوتے ہوئے کہا۔

''وہ بھی تمہیں بہت چاہتی ہے اور تم ہی اُس حویلی کی خونی دیواروں میں روزن بنو گے، تمہارا جذبہ اور کسی ماں کی شدید دُعاؤں کا نتیجہ ہو۔'' فیصل نے نہ سمجھنے والے انداز میں اُس فقیر کو دیکھا، کھچڑی بالوں والا یہ بابا کیا کہنا چاہ رہا تھا۔

''لیکن تم اُسے پاکر بھی پا نہ سکو گے ہاں وہ تمہیں ضرور پائے گی۔'' فقیر نے پراسرار انداز میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' فیصل نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کی باتوں میں کھو سا گیا۔

''مطلب بتانے کی ہم کو اجازت نہیں ہے۔'' فقیر کہہ کر وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کے چہرے پر وہ ہی جنونی سی اجنبیت چھا گئی جو اُس کے نقوش کا حصّہ تھی۔

''بابا!'' فیصل نے اُسے آواز دی۔ فقیر نے ایک مسکراتی نگاہ مُڑ کر اُس پر ڈالی۔

دھن دے، جی راکھیے جی دے رکھیے لاج
جیو لاج دھن دیجیے اِک پریت کے کاج
پریت کرے ایسی کرے جیسی راسی ڈور
گلا پھنسا وے اپنا لاوے پر جھکور

فقیر پاؤں زمین پر مارتا باآواز بلند بولتا چلا گیا۔

ارے ایسی پریت کر جیسی چندر چکور
چونچ جھکی گردن جھکی جنون واہی اور

(محبت کرنی ہے تو ایسی کرو جیسی چاند و چکور میں ہے، دانہ پانی کی فکر نہیں کرتا محبوب کے غم میں زندگی دیتا ہے)

فقیر نے ایک بار پھر پاؤں زور سے مارے، گھنگروؤں کی چھنک دُور تک پھیل گئی۔

ذات، مذہب ایہہ عشق نہ پچھا
عشق شرع دا ویری
جس تن لگیا عشق کمال
ناچے بے سُر تے بے تال

فقیر پاؤں زمین پر مارتا ہاتھ اوپر اُٹھاتا پھر اُسی مست کیفیت میں چلا گیا جس میں وہ ناچ رہا تھا۔

فیصل کو جہاں اُس فقیر کی کہی باتیں اُلجھا رہی تھیں، وہیں اُس فقیر کی فلسفیانہ باتیں حیرت میں ڈال رہی تھیں جو کسی پڑھے لکھے شخص کی طرح، کسی اسکالر کی طرح شعر و شاعری سناتا تھا۔ لیکن جیسے ہی کسی کے چہرے پر اُس کی ذات کے متعلق سوال آتا تھا۔ وہ یوں ہی بے نیاز ہو جاتا تھا۔

''کس قدر عجیب ہے نا یہ بابا! کون ہے یہ بابا؟''

فیصل نے خود سے کہا تھا۔

❖❖○❖❖

ظہر کی نماز کے بعد سید عبداللہ کا نکاح عائشہ سے پڑھایا گیا۔ سید عبداللہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے فید

براق کُرتا شلوار پہنے اپنی بیماری کے باوجود بے حد اچھا لگ رہا تھا۔ فیصل کی آمد پر وہ اُس سے کھڑا ہو کر ملا۔

''آپ پلیز بیٹھ جائیں۔ زیادہ حرکت فی الحال آپ کے زخم کے لیے اچھی نہیں۔'' فیصل نے کہا۔

''تمہارے آنے سے مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے!'' سید عبداللہ نے بشاشت سے کہا۔ جواباً فیصل مسکرایا۔

''تو تم ہو جس نے بھائی صاحب کی جان بچائی۔'' سید سرفراز علی ماتھے پر بَل ڈالے فیصل کو دیکھ رہا تھا۔

''کم بخت نے میری ساری محنت اکارت کر ڈالی!'' سید سرفراز دل ہی دل میں بَل کھا کر رہ گیا۔

فیصل نے کچھ دیر بعد جانے کی اجازت مانگی تو سید عبداللہ نے اصرار کر کے اُسے کھانے پر روک لیا۔

''ارے رکو رکو... میں نے کچھ شغل میلے کا بندوبست بھی کیا ہے۔'' سید سرفراز نے ہنستے ہوئے کہا۔

سید عبداللہ نے کچھ ناگواری سے اُسے دیکھا اُسے معلوم تھا یہ شغل میلہ کیا ہو سکتا تھا۔ شہر سے مشہور طوائف بلوائی گئی تھی، سب کی دِل پشوری کرنے کے لیے۔

فیصل نا چاہتے ہوئے بھی سید عبداللہ کی خاطر بیٹھ گیا جب محفل شروع ہونے لگی تو سید عبداللہ کو بیٹھنے میں تکلیف شروع ہوگئی۔

''فیصل پلیز مجھے کمرے تک لے چلو۔'' سید عبداللہ نے پاس بیٹھے فیصل سے کہا۔

''اگر چلنے میں تکلیف ہو رہی ہے تو کسی ملازم سے کہوں مدد کے لیے؟'' فیصل نے سید عبداللہ سے کہا۔

''نہیں سب خوشی خوشی مگن بیٹھے ہیں ملازم بابا سائیں کو بتا کر پریشان کر دیں گے، آپ مجھے لے چلیں۔'' سید عبداللہ نے فیصل کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

''آپ آرام کیجیے اتنی دیر بیٹھنا مناسب نہیں۔'' فیصل نے پروفیشنل انداز میں کہا۔

''ہوں! آپ ٹھیک کہہ رہے ہو!'' سید عبداللہ نے نقاہت سے کہا اور آنکھیں موندھ لیں۔

''آپ کو میوزک کا شوق ہے؟'' فیصل نے سید عبداللہ کے کمرے میں موجود پیانو کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میوزک، پینٹنگ اور قدرتی مناظر میری کمزوری ہیں۔'' سید عبداللہ نے آنکھیں بند کیے کہا۔

''حیرت ہے جہاں کے مَرد صرف کتوں، گھوڑوں کو پالنے کے شوقین ہوں وہاں اتنے نازک جذبات رکھنے والا مَرد سب سے الگ ہی نظر آتا ہے یا یوں کہہ لیں کہ مِس فٹ نظر آتا ہے۔'' فیصل نے ہنس کر سے کہا۔

''یار ڈاکٹر! چھوڑو اِس بے معنی بحث کو۔ میں اِس موضوع سے بیزار ہوں۔'' سید عبداللہ نے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے آپ آرام کریں پھر ملاقات ہوگی۔'' فیصل اجازت لیتا ہوا کمرے سے باہر آ گیا۔

لمبی راہ داری میں بنے اتنے سارے کمروں کو دیکھ کر فیصل اُلجھ گیا کہ وہ کہاں سے جائے؟ بے شک وہ اِسی کا راستا بھول گیا تھا۔ اندازے سے وہ چلتا ہوا پہلے آنے والے موڑ پر مُڑ گیا۔

''یا اللہ کیا حویلی ہے! انسانوں سے زیادہ کمرے ہیں لگتا ہے کہ ہر ایک کام کے لیے الگ کمرا ہوگا۔'' فیصل خود سے کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

''بشیراں! یہ میرے بال تو سلجھا کر باندھ دو۔'' سامنے برآمدے نما ہال میں بے شک وہ سدرہ ہی تھی گھٹنوں کو چھوتے ہوئے لمبے بال اُس کے چہرے پر گرے ہوئے تھے۔

وہاں موجود مریم، سدرہ اور بشیراں تینوں کے چہرے پر حیرت اور پریشانی تھی، پریشانی اور حیرت اُن کا بالکل بجا تھی ایک اجنبی زنان خانے میں کھلم کھلا کیا کر رہا تھا۔

''کون ہو تم؟'' مریم نے غصّے سے پوچھا۔

''میں۔'' فیصل کی نگاہیں ابھی تک سدرہ کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں، جو حیرت سے بت بنی بیٹھی تھی۔

''میں سید عبداللہ کا دوست ہوں اُن کو کمرے میں چھوڑ کر آ رہا ہوں لیکن مجھے باہر جانے کا راستا نہیں معلوم، میں شاید غلطی سے اِدھر نکل آیا ہوں۔'' فیصل نے وضاحت کی۔

''بشیراں اِن کو فوراً باہر لے جاؤ کوئی آ گیا تو بہت مصیبت ہو جائے گی۔'' سدرہ نے حواسوں میں آتے ہوئے کہا۔

''چلو صاحب!'' بشیراں اُسے دُوسری جانب لے گئی۔

''تمہاری قسمت اچھی ہے صاحب کہ تم زنان خانے آئے اور یوں خیریت سے واپس بھی جا رہے ہو ایسی جگہ ہے جہاں شاہ جی بھی بتا کر آتے ہیں۔ اَب تم یہاں سے جاؤ اور اپنا یہاں تک آنے کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔'' بشیراں نے اُسے باہر پہنچا کر کہا۔

''آپی! تم نے اُس اجنبی کو یوں کیسے جانے دیا؟ تم جانتی ہو نا کہ کسی مَرد کا یہاں آنے کا جرم، اس کی سزا کیا ہے۔'' مریم نے سدرہ سے اُلجھ کر پوچھا۔

''مریم! تم جانتی ہو وہ کون تھا!'' سدرہ نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

''کون؟'' مریم نے سوال کیا۔

''وہ ہی جو تمہاری آپی کے خوابوں کا مرکز ہے! وہ ہی جو مجھے درگاہ میں ملا تھا۔'' سدرہ نے بے خوفی سے کہا۔

''کیا؟'' مریم نے حیرت سے کہا۔

''ہاں! یہ وہ ہی ہے، جسے میں چاہتی ہوں!'' سدرہ نے اعتراف کیا۔

''اوہ میرے اللہ!'' مریم سر تھام کر رہ گئی۔ وہ جسے اپنی بہن کا تصور سمجھتی تھی، وہ تو ایک حقیقت تھا۔

''آپی تم جانتی ہو کہ تمہارے اِس جرم کی کیا سزا ہو سکتی ہے؟'' مریم کی آنکھوں کے سامنے فاطمہ پھوپو کا چہرہ لہرا گیا۔

''ہاں!'' سدرہ کی آنکھوں میں بے خوفی تھی۔

''آپی یہ سراسر خودکشی ہے۔'' مریم نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''منظور ہے۔ یہ خودکشی بھی تو اِن دیواروں سے آزادی کا ایک ذریعہ ہی ہے نا۔'' سدرہ نے بے خوفی

سے کہا۔

مریم پھٹی پھٹی نگاہوں سے سدرہ کو دیکھ رہی تھی، وہ یقیناً پہلی لڑکی تھی جو جانتے بوجھتے خوشی خوشی موت کو گلے لگانا چاہ رہی تھی۔

اِس حویلی میں لڑکی کے محبت کرنے کی سزا صرف اور صرف موت تھی۔ ایک بھیانک اور عبرت ناک موت۔

❀❀❀

میں!

میں درپن دیکھ کر رویا

جیون کی اِس دوڑ میں، میں نے

کیا کھویا، کیا پایا

سمے کے ہاتھوں پڑ گئیں مُکھ پر

ایسی گہری لکیریں

جیسے ہزاروں سال پُرانے

دَور کی ہوں تحریریں

پتھرائی بے جان سی آنکھیں

چہرہ سویا سویا

میں درپن دیکھ کے رویا

اِک پَل کو پہچان نہ پایا

میں اپنی ہی صورت

مکڑی کے جالے میں جیسے

قید ہو کوئی مورت

رنگ و رُوپ کے اُجڑے پن میں

مَن سے کھویا کھویا

میں درپن دیکھ کے رویا

ترنم کتنی ہی دیر سے چُپ چاپ بیٹھی اپنے عکس کو دیکھ رہی تھی۔ کمرا گرم تھا، باہر بارش بھی رُک چکی تھی۔ کمرے کی خاموشی میں عبدالولی کے سانسوں کی آواز بہ خوبی سنائی دے رہی تھی، جو ترنم کے ہوش میں آنے کے انتظار میں جانے کب سو گیا تھا۔

ایگزیبیشن کی تیاری کی وجہ سے وہ پہلے ہی دو راتوں سے بے آرام تھا اُس پر ترنم کا یوں اُس سے ٹکرانا اور پھر بے ہوش ہو جانا اُسے مزید اَپ سٹ کر گیا تھا۔ وہ بے حد تھکا ہوا تھا۔ ترنم کی پُراسرار شخصیت اُسے عجیب سے وہم میں مبتلا کر گئی تھی، آج وہ اِس لڑکی کے متعلق سب کچھ جاننا چاہتا تھا اِ

وہ ترنم کے پاس پڑے صوفے پر بیٹھ گیا اور جانے کب انتظار کرتے کرتے اُس کی آنکھ لگ گئی۔

ترنم جب ہوش میں آئی تو اُسے فوراً اپنی اور ولی کی ریسٹورنٹ میں ملاقات یاد آ گئی ساتھ ہی اُس کا سوال کہ وہ کون تھی۔

''میں ایک بُری لڑکی ہوں !سنا عبدالولی! میں ایک بُری لڑکی ہوں تمہارے پاکیزہ گھر میں میرا کیا کام؟'' ترنم نے اِدھر اُدھر نِگاہ دوڑائی، جوتے پیروں میں ڈال کر وہ کھڑی ہوئی تو ایک پَل کو اُسے چکر آ گیا۔

''تم اُٹھو گے اور پھر مجھ سے وہ سوال دُہراؤ گے۔ اور میرے اندر تمہارے سامنے اپنا بھیانک روپ کھولنے کا حوصلہ نہیں ہے۔'' ترنم نے پیار بھری نگاہ اُس کے تھکے تھکے چہرے پر ڈالی۔

''اللہ کرے ہم دوبارہ کبھی نہ ملیں!'' ترنم نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا اور باہر نکل گئی، باہر ٹھنڈی یخ ہَوا نے اس کا استقبال کیا۔ صبح چڑیوں کی چوں چوں پر ولی کی آنکھ کھلی صوفے پر بے آرامی سے لیٹنے پر اُس کی گردن مُڑ گئی تھی اور اُسے خاصی تکلیف کا احساس ہو رہا تھا۔

عبدالولی ایک دم چونک کر اُٹھا سامنے بستر خالی تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکلا سب کمروں کو جھانکتا وہ نیچے ہال میں پہنچا جہاں نگی گرم کپ چائے کا لیے بیٹھی تھی۔

''السلام علیکم بھائی!''

نگی نے اُسے دیکھتے ہی سلام کیا۔

''وعلیکم السلام! وہ...''

عبدالولی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ ترنم کے متعلق پوچھے یا نہ پوچھے۔

''وہ آپ کی مہمان رات ہوش میں آتے ہی باہر نکل آئی، وہ تو اتفاق سے میرا سامنا اُس سے ہو گیا۔ میں نے اُسے روکا کہ وہ اتنی رات اور بارش میں کہاں جا رہی ہے لیکن وہ بالکل نہ مانی۔ اپنا پرس اور موبائل وہ مجھ سے لے کر باہر جانے پر جب زیادہ ضد کرنے لگی تو میں نے اُسے ڈرائیور کے ساتھ روانہ کر دیا لیکن... لیکن ڈرائیور پانچ منٹ بعد ہی واپس آ گیا اور کہنے لگا کہ باجی بیچ راستے میں اُتر گئی تھی۔''

نگی نے ساری تفصیل اُسے سنائی۔

عبدالولی کا ایک دم خون کھولنے لگا۔ یعنی کہ حد ہو گئی، اپنے باپ کا غلام سمجھا ہے ہر بار مصیبت بن کر میرے گلے پڑ جاتی ہے اور نوابوں کی طرح اُٹھ کر چل دیتی ہے اَب اگر یہ لڑکی مجھے ملی تو دیکھوں گا کہ کیسے بھاگتی ہے! اُس کا رویّہ میرے ساتھ ایسا کیوں ہے۔'' عبدالولی نے ماتھے پر تیوری ڈال کر سوچا۔

''لیکن تمہیں اِس سے کیا کہ وہ کون ہے اور کیوں ہر وقت بھاگتی ہے؟ تمہیں اُس سے دِلچسپی کیوں؟'' عبدالولی کے اندر سے کوئی بولا۔

''شاید! اِس لیے کہ اُس نے میری جان بچائی تھی۔'' ولی نے خود کو جواب دیا۔

''نہیں ولی! تم کہیں نہ کہیں اُس سے انسپائر ہوا!'' کوئی پھر اُس کے اندر سے بولا۔

''نہیں! بالکل نہیں! میں صرف علیزے سے محبت کرتا ہوں!'' عبدالولی نے سچائی سے کہا۔

''تو پھر یہ لڑکی ترنم؟'' اندر سے پھر سوال ہوا۔

''وہ صرف ایک تجسس ہے! اُس کا یوں پُر اسرار ہونا مجھے اکثر اُس کی جانب بلاوجہ مائل کرتا ہے'' عبدالولی نے یک سوئی سے کہا۔

''میں اَب اِس اسرار اور اِس تجسس کا پتا ضرور لگاؤں گا!'' عبدالولی نے خود سے کہا، اُس کے چہرے پر، پُرسوچ لکیریں تھیں۔

''تم کون ہو؟ اور کہاں چلی جاتی ہو، میں ضرور جانوں گا!'' عبدالولی نے گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے سوچا...

کچھ کرو ایسا، تمہارے بعد بھی
نیک نامی کا ذریعہ ہو وہ کام
رہتی دنیا تک تمہارا نام ہو
ذکر جاری ہر جگہ ہو صبح و شام

سید عبداللہ نے مسکرا کر فیصل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نہ صرف خوش ہوں بلکہ بے حد ممنون بھی کہ آپ نے اس گاؤں میں مجھے پریکٹس کرنے کے لیے نہ صرف اجازت دی بلکہ زمین بھی دی۔'' ڈاکٹر فیصل نے بے حد پیار بھری نگاہ سید عبداللہ پر ڈالی۔

سید عبداللہ کو اللہ نے نہ صرف خوب صورت شکل دے رکھی تھی بلکہ بے حد نرم اور پیار کرنے والا دل بھی دے رکھا تھا۔ ڈاکٹر فیصل کو وہ بے حد اچھا اور مختلف لگا تھا۔

''لیکن ساتھ ہی مجھے یہ خیال بھی آتا ہے کہ آپ کے والد اور بھائی آپ کے اس عمل سے بے حد ناراض ہیں۔ آپ نے میرے کہنے پر بہت بڑی ناراضی مول لے لی ہے، بڑے شاہ صاحب کا غصہ سارے گاؤں میں مشہور ہے۔'' ڈاکٹر فیصل نے سید عبداللہ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میری امّاں جان کہتی ہیں کہ جس کام میں سب کی بھلائی ہو اُس کے صدقے میں کسی کی ناراضی مول لینی پڑے تو یہ گھاٹے کا سودا نہیں کیوں کہ جس سے اللہ راضی ہوتا ہے صرف وہ ہی عمل اچھا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے سید عبداللہ کا چہرہ بے حد مطمئن تھا۔

''عبداللہ! مجھے فخر ہے کہ مجھے آپ جیسا صاحبِ دِل شخص دوست کی صورت میں ملا۔'' ڈاکٹر فیصل نے اعتراف کیا۔

''میں بھی تمہارے لیے بہت اچھے اور مانوس سے جذبات محسوس کرتا ہوں۔ اس گاؤں میں تم جیسا پڑھا لکھا شخص میرے لیے بھی غنیمت ہے۔'' سید عبداللہ نے کہا تو ڈاکٹر فیصل ایک دم ہنس دیا۔

''اس طرح کی گفتگو کرتے رہے تو مقابلہ شروع ہو جائے گا، آپ کو ماننا پڑے گا کہ میری بات زیادہ درست ہے کہ آپ بہت زیادہ اچھے ہیں۔'' ڈاکٹر فیصل نے اصرار کیا۔

''سائیں۔ سائیں جی!'' مشتاق سید عبداللہ کا ملازم حواس باختہ دوڑتا ہوا آیا۔

''کیا ہوا؟'' سید عبداللہ نے پوچھا۔

''سائیں... وہ... وہ!'' مشتاق کی سانسیں ابھی تک بے ترتیب تھیں۔

"روشن! اس میں زیادہ قصور تو انور میاں کا ہے، وہ ہمیشہ حسن آرا بہن کو اپنی باتوں سے اذیت دیتے آئے ہیں۔" احمد شاہ نے پہلی بار اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔

ہسپتال میں بھی انور میاں، احمد شاہ کو باتوں باتوں میں کتنی بار اپنی خیریت کا سنا چکے تھے۔ ساتھ میں ہر رشتے داروں کی بے حسی کا ذکر کرتے رہے جو غریب رشتے داروں کو پوچھتے تک نہیں، احمد شاہ نے اسپتال کے سارے بل بھرے تھے، لیکن انور میاں کا موڈ پھر بھی بے حد خراب تھا۔ یہاں تک کہ وہ بیمار بی بی کو بھی باتیں سناتے رہے تھے۔

"شادی ہمارے معاشرے میں اکثر ون وے ہوتی ہے۔ یہ وہ زندگی ہے جہاں سے انسان واپس مُڑ کر نہیں آ سکتا۔ حسن آرا نے بھی ساری عمر اس رشتے کو نبھانے کی کوشش کی یہ اور بات ہے کہ وہ اسے نبھاتے نبھاتے روگی ہو گئی!" روشن آرا بیگم کے لہجے میں بے حد دُکھ تھا۔

بہن کا مرجھایا چہرہ اُن کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا تھا۔ شادی شدہ زندگی میں شوہر کی محبت اور توجہ عورت کو ہرا بھرا کر دیتی ہے تو اُس کی لاپروائی اُس کو مرجھا کر رکھ دیتی ہے۔ اور حسن آرا بھی ایک مرجھایا ہوا پودا تھیں۔

"اماں جان! کیا کوئی لڑکی اگر اپنے شوہر کے ساتھ خوش نہ ہو تو بھی اُسے اُس کے ساتھ ہی رہنا ہوگا؟" نگی نے معصومیت سے پوچھا۔

"ہاں بیٹا! عورت کے لیے تو اُس کا شوہر ہی سب کچھ ہوتا ہے چاہے وہ کیسا بھی ہو!" روشن آرا بیگم نے کہا۔

نگی کے دل و دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی اور اُس کا معصوم دل سہم کر رہ گیا۔

"روشن! میرا خیال ہے کہ تم علیزے کا رشتہ عبدالولی کے لیے مانگ لو، اس سے حسن آرا کو سکون و خوشی ملے گی۔" احمد شاہ کو روشن آرا عبدالولی کی رضا مندی پہلے بتا چکی تھیں اس لیے آج انہوں نے شوہر کے سامنے کھلم کھلا شادی کی بات کی تھی۔ اس قدر پریشانی میں بھی یہ بات روشن آرا بیگم کے چہرے کو کھلا گئی۔

"آپ کی اجازت ہے؟" وہ گویا ہوئیں۔

"بالکل! مجھے آج وہ بچی بے حد اچھی لگی۔ ہمیں ایسی ہی خیال کرنے اور پیار کرنے والی بہو چاہیے تھی۔" احمد شاہ نے کہا۔ عبدالولی کے چہرے پر بے حد پرسکون مسکراہٹ تھی۔

"کیا اماں جانی! آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟" نگی نے پرجوش ہو کر پوچھا۔

"یہی کہ علیزے تمہاری بھابی بن کر اس گھر میں آئے گی۔" روشن آرا بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اللہ! کس قدر مزا آئے گا نا۔ میرے ساتھ بھی کوئی رہنے آئے گا۔" نگی نے خوشی اور معصومیت سے کہا۔

"جناب وہ کچھ دن کے لیے نہیں ہمیشہ کے لیے آئے گی، سوچ لو کہیں اماں بابا کی توجہ بٹ گئی تو تمہیں ہی سب سے زیادہ تکلیف ہوگی۔" عبدالولی نے شرارت سے کہا۔

"ایک اچھی سی بھابی کے لیے مجھے سب کچھ منظور ہے۔" نگی نے دل بڑا کرتے ہوئے کہا۔

"کیا وہ، وہ لگار کھی ہے؟" سید عبداللہ نے فکرمندی سے پوچھا۔

"سائیں! سید عاشق علی کی طبیعت بہت خراب ہے اور وہ ولایت سے واپس آ گئے ہیں، ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ بڑے شاہ صاحب نے کہا ہے کہ آپ کو بلا لاؤں تا کہ سائیں عاشق علی بی کے ہاں جایا جا سکے۔"

"اچھا فیصل! پھر ملاقات ہوگی اگر زندگی رہی تو۔" سید عبداللہ نے ڈاکٹر فیصل سے اجازت لیتے ہوئے کہا۔

"ارے ابھی تو آپ کی زندگی شروع ہوئی ہے اور آپ اس طرح کی اَنٹ شنٹ باتیں کر رہے ہیں۔" ڈاکٹر فیصل نے کہا۔

سید عبداللہ نے مشتاق کو جانے کا اشارہ کیا۔

"دراصل صبح جب میں گھڑسواری کے لیے نکلا تو میرے گھوڑے کی زین کی بکل توڑ دی گئی تھی، کل میرے دودھ میں زہر تھا، جسے ہماری بلی پی کر مر گئی۔ یہ سب باتیں میں نے ابھی تک کسی کو نہیں بتائیں لیکن کوئی ہے ضرور جو مجھے زندہ دیکھنا نہیں چاہتا۔" سید عبداللہ نے کچھ ایسے مطمئن انداز میں بتایا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

"اتنا کچھ ہو رہا ہے اور آپ خاموش ہیں۔" ڈاکٹر فیصل نے فکرمندی سے پوچھا۔

"زندگی، موت اللہ رحمٰن کے ہاتھ میں ہے، جب وہ بلائے گا تب ہر صورت جانا ہوگا لیکن اُس کی مرضی کے بغیر میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ یہ میرا یقین ہے میرا خیال کرنے کے لیے وہ ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والی ذات ہے نا!" سید عبداللہ نے بے حد مطمئن انداز میں کہتے ہوئے رخصت لی۔

"کچھ لوگوں کی زندگی میں واقعی اللہ پر یقین سے خیر پڑی رہتی ہے، جیسے کہ سید عبداللہ!" ڈاکٹر فیصل نے بے اختیار کہا۔

❖❖○❖❖

"آخر ترنم کہاں گئی؟" عبدالولی نے گاڑی کچھ ہی دور جا کر روک دی۔ وہ کہیں بھی نہ تھی اور سائے کا پیچھا نہیں کیا جا سکتا۔ کسی پہیلی کی طرح وہ لڑکی گنجلک بنی اُس سے ملتی تھی۔ عبدالولی نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کی جانب متوجہ ہو جاتا تھا۔

اُس کی بے حد اُداس آنکھیں جو زیادہ ترنم رہتی تھیں، یوں جیسے وہ تکلیف میں ہو، لیکن وہ تکلیف کیا تھی وہ نہیں جانتا تھا۔ اور وہ خود کیا تھی وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا اور جب اُس نے اُسے جاننے کی خواہش کی تو وہ کسی مجرم کی طرح اُس سے دور بھاگ گئی۔ عبدالولی ڈھیروں سوالوں سے گھبرا کر واپس گھر میں داخل ہوا تو روشن آرا بیگم اور احمد شاہ واپس آ چکے تھے۔

"کیا ہوا اماں جان! خیریت تھی؟" عبدالولی نے سلام کے بعد روشن آرا بیگم سے خالہ کی طبیعت پوچھی۔

"ہاں خیریت ہی رہی، اللہ نے بڑا کرم کر دیا، ہلکا سا انجائنا کا اٹیک تھا لیکن حسن آرا بے حد کمزور ہوتی جا رہی ہے، جانے کس چیز کا غم اُسے کھائے جا رہا ہے۔" روشن آرا بیگم نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

''چلو اچھا تم نے تو جلد ہی ہار مان لی ورنہ میں تمہاری خاطر تین مزید خواتین کو برداشت کرنے کو تیا
تھا۔'' ولی نے شرارت سے کہا۔ احمد شاہ اور روشن آرا بیگم ولی کی شرارت سمجھ کر مسکرا دیے جب کہ نِگی
ایک دم سنجیدہ ہوگئی۔

''اللہ بھائی! کس قدر مزا آئے کہ میری ڈھیر ساری بھابیوں والی خواہش پوری ہوجائے۔'' نِگی کی
احمقانہ بات پر ولی نے ایک دم لاحول پڑھی۔

''لڑکی! تم میرے لیے اتنا ہولناک مستقبل سوچے بیٹھی ہو۔'' عبدالولی نے خوف زدہ شکل بنا کر
پوچھا۔

''بھائی! میری دوستوں کی دو، دو تین، تین بھابیاں ہیں۔'' نِگی نے بچوں کی طرح جواب دیا۔

''کیا ایک ایک بھائی کی؟'' ولی نے پوچھا۔

''نہیں! سب کی ہے تو ایک ایک بیوی لیکن بھائی دو تین ہیں۔'' نِگی کے جواب پر سب کا مشترکہ
قہقہہ بلند ہوا۔

''آپ سب میری بات پر ہنس کیوں رہے ہیں؟'' نِگی نے برا مناتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں! تم کو ولی کے معاملے میں ایک بھابی پر ہی اکتفا کرنا ہوگا۔'' روشن آرا نے کہا۔

''امّاں جانی! کوئی کوئی آدمی دو شادیاں بھی کرتا ہوگا۔ ہم بھائی کی دو شادیاں کر دیں تو زیادہ رونق
ہوجائے گی نا؟'' نِگی کی بات پر روشن آرا نے دہل کر اُسے ٹوکا، کوئی وقت سنے جانے کا بھی ہوتا ہے، بات
پوری ہوجانے کا وقت!

''نِگی بیٹا! اب تم بڑی ہوگئی ہو بات کرتے ہوئے پہلے سوچ لیا کرو۔'' روشن آرا بیگم نے اُسے
سمجھاتے ہوئے کہا۔

''سوری امّاں جانی! میں تو اِس گھر میں اپنی تنہائی سے اِس قدر گھبرا جاتی ہوں کہ مجھے کسی دوست اور
سہیلی کی کمی کا احساس بے حد ہوتا ہے ایسے میں، میں نے اکثر بہن جیسی بھابیوں کی دعا کی تھی۔'' نِگی
نے اپنا موٴقف بیان کرنے کی کوشش کی۔

''بیٹا! ہم تمہاری شادی وہاں کر دیں گے، جہاں رونق ہو، لیکن تم ولی کے لیے اچھی اچھی باتیں سوچا
کرو۔'' وہ بولیں۔

''امّاں جان! کیا دو شادیاں بری بات ہے؟'' نِگی کے سوال تھے کہ ختم ہونے کو نہ آ رہے تھے۔

''بالکل بُری بات ہے۔'' روشن آرا نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ وہ نِگی کو اُس کی بچگانہ ... سے ہٹانا
چاہ رہی تھیں۔

''جی!'' نِگی نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

اُن میں سے کوئی نہ جانتا تھا کہ تقدیر اُن کے لیے کیسے کیسے سرپرائز لیے بیٹھی تھی۔ معصومیت میں مانگی
دعائیں ویسے بھی بہت جلد قبول ہوجاتی ہیں۔

❖❖○❖❖

دِن رات کی بے حد محنت کے بعد آخر کار عبدالولی کے فائنل ایگزام کا پروجیکٹ مکمل ہوگیا تھا۔

ہدالولی اپنے پروجیکٹ کو ملٹی میڈیا میڈیم پر بھی کرنا چاہ رہا تھا تاکہ وہ اُسے کمرشلی بیچ سکے۔ اُس کے
لیے اُسے کسی پروفیشنل کی مدد کی ضرورت تھی جس کے پاس سامان ہو، انتظام ہو ہر طرح کا شوٹ اور
امیشن کرنے کے لیے، اُس کے پاس اسٹوڈیو کی سہولت موجود ہو۔ ایسے میں اُسے سمعان علوی کا خیال
ایا جس سے اُس کی ملاقات طارق کے فارم ہاؤس پر ہوئی تھی۔

''میں طارق کو فون کرتا ہوں کہ مجھے سمعان کا نمبر دے!'' ولی خود کلامی کے انداز میں بولا مگر طارق کا
لبر تھا کہ مِل کے نہیں دے رہا تھا۔

''میرا خیال ہے سائرہ کے پاس بھی سمعان کا نمبر ہوگا۔'' ٹی ٹو نے مشکل کا حل پیش کیا۔

''ہوں! ٹھیک ہے اُسی سے نمبر لے لیتے ہیں۔'' ولی کہتے ہوئے ٹی ٹو کے ساتھ ڈرائنگ اسٹوڈیو چلا
ایا۔ اس وقت سائرہ اور مسکان کی کلاس ڈرائنگ اسٹوڈیو میں ہو رہی تھی۔ کلاس کے باہر بیٹھے
اسٹوڈنٹ نے بتایا کہ ہاف ٹائم ہے اس لیے اکثر اسٹوڈنٹس باہر کھانے پینے کے لیے گئے ہوئے ہیں۔

''ٹھیک ہے ہم انتظار کر لیتے ہیں۔'' ٹی ٹو نے سائرہ اور مسکان کے ایزل کے پاس پڑے اسٹول پر
ہلتے ہوئے کہا۔ ولی اور ٹی ٹو بہت سینئر طالب علم تھے اِس لیے اسٹوڈیو کے نگران نے انہیں اندر بیٹھنے کی
اجازت دے دی تھی ورنہ کسی کو اجازت نہ تھی کہ دوران کلاس اندر آ کر بیٹھے کیوں کہ ہر طالب علم کا بیگ
اور کتابیں وغیرہ کھلی رکھی ہوتی تھیں اور بریک ٹائم میں طالب علم اپنی ہر چیز کھلی چھوڑ کر باہر چلے جاتے
تھے۔

ولی موبائل پر طارق کو میسج کر رہا تھا، جب کہ ٹی ٹو نے حسبِ عادت کتابیں کھول کھول کر دیکھنی
شروع کر دیں۔ یہ کتابیں مسکان کی تھیں، اُس کے پاس ہی مسکان کی اسکیچ بک بھی پڑی تھی ٹی ٹو
اُسے بھی بے خیالی میں کھول بیٹھا۔

تھوڑی دیر کے لیے تو ٹی ٹو ہکا بکا ہی رہ گیا۔ وہ کبھی اسکیچ بک کو دیکھتا کبھی موبائل پر میسج کرتے ولی کو
دیکھتا۔ بیس، تیس کی شیٹس پر بنی یہ بڑی سی اسکیچ بک ولی کے پورٹریٹس سے بھری پڑی تھی۔

بس وہ شخص اچھا لگا اسے صاف کہہ ڈالا
دل کی بات تھی ہم سے منافقت نہ ہوئی

ایک اسکیچ کے نیچے لکھا ہوا الیہ شعر مُسکان کے دِلی جذبات عیاں کر رہا تھا۔

''تمہیں کیا ہوا؟'' عبدالولی کی نگاہ اچانک ٹی ٹو کے اُڑے چہرے پر پڑی تو اُس نے مسکرا کر پوچھا۔

''خدا کی قسم اگر کوئی مجھ پر یوں مرتا تو میں کبھی ناشکری نہ کرتا۔'' ٹی ٹو نے اسکیچ بک ولی کے سامنے
کرتے ہوئے کہا۔

ولی ایک دم چونکا۔ مسکان کی پسندیدگی اپنی حدود سے نکل کر محبت کی حد میں جا داخل ہوچکی تھی۔
عبدالولی نے نہایت خاموشی سے اسکیچ بک بند کر کے واپس رکھ دی۔

''کیوں! اب کیا گونگے کا گڑ کھالیا۔ جب میں کہتا تھا کہ وہ سنہری بالوں والی گڑیا تمہیں عجیب
نگاہوں سے دیکھتی ہے تو تم نہیں مانتے تھے، جب تم نے مائم کروایا تھا تو یہ لڑکی ساری دنیا سے بے خبر
تمہیں دیکھا کرتی تھی۔ تم اب بھی مکر جاؤ کہ ایسی ویسی کوئی بات نہیں۔'' ٹی ٹو نے ولی کی آنکھوں میں

دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ چلتے ہیں، میں نے طارق کو پیغام دے دیا ہے وہ خود ہی مجھے میسج کر دے گا۔" وا نے نگاہ چُراتے ہوئے کہا۔ مسکان کا اقرارِ محبت وہ اُس کی زبان سے سُن چکا تھا۔ ولی نہیں چاہتا تھا ا ایسے میں اُس کی جانب سے مُسکان کو کوئی خوش فہمی ملے۔

"اے بے نیازی کے بادشاہ! اے حضورِ اعلیٰ!" ٹی ٹو نے اُسے پیچھے سے پکارا۔

"کیا ہے یار؟" عبدالولی جو کچھ کام کی وجہ سے تھکا ہوا تھا کچھ مسکان کے جذبات جان کر بے ڈسٹرب ہو گیا تھا۔

"وہ تم سے محبت کرتی ہے یار ولی!" ٹی ٹو قدم بڑھاتا اُس کے پاس آیا۔

"لیکن میں اُس سے محبت نہیں کرتا!" عبدالولی نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

"لیکن وہ بہت اچھی لڑکی ہے اور تمہیں چاہتی بھی بہت ہے ایسے میں کیا پرابلم ہے؟" ٹی ٹو کو مسکا سے ہمدردی ہونے لگی تھی۔

"اُس میں کوئی خرابی نہیں ہے! محبت کے جواب میں محبت دینا ضروری ہوتا ہے اور میری محبت کسی او کے لیے مخصوص ہو چکی ہے۔" عبدالولی نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے دِل کا راز عیاں کر دیا۔

"یار ولی! تم کو بھی کسی سے محبت ہو سکتی ہے؟" ٹی ٹو نے بے یقینی سے پوچھا۔

"کیوں! کیا میں نارمل انسان نہیں؟" ولی مسکرایا۔

"حرکتیں تو تمہاری پتھروں جیسی تھیں۔" ٹی ٹو نے سچائی سے اعتراف کیا۔

"میرا رویّہ میرے کردار کی ڈھال ہے! میں ہتھیلی پر دِل لیے پھرنے والے مَردوں میں سے نہیں ہوں۔" عبدالولی نے سنجیدگی سے کہا۔

"کون ہے وہ خوش نصیب، جس سے تم محبت کرتے ہو؟" ٹی ٹو نے اب کی بار کچھ تجسس اور دِل چسپی سے پوچھا۔

ولی اور ٹی ٹو دونوں نہیں جانتے تھے کہ سائرہ اور مسکان اسٹوڈیو آ چکی تھیں اور اِس وقت بڑے سے ایزل کے پیچھے کھڑی اُن کی ہی گفتگو سُن رہی تھیں۔

مُسکان کا سارا وجود کان بنا ہوا تھا وہ ابھی آئی تھی سائرہ کو اُن کی باتیں سنتے دیکھ کر وہ بھی وہاں کھڑی ہو گئی تھی۔

"علیزے! اُس کا نام علیزے ہے۔" عبدالولی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مسکان کو لگا کہ سامنے کا منظر دھندلا گیا ہے۔ زمین ایک دم سے گھومنے لگی ہے، اُس نے سہارا لینے کے لیے پاس کھڑی سائرہ کا ہاتھ تھاما۔ لیکن صدمہ اِس قدر گہرا تھا کہ وہ خود کو سنبھال نہ سکی اور لہرا کر سائرہ کے بازوؤں میں آن گری۔

ٹی ٹو اور عبدالولی نے کھٹکے پر مڑ کر دیکھا اور تیزی سے آگے بڑھے۔

"اِسے کیا ہوا؟" ٹی ٹو نے پوچھا۔ سائرہ تو خود اِس صورتِ حال پر حیران و پریشان تھی۔

"کیا ہوا سائرہ؟" ولی نے بے ہوش مسکان کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ما...... معلوم نہیں!" سائرہ نے پریشانی سے جواب دیا۔

"اِن کو پلیز اٹھانے میں مدد دیں۔" عبدالولی نے سائرہ سے کہا جو خود ہاتھ پاؤں چھوڑے بیٹھی تھی۔

سائرہ، عبدالولی اور ٹی ٹو کی مدد سے مسکان کو سِک روم میں لے آئی لیکن اُسے ہوش نہ آ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے اِسے ہسپتال لے چلتے ہیں۔" ٹی ٹو نے مشورہ دیا۔

"ٹھیک ہے میں اِس کی آپا امّاں کو بھی فون کر دیتی ہوں۔" سائرہ نے کہا۔

"ولی بھائی پلیز! اُسے ہسپتال پہنچانے میں میری مدد کریں۔" سائرہ نے سنجیدہ کھڑے ولی سے کہا۔

"شیور!" عبدالولی نے فوراً ہامی بھری۔

زندگی میں کبھی کبھی انسان بنا قصور کے ہی قصوروار بن جاتا ہے، عبدالولی کو بھی اپنا وجود قصوروار لگ رہا تھا۔ مسکان کی بند آنکھوں میں وہ بہتا پانی، پانی نہ تھا بلکہ آنسو تھے۔

عبدالولی کے دِل میں عجیب سی چبھن تھی، جس کو وہ کوئی نام نہ دے پا رہا تھا۔

❖❖○❖❖

"برین ہیمبرج؟" سائرہ نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے ڈاکٹر کی بات دُہرائی۔

عبدالولی تھک کر وہیں بنچ پر بیٹھ گیا، وہ بے حد ذہین آدمی تھا بہت سی باتیں اُس کے زبردست مشاہدے کی وجہ سے اُس تک وقت سے پہلے پہنچ جاتی تھیں۔ مسکان کی نگاہ میں جو پیغام ہوتا تھا وہ اُسے پڑھ سکتا تھا۔ لیکن وہ اپنے دِل کا کیا کرتا جو کبھی اُس کی جانب مائل ہی نہ ہو سکا تھا۔

"مسکان! آئی ایم سوری!" عبدالولی نے دِل ہی دِل میں کہا۔ اُسے مسکان سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی اور ہمدردی میں محبت نہیں ہو سکتی!

"سائرہ، مسکان کدھر ہے؟" یہ آواز عبدالولی کو بہت قریب سے سنائی دی، جیسے ہی عبدالولی نے اپنا جھکا ہوا سر اُٹھایا تو مسکان کی آپا امّاں کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ اپنی بات کہتے کہتے رُک گئیں۔

"سید عبداللہ!" آپا امّاں نے کانپتی آواز اور کانپتے ہاتھوں کے ساتھ اُسے دیکھ کر اشارہ کیا۔ اُن کے چہرے پر اِس قدر مختلف رنگ تھے کہ ولی خود بھی بوکھلا گیا۔ لیکن اِس ساری بوکھلاہٹ میں بھی وہ آپا امّاں کے منہ سے نکلنے والے الفاظ کو نہ بھولا تھا، ایسے ہی تاثرات کا اظہار ایک بار پہلے وہ تب دیکھ چکا تھا جب وہ میاں جی کے گاؤں گیا تھا اور وہاں ایک کھنڈر حویلی کی سیر کرتے ہوئے گاؤں کا ایک آدمی اُسے ملا تھا۔ اُس نے بھی اُسے سید عبداللہ کے نام سے پکارا تھا۔

"سید عبداللہ!" یہ نام اُسے کچھ مانوس سا لگا تھا اور دنوں اُسے ڈسٹرب کیے رکھا تھا۔ اب یہ عورت بھی اُسے اِس نام سے پکار کر پریشانی و حیرانی سے تک رہی تھی۔ وہ جسے اپنا وہم، اپنا تصور خیال کرتی تھیں وہ تو حقیقت تھا! آپا امّاں دِل میں سوچتی ہوئی کبھی مسکان کو اور کبھی عبدالولی کو تکے جا رہی تھیں۔

"آپا امّاں! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" سائرہ نے اُن کے گم سم ہوتے وجود کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آ۔ ہاں!" وہ اب تک بوکھلائی ہوئی تھیں۔

"یہ عبدالولی بھائی ہیں، طارق بھائی کے بیسٹ فرینڈ اور ہمارے سینئر بھی ہوتے ہیں کالج میں۔"

سائرہ نے عبدالولی کا مکمل تعارف کرواتے ہوئے بتایا۔

''کیا؟''

''کیا واقعی تمہارا نام عبدالولی ہے؟ آپا امّاں کی آواز سرگوشی میں تبدیل ہو گئی، جیسے وہ کوئی راز والی بات پوچھ رہی ہوں۔

''جی ہاں!'' عبدالولی نے حیرت سے اُس عورت کو دیکھا، جو مسلسل اسے تکے جا رہی تھی۔

''تمہاری بہن کا نام نگینہ ہے نا؟'' آپا امّاں نے ڈوبتے دل سے پوچھا۔ ولی کو وہ عورت بے حد عجیب لگی تھی اور اُس کے سوال پر وہ بے اختیار چونکا تھا۔

''یہ نگینہ کو کیسے جانتی ہے؟'' ولی نے من میں سوچا۔

''آپ میں سے سائرہ کون ہے؟'' ڈاکٹر نے ایک دم باہر آ کر پوچھا تو کچھ پَل کو سب کی توجہ اُس کی جانب ہو گئی۔

''جی میں ہوں!'' سائرہ نے آگے بڑھ کر کہا۔

''آپ مریضہ کی کیا لگتی ہیں؟'' عمر رسیدہ ڈاکٹر نے پوچھا۔

''جی وہ میری بہن جیسی ہے۔'' سائرہ نے سچائی سے جواب دیا اور یہ سچ ہی تھا۔ کیوں کہ سائرہ مسکان کے لیے اپنے دل میں بہنوں جیسی تڑپ محسوس کر رہی تھی۔

''آپ میرے ساتھ آیئے!'' ڈاکٹر سائرہ کو لے کر اندر چلی گئی۔

''جی ڈاکٹر صاحبہ! مسکان تو ٹھیک ہے نا؟'' سائرہ نے پریشانی سے پوچھا۔

''اُس کا بے حد خیال کرنا ہوگا کہ وہ آئندہ کسی قسم کی ٹینشن یا کسی کام کا Stress نہ لے اور!'' ڈاکٹر کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔

''اور کیا؟'' سائرہ نے پوچھا۔

''اور یہ کہ یہ ولی کون ہے؟'' ڈاکٹر کے ایک دم پوچھنے پر سائرہ گڑبڑا گئی۔

''جی؟'' سائرہ نے نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔

''بے ہوشی میں بھی وہ کسی ولی کو مسلسل پکارتی رہی ہے یا پھر سائرہ یعنی آپ کا نام لیا تھا۔ میں بھی ایک ماں ہوں اور نوجوان نسل عموماً اپنی پہلی پہلی محبت کے لیے جذباتی ہوتی ہے، میں بچی کی بدنامی نہیں چاہتی تھی، اس لیے آپ کو تنہائی میں لا کر بتایا ہے۔''

''جی! ولی ہمارا سینئر ہے اور مسکان شاید اُسے پسند کرتی ہے!'' سائرہ نے سر جھکا کر جواب دیا۔

''اوہ! میرا اندازہ درست تھا۔ آپ کو خیال کرنا ہوگا کہ اب اُسے کوئی دُکھ کی خبر نہ ملے ویسے بچی کے والدین کدھر ہیں؟ مجھے یہ سب باتیں اُن سے کرنی چاہئیں۔'' ڈاکٹر نے سائرہ سے کہا تو سائرہ کو ایک دم آپا امّاں کا خیال آیا، جو ولی کو دیکھ کر پریشان ہو رہی تھیں۔

''میں بھیجتی ہوں، مسکان کی والدہ باہر ہیں۔'' سائرہ کہتے ہوئے اُٹھی۔

''ویسے اب مسکان خطرے سے باہر ہے نا؟'' سائرہ نے مُڑ کر پوچھا۔

''جی ہاں!'' ڈاکٹر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''مسکان کیسی ہے؟'' آپا امّاں بے تابی کے ساتھ سائرہ کی جانب بڑھیں۔

''آپ آیئے میرے ساتھ، ڈاکٹر آپ سے ملنا چاہ رہی تھیں۔'' سائرہ آپا امّاں کو لیے اندر چلی گئی تو ...نے ایک گہرا سانس بھرا۔

''میرا خیال ہے کہ ہم چلتے ہیں، شام کو واثق کے ہاں سے ٹرانسپیرنسیز بھی لینی ہیں۔'' ولی نے ٹی ٹو ...کہا۔ تھیسز کے ڈسپلے کی ڈیٹ قریب آ رہی تھی ولی کو اُس کی بھی ٹینشن تھی۔

''چلو یار! چلتے ہیں یہاں تو خواتین تمہیں اِس قدر میٹیریلس انداز میں دیکھتی ہیں، جیسے تم کمبھ کے فلمی ...میں کھوئے ہوئے اُن کے گم شدہ لختِ جگر ہو۔'' ٹی ٹو کا اشارہ آپا امّاں کی جانب تھا جن کا رویّہ ولی ...کچھ عجیب سا تھا۔

''ایسا کیوں ہے؟ آئی کانٹ انڈرسٹینڈ! چلو یار کام بہت پڑا ہے۔'' ولی، ٹی ٹو کے ساتھ بہت ...ت کے ساتھ ہسپتال سے نکلا تو سامنے آتے ایک شخص سے بُری طرح ٹکرا گیا۔

''سوری ویری سوری!'' ولی نے اُس سے معذرت کی جب کہ وہ ولی کو ہونقوں کی طرح دیکھ رہا تھا۔

''سائیں عبداللہ!'' اُس نے کہا۔

ولی جاتے جاتے ایک دم رُک گیا۔ تیسری بار وہ ایک ہی نام سُن رہا تھا۔

''کیا کہا آپ نے؟'' ولی نے مڑ کر پوچھا۔ جب کہ وہ شخص ڈر کر بھاگ گیا۔ عبدالولی کے ماتھے پر ...ک دم تیوری آ گئی تھی۔

''مجھے لگتا ہے کہ آج تمہاری شکل کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے، کوئی تمہارے پورٹریٹ بنا بنا کر برین ...ہرج کروا لیتا ہے، کوئی تمہیں دیکھ کر ڈر کر بھاگ جاتا ہے۔ آج پہلی بار مجھے اپنی معمولی شکل و صورت ...ر ہو رہا ہے۔'' ٹی ٹو نے ولی کی سنجیدہ شکل دیکھتے ہوئے اُسے ہلکا پھلکا کرنے کی کوشش کی۔

''کچھ نہ کچھ ہے تو ضرور جو بی ہائنڈ دا اسکرین ہے!'' ولی نے سوچتے ہوئے کہا۔

''کم آن یار! کیا ہو سکتا ہے بی ہائنڈ دا اسکرین؟ اجنبی لوگ، جن کو تم جانتے تک نہیں تو پھر بھلا کیا ...ت ہو سکتی ہے؟'' ٹی ٹو اُسے کھینچ کر باہر لے آیا۔ لیکن عبدالولی کا دماغ مسلسل ایک ہی نام کو سوچے ...ا رہا تھا۔ یہ سید عبداللہ کون ہے؟

''سید عبداللہ! کتنا مانوس سا لگتا ہے یہ نام!'' عبدالولی نے سوچا۔

سید عبداللہ! کون ہے وہ؟'' عبدالولی کا ذہن ایک ہی نقطے پر اٹک کر رہ گیا تھا۔

❖❖○❖❖

''رمضان یہ کام ہو جانا چاہیے، میں کوئی بھی کوتاہی برداشت نہ کروں گا۔'' سید سرفراز نے کتوں کی ...بریں دوسرے ملازم کو تھماتے ہوئے کہا۔ وہ روز اِس وقت اپنے پالے ہوئے کتوں کا معائنہ کرنے آتا لیکن آج اُس کا یہاں آنے کا مقصد کچھ اور تھا۔

سید عبداللہ اور سید نوازش علی آج رات سید عاشق علی سے ملنے اُن کے ہاں جانے والے تھے اور سید ...راز چاہتا تھا کہ سید عبداللہ پر ایک کامیاب حملہ ہو اور اُسے مار دیا جائے۔

''لیکن سائیں! آپ بھول رہے ہیں کہ گاڑی میں بڑے سائیں بھی ہوں گے۔''

رمضان عرف رمضو کے لیے یہ بات ہضم کرنا مشکل تھی کہ ایک بیٹا باپ اور بھائی دونوں کا دشمن ہو سکتا ہے۔ چلو بھائی تو ماں کی جانب سے سوتیلا تھا لیکن باپ تو سگا تھا۔

''رمضان! کبھی کبھی کچھ حاصل کرنے کے لیے کچھ قربانیاں دینی پڑتی ہیں، ویسے حملہ تو بھائی صاحب پر ہوگا، بابا سائیں ہمارا ٹارگٹ نہیں ہیں۔'' سید سرفراز لالچ اور بے حسی کی اُس انتہا پر کھڑا تھا، جہاں بھی خونی رشتہ اُسے نظر نہیں آ رہا تھا زمین اور حکمرانی کا لالچ اُسے اندھا کر چکا تھا۔ اور وہ ہر حد پار کر کو بے چین تھا۔

''اِس کام کے لیے جگو کو بھیجو، اُس کی شکل سب کے لیے اجنبی ہے۔ کام مکمل ہو یا نامکمل دو صورتوں میں اِس کی زبان پر ہمارا نام نہیں آنا چاہیے۔'' سید سرفراز نے کڑی وارننگ دی تھی۔

''جی سائیں! جیسا آپ چاہیں گے، ویسا ہی ہوگا۔'' رمضو نے سر جھکا کر تابع داری سے کہا اور اُ قدموں واپس مڑا۔

''ہونہہ! چلے ہیں حاتم طائی بننے۔ زمین دی جا رہی ہے ہسپتال کے لیے، پیسا لگایا جا رہا ہے ا کے اسکول کے لیے تاکہ کل کو یہ ہی کیچوے جیسے انسان، شیر بن کر ہمیں اور ہماری حکم رانی کو اُدھیڑ کر دیں!

''نہیں بھائی صاحب! آپ جیسے لوگوں کا ہمارے ہاں کیا کام؟ آپ تو جنتی بندے ہیں! اور آ اپنی جنّت میں جلد از جلد چلے جانا چاہیے۔ آپ کی جنت آپ کا انتظار کر رہی ہے!'' سید سرفراز زوردار قہقہہ لگایا۔

''اور اُس جنت میں جانے کے لیے آپ کو مرنا ہوگا۔'' سید سرفراز نے ایک اور سفاکانہ قہقہہ لگایا ا اندر تک اپنی کامیابی کا یقین تھا۔

❖❖ ○ ❖❖

''تائی جی!'' عائشہ نے سسکی بھری۔

''حوصلہ رکھو دھی رانی! زندگی اور موت تو اُس سوہنے رب کے ہاتھ میں ہے، اُس سے عاشق زندگی مانگو۔'' زلیخا بی بی نے عائشہ کو گلے لگاتے ہوئے حوصلہ دیا۔

''چلو اُٹھو چلنے کی تیاری کرو، باپ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔'' زلیخا بی بی نے عائشہ کو تیاری کرنے لیے اُٹھایا۔ عائشہ بوجھل قدموں سے باہر نکل گئی۔

''زلیخا بی بی نے ایک گہرا سانس بھرا۔ اُن کے دل پر بہت بوجھ تھا۔ عاشق علی نے اُن کی نند سے ملنے کا اصرار کیا تھا۔ وہ فاطمہ، جس کی زبان اُس نے اپنے ہاتھوں سے کاٹ ڈالی تھی جو گزشتہ برس سے ایک کمرے میں بند زندہ لاش کی طرح رہ رہی تھی۔ اِس حویلی کے مرد ہمیشہ سے عورتو زندگی سے کھیلتے آئے تھے لیکن اپنے اس عمل پر وہ کبھی نہ پچھتائے تھے، پہلی بار کوئی پچھتایا تھا لیکن نوازش علی کسی طور فاطمہ کو لے جانے پر آمادہ نہ ہوئے تھے۔ اُن کے خیال میں سید عاشق علی کی یہ خو سراسر حماقت تھی اور سید نوازش علی حماقتیں کرنے کے لیے پیدا نہیں ہوا۔'' سید نوازش علی نے دو انداز میں کہہ دیا تھا۔

''کاش سید نوازش علی تم مان لو کہ تم کس قدر برائی کی جانب جا رہے ہو، معصوم زندگیوں سے کھیلتے اے کاش تمہارا دل کانپ جائے اور تم اِس گھناؤنے کھیل سے باز آ جاؤ۔ تم میرے شوہر ہو میں تو ہیں بد دعا نہیں دے سکتی!'' زلیخا بی بی کے لہجے میں بے حد بے بسی تھی۔

❖❖ ○ ❖❖

''یہ زبیدہ کو کیا ہوا ہے؟ بہت خاموش رہنے لگی ہے۔'' جج صاحب نے ناشتے کی ٹیبل پر اپنی بھابی رہ اور چاند کی ماں سے پوچھا۔

''اب تو اُس کا بخار بھی اُتر گیا ہے لیکن جانے کیوں ہر وقت کمرا بند کیے خاموش بیٹھی رہتی ہے۔'' رہ چچی نے بھی فکر مندی سے کہا۔

''کیوں چاند بیٹا! کوئی بات ہوئی؟ وہ تمہارے تو بے حد قریب ہے!'' سدرہ چچی نے خاموش بیٹھے، انٹے کو گھورتے چاند میاں سے پوچھا۔

''ہونہہ! قریب! میں بھی اسی خوش فہمی میں تھا۔ لیکن وہ تو ہمیشہ مجھ سے دور ہی رہی ہے۔'' چاند نے ار ہی اندر کلستے ہوئے سوچا۔

''چاند! بھابی بیگم تم سے کچھ پوچھ رہی ہیں، تم کہاں کھوئے ہوئے ہو؟'' جج صاحب نے چاند سے پھا انہیں چاند بھی کچھ عرصے سے اُلجھا اُلجھا نظر آ رہا تھا۔

''نہیں امی! میں بھی اِس بارے میں کچھ نہیں جانتا'' چاند کا صرف یہ ایک جملہ ادا کرنے میں سانس ولنے لگا تھا۔ وہ زوردار جھٹکے سے کرسی پرے کر کے اُٹھا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ڈائننگ روم سے نکل گیا۔

''اُسے کیا ہوا؟'' خود میں ہمیشہ گم رہنے والی سدرہ چچی بھی بیٹے کی اس تبدیلی پر حیران ہو کر بولیں۔

''بھابی بیگم! آپ پیار سے زبیدہ سے بات کریں کہ اُس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے، ہنستی کھیلتی ہماری بیٹی ں کیوں کملا گئی ہے؟ پھر چاند میاں کا رویّہ بھی کچھ عجیب سا ہے، جانے یہ بچے ہم سے کیا چھپا رہے ہ۔'' جج صاحب بے شک بے حد مصروف انسان تھے لیکن اولاد کے چہرے پر کیا لکھا ہے اُسے وہ پڑھ لیتے تھے۔

''شاید وہ کسی مضمون میں رہ گئی ہے۔'' سدرہ چچی کی سوچ بس اتنے تک ہی جا سکتی تھی کیوں کہ جج احب زبیدہ کی پڑھائی کے لیے بے حد سخت تھے۔ وہ بچپن سے ہی اگر کم نمبر لیتی تو ڈر کے مارے ں باپ سے چھپتی رہتی تھی۔

''ہوں! میرا خیال ہے آپ درست کہہ رہی ہیں کیوں کہ کچھ روز پہلے ایف اے کا رزلٹ آیا ہے، ہم ل کی گاؤں سے واپسی کا انتظار کر رہے تھے، آ کر رول نمبر دے تاکہ اُس کا رزلٹ پتا کروایا جائے۔ لین گاؤں سے وہ بیمار واپس آئی تو کچھ روز کے لیے ہم بھی یہ بات بھول گئے۔ یقیناً آتے ہی اُسے پنے رزلٹ کا پتا چلا ہوگا۔ شاید وہ اِس بار کم نمبر لے پائی ہے۔'' جج صاحب نے باآواز بلند اپنے الات کا اظہار کیا۔

''بھابی بیگم! میں تعلیم کے معاملے میں سخت تو ضرور ہوں لیکن سب سے زیادہ عزیز مجھے میری اولاد ہے۔ اُسے حوصلہ دیں کہ وہ یوں ڈر کر گم سم نہ ہو، میں اُس کا دوستوں جیسا باپ ہوں، مجھ سے ہر بات

شیئر کیا کرے۔'' جج صاحب کے لہجے میں اپنی بیٹی کے لیے بے حد فکر تھی۔

''جی اچھا!'' سدرہ چچی نے ہامی تو بھرلی تھی لیکن کسی سے بات کرنا یا دُکھ سکھ شیئر کر... نہ تھا وہ تو خود اپنے آپ میں کھوئی کھوئی رہتی تھیں۔

زبیدہ کے لیے چاند کا وجود انہیں غنیمت لگا کرتا تھا۔ وہ بِنا کہے زبیدہ کا خیال رکھتا آیا تھا اِس۔ سدرہ چچی کو کبھی زبیدہ کے معاملے میں اتنی فکر کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی، لیکن جانے کیا ہوا جو چاند بھی آنکھیں چرائے چرائے گھومتا تھا۔ اپنے خول سے باہر نکل کر کسی کی خبر گیری کرنا سدرہ چچی لیے ایک ناپسندیدہ کام تھا۔ اس لیے اُن کے ماتھے پر بے انتہا تیوریاں تھیں۔

''آخر یہ چاند آج کل کہاں گم رہتا ہے؟ گھر کی اُسے کوئی خبر نہیں رہتی۔'' وہ چاند سے بات کر اُس کے کمرے میں چلی آئیں۔

''چاند! تم مصروف تو نہیں؟'' انہوں نے چاند کے کمرے کی دہلیز پر کھڑے ہوکر پوچھا۔

''خیریت امی جان! آج آپ کو بیٹے کی اچانک یاد کیسے آگئی۔'' چاند، زبیدہ کی وجہ سے بے ڈسٹرب تھا کچھ ماں کی ہمیشہ کی لاتعلقی اُسے اندر سے جلاتی رہتی تھی اِس لیے وہ سدرہ چچی سے جلے انداز میں گویا ہوا تھا۔

''کیوں! کیا میں تمہارے کمرے میں نہیں آسکتی؟''

''آتو سکتی ہیں لیکن آج سے پہلے آئی نہیں اِس لیے میری حیرت کے اظہار پر آپ کی حیرت کیسی!''

''اچھا چھوڑو اِن باتوں کو، مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔'' وہ چاند سے کسی قسم کی بحث نہ چاہتی تھیں، کسی بات پر اُلجھ کر اُسے سلجھانے کے لیے اپنی دنیا سے باہر نکلنا نہ چاہتی تھیں، چاند نے حد دُکھ سے انہیں دیکھا، اُس کی ذات سے ماں کی لاتعلقی اُسے ہمیشہ تکلیف دیتی تھی۔

''جی کہیے!'' چاند نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''زبیدہ سے پوچھو اُسے کیا مسئلہ ہے؟ وہ میرے ساتھ کبھی بھی بے تکلف نہیں رہی لیکن تمہاری تو کے ساتھ بہت اچھی دوستی ہے، وہ تمہیں ہر بات بتاتی بھی ہے، بھائی صاحب اُس کے لیے بے پریشان ہیں۔'' سدرہ چچی نے اپنی ذمّے داری ہمیشہ کی طرح اُس پر لادتے ہوئے کہا۔ ان کی بات چاند کے لیے بھڑکتی آگ پر تیل کا کام کیا۔

''سوری امی جان! مجھے تو اِس معاملے میں معاف ہی رکھیں۔ نہ تو میری اُس سے کوئی دوستی ہے اور وہ اپنے معاملات مجھ سے شیئر کرتی ہے۔'' چاند تو اِس قدر تپا ہوا تھا کہ وہ اپنی بات کہہ کر وہاں رُکا بھی نہیں پہلی بار سدرہ نے فکر مندی سے اُسے جاتے دیکھا۔ بچوں میں جانے کیا بات ہوئی تھی جو اُن مزاجوں میں اِس قدر تبدیلی آگئی تھی۔

''آخر ہوا کیا ہے؟'' وہ کچھ کچھ حیرت اور پریشانی سے خود سے سوال کررہی تھیں۔ وہ نہیں جانتی کہ آنے والے دِنوں میں کیسا طوفان اُن کے گھر اُٹھنے والا ہے جو بربادی کی خبر لانے والا ہے بربادی جس کی آنچ اُن کے بیٹے کی زندگی کو جھلسانے والی تھی۔

❖❖○❖❖

''وہ تم سے ملنا چاہتا ہے!'' زلیخا بی بی نے خستہ حال فاطمہ بی بی سے کہا جو ٹکر ٹکر انہیں دیکھے جا رہی ...یں۔

''سید عاشق علی نے تمہاری زندگی تباہ کردی لیکن شاید اُسے اب پچھتاوا گھیر رہا ہے شاید اِسی لیے وہ تم ...ے ملنا چاہتا ہے۔'' زلیخا بی بی نے فاطمہ بی بی کے پتھر چہرے کو غور سے دیکھا۔ اُن کا دل بے اختیار ...ہتا تھا کبھی کبھی انہیں اُس کے چہرے میں سدرہ کا چہرہ دکھائی دینے لگتا تھا۔ کبھی مریم کا چہرہ دکھائی دینے ...ا تو اُن کا خود کا دم گھٹنے لگتا تھا۔

''اِس بے زبان سے آپ کیا باتیں کررہی ہیں؟ یہ آپ کی کسی بات کا جواب بھلا کب دے سکتی ...!'' سدرہ نے جل کر کچھ اونچی آواز میں کہا۔

''میں تو بس ایسے ہی بتا رہی تھی کہ یہ شاید اُس کی موت جیسی بیماری کی خبر سُن کر اُسے معاف ...ے۔'' زلیخا بی بی نے لڑکھڑاتے لہجے میں کہا۔

''کیوں امّاں جان! آخر یہ ہی کیوں اُسے معاف کرے۔ اگر اُس نے ظلم کیا ہے تو اللہ سائیں کی سزا ... لیے وہ تیار بھی رہے۔'' سدرہ نے تلخی سے کہا جب کہ اِس ساری گفتگو سے لاتعلق فاطمہ بالکل ...ش تھی۔

''خدا کے لیے فاطمہ کبھی رو ہی لیا کرو، ورنہ تمہاری آہیں کسی دِن ہم سب کو بھی برباد کردیں گی۔'' ...ا بی بی نے فاطمہ بی بی کو جھنجوڑا، جواباً وہ زلیخا بی بی کی جانب دیکھ کر مسکرائی۔

''کیا کچھ نہ تھا اِس زخمی مسکراہٹ میں۔'' فاطمہ بی بی کا چہرہ منعکس ہوتے محسوس ہوا۔

''نہیں میرے اللہ! میری بچیوں کے ساتھ تو ایسا کبھی نہ ہو، اے اللہ میری بچیوں کو اُن کے ہاں (بر) ...ر۔'' انہوں نے گڑگڑا کر دعا کی۔

❖❖○❖❖

''بابا سائیں میرا جانا کون سا اتنا ضروری ہے!'' سید سرفراز علی، سید نوازش کی بات پر گڑبڑا گیا تھا۔

''ضروری ہے بیٹا! بہت ضروری ہے۔'' سید نوازش علی نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''عاشق علی اپنی ساری زمینیں عائشہ کے نام لکھ رہا ہے تم یہ سارا معاملہ دیکھ لینا۔ ویسے تو عائشہ کے ... میں کوئی نہیں ہے لیکن ایسے موقعوں پر سو طرح کے شریکے نکل آتے ہیں۔ تم کو زمینوں کے ...ت کا اچھی طرح اندازہ ہے۔ عبداللہ کو تو میں نے ولایت بھیج کر بے کار کردیا ہے ہر وقت رنگوں اور ... میں مگن رہتا ہے یا پھر گاؤں والوں کے لیے خدمت خلق شروع کررکھی ہے۔'' سید نوازش علی، سید ...ند کے ہسپتال بنانے کے اقدام سے سخت خفا تھے۔ لیکن بیٹے کی محبت سے مجبور ہوکر انہوں نے ...ت دے دی تھی۔

''ولایت تو آپ نے خود بھیجا تھا انہیں!'' سید سرفراز نے دِل کی جلن باہر نکالی کیوں کہ اُسے بابا ... نے نہیں بھیجا تھا۔

...وہ تو ملکوں کا لڑکا باہر پڑھنے گیا تھا تو ہم کیوں اُن کا سر اونچا ہونے دیتے۔ ہمارے پاس کس چیز کی ... پھر عبداللہ پڑھائی میں اچھا تھا تو ...

ملکوں سے کسی طور کم نہیں۔'' سید نوازش علی نے سید عبداللہ کو پڑھنے کی اجازت بھی اس لیے دے دی تھی کہ وہ ملکوں سے مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔

عبداللہ شروع سے خوش قسمت رہا ہے کہ اُس کی ماں اپنے دس گاؤں کی زمین ساتھ لائی تھی اور اب بیوی بھی اچھی خاصی زمین ساتھ لا رہی ہے لیکن اُس کم عقل کو زمین سنبھالنی نہیں آتی، ہاتھ ملی طاقت ا استعمال نہیں کرتا۔'' سید نوازش علی کو عبداللہ کی ہر معاملے میں لاتعلقی سخت ناپسند تھی۔

''بس اب تم کو ہمارے ساتھ ہر صورت چلنا ہے ہم دس پندرہ منٹ میں نکلنے والے ہیں تم بھی ہا آجاؤ۔'' سید نوازش علی اتنا کہہ کر باہر نکل گئے جب کہ سید سرفراز ایک دم بوکھلا گیا۔ نہر پار اُس کے کارندے حملے کے لیے تیار بیٹھے تھے اُسے اپنا پلان بدل کر اُن کارندوں کو فوری اطلاع کروانی تھی۔ وہ عجلت میں حویلی کے پچھواڑے گیا، جہاں اُس نے رمضو کو فوراً بلوایا تھا۔

''جی سائیں!'' رمضو پھولی سانسوں کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ وہ بھاگتا ہوا یہاں تک آیا تھا۔

''تم فوراً میری جیپ لے کر نکلو اور جگو کو اطلاع کرو کہ سید عبداللہ پر حملہ جاتے ہوئے نہیں آتے ہوئے ہوگا۔'' سید سرفراز نے بے چینی سے کہا۔

''لیکن سائیں کیوں؟'' رمضو نے چابیاں پکڑتے ہوئے پوچھا۔

''اس لیے کہ بابا سائیں مجھے بھی ساتھ لے جانے پر مجبور کر رہے ہیں، میں انہیں مزید انکار نہیں کرسکوں گا، واپسی پر میں ایک روز بعد آؤں گا اس لیے میں اُن کے ساتھ نہ ہوں گا۔''

''جی سائیں! جیسے سرکار کا حکم۔'' رمضو بھاگتا ہوا نکلا۔

''سید سرفراز اپنی بات کہہ کر مڑا تو کچھ پل کو اُس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ بیل لپٹے ستون کے پاس سدرہ کھڑی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں سید سرفراز کے لیے کبھی بھی پیار ہوتا تھا۔ لیکن آج تو نفرت کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

سید سرفراز کو یوں لگا کہ سارا کھیل اُلٹ گیا ہے۔ اور وہ بُری طرح پھنسنے جا رہا ہے۔

❖❖○❖❖

''دیکھ فیصل! مجھے تو رانی بہت پسند ہے بڑی ہی پیاری بچی ہے۔'' ماسی صابراں نے فیصل کے سامنے بھنا گوشت اور ساتھ گھی سے چپڑی روٹی رکھی۔ آج ماسی صابراں نے اپنی سب سے عزیز مرغی حلال کر کے بیٹے کے لیے خاص طور پر گوشت بھونا تھا۔ یہ اُس کی محبت کے اظہار کا ایک طریقہ تھا۔

''اماں پلیز!'' فیصل اِس موضوع پر بات نہ کرنا چاہ رہا تھا۔

''یہ پولیس پولیس ماں کو کیوں سنا رہا ہے، اِس معاملے میں پولیس کہاں سے آ گئی؟'' ماسی صابراں نے معصومیت سے کہا۔ فیصل جو اس موضوع پر بُرا سا منہ بنا کر بیٹھا تھا ایک دم مسکرا دیا۔

''اوہ میری بھولی پیاری سی ماں! میں پولیس نہیں پلیز کہہ رہا ہوں جس کا مطلب ہے کہ اے میری پیاری اماں برائے مہربانی ابھی شادی کا موضوع نہ چھیڑیں۔ میں ہسپتال کے کام میں بے حد مصروف ہوں۔''

ابھی تو ہسپتال کی عمارت تیار ہو رہی ہے تو اِس قدر مصروفیت ہے۔ پھر اُس کے لیے مشینری اور عملے کا بھی کرنا ہے یہ ساری ذمے داری سید عبداللہ نے مجھ پر ڈال دی ہے۔ اگر وہ شخص معاشی اور اخلاقی طور پر میرا اِس قدر ساتھ دے رہا ہے تو میرا بھی فرض ہے کہ میں پوری ایمان داری اور توجہ سے اِس کام کو مکمل کروں۔

''لیکن پُتر! میں تو صرف رشتے کی بات کر رہی ہوں، بیاہ پھر سال چھ مہینے بعد سہی۔'' ماسی صابراں کو بیٹے کا بار بار اِس موضوع سے جان چھڑانا فکر مند کر رہا تھا۔

''اماں! مجھے کچھ سال شادی نہیں کرنی۔'' فیصل نے بالآخر دوٹوک جواب دے دیا۔

''لیکن کیوں؟ اگلے سال تو پورے انتیس سال کا ہو جائے گا۔ یعنی بلقیس کے پتر جتنا جس کا پہلا بیٹا اسکول میں پڑھتا ہے۔ نہ... نہ!''

''نہ جی پتر... میں نے اب تجھے بڈھا کر کے نہیں بیاہنا، لوگوں کے بیٹوں کے ہاں بچے بھی آ گئے اور تُو کنوارا کا کنوارا پھر رہا ہے۔''

''اماں! آپ کو پتا ہے کہ باہر کے ممالک میں چالیس سال شادی کے لیے آئیڈیل عمر سمجھی جاتی ہے۔'' فیصل کی بات نے ماسی صابراں کو تو دہلا کر رکھ دیا۔

''ہائے ربا! نہ پتر! اِس عمر میں تو بندہ اپنے بچے بیاہنے کی سوچتا ہے۔ توبہ توبہ انگریز بڈھے ہو کر شادی کرتے ہیں ہم کو نہیں کرنی اُن کی (نقل) میں تو تیری شادی جلد از جلد کر دوں گی۔ اگر تو باہر پڑھنے نہ جاتا تو میں ضرور تیرا بیاہ وقت پر کر دیتی۔'' ماسی صابراں نے یوں کہا، جیسے بہت سارا وقت گزر گیا ہو۔

''اماں مہربانی کریں، میں سکون سے کھانا کھا لوں؟''

''کھا پتر۔ رج رج کھا لیکن یہ تیرے بیاہ کا معاملہ میں نہیں ٹالنے والی۔'' ماسی صابراں کے ارادے خطرناک لگ رہے تھے۔

''اماں! آپ قیصر بھائی کی شادی پہلے کر دیں۔'' فیصل نے اپنی جان چھڑانے کے لیے قیصر کا ذکر کیا۔

''لو بھلا میں اُس کی شادی پہلے کیسے کر دوں ٹھیک ہے کہ وہ صرف سال ہی تم سے چھوٹا ہے پھر بھی شادی کی باری پہلے تمہاری ہے۔'' ماسی صابراں نے پریشانی سے بیٹے کو دیکھا جو بالکل اُلٹ بات کر رہا تھا۔ کبھی چھوٹوں سے بھی شادیاں شروع ہوئی ہیں۔ وہ معصوم عورت حیرت سے بیٹے کی بات کو سوچ رہی تھی۔

''اماں! تم باریوں کا انتظار نہ کرو بلکہ تم سب سے پہلے نفیسہ کی شادی کرو۔'' فیصل کو نئی سوجھی تھی۔

''باہر سے پڑھ کر آیا ہے جانتی ہوں میں۔ لیکن میٹھی مت مجھے نہ پڑھا!'' ماسی صابراں کو فیصل کا مشورہ ذرا نہ پسند آیا تھا۔

''بس مجھے رانی پسند ہے! اگر تجھے کوئی اور اچھی لگتی ہے تو بتا دے ورنہ میں رانی سے تیرا رشتہ پکا کر دوں گی۔'' ماسی صابراں کی دھمکی پر فیصل پہلی بار گڑبڑا گیا۔

''فیصل پتر! اپنی ماں کی دھمکیوں کو ایویں نہ سمجھنا یہ جو کہتی ہے زیادہ تر وہ کر دیتی ہے اور بندہ اس کے لیے پر گزارا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔'' فیصل کے بابا جو دوسری چارپائی پر لیٹے ماں بیٹے کی گفتگو

خاموشی سے سُن رہے تھے، لقمہ دے کر فیصل کو ڈرایا۔

''وہ جو محلوں میں رہنے والی رانی ہے میرے دِل میں آن بسی ہے، اب اُس کے بعد تو کسی اور کا خیال بھی ممکن نہیں ہے۔'' فیصل نے دل میں کہا۔

''امّاں! مجھے کوئی اور پسند ہے۔'' فیصل نے وہ بم پھوڑ ہی دیا، جو تباہی لا سکتا تھا۔ وہ اپنے دِل کی بات کہنے جا رہا تھا۔

''کون ہے وہ؟'' ماسی صابراں بیٹے کی شادی کے ارمان میں کوئی ناراضی نہ دکھانا چاہتی تھیں، اس لیے انہوں نے اشتیاق سے پوچھا۔

''آپ اُسے جانتی ہیں اور اُسے دیکھا بھی ہے۔'' فیصل نے گلا کھنکھارتے ہوئے کہا۔

''کون ہے؟'' ماسی صابراں نے کچھ سوچتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔ فیصل کے بابا بھی اشتیاق سے اُسے کو تک رہے تھے۔

''وہ۔ اُس کا نام سدرہ ہے اور وہ سید عبداللہ کی چھوٹی بہن ہے!'' فیصل نے دھماکہ کر دیا تھا۔

ماسی صابراں کے ہاتھ میں پکڑا اسلور کا گلاس ایک دم چھوٹ گیا اور اس کے بابا ایک دم لیٹے سے اُٹھ بیٹھے۔

''دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا؟'' وہ دھاڑے۔

''اگر سید عبداللہ دو لفظ پیار کے بول کر تجھے اپنے برابر بٹھا لیتا ہے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ تم ان کی برابری کرنے اُٹھ کھڑے ہو۔'' بابا کا غصّہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ اُن کا بیٹا ایسی حماقت بھی کرے گا، انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔

''بیٹا کبھی مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا ہے؟'' ماسی صابراں جوان بیٹے کو رام کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''امّاں! کسی کو پسند کرنے کا حق تو سب کو ہے۔'' فیصل نے دھیمی آواز میں کہا۔

''تم اس بارے میں سوچنا بھی نہ! سید نوازش علی کو تمہارے اِس ارادے کی خبر مل گئی تو وہ تمہارے وجود کے اتنے ٹکڑے کروائے گا کہ ہمیں، تمہیں رونے کے لیے کوئی قبر بھی نہ مل سکے گی۔'' بابا دھاڑتے ہوئے کہا۔

''کیسی خوف ناک باتیں کر رہے ہیں فیصل کے بابا!'' ماسی صابراں نے دہل کر شوہر کو ٹوکا۔

''ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اسے کہو کہ اپنی اِس ناسمجھی کو اپنے دِل میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دے۔ ہمیں اِس عمر میں زندہ درگور ہونے کے لیے تیار ہو جائے۔ سیدوں کی لڑکیاں ہمیشہ خالص رہتی ہیں! شادی تو ناممکن ہے پھر ہم جیسے کمیوں کے ساتھ تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کیوں یہ اِس عمر میں میرے میں خاک ڈلوانا چاہتا ہے۔'' بابا کی آواز ایک دم رُندھ گئی۔

فیصل جو سر جھکائے اُن کی ڈانٹ سُن رہا تھا، یک دم تڑپ کر اُن کے پاس آ بیٹھا۔

''بابا! میں جانتا ہوں کہ میں نے آسمان کا چاند مانگا ہے۔ لیکن بابا اللہ جب اِس دل میں اُس کا ڈال دے تو پھر وہ کیا کرے؟'' فیصل نے بے بسی سے سوال کیا۔

''نہیں بیٹا! تم کو اِس راستے سے واپس آنا ہو گا، میں تمہیں اپنے سامنے موت کے کنویں میں چھلانگ نہیں لگانے دوں گا۔'' بابا نے اِدھر اُدھر سر ہلا کر نفی میں جواب دیا۔

''بابا میں مجبور ہوں!'' فیصل کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''اگر تم اتنے مجبور ہو تو لو اِس سے میرا اور اپنی ماں کا سر کاٹ ڈالو۔'' بابا نے لکڑیوں کے ڈھیر سے کلہاڑی اُٹھا کر فیصل کے ہاتھ میں دے دی۔

''بابا!'' فیصل نے لرز کر انکار کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں! یہ ہی بہتر ہے۔ تمہاری ضد، ہمیں تمہارے بعد بھی مار دے گی اِس سے بہتر ہے کہ تم ہمیں اپنے ہاتھوں سے ختم کر دو۔'' بابا نے تھک کر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

فیصل نے ایک دُکھ بھری نگاہ اپنے ماں باپ پر ڈالی، جن کی آرزوؤں اور تمناؤں کا محور اُن کی اولاد تھی اور آج اُس کی بے بسی نے انہیں دُکھی کر دیا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اُٹھا اور بِنا کچھ کہے باہر نکل گیا۔

''فیصل۔'' ماسی صابراں نے پیچھے سے آواز دی۔

''جانے دو اُسے۔'' بابا نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''جوان بیٹے سے یوں بات کی جاتی ہے؟'' ماسی صابراں نے گھبرا کر کہا۔

''وہ بے حد دُکھی ہو کر نکلا ہے اُسے پیار سے سمجھا لیتے۔''

''نہیں! اُسے اِس راستے سے سختی سے روکنا ہو گا۔ یہ کون سا دور ہے جہاں ہیر رانجھا یا سسی پنوں کی بات کی طرح جان گنوا دی جائے۔ اُسے ہماری خاطر اِس سے دور رہنا ہو گا۔ وہ نہیں جانتا کہ سید نوازش اور سید سرفراز کتنے ظالم بھیڑیے ہیں۔'' بابا نے بیوی کو سمجھایا۔

''تم جورے کو بھول گئی ہو کیا؟ اُس کے معصوم سے بچے کے ساتھ اُس ظالم شخص نے کیا کیا؟ صرف اُن کے کتوں کی خوراک سے ایک بوٹی کھانے کا گناہ گار تھا وہ ننھا سا بچہ اور اُس بچے کی بوٹی بوٹی اُس کے کتے کھا گئے تھے۔ ایک انسان کے بچے کو سید نوازش علی نے کتوں کے سامنے ڈال دیا۔ وہ کس قدر جابر اور ظالم ہے اِس سے اندازہ کر لو۔ جو شخص اپنے کتوں کے معاملے میں اتنا سخت ہے تم سوچو کہ اپنی بیٹی کے معاملے میں تو وہ ہم سب کو ذلیل کر کے مار ڈالے گا۔'' بابا نے ماسی صابراں کو حقیقت بتائی۔

''تمہیں اُسے روکنا ہو گا یہ میرا فیصلہ ہے، اِسی میں ہم سب کی زندگی اور بھلائی ہے۔'' بابا کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور باہر نکل گئے۔ اور ماسی صابراں اپنے پیروں میں گرے سلور کے گلاس کو دیکھ رہی تھی جس میں سے پانی چھلک کر مٹی میں جذب ہو گیا تھا۔ اُن داستانوں کی طرح جو سید نوازش علی کے ظلم سے پیدا ہوئی تھیں اور ایک کے بعد ایک اس پانی کی طرح مٹی میں جذب ہو گئی تھی اور اُسے کوئی کچھ کہنے والا نہ تھا۔

فیصل نہیں جانتا تھا کہ اُس کے قدم بے اختیار درگاہ کی جانب کیوں اُٹھ رہے تھے۔ بوڑھے برگد تلے وہ نڈھال ہو کر بیٹھ گیا۔ یہ ہی وہ جگہ تھی جہاں اُسے عمر بھر کا روگ لگ گیا تھا۔

بس کچھ پَل... کچھ جادو اثر پَل اُس کی زندگی کو بدل گئے تھے وہ خوشبو جیسی لڑکی اُس کے حواسوں پر یوں چھائی کہ اُسے بے بس کر گئی۔ یا میرے اللہ! اچھی خاصی زندگی تھی تو نے مجھے اُس سے کیوں ملوایا؟

اور پھر اِس دل میں اُس کی اتنی طلب کیوں ڈالی؟ میں تو خود اپنی شدتوں پر حیران ہوں۔ کیا جذبے زندگی پر اِس طرح بھی حاوی ہو سکتے ہیں؟

"ہو سکتے ہیں!" وہ سوال جو اُس نے خود سے کیا تھا اُس کا جواب اُسے اُس کی پشت پر کھڑے شخص نے دیا تھا۔ فیصل نے ایک دم سر اُٹھا کر پیچھے دیکھا، وہ ہی درویش سامنے کھڑا تھا۔

"محبت ایک ایسا احساس ہے جو کسی کو چھو جائے تو وہ رب کو پہچان لیتا ہے، محبت ہی انسان کو ا... کی پہچان دیتی ہے، محبت کی توفیق بھی کسی کسی کو ملتی ہے۔ عشق مجازی ہی عشق حقیقی کی پہلی سیڑھی... محبت ہی تو عشق کے ساتھ تعارف کرواتی ہے ایک ایسے جذبے سے جو بالکل سچا ہے۔" درویش... عادت اپنے آپ میں نہ تھا۔ فیصل کسی معمول کی طرح اُسے دیکھ رہا تھا۔

"یہ شخص ہمیشہ میرے دِل کے بھید پڑھ لیتا ہے یہ کون ہے؟" فیصل نے سوچا۔

"نہ... نہ! ایسا نہ کہہ!" درویش نے اپنی لاٹھی زمین پر ماری، جس کے ساتھ گھنٹی بندھی ہوئی تھی زمین پر لگنے سے بجنے لگتی تھی۔

"بھید سارے صرف ایک ہی ذات جانتی ہے وہ ہی جانتا ہے کہ کل کیا ہونے والا ہے اور کوئی کچھ نہیں جانتا!" درویش کہتا ہوا مست انداز میں آگے بڑھا۔

"بابا۔ بابا!" فیصل ایک دم اُس کے پیچھے بھاگا۔

"تم میرے متعلق اتنا کچھ جانتے ہو تو بتاؤ کیا مجھے میری محبت ملے گی؟" فیصل نے بے تابی سے پوچھا۔

"ہٹ پرے! تجھے کہا نا کہ جاننے والا صرف ایک ہی ہے میں بھلا کیا جان سکتا ہوں؟" فقیر نے... مناتے ہوئے کہا۔

"بابا پلیز! میری مدد کرو میں اِس جذبے کی تپش سے ایسا جھلس رہا ہوں کہ تن من عجیب سے اوپرے اوپرے لگتے ہیں۔" فیصل کو اپنے احساسات کا ٹھیک سے بتانا بھی نہ آ رہا تھا۔

"تن میں لگی ہے؟" فقیر نے مُڑ کر ایک دم دِل چسپی سے پوچھا۔

"ہاں۔" فیصل نے اقرار کیا۔

"من میں بھی لگی ہے؟"

"ہاں بابا۔" فیصل بولا۔

"تو پھر ٹھیک ہی ہے تیرا جذبہ سچا ہے تو ضرور پائے گا۔" فقیر کے منہ سے یہ بات سُن کر فیصل ایک دم خوش ہو گیا۔

"لیکن!"

"لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ تو اپنی مرضی ہی کی مراد پائے۔ اب یہ تو دینے والے پر منحصر ہے کہ وہ کیا دیتا ہے، وہ تجھے بھی دے گا ضرور دے گا تو اُس کی بہت قدر کرنا کیوں کہ وہ تیرے مقدر میں لکھ دی گئی ہے۔"

"تو ضرور پائے گا! ضرور پائے گا اب یہ دینے والے پر منحصر ہے وہ تجھے کیا دیتا ہے!" فقیر اپنی بات

مسلسل دُہرا رہا تھا۔ فیصل اُس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ ایک بار پھر اپنے چہرے پر ازلی اجنبیت سجائے بڑے بڑے قدم اُٹھاتا چلا گیا۔

الف اللہ! بس تو ہی سچا۔

الف اللہ! اِک تیرا رشتہ۔ بس وہ ہی سچا۔

الف اللہ! بس تو ہی سوہنا!

الف اللہ! بس تو ہی ہے باقی رہنا۔

الف اللہ! بس تو ہی سچا۔

فقیر کی آواز میں بے حد مٹھاس تھی، جیسے وہ اپنے محبوب سے دُلار کر رہا ہو، اپنے پیار کا اظہار کر رہا ہو۔

الف اللہ! تو ہی سب سے بڑا۔

فقیر کی آواز دور جا رہی تھی۔ فیصل بالکل سیدھا کھڑا ہاتھ چھوڑے اُسے جاتا دیکھ رہا تھا۔

"مجھے دِل کی لگی ہے بابا تم دعا کرو کہ وہ مجھے مل جائے۔" فیصل نے اُسے جاتے دیکھ کر کہا۔ وہ ڈھیلے ڈھالے قدموں سے اندر درگاہ میں فاتحہ پڑھنے کے لیے بڑھا۔ ایک عورت اُس کے پاس سے گزری اور پھر واپس مُڑی۔

"ڈاکٹر باؤ کیا حال ہے تیرا؟" عورت نے خوش اخلاقی سے پوچھا۔ فیصل نے بے خیالی سے اُسے دیکھا۔ اُسے وہ جانی پہچانی تو لگی تھی لیکن اُسے یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ اُس نے اُسے کہاں دیکھا ہے؟

"ٹھیک ہوں شکر الحمدللہ! میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔" فیصل نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں بشیراں ہوں ڈاکٹر باؤ۔" بشیراں کا انداز ایسا تھا کہ جیسے وہ کوئی مشہور شخصیت ہو اور فیصل کا نہ پہچاننا حیران کن ہو۔

"کون؟" فیصل نے کچھ بیزار ہوتے پوچھا۔

"وہ میں بڑی حویلی میں کام کرتی ہوں، میں سدرہ اور مریم بی بی کی خاص ملازمہ ہوں۔" بشیراں نے ہوا میں تیر چلایا۔ وہ اتنا تو اندازہ کر چکی تھی کہ اِس لڑکے کا حویلی کی بیبیوں میں سے کسی ایک کی طرف جھکاؤ تھا۔ لیکن کس کی طرف وہ یہ جاننا چاہتی تھی۔

اب کی بار فیصل اُسے نظر انداز نہ کر سکا۔

"اچھا!" فیصل بس اتنا ہی کہہ سکا۔ اُس کی نظروں کے سامنے کچھ دیر پہلے اپنے ماں باپ کا چہرہ لہرا گیا تھا، اِس لیے وہ فوراً محتاط ہو گیا۔ بشیراں کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ڈاکٹر باؤ نے تو کوئی دِل چسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

"ڈاکٹر باؤ! میں بہت کام کی چیز ہوں، کبھی کوئی کام ہو تو ضرور بتانا۔ بیوہ ہوں بہت غریب ہوں میرے پانچ لڑکے اور چھ لڑکیاں ہیں سب چھوٹے چھوٹے ہیں، تین وقت پیٹ بھر کر کھانا تک نہیں ملتا۔ تم بڑے لوگوں کا کام کر کے ہمیں دو پیسے ہی مل جائیں گے۔" بشیراں نے کھلے ڈھلے لفظوں میں مدد کی پیش کش کی تھی۔

فیصل نے حیرت سے اُس عورت کی پیش کش کو سنا اور غور کرنے لگا۔ عجیب طرح کا لالچ اُس میں آیا۔ ایک پَل کو فیصل کا دِل چاہا کہ ہر طرح کی مصلحت بالائے طاق رکھ کر وہ سدرہ کو ملنے کا دے، دے۔

''میں تم پر کیسے اعتبار کرلوں؟'' فیصل نے بے اعتباری سے کہا۔

''آپ کے پاس اللہ نے میری صورت میں ایک وسیلہ بھیجا ہے، ورنہ بڑی حویلی میں کوئی داخل ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔'' بشیراں کو ڈاکٹر باؤ کے رویے سے خاصی مایوسی ہوئی تھی۔

''اچھا تم میرا ذکر بیبیوں کے سامنے کردینا۔ اگر تم اُن کے لیے قابل اعتبار ہوئیں تو وہ تمہارے ذریعے مجھے پیغام دے دیں گی۔'' فیصل نے محتاط انداز میں کہا۔

''لیکن میں آپ کا ذکر کس بی بی کے پاس کروں؟'' بشیراں نے اُلجھتے ہوئے کہا۔

''تم بس دونوں کے سامنے کہہ دینا کہ ڈاکٹر باؤ تمہیں ہر جمعرات کو درگاہ پر ملتا ہے وہ بھی وہاں جلانے آتا ہے۔ جس کو تم پر اعتبار ہوگا وہ خود بول پڑے گی۔'' فیصل نے نہایت ہوشیاری اور عقل مندی سے کام لیا۔ اُس نے اِن ڈائریکٹ اپنا پیغام بھی دے دیا تھا۔

''اچھا ڈاکٹر باؤ، کہہ دوں گی۔'' بشیراں بدمزہ ہوگئی۔ ڈاکٹر باؤ اُس کی سوچ سے کہیں زیادہ عقل مند تھا۔

❖❖○❖❖

آپا بے حد خفا ہیں کہ اُس وفاقی وزیر پر اتنا وقت برباد کیا۔ لیکن عین وقت پر سنہری کا اتنا بُرا ایکسیڈنٹ ہوا کہ وہ اپنا پروجیکٹ مکمل کر ہی نہ سکی۔'' ماہی نے ڈائٹ کوک کا ٹِن کھول کر سوہنی اور پھر ترنم کو پکڑایا۔

''لیکن میں حیران ہوں کہ آخر سنہری کا کون اتنا دشمن تھا، جس نے اُس پر یہ حملہ کروایا۔'' سوہنی ابھی تک سنہری کی حالت کی وجہ سے بے حد خوف زدہ تھی۔

''ہم جس ماحول اور دنیا کے لوگ ہیں وہاں ہمارا کوئی دوست نہیں ہوسکتا یہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔'' ترنم نے زہریلی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

''کسی حد تک ترنم ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' ماہی نے بھی ترنم کی بات سے اتفاق کیا۔

''کیا مطلب؟'' سوہنی جو اپنے نام کی طرح بے حد سوہنی تھی اُس نے نہ سمجھنے کے انداز میں پوچھا۔

''وہ دو سال تک ایک جاگیردار کے لیے بُک تھی۔ جاگیردار نے اُسے بُک کرنے سے پہلے میڈم چاندنی سے کہا تھا کہ اِس دوران اِس کا کوئی مزید عاشق نہ پیدا ہوگا اور نہ ہی یہ خود کسی سے ملے گی اور جب جب وہ شہر آئے گا تو وہ اتنے دِن مکمل طور پر اُس کے ساتھ رہے گی۔ ایسے میں وہ جب ہفتے یا مہینے کے لیے آتا تو سنہری کو بے حد پریشانی ہوتی، وہ ہر وقت اسے اپنی کوٹھی میں بند رکھتا کوئی فون کال تک اٹینڈ کرنے کی اجازت نہ دیتا۔''

''اب... سنہری کھلی فضاؤ میں اُڑنے والی تتلی اور ہر وقت بھنوروں میں گھری رہنے والی کہاں اتنی پابندیاں سہنے والی تھی۔ وہ اکثر اُس جاگیردار کو گالی دے کر کہا کرتی تھی کہ کم بخت مجھے اپنی بیوی سمجھنے لگا ہے، سنہری اُس سے بیزار رہنے لگی تھی، جب وہ نہ ہوتا تو وہ فارغ رہ رہ کر بور ہونے لگی تھی۔'' ماہی نے

اُسی کنزرویٹو نے جب سنہری کو کسی وقت اُس وفاقی وزیر کے ساتھ دیکھا تو اُس نے سنہری کو بھی دی تھی لیکن سنہری اُس جاگیردار سے بیزار ہوچکی تھی۔ پس وہ نہ مانی اور بدلے میں اُس دار نے اُسے اُٹھوا کر مارا پیٹا الگ اور اُس کے خوب صورت بال منڈوا دیے اُس کے نازک اعضاء ریٹ سے داغا کہ بے چاری کا خوب صورت بدن بدنما ہوکر رہ گیا ہے۔'' ماہی نے دُکھ کے ساتھ

''اُس کے گناہوں کے بوجھ کی وجہ سے اگلے جہنم میں داغا جاتا تو چلو اسی دنیا میں پریکٹس ہوگئی۔ بے اختیار ہنستی چلی گئی۔ ماہی اور سوہنی دونوں نے اُسے بے حد غصّے سے دیکھا۔

''کیا ہوگیا ہے تمہیں ترنم، کیا تمہارے اندر انسانیت بالکل ختم ہوگئی ہے۔'' ماہی نے ماتھے پر بل ڈال پوچھا۔

''میرے تو اندر کا انسان ہی مرگیا ہے پھر انسانیت کی ڈیمانڈ کرنا سراسر حماقت ہے۔'' ترنم نے ایک ہنستے ہوئے کہا۔ اُس کی ٹوٹے کانچ جیسی ہنسی ماہی کو بے حد چبھی تھی۔

''تم ایسی کیوں ہو ترنم؟'' سوہنی نے کچھ کچھ حیرت سے پوچھا۔

''کبھی بھڑکا ہوا سا، کبھی بجھا بجھا سا۔''

''اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے۔'' ترنم نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ اُسی پَل میڈم چاندنی اپنے تھل تھل رتے وجود کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔

''سنہری کا معاملہ پریس میں چلا گیا ہے، اُس دو ٹکے کے رپورٹر نے سنہری کے گنجے سر کے ساتھ اریں لے لی ہیں۔ اگر اِس طرح کی تصویریں مزید شائع ہوگئیں تو سمجھو سنہری کا ساری عمر کے لیے ریئر برباد ہوگا اور اُس کی مارکیٹ ویلیو ساری عمر کے لیے ختم ہوجائے گی، ساتھ ہی میرا اُس پر اتنا سارا روپیہ اور محنت برباد ہوجائے گی۔'' میڈم چاندنی نے تفکر سے کہا۔

''سو سمپل! اُس رپورٹر اور فوٹو گرافر کو اُٹھوالیں مسئلہ حل ہوجائے گا۔'' سوہنی کو میڈم چاندنی کا یوں فکر نا کچھ عجیب سا لگا تھا۔

''نہیں! آج کل ایک خفیہ کا آدمی ہمارے ہر کام کے پیچھے پڑا ہوا ہے، وہ تو موقعے کی تلاش میں ہے ہم کب غلطی کریں اور ہماری کوتاہی کا چھوٹا سا سرا پکڑ کر ہماری اصل پہچان کھینچ کر باہر لے آئے۔ ں آئندہ کچھ دنوں کے لیے زیادہ محتاط ہوکر رہنا ہوگا یہ ہی بگ باس کی طرف سے ہدایات ہیں۔''

''تو پھر آپ کیا کریں گی؟'' ماہی نے بھی دِل چسپی کا اظہار کیا۔

''اُسے فوراً چارہ ڈالنا ہوگا!'' میڈم چاندنی نے سب پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

''تو پھر دے دیں اُسے پیسا، خود ہی اُس کا منہ بند ہوجائے گا۔'' سوہنی نے بہت خوب صورت سا بی رنگ کا چھوٹا سا ڈبا کھولتے ہوئے کہا۔ اُس ڈبے پر گلابی ہی رنگ کے خوب صورت پھول بنے ئے تھے اور اندر پنسل سائز کے نفیس سے سگریٹ موجود تھے۔

سوہنی نے ایک سگریٹ سلگا کر پہلے میڈم چاندنی کو دیا اور دوسرا سلگا کر خود اُس کے کش لگانے لگی۔

"نہیں! وہ تو پیسے سے بھی نہیں مان رہا۔ ہمارے ایک بندے کے ساتھ اُس کی کچھ تو تو میں میں ہوئی ہے جس کی وجہ سے وہ کچھ ضد میں آ گیا ہے۔ اب اُسے کچھ پیار محبت سے منانا ہوگا۔" میڈم چاندنی کی ساری گفتگو کے دوران ترنم بالکل لاپروائی کے انداز میں اپنے کالج کی کتابیں کھول کر بیٹھی رہی، یہ تعلیم کا ڈھونگ بھی میڈم چاندنی کا ہی شروع کروایا ہوا تھا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ!" ماہی نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

"اِسی لیے میں تم لوگوں کے پاس آئی تھی۔ وہ پڑھا لکھا نوجوان ہے اُسے بے باکی پسند نہیں آئے گی اِس لیے یہ کام ترنم کرے گی۔" میڈم چاندنی نے رُخ ایک دم ترنم کی جانب کیا تو ترنم نے دِل ہی دل میں میڈم چاندنی کو بہت بڑی گالی دی۔

"ترنم!" اب میڈم چاندنی ترنم سے مخاطب تھی۔

"جی!" ترنم نے بیٹھی بیٹھی آواز میں جی کہا۔

"آصف ہے اُس لڑکے کا نام اور یہ اُس کا ایڈریس اور اُس کی روٹین کی فائل ہے، تم اِس پر چوبیس گھنٹے کام کرو گی مجھے ایک دن کے اندر اندر ساری تصویریں بمع نگیٹو چاہئیں۔" میڈم چاندنی نے اُسے آرڈر دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں اُس سے یہ سب کیسے حاصل کروں گی؟" ترنم نے کچھ پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

"اِسی طرح معصوم شکل کے ساتھ اُس کے ساتھ جا کر ملو، اُس سے کہو کہ تم گھر سے بھاگ کر آئی ہو، ماں باپ تمہارے مر چکے ہیں۔ تمہاری چچی تمہاری شادی ساٹھ سال کے بوڑھے کے ساتھ کرنا چاہتی ہیں اور تم گھر سے بھاگ کر دارالامان میں جانا چاہتی ہو، اِس کے لیے تمہیں اُس کی مدد کی ضرورت ہے اور ہاں! خیال رہے کہ تم اُس کے پاس رات میں جاؤ گی کیوں کہ وہ بارہ بجے کے بعد گھر جاتا ہے اور اُس وقت کوئی دارالامان بھی نہیں کھلا ہوتا تم اُس کو اپنے جال اور معصومیت سے اِس طرح قابو میں کرو گی کہ وہ تمہیں اپنے گھر لے جانے پر مجبور ہو جائے اور وہاں اُس کے گھر پہنچ کر تمہیں اُس کے لیے کمزور لمحے پیدا کرنے ہوں گے اور مجھے تمہیں یہ بتانے کی تو ضرورت نہیں ہے کہ اِن کمزور لمحوں میں اپنا کام کس طرح نکلوانا ہے۔" میڈم چاندنی نے خباثت سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ترنم کے اندر تو آگ کے بھابھڑ جل رہے تھے اُس نے ایک تھکی تھکی سانس بھری۔

"مجھے اِسی دنیا میں اپنے گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔" اُس نے دِل ہی دِل میں خود سے کہا۔

"جی اچھا!" کہہ کر ترنم میڈم چاندنی کی لائی فائل دیکھنے لگی۔

"میری زندگی میں جانے اور کتنے سانپ لکھے ہیں اور کب تک مجھے اپنا جسم ان سانپوں سے ڈسوانا ہوگا!" ترنم کو فائل میں رپورٹر کی لگی تصویر بھی کسی سانولے سے سانپ جیسی لگ رہی تھی۔

میری تے اپنے مقدر دے نال لگدی اے!

(میری اپنی قسمت کے ساتھ ہی دشمنی ہے!)

میں نے اپنی اچھی بھلی قسمت کو خود داغ لگایا تھا۔

❖❖○❖❖

"تم آخر اُس لڑکی کے جال میں پھنس کیسے گئے؟" طارق نے آصف سے پوچھا۔ طارق مسلسل ہاتھ ...ہا تھا ہر بار وہ کوئی نہ کوئی جال بُنتا تھا لیکن میڈم چاندنی اور میڈم راگنی چکنی مچھلی بن کر ہمیشہ نکل جاتی ...ہا۔

آصف آئی بی کے نیٹ ورک کا تھا اور طارق کو رپورٹ کرتا تھا۔ اخبار کے رپورٹنگ ڈیسک پر وہ ...ت صحافی کام کرتا تھا، میڈم چاندنی نے بہت صفائی سے اپنا کام کر ڈالا تھا اور اس کی ساری محنت ...کر دی تھی۔

"ہوا کیا تھا؟" طارق نے ماتھے پر بَل ڈال کر پوچھا۔

...ابا آصف کے ماتھے پر پسینا آ گیا۔

"میں جانے کیسے کمزور پڑ گیا وہ اتنی معصوم اور خوب صورت لڑکی یوں اتنا اہم میٹریل لے اڑے گی ...سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔" آصف کے چہرے پر ملال تھا، اُسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ...ں جیسی خوب صورت اور کومل سی لڑکی اُس گروہ میں شامل تھی۔

...ں کی خوشبو ابھی تک اُس کے سانسوں میں موجود تھی، آصف ایک عجیب سی کسک ابھی تک اپنے دِل ...سوس کر رہا تھا۔ وہ بہت مشکل میں تھا فرض سے کوتاہی اور دِل کا خالی پن دونوں ایک ساتھ اُسے ...ہے تھے۔

...صف نے ساری بات دھیرے دھیرے طارق کے سامنے دُہرادی کہ کیسے وہ لڑکی خوشبو بن کر آئی ...ں کے حواسوں کو معطل کر کے سب کچھ لے اُڑی۔

"...مائی گاڈ! تم تو بہت پکے کردار کے مالک تھے۔" طارق کو آصف کا یوں بہکنا بہت بُرا لگا تھا۔

"سوری سر! میں شرمندہ ہوں یہ میری کوتاہی ہے۔" آصف نے اقرار کیا۔

"میں مانتا ہوں کہ میں بھی عام سا انسان ہوں کوئی فرشتہ نہیں، لیکن میں اپنے فرض سے کوتاہی کر کے ...ا حق دار بھی ہوں۔" آصف نے سچائی سے کہا۔ طارق نے اضطراری کیفیت میں کھڑے ہو کر چکر ...ع شروع کر دیے۔

"میں کوشش کروں گا، تمہیں کَوَر کرنے کی لیکن تمہیں ڈائریکٹر صاحب کی ڈانٹ کے لیے تیار رہنا ...۔ خیر جب وہ تمہیں بلائیں گے تو میں وہیں سب سنبھال لوں گا۔" طارق نے آصف کو تو تسلی دے کر ...تھا لیکن وہ خود بے حد بے چین تھا۔ اب تک اس کیس پر کام کرتے وہ کتنوں ہی کو پکڑ چکا تھا لیکن وہ ...مچھلی پر ابھی تک ہاتھ نہ ڈال سکا تھا۔ ملک کے اِس قدر اہم راز کیسے لیک آؤٹ ہوتے تھے وہ جان...نا تھا۔ لیکن وہ چاہتا تھا کہ اس بڑی مچھلی کو پکڑے جو سارے سسٹم کو پلان کے ساتھ خراب کر رہی تھی۔

...معصوم لڑکیوں کی پورنوگرافی کی سی ڈیز کا بزنس بے حد عروج پر تھا اُس نے ان پورنوگرافی اور بے ...مجروں کی سی ڈیز کی دکانوں پر کامیاب چھاپے مار مار کر اپنے شہر میں اِس کی سرکولیشن کافی حد تک ...دی تھی۔ لیکن یہ تو بُرائی کی ایک زنجیر تھی، جس کی ہر کڑی میں گناہوں کا کاروبار عروج پر تھا۔ اپنے ...ے وطن کی جڑیں کھوکھلی کی جا رہی تھیں، نئی نسل کو ذہنی طور پر تباہ کیا جا رہا تھا۔ آنے والا کل بے حد ...ک نظر آ رہا تھا۔ طارق کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ کس طرح اِن کالی بھیڑوں سے اپنے وطن عزیز اور

اپنے لوگوں کو بچالے۔

نئی نسل کو ایسے ایسے غیر فطری کاموں کی ترغیب دی جارہی تھی کہ شرم سے ڈوب مرنے کا مقام تھا طارق بے حد ڈسٹرب تھا ابھی پرسوں ہی اُس نے ایک بوائز کالج کے ہاسٹل پر ریڈ کی تھی، کتنی ہی معصوم جانیں جو بہت ساری آنکھوں کے ارمان تھے خواب تھے اپنی زندگی تباہ کر بیٹھے تھے۔ طارق کو ریڈ کے دوران ایک لڑکا ایسا بھی ملا، جو بالکل ہوش وحواس سے بیگانہ تھا اُسے بالکل یاد نہیں آرہا تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟ اُسے استعمال کرنے کے لیے جانے کتنے عرصے سے نشے کے انجکشن لگائے جارہے تھے۔

وہ قوم جس کو بیدار کرنے کے لیے اقبال نے اپنی ساری توانائیاں صرف کردی تھیں جس قوم کو اقبال شاہین کی طرح دیکھنا چاہتے تھے اُسی قوم کو دوسرے لوگ باقاعدہ پلان کے ذریعے انہیں زمین پر چلنے والے کیچوے بنا رہے تھے، طارق کو یہ سب اپنی توہین لگ رہا تھا ایسی توہین اُس سے برداشت نہیں ہورہی تھی۔

مری بستی، شتر مرغوں کی بستی ہے
ہم اتنا دیکھ لیتے ہیں
جسے خود میں سمونے کا ہمیں یارا نہیں ہوتا
جسے مفہوم دینے کو
ہمارے کاسہ سر میں کوئی گوشہ نہیں ہوتا
شعور و لاشعور اِک کشمکش میں پھر بھی رہتے ہیں
مگر اس جنگ میں
جس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا
ہم اتنا دیکھ لیتے ہیں
جسے آنکھوں کی سرحد سے
گزرنے کا کوئی رستہ نہیں ملتا!

طارق نے اپنا ماتھا مسلا، اُس کی نگاہوں میں کئی چہرے گڈمڈ ہورہے تھے، یہ چہرے کئی معصوم لڑکوں، لڑکیوں کے تھے، بے بس والدین کے تھے، جن کی لڑکیاں اغوا ہونے کے بعد ایسی غائب ہوئیں کہ وہ اُن کا نشان تک نہ پاسکے تھے۔

''راگنی اور چاندنی! میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا! ایک بار، صرف ایک بار میرے پاس ٹھوس ثبوت آجائیں تو تم لوگوں پر ہاتھ ڈالنا ایسا کچھ مشکل نہ ہوگا۔ کتنی ہی معصوم لڑکیاں تم لوگوں کے ہاتھوں تباہ ہوئی ہیں۔'' طارق نے آنکھیں بند کرکے سر کرسی سے ٹکایا تو چھم سے ایک مظلوم چہرہ اُس کی آنکھوں کے سامنے آگیا۔

یہ چہرہ سحرش کا تھا۔ خالی خالی آنکھوں کے ساتھ وہ گھنٹوں ایک ہی جگہ کو تکے جاتی تھی۔ اُس کے چہرے پر بے اعتباری کسی نقش کی طرح جگہ بناگئی تھی اُسے یقین ہی نہ آتا تھا کہ زندگی جو تتلی کے رنگوں

کی طرح رنگ برنگی لگتی تھی، ایک دم کیسے بھیانک خواب میں بدل گئی، جہاں اب اُس کے ناز اُٹھانے والا باپ بھی نہ تھا جہاں سارے زمانے کی نظروں میں اُس کے لیے فہمائش تھی۔ ہر نگاہ اُسے تلوار کی طرح کاٹ کر رکھ دیتی تھی اب وہ ایک مکمل لڑکی نہیں تھی بس ٹکڑوں میں بکھری ایک ٹوٹا پھوٹا وجود تھا۔ وہ ٹوٹا پھوٹا وجود طارق سے بے حد ہمدردی حاصل کرنے لگا تھا۔

ایسا کیوں تھا وہ خود بھی نہ جانتا تھا۔ ہر انسان خواہش اور مقدر کے بیچ کھڑا ہوتا ہے اگر اُس کی خواہش کے جذبے میں طاقت زیادہ ہوگی تو وہ اپنی خواہش کو پالے گا اور اگر اُس کے مقدر کے لکھے کو خواہش کی طاقت بدل نہیں پاتی تو انسان کو اُس کے مقدر کا صرف لکھا ملتا ہے۔ طارق کی خواہش تو صرف ایک ہی چہرہ تھا۔ اور وہ تھا نگی کا چہرہ! لیکن اب اُس کے مقدر میں کیا لکھا ہے وہ نہیں جانتا تھا۔

اُس کا سارا دل نگی کی محبت سے بھرا پڑا تھا۔ نگی اُس کی بچپن کی محبت تھی لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ نگی کی محبت کے بعد بھی کوئی گنجائش نکل سکتی تھی۔ ایک ہمدردی کا رشتہ اتنا مضبوط ہوسکتا تھا کہ وہ اپنے ساتھ باندھ لے، جیسے طارق محسوس کررہا تھا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سحرش سے ہمدردی کرنے پر مجبور تھا زندگی کا کھیل تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اب تو دیکھنا تھا کہ جیت کس کی ہونی ہے، خواہش کی یا پھر مقدر کی!

❖❖○❖❖

پالیا آج وہ سہارا
جو کبھی نہ گرنے دے گا
آج ہے اسے میں نے پکارا
جو میری ہر بات سنے گا
ہے جو میری شہ رگ
سے بھی قریب
بناتا ہے جو ہم سب
کا نصیب
ہے جو پوری کائنات کا مالک
ہے جو میری زندگی کا مالک
ہے جو ہم سب کا مالک
بس تو ہی تو
اے اللہ! اللہ اللہ اللہ!

روشن آرا ہاتھ اُٹھائے بلند آواز میں دُعا مانگ رہی تھیں۔

ولی تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا اُن کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ ماں کے فارغ ہونے کے انتظار میں نے کب اُس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ روشن آرا بیگم اپنی لمبی دُعا کے بعد فارغ ہوکر مڑیں تو بیڈ سے ٹیک ئے کارپٹ پر ولی بے خود سورہا تھا۔ روشن آرا بیگم نماز بے حد لمبی اور دُعا بے حد تفصیلی مانگا کرتی تھیں،

وہ اپنی دُعاؤں میں اللہ کے ساتھ محو گفتگو ہوتی تھیں۔

"لگتا ہے میرا انتظار کرتے ہی سو گیا ہے!" روشن آرا بیگم نے کہتے ہوئے کمبل اُٹھا کر اُس پر ڈال دیا۔

برسوں پہلے کی وہ سردیوں کی ٹھنڈی رات یاد آ گئی جب احمد شاہ سات آٹھ سالہ ولی اور نگینہ کو کمبل میں لپیٹے اُن کے پاس لے کر آئے تھے۔ کس قدر شکوہ تھا نا انہیں اپنی زندگی سے لیکن آج اللہ نے کیسے اُن کی سُونی کوکھ میں لال ہیرے جیسے بچے دے دیے تھے جن کی پرورش کرتے ہوئے انہوں نے بارہا شکر ادا کیا تھا اُس بڑی ذات کا، جس نے اُن کی زندگی کی ہر کمی پوری کر دی تھی۔ جانے کن ماں باپ کی ایسی نیک طبیعت اولاد تھی، جو اُسی طرح ڈھلتے گئے جیسے انہوں نے چاہا تھا۔ آج ولی کی طبیعت میں جو مضبوط قلعے تھے وہ انہی کی رکھی بنیادوں پر کھڑے تھے۔

نگی کے چہرے کی پاکیزگی اور والدین کی تابع داری سب کچھ اُن کے دیے ہوئے ماحول کی وجہ سے تھی۔

"اللہ تیرا شکر ہے!" انہوں نے بے اختیار شکر ادا کیا اور سوئے ہوئے ولی پر انہیں بے اختیار پیار آیا۔ انہوں نے جھک کر ولی کے ماتھے پر پیار کیا تو ولی اُن کے لمس کی نرمی محسوس کر کے اُٹھ گیا۔

"السلام علیکم امّاں جان!" ولی نے اُن کے ہاتھوں کو چوم لیا۔

"وعلیکم السلام! اللہ سائیں تم کو دین و دنیا کی خوشیاں عطا کرے اور تمہیں اور تمہاری سات نسلوں کو رحمتوں کے سائے میں رکھے۔" کچھ لوگ ہمیشہ دُعائے خیر کرتے ہیں۔ اُن کی دی ہوئی دعائیں دِل و روح تک ٹھنڈک اُتار دیتی ہیں۔ ولی جو جلتے تپتے وجود کے ساتھ آیا تھا، اُس کے اندر تک سکون اُتر آیا۔

"تھینکس امّاں جان!" ولی نے بے اختیار اُن کے ساتھ لگ کر کہا۔

"کس لیے ماں کی جان؟" امّاں جان نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ اکثر پنجابی میں لوگ کہتے ہیں نا کہ "ماواں ٹھنڈیاں چھاواں" تو وہ بالکل ٹھیک کہتے ہیں امّاں جان! میں اِس قدر بے سکون ہو کر گھر آیا تھا لیکن آپ کے لمس اور دُعا نے میرے اندر تک سکون اُتار دیا، مجھے ایک دم ہلکا پھلکا کر دیا ہے۔" ولی نے اقرار کیا۔

"لیکن میرا بیٹا اتنا پریشان کیوں ہے؟" روشن آرا بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

"میں نے آپ سے مسکان کا ذکر کیا تھا نا؟" ولی نے کہا۔

"ہاں! مجھے وہ بچی اچھی طرح یاد ہے کیا ہوا اُسے؟" روشن آرا بیگم نے پوچھا۔

"برین ہیمبرج ہو گیا ہے اُسے آج، اور ہوا بھی شاید میری وجہ سے ہے! میں بہت گلٹی محسوس کر رہا ہوں۔"

ولی نے دھیرے دھیرے ساری بات روشن آرا بیگم کو سنا ڈالی۔

روشن آرا بیگم ساری بات سن کر ایک دم سنجیدہ ہو گئیں۔

"اللہ تعالیٰ اُس بچی پر رحم کرے، تم قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی قصوروار ہو گئے ہو۔"

"میں سمجھ سکتی ہوں کہ تم کس طرح کی اُلجھن میں گھرے ہو اگر تم چاہو تو میں علیزے کا خیال دِل سے نکال کر اُس بچی کے باپ سے مل لیتی ہوں۔" وہ جوان بیٹے کی ماں تھیں انہیں اپنے بچے کی خوشی اور

اس کے لیے دِل بڑا کرنا ہی پڑتا تھا، بے شک علیزے سے دست بردار ہونے میں وہ سراسر ناخوش تھیں لیکن انہیں ولی کی خوشی زیادہ عزیز تھی۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ شاید ولی اُن کی وجہ سے اپنے دِل کی بات مار رہا تھا۔

"نہیں امّاں جان! ہرگز نہیں! میں نے مسکان کو کبھی اِس نگاہ سے دیکھا ہی نہیں ہے۔ پھر وہ میرے خیالی معیار پر پوری نہیں اُترتی، جو اُترتی ہے، وہ میں آپ کو بتا چکا ہوں۔" ولی نے جملے کا دوسرا حصہ دِل ہی دِل میں ادا کیا۔

"پھر...؟" روشن آرا بیگم نے نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا۔

"آپ میرے لیے بھی دعا کریں۔ اُس لڑکی کے لیے بھی دعا کریں کہ میرا تصور اُس کے دل و دماغ سے اُتر جائے تاکہ وہ اپنی زندگی بہترین انداز میں گزار سکے۔" ولی نے سچے دل سے مسکان کی بہتری چاہی۔

"ٹھیک ہے! لیکن تم صرف اِس بات کو ہی لے کر اتنے پریشان ہو؟" روشن آرا بیگم نے ولی کا چہرہ بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ ماں تھیں اور وہ اُن کی انگلیوں کی پوروں میں تھا، وہ جان گئی تھیں کہ ولی صرف اِس بات کو لے کر پریشان نہ تھا۔

"امّاں جان وہ....." ولی کچھ کہتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ وہ خود بھی سمجھ نہ پا رہا تھا کہ کس طرح اپنے دلی اِس پریشانی کو ماں کے ساتھ شیئر کرے۔ اُسی پَل احمد شاہ اندر داخل ہوئے، ماں بیٹا اپنی باتوں میں اِس قدر مشغول تھے کہ دبیز قالین کی وجہ سے احمد شاہ کے آنے کی خبر تک انہیں نہ ہوئی۔

"کہو بیٹا کیا مسئلہ ہے؟" روشن آرا بیگم نے اُس سے پیار سے پوچھا۔

"امّاں جان!" ولی نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"یہ سید عبداللہ کون ہے؟" ولی نے پوچھا۔

روشن آرا بیگم تو ایک دم سکتے میں آ گئیں۔

"ولی کو یہ نام کس نے بتایا؟"

کچھ اس طرح کی کیفیت سے احمد شاہ بھی گزر رہے تھے۔

کیا وہ واپس اپنی پہچان کی جانب لوٹ رہا تھا؟

احمد شاہ اور روشن آرا بیگم ایک دَم چپ ہوگئے۔ عبدالولی کو اُن کی خاموشی سے گھبراہٹ ہونے لگی۔

''عبدالولی!'' آخر احمد شاہ بولے۔ لیکن جس طرح انہوں نے عبدالولی کا پورا نام لے کر پکارا تھا۔ ولی کو زندگی میں پہلی بار سامنے کھڑے شخص میں اجنبیت کا احساس ہوا۔ اُونچے لمبے جوان کا دِل سہم کر ڈرا جتنا کیسے چھوٹا ہوسکتا ہے؟ عبدالولی باقاعدہ محسوس کرسکتا تھا۔ ساری عمر احمد شاہ اور روشن آرا بیگم کی محبت اور توجہ حاصل کی تھی۔ آج اِس کے ایک سوال نے کیسی اجنبیت کی فضا قائم کردی تھی۔ عبدالولی کو ایک دم اپنی غلطی کا احساس ہوا شاید اُس نے بے حد غلط سوال کردیا تھا۔

''سیّد عبداللہ کون تھا؟'' یہ صرف اس کا تجسّس تھا۔

''جی بابا سائیں! آپ کچھ کہنا چاہ رہے تھے۔'' عبدالولی نے متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

احمد شاہ بے حد پریشان تھے ایک نہ ایک دن ولی اور نگینہ کو اُن کی پہچان بتانی تھی۔ لیکن اِس طرح اچانک بتانا، جہاں دونوں بچوں کے لیے مفید نہ ہوتا وہاں انہیں بابا صاحب سے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اُٹھانا تھا۔ زندگی میں واقعات کی ترتیب حسبِ منشا رہے تو کبھی حادثے نہیں ہوتے، زندگی مالک دوراہے نہیں دیکھتی لیکن سب کچھ انسانوں کے ہاتھ میں کہاں ہوتا ہے۔ کبھی کبھی وہ ہوجاتا ہے جو نہیں ہونا چاہیے۔ احمد شاہ خود کو بھی کچھ اِسی قسم کے دوراہے پر محسوس کررہے تھے۔

''ولی! تم ہمیشہ سے میرا فخر رہے ہو۔'' احمد شاہ اتنا کہہ کر کچھ دیر کو خاموش ہوگئے، جیسے وہ مزید کچھ کہنے کے لیے الفاظ ترتیب دے رہے ہوں۔

''آج میں چاہتا ہوں کہ تم ہمیشہ کی طرح وہ مانو جو میں چاہتا ہوں۔'' احمد شاہ ابھی تک خود میں حوصلہ نہ پارہے تھے کہ یوں سچائی کو منظرِ عام پر لے آئیں۔

''آپ کہیے بابا سائیں! میرے لیے دنیا میں بس وہ ہی سچ ہے جو آپ کہیں گے۔'' ولی نے ہمیشہ کی طرح تابع داری سے کہا۔ اُس کی بات سُن کر احمد شاہ نے خود کو ایک دم بے حد توانا محسوس کیا۔

ایسے کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ محبت بوئیں اور نفرت حاصل کریں، محبت بونے والے ہمیشہ محبت ہی حاصل کرتے ہیں۔ ولی کے اندر بھی اُن کی محبت کا بیج تناور درخت کی شکل اختیار کرگیا تھا۔

''ولی! مجھے تمہیں کچھ سچائیاں بتانی ہیں یہ تمہارا اُدھار ہے مجھ پر، لیکن تم ہمیں کچھ وقت دو اور یقین رکھو کہ ہم تم سے اتنا پیار کرتے ہیں کہ تم سے کسی قسم کی زیادتی نہیں کرسکتے۔'' احمد شاہ نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

آج احمد شاہ کی تربیت کا امتحان تھا کہ عبدالولی کتنا پورا اُترتا ہے۔ تجسس اور اندر کے سوال اِس قدر پریشان کریں کہ انسان اپنے آپ میں بے بس ہوجائے لیکن ایسے میں اُسے صبر و انتظار کا کہا جائے اور

اور بھی ایسا جس کی کوئی مدّت مقرر نہ کی جائے۔ احمد شاہ نے عبدالولی کو کچھ اِسی قسم کی مشکل میں ڈال دیا تھا۔

عبدالولی نے چونک کر احمد شاہ کو دیکھا۔ سامنے کھڑا شخص اُس کا ایسا مہربان باپ تھا، جس نے اُسے صرف پیار ہی دیا تھا، وہ اُس کی بات کسی طور نہیں ٹال سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے بابا سائیں!'' عبدالولی نے اپنے اندر شور مچاتے سوال کو دبا کر کہا۔ سیّد عبداللہ سے اُس کا کوئی تعلق ضرور تھا یہ تو وہ جان ہی گیا تھا۔ احمد شاہ اور روشن آرا کے چہروں کے تاثرات اُسے بتا گئے تھے کہ یہ نام اُن کے لیے اجنبی نہ تھا۔ لیکن یہ تعلق کس نوعیت کا تھا اِس کے لیے اُسے انتظار کرنا ہی تھا کیوں کہ ایسا احمد شاہ نے کہا تھا اور عبدالولی کے لیے احمد شاہ کا کہا کسی حکم سے کم نہ تھا۔

''جیتے رہو، اللہ تعالیٰ تمہیں دین و دنیا کی خوشیاں عطا کرے۔ تم جیسا بیٹا تو قسمت والوں کو ملتا ہے، کسی انعام سے کم نہیں۔'' روشن آرا بیگم نے آگے بڑھ کر عبدالولی کی پیشانی چوم لی، عبدالولی کے اندر کے سوال ایک دم ٹھنڈے پڑگئے۔ بے شک اُن کی محبتوں کے آگے تو کچھ بھی اہم نہ تھا۔ روشن آرا نے خود کو ایک دَم بے حد پُرسکون محسوس کیا، کچھ پَل پہلے والی پریشانی اور کھودینے کا احساس اب ختم ہوگیا تھا۔

''امّاں جان! میں واقعی شرمندہ ہوں کہ میرے ایک سوال نے آپ دونوں کو پریشان کردیا۔'' عبدالولی نے اُن کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''بچے! یہ تمہارا حق ہے! بس تم کچھ دیر کے لیے ٹھہر جاؤ، جب اللہ کا حکم ہوگا تو وہ ہمارے اور تمہارے اندر بات سننے اور کہنے کی ہمت دے گا۔'' روشن آرا بیگم نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''اچھا اُس بچی کی خبر لینے میں ہسپتال جانا چاہتی ہوں۔'' روشن آرا بیگم نے ایک دَم بات کا رُخ بدلتے ہوئے کہا۔

''کون! مُسکان؟'' عبدالولی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں! میرا بھی خیال ہے کہ ہمیں اُس بچی کی خبر لینی چاہیے۔'' احمد شاہ نے کہا۔

''لیکن۔'' عبدالولی واقعی ہچکچا رہا تھا۔

''تم پریشان نہ ہو بیٹا! اللہ سوہنا کرم کرے گا۔ تم خود پر اُس کے متعلق کوئی بوجھ نہ لو، اللہ سوہنا کسی کو اُس کی استطاعت سے بڑھ کر نہیں آزماتا۔'' روشن آرا بیگم نے عبدالولی کو تسلی دی۔

''امّاں جان! آپ دُعا کریں کہ اُس لڑکی کے دِل سے میرا خیال نکل جائے میں نہیں چاہتا کہ ایک لڑکی میری وجہ سے ڈسٹرب ہوجائے۔'' عبدالولی کو مُسکان سے ہم دردی محسوس ہوئی تھی۔

''ہاں بیٹا! کیوں نہیں! بیٹیوں کے دِل تو بہت نازک ہوتے ہیں، تم فکر نہ کرو تم مجھے اُس کے پاس لے چلو۔'' روشن آرا بیگم نے کہا۔

''ٹھیک ہے میں آپ کو لے چلوں گا۔'' عبدالولی نے دھیمے لہجے میں کہا۔

مُسکان سے ملنے کے لیے اُس کے دِل میں رتی بھر آمادگی نہ تھی لیکن وہ ماں کا کہا ٹال نہیں سکتا تھا۔

❖❖○❖❖

"اِس طارق کے بچے نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے۔" میڈم چاندنی نے غصّے سے پھنکارتے ہو
کہا۔

"بگ باس نے جو پارٹیز ارینج کرانے کا کہا تھا، وہ اِس طارق کی وجہ سے ممکن نہیں ہو پا رہیں" میڈم راگنی نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔

"وہ لوگ خاص خاص مقامات پر ہو میوزیکل پارٹیز ارینج کرواتے تھے، جس میں کالج کے لڑکے شامل تھے۔ اپر کلاس لڑکے اِس کام کے لیے اُس نے مقرر کیے تھے، جو مڈل کلاس لڑکوں کو ورغلا کر اِن پارٹیوں کا حصّہ بناتے تھے۔ بگ باس ہر کام بڑے پلان سے کرواتا تھا۔"

"جب تک اُسے اُوپر سے سپورٹ ہے اُسے کوئی نہیں روک سکتا۔ تم اُوپر سے یہ کام رکواؤ تو یہ لوگ ہمارے لیے مصیبت بنتے جا رہے ہیں۔" میڈم چاندنی نے اپنی جانب سے حل پیش کیا۔

"اِن کا ڈائریکٹر بڈھا کھوسٹ سا ہے، آگے پیچھے اُس کے ہے کوئی نہیں اور عورت میں اُس کی دل چسپی صفر ہے، پھر ہے بھی شریف! اب تم بتاؤ میں اُوپر سے کس طرح یہ کام رکوالوں؟" میڈم راگنی پنسل نما لمبا سا سگریٹ سُلگاتے ہوئے کہا۔

"اگر ڈائریکٹر کی کوئی کمزوری نہیں ہے تو طارق کی تو کوئی نہ کوئی کمزوری ضرور ہوگی۔ جوان آدمی ہمیں طارق کو ٹارگٹ کرنا ہوگا۔" میڈم راگنی نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیا۔

"ہاں! اُس کی ایک کمزوری ہے، اُس کی ایک بہن ہے۔" میڈم چاندنی نے شاطرانہ مسکراہٹ ساتھ کہا۔

"تو پھر دیر کس بات کی ہے! اُسے فوراً اُٹھوالو اور صرف اُٹھوانا نہیں ہے اُس کی زبردست قسم کی شو کر ڈالو۔ آئندہ وہ کم بخت ہمارے راستے میں آنے کی کوشش کرتے ہوئے سو بار سوچے گا۔" میڈم راگ نے غصّے سے کہا۔

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو، اِس طوفان کو روکنے کا صرف ایک یہ ہی حل ہے، لیکن راگنی ذرا دھ سے ہاتھ ڈالنا۔ وہ خفیہ کا خاصا اہم افسر ہے کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔" میڈم چاندنی نے کیوں کہ وہ اندر سے کچھ ڈر بھی رہی تھی۔ طارق نے اُس کے کئی ٹھکانے تباہ کر ڈالے تھے۔

"ٹھیک ہے!" میڈم راگنی نے اپنے موبائل پر کچھ نمبر پُش کیے اور اِس کام کے لیے مارک کو خا ہدایات دیں۔

"اب دیکھتے ہیں یہ لڑکا کیسے ہمارے راستے میں آتا ہے۔" میڈم راگنی نے موبائل آف کر کے م چاندنی سے کہا۔

اُس کے چہرے پر بے حد اطمینان تھا۔ اب وہ جو کرنے جا رہی تھی، وہ طارق کی سات نسلوں کو سبق سکھانے کے لیے کافی تھا۔

❖❖○❖❖

"مُسکان! میری جان! خُدا کے لیے خود کو سنبھالو۔" سائرہ نے نڈھال سی مُسکان سے کہا ابھی ا سیّد سرفراز علی مُسکان کے کمرے سے بے حد فکرمندی سے نکلے تھے، اُن کے سوالات پر آیا اماں کا

ایک دم فق ہو گیا تھا۔

اگر اچانک نرس ڈرپ کے لیے اندر نہ آتی تو آیا اماں بچ نہ پاتیں کیوں کہ اُن کے پاس فوراً کوئی بہانہ، نہ تھا اس لیے وہ ایک دم سے بوکھلا گئی تھیں۔

"سائرہ! وہ صرف میری چاہت ہی نہیں، میری زندگی کا مرکز و محور بھی ہے۔ ایسا محور کہ اگر میں اُس کے گرد نہ رہی تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خود سے بچھڑ جاؤں گی۔" مُسکان کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر اُس کے سنہری بالوں میں جذب ہو گئے۔

"اِس لڑکی کا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اچھی بھلی زندگی کو روگ لگا لیا ہے۔" سائرہ نے دِل میں بے حد دُکھ محسوس کیا۔

"سائرہ اُس سے کہو کہ مجھے اپنی زندگی میں جگہ دے۔" مُسکان ایک دم ضدی بچوں کی طرح مچلی۔

"یہ کیا بے کار کی ضد ہے۔" سائرہ نہ چاہتے ہوئے بھی سختی سے بولی۔

"یہ ضد نہیں سائرہ! میری بے بسی ہے۔" مُسکان نے تقریباً ہانپتے ہوئے کہا۔ اُس سے نقاہت کی وجہ سے بولنا دُشوار ہو رہا تھا۔

میں تمہارے احساسات بہت پہلے سے جانتی ہوں لیکن میں اِس معاملے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی بلکہ کوئی بھی تمہاری مدد نہیں کر سکتا اِس لیے پلیز تم اِس پاگل پن سے باہر نکلو۔ سائرہ نے اُسے کوئی بھی دلاسا نہ دیا۔

"نہیں! وہ میرا جنون ہے اگر وہ نہ ملا تو میں مر جاؤں گی اور میری موت ہی اِسے میری اہمیت کا احساس دلائے گی۔" مُسکان نے بالکل پاگلوں کی طرح کہا۔

اُسی پل آیا اماں اندر داخل ہوئیں۔ مُسکان کی بات وہ سن چکی تھیں اور بے حد دُکھی تھیں۔

"کیا ہماری اُنیس بیس سال کی محبت پر تمہاری دو سال کی محبت حاوی ہو گئی ہے جو تم یوں اپنے مرنے کی باتیں کرنے لگی ہو، تمہیں صرف اپنے دِل کی پڑی ہے! دوسرا کوئی اور تمہیں نظر نہیں آتا! ایسی تو میری تربیت نہ تھی۔" آیا اماں نے افسوس سے کہا۔

"آیا اماں! میں چاہ کر بھی خود کو کنٹرول نہیں کر پاتی۔ پلیز آیا اماں اُسے کہیں کہ وہ میری محبت کو نہ ٹھکرائے، میں نے اُسے بہت چاہا ہے، وہ نہ ملا تو میرا دم نکل جائے گا۔" مُسکان ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور اُس کے اِس طرح رونے سے سائرہ اور آیا اماں دونوں ایک دم بوکھلا گئیں۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اُسے بے حد سکون سے رکھیں، مُسکان کا یوں رونا اچھا نہ تھا۔

"مُسکان بیٹا! خدا کے لیے چپ ہو جاؤ، تمہاری خاطر تمہاری یہ کمزور ماں ہر روایت، ہر رسم اور ہر انسان سے لڑ جائے گی، یہ میرا وعدہ ہے۔" اُن کا یہ وعدہ انہیں خود کو بھی بہت مہنگا پڑ سکتا تھا۔

سیّد سرفراز سے مُسکان کا راستہ عبدالولی کے لیے صاف کرانے کا پہاڑ طے بھی انہیں کرنا تھا جو حکم رانی کے نشے میں اپنی سگی اولاد تک کے حقوق دینے کو تیار نہ تھا۔

❖❖○❖❖

"مُسکان کو کیا ہوا ہے نفیسہ؟" سیّد سرفراز علی کا لہجہ بے حد سرد تھا۔

نفیسہ بیگم کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑتی محسوس ہوئی، بہت برس پہلے اسی طرح سیّد سرفراز علی کا سامنا نفیسہ بیگم نے کیا تھا تب بھی انہوں نے اپنی جان کی پروانہ کی تھی اور آج تو اتنے برسوں بعد اُن کو اپنا آپ ویسے ہی کسی لاش کی طرح لگتا تھا۔ آج اگر اُن کا دِل ڈر رہا تھا تو مُسکان کی محبت کی وجہ سے ڈر رہا تھا۔

گزرتے سالوں میں مُسکان اُن کے دِل میں ایک خاص مقام حاصل کر چکی تھی۔ پھر مُسکان، صائمہ بی بی کی امانت تھی اُن کے پاس۔ صائمہ بی بی کا اُن کی ذات پر ایک بہت بڑا احسان تھا، آج بھی وہ خود کو اُن کے احسان تلے محسوس کرتی تھیں، ایسے میں مُسکان کے لیے لڑنا اُن کو اپنے فرائض میں شامل لگتا تھا۔

''نفیسہ! میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں؟'' سیّد سرفراز علی نے کڑکتے لہجے میں اپنا سوال دُہرایا۔

''سچ جاننا چاہیں گے یا اپنی جھوٹی آن کو قائم رکھنے کے لیے مجھ سے کوئی جھوٹ سننا چاہیں گے؟'' نفیسہ بیگم نے ٹھہر ٹھہر کر بے حد پُرسکون انداز میں کہا۔

''نفیسہ! تم ہمیشہ میرا ضبط آزماتی ہو، لیکن آج تمہاری خیر اِسی میں ہے کہ تم مجھے سچ سچ بتاؤ۔'' سیّد سرفراز علی کا سانولا چہرہ غصّے سے سیاہ پڑنے لگا۔

''مُسکان تو خود آپ کی اولاد ہے کیا اُس کی غلطی کو معافی ملے گی؟ اپنی اولاد کے لیے تو انسان کے دِل میں بے انتہا وسعت ہوتی ہے۔'' آپا امّاں نے سیّد سرفراز علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم جانتی ہو ہمارے ہاں لڑکیوں کی غلطیوں کو معاف نہیں کیا جاتا۔'' سیّد سرفراز علی نے ایک دم کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''وہ آپ کی لاڈلی بیٹی مُسکان ہے کوئی عام لڑکی نہیں۔'' آپا امّاں نے اُن کی دِل میں مُسکان کی محبت کو جگانے کی کوشش کی۔

''نفیسہ تم صاف صاف کہو، ہمارے اندر مزید صبر کا حوصلہ نہیں ہے۔'' سیّد سرفراز علی نے بے چینی سے کہا، کہیں اندر سے وہ مُسکان کے لیے کمزور پڑ رہے تھے۔

''مُسکان سے بھی وہ غلطی ہوئی ہے جو آج سے برسوں پہلے سدرہ بی بی سے ہوئی تھی۔'' آپا امّاں نے سیّد سرفراز علی کے سر پر بم دھماکہ کیا۔

سیّد سرفراز علی کا چہرہ جو غصّے سے سیاہ پڑ رہا تھا ایک دم پھیکا پڑ گیا وہ صوفے پر یوں گرے جیسے کوئی کٹا ہوا درخت زمین پر گرتا ہے۔ اُن کے وجود پر صدیاں گزر گئی تھیں، وہ ایک دم اپنے آپ کو بے حد کمزور اور بوڑھا محسوس کرنے لگے تھے۔

''کون ہے وہ؟'' کچھ دیر موت جیسی خاموشی کے بعد وہ بے حد ٹوٹے ہوئے لہجے میں مخاطب ہوئے۔ آج اُن کو شدت سے محسوس ہو رہا تھا کہ مُسکان اُن کی مضبوطی نہیں کمزوری ہے۔ اللہ نے اِس بچی کے لیے ان کے دِل میں بہت شدید محبت ڈال دی تھی، جس کے سامنے وہ خود کو بھی بے بس محسوس کرتے تھے۔

''عبدالولی۔'' آپا امّاں نے اُن کا کمزور چہرہ دیکھ کر عجیب طرح کا سکون محسوس کیا۔

''عبدالولی؟'' سیّد سرفراز علی بُری طرح چونکے۔ آج سے دو سال پہلے اُن کو اُن کے بندوں نے خبر دی تھی کہ کالج کا کوئی لڑکا عبدالولی ہے، جس کے متعلق مُسکان اکثر باتیں کرتی ہے لیکن وہ کسی لڑکے سے ملتی ہے، یہ نہیں بتایا تھا۔ اگر مُسکان کسی سے ملتی نہیں تھی تو وہ کسی سے انوالو کیسے ہوگئی؟'' یہ سوال انہیں بُری طرح پریشان کر رہا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ مُسکان کی ''راکھی'' بے حد احتیاط سے کی تھی پھر بھی ان کی بیٹی کس طرح بغاوت کر گئی؟

''کون ہے یہ لڑکا اور اِس نے مُسکان کو کب ورغلایا؟'' سیّد سرفراز علی نے غصّے سے پوچھا۔

''لڑکا بہت اچھے خاندان کا ہے اور اُس نے ہرگز مُسکان کو نہیں ورغلایا، وہ تو آپ کی بیٹی کے جذبات سے بالکل بے خبر ہے۔ یہ مُسکان کی یک طرفہ محبت ہے۔'' آپا امّاں نے بے حد سرد لہجے میں کہا۔

''ہونہہ! یک طرفہ محبت! یہ یک طرفہ محبت نہیں، سراسر حماقت ہے اور تم نے اُسے اِس حماقت سے کیوں نہیں روکا؟ تم بھی اُس کے قصور میں برابر کی شریک ہو۔'' سیّد سرفراز علی ایک دم چلائے۔

''بہت خوب سیّد سرفراز علی! بہت خوب! یہ تمہارا پرانا وطیرہ ہے اپنا قصور بھی کسی اور کے ذمے آسانی سے لگا دیتے ہو۔''

''کیوں کیا تم پر مُسکان کی مکمل ذمے داری نہیں تھی، تمہیں اُسے اِن فضولیات سے روکنا چاہیے تھا۔ کیا تم اپنی بے خبری کی قصوروار نہیں ہو؟'' سیّد سرفراز علی ایک بار پھر چلائے۔

''میں ہرگز بے خبر نہیں ہوں، بے خبر تو آپ ہیں جو اولاد کی جائز خوشیاں روک لیتے ہیں یہ بھی تو آپ کی خاندانی روایت ہے نا؟'' آپا امّاں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہم نے اُسے اُس کی اوقات سے زیادہ خوشیاں دی ہیں اُس کی ہر طرح کی خواہش اور ضرورت پوری کی ہے۔'' سیّد سرفراز علی نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔

''تو پھر اُس کی اِس خواہش کو بھی حماقت کا نام دینے کے بجائے پورا کردیں، پریشانی کیا ہے۔'' آپا امّاں نے بے نیازی سے کہا۔

''مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی جو صائمہ کی بات مان کر اپنی بچی کی پرورش تمہارے حوالے کی، تم تو ہمیشہ سے میری دُشمن رہی ہو، تم کیوں کر میری اولاد کا فائدہ چاہوگی؟'' سیّد سرفراز علی لڑنے کے انداز میں بولے۔

''مُسکان میرے لیے کس قدر اہم ہے یہ مجھے آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں، اب آپ یہ سوچیں کہ آپ کو ایک اچھا باپ بننا ہے یا پھر اچھا جاگیردار؟'' آپا امّاں نے اپنے سر کی چادر درست کرتے ہوئے کہا۔

''مُسکان میری بیٹی ہے اور میں جانتا ہوں کہ اُس کے لیے کیا اچھا ہے اور کیا بُرا! تم مُسکان کا چھوٹا موٹا سامان پیک کردو، وہ ہمارے ساتھ واپس گاؤں چلے گی۔ ہم جلد ہی اُس کی شادی کر رہے ہیں۔'' سیّد سرفراز نے ایک دم سے دھماکا کیا۔ آپا امّاں کی آنکھیں بے یقینی سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''سیّد سرفراز علی! تم اتنے ظالم کیسے ہوسکتے ہو؟ اتنی سی بچی کی شادی تم اُس بڈھے سے کروگے۔ تم کو، تمہارے دِل کو ایسا کرتے کچھ نہ ہوگا؟'' آپا امّاں نے نفرت سے کہا۔

"میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ مُسکان کا جوڑ فی الحال خاندان میں کوئی نہیں ہے۔ اگر یہاں رشتہ نہیں کریں گے تو پھر ہمیشہ کے لیے مُسکان کو بنا شادی کے رہنا ہوگا اور پھر یہ بہترین رشتہ ہے بدلے میں ا اپنی بہت پیاری بیٹی کا رشتہ بلال کو دے رہا ہے۔ بلال کی حالت جس طرح کی ہے، ایسے میں اُسے کوئی خاندانی لڑکی نہیں مل سکتی، یہ بھی تو سوچو کہ مُسکان کے ذریعے اُس کے بھائی کو بھی بَر مل رہا ہے لڑکی ط زمین کی مالک ہے۔"

"سیّد سرفراز علی! اس میں دونوں جانب ایک بار پھر دونوں لڑکیاں ہی خسارے میں رہیں۔ ایک ا بوڑھا لالچی شوہر ملے گا اور دوسری کو پاگل خبطی شوہر۔"

"نفیسہ!" سیّد سرفراز نے آپا لقاں کی بات پوری ہونے سے پہلے کاٹ دی۔

"میں تمہارا بہت لحاظ کر رہا ہوں۔ بس اب وہ ہی ہوگا، جو ہم چاہیں گے۔ مُسکان کل ہمارے ساتھ گاؤں چل رہی ہے۔"

"لیکن ابھی اُس کی حالت ٹھیک نہیں ہے جب تک ڈاکٹر چھٹی نہیں دیں گے وہ کیسے جاسکتی ہے؟" آپا لقاں کسی بھی طرح سیّد سرفراز علی کو اُس کی اِس جلد بازی سے روکنا چاہتی تھیں۔ وہ خود نہیں جانتی تھیں کہ بات اِس قدر بگڑ بھی سکتی ہے۔

"ہم یہاں سے نرس اور لیڈی ڈاکٹر کو ہائر کرلیں گے وہ اُس کی دیکھ بھال گاؤں میں بھی کرلیں گی۔" یعنی سیّد سرفراز کا فیصلہ اٹل تھا، جس میں ردوبدل نہیں ہونے والا تھا۔

"مُسکان کی تعلیم؟" آپا لقاں نے بوکھلا کر کہا۔

"بہت حاصل کرلی تعلیم، آزادی اور ہماری محبت اور اُس کا ناجائز فائدہ! اب سب کچھ ختم، اب صرف اُ کی شادی ہوگی۔" سیّد سرفراز علی نے اٹل فیصلہ کیا اور ایک دَم اُٹھ کر باہر نکل گئے یعنی اب وہ ہی ہونا تھا جو ا سوچ چکے تھے۔

"سیّد سرفراز علی! تم یہ بھول جاؤ کہ تم میری مُسکان کے ساتھ بھی وہ کرو گے جو تم اپنی پھوپو اور بہنوں کے ساتھ کر چکے ہو، اگر عبدالولی سے مُسکان کی شادی ناممکن ہے تو اُس بوڑھے کھوسٹ کے ساتھ بھی اپنی بچی کی زندگی تباہ نہیں ہونے دوں گی، چاہے اِس کے لیے مجھے اپنی جان سے بھی جانا پڑے۔ ابھی تم کرلو جو کرنا ہے لیکن میں کبھی وہ نہ ہونے دوں گی جو تمہارے خاندان میں عورتوں کی ساتھ ہوتا آ ہے۔"

آج سے برسوں پہلے سیّد عبداللہ نے ایک عورت کی زندگی بچا کر اپنے سارے خاندان کی زندگی گنوادی تھی۔ میں اُس کی قربانی کو ضائع نہ جانے دوں گی، میں دوسری نسل کی اِس لڑکی کو بچاؤں گی کیونکہ کہ سُنا ہے کہ ایک نسل کی عورت کی قسمت، دوسری نسل کی عورت کو بھی ملتی ہے۔ اگر تیسری نسل بچا جائے تو پھر وہ قسمت بدل جاتی ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اِس رسم کو توڑنے کے لیے اگر مجھے اپنی جا گنوانی پڑے تو میں یہ ضرور کروں گی۔" آپا لقاں نے با آواز بلند کہا۔

❖❖○❖❖

ہر طرف روشنی کا سیلاب تھا۔ ہال کو بلبز اور بلیو لائٹ سے سجایا گیا تھا جب یہ دونوں لائٹیں مود کر

لی ملتیں تو ایک دَم سبز روشنی میں منتقل ہو جاتیں، جس سے بہت خوب صورت تاثر مل رہا تھا۔ ہال کی ہت بھی موو ایبل تھی۔ آج میڈم راگنی نے اِس پارٹی کو بالکل الگ طرح کا رنگ دینے کا سوچا تھا۔ وہ ی کچھ لڑکیوں کو لانچ کر رہی تھی اس کے علاوہ آج کی پارٹی میں بہت سے وزرا اور افسروں سے بہت ا اہم فائلوں پر کام لینا تھا۔ نیو ایئر پارٹی کے بعد میڈم راگنی کوئی اور پارٹی نہ کرسکی تھی، وجہ طارق تھا، جو ن کی بو سونگھتا پھر رہا تھا۔ لیکن آج کی پارٹی کے متعلق میڈم راگنی بے حد بے فکر تھی کیوں کہ جس وقت پارٹی اپنے عروج پر ہوتی تھی، اُس وقت طارق کو خود اپنے ہی مسئلے میں اس قدر اُلجھا ہوا ہونا تھا کہ وہ ان کو قطعی ڈسٹرب نہ کرسکتا تھا۔

"واؤ! چاندنی جی آج تو آپ نے ہمارے حواس باقاعدہ اُڑا دینے کا پورا پورا بندوبست کر رکھا ہے۔" گورمانی نے مدھم میوزک پر ایک خوب صورت سی لڑکی کو ناچتے دیکھ کر کہا۔ وہ لڑکی بے حد کم عمر تھی اور بے مدکم لباس میں اپنی قاتل اداؤں سے بہت ساروں کو گھائل کر رہی تھی۔

"ارے گورمانی صاحب! یہ تو کچھ بھی نہیں ہے آج بارہ بجے آپ اصل حُسن دیکھیں گے۔" میڈم راگنی آج بہت آفت قسم کی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ یہ پانچ لاکھ کی ساڑھی اُس نے اپنے ڈیزائنر بیٹے سے ڈیزائن کروائی تھی۔ اُس کا بیٹا اپنے سرکل میں بے حد بدنام تھا نو عمر لڑکوں کو برائی کی جانب لا کر وہ اُن کو تباہ کر دیتا تھا۔ وہ لڑکے یا تو کچھ عرصے بعد خودکشی کر لیتے یا پھر عادی ہو کر اُس کے گروہ کا حصہ بن جاتے تھے۔ وہ اکثر افسروں کو سرو کرتے تھے، مختلف ایمبیسی کے غیر ملکی افسر اپنی ضرورت کے لیے "بنی" سے رابطہ کرتے تھے۔ اب تو اس برائی کا چسکہ بہت سے ملکی افسروں کو بھی پڑ گیا تھا۔

"بنی" ایسے بے باک جملوں سے اپنی ماں کی تعریف کر رہا تھا کہ تیار ہوتی ماہی نے دِل ہی دِل میں اس بے غیرت کو گندی سی گالی دی۔

"مجھے آج لگ رہا ہے کہ عورت ہو کر بھی ہماری اہمیت ختم ہو رہی ہے۔" پری نے جل کر کہا۔ اِس وقت ٹاپ کی بیوٹیشنز اُن سب کا میک اپ کر رہی تھیں، لڑکیوں کے مختلف لکس کے متعلق میڈم راگنی کی خاص ہدایات تھیں۔

"کیوں؟ تم ایسا کیسے سوچ رہی ہو اگر ہماری اہمیت کم ہوتی تو یہ وزرا ہمارے تلوے نہ چاٹتے۔" سونی نے اپنے آپ کا جائزہ آئینے میں لیتے ہوئے کہا۔

"اس "بنی" کی وجہ سے کہہ رہی ہوں، کم بخت آدھا مرد! اپنے لڑکوں کو کیوں اِس پارٹی میں لے کر آیا اور یہ لڑکے یوں پیسٹری بن کر آئے ہیں، جیسے ہمارا پتہ کاٹنا مقصود ہو۔" پری کا تجزیہ کچھ غلط بھی نہ تھا۔

"کم آن یار! یہ تو ورائٹی ہے ورائٹی! کسی کو میٹھا، کسی کو کھٹا، کسی کو نمکین اور کسی کو سلاد چاہیے، میڈم راگنی نے تو اِس پارٹی میں ہر طرح کی سروس پرووائیڈ کی ہے اِس میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟" مالا نے اپنے بیک لیس بلاؤز کے ہکس بند کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ عورت ذات کی توہین ہے کہ ہم عورت ہو کر مرد کی ضرورت پوری نہیں کرسکتیں کہ وہ اِدھر اُدھر منہ ماری کرے۔" سونی کو واقعتاً بنی اور اُس کے لڑکوں سے خار محسوس ہو رہی تھی۔

''تو ہین؟ یعنی بے عزتی!'' ترنم، جو کب سے چپ چاپ اُن سب کی گفتگو سن رہی تھی ایک دم قہ
لگا کر ہنسی۔

''ارے بے عزتی تو اُس کی ہوتی ہے، جس کی کوئی عزت ہو، تم لوگوں کو تو ایسے معاملے میں پریشا
ہونے کی ضرورت ہی نہیں کیوں کہ تمہاری...''

''شٹ اپ ترنم!'' سوہنی نے غصّے سے اُس کی بات کاٹی۔

''یو شٹ اپ۔'' ترنم تو ڈرگ کی اچھی خاصی ڈوز لے کر بیٹھی تھی، وہ ایک دم آپے سے باہر ہوگئی۔

''تم! تیسرے درجے کی طوائف، بے غیرت...'' ترنم تابڑتوڑ گالیاں دے رہی تھی۔

''ترنم میں کہتی ہوں اپنی بکواس بند کرو، تم خود کون سی سیّد زادی یا دودھ سے دُھلی ہو۔'' سوہنی نے ایک
گندی گالی دی۔

''تمہارے جیسی نہیں ہوں، جو سات نسلوں سے طوائف ہے، جس کے باپ تک کا پتا نہیں، تمہارا
ماؤں کے اتنے چاہنے والوں میں تمہارے باپ کا کیا پتا چلتا ہوگا۔'' ترنم جو ستاروں والا نیلا ٹاپ اور جا
جیسے چھوٹے سے اسکرٹ نما لباس میں ملبوس تھی، جس میں سے اُس کی لمبی گوری ٹانگیں بے حد نمایا
تھیں، ایک دَم محلے کی بینڈولڑا کا عورتوں کی طرح کھڑے ہو کر لڑنے لگی۔ نشہ چڑھ کر اُس کے حوا
معطل کر گیا تھا۔

''اوہ مائی گاڈ۔'' ماہی نے اپنا سر تھام لیا وہ جان گئی تھی کہ ترنم نشے میں ہے اور وہ نشے میں بے
خطرناک ہوجاتی تھی۔ آج تو سونگ (جھولے) پر اُس کی بھی انٹری تھی۔ مووایبل چھت سے د
جھولے اُترنے تھے اور اِن دس جھولوں پر میڈم راگنی نے اپنی آئیٹم گرلز بٹھانی تھیں، جو حاضرین
حواس معطل کرکے اُن کے ٹارگٹس کو پورا کرنے والی تھیں۔

''تم...'' سوہنی گالی دیتے ہوئے ترنم پر جھپٹی۔ اِس طرح کی ہاتھا پائی کے لیے وہاں موجود ترنم سمیت
کوئی تیار نہ تھا۔

پنسل ہیل سے سوہنی نے ترنم کے بازوؤں پر پاؤں مارے، زمین پر گری مار کھاتی ترنم ایک دم قہقہ
لگا کر ہنسنے لگی اور اُس کے ہنسنے پر سوہنی کے چلتے ہاتھ رک گئے، سوہنی کو ہٹانے والی لڑکیاں بھی حیر
سے ترنم کو دیکھنے لگیں۔ ترنم ہنستے ہنستے ایک دَم رونے لگی۔ اُس نے سوہنی کے ہاتھ سے اُس کا ہائی ہیل
جوتا پکڑ لیا۔

''اُدھر نہیں اِدھر مارو!'' ترنم نے جوتا پکڑ کر اپنے سر پر مارتے ہوئے کہا۔ ''میں، ترنم، اِس قابل ہو
کہ میرے سر پر جوتے لگیں میں نے ایک معصوم پاکیزہ بیٹی ایمان فاطمہ کا قتل کیا ہے، میں قاتل ہو
مجھے تو پھانسی دے کر ہمیشہ کے لیے لٹکا دینا چاہیے تاکہ ہر ڈولنے والے قدم مجھ سے عبرت حاصل
کریں۔'' ترنم اتنا کہہ کر ہانپنے لگی۔ سوہنی کی مار سے اُس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور اُس کے چہرے پر ہلکی
سی خون کی باریک لکیر بن گئی تھی۔

''یہ سب کیا تماشا ہے؟'' ڈریسنگ روم میں میڈم راگنی نے داخل ہو کر پوچھا۔ پھر ترنم کے چہر
پر خون اور سوہنی کے ہاتھ میں جوتا دیکھ کر ایک دَم بھڑک اُٹھی۔

''ایک تو چاندنی نے ان کو اتنا لو پروفائل میں رکھا ہے کہ سوائے کال گرل ہونے کے یہ کچھ نہیں بن
ل۔ جسم فروشی کے علاوہ یہ کچھ نہیں سیکھ سکیں، کتے بلیوں کی طرح لڑتی ہیں۔ پارٹی عروج پر ہے اور تم
ہ کی انٹری ہونے والی ہے اور تم نے یہ تماشا لگا رکھا ہے۔ پانچ منٹ میں اپنے اپنے حلیے درست
کے اپنی پوزیشنز سنبھالو ورنہ تم لوگوں کی کھال گلانے کے لیے میرے پاس شان دار تیزاب موجود
ہ۔'' میڈم راگنی نے چلاّتے ہوئے کہا اور دھپ دھپ پاؤں مارتی باہر نکل گئی۔

سوہنی کے تو بدن سے جان نکل رہی تھی، گیتی آرا کے ساتھ جو کچھ ہو چکا تھا سب کے سامنے تھا۔ وہ
ا پلٹ کر اپنی بیوٹیشن سے اپنا حلیہ ٹھیک کروانے لگی جب کہ ماہی نے بڑھ کر ترنم کو اُٹھا کر پانی پلوایا۔

''بینا اِس کا میک اپ ٹھیک کرو اور دیکھو زخم کو کس طرح چھپانا ہے۔'' ماہی نے کہا۔

بیوٹیشن کی اسسٹنٹ جو گھبرا کر ایک جانب کھڑی تھی فوراً ترنم کی جانب لپکی، دِل ہی دِل میں وہ ان
ہ خوب صورت آفتوں پر لعنت بھیج رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ایسے موقوں پر گندم کے ساتھ گھن بھی ضرور
ا ہے۔

''کم آن گرلز! تم سب کے سونگ تیار ہیں، سب سے پہلے تین جھولے اُتریں گے اور چھ منٹ کے تیز
زک کے ساتھ تم سب کو اپنی پرفارمنس دینی ہوگی۔ اور پھر تم سب کے جھولے تھوڑا فاصلہ لے کر کارنر
جائیں گے۔ اِسی طرح تین تین کرکے جھولے اُتریں گے اور چھ چھ منٹ کی پرفارمنس ہے۔ آخر میں
ڈ میوزک کے ساتھ یہ جھولے نیچے زمین کی جانب جائیں گے اتنا کہ تم لوگ جمپ کرکے نیچے اُتر
۔ ڈانسنگ فلور کو کچھ دیر کے لیے میں سلو کروادوں گا اتنا یاد رہے کہ تم سب نے جمپ ایک ساتھ کرنا
، یہ سب بہت خوب صورت لگنا چاہیے۔'' بنی اُن سب کو ہدایات دے رہا تھا۔

''کم آن بنی! یہ کسی فلم کی شوٹنگ تھوڑا ہی ہے جو تم اِس قدر کانشس ہو رہے ہو۔'' پری نے کچھ
وائی سے کہا۔

''اب جن کو لڑکیاں چاہئیں وہ تو اِس سب کے بغیر بھی قیمت ادا کردیں گے۔'' پری نے کچھ کچھ بیزار
تے ہوئے کہا، گذشتہ نو دن اور رات سے وہ مسلسل ڈانس پریکٹس کر کے تھک گئی تھی۔

''مائی ڈیئر ڈول! یہ دور کمپیٹیشن کا ہے! ہماری فیلڈ میں کئی لوگ ہیں لیکن سب بڑے بڑے کلائنٹ صرف
ی پارٹیز اٹینڈ کرنے آتے ہیں تو اُس کی وجہ ہماری لڑکیوں کی کیٹ واکس، گلیمر اور نیا پن ہے۔ مام اگر
ب کھیل تماشے نہ کریں تو لوگ جو دِنوں ہماری پارٹیز کا انتظار کرتے ہیں وہ کبھی نہ کریں اور ہاں یہ
۔ میں تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں تاکہ تم جان لو کہ اگر مام ہر چیز کو پلان کرتی ہیں تو سب وجوہات کو
لر رکھ کر پرفیکٹ رزلٹ حاصل کرنے کے لیے یہ سب کرتی ہیں۔ اب جلدی جلدی تیار ہوجاؤ، نینی آتا
ہوگا۔'' بنی کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

کچھ ہی دیر بعد نینی گلے میں کیمرا لٹکائے داخل ہوا۔

''اوہ لَول ڈولز! سیزلنگ، اگر تیار ہو تو تصویریں بنوالو کیوں کہ بنی کا موڈ بے حد خراب ہے۔'' نینی جو
کلاس فوٹو گرافر تھا، وہ عام سی لڑکی کو حور بنا کر پیش کر دیتا تھا۔ اُس نے باری باری سب کی تصویریں
شروع کردیں۔

"کمال کی پارٹی ہے راگنی!" میڈم چاندنی کو پہلی بار موقع ملا تھا راگنی کی پارٹی کا حصّہ بننے کا، اِس لیے اُس کا جوش بھی بہت زیادہ تھا۔ میڈم راگنی کی مسکراہٹ میں بے نیازی تھی، وہ شروع سے ما کہلائی جارہی تھی جب کہ چاندنی کو بائی سے میڈم کا سفر طے کرنا پڑا تھا اور میڈم راگنی اِس واضح فرق پاٹنے کا کوئی خاص ارادہ نہ رکھتی تھی۔ وہ تو بگ باس کی اگر خاص ہدایات اور چاندنی کے پاس اس ط خاص لڑکیاں نہ ہوتیں تو اُسے کبھی گھاس نہ ڈالتی۔

"واقعی! کمال کی پارٹی ہے۔" میڈم چاندنی نے بیسیوں بار دُہرایا جملہ پھر دُہرایا۔ آج تو کروڑوں ا ڈیل ہو رہی تھی۔ واقعی میڈم راگنی کے ساتھ کام کرنے سے ایک دَم اُس کا اسٹیٹس بڑھ گیا تھا۔

میڈم چاندنی نے برسوں کی محنت کے بعد اپنی لڑکیوں اور خود کی گرومنگ کی تھی۔ بگ باس کے کام ا وہ بھی مسلسل کر رہی تھی لیکن راگنی جیسی گڈ بُک میں نہ تھی اور آج وہ جان گئی تھی کہ اِس عورت کے پا کریٹو دماغ ہے وہ ہر کام کے لیے پہلے سے پلان کرتی تھی اور یہ ہی پلاننگ اُسے نمایاں کامیابی دلا تھی۔

"آج میں تم سے کچھ لڑکیوں کی ڈیل کرنا چاہ رہی ہوں۔" میڈم راگنی نے ماہی، ترنم اور مالا کو دیکھ ہوئے میڈم چاندنی سے کہا۔ وہ ہیرے جیسی لڑکیاں میڈم چاندنی کے ساتھ رہ کر اپنا آپ ماند کر رہی تھیں اور میڈم راگنی کی عادت تھی کہ وہ ہر لڑکی کو اُس کے پروفائل کے مطابق ڈیل کرتی تھی۔

"دیکھو راگنی! ہم سب مل کر کام کر لیتے ہیں پھر بگ باس بھی تو کچھ اِس قسم کی ہدایات دے ر ہیں۔" میڈم چاندنی نے جان بچاتے ہوئے کہا۔ اتنی کم عقل وہ ہرگز نہ تھی کہ اپنی ٹرینڈ لڑکیاں کسی ا کے حوالے کردے۔

میڈم راگنی کے چہرے پر ہلکی سی ناگوار لہر نمودار ہوئی لیکن پھر فوراً غائب ہوگئی۔ اُسے اپنے جذبات پ بے حد کنٹرول تھا اور یہ ہی اُس کی کامیابی کی کنجی تھی۔

"راگنی! تم نے اُس طارق کے بچے کا کیا کیا؟" میڈم چاندنی نے ویٹر سے خاص مشروب کا گلاس تھامتے ہوئے پوچھا۔ میڈم راگنی نے تو ویٹرز تک کو سیکسی لباس پہنوا کر گلیمر پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

"وہ تم کو بہت جلد پتا چل جائے گا۔" میڈم راگنی مطمئن انداز میں بولی۔

"میں اُس طارق کو ایسا سبق سکھانے والی ہوں کہ وہ ہمارے متعلق کیس بنانے کے بجائے ہمارا نام تک لینے سے ڈرے گا۔" میڈم راگنی نے ہنستے ہوئے کہا۔

جواباً میڈم چاندنی نے اثبات میں سر ہلایا۔ یقیناً راگنی نے کوئی دُور کی پلاننگ کی ہوگی، وہ راگنی کی پلاننگ کی تو خود بے حد قائل اور قدر دان ہوگئی تھی۔

❖❖○❖❖

مُسکان کو ڈاکٹرز نے ابھی تک جانے کی اجازت نہیں دی ہے؟ سائرہ نے آیا امّاں سے کہا۔

"میں جانتی ہوں لیکن میں سیّد سرفراز علی کے حکم کے آگے مجبور ہوں۔" آیا امّاں نے مُسکان کا سامان ایک باسکٹ میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔

"وہ اُس کا باپ ہے، ہر فیصلہ لے سکتا ہے۔"

"عجیب انسان ہیں!" سائرہ، مُسکان کے بابا کا لحاظ کر کے اس کے علاوہ کچھ نہ کہہ سکی۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن کچھ دِن بعد ہمارے ایگزام شروع ہونے والے ہیں، آپ مُسکان کو جلدی واپس دیجیے گا۔" سائرہ نے آیا امّاں کی مدد کرتے ہوئے مزید بکھری چیزیں اُن کے پاس رکھتے ہوئے ا۔

"واپس؟" آیا امّاں کے لہجے میں فکر نمایاں تھی۔

"ٹھیک ہے۔" وہ کمزور لہجے میں بولیں۔

"اللہ جانے آئندہ کیا کیا حالات ہوں گے؟" آیا امّاں دِل ہی دِل میں بولیں۔ مُسکان دوائیوں کے اثر گہری نیند سو رہی تھی، چند دِن میں اُس کی گوری رنگت پھیکی پڑ گئی تھی۔ اُس کی بیماری جو نظر آتی تھی لی نہیں، یہ تو آیا امّاں ہی جانتی تھیں کہ اُسے کون سا روگ لگ چکا ہے۔

"آج شام وہ گاؤں کے لیے نکل رہے تھے آئندہ آنے والے دن بے حد مشکل ہوں گے یہ اُن کو ازہ تھا لیکن کیا مُسکان اپنے باپ کا دوسرا روپ برداشت کر سکے گی، اپنی محبت کے نہ ملنے کا دُکھ اور پ کے بدلے ہوئے روپ کا دُکھ! کیا مُسکان سہہ پائے گی۔" آیا امّاں کے اندر سوال کسی سانپ کی ح سرسرا رہے تھے وہ ایک دَم بے چین ہو کر مُسکان کے پاس آن کھڑی ہوئیں۔

عائشہ بی بی کی کتنی جھلک تھی اُس میں اور کچھ کچھ سدرہ بی بی سے بھی اُس کی مشابہت تھی۔

"اللہ کرے تمہاری قسمت کی مشابہت اُن جیسی نہ ہو۔" آیا امّاں نے اُسے دِل ہی دِل میں دُعا دی۔

❖❖○❖❖

"ارے آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟" طارق نے گاڑی واپس موڑ کر نگینہ سے پوچھا، جو اپنی گاڑی باہر یونیفارم میں ملبوس پریشان کھڑی تھی۔

"دیکھیں نا طارق بھائی! ہماری گاڑی بند ہوگئی ہے اب اتنی شدید دھوپ میں گاڑی بغیر اے سی کے ال برداشت ہوتی ہے۔ ڈرائیور شاید کسی مکینک کو لینے گیا ہے۔" نگینہ نے اپنی کالج فائل کی موٹی جلد ہوا جھلنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ! اچھا تم میرے ساتھ چلو میں تمہیں گھر ڈراپ کر دیتا ہوں ڈرائیور گاڑی ٹھیک کروا کر خود ہی ائے گا۔" طارق نے اپنی گاڑی کا دروازہ کھول کر اُسے بیٹھنے کو کہا۔

"لیکن ڈرائیور مجھے غائب پا کر پریشان ہو جائے گا۔" نگینہ کی بات بھی درست تھی۔

"چلو اُس کا انتظار کر لیتے ہیں۔ تم بتاؤ کیا پیو گی؟" طارق نے اُسے گاڑی میں بٹھا کر پوچھا۔

"ٹھنڈا سادہ پانی۔" نگینہ نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"اِدھر سامنے شادمان کا سلش بہت مشہور ہے میں وہ لے کر آتا ہوں، تم تسلی سے بیٹھو کوئی کیسٹ کرلو۔" طارق کہتے ہوئے سڑک پار کر گیا۔

"ایک لیمن اور بلیک بیری!" طارق نے آرڈر کر کے پیسے جیب سے نکالے۔

"لیس سر!" دکاندار لڑکے نے ربڑ بینڈ کے ساتھ جیلٹن پیپر سے گلاس کو کوَر کر دیا تھا۔

طارق دونوں گلاس تھامے سڑک کراس کر رہا تھا، جب اُس نے اپنی گاڑی کے پاس ایک بڑی پیرو ڈو

رُکتی دیکھی۔ اُس میں سے جو شخص نکلا اُس نے طارق کو بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ طارق تیزی سے گاڑی کی جانب بڑھا جب کہ دوسری گاڑی سے چار آدمی نکل کر طارق کی گاڑی کا گھیرا کر چکے تھے۔ نگینہ تو اپنی بزدلی کی وجہ سے ہمیشہ گاڑی لاک کر کے بیٹھتی تھی۔ اب بھی اگر اُس نے گاڑی لاک نہ کی ہوتی تو وہ لوگ کب کا نگینہ کو نکال چکے ہوتے۔

"اے!" طارق نے انہیں دور سے للکارا۔ مارک نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو طارق دوڑتا ہوا اُن کے پاس ہی آ رہا تھا۔

مارک کے ساتھیوں نے اچانک فائر کھول دیے تو طارق نے رستے میں کھڑی گاڑی کی آڑ لے کر جوابی فائرنگ کی۔ طارق کی گاڑی کا ایمرجنسی لاک کا الارم مسلسل بول رہا تھا۔ فائر کی آواز اور الارم کی آواز سے کئی دکاندار باہر نکل آئے تھے۔ مارک اور اُس کے ساتھی یہ دیکھ کر ایک دَم بھاگے۔

طارق نے اُن کی گاڑی کے ٹائر کا نشانہ لینا چاہا لیکن وہ نکل چکے تھے۔ طارق دوڑتا ہوا اپنی گاڑی کے پاس آیا، جہاں اِردگرد مختلف لوگ اکٹھے ہو چکے تھے۔ طارق نے نہایت پریشانی سے گاڑی کا لاک کھولا، اندر نگینہ بے سُدھ پڑی تھی۔ خوف و دہشت سے وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

"شکر کرو باؤ لڑکی بچ گئی۔" رش میں سے کسی نے کہا۔

طارق نے سیٹ بیلٹ نگینہ کے ساتھ باندھ کر اُس کی سیٹ کو کھول دیا تاکہ وہ آرام سے لیٹ سکے۔

گاڑی اپنے دوست کے کلینک کی جانب لے جاتے ہوئے طارق مسلسل پریشانی سے اپنا ماتھا مسل رہا تھا۔ آج کل وہ جس گروہ کے متعلق کام کر رہا تھا اُس گروہ میں مارک کا نام بھی شامل تھا اور طارق مارک کے چہرے کو اچھی طرح پہچان گیا تھا۔

"کیا وہ لوگ مجھ پر حملہ کرنے آئے تھے؟" طارق خود سے سوال کر رہا تھا۔ اگر وہ میری تلاش میں آئے تھے تو وہ نگینہ کا گھیراؤ کیوں کیے ہوئے تھے؟

نگینہ خوف سے بے ہوش ہوگئی تھی۔ اس لیے جلد ہی اُسے ہوش آ گیا۔

"طارق بھائی!" نگینہ ایک دَم طارق کے کندھے سے لگ کر رونے لگی۔ طارق جو اُس کے بے ہوش ہونے پر، پریشان تھا اُس کے اتنے قریب آنے پر مسکرا دیا۔ ہَوا میں ہاتھ اُٹھائے وہ اپنا ضبط آزما رہا تھا۔ جی تو چاہتا تھا کہ اِس کانچ کی گڑیا کو اپنی پناہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لے لے۔

"نگی۔" طارق نے اُس کا سر سہلایا۔

"یار گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے میں ہوں نا!"

"ہوں!" نگی نے سوں سوں کرتے اُس کی ہی شرٹ سے منہ پونچھ لیا۔

"ارے۔" طارق کو اپنی مسکراہٹ ضبط کرنی مشکل ہوگئی، حُسن کی معصوم ادائیں جان لیوا ہوتی ہیں۔ صبر کے لیے آزمائش ہوتی ہے، طارق اچھی طرح جان گیا تھا۔

"یار تمہارے آنسو پونچھنے کے لیے کیا یہ رومال کافی رہے گا یا پھر کسی چادر وادر کا انتظام کرنا پڑے گا؟" طارق نے ہلکے سے شرارتی موڈ میں کہا۔

"بھائی آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے میری تو ساری جان نکل گئی ہے۔" نگی نے روٹھے لہجے میں کہا۔

"ایک تو یہ حسینہ بھائی بھائی کہہ کر خوب چھریاں چلاتی ہے۔" طارق منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

"جی؟" نگی کچھ سُن نہ پائی۔

"کچھ نہیں یار! چلو گھر چلتے ہیں۔ انکل آنٹی پریشان ہو رہے ہوں گے۔" طارق نے اُسے اُس کی چادر تھماتے ہوئے کہا۔

جب نگی اور طارق گھر پہنچے تو عبدالولی روشن آرا کو لے کر مُسکان سے ملوانے جا رہا تھا۔ نگی اور طارق کے پہنچنے سے کچھ دیر پہلے ڈرائیور نے آ کر نگی کے لاپتا ہونے کی دِل دہلا دینے والی خبر سنادی، روشن آرا تو وہیں لان چیئرز پر ڈھے گئیں، وہ تو اچھا ہوا کہ چند منٹ بعد ہی طارق نگی کو لیے وہاں پہنچ گیا اور صورتِ حال سنبھل گئی۔

روشن آرا نگی کو سینے سے لگائے رو رہی تھیں اور نگی اُن سے زیادہ جوش سے رونے میں مصروف تھی۔

"خدا کے لیے امّاں جان بس کریں اِس طرح تو آپ دونوں کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔" عبدالولی نے نگی کی جانب اشارہ کیا جو مسلسل رو رو کر نڈھال ہو رہی تھی۔

"میں جانتی ہوں تم دونوں ہی اللہ کا مال ہو، لیکن میں کیا کروں، اُس اللہ ہی نے میرے دِل میں تمہارے لیے اتنی تڑپ اور محبت رکھ دی ہے کہ مجھ سے تم دونوں کی جدائی برداشت نہیں ہوتی۔" روشن آرا بیگم نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

"عبدالولی، نگی تم دونوں میری کوکھ کی بہار ہو، کبھی ہم سے بدگمان ہو کر دور نہ جانا۔" روشن آرا بیگم نے آئندہ آنے والے دنوں کے وسوسوں سے گھبرا کر کہا۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں امّاں جان!" ولی نے اُن کا ہاتھ تھام کر بوسہ لے کر کہا۔ طارق نے بہت رشک سے روشن آرا بیگم کو دیکھا۔

"کاش میری ماں زندہ ہوتی! کاش میرا باپ زندہ ہوتا!" طارق کے دِل میں ہوک اُٹھی، اُسی پَل مین گیٹ سے گاڑی داخل ہوئی۔ گاڑی سے احمد شاہ اور شہباز دونوں اکٹھے اُترے تھے۔

"مجھے راستے میں ڈرائیور نے فون کر کے ساری بات بتادی تھی، نگی خیریت سے ہے نا؟" احمد شاہ فکر مندی سے آگے بڑھے۔ پھر عبدالولی سے ساری بات سُن کر طارق کا شکریہ ادا کرنے لگے۔

"ارے نہیں انکل! شکریے کی کیا بات ہے؟" طارق نے مسکرا کر کہا۔

"اب میں یہ ہرگز نہیں کہوں گا کہ نگی میری بہنوں کی طرح ہے، وہ بس سب کی بہن ہے سوائے میرے!" طارق نے دِل ہی دِل میں کہا۔

"کیا خیال ہے، کیا ہمیں اِس حادثے کے متعلق پولیس کو خبر دینی چاہیے؟" ولی نے طارق سے مشورہ لیا۔

"میرا خیال ہے اِس کی ضرورت تو نہیں ہے اگر آپ لوگ خبر کرنا چاہیں تو اِس میں بھی کوئی پرابلم بھی نہیں ہے!" طارق نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے تم میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلو تاکہ وہ نگینہ کا بیان وغیرہ لینے پر اصرار نہ کریں۔"

عبدالولی نے اُسے ساتھ چلنے کو کہا۔

''اوکے! جس طرح تمہارا دل چاہے!'' طارق اندر سے کچھ پریشان تھا۔

''بابا سائیں ہم ذرا پولیس اسٹیشن ہو آئیں۔'' عبدالولی نے اجازت لیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے!'' احمد شاہ نے جواب دیا۔ عبدالولی اور طارق دونوں ایک ساتھ باہر نکلے۔

''بھائی صاحب آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟'' روشن آرا کی نگاہ ایک دم شہباز صاحب پر پڑی، جن کی رنگت پھیکی پڑ گئی تھی۔

''شہباز تم اِدھر بیٹھو!'' احمد شاہ جو اُن کے رازداں بھی تھے انہوں نے نہایت فکرمندی سے کہا۔

''تم خود پر کنٹرول رکھو اِس طرح تو تمہاری طبیعت بگڑ جائے گی۔''

''احمد! میری تو ساری زندگی تباہ ہو چکی ہے اب اور کون سے خسارے باقی ہیں!'' شہباز صاحب سے اب اپنے بچوں کے لیے صبر کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

''احمد! مجھ سے اب مزید صبر نہیں ہوتا، مجھے اپنے بچوں سے ملنا ہے۔'' وہ ضدی بچوں کی طرح مچلے۔

''میرا خیال ہے کہ میں خود طارق سے اِس معاملے پر بات کرتا ہوں تاکہ اگر اُس کے دِل میں کوئی بدگمانی ہے تو اُسے ختم کیا جا سکے۔'' احمد شاہ نے شہباز صاحب کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''وعدہ کرو احمد! تم مجھ سے میرے بچوں کو ملواؤ گے!'' شہباز صاحب نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

''وعدہ!'' احمد شاہ نے شہباز صاحب کا ہاتھ گرم جوشی سے دباتے ہوئے کہا تو شہباز صاحب کو لگا کہ اُن کے مرتے ہوئے وجود میں توانائی دوڑنے لگی ہے۔ ایک باپ کو آس ہونے لگی تھی اور وہ اِس آس کا دامن پکڑے قسمت کی مہربانی کا منتظر تھا۔

❖❖◐❖❖

''بلڈ پریشر بہت ہائی ہے۔'' ڈاکٹر نے قاسم علوی کو باہر آ کر اطلاع دی۔ وہ اِس وقت ہسپتال میں تھے زبیدہ کو پھر اٹیک ہوا تھا۔ گھر میں ملازموں کے سوا کوئی اور نہ تھا اس لیے زبیدہ کی طبیعت بہت بگڑ گئی تھی۔

''کیا زیادہ خطرے کی بات ہے؟'' قاسم علوی نے تھکے تھکے لہجے میں ڈاکٹر سے پوچھا۔ زندگی تو بس اِک مشقت بن گئی تھی۔

''آپ حوصلہ رکھیے! فی الحال ہم انہیں آئی سی یو میں ہی رکھیں گے۔'' ڈاکٹر درست صورتِ حال بتانے کے بجائے کچھ ٹال مٹول کر گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ باہر کھڑے متعلقین مریض سے زیادہ تکلیف میں ہوتے ہیں۔

''پاپا آپ تو میرا حوصلہ ہیں، آپ کو دیکھ کر مجھے جینے کا حوصلہ ملتا ہے۔ اتنے مشکل حالات میں بھی کبھی آپ نہیں گھبرائے تو پھر اب کیوں حوصلہ و ہمت ہارے جا رہے ہیں؟'' سمعان نے باپ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''یار! پن کشن میں پن کھبونے کی ایک خاص حد ہوتی ہے۔ جب پن کشن پنوں سے بھر کر اپنے اندر مزید پنز کی جگہ نہیں رکھتا تو پھر میں کون ہوں۔ میں تو ایک بہت عام سا انسان ہوں، ایسا انسان جو دُکھوں

کو پیتے پیتے اب تھک گیا ہے۔'' قاسم علوی نے ایک بینچ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''پاپا یو نیڈ سم چینج!'' سمعان نے اپنے باپ کا تھکا ہوا چہرہ دیکھ کر کہا۔

''نو! لیکن شاید یس! تم ٹھیک کہتے ہو۔''

''مجھے اب شادی کا سوچنا ہوگا!'' قاسم علوی نے سمعان کے سر پر دھماکا ہی تو کیا تھا۔

''واٹ! اِس عمر میں شادی کریں گے؟ شادی کرنی تھی تو پہلے کر لینی تھی اب اِس ڈھلتی عمر میں آپ کو شادی کرتے شرم نہیں آئے گی۔'' سمعان باہر کا تعلیم یافتہ اور بات کہنے میں بے حد بے باک تھا۔

''اب ایسی کون سی تمہاری عمر بڑھ گئی ہے، جو تم شادی سے انکاری ہو۔'' قاسم صاحب نے کہا۔

''کیا! آپ میری شادی کے متعلق بات کر رہے تھے؟'' سمعان نے شرمندہ ہو کر پوچھا۔

''تو اور کیا میں اپنی شادی کی بات کروں گا!'' قاسم صاحب نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔

''ویسے اِس میں کوئی حرج نہیں اگر کوئی سوبر سی خاتون مل جائے۔'' سمعان نے اپنی شرمندگی مٹانے کی کوشش کرتے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

''وہ سوبر سی خاتون مجھے برسوں پہلے مل گئی تھی اب تو مجھے اپنی بہو رانی کی ضرورت ہے، جو میرا گھر میرے پوتے پوتیوں سے بھر دے۔'' قاسم علوی وقتی طور پر ساری پریشانی بھول کر آنے والے دِنوں کے تصور میں کھو گئے تھے۔ اِس تصور میں اُن کی دنیا آباد تھی۔

''میری شادی۔'' سمعان کچھ مسکرایا۔

''ہاں تمہاری شادی! اور تمہاری شادی کے لیے ضروری ہے کہ کوئی لڑکی ہو اور اگر تمہیں پسند ہے تو بتادو ورنہ میری پسند سے گزارہ کرنے کو تیار ہو جاؤ۔'' قاسم صاحب کے لہجے میں پیار بھری دھمکی شامل تھی۔

''لڑکی! ہوں۔'' سمعان نے ہوں کو کھینچتے ہوئے باپ کو دیکھا، سامنے وہ باپ کھڑا تھا، جو بیٹے کی ایک ایک نبض کو جانتا تھا۔ قاسم صاحب جان گئے تھے کہ سمعان کے دل میں کوئی موجود ہے۔ اُس کی آنکھوں کی چمک میں کسی کا عکس نظر آ رہا تھا۔

''ہاں! اب مجھے اُس کا نام پتا بتادو تاکہ میں اپنی بہو رانی کو جلد سے جلد گھر لے آؤں۔ کم از کم تمہاری ماں کے پاس کوئی اپنا تو رہے، جو اُس کی دیکھ بھال کر سکے، اُسے خالص اور بے لوث محبت دے سکے۔'' قاسم صاحب کا لہجہ بات کے اختتام تک بالکل سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''پاپا!''

''وہ ہے!'' سمعان اعتراف کرتے ہچکچا رہا تھا۔

''وہ ہے، یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔'' قاسم صاحب نے مسکرا کر اُسے دیکھا۔

''ہاں پاپا! وہ......'' سمعان، جو بات کہنے سننے میں خاصا بولڈ تھا، شرما گیا۔

''یار بول بھی چکو کیا نام ہے لڑکی کا؟'' قاسم صاحب نے بے تابی سے پوچھا۔

''مُسکان! مُسکان ہے نام اُس کا۔'' سمعان علوی نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''کہاں رہتی ہے اور کس کی بیٹی ہے؟'' قاسم صاحب نے اگلا سوال کیا۔

''لاہور میں رہتی ہے اور اپنے باپ کی اکلوتی بیٹی ہے۔'' سمعان کے پاس بہت ادھوری انفارمیشن تھی۔

''تم اس سے محبت کرتے ہو!'' قاسم صاحب کے لہجے میں بے چینی تھی۔ محبت کے نام پر جو روگ وہ سہہ رہے تھے اُن کی خواہش تھی کہ اُن کا بیٹا اِس چکر میں نہ پڑے اور زندگی میں اُس کی پریکٹیکل اپروچ ہو۔

''محبت اگر کسی کے اچھا لگنے کو کہتے ہیں تو شاید مجھے محبت ہے۔'' سمعان خود بھی شیور نہ تھا۔

''نہیں! محبت کسی کے صرف اچھے لگنے کو نہیں کہتے وہ تو Infatuation ہوتی ہے۔ محبت تو وہ ہوتی ہے جس میں محبوب کا نا محبوب بھی اچھا لگتا ہے، محبت وہ ہوتی ہے جس میں آپ کسی کو اُس کی برائیوں سمیت پیار کرتے ہوں، محبت وہ ہوتی ہے کہ آپ محبوب کے بغیر رہ نہیں سکتے اور آپ کا وجود اُسے گمشدہ ٹکڑے کی طرح ہر وقت تلاش کرتا رہتا ہے، تب تک جب تک وجود کا گمشدہ ٹکڑا اُس سے آن نہ ملے۔'' قاسم صاحب کھوئے کھوئے انداز میں بولے جا رہے تھے۔

''پاپا کیا آپ نے بھی محبت کی تھی؟'' سمعان سوال کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''میری محبت اپنے پچھتاووں سے اندر لڑ رہی ہے۔'' قاسم صاحب ایک دم فکرمند اور اُداس ہو گئے۔

''پاپا آپ کی محبت تو بہت گریٹ ہے، جو اتنے برسوں سے وفا کی بلندیوں پر کھڑی ہے، میں آپ کی محبت کو سلام کرتا ہوں، جس کی وجہ سے آپ نے اپنی ذات کی قربانی تک دے دی۔'' سمعان کے لہجے میں سچائی تھی۔

لیکن! لیکن میری محبت میں ابھی کوئی عروج نہیں ہے کیوں کہ یہ ابھی تک شدید پسندیدگی تک محدود ہے اور... اور شاید یہ پسندیدگی بھی یک طرفہ ہے۔'' سمعان نے بنا کچھ چھپائے سب کچھ بتا دیا۔

''کیا وہ تمہیں پسند نہیں کرتی؟''

''کرتی تو ہے لیکن ایک دوست کی طرح! اِس سے زیادہ وہ میرے لیے سوچتی ہے یا نہیں میں ابھی تک جان نہیں سکا۔'' سمعان اتنے عرصے سے مُسکان کو پسند کر رہا تھا لیکن نہ اپنے جذبات اُسے بتا سکا تھا اور نہ اُس کے جذبات جان سکا تھا۔

''اُس کے گھر بار کا ایڈریس لو اور ہو سکے تو اُس کے دِل کی خبر لو کہ وہ تمہارے لیے کیسے جذبات رکھتی ہے تاکہ ہم اپنے گھر کی رونق کو جلد از جلد گھر لے آئیں۔'' قاسم علوی نے کہا۔

''پاپا! یہ سب کچھ آپ ماما کے لیے کر رہے ہیں نا!'' سمعان نے اُن کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''سمعان! آج تک جو کچھ اُس کے لیے کرتا آیا ہوں وہ ایکچوئلی میں اپنے لیے ہی کرتا ہوں۔ زبیدہ میرے دِل میں رہتی ہے اور وہ میرا حصّہ تو ہے نا۔'' قاسم صاحب نے کہا۔

''پاپا میں ہمیشہ وِش کرتا ہوں کہ میں آپ کے جیسا بنوں!'' سمعان نے کہا۔

''لیکن میں ہمیشہ دعا کروں گا کہ تم بے شک میرے جیسے بنو لیکن تمہاری قسمت میرے جیسی ہرگز نہ ہو۔'' قاسم صاحب نے دِل ہی دِل میں کہا۔

❖❖○❖❖

''امی جان! منزہ کو بہت دیر ہو گئی ہے۔'' علیزے نے عصر کی نماز پڑھ کر ماں سے پوچھا جو خود بھی بے حد متفکر بیٹھی تھیں۔

''اللہ جانے اس لڑکی کے دماغ میں اتنی بغاوت کیوں ہے، جس کام سے روکو اِس کو ہمیشہ وہ ہی کام کرنا ہوتا ہے۔ اب یہ موا بیوٹی پارلر کا کام کیا خاندانی ہے؟ ہمارے دور کے جتنے حجام نائی تھے وہ سیلون کھول کر بیٹھ گئے ہیں اور اُن کی خاندان کی عورتیں ہی زیادہ تر اِس کام میں ملوث ہیں۔'' حسن آرا بیگم کو آج اپنا غصّہ نکالنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ منزہ کے کام کے سخت خلاف تھیں۔ کچھ بیماری کے بعد وہ کافی چڑچڑی بھی ہو گئی تھیں۔

''امی! اللہ کی ذات کرم کرے گی آپ فکرمند نہ ہوں۔'' ماں کی بگڑتی طبیعت دیکھ کر علیزے فوراً گھبرا کر بولی۔ اُسے منزہ کا ذکر کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔

''علیزے! زندگی اِس قدر مشکل ہو گئی ہے کہ جیا نہیں جاتا۔'' حسن آرا جو ساری عمر انوار صاحب کی ی بھلی اور تلخ سنتی آ رہی تھیں اب دھیرے دھیرے اُن کے اندر سے برداشت کا مادہ ختم ہو گیا تھا۔

''امی! آپ کیسی باتیں کرتی ہیں اللہ تعالیٰ آپ کو صحت، تندرستی اور طویل زندگی عطا فرمائے۔'' لیزے ماں کی مایوسی دیکھ کر روہانسی ہو گئی۔

''کاشف اور منزہ میری پہلی بڑی اولادیں تھیں۔ انور صاحب کی تلخیاں اور سخت رویے نے مجھے میری اولاد کی طرف زیادہ راغب کر دیا تھا۔ کاشف اور منزہ سے میری توقعات بھی زیادہ تھیں اب جب اُن کو ں خود سے اور اپنے ماحول سے بیزار دیکھتی ہوں تو بے حد دکھ ہوتا ہے۔'' حسن آرا کو گزشتہ دنوں ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ کاشف کو دیر سے گھر آنے سے روکنے پر کاشف نے اُن کے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔ وہ اخوش تھا! وہ اپنے گھر اور اپنے اسٹیٹس سے ناخوش تھا اسی لیے وہ گھر سے اور اُن سب سے فرار حاصل کر رہا تھا۔ ایسے میں حسن آرا بیگم کے دِل پر اتنا بوجھ آیا کہ وہ سہار ہی نہ سکیں اور انہیں ہارٹ اٹیک و گیا۔ اب علیزے کی کوشش ہوتی تھی کہ انہیں ٹینشن سے بچائے رکھے۔

''امی پلیز آپ نہ اِس طرح کی باتیں کریں اور نہ ہی اِس طرح کی باتیں سوچیں۔'' علیزے دوڑ کر پانی لے آئی۔

''کچھ نہیں ہوا بیٹا! مجھے پانی کی طلب نہیں ہے۔ میرا تو دِل کڑھتا ہے جس اولاد کی خاطر میں نے ب ایسے شخص کے ساتھ زندگی گزاری جو کانٹے کی طرح ساری عمر الجھتا ہی رہا، وہ ہی اولاد آج میرے بنے میں نہیں ہے۔ تم آج کی بات یاد رکھنا کہ منزہ کی یہ نوکری کوئی نہ کوئی چاند ضرور چڑھائے گی۔ یہ جو را دِل ہے نا اس کی نوکری سے کبھی مطمئن نہیں ہوا۔ ہمیشہ وسوسہ ہی آتا ہے میرے دِل میں، دیکھنا تم زے!'' حسن آرا بیگم ایک دَم ہانپنے لگیں اور سامنے پڑا پانی پینے لگیں۔

''امی! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟'' علیزے نے گھبرا کر انہیں دیکھا۔ وہ تو ہمیشہ دُعا کرتی تھیں لیکن ج پہلی بار اپنی اولاد کے متعلق ہدایت کی دُعا کرنے کے علاوہ پیش گوئی کر رہی تھیں۔

''میں اپنی زندگی سے مایوس ہو گئی ہوں، آج ہوں شاید کل نہ ہوں اور یہ اولاد...'' حسن آرا بیگم نے لگیں۔

"علیزے تم زندگی میں میری بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ کمزور عورت کا بچہ تو زندگی میں کامیاب ہوسکتا ہے لیکن کمزور ماں کا بچہ زندگی میں کامیابی کبھی حاصل نہیں کرسکتا۔ اولاد کی محبت ہمیشہ میرے لیے کمزوری رہی ہے میں اُن کی جائز ناجائز سب مانتی آئی ہوں اور آج وہ وقت آ گیا کہ میری رائے یا نصیحت اُن کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی اُن کے لیے اپنی رائے اور سوچ ہی اہم ہے۔ جو وہ ایک بار سوچ لیتے ہیں وہ ہی کرتے ہیں، چاہے اس میں کتنا ہی نقصان اُٹھانا پڑے۔"

"امی جان! آپ پلیز یوں مایوس ہونے کے بجائے ہم سب کے لیے دعا کیا کریں۔ ماں کی دعا قسمت بدل دیتی ہے دیکھیے گا آپ کی دعاؤں کے نتیجے میں کاشف بھائی اور منزہ دونوں ہی راہ راست پر آجائیں گے۔" علیزے نے اُن کو تسلی دی۔

"اللہ کرے!" انہوں نے تھک کر سر تخت پر رکھے تکیے پر ٹکا لیا۔ اُسی پل منزہ بیرونی دروازے سے برآمد ہوئی۔

"لیں وہ آ گئی اب تو پریشان ہونا بند کریں۔" علیزے نے مسکرا کر کہا۔ مغرب کی اذان شروع ہو چلی تھی۔

"جو لڑکیاں سورج غروب ہونے کا انتظار کریں اور پھر گھر میں واپس آئیں، وہ پریشانی کے علاوہ کیا ہوسکتی ہیں؟" امی نے منزہ کے قریب آتے ہی کہا۔

"اُف! پھر نصیحت نامہ شروع۔" منزہ نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"یار علیزے! جلدی سے کھانا کھلا دو، خالی پیٹ صرف نصیحت سے نہیں بھر سکتا۔" منزہ نے پاس کھڑی علیزے سے کہا جو بہن کی زبان درازی سے خائف کھڑی تھی۔ کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ ماں کے ساتھ اس طرح کی گفتگو کرنے سے اُن کی طبیعت کس قدر بگڑ سکتی ہے، اولاد اِس قدر بے حس کیسے ہوجاتی ہے! علیزے نے دِل ہی دِل میں کہا۔ وہ منزہ کے ساتھ منہ ماری کر کے ماں کو مزید ٹینشن میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"کھانا۔" منزہ نے شور مچانا شروع کردیا۔

"اچھا! تم ہاتھ منہ دھولو میں لاتی ہوں۔" علیزے نے ہمیشہ کی طرح اپنا غصہ دبا کر صلح جُو انداز میں کہا۔ وہ اُسے ماں کی نظروں کے سامنے سے ہٹانا چاہتی تھی۔

"تم کھانا تو لاؤ، ہاتھ بھی دھل جائیں گے۔" منزہ کے اندر بے صبری بہت تھی، اُسی پل باہر بیل ہوئی۔

"لو یہ کون آ گیا اور بیل کیوں دے رہا ہے؟" منزہ کے اِسی قسم کے بے وجہ اعتراض ہوتے تھے۔

"کون ہے بھئی؟ گڈو باہر دیکھو۔" انور صاحب جو اندر کمرے میں سوئے ہوئے تھے شاید بیل کی آواز سے اُن کی آنکھ کھل گئی تھی۔

علیزے نے کچن سے منہ نکال کر باہر دیکھا۔ منزہ واش بیسن پر کھڑی منہ دھو رہی تھی اور اُس کا ارادہ دروازے پر دیکھنے کا بالکل نہ تھا وہ یوں ہی ہر چیز سے بے نیاز رہتی تھی۔

"حد ہوگئی!" علیزے نے چولہا بند کر کے دروازے کی جانب جاتے ہوئے کہا۔

"آپ کو کیا واچ مین کی ڈیوٹی گھر والوں نے سونپ رکھی ہے؟" ولی نے جس چہرے کو شدت سے دیکھنے کی خواہش کی تھی اُسے دیکھ کر وہ اندر تک خوش ہوگیا تھا۔

"جی؟" علیزے ہمیشہ اِس شخص کی ذومعنی باتوں پر پریشان ہوجاتی تھی۔

"ویسے یہ صرف ہماری خوش نصیبی ہے یا واقعی گھر والوں نے دروازہ کھولنے کی ڈیوٹی آپ کو سونپ رکھی ہے؟"

"آپ اندر آجائیے!" علیزے کے پاس عبدالولی کے اس طرح کے سوالوں کا جواب تو تھا لیکن وہ کیا کرتی وہ اُس کی ماں کا اکلوتا بھانجا تھا۔

"حُسن خالہ اب کیسی ہیں؟" عبدالولی نے وہیں کھڑے کھڑے پوچھا۔

"امی اندر ہی ہیں آپ پلیز اندر آجائیں۔ وہ آپ کا سنیں گی تو آپ کے ملے بغیر جانے پر خفا ہوں گی۔" علیزے کا خیال تھا کہ شاید پچھلی مرتبہ کی طرح وہ ایک بار پھر دروازے سے رخصت ہونے والا ہے۔

"یہ آپ کو کس نے کہا کہ میں واپس جارہا ہوں؟"

"وہ میں تو..." علیزے اُس کے یوں اونچا بولنے پر گھبراگئی۔

"کیا آپ چاہ رہی ہیں کہ میں چلا جاؤں؟" ولی کو اُس کا گھبرایا چہرہ مزہ دے رہا تھا۔

"نہیں! میں نے ایسا تو کچھ بھی نہیں کہا۔" علیزے باقاعدہ گھبراگئی، ولی جو بے حد ذہین آدمی تھا اسے ہمیشہ سے ذہانت ہی اٹریکٹ کرتی تھی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اُس کا دِل بالکل ایک سادہ سی لڑکی میں اُلجھ جائے گا۔

"تم عام سی لڑکی نہیں ہو، تم تو بہت خاص ہو کیوں کہ تم میں میری ماں کی مشابہت بہت زیادہ ہے اور میری ماں دنیا کی بہترین عورت ہے۔" ولی نے علیزے کو غور سے دیکھتے ہوئے سوچا۔

"تو پھر آپ نے کیا کہا ہے؟" ولی نے سامنے گلی میں آتے ہوئے ڈرائیور کو پاس آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"پلیز آپ اندر آجائیں۔" علیزے نے شرمندگی سے سرخ ہوتے ہوئے کہا۔

میرا کہنا بالکل درست ہے یہ لڑکی واقعی سرخ وسفید رنگ میں خود کفیل ہے بار بار سرخ پڑجاتی ہے۔ ولی نے ایک نگاہ علیزے پر اور دوسری ڈرائیور پر ڈالی، جو ہاتھوں میں بڑے بڑے شاپرز لیے قریب آگیا تھا۔

ولی نے شاپرز ڈرائیور کے ہاتھ سے لے کر اُسے جانے کا اشارہ کیا۔

"چلیں محترمہ۔" ولی دروازے کی اوٹ میں کھڑی علیزے سے مخاطب ہوا جو اتنے ڈھیر سارے شاپرز کو ناپسندیدگی سے دیکھ رہی تھی۔

"کون ہے باہر؟" حُسن آرا بیگم مغرب کی نماز کا وضو کر کے غسل خانے سے نکلی تھیں۔

"السلام علیکم خالہ جان۔" ولی نے ایک دم سامنے آکر اپنا سر آگے جھکا دیا۔

"جیتے رہو! شاد رہو! اللہ تمہیں عرشوں پر بھاگ لگائے۔" حسن آرا بیگم نے خوش ہو کر ولی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" ولی شاپرز وہیں رکھ کر اُن کے کندھے کے گرد بازو حمائل کرکے ساتھ ساتھ چلتا صحن میں رکھے تخت پر جا بیٹھا۔

"تمہیں دیکھ کر تو میں بالکل ٹھیک ہوگئی ہوں۔" حسن آرا بیگم نے دِل ہی دِل میں اپنے خوبرو بھانجے کی نظر اُتارتے ہوئے کہا۔

اُس کی تابع داری، آنکھوں کی حیا حسن آرا بیگم کو بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ اپنی بہن پر رشک کرتی تھیں جس کی اتنی تابع دار اولاد تھی، اس قدر دولت کے باوجود اُن کے وجود میں عاجزی بھری ہوئی تھی۔

"اگر میرا وجود دوا کا کام کرتا ہے تو میں صبح دوپہر شام دست یاب ہوں، پلیز آپ جلدی جلدی ٹھیک ہوجائیں۔" ولی نے اُن کا ہاتھ محبت سے تھام کر کہا۔

"آپ چائے لیں گے یا ٹھنڈا؟" علیزے نے اپنی ماں کا ہشاش بشاش چہرہ دیکھ کر ولی کو بہت نرم نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جو آپ کا دِل چاہے!" ولی نے مسکرا کر کہا۔

ولی کا یہ روپ مُسکان دیکھ لیتی تو شاید مر ہی جاتی۔ وہ جو کبھی کبھی مسکرایا کرتا تھا آج مسکراہٹ اُس کے چہرے کے ساتھ چپک گئی تھی۔

"علیزے میڈم کھانا؟" منزہ بدتمیزی سے کہتی کمرے سے باہر نکلی لیکن ولی کو دیکھ کر اُس کی بولتی بند ہوگئی تھی۔ اُس کے بیزار چہرے پر بہت خوش گوار مسکراہٹ دَر آئی۔

"ارے! بڑے لوگ ہمارے غریب خانے پر کیسے تشریف لے آئے۔" منزہ ایک کرسی کھینچ کر اُس کے سامنے آبیٹھی۔

ولی کو اپنی اِس کزن سے اُلجھن ہوتی تھی، جو بغیر وجہ کے بہت زیادہ فری ہونے کی کوشش کرتی تھی۔

علیزے بہت تیزی سے کچن سے نکلی، ایک ٹرے میں تین گلاسوں میں بوتلیں اور منزہ کا کھانا رکھ کر لے آئی تھی۔ چھوٹی سی میز اُن کے سامنے گھسیٹ کر اُس نے وہ ٹرے اُن کے سامنے رکھ دی۔

"امی جان! میں نماز پڑھ لوں آپ بھی پڑھ لیں پھر بیٹھ کر تسلی سے باتیں کریں گے۔" علیزے نے ماں کو مخاطب کیا۔

"بیٹا میں نماز پڑھ کر آتی ہوں۔" حسن آرا بیگم، ولی کے کندھے پر ہاتھ پھیر کر بولیں۔

"مجھے بھی نماز پڑھنا ہے، جانماز دے دیں۔" ولی نے فوراً اُٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے آپ آرام سے بیٹھیں۔ علیزے کو تو پرانی بیماری ہے ایک ایک بندے کو اس کے کام سے ڈسٹرب کر کے نماز پڑھنے کا کہنا۔" منزہ کو ولی کا اُٹھنا اچھا نہیں لگ رہا تھا، ولی کے دِل میں ایک ناگوار لہر اُٹھی۔

"میرا خیال ہے نماز کی دعوت دینا تو بہت اچھا کام ہے!"

"لیکن اگر کوئی کھانا کھا رہا ہے یا کسی مہمان کے پاس بیٹھا ہے اور مہمان بھی وہ جو دُور سے چل کر آیا ہو، کم از کم انسان اُس کو تو ڈسٹرب نہ کرے۔" منزہ نے ماتھے پر تیوری ڈال کر کہا۔

"ہمارے ہر کام سے ضروری اللہ کا ذکر ہے، انسان کو وہ اتنی نعمتیں دیتا ہے کیا اُس بڑی ذات کا شکر

ادا کرنا ہم سب پر واجب نہیں ہے؟" ولی کو اُس لڑکی سے بحث کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن وہ کیسے برداشت کر لیتا کہ جس بڑی ذات کی محبت میں اُس نے ساری عمر اپنے والدین کو پور پور ڈوبے دیکھا اور ہمیشہ اُن جیسا بننے کی خواہش کی تھی۔ اُس بڑی ذات کے متعلق وہ کچھ اُلٹ کیسے سن سکتا تھا۔

"آپ تو شدت پسند ہو رہے ہیں؟" منزہ نے صلح جُو انداز میں کہا۔

"یہ ہی تو ہم سب کا پرابلم ہے کہ اگر غلط بات کو غلط کہیں گے تو انتہا پسند کا ٹیگ لگا دیا جاتا ہے۔ فی زمانہ کیا ہم اپنے مذہب کے متعلق اپنی محبت کا کُھل کر اظہار بھی نہیں کر سکتے؟" ولی نے بدمزہ ہو کر اُٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ شخص کس قدر مشکل ہے۔" منزہ نے ولی کو ناراض ہوتے دیکھ کر سوچا۔

"پانی تو پی لیں، کیا نماز کھانے پینے سے پرہیز بتاتی ہے؟" منزہ نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

"ضرور پی لیتا ہوں۔ لیکن پلیز آپ بار بار نماز کو درمیان میں نہ لائیں ہم سارا دن ایسے کام کرتے ہیں، جن سے پرہیز کرنے کو کہا جاتا ہے تو کیا وہ بھی ہم نماز کے کھاتے میں ڈال دیں گے؟" منزہ کی ہیچ سوچ اور کم وژن ولی کا سامنا نہیں کر سکتا تھا، اِس لیے وہ چپ ہوگئی۔

منزہ کا بہت کم مردوں سے واسطہ پڑا تھا لیکن جتنے بھی لوگوں سے واسطہ پڑا تھا، وہ اُس کے حُسن کے آگے ہاتھ باندھ کر منزہ کے حکم کے منتظر رہتے تھے۔ لیکن یہ ولی تھا جو آئرن مین کہلاتا تھا اُس کے نزدیک اچھا لگنے کا پیرا میٹر خوب صورتی ہرگز نہیں تھی۔ وہ بہت چوزی تھا زندگی میں اور زندگی کے رشتوں میں پیوریٹی اُس کے نزدیک بے حد اہم تھی۔ اور منزہ اُس پیورٹی سے بہت فاصلے پر کھڑی تھی۔

"یہ کون لایا ہے؟" انور صاحب جو کمرے سے باہر نکلے تھے، سامنے پڑے ڈھیروں شاپرز دیکھ کر بولے۔

"ولی لائے ہیں!" منزہ نے صحن کے کونے میں نماز پڑھتے ولی کی جانب اشارہ کیا۔

"اوہ!" انور صاحب لفافوں کی جانب بے حد اشتیاق سے بڑھے، اُن کی کاہل اور لالچی طبیعت بے حد بے حس تھی۔ شاپرز میں مردانہ زنانہ قیمتی کپڑے اور پھل وغیرہ تھے۔

"السّلام علیکم۔" ولی نے سلام پھیر کر لفافوں کی تلاشی لیتے انور صاحب سے کہا۔

"وعلیکم السّلام! کب آئے؟"

"ابھی! اور یہ آپ کی امانت! بابا سائیں کہہ رہے تھے کہ آپ کے اسٹور میں جو نقصان چل رہا ہے اُن سے کچھ مال وغیرہ ڈلوالیں۔" ولی نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکال کر سامنے کی۔

"کتنے ہیں؟" انور صاحب کا چہرہ ایک دم کُھل گیا۔

"دو لاکھ!" ولی کو اُن کا چہرہ دیکھ کر اُلجھن سی ہوئی۔

"بس!" انور صاحب نے کھلم کھلا کہا۔

علیزے جو ابھی ابھی نماز پڑھ کر باہر آئی تھی، شرمندگی سے اُس کی رنگت سفید پڑ گئی تھی۔

"اگر احمد شاہ صاحب غریبوں کی مدد کرنا ہی چاہتے ہیں تو پوری طرح کیا کریں، تھوڑی رقم سے کچھ نہیں بنتا۔" انور صاحب نے پیسا ہاتھ میں پکڑ بھی لیا پھر بھی شکوہ کر رہے تھے۔

ولی سے اُن کی باتیں سمجھنا مشکل ہو رہی تھیں۔ روشن آرا بیگم نے انور صاحب کا یہ روپ آج تک کسی کو نہیں بتایا تھا۔

"آپ پلیز یہ رقم لے جائیں، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے ہمیں کسی طرح کی کوئی رقم درکار نہیں۔" علیزے نے آگے بڑھ کر باپ کے ہاتھ سے پیسے پکڑ کر واپس لیے۔

انور صاحب نے بیٹی کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

"یہ پیسے بابا سائیں نے بھیجے ہیں آپ کو کچھ کہنا ہے تو بابا سائیں سے کہیے گا۔" ولی کو علیزے کی انا اچھی تو لگی لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ پیسے انور صاحب کے لیے کس قدر ضروری تھے۔

"ہاں بیٹا! تم درست کہہ رہے ہو یہ میرا اور احمد شاہ کا معاملہ ہے۔" انور صاحب نے فٹافٹ پیسوں کی گڈی ہاتھ میں تھام کر کہا۔

"ہمیں نہیں چاہئیں یہ پیسے، برائے مہربانی آپ یہ واپس لے جائیے گا!" علیزے شدید غصے میں اپنے آپ میں نہ تھی۔

"دماغ خراب ہوگیا ہے، تمہارا کیا کام کہ بڑوں کی باتوں میں بولو۔" انور صاحب نے چلّا کر علیزے کو ڈانٹا۔ حسن آرا بیگم گھبرا کر باہر نکلیں جب کہ منزہ بے حد پرسکون انداز میں بیٹھی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

اُس کا غصہ نکل رہا تھا کیوں کہ جس طرح علیزے ایک پلیٹ میں آلو شوربہ اور چپاتی لے کر ولی کے سامنے اُس کا کھانا لائی تھی۔ منزہ کو بے حد شرمندگی کا احساس ہوا تھا کہ وہ کیا سوچے گا کہ ہم کیسی غذا کھاتے ہیں۔ ولی کے جانے کے بعد منزہ کا پکا ارادہ تھا کہ وہ علیزے کی خبر لے گی لیکن اُس سے پہلے ہی وہ اپنی خودداری کی وجہ سے انور صاحب کے جلال کو آواز دے چکی تھی۔

"میرا خیال ہے میں چلتا ہوں، مجھے اجازت دیجیے۔" ولی کو وہاں کھڑے رہنا مناسب نہ لگا۔

"بیٹھو نا بیٹا!" حسن آرا بیگم ابھی تک کوئی بات سمجھ نہ سکی تھیں۔

"نہیں خالہ! میں پھر چکر لگا لوں گا۔" ولی نے سنجیدگی سے کہا۔

"رُکیں ولی! یہ کچھ اُٹھا کر لے جائیں۔" علیزے نے ضدی لہجے میں کہا۔

"یہ سب امّاں جان نے آپ سب کے لیے تحفے بھیجے ہیں اور تحفے واپس نہیں کیے جاتے۔" عبدالولی نے تحمل سے جواب دیا اور حسن آرا بیگم سے اجازت لے کر باہر نکل آیا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ تم میرے معاملات میں بولو۔" انور صاحب کی اونچی آواز نے ولی کا پیچھا کیا تھا۔ ولی کے قدم وہیں تھم گئے، یہ ڈانٹ علیزے کو پڑ رہی تھی اور ولی کو یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"ابو! آپ کو یہ رقم واپس کرنی ہوگی ہم کب تک امداد لیتے رہیں گے؟" علیزے نے اُن کو اُن کی غیر ذمّے داری کا احساس دلایا۔

"باپ کے سامنے زبان چلاتی ہو، تمہیں عقل، ڈر یا خوف کوئی ہے؟" انور صاحب غصے سے پاگل ہو رہے تھے۔

"میں آپ کو یہ پیسے نہیں لینے دوں گی اگر آپ یہ پیسے خود واپس نہیں کریں گے تو میں کر دوں گی۔" علیزے نے چلّا کر کہا۔

"بے غیرت، بدتمیز!" انور صاحب کے منہ سے گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھ انہوں نے علیزے کے بال پکڑ کر اُس کو مارنا شروع کر دیا۔

"کیا کرتے ہیں؟" حُسن آرا نے اُن کے بیچ میں آ کر کہا۔

ولی کے کان سب سُن رہے تھے اور دِل پر بے تحاشا بوجھ آن گرا تھا اُس نے بیرونی دروازے کو بے مضبوطی سے تھام لیا۔ جیسے وہ اپنے اندر کے غصّے اور بے چینی کو ضبط کرنا چاہتا ہو۔ اُس سے یہاں ٹھہرنا بے حد مشکل ہو رہا تھا، وہ بے حد تیزی سے باہر نکلا۔ وہ یہ سب تو ہرگز نہ چاہتا تھا اور مار کھاتی علیزے کے دل میں ولی کے لیے نفرت کی شدید لہر اُٹھی تھی۔ وہ شخص نہ صرف اُس کی انا کو ٹھیس پہنچا کر گیا تھا بلکہ اُس کی وجہ سے آج اُس نے اپنے باپ کے ہاتھوں پہلی بار مار کھائی تھی۔

"زہر لگتے ہو تم مجھے!"

"بہت بُرے ہو تم! میں دوبارہ تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتی۔" علیزے نے اپنے زخم سہلاتے ہوئے کہا۔

❖❖○❖❖

"آپ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں؟" مُسکان نے چند دنوں بعد جب شہر واپس جانے کا کہا تو سیّد سرفراز اُسے منع کر کے چلے گئے۔

"یہ تم اپنے باپ سے پوچھو۔" آپا امّاں کے پاس فوری کوئی اور جواب نہ تھا۔

"بابا سائیں! پلیز مجھے بتائیں کہ آپ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں، میری پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے۔" مُسکان ایک بار پھر سیّد سرفراز کے سامنے کھڑی سوال کر رہی تھی۔

"تم ٹھیک نہیں تھیں اِس لیے!" سیّد سرفراز علی نے کہا۔

"اب تو میں ٹھیک ہوں! لیٹ می گو بابا!" مُسکان کا ولی کو دیکھے بغیر نشہ ٹوٹ رہا تھا۔

"نہیں! ابھی تم ٹھیک نہیں ہو!" سیّد سرفراز علی نے سنجیدگی سے کہا۔

"آپا امّاں! آپ ہی بابا کو بتائیں کہ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔" مُسکان نے آپا امّاں کو بیچ میں گھسیٹا۔

"ہاں سرفراز صاحب! مُسکان صحت کے معاملے میں اب بالکل ٹھیک ہے۔" آپا امّاں نے مُسکان کی ہاں میں ہاں ملا دی۔

"دیکھ لیں بابا سائیں! آپا امّاں بھی کہہ رہی ہیں اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔" مُسکان نے مسکرا کر سیّد سرفراز کے کندھے پر سر رکھ کر کہا۔

سیّد سرفراز نے ایک نظر مُسکان کی بیماری کی وجہ سے پیلی رنگت کو دیکھا پھر ایک دم سے نظریں چرا لیں۔ مُسکان اُن کی اولادوں میں واحد تھی، جس کے لیے اللہ نے اُن کے دِل میں عجیب سی محبت ڈال دی تھی، جس کے آگے وہ خود کو بے بس سمجھتے تھے لیکن وہ خود کو مُسکان کی محبت میں کمزور کر لیتے تو ساری عمر کے لیے اُن کی خاندانی روایت ٹوٹ جاتی اور اِس طرح اُن کی لمبی چوڑی جاگیر حصوں میں بٹ جاتی جو وہ مر کر بھی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ جس زمین کے لیے انہوں نے باپ بھائی بہنوں کی

قربانی دے دی اُس کو اولاد کی محبت سے کمزور ہو کر کیسے گنوا سکتے تھے۔

''مُسکان! تم اب شہر کو بھول جاؤ۔'' سیّد سرفراز نے اپنا آپ مُسکان سے چھڑاتے ہوئے کہا۔

''مطلب۔'' مُسکان کو باپ کا چہرہ ایک دم اجنبی لگا۔

''مطلب یہ کہ ہم تمہاری شادی کر رہے ہیں۔''

''شادی؟'' مُسکان کے سر پر بم پھٹا تھا۔

''ہاں۔'' سیّد سرفراز نے بِنا نظر ملائے کہا۔

''کس سے؟'' مُسکان نے لبوں پر زبان پھیر کر پوچھا۔

''سیّد اظہر علی سے۔'' ایک اور بم دھماکا ہوا۔

''کیا؟'' مُسکان نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔ اُس کی نگاہوں میں بہت
تھی یہ اُس کے باپ کا کون سا روپ تھا، جس سے وہ ہمیشہ انجان رہی تھی۔

مُسکان نے سیّد سرفراز علی کو غور سے دیکھا وہاں پر ہر طرح کی نرمی، شفقت ختم ہو چکی تھی۔
نگاہوں اور رویے والا اجنبی چہرہ اُس کے باپ کا تو نہ تھا۔ وہ تو کوئی اجنبی تھا۔ ایسا اجنبی، جسے
تھی اور اُس کا سہا ہوا دِل جاننا بھی نہ چاہتا تھا۔

زندگی تو عذاب لگتی ہے
اب حقیقت بھی خواب لگتی ہے
جس پہ لکھا تھا ہم نے تیرا نام
اب وہ خالی کتاب لگتی ہے
روز ہوتے ہیں سانحے ایسے
زندگی اضطراب لگتی ہے
کس کو الزامِ بے وفائی دیں
قسمت اپنی ہی خراب لگتی ہے
یاد کرتے ہیں اِس قدر تم کو
زندگی آب آب لگتی ہے

اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں، خالی نگاہوں سے وہ دیوار تکے جا رہی تھی۔ اُس کی ساری
لبالب سی جانے کہاں کھو گئی تھی۔ بڑی سی مسہری کے نیچے وہ ٹیک لگائے خود میں گم بیٹھی تھی۔ آپا لتاں کا
جیسے ایک دَم پھٹنے کو آیا تھا۔ ستارہ جیسی جگ مگ آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی تھی، اُن میں اتنی بے
اور حیرت تھی کہ آپا لتاں کی ہمت نہ پڑ رہی تھی کہ اُس سے بات کریں۔

''مُسکان! کتنا پیارا اور چھوٹا سا نام رکھا تھا انہوں نے۔ وہ کبھی نہیں روئے گی، ہمیشہ خوش رہے گی
لائے گی۔'' انہوں نے اُسے گود میں لے کر صائمہ بی بی سے وعدہ کیا تھا، آج وہ وعدہ انہیں
دکھائی دے رہا تھا۔

''میں کیسے تمہاری قسمت بدلوں؟ اِس حویلی کی ہر بیٹی کی قسمت ایک جیسی کیوں ہوتی ہے؟ کیوں اِس
کی بیٹی کی قسمت میں صرف درد ہی سہنا لکھا ہے؟'' آپا لتاں نے بے اختیار شکوہ کیا۔

''اے اللہ! میں تو بے حد گناہ گار ہوں! تو اِس گناہ گار کی دُعا قبول کر لے، مسکان کو اُس کے جیون کی
مل جائے۔'' آپا لتاں دِل ہی دِل میں گڑگڑا کر دُعا مانگ رہی تھیں۔

''مسکان!'' انہوں نے اُسے پکارا لیکن وہ کچھ نہ بولی، آپا لتاں گھبرا کر اُس کی جانب بڑھیں۔

''مسکان چندا! میری جان کچھ تو بول ورنہ تیری ماں مرجائے گی۔'' آپا لتاں نے اُس کا سر اپنے

کندھے سے لگایا تو وہ ایک دَم پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

''امّاں! امّاں!'' سسکیوں میں اُس سے بولنا مشکل ہو رہا۔

''امّاں! میں کتنی بدنصیب ہوں نا! میں نے زندگی میں صرف دو ہی مردوں سے پیار کیا، ایک میرے اعتبار کو دھوکا دیا اور ایک خود سراب، نکلا۔

''امّاں! آخر یہ میرے ساتھ ہی کیوں ہوا، میں نے تو آج تک... آج تک کسی کو دُکھ نہیں دیا پھر ناقابلِ برداشت دُکھ میرے ہی حصّے میں کیوں آیا، امّاں میرا کیا قصور ہے؟'' مُسکان اِس قدر شدت روئی کہ آیا امّاں کو اُسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

''قصور تمہارا نہیں، تمہاری قسمت کا ہے کہ تم اِس عالی شان حویلی میں پیدا ہوئیں، اگر تم کسی جھونپڑے میں پیدا ہوتیں تو شاید تم زندگی کی سچی خوشیاں حاصل کر سکتیں! آیا امّاں نے دھیمی آواز میں دِل بہلایا۔

''اِس حویلی کی سب بیٹیوں کی قسمت ایک جیسی ہے۔'' آیا امّاں نے با آواز بلند سوچتے ہوئے کہا۔

''امّاں! وہ، وہ میرے بابا نہیں ہو سکتے۔ وہ کیسے... کیسے میری مرضی کے خلاف میری شادی کر سکتے ہیں؟ وہ کیسے ایک دم مجھے اِس حویلی میں قید کر کے بھول سکتے ہیں۔'' اتنے بہت سے دِنوں میں مسکان کو یہ یقین دلانا مشکل ہو رہا تھا کہ یہ سب اُس کا باپ کر رہا ہے، جو اُس کی چھوٹی سے چھوٹی خواہش پورا کرنے کے لیے ہمیشہ اُٹھ کھڑا ہوتا تھا۔

''تم کو تو اُس نے اپنی عادت اور روایات کے خلاف بہت چاہا ہے! تم تو بہت خوش نصیب ہو، جس کو بہت سی چیزیں بن مانگے ملیں، سید سرفراز علی کے دِل میں اللہ نے تمہارے لیے بے حد نرم گوشہ رکھا ہے ورنہ جو غلطی تم کر بیٹھی ہو، وہ یہاں ناقابلِ معافی ہے۔'' آیا امّاں تھکے تھکے لہجے میں کہتیں اُٹھیں اور پانی کا گلاس بھر کر مسکان کو دیا۔

''مسکان پانی پیو، اپنے آپ کو رو رو کر ہلکان نہ کرو۔''

''مجھے نہیں پینا اور نہ ہی کچھ کھانا ہے!'' مُسکان نے ایک دَم ضدی ہو کر کہا۔ ضد تو اس کی نسل کی پہچان تھی۔

''مجھے یہاں سے واپس جانا ہے!'' وہ بے حد ضدی ہو رہی تھی۔ آیا امّاں نے بوکھلا کر اُس کا چہرہ دیکھا۔

''ایسے کیسے چلے گا مسکان؟'' آیا امّاں نے اُسے پیار سے سمجھانے کی کوشش کی۔

''مجھے واپس جانا ہے! نہیں رہنا مجھے یہاں...'' وہ پورا حلق پھاڑ کے چلاّئی۔

''مجھے ولی کے پاس جانا ہے!'' اُس کا لہجہ ایک دَم ٹوٹ گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

''بھول جاؤ اُسے!'' آیا امّاں نے سختی سے کہا۔

''نہیں! میں اُس کے بنا مر جاؤں گی!'' مسکان جنونی ہو رہی تھی۔

''کیا وہ تم کو چاہتا ہے؟'' آیا امّاں نے بے بس ہو کر پوچھا۔

''نہیں! وہ تو کسی علیزے نامی لڑکی کو چاہتا ہے۔'' مسکان نے سچ بولا۔ آیا امّاں کو ایک پل کو اُس کی

ماغی حالت پر شبہ ہوا۔

''یہ یک طرفہ محبت! تم اِس کے متعلق تو پہلے بھی بتا چکی ہو، لیکن بیٹا اگر کوئی آپ کے متعلق ویسے ذبات نہ رکھے، جیسے کہ آپ اُس کے لیے رکھتے ہو تو کیا ہم اُس کے ساتھ زبردستی کریں گے؟''

''نہیں! یہ زبردستی نہیں ہو سکتی۔''

''میری جان! یہ تو دِلوں کے سودے ہوتے ہیں! یہ زبردستی کے مول کبھی نہیں ملتے، تم خود کو اور ہم مشکل میں نہ ڈالو وہ تمہاری قسمت میں نہیں ہے! تم اگر اِس طرح کی حماقتیں کرتی رہیں تو سید رفراز کوئی سخت قدم اُٹھا سکتا ہے۔''

''سید اظہر علی سے تو میں تمہارا بیاہ نہیں ہونے دوں گی لیکن میں تمہاری شادی ولی سے بھی نہیں کروا سکتی۔'' آیا امّاں نے اُسے حقیقت بتائی۔

''امّاں میں مر جاؤں گی! میرے دِل میں بھانبڑ اُٹھ رہے ہیں، مجھ سے اِس آگ میں اور نہیں جھلسا اتا۔'' مسکان کی بے بسی بے اختیار تھی۔

''مسکان! تو نے تو انسانوں کو بھی اپنا پسندیدہ کھلونا سمجھ لیا ہے، جس طرح تو اپنے پسند کے کھلونے پر لا کرتی تھی ٹھیک اُسی طرح تم ولی کے لیے ضدی ہو گئی ہو۔ لیکن بیٹا وہ جیتا جاگتا انسان ہے اُس پر تیری اہش کا بس کیسے چلے گا؟ پھر تیرا باپ بھی تو ایسا کبھی نہ ہونے دے گا۔'' آیا امّاں اُسے نفع نقصان سمجھانا چاہ رہی تھیں لیکن مُسکان کچھ نہ سمجھنا چاہ رہی تھی۔

''اگر... اگر مجھے ولی نہ ملا تو میں مر جاؤں گی یہ آپ بابا سائیں کو بھی بتا دیجیے گا! میں مسکان سرفراز علی ی محبت سے کبھی بھی دست بردار نہ ہوں گی۔'' مسکان کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا، جس پہ آیا امّاں بے ختیار چونکی تھیں۔

ایسی ہی چمک آج سے سالوں پہلے انہوں نے کسی اور کی آنکھوں میں بھی دیکھی تھی اُس کا انجام کیسا ہلا دینے والا تھا، تو کیا واقعی تاریخ بار بار خود کو دُہراتی ہے؟ یہ سوال اُن کے ہی دِل نے کیا تھا اور خود ہی ہا جا رہا تھا۔

❖❖○❖❖

پاگل لڑکی!
خواب نہ دیکھو
درد ہی درد عذاب نہ دیکھو
خواب تو بہت رُلاتے ہیں
خواب بہت تڑپاتے ہیں
پاگل لڑکی!
خواب نہ دیکھو
سورج کو پا لینے کی خواہش
اپنی آنکھیں کھو بیٹھو گی

اپنا آپ گنوا بیٹھوگی
سچ کی آنکھ میں آنکھیں ڈالو
خواب نہ دیکھو
پاگل لڑکی!

''تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ تم اگر کچھ سوچتی ہو تو کم از کم اُسے بولا تو نہ کرو، سارے فنکشن میں میڈم کا موڈ تم سے خراب رہا تھا۔'' ماہی نے ترنم سے کہا۔

ترنم کو اس وقت ڈرپ لگی ہوئی تھی... ڈرگز کی ڈوز زیادہ لینے کی وجہ سے اُس کا معدہ واش کیا گیا تھا اور اب وہ ہسپتال کے پرائیویٹ روم میں لیٹی چُپ چاپ ماہی کی ڈانٹ سُن رہی تھی۔

''ماہی! کیا موت جیسی چیز ہوتی بھی ہے کہ نہیں؟'' ترنم نے اُس کی لمبی چوڑی تقریر کے جواب میں پوچھا۔

ماہی نے ایک دَم اپنا سر تھام لیا!

''میں موت کے پیچھے بھاگتی ہوں لیکن مجھے موت نہیں آتی، میری سزا میرا آبِ حیات بن گئی ہے مجھے اب تاعمر اپنی سزا یہیں سہنی ہوگی۔'' ترنم خود میں بالکل نہ تھی۔

''کاش میں تمہارے لیے کچھ کر سکتی!'' ماہی نے بے حد دُکھ سے ترنم کو دیکھا، اُس کی سرخ و سفید رنگت پھیکی پڑ چکی تھی لیکن پھر بھی وہ بے حد حسین نظر آ رہی تھی۔

''ترنم! تم جانتی ہو کہ تم کسی بھی حال میں ہو پھر بھی بے حد حسین نظر آتی ہو۔'' ماہی نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

''میری ماں اکثر کہتی تھی کہ ربّ اگر چنگی شکل دے تو ساتھ چنگی قسمت بھی دے، میں بہت نا سمجھ تھی مجھے اُس کی بات سے ہمیشہ اختلاف ہوتا تھا۔ میں نے اپنی شکل پر بے حد غرور کیا تھا، خود کو ہمیشہ شہزادی ہی جانا، لیکن کیا... کیا صرف شکل ہی وہ ایسا پھندا نہیں ہے، جو میرے گلے میں گذشتہ چھ سال سے بندھا ہوا ہے۔ اگر میری قسمت اچھی ہوتی تو کیا یہ پھندا میرے گلے پھنستا؟'' ترنم نے ایک دم ماہی سے سوال کیا۔

''تم اور تمہاری باتیں دونوں ہی ڈسٹرب ہیں، میرا خیال ہے تم کسی اچھے ماہرِ نفسیات سے وقت لے کر اپنے آپ کو دکھاؤ، تمہارے اعصاب اچھا فیل کریں گے۔'' ماہی نے اُسے مشورہ دیا۔

''کوئی ماہر نفسیات میرے اعمال نامے سے میرے گناہ، میری کوتاہیاں دھو سکتا ہے کیا؟'' ترنم نے نقاہت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''تم ہر وقت اس طرح کی باتیں کیوں کرتی ہو؟''

''دیکھو ترنم! تمہاری زندگی میں اب کبھی ریورس گیئر نہیں لگ سکتا، اِس لیے تم اپنی موجودہ زندگی سے خوش رہنا اور اِسے سہولت سے گزارنے کا گر سیکھ لو، ورنہ جس طرح تم روز مرتی اور جیتی ہو تو کسی دن میڈم چاندنی اور راگنی تمہیں Expired دوا کی طرح ڈسٹ بن میں پھینک دیں گی، اپنے آئندہ دنوں کے لیے کچھ جوڑ لو اور یوں ہر وقت ناشکری نہ کیا کرو، جس طرح کی زندگی اور سہولتیں ہمیں میسر ہیں وہ

معاشرے میں اَپر کلاس کے پاس ہوتی ہیں تمہیں ان سہولتوں کے بغیر رہنا پڑا تو تمہارے چودہ طبق ن ہو جائیں گے۔'' ماہی اپنی موجودہ زندگی سے بے حد خوش تھی اور اپنی زندگی کے لیے کچھ سرمایہ بھی ڑ رہی تھی۔

''کیا بس یہی زندگی ہے! کیا تم نے صرف اِس کے لیے سرمایہ جوڑا ہے؟'' ترنم نے نقاہت سے پوچھا۔

''مطلب؟'' ماہی نے بیزاری سے ماتھے پر بَل ڈال کر پوچھا۔

''مطلب تمہاری ماں زندہ ہے کیا؟'' ترنم نے اُسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔'' ماہی نے جواب دیا۔

''اور تمہاری نانی؟''

''نہیں! وہ کہاں زندہ ہے۔'' ماہی نے کچھ اُلجھ کر جواب دیا۔

''اور تمہاری نانی کی ماں؟'' ترنم کا سوال شاید ابھی تک پورا نہ ہوا تھا۔

''کمال کرتی ہو۔ یہ کس طرح کی گفتگو ہے کوئی اِتنا جی سکتا ہے؟ میری نانی کی ماں! میری نانی مر چکی ہیں اور میری ماں بے چاری دس سال پہلے ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں مر گئی تھی۔ لیکن اِس ساری گفتگو کا مقصد کیا ہے؟''

''انہوں نے اپنے اپنے دور میں اپنے اِس بزنس سے خاصا پیسا بھی کمایا ہوگا، اپنے مستقبل کے لئے جمع بھی کیا ہوگا!'' ترنم نے ماہی سے مزید سوال کیا۔

''ہاں نا کیا تھا۔ ظاہر ہے ہر سمجھ دار شخص ایسا ہی کرتا ہے۔''

''کیا وہ اپنے جمع کیے گئے پیسے کو استعمال کر سکیں؟''

''نہیں! لیکن تم کیا کہنا چاہ رہی ہو۔'' ماہی جواب دیتے ہوئے ایک دَم رُک کر بولی۔

''میری جان! یہ زندگی بہت مختصر ہے اِس زندگی کو تو موت آ ہی جاتی ہے لیکن اگلی زندگی کو کبھی موت نہیں آنی وہاں تو ہمیں اپنے کیے کا بھگتنا ہے یہ دُنیا تو ایک ایگزامی نیشن روم ہے کوئی۔ اگر کوئی میری طرح فیل ہو جاتا ہے تو اُس کی سزا کا عمل اِسی دنیا سے شروع ہو جاتا ہے میں نے اپنی زندگی کو کھلونا جان کر برباد کر دیا، اب یہ پچھتاوا مجھے نہ جینے دیتا ہے نہ مرنے! ہاں مجھے آس کی اس اُمید کی تلاش ہے جو ایک سچا راستا دکھاتی ہے۔'' ترنم سے بولنا دُشوار ہو رہا تھا۔

''سُنا ہے بڑے مالک کے ہاں آمرزش ملتی ہے! میں اِس قابل تو نہیں ہوں لیکن کیا مجھے بھی یہ نعمت مل سکتی ہے؟'' ترنم نے ایک دَم ماہی کو دیکھا، جیسے وہ بتا سکتی ہو۔

''اِس لیے ماہی میں کچھ جوڑنا نہیں چاہتی، کچھ پانا نہیں چاہتی جب یہاں رہنا ہی نہیں ہے لیکن میرا دل اِس بات کا ضرور طلب گار ہے کہ مجھے ربّ کائنات کی صفائی مل جائے، معافی کی طلب گار کب سے ہاتھ جوڑے کھڑی ہے، اب یہ اُس مالک کی مرضی کہ وہ قبول کرے یا نہ کرے۔

''تو تیری باتیں مجھے بہت ڈسٹرب کرنے لگی ہیں، پلیز میرے سامنے اِس طرح کی باتیں نہ کیا کر کہیں میری ذہنی حالت بھی تیری طرح نہ ہو جائے۔'' ماہی کو ترنم کی باتوں سے خوف آنے لگا تھا۔

ترنم نے نہایت تاسف بھری نگاہ اُس پر ڈالی۔

''میری سہیلی! یہ جو احساس مجھ سے لپٹ کر مجھے ڈس رہا ہے نا، یہ ہر کسی کو زندگی کی کسی نہ کسی اسٹیج ہو ہی جاتا ہے۔ کبھی کبھی یہ پچھتاوا آخری لمحوں میں ہوتا ہے تب نہ معافی ملتی ہے نہ قبولیت کا دروازہ کھلا ہے اور پھر سب دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں' جو تم مجھے پاگل سمجھتی ہو؟ میں تو بس وہ ایک دروازہ کھٹکھٹانے کی کوشش کرتی ہوں، جہاں سے مجھے یہ نوید مل سکتی ہو کہ میرے گناہ معاف ہو گئے، یہ تو ایک احساس ہے! لیکن جب میں اپنا گندا وجود جو گندگی میں پور پور ڈوبا ہے دیکھتی ہوں تو مجھے اتنی شرمندگی ہوتی ہے کہ میں تو اِس معافی کے لائق بھی نہیں ہوں، اور یہ ہی شرمساری مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں ایک ایسی دُنیا میں چلی جاؤں، جہاں ہوش گم ہو جاتے ہیں، جہاں ڈرگز استعمال کر کے کبوتر کی طرح کچھ دیر کو آنکھیں بند کی جاسکتی ہیں لیکن جب آنکھ کھلتی ہے تو پھر وہی میں اور یہ سانپوں کی دنیا! ایسے میں موت کی تمنا پر موت بھی نہیں ملتی!'' ترنم اتنی لمبی بات کرنے پر کھانسنے لگی، ماہی نے دوڑ کر اُسے پانی پلایا۔

ماہی کی آنکھوں میں ترنم کے لیے ترحم تھا۔

''یہ دِل کی لگی جانے کہاں کہاں خوار کروائے گی!'' ترنم نے بہت دھیمی سرگوشی میں کہا اور آنکھیں موندھ لیں، دو آنسو اُس کی حسین آنکھوں سے نکل کر کنپٹیوں سے گزرتے ہوئے بالوں میں جذب ہو گئے۔

اُسی پل دروازے پر دستک ہوئی۔

''السلام علیکم!'' سسٹر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا، وی آئی پی رومز میں اسٹاف کا رویّہ بے حد کرٹسی لیے ہوتا ہے۔

''آپ پلیز کچھ دیر کے لیے باہر چلیں۔'' سسٹر نے ماہی سے کہا۔ ماہی نے خیال جانا شاید وہ آیا کو بلوا کر ترنم کے کپڑے بدلنے جا رہی ہے اِس لیے وہ باہر نکل آئی۔

اُس کی رحمت کی بھلا آخری حد کیا ہوگی
دوست کی طرح جو دشمن دُعا دیتا ہے

ترنم نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں، سسٹر اُس کو ہی دیکھ رہی تھی۔ سسٹر کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ ترنم نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن کچھ بول نہ سکی۔

''جب تک تم اُس سے تعلق نہیں بناؤ گی، تب تک تم کیسے معافی حاصل کر سکتی ہو؟'' سسٹر نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ایک برقی رو تھی جو ترنم کے سکتے مردہ وجود میں دوڑی تھی۔

''کیا واقعی کبھی وہ اِس قابل ہو سکتی ہے کہ اللہ سے کوئی رشتہ بنا سکے۔''

''ہاں تم رشتہ بنا سکتی ہو!'' وہ اُس کی سوچ پڑھ گئی تھی۔

''میں تو گندگی میں لتھڑی ہوئی ہوں۔ کیا وہ اللہ میرے ساتھ تعلق رکھیں گے؟''

''وہ بڑا رحمٰن ہے یہ ساری دُنیا اُس نے بنائی ہے، ہم اُس کو بھول سکتے ہیں لیکن وہ ہمیں نہیں بھول سکتا؟ گناہ گار کا رشتہ اللہ سے بہت قریب ہوتا ہے اگر وہ معافی مانگ لے تو وہ ولی بن جاتا ہے، اللہ کا

دوست بن جاتا ہے۔'' ترنم کو لگا کہ اُس کے نقاہت بھرے وجود میں ایک دم توانائی بھر گئی ہو۔

''میں... میں کیسے معافی مانگوں؟ اُس کو جانے کیسا انداز پسند ہے اور مجھے تو معافی مانگنے کا ڈھب بھی نہیں آتا۔'' ترنم کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔

''تُو بس جھک جا! اُسے عاجزی پسند ہے!''

''اُس کے پاس سب کچھ ہے لیکن عاجزی نہیں ہے اس لیے اُس کو وہ پسند ہے، جو عاجزی سے جھک کر اُس سے مانگ لیتا ہے۔'' ترنم کا رُواں رُواں کان بن کر اُسے سُن رہا تھا۔

''جب جب انسان اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرتا ہے تب تب اُس کے لیے معافی کے دروازے کھل جاتے ہیں، تمہیں بھی زندگی میں موقع ملے گا۔ یہ موقع ہر انسان کو ملتا ہے اب یہ تم پر ہے کہ تم اِس موقعے کو پہچان کر کیسے حاصل کرتی ہو۔'' سسٹر نے اپنا سامان اکٹھا کیا، اُس نے قدم دروازے کی جانب بڑھائے پھر ایک دَم پلٹی۔

''بس اب تم نے بہت شور مچالیا، پہلے تم جانتی نہ تھی کہ تم کو کیا کرنا ہے اب تم کو بتا دیا گیا ہے کہ تم کو کیا کرنا ہے آج سے تم خود اپنے لیے معافی کے دروازے کھولو گی۔'' سسٹر کی آواز میں عجیب سا سحر تھا۔

''تم نے جو کیا وہ بڑا ظلم تھا اور جن اچھے لوگوں کے ساتھ کیا وہ اُس سے بھی بڑا ظلم تھا۔''

''لیکن کیسی عجیب بات ہے اُن ہی لوگوں کی گریہ زاری آج تمہارے کام آ گئی، تمہاری ماں کا ایک ایک آنسو تمہاری لگائی آگ بجھا رہا ہے لیکن اب تمہیں بھی کچھ کرنا ہوگا!''

''سسٹر... سسٹر کیا کرنا ہے؟'' ترنم بے تابی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''کفارہ!'' سسٹر نے مختصر سا جواب دیا اور باہر نکل گئی اور اُس کے جاتے ہی ترنم ہوش میں آ گئی۔ فضا میں جو سحر تھا، وہ ایک دَم ٹوٹ گیا۔

''کون تھی وہ!'' ترنم کو پہلا خیال آیا۔

''اور... اور وہ میرے دِل کی ہر بات کیسے جانتی تھی؟''

ترنم نے ڈرپ کی سوئی بے دردی سے اُتاری اور لڑکھڑاتی ہوئی باہر کی جانب بھاگی۔ ترنم نے باہر دیکھا لمبا کوریڈور بالکل صاف اور خاموش تھا، پل بھر میں وہ سسٹر غائب ہو گئی تھی۔ ماہی ہاتھ میں موبائل تھامے کسی سے بات کرتی سامنے سے آ رہی تھی۔

''ارے تم!'' ماہی نے موبائل بند کر کے ترنم کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

''مائی گاڈ! تمہارے تو ہاتھ سے خون نکل رہا ہے پاگل لڑکی تم نے خود سے کیوں ڈرپ اُتاری کسی سسٹر سے کہتیں۔'' ماہی نے پرس سے ٹشو پیپر نکال کر اُس کے ہاتھ پر رکھا جب کہ ترنم مسلسل اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

''کسے تلاش کر رہی ہو؟'' ماہی نے ترنم کی بے چینی کو دیکھ کر پوچھا۔

''ماہی وہ... وہ سسٹر، وہ کدھر گئی؟'' ترنم نے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''یہیں کسی کمرے میں گئی ہوگی۔ اُدھر کوریڈور کے اینڈ پر تو میں کھڑی کتنی دیر سے فون پر بات کر رہی تھی، میرے سامنے سے تو وہ گزر کر نہیں گئی۔'' ماہی کو ترنم کی بے چینی سمجھ نہ آ رہی تھی۔

"ماہی پلیز! اُسے ڈھونڈو، میرا اُس سے ملنا بے حد ضروری ہے۔" ترنم نے روتے ہوئے کہا۔

ماہی نے ترنم کی بے چینی اور پریشانی دیکھتے ہوئے ہر کمرے میں دستک دے کر سسٹر کو دیکھا لیکن وہ کہیں بھی نہ تھی۔

"حیرت ہے وہ کہاں چلی گئی؟" ماہی نے ترنم کے پاس واپس آ کر کہا۔

"تو پھر ہسپتال کی انتظامیہ سے پوچھو، آخر آج اُس کی ڈیوٹی ہے وہ ہمیں مل ہی جائے گی۔" ترنم نے ماہی کو کاؤنٹر پر بھیجا۔

ماہی کچھ دیر بعد واپس آ گئی۔

"وہاں تو ایسی کوئی نرس آن ڈیوٹی ہے ہی نہیں، میرے کہنے پر انہوں نے ڈیوٹی پر موجود ساری سسٹرز کو مجھ سے ملوایا لیکن وہ سسٹر اُن میں نہ تھی۔" ماہی خود بہت پریشان تھی۔

"تم کسی کو بلا کر لاؤ میں خود بات کروں گی، بھلا یہ کیا بات ہوئی۔" ترنم نے بے چینی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے، تم لیٹو۔ کہیں گر گرا نہ جاؤ۔ میں دیکھتی ہوں۔" ماہی کہہ کر واپس پلٹی۔

کچھ ہی دیر بعد ماہی اپنے ساتھ ایک چالیس پینتالیس سال کے آدمی کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔

"میڈم! جس طرح کا حلیہ آپ بتا رہی ہیں، وہ سسٹر ہمارے ہاں کام تو کرتی تھی لیکن آج سے تین سال پہلے وہ اپنے شوہر، جو یہاں کے بڑے اچھے قابل ڈاکٹر تھے اُن کے ساتھ باہر چلی گئی تھیں۔ وہ بہت نیک دِل اور بے حد لگن سے کام کرنے والی سسٹر تھیں۔ چوں کہ اُن کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی اِس لیے وہ اپنی ساری تنخواہ چلڈرن وارڈ میں مستحق بچوں کے لیے دے دیتی تھیں۔ لیکن آج سے تین سال پہلے ڈاکٹر صدیق اپنے کسی کورس کے لیے باہر جا رہے تھے اِس لیے وہ اور اُن کی اہلیہ استعفیٰ دے کر چلے گئے۔" وہ شخص ایڈمنسٹریشن میں تھا اور اُس کی بات کو ٹالا نہ جا سکتا تھا۔

جہاں ترنم حیران و پریشان تھی، وہیں ماہی خوف زدہ کھڑی تھی۔ اگر وہ تین سال پہلے ہسپتال چھوڑ کر جا چکی تھی تو اچانک یہاں کیسے آ گئی اور اُن کے کمرے میں کیا کر رہی تھی۔

"کفارہ! تم کو اب کفارہ ادا کرنا ہوگا، تم کو اپنے لیے معافی کے دروازے خود کھولنے ہوں گے۔" ترنم کے کانوں میں سسٹر کی آواز گونج رہی تھی۔

"تم کو اپنا تعلق خود بنانا ہوگا!" ترنم نے گہری سانس لی۔

"کچھ ضرور ایسا ہوا تھا۔" اُس کا پھڑکتا ہوا دِل ایک دم ٹھہر سا گیا۔

❖❖❍❖❖

"زندگی کہاں رُکتی ہے اُس کا کام تو آگے اور آگے ہی بڑھنا ہے۔ آج میری دوست کو گئے ہوئے دو ماہ ہونے کو ہیں لیکن کسی کو کوئی فرق نہیں پڑا، میں نے اُسے کتنے فون کیے لیکن وہ ملی ہی نہیں، جانے کہاں ہوگی وہ؟" سائرہ بے حد اُداسی سے سوچتی ایگزیبیشن گیلری میں داخل ہوئی۔

آج فائنل والوں کا کام ڈسپلے کے لیے لگ رہا تھا۔

سارے کالج کے کمروں، ہال، بیسمنٹ، اُوپر والے کمروں یہاں تک کہ بہت سارے کوریڈورز تک

تھے۔ کوریڈورز کو ایک جانب سے بند کر کے لڑکے لڑکیوں نے ڈسپلے کے لیے تیار کر لیا تھا۔ چوں کہ زیادہ تر کلاسوں اور اسٹوڈیوز میں تھیسز ڈسپلے ہونے جا رہا تھا اس لیے باقی کالج کے اسٹوڈنٹس یا تو آؤٹ ورک کر رہے تھے یا اِدھر اُدھر خوش گپیوں میں مگن تھے ایسے میں سائرہ کو مُسکان کی کمی شدّت سے محسوس ہوئی۔

"یار یہ کیا ہے؟ اب سربٹ نے مزید پخ لگا دی۔" ٹی ٹو جھنجلایا سا سائرہ سے ملا۔

"کیا ہوا؟" سائرہ نے گلے میں لٹکا کیمرا سائیڈ پر رکھتے ہوئے پوچھا، جونیئرز عموماً سینئرز کے کام کی فوٹوگرافی اُن کی اجازت لے کر کرتے تھے تا کہ آئندہ انہیں اپنا ڈسپلے کرتے ہوئے مدد مل سکے۔

"وہ کہہ رہے ہیں کہ جتنا کام کیا ہے اُس کا ڈسپلے بھی کریں۔ یار میں تو اسائمنٹ کرنے کے بعد جب جب اُس کی مارکنگ ہو جاتی تھی، اُسے اسٹور میں ڈال دیتا تھا اب میرے کام کا تو حشر ہو چکا ہو گا۔" ٹی ٹو بے حد جھنجلایا ہوا تھا۔

"اوہ! واقعی بات تو پریشانی کی ہے۔" سائرہ نے کہا۔

"اب کیا کریں گے؟" سائرہ نے اُس سے پوچھا۔

"کرنا کیا ہے یار! عبدالولی صاحب کی منت کریں گے کہ وہ اپنا کچھ کام اُدھار دے دیں ورنہ میرے ڈسپلے میں اُلّو بولیں گے۔" ٹی ٹو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"تو ولی بھائی کیا کریں گے؟"

"یار وہ ایک اسائمنٹ کو تین، چار میڈیاز میں کرتا آ رہا ہے اُس کے پاس تو ایک کے ساتھ تین تین فری اسائمنٹ ہوتی ہیں۔ اگر کچھ کام وہ مجھے دے دے گا تو اُس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔" ٹی ٹو نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"حد ہوگئی!" سائرہ نے ٹی ٹو کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

"ولی بھائی کہاں ڈسپلے کر رہے ہیں؟" سائرہ نے پوچھا۔

"اُسے تو سربٹ نے اپنے آفس کے ساتھ ٹیچرز گیلری میں جگہ دی ہے اور کیوں نہ دیں خیر سے چہیتا طالب علم ہے اُن کا..."

ٹیچرز گیلری بے حد خوب صورت تھی۔ وہاں لائٹس کا مکمل انتظام تھا اِس لیے وہاں پر لگا ہوا کام بے حد اچھا لگتا تھا۔

"یہ تو ہم ہیں جو کالج کی بدرنگ دیواروں کو چھپانے کے لیے پہلے کپڑا لا کر بیک گراؤنڈ تیار کریں گے پھر لائٹس کرائے پر لائیں گے، راستے کی خوب صورتی کے لیے گھر سے گملے بھی اُٹھا کر لا رہی ہیں یہ لڑکیاں تو۔ اللہ جانے اِن لڑکیوں سے آسان کام کیوں نہیں ہوتے۔" ٹی ٹو نے بیزاری سے کہا۔

"سدرہ اور صائمہ عبدالغنی تو اپنا ڈسپلے روم اتنا سجا چکی ہیں کہ کیا کسی کی شادی سیج سجی ہوگی، اِن لڑکیوں نے تو اپنے سارے ارمان اِس غیر ضروری ڈسپلے پر لگا دیے۔ اللہ جانے اپنی باقی زندگی کے لیے بھی کچھ ارمان بچا رکھے ہیں کہ نہیں۔" ٹی ٹو واقعی چڑا بیٹھا تھا سائرہ کا ہنس ہنس کر بُرا حال ہو گیا۔

"لو کر لو گل! کڑی ہنسے جا رہی ہے! ہنس لو ہنس لو، یہ زمانہ تو ستم کر کے ہمیشہ ہنستا ہے!" ٹی ٹو نے

مصنوعی غمگین شکل بنا کر کہا۔

”ہیں! کس نے آپ پر ستم کیا؟“ سائرہ کی ہنسی کو بریک لگ گیا۔

”اتنی قاتلانہ ہنسی سے آپ ہمیں شہیدوں میں شامل کرنے آئی ہیں۔“ ٹی ٹو نے روانی سے کہا۔

”توبہ ہے ٹی ٹو صاحب آپ بھی نا۔“ سائرہ کو اُس کی بے تکی باتوں پر ہمیشہ ہنسی آتی تھی۔

”اللہ... ٹی ٹو صاحب!“

”ارے اتنے پیار سے صاحب نہ کہیں ہم تو پہلے ہی دل و جان سے فدا ہیں، ویسے ہم آپ کے صاحب بننے کو تیار ہیں اگر آپ ہماری بیگم بننے کو تیار ہیں تو۔“ ٹی ٹو نے حسبِ عادت کہا۔

”کبھی تو کسی کو بخش دیا کرو یار! تمہیں تو بس کوئی لڑکی ملنی چاہیے فلرٹ کرنے کے لیے۔“ اُسی پل ولی نے اندر داخل ہوکر کہا۔ غالباً وہ ٹی ٹو کی باتیں سُن چکا تھا۔

”لو آ گئے لیڈی کلر! اب ہماری دال تو کیا سبزی بھی نہیں گلنے گی۔“ ٹی ٹو نے عبدالولی سے یوں گلے ملتے ہوئے کہا، جیسے وہ ولی سے برسوں کا بچھڑا ہوا تھا۔

عبدالولی کے چہرے کو بڑی دھیمی سی مسکراہٹ چھوکر گئی۔ سائرہ نے اُسے غور سے دیکھا۔ وہ واقعی بہت مختلف کشش رکھتا تھا اُس میں بہت ساری خاص باتیں تھیں، جن میں ٹاپ آف دی لسٹ اُس کی بے نیازی شامل تھی، جو صنف مخالف کے لیے چیلنج بن جاتی تھی۔

”کیا انہیں کچھ احساس ہے کہ کوئی اِن کی خاطر اپنی زندگی سے کھیل گیا؟“ سائرہ عبدالولی کو دیکھتے سوچ رہی تھی۔

”ہائے ربا! یہ کس قدر ظلم وستم ہے۔“ ٹی ٹو کی آواز نے سائرہ کی سوچ کا ارتکاز توڑا۔

”اب کیا ہوا؟“ ولی جو اپنے کام کے بُروشر چیک کررہا تھا اُس نے حیرت سے ٹی ٹو سے پوچھا۔

”بھائی میاں آخر کیا مسئلہ ہے، کیا آپ کوئی خاص قسم کی ”ریز“ چھوڑتے ہیں، جو لڑکیاں آپ کو ”بھائی بھائی“ کہتی ہیں وہ بھی صرف آپ کو دیکھتی ہیں۔ اب یہ خاتون ہمارے دِل پر چھریاں چلا کر مسلسل آپ کو دیکھ رہی ہیں، اللہ جانے ہر لڑکی آپ کو ایسے کیوں دیکھتی ہے، جیسے آپ کو دیکھنا ”عین ثواب“ ہو۔“ ٹی ٹو نے سائرہ کی چوری پکڑلی تھی۔

”لاحول ولاقوۃ۔“ سائرہ اور عبدالولی نے اکٹھے کہا۔

”میں اپنے کسی خیال میں مگن تھی، آپ جانے کیا کیا سوچنے لگتے ہیں۔“ سائرہ نے خجل ہوکر کہا۔

”یہ مگن مگن خیال وسوچیں اِس غریب کے چہرے کو دیکھ کر کیوں نہیں آتیں یعنی ہم تو اتنے احساس کمتری میں مبتلا ہوگئے کہ عبدالولی صاحب کے ساتھ رہتے رہتے، لڑکیوں کی بے نیازیاں سہتے سہتے اپنا منہ، فٹے منہ لگنے لگا ہے! بقول شاعر،

اب وہ منہ ہی کیا ہے جس پہ صنف نازک کی نگاہ نہ پڑے
ایسے ہی منہ کو فٹے منہ کہا جاتا ہے

واہ! واہ! ٹی ٹو نے سر کو گھما گھما کر خود کو داد دی۔“

”ہیں یہ کون سا شاعر ہے؟ یہ یقیناً آپ کا اپنا شعر لگتا ہے۔“ سائرہ نے کہا۔

”لاحول ولاقوۃ! یک نہ شد دو شد۔“ عبدالولی نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔

”یار سائرہ! تم ایسے جملوں کو کیسے شعر کہہ سکتی ہو شاعری کو ایسے جملوں سے اذیت تو مل سکتی ہے، لیکن شاعری کا درجہ نہیں مل سکتا، اچھا چھوڑو اِن باتوں کو یہ میرے کام کا بروشر ہے دیکھو کیسا ہے!“ عبدالولی نے اپنے کام کی ساری فوٹوگرافی کرکے اُس کا پہلے سے بروشر بنالیا تھا۔

”واؤ! اِٹس ریئلی امیزنگ۔“ سائرہ نے بے اختیار کہا۔

ابھی تک کسی اسٹوڈنٹ کو یہ آئیڈیا نہ آیا تھا۔ ایسے کمال آئیڈیاز صرف عبدالولی کو ہی سوجھتے تھے۔

اُس نے اپنے فائنل ایئر کے کام سے لے کر اپنے شروع کے کام تک کی فوٹوگرافی کرکے ایک الگ بروشر بنایا تھا۔ اس کے دو فائدے تھے ایک تو اُسے کسی ایجنسی کو جوائن کرنے کے لیے پورٹ فولیو اُٹھا کر لے جانا پڑتا تھا۔ دُوسرے ایگزیبیشن دیکھنے والوں کو اُس کا سارا گذشتہ کام اکٹھا دیکھنے کو مل جاتا، اِس طرح مختلف کمپنیز کے سربراہ جو اِس ایگزیبیشن کو دیکھنے کے لیے خاص طور پر بلائے جاتے تھے وہ اپنی پسند کا کام اور بندہ سلیکٹ کرکے لے جاتے تھے۔

عبدالولی کا کام تو خود سے بولتا تھا اُس پر اُس کی زبردست قسم کی پریذنٹیشن تھی۔ اِس قدر ڈرامیٹک ماحول تخلیق کرنا ہر کسی کے بس کی بات کہاں تھا سب اسٹوڈنٹس کا خیال تھا کہ ہر مرتبہ کی طرح اس بار بھی عبدالولی ہی ٹاپ کرے گا۔

”آپ کو میرا کام پسند آیا؟“ عبدالولی نے وہیں رکھی ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”بے حد! ان فیکٹ آپ کا کام ہے ہی بے حد امپریسو۔“ سائرہ نے سچائی سے تعریف کی۔

”یار ٹی ٹو! وہ ماسٹر صاحب تمہارا پوچھ رہے ہیں اسکلپچر روم میں تمہارے مولڈز تیار رکھے ہیں اُن کو سنبھالو، ماسٹر صاحب لوڈ آف ورک کی وجہ سے آؤٹ آف کنٹرول ہورہے ہیں کوئی پتا نہیں وہ اُٹھا کر پھینک دیں۔“ کاشف نے دروازے کے پاس کھڑے ہوکر کہا تو ٹی ٹو سب کچھ چھوڑ چھاڑ باہر کی جانب بھاگا۔

”ولی بھائی ایک بات پوچھوں؟“ سائرہ نے ٹی ٹو کو باہر جاتے دیکھ کر عبدالولی سے پوچھا۔

”ہاں ضرور!“ عبدالولی ہاتھ میں پکڑی ٹرانسپرنسیز لائٹ کے سامنے کرکے دیکھتے ہوئے بولا۔ وہ اپنے کام میں اِس قدر مگن تھا کہ وہ سائرہ کی سنجیدہ شکل کو نوٹ ہی نہ کرسکا ورنہ وہ فوراً جان جاتا کہ سائرہ اُس کے متعلق پوچھنے والی تھی۔

”آپ کے آئندہ پلانز کیا ہیں؟“ جانے کیوں سائرہ اُس سے ڈائریکٹ کچھ نہ پوچھ سکی۔

”شاید کوئی ایجنسی جوائن کروں گا یا پھر اپنا خود کا کام اسٹارٹ کرلوں گا۔“ ولی نے مگن سے انداز میں جواب دیا۔

”نہیں ولی بھائی! میں آپ سے کچھ اور پوچھنا چاہ رہی تھی۔ میرا مطلب ہے کہ آپ اپنے لائف پارٹنر کے متعلق؟“ سائرہ نے آخر بات کرنے کا فیصلہ کرہی لیا۔

وہ ٹاپک جس پر عبدالولی کبھی بات نہ کرنا چاہتا تھا وہ آج اُس کے سامنے آخر کار سوال بن کر کھڑا ہوگیا تھا۔

''میں نے کسی کو آس نہیں دلائی سائرہ! تم اچھی طرح جانتی ہو۔'' عبدالولی نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

اِس بار باری بوکھلانے اور حیران ہونے کی سائرہ کی تھی۔

''کیا...؟ اِس کا مطلب ہے آپ جانتے تھے کہ مسکان آپ کو پسند ...'' سائرہ کا لہجہ بے حد تا... سے بھرا ہوا تھا۔

''ہاں! اُس دِن ریہرسل روم میں، میں نے اُس کا اقرارِ محبت سُن لیا تھا۔'' عبدالولی نے نگاہ چُرا... ہوئے کہا۔

''تو... تو پھر بھی آپ بے خبر، بے نیاز بنے رہے۔ کیوں ولی بھائی؟ ایک لڑکی آپ کی خاطر تڑپ... رہی لیکن آپ بے حس بنے رہے۔'' سائرہ کو واقعی بے حد دُکھ تھا۔

''سائرہ! میں عورت ذات کی بے حد عزت کرتا ہوں، میں نے مسکان کو آج تک کوئی آس نہ دلائی... اِس لیے میرا رویّہ بے حس ہرگز نہ تھا۔ میں اُس کا بھرم نہیں توڑنا چاہتا تھا اگر وہ میرا انکار منہ پر سُن لیتی... اُسے زیادہ دُکھ ہوتا، میری بے نیازی سے بھی زیادہ جسے تم اب بے حسی کا نام دے رہی ہو۔''

''لیکن مسکان میں کیا کمی تھی؟'' سائرہ نے کہا۔

''وجہ صرف کمی نہیں ہے، وجہ یہ ہے کہ میں نے اُس کو کبھی اِس نظر سے دیکھا ہی نہیں، پھر جانے... ایک دِن کیسے ایک لڑکی اچھی لگنے لگی۔ ایسے میں مسکان کے کسی بھی جذبے کی پذیرائی کرنا میرے... بے حد مشکل تھا۔ یہ جو دِل کے معاملات ہوتے ہیں نا یہ اگر خالص رہیں تو اچھا ہے۔ میں جس لڑکی... پسند کرتا ہوں وہ میری خالہ زاد ہے، میں نے اُس پر اپنی پسندیدگی لفظوں میں کبھی ظاہر نہیں کی، للا... میرے ایگزام کے بعد وہاں پرپوزل لے کر جانے والی ہیں اگر اُس لڑکی کے دِل میں کوئی اور خیال ہوا... میں ہرگز سختی نہ کروں گا۔ دِل مانے بغیر کبھی زندگی کے فیصلے کامیاب نہیں ہوتے! یہ تم اپنی دوست کو بھی... سمجھانا۔'' عبدالولی نے سائرہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ غریب تو جانے کس حال میں ہوگی، میں نے جب، جب اُس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی... سے اُس کی بات نہ ہوسکی۔ اُس کے بابا کا یہاں سے جاتے ہوئے رویہ بے حد عجیب سا تھا۔'' سائرہ بے حد فکرمندی سے کہا۔

''مطلب؟'' ولی نے نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''مطلب یہ ولی بھائی کہ اُس کے بابا اُسے گاؤں واپس لے گئے ہیں اور اب شاید وہ کبھی واپس... آسکے۔ اُس کی آپا لقاں سے میری بہت مشکل سے بات ہوئی تھی انہوں نے ہی مجھے بتایا کہ اُس کے ا... کو جیسے ہی پتا چلا کہ مسکان کسی لڑکے میں دِل چسپی رکھتی ہے تو وہ غصّے سے اُسے واپس لے گئے اور ا... کی تعلیم بھی ختم کروادی۔ اُسے کسی گناہ کے بغیر جانے کیوں اتنی سزا دی گئی۔'' سائرہ نے بے حد دُکھ... کہا۔

''واٹ نان سینس! یہ تو سراسر اُس لڑکی پر زیادتی ہے جب اُس کا جذبہ یک طرفہ تھا تو پھر کیوں ا... اِس طرح سزا دی گئی؟'' ولی کو واقعتاً مسکان کی تعلیم ختم ہونے کا دُکھ ہوا تھا۔ بے شک وہ اپنے اندر...

حد بے چینی محسوس کر رہا تھا، بِنا کچھ کیے بھی اُسے اپنا آپ مجرم لگ رہا تھا۔

باضمیر لوگ ہمیشہ ایسے ہی ہوتے ہیں، ولی نے بھی کبھی نہ سوچا تھا کہ اُس کی ذات سے کسی کو دُکھ ملے۔

''جانے وہ کس حال میں ہوگی!'' سائرہ نے بے حد دُکھ سے اپنی بات دوبارہ دُہرائی۔

''میری دُعا ہے کہ وہ خیریت سے ہو، اِس کے علاوہ میں اُس کے لیے اور کچھ نہیں کرسکتا۔'' ولی ایک دَم بے حد بے چین ہوگیا، اُس سے اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا اس لیے وہ یک دَم سے اُٹھ کھڑا ہوا اور باہر نکل گیا۔

سائرہ نے اُسے جاتے دیکھا اور ایک طویل سانس بھر کر رہ گئی۔

دو کناروں میں صرف اِک رشتہ بنتا ہے۔ وہ ہے فاصلے کا اور دوری کا رشتہ۔

❖❖○❖❖

''تم سے ایک ذرا سا کام ٹھیک سے نہ ہوسکا۔'' میڈم راگنی مارک پر چلا رہی تھی اور مارک حقیقتاً شرمندہ تھا۔ زندگی میں پہلی بار ہوا تھا کہ وہ کسی کام کو ٹھیک سے نہ کر پایا تھا اِس لیے وہ خود بھی جنونی ہو رہا تھا۔ ایسے میں وہ میڈم راگنی کے احکامات کا منتظر تھا کہ اب وہ لڑکی کو دوبارہ کب اُٹھانے جائیں۔

''میڈم پلیز! گیو می این آدر چانس! اس بار کوئی غلطی نہ ہوگی، ہم نے اُس لڑکی کو دیکھ لیا ہے اب تو کہیں بھی اُس پر ہاتھ ڈالا جاسکتا ہے۔''

''نہیں! فی الحال تم رُک جاؤ اور کچھ دِن کے لیے انڈر گراؤنڈ چلے جاؤ، ہمیں اطلاع ملی ہے کہ طارق تمہیں پہچان گیا ہے اور تمہارا اسکیچ اُس نے تھانے میں بھی جمع کروادیا ہے۔ وہ تو اپنے بھائی بند تھانے میں بیٹھے ہوئے ہیں اس لیے ہر اطلاع ہمیں مِل جاتی ہے۔'' میڈم راگنی کی بات بیچ میں ہی رہ گئی۔ اُس کے موبائل پر خاص نمبر آ رہا تھا۔

''اچھا اب تم جاؤ۔'' وہ تیزی سے اپنے خاص کمرے کی طرف بڑھی، جس کے بیسمنٹ میں کنٹرول روم تھا جہاں نہایت حساس کیمرے لگے ہوئے تھے۔ وہ یہیں پر بگ باس کے احکامات وصول کرتی تھی۔

''یس سر!'' میڈم راگنی نے نہایت مہذب لہجے میں کہا۔

''تمہیں ایک نیا ٹاسک دیا جارہا ہے تم اِس پر فوراً کام شروع کردو۔'' وہاں سے انگریزی میں احکامات ملے تھے۔

''اوکے سر! میڈم راگنی نے تابع داری سے کہا۔

اور پھر بگ باس نے جو کچھ اُس سے کہا تھا، میڈم راگنی کے چہرے پر بے حد شاطر مسکراہٹ دَر آئی تھی۔ راگنی نے بات ختم کرکے ہیڈ فون سر سے اُتارا اور کوڈ ملا کر رابطہ بند کیا۔ وہ اپنی ساڑھی کا پلو سنبھالتی اُوپر اپنے کمرے میں چلی آئی، مووایبل دیوار نے سیڑھیوں تک جانے والے راستے کو چھپالیا تھا۔

اُس نے فریج سے وائن کارٹن نکالا اور اُس کا ڈھکنا کھولا تو کمرے میں شو کی آواز آئی، وائن کے لنڈے چھینٹے اُچھل کر اُس کے چہرے پر آئے۔ میڈم راگنی نے ٹھنڈا یخ گھونٹ بھرا۔

"یو... پاکستانیز! اب تم لوگوں کو تمہارا خدا بھی نہیں بچا سکتا۔" وہ پاکستانیوں کو گندی سی گالی دے کر خود ہی ہنسنے لگی۔

میڈم راگنی کی مکروہ ہنسی اُس کے مکروہ ارادوں کو ظاہر کر رہی تھی۔ اب وہ کوئی بہت بڑی تباہی کا انتظام کرنے جا رہی تھی۔

❖❖○❖❖

"جی انکل آپ کے فون نے تو باقاعدہ پریشان کر دیا تھا، خیریت ہے نا؟" طارق نے احمد شاہ سے ملتے ہی فکرمندی سے پوچھا، وہ واقعی احمد شاہ کے فوراً بلاوے پر پریشان ہو گیا تھا۔

"ارے ارے اِٹس آل رائیٹ! تم پلیز بیٹھو!" احمد شاہ نے اُس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

طارق صوفے پر بیٹھتے ہوئے انہیں ہی دیکھ رہا تھا۔

"تم سے اب کبھی تفصیلی ملاقات ہی نہیں ہو پاتی۔ اللہ جنت نصیب کرے تمہارے نانا مرحوم جب انگلینڈ آتے تھے ہم سے ضرور ملنے آتے تھے۔ لیکن میں نے کبھی پوچھا ہی نہیں کہ تمہارے والد والدہ کبھی آپ سے ملنے نہیں آتے۔"

طارق اور ولی دونوں پیٹر اینڈ کیتھرائن میں اکٹھے پڑھتے تھے، طارق تو ہوسٹل میں ہوتا اِس لیے ہر ویک اینڈ پر ولی اُسے گھر لے آتا تھا۔ طارق سے اُس کے نانا جب ملنے آتے، ولی کے لیے بھی پاکستانی سوغاتیں لاتے، ولی کی وجہ سے طارق اُن کا ایک فیملی ممبر بن گیا تھا پھر وہ اپنے نانا کی وفات کے بعد واپس پاکستان چلا گیا۔ لیکن پھر بھی ولی اور طارق کا ٹیلی فون پر ہمیشہ رابطہ رہا، پاکستان واپس آ کر ولی، طارق سے ملنے لگا تھا۔ اُن دونوں کی دوستی ہی ایسی تھی کہ چاہے مہینوں ایک دوسرے سے دور رہتے لیکن اُن کی دوستی میں کبھی فرق نہ پڑا تھا۔

"میرے والدین کی ڈیتھ ہو چکی ہے! کیا ولی نے کبھی آپ سے ذکر نہیں کیا؟" طارق نے حیرت سے پوچھا۔

"میری آنی نے ہماری پرورش کی ہے، روشن آنٹی سے تو اُن کی بارہا ملاقات ہوئی ہے۔" طارق واقعی حیران تھا کہ احمد انکل اتنی Basic بات اُن کے متعلق نہ جانتے تھے۔

"طارق بیٹا! ہے تو کچھ پرسنل سی بات، لیکن جانے کیوں میرا دِل تم سے کچھ پرسنل سی باتیں کرنے کو..." احمد شاہ کی بات پر طارق ایک دم کھل سا گیا۔

"میرا خیال ہے کہ میں اُن کی نظر میں ہوں! طارق میاں لگتا ہے ہونے والے سُسر انٹرویو کے موڈ میں ہیں۔" طارق نے دِل میں ہنستے ہوئے کہا۔

"نیور مائنڈ سر!" طارق نے پرسکون ہو کر صوفے کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

"آپ کو اپنے فادر کی کچھ یاد ہے؟" احمد شاہ نے ملازم کے ہاتھ سے چائے لے کر پہلے طارق کے ہاتھ میں تھمائی اور دوسرا کپ اپنے لیے تھام لیا۔

"نہیں! میں نے اپنے ہوش میں ابو کو کبھی نہیں دیکھا، وہ میرے بچپن میں فوت ہو گئے تھے۔ میں جب بڑا ہوا تو میں نے اپنی امی کو ہمیشہ بیمار ہی دیکھا وہ ابو کو بہت یاد کرتی تھیں۔ میری آنی ابو کے لیے

کچھ اچھی Feelings نہیں رکھتیں اِس لیے ہمارے ہاں اُن کا ذکر بھی نہیں ہوتا۔" طارق نے بے حد سچائی سے انہیں بتایا۔

"اور آپ کی اپنی Feelings کیا ہیں، اپنے فادر کے لیے؟" احمد شاہ نے اُسے بہ غور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میری...؟" طارق واقعی کشمکش و پنج میں تھا کیوں کہ وہ خود اپنے باپ کے لیے اچھی Feelings نہ رکھتا تھا لیکن کسی دوسرے کے سامنے اپنا بھرم توڑنا بھی اُسے پسند نہ تھا۔ وہ اپنے باپ کو دوسروں کے سامنے ڈی گریڈ نہ کرنا چاہتا تھا کیوں کہ اُس کی رائے ہی اُس کے باپ کی عزت یا بے عزتی کا سبب بن سکتی تھی۔

"ہاں بیٹا! میں آپ کے احساسات جاننا چاہتا ہوں۔" احمد شاہ مسلسل اُس کا چہرہ پڑھ رہے تھے اُن کی اتنی عمر گزر گئی تھی، اب وہ چہروں کو پڑھنے کا فن جان گئے تھے اور طارق کے چہرے پر لکھا تھا کہ وہ اپنے باپ کے متعلق اچھی رائے نہ رکھتا تھا۔

"میرا خیال ہے انکل! ہمیں اِس ٹاپک پر بات نہیں کرنی چاہیے، وہ اب اِس دنیا میں نہیں ہیں، ہماری زندگی میں نہیں ہیں تو اُن کا ذکر بھی نہیں ہونا چاہیے۔" طارق نے طویل سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"تو کیا جو لوگ ہماری دنیا سے چلے جاتے ہیں وہ ہمارے دِلوں سے بھی چلے جاتے ہیں؟" احمد شاہ کا سوال طارق کو گڑبڑا گیا۔

"جو لوگ ہمارے دِلوں میں بستے ہوں، وہ چاہے دُنیا سے چلے جائیں لیکن پھر بھی ہمیشہ ہمارے دِلوں میں رہتے ہیں!" طارق نے طویل سانس بھری۔

"تو تم یہ مانتے ہو!" احمد شاہ نے اُسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں!"

"تو پھر تمہارے فادر....!" احمد شاہ نے جان بوجھ کر جملہ اُدھورا چھوڑ دیا۔

"میرے فادر اِس قابل نہ تھے کہ وہ ہمارے دِلوں میں رہتے!" طارق نے جھنجلا کر تیزی سے کہا۔

"کیوں؟"

"اِس لیے کہ انہوں نے بغیر کسی وجہ کے میری مدر کو طلاق دی تھی جس کے غم میں وہ ہمیشہ کی بیمار ہو گئیں اور یہی روگ اُن کی زندگی لے گیا اور ہمیں اِس دنیا میں ہمیشہ کے لیے تنہا کر گیا۔ آپ جانتے ہیں کہ میری مدر کی تباہی کا ذمے دار صرف اور صرف میرا باپ تھا۔" طارق کے لہجے میں بہت کچھ کھو دینے کا دُکھ تھا۔

اُن دونوں بہن بھائیوں نے نہ باپ کی شفقت دیکھی تھی اور ماں کی ممتا سے وہ محروم کر دیے گئے تھے ایسا انہیں اُن کی آنی نے ہی بتایا تھا۔

"کیا تم نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ جیسا تمہیں بتایا گیا وہ ہی درست تھا؟" احمد شاہ نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے اُس کے پاس بیٹھ کر کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"سر! ہم ہمیشہ اُسے ہی سچ جانتے ہیں جو ہمیں ہمارے بڑے بتاتے ہیں، جیسے وہ ہمیں مختلف چیزوں کی پہچان کے لیے اُن کے نام بتاتے ہیں اسی طرح کا معاملہ رشتوں کے متعلق بھی ہوتا ہے۔" طارق کو احمد شاہ کی اِس بحث سے اُلجھن ہونے لگی تھی۔

"بیٹا! باپ کسی چڑیا، کوّے یا پھر میز کرسی جیسی چیزوں کی پہچان نہیں ہے کہ جو جس نے جتنا بتایا اُس پر اعتبار کرلیا۔ باپ کا رشتہ تو بے حد اہم ہوتا ہے، بچے تو صرف اُس کے متعلق بتانے پر راضی نہیں ہوتے اُن کے اندر کھوج ہوتی ہے۔ کیا آپ کو کبھی تجسس نہیں ہوا!" احمد شاہ کا سوال طارق کو بے چین کر گیا۔

"ہوتا تھا لیکن ہمارے لیے ہمارے موجودہ رشتے اہم تھے، ہم کون سا رشتوں کے معاملے میں امیر تھے، گنے چنے لوگ میرے نانا اور میری خالہ تھے اگر ہمارے سوال ہمارے شک اُن کو بھی ہم سے دور کردیتے تو ہم سوشلی بھی سروائیو نہ کرسکتے۔ انکل زندگی میں کبھی کبھی ایسی اسٹیج بھی آتی ہے جب انسان کو مجبوراً نفع نقصان دیکھنا ہی پڑتا ہے۔" طارق کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا، وہ جو ہمیشہ سے مضبوط اور سنجیدہ نظر آتا تھا آج اُس سے بالکل الگ دکھائی دے رہا تھا۔ اِس خول کے نیچے آج بھی اُس کی محرومی بول رہی تھی۔

"میرے نانا کہتے تھے کہ انسان اگر بوڑھا بھی ہو جائے تو بھی اُسے اپنے ماں باپ کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے، انکل ہماری زندگیوں میں ماں باپ کا خانہ خالی ہے اور اِس خلا کو کوئی پورا بھی نہیں کرسکتا۔"

"اگر میں کہوں کہ آپ کی زندگی میں یہ خلا پر ہوسکتا ہے تو...؟" احمد شاہ نے بہ غور اُس کا چہرہ دیکھا۔

"مطلب...؟" طارق نے نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔

"اگر میں کہوں کہ آپ کے والد زندہ ہیں تو...؟" احمد شاہ کی بات سے طارق کے وجود میں زلزلے سے آگئے۔

"سر! کیا میں اِس مذاق کا متحمل ہوسکتا ہوں؟ میں آپ کی بے انتہا عزت کرتا ہوں لیکن اِس طرح کی باتیں مجھے ہرٹ کررہی ہیں۔" طارق نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"میں اب چلتا ہوں سر! مجھے بے حد ضروری کام ہے۔" طارق کا چہرہ بے حد پھیکا پڑ چکا تھا۔

"بیٹا! میں معذرت خواہ ہوں کہ میری باتوں سے آپ کا دِل دُکھا لیکن میں تو صرف تصویر کا دُوسرا رُخ آپ کو دکھانا چاہتا تھا۔ آپ پلیز اپنا دِل نہ بُرا کریں۔" احمد شاہ کو واقعتاً طارق کی فکر تھی۔

"سر آپ کے کہنے کا کیا مطلب ہے؟" طارق نے اُلجھ کر اُن سے پوچھا۔

"یہی کہ تمہارے والد زندہ ہیں اور بے حد اچھے انسان ہیں انہوں نے آپ کی والدہ کو اُن کے مجبور کرنے پر چھوڑا تھا۔ آپ لوگوں سے قطع رابطہ کی فرمائش بھی آپ کی والدہ اور خالہ کی تھی۔ چوں کہ آپ کے والد آپ کی والدہ سے بے حد محبت کرتے تھے اِس لیے انہوں نے اُن کی خوشی کی خاطر اپنے بچوں کی بھی قربانی دے دی۔ آپ کی والدہ سے محبت کرنا اُن کا سب سے بڑا قصور بن گیا تھا وہ اِس دوران آپ لوگوں کا خرچ مسلسل بھجواتے رہے ہیں۔ آپ کی خالہ نے اُن کو بھی اطلاع نہیں دی کہ آپ کی والدہ وفات پاچکی ہیں ورنہ وہ کب کا آپ لوگوں کو اپنے پاس بلالیتے۔ اب جب کہ انہیں اچانک ساری صورت حال کا پتہ چل چکا ہے تو وہ آپ سے ملنے کے لیے بے حد تڑپ رہے ہیں۔"

"طارق بیٹا! میں جانتا ہوں کہ ایک دَم سے آپ کے لیے یہ سب کچھ قبول کرنا بے حد مشکل ہوگا۔ لیکن یہ سچ ہے کیا آپ ایک تڑپتے ہوئے باپ کی بانہوں کو ٹھنڈک نہیں دو گے؟ یہ ٹھنڈک اُسے صرف اپنے

بیٹے کے سینے سے لگ کر ہی حاصل ہوسکتی ہے!"

"آپ... آپ یہ سب کیسے جانتے ہیں؟" طارق نے کھوئے کھوئے لہجے میں پوچھا۔

"کیوں کہ آپ کے والد میرے بہت اچھے دوست ہیں اور الحمدللہ وہ زندہ ہیں۔"

"کیا ابو زندہ ہیں؟" طارق کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپکے تھے، یہ دو آنسو کتنی محرومیوں سے بھرے ہوئے تھے یہ صرف وہ ہی جانتا تھا۔

"ہاں! یہ سچ ہے۔" احمد شاہ نے اُس کا کندھا تھپتھپا کر کہا۔

طارق نے احمد شاہ کو غور سے دیکھا، کتنی عجیب بات تھی کہ ایک اجنبی شخص اُسے بتارہا تھا کہ اُس کا باپ زندہ ہے اور وہ اُس سے بے حد پیار کرتا ہے۔

"آنی... کیا آنی ہم سے جھوٹ بولتی رہیں؟" ایک ناگ کی طرح کا سوال تھا، جس کے اندر بے حد زہر تھا۔ طارق کو اپنے اندر لاوا اُبلتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔

❖❖○❖❖

"السلام علیکم! کیسی ہیں آپ...؟" عبدالولی نے بے حد دھیمی آواز میں کہا۔

"ارے آپ...؟" علیزے ایک دَم سے بوکھلا گئی۔

علیزے اسکول سے آنے کے بعد بنا کچھ کھائے پیے سوگئی تھی ابھی ابھی وہ سو کر اُٹھی تھی۔ بغیر دوپٹے میں بے خیالی سے وہ باہر آئی تو سامنے عبدالولی امی کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا۔

"جی!" ولی نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ اُس نے ایک کے بعد دُوسری نگاہ اُس پر نہ ڈالی۔

علیزے فوراً اندر بھاگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سلیقے سے دوپٹا اوڑھے باہر آئی۔

"امی جان کھانا بنانا ہے؟" علیزے نے ماں کے کان میں سرگوشی کی۔

حالاں کہ وہ دیکھ رہی تھی کہ منزہ نے ٹھیک ٹھاک خرچا کر کے چائے کے لوازمات اُس کے سامنے اکٹھے کر رکھے تھے۔ لیکن چوں کہ اُس کی ماں ولی کو دیکھ کر بے حد خوش ہوتی تھیں اِس لیے اُس نے ماں سے ولی کے لیے کھانے کا پوچھا تھا۔ علیزے کے دِل میں ولی کے متعلق بے حد غبار تھا۔ وہ اُسے ایک دم سے بُرا لگنے لگا تھا۔

"نہیں خالہ! مزید تکلف نہ کریں میں بس اب چلتا ہوں۔" ولی نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

علیزے نے بھی صرف اپنی ماں کے لیے پوچھنا تھا اِس لیے وہ خاموشی سے کچن میں چلی آئی جہاں منزہ زور شور سے گڈو کو مختلف ہدایات دے رہی تھی، وہ ولی کے لیے کھانا باہر سے منگوا رہی تھی۔

"رہنے دیں، وہ آپ کے کزن تو تشریف لے کر جارہے ہیں۔" علیزے نے کولر سے پانی بھرتے ہوئے بہن کو اطلاع دی۔

"کیا... اتنی جلدی؟ تم رُکو گڈو، میں ذرا پوچھ کر آؤں کہ اتنی جلدی کس بات کی ہے ابھی تو آئے تھے۔" منزہ تیزی سے باہر نکلی۔

"ہونہہ! شہزادہ چارلس ہے نا جس کا پروٹوکول بہت ضروری ہے۔" علیزے منہ ہی منہ میں بڑبڑائی

اِس شخص کی وجہ سے اُس نے زندگی میں پہلی بار اپنے باپ کی مار کھائی تھی۔

علیزے نے بچی ہوئی چائے کیتلی سے کپ میں انڈیلی اور دو بسکٹ نکال کر پلیٹ میں رکھے اور اندر چلی آئی۔ اُس نے کمرے میں جاتے ہوئے ولی پر نگاہ بھی نہ ڈالی، لیکن امی کی آواز سے لگتا تھا کہ وہ جانے کے لیے بالکل تیار تھا۔ علیزے کے دِل پر ایک بار پھر نامحسوس طریقے سے بوجھ آن گرا تھا۔ اُس دِن کی انسلٹ کے بعد ولی سے اُس کا دِل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھٹا ہو گیا تھا۔

''آپی!'' گڈو کچھ دیر بعد اُس کے سر پر کھڑا پکار رہا تھا۔ علیزے ایک دَم چونکی۔

''ہاں!'' علیزے نے بیڈ پر لیٹتے ہوئے پوچھا جانے آج اُس پر سستی کیوں سوار تھی، کسی کام میں دِل نہ لگ رہا تھا۔

''آپی! یہ ولی بھائی آپ کے لیے دے کر گئے ہیں، کہہ رہے تھے کہ اُن کے کام کی نمائش لگی ہے آپ ضرور دیکھنے آئیں۔'' علیزے نے مجبوراً اُس سے کارڈ لے کر تھام لیا۔

کارڈ کے باہر ولی کی تصویر اسکیچ کی صورت اور اُس کے کام کی ایک تصویر پرنٹ تھی، کارڈ بے شک بہت خوب صورت اور اٹریکٹیو تھا۔ علیزے نے بے خیالی میں اُسے کھولا تو ایک خط ایک دَم سے اُس کی جھولی میں آن گرا۔

''یہ کیا ہے؟'' علیزے نے خط کھولا۔

پیاری کزن! السلام علیکم!

''ہیں یہ کس کے نام خط ہے۔'' علیزے نے حیرت سے سوچا۔

''میں نے کبھی کسی کو دانستہ دُکھ نہیں دیا میری شعوری، لاشعوری کوشش رہی ہے کہ میں ہمیشہ دوسروں کے لیے سُکھ کا باعث بنوں، ایسا میری ماں کی تربیت میں شامل تھا۔ لیکن پھر ایک دِن یہ کوشش ناکام ہو گئی میں بے حد دُکھی ہوا۔ آپ کی انا کو جو زخم لگا اُس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔ میری خواہش ہے کہ آپ کو زندگی کی ہر خوشی ملے آپ کے چہرے پر اطمینان آپ کے نقوش میں شامل ہو جائے۔ کبھی کبھی ہماری زندگی میں ناخوش گوار واقعات ہماری کوشش کے باوجود ہو جاتے ہیں لیکن بڑے دِل والے معاف کر دیتے ہیں۔ زندگی میں معافی کی گنجائش ہی زندگی کو خوشیوں سے بھرتی ہے، میں نے کچھ نہیں کیا لیکن پھر بھی آپ کے ماتھے کے بَل کی وجہ بنا ہوں، یہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ میں جہاں سے شروعات کی توقع رکھتا ہوں وہیں ہی بدمزگی پیدا ہو، یہ بھی اچھا نہیں ہوتا۔

تو ڈیئر کزن! کیا آپ کی وہ دھیمی سی مہمان نواز مسکراہٹ دوبارہ نہیں مل سکتی؟ میں اپنے ڈسپلے میں ہر روز آپ کا انتظار کروں گا۔ یقین جانیے آپ وہ واحد مہمان ہیں، جس کا میں انتظار کروں گا، آپ آئیں گی تو میں سمجھوں گا کہ آپ کے دِل سے میرے لیے بدگمانی ختم ہو گئی۔ آپ آئیں گی نا؟

منتظر

محمد عبدالولی۔''

علیزے نے حیرت سے خط کو دوبارہ سہ بارہ پڑھ ڈالا۔

''کیا ولی کو الہام ہوا تھا کہ میں اُس سے بے حد بدگمان ہو چکی ہوں۔'' علیزے کو حیرت تھی کہ ولی

اُس کی دِلی کیفیت کیسے جان گیا؟ خط کیا تھا ایک عجیب سی اَدبی تحریر تھی جو کچھ کہتے کہتے سب کچھ چھپا رہی تھی، بہ ظاہر خط میں کوئی بھی بات کھلی ڈلی نہ تھی لیکن علیزے کو خط کے لفظوں سے اِک عجیب طرح کی خوشبو آ رہی تھی، وہ اِس احساس کو کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی البتہ یہ تھا کہ اُس کے دِل پر موجود سارا غبار ایک دَم سے ڈھل گیا تھا۔

علیزے کیا کانوں میں مسلسل ایک ہی جملہ گھوم رہا تھا۔

''آپ آئیں گی نا؟''

''ہاں میں آؤں گی!'' علیزے کے چہرے کا تناؤ ختم ہو چکا تھا ایک عجیب سے احساس میں وہ گھری ہوئی تھی۔ دِل میں ایک عجیب سی کسک سی اُٹھ رہی تھی جس کا الگ ہی مزا تھا۔

''مجھے کیا ہو گیا ہے؟'' علیزے نے گھبرا کر خود سے سوال کیا، لیکن ابھی تک وہ اپنی کیفیت کو پہچان نہ پا رہی تھی۔

❖❖○❖❖

''بی بی جی... بی بی جی وہ... وہ مسکان بی بی کو جانے کیا ہو گیا ہے۔'' ملازمہ دوڑتی آپا اماں کے پاس آئی۔

آپا اماں جو وضو کر کے غسل خانے سے نکلی تھیں، ننگے پاؤں مسکان کے کمرے کی جانب دوڑیں۔

''مسکان!'' آپا اماں کی چیخ بے اختیار تھی۔

''مسکان!'' سید سرفراز علی کو بھی کسی نے اطلاع کر دی تھی وہ بھی پریشانی سے بھاگے آئے۔

مسکان کی ناک سے خون بہنے لگا تھا۔

''میرے اللہ!'' آپا اماں نے روتے ہوئے مسکان کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

''مسکان میری جان آنکھیں کھولو۔'' آپا اماں نے بے سدھ مسکان کو ہلاتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا ہے اِسے...؟'' سید سرفراز علی کی آواز دُکھ سے پھٹ رہی تھی۔ مسکان کی تکلیف کو دیکھ کر اُن کا دِل ڈوبنے لگا، جانے کیوں اِس بچی میں اُن کی جان بندھی تھی۔

''تم نے ہی اِسے اِس مقام تک پہنچایا ہے اب مجھ سے کیا پوچھتے ہو کہ اِسے کیا ہوا ہے۔'' آپا اماں نے روتے ہوئے کہا۔

''صدیق کو کہو گاڑی نکالے، مسکان کو ہسپتال لے جانا ہے۔'' سید سرفراز نے چلّا کر ملازمہ سے کہا۔

''سید سرفراز! تم ایک اور سدرہ بی بی کو جنم دے چکے ہو، تمہارے فیصلے کب تک اِس حویلی کی بیٹیوں کو ماریں گے؟'' آپا اماں نے چلا کر کہا۔

''سدرہ! سدرہ...؟'' سید سرفراز نے ایک پَل کو ٹھٹک کر آپا اماں کو دیکھا۔ انہوں نے بے اختیار مُسکان کا چہرہ دیکھا جو ہو بہو سدرہ جیسا لگنے لگا تھا۔

ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئیں پیلی پھیکی رنگت، ہڈیوں کا ڈھانچا! سید سرفراز علی کو ایک دم جھرجھری آ گئی، یہ تو اُن کی اپنی بیٹی تھی۔ چند ہی دِنوں میں مسکان کا چہرہ اُتر کر رہ گیا تھا۔

''تو کیا واقعی مسکان بھی سدرہ کے انجام تک پہنچ جائے گی...؟'' سید سرفراز علی بے چینی کے اُس

عروج کو محسوس کر رہے تھے، جہاں سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔

❖❖○❖❖

سید سرفراز علی کا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا سدرہ اُن کے پلان کے متعلق جان گئی تھی۔ سدرہ کی زبان بند کرنا بے حد ضروری تھا لیکن فی الحال سید سرفراز علی سدرہ سے اُلجھ کر اپنا بھرم نہیں توڑنا چاہتا تھا۔

''میرے تو ستارے ہی گردش میں ہیں، عبداللہ کا ایک دَم زمینوں کے معاملات میں دخل دینا، عائشہ کا عبداللہ سے نکاح ہونا! اب اُس کی ساری زمین عبداللہ کے ہاتھ لگنے والی تھی۔ اب جب اُس نے عبداللہ کو مروانے کا پلان طے کروایا تھا تو ڈاکٹر فیصل سامنے آ گیا اور آج یہ سدرہ سامنے آ گئی تھی۔

''سید سرفراز! تم کو یہ حملہ روکنا ہوگا ورنہ سدرہ منہ کھول دے گی اور وہ بات خطرناک ہو جائے گی۔''

سید سرفراز کے پاس وقت بہت تھوڑا تھا۔ سید نوازش علی نے پیغام بھجوایا تھا کہ وہ باہر آ جائے گاڑیاں روانگی کے لیے بالکل تیار تھیں۔

''اماں جان! میرا کام کروا دیں گی لیکن کیا وہ اِس بات پر خفا نہ ہوں گی کہ گاڑی میں بابا سائیں کی موجودگی کے باوجود میں نے حملہ کروایا۔'' سید سرفراز نے پریشانی سے ماتھا مسلا، وہ بُری طرح پھنس گیا تھا۔ اُس نے اپنے خاص بندے کو بلایا تھا وہ اپنے کمرے میں اُس کا انتظار کر رہا تھا یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے کسی آدمی کو اپنے کمرے میں بلایا ہو۔

بختاور کو سید سرفراز کے کمرے میں جاتے سدرہ نے دیکھا تو دبے پاؤں وہ بھی سرفراز کے کمرے کے دروازے کے باہر جا کھڑی ہوئی۔ سید سرفراز علی بے حد بوکھلایا ہوا تھا اُس نے ہر طرح کے حملے سے منع کر دیا تھا۔

''مجھے یقین نہیں آتا کہ بھائی صاحب اپنے ہی بھائی اور باپ کی جان کے دشمن بن گئے۔ لیکن بھائی صاحب! میں آپ کے ارادے پورے ہرگز نہ ہونے دوں گی۔'' سدرہ تیزی سے وہاں سے ہٹی۔

''اللہ میاں! میں کیا کروں کہ سید سرفراز اپنے ارادوں سے باز آ جائے!'' سدرہ تیزی سے سید عبداللہ کے کمرے کی طرف بڑھی۔

سید عبداللہ غالباً نکل چکا تھا اُس کا کمرا خالی تھا۔

''ہائے ربا! بھائی تو نکل گیا۔'' سدرہ باہر بھاگی، نذیراں دیکھو بابا سائیں نکل گئے ہیں اگر نہیں تو عبداللہ بھائی کو اندر بھیجو میری بات سننے کے لیے۔'' سدرہ نے جلدی سے ملازمہ کو باہر بھیجا۔

''اگر وہ نکل گئے تو...!'' وہ بے حد فکر مند ہو رہی تھی۔

''یا میرے اللہ! میرے ویر کی خیر کرنا۔'' سدرہ نے دِل سے دُعا کی، ویسے فی الحال سرفراز نے حملے سے منع کر دیا ہے لیکن اگر آئندہ اُس نے عبداللہ بھائی کو سفر کے دوران ہی.... '' سدرہ کو جھرجھری آنے لگی۔

''اللہ نہ کرے!'' اُس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

''بی بی جی! وہ ابھی نکلے ہیں۔'' نذیراں نے اندر آ کر اطلاع دی۔

''اچھا!''

''اچھا ٹھیک ہے تم جاؤ۔'' سدرہ کا رُخ اب اپنی ماں کے کمرے کی جانب تھا۔

''کیا ہوا؟ خیریت تو ہے نا، تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟'' زلیخا بی بی سدرہ کا پیلا فق چہرہ دیکھ کر پریشان ہو گئیں، سدرہ اُن کے کندھے سے لگ کر ایک دَم پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور ساتھ ہی ساری بات کہہ سنائی۔

''یا میرے اللہ!'' زلیخا بی بی کا وجود اپنی جگہ سُن ہو کر رہ گیا۔ لالچ وہ بلا ہے، جو دُکھ سُکھ اور سانجھ کا ہر رشتہ کھا جاتی ہے۔ حرص وہ دیمک ہے، جو انسان میں سے انسانیت کو کھا جاتی ہے اور پیچھے بس حیوانیت باقی رہتی ہے اور حیوان تو ہوتا ہی شیطان کے قریب ہے، سید سرفراز کا لالچ اور حرص بھی اُسے شیطان کا روپ دے گئے تھے۔

''اماں جان! کچھ کریں، بھائی کی جان کو مسلسل خطرہ ہے۔''

''سدرہ بیٹی! تم ٹھیک کہتی ہو اب مجھے کچھ کرنا ہی ہوگا اور وہ کرنا ہوگا، جو مجھے بہت شروع میں کرنا چاہیے تھا۔'' زلیخا بی بی کا لہجہ بے حد سرد تھا۔

''آپ... آپ کیا کریں گی؟'' سدرہ نے اپنی سُرخ آنکھوں کو چادر سے رگڑتے ہوئے کہا۔

''میں اب بٹوارہ کروں گی، بڑی اولاد اور چھوٹی اولاد کے درمیان حویلیاں اور زمین برابر تقسیم ہوں گی اور میری زمین صرف اور صرف میرے بیٹے اور بیٹیوں کے نام ہے، سرفراز نے میری نرمی کا ناجائز فائدہ اُٹھایا ہے زمین اور حکم رانی کے نشے میں وہ میرے ہی بچے کا دشمن ہو گیا وہ یہ بھول گیا کہ اصل مالک صرف اور صرف عبداللہ ہے۔ زمینوں کی معاملات کی دیکھ بھال کرنے سے کوئی اُس کا مالک کیسے بن سکتا ہے؟ میرے بچے کو خدانخواستہ ایک خراش بھی آئی تو سرفراز کو اُس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔'' زلیخا بی بی شیرنی کی طرح بپھری ہوئی تھیں ایک عورت بے شک کمزور ہو سکتی ہے لیکن ایک ماں ہرگز کمزور نہیں ہوتی۔

''اگر میرے بچے کو کچھ ہوا تو سید سرفراز علی... تم کو ایک دھیلا نہیں ملے گا!'' زلیخا بی بی کا لہجہ ہی نہیں پورا وجود جل رہا تھا۔

''بشیراں کو کہو گاڑی تیار کروائے کہ بڑی بی بی اپنے بھائی کے ہاں جائیں گی۔'' زلیخا بی بی نے سدرہ سے کہا، زلیخا بی بی کے اپنے تو کوئی بھائی نہ تھے، سات عدد چچازاد تھے، زلیخا بی بی کے بابا نے اُن سب کی پرورش کی تھی۔ زلیخا بی بی کو وہ اپنی سگی بہن مانتے تھے۔

''سرفراز! میں سات بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں۔ میرے باپ سے اُن کی اتنی شدید محبت تھی کہ وہ میرے لیے اپنی جان تک قربان کر سکتے ہیں۔ میں عبداللہ کے گرد اللہ اور اُس کے رسولؐ کے بعد اپنے بھائیوں کی ایک ایسی مضبوط دیوار بنا دوں گی کہ تم کبھی میرے بچے کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکو گے۔'' زلیخا بی بی نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے سوچا اُن کے چہرے پر بے حد تاسف بکھرا ہوا تھا۔

''جس بچے کو انہوں نے ہمیشہ اپنے بیٹے کی طرح جانا، وہ جسے انہوں نے اپنے ہاتھوں سے لقمے کھلا کر بڑا کیا تھا، اُن کی گود میں سوتا تھا آج لالچ و حرص میں آ کر اُن کی گود اُجاڑنے کے درپہ تھا۔'' زلیخا بی بی کی آنکھوں سے دو آنسو بے اختیار ٹپکے۔

"جب جب اعتبار ٹوٹتے ہیں تب تب وہ دنیا بھی تو ٹوٹ جاتی ہے جو کسی پر اعتبار کر کے آپ بناتے ہیں۔" زلیخا بی بی کے دِل کی دنیا میں ہلچل مچی تھی۔

"سرفراز! تم اگر منہ سے مانگ لیتے تو کیا تمہاری چھوٹی ماں تم کو زمین نہ دیتی، کاش تم میرا اعتبار توڑنے سے پہلے مجھ پر اعتبار کر لیتے۔" زلیخا بی بی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔

"اللہ سوہنے میرے عبداللہ کی حفاظت کرنا۔" انہوں نے بے اختیار دُعا کی۔

❖❖○❖❖

تمام عمر تمہیں زندگی کا پیار ملے
خدا کرے یہ خوشی تم کو بار بار ملے
کھلے رہیں یہ سدا پھول تیری راہوں میں
قدم قدم پر تجھے موسم بہار ملے

یہ کارڈ چاند نے زبیدہ کو اُس کی اٹھارہویں سالگرہ پر دیا تھا۔ کس قدر وہ اُس کا خیال کرتا تھا اُس کا بہترین دوست تھا۔ اب اُس کی آنکھوں میں ہر وقت نفرت کی لہریں اُٹھتی تھیں، زبیدہ جو سید سرفراز کی بے وفائی سے پہلے ہی ٹوٹ چکی تھی ایسے میں چاند کی سرد مہری اُسے مزید توڑ رہی تھی۔ وہ جہاں جاتی وہ وہاں سے اُٹھ جاتا، اگر تائی جی اُسے مجبور کر کے کھانے کی میز تک لے آتیں تو چاند کسی نہ کسی بہانے فوراً وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوتا۔ وہ زبیدہ سے یوں کتراتا، جیسے وہ اُس کا چہرہ نہ دیکھنا چاہتا ہو۔

"اگر میرا بچپن کا ساتھی، میرا دوست مجھ سے اِس قدر نفرت کر سکتا ہے تو اِس کا مطلب ہے کہ جس کسی کو میرے حالات پتا چلیں گے وہ مجھ سے نفرت کرے گا۔ میں نے کام ہی قابلِ نفرت کیا ہے! لیکن میں نے تو صرف محبت کی تھی، جو لوگ زندگی کے معاملات میں حد توڑتے ہیں وہ ہی باغی ہوتے ہیں وہ ہی نہ ماننے والے، وہی منکر ہوتے ہیں اور سزا تو منکروں کو ہی ملتی ہے۔"

ہر چیز کی حد ہوتی ہے، ہر بات کا ایک دائرہ ہوتا ہے اور دائرے سے نکلی ہوئی بات اُس خراب پینٹنگ کی طرح لگتی ہے جس کا رنگ باہر نکل آیا ہو۔

"میرے اللہ! کس قدر مشکل احساس ہے ایک ناپاکیزگی کا احساس! میں نے محبت کے نام پر دھوکا کھایا میں نے یقین کی حد پار کر دی میں، میں گناہ گار ہوں!" زبیدہ فرسٹریشن کی حدود کراس کر رہی تھی، سوچوں اور پچھتاووں نے اُسے ادھ موا کر دیا تھا۔

رات میں سوتے ہوئے جو خواب اُسے رنگین دنیا میں لے جاتے تھے اب اُن خوابوں کا ہیرو ایک دم بھیانک شکل والا وِلن بن گیا تھا۔ اُس کی ڈراؤنی شکل اُسے سوتے جاگتے، جب جب یاد آتی وہ بُری طرح ڈر جاتی تھی۔

وہ سید سرفراز کا لمس! اب یوں لگتا تھا کہ اُس کے جسم پر ہر وقت ناگ سرسراتے رہتے ہیں، سانپوں کے سرسرانے کے تصور سے اُسے کراہیت آنے لگی، اپنا آپ اُسے بے حد گندا لگا کرتا تھا۔

"زبیدہ! زبیدہ بیٹے!" تائی امی اُسے ڈھونڈتی ہوئی اُس کے کمرے میں داخل ہوئیں، وہ کمرے میں نہ تھی۔

"زبیدہ!" انہوں نے اُسے دوبارہ آواز دی۔

"شاید غسل خانے میں ہے۔" انہوں نے غسل خانے میں چلتے ہوئے پانی کی آواز سُن کر سوچا۔

"زبیدہ!" انہوں نے باتھ روم کے کھلے دروازے سے جھانک کر اُسے پکارا۔ وہ یوں کھڑی تھی جیسے اُس نے اُن کی آواز سنی ہی نہ ہو، وہ بہت مگن انداز میں مسلسل صابن مل مل کر ہاتھ دھو رہی تھی۔

تائی امی نے جب کافی دیر سے اُسے فارغ نہ ہوتے دیکھا تو وہ آگے بڑھیں۔

"بیٹا کیا لگ گیا ہے ہاتھوں پر جو مسلسل دھوئے جا رہی ہو۔" تائی امی نے اُس کے غیر معمولی تاثرات والے چہرے کو دیکھ کر پوچھا۔ جب کہ زبیدہ اپنے کام میں مسلسل مگن تھی۔ اُس نے صابن سے ہاتھ دھو دھو کر صابن تقریباً ختم کر دیا تھا۔

"زبیدہ! میں تم سے بات کر رہی ہوں بیٹا! کیا ہوا ہے جو ہاتھ دھوئے جا رہی ہو۔"

"تائی امی! میرے ہاتھ گندے ہو گئے ہیں وہ دھو رہی تھی!" زبیدہ نے سرسراتی آواز میں کہا۔ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہ تھی۔ پھر وہ ایک دَم باتھ ٹب پر بیٹھ کر صابن اپنے جسم پر ملنے لگی۔

"ارے... ارے یہ کیا کر رہی ہو۔" تائی امی نے پریشانی سے پوچھا۔

"گندگی صاف کر رہی ہوں، میرے ہاتھوں کے ساتھ ساتھ میرا وجود بھی گندا ہو گیا ہے۔" زبیدہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"زبیدہ! تمہارا دماغ ٹھیک ہے، اُٹھو بیمار پڑنا ہے کیا؟" تائی امی نے اُسے گھسیٹ کر اُٹھانا چاہا۔

"نہیں، نہیں! مجھے گند اُتارنے دو۔" زبیدہ نے اصرار کیا۔

دماغ خراب ہو گیا ہے زبیدہ! کہاں لگی ہے گندگی اور کیسے لگ گئی گندگی؟" تائی امی نے زبیدہ کو ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔

"دماغ نہیں، قسمت خراب ہو گئی ہے تائی امی!" زبیدہ ایک دَم صابن لگے ہاتھوں کو منہ پر رکھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

تائی امی کی جھنجلاہٹ گہرے تفکر میں بدل گئی۔

"زبیدہ بیٹا کیا ہوا؟ اللہ نہ کرے تمہاری قسمت خراب ہو۔" تائی امی کا لہجہ رُندھ گیا۔ بیوگی کی کرب اک زندگی گزارتے وہ بے حد کمزور دل اور کمزور اعصاب کی مالک ہو گئی تھیں۔

"تائی امی! سب کچھ برباد ہو گیا! سب کچھ گندا ہو گیا!" زبیدہ نے شاور کے نیچے کھڑے ہو کر پانی کھول دیا، خود تو وہ جو بھیگ رہی ہی تھی دروازے میں کھڑی تائی امی کو بھی بھگو دیا۔

تائی امی پر سے تو جیسے ٹرین گزر گئی تھی، زبیدہ کے جملے عام سے جملے ہرگز نہ تھے وہ اِن جملوں کے جو معنی جو سمجھ رہی تھیں اللہ نہ کرے اُس کے معنی وہ ہوں۔" انہوں نے دھڑکتے دِل سے زبیدہ کو دیکھا۔

"زبیدہ! کیا، کیا ہے تم نے۔" اُن کا لہجہ سرسراہا تھا۔ وہ اُسے گھسیٹ کر باہر لے آئیں۔

"میں! میں گناہ گار ہوں۔" زبیدہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"میرا پورا وجود گندا ہو گیا ہے۔"

"زبیدہ ٹھیک سے بولو، میرا دِل تو بیٹھا جا رہا ہے۔" تائی امی نے اُس کا رخ اپنی جانب کرتے ہوئے

پوچھا۔

''تائی امی! میں... مجھ سے، محبت کے دھوکے میں بہت بڑی بھول ہوگئی اب... اب آپ کی زبیدہ پہلے جیسی پاکیزہ نہیں رہی!'' ساتھ ہی زبیدہ پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

زبیدہ کا جملہ کسی بلڈوزر کی طرح کچلتا ہوا تائی امی کے پورے وجود کو تہس نہس کر گیا۔

''نہیں...!'' باتھ روم میں ان کی چیخ گونجی۔

تائی امی کی شدتِ دُکھ سے آنکھیں پھٹی جارہی تھیں۔

''کہیں پہ نگاہیں کہیں پہ نشانہ!'' ٹی ٹو، ولی کے پاس آکر گنگنایا۔

''مطلب؟'' ولی نے فشنگ وائر سے ایک ہورڈنگ کو دیوار سے لٹکاتے ہوئے پوچھا۔

''مطلب صاف ظاہر ہے، روبن نیل کی طرح شفاف چمک دار کہ جناب کو کسی کا انتظار ہے تب ہی تو ی دیوار کے ساتھ صمد بانڈ کی طرح چپک گئی ہیں اور ہر آنے والی لڑکی کو یوں دیکھتے ہیں جیسے چاکلیٹ کے بجائے ڈسپرین کی گولی منہ میں آگئی ہو۔''

''یار کیا بکواس ہے!'' ولی بے ساختہ مسکرایا۔

''تمہاری بے تکی باتوں کا میرے پاس تو کوئی جواب نہیں ہے البتہ تم ڈیزائن کی تھیوری پڑھ پڑھ کر اب پروڈکٹ یاد کر کے بیٹھے ہو۔''

''ارے چھوڑیئے، اس بڑھاپے میں بوڑھے طوطے آخر کیا پڑھیں گے۔ رٹا لگا لگا کر دماغ پولا (پلپلا) ہوگیا ہے۔'' ٹی ٹو نے ہاتھ میں پکڑا ہوا برگر کھاتے ہوئے کہا۔

''لگ رہا ہے کہ تمہارا دماغ کس قدر پولا ہو چکا ہے، یار کبھی تمہارا پیٹ کھا کھا کر پولا نہیں ہوتا۔'' ی واقعی حیران ہوتا تھا کہ ٹی ٹو اتنا کھا کیسے لیتا ہے۔

''جب مجھے شدید ٹینشن ہوتی ہے تو میں کھانا کھا کر اپنی ٹینشن دور کرتا ہوں، لیکن آپ یہ سب باتیں وڑیں اور اصل بات بتائیں کہ آج آپ کو کس کا انتظار ہے؟'' ٹی ٹو گھوم پھر کر واپس اصل موضوع پر آگیا تھا۔

''ارے نہیں! تم کو یہ کس نے کہہ دیا۔'' ولی نے صاف مکرتے ہوئے کہا۔

''تمہاری آنکھوں نے یار! اب تم مجھ سے چھپاؤ گے تو میں باقاعدہ ناراض ہو جاؤں گا۔'' ٹی ٹو نے منہ پھلا کر کہا۔

''اچھا وہ آئے گی تو خود دیکھ لینا۔'' ولی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بلے او بلے! تو ہمارے پرنس کو بھی وہ مرض لگ ہی گیا، جس سے وہ ساری عمر پرہیز کرتے رہے، گر وہ ہے کون؟ کیا وہی ڈیئر کزن، جس کا نام سن کر بے چاری مسکان مرنے کے قریب پہنچ گئی تھی۔'' ٹو نے مذاق، مذاق میں ولی کو کچھ احساس دلانے کی کوشش کی۔

''یہاں مُسکان کا کیا ذکر؟'' ولی کی مسکراہٹ ایک دم غائب ہوگئی۔

''کیا تمہارے انکار سے حقیقت بدل جائے گی؟ تم نے تو اُس معصوم لڑکی کو مڑ کر بھی نہ پوچھا۔'' ٹی ٹو

کوسائرہ نے ساری بات بتادی تھی۔

''اُس معصوم لڑکی کو میں نے نہیں کہا تھا کہ مجھ سے محبت کرے۔'' ولی نے اپنا ماتھا مسل کر کہا۔ نا چاہتے ہوئے بھی مسکان کے نام سے، اُس کے ذکر پہ بے چین ہو جاتا تھا۔

''تمہیں نہیں لگتا کہ تم کچھ زیادہ روڈ ہو رہے ہو۔'' ٹی ٹو نے سنجیدگی سے کہا۔

''میں روڈ نہیں ہو رہا، میں تو... میں تو یار! کیا مصیبت ہے، بنا کسی قصور کے سب مجھے ہی قصور وار ٹھہرانے لگے ہیں۔ ٹھیک ہے وہ بہت اچھی لڑکی ہے لیکن میں اُس کے لیے کسی دوسری قسم کی سوچ نہیں رکھتا۔'' ولی کا موڈ ایک دم پھر خراب ہو گیا۔

''کیا تم نہیں جانتے کہ دِلوں کے سودے زبردستی کے مول نہیں ملتے۔ پھر یہ کوئی ایک آدھ دن کی بات تو نہیں تھی ساری زندگی کا مسئلہ تھا، تم پلیز مجھے آئندہ اِس مسئلے میں شامل نہ کرنا۔'' ولی اسٹول سے اُتر کر تیزی سے باہر نکلا اور سامنے کسی سے بُری طرح ٹکرا گیا۔

''یا وحشت! کیا آنکھیں نہیں ہیں۔'' ولی خلاف مزاج بولا، لیکن سامنے موجود شخصیت کو دیکھ کر اُس کی ساری کوفت اُڑن چھو ہو گئی، دِل میں مسکان والے قصّے کی وجہ سے جو کڑی دھوپ جیسا موسم تھا، اُس پر بڑی ٹھنڈی میٹھی پھوار پڑی تھی اور ولی کے لب خود بہ خود مسکرائے تھے۔

''آپ؟'' ولی نے اپنی مسکراہٹ دبا کر کہا۔

''آپ ہی نے تو یہاں آنے کی دعوت دی تھی۔'' علیزے نے دھیمی سی مسکان کے ساتھ جواب دیا۔ وہ کچھ بوکھلائی ہوئی تھی، جس لڑکی نے ساری عمر کو ایجوکیشن کی شکل نہ دیکھی تھی وہ ایک دم سے ایسے بے باک ماحول کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی، جہاں لڑکے لڑکیاں اکٹھے بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔

یہ تو کوئی اور ہی دنیا تھی، خود اعتمادی اور بولڈنیس یہاں کے طالب علموں کا خاصا تھی۔ ایسے میں ذرا لم وژن والا بندہ اپنے آپ کو بُدھو ہی تصور کرتا تھا۔ علیزے کی سفید رنگت بے حد سرخ ہو رہی تھی اور وہ جب جب گھبراتی یا شرمندہ ہوتی اُس کے چہرے کی رنگت ایک دم سے بدل جاتی تھی۔

''آیئے اندر آیئے میں آپ کو اپنا کام دکھاؤں۔'' ولی نے اُس کو دِل چسپی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

یہ دِل! یہ دِل انسان کو کہاں کہاں نہیں خوار کرتا، ولی جیسا جینئس انسان کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اُسے اتنی سادہ اور عام سی لڑکی بھا جائے گی، جو یوں کو ایجوکیشن والے ادارے میں پہنچ کر بوکھلا جائے گی جیسے کسی اور سیارے میں آ گئی ہو۔

''تم جو بڑے بڑے جینئس قسم کے جنوں کو کچھ نہیں سمجھتے، تمہاری ہونے والی شریکِ زندگی میں تو خود اعتمادی اتنی سی ہے کہ یہاں آتے آتے اُس کا سانس پھولا ہوا ہے۔'' ولی نے علیزے کو دیکھتے ہوئے سوچا، جو ڈری ہوئی ہرنی کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔

''یہ واقعی آپ نے بنایا ہے اتنا کچھ!'' حُسن حیرت سے پوچھتے قیامت لگ رہا تھا۔

''آپ کو کیا لگتا ہے؟'' ولی نے اُس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔ اُونچے لمبے ولی کے سامنے وہ گڑیا سی لگ رہی تھی۔

''آپ تو اتنے چھوٹے سے ہیں، یقین نہیں آتا کہ یہ کام آپ نے خود کیا ہوگا۔'' علیزے نے معصومیت سے جواب دیا۔

''چھوٹا سا ہوں! مطلب؟'' ولی نے حیرت سے پوچھا۔

''میرا مطلب ہے آپ تو کم عمر ہیں یہ تو کسی میچور اور بڑی عمر کے آرٹسٹ کا کام لگتا ہے۔'' علیزے نے آٹھ نو فٹ بلند ایک بڑے سے اسکیچر کو دیکھتے ہوئے کہا، جسے ولی نے بڑی بڑی سنگل نما زنجیروں سے باندھ کر چھت کے ساتھ لٹکایا تھا۔ یہ مجسمہ تھری ڈی بنایا گیا تھا ہومین والکینس ٹاپک تھا اور یہ بے حد شان دار تھا۔

''اچھا کام کرنے کے لیے کسی کا بڑی عمر کا ہونا شرط نہیں ہوتا، اس کے لیے اندر سے کری ایٹو ہونا اور لگن رکھنا ضروری ہے۔'' ولی نے دھیرے سے جواب دیا۔

''لیکن اتنا پرفیکٹ کام واقعی حیران کر رہا ہے۔'' علیزے نے تعریفی نگاہوں سے بڑے سے ہال کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں ہمیشہ کوشش کرتا ہوں کہ کوئی بھی کام کروں اُسے پرفیکٹ کروں۔'' ولی نے کسی قدر شدت سے جواب دیا۔

''کبھی کبھی انسان کو سب کچھ پرفیکٹ نہیں بھی ملتا۔'' علیزے نے بہت گہری بات کی، ولی کے چلتے ہوئے قدم رُک گئے۔

''آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں، میں نے آپ سے یہ نہیں کہا کہ میں ہمیشہ پرفیکٹ چیز کی ڈیمانڈ کرتا ہوں۔ میں نے تو آپ سے یہ کہا ہے کہ میں پرفیکٹ کام کرنے کی کوشش کرتا ہوں آپ اندازہ لگانے میں جلدی نہ کیا کریں۔''

''سوری! آپ کو میری بات بُری لگی۔''

''نہیں ایسا نہیں ہے، لیکن مجھے آپ کی جلد بازی بُری لگی ہے۔ آپ رائے بہت جلد بنا لیتی ہیں۔''

''مطلب؟'' علیزے نے پہلی بار ولی کو باقاعدہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ آپ جس طرح پہلے مجھ سے ناراض ہوئی تھیں کیا وہ انصاف تھا۔''

''لیکن اُس سب کی وجہ تو آپ ہی بنے تھے نا! نہ آپ اتنے سارے پیسے لے کر آتے نہ یہ جھگڑا پیدا ہوتا۔'' علیزے نے صاف گوئی سے کہا۔

''دیکھو ڈیئر کزن! میں اپنے والدین کے حکم سے آیا تھا، وہ برسوں سے اپنی بہن کو کچھ نہ کچھ تحفے کے طور پر دیتے آئے ہیں یہ کوئی صدقہ خیرات نہیں ہوتا، جس پر بُرا مانا جائے۔ صدقہ خیرات کے لیے اور کافی مستحق لوگ موجود ہیں۔''

''ولی صاحب! تحفہ برابر کا ہوتا ہے، تحفہ وہ ہی قبول کیا جاتا ہے، جتنا انسان لوٹا سکے۔'' علیزے نے بے دبے غصّے سے جواب دیا۔

''تحفہ بدلہ لینے کے لیے نہیں دیا جاتا۔'' ولی نے کہا۔

''اگر یہ صدقہ خیرات نہیں ہے تو رشتے داری میں لین دین برابر کا ہو تو بات آگے چلتی ہے۔''

''کیا کوئی اپنے غریب بہن بھائی کی مدد نہیں کر سکتا... اُس کو وہ رقم تحفے کے طور پر نہیں دے سکتا تاکہ

اُسے شرمندگی نہ ہو۔'' ولی کو علیزے کو رام کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

''دے لیکن وہاں، جہاں ساری عمر کا مسئلہ ہو، وہاں دینے سے گریز کرنا چاہیے۔'' علیزے پھولے پھولے منہ کے ساتھ کہا۔

''مطلب؟ ولی نے نا سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''مطلب آپ نہیں جانتے میرے ابو اِس باہر سے آنے والی امداد کی وجہ سے بالکل لاپروا ہو چکے ہیں۔ وہ محنت نہیں کرتے بس جو لگی بندھی تنخواہ آتی ہے وہ ہی برسوں سے چل رہی ہے۔ اگر انکل اسد یوں ہر سال چھ ماہ بعد لاکھ ڈیڑھ لاکھ نہ دیا کرتے تو شاید ابو کی سدا کی کاہلی ختم ہو جاتی، نہ آپ اسپون فیڈنگ بند کرتے ہیں اور نہ ہی ہمارے گھر کے حالات سُدھرتے ہیں اور اپنے گھر کے بگڑے ہوئے حالات دیکھ کر مجھے غصہ ہی آ گیا تھا۔'' علیزے نے نہایت صاف گوئی سے کہا۔

ولی نے بہت غور سے اُسے دیکھا، ایسے ہی تو تمہارا دِل اِس لڑکی کا حامی نہیں ہوا۔ اِس لڑکی میں خود اعتمادی نہ تھی تو کیا ہوا! She was the Girl with the values! اور صرف Values ہی ہوتی ہیں جو کسی معاشرے کو کسی گھر کو کھڑا رکھتی ہیں۔ ولی بھی اپنی شریکِ زندگی کو اتنا ہی خود دار دیکھنا چاہتا تھا اور وہ اتنی ہی سچی ہونی چاہیے تھی جو بلا خوف اپنے اور اپنے اِرد گرد کے متعلق سچ بول سکتی ہو۔

''ٹھیک ہے علیزے! آپ درست کہہ رہی ہیں۔'' ولی نے اُسے بے حد غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ایک دیوار گیر میورل کے پاس کھڑے تھے۔

''آپ اِس کو غور سے دیکھیں، میں چاہتا ہوں کہ اِس کو آپ جانیں کہ یہ میورل کیا کہہ رہا ہے؟'' ولی نے لہجے کے ساتھ ایک دم ٹاپک بھی بدل دیا۔

علیزے نے اُس کے کہنے پر بہ غور اُس میورل کو دیکھا اور پھر ایک دم سے چونک گئی۔

''یہ... یہ تو میں ہوں!'' علیزے کی حیرت ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔

''لیکن آپ نے یہ زبانی کیسے بنالی؟'' علیزے نے حیرت سے پوچھا۔

''جن کی تصویر دِل میں موجود ہو انہیں کاغذ پر اُتارنا مشکل نہیں ہوتا۔'' ولی اقرار کر رہا تھا۔

علیزے سے نگاہ اُٹھانا مشکل ہو گیا تھا۔

''علیزے! میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں بھی کبھی دِل کا تابع دار ہو جاؤں گا۔ لیکن یہ سچ ہے کہ تم نے اِس دِل کو جو سب کے لیے غیر مفتوحہ قلعہ رہا، فتح کر لیا ہے۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اپنی زندگی کے آنے والے سال تمہارے ساتھ جینا چاہتا ہوں۔'' ولی نے بے حد دھیمی آواز میں کہا۔ اِرد گرد بہت سے لوگ نمائش دیکھ رہے تھے لیکن ولی کو کسی کا کوئی ڈر خوف نہ تھا۔

''جی!!'' علیزے نے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ حیرت سے پوچھا۔

''حیران بعد میں ہو لینا، پہلے میرے سوال کا جواب دو...'' ولی نے اُس سے کچھ ڈپٹ کر کہا۔

''میں... میں بھلا خود سے کیسے کوئی فیصلہ کر سکتی ہوں۔'' علیزے نے دھڑ دھڑ کرتے دِل کے ساتھ جواب دیا۔ وہ جو آسمان کا چاند تھا، اُس کی جھولی میں گرنے کو بے تاب تھا۔ علیزے کو اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''مجھے تم سے پہلے ہاں سننا ہے، پھر میں امّاں جان کو تمہارے گھر بھیجوں گا۔'' ولی نے اُس کو بہ غور دیکھا، علیزے کو بولنا مشکل ہو رہا تھا۔

''یہ میں نے تمہارے لیے لی ہے اگر تم اِس کو پہن لو گی تو میں تمہارا جواب ہاں میں سمجھوں گا۔'' ولی نے ایک خوب صورت سی گولڈ کی پائل اُس کے سامنے کی۔

''یہ... یہ کیا ہے؟'' علیزے نے بے حد حیرت سے اُس گولڈ کی خوب صورت پائل کو دیکھا۔

''یہ میں نے بہت برس پہلے سنگاپور سے خریدی تھی۔ یہ مجھے بے حد یونیک لگی تھی ظاہر ہے یہ میں نے امّاں یا بہنوں کے لیے نہیں خریدی تھی، جس طرح کی یہ یونیک سی تھی میرے خیال میں آیا تھا کہ میں اسے اپنی زندگی میں آنے والی اہم شخصیت کو دوں گا۔ اور تم ہی ہو وہ، جو میرے تصور پر پوری اُترتی ہو اور یہ تمہارے ہی لیے ہے۔'' ولی نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر پائل اُسے تھمادی، ڈیڑھ دو انچ چوڑی یہ پائل بے حد بھاری تھی۔

''یہ... اِس قدر قیمتی چیز میں کیسے لے سکتی ہوں۔'' علیزے نے بوکھلا کر کہا۔

''اِس لیے کہ مجھے تمہارا جواب ہاں میں سننا ہے۔'' ولی نے شوخی سے کہا۔

''نہیں! میں یہ نہیں لے سکتی۔'' علیزے کے ایک دم کہنے سے ولی کے چہرے پر سایہ لہرا گیا۔

''تو تمہیں میں نہیں پسند!'' ولی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''نہیں! میں نے ایسا تو نہیں کہا۔'' علیزے نے ایک دم پریشان ہو کر کہا۔

''تو پھر بتاؤ، تم کیا چاہتی ہو؟''

''نہیں! آپ تو مجھے پسند ہیں لیکن میری ہاں کے ساتھ یہ تحفہ مشروط نہ کریں، میں یہ تحفہ تب ہی پہنوں گی، جب میں اِس کی باقاعدہ حق دار ہو جاؤں گی۔'' علیزے نے نگاہیں جھکائے جھکائے کہا۔

''تو پھر ٹھیک ہے آپ اِس کو میری امانت جان کر رکھ لیں اور جب آپ اِس کی حق دار بن جائیں تب پہن کر مجھے دکھا دیجیے گا۔'' ولی نے ہاتھ پیچھے کر کے پائل لینے سے انکار کر دیا۔

''اچھی زبردستی ہے!'' علیزے نے پریشان ہو کر کہا۔

''صرف آپ سے۔'' ولی نے بے ساختہ کہا، علیزے بھی ایک دم مسکرا دی۔

''تو پھر میں امّاں کو بھیجوں؟'' ولی نے اُسے بہ غور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہوں!'' علیزے نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا۔

''اچھا اب میں چلتی ہوں۔'' اُس نے ایک دم کہا۔

''لیکن آپ جائیں گی کیسے؟'' ولی نے فکر مندی سے پوچھا۔

''جیسے آئی تھی، میری کولیگ کی کزن بھی یہاں پڑھتی ہے وہ بھی اُس کا کام دیکھنے آئی ہے میں بھی اُس کے ساتھ ہی آئی تھی اب اُس کے ساتھ ہی جاؤں گی، اُس کی کزن کا کام تو کالج میں داخل ہوتے ہی سامنے کوریڈور میں لگا ہوا ہے، وہ میرا وہیں انتظار کر رہی ہوگی۔''

''چلیے میں آپ کو وہاں تک چھوڑ آتا ہوں۔'' ولی نے اُس سے کہا۔

''ٹی ٹو میں ابھی آتا ہوں۔'' ولی نے کچھ فاصلے پر بیٹھے ٹی ٹو سے کہا، جو اتنی دیر سے مسلسل اُسے

خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''تم ذرا اپنی ڈیئر کزن کو چھوڑ آؤ تو کرتا ہوں تمہارا حساب کتاب، حد ہوگئی یعنی کہ اپنے فاسٹ فرینڈ سے بھی اتنی پردے داری، بالا ہی بالا اُس خاتون سے باتیں کی جارہی تھیں اور تو اور اُسے تم نے جیب سے نکال کر کچھ دیا بھی تھا۔'' ٹی ٹو نے لڑاکا عورتوں کی طرح کہا تو ولی بے ساختہ ہنس پڑا۔

''توبہ ہے اگر اتنے غور سے سُن اور دیکھ رہے تھے تو پاس آجاتے۔''

''کیوں! میں، کیوں بن بلائی ہڈی بنتا۔'' ٹی ٹو منہ پھلا کر بولا۔

''تو تم مانتے ہونا کہ اُس وقت تم وہاں صرف ہڈی ہی بن سکتے تھے۔'' ولی نے شرارت سے کہا۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے، کرلو باتیں!'' ٹی ٹو نے منہ پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

''کم آن یار! میں نے کون سا تم سے چوری چوری شادی کر ڈالی۔ تمہارے بغیر میں کوئی کام نہیں کروں گا پکا وعدہ، اب تم یہ پھولا ہوا منہ سیدھا کرو میں ابھی آتا ہوں۔'' ولی کہہ کر تیزی سے علیزے کی جانب بڑھا، جو بڑی سی کالی چادر میں لپٹی کھڑی تھی۔ اُس کا دمکتا ہوا خوب صورت چہرہ کالی چادر میں چاند کی طرح لگ رہا تھا۔

''کم بخت نے چُن کر بے حد خوب صورت لڑکی کا انتخاب کیا ہے، کیا کمال لڑکی ہے! میں نے یہ تو سنا تھا کہ پیسا، پیسے کو کھینچتا ہے لیکن یہاں تو خوب صورتی نے خوب صورتی کو کھینچا ہے۔ ولی کیا کم تھا، جو یہ حسینہ بھی اُس کی زندگی میں آگئی۔ واہ مولا! واقعی سچ ہے کہ صبر والے کو پھل میٹھا ملتا ہے، ہم جیسے بے صبروں کو کہاں ایسا میٹھا پھل ملتا تھا۔ ولی نے تو واقعی بڑے صبر کے ساتھ اِس قدر خاصے کی چیز حاصل کرلی ہے۔'' ٹی ٹو مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔

''واقعی یار ولی! تم نے کیا قسمت پائی ہے ایک وہ مسکان تھی، جو بے حد خوب صورت تھی اور اب یہ ہے، تم کو تو ہمیشہ اللہ نے صرف نوازا ہی نواز ہے!''

❖❖○❖❖

''مسکان کی خواہش اِس بار لاحاصل خواہش تھی۔ وہ دو دِن سے بے سُدھ پڑی تھی، جیسے جینے کی تمنا ختم کرچکی ہو۔ سید سرفراز نے بس ایک بار مسکان کو دیکھا تھا۔ اُن کو یوں لگتا تھا کہ مسکان کی یہ حالت دیکھ کر وہ بے حد کمزور پڑجائیں گے۔

''بابا سائیں! آپی کو کیا ہوا؟'' بلال نے بے حد معصومیت سے سوال کیا۔ آج وہ کچھ ہوش میں تھا ورنہ وہ جس مشکل میں تھا اور جس طرح کے روگ میں مبتلا تھا وہ اُسے اِردگرد کا ہوش کہاں لینے دیتا تھا۔

''ہوں...'' سید سرفراز علی نے چونک کر اُسے دیکھا۔

کبھی بلال کی رنگت سُرخ و سفید ہوا کرتی تھی، اب جب سے اُسے بجلی کے جھٹکے دیے جانے لگے تھے اُس کا رنگ گندمی رنگ میں بدل گیا تھا شیو بڑھی ہوئی تھی اور کسرتی بدن روز بروز کمزور ہوتا جارہا تھا۔ سید سرفراز علی نے پہلی بار شاید بلال کو اتنے غور سے دیکھا تھا۔

''تجھے کبھی اولاد کا سکھ نصیب نہ ہو! تُو نے مجھے اور میری اولاد کو جو روگ لگایا ہے، وہ تیرے آگے آئے!'' سید سرفراز علی کے کانوں میں ایک بھولی بھٹکی آواز گونجی، اُس وقت تو اُس نے اُس آواز کی رتّی

بھر پرواہ نہ کی تھی۔ آج جانے کیوں اُن کو یہ آواز کسی بھوت کی طرح اپنا پیچھا کرتی محسوس ہورہی تھی۔

''بابا سائیں!'' بلال نے اُن کو دوبارہ پُکارا تو وہ ایک دم چونکے۔

''نہیں! میں سب کچھ غلط کرسکتا ہوں، میری اولاد کو ہر خوشی ملے گی، مسکان کی ایک بار سید اظہر علی کے ساتھ شادی ہوگئی تو وہ سب کچھ بھول جائے گی، سید اظہر علی دولت و طاقت میں مجھ سے دُگنا ہے وہ مسکان کو مجھ سے زیادہ خوش رکھے گا۔'' سید سرفراز علی ایک بار پھر سوچ کے مطابق سوچ رہے تھے۔

''بابا سائیں آپی کو کیا ہوا ہے؟'' بلال کی سوئی ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔

''کچھ نہیں ہوا، تم کیوں اتنا پریشان ہورہے ہو؟''

''وہ ہی تو ہیں جو میری ہر بات کا اعتبار کرتی ہیں، میں جب جب اُن کو بتاتا ہوں کہ میں ٹھیک نہیں ہوں میرے اندر آگ سی لگی ہے تو وہ میرے لیے فکر مند ہوتی ہیں۔'' صرف مسکان تھی جو بلال کی تکلیف کو وہم کے زمرے میں نہ لاتی تھی۔

''اُسے کچھ نہیں ہوا اور نہ ہی تمہارے بابا سائیں اُسے کچھ ہونے دیں گے، تم بالکل بے فکر رہو۔'' سید سرفراز علی نے بلال کو دِلاسا دیا اور خود موبائل پر کسی کا نمبر ملایا۔

''السلام علیکم بھائی اظہر! ہاں، ہاں! بالکل خیریت ہے، میں نے پہلے بھی انکار نہ کیا تھا۔ ٹھیک ہے نکاح اِس جمعے کو کرلیتے ہیں رخصتی کچھ عرصے بعد دھوم دھڑکے سے کرلیں گے۔ پھر آپ تیاری کریں پرسوں پہلے آپ کا اور مسکان کا نکاح ہوگا اور ہفتے کو بلال اور مدثرہ بیٹی کا نکاح ہوگا۔'' سید سرفراز علی نے کھڑے کھڑے سارے پروگرام طے کرلیے۔ وہ اِس وقت خود کو خدا سمجھتے ہوئے ہو طرح کے فیصلے کیے جارہا تھا۔

''اب سب ٹھیک ہوجائے گا!'' انہوں نے فون بند کرکے سوچا۔ حالاں کہ یہ ایسا ''ٹھیک'' تھا جو ہر ٹھیک کو نہ ٹھیک کرنے جارہا تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اُن کی بیٹی کی تو سانسوں تک کا تعلق ولی سے جڑ چکا ہے۔

اگر وہ اُس کا تعلق ولی سے ختم کرنے جارہے تھے تو اِس کا مطلب تھا کہ وہ اُس کی سانسوں کو ختم کرنے جارہے تھے۔

❖❖○❖❖

''آج میں بہت خوش ہوں! کہیں میں خوشی سے مر ہی نہ جاؤں!'' حُسن آرا بیگم نے روشن آرا بیگم کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''بھائی صاحب کو تو اِس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں؟'' احمد شاہ نے انور میاں کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ارے مجھے کیوں اعتراض ہونے لگا!'' انور میاں کی تو باچھیں کھل رہی تھیں، ولی روشن آپا کی واحد اولادِ نرینہ تھی، سب کچھ ولی کو ملنا تھا اور ولی کو سب کچھ ملنے کا مطلب تھا کہ سب کچھ علیزے کا ہونے والا تھا اور علیزے تو اُن کی سب سے ہمدرد بیٹی تھی آخر وہ اپنے والدین کی مدد کیے بنا کیسے رہ سکتی تھی۔ انور میاں تو بہت دُور کی سوچ رہے تھے۔

''تو پھر ہم آج ہی علیزے کا شگن کرنا چاہ رہے ہیں، آج جمعے کا مبارک دن ہے، میں علیزے کو ا... ہی منگنی کی انگوٹھی پہنانا چاہ رہی ہوں۔'' روشن آرا بیگم نے علیزے کو بڑھ کر گلے لگایا، جو چھوئی ... ہوئے جا رہی تھی۔

''تو ٹھیک ہے! جیسا آپ کا دِل چاہے۔'' انور میاں نے فوراً حامی بھری۔

''آپا! میں کہہ رہی تھی کہ آپ ایک آدھ دِن رُک جاتیں، ہم بھی ولی کے لیے کچھ خرید لیتے'' حُسن آرا بیگم نے پریشان ہوکر انور میاں کو دیکھتے ہوئے روشن آرا سے کہا۔

''ارے سب کچھ ہوجائے گا، تم کیوں فکر کرتی ہو، تم بس تیار ہوکر ہال میں آجانا، میں علیزے کی خا... بھی تو لگتی ہوں اگر تمہیں علیزے کے دولہا کا کچھ خریدنا ہے تو مٹھائی، شگن کے طور پر میرا حق بنتا ہے ا... میں اپنی بھانجی کے لیے کچھ خریدوں۔'' روشن آرا بیگم نے ہر طرح سے اپنی بہن کی انا اور خرچے کو بچا... کی کوشش کی۔

''ہاں، ہاں! آپا بیگم بالکل درست کہہ رہی ہیں۔'' انور میاں نے ایک دم آگے بڑھ کر کہا۔

حسن آرا بیگم کے دِل میں جو تھا، وہ زبان تک آتے آتے رہ گیا۔ انہیں اور علیزے کو انور میاں رویّے سے بے حد شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔

''تو پھر ٹھیک ہے شام کو، نہیں! میرا خیال ہے رات نو بجے کا وقت رکھ لیتے ہیں، ابھی میں اپنے م... ملنے والوں کو مدعو کروں گی تو کوئی آئے گا نا۔ اگر بیچ کا وقت اتنا کم رکھیں گے تو لوگ آ نہیں سکیں گے۔ تم بھی اپنے ملنے والوں میں سے کسی کو کہنا چاہتی ہو تو کہہ دو۔'' روشن آرا بیگم بے حد پُرجوش تھیں۔

اُن کے لاڈلے بیٹے کی پہلی پہلی خوشی تھی۔ وہ ہر کام دھوم دھام سے کرنا چاہ رہی تھیں اُن کی خوشی اِس لیے بھی سوا تھی کیوں کہ علیزے اُن کی دِل پسند بہو بننے جا رہی تھی۔

''آپا اتنی جلدی کیسے سب کچھ ہوگا!'' حسن آرا بیگم بے حد بوکھلا گئی تھیں۔

''یہ تم بس مجھ پر چھوڑ دو، سب کے کپڑوں کی شاپنگ اُن ہی دو گھنٹوں میں ہوگی اور پی سی میں بکنگ کوئی مسئلہ نہیں، ولی کے بابا کے بہت اچھے دوست انتظامیہ میں ہیں۔ چلو تم لوگ تو ڈرائیور کے ساتھ فوراً شاپنگ پر نکلو۔'' روشن آرا بیگم نے نگی اور علیزے کو فوراً اُٹھایا۔

''یعنی کہ حد ہوگئی، ہم کیا پہنیں گے تینوں چھوٹے بچے لائن میں کھڑے تھے؟''

''تم لوگوں کے بھی بہترین کپڑے آئیں گے۔'' نگی نے پیار سے گڈو کا گال تھپکا۔

''چلیں بھابی؟'' نگی نے مسکرا کر علیزے کو دیکھا۔

علیزے لفظ بھابی پر ایک بار پھر بیر بہوٹی بن گئی تھی۔

''اللہ، آپ کتنی پیاری ہیں نا!'' نگی بے ساختہ مسکرائی۔

''میری بھابی بہت پیاری ہیں!'' وہ خوشی خوشی علیزے کا ہاتھ تھام کر باہر نکل گئی۔

❖❖○❖❖

''کیا نام ہے اُس کا؟'' مسکان نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''علیزے!'' سائرہ نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''تو وہ جانتا تھا کہ میں اُس سے محبت کرتی ہوں!'' مسکان نے سائرہ سے پوچھا۔

''ہاں!'' دو آنسو ٹپ سے مسکان کی آنکھوں سے نکلے۔

''پھر بھی وہ بے خبر بنا رہا، اُس نے مجھے ٹھکرایا! کیوں؟ کیا کمی تھی مجھ میں؟'' مسکان کے لہجے میں بے درد دُکھ تھا۔

''مسکان، میری جان! یہ یک طرفہ محبت ہمیشہ دُکھ دیتی ہے۔''

''تم اپنی جان ہلکان نہ کرو، اللہ تم کو بہت بہترین نعم البدل دے گا۔'' مسکان کا دِل رِکرچی رِکرچی ہو رہا تھا اُسے کسی کی تسلی سکون نہ دے رہی تھی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''جب تم ہی قسمت میں نہ تھے تو اب قسمت اچھی ہو یا بری! مجھے اِس سے کیا لینا!'' مسکان موبائل فون پکڑے پکڑے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''مسکان، مسکان!'' سائرہ اُسے پکار رہی تھی لیکن مسکان مایوسی کی اُس دنیا میں چلی گئی، جہاں اُسے کسی کی آواز نہ سنائی دے رہی تھی۔ ایک عجیب سی بے حسی اُس کے حواسوں پر طاری ہوئی جا رہی تھی۔

''میں نے ولی کو کھو دیا! میں نے اپنی محبت کو کھو دیا! وہ تو میرا پہلا پیار تھا! میرا پہلا پیار ادھورا رہ گیا!'' مسکان جس کی زندگی میں کوئی خواہش ادھوری نہ رہی تھی۔ آج اُس کی سب سے بڑی تمنا ادھوری رہ گئی تھی اُسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ خود ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ادھوری رہ گئی ہے۔

''مسکان بیٹا! خود کو سنبھالو۔'' آپا امّاں نے فون اُس کے ہاتھ سے پکڑ کر اُسے گلے لگالیا۔

''تم کیوں نہیں مانتیں میری بات، کیوں خود کو برباد کیے جا رہی ہو؟ چلو اُٹھو ہمیں یہاں سے جلد از جلد نکلنا ہوگا۔'' ورنہ سید سرفراز تمہارا نکاح اُس بڑی عمر کے آدمی سید اظہر علی سے کر ڈالے گا اور تم ہمیشہ کے لیے بند گلی میں زندگی گزارنے پر مجبور ہوجاؤ گی اور یہ میں ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔'' آپا امّاں نے مسکان کو اُٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں! مجھے کہیں نہیں جانا!'' مسکان نے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

''مسکان میری جان! کیا پاگل پن ہے!'' آپا امّاں نے پریشانی سے اُسے دیکھا۔ انہوں نے بہت مشکل سے یہاں سے نکلنے کا انتظام کیا تھا اُن کے پاس وقت بے حد کم تھا۔ سید سرفراز جو کسی کام سے شہر گیا ہوا تھا، کسی وقت بھی واپس آجاتا اور پھر یہاں سے نکلنا ناممکن تھا۔

''ہاں میں ہوگئی ہوں پاگل!'' مسکان ایک دم سے چیخی۔

''میں ولی کے عشق میں پاگل ہوگئی ہوں اور پاگلوں کو تو پتھر ہی پڑا کرتے ہیں، مجھے بھی پتھر پڑنے چاہئیں۔ ہاں آپا امّاں پاگلوں کو تو پتھر ہی پڑتے ہیں نا!'' مسکان نے روتے ہوئے کہا۔

''باؤلی ہوگئی ہے کیا؟ اُٹھو ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔'' آپا امّاں نے اُس کا بازو کھینچ کر اُٹھانے کی کوشش کی۔

''آپا امّاں پلیز مجھے کہیں نہیں جانا۔''

''تم کو معلوم ہے نا کہ آج سید اظہر سے تمہارا نکاح ہونے والا ہے۔'' آپا امّاں نے اُسے جھنجوڑا، جیسے وہ ہوش میں نہ ہو۔

"جب وہ نہیں تو کوئی بھی سہی!" مسکان بے حد ٹوٹ گئی تھی۔

"پاگل یہ تو سراسر خودکشی ہے!" آپا لمّاں بھی رو پڑیں۔

"تو میں کون سا زندہ ہوں!" مسکان نے بے حسی سے کہا۔

"دماغ خراب ہوگیا ہے تمہارا، میں تم کو کبھی اِس آگ میں نہیں کودنے دوں گی۔" آپا لمّاں نے چلا کر کہا۔

"جس آگ میں، میں جل رہی ہوں اُس سے بڑی اور آگ کیا ہوگی۔" مسکان تیزی سے وہاں سے اُٹھی اور دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں جا کر بند ہوگئی۔

مسکان نے سمندر میں عین طوفان کے وقت اپنی کشتی کے چپو پانی میں پھینک کر آنکھیں بند کرلی تھیں۔ اب اُسے بس ایک ہی بات کا انتظار تھا کہ اُس کی کشتی کب ڈوبے گی!

❁

"یہ کس کا ہے؟" گرے اور لائٹ بلیو شیڈ کا لہنگا دیکھ کر منزہ نے حیرت سے پوچھا۔ وہ ابھی ابھی پارلر سے آئی تھی، گھر میں اِس قدر گہما گہمی دیکھ کر اُسے خاصی حیرت ہوئی۔

"آپی کی منگنی ہو رہی ہے یہ اُن کا ہی سوٹ ہے!" چھوٹی بہن نے اطلاع دی۔

"ہیں منگنی؟ صبح تک تو اِس طرح کی خبر نہیں تھی یہ اچانک اتنی ایمرجنسی میں منگنی کیسے ہو رہی ہے۔" منزہ کی حیرت بجا تھی۔

"اتنے زیادہ امیر لوگ ہیں، پیسے سے کچھ بھی کرسکتے ہیں، چند گھنٹوں میں انہوں نے جو سوچا وہ کر ڈالا۔ میں نہ کہتا تھا کہ پیسے میں بڑی طاقت ہے مہینوں کے کام گھنٹوں میں ہو جاتے ہیں۔" کاشف نے اپنا شان دار پینٹ کوٹ منزہ کے سامنے لہرایا۔ روشن آرا خالہ نے اُسے اُس کے کپڑوں کی خریداری کے لیے الگ رقم دی تھی اور اتنی مہنگی شاپنگ کرکے وہ بے حد خوش تھا۔

"لیکن علیزے جیسی دبو لڑکی کو کون سے بے وقوف امیر ٹکر گئے، جو اُسے بہو بنانے جا رہے ہیں۔" منزہ کو واقعی اندر سے دھچکا لگا تھا کہ بڑی بہن کے ہوتے چھوٹی بہن کی منگنی ہونے جا رہی تھی۔ اِس لیے اُس نے بے اختیار جل کر پوچھا۔

"اور مجھے کسی نے اہم نہیں جانا کہ کوئی مجھے بھی بتاتا۔" منزہ نے ایک دم منہ پھلا لیا تھا۔

"تمہارے پارلر فون کیا تھا لیکن تمہاری مالکن نے کہا کہ تم دلہن تیار کر رہی ہو، اس لیے بات نہیں ہوسکتی۔ پھر میں نے کہا کہ آج جمعہ ہے، ہاف ڈے ہے تم جلدی آجاتی ہو تو تمہیں گھر آنے پر ہی اطلاع دے دوں گی۔" حسن آرا بیگم نے باقاعدہ وضاحت کی۔ منزہ کا جس طرح کا شعلہ جوالا قسم کا مزاج تھا وہ اُس سے ہمیشہ ڈرتی تھیں۔

"لیکن امی! آخر ایسی کیا مصیبت پڑ گئی تھی کہ اتنی ایمرجنسی میں منگنی ہونے جا رہی ہے۔" منزہ نے بیزار لہجے میں کہا۔ اُسے واقعی علیزے کے آگے بڑھ جانے پر دُکھ ہو رہا تھا۔ اُسے اپنے والدین پر بھی غصہ آرہا تھا کہ وہ بڑی بیٹی کو چھوڑ کر چھوٹی بیٹی کی شادی کا کیسے سوچ رہے تھے۔

"وہ دراصل آپا تو پہلے بھی علیزے کو مانگ چکی تھیں، بچپن ہی سے اُن کا سارا رُجحان علیزے کی طرف تھا۔ اب وہ باقاعدہ رشتہ مانگنے آئیں اور اتنا اصرار کیا کہ منگنی آج ہی ہوگی، کیوں کہ آج جمعے کا مبارک دن ہے تو اُن کے اتنے اصرار اور پیار کی وجہ سے ہم انکار نہ کرسکے۔" حسن آرا بیگم نے ایک بار پھر تفصیل سے اُسے جواب دیا۔

"ک... کون؟ علیزے کی منگنی ولی سے ہو رہی ہے؟" منزہ کو سانس لینا دُشوار ہو رہا تھا۔

"کاش! یہ خبر غلط ہو!" اُس کا دِل گڑگڑایا۔

"ہاں علیزے کی منگنی ولی سے ہو رہی ہے۔" حسن آرا بیگم نے حیرت سے بیٹی کے چہرے تاثرات دیکھے۔ اُس کا ردِعمل زیادہ خطرناک تھا۔

"لیکن تمہیں کیا ہوا؟" وہ پوچھے بنا نہ رہ سکیں۔

"کیا ہوا...؟ یہ آپ مجھ سے پوچھ رہی ہیں۔ گھر میں جو پہلا رشتہ آتا ہے کیا آپ نہیں جانتیں کہ اُس پر بڑی بیٹی کا حق ہوتا ہے۔" منزہ نے پوری طاقت سے چلاتے ہوئے کہا۔

"منزہ! بیٹیاں اپنے ماں باپ سے ایسے باتیں نہیں کرتیں، تم کیسے اِس قدر منہ زور ہو سکتی ہو؟" حسن آرا کو اُس کا رویّہ بے حد بُرا لگا۔

"اور ماں باپ ایسا کر سکتے ہیں؟" منزہ نے روتے ہوئے کہا۔

"آپ کو میرا خیال کیوں نہیں آیا؟ کیا علیزے آپ کو مجھ سے زیادہ پیاری ہوگئی۔" منزہ روتے روتے پھر چیخنے لگی۔

"منزہ! انہوں نے اپنے منہ سے علیزے کو مانگا تھا پھر میں کیسے تمہارا نام لے سکتی تھی؟" حسن آرا بیگم نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ کو میں عزیز ہوتی تو آپ اُن سے کہہ سکتی تھیں کہ آپ بڑی کی موجودگی میں کیسے چھوٹی کا رشتہ طے کر سکتی ہیں۔ لیکن نہیں آپ کو تو ہمیشہ سے علیزے ہی پیاری رہی ہے۔" منزہ نے بستر پر پڑے سب کپڑے اُٹھا کر دور پھینک دیے۔

"تم سب میں سے کسی کو میری خوشی عزیز نہیں، سب کے سب بے حس ہیں۔" منزہ غصّے سے کف اُڑانے لگی۔

"اچھا بیٹا! غصّہ تھوک دو اور تیار ہو جاؤ، آخر تمہاری بہن کا فنکشن ہے۔" انور صاحب نے بھی منزہ کو منانے کی کوشش کی۔

"نہیں جانا مجھے کہیں۔" منزہ دھپ دھپ پاؤں مارتی باہر نکل گئی۔

"تم سب میری شکل کیا دیکھ رہے ہو، تیار ہو جلدی سے۔" انور صاحب نے سب کو ڈانٹا۔

"لیکن منزہ؟" حسن آرا بیگم نے فکرمندی سے پوچھا۔

"ابھی اُس کا موڈ خراب ہے بعد میں ٹھیک ہو جائے گا میں بھابی رخسانہ کو اُس کے پاس چھوڑ جاؤں گا۔ ہمارے آنے تک وہ اُس کا خیال رکھ لیں گی۔" انور میاں، احمد شاہ سے رشتے داری پر اِس قدر خوش تھے کہ زندگی میں پہلی بار انہیں اپنی لاڈلی بیٹی منزہ کی ناراضی بھی نظر نہ آئی۔ جو کچھ ہو رہا تھا وہ نہایت عمدہ اور اُن کا پسندیدہ تھا اور وہ اِس میں کسی قسم کی رکاوٹ برداشت کرنے والے نہ تھے۔

❖❖○❖❖

لفظوں کی جستجو میں سب کچھ گنوا دیا!
وہ چل دیا، میں طرزِ ادا ڈھونڈتا رہا

اِس کو کسی نے ربّ سے لیا مانگ اور میں
سجدے میں گر کے حرفِ دعا ڈھونڈتا رہا!

آیا امّاں کی سسکیاں بھی مسکان کے پتھر وجود میں زندگی دوڑا نہ سکیں۔

"میں ہار گئی مسکان! میں ہار گئی، میں تم سے ہار گئی مسکان! اب میں اللہ کے ہاں جا کر صائمہ بی بی کو کیا جواب دوں گی؟......تم نے ایسا کیوں کیا؟......... جب میں تمہاری ماں، تمہارے ساتھ تھی تو تم نے یہ خودکشی کا فیصلہ کیوں کیا؟"

آیا امّاں نے زندگی میں خود کو ایک بار پھر اِس قدر بے بس پایا تھا کہ اُن کا دل چاہ رہا تھا دیواروں کے ساتھ سر ٹکرا ٹکرا کر مر جائیں۔

"آیا امّاں! کیوں روتی ہیں میں نے یہ فیصلہ پورے ہوش و حواس میں قبول کیا ہے۔" مسکان نے سرد لہجے میں کہا۔

"تم ہوش میں ہی تو نہیں ہو، کیا کوئی ہوش منداس طرح اپنی زندگی سے کھیلتا ہے؟"

"آج وہ بھی تو کسی کا ہو گیا ہوگا، وہ، جسے میں نے عبادت کی طرح ہر پَل یاد کیا، وہ جسے میں نے ہمیشہ چاہا، وہ آج کسی اور کو اپنے ساتھ زندگی میں شامل کر رہا ہوگا۔ اُس کے پہلو میں وہ لڑکی میری ہی طرح سج سنور کر دلہن بن کر بیٹھی ہوگی۔" مسکان پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"میں نے یہ روپ صرف اور صرف اُس کے لیے سنوارنے کا خواب دیکھا تھا۔ لیکن اُس نے میری جگہ کسی اور کو یہ سارے حق دے کر میرے خواب چکنا چور کر دیے، تو آیا امّاں جب وہ نہ ملا تو چاہے کوئی بھی اِس لاش کو لے جائے۔" مسکان نے مایوسی سے کہا۔

"کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم نے ایک شخص کی محبت کی خاطر خود کو برباد کر لیا۔"

"آپ ہی تو کہتی تھیں کہ ہر ایک صرف ایک کے لیے ہی ہوتا ہے۔"

"لیکن تمہاری زندگی اِن سب سے زیادہ اہم تھی۔" آیا امّاں نے یوں ہاتھ ملے، جیسے وہ اپنا سب کچھ گنوا بیٹھی ہوں، انہوں نے کس قدر کوشش کی تھی کہ مسکان سید اظہر علی سے نکاح نہ کرے لیکن اُس نے کسی بات، کسی فریاد کو نہ سُنا اور ضد میں آ کر اپنا آپ برباد کر لیا تھا۔

"یا میرے اللہ!" آیا امّاں کا دِل بُری طرح ڈوبا اور وہ ایک دم لہرا کر گر پڑیں۔

"آیا امّاں!" مسکان اُن کی جانب بڑھی۔

"کوئی ہے؟" مسکان نے دروازے کی جانب منہ کر کے ملازمہ کو پکارا... مسکان لاکھ اپنے ساتھ بُرا کر لیتی لیکن آیا امّاں اُس کے لیے بے حد اہم تھیں، وہ اُن کے ساتھ تو بے حسی نہ دکھا سکتی تھی۔ آیا امّاں کا چہرہ بُری طرح پیلا پڑ رہا تھا! آیا امّاں جس کی خاطر جی رہی تھیں آج اُس نے اپنے متعلق ایک غلط عمل کر کے اُن کے جینے کا مقصد ختم کر دیا تھا۔

❖❖○❖❖

"علیزے!" ولی نے ایک دم اُس کا ہاتھ تھام کر پکارا... وہ آج کسی دیس کی شہزادی لگ رہی تھی، جو رستا بھول کر اِس جہاں میں نکل آئی ہو۔ محبت کے اعجاز نے اُس کے روپ کو سنہرا کر ڈالا تھا۔ دیکھنے

والوں کی نگاہ اس خوب صورت جوڑی پر ٹھہر نہ رہی تھی۔

"جی!" علیزے کے چہرے پر الگ ہی طرح کی دھیمی سی شرمیلی مسکان تھی۔

"اب تو مجھے حق ہے نا کہ میں تمہارے پیروں میں وہ پائل دیکھ سکوں؟"

"بالکل آپ کو حق ہے!" علیزے نے اپنا دایاں پاؤں آگے کر دیا، گھٹنے کے اندر اُس کے پاؤں بہت پیارے لگ رہے تھے اور وہ پائل اُس کے پاؤں میں جا کر سج گئی تھی۔

"تمہیں پسند آئی؟"

"بہت زیادہ!" علیزے نے کھلے دِل سے تعریف کی۔

"لو، یہ تمہارے لیے۔" ولی نے ایک فریم اُس کے آگے کیا۔

"یہ کیا ہے؟"

"خود ہی کھول کر دیکھ لو۔" ولی نے اُسے بہت پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرے خدا! یہ تو، یہ تو میں ہوں! لیکن آپ نے کِس قدر خوب صورتی سے اِسے پینٹ کیا ہے؟"

علیزے کے آدھے چہرے پر دوپٹے کی باریک جالی تھی اور وہ اپنے ہاتھوں پر اپنا چہرہ رکھے کہیں کھوئی ہوئی تھی۔ اُس کے بالکل سامنے چھوٹی سی گلاب کی کلی پڑی تھی اور اُس کے نیچے کپڑے کے ساتھ کولاج کر کے ایک شاہی طرز کا خط کھلا ہوا تھا اور اُس پر ایک غزل کے چند اشعار لکھے تھے۔

اپنے احساس سے چھو کر مجھے صندل کردو
میں کہ صدیوں سے اُدھورا ہوں مکمل کردو
نہ تمہیں ہوش رہے اور نہ مجھے ہوش رہے
اِس قدر ٹوٹ کے چاہو، مجھے پاگل کردو
تم ہتھیلی کو مرے پیار کی مہندی سے رنگو
اپنی آنکھوں میں مرے نام کا کاجل کردو

"کیسا لگا میرا تحفہ؟"

"ایک بہت یونیک اور قیمتی احساس کو میں اپنے اِردگرد محسوس کر رہی ہوں۔ میرا دِل شکر ادا کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ کچھ مغرور ہو رہا ہے کہ مجھے اِس قدر چاہنے والا شخص ملا، وہ شخص جو کسی کا بھی خواب ہو سکتا ہے!" علیزے نے دِل ہی دِل میں کہا۔

"میں بیان نہیں کر سکتی کہ یہ آپ نے کس قدر پیارا بنایا ہے!" علیزے نے معصومیت سے کہا۔

"یہ بتاؤ تمہیں اِس میں موجود میسیج بھی نظر آیا یا خالی خولی اپنی ہی تصویر کی تعریف کیے جاؤ گی۔" ولی نے شرارت سے پوچھا۔

آج وہ بے حد خوش تھا۔ اُس نے جو چاہا وہ پالیا تھا۔

"حضرت اینڈ خاتون! ملاقات کا وقت ختم ہوا آپ دونوں کو اماں جان بلا رہی ہیں۔" نگی اُن دونوں کو جو ہوٹل کے اِس فلور کے ٹیرس پر کھڑے تھے ہاتھ پکڑ کر واپس محفل میں لے آئی اِن چند منٹ کی ملاقات کا اہتمام بھی نگی نے ہی کیا تھا۔

❖❖○❖❖

"کیا بات ہے آپ کا موڈ بہت آف ہے؟" نگی نے سائرہ سے پوچھا۔

"بس ایسے ہی!" سائرہ تکلفاً بھی نہ مسکرا سکی۔

"طارق بھائی بھی چپ چپ سے ہیں! نگی نے دونوں بہن بھائی کی خاموشی کو بہت شدت سے محسوس کیا تھا۔ طارق تو احمد شاہ کی اُس گفتگو کے بعد سے ڈسٹرب تھا، جب کہ سائرہ کو مسکان کا دُکھ تھا اِس لیے دونوں بہن بھائی جو ہمیشہ چہکتے تھے ایک دم چُپ سے ہو گئے تھے۔

"ہاں طارق! میں نے بھی محسوس کیا ہے کہ تم بہت اپ سیٹ سے ہو۔" ولی نے ڈنر سوٹ میں ملبوس طارق کو بہ غور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

نک سک سے ہمیشہ تیار رہنے والا طارق آج بڑھی ہوئی شیو کی وجہ سے رف اینڈ ٹف لگ رہا تھا۔

"کبھی کبھی چپ رہ کر بھی دیکھنا چاہیے، اس طرح دوسروں کو سننے کا موقع ملتا ہے!" طارق نے پھیکی سی ہنسی کے ساتھ جواب دیا۔

آنی کچھ عرصے کے لیے باہر گئی ہوئی تھیں اور طارق کو ایک ایک پل کاٹنا بے حد مشکل ہو رہا تھا۔ ایسے میں وہ خود سے لڑتا جھگڑتا تھکنے لگا تھا۔

"ارے!" ولی نے چونک کر طارق کو دیکھا۔ اس کی خالی خالی آنکھیں ولی کو ایک دم پریشان کر گئیں۔

"ایکسکیوزمی!" ولی سب کو کہتا ہوا طارق کا ہاتھ پکڑ کر اُسے ایک کونے میں لے آیا۔

"اب بتاؤ کیا ہوا ہے؟"

"کیوں کیا ہوا؟" طارق نے نگاہ چراتے ہوئے کہا۔

"تم مجھ سے اپنی خوشیاں چھپا لینا، میں نہیں روکوں گا لیکن مجھ سے اپنا کوئی دُکھ نہ چھپانا، یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔" ولی نے طارق کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تمہارا رویّہ کبھی اجنبی ہوا تو میں برداشت نہ کر سکوں گا۔" ولی نے بے حد فکرمندی سے کہا۔

"میں تم سے کبھی کچھ نہیں چھپاتا تم جانتے ہو، لیکن یہ وجہ ایسی ہے کہ میں خود سے بھی کھل کر کچھ کہہ نہیں پا رہا، کبھی کبھی اپنے بے حد قریب رہنے والے بھی تو دھوکا دے جاتے ہیں نا؟" طارق نے لوگوں کے خوش باش چہرے دیکھتے ہوئے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا اور پھر ایک دم چونک کر ولی کو دیکھا۔

"کم آن! تم کون سی پریشانی لے کر بیٹھ گئے۔ ٹوڈے از یور بگ ڈے۔ اِس کو یوں بدمزہ نہ کرو۔"

"اب تم بات کو ٹال رہے ہو۔" ولی نے اُس کی آنکھیں دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"میں بھلا بات کو کیوں ٹالوں گا! میں وعدہ کرتا ہوں، جیسے ہی میں اپنی اندر کی اُلجھن کو سلجھا لوں گا میں تمہیں ساری بات بتا دوں گا۔" طارق نے ولی کو کھینچ کر محفل میں لاتے ہوئے کہا۔

"تو اِس اُلجھن کو سلجھانے کے لیے تمہیں اپنا کوئی دوست نہیں چاہیے۔" ولی کو طارق کا یوں ٹالنا اچھا نہ لگا۔

"پلیز ولی!" طارق نے اُس سے درخواست کی۔

"او کے!" ولی نے دیکھا کہ وہ کچھ بتانا نہیں چاہ رہا تو اُسے انتظار کر لینا چاہیے۔

''تمہیں یہ نیا رشتہ بہت مبارک ہو، ماشاء اللہ بہت پیارا جوڑا ہے تم دونوں کا، مجھے تو بھابی کی عادتیں بھی بہت اچھی لگیں۔'' طارق نے ولی کو مبارک باد دی۔

''شکریہ... ویسے یہ میری امّاں کی پسند پہلے ہیں اور بعد میں میری اور ماں کی دُعا ہو یا پسند دونوں ہی بیٹے کے بھاگ جگا دیتی ہیں۔'' ولی نے پُریقین لہجے میں کہا۔

''تو تم بھابی کو بھاگ بھری کہہ رہے ہو!'' طارق نے شرارتی لہجے میں کہا۔

''نہیں! میں اپنی ماں کے متعلق کہہ رہا ہوں کہ وہ میرے لیے صرف اچھا ہی نہیں بلکہ بہترین سلیکٹ کریں گی۔'' وَلی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا آؤ میں تم کو بابا سائیں سے ملوادوں وہ بیسیوں بار تمہارا پوچھ چکے ہیں۔'' طارق کا دِل ایک دم اپنی رفتار سے زیادہ دھڑکا۔

ولی کے ساتھ ساتھ چلتے وہ مسلسل کئی باتیں اکٹھی سوچ رہا تھا۔ احمد شاہ اُس کی زندگی کے ایک بہت اہم راز کے امین تھے، وہ اُن سے گھبرانے لگا تھا۔ اُس کا دِل و دماغ اُلجھ کر رہ گیا تھا۔

''ارے طارق بیٹا! السلام علیکم!'' احمد شاہ کی پرانی عادت تھی کہ وہ ہر چھوٹے بڑے کو سلام کرنے میں پہل کرتے تھے۔

''السّلام علیکم سر!'' طارق نے آگے بڑھ کر اُن سے مصافحہ کیا۔

''وعلیکم السلام بیٹا! جیتے رہو، اللہ تمہارا بخت بلند کرے۔'' انہوں نے مسکرا کر اُسے دُعا دی۔

طارق کے بے چین جلتے کڑھتے دِل پر اُن کی دعا سے ٹھنڈی میٹھی پھوار پڑی۔

''طارق بیٹا! میں تمہیں کسی سے ملوانا چاہتا تھا۔'' طارق کا دِل ایک بار پھر شدت سے دھڑکا۔

''سر پلیز۔'' طارق ایک دم واپس مُڑا۔

''طارق بیٹا! تم کب تک اپنے وجود سے انکار کرسکتے ہو، وہ تمہارے وجود کا سبب ہے، وہ تمہاری اصل پہچان ہے، تمہیں اُس سے بھاگنا نہیں چاہیے اور ایسے میں جب کہ اُس کا کوئی قصور بھی نہیں ہے۔'' احمد شاہ نے طارق کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر روکا، ولی نے حیرت سے اُن دونوں کو دیکھا۔

''آخر معاملہ کیا تھا۔''

''پلیز انکل! میں ابھی اُن سے ملنا نہیں چاہتا!''

برسوں سے اپنے باپ کے متعلق غلط سنتے سنتے اُس کے دِل میں اپنے باپ کے لیے بے حد بدگمانی تھی۔ سچائی سننے کے بعد وہ اُن سے فوراً ملنا چاہتا تھا لیکن اُس نے خود کو روک لیا تھا۔ اپنے باپ سے ملنے کے بعد جو سوال اور غصہ اُس کا آنی کی طرف نکلتا تھا کہیں وہ ٹھنڈا نہ پڑ جائے۔ جب کہ وہ آنی کے ساتھ اِس ساری سازش کا حساب کرنا چاہتا تھا کہ انہوں نے کیوں اُن کے سارے گھر کو تباہ کر ڈالا۔

''کیا تم اب بھی اُس سے بدگمان ہو؟'' احمد شاہ نے پوچھا۔

''نہیں سر! لیکن میں ابھی اُن سے ملنا نہیں چاہتا، مجھے کچھ وقت دیں پلیز!'' طارق کہہ کر تیزی سے سائرہ کی جانب بڑھا اور اُسے لیے باہر نکل گیا۔

''احمد! کیا وہ مجھ سے کبھی نہیں ملے گا؟'' احمد شاہ کو اپنی پشت پر شہباز علی کی بے قرار آواز سنائی دی۔

''نہیں شہباز! تم فکر نہ کرو، وہ تمہارے پاس ضرور آئے گا۔ تم نے شاید اُس کی آنکھیں نہیں دیکھیں جب میں پہلے دِن اُس سے ملا تھا تو اُس کی آنکھوں میں تمہارے لیے نفرت تھی اور آج اُن آنکھوں میں، میں نے بے حد نرم تاثر دیکھا ہے۔''

''شہباز تمہاری سچائی کی جیت ہوگی۔'' احمد شاہ نے پُریقین ہوکر اُن کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''تم سچ کہہ رہے ہو نا!'' شہباز صاحب کے لہجے میں بے حد آس تھی۔

''مجھے میرے اللہ پر یقین ہے، وہ تمہیں زیادہ دیر انتظار نہیں کروائے گا۔'' احمد شاہ نے شہباز صاحب کو تسلی دلائی۔

''انشاء اللہ!'' شہباز صاحب کا لہجہ دُعائیہ تھا۔

''آخر درخت کو اپنی جڑوں کی ہی جانب جھکنا ہوتا ہے، وہ کب تک تم سے بے نیاز رہ سکتا ہے!'' احمد شاہ کا جملہ شہباز صاحب کے تھکے ہوئے وجود میں توانائی بھر گیا۔

❖❖○❖❖

''کیسی ہو سائرہ؟'' سمعان نے اُسے فون کیا تھا۔

''خیریت ہے، آج مہا کنجوس نے پیسے خرچ کرکے فون کیسے کرلیا؟'' سائرہ کے اُداس چہرے پر جانے کتنے دِنوں بعد مسکراہٹ آئی تھی۔

''چلو میں نے تو مہا کنجوس ہوکر پھر بھی فون کرلیا لیکن تم تو مہا کنجوس کی مہارانی لگتی ہو تم سے تو اتنا بھی نہ ہوسکا کہ مجھے فون کرلیتیں۔'' سمعان نے بھی اُس سے شکوہ کیا۔ اُس نے سائرہ کو فون مسکان کا پوچھنے کے لیے کیا تھا اُس کے گھر کوئی فون اٹینڈ نہیں کر رہا تھا۔

''بس میں کچھ پریشان تھی ایسے میں، میں نے کسی سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔''

''خیریت؟''

''بس مسکان کے یہاں سے جانے کے بعد میں اِس قدر ڈسٹرب رہی کہ مجھے کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا۔''

''کیا ہوا مسکان کو، کہاں چلی گئی وہ؟'' سمعان نے پریشان ہوکر پوچھا۔

''اُس کے بابا اُسے ہمیشہ کے لیے گاؤں لے گئے تھے اور...'' سائرہ نے سرد آہ بھری۔

''اور کیا ہوا...؟'' سمعان نے بے چینی سے پوچھا۔

''اور لاسٹ فرائی ڈے کو اُس کا نکاح باپ کی عمر سے بھی زیادہ ایک شخص سے کر دیا گیا۔'' ایک بم دھماکا ہی تو تھا، جو سائرہ کے الفاظ نے کیا تھا۔ سمعان کو اپنا وجود کرچی کرچی ہوتے محسوس ہوا۔

''ہیلو... ہیلو۔'' سائرہ اُس کو پکار رہی تھی لیکن اُس نے چُپ چاپ فون بند کردیا۔

''کیا ہوا؟'' سمعان علوی نے حیرت سے اپنی پشت پر مڑ کر دیکھا، سمعان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ یہ زبیدہ بیگم تھیں اُس کی ماں، اُس کی بے نیاز ماں! جس کو اِس گھر میں کیا چل رہا ہے کبھی پروا نہ ہوتی تھی۔ بچپن میں وہ ماں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے چیخ چیخ کر رویا کرتا تھا لیکن اُسے زبیدہ بیگم کی گود کیا ایک اپنائیت بھری نگاہ تک نہ ملتی تھی۔ آج اُس کی ماں نے اُس کے کندھے کو چھو کر پوچھا تھا کہ ''کیا ہوا

ہے؟''

''مما!'' سمعان شدّت جذبات سے بول بھی نہ پا رہا تھا۔

''ہوں!'' زبیدہ بیگم نے اُس کی جانب دیکھ کر پوچھا۔

''مما! آپ نے مجھے بلایا، مجھے چھوا!'' سمعان نے بے یقینی سے زبیدہ بیگم کو دیکھا۔ زبیدہ بیگم بنا کسی وہم کے اُسے چھو چکی تھیں۔

''ہاں!'' زبیدہ بیگم نے کہا۔

''اوہ مما!'' سمعان اُن کے گلے لگ گیا، وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا، جیسے برسوں بعد ایک ننھا بچہ اپنی بچھڑی ماں سے ملا ہو۔

''تم رو رہے ہو!'' زبیدہ بیگم نے دھیرے سے پوچھا۔

''پلیز مما! آج مجھے رونے دیں میری برسوں کی پیاسی روح آپ کے لیے ترسی ہوئی تھی۔ اللہ سے کچھ دیر پہلے مجھے بے حد شکوہ تھا کہ اُس نے میری محبت جس کا بیج ابھی ننھا منا پودا ہی بنا تھا مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھین لی، لیکن اُس کا دیا غم میرے لیے تو Blessing بن گیا۔ آج میری ماں نے میرے دِل کی چوٹ کو محسوس کر کے مجھے بلایا ہی نہیں مجھے چھوا بھی ہے۔'' سمعان بولتے بولتے ایک دم چپ ہو گیا۔ زبیدہ بیگم کے چہرے پر پھر وہ ہی اجنبی تاثر تھا۔ سمعان کا دِل اُس معصوم بچے کی طرح سہم گیا جسے اُس کی دِل پسند چیز دے کر چھین لی گئی ہو۔

''پرے ہٹو!'' زبیدہ بیگم کے لہجے میں نہایت سرد مہری تھی۔

''کیوں مما! آخر کب تک آپ مجھ سے دور رہیں گی۔'' سمعان نے اُن کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔

''تمہیں کتنی بار کہا ہے میں نے کہ مجھے ہاتھ نہ لگایا کرو، تم نے مجھے گندا کر دیا ہے!'' سمعان کا چہرہ ایک دم سیاہ پڑ گیا۔

''تم نے مجھے گندا کر دیا۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب بڑھیں، سمعان جانتا تھا کہ وہ اب کیا کریں گی۔

''وہ اب باتھ روم میں بند ہو کر گھنٹوں صابن مل مل کر خود کو دھوئیں گی۔'' سمعان کسی ہارے ہوئے انسان کی طرح ڈھے کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

''سمعان تم پھر دُکھی ہو گئے؟'' قاسم علوی نے اُس کے پاس آ کر پوچھا۔

''آپ نے دیکھا نا، اُن کو کچھ لمحے پہلے وہ کس طرح اپنی تھیں اور صرف چند لمحوں میں وہ ایک بار پھر ہم سے دور جا کھڑی ہوئیں۔'' سمعان نے دُکھ سے کہا۔

''ہاں میں نے دیکھا اور میں بہت خوش بھی ہوں۔'' قاسم علوی نے کہا۔

''کس بات پر؟'' سمعان نے بے حد خراب موڈ میں پوچھا۔

''تم نے دیکھا کہ اُس کا خول پہلی بار چٹخا تھا۔ یہ کس قدر خوشی کی بات ہے۔''

''وہ ایک دم ہمارے پاس کیسے آئے گی؟ اُسے اتنا وقت لگا اور آج پہلی بار تمہارے لیے کوئی احساس اُس کے دِل میں پیدا ہوا، اُسے کچھ اور وقت دو... آج مجھے اُمید ہو گئی ہے کہ جس سوکھے سڑے پودے

سے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نا اُمید ہو گیا تھا کہ یہ کبھی ہرا نہیں ہو سکتا چاہے لاکھ توجہ، محبت، تحفظ کا پانی اور کھاد ڈال لوں... وہ ہرا ہونے لگا ہے، ہاں سمعان وہ ہرا ہونے لگا ہے!''

''اِس کا مطلب ہے زبیدہ کے مردہ دِل میں زندگی نے دروازہ کھول کر قدم رکھ لیا ہے۔''

''سمعان میں جیت گیا! میں جیت گیا! دیکھو میں نے سید سرفراز علی کو ہرا دیا۔'' قاسم علوی اپنے آپ میں نہ تھے۔

سمعان نے حیرت سے قاسم علوی کو دیکھا۔

''کون سید سرفراز علی؟'' سمعان نے حیرت سے پوچھا۔

قاسم علوی کو ایک دم سانپ سونگھ گیا، وہ پریشان سے سمعان کو دیکھ رہے تھے کہ جذبات میں آ کر انھوں نے اُس موذی کا نام کیسے لے لیا؟

''کوئی نہیں بیٹا! کوئی بھی نہیں... تم صرف میرے بیٹے ہو صرف میرے بیٹے!'' انہوں نے ایک دم سمعان کو گلے لگا کر کہا۔

''سمعان بے حد حیران پریشان تھا کہ اُس کے باپ کا رویّہ ایک دم اِس قدر عجیب سا ہو گیا تھا۔ وہ اُسے گلے لگائے بس ایک ہی تکرار کیے جا رہے تھے کہ تم صرف میرے بیٹے ہو... تم صرف میرے بیٹے ہو!''

لیکن اب اُس نے زیادہ سوال کرنے چھوڑ دیے تھے وہ بچپن سے ہی اِس قدر ابنارمل رویوں کے ساتھ رہا تھا کہ اب اُسے کوئی چیز بہت زیادہ حیران و پریشان نہ کرتی تھی۔

❖❖○❖❖

دُکھ کا پہاڑ تائی امّاں پر ٹوٹا تھا۔

''زبیدہ!'' تائی امی نے بے حد دُکھ سے اُسے دیکھا۔

''بولو وہ کون ہے، تم کو ایک بار بھی اپنے خاندان اور اپنے باپ کی عزت کا خیال نہ آیا؟ زبیدہ میرا دِل کرتا ہے کہ میں تم کو شوٹ کر کے خود کو بھی مار ڈالوں۔'' تائی امی نے بے حد بے بسی سے کہا۔

''یہ دیکھو تائی امی! میرا سارا وجود گندا ہو گیا ہے!'' زبیدہ دھیرے دھیرے ہوش و حواس سے بیگانہ ہوتی جا رہی تھی۔

''زبیدہ!'' تائی امی نے اُسے زور سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

''بند کرو یہ ڈراما اور مجھے اُس گھٹیا شخص کا نام بتاؤ، جس کے ساتھ تم نے منہ کالا کیا ہے۔'' تائی امی نے اُسے باتھ روم سے لا کر بیڈ روم پر پٹخا۔

''میں نے... تو... میں نے تو اُس سے محبت کی تھی!'' زبیدہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''اُس نے محبت کی آڑ میں میرا سب کچھ لوٹ لیا! میرا اعتبار، میری عزت!'' تائی امی سر تھام کر وہیں بیٹھ گئیں۔

''یا میرے اللہ! میں بھائی صاحب کو کیا جواب دوں گی کہ میں نے اُن کی بیٹی کی کیسی تربیت کی۔'' تائی امی بے بسی کی شدت سے ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

"کوئی گناہ نہیں کیا، میں نے تو سید سرفراز سے صرف محبت کی تھی۔" زبیدہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

"کون؟ سید سرفراز علی سے تم!"

"یا میرے اللہ! یہ اِس نے کیا کر ڈالا۔ میں صرف اُس کو گناہ گار نہیں سمجھتی تم کو بھی اِس گناہ میں برابر کی شریک سمجھتی ہوں۔ تمہیں پتا ہے نا کہ ہمارے مذہب میں زانی اور زانیا کی کیا سزا ہے۔" تائی امی کی بات پر زبیدہ نے دہل کر انہیں دیکھا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا کہ اُس کے اندر کوئی چیز کٹ کٹ کر ختم ہورہی ہے، اُس کا دِل اس قدر شدت سے گھبرایا کہ اُسے اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہوگیا، وہ لہرا کر گرگئی تائی اماں نے بجائے اُسے سنبھالنے کے وہیں کھڑے کھڑے اُسے دیکھا، وہ بے شک بہت برسوں سے خود میں گم رہنے لگی تھیں لیکن وہ ایک جہاں دیدہ عورت تھیں اور جو بات اُن کو نظر آرہی تھی وہ اِس قدر خوف ناک تھی کہ وہ وہیں کھڑے کھڑے بت بن گئی تھیں۔

زبیدہ کی پیلی رنگت چیخ چیخ کر اُن کے وہم کی تصدیق کررہی تھی۔ وہ طوفان جس کا اُن کو خدشہ تھا آ گیا تھا۔ اب وہ نہیں جانتی تھیں کہ یہ بھیانک طوفان اِس گھر اور اس کے افراد کو کتنا تباہ کرڈالے گا۔

"اِس طوفان کی خبر اگر بھائی صاحب کو ہوگئی تو؟" زبیدہ کے بھائی اپنی اولاد کو جس قدر لاڈ اور پیار سے رکھنے والے تھے اُس سے کہیں زیادہ بے حد غصّے والے اور بااصول بھی تھے۔

تائی امی کو زبیدہ کے والد کا تصوّر ہی لرزا دے رہا تھا۔

"یا اللہ خیر کرنا!" انہوں نے بے اختیار دُعا کی۔

❖❖○❖❖

کتنی خواہش ہے کہ اِک شخص
مجھے ترجمہ کرے
اتنے حسین لفظوں میں
کہ میری ذات کا ہر اِک رنگ
پھول بن کے کِھل جائے
اور اس پھول کی خوشبو
محرومیوں کے جنگل سے
مردہ جذبوں کی کہنہ باس کو
کہیں دور لے جائے
کتنی خواہش ہے!

سدرہ نے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے اور پھر آنکھیں بند کرکے وہ ہچکیوں میں رو پڑی۔

"یا میرے اللہ!" میں جانتی ہوں کہ میرے نصیب کی بارش میرے صحرائے دِل پر کبھی نہیں برس سکتی، تو پھر یہ دِل اُس کے لیے کیوں مچلتا ہے؟ یہ دِل منہ زور گھوڑے کی طرح بے لگام ہوکر مجھے، میرے دائرے سے میری حدود سے نکالنے لگا ہے، اب میں بے بس ہونے لگی ہوں۔ اے اللہ میں تو مزید کسی

آزمائش کے قابل نہ تھی پھر تو نے محبت مجھے دی بھی تو وہ بھی کسی آزمائش کی طرح... کیوں اللہ جی۔ ایسی خواہشیں تُو وہاں کیوں اُگاتا ہے، جہاں وہ خواہش پانی کو ترس ترس کر مرجھا کر کانٹا بن جاتی ہے اور پھر یہ کانٹا سدا دِل میں چبھتا رہتا ہے۔" سدرہ کی آنکھوں سے آنسو کسی لڑی کی طرح بہہ رہے تھے۔

"وہ مجھے بھولتا کیوں نہیں!" سدرہ نے اپنے رب سے شکوہ کیا۔

وہ جانے کتنی ہی دیر سے آنکھیں بند کرکے کھڑی تھی۔ پھر ایک دم اُس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں، وہ بالکل سامنے کھڑا تھا۔

"یا اللہ! کیا یہ میرا تصور ہے؟" اُس نے خود سے سوال کیا۔

مزار کے دو راستے تھے ایک عورتوں کے لیے اور ایک مردوں کے لیے، وہ دُوسری جانب کھڑا تھا۔

جب وہ مسلسل آنکھیں جھپک جھپک کر اُسے دیکھتی رہی اور وہ کسی تصور کی طرح غائب نہ ہوا تو اُسے یقین ہو چلا کہ یہ سچ مچ ڈاکٹر فیصل ہی ہے! وہ گھبرا کر باہر نکل آئی اور اُس نے بشیراں کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔

"کملی جانے کدھر نکل گئی ہے؟" اُسے گاڑی تک اکیلے جانا دُشوار لگ رہا تھا اور یہاں کھڑے رہنا اُس سے بھی دُشوار لگ رہا تھا۔

"موتیا! اُس کی پشت پر وہ آواز آخر اُسے سنائی دے ہی گئی، جو اُسے پتھر کا بت بنا کر وہاں ٹھہرنے پر مجبور کرچکی تھی۔

سدرہ نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا، کہیں کوئی دیکھ نہ لے لیکن وہاں دُور دُور تک کوئی نہ تھا۔ بشیراں چُن کر اُسے ایسے وقت میں درگاہ میں لائی تھی، جب وہاں صرف اِکا دُکا لوگ موجود تھے اب جانے وہ خود بھی کہاں غائب ہوگئی تھی۔

"موتیا پلیز رُکو!" ڈاکٹر فیصل نے اُسے وہاں سے جاتے دیکھ کر پیچھے سے آواز دی، سدرہ کو لگا کہ اُس کے پاؤں وہیں زمین سے جُڑ گئے ہیں۔

"تم جتنا مجھ سے دور بھاگتی ہو اُس سے دگنا میں تم کو اپنے دِل کے قریب محسوس کرتا ہوں!"

"تم کیوں میرے صبر اور میری چاہت کا امتحان لیتی ہو۔" اُس نے اُس کے بالکل سامنے آکر پوچھا۔

"میں... بھلا آپ کو کیا کہتی ہوں؟" سدرہ نے نگاہیں نیچی کرکے کہا۔

"میں بتاؤں تم کو کہ تم نے مجھے کسی کام جوگے نہیں رکھا۔ میرا دِل کسی لوہے کی طرح تمہارے مقناطیسی وجود کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے اور تم ہو کہ چند پل بھی میرے لیے نہیں رکتیں ہر بار دامن چھڑا کر بھاگ جاتی ہو۔" ڈاکٹر فیصل نے اُس کی بڑی بڑی اُداس آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم مجھ کو اتنے عزیز اگر نہ ہوتے تو میں تم سے کبھی نہ بھاگتی!" سدرہ نے دِل ہی دِل میں کہا۔

"تمہاری زندگی کی خیر چاہتی ہوں، اس لیے تو اپنے بم جیسے وجود سے تم کو دُور رکھتی ہوں کیوں کہ میرے قریب آنے والا ہر شخص تباہ و برباد ہوجائے گا اور تم مجھے بے حد عزیز ہو، میں کیسے تم کو اپنے وجود کے ساتھ لگی موت دے دوں؟" سدرہ نے آخر اُس سے کہہ ہی دیا۔

''تو تم مانتی ہو کہ تم بھی مجھے چاہتی ہو، اس کا مطلب ہے کہ میری محبت اِس راہ میں تنہا نہیں ہے۔'' فیصل نے خوش ہو کر کہا۔

''کیا فرق پڑتا ہے اِس سے؟ میں اگر تمہیں چاہتی بھی ہوں تو بھی کیا فرق پڑتا ہے؟ ہم دونوں میں صرف ایک ہی رشتہ بن سکتا ہے دو کناروں کا، جن کے نصیب میں سوائے فاصلے اور جدائی کے کچھ نہیں ہوتا۔ جب ہم مل نہیں سکتے تو کیا فرق پڑتا ہے کہ تم مجھے کتنا چاہتے ہو اور میں تم کو کتنا چاہتی ہوں؟'' سدرہ نے بے حد اُداسی سے کہا۔

''فرق پڑتا ہے موتیا! کیوں نہیں پڑتا! یک طرفہ محبت کو وہ عزت نہیں ملتی وہ نام نہیں ملتا اور وہ مقام نہیں ملتا جو محبوب کے دِل میں ہوتا ہے، وہ ہمیشہ لاوارث رہتی ہے۔ تم نہیں جانتیں کہ تمہارے اقرار نے میرے اِس مقدس جذبے کو لاوارث نہیں ہونے دیا۔'' فیصل نے اُس کو بہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں اب چلتی ہوں۔'' سدرہ نے گھبرا کے کہا۔

''بھاگ لو مجھ سے... کتنا بھاگو گی، کیا تم اپنی پرچھائیں سے بھاگ سکتی ہو، میں تمہاری پرچھائیں بن جاؤں گا۔'' فیصل نے جذب سے کہا۔

''یاد رہے پرچھائیاں جب تک روشنی رہے، تب تک ساتھ رہتی ہیں اور اندھیروں میں تنہا کر جاتی ہیں۔'' سدرہ نے بہت گہری بات کہی۔

''تو پھر میں تمہاری آنکھوں کی روشنی تمہارے دِل کی دھڑکن بن جاؤں گا کہ جب جب تم آنکھیں کھول کر کچھ دیکھنا چاہو، تو میں تمہیں نظر آؤں اور جب تم اپنے دِل کی دھڑکن کو سنو تو صرف میری آواز کو سن سکو۔''

سدرہ کو لگا کہ وہ چند پَل مزید وہاں رُک گئی تو موم کی طرح پگھل کر رہ جائے گی۔

''فیصل باؤ! سرابوں کے پیچھے جوانیاں نہیں گالتے (برباد) رب تمہاری جوانی کو مان کرے میں تو بد دعا ہوں، اگر کسی کے ساتھ رہ جاؤں گی تو اُسے بھی بنجر کر دوں گی۔ میرا وجود ہر مرد کے لیے سوائے موت کے کچھ نہیں۔'' سدرہ ایک دم چیخ کر بولی اور تیزی سے نکل گئی اور فیصل ایک بار پھر بے بسی سے ہاتھ ملتا رہ گیا۔

یہ دل پاگل
یہ دل سودائی
مار بھی سہے، خار بھی سہے
یہ دِل پاگل
یہ دِل سودائی! وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ مسکرایا۔

❖❖○❖❖

''زلیخا بہن! تم فکر نہ کرو، عبداللہ پتر کا تو کوئی بال بھی بیکا نہ کر سکے گا۔'' زلیخا بی بی کے چچا زاد نے اُن کو تسلی دی۔

''میرا بیٹا دنیاوی معاملوں سے بے نیاز رہتا ہے، اُس کا یہ مطلب نہیں کہ اُس کا حق بھی مارا جائے

اور اُس کو مارنے کے منصوبے بھی بنائے جائیں۔'' زلیخا بی بی باقاعدہ غصّے سے بپھری ہوئی تھیں۔ یہ اُن کے اکلوتے عزیز از جان بیٹے کی زندگی کا سوال تھا۔

''بی بی سائیں، بی بی سائیں!'' ملازمہ حواس باختہ دوڑتی آئی۔

''کیا ہوا؟ دم تو لو آرام سے بات کرو۔'' زلیخا بی بی نے ملازمہ کو ٹوکا۔

''بی بی وہ...'' ملازمہ کو بات کرنی مشکل ہو رہی تھی۔

''بول کملی کیا وہ.. وہ لگا رکھی ہے۔'' سید غضنفر نے بیزار ہو کر کہا۔

''سائیں... وہ سید عاشق علی کے ہاں سے سید نوازش علی جب واپس آ رہے تھے تو کسی نے اُن کی جیپ پر حملہ کر دیا۔''

''ڈرائیور تو تھا (وہیں) تے مر گیا جب کہ بڑے سائیں اور عبداللہ سائیں ہسپتال وچ ہیں۔'' ملازمہ نے آخر روح فرسا خبر سُنا ہی دی۔

''ہائے میرے ربا!'' زلیخا بی بی سینے پر دو ہتھڑ مار کر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''ویرے (بھائی) ظالم نے تو وار کر بھی ڈالا...'' اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

سید غضنفر غصّے سے دھپ دھپ پاؤں مارتے تیزی سے باہر نکلے... یوں لگتا تھا کہ اعلان جنگ ہو چکا ہے اور اب سب کو اپنے اپنے حصّے کی لڑائی لڑنی ہے۔ اور یہ اعلان جنگ سید سرفراز علی نے کیا تھا اور بہت بُرا کیا تھا۔

اے ربّ کائنات
اِک دُعا ہے
شاید کہ آخری ہو
میری زندگی، اور موت
تیرے ہاتھ میں ہے
نہیں جانتی، کہ اگلا لمحہ
میری زندگی کا سفینہ
لے ڈوبے گا
یا پھر! موت کے طوفان سے بچا کے
میری ناؤ کو کنارے لگا دے گا
کاش!
میرے تشنہ تکمیل خوابوں کو
حقیقت مل جائے
اِس لمحے تو یہی خواہش سر اُٹھاتی ہے
کہ اے اللہ
مجھے نئی زندگی مل جائے
میرے وعدے، میرے ارادے
سب پورے ہو جائیں
کسی کی دعائیں، نیک تمنائیں
میری آس کے بجھتے دیے کو
پھر سے روشنی دکھا جائیں
بے شک
میری تنہائی کا مداوا نہ ہو
مجھے مادی آسائشوں سے

کوئی سروکار نہیں
بس!!!
میں اپنے گناہوں کا بوجھ کچھ کم کرلوں
تیری بارگاہ میں سر جھکانے کے قابل ہو جاؤں
کہ تیری معافی، میری رہائی
تیری رضا، میری زندگی
مجھے پھر سے
نئی زندگی دے!!

ترنم کی آنکھوں میں تو ہمیشہ ہی برسات کا موسم ٹھہرا رہتا تھا۔ آج سے پہلے وہ جب جب روئی اپنے پچھتاوے اُسے رلاتے تھے۔ اپنے جرم، اپنے گناہ اور گزرا ہوا وقت اُسے رُلاتا تھا وہ کچھ نہیں کرسکتی۔ یہ بے بسی اُسے رُلاتی تھی۔

لیکن آج اُس کا تڑپتا، سُلگتا دِل ایک دم سے راہ پا گیا تھا۔

ہے دنیا میں کوئی ایسا رشتہ جو اپنی ناراضی یوں ختم کردے کہ بال برابر بھی اپنے دِل میں ناراضی نہ رکھے اور نئے سرے سے یوں تعلق بنائے کہ جیسے کبھی کوئی بات ہوئی ہی نہ ہو؟

ایک ماں کے پاس بھی کوئی بچہ جاتا ہے نا اور کہتا ہے کہ اے ماں مجھے معاف کردے تو وہ معاف کرنے سے پہلے سو بار جتاتی ہے پھر معاف کرتی ہے جب کہ اللہ اتنا رحمان ہے کہ وہ بندے کی ہر خطا معاف کرنے کو ہر پل تیار رہتا ہے۔

ترنم کے دِل میں جو معافی کی آس تھی، اب وہ اُسے پوری ہوتی نظر آرہی تھی۔ آج وہ اپنے کفارے کی پہلی قسط ادا کرنے جارہی تھی۔ رات کے دو بجے اُس نے پہلے رو رو کر معافی مانگی اور دو نفل حاجت کے پڑھ کر وہ اپنے آپ کو اُس کام کے لیے تیار کرچکی تھی کہ اگر وہ پکڑی جاتی تو بھیانک موت اور بھیانک زندگی اُس کا نصیب بنتا تھی۔

وہ شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالنے جارہی تھی

''ہیلو!''

''یہ میں ہوں!'' ترنم نے موبائل پر کسی سے سرگوشی میں بات کی۔

''جی۔ جی!''

''میں آپ کو ایک ایڈریس لکھواتی ہوں آپ پلیز جلدی سے نوٹ کریں۔'' ترنم کی آواز اور ہاتھ دونوں کانپ رہے تھے۔ کسی پل بھی میڈم چاندنی کے خاص بندے مارک کو ہوش آسکتا تھا۔ ترنم سالوں سے جو کام میڈم چاندنی اور راگنی کے لیے کر رہی تھی، آج اُس نے وہ ہی کام اُن کے خلاف کیا تھا۔ فرق بس اتنا تھا کہ آج بستر پر کسی سرکاری افسر کا وجود بے ہوش نہ پڑا تھا بلکہ وہاں مارک تھا اور وہ اس وقت مارک کے لیپ ٹاپ سے انتہائی خفیہ معلومات کو چُرا کر اپنی فلاپی میں فیڈ کرچکی تھی۔ اب وہ اس فلاپی کو ایک نہایت ایماندار افسر کو ہینڈ اوور کرنے والی تھی جس کا نام طارق تھا۔

طارق کے ایک ماتحت آصف کو ایک بار وہ بے وقوف بنا کر اُس سے معلومات چُرا کر لائی تھی۔۔۔ آصف کے ذریعے ہی طارق کو جانتی تھی کہ وہ ہی اُن کا افسر ہے، چند روز پہلے اُس نے طارق کو فو[illegible] کرکے اپنی مدد کی پیش کش کی اور اپنی پہچان کو وہ چھپا گئی تھی۔ طارق ہی نے اُسے مارک کے لیپ ٹا[illegible] سے کسی فائل کے چرانے کا کہا تھا۔

تین دن مسلسل مارک کے ساتھ رہنے سے آخر ترنم آج کامیاب ہو ہی گئی تھی۔

''نہیں پلیز! آپ خود آیئے گا میں آپ کے علاوہ کسی پر اعتبار نہیں کرسکتی۔'' ترنم نے کہہ کر فون [illegible] کردیا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی مارک کے پاس آئی، مارک بے سُدھ پڑا تھا۔ یہ نشہ خالی شراب [illegible] نشہ نہ تھا یہ ایک بہت اسٹرونگ قسم کا نشہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ڈرگ لینے والے شخص پر یہ نشہ عام آدمی [illegible] نسبت کچھ کم اثر کرتا ہے لیکن پھر بھی مارک کو اگلے چار گھنٹے ہوش نہیں آنے والا تھا۔ ترنم نے تیزی [illegible] اپنے جوتے پہنے اور باہر نکل گئی، جانے سے پہلے وہ باتھ روم کا لاک لگانا اور پانی کھولنا نہ بھولی تھی۔

اِس قدر شدید سردی میں بھی اُس کا سارا وجود شدید پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔

''کہاں رہ گیا یہ بندہ؟'' اُس نے گاڑی مطلوبہ جگہ پر روک کر اِدھر اُدھر دیکھ کر گھڑی کی جانب پریشانی سے دیکھا، اگر پیچھے سے مارک کو ہوش آجاتا تو غضب ہوجاتا تھا۔

''یا اللہ! اُسے بھیج دے!'' ترنم نے گڑگڑا کر دُعا کی۔

گزرتا ہوا ہر پل اُسے بدحواس کررہا تھا۔

❖❖ ○ ❖❖

''اوہ نو!'' طارق نے غصّے سے جیپ کو کک ماری، پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ اِس گاڑی سے اُلجھ رہا تھا جو ایک دم چلتے چلتے رُک گئی تھی اور اب تک چلنے کو آمادہ نہ ہوئی تھی۔

''اب کیا کروں؟ کوئی رکشا یا ٹیکسی وغیرہ؟'' طارق سوچ رہا تھا، لیکن وہ جس جگہ کھڑا تھا، وہاں سے کنوینس ملنا مشکل تھی۔

''یار خالد! جلدی سے پہنچو!'' طارق نے اپنے اسسٹنٹ کو فون کیا۔ اُسے یہاں تک آنے میں کم از کم آدھا گھنٹہ ضرور لگ جاتا جب کہ طارق کا اپنی منزل تک پہنچنا بے حد ضروری تھا، لیکن اب سوائے انتظار کے اُس کے پاس کوئی راہ نہ تھی۔

''تم۔تم بے وفا، تم کو بھی ابھی خراب ہونا تھا۔'' طارق بڑبڑا رہا تھا۔

''ایکسکیوزمی! اگر آپ کو بُرا نہ لگے تو میں آپ کو ڈراپ کردوں؟'' طارق کو اپنی پشت پر بہت مانوس سی آواز سنائی دی۔

''آ..آپ؟ آپ کو شاید میں نے احمد انکل کے گھر دیکھا ہے!'' طارق نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔

''جی میرا نام شہباز ہے!'' شہباز علی صاحب نے یک ٹک طارق کو دیکھتے ہوئے کہا۔ طارق کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔ کیا وہ بھول سکتا تھا کہ وہ سالوں سے اپنے ہر ڈاکومنٹ پر ولدیت کے خانے میں شہباز علی نامی شخص کا نام لکھتا آرہا تھا۔

''آپ؟'' طارق کنفرم کرنے کے لیے کچھ پوچھنا چاہ رہا تھا۔ (کیا یہ ہی احمد انکل کے وہ دوست ہیں؟)

''میں احمد شاہ کا دوست ہوں بیٹا! آپ کو میں نے وہاں ایک فنکشن میں دیکھا تھا۔'' شہباز علی صاحب جیسا بزدل انسان طارق کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر ہی گھبرا گیا تھا۔ اب وہ تھکے تھکے لہجے میں اپنا ادھورا تعارف کروا رہے تھے۔

''اوہ!'' طارق کے تنے ہوئے اعصاب ایک دم ریلیکس ہوگئے۔

طارق زندگی کی اس سچائی سے یوں بھاگ رہا تھا، جیسے کبوتر بلّی کو دیکھ کر آنکھیں بند کرلیتا ہے۔

''آؤ بیٹا! میں آپ کو ڈراپ کردیتا ہوں۔'' انہوں نے دوبارہ اصرار کیا تو طارق نے کچھ سوچ کر قدم بڑھادیے۔

فرنٹ سیٹ پر باوردی ڈرائیور بیٹھا تھا۔ طارق، شہباز صاحب کے ساتھ پیچھے بیٹھ گیا۔ طارق نے ڈرائیور کو اپنی مطلوبہ جگہ بتا کر شہباز صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

جب کہ وہ چپ چاپ اُسے پیاسی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ سمندر سامنے ہو اور پیاس سے جان نکل رہی ہو اور ایسے میں بھی انسان کو صبر کرنا پڑے یہ زندگی کی بے حد کٹھن اور کڑی گھڑی ہوتی ہے، شہباز صاحب بھی اس مشکل منزل سے گزر رہے تھے۔

''انکل آر یو او کے؟'' طارق اُن کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر پوچھے بنا رہ نہ سکا۔

''آں۔ہاں!'' شہباز صاحب ایک دم واپس آئے۔ ورنہ جس طرح وہ طارق کو دیکھ کر کھو سے جاتے تھے بہت مشکل ہوتا تھا ان کو خود پر قابو پانا۔

''بیٹا آپ کیا کرتے ہیں؟'' شہباز صاحب نے اُس سے گفتگو کرنے کی خاطر بات بڑھائی۔

''جی...وہ...میں؟'' طارق کو اپنی جاب بتاتے ہمیشہ پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

''جی میں صحافت میں ہوں!'' طارق نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ یہ سچ تھا کیوں کہ اُن کے سارے اسٹاف کو فرنٹ ڈیسک پر جو جاب دی گئی تھیں، وہ صحافت کے متعلق ہی تھیں۔

''اچھا۔اچھا!'' شہباز صاحب نے بلاوجہ خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! آپ کے والدین کہاں ہوتے ہیں؟'' طارق کے اعصاب ایک دم پھر سے تن گئے۔

''وہ دونوں اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔'' طارق کا جملہ شہباز صاحب پر کسی بم کی طرح گرا۔

احمد شاہ کے اُمید افزا جملے اُن کو خوابوں کی ایک الگ رنگین دنیا دکھاتے رہے تھے۔ لیکن طارق کا جملہ اُن کو کرچی کرچی کر گیا سب سچائی جاننے کے باوجود اُس نے باپ کے وجود کو مردہ ہی رکھا تھا۔

''کیوں! کیا وہ معافی کے قابل نہ تھے۔'' اُن کو ایک دم اپنے سینے کے دائیں جانب شدید درد محسوس ہوا۔

''بس یہیں اُتار دو!'' طارق نے ڈرائیور کو کہا۔

''تھینک یو انکل! مجھے جس قدر جلدی ہے آپ نے واقعی میری بہت بڑی مدد کی۔'' طارق عجلت میں شکریہ کہتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا تیزی سے ایک گلی میں مڑ گیا۔

"صاحب چلیں؟" ڈرائیور نے مڑ کر پوچھا اور پھر ایک دم اُچھل پڑا، شہباز صاحب کی تکلیف سے آنکھیں باہر نکل رہی تھیں۔

"صاحب؟" ڈرائیور دوڑ کر پچھلی سیٹ پر آیا۔

"صاحب کیا ہوا؟" ڈرائیور نے پسینے پسینے ہوتے شہباز صاحب کو پوچھا۔

"گولیاں!" شہباز صاحب نے اپنے چھوٹے سے بریف کیس کی جانب اشارہ کر کے ڈرائیور کو گولیاں نکالنے کے لیے کہا۔

ڈرائیور نے جلدی سے بریف کیس سے گولیاں نکال کر شہباز صاحب کو دیں وہ، یہ گولیاں اکثر صاحب کو استعمال کرتے دیکھ چکا تھا۔

"صاحب... صاحب منہ کھولو!" ڈرائیور نے گولیاں نکال کر شہباز صاحب کی زبان کے نیچے رکھ دیں۔

شہباز صاحب نڈھال ہو کر سیٹ پر گر سے گئے۔

"صاحب، صاحب!" ڈرائیور نے پریشانی سے انہیں آواز دی۔

"ہوں۔" شہباز صاحب نے آنکھیں بند کیے ہوئے ہاتھ سے ٹھیک ہونے کا اشارہ کیا۔

"سارہ، طارق، میرے بچے!"

"طارق! سائرہ!" شہباز صاحب کے منہ سے یہ نام سسکیوں کی طرح نکل رہے تھے۔

"صاحب!" ڈرائیور ایک بار پھر گھبرا گیا، اُس نے شہباز صاحب کو سیٹ پر لٹا کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اب اُس کا رُخ ہسپتال کی جانب تھا۔

شہباز صاحب کا چہرہ بے حد پیلا پڑتا جا رہا تھا۔

❖❖○❖❖

"السلام علیکم!" طارق نے ترنم کے پاس جا کر کہا۔

ترنم نے ہاتھ سے اسکارف کے ساتھ چہرہ چھپا رکھا تھا اُس نے ایک دم چونک کر ہاتھ نیچے کر دیا۔

"آپ؟" طارق اُسے فوراً پہچان گیا تھا۔

"جی۔" ترنم نے گہری سانس بھری، اب اپنی پہچان چھپانے کا کوئی فائدہ نہ تھا وہ اُسے دیکھ چکا تھا۔

"لیکن آپ! آپ تو نگی کی دوست؟" طارق کو یہ بات ہضم کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

"پلیز طارق صاحب! یہ اِن باتوں کا وقت نہیں ہے میرا ایک ایک پل بہت قیمتی ہے میں اپنی جان مصیبت میں ڈال کر یہاں تک آئی ہوں۔ یہ لیں آپ کی امانت، اُمید ہے اس میں آپ کو اپنی مطلوبہ ساری معلومات مل جائیں گی، ترنم نے اپنے ہینڈ بیگ سے ایک چھوٹا سا لفافہ نکال کر حوالے کیا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کے اس تعاون کے پیچھے کیا مقصد ہے؟" طارق کے لیے یہ جاننا ضروری تھا کہ میڈم راگنی اور چاندنی جیسی بلاؤں سے یہ لڑکی کیوں پنگا لے رہی ہے؟ جس کے متعلق وہ جانتی تھی کہ اُس کی سزا صرف اور صرف موت ہے!

"ظاہر ہے اِس غداری کی سزا تو ہو سکتی ہے لیکن اِس کا مجھے انعام تو نہیں ملے گا پھر بھی آپ مجھ پر

شک کر رہے ہیں۔" ترنم نے گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے استہزائیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"تو پھر اتنا بڑا رسک، اتنا بڑا قدم کیوں اُٹھایا؟" طارق کا انداز ابھی بھی تفتیش لیے ہوئے تھا۔

"طارق صاحب! ساری زندگی میں نے ہر چیز کھونے میں گزار دی، چاہے وہ میرے خود کے رشتے تھے یا پھر میں خود، اب کسی کی رضا پانا چاہتی ہوں!"

"معافی چاہتی ہوں!"

"کفارہ سمجھتے ہیں آپ؟"

"اگر سمجھتے ہیں تو بس اتنا سمجھ لیجیے کہ میں نے بھی کچھ ایسا کرنے کے لیے کیا ہے۔"

"اللہ حافظ۔" وہ کہہ کر تیزی سے گاڑی بھگا لے گئی۔

طارق کتنی ہی دیر گاڑی کے پیچھے اُڑتی دھول کو دیکھتا رہا، وہ اُس کی مبہم سی باتوں میں کھو گیا تھا۔

اُسے ایک دم وہ رات یاد آئی جب اُس نے ترنم کو پہلی بار ولی کی گاڑی میں دیکھا تھا۔ ہوش و حواس سے بیگانہ وہ خوب صورت لڑکی کسی پری کی طرح دکھائی دیتی تھی، پہلی نظر میں ہی اُس لڑکی کا غیر معمولی حُسن اور اُس کی غیر معمولی حد تک اُداس آنکھیں دیکھنے والے کو چونکا دیتی تھیں۔ کچھ بہت مختلف ہے اس لڑکی میں!

"لیکن! اینی وے! ہمارے لیے تو بہت کام کی لڑکی نکلی۔" طارق نے لفافے کی جانب دیکھتے ہوئے سوچا۔

"میڈم! اب دیکھتا ہوں کہ تم کیسے ہماری سرزمین پر گندگی پھیلاتی ہو!" طارق نے دِل ہی دِل میں میڈم چاندنی کو مخاطب کیا۔

"بس اب بہت ہو گیا!" طارق نے مضبوطی سے سوچا۔

❖❖○❖❖

ساتھیا بن ترے جییں کیسے
درد جو دے دیا سہیں کیسے
سرمئی سردیوں کی شامیں ہیں
پگلا من بس میں ہم کریں کیسے
کل تلک خواب تھے محبت کے
سپنے اب ہجر کے بُنیں کیسے
فاصلے مانگتے جدائی ہیں
ہم تجھے ہم سفر چنیں کیسے
آنکھ نم دِل پہ پہرہ یادوں کا
زخم ہوں گہرے تو سیئیں کیسے
مانا جاں بن ترے ہے جینا اب
جینے کا زہر پئیں کیسے

تم بن جئیں کیسے؟؟

مُسکان خالی کاغذ پر آڑھی ٹیڑھی پنسل سے لکیریں کھینچ رہی تھی اُس کی اپنی زندگی بھی تو اِن لائنوں ا طرح اُلجھی اور گھم گھتا ہوگئی تھی۔

"مسکان" آپا امّاں کی نحیف آواز اُس کے کھوئے ہوئے وجود کو ایک دم چونکا گئی۔

"جی اماں جان۔" وہ آگے بڑھ کر پوچھنے لگی۔

آپا امّاں کا بی پی خطرناک حد تک ہائی رہنے لگا تھا۔ کتنے ہی دِن تو اُن کو ہسپتال میں رکھا گیا تھا، ا اُن کو گھر میں شفٹ کردیا گیا تھا۔ مسکان آپا امّاں کا سایہ بنی رہتی تھی، کہیں کہیں اُس کے دِل میں تھا یہ سب کچھ اُس کی وجہ سے ہوا تھا۔ وہ اپنی زندگی کو بے معنی جان کر بے قدرا کر کے تباہ کرنے جارہی تھی ا یہ آپا امّاں کو بالکل برداشت نہ ہوا تھا۔

"تم نے یہ کیا کیا؟" آپا امّاں کو بے حد پچھتاوا ہورہا تھا کہ کاش وہ مسکان کو اِس غلط فیصلے سے بچا سکتیں۔

کتنے نازوں سے اُسے پالا تھا۔ ہمیشہ دنیا کی ہر اچھی چیز اُسے دِلائی تھی اور جب زندگی کا اتنا اہم فیصلہ سر پر آیا تو اُس نے کھوٹے سکوں سے اپنی جھولی بھرلی۔

"یہ میری قسمت تھی! جب میں اپنی قسمت کو نہ بدل سکی تو کوئی بھی کیا کرلیتا۔ میری وجہ سے آپ بابا سائیں کی دشمنی مول لے لیتیں لیکن پھر بھی ہم کہاں اُن سے بچ پاتے؟ آپ جانتی ہیں کہ بابا سائیں کی اپروچ کس قدر ہے ہم اگر یہاں سے بھاگ بھی جاتے تو بھی بیچ راستے میں دھرلیے جاتے۔ کیا فائدہ تھا ایسی دوڑ کا، پھر میں کس کے لیے یہ کرتی؟ جس کو میں چاہتی تھی، جب وہ ہی نہ ملا تو کوئی بھی سہی!" مسکان نے بے حد گہری سانس بھری۔

"مسکان! تم نہیں جانتی کہ تم نے ضد میں آکر کس قدر بڑی بھول کرڈالی ہے، تم نے اپنی زندگی کی بے حد ناقدری کی ہے! ارے تم نہیں جانتیں کہ اس زندگی کے لیے میں نے کتنوں کو تڑپتے سسکتے دیکھا۔" آپا امّاں کی آنکھوں میں کچھ درد بھرے مناظر ایک دم ہی سے آگے آگئے۔

سدرہ بی بی کس قدر تڑپی تھی، کاش وہ زندہ رہ جاتی!

صائمہ بی بی، عائشہ بی بی سب نے جوانی میں موت کا مزہ چکھ لیا تھا۔

"آپا امّاں پلیز! میرا دِل اس قدر ٹوٹا ہوا ہے کہ مجھے اب مزید کوئی دُکھ، دُکھ نہیں لگتا۔"

"تم نے سید سرفراز کی بات مان کر بہت بُرا کیا۔"

"اُن کا نام نہ لیں، میں نہ اُن کا نام سننا چاہتی ہوں اور نہ ہی اُن کی شکل دیکھنا چاہتی ہوں!" مسکان نے بے حد نفرت سے کہا۔

باہر کھڑے سید سرفراز ایک دم لرز گئے، اُن کی پیاری بیٹی اُن سے نفرت کرنے لگی تھی۔

"ہی واز مائی آئیڈیل! ہی واز مائی فرسٹ لو!" لیکن انہوں نے مجھے دھوکا دیا! انہوں نے مجھے اُڑنے کے لیے پہلے آسمان دیا اور پھر ایک دم میرے پر کاٹ لیے۔" مسکان نے اپنے دونوں بازو لپیٹ کر سسکی بھری۔

"کیوں آپا امّاں! پہلے وہ اتنے اچھے کیوں بنے؟ کیوں مجھے تعلیم دلوائی ساری برادری سے جھگڑ کر! اگر مجھے پڑھانا ہی تھا تو مجھے اِسی گاؤں میں پڑھا دیتے، کسی عام سے کالج سے بی اے کروادیتے، کیا ضروری تھا کہ مجھے شہر کے اسکولوں اور اعلیٰ کالج میں تعلیم دلائی جاتی، پھر مجھے کو ایجوکیشن میں پڑھنے یونیورسٹی بھیج دیا۔ میں نے جب ہر طرح کی آزادی اور بڑے وژن کو محسوس کرلیا تو وہ ایک بار پھر مجھے واپس حویلی لے آئے اور اِس چار دیواری میں لاکر بند کردیا۔ اگر سید اظہر سے میری شادی کروا کر انہوں نے مجھ پر بڑا ظلم کیا ہے تو اُس سے بڑا ظلم انہوں نے مجھے اِس چار دیواری کے باہر دنیا دکھا کر کیا ہے۔ بلی کو اگر دودھ پر ہی رکھنا ہو تو اُسے کبھی گوشت نہیں کھلانا چاہیے۔" مسکان پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

"لوگ اپنے جانوروں تک کی نفسیات کا اتنا خیال کرتے ہیں ایک میرا باپ ہے، جس نے میرے ساتھ کسی کھلونے کی طرح کھیلا، کیوں، کیوں مجھے باہر نکالا، کیوں؟ اگر یہ چار دیواری ہی ہمارا مقدر ہے تو انہوں نے خود کو اچھا ثابت کرنے کے لیے میرے ساتھ ہی کیوں یہ گیم کھیلا؟ وہ ایک ظالم کھلاڑی ہیں۔" مسکان اپنی نفرت اُگل رہی تھی۔

"آئی ہیٹ ہم۔"

اور سید سرفراز کے اندر جاتے قدم ایک دم سے رک گئے، اپنے پاؤں اُن کو اِس قدر وزنی محسوس ہورہے تھے کہ انہیں واپس مڑنا بھی بے حد مشکل لگ رہا تھا۔ زندگی میں انہوں نے بہت سی عورتوں، لڑکیوں کی آنکھوں میں ڈر، خوف اور نفرت دیکھی تھی، اُن کو یہ سب بہت مزہ دیتا تھا لیکن آج پہلی بار اُن کو یہ سب بہت بُرا لگ رہا تھا، اتنا بُرا کہ برداشت بھی نہ ہورہا تھا۔ اگر انہوں نے آج تک کسی کو محبت جیسا جذبہ دیا تھا تو وہ صرف مسکان کا وجود تھا۔ اور اُن کی محبت بھی اُن کی بے وفائی اور ظلم کی طرح نکلے گی وہ نہ جانتے تھے۔

بعض لوگ خالی کنویں ہوتے ہیں جتنا بھی بانس ڈالو وہاں سے پانی نہیں نکلتا۔

"آئی ہیٹ ہم" سید سرفراز کے کانوں میں گرم سیسہ پگھل پگھل کر گر رہا تھا۔

❖❖○❖❖

"بابا سائیں! پلیز آپ بیٹھ جائیں!" ولی نے مسلسل ٹہلتے ہوئے احمد شاہ سے کہا۔

"نہیں بیٹا! میرے دِل کو سکون نہیں ہے۔" احمد شاہ نے بے چینی سے کہا۔

"پلیز بابا سائیں! کہیں آپ بیمار نہ پڑ جائیں۔" ولی کو ہر چیز سے زیادہ اپنے باپ کی فکر تھی۔

"میرا دوست اندر بنا کسی قصور کے اپنی سزا بھگت رہا ہے میں کیسے سکون سے بیٹھ جاؤں؟" احمد شاہ نے بے چینی سے کہا۔

"آخر شہباز انکل کو کیا ٹینشن ہے جو اُن کو اتنی جلدی جلدی دو ہارٹ اٹیک ہوئے۔" ولی نے اپنے باپ کے فکرمند چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میرا خیال ہے وقت آگیا ہے کہ ہم شہباز کے راستے کے کانٹے چنیں، یہ ہمارا اخلاقی فرض بھی بنتا ہے۔" احمد شاہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"میں سمجھا نہیں بابا سائیں؟" ولی نے پوچھا۔

"بیٹا! میرا دوست ایک بہت معصوم انسان ہے، اُس نے اپنی بیوی کو بہت پیار دیا، اُن کا گھرانہ ایک مثالی گھرانہ تھا۔ شہباز کی بیوی سارہ ایک جذباتی لڑکی تھی۔ شہباز اُن کا پھوپھو زاد تھا، سارہ بھابی کے والد صاحب نے شہباز کی پرورش کی، لکھایا پڑھایا، وہ چاہتے تھے کہ شہباز ہمیشہ اُن کے ساتھ رہے، انہوں نے اپنی دونوں بیٹیوں سارہ اور نیلوفر کے رشتے شہباز کے سامنے رکھے تاکہ وہ اُن سے ہمیشہ جُڑا رہے، شہباز نے چھوٹی بہن سارہ کا رشتہ قبول کرلیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ نیلوفر جس کو وہ اپنی بہت اچھی بہن اور دوست کا درجہ دیتا تھا وہ دِل ہی دِل میں اُسے پسند کرتی تھی، شہباز کے سارہ کے رشتے کو قبول کرنے اور اُس کو انکار کرنے پر اپنا عزت کا مسئلہ بنالیا۔ اُسے اپنی انسلٹ محسوس ہوئی اور اُس نے اپنی انسلٹ کا بدلہ شہباز سے اس طرح لیا کہ اپنی بہن کو اُسی سے متنفر کرنا شروع کردیا۔ اُن دونوں کے بیچ روز نئی غلط فہمی پیدا کرنی شروع کردی۔ دھیرے دھیرے سارہ کی بدگمانی کی دیواریں اِس قدر اونچی ہوگئیں کہ اُن کو شہباز علی اور اُس کی محبت دکھائی دینا بند ہوگئی۔ یوں نیلوفر اپنی چال میں کامیاب ہوگئی اور اُن دونوں کی ازدواجی زندگی ناکام ہوگئی۔ شہباز مایوس ہوکر کچھ عرصے کے لیے باہر چلا گیا اور نیلوفر نے اپنا آخری وار بھی کر ڈالا اور اُن دونوں کی غلط فہمیوں اور جدائی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُن میں طلاق کرواکر اُن میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدائی ڈال دی!" احمد شاہ نے ایک طویل تھکن بھری سانس لی۔

"اُس ظالم عورت نے اپنی انا کی خاطر دو معصوم لوگوں اور ان کے دو معصوم بچوں کی زندگی تباہ کر ڈالی۔" دھیرے دھیرے جھوٹی چالوں اور سازشوں پر سے جب پردہ اُٹھا تو سارہ کو پچھتاووں نے گھیرلیا، اُسے اپنی حماقتوں اور اپنی بہن پر بے حد غصّہ آیا کہ اُس نے کیوں نہ شہباز علی کی بات سُنی اور اِس طرح اپنے پچھتاوے اُس کی جان لے گئے۔ اِس ساری کشمکش میں شہباز کو اُس کے بچوں سے کبھی ملنے نہ دیا گیا۔ شروع میں وہ سارہ کی وجہ سے بچوں سے نہیں ملتا تھا کہ عدم تحفظ کا شکار نہ ہوجائے لیکن بعد میں وہ ہر ممکن کوشش میں رہا کہ نیلوفر اُسے اُس کے بچوں سے ملنے دے لیکن اُس عورت نے انتقام کی آگ میں اُس کے بچوں کو نا صرف دور رکھا بلکہ انہیں بدگمان بھی کر دیا۔" احمد شاہ اتنی طویل بات کرکے شاید تھک سے گئے تھے، اِس لیے چپ سے ہوگئے۔

"لیکن بابا سائیں! آپ مجھے کیوں یہ سب کچھ اتنی وضاحت سے سنا رہے ہیں؟" ولی کی حیرت بجا تھی۔

"اِس لیے کہ تمہارا بھی شہباز سے رشتہ ہے اور تم اُس کی مدد کرسکتے ہو۔"

"مطلب؟ میں سمجھا نہیں، میرا اُن سے کیسا رشتہ؟ اور اور میں اُن کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟"

"شہباز علی کے بیٹے کا نام طارق ہے اور بیٹی کا نام سائرہ!" احمد شاہ نے انکشاف کیا۔

"کیا؟" ولی واقعتاً بے حد حیران ہوا تھا۔

"طارق اور سائرہ تو ہمیشہ یہ ہی بتاتے آئے ہیں کہ اُن کے والدین حیات نہیں ہیں۔" ولی نے بے حد تاسف سے کہا۔

"اِس میں اُن کا قصور نہیں ہے، یہ سب کچھ وہ تھا جو اُن کو بتایا گیا تھا۔" احمد شاہ نے بیٹے کو تسلی دی، آخر طارق اُس کا بے حد عزیز دوست تھا۔

"اوہ!" ولی نے گہری سانس بھری۔

"اب؟" ولی نے سوالیہ نگاہوں سے باپ کو دیکھا۔

"اب یہ کہ تم طارق اور سائرہ کو بھی بلالو۔ میں طارق کو ساری سچائی بتا چکا ہوں لیکن جانے کیوں وہ اپنے باپ کا سامنا کرنے میں ہچکچا رہا ہے، تم اُس کو بہتر طریقے سے سمجھا سکو گے، جاؤ کہیں وقت اُن سے اپنے باپ سے ملنے کی مہلت نہ چھین لے۔" احمد شاہ نے ولی کو بھیجا۔

"نہیں بابا سائیں! انشاء اللہ سب اچھا ہوگا۔" ولی نے باپ کو تسلی دی۔

"اللہ کرے!" احمد شاہ نے دعائیہ انداز میں کہا۔

❖❖○❖❖

"آپ لوگوں نے میرے ساتھ بے حد زیادتی کی ہے۔" منزہ بے حد ناراض تھی۔

"بیٹا! کیا تم اپنی بہن کی منگنی پر ناخوش ہو؟" حُسن آرا بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

"ہونہہ منگنی!" منزہ کا خوب صورت چہرہ غصّے سے عجیب وغریب ہوگیا تھا۔

آپ نے ہمیشہ علیزے کو سب سے زیادہ پیار کیا اور آج جب اِس رشتے پر پہلا حق میرا تھا تو آپ نے ایک بار پھر علیزے کو مجھ پر اہمیت دی۔" منزہ کے شکوے بے شک خود ساختہ تھے۔ بھلا کوئی ماں اپنی اولاد میں بھی فرق کرسکتی ہے۔

"تم کو میں ایک بار پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ آپا نے علیزے کا رشتہ اپنے منہ سے مانگا تھا۔ اِس میں ہمارا دخل نہیں ہے۔" حُسن آرا بیگم بلاوجہ صفائیاں پیش کررہی تھیں۔

"میں سب کچھ تباہ کردوں گی!" منزہ دروازے کو ٹھوکر مار کر باہر نکل گئی۔

"منزہ!" حسن آرا بیگم نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا۔ اِس لڑکی کے تیور اچھے نہیں ہیں خدانخواستہ واقعتاً کوئی نقصان نہ کر بیٹھے۔" حسن آرا بیگم کو ایک دم سے پریشانی نے گھیرلیا۔

❖❖○❖❖

"طارق۔" ولی نے طارق کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے پکارا۔

وہ کتنی ہی دیر سے گم سم بیٹھا تھا، کمرے میں صرف سائرہ کی ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز آرہی تھی۔

"طارق!" ولی نے اُسے ایک بار پھر پکارا۔

"ہوں!" طارق جیسے گہری نیند سے چونکا۔

"لالہ! اگر ابو جی زندہ تھے تو آنی نے یہ سب کیوں کیا؟" سائرہ سسکی۔

آنی کی شخصیت کو انہوں نے ہمیشہ اتنے اونچے مقام پر رکھا تھا کہ خود طارق کو سچائی بتاتے تکلیف ہورہی تھی۔

"سائرہ، طارق! یہ وقت حساب کتاب کرنے کا نہیں، تم لوگ فوراً انکل کے پاس چلو، زندگی میں اِس قدر بے اعتباریاں دیکھنے والے شخص کا اس بار زندگی سے اعتبار اُٹھنے والا ہے۔ اگر تم لوگ چلو تو

ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے بیمار دِل میں مزید زندہ رہنے کی اُمنگ کو پاسکیں'' ولی نے دونوں کو اُٹھایا۔

''میرے، میرے ابو زندہ ہیں!'' تمام راستے سائرہ بے یقینی سے بس یہ ہی ایک جملہ بول کر کبھی ہنس دیتی اور کبھی رو دیتی۔

''جاؤ طارق! اُس گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دو!'' ولی نے آئی سی یو کے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر طارق سے کہا۔

طارق کی شدّت ضبط سے آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں وہ مرد تھا اور کبھی مرد بھی اپنے غم پر رویا کرتے ہیں، لیکن وہ ایک بیٹا بھی تو تھا جس کا دِل اپنے باپ کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہ رہا تھا۔

''ابو!'' سائرہ شہباز صاحب کے سرہانے کھڑی ہو کر سسکی۔ طارق اُن کی پائنتی پر کھڑا سر جھکائے بے حد خاموش تھا۔

ٹپ۔ٹپ! دو آنسو اُس کی آنکھوں سے نکل کر شہباز صاحب کے پیروں پر پڑے۔

''طارق!'' شہباز صاحب سارا وقت نیم بے ہوشی میں بس اُس کا ہی نام پکارتے رہے تھے۔

''ابو!'' طارق نے اپنا سر اُن کے پیروں پر گرا دیا۔

''کون، طارق!'' شہباز صاحب نے ایک دم آنکھیں کھول دیں۔ یہ خواب نہ تھا، حقیقت تھی۔ اُن کا بیٹا اُن کے سامنے کھڑا تھا۔

''یا اللہ! کیا یہ سچ ہے؟'' سائرہ کو بھی اپنے پاس کھڑے دیکھ کر انہوں نے بے یقینی سے دھیرے سے کہا۔ اُن کا دِل ایک دم اپنی رفتار سے تیز دھڑکنے لگا، مشین ایک دم بول اُٹھی۔

''پلیز مریض کے لیے یہ سب کچھ خطرناک ہے۔'' سسٹر نے ایک دم آگے بڑھ کر کہا۔ سائرہ نے سوالیہ نگاہوں سے بھائی کو دیکھا وہ کسی طور باہر جانے کو آمادہ نہ تھی۔

''سسٹر پلیز! میرے بچوں کو میرے پاس رہنے دو۔'' شہباز صاحب نے اٹک اٹک کر کہا۔

''دیکھیں! ابھی آپ کا اتنا بولنا اچھا نہیں ہے۔'' سسٹر نے سختی سے کہا۔

''سسٹر! ہم اِن سے زیادہ نہیں بولیں گے، پلیز دو منٹ ہمیں دے دیں۔'' طارق نے درخواست کی تو سسٹر وارن کر کے بُرے بُرے منہ بنا کر باہر چلی گئی۔

''ابو جی!'' سائرہ نے اُن کا ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگایا۔

''سائرہ، میری گڑیا۔'' شہباز صاحب نے اُس کے ہاتھ پر بوسہ لیا۔

''تم ہو بہو سارہ جیسی ہو!'' انہوں نے دِل ہی دِل میں اپنی بیٹی کو دیکھ کر کہا۔

''ابو جان!'' طارق اُن کی دوسری جانب آ کھڑا ہوا۔

''تم اپنے باپ سے اِس قدر ناراض ہو کہ سب جانتے ہوئے بھی اُسے مرا کہتے رہے۔'' شہباز صاحب کے لبوں پر آخر وہ شکوہ آ ہی گیا، جس کی وجہ سے اُن کی حالت آج اِس قدر خراب ہوئی تھی۔

''یہ درست ہے، میں پہلے کچھ فیصلہ نہ کر پا رہا تھا۔ مجھے معاف کر دیں ابو، انجانے میں، میں نے آپ کا بہت دِل دُکھایا ہے۔'' طارق نے اُن کے بے حد قریب آ کر کہا۔

''مجھے میری بچے مل گئے اب مجھے کسی سے اور زندگی سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔'' شہباز صاحب نے ل رُک کر کہا۔

بے شک انہیں بولنے میں دقت ہو رہی تھی لیکن وہ بے حد خوش تھے۔

''ابو جان! آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں پھر ہم ساتھ ساتھ رہیں گے۔'' سائرہ نے آنکھیں پونچھ رکہا۔

''ہاں گڑیا! اب تو میرا بھی دِل چاہتا ہے جینے کو، تم دونوں کے ساتھ اپنی زندگی کے دن گزارنے کو، ب میں جینا چاہتا ہوں طارق! میں بہت سارا جینا چاہتا ہوں!'' شہباز صاحب نے بہ مشکل مسکرا کر کہا ن کو بولنے، مسکرانے سب میں بے حد تکلیف کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

''دیکھا شہباز! میں نہ کہتا تھا کہ درخت آخر اپنی جڑوں کی ہی جانب جھکتا ہے۔'' احمد شاہ نے قریب کر کہا۔

''احمد! مجھے آج اِس قدر خوشیاں ملی ہیں کہ یوں لگتا ہے کہیں آج میں خوشی سے مر ہی نہ جاؤں۔'' ہباز صاحب کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر اُن کی کنپٹیوں میں جذب ہو گئے۔

''کیسی باتیں کرتے ہیں ابو، ابھی تو ہم مل کر بیٹھے تک نہیں اور آپ پھر جدائیوں کی بات کرنے لگے۔'' طارق نے تڑپ کر کہا۔

کس قدر ترسا تھا وہ اپنے اِس قیمتی رشتے کے لیے۔

''آپ پلیز فوراً کمرے سے باہر چلے جائیں، بڑے ڈاکٹر صاحب آ گئے تو آئی سی یو میں اتنے ندے جمع دیکھ کر مجھے تو نوکری سے فارغ کروا دیں گے۔'' سسٹر بڑبڑاتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

کمرے میں موجود ہر شخص کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ در آئی۔ سسٹر اگر عام طور پر اتنا چڑتی تو اید کوئی مائنڈ بھی کر لیتا لیکن یہاں سب اِس قدر خوش تھے کہ کسی نے کسی بات کا بُرا نہ منایا۔

''چلو بیٹا! اپنے باپ کو آرام کرنے دو۔'' احمد شاہ سب کو لیے باہر آ گئے۔

''لالہ! آنٹی نے ہم سے ہمارے باپ کو دُور رکھ کر بہت بڑا ظلم کیا ہے۔'' سائرہ نے باہر آ کر بے حد لگتے لہجے میں طارق سے کہا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو! اتنے دِنوں کا رُکا ہوا غصّہ طارق کے اندر پھر لاوا بن کر اُبلنے کو تیار تھا۔

''آنٹی کل پاکستان واپس آ رہی ہیں۔'' سائرہ نے کہا۔

''اِس بار اُن کو ہمارے ہر سوال کا جواب دینا ہوگا۔ کیا وہ ہماری نفرت کا جواب دے پائیں گی۔'' ائرہ کے دِل میں اُبال اُٹھ رہے تھے۔

''آنٹی! یہ آپ نے کیا کیا؟ آپ جو ہم دونوں کی آئیڈیل تھیں، آپ جو دنیا کی سب سے اچھی آنٹی یں میں نہیں جانتی تھی کہ آپ تو دنیا کی سب سے بُری آنٹی تھیں۔''

❖❖○❖❖

کاش!
ہم پیار نہیں

دل لگی ہی کرتے سجن
تجھ کو اِک خواب سمجھ کر ہی
بھلا دیتے مگر
ہم نے تو پیار کیا
تیرا یقیں یار کیا
کاش!
ہم خود کو فنا
اِس طرح نہ کرتے سجن
تجھ کو اِک بھول سمجھ کر ہی
بھلا دیتے مگر
جینا دُشوار کیا
ویری یہ سنسار کیا
کاش!
ہم تیری طرح
بے وفا ہی ہوتے سجن
تجھ کو اِک شام سمجھ کر ہی
بھلا دیتے مگر
کاش!
ہم پیار نہیں
دل لگی ہی کرتے سجن

اِس تحریر کے ساتھ ولی کی وہ کھوئی ہوئی چین بھی تھی، جس کو وہ کتنے ہی روز بہت بے قراری سے ڈھونڈتا رہا تھا۔ بچپن سے یہ چین لاکٹ اُس کے گلے میں تھے ان کے کھو جانے سے وہ اکثر ایک اُدھورا پن محسوس کرتا تھا۔

''یہ تحریر کس کی ہے؟'' ولی نے لفافے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا، یہ ڈاک کہاں سے آئی تھی، پھر ایک دم ولی بہت بے چینی سے اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ یہ خط مسکان کا تھا، ڈاک اسٹیمپ اُس کے گاؤں کی تھی۔

کتنی عجیب بات ہے نا کہ اِس گاؤں کا نام ہمیشہ مجھے بہت کشش لیے محسوس ہوتا ہے۔ شاید اس لیے کہ بابا جی کا گاؤں بھی وہیں قریب ہے! ولی نے اپنے دِل و دماغ کو اِدھر اُدھر لگانے کی کوشش کی لیکن بے سود، دو پُر شوق نگاہیں اُسے مسلسل ڈسٹرب کر رہی تھیں۔

''پاگل۔ احمق۔ دیوانی!'' ولی نے مسکان کو مخاطب کیا۔

''تم کسی قدر دان سے دِل لگاتیں، کیوں تم نے خالی تھالی سے آس لگالی کہ تم کو وہاں سے کھانے کو مل جائے گا۔'' ولی مسلسل بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔

اُس کی بے نیازی، اُس کا اسٹریٹ فارورڈ رویّہ اکثر لوگوں کو لگتا کہ وہ نہایت خود پرست ہے۔

''ہونہہ! کیا میں بے حس ہوں؟''

''وہ سائرہ اور ٹی ٹو تو مجھے سمجھتے ہی بے حس ہیں، لیکن میں تو اُس لڑکی کی زندگی برباد ہونے سے بچانا چاہتا تھا۔ لیکن اُس دیوانی نے تو خود پاگل پن کی انتہا کر ڈالی ہے اور میرا قصور نہ ہونے کے باوجود سارا قصور میرے سر آ پڑا ہے۔'' ولی نے بے اختیار ماتھا مسلا۔

ایک بار پھر دو پُر شوق نگاہیں اُس کے ذہن کے پردے پر لہرائیں، اِس بار اِن آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے، ولی کو بے حد دُکھ محسوس ہوا تھا اس نے ایک لمبی سانس بھری۔

''آئی ایم سوری!''

''آئی ایم رئیلی سوری مسکان!'' ولی نے لب بھینچ کر کہا۔ میں تم کو کبھی دُکھ نہ دینا چاہتا تھا اِس لیے ہمیشہ تم سے دور رہا، لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ یہ دوری ہی تمہارا دُکھ بن جائے گا، یہ دوری تمہارا پاگل پن بڑھا دے گی۔

''آئی ایم رئیلی سوری مسکان!'' میں چاہ کر بھی تمہاری چاہت کا قدر دان نہ بن سکا کیوں کہ اِس دِل کے آئینے پر تو کسی اور کا سراپا لہرا رہا تھا۔''

''تم! اے اچھی لڑکی! خود کو اذیت نہ دو اور مجھے معاف کر دو!'' ولی نے تحریر پر نگاہ ڈال کر بے حد دُکھ سے با آواز بلند کہا اور کاغذ طے لگا کر اپنی دراز میں رکھ دیا۔

حسیں میری چاہت کا انجام کردو
کہ تم نام اپنا میرے نام کردو
چرا لو مری ساری صبحوں کو اب کے
میرا ہر پہر اپنی ہر شام کردو

ولی نے دوسرا کاغذ بھی بے حد احتیاط سے بند کر کے پہلے کاغذ کے ساتھ رکھ دیا۔

دِل کی رگیں ٹوٹتی ہیں
یاد اتنا بھی کوئی نہ آئے

یہ تیسرا کاغذ تھا اور جس قدر بے قراری سے بھرا تھا ولی سے پکڑے رکھنا دُشوار ہو گیا تھا۔

''دیوانی!'' ولی کو تاسف نے آن گھیرا، وہ عورت ذات کا بے حد احترام کرتا تھا کسی لڑکی کے جذبات وہ کبھی بھی یوں پامال نہ کرنا چاہتا تھا۔

جو ہے لکھا دِل کی لکیر میں
میری سانس سے بھی قریب ہے
کروں کیسے پھر یہ یقین میں
کسی اور کا وہ نصیب ہے
بجھے کیسے دِل کی یہ پیاس بھی
گھڑے خشک ہیں تیری دید سے

میں لٹک رہی ہوں اُتار دے، ترا انتظار صلیب ہے

اُس میں مزید آگے پڑھنے کی ہمت نہ تھی، اُس نے باقی کاغذ بنا پڑھے ہی لپیٹ کر باقی کاغذوں کے ساتھ رکھ دیے۔ دِل پر ایک عجیب سا بوجھ تھا، جس کو وہ کوئی نام نہ دے پا رہا تھا۔ ولی نے بیڈ پر گر کر آنکھیں موندھ لیں۔ دو پُرشوق ذہین آنکھیں نمی سے بھری اُس کے سامنے تھیں۔

''آئی ایم ریئلی سوری مسکان! آئی کین فیل Sympathy (ہمدردی) فار یو لیکن آئی کانٹ لَو یو!''

''کہا جاتا ہے کہ چوٹی پر جگہ ہمیشہ خالی رہتی ہے!''

''کیوں؟''

''اِس لیے کہ جب نام ور افراد چوٹی تک پہنچتے ہیں تو وہ اِس کی بلندی کو اور بڑھا دیتے ہیں نئے مہم جُو کے لیے، نئے فاتح کے لیے بلندی منتظر رہتی ہے اِس لیے کہ کسی بھی کام میں حرف آخر کوئی نہیں ہے، آخری حرف ہمیشہ لکھا جانا ہوتا ہے!'' سر بٹ نے بہت سے مایوں چہروں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

تھیسز کی مارکنگ شروع ہو چکی تھی اور بہت سے طالب علم External ایگزامنر کے رویّے سے بُری طرح ڈِس کرِیج ہوئے تھے، خاص طور پر کچھ لڑکیاں وائیوا کے بعد با قاعدہ رونے بیٹھ گئی تھیں۔ سر بٹ بے حد قابل اور ذہین اُستاد تھے انہوں نے ساری عمر حوصلہ بانٹا تھا، وہ کیوں کر برداشت کرسکتے تھے کہ اُن کی کلاس ہمت ہار بیٹھے اور ایسے وقت میں جب وہ اپنی تعلیم کو مکمل کر کے عملی زندگی میں قدم رکھنے جارہے تھے۔ آج اگر وہ لوگ حوصلہ ہار جاتے تو ساری عمر کے لیے خود اعتمادی کو ہارنے والے تھے اور ایسا وہ ہونے نہیں دے سکتے تھے۔

''سر! میرے کام کا وہ سر عمر نے اِس قدر مذاق اڑایا کہ اور تو اور وہ کہہ رہے تھے کہ میں نے کاپی ورک کیا ہے!'' مہوش با قاعدہ سوں سوں کرتے رو پڑی۔

''گائز! آئی ڈونٹ وانٹ ٹو سی اے سنگل ٹیر! اب غور سے سنو، اگر تم میں سے کوئی لڑکی ملکہ جذبات بن کر نشو یا شبنم کی طرح آہیں بھرتے ہوئے روتی مجھے نظر آئی تو بلیومی میں وہ پہلا شخص ہوں گا، جو تمہارے نمبرز کاٹ لوں گا۔ انسان بنو، کیا چار سال تم نے سوتے گزارے ہیں کہ تم لوگ کچھ سیکھ ہی نہیں سکے۔ خبردار جو اب کوئی طالب علم مجھے اپنا کانفیڈنس لوز کرتا نظر آیا۔ تم لوگ نوجوان ہو، تم لوگوں کو زندگی کے سمندر میں مگرمچھوں جیسے ظالم چیلنج اور وہیل کی طرح منہ زور حالات کا سامنا کرنا ہوگا، تو کیا مرنے کے لیے خود کو اُن کے حوالے کردو گے؟ اگر تمہارے کام میں کوئی ویک پوائنٹ ہے تو مان لیا کہ تمہارے Skill میں کمی ہے، لیکن اِس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ تم لوگ کری ایٹو نہیں ہو، اپنے آپ کو اور اپنے کام کو بول کر ثابت کرو، اب وائیوا میں چوزوں کی طرح نحیف آواز میں چوں چوں کرتا مجھے کوئی نظر آیا تو اُس کی خیر نہیں۔ ارے یہ External ایگزامنر تو ہوتے ہی کنفیوز کرنے کے لیے ہیں پروا نہ کرو، بس خود کو ثابت کرو۔'' سر بٹ نے سب کی ہمت بڑھائی۔

جبران نے کہا تھا۔

"کوئی بہت بڑا ہنر رکھنا تو دور کی بات ہے اگر آپ بانسری کی اچھی تان اُٹھا لیتے ہیں، کرسی مرمت کرنے کا کام ہی دوسروں سے بہتر کر لیتے ہیں یا برتن پختہ کرنے کے بارے میں دوسروں سے زیادہ جانتے ہیں، اگر اور کچھ نہیں تو صحیح طریقے سے دُعا دینا ہی جانتے ہیں تو چاہے آپ جنگل میں بھی جا بسیں، ایک پگڈنڈی خود بخود آپ کی جھونپڑے تک پہنچ جائے گی۔"

"ایسی ہی ایک پگڈنڈی آپ لوگوں تک بھی پہنچ سکتی ہے، آپ کی بہترین کوشش پر کامیابی کا موڑ وے گھوم کر آپ کی طرف ہی آئے گا۔" سربٹ کے جملے مایوس اور نڈھال طالب علموں میں توانائی بن کر دوڑے، بہت سارے چہروں کی روشنی واپس آ گئی تھی۔

ولی نے اپنے اِرد گرد سب طالب علموں کو دیکھا، وہ نئے سرے سے پُر جوش ہو چکے تھے۔ ہر اچھی بات مومن کی میراث ہی تو ہوتی ہے، ولی نے بھی شدت سے خواہش کی کہ اُس کا وجود بھی سربٹ کی طرح ہمیشہ آسانیاں بانٹنے والا بنے۔

"اوہ ینگ مین مبارک۔" سربٹ کی نظر ولی پر پڑی تو وہ بہت گرم جوشی سے اُس سے ملے۔

ولی دھیمی سی مسکراہٹ لیے اُن کے پُر جوش چہرے کو دیکھ رہا تھا وہ اپنے طالب علموں کی خوشیاں بھی یوں سیلیبریٹ کرتے تھے، جیسے یہ اُن کی خود کی کامیابی ہو۔

"تھینکس سر!" ولی نے اُن کے گلے لگتے ہوئے کہا۔

"تم ہمیشہ میرا فخر رہے ہو، میں نے جتنا سکھایا تم نے اُس سے بڑھ کر دکھایا، یہاں پر تیس چالیس کی کلاس میں بمشکل دس پندرہ لوگ ہی اپنی فیلڈ میں کچھ کام کرتے ہیں اور اِن دس پندرہ لوگوں میں کوئی ایک طالب علم سالوں بعد ایسا آتا ہے جو کہ بورن آرٹسٹ ہوتا ہے، جس کو کچھ سکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے بلکہ ہمیں خود اُس کے کام سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔" سربٹ دھیرے دھیرے چلتے اپنے دفتر کی جانب جا رہے تھے اُن کا اپنا کمرہ بھی ایک ڈسپلے روم بنا رہتا تھا، وہ ہر وقت کچھ نیا تخلیق کرتے رہتے تھے۔

"سر! آپ کی باتیں میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں ہیں۔" ولی نے اُن کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تم کو کچھ کچھ اندازہ تو ہو ہی چکا ہوگا اپنے رزلٹ کا؟" سربٹ نے ایک دم اُس سے سوال کیا۔

"جی! لیکن جب تک رزلٹ سامنے نہیں آ جاتا، میں کیسے کچھ شیور ہو کر کہہ سکتا ہوں، پھر مصطفی کا کام بھی بے حد اچھا ہے، ہم میں مقابلہ تو ہمیشہ سے رہا ہے۔" ولی نے سچائی سے کہا۔

"وہ تو بالکل ٹھیک ہے مصطفی بہت محنتی ہے اس لیے آج وہ اِس مقام پر ہے کہ تمہارے بعد اگر کسی کا کام قابل تعریف ہے تو اُس کا ہے، لیکن مائی ڈیئر! محنتی آرٹسٹ اور بورن آرٹسٹ کی کامیابی میں ہمیشہ بہت فرق رہا ہے۔"

"بورن آرٹسٹ کے آئیڈیاز ہمیشہ اُسے کام میں یونیک اور زندہ رکھتے ہیں، جب کہ محنتی آرٹسٹ پر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ Saturation پر رُک جاتا ہے، وہ مزید کچھ نیا نہیں کر پاتا۔" سربٹ نے اپنا نظریہ پیش کیا۔

"اور تم کو میں ہمیشہ سے بتاتا آیا ہوں کہ تم ایک بورن آرٹسٹ ہو۔" سربٹ شاید جاتے جاتے کوئی بھی پردہ نہ رکھنا چاہتے تھے، اِس لیے وہ آج کھل کر اُس کی تعریف کر رہے تھے۔ سربٹ اُس کے سامنے کبھی تعریف نہ کرتے تھے تب شاید اُن کو خطرہ تھا کہ ولی تعریف سُن کر ایک ہی جگہ نہ ٹِک جائے، وہ اُس کے کام میں ہمیشہ امپروومنٹ کی گنجائش نکالتے آئے تھے، لیکن آج پہلی بار انہوں نے سب کچھ کھل کر کہا تھا۔

"سر! آپ کی محنت نے اِس ہیرے کو تراش کر قابل دید بنایا ہے، مجھے بھی یہ کہنے دیں۔" ولی نے الیکٹرک کیٹل کا بٹن دبا کر اپنی اور اُن کی چائے کا پانی گرم کرنے کے لیے رکھا، ولی اُن کا واحد بے تکلف طالب علم تھا، جو اُن کے کمرے میں گھنٹوں گزارتا تھا اور اُن کے ساتھ دوستوں کی طرح وقت گزارتا تھا۔

"ولی! میں تمہیں وقت سے پہلے ایک خبر دینا چاہتا ہوں اور میری وِش ہے کہ تم اِس موقعے کو ضرور حاصل کرو۔" سربٹ نے اُسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی سر۔" ولی نے اُن کی جانب متوجہ ہو کر پوچھا۔

"اگر تمہیں Distination کے ساتھ یہاں ٹیچنگ کی آفر ہو تو تم انکار نہ کرنا۔ میں جانتا ہوں تم ایک رئیس خاندان سے بی لونگ کرتے ہو، لیکن تمہاری ضرورت اِس ڈیپارٹمنٹ کو زیادہ ہے، کسی ایجنسی میں کام کر کے تم اپنے لیے ایک شاندار کیریئر بے شک بنا لو گے لیکن تمہارے جیسے آرٹسٹ کی ضرورت ہم سب کو ہے۔" آنے والے طالب علموں میں ایک اور ولی کو تلاش کرنے کے لیے سربٹ نے دھیرے دھیرے کہا۔

"سر۔" ولی سوچ میں پڑ گیا ابھی کل ہی تو بابا سائیں اُسے اُس کے دفتر لے کر گئے تھے۔ اُس کے آفس کو بنانے اور وہاں اسٹاف رکھنے تک انہوں نے ہر کام بے حد چاؤ سے کیا تھا۔

"سر! اگر ایسی بات ہے تو مجھے پہلے اپنے فادر سے ڈسکس کرنا ہوگی۔ میں کوئی بھی قدم اُن کی اجازت کے بغیر نہیں اُٹھانا چاہتا۔" ولی نے بے حد سچائی سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، تم اُن سے ضرور بات کرو لیکن میری خواہش کی سفارش کرتے ہوئے، میں تم کو یہاں اِس ڈیپارٹمنٹ کا حصّہ بنے دیکھنا چاہتا ہوں۔" سربٹ نے تمنا کی۔

"اگر اللہ کو ایسا منظور ہوا تو ضرور سر۔" ولی نے مسکرا کر کہا۔

❖❖❖○❖❖❖

"تم کالج نہیں گئیں چندا؟" آنی نے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

وہ صبح چار بجے کی فلائٹ سے واپس آئی تھیں اور آتے ہی اپنے کمرے میں گھس کر سو گئی تھیں اب دس بجے وہ نہا دھو کر آفس کے لیے تیار ناشتے کے لیے ٹیبل پر آئیں تو سائرہ کو وہاں اپنا انتظار کرتے دیکھ کر چونک گئیں۔

"نہیں آنی! میں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔" سائرہ نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"اوہ! میری لعل ڈول! میری جان میرے لیے ویٹ کر رہی تھی۔" آنی نے حسب عادت بے حساب

پیار دکھاتے ہوئے کہا۔

''آنی! ہمیں آپ سے کچھ پوچھنا ہے!'' صوفے پر بیٹھے طارق نے کہا۔

''اینی تھنگ اسپیشل؟ تگی کا تو کوئی پرابلم نہیں، میرا خیال ہے کہ ہمیں اتنی اچھی لڑکی کے لیے اتنا ڈیلے نہیں کرنا چاہیے، تم دونوں گھر میں میرا ویٹ کررہے ہو، کوئی بہت اہم بات ہے؟'' آنی گیس کرتی ہوئی طارق کے مقابل آبیٹھیں۔

''بولو جانو کیا مسئلہ ہے؟ اور یہ کیا ہے، کون جارہا ہے اور اِس قدر سامان؟ کس کا ہے یہ سامان؟'' آنی نے حیرت سے ڈھیروں سوال کرڈالے۔

''ہم جارہے ہیں آنی!'' سائرہ نے سامنے کے صوفے پر آکر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تم لوگوں کا کہیں سیر کا پروگرام ہے؟ لیکن چندا مجھے بتانا تو تھا تاکہ میں بھی تم لوگوں کو جوائن کرسکتی۔'' آنی نزاکت سے اپنے سرخی مائل شولڈر کٹ بالوں کو پیچھے کرتے ہوئے بولیں۔

''نہیں آنی! ہم کہیں بھی سیر کرنے نہیں جارہے!'' سائرہ بے حد سنجیدگی سے بولی تو آنی پہلی بار بُری طرح چونکیں۔ انہوں نے سائرہ کو کبھی اِس قدر سنجیدہ اور طارق کو اِس قدر خاموش نہ دیکھا تھا۔

''آنی پلیز! آپ سے جو کچھ میں پوچھوں وہ سچ سچ بتایئے گا۔'' طارق کا دِل چیخ چیخ کر پکار رہا تھا کہ کاش اُس کے دونوں رشتے بچ جائیں، اگر اُن کو ایک رشتہ ملا تھا تو وہ دُوسرا رشتہ کھونے جارہے تھے۔

''طارق! یہ تم کس لہجے میں بات کررہے ہو؟'' نیلوفر نے حیرت سے پوچھا۔ اُن کے اندر کسی انہونی کا الارم بجنے لگا تھا۔ لیکن کیا؟

''آنی! کیا ہمارے ابو زندہ ہیں؟'' طارق سپاٹ لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

''یہ کیسا سوال ہے؟'' نیلوفر نے گھبرا کر غصّے سے پوچھا۔

''آنی! آئی ایم ٹاکنگ اباؤٹ مائی فادر۔'' طارق نے ایک دم کھڑے ہوکر کہا۔

''کیا تم نہیں جانتے؟'' آنی نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔

''نہیں!'' طارق نے اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''وہ سائرہ کی پیدائش پر تمہاری ماں کو طلاق دے کر چلے گئے تھے۔ تمہاری ماں اُن کی بے وفائی کے غم میں گھل گھل کر مرگئی۔ وہ شخص دراصل کسی عورت کے پیچھے تھا۔ جب وہ عورت اُس کو چھوڑ گئی تو وہ تم لوگوں کو لینے کا مطالبہ کرتا رہا لیکن ابا جی نے اُس کو تم لوگوں کی قیمت دے کر اُس کا منہ بند کردیا۔ ارے وہ تم لوگوں کا باپ تھا نہایت کم ظرف اور گھٹیا... اُس نے تم لوگوں کا سودا کیا، مرگیا کم بخت، بہت اچھا ہوا، نمک حرام!''

''بس آنی بس!'' طارق ایک دم چلایا۔ اُس کی آنکھوں میں جس طرح کی لالی تیر رہی تھی اُسے دیکھ کر نیلوفر کو کچھ دیر کو لگا کہ کوئی طوفان ہے، کوئی لاوا ہے جو اگر بہہ نکلا تو سب کو تباہ کرکے اپنے ساتھ بہا لے جائے گا۔

''آنی! آپ کے لفظ میرے ضبط کی حدود پار کرگئے ہیں، اب بس کریں۔'' طارق کے لہجے میں بے حد تاسف تھا، ایک مدت اُس نے اِس عورت کو ماں کی طرح چاہا تھا اب ایک دم وہ اتنے نیچے مقام پر

آ کھڑی ہوئی تھی، طارق سے اُس کا یہ مقام بھی برداشت نہ ہورہا تھا۔

''آنی! آپ سے آئندہ اگر محبت کرنا مشکل ہوگا تو اتنا ہی آپ سے نفرت کرنا بھی مشکل ہوگا! کیوں! کیوں آخر! آپ نے ایسا کیا؟ کیا کوئی عورت بھی بدلے اور انا کی آگ میں اتنی پاگل ہوسکتی ہے کہ وہ اُس آگ میں اپنی سگی بہن کی زندگی اور گھر کو آگ لگادے۔'' سائرہ کی آواز دُکھ سے پھٹنے لگی تھی۔

''میرے اللہ۔'' سائرہ نے روتے ہوئے ماتھا پکڑ کر سر جھکالیا۔

''میری ماں نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی، مجھے ہر وقت اپنی ماں کی کھوئی کھوئی شکل یاد آتی ہے کہ کیسے وہ گھنٹوں برگد تلے بیٹھ کر گیٹ کو دیکھتی رہتی تھی، ہوا کی سرسراہٹوں میں کسی کے قدموں کی آہٹ کو تلاش کرتی رہتی تھی۔ آپ کو اپنی بہن پر بھی ترس نہ آیا؟'' طارق کا چہرہ شدتِ ضبط سے سُرخ ہونے لگا تھا۔

''آپ میری ماں کی قاتل ہیں!'' سائرہ نے اُن کے سامنے کھڑے ہوکر کہا۔ آنی کا چہرہ ایک دم تاریک ہوگیا۔

''آپ نے ہمارا باپ جیتے جی چھین لیا، آپ دھوکے باز ہیں۔'' طارق نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

''آپ نے ہمیں والدین جیسے رشتے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم کردیا۔ آپ ایک ظالم عورت ہیں۔'' سائرہ مزید گویا ہوئی، آنی سے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا مشکل ہورہا تھا۔

''یہ کیا ہوا؟ وہ کیسے ایک پَل میں ہی بازی ہار گئیں۔''

''نہیں، نہیں! میں یہ بازی کبھی نہیں ہاروں گی، میں نے اِن بچوں کو اپنی زندگی کے قیمتی ترین سال دیے ہیں، یہ بچے مجھے کیوں کر چھوڑ کر جاسکتے ہیں۔'' اُن کے اندر سے کوئی بولا۔

''یہ سب جھوٹ ہے! تم لوگوں کو کس نے بہکایا ہے؟'' نیلوفر نے اپنا دشمن سوچا کہ کس نے اِس قدر دشمنی نبھائی ہے کہ اُن کی بنائی ہوئی دنیا کو تہس نہس کردیا۔

''آنی! آپ کو کیا لگتا ہے کہ ہم چھوٹے بچے ہیں جن کو کوئی لالی پاپ دے کر بہلا لے گا اور دھمکا کر بھگا دے گا۔'' سائرہ کا بس نہ چل رہا تھا کہ اِس عورت کو نوچ ڈالے، جس نے اُن کی ماں کی زندگی کی ہر خوشی حسد میں آکر نوچ ڈالی تھی۔

''طا۔ طارق جانو! تم۔ تم تو بہت سمجھ دار ہو، تم ہی سوچو میں بھلا ایسا کیوں کروں گی؟'' نیلوفر نے طارق کی جانب مُڑ کر کہا۔ جواباً طارق نے جن نگاہوں سے آنی کو دیکھا تھا وہ اندر تک لرز گئی تھیں اُن کی چلتی ہوئی زبان ایک دم سے رُک گئی۔

''آنی! شہباز علی ہی میرے ابو کا نام ہے نا؟''

''ہوں!'' نیلوفر نے سہمے سہمے انداز میں جواب دیا۔

''یا اللہ! یہ سب کیا ہے میں پندرہ دن کے لیے ملک سے باہر گئی تھی اور میرے پیچھے یہ سب!''

''ابو زندہ ہیں نا؟'' طارق نے بے حد دھیمے لہجے میں پوچھا۔ اُس کی آواز اِس قدر دھیمی تھی کہ نیلوفر بہ مشکل سُن پائیں۔

''طارق وہ۔'' نیلوفر کچھ اور کہنے جارہی تھیں۔

"آنی! ہاں یا نا!" طارق نے ٹھوس لہجے میں پوچھا۔

"وہ۔" نیلوفر منمنائیں، سب مہرے پٹ گئے تھے، نیلوفر کے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔

"آنی! ہاں یا نا؟" طارق کا لہجہ بے حد سرد تھا۔

نیلوفر کو اپنی ریڑھ کی ہڈی تک میں سنسناہٹ محسوس ہوئی، اُسے طارق اور سائرہ دور کنارے پر کھڑے نظر آئے۔

"ہاں!" آنی نے بے حد شکست خوردہ انداز میں جواب دیا۔

"آپ نے ہم سے جھوٹ بولا تھا۔" طارق کی آنکھوں میں ایک دم مرچیں بھر گئیں، اُس سے بولنا مشکل ہوگیا۔ دِل اتنا عرصہ اِس عورت کو بہت بڑے مقام پر بٹھاتا آیا تھا آج ایک دم سے وہ عورت اتنے اونچے قد سے نیچے آ گئی تھی، آنی کا سر جھک گیا تھا۔

"آنی آپ نے اچھا نہیں کیا!" سائرہ نے ایک دم اپنا شولڈر بیگ کندھے پر ڈالا۔

"میں آپ کی شکل اب کبھی دیکھنا نہیں چاہوں گی۔ لالہ میں گاڑی میں بیٹھتی ہوں، ڈرائیور کو باقی کا سامان اُٹھانے کے لیے بھیج رہی ہوں۔" سائرہ وہاں سے یوں بھاگی، جیسے اگر چند پل بھی ٹھہر جاتی تو شاید آکسیجن کی کمی سے اُس کا دم گھٹ جاتا۔

"تم! تم لوگ کہاں جارہے ہو؟" آنی نے ہراساں ہوکر پوچھا۔

"آپ کو چھوڑ کر کہیں بھی جارہے ہیں۔" طارق نے ایک ایک کر کے بیگ، اٹیچی کیس اُٹھا کر ملازم کو دیے۔

"اور ہاں! اِن بیگز میں ہمارے کپڑے، ہماری کتابیں اور ہماری ماں کی کچھ یادیں ہیں، آپ کی دی ہوئی ہر چیز سوائے اُن زخموں کے، جو آپ نے ہمیں دیے سب کچھ چھوڑ کر جارہے ہیں۔"

"یہ گھر نانا جان نے ہم دونوں بہن بھائی کے نام کیا تھا۔ یہ گھر اور فیکٹری کا آدھا حصہ سب میں نے اور سائرہ نے آپ کو دے دیا ہے۔ میں نے صرف فارم ہاؤس والا گھر اپنے پاس رکھا ہے کیوں کہ وہ گھر ماما کو بہت عزیز تھا۔" طارق سب حساب کھڑے کھڑے نمٹا رہا تھا، آنی کا دِل اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب رہا تھا۔

"طارق! یوں ہر تعلق تو توڑ کر نہ جاؤ۔ میں، میں تم لوگوں کے بغیر کیسے جیوں گی؟" نیلوفر نے دیوانوں کی طرح اُس کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔ طارق نے منہ موڑ لیا۔

"آنی! اب تو میرا دِل آپ کو آنی کہنے کو بھی نہیں چاہ رہا۔" طارق نے دُکھ سے کہا۔

"جو کچھ آپ نے کیا ہے ہم اُس کا بدلہ نہیں لے سکتے، بدلہ لے کر جو نقصان ہماری زندگیوں کا ہوا ہے اُس کی تلافی ہو بھی نہیں سکتی، لیکن ہم آپ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جارہے ہیں۔ یہ ہی آپ کی سزا ہے! اور یہ ہی ہمارا بدلہ!" طارق نے ایک دم اپنا ہاتھ اُن سے چھڑایا اور دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

"طا۔ طارق۔ طارق جانو! سُنو۔ سنو، رک جاؤ! تم اس طرح اپنی آنی کو چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔" نیلوفر چلائیں اور دوڑ کر آگے بڑھیں لیکن اپنی ہی ساڑی کے پلو میں اُن کا پاؤں اُلجھا تو وہ ایک دم لڑ

کھڑا گئیں۔

اُن کا غرور اُن کا تنفر جانے کہاں جا سویا تھا اِس وقت تو وہ کچھ کھو جانے کے ڈر سے ایک ڈری ہوئی عورت لگ رہی تھیں۔

"تم اپنی آنی کو کیسے چھوڑ کر جاسکتے ہو!" آنی رو دیں،

"اب اِس گھر میں ہمارا کوئی اپنا نہیں رہتا۔" طارق نے ایک دم مڑ کر کہا اور پھر تیزی سے شیشے کے دروازے کو دھکیلتا ہوا باہر نکل گیا۔

"طا.. طارق!" آنی کے لبوں سے سسکی نکلی، وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے جاتا دیکھتی رہیں۔

اُن کا پلو گر کر نیچے آ رہا تھا، بال ایک دم پریشان ہوکر اُن کے چہرے پر بکھر گئے تھے۔ ساری عمر جیتنے والی عورت آج ایک ہاری ہوئی عورت نظر آ رہی تھی۔ اُن کے وجود کا مضبوط قلعہ ایک دم مسمار ہوکر بکھر گیا تھا۔

پھر وہ ایک دم نیچے بیٹھتی چلی گئیں اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

❖❖○❖❖

پرندوں کو فضا میں
کون ہے جو تھام لیتا ہے
ابابیلوں سے ہاتھی مارنے کا
کام لیتا ہے
تھکے لوگوں کو شب بھر نیند سے آرام دیتا ہے
شب تاریک میں جو صبح کا پیغام دیتا ہے
زمیں پہ کوہساروں کی جو میخیں گاڑ دیتا ہے
وہی جھرنوں کے نغموں کے لیے
اِن پربتوں کو پھاڑ دیتا ہے
یہ کس نے آسماں کو بے ستوں تعمیر کر ڈالا
"کوئی تو ہے"
جو کالی رات کی تاریکیوں میں
اِک سیاہ پتھر پہ
کالے ناتواں کیڑے کو چلتا دیکھ لیتا ہے!

ترنم ساری رات شب بے داری کے بعد وہیں ڈریسنگ روم میں بچھی چادر پر لیٹی رہی، اُس کے چہرے پر سالوں بعد کچھ سکون نظر آ رہا تھا۔ اس کے اندر کی سائیں سائیں لحہ بہ لحہ کم ہورہی تھی۔ اُس نے بہت سارا عرصہ بھٹکتے اور پچھتاوے میں گزارا تھا، وہ دور بھی جہنم کی بدترین شکل تھا۔

اب اُسے راہ مل گئی تھی، جیسے جیسے وہ کفارے کی جانب بڑھ رہی تھی میڈم چاندنی اور راگنی کے لیے خطرہ بنتی جارہی تھی۔ بے شک سامنے موت ہے!

''اِس ساری بغاوت کی سزا بھیانک زندگی اور بھیانک موت ہے!'' کوئی اُس کے اندر بولتے ہوئے اُسے خوف زدہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''جس طرح کے دور سے میں گزر رہی ہوں، کیا اُس سے بھی بھیانک زندگی یا بھیانک موت ہوگی؟'' ترنم ہنستی چلی گئی، ہنستے ہنستے اُس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

''لیکن اے اللہ! اب کسی بات کا ڈر نہیں ہے تُو جو میرے ساتھ ہے!'' ترنم کے اندر اِس ساتھ کے احساس نے بہت اطمینان بھر دیا تھا۔ اُسی پل اُس کے موبائل پر ایک نمبر جگمگایا۔

ترنم کے چہرے پر بہت عجیب قسم کے تاثرات تھے۔

''جی؟'' ترنم کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

''آپ نے ہمارا کام کیا ہے، آپ بدلے میں ہم سے جو چاہتی تھیں، ہم نے وہ کام شروع کر دیا ہے لیکن آپ کے لیے ایک بُری خبر بھی ہے!'' طارق کی آواز بے حد سنجیدہ تھی۔

''جی۔!'' ترنم کا دل جیسے تیز دوڑتے دوڑتے ایک دم سے مدھم ہوگیا۔

''کیا؟'' وہ اتنا تو جانتی تھی کہ وہ جب بھی پیچھے مڑ کر دیکھے گی اُس کی پھیلائی تباہی سے سب کچھ تباہ ہو چکا ہوگا لیکن پھر بھی کوئی خوش گمانی تھی کہ شاید وہ اُن کے متعلق کوئی اچھی خبر سُن لے۔

''آپ کے والد صاحب کا دماغ کی شریان پھٹنے سے آج سے چار سال پہلے انتقال ہو چکا ہے۔''

''آہ!'' ترنم کی سِسکی بے اختیار تھی۔

''وہ نرم گرم، مضبوط آغوش! اُن کا شفقت بھرا لمس۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خواب ہوگیا تھا، آہ میں نے اپنی جنت کھودی۔'' آنسو اُس کے حلق میں گرنے لگے۔

''اور... اور امّاں؟'' وہ بُری طرح رودی۔

''اُن کا دماغی توازن بگڑ چکا تھا، اکثر وہ گھر سے نکل جاتی تھیں ایک دن ایسی نکلیں کہ پھر کبھی واپس نہ آسکیں ان کی گمشدگی سے اگلے ہی دن آپ کے والد کا انتقال ہوگیا تھا۔ وہ یہ دکھ برداشت نہ کر سکے تھے۔ گھر محلے داروں نے بند کر رکھا ہے ہم کوشش کر رہے ہیں کہ آپ کی والدہ کا پتا جلد از جلد لگ جائے۔'' وہ جانے اور کچھ بھی کہہ رہا تھا لیکن ترنم کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

''میری گڑیا!'' بابا کی آواز اُس کے اِردگرد خوشبو کی طرح پھیلی تھی۔

''آہ! میں نے کیسے ہیرے موتی جیسے لوگوں کو مٹی میں رول دیا۔'' پچھتاوے کے سانپ ایک بار پھر اُس کے گرد گھیرا تنگ کر رہے تھے۔

❖❖○❖❖

''مبارک ہو ولی بھائی!'' سائرہ نے ولی اور ٹی ٹو کے پاس آ کر کہا۔

''خیر مبارک!'' ولی نے نہایت خوش دلی سے کہا۔

''ارے کچھ مبارک باد کا حصہ ہمارے لیے بھی رکھ لیں، گو کہ اِن صاحب کے سامنے ہماری موم بتی بھی نہیں جلتی لیکن بہر حال حقیقت یہ ہے کہ معرکہ مسٹر عبدالولی نے نہیں بلکہ مسٹر افضل خان نے مارا

ہے۔'' ٹی ٹو حسبِ عادت بول رہا تھا۔

''ہیں؟ کون افضل خان؟'' سائرہ نے حیرت سے پوچھا۔

سائرہ کے سوال پر ولی کی ہنسی بے ساختہ تھی۔

''اُڑا لو... اُڑا لو میرا مذاق! خیر سے ٹاپ جو کر لیا ہے۔'' ٹی ٹو نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''ٹی ٹو کا نام افضل خان ہے!'' ولی نے وضاحت کی تو سائرہ کے منہ سے حیرت سے بے اختیار اوہ! نکلا تھا۔

''آپ کو بھی مبارک ہو، آپ بھی تو پاس آؤٹ ہوگئے ہیں۔'' سائرہ نے سادگی سے کہا۔

''ہاں بھئی ہمیں یہ ہی تو ہمیشہ خطرہ تھا کہ اگر کبھی ہم پاس ہوگئے تو کالج سے آؤٹ ہو جائیں گے، آخر میں یہی ہوا آپ سب نے مل کر مجھے میرے پیارے کالج اور یہاں کے دوستوں سے جُدا کر دیا۔'' ٹی ٹو باقاعدہ افسردہ تھا۔

''حیرت ہے کہ آپ پاس ہونے پر غمگین ہیں، میں نے پہلا بندہ دیکھا ہے، جس کے پاس ہونے پر یہ تاثرات ہیں۔'' سائرہ کی حیرت بجا تھی۔

''میں پاس ہونے پر نہیں بلکہ پاس ہو کر ''آؤٹ'' ہونے پر افسردہ ہوں۔''

''ارے شکر کیا ہوگا کالج والوں نے کب سے ایک سیٹ پر تم نے مسلسل قبضہ کیا ہوا تھا۔'' کاشف نے قریب آ کر گفتگو میں حصہ لیا۔

''اب تو کالج والے کہہ رہے تھے کہ بس ٹی ٹو کو امتحان میں بٹھانا ہے۔ چاہے یہ امتحان میں خالی پرچے دے یا ڈسپلے میں کچھ بھی نہ لگائے، لیکن اِس کو پاس کر دینا ہے بس اس کی حاضری ضروری ہے۔'' کاشف نے بتایا تو سب کے چہروں پر سوائے ٹی ٹو کے بے اختیار مسکراہٹ دَر آئی تھی۔

''خدا حافظ!''

''خدا حافظ اے پیارے کالج!'' ٹی ٹو نے دونوں بازو اُٹھا کر با آواز بلند کہا۔

کاشف، اسد، جواد، حامد، ریحان، منزہ، عائشہ، صائمہ، سدرہ، ہادیہ سب کے سب اُن کے گرد آ کھڑے ہوئے۔

''نہیں ایسی بات نہیں ہے، ہم تو روز مل سکتے ہیں اور ظاہر ہے ٹیلی فون پر بھی رابطہ رہے گا لیکن...''

''لیکن یوں ہر روز صبح صبح ملنا تو نہ ہوگا۔''

ایک جو پہلے آ جاتا تھا وہ سب کا انتظار کرتا تھا یہ خوشی کے دن، یہ دوستی کے دن، میری زندگی کی خوب صورت یاد بن کر رہیں گے۔'' منزہ نے جذب سے کہا۔

''کیا ساری لڑکیاں اتنی ہی جذباتی ہوتی ہیں؟'' ولی نے خوش دلی سے مسکرا کر پوچھا۔

''آپ کو یہ سوال کرنے کی ضرورت ویسے ہے تو نہیں!'' سائرہ کا لہجہ بے اختیار کاٹ دار ہوگیا تھا۔

''ایک لڑکی جو آپ کے لیے بے حد جذباتی تھی آپ نے اُس کے جذبات کے ساتھ کیا کیا؟ اُسے اُس اندھے کنویں میں سڑنے کے لیے اکیلا چھوڑ دیا۔'' سائرہ کی سرگوشی بے حد دھیمی تھی لیکن اُس کا بولا ہوا زہر ولی سُن اور محسوس کر سکتا تھا۔

ولی کے چہرے سے خوشی اور مسکراہٹ یوں غائب ہوئی جیسے کسی نے بلاٹنگ پیپر رکھ کر سب چوس لیا ہو۔

وہ بہت خاموشی سے وہاں سے ہٹ گیا۔

سائرہ کو اپنی بدسلوکی کا احساس ایک دم سے ہوا وہ تیزی سے ولی کے پیچھے بھاگی۔

”ولی بھائی!“ اُس نے پیچھے سے آواز لگائی۔

ولی رُکا ضرور تھا لیکن اُس نے مڑ کر نہ دیکھا۔

”آپ... آپ مائنڈ کر گئے؟“ سائرہ پھولی سانسوں کو ہموار کرنے لگی۔

”کیوں... کیا میں Stuff ٹوائے ہوں؟“ ولی واقعی بے حد غصے میں تھا۔

”آئی ایم سوری!“ سائرہ نے گہری سانس بھر کر کہا۔

”میں مسکان کو بے حد مِس کرتی ہوں اور جو کچھ اُس کے ساتھ ہوا میرا دِل کہیں نہ کہیں آپ کو اُس کا قصور وار ٹھہراتا ہے۔ اُس کے فادر نے ایک پرچھائی کی اُسے اتنی سزا دے دی کہ اُس کی زندگی تباہ ہوگئی!“

”اور... اور وہ پرچھائی آپ کی تھی۔“

”نہ وہ آپ کی اِس قدر بے نیازی سہتی نہ وہ آپ کی جانب اِس قدر اٹریکٹ ہوتی اور نہ آپ اُس کی زندگی کی خوشی بننے کے بجائے اُس کا روگ بنتے!“ سائرہ بے حد روہانسی ہو رہی تھی۔

”شی واز لائک مائی سسٹر!“

”میں اُس کو بہت مِس کرتی ہوں!“ سائرہ نے گہری طویل سانس بھری۔

”اگر... اگر میں آپ کو اپنی محبت میں کچھ کہہ جاتی ہوں تو یہ واقعی میرے بس میں نہیں ہے!“ سائرہ کی سیاہ آنکھوں سے دو آنسو ٹپکے۔

”وہ ہنستی مسکراتی گڑیا سی، چھوٹی چھوٹی باتوں پر پرجوش ہو جانے اور چھوٹے چھوٹے خواب رکھنے والی لڑکی یوں برباد ہو جائے گی، میں نے تو کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔“ ولی نے بے اختیار گہری سانس بھری۔

اُس کے دل میں مسکان کے دکھ پر بہت ساری ہمدردی ہمکی تھی۔

لیکن مسکان! وہ ضدی لڑکی، ولی سے ہمدردی نہیں اُس کا دل چاہتی تھی اور یہاں آ کر ولی خود کو بے بس محسوس کرتا تھا۔

”مجھے بھی بے حد دُکھ ہے لیکن یہ سچ ہے کہ ہم میں سے کوئی اُس کی مدد نہیں کر سکتا۔“

ولی کو محسوس ہوا کہ وہ سائرہ سے یہ کہہ کر جان نہیں چھڑا سکتا کہ اُس کا دِل مسکان کے لیے ویسے جذبات نہ رکھتا تھا، جیسے کہ مسکان اُس کے لیے رکھتی تھی۔

”او کے... میں چلتا ہوں، پھر ملاقات ہوگی۔“ ولی کہہ کر مڑا اور پھر ایک دم رُکا۔

”سائرہ تمہیں کچھ بتانا تھا۔“ وہ مسکرایا۔

”میں نے یہاں جوائن کرلیا ہے!“ ولی نے اُسے اطلاع دی۔

”اوہ ریئلی!“ سائرہ نے بے حد خوش دلی سے کہا۔ اُس کے روئے روئے چہرے پر مسکراہٹ بہت بھلی لگ رہی تھی۔ ولی نے آگے بڑھ کر اُس کا سر تھپتھپایا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ سائرہ اُسے دور جاتا دیکھتی رہی۔

اُسے ولی کے آس پاس مسکان کی خوشبو محسوس ہونے لگی تھی۔ اُس نے ولی کو اِس قدر چاہا تھا کہ مسکان، ولی کا حوالہ محسوس ہونے لگی تھی۔

اکثر پیار کرنے والے اپنے محبوب کے اندر جذب ہو کر خود اُس کی پرچھائی ہی تو لگنے لگتے ہیں۔

❖❖○❖❖

کٹھن ہے زندگی کتنی، سفر دُشوار کتنا ہے
کبھی پاؤں نہیں چلتے کبھی راستے نہیں ملتے
ہمارا ساتھ دے پائے کوئی ایسا نہیں ملتا
فقط ایسے گزراوں تو
یہ روز و شب نہیں کٹتے
یہ کٹتے تھے کبھی پہلے
مگر ہاں اب نہیں کٹتے
مجھے پھر بھی میرے مالک کوئی شکوہ نہیں تجھ سے
میں جاں پر کھیل سکتا ہوں میں ہر دُکھ جھیل سکتا ہوں
اگر تو آج ہی کر دے محبت ہم سفر میری

مُسکان ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی، اُس نے ولی کو خواب میں اپنے بے حد قریب دیکھا تھا۔

”یا اللہ!“ مسکان کو ایک دم اُچھو لگ گیا، سانس اٹکنے لگی۔

”یا اللہ!“ مسکان نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل سے گلاس اُٹھا کر پانی لبوں کو لگالیا۔

محبت میں عشق کی شدت اللہ جی نے ہر انسان میں رکھی ہے۔

انسان بہت بے خبر ہے، وہ جب انسان کے ساتھ اپنی ساری محبت خرچ کر دیتا ہے تو پھر یوں ہی خالی ہاتھ بے قرار ہو کر پھرتا ہے۔ محبت میں عشق کی شدت صرف اللہ جی کی ذات حق دار کو ہے!

”کیا ہوا بیٹا؟“ آپا اماں گھبرا کر کمرے میں داخل ہوئیں۔

”کچھ نہیں!“ مسکان نے بیزاری سے کہا۔ ملگجے کپڑے، اُلجھے بال وہ کس قدر بکھر گئی تھی۔

”میری جان! تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ ایسے تو تم مزید بیمار ہو جاؤ گی۔“ آپا اماں نے بے حد فکر مندی سے کہا۔

”ہنہ بیمار! کیا ہو جائے گا مجھے؟“

”بیمار ہوں، پھر مزید بیمار ہو جاؤں گی اور اِس کے بعد مر جاؤں گی، دی اینڈ۔“

”مسکان مسز اظہر کی اسٹوری کی دی اینڈ!“ مسکان نے کھوکھلا قہقہہ لگایا۔

”کیوں [illegible]؟“ آپا اماں [illegible] لگیں۔

''ایک آپ ہی ہیں، جس کو میری فکر ہے، میری پروا ہے! جو میرے اُجڑنے پر روتی ہیں، وہ جو میرا سگا باپ ہے اُسے تو کوئی پروا نہیں کہ میں جیوں یا مروں؟'' مسکان کے لہجے میں بے انتہا نفرت پھنکار رہی تھی۔

''وہ شہر بانو کو اگلے اتوار رخصت کروا کر لا رہا ہے!'' آپا امّاں نے سرد لہجے میں کہا۔

''تو؟ جب بلال کے ساتھ شہر بانو کا نکاح ہو ہی گیا ہے تو آخر اُس نے رخصت ہو کر ایک نہ ایک دن آنا ہی تھا۔'' مسکان نے لاپروائی سے کہا۔

اِک عجیب سی بے حسی اُس کی خود کی ذات کے لیے اُس پر طاری تھی۔

''شہر بانو اِس حویلی میں رخصت ہو کر آئے گی تو تمہیں اِس حویلی سے رخصت ہو کر جانا ہوگا!'' آپا امّاں نے آخر وہ بم دھماکا کر ڈالا، کمرے میں موجود نفوس کو اِس خبر نے چکنا چُور کر دیا تھا۔

لاکھ مسکان نے ضد میں آ کر نکاح کے لیے ہاں کر دی تھی لیکن رخصت ہو کر کسی کی بیوی بن کر اُس کے ساتھ رہنے کا تصور کس قدر لرزا دینے والا تھا۔ اُس کا پاپی دل تو ابھی تک ولی کے حصار سے نہ نکلا تھا۔ اُس کا دل اور اُس کا جسم سوائے ولی کے کسی کو قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔

سید اظہر!

عبدالولی! دونوں نام مکس ہو گئے تھے۔

مسکان کو ایک بار پھر زبردست قسم کا اُچھو لگا۔ وہ کھانستے کھانستے ادھ موئی ہو رہی تھی، آپا امّاں نے پانی کا گلاس اُس کے لبوں سے لگایا، کمر سہلائی لیکن مسکان کی حالت نہ سنبھلی۔

''سید اظہر کے ساتھ رخصتی کی خبر سے اِس کی یہ حالت ہو گئی ہے تو پھر آئندہ کیا ہوگا؟'' آپا امّاں نے ہاتھ میں پکڑے پانی کی جانب دیکھ کر سوچا۔

''اب اور کیا ہوگا؟''

''اب کون سی نئی قیامت منتظر ہے؟'' امّاں اندر سے کانپ گئی تھیں۔

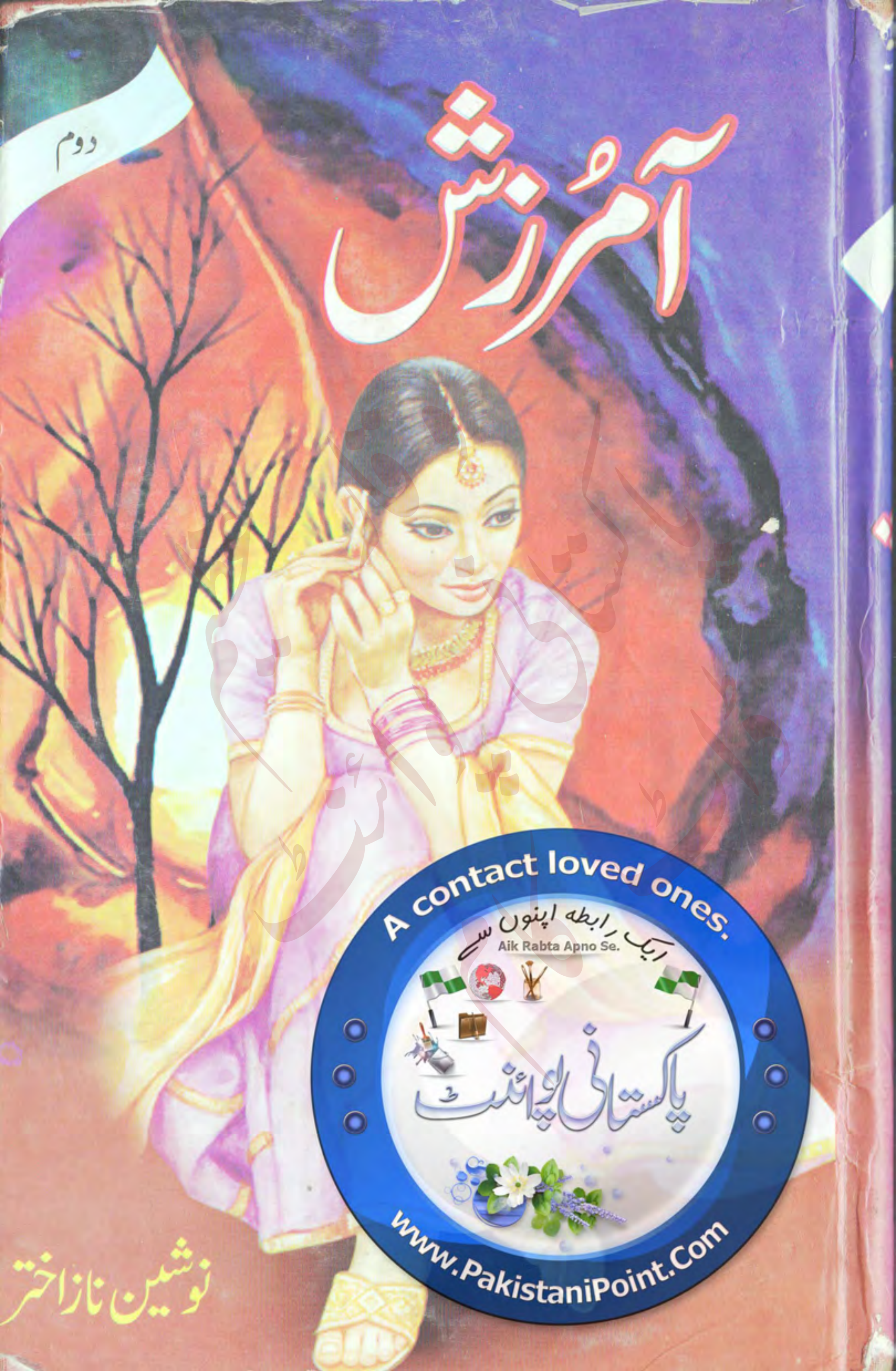

A contact loved ones.
ایک رابطہ اپنوں سے
Aik Rabta Apno Se.
پاکستانی پوائنٹ
www.PakistaniPoint.Com

آموزش

(دوئم)

نوشین ناز اختر

القریش پبلی کیشنز

سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور

فون 042-37668958 , 042-37652546

www.alquraish.com E.mail:info@alquraish.com

معیاری اور خوبصورت کتابیں

با اہتمام محمد علی قریشی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

بار اوّل 2010ء

مطبع .... نیئر اسد پریس لاہور

کمپوزنگ .... کلاسکس گرافکس

قیمت .... [redacted] روپے

سائرہ پریس میں اپنی ڈائی بنوا رہی تھی، جب اُسے گھر سے فون آیا۔

''صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں، وہ بہت گھبرائے ہوئے ہیں۔'' ملازم نے اطلاع دی۔

''یا اللہ خیر! میرے ابو کو صحت تندرستی دینا!'' سائرہ نے دعا کی، اُس کے چہرے کا رنگ ایک دم پھیکا پڑ گیا تھا۔

''اچھا تم فوراً ڈاکٹر گیلانی کو فون کرو اور پھر لالہ کو بھی بتاؤ، میں بس ابھی نکل رہی ہوں۔'' سائرہ سارا کام ادھورا چھوڑ کر تہہ خانے کی سیڑھیوں کی جانب بڑھی، کالج کا پرنٹنگ پریس تہ خانے میں تھا، سائرہ تیزی سے اوپر کو دوڑی۔

''لالہ، فون اٹھاؤ!'' سائرہ مسلسل طارق کا سیل نمبر ڈائل کر رہی تھی لیکن فون سوئچ آف مل رہا تھا سائرہ نے جلدی جلدی طارق کو پیغام سینڈ کیا۔

''ولی بھائی! پلیز لالہ کا پتا کریں ابو کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں!'' سائرہ نے ولی کا نمبر ملا کر کہا۔

''ٹھیک ہے میں پتا کرتا ہوں، تم فکر نہ کرو، تم کہاں ہو اس وقت؟'' ولی نے سوال کیا۔

''میں ابھی تو کالج سے نکل رہی ہوں، گھر پہنچنے میں آدھا گھنٹا تو ضرور لگ جائے گا۔'' سائرہ روہانسی ہو رہی تھی، باپ کا بیمار اور نقاہت بھرا چہرہ مسلسل اُس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔

''میں ابھی گھر سے نکلا ہوا ہوں، ٹھیک ہے میں سیدھا تمہارے گھر جا رہا ہوں۔'' ولی نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

گھر پہنچ کر سائرہ تقریباً دوڑتی ہوئی اندر بھاگی۔ یوں لگ رہا تھا کوئی بہت قیمتی چیز ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلے جا رہی ہو۔

سائرہ کو ڈاکٹر گیلانی ابو کے کمرے کے باہر ہی مل گئے۔ وہ بہت تیزی سے کمرے سے باہر نکلے تھے۔

''ڈاکٹر... ڈاکٹر صاحب کیا ہوا ابو کو؟'' سائرہ کی آواز شدتِ غم سے بیٹھ گئی تھی۔ اُسے بولنا دشوار ہو گیا تھا۔

''انہیں فوراً ہسپتال لے جانا پڑے گا میں نے ہسپتال فون کر دیا ہے ایمبولینس پہنچنے ہی والی ہو گی۔'' ڈاکٹر گیلانی کے منہ میں ابھی الفاظ ہی تھے کہ باہر ایمبولینس کے سائرن کی آواز سنائی دی۔

''جلدی کریں، آپ میں سے جس کو بھی ساتھ جانا ہے وہ فوراً آ جائے۔'' ڈاکٹر گیلانی کہہ کر شہباز صاحب کے کمرے کی جانب دوبارہ بڑھے۔

PAKISTANIPOINT

''ابو!'' سائرہ نے اُن کا ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگالیا۔

''تم کیوں فکر کرتی ہو!'' شہباز صاحب نے اٹک اٹک کر کہا۔

''ابھی تو میں بہت جیوں گا! ابھی تو... ابھی تو میں زندہ رہنا چاہتا ہوں تا کہ میں اپنے بچوں کے ساتھ رہ سکوں۔'' شہباز صاحب کے چہرے پر تکلیف با آسانی دیکھی جاسکتی تھی۔

''میں... میں زندہ... زندہ رہنا چاہتا ہوں تو موت کیوں آئے گی!'' شہباز صاحب کا تنفس بے حد تیزی سے چل رہا تھا۔

''آپ پلیز کم بولیں۔'' ڈاکٹر نے آکسیجن ماسک اُن کے منہ پر دوبارہ رکھتے ہوئے سختی سے ہدایت کی اور ساتھ ہی اُن کو انجکشن لگادیا، جس سے وہ غنودگی میں چلے گئے۔

''ہسپتال پہنچنے تک ان کا پُرسکون رہنا ضروری ہے۔ ویسے تو اب یہ انجکشن شاید ہی اِن پر اثر کرسکیں۔'' دوسری سیٹ پر بیٹھے ڈاکٹر کی بڑبڑاہٹ اتنی واضح تو ضرور تھی کہ سائرہ با آسانی سُن سکتی۔ وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو دی، ایمبولینس میں ساتھ بیٹھے ولی نے سائرہ کا سر تھپتھپایا، وہ خود نہیں جانتا تھا کہ اُسے کس طرح تسلی دے، باپ تو وہ رشتہ ہوتا ہے جس کا کوئی نعم البدل ہی نہیں۔ پھر انہوں نے یہ واحد رشتہ بھی تو کیسے تڑپ تڑپ کر حاصل کیا تھا۔

''بھائی! ابو ٹھیک تو ہوجائیں گے نا؟'' سائرہ نے اپنی روئی روئی سرخ آنکھیں اُٹھا کر سوال کیا۔

''انشاءاللہ!'' ولی نے اُسے پھر تسلی دی۔

اِنسان کتنا بے بس ہے وہ نہ تو اپنی مرضی سے اِس دنیا میں آتا ہے اور نہ ہی اپنی مرضی سے اِس دنیا میں ایک پل زیادہ رہ سکتا ہے۔

ولی نے فکرمندی سے شہباز انکل کا چہرہ دیکھا، جو چند منٹوں میں ہی ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا تھا۔

❖❖○❖❖

''اتنی دیر سے یہ لڑکی گھر آتی ہے! کسی دن اِس لڑکی کی یہ عادتیں میری جان لے کر ہی دم لیں گی۔'' حُسن آرا بیگم نے دروازے سے پلٹ کر کہا۔

وہ مسلسل دروازے کے چکر لگارہی تھیں، مغرب کا وقت کب کا نکل چکا تھا، منزہ گھر نہیں آئی تھی وہ بار بار گلی میں جاکر دیکھتی تھیں۔ اِسی پریشانی میں انہوں نے صرف تین رکعت سنت پڑھ کر جاء نماز لپیٹ دی۔

''یا باری تعالیٰ معاف کرنا، میرا دِل و دماغ تو کہیں اور ہی اٹکا ہوا ہے، یہ لڑکی آخر کہاں رہ گئی... ہر سُو اندھیرا اپھیل گیا ہے۔'' اُن کی فکر جوں جوں بڑھ رہی تھی اتنا ہی اُن کا سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔

''علیزے... علیزے۔'' انہوں نے گھبرا کر علیزے کو پکارا۔

''جی امی!'' علیزے گھبرا کر کمرے سے باہر نکلی وہ بھی ابھی نماز پڑھ کر ہٹی تھی۔

''علیزے! مجھے پانی پلاؤ، میرا دِل ڈوب رہا ہے۔''

''امی جی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' علیزے نے اُن کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا، اُن کا ماتھا بے حد ٹھنڈا تھا انہیں باقاعدہ ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔

''وہ... منزہ ابھی تک گھر نہیں لوٹی، اُس کے پارلر فون لگاؤ۔'' حُسن آرا پر جانے کس بات کی گھبراہٹ طاری تھی۔

''اچھا امی! میں ملاتی ہوں فون! لیکن پلیز خود کو سنبھالیے، بے وجہ فکر مند ہو رہی ہیں، منزہ آپی کوئی چھوٹی سی بچی تھوڑا ہی ہیں، جو راستہ بھول جائیں گی۔'' علیزے نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

''بچی ہی تو ہے۔ اور تم ٹھیک کہہ رہی ہو کہ وہ راستہ ہی تو بھٹک گئی ہے۔'' حُسن آرا بیگم نے بہت گہری بات کہی تھی۔

''تم نہیں دیکھتیں کہ وہ جس قسم کا لباس پہن کر گھر سے باہر نکلتی ہے وہ تو خود فتنہ ہے، اللہ میری نادان بچی کو اپنے حفظ و امان میں رکھنا، جانے کیوں میرا دل گھبرا رہا ہے، جیسے کچھ انہونی ہونے والی ہو۔'' حسن آرا بیگم نے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔

''اپنے ابو کا پتا کرو کہاں رہ گئے؟ ایک تو یہ شخص کبھی چھتنار نہ بن سکا، مجال ہے جو اِسے پیسے کے علاوہ کسی چیز سے سروکار ہو۔'' حُسن آرا بیگم تو پہلے سے بھری بیٹھی تھیں، اب باقاعدہ چھلک پڑی تھیں۔

''اِس گھر کے سارے ہی مرد بے حِس ہیں۔'' حُسن آرا بیگم با آواز بلند بولیں۔

''کاشف بھی اللہ جانے یونی ورسٹی کا بتا کر سارا سارا دن کہاں غائب رہتا ہے۔''

''امی کیا میں بھی بے حِس ہوں؟'' گڈو نے پریشانی میں پوچھا۔

اتنی پریشانی میں بھی حسن آرا اُس کی بات پر مسکرا دیں۔

وہ چھوٹا سا بچہ ذمّے داری کو محسوس کرکے خود کو مردوں میں شامل کرچکا تھا اور جن کا فرض تھا وہ جانے کہاں غائب تھے۔

''کیا ہوا؟ کیا کہا پارلر والوں نے؟'' حُسن آرا نے کمرے سے باہر آتی علیزے سے بے تابی سے سوال کیا۔

''وہ تو کہہ رہے ہیں کہ تین بجے اپنی چھٹی کے وقت یہاں سے جاچکی ہے، اب تو دوسری شفٹ والی لڑکیاں پارلر میں موجود ہیں۔'' علیزے خود بھی پریشان تھی۔

''علیزے! اُس کے ساتھ کام کرنے والی لڑکیوں کو فون کرو۔''

''امی! صرف سدرہ سے اُس کی دوستی ہے اور وہ خود گزشتہ ایک ماہ سے پارلر نہیں جارہی، اُس کا ایکسیڈنٹ جو ہوگیا تھا۔'' علیزے نے طویل سانس بھری۔

منزہ اُس کی سب سے ضدی بہن تھی، اللہ جانے وہ کہاں تھی اُس کی علیزے سے کبھی بھی نہیں بنی تھی، حقیقت میں وہ غصّے کی اِس قدر تیز تھی کہ اکثر اپنا نقصان کر بیٹھتی تھی۔ علیزے کی منگنی کے بعد علیزے سے اُس کی بول چال ختم ہوچکی تھی بلکہ گھر والوں کے ساتھ بھی اُس کا رابطہ بہت کم رہ گیا تھا۔ اکثر وہ اپنی من کی مرضی کرتی تھی۔ علیزے نے ایک نظر اپنی گھبرائی ہوئی ماں پر ڈالی اور دوسری نظر باہر پھیلتے اندھیرے پر! دونوں ہی گزرتے وقت کے ساتھ پَل پَل مزید تاریکی کی جانب بڑھ رہے تھے۔

اور علیزے یہ تو جانتی ہی نہ تھی کہ یہ اندھیرا، یہ تاریکی کہیں اور بھی کسی کی تقدیر پر جم رہی تھی۔

❖❖○❖❖

کمرے میں لمبی میز کے گرد آٹھ افراد بیٹھے تھے، سامنے پروجیکٹر پر طارق نے اِن افراد کو کچھ مواد دکھایا جو نہایت شرمناک تھا۔ کچھ پَل کی خاموشی کے بعد طارق نے اپنی پریزنٹیشن دوبارہ شروع کی۔ ڈائریکٹر صاحب آج خصوصی طور پر یہ میٹنگ اٹینڈ کرنے آئے تھے۔

''آج کل نئے منصوبوں کے لیے نئی لڑکیاں، نئے چہرے مختلف پارلر سے حاصل کیے جارہے ہیں۔'' طارق نے بے حد دُکھ سے کہا۔

''پارلر میں عام گھروں سے لے کر اچھے گھروں تک کی لڑکیاں کپڑوں سے بے نیاز ہوجاتی ہیں! آصف آپ اپنی رپورٹ پیش کریں۔'' طارق نے کہا۔

''مارکیٹ میں یہ وڈیو بالکل ایک نئی دلہن کی ہے ابھی چند روز پہلے وہ ایک مشہور پارلر میں دلہن پیکیج کے لیے گئی تھی، جس میں خواتین کو فل باڈی ویکس سے لے کر میک اپ وغیرہ دیا جاتا تھا اور نہایت کم ریٹ میں! جس کی وجہ سے بہت سی لڑکیاں اپنے سب سے خاص دن کے لیے بے حد خاص نظر آنے کی لالچ میں وہاں دوڑی جاتی تھیں۔''

''یاسمین نجمی! اس کی عمر بیس سال ہے، ایم اے معاشیات کی طالبہ تھی، گیارہ روز پہلے اس کی شادی ہوئی، جس پارلر سے وہ تیار ہوئی انہوں نے جی بھر کر اِس کے جسم کی تصاویر اُتاریں اور یہ سب کچھ سروس روم میں، دورانِ سروس ہوا۔ جس روز اِس کا نکاح تھا اِس کی فلم اور مختلف کلپس انٹرنیٹ اور موبائل نیٹ پر دے دیے گئے۔ دولہا کو اُس کے ہی کسی دوست نے وہ تصاویر دکھائیں تو دولہا نے نکاح کے آدھے گھنٹے بعد ہی سب کے سامنے دلہن کو طلاق دے دی۔ لڑکی کی ماں کو برین ہیمرج ہوا اور اب وہ کومے میں ہے۔ اُس کی زندگی، موت سے لڑ رہی ہے، لڑکی نے اگلے دو گھنٹوں میں ہی شادی ہال کی چھت سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرلی۔ یہ ساری فیملی ایک ہی دن میں برباد ہوگئی اور سب سے تکلیف دہ بات یہ ہے کہ اِن میں سے کوئی بھی اِس کیس کی پیروی نہیں کرنا چاہتا۔'' آصف نے پروجیکٹر آف کرکے لائٹس آن کردیں۔

''اللہ جانے ان لڑکیوں کی ماؤں کی عقلوں کو کیا ہوگیا ہے وہ اپنی بچیوں کے لیے محتاط کیوں نہیں ہیں۔'' امتیاز احمد نے کہا۔

وہ اُن کی ٹیم کا متحرک رکن اور بے حد اچھا صحافی بھی تھا۔ لڑکیاں ذرا سا بھی **Resist** نہیں کرتیں کہ ویکس، فیشل وغیرہ کے لیے پارلرز والوں کے گاؤن چینج روم میں جاکر پہننے کی کیا ضرورت ہے، گھر سے ہی لوز کپڑے پہن لیے جائیں تو بھی یہ مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔'' مس شازیہ نے کہا۔ یہ بھی اُن کی ٹیم کی نہایت ذہین رکن تھی اور ایک بڑی ایجنسی میں پی۔ آر۔ او کی پوسٹ پر کام کررہی تھی۔

''ٹھیک ہے مس شازیہ! احتیاط بھی اِس مسئلے کو حل کرنے میں مددگار ثابت ہوسکتی ہے لیکن کیا صرف احتیاط کافی ہے؟ اس سسٹم کو ہرصورت ختم کرنا ہوگا ورنہ کچھ محفوظ نہ رہ سکے گا۔'' رانا راشد علی نے کہا۔ وہ محکمہ تعلیم میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اُن سب کو فرنٹ اینڈ پر مختلف جابز کرنی پڑتی تھیں، اُن کی نوکری کا پہلا اصول تھا کہ اُن کی پہچان کو نہایت خفیہ رکھا جائے گا۔

''یہ تجربہ پہلے اسلام آباد میں وڈیو سینٹر اور نیٹ کیفیز پر کیا گیا، خفیہ کیمرے سے تصاویر بنا کرتی ہی

لڑکیوں کی زندگیوں سے کھیلا گیا، کم از کم چار لڑکیوں نے خودکشی کی تھی۔ تین کے گھر ٹوٹے، دو کے والدین نے خودکشی کی، جن میں اعلیٰ فوجی اور سول حکام شامل تھے۔ حکومتی مداخلت پر وڈیو سینٹرز کے کمروں کی دیواریں چھوٹی تو ہوئیں، کچھ ڈر کے مارے باز آگئے۔ مگر یہ تو کسی نے سوچا ہی نہ تھا کہ شکاری، شکار کا دوسرا راستہ بھی نکال سکتے ہیں۔'' طارق نے اپنے ہاتھ میں پکڑا قلم زور سے ٹیبل پر پھینکتے ہوئے کہا۔

''بیوٹی پارلرز شکار کا آسان ذریعہ ثابت ہوئے۔ پہلے اپنی لڑکیاں بھجوادیں، وہ کمال بے نیازی سے یہ گاؤنز وغیرہ پہن لیتی تھیں، ان چینجنگ روم میں وہ اپنا لباس کیا بدلتی ہیں اُن کی تقدیر ہی بدل جاتی ہے! دو اینگلز سے کیمرے لگائے جاتے ہیں اور ان معصوم فرشتہ صفت حیادار لڑکیوں کے جسموں کی تصاویر بن جاتی ہیں، جن کو کبھی انسانی آنکھ نے بے لباس نہ دیکھا، اُن کی عزت پامال ہوجاتی ہے۔ یہی مناظر، شکاریوں کے لیے سب سے قیمتی ہوتے ہیں، وہ اُنھی کو دیکھ کر لڑکی کو گھیرنے کا فیصلہ کرتے پھر اس کے گرد گھیرا یوں تنگ کیا جاتا ہے کہ وہ محسوس بھی نہیں کرپاتی۔ کبھی دوستوں جیسی لڑکیوں کے ذریعے، کبھی بوائز کے ذریعے اور آخر میں اُنھی فلمز کے ذریعے! جب ایسا کیس ہوتا، لوگ شرم کے مارے چپ ہو جاتے، کس کو بتاتے اور کیا بتاتے؟

لوگ تو قانون کا دروازہ بھی کھٹکھٹانے کو تیار نہیں ہیں۔

''سب لوگوں کا کہنا ہے کہ نہ کوئی قانون نہ ضابطہ، نہ قانون کے محافظ کوئی بھی معصوموں اور بے چاریوں کے ساتھ نہیں ٹھہرتا۔ سبھی طاقتوروں، ظالموں اور شکاریوں کے ساتھ ذاتی اور لمحاتی فائدوں کی خاطر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ کچھ بک جاتے، کچھ جھک جاتے، کچھ مختلف ترغیباتی قیمت لے کر برباد ہونے والیوں کو کیس دبانے کا مشورہ دیتے ہیں۔'' طارق نے اپنی بات کو ایسے جملے پر ختم کیا کہ سب کے ہی دلوں میں کوئی نہ کوئی سوال اور اُس کا حل آیا تھا۔

طارق نے اپنے سامنے پڑی منرل واٹر کی چھوٹی سی بوتل سے پانی گلاس میں انڈیلا اور چند گھونٹ لیے، اِس دوران وہ اپنے خون کے چڑھاؤ کو نارمل کرنے میں کامیاب ہوچکا تھا۔

''آپ نے اِس مسئلے کے حل کے لیے ابھی تک کیا ہوم ورک کیا ہے؟'' ڈائریکٹر صاحب نے طویل سانس بھر کر سنجیدگی سے پوچھا۔

''سر! ہم نے کچھ لوگوں کے متعلق مضبوط، ٹھوس ثبوت حاصل کرلیے ہیں، ہمیں وارنٹ اور آپ کی اجازت درکار ہے۔''

ترنم نے ابھی حال ہی میں نہایت اہم ثبوت طارق کو پہنچائے تھے۔

''تمہارے خیال میں تم درست آدمی تک پہنچ گئے ہو؟''

''کون ہے بڑی مچھلی؟'' ڈائریکٹر صاحب نے سوال کیا۔

''سر! بڑی مچھلی تک تو ہاتھ نہیں پہنچا لیکن اُن لوگوں کے نہایت اہم کارکن اور اڈوں کی انفارمیشن مل چکی ہے۔ ہمارے پاس اِن کے خلاف بے حد اہم ثبوت موجود ہیں۔'' طارق آج ہرصورت ڈائریکٹر صاحب سے گرفتاری کے وارنٹ کی اجازت لے لینا چاہتا تھا۔ اس نے آج کی یہ ساری میٹنگ اور

پریزنٹیشن کا اہتمام کیا ہی اس لیے تھا کہ اُسے گرفتاری کے وارنٹ حاصل ہو جائیں۔

''تمہارا خیال ہے کہ تم اِن چند لوگوں کو پکڑ کر اُن بڑے مگرمچھوں تک رسائی حاصل کرلو گے؟'' ڈائریکٹر صاحب جس قدر خاموش طبع انسان تھے، اُسی قدر ذہین بھی تھے۔

طارق اُن کی باریک بینی اور دوراندیشی کا بے حد قائل تھا۔

''سر! ہم اگر ایک ایک کر کے بھی صفائی کا عمل شروع کر دیں تو ایک نہ ایک دن اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گے۔'' طارق نے بے حد جذبے سے کہا۔

''کیا تمہاری یہ چھوٹی موٹی صفائی بڑے گاربیج کو الرٹ نہیں کرے گی؟'' انہوں نے بے حد اہم نکتے کی جانب طارق کی توجہ دلائی۔

''سر! بے شک آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن ہمارے اِس آپریشن کے شروع ہونے سے وہ بوکھلا کر کئی غلطیاں اور کئی قدم اٹھائیں گے اور... اور ان کی بوکھلاہٹ ہی ہمارے لیے بہت سارے راستے کھولے گی۔'' طارق نے اُن کو کنوینس کرنے کی کوشش کی۔

''میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں، بے شک تم ایک بے حد ذہین اور قابل انسان ہو لیکن اکثر تمہارا جذبہ، تمہاری ذہانت پر حاوی ہو جاتا ہے اور ینگ مین! ہمارے شعبے میں غلطی کی گنجائش نہیں نکلتی۔'' ڈائریکٹر صاحب اُسے اجازت دینے میں تامل کر رہے تھے۔

''سر! مجھے اپنی نیت پر پورا یقین ہے اور میری نیت نیک ہے، مجھے امید ہے کہ اِس آپریشن سے ہمیں کئی راستے ملیں گے۔'' طارق نے اصرار کیا۔

''سر! ہماری بہو، بیٹیاں اور بہنیں پامال ہو رہی ہیں اور اُن کی پامالی کے ذریعے ہمارے نوجوانوں کو بے کار بنایا جا رہا ہے۔ یہ ہمارے ملک کی آئندہ نسل کے مستقبل کا سوال ہے۔''

''ٹھیک ہے ینگ مین! میں تمہیں فی الحال چند لوگوں کی گرفتاری کے وارنٹ ایشو کروا دیتا ہوں، باقی کچھ ایسے نام ہیں، جن کے لیے تمہیں اِس سے بھی ٹھوس ثبوت درکار ہوں گے۔ اگر تم موجودہ ثبوتوں کے ساتھ اِن کو پکڑ بھی لیتے ہو تو یہ شام تک باہر ہوں گے، تمہیں مزید جدوجہد کی ضرورت ہوگی۔''

''یس سر!' طارق نے الرٹ ہو کر کہا۔

''ابھی یہ چند نام چھوڑ کر میں باقی لوگوں کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کروا دیتا ہوں۔'' انہوں نے اپنا چشمہ اُتار کر کہا۔

''تھینک یو سر! انشاء اللہ آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔'' طارق نے بے حد سچائی سے کہا۔

''گڈ لک۔'' انہوں نے کہہ کر اپنی سیٹ سے اُٹھ کر طارق کا کندھا تھپتھپایا۔

''بے شک ہمارے ہاتھ کافی حد تک بندھے ہوئے ہیں لیکن ہم ہمت نہیں ہاریں گے۔ میرا تعاون ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گا۔'' انہوں نے بھرپور یقین دلایا۔

اگر لیڈر کا دِل صاف ہو تو ٹیم ہمیشہ کامیاب ہوتی ہے اور خوش قسمتی سے طارق کو اپنے باس بہت اچھے ملے تھے۔

''تھینک یو سر!'' طارق کے چہرے پر بہت پُرنور مسکراہٹ دَر آئی تھی، ہدف کے لیے سفر شروع ہو ہی

ایا تھا اور جب سفر شروع ہوتا ہے تو کچھ نہ کچھ راستہ کٹتا بھی ہے اور منزل ملتی بھی ہے۔

❖❖ ☾ ❖❖

''کہاں تھیں تم اتنی دیر سے؟'' علیزے نے منزہ سے دروازے سے ہی پوچھا، جب کہ منزہ بے حد گم سم تھی، اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

علیزے نے اُس کی خاموشی کو روز کی ناراضی جانا۔

''ٹھیک ہے تم مجھے نہ بتاؤ لیکن کم از کم امی کا خیال کر کے ایک فون ہی کر دیتیں۔'' علیزے نے اُس ے پیچھے چلتے ہوئے کہا۔ پہلی بار منزہ کی چال نہایت شکستہ تھی۔

''امی جی کی طبیعت اتنی خراب ہوگئی کہ انہیں ڈاکٹر کو دکھانا پڑا۔ ابھی ابھی ڈاکٹر امی کو سکون کا انجکشن ے کر گیا ہے، وہ نیند میں بھی بے حد پریشان تھیں، میں خود بے حد پریشان تھی۔'' علیزے نے اُسے کچھ احساس دلانے کی کوشش کی۔

منزہ نے مڑ کر کچھ نہ کہا وہ بے حد خاموش تھی۔

علیزے نے حیرت سے اُسے دیکھا، ورنہ تو وہ ایک جملے کے جواب میں دس جملے سنایا کرتی تھی۔

''تم ٹھیک ہو؟'' علیزے نے اسے اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں!'' منزہ نے پہلی بار کچھ کہا تھا۔

''تمہیں فون کرنا چاہیے تھا تم کہاں تھی؟'' علیزے نے اُس سے دوبارہ پوچھا۔

''میں، میرا سر بہت دُکھ رہا ہے، کیا میں کچھ دیر آرام کر سکتی ہوں؟'' منزہ نے بے حد دھیمے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے! کیا تمہیں کچھ کھانے کو چاہیے؟'' علیزے کا ہمدرد دل بہن کی بھوک کے لیے فکر مند ہوا۔

''ابھی نہیں!'' منزہ کہہ کر کمرے میں گھس گئی، جو اُن بہنوں کا مشترکہ کمرا تھا۔

''دیکھوں اگر امی اُٹھ گئی ہیں تو ان کو بتا دوں کہ اُن کی لاڈلی آ چکی ہے۔'' علیزے بڑبڑاتی ہوئی حسن آرا کے کمرے میں چلی گئی۔ حسن آرا بیگم انجکشن کے زیرِ اثر ابھی تک سو رہی تھیں اُن کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔

''منزہ تو گھر آ گئی ہے اور مزے سے آرام بھی کر رہی ہے، جانے امی کیوں آج اتنا گھبرا گھبرا کر منزہ ے لیے فکر مند تھیں۔'' علیزے امی کے پاس پڑی کرسی پر ڈھے نے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ گزشتہ کچھ ننٹوں کی فکر اور پریشانی سے اُس کے اعصاب بھی تھک گئے تھے۔

''میرے ابو کا، منزہ اور کاشف کا مزاج کتنا الگ ہے، امی ہمیشہ پریشان رہتی ہیں۔ کاش اِن لوگوں ے دلوں پر پڑے بے حسی کے تالے کھل جائیں!'' علیزے نے شدّت سے دُعا کی۔

❖❖ ◯ ❖❖

سارے دن کی مشقت کے بعد طارق تھک کر چُور ہو چکا تھا لیکن اُس کے لیے یہ ذہنی اور جسمانی تھکن کبھی بھی مسئلہ نہ رہی تھی۔ وہ ہر پل، ہر وقت کام کے لیے تیار رہتا تھا۔ اس نے کرسی سے سر ٹکایا ور ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا اور جیب سے موبائل نکال کر آن کیا۔ دوران میٹنگ اُس نے فون بند کر دیا تھا

پھر مسلسل کام کے دوران وہ فون آن کرنا بالکل ہی بھول گیا تھا، اب اُسے اچانک یاد آیا کہ فون مسلسل صبح سے بند پڑا ہے۔

فون آن کرتے ہی سامنے چوبیس میسج آئے ہوئے تھے، ابھی وہ اِن باکس کھول کر پیغامات پڑھنے ہی والا تھا کہ اسکرین پر ولی کا نمبر جگمگایا۔

''السلام علیکم! خیریت آج مہا کنجوس نے خود کیسے فون کرلیا؟' طارق نے نہایت ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔

''تم صبح سے فون کیوں نہیں اٹھا رہے تھے۔'' جواباً ولی کی آواز بے حد سنجیدہ تھی۔

''یار بہت کانفیڈینشل میٹنگ تھی۔'' طارق نے طویل تھکن بھری سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''اوہ... اچھا تم فوراً سروسز ہسپتال کے کارڈیالوجی کے شعبے میں پہنچو، میری ملاقات تم سے وہیں ہوگی۔''

''خیریت ہے نا، کس کو دل دے بیٹھے جناب؟'' طارق ابھی تک شوخی سے مخاطب تھا۔

''طارق! انکل شہباز ٹھیک نہیں ہیں، تم جلدی سے پہنچو۔'' ولی نے مزید گفتگو سے پہلے رابطہ ختم کردیا۔ طارق نے جلدی سے اپنا ریوالور اور موبائل پینٹ کی جیبوں میں رکھے، ریوالور کے لیے اُسے خاص طرح کا کیس اپنے شعبے سے ملتا تھا، جس میں وہ اِسے رکھ کر کمر سے لٹکا لیتا تھا۔

''سر! آپ جا رہے ہیں؟'' اس کے ماتحت نے اُسے پیچھے سے آواز دی۔

''ہاں... جلدی بولو کوئی کام تھا۔'' طارق نے بے حد عجلت سے پوچھا۔

''نو سر! آپ کے لیے کسی مِس سحرش کی والدہ کا فون مسلسل آرہا تھا اِس کے علاوہ آپ کے گھر سے بھی بہت بار کال آئی تھیں۔ مِس سحرش کی والدہ کا فون ہسپتال سے آیا تھا اُن کا ایکسیڈنٹ ہو چکا ہے اور وہ آپ سے بات کرنا چاہتی تھیں، وہاں کے ڈاکٹرز مسلسل آپ کو بلا رہے تھے۔'' ماتحت نے جلدی جلدی پیغام دیا۔

''کون سے ہسپتال میں؟'' طارق نے پوچھا۔

''سروسز ہسپتال کی ایمرجنسی میں۔'' ماتحت نے جواب دیا۔

''اوکے!'' طارق بہت تیزی سے باہر نکلا۔

''یا اللہ میرے ابو کو خیریت سے رکھنا۔'' ایک بیٹے کے تڑپتے ہوئے دِل نے شدت سے دُعا کی۔

❖❖○❖❖

''آپ؟'' سائرن نے پہلے حیرت سے آنی کو دیکھا پھر منہ موڑ لیا۔

''میری جان مجھے معاف کردو۔'' آنی گڑگڑائیں۔

جواباً سائرہ کو کچھ اور تو نہ سوجھا وہ ہسپتال کے کوریڈور میں بیٹھی تھی، وہاں سے اُٹھ کر باہر نکل گئی۔ نیلوفر نے طویل سانس خارج کی۔

''شہباز! میں تم کو جیتنے نہیں دوں گی، تم نے پَل بھر میں مجھ سے میرے بچے چھین لیے۔'' نیلوفر نے آئی سی یو کے باہر کھڑے ہوکر با آواز بلند کہا۔

شیشے کے اُس پار شہباز مختلف مشینوں سے جکڑا لیٹا تھا نیلوفر مسلسل اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُسی پل نیلوفر کو اکا کہ شہباز علی نے شاید آنکھیں کھولی تھیں، وہ فوراً اندر داخل ہوئیں۔

کمرے میں دوائیوں کی بُو اور مشینوں کا مدھم شور تھا۔

نیلوفر نے اِدھر اُدھر دیکھا، کمرے میں فی الحال کوئی نرس موجود نہ تھی۔

''شہباز۔'' نیلوفر نے شہباز علی کے قریب آکر انہیں پکارا۔

شہباز علی نے غنودگی میں آنکھیں کھولیں لیکن وہ سامنے کھڑے چہرے کو پہچان نہ پا رہے تھے۔ غنودگی ے ہر منظر دھندلا نظر آرہا تھا۔

''لیکن یہ آواز! انہوں نے کچھ سوچنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے وہ ایک بار پھر غنودگی میں چلے ائے۔''

''تم... تم نے مجھ سے سائرہ اور طارق کو جدا کیا۔ تم نے پہلے میری انسلٹ کی اور میرے پیار کو ٹھکرایا اور پھر سارہ سے شادی رچا کر میری مزید بے عزتی کی... تم نے میری جوانی، میری زندگی روگی کر کے تباہ کر ڈالی۔''

''تم... تم تو میرے بہت قصوروار ہو، میں نے تم دونوں کو ایک ساتھ رہنے نہ دیا۔ تم نے اگر مجھ سے ب کچھ چھینا تھا تو میں نے بھی تم سے تمہارا سب کچھ چھین لیا...''

''تمہارا سکون، خوشی، گھر بار، بیوی اور بچے.... یہاں تک تو حساب برابر تھا۔ لیکن اب تم پر زیادہ ساب نکلتا ہے! تم جانتے تھے کہ یہ بچے میری کمزوری، میری زندگی بن چکے تھے، تم نے میری زندگی ھین لی... تم نے سائرہ اور طارق کو چھین لیا۔'' وہ جنونی ہو رہی تھیں۔

''اب میں تم سے تمہاری زندگی چھین لوں گی اور تم کچھ کر بھی نہ سکو گے۔'' وہ ہذیانی لہجے میں ہنسیں، پھر نیلوفر بیگم نے ہاتھ بڑھا کر سامنے دیوار پر موجود آکسیجن سسٹم کا بٹن آف کردیا۔

اگلے ہی لمحے شہباز علی کا جسم جھٹکوں کی زد میں تھا۔ لمحہ لمحہ اُن کی سانسیں اُکھڑ رہی تھیں۔

❖❖○❖❖

''ہیلو!''

''جی... جی میں طارق بول رہا ہوں۔'' طارق ہسپتال کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

''آنٹی پلیز ابھی میں نہیں آسکتا، میرے فادر آئی سی یو میں ہیں اور میں اُن سے ہی ملنے جارہا وں۔'' طارق نے زچ ہوکر کہا، یہ اُسے مسلسل آٹھواں فون تھا۔

''بیٹا وہ ڈیتھ بیڈ پر ہے اور اُس کے لبوں پر صرف تمہارا نام ہے وہ جب جب ہوش میں آتی ہے ف تمہارا نام لیتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اُس کی سانسیں تمہارے ہی لیے اٹکی ہیں۔''

''پلیز طارق! میں تانیا کی پڑوسن ہی نہیں اُس کی بہت پرانی دوست ہوں، وہ میرے لیے میری وں کی طرح ہے، پلیز ایک مرتے ہوئے انسان کی بات سُن لو، جانے وہ تمہارے لیے کیوں اتنی بے ین ہے۔'' اجنبی عورت جس نے مرینا کے نام سے تعارف کروایا تھا، مسلسل منتیں کر رہی تھی۔

''بائی گاڈ۔'' طارق نے تنگ آکر کہا۔

''آنٹی! لسن! مائی فادرز لائف از ان ڈینجر اینڈ ہی نیڈز می! میں فوراً نہیں آ سکتا۔'' طارق نے کہہ کر فون بند کر دیا۔ وہ تیزی سے آئی سی یو کی جانب بڑھ رہا تھا۔ موبائل پھر بجا، یہ مرینا آنٹی ہی کا فون تھا۔

''اوہ نو!'' طارق نے گہری سانس لے کر فون اُٹھایا۔

''طارق۔''

''پلیز دوڑ کر آؤ!'' وہ رو رہی تھیں ان کے لہجے میں کچھ ایسا ضرور تھا، جس کی وجہ سے طارق کو اپنے قدم ایمرجنسی کی جانب موڑنے پڑے۔

طارق۔ پھولے سانسوں کے اندر داخل ہوا، مسز تانیا کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔

''طا... طارق... طارق!''

''طارق کو بلاؤ...'' وہ پھٹی پھٹی آواز میں بول رہی تھیں، ایسے جیسے اُن کے گلے پر چھری پھر رہی ہو۔

''وہ دیکھو... یہ ہی طارق ہے نا۔'' مرینا آنٹی نے مسز تانیا کو بتایا۔

''طا... طارق'' مسز تانیا کے تکلیف زدہ چہرے پر ایک دم بے حد سکون اُتر آیا تھا۔

''طارق!'' اُن کی اکھڑتی ہوئی سانسیں کچھ دیر کو یوں پُرسکون ہو گئیں، جیسے طارق کے وجود سے اُن کو آکسیجن مل رہی ہو۔

''جی... جی آنٹی!'' طارق کو اِس ساری صورتِ حال میں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ مسز تانیا اُس کے لیے اِس قدر بے چین کیوں تھیں۔

''تم میری سحرش سے شادی کر لو گے؟'' مرتی ہوئی عورت نے عجیب و غریب فرمائش کی۔

''واٹ؟''

''لیکن آنٹی! میں! طارق اُن کی فرمائش پر بوکھلا گیا تھا۔

''طارق! میں... میں مر رہی ہوں، میرا سارا خاندان ختم ہو گیا، میری سحرش اِس بھیڑیوں کی دنیا میں اکیلی رہ جائے گی!'' مسز تانیا کا تنفس ایک بار پھر بے ترتیب ہو گیا تھا۔

''تانیا کا بیٹا، بھائی اور بھابی اِس حادثے میں آن دی اسپاٹ فوت ہو گئے ہیں بیٹا!'' مرینا آنٹی نے دِل دہلا دینے والی خبر دی۔

''یہ سب ایئرپورٹ سے واپس آ رہے تھے، تانیا کا بڑا بیٹا ماں سے ملنے آیا تھا۔ چھوٹا بیٹا! وہ بھی ابھی دس منٹ پہلے دم توڑ گیا ہے۔'' مرینا آنٹی نے روتے ہوئے بتایا۔

''اوہ! میرے اللہ!'' طارق کا دل دُکھ سے بھر گیا۔ گزشتہ سال سے وہ ریگولر سحرش سے ملنے جا رہا تھا اِس لیے وہ سب ہی سے واقف تھا۔ اِس گھر کو تو نظر ہی لگ گئی تھی پہلے باپ، پھر دادی اب سب کے سب ختم ہو گئے تھے۔ اور وہ مظلوم لڑکی جو نہ زندوں میں تھی نہ مردوں میں! وہ دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی تھی۔

''طارق تم سحرش کو اپنا لو گے نا!''

''میں... میں تمہارے سوا کسی پر اعتبار نہیں کر سکتی۔'' مسز تانیا کی سانس ایک بار پھر اُکھڑنے لگی۔

''اُسے اِس دنیا میں، بھیڑیوں میں، تنہا نہ چھوڑنا!''

''طا... طارق... وعدہ کرو!'' اُن کی آنکھیں تکلیف سے پھیل رہی تھیں۔

طارق نے زندگی میں بہت سے فیصلے فوراً کیے تھے۔ اکثر دشمنوں سے مقابلہ کرتے ہوئے وہ حکمتِ عملی آن دا اسپاٹ تیار کرتا تھا۔ لیکن آج تک اُسے اِس قدر دُشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

مسز تانیا کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں، مگر شاید طارق کا جواب سنے بغیر سکون حاصل نہیں کر سکتی تھیں، اِسی لیے وہ موت سے لڑ رہی تھیں، لیکن... لیکن یہ کس قدر تکلیف دہ تھا نا!

''طا... رق!''

''سحرش!''

''وعدہ کرو!''

''شاد... ی!'' طارق کے سامنے نگینہ کا چہرہ لہرایا لیکن اِس چہرے کو دو منت بھری نگاہوں نے دھندلا دیا۔

''آنٹی میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں سحرش سے شادی کروں گا۔'' طارق کو اپنی ہی آواز اجنبی محسوس ہوئی۔

''ہا...'' مسز تانیہ کا سانس اور چہرہ ایک دم پُرسکون ہو گیا۔ وہ شاید تھوڑا سا مسکرائی بھی تھیں اُن کی آنکھیں مسلسل طارق کو دیکھ رہی تھیں۔

''آنٹی!'' طارق کو کچھ مختلف سا احساس ہوا تو اُس نے مسز تانیہ کو پکارا، لیکن وہ اپنے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ چھوڑ کر جا چکی تھیں۔ جس وعدے کے لیے وہ کتنی دیر سے موت سے لڑ رہی تھیں وہ پورا ہوتے ہی وہ ایک دم سے سدا کے لیے پُرسکون ہو گئی تھیں۔

''بیٹا طارق! وہ جا چکی ہے!'' آنٹی مرینا نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''میرے خدایا!'' طارق کا دِل دُکھ اور کسی اَن جانے سے بوجھ تلے دب گیا۔

''تانیہ دوپہر سے تمہیں یاد کر رہی تھی اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب وہ مزید جی نہ سکے گی... یہ ہیں کچھ کاغذات جو اُس نے مجھے تمہیں دینے کے لیے دیے تھے۔'' نرس مسز تانیا کی ڈیڈ باڈی پر چادر ڈال کر دو آیاؤں کے ساتھ مل کر لے جا چکی تو مرینا آنٹی نے کاغذ اُس کے حوالے کر دیے۔ ساتھ میں مسز تانیا کا پرس بھی تھا۔

''یہ... یہ سب کیا ہے؟'' طارق کا ذہن باقاعدہ ماؤف ہونے لگا تھا۔

''کاغذ تو دوپہر تانیا کا وکیل اُس کے کہلوانے پر دے کر گیا تھا، جب کہ یہ پرس اُس نے خود مجھے دینے کو کہا تھا اِس میں گھر، لاکرز وغیرہ کی چابیاں ہیں۔'' مرینا آنٹی نے ایک دم سے ساری ذمے داری اُس پر لاد دی۔

''لیکن یہ سب آپ مجھے کیوں دے رہی ہیں؟'' طارق نے پریشانی سے کہا۔

''تم شاید ابھی مرحومہ سے کیا وعدہ بھول رہے ہو!'' مرینا آنٹی نے کچھ سخت لہجے میں کہا۔

''تم پر ہی اُس کا اعتبار تھا ورنہ کچھ دُور کے رشتے دار تو نکل ہی آتے سحرش کی ذمے داری اُٹھانے کے لیے...''

''اب سحرش اور جائیداد دونوں تمہارے ہیں تم مرحومہ سے کیا وعدہ پورا کرو... اور ہاں اب اُن سب

کی تدفین کی ذمے داری بھی اُٹھانی ہوگی، پیچھے اُس معصوم بچّی کے علاوہ کوئی نہیں بچا۔'' مرینا آنٹی نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

طارق کو ایک دم اپنا وجود بھاری زنجیروں میں بندھا ہوا محسوس ہوا۔

''میرے اللہ! یہ میں کہاں پھنس گیا؟ کسی کا اندھا اعتبار اُس پر کیسی تاعمر کی ذمّے داری ڈال گیا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے آئندہ اِس ذمے داری کو اٹھانا ہی تھا۔''

❖❖❖ ❖❖❖

''امی! منزہ، علیزے...'' کاشف غصّے سے تھرتھر کانپتے ہوئے گھر میں داخل ہوا۔

''کیا ہوا ہے آخر تمہیں... کیوں چلا رہے ہو، آہستہ بات کرو امی کی طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں ہے۔'' علیزے نے باہر نکل کر ناگواری سے پوچھا۔

''منزہ!'' کاشف نے چیخ کر اُسے آواز دی، اس نے علیزے کی کسی بات پر دھیان نہ دیا۔

''کیا مصیبت آ گئی؟ تمہیں کہا نا کہ دھیرے بولو، امی اُٹھ جائیں گی۔'' علیزے نے بھی کچھ بلند آواز میں کہا، کاشف نے سُرخ سُرخ آنکھوں سے اُسے گھورا تو وہ ایک دم سہم گئی۔

''منزہ!'' کاشف کی آواز غصّے سے پھٹ رہی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' منزہ نے کمرے سے باہر نکل کر دھیرے سے پوچھا۔ علیزے نے حیرت سے منزہ کو دیکھا۔ یہ آج، شعلہ کیسے بجھ گیا؟

لیکن اِس سے پہلے کہ منزہ کو کاشف اُس کی کسی بات کا جواب دیتا یا پھر علیزے کی کچھ حیرت ختم ہوتی۔ کاشف نے اپنی جیکٹ سے کوئی چیز باہر نکالی۔

اگلے ہی پل سارا گھر چیخوں سے گونج اُٹھا۔ کاشف نے پستول منزہ کی جانب تان کر مسلسل گولیاں چلائیں۔

سامنے منزہ کا وجود خون سے لت پت پڑا تھا، علیزے کی چیخیں سُن کر حُسن آرا بیگم اور گڈو باہر آئے لیکن حُسن آرا بیگم باہر کا منظر دیکھ کر لہرا کر گر گئیں۔

منزہ!

منزہ! علیزے اُس کا سر گود میں رکھے پکار رہی تھی، جب کہ منزہ کا سانس دھیرے دھیرے اُکھڑ رہا تھا۔

''کوئی... کوئی ہے؟

''کوئی ہے جو میری بہن کو بچا لے۔'' علیزے نے سر اُٹھا کر آواز دی۔

کاشف فائرنگ کر کے فوراً بھاگ گیا تھا، جب کہ چھوٹا سا بچہ گڈو صدمے سے سُن ماں اور بہنوں کی حالت دیکھ رہا تھا۔

ایسے میں علیزے خود ہی فون کی جانب بھاگی ریسکیو ون کا نمبر ملا کر اُس نے اپنے گھر کا ایڈریس لکھوایا۔ وہ دوڑ کر پھر منزہ کے پاس آئی، منزہ کے گرد اِس قدر خون بکھرا ہوا تھا، جیسے بکرا ذبح کیا گیا ہو۔ علیزے کو تو اپنی بے ہوش ماں بھی نظر نہ آئی تھی، محلے کی کچھ خواتین دوڑتی ہوئی گھر کے کھلے دروازے

سے اندر بھاگی آئیں۔

''کیا ہوا؟''

''کیا ہوا؟'' ہمسایوں نے پوچھا۔

وہاں کوئی جواب دینے والا بھی نہ تھا۔

''میری بہن، ہائے میری بہن!''

علیزے منزہ کا سر گود میں رکھے سِسک رہی تھی، جب کہ گڈو ساکت کھڑا منزہ اور اِس کے گرد پھیلے خون کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

کبھی زندگی لانگ جمپ مار کر بہت سا فاصلہ ایک دم طے کرلیتی ہے، ایسے میں اگر یہ لانگ جمپ انسان کی اپنی خواہش پر مارا گیا ہوتو اُسے یوں لگتا ہے، جیسے اُس کی ایک دم لاٹری نکل آئی اور اگر یہ لانگ جمپ اُس کی خواہشوں کے برعکس ہوتو وہ بلاوجہ تھکن کا شکار ہوکر ہانپنے لگتا ہے!

طارق کو بھی اپنا وجود ایک دَم بہت بڑے بوجھ تلے محسوس ہورہا تھا۔

چار لاشوں کو کندھا دینا اور اُن کا وارث بننا کتنا مشکل تھا، کوئی اُس سے پوچھتا۔ایک زندہ لاش ابھی گھر میں منتظر تھی، جس کے ساتھ اُسے اپنی زندگی منسلک کرنی تھی۔

''کیا وہ ساری عمر ایک زندہ لاش کا جنازہ اُٹھا سکے گا؟'' یہ سوال اُس کا سانس لینا دوبھر کررہا تھا۔

''یا میرے اللہ، میں کیا کروں؟'' طارق نے بے اختیار اُس بڑی ذات کو پکارا۔

جب تک انسان اپنی پریشانیوں کا بوجھ خود اُٹھانے کی کوشش کرتا ہے اور خود اپنے مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ ایک ایسی گنجلگ حالت میں پھنس جاتا ہے، جہاں سے نکلنا اور راستہ پانا اکثر ناممکن ہوجاتا ہے۔ اِس لیے ہر سمجھ دار مسلمان بڑے بوجھ خود نہیں اُٹھاتا۔ جب یہ بوجھ وہ بڑی ذات کو دے دیتا ہے تو اللہ اُس کا کبھی مان ٹوٹنے نہیں دیتا اور اُس کو ہر مشکل سے یوں نکالتا ہے، جیسے دودھ میں سے بال! طارق کا دِل جب اِس بے پناہ بوجھ کو نہ سہار سکا تو اُس نے بے اختیار اپنے ربّ کو پکارا۔

''اے میرے اللہ میری مدد فرما!'' طارق نے بے حد سچے دل سے دُعا کی تھی۔

''آنٹی! آپ ایک فیور کریں۔ یہ پانچوں ڈیڈ باڈیز میرے ماتحت لے کر آتے ہیں، آپ پلیز سحرش کے پاس جائیے وہ بے شک بے خبر ہے لیکن وہ زندہ ہے اور زندہ انسان میں اُمید باقی ہوتی ہے کہ وہ کب ہوش میں واپس آجائے...آپ اُسے جا کر سب کچھ بتائیے! ہوسکتا ہے جیسے ایک بہت بڑے دُکھ بھرے حادثے نے اُس کی ہر طرح کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین لی تھی۔ شاید ایک اور بڑا دُکھ اُس کے سوئے ہوئے احساسات کو جگادے۔'' طارق نے بے حد سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''طارق!'' مرینہ آنٹی نے جاتے جاتے رُک کر اُسے پکارا۔

''جی آنٹی!''

''تم سے مل کر مجھے اندازہ ہوگیا کہ کیوں تانیہ کو اِس بھری دنیا میں صرف تم پہ اعتبار تھا۔تم واقعی بہت اچھے ہو!'' مرینہ آنٹی نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''اور تم یقین مانو کہ اچھے لوگوں کے ساتھ ہمیشہ اچھا ہی ہوتا ہے، تمہاری یہ نیکی کبھی رائیگا نہیں جائے لی۔'' مرینہ آنٹی نے نم آنکھوں کے ساتھ اُسے دُعا دی۔

''آنٹی! میں اپنے ابو کی خیریت پتا کر کے آتا ہوں۔ انشاء اللہ جلد گھر پہنچ جاؤں گا۔ اتنی دیر میں میرا ماتحت سب بندوبست کروادے گا۔'' طارق انہیں تسلی دے کر تیزی سے آئی سی یو کی طرف بھاگا۔ پہلے ہی اُسے بہت دیر ہوچکی تھی۔

❖❖○❖❖

''سچے دل سے دی ہوئی دُعا ضرور قبول ہوتی ہے اور ...اور سچے دِل سے کی ہوئی نیکی کا اجر ضرور ملتا ہے۔''

''اللہ دعاؤں اور نیکیوں کا اجر کبھی اپنے پاس نہیں رکھتا، کیوں کہ وہ کبھی لیتا نہیں، صرف دیتا ہے!''

عبدالولی چائے کے دو کپ لیے جب آئی سی یو کے باہر یمی ویٹنگ روم میں آیا تو سائرہ وہاں نہ تھی۔

''کہاں چلی گئی؟'' عبدالولی نے سوچا۔

''شاید انکل کو دیکھنے چلی گئی ہے، وہ سوچتا ہوا آئی سی یو کی جانب اندر چل دیا۔ عبدالولی جانتا تھا کہ اندر کھانے پینے کی اشیا لانا سختی سے منع ہے لیکن پھر بھی وہ اندر چلا گیا۔ اُسے کوئی طاقت اندر کی جانب کھینچ رہی تھی۔

وہ بے حد تیزی سے شیشے کے بنے دروازے کی جانب بڑھا اور انکل شہباز کو دیکھنے کے لیے جیسے ہی اُس نے کھڑکی، کی طرح بنے ٹرانسپیرنٹ شیشے سے جھانکا، اُس کے ہاتھوں سے چائے کے ڈسپوزیبل کپ گر گئے۔

گرم چائے کے چھینٹوں نے اُس کے ہاتھ اور پاؤں جلادیے تھے لیکن وہ اِن کی پروا کیے بغیر تیزی سے دروازہ دھکیلتا اندر داخل ہوا۔

''یہ کیا کیا آپ نے؟'' ولی نے غصے سے پھنکارتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا وہ آکسیجن کا بٹن تلاش کر رہا تھا، جو چند سیکنڈ میں اُسے نظر آ گیا۔

اُس نے انکل شہباز کے جھٹکے کھاتے جسم کو بے حد فکرمندی سے دیکھا۔ بٹن آن کر کے اُس نے جلدی سے اُن کا آکسیجن ماسک اُن کے منہ پر دوبارہ لگایا۔ اِس ساری کارروائی کے دوران وہ ڈاکٹرز روم کا ایمرجنسی کال کا بٹن دبانا نہ بھولا تھا۔

انکل شہباز کا تنفس ابھی بھی ٹھیک نہیں ہوا تھا۔

''اگر انکل کو کچھ ہوگیا تو آنی آپ کو کوئی نہیں بچا سکے گا۔'' ولی نے تیزی سے باہر کی طرف جاتی نیلوفر کا بازو پکڑ کر کہا۔

''اور آپ کہیں نہیں جارہیں! ہاں دُعا کریں کہ انکل کو کچھ نہ ہو ورنہ آپ کا اتنا بڑا نقصان ہوگا کہ اگر پ ایک اور زندگی مانگ کر بھی لائیں گی تو کبھی پورا نہ ہوگا۔'' ولی کی آنکھیں غصے کی شدت سے سُرخ رہی تھیں۔

اُسی پل ڈاکٹر اور نرسیں بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور انہیں باہر بھیج دیا۔ ولی نیلوفر کا بازو پکڑے

پکڑے باہر آیا۔

''چھوڑو مجھے!'' وہ غرائیں۔

''ان کو کیوں پکڑے کھڑے ہو؟'' طارق پھولی سانسوں کے ساتھ وہاں پہنچا۔ آنی کو دیکھ کر اُس کے ماتھے پر ناگوار بَل پڑ گئے تھے۔

''انہوں نے آج اپنے مرتبے سے اُتر کر اِس قدر گھناؤنی حرکت کی ہے کہ میرے لیے اپنی ہی آنکھوں سے دیکھے سچ پر یقین کرنا دُشوار ہو گیا ہے۔'' ولی نے ایک جھٹکے سے نیلوفر کا بازو چھوڑتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا؟'' طارق نے پریشانی سے پوچھا۔

''اِن محترمہ نے اندر جا کر انکل کا آکسیجن ماسک اُتار کر پیچھے سے سسٹم بھی بند کر دیا اور وہاں کھڑی انکل کی اکھڑتی سانسوں پر قہقہے لگا رہی تھیں۔''

''ڈس گسٹنگ!''

''میں... میں یقین نہیں کر پا رہا کہ واقعی کوئی اِس حد تک خطرناک ہو سکتا ہے! اِس حد تک گر سکتا ہے!'' ولی کی آواز میں غصہ اور حیرت دونوں موجود تھیں۔

طارق کی آنکھوں میں آنی کے لیے پہلے اجنبیت رہتی تھی لیکن اُس کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں پہلی بار سلگی تھیں۔

''آپ... آپ کوئی تو گہرائی رہنے دیتیں، جس میں آپ نہ گرتیں... اتنا... اتنا گر سکتی ہیں آپ؟'' طارق نے نفرت سے کہا۔

''اور کتنا گریں گی؟'' طارق کا لہجہ جھلسا ہوا تھا۔

''طارق جانو وہ... وہ کم بخت مجھ سے میرا سب کچھ چھین کر لے گیا۔'' آنی حواسوں میں نہ تھیں۔

''آنی!''

''بس کریں!'' طارق نے غصّے سے کہا۔

''آئی ایم سوری ولی صاحب! آپ کے مریض کی حالت بے حد نازک ہے، ہم سمجھنے سے قاصر ہیں کہ مریض کا لائف سپورٹنگ سسٹم اچانک کیسے بند ہو گیا۔'' ڈاکٹر نے پریشانی سے کہا۔

''بہر حال زندگی موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، آپ دعا کریں کہ اللہ کوئی معجزہ کر دے۔'' ڈاکٹر نے بے حد سچائی سے نہایت سفاک حقیقت سے آگاہ کیا۔

طارق کی آنکھیں دُکھ سے لبریز ہو گئیں۔ اُس نے بے اختیار اپنا موبائل نکالا۔

''جی بٹ صاحب! جی بالکل ٹھیک ہوں!''

''آپ پلیز اپنے کسی ایس ایچ او کو بھیجیں ایک گرفتاری کروانی ہے۔ ملزمہ نیلوفر بیگم، ڈاکٹر شہباز علی قاتلانہ حملہ کرتے ہوئے عین موقع پر پکڑی گئی ہیں اور ڈاکٹر شہباز علی کی حالت بے حد نازک ہے۔''

''جی فوراً۔''

''جی...''

''جی ہاں! میری اُن سے رشتے داری ہے!''

''ڈاکٹر شہباز علی میرے والد ہیں۔'' طارق کا لہجہ بے حد دُکھی ہو گیا تھا۔

عبدالولی نے حیرت سے طارق کا چہرہ دیکھا۔

''طارق یہ... یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' آنی نے بے حد پریشانی سے پوچھا۔

''گناہ گار کو سزا ہی ملتی ہے انعام تو نہیں ملتا نا؟'' طارق نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر آنی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''طارق! میں تمہاری خالہ ہوں! تم... تم کیسے مجھے پولیس کے حوالے کر سکتے ہو؟'' نیلوفر بیگم نے جارحانہ لہجے میں کہا۔

''ہونہہ!'' طارق نے چہرہ موڑ لیا۔

''طارق...'' وہ چلائیں۔

''مِس نیلوفر بیگم! میرے باپ پر قاتلانہ حملے کرتے وقت آپ کو اپنے کسی رشتے کا خیال آیا تھا؟''

''آپ تو عادی مجرم ہیں اور خطرناک مجرموں کو کھلے رکھنا نہایت حماقت ہے!'' طارق نے بے حد سرد لہجے میں کہا۔

''میں دیکھتی ہوں کس کی جراَت ہے کہ مجھے گرفتار کرے۔'' نیلوفر نے وہاں سے جانے کی کوشش کی۔

''اوں۔ہوں!'' طارق نے نرمی سے اُن کا بازو پکڑ کر انہیں روکا۔

''آپ یہاں سے اب کہیں نہیں جا سکتیں۔'' طارق کا لہجہ بے حد مضبوط تھا۔

''طارق! میں نے اِن ہاتھوں سے تمہیں نوالے کھلا کھلا کر بڑا کیا ہے، تم اِن ہاتھوں میں کیسے ہتھ کڑیاں ڈلوا سکتے ہو؟'' آنی نے احسان جتایا۔

''آنی! اگر آپ کے نوالے یاد نہ رہتے، بے شک وہ آپ نے ہمارے ساتھ ایک گیم کھیلا تھا لیکن پھر بھی آپ کے نوالے یاد ہیں تو میں اپنے باپ کے مجرم سے اِس قدر فاصلے پر کھڑا ہوں۔ آپ کی محبت چاہے جھوٹی ہی تھی، وہ میرے دِل کو بے بس کیے ہوئے ہے۔'' طارق نے دِل ہی دِل میں کہا۔

''لالہ... ابو!'' سائرہ باہر سے ابھی آئی تھی، آتے ہی بھائی کے گلے لگ گئی۔

''انشاء اللہ ہمارے ابو ٹھیک ہو جائیں گے۔'' طارق نے اُس سے زیادہ خود کو تسلی دی۔

''یہ سب کیا ہے؟'' سائرہ نے آنی کو وومین پولیس کی حراست میں باہر جاتے دیکھ کر سہم کر پوچھا۔

''سزا کا عمل شروع ہو چکا ہے! اگر اللہ پاک چاہتے ہیں کہ اِن کو سزا ملے تو انہیں سزا مل جائے گی اور اگر انہیں معافی ملنی ہوئی تو معافی مل جائے گی... ہماری زیادتیوں کا فیصلہ اللہ پاک کریں گے۔'' طارق سائرہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے آئی سی یو کے دروازے کے پاس لے آیا۔

اندر اُن کا باپ زندگی موت سے لڑ رہا تھا۔

''اگر موت جیت گئی تو؟''

طارق کا دل ایک دم کسی چھوٹے بچے کی طرح سہم گیا تھا۔ لاکھ وہ روز موت کا کھیل دیکھتا تھا لیکن پرائے کی موت اور اپنے کی موت میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے جب کوئی اپنا مرتا ہے تو اپنے دِل کا

بھی ایک حصہ مرجاتا ہے کیوں کہ اپنے گھروں میں نہیں دلوں میں رہتے ہیں اُن کے جانے سے دل کا وہ حصہ قبرستان بن جاتا ہے۔

''یا اللہ! اگر میں نے زندگی میں کوئی نیکی کی ہے تو پلیز میرے ابو کو صحت تندرستی کے ساتھ زندگی عطا فرما۔'' طارق نے آنکھیں بند کر کے بے حد دھیان سے دُعا کی اور دعا کی قبولیت کی شرط تو ہے ہی، پوری لگن اور دِل و دماغ کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ ہی دعا کو مقبول کرواتی ہے۔

''حیرت ہے ان کی پلس اور بی پی ایک دم کیسے نارمل ہو گیا؟'' دو جونیئر ڈاکٹر شیشے کے دروازے کو دھکیل کر باہر آئے تو اُن میں سے ایک بولا۔

''ڈاکٹر!'' سائرہ نے پیچھے سے بلایا۔

''کیسے ہیں میرے فادر؟'' سائرہ نے بے صبری سے پوچھا۔

''یہ اگر معجزہ کہا جائے تو ٹھیک رہے گا۔''

''ہم تو مریض کے پاس کھڑے تھے کہ چند منٹ بعد یہ مرجائے گا۔ بڑے ڈاکٹر صاحب نے ہمیں فوراً یہ ٹیکہ لگانے کو کہا تھا۔لیکن حیرت ہے کہ اس کی نوبت ہی نہیں آئی، وہ پندرہ منٹ سے بالکل نارمل ہیں۔'' ڈاکٹر بتاتے ہوئے خود بھی حیران تھے۔

''سچ!'' طارق نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

''جی بالکل!'' ڈاکٹر کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

طارق کے کانوں میں کہیں دُور سے ایک گونج سنائی دی تھی۔

''تمہاری یہ نیکی کبھی رائیگاں نہیں جائے گی۔''

طارق کا دِل ایک اَن جانے بوجھ تلے تھا۔ بے حد اُداس اور پریشان یوں کہ اَن جانے جی سے وہ کوئی نیکی کیسے لے سکتا تھا۔ لیکن اپنے باپ کی زندگی کے ساتھ معجزہ دیکھ کر اُس کا دِل بے حد پرسکون ہو گیا تھا۔ یوں جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ چکا ہو۔ شہباز صاحب کو دیکھ کر جب وہ باہر نکلا تو سیدھا عبدالولی کے پاس آیا۔

''ولی! میرے ابو اب بالکل ٹھیک ہیں۔'' خوشی سے اُس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

''تمہیں اُن کی نئی زندگی بہت بہت مبارک ہو!'' ولی نے اُس کا کندھا تھپتھپا کر کہا۔

''ولی! اللہ نے مجھے جس نیکی کے کام کا ایڈوانس میں یہ اجر دے دیا ہے۔ میں وہ ادھورا کام پورا کرنے جا رہا ہوں تم شام تک ابو کے پاس رُک سکتے ہو؟ تاکہ ادھورا کام ادھوری نیکی نہ رہے۔ مکمل ہو جائے۔''

''کیوں نہیں! لیکن یہ تم کس نیکی کی بات کر رہے ہو؟'' ولی اُس کی مبہم گفتگو سے کچھ اندازہ نہ کر پا رہا تھا۔

طارق کچھ بتاتے بتاتے رُک سا گیا۔ نگی سے اُس کا دِل زندگی بھر دست بردار نہ ہو سکتا تھا۔

ولی کو سحرش کے راز میں شامل کرتے کرتے وہ ایک دم سے رُک گیا۔ ولی، نگی کا بھائی تھا اور بے شک وہ طارق کا بہترین دوست بھی تھا لیکن اُسے اس راز میں بالکل شامل نہ کیا جا سکتا تھا۔

''میرے پیارے دوست! نیکیوں کے ساتھ ایک شرط لازم ہوتی ہے کہ اُن کی تشہیر سے اُن کے اجر میں کمی کا خطرہ ہوتا ہے۔ سوری! میں تم سے فی الحال کچھ شیئر نہیں کر سکتا۔'' طارق نے معذرت کی۔

''اٹس او کے یار! تم تو پریشان ہو گئے ہو۔'' ولی نے اُسے باقاعدہ تسلی دی کیوں کہ طارق کا چہرہ کچھ پریشان ہو چکا تھا۔

''تھینکس! اچھے دوست واقعی نعمت ہوتے ہیں۔'' طارق ولی سے مل کر تیزی سے باہر نکلا، اُس کا رُخ اُس گھر کی جانب تھا، جہاں ایک طرح کی قیامت برپا ہو چکی تھی جہاں ایک تنہا اور خود سے بے گانہ لڑکی رہتی تھی۔

جو اُس کے سہارے اور نام کی منتظر تھی۔

❖❖○❖❖

''یہ... یہ سب کیا ہو گیا؟''

علیزے نے سر گھٹنوں میں دے رکھا تھا۔ بہت دیر سے اُس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کام نہیں کر رہی تھی لیکن جوں جوں کچھ وقت گزرا تو پہلا احساس بہت بڑے نقصان کا تھا اور پہلا سوال بے یقینی کا تھا کہ یہ سب کیا ہو گیا؟

وہ پرائیویٹ روم کی سیٹی پر پاؤں اونچے کیے بیٹھی تھی۔

''اس روم میں حُسن آرا کو شفٹ کیا گیا تھا انہیں انجائنا کا اٹیک ہوا تھا بروقت طبی امداد ملنے سے اب وہ خطرے سے باہر تھیں لیکن دواؤں کے زیرِ اثر تھیں۔ گڈو کو بھی سکون آور انجکشن دیے گئے تھے، وہ بھی بچوں کے وارڈ میں عارضی طور پر داخل تھا۔ اور... اور منزہ؟

منزہ پر آ کر اُس کا دِل بُری طرح ڈوبا تھا۔

''کیا وہ چاند چہرہ لڑکی، جو زندگی سے بہت کچھ پانا چاہتی تھی کیا... کیا وہ ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائے گی؟'' یہ ایسا سوال تھا، جو وہ ابھی پانچ منٹ پہلے ہی آئی سی یو سے لے کر آئی تھی۔ وہ فوراً کھڑی ہو گئی اور تیزی سے دوبارہ آئی سی یو کی جانب بڑھی۔ گزشتہ ایک ڈیڑھ گھنٹے سے وہ کبھی گڈو، کبھی امی اور کبھی منزہ کے پاس مسلسل چکر کاٹ رہی تھی۔

آئی سی یو کے باہر شیشے سے سر ٹکائے وہ مسلسل رو رہی تھی، گزرا سارا بچپن اُس کی آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔ منزہ بہت زیادہ حسین بچی تھی اور بے حد ضدی بھی، ہر اچھی چیز کے لیے وہ مچل جاتی تھی اور تب تک چین سے نہ بیٹھتی اور نہ بیٹھنے دیتی تھی، جب تک وہ اپنی مطلوبہ چیز حاصل نہ کر لیتی یونہی لڑتے جھگڑتے دن تیزی سے گزر گئے تھے، کچھ عرصے قبل جب علیزے کی منگنی ولی سے ہوئی تھی وہ جو پہلے ہی بہت خفا رہتی تھی اب گھر والوں سے اور اُن کی زندگی سے مزید کٹ کر رہ گئی تھی۔

اور اب کیا وہ ہمیشہ کے لیے اُن سے کٹنے جا رہی تھی؟

تم کتنا لڑتی تھیں کتنا زیادہ تنگ کرتی تھیں لیکن میں نے کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ تم یوں ریت کی طرح ہمارے ہاتھوں سے پھسل جاؤ گی۔

منزہ۔ پلیز کم بیک!''

''میری پیاری بہنا پلیز ٹھیک ہو جاؤ اور واپس آ جاؤ۔''علیز ے نے با آواز بلند کہا۔
لیکن منزہ کی سانسیں مزید مدھم دیکھ کر وہ بے بسی سے سسک پڑی۔
''منزہ میری بچی!''علیز ے کو اپنی پشت پر ابو کی فکر بھری آواز سنائی دی۔
''ابو جی...''علیز ے کسی اپنے کو دیکھ کر سارے ضبط ایک بار پھر کھو چکی تھی وہ ابو کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔
''یہ سب کیسے ہوا؟ میں گھر آیا تو محلے داروں نے بتایا، تم نے مجھے کیوں نہیں انفارم کیا؟''انور میاں نے آتے ہی علیز ے پر ناراضی کا اظہار کیا۔علیز ے جواب دیے بغیر مسلسل سسکتی رہی۔
''تم نے اپنی خالہ اور خالو کو بھی انفارم نہیں کیا؟''انور میاں نے غصے سے پوچھا۔
''مجھے کسی شخص کا خیال نہیں آیا سوائے اس کے کہ میری بہن، ماں اور بھائی کی زندگی بچ جائے۔''علیز ے نے سچائی بتائی۔
''تو اِس ہسپتال کا خرچا کون اُٹھائے گا؟''انور میاں کو بیٹی کی زندگی کی اتنی پروا نہ تھی، جتنی خرچوں کی فکر تھی۔
''میں لماری سے پچیس ہزار روپے لے آئی تھی، جس میں سے آٹھ ہزار بچ گئے ہیں۔''
''اگر منزہ کی بلیڈنگ رک جاتی ہے! انٹرنل بلڈنگ۔ تو پھر وہ فوراً میجر آپریشن کریں گے، جس کے لیے بیس ہزار فوراً جمع کروانے ہوں گے۔ دوائیاں خود لانی ہوں گی۔''علیز ے کی باتیں سُن کر انور میاں کا غصہ آسمان کو چھونے لگا تھا۔
''ت...تم میرے پیسے بھی لے آئیں؟''انور میاں کا دِل چاہ رہا تھا کہ علیز ے کے منہ پر کس کر تھپڑ لگائیں۔
''بجائے اس کے کہ تم اپنے خالو کو فون کرتیں کہ آ کر وہ سب کچھ سنبھالیں، تم...تم نے گھر کی جمع پونجی بھی خرچ کر ڈالی۔''علیز ے کو اپنے آپ سے گھن آنے لگی تھی کہ وہ ایسے بے ضمیر باپ کی بیٹی ہے۔
''یہ پیسے بھی تو خالو کے دیے ہوئے پیسوں میں ہی سے تھے۔''علیز ے نے چبا چبا کر کہا۔
پیسہ پیسہ۔ اور صرف پیسہ!
بس کریں ابو۔ بس کریں!
میری بہن مر رہی ہے!
''میری ماں کی زندگی خطرے میں ہے اور میرا بھائی...وہ قاتل بن گیا ہے! کیا آپ جانتے ہیں کہ منزہ پر گولی کاشف بھائی نے چلائی تھی۔''علیز ے نے دھماکا کیا۔
''کا۔کیا؟''انور میاں پہلی بار سارے دورانیے میں شاکڈ ہوئے تھے۔ پیسہ اور بیٹا واحد دو چیزیں اُن کو زندگی میں پیاری تھیں۔
''کاشف نے؟ لیکن کیوں؟''اُن کی آواز پست تھی۔
''معلوم نہیں...اُس پر تو جانے کیسا شیطان سوار تھا۔''علیز ے نے روتے ہوئے کہا۔ سارا منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا تھا۔

''اگر منزہ کو کچھ ہو گیا تو پولیس کاشف کو پکڑ لے گی؟''انور میاں کے لہجے میں صرف کاشف کے لیے فکر تھی۔ علیز ے نے بے حد حیرانی سے اپنے باپ کو دیکھا زندگی میں اپنی بیٹیوں کا کوئی مقام نہ تھا۔ حالاں کہ منزہ انور میاں کے بے حد قریب رہتی تھی۔
علیز ے نے بے اختیار منہ موڑ لیا۔
''یا میرے اللہ!''وہ بے حد کرب میں تھی۔
''یا اللہ رحم کرنا!''
علیز ے کے ذہن میں تو لفظ بھی نہ بن پا رہے تھے کہ وہ کوئی کامل دُعا مانگ سکتی۔
اُسی پل پولیس کے دو اہل کار کمرے میں تقریباً بھاگتے ہوئے گئے اُن کے ساتھ ساتھ نرس اور ڈاکٹرز تھے۔
علیز ے نے چونک کر شیشے کے پار دیکھا۔ منزہ کو ہوش آ گیا تھا۔
''لگتا ہے منزہ کو ہوش آ گیا ہے!''وہ کہہ کر بجلی کی سرعت سے اندر بھاگی، اُس کے پیچھے انور میاں بھی تھے۔
''بیٹا! بولو تم پر کس نے گولی چلائی؟''ادھیڑ عمر ایس ایچ او منزہ کا بیان ریکارڈ کرنا چاہتا تھا۔
''بولو بیٹا! تم پر کس نے گولی چلائی اور کیوں چلائی؟''
علیز ے نے دیکھا کہ منزہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن درد کی شدت سے اُس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔
''منزہ!''علیز ے تڑپ کر اُس کی جانب بڑھی اور اُس کا خون آلود ہاتھ تھام کر بے اختیار چومنے لگی۔
''میری جان تمہیں کچھ نہ ہوگا!''
''علیز ے!''منزہ کی آواز میں کس قدر بے بسی تھی۔
''میں...میں تو جینا چاہتی تھی۔''منزہ نے ٹوٹتی سانسوں سے کہا۔
''زندگی!''
''آہ!''
''میرا جہاں...میری دنیا!''منزہ کو پچھتاوے کے ناگ نے ڈسا۔
''زندگی بس اتنی سی تھی کیا؟''منزہ کا سوال علیز ے کا دِل دہلا گیا۔
''آپ پلیز ہٹیے، ہمیں اِن سے کچھ پوچھنا ہے!''ایس ایچ او نے آگے بڑھ کر علیز ے کو ہٹایا۔
''آہ!''
''زندگی کتنی پیاری تھی!''
''آہ!''
''واپسی کتنی تکلیف دہ ہے!''منزہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے پھر وہ تکلیف سے بُری طرح تڑپنے لگی۔
''امی۔''منزہ کی چیخ بھرپور تھی۔

''امی پلیز مجھے بچالو...'' منزہ کے چہرے پر ڈر بے حد نمایاں تھا۔

''بیٹا پلیز! ہمارے ساتھ تعاون کرو، ہمیں بتاؤ تم پر کس نے گولی چلائی تھی؟'' ایس ایچ او نے اونچی آواز میں منزہ کو متوجہ کیا۔

''گولی!''

''آہ! بہت درد...'' منزہ پھر تڑپی۔

''ہاں بیٹا کس نے گولی چلائی؟''

انور میاں اور علیزے کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا۔ اُن کا گھر اُجڑنے اور اُن کا دِل بکھرنے جا رہا تھا۔

منزہ کے سامنے کاشف کا ہنستا ہوا چہرہ لہرایا۔

وہ اُس سے کس قدر پیار کرتا تھا۔ سوائے اُس کے، کسی کے ساتھ اُس کی دوستی نہ تھی ہر اچھی چیز وہ منزہ کے لیے ضرور رکھتا تھا۔ پھر اِس قدر بُری موت وہ اُس کے لیے کیوں ڈھونڈ کر لایا؟ وہ تو ایک پیارا، لاڈلا بھائی تھا؟

منزہ کے بدن میں اِس قدر درد تھا کہ سب سوال، باتیں، منظر، چہرے گڈمڈ ہو رہے تھے۔

پھر ایک دم ایک بہت بھیانک چہرہ سب چہروں میں نمایاں ہوگیا۔

یہ پاشا کا چہرہ تھا!

یہ وہ بلیک میلر تھا، جس نے اُس کی پورنوگرافی کر کے نیٹ پر دے دی تھی، اسے عریاں کر کے تصاویر عام کر دی تھیں۔ اُس نے اُس کی عزت کو داغ دار کر دیا تھا۔ اور وہ کچھ نہ کر سکی تھی۔

کاشف نے منزہ کی یہی عریاں تصاویر کسی کے موبائل پر دیکھی تھیں اور طیش میں آ کر بہن پر گولی چلا دی تھی۔

''پاشا۔ میں کس قدر بے بس تھی!''

''لیکن اب نہیں ہوں!'' درد کی لہریں تیز ہونے سے منزہ کی سوچیں منتشر ہو رہی تھیں۔

''پاشا!'' منزہ کے منہ سے بے اختیار نکلا، علیزے اور انور میاں نے چونک کر منزہ کو دیکھا۔

''کون پاشا؟'' ایس ایچ او نے پوچھا۔

''جس پارلر... پارلر میں! میں... میں کام کرتی تھی۔ اُس کی مالکن کا بھائی!'' منزہ کی آنکھیں درد سے کھل رہی تھیں۔

ایس ایچ او بہت تیزی سے منزہ کا بیان نوٹ کر رہے تھے۔

''اُس نے میری عزت لوٹی!'' منزہ کا انکشاف علیزے اور انور میاں کے لیے بے حد تکلیف دہ تھا۔

''اُس نے میری ویڈیو بنائی'' منزہ کا سانس اُکھڑنے لگا۔

''اُس نے مجھ پر گولی چلائی!''

منزہ بھائی کو صاف بچا گئی اور جاتے جاتے اصل مجرم کو سزا دلانے کے لیے جال کس گئی تھی۔

''یہاں پر سائن کرو بیٹا!'' ایس ایچ او نے پھرتی سے منزہ کے ہاتھ میں قلم تھمایا۔

وہ باوجود کوشش کے سائن نہ کر پا رہی تھی۔

''میرے انگوٹھے کی مہر لے لو! پاشا کو سزا دلانا۔'' منزہ باوجود تکلیف کے بول رہی تھی۔

ایس ایچ او نے پھرتی سے اُس کے انگوٹھے کا نشان کاغذ پر لیا۔

''علیزے۔ معاف... معاف کر دینا!''

''معافی۔'' منزہ نے باپ کو دیکھا۔

''معافی..اللہ!''

''اللہ معافی!'' علیزے نے بڑھ کر بہن کو گلے سے لگا لیا۔

''اللہ معافی..معافی..اللہ!'' منزہ کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔ علیزے بے اختیار رو دی۔

''اللہ..اللہ..معا...'' علیزے کو لگا کہ منزہ کا وجود ریت کی طرح اُس کے ہاتھوں سے پھسل گیا ہو۔

''منزہ!'' علیزے نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے منزہ کو دیکھا، جس کی آنکھیں ہلکی سی کھلی تھیں اور وہ پانی سے لبریز تھیں۔

''اوہ مائی گاڈ۔''

''شی از نو مور!'' ایس ایچ او نے ڈاکٹر سے کہا۔

ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر تصدیق کر ڈالی۔

''نہیں۔'' علیزے کی سسکی نکلی۔

اُس نے بے یقینی سے اپنے بازوؤں میں جھولتے منزہ کے بے جان وجود کو دیکھا۔ دُکھ سے دِل پھٹنا کیا ہوتا ہے! علیزے اِس وقت جان گئی تھی۔

آیا اور نرس نے تیزی سے بڑھ کر منزہ کو علیزے سے الگ کر کے اُس کی آنکھیں بند کیں اور ٹانگیں سیدھی کر دیں۔ چہرہ سفید کپڑے سے ڈھانپ دیا۔

علیزے نے بے یقینی سے اُس چاند کو غروب ہوتے دیکھا۔

اپنے ماضی کے تصور سے ہراساں ہوں میں
اپنے گزرے ہوئے ایّام سے نفرت ہے مجھے
اپنی بے کار تمناؤں پہ شرمندہ ہوں
اپنی بے سود اُمیدوں پہ ندامت ہے مجھے
میرے ماضی کو اندھیرے میں دبا رہنے دو
میرا ماضی میری ذلت کے سوا کچھ بھی نہیں
میری اُمیدوں کا حاصل، میری کاوش کا صلہ
ایک بے نام اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں،
کتنی بے کار اُمیدوں کا سہارا لے کر
میں نے ایوان سجائے تھے کسی کی خاطر
کتنی بے ربط تمناؤں کے مبہم خاکے
اپنے خوابوں میں بسائے تھے کسی کی خاطر

مجھ سے اب میری محبت کے فسانے نہ کہو
اپنے ماضی کے تصور میں ہراساں ہوں میں
اپنے گزرے ہوئے ایام سے نفرت ہے مجھے!

وہ چلی گئی تھی بہت سی باتیں راز لیے اور کچھ راز کھول کر!

زندگی میں کبھی اپنے گھر اور بہن بھائیوں کی خبر بھی اخبار میں لگے گی، علیزے نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ اُس کی برداشت کی حد ختم ہوگئی تھی۔ علیزے کا دِل بے اختیار ڈوبا، وہ لہرا کر گری اور فرش بوس ہوگئی۔

❖❖○❖❖

میری اتنی سی خواہش ہے کہ
میں اِک آسماں ہوتا
اور تو میری زمین ہوتی
میں جھک کر تیرے سارے غم
اپنے کاندھوں پر ڈھولیتا
تیری تکلیفیں اور کٹھنائیاں
خود میں سمولیتا
میرے بادلوں سے بارشیں
چھم چھم برستیں تو تجھے سیراب کردیتیں
وہ تیری پیاس کو پی کر تجھے شاداب کردیتیں
میرے سورج کی کرنیں تجھ پر پڑتیں تو
بڑی ان مول ہوجاتیں
ہَوا سے مل کر نئی اِک شکل میں ڈھلتیں
غزل کے بول ہوجاتیں
میں تجھ سے روٹھتا تو تاریک رات ہوجاتا
مگر پھر بھی میرا چندا تیرے ہی ساتھ ہوجاتا
کہیں تارے چمک پڑتے تو میرا حسن بڑھانے کو
مگر بے تاب رہتے وہ تیرا آنچل سجانے کو
لیکن جاناں! میں نے مانا
کہ ایسا ہونہیں سکتا
نہ جانے کس کی سازش ہے
مگر پھر بھی میری اتنی سی خواہش ہے

ڈاکٹر فیصل کی سرگوشیاں خوشبو کی طرح اُس کے اِرد گرد پھیلی ہوئی تھیں، سدرہ کتنی ہی دیر سے آئینے

ں کھڑی اپنا عکس دیکھ رہی تھی۔ اس کے عکس میں اس کے نقوش میں اضافہ ہوگیا تھا اور یہ نیا نقش اس نمایاں تھا کہ ہر کوئی ٹھہر ٹھہر کر پوچھتا تھا کہ واقعی یہ پرانی والی سدرہ ہے؟

وہ اس خوشی کے نقش کو کہیں چھپا نہ پارہی تھی۔ یہ خوشی کی کرنیں تو اُس کے اندر سے پھوٹ کر اُس چہرے کو جگمگاتی تھیں۔ ڈاکٹر فیصل کوئی خواب کی طرح لگتا تھا لیکن اب وہ اس کی حقیقت کو چھوسکتی تھی۔

گزرے دن اس حویلی کے لیے بہت سارے دُکھ لائے تھے۔ سید نوازش علی، سید سرفراز علی کی کروائی ...نگ سے ہلاک ہوگئے تھے۔ اس حملے میں سید عبداللہ بھی بُری طرح زخمی ہوا تھا لیکن وہ کیا کہتے ہیں نا اچھے لوگوں کے ساتھ ہمیشہ اچھا ہی ہوتا ہے۔

سید عبداللہ کو اللہ نے دوبارہ ایک نئی زندگی عطا کردی تھی لیکن اِس پیچھے سے کیے گئے وار سے دشمنیاں ...نے سے کھل کر شروع ہوچکی تھیں۔ زلیخا بی بی کے بھائیوں نے جوابی حملہ کیا تو سید سرفراز کے چار اور ...ان کے پانچ بندے مرگئے۔ اب یہ لڑائی صرف اُن کی چچا زاد بہن زلیخا کی لڑائی نہ رہی تھی بلکہ اس لڑائی نے ذاتی لڑائی کی شکل اختیار کرلی تھی۔

زلیخا بی بی نے فوراً بٹوارے کا کہا تو سید سرفراز علی مزید بپھر گیا اور اُس نے سید عبداللہ پر دوبارہ جان ...ملہ کروایا تاکہ وہ زمینوں کی ڈیمانڈ دوبارہ نہ کریں۔ اس کشمکش میں کچھ زمینیں ہی سید عبداللہ واپس لے سکے، باقی کا کیس انہوں نے عدالت میں دائر کردیا۔

''دِلوں کے بٹوارے پہلے ہوتے ہیں پھر جاکر زمینوں کے بٹوارے ہوتے ہیں۔'' یہ محاورہ سچ ثابت ہوا تھا۔

سید سرفراز اور ریحانہ بی بی چھوٹی حویلی میں شفٹ ہوگئے۔ ظالم بھائی کے جانے سے حویلی کی سالوں بند کھڑکیاں خود بہ خود کھل گئیں اور وہاں سے تازہ ہَوا کے جھونکے آنے لگے، ان ہی تازہ جھونکوں ں سے ایک تازہ ہوا کا جھونکا ڈاکٹر فیصل بھی تھا۔

اس مرتبہ سدرہ ڈاکٹر فیصل کے دستک دیتے ہوئے ہاتھوں کو نہ روک سکی۔ اور پھر محبت کا ننھا منا پودا ...ھتے دیکھتے تناور درخت کی شکل اختیار کرگیا تھا۔ اور اِس محبت کے سارے خوب صورت رنگ سدرہ بی کے چہرے پر اس قدر نمایاں تھے کہ اکثر انہیں لگتا کہ اُن کا راز بس کھلنے ہی والا ہے۔

وہ جانتی تھی کہ جب یہ راز کھلے گا تو ہمیشہ کی جدائی اُس کا مقدر تو ٹھہرے گی، اِس لیے وہ آنے والے ں بھی بُرے وقت سے پہلے اِس محبت کا بھرپور لطف لے لینا چاہتی تھی۔

''بی بی سائیں... بی سائیں...'' ملازمہ دوڑتی ہوئی اُس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

''کیا ہوا؟........خیریت تو ہے نا؟''

''وہ جی عائشہ بی بی تو درد سے بہت تڑپ رہی ہیں۔ دائی مائی بھی پریشان ہے کہ انہیں اگر ہسپتال نہ ...جایا گیا تو وہ ... بچہ اور وہ...'' ملازمہ کی جرأت نہ تھی کہ مالکن کے متعلق کوئی غلط اندیشہ بھی زبان پر لے۔

''اماں کدھر ہیں؟'' سدرہ نے تیزی سے عائشہ کے کمرے کی جانب بڑھتے پوچھا۔

''لو بی بی کل رات بڑی بی بی اور عبداللہ سائیں شہر والی کوٹھی گئے تھے، آج دوپہر بڑے شاہ جی کے قاتلوں والے کیس کی سنوائی جو ہے۔'' بشیراں نے سدرہ کو یاد دلایا کہ وہ اتنی اہم بات کیسے بھول گئی؟

''اوہ! میں کیسے بھول گئی؟'' سدرہ نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

''ہاں ماسی بختاں، کیا ہوا ہے بھابی کو؟'' سدرہ نے بستر پر تڑپتی عائشہ کو دیکھ کر دایا سے پوچھا۔

''وہ جی... اب میرے بس کی بات نہیں ہے، بچہ ترچھا بھی ہے اور سانس بھی مدھم ہے اگر جلدی آپریشن نہ کیا گیا تو زہر پھیل جائے گا، کیوں کہ بچے کا پانی بھی ختم ہوگیا ہے۔''

''میرے خدا!'' سدرہ نے دل پر ہاتھ رکھا۔

''تم دو گھنٹے سے بھابی کو کمرے میں لیے بیٹھی ہو اور ایک بار بھی اتنی خطرناک صورتِ حال کا نہ بتایا۔ اگر میری بھابی کو کچھ ہوگیا تو تیری اور تیرے خاندان کی خیر نہیں۔'' سدرہ کا غم اور غصے سے بے حد بُرا حال تھا۔

''بشیراں... بشیراں!'' سدرہ نے تڑپتی ہوئی عائشہ کا سر گود میں رکھ کر ملازمہ کو آواز دی۔

''جی بی بی!'' بشیراں کسی بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوئی۔

''ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے شہر جانا ہے!'' تڑپتی ہوئی عائشہ کی چیخیں آسمان تک چھو رہی تھیں۔

سدرہ کے تو ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔

''بی بی صاحبہ! شہر لے جانے کا بھی وقت نہیں رہا۔'' دایا نے کانپتی آواز میں کہا۔ وہ کم عقل عورت سیدوں سے بچے کی پیدائش کے انعام و اکرام کے چکر میں خود ہی مسئلے سے نپٹنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔

جب سید عبداللہ پیدا ہوئے تھے تو اُس کی ماں کو ایک قطعہ زمین سید نوازش علی نے انعام کے طور پر دی تھی۔

یہ دایا بھی اِسی لالچ میں تھی۔ وہ ہر صورت یہ کیس کرنا چاہتی تھی اور اب اِس لالچ میں اُسے اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ وہ عائشہ بی بی کا کیس بے حد خراب کر چکی تھی۔

''سدرہ!''

''ہائے۔ میں مر جاؤں گی!'' عائشہ نے روتے ہوئے کہا۔

''اگر شہر نہیں لے جائیں گے تو پھر کیا کریں؟'' سدرہ نے چیخ کر پوچھا۔

''بی بی صاحبہ! میں تو پیٹ کاٹنے اور ٹانکے لگانے میں اناڑی ہوں البتہ وزیراں علی چھوٹے مو[ـ] ٹانکے لگاتی آئی ہے شاید وہ کچھ کر سکے۔'' دایا نے پھر اپنی ہی سوچی کہ وہی کوئی عورت لا کر دے تا ک[ہ] انعام میں اُس کو حصہ ہر صورت مل جائے۔

''دماغ خراب ہوگیا ہے تمہارا... ہر طرح کی اوٹ پٹانگ تجربے کے لیے تمہیں میری ہی بھابی مل[ی] تھیں۔''

''یا اللہ کیا کروں... کیا کروں؟'' سدرہ نے درد سے دُہری ہوتی عائشہ کا سر سہلایا اور پھر آخر اللہ [نے] راہ سوجھا دی ورنہ سدرہ تو اپنے ہاتھ پاؤں چھوڑے بیٹھی تھی۔

❖❖ ◯ ❖❖

''بی بی! سوچ لو آج تک آپ کے خاندان کی عورتوں کو کسی نے دیکھا تک نہیں، کہاں یہ زچگی مرد [ک]روائے گا۔'' بشیراں نے ڈرتے ہوئے کہا۔

''تم اپنی زبان مکمل بند رکھو کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ عائشہ بھابی کی مدد کے لیے ایک مرد ڈاکٹر کو [ب]لایا ہے۔'' سدرہ نے نہایت سختی سے اُسے جھڑکا۔

''بی بی جی! میری زبان تو کبھی نہیں کھلے گی لیکن سید عبداللہ کو اگر پتا چل گیا اور انہوں نے اِسے اپنی [غی]رت کا مسئلہ بنالیا تو بہت مشکل ہو جائے گی۔'' بشیراں نے بند دروازے کو خوف سے دیکھتے ہوئے کہا [جس]ں کے پیچھے ڈاکٹر فیصل، عائشہ بی بی کے لیے اندر داخل ہوا تھا۔

''اللہ کرم کرے گا... اس وقت بھابی کی اور بچے کی زندگی اہم ہے، پھر میرا بھائی باہر کا پڑھا لکھا ہے اللہ کرے وہ کبھی غلط نہ سوچے...'' سدرہ کہہ کر تیزی سے اندر داخل ہوگئی۔

ایک زندگی کو جنم دینا کس قدر مشکل مرحلہ ہے۔ شاید یہ ہی وجہ ہے کہ اللہ کو عورت میں، ماں کا روپ [سب] سے زیادہ پسند ہے اور اُسے افضل درجہ دیا ہے۔

عورت ایک جنم دینے کے لیے، ایک زندگی کو اس دنیا میں لانے کے لیے خود موت سے ہاتھ ملا کر آتی ہے۔ دنیا کا بڑے سے بڑا دل والا مرد بھی موت کو خوش دلی سے دیکھنا نہیں چاہتا جب کہ ایک کمزور ناتواں عورت کو اللہ نے ساری تکلیف برداشت کرنے کی ہمت دے رکھی ہے۔

''میں اپنی پوری کوشش کر رہا ہوں کہ دونوں بچ جائیں لیکن حالت تمہارے سامنے ہے۔''

''پھر... یہ دیکھو میرے پاس تو مکمل آپریشن کے اوزار تک نہیں ہیں۔'' ڈاکٹر فیصل کی آواز بے حد فکر [م]ند تھی۔ ڈاکٹر فیصل کی مدد مریم کر رہی تھی۔

سدرہ تو چاہتے ہوئے بھی قریب کھڑی نہ ہو پا رہی تھی اس نے قریب ہی حاجت کے نوافل کی نیت [ب]اندھ لی۔

''اے اللہ تو تو مُردوں میں بھی جان ڈال دیتا ہے۔ جنگلوں میں جہاں کوئی مددگار تک نہیں ہوتا وہاں [ز]ندگیاں جنم لیتی ہیں صرف اور صرف تیری مدد سے...

اے اللہ! تو میری بہن، میری بھابی عائشہ کو صحت و زندگی عطا فرما اُسے نیک صالح اولاد عطا [فر]ما۔'' سدرہ نے سجدے میں جا کر گڑگڑا کر دعا کی۔ وہ اِس وقت کمرے کے سارے ماحول سے کٹ گئی [تھ]ی۔

وہ تھی... اُس کا اللہ اور اُس کی منت بھری دعا تھی۔

''مالک!'' وہ سسکی۔

اُسی پل بچے کے رونے کی آواز آئی۔

''یا میرے اللہ! ہمیں اپنی بھابی اور اِسے ماں کی جدائی کی آزمائش سے بچانا۔'' سدرہ کی ہمت نہیں [ر]ہی تھی کہ وہ سر اُٹھا کر صورتِ حال تک دیکھے۔

''سدرہ!'' اُسے اپنے کندھے پر بوجھ محسوس ہوا۔

اُس نے بے اختیار سر اُٹھایا۔ سامنے سید عبداللہ لبریز آنکھوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ اُن کے

بازوؤں میں ایک ننھا فرشتہ تھا۔

''لالہ! معاف کردینا... میرے پاس ان دونوں کی زندگی بچانے کے لیے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا۔'' سدرہ گڑگڑائی۔ وہ اپنے خاندان کے مردوں کی سختی سے آگاہ تھی۔

''چپ! اللہ نے دیکھو کتنا کرم کیا ہے، ہماری عائشہ ہمارے ساتھ ہے۔'' سید عبداللہ گزشتہ آدھے گھنٹے سے کمرے میں موجود تھے۔ سدرہ اپنے نوافل میں اِس قدر مگن تھی کہ ماں اور بھابی کی واپسی کا پتہ ہی نہ چل سکا۔

عائشہ بے ہوش تھی لیکن خطرے سے باہر تھی۔ ڈاکٹر فیصل بہت قابل سرجن تھا، اُس نے بے حد مہارت سے اس آپریشن کو بغیر سہولتوں کے ہینڈل کیا تھا۔

''ٹانکے کچے ہیں مریضہ کو ہلنے جلنے سے منع کرنا ہے، میں کچھ دوائیاں لکھ کر دیتا ہوں فوراً شہر سے منگوالیں۔ ساتھ ہی کسی نرس وغیرہ کا بندوبست کریں جو دو تین دن ان کو ڈرپ میں میڈیسن وغیرہ لگا سکے۔'' ڈاکٹر فیصل نہایت پروفیشنل انداز میں بول رہا تھا۔

''لالہ! مبارک ہو۔'' مریم کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی۔

''یہ دیکھو بیٹا ہے!'' مریم نے بچہ سدرہ کی گود میں ڈال دیا۔

''میرے اللہ!'' سدرہ کے جلتے سلگتے وجود میں ایک دم سے ٹھنڈک اُتر آئی۔ اُس نے بے اختیار کو چوما۔

معصوم فرشتہ کسمسایا۔

''یہ تو میرا بیٹا ہے!'' سدرہ کا ادھورا پن سوالی بنا۔

''اسے میں لے لوں؟'' وہ بھائی سے فرمائش کررہی تھی، جیسے وہ کوئی چوڑی ہار بُندا مانگ رہی ہو۔

''ہوں!'' سید عبداللہ نے اثبات میں سر ہلایا تو سدرہ کے مُردہ دل میں جان پڑگئی۔

''اُس کا نام میں ولی رکھوں گی... یہ ننھا فرشتہ اللہ کا دوست بن کر آیا ہے۔ ہم سب کے لیے رحمت بن کر آیا ہے۔ یہ میرا عبدالولی ہے!'' سدرہ نے جھک کر بچے کی بند آنکھوں پر پیار کیا۔

''تمہیں یہ دنیا بدلنی ہوگی، تم پر میرے ان لمحوں کا قرض ہے۔'' سدرہ نے بچے کے چہرے کے قریب آکر سرگوشی کی۔ ''عبدالولی!''

''یہ ہمارا بیٹا ہے مریم۔''

''ہمارا!'' سدرہ نے لبریز آنکھوں سے کہا۔

مریم بھی روتی آنکھوں سے بے اختیار رودی تھی، وہ سدرہ کے اندر کے خالی پن سے اچھی طرح آگاہ تھی، جو بچوں کے لیے ترستا تھا۔

''کتنا پیارا ہے نا!'' سدرہ نے بھائی کو مخاطب کیا۔

''آں... ہاں!'' سید عبداللہ نے چونک کر کہا۔ اُس کی ساری توجہ بے ہوش عائشہ پر تھی، جو ہلدی کی طرح پیلی پڑ چکی تھی۔

''اب فکر کی کوئی بات تو نہیں؟'' سید عبداللہ نے ڈاکٹر فیصل کے ساتھ باہر آتے ہوئے پوچھا۔

''احتیاط کی بے حد ضرورت ہے! اناڑی دایا نے کافی نقصان کردیا ہے۔ بھابی کچھ عرصہ مکمل بیڈ پر گزاریں شاید تین چار ماہ لگ جائیں... مجھے تو دایا کی، کی ہوئی گڑبڑ کے بھی ٹانکے لگانے پڑے۔ وہ تو شکر ہے کہ ابھی گزشتہ ہفتے ہی میں سرجری کا بہت سارا سامان لے کر گاؤں آیا تھا۔ ورنہ تو یہ آپریشن ناممکن تھا۔'' ڈاکٹر فیصل نے گول کمرے میں آکر کہا، جہاں سید عبداللہ نے اُن کے لیے چائے کے ساتھ بہت سارے لوازمات منگوا رکھے تھے۔

''عبداللہ!'' پیچھے سے زلیخا بی بی کی آواز آئی۔

''جی امّاں جان!'' سید عبداللہ تابع داری سے مُڑا۔

لیکن ڈاکٹر فیصل سے پردہ کیے ہوئے بھی سید عبداللہ ماں کی واضح ناراضی دیکھ چکا تھا۔

''بچے سے کہو کہ وہ کسی سے ذکر نہ کرے کہ وہ ہماری حویلی کی عورت کے علاج کے لیے آیا تھا۔'' یہ بات اِس حویلی سے باہر نہیں نکلنی چاہیے۔''

''جی اچھا!'' سید عبداللہ، ڈاکٹر فیصل کو وہاں بٹھانے کے بجائے باہر لے آئے۔

''سوری یار!''

''ہمارا ماحول اِس قدر دقیانوسی ہے کہ میں تمہیں بتا بھی نہیں سکتا۔ یہاں عورتوں کو مرنے دیا جاتا ہے لیکن کسی میل ڈاکٹر سے علاج کروانے کا سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ آج میری بہن نے جو بولڈ اسٹیپ لے کر میری بیوی اور بچے کی زندگی بچائی ہے، میرے اوپر سدا اس کا احسان رہے گا۔ امّاں جان، سدرہ آپی اور مجھ سے بے شک بے حد ناراض ہیں لیکن دو زندگیوں کے سامنے یہ ناراضی تو جھیلی جاسکتی ہے۔''

''تھینکس یار! تمہارے مجھ پر دُہرے احسانات ہیں پہلے تم نے میری جان بچائی یہ احسان کم تھا، جو آج تم نے میری بیوی اور بچے کو نئی زندگی دی... میں واقعتاً تمہارا بے حد شکر گزار ہوں۔ کسی بھی شخص کی اچھائی کا اجر کوئی انسان نہیں لوٹا سکتا۔ تمہاری اچھائی، بھلائی کا اجر اللہ تعالیٰ ہی کی ذات دے گی لیکن پھر بھی تم بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں؟'' سید عبداللہ نے بہت پیار سے پوچھا۔

ڈاکٹر فیصل نے بہ غور اس بے حد وجیہہ انسان کو دیکھا، جس کا چہرہ ہی نہیں دِل بھی بے حد خوب صورت تھا۔

''کیا یہ اپنی بہنوں کے لیے بھی اِس قدر اچھا دِل رکھتا ہوگا؟'' ڈاکٹر فیصل کے اندر مختلف سوالات مختلف زاویوں سے پلس مائنس ہونے لگے۔

''کیا میں اِس موقعے کا فائدہ اُٹھالوں...؟'' اُس کے اندر لالچ نے سر اُٹھایا۔

''موقعے سے فائدہ اُٹھانا اچھی بات نہیں ہوتی۔'' ڈاکٹر فیصل بے اختیار بولا۔

''تو ٹھیک ہے تم بھی بغیر موقعے کچھ کہہ کر دیکھنا میں تمہیں کبھی مایوس نہ کروں گا۔'' سید عبداللہ نے ڈاکٹر فیصل کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''اللہ کرے تمہارا ظرف تمہارے قول کا ساتھ دے۔'' ڈاکٹر فیصل کی بات پر سید عبداللہ بے اختیار چونکا۔

''ایسا کیا تم کہنے والے ہو جو میرے ظرف سے بڑا ہوگا؟'' سید عبداللہ خود کو سوال سے روک نہ سکا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ کہوں گا میں صرف تم سے... لیکن کچھ عرصے بعد۔" ڈاکٹر فیصل کا سسپنس سید عبداللہ کو بے چین کرگیا تھا۔

"اگر تم اپنے ہسپتال کے لیے مزید زمین چاہو گے تو میں ضرور دوں گا..." سید عبداللہ نے دِل ہی دِل میں اندازہ لگا کر خود سے کہا۔

❖❖○❖❖

"کون ہو مائی تم؟" سید سرفراز سیڑھیاں اُتر کر ہال کمرے میں آیا۔ ملازم نے بتایا تھا کہ کوئی عورت اُس سے ملنے پر بہت اصرار کررہی تھی۔

"میں زبیدہ کی چچی ہوں!" ریحانہ چچی نے نقاب کھول دیا۔

"تو؟" سید سرفراز نے ماتھے پر بَل ڈال کر کہا۔

"میں تمہیں کچھ بتانے آئی ہوں۔" ریحانہ چچی کو سید سرفراز سے مل کر بے حد مایوسی ہوئی تھی لیکن وہ پھر بھی سید سرفراز سے بات کرنا چاہتی تھیں۔ آخر یہ زبیدہ کی زندگی کا سوال تھا۔

"میں کچھ بھی سننے میں دِلچسپی نہیں رکھتا۔" سید سرفراز نے روکھے لہجے میں کہا۔

"لیکن یہ تم کو سننا ہوگا خواہ تمہارا دِل چاہے یا نہ چاہے۔" ریحانہ چچی نے کہا۔

"تم نے جو کچھ زبیدہ کے ساتھ کیا تھا اُس کا پھل اُس کی کوکھ میں پل رہا ہے۔ وہ اکیلی اِس سارے کی ذمے دار نہیں ہے تم برابر کے اس گناہ میں شریک ہو اب تمہارے اور اُس کے لیے بہتر ہوگا کہ تم اُس سے نکاح کرلو تا کہ بچے کو باپ کا باعزت طریقے سے نام مل سکے۔ ویسے دیر اس قدر ہوگئی ہے کہ تم لوگ بچے کو فوراً دنیا والوں کو دکھا نہ پاؤ گے، زبیدہ کو میں اپنے ننھیالی گاؤں لے کر گئی ہوں تا کہ اُس کے باپ کو اس قیامت کی خبر نہ ہو۔ چند دنوں تک بچہ دنیا میں آجائے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ اُسے تم نام دو تا کہ وہ ناجائز نہ کہلائے۔" ریحانہ چچی نے کہا۔

"اس ساری گفتگو کرنے کا مقصد؟" سید سرفراز علی نے بے نیازی سے پوچھا۔

"تم اُس بچے کی باپ ہو!" وہ غصے سے بولیں۔

"جس کو میں نہ مانوں گا تو وہ کیسے میرا بچہ کہلائے گا؟" سید سرفراز کی ہنسی، ریحانہ چچی کو بے حد مکروہ لگی۔

"اللہ سے ڈرو سید سرفراز علی۔" ریحانہ چچی نے اُسے اُس بڑی ذات کا ڈراوا دیا۔

سید سرفراز یوں قِل قِل کر کے ہنسا جیسے اُس نے کوئی لطیفہ سن لیا ہو۔

"مت ہنسو! ایسے کسی دن سر پر ہاتھ رکھ کر روؤ گے..." ریحانہ چچی نے نہایت بے بسی سے کہا۔

"ایسا کوئی دِن نہیں نکلنے والا۔" سید سرفراز علی اپنی جوانی، صحت، دولت اور طاقت کے نشے میں چُور ہوکر بولا۔

"کیوں خود کو خدا بنا کر دوسروں کی زندگیاں بھی تباہ کررہے ہو۔ تم زبیدہ کو اپنا لو تو اللہ کی ناراضی سے بچ جاؤ گے۔" ریحانہ چچی نے مجبوراً اپنا لہجہ نرم کیا۔

"ہرگز نہیں... میرے وارث کو کوئی بہت امیر کبیر اور خاندانی لڑکی جنم دے گی۔" سید سرفراز نے فوراً انکار کردیا۔

"اور یہ بچہ؟" ریحانہ چچی نے دکھ سے پوچھا۔

"اُسے تم جو مرضی کرو، لیکن آئندہ میرے سر تھوپنے ہرگز نہ آنا۔" سید سرفراز علی کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"تم کس قدر ظالم ہو، اپنی ہی اولاد کے لیے اِس طرح کی باتیں کررہے ہو۔ تم نے ایک لڑکی کی زندگی تباہ کر ڈالی، تم کو اِس کا احساس تک نہیں ہے۔"

"میں اُس لڑکی کے پاس نہیں گیا تھا۔ وہ ہی میرے پیچھے آیا کرتی تھی اور اگر وہ میرے پیچھے آتی تھی تو جانے اور کتنوں کے پیچھے جاتی ہوگی اور جانے یہ بچہ کس کا ہے۔" سید سرفراز نے بدتمیزی سے کہا۔

"بس کرو سید سرفراز علی! میں نے آج تک کسی کو بد دعا نہیں دی لیکن میں آج تمہیں بد دعا دیتی ہوں۔ اللہ تمہیں اس بچے کی ناقدری کے بدلے میں کبھی اولاد کا سُکھ، اُن کی خوشیاں نہ دے، اللہ میری بچّی کی ناقدری کے بدلے تمہیں کبھی بیوی کا سُکھ نہ دے۔ تم بھی ویسے ہی خالی اور کانٹوں بھرے راستے میں سفر کرو، جو میری بچی جھیل رہی ہے۔"

"مقبول احمد!" سید سرفراز کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہوگیا تھا۔

"اس مائی کو اُٹھا کر باہر پھینکو۔" سید سرفراز کہہ کر سیڑھیاں چڑھنے لگا لیکن ریحانہ چچی کی بے بس بد دعائیں اُس کا اُوپر تک پیچھا کرتی آئی تھیں۔ سید سرفراز علی نے کمرے میں آ کر یوں سر جھٹکا، جیسے وہ کوئی وزن سر سے اُتار رہا ہو۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اُس کے سر جھٹکنے اور اُس عورت کی باتوں کو جھٹلانے سے یہ بات ختم نہ ہوگی۔

ریحانہ چچی نے زبیدہ کو ماں بن کر پالا تھا اور وہ ایک دکھی ماں کی تڑپ تھی اور ماں کی تڑپ کبھی اللہ رائیگا نہیں جانے دیتا۔

آج وہ ماں جس آگ میں جل رہی تھی۔ سید سرفراز علی کا مستقبل اُس کی تپش سے جھلسنے والا تھا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ لوگ کانٹے بوئیں اور انہیں کاٹے نا۔ سید سرفراز علی نے اندر آتی اپنی ماں کو دیکھا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

"خیریت؟" ماں کے چہرے پر کچھ عجیب سا تھا۔

❖❖○❖❖

"سید عبداللہ کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔ اُن کا وارث آچکا ہے! اِن زمینوں کا وارث آچکا ہے اب تو کیا کرے گا؟" ماں نے اُسے دہلایا۔

سید سرفراز کو واقعتاً اندر سے بے چینی ہوئی تھی۔

"اماں! میرا بیاہ کردو۔" سید سرفراز کے اتنے ٹال مٹول کے بعد یہ حامی واقعی اُس کی ماں کے لیے حیرانی لیے ہوئے تھے۔

"لیکن..." وہ کچھ کہنے جارہی تھیں۔

"لیکن... کچھ نہیں... مجھے فوراً شادی کرنی ہے۔" سید سرفراز کہہ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

اُسے فوراً اپنی زمینوں کے وارث کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ عبداللہ سے اُسی صورت جیت سکتا تھا کہ

اُس کے ہاں بھی بیٹے ہوں کیوں کہ سید نوازش علی نے اپنی ساری زمین اپنے پوتوں کے نام لکھی تھی۔

''عبداللہ کے بچے کو تو میں جینے نہیں دوں گا اور باقی زمین صرف میرے بچوں کے لیے ہوگی...لیکن اس سے پہلے مجھے شادی ضرور کرنا ہوگی...تاکہ میرے بچے بھی آسکیں۔''

اِس ساری پلاننگ میں اُسے رتی بھر بھی اُس بچے کا خیال نہ آیا، جو اُس کی ہوس کی نشانی بن کر ایک معصوم لڑکی کی کوکھ میں پل رہا تھا۔ دو زندگیاں معاشرے میں سوال بننے والی تھیں لیکن اُسے صرف اپنی پروا تھی۔

وہ تو صرف اور صرف خود کے لیے سوچتا تھا۔ اس کی وجہ سے ایسے میں کوئی مرے یا جیے اُسے کسی کی پروا کب تھی۔ ظلم کرنے اور زیادتی کے مزے لینے والے کب جانتے ہیں کہ ظالم کی رسی دراز ضرور ہوسکتی ہے لیکن وہ قدرت کے انتقام سے بچ نہیں سکتے، حساب سے بھاگ نہیں سکتے۔ آنے والا کل سرفراز علی کے ظلم کا دہلا دینے والا جواب لیے کھڑا تھا۔

❁

خواہشوں سے دست بردار ہونے کا مطلب ہے کہ انسان اپنے خوابوں سے دست بردار ہو رہا ہے۔ اور...اور جب خواب نہ رہیں تو نیند نہیں رہتی اور ایسے میں انسان بس جاگتا ہی رہتا ہے۔ خواہش اور خواب کا ادھورا پن اور جاگتے زخم انسان کو دھیرے دھیرے توڑ دیتے ہیں۔

''میں تم سے کیسے دست بردار ہو جاؤں نگینہ!'' طارق نے بے چینی سے چکر کاٹتے ہوئے سوچا۔

وہ اس وقت سحرش کے گھر میں تھا اُس کے کمرے میں موجود! اب سحرش نا چاہتے ہوئے بھی اُس کی زندگی کا اہم ترین حصہ تھی۔ لیکن وہ ایسا حصہ تھی، جس کو وہ کبھی کسی کے سامنے ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا۔

طارق نے تھک کر اپنا وجود ڈرائنگ چیئر پر گرادیا۔

وہ جب جب سحرش سے ملنے آتا تو نگینہ کا تصور مجسم ہو، ہوکر اُس کے سامنے چلا آتا اور بے طرح اُسے بے بس و مجبور کردیتا۔

سحرش! جس کو بے حسی کے خول سے طارق ہی نے نکالا تھا، اب ہر وقت طارق کا بے چینی سے انتظار کرنے لگی تھی۔ ادھر مرینہ آنٹی دھیرے دھیرے سحرش کے کانوں میں اُس کے اور طارق کے رشتے کے متعلق کچھ نہ کچھ ڈالتی رہتی تھیں۔ وہ پہلے سے زیادہ طارق سے اٹیچ ہوچکی تھی، جب کہ جیسے ہی سحرش طارق کے سامنے آتی، اس کو اپنا وجود ایک دم خالی خالی لگنے لگتا۔

تم مری کون ہو، تم سے ہے تعلق کیسا؟
تم کسی دُھند میں لپٹی ہوئی تنہائی ہو
میری شہرت ہو دعا ہو، میری رُسوائی ہو
بات کرتی ہو کبھی چُپ میں بکھر جاتی ہو
کیوں میری روح کے گوشوں پر ستم ڈھاتی ہو
تم مری کون ہو، تم سے ہے تعلق کیسا؟
تم مرے پاس ہو، نا دور ہو میرے دل سے

''ہیلو...ہیلو! کون بول رہا ہے؟'' نگینہ کی آواز مسلسل موبائل سے آرہی تھی، جب کہ طارق لب بھینچے اُس کی آواز سُن رہا تھا۔ جن سے دِلوں کا تعلق ہوتا ہے، اُن کی تو آواز بھی دِل کی رگوں میں توانائی بن کر اُترتی ہے۔

طارق بھی اپنے مرتے بے جان دِل کی زندگی چاہتا تھا۔ نگینہ نے ہیلو، ہیلو کر کے فون آخر بند کر دیا۔ طارق نے آنکھیں موندھ کر طویل گہری سانس بھری... وہ دھیرے دھیرے چلتا دیوار پر لگے اُس فریم کے پاس پہنچا، جس میں سحرش کی اپنی فیملی کے ساتھ تصویر تھی۔

تابیہ آنٹی، اُن کے شوہر، ساس، بیٹے اور سحرش کا مسکراتا زندگی سے بھرپور چہرہ... یہ سب لوگ مر چکے تھے لیکن مرنے سے پہلے اپنا رشتہ طارق سے بنا چکے تھے۔

''نہیں یہ سب کے سب نہیں مرے! اِن میں سحرش تو زندہ ہے... کیا وہ سحرش کو خوش رکھ پائے گا؟'' یہ ایسی کسوٹی بھرا سوال تھا کہ طارق کا سارا وجود بے چینی سے بھر گیا۔

اُسی پل کوئی اُس کی پشت سے آ کر لپٹ گیا۔

''طارق آپ کتنے دِنوں بعد آئے ہیں!'' معصوم اور بے قرار شکوہ اُس کے سامنے تھا۔

''میں کام سے گیا ہوا تھا۔'' طارق نے نرمی سے اپنا آپ اُس سے چھڑا کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

وہ بے اختیار اُس سے نظریں چُرا رہا تھا۔ وہ اُس کی زندگی کی ایسی حقیقت بن چکی تھی کہ جس سے وہ چاہ کر بھی نگاہیں نہ چُرا سکتا تھا۔

''میں نے آپ کو بہت مِس کیا... کیا آپ نے بھی مجھے مِس کیا؟'' وہ بے حد جوش سے بول رہی تھی۔

''ہوں...!'' طارق کو یہ ہوں کہنا بھی بے حد دُشوار لگ رہا تھا۔

''یا اللہ! میں اِس سے رشتہ کیسے نبھا پاؤں گا۔''

''طارق! ایک بات پوچھوں؟'' سحرش نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''ہوں...!'' طارق نے جیب سے سگریٹ نکال کر لائٹر جلایا۔

وہ سحرش سے شادی سے پہلے کبھی اسموکنگ نہ کرتا تھا۔ لیکن اپنے اندر کی بے چینی سے گھبرا کر اُس نے اسموکنگ شروع کر دی تھی۔

''مرینہ آنٹی کہتی ہیں کہ آپ میرے شوہر ہیں اور شوہر...! وہ ایک دم چُپ ہو گئی۔

''اور کیا؟'' طارق اپنے ہی خیالوں میں مگن تھا ورنہ اُس کے چہرے کے رنگوں کو دیکھ کر مزید سوال نہ کرتا۔

''طارق! میں نے زندگی سے بس دُکھ اور عدم تحفظ ہونے کا احساس ہی پایا ہے۔ لیکن اتنا سب کچھ ہونے کے بعد اگر اللہ نے مجھے آپ سے نواز دیا ہے تو میں آپ کو کبھی کھونا نہیں چاہوں گی... میں نے زندگی کے دو سال پتھر کی مورت بن کر گزارے، وہ زندگی کا خوف ناک دور تھا لیکن اُس حبس بھرے اندھیرے میں تازہ ہوا اور روشنی آپ نے ہی بھری تھی۔ آپ کی توجہ سے میں زندگی کی جانب بڑھی ہوں... آپ... آپ مجھے کبھی نہ چھوڑ کر جانا۔'' وہ ایک دم اُس سے لپٹ گئی۔ طارق کو اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

''اب آپ میرے شوہر ہیں، میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی...'' اُس کے لفظوں میں جو مطالبے تھے، وہ فی الحال طارق پورے نہیں کر سکتا تھا، اُس کا دل و دماغ اُس کا ساتھ نہ دے رہے تھے۔

''تم بے فکر رہو میں کبھی تم سے لاپروا نہ رہوں گا۔'' طارق نے ایک دم کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''طارق! آپ نہیں جانتے تو جان لیں، آپ میری زندگی کی سانسیں ہیں اور... آپ یہ تو جانتے ہی ں نا کہ سانسوں بنا زندگی ختم ہو جاتی ہے۔'' طارق نے چونک کر سحرش کو دیکھا، اُسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا ۔حرش کی آنکھوں میں جنون اور ضد تھی۔

''اللہ حافظ!'' طارق نظر چُرا کر تیزی سے باہر نکل آیا۔

۔حرش کی نگاہوں کا رنگ طارق کی آنکھوں کے سامنے مسلسل گھوم رہا تھا۔

''کبھی کبھی ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جب انسان گتھیاں سلجھانے بیٹھتا ہے تو دھاگے مزید اُلجھنے لگتے ہیں۔'' طارق نے بے حد تھکے ذہن کے ساتھ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے سوچا پھر اُس نے گاڑی فوراً ۔ام زبیر کے گھر کی طرف موڑ دی۔

❖❖○❖❖

''کیسے ہو، خوب صورت آدمی!'' پروفیسر اکرم زبیر نے وہیل چیئر کے ساتھ اندر آتے ہوئے کہا۔

''شکر الحمدللہ سر!'' طارق نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا۔

''کچھ اُلجھے ہوئے لگ رہے ہو۔'' انہوں نے اپنی الیکٹرک چیئر صوفوں کے بیچ خالی جگہ پر لا کر ۔پوچھا۔

صوفوں کے درمیان یہ جگہ اُن کے لیے خاص طور پر خالی رکھی گئی تھی۔ اِسی طرح کھانے کی میز کی بھی ۔کرسی ہٹا کر اُن کی وہیل چیئر کی جگہ بنائی گئی تھی۔ طارق نے پہلی بار جب اِس شخص کو دیکھا تھا تو بے حد افسوس ہوا تھا لیکن جیسے جیسے وہ پروفیسر اکرم زبیر سے گفتگو کرتا گیا اُس کا یہ افسوس بھاپ بن کر اُڑ گیا ۔ بے شک وہ پولیو زدہ ٹانگوں کی وجہ سے چل پھر نہیں سکتے تھے لیکن وہ بے حد خود مختار تھے۔ اُن کو اپنی ۔کی سے کوئی شکوہ نہ تھا اُن کی ٹانگیں بے شک کمزور تھیں لیکن وہ بے حد مضبوط انسان تھے، خود گاڑی چلا ۔آتے جاتے تھے۔ انہوں نے زندگی میں ہار اور مایوسی کو کبھی اپنے سامنے نہ آنے دیا تھا۔ وہ بے حد ۔ال ماہر نفسیات تھے اُن کا اپنا پرسنل سیٹ اَپ بھی تھا اِس کے علاوہ گورنمنٹ جاب بھی تھی۔ پبلک ۔ں کمیشن کے تھرو وہ بیسیوں افراد میں سے منتخب ہوئے تھے آج کل سینٹرل جیل ہسپتال میں کام ۔رہے تھے جو مجرم مریض اُن کے پاس لائے جاتے تھے وہ بے حد خطرناک ہوتے تھے کبھی اپنے جرائم ۔ار نہ کرتے تھے۔

۔ن پروفیسر اکرم زبیر کا ریکارڈ تھا کہ اُن کے پاس مشکل سے مشکل کیس حل ہو جاتا تھا۔ بڑے ۔جرم اپنا قصور مان لیتے تھے۔ اِسی طرح نوجوان لڑکے جو ذہنی طور پر بے حد ڈسٹرب ہوتے تھے وہ ۔لی تحلیل نفسی کے بعد زندگی اور مثبت سوچ کی طرف آ جاتے تھے۔ اس لیے وہ کمزور ٹانگوں اور مضبوط ۔وں والے ذہین آدمی بے حد مصروف رہتے تھے لوگوں میں آسانیاں بانٹتا انہوں نے اپنی زندگی کا ۔بنا ڈالا تھا۔

۔ل میں کوئی عام آدمی بھی جا کر مجرم بن جاتا ہے۔ انہوں نے یہ کلیہ ختم کر ڈالا تھا۔ وہ بہت محنت ۔دوں کو انسان بنا رہے تھے۔ طارق کے ساتھ اُن کی دوستی بھی جیل کے ایک وزٹ کے دوران

ہوئی تھی پھر یہ دوستی کب ایک محبت بھرے رشتے میں تبدیل ہوگئی طارق خود بھی نہ جانتا تھا۔

''طارق! آر یو آل رائٹ؟'' پروفیسر اکرم زبیر نے پوچھا۔ طارق نے بے اختیار تھکن بھری سانس بھری۔

اور پھر جانے کیسے وہ اُن کے سامنے کھلتا ہی چلا گیا۔ سحرش سے چھپ کر شادی کرنا ایک اتنا بڑا بوجھ تھا جو وہ اکیلے سہار نہ پا رہا تھا۔

''ہوں... اگر تم نے شادی کر ہی لی ہے تو پھر گھبرا کیوں رہے ہو؟'' پروفیسر اکرم زبیر کے سوالات کا مطلب ہوتا تھا کہ اُن کا Analises شروع ہے۔

''میں... میرا تو خیال تھا کہ وہ تو اِس قدر مظلوم اور زندگی سے بیزار لڑکی ہے کہ مجھ سے کسی قسم کے حقوق کی ڈیمانڈ نہ کرے گی لیکن وہ تو... عام لڑکیوں سے زیادہ Expressive ہو چکی ہے۔'' طارق نے آخر اپنی پریشانی کہہ ہی ڈالی۔

''تو تم اُس سے صرف کاغذی رشتہ رکھنا چاہتے تھے؟''

''جی ہاں! کیوں کہ میرا ماننا ہے کہ جسمانی تعلق بھی صرف دلی تعلق سے بنتا ہے۔'' طارق نے اپنی بے بسی ظاہر کی۔

''لیکن ہر مرد اتنی خالص سوچ نہیں رکھتا، وہ تو عموماً اَن چاہی بیویوں کے ساتھ بھی ساری زندگی گزار دیتے ہیں۔'' پروفیسر اکرم زبیر نے مسکراتے ہوئے اُسے ملازم کی لائی ہوئی چائے دی۔

''لیکن... میرا معاملہ مختلف ہے سر! میری زندگی میں سچائی بے حد اہم ہے، میں سحرش کے نام کا ملاوٹ ہرگز نہ کرتا اگر اُس مرتی ہوئی عورت کا اِس قدر زیادہ اصرار نہ ہوتا... اب جب کہ میرا خیال تھا کہ سحرش چوں کہ خود اتنے بڑے سانحے سے گزری ہے تو وہ...'' طارق کہتے کہتے حجاب سے رُک گیا۔

''ہوں...!'' پروفیسر اکرم زبیر نے بڑا سا ہنکارا ابھرا۔

''ایسے اسپیشل کیسز میں عموماً ایسا ہوتا ہے کہ جس شخص کو ہم بے ضرر جانتے ہیں وہ بے حد Selfish ہو جاتا ہے۔ عموماً اندھے، لنگڑے، گونگے لوگ اپنے حقوق کی حفاظت کے چکر میں نارمل انسانوں سے زیادہ لڑاکا اور غصیلے ثابت ہوتے ہیں۔

وہ بھی بہت کچھ کھونے کے بعد اِس عجیب سے دور میں داخل ہو چکی ہے اور تم واحد انسان اور واحد رشتہ ہو اُس کے پاس، پھر بے حسی کے دور میں تم واحد انسان تھے، جو اُس کے سامنے تھے۔'' وہ لمحے بھر کے لیے رکے اور پھر مخاطب ہوئے۔

''ایکچولی تم اُس کی چھوٹی سی دنیا کا مرکز ہو... اِس لیے تم پر اُس کی ملکیت بڑھ گئی ہے، اِس لیے اُس کا ڈیمانڈنگ ہونا اور تم پر حق جتانا ایسے کیس میں نارمل ہے۔ آئندہ دِنوں میں تم تیار رہو کہ وہ تمہارے ایک ایک پل کے لیے Agressive ہو جائے گی۔ یہ تم کو بہت بُرا لگے گا لیکن وہ اِس کو درست جانے گی۔'' پروفیسر اکرم زبیر نے پزے کے ٹکڑے کو کانٹے میں پرو کر نفاست سے کھاتے ہوئے کہا۔

''اُف...'' طارق نے بے اختیار سانس خارج کیا۔

''ڈونٹ وری بیٹا! اگر تم نے کوئی قدم اچھے مقصد کے لیے اُٹھایا ہے تو اللہ تمہیں آسانیاں دیں گے

انسان کی عقل، تدبیریں، فیصلے اللہ کے آگے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ تم سحرش کو ویک میں ایک بار میرے پاس لایا کرو میں اُسے زندگی میں اُس کا اپنا وجود جو کہیں کھو گیا ہے اُسے کھوجنے میں مدد دوں گا... اِس طرح اُس کا صرف اور صرف تم پر فوکس ختم ہو جائے گا... لیکن اِس کے ساتھ ساتھ تم کو بھی اپنے دل کو منانا ہوگا اور سحرش کو اُس کا حق بھی دینا ہوگا... اب تم اپنی زندگی کا یہ حصہ اگنور نہیں کر سکتے۔'' پروفیسر اکرم زبیر نے اُسے حقیقت کا آئینہ دکھایا۔

''لیکن سر! میں جب سحرش کو دیکھتا ہوں sense of loss میرے اندر بڑھ جاتا ہے اور نگینہ کا تصور میرے ہر احساس کو درہم برہم کر دیتا ہے۔'' طارق نے بے بسی سے اپنا سر اپنے ہاتھوں پر گرا دیا۔

''اِس کا آسان سا حل ہے کہ تم نگینہ سے شادی کر لو... اِس طرح نگینہ کو کھو دینے کا دُکھ اور پچھتاوا تم ڈسٹرب نہیں کرے گا۔'' اکرم زبیر کے مشورے پر طارق نے حیرت سے اُن کو دیکھا۔

''لیکن سر! نگینہ سے پہلے میری زندگی میں لڑکی آ چکی ہے، وہ کیسے میری زندگی کا حصہ بنے گی...؟''

''ہاں کچھ سوشل پرابلمز تو ہیں لیکن تمہارے مسئلے کا حل صرف اور صرف یہی ہے۔ تم فرض اور محبت کے درمیان جھولتے رہے تو کسی ایک کا بھی حق نہ ادا کر سکو گے اِس لیے تم اُن چیزوں کو حاصل کرو، جو تمہارا بچپن کا خواب ہے پھر تم شاید نہیں یقیناً یہ فرض بھی اچھے طریقے سے نبھا لو گے...'' پروفیسر اکرم کا مشورہ طارق کے بے چین اور بے قرار دِل کو ایک دم قرار دے گیا۔

واقعی یہ سچ تھا کہ نگینہ کو کھو دینے کا احساس اُسے اندر سے توڑنے لگا تھا۔

''تھینک یو سر!'' وہ ڈاکٹر اکرم کا شکریہ ادا کر کے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''بیٹا!'' ڈاکٹر اکرم نے اُسے پیچھے سے پکارا۔

''جی سر!''

''اپنے رب پر ہمیشہ یقین رکھنا وہ تم کو کبھی بھی مشکل میں ہمیشہ کے لیے نہیں رہنے دے گا...'' انہوں نے مسکرا کر اُسے دعائیہ انداز میں نصیحت کی۔

''یس سر! انشاء اللہ۔'' وہ دھیرے سے مسکراتے ہوئے باہر نکل آیا۔

واقعی یہ درست ہے کہ صرف ایک مسکراہٹ انسان کے لیے تازہ جھونکے کی طرح ثابت ہوتی ہے۔ طارق اتنے دِنوں سے کھل کر تو کیا دھیمے سے بھی نہ مسکرایا تھا آج جب وہ دھیرے سے مسکرایا تو اُسے اپنے اعصاب بے حد ریلیکس لگ رہے تھے۔ وہ بے حد مگن انداز میں گاڑی چلاتے ہوئے ایک دم رُکا۔ طارق نے بے اختیار چونک کر سامنے عالی شان بنگلے کو دیکھا۔

''کاشانہ روشن'' اپنی پوری آب و تاب سے کھڑا تھا۔ مشہور ڈیزائنر کا بنایا ہوا یہ بنگلہ بے حد Elegent اور خوب صورت تھا۔

دل بوجھل بوجھل رہتا ہے
اک بات یہ مجھ سے کہتا ہے
میں اِس کو بہت سمجھاتا ہوں
ہر بار اسے بتلاتا ہوں

جو خواب ہیں تیری آنکھوں میں
یہ تجھ کو پاگل کر دیں گے
اشکوں سے دامن بھر دیں گے
پھر پاگل دل تو کیا جانے
جب ٹوٹ کے خواب بکھرتے ہیں
تب یاد کے دیپ بھی جلتے ہیں
اور آنکھ سے آنسو بہتے ہیں
لیکن اے پاگل دِل اب کون یہ تجھ کو سمجھائے

''تم کو بھلانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے نگینہ!'' طارق نے بے اختیار مسکرا کر باآواز بلند کہا۔

''صاحب!'' چوکیدار نے اُسے آکر چونکایا۔

''ہوں!''

''صاحب دروازہ کھول دوں؟'' چوکیدار نے اُسے پہچان کر کہا۔

''ہوں۔نہیں!'' طارق نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''ہیں...؟'' چوکیدار واقعی حیران تھا کہ اگر صاحب نے گھر کے اندر نہیں آنا تھا تو وہ یہاں تک لینے کیا آیا تھا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ دِل کی لگی تو انسان کو صحراؤں تک کی سیر کروادیتی ہے۔ یہ تو بس گھر تک کا ہی فاصلہ تھا۔

''یہ بڑے لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں! جانے کب کیا سوچ لیتے ہیں موڈ بدل لیتے ہیں۔'' چوکیدار نے بڑبڑا کر کہا اور اپنے کیبن میں جاکر بیٹھ گیا۔

❖❖○❖❖

وہ لوریوں کی صدا کہاں ہے
گرہ میں تھی جو دُعا کہاں ہے
چراغ بجھنے پہ آ گیا ہے
ہوا کو دیکھو ہوا کہاں ہے
یہ رات اتنی مہیب کیوں ہے
ہمارے آنسو کہاں گرے ہیں
ہمارے غم کا صلہ کہاں ہے
جو کھو گئیں منزلیں کدھر ہیں
جو چھن گیا راستا کہاں ہے!

ترنم کا سارا وجود آنسوؤں کے طوفان سے لرز رہا تھا۔

''میں نے کیسے ہیرے موتی جیسے لوگ کھو دیے...'' وہ دروازے کا تالا پکڑ کر رودی، یہ اُس کا گھر تھا!

اُس کی جنم بھومی! اِس کے آنگن کی مٹی سے اُسے اماں ابا کی خوشبو آتی تھی۔

''میری بیٹی تو شہزادی ہے! یہ تو میری نورالعین ہے! میری آنکھوں کا نور ہے۔''

ابا کہتے تھے۔

''ابا! آہ! میں نے اپنے باپ کو بس ایک بازگشت ہی بنا ڈالا!'' وہ سسکی۔

''آپ کی والدہ کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا اور وہ ایک دِن اچانک گھر سے کہیں چلی گئیں پھر آج تک اُن کا پتا نہ چلا۔'' طارق کی آواز ترنم کے کانوں میں گونجی۔

یہ وہ ہی گلی تھی، وہ ہی شہر تھا اور یہ... یہ وہ ہی دہلیز تھی، جس کو چند سال پہلے وہ رات کو پار کرگئی تھی۔

وہ کہاں جانتی تھی کہ دہلیز کے پار تو حفاظت کا ہر دائرہ ختم ہو جاتا ہے۔

یہ کراچی شہر تھا انسانوں سے بھرا پڑا تھا۔

''میں... میں کہاں سے اپنی ماں کو تلاش کروں؟'' وہ خاص طور پر آج کی فلائیٹ سے کراچی آئی تھی، ابھی تو وہ ایم پی اے کے لیے تھی لیکن سب سے پہلے وہ اپنے محلے میں گئی تھی۔ رات کے اِس پہر سب محلے دار سو رہے تھے، وہ اِس گھپ اندھیرے میں ڈوبی گلی میں اندھیرے کا حصہ بنی سسک رہی تھی۔

''کاش اُس دِن وہ واپس گاڑی سے اپنے گھر جاسکتی تو ایمان فاطمہ کبھی نہ مرتی!'' روتے روتے اُس ...ہ کا نمکین ہوگیا تھا۔

''اس گندے سسٹم میں نا جانے کتنی بے قصور ایمان فاطمہ مری ہوں گی اور کتنی ہی ترنموں نے جنم لیا ہوگا...''

''لیکن اب بس! اب مزید کوئی اور ترنم جنم نہ لے گی، میں اُن کے سارے سسٹم کو ختم کر ڈالوں گی'' ترنم نے وہیں دروازے پر بیٹھے بیٹھے اپنے پرس سے موبائل نکالا اور لاہور ایک نمبر پر بات کی۔

کچھ دیر بعد وہ پُرسکون ہو کر دروازے سے سر ٹکا کر بیٹھ گئی۔ اُس نے جو خبر لیک آؤٹ کی تھی۔ کل کے اخبار کی وہ ہیڈ لائن بننے والی تھی۔

''اے پاک دہلیز! میں تیری قصور وار ہوں... لیکن آج میں نے وہ کیا ہے کہ تیرا کچھ نہ کچھ قرض ضرور اُترے گا...'' ترنم کے چہرے پر بہت ہی مختلف قسم کی مسکراہٹ تھی، جیسے اندھیرا چھٹنے والا ہو...

❖❖○❖❖

یہ ڈھلتے بڑھتے سائے، اور گھٹتی بڑھتی چھاؤں
یہ آتے جاتے موسم، یہ رنگ بدلتا آسمان
سب بے اعتبار ہیں، چڑھتے سورج کے پجاری
کبھی تیرے ہیں تو کبھی میرے
جانے والوں کے ساتھ کوئی نہیں روتا
آنے والوں کا ساتھ... سب دیتے ہیں
پاؤں گیلا کیے بنا سات سمندر پار ہو جاتے ہیں
آنسو بن کہاں... زندگی کٹتی ہے؟

دو

کون جانے قسمتوں کے آسمان پہ
مقدر کے دوڑتے بادل
کس کے در پہ برستے ہیں؟
موسموں کے اعتبار پہ مت رہو، سب دھوکا دیتے ہیں
یہ ڈھلتے بڑھتے سائے، یہ گھٹتی بڑھتی چھاؤں

باہر ڈھولک کی تھاپ پر گاؤں کی نائن بلند آواز میں شادی کے ماہیے گارہی تھی۔ جیسے جیسے نائن کی آواز میں جوش بڑھتا جارہا تھا۔ مسکان کا دل بُری طرح ڈوبتا جارہا تھا۔

''میرا وجود بہت مضبوط ہے بلکہ میں بہت ڈھیٹ ہوں، لوگ کہتے ہیں کہ میں مسلسل دو تین بار موت کے منہ میں گئی ہوں۔ لیکن کیا میں اتنی بُری ہوں کہ موت تک مجھے قبول نہیں کرتی...'' مسکان نفاست سے چلتی ہوئی شیشے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ آئینہ ایک الگ ہی مسکان کو دکھارہا تھا، وہاں سامنے تو کسی ہڈیوں کے ڈھانچے کا عکس تھا۔ سرخ سنہری رنگت کملا کر سنولا گئی تھی، آنکھوں کے گرد بے حد گہرے حلقے پڑے ہوئے تھے۔

''تم کون ہو...؟'' بے اختیار مسکان کے اندر سے اِس عکس نے پوچھا۔

''Iam a Loser!'' مسکان نے سسکی بھر کر کہا۔

''اوہ! تو کیا ناکام لوگ تمہاری طرح زندہ لاش بن جاتے ہیں؟''

''شاید...'' مسکان نے غائب دماغی سے کہا۔

واقعی یہ عکس کسی لوزر ہی کا ہوسکتا ہے، آئینہ ایک دم قہقہے لگانے لگا۔

''یولوز ایوری تھنگ...''

''تم نے اپنی محبت کھودی...''

''تم نے اپنا باپ کھودیا...''

''تم نے اپنا اعتبار کھودیا...''

''تم نے اپنا بہتر مستقبل کھودیا...''

''یس یو آر لوزر! لوزر... لوزر... لوزر!'' آئینہ قہقہے لگارہا تھا۔ مسکان نے ڈریسنگ ٹیبل سے پرفیوم کی بوتل اُٹھا کر آئینے پر دے ماری، آئینہ زمین پر گر کر کرچی کرچی ہوگیا۔ مسکان نے جھک کر کرچیوں کو دیکھا۔

ٹوٹے پھوٹے شیشوں میں اُس کا اپنا عکس بھی ٹوٹا پھوٹا سا ہو کر رہ گیا تھا۔

''مسکان! تم بھی اندر سے ٹوٹ چکی ہو...'' وہ تھک کر بیڈ کی پائینتی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

''بیگم صاحبہ! بی بی جی! مہندی آگئی ہے۔'' ملازمہ جوش سے اندر بھاگی چلی آئی۔

مسکان نے خالی نظروں سے اُسے دیکھا۔

''ہائے ربا! اے کی ہویا...؟'' ملازمہ نے سارے کمرے میں بکھرے شیشے دیکھ کر پوچھا اور جلدی جلدی شیشے اکٹھے کرنے لگی۔

ابھی سب عورتوں نے اِسی کمرے میں دلہن کو لینے آنا تھا، مہندی لگانے کے لیے مسکان کی سسرال سے بہت ساری خواتین آئی تھیں۔

''تمہاری آپا امّاں کہاں ہیں؟'' سید سرفراز علی نے اندر آکر سوال کیا۔ مسکان نے منہ موڑ لیا۔

سید سرفراز بے حد جلدی میں تھے انہوں نے کسی بھی اُلجھن سے بچنے کے لیے باہر کا رُخ کیا۔

''آپا امّاں کہاں...؟'' مسکان کے دماغ نے بھی پوچھا۔

گزشتہ دو دن سے وہ نظر نہ آئی تھیں۔ اگر مسکان ذہنی تکلیف کے اِس دور سے نہ گزر رہی ہوتی تو وہ امّاں کی غیر حاضری پر یوں لاپروائی ہرگز نہ دکھاتی۔

''بی بی جی کدھر جارہی ہو...؟'' ملازمہ نے اُسے باہر نکلتے پوچھا۔

''آپ کی سسرالی عورتیں بس اندر ہی آنے والی ہیں۔'' ملازمہ نے فکرمندی سے پوچھا۔ کچھ سید سرفراز کی خاص ہدایات تھیں کہ مسکان کو اکیلے نہ چھوڑا جائے۔

''میں ٹھیک ہوں... تم فکر نہ کرو، امّاں کو دیکھنے جارہی ہوں۔'' مسکان نے رک کر کہا۔

''وہ تو بی بی اپنے کمرے سے دو دن سے نکلیں ہی نہیں...'' ملازمہ اطلاع دے کر دوبارہ شیشے چننے

مسکان دھیرے دھیرے چلتی ہوئی آپا امّاں کے کمرے کی طرف چل دی لیکن دروازے پر جاکر اُس کے قدم اندر جانے سے رُک گئے۔

اندر سے سید سرفراز علی اور آپا امّاں کی اونچی اونچی بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

''میں یہ ظلم نہ ہونے دوں گی...'' آپا امّاں کی آواز میں جو طاقت تھی وہ باہر کھڑی مسکان محسوس کرسکتی

''کس ناتے...؟'' سید سرفراز علی غرائے۔

''بیوی ہوں تمہاری!'' آپا امّاں کے انکشاف نے مسکان کے سر پر دھماکا کیا۔

''ہونہہ! تم کب مانتی ہو اِس رشتے کو...'' سید سرفراز علی نے کہا۔

''بیس سال اور آٹھ ماہ سے میں تمہاری رکھیل کی طرح جی رہی ہوں... لیکن اگر وہ نیک فرشتہ انسان عبداللہ میرا نکاح نہ کرواتے تو شاید میں ساری عمر حرام جینے پر مجبور ہوتی... اور جو تمہارا رویہ تھا اُس میں کیسے تمہیں اعلانیہ شوہر کہہ سکتی تھی؟ مجھے ڈر لگتا تھا کہ تمہارے کردار کی بدنامی کہیں مجھ تک آکر مجھے بھی اپنی لپیٹ میں نہ لے لے...'' آپا امّاں نے بے حد سچائی سے جواب دیا۔

''لیکن صائمہ سے مسکان پیدا ہوئی تھی، تم اُس کی اصلی ماں نہیں ہو... اِس لیے مت بھولو کہ تم نے اِس سے پنگا لیا ہے۔'' سید سرفراز علی نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

''میں جب تک زندہ ہوں آخری سانس تک یہ لڑائی لڑوں گی... میں اپنی بیٹی کی زندگی کبھی برباد نہ ہونے دوں گی...'' آپا امّاں نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔

''تو پھر تم کو مرنا ہوگا...'' سید سرفراز علی کی سرد آواز پر باہر کھڑی مسکان کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہوئی۔

وہ تیزی سے اندر بھاگی۔ سید سرفراز علی کے مضبوط ہاتھوں نے آیا اماں کی گردن کو دبوچ رکھا تھا۔

"بابا...!" مسکان نے آگے بڑھ کر پوری طاقت سے سید سرفراز علی کو پرے ہٹایا۔

سید سرفراز علی کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

"پلیز! اِن کو چھوڑ دیں..." مسکان گڑگڑائی۔

آیا اماں مسلسل کھانس رہی تھیں۔

"تو پھر اِس سے کہو کہ ابھی فوراً اُس وومن ایسوسی ایشن یا جو بھی کوئی این جی او والوں کو روکے، فو کرے، ورنہ مجھے اِسے ختم کرنے سے کوئی نہ روک سکے گا..."

"آیا اماں پلیز! آپ نے کیوں یہ سب کچھ کیا...؟" مسکان نے روتے ہوئے کہا۔

"اپنی اولاد کے لیے تو بلی بھی شیر سے لڑ جاتی ہے میں تو پھر انسان ہوں..." آیا اماں نے کھان ہوئے کہا۔

"پلیز آپ منع کر دیں آپ کو میری قسم! اگر آپ نے این جی او والوں کو نہ روکا تو آپ میرا مرا منہ دیکھیں گی۔"

"نہیں بچے!" آیا اماں تڑپ اُٹھیں۔

"تو آپ فوراً منع کر دیں۔" مسکان نے تھکے تھکے لہجے میں اصرار کیا تو آیا اماں کو مجبوراً فون کر اُن لوگوں کو منع کرنا پڑا، ورنہ تو این جی او کی چیئرپرسن پریس والوں کے ساتھ حویلی پر ہلّہ بولنے والی تھی

"تم نے ایک بار پھر مجھے بیچ راستے رُسوا کیا ہے۔" آیا اماں پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

"آپ اِسے میری بُری قسمت سمجھ کر قبول کر لیں۔" مسکان روتے روتے اُن کے قدموں میں ب گئی۔ آیا اماں نے کاٹتی نظروں سے اُسے دیکھا۔

سید سرفراز علی نے ایک گہری نگاہ دونوں پر ڈالی اور باہر نکل آئے۔ مسکان کا روتا سسکتا وجود اُن بے قرار کر چکا تھا۔ وہ کتنے ہی دنوں سے اُس سے بھاگ رہے تھے لیکن آج آخر اُن کا سامنا مسکا سے ہو ہی گیا تھا۔ وہ وہاں سے تیزی سے بھاگے تھے کہ کہیں مسکان کے آنسو اُن کو پگھلا نہ دیں۔

❖❖ ◐ ❖❖

کمرے کی خاموشی کو گھڑی کی ٹِک ٹِک کی آواز توڑنے میں مصروف تھی، اس لیے یہ آواز یوں لگ رہی تھی جیسے وہ خاموشی کا گیت ہو یا اُن کہے لفظوں کا ردھم!

کمرے میں موجود دونوں نفوس کتنی ہی دیر سے خاموش بیٹھے تھے۔ ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ بعض اوقا وہ لفظ ہی ختم ہو جاتے ہیں، جن سے گفتگو چلتی ہے۔

"آپ کے لیے چائے لاؤں...؟" علیزے نے آخر خاموشی توڑ ڈالی

"نہیں! تم یہاں میرے پاس بیٹھو۔" ولی نے گہرا طویل سانس بھرا۔ سکھ انسان کو اتنا قریب نہیں ل جس قدر دُکھ انسانوں کے درمیان فاصلے کم کر دیتا ہے، ولی بھی علیزے کو آپ سے تم کہنے لگا تھا۔

علیزے چپ چاپ دوبارہ بیٹھ گئی۔

"حسن خالہ کہاں ہیں...؟" ولی نے کچھ دیر پہلے کا کیا سوال دوبارہ دہرایا۔

"وہ سو رہی ہیں، میں نے اُن کو نیند کی گولی دی تھی تاکہ وہ سو جائیں..." علیزے کی آواز ابھی تک ہوئی تھی۔

رو کر اُس کا حال بے حال ہو چکا تھا۔ اِس وقت بھی وہ نڈھال بیٹھی تھی، جیسے کچھ دیر میں ہی گر لی۔

"منزہ... منزہ کا دُکھ! ایک روگ کی طرح ہمارے ساتھ رہے گا... وہ جس طرح ہمارے بیچ سے نکل کر ہے وہ دُکھ سدا تازہ رہے گا۔"

"میں تمہیں اُسے بھولنے کو بھی نہ کہوں گا وہ تمہاری بہن تھی۔ اُس کی موت کا دُکھ اور اس کی تلافی تب لتی ہے کہ تم اُس کے لیے کچھ زادِ راہ بھیجو..." ولی نے گہرا سانس بھر کر کہا۔

"تمہارے آنسو اُسے کوئی فائدہ نہ دے پائیں گے ہاں البتہ تم جو اُس کے لیے بخشش کی دُعا کرو گی، اُس کے لیے اُس کی مغفرت کے لیے صدقہ جاریہ قرآن پاک پڑھ کر، نیک عمل کر کے یا خیرات کر کے ولی، وہ اُس کی منزلیں آسان کرنے کے لیے مدد دے گا..." ولی نے قریب بیٹھی علیزے کے سرد ہاتھوں اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

علیزے کو اپنے نڈھال مردہ وجود میں ایک دم طاقت کا احساس ہوا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" علیزے کو واقعی ولی نے راہ دکھائی تھی، ورنہ وہ بہت دنوں سے خالی سوگ بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔

"ولی! ہمارا سارا گھر بکھر گیا ہے۔" وہ سسکی۔

"کاشف..." علیزے نے کچھ کہتے کہتے اپنی زبان دانتوں تلے لے لی، وہ کیسے راز سے پردہ اُٹھانے ا رہی تھی۔

"کیا ہوا کاشف کو؟ وہ سارے دورانیے میں کہیں نظر نہیں آیا۔" ولی نے سوال کیا۔

"پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے اُس کی گمشدگی بھی بہت پریشان کُن ہے۔" علیزے نے خالی آنکھوں سامنے بنی کھڑکی جو آنگن میں کھلتی تھی اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ابو بے حد خاموشی سے تخت پر لیٹے ئے تھے وہ اپنے آپ میں بے حد مگن سے تھے جو اُن کو گھر آئے گئے تک کی خبر نہ تھی۔

"حیرت ہے کسی نے پہلے ذکر تک نہیں کیا ورنہ بہت پہلے اُس کی خبر گیری کر لی جاتی..." ولی کو واقعی ت ہوئی تھی کہ کہاں تو خالہ، خالو بیٹے کے بغیر نہ رہتے تھے کہاں وہ اتنے دِن سے اُس کی گمشدگی پر وش بیٹھے تھے۔

علیزے نے ایک دم نگاہیں چرائی تھیں، اب وہ کس منہ سے واپس آتا۔

"کیا بہن کو قتل کرنے کے بعد وہ کبھی ہم سب سے نگاہ ملا پائے گا اور کیا ہم... ہم اُسے معاف کر سکیں، کیا منزہ کا خون اتنی آسانی سے معاف کیا جا سکتا؟" یہ سارے سوال مل کر اُس کے اندر شور مچا رہے ے۔

"علیزے!" ولی کی آواز نے اُسے چونکایا۔

"جی...!"

''کہاں کھوگئی ہو؟ میں پتا کرواتا ہوں کاشف کا، تم لوگ پریشان نہ ہونا، وہ کوئی بچہ تھوڑا ہی ہے جو گھ
کا راستا بھول گیا ہو...'' ولی نے علیزے کو تسلی دی۔

''ہاں وہ بچہ نہیں ہے، لیکن بھٹکا ہوا ضرور ہے۔'' علیزے نے دِل ہی دِل میں کہا۔

''میں حُسن خالہ سے مل لوں، اب وہ اُٹھ چکی ہوں گی...'' ولی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''شاید... کیوں کہ وہ نیند کی گولی لے کر سوئی ہیں۔'' علیزے نے بے حد نارمل انداز میں کہا۔

ولی نے چونک کر اُسے دیکھا۔ کاشف کے ذکر پر اُس کا لہجہ، رویّہ کچھ عجیب سا تھا کچھ بہت مختلف
جس کو ولی محسوس تو کرسکتا تھا لیکن بیان نہ کرسکتا تھا۔

''آئیں میں آپ کو امی کے پاس لے چلوں۔'' علیزے کہہ کر باہر نکل گئی۔

ولی چپ چاپ کتنے ہی لمحے کھڑا رہا۔

کچھ عجیب سا ہے! کچھ راز سا ہے!

لیکن کیا؟ ولی بے حد ذہین انسان تھا، وہ آس پاس کیا پک رہا ہے، بہت پہلے محسوس کرلیتا تھا۔

ایسا ہی اِس معاملے میں تھا۔

''کچھ راز تو ہے!'' ولی نے طویل سانس بھر کر اپنے آپ کو پُرسکون کیا۔

''دیکھتے ہیں کہ میرا شک درست نکلتا ہے کہ نہیں!'' ولی نے باآواز بلند پرسوچ لہجے میں کہا۔

❖❖○❖❖

''سر میرا خیال ہے کہ ہمیں پہلے اُوپر تک بات کرلینی چاہیے۔'' طارق کے ماتحت آصف نے یہ مشو
کوئی تیسری بار دیا تھا۔

''یونو آصف! ہم پولیس والوں کے ہاتھ سے اسّی فیصد مجرم نکل کیوں جاتے ہیں؟'' طارق نے ا
ریوالور میں گولیاں چیک کر کے کمر کے پیچھے ہولسٹر میں لگاتے ہوئے پوچھا۔

''ہم لوگ جہاں بھی جاتے ہیں ہماری گاڑیوں میں موجود سائرن الارم کی طرح مجرموں کو الر
کردیتا ہے، بھاگنے میں مدد کردیتا ہے، چوہے کو پکڑنا ہو تو بلّی تک جس کے قدموں کی چاپ نہیں ہوتی
بھی دبے پاؤں چوہے کو پکڑنے کے لیے بڑھتی ہے۔ ایک ہم ہیں! ہم ایک معمولی سا ریڈ بھی مار
جائیں گے تو آس پاس سارے محلے کو باخبر کر کے نکلیں گے۔ میں مانتا ہوں کہ ریڈ کرنے کے لیے اَ
پراسیس ہوتا ہے، ہمیں ہر صورت اپنے بڑوں سے اجازت لینی ہوتی ہے لیکن ہمارے عہدوں کے ب
حق بھی ہے اور اختیار بھی... اور بائی داوے! نوکری ہم کس بات کی کررہے ہیں۔ چلو جلدی نکلو
ہماری بے حد احتیاط کے باوجود کوئی نہ کوئی خبر اس ریڈ کو لیک آؤٹ کردے گا...'' طارق نے تیزی
باہر نکلتے ہوئے کہا۔

آصف کو لامحالہ باہر کی جانب رُخ کرنا ہی پڑا۔

''طارق سر بھی نا! ہر وقت پنگے، پھڈے لیتے رہتے ہیں۔'' آصف بڑبڑاتا ہوا پیچھے پیچھے آیا۔

❖❖○❖❖

''بھائی یہ آپ کے نام ارجنٹ میل سے کوئی خط آیا رکھا ہے۔'' ولی کے گھر آتے ہی نگینہ نے اط

''کدھر ہے!''

''ادھر آپ کی ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔'' نگینہ نے کمرے کے پردے برابر کر کے ہیٹر آن کردیا۔

''تھینک یو!'' ولی نے مشکور نظروں سے بہن کو دیکھا، جو اُس کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی بے حد
ال رکھتی تھی۔

''اماں جان اور بابا سائیں کا کوئی فون آیا؟'' ولی نے مگن سے انداز میں لفافہ کھولتے ہوئے پوچھا۔
نے والے نے پشت پر اپنا ایڈریس نہ لکھا تھا۔

''ہاں بھائی! شام میں آیا تھا۔ انشاء اللہ کل تک واپسی ہوجائے گی...'' احمد شاہ اور روشن آرا بیگم
نوں پر گئے ہوئے تھے۔ وہاں مزارعوں کی آپس کی لڑائی میں بندہ مارا گیا تھا۔ احمد شاہ کو ایمرجنسی میں
انا پڑا تھا انہوں نے روشن آرا بیگم کو بھی ساتھ لے لیا تھا کیوں کہ گھر میں رہتے ہوئے وہ ہر وقت منزہ
ی جواں مرگی کے غم میں رہتی تھیں، روشن آرا بیگم کا دِل اور ذہن بٹ جائے اِس لیے احمد شاہ اُن کو مجبور
ر کے لے گئے تھے۔

''بھائی! میں نے مقبول کو کھانا گرم کرنے کا کہہ دیا ہے۔ آپ ہاتھ منہ دھو کر آجائیں، تب تک میں
انا لگواتی ہوں۔'' نگینہ کہہ کر باہر نکل گئی جب کہ ولی گم صم سا ہاتھ میں پکڑی تحریر کو دیکھ رہا تھا۔

کف شام پہ سجی حنا کا سرخ اور سیاہ ہونا
دور جنوں کا... بڑھتے جانا
ہمارے سانسوں کی ڈور کو جھٹکے لگا رہا ہے
آنکھوں کے سامنے، تاریکی اُسی طرح بڑھ رہی ہے
جس طرح کھڑکی کے پار...
آسمان پر چھائے گہرے بادلوں کی چادر
لحظہ بہ لحظہ دبیز ہوتی جارہی ہے
ریتیلی دِل کی زمین پر... اَن گنت دُکھ
سسکتے دم توڑ رہے ہیں
کیا یہ یوں ہی بے گور و کفن پڑے رہ جائیں گے؟
ہاں! تمہیں تو اِس حادثے کی خبر بھی نہ ہوگی
اور ہم! چپکے سے یہ دنیا چھوڑ جائیں گے
مگر... اِس سے پہلے
وہ سامنے... رائٹنگ ٹیبل پر
اِک آخری نامہ تمہارے نام رکھا ہے
اُسے پڑھ کر... تمہیں یقین آجائے
کہ زیست کے اِن آخری لمحوں میں

تمہاری ہی یادیں... تمہاری ہی باتیں
ہمارے ذہن کی غلام گردش میں بھٹکتی پھر رہی تھیں
اور... ہماری بے جان آنکھوں میں
تمہاری ہی صورت منقش تھی
مگر بہت ممکن ہے
جتنی دیر میں تمہیں اس بات کا احساس ہوگا
سینہ گیتی پہ مٹی کا اِک اور ڈھیر... بڑھ چکا ہوگا

ولی نے لفافے میں دُوسرے کاغذ کو دیکھا یہ مسکان کی شادی کا کارڈ تھا۔

اس نے بے اختیار دُکھ بھرا سانس لیا۔ وہ اُسے اپنی زندگی کا مرکز جب مانے ہوئے تھی، تب بھی ولی بے خبر تھا اور آج وہ اُسے اپنی بربادی کا ذمے دار ٹھہرا رہی تھی تب بھی ولی بے قصور تھا، لیکن وہ اُسے ہی سارے معاملے کا قصور وار ٹھہرا رہی تھی۔

''اُس کی شادی ہو رہی ہے! چلو شکر ہے کم از کم وہ اپنی نئی زندگی میں مگن ہو کر مجھے تو بھول جائے گی...'' ولی نے خود کو تسلی دی۔

''جب تک لڑکیوں کی شادی نہیں ہوتی تب تک انہیں تصوراتی (آئیڈیل) مرد بے حد عزیز ہوتا ہے اُن کو لگتا ہے کہ وہ اُس کے بغیر مر ہی تو جائیں گی، لیکن پھر یہ لڑکیاں اپنے شوہر کی محبت میں اس قدر آگے نکل جاتی ہیں کہ اُن کو اپنا ماضی کسی حماقت سے کم نہیں لگتا۔'' ولی مسلسل ایسی ہی سوچوں میں گرفتار خود کو تسلیاں دے رہا تھا لیکن جانے کیوں اتنی زیادہ تسلیاں دینے کے باوجود اُس کا دِل مطمئن نہ ہو رہا تھا۔

❖❖○❖❖

لاہور کو داتا نگری بھی کہا جاتا ہے، اُن کے کتبے پر یہ تحریر دیکھو کس قدر خوب صورت ہے۔

گنج بخش فیضِ عالم مظہر نور خدا
ناقصاں رہبر کامل کاملاں را رہنما

طارق نے بلند آواز میں تحریر کو پڑھا۔ پھر داتا صاحب کے مزار پر فاتحہ پڑھی، اب وہ دُعا کے بعد آصف سے محوِ گفتگو تھا۔

''اگر داتا صاحب کو اندازہ ہوتا کہ لوگ اُن کے مزار کے گرد ایسے ایسے گھناؤنے عمل میں مصروف ہوں گے تو داتا صاحب کبھی یہاں آرام کرنا پسند نہ کرتے...'' آصف نے جذباتی ہو کر کہا تو طارق بے اختیار مسکرا دیا۔

''کم آن یار! اگر ہمارے پاس یہ ولی نہ ہوتے تو ہم آگہی اور رہنمائی سے محروم رہتے... پھر یہ جو کچھ ہو رہا ہے اِس میں گناہ گار بھی ہدایت اور اچھائی سے محروم ہیں۔ ہم اُن گناہ گاروں سے اِس داتا کی نگری کو پاک کر دیں گے... بس اللہ کی مدد چاہیے۔'' طارق نے سیڑھیاں اُترتے ہوئے کہا۔

آج رات طارق نے مزار کے پاس کچھ مخصوص گلیوں کا گھیراؤ کروایا تھا۔ وہ آج اِن گناہ آلود

اندھیری گلیوں میں ریڈ کرنے والے تھے، جہاں خیرات کی دیگیں بھی پکائی اور چھپائی جاتی تھیں۔

❖❖○❖❖

مسکان کا سر بے حد بھاری ہو رہا تھا، اُس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں تو ایک دَم چونک کر بیٹھ گئی، یہ اُس کا کمرا نہ تھا۔ اِس کمرے تک وہ شاید نیم بے ہوشی میں لائی گئی تھی۔ دلہن کے لباس میں زیور سے لدا یہ اُس کا اپنا ہی وجود تھا۔

مسکان کو اپنے گلے میں کانٹے چبھتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ پانی کی شدید طلب نے اُسے اُٹھنے پر مجبور کیا۔ ابھی اُس نے ٹانگیں مسہری سے لٹکا کر پاؤں زمین پر ہی رکھے تھے کہ دھڑ سے دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر شخص نشے میں دھت اندر داخل ہوا، اُس کے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں۔

''معاف کرنا بھرجائی! بھائی صاحب آج آپ کے آنے کی خوشی میں زیادہ پی گئے ہیں۔'' ساتھ ہی اُس موٹی سی سانولی خاتون نے ہنسنا شروع کر دیا۔

مسکان نے حیرت بھری نظروں سے خاتون کو دیکھا۔

''ارے بھابی بھی کہتی ہوگی کہ میں نے اپنا تعارف تو کروایا ہی نہیں۔'' عورت نے نشے میں دھت مرد کو کرسی پر بٹھا دیا، جو اگلے ہی پل میں ہوش سے بے گانہ ہو گیا تھا۔

''میں نا آپ کی سب سے چھوٹی نند ہوں۔'' وہ ایک بار پھر بے ترتیبی سے ہنسی۔ مسکان کو اُسے دیکھ دیکھ کوفت اور کرسی پر ڈھیے ہوئے شخص کو دیکھ کر بے حد وحشت ہو رہی تھی۔

''بھابی کو کچھ کھلایا پلایا نہیں؟'' اُس کی دوسری نند نے سوال کیا۔

''ہیں! بھرجائی تم نے تو کچھ بھی نہیں کھایا! یہ کھانے کی ٹرے، پھل دودھ تو جوں کا توں پڑا ہے۔'' اُس کی سب سے چھوٹی نند نے جاہلانہ انداز میں اُونچا بولتے ہوئے کہا۔

''میں... مجھے... پانی چاہیے۔'' مسکان نے مری مری آواز میں کہا۔

''ہاں یہ لو...'' دوسری نند نے جلدی سے چھوٹا سا روم فریج کھول کر پانی نکال کر اُسے تھمایا۔

''بھرجائی کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک بول دینا۔'' اُس نے سخاوت دکھاتے ہوئے کہا جب کہ مسکان گھونٹ گھونٹ پانی حلق میں اُتارتے ہوئے اپنے اِرد گرد کا جائزہ لے رہی تھی۔ اِس بڑے سے کمرے کی اجنبی فضا سے اُس کا دِل بُری طرح گھبرا رہا تھا۔ آئندہ آنے والے لمحوں کا سوچ کر اُس کا دل بُری طرح گھبرایا۔ وہ مسز اظہر علی بنا کر اِس کمرے اِس حویلی میں پہنچا ہی دی گئی تھی۔

❖❖○❖❖

''دور دراز کے علاقوں سے لوگ منتیں ماننے، دعائیں کرنے داتا صاحب آتے ہیں، اِن زائرین میں جوان لڑکیاں بھی شامل ہوتی ہیں، جو اپنے والدین کے ساتھ آتی ہیں۔ گزشتہ پانچ سال کا ہی ریکارڈ دیکھ لو، ہر مہینے تقریباً ایک یا دو لڑکیاں، بچیاں اور عورتیں غائب ہوئی ہیں، بہت تلاش کے باوجود یہ لڑکیاں کہیں سے بازیاب نہیں ہو پاتیں، گھر والے اور انتظامیہ اِس لیے پریشان ہوتے ہیں کہ آخر چند منٹوں میں لڑکی کہاں غائب ہو جاتی ہے؟ بہت سے کھاتے پیتے، اعلیٰ گھرانوں کی لڑکیاں غائب ہوئیں تو انہوں نے بہت زیادہ شور مچایا، پولیس عدالت! لیکن کسی کو کبھی بھی اپنی بیٹی نہ مل سکی۔ یہ کیس آج تک ان سولوڈ

پڑے تھے۔ کوئی بھی نہ جانتا تھا کہ لڑکیاں کہاں گئیں یا انہیں کون لے گیا؟'' طارق نے رُک کر سب کی جانب دیکھا، ابھی کل ہی اُس نے ایک کامیاب ریڈ کر کے بہت ساری لڑکیاں بازیاب کروائی تھیں، اب وہ اپنی رپورٹ ہائی کمان کے سامنے پیش کر رہا تھا۔

''لڑکیاں اغوا کر کے وہیں پاس ہی گلیوں میں چھپادی جاتی تھیں، اِسی لیے لڑکیاں کسی ناکے تک نہ پہنچتی تھیں نہ پکڑی جاتی تھیں۔ اِن لڑکیوں کو مہینوں اِن ہی گلیوں میں بنے چھوٹے چھوٹے گیراجوں ،کوٹھی خانوں اور اندھیری دکانوں میں رکھ کر جسم فروشی کروائی جاتی۔ جب لڑکی ان کے سامنے بالکل اِس کام کے لیے سرنڈر کر جاتی تو اُسے ریڈ لائیٹ ایریا میں شفٹ کر دیا جاتا، جہاں ایک نہ ختم ہونے والا جہنم ہوتا تھا، جس میں انہیں عمر بھر کے لیے جلنا ہوتا تھا اچھی شکل اور تعاون کرنے والی لڑکیاں باقاعدہ تربیت پاتیں اور عام صورت لڑکیاں وہیں عام لوگوں کے لیے رکھی جاتیں۔''

''اِن لڑکیوں کا اغوا بہت چالاکی سے کیا جاتا ہے۔ جب کوئی خاندان منت مانگنے کے لیے آتا اور کچھ گھنٹے یا رات کا قیام کرتا تو نائکہ اپنی چھ سات لڑکیوں کے ساتھ اِس خاندان کے ساتھ گھل مل جاتی ہے۔ پھر کسی بھی لمحے لڑکی کو اہلِ خانہ سے جدا کر دیتی ہے اور اُس کے کارندے صرف چند منٹوں میں لڑکی کو اُس اندھیری گلی میں بنے گیراج میں پہنچا دیتے، جہاں کسی کا دھیان اور شک بھی نہ جاتا۔ ماں باپ بے چارے تلاش کرتے رہ جاتے تھے لیکن آج تک کسی کی لڑکی دستیاب نہ ہوسکی تھی۔ گزشتہ رات ہمیں اطلاع ملی تھی اور اُسی مخبری کی وجہ سے ہم نے کامیاب ریڈ کیا اور سترہ لڑکیاں بازیاب کروائیں اس گروہ کے تقریباً سارے افراد کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔ اِن لڑکیوں میں دو معصوم بچیاں بھی ہیں ایک کی عمر تیرہ سال ہے اور دوسری کی عمر صرف آٹھ سال ہے، یہ بچیاں تقریباً پانچ مہینے پہلے اغوا ہوئی تھیں۔ باقی کی لڑکیوں میں دو عورتیں ایسی ہیں، جو خاوندوں سے جھگڑ کر دربار آئیں اور اکیلی ہونے کی وجہ سے اِن لوگوں کے ہتھے چڑھ گئیں، کچھ لڑکیاں باہر کے دور دراز کے علاقوں سے ہیں، بے چاری مہینوں سے مسلسل سخت جسمانی اذیت میں تھیں۔ دِن میں چار پانچ بار دلال اُن کو گاہکوں کے حوالے کر رہا تھا۔ اُن میں سے ایک بے حد بیمار ہے، جسے فوراً ہسپتال داخل کروادیا گیا ہے۔ جب ہم اِن لڑکیوں کو لے کر گاڑیوں میں بٹھا رہے تھے تو ہمارے سر شرم سے جھک گئے تھے، اُن سب کی نظروں میں دِن کی روشنی اور ہَوا دیکھنے کی جو حسرت تھی وہ دِل دہلا دینے والی تھی، ایک انسان کیسے شیطان بن جاتا ہے کہ وہ معصوم اور پاکیزہ لڑکیوں کو عزت، خوشی، آزادی تک سے محروم کر دیتا ہے۔ ایسے بدبختوں کا نام چاہے مسلمانوں جیسا ہو، مگر ایمان اور اِسلام نے اِن کو چھوا بھی نہیں ہوتا، گناہ کے اِس کاروبار میں انہیں نہ مذہب روک پاتا ہے نہ قانون!''

''ایک خوف خدا رکھنے والی جگہ، خدا کی نافرمانی کی بنیاد پہ غلیظ کاروبار پروان چڑھ رہا تھا۔ ایک مزار جو لوگوں کے عقیدتوں کا مرکز ہے، وہاں زندگیاں برباد ہو رہی تھیں۔''

''ریڈ اِز سکسیس فُل! ہم نے کچھ بہت اہم کارندے پکڑے ہیں، انشاء اللہ آئندہ کا آپریشن بہت دھماکا خیز ہوگا۔'' طارق نے دھیمے سے مسکرا کر کہا اور اپنی بات مکمل کر کے کُرسی پر بیٹھ گیا۔

''گڈ مسٹر طارق!''

''لیکن! آپ اِن لڑکیوں کے لیے آئندہ کیا لائحہ عمل تیار کریں گے؟'' طارق سے اُس کے ایک ڈائریکٹر نے پوچھا۔

''جن کے گھر والے اُن کو لے جانا چاہیں گے... وہ لڑکیاں اُن کے حوالے کردی جائیں گی اور باقی کو دار رحمت میں بھیج دیا جائے گا۔''

''گڈ!''

''مسٹر طارق آپ نے جو رپورٹ پیش کی ہے، اُس میں کچھ بہت بڑے بڑے نام بھی شامل ہیں، کیا آپ اِن ناموں پر ہاتھ ڈالنے کے لیے تیار ہیں؟''

''ابھی تو نہیں سر! کیوں کہ اِن اہم شخصیات کو پکڑنے کے لیے ہمارے پاس مکمل ہوم ورک ہونا ضروری ہے، جس کے لیے ہم لگے ہوئے ہیں۔'' طارق نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔

''ہوں! ٹھیک ہے! اچھا آپ بتائیے کہ آپ کا سورس آف انفارمیشن کیا ہے؟ آپ کا یہ ریڈ، آئی مین یہ دوسرا کامیاب آپریشن ہے، آپ تو بڑے ٹھیک نشانے سے ریڈ کر رہے ہیں۔'' اُن چار ڈائریکٹروں میں سے ایک نے بہت تجسس سے پوچھا تو طارق کی چھٹی حِس نے الارم کیا کہ اُسے یہ سوال ہر صورت ٹالنا ہوگا۔

''بس سر اِس سارے آپریشن میں ہماری نیک نیتی کاؤنٹ کرتی ہے۔ ہم نے بہت محنت اور پلان سے سب کچھ کیا تھا اور باقی رہا سورس آف انفارمیشن تو وہ ہم خود ہی ہیں۔ بس کبھی کبھی بلی کی طرح دبے پاؤں پیچھے لگ کر کچھ اہم راز حاصل کر لیے جاتے ہیں ورنہ کوئی خاص سورس آف انفارمیشن یا سورس آف پرسن نہیں ہے۔'' طارق صاف ترنم کا نام بچا گیا تھا۔

''اوکے طارق!

ویل ڈن طارق!'' باقی سب نے اُٹھ کر اُسے شاباش دی، سوائے اُن میں سے ایک کے، وہ مسلسل طارق کو جانچتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

طارق جب باہر نکلا تو اُسے اپنی پشت پر اُن ڈائریکٹر صاحب کی نظروں کی تپش کا شدّت سے احساس ہوا تھا۔

''یہ بندہ گڑ بڑ ہے! یقیناً یہ کوئی نہ کوئی پرابلم پیدا کرنے والا ہے، مجھے ترنم سے رابطے کے لیے مزید احتیاط کرنی ہوگی، ورنہ وہ بے چاری تو خوامخواہ ماری جائے گی۔'' طارق نے دِل ہی دِل میں کہا۔

''ویسے وہ لڑکی کتنی عجیب ہے نا! اپنی جان خطرے میں ڈال کر مسلسل ہماری مدد کر رہی ہے۔ اُسے دیکھ کر بھی کال گرل کا احساس نہیں ہوتا، سچ ہے کنول کا پھول کیچڑ میں رہ کر بھی خوب صورت لگتا ہے۔''

طارق نے اپنے دِل میں ترنم کے لیے بے حد عزت محسوس کی۔

❖❖○❖❖

''تم سے میں نے کہا تھا کہ اِس لڑکے کا کوئی بندوبست کرو، کم بخت جان کو ہی آ گیا ہے۔'' چاندنی میڈم اِس وقت بے حد غصّے سے فون پر میڈم راگنی سے بات کر رہی تھی۔

''ٹھیک ہے میں انتظار کر لیتی ہوں ...لیکن دیکھنا تمہارا یہ انتظار کسی دن ہمیں لے ڈوبے گا۔'' میڈم

چاندنی نے غصّے سے فون رکھا۔

آج کل اُس کی طبیعت خراب تھی اور کل کے واقعے کے بعد اُس کی صحیح معنوں میں کمر ٹوٹی تھی سترہ لڑکیاں اُس کے ہاتھوں سے نکل گئی تھیں، اِس سے زیادہ دکھ اُسے اپنے بہت اہم کارندوں کے جانے کا ہوا تھا۔ اُس کے خفیہ اڈے لیک آؤٹ ہوگئے تھے۔ کل اس کے دھندے پر باقاعدہ بُرا وقت آیا تھا۔ لیکن رانگی اِس سارے معاملے میں بے حد پُرسکون تھی۔ مشکل یہ تھی کہ بگ باس کے درمیان جو رابطے کا پل تھا، وہ رانگی ہی تھی اسی لیے رانگی کو اپنے اسٹیٹس پر بہت زیادہ غرور تھا۔ ایسے میں وہ باقی لوگوں کو اگنور کر دیتی تھی۔

''آپا! طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' ماہی نے بہ غور اُس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ میڈم چاندنی کا چہرہ اِس قدر پیلا پڑ رہا تھا کہ کوئی بھی اندازہ کرسکتا تھا کہ اُس کی طبیعت خراب ہے۔

''ہاں کچھ دنوں سے ٹھیک نہیں ہوں۔'' میڈم چاندنی نے نقاہت سے کہا۔

''تو پھر ڈاکٹر کو دکھادیں۔'' ماہی نے مشورے کے ساتھ فوراً ساتھ چلنے کی آفر کی۔

''ہاں! تم ٹھیک کہتی ہو، میرا حال واقعی ناقابلِ برداشت ہے۔''

''چلیں پھر۔'' ماہی نے گاڑی کی چابیاں اُٹھا کر پوچھا۔

''ہاں چلو... میڈم رانگی کے رویّے تو مجھے مزید روگی بنادیں گے۔'' میڈم چاندنی تمام راستے بڑبڑاتی آئیں۔ کلینک پہنچ کر بھی اُس کی بڑبڑاہٹ ختم نہ ہوئی تھی۔

اگر ڈاکٹر اُن کو اتنی عجیب نظروں سے نہ دیکھتا تو وہ یوں ایک دم چپ نہ ہوتیں۔

''آپ کے شوہر کیا کام کرتے ہیں؟''

''میں غیر شادی شدہ ہوں۔'' میڈم چاندنی نے جواب دیا۔

''اوہ!'' ڈاکٹر نے ہنکارا بھرا۔

''پھر۔ آئی مین۔ اچھا!

''اچھا یہ بتائیں، کبھی آپ نے بغیر ٹیسٹ کروائے خون لگوایا؟''

''جی مجھے کبھی خون وغیرہ نہیں لگا۔''

''کیا کبھی کسی دانتوں کے ڈاکٹر سے ٹریٹ منٹ لی؟''

''جی نہیں!'' میڈم چاندنی نے حیرت سے ڈاکٹر کے سوال کو سُنا۔

''کیا کبھی کوئی Stearilize سرنج کے علاوہ انجکشن استعمال کیا؟''

''جی نہیں...'' میڈم چاندنی نے بے حد سکون سے جواب دیا۔

''آپ کا پروفیشن کیا ہے؟'' اِس بار ڈاکٹر نے بہ غور اُن کو دیکھتے ہوئے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا۔

میڈم چاندنی اور ماہی کو ایک دم سانپ سونگھ گیا تھا۔

ڈاکٹر نے اُن کے چہرے پر نظریں ہٹا کر کاغذ پر کچھ ٹیسٹ لکھے۔ وہ اپنے مطلوبہ جواب تک پہنچ چکا تھا۔

''بی بی! یہ ایچ آئی وی کا ٹیسٹ کروالیں آج اور ابھی۔ اور ساتھ یہ دوا فوراً شروع کردیں، اگر میرا

اندازہ درست ہے تو آپ فوراً اِس کلینک میں جائیں یہ خاص طور پر آپ لوگوں کے مرض کے علاج کے لیے ہے۔'' ڈاکٹر نے فوراً کاغذ اُن کو پکڑا کر اگلے مریض کے لیے بیل بجادی۔ وہ اُن کو فوراً اپنے کمرے سے واپس بھیج دینا چاہتا تھا۔

میڈم چاندنی کو یوں لگا کہ اِردگرد کی ساری عمارتیں اس کے اُوپر آن گری ہوں۔ اِس بوجھ تلے اُس کا سانس رُکنے لگا تھا۔

''آپا چلیں...!'' ماہی نے ڈاکٹر کو دوبارہ گھنٹی بجاتے دیکھ کر اُسے اُٹھایا۔ میڈم چاندنی کسی نیند سے جاگی تھی۔

اُسے لگا یہ گھنٹی اُس کے اِس کلینک سے نکلنے کے لیے نہیں بلکہ اُس کے اِس دنیا سے نکلنے کے لیے بجائی جارہی ہے، خوف سے اُسے اپنے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوتے محسوس ہورہے تھے۔

وہ خالی خالی نظروں سے اِردگرد دیکھتی ماہی کے ساتھ باہر نکل آئی۔

❖❖○❖❖

''ابو کی طبیعت اتنی زیادہ خراب رہی تم کدھر تھے؟'' سائرہ نے سمعان سے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

''تھا تو اِسی دنیا میں، لیکن احساسات کی حس کچھ عرصے سے سوگئی تھی۔'' سمعان علوی نے کھوکھلی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

''سمعان! کیا تم ٹھیک ہو؟'' سائرہ نے فکرمندی سے اُس سے پوچھا۔ جن سے محبت کی جاتی ہے اُن کے مزاج میں بال برابر بھی فرق پڑے تو فوراً پتا چل جاتا ہے، چاہنے والے تو خون میں دوڑتے ہیں۔

''تم ہمیشہ بہت پہلے سے جان جاتی ہو کہ میں پریشان ہوں یا نہیں، کیسے جان جاتی ہو؟ سمعان نے ...ت سے سائرہ سے پوچھا۔

''محبوب کا مزاج تو انگلیوں کی پوروں پر ہوتا ہے نا!'' سائرہ نے دل ہی دل میں کہا۔

''کیوں! کیا ہم اچھے دوست نہیں؟'' سائرہ نے اُسے جذب سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں یہ تو ہے! اور واقعی یہ بات درست ہے کہ یو آر اونلی مائی فرینڈ!'' سمعان نے طویل سانس لی۔

''سمعان! ہوا کیا ہے؟'' سائرہ نے ملازم کو چائے لانے کا کہہ کر اُس کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

سمعان گہری سوچ میں تھا کہ آیا وہ اپنے دل کی بات شیئر کرے یا نہ کرے۔ اُس کا دل اِس قدر بوجھل ہوچکا تھا کہ وہ فی الواقعی کسی دوست کا کندھا چاہتا تھا۔

اچھے دوست بھی تو سکھ کے سنبل جیسے نرم اور پیارے تکیے ہوتے ہیں، جن پر جب دل چاہا سر رکھ کر سکون سے سو بھی لیا جاتا ہے اور دُکھ سے رو بھی لیا جاتا ہے۔

''کہانی تو بے حد طویل تھی لیکن خیر! میری کہانی تو ابھی ٹھیک سے شروع بھی نہ ہوئی تھی کہ اس کا اختتام ہوگیا!'' سمعان نے کھوکھلی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

''مجھے محبت ہوگئی تھی!'' سمعان نے یوں کہا، جیسے کوئی بیماری ہوگئی ہو۔

محبت کا سفر آسان نہیں ہوتا، کٹھن ہیں راستے اس کے

اگر تم کبھی غلطی سے اِس راہ پر نکلو تو ذہن میں رکھنا
کہ اِس میں واپسی کا کوئی بھی راستا نہیں ہوتا
جو راستا مل بھی جائے، تو انسان جا نہیں پاتا
وہ زخمی روح زخمی دِل و جگر لے کر کہاں جائے
محبت کا سفر آسان نہیں ہوتا۔

سمعان سامنے بنی کھڑکی میں دیکھتے ہوئے بولا۔

سائرہ کے تو مانو جیسے سارا خون نچڑ کر رہ گیا ہو۔

''جس کو آپ اپنا سب کچھ مان لیتے ہیں ..اگر وہ کسی اور کو چاہے تو اپنا آپ کسی تنکے کی طرح بے وقعت لگنے لگتا ہے، کیا ہم دونوں سہیلیوں کی قسمت میں لکھا ہے کہ ہم دونوں وَن سائیڈ محبت کا ذکر سہیں۔'' سائرہ کے دماغ میں پہلی سوچ یہ ہی آئی۔

''کون ہے وہ؟'' سائرہ نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ہے نہیں! تھی وہ، اب نہیں ہے! لیکن نہیں وہ شاید میرے دِل میں ہمیشہ رہے گی، وہ میرا پہلا پیار تھی!'' سمعان نے اُداس لہجے میں کہا۔

''کون..؟ سائرہ کا سانس اٹکا ہوا تھا۔

''مسکان!'' سمعان نے یوں سر جھکا کر کہا جیسے وہ خود بے حد قصوروار ہو۔

سائرہ کے اٹکا ہوا سانس بے اختیار اُس کے سینے سے خارج ہوا۔ یعنی سمعان کی محبت ون سائیڈ تھی پھر اب تو مسکان پرائی امانت تھی۔

''وہ مجھے ملنے سے پہلے ہی گم ہوگئی! وہ مجھے بہت اپنی اپنی لگا کرتی تھی، کچھ خاص طرح کی کشش تھی اُس کی جانب کھنچا کرتی تھی۔ لیکن اب تو...!'' سمعان اُس سے اپنا پہلا پیار، اپنا پہلا احساس شیئر کر رہا تھا۔ ایسے میں سائرہ کو سمجھ نہ آرہی تھی کہ وہ سمعان سے کیا کہے۔

''سمعان! میں تم کو اُسے بھولنے کو ہرگز نہیں کہوں گی لیکن یہ بھی سچ ہے کہ پرائی چیز کا خیال خیانت کی طرح ہوتا ہے۔ تمہارے سامنے بہت ساری زندگی پڑی ہے اور گاڑی بھی ایک پہیے سے نہیں چلتی، آگے جا کر تمہیں بھی ہر صورت ایک ساتھی کی ضرورت ہوگی اور میں دُعا کروں گی کہ تمہاری زندگی میں کوئی ایسی لڑکی آئے، جو تمہاری زندگی کے ہر کانٹے، ہر دُکھ کو چُن لے...'' سائرہ نے سچے دِل سے اُسے دُعا دی۔

''تھینک یو سائرہ! یو آر ریئلی مائی فرینڈ! تمہارے وجود سے مجھے ہمیشہ سکون ملتا ہے۔'' سمعان مشکور ہوتے ہوئے کہا۔

''دوستوں کو تھینک یو کہہ کر پرایا نہیں بناتے۔'' سائرہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

جانے کیوں اُسے لگ رہا تھا کہ اگر اس نے سمعان کو پایا نہیں تو کھویا بھی نہ تھا۔

❖❖○❖❖

''ماہی اِس وقت فون کر رہی ہو، کیا تم ٹھیک ہو؟'' ترنم نے سوئی سوئی آواز میں پوچھا۔ صبح ساڑھے تین بج رہے تھے۔

''ت... ترنم!'' ماہی کی مارے گھبراہٹ کے آواز نہ نکل رہی تھی۔ اُس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا، جس سے اتنی دُور بیٹھی ترنم بھی چونک گئی تھی۔

''کیا ہوا ماہی؟'' ترنم نے الرٹ ہوتے ہوئے پوچھا۔

وہ اِس وقت کراچی میں تھی۔ آئی تو وہ ایک کام کے ہی سلسلے میں تھی لیکن کام ہوتے ہی وہ کچھ دن کے لیے ایک اور ہوٹل میں جا ٹھہری تھی۔ اس روشنیوں کے شہر سے اُس کی جڑوں کا رشتہ تھا ایسے کیسے اتنی آسانی سے وہ اُسے جانے دیتا۔

ترنم! آپا... آپا میرا خیال ہے کہ مرگئی ہیں!'' ماہی کی کپکپاتی آواز ترنم محسوس کرسکتی تھی۔

''کیا مطلب ہے تہمارا؟'' ترنم نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''میں ابھی ابھی ایک نائٹ پارٹی سے آئی تھی۔ مجھے ڈائمنڈ کا ایک ہار گفٹ ہوا تھا، آپا کو پہلے سے اِس کی خبر تھی، تم تو جانتی ہو آپا ایسے معاملوں میں کیسی حساب کی پکی ہے۔ میں نے سوچا صبح یہ اسلام آباد جارہی ہیں، میں سونے سے پہلے ہار اِن کو دے دوں... جب میں ابھی اِن کے کمرے میں آئی ہوں تو...!'' ماہی کی آواز میں مسلسل کپکپاہٹ تھی۔

''ہاں کیا ہوا؟'' ترنم نے پوچھا۔

''یہ... یہ مرچکی ہے!''

''ترنم یہ مرچکی ہے میں نے ٹھیک سے دیکھا ہے۔'' ماہی نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔

''کیا..کیا میڈم چاندنی مرگئی ہے!'' یہ انکشاف واقعی ترنم کے لیے بے حد چونکا دینے والا تھا۔ وہ اُس کی بددُعاؤں سے نہ مری تو اب اچانک کیسے مرگئی؟

''لیکن کیسے...؟'' ترنم نے پریشانی سے پوچھا۔

ماہی جواب میں خاموش تھی۔

ڈاکٹر کی کاٹتی نگاہیں، اِن میں چھپا پیغام، سوال مرض اور نفرت سب بول رہے تھے۔

وہ اندر تک سے کانپ گئی تھی۔ کیسے بتاتی کہ وہ خود اپنے Test بھی دے کر آئی تھی۔ اور رزلٹ لینا بھول گئی ہے۔

''ایڈز!'' اس کے منہ سے نکلا۔

قدرت کا اپنا نظام ہے، کسی کے چاہنے نہ چاہنے سے نہیں بدلتا۔ جو اِس کے اصولوں اور پابندیوں سے کھیلتا ہے اُنہیں توڑتا ہے۔

ایک دِن اچانک ایسے ہی سوتے میں مرجاتا ہے۔

''ترنم! آپا کو ایڈز تھا!'' ماہی کی آواز خوف سے پھٹ رہی تھی۔

میڈم چاندنی کی اچانک موت کل کے اخبار کی سرخی تھی۔ وہ ایک بہت بڑا سوشل سرکل رکھتی تھی۔ اُس کے جنازے پر ٹاپ کی ہیروئنز بھی شامل تھیں، کئی ادھیڑ عمر اداکارائیں جو اب فلمیں ڈائریکٹ یا پروڈیوس کرتی تھیں، وہ بھی اُس کے جنازے پر دھاڑے مار مار کر رو رہی تھیں، ہیرا منڈی کی ہر طوائف، انڈسٹری کی اداکارائیں، اسٹیج ایکٹریس کالے لباس میں یوں ماتم کرتی نظر آ رہی تھی جیسے اُن کی ماں مرگئی ہو۔

میڈیا نے بھی بڑھا چڑھا کر سارے ایونٹ کی کوریج کی تھی لیکن آج کے اخبار میں ایک ہیڈ لائن نے سارا منظر بدل دیا تھا۔

''ایڈز'' میڈم چاندنی کی موت ایڈز کی وجہ سے ہوئی تھی!

یہ انکشاف ایسا تھا کہ ہر آرٹسٹ ہر ''ہوکر'' ہر ''سائڈ'' کے اندر بے چینی بھر گئی تھی۔ سب ہی نے چوری چھپے ہسپتالوں اور کلینک کا رخ کیا تھا اپنے ایچ آئی وی ٹیسٹ کے لیے، کچھ امیر اور سمجھ دار اداکاروں نے اس کے لیے باہر کے ممالک کا رُخ کیا تھا۔

بہر حال ایک خوف و ہراس کی فضا تھی، جو اِن سب میں پھیلی ہوئی تھی۔ انڈسٹری میں ایک دم ویرانی سی پھیل گئی تھی پروڈیوسروں کی فلمیں، ڈرامے بیچ میں چھوڑ کر اداکاراؤں کا یوں غائب ہونا مزید شکوک پھیلا گیا تھا۔

''لگتا ہے ہمارا قفس کھل گیا ہے!'' شبنم نے سب لڑکیوں سے کہا۔ میڈم چاندنی کی اچانک موت پر جہاں وہ سب حیران ہو رہی تھیں وہیں سب کو ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہو رہا تھا کہ آئندہ وہ آزاد ہوں گی۔ وہ اتنے سالوں سے اتنی کڑی نگرانی میں تھیں کہ اُن کو ابھی تک ٹھیک سے اپنی آزادی کا تعین نہیں ہو رہا تھا۔ میڈم چاندنی کی موت پر سب سے زیادہ دُکھی ترنم تھی۔

''تم اُس وقت کیوں نہ مریں جب میرا سارا وجود پاکیزہ تھا۔ جب ایمان فاطمہ نے خود کو زندہ رکھنے کے لیے صرف اور صرف تمہاری موت کی خواہش کی تھی۔'' ترنم سسکی۔

''کاش تم تب مرتیں! اب جب کہ میرا سب کچھ تباہ و برباد ہو چکا ہے تو مجھے تمہاری موت کا کیا فائدہ، ایسی آزادی کا کیا فائدہ! ایک بار فصل کو آگ لگ جائے تو بعد میں راکھ کی حفاظت تو نہیں کی جاتی نا!''

''اب تم یہیں رہو گی یا کہیں اور جاؤ گی؟'' رات کو ماہی نے ترنم سے سوال کیا تھا۔ وہ لوگ فی الحال آنٹی چاندنی کی کوٹھی میں ہی تھیں۔

''صبح میں دوبارہ کراچی چلی جاؤں گی، مجھے اپنی ماں کو ڈھونڈنا ہے۔'' ترنم نے دھیمے لہجے میں کہا، ایک عجیب سے خالی پن کا احساس تھا۔

...ہی کے پَر اتنے سالوں سے کاٹ کر اُسے پنجرے میں رکھا گیا تھا، اب پنجرے کا دروازہ کھلا بھی تھا ...ان وہ خود کو قید میں ہی محسوس کر رہا تھا۔ یہ ہی حال سب لڑکیوں کا تھا۔ ابھی تک کوئی لڑکی کہیں بھی نہ گئی ...ی میڈم چاندنی کا زیور جو کوٹھی میں ہی پڑا تھا سب لڑکیوں نے آپس میں بانٹ لیا تھا۔ ابھی تک ...ان اُس کے اکاؤنٹس تک رسائی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔

''میں۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں؟'' ماہی نے حسرت سے پوچھا۔

''ارے! تمہاری تو اپنی ذاتی کوٹھی ہے، جہاں تک مجھے یاد ہے تم نے کرائے پر چڑھا رکھی تھی۔ تمہارا ابا گھر ہے اور جمی، وہ جمی بھی مجھے لگتا ہے کہ تم سے سچی محبت کرتا ہے تم اُس سے شادی کر لینا۔'' جمی ...ان ایکسر سائز کروانے آتا تھا۔ ترنم یہ نہ جانتی تھی کہ وہ ماہی کو نہیں ترنم کو دل سے چاہتا تھا۔

''نہیں! میں۔ میں اِس شہر میں نہیں رہنا چاہتی۔'' ماہی کے چہرے پر گھبراہٹ بے حد نمایاں تھی۔

''میں بس تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔'' ماہی نے ضد کی۔

''ماہی! آئندہ دِن میرے اور خواری کے ہیں! میں پچھتاوے سے کفارے کے دور میں داخل ہونا چاہتی ہوں اور جو گناہ میری روح کو آلودہ کر چکے ہیں اُن کو دھونے کے لیے ایک بہت مشقت بھرا راستہ منتظر ہے۔'' ترنم نے اُسے اپنے ساتھ جانے سے منع کیا۔

''میں اپنے اُسی محلّے، اسی گھر جو کہ صرف دو ڈھائی مرلے کا ہے، میں رہنے جا رہی ہوں تم کہاں ...ے ساتھ خوار ہوگی؟'' ترنم نے حیرت سے ماہی کے مسلسل اصرار اور ضد کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ترنم! میں بہت خوف زدہ ہوں'' ماہی کی آواز ایک دم کپکپانے لگی۔

''اب کس بات کا خوف ہے؟'' ترنم نے حیرت سے پوچھا، وہ دیکھ رہی تھی کہ ماہی کے چہرے کی ...ت ایک دم سے ماند پڑ گئی ہے۔ اُسے واقعی حیرت تھی کہ ہر پل اپنے لیے کانشس رہنے والی لڑکی کیسے ...ے لاپرواہ رہ سکتی ہے۔

''ترنم! کیا موت کے بعد واقعی انسان کو اپنے اچھے بُرے کا جواب دینا ہوگا؟'' ترنم ایک دم چونکی، ...ال بے شک حیران کن نہ تھا البتہ سوال کرنے والی حیرانی کا باعث تھی۔

''ہاں! ایک مسلمان کا آخرت پر ایمان ہوتا ہے!'' ترنم نے دھیرے سے کہا، وہ غور سے ماہی کا چہرہ ...ہی تھی۔

''بُرے لوگوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟'' ماہی کے چہرے پر اِس وقت بچوں جیسی معصومیت تھی۔

''وہ۔ وہ جہنم میں جاتے ہیں!''

''جہنم کیسی ہوتی ہے؟'' ماہی نے پوچھا۔

''میری اماں بتاتی تھیں کہ اگر جہنم کی آگ کا ایک شعلہ زمین پر پڑ جائے تو اِس پر کبھی سبزہ، اناج ...ں آئے گا اور یہ جو آگ ہم استعمال کرتے ہیں جس میں کوئی گر جائے تو جل کر راکھ ہو جاتا ہے، یہ ...ک ستر پانیوں سے دُھل کر زمین پر اُتاری گئی ہے۔'' ترنم کی آواز میں بے انتہا لرزش تھی۔

''ترنم! تم کہتی ہو کہ ہم بُری لڑکیاں ہیں کیا ہم بھی جہنم میں جائیں گی؟'' ماہی نے روہانسی ہو کر

’’کیوں! تمہیں نہیں معلوم کہ ہم اچھی ہیں یا بُری؟‘‘ ترنم نے اُلٹا اُس سے سوال کیا۔

’’ہاں بُری ہیں!‘‘ ماہی نے جیسے اقرار کیا۔

’’ماہی! میں یہ تو جانتی ہوں کہ ہم بُری ہیں ہمارے اعمال بُرے ہیں لیکن میں یہ نہیں جانتی کہ ہم د جہنم میں جائیں گے۔ کیوں کہ جزا اور سزا کا اختیار اللہ جی کو ہے اور وہ بڑا مہربان ہے اُس کی رح ہمارے گناہوں سے ہمیشہ بڑی رہتی ہے۔‘‘ ترنم بات کرتے کرتے ایک دم چُپ ہوگئی وہ خود حیران کہ وہ یہ سب کچھ بول رہی تھی۔

یہ سب تو امّاں اور ابّا بولا کرتے تھے۔ یہ سب باتیں کہیں دِل کے نہاں خانوں میں ہمیشہ سے تھیں آج ماہی کی باتوں سے دوبارہ سامنے آ گئیں۔

ترنم کو ایک دم احساس ہوا کہ اِن باتوں کی زیادہ ضرورت تو خود اُسے تھی، وہ جو بھول بھلیوں بھٹک رہی تھی۔ اللہ نے اُسی سے اُس کے لیے راستہ دکھا دیا تھا۔

’’تو اِس کا مطلب ہمیں بھی معافی مل سکتی ہے؟‘‘

’’ہم بھی بخشے جا سکتے ہیں؟‘‘ ماہی نے اُمید سے کہا۔

’’نا اُمیدی کفر ہے!‘‘ ترنم کی آواز کسی گہرائی سے آئی تھی۔

’’میرے خدا! کیا میں!‘‘ وہ عین امّاں کے الفاظ دہرا رہی تھی۔

’’بس ترنم! تم مجھ کو بھی اپنے ساتھ لے چلو، نہیں رہنا مجھے اِس دنیا میں، اِس حرام کاری میں۔‘‘ نے اُس کے ہاتھ تھام کر کہا تو ترنم نے آنسو بھری آنکھوں سے اثبات میں سر ہلایا۔

’’ٹھیک ہے میں اپنی بھی پیکنگ کرتی ہوں۔‘‘ ماہی کہہ کر اُٹھ کھڑی ہوئی، جب کہ ترنم ساکت بیٹھ اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ وہ کہیں دُور کچھ لوگوں کی آوازیں سُن رہ کچھ سائے سے اُس کے سامنے لرزتے گھوم پھر رہے تھے۔ پھر ایک دم سے یہ سائے واضح منظر بن اور مدھم آوازیں ٹھیک سے سنائی دینے لگیں۔

’’ایمان۔ ایمان پُتر! عصر کا ویلا (وقت) ہو رہا ہے تو اپنے بال باندھ لے۔‘‘ خدیجہ بی بی نے کٹ کرتی مرغیوں کو دانا ڈالتے ہوئے کہا۔

’’توبہ ہے امّاں! اب اپنی مرضی سے بال بھی کھلے نہیں رکھے جا سکتے؟ یہ آپ کے اصول کسی پھن کی طرح میرا دم گھونٹ دیتے ہیں!‘‘ ایمان بڑبڑائی۔

’’نہ پُتر ایسے تو خار نہ کھا! تیرے بھلے کو دھیان کرتی ہوں۔‘‘ امّاں نے پیار سے کہا، اُن کا تحمل ختم ہوتا تھا۔

’’اِس میں میرا کیا بھلا ہے؟‘‘ ایمان بھڑکی۔

’’تُو تو میرا سب سے قیمتی مال ہے، تیرا دھیان نہ کروں گی تو کس کا کروں گی؟‘‘ خدیجہ بی بی سوکھی روٹیوں کا چورا بنا کر اُن کی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

’’ہمارے پاس کوئی ہار موتی ہوتا ہے تو اُسے ہم جندھروں (تالوں) میں چھپا کر رکھتے ہیں دھیاں (بیٹیاں) تو بہت قیمتی ہوتی ہیں کسی لال موتی کی طرح اور پاکیزہ بالکل روشنی کی طرح!

...دھیان سے رکھنا ہوتا ہے۔ کسی چندرے کی میلی نظر نہ پڑ جائے۔‘‘ خدیجہ بی بی نے پیار سے اُس ... ہاتھ پھیر کر اُس کے غصّے کو دباتے ہوئے کہا۔

امّاں! اِس چار دیواری میں کم از کم اتنا روکا ٹوکا نہ کریں۔ تنگ آ جاتی ہوں میں!‘‘ ایمان نے ماں کا ... دیکھ کر دِل کی بات کہی۔

اُوں ہوں! کنواری لڑکی ہو یا پکے آم کی خوشبو! دونوں باہر سے گزرتے بندے کو اپنے ہونے کا پتا ... ہیں۔‘‘ خدیجہ بی بی اب بھی اپنے کہے پر ڈٹی ہوئی تھیں۔

...نی امّاں میں اپنے ہی گھر میں قید ہو جاؤں!‘‘ ایمان نے بُرا سا منہ بنایا۔

...نا اسے قید نہیں کہتے قرینہ کہتے ہیں۔‘‘

...یاں گھر میں ہوں یا باہر! ڈھکی چھپی، دبی ہی اچھی لگتی ہیں۔‘‘ خدیجہ بی بی نے ڈربے سے ...اں کے تازہ دیے گرم گرم انڈے اکٹھے کر کے پیالے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

...ونہہ! یہ قرینہ نہیں ہے، یہ تو قید ہے!‘‘ ایمان کا باغی دِل تو بہرہ ہوا پڑا تھا۔ اُسے کہاں کچھ سنائی دیتا ...اں کی باتیں اُس تک نہیں اُترتی تھیں۔ ترنم نے بے اختیار سسکی بھری۔

’’کاش! کاش زندگی کی اِس فلم کو ریوائنڈ کر کے پھر سے شروع کیا جا سکتا!‘‘ ترنم کے کانوں میں دُور ...ی آواز رس گھول رہی تھی۔

...ں تیری منزلوں کے نشاں سے
...ہت دُور آگے نکل گیا
...سنبھل سکا بہت دیر تلک
...یونہی بے سبب بھٹکتا رہا
...رے نور کی وہ روشنی
...رے آس پاس بکھرتی رہی
...یں نااہل میں بے خبر!
...یوں دیر تک سویا رہا
...مجھے آگہی کا شعور دے
...مجھے تازگی کا سرور دے
...یری راہ میں کھڑا ہوں
...رے راستے کی دھول ہٹا دے
...الٰہی مجھے اپنے قرب سے نواز دے

...یہ ابّا تھے! یہ ابّا کی آواز تھی۔

...نم نے بے اختیار اُن کو چھونے کی کوشش کی، منظر بلبلے کی مانند پھوٹ گیا۔

...نم بے اختیار سسکی۔

’’...غرضی، بے حسی ہی بے وفائی کے پودے کو جنم دیتی ہے اور یہ پودا ایسا جھاڑ کانٹے جیسا ہوتا ہے کہ

ساری اچھائی کا پانی چوس لیتا ہے اور پھر آس پاس کی ساری زمین کو بنجر کر دیتا ہے۔ اسی لیے تو بے و
آدمی ہو، عورت ہو یا اولاد! وہ ہمیشہ اکیلے اور بنجر رہ جاتے ہیں، بے وفا رستوں کو ہریالی کبھی نہیں نصیب ہوتی۔

''لے پتر! یہ تیرے نئے جوڑے اور یہ ہیں تیرے جوتے! تیرے ابا جی نے پتر ے ہار بندوں کے یہ تیس روپے الگ سے دیے تھے۔'' خدیجہ بی بی نے پاؤں کی چپل اُتار کر برقعے کی ڈوری کھولی۔

ایمان نے کھولتے خون کے ساتھ ان دو تین شاپرز پر نظر ڈالی۔

''اماں! اتوار بازار سے چھانٹ چھانٹ کر (ٹوٹوں) پیسوں سے اُس کے لیے کپڑے اور سو رو
کی چپل خرید کر لائی تھیں، جس پر سفید نگ لگے ہوئے تھے۔ اماں نے اپنی سی کوشش کر کے کپڑوں کے کھلتے رنگ تلاش کیے تھے۔ چپل بھی نازک سی تھی۔

لیکن ایمان کے ماتھے پر بل تھے۔

ترنم نے بے اختیار ایمان کو روکنے کی کوشش کی لیکن اُس کا ہاتھ منظر کو چھو نہ پا رہا تھا۔

''کیا ہوا ایمان پتر؟'' اماں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا، اماں کا چونکنا لازمی تھا کیوں کہ ا
سے پہلے یہ ہی ایمان تھی، جو لپک کر اِن چیزوں کو پکڑتی تھی، اِس کے لیے یہ چیزیں بہت اہم ہ
تھیں۔

ترنم نے بے اختیار سسکی بھری، کاش وہ اِس منظر کو چلنے سے روک سکتی۔

اب وہ ہی ایمان منہ بنائے اُن پر نظر ڈالے، چھوئے بغیر اتنے فاصلے پر بیٹھی تھی، اُس کی یہ حرک
اماں کو حیران کرنے کے لیے کافی تھی۔

''ہوں! مجھے نہیں چاہیے یہ ''سی'' کلاس چیزیں!'' ایمان نے غصے سے کہا۔

''سی کلاس! یہ کیا ہوتا ہے؟'' اماں نے حیرانی سے پوچھا۔

ترنم نے ایک بار پھر بڑھ کر ایمان کو روکنے کی کوشش کی لیکن وہ منظر ایک بار پھر اُس کے ہاتھوں پھسل گیا تھا۔

ایمان کو وہ اسکول باقاعدگی سے بھیجتی تھیں لیکن وہ خود سوائے قرآن پاک کے، کچھ نہ پڑھ لکھ
تھیں۔

''اماں! یہ ٹکے ٹکے کی گھٹیا سستی چیزیں!'' ایمان نے شاپرز کو دور دھکیلتے ہوئے کہا۔

ترنم نے دوڑ کر اُن شاپرز کو پکڑنے کی کوشش کی۔ وہ اِن چیزوں کو کسی قیمتی متاع کی طرح سینے لگانا چاہتی تھی۔

ایمان کی بات سمجھتے ہی اماں کے ماتھے پر بل پڑ چکے تھے۔

''استغفار کر ایمان! اُس ربّ جی کا شکر ادا کر، ایسی ناشکری نہیں کرتے۔'' اماں نے دھیمی لیکن آواز میں کہا۔

''وہ بھی تو لوگ ہوتے ہیں، جن کو تن ڈھانپنے کو کپڑا نہیں جُڑتا، کھانے کو دانہ، رہنے کو چھت نہیں ہم ربّ جی کا لاکھ بار بھی شکر کریں تو کم ہے اُس سوہنے رب نے ہم کو ہر چیز سے نواز رکھا ہے۔''

نے جذب سے کہا۔

''صدقے جاؤں اُس رحمان جی کے، ہم کبھی بھوکے نہیں سوئے، تین وقت کا رج رج کھاتے ہیں،
ی سردی کا لتا کپڑا، رہنے کو اپنا ٹھار (ٹھکانا) ہے۔ میں تو کہتی ہوں اللہ سوہنے نے بڑا ہی چنگا (اچھا)
ھا ہے۔ بہت بہت کرم کر رکھا ہے۔ شکر الحمدللہ!''

''لاکھوں سے بہتر، ہمیشہ سے بہتر ہیں! شکر الحمدللہ۔'' آخر میں اماں نے بڑے جذب سے شکر
الحمدللہ کہا تھا اور صرف دیکھنے والی آنکھ دیکھ سکتی تھی کہ اُن کا روم روم پوری سچائی سے شکر گزار تھا۔

''ہونہہ! اللہ ہی جانے آپ کو کس بات کا اتنا اطمینان اور خوشی چڑھی رہتی ہے کہ ہر وقت شکر کرتی
تی ہیں۔''

''آخر ہم کس بات پر اتنا شکر ادا کریں؟'' ایمان کے کہنے پر ترنم بے اختیار چلائی تھی۔

''رک جاؤ ایمان، چپ ہو جاؤ ایمان۔''

''شکر کریں اِس غریبی پر جو تن نہ ڈھانپے، جو پیٹ نہ بھرے! اِس پر شکر ادا کریں، کیا دیا ہے آخر
پ کے رب جی نے ہمیں؟ یہ دو مرلے کا گھر! دم گھٹتا ہے میرا!''

''یہ، یہ کپڑے!'' ایمان نے پاگلوں کی طرح کپڑے شاپرز سے نکال کر تخت پر اُچھالے۔

''رک جاؤ ایمان، نہ کرو ایمان!'' ترنم سسکتے ہوئے بولی۔

''یہ۔ یہ داغ لگے، ڈورا آئے سستے سے سوٹ! ہونہہ! جب ساری دنیا تھان سے اچھا کپڑا خرید کر
لے جاتی ہے تو میری اماں شکر ادا کرنے کے لیے بچ جانے والا وہ کپڑا جو نقص زدہ ہوتا ہے خریدنے چل
پڑتی ہے۔ سارا اچھا تھان سب کے لیے اور یہ بچ جانے والے میرے لیے! کیا میں اِس قابل ہوں
اماں؟''

دیکھو اماں! باہر نکل کر لوگ اپنی اولاد کی آسائشوں کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے، ایک آپ لوگ ہیں
ن وقت سبزی دال پکا کر، کھلا کر ''شکر شکر'' کی گردان کے سوا کرتے کیا ہیں آپ؟''

ترنم نے بے اختیار اپنا سینہ پیٹ لیا۔

''ہائے ایمان! تیری لمبی زبان اور بڑی بڑی باتیں کس قدر دُکھ دینے والی تھیں۔''

''ایمان!'' اماں کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

''یہ کیا بک بک کر رہی ہے؟''

''یہ تجھے آخر کیا ہو گیا ہے؟'' اماں کی آواز رنج و غم میں ڈوبی ہوئی تھی، حیرانی اُن کی آنکھوں میں تھی
ن سے پہلے ان کی یہ ہی بیٹی ہر حال میں مست و مگن رہتی تھی۔

''اُس کو ''ناشکری کے کیڑے'' نے کب کھانا شروع کیا؟'' اپنی بے خبری پر اُن کو دُکھ بھی ہوا تھا۔

''کیا ہوا ہے تجھے پتر؟''

''یہ سب کچھ تو ہمیشہ سے ہے پھر اب تجھے ہر چیز بُری، کم، سستی اور گھٹیا کیسے لگنے لگی؟'' اماں کی
ھیں اُس کے وجود میں چھبی رہی تھیں، وہ ان ساری باتوں کی جان لینا چاہتی تھیں۔

ایمان چپ چاپ تخت پر بیٹھی اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے کچی زمین پر جانے کیا بنا رہی تھی۔

''بھکے پیروں سے بنائی آڑی ترچھی لکیریں ہوں یا خواب! کبھی اچھی تعبیر اور تصویر نہیں بن پاتی۔''

''یہ گھر ہمارا اپنا ہے دو کمرے اوپر ہیں پھر ویہڑا (صحن) ہے، غسل خانہ ہے نیچے ویہڑا، باورچی خانہ اور تیرے ابّا کا کمرہ! دیکھ کتنا کھلا اور زیادہ گھر ہے ہم دو جیوں (افراد) کے لیے۔''

''پھر؟''

''پھر تیرا دم کیوں گھٹنے لگا؟''

''آہ! جب انسان کا زوال آتا ہے اُس کو اچھی خاصی چیز اور ماحول بُرا لگتا ہے۔ وہ ناشکرا ہو کر اپنے بُرے وقت کو خود دعوت دے دیتا ہے امّاں۔'' وہ بے اختیار بولی۔

''کچھ نہیں امّاں! چھوڑیں بس میرا دِل ہی مجھے تنگ کرتا ہے۔'' اِس بار ایمان کے لہجے میں سچائی اور بے بسی دونوں نمایاں تھیں۔

''کیا ہوا تیرے دل کو؟''

''بس امّاں! شاید میرے خواب بڑے اور دِل چھوٹا پڑ گیا ہے۔'' ایمان بغیر کسی مصلحت کے بولی۔

''نہ پُترا! اپنے دِل کو خواہشوں سے چھوٹا نہ کر! یہ دِل چھوٹا بڑا نہیں ہوتا خواہشیں اگر اوقات سے بڑ کرنے لگیں تو تب یہ دل کم پڑ جاتا ہے۔ تو کبھی ان خواہشوں کو سر پر سوار نا کرنا، یہ سر پر سوار ہو کر ہمیشہ سر جھکا دیتی ہیں۔''

''من مارنا سیکھ! نا ماننے والے تو ہمیشہ ریوڑ سے نکلی سرکش بھیڑوں کی طرح ہوتے ہیں، لاکھ گھیر ریوڑ میں واپس لائیں وہ موقع ملتے ہی پھر باہر کو بھاگتی ہیں اور ''باہر'' پُتر جی ان کے لیے عافیت نہیں ہوتی!''

ترنم نے امّاں کو دیکھا اُن کا وجود روشنی اور نور سے بھرا نظر آ رہا تھا۔ ترنم سے یہ روشنی برداشت نہ ہو تو ایک دم اُس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا، اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی شدت مزید تیز ہو گئی تھی۔

ترنم نے دوبارہ ہاتھ ہٹایا تو سارے منظر، آوازیں غائب ہو چکی تھیں کھو دینے کا احساس ترنم کا سانس روکنے لگا تھا۔ امّاں کی نرم آغوش میں جانے کو دل مچل مچل جا رہا تھا۔

''میں آ رہی ہوں امّاں! میں تم کو ڈھونڈ نکالوں گی! تیرے پیروں میں سر رکھ کر معافی مانگوں گی، تیری جوتیاں سر پر کھاؤں گی تو شاید میری روح کے آزار کو کچھ سکون میسّر آ جائے۔''

میں آ رہی ہوں امّاں! ترنم نے مصمّم ارادے سے کہا۔

❖❖○❖❖

''السّلام علیکم بابا سائیں!'' ولی نے اندر داخل ہو کر کہا۔

''آپ نے یاد کیا تھا بابا سائیں؟'' ولی اُن کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''آج کل کیا ہو رہا ہے؟ تم آفس بھی باقاعدگی سے نہیں جا رہے، قاسمی صاحب نے بتایا تھا۔''

''بابا سائیں! کالج میں کچھ مصروفیت زیادہ تھی کل سے انشاء اللہ باقاعدگی سے جاؤں گا۔ آپ کو آئندہ کبھی شکایت نہ ہو گی۔'' عبدالولی نے ہمیشہ کی طرح تابع داری سے کہا۔ اُس کو کتنا بھی اہم کیوں نہ ہوتا وہ پہلے ہمیشہ احمد شاہ کا کہنا سُنتا تھا۔ اب کل بھی اُس کے پاس آفس جانے کا وقت نہیں

ن اُس نے احمد شاہ کے کہنے کو کبھی نہیں ٹالا تھا۔

''بیٹا! جوانی میں کی ہوئی محنت، عبادت ہی لونگ لاسٹنگ ہوتی ہے!'' احمد شاہ نے بہت گہری بات کہی ی۔

''جی بابا سائیں۔'' عبدالولی نے بے حد تابع داری سے جواب دیا۔

''اور بیٹا! آج شام میں، بابا جی سے ملاقات کے لیے نکل رہا ہوں، ان کا پیغام آیا ہے وہ یاد ر رہے تھے۔ تم اپنی ماں کا خاص خیال رکھنا۔'' احمد شاہ نے فکرمندی سے کہا۔

''بابا سائیں! امّاں جان پر تو میری زندگی قربان آپ بے فکر رہیں، میں اُن کو چیک اپ کے لیے بھی لے کر جاؤں گا۔'' عبدالولی نے بے حد ذمّے داری سے کہا۔

''بابا جی ٹھیک ہیں نا؟ میرا بھی اُن سے ملنے کو بے حد دِل کرتا ہے میرا انہیں سلام دیجیے گا۔'' عبدالولی کہا۔

''رحیم بخش کہہ رہا تھا کہ بابا جی بے حد کمزور ہو گئے ہیں، اِس عمر میں ضعیفی تو بے شک ضرور ہوتی ہے ن وہ ہمارے لیے روشنی کا مینار ہیں، ان کے بغیر رہا نہیں جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت اور زندگی عطا ائے۔'' احمد شاہ نے اپنے وسوسوں کو دُعا کی شکل دی۔

''آمین!'' عبدالولی نے بے اختیار کہا۔

''اچھا بیٹا! تم چل کر آرام کرو رات گہری ہو رہی ہے۔'' احمد شاہ نے اُسے جانے کی اجازت دی۔

بدالولی جس طرح باپ کے کہنے پر فوراً دوڑا آیا تھا، اُسی طرح اُن کے کہنے پر فوراً واپس چلا گیا ب کہ احمد شاہ گہری سوچ میں مبتلا ہو گئے تھے۔

''آخر ایسی کون سی بات ہے جس کے لیے بابا جی نے اتنا ارجنٹ بلایا ہے، وہ کون سی بات ہو سکتی ہے؟'' وہ خود سے سوال کر رہے تھے۔

❖❖○❖❖

''میں نا اب اپنے بیٹے کی شادی کر دینا چاہتی ہوں۔'' روشن آرا بیگم نے گاڑی کی سیٹ کے ساتھ ٹیک لگا کر آہستگی سے کہا۔ وہ اِس وقت ڈاکٹر کے ہاں سے واپس آ رہے تھے۔

''جی امّاں جان!'' پیچھے بیٹی نگینہ نے پُرجوش انداز میں کہا۔

عبدالولی کے چہرے پر مسکراہٹ بے اختیار تھی۔

''لیکن میں سوچتی ہوں کہ حسن آرا کو ابھی ابھی بہت بڑے صدمے سے گزرنا پڑا ہے۔ ایسے میں اس کی بات کچھ عجیب لگتی ہے۔'' روشن آرا بیگم نے با آواز بلند خیال آرائی کی۔

''امّاں جان! بابا سائیں آ جائیں تو مجھے آپ دونوں سے ایک اجازت لینی ہے۔''

''آسٹریلیا سے اسکالرشپ پر کورس کروائے جا رہے ہیں، میرا نام بھی اسکالرشپ میں نکلا ہے اگر آپ لوگ اجازت دیں گے تو میں پہلے کورس کرنا چاہتا ہوں۔'' عبدالولی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''کتنے عرصے کا کورس ہے؟'' روشن آرا بیگم نے پوچھا۔

''ہے تو ڈیڑھ سال کا، لیکن چھ ماہ کے سمسٹر کے بعد اگلا سمسٹر دو مہینے بعد شروع ہو گا۔ میں دو ماہ کے

لیے واپس پاکستان آؤں گا۔ یہ سب کچھ تب ہی ہوگا، جب آپ لوگ مجھے اجازت دیں گے۔“

”پھر... پھر شادی بھی کر دیجیے گا بلکہ آپ اِس بلّی کے لیے بھی اچھا سا رشتہ دیکھیں۔“ عبدالولی نے ساتھ ہی اپنا رُخ نگینہ کی جانب کر دیا۔

”کوئی نہیں! میں پہلے اپنی بھابی کے ساتھ رہنے کا خواب تو پورا کرلوں۔“ نگینہ نے معصومیت سے کہا۔

”ماشاء اللہ! میڈم نے خواب دیکھے تو پرائے دیکھے۔“ عبدالولی نے ہنستے ہوئے کہا۔

”کوئی نہیں میری بھابی پرائی تھوڑی ہوگی، وہ تو میری بہن ہوگی اور علیزے آپی تو ہیں بھی بہت نائس۔“ نگینہ نے کہا۔

”ولی! اس کے بیاہ کا سوچ کر تو میرا دِل ہولنے لگتا ہے۔“

”اِس گڑیا کی جدائی کیسے برداشت کروں گی پھر سوچتی ہوں کہ بیٹیاں تو پیغمبروں نے نہیں رکھیں تو پھر ہم کون ہوتے ہیں ایسا سوچنے والے۔“ روشن آرا بیگم نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”امّاں جان! پلیز بابا سائیں سے میری سفارش کر دیجیے گا۔ میری بہت زیادہ خواہش تھی اِس کورس کرنے کی۔“ ولی روشن آرا سے فرمائش کرلیتا تھا۔

”اگر میں ہی تم کو جانے کی اجازت نہ دوں تو؟“ روشن آرا بیگم نے غور سے ولی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”اگر آپ کو منظور نہیں تو میں کبھی ضد نہیں کروں گا۔“ عبدالولی نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

”میں بابا سائیں سے کہوں گی کہ اگر تمہارے لیے یہ کورس بے حد اہم ہے تو تم کو ضرور اجازت دیں۔“ روشن آرا بیگم نے بے حد پیار سے کہا۔ اگر اولاد اتنی فرماں بردار ہو تو ماں باپ بھی اولاد کی خوشیوں میں حائل نہیں ہوتے۔

”بھائی! پھر شادی تو لیٹ ہوگئی؟“ نگینہ کو صرف اپنی مطلب کی بات سے غرض تھی۔

”یار ابھی کون سا شادی اناؤنس ہوگئی تھی، جو لیٹ ہوگئی ہے۔ بہت کم مدت کا میرا یہ کورس ہے جب تک تم نے اپنے سوٹ کے ساتھ میچنگ چیزیں خریدنی ہیں، تب تک میں واپس بھی آجاؤں گا۔“

”بھائی! تو کیا مجھے سال لگتا ہے میچنگ کرتے ہوئے؟“ نگینہ نے حیرت سے پوچھا۔

”تمہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ اللہ جی نے تمہارے سر میں دماغ نہیں ڈالا یا پھر تمہیں بچپن میں کہیں بہت بلندی سے سر میں چوٹ لگی ہوگی!“ ولی ہنستے ہنستے ایک دم چپ ہوگیا ساتھ ہی اُس نے بریک لگا کر گاڑی روک دی۔

پلک جھپکتے اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک منظر لہرایا تھا۔

ایک سات آٹھ سال کے بچے نے گود میں کوئی بچہ اُٹھایا ہوا تھا، پس منظر میں آگ کے شعلے لپک رہے تھے اور اچانک وہ بچہ چھلانگ لگا دیتا ہے۔

ولی نے یہ منظر اکثر خواب میں دیکھا تھا، جب وہ چھوٹا سا تھا تو اکثر راتوں میں یہ خواب دیکھ کر ڈر کر اُٹھ جایا کرتا تھا۔ ایسے میں روشن آرا بیگم اُس پر ساری ساری رات آیت الکرسی اور سورۃ الناس پڑھ کر پھونکا کرتیں، اُسے گود میں لے کر سلایا کرتیں۔ پھر یہ ہوا کہ روشن آرا بیگم کی محبت اور آغوش کی گرمی اُس کے

خواب اور اُس کے ڈر پر حاوی ہونے لگی تو وہ دھیرے دھیرے اِس خواب کو بھولنے لگا تھا لیکن آج پھر اچانک یہ منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا تھا۔

”کیا ہوا بیٹا؟“ روشن آرا نے پریشانی سے اُس کے سر کو سہلایا، جو ہاتھوں پر سر گرائے بیٹھا تھا۔

”آں۔ ہاں۔ ہاں جی! میں ٹھیک ہوں۔“ خود ولی کو بھی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ اُس کے دِل و دماغ کی کیفیت ایسی کیوں ہے۔

پیچھے گاڑیوں کے ہارن بج رہے تھے۔

”بیٹا چلو! لوگ پریشان ہو رہے ہیں۔“ روشن آرا بیگم نے عبدالولی کو پیار سے کہا تو عبدالولی نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ اُس کے چہرے کے **Reflexes** بہت سلو تھے۔

”ہاں جی میں ٹھیک ہوں!“

”امّاں جان جب یہ خواب میری آنکھوں کے سامنے آتا ہے کہ کوئی بچہ بلندی سے گر رہا ہے تو مجھے لگتا ہے کہ جیسے میں گر رہا ہوں۔“ عبدالولی نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

روشن آرا بیگم نے چونک کر ولی کو دیکھا۔ وہ خود نہیں جانتی تھیں کہ ولی کے بچپن کی یہ گنجلک کیفیات کیوں تھیں اتنا تو وہ جانتی تھیں کہ یہ دونوں بچے اُن تک شدید حادثے کے بعد پہنچے تھے۔ اِس لیے وہ بچپن میں بھی اُسے ہمیشہ پیار سے دلاسہ دے کر ایسی باتوں کو اُس کا وہم کہتی تھیں تاکہ بچہ اِن باتوں کو سر پر سوار نہ کرلے۔

”تمہارا وہم ہے! میں ہمیشہ کہتی ہوں کہ جب جب تم کو کوئی بے قراری ہو تو ’یا حیّ یا قیوم‘ پڑھا کرو، دِل کو بے حد سہارا نصیب ہوتا ہے۔“ روشن آرا بیگم نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”جی امّاں جان!“ عبدالولی نے دِل ہی دِل میں مسلسل ”یا حیّ یا قیوم“ کا ورد شروع کر دیا اور آخر اُس کے دِل کو قرار آ ہی گیا۔

وہ چپ چاپ گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اُس کے دِل کو بے شک بے حد سکون میسر آیا تھا لیکن اُس کا دماغ ابھی تک اُلجھا ہوا تھا کہ مجھے بچپن سے صرف ایک ہی خواب کیوں آتا ہے؟

❖❖○❖❖

”یار ایک ضروری کام تھا!“ ولی نے سلام دُعا کے بعد فون پر کہا۔

”پولیس والے عموماً ضرورت کے وقت ہی یاد آتے ہیں، یہ ہماری بدقسمتی ہے۔ لوگ ہمیں نارمل حالات میں یاد نہیں کرتے۔“ طارق نے ولی کی غیر حاضری صاف لفظوں میں جتا ڈالی۔

”بکو نہیں! کیا میں پہلے تمہیں ہمیشہ کام سے فون کرتا رہتا تھا۔“ عبدالولی نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اچھا کہو خاکسار کے لائق کیا کام نکل آیا؟“ طارق اِس وقت ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

”یار میری کزن کا کیس سول پولیس کے پاس ہے اور وہ روز ہی اُن بے چاروں کو تفتیش کے معاملے میں ستانے پہنچ جاتے ہیں۔ گھر میں موجود خواتین اور اُن کا چھوٹا بھائی خوف زدہ رہنے لگے ہیں۔ تم پلیز اِس معاملے میں کچھ کرو کہ وہ بار بار اِن لوگوں کو تنگ نہ کریں۔ دوسرے یہ کہ جس دن منزہ پر فائرنگ ہوئی تھی اُسی روز سے اُن کا بڑا بیٹا بھی لاپتہ ہے۔ گھر میں اِس قدر پریشانی رہی ہے کہ وہ اپنے بیٹے کی

گمشدگی کو ٹھیک سے محسوس ہی نہ کر سکے لیکن جوں جوں دِن زیادہ ہو گئے ہیں کاشف کی پریشانی بڑھتی جا رہی ہے۔ میں اس کی تصویر تمہارے دفتر پہنچادوں گا، پلیز اپنے ''کھوجیوں'' سے اس کا پتا تو کرواؤ۔'' عبدالولی نے فکرمندی سے کہا۔

لفظ ''کھوجی'' عبدالولی مذاق سے اُن کے محکمے کے لیے استعمال کرتا تھا۔

''ٹھیک ہے تم بھجوادو میں پتا کرواتا ہوں اور تمہاری کزن کے کیس کی تفصیلات بھی منگواتا ہوں۔'' طارق نے اچھے اور ہمدرد دوستوں کی طرح فوراً حامی بھرلی۔

''تھینک یو یار!'' ولی نے مشکور ہوتے ہوئے کہا۔

''تم ہوتے کہاں ہو آج کل؟''

''نہ گھر نہ دفتر۔ خیریت تو ہے نا؟'' ولی نے شرارت سے پوچھا تو طارق کا چہرہ اُس کی آواز میں جو سوال تھا اُسے سُن کر ہی بدل گیا۔

اُس نے گاڑی گیٹ کے باہر ہی کھڑی کردی وہ اُس وقت حسب معمول سحرش کی خبر گیری کے لیے چھوٹا سا چکر لگانے آیا تھا۔

کیسی عجیب بات تھی کہ وہ اپنی زندگی کی اتنی بڑی سچائی اُسی دوست سے چھپالینا چاہتا، تھا جس سے وہ ہمیشہ ہر بات کو شیئر کرتا آیا تھا۔

''بس یار کچھ کام تھا۔ میں اِدھر ہی تھا۔'' طارق نے کمزور سے لہجے میں جواب دیا۔

''او کے فائن!''

''سی یو لیٹر!''

''اللہ حافظ'' ولی نے کہہ کر فون رکھ دیا۔

جب کہ طارق لمبے لمبے سانس لے کر خود کو کافی دیر کمپوز کرتا رہا تھا۔

''یا اللہ زندگی کس قدر مشکل دور میں آ گئی ہے! تو ہی مدد فرما!'' طارق نے بے اختیار اللہ سے مدد مانگی تھی۔

❖❖○❖❖

احمد شاہ بہت دیر سے خاموش بیٹھے بابا جی کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

بابا جی عشا کی نماز کے بعد لمبی دعا میں مصروف تھے۔

''اِدھر ہی آجاؤ بیٹا!'' بابا جی نے دُعا مانگ کر انہیں اپنے قریب ہی بلالیا۔ وہ بہت ضعیف ہو گئے تھے۔

احمد شاہ نے بڑھ کر اُن سے سلام لیا اور ہاتھ کا بوسہ لیا۔

''آپ نے مجھے یاد فرمایا تھا۔'' احمد شاہ نے تابع داری سے پوچھا۔

''ہاں! تم سے ملنے اور تم کو دیکھنے کو شدّت سے دِل چاہ رہا تھا۔'' بابا جی نے پیار بھری نگاہوں سے احمد شاہ کو دیکھا۔

''بابا جی! میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں پلیز آپ میرے ساتھ چلیں، ہمیں خدمت کا موقع

دیں۔'' احمد شاہ نے ہمیشہ کی طرح اُن سے ساتھ چلنے پر اصرار کیا۔

''نہیں بیٹا! مجھے یہاں سے جانے کا حکم نہیں ہے۔'' بابا جی نے اتنی مدھم آواز میں کہا کہ احمد شاہ مشکل سے سُن سکے۔

''پاکستان ہندوستان بننے کے دوران میرا سارا خاندان شہید ہو گیا، میں اپنی بیٹی، جو تین سال کی تھی اور آٹھ ماہ کے بیٹے کو بچا کر اس سرزمین تک پہنچا تھا۔ بہت مشکل وقت تھا!'' انہوں نے طویل گہری سانس بھری۔

''اس جگہ جتنے گاؤں تھے سکھوں اور ہندوؤں کے پاس تھے، بہت کم مسلمان تھے یہاں پر، ایک رات سکھوں نے حملہ کیا اور رہے سہے مسلمان بھی مار ڈالے، لڑکیوں کو سرِ عام بے آبرو کیا۔ مردوں کو ننگا کر کے دوڑا کر مارا اور بچوں کے سینے میں نیزے پرو ڈالے۔ میری بیٹی توتلی زبان میں بات کیا کرتی تھی۔'' بابا جی باتیں کرتے کرتے کہیں دُور کھو گئے۔

''نورالعین!''

''وہ واقعی میری آنکھوں کا نور تھی! اُس معصوم جان کے سینے میں ظالموں نے خنجر گھونپ دیا تھا۔ خنجر زہر آلود تھا، میری بچی نے چار گھنٹے تڑپ تڑپ کر جان دی تھی۔''

''میں نے وہ چار گھنٹے جس بے بسی کے گزارے تھے اُس نے مجھے ایک دم سے احساس دلایا کہ انسان کی ذات ایک ذرّے سے بھی کم ہے۔ اگر اللہ مدد نہ فرمائے تو وہ لاکھ کوشش بھی کرنا چاہے، تب بھی کچھ نہیں کرسکتا، چار گھنٹے میں نے اُس کی مسلسل باتیں سنی تھیں۔ وہ کبھی اتنا نہ بولی تھی لیکن اُس روز تکالیف کے باوجود وہ مسلسل بولتی رہی تھی۔ اُسے پورا یقین تھا کہ اُس کے بابا اُسے بچالیں گے۔'' بابا جی کہتے کہتے رُک گئے!

بے شک وہ بہ ظاہر خاموش تھے لیکن اُن کا دِل رو رہا تھا۔

''اناللہ وانا اللہ راجعون!''

''اور آپ کا بیٹا!'' احمد شاہ نے دِل چسپی سے سنتے سنتے پوچھا۔

''وہ معصوم روح تو اُن ظالموں کا ایک وار بھی نہ سہہ سکا تھا۔'' بابا جی نے دھیرے دھیرے کہا۔

''میرے ماں باپ، بہن بھائی، دادی، عزیز رشتے دار اور میری شریک حیات سب شہید ہو گئے تھے لیکن میں اپنے بکھرے وجود کے ساتھ زندہ تھا تو اپنے بچوں کے لیے، اُن کی شہادت کے بعد میں نیم پاگل سا ہو گیا تھا میں دنوں بولایا بولایا سنسان گلیوں میں گھومتا رہا، ہر گلی میں مجھے اپنی نورالعین کھیلتی دوڑتی نظر آتی تھی۔''

پھر دھیرے دھیرے یہاں دوبارہ آبادی ہونے لگی، ٹوٹے بکھرے مسلمانوں نے دوبارہ سے زندگی شروع کی، ہر کسی کے سینے میں کوئی نا کوئی گھاؤ رستا رہتا تھا۔ لیکن میں تو بے خود رہنے لگا تھا! ایسے میں ایک دن مجھے ایک بہت خوب صورت نوعمر لڑکا اسی گاؤں میں ملا۔

''تم ہر وقت سوگ میں رہتے ہو، کیا یہ ناشکری نہیں؟'' اُس نے ایک دم مجھے پکڑ کر کہا۔

''میرا سب کچھ لٹ گیا میں نے کس بات پر شکر کرنا ہے!'' میں نے روتے ہوئے کہا۔

''تمہاری ہی طرح ایک عورت تھی۔ ایک بار اُس کا اکلوتا بچہ مرگیا اُس نے بہت شور مچایا۔ اللہ سے ناراض ہوگئی، دنیا سے ناراض ہوگئی، ایک دن حضرت موسیٰ کو اُس نے پکڑ کر کہا کہ اپنے اللہ کو کہو کہ میرا بچہ واپس کردے اُس نے مجھے اتنا بڑا دُکھ دیا ہے کہ میری برداشت سے باہر ہے حضرت موسیٰ نے کہا ٹھیک ہے میں تمہارے بچے کو زندہ کرنے میں تمہاری مدد کروں گا لیکن مجھے اس کے لیے ایسے پانی کی ضرورت ہے، جو اُس گھر سے لیا جائے جہاں آج تک کسی کی موت نہ ہوئی ہو۔''

وہ ممتا کی ماری دیوانی گاؤں کے گھر گھر گئی کہ ایسے گھر سے پانی حاصل کرسکے جہاں پر موت نے قدم نہ رکھا ہو۔

لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکی کیوں کہ ہر گھر میں کبھی نا کبھی کوئی نا کوئی ضرور مرا تھا۔ وہ مایوس لوٹ آئی، لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی سمجھ گئی کہ وہ اکیلی نہیں تھی جس کے ساتھ ایسا ہوا تھا بالآخر اُسے صبر آ گیا۔

''اور تم جانتے ہو صبر کرنے والوں کے ساتھ اللہ ہوتا ہے! اگر تم سمجھتے ہو کہ موت نے صرف تمہاری آغوش سے تمہارا سکون، نور چُرایا ہے تو ضرور یہ سوانگ بھر کر پھرو، اور اگر تمہاری عقل میں یہ بات آجائے تو اپنی ذمّے داری سنبھالو!''

''کیسی ذمّے داری؟'' میں نے حیرت سے پوچھا تھا۔

''اپنے حصّے کی جھاڑو پھیرنے کی ذمّے داری۔'' اُس نے بے حد سکون سے کہا۔

''جھاڑو پھیرنے کی ذمّے داری؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں! جہاں جہاں سے معاشرے کی گندگی تم صاف کرسکو، تمہیں کرنا ہوگی۔ اور یہ چاروں گاؤں جو اِس گھاٹی کے لگتے ہیں اِن میں لوگوں کے دِلوں میں جھاڑو لگانے کی تمہاری ذمّے داری ہے!''

''اور تم اب یہاں سے کہیں نہیں جاؤ گے، جب تک تم کام مکمل نہ کرلو۔ ہاں آئندہ دنوں میں یہاں دس گاؤں آباد ہوجائیں گے اور تمہیں اِن ٹوٹے بکھرے انسانوں کو اللہ کی ہدایت کی طرف بلانا ہے، اب بس کرو بہت وقت ضائع کرلیا۔'' وہ نوجوان لڑکا یوں بولا، جیسے مجھ سے بڑا ہو۔

''واقعی اُس کے لہجے میں جو رعب تھا وہ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ لڑکا اپنی بات کہہ کر چلا گیا اور مجھے جینے کا مقصد مل گیا۔ میں نے قرآن کی تعلیم کا بیڑہ اُٹھایا۔''

''الحمدللہ! میں کامیاب رہا اِن دس گاؤں میں جگہ جگہ میرے طلبا اور طالبات اللہ کے پیغام اور علم کو سب تک پہنچارہے ہیں۔'' بابا جی اتنی طویل بات کرکے تھک سے گئے تھے اِس لیے وہ بولتے بولتے چپ ہوگئے، انہوں نے اشارے سے پانی مانگا۔

احمد شاہ نے لپک کر مٹکے سے پانی نکال کر اُن کو دیا جو انہوں نے بسم اللہ پڑھ کے گھونٹ گھونٹ یوں پیا جیسے کوئی بہت بڑی نعمت کا لطف لے رہے ہوں۔ اُس وقت زندگی میں جو جینے کا مقصد لگا اب وہ جینے کا بہانہ لگتا ہے!

میرا دِل اُس مالک کے قبلہ رُخ رہتا ہے؟ اُس مالک نے مجھ پر بڑا کرم کیا۔ ورنہ ہر انسان ساری عمر اس دِل کے ہاتھوں خوار ہوتا رہتا ہے۔

میں نے ساری عمر لوگوں کو ایک ہی بات بتائی ہے کہ یہ جو ہمارا دِل ہے نا! ہم اگر اس کو رب کے قبلہ

ن کرلیں تو ہماری زندگی کا مقصد پورا ہوجاتا ہے!

ں نے گاؤں کے لوگوں کو ہمیشہ بتایا کہ سب سے بڑی ذات اللہ کی ہے لیکن وہ لوگ ایسے نفس کے یں کہ اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے انہوں نے کچھ لوگوں کو اپنی زندگی کا ''بڑا'' ا ہے۔ نتیجے کے طور پر وہ ہمیشہ سے خوار ہورہے ہیں اِن جاگیرداروں کے ہاتھوں۔

ں دن ہم ہر انسان کو بڑے رتبے سے نکال کر صرف اللہ کو ہی بڑا کہیں گے اس دن ہم ہر طرح کی سے نکل آئیں گے، اللہ تعالیٰ کی ذات اِن لوگوں پر رحم کرے۔'' انہوں نے حسبِ عادت فوراً دعا وہ دُعا دینے اور مانگنے میں کبھی کنجوسی نہ کرتے تھے کیوں کہ اُن کا خیال تھا کہ اگر اللہ نے دُعا کو ات کہا ہے تو ہمیں یہ عبادت ہر صورت ہر وقت کرنی چاہیے۔

احمد شاہ! اِن جاگیرداروں کی چھاپا اِن لوگوں پر حاوی ہوتی جارہی ہے، جس سے اِن انسانوں نے تا گرالیا ہے کہ وہ خود کو کیڑے مکوڑے سمجھنے لگے ہیں، ہمیں اس کے لیے باقاعدہ کچھ کرنا چاہیے۔ میں اگر ہائی اسکول، ہسپتال اور مدرسے بنیں تو ان کے بچوں کے اندر آگہی ہوگی۔'' بابا جی نے ہی حل پیش کردیا۔

بابا جی! میرے پاس جس قدر وسائل ہیں میں اُن کو خرچ کرنے پر تیار ہوں لیکن یہاں کے ہیڈ اپنی زمین ہمیں دے دیں گے؟'' احمد شاہ نے پوچھا۔

ہیں! وہ کبھی نہیں دے گا، زمین اُس کی کمزوری ہے!'' بابا جی نے صاف لفظوں میں بتایا۔

تو پھر؟'' احمد شاہ نے پوچھا۔

ان کا صرف ایک ہی حل ہے کہ اس کا اصل مالک اپنی زمین اِن اچھے کاموں کے لیے دے '' بابا جی نے دھیرے سے کہا۔

کون ہے اصل مالک؟ ہم اُس سے بات کرکے دیکھ لیتے ہیں۔'' احمد شاہ نے کہا۔

بدالولی!''

ید عبدالولی شاہ! یہاں کی تقریباً ساری زمین کا مالک ہے!'' بابا جی کی بات پر احمد شاہ کو باقاعدہ کا لگا تھا۔

بابا جی! آپ۔ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟'' احمد شاہ نے بے حد حیرانی سے کہا۔

یں کچھ غلط کہہ رہا ہوں احمد بیٹے؟'' بابا جی نے اُلٹا اُن سے سوال کرڈالا۔

یں ولی کو اِس خون خرابے میں جان بوجھ کر دوبارہ نہیں دھکیل سکتا، جہاں سے میں نکال کر انہیں یا تھا۔'' احمد شاہ نے منت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

احمد شاہ! جب تم دونوں بچوں کو لے کر جارہے تھے تو میں نے تمہیں صاف لفظوں میں کہا تھا کہ امانت لوٹانی پڑتی ہے۔'' بابا جی کی بات پر احمد شاہ نے سر جھکالیا اُن کے اندر جو طوفان برپا تھا اس جود اُکھڑا رہا تھا۔

پ۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں!'' بالآخر احمد شاہ نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

شاباش! بیٹے مجھے خوشی ہے کہ آج سے برسوں پہلے جو میں نے فیصلہ کیا تھا وہ درست تھا تم اُن

بچوں کے سرپرست کے طور پر بہترین انسان تھے، تم نے آج کی بات سے ثابت کردیا ہے۔'' باباجی نے تعریفی انداز میں کہا۔

جواباً احمد شاہ خالی خالی دِل کے ساتھ چپ سے رہے۔

''احمد شاہ!''

''بچوں کو اُن کی پہچان بتانے کا وقت آ گیا ہے۔'' باباجی کی بات پر احمد شاہ کو لگا، جیسے اُن کی زند کے کڑے امتحان کا وقت آن پہنچا ہو۔

''تم اُن کو سب حقیقت سے آگاہ کرو، یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اُن کی پہچان واپس کریں۔'' باباجی دھیمے سے کہا۔

''لیکن اِس سب کا کوئی فائدہ؟'' احمد شاہ کہنے بنا نہ رہ سکے۔

''نگینہ تو ابھی تک بے حد معصوم ہے!''

''بچے ایسی بات سُن کر ذہنی طور پر ڈسٹرب ہوجائیں گے۔''

(بچے کیا! اُن کا سارا گھر اُن کی ساری زندگی ڈسٹرب ہونے والی تھی)

''تم ٹھیک کہتے ہو!''

''لیکن تم نے اب نہ بتایا تو آئندہ دِنوں میں کسی اور ذریعے سے اُن کو معلوم ہوا تو تم پر سے اُن بھروسہ ٹوٹ جائے گا۔''

''لیکن باباجی کون بتائے گا میں نے انہیں معاشرے میں اپنا نام دیا ہے، اُن کا ماضی کیسے اُن تک آ سکتا ہے؟'' احمد شاہ نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

''ماضی، حال اور مستقبل سے ہمیشہ جُڑا رہتا ہے کبھی الگ نہیں ہوتا اور کسی موڑ پر سامنے آ ہی جاتا اور اب تو بچے بڑے ہوچکے ہیں۔ یہ ہی درست وقت ہے تم انہیں حقیقت سے آگاہ کرڈالو۔'' باباجی نصیحت کی۔

''باباجی! اگر زمین کا معاملہ ہے تو ولی کے پاس کون سے کوئی کاغذات ہیں جو وہ ثابت کرسکے ک ہی سید عبداللہ کا بیٹا اور ان زمینوں کا اصل مالک ہے!'' احمد شاہ کے اس سوال پر باباجی بے اخ مسکرائے۔

''جس اللہ نے اُن کی زندگی بچائی وہ چاہتا تھا کہ بچے واپس اپنے مقام پر آئیں، اس لیے اُسی نے سارے ثبوت بھی محفوظ رکھے۔''

''مطلب؟'' احمد شاہ نے نا سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔

''عبدالولی جب مجھے ملا تھا تو بچے نے اعلیٰ قسم کے چمڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ کچھ دن بعد بخش کی بیوی میرے پاس وہ جیکٹ لائی کہ بچے کو نہلانے کے لیے جب کپڑے بدلوائے گئے تو اُس جیکٹ میں چرمی بیگ اندر کی بڑی جیب میں سے ملا تھا۔ وہ اُس کے باپ کی جاگیر کے کاغذات اُس میں بچوں کے پیدائشی سرٹیفکیٹ سے لے کر اُن کے والدین کا نکاح نامہ تک موجود تھا۔ مرنے پہلے کسی بہت وفادار اور سمجھ دار شخص نے ہر طرح کا اہم کاغذ جو یقیناً اکٹھے کرتے ہوں گے

بڑوں میں ڈال دیا تھا۔'' باباجی نے ایک بم دھماکہ ہی تو کیا تھا۔

اتنے سالوں سے وہ اتنی بڑی اور اہم بات سب سے چھپائے بیٹھے تھے۔

''آپ۔ آپ نے پہلے کیوں نہ بتایا!'' احمد شاہ کی آواز کھوئی کھوئی تھی۔ اُن کی آخری اُمید بھی کھوگئی تھی کہ عبدالولی اور نگینہ کو بچالیا جائے۔

''کچھ مصلحتیں آڑے تھیں ورنہ تم پر مجھے پورا بھروسہ تھا اگر میں بچے تمہارے حوالے کرسکتا تھا تو یہ کاغذات بہر حال بچوں سے کسی طور اہم نہ تھے۔'' باباجی نے احمد شاہ کو تسلی دی کہ وہ اُن کے بھروسے پر پورے اُترتے تھے۔

''یہ دیکھو، یہ ہے ولی کی امانت۔'' باباجی نے کاغذوں کا لفافہ اُن کے حوالے کیا۔

''ہر کاغذ کو تہہ لگا کر چھوٹا کرکے اِس چھوٹے سے چرمی بیگ میں رکھا گیا تھا۔ باباجی نے بھی ترتیب میں کوئی ردوبدل نہیں کی تھی۔'' واقعی وہ کاغذات نہایت اہم اور پکے تھے۔ چھوٹے چھوٹے ہر طرح کے کاغذات اُس میں موجود تھے، نا صرف حویلی کے اہم کاغذات بلکہ ہر طرح کے کاغذات بچوں کی آیا اماں ہی سنبھال کر رکھتی تھیں۔ وہ پڑھی لکھی بیوہ عورت تھی جیسے سید عبداللہ نے اپنے بچوں کی نگہداشت کے لیے رکھا تھا۔ سید عبداللہ اُن کو ماں کا درجہ دیتے تھے بہت عزت اور محبت سے انہوں نے آیا اماں کو رکھا تھا۔ جب وہ ولی اور نگینہ کو لے کر سیڑھیوں کی طرف دوڑی تھیں تو انہوں نے ہر طرح کا کاغذ، جو الماری میں رکھا تھا وہ موڑ کر ایک چرمی پرس میں ڈالے اور ولی کی جیکٹ کے اندر موجود بڑی سی جیب میں رکھ دیے تھے۔

وہ نہیں جانتی تھیں کہ وہ بچوں کو بچاپائیں گی یا نہیں لیکن انہوں نے اپنی پوری کوشش کی تھی کہ بچے نہ صرف بچ جائیں بلکہ اُن کے پاس اُن کی پہچان بھی ہو۔

انہوں نے ہر چیز اللہ کے سپرد کردی تھی۔

اللہ بہتر معاملات طے کرنے والا ہے! اور اللہ تو بالکل ویسا ہی ہے جیسا ہم اُس کے بارے میں گمان کرتے ہیں۔

ایک مرتی ہوئی جلتی ہوئی عورت کا گمان اُس کا یقین تھا کہ اللہ اِن معصوم بچوں کی ضرور حفاظت کرے گا اور اللہ نے اُس کے یقین کو شرمندہ نہیں ہونے دیا تھا۔

بچوں کو جس طرح معجزانہ طریقے سے اللہ نے زندگی بخشی تھی وہ انسانی عقل سے دور تھی کیوں کہ جہاں انسانی عقل کی حد ختم ہوتی، ہے وہاں سے ہی انسان کو جان لینا چاہیے کہ اللہ ہی سب کچھ کرسکتا ہے۔

بے شک جان ڈالنے اور لینے والی صرف اللہ کی ہی ذات ہے!

''یہ۔ یہ تو واقعی بے حد اہم کاغذات اور ثبوت ہیں!'' احمد شاہ کی آواز حیرانی سے سرسراتی ہوئی تھی۔

''تو بیٹا! تم ایسے حالات پیدا کرلو، جس میں بچوں کو ذہنی طور پر تیار کرکے اصلیت بتادی جائے۔'' باباجی نے نقاہت بھرے لہجے میں کہا، وہ بہت زیادہ لمبی گفتگو سے تھک گئے تھے لیکن اُن کو یہ امانت حق دار تک پہنچانی ہی تھی۔

''باباجی! اس طرح [illegible] کے ساتھ بچے ایک دم اُس شخص [illegible] کے سامنے آئے تو کیا بچوں کی زندگی

خطرے میں نہ آئے گی؟" احمد شاہ نے فکرمندی سے پوچھا۔

"پیارے بیٹے! جس اللہ نے اُن کی اب تک حفاظت کی ہے۔ وہ ہی اُن کی اب بھی حفاظت کرے گا۔" باباجی نے انہیں تسلّی دلائی۔

احمد شاہ نے اثبات میں سر ہلا تو دیا لیکن اُن کے دِل و دماغ میں شدید جنگ جاری تھی۔

آنے والے دن اُن کو بے حد مشکل لگ رہے تھے۔ درحقیقت انہیں اپنی زندگی کے بے حد مشکل دِا لگ رہے تھے۔

❖❖○❖❖

ابر گریزاں ہو میں صحرا کی طرح ہوں
دو بوند جو برسو گے بے کار میں برسو گے
ہے خشک بہت مٹی ہر سمت بگولے ہیں
صحرا کے بگولوں سے اُٹھتے ہی تو شعلے ہیں
تم کھل کر اگر برسو صحرا میں گلستاں ہو
پر تم سے کہیں کیسے تم ابر گریزاں ہو
جل تھل جو اگر کر دو تن من میں نمی بھر دو
ہے خشک بہت مٹی پوری جو کمی کر دو
پھر تم کو بتائیں گے کہ روح میں پنہاں ہو
پر تم سے کہیں کیسے تم ابر گریزاں ہو
مل جاؤ اگر ہم کو تو جشن منائیں گے
دھرتی نے نہ دیکھے ہوں وہ پھول کھلائیں گے
آنکھوں میں اُجالے ہوں اور دِل میں چراغاں ہو
پر تم کو کہیں کیسے تم ابر گریزاں ہو
مانا نہیں اس قابل تم چاہو محبت دو
ہم تم کو سدا چاہیں بس اتنی اجازت دو
تم عشق تم ہی پوجا اے جان میری جاں ہو
پر تم سے کہیں کیسے تم ابر گریزاں ہو

مسکان کی مٹھی میں موجود کاغذ اور اُس کی تحریر جو وہ کئی سو بار پڑھ چکی تھی، اُس کے ہاتھوں کے پسینے سے گیلی ہو رہی تھی لیکن اُس نے کاغذ اپنے ہاتھوں میں اس قدر مضبوطی سے دبا رکھا تھا، جیسے کوئی قیمتی ترین چیز مضبوطی سے پکڑی جاتی ہے۔

یہ ایک چھوٹی سی تحریر تھی جو شہر بانو میکے آئی تو آتے ہوئے مسکان کی ڈاک بھی لے آئی۔ وہ نہایت سادہ اور کم عمر سی لڑکی تھی، جس کو سید سرفراز علی نے اپنے ابنارمل بیٹے کی بیوی بنا کر رخصت بھی کروالیا تھا۔

کان اور شہر بانو کا نکاح ایک ہی دِن ہوا تھا۔ دونوں ہی قسمت کے معاملے میں بدقسمت نکلی تھیں۔
کا شوہر بوڑھا شرابی تھا تو دوسری کا شوہر پاگل جنونی تھا۔
نارمل ہنستی مسکراتی لڑکیاں قربانی کا بکرا بنا کے بھینٹ چڑھا دی گئی تھیں۔

"آپی! یہ آپ کے کچھ خط آئے ہوئے تھے، جو آپا امّاں کے پاس پڑے تھے، انہوں نے آتے مجھے دیے ہیں کہ آپ کو دے دوں۔" شہر بانو نے دھیمے لہجے میں کہا وہ اپنی پھوپیوں سے بالکل تھی۔ عام سے نقوش کی گندمی رنگت رکھنے والی لڑکی کا چہرہ بھی مرجھایا ہوا تھا لیکن اُس کی ازدواجی اُس کی توقعات سے بھی زیادہ بُری نکلی تھی۔

کان نے بے دلی سے خطوط پکڑ لیے، کمرے میں آ کر اُس نے خط میز پر پھینک دیے، یہ خط یقیناً نے لکھے ہوں گے وہ شہر میں اکیلی اُس کی تکلیف پر تڑپ رہی تھی۔

نہیں، اُس سے کیا رابطہ کروں، میرے حالات سُن کر الٹا وہ اور پریشان ہوگی اور اب مجھے کوئی حق پہنچتا کہ میں کسی کو اپنی ذات کے لیے مزید پریشان کروں۔" مسکان نے جل کر سوچا تھا۔ اچانک اس کی نگاہ خطوط پر پڑی۔

ایک لفافہ بالکل مختلف ہینڈ رائٹنگ میں تھا۔

کان کا دِل بے اختیار دھڑکا، اُس نے حیرت سے اپنی دِلی کیفیت کو دیکھا۔ اُس کا تو خیال تھا کہ کے اندر اب ہر طرح کے محسوسات کی حِس ختم ہو چکی ہے لیکن یہ اُس کی خام خیالی تھی۔

دِل تو اپنے محبوب کے نام پر ہر صورت دھڑکے گا مچلے گا، تڑپے گا۔ کیوں کہ دِلوں کے نکاح نہیں دلوں پر بندش نہیں لگتی۔" مسکان نے لرزتے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا اور خط کھولا۔

م اللہ الرحمٰن الرحیم"

اُس لڑکی کے لیے ہے جس کا خیال ہے کہ وہ ایک ڈوبتی شام ہے۔ جو خالی جھولی ہے، جو بے اور جس کا دِل اتنا چکنا چُور ہے کہ اُس کے سینے میں اُس کی جگہ خالی ہو چکی ہے! اور۔ اور وہ مر چکی

ہماری قسمت میں ہوتا کہ ہم ملتے اور پھر مل کر ہمیشہ کے لیے جڑ جاتے جیسا کہ لوگوں کے ساتھ تو مجھے کہنے میں عار نہیں کہ تم بہترین لڑکی تھیں۔

اے پیاری لڑکی۔

ی کے کٹورے میں دُودھ جیسی شفاف آنکھیں اور دِل رکھنے والی، قصہ صرف اتنا تھا کہ ہماری یہ تھا کہ ہم ملیں اور پھر جدا ہو جائیں۔ اس سارے سفر میں نہ تمہارا قصور ہے اور میرا تو بالکل پھر یہ تو قسمتوں اور دلوں کے فیصلے تھے۔ اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔

اگر میں نے ان جانے میں تمہارا دِل دُکھایا تو اب معاف کر دو۔ کسی کا مجھ سے ناخوش ہونا کے لیے زندگی برباد کر دینا یہ احساس میرے لیے ایسا ہی ہے، جیسے میری پھولوں بھری زندگی کانٹے بار بار چبھنے لگ جائیں۔ میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ کبھی کسی دِل کا، زندگی کا روگ بن

پیاری لڑکی!

مجھ تک تمہاری سسکتی روتی تحریریں آئی ہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ میرا دل بہت دُکھا۔ لیکن میں پھر کہو کہ میں نے کبھی نہ تم کو کوئی امید دلائی نہ وعدہ کیا، نہ توہین کی اور نہ ہرٹ کیا۔ تم میرے لیے دوست کی طرح قابلِ احترام تھیں اور رہو گی! مجھے اُمید ہے کہ تم۔ اپنا دل بڑا کرو گی اور میرے لیے نہیں بہاؤ گی۔ اللہ نے تمہیں نئی زندگی میں داخل کر دیا ہے! میری دُعا ہے کہ تمہیں اللہ اتنی محبت او دے کہ تم مجھے کیا میرا نام تک بھول جاؤ (آمین) والسلام۔

عبدالولی احمد شاہ

مسکان کو یہ تحریر پڑھ کر یوں لگا کہ گھٹن بھرے کمرے میں اچانک ہوا آنے لگی ہو۔ کئی روزن کھڑکیاں کھل گئی ہوں۔ اُسے اچانک زندگی میں تازگی محسوس ہوئی تھی وہ زندگی جو مردہ وجود کی بے حِس ہو گئی تھی، زندگی لگنے لگی تھی۔ وہ بجائے خط پڑھ کر ولی کو اپنی زندگی سے الگ کر دیتی بلکہ وہ بار پھر خوش گمانیوں میں گھر چکی تھی حالانکہ وہ جس قید میں تھی وہاں سے موت کے سوا اُس کی جان کو چھڑا سکتا تھا۔

''بھرجائی! کیا تم دن چڑھے بھی اندھیرے کر کے لیٹی رہتی ہو، خیر سے نئی دلہن ہو پہنو اوڑھو بنو یہی تو دلہن کے دن ہوتے ہیں۔'' بڑی نند تقریباً روز ہی اس حویلی کا چکر لگاتی تھی کیوں کہ اُس کی بھی کہیں قریب ہوئی تھی۔

مسکان نے تیزی سے خط تکیے کے نیچے کر دیا۔ اُس پر اُس طرح کی گھبراہٹ طاری تھی، جیسے اُ کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔

''ایک تو بھائی صاحب کے یہ زمینوں کے بکھیڑے جانے کب ختم ہوں گے اپنی نئی نویلی دلہن چھ ڈیرے جانے کا تُک کیا بنتا ہے؟'' وہ تیز تیز بولتی الماری کھول کپڑے نکالنے لگیں۔

''آج رج کر تیار ہو جاؤ، میں مالشن کو بھیجتی ہوں، وہ تم کو چنبیلی کے تیل سے مالش کرے گی تیر بدن خوشبو میں دس دن نہ بسا رہا تو مجھے کہنا، مرد کو بنی سنوری عورت زیادہ اچھی لگتی ہے۔''

''تُو ہمیں بس وارث دے دے تاکہ شریکوں کا منہ بند ہو جائے۔ میرے ویر کے دشمن بہت ہیں، کیا کریں جتنی زیادہ زمین اُس سے زیادہ دشمن ہوتے ہیں، تیری کوکھ سے لڑکا مل گیا تو بھائی ا تم کو رانی بنا کر رکھے گا تا عمر تیرا ہی رہے گا۔ ورنہ عورت کے معاملے میں وہ بڑا بے نیاز ہے کیوں ک عورت پر وہ نگاہ کرے راتوں رات اُس کے ڈیرے میں آ جاتی ہے اِس لیے وہ کوئی ترسا ہوا م ہے اُس کو قابو کرنا ہے تو تیری چھوٹی عمر کام نہیں آئے گی بلکہ تیری شوخ ادائیں کام آئیں گی۔'' نے حیرت سے اُس عورت کو دیکھا، وہ کس قدرے بے حیائی اور ڈھٹائی سے اپنے بھائی کے کرتو رہی تھی، جیسے اُس کا بھائی کوئی کارنامہ انجام دیتا رہا ہو۔

''آج رات وہ ڈیرے سے واپس آ رہا ہے، کہہ رہا تھا نئی دلہن کو تیار کرو آج وہ سہاگ رات گا۔ ہا، ہا۔ ہی۔'' ساتھ ہی اُس نے بے ہودگی سے ہنسنا شروع کر دیا، جیسے اُسے کوئی لطیفہ سننے کو ہو۔

ہائے!''

جائی اُٹھ جا، اُٹھ کر تیاری شیاری شروع کر کیا مُردوں کی طرح پڑی ہے۔ عورتیں تو شوہر کے ن کر ہر بار دلہن کی طرح سجتی اور انتظار کرتی ہیں۔'' مسکان کو اِس عورت کی باتوں سے سخت رہی تھی۔

کے زبردستی کرنے پر وہ اُٹھ کر کھڑی ہوئی تو اُسے اندازہ ہوا کہ اُس کی ٹانگیں تو بے جان ہوئی یں۔

ن رات ہی اللہ تیرے پر خیر کر دے تو اِس حویلی کا وارث آ جائے گا۔''

سے پہلے وہ بتول تو کچھ نہ دے سکی، ہر سال مُردہ بچہ پیدا کر کے نحوست پھیلاتی رہی اور شہر بانو ایک کُڑی پیدا کر کے ہی بنجر ہو گئی اور وہ تیسری والی بھی خالی پڑی ہے۔ بھلا ہم نے اِن سب کا ہے جو وارث ہی پیدا نہ کر کے دیں۔'' مسکان پر یہ انکشافات حیران کن تھے۔

ہر علی کی تین بیویاں موجود تھیں تو مجھے کیوں بابا سائیں نے اِس شخص کے ساتھ بیاہا؟ مسکان کے ید سرفراز علی کے لیے نفرت بڑھ گئی تھی۔

ان کی بیویاں موجود ہیں تو پھر مجھ سے شادی کیوں کی؟'' مسکان نے اپنی نند سے بھی سوال کر

تا تمہیں بھرجائی، لڑکے کے واسطے۔''

پلی شادی کو انتیس تیس سال ہو گئے ہیں، پر اولاد پیدا ہوتی مرجاتی، دوسری سے شیر بانو کے بعد تیسری کے ساتھ بھی کچھ یہی معاملہ ہے۔ بھائی اظہر علی بوڑھا ہو گیا تو شریکوں کو تو موقع مل زمین ہتھیانے کا، خود میرا میاں اکثر اِس زمین کے متعلق بات کرتا ہے لیکن میں نے بھی سوچ لیا ے کا ویاہ (شادی) اور کر دوں گی تاکہ بچہ ہو جائے لیکن یوں لوگوں کی تھوتھنیاں نہیں کھلنے دوں مانون نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔

میں مالشن کو بھیجتی ہوں۔'' وہ کہہ کر باہر نکل گئی جب کہ مسکان کھڑے وجود کے ساتھ زمین پر گی

فرش پر سجدہ ریز ہو گئی تھی۔

پلیز! اب سے پہلے میں نے کبھی بھی تم سے جامع دُعا نہیں مانگی لیکن پلیز میری دُعا قبول ے وجود کو صرف اور صرف ولی چھوئے، میرے بدن سے صرف ولی کی اولاد پیدا ہو۔ مجھے اس جانور نما شوہر سے۔''

نہیں جانتی یہ کیسے ہوگا لیکن تیرے لیے تو کچھ بھی ناممکن نہیں ہے جب تو چشموں کا رُخ بدل ری دُعا قبول کرنا تیرے لیے کون سا بڑا کام ہے۔''

اللہ! تجھے تیری بڑائی کا واسطہ! میری دعا قبول فرما!'' مسکان سسک رہی تھی، بلک رہی تھی، آج مرنے کی کوشش کرتی رہی تھی کبھی جامع دُعا نہیں کی تھی۔ اللہ پر یقین بھروسہ نہ کیا تھا لیکن ے یقین سے، بھروسے سے دعا مانگ رہی تھی اور یقین اور بھروسے سے کی جانے والی دُعا تو

ہمیشہ قبول ہوتی ہے، معراج پاتی ہے مسکان اِردگرد سے بے گانہ مسلسل دُعا میں مشغول تھی۔

''اللہ۔ پلیز اللہ بچالو!''

کیسے میں نہیں جانتی!

''اللہ مجھے میری محبت دے دے، اُسے میرا شریکِ زندگی بنادے۔'' وہ اَنہونی مانگ رہی تھی۔

اُسے لگا آج وہ دوبارہ ہوش میں آ گئی ہے!

اِس سے پہلے شیطان نے اُسے اتنا بھٹکایا کہ اُس نے اپنے لیے خیر کا سوچا بھی نہیں اور دُعا تک نہ تھی لیکن ولی کی ایک تحریر نے وہ شیشے کا حصار توڑ ڈالا تھا۔ اب وہ پھر سے سانس لینے لگی تھی۔

❖❖○❖❖

ترنم اور ماہی ایئر پورٹ پہنچ کر بورڈنگ کارڈ لے کر ویٹنگ لاؤنج میں بیٹھی تھیں، جب دو وومن پولیس کی اہلکار اُن کی طرف تیزی سے بھاگتی آئیں۔

''آپ دونوں فلائیٹ نہیں لے سکتیں!'' انہوں نے کہا۔

''لیکن کیوں؟'' ماہی نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا۔

''وہ اِس لیے کہ آپ کے نام بلیک لسٹ میں ہیں!'' وہ انکشاف کررہی تھیں۔

''واٹ؟'' ماہی چیخی۔

''لیکن ہم نے کیا کیا ہے؟'' ترنم نے پوچھا۔

''آپ ہمارے ساتھ چلیں آپ کو پتا چل جائے گا۔'' دونوں نے اُن دونوں کا ایک ایک بازو پکڑا انہیں باہر لے آئیں۔

''لیں جی! یہ ہی ہیں نا آپ کی لڑکیاں؟'' اُن میں سے ایک پولیس آفیسر بولی۔

ترنم اور ماہی کا سانس اوپر کا اُوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

سامنے میڈم راگنی کھڑی تھی بیک لیس بلاؤز میں، کالے رنگ کی ساڑھی میں اُس کا جسم چمک رہا تھا

''ارے تم لوگ کہاں جارہی ہو؟''

''چندا کیا ہوا اگر چاندنی نہیں رہی تو، میں تو ہوں نا، میں کیوں اُس کی لڑکیوں کو لاوارثوں کی طرح رستوں میں رُلنے دوں گی۔''

''چلو میرے ساتھ!'' اُس نے پیار سے کہتے کہتے حکم دیا۔

''نہیں میڈم! اب ہم خود مختار رہیں گی۔'' ماہی میں جانے کہاں سے ہمت آ گئی، جو اُس نے

ڈالا۔

''مت بھولو لڑکی کہ یہ جو ہماری دُنیا ہے یہ وَن وے ہے، جہاں لڑکی آ تو سکتی ہے لیکن جا نہیں سکتی صرف ایک راستے سے واپس جاسکتی ہے اور وہ ہے موت، اب آرام سے چلو۔''

''مائیک! لے چلو ان کو۔'' اُس نے اپنے ہیوی ویٹ باکسر نما نوکر کو حکم دیا، جس نے اگلے ہی دونوں کے بازوؤں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

''سی۔'' ماہی اور ترنم بے اختیار ہوئیں۔

جب وہ دونوں میڈم راگنی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ رہی تھیں تو ترنم کو ایک بار پھر لگا کہ ایمان فاطمہ اب بار پھر لُٹنے بازار جارہی ہے!

ترنم کو سانس لینا دُشوار ہو رہا تھا۔ وہ بے بسی سے کسمسا کر رہ گئی۔

جس دُنیا کی اُسے ملکیت بنادیا گیا تھا، وہ دنیا ایک ایسی دلدل تھی، جہاں مزید دھنسا تو جاسکتا ہے بہ سا تو جاسکتا ہے! لیکن نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن نظر آرہا تھا۔

''سر! اطلاع بالکل پکی ہے!'' طارق کے اسسٹنٹ نے ایک فائل اُس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا
''اگر لڑکے نے کچھ گڑ بڑ نہیں کی تھی تو وہ علاقہ غیر کیوں گیا؟ ملزم عموماً کچھ غلط کر کے ہی علاقہ
دوڑتے ہیں۔'' طارق نے با آواز بلند خیال آرائی کی۔
''سر! وہاں تک ہمارے قانون اور پولیس کی پہنچ تو ہوتی نہیں، پھر کس طرح لڑکے کو واپس لانا ہے
طارق کا ماتحت خبر لایا تھا کہ کاشف علاقہ غیر دوڑ گیا ہے۔
ایک مخبر پٹھان کے ذریعے خبر کنفرم بھی کر لی گئی تھی۔
''ایک تو بہت سادہ اور عام طریقہ ہے کہ اخبار میں اُس کے والدین اور گھر والوں کی جانب سے ا
محبت بھرا پیغام چھپواؤ کہ وہ واپس آ جائے، ساتھ اُس کی تصویر ضرور دینی ہے۔ علاقہ غیر میں اُردو اخبا
اپنے مخبر قائم خان کے ذریعے کاشف تک پہنچاؤ۔ یہ سب کچھ یوں ہو کہ لڑکے کو یہ سب اچانک نظر آ
تا کہ اگر اُس کی کوئی ناراضی ہے تو وہ دور ہو جائے یا پھر کوئی اور مسئلہ ہے تو وہ بھی دُور ہو تا کہ وہ خود
واپس آئے۔'' طارق نے اپنے ماتحت کو ہدایات دیں۔
''وہ جی سر کہتا باہر نکل گیا۔''
طارق نے ہاتھ بڑھا کر فون اُٹھایا اور ولی کا نمبر گھمایا اُدھر سے جو آواز سنائی دی، طارق کی روح
میں آسودگی اُتر گئی۔
''کیسی ہیں؟'' طارق کا رُواں رُواں کان بنا ہوا تھا۔
''کاش تم کہو کہ صرف آپ کی ہوں!'' طارق نے خود سے خیال آرائی کی۔
''ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں، اب تو آپ سائرہ آپی کو بھی نہیں لاتے۔'' نگی نے اُس کی غیر حا
کا شکوہ کیا۔
''اس کا مطلب ہے کہ تم میری غیر حاضری کو محسوس کرتی ہو؟'' طارق بے اختیار سوال کر بیٹھا
''بالکل!''
''آپ اتنے دِنوں سے نظر نہیں آئے، نہ ہی سائرہ آپی کو لائے، کہیں گئے ہوئے تھے کیا...؟'' نگی
باتوں میں سادگی تھی۔ کاش اِن میں کوئی تڑپ ہوتی تو یہی جملہ طارق کے لیے کتنا انمول ہو جاتا۔
''میں یہیں ہوں! اگر تم اپنے آس پاس محسوس کرو تو!'' طارق کا اظہار بے اختیار تھا، درست وقت
انتظار کرتے کرتے وہ بہت کچھ گنوا بیٹھا تھا۔ نگی کے لیے اُس کی شدت مزید بڑھ چکی تھی۔

طارق بھائی! آپ ٹھیک تو ہیں، آپ کا لہجہ کتنا بدلا بدلا ہے۔'' نگی نے حیرت سے طارق کی خیریت
...اُس سے کبھی اتنی سنجیدگی سے مخاطب نہ ہوتا تھا۔
کچھ ٹھیک نہیں ہے، میں، میرا دِل! کچھ بھی تو اپنے مقام پر نہیں ہے، میں بہت اپ سیٹ
تمہاری مدد کی ضرورت ہے تم مجھے اور میرے دِل کو مقام پر لانے میں مدد کرو۔'' طارق دھیرے
بولتا گیا۔ اُس کی آواز بے حد گمبھیر ہو چکی تھی۔
نے حیرت سے فون کو دیکھا۔
طارق بھائی کو کیا ہوا؟ اور یہ اتنے اپ سیٹ کیوں ہیں؟'' وہ بے اختیار سوچ گئی۔
ہیلو!''
تم فون پر موجود ہو؟'' طارق آج بہت بے صبرا ہو رہا تھا۔
ں!''
طارق بھائی پلیز! آپ اپ سیٹ نہ ہوں، ہم سب آپ کے ساتھ ہیں، میں بھائی کو بھی آپ کی
وں گی، آپ بتائیں کہ کیا مسئلہ ہو گیا؟ انکل شہباز کی طبیعت ٹھیک ہے؟'' نگی کا صاف دِل و
نی باتیں سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ طارق کی باتوں سے اور ہی نتیجہ اخذ کر بیٹھی تھی۔
چپ! چپ!'' طارق ایک دم سے چڑ کر بولا۔
اب تم بڑی ہو چکی ہو، اور بڑوں کی طرح سوچنا اور دیکھنا شروع کرو۔''
اتنی بے خبری! یہ بے خبری بہت قیمتی پل اور انسان کھو دیتی ہے، کبھی اپنے بچپنے سے نکل کر
طارق بات کرتے کرتے ایک دم بے حد غصے میں آ گیا ساتھ ہی اُس نے کھٹاک سے فون رکھ
نے حیرت سے فون کو دیکھا۔
طارق کی ساری باتیں تو اُسے سمجھ نہ آئی تھیں، لیکن طارق کا بدلا بدلا لہجہ اور غصّہ اُس کو سہا گیا تھا۔
میں نے کیا کہا؟ مجھ پر کیوں اتنے خفا تھے!''
کبھی کسی نے اونچی آواز میں مخاطب نہ کیا تھا۔ طارق کی گفتگو پر وہ روہانسی سی ہو گئی، دِل کچھ
اس سے دھڑکنے لگا تھا، کیوں؟ فی الحال وہ خود بھی نہ جان پا رہی تھی۔

❖❖ ☾ ❖❖

اتنی سی تھی تب سے من مانی کرنے لگی تھی، من کی بہت سنتی تھی میں اُس سے ہمیشہ یہ ہی کہتی تھی
لوں کو من مارنا سیکھنا چاہیے! لیکن اُس نے...اُس نے سُنا ہی نہیں!'' حسن آرا کی آواز بے حد
تھی۔
کھو دینے کا احساس ایسا تھا جیسے بہت قیمتی چیز ہاتھوں سے پھسل جاتی ہے۔
نے دیکھا بیٹا! من نہیں مارا اُس نے، تو من نے اُسے مار ڈالا!'' وہ سسکتے سسکتے ایک دم پھوٹ
رو دیں۔
میری پہلی بیٹی تھی، میں نے اپنی ممتا کے احساس کو اُس کے وجود سے تسکین دی تھی۔'' حسن آرا

ر کا لفظ ماتم کرر ہا تھا۔

''پلیز! آپ حوصلہ کریں... میں تو معمول کی کارروائی کے لیے حاضر ہوا تھا، میرا مقصد آپ کا دل دُکھانا ہرگز نہ تھا۔'' طارق کو اُس روتی بلکتی خاتون کے رونے سے بے حد تکلیف ہو رہی تھی۔

''وہ خود تو مرگئی... اپنے ساتھ ہمیں بھی مارگئی۔'' حسن آرا بیگم ایک بار پھر زار وقطار رونے لگیں۔

''سسٹر پلیز! اِن کو پانی پلائیں!'' طارق نے پاس کھڑی علیزے کو مخاطب کیا، جو چُپ چاپ آنسو بہارہی تھی رونے سے اُس کی آنکھیں اور ناک بے حد سرخ ہورہی تھی، اُس نے آگے بڑھ کر ماں کو پانی پلایا۔

''وہ نامراد! اُس کا کچھ پتا چلا...؟'' حسن آرا بیگم نے پانی پی کر پوچھا۔

''کون...؟'' طارق نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ، یہ کاشف بھائی کا پوچھ رہی ہیں۔ ولی بتارہے تھے کہ انہوں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ آپ اُن کا پتا کروائیں۔'' علیزے نے فوراً آگے بڑھ کر بات کو سنبھالا، اُسے ڈر تھا کہ ماں اپنے غم میں کہیں سچائی نہ اُگل دیں۔

دِل تو علیزے کا بھی کاشف سے بے حد اُکھڑا ہوا تھا لیکن جب مرنے والی اُسے صاف بچا کر معاف کرگئی تھی تو اُس کو کاشف سے بدلہ لینے کا حق نہ پہنچتا تھا۔ پھر وہ کس سے بدلہ لیتے؟

اپنے ہی بھائی بیٹے کو سزا دینا اُن میں حوصلہ نہ تھا۔

''اوہ اچھا!''

''جی ہاں! کاشف کا پتا تو چل گیا ہے لیکن جس جگہ وہ موجود ہے اُس سے پہلا سوال یہ ہی اُٹھتا ہے کہ اُس نے ایسا کیا کیا، جو وہ علاقہ غیر میں جا چھپا...'' طارق کے سوال پر حسن آرا بیگم نے بے ناراضی سے منہ موڑ لیا، وہ منزہ کا قتل کاشف کو معاف نہ کرسکی تھیں، لیکن اپنے منہ سے اپنے ہی بیٹے کے خلاف گواہی بھی نہ دے سکتی تھیں۔

''وہ ابو کے کچھ پیسے، تقریباً لاکھ روپے چُرا کر بھاگے ہیں، بھائی کوئی کاروبار کرنا چاہتے تھے ابا اُن کو رقم نہیں دے رہے تھے، اِس لیے وہ رقم لے کر بھاگ گئے۔''

کبھی کبھی بڑے جُرم کو چھپانے کے لیے چھوٹے جرم کا اظہار ہی بڑے جُرم سے بچا سکتا ہے، علیزے نے بھی کچھ ایسا کیا تھا۔

''اوہ! تو یہ بات تھی۔'' طارق کے منہ سے بے اختیار نکلا، جیسے وہ ساری بات سمجھ گیا ہو۔

علیزے نے بھی ایک طویل سانس بھری۔ شکر تھا طارق ان کی باتوں پر یقین کررہا تھا، ورنہ طارق جیسے ذہین شخص کا یوں آسانی سے بات مان جانا آسان نہ تھا۔

''میں انشاء اللہ جلد از جلد کوشش کروں گا کہ وہ گھر واپس آجائے، اپنی ایک غلطی کو چھپانے کے لیے وہ بے حد غلط جگہ جاچکا ہے۔ وہ تو مجرموں کی پناہ گاہ ہے وہاں رہنے والا ہر شخص جرم کی اُس دنیا کے جراثیموں سے خود کو کم ہی بچا پاتا ہے، آپ بھی اُس سے رقم کا ذکر کرکے اُسے پریشان نہ کیجیے گا۔ اُس کا واپس آجانا ہی اُس کی زندگی کے لیے بہتر ہوگا۔'' طارق نے علیزے کے بنائے ہوئے بہانے کے

اور ان سب کو سمجھایا۔

''جی... انشاء اللہ ہم اُس کو کبھی گزری باتوں سے ڈسٹرب نہیں کریں گے۔ اُس کا واپس آجانا بے حد ضروری ہے، جب سے وہ گیا ہے میرے ابّو بالکل گم صم سے ہوکر رہ گئے ہیں وہ اُن کا بے حد لاڈلا اور پیارا تھا، اُس کے یوں غائب ہوجانے پر وہ بے حد ڈسٹرب ہوچکے ہیں۔'' علیزے نے سچائی بیان کی۔

''ٹھیک ہے، میں اب چلتا ہوں، اجازت دیجیے...'' طارق نے وہاں سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''جی بہت زیادہ شکریہ! آپ نے سول پولیس کی روز کی تفتیش سے ہماری جان چھڑائی۔'' علیزے نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

''ارے! میرا شکریہ ادا کرنے کے بجائے اپنے صاحب بہادر کا شکریہ ادا کیجیے گا، وہ محترم اپنی محترمہ کے لیے بے حد فکر مند تھے۔ واقعی بھابی صاحبہ! آپ نے سرپھرے شیر کو کیسے قابو کرلیا؟ وہ تو ایسا انسان تھا جس کے متعلق لڑکیاں آئرن مین کا لفظ استعمال کرتی تھیں، جانے وہ آئرن مین آپ کے آگے کیسے پگھل گیا، آخر آپ نے اُس پر کیا جادو کیا؟'' طارق نے دلچسپی سے علیزے کا حیا سے سرخ چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

جواباً علیزے، شرم سے بے حد سُرخ پڑگئی۔

''واقعی یار ولی! تمہاری پسند ہے تو بالکل یونیک! آج کل کہاں ایسی شرم میں ڈوبی لڑکیاں ملتی ہیں۔'' طارق دِل ہی دِل میں سوچتا باہر نکل آیا۔

❖❖ ( ) ❖❖

سید سرفراز بہت دیر سے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ بے چینی اُن کے چہرے اور چال دونوں ہی سے واضح تھی غصّے میں اُن کا تنفس ہمیشہ بے ترتیب ہوجاتا تھا اس وقت بھی غصّے سے اُنکا تنفس بے ترتیب تھا لیکن ان کا دماغ ہر بات کو بہت ترتیب سے سوچ رہا تھا۔

سید اظہر علی کی باتیں اُن کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھیں، وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ اُن کی پلاننگ اِس بُری طرح بھی فیل ہوسکتی ہے۔

بلال اور شہر بانو کی شادی اور مسکان اور اظہر علی کی شادی اسی پلان کا مکمل حصہ تھا۔ لیکن آج اُن کو اپنا پلان فیل ہوتا محسوس ہوا۔

مسکان کی شادی اظہر علی سے کرنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ اُن کی زمین کو بٹوارے کا سامنا نہ کرنا پڑے... اِس لیے انہوں نے شادی سے پہلے ہی کہلوادیا تھا کہ اُن کو شہر بانو کے جہیز میں زمین نہیں چاہیے۔ ان کا خیال تھا کہ وٹے سٹے کے اِس رشتے میں اگر سید سرفراز نے زمین کا مطالبہ نہیں کیا ہے تو سید اظہر علی بھی زمین کا مطالبہ نہیں کرے گا... لیکن یہ اُن کی خام خیالی ہی ثابت ہوئی۔

سید اظہر علی مسلسل اُن سے زمین کا مطالبہ کررہا تھا شادی سے لے کر اب تک سید اظہر علی کا یہ کوئی پانچواں چکر تھا زمین کے چکر میں۔

سید سرفراز علی کے ذہن میں بھی نہ تھا کہ اظہر علی اِس قدر لالچی اور حریص نکلے گا۔ اُن کا تو خیال تھا کہ جوان اور خوب صورت خاندانی لڑکی سے شادی ہی اُس کو دبا لے گی لیکن اظہر علی بے حد شاطر انسان

تھا۔ عورتیں، لڑکیاں اُس کے لیے کوئی خاص معنی نہ رکھتی تھیں، وہ جس عورت کو چاہتا تھا قیمت دے کر فوا حاصل کرتا آیا تھا۔ مسکان سے شادی صرف اور صرف اُس نے زمین کے لالچ میں کی تھی۔ سید سرفراز کا زمین بہت زرخیز مقام پر تھی اور یہ زمینیں صحیح معائنوں میں سونا اگلتی تھیں۔

''مجھے اپنی بیوی کا حصّہ چاہیے...!'' آج وہ پھر مطالبہ لے کر پہنچ گیا تھا۔

''میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اگر مجھے زمین ہی بانٹنی ہوتی تو میں وٹے سٹے کا رشتہ ہی کرتا۔'' سید سرفراز نے واضح لفظوں میں جتایا۔

''لیکن اِس سارے معاملے میں، میں نے یہ بالکل نہ کہا تھا کہ میں اِس رشتے میں زمین سے دستبردا ہو چکا ہوں۔'' سید اظہر علی نے فوراً کہا۔

''تم..تم بھول رہے ہو کہ تمہاری اکلوتی بیٹی اب میری بہو بن کر اِس حویلی میں آ چکی ہے۔'' س سرفراز نے اُسے ڈرانے کی کوشش کی۔

''کیا تم نہیں بھول رہے کہ تمہاری بیٹی اب میری بیوی بن کر میری حویلی میں آ چکی ہے۔'' سید اظہر عل تو بہت ہی شاطر انسان تھا، وہ کیسے چوکتا۔ سید سرفراز کو اب باقاعدہ احساس ہوا کہ اُس کا واسطہ ایک حریص انسان سے پڑا ہے۔ اُن کے دماغ نے فوراً کہا کہ اِس غلط کو فوراً اُس درست ہونا چاہیے۔ ورنہ اُن کے لیے بے حد خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔

''اور تم یہ بھی نہ بھولنا کہ اگر میں چاہوں تو تمہاری بیٹی کو فوراً طلاق دے کر واپس بھیج سکتا ہوں، م نے تو اِسی لیے اب تک اُسے بیوی کا حق بھی نہیں دیا کہ معاملات طے ہو جائیں...'' اظہر علی کی بات سید سرفراز کا غیرت سے چہرہ سرخ پڑ گیا۔

''میرا کیا جاتا ہے! اگر میں مسکان کو طلاق دوں گا تو ساری برادری میں تھو تھو ہوگی کہ شوہر نے ہاتھ لگائے بغیر ہی طلاق کیوں دے دی، یقیناً لڑکی آوارہ بد چلن ہوگی۔'' سید اظہر علی اپنی بات کہہ کر خود ہنسا۔

''اور اگر ہم تمہاری بیٹی کو طلاق دے دیں تو...؟'' سید سرفراز نے غصّے سے کہا۔

''تم بھول رہے ہو کہ تمہارے نیم پاگل بیٹے کی ذہنی حالت کی وجہ سے تم طلاق کا حق لڑکی کو تفویض کر چکے ہو، اب تمہارا بیٹا میری بیٹی کو خود سے طلاق نہیں دے سکتا۔''

سید سرفراز کو فوراً احساس ہو گیا تھا کہ اظہر علی نے اِس شادی میں سید سرفراز سے زیادہ گیم کھیلا تھا ا اُس نے اپنے مہرے بے حد پکے کیے تھے۔

''اور تم نکاح نامے میں واضح کر چکے ہو کہ اِس نکاح کے ساتھ تمہیں زمین وغیرہ سے غرض بھی نہیں ہے۔'' اظہر علی کھل کر مسکرایا، سید سرفراز کو اُس کی یہ مسکراہٹ بے حد بُری لگی۔

''اگر تم کو لڑکی عزت سے بسانی ہے تو آج اُس کے زمین کے کاغذات بنوا دو، ورنہ اپنی لڑکی گھر بٹھاؤ۔'' اظہر علی نے خاصی بدتمیزی سے کہا۔

''اگر تم نے میری بیٹی کے ساتھ زیادتی کی تو ہم تمہاری لڑکی کو تمہارے گھر بھیج دیں گے۔'' سید سرف نے اُس کے پیچھے سے آواز دیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے! لیکن اِس کے بعد کے نتائج کے تم خود ذمے دار ہو گے۔'' اظہر علی کے لہجے میں بے حد ان تھا۔

اظہر علی کے چہرے پر کچھ ایسا ضرور تھا، جس نے سید سرفراز کو چونکا دیا تھا۔

''تم آخر کیا کرنے والے ہو...؟'' سید سرفراز پوچھے بِنا نہ رہ سکے۔

''یار دیکھو! میں ہوں سیدھا سادا انسان، میں پیچھے سے کچھ نہیں کرتا۔ جو کرتا ہوں سامنے سے کرتا وں۔ مسکان تمہاری بیٹی، بیوی میری! آخر میرا ہی سنے گی۔ میں اُس کے دستخط لوں گا اور قانونی طور پر پنی بیوی کا حصہ لوں گا اور وہ کچھ بھی جو اُس کی والدہ اُس کے نام کر گئی تھیں۔ میری بیوی کا حصّہ اور حق ان کے پاس رہنا چاہیے، یہ حق تلفی میں ہرگز نہ ہونے دوں گا... میں اپنی بیوی کے سارے حقوق اُسے دلاؤں گا۔'' سید اظہر ہنسا اور ہنستا ہی چلا گیا...

''تم زمین کی خاطر اتنی گری ہوئی حرکتیں کرو گے؟'' سید سرفراز کا خون ہی کھول گیا۔

''تم سے کم! تم کون سا بلندی پر بیٹھے ہو، تم نے زمین اور حکم رانی کی خاطر جو کچھ آج تک کیا ہے وہ لوگ آج تک بھولے نہیں ہیں، میں تم سے پنگا بالکل نہیں لوں گا تم سیدھے طریقے سے ہمارا حق دے دو...'' اظہر علی نے صلح جو انداز میں کہا۔

''ہمارا حق!'' سید سرفراز علی نے ایک قہر بھری نگاہ اُس پر ڈالی۔

''کون سا تمہارا حق؟''

''میری بیوی کا حق، میرا حق ہی تو ہوا۔'' اظہر علی کی باچھیں کھل رہی تھیں وہ کچھ زیادہ ہی خوش اخلاق ہو رہا تھا بات بات پر مسکراہٹ اُس کے چہرے کا حصّہ بن کر سید سرفراز کا خون کھولا رہی تھی۔

''اچھا سُسر جی! چلتا ہوں!'' اظہر علی بے حد خود اعتمادی سے قدم اُٹھاتا باہر نکلا تو سید سرفراز علی بے بسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے، تب سے اب تک وہ پاؤں جلی بلّی کی طرح چکر کاٹ رہے تھے۔

اظہر علی! جسے وہ بیٹی دے کر اور اُس کی بیٹی لے کر احسان کرنے نکلے تھے، کیسا زہریلا سانپ نکلا جس نے شادی کے فوراً بعد ہی اپنا سر اُٹھا لیا تھا۔

''اِس سانپ کا سر کچلنا بے حد ضروری ہے ورنہ یہ سانپ ہمیں ہی ڈس لے گا...'' وہ ایک دم چلتے چلتے رک کے اور با آواز بلند بولے۔ یوں جیسے وہ کسی فیصلے پر پہنچ گئے ہوں۔

''اکبر!'' انہوں نے اپنے ملازم خاص کو آواز دی۔

''جی سائیں!'' وہ دوڑتا ہوا اندر آیا، اپنی گھر والی سے کہو کہ میرے کالے کپڑے نکال کر تیار کرے، مجھے ماتم والے گھر جانا ہے۔'' اکبر کی بیوی حویلی کے اندر خاص ملازمہ تھی اور بہت سارے کام سنبھالتی تھی۔

''جی سائیں!'' اکبر نے نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔

''کس کے گھر ماتم ہے؟'' اکبر نے پوچھا۔

''میرا داماد کچھ دیر بعد اِس دنیا میں نہیں رہے گا! وہاں اُس کی حویلی میں ماتم تو ہو گا نا۔'' سید سرفراز علی نے سفاکی سے کہا۔

''جی سائیں!'' اکبر علی نے حیرت سے سید سرفراز علی کو دیکھا۔
''پر سائیں وہ تو چھوٹی بی بی کے سائیں ہیں۔'' اکبر کہے بِنا نہ رہ سکا۔
''ہیں نہیں، تھے۔'' سید سرفراز علی نے غصّے سے کہا۔
''جاؤ دیگوں کا انتظام کرو... ہمارے ہاں داماد کی فوتگی پر سسرال سے کھانا جاتا ہے۔''
''جی... جی سائیں!'' اکبر نے فوراً تابع داری سے حامی بھری۔

''سندھو گولی سے کہو کہ ایک لال جیپ ہماری حویلی سے پندرہ منٹ پہلے نکلی ہے وہ جیپ اپنے گ ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچ سکتی ہے لیکن اب نہیں پہنچنی چاہیے، اُس کی ہر سواری سیدھی شہر کے سول ہسپتال کے مردے خانے میں پہنچنی چاہیے۔

جاؤ فوراً! اور ہاں کام ہو جائے تو فوراً اطلاع دینا تا کہ ہم تیار ہو کر ماتم کے گھر پہنچ سکیں۔'' سید سرفرا کے چہرے پر ایسی سفاکی تھی کہ اکبر کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ محسوس ہوئی۔

''جی سائیں!'' وہ تابع داری سے سر ہلاتا باہر نکل آیا۔ سید سرفراز کے تنے ہوئے اعصاب اُن کے ذہنی خلفشار کی نشان دہی کر رہے تھے۔

''ہونہہ! مجھ سے پنگا لے گا! ارے میں نے تو اپنے سگے باپ اور پھر اپنے بھائی کو اپنی راہ میں آنے دیا یہ پھر کیا چیز ہے۔'' سید سرفراز نے تنفر سے سوچا اور باہر نکل گئے، ابھی اُن کو ڈھیروں کام کرنے تھے۔

سو طرح کی رسمیں، بیٹی کے گھر پوری کرنی ہوتی ہیں وہ اُن کے انتظامات کرنے کا کہنے نکلے تھے۔

❖❖()❖❖

''تمہیں کیا ہوا ہے بھر جھائی؟ یہ بوتھا تو ٹھیک رکھو... آخر کو تیرا میاں آنے والا ہے یہ سارا ہار سنگ اُس کے ہی لیے تو ہے، خوش ہو کہ آج تیری سہاگ رات ہے۔'' وہ تھوڑا غصّے سے بولی، اُسے مسکان کا بنا ہوا منہ اچھا نہ لگ رہا تھا۔

مسکان نے کچھ گھور کر اپنی اِس نند کو دیکھا، جو کسی مصیبت کی طرح نازل ہوتی تھی اور چیونگم کی طرح چپک جاتی تھی۔

''ایک بات اپنے پلّے سے باندھ لے کہ وارث چاہیے ہمیں حویلی کا... اگر تو نے بھی وارث نہ دیا تجھے بھی دوسری بانجھ بیویوں کے ساتھ چھوٹی حویلی میں رہنا ہوگا۔'' مسکان کی چھوٹی نند اُسے مختلف گھر روایتوں سے آگاہ کر رہی تھی۔

مسکان نے ایک بیزار سی نگاہ اُس پہ ڈالی، اُسے اِن روایتوں اور حکمت عملیوں سے کوئی نہ غرض تھی وہ تو اِس قید خانے سے نکل جانا چاہتی تھی۔

''تی... تجھے کہا تھا بی بی کو یہ لال اور ہرا سیٹ چوڑیوں کا پہنانا ہے۔'' مسکان کی نند کی نگاہ ایک مسکان کی سونی کلائیوں پر پڑی۔

''کم بخت! پہلے بی بی کو چوڑیاں پہنا... سونی کلائیاں تو بہت بڑی بدشگونی ہوتی ہے۔''
''یا اللہ! اگر میری قسمت میں یہ ہی جاہلانہ ماحول تھا تو تو نے باہر کی دنیا دیکھنے ہی کیوں دی۔

لی اگر دودھ پر پالنی ہو تو کبھی بھی اُسے گوشت نہیں چکھاتے، تا کہ وہ اُس کی کمی محسوس ہی نہ کرے۔ ں کے باپ نے کیوں اُس کے ساتھ، ایک جیتی جاگتی لڑکی کے ساتھ، اُس کے جذبات کے ساتھ دل ھول کر کھیلا تھا۔

اُس کے باپ نے اُسے تعلیم دلوائی، ہائر اسٹڈی کے لیے باہر نکالا پھر اُسے صرف لڑکیوں کے ہی نہیں وں کے ساتھ پڑھایا، بے انتہا اعتماد دے کر اپنی ذات کے خاص ہونے کی پہچان دے کر اُسے یہاں یواری میں لا کر بند کر دیا۔ آسمان دکھا کر اُس کے پر کاٹ لیے!

''سی!'' مسکان نے ایک دم سسکی بھری، جیسے وہ اُس تکلیف کو ابھی تک محسوس کرتی ہو۔

کان چپ چاپ ملازمہ کو چوڑیاں پہناتے دیکھ رہی تھی، ایسے جیسے وہ یہ چوڑیاں اُس کو نہیں کسی اور پہنا رہی ہو۔ مسکان کی مگن خیالی تب بھی نہ ٹوٹی جب بہت ساری سرخ چوڑیاں ایک دم ٹوٹ کر اُس ہاتھوں پر زخم بنا کر ہلکی سی خون کی لکیر بنا گئیں۔

ہائے، ہائے مرجانی!'' مسکان کی نند کی نگاہ اچانک مسکان کے ہاتھ پر پڑی تو اُس نے ملازمہ کو ا۔

مرجانی! بی بی کا سارا ہاتھ لہولہان کر ڈالا، تیری آنکھیں ہیں کہ بٹن، جو دیکھتی نہیں صرف سجاوٹ لیے ٹکا رکھی ہیں۔'' اُس کا غصّہ اب بھی نہ اُترا تھا۔

''چل اب بس کر۔ آدھی درجن چوڑی توڑ ڈالی ہے کم بخت یہ بھی بدشگونی ہوتی ہے، دھیان سے نہیں التی تھی۔'' مسکان کی نند نے ملازمہ پر برستے ہوئے کہا جو ایک دم سہم گئی تھی۔

''معاف کر دو بی بی!'' ملازمہ نے معافی مانگی۔
''دفع مر! پتا بھی ہے چوڑی ٹوٹنا بدشگونی ہوتی ہے۔'' وہ بڑبڑاتی باہر نکل گئی۔
''توبہ کس قسم کے جاہل لوگ ہیں۔'' مسکان نے اُس کے واویلے پر سوچا۔
''آخر ایک چوڑی ٹوٹنے سے کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا...'' مسکان ابھی اتنا ہی سوچ رہی تھی کہ باہر ایک دم رونے دھونے کی آوازیں بلند ہوئیں۔
''ربا خیر کرنا!'' ملازمہ کہتی ہوئی باہر بھاگی۔

لیکن چند پل بعد ہی ملازمہ اُس کی نند کے ساتھ اونچی آواز میں روتی اندر داخل ہوئی اُس کے ساتھ ویلی کی چند خواتین بھی تھیں۔ وہ روتے ہوئے عجیب وغریب آواز نکال رہی تھیں، ایک پَل کو مسکان الکل نہ سمجھ پائی کہ آخر ہوا کیا تھا۔ وہ بہ غور سب کے روتے دھوتے چہرے دیکھ کر صورتِ حال سمجھنے کی ش کر رہی تھی۔

''کیا ہوا؟'' آخر مسکان نے پوچھا۔
''ہائے تو برباد ہوگئی! تو لُٹ گئی!'' ساتھ ہی اُس کی نند نے آگے بڑھ کر اُس کے دونوں ہاتھوں کی یاں ایک دوسرے سے ٹکرا کر توڑ ڈالیں۔
کان درد سے ''سی'' کر کے رہ گئی۔
''تیرے سر کا سائیں نہیں رہا! بھائی اظہر علی کو کسی ظالم نے گولی مار ڈالی! ہائے۔ ہائے ربّا!'' کرے

میں ماتم کی آوازیں بلند ہورہی تھیں۔

"نہیں!" مسکان نے سہم کر ایک دم کہا۔

وہ ان عورتوں کو بہ غور دیکھ رہی تھی جو اُس کا ایک ایک سنگار نوچ نوچ کر اُتار رہی تھیں۔ اس کو یوں لگا کہ یہ جاہل عورتیں کہیں اُسے اپنے بھائی کے ساتھ ہی نہ مار ڈالیں۔ اُس کے لیے یہ سب کچھ نیا تھا اُس کا دِل خوف سے ایک دم سکڑا۔

ایک دم اُس کی نندوں نے روتے روتے اُسے دیکھا۔

"یہ ہی منحوس تھی، یہ ہی سبز قدم تھی میرے بھائی کو کھا گئی۔" اگلے ہی پَل اُن میں سے ایک خطرناک تیور لے کر مسکان کی جانب بڑھی۔

مسکان سہم کر دیوار کے ساتھ جا لگی۔

"یا اللہ مدد! یا اللہ رحم!" بے اختیار اُس کا دِل پکارا۔

❖❖○❖❖

یاد اِس کی ہمیں آتی ہے
وہ جو خوشبو تھی میرے آنگن کی
میرے دِل کی دھڑکن
میرے ہر دِن کی سحر
ہمہ وقت جو ہنستی تھی وہ
ہنستے ہوئے جدا ہوئی
پَل میں ہم سے خفا ہوئی
گلشن میرا ویران کر گئی
جا کے سب کو حیران کر گئی وہ
نارسائی کا دُکھ دے کر خالی ہاتھ مگر
پھر بھی... پھر بھی سب لے گئی
ایسی کیا خطا ہوئی کڑی اتنی جس کی سزا ہوئی

کمرے میں سسکیوں کی آواز سے اُداسی بال بکھیرے، منہ نہوڑے بیٹھی تھی۔

حسن آرا بیگم کی تو ہچکی ہی بندھ گئی تھی علیزے اور غزالہ مسلسل اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کر رہی تھیں، جب کہ انوار صاحب زمین کی جانب نگاہیں جھکائے جانے کہاں سفر کر رہے تھے۔

طارق نے ولی کو اشارہ کیا کہ وہ کچھ اِن لوگوں کو تسلی دے تاکہ بات مکمل ہو سکے۔

"خالہ پلیز! خود کو سنبھالیں۔" ولی نے اُن کو اپنے کندھے سے لگا کر کہا۔

"میں، میں اپنی بیٹی کو نہیں سنبھال سکی اِسی لیے وہ نازک سی کلی اُن درندوں کے ہاتھ چڑھ گئی۔" خالہ کی آواز میں بے حد پچھتاوا تھا۔

انوار صاحب اب بھی خاموش بیٹھے تھے۔

ھ دیر پہلے طارق ایک بریف کیس اور ولی کے ساتھ اُن کے گھر میں داخل ہوا تھا، بریف کیس میں ساری ویڈیوز، سی ڈیز اور پرنٹ تھے، جو منزہ کی زندگی کو گرہن لگا کر اُسے موت سے ہم کنار کر گئے اس بریف کیس میں کچھ اور لڑکیوں کے بھی کیسٹ ہیں، جن کو اُس کم بخت پارلر کی مالکن کے نام بھائی نے بلیک میل کرنا شروع کیا ہوا تھا۔

"منزہ بہت بڑا کام کر گئی، مرنے سے پہلے اُس آدمی کے خلاف بیان لکھوا کر اُس کے لیے بچاؤ کا ہر ابند کر گئی۔ منزہ کا خون رائیگا نہیں گیا۔" طارق نے اپنی سی تسلی دینے کی کوشش کی۔

انوار صاحب ایک دم دھاڑیں مار مار کر رو دیے، منزہ جب مری تھی تب سے لے کر اب تک وہ نہیں ے تھے بلکہ زیادہ تر کاشف کا سوچتے رہتے، لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا ایک حیران کن بات نے آئی۔ اُن کو چھوٹی سی منزہ اِدھر اُدھر کھیلتے بھاگتے باتیں کرتے دکھائی دینے لگی۔ ہر ہر پَل اُن کے نے زندہ ہو کر چلنے لگی کیسے وہ خود بھی "تھوڑے" سے ناراض رہتے اور ناشکری کرتے تھے اور کیسے انے ان جانے میں انہوں نے منزہ اور کاشف کو خود کی سوچ کے پیچھے لگالیا تھا۔ جوں جوں وہ بڑی ولی۔ زیادہ کی تمنا نے اُسے زیادہ خوار کیا اور اِس تمنا کو انہوں نے کبھی روکنے ٹوکنے یا سمجھانے کی کوشش لی تھی بلکہ ہمیشہ بڑھاوا دیا تھا۔

دنیا میں دو طرح کے باپ ہوتے ہیں ایک جو مثبت سوچ دیتے ہیں، لونگ ٹرم راستے کے ذریعے، ت اور صاف دِل کے ذریعے منزل کو پانے کی رہنمائی دیتے ہیں۔ اور دوسرے خود جو جلد باز ہوتے ہیں، شارٹ کٹ سکھاتے ہیں، اپنے اندر کی بے صبری، ناشکری اپنی اولاد کے اندر منتقل کرتے ہیں اور ان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اندھیروں میں دھکیل دیتے ہیں اور یہ اندھیرے جلد یا بدیر بُری موت پر ختم ہوتے ہیں۔

وہ کیسے باپ تھے، جنہوں نے اپنے بچوں کے شفاف دِل اپنے خیالات سے گندے کر ڈالے، پچھتاوے کا ناگ اُن کو ہر پَل ڈسنے لگا تھا اور وہ چپ اور گم صم رہنے لگے تھے اور آج...... آج یہ چپ ان کے آنسوؤں سے ٹوٹی تھی۔

طارق اور ولی دونوں گھبرا کر اُن کی جانب لپکے۔

"خالو پلیز خود کو سنبھالیں!" ولی کے لیے انور خالو کا یہ رویہ حیران کن تھا۔ وہ اب تک تو بالکل خاموش تھے جیسے انہوں نے اِس بات کو، اِس تلخ حقیقت کو قبول کرلیا ہو لیکن نہیں، پچھتاوا دُکھ کا لاوا بنا تا رہا تھا اور آج یہ لاوا باہر آ گیا تھا۔

"میں نے... میں نے اپنی اولاد کو تباہ و برباد کر دیا!" وہ ایک دم بولے۔

"باپ تو گھر کا سربراہ ہوتا ہے، وہ اپنے بچوں کے لیے کسی آئیڈیل کی طرح ہوتا ہے اُس کے بنائے ہوئے نشان پر بچے پاؤں رکھ کر زندگی کی شاہراہ پر چلنا سیکھتے ہیں۔ میں کیسا بدقسمت باپ ہوں! میرے بنائے ہوئے نشان میرے بچوں کو تباہ کر گئے۔ اندھیروں میں دھکیل گئے۔" وہ اونچی آواز میں دھاڑیں مار مار کر رو دیے۔ طارق نے بے حد دُکھ سے اُس بلکتے باپ کو دیکھا۔

لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ، یہ زمانہ ہمارے بچوں کو خراب کر رہا ہے لیکن بچوں کی پہلی درس گاہ

پہلی سوچ، اچھائی برائی کی تمیز تو اپنے گھر سے ملتی ہے اور پھر یہ معاشرہ یہ زمانہ کیا ہے، معاشرہ تو ہم ہی ہیں اور زمانہ تو بہت بڑی چیز ہے۔ اللہ کہتا ہے کہ زمانے کو برا نہ کہو۔ کیوں کہ وہ خود زمانہ ہیں۔

''طارق بیٹا! آج میرا دل کرتا ہے کہ گلی گلی جا کر گھر گھر جا کر ہر شخص کو پکڑ کر بتاؤں کہ اولاد کی تر اور اُن کی سوچ کو اپنی بے صبری اور ناشکری سے میلا نہ کرو۔ یہ بچے شفاف ذہین ہم اگر خراب کرد ہیں تو ہمیشہ کے لیے اپنے بچوں تک کو کھو دیتے ہیں پھر یہ ہیرے موتی جیسی اولاد واپس نہیں ملتی'' وہ ایک دم ہاتھ ملتے ہوئے بولے۔

طارق نے بڑھ کر اُن کا ہاتھ تھام کر اُن کو دلاسا سا دیا۔

''انکل جو کھو گیا وہ ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے اور جو موجود ہے وہ ہمارے ہاتھ میں ہے، آپ پاس اپنے دوسرے بچے موجود ہیں آپ بجائے دُکھ اور پچھتاوے کے جنگل میں کھو کر خود کو گنوا دیں کے بجائے آپ ان سب کے لیے ایک مثالی باپ بنیں۔ اولاد کو تو آخری عمر میں بھی جا کر اپنے والد کی راہنمائی درکار ہوتی ہے۔'' طارق کی باتوں سے انوار صاحب کے تڑپتے سسکتے دل کو کچھ ڈھار بندھی۔

''ہاں! ایک بات کچھ اُلجھی ہوئی ہے کہ اُس پارلر کی مالکہ کے بھائی نے ہر جرم قبول کیا ہے سوا منزہ پر گولی چلانے کے، اس کے لیے وہ کچھ ثبوت بھی بتاتا ہے کہ اُس روز وہ اپنی بھانجی کی سالگرہ میں موجود تھا۔ ویڈیو مووی اور سالگرہ میں موجود تصاویر اور گھر والوں کی گواہی بتاتی ہے کہ منزہ کے قتل روز وہ تقریب میں موجود تھا۔ اگر ایسا ہے تو منزہ پر گولی کس نے چلائی؟ اور اگر وہ شخص نہیں تھا تو منزہ نے خاص طور پر اُس کا ہی نام کیوں لیا؟ یہاں پر آ کر کیس کی گتھی کچھ اُلجھ جاتی ہے۔'' طارق نے بات کے اختتام پر ہر شخص کے چہرے کو حیرت سے دیکھا، جو ایک دم ایسے ہو گئے تھے جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔

''آنٹی! آپ لوگ پلیز کوئی بات نہ چھپائیں، آئندہ اگر تفتیش کے دوران کچھ مختلف پتا چلتا ہے میں اُس وقت کچھ سیف نہ کر پاؤں گا۔'' طارق کو سب کے چہرے دیکھ کر یہ بُو تو آ گئی تھی کہ واقعی کچھ تھا جس کو اُس سے چھپایا گیا تھا۔ ولی کو بھی اپنے اندر اتنے دنوں کا شک درست محسوس ہو رہا تھا۔

''طارق بھائی!'' علیزے نے گلا کھنکھار کر اُسے مخاطب کیا۔

''مرنے والا کبھی جھوٹ نہیں بولے گا، اُس وقت اُس پر کوئی دباؤ نہیں ڈال سکتا کہ وہ اپنا بیان بد اِس لیے آپ منزہ کے دیے ہوئے بیان کے مطابق مجرم کو سزا دلائیں۔'' علیزے نے بے حد مضبوط میں جواب دیا تو طارق کو پہلی بار اپنا شک کچھ غلط محسوس ہوا۔

''جب مرنے والی نے اپنے خون کا الزام کسی ایسے شخص کو دیا، جو واقعی اُس کی موت کا سبب تھا تو سو کالڈ سچ بول کر کیوں اُس کی روح کو تکلیف پہنچائیں۔'' علیزے نے بے حد سکون سے سوچتے ہو دِل ہی دل میں کہا۔

علیزے کی بات پر حسن آرا اور انوار صاحب نے چونک کر اپنی بیٹی کو دیکھا۔ وہ جو ہاں یا نہ میں لگے ہوئے تھے، علیزے کی بات پر کسی حد تک پُرسکون ہو گئے، کچھ بھی تھا اب اُن کے اندر کاشف کو کھونے

ات نہ تھی۔

ٹھیک ہے بہن! اگر یہی درست صورت حال ہے تو اُس شخص کو کوئی نہیں بچا سکتا۔ اُس کے خلاف یہ اور منزہ کا بیان بے حد مضبوط گواہی ہے، اُسے پھانسی کے شکنجے تک ضرور پہنچائے گا۔'' طارق نے یقین دہانی کروائی اور ولی سے چلنے کا کہا۔

وہ دونوں باہر نکلے تو علیزے نے ایک دم سکون کا سانس بھر کر آنکھیں موندھ لیں، پھر ایک دم جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں، اُس کی آنکھوں کے سامنے منزہ کا مسکراتا چہرہ لہرایا۔

''آہ! منزہ!'' علیزے کو بے اختیار اپنی بہن یاد آئی۔

اُس کا مسکراتا چہرہ تو علیزے کے تصورات میں سے کہیں کھو گیا تھا، اُسے جب جب اپنی بہن کا تصور اُس کی نظروں کے سامنے وہ ہی تڑپتا بلکتا چہرہ گھومتا جو آخری وقت میں اُس نے ہسپتال میں دیکھا آج پہلی بار اُس کا مسکراتا ہوا چہرہ اُس کے تصور میں زندہ ہوا تھا اِس کا مطلب ہے کہ آج میں نے لیا وہ بالکل ٹھیک کیا!

علیزے کو اپنی بات کے درست ہونے پر بے حد سکون اور اطمینان کا احساس محسوس ہوا۔

''اللہ میری بہن کو آسانیاں دینا اور اُس کی کوتاہیوں کو معاف کر کے اُس کے درجات بلند کرنا۔'' ایک آنسو اُس کی آنکھوں سے ٹپکا۔

❖❖ ( ) ❖❖

گول گول گھومتے اِس دائرے جیسی زندگی میں باہر جانے کا راستا کدھر ہے؟ اِس بھول بھلیوں جیسی کی طرح زندگی کو باہر نکلنے کا راستا نہیں ملتا، آخر کب یہ سب ختم ہوگا، یہ کیسی دلدل ہے، جو اپنے کھینچ جاتی ہے۔ میرا سارا وجود اِس دلدل میں پھنس کر غائب ہو چکا ہے بس اِک چہرہ باقی ہے اور چہرے پر اُمید بھری آنکھیں باقی ہیں، جو ابھی تک باہر نکلنے کا راستا تلاش کر رہی ہیں۔ ہاں ایک ہی باقی ہے جو سدا کھڑا ہے بار بار التجا کر رہا ہے کہ ہے کوئی جو اِس دلدل میں پھنسے وجود کے ہاتھ کو لے۔

ہے کوئی جو اِس ہاتھ کو تھام کر اُسے باہر کھینچ لے؟

''اماں، ابا!''

''ہے کوئی جو مجھے بچا لے! اللہ مجھے بچا لو!'' وہ زور زور سے چیخنے لگی تھی۔ چیختے چیختے اُس کا حلق دُکھنے لگا تھا۔ اتنا چیخنے سے آہستہ آہستہ آواز میں سے لفظ غائب ہو گئے اور گریہ زاری اور بس غوں سنائی دینے لگی۔

''ترنم!..... کیا تم ٹھیک ہو......؟'' ماہی نے اُس کے پسینہ پسینہ وجود کو دیکھتے ہوئے ہلایا، جو نیند میں چلاتے عجیب سی آوازیں نکالنے لگی تھی۔

''اں!'' ترنم نے ایک دم آنکھیں کھول دیں۔

وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے ماہی کو دیکھنے لگی۔ وہ ابھی تک اُس خواب کے زیر اثر تھی۔ وہ ابھی تک کچھ محسوس نہ کر رہی تھی۔

''ترنم پانی پی!'' ماہی نے اُسے سہارا دے کر اُٹھایا اور اُس کے لبوں سے پانی کا گلاس لگا دیا، ترنم پانی ایک ہی سانس میں پی لیا، جیسے وہ صدیوں کی پیاسی ہو۔

''کیا ہوا...؟'' ماہی نے کتنی ہی دیر بعد اُس سے پوچھا ترنم گہرے گہرے سانس لیتی بیڈ کی ٹیک ساتھ سہارا لے کر بیٹھی، خود کو کافی حد تک نارمل کر چکی تھی۔

''میں نے ایک خواب دیکھا!'' ترنم کی آواز سرسراتی ہوئی تھی۔

''یہ کوئی انوکھی بات ہے، تم تو ایسی لڑکی ہو، جسے سوتے جاگتے حال اور ماضی کی یادوں کے مت خواب آتے ہی رہتے ہیں۔'' ماہی نے کچھ لاپروائی سے کہا کیوں کہ ترنم کو اتنے عرصے میں وہ خوب چکی تھی۔

''نہیں ماہی! میں نے ایک بالکل مختلف خواب دیکھا ہے!'' ترنم کسی مسمریزم میں تھی۔ اس چہرے پہ کچھ ایسا تھا کہ ماہی چونک کر اُس کے نزدیک بیٹھ گئی۔

''کیا دیکھا...؟'' ماہی اُس کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''میں نے خواب میں ولی کو دیکھا، وہ کسی بزرگ کے ساتھ کھڑا تھا، اُس بزرگ نے ولی کو کچھ پکڑا جو ولی نے میری جھولی میں ڈال دیا۔ ماہی وہ گلاب کا اتنا بڑا پھول تھا جتنے سائز کا کچھ ماہ کا انسانی میں حیرت و خوشی سے رونے لگتی ہوں، روتے روتے میری ہچکی بندھ جاتی ہے اُس گلاب کی خوشبو قدر تیز ہوتی ہے کہ مجھے اپنا سارا وجود گلاب کی خوشبو سے مہکتا محسوس ہوتا ہے۔ تب میں اُن بزرگ کہتی ہوں کہ میں اِس پھول کے کہاں قابل ہوں، میں نجس اور گندی ہوں یہ تو کسی عبادت گزار پاکیزہ لڑکی کا انعام ہے، مجھ جیسی لڑکی اس کے قابل نہیں ہے۔ بزرگ میری بات سُن کر مسکرانے ہیں اتنے میں ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو جاتی ہے، ہم تینوں اُن بزرگ کی جھونپڑی نما گھر میں آتے ہیں۔ راستا کچا ہوتا ہے اور میرے پاؤں مٹی سے بھر جاتے ہیں لیکن مجھے اپنے پیر اِس رستہ چلتے بالکل آلودہ محسوس نہیں ہوتے۔

جب ہم تینوں اُس جھونپڑی نما گھر میں بیٹھ جاتے ہیں تو میں دوبارہ اصرار کرتی ہوں کہ میں اِس قابل بالکل نہ تھی۔ میری بات پر وہ بزرگ دوبارہ مسکراتے ہیں اور پھر مجھے ایک قصہ سناتے ہیں۔ یقین مانو خواب اتنا واضح تھا کہ مجھے اُن بزرگ کی شکل، اُن کے گھر تک جاتا راستا اُن کی ہر بات طور پر یاد ہے۔'' ترنم نے جوش سے بتایا۔

''انہوں نے مجھے ایک ایسے شخص کی کہانی سنائی، جو ہزاروں سال تک اللہ کی عبادت میں مصروف وہ ایک ایسی چوٹی کے غار میں عبادت میں مصروف رہا جہاں کوئی جنگلی نقصان دہ حشرات یا جانور نہ بلکہ انار کا پیڑ اور ایک چشمہ تھا۔ جب اُسے بھوک لگتی، وہ انار کے پھل کھا کر پیٹ بھر لیتا اور پانی پینے وضو کرنے کے لیے وہ اُس میٹھے چشمے کا استعمال کرتا۔ اللہ نے اُسے طویل عمر عطا کی اور یہ سلسلہ ہزا سال تک چلا، پھر جب اُس کو موت آئی اور فرشتے اُسے رب کریم و عظیم کے پاس لے کر گئے تو سے کہا گیا کہ وہ بخش دیا گیا ہے، وہ شخص بے حد مسرور ہوا۔ رستے میں ایک فرشتے نے پوچھا معاملہ رہا؟ اُس نے کہا کہ میرے ساتھ تو اللہ نے بہت اچھا معاملہ کیا میں بخشا گیا اور مجھے جنت نوا

شتے نے پوچھا تجھے یہ سب کیوں ملا؟ اِس لیے کہ میں نے اپنی عمر کا پل پل اللہ کی یاد میں گزارا ان کی عبادت کی۔ اُس شخص نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اُس کے جواب کو سن رہی مان ہوا جاؤ اِس شخص کو ذرا جہنم کے باہر باہر سے گھما کر لاؤ فرشتوں نے ایسا ہی کیا۔ جہنم کے باہر ر تپش و گرمی اور تکلیف تھی کہ وہ شخص بلبلا اُٹھا۔

انی۔ پانی۔ پانی۔''

شتے اُس نڈھال کو واپس لیے جا رہے تھے کہ راستے میں ایک شخص ایک پیالے میں صرف تین بوند لے کر کھڑا تھا۔ وہ شخص تڑپتا ہوا اُس پانی کے پیالے کو تھامے شخص کی جانب بڑھا۔

ھے۔ مجھے یہ پانی دے دو۔'' وہ گڑگڑایا۔

اں پانی کی قیمت ہے۔'' اُس شخص نے جواب دیا۔

ے شخص نے کہا کیا؟

اں کی قیمت تم نہیں ادا کر سکتے کیوں کہ یہ دنیا کمانے کی نہیں سزا و جزا پانے کی ہے۔ عمل اور حاصل یا تو چھوڑ آیا ہے۔'' اُس شخص نے جواب دیا۔

تو پھر میں کیا دے سکتا ہوں؟'' پیاسے شخص نے بلکتے ہوئے پوچھا۔

م اپنے سات ہزار سال کی عبادت کا اجر دے دو، میں یہ پانی تم کو دے دیتا ہوں۔'' اُس شخص نے دیا۔

ھیک ہے پانی دو اور سارا اجر لے لو۔'' پیاسے شخص نے تڑپتے ہوئے کہا۔

ن بوند پی کر بھی پیاس نہ بجھی تھی لیکن ذرا تلخی کم ہو گئی تھی۔

ای کی عقل کچھ ٹھکانے لگی، فرشتے اُسے دوبارہ دربار عظیم باری تعالیٰ کے سامنے لے گئے کہ اِس کا اب کیا کرنا ہے، یہ اپنی ساری عمر کی کمائی تو تین بوند پانی کے عوض لٹا آیا ہے۔

ان کریم نے پوچھا۔

دل اب کیا کہتا ہے؟'' شخص گڑگڑایا۔

ے پروردگار! میں تو اب خالی ہوں، صرف تیری رحمت ہی ہے جو مجھے بخش سکتی ہے، میں نے ہزار سال اپنی عبادت کو اپنی بخش کا سبب جانا تھا لیکن وہ تو بس اتنی ہی اہمیت رکھتی تھی تین بوند پانی ابر۔ ہر شخص جو بخشا جاتا ہے وہ اپنی ہزاروں سال کی عبادت کی وجہ سے نہیں، تیری رحمت کی وجہ ثا جاتا ہے۔ اُس شخص نے دنیا و آخرت کا راز سمجھ لیا تھا۔ اللہ رحیم کریم نے اُسے اپنی رحمت کے میں بخش دیا اور اُسے جنت عطا کی۔

با! اس ساری گفتگو میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں کہ نیک عمل، اچھا عمل کتنا بھی کر لیں ان کا تکبر دل جائے تو وہ کُل تین بوند پانی کی وقعت رکھتے ہیں، اگر ساتھ میں صرف یقین ہونا لازم ہے کہ اللہ کی ان سارے معاملے سیدھے کرنے والی ہے! وہی کوتاہیاں معاف کرنے والی ہے، اُن بزرگ کی ان کر میں خوشی سے روتی جاتی ہوں، مجھے یقین نہیں آتا کہ واقعی یہ سب کچھ میری زندگی کا حصہ ان ایک دم مجھے عجیب و غریب آوازیں سنائی دیتی ہیں، منظر بدل جاتا ہے۔

ایک وجود دلدل میں بُری طرح ڈوبا ہوتا ہے۔

اُس کا چہرہ اور صرف ایک ہاتھ باہر نکلا ہوتا ہے۔ وہ چہرہ مدد مدد پکارتا پکارتا عجیب وغریب آواز نکالنے لگتا ہے۔ خوف، دکھ، تکالیف، نا امیدی جو کچھ وہ وجود محسوس کرر ہا تھا، وہ میں بھی محسوس کرتی ہ اور روتی جاتی ہوں۔ تب ہی میری آنکھ کھل جاتی ہے اور سامنے تم کھڑی تھیں، کیسا عجیب سا خواب نا!'' ترنم نے معصومیت سے ماہی سے پوچھا۔

''ہاں۔ شاید!'' ماہی نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

''اچھا تم اب سو جاؤ، صبح تمہاری فلائٹ ہے پھر سیدھا تم کو ایک پارٹی میں پہنچنا ہے، تمہارا فریش اور دکھائی دینا بے حد ضروری ہے۔'' ماہی نے ترنم کو کمبل اوڑھایا، ترنم چھوٹے اور معصوم بچوں کی ط فوراً کہا مان کر آنکھیں بند کر کے بے سُدھ ہوگئی۔ اِس بار اُس کے چہرے پر بے حد سکون تھا، ماہی اُ کتنی دیر ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی پھر طویل سانس بھرتی ہوئی اپنے لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہوئی اچانک ہی وہ اپنی جگہ پر بیٹھتے بیٹھتے رک گئی، بے حد چونکتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے ترنم کے بیڈ پاس آئی کمرے میں پہلے بھی سنگل لائٹ آن تھی لیکن اُس نے دو لائٹیں اور آن کر دیں اور بیڈ کے زمین پر بیٹھ گئی۔ اب وہ کمبل سے باہر نکلے ترنم کے پیر دیکھ رہی تھی، ماہی کے سارے وجود میں سنن پیدا ہوئی۔ اُس نے شہادت کی انگلی سے ترنم کے تلووں کو چھوا، اُس کا شک وگمان درست نکلا۔ ترنم پاؤں مٹی سے آلودہ تھے اور یہ مٹی گیلی تھی۔

''بیڈ پر لیٹے لیٹے یہ ترنم کے پیروں میں گیلی مٹی کہاں سے آ گئی؟'' یہ سوال اُس نے با آواز بلن سے کیا۔

ایک برقی رو اُس کے پورے وجود میں سے گزری۔ کانوں میں ابھی کچھ دیر پہلے ترنم کا سنایا خ گونجا۔

ماہی نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے پہلے اپنی شہادت کی انگلی کو دیکھا، جس پر واضح مٹی لگی تھی اور پھر ت دیکھا جس کا چہرہ سوتے میں اتنا معصوم، پاکیزہ اور پُرسکون لگ رہا تھا جیسے کسی حور کا ہو۔

ماہی کو لگا کہ اُس کا دِل پسلیاں توڑ کر باہر نکل آ جائے گا۔

❖❖ ☾ ❖❖

''بابا سائیں! آپ نے بلایا تھا۔'' ولی نے دروازے کی دہلیز پر کھڑے ہو کر پوچھا۔

''آؤ بیٹا! اندر آ جاؤ!'' احمد شاہ کسی گہری سوچ میں گم تھے، ولی کی آواز سُن کر ایک دم چو بولے۔

''بابا جی کیسے تھے؟'' ولی نے اُن کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''بہت کمزور اور ضعیف ہو چکے ہیں لیکن بے حد ہمت والے ہیں اپنی کمزوری کو کسی پر عیاں نہیں دیتے۔'' احمد شاہ نے جواب دیا۔

''آپ اُن کو یہاں لے آئیں... ہم اُن کی خدمت بھی کریں گے اور ہمارے گھر میں بھی خیر و ...ں۔'' ولی نے اُن کے پاس رکھی چائے کی ٹی کوزی اُٹھا کر کپوں میں چائے اُنڈیلی، وہ ولی

...طار میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''...یں نے اُن سے کہا تھا لیکن وہ وہاں سے کہیں جانے پر تیار نہیں ہیں۔'' احمد شاہ نے طویل سانس ...تے ہوئے کہا۔ اُن کے اندر مسلسل جوڑ توڑ چل رہی تھی کہ بابا جی کی دی ہوئی ذمّے داری کے لیے وہ ...تہید باندھیں۔

''...پھر ان کے پاس ایک دو خدمت گار ہوں، جو اُن کی دیکھ بھال کریں۔'' ولی نے دوسرا خیال پیش ...

''ہاں یہ بات بے حد اچھی ہوگی اگر وہ مان جائیں۔'' احمد شاہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''...واقعی وہ بابا جی کو کچھ آرام دینا چاہتے تھے لیکن وہ یہ آرام کیسے اُن کو دیں، وہ ابھی تک سمجھ نہ پا رہے ...

''بابا سائیں! کچھ خاص کام تھا؟ امّاں جان کہہ رہی تھیں کہ جب سے آپ گاؤں سے آئے ہیں کچھ ...شان لگ رہے ہیں۔'' ولی نے انہیں چائے کا کپ تھماتے ہوئے کہا۔

''آں۔ ہاں!''

''اچھا تم بتاؤ تمہاری آئندہ کی کیا پلاننگ ہے؟'' احمد شاہ چاہتے تھے کہ وہ ولی کو سب حقیقت تب ...ں جب وہ ذہنی طور پر بالکل فری ہو، تاکہ اُس کے کیریئر پر کوئی بُرا اثر نہ پڑے۔

''امّاں جان نے شاید آپ کو بتایا ہو کہ میں ڈیڑھ دو سال کے لیے آسٹریلیا جا کر ایک کورس کرنا چاہتا ...ں، جو یہاں کی کسی پی ایچ ڈی ڈگری سے کم نہیں ہے۔ یہاں میرے کیریئر میں یہ کورس بہت کام ...ے گا۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو پھر یہ ڈیڑھ دو سال میں باہر اپنی تعلیم پر استعمال کرنا چاہتا ہوں۔'' ولی ...جھکتے ہوئے کہا۔

''اور تمہاری شادی؟'' احمد شاہ نے سوال کیا۔

''...چھ ماہ بعد ایک سمسٹر ختم ہوگا اور دو ماہ کی چھٹیاں ہوں گی، تب میں پاکستان آؤں گا تب دیکھ لیں ...'' ولی ہر حال میں یہ کورس کرنا چاہتا تھا۔

''ہوں!'' احمد شاہ نے ہنکارا بھرا۔

''ولی! میں تم سے کچھ بے حد ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' احمد شاہ کے لیے بولنا بے حد دوبھر تھا۔

''...جی کہیے!'' ولی نے تابع داری سے پوچھا۔

...احمد شاہ شش و پنج میں تھے کہ آیا وہ اُسے بتائیں یا نہ بتائیں۔

''میرا خیال ہے تم کورس کے لیے چلے جاؤ، اپنے سمسٹر کے بعد تم جب پاکستان آؤ گے تو میں تم کو ...اری زندگی کا وہ اہم پہلو بتاؤں گا، جس کا جاننا تمہارے اور نگینہ کے لیے بے حد ضروری ہے لیکن میں ...لوگوں کو یہ تب بتاؤں گا، جب اِس کا ٹھیک وقت ہوگا تاکہ تم لوگوں کی اپنی زندگی ڈسٹرب نہ ہو، ابھی تم ...اُس کے لیے جانا چاہتے ہو اگر میں پہلے بتاتا ہوں تو ہو سکتا ہے کہ تمہاری ذہنی حالت ایسی نہ رہے کہ تم ...جا کر یکسوئی سے اپنا کورس کر سکو میرا خیال ہے ہم کچھ عرصے کے لیے رُک جاتے ہیں۔'' احمد شاہ ...از بلند خیال آرائی کر رہے تھے جیسے وہ کوئی فیصلہ کرنا چاہتے ہوں۔

ولی نے چونک کر باپ کو دیکھا۔ ایسی کون سی باتیں ہیں، جن کے لیے اُن کا باپ اس قدر متفکر ایسے کون سے پہلو ہیں زندگی کے، جن کو وہ نہیں جانتا۔ لیکن وہ سدا کا تابع دار بیٹا۔ جس نے اپنے سے کبھی کوئی سوال نہ کیا تھا، بے حد تجسس کے باوجود اُس نے کچھ نہ پوچھا۔

''ٹھیک ہے بیٹا! تم جب واپس آتے ہو تو میں تم کو تمہاری جنم بھومی لے جاؤں گا... وہاں تمہا لیے بہت کچھ منتظر ہے، میرا وعدہ ہے کہ میں تم کو کبھی بھی اکیلے نہیں کروں گا۔ تم میرے بیٹے ہو حقیقت ہے اور رہے گی۔'' وہ کہتے گئے، ولی کے لیے ڈھیروں سوال چھوڑتے جا رہے تھے۔

''ٹھیک ہے تم اپنے کورس کے لیے کاغذی تیاریاں کرو۔'' احمد شاہ نے سب کچھ خود ہی طے کیا اُسے جانے کی اجازت دے دی۔

اور ولی نے تابع داری کی حد کردی، اپنے منہ زور قسم کے سوالات کے باوجود خود پر ضبط باندھ اُٹھ کھڑا ہوا۔

''جی اچھا! جیسا آپ کہیں۔'' وہ یہ کہتا ہوا باہر نکل آیا۔

❖❖☾❖❖

''جانے زندگی میں اور کتنے رنگ اور روپے دیکھنے باقی رہ گئے ہیں۔'' مسکان نے سر پر اپنے د ہاتھ رکھے ہوئے تھے، دونوں جانب سے اُس کے سر پر جوتے برس رہے تھے۔ جب جب جوتا اُس سر پہ لگتا، توہین کا احساس سِوا ہو کر اندر ہی اندر آگ سلگانے لگتا۔ مسکان خود کو بچانے کے لیے اپنے دونوں ہاتھوں کا استعمال کر رہی تھی۔

اظہر علی کی بہنیں، بیویاں غم و غصے سے پاگل ہو رہی تھیں کبھی کبھی کسی جلوس کو کسی خاص طرف کردیا جائے تو سارے کے ساروں کا رُخ اُسی جانب ہو جاتا ہے، مسکان کی سب سے چھوٹی نند ایک دم مسکان کو ٹارگٹ بنا کر، سب کو اشتعال دلا کر اُسے مرکز بنا دیا تھا۔

منحوس!

سبز قدم!

کم بخت! جاہل عورتیں زبان اور ہاتھ دونوں سے اُسے زخمی کر رہی تھیں، سید سرفراز علی کی بیٹی کو ج سے مار پڑ رہی تھی۔

''سید سرفراز علی کی اولاد اِسی قابل ہے کہ اُس کی بیٹی کو جوتے پڑیں، ارے اِس سید سرفراز کی قبر پہلے زندگی میں کیڑے پڑیں۔'' وہاں بہت ساری تماشا دیکھتی عورتوں میں سے کھڑی ایک عورت کہا۔

کچھ عورتوں نے مڑ کر اُسے دیکھا یہ بوڑھی عورت کچھ نیم پاگل سی تھی، ہر وقت اِدھر اُدھر گلیوں گھومتی تھی۔ حویلی میں بھی وہ گھومتی پھرتی بلا اجازت آجاتی تھی۔ اظہر علی کی تیسری بیوی، جو بالکل اولاد تھی وہ اُس پر ترس کھا کر اُسے روٹی اور کپڑے دیتی اور نہلاتی، شاید اللہ اُس کی اِس نیکی سے ہو کر اُس کی گود ہری کردے، اِس لیے اُس کا حویلی میں آنا جانا بلا روک ٹوک تھا۔

''نی گوما تجھے کیا بیر ہے سید سرفراز علی کی اولاد سے؟'' ایک جوان ملازمہ جو مسکان کی درگت

ڈھی ہو رہی تھی لیکن وہ مالکوں کو روکنے سے بے بس تھی، اُس نے چڑ کر مائی گوما سے پوچھا۔

''ارے کیڑے پڑیں اِس سید سرفراز علی کے، اُس کی اولاد اور اُس کی آگے سے اولاد در در کی خاک ... نامراد رہے یہ سارا خاندان!'' مائی گوما کف اُڑاتی ہذیانی انداز میں گویا ہوئی۔

اِس عورت نے حیرت سے مائی گوما کو دیکھا۔

''اے کیا ہوا ہے؟'' وہ بے اختیار خود سے بولی۔

کان کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں، ایک بے حد قابل لڑکی چند ماہ پہلے جو این سی اے کی طالبہ تھی، ایک سٹوڈنٹ، جس کا نام و پہچان تھی۔ اپنی کلاس میں ہمیشہ ٹاپ کرتی تھی، جس کو اپنے وجود اور ذات غرور حاصل تھا جو بے حد حسین لڑکی تھی، کئی دلوں کی دھڑکن میں شامل تھی۔ وہ چند جاہل عورتوں ہاتھوں بُری طرح پیٹ رہی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ باپ کے ہاتھوں سرزد ہوئی بداعمالیوں کی سزا اِس دنیا میں اولاد کو سہنا پڑتی ہے۔

ہی تو ہر اچھی ماں اپنے بیٹے کو باپ کا درجہ حاصل کرنے پر تحفے میں ایک نصیحت بھری دعا دیتی

''اب تو بیٹی کا باپ بن گیا ہے، تجھے اللہ نے اپنی رحمت سے نوازا ہے، اِس کی ذمے داری اچھے سے اب تم صاحب اولاد ہو گئے ہو ہمیشہ اپنی سوچوں، اعمال اور کردار کو لگام دینا، ورنہ بداعمالیوں کے بھاگتے گھوڑے تمہاری اپنی اولاد کو یوں روندیں گے کہ تم ان کی چیخیں تو سنو گے اور بے گناہی کا بہتے دیکھو گے... مگر اِن کی اُڑتی گرد دیکھنے کے سوا کچھ نہ کرسکو گے۔

ماں باپ کے اچھے اعمال بُری اولاد کو اچھا بنا دیتے ہیں اُن کے آگے اچھا آتا ہے۔ لیکن ماں باپ ے اعمال اکثر اچھی اولاد کے لیے زندگی بھر کا عذاب پیدا کردیتے ہیں۔

اور مارو... اور مارو...!'' مائی گوما نے تالیاں بجاتے ہوئے کہا۔ وہ اِس طرح خوش ہو رہی تھی، جیسے اپنا دل پسند کھیل دیکھ کر خوش ہو رہی ہو۔

''رب سے ڈر مائی گوما! وہ بھی کسی کی اولاد ہے۔'' ملازمہ نے مسکان کے سر پر بہتے خون کو دیکھ کر زدہ ہو کر مائی گوما کو روکا۔

''ارے اُس کی اولاد کو تو صرف جوتے پڑ رہے ہیں میرا تو لال ہیرے جیسا پتر اُس کم بخت نے کتوں کے ڈلوا دیا تھا، کتوں نے نوچ نوچ کر میرے معصوم بچے کو یوں کھا لیا جیسے بھیڑیے کھا جاتے ہیں۔ ما میرا بیٹا!'' وہ اُس عورت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

دہ وجود کو ذرا سی چوٹ لگے تو دیکھ ایسے چیخیں نکلتی ہیں، یہ تو جوان ہے میرا پتر تو چھوٹا سا بال اِس معصوم کو اِس کے باپ نے کتوں کے آگے ڈال دیا تھا۔'' مائی گوما ایک دم اونچی آواز میں رونے

کان کو مارتے ہاتھ ایک دم رک کر مائی گوما کو دیکھنے لگے، اُس کے گلے سے کتوں کے غرانے آوازیں نکل رہی تھیں۔ اور وہ سُرخ سُرخ آنکھوں سے مسکان کو گھورنے لگی۔

کانپتی مسکان نے منہ سے خون صاف کرکے اُس کی جانب دیکھا۔ اُس کی روح فنا ہونے لگی نیم پاگل عورت اُس پر جھپٹ پڑی پھر اُس نے مسکان کو دانتوں سے اِس طرح کاٹنا شروع کیا

کہ مسکان کی چیخوں سے در و دیوار لرزنے لگے۔ گھر کی خواتین میں سے کسی نے مائی گوما کو نہ روکا۔
مسکان ان کے لیے وہ منحوس وجود تھا جس نے اِس حویلی کے واحد مرد، اُن کے سائباں کو کھالیا تھ
اُس کے جاتے ہی یہ حویلی زمین اور وہ خود بٹے ہوئے مالِ غنیمت کی طرح شریکوں کے ہاتھ لگ
تھیں۔
اس کم بخت نے اُن کی زندگی کے تحفظات ہی ختم کر ڈالے تھے۔ اب اُس کو جتنی سزا ملتی کم تھی۔

امّاں بچاؤ! بابا سائیں بچاؤ!

اللہ بچاؤ!

اللہ۔ اللہ۔ اللہ!

مسکان کی دل دوز چیخیں حویلی کے باہر تک گئی تھیں اور اندر داخل ہوتے قدم حویلی کے آنگن
جانب تیزی سے دوڑے تھے، جہاں یہ خونی کھیل بہت ساری تماشائی عورتوں کے ساتھ کھیلا جا رہا تھا۔

❖❖○❖❖

ہونٹوں پہ کبھی اُن کے مرا نام ہی آئے
آئے تو سہی برسرِ الزام ہی آئے
حیران ہیں لب بستہ ہیں دل گیر ہیں غنچے
خوشبو کی زبانی ترا پیغام ہی آئے
لمحاتِ مسرت ہیں تصور سے گریزاں
یاد آئے ہیں جب بھی غم و آلام ہی آئے
تاروں سے سجالیں گے رہ شہرِ تمنا
مقدور نہیں صبح چلو شام ہی آئے

وہ شوخ انداز میں گنگناتی اُس کے اِرد گرد منڈلا رہی تھی۔ تیز پرفیوم کی خوشبو، چست چوڑی
پاجامہ اور فٹ شرٹ پہنے رسی نما دوپٹا گلے میں ڈالے وہ طارق کے سامنے بیٹھی چائے بنا رہی تھی۔
طارق نے ایک نگاہ ڈال کر لب بھینچ لیے۔ جانے کیوں جتنا وہ اُس کے قریب آتی اُس کا دِل
سے اور دور ہونے لگتا تھا۔

''سحرش!'' آخر وہ اُسے ٹوکے بنا نہ رہ سکا۔

''زہے نصیب! آپ نے اتنی دیر سے مخاطب کرنا تو پسند فرمایا۔'' وہ شوخی سے بولی۔

طارق کو اُس کی یہ شوخی قطعی نہ بھائی، کہاں تو وہ پتھر جیسی ساکن سحرش! کہاں اُس کی یہ شوخیاں
شوخیاں یہ زندگی بے شک طارق کی مسلسل محنت کا نتیجہ تھا بلکہ اُس کی یہ محنت و ہمدردی اُسے تا عم
لیے پھنسا گئی تھی۔ اب اُسے سحرش کا یوں چنچل ہونا اچھا نہ لگتا تھا۔

''تم کو میں نے ڈاکٹر اکرم زبیر کے پاس جانے کے لیے کہا تھا، تم تیار ہونے کے بجائے اِدھ
گھوم رہی ہو۔'' طارق نے سنجیدگی سے کہا، وہ اُسے ڈاکٹر اکرم زبیر کے پاس مسلسل سیشن کے لی
جاتا تھا لیکن آج سحرش جانے کس موڈ میں تھی۔

''آج رہنے دیں طارق! آج نہیں!'' وہ بہت خوش و مگن تھی۔

''کیوں آج کیا ہے؟''

''آج کیا خاص بات ہے۔'' طارق نے بیزاری سے پوچھا۔

''آپ کو واقعی بالکل یاد نہیں ہے؟'' سحرش نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں!'' طارق نے سنجیدگی سے جواب دیا تو سحرش کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔

''جب میرے اندر کوئی جذبہ زندہ نہ تھا تب آپ میرے متعلق ہر بات یاد رکھ کر میری زندگی کا ہر لمحہ
اہمیت کرتے تھے اور جب میرے اندر آپ کی دی ہوئی زندگی ہر طرح سے متحرک ہے تو آپ مجھے
اور لرنے لگے ہیں۔'' سحرش نے منہ در منہ شکوہ کیا تو طارق ایک دم بوکھلا گیا۔

''طارق! آپ کا کون سا سچا روپ ہے؟ وہ جو ایک ہمدرد دوست تھا جو میرے ننگے سچ پر پردہ ڈالتا تھا
یا یہ جو میرا محرم ہو کر میرے ساتھ نامحرموں جیسا رہتا ہے۔'' سحرش ایک دم پھٹ پڑی۔

طارق کے تو صحیح معنوں میں ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے تھے۔

''کیا... کیا ہوا؟'' طارق نے ایک دم نرمی سے پوچھا۔

''طارق! آج میرے سالگرہ ہے۔'' سحرش نے احتجاج کیا۔

''اوہ!'' طارق نے ایک دم طویل سانس بھرا۔

''آئی ایم ریئلی سوری یار! دراصل میں دفتری کام میں اُلجھا ہوا تھا، اِسی لیے میرے دماغ سے نکل
گیا۔'' طارق نے شائستگی سے معذرت کی۔

''اوکے ٹھیک ہے۔'' سحرش جس کا منہ بے حد پھولا تھا ایک دم مسکرا کر بولی۔ اُس کے چہرے پر بچوں
کی معصومیت اور خوشی تھی۔ وہ ایسی ہی تھی فوراً سے من جانے والی اور فوراً سے روٹھ جانے والی۔

''تھینک یو، تم نے مجھے معاف کر دیا۔'' طارق نے ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا۔

''اوں ہوں! اب ہر بات پہ معافی نہیں ملے گی۔'' سحرش گویا ہوئی۔

''مطلب؟'' طارق نے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ میرے تحفے کی معافی نہیں ملے گی۔'' سحرش نے لاڈ سے کہا۔

''اوکے! کیا چاہیے تمہیں؟ جو کہو گی ساتھ جا کر دلا دوں گا۔'' طارق نے فراخ دلی سے کہا۔

''جو میں کہوں گی وہ دیں گے۔'' وہ طارق کو بہ غور دیکھ کر بولی۔

''آف کورس! برتھ ڈے بے بی جو چاہے گی وہ ملے گا۔'' طارق نے اُسے یقین دلایا۔

''طارق!'' وہ اُس کے بے حد قریب آ کر بیٹھ گئی۔

''آپ مجھے اپنا آپ دے دیں۔'' سحرش نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

طارق نے بے اختیار اُسے چونک کر دیکھا۔ وہ اُس کے بے حد قریب بیٹھی اُس سے اپنا وہ حق مانگ
رہی تھی، جو طارق اب تک بچاتا آیا تھا۔

''کیوں؟ کیوں چپ ہیں؟'' وہ بولی۔

''کیا میں نے اپنی اوقات سے زیادہ مانگ لیا ہے۔'' درد اُس کے اندر سے بولا تھا۔

طارق کو یوں لگا کہ وہ ایسے موڑ پر آن کھڑا ہوا ہے، جہاں واقعی بچ نکلنے کا کوئی بھی راستا سامنے نہ
''طارق مجھے اپنا تحفہ چاہیے!'' سحرش کے لہجے میں ضد اور اصرار تھا۔ سحرش کے تیور دیکھتے ہ
طارق کے اندر مسلسل جوڑ توڑ چلنے لگی تھی۔

لب اِس خوں میں غرق زمیں کی پیاس بُجھے گی!
لب غم کے اِن ویرانوں!
غارگھوں میں، قتل گھوں میں
زہریلے سانپوں سے بھری سہمی راہوں میں
آس اُمید کا پھول کھلے گا!
لب ظلم کے پرکاروں کا بھید کھلے گا
لب حاکم کی عیاری کا تاج گرے گا
مظلوموں کے پیمانوں میں
خوشی کا کوئی رنگ کھلے گا!
ناداروں کی زخم رسیدہ، نم آنکھوں میں
لب اِس خوں میں غرق زمیں کی پیاس بجھے گی!
لب پیاس بجھے گی! کب پیاس بجھے گی!

''رُک جاؤ! میں کہتا ہوں رُک جاؤ!'' سید سرفراز علی نے چیخ کر کہا اور تیزی سے آگے بڑھے۔

مائی گوما نے ایک پل کو رُک کر سید سرفراز علی کو دیکھا، پھر جیسے اُس کے جنون میں شدت آ گئی ایسے ، مندر میں طوفان آ جاتا ہے۔ وہ مسکان پر اب شدت سے حملہ آور ہوئی تھی۔

کان کی چیخوں اور اُس کی حالت دیکھ کر سید سرفراز کا دِل ٹکڑے ٹکڑے ہوا۔ وہ دیوانہ وار آگے ئے اور مائی گوما سے مسکان کو چھڑانے لگے، لیکن اس نے بہت سختی سے مسکان کے بازو پر دانت گاڑ ئے تھے۔

اُف! درد کا ایک سمندر تھا۔ مسکان کو لگا کہ اِس درد کے سمندر میں بہتے بہتے اُس کا سارا وجود درد بن اُبھر رہا ہے۔

''امّاں! ماں!'' مسکان کی چیخیں ناقابلِ برداشت تھیں۔

ید سرفراز علی اور شیر بانو جتنا مائی گوما سے مسکان کو چھڑانے کی کوشش کرتے، مائی گوما اس سے زیادہ ت سے اس کو کاٹتی۔ جانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی اس میں کہ وہ قریب آنے والے ہر بندے ھکا دے رہی تھی۔ آخر سید سرفراز نے آنگن میں پڑے مٹکے کو اُٹھایا اور اُس کے نیچے پڑی اینٹ

اُٹھا کر مائی گوما کو دے ماری........ چوٹ بہت شدید تھی مائی گوما لہرا کر گری لیکن گرتے گرتے اُس کے دانت مسکان کی بوٹی نوچ کر لے گئے تھے۔

"اللہ!" مسکان کی چڑ مڑ چیخیں، سسکیاں دل دہلا دینے والی تھیں۔

سید سرفراز علی کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ وہ خوں خوار نگاہوں سے مائی گوما کو دیکھ رہے تھے جس کے خون آلود چہرے پر زہریلی اور فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اُس کے سر سے خون کسی فوارے کی طرح پھوٹ کر اُس کے گلے سے ہوتا ہوا اُس کے کپڑوں کو تر کر رہا تھا لیکن اُس کے چہرے پر درد کے احساس کے بجائے عجیب سی خوشی تھی اور یہی مسکراہٹ سید سرفراز علی کے تن من میں آگ لگا گئی تھی۔

انہوں نے جنونیوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھ کر اینٹ ڈھونڈی اور اینٹ اُٹھا کر دوبارہ مائی گوما کا نشانہ لیا۔ مائی گوما بے خوفی سے کھڑی رہی اُس نے خود کو بچانے کے لیے ہٹنا مناسب نہ سمجھا۔

سید سرفراز کو اُس کی آنکھوں کی بے خوفی حیرت اور غصہ دِلا رہی تھی۔

"تیری تو!" انہوں نے ایک گالی اُسے دی۔

اِرد گرد کھڑی گھر کی خواتین اور ملازموں میں سید سرفراز کی موجودگی کی وجہ سے بہت زیادہ خوف و ہراس پیدا ہو گیا تھا۔

"بس!" مائی گوما خون خون ہوتے وجود کے ساتھ بے خوفی سے آگے بڑھی۔

"مقبول... آصف!" سید سرفراز علی نے دروازے کی جانب منہ کر کے اپنے ملازموں کو آواز دی۔ بھول گئے تھے کہ اپنے گھر کی خواتین کو وہ مرد ملازموں سے دور رکھتے ہیں، اِس وقت مسکان نیم ہوش چیتھڑے وجود اور لباس کے ساتھ ڈھیر بنی پڑی تھی۔ لیکن سید سرفراز علی کے سر پر تو مائی گوما کی خوف آنکھیں سوار تھیں۔ وہ اِن آنکھوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکال کر باہر پھینک دینا چاہتے تھے۔

"بابا سائیں!" شیر بانو کی کپکپاتی آواز نے اُن کو چونکایا۔

"آپی کو ہسپتال لے چلو!" صرف شیر بانو تھی، جو مسکان کی حالت پر رو رہی تھی۔

باہر سے ملازم دوڑتے آ رہے تھے۔ سید سرفراز نے اُن کو آتے دیکھ کر جلدی سے اپنی چادر مسکا ڈال دی۔

"دیکھا سرفراز علی!" مائی گوما کی سرسراتی آواز سید سرفراز علی کو کچھ جانی پہچانی لگی۔

"دیکھا اولاد کا دُکھ! ماں باپ کے اندر کیسی آگ لگاتا ہے، تو نے ایک دن میرے معصوم بچے کو باپ کے ساتھ مل کر بھوکے کتوں کے آگے ڈالا تھا۔ دیکھ اپنی بیٹی کے پنڈے پہ زخم! میں نے تو تھوڑے زخم لگائے ہیں، تیرے کتوں نے تو میرا بیٹا زخم زخم کر کے مار دیا تھا۔ اپنی بیٹی کا زخم تجھے سار اپنے ظلم کی یاد دلاتا رہے گا۔ میرا مرد جورا، میرے سرکار سائیں تیری وجہ سے خود کو کتا سمجھتا ہے۔ وہ دن آسمان کی طرف منہ کر کے کتوں کی طرح روتا ہے! دیکھنا ایک دن ربّ ہمارا انصاف ضرور کرے۔ ایک سورج ایسا ضرور طلوع ہونے والا ہے، جب سید سرفراز علی تو اپنے ظلم سمیت غروب ہوگا۔" وہ انداز میں ہنستی چلی گئی۔

سید سرفراز نے غصے میں آ کر مقبول کے ہاتھ سے بندوق لے کر مائی گوما کا نشانہ لینے کی کوشش

لیکن مائی گوما ہنستے ہنستے ایک دم لہرا کر زمین پر گری۔ چوٹ اُسے بہت شدید لگی تھی سر سے نکلا خون اُس کے سارے وجود کو نہلا گیا تھا۔

"تم بھی ضرور اولاد کا دُکھ دیکھو گے، تیری اولاد بھی رُلے گی، تو پناہ مانگے گا لیکن تجھے پناہ نہ ملے گی۔" وہ دھیمے دھیمے بولتی ایک دم آنکھیں بند کر گئی۔

روح نے جسم کو بے حد آسانی اور بِنا تکلیف کے آزاد کر دیا تھا۔ مائی گوما کے چہرے پر بہت چمک اور مسکراہٹ آ کر جم گئی تھی۔

"یہ... یہ تو مر گئی ہے۔" ایک عورت نے مائی گوما کو چھو کر انکشاف کیا۔

"ہونہہ!" سید سرفراز علی نے اُس پر تھوکا لیکن تھوک اُس کے چہرے تک نہ پہنچا، وہاں ایک فاتحانہ مسکراہٹ سید سرفراز علی کو منہ چڑھا رہی تھی۔

"سائیں! چھوٹی بی بی کو ہسپتال لے چلتے ہیں۔" ملازم بولا تو سید سرفراز علی چونکے۔

"ہاں!" وہ مسکان کی جانب بڑھے اور اُسے پھولوں کی طرح اُٹھا لیا اور جاتے جاتے ایک دم مجمع میں کھڑی عورتوں کی جانب مڑے۔

"تم لوگوں نے جو کچھ میری بیٹی کے ساتھ کیا ہے، میں کبھی معاف نہ کروں گا، تم نے سید سرفراز علی کے لختِ جگر پر ہاتھ ڈالا، میں قسم کھاتا ہوں کہ یہاں کھڑے ہر فرد چاہے وہ مالکن ہے یا نوکر! اسے میرے بدلے کی آگ میں سے گزرنا ہوگا۔ تم لوگوں نے سید سرفراز علی کی بیٹی کے ساتھ بُرا کر کے بہت بُرا کیا ہے، میری آنکھ میں زخمی ناگ کی طرح ہر اُس شخص کی تصویر قید ہوگئی ہے، جس نے اس پر ظلم میں شرکت کی ہے اور یہ شرکت چاہے صرف دیکھنے تک ہی کیوں نہ ہو، میں نہیں معاف کروں گا۔" وہ چلائے اور اس گونج نے حویلی کے در و دیوار ہلا دیے۔

وہاں کھڑی ساری عورتیں حواس باختہ تھیں لیکن ملازموں کا سب سے بُرا حال تھا۔ اُن کو نظر آ رہا تھا کہ وہ گیہوں کی طرح ضرور پیسی جائیں گی۔

سید سرفراز علی دھپ دھپ پاؤں مارتے باہر نکل گئے عورتوں نے خوف زدہ ہو کر مائی گوما کی لاش اور سید سرفراز علی کو باہر جاتے دیکھا۔

"ہونہہ! کیا کر لے گا یہ!" مسکان کی چھوٹی نند نے تنفر سے کہا۔

"میرا ہیرے جیسا بھائی یہ منحوس کھا گئی، مر ہی جاتی یہ کلموہی تو اچھا تھا۔" بڑی نند کا کینہ بولا۔

سید اظہر علی کی ساری بہنیں نڈر ہو کر مسلسل بول رہی تھیں اُن کے لہجے کی بدتمیزی بے خوفی پہچان کروا رہی تھی کہ وہ کس شخص کی بہن تھیں۔

"وہ بہت بُرا کرے گا، اب بہت بُرا ہوگا۔" شیر بانو نے سہمی سہمی آواز میں کہا۔

وہ سید سرفراز علی کو چند ہی دِن میں بہت اچھی طرح جان گئی تھی اور کیوں نہ جانتی اُس نے بہت قریب سے اُس کے دل دہلا دینے والے مظالم دیکھے تھے۔

"خدایا! اب کیا ہوگا، اب شاید بہت بُرا ہوگا!" شیر بانو نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

❖❖ ◯ ❖❖

''طارق...!'' وہ سراپا سوال بنی اُس کے سامنے کھڑی تھی کیا کچھ نہ تھا اُس کی آنکھوں میں محبت اصرار، اقرار محبت کی چاہت اور ''سب'' پالینے کی تمنّا!

طارق ہی اُس کی زندگی میں سب کچھ تھا۔

''سحرش...!'' طارق کو واقعی لگا کہ اِس مرتبہ اُسے ٹالنے کا مطلب تھا کہ اُسے غصّے کے اُس ردِعمل کی جانب دھکیل دیا جائے جس کے لیے ڈاکٹرز نے سختی سے منع کیا تھا وہ واقعی مشکل میں گھر گیا تھا۔

طارق نے نرمی سے سحرش کے بالوں کو چھوا اور اُسے اپنے حلقے میں لے لیا۔ سحرش کی بلکتی تڑپتی روح میں ایک دم جیسے سکون اُترا تھا۔ اب وہ اِن پناہوں میں اُتر کر اپنا آپ بھول جانا چاہتی تھی خود طارق کو اپنے پہ بند باندھنا مشکل لگ رہا تھا۔

تیل جب جب لکڑی پر پڑتا ہے آگ تو لگتی ہے نا۔

''اَن جانے جی سے محبت کرنا یوں ہی لگتا ہے، جیسے بھرے پیٹ میں بِنا بھوک کے کھا کر طبیعت پر بوجھ ڈال دینا۔'' طارق کو دو طرح کی کیفیتوں کا احساس فوراً ہوا تھا۔

وہ سحرش کو لے کر صوفے تک آیا، سحرش نے طارق کی آنکھوں میں جھانکا، وہ روز کی طرح جلدی میں جانے کے چکر میں نہ تھا۔ سکون کی ایک اور لہر نے اُسے اپنی لپیٹ میں لے لیا کہ طارق کہیں نہیں جا رہا۔ طارق چپ چاپ اُس کا سر سہلا رہا تھا سحرش کو بے حد سکون سے اپنی آنکھیں بند ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔

''طارق! آپ مجھ سے محبت تو کرتے ہیں نا!'' سحرش نے بند ہوتی آنکھوں کو زبردستی کھولتے ہوئے پوچھا۔

''یہ کیا سوال ہوا؟'' طارق نے پوچھا۔

''بولیں نا!'' سحرش نے ضد کی۔

''سحرش! تم اگر مجھے عزیز نہ ہوتیں تو میری زندگی میں اتنا اہم مقام کبھی حاصل نہ کر پاتیں۔'' طارق نے اپنی سی تسلّی اُسے دینے کی کوشش کی بہرحال اُسے کوئی تو جواب دینا تھا، جس سے سحرش کا سوال اُگاتا دماغ کچھ پُرسکون ہوسکے۔

''طارق! میں نہیں جانتی، لیکن شاید ہر عورت اظہارِ محبت کی بھوکی ہوتی ہوگی۔ کیوں کہ میں نے اپنا سب کچھ کھو دیا ہے اِس لیے میں زیادہ بھوکی ہوں۔'' سحرش نے بلا جھجک اظہار کیا، وہ طارق کا ایک ہاتھ مضبوطی سے پکڑے بیٹھی تھی یوں کہ اُسے جیسے ڈر ہو کہ طارق اب بس بھاگنے ہی والا ہو۔

''بولیے نا! آپ کو مجھ سے محبت ہے؟'' وہ ایسا سوال کر رہی تھی، جس کا جواب سحرش بالکل برداشت نہ کرسکتی تھی۔

''تم محبت کسے کہتی ہو؟'' طارق نے الٹا اُس سے سوال کر ڈالا۔

''محبت وہ جذبہ ہے جو ہمارے سلگتے، بنجر ذہن کو سیراب کرکے سرسبز و شاداب کر دیتا ہے۔'' سحرش نے اِک جذب سے کہا۔

طارق کے صحیح معنوں میں چودہ طبق روشن ہوگئے تھے، وہ اپنی بے خبری پہ حیران تھا کہ سحرش کب اور

وقت اس قدر زیادہ باخبر ہوگئی تھی۔ ان جانے میں پتھر کو چھو کر زندگی دے بیٹھا تھا۔

لارق کو بچپن میں امی کی سنائی کہانی یاد آگئی کہ کیسے ایک روز شہزادہ کسی کھوئی ہوئی شہزادی کو تلاش تے کرتے پتھروں کے شہر میں چلا جاتا ہے۔ پھر اچانک وہ ایک پتھر کی مورتی کو چھو بیٹھتا ہے، جو اس ھونے سے ہی زندہ ہوجاتی ہے۔ وہ ایک اور ملک کی شہزادی تھی، جسے کسی جن نے پتھر بنا کر کھڑا لیا تھا لیکن شہزادے کا چھونا شہزادی کو زندگی دے گیا تھا۔ پھر شہزادہ اس شہزادی سے ہمدردی کر بیٹھتا اور شہزادی کو چھوڑنے اس کے ملک جاتا ہے جہاں سب اُسے شہزادی کا شوہر سمجھ کر عزت مان اور یتے ہیں۔ شہزادہ کچھ ایسی مروّت اور ہمدردی میں گھر کر اپنے اصل رشتوں کو بھول کر اپنی محبت کو ال کر وہیں رہ جاتا ہے۔

ایک دن اچانک اسے اپنے ملک کا ایک آدمی ملتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس کے والدین اس کی راہ تکتے ر گئے اور ایک دن اس کی شہزادی بھی اسے تلاش کرتی محل میں پہنچ گئی اور جب اسے پتا چلا کہ شہزادہ ہے تو ایک بار پھر شہزادے کو ڈھونڈنے کے چکر میں دنیا کے ہجوم میں کھوگئی یوں کہ آج تک کسی کو اس کا پتا نہ چلا۔ شہزادے کو یہ سب کچھ سن کر بے حد دکھ ہوا تھا کہ وہ اپنے مقصد سے ہٹ گیا تھا، سب بھول گیا تھا۔ اپنوں کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا یوں وہ تا عمر اس بات پر پچھتاتا رہا کہ اس نے رستے کو ل جانا اور اپنی منزل کھوٹی کر ڈالی۔

لارق کو بچپن ہی سے اس شہزادے پر غصہ آتا تھا کہ کیوں وہ اپنے مقصد سے ہٹا، کیوں اس نے تے کو منزل جانا؟ لیکن آج اس کی زندگی بھی کچھ اسی طرح کے موڑ پر آن رکی تھی۔

زندگی جب رکتی ہے تو انسان کے ہونے کا مقصد فوت ہونے لگتا ہے۔ چلتی زندگی بہتا پانی ہی خوشبو اور شفاف رہتا ہے اس میں آگے بڑھنے کی ہمت اور لگن ہوتی ہے۔ اسی پل طارق کا فون مسلسل

لارق نے دیکھا آصف کا فون تھا۔

''ہاں کہو آصف!'' طارق نے بہ غور آصف کو سنتے ہوئے کہا۔

''سر بٹر فلائی کلب پہ جو ریڈ ہم نے کی ہے وہاں سے درجنوں لڑکے، لڑکیاں اپنی پرائیویٹ فلمیں کرواتے پکڑے گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو بہت اچھے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور کچھ تو شہور لوگوں کی اولاد ہیں ان سب کا کرنا کیا ہے؟'' آصف نے تشویش بھرے انداز میں پوچھا۔

''ابھی تو فوری طور پر سب کو اسپیشل سیل لے جاؤ، بعد میں دیکھتے ہیں کہ سب کا کیا کرنا ہے۔ ہاں وہ یو تھے کلب کے وہ مل گئے۔'' طارق نے پوچھا۔

کچھ روز پہلے ایک والدین طارق کے پاس آئے تھے کہ ان کی بیٹی اپنی ایک غلطی کی وجہ سے مسلسل ل ہو رہی ہے اسے ان لوگوں سے نجات دلا دیں۔ طارق نے لڑکی سے ساری تفصیل پوچھی تو لڑکی ایا کہ اس کی کالج کی دوستوں نے مل کر پہلے اس لڑکی کے ساتھ دوستی کی اور پھر مل کر اس کو تباہ کیا۔ ں وہ اس غلط کام کے لیے اسے مجبور کرنے لگیں، نہ ماننے پر اس کے کچھ عریاں اور فحش کلِپ دکھا ے بلیک میل کرنے لگیں۔ لڑکی سے جب یہ سب کچھ سہا نہ گیا تو اس نے اپنے ماں باپ کو ساری

سچائی بتادی اور اس کے ماں باپ کسی نہ کسی طریقے سے طارق تک پہنچ گئے اور مدد کی درخواست کی۔ لڑکی کے بتائے ہوئے نیٹ کیفے اور کلب میں آج چھاپہ مارا گیا تھا اور ریڈ بے حد کامیاب ہوئی
''گڈ! اچھا اوکے! میں بھی کچھ دیر بعد پہنچ جاؤں گا۔'' طارق نے کہہ کر فون بند کردیا۔
سحرش مسلسل اس کا ایک ہاتھ تھامے طارق کی ساری گفتگو بہ غور سن رہی تھی۔
''آج آپ کو جانا پڑ رہا ہے۔'' وہ خود ہی دھیمی پڑ گئی تھی۔
''ہاں! لیکن اگر تم نہیں چاہو گی تو نہیں جاؤں گا۔ آج تمہارا بڑا دن ہے میں تم کو اکیلے نہ کروں'' طارق نے اس کا دل رکھتے ہوئے کہا۔
''نہیں! آپ جائیں!'' سحرش ایک دم اس کا ہاتھ چھوڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔
طارق نے حیرت سے اسے دیکھا۔ کہاں تو وہ آتش جوالا بنی منہ زور لہر بنی اُس کو بے بس کر رہی کہاں سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔
''سحرش! میں تمہارا وقت کسی کو نہیں دے رہا، تم اپنا موڈ ٹھیک کرو۔'' طارق نے اس کا دل رکھا۔
''نہیں طارق! آپ کی بے شک مجھے بے حد ضرورت ہے لیکن مجھ سے بھی زیادہ آپ کی ضر کہیں اور ہے۔ جائیے ایک اور سحرش کو پیدا ہونے سے روک لیں۔'' سحرش کے لہجے میں بربادی بول رہا تھا۔
طارق نے اس کی بھیگی آنکھوں کو دیکھا اور جھک کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔
ایک جانور بھی ساتھ رہے تو اس کے ساتھ اُنسیت ہو جاتی ہے۔ پھر یہ تو ایک جیتی جاگتی لڑکی تھ ہر وقت دل و جان سے اس پر واری صدقے جاتی تھی۔ اسے مرکز زندگی مان کر اسی کے گرد گھوم رہی ساری نہ سہی، بہت نہ سہی لیکن سحرش کے ساتھ اور تعلق نے اس کے دل میں کچھ مقام و جگہ حاصل لی تھی۔
''میرا وعدہ ہے تم سے کہ میں بہت جلد اپنے دل کو سمجھالوں گا۔ تا کہ تمہاری جانب سے مجھے جواب دہی نہ دینی پڑ جائے۔'' طارق نے دل ہی دل میں کہا۔
''طارق!'' سحرش نے جاتے جاتے اسے پکارا۔
طارق نے رک کر اسے دیکھا پھر ایک دم طارق کو خود کو اور اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا، وہ اس کے سے لگی رو رہی تھی۔
''طارق! اب نہ سہی لیکن آئندہ ضرور میرے سوال کا جواب لانا۔'' اس نے بھیگے بھیگے لہجے میں ک
''کیا؟'' طارق نے پوچھا۔
''یہی کہ کیا آپ کو مجھ سے محبت ہے؟'' وہ اس سے سوال کر رہی تھی اور طارق نظر چرائے باہر کہ کہیں وہ اس کی آنکھوں میں اپنا عکس ڈھونڈھتی ڈھونڈھتی کسی اور کو نہ پالے۔
سحرش نے لمبے چوڑے طارق کو باہر نکلتے دیکھ کر گہرا سانس بھرا۔

تمہیں ضد ہے کہ میں کہہ دوں
مجھے ضد ہے کہ تم کہہ دو

مجھے تم سے محبت ہے
کہو مجھ سے محبت ہے
نہیں یہ جانتے دونوں
محبت کب محتاج ہے لفظوں کی
محبت تو ہماری دھڑکنوں کے ساز میں شامل
سُریلے گیت کی مانند
جو تنہا رات کو اکثر آتی ہے آنکھوں میں
محبت مسکراہٹ ہے
حسین نازک سے ہونٹوں میں
محبت صندلی ہاتھوں کی نازک لرزشوں میں ہے
محبت سوچ کی گہرائیوں سے پھوٹتی خوشبو!
ہمیشہ ساتھ رہتی ہے
محبت آنکھ میں پلتا وہ پُرسرار جذبہ
جسے اب تک نہ کوئی سمجھ پایا
نہ اس کی کوئی صورت ہے نہ اس کا کوئی پیمانہ
ڈھکے الفاظ میں اس کا بہت اظہار ہوتا ہے
کچھ ایسے ہی کہ جیسے اب
تہہ دل سے تو ہم دونوں اقرار کرتے ہیں
مگر پھر بھی نجانے کیوں
تمہیں ضد ہے کہ میں کہہ دوں
مجھے ضد ہے کہ تم کہہ دو مجھے تم سے محبت ہے

سحرش نے صوفے کی لکڑی کی بیک پر ہاتھ پھیرتے مگن سے انداز میں با آواز بلند یہ نظم پڑھی۔ اس کا حافظہ بلا کا تیز تھا۔ طارق اسے اُردو فکشن، اسلامی ادبی کتابیں لاکر دیتا رہتا تھا، جو وہ ایک بار پڑھ لیتی تو از بر ہو جاتی تھیں۔
''طارق! تم صرف میرے ہو، میرے! خدا نے تم کو میرا نصیب بنا کر یہ بات ہمیشہ کے لیے ثابت کر دی کہ تم صرف اور صرف میرے ہو اور تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔'' سحرش نے اپنے آپ سے مسکراتے ہوئے کہا۔
''سحرش! یہ طارق کہاں گیا؟'' مرینہ آنٹی نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔
''ان کو کوئی کام تھا۔'' سحرش نے بے حد مطمئن انداز میں جواب دیا۔ طارق کے لبوں کا لمس ابھی بھی اس کی پیشانی پر تازہ تھا۔ اسے اپنے ماتھے پر خوشبو کا فوراہ پھوٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ طارق کا اپنایت بھرا ان احساس اس کے اندر کی بے چینی کی آگ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ثابت ہوا تھا۔

"تم نے اسے جانے کیوں دیا؟ میں نے تم کو سمجھایا تھا کہ اسے اپنے قابو میں کرو، اس سے اپنا وصول کرو۔" مرینہ آنٹی نے حسبِ معمول نصیحت کرتے ہوئے کہا۔

"اب وہ کہیں نہیں جائے گا آنٹی! آپ کے خدشات غلط ہیں، اس کی یہی تو خاصیت مما کو پسند کہ وہ زبان اور آن کا سچا ہے۔ اور اس نے اپنی زبان سے اقرار کر کے یہ بندھن باندھا ہے اور مجھے ا آن بنایا ہے، وہ مجھ سے کیسے مُکر سکتا ہے۔ وہ صرف میرا ہے۔" سحرش نے مسکرا کر کہا۔

مرینہ آنٹی بس ایک طویل سانس بھر کر رہ گئیں۔

اب وہ اتنا اندھا اعتماد کر رہی تھی تو اس کی کوئی نہ کوئی تو بنیاد ہوگی۔ وہ حیران تھیں کہ آدھی عمر کی یہ لڑکی صرف اپنے اعتماد کی وجہ سے قابلِ رشک سکون میں تھی۔

❖❖○❖❖

اے مرے کبریا
میرے ادراک کی سرحدوں سے پرے
میرے وجدان کی سلطنت سے اُدھر
تیری پہچان کا اوّلین مرحلہ
میری مٹی کے سب ذائقوں سے جدا
تیری چاہت کی خوشبو کا پہلا سفر
میری منزل؟ تیری رہ گزر کی خبر
میرا حاصل؟ تیری آگہی کی عطا
میرے لفظوں کی سانسیں
ترا معجزہ؟
تیرے لطف کا بے کراں سلسلہ
میرے اشکوں کی چاندی
تیرا آئینہ
تری جستجو کی مسافت میں گم راستوں کا پتا
میں مسافر تیرا خود سے نا آشنا
ظلمت ذات کے جنگلوں میں گھرا
میں مسافر تیرا!

ولی نے احمد شاہ کے کمرے میں قدم رکھا تو وہ حاجت کے نفل ادا کر کے دعا میں مشغول تھے۔ احمد ش نے دعا کر کے ہاتھ چہرے پر آمین کہہ کر پھیرے۔ سامنے ولی کھڑا تھا۔

لمبا چوڑا یہ خوبرو لڑکا جوان کے اندر خون کی طرح شامل تھا۔ انہوں نے اپنے سارے خواب اس ذات سے پورے کیے تھے۔ وہ بے حد فرماں بردار بھی تھا۔ آج ایک کڑی آزمائش بن کر ان کے سا کھڑا تھا۔

احمد شاہ نے بہت سارے دن بے حد ڈسٹرب ہو کر گزارے تھے پھر انہوں نے اپنا آپ اور اپنے دل کا سارا بوجھ اللہ تبارک کے حوالے کر دیا تھا۔ تب سے لے کر اب تک وہ بے حد پرسکون ہو گئے تھے۔

"بابا سائیں چلیں!" ولی نے احمد شاہ سے پوچھا۔

وہ سب لوگ علیزے کی جانب جا رہے تھے، ولی کی دو روز میں آسٹریلیا کے لیے روانگی تھی۔ حسن آرا چاہتی تھیں کہ آج وہ سب ان کی طرف کھانا کھائیں۔

"ہاں چلو!" احمد شاہ نے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل سے چشمہ اُٹھا کر ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

روشن آرا اور نگینہ پہلے ہی لان کی کرسیوں پر بیٹھی انتظار کر رہی تھیں۔ یہ قافلہ چھوٹی چھوٹی باتیں کرتا علیزے کے گھر پہنچا تو حسن آرا خالہ کے ساتھ انور خالو بھی ان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔

ولی موت جہاں انور صاحب کو بہت سا سبق دے گئی تھی وہاں ان کو بہت سا بدل بھی گئی تھی۔ ان کی اکڑی گردن اور تنفر بھری نگاہوں میں واضح فرق آ چکا تھا۔ اب وہ حسن آرا خالہ کا خیال کرنے لگے تھے۔ انسان کو قربت میں باندھے یا نہ باندھے لیکن دکھ کی سانجھ انسانوں کو ہمیشہ جوڑ دیتی ہے رونے کے لیے ایک دوسرے کا کندھا دستیاب ہوتا ہے تو انسانوں کے بیچ ہر فاصلہ ختم ہو ہی جاتا ہے۔ انور صاحب حسن آرا بیگم اور اپنے بچوں کے بے حد قریب ہو گئے تھے۔ منزہ کی موت پر حسن آرا خالہ نچڑ کر رہ گئی تھیں لیکن شریکِ سفر کے ساتھ اور محبت نے ان کے اندر تک توانائی بھر دی تھی۔ دوبارہ سے زندگی، ان کی لگنے لگی تھی۔

سب نے اس تبدیلی کو بہت واضح طرح محسوس کیا تھا اور یہ تبدیلی سب کو اچھی لگی تھی۔ انسان بعض اوقات اپنی زندگی کی بہت اہم یادوں کو کھو کر سبق سیکھتا ہے انور صاحب بھی مچھلی کی طرح پتھر چاٹ کر واپس آئے تھے۔

علیزے نے سرخ اور رائل بلیو کنٹراسٹ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر سرخ آنچل اور بنا ہار سنگھار کے بھی وہ کسی گڑیا کی طرح من موہنی لگ رہی تھی۔

عبدالولی نے ایک بھرپور نگاہ اس پر ڈالی۔

جب سے اس کے حقوق ولی کے نام ہونے کا اعلان ہوا تھا۔ ولی بلاجھجک علیزے کو دیکھا کرتا تھا اس کا اپنے ہونے کا احساس ولی کے اندر تک خوشی کو بھر دیتا تھا۔

"آپ نے کھانے پہ اس قدر تکلف کیوں کیا؟" احمد شاہ نے دسترخوان کو پُرتکلف دیکھ کر کہا۔

"آپا! میرا دل بہت دنوں بعد ہوا کہ میں کچھ کروں میں نے یہ بریانی اور چپلی کباب خاص طور پر آپ لوگوں کے لیے بنائے ہیں۔ آپ کی وجہ سے میں اپنی بیماری بھول کر کچن میں کھڑی ہو سکی تھی۔"

حسن آرا نے سچائی سے جواب دیا۔

"عبدالولی بیٹا کتنے عرصے کے لیے رہنے کا پروگرام ہے؟" انور صاحب نے پوچھا۔

"انکل میں چھ ماہ بعد چکر لگاؤں گا۔ ویسے کورس تو دو سال بعد ختم ہوگا۔" عبدالولی نے علیزے پر ایک نگاہ ڈالی اس کے جانے کا سن کر اس کے چہرے پر اداسی کے بادل چھا گئے تھے۔

"چھ ماہ بعد!" حسن آرا بیگم کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔

''دو سال مزید! بیٹا یہ تو بہت زیادہ ہیں۔'' حسن آرا بیگم نے بے ساختہ کہا۔

''میرا دل تھا کہ اب علیزے کی صورت میں کوئی خوشی دیکھ لوں۔'' وہ اپنی طبیعت کے اوپر نیچے ہو
ے بہت گھبرائی ہوئی تھیں۔ علیزے کچھ غیر محسوس انداز سے وہاں سے اُٹھ کر باہر نکل گئی۔

''اگر بیٹا! تمہیں اعتراض نہ ہو تو تمہارے چھ ماہ بعد نکاح کی ایک تقریب کر لیتے ہیں۔'' احمد شاہ
قریب بیٹھے عبدالولی سے سرگوشی میں مشاورت کی۔

''جیسے آپ کی مرضی!'' عبدالولی نے ہمیشہ کی طرح تابع داری دکھائی، حالاں کہ وہ بیچ کورس میں
باتوں سے بچنا چاہتا تھا۔

''بہن! اگر ایسی بات ہے تو ہم ولی کے آنے کے بعد نکاح کی تقریب کر لیتے ہیں اور رخصتی ولی
مکمل واپسی کے بعد ہو جائے گی۔'' احمد شاہ کی بات نے دونوں ماں باپ کے چہرے کھلا دیے تھے۔
منزہ کے قتل اور کاشف کی مشکوک روپوشی کی وجہ سے خاندان کے لوگ اور ملنے جلنے والے ان سے
دور رہنے لگے تھے، جیسے ان کے خاندان میں چھوت کی بیماری ہوگئی ہو۔ تب سے حسن آرا اور
صاحب کو یہ لگنے لگا تھا کہ علیزے کے رشتے پر بھی یہ اثر نہ پڑ جائے۔

''تو ٹھیک ہے، پھر ٹھیک چھ ماہ بعد عبدالولی کے آنے پر دونوں بچوں کا نکاح کر دیا جائے گا۔'' احمد
نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپا آپ کو بہت مبارک ہو!'' روشن آرا بیگم نے کہا۔

''خیر مبارک!'' حسن آرا بیگم نے بہن کو مبارک دی۔

''ارے ایسے سوکھے منہ بھی مبارک باد ہوتی ہے۔ میں ابھی مٹھائی لے کر آتا ہوں۔'' انور صا
کے اندر تو انائی بھر گئی تھی وہ تیزی سے باہر نکلے۔

چائے ٹرے میں لاتی علیزے نے اندر کا خوش گوار ماحول دیکھا تو سب کے چہرے پڑھنے کی کو
کی۔

سب کے چہروں سے ہوتی ہوئی نگاہ جب عبدالولی پر پڑی تو اس کی نگاہوں میں ایک عجیب سی
تھی کہ اس کے کانوں کی لویں تپنے لگیں اور دل بہت تیز دھڑکنے لگا۔

''اِدھر آؤ بیٹا!'' روشن آرا بیگم نے علیزے کے لیے اپنے قریب جگہ بناتے ہوئے کہا۔

علیزے کچھ جھجک کر ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔ روشن آرا بیگم نے اس کا ماتھا چوما اور اپنے ہاتھ میں
خوب صورت کنگن اُتار کر علیزے کو پہنا دیا۔

''حسن آرا! ٹھیک چھ ماہ بعد یہ گڑیا ہماری ہو جائے گی انشاء اللہ!'' روشن آرا بیگم کی بات پر علیز
سمجھ آئی کہ سب کے چہرے اور خاص طور پر عبدالولی کی نگاہیں کیا بول رہی تھیں۔ اس نے ایک دم
کر اپنا سر جھکا لیا، اسے اپنی خوش قسمتی پر ناز ہو رہا تھا کہ بہت پیار کرنے والے اور قدر دانے والے خاندا
ساتھی کے ساتھ وہ زندگی گزارنے جا رہی ہے۔ لیکن جانے کیوں اتنی ڈھیر ساری خوشی میں بھی اس
دل کا ایک کونہ کچھ چپ چپ اور گم سم سا تھا۔ بے اختیار اس کے لبوں پر دعا آئی۔

''پروردِگار! میری خوشیوں کو سلامت رکھنا۔'' اس نے چور نگاہ ولی پر ڈال کر کہا۔

❖❖ ◯ ❖❖

خار پھولوں کے عوض دے گئی دنیا ہم کو
خواب کیا دیکھا تھا، تعبیر ملی کیا ہم کو
ہم نے تو وادیٔ شبنم کی تمنا کی تھی
زندگی دے گئی تپتا ہوا صحرا ہم کو

کان کا سارا وجود پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کا منہ سوجھ کر بہت بڑا ہو گیا تھا سارے جسم پر بے حد
ل اور زخم تھے۔ دانتوں کے زخم سے بازو میں زہر پھیلنے کا خطرہ تھا اس لیے ڈاکٹرز نے ان زخموں کی
ی لی تھی اور اس انفکشن سے مسکان کی موت بھی واقع ہو سکتی تھی۔ اس کا پور پور دکھ رہا تھا۔

ڈاکٹر تو کہہ کر چلا گیا لیکن سید سرفراز علی تو جیسے پتھر کے ہو گئے۔ چند گھنٹوں میں ہی وہ بہت بوڑھے
لگے تھے۔ مسکان کی تکلیف وہ خود پر محسوس کر رہے تھے۔ وہ گم سم دھیرے دھیرے چلتے ہوئے آئی
ے شیشے کے باہر آ کھڑے ہوئے۔

''...کان...!'' ان کے لب پھڑپھڑائے۔

بستر پر پٹیوں میں لپٹی زخم زخم ادھڑی ہوئی لڑکی تھی ان کی تو بیٹی نہ تھی۔ ان کی بیٹی تو بہت خوب
ت تھی۔ سنہری بالوں، کتھئی آنکھوں والی یہ گڑیا تو ان کی جان تھی، وہ اس کے چہرے سے عشق کرتے
اس کے چہرے میں وہ اپنی محبوبہ کا چہرہ دیکھتے تھے۔ عائشہ کا چہرہ دیکھتے تھے۔

ایک تو اللہ نے ان کے دل میں مسکان کے لیے خاص طرح کی محبت رکھ دی تھی، دوسرے عائشہ کے
لی مماثلت بھی مسکان میں بے حد کشش کا باعث تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس محبت میں اضافہ
گیا۔

لیکن بات جب روایات کی آئی تو وہ ان سب محبتوں کو بھول گئے تھے ان پر تو زمین اور روایات کو
پانے کا جنون تھا اور آج اس جنون کی بھینٹ ان کی اپنی خود کی بیٹی چڑھ گئی تھی۔

''مسکان....!'' وہ دھیرے سے بولے۔

ان تک شیشے سے پار ان کی آواز نہ جا سکتی تھی۔ اگر وہ اس کے پاس بھی کھڑے ہوتے تو بھی وہ ان
آواز نہ سن سکتی تھی کیوں کہ جب جب وہ ہوش میں آتی تو درد اس قدر زیادہ ہوتا تھا کہ وہ بے حد چیخنے
لگتی۔ اس لیے ڈاکٹر نے اسے پین کلرز اور بے ہوشی کی دوائیاں دے کر سلا رکھا تھا کیوں کہ نیند اسے
ے بیگانہ رکھتی تھی اور ہوش میں تو صرف اور صرف درد تھا۔

''میری بچی...!'' وہ پہلی بار سسکے تھے۔ ان کے دل پر چھریاں چل رہی تھیں۔

''مت کہو اسے اپنی بچی!'' ان کو اپنے پیچھے ایک روتی آواز سنائی دی۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا تو وہ آیا
تھیں۔

''انیسہ!'' وہ کچھ کہنا چاہتے تھے کہ ان کے ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے یوں لگتا تھا کہ ایک دم اُن کے
اس ے اِدھر اُدھر سے دھند چھٹ گئی ہو اور اب صرف اور صرف مسکان اور اس کا درد ان کے سامنے تھا
ان کا دل چیر رہا تھا۔

''پہلے خود ہی اسے دوزخ میں مرنے کے لیے دھکیل دیا اور اب ٹسوے بہا رہے ہو، میری پھول
جیسی بچی کی تم نے کیا حالت بنوادی!'' آیا اماں کا رو رو کر گلا بیٹھا ہوا تھا۔

''اسے کچھ ہوگیا تو میں کبھی خود کو معاف نہ کرسکوں گی۔ آہ! میں اس کی جنت مکانی ماں سے کیا و
تک نہ نبھا سکی میں۔ اس کی حفاظت نہ کرسکی۔'' آیا اماں رو رہی تھیں۔

سید سرفراز یوں تھک کر بینچ پر ڈھے گئے جیسے وہ ایک دم کوئی بہت بڑی بازی ہار گئے ہوں۔

''میں نے اپنی بچی کی خوشیاں تباہ کردیں!'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائے۔

''تم نے مسکان کی خوشیاں، اس کی زندگی سب کچھ تباہ کردیا۔ تم قاتل ہو! تم قاتل ہو! کیسی تمہا
محبت ہے، جو کبھی کسی کو سکھ نہیں دے سکتی۔ تمہارا وجود کیسا گرہن جیسا ہے جس کے ساتھ جڑتا ہے و
اندھیرا کردیتا ہے۔'' نفیسہ بیگم کا بس نہ چل رہا تھا کہ سید سرفراز علی کا سر پھاڑ دیں۔

حیرت تھی کہ سید سرفراز علی بے حد صبر وتحمل سے سب کچھ برداشت کررہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ و
سب کچھ سننا چاہتا ہو۔

''کیا کیا تھا میری بچی نے؟ بس کسی کو چاہتی تھی! اور یہ محبت تو تھی بھی یک طرفہ... اگر تم کو اس کی
سے شادی نہیں کرنی تھی تو کم از کم اظہر علی کے ساتھ اس کی زندگی تو نہ تباہ کرتے۔'' نفیسہ بیگم نے
سے پھنکارتے ہوئے کہا۔

سید سرفراز علی کو واقعی بے حد پچھتاوے نے گھیرا، وہ گڑیا اپنی پیاری گڑیا کو کیسے اپنے ہی ظلم کی بھ
چڑھا گئے تھے۔

''کون تھا یہ لڑکا، جسے مسکان چاہتی تھی؟'' انہوں نے ایک دم نفیسہ بیگم سے سوال کیا۔

''اب کیا فائدہ ان باتوں کا؟'' نفیسہ بیگم نے چادر کے پلو سے آنسو صاف کرتے ہوئے مسکا
سوچا ہوا وجود دیکھا۔

''میں جو پوچھ رہا ہوں اتنا بتاؤ!'' سید سرفراز علی نے حسبِ عادت دبنگ لہجے میں کہا۔

نفیسہ بیگم کچھ دیر کو ناراضی سے چپ رہیں۔

''تم کو اب کیا سوجھ رہی ہے؟'' آیا اماں نے سسکتے ہوئے کہا۔

''نفیسہ! میں وقت کا پہیہ اُلٹا چلا لوں گا، میں اپنی بیٹی کو سب کچھ دوں گا جو کچھ وہ چاہتی تھی۔''

سرفراز کی باتوں پر آیا اماں نے ایک ناراض نگاہ ان پر ڈالی۔

''اب کیسے کرو گے یہ سب کچھ، اب تمہاری ناک نہ کٹے گی... غیروں میں بیٹی بیاہتے؟''

''نفیسہ! تم سے میں نے پوچھا ہے وہ کون لڑکا تھا؟ اگر تم نہ بتاؤ گی تو میں خود پتا کروالوں گا۔
سرفراز علی تو کبھی بھی بے بس نہیں رہا۔ وہ جو جاننا چاہتا، کرنا چاہتا ہمیشہ کرکے رہا ہے۔''

''کیا کرو گے سرفراز؟''

''میں اپنی بیٹی کی شادی اس سے کرواؤں گا۔'' سید سرفراز علی نے خوش ہوکر کہا۔ ان کو ایک دم اپن
ہلکا پھلکا محسوس ہوا۔ اتنی دیر سے جس بوجھ میں وہ دبے ہوئے تھے، وہ ایک دم اُتر گیا تھا ایسے جیسے
فیصلے پر پہنچ گئے ہوں۔

وہ زندہ بچے گی تو تب نا!'' نفیسہ بیگم نے طنز سے کہا۔ اسے اس حال پر پہنچا کر بھی اس شخص کو مزید
املے لینے کی پڑی ہے۔

ں... میں اس کے لیے زندگی مانگ کر لے آؤں گا... میں اسے ہر خوشی دوں گا۔''

وہ تمہاری شکل تک دیکھنا نہیں چاہتی۔'' نفیسہ بیگم نے اسے احساس دلایا۔

ں اپنی بیٹی کو منالوں گا... بس وہ ایک بار ٹھیک ہوجائے میں اپنی بیٹی کو ہر خوشی دوں گا... تم بتاؤ
یا نام ہے اس لڑکے کا؟'' نفیسہ بیگم نے یک ٹک ان کا چہرہ دیکھا اور پھر دھیرے سے بولیں۔

بدالولی!'' ان کا لہجہ سرسرا رہا تھا، جس پر سید سرفراز کی توجہ نہ جاسکی۔

بدالولی! ٹھیک ہے! میں اپنی بیٹی کو عبدالولی کے نام کی خوشی ضرور دوں گا۔'' انہوں نے کہا۔

اگر... اگر لڑکا نہ مانا تو؟'' نفیسہ بیگم نے پوچھا۔

ہونہہ! سید سرفراز علی نے آج تک کسی کو نہیں پوچھا وہ صرف حکم دیتا ہے اور وہ جو چاہتا ہے وہ کرتا
م دیکھنا اگر خوشی راضی سے یہ رشتہ ہوا تو میں ہر صورت میں یہ رشتہ کروں گا۔ یہ سید سرفراز علی کی
ہے کہ مسکان سرفراز علی کی شادی اسی لڑکے سے ہوگی، عبدالولی کی اگر شادی ہوگی تو صرف مسکان
ورنہ وہ ہمیشہ کنوارا رہے گا...'' سید سرفراز علی کے جنونی لہجے پر آیا اماں کا دل مزید ہراساں ہوا۔

انہوں نے شیشے کے پار درد میں ڈوبے مسکان کے وجود کو دیکھا۔ اگر وہ بچ گئی تو کیا بی ہیو کرے
یہ وہ خود بھی نہ جانتی تھیں، کیا اب بھی اس کی زندگی میں وہ ہی باتیں، چیزیں اہم ہوں گی جو پہلے
ں

ہت سارے سوال اُٹھ کر ان کے اِردگرد اکٹھے ہوکر شور مچانے لگے تھے۔

❖❖○❖❖

راستے، دل، نظر اداس اداس
کر رہا ہوں سفر اداس اداس
غم کی برسات کرگئی سارے
پھول، پتے، شجر اداس اداس
تم نہیں ہو تو زندگی اپنی
ہو رہی ہے بسر اداس اداس
جانے کیوں آسمان چپ چپ ہے
کیوں ہیں شمس وقمر اداس اداس
کوئی پوچھے مجھے تو بتلانا
جی رہا ہوں مگر اداس اداس
رونقیں تو تمہارے دم سے تھیں
تیرے بن ہے نگر اداس اداس
فاصلے کیفیت بدل نہ سکے

میں اِدھر وہ اُدھر اداس اداس

علیزے نے کبوتروں کو دانہ ڈال کر پلیٹ دیوار پر رکھ دی اور خود چپ چاپ اپنے ہاتھ دیوار پر اپنی ٹھوڑی اُس پر رکھ کر ڈوبتے سورج کو دیکھا۔

ولی کی آج فلائیٹ تھی۔ شاید اب تک وہ چلے بھی گئے ہوں۔ اس کا دل بے حد اداس تھا۔

بے شک ولی سے ٹیلی فون یا ملاقات کا کوئی رابطہ نہ تھا لیکن دل کو تسلی رہتی تھی کہ وہ ان ہی فض میں رہتا ہے۔ یہ ہوائیں اس کو چھو کر جب اس کے پاس آتیں تھیں تو اسے ولی کی موجودگی کا اح اِردگرد ہوتا تھا۔ علیزے کو خود بھی پتا نہ چلا کہ کب وہ ولی کے نام کے سنگ اتنی دور تک آ نکلی تھی۔

''شاید محبت اُسے ہی کہتے ہیں کہ کوئی دور جا رہا ہو تو دل بے کل ہو کر رہ جاتا ہے۔'' علیزے دھیرے سے کہا۔

''بالکل! درست فرمایا آپ نے!'' نِگی نے ایک دم اس کے سامنے آتے ہوئے کہا۔ اب ذرا سے نیچے تشریف لائیں مجھے ضروری کام سے آپ کو ساتھ لے جانا ہے، خالہ سے میں نے اجازت لی ہے۔'' نِگی بے حد جلدی میں تھی، اس لیے وہ اس کا بازو کھینچ کر نیچے لے آئی۔

''ارے آخر کیا ہو گیا، کس بات کی جلدی ہے؟'' علیزے نے جوتے بدلتے ہوئے پوچھا۔

''کام ہے! کچھ شاپنگ کرنی ہے چلیں جلدی۔'' نِگی جلدی جلدی بولتی اسے لے کر گاڑی آ بیٹھی۔

''یہ؟'' گاڑی رکی تو علیزے نے بے اختیار سوال کیا تھا۔

''یہ تو!''

''جی بالکل! آپ درست سمجھیں، اب جلدی کریں بیچارے بہت دیر سے آپ کی راہ تک رہے کہیں ان کی فلائیٹ ہی مس نہ ہو جائے۔'' نِگی علیزے کو ایئر پورٹ لے کر آئی تھی۔ اب وہ اس کا پکڑے تقریباً بھاگ رہی تھی۔

سلیپری فرش پر علیزے کا پاؤں کئی بار پھسلا تھا لیکن نِگی ہیل والا جوتا پہنے بھی تیزی سے یوں رہی تھی، جیسے پانی کی سطح پر چل رہی ہو۔

''امیر لوگوں کے لیے ایسے فرشوں پر ہر جوتے کے ساتھ چلنا کب مسئلہ ہوگا۔'' علیزے کو ایک کے لیے احساس کمتری نے گھیرا۔

یہ بڑی بڑی شیشے جیسی عمارتیں ہمیشہ اس کے اندر اپنی برتری کا احساس دلا کر اُس کے دل کو س تھیں۔ اسے ایک دم اپنا آپ بونا لگتا۔ ایک بار اس نے یہی بات حسن آرا بیگم کو بتائی تو کچھ پل خاموش رہیں اور پھر ایک دم مسکرا دیں، جیسے وہ کسی حل کو پا گئی ہوں۔

''تمہارے دل میں اگر اللہ جی رہتے ہیں تو پھر تم جان لو کہ یہ بڑی بڑی عمارتیں اور بڑے بڑے سب عام سے اور چھوٹے ہیں کیوں کہ تمہارا تو سب سے بڑی ذات پر قبضہ ہے، اس کا ساتھ ہے سے بھی بڑے ہیبت ناک پہاڑوں کا خالق ہے، یہ عمارتیں پہاڑ اور ان میں رہنے والے سب کے اسی کے کہنے سے وجود میں آئے ہیں، ان کے پاس اصل میں کوئی طاقت نہیں ہے۔ سب چھوٹا۔

اا ''اللہ اکبر ہے!'' حسن آرا بیگم کی بات جیسے ہی علیزے کے اندر بازگشت کی طرح گونجی تو اس کے اندر میں ایک دم خود اعتمادی آ گئی اسے اِردگرد کے بنے سنورے لوگوں سے خوف ختم ہو گیا۔

''بے شک! اللہ آپ ہی سب سے بڑے ہیں!'' علیزے نے شکر بھرا اقرار کیا۔

''وہ دیکھیں آپی! بھائی ادھر کھڑے ہیں!'' نِگی نے اسے متوجہ کیا۔

''جلدی چلیں بہت دیر ہو چکی ہے!'' نِگی تیزی سے ولی کی جانب بڑھی اور دوڑ کر ولی کے بازو سے جا لی

''بھائی آئی وِل مس یو!'' نِگی نے تڑپ کر کہا۔

''تم کو کس نے روکا ہے، تم ملنے آ جانا بابا سائیں اور امّاں جان دو ماہ بعد میرے ہاں چکر لگائیں گے۔'' ولی نے اسے تسلی دی۔

''پھر بھی بھائی! دو ماہ تو ہیں!'' نِگی واقعی اداس ہو رہی تھی۔

''پگلی بچی جب تمہاری شادی ہوگی پھر بھی تو تم نے رخصت ہو کر ہم سے دور جانا ہے پھر کیسے رہو گی۔ اپنے دل کو بڑا کرو۔'' ولی نے فوراً اسے نصیحت کی اور دھیرے دھیرے اس کے ساتھ چلتا علیزے تک پہنچا۔ نِگی نے دونوں کا ایک دوسرے کو بے اختیار تکنا فوراً نوٹ کیا تھا۔

''بھائی! بابا اور امّاں جان کدھر ہیں؟'' نِگی نے پوچھا۔

''وہ امّاں جان کو واش روم کی جانب وضو کرانے لے کر گئے ہیں۔'' ولی نے جواب دیا۔

''میں بھی ہو کر آتی ہوں۔'' نِگی کہہ کر واش روم کی طرف بڑھی، کچھ پل کو وہ ولی اور علیزے کو مکمل تنہائی دے گئی تھی۔

''میں جا رہا ہوں، اب بھی چپ رہو گی لڑکی!'' ولی نے گم سم علیزے کو دیکھ کر مسکرا کر پوچھا۔

''خیر سے جائیں، خیر سے واپس آئیں!'' علیزے نے نگاہ اُٹھا کر دعا دی۔

''اور واپسی پر تمہارے لیے کیا لاؤں، کوئی گوری میم چلے گی؟'' ولی نے شرارت سے کہا۔

''آپ ایسے تھوڑا ہی ہیں!'' علیزے نے مسکرا کر کہا۔

''تو پھر کیسا ہوں، کیا تم مجھے جاننے لگی ہو؟'' ولی نے گھمبیر آواز میں پوچھا۔

''آپ... آپ بہت!'' وہ اچھا کہتے کہتے رک گئی۔

''آپ بہت کیا؟'' ولی متوجہ تھا۔

''بہت شیطان ہیں! لفظ پکڑتے ہیں۔'' علیزے نے کہا۔

''اچھا چھوڑو! یہ بتاؤ مجھے مس کرو گی؟'' ولی نے اشتیاق سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اوں ہوں!'' علیزے نے نفی میں سر ہلایا۔

''ایسا ہے کیا؟'' ولی نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''بالکل! مس تو اسے کیا جاتا ہے، جو آپ سے دور ہو آپ تو ہمیشہ میرے آس پاس ایک مضبوط حصار کی طرح رہتے ہیں۔'' علیزے کا لفظ لفظ اظہار کر رہا تھا، ولی کا دل کھل گیا۔

''کبھی کبھی اظہار بالکل زندگی کی طرح ضروری ہوتا ہے۔ You Have made my

!day۔'' ولی نے اس کے اظہار پر خوش ہو کر کہا۔

''تمہارا یہ اظہار میں سنبھال کر لے جا رہا ہوں۔ تنہائی میں تمہاری یاد میں کام آئے گا۔'' ولی نے ایک دم اس کا ہاتھ گرم جوشی سے دبا کر چھوڑا تو علیزے کے ایک برقی رو سر سے پیروں تک گزر گئی۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ رابطے میں رہو۔'' ولی نے اسے ایک موبائل سیٹ پکڑایا۔

''یہ...؟''

''لیکن ولی! امّاں ابا کو کیا بتاؤں گی؟'' علیزے نے پریشانی سے کہا۔

''تم خالہ کو فوراً بتا دینا۔ اگر وہ اجازت دیں تو اسے آن کر کے سب سے پہلے ان کی ہی مجھ سے بات کرانا اگر وہ نہ مانیں تو بھی ہمارے دل کے رابطے تو برقرار ہیں۔ وعدہ کرو کہ دل کے تاروں اور اس کے سٹیلائیٹ میں کوئی رکاوٹ نہیں آئے گی تم اپنا ہر مسئلہ مجھ سے شیئر کرو گی۔'' وہ جاتے جاتے اسے کتنا معتبر کر رہا تھا۔ اس کی ساری پریشانیوں کو اپنے سر لینے کا کہہ رہا تھا۔

''بولو...!'' ولی نے پوچھا۔

''ٹھیک ہے!'' علیزے دھیمے سے مسکرا دی۔

''دیٹس لائیک مائی گرل!'' ولی کو اس کی اتنی اپنائیت بہت اچھی لگ رہی تھی، زندگی میں ایک وقت اور کوئی ایک رشتہ ضرور آتا ہے جس پر ہم کوئی حد نہیں باندھتے ہیں۔

''بھائی ہم آ رہے ہیں۔'' نکی نے کچھ فاصلے سے آواز دی۔

''او کے علیزے!'' ولی نے ایک بار پھر علیزے کا ٹھنڈا ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں لے کر گرم جوشی سے دبایا۔

''اللہ کے سپرد!'' علیزے نے کہا۔

ولی فوراً سب کی جانب مڑا اور پھر سب سے ملتا ہوا اندر چلا گیا، علیزے کے اندر جو اداسی کا بسیرا تھا اب نہ تھا۔ اب اس کے اندر خود اعتمادی تھی۔

کسی کے ساتھ اور پیار کا احساس آپ کو اکیلے اور اداس نہیں ہونے دیتا۔ ولی کو رخصت کر کے جس وقت وہ گاڑی میں آ کر بیٹھنے لگی تو اس نے آسمان پر اُڑتے ایک جہاز کو دیکھا، اُسے لگا کہ اسی میں ولی موجود ہے۔ علیزے نے بے اختیار کہا۔

''جلدی آ ئیے گا ولی!''

محبت کا احساس دلا کر وہ شخص اسے مکمل طور پر اپنے حصار میں باندھ کر چلا گیا تھا۔

❖❖○❖❖

اے ماں!
آتا ہے یاد مجھ کو
شانوں پہ تیرے وہ جھولنا مرا
ماتھے کو میرے ہر دم وہ چومنا ترا
انگلی کو تھام کے مجھے چلنا بھی سکھایا

بولنا، لفظ کو پڑھنا بھی سکھایا
لڑھکا جو کبھی تھام لیا تو نے
رویا جو کبھی بھینچ لیا تو نے
زندگی میں جب کٹھن موڑ کوئی آیا
فقط تیری دعاؤں سے ملا مجھ کو سہارا
ٹھوکر جو لگی تو نے سنبھالا مجھ کو
گر جو گیا تو نے اُٹھایا مجھ کو
مرے دکھ نے تجھے تڑپایا ہے
خوشیوں نے مری تجھ کو ہنسایا ہے
دنیا میں فقط تو ہی مری خیر اندیش
بے غرض و جانثار پُر خلوص
مشکل نے جو گھیرا کبھی راہوں کو میری
کام آئی ہیں سدا صرف دعائیں تیری
وہ گود سر رکھ کر جس پہ میں سوتا تھا
آرام و سکون جس سے مجھے ملتا تھا
میں نشاں ہوں تری محبتوں، عطاؤں کا
تری بے غرض وفا، سحر کی دعاؤں کا
ترے قدموں تلے جنت ہے جان گیا ہوں
تو جو نہیں تو یہ سب کچھ مان گیا ہوں

''ترنم! یہ فون بند کرو اور میری بات غور سے سنو۔'' ماہی ایک دم کمرے میں داخل ہوئی۔ ترنم نے فون بند کر کے اُس کی طرف دیکھا۔

''تم کہاں فون کر رہی تھیں؟'' ماہی نے پوچھا۔

''جانتی ہو تو بار بار کیوں پوچھتی ہو؟'' ترنم نے بیڈ پر لیٹے ہوئے پوچھا۔

''تم اپنی مدر کے لیے پوچھ رہی ہو نا؟'' ماہی نے پوچھا۔

''ہاں! میں نے ایک این جی او سے رابطہ کیا تھا انہوں نے مجھے مختلف دارالامان اور پاگل خانوں کے نمبرز دیے تھے جہاں میں پتا کروا رہی ہوں کہ شاید کہیں سے ان کا معلوم ہو سکے۔'' ترنم نے تھکے تھکے لہجے میں اب تک کی مسلسل کوشش گوش گزار کی۔

''کیا تم شیور ہو کہ وہ ضرور اس طرح کے ادارے میں ہی ہوں گی۔ ہو سکتا ہے کسی گھر نے ان کو پناہ دے رکھی ہو۔'' ماہی کی بات پر جہاں ترنم نے چونک کر دیکھا، وہیں اس کا دل بُری طرح ڈوبا کہ اگر ایسا ہوا تو وہ کہاں اتنی بڑی دنیا میں اپنی ماں کو تلاش کرے گی۔

''یا میرے اللہ!'' ترنم نے بے اختیار اپنا سر اپنے ہاتھوں پر گرا لیا۔

جب سے اُس نے اپنی ماں کے متعلق سنا تھا اس کا دل کرتا تھا کہ وہ اُڑتی ہوئی اپنی ماں کے پاس جائے لیکن جتنا وہ اسے تلاش کرنے کی کوشش تیز کرتی، اتنا ہی وہ مایوسی کا سامنا کررہی تھی۔

''امّاں! میری پیاری ماں!
تجھے ڈھونڈوں کہاں؟'' ترنم بے اختیار سسکی۔

''ترنم حوصلے سے ...اب تم نے کچھ کرنے کا عہد کیا ہے تو حوصلے اور صبر سے کرو۔ اللہ تمہاری کرے گا۔'' ترنم نے چونک کر ماہی کو دیکھا۔ یہ ماہی تھی، جو اُسے تسلیاں دے رہی تھی۔ گئے دنوں ماہی کے اندر خاصی تبدیلی آ گئی تھی۔

ترنم اکثر اسے دیکھ کر چونکتی تھی، ماہی کے بدلنے کی وجہ وہ ابھی تک جان نہ پائی تھی اگر جان پاتی شاید اتنی حیران نہ ہوتی کیوں کہ موت کے دہانے پر کھڑا شخص یا تو بے حد خوف زدہ ہوتا ہے یا پھر بہادر! اور ماہی بے حد بہادر ہوگئی تھی۔

''ہاں تم کیا کہنے ئی تھیں؟'' ترنم نے سائیڈ ٹیبل کی دراز سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔

''پلیز اسے تو بند کرو، میرا دل گھبراتا ہے۔'' ماہی کے کہنے پر ترنم نے ایک بار پھر چونک کر اسے دیکھا کیوں کہ کچھ عرصے پہلے ماہی خود بھی سگریٹ نوشی کرتی تھی۔

''یہ ماہی نے سگریٹ کیسے چھوڑی؟''

''وہ راگنی چڑیل نے تمہاری ڈیوٹی وڑائچ کے ساتھ لگائی ہے۔''

''وڑائچ کے ساتھ آج میں جاؤں گی، کم بخت بہت کرپٹ ہے، بہت ساری لڑکیوں کی زندگی تباہ ہے اب اسے مزید نہیں جینا چاہیے اس لیے اس کے ساتھ میں جاؤں گی۔'' ماہی نے آخری لفظ بڑ کر کہے۔

''یہ تمہیں آج کل کیا مصیبت آئی ہوئی ہے ہر کیڑے مکوڑے کے ساتھ جارہی ہو، انسان ہو کہ مشی تھکتی نہیں؟'' ترنم نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔

''بہت سارے حساب باقی ہیں، میرے پاس وقت کم اور کام زیادہ ہے جب میں نہ ہوں گی لیکن دیکھنا یہ لوگ مجھے ضرور یاد کریں گے۔'' ماہی خود ہی ہنستی چلی گئی لیکن اس کی ہنسی ٹوٹے ہوئے کانچ طرح تھی۔ ہنستے ہنستے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔

''ماہی!'' ترنم ایک دم لیٹے سے اُٹھ بیٹھی۔

''تمہیں کیا ہوا ہے؟ تم اس طرح کی باتیں کیوں کررہی ہو؟'' ترنم واقعی پریشان تھی۔

''ارے ڈونٹ وری بے بی! آخر کمپنی کا اثر تو ہونا ہی تھا نا! تمہارے زیرِ سایہ رہنے سے اس طرح ابنارمل باتیں کرنا انتہائی نارمل ہے۔'' ماہی نے فوراً ہنستے ہوئے بات کو ٹالا۔

''لیکن...لیکن میں کچھ اور محسوس کررہی ہوں۔'' ترنم فوراً سمجھ نہ پارہی تھی کہ یہ سب کیا ہے لیکن وہ ضرور جان گئی تھی کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔

''ارے جناب! میں نے چھ سال تمہاری ابنارمیلٹی کو بھگتا ہے۔ آخر مجھ پر کچھ اثر تو ہونا تھا نا۔ آج شام کے لیے تم فری ہو، تم ماں جی کے لیے جاؤ انہیں ڈھونڈنے کے لیے کسی نجی ادارے کی مدد

آج کل کئی نجی سراغ رساں کمپنیاں بھی تو نظر آتی ہیں۔'' ماہی کہہ کر باہر نکل گئی۔

''یہ ماہی کیا کرتی پھر رہی ہے، کیسی کھچڑی ہے، جو مجھے سمجھ نہیں آرہی۔'' ترنم نے باآواز بلند خیال ظاہر کیا لی۔

❖❖○❖❖

''اللہ! کدھر تھے آپ؟'' سائرہ نے طارق کو گھر میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''اللہ کی بندی ذرا سانس تو لینے دو۔'' طارق نے مسکرا کر اس کے سر کے بالوں کو بکھیرتے ہوئے کہا۔

''اللہ! آپ تو اتنا زیادہ گھر سے غائب رہتے ہیں کہ مجھے آپ پر شک ہونے لگتا ہے۔'' سائرہ کی بات پر طارق کے چہرے پر اِک سایہ لہرایا۔

''شک! کیسا شک؟'' اس کے اندر کا چور ہر وقت الرٹ رہتا تھا۔

''یہی کہ آپ نے یقیناً پرموشن لے لی ہے اور اب آپ نے اپنا کام مزید بڑھا لیا ہے۔'' سائرہ نے معصومیت سے کہا تو طارق کے تنے ہوئے اعصاب ایک دم ڈھیلے پڑ گئے۔

''دراصل میں آپ کو مسلسل فون کررہی تھی، میں مسکان کی طرف جانا چاہ رہی تھی۔''

''مسکان! وہ یہاں شہر میں واپس آ گئی؟'' طارق نے پوچھا۔

''آئی نہیں بلکہ لائی گئی ہے۔''

''مطلب؟'' طارق نے پوچھا۔

''وہ بے حد بیمار ہے، مجھے آپا امّاں نے فون پر بس اتنا ہی بتایا تھا۔ کیا آپ میرے ساتھ چل سکتے ہیں؟'' سائرہ نے رک کر پوچھا۔

''اوہ۔ سوری یار! مجھے تو اگلے گھنٹے میں فوراً نکلنا ہے میں تو گھر ایک بہت اہم فائل لینے آیا تھا۔'' طارق نے معذرت کی تو سائرہ کا چہرہ اُتر گیا۔

''کم آن یار! تم سمعان کو لے جاؤ... میں اُسے فون کردیتا ہوں۔ تم لوگوں میں دوستی بھی تو ہے۔'' طارق نے مصروف انداز میں کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

''اوں! ٹھیک ہے میں سمعان کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔'' سائرہ میں ایک اچھی بات تھی وہ بات فوراً مان جایا کرتی تھی۔

''گڈ گرل!'' طارق نے اس کا سر تھپتھپایا۔

''والد کیسے ہیں کیا میں ان سے مل لوں؟'' طارق نے پلٹ کر پوچھا۔

''وہ دوا لے کر سو رہے ہیں۔ اُٹھایئے گا نہیں۔'' سائرہ نے کہا تو طارق اثبات میں سر ہلاتا اندر چلا گیا۔

''سمعان! ہاں سمعان سے کہتی ہوں کہ میرے ساتھ چلے...'' سائرہ کہتی ہوئی فون کی جانب بڑھی۔

❖❖○❖❖

کتنی ہی دیر گزر گئی لیکن کمرے میں موجود نفوس بے حد چپ تھے، ہر کوئی اپنی اپنی جگہ مختلف سوچوں میں گم تھا لیکن ابھی سب کی سوچ کا مرکز صرف اور صرف مسکان تھی۔

وقفے وقفے سے سائرہ کی سسکی کمرے کی خاموشی کا ارتکاز توڑتی رہی۔

"اتنا کچھ میری بہنوں جیسی سہیلی پر بیت گیا او مجھے آپ نے اب بتایا۔" سائرہ کے لہجے میں دکھ نمایاں تھا جیسے اگر وہ جان جاتی تو شاید اپنی سہیلی کو بچالیتی۔

"ہم سب اس کے لیے بے حد بے بس تھے، تم کیا کرلیتیں۔" آیا اماں ہارے ہوئے جواری کی بولیں۔

"مسکان کو اپنے شوہر کی موت کا بے حد دکھ ہوگا مزید اس کے سسرال والوں کا اتنا جان لیوا میری بہن پر کیا گزری ہوگی۔" سائرہ نے پیار سے بے سدھ لیٹی مسکان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

آیا اماں نے جواباً کچھ نہ کہا۔

وہ بھی سب چپ چاپ یک ٹک بے سدھ لیٹی مسکان کو دیکھتی رہیں۔

"آج اسے دسواں روز ہے، ایسے ہی سوئی رہتی ہے۔

دواؤں کا اثر جب جب ختم ہوتا ہے تو چیخیں مارتی ہے روتی ہے ڈاکٹر پھر نشہ آور ادویات سے سلا دیتے ہیں۔ جب تک یہ بے ہوش ہے یوں لگتا ہے کہ اسے سکون آ گیا ہے لیکن جب جب اسے آتا ہے تو... کیا اسے ہم ساری عمر بے ہوش رکھیں گے؟" آیا اماں کی آواز درد سے ڈوبی ہوئی تھی۔

سمعان ان دونوں کی گفتگو سے بالکل لاپروا بس چپ چاپ مسکان کے سوجے منہ اور وجود کو تھا۔

جانے کیوں اس کا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو کررہا تھا۔ مسکان کی تکلیف اسے اپنے پہ رہی تھی، اس لڑکی سے کبھی وہ اظہار نہ کرپایا تھا اسے ہمیشہ دیکھ کر یہ لگتا تھا کہ اس کا اس لڑکی رشتہ ہے تب ہی تو وہ اسے اپنے بے حد قریب لگا کرتی تھی۔ اُسی پل ڈاکٹرز روم کا دروازہ کھول آئے۔ ڈیوٹی ڈاکٹر اور نرسیں بڑے ڈاکٹر کے راؤنڈ کے وقت بے حد الرٹ تھیں۔

"ڈاکٹر عابد! میں نے آپ سے کہا تھا کہ مریضہ کی ذہنی حالت کی ہسٹری لیں۔" سرجن عثـ اپنے ماتحت ڈاکٹر سے پوچھا۔

"دیکھیں خاتون! آپ ہمارے ساتھ تعاون کریں گی تو مریضہ کی حالت میں بہتری آ مریضہ کے باہر کے زخم تو دواؤں کے ذریعے ٹریٹ ہورہے ہیں لیکن یہ سب بالکل بے سود ہے اگر ذہنی حالت کی ٹریٹ منٹ نہ کی گئی تو..." ڈاکٹر عثمان نے اماں کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔

"بچی ہوش میں آتے ہی بری طرح چیخنے لگتی ہے جس سے اس کے زخم اکھڑنے لگتے ہیں اس مجبوراً اسے سلا دیتے ہیں۔ لیکن آپ ہی بتائیں کہ ہم اسے کب تک سلائیں گے؟ اسے ہوش میں دنیا اور اس کے خود کا سامنا کرنے کے لیے تیار تو کرنا ہوگا نا...؟" ڈاکٹر نے آیا اماں اور سائرہ ہوئے کہا۔

"اس کے لیے ہمیں کیا کرنا ہوگا؟" سائرہ نے پوچھا۔

"اس کے لیے مریضہ کو ہمارے علاوہ کسی اسپیشل ڈاکٹر کی ضرورت ہے، جو اس کی ذہنی حا بہتری لاسکے۔" ڈاکٹر عثمان نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"مطلب؟" آیا اماں نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ ان کو کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھانا ہوگا۔" ڈاکٹر عثمان نے وضاحت کی۔

"اوہ!" سائرہ جیسے بات کی تہہ تک پہنچ گئی ہو۔

"ان کو اس وقت ڈاکٹر اکرم زبیر کی ضرورت ہے۔ وہ بے حد کامیاب نفسیات دان ہیں اور بے حد قابل انسان بھی! وہ انشاء اللہ آپ لوگوں کے لیے بہت بہتری کا باعث بنیں گے۔" ڈاکٹر عثمان نے ان تسلی دی۔

"کیا نام بتایا ہے ان کا، ہم جلدی ان سے رابطہ کرلیتے ہیں۔" سائرہ نے پوچھا۔

"ان کا نام ہے ڈاکٹر اکرم زبیر!" ڈاکٹر عثمان نے بتایا۔

"ڈاکٹر اکرم زبیر!" سائرہ کو یہ نام کچھ جانا پہچانا سا لگا پھر ایک دم اس کے دماغ میں جھماکہ سا ہوا۔ اس نے کچھ روز پہلے طارق لالہ کی جیب سے ایک کارڈ گرتے دیکھ کر اُٹھایا تھا۔ وہ ڈاکٹر اکرم زبیر کا تھا جو کہ مشہور نفسیات داں تھے۔

"ہوسکتا ہے لالہ ان کو جانتے ہوں، میں لالہ سے بات کروں گی کہ وہ مسکان کے لیے ان سے رابطہ کریں۔" سائرہ نے دل ہی دل میں سوچا۔

"لیکن لالہ کی جیب میں ایک سائیکاٹرسٹ کا کارڈ کیوں تھا۔" ایک بے ضرر سا خیال سائرہ کے دماغ کو چھو کر گزر گیا۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ بے ضرر سوال نہ تھا بلکہ اس کے بھائی کی زندگی کا بے حد اہم حصہ تھا۔

❖❖○❖❖

جیسے ہی سید سرفراز علی نے سید اظہر علی کی حویلی میں قدم رکھا تو وہاں موجود سب نفوس کو سانپ سونگھ گیا کان کی سب سے بڑی نند کا میاں شہر بانو کا ماموں تھا اس وقت وہ ہی سب کو اٹینڈ کررہا تھا۔

"آپ...؟" سید سخاوت علی نے گھبرا کر اُٹھتے ہوئے کہا۔

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ میرے داماد کا دسواں ہے، کیا مجھے نہیں آنا چاہیے تھا۔" سید سرفراز لی کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ جیسے دس روز پہلے ان کی بیٹی کے ساتھ کچھ بھی نہ ہوا ہو۔

"جی... جی ضرور!"

"پھر یہ میرے بیٹے کی سسرال بھی تو ہے نا!" انہوں نے اپنے ساتھ آئے بلال کی جانب اشارہ تے ہوئے کہا۔ وہ جس بات کا احساس دلانا چاہتے تھے سید سخاوت علی نے فوراً محسوس کرلی جب کہ لال بالکل چپ تھا۔ وہ تو ہمیشہ سے ایسا ہی تھا خود میں مگن رہتا تھا۔

"بالکل... بالکل! آپ مہربانی کر کے تشریف رکھیں۔" سید سخاوت علی نے بے حد مؤدب ہو کر کہا۔ یہی یا کم تھا کہ سید سرفراز علی اپنا غصہ تھوک کر دوبارہ بنا کہے ان سے ملنے آئے تھے۔ اس لیے وہ جتنے مشکور تے کم تھا۔

کچھ دیر سید سرفراز علی نے بیٹھ کر واپسی کی اجازت لی۔

"اچھا سائیں! اب ہم چلتے ہیں۔" وہ بے حد نارمل انداز میں مخاطب تھے۔ سب ہی نے شکر ادا کیا

کہ بات اتنی نہ بگڑی تھی ورنہ ان کے خاندان کی جاہل عورتوں نے ایک طوفان کو اپنی جاہلیت سے دعو، تو دے ہی دی تھی۔

''اچھا بھئی! وہ ہماری لڑکی کو تو تیار کرو، بہت دن رہ لی اب اپنے گھر چلے۔'' سید سرفراز علی نے حد نارمل انداز میں کھڑے ہوتے ہوئے شہر بانو کے متعلق کہا۔

''ابھی...؟'' سخاوت علی کچھ سوچ میں مبتلا ہو گئے۔ لیکن سید سرفراز علی کا چہرہ اس قدر نارمل تھا کہ ا کے دماغ میں کوئی بھی وسوسہ نہ آ سکا۔

''ہاں ابھی کروا دو، ابھی تو بچہ بھی ساتھ لینے آیا ہے۔'' انہوں نے بلال کی جانب اشارہ کر کے کہا، جانے کہاں کھویا ہوا تھا۔

''ٹھیک ہے سائیں! ہم اندر کہلوا دیتے ہیں، بس دس منٹ اور انتظار کرلیں۔'' سید سخاوت علی نے ف اندر زنان خانے پیغام پہنچایا۔

کچھ دیر بعد جب گھبرائی، ڈری سہمی شہر بانو ملازمہ کے ساتھ جیپ تک آئی تو سید سرفراز علی نے اس یوں بھرپور جائزہ لیا، جیسے شکاری اپنے شکار کو دیکھتا ہے۔

❁

طارق بے حد تیزی سے جیپ سے نکل کر پورچ کا راستا پار کر کے اندر آیا، تیز بارش نے چند سیکنڈ میں بھگو ڈالا تھا۔ اُسے بے حد کوفت کا احساس ہوا اُس نے شیڈ کے نیچے آ کر اپنے کوٹ کو پانی کی ...ل سے صاف کیا لیکن کچھ پانی کپڑوں میں جذب ہو کر جسم میں کپکپی کا احساس پیدا کر گیا تھا۔

''یا وحشت! مجھے تو ابھی آفس بھی جانا تھا۔'' طارق بڑبڑایا لیکن پھر اُس کی بڑبڑاہٹ ایک دم رُک ...ل منظر ہی ایسا تھا کہ ساری کوفت، غصہ بھاپ بن کر اُڑ گئے تھے، سامنے ہی نگی شیڈ کے نیچے کھڑی ...مسکرا کر ہنس رہی تھی۔

وہ تھوڑا سا آگے بڑھ کر پانی کی بوندوں کو خود پر آنے دیتی اور پھر ایک دم پیچھے ہٹ جاتی۔ بازو پھیلا ...اپنے ہاتھوں پر بارش کی بوندوں کو لیتی اور پھر بے حد خوش ہوتی، ایک ہاتھ میں اُس نے اپنی لاڈلی بلی ...الی'' پکڑ رکھی تھی۔ طارق کے قدم بے اختیار نگینہ کی جانب بڑھنے لگے۔ اسے لگا، جیسے وہ خود میں بے ...ہے۔

گیراج کے شیڈ سے سامنے بنے برآمدے کے بیچ لان سے گزرتے اُسے ایک پل کو بھی بھیگنے کا ...اس نہ ہوا تھا۔ وہ ایسے چلے جا رہا تھا، جیسے مقناطیس کھینچا چلا جاتا ہو۔

''ارے! آپ؟'' نگینہ خوش گوار موڈ میں طارق کو دیکھ کر مزید خوش ہوئی۔

''آپ تو بالکل بھیگے بلے بن گئے!'' وہ طارق کے بھیگے حلیے کو دیکھ کر قل قل کرتی ہنسنے لگی۔

''مطلب؟'' طارق نے بہت نرم اور پیار بھری نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ اگر رانی بھیگتی ہے تو وہ بھیگی بلی ہوئی اور آپ بھیگے تو بلے ہوئے۔'' نگینہ کو بہت مزہ ...ا

''تم رانی کو اور مجھے ایک ہی صف میں کھڑا کر رہی ہو!'' طارق نے مصنوعی سنجیدگی سے پوچھا۔

''اوہ سوری! اگر آپ کو بُرا لگا ہے تو!'' نگینہ نے کچھ سہم کر اُسے دیکھا۔ وہ نہ کسی کو دُکھ دے سکتی تھی اور ...ن کو ناراض کر سکتی تھی۔

طارق کو تو وہ پوری کی پوری اچھی لگا کرتی تھی، لیکن اُس کی سادگی اور دھیما پن تو دِل کو چھو جایا کرتا ...ا

''نہیں! مجھے تمہاری کبھی کوئی بات بھی بُری نہیں لگتی۔'' طارق نے اپنے گھنے بالوں میں ہاتھ پھیر کر ...ان کے قطروں کو ہٹایا۔

''اندر چلیے نا، سب لوگ بھی اندر ہیں۔'' نگینہ نے اُس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ لیکن ایک دم اُسے دیکھنے لگی، ساتھ چلتے طارق نے بھی رُک کر سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''لیکن؟ لیکن آپ تو اُس دن مجھ سے بہت خفا ہو کر نکلے تھے، میں کتنی دیر ڈسٹرب رہی، طارق آپ کو میری کوئی بات بُری لگی تھی؟'' آنکھوں میں معصومیت چھپائے وہ دشمنِ جاں اُس سے کس قد سوال کر رہی تھی۔

''نگینہ! کیا تم نے کسی سے محبت کی ہے؟'' طارق نے بے حد جذب سے پوچھا۔ اس کا سوال نگی سوال کے جواب میں بالکل برخلاف تھا۔

''ہاں جی کی ہے!'' نگینہ نے کہا تو طارق جیسے مضبوط اعصاب کے مالک شخص کا دِل بھی کچھ اپنی معمول کی رفتار سے ہٹ گیا تھا۔

''کس سے؟'' طارق کا سارا وجود کان بنا ہوا تھا۔

''مجھے اپنی لمّاں اور بابا جانی سے محبت ہے!'' نگینہ کے جواب سے طارق کے جوش کے غبار ایک دم سوراخ ہوا تھا۔

''اچھا! اس کے علاوہ؟'' طارق نے بھی ہمت نہ ہاری۔

''ولی بھائی سے!'' نگینہ نے پھر معصومیت سے درست جواب دیا۔

''لاحول ولا!'' طارق منہ میں بڑبڑایا۔

''ماں باپ اور بہن بھائیوں سے تو سب کو پیار ہوتا ہے میں اِس کے علاوہ پوچھ رہا ہوں۔' کے جسم سے سرد ہَوا کا جھونکا ٹکرایا تو اُسے سارے جسم میں سردی سے سوئیاں سی چبھنے لگیں لیکن آ وہ بے صبرا ہوا بیٹھا تھا۔

''ہاں جی! مجھے ''رانی'' سے بھی بہت پیار ہے۔'' نگینہ نے جواب دیا۔ طارق کا موڈ ایک دم ہو گیا۔

''طارق! کیسے بے خبر، نا سمجھ صنم سے دِل لگا بیٹھے ہو!'' اس نے کڑھ کر خود سے کہا۔

''بس؟'' طارق نے پوچھا۔

جیسے اُس کی خود کی بس ہو چکی ہو۔

''اور کون ہے؟'' نگی نے سہمی سہمی نظروں سے طارق کے بگڑے موڈ کو دیکھا۔

''زندگی میں بہت ساری محبتیں ہوتی ہیں لیکن زندگی میں صرف کوئی ایک محرم راز، محرم دِل ہوتا ہی ہمارے وجود کی اصل محبت کا حق دار ہوتا ہے! میں تم سے تمہارے محرم دل کی محبت کے متعلق ہوں!'' طارق نے اُس کی جانب تھوڑا سا جھک کر گمبھیر لہجے میں کہا۔

طارق کی آنکھوں کی تپش اُس کے لہجے کی گرمی کو نگینہ نے اِس سردی میں بے حد شدت کیا۔

نگینہ اُسے یک ٹک دیکھے گئی۔

دِل نہ مجھی سے باخبری کی سیڑھیاں طے کر رہا تھا اور جب دل نے طارق کی بات کے مفہوم کو

قدم رکھا تو نگینہ کی سفید رنگت ایک دم سرخ پڑ گئی۔ اس کے چہرے کا ہر رنگ طارق بہ غور پڑھ رہا
ہی نگینہ کے چہرے کے رنگ چمکے اُس کا دِل بے حد خوشی سے بھر گیا تھا۔ وہ اُس کے احساس کو
بار ہی تھی۔

نگینہ! کیا تم نے کسی سے محبت کی ہے؟''

طارق پھر پوچھ رہا تھا لیکن اِس بار وہ خوش تھا کہ اس بار وہ اپنی بات کو اندھے کنویں میں نہیں پھینک

اں!'' نگینہ نے اِدھر اُدھر سر گھما کر کہا۔

وہ طارق کی نظروں کی تپش سے بے حد گھبرائی ہوئی تھی۔

کیا تم جانتی ہو کہ میں نے اپنے دل کے سب سے اہم حصے میں جو چہرہ چھپا رکھا ہے وہ کون
طارق کا لہجہ شدت جذبات سے بھاری ہوئے جا رہا تھا۔

کوئی جواب نہ بن پا رہا تھا۔ وہ اُس سے آخر کیا پوچھتی۔

چہرہ، جسے میں بچپن سے پیار کرتا آیا ہوں، اُس کی صورت میرے من مندر میں سالوں سے سجی
لیکن میں اُسے بتانے کے لیے ہمیشہ درست وقت کا انتظار کرتا رہا۔ کیا میں تمہیں بتاؤں کہ آج
وقت ہے!'' طارق نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

میں تم سے جو کہنے جا رہا ہوں وہ دنیا میں کروڑوں شخص روز شاید ایک دوسرے کو کہتے ہوں گے۔
کے لیے وہ بات اُس کی زندگی کی اہم ترین بات ہے! اور... اور میرے لیے بھی یہ زندگی کی
بات ہے! نگی میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ اب سے بہت بہت پہلے سے جب میں نے
لفظ کو زندگی میں پہلی بار جانا، تب سے اور تب سے بھی جب یہ کسی آبِ حیات کی طرح قطرہ
دل پر برسی اور میرے دِل کو تمہارے نام سے زندہ کرنے لگی تب سے!'' طارق نے اُس کے
ہو کر کہا۔

وجود یوں ہوا کہ جیسے اُس کے اندر سے برقی رو گزری ہو، جو سر سے پیروں کے تلووں تک گئی
ہاتھ سے رانی چھٹ گئی، رانی بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی۔

نگاہیں تو زمین میں گڑ گئیں دل تھا کہ سرپٹ گھوڑے کی طرح بھاگے جا رہا تھا۔

گی! کیا تمہیں میں اور میری محبت قبول ہے؟'' طارق نے بے حد جذب سے پوچھا۔

سارا وجود دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔ ساری عمر اُس نے ایک کپڑا تک اپنی مرضی سے نہ
اتنی بڑی بات کا وہ کیسے جواب دے لیتی۔ وہ ایک دم کنفیوژ سی ہو گئی، بہت سارے خیالات
ہو کر اُس سے فیصلہ نہ کروا پا رہے تھے۔

گی!'' وہ منتظر تھا۔

نے پریشان ہو کر نگاہیں اُٹھا کر اُسے دیکھا، پھر ایک دم سارے منظر واضح ہو گئے۔ اُس کا دل
صورت احساس میں گھرا تھا اُسے یہ سب بُرا نہیں لگا تھا بلکہ بے حد اچھا لگا تھا اُسے طارق کے
خوشبو بے حد اچھی لگ رہی تھی۔ اُسے طارق آج ایک بالکل نئے رُخ سے مزید اچھا لگنے

لگا تھا۔ اُس کی نظریں بے اختیار جھکیں، لب مسکرائے اور چہرہ مزید لال گلاب ہوگیا۔

طارق کے اندر تو زندگی دوڑ گئی تھی وہ نگینہ کی ہر ہر ادا کا قاری تھا وہ نگینہ کا چہرہ پڑھ گیا تھا۔

''نگینہ تمہارا جواب ہاں ہے؟'' طارق پھر بھی پوچھے بِنا نہ رہ سکا۔

نگینہ نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک دم اندر کو بھاگی لیکن اُس کا دوسرا ہاتھ تو طارق کی مضبوط میں تھا۔ اُس کا سارا وجود طارق کی نظروں کی گرفت میں تھا، اُسے اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہنا دُشوار تھا۔

''طارق بھائی! پلیز ہاتھ چھوڑیں!'' اُس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ طارق تو جانے نشے کی کیفیہ تھا!

اپنی محبت کو پالینے کی، فتح کے نشے کی کیفیت! اُس کے چہرے پر بے حد جان دار مسکراہٹ تھی۔

طارق نے اُسے بہت نرمی سے اپنے قریب کیا اور اِس سارے دورانیے میں ایک بار بھی اُس نگینہ کے چہرے سے نہ ہٹی تھی۔ نگینہ تو یوں تھی، جیسے بدن میں جان نہ ہو اُس سے حرکت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

طارق نے اپنے گلے سے موٹی سی چین اُتار کر نگینہ کو پہنادی۔

''یہ...؟'' نگینہ نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''دل تو میرا کرتا ہے کہ تمہیں ڈیک لگا کر پی جاؤں لیکن ابھی مجھے تمہارے حقوق اپنے نام کے لیے تھرو پراپر چینل جانا ہوگا۔'' طارق نے بے حد استحقاق بھری نظروں سے اُسے دیکھتے ہو ہی دِل میں سوچا۔

''یہ میری امی کی ہے انہوں نے مجھے میری سالگرہ پر اپنے گلے سے اُتار کر پہنائی تھی۔ تب تو کا بے اختیار ہو کر اِسے پہنانا سمجھ میں نہیں آیا تھا، لیکن آج تمہیں پہناتے ہوئے جان گیا ہوں پر بہت پیار آ رہا ہے اور میں تم کو کچھ اپنا دینا چاہتا ہوں۔'' طارق بولا۔

''ہمارے دین کی حد مجھے تمہیں چھونے سے منع کرتی ہے ورنہ تو میرا اس وقت تمہارے وجود میں جذب ہونے کو دِل چاہ رہا ہے۔'' طارق کو خود پر بند باندھنا مشکل ہو رہا تھا۔

نگی کے لرزتے لبوں پر پیاری سی مسکان آ کر ٹھہری، اُس نے بے حد نرم نگاہوں سے طارق کو پھر وہ تیزی سے بھاگتی اندر چلی گئی۔

طارق نے مسکراتے ہوئے اُس کے پیروں کی رفتار سے اُڑتے ہوئے چھینٹے دیکھے۔ اگر آ پر برکھا تھی تو خوشی و اطمینان کی بارش اُس کے من پر بھی اپنی پھوار برسا رہی تھی۔ وہ بے حد خوش کے ساتھ اندر بڑھا جہاں ابّو اور احمد شاہ انکل اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ اُس کا دِل بے حد جھ آج کتنے دنوں بعد اُسے سب اُجلا اُجلا لگ رہا تھا۔

واقعی جب من پریشان ہو، اُداس ہو تو اُداسی اندھیرا بن کر سارے منظروں پر چھا جاتی ہے من خوش ہو تو ہر سو بہار ہی بہار نظر آتی ہے کون کہتا ہے کہ موسم چار ہوتے ہیں۔ موسم تو پانچ ہو پانچواں موسم تو من کا موسم ہوتا ہے جو ہر موسم پر حاوی ہوتا ہے!

طارق کے من کا موسم بھی بے حد خوش گوار تھا۔ تب ہی تو اُسے دنیا نئی نئی لگ رہی تھی۔

❖❖ ◯ ❖❖

تمہاری ذرا سی توجہ نے
جانتے ہو کیا کیا ہے
مجھے میرے من میں
جدا کر دیا ہے

زندگی اتنی خوب صورت بھی ہوتی ہے علیزے کو اِس سے پہلے احساس نہ ہوا تھا۔

امی نے اُسے موبائل فون استعمال کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ ولی کے فون اُس کی آواز کا انتظار اُس کے لیے ایک بے حد قیمتی احساس تھا۔ اُسے یوں لگتا تھا، جیسے وہ ایک دم بے حد مال دار ہوگئی ولی کی ڈھیروں ڈھیر محبتوں سے وہ مالا مال ہو چکی تھی۔ اِس وقت بھی اُس کا سارا دھیان موبائل کی گھنٹی کی جانب تھا۔ ویسے تو دو چاہنے والوں کے دِل کے تار ایسے ملتے ہیں کہ بِنا کچھ کہے سُنے ہی وہ ایک دوسرے پر بیتنے والے پَل اور خیال جان لیتے ہیں لیکن اگر محبوب کی آواز بھی سننے کو مل جائے تو اُن کا احساس دوبالا ہو جاتا ہے۔ یہ ہی کچھ علیزے بھی محسوس کر رہی تھی۔

بظاہر تو وہ اسکول سے لائی بچوں کی کاپیاں چیک کر رہی تھی لیکن اُس کی نگاہ بار بار اپنے سامنے رکھے موبائل پر پڑتی۔ حالاں کہ یہ ولی کے فون آنے کا وقت نہیں ہوتا تھا لیکن پھر بھی اُس کا دِل چاہ رہا تھا کہ فون آئے اور وہ ولی کی آواز سُن سکے۔

کوئی آپ کو اس قدر ارتکاز سے سوچے تو ہم اُس ارتکاز کے اثر میں ضرور آتے ہیں۔ سائنس نے اسے ٹیلی پیتھی کا نام دیا ہے، جب کہ یہ تو دِلوں کے رشتے ہوتے ہیں، جو ایک کا وجود اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔

اُسی پَل موبائل فون کی بیل بجی۔ اسکرین پر چمکتے نام نے علیزے کے چہرے پر بہت چمک دار مسکراہٹ سجادی تھی۔ علیزے نے آگے بڑھ کر فون ہاتھ میں لے کر اوکے کا بٹن دبادیا۔

''السلام علیکم!'' ولی کی آواز گونجی اور ہر روز کی طرح علیزے کے ہاتھوں میں پسینہ آ گیا۔ نگاہ یوں جھک گئی، جیسے ولی سامنے بیٹھا ہو۔

''السلام علیکم!'' ولی نے دوبارہ کہا۔

''السلام علیکم!'' جواباً علیزے نے دھیرے سے کہا۔

''پہلے میرے سلام کا تو جواب دے دو!'' ولی نے شرارت سے کہا۔

''جی وعلیکم السلام!'' علیزے کو ہمیشہ کی طرح گھبراہٹ نے گھیرا۔

''جانے اِس ساحر میں کیسا جادو ہے، جو میری زبان ہمیشہ اُس کے سامنے لڑکھڑا جاتی ہے!'' علیزے نے دل ہی دِل میں کہا۔

''حسن خالہ اور خالو کیسے ہیں؟ بچے کیسے ہیں۔'' ولی نے پوچھا۔

''امی ابّو کی طبیعت بس مناسب ہی رہتی ہے۔ منزہ کی موت اور کاشف کی دوری کا غم اگر وہ نہ بھی

کہیں تو بھی اُن کی آنکھوں سے ہر پَل جھلکتا ہے!" علیزے کا لہجہ ایک دم اُداس ہوگیا تھا اور یہ اُدا
ہزاروں میل دور بیٹھا ولی بے حد آسانی سے محسوس کرسکتا تھا۔

"علیزے! میں نے دراصل ایک بہت اہم بات کے لیے بے وقت فون کیا ہے۔ اُمید ہے تم حو
سے سنوگی اور سمجھ داری سے سارے معاملے کو سنبھالوگی۔" ولی نے کہا۔

ولی کی تمہید پر علیزے کا دِل مزید سہم گیا وہ منزہ کی موت کے بعد اپنے اعصاب کو بے حد کمزور
تھی۔ کسی بھی بُری خبر کو سننے کی اُس کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ امی ابو تو دونوں ہر وقت کے بیمار آدمی تھے۔

"کیا کوئی بُری خبر ہے؟" علیزے نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"اوں...نہیں!
لیکن... اِن فیکٹ.....اچھی خبر کچھ بُری ریسینگ میں ہے۔" ولی بھی اُس کی سہمی آواز سُن کر محتاط ہو
تھا اِسی لیے بے حد ہلکے پھلکے انداز میں مخاطب ہوا۔

"مطلب...؟" علیزے نے کان لگا کر سوال کیا۔ بہر حال ولی کے پاس کوئی اہم بات تھی۔

"مطلب یہ کہ کاشف مل گیا ہے!" ولی نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا۔

"کہاں ہے؟" علیزے نے بے اختیار سانس خارج کیا۔اس کا لہجہ بے حد مدھم تھا، ولی کچھ نہ
پایا۔

"طارق کا فون آیا تھا کہ کاشف مل گیا ہے لیکن وہ بُری طرح بیمار ہے اس لیے ہسپتال میں ہے۔"
نے کہا۔

"کہاں؟ کس ہسپتال میں ہے؟" علیزے نے بے حد سرد لہجے میں دریافت کیا۔ کاشف کے چہ
کے سامنے ہمیشہ منزہ کا خون سے لت پت وجود آجاتا تھا۔ اس کی یہ بھول وہ لوگ کیسے معاف کر
گے۔

"فی الحال تو وہ اسلام آباد کے پی ایچ ٹی ہسپتال میں داخل ہے اور نیم بے ہوشی میں ڈاکٹرز نے
رکھا ہوا ہے۔ طارق اُس کے علاج معالجے کی پوری نگرانی کررہا ہے اس معاملے میں تم لوگوں کو فکر کر
کی ضرورت نہیں۔

ہاں طارق بتارہا تھا کہ وہ بے حد بیمار ہے، اس لیے اُس کے لیے دعا بھی کرو اور خالہ خالو کو دھ
دھیرے اُس کی واپسی کے لیے تیار کرو۔ یہ نہ ہو کہ ایک دم خوشی حسن خالہ کے لیے نقصان دہ ثابت
ولی نے بُردباری سے کہا۔

"جی اچھا!" علیزے نے سرد آہ بھر کر جواباً کہا۔

اگر وہ اپنی بہن کا خون کاشف کو معاف نہیں کرسکتی تھی تو اپنے بھائی کو بھی بھول نہیں سکتی تھی۔ اگر
اُس سے خفا تھا تو اُس کی گمشدگی پر، پریشان بھی تو رہتا تھا۔ بہر حال اُس کے ملنے کی اطلاع نے
کچھ سکون بخشا تھا۔

"علیزے! کیا تم سن رہی ہو؟" اس کی طویل خاموشی پر ولی بولا۔

"ہاں جی!" علیزے اِس وقت خاصی ڈسٹرب تھی۔

"علیزے مجھے بہت عرصے سے ایک سوال تنگ کررہا ہے اُمید ہے تم مجھے اِس کا تسلّی بخش جواب
دا..." ولی نے کہا۔

"...ی پوچھیے!" علیزے نے غائب دماغی سے جواب دیا۔

"...یہی کہ منزہ کی موت کے دن سے اب تک کاشف ہم سب سے کیوں چھپتا پھر رہا ہے، اُس نے
...ایا لیا، جو اتنے عرصے سے روپوش ہے؟" ولی کے سوالوں کے جواب دینے کا مطلب تھا کہ اس راز
...ہ اُٹھ جاتا کہ منزہ کا قتل کاشف ہی نے کیا تھا۔ بے شک ولی اُس کا محرم دِل تھا وہ اُسے سب کچھ
...بتا بھی دینا چاہتی تھی لیکن ولی طارق کا دوست بھی تھا اور پولیس سے وہ ساری سچائی چھپا گئے
...علیزے سے واقعی فوراً کوئی جواب نہ بن پا رہا تھا۔

"علیزے! چپ کیوں ہو، کیا میری کوئی بات بُری لگی، دراصل یہ سوال مجھ سے طارق نے کئی بار
...ا ہے۔ وہ پولیس کا بندہ ہے نا، اس لیے ہر معاملے کی تہہ کو کھوجتا ہے ورنہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے
...م مزید پریشان ہو۔" علیزے کے تنے ہوئے اعصاب ایک دم ڈھیلے ہوگئے وہ کتنا اچھا تھا کبھی
...ے میں نہ کھڑا کرتا تھا، کبھی مشکل نہ دیتا تھا ہمیشہ آسانیاں ہی بانٹتا تھا۔

"تھینکس ولی! آپ اتنی دور بیٹھ کے بھی ہمارے سارے مسئلے حل کرتے ہیں!" علیزے نے دِل سے
...ر ہو کر کہا۔

"اوں، ہوں! آئندہ یہ تھینک یو کا ڈنڈا میرے سر نہ مارنا! یار میں نے بہت پہلے بھی کہا تھا کہ تمہارے
...ے دُکھ میرے اور میرے سارے سُکھ تمہارے... پھر کیوں ایسے بولتی ہو۔" وہ اُسے ہر پَل معتبر کرتا
...ا

...ی و تشکر سے علیزے کی آنکھیں جھلملا گئیں...

"او کے! میں اب فون بند کرتا ہوں، تم ذرا کاشف کی خبر حسن خالہ کو دوپہر میں طارق سے کہہ کر تم
...لی کاشف سے ملاقات بھی کروا دیتا ہوں۔ او کے اللہ حافظ؟"

"...ی! اللہ کے سپرد۔ اللہ کی امان میں!" علیزے نے دعا دی۔

"اچھا فون بند کرو۔" ولی نے کہا۔

"نہیں آپ پہلے رکھیں!" علیزے نے کبھی ولی کی کال خود ڈسکنیکٹ نہ کی تھی، وہ خود سے کبھی رابطہ
...نہ کرتی تھی۔ ولی کو اُس کی یہ ادا بے حد خاص اور اچھی لگتی تھی۔

"او کے اللہ حافظ!" ولی نے مسکرا کر فون بند کیا۔

...ب کہ علیزے نے اپنی گود میں رکھی اسکول کی کاپیاں سائیڈ پر رکھیں اور جسم ڈھیلا چھوڑ کر آنکھیں
...ر بیٹھ گئی۔

"...تو کاشف تم آخر آہی گئے! لیکن تم ہمارا اور ہم تمہارا سامنا کیسے کریں گے، کیا منزہ کا خون سے لت
...ود ہمارے بیچ سے نکل سکتا ہے؟

...ے پیارے بھائی تم نے یہ کیا کیا؟ کیسا ظلم کمایا!
...ھی بھی رشتوں کو کھینچ کر اُس "حد" کے پار نہیں لائے، جہاں محبت اور نفرت کی سرحدیں مل کر

خالص جذبات میں ملاوٹ کر ڈالیں۔ بس ایک... صرف ایک کانٹے کی طرح چبھتا احساس رہے پل دُکھ دیتا رہے!'' دو آنسو اُس کی آنکھوں سے نکل کر اُس کے دامن میں جذب ہوگئے، وہ پہلے دِل کو اور خود کو کاشف کی واپسی کے لیے تیار کر رہی تھی تب ہی امی ابو کو تیار کر سکتی تھی نا۔''

❖❖○❖❖

کیفے میں مدھم لیکن رنگین روشنیوں کی حرکت مختلف چہروں پر مسلسل تھی۔ جب جب لال، پیلی روشنی چہروں پر پڑتی تو کچھ چہرے بے حد بھیانک نظر آتے۔ ترنم نے اپنے سامنے بیٹھے مرکزی اطلاعات کو دیکھا، جو مسلسل ڈرنک پر ڈرنک کر رہا تھا۔

''کم بخت جب تک چڑھتی محسوس نہیں ہوتی، مزہ نہیں دیتی!'' اُس نے ہنستے ہوئے اپنے سگریٹ پیلے پڑے دانت نکوسے۔

''بالکل رشید صاحب! واقعی مزہ چکھنے میں ہے، جلد ہی آپ کو بھی مزہ آجائے گا۔'' ترنم نے دیکھتے ہوئے بیزاری سے کہا۔ وہ سلیولیس بلیک میکسی میں ملبوس تھی اور قیامت لگ رہی تھی۔

''ڈانس! کیا تم میرے ساتھ ڈانس کرو گی؟'' وزیر نے کچھ آگے بڑھ کر ہاتھ آگے کیا۔

''اس کو چڑھ گئی ہے اب یہ بندر ضرور ناچے گا...''

ترنم نے بیزاری سے کہا۔

''کیا بولتی تم؟'' وزیر نے اُس کے ہلتے ہوئے لب محسوس کیے تھے۔

''بکواس کر رہی ہوں، کیا آپ سنیں گے؟'' ترنم نے ایک دم بھڑک کر کہا۔

''اوئی۔ تیری یہی ادائیں ہیں، جو مجھے تیرے پاس لاتی ہیں، قسم خدا کی تم مجھے ورلڈ ٹور پر لے آئی۔ تمہاری یہ بکواس سننے کو میں راگنی کو ڈبل پیسہ بھرا۔ کم بخت بہت منہ پھاڑ کر مانگتی ہے۔'' وزیر نے ترنم کو یوں لاڈ سے دیکھا، جیسے اُس نے وزیر کو بہت اچھی بات سنائی ہو۔

ترنم نے ایک بے بیزار اور تیکھی نگاہ اُس پر ڈالی۔

''مگرمچھ کا مگرمچھ۔ بُرے کرتوت اُس کے چہرے پر ثبت ہو گئے تھے، مکروہ چہرہ!'' ترنم کو ابکائی آئی۔ اُس نے اپنی توجہ بٹانے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا۔

''اچھا اگر ڈانس کا موڈ نہیں تو کچھ سنا ہی دو!'' ایک نئی فرمائش آئی۔ اکثر کسٹمر اُسے کال گرل کے ساتھ ساتھ طوائف کا درجہ بھی اعزازی دیتے تھے، ساتھ ناچنے کے علاوہ گانا سننے کی فرمائش عام تھی۔ پڑھا لکھا طبقہ غزل کی فرمائش کرتا تھا لیکن اندر سے سارے کسی تہلکہ خیز مجرے کی امید کرتے۔ ترنم کو ان کی ایسی فرمائشیں زہر لگا کرتی تھیں اُس کا فشارِ خون مزید بڑھ جاتا تھا۔

''یہاں پر! رشید صاحب یہاں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی، اتنے میوزک اور شور میں آپ کو میری آواز کیسے سنائی دے گی؟'' ترنم نے طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

''ویسے اتنے میوزک کو سننے کے بعد بھی کچھ سننے کی حسرت ہے؟''

''تو تیرا کیا خیال ہے کہ میں اتنی حسین رات یہاں بیٹھ کر خراب و برباد کروں گی۔'' رشید صاحب ہنستے ہوئے کہا۔

''ہم تیرے کو اندر سویٹ میں لے کر چلتے ہیں نا! وہاں تجھے گھونٹ گھونٹ پئیں گے اور تجھے سنیں گے ...!''

''چل۔'' وہ ایک دم کھڑا ہوگیا لیکن ایک دم لڑکھڑایا اُسے نشہ چڑھ ہی گیا تھا۔

وہ ترنم کو لیے بڑے سے کمرے میں آ گیا۔ یہ کمرہ ہنی مون سویٹ کہلاتا تھا اور بے حد لگژری تھا لیکن ...اسی جہنم سے کم نہ لگ رہا تھا۔

''یا میرے اللہ! پھر وہی کچھ! جانے مجھے اتنا سہنے سے پہلے موت کیوں نہیں آتی۔ اگر مجھے نہیں آتی تو ...بختوں کو بھی تو نہیں آتی!'' ترنم نے سامنے بنے شیشے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے کہا۔

''اوئی! تم ابھی تک وہاں ہی کھڑی ہے! ارے بابا میرے پاس آؤ یہاں میرے ساتھ!'' رشید صاحب نے اپنے پاس اُسے بلایا۔

ترنم سڑتی کڑھتی اُس کے پاس جا بیٹھی۔

''اوئی! یہ تم کو ہم کوئی مہمان بنا کر لایا ہے۔ اری ادھر میرے نزدیک بیٹھو نا!'' رشید صاحب نے بات سے ہنستے ہوئے کہا جیسے انہوں نے بڑا جوک مارا ہو۔ ترنم کا دل چاہا اُس کا سر پھاڑ دے۔

''زمین کا عذاب، کم بخت، اللہ کرے تو مر ہی جائے۔'' وہ بڑبڑائی۔

''ہاں اب کچھ سناؤ!'' رشید صاحب نے اُس کی کمر کے گرد اپنا مضبوط بازو حمائل کرتے ہوئے کہا۔

ترنم کو لگا، جیسے کوئی سانپ اُس کے گرد لپٹ گیا ہو۔

''اوئی بول بھی نا! تیری آواز میں جادو بھی تیری طرح ہے!'' اُس نے ترنم کے ساتھ چھیڑ خانی کرتے ہوئے کہا، اُس کا بھاری بھرکم ہاتھ ترنم کے ہاتھ کو دبوچے ہوئے تھا۔

جو بھی ارماں حیات میں ہے
آج تو دامِ ممکنات میں ہے!

ترنم دھیرے سے کہتی خود کو چھڑاتی سامنے بنے شیشے کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ سامنے اُس کا ہی عکس ...ملا ہوا لہ بنا نظر آ رہا تھا۔

ترنم نے ایک دُکھ بھری نگاہ اپنے عکس پر ڈالی۔ ایک وقت تھا کہ اِس عکس کو اُس کی ماں کتنا چھپا چھپا کر رکھتی تھی۔ اور اب!

جو بھی ارماں دِل حیات میں ہے
آج تو دامِ ممکنات میں ہے!
کل نہ معلوم کیا سے کیا ہوجائے
کل کا مفہوم کیا سے کیا ہوجائے
اُلجھے اُلجھے اجل کے دھارے سے
جا کے ٹکرائیں کس کنارے سے
کس نشیمن میں، کس ٹھکانے، کہاں...؟
اپنی منزل ہو پھر نہ جانے، کہاں...؟

ترنم کی آواز میں آنسوؤں کی نمی گھل گئی اُسے لگا کہ وہ مزید نہ بول پائے گی۔ اُس کے حلق میں کا
چبھنے لگے تھے اُسے پانی کی شدید طلب ہوئی تھی۔ اُس نے جیسے ہی پیچھے مڑ کر دیکھا تو رشید صاحب
آنکھیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں اور وہ اپنے ننگے سینے کو مسلسل مسل رہے تھے۔

ترنم کو کسی غیر معمولی پن کا احساس شدت سے ہوا۔

اب رشید صاحب کرسی سے گر کر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔

''خان صاحب! خان صاحب کیا ہوا؟'' ترنم نے رشید صاحب کو سیدھا کر کے پوچھا۔

''اوئی! امارے سینے میں بہت درد ہے!'' وہ کراہ کر بولے۔

''اوہ! میں ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں۔'' ترنم نے اپنا موبائل اُٹھاتے ہوئے کہا۔

''اوئی نہیں یارا! تم میرے پی اے کو فون کرو وہ کسی اعتبار کے ڈاکٹر کو بلائے گی!'' رشید صاحب اتنی تکلیف میں بھی احتیاط لازم رکھی۔ اس کمرے سے باہر کی دنیا میں وہ ایک بہت باکمال اور اصول وزیر کہلاتے تھے۔ رات کے اس پہر کوئی بھی ڈاکٹر ان کو اس ہوٹل میں چیک کرنے آتا تو یقیناً ساری باتیں بھی اپنے ساتھ لے جاتا۔ اس لیے اتنی تکلیف میں بھی احتیاط ملحوظ خاطر تھی۔

ترنم نے فوراً رشید صاحب کے پی اے کو فون ملا کر صورتِ حال بتائی، پھر زمین پر گرے رشید صا
کی طرف متوجہ ہوئی۔

وہ بے حد فکر مندی سے اُن کے ہاتھ سہلا رہی تھی۔ اُسے فوری طبّی امداد نہیں دینی آتی تھی ورنہ وہ جانتی کہ رشید صاحب کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔

ابھی کچھ دیر پہلے اُس نے خود ہی اس شخص کی موت کی تمنا کی تھی اور اب اُس کو بچانے کے مسلسل کوششیں کر رہی تھی۔

''خان صاحب! اِدھر اوپر بیڈ پر لیٹو!'' وہ بہ مشکل خان صاحب کے بھاری بھرکم وجود کو گھسیٹ کر آئی۔ وہ تو شکر تھا کہ بیڈ ایک ڈیڑھ قدم کی دوری پر تھا ورنہ وہ شاید یہ نہ کر پاتی۔

''یہ پانی پی لیں!'' اُس نے سہارا دے کر خان صاحب کو پانی پلانے کی کوشش کی لیکن رشید صا
تکلیف سے بے حال ہو رہے تھے۔ پانی کا وہ گھونٹ نہ بھر سکے، گلاس چھلک کر دور جا گرا۔

رشید صاحب کی آواز ایک دم غراہٹ میں بدل گئی۔ وہ زور زور سے چیخنے لگے تھے۔

''خان صاحب کیا ہوا؟'' ترنم نے گھبرا کر پوچھا۔ بہر حال اُس میں ابھی تک انسانیت باقی تھی۔

''اوئی! یہ... یہ بلائیں میرے سینے پر چڑھ گئی ہیں!''

وہ کہہ رہے تھے۔

''خان صاحب ہوش میں آئیں۔ کون سی بلائیں؟'' ترنم نے گھبرا کر کہا۔

''اوئی! یہ امارے کو مارتی ہیں!'' ساتھ ہی وہ اپنے بیڈ سے دو دو فٹ اُچھل کر جھٹکے کھانے لگے، اُن کو بجلی کے کرنٹ لگ رہے ہوں۔ اُن کے گلے سے عجیب غریب آوازیں نکل رہی تھیں۔

ترنم گھبرا کر پیچھے جا کھڑی ہوئی، لیکن بعد میں اُسے خیال آیا کہ خان صاحب کی مدد کرنی چاہیے۔

''خان.. خان صاحب آپ کو کیا ہوا ہے؟'' وہ بے اختیار پوچھ رہی تھی۔

''یہ بڑی بڑی بلائیں میرے سینے پر چڑھ کر بیٹھی ہیں، اُچھل رہی ہیں آہ! میرا سینہ پھٹ جائے گا ان
...ہ سے...'' وہ تڑپے۔

''یہ... یہ میرا کلیجہ کھا جائیں گی!'' وہ غراہٹ بھری آواز میں بولے۔

...م نے سہم کر خان صاحب کی جانب دیکھا۔

...ترنم کی گھگھی بندھ گئی۔ خان صاحب کا مشکل وقت اُس پر بیتنے لگا تھا۔

''استغفر اللہ!'' ترنم نے بے اختیار استغفار کی تھی۔

...ید صاحب کی چیخ پکار اس قدر ڈراؤنی تھی کہ ترنم کو لگا اُس کا خود کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔

''یہ بلائیں، یہ اتنی ساری بلائیں میرا کلیجہ کھا...'' خان صاحب غراہٹ نما آواز میں بولے پھر اُن کی
...یں اوپر کو ساکت ہوئیں اور گلے سے ایسی آواز نکلنے لگی، جیسے اُن کے گلے پر کسی نے پیر رکھ دیا ہو۔

...وں نے چار فٹ جتنا جھٹکا کھایا اور جسم ساکت ہو گیا۔

...نم سہمی نظروں سے دیوار کے ساتھ لگی یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ پھر اُس نے ڈرتے ڈرتے
...گے بڑھ کر خان صاحب کو دیکھا۔

''یا میرے خدایا! یہ تو مر گیا ہے!'' ترنم نے خوف زدہ ہو کر پیچھے ہوتے ہوئے کہا۔

...بھی باہر کمرے کی ڈور بیل ہوئی، ترنم نے لپک کر دروازہ کھولا۔ رشید صاحب کا پی اے ڈاکٹر کے
...ساتھ تیزی سے اندر بڑھا۔

''اوہ میرے خدایا!'' پی اے کا ترنم کی طرح بُرا حال تھا۔ اُن میں فرق صرف اتنا تھا کہ ایک خوف
...اور دوسرا اپنے روزگار کی محرومی کی وجہ سے گھبرایا ہوا تھا۔

''...بی بی! صاحب کے سانس تو نہیں ہیں!'' پی اے نے زبان ہونٹوں پر پھیر کر کہا۔

''ہاں! شاید!'' ترنم کی آواز بہ مشکل نکلی۔

''اب؟ اب کیا کریں؟ صاحب تو مر گیا!'' پی اے نے پوچھا۔

''اب ان کو سیدھا ہسپتال لے جاؤ۔ اس طرح اخبار والے یہ ہی چھاپیں گے کہ ہسپتال میں آ کر
...موت ہوئی ہے۔'' ترنم نے تھکے تھکے انداز میں کہا اور اپنی **Black** شال اُٹھا کر اپنے اِرد گرد لپیٹی۔

''میرا خیال ہے کہ مجھے چلنا چاہیے۔ تم ان کے گھر والوں کو اطلاع دے دو۔'' وہ ان سب کو چھوڑ کر
...ہر نکل آئی۔ ترنم کو اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی، وہ بہ مشکل لفٹ تک آئی۔

اس نے لفٹ میں داخل ہو کر لفٹ کی دیوار سے ٹیک لگا دی۔ چاروں طرف قد آدم شیشوں میں اُس کو
...اس نظر آیا۔ ترنم کو اپنا عکس نہایت ناپسند تھا، اُس نے فوراً آنکھیں بند کر لیں۔

''یس میم!'' لفٹ کیئر نے شائستگی سے پوچھا۔

''گراؤنڈ فلور!'' ترنم نے کہہ کر لمبے لمبے سانس لے کر خود کو متوازن کرنے کی کوشش کی۔ لیکن! لیکن
...خان صاحب کی پھٹی پھٹی آنکھیں ذہن کے پردے پر لہرانے لگیں تو اُس نے جھٹ سے آنکھیں کھول
...یں۔

...کاؤنٹر پر منیجر نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ وہ اتنی جلدی واپس کیوں جا رہی تھی؟ وہ لپک کر آگے

بڑھا۔

''میڈم! واپس جائیں گی آپ...؟''

''کیوں آپ کو کیا لگتا ہے میں یہاں ٹہلنے کے لیے نکلی ہوں!'' ترنم نے اپنی ٹینشن اُس پر نکالی۔

''سوری میڈم! اگر آپ کو بُرا لگا ہے۔'' منیجر نے فوراً معذرت کی، اُس کا دماغ خراب نہیں تھا کہ اِن خاص لڑکیوں کی ناراضی مول لیتا جو صرف اور صرف اپر کلاس کو سرو کرتی تھیں اور شریف گھرانوں کی لڑکیوں کی طرح پروٹوکول وصول کیا کرتی تھیں۔

''میں.. میں آپ کی گاڑی لگواتا ہوں!'' وہ کہہ کر تیزی سے واپس مُڑا۔ ترنم چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی خود کو گھسیٹتی ہوئی باہر لے کر آئی۔ اُس کی گاڑی فوراً اُس کے پاس آ کر رُکی، جب وہ بیٹھنے لگی تو ریسکیو والوں کی خوب صورت ایمبولینس بھی ساتھ آ کر رُکی۔ بھاگتے دوڑتے بوٹوں کی آواز وہ با آسانی سُن سکتی تھی۔

ترنم کا سر درد سے پھٹنے کو تھا۔

''کہاں چلنا ہے بے بی؟'' ڈرائیور نے پوچھا۔

''ابھی تو تم فوراً یہاں سے چلو۔'' ترنم نے بیزاری سے کہا۔

''جیسے آپ کی مرضی!'' ڈرائیور بھی سمجھ دار تھا، اُس کی ناراضی دیکھ کر فوراً بولا۔

ترنم نے تھک کر سر سیٹ کے ساتھ ٹکا دیا۔ دو آنسو آنکھوں سے نکل کر اُس کی صراحی دار گردن پر آ گئے تھے۔

دور کہیں بہت دور سے اُسے آوازیں سنائی دی تھیں پھر یہ آوازیں دھیرے دھیرے واضح ہونے لگیں...

''مومن بندے کی جان ربّ سوہنا اُس کے جسم سے یوں نکالتا ہے، جیسے بھری مشک کا منہ کھول دیا جائے تو پانی بہ آسانی باہر نکل آتا ہے! لیکن بُرے آدمی کی جان ایسے نکلتی ہے، جیسے خاردار جھاڑی میں اُلجھ کر دُکھ و تکلیف دے کر نکلے اور اندر لیروں لیر کر ڈالے۔ بُرے آدمی کی روح سات زمین نیچے دوزخ میں لے جائی جاتی ہے اور اُس کی روح ڈراؤنی شکل والے دوزخ کے فرشتے لینے آتے ہیں۔ اُس کا نامہ اعمال ''سجین'' میں رکھا جاتا ہے۔'' لتاں کی آواز اُس کے کانوں میں گونجی۔

کتنی کم تعلیم یافتہ یا پھر بالکل بھی پڑھی لکھی نہ تھی اُس کی ماں لیکن کتنا سچ اور کتنا کچھ جانتی تھی وہ...!

آج ترنم نے خان صاحب کا نزع کا عالم دیکھا تھا۔

جتنی اُن کو تکلیف تھی وہ واقعی بہت خوف ناک تھی۔ تکلیف سے وہ دو دو فٹ اونچے جھٹکے کھاتے تھے۔ گناہ گار کے نزع کا وقت وہ دیکھ آئی تھی۔

''موت! موت کی تکلیف اِس قدر ہے تو موت کے بعد کیا ہوگا؟'' ترنم کا سارا وجود پسینے سے بھیگ گیا۔

خان صاحب پیتے پلاتے، ناچتے گاتے مزید گناہ کے لیے پر جوش بیٹھے تھے۔ دور دور تک کوئی امکان نہ تھا کہ وہ مرجائیں گے! خود اُن کو بھی مرنے سے پہلے یقین نہ ہوگا۔ وہ تو شاید یہ ہی سمجھتے رہے تھے

ب کچھ ہمیشہ کی طرح یوں ہی سدا چلتا رہے گا... لیکن آخر موت سر پر آن پہنچی اور گیم از اوور کا سگنل اب صرف اس گیم میں حاصل کیے اسکور کا فیصلہ ہونا باقی تھا۔

م ایک دم ہچکیوں سے رونے لگی۔

ئیور نے بیک ویو مرر سے پیچھے دیکھا۔ لیکن اُس نے مداخلت کی کوشش نہ کی تھی۔ آخر وہ میڈم ٹرینڈ ڈرائیور تھا۔ پھر وہ اکثر دیکھتا آیا تھا کہ جب یہ نیلی پیلی پریاں ڈرنک کر کے آتی تھیں تو ئے میں اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتی تھیں۔

ئیور کو ہدایات تھیں کہ لڑکیوں سے زیور اور کیش فوراً لے کر سنبھال لے۔ پھر لڑکی چاہے ہنسے، گائے یا ناچے اُس کی بلا سے...

اس کی ڈیوٹی تھی کہ وہ لڑکی کو حفاظت سے اُس کے مقام پر پہنچا آئے۔

بے بی کدھر جانا مانگتا...؟ رات ابھی باقی تھی یہ لڑکیاں تو صبح کے وقت ہی اپنے ٹھکانے پر اُترتی اس لیے اُس نے پوچھنا ضروری سمجھا تھا۔

مجھے... مجھے یہ کپڑے فوراً بدلنے ہیں! کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟'' ترنم کو اپنے ننگے لباس سے کوفت ں تھی۔

بے بی اس وقت تو ہر طرح کا اسٹور اور بوتیک بند ہو چکا ہوگا... رات کے پونے دو بج رہے ڈرائیور نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

آپ کو کس قسم کا لباس درکار ہے؟'' ڈرائیور کو اُس کا لباس بدلنے کا پرابلم سمجھ نہ آ رہا تھا۔

میں...!'' ترنم سوچ میں پڑ گئی۔ آیا وہ اپنے دِل کی بات اُس سے شیئر کر سکتی ہے یا نہیں لیکن پھر کچھ کر بولی۔

مجھے! مجھے نماز پڑھنی ہے!'' ڈرائیور کو شاید بجلی کا جھٹکا لگا تھا، تبھی بے اختیار اُس کے پیر ایک دم جا پڑے۔ تیز رفتار گاڑی اچانک جھٹکے سے جا رُکی تھی وہ تو شکر تھا کہ سڑک خالی تھی ورنہ شاید حادثہ ہو جاتا۔

کیوں! کیا کسی کال گرل کا مذہب نہیں ہوتا؟'' ترنم تو ویسے ہی بھری بیٹھی تھی اُس کی اس حرکت اور ل کر حیرت کے اظہار پر اُلٹ ہی تو پڑی تھی۔

باہر کے ممالک میں جتنی بھی پیشہ ور لڑکیاں ہیں، وہ ہر اتوار چرچ جاتی ہیں۔ اپنے گناہ کم کرنے اپنے سکون کے لیے... پھر ہمارے لیے اس طرح کے ردِعمل کی وجہ؟'' ترنم نے اُسے یوں چپ دیکھ کر بھڑک کر کہا۔

نہیں بے بی! وہ بات نہیں ہے!'' ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

اصل ہمارے مذہب میں تو ایسے کام کی سرے سے اجازت ہی نہیں ہے اور جو دین اسلام مانتا مسلمان کہلانے کا حق بھی اُس کا ہے۔

مذہب جس کام سے روکے اُس سے رُکنا چاہیے اور جس کام کے لیے حکم دے اُس کو ماننا چاہیے نہیں ہے تو کوئی کہاں کا اور کیسا مسلمان؟'' ڈرائیور کا لہجہ جھلسا ہوا تھا۔

"مجھے ہی دیکھ لو بے بی! اچھا خاصا، سیدھا سادا بھولا بھالا انسان تھا، جب گاؤں سے آیا۔ پا
اور ماں بہنوں کی ذمّے داری نے دلالوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ اب یہ دلالی کیا جائز ہے!
اب نماز برائیوں سے روکتی ہے! جب میں نماز کی خاطر برائی سے رُک نہیں سکتا تو میں اپنے کا
میں کیا ڈال رہا ہوں! کم بخت اِس منحوس پیٹ نے نہ دین کا رہنے دیا نہ دنیا کا رہنے دیا!" ڈرائیو
گاڑی ایک کچی بستی میں لا کھڑی کی، جہاں کوئی بھی اسٹریٹ لیمپ روشن نہ تھا، ہر طرف گھور اندھیرا
"زندگی میں روشنی کی اُمید ختم ہوجائے تو ایسے ہی گھور اندھیرے دلوں میں بس کر انسان کو ہمیشہ
لیے ویران اور بدقسمت بنا دیتے ہیں۔" وہ بڑبڑاتا ہوا اُترا۔ ترنم نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا
اُسے کہاں لے آیا تھا۔

"یہاں میری میری منکوحہ رہتی ہے! گھر والے چاہتے ہیں کہ میں پہلے اپنی چھ بہنوں کی شادی
دھام سے کروں، پھر جا کر اپنے سر پر سہرا سجاؤں! اور... اور اگر میرے دِل اور جسم کو طلب ہو
ضرورت کہیں سے بھی پوری کرلوں لیکن شادی چھ بہنوں کی شادی کے بعد... کیوں کہ اُن کو ڈر
میری کمائی میں بٹوارہ ہوجائے گا... کیسا ظلم ہے نا! اپنے فائدے کے لیے راہ جاتے انسان کو زانی
جائے۔" ڈرائیور ترنم کو لیے ایک بوسیدہ سے گھر کے سامنے جا رُکا۔

"میں اگر یہاں کام نہ کرتا اور بُرائی اور اُس کے نقصانات کو اتنے قریب سے نہ دیکھتا تو اپنی ضرو
کے لیے کہیں بھی منہ ماری کرلیتا۔ کم بخت طوائفیں! یہ سی کلاس طوائفیں ہمارے جیسے غریب اور مڈل
کے لیے خدمات انجام دے رہی ہیں۔" اُس نے ایک موٹی سی گالی دی، ترنم کو لگا، جیسے یہ گالی اُس
اُسے ہی دی ہو!

اِک عجیب سا توہین بھرا احساس تھا۔

"ایک رات میں اتنے مرد بھگتاتی ہیں کہ کیا کتیا بھی!" اُس نے موٹی سی گالی دے کر درواز
زنجیر بجائی۔

"جتنے مردوں کا ساتھ اتنی ہی بیماریاں ان طوائفوں کے ساتھ سزا کے طور پر منتقل ہوجاتی ہیں
دھیرے دھیرے یہ ہر شخص کو اپنے عذاب میں شریک کرلیتی ہیں۔ میں نے اِس عذاب اور تکلیف
بچنے کے لیے الگ گھر لے کر بیوی رکھ لی... جب وقت آئے گا تو بتا بھی دوں گا" ترنم اُس کی تڑ
زبان کو سُن کر جان گئی کہ بھولے سے اُس نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا۔ اور یہ چھتہ بہت بُری
چھڑ بھی گیا تھا۔

دروازہ کھولنے والی اٹھارہ اُنیس سال کی ایک سانولی سی لڑکی تھی۔

"کتنی بار کہا ہے دروازے کھولنے سے پہلے پوچھ لیا کر۔" ڈرائیور نے اپنی بیوی کو دیکھتے ہی ڈ
پلادی۔

"تیری گاڑی کی آواز پر میرا سارا دھیان ہوتا ہے۔" اُس نے بُرا منائے بغیر کہا اور پھر بولتے بو
رُک گئی۔

"یہ کون... یہ کون ہے؟" وہ اپنے سانولے سلونے شوہر کے ساتھ پریوں جیسی اِس خوب صورت

ا دیکھ کر بے حد حیران ہوئی تھی اور ترنم کے رعب حسن سے متاثر بھی ہوئی تھی۔

"اللہ کتنی سوہنی ہے! اندھیرے میں بھی لائٹیں مار رہی ہے!" اُس نے ترنم کو دیکھ کر دِل ہی دل میں
کہا۔

"چل پہلے رستے سے تو ہٹ!" ڈرائیور نے اُسے پرے کرکے ترنم کے لیے راستا بنایا۔

ترنم کچھ ہچکچاتی ہوئی اندر داخل ہوگئی۔ گھر بہت بڑا نہ تھا۔ صرف ایک کمرا ایک برآمدہ اور برآمدے
آخر میں رکھا باورچی خانے کا سامان اور کچھ تھوڑا سا آنگن تھا۔ پورے چاند کی روشنی اِس قدر زیادہ
کہ صحن میں انرجی سیور لگا محسوس ہو رہا تھا۔

"یہ ہماری مالکن ہیں! جاؤ ان کو اندر لے جاؤ اور جس چیز کی ضرورت اِن کو ہو، وہ لادو۔" ڈرائیور صحن
میں بچھی چارپائی پر تکیہ رکھ کر بولا۔ اُس کا ارادہ تھا، جب تک میڈم اپنا مسئلہ حل کرتی ہیں، تب تک وہ
کچھ کمر سیدھی کرلے۔

"رانی! کیا کھڑی ٹکر ٹکر میرا تھوبڑا دیکھ رہی ہے۔ بیگم صاحبہ کو اندر لے جا..." ڈرائیور نے دبک کر بیوی
سے کہا جو حیرت سے گنگ کھڑی تھی۔

"اٹس اوکے! میں خود چلی جاتی ہوں۔" ترنم نے بہت دھیرے سے رانی کا ہاتھ پکڑ کر اندر کا راستہ
لیا، جیسے وہ یہاں مہمان نہیں میزبان ہو۔

کم عمر رانی! وہ تو اتنی خوب صورت لڑکی دیکھ کر اپنے حواسوں میں نہ تھی بس گم سم، ٹکر ٹکر ترنم کو دیکھے
جا رہی تھی۔ ترنم کو اُس کا تسلسل سے دیکھنا عجیب سا لگ رہا تھا۔

"وہ... رانی مجھے تمہاری کوئی شلوار قمیص مل جائے گی۔" ترنم نے گلا کھنکار کر پوچھا۔

"آں۔ ہاں باجی! کیوں نہیں!" رانی ایک دم ہوش میں آ گئی پھر وہ بے حد پھرتی سے اپنی پیٹی پر
سے صندوق کو اُتار کر نیچے بیٹھ گئی اور بے حد شوخ کپڑے نکال کر ترنم کے سامنے رکھنے لگی۔ یہ اُس کا
ترنم کے لیے بے حد پروٹوکول تھا۔

وہ اپنے عزیز، جھلمل کرتے کپڑے جو اُس نے اپنے شوہر سے فرمائشیں کر کر کے لیے تھے بے حد دیالو
بن کر اُس کے سامنے رکھ رہی تھی۔ وہ اس قدر معصوم تھی اس نے ایک بار بھی کوئی سوال نہ کیا تھا۔

"یہ... یہ والا لے لو!" اُس نے اورنج اور آتشی رنگ کا چنگاڑتا ہوا سوٹ اُس کے سامنے لہرایا۔ ترنم کو
اس کی معصومیت بہت پیاری لگی، وہ دُکھی سی ہنسی ہنس دی۔ اُسے کیا بتاتی کہ اُس کی ذات تو ایسی سیاہ کار،
ماں چوس، رنگ چوس بن گئی ہے کہ اُس کے لیے تو بس ایک کالا لباس باقی رہ گیا تھا۔ اُس کی ذات کی
سیاہی نے ہر رنگ چوس ڈالا تھا۔

"نہیں رانی!" ترنم نے نرمی سے انکار کیا۔

رانی بے چاری کا پریشانی سے چہرہ اُتر آیا تھا۔ "پھر باجی یہ... یہ والا لے لو!" رانی نے ایک اور سوٹ
سامنے لہرایا۔

"نہیں رانی! مجھے کوئی سادہ سوتی سوٹ چاہیے کیا تمہارے پاس ہے؟" ترنم نے نرمی سے پوچھا۔

"ہاں! لیکن وہ تو پرانا ہے!" رانی نے پریشانی سے کہا۔ اتنی بڑی بیگم جو اتنی شان دار لگ رہی تھی اُس

کی کالے رنگ کی میکسی جانے کس کپڑے کی تھی دور سے ہی بے حد نفیس اور بے حد قیمتی لگ رہی تھی
اُسے اُس کے سادے سے کاٹن کے جوڑے کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی۔

''کیا ہے؟'' ترنم نے اپنا سوال دُہرایا تھا۔

''جی..جی ہاں!'' وہ فوراً ہی ایک سادہ سا بے رنگ جوڑا لے آئی۔

''یہ.. یہ آپ کے قابل نہیں ہے!'' رانی بے اختیار بول اُٹھی۔

''تم کیا جانو رانی! میں تو کسی بھی چیز کے قابل نہیں ہوں، یہ تو بہت زیادہ ہے!'' ترنم دِل ہی دِل م
بولی۔

''نہیں! یہ ہی ٹھیک ہے!'' ترنم نے جوڑا پکڑ کر اپنے گرد سے شال ہٹائی۔

رانی کو لگا خوشبو اور روشنی کا کوئی طوفان ہے، جو ایک دم برپا ہو گیا تھا۔ ترنم کا بے حد خوب صور
وجود اُس کے حواس معطل کر گیا تھا۔ عورت ہو کر اُس کا یہ حال تھا تو ترنم تو مردوں کا پانی پتہ کر دیتی تھی
رانی آنکھیں پھاڑے یک ٹک اُسے دیکھ رہی تھی۔

''میں کہاں بدلوں کپڑے؟'' ترنم کے سوال نے اُسے چونکا دیا۔

''یہ اِدھر ہی بدل لو میں باہر چلی جاتی ہوں۔'' رانی حواس باختہ سی باہر نکلی۔

''ہائے ربّا! کیا کوئی اتنا بھی خوب صورت ہوتا ہے کہ دِل ہی رُک جائے!'' رانی کی چھوٹی سی دنیا
وہ پہلی اور آخری لڑکی تھی، جو اتنی خوب صورت تھی۔ بھلا اُس نے کہاں ایسے چہرے، ایسے وجود د
رکھے تھے۔

ترنم نے بے حد سُرعت سے لباس بدلا، وہ اِس ننگے لباس کو مزید برداشت نہ کر پا رہی تھی، جو سا
کی طرح لپٹے اُسے ڈس رہا تھا۔

رانی کا لمبا ڈھیلا لباس بے حد بے ہنگم تھا لیکن ترنم کو لگا اُس کی ننگی روح کو پہلی بار لباس میسر آیا
رانی ہاتھ میں ٹرے اُٹھائے اندر آئی۔

''راجی تو خراٹے مار مار کر سو رہا ہے!'' وہ بے حد بے ہنگم انداز سے ہنسی لیکن ترنم کو وہ بالکل بُری
لگی۔

''یہ کیا ہے؟'' ترنم نے ٹرے کی جانب دیکھ کر پوچھا۔

''یہ باجی کڑھی ہے میں بہت چنگی بناتی ہوں۔ آپ نے روٹی نہیں کھائی ہوگی تو میں کھانا ل
لائی۔'' رانی فوراً آداب میزبانی نبھا رہی تھی۔

''نہیں.. مجھے طلب نہیں ہے!'' ترنم نے بے حد سہولت سے انکار کیا۔

وہ جس طلب سے بے بس ہو کر یہاں ان جان گھر، ان جان میزبان کے سامنے تھی بھلا اُس
اور طلب کے آگے کسی اور بات کی طلب کیسے ہو سکتی تھی۔

''مجھے وضو کرنا ہے!'' ترنم نے رانی سے کہا۔

''جی.. باہر نلکا لگا ہے وہاں سے کر لو۔'' رانی کو وہ حسین پری اور اُس کی حرکتیں عجیب سی لگ
تھیں۔

نم نے چھوٹا سا صحن پار کر کے گھر کے کونے میں رکھی چوکی پر بیٹھ کر وضو کیا۔ پھر وہ پاس کھڑی رانی
یاں سوئے راجی کو اور ان کے گھر اور اِس ان جان جگہ کو مکمل طور پر بھول گئی۔ وہ شاید۔ وہ شاید خود
تھی! وہ تو خود کو ہی بھول گئی تھی۔

پنے جسم کے ایک ایک عضو کو بار بار دھو کر بے حد لگن سے وضو کرتے اُس کی آنکھوں سے جھڑی لگی
می۔ جس کے سامنے ابھی اُس کی حاضری تھی۔ وہ ذات کتنی پاک تھی اور وہ کتنی ناپاک!

وں کی طرح بلک بلک کر روتے ہوئے وہ نماز پڑھ رہی تھی۔ رانی اُسے روتے دیکھ دیکھ کر خود بھی رو
می۔ وہ معصوم سی لڑکی بالکل نہ جانتی تھی کہ ترنم کیوں رو رہی تھی۔ وہ تو اتنی سادہ دِل تھی، جو کسی کو ہنستے
ہنستی تھی اور روتے دیکھ کر روتی تھی۔

تے روتے ترنم کی ہچکی بندھ گئی اور وہ کٹے ہوئے درخت کے تنے کی طرح سجدے میں گر گئی۔

''باجی کیا ہوا؟'' رانی جو کسی پہرے دار کی طرح اُس کے پاس بیٹھی تھی۔ دوڑ کر ترنم کی جانب بڑھی۔
نم آنکھیں بند کیے بے حس پڑی تھی۔ اتنی بے حس کہ رانی کو لگا کہیں ترنم مر گئی ہے! اُس کا ننھا سا
ہم گیا۔

''باجی!'' اُس نے پکارا۔

وہ ایک دم پُرسکون ہو گئی کیوں کہ ترنم کی آنکھیں بند تھیں، جسم ڈھیلا تھا لیکن اُس کے جسم کے اندر
اس کی ہچکیاں چل رہی تھیں۔

نم روح میں غوطہ کھا کر رو رہی تھی۔

چھ لوگ اُوپر سے روتے ہیں! کچھ دل سے روتے ہیں اور بہت کم کو سعادت حاصل ہوتی ہے کہ وہ..
ں میں غوطہ لگا کر ڈوب کر روتے ہیں!
اور پھر ''یار'' کو منا لیتے ہیں!

❖❖○❖❖

''سائیں وہ چھورا تو کہیں باہر کے ملک پڑھنے گیا ہے!'' سید سرفراز احمد کے خاص بندے نے آ کر
اطلاع دی۔

''کتنے عرصے بعد آئے گا؟'' سید سرفراز احمد نے حنوط شدہ ''ہرن'' کو بہ غور دیکھتے ہوئے پوچھا جس
انہوں نے کچھ روز پہلے شکار کیا تھا۔ آج وہ تیار ہو کر گھر آ گیا تھا۔

ن کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن اُس کے چہرے پر درد اور موت کے تاثرات آ کر ٹھہر گئے تھے اس
وہ بے شک حنوط ہونے کی وجہ سے زندہ لگتا تھا لیکن جب پاس سے اُس کو دیکھا جاتا تو اس کے
کا درد بہت نمایاں ہوتا تھا۔ اور یہ درد بھرے تاثرات سید سرفراز کو بہت مزہ دے رہے تھے۔

''سائیں! سال بعد یا پھر ماہ بعد، ابھی کوئی پتا نہیں، میں نے یہ ساری معلومات شکھاں کو وہاں نوکری
لگوا کر حاصل کی ہیں۔ شکھاں نے وہاں کے خاص ملازموں سے اچھی دوستی کر لی ہے اور باتوں ہی
باتوں میں ہمارے لیے ہر طرح کی معلومات اکٹھی کر دی ہیں۔'' رفیق نے سینہ پھلا کر اپنی کارکردگی بیان

سید سرفراز کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ اُن کو اس کی کارکردگی پسند آئی ہے۔

''ٹھیک ہے!'' انہوں نے ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔

''سکھاں کو ابھی وہیں رہنے دینا، ابھی تو ہمارا کام شروع ہوا ہے!'' سید سرفراز مزید گویا ہوئے۔

''اچھا یہ بتاؤ اُن کے خاندان کی کیا کمزوری ہے؟'' سید سرفراز نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

''سائیں! اُن کی لاڈلی بیٹی ''نگینہ'' جو لڑکے کی اکلوتی بہن ہے۔ گھر بھر کی جان اُس چھوکری ہے۔'' رفیق نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

''ہوں!'' سید سرفراز نے کچھ سوچتے ہوئے ہنکارا بھرا۔

''اور ماں باپ کس ذات برادری کے ہیں؟'' سید سرفراز نے پوچھا۔

''وہ تو سائیں آپ کی ہی ذات کے ہیں!''

''احمد شاہ ہے اُن کے والد کا نام اور دولت بھی خاصی ہے۔ بہت اچھا پڑھا لکھا اور سلجھا ہوا گ کہلاتا ہے۔ اور.. اور.. سائیں لڑکا سُنا ہے بہت اچھا اور گھبرو جوان ہے!'' رفیق نے دانت نکسوتے ہ کہا۔

''ہوں! اگر وہ ہر معاملے میں اتنے آگے اور اچھے ہیں تو ہوسکتا ہے رشتہ کرنے میں مشکل کریں لڑکا! نفیسہ کہہ رہی تھی کہ وہ مسکان کو پسند نہ کرتا تھا، اگر اُس نے اپنی مرضی چلائی تو مزید مشکل ہو گی!'' وہ بڑبڑائے۔

رفیق نے اُن کی بڑبڑاہٹ کا کچھ حصہ تو سمجھ لیا تھا لیکن وہ جان بوجھ کر انجان بن گیا تھا۔ حویلی کے ملازموں کی ٹریننگ کا حصہ تھا کہ وہ اتنا سنیں جتنا اُن کو بتایا جائے اور اتنا بولیں، جتنا اُ پوچھا جائے۔

''اور اگر انہوں نے کوئی مشکل پیدا کی تو گھی ٹیڑھی انگلیوں سے ہی نکالنا ہوگا!'' وہ مزید گویا ہو۔

رفیق اب بھی خاموش تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا سید سرفراز احمد یہ سب کچھ اُس سے نہیں کہہ رہے۔

''شادی تو اب میں ہر صورت اپنی بیٹی کی اُسی لڑکے سے کرواؤں گا۔'' سید سرفراز علی نے اٹل میں کہا۔

• وہ ہر معاملے میں اپنی مرضی کرنے کے عادی تھے۔ پہلے جب وہ مسکان کی شادی یہاں کر۔ خلاف تھے تو مسکان کی تعلیم سب کچھ چھڑوا کر ایک شادی شدہ آدمی سے بیاہ دیا۔ اور پھر دل میں بات سما گئی تھی کہ وہ اب اپنی بیٹی کو اُس کی محبت دِلا کر ازالہ کریں گے۔ یہ بات بھی دِل و دماغ میں گئی تھی وہ ایک بار پھر اپنی مرضی ۔ لگے تھے۔ دوسروں پر اپنی مرضی ٹھونسنے لگے تھے۔

''سائیں میرے لیے کیا حکم ہے؟'' رفیق نے تابع داری سے پوچھا۔

''آ.. ہاں! وہ تم! تم مجھے وہاں کی پَل پَل کی خبر سے باخبر رکھو گے۔'' سید سرفراز علی نے چونک کر

''ٹھیک ہے سائیں! وہ ہی ہوگا، جو آپ چاہتے ہیں۔'' رفیق تابع داری سے کہہ کر اُلٹے قدموں

سید سرفراز علی اُس کے جانے کے بعد ایک بار پھر ہرن کو دیکھنے لگے۔ وہ ہرن کو بہت شوق سے پھیر پھیر کر دیکھ رہے تھے اُن کو یہ ہرن اپنے شکار کا ''ماسٹر پیس، ماسٹر اسٹروک'' لگ رہا تھا۔

ے انہوں نے ہرن کی زندگی کے آخری پَل اور درد بھرے احساس کو ''اسٹور'' کرلیا تھا۔

ان کے اندر کے Bad Man کو یہ سب کچھ دیکھ کر بے حد تسکین حاصل ہو رہی تھی۔

ا ئیں! اندر آجائیں۔'' زنان خانے کی ملازمہ نے دروازے پر آ کر پوچھا۔

ہاں آجاؤ!'' سید سرفراز کے چہرے پر ایک دم تناؤ آ گیا تھا۔ ملازمہ کے ساتھ شہر بانو اندر داخل

یٹھو!'' سید سرفراز نے اُس کا سر سے پاؤں تک جائزہ لے کر کہا۔ ملازمہ شہر بانو کو چھوڑ کر باہر نکل

سرفراز کی سرخ سرخ آنکھیں شہر بانو کا دِل دہلا رہی تھیں، کتنے ہی پَل بے حد خاموشی سے گزر یدسرفراز علی جب کچھ نہ بولے تو شہر بانو کو گھبراہٹ سی ہونے لگی۔

ابا سائیں! آپ نے مجھے بلایا تھا۔'' اُس نے اپنی چادر کو سر پر مزید درست کرتے ہوئے پوچھا۔

سرفراز علی پھر بھی کچھ نہ بولے وہ قہر بھری نظروں سے اُس لڑکی کو دیکھ رہے تھے، جس کے باپ لو تباہ کرنے کی، اُن کی انا توڑنے کی پوری کوشش کی تھی۔

اُن عورت کی بھتیجی تھی اور اُس عورت کی بیٹی تھی، جنہوں نے مسکان کو اِس حال تک پہنچایا کہ آج نہ زندوں میں تھی نہ مُردوں میں تھی۔

سرفراز علی کی بیٹی دن رات درد و تکلیف سے چلاتی رہے اور اظہر علی کی بیٹی ہمارے ہی گھر میں مقام پر رہے۔ یہ کیسا انصاف ہے؟

انصاف تو ہونا چاہیے!'' وہ ایک دم بڑبڑائے۔

ن بابا سائیں آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟'' شہر بانو نے پوچھا۔

ہاں! نہیں!'' سید سرفراز اپنی ظالمانہ سوچوں سے ایک دم نکل کر بولے۔

ے لڑکی!'' وہ بہت کچھ مسلسل سوچ رہے تھے۔

م لو اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو کسی اور سے کہنے کے بجائے سیدھی میرے پاس آنا۔'' انہوں نے ے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک دم اُس کی کمر پر ہاتھ پھیر کر اُس کی کمر سہلائی۔

انے کے جسم میں عجیب سی جھرجھری پیدا ہوئی، اُسے سید سرفراز علی کا یہ لمس عجیب سا لگا تھا۔ اللہ عورت ہو یا لڑکی اُس کے اندر ایک خاص حِس رکھی ہے، لڑکی کتنی بھی چھوٹی یا معصوم ہو لیکن مرد اچھا ہے یا بُرا اُس کے اندر لگا الارم فوراً بتا دیتا ہے۔ شاید یہ ہی وجہ تھی کہ شہر بانو کو سید سرفراز کا اس چھونا بے حد بُرا لگا تھا۔

ں چلوں بابا سائیں؟'' شہر بانو نے بیٹھی بیٹھی آواز سے پوچھا۔

.. ہاں! تم جاؤ۔'' سید سرفراز نے اُس پر بے حد گہری نگاہ ڈالی۔

جب جانے کے لیے کھڑی ہوئی تو اس کے قدم سید سرفراز کی آنکھوں کے ارتکاز کی وجہ سے لڑ تھے۔

شہر بانو تم کو کوئی ضرورت پڑے۔ کبھی دن میں یا پھر ''رات'' میں تو تم صرف میرے پاس

"!

سید سرفراز نے اُسے دروازے سے جاتے جاتے پھر روکا۔

"جی اچھا..." شہر بانو نے نگاہ اور سر جھکا کر کہا اور دروازہ پار کرگئی۔

"تم لوگوں نے میری بیٹی کے جسم پر زخم لگائے تھے نا! اب دیکھنا میں تمہاری بیٹی کی روح پر کیسے زخم لگاتا ہوں!" سید سرفراز نے عجیب سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

اُن کی نگاہیں خوب صورت معصوم سے ہرن پر جاٹھہریں جس کی آنکھوں کا درد اُن کو بہت اُ تھا۔ پھر اچانک ہی منظر بدل گیا تھا اب ایک دم ہرن کی درد بھری آنکھوں کی جگہ اُن کو شہر بانو بھری آنکھیں نظر آئی تھیں۔

سید سرفراز کا فوراً دِل چاہا کہ وہ شہر بانو کو بھی ایک ایسا درد دے ڈالیں، جو ہمیشہ کے کے چہرے اور آنکھوں میں ٹھہر جائے اور اُس کا وجود اِس حنوط شدہ ہرن کی طرح بے جان ہو جا۔

کوئی بہت بڑا ظلم اُن کے اندر کسی لاوے کی طرح پھٹنے کو بس تیار ہی تھا۔

❖❖○❖❖

گھر! میرا گھر!
میں اپنے گھر کیسے پہنچوں...
سوکھے حلقوم اور بیٹھتے دِل سے سوچتی ہوں
شاید میں رستہ بھول گئی۔
یہ راہ تو میری راہ نہیں
سب گلیوں پر یہاں نام لکھے
اس گلی پہ کوئی نام نہیں
اور دور دور تک دم سادھے
یہ سارے گھر انجانے ہیں
لو پیلے چاند کا ٹکڑا بھی
کالے پتوں میں ڈوب گیا
اب کچھ بھی نہیں...
بس میرے منہ میں خوف سے بھاری
اور مفلوج زباں ہے یا تلووں سے اوپر چڑھتی ہوئی
میرے انگ انگ میں رچی ہوئی
اِک خنکی ہے

رانی نے ساری رات ترنم کے سرہانے بیٹھ کر گزاری تھی۔ رانی ٹھنڈے پانی کی پٹیاں مسلسل ما تھے پر رکھتی رہی تھی، تب جا کر ترنم کے بخار کو کچھ فرق پڑا تھا۔

ترنم ساری رات بخار میں مسلسل بولتی رہی تھی۔

اماں، بابا اور اُس کا گھر اُس کے گھر کی وہ دہلیز کے اندر صرف امان ہی امان تھی اور جس کے باہر شر لا س شر نے اُسے کھالیا تھا۔ وہ سب کو یاد کرتی رہی تھی۔

رانی بے حد معصوم لڑکی تھی، وہ پریشان ہوتی رہی کہ باجی کے سر کو تاپ چڑھ گیا ہے تبھی تو وہ ساری ا بس بولتی ہی رہی تھی۔

رانی نے بہت احتیاط سے اپنے گھر کے واحد کمرے کا دروازہ بند کیا تا کہ ترنم تھوڑی دیر سکون سے لے۔ ساری رات تڑپنے کے بعد اُس کی اب جا کر آنکھ لگی تھی۔

"سوگئی؟" راجی نے نل سے منہ دھو کر تولیے سے منہ رگڑتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں!" رانی بے حد چپ تھی۔ ترنم کی تکلیف وہ دِل سے محسوس کر رہی تھی اس کا من موہنا چہرہ اور لا لہجہ اُس کے دل میں گھر کر گیا تھا۔ وہ ترنم کے لیے اپنے دِل میں بہت پیارے جذبات محسوس کر رہی ں جیسے ترنم اُس کی بہت قریبی رشتے دار ہو۔

"اچھا چل تُو مجھے چاء (چائے) بنا دے، ذرا سُستی تو دُور ہو۔" راجی نے انگڑائی بھر کر وہیں چارپائی اٹھتے ہوئے کہا۔

"اچھا!" رانی نے برآمدے میں پڑی ڈولی کا دروازہ کھولا، جس کے دروازے پر جالی لگنے سے ہَوا کا لہ بے حد آسان تھا۔ پرات میں پانی ڈال کر اُس میں دودھ کی دیگچی کو ڈھانپ کر رکھا ہوا تھا ایک اور ت میں پانی ڈال کر آٹا رکھا ہوا تھا۔

یہ طریقہ وہ چیزوں کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے استعمال کرتی تھی۔

چائے کا پانی رکھ کر وہ پراٹھے بنانے لگی۔ دیسی گھی کی خوشبو نے سارے گھر کو گھیر لیا تھا۔ راجی کی ل ایک دم چمک اُٹھی وہ اُٹھ کر اُس کے پاس پڑی چوکی پر آ بیٹھا۔

رانی نے چائے، انڈا اور پراٹھا راجی کے سامنے رکھا تو راجی فوراً کھانا شروع ہو گیا۔

"ایک بات پوچھوں راجی!" رانی نے راجی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں پوچھو۔" راجی نے اپنے کھانے کے تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ باجی جو رات آئی تھی، اس کو کیا دُکھ ہے اس کو اتنا تاپ چڑھا، ساری رات وہ روتی، بولتی " رانی نے آخر پوچھ ہی لیا۔ اُس کے لیے ترنم اور اُس کا رویّہ بالکل ایک نئی سی بات تھی۔ اُس نے ل لو بہت محدود پیمانے پر دیکھ رکھا تھا تب ہی تو اُس کی خوشیاں اور دُکھ بے حد چھوٹے چھوٹے تھے۔ ل رات جو کچھ ہوا تھا اُس کے لیے بہت بڑا اور انوکھا تھا۔

"ان کو کیا دُکھ ہو سکتا ہے رانی؟" راجی نے لاپروائی سے کہا۔

"ارے یہ تو لوگوں کو پیسے لے کر سکون بانٹتی پھرتی ہیں۔ لوگوں کے بے سکون لمحات کو خوشی دینے کا بتی ہیں، اِن کو کیا دُکھ ہونا۔" راجی کو ترنم لوگوں کے کام اور اِن لڑکیوں سے بہت شدید نفرت تھی۔ ا ل بے حد خواہش تھی کہ وہ کسی طرح یہاں کی نوکری سے جان چھڑا لے۔

لیکن اِن سب کے باوجود راجی کو زندگی میں پہلی بار اِن لڑکیوں میں سے کسی سے ہمدردی ہوئی تھی تو ف ترنم تھی۔

"وہ ساری رات روتی رہی، معافیاں مانگتی رہی یہ سب کیا تھا؟" رانی نے اپنا سوال اُس کے سامنے رکھا۔

"رانی! تجھے اُس نے کچھ بتایا؟" راجی کو یہ فکر ہونے لگی کہ کہیں رانی کو اُس کے کام کی نوعیت کا نہ چل جائے۔

"نہیں!" رانی نے سچائی سے جواب دیا تو راجی ایک دم پُرسکون ہوگیا۔

"دیکھ رانی! یہ بڑے لوگ ہیں ان کی باتوں میں کبھی نہ پڑنا۔ یہ کبھی خوش ہوتے ہیں اور کبھی نا ہوتے ہیں۔ یہ بھی جاننے کی کوشش نہ کرنا۔ ان کے دُکھ اور ان کی خوشیاں اِن کے مزاج پر منحصر ہوتی اور ان کا مزاج کب بدل جائے کچھ نہیں پتا چلتا۔ پل پل میں بدلتا ہے اور ہم جیسے لوگ اِن کی ہم در یا غصّے میں فوراً پھنس جاتے ہیں۔ تو اِن سے دُور ہی رہنا یہ ہی اچھا ہے!" راجی اپنا ناشتا چھوڑ کر رانی سمجھانے بیٹھ گیا۔

"کچھ سمجھی؟" راجی نے گم سم رانی سے پوچھا۔

"ہوں!" رانی نے اَن مانے جی سے جواب دیا۔

"اچھا میں گھر سے ہو آؤں... کل اماں کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ میں دس بجے آجاؤں گا تم صاحبہ کو آٹھ نو بجے اُٹھا کر چائے وغیرہ پلوا کر ریڈی کر رکھنا۔ اِن کو بھی اپنے ٹھکانے پہنچ کر اپنے پہنچنے اطلاع دینی ہوتی ہے۔ زیادہ دیر ہم یہاں رُک نہیں سکتے۔" راجی کہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر تیزی باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد گاڑی کے اسٹارٹ ہونے اور پھر چلنے کی آواز آئی تو رانی گہرا سانس لے کرا کر کمرے کی جانب بڑھی، جہاں ترنم لیٹی ہوئی تھی۔

رانی نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر ترنم کو دیکھا پھر وہ حیران رہ گئی۔ ترنم بالکل الرٹ، ٹیک لگا کر ہوئی تھی۔ اُس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ راجی کی کڑوی باتیں سُن چکی تھی۔

"باجی تو سی اُٹھ گئے کیسی طبیعت ہے آپ کی،
آپ کے کھانے کو کچھ لاؤں؟" رانی نے ترنم کے پاس آکر پوچھا۔

"نہیں بہت شکریہ!" ترنم نے دھیرے سے مسکرا کر کہا۔

"تُسی راجی کی باتیں سُن کر ناراض ہوگئے ہو؟" رانی نے پوچھا۔

"نہیں چندا! راجی تو بہت اچھا انسان ہے، جس کے اندر اچھائی بُرائی کو پرکھنے اور الگ رکھنے صلاحیت ہے وہ تو بہت ہی اچھا انسان ہے اُس پر اللہ کی خاص رحمتیں ہیں۔ مجھے بھلا اُس کی باتیں بُری لگیں گی۔" ترنم نے سچائی سے کہا۔

"اب تو آپ کا تاپ (بخار) اُتر گیا توبہ توبہ اتنا پنڈا (جسم) آپ کا سڑ رہا تھا، جیسے آگ لگی" رانی نے کہا۔

"میرے اندر آگ ہی تو لگی ہے کچھ میرے گناہوں کے بانجھڑ ہیں کچھ میرے پچھتاووں کے ہیں اور میری اپنی لائی ہوئی، بلائی ہوئی بربادی ہے، اللہ جانے یہ آگ کب بجھے گی؟" ترنم دل میں بولی۔

"باجی میں پراٹھے بہت اچھے بناتی ہوں تُسی ناشتا کرلو، میں نوں بہت خوشی ہوگی۔" رانی کی شدید ال تھی کہ ترنم اُس کے گھر سے ہر صورت کچھ کھا کر جائے۔

"ٹھیک ہے لیکن میں پہلے نماز پڑھنا چاہتی ہوں!" ترنم کی بے وقت نماز کی فرمائش پر رانی پھر سہم ل۔

"اس ویلے کون سی نماز پڑھنی ہے؟" رانی سوال کیے بِنا نہ رہ سکی۔ پھر اُسے رات کو ترنم کی حالت یاد لی، اگر ہر بار وہ ایسی ہی نماز پڑھتی تھی تو کتنی خطرناک بات تھی کیوں کہ نماز کے دوران اُس پر بے طاری ہوگئی تھی۔

"باجی اِس ویلے تو نماز کا وقت ختم ہوگیا ہے، عبادت کا وقت ختم ہوگیا۔" رانی اُسے روکنا چاہ رہی ی۔

"مطلب؟" ترنم نے پوچھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی نقاہت بھرے وجود کے ساتھ باہر نل کے پاس آبیٹھی تھی۔

"مطلب اب ظہر ویلے، ہی ظہر کا ویلا ہوگا نا!" رانی نے معصومیت سے سمجھایا۔

"نہیں رانی! یہ تو اُن لوگوں کی موجیں ہیں، جو تابع دار رہ چکے ہوں میرے جیسے گناہ گار اگر سارا دن دے میں معافی مانگیں تو بھی کم ہے!" ترنم کی آواز میں بے حد نقاہت تھی۔

"نہیں باجی! آپ کو کس نے کہا ہر وقت عبادت کرنے والے گناہ گار ہوتے ہیں۔ وہ تو بہت چنگے تے ہیں جو .. جو رب سوہنے دی عبادت کرے... ذکر کرے وہ تو چنگا ہی ہے نا۔" رانی ترنم کا دِل انے کو بولی۔

جواباً ترنم کے چہرے پہ بہت کرب ناک سی مسکراہٹ تھی۔

"وہ ولی اللہ ہوتے ہیں بلکہ سب ہی لوگ اچھے ہوتے ہیں، سوائے میرے!" وہ منہ ہی منہ میں بڑ ائی۔

"باجی! اللہ جنت نصیب کرے... میری ماں بڑی عبادت گزار تھی۔ جوانی میں بیوہ ہوگئی اُس نے اپنا ان اللہ سے لگالیا میں اکثر اُس سے پوچھتی تھی کہ وہ دنیا سے الگ تھلگ کیوں رہتی ہے؟ تو وہ کہتی تھی کہ نے اپنے من کو جہاں لگایا ہے، وہاں ساری لذتیں کم ہیں۔ وہ سارا دن عبادت کرتی، میں پوچھتی کہ ی عبادت کیوں کرتی ہے تو وہ کہتی کہ دنیا کی ہر چیز ہر ویلے عبادت میں لگی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ ت جو رکوع کی حالت میں کھڑے ہیں۔ چوپائے سجدے کی حالت میں ہیں، پہاڑ تشہد کی حالت ، چونٹیاں سجدے کی حالت میں، ہر شے رب کا ذکر کرتی ہر ہر ویلے ہر گھڑی اُس کی عبادت کرتی ہے ر... انسان تو اللہ نے سب سے اشرف درجے پر پیدا کیا ہے وہ کیوں نہ ان سب سے زیادہ رب کا کرے۔ وہ بھی آپ کی طرح بہت اچھی تھی!" رانی نے اپنی ماں کی یاد میں آنسو صاف کیے۔

"نہیں! تمہاری ماں تو بہت نیک تھی اور کسی نیک کا بد سے کیا مقابلہ؟" ترنم نے تاسف سے آہ ی۔

"رانی! تم تو پڑھی لکھی نہیں لگتیں لیکن تمہاری ماں کی باتیں تو بہت پڑھے لکھوں جیسی لگتی ہیں۔" ترنم

نے سوال کیا۔

''لے باجی! میں پنج فیل ہوں!'' رانی نے فخر سے کہا۔

''میں تو امی سے کہیں زیادہ پڑھی ہوئی ہوں۔ امی کو تو سوائے قرآن مجید کے کچھ نہیں آتا تھا، کیوں کہ امی کا من ہر وقت عبادت میں لگتا تھا اس لیے وہ ہر وقت ایسی باتیں کرتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ دنیا میں من لگاتے ہیں میری طرح وہ شاید ان پڑھ ہی لگتے ہیں! کیوں کہ ہر کوئی میری ماں کو بہت پڑھا لکھا سمجھتا تھا حالاں کہ جس کوٹھی میں وہ کام کرتی تھی، وہاں کا ہر بندہ اُن کو بہت عزت دیتا تھا۔ باجی پڑھے لکھے آدمی ہی کی عزت ہوتی ہے نا؟'' رانی نے اپنی رائے کے ساتھ ہی سوال کر ڈالا۔

''عزت تو اللہ کے ہاں جو منظورِ نظر ہو جائے صرف اُس کی ہوتی ہے!'' ترنم نے طویل سانس بھرا۔

''میں قضا نماز پڑھنا چاہ رہی تھی، میں تمہاری ماں جیسا نہ کرم رکھتی ہوں نہ عمل، جو سارا دن عبادت میں گزار سکوں۔'' ترنم نے دھیمے لہجے میں وضاحت کی پھر بیٹھ کر نماز ادا کی۔ پہلے اُس کو نماز میں سکون ملتا تھا لیکن ترنم پر اب یہ کرم ہونے لگا تھا کہ اُسے نماز میں بے حد سکون میسر آنے لگا تھا۔

ترنم نے سلام پھیر کر رانی کی طرف دیکھا، جو اُس کے لباس کو ہاتھ پھیر پھیر کر پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔

''یہ تم رکھ لو! لیکن یہ لباس تم صرف راجی کے سامنے ہی پہننا خاصا بولڈ ہے، اگر شال بھی لے جائے تو بھی!'' ترنم نے چارپائی کا سہارا لے کر اُٹھتے ہوئے کہا۔

''نہ..نہیں باجی! میں تو ویسے ہی دیکھ رہی تھی۔'' رانی نے فوراً ہچکچا کر کہا۔

''ارے رکھ لو!'' ترنم نے دیوار سے ٹیک لگا کر کہا۔

''پھر آپ کیا پہنو گے؟'' رانی نے پوچھا۔

''پہن تو رکھے ہیں تمہارے یہ کپڑے، اگر تم کو اعتراض نہ ہو۔'' ترنم نے اُس کا لایا ہوا ناشتا کرتے ہوئے کہا۔

''ہو.. ہائے باجی! کیسی باتیں کرتے ہو، میں کیوں اعتراض کروں گی بھلا، پھر میرا والا تو سوٹ بھی ڈیڑھ سو کا ہے آپ والا تو اللہ جانے کتنے ہزار کا لگ رہا ہے! یہ شال، ایسی مخملیں شال تو میں نے حیاتی میں کبھی نہیں دیکھی۔'' رانی نے سچائی سے کہا۔

''رانی تمہارے پراٹھے واقعی بہت مزے کے ہیں میں نے سالوں بعد ایسا کھانا کھایا ہے لذت بھرپور۔'' ترنم نے رغبت سے رات کا بچا سالن اور پراٹھا کھاتے ہوئے کہا۔ وہ کھانے بیٹھی تو رانی کا دل رکھنے کے لیے تھی لیکن کھانے کا ذائقہ ہو بہو ترنم کی اماں جیسا تھا۔ ترنم کھاتے ہوئے چونکی تھی کس قدر اپنا اپنا سا احساس تھا اور کتنا مانوس ذائقہ تھا اس مانوس ذائقے کے لیے ترنم کی زبان ترس گئی تھی۔ رانی دھیرے سے مسکرادی۔

''ویسے یہ ساگ تو میری خالہ بنا کر گئی تھی۔ وہ ہر وقت جانے کس خیال میں مگن رہتی ہے سودائیوں کی طرح لیکن کبھی کبھی تو بالکل ہوش مندوں کی طرح ہو جاتی ہے۔ باتیں کرتی ہے سیانوں جیسی، کام کرتی ہے مشورہ دیتی ہے۔'' رانی کو ہر بات شاید بے حد تفصیل سے کرنے کی عادت تھی۔

''واقعی بہت مزہ ہے اِس ساگ میں! میری امّاں بھی بالکل ایسا پکایا کرتی تھیں۔'' ترنم نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

''واقعی خالہ کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے لیکن خالہ نا پتا نہیں اُسے کیا ہو جاتا ہے۔ دنوں چپ رہتی ہے مہینوں غائب رہتی ہے لیکن پھر بھی ہمارے ہاں ضرور آتی ہے، چاہے مہینوں بعد آئے۔'' رانی نے ...ال میں کہا۔

''ہوں!'' ترنم نے رانی کی باتوں پر بہت زیادہ دھیان نہ دیا۔ پیٹ بھرتے ہی خیالات اُس کے ذہن میں گھومنے لگے تھے اُسے میڈم راگنی کی فکر ہوئی تھی۔ رات سے اُس سے رابطہ نہ تھا۔ وزیر کی موت کی خبر تو اُسے فوراً ہو چکی ہوگی اور اب تک اُس کے رابطے میں نہ رہنے کی وجہ سے خاصی ناراض بھی ہوگی اُس کی ناراضی کا مطلب اپنی زندگی کو مزید کرب ناک بنانا۔

وہ کچھ سوچ کر اپنے بیگ میں رکھے موبائل فون کو آن کر رہی تھی، کل رات سے اُس نے موبائل ...ل کر رکھا تھا۔

میڈم راگنی کی تین وائس میل اور سولہ میسج موجود تھے۔ ترنم ان کو کھولے بغیر بھی جانتی تھی کہ اِن میں کیا پیغام ہوگا اِس لیے اُس نے ڈائریکٹ میڈم راگنی کا نمبر ڈائل کیا اور اُس کی چنگھاڑ دھاڑ سننے کے بعد اُسے اپنا پتا بتایا کہ وہ جلد آ رہی ہے۔

فون بند کر کے ترنم نے ایک گہری سانس لی۔ جانے اِس عورت سے اِس گروہ سے اُس کی جان کب ...ائی تھی، شاید جاں جا کر ہی چھوٹنی تھی۔

''باجی! باہر راجی آیا ہے آپ کو بلا رہا ہے کہ چلنا ہے۔'' رانی جو اُس کے فون کرنے کے دوران باہر گئی تھی آ کر بولی۔

''ٹھیک ہے!'' ترنم نے اپنا بیگ اُٹھایا۔ پھر ایک دم واپس مڑ کر رانی کے گلے جا لگی، ترنم کے روّیے میں بے حد اپنائیت تھی۔ رانی بے حد خوش ہوگئی۔

ترنم نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈالا پھر مٹھی بھر کر ہزار ہزار کے ڈھیروں نوٹ نکال کر رانی کو دے دیے۔

''یہ تم میری طرف سے رکھ لو آخر راجی کی نئی نویلی دلہن ہو۔'' ترنم نے بہانے سے اُن کی مدد کرنے کی کوشش کی۔

''ارے باجی ہمارے تو ویہا (بیاہ) کو تیسرا ورہ ہے۔ اللہ کوئی بال دے اب تو۔'' رانی نے شرماتے ہوئے کہا۔

''اللہ کرے۔'' ترنم مسکرا کر بولی اور باہر کو قدم رکھے۔

''اللہ حافظ!'' وہ کہہ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

''اللہ حافظ!'' رانی جواباً بولی اور ہاتھ ہلا کر ترنم کو رخصت کیا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی رانی ابھی دروازہ بند کرنے ہی لگی تھی کہ ایک دم خالہ سامنے آ گئی۔

''ارے خالہ کر آئی داتا صاحب کو سلام!'' رانی نے مسکرا کر پوچھا۔

''یہ.. یہ کون تھی!'' خالہ نے پھٹی پھٹی نگاہوں اور پھٹی پھٹی آواز میں پوچھا۔

''یہ راجی کی بیگم صاحب تھی۔'' رانی نے خالہ کو ہاتھ پکڑ کر اندر کیا۔ خالہ کو اکثر اٹھانا بٹھانا، کھلانا کروایا جاتا تھا۔

''بیگم صاحبہ؟

نہیں! نہیں..نہیں! یہ.. یہ تو میری!'' خالہ نے اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''یہ تو! میری ایمان فاطمہ تھی! میری نظر کمزور ہوسکتی ہے، پر میرا دل اُس کی آہٹ پہچانتا ہے! میری ایمان ہی تھی!'' خالہ کا لہجہ بے حد دھیما تھا، مگر بہت مضبوطی لیے تھا۔

''خالہ.. خالہ.. کیا ہوا؟'' رانی نے اُن کا سرد ہاتھ ہلا کر اُسے پکارا لیکن اگلے ہی لمحے خالہ لہرا کر اس کے اوپر گری تھیں!

❖❖○❖❖

''یوں لگتا ہے جیسے کوئی بہت بڑا طوفان آنے والا ہے! کیسے زور کی آندھی ہے!'' ملازمہ نے کمرے کی کھڑکیاں بند کرتے ہوئے کہا۔

''اب زندگی میں اور کتنے طوفان باقی ہیں؟'' ساجدہ بی بی نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

''حوصلہ کریں بڑی بی بی جی! مردوں کے ساتھ مرا تھوڑی جاسکتا ہے، اپنے اپنے حصے کی زندگی تو کر ہی جانی پڑتی ہے۔'' بوڑھی ملازمہ چوں کہ خود بیوگی کی آگ کو جھیل چکی تھی شاید اِسی لیے اُسے ساجدہ بی بی کی تکلیف کی شدت کا احساس اچھی طرح سے تھا۔

''اپنے اپنے حصے کی زندگی میں دوسروں کی زیادتیاں پھر ہم عورتوں کو کیوں بھگتنی پڑتی ہیں؟'' ساجدہ بی بی نے دکھ سے پوچھا۔

''کیوں بی بی اتنی پریشان ہو؟'' بوڑھی ملازمہ نے آخر پوچھ ہی لیا۔

''ایک عورت کا دِل اپنے مرد میں اٹکتا ہے اور ماں کا دِل اپنی اولاد میں۔ شوہر تو اب میرا رہا نہیں، صرف اولاد کی خاطر زندہ ہوں، لیکن وہاں سے بھی کوئی سکون نہیں ہے۔ جانے کیوں میرا دل اُس دن سے ہی ڈر رہا ہے، جب سے شہر بانو اپنے سسرال واپس گئی ہے!'' ساجدہ بی بی نے اپنا وسوسہ بیان کیا۔

''لیکن بی بی پریشانی کی کیا بات؟ اُسے تو وہ لوگ بہت آرام سے لے گئے تھے ورنہ تو سب کا خیال تھا کہ سید سرفراز علی جیسا بندہ اپنی بیٹی کی تکلیف کا بدلہ ضرور لے گا۔'' بوڑھی ملازمہ نے مالکن کا وسوسہ دور کرنے کی کوشش کی۔

''اتنے آرام سے وہ لے گئے یہ ہی تو اصل پریشانی کی وجہ ہے!'' ساجدہ بی بی نے کہا۔

''وہ شخص اتنے آرام سے نہیں بیٹھنے والا۔ ہر کوئی یہ ہی بتاتا ہے کہ وہ سید اظہر علی سے بھی سخت ہے پھر.. پھر وہ اُس روز جتنے غصے سے مسکان کو لے کر حویلی سے گیا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ یقیناً خون کی ندیاں بہادے گا اور یہ رشتے داری دشمنی میں بدل جائے گی.. لیکن؟ لیکن پھر کچھ بھی نہ ہوا! وہ بہت خاموشی سے آیا اور شہر بانو کو لے گیا، کیا وہ اتنا اعلیٰ ظرف ہے؟ لیکن دِل اس پر بھی نہیں ٹھہرتا، مجھے اُس کی اتنی خاموشی سے ڈر لگتا ہے!'' ساجدہ بی بی کا دل بے حد پریشان تھا۔

باہر بہت زور سے بجلی کڑکی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے یہ بجلی کہیں گری تھی کچھ پل کو بوڑھی ملازمہ اور ساجدہ بی بی دونوں اتنی گرج کی آواز سے سہم کر چپ ہوگئے۔

''تمہیں پتا ہے ماسی جب بجلی گرتی ہے تو پہلے کیا ہوتا ہے؟'' ساجدہ بی بی نے بوڑھی ملازمہ سے کہا۔

''کیا ہوتا ہے؟''

ملازمہ نے مالکن کا دل رکھنے کے لیے پوچھ لیا ورنہ جتنی اُس کی عمر اور تجربہ تھا اُس کے پاس تو ہر سوال کا ریڈی میڈ جواب پہلے سے موجود ہوتا تھا۔

''بادل گرجنے سے پہلے بجلی کی روشنی نیچے زمین پر آتی ہے بنا آواز کے خاموشی سے۔ پھر۔ پھر دل ہلا دینے والی گرج سنائی دیتی ہے! تب جا کر پتا چلتا ہے کہ بجلی گری ہے! مجھے سید سرفراز علی کی آمد اور اُن کی خاموشی سے آنا یوں ہی محسوس ہوتا ہے!'' ساجدہ بی بی کا لہجہ سرسرا رہا تھا۔

اُن کے پاس ایک ماں کا دِل موجود تھا، جس کے ریڈار پر بہت ساری انہونیاں پہلے سے سنائی دینے لگی ہیں!

❖❖○❖❖

''بلال۔ بلال؟''

شہر بانو کی آنکھ اچانک کھلی تھی، یوں لگتا تھا، جیسے کچھ آس پاس مختلف ہوا ہو۔ اُس کا نیند سے بیدار ذہن اس ''مختلف'' کو فوراً جانچ نہ پایا۔ پھر اچانک ہی اُسے احساس ہوا کہ بلال کمرے میں نہیں ہے۔

''بلال!'' اُس نے بستر سے اُٹھتے ہوئے اسے آواز دی۔ لیکن اُسے اُٹھنے سے پہلے ہی کسی نے بے دردی سے گرفت میں لے لیا تھا۔ شہر بانو نے خوف زدہ نگاہوں سے حملہ آور کو دیکھا۔

''کا... کون ہو تم؟

''چھوڑو مجھے۔'' شیر بانو کی آواز خوف سے پھٹ گئی، ننھا سا دل خوف سے ڈوبنے لگا۔ باہر بجلی چمکی تو شہر بانو کو اُس کا چہرہ دکھائی دے گیا۔

''آپ؟'' شہر بانو کی دکھ اور تاسف سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ دوسری جانب سے دست درازی بڑھی تھی۔

''پلیز.. پلیز مجھے چھوڑ دیں۔ آپ کو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کا واسطہ! یہ ٹھیک نہیں ہے!'' شہر بانو نے روتے ہوئے خود کو چھڑانے کی بھرپور کوشش کی اور کچھ کامیاب بھی ہوگئی اور دوڑ کر دروازے کو کھولنے کی کوشش کی لیکن دروازہ شاید باہر سے لاک کیا گیا تھا۔

لگتا تھا بکری کو ایک کمرے میں شیر کے ساتھ بند کر دیا گیا ہو اور اِس کا نتیجہ سب ہی کو پتا تھا۔

کیا شیر نے بکری کو کبھی چھوڑا ہے؟

''کوئی فائدہ نہیں ہے، دروازہ نہیں کھلے گا!'' دوسری جانب سے نہایت سفاک لہجہ میں کہا گیا اور اُس کا دوپٹا کھینچ کر ہوا میں اُچھال دیا۔

''نہ.. نہ، نہیں!'' شہر بانو چیخی۔

”بلال.. بلال.. بچاؤ۔“

”اللہ۔ اللہ جی!“ وہ دور ہٹنے کی بے سود کوشش کر رہی تھی۔

”ہائے.. نہیں.. کوئی ہے! بچاؤ!

”پلیز نہیں! چھوڑ دو مجھے!“

مگر لگتا تھا کہ ہر چیز بہری ہو گئی ہو! جہاں اُس کی آواز کسی کو سنائی نہ دی ہو!

”نہیں!“ شہر بانو کی چیخ آسمان کو دہلا گئی، تب ہی شاید اتنے زور سے بجلی کڑکی تھی کہ دِلوں کو، زمیں دہلا گئی تھی!

”کہیں بجلی گر چکی تھی اور جلا کر خاک کر گئی تھی!“

ذرا دھیرے سے تم چلنا کہ یوں تو آبگینے ہیں
یہی وہ آبگینے ہیں
کبھی ہو پیاس کی شدت تو یہ پانی پلاتے ہیں
کبھی سورج کی ہو حدت تو یہ سایہ بناتے ہیں
یہ ہیں آنگن کے تارے جو ہمیشہ جگمگاتے ہیں
مکاں کو گھر بناتے ہیں، انہی میں وہ قرینے ہیں
کہ یہ تو آبگینے ہیں کہ جو گھر بھر کی زینت بھی
یہی آنکھوں کی ہیں ٹھنڈک
یہی فرحت بھی، راحت بھی
ان ہی سے رونق محفل، ان ہی سے حرمتِ محمل
بھری شاداب دنیا میں، یہی سرسبز اِک حاصل
یہی جنت کے زینے ہیں کہ
ہیں یہ ماں یہی بیٹی، یہی بہنا
یہی ہیں ہاتھ کا گہنا
محاذوں پر جو نکلو تو
کبھی پیروں کی بیڑی بھی!
مگر تم توڑ مت دینا، انہیں مستور ہی رکھنا
یہ ”عصمت“ کے نگینے ہیں کہ یہ تو آبگینے ہیں!
کبھی سوچا بھی ہے تم نے؟ یہ کتنا دُکھ اُٹھاتی ہیں
تمہاری زندگی کو کس طرح شاداں بناتی ہیں
تمہاری راہ کے کانٹے یہ چن لیتی ہیں پلکوں سے
سفر آساں بناتی ہیں
سنور جائیں اگر اِک نسل کا ایماں بناتی ہیں
پھر اِن معصوم کلیوں کو یہی بصریؒ یہی سفیانؒ بناتی ہیں!

تم مگر......توڑ مت دینا! انہیں مستور ہی رکھنا!

یہ عصمت کے نگینے ہیں

کہ یہ تو آبگینے ہیں! یہ تو آبگینے ہیں!

''یہ اتنی صبح صبح کس کا فون آیا ہے؟'' ساجدہ بی بی نے مندھی مندھی آنکھوں سے بجتے ٹیلی فون دیکھا۔ پہلے تو وہ سستی سے فون کو چپ چاپ دیکھتی رہیں لیکن جب انہیں اندازہ ہوا کہ دوسری طرف سے کوئی ہرصورت بات کرنا چاہتا ہے تو ناچار اُن کو اُٹھنا ہی پڑا۔ رات مسلسل جاگنے سے ان کا سر بھاری ہو رہا تھا۔

''اللہ خیر کرے۔'' وہ کہہ کر آگے بڑھیں۔

خیریت نہیں تھی یہ اُن کا دِل کل رات سے کہہ رہا تھا۔ فون بڑی حویلی سے تھا، شہر بانو کی طرف سے پیغام تھا کہ وہ اُس سے فوراً مل جائیں یا پھر اُس کو بلا لیں۔

ساجدہ بی بی نے تڑپ کر پوچھا آخر کیا بات ہے؟ کہ اُس کی بیٹی اُسے بلا رہی ہے، جب کہ وہ جا بھی ہے کہ ماں عدت میں ہے باہر نہیں نکل سکتی لیکن ملازمہ نے مزید کوئی تفصیل بتائے فون بند کر تھا۔

ملازمہ نے بھی تو اتنا ہی بتانا تھا، جتنا کہ سید سرفراز علی نے کہلوایا تھا۔

ساجدہ بی بی کتنی ہی دیر ساکن بیٹھی رہیں، خالی الذہن! دِل میں عجیب طرح کی گھبراہٹ اور وسو جنم لے رہے تھے۔

''میں تو نہیں جاسکتی! عدت میں کہاں باہر نکلنے کی اجازت ہے، لیکن میں سعادت علی بھائی اور بھا سے کہتی ہوں کہ شہر بانو سے جا کر مل آئیں، آخر بچی کے ساتھ کیا مسئلہ ہے جو اُس نے خاص طور ملنے کا کہلوا بھیجا۔''

وہ ایک بار پھر تیزی سے فون کی جانب بڑھیں تا کہ بھائی اور بھاوج کو شہر بانو سے ملنے کے لیے کہ سکیں۔

بھائی کے گھر کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے اُن کی انگلیوں میں واضح لرزش تھی، چھٹی حِس اُسے بتا رہی تھی کہ کچھ غلط ہو چکا ہے یا پھر ہونے جا رہا ہے، ایک ماں کے دِل کے ریڈار پر ریڈنگ اچھی نہیں آرہی تھی۔

❖❖❍❖❖

دروازہ بُری طرح کھٹکھٹایا جا رہا تھا، آپا اماں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھیں۔

''اللہ خیر کرنا!'' بے اختیار انہوں نے دھڑ دھڑاتے دِل سے دُعا کی تھی۔ وہ نیند کی دوا لے کر سو تھیں یوں اچانک آنکھ کھلنے سے اُن کا دل بے ترتیب ہو کر اپنی رفتار بھی بے ترتیب کر گیا، پھولتے سان کے ساتھ انہوں دروازہ کھولا۔

''بڑی اماں! وہ..وہ!'' بلال بُری طرح ہراساں تھا۔

وہ تو بہت گم سم رہنے والا بچہ تھا، کم ہی یوں کسی نے اُس کی کبھی آواز سنی ہو گی۔

''کیا ہوا بیٹا؟'' آپا اماں نے پریشان ہو کر اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

''وہ..وہ دلہن کے خون نکل رہا ہے وہ رو رہی ہے۔'' بلال نے خود بھی سسکیاں لینی شروع کر دیں۔

بے شک شہر بانو کے ساتھ اُس کے ازدواجی تعلقات نہ تھے نہ ہی اُس کا سویا ہوا دماغ اس رشتے کی اہمیت کو سمجھتا تھا لیکن شہر بانو نے اپنے دھیمے انداز اور پیار سے بلال اور اپنے بیچ دوستی کا بے حد خوب صورت تعلق بنالیا تھا۔ شاید یہ ہی وجہ تھی بلال اُس پر اعتبار کرنے لگا تھا اُسے اپنے کمرے میں رہنے دینے لگا تھا اور اُس کا بے حد خیال رکھنے لگا تھا۔ اب بھی وہ شہر بانو کے لیے پریشان ہو کر آپا اماں کی طرف بھاگا تھا۔

''بیٹا حوصلے سے...!'' آپا اماں نے اُسے تسلی دی اور سلیپر پیروں میں ڈال کر اُس کے ساتھ ہولیں۔

''مجھے تم بتاؤ کہ کیا ہوا؟ کہیں تم نے اپنی دوست کو مارا تو نہیں؟'' آپا اماں نے بلال کے ساتھ چلتے چلتے پوچھا۔

''میں نے تو دلہن کو کچھ نہیں کہا، وہ تو بہت اچھی ہے! میرے سارے کام کرتی ہے مجھے پیار کرتی ہے اور جب مجھے آگ لگتی ہے تو وہ کچھ پڑھ کر میرے اُوپر پھونکتی ہے پھر میرے اندر آگ کم ہو جاتی ہے۔''

بلال کو عرصہ دراز سے عجیب وغریب بیماری تھی، اُس کا جسم اچانک بُری طرح جلنے لگتا تھا ایسے کہ جیسے اُسے آگ لگی ہو، ایسے میں وہ پاگلوں کی طرح چیختا چلاتا تھا۔ اُس کے دماغ کی کچھ نسیں دب گئی تھیں جس کی وجہ سے وہ نارمل لڑکوں کی طرح بی ہیو نہ کرتا تھا۔ بلال کے لہجے میں بے حد سچائی تھی۔ آپا اماں نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ اُسے دیکھا۔

''میرا بیٹا تو بہت اچھا ہے، بہت سمجھ دار ہو گیا ہے۔'' آپا اماں واضح طور پر اُس کے اندر شہر بانو کے آجانے کے بعد فرق محسوس کرتی تھیں۔ شہر بانو بلال کے لیے جلتی ہوئی آگ پر ٹھنڈی پھوار کا اثر کر رہی تھی۔

''آپا اماں! رات میں حمیدہ ماسی کے پاس تھا وہ مجھے فلم دکھانے لے کر گئی تھی سپرمین والی، پھر میں نے دلہن کے رونے کی آواز سنی، میں نے جا کر دروازہ کھٹکھٹایا لیکن دلہن مجھے بلاتی رہی، روتی رہی لیکن دلہن نے دروازہ نہیں کھولا، میں تو دلہن سے ناراض ہو گیا تھا کہ وہ میری بات نہیں سنتی، لیکن جب مجھے بہت غصہ آیا تو بابا جان نے دروازہ کھولا۔ بابا جان بہت اچھے ہیں وہ میری بات ہمیشہ مانتے ہیں لیکن دلہن گندی ہے، جب دلہن روتی ہے تو میں بہت دُکھی ہوتا ہوں۔ آپ اُس کو چل کر چپ کراؤ اُس کے خون بھی نکل رہا ہے!'' بلال ایک کے بعد ایک دھماکہ کر رہا تھا۔

آپا اماں صدمے کی حالت میں کھڑی کی کھڑی رہ گئیں، دُکھ اور تکلیف کا ایک لاوا سا اُن کے دِل سے پھوٹا جس میں وہ پگھل پگھل کر ٹوٹ ٹوٹ کر بہے جا رہی تھیں۔

''اُف میرے خدا! اللہ میرا خدشہ غلط کر دینا!'' انہوں نے صدقِ دل سے دُعا کی لیکن دِل کسی سوکھے پتے کی مانند لرز رہا تھا۔ وہ کسی بہت بڑی قیامت کی خبر دے رہا تھا۔

''آپا اماں! چلیں نا۔ آپ رُک کیوں گئیں؟'' بلال نے ہاتھ پکڑ کر اصرار کیا۔

''میں آرہی ہوں بیٹا!'' آپا اماں کسی زندہ مردے کی طرح خود کو گھسیٹتے ہوئے چلیں، یوں لگ رہا تھا

جیسے اُن کے سارے وجود کا خون نچڑ کر رہ گیا ہو۔

بلالی کا کمرہ خاصا دُور تھا، دو تین راہ داریاں کراس کر کے وہ بلال کے کمرے تک گئی تھیں۔

''بڑی امّاں آؤ نا!'' بلال نے آیا امّاں سے کہا۔

آیا امّاں نے لرزتے قدموں سے کمرے میں قدم رکھا۔ کمرے کی اور شہر بانو کی ادھڑی حالت چیخ کر اُن کے خدشے کو درست ثابت کر رہی تھی۔

آیا امّاں کی جرأت نہ پڑ رہی تھی کہ وہ شہر بانو سے نگاہ ملائیں، پھر بھی وہ ہمت کر کے اُس کی طر بڑھیں۔

''شہر..شہر بانو!'' انہوں نے خشک گلے کو تھوک سے تر کرتے ہوئے اُسے مخاطب کیا۔ جن نظروں شہر بانو نے اُن کو دیکھا، اُن کے ہونٹوں سے بے اختیار سسکی نکلی۔

اُن کی نظروں کے سامنے بہت برسوں پہلے کے منظر گھوم گئے۔ رانی کا خوب صورت وجود کا کٹا ہوا، اُس کی رحم مانگتی اَدھ کھلی نگاہیں! پھر...!!

پھر امنگوں بھری نفیسہ کی ادھڑی حالت! جو جیتے جی مرگئی تھی! زبیدہ کا بلکتا سسکتا وجود! اور کئی ایسے بے گناہ معصوم وجود ایک ہی بھیڑیے کا شکار ہوئے تھے۔

اور آج اتنے سالوں بعد پھر... پھر وہی کہانی سامنے تھی لیکن یہاں اتنے نازک اور پاکیزہ رشتے بے حرمتی ہوئی تھی... اس کہانی کا کیا انجام ہونا باقی تھا؟

آیا امّاں کا وجود تیز آندھیوں میں تھا۔

شہر بانو یوں گم سم ٹکر ٹکر سامنے دیوار کو گھور رہی تھی، جیسے وہ پتھر کی ہو چکی ہو، اُس نے بس ایک زخمی آیا امّاں پر ڈالی پھر دوبارہ سامنے دیکھنے لگی۔

نیم برہنہ کپڑوں سے بے پرواہ ساکن تھی، خاموش تھی۔

بھیڑیے نے نوچ نوچ اُسے کھا ڈالا تھا، مار ڈالا تھا۔ یہ تو اُس کا ''پنجر'' باقی تھا۔

''شہر بانو کچھ تو بولو بیٹا!'' آیا امّاں نے تڑپ کر اُسے ہلا کر کہا۔

شہر بانو نے ایک خالی نگاہ اُن پر ڈالی۔

''پنجر نہیں بولا کرتے!''

''شہر بانو کیا ہوا؟'' آیا امّاں رو ہی پڑیں۔

''قیامت آئی تھی۔ لیکن قیامت کے بعد تو روز حساب شروع ہوتا ہے نا! تو میرا حساب، میرا بدلہ لے گا؟ کب میرے ساتھ ہوئے ظلم کا حساب ہوگا؟ دیکھو اِس کے چوٹ لگی ہے! خو۔ خون۔ خون ہے بلال نے شہر بانو کا ماتھا چھو کر کہا۔ وہ تو تھوڑا سا خون دیکھ کر ہراساں ہو جاتا تھا، جب کہ شہر بانو ماتھے سے تو ٹھیک ٹھاک خون بہہ رہا تھا۔

''شہر بانو!'' آیا امّاں نے شہر بانو کو ہلایا تو وہ جھٹکے سے گری تھی یوں جیسے بے جان مٹی کا بُت ہو۔ امّاں نے گھبرا کر شہر بانو کو اُٹھایا، وہ بے جان گڑیا کی طرح اُٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

''تُو کیوں واپس آئی تھی؟ تجھے معلوم بھی تھا کہ سید سرفراز وہ شیطان ہے، جو کبھی بھی اپنے ساتھ ا

اِرتی کا بدلہ نہیں رکھتا، یہاں تو اُس کی بیٹی کا معاملہ تھا، کیسے تیرے گھر والے عقل کے اندھے تھے تجھے ھیڑیے کے حوالے کر دیا!'' آیا امّاں کے لہجے میں ایسا دُکھ تھا، جیسے کچھ کھونے پہ کوئی ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے۔

''میں بھی کل رات ہی واپس آئی تھی مسکان کو لے کر، مجھے تو کسی نے بتایا ہی نہیں کہ تم واپس آ گئی ابہ تو بلال نے بتایا کہ...'' آیا امّاں صفائیاں دے رہی تھیں لیکن لفظ، تسلیاں کچے برتنوں کی طرح ٹوٹ رہی تھیں اور کچے برتن کہاں دُکھ کے آنسو اپنے اندر سنبھال سکتے ہیں۔ آیا امّاں کو اپنی ہر بات بے کار لگ رہی تھی۔

''شہر بانو!'' انہوں نے اُسے پھر ہلایا اور پھر بے بسی سے پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

بلال نے مزید ہراساں ہو کر شہر بانو اور آیا امّاں کو دیکھا اور وہ بھی رونے لگا۔

وہ جو بلال کی ذرا ذرا تکلیف پر تڑپ اُٹھتی تھی آج اُس کے کانوں تک کسی آواز کا اثر نہ پڑ رہا تھا۔

''دلہن! آیا امّاں دلہن کو کیا ہوا، یہ بولتی کیوں نہیں؟'' بلال نے روتے ہوئے تڑپ کر پوچھا۔

''تم کیسے مرد ہو؟ اپنی بیوی کی حفاظت نہ کر سکے۔''

دُکھ تو یہ ہے کہ اپنی ہی ''چھت'' جس کو سائبان جانا وہ ہی سر پر آن گری!

''جب اپنی چھتیں سایہ دینے، پناہ دینے کے بجائے گر کر انسان کو ڈھا دیں تو باہر کی دنیا سے کیا گلہ!'' آیا امّاں سسک رہی تھیں۔

''بی بی جی! وہ... وہ چھوٹی بی بی کے گھر والے آئے ہیں۔'' ملازمہ نے آ کر اطلاع دی۔

ملازمہ کی بھی ہوائیاں اُڑی ہوئی تھیں کل رات کی قیامت کا کچھ حصہ وہ بھی تھی، وہ ہی تو بلال کو کمرے سے اُٹھا کر لے گئی تھی۔ اب دِل و ضمیر پچھتاوے میں گھرا ہوا تھا۔ وہ شہر بانو سے نظر نہ ملا پا رہی تھی۔ اُسے لگ رہا تھا کہ اُس نے کسی کا قتل کر ڈالا ہو۔

''اِس وقت! اُن کو کسی نے بتا تو نہیں دیا؟ یا اللہ یہ کیا قیامت ہے! اِس کا سامنا کیسے ہوگا؟'' آیا امّاں نے لرزتی ٹانگوں سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''کدھر ہے شہر بانو! یہ تم لوگ شہر بانو سے ملنے کیوں نہیں دے رہے؟'' سعادت علی نے اپنی بیوی ارم بی بی کے ساتھ داخل ہوتے ہوئے کہا۔ پھر وہ اندر کا منظر دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

''شہر بانو! یہ تجھے کیا ہوا ہے۔'' ارم بی بی جو اُس کی ممانی اور پھوپھو تھیں، تڑپ کر لپکیں۔

سید سعادت علی کی آنکھیں خون رنگ ہو رہی تھیں اور تنفس غصّے سے بے ترتیب ہو رہا تھا۔

شہر بانو نے ایک دم سر اُٹھا کر ماموں ممانی کو دیکھا، پھر ایک دم اُس کے چہرے پہ جیسے زلزلہ سا آ گیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ وہ سب کی سوالیہ نظروں کا جواب نہیں دے پائے گی اور ایسا سچ کبھی بھی نہ بتا پائے گی جس کو بتانے سے بہتر تھا وہ مر جائے!

ہاں وہ مر جائے!! جیسے کسی نے ہاتھ پکڑ کر اُسے اُٹھایا تھا۔ پھر وہ ایک دم اُٹھ کھڑی ہوئی کٹے پھٹے کپڑوں کے ساتھ بنا دوپٹے کے وہ سید سعادت علی کی غیرت کے لیے ایک بہت بڑا تازیانہ تھی۔ وہ اُس کی یہ حالت برداشت نہ کر پا رہے تھے۔

''شہر بانو کدھر جارہی ہو؟''

شہر بانو تیزی سے ماموں کے پاس سے گزرتی ہوئی باہر کو دوڑی۔

''بانو! گڑیا!'' ماموں نے اُسے پکارا اور پھر سب ہی باہر کو لپکے۔

''یہ.. یہ کہاں جارہی ہے؟'' ارم بی بی نے اُس کے پیچھے لپکنے کے ساتھ روتے ہوئے پوچھا۔

''بانو! آپا لمّاں نے شہر بانو کا رخ دیکھ کر ہراساں ہوکر اُس کی جانب دوڑ لگائی تھی کہ وہ اُسے روک سکیں، اُن کا دل خوف سے بند ہونے کو تھا۔

''شہر بانو! رکو بیٹا!'' آپا لمّاں نے بھی اُسے پکارا سب ایک دم ڈر کر چیخے تھے کہ وہ رُک جائے لیکن اُس نے مڑ کر سب کی جانب بس ایک نگاہ ڈالی تھی۔ کیا کچھ نہ تھا اُس کی نگاہ میں، پھر لیکن بس اک پَل !!

ایک پَل لگا تھا وہ ہاتھ سے ریت کی طرح پھسل گئی تھی۔

فضا میں شہر بانو کی آخری چیخ کے ساتھ بہت ساری بے یقین دُکھ بھری چیخیں اُبھری تھیں۔

''نفیسہ! یہ کنواں اندھا نہیں ہے، یہ تو زندہ لاشوں کی قبر ہے! جو اُس پَل کھلتی ہے، جب جب یہاں کی روایات، یہاں کے مرد ہم عورتوں کی زندگی کو تنگ کردیتے ہیں۔ فیصلوں کی سلیب بنا کر ہمیں لٹکا دیتے ہیں۔ تم نہیں جانتیں یہ اندھا کنواں نہیں یہ تو قبر ہے، جو اِس حویلی کی بہو، بیٹیوں کے لیے اِن دالانوں کمروں کے ساتھ بنائی گئی ہے، ڈیزائن کی گئی ہے تاکہ وقت ضرورت اِس میں زندہ لاشیں ڈالی جا سکیں۔''

آپا لمّاں کے کانوں میں دُور کہیں سدرہ بی بی کی سسکی بھری آواز گونجی تھی، ٹوٹے کانچ جیسی ہنسی اُبھری تھی۔

اُن کا چہرہ تاریک ہوگیا تھا۔

پھول سے چہرے اور کومل سے وجود کو اُس اندھیری قبر نے نگل لیا تھا۔

''ہائے شہر بانو! ارے کوئی میری شہر بانو کو دیکھو!'' سعادت علی کنویں میں جھانک جھانک کر دیکھ رہے تھے لیکن سوائے اندھیرے کے اُن کو کچھ دکھائی نہ دیا تھا۔

ارم بی بی چیخ چیخ کر رو رہی تھیں۔ سعادت علی باہر ملازموں کو لینے دوڑے تھے تاکہ مدد لے سکیں۔

آپا لمّاں کو دائیں جانب بہت شدت کے ساتھ درد محسوس ہوا تھا۔ لیکن ابھی وہ درد کو سنبھال ہی رہی تھیں کہ اُن کے پیچھے سے بلال نکل کر کنویں کی جانب ''دلہن.. دلہن'' کرتا لپکا۔

''بلال!'' آپا لمّاں گرتی پڑتی اُس کی جانب لپکیں۔

''بلال!'' اُن کی آواز دُکھ اور خوف سے پھٹ گئی تھی۔

بلال...!! رُکو...!'' آپا لمّاں نے بلال کو روکنے کی کوشش کی...

❖❖○❖❖

چاندنی گنگنانے لگی کس لیے
تارے آنگن میں آنے لگے کس لیے

کس لیے رنگ منہدی کا کھلنے لگا
پھول ہم کو ستانے لگے کس لیے
بس تمہارے لیے...!
بس تمہارے لیے...!

''بہت خوش ہیں آپ!'' مہوش نے کھانے کی ٹرے طارق کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ طارق جو میں مونڈھے نگی کے خیالوں میں مگن تھا، شاید اُس کے چہرے پر بے حد خوب صورت مسکراہٹ بھی تھی جو اِس قدر بے خود تھی کہ خود طارق جیسے محتاط انسان کو بھی اندازہ نہ ہوسکا تھا۔

''یہ تم کیوں کھانا لائی ہو، زینت کدھر ہے؟'' طارق نے ٹانگیں سمیٹ لیں۔

''کیوں آپ کو میرا کھانا لانا بُرا لگا؟'' مہوش نے حسب معمول ایک دم حساس ہوکر پوچھا۔

''نہیں! مجھے تمہارا کھانا لانا بالکل بُرا نہیں لگا، لیکن جب ملازم موجود ہوں تو تمہیں ریسٹ کرنا چاہیے۔'' طارق نے بے حد نرمی سے اُسے سمجھایا۔

''ریسٹ ہی ریسٹ ہے، میں بھلا یہاں کرتی ہی کیا ہوں!'' مہوش نے اُداس ہوکر کہا۔

ایک وقت تھا کہ سب افراد خانہ موجود تھے، اُسی لحاظ سے رونق تھی، گھر کے کام موجود تھے لیکن اب اُس کے آس پاس کوئی نہ تھا اور نہ ہی کوئی کام تھا۔

زندگی جب تک متحرک رہے، زندگی لگتی ہے جیسے ہی وہ رُکتی ہے تو موت سی لگتی ہے۔ مہوش کو بھی یہ بحالی، یہ بے انتہا فراغت موت سی لگتی تھی۔ اِس لیے جس روز طارق نے آنا ہوتا تو وہ پَل پَل اُس کے انتظار میں، اُس کے لیے سنگھار میں اور اُس کے کاموں میں گزارتی تھی۔

اس کے لیے تو ہفتے میں وہ ہی دن زندہ ہوتے تھے، جب جب طارق آتا تھا۔

طارق کے چہرے پہ اپنی بات کا ردِعمل دیکھ کر بے حد شرمندگی دَر آئی تھی۔

''ایم رئیلی سوری! میرا مطلب یہ نہ تھا کہ تمہارا دِل دُکھے!'' طارق نے فوراً معذرت کرلی۔

''تم خوش رہا کرو۔'' طارق نے دِل سے کہا۔

''اچھا...!'' مہوش نے دھیمی سی مسکراہٹ سے کہا۔

''پہلے مجھے یہ تو بتائیں کہ آپ کیوں اتنے خوش ہیں؟ سم تھنگ اسپیشل؟'' وہ طارق کی آنکھوں کو بغور دیکھتے پوچھ رہی تھی۔

''کیوں! تم کو کیوں ایسا لگا؟'' طارق نے پوچھا۔

''کیوں کہ آپ کے چہرے پہ خاص طرح کی چمک ہے، مسکراہٹ ہے جو کچھ پا لینے پر چہرے پر آسودگی کی طرح نقش ہوجاتی ہے۔''

''ارے! یہ تم کیسے اتنی بڑی اور گہری باتیں کرنے لگی ہو؟'' طارق نے خوش دِلی سے کہا۔

''ٹالیے نہیں۔ بتایئے نا!'' مہوش نے اصرار کیا۔

''کیا...؟'' طارق نے پلیٹ میں سالن ڈالتے پوچھا۔

''یہ ہی کہ آج آپ اتنے خوش کیوں ہیں کہ آپ کی ساری ذات اتنی چمک رہی ہے، کیا ایسا مل گیا

کہ اتنی خوشی مل گئی۔'' مہوش نے دھیرے سے پوچھا۔

''تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ ایسا ہے!'' طارق نے چونک کر پوچھا۔

''جو دِلوں میں بستے ہیں، وہ خون میں دوڑتے ہیں طارق آپ کا مزاج، آپ میری انگلیوں کی پوروں پر ہیں، جتنا میں آپ کو سوچتی، دیکھتی ہوں اتنا تو شاید آپ کو بھی اپنے لیے وقت نہ ملا ہو۔'' مہوش نے فخر سے کہا۔

''واقعی تم سچ کہتی ہو! میں خوش ہوں مجھے کچھ ایسا مل گیا ہے، جسے کھونے کا ڈر میری سانس بند کرنے لگتا ہے!'' طارق نے اقرار کیا۔ اقرار کرتے ہوئے شاید وہ خود میں بھی نہ تھا کہ اُسے اپنے لفظوں اور لہجے میں چھلکتے جذبات کا احساس تک نہ ہوا۔

مہوش کا چہرہ ایک دم سیاہ پڑ گیا۔

وہ طارق کے لیے بہت زیادہ حساس تھی!

''کیا مل گیا ہے طارق!'' مہوش کی آواز کنویں سے آئی تھی۔

طارق ایک دم ہوش میں آ گیا۔ اُسے اپنی بات اور لہجے کا ایک دم احساس ہوا۔

''ارے! تم میری بیوی ہو اور بیوی سے کچھ نہیں چھپانا چاہیے، میں وعدہ کرتا ہوں وقت آنے پہ سب سے پہلے تم کو بتاؤں گا۔''

''تب تک تم ذہنی طور پر اتنی مضبوط ہو چکی ہو گی کہ کم از کم میرے دل کی بے بسی کا اندازہ کر کے یہ سمجھ سکو گی کہ نگینہ میری زندگی کی پہلی اور آخری محبت ہے اگر وہ مجھے نہ مل سکی تو میں شاید زندگی میں کسی سے بھی محبت نہ کر سکوں گا میری زندگی میں وہ محبت کا انسپائریشن ہے!''

''وعدہ...!'' مہوش نے دھیرے سے مسکرا کر اصرار کیا۔

''پکا وعدہ...!'' طارق نے بھی خوش دلی سے اقرار کیا۔ وہ جان گیا تھا، اُس نے مان لیا تھا اُسے اپنی زندگی میں مہوش اور نگینہ کو اب ساتھ ساتھ رکھنا ہوگا، مقام اور جگہ دینی ہو گی۔ کیوں کہ...

کیوں کہ ایک کو اللہ نے بن مانگے اُس کی جھولی میں ڈال دیا تھا اور دوسری کے لیے اُس نے خود اپنے من کی جھولی اللہ کے سامنے پھیلا رکھی تھی اور قدرت کا تو یہ ہمیشہ سے قانون ہے کہ اگر انسان اللہ کی دی ہوئی نعمت کا شکر ادا کرتا ہے تو ہی اُسے انعام کے طور پر اُس کی من کی مُراد نصیب ہوتی ہے۔

طارق بھی مہوش کو قدرت کی رضا جان کر دھیرے دھیرے قبول کرنے لگا تھا۔

''طارق آپ چائے پئیں گے یا کافی؟'' مہوش نے ایک دم اُس کے پاس سے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

''کافی!'' طارق کا دھیان کھانے کی جانب تھا ورنہ وہ جان جاتا کہ مہوش کا رنگ بے حد پھیکا پڑ چکا اور خود کو ضبط کرنے کے لیے اُس نے کچن کا رُخ کیا تھا۔

طارق دیکھ لیتا تو اُسے مہوش کا یہ ایک پہلو دیکھ کر بے حد خوشی ہوتی کہ اُس نے ضبط کرنا کافی سیکھ لیا تھا۔

مہوش بے جان سے پاؤں گھسیٹتی کچن میں داخل ہوئی۔

''طارق! آپ کی زندگی میں ایسا کیا شامل ہوا ہے کہ آپ کے سارے وجود سے الگ طرح کی خوشی کی روشنی نکل رہی ہے۔ وہ روشنی جس کی میں نے ہمیشہ تمنا کی ہے۔ میں خود غرض ہوں یا جنونی پاگل! ان میں آپ کی زندگی میں کسی کو حق جمانے نہیں دے سکتی نہ دوں گی... آپ صرف اور صرف میرے ہیں آپ کو کوئی مجھ سے نہیں چھین سکتا۔'' وہ جھلس کر بولی، اُس کے اندر ایک اَن دیکھے احساس سے آگ لگی ہوئی تھی۔

''آپ صرف اور صرف میرے ہیں!'' مہوش مسلسل بولے جا رہی تھی، عجیب سی کھولن تھی اُس کے اندر، بالکل سامنے ساس پین میں رکھے کھولتے پانی کی طرح،

جو کھول کھول کر، اُبل اُبل کر ختم ہوتا جا رہا تھا۔

❖❖ ○ ❖❖

وہ تو کاشف بالکل نہ تھا!

شاید اُس کا کوئی سایہ تھا یا اُس سے ملتا جلتا کوئی بوڑھا انسان تھا۔ وہ صحت مند، سرخ و سفید، وہ کاشف تو جانے کہاں کھو گیا تھا۔

اس کاشف کو ایک موٹی سی زنجیر سے باندھا گیا تھا۔

''یہ... یہ کیوں باندھی ہے؟'' انور صاحب نے تڑپ کر ڈاکٹر سے پوچھا۔

''مریض کو نشے کی عادت ہے، جب اُسے نشہ نہیں ملتا تو وہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے اِس لیے یہ اِس لگانا بے حد ضروری ہیں۔'' ڈاکٹر کے تفصیلی جواب نے انور صاحب کو بے حد دُکھی کر دیا۔

طارق اُن کو یہاں تک لایا تھا۔ کاشف کے پاس اُن کو چھوڑ کر وہ خود بڑے ڈاکٹر کے پاس چلا گیا تھا کہ انور صاحب بے یقینی سے کاشف کو دیکھتے رہے۔

یہ چھ فٹ سے اونچا لمبا انسان، یہ اُن کا بیٹا اُن کا غرور تھا۔ آج اُن کا غرور ملیا میٹ ہو گیا تھا۔

''جنسی تشدد اور نشے کی عادت نے اِن کو فزیکلی اور مینٹلی دونوں طرح سے نقصان دیا ہے۔'' ڈاکٹر مزید بم پھوڑا۔

''یا خدایا! کیا مجھے یہ دن بھی دیکھنے تھے۔'' انور صاحب کاشف کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئے اور بے اختیار کر اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کیے، وہ یک ٹک کاشف کو دیکھے جا رہے تھے اِس وقت اُن کو اپ بے حد خالی لگ رہا تھا، ہر طرف سائیں سائیں ہو رہی تھی۔

اُسی پل ایک دم ہی کاشف نے بیڈ کو جھٹکے دینے شروع کر دیے۔ بیڈ کو وہ اِس قدر طاقت سے کھینچ رہا تھا کہ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی زلزلہ آ گیا ہو۔

وہ اتنی دیر سے نیند کی دوا کے اثر میں تھا۔ ہوش کی دُنیا اُس کی برداشت سے بالکل الگ تھی، بے چینی میں انور میں کیسے تکلیف ہوتی ہے وہ عام درد سے مختلف اور بے حد اذیت ناک ہوتی ہے۔

''چھوڑو مجھے...!'' کاشف چیخ رہا تھا۔

''کھولو مجھے... مجھے ایک... ایک انجکشن لگا دو! بس ایک!!'' وہ سب سے منت کر رہا تھا۔ اُسے اپنی الف میں اپنے باپ کا چہرہ بھی نظر نہ آیا تھا۔ اُسے اِس پل کسی سے غرض نہ تھی ماسوائے نشے کے...

''کاشف! کاشف۔'' انور صاحب نے آگے بڑھ کر اُسے پکارا۔

''کون؟'' ایک پَل کو صرف ایک پَل کو اُس نے رُک کر پوچھا۔

''میں تمہارا باپ۔ تمہارا ابو!'' انور صاحب نے تڑپ کر اُس کا چہرہ تھاما۔

''اچھا! تم میرے باپ ہو، تم مجھ سے پیار کرتے ہو؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔ انہوں نے اثبات میں جلا جلدی سر ہلایا۔

اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے نم تھیں۔

''تو پھر لاؤ میرا انجکشن!'' اُس نے اپنی غرض دکھائی۔

''تم میرے لیے لاسکتے ہو انجکشن، دیکھو تم نے وعدہ کیا ہے تم نے ابھی کہا ہے کہ تم مجھ سے ا کرتے ہو، دیکھو میرا کیا حال کردیا ہے اِن ڈاکٹروں نے۔'' اُس نے اپنی بیڑیوں کی جانب اش کرکے کہا۔

''تم مجھے انجکشن لاکر دو گے؟'' وہ اصرار کررہا تھا۔

''دیکھو بیٹا!'' انہوں نے اپنے آنسوؤں کو پیتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر تمہارا علاج کررہے ہیں اور وہ بہتر کررہے ہیں تمہارے ساتھ، یہ سب کچھ تمہارے علا حصہ ہے۔'' انور صاحب نے اپنی جانب سے اُس کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن کاشف تو ایک دم بھڑ اُٹھا۔

''شٹ اَپ!'' وہ دھاڑا۔

''بیٹا!'' انہوں نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

''چپ بڈھے! اگر تو نے مجھے انجکشن لاکر دینا ہے تو دے ورنہ مجھے یہ تقریر، یہ بھاشن نہ دے کاشف کی آنکھوں میں لال ڈورے تھے، کچھ دیر کو تو انور صاحب بھی گھبراگئے۔

وہ ایک دم آپے سے باہر ہوگیا، اُس کے منہ سے چیخوں اور گالیوں کا طوفان اُٹھا تھا۔

انور صاحب دُکھ سے سکتے کی کیفیت میں کھڑے کے کھڑے رہ گئے اُن کا دل اپنے پیارے اِس حالت میں دیکھ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''انکل! حوصلے اور ہمت سے کام لیں!'' طارق جو ابھی وہاں پہنچا تھا، اُس نے اُن کو تسلی دی۔

''یہ۔ یہ میرے کاشف کو کیا ہوگیا؟'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رودیے۔

اولاد تو ہر انسان کی کمزوری ہوتی ہے لیکن کاشف تو اُن کی زندگی کی مضبوطی تھا، وہ جسے مضبوطی ما دیکھتے اور جیتے تھے آج کیسے خود کو اور اُن کو کمزور کرگیا تھا۔

منزہ کی موت نے اُن کے قلعے کی سنگلاخ دیواروں کو توڑ ڈالا تھا تو آج کاشف نے اُن کے موجود بے حد حساس دِل کو توڑ ڈالا تھا۔

''انکل پلیز! خود کو سنبھالیں!'' طارق اُن کو کھینچ کر باہر لے آیا۔

انور صاحب پیچھے مڑ مڑ کر کاشف کو دیکھ رہے تھے، جہاں نرسیں اور ڈاکٹرز کاشف کو قابو کر کوشش کررہے تھے، ڈاکٹرز نے کاشف کو باندھ کر بجلی کے جھٹکے لگائے۔

''امی!!'' کاشف کے مسلسل تڑپتے تڑپتے آخر میں کراہ کی طرح منہ سے نکلا۔

انور صاحب تو وہیں ڈھے گئے۔

''انکل! وہ ٹھیک ہوجائے گا۔ انشاء اللہ بہت جلد ٹھیک ہوجائے گا اُس کا مسلسل علاج چل رہا ہے۔'' ل نے اُن کو بے حد تسلی دی۔

''وہ۔ وہ ایسا نہیں تھا۔'' انور صاحب نے جیب سے رومال نکال کر آنسوؤں کو پونچھ کر کہا۔

''سب ٹھیک ہوجائے گا!'' طارق نے اُن کو تسلی تو دے دی تھی لیکن کاشف کی جسمانی اور ذہنی صحت بارے میں وہ ڈاکٹر سے بات کرکے آیا تھا۔ اِس کو بہت احتیاط اور توجہ کی ضرورت تھی اِس کے علاوہ کا علاج بھی خاصا مہنگا تھا، جو انور صاحب جیسے شخص کی استطاعت سے دور تھا۔ میں ولی سے بات ں گا تاکہ کاشف کا علاج اچھا ہوسکے۔ طارق نے انور صاحب کے ساتھ ہسپتال سے باہر آتے دِل ل میں سوچا۔

میں نے کیسے جتن سے تختی لکھی تھی
وقت نے کیسا مٹادیا آسانی سے

انور صاحب بار بار مُڑ مُڑ کر ہسپتال کی عمارت کو دیکھ رہے تھے، جہاں اُن کا لختِ جگر موجود تھا۔ آج ں کی حالت دیکھ کر وہ خود ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے تھے۔ وہ جان گئے تھے کہ انسان جس بچے کو اپنا سہارا لگتا ہے کہ بڑھاپے میں وہ اُس کے بڑھاپے کی لاٹھی بنے گا تو ہمیشہ ہی اپنی توقع سے کم پاتا ہے۔ کا برتن ہمیشہ ٹوٹتا ہے! سہارا تو ہمیشہ صرف ایک ہی ذات کا ہونا چاہیے، سب سے بڑی ذات کا۔ اللہ سوہنے کی ذات کا، جو ہر بے سہارا کا اصل سہارا ہے۔ انور صاحب نے بھی اللہ سے سہارے کے گڑگڑا کر دُعا مانگی۔

وہ ہی انور صاحب تھے، جو حُسن آرا بیگم کی عبادتوں کا مذاق اُڑایا کرتے تھے، جن کے لیے اللہ اور کی عبادت بڑھاپے کی عمر کی ایک ایکٹویٹی تھی، لیکن آج جیسے ہر جانب آئینے آ کھڑے ہوئے تھے، ہر جانب سے اُن کو اپنا قصور اور خطا نظر آنے لگی تھی۔

انسان اگر سرکش ہے تو وہ اللہ کی ذات ہمیشہ کی بے نیاز ہے!

انسان اگر تابع دار اور ماننے والا ہے تو بھی اللہ کی ذات نوازنے کے لیے ہمیشہ کے لیے بے نیاز

❖❖○❖❖

''ایمان!''

''ایمان فاطمہ!'' خالہ بے ہوشی میں اِدھر اُدھر سر مارتی مسلسل ایمان فاطمہ کو پکار رہی تھیں۔ رانی نے ان کے ہاتھوں کو تھام لیا۔

''خالہ! خالہ یہ دیکھو، یہ میں ہوں رانی!'' رانی نے خالہ کو ہوش دلانے کی کوشش کی۔

''وہ۔ وہ میری ایمان فاطمہ تھی! تم نے اُسے روکا کیوں نہیں؟'' خالہ نے آنکھیں کھول کر نقاہت سے اُسے پوچھا۔

''شکر ہے تجھے ہوش تو آیا۔'' رانی نے سکون بھرا سانس لیا۔

''دو دِن سے تو بے سُدھ پڑی بس بڑ بڑ کرتی رہی ہے کم بخت یہ ڈاکٹر بھی تو کچھ نہیں بتاتے، غر اور اَن پڑھ کی بھی کوئی زندگی ہے! کوئی بھی اُن کو مریض کے متعلق کچھ نہیں بتاتا۔'' رانی حسبِ معمول رہی تھی، خالہ کی بے ہوشی کے دِن اُس نے ڈہل ڈہل کر گزارے تھے۔

''بڑے ڈاکٹر نے کہا تھا کہ آج تمہارا ہوش میں آنا بے حد ضروری ہے۔ شکر اللہ کا اُس نے تجھے دیا۔'' رانی نے کچھ سکون بھرا سانس بھرا۔ وہ دھیرے دھیرے خالہ کے بال سہلا رہی تھی۔

''رانی! وہ میری ایمان فاطمہ تھی۔'' خالہ نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

''خالہ کیسی باتیں کرتی ہو، تم کو تو ہر خوب صورت لڑکی اپنی بیٹی لگتی ہے۔ وہ تو راجی کی مالکن تھی۔ ا تیری بیٹی کیسے اتنی بڑی ہوسکتی ہے؟ وہ بھی تو تیرے میرے جیسی ہی ہوگی نا! نہ ہر لڑکی کو دیکھ کر بھا کئی بار تُو مرتے مرتے بچی ہے کبھی گاڑیوں کے پیچھے اندھا دھند بھاگتی ہے تو کبھی سڑکوں پہ ماری پھرتی ہے، تیرا حال سے بے حال ہوگیا لیکن مانتی نہیں ہے۔'' رانی بولتے ہوئے تھرماس سے چا نکالنے لگی۔ اُس نے بسکٹ کا پیکٹ کھول کر دو بسکٹ نکال کر پلیٹ میں رکھے اور چائے اور بسکٹ لے اُن کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔

''اُٹھو۔ اُٹھ کر کچھ کھالو، کتنی پیلی پڑگئی ہو۔''

رانی نے پیار سے خالہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اِس عورت کے ساتھ اُس کا کوئی خونی رشتہ نہ تھا لیکن کبھی دِل کے رشتے، خون کے رشتوں سے زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔

خالہ کے ساتھ بھی تو اُس کا دِل کا ہی رشتہ تھا۔

''رانی! مجھے اُس کے پاس لے جا۔'' خالہ نے ایک دم رانی کا ہاتھ تھام کر منت بھرے لہجے میں اُن کی آنکھوں میں بے حد وحشت بھری ہوئی تھی۔ ایسی وحشت جو جنون کی حد کے پاس کھڑی زور ہے۔ ضد اور بے حد بے بسی دونوں ایک ہی تو پہلو ہیں لیکن جب جب ساتھ مل جاتے ہیں تو انسان حواس تک ختم کر جاتے ہیں۔

''خالہ! کتنی بار بتاؤں وہ تیری بیٹی نہیں تھی وہ راجی کی مالکن تھی اور اُس کا نام ترنم تھا۔'' رانی نے بات کو دوبارہ دُہرایا۔

''نہیں! وہ میری ایمان فاطمہ ہی تھی۔'' خالہ ایک دم چیخ کر بولیں۔

''میں! میں تجھے جھوٹی لگتی ہوں، میرا دِل اپنی ہی بیٹی کے لیے دھوکا کھا سکتا ہے، وہ میری بیٹی تم ایمان فاطمہ تھی!!'' خالہ نے پورے حلق سے چیختے ہوئے کہا۔

اُن کی آنکھیں باہر کو آ رہی تھیں، بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔

''خالہ۔ خالہ!'' رانی نے پیار سے اُن کو سنبھالنے کی کوشش کی، لیکن وہ اپنے آپے سے باہر تھیں۔

''وہ۔ ایمان تھی!!'' جیسے جیسے وحشت اور جنون اُن پر حاوی ہوتا جا رہا تھا اُن کی آواز بھاری جا رہی تھی۔

''میری ایمان!'' اُن کے ہاتھ پاؤں ایک دم مڑنے لگے۔

''میری بیٹی! میری چندا!!'' اب اُن کے دانت ایک دوسرے میں پیوست ہوگئے تھے۔

''اوہ نہیں!'' رانی نے اُن کو دیکھ کر بے حد دُکھ سے کہا۔

خالہ کا دورہ بے حد خطرناک ہوتا تھا، ایسے میں وہ مہینوں حواس کھوئے دنیا سے بے خبر ہو جاتی تھیں۔

''خالہ!'' رانی نے دُکھ سے خالہ کو تھامنے کی کوشش کی لیکن ان کا جسم بے حد اکڑ گیا تھا وہ اب ہر کسی سے بے خبر عجیب سے سکتے میں تھیں۔

''بیٹی!

چندا!!

فاطمہ۔ ایمان!!'' لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر سرگوشیوں میں اُن کے لبوں سے آزاد ہوئے تھے۔

''خالہ۔'' رانی کی آواز روہانسی ہوگئی۔

لیکن خالہ اُس کو کہاں سُن رہی تھیں وہ تو ریت کی مانند اُس کے ہاتھوں سے پھسلی تھیں اور کٹے ہوئے پیڑ کی طرح بستر پر گری تھیں۔

رانی نے بے حد احتیاط سے اُن کو لٹایا اور ایک دُکھ اور تاسف بھری نگاہ اُن پر ڈالی۔

پھر وہ تھکے تھکے قدموں سے بڑے ڈاکٹر کو ڈھونڈنے نکلی تا کہ کوئی آ کر خالہ کو چیک کر جائے۔

اس کا دِل خالہ کے دکھ پر دُکھی ہو رہا تھا۔

کیسی کرموں جلی عورت تھی۔ ایک مسلسل تلاش اور کرب میں تھی۔

''ربّ سوہنے اِس بلکتی تڑپتی ممتا کو سکون دے دے اِس کو اِس کی بیٹی سے ملوا دے!'' رانی نے بے صدق دِل سے اُس کے لیے دعا کی۔

❖❖○❖❖

میں اُداس رستہ ہوں شام کا، مجھے آہٹوں کی تلاش ہے
یہ ستارے سب ہیں بجھے بجھے، مجھے جگنوؤں کی تلاش ہے
وہ جو اِک دریا تھا آگ کا سبھی راستوں سے گزر گیا
ہمیں کب سے ریت کے شہر میں نئی بارشوں کی تلاش ہے

ترنم نے ہیئر برش ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ کر اپنے عکس کو بغور دیکھا، اُس کے دِل میں ہمیشہ ایک خواہش لاوے کی طرح اُبھرتی تھی کہ یہ ''نائٹ میرز'' ٹوٹ جائے اور وہ دوبارہ اپنے پاکیزہ عکس کو دیکھ سکے۔

انسان اگر آئینہ دیکھ کر اجنبیت کا احساس محسوس کرے تو وہ خود سے بچھڑ جاتا ہے پھر وہ ساری زندگی آئینہ دیکھنے کے قابل بھی نہیں رہ پاتا۔

ترنم آئینے کے آگے یوں کھڑی تھی، جیسے کسی اجنبی کے سامنے کھڑی ہو اُسی پَل اُس کے موبائل کی انکامنگ ٹون بجی۔ ترنم نے غور سے ٹون کو سُنا۔ یہ اُس کے خاص سیل کی تھی، جس کا نمبر سوائے ماہی اور طارق کے کسی کے پاس نہ تھا۔

ترنم تیزی سے موبائل فون کی جانب بڑھی، اسکرین پر طارق کا نمبر جگمگا رہا تھا، ترنم کا ایک پَل کو جی

چاہا کہ فون بند کر دے، اُس کا کسی سے ملنے کو جی نہ چاہ رہا تھا، کوئی بات سننے کے موڈ میں نہ تھی۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر فون اُٹھالیا۔

''ہیلو!'' اُس کی آواز بے حد مدھم تھی۔ طارق نے بھی اُس کی کیفیت کو شدت سے محسوس کیا۔

''آپ ٹھیک ہیں؟'' طارق نے سچائی سے پوچھا۔

''بالکل نہیں! میں بہت غلط ہوں! یہ تو آپ بھی جانتے ہوں گے۔'' ترنم کا لہجہ بے حد کڑوا اور سرد تھا۔ ہر شخص چاہے وہ خوب صورت ہو یا پھر بدصورت، کالا ہو یا پیلا، اُسے اپنا چہرہ اور اپنا آپ بہت اچھا لگتا ہے۔

اِس لیے وہ ہمیشہ خود کو زیادہ نمبر دیتا ہے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو پھر وہ ہمیشہ اپنے دائرے سے اُکھڑا ہے۔ اپنے آپ کو بُرا کہلانا اور بُرا کہنا بہت مشکل ہے اِس لیے ایسا شخص... سب کے ساتھ بھی بس اُکھڑا اُکھڑا رہتا ہے۔ ترنم کے ساتھ بھی تو یہی تھا۔ وہ اپنے لیے جب جب اقرار کرتی کہ وہ بُری لڑکی ہے دِل خون کے آنسو روتا تھا۔

''کیا آپ کو میری کوئی بات بُری لگی؟'' طارق نے بے حد محتاط لہجے میں پوچھا۔ اُس کے لیے بہت قیمتی سورس تھی وہ اُسے ناراض کرنا یا کھونا نہیں چاہتا تھا۔

''میرا آپ سے کیا کوئی تعلق ہے، جو میں آپ کی باتوں کا بُرا مناؤں گی۔'' ترنم نے کچھ سرد لہجے میں کہا۔

طارق نہیں جانتا تھا کہ اُس نے غلط وقت پر فون کر ڈالا تھا۔ ترنم خود میں بالکل بھی نہ تھی، نہ اِس وقت اُسے اپنے جذبات پر کنٹرول تھا۔

''میرا خیال ہے میں فون رکھتا ہوں، دراصل میرے سیل پر آپ ہی کی جانب سے مِس کال آئی تھی اِس لیے میں نے رِنگ بیک کی تھی۔'' طارق نے سنجیدگی سے کہا۔

ترنم کو فوراً ہی کوئی بہت اہم بات یاد آئی۔ واقعی اُس نے تین چار گھنٹے پہلے خود طارق کو فون کیا تھا۔

''آئی ایم سوری! واقعی میں نے آپ کو فون کیا تھا۔'' ترنم نے کچھ آپے میں آتے ہوئے کہا۔

''وہ دراصل مجھے آپ کو انفارم کرنا تھا کہ محمود بٹ نامی فوٹو گرافر ہے۔ وہ مختلف کالجز میں لڑکیوں کے مینا بازار اور مختلف فنکشنز پر تصاویر لیتا ہے۔ لڑکیاں اُس وقت کچھ تصاویر کھنچوالیتی ہیں اور میں پیسے دے کر خرید لیتی ہیں ایسا کچھ عرصے سے مختلف کالجز میں چل رہا ہے لیکن یہ کم بخت محمود راگنی کے ہی گروہ کا آدمی ہے، چن چن کر اچھی لڑکیوں کی تصاویر اُتارتا ہے پھر راگنی تک پہنچاتا ہے لڑکیوں کو ہر ہر طریقے سے ٹریپ کیا جاتا ہے۔

کبھی اپنی لڑکی بھیج کر لڑکی کو ماڈرن لائف اسٹائل کے بہانے اُس کو تباہی کے قریب لایا جاتا ہے خوب صورت لڑکی کی ایک بار کی تباہی اُس کی آئندہ زندگی اور قسمت کو کالا کر ڈالتی ہے۔ کبھی اِن خوب صورت لڑکیوں کو لڑکوں کے ذریعے ٹریپ کرتے ہیں لڑکے محبت کا فراڈ کر کے ان کو ورغلا کر راگنی کے پنجرے تک گھسیٹ لاتے ہیں۔ تیسرا طریقہ اُن لڑکیوں پر استعمال کیا جاتا ہے جو نہ کسی لڑکی کے ہاتھ آتی ہیں اور نہ ہی لڑکوں کے قابو آتی ہیں ایسی لڑکیوں کی تصویروں کو کمپیوٹر کے ذریعے ننگے دھڑوں سے جوڑ کر اسے استعمال کر کے بلیک میل کیا جاتا ہے اُن کو ہر صورت گناہ آلود کام کرنے کے لیے آمادہ کیا جاتا ہے امیر لڑکیوں سے تو پیسہ بھی نکلوایا جاتا ہے۔ لیکن جو لڑکی محمود بٹ، راگنی کی منحوس نگاہ کے سامنے کر دیتا ہے اُس کو سمجھو کوئی بہت بڑی دعا ہی بچا سکی ہے ورنہ اسّی فیصد لڑکیاں بُری طرح ٹریپ ہو رہی ہیں۔ معصوم سی کلیوں جیسی یہ لڑکیاں راگنی کے زہر آلود ہاتھوں میں آ کر مسلی جاتی ہیں۔'' ترنم اتنی لمبی بات کر کے تھک گئی تھی، اُس نے سانس لینے کو کچھ وقف کیا۔

اس دوران طارق کاغذ قلم لے کر اہم نکات نوٹ کرتا گیا تھا۔

''طارق اِس ساری برائی کی جڑ کو آپ کاٹیں یا نہ کاٹیں، لیکن اس کے سورس یعنی محمود بٹ کا کچھ کریں۔ کم بخت خود بھی لڑکیوں کی عزت سے کھیلتا ہے۔ فیشن فوٹو گرافرز کی طرح بہت بڑا بلیک میلر ہے اور اس وقت شہر کے ٹاپ کالجز کے فنکشن کوریج کے لیے یہ ہی جاتا ہے اس کا بندوبست کروائیں۔ آج صبح بھی اتنی چھوٹی عمر کی دو لڑکیاں اِس خبیث کی وجہ سے اِس دلدل بھری دنیا میں پھنسی ہیں کل تک وہ پاکیزہ تھیں، اپنے گھر کی رونق رحمت، اپنے ماں باپ کی آنکھوں کا تارا تھیں، لیکن اِس کم بخت نے اُن کو اس اندھیری دنیا کا حصہ بنا کر سیاہ بخت کر ڈالا ہے۔'' ترنم کا تنفس غصّے سے بے ترتیب ہو گیا تھا اُس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ محمود بٹ کو آن دی اسپاٹ شوٹ کر دیتی لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی اسی لیے اس نے طارق کو فون کیا تھا۔ وہ طارق کے ذریعے محمود بٹ کو انجام پر پہنچا سکتی تھی اور وہ ایسا ہی کر رہی تھی۔

''طارق! کیا آپ مجھے سُن رہے ہیں؟'' ترنم نے دوسری جانب بے حد خاموشی محسوس کر کے پوچھا۔

''جی بالکل میں سُن رہا ہوں۔'' طارق نے اُسے تسلّی دی۔

''طارق! کیا محمود بٹ کو سزا مل سکتی ہے؟'' ترنم نے بڑی آس سے پوچھا۔

''بالکل! اور انشاء اللہ آپ دیکھیں گی کہ ہم اُس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ یقین مانیے ترنم آپ کا برائی سے لڑنے کا جہاد آپ کو بہت بلند درجات عطا کرے گا۔'' طارق نے اُس کا مورال بڑھایا۔

''بلند درجات...؟'' ترنم کی ٹوٹے کانچ جیسی ہنسی فون پر طارق کو سنائی دی۔

''طارق صاحب! میں ایسے نشیب میں جا اُتری ہوں، جہاں اُوپر آنے کے لیے کوئی رسی نہیں پہنچتی!'' ترنم کا لہجہ آنسو ہو رہا تھا۔

''جزا اور سزا کا فیصلہ صرف اللہ کر سکتے ہیں۔ آپ کا کام صرف امید باندھنا ہے وہ باندھے رکھیں، اتنا تو ہر انسان اپنے لیے کر ہی سکتا ہے نا!'' طارق نے بے حد نرم لہجے میں اُس کی آس بندھائی۔

''آپ کو قرآن پاک کی ایک آیت سناتا ہوں، مختلف حالات میں یہ ہر ایک کے کام آتی ہے۔ اللہ کی بات تو ہوتی ہی سب انسانوں کے لیے ہے ہر شخص کے پاس اپنی مشکل کا الگ اینگل ہوتا ہے لیکن کیا خوب صورت امید ہے کیا یقین ہے! اگر انسان تھام لے تو ہمیشہ کے لیے پار ہو جائے۔

(اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو!)

آپ کسی بھی نشیب میں ہوں، کتنی بھی گہرائی میں ڈوبے ہوں صرف ''اللہ کے ہونے کے احساس کی رسی'' آپ کو باہر نکالتی ہے!

’’کیا میں آپ کو دعوت دے سکتا ہوں کہ آپ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھیں!‘‘ طارق پوچھا۔

جواباً ترنم نے آنسوؤں کی جھڑی کے ساتھ سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔ منہ سے صرف جی ہی تھا۔

’’بس تو پھر ہمیشہ اللہ سے خوش گمان رہیں کیوں کہ یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ جیسا ہم اُس سے گمان ر ہیں وہ ہم کو ویسا ہی ملتا ہے۔‘‘ طارق کی باتوں نے ترنم کے سلگتے دِل پر ٹھنڈے چھینٹے ڈالے تھے۔

’’اوکے! اجازت دیجیے! اُمید ہے کہ آپ آئندہ بھی ہمارے ساتھ تعاون کریں گی اور رابطے رہیں گی۔‘‘ طارق نے فون بند کرنے سے پہلے اُسے یاد دہانی کرانی مناسب سمجھی!

’’جی انشاء اللہ!‘‘ ترنم نے آنسوؤں کے گولے کو پیتے ہوئے جواباً یقین دہانی کرائی۔

یہ تو اُس کے بھی دِل کی شدید خواہش تھی کہ وہ راگنی کے سیٹ اپ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کردے، ختم کردے چاہے اِس کے لیے اُس کو اپنی جان ہی کیوں نہ گنوانی پڑے!

❖❖○❖❖

’’رائل ڈرامیٹک تھیٹر کی شام پانچ بجے کی ٹکٹس لی ہیں۔‘‘ عبداللہ نے ولی کو ٹکٹیں دکھاتے ہوئے کہا۔

’’تم کو چین سے بیٹھنا نہیں آتا! لگتا ہے تم میں ابن بطوطہ کی روح گھسی ہوئی ہے۔‘‘ عبدالولی مصنوعی خفگی سے کہا۔

عبداللہ سے دوستی اُس کی یہیں آرٹ اسکول میں ہوئی تھی۔ وہ اُس سے خاصا چھوٹا تھا لیکن نہ جا کیسے وہ دونوں مقناطیس کی طرح کھنچ کر ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ اب عالم یہ تھا کہ عبداللہ فلیٹ چھوڑ کر عبدالولی کے ساتھ شفٹ ہو گیا تھا، اُسے اپنی مرضی چلانے کا بے حد شوق تھا خاص طور عبدالولی کو ہر وقت اپنے ساتھ ساتھ رکھتا تھا۔ اِس لیے پورے دن کا پلان وہ خود ہی بناتا تھا، مجبوراً ولی کو بھی اُسے جوائن کرنا پڑتا تھا۔ اب بھی وہ ولی سے پوچھے بنا ہی تھیٹر کی ٹکٹیں اُٹھا لایا تھا۔

’’یہ بالکل سچ ہے بڑے بھائی! میرا دِل کہیں نہیں لگتا، میں ایک جگہ ٹک کر بیٹھ نہیں سکتا۔ جا میرے اندر کہاں سے اتنی بے چینی آ گئی ہے کہ میں کہیں بھی ایک جگہ کچھ زیادہ دیر نہیں گزار سکتا۔ میں جگہ بہت شوق سے جاتا ہوں لیکن وہاں پہنچ کر مجھے احساس ہوتا ہے کہ یہ جگہ بھی اجنبی ہے۔‘‘ عبداللہ مسکراتے ہوئے اپنا مسئلہ بتایا۔

ولی اُسے یک ٹک دیکھے گیا، کتنا خوب صورت تھا وہ یا شاید ولی کو ہی سب سے زیادہ خوب صورت ا الگ سا نظر آتا تھا۔ بچوں جیسی معصومیت ہر وقت اُس کے چہرے سے چھلکتی تھی۔ گھور سیاہ آنکھیں کشادہ پیشانی اور عنابی ہونٹ، ستواں ناک! کس قدر کشش تھی اُس میں لیکن کیا یہ چیزیں ہونا اہم تھا؟ نہیں!! کیوں کہ یہاں چپے چپے پہ خوب صورت لوگ نظر آتے تھے، خود ولی بے حد خوب رو ا زبردست شخصیت کا مالک تھا۔ لیکن!!

لیکن جو کشش ولی کو عبداللہ میں محسوس ہوتی تھی، جو اپنائیت اس اجنبی دیس میں عبداللہ کے لیے محسو ہوتی تھی وہ کسی اور میں رتی بھر بھی نہ ہوتی تھی۔ اس لیے جب وہ بڑے بھیا کہہ کر اُسے بلاتا تو ولی

اچھا اور اپنا سا لگتا تھا۔ جانے کیوں ولی کو لگتا تھا کہ وہ اُسے پہلے سے جانتا ہے۔ بہت سوچنے کے اُسے اپنے اِس دوست کے ساتھ اتنی اپنائیت کی وجہ کا سِرا نہ ملتا تھا۔

’’بڑے بھیا پاکستان کیسا ہے؟‘‘ عبداللہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

’’تم اتنی اچھی اردو بولتے ہو، میں تو سمجھتا تھا کہ تم پاکستان ہی سے ہو۔‘‘ ولی نے اپنے دِل کی بات ال۔

’’میری مدر اور فادر کا تعلق پاکستان سے تو ہے لیکن آج تک انہوں نے نہ خود پاکستان جانے کی ش کی اور نہ ہی ایسی خواہش میرے اندر آنے دی۔ لیکن جانے مجھے کیوں وہ لینڈ آف فیئرز کی طرح ٹ کرتی ہے۔‘‘ عبداللہ کے چہرے پر دبا دبا جوش وخروش تھا۔

’’پاکستان!!

’’پاکستان بہت پیارا ہے! اُس کی مٹی میں ہر دُکھ درد جذب کرنے کی گنجائش ہے، بہت فراخ دِل ن ہے۔ قربانیوں سے بنا یہ ملک اپنے لوگوں کی وجہ سے ’’میچ لیس‘‘ ہے۔ یہاں رہنے والے شدت ہیں، کچھ گڑبڑ کرنے والے بھی شدت پسند اور اِسے چاہنے والے بھی شدت پسند ہیں۔ بنیادی طور مجھے پاکستان بہت پسند ہے، ہر موسم کی شدت یہاں پر اُترتی ہے۔ یہ نہیں ہے چھ ماہ برف ہے تو برف ل جائے گی اور گرمی ہے تو گرمی ہی پڑتی جائے گی۔ اس کے چاروں موسم پیارے ہیں۔‘‘ عبدالولی چائی سے جواب دیا۔

’’اور پاکستان کے رسم و رواج؟‘‘ عبداللہ کو آج ایسا بندہ مل گیا تھا، جو اُس کے من پسند ٹاپک پر بات رہا تھا۔ اُسے سن رہا تھا۔

’’وہ بھی بہت اچھے ہیں، خوشی کو خوشی محسوس کرنا اِن رسموں کے ذریعے ہی ہوتا ہے۔ تم میرے ساتھ ستان چلنا میں تم کو اپنے گھر والوں سے ملواؤں گا، سارا پاکستان بھی گھماؤں گا۔‘‘ عبدالولی نے ساتھ ہی دعوت دے ڈالی۔

’’ہاں میرا بھی دِل کرتا ہے کہ پاکستان جاؤں، لیکن جانے کیا بات ہے کہ میری ممی ہمیشہ پاکستان الے سے گھبراتی ہیں۔ جب میں چھوٹا تھا میں نے کبھی پروا نہ کی تھی، لیکن اب میرا دِل کرتا ہے کہ میں ں پریوں کی کہانی جیسی زمین کو ضرور دیکھوں۔‘‘ عبداللہ نے شوق سے کہا۔

’’جانے پاکستان میں ایسا کیا ہے جو ممی اتنا گھبراتی ہیں۔‘‘ وہ دل ہی دِل میں بڑبڑایا۔

’’ٹھیک ہے تم سمسٹر بریک میں میرے ساتھ چلنا۔‘‘ عبدالولی نے برش اور پلیٹ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ئے کہا اور دور ہو کر کینوس کو دیکھنے لگا۔ وہ اپنی بنائی ہوئی پینٹنگ کو بے حد غور سے دیکھ رہا تھا، ڈرامیٹک ر اور کمپوزیشن کے ساتھ وہ ایک شاہکار لگ رہی تھی۔

عبدالولی نے یہاں ایمسٹرڈ آرٹ اسکول میں بھی اپنی دھاک بٹھانی شروع کر دی تھی، اُس کا کام بولتا یکھنے والے کو گھیرتا تھا اور چھا جاتا تھا۔ ولی نے یہ پینٹنگ ایک نظم کی تھیم پر بنائی تھی بلکہ وہ اپنی ساری ے میں مختلف نظموں غزلوں اور اشعار کے مین تھیم کو پینٹ کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اِن نظموں اشعار کو اردو اور انگلش میں کمپوز کر کے الگ سے ہر پینٹنگ کے ساتھ فریم کرے گا۔

''واؤ! یہ بہت خوب صورت ہے!'' عبداللہ نے کینوس پر نگاہ ڈال کر کہا۔
جواباً عبدالولی کے چہرے پہ بہت بُردبار مسکراہٹ تھی۔
''پلیز مجھے اس پینٹنگ کا تھیم سنادیں۔'' عبداللہ نے فرمائش کی بلکہ بے حد اصرار کیا تو ولی کو نظم سنانی ہی پڑی۔

محبت میرا آنچل ہے
جہاں میں نے اُمیدوں کے
ہزاروں پھول ٹانکے ہیں
محبت میری دھڑکن ہے
کہ جس سے دِل یہ زندہ ہے
محبت میری آنکھوں میں بسی ہے
جو تم کو کھوجنے کی آس میں
دنیا میں زندہ ہیں
محبت اِک دعا ہے، جو کبھی تم نے مجھے دی تھی
وہی اب میرا قیمتی اثاثہ بن کے میرے دِل میں ہے
محبت تیرے گزرے راستوں کا نقش پا بن کر
ہمیشہ میرے دِل کے آئینے میں نقشِ رہتی ہے
محبت میرا آنچل ہے
جہاں میں نے امیدوں کے ہزاروں پھول ٹانکے ہیں

ولی نے مسکرا کر نظم ختم کی۔
''ارے! کیا آپ محبت پر یقین رکھتے ہیں؟'' عبداللہ نے اتنی شدت پسند تحریر سُن کر پوچھا۔
''آف کورس! اور ...تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جس کو میں نے چاہا ہے وہ ہی کچھ عرصے میں تمہاری بھابی بننے والی ہے۔'' ولی کے تصور میں چھم سے علیزے اُتر آئی۔ ولی کا موڈ ایک دم مزید خوش گوار ہوگیا۔
بے شک دِل پسند لوگ، دل کا موسم بدلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔
''بڑے چھپے رستم نکلے آپ تو۔ یہ کب ہوا؟'' عبداللہ نے مسکراتے ہوئے بے حد اشتیاق سے پوچھا۔
''یہاں آنے سے پہلے میری اُس کے ساتھ منگنی ہوئی ہے۔'' عبدالولی نے دوبارہ پلیٹ اور برش لے کر کچھ ری ٹچنگ شروع کردی تھی۔ آج وہ اِس پینٹنگ کو فائنل کرنا چاہتا تھا۔
''گڈ گارڈ! مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ جیسے اصولی اور آئرن مین کی زندگی میں ایسا کوئی نرم پہلو موجود ہوسکتا ہے۔'' عبداللہ نے ہنستے ہوئے کہا۔
''کیوں! میں تم کو بے جان کھلونا لگتا ہوں کہ جس کے پاس دِل اور فیلنگ نہیں ہیں۔'' عبدالولی نے برش روک کر عبداللہ کی جانب مڑ کر کہا۔

''نہیں! لیکن جیسے وہ ہماری کلاس کی دو عدد خوب صورت لڑکیاں لِنڈا اور جینی آپ پر مر مٹنے کو تیار ہیں اور آپ اُن کو ہمیشہ اگنور کرتے ہیں۔ ایسے میں لگتا نہیں ہے کہ آپ دِل وِل رکھتے ہیں۔'' عبداللہ نے عبدالولی کو چھیڑا تو عبدالولی کا بہت دھیما قہقہہ کمرے میں اُبھرا۔
''تم۔تم کتنے شرارتی ہو!'' عبدالولی نے پیار بھری نگاہ اُس پر ڈالی۔
عبدالولی کے دِل میں اُس کے لیے بہت سارا پیار تھا وہ خود نہ جانتا تھا کہ یہ لڑکا اتنا اچھا، اپنا سا کیوں لگتا ہے اور وہ کیسے اپنے مزاج سے ہٹ کر اُس کی ہر ہر بات مان لیتا ہے۔
''اچھا چھوڑو اِن باتوں کو، مجھے یہ بتاؤ کہ تمہاری اُردو اتنی اچھی کیسے ہے۔ تم بولتے تو بہت اچھے ہو لکھ بھی لیتے ہو۔'' عبدالولی نے پوچھا۔
''مما اور پاپا نے سکھائی ہے، ممی کو اُردو بہت اچھی لکھنی بھی آتی ہے اُن کی تو ہینڈ رائٹنگ بھی بے حد اچھی ہے۔'' عبداللہ نے کہا۔
''یار کسی روز اپنی فیملی سے ملواؤ، اتنا ذکر کرتے ہو آنٹی کا کہ وہ ایشین کھانے بہت اچھے پکاتی ہیں، قسم سے اس بدمزہ ملک آسٹریلیا میں ذائقے دار کھانا کھائے ہوئے عرصہ ہوگیا۔'' عبدالولی نے کہا۔
''بس یار! دو ماہ! پھر پاپا بھی اِدھر آجائیں گے۔ اُدھر سویڈن میں ایک ہسپتال کے ساتھ اُن کا پانچ سال کا کنٹریکٹ تھا، اب تو ختم ہونے میں تین ماہ رہ گئے ہیں۔ زہرہ اور ممی پہلے شفٹ ہوں گی اور پاپا ایک ماہ بعد آئیں گے پھر ہم سب اکٹھے رہیں گے!'' عبداللہ نے پُرجوش انداز میں کہا۔ وہ ایسے ہی ہر ہر بات پر پُرخوش ہوا کرتا تھا، اُس کے اندر کُوٹ کُوٹ کر زندگی بھری ہوئی تھی۔
''اِس کا مطلب ہے تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے!'' عبدالولی نے اُسے چھیڑنے کو کہا۔
''بڑے بھائی! آپ نے شاید میری بات پوری توجہ سے نہیں سُنی، میں نے کہا ہے کہ پھر ہم سب اکٹھے رہیں گے۔''
''ہم سب میں'' آپ بھی شامل ہیں!'' عبداللہ کے لہجے میں اصرار تھا۔
''کم آن یار! میں کیوں تم لوگوں میں ہڈی بن کر رہوں۔'' عبدالولی نے کینوس اُٹھا کر دیوار کے ساتھ سوکھنے کے لیے رکھتے ہوئے کہا۔
''خبردار! جو آپ نے میرے بڑے بھیا کے لیے اِس طرح کے الفاظ استعمال کیے ورنہ میں ناراض ہوجاؤں گا۔'' عبداللہ نے پیار بھری دھمکی دی۔
''میں فون پہ زہرہ اور ممی سے آپ کا اتنا ذکر کرتا ہوں کہ اُن سب کو آپ سے ملنے کا بے حد شوق ہے وہ دیکھنا چاہتے ہیں اُس مسیحا کو جس نے اُس روز برستی بارش میں کیسے غنڈوں سے اُن کے بیٹے کی جان بچائی تھی۔ میری زندگی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بعد آپ کی دی ہوئی ہے۔'' عبداللہ کہہ رہا تھا اور ولی کے ذہن کے پردے پر دو سبز سنہری آنکھیں لہرائی تھیں، ایک بار اِسی طرح ترنم نے اُسے موت کے منہ میں جانے سے بچایا تھا۔
''حیرت ہے وہ مجھے کیسے یاد آگئی۔'' ولی نے سوچا۔
''اچھی لڑکی تھی لیکن جانے کیوں عجیب سی تھی۔'' ولی سوچے بِنا نہ رہ سکا۔

''سب سے عجیب بات تو یہ ہے کہ جب جب وہ مجھے بھولنے لگتی ہے، اچانک ہی وہ میرے سام
آجاتی ہے۔'' ولی نے سوچا۔

''بڑے بھیا!'' عبداللہ نے عبدالولی کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرا کر اُسے چونکایا۔

''کدھر نکل گئے جناب! واپس آجائیں ورنہ خیالی گاڑی کا پیٹرول ختم ہوجائے گا۔'' عبداللہ نے کہا۔

اُس کی باتیں ایسے ہی برجستہ ہوتی تھیں۔

''کدھر تھے! کن کے خیالوں میں تھے!

کیا بھابی صاحبہ تشریف لائی تھیں؟

اوہ! ہو پھر تو میں نے ڈسٹرب کردیا۔'' عبداللہ نے شرارتی انداز میں کہا۔

''تم بھی نہ نان اسٹاپ ٹرین ہو، کہیں اسٹاپ لے لیا کرو یار!'' عبدالولی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اُف مار ڈالا...'' عبداللہ نے لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا...؟'' عبدالولی نے پریشانی سے پوچھا۔

''آپ کی قاتل ہنسی نے مار ڈالا، میں بھی کہوں کہ آپ اتنا کم ہنستے کیوں ہیں۔ ظاہر ہے لوگوں کو ما
اچھی بات تھوڑا ہی ہے۔'' عبداللہ ایک بار پھر اپنی جون میں تھا۔

''تم ناواقعی باتوں کی پٹاری ہو۔'' ولی سر ہلاتا کچن کی جانب مُڑا۔

''میرے لیے بھی ایک کپ کافی پلیز! اگر سینڈوچ بن رہا ہے تو پلیز آدھا میں بھی کھاؤں گا۔ اپ
ہاتھ کی کافی اور سینڈوچ کھانے سے تو بہتر ہے بھوکا رہ لیا جائے۔ توبہ توبہ میرے ہاتھ میں کتنی بدمز
ہے، بڑے بڑے لوگوں کی بھوک میرا کھانا چکھ کر اُڑ سکتی ہے۔'' عبداللہ اب با آواز بلند بول
تھا۔ جب کہ کچن میں کھڑا ولی بہ مشکل اپنی ہنسی ضبط کررہا تھا۔ ابھی پچھلے دنوں عبداللہ نے آملیٹ بنایا
اور اِس قدر بدمزہ تھا کہ ایک لقمہ نہ کھایا گیا تھا۔ اسی طرح وہ اکثر کافی اور چائے بھی بناتا تھا تو پ
والے کے صبر کا امتحان بن جاتا تھا۔

خود عبداللہ اپنی بے تکی کوکنگ سے نالاں تھا۔

''مجھے زہرہ اور ممی نے کسی کام کے قابل نہیں رہنے دیا، میرا ہر کام ایشیا کے مردوں کی طرح پروٹوکو
کے ساتھ کرتی ہیں اور میں باہر آکر مشکل میں گھر جاتا ہوں۔'' عبداللہ نے کافی اور سینڈوچ پکڑ
ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں! تم کسی پاکستانی لڑکی سے شادی کرلینا، وہ ساری عمر عبادت سمجھ کر تمہارے کام کر
گی اور کبھی منہ نہیں بنائے گی، ہماری لڑکیوں کا یہ بہت بڑا وصف ہے۔ وہ بہت خدمتی ہوتی ہیں۔''
ولی نے اُس کا مسئلہ حل کرتے ہوئے کہا۔

''ہوں! پاکستانی لڑکی!!'' عبداللہ نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

''واقعی گڈ آئیڈیا! یہاں کی لڑکیوں کی طرح اُس کی آنکھیں نیلی پیلی تو نہ ہوں گی۔ توبہ ہے م
یہاں کی رنگ برنگی شکلیں دیکھ دیکھ کر تنگ ہوں۔'' عبداللہ نے کہا۔

''اوئے! تم تو لگتے ہی نہیں کہ تم پیدا یہاں ہوئے، کتنا دیسی سا ٹچ ہے تمہارے خیالات میں۔

دالولی کہے بنا نہ رہ سکا تھا۔

''میری ممی کی وجہ سے۔ آپ ملوگے تو پتا چلے گا کہ میرے خیالات اور میں یہاں رہنے کے باوجود
ں اتنے دیسی ہیں! اوہ یاد آیا آپ تو گئے ہوئے تھے ورکشاپ کے لیے، پیچھے کسی ٹی ٹو کا فون تھا۔
ے بھائی یہ کیسا نام ہے؟'' عبداللہ نے پوچھا۔

''تم اُس سے ملو گے تو تم بہت خوش ہوگے کیوں کہ وہ بھی تمہاری طرح بے حد زندہ دل ہے، میں تم
اپنے دوستوں سے ضرور ملواؤں گا۔ میرے بہت کم دوست ہیں لیکن بے حد اچھے اور اپنی اپنی ذات
بے حد اہم انسان ہیں۔ خاص ہیں، تم اُن سے مل کر بے حد خوش ہوگے۔'' عبدالولی نے سچائی سے
ا۔

''کیا میں اپنے آپ کو اتنا خوش نصیب سمجھوں کہ میں بھی آپ کے دوستوں میں شامل ہوں۔''
داللہ نے ایک دم ہی سامنے آکر پوچھا۔

''تم! تم میرے لیے دوستوں سے زیادہ ہو عبداللہ!'' عبدالولی نے بے حد جذب سے کہا۔

''تمہارے وجود سے پھوٹتی خوشبو بہت مانوس ہے تم تو میرے دِل میں چھوٹے بھائیوں کی طرح
'' عبدالولی جو اقرار کے معاملے میں بے حد کنجوس تھا بے ساختہ اظہار کرگیا۔

عبداللہ ایک دم آگے بڑھ کر عبدالولی کے سینے سے جالگا۔

''آپ میرے ہی بھائی ہیں، یقین جانیے میرا دِل کہتا ہے اللہ نے آپ کو میرا بھائی بنا کر بھیجا ہے۔''
عبداللہ نے بھی بے ساختہ اظہار کیا۔

وں کو ایک دوسرے کے سینے سے لگ کر بے حد آسودگی کا احساس ہوا تھا۔ ایسا احساس، جو ایک ہی
ے پودوں کو ہوتا ہے!

❖❖○❖❖

ان تمہارے سُونے ہیں راستے محبت کے
ابھی جاؤ اب تو جاں واسطے محبت کے
تم کو کیا خبر!
یے بن تمہارے بستے ہیں
لمحہ فرقت کے ناگ ہم کو ڈستے ہیں
پ یہاں نہیں ہو تم! چین کیسے آئے گا
تق اب کے لگتا ہے جان لے کے جائے گا
ب بھی تیری یادوں کے ہم پہ جان پہرے ہیں
ل جہاں تھے اب بھی ہم اُس جگہ پہ ٹھہرے ہیں
لوٹ پلٹ کے جاں ہم کو!
یے جیتے ہیں
جب تری آئے، اشک کیسے پیتے ہیں

یاد ہے تمہیں
ہم کو! کل تلک جو دیتے تھے
آج! ہم ہیں دیتے وہ واسطے محبت کے
مار ہم کو ڈالیں ناں حادثے محبت کے
آ بھی جاؤ اب تو جاں واسطے محبت کے
دیکھ کتنے ہیں ویراں راستے محبت کے
آ بھی جاؤ اب تو جاں واسطے محبت کے!

محبت کے پیالے کی جانب ہر انسان اندھا دُھند دوڑتا ہے، بے حد جنونی ہو جاتا ہے اِس پیالے کو حاصل کرنے کے لیے۔ یہ اُس کی سرشت میں ہے لیکن وہ نہیں جانتا کہ جب جب وہ اس پیالے سے ''پریم امرت'' پیتا ہے تو پیاس بجھنے کے بجائے بڑھ جاتی ہے اور پھر ہمیشہ بڑھتی ہی جاتی ہے۔

علیزے نے کبھی نہ سوچا تھا کہ اُس کی زندگی میں بھی یہ ''پریم امرت'' پینا لکھا ہے۔ ولی جاتے جاتے یہ پیالہ اُسے تھما گیا تھا، جسے اُس نے دھیرے دھیرے پیا تھا لیکن اُس کے اندر پیاس بہت جلدی جاگ اُٹھی تھی۔

ولی کو وہ اتنا چاہنے لگے گی، اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اب تو کسی کام میں دِل نہ لگتا تھا۔

محبوب بے شک فاصلے پر ہو لیکن اپنے شہر میں ہو تو اُس کے آس پاس سے ہوتی فضائیں انسان کو اُداس اور بے چین نہیں ہونے دیتیں۔ وہ تسلی دیتی ہیں دِل کو کہ محبوب یہیں کہیں ہے لیکن جب محبوب دُور ہو تو بے چینی کی آگ زور پکڑ کر تن من جھلساتی رہتی ہے۔

علیزے کھانا پکاتے، گھر کا کام کرتے، پودوں کو پانی دیتے غرض ہر ہر وقت ولی کے گمان میں گم رہنے لگی تھی۔

وہ خود اپنی اِس کیفیت سے پریشان تھی۔ شاید اِسے ہی محبت کہتے ہیں۔ آخر وہ اقرار کرنے لگی تھی۔

''علیزے۔ علیزے!'' نیچے سے ایک دم اونچی اونچی آواز میں امی کی پکار سنائی دی۔

علیزے نے گھبرا کر کبوتروں کا دانہ دیوار پر رکھ کر نیچے کو دوڑ لگائی۔

''خدا خیر کرے!'' علیزے کا دِل اب بہت حساس ہو گیا تھا، ہر پَل الرٹ اور دعا گو کہ اب اللہ اُن پر رحم کرتے رہیں۔

علیزے نے دو دو سیڑھیاں ایک ایک قدم میں پار کی تھیں۔

''کیا ہوا امی!'' علیزے کی ہوائیاں اُڑی ہوئی تھیں۔

''آں۔ ہاں! وہ تمہارے ابّو کاشف سے مل کر آئے ہیں۔

''کاشف! اب کاشف واپس آ جائے گا!!'' امی سے خوشی چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔

''مبارک ہو آپ کو امی!'' علیزے نے اُن کے گرد اپنے بازو حمائل کرتے ہوئے کہا۔

''آں۔ ہاں!

خ۔ خیر مبارک!!'' حسن آرا بیگم کا سانس پھولنے لگا تھا۔

ال اس قدر کمزور ہو چکا تھا نہ دُکھ اور نہ ہی خوشی سہار پاتا تھا۔

''ابو کدھر ہیں امی!'' علیزے نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔

''وہ تو آتے ہی جانماز پر کھڑے ہو گئے ہیں۔'' حسن آرا نے بیٹے کی دستیابی کا سُن کو شوہر کے غیر الی روّیے کی بالکل پروا نہ کی تھی۔

اندر انور صاحب دروازہ بند کیے جانماز پر کھڑے ہچکیوں کے ساتھ رو رہے تھے۔

اج اُن کی واپسی ہو گئی تھی۔

انسان بھی تو کتنا پاگل ہے، ساری عمر دولت سے محبت کرتا ہے۔ اولاد سے محبت کرتا ہے اور پھر اپنی ل بھی محبت دنیا کے نام لگا دیتا ہے اور پھر اُس سے سب چھن جاتا ہے کچھ باقی نہیں بچتا۔

اگر وہ جان جائے کہ ہر چیز اور اُس کی محبت بھی فانی ہے تو وہ گھاٹے کا سودا کبھی نہ کرے، اپنے من کو ہاں لگائے، جہاں اُس کی بے حد قدر کی جائے۔

اج انور صاحب نہیں ٹوٹے تھے بلکہ اُن کا غرور ٹوٹا تھا۔ اُن کو اپنے بیٹے کی شان دار جوانی، خوب صورت چہرے پر کتنا مان تھا، کتنا غرور کرتے تھے وہ کہ ایک بے حد شان دار بیٹے کے باپ ہیں۔ فخر سے ان کا سینہ پھول جاتا تھا۔ لیکن آج وہ جان گئے تھے کہ اگر اللہ صرف ذرا سی ایک حس ہی واپس لے لے تو ال قدرت والا شخص بھی بے کار ہو جاتا ہے!

اب تک وہ پرائے مال پر ہی اِتراتے رہے، اور آخر کار اُن کو دکھ اپنا ہی ملا تھا۔

''اے اللہ! مجھے معاف کر دے۔!!

سب کچھ، یہ مال یہ اولاد تیری ہی دی ہوئی ہے، تیری امانت ہے، میں نے تیری امانت پر قبضہ کر کے غرور کیا اور آج میں اپنی اولاد کے لیے بے بس ہوں! مجھے معاف کر دے۔ مجھے اولاد کی آزمائش سے نکال دے!

میرے اللہ مجھے اور میرے بچوں کو آسانیاں دے دے۔ میں جان گیا ہوں کہ میں ادنیٰ ہوں!

کمزور ہوں، بس تو ہی ہر بات پر طاقت رکھتا ہے!

اے طاقت والے ہم کو سہارا دے!

ہم کمزور نفس والوں کو سہارا دے!!

سہارا دے!!'' وہ سجدے میں گر کر گڑگڑا رہے تھے۔

آج وہ واپس آ گئے تھے اور اللہ کو واپس مُڑ کر آ جانے والے بے حد پسند ہیں۔

بے شک اللہ سب سے زیادہ مہربان اور بڑا ہے!!

شب کی آغوش سے وہ صبح نکلی ہوگی
ساعت نحس بھی وہ اِس کے جلو میں ہوگی
سبز رستے وہ سبھی دُھند میں ڈوبے ہوں گے
زندگی جن سے کئی بار گزرتی ہوگی
سوچتی ہوگی فضا
آسماں آج یہ کیوں اُداس ہوا جاتا ہے
کس کے گھر درد کا سیلاب بلا جاتا ہے
پیڑ رستوں پہ یہ کیوں سر کو جھکائے چپ ہیں
پھول شاخوں پہ یہ کیوں منہ کو چُھپائے گم ہیں
کس لیے کہر کی چادر میں ہیں گم نظارے چپ ہیں
چارسُو چھائی وحشت میں گھرے پیارے چُپ ہیں
دور تک آج گلی کوچوں میں بے بسی ننگے پاؤں گھومتی ہے

''بلال۔ بلال!'' آپا امّاں کی دِل دوز چیخیں حویلی کے در و دیوار ہلا رہے تھے۔

''بلال!'' وہ کنویں کے کنارے لٹک کر چیخیں مار رہی تھیں۔

''تو کیا.. تو کیا مکافاتِ عمل شروع ہو چکا ہے؟'' اُن کے درد سے پھٹتے ہوئے دِل سے آواز آئی۔

''نہیں! لیکن اِن معصوم بچوں کا کیا قصور تھا؟'' انہوں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی، وہ کنواں کسی موت کی وادی کی طرح تھا، جہاں جو داخل ہو جاتا کبھی مُڑ کر نہیں آ سکتا تھا۔

''نہیں۔ نہیں!'' آپا امّاں نے سسکتے ہوئے کنویں کی منڈیر پر سر مارا، پھر کسی کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین بوس ہو گئیں۔

کوئی انجام سی آہٹ تھی سماعت سے پرے
آہ بھرتی ہوئی اِن سرد ہواؤں سے پرے
جب اچانک وہ خموشی ٹوٹی
سسکیاں لیتی فضا چیخ اُٹھی
گل صد برگ جُدا ہم سے ہوا چاہتا ہے

اور نایاب وہ مٹی میں ملا چاہتا ہے
اور نایاب وہ مٹی میں ملا چاہتا ہے

بلال کی موت اور ایسی موت تو خود اُس کے باپ کی ڈیزائن کردہ تھی۔ اصل میں تو یہ موت اُس نے اہلِ ملی کے خاندان کے لیے ڈیزائن کی تھی!

سید سرفراز علی نے جو گڑھا کسی اور کے لیے کھودا تھا، اُن کی اپنی اولاد اُس میں گر چکی تھی۔ بلال کی موت ایسا دھچکا تھا جس نے زلزلے کی طرح سید سرفراز کے مضبوط قلعے کی بنیادوں کو ہلا کے رکھ دیا۔

بنیادیں ہل جائیں تو قلعے اور عمارتیں زیادہ دیر تک سر اُٹھا کر کھڑے نہیں رہ سکتے۔

فضا میں اگربتیوں اور گلاب کے پھولوں کی ملی جلی خوشبو رچی بسی تھی، سرگوشیوں میں بولتے ہوئے لوگوں کی بھنبھناہٹ خاصی تیز تھی۔

اندر خواتین کلمہ طیبہ پڑھ رہی تھیں جب کہ باہر بیٹھے مرد زیادہ تر گفتگو میں مشغول تھے۔ یہ گفتگو بلال اور بانو کی معمائی موت سے لے کر کرنٹ ایشوز تک پر معمور تھی۔

''بہت افسوس ہوا سرفراز صاحب!'' سیکریٹری صاحب خاص طور پر سید سرفراز کے ہاں تعزیت کے لیے آئے تھے۔

آج صبح اخبار میں انہوں نے ''افسوس پر ملال'' کا اے فور سائز میں بڑا سا اشتہار پڑھا تھا کہ سید سرفراز علی کا بیٹا اور بہو کار ایکسیڈنٹ میں موقعے پر ہی جاں بحق ہو گئے آج اُن کی نمازِ جنازہ عصر کے بعد ہو گی۔

اشتہار کے ساتھ بڑی نمایاں خبر اِس کار ایکسیڈنٹ کی بھی لگی تھی، کار جس میں بیٹا اور بہو سوار تھے بُری طرح تباہ ہو چکی تھی، تباہ شدہ گاڑی کی نمایاں تصویر بھی خبر کے ساتھ موجود تھی۔

سید سرفراز افسوس کرنے آنے والے افراد کے ساتھ بہت کم گفتگو کر رہے تھے۔ زیادہ تر سر کے اشارے سے سلام اور گفتگو کا جواب دے رہے تھے۔ ان کا معاون خاص جبار احمد سارے معاملات دیکھ رہا تھا وہ سید سرفراز علی کا برسوں کا ٹرینڈ آدمی تھا۔ اُس نے ایسے میں، جب مالک کو زندگی میں پہلی بار ٹوٹتے اور چپ ہوتے دیکھا تو معاملہ فہمی سے کام لیتے ہوئے بلال اور بانو کی موت کو ایک حادثے کی صورت دے دی تھی اور اُس کا اشتہار بھی لگوا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی آس پاس کے سارے کاروباری اور سماجی حضرات جنازہ کے لیے پہنچ چکے تھے۔

سیاہ لباس میں سرخ ہوتی آنکھوں سے سید سرفراز علی بے حد خاموش تھا۔ وہ ایسا لاوا تھا جس کو جہاں سے دبایا جاتا، وہیں سے پھوٹ نکلتا اُس کے اندر گھٹن بڑھ رہی تھی، طوفان اُٹھ رہا تھا۔

''سائیں! بدائی کا وقت آ گیا ہے! آپ بیٹی اور بیٹے کو وداع کریں!'' خادم خاص نے سید سرفراز علی کے کان میں سرگوشی کی۔

سید سرفراز علی کو اپنے اندر عجیب سی تبدیلی کا احساس ہوا، اُن کو یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے کوئی رو رہا ہو انہوں نے کان لگا کر اِدھر اُدھر دیکھا لیکن یہ آواز بالکل مختلف تھی اور بہت قریب سے آ رہی تھی۔

انہوں نے مزید بے چین ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

''اوہ خدایا!'' وہ ایک دم چونکے۔

ہاں واقعی کوئی رو رہا تھا! یہ تو کوئی اُن کے ہی اندر رو رہا تھا! یہ خبر اُن کو بے حد حیرت زدہ کرگئی تھی۔ وہ اُس کے گرتے آنسو اپنے اندر محسوس کرسکتے تھے۔

پھر ایک دم ہی اُن کا وجود لرز گیا۔

خدایا! یہ تو اُن کا اپنا ہی دِل رو رہا تھا۔

وہ جھکے کندھوں کے ساتھ کھڑے ہوئے تو اُن کی کمر اور ٹانگوں سے ہڈیاں چٹخنے کی واضح آواز آئی اُن کی ہڈیاں یوں کڑکڑائی تھیں، جیسے کمزور چھت کی ٹوٹنے والی کڑیاں کھڑکھڑاتی ہیں۔

یہ تو وہ سید سرفراز علی نہ تھا جو کہتا تھا کہ ''میں جو چاہوں حاصل کرسکتا ہوں، میں ہاتھوں کی لکیروں کو اپنی مرضی سے بناتا ہوں۔'' آج وہ جو کھو چکا تھا اب کبھی دوبارہ حاصل نہ کرسکتا تھا۔

زنان خانے کے ہال کے بیچوں بیچ دونوں جنازے رکھے ہوئے تھے۔ صرف خاندان اور قریبی احباب کی خواتین جنازوں کے پاس بیٹھی تھیں جب کہ باقی آس پاس کے گاؤں کی خواتین لائن بنا کر ایک نظر دیکھ کر اگلے کمرے میں پہنچائی جا رہی تھیں، جہاں سفید چاندنی بچھا کر سپارے رکھے گئے تھے خواتین کھجور کی گٹھلیاں پڑھ رہی تھیں۔ تیز چلتا پنکھا اور پاس پڑی ہوئی برف کی سِلوں سے جو بڑے بڑے اسٹینڈز میں رکھی گئی تھیں کمرے میں خنکی کا احساس نمایاں تھا۔

سید سرفراز علی چھوٹے چھوٹے قدموں کے ساتھ چلتے ہوئے جنازوں کے قریب آئے اور پھر ایک ڈر کر پیچھے ہٹے، انہیں شہر بانو کے لب باقاعدہ مسکراتے ہوئے محسوس ہوئے اور یہ مسکراہٹ تھی بھی حد گہری اور واضح کہ سید سرفراز کو لگا شہر بانو زندہ ہے۔

انہوں نے ایک بار پھر غور سے چہرے کو دیکھا۔ خوف جس کو انہوں نے زندگی میں کبھی کوئی جگہ نہ دی تھی آج اُس کا ذائقہ بھی محسوس کرلیا تھا۔

یہ کیا ہو رہا تھا؟ کیا اُن کی زندگی بدل رہی تھی۔

شہر بانو کا چہرہ بے حد پُرسکون تھا۔ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ سوتی ہوئی محسوس ہوئی تھی اُس کے چہرے پہ رتی بھر بھی موت کی سیاہی نہ تھی بلکہ اُس کا چہرہ بے حد روشن اور پُرنور تھا۔

''کیا کبھی مرے ہوئے لوگوں کا چہرہ بھی اِس قدر فاتحانہ ہوتا ہے؟'' سید سرفراز علی کو لگا، وہ ابھی اٹھ کر اُن کا گریبان تھام لے گی اور اپنے اوپر کی جانے والی زیادتی کا حساب لے گی۔ وہ لاشعوری طور پر دو قدم پیچھے کی جانب ہٹے، اُن کو ایک بار وہم سا ہوا کہ اُن کے یوں پیچھے ہٹنے سے شہر بانو پھر مسکرائی تھی۔

''سائیں! اُدھر بلال سائیں!!'' خادم خاص کی بیوی نے سید سرفراز کو دوسری جانب متوجہ کیا کیوں کہ وہ شہر بانو کے جنازے کے پاس ٹک کر کھڑے ہوگئے تھے۔

سید سرفراز علی گھوم کر بلال کی میت کے پاس آ کر کھڑے ہوگئے۔ معصوم اور بے ضرر آنکھوں والا بلال آنکھیں موندیں لیٹا تھا۔ سید سرفراز کا دِل چاہا آگے بڑھ کر اُسے اُٹھا دیں تاکہ وہ اُٹھے اور اُن کے ساتھ ضد کرے فرمائش کرے۔

لیکن آج وہ ایسا چُپ ہوا تھا کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بے نیاز ہوگیا تھا، ہر غصے، ہر طلب اور ہر تکلیف سے اُسے نجات مل گئی تھی اُس تکلیف سے بھی، جو اُس کے باپ نے اپنے اعمالوں کی وجہ سے اُسے عطا کرکے دی تھی جس کی وجہ سے ہر وقت اُس کا سارا وجود ان دیکھی آگ میں جلتا رہتا تھا۔

''بلال!'' سید سرفراز کے ہونٹوں سے سسکی نکلی۔ اُن کو محسوس ہوا کہ وہ اندر سے ٹوٹ رہے ہیں۔

''شہر بانو!'' انہوں نے مڑ کر ایک بار پھر شہر بانو کو دیکھا، وہ جیت گئی تھی، آج تک جتنے ظلم وہ کرتے رہے تھے انہوں نے مظلوم کو بے بس ہی دیکھا تھا۔

بہت سارے شکستہ چہرے اُن کی آنکھوں کے سامنے لہرائے پھر یہ چہرے آپس میں گڈمڈ ہونے لگے اور آخر میں ایک فاتح چہرہ اُن کے سامنے اُبھرا، وہ شہر بانو کا چہرہ تھا، اُن کے دِل پہ بے حد کاری ضرب لگی تھی۔

وہ جاتے جاتے اُن کی جیت کو ہار میں بدل گئی تھی۔ اپنی موت کے ساتھ وہ اُن کی عزیز ترین چیز کو اپنے ساتھ لے گئی تھی، بلال کی صورت میں اُن کو بہت بڑا غم دے گئی تھی۔ جوان اولاد اور خاص طور پر جوان بیٹے کی موت کسی بھی باپ کی مضبوط عمارت کو جڑوں سے ہلا کر رکھ دیتی ہے وہ اچھی طرح جان گئے تھے۔

''بلال!'' وہ بلال کی چارپائی کے پاس دوزانو ہوکر دیکھنے لگے۔

''ہٹ جاؤ یہاں سے!'' آپا امّاں جو بلال کی چارپائی کے ساتھ سر نیہوڑائے بیٹھی تھیں، دھیمی آواز میں سید سرفراز علی سے مخاطب ہوئیں۔ رو رو کر اُن کا گلا بیٹھ چکا تھا۔

''تمہارا منحوس و مکروہ سایہ بھی اِن معصوموں پر اب نہیں پڑنا چاہیے!'' آپا امّاں نے سوجی سوجی آنکھوں سے اُن کو گھورتے ہوئے کہا۔

سید سرفراز علی نے ڈبڈباتی آنکھوں سے اُن کو دیکھا۔

پہلی بار اُن کا دِل چاہا کہ وہ کسی کے کندھے پہ سر رکھ کر رو دیں۔ پھر وہ جو سامنے بیٹھی تھی، وہ ہمیشہ اُن کی چاہتے ناچاہتے محرم راز تھی، اُن کے بچوں کی پرورش اُس نے کی تھی اور ایک اور بھی تو رشتہ تھا! ہاں ایک اور بھی تو رشتہ تھا اُس کے ساتھ جس کو اُس نے اپنی مرضی سے بھلا دیا تھا۔ بے شک اس رشتے کو وہ مانتے نہ تھے لیکن وہ رشتہ موجود تو تھا۔ وہ کسی طور بھی دِل کا رشتہ نہ تھا بس مجبوری و تقدیر کا رشتہ تھا وہ تقدیر جس نے اُس کو اُن کی زندگی میں شامل کردیا تھا اُن کی ''بیوی'' کا درجہ دے دیا تھا۔

''تم قاتل ہو اِن معصوموں کے...!!

تم نے قتل کیا ہے ان کا...!'' آپا امّاں نے بلال کا ہاتھ تھام کر اُسے چومتے ہوئے سید سرفراز علی سے کہا۔

''تم نے ظلم کی حد کردی شہر بانو کے ساتھ اور اُس سے اُس کی زندگی کو چھین لیا اور بلال اُس کی وجہ سے مرگیا! اگر تم یہ ظلم نہ ڈھاتے تو آج دونوں بچے مٹی کی طرح، ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسل نہ جاتے۔'' آپا امّاں روتے روتے بولیں۔

اردگرد کی خواتین کو اِس لیے بھی اندازہ نہ ہوسکا کیوں کہ آپا امّاں کی آواز نہایت مدھم اور بیٹھی بیٹھی

تھی۔

''اللہ! یہ کیسا ظلم اس شخص نے کمایا ہے! یہ دیکھو سید سرفراز علی! تمہارے گناہوں کی پکڑ۔'' انہوں نے بلال کی جانب انہیں متوجہ کروایا۔

''تمہارے گناہوں کی سزا کا وقت شروع ہوچکا ہے سید سرفراز علی۔'' اُن کی ٹھنڈی سرد نگاہ اس گرا... میں بھی اُن کے اندر سرد لہر دوڑا گئی تھی۔

''اندر تمہاری بیٹی زخموں سے چُور چُور موجود ہے ابھی نہ تو اُس کا رشتہ زندگی سے ہے نہ موت سے اور یہ، یہ دیکھو اِس کو! کیا اِس معصوم نے اپنے ظالم باپ کا بھگتان نہیں بھگتا؟'' سید سرفراز علی کو نفیسہ بیگم کے سوالات اور باتیں کوڑے کی طرح لگ رہی تھیں۔

وہ ایک دم ہی وہاں سے تیزی سے نکلے، دُکھ درد تکلیف نے اُن کو بے چین کر دیا تھا۔ چوں کہ اس ذائقے کو انہوں نے ساری عمر نہ چکھا تھا اِس لیے اب یہ ذائقہ ان کے اندر تک کڑواہٹ بھر گیا تھا۔

''سید سرفراز علی! ظالم ظلم کرتے ہوئے یہ ہمیشہ بھول جاتا ہے کہ ظالم کی رسی ہمیشہ دراز ہی ہوتی لیکن جب اللہ اُس کی رسی کھینچتا ہے تو اُس کا پَل پَل سب کے لیے عبرت بن جاتا ہے!'' آیا اماں ایک نظر شہر بانو کے مطمئن چہرے کو دیکھا اور دوسری نظر بلال کے معصوم چہرے پر ڈالتے ہوئے سوچا۔

کیا انجام کا بگل بج چکا تھا؟ دن کی طرح زندگی کی کہانی کے بھی تین حصے ہوتے ہیں۔ پہلے حصے م سن رائز دوسرا حصہ سن شائن اور تیسرا حصہ سن سیٹ ہوتا ہے!

ظلم کا سورج طلوع ہوا پھر خوب چمکا اور اب پیچھے باقی تھا اِس کے غروب ہونے کا وقت!!

❖❖❍❖❖

''یہ کیسا شور ہے؟'' ترنم نے اپنے کمرے سے باہر آکر پوچھا۔ وہ نیند کی گولیاں کھا کر سوئی تھ اچانک شور سے اُس کی آنکھ بھی اچانک کھل گئی تھی اور نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے سر میں ایک دم درد شروع ہوچکا تھا۔

ترنم نے ایک ہاتھ سے اپنا پھوڑے کی طرح دُکھتا سر دباتے ہوئے کیتھی سے پوچھا۔

''بے بی! کوئی بہت اچھے گھرانے کی لڑکی لگتا ہے، یہ لوگ اُسے کڈنیپ کر کے لائے ہیں، اب ہو میں آتے ہی اُس نے شور مچادیا ہے، میرے کو ڈر ہے کہ جتنا یہ شور کری ایٹ کرے گا، اتنی جلدی غلط کروالے گا یہاں بپھری گھوڑی اور لڑکی دونوں کو خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ اور ان کو قابو کرنے کا طریقہ تم جانتی ہو کہ کتنا مائیزرایبل ہے۔

''پور سلی گرل!!'' کیتھی افسوس کر رہی تھی۔ اُس کے افسوس میں تعزیت کی خوشبو تھی، جیسے کوئی مر ہو۔

''ک۔ کہاں ہے وہ؟'' ترنم اپنا سارا درد بھول گئی تھی۔

جب سے وہ کفارے کی راہ کی راہی بنی تھی، وہ ہمیشہ خطرناک معاملے میں خود کو پھنسا لیتی تھی یہ جا ہوئے بھی کہ نئی چڑیا کے پاس پھڑکنے کی کسی کو اجازت نہیں ہوتی تھی وہ کیتھی سے اُس کا پتا پوچھ ر تھی۔

''تم کاہے کو خطرہ مول لیتی ہے؟'' کیتھی نے اُسے باز رہنے کی تلقین کی۔

''کیتھی! شی نیڈز اَس! ورنہ! ورنہ ایک اور ایمان فاطمہ مر جائے گی۔'' ترنم نے تڑپ کر اِدھر اُدھر ...ہوئے شور کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

''آر یو میڈ؟'' (کیا تم پاگل ہوگئی ہو)

اور یہ ایمان فاطمہ کون سا بے بی ہے؟'' کیتھی اُس کی باتیں سمجھنے کے قابل نہ تھی۔

''تم چھوڑو اِن باتوں کو، صرف مجھے یہ بتاؤ کہ اُس لڑکی کو کس روم میں بند کیا گیا ہے؟'' ترنم نے ...ا منت بھرا اصرار کیا۔

''میں تم کو وہاں نہیں لے جائے گی، تم کو خود جانا ہے تو ضرور جاؤ...'' کیتھی اتنے برسوں سے اِن ...وں کے ساتھ رہ رہی تھی اِس لیے اُس نے بے حد خوف زدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں ٹھیک ہے میں اکیلی چلی جاؤں گی۔'' ترنم نے فوراً حامی بھری، اِسی دوران لڑکی کی دوبارہ ...نے کی آوازیں آئیں۔ ترنم کو اندازہ ہوگیا کہ لڑکی کو کس کمرے میں بند کیا گیا تھا۔ وہ مزید اصرار کیے ...ں جانب بڑھی، کیتھی نے طویل سانس بھرا۔

''شی از میڈ!''

...وہ جانتی تھی ترنم ایک ضدی اور سر پھری لڑکی ہے! لیکن یہ سر پھری لڑکی اگر میڈم راگنی کی نظر میں آ گئی ...ہو جائے گی۔

''مجھے یہاں سے فوراً جانا چاہیے!'' کیتھی نے خوف زدہ ہوتے ہوئے ترنم کو اُس لڑکی کے کمرے کا ...ازہ کھولتے دیکھا تھا۔

''یہ تو مرے گی اور دوسروں کو بھی مروائے گی...'' وہ بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے تیزی سے نکل گئی۔

ترنم نے تھوڑی سی کوشش سے دروازہ کھول لیا تھا۔

یہاں پہ دروازوں پر کم ہی لاک لگائے جاتے تھے کیوں کہ یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا بے حد ...قسم کی سیکورٹی تھی، یہاں سے ہر راستے پہ کیمرے لگے ہوئے تھے اور دو تین واچ مین اِن کیمروں ...ذریعے پل پل کی خبر رکھتے تھے اس کے علاوہ آسمان کو چھوتا ہوا مین گیٹ تھا، جہاں ہر وقت سخت ...رٹی کا انتظام تھا، اِس لیے کارندے لڑکی کو کھلا چھوڑ دیتے تھے لیکن اگر کوئی شور مچائے تو اُسے عارضی ...پر باہر سے بند کر دیتے تھے۔

''مجھے جانے دو...!

پلیز مجھے جانے دو...!'' دروازہ کھلتے ہی اُس لڑکی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

...بیس سال کی نہایت معصوم لڑکی تھی۔ بے حد خوب صورت! اُس نے گاؤن پہن رکھا تھا جب کہ ...ا تھا یقیناً اُس نے ان لوگوں سے بھاگنے یا خود کو بچانے کی کوشش کی ہوگی، اِسی دوران اُس کے سر کا ...رف کہیں اُتر کر گر چکا ہوگا۔

''باجی! میں، مجھے جانے دو! میرے ابا جی... اگر مجھے گھر جانے میں دیر ہوگئی تو وہ مجھے زندہ گاڑ دیں گے'' لڑکی نے سسکتے ہوئے کہا۔

ترنم نے ایک دُکھ اور تاسف بھری نگاہ اُس پر ڈالی۔

نادان لڑکی نہ جانتی تھی کہ گھر کی دہلیز کو پار کرتے ہی بابل اور بابل کی گلیاں ہمیشہ کے چھوٹ چکی ہوتی ہیں۔

یہاں سے نکلنا تو ناممکن تھا۔

ترنم کے دِل میں عجیب سی خواہش نے کروٹ لی کہ کاش اِس لڑکی کی عزت مرنے سے پہلے یہ مرجائے، کم از کم حرام زندگی گزارنے سے عزت کی موت بے حد اچھی تھی۔ لیکن وہ اُسے کیسے احساس دلائے کہ اُسے اہم چیز کی چوائس (عزت) کرنا ہوگی۔

''میری بات غور سے سنو!'' ترنم نے نرمی سے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''نہیں باجی! مجھے جانے دو...''

لڑکی کے چہرے پہ موجود درد ترنم سے سہا نہ جارہا تھا۔ ایک بار وہ بھی واپس جانے کو یوں ہی طرح تڑپی تھی لیکن وہ اتنی بہادر ثابت نہ ہوسکی تھی، اُس نے مرنے کی جرأت نہ کی تھی اُس نے موت کو چوائس نہ کیا تھا۔ بعد میں اُس نے خود بہت بار خودکشی کی کوشش کی تھی اور اُس کے نصیب میں موت بھی باقی نہ بچی تھی۔ ایک عذابِ مسلسل تھا، جو وہ جھیل رہی تھی۔

''کاش وہ میڈم چاندنی کی دی ہوئی موت سے نہ گھبراتی اور باعزت موت حاصل کرلیتی۔'' اُس کے بہت سارے پچھتاوؤں میں یہ پچھتاوا بھی شامل تھا۔

پھر اُس نے عظمیٰ کو (لڑکی نے یہی نام بتایا تھا) دھیرے دھیرے ساری سچائی بیان کردی کہ وہ جال میں آ پھنسی تھی، جس سے نکلنا ناممکن تھا۔ اِس زندان میں صرف ایک ہی دروازہ کھلتا تھا۔ موت کا دروازہ۔

ترنم نے نہایت سفاکی سے اُسے اِس دروازے کو پار کر جانے کو کہا۔

لڑکی یک ٹک اُسے دیکھے جارہی تھی، اُس کی آنکھوں کی حیرت بے حد نمایاں تھی۔ یقیناً ترنم نے اُس کے حوصلے سے بڑی بات کہہ دی تھی۔

''تم اِن تک کیسے آئیں؟'' ترنم نے گہری سانس بھرتے ہوئے پوچھا۔

''میں! میں نے واقعی بہت بڑی غلطی کی ہے۔'' لڑکی کے لہجے میں پچھتاوا شامل تھا۔

''ساجد! جو مجھ سے محبت کے دعوے کرتا تھا جو کہتا تھا کہ میرے لیے وہ جان بھی دے دے گا اُس نے اِن لوگوں کے ہاتھ مجھے فروخت کردیا۔''

''تمہیں ساجد کہاں مل گیا؟ تم تو بتارہی تھی کہ تمہارے گھر کا ماحول بے حد سخت تھا۔'' ترنم نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا، وہ ایسا کہتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ ماحول تو اُس کا بھی خاصا پابند تھا لیکن جب وقت آتا ہے بلکہ جب ہم اُسے آنے کا راستا دے دیتے ہیں تو وہ کہیں سے بھی گھس کر پہنچ جاتا ہے۔ Loop holes!! چاہے شخصیت کے ہوں یا پھر سوچ کے، ہمیشہ ہی آدمی کو نشیب کی طرف لے جاتے ہیں۔

''آپ ٹھیک کہتی ہیں میرے گھر کا ماحول بے حد سخت تھا اور میں اُس سے بے حد تنگ بھی تھی لیکن

اندازہ ہوگیا وہ سختیاں ہمیں باہر کی گندی نگاہ سے بچانے کے لیے ضروری تھیں۔ میں نے امی اور ابا سے جھوٹ بولا کہ میں دوست کے ساتھ کالج جاتی ہوں، میں تو کم و بیش ہی کالج میں کلاسیں اٹینڈ کرتی تھی۔''

''میری اور ساجد کی دوستی انٹرنیٹ پر ہوئی تھی ڈیڑھ سال وہ مجھے مجبور کرتا رہا کہ ہم باہر بھی ملیں لیکن ہمت ہی نہ کر پائی، مجھے اُس سے ملنے کے لیے ہمت ڈیڑھ سال بعد حاصل ہوئی تھی۔ انسان ایک حد کو پار کرکے نکل جائے تو وہ دعاؤں کی حد سے بھی نکل جاتا ہے وہ دعائیں جو اُس کی ہر جگہ حفاظت کرتی ہیں۔ میں نے ایک بار گھر کی دہلیز پار کی اور اُس کے بعد میری ہچکچاہٹ ختم ہوگئی۔ ساجد نے مجھے اِس قدر پمپ کیا کہ میں بے حد نڈر اور بے خوف ہوگئی اور یہ ہی بے خوفی مجھے کھینچ کر یہاں لے آئی۔''

لیکن تین ماہ مسلسل ملتے رہنے کے بعد ساجد نے اُس کے ساتھ بُری طرح دھوکا دہی کی تھی۔ اب وہ گالیاں اور بددعائیں دے رہی تھی۔

''باجی! یہاں سے نکلنے کا کوئی راستا!'' لڑکی نے آس بھری نظروں سے پوچھا۔

''ہاں! لیکن وہ راستا موت کو پار کرکے ملتا ہے۔'' ترنم نے بے حد سچائی سے جواب دیا۔

عظمیٰ کا چہرہ بے حد سیاہ پڑ گیا تھا۔

''اچھا! میں تم کو ایک بات سناتی ہوں، جو میں نے کچھ روز پہلے ہی پڑھی تھی۔'' ترنم نے کمرے میں موجود بیڈ پر مزے سے لیٹتے ہوئے کہا۔ پھر ایک دم سیدھی ہوکر بیٹھ گئی۔

''کالج میں کچھ پڑھا لکھا بھی تھا کہ سب عزت کی طرح ضائع کر ڈالا؟'' ترنم کو اُس لڑکی پر بے حد غصہ آرہا تھا۔

''آخر یہ لڑکیاں اپنی چادر اور چار دیواری کی قدر کیوں نہیں کرتیں؟'' ترنم نے سوچا۔

''ایک مور اپنے خوب صورت پَروں کو نوچ نوچ کر پھینک رہا تھا ایک حکیم کا گزر ہوا اُس نے معلوم کیا کہ اے طاؤس! ایسے خوب صورت پَروں کو اکھاڑ کر کیوں ناشکری کرتا ہے؟'' طاؤس نے کہا۔

آں نمی بینی کہ ہر سُو صد بلا

سوئے من آید پئے ایں بالہا

(کیا تو نہیں دیکھتا کہ ہر طرف سے سینکڑوں بلائیں انہی بازو کے لیے میری طرف آتی ہیں۔

اے شخص! اکثر اوقات ظالم شکاری انہی پروں کے لیے ہر طرف جال بچھاتا ہے۔

چوں ندارم روز ضبط خویشتن

زیں قضا وزیں بلا وزیں فتن

''جب میں دن کو اِن فضاؤں اور بلاؤں اور فتنوں سے اپنے کو محفوظ رکھنے پر قادر نہیں ہوں تو اِس سے یہ بہتر ہے کہ میں اپنے پَروں کو دور کردوں اور اپنی صورت کو مکروہ بنالوں تاکہ پہاڑوں اور میدانوں میں بے فکر ہوجاؤں۔'' ترنم نے دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اُس کے پاس آکر کہا، یوں جیسے وہ اُس لڑکی کو اُس کے حتمی فیصلے کے لیے مجبور کررہی ہو۔

نزدِ من جاں بہتر از بال و پرست

جاں بماند باٸی وئن ابتر ست

''میرے نزدیک جان کی حفاظت بال و پَر کی حفاظت سے زیادہ ضروری اور اہم ہے، جان تو رہے، جسم کی ابتری کا جان کے مقابلے میں کیا غم۔

''سنو عظمٰی! میں تمہاری ماں نہیں ہوں جو تم کو آ کر کہانی سنانے بیٹھی ہوں۔ وقت بہت تھوڑا ہے بات دھیان سے سنو، اُس وقت اُس معمولی سے پرندے نے اپنی جان کو بچانے کے لیے اپنی صورت ترین، عزیز ترین چیز قربان کر ڈالی تھی۔ اُس نے نہایت عقل مندی کا سودا کیا تھا کیا ہم لڑکیوں کے لیے اپنی عزت اپنی جان سے پیاری نہیں ہوتی؟'' ترنم اُس کی انا کو جگا رہی تھی۔

''اگر آج تم نے ابھی اِسی وقت کوئی فیصلہ نہ کیا تو میری طرح ناسور بھری زندگی گزارنے پر مجبور ہو گی جہاں پَل پَل موت ہے! ارے موت کے بعد تو ہر شخص کو سکون مل جاتا ہے جب کہ میں تو اِس پَل کی موت کے بعد اور بے سکونی کے ریلے میں بہہ جاتی ہوں جہاں کوئی بھی ہاتھ تھام کر باہر نکالنے والا نہیں ہوتا۔'' ترنم کی آنکھیں اور آواز بے اختیار نم ہوئی تھیں۔

عظمٰی پھٹی پھٹی نگاہوں سے ترنم کو دیکھ رہی تھی وہ ترنم کی بات کا مفہوم سمجھ چکی تھی، تب ہی اُس نے بے اختیار لبوں پر زبان پھیری۔

موت کو گلے لگانا بے حد مشکل کام ہے۔ بڑے سے بڑا جیدار بھی خود کو اس کام کے لیے بے بس ہے جب کہ وہ تو کمزور سی لڑکی تھی۔

''باجی!'' اُس نے لبوں پہ دوبارہ زبان پھیری۔

''خودکشی بھی تو حرام موت ہوتی ہے۔ اگر اِس پار حرام زندگی ہے تو دوسری پار حرام موت ہے، دونوں ہی صورتوں میں ماری جاؤں گی۔'' عظمٰی نے ماتھے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں! میں تم کو خودکشی کرنے کا تھوڑا ہی کہہ رہی ہوں، میں تو تم کو حرام زندگی سے بچنے کے لیے کہہ رہی ہوں۔ تم کو بس اِس زندگی سے بچنے کے لیے جان توڑ محنت کرنا ہوگی۔'' ترنم نے سرگوشی میں کہا۔

''باہر سیکورٹی بے حد سخت ہے۔'' وہ کہتی ہوئی اُس کے قریب آ گئی۔ پھر ترنم نے اُس کے کان میں کچھ کہا۔

''باجی!'' عظمٰی نے سہم کر اُسے دیکھا۔

''کیا باجی باجی لگا رکھی ہے اُس مردود ساجد سے محبت کرتے ہوئے نہیں پتا تھا کہ خود کو کہاں کانٹوں میں گھسیٹ رہی ہو۔'' ترنم نے ڈپٹ کر اُسے کہا۔

''جیسا میں نے کہا ہے ویسا کر ڈالو، آگے تمہاری قسمت، اگر تمہاری زندگی باقی لکھی ہے تو تم بچ جاؤ گی ورنہ تمہاری عزت تو یقیناً بچ ہی جائے گی۔

''سودا مہنگا نہیں ہے۔'' ترنم نے اُس کی حوصلہ افزائی کی۔

''بس تم کو ہوشیاری سے کام لینا ہے۔'' ترنم اُس کا کندھا تھپکتے ہوئے باہر نکل آئی۔

باہر آ کر اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا اُس کی قسمت اچھی تھی باہر کوئی بھی نہ تھا۔ کمرے میں آ کر اُس نے

موبائل پر طارق کے نمبر پر لمبا چوڑا پیغام دیا۔

میسج سینڈ کر کے اُس نے Text clear کیا پھر سینڈ آئٹم کلیئر کیا اور سم نکال کر اپنے پرس میں ڈالی اور عام روٹین میں استعمال ہونے والی سم فون میں ڈال دی۔ بعد میں وضو کر کے دو نفل حاجت لیے کھڑی ہوگئی۔ اُس نے ہاتھ اُٹھا کر خاص طور پر عظمٰی کے لیے دُعا کی۔

''اللہ اُس کے ساتھ بہترین معاملہ کرنا! بے شک ساری بھلائیاں تیری ہی جانب سے ہیں۔'' ترنم نے بے حد صدقِ دِل سے دعا کی تھی اور سچے دِل سے کی دعا اور کام میں تو ہمیشہ ہی خیر پڑتی ہے!

❖❖ ( ) ❖❖

''آنے والے وقت نے اِس گھر کے لیے کیا رکھا ہے اپنی جھولی میں؟'' نفیسہ بیگم نے قرآن پاک کو جزدان میں لپیٹتے ہوئے سوچا۔

جب ہم عبادت کے بعد بھی دُعا کے بجائے فکر اور وسوسے سوچتے ہیں تو وہ ہمارا بہت بُرا وقت ہوتا ہے کیوں کہ دُعا کرنے کی نعمت ہم سے واپس لی جا چکی ہوتی ہے۔ اِس حویلی میں صرف آپا اماں ہی کا وجود تھا جو اللہ تعالیٰ سے اپنے بچوں کی خاطر اِس کے مکینوں کی خیر مانگتی تھیں لیکن اب وہ بھی ہر وقت سوچوں میں گھری رہتی تھیں لیکن جب گھر کا سربراہ ظلم کی حد توڑ دیتا ہے تو وہ اپنے ساتھ ساتھ اپنے گھر کے ہر فرد کے لیے بھی آزمائش بن جاتا ہے۔ سید سرفراز کے ظلم نے ہر حد پار کر لی تھی اب تو رسی کھینچنے کا وقت تھا اِس کی شروعات مسکان کے گھر کے اُجڑنے سے ہو چکی تھی، بلال کی موت اتنا بڑا سانحہ تھا کہ سید سرفراز علی کو جڑوں تک کو ہلا گیا تھا۔

''اب مزید کیا بُرا ہوگا؟'' نفیسہ بیگم نے بے جان ٹانگوں سے خود کو چند قدم چلنے پر مجبور کیا، وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی سید سرفراز کے کمرے کی جانب گئی تھیں۔

نفیسہ بیگم کے لیے حیرت کا دھچکا تھا آج پہلی بار انہوں نے سر پھرے شیر کو یوں بے حد خاموش، چپ چاپ بلکہ بے بس دیکھا تھا۔

''مجھے تم سے بات کرنی تھی۔'' وہ اُکھڑے اُکھڑے لہجے میں بولیں۔

''نفیسہ!'' وہ تڑپ کر اُن کی جانب مُڑے۔

''وہ۔ وہ کہہ رہی ہے کہ مجھے کبھی میری اولاد کا سکھ نہیں ملے گا...'' انہوں نے ہوا میں جانے کس کی جانب اشارہ کر کے کہا تھا۔ نفیسہ بیگم کو تو وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔

''کون! کس کی بات کر رہے ہو؟'' نفیسہ بیگم نے ماتھے پہ بل ڈال کر کہا، ویسے بھی اُسے اِس شخص سے کوئی ہمدردی نہ ہوئی تھی اِس لیے انہوں نے بے حد بیزاری سے پوچھا۔

''یہ! یہ زبیدہ! زبیدہ ہے نا، یہ کہہ رہی ہے۔'' انہوں نے سامنے فضا کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

''میں اِس کو، تم کو سب کو بتا دوں گا کہ میرا نام سید سرفراز علی ہے میں جو چاہوں حاصل کر سکتا ہوں۔'' وہ ہذیانی انداز میں گویا ہوئے۔

نفیسہ بیگم کو اُن کی ذہنی حالت کی درستگی پہ شک ہوا۔

''میں اپنی اولاد کے لیے ہر، ہر خوشی حاصل کروں گا! جیسا یہ کہہ رہی ہے کبھی نہیں ہونے دوں گا۔

سب جان لیں! سمجھی تم بھی زبیدہ!'' وہ آنکھیں نکال نکال کر کسی غیر مرئی نقطے پر چلاّ رہے تھے۔

''ہنسنا بند کرو۔'' انہوں نے پاس پڑا لیمپ اُٹھا کر دے مارا جو فضا میں لہرا کر زمین بوس ہوتے ہی ٹوٹ گیا۔

''میں! میں ہر خوشی حاصل کروں گا، میں تقدیر پر یقین نہیں رکھتا، میں تو خود تقدیر کی لائنیں بنا ہوں!'' وہ مسلسل بڑبڑا رہے تھے اور اپنے آپے میں نہ تھے۔

''سرفراز علی!'' نفیسہ بیگم نے آگے بڑھ کر انہیں زور سے پکارا۔

''آں۔ ہوں!'' سید سرفراز علی جو مسلسل ٹوٹے ہوئے کانچ کو دیکھ رہے تھے، ایک دم کسی خواب سے چونکے۔

''زبیدہ کون ہے؟'' نفیسہ بیگم اپنی بات تو بالکل بھول گئی تھیں۔

''زبیدہ!'' سید سرفراز علی نے سوکھے ہونٹوں پہ زبان پھیری۔

''کا۔ کوئی نہیں!'' انہوں نے ٹالا۔

''کیا ہوا سید سرفراز علی! تم اتنے خوف زدہ کیوں ہو، تم تو کسی سے ڈرتے نہ تھے بلکہ خوف و دہشت تو تمہارے نام کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں نا؟ پھر آج! آج تم کو کیا ہوا؟'' نفیسہ بیگم کو اُس کے تڑپنے سے بے حد خوشی محسوس ہوئی تھی۔

''کچھ نہیں، کچھ نہیں!!'' سید سرفراز علی کو اپنی انا بے حد پیاری تھی، ہوش و حواس میں آتے ہی وہ فوراً کمرے سے نکل گئے۔ نفیسہ بیگم نے گہری سانس خارج کی، دیواروں پر لگے مختلف جانوروں کے سر، سید سرفراز علی نے اپنی بہادری کے ثبوت کے طور پر لگا رکھے تھے نفیسہ بیگم کو وہ سب قہقہے لگاتے محسوس ہوئے، وہ گھبرا کر باہر نکل آئیں۔

اُن کا رخ مسکان کے کمرے کی جانب تھا، جہاں وہ نیند کی دواؤں کے زیرِ اثر زیادہ تر سوئی رہتی تھی۔ درحقیقت وہ سید سرفراز کے پاس مسکان کے علاج کا ہی کہنے گئی تھیں مشہور نفسیات دان ڈاکٹر زبیر سے وہ وقت لے چکی تھیں۔ بے شک دِل اور گھر میں ابھی تک بلال اور شیر بانو کا سوگ چل رہا تھا لیکن ان کو بہت جلد احساس ہوگیا کہ انہیں اب اُس کو بچانا ہے، جو باقی رہ گئی تھی، جو بچ گئی تھی۔ جو زندہ تھی اُس کا خیال بے حد ضروری تھا وہ جو زندگی سے ہاتھ چھڑا کر دھیرے دھیرے موت سے بھی خوف ناک وادی کا حصہ بننے جا رہی تھی۔

نفیسہ بیگم نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا، مسکان سو رہی تھی اور نرس پاس بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ وہ دن کے بائیس گھنٹے سوتی ہی رہتی تھی۔

''نہیں! میں تم کو کبھی ضائع نہ ہونے دوں گی! میں تمہارے لیے لڑ کر زندگی حاصل کروں گی، تم کو اُس کا حصہ نہ بننے دوں گی، جو ایسی خوف ناک وادی ہے جہاں پہنچ کر انسان خود بھی پہچان کھو دیتا ہے۔ میں تم کو ڈاکٹر زبیر کے پاس لے جاؤں گی! میں اپنی بیٹی کو ضرور لے جاؤں گی۔'' ایک ماں کے دِل نے خود سے ایک پر یقین وعدہ کیا تھا۔

❖❖ ☽ ❖❖

''کدھر ہو تم؟ یہاں قیامت گزر گئی تمہارے باپ پہ اور تم کو کچھ خبر ہی نہیں! ایسے کڑے وقت میں باپ کو اُس کے اپنے بیٹے کے کندھے کا سہارا درکار ہوتا ہے۔'' سید سرفراز علی، ناصر علی سے مخاطب تھے۔

''بابا سائیں! آج سے پہلے آپ نے کبھی میری خبر نہیں لی، آپ کا اور میرا رابطہ بس چیکوں کے لیے قائم رہا۔ پھر آپ کیسے مجھ سے رابطوں کے کٹنے کا شکوہ کر سکتے ہیں؟'' ناصر علی نے کھوکھلی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

''تمہاری ہر ہر ضرورت کا خیال رکھا، تمہیں کبھی پیسے کی کمی نہ آنے دی تو کیا بُرا کیا؟ کیا یہ بھی بُرائی ہے؟'' سید سرفراز علی تو اس قدر دُکھی تھے کہ انہیں ناصر علی کی بات کسی نیزے کی انّی کی طرح چبھی تھی۔

''پیسہ دینا برائی نہیں ہے بابا سائیں! پیسہ دے کر اولاد سے نہ پوچھنا کہ وہ کہاں خرچ کر رہی ہے مکمل آزادی دے دینا کہ وہ پیسے کو ایسی جگہ خرچ کر ڈالے، جہاں سے اُس کی بربادی ملتی ہو!''

''بابا سائیں! دوسروں کے والدین بھی اُن کو پیسہ بھیجتے تھے لیکن کبھی اُن کا پیسہ اُن کے لیے بربادی لے کر نہ لایا تھا پھر آپ کا پیسہ، آپ کی دی آزادی کیوں میرے لیے دلدل کا گڑھا بن گئے۔'' ناصر علی کی باتیں کسی کوڑے کی طرح سید سرفراز علی کا پنڈا نیلا کر رہی تھیں، حیرت سے اُن کا منہ کھل گیا تھا۔

''یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟'' سید سرفراز علی نے شاک کی کیفیت میں پوچھا۔

وہ جو اُن سے فرمائشیں کر کر کے پیسہ منگواتا تھا، ہر طرح کا غلط شوق اُس نے پال رکھا تھا۔ آج سے پہلے وہ اپنے باپ سے بہت خوش تھا کہ اُس کا باپ اُس کا ہر طرح خیال رکھتا آیا تھا لیکن آج اُسے کیا ہوا تھا؟

''میں بعد میں فون کرتا ہوں بابا سائیں!'' ناصر علی نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔

سید سرفراز علی کو یوں لگا، جیسے اُن کے اندر سے جان نکل گئی ہو۔

''یہ ناصر علی کیا کہہ رہا تھا؟'' وہ بے حد پریشانی سے سوچ رہے تھے۔

دوسری جانب ناصر علی سر نیہوڑائے بیٹھا تھا۔ آج سے تین ماہ پہلے وہ کس قدر پرجوش اور عیاش نوجوان تھا صرف تین ماہ میں اُس کی ساری زندگی بدل کر رہ گئی تھی، اس کا ظاہری حلیہ بدل کر رہ گیا تھا یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اِس حلیے میں تو اُس کا سگا باپ اُسے پہچان نہ سکتا تھا۔

ہر حد توڑ دینے والا صرف ایک ہی مقام پر پہنچتا ہے وہ ہے تباہی کا مقام۔ دیر سے سہی لیکن اُسے اسی مقام پر کھڑا ہونا پڑتا ہے، ناصر علی نے وہ حد توڑی تھی جس کی وجہ سے قوم لوط پر عذاب اُترا تھا۔

اور ایک عذاب ناصر علی پہ بھی اُترا تھا وہ ایڈز کا عذاب تھا موت کو سر پر ناچتے محسوس کرنا اور دیکھنا بے حد اذیت ناک تجربہ تھا اور وہ اُس تجربے سے گزر رہا تھا۔ ہاں وہ اِس پلِ صراط کی تکلیف سے گزر رہا تھا۔ اپنی اِس حالت اور تکلیف کا ذمے دار وہ اپنے ہی باپ کو سمجھتا تھا، جس نے اُسے اتنا پیسہ دیا کہ اُس نے اپنے لیے بربادی خرید لی تھی۔

بے سکونی کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا، جس میں وہ ہر وقت غوطے کھاتا رہتا۔ وقت سے پہلے وہ ہر مر رہا تھا اور یہ بہت بُری اذیت تھی جو لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتی تھی، وہ شروع شروع میں سکون کی

تلاش میں اپنے ایک بُدھ مت ماننے والے دوست کے انکل کے پاس جانے لگا، وہ مراقبے کے ذریعے اعصابی سکون کی ورزشیں کروایا کرتے تھے لیکن اُسے وہ سکون حاصل نہ ہوسکا، جس کی اُسے تلاش تھی اس نے لاماز کی طرح کا لباس پہن کر سر منڈوا کر بھی دیکھ لیا تھا۔ لیکن پچھتاوے کی جو بے سکونی تھی وہ موت سے بھی زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوئی تھی۔ روز کا سورج اُس کی زندگی میں سے ایک دن کم کرتا تھا ایسے میں وہ خود میں بھی نہ تھا۔

بلال کی موت پہ وہ گزشتہ سات دنوں سے رو رہا تھا اس کی موت کی خبر اُسے اپنے ایک دوست کے ذریعے ملی تھی کس قدر خوش قسمت تھا اُس کا بھائی ہر تکلیف، ہر حساب سے آزاد ہوگیا تھا۔ روتے روتے اکثر یہ سوچ اُس کے آنسو کم کر دیتی تھی لیکن اب اُس کا کیا بنے گا؟

یہ سوال اُسے صبح سے شام تک رلاتا تھا۔

لیکن سکون پھر بھی کہیں نہ تھا۔

❖❖ ○ ❖❖

''کہتے ہیں دُکھ کی دراڑیں چہروں سے تو رخصت ہوجاتی ہیں لیکن وہ انسان کے اندر اُتر کر اُس گوشے کو ویران کر دیتی ہیں جو کسی ایک انسان کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔'' ڈاکٹر زبیر اپنی الیکٹرک چیئر باہر آئے تو انہوں نے نفیسہ بیگم کو مخاطب کر کے کہا۔

مسکان کے اندر کئی قسم کے دُکھ موجود ہیں جن سے لڑتے لڑتے وہ بُری طرح ٹوٹ چکی ہے، جس کی وجہ سے اُس کے اندر ذہنی انتشار پھیل چکا ہے۔ اُسے اپنی زندگی کے دونوں بڑے دُکھ اُن لوگوں سے ملے جن کو وہ بے حد چاہتی تھی، جو اُس کی محبت تھے جن سے اُس کو توقعات تھیں اور توقع کا احساس کانچ کی طرح نازک ہوتا ہے، جو ٹوٹ جائے تو چبھ کر لہولہان کر دیتا ہے۔

پہلا شخص اُس کا باپ تھا۔ اُس کا مرکز محبت، توقع اور دوسرا وہ شخص، جس سے وہ یک طرفہ محبت کرتی تھی۔ تیسرا دُکھ اُسے اپنے باپ سے ملا جس کی وجہ سے اُس کی عزت نفس کچلی گئی تھی۔ یہ اُس کی کمر کی دیوار کو آخری اور بہت بُرا دھکا ثابت ہوا تھا جب کہ اس سے پہلے اُسے برین ہیمرج بھی ہوا تھا، حیرت ہے وہ مری کیوں نہیں یا مکمل پاگل کیوں نہیں ہوئی۔ لیکن اب بھی وہ مُردوں سے بدتر حالت میں ہے۔''

''ہم شروع شروع میں اُسے نیورولینگوئسٹک (NLP) پروگرامنگ کے سیشن دیں گے، گو سیریس کنڈیشن میں بہت لائٹ ڈوز کی طرح ہوں گے لیکن بہر حال ہم کوشش شروع کریں گے تو ہی مرحلے طے ہوں گے۔'' ڈاکٹر زبیر نے طویل سانس بھرتے کہا۔

''میرے علاوہ آپ کسی اور کے پاس لے جائیں گے تو وہ آپ کو مشورہ دیں گے کہ ان کو پاگل خانے لے جائیں، جو میرے خیال میں بہت بڑا ظلم ہے۔ بہر حال آپ اُمید رکھیں اللہ نے چاہا تو انشاء اللہ اِس خول کو توڑنے میں کام یاب ہوں گے، جو اِس وقت مسکان کے گرد تنا ہوا ہے۔

''ہاں اگر اِن کے والد اور وہ لڑکا اِن کے ساتھ محبت اور بہت ساری توجہ بھرا رویہ رکھیں تو بھی کام یابی ملے گی...'' وہ آیا اماں کو وہ بات بتا رہے تھے جو مسکان کا اصل علاج تھا۔

''بہر حال! آپ مایوس نہ ہوں! آپ ماں ہیں اور ماں کے پاس سب سے بڑا اور کارگر ہتھیار دعا

ہے آپ دُعا کریں، اللہ بہتر کرے گا۔'' ڈاکٹر زبیر نے دھیمی مسکراہٹ سے آیا اماں کو یقین دلایا۔

''انشاء اللہ!'' آیا اماں نے بے اختیار دعائیہ انداز میں جواب دیا۔

❖❖ ○ ❖❖

''کھانا کھالو۔'' کیتھی نے کھانا عظمیٰ کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ جواباً عظمیٰ نے غصے سے منہ موڑ لیا۔

''بے وقوف لڑکی! اِدھر دیکھو! یہ جو کچھ تمہارے لیے ہے میں نہ لاتی۔ لیکن ترنم نے مجھے مجبور کر کے دیا ہے۔'' کیتھی نے ایک کاغذ کا ٹکڑا، جسے تہہ کر کے چھوٹا کیا گیا تھا اُس کی مٹھی میں دیا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

عظمیٰ نے اِدھر اُدھر دیکھا اور چور نگاہوں سے اپنے ہاتھ میں دبا کاغذ دیکھا۔

''آخر کیا ہے اس میں؟'' اُس نے خود سے سوال کیا۔

''اے لڑکی! جلدی جلدی کھانا ختم کرو!'' اچانک مارک نے اندر آ کر کہا۔

''کیوں! کیوں جلدی کھانا کھاؤں؟ کیا چاہتے ہو تم؟'' عظمیٰ نے اکھڑ کر پوچھا۔

''ہاہاہا! سالی جتنی دیکھنے میں تیکھی ہے بولتی بھی تیکھا ہے، آئی لائیک اِٹ، یس آئی لائیک اِٹ! مجھے ہر ایسی گھوڑی سدھارنے میں بہت مزہ آتا ہے!'' اُس نے زبان سے یوں چٹخارہ لیا، جیسے کسی مزے دار چیز کا ذائقہ منہ میں آ گیا ہو۔

عظمیٰ نے ایک کڑی نگاہ اُس کے مکروہ چہرے پر ڈالی۔

''تم واقعی مختلف ہو، کس قدر سکون سے بیٹھی ہو ورنہ یہاں آنے والی ہر لڑکی بے حد بپھری ہوتی ہے، اب شور شرابا مچاتی ہے پھر جب تک اُس سے اُس کی وہ ''قیمتی چیز'' چھین نہیں لی جاتی جس کے لیے وہ مار لڑائی اور ہنگامہ کرتی ہے، وہ چپ نہیں ہوتی، کیا تمہیں اُس قیمتی چیز کے کھونے کا ڈر نہیں؟'' مارک نے خباثت سے ہنستے ہوئے پوچھا، جواباً عظمیٰ نے غصے سے منہ موڑ لیا۔

اب سے کچھ دیر پہلے وہ بھی تو باقی لڑکیوں کی طرح شور مچا رہی تھی اگر ترنم آ کر اُسے نہ روکتی۔

ترنم نے ہی سمجھایا تھا کہ ایسا کرنے سے ''بُرا انجام'' جلدی قریب آ جاتا ہے اس لیے اس وقت وہ کچھ کنٹرول میں تھی۔

''اوکے، اوکے! ابھی تم کھانا کھاؤ، ہم باقی کا کام کل کریں گے۔'' مارک اُس کے رویے سے مطمئن ہو کر بولا ورنہ وہ اپنا ایک ہی مجرب اور آزمودہ نسخہ آزماتا تھا۔ لڑکی کو بے بس کر کے اُس کی سی ڈی بنالی جاتی تھی، اُس کو نہیں مارا تو جاتا تھا لیکن اُس کی روح کو مارنے کا مکمل انتظام کیا جاتا تھا۔

مارک کے جانے کے بعد عظمیٰ نے گہرا سانس بھرا اور اپنے ہاتھ میں موجود کاغذ کی تہہ کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

''پیاری عظمیٰ! سورۃ النساء آیت 17-18 خاص تمہاری ساری اُلجھنوں کو دور کرتی نظر آ رہی ہے۔ تم اس کا سرا تھام کر آج ہی یہاں سے نکلنے، اپنی عزت بچانے کی کوشش کرو۔ اپنی عزت کو ہر صورت بچالینا ہے اس کے لیے تم کو اپنی جان ہی گنوانی پڑے۔

زیرِنظر آیت کا ترجمہ ہے اس کو دل سے پڑھنا اور جان لینا، چوں کہ میں اِن مرحلوں سے گزر کر بھسم ہوئی ہوں اس لیے تمہارے لیے بالکل سچا راستا ہی بتاؤں گی اِس کو پڑھو۔

''خدا انہی لوگوں کی توبہ قبول فرماتا ہے جو نادانی سے بُری حرکت کر بیٹھتے ہیں۔ پھر جلد توبہ کر لیتے ہیں پس ایسے لوگوں پر خدا مہربانی کرتا ہے اور وہ سب کچھ جانتا اور حکمت والا ہے اور ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو (ساری عمر) بُرے کام کرتے رہیں یہاں تک کہ جب اِن میں سے کسی کو موت آ موجود ہو تو اِس وقت کہنے لگے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں اور نہ اُن کی (توبہ قبول ہوتی ہے) جو کفر کی حالت میں مریں۔ ایسے لوگوں کے لیے ہم نے عذاب الیم تیار کر رکھا ہے۔''

پیاری عظمیٰ! اتنی وضاحت کے ساتھ کھول کھول کر اللہ نے اپنا حکم سنایا ہے، آگے تمہاری مرضی ہے۔"

ترنم نے اُس کے اندر جو خوف کے بڑے بڑے کھڈے پڑ گئے تھے، اُن کو فِل کر کے سارا فاصلہ مٹادیا تھا، ساری اُلجھنیں سلجھا دی تھیں۔

عظمیٰ نے وہ کاغذ دوبارہ تہہ کر دیا لیکن اس مرتبہ اُس نے کاغذ کو بے حد خیال سے پکڑا ہوا تھا، جیسے کوئی قیمتی چیز اُس کے ہاتھ میں ہو۔

اللہ رحمٰن نے تو ہم سب کے لیے گائیڈ لائن (قرآن پاک) دی ہوئی ہے۔

یہ تو اب ہم پر ہے کہ ہم اِسے کس طور پر استعمال کرتے ہیں اور کسی فیصلے تک کیسے پہنچتے ہیں۔

❖❖○❖❖

میرے من کے آنگن میں کیوں اپنا روپ سجاتی ہو
سارے موسم بیت گئے اب سج دھج کر کیوں آتی ہو
کیوں من کو جلاتی ہو
تم میری بھلا کون ہوتی ہو؟
برسوں پہلے میں نے تم کو چپکے چپکے چاہا تھا
اپنے من میں بسایا تھا
دھیرے دھیرے پیار میں کھو کر من کو اپنے جلایا تھا
پہروں خود کو رلایا تھا
پیار ہی جینا پیار ہی کل سرمایہ تھا
پیار کی راحت کھو کر جانا جو کچھ تھا سب مایا تھا
تم جو مایا کی دیوی تھیں سپنوں میں کھوئی رہتی تھیں
نیل گگن سے آنے والے شہزادے کی
باہوں میں سوئی رہتی تھیں
خواب سجا کر آنکھوں میں جب تم نے اپنی عمر گنوائی
پیچھے مڑ کر کبھی نہ دیکھا کوئی صدا نہ تم تک آئی

پھر اب...
میرے من کے آنگن میں چپ چاپ کھڑی کیوں رہتی ہو
پیار کی کچی مالا میں اشکوں کے موتی پروتی ہو
تم میری بھلا کون ہوتی ہو؟
بھول گیا میں ساری باتیں
بیت گئیں جیون کی راتیں
بہتے آنسو آہیں نالے
لے لو سب اپنی سوغاتیں
اب کیوں تم پچھتاوا بن کر
میرے خواب چراتی ہو؟
تم میری بھلا کون ہوتی ہو؟
تم میری بھلا کون ہوتی ہو؟

سمعان بیڈ کے سرہانے سر رکھے شاید سو گیا تھا۔ جب سے اُسے اطلاع ملی تھی کہ مسکان کو ٹریٹمنٹ کے لیے ہسپتال میں رکنا ہو گا وہ مسکان کے ساتھ ساتھ تھا۔

اب بھی جب تین گھنٹے پہلے وہ سائرہ کے ساتھ ہسپتال آیا تھا تو سائرہ زبردستی آپا اماں کو گھر چھوڑنے لے گئی، ایسے میں وہ مسکان کے پاس ہی رُک گیا تھا۔

مسکان کے سر کو سہلاتے اُسے چپ چاپ نیند کی دواؤں کے زیرِ اثر سوتے دیکھ کر وہ بے حد دُکھ میں ...ا ہو گیا تھا۔

کیسی سنہری سی لڑکی تھی وہ! پہلی بار، پہلی بار اُسے دیکھتے ہی اُس کے ذہن میں جو خیال آیا تھا وہ "گولڈن گرل" کا آیا تھا۔ آج وہ گولڈن گرل اپنی ساری سنہری شعاعیں خود میں بند کیے پنجر کی طرح ...ر آ رہی تھی۔

وہ اُس کا ہاتھ تھامے بہت ساری باتیں کرتا رہا اور پھر جانے کب اُس کی خود کی آنکھ بھی لگ گئی تھی۔

سائرہ دروازہ کھول کر جب اندر داخل ہوئی تو چھن سے کچھ اُس کے اندر ٹوٹا تھا، جن سے ہم محبت ...تے ہیں حقیقت کا کوئی منظر ہو یا تصور کا کوئی منظر کسی اور کا ساتھ اُس میں ہو تو ہمیں کبھی برداشت ...یں ہوتا۔

یہ انسانی فطرت ہے!

...کہ مسکان میں سائرہ کی جان تھی۔ تو پھر اُسے سمعان کے ساتھ دیکھ کر اُسے کیوں لگا کہ اُس کے جسم ...جان ہی نکل گئی ہے۔

"سمعان!" سائرہ نے آگے بڑھ کر اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اُسے اُٹھایا۔

"آں، ہاں!" سمعان ایک دم چونک کر اُٹھا۔

"سوری! میں شاید سو گیا تھا۔" سمعان نے دونوں ہاتھوں سے ماتھے پہ آئے بالوں کے گچھے کو پیچھے

کیا۔ جواباً سائرہ نارمل سی مسکراہٹ بھی اپنے چہرے پہ نہ لا سکی۔

''مسکان اُٹھی تھی کیا؟'' سائرہ نے سوپ والا تھرماس سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

ویسے تو ڈاکٹر نے اُسے ہر غذا کھانے کی اجازت دے رکھی تھی لیکن چوں کہ مسکان کا زیادہ تر وقت سوتے گزرتا تھا اِس لیے اُسے بے حد ہلکی پھلکی غذا کھلائی جا رہی تھی۔

''نہیں! یہ نہیں اُٹھی، تب سے سو رہی ہے۔'' سمعان نے یک ٹک مسکان کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

''مائی گولڈن گرل! پلیز ٹھیک ہو جاؤ۔ تمہاری تکلیف مجھے بہت زیادہ تکلیف دیتی ہے۔'' سمعان نے صدقِ دل سے دعا کی تھی۔

''سائرہ! میرا دِل کرتا ہے، جس جس نے مسکان کے ساتھ زیادتی کی، اُن سب کو شوٹ کر دوں، جن لوگوں نے اِسے مارا پیٹا اُس سے زیادہ قصوروار تو مسکان کے پاپا ہیں۔'' سمعان نے اپنا غصہ اُتارا۔

''کس قدر زیادتی کی ہے! میں حیران ہوں کہ... ایک جیتے جاگتے انسان کے ساتھ وہ کیا کھیل کھیلتے رہے اور وہ کوئی اور نہیں اُن کی سگی بیٹی تھی! آئی ہیٹ دیٹ مین!'' سمعان نے اپنے دِل کا غصہ اور نفرت باہر نکالا۔

سائرہ اس سارے دورانیے میں چپ رہی خود اُسے بھی مسکان کے باپ پہ بہت غصہ تھا۔

''یو آر رائٹ! وہ ایک بے حد سخت دِل انسان ہے۔'' سائرہ نے سپاٹ لہجے میں کہا اور پاس پڑی کرسی پہ بیٹھ گئی اُسی پَل دروازہ کھول کر کوئی اندر داخل ہوا۔

سائرہ ایک دم اُچھل کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اندر آنے والے سید سرفراز علی تھے، اُن کی آنکھوں سے سرخی چھلک رہی تھی۔

سائرہ کو جانے کیوں لگا کہ وہ اُن کی گفتگو سُن چکے ہیں۔

''ہُو اِز ہی! کون ہے یہ؟'' سمعان نے پوچھا۔

''مسکان ز فادر۔'' سائرہ نے سرگوشی میں جواب دیا۔

''اوہ...'' سمعان جو اتنی دیر سے بڑے بڑے دعوے کر رہا تھا، بس اتنا ہی کہہ سکا۔

سید سرفراز علی کے ساتھ ڈاکٹرز تھے جو ڈاکٹر زبیر کے اسسٹنٹ تھے وہ سید سرفراز علی کو مسکان کی کنڈیشن بتا رہے تھے جب کہ سمعان خاموشی سے باہر نکل آیا تھا۔

''یہ شخص...؟'' سمعان کا دماغ اُلجھا ہوا تھا۔

''میں نے اِس کو کہاں دیکھا ہے؟'' سمعان کو یاد نہ آ رہا تھا کہ اُس نے اِس شخص کو کہاں دیکھا تھا اُس کی شکل کیوں جانی پہچانی لگ رہی تھی۔

سمعان نے جب بہت ذہن پہ زور ڈالا تو اُسے یاد آیا کہ اُس نے اِس شخص کی تصویر اپنے ہی گھر اپنی ہی ماں کے پاس اُس کی الماری میں موجود ایک پرانے البم میں دیکھی تھی۔ وہ البم جس کو اُس کی ماں بہت غور سے دیکھا کرتی تھی، بے شک وہ اِس شخص کی جوانی کی تصویر تھی لیکن وہ پہچان گیا تھا۔

''کون ہے یہ اور ہمارا جاننے والا کیسے ہے؟'' سمعان ابھی تو خود سے سوال کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد گھر جا کر یہ سوال اپنی ماں سے کرنا چاہتا تھا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ اُس کا یہ سوال اُس کی ماں اور باپ دونوں کے زخم اکھاڑ سکتا تھا۔

❖❖ ( ) ❖❖

زی آنکھیں بڑی گہری
بہت ہی خوب صورت ہیں
اجازت ہو تو میں کچھ دیر
ان میں جھانک کر دیکھوں
کہ مجھ کو چاند کے مانند
جھیلوں میں اُترنا
للک دیتا ہے!

لی نے کتنی ہی بار یہ تحریر پڑھی تھی اور ہر بار شرما کر ڈائری کو بند کر دیا تھا۔ شرم سے سرخ ہوتے اپنے چہرے کے ساتھ وہ بیر بہوٹی ہوئے جا رہی تھی۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم بھی میری شدتوں کو، میری محبت کو جانو، تب سے جب سے میں تمہیں چاہتا ہوں۔'' طارق نے نگی سے کہا تھا۔

''یہ وہ ڈائری ہے جو میں نے پہلی بار تمہارے لیے اپنے دل کے جذبات لکھنے کے لیے استعمال کی ہے۔'' طارق نے گہرے سبز رنگ کی ڈائری سامنے کرتے ہوئے کہا۔

''ایسی اٹھارہ اور ڈائریاں ہیں۔'' طارق جیسے سنجیدہ، کم گو، لیے دیے رہنے والے شخص کے منہ سے اس طرح کی باتیں سن کر نگی واقعی حیران رہ گئی تھی۔ ہر شخص کے اندر ایک بچہ موجود ہوتا ہے جو اپنی مرضی کرتا ہے اور اپنے اظہار کے لیے کوئی بھی راہ اپناتا ہے۔

''نگی! میں نے تم کو بہت چاہا ہے۔'' طارق نے اُس کے بے حد قریب آ کر کہا۔

نگی نے حیرت سے طارق کو دیکھا۔

''یار پلیز! کچھ بول دیا کرو! لیکن... لیکن ایسے نہ دیکھا کرو، میری باتوں، میری فیلنگ کو سمجھا کرو۔'' نگی نے کچھ چڑ کر کہا۔

نگی سے شادی اور اُس کے مطالبوں کے بعد طارق بہت زیادہ بے صبرا ہو گیا تھا وہ اِس بات کو مانتا لگا تھا کہ وہ جب تک اپنے محبت کرنے کے سورس آف انسپائریشن کو اپنی زندگی میں شامل نہیں کرے گا وہ زندگی میں کسی سے بھی محبت نہ کر سکے گا۔ اس لیے وہ بے حد بے صبری سے چاہتا تھا کہ نگی اُس کا پورا جان لے، اِن ڈائریوں کے ہی ذریعے یا پھر کسی بھی بیرومیٹر سے اُس کی شدت کو جان لے۔

نگی نے اثبات میں سر ہلا کر ڈائری لی تھی۔

اور اب... جوں جوں وہ پڑھتی جا رہی تھی تو شرم سے دُہری ہوئے جا رہی تھی۔

''مجھے مزید طارق بھائی نہ کہنا۔'' وہ جاتے جاتے انگلی اُٹھا کر تنبیہ کر کے گیا تھا۔

اور جوں جوں وہ تاریخوں کے ساتھ ڈائری پڑھ رہی تھی حیران ہو رہی تھی کہ طارق کتنے عرصے پہلے سے اُسے چاہتے آ رہے تھے۔ حیرت و شرم کے علاوہ کچھ فخر سا اُسے محسوس ہوا تھا کہ اُسے چاہنے والا شخص

بے حد متوازن اور اچھا ہے۔

اُس کی زندگی میں صرف دو ہی مرد تھے اور اتفاق ایسا تھا کہ دونوں ہی بے حد کمپیوزڈ اور مشکل پسند تھے۔ اُن کی عادت کسی بھی لڑکی کا آئیڈیل ہو سکتی تھیں۔ بے شک اُن کے والد اور بھائی کی پرسنلٹی کو کم ہی میچ کر سکتا تھا۔ البتہ نگی! وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ اُس کی زندگی میں طارق جیسے ہی مرد کی تھی، بے شک طارق ایک پرفیکٹ چوائس تھا اس سے کم سے وہ کبھی خوش نہ رہ سکتی تھی۔

''نگی! تم اب تک سوئی نہیں؟'' روشن آرا بیگم جو تہجد کے لیے اُٹھی تھیں، نگی کے کمرے کی لائیٹ دیکھ کر فکر مندی سے اسے دیکھنے چلی آئیں۔

نگی کے وجود میں اس قدر سادگی اور بھولپن تھا کہ اُس کے وجود میں آئی کوئی بھی معمولی، غیر معمولی بات چھپ نہ سکتی تھی۔ روشن آرا بیگم کو بھی فوراً سے کچھ مختلف کی خوشبو آئی تھی۔

''امّاں جان! بس نیند نہیں آ رہی تھی۔'' نگی نے کہا۔ وہ سچ کہہ رہی تھی اُسے واقعی نیند نہیں آ رہی اُس کی نیند تو جانے کہاں اُڑ گئی تھی۔

''خیریت بیٹا! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' روشن آرا بیگم نے فکر مندی سے پوچھا۔

''جی امّاں جان! میں بالکل ٹھیک ہوں شاید دوپہر میں، میں سوئی تھی اس لیے ہو سکتا ہے میری ڈسٹرب ہو گئی ہو۔'' نگی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی ماں کو کیسے مطمئن کرے۔ شرم و حیا اُسے رہی تھی کہ وہ یہ بات اپنے منہ سے اپنی ماں کو نہ بتائے ورنہ وہ اپنی ماں سے کوئی بات نہ چھپاتی تھی۔

''بیٹا! لائٹ بند کردو اور لیٹ جاؤ، کمرا روشن کر کے لیٹو گی تو نیند آتی بھی ہوئی تو نہیں آئے گی'' روشن آرا بیگم نے پیار سے اُس سے کہا تھا۔

''جی اچھا!'' وہ تابع داری سے لائٹ بند کر کے زیرو کا بلب آن کر کے لیٹ گئی، نگی کی اِس قدر تابع داری نے روشن آرا بیگم کے دِل سے خیال نکال باہر کیا کہ شاید نگی اُن سے کچھ چھپا رہی ہے۔

''مجھے امّاں جان کو باخبر رکھنا ہو گا ورنہ وہ ناراض ہوں گی۔'' نگی نے کروٹ لیتے ہوئے سوچا نے اپنی زندگی کی کوئی بھی بات آج تک امّاں جان سے نہیں چھپائی تھی تو اس کی وجہ روشن آرا اُس کے ساتھ دوستانہ رویہ اور آزادی و رائے دینے کا حق تھا۔

''مجھے کچھ بتاتے شرم آئے گی!

''طارق! طارق سے کہوں گی کہ وہ سب کو بتائیں۔ پھر وہ خود بھی تو کہتے ہیں کہ رشتے جب تک نام نہ پا جائیں معتبر نہیں ہوتے۔ اب تک انہوں نے اپنا اظہار بھی اِسی وجہ سے چھپا رکھا تھا لیکن وال سے چھپ کر کوئی رشتہ بنانا بھی تو غلط بات ہے نا!'' نگی کی ذات کا شفاف پن اُسے ہمیشہ شفاف سو شفاف رویے ہی بتاتا تھا۔

''ٹھیک ہے میں طارق کو یہ ڈائری واپس کر دوں گی اور اُن سے صاف لفظوں میں کہہ دوں گی کہ اپنے والدین سے چھپ کر کوئی رشتہ نہیں بنا سکتی، اگر طارق واقعی اِس رشتے کی کوئی حتمی شکل چاہتے گے تو کچھ آگے بڑھیں گے۔ مجھے اپنے والدین سے چھپ کر کوئی کام، کوئی نیا رشتہ منظور نہیں!'' اُس فیصلہ کیا۔ بے شک اُس کا دل سورج مکھی کے پھول کی طرح اُدھر ہی جھکے جا رہا تھا، جہاں جہاں طا

ام تھا لیکن اُس نے اپنے دِل کو پرے رکھ کر وہ فیصلہ کیا اور بے حد کٹھن فیصلہ کیا، جو اُس کے والدین کی بیت کا نتیجہ تھا۔

والدین کی اچھی تربیت تو ایسی روشنی کی طرح ہوتی ہے، جو زندگی کے ہر اندھیرے کو کھا جاتی ہے اور ان کو اندھیروں میں ڈوبنے سے بھی بچا لیتی ہے۔

❖❖○❖❖

''سر! دیکھ تو آپ نے لیا ہے کس قدر سخت سکیورٹی ہے اب آپ کچھ سوچ بھی لیں۔'' آصف نے ارق کو مزید پیش قدمی سے روکنے کی کوشش کی۔

''تم اگر خوف زدہ ہو تو واپس جا سکتے ہو۔'' طارق نے بے حد سچائی سے جواب دیا۔

''نہیں سر! آپ کے خیال میں مجھے ایسا کرنا چاہیے؟'' آصف نے شرمندگی سے پوچھا۔

''غلط اور درست باتوں کا بیرومیٹر تو ہر شخص کے اندر اللہ نے ہمیشہ رکھا ہے کسی سے سوال کرنے سے ہر شخص کو اپنے اُس بیرومیٹر کو خود سے چیک کر لینا چاہیے۔'' طارق کی بات پر آصف کا چہرہ جو کچھ دیر پہلے خوف زدہ تھا، ایک دم سے شرم سے سرخ پڑ گیا۔

''ہمیشہ وہی فوجیں کام یاب ہوتی ہیں، جن کے لیڈر آگے بڑھ کر کھڑے ہوتے ہیں، جن کو گولی لگ نے کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا کوئی ڈر، کوئی خوف اُن کے پاؤں نہیں اکھاڑ سکتا۔ وہ دوسروں کے لیے الت کا انسپائریشن ہوتے ہیں۔''

''سوری سر!'' آصف نے شرمندگی سے کہا۔

''کس بات کا سوری یار! کم آن مجھے اپنے شیر جوان ہمیشہ مسکراتے اچھے لگتے ہیں۔'' طارق نے اُس کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اُس کی ساری شرمندگی چوس ڈالی تھی۔

''اچھا تم دوسری گاڑی میں میرے پیچھے ہو گے اور تم اور رانا میری گاڑی کو کور کرو گے۔ کم آن جلدی ا۔'' طارق نے اُسے دوسری گاڑی میں فوراً بھیج دیا۔

وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ سانپ کے منہ میں ہاتھ ڈال کر اُس کا نوالہ چھین لینے کا پلان کر رہے ہیں۔ کے منہ سے نوالہ چھینتے ہوئے آپ کو جسمانی لڑائی لڑنی پڑتی ہے اور شیر بڑا غیرت مند جانور ہوتا ہے امنے لڑتا ہے جب کہ سانپ بڑا زہریلا اور چھپ کر وار کرنے والا موذی ہوتا ہے۔ اس کے منہ سے ال چھیننے کا مطلب ہے کہ خود کو ڈسوا کر کچھ چھینا۔ لیکن طارق جیسے سچے اور کھرے جرأت مند لوگوں لیے کبھی بھی زندگی کے کھونے کا خوف، خوف نہیں رہا تھا۔

''بس یہ ہی موقع ہے ہمارے پاس، اس کے بعد ہم اُس لڑکی کو نہیں بچا پائیں گے۔ تم جانتے ہو کہ یہ آپریشن ان آفیشلی کر رہا ہوں، اس لیے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔'' طارق نے وائرلیس پر ف کو مختلف ہدایات دینے کے ساتھ ساتھ یہ بات کہی تھی۔

''یس سر!'' آصف نے تابع داری سے کہا۔

مہرون وی ٹی آئی تیزی سے آگے بھاگ رہی تھی۔ ترنم کی دی ہوئی اطلاع کے مطابق لڑکی اُسی کار لے جائی جا رہی تھی، کل اِس لڑکی کی گمشدگی کی رپورٹ تھانے میں بھی لکھی جا چکی تھی۔ لیکن راگنی

کے سورس کی وجہ سے کوئی بھی کارروائی دو دن کے لیے روک دی گئی تھی۔
''اوہ میرے خدایا! یہ تو پشاور جارہے ہیں۔'' تین گھنٹوں کی مسلسل مسافت کے بعد طارق کو اندا[زہ] ہوگیا تھا یعنی لڑکی آگے علاقہ غیر تک لے جائی جائے گی۔ وہ بے حد ذہین آدمی تھا۔ بہت ساری با[تیں] اُسے وقت سے پہلے معلوم ہوجاتی تھیں۔
اُن لوگوں نے موٹروے وغیرہ پر چڑھنے کی کوشش نہ کی تھی بلکہ دوسرے راستوں سے جایا جارہا تھا۔
''یار! اگر یہ پشاور کی طرف جارہے ہیں تو کسی بھی پَل ہمارے ہاتھوں سے نکل سکتے ہیں۔'' طار[ق] نے وائرلیس پر آصف سے مشاورت کی۔
''سر! پشاور پولیس سے مدد لی جاسکتی ہے۔'' آصف نے کہا۔
''کمال ہے یار! ڈائریکٹر صاحب کی پرمیشن کے بغیر میں نکلا ہوں۔ اُن کا کہنا ہے کہ میں اُن کی لم[بی] کے کمانڈوز اُن کی اجازت کے بغیر کیوں استعمال کررہا ہوں۔ میرے ساتھ ساتھ تم لوگوں کی نوکری بھی جائے گی۔ اگر ڈائریکٹر صاحب نے کچھ عرصے تک آپریشن کی پابندی نہ لگائی ہوتی تو اِس لڑکی کو ہم ا[پنے] ہی علاقے میں بازیاب کروالیتے لیکن اب مسئلہ۔ باقاعدہ مسئلہ ہے۔'' طارق نے ماتھے پر بَل ڈال [کر] سامنے جاتی گاڑی کو دیکھتے ہوئے کہا جو تیزی سے بھاگے ہی جارہی تھی۔
''تو پھر سر آپ کیا کریں گے؟'' آصف نے پوچھا۔
''اُن کو میں روکوں گا اور تم لوگ صرف مجھے کور کروگے فرنٹ پہ نہیں آؤ گے چاہے کچھ بھی ہو!'' طار[ق] نے سختی سے حکم دیا۔
''کیوں سر! کیا اجرنیکی کے صرف آپ حق دار ہیں۔'' رانا جواد کی آواز وائرلیس سیٹ پر اُبھری۔
''رات کو جگا کر گھر کے دروازے پر بلا کر آپ اِس لیے لے کر گئے تھے کہ ہمیں چوہوں کی طر[ح] چھپے رہنے کا حکم دیں اور خود شیروں کی طرح موت کے منہ میں جا گھسیں۔'' رانا جواد نے سلگتے ہوئے کہا وہ کسی طور طارق کو اکیلے آگے بڑھنے نہ دینا چاہ رہا تھا، اس لیے وہ لڑنے پہ اُتر آیا تھا۔
''پاگل نہ بنو! میں تم لوگوں کو کیسے مرنے کے لیے آگے کردوں، اُن کے پاس جدید اسلحہ ہے، وہ تعدا[د] میں ہم سے زیادہ ہیں جتنا میں نے کہا اتنا کرو۔ اٹس مائی آرڈر!'' طارق نے سختی سے کہا جواباً دوسر[ی] جانب مکمل خاموشی تھی۔
عظمیٰ چپ چاپ بے حد خاموشی سے بیٹھی تھی۔
مارک نے کتنی ہی بار پیچھے مڑ کر حیرت سے اُس لڑکی کو دیکھا، جو بلا چون و چرا بیٹھی تھی ورنہ تو لڑکیا[ں] اتنی مزاحمت کرتی تھیں کہ اُن کو لڑکی ہمیشہ بے ہوش کرنی پڑتی تھی۔
''یہ اتنی چپ اور مطمئن کیوں ہے؟'' عظمیٰ کا اتنا نارمل نظر آنا مارک کو ایب نارمل لگ رہا تھا۔
عظمیٰ نے ہاتھ میں ترنم کا دیا خط مضبوطی سے تھام رکھا تھا، یہاں تک کہ کاغذ اُس کے ہاتھ کے پ[سینے] سے گیلا ہونے لگا تھا لیکن اُس نے بے حد مضبوطی سے تھام رکھا تھا جیسے سہارے کے لیے رسی کو تھاما [جاتا] ہے۔
''اگر ترنم باجی نے کسی کو مجھے بچانے کے لیے نہ بھیجا تو میں گاڑی سے کود جاؤں گی لیکن اِس گندگی [میں]

[ک]ول میں نہ اُتروں گی۔'' وہ مسلسل دل ہی دل میں آیت الکرسی کا ورد کررہی تھی۔
''یا اللہ میری مدد کر! میں ہر مشکل و تکالیف سے تیری پناہ چاہتی ہوں۔'' عظمیٰ نے صدق دِل سے دُعا [ما]نگی۔
اسی پَل جانے کیا ہوا کہ گاڑی ہچکولے کھاتی رُکی ساتھ ہی فائرنگ شروع ہوگئی۔ عظمیٰ نے سختی سے [آنکھ]یں بند کرلی تھیں۔
''کیا.. کیا موت سر پر کھڑی ہے؟'' اُس نے خود سے سوال کیا اور فوراً کلمہ پڑھنا شروع کردیا۔
گاڑی میں موجود مارک کے ساتھیوں نے جوابی فائرنگ شروع کردی تھی۔ پھر وہ لوگ گاڑی سے اُتر [ک]رنے لگے۔ عظمیٰ کو جب احساس ہوا کہ وہ گاڑی میں اکیلی رہ گئی ہے تو اُس نے فیصلہ کرنے میں [ا]یک پل بھی نہیں لگایا۔
دونوں جانب شدید فائرنگ ہورہی تھی اور وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔
''اوہ شٹ!'' آصف نے لڑکی کو گاڑی سے باہر نکلتے اور طارق کو لڑکی کو بچانے کے لیے آگے بڑھتے [دیکھ]کر غصّے و بے بسی سے کہا۔
''نو سر! پلیز سر آگے نہ بڑھیں۔'' آصف نے فائرنگ کا جواب مسلسل دیتے ہوئے دِل ہی دِل میں [ط]ارق کو مخاطب کیا۔ اُس کا بس نہ چل رہا تھا کہ کسی بھی طرح طارق کو روک لے۔
''سر!'' رانا جواد ایک دم چیخا تھا۔
اگلے ہی پَل طارق کی کمر کو چیرتی گولیاں خون کے فوارے پھوڑتی نکل گئی تھیں، اُس نے لڑکی کو [بچ]انے کے لیے ایسا کیا تھا۔ وہ لڑکی کے سامنے آ گیا تھا۔
آصف اور جواد دونوں نے جنونیوں کی طرح مارک اور اُس کے ساتھیوں پر حملہ کیا۔ اسکے سارے [س]اتھی ایک ایک کرکے ختم ہوگئے تھے۔ مارک نے بھاگنے سے پہلے غصّے سے طارق کو زمین پہ گرتے [دیک]ھا۔
''اگر تم زندہ بچ گئے تو میرے بدلے سے کبھی نہ بچ پاؤ گے تم نے مارک سے پنگا لیا ہے۔'' وہ غصّے [س]ے بل کھاتا وہاں سے نکلا۔
آصف اور جواد دونوں تیزی سے آگے بڑھے۔
''سر! سر!'' آصف چیخ چیخ کر طارق کو پکار رہا تھا۔
طارق کی ڈوبتی سانسیں آصف کو پاگل کررہی تھیں۔
''پلیز سر اُٹھیں۔ میں آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔'' رانا جواد نے طارق کو کندھوں پر ڈال کر اٹھالیا۔
''آصف!'' رانا جواد نے مڑ کر آصف کو پکارا، جو زمین پر گھٹنے ٹیکے رو رہا تھا۔
''لڑکی کو گاڑی میں ڈالو اور فوراً چلو سر کو ہسپتال لے جانا ہے۔'' رانا جواد نے آصف کا انتظار کیے بغیر [ط]ارق کو طارق کی گاڑی میں ڈالا اور تیزی سے گاڑی بھگا لے گیا تو آصف کو ایک دم سے ہوش آیا اُس [ک]ے پاس پڑی لڑکی کو دیکھا، جو شاید خوف سے بے ہوش ہوگئی تھی۔

آصف نے لڑکی کو کندھوں پر ڈالا اور منہ سے آنسو صاف کرتا ہوا گاڑی کی جانب بڑھا...

''طارق سر! یہ کہاں کی دوستی ہے۔خبردار جو آپ ہم کو چھوڑ کر گئے۔'' آصف نے اپنے روانی سے آنسوؤں کے ساتھ دِل ہی دِل میں طارق کو مخاطب کر کے کہا اور گاڑی جواد کی گاڑی کے پیچھے لگا دی۔ تیزی سے ہسپتال لے کر جا رہا تھا۔ طارق کی سانسیں ڈوبتے ڈوبتے بے حد مدھم ہوتی جا رہی تھیں۔ طارق کی سانسیں مدھم ہو رہی تھیں، جواد اُس سے زیادہ گاڑی کی رفتار بڑھا رہا تھا۔

موت زندگی کو پکڑنے کے لیے فاصلہ دھیرے دھیرے کم کرتی جا رہی تھی.....!!

❁

بعض لوگوں کے ساتھ انسان کا خون کا رشتہ نہیں ہوتا لیکن اُن پر جب جب تکلیف یا مصیبت آتی ہے ہمارا دل بُری طرح تڑپ اُٹھتا ہے، تب ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اُن کے ساتھ تو ہمارا دِل کا رشتہ ہے۔ یہ رشتہ بھی عجیب ہوتا ہے خونی رشتوں کی طرح ڈیمانڈنگ نہیں ہوتا یہ تو بنا کسی گلے شکوے کے بس بن جاتا ہے محبت، دوستی، قربانی جیسے لفظ اس رشتے کو مزید سینچتے ہیں۔ طارق نے بھی ہمیشہ دِل کے رشتے بنائے تھے، ان میں محبت، دوستی اور قربانی کی کھاد ڈالی تھی۔

رانا جواد بہت مضبوط اعصاب کا مالک تھا کبھی اُس کی آنکھوں سے آنسو نہ بہے تھے لیکن وہ اِس وقت آپریشن تھیٹر کے باہر کھڑا زار و قطار رو رہا تھا اور... اور جس شخص کے لیے وہ رو رہا تھا اس سے اُس کا کوئی نہیں دل کا ناتا تھا۔ طارق کا آپریشن شروع ہو چکا تھا۔ یہ سب اُس نے خود کیا تھا جب اے ٹی ایم سے پیسے نکلواتے وقت اُس کے ہاتھ بُری طرح کانپ رہے تھے تو اُسے احساس ہوا تھا کہ طارق کو کھونے کا ڈر اُسے اندر سے کمزور کر رہا ہے، اُس کو اچانک احساس ہوا کہ وہ طارق سے بے حد پیار کرتا ہے اور اب وہ کسی قریبی عزیز کی طرح باہر کھڑا آنسو بہا رہا تھا۔

''جواد! سر کے گھر اطلاع دے دیں۔'' افسردہ سے آصف نے قریب آ کر مشورہ لیا۔

''آں ہاں! دینی تو چاہیے۔'' جواد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

آپریشن اس قدر ارجنٹ تھا کہ اُن کو یاد ہی نہیں رہا کہ طارق کے گھر اطلاع کر دیں۔ پھر ضروری قانونی کارروائی، جس کو رانا جواد نے اپنے سورس سے فی الحال دبا لیا تھا۔ سول پولیس میں اُس کے کچھ دوست تھے جو آج کام آ گئے تھے۔

''سر! طارق کے سیل پہ گھر کے نام پہ دو نمبر ایڈ ہیں کس پہ انفارم کروں؟'' آصف نے فون انڈیکس کال کر دیکھا اور پھر رانا جواد سے مشورہ لیا۔

''دونوں پہ کر دو یار۔'' رانا جواد نے بے دلی سے جواب دیا۔ اُس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اس کا جواب دے رہی تھی۔

آصف نے دونوں نمبرز پر اطلاع کر دی تھی، یہ جانے بغیر کہ وہ اَن جانے میں ایسی جگہ اطلاع کر بیٹھا جو طارق کی زندگی کا ایک بہت بڑا راز تھی، جس کو طارق نے سات پردوں میں چھپا کر رکھا تھا لیکن اب.. آج اچانک کسی کی اَن جان غلطی سے طارق کا بھرم کھلنے جا رہا تھا۔

❖❖○❖❖

''تانیہ کو میں کیا جواب دوں گی کہ میں بچی کا خیال نہ کرسکی۔'' مرینہ آنٹی نے سحرش کے ہاتھ ا
رگڑتے ہوئے کہا۔

''کس کا فون تھا؟'' وہ ملازمہ سے پوچھ رہی تھیں۔

''پتا نہیں بیگم صیب! بی بی نے خود ہی سُنا تھا۔'' سحرش کے بے ہوش ہونے پر ملازمہ دوڑ کر سا والے گھر میں رہنے والی مرینہ آنٹی کو بلا لائی، جو اُن کے خاندان کی بڑی بزرگ بھی تھیں۔

''اچھا تم پہلے محمد حنیف سے کہو کہ ڈاکٹر کو گھر لے کر آئے، معلوم نہیں بچی کو کیا ہوا ہے۔'' مرینہ ا نے فکرمندی سے سحرش کو دیکھتے ہوئے کہا جو سرسوں کی طرح پیلی پڑ چکی تھی۔

''یا اللہ خیر کرنا۔'' وہ بے اختیار دعا گو ہوئیں۔

ڈاکٹر نے سحرش کو انجکشن دیا۔

''فکر کی بات نہیں، ابھی کچھ ہی دیر میں ہوش آجائے گا۔'' ڈاکٹر تسلی دے کر چلا گیا۔

ڈاکٹر کی تسلی پر مرینہ آنٹی کو کچھ تسلی ہوئی، ان کے اعصاب پرسکون ہوئے تو وہ کچھ سوچنے کے ا ہوئیں۔

• وہ فون کی جانب بڑھیں اور سی ایل آئی پر آئے نمبر کو نوٹ کر کے ڈائل کیا۔ آخری بار اسی نمبر سے ا آئی تھی، جس کو سن کر سحرش بے ہوش ہوگئی تھی۔

لیکن کچھ دیر بعد بھی ہاتھ پاؤں چھوڑے بیٹھی تھیں۔

طارق!! طارق زندگی اور موت میں جھول رہا تھا۔

سحرش کی زندگی کا سینٹر آف سرکل طارق ہی کی تو ذات تھی، جب اُس کی زندگی کا سینٹر آف سرکل اُس سے کھونے لگا تو وہ اِس کھونے کے ڈر کو فیس نہ کرسکی اور بے ہوش ہوگئی۔

''سحرش! میری جان اُٹھو!'' انہوں نے ہوش میں آتی سحرش کو الرٹ کیا۔

''آنٹی... آنٹی!'' سحرش سسکتے ہوئے اُٹھی۔

''میرے طارق کو کچھ ہوگیا نا تو میں جی نہ پاؤں گی... میں مرجاؤں گی۔'' سحرش اُن کی گود میں رکھے پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

''اللہ نے چاہا تو کچھ نہیں ہوگا۔'' مرینہ آنٹی نے خود بھی آنسو صاف کرتے ہوئے اُسے تسلی دی۔

''اللہ نے چاہا تو؟'' سحرش نے ایک دم بپھری ہوئی شیرنی کی طرح سر اُٹھا کر سوال کیا۔

''اور اگر میرا طارق چھین لیا تو؟'' سحرش سے بات مکمل نہ ہو رہی تھی، آنسوؤں کے گولے اُس گلے میں اٹک رہے تھے۔

''میرا تو پہلے ہی سب کچھ چھن گیا میری عزت، میرے خواب، میرا اُجلا پن، ڈیڈی، بھائی، مما دادو اور اِس معاشرے میں ایک باعزت مقام! اب میرے پاس صرف طارق ہیں۔'' سحرش نے کا مڑے ہاتھوں کے ساتھ پوچھا، وہ اِس وقت نارمل نہ تھی۔

''سحرش! خدا پر بھروسا کرو، اچھا گمان رکھو!'' مرینہ آنٹی نے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''آنٹی! مجھے کچھ نہیں چاہیے کوئی مال و دولت، کچھ نہیں، بس کوئی مجھ سے میرا طارق نہ چھنے۔''

لے مرینہ آنٹی کے ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''سحرش! ہوش کے ناخن لو، طارق کو اِس وقت تمہاری اور تمہاری دعاؤں کی ضرورت ہے۔'' مرینہ آنٹی نے اُسے جھٹک کر کہا۔

''دعا...؟''

''دعا! مگر میری دعا کیوں قبول نہیں ہوتی؟'' سحرش نے روٹھے ہوئے بچے کی طرح کہا۔

''تم!''

''تم!'' مرینہ آنٹی اُسے سمجھانے کے چکر میں پڑتے پڑتے رک گئیں۔

''اوکے۔'' انہوں نے طویل سانس بھر کر خود کو کمپوز کیا۔

''لیکن تمہارا تعلق طارق سے تو ہے نا! اور طارق کا اللہ سے بہت گہرا رشتہ ہے! تم جانتی ہو نا؟'' انہوں نے اُسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

''ہا۔ ہوں!!'' سحرش نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو پھر طارق کے لیے اللہ سے اُس کی زندگی مانگو۔'' مرینہ آنٹی نے بے حد ٹھوس لہجے میں کہا تو سحرش نے گم سم انداز میں انہیں دیکھا۔

''اللہ سے طارق کو مانگوں؟ لیکن کیسے؟'' بہت عرصہ ہوا اُس نے اپنی زندگی سے یہ تعلق یہ ناتا نکال باہر کیا تھا۔ اور آج!

سحرش کو ایک دم بہت ساری دھند اپنی آنکھوں کے سامنے چھائی محسوس ہوئی، چھن چھن کسی جھرنے کی طرح بہتی یہ آواز اُس کے دِل تک سنائی دی۔

''یہ کیسی آواز تھی؟'' سحرش نے غور سے سننے کی کوشش کی، جو اُسے اپنے ہی اندر سے آرہی تھی۔

میں ہوں!

میں تھا... میں ہوں! اور صرف میں رہوں گا!

ذات لافانی کی آواز وہ غور سے سن سکتی تھی، اُس کا پورا وجود لرزا۔

میں ہوں... میں ہوں! میں ہوں!

حجاب شب شب و تاب خواب رکھتا ہے
درون خواب ہزار آفتاب رکھتا ہے
کبھی خزاں میں کھلاتا ہے رنگ رنگ کے پھول
کبھی بہار کو بے آب و رنگ رکھتا ہے
کبھی زمین کا منصب بلند کرتا ہے
کبھی اسی پر بنائے عذاب رکھتا ہے
کبھی یہ کہتا ہے سورج ہے روشنی نہ گواہ
کبھی اسی پہ دلیل حجاب رکھتا ہے
کبھی فغاں کی طرح رائیگاں اثاثہ حرف

کبھی دعا کی طرح مُستجاب رکھتا ہے
میں صابروں کے قبیلے سے ہوں مگر میرا ربّ
وہ محتسب ہے کہ سارے حساب رکھتا ہے
میں ہوں، میں ہوں!!
ظاہر باطن۔ اندر باہر۔ زمین آسمان...
میں... بس میں ہوں!

دُھند چھٹ رہی تھی، ایک دم روشنی کا جھما کا سامنے آیا اِس بار سحرش نے آنکھیں بند کی تھیں لیکن اُر کے دِل کی آنکھیں کھل چکی تھیں اور وہ سجدے میں ایک دم گر گئی تھی۔

❖❖○❖❖

''ماہی! یہ سب کیا ہے؟'' ترنم نے دِل ہی دِل میں اُس سے سوال کیا۔

گئے دِنوں میں ماہی کا بدلا ہوا رویّہ ترنم کو حیران کرتا آیا تھا۔ وہ طوائف زادی تھی اور اُسے اپنی زندگی سے کوئی شکوہ نہ رہا تھا، پیسے اور دوستی کے علاوہ اُس نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی ٹارگٹ نہ رکھا تھا، لیکن میڈم چاندنی کی اِس طرح اچانک کے موت کے بعد وہ مکمل طور پر بدل گئی تھی شروع میں یہ احساس نمایاں نہ تھا لیکن اب ترنم واضح طور پر اِس احساس کو محسوس کرسکتی تھی، آج ہر طرح کی دھند چھٹ گئی تھی

ماہی کب واپسی کے راستے پر چل پڑی، ترنم کو احساس تک نہ ہوسکا۔

''یہ سب کیا ہے؟'' ترنم نے جائے نماز پر کھڑی ماہی سے دریافت کیا۔

ماہی کھڑے سے وہیں جائے نماز پر بیٹھ گئی۔

''ایسی بھی کوئی انہونی نہیں ہے!'' ماہی ایک دم ہنس دی اور ہنستے ہنستے ایک دم رو پڑی۔

''مانتی ہوں کہ میں بہت گناہ گار ہوں، بہت سیاہ کار ہوں! لیکن وہ اکثر تم ہی تو سنایا کرتی تھیں مجھے۔'' ماہی نے کچھ رک کر ترنم کو دیکھا۔

اِنَّ وَعْدَاللہ حقٌّ!

سچے لوگ ہمیشہ سے کہتے آئے ہیں سب تعریفیں اس کے لیے ہیں، جو فشارِ عزائم ہے اور جو کشادہ ارادہ ہے۔

میرے حضور ﷺ سے مرے خدا کا وعدہ ہے۔
خیر کے گھر میں جتنے دروازے کھلتے ہیں۔
اُن میں ایک توبہ کا بھی دروازہ ہے۔
اشک ندامت اپنی جگہ پر آپ بڑا خمیازہ ہے۔
مرے حضور سے مرے خدا کا وعدہ ہے!''

ماہی ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رودی! چاند چہرہ اُس نے ہتھیلیوں میں چھپا رکھا تھا۔ ترنم اُسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

''ماہی! یہ سب کب؟ کیسے ہوا؟ کیا میں اِس قابل نہ تھی کہ تمہاری رازداں ہونے، تمہارے بوجھ

کی حصے دار بن سکتی؟'' ترنم نے اِس کے ہاتھ اُس کے چہرے سے ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

آنسوؤں سے اُس کی ہتھیلیاں تک گیلی تھیں۔

''نہیں! ایسا نہ کہو! تم نہیں جانتیں، تم ہی کو دیکھ کر میرے اندر اس برائی سے چھٹکارے کی ہمت جاگی تھی۔'' ماہی نے نم آنکھوں اور نم لہجے میں جواب دیا۔

''لیکن میں تم کو کیا بتاتی؟ میرے اندر شرمندگی اِس قدر تھی کہ اُس کے بوجھ تلے میری روح اور زبان دبی ہوئی ہے میں تم سے، اپنی سہیلی تک سے کہہ نہ پائی کہ مجھے اپنے کیے پر شرم ساری ہے!''

''کس زبان سے کہتی، کس منہ سے کہتی؟ تیری واپسی اور توبہ کا میں نے کتنا مذاق بنایا تھا نا!'' ماہی نے کھوئے کھوئے لہجے میں جواب دیا۔

''ماہی!'' ترنم نے بے حد خوشی سے اُسے گلے لگالیا۔

''مبارک ہو!'' ترنم اُسے مبارک باد دے رہی تھی۔

''یہ زندگی عمل اور اَجر کمانے کی جگہ ہے، یہاں کی گئی ندامت اور توبہ کا بڑا درجہ ہے، اُس دنیا میں تو ...ل جواب دہی ہوتی ہے۔ مبارک ہو تم کو اللہ سوہنے نے مہلت دی کہ تم توبہ کرسکو، غلط اور درست کو ...ان سکو۔'' ترنم نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''تم جانتی ہو میں خود دھوپ چھاؤں کی کیفیت میں رہتی ہوں کبھی کبھی میرے سیاہ اعمال مجھے اتنا ...لدہ کرتے ہیں کہ میری شرم ساری بھی اُن کے آگے کم پڑ جاتی ہے اور میں عجیب یاسیت میں گھری ...ل ہوں، لیکن پھر مجھے اللہ کی بڑائی یاد آتی ہے، اُس کا رحمان ہونا یاد آتا ہے تو میں پھر سے اطاعت ...ار ہو کر کفارے کی جانب لگ جاتی ہوں اور آج تمہارا یہ جملہ تم نہیں جانتی کتنا بھاری اور قیمتی ہے ...ے لیے کہ ''تم کو واپسی کی ہمت میری وجہ سے ہوئی۔'' اللہ تیرا شکر ہے میں مثالِ عبرت کے بجائے ...ل خیر کی حصے دار ہوگئی، اللہ تیرا شکر ہے۔'' ترنم زار و قطار رو رہی تھی۔ یہ آنسو خوشی کے تھے، بے شک ...لہ ابھی بنا نہیں تھا لیکن اُس کی شروعات ہوچکی تھی۔ ترنم کو یہ جنگ لڑنے کے لیے ایک ساتھی مل گیا ...ا

''ترنم! کیا میری توبہ قبول ہوگی؟ دراصل آخری وقت پہ توبہ کا اسٹیٹس بھی تو کم ہوجاتا ہے، ایسا میں ...سنا ہے۔'' ماہی نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

''ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟'' ترنم نے فکرمندی سے کہا۔

''اور آخری وقت کا کیا مطلب ہے، آخری وقت تو مرنے والے کا ہوتا ہے اور جب تک موت نہیں ...ی توبہ کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔'' ترنم نے ٹھہر ٹھہر کر جواب دیا۔

''موت! موت ہی تو سر پہ کھڑی ہے۔'' ماہی کی سہمی سہمی آواز کسی کنویں سے سنائی دی۔

''مطلب؟'' ترنم نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''مطلب؟'' ماہی ٹوٹے کانچ جیسی ہنسی ہنسی، اُس نے جائے نماز کو لپیٹا اور الماری میں رکھ دیا اور ...ماری کا پٹ بند کر کے اُس کے ساتھ ٹیک لگا کر چپ چاپ کھڑی ہوگئی، جیسے بات کرنے کے لیے تمہید ...دہ رہی ہو۔ پھر وہ ایک دم الماری سے گھسٹتی ہوئی نیچے بیٹھ گئی۔

’’کتنی نادان تھی نا میں، کبھی سوچا ہی نہیں کہ میں جو یہ زندگی جیے جا رہی ہوں، کبھی ختم بھی ہوگی!‘‘ ماہی نے اپنے بے حد حسین ہاتھوں کو گھورتے ہوئے کہا۔

’’لیکن پھر ایک دِن مجھے نہ صرف احساس ہوا بلکہ مجھے یہاں سے نکلنے کی تاریخ بھی مل گئی۔‘‘ بات کرتے کرتے چپ ہوگئی۔ اُس کے گلے میں آنسوؤں کے پھندے لگ رہے تھے۔ ترنم آنکھیں پھاڑے، سانس روکے اُس کا انکشاف سن رہی تھی۔

’’مجھے۔ مجھے!!‘‘ ماہی نے تھوک سے حلق تر کرتے ہوئے بولنے کی کوشش کی۔

’’مجھے۔ مجھے ایڈز ہے!‘‘ وہ پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

’’کیا؟‘‘ ترنم کے لب پھڑ پھڑائے، ایک بم تھا، جو عین اس کے سر پر پھٹا۔

’’میرے اللہ!‘‘ ترنم کو اپنے دل میں بے حد درد محسوس ہوا۔ سامنے بیٹھی لڑکی رو رو کر پانی ہوئی جا رہی تھی، ترنم کو ایک تلخ حقیقت کا احساس بے اختیار ہوا تھا۔ وہ لڑکی بہت جلد ہاتھوں سے پھسل کر نکلنے والی بھی تھی۔

❖❖○❖❖

میں اپنی بند آنکھوں سے
تمہارے پرسکون جیون کا
سپنا دیکھتی ہوں
کھلی آنکھوں سے ہر پَل میں
تمہارے واسطے خوشیوں کی برکھا مانگتی ہوں
میں چاہتی ہوں کہ
اِس دنیا کے سارے شبنمی رنگ
جو میری دسترس میں ہیں تمہیں دے دوں
وہ سارے خیال جو کہ تم!
تصور میں پروتے ہو
میں اُن میں آ کے چپکے سے
حقیقت کی دھنک بھر دوں

ولی کتنی ہی دیر سے کاغذ تھامے مسکرا رہا تھا۔ عبداللہ نے کچن کی کھڑکی، جو لاؤنج میں کھلتی تھی کتنی ہی بار جھانک کر ولی کے پوز کو دیکھا، جو اُس کی پُرتجسس طبیعت کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

’’بڑے بھائی! کیا خوشی سے سکتہ ہوگیا ہے۔ اگر بھابی کا لیٹر اتنا پُر اثر ہے تو وہ خود تو خوب تباہی شباہی کر ڈالتی ہوں گی۔‘‘ عبداللہ نے شرارت سے کہا۔

’’یہ تباہی شباہی کیا بلا ہے؟‘‘ ولی نے مسکراتے ہوئے پوچھا اور خط تہہ کر کے اپنی ڈائری میں رکھ دیا۔ یہ علیزے کی جانب سے پہلی بار کوئی اظہار تھا، ولی کو حقیقتاً بہت مزا آیا تھا۔ جن سے آپ پیار کرتے ہوں، اُن کا اظہار بھی بہت پیارا ہوتا ہے، عزیز ہوتا ہے۔

’’یہ پیارے پیارے لوگ عموماً بلکہ پیاری پیاری ایشین کڑیاں ہم بے چارے لڑکوں کے دلوں میں جو ادھم مچاتی ہیں۔‘‘ عبداللہ نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ اُس کے چہرے کے جو تاثرات تھے، عبدالولی کی ہنسی بے اختیار تھی۔

’’تم کو بڑا تجربہ ہے ایشین لڑکیوں کا؟‘‘ ولی نے پوچھا۔

’’بالکل! دو عدد ٹیاریں تو میرے اپنے گھر میں موجود ہیں۔‘‘ عبداللہ کا اشارہ اپنی بہن اور امی کی جانب تھا۔

ولی نے یوں سر ہلایا، جیسے وہ کبھی نہیں سُدھر سکتا، عبداللہ نے بربڑ دھیما کیا اور بُرے بُرے منہ بناتا باہر نکلا۔

’’بڑے بھائی! یہ اُبلی ہوئی سبزیاں کھا کھا کر میرا کباڑا ہوگیا ہے۔‘‘ ولی عموماً مکس سبزیوں کا پیکٹ لے آتا تھا جس میں سیلری، مٹر، گاجر، گوبھی، آلو، مکئی وغیرہ ریڈی کر کے پیک کی ہوتی تھیں، جنہیں تھوڑے سے پانی سے نکال کر وہ ہلکی سی اسٹیم پر رکھ دیتا جو آدھے گھنٹے بعد گل جاتی تھیں، جس کو وہ کالی مرچ اور ہلکا سا نمک ڈال کر کھاتے تھے۔

عبدالولی تو بہت رغبت سے یہ اُبلی سبزیاں کھالیتا تھا کیوں کہ ریڈی فوڈز میں ہر چیز میں حرام چیز کا گوشت یا آئل استعمال ہوتا تھا اس لیے وہ زیادہ سے زیادہ سبزیاں اور چکن استعمال کرتا تھا، وہ گھر میں کھانا بھی اسی وجہ سے زیادہ بناتا تھا تاکہ ہر طرح کے رسک سے بچا جاسکے۔

’’بڑے بھائی! پلیز اِس کھانے سے میری جان صرف آج کے دن کے لیے چھڑوادیں، آج کچھ باہر کھاتے ہیں۔‘‘ عبداللہ بچوں کی طرح منمنایا۔

’’عبداللہ! ہم نے رات بھی باہر کھانا کھایا تھا۔‘‘ ولی نے اُسے کچھ یاد کروانے کی کوشش کی۔

’’رات بھی گزر گئی اور کھانا بھی ہضم ہوگیا پھر کھانے پینے کی باتیں کون یاد رکھتا ہے۔‘‘ عبداللہ نے نہایت معصومیت سے کہا۔ اُس کی یہی معصومیت اور سادہ شفاف مسکراہٹ عبدالولی کو مجبور کردیتی تھی کہ وہ اس کی مدد کرے، اُس کا کہا مان لے۔

’’یار کھانا تو تقریباً ریڈی ہے نا۔‘‘ ولی نے ایک اور عذر تراشا۔

’’کم آن بڑے بھائی! یہ غذا کون سا آپ نے پھر کبھی نہیں پکانی، اگلے ڈنر میں کام آجائے گی۔ بس آپ جھٹ پٹ تیار ہوجائیں۔‘‘ عبداللہ فوراً ریڈی ہوگیا۔

’’اوکے! تم جیتے میں ہارا! ویسے تم ہو بہت ضدی۔‘‘ ولی نے اپنی لیدر کی جیکٹ اُٹھاتے ہوئے کہا۔

’’بالکل جناب! میں اِس بات کو تسلیم کرتا ہوں لیکن میری نظر میں یہ کوئی خرابی والی بات نہیں بلکہ میں تو اسے سراسر خوبی مانتا ہوں، بھئی جو عادت آپ کو کچھ حاصل کروادے تو وہ فائدہ مند ہی ہوئی نا، میرے ابا کہتے ہیں کہ ضدی لوگ ہی دنیا میں کچھ کرسکتے ہیں، کچھ پاسکتے ہیں، کامیابی حاصل کرنے کے لیے ضد اور جنون کا ہونا ضروری ہے، اب دیکھیں نا بڑے بڑے اسکالر ضد کو **Passion** کا نام دے کر آنز دیتے ہیں اور جنون کو **Detemination** کا نام دے دیا ہے پھر یہ ہی **Passion** اور **Determination** ہی تو عام انسان کو کام یاب انسان میں بدل دیتے، ہیں اس لیے بڑے بھائی میرا

خیال ہے کہ میری یہ عادت واقعی بہت بڑی خوبی ہے۔'' عبداللہ نے سنجیدہ بات کرتے کرتے آخر م فرضی کالر شرارت سے جھاڑتے ہوئے کہا تو عبدالولی نے بے حد میٹھی نظر سے اُسے دیکھا۔

وہ بہت ذہین اور شرارتی تھا لیکن اِن سب سے بڑھ کر وہ بہت مخلص اور وفادار انسان تھا۔

''کمال ہے! مجھے یقین نہیں آرہا کہ یہ تم ہو جو اتنی بڑی بڑی باتیں کررہے ہو۔'' عبدالولی نے اپ جاگرز کے تسمے کستے ہوئے کہا۔

''ارے جناب! اگر آپ بھی کچھ دن میرے پاپا کے ساتھ رہ لیں تو ضرور اسکالر بن جائیں گے، پاپا ہمیشہ چھوٹی، مختصر لیکن بہت گہری باتیں کرتے ہیں۔'' عبداللہ اپنے پاپا کا ذکر کررہا تھا تو اُس کے چہرے پر خاص طرح کی خوشی اور جوش تھا، آنکھوں میں بے حد چمک تھی۔

ولی نے دِل چسپی سے اُسے دیکھا۔

''آپ کو معلوم ہے میں نے پاپا سے ایک بار پوچھا کہ آپ اتنی عام سی باتوں میں بھی اتنے گہرے رزلٹ کیسے نکال لیتے ہیں تو وہ بولے جن کے دِل پر کوئی بہت گہرا گھاؤ لگا ہو تو وہ ساری زندگی کوئی عام سی بات نہیں کرپاتے کیوں کہ دل کی چوٹ، دل کا درد عجیب قسم کی قوت رکھتا ہے دیوار پار کیا ہورہا ہے ہمیشہ دکھا دیتا ہے، مجھے اُن کی یہ بات کبھی نہیں بھولی۔ ہے نا عجیب بات!'' عبداللہ نے ولی سے پوچھا تو وہ جو عبداللہ کی گفتگو میں اِس قدر محو ہو گیا تھا، ایک دم چونکا۔

جانے کیوں، جانے کیوں اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک چہرہ لہرایا تھا شکوہ کرتا، اُداس آنکھیں لیے! وہ بھی تو کہتی تھی نا کہ دِل کا گھاؤ بہت گہرا ہوتا ہے، کبھی نہیں بھرتا ساری عمر بس رستا ہی رہتا ہے، درد ہی دیتا رہتا ہے۔

یہ چہرہ مسکان کا تھا۔

عبدالولی حیران تھا کہ اُسے اِس پل اچانک وہ کیسے یاد آگئی... لیکن وہ نہ جانتا تھا کہ جب ہم کسی کو بہت شدت سے سوچتے ہیں، یاد کرتے ہیں تو وہ چاہے سمندر پار موجود ہو، ہماری شدت کی یاد ہمیشہ کرنٹ رکھتی ہے۔ دوسرے تک ضرور اپنا احساس چھوڑ کر جاتی ہے۔

لاکھوں میلوں دور اُسے بھی کوئی سوچ رہا تھا بہت شدت سے، بہت تڑپ سے... پھر یہ کیسے نہ ہوتا کہ وہ اپنا اثر ولی تک نہ پہنچا سکتی۔

''کدھر غائب ہو جاتے ہیں آپ؟'' عبداللہ نے ولی کے سامنے ہاتھ لہرا کر پوچھا۔

''آں ہاں! یار کہیں نہیں!'' ولی نے اُسے ٹالا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ لیکن وہ نہ جانتا تھا کہ بعض لوگ جن کو ہم اپنی زندگی میں کوئی حصہ نہیں دیتے لیکن وہ اپنی قسمت کی وجہ سے ہماری زندگیوں کا حصہ بن جاتے ہیں۔

❖❖○❖❖

دِل کے آئینے میں اُترا تھا ترا عکس
تو پھر!
آئینہ ٹوٹا کیوں

اب نہ آئینہ ہے باقی، نہ ترا عکس نہ بہلاوا کوئی
رات، دن بہتے رہے
میری رگوں میں پھیلے سرخ قطروں کی طرح
شام و سحر اُڑتے رہے
بے نیازی کے بیابان میں ذرّوں کی طرح
تو کہاں ہے، میں کہاں
صرف پرچھائیاں ہیں
اور ہے یادوں کا دھواں

''ڈاکٹر! مسکان کب تک ٹھیک ہو جائے گی؟'' سمعان نے ماتھا مسلتے ہوئے پوچھا۔

لڑکی جس نے اُس کے دِل کو دھڑکایا، تھا اب ہڈیوں کا ڈھانچا بن کر رہ گئی تھی، پہلے وہ گھنٹوں سوئی تھی اب وہ سوتی تو اتنا نہ تھی لیکن پوری طرح جاگی بھی نہ تھی، یوں جیسے وہ کسی چیز کسی چہرے، کسی ت سے دلچسپی نہ رکھتی ہو۔

''آپ دیکھ رہے ہیں پہلے سے کافی بہتر ہے لیکن وہ جان بوجھ کر اپنی بہتری بتانا اور دکھانا نہیں تی۔'' ڈاکٹر زبیر نے پرسوچ انداز میں جواب دیا۔

''یہ آپ! یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' سمعان نے حیرت سے پوچھا۔

''ائی سَن! آئی ایم ماہر ڈاکٹر! تم یہ کیوں بھول رہے ہو، ایک ڈاکٹر ہی ہوتا ہے جو مریض کے اندر والے ہر سگنل اور ٹریکس کو ریسیو کرسکتا ہے۔'' ڈاکٹر زبیر نے دھیمی مسکراہٹ سے سمعان کو دیکھتے ے کہا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر؟'' سمعان کے پلے تو کچھ نہ پڑا تھا۔

''او کے! آئی دِل شو یو دن تھنگ۔'' ڈاکٹر زبیر نے دراز سے ایک کاغذ نکال کر سمعان کے سامنے ہوئے کہا۔

ال آتا ہے
اتوں سے، نیندوں سے، خوابوں سے
ایسی اندھیری ہوئی جارہی ہیں
ایسی خوابوں میں آکے ڈراتی ہیں
دوں میں آرام جاں اب نہیں
اب آور دواؤں کی تلخی گھلی ہے
ی نیند سے لطف کیف واماں
رے خوابوں کی سرگوشیوں سے
ری کہکشاں لے گیا کون
لو، دیے، شمعیں چاند اور تارے

کہاں چھپ گئے
رات کیوں کر بھیانک ہوئی
دن میں سورج بھی اب
روشنی کے بجائے محض آگ برساتا ہے
دِل میں بس خودکشی کا خیال آتا ہے
دل میں بس خودکشی کا خیال آتا ہے۔

سمعان نے حیرت وسوال بھری نظروں سے ڈاکٹر اکرم زبیر کو دیکھا۔

''یہ؟''سمعان بس اتنا ہی کہہ سکا۔

''جی ہاں! یہ مسکان نے ہی لکھا ہے اُسی کی ہینڈ رائٹنگ ہے ہم نے کنفرم کروالیا ہے۔ دراصل ہم نے مسکان کے کمرے میں اسکیچ بک، پنسل، کلرز اور کچھ کاغذ وغیرہ رکھوائے تھے۔ ایک عام آدمی زندگی میں اتنا Expressionist نہیں ہوتا جتنا کہ ایک آرٹسٹ! وہ چھوٹی سی چھوٹی بات کو لے بہت حساس ہوتا ہے اپنے احساسات کو فل Expressions کے ساتھ رنگوں کی صورت میں بورا اُتارتا ہے، اسی طرح ایک رائٹر کاغذ قلم سے کبھی دور نہیں رہ سکتا۔ مسکان کی ہسٹری کی Study دوران مجھے معلوم ہوا کہ وہ ڈائری بہت شوق سے لکھتی تھی، میں نے بہت خوب صورت دو عدد ڈائریا وہاں رکھوائی تھیں۔ شروع کے ایک ہفتے ہمیں کوئی نتیجہ نہ ملا، صفر رزلٹ تھا۔'' ڈاکٹر زبیر نے گہ سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''لیکن ابھی کچھ دن پہلے سسٹر ماریہ نے مجھے اُن دو ڈائریوں میں سے ایک ڈائری لا کر دی، تم یقی نہیں کرو گے میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، مسکان نے یہ تحریر کاغذ پر لکھی تھی یعنی ہم اُس کا جمود توڑ میں کام یاب ہو چکے تھے، دیوار سے پہلا پتھر ہی نکلنا مشکل ہوتا ہے لیکن بعد کا کام آسان ہو جاتا ہے مشکل مرحلے سے نکل آئے ہیں۔'' ڈاکٹر اکرم زبیر نے خوشی سے کہا۔

''لیکن ڈاکٹر! وہ جو مسکان کا گھنٹوں ایک ہی جگہ دیکھنا اور بیٹھے رہنا، کسی سے بات نہ کرنا، وہ ہے؟''سمعان نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ ابھی دوسروں کو کیا خود کو بھی یہ میسج نہیں کرنا چاہتی کہ اُس کے گرد کا جمود ٹوٹ رہا ہے۔'' ڈا اکرم زبیر چیئر گھما کر کھڑکی کے پاس آ گئے۔

''یہ شیشے کی کھڑکی دیکھ رہے ہو تم؟''انہوں نے کھڑکی پر لگے ہوئے شیشے کی جانب اشارہ کر ہوئے پوچھا۔

''جی۔''سمعان نے مختصراً جواب دیا۔

''شیشے دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک جس کے پیچھے پارہ لگا ہوتا ہے اور وہ دوسری جانب کا عکس دیتا ہے، یوں وہ آئینہ بن جاتا ہے جب ہم آئینے میں دیکھتے ہیں تو ہمیں صرف اور صرف اپنا عکس آتا ہے اپنی ذات، اپنا چہرہ اور اپنا وجود! اور بس!'' وہ کچھ دیر کو رُکے، جیسے وہ مسکان کی ذہنی کیفی مکمل طور پر خود یہ محسوس کر رہے ہوں۔

''اور دوسرا شیشہ جیسے یہ ونڈو گلاس ہے صاف شفاف دونوں جانب سے سادہ! اِس لیے ہم اِس کے وجود منظر دیکھ سکتے ہیں، اپنی ذات سے ہٹ کر دوسروں کو دیکھ سکتے ہیں اِس شیشے میں صرف ہمیں اپنا ں نہیں نظر آتا بلکہ دوسروں کا وجود بھی نظر آتا ہے، کیوں؟'' انہوں نے ایک دم سمعان سے سوال کیا۔

''اِس لیے کہ ایک آئینے کی پشت کوٹیڈ ہے اور وہ صرف اور صرف ہمیں ہمارا ہی عکس دکھاتا ہے، جب وسرا شفاف ہے۔''سمعان نے کہا۔

''بالکل! کچھ یہی کیفیت مسکان کی ہے، اُس کا دماغ شفاف نہیں ہے اس لیے ابھی وہ اپنے ہی عکس ں اُلجھی ہوئی ہے، اُسے ہر جانب صرف اپنا آپ نظر آ رہا ہے اِس کے علاوہ کچھ اور دیکھ نہیں پا رہی وہ دیکھ بھی نہیں سکتی، یہ اُس کی مجبوری نہیں بلکہ بے بسی ہے۔ ہمیں آج نہیں تو کل انشاء اللہ ضرور م یابی ملے گی کہ ہم اُس کے آئینے کو شفاف کر سکیں تاکہ وہ اپنے اِرد گرد کے منظر کو دیکھ سکے محسوس رسکے، یہی وہ وقت ہوگا، جب وہ دوبارہ زندگی میں حصہ لے پائے گی۔'' ڈاکٹر اکرم زبیر نے ہر بات کو ھول کر بہت تفصیل سے بیان کر دیا تھا۔

''اور اِس میں کتنا وقت لگ سکتا ہے؟''سمعان نے پُرامید ہو کر پوچھا۔

''یہ تو اللہ کی ذات جانتی ہے، ہوسکتا ہے بہت جلد وہ نارمل ہو جائے لیکن اُسے نارمل ہونے کے لیے لوگوں کا اعتبار دوبارہ چاہیے ہوگا، جن کو وہ سینٹر آف لائف سمجھتی تھی۔''

''کون دو لوگ؟''سمعان نے پوچھا۔

''ایک اُس کا باپ، جو اُسے ہتھیلی کے چھالے کی طرح سنبھال کر رکھتا تھا، اُسے دوبارہ اپروو کرنا ہوگا وہ قابلِ اعتبار ہے اپنی محبت، توجہ اور اپنے نرم رویے کے ذریعے۔''

''اور دوسرا کون ہے؟''سمعان نے پوچھا۔

''عبدالولی! اُس کا پہلا اور آخری پیار! جس کے لیے وہ اپنی قسمت سے لڑ بیٹھی، ہر وہ چیز، ہر وہ ری قبول کرنے سے انکار کر دیا، جس میں وہ موجود نہ تھا۔ بے شک عبدالولی اپنا کردار ایک محبوب والا دہرائے لیکن اتنا ضرور کرے کہ اچھے دوستوں کی طرح اُسے تسلی دے اور بتائے کہ وہ بھی اُس کے لیے م ہے لیکن صرف دوستوں کی طرح! تو شاید... وہ اپنی ضد سے ہٹ جائے۔'' ڈاکٹر زبیر کہہ رہے تھے اور مان کے گرد مزید کچھ ٹوٹ کر بکھر رہا تھا۔

''ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جن کو ہم چاہتے ہیں اگر اُن کی خوشی کسی اور کو چاہنے میں ہو تو ہم محبوب کی لی میں خوش کیوں نہیں ہو پاتے؟ سارا کھیل تو اِس ناخوشی ہی کی وجہ سے ہے۔ اگر ہم اِس ناخوشی کو خود حاوی نہ ہونے دیں تو ہم کبھی خود نہیں ٹوٹتے اور نہ ہی کسی اور کو ٹوٹنے دیتے ہیں اور نہ ہی توڑتے ہم اللہ کی Design کی ہوئی رضا کو جب نہیں مانتے تو بھی تو وہ ہی ہوتا ہے، جو شروع سے Design ہے۔ پھر کیوں نہ جی سے مان لیا جائے اور یاد رکھا جائے کہ ایسے عمل سے اجر ملتا ہے اور ی کبھی تو اللہ خوش ہوتے ہیں اِس شکر گزاری سے اتنا کہ وہ ہی نعمت اُس کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں س کے لیے اُس نے اللہ کی رضا کے لیے صبر کیا ہوتا ہے۔''

❖❖○❖❖

''لالہ!'' سائرہ نے شیشے کے پار پٹیوں میں جکڑے طارق کو دیکھا تو بے اختیار اُس کے لبوں سسکی برآمد ہوئی۔

شہباز صاحب کی خود اپنی طبیعت بگڑ گئی تھی گھر میں اِس وقت ڈاکٹر نے اُن کو انجکشن دے کر تھا۔ سائرہ اِس قدر پریشان تھی کہ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ فوری طور پر کیا کرے، احم شہباز صاحب کے پاس رُک گئے تھے جب کہ سائرہ روشن آرا بیگم اور اُن کے کمپنی مینجر کے ساتھ آ گئی تھیں کیوں کہ طارق لاہور سے خاصی دور واقع ایک ہسپتال میں ایڈمٹ تھا۔

میجر ہارون نے دوڑ بھاگ کر ہر معاملہ چیک کر لیا تھا لیکن اُن کو کچھ کرنا نہیں پڑا تھا کیوں کہ آ اور رانا جواد دونوں ہر طرح کے معاملات طے کر چکے تھے۔

''لالہ۔'' سائرہ نے سسکتے ہوئے شیشے کے پار اُسے پکارا۔

کوئی بات کوئی لفظ اس وقت اُس کے منہ سے پوری طرح ادا نہ ہو رہے تھے، وہ بُری طرح بس رہی تھی۔ روشن آرا بیگم، جو پاس پڑے بینچ پر بیٹھیں مسلسل تسبیح پڑھ رہی تھیں، انہوں نے فوراً اُٹھ کر ا گلے لگا لیا۔

''حوصلہ کرو، اللہ رحمان کی ذات سے پُر امید رہو انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' روشن آرا بیگم سائرہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''آنٹی! میرا ایک ہی بھائی ہے، بھائی بھی ایسا، جس نے جب مجھے ماں اور باپ جیسے رشتے کی ک احساس نہ ہونے دیا جب میں اِس دنیا میں ہر رشتے سے کنگال ہوئی کھڑی تھی، لالہ مجھ سے تھوڑے ہی تو بڑے ہیں آخر اُن کو خود کو بھی تو اِن رشتوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہو گی لیکن وہ صرف میری خا وقت سے بہت پہلے بڑے ہو گئے، میری ہر خوشی، ہر سُکھ اُن کی ہمیشہ پہلی ترجیح رہا ہے۔ ایسا ہیرے بھائی، ایسا چھتنار بھرا رشتہ! میں تو طارق لالہ کے بغیر خالی ہو کر رہ جاؤں گی۔'' سائرہ پھوٹ پھوٹ رو دی۔ روشن آرا بیگم نے نہایت تحمل سے اُس کی پوری بات سُنی تاکہ وہ اپنے دِل کی بھڑاس نکال اپنے دِل کا بوجھ بانٹ سکے۔

''سائرہ! اُسے کھونے کے ڈر سے رونے کے بجائے اللہ رحمان کے سامنے جھک کر اور اپنے ہا اُس کے سامنے درخواست پہ لگا کر اپنے بھائی کی صحت مند زندگی مانگو، دیکھنا انشاء اللہ وہ بالکل ٹھ ہو جائے گا۔'' انہوں نے سائرہ کو سمجھایا۔

''جی۔'' سائرہ نے ہچکیاں لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا، روشن آرا بیگم نے اُسے وہاں سے ا اپنے پاس بٹھا لیا، وہ زار زار رو رہی تھی لیکن اب اِن آنسوؤں کی نوعیت مختلف ہو گئی تھی اب یہ ڈر، ما اور شکوے بھرے آنسو نہ تھے بلکہ دعا بھرے، درخواست بھرے آنسو تھے، جو اُس بڑی ذات سے ا بھائی کی زندگی مانگ رہے تھے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ وہ ہی نمکین پانی جو پہلے بھی بہہ رہا تھا لیکن پہلا خام سے آنسو تھے ایسی دوا جیسے تھے، جس میں سے اثر ختم ہو چکا تھا۔ اور اب بھی وہی آنکھیں تھیں وہی اِن میں بہتے ہوئے آنسو، لیکن اب ان میں واضح فرق تھا ان کی تاثیر بدل گئی تھی، اب یہ تاثیر تھے کیوں کہ اب یہ ایک عاجز دِل نے سچے دل سے اپنے رب سے امید رکھ کر بہائے تھے۔ اور وہ

ہا چاہتا ہے کہ ہر چیز اُسی سے مانگی جائے کیوں کہ وہ دے کر خوش ہوتا ہے۔

ں اُس کے ہاں ایک ہی شرط ہے کہ مانگنے کا سلیقہ بے شک ہو نہ ہو لیکن اُسے سب سے بڑا ماننے کا قرار ہو، یہی اُس بڑی ذات کا حق ہے جو بندہ ادا نہ کر کے ہمیشہ ظلم کر جاتا ہے۔

اے اللہ! میرے لالہ کو صحت و زندگی عطا کر دیں بے شک تو سب سے بڑا دینے والا ہے!'' سائرہ ل سے بے اختیار دعا نکلی۔

رحیم! تُو بیٹھا ہی ہمیں سننے کے لیے ہے یہ تو بس ہماری اپنے پکارنے کی دیر ہوتی ہے!

❖❖○❖❖

سب کیا ہے؟'' نفیسہ بیگم نے پوچھا۔

کیوں! تم نہیں جانتیں؟ عورتوں کو تو اِن چیزوں کا بہت پتا ہوتا ہے۔'' سید سرفراز علی نے بے نیازی اب دیا۔

سید سرفراز! ہر بات کو اپنی نگاہ سے دیکھنا بند کر دو، یہ رشتے ناتوں کی باتیں بہت نازک ہوتی ہیں ان کسی ایک فریق کی مرضی نہیں چل سکتی۔'' نفیسہ بیگم نے اُن بڑے بڑے تھالوں کو دیکھا جو شگن ل سے بھرے ہوئے تھے۔

اب بات شروع کی جاتی ہے تو فوراً یہ شگن وغیرہ نہیں لے کر جاتے، دوسرے فریق کی کیا مرضی یہ دیکھا جاتا ہے۔'' آپا امّاں نے سید سرفراز علی کو اپنی سی سمجھانے کی کوشش کی۔

... پھر ابھی تو ہمارے گھر میں سوگ چل رہا ہے تم کیسے شادی بیاہ کی باتیں کر سکتے ہو؟ کیوں... تمہارا ہر کام زبردستی کا عنصر لیے ہوتا ہے؟'' آپا امّاں ہانپنے لگیں وہ اِس شخص سے لڑتے لڑتے تھکنے لیکن یہ شخص بڑے سے بڑے حادثے کے بعد بھی اپنی سرشت نہ بدل سکا تھا۔

زیادہ بری حالت ہوتی ہے نا جب ہمیں ساری زندگی کسی ایسے شخص کے ساتھ رہنا پڑتا ہے، جو نہ صبر کا امتحان ہو بلکہ ساری زندگی کو امتحان بنا دے۔

تم جانتی ہو میں نے ہمیشہ جو چاہا وہ پایا ہے پھر مسکان تو لاکھوں میں ایک ہے اُس جیسی لڑکی تو سے ملتی ہے۔'' آپا امّاں نے سید سرفراز علی کو حیرت سے دیکھا۔

تمہاری یادداشت کو دوبارہ میں کچھ یاد دلانا چاہوں گی کہ ایسا اب نہیں ہے کچھ... تم بھول رہے ہو اپنے شہر بانو کے ساتھ جو ظلم کی حد توڑی تھی، اُس کے بعد کیا تم نے وہ نتائج حاصل کر لیے جن کی تمنا کی تھی۔ نہیں! نہیں نا۔'' آپا امّاں نے دانت بھینچ کر کہا۔

بجائے اس کے کہ تمہاری بدلے کی آگ ٹھنڈی ہوتی تم مزید آگ میں دھکیلے گئے، تم کو بیٹے کی ل کاری ضرب لگی، ایسا گھاؤ جو تم مانو یا نہ مانو، تمہیں بے حد تکلیف دیتا ہے۔'' سید سرفراز علی کا چہرہ م سیاہ پڑ گیا۔

اب تک تم ہر کام میں اپنی مرضی چلا کر، طاقت اور پیسہ استعمال کر کے زبردستی فیصلے کر دو گے۔ پہلے تم نے مسکان کے ساتھ کر کے دیکھ لیا؟ دِلوں کی دنیا زبردستی آباد نہیں ہوتی۔ بیٹیاں بہت پیاری ہیں لیکن بیٹیوں کی قسمت اُن کے باپ کی دولت، طاقت سے نہیں اُس کی دُعا سے بنتی ہے۔ تم تو

مسکان کی قسمت کے ساتھ بھی تجربے کر چکے اب بس کرو!'' آپا اماں نے بیزاری سے کہا۔

''میں نے تمہیں تقریر کے لیے نہیں بلایا، اِس لیے بلایا ہے کہ تم جاؤ اور مسکان کا رشتہ طے کر آؤ؟'' سید سرفراز علی نے اُن کو یوں حکم دیا جیسے بازار سے جا کر کپڑا خرید کر لانا ہو۔

''بھلا رشتے کب خریدے جاسکتے ہیں یہ تو قسمت اور نصیب کے سودے ہوتے ہیں مجھے تو تم اِس سارے معاملے میں معاف ہی رکھو، میں اِس کام کے لیے ہرگز نہیں جاؤں گی۔'' آپا اماں نے صاف انکار کر ڈالا۔

''کیوں! ویسے تو تمہیں مسکان کی ماں ہونے کا بہت دعویٰ ہے، تم اس کی خوشیوں کی خاطر بھی نہ جاؤ گی؟'' سید سرفراز علی، نفیسہ بیگم کی ضد کو اچھی طرح جانتے تھے اس لیے انہوں نے اُن کو دوسرے طریقے سے گھیرنا شروع کیا کیوں کہ وہ جانتے تھے مسکان کا وجود اُن کے لیے زندگی کی طرح اہم ہے۔

''ماں ہوں اسی لیے تو اِس کام کو انکار کر رہی ہوں۔'' آپا اماں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ زیادہ اسٹریس سے ہمیشہ اُن کا بی پی ہائی ہونے لگتا تھا۔

''ٹھیک ہے تم نہ بھی جاؤ گی تو بھی مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں تمہاری وجہ سے کوئی کام نہیں روکوں گا اور مجھے مسکان کا یہ رشتہ طے کرنے سے اب کوئی نہیں روک سکتا۔'' سید سرفراز علی نے مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔

''میرے اللہ! یہ شخص بالکل دہریہ ہوگیا ہے اب مزید کیا کرے گا؟'' آپا اماں نے بیزار نظروں سے سید سرفراز علی کو باہر جاتے دیکھ کر کہا۔

''سید سرفراز علی! تم ایک بار، صرف ایک بار عبدالولی کا چہرہ دیکھ لو گے تو فوراً اپنا فیصلہ بدل لو گے کیوں کہ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں اگر تم نے کسی چہرے سے شکست کھائی تھی تو وہ سید عبداللہ کا تھا اور عبدالولی کے چہرے میں بھی تو سید سرفراز علی کی زندگی کی سب سے بڑی شکست موجود تھی۔''

''بے چارہ سید سرفراز علی!!
دعوے کرتا ہوا سرفراز علی!!

وہ نہیں جانتا کہ جس چیز کے لیے وہ اپنی سرتوڑ کوشش کرنے جا رہا ہے، اُس میں اُس کی کتنی بڑی مات موجود ہے۔'' نفیسہ بیگم ایک دم ہنسنے لگیں۔

یہ عجیب سی ہنسی تھی، جس میں بہت سارے دکھ بین کر رہے تھے۔ اس بار بازی وقت نے اپنے نام رکھی تھی۔

❖❖○❖❖

یا اللہ!
اب فقط تیرے لیے ہی گونجتی ہیں
رات، دن
ایک پابندِ زماں کی
ایک محصورِ مکاں کی سسکیاں!

میں نے سجدے میں رکھا سر
آ گئی میں تیرے در پر
الٰہی! بے خوف و خطر
محروم ہونے سے بچا لے
تجھ سے وابستہ ہیں اُمیدیں بہت
دامانِ رحمت میں چھپا لے

ترنم ٹکٹکی باندھے سامنے دیوار پر دیکھ رہی تھی۔ دیوار خالی تھی لیکن اُس کی آنکھوں کے سامنے بہت سارے منظر کیمرے کی ریل کی طرح گھوم رہے تھے۔

ترنم کی گود میں ماہی سر رکھے کسی معصوم بچے کی طرح سو رہی تھی، روتے روتے وہ اِس قدر نڈھال ہو گئی تھی کہ اُس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ ترنم کی ٹانگیں سُن ہو کر دکھنے لگی تھیں لیکن اُس نے ماہی کو ڈسٹرب نہ کیا اسے سونے دیا تھا۔ ترنم کے کانوں میں ماہی کے الفاظ گونج رہے تھے اور دِل کو اتھل پتھل کر رہے تھے۔

''ترنم! تم جانتی ہو کہ میں جب جب ٹی وی یا اخبار میں خودکش دھماکے کے متعلق پڑھتی یا سنتی تھی تو میرے اندر جھرجھری سی پیدا ہو جاتی تھی۔ میں اکثر سوچتی تھی کہ آخر وہ کون سی طاقت ہوتی ہے جو کسی کو اپنی جان ختم کرنے پر مجبور کر دیتی ہے، کتنا ہی بہادر کیوں نہ ہو لیکن اپنی زندگی تو سب کو بہت پیاری ہوتی ہے؟'' اُس نے اپنی بڑی بڑی اور خوب صورت آنکھیں کھول کر ترنم سے پوچھا تھا۔

''کوئی کتنی بڑی مجبوری، کوئی کتنا بڑا لالچ زندگی کے ساتھ ہی تو ہوتا ہے؟ زندگی کے بغیر تو کچھ بھی نہیں لیکن جب زندگی ہی نہیں رہے گی تو پھر کیسی سودے بازی! مجبوری کو فائدے میں بدلتے دیکھا نہیں اگر دولت کا لالچ ہے تو وہ دولت استعمال ہو نہیں سکتی تو پھر ایسی کون سی چیز ہے، جو اِن لوگوں کو موت قبول کرنے پر راضی کر دیتی ہے!'' یہ وہ سوال تھا جس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا تھا۔ اور یہ سوال مجھے بہت تنگ کرتا تھا، میں اُس فورس کو جاننا چاہتی تھی! لیکن مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکا تھا۔

''ترنم! دیکھو مجھے اِس سوال کا جواب کب ملا۔ تب جب میں زندگی کے بالکل آخری کنارے پر کھڑی ہوں!'' ماہی ایک دم سے ہنسی، ترنم نے اُسے چونک کر دیکھا، اُس کی ہنسی بہت خوف ناک تھی، اُس کے ارادوں کو ظاہر کر رہی تھی۔

''ماہی! یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟'' ترنم نے گھبرا کر اُس سے سوال کیا۔

''ترنم! میری زندگی تو میرے کسی کام نہیں آئی لیکن میری موت! میری موت تو میرے کام آ سکتی ہے نا!'' ماہی کے لہجے میں موجود پُراسراریت ترنم بہ خوبی محسوس کر سکتی تھی۔

''تم کیا کرنے والی ہو؟ جانتی ہو نا، اگر ہماری زندگی حرام تھی تو کیا تم حرام موت! میرا مطلب ہے ایسی کرو گی۔'' ترنم کے پاس الفاظ نہ تھے کہ وہ کیا لفظ استعمال کرے، جو ماہی کو اُس کے ارادوں سے ٹال سکیں۔

''نہیں ترنم! میں اب ایک پَل کا بھی گھاٹے کا سودا نہیں کرنا چاہتی۔ میرے پاس مزید ضائع کرنے

کے لیے کوئی چوائس ہی نہیں ہے، میں کیوں حرام موت چاہوں گی؟ میں بے مقصد زندگی جینے کے با مقصد موت حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ ترنم میں، میں اِس سارے نا سہی! لیکن اس سیٹ اپ کی سرغنا ختم کرنا چاہتی ہوں! کہتے ہیں کہ دیمک کو جگہ جگہ سے کتنی ہی بار مار لو لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوتا، جب تک دیمک کی ماں کو نہ مارا جائے۔'' ماہی نے ترنم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

''تم! تم میڈم راگنی کو؟'' ترنم نے حیرت سے پوچھا تھا۔

''نہیں۔'' ماہی کے چہرے پر بہت مختلف مسکراہٹ تھی۔

I will kill that basterd few who had planed and lounched this set up in Pakistan

ماہی نے بے حد ٹھوس لہجے میں جواب دیا، جیسے وہ اِس سب پہ خاصا ہوم ورک کر چکی ہو۔

''تم پاگل ہوئی ہو؟ بگ باس تک پہنچنا ناممکن ہے پھر سُنا ہے وہاں تو یہاں سے بھی زیادہ سیکیورٹی ہوتی ہے، تم اکیلی آخر کیا کر پاؤ گی۔'' ترنم نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''بس کچھ نہ کچھ تو ضرور کروں گی پھر میری نیت زندگی میں پہلی بار سچی ہے، مجھے بے حد یقین ہے، بے حد یقین ہے کہ اللہ پاک میری مدد کریں گے میرے پاس بہت پیسہ ہے، میں اِس پیسے سے ہر سواری خریدوں گی جو مجھے وہاں تک پہنچا دے۔'' ماہی کے ارادے بے حد مصمم تھے۔

''لیکن! لیکن وائے بگ باس؟ یہ بہت رسکی ہے، تم راگنی کو ٹارگٹ کروا دو۔'' ترنم نے اُسے روکنا چاہا۔

''میرے پاس کون سا عمر کی بہت نقدی پڑی ہے، جو میں رِسک سے ڈروں، پھر ابھی تو میں نے تم کو بتایا تھا نا کہ دیمک کی ماں کو مارنا بے حد ضروری ہے!'' ماہی نے ترنم کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''میں نے ایک بار نیشنل جیوگرافک پر دیکھا تھا وہ لوگ دیمک کو مار رہے تھے، انہوں نے نیچے گہرائی تک کھودنا شروع کر دیا، جانے کتنے کلومیٹر کھدائی کی تو جا کر انہیں زمین کی تہہ میں ایک مرغی نما سی شکل کی دیمک کی ماں بیٹھی مل گئی انہوں نے اُسے ختم کیا جو میلوں دور بیٹھی مسلسل انڈے دے رہی تھی۔ وہ لاکھ اوپر اوپر سے دیمک کو ختم کر دیتے لیکن کوئی فائدہ نہ ہوتا تھا، جب تک وہ اصل Suorce کو ٹارگٹ نہ کرتے۔''

''میں ایک راگنی کو آج ٹارگٹ کروں گی تو جیسے چاندنی کے مرنے کے بعد راگنی آ گئی اور اس کے بعد کوئی اور پیسے کے لیے ناچنے والی بندریا آ جائے گی اور یہ سیٹ اَپ کبھی ختم نہ ہو سکے گا۔ مجھے ہر صورت اِس ''سیٹ اَپ'' کو اَپ سیٹ کرنا ہے۔'' ماہی نے مضبوط ارادے سے جواب دیا۔

''میں! میں نہیں چاہتی کہ میری موت کی اخبار میں سرخیاں لگیں کہ میں ایڈز سے مر گئی۔'' وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''میں نے زندگی تو اللہ کے لیے جی نہیں، لیکن میری موت تو اُس کی راہ میں قربان ہونے کا بہانہ بن جائے گی۔'' وہ ترنم ہی کی گود میں روتے روتے سو گئی تھی۔ ترنم کے اندر اتھل پتھل شروع ہو چکی تھی۔

کبھی کبھی ہم اِس بات پر غرور کرتے ہیں کہ ہم بے حد نیک ہیں دوسروں سے زیادہ اچھے اعمال رکھتے ہیں اور کبھی کبھی ہم گناہ گار ہو کر بھی اِس احساسِ برتری کو نہیں چھوڑ پاتے کہ ہماری توبہ تو سب سے زیادہ ہے!

ہمارا کفارا تو بہترین ہے!

جب جب عبادت ہو یا ثواب یا پھر گناہ کے بعد توبہ ہو یا پھر کفارا! ہم اس کی اپنی سوچ کی ویٹ مشین میں ڈال کر تو لتے ہیں تو ہمیشہ گھاٹے میں رہتے ہیں! ایسے میں اچانک کوئی اور ہمارے سامنے آتا ہے اور ہمیں بتا جاتا ہے کہ وہ ہم سے کتنا بہتر تھا کس قدر بہتر عبادت کرنے والا، بہترین ثواب حاصل کرنے والا یا پھر بہترین کفارا ادا کرنے والا، توبہ کرنے والا!

ماہی نے بھی اچانک سامنے آ کر ترنم کو بتایا تھا کہ وہ اور اُس کی توبہ کی سچائی کی شدت بے حد زیادہ تھی۔

''ترنم! وہ ایک طوائف زادی ہو کر جب واپس پلٹی تو کس قدر نڈر اور سچی ہے اُس کی توبہ میں تو اِس قدر Passion ہے پھر تم تو جس مٹی کا پودا ہو تمہیں تو کفارے میں مزید آگے بڑھنا چاہیے۔'' ترنم کے دل میں جو ڈر، خوف اور ہر وقت کی بے چینی تھی وہ ختم ہو گئی تھی، ماہی کے وجود سے اُسے بے حد حوصلہ و ہمت میسر ہوئی تھی۔ ایک نیا جوش اور ولولہ اُس کے اندر پیدا ہوا تھا، عظمیٰ کو بھگانے میں جس طرح وہ کامیاب ہوئی تھی اس چیز نے تو اُس کا حوصلہ مزید بڑھا دیا تھا۔ ترنم نے بہت پیار سے سوئی ہوئی ماہی کا سر سہلایا، باہر ان کے نام کی ڈیوٹی لسٹ بن رہی تھی، میڈم راگنی نے ترنم اور ماہی دونوں کی ڈیوٹیاں بہت اہم بندوں کے ساتھ لگائی تھیں کہ وہ سینئر اور ٹرینڈ لڑکیاں تھیں۔

لیکن میڈم راگنی نہ جانتی تھی کہ جن لڑکیوں کو وہ اپنی بہترین لڑکیوں میں شامل کر رہی تھی وہ تو اُن کے لیے ایسا بارود بننے والی تھیں کہ اِس الیکٹرک سیل، جس میں وہ لڑکیوں کو کسی قبر کی طرح بند کر کے ہمیشہ کے لیے بے بس کر دیتی تھی یہ Confirment بہت جلد انہی لڑکیوں کے ہاتھوں تباہ ہونے والی تھی۔

❖❖○❖❖

''یا اللہ! تیرا شکر ہے۔'' شہباز صاحب نے با قاعدہ ہاتھ اٹھا کر دعائیہ انداز میں شکر ادا کیا۔ ابھی ابھی سائرہ نے ہسپتال سے فون کر کے بتایا تھا کہ طارق اب خطرے سے باہر ہے۔ میرے مولا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''چلو اب تم آرام کرو، اللہ نے مہربانی کر دی ہے۔'' احمد شاہ نے اُن سے کہا۔

''ہاں! اب میں آرام کر سکتا ہوں۔'' وہ دھیرے سے مسکرائے۔

''صاحب! باہر وکیل صاحب آئے ہیں کہتے ہیں کہ ملنا ضروری ہے میں نے تو کہا تھا کہ صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں لیکن وہ پھر بھی کہہ رہے ہیں کہ ملنا بہت ضروری ہے۔'' ملازم نے مالکوں کے خوف سے اپنی بات کو دوبارہ دہرایا۔

''خیریت ہے، یہ وکیل صاحب کس لیے آئے ہیں؟'' احمد شاہ نے پوچھا۔

''وہ نیلوفر کی ضمانت کینسل ہونے والی ہے نا، دن ختم ہو گئے ہیں۔ اُسی کا وکیل ہے فون پہ بھی وہ مسلسل اصرار کر رہا تھا کہ یہ معاملہ کورٹ سے باہر طے کر لیا جائے۔'' شہباز صاحب نے طویل سانس

بھرتے ہوئے اصل بات بتائی۔

''پھر! پھر تم نے کیا سوچا؟'' احمد شاہ نے شہباز صاحب کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں! میں اُس عورت کو کیسے معاف کر دوں، جو میری سارہ کی زندگی تباہ کرنے کا باعث بنی، میرے بچوں کے بیچ میں جدائی کا باعث بنی، جس نے میری زندگی کے پھل کا سارا رس نچوڑ لیا۔ یہ قصور اتنے بڑے ہیں کہ میرا دل اُسے معاف کرنے پر راضی نہیں ہوتا اِن قصوروں پر مشکل یہ ہے کہ اُسے کوئی عدالت سزا نہیں دے گی، لیکن جس کی سزا اُسے مل سکتی ہے اُسے میں کیوں روکوں، ہم وہی deserve کرتے ہیں جو ہم خود پلان کرتے ہیں۔'' شہباز صاحب نے واضح لفظوں میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''تو تم اُسے معاف نہیں کرنا چاہتے!'' احمد شاہ نے اُن کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔'' شہباز صاحب نے واضح لفظوں میں جواب دیا۔

''دیکھو شہباز! میں تم سے یہ نہیں کہوں گا کہ تم اُسے معاف کر دو، لیکن میں ایک بار ضرور کہوں گا کہ زندگی ہر کسی کو ایک موقع ضرور دیتی ہے کہ ہم اپنی اپنی بازی کھیل سکیں۔ پہلے نیلوفر کی بازی تھی، بدلے کی آگ کی وجہ سے وہ جیتی ہوئی بازی بھی ہار گئی۔ طارق اور سارہ کے دلوں کو ہار گئی، جو اُس کی سب سے بڑی شکست اور دُکھ ہے اس بار بازی تمہارے ہاتھ میں ہے کنڈیشنز بھی وہی ہیں، تم بھی بدلہ چاہتے ہو تم نے بدلے کی خاطر کھیلتے ہوئے لوگوں کا حال دیکھنا ہے تو نیلوفر کی طرف دیکھ لو اور فیصلہ کرو کہ فائدہ کس چیز میں ہے! آج طارق موت کے منہ سے واپس آیا ہے! اللہ نے تم پر ایک اور مہربانی بڑھا دی ہے تم کو پہلے تمہارے بچے واپس دلوائے اور اُن کے دل تمہارے فیور اور محبت سے بھرے ورنہ نیلوفر تو اُن کو پوائزن کر چکی تھی کیا وہ تمہاری طرف پلٹتے؟'' احمد شاہ نے شہباز سے سوال کیا۔

''یہ اللہ کی ذات تھی، جس نے تمہیں Reward دیا تھا تمہارے اچھے صبر اور رویے کا، اللہ سے شکر اُس کی رضا پر صبر کرنے والوں کو ہمیشہ ہی نوازتا ہے۔ تمہیں تو اللہ نے ہمیشہ ہر چیز واضح طور پر کھول کر دکھائی ہے جس پر اللہ نے ہمیشہ نرم اور مہربان رویہ رکھا، وہ کیسے ایک بدلے کی خاطر اپنا گریڈ کم کر سکتا ہے کیا تم ایسا کر سکتے ہو؟'' احمد شاہ کی بات تھی کہ کوئی Smoke Cleaner جو ہر چیز کو واضح کر گیا تھا۔ وہ میل جو سالوں سے دلوں پر چڑھ آیا تھا جس کو شاید اُترنے کے لیے بھی اتنا ہی عرصہ درکار تھا۔ آج احمد شاہ کی وجہ سے اُسے اترنے میں پَل لگا تھا، ایک فیصلہ ہونے میں پَل لگا تھا ایک بہترین فیصلہ، معاف کر دینے والا فیصلہ ہوا تھا۔ بدلے میں اگر آمرزش کی جیت ہو تو معافی دینے والا ساری زندگی کی بازی جیت جاتا ہے۔

❖❖ ○ ❖❖

یہ نگینہ کا کوئی بیسواں فون تھا، سارہ کو طارق کی خیریت دریافت کرنے کے لیے۔ وہ جلے پاؤں کی بلی کی طرح مسلسل بے چینی سے چکراتی پھر رہی تھی۔ جائے نماز سے فون اور فون سے دوبارہ جائے نماز تک اُس کا طواف جاری تھا۔ بالآخر طارق کی خیریت کی اطلاع پر اُس نے سجدہ شکر ادا کیا تھا، کون کہتا ہے کہ محبت اثر نہیں کرتی۔ محبت تو محبت ہوتی ہے چاہے یہ یک طرفہ ہو لیکن اپنی شدت کا احساس

دوسرے کے دل تک ضرور پہنچاتی ہے۔

نگینہ نے طارق کی سچی چاہت کو اپنی روح تک محسوس کیا تھا اور اب اُس کا دل طارق کی تکلیف پر ڈوب رہا تھا۔

سکھ کے موسم انسانوں کو اتنا قریب نہیں کرتے جتنے دُکھ کے موسم دو لوگوں کو ایک دوسرے کے بے حد قریب کر دیتے ہیں۔

نگینہ نے طارق کی محبت کو اِن چند گھنٹوں میں قطرہ قطرہ نہ صرف محسوس کیا بلکہ وہ تو اِس سمندر میں خود اپنے، ڈوبتے بے بسی سے دیکھتی رہ گئی، اُسے ادراک ہوا کہ کوئی زندگی میں اتنا بھی اہم ہو سکتا ہے کہ خون بن کر رگوں میں دوڑنے لگتا ہے۔ سانسوں کی طرح زندگی میں اہم ہو جاتا ہے۔

نگینہ نے روشن آرا کا موبائل فون ملایا۔

''السلام علیکم امّاں جان!'' نگینہ پہلی بار ماں سے فون پر بات کرتی کچھ گھبرا رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار کوئی ایسا احساس تھا، جس کی وہ اکیلی امین تھی ورنہ تو وہ اپنے دِل کی ہر بات اُن سے شیئر کرتی تھی۔

''وعلیکم السلام! چندا تم ٹھیک تو ہو نا؟'' وہ ماں تھیں اور اولاد تو ماں کے فنگر ٹپس پر ہوتی ہے بھلے وہ دور ہی کیوں نہ بیٹھی ہو، بچے کی گھبرائی آواز فوراً پہچان لیتی ہے۔

''جی میں ٹھیک ہوں، اب طارق بھائی کیسے ہیں؟'' نگینہ کی تسلی نہ ہو رہی تھی اس لیے سارہ سے پوچھنے کے باوجود وہ ماں سے طارق کا حال دریافت کر رہی تھی۔

''اللہ نے معجزہ کیا، اللہ رحمان نے احسان کیا ہے، اُس سوہنے پروردگار نے ہماری دُعائیں سُن لی ہیں اور اب طارق خطرے سے باہر ہے۔'' روشن آرا بیگم کا لفظ لفظ شکر سے ڈوبا ہوا تھا۔

''شکر الحمدللہ!'' نگینہ نے ایک بار پھر کہا۔

''امّاں جان! اگر آپ اجازت دیں تو میں سارہ آپی کے ساتھ رکنا چاہتی ہوں، آپ بابا جان کے ساتھ چلی جائیں اور شہباز انکل کو بھی صبح لے آئیے گا آپ بھی کچھ ریسٹ کر لیں گی۔ آپ کی نمازیں بھی وہاں میں پڑھی جائیں گی۔'' وہ روشن آرا بیگم کی عشا اور تہجد کے متعلق کہہ رہی تھی۔

''ہاں! تم ٹھیک کہہ رہی ہو اُدھر شہباز بھائی کی خیریت بھی پتا کرنا ضروری ہے۔ ویسے تو شاہ صاحب اُن کے پاس ہیں لیکن مجھے بھی جا کر باپ کو بیٹے کی اصل حالت بتانی چاہیے تا کہ اُن کی بھی تسلی ہو جائے۔'' روشن آرا بیگم نے فوراً حامی بھر لی تو نگینہ نے ایک بے حد سکون بھرا سانس خارج کیا۔

''میرے خدا! شکریہ۔ اب میں اُن کو دیکھ لوں گی تو میرے دِل کو قرار آ جائے گا۔'' نگینہ نے دل ہی دل میں کہا۔

''ٹھیک ہے امّاں جان! میں رحیم چاچا کے ساتھ اِدھر کے لیے نکلتی ہوں، اللہ حافظ!'' نگینہ تیزی سے فون بند کر کے اپنے کمرے کی جانب بڑھی۔ اُسے شدید بے چینی تھی کہ وہ کسی طرح طارق تک پہنچ جائے۔

''اے اللہ! طارق کو اپنے حفظ وامان میں رکھنا۔'' نگینہ کا دِل شدت سے دعا گو تھا۔

❖❖ ○ ❖❖

''سنیے!'' حسن آرا بیگم نے اندر آ کر انور صاحب کو پکارا، جو تسبیح پڑھنے میں مصروف تھے۔ آج اُن کو صرف تین ہی کام تھے آفس سے مسجد، مسجد سے گھر اور ہر ویک اینڈ پر اسلام آباد کاشف سے ملنے جانا۔ اس کے علاوہ، وہ نہ کہیں آتے جاتے تھے اور نہ ہی بلاضرورت کسی سے بات کرتے تھے۔

''سنیے! آپ نہیں جائیں گے میں تو تیار ہوں۔'' حسن آرا بیگم آج بہت دنوں بعد کہیں جانے کے لیے تیار ہوئی تھیں اور اِس وقت وہ بہت اچھی لگ رہی تھیں اور بہت خوش بھی تھیں۔

''اچھا جی! چلتے ہیں میں تم ہی لوگوں کا انتظار کر رہا تھا۔'' انہوں نے بے حد دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

حُسن آرا بیگم نے اب اُن کے رویّے پر بالکل حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔ شروع شروع میں وہ اِس شیر کو ایک دم معمولی آدمی میں ڈھلنے سے بے ضرر بنتے دیکھ کر حیرانی سے سکتے کے عالم میں آ جاتی تھیں لیکن پھر دھیرے دھیرے اُن کو یقین آنے لگا تھا کہ یہ معجزہ واقعی رونما ہو چکا ہے۔ انور صاحب کی کاٹ دار نگاہیں اور زبان کو ایسا سبق ملا تھا کہ وہ اپنی ساری تیزی بھول گئے تھے۔ آج حسن آرا بیگم کا روشن آرا آپا کی طرف جانے کا بے حد من تھا، انہوں نے صبح صبح ہی انور صاحب سے ذکر کیا کہ ان کا بے حد دِل چاہ رہا ہے کہ وہ آپا کی طرف جائیں، آج آپا کی سالگرہ کا دن ہے۔

''میں اُن کی ہر سالگرہ پر اپنے ہاتھ کا کڑھا سوٹ یا چادر دیتی ہوں۔'' انہوں نے گہرے کائی کلر کے سوٹ پر اُسی کے ہم رنگ دھاگے سے کڑھائی کیے سوٹ، جس پر ننھے منے شیشے بالکل ستاروں کی طرح لگ رہے تھے، انور صاحب کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

''تو اِس میں پریشانی کی کیا بات ہے چلے چلتے ہیں آپا کی طرف بلکہ بچیوں اور گڈو سے بھی کہنا تیار رہیں۔'' یہ وہی انور صاحب تھے جو کبھی اُن کو روشن آرا بیگم کی طرف جانا ہوتا تو انور صاحب اُن کو پہلے خون کے آنسو رُلاتے تھے پھر کہیں جا کر اجازت دیتے تھے لیکن آج انہوں نے خود سے اجازت ہی نہ دی تھی بلکہ خود بھی ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے تھے۔

''کہاں کھو گئیں تم؟ چلو باہر بچے انتظار کر رہے ہوں گے۔'' انور صاحب نے سوچوں میں گم حُسن آرا بیگم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''آپ! ہوں، چلیے!'' انہوں نے انور صاحب کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

''مجھے اب اپنی خوش قسمتی پر یقین کر لینا چاہیے کہ انور صاحب واقعی بدل گئے ہیں۔'' حُسن آرا بیگم نے دِل ہی دِل میں کہا۔

''وہ شخص جس کے متعلق اُن کا خیال تھا کہ کبھی نہیں بدل سکتا، آج ایک بالکل مختلف انسان نظر آ رہا تھا اور یہ سب اللہ کے کرم سے ہوا تھا، جس سے وہ کبھی مایوس نہ ہوتی تھیں۔''

❖❖○❖❖

''سلام بی بی صیب!'' چوکیدار نے حُسن آرا اور انور صاحب کو دیکھ کر دروازہ کھول دیا۔ پورچ میں پہلے ہی ایک پجیرو اور دو جیپیں کھڑی تھیں، ایک جیپ کے پاس باڈی گارڈ کھڑے تھے۔

''لگتا ہے اندر کوئی مہمان آیا ہے۔'' انور صاحب نے گاڑیوں کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا۔

''جی ابو میرا بھی یہی خیال ہے!'' علیزے نے اپنے سر کی چادر ٹھیک کرتے ہوئے ہاں میں ہاں ملائی۔

''کہیں ہم غلط وقت پر تو نہیں آ گئے، خالہ کے ہاں تو آل ریڈی مہمان آئے ہوئے ہیں۔'' غزالہ نے اندر جانے سے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''ارے! تمہاری سگی خالہ کا گھر ہے، ہم ان کے مہمان نہیں ہیں۔'' حسن آرا بیگم نے خوش دِلی سے آگے بڑھتے ہوئے کہا، ویسے بھی بہن کے گھر آ کر ان کو میکے کا احساس ملتا تھا کیوں کہ روشن آرا بیگم اُن کا خیال بھی بہت رکھتی تھیں۔

حسن آرا بیگم کو روشن آرا سے ملنے کی بے حد بے صبری تھی اِس لیے وہ فوراً اندر کی جانب بڑھیں۔

''باجی صاحبہ اور صیب جی تو کل کے طارق باؤ کے پاس ہسپتال چلے گئے تھے۔'' ملازمہ نے اُن کو گھر کے اندرونی حصے کی جانب لے جاتے ہوئے کہا۔

''تو کیا نگینہ بھی گئی ہے؟'' علیزے نے پوچھا۔

''جی بی بی صیب! کل شام وہ بھی چلا گیا تھا۔'' ملازمہ نے جواب دیا۔

''کیا ہوا تمہارے طارق باؤ کو؟'' کاشف اور منزہ کے کیس کی وجہ سے وہ بھی طارق کو اچھی طرح جانتے تھے۔

''معلوم نہیں صیب! لیکن وہ ٹھیک نہیں تھی اِس لیے سب اُس کو ملنے واسطے گیا ہے۔'' چوکیدار کی پٹھانی نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں جواب دیا۔

''اللہ کرم کرے، سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔'' انور صاحب نے با آواز بلند دعا دی۔

''تم اندر بیٹھو صیب! اندر پہلے سے کوئی اور صیب بھی بڑے صیب کا انتظار کرتی ہے، میں نے اُن کو بتائی کہ وہ لوگ خدا جانے کب آئیں پر وہ نہیں مانی اور اندر بیٹھی انتظار کر رہی ہے۔'' ملازمہ نے تفصیل سے بتایا۔

''اچھا ہوا کوئی تو گھر والوں میں سے آیا ورنہ ہم کو اُس غصے والی مہمان سے ڈر لگ رہا تھا۔'' پٹھانی نے کانوں کو توبہ کے انداز میں ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

ملازمہ انہیں سیدھے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

''علیزے! ذرا اپنی خالہ کو فون کر اور اُن کو بتا کہ ہم لوگ گھر آئے ہیں اور اُن کا انتظار کر رہے ہیں۔'' حسن آرا بیگم نے علیزے کو دوسری جانب فون کرنے بھیج دیا۔ علیزے، نگینہ کے کمرے کی جانب بڑھی۔

''السّلام علیکم!'' انور صاحب نے آگے بڑھ کر مہمان سے ہاتھ ملایا۔

''میں احمد شاہ صاحب کا ہم زلف ہوں۔'' انور صاحب نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کرایا۔

مہمان نے انور صاحب کا بھرپور نظروں سے جائزہ لیا۔ اب اگلا سوال انور صاحب کی آنکھوں میں تھا کہ مہمان اپنا تعارف کروا دے جو بڑی بے تکلفی سے بیٹھا شاہ صاحب کا انتظار کر رہا تھا۔

''میرا تعارف بھی اچھا ہی ہے!'' مہمان عجیب سے طریقے سے مسکرایا تھا۔

''دراصل احمد شاہ صاحب اور میں بہت جلد سمدھی بننے والے ہیں۔'' مہمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ نگینہ کے رشتے کی بات کب چلی، ہمیں معلوم ہی نہیں۔'' حُسن آرا بیگم نے خوش اخلاقی اور دلچسپی سے پوچھا۔

''جی کون نگینہ!'' مہمان نے سوال کیا۔

''احمد بھائی کی بیٹی اور کون۔'' حُسن آرا بیگم نے نہ سمجھنے کے انداز میں جواب دیا۔

''ارے ارے نہیں! آپ غلط اندازہ لگا رہی ہیں، میں تو اُن کے بیٹے عبدالولی اور اپنی بیٹی مُسکان کے رشتے کی بات کر رہا ہوں۔'' مہمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کوئی بم دھماکہ ہوا تھا اُن کے قریب اور یوں لگتا تھا کہ اِس گھر کی ساری عمارت اُن کے اوپر آ گری ہو۔ حُسن آرا بیگم نے حیرت و پریشانی سے انہیں دیکھا، یہی حالی کچھ انور صاحب کا تھا۔

''میرا نام سید سرفراز علی ہے! میری بیٹی اور عبدالولی ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے ایک محترمہ کے لیے اُن کی پسند کب محبت میں بدلی وہ جان نہیں پائے لیکن عبدالولی میری بیٹی کے ساتھ Commited ہے! مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی تھی۔ پس میں نے سوچا کیوں نہ اِس Commitment کو کنفرم کر دیا جائے اور اُن کا رشتہ طے ہو جائے۔ یہ شگن میں اِسی سلسلے کے لیے لایا ہوں، بس احمد شاہ صاحب کا انتظار ہے پھر ساری باتیں طے ہو جائیں گی۔'' سید سرفراز علی نے نہایت خود اعتمادی سے ٹانگ پہ ٹانگ رکھتے ہوئے کہا۔

''ویسے بھی رشتے داری برابری میں اچھی لگتی ہے! ہمارا اور اُن کا Status میچ ہوتا ہے۔'' سید سرفراز علی کچھ اور بھی کہہ رہے تھے لیکن انور صاحب اور حسن آرا بیگم سے مزید کچھ اور سننا دُشوار ہو رہا تھا۔

رشتے داری؟ برابری میں رشتے داری؟ مسکان اور عبدالولی کی Commitment؟

''مسکان اور عبدالولی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں؟'' انہوں نے ڈرائنگ روم میں پڑے تحائف اور قیمتی زیورات جو شگن کے نام پر سید سرفراز علی لائے تھے ایک دم جن بھوت بن کر اُن کو منہ چڑھانے لگے اُن کو ڈرانے لگے تھے۔

''لیکن! احمد بھائی نے تو عبدالولی کی منگنی کہیں اور کر دی تھی۔'' انور صاحب کی آواز کہیں کنویں سے آئی اُن کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔

''ارے جناب! منگنیاں تو ہوتی ہی ٹوٹنے کے لیے ہیں۔'' سید سرفراز علی نے بہت بے رحمی سے کہا۔

''اہم بات تو یہ ہے کہ لڑکا ہماری لڑکی سے محبت کرتا ہے اور شادی بھی ہماری ہی لڑکی سے کرے گا!'' سید سرفراز علی کا دعویٰ انور صاحب کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا کر گیا تھا۔

''دعوے کسی بنیاد پر ہی تو کیے جاتے ہیں نا۔'' انور صاحب کے اندر سے کوئی بولا تھا۔

اور پھر یہ آواز اُن کے سارے وجود میں ایک دم بہت ساری سوئیاں چبھونے لگی، درد کی کوئی لہر تھی، جو اُن کے دائیں جانب سے اُٹھی تھی۔

''ویسے احمد بھائی کب آئیں گے؟'' سید سرفراز علی نے مزے سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر پوچھا۔ وہ اپنا تیر نشانے پر لگا چکے تھے۔

جیراں جو اُن کی خادم خاص تھی، روشن منزل میں رکھوالی تھی اُس نے بہت پہلے یہ آ کر اطلاع دے

دی تھی کہ عبدالولی کا رشتہ اُس کی اکلوتی خالہ کے ہاں ہو چکا ہے۔ جب انور صاحب نے سید سرفراز علی سے اپنا تعارف کروایا کہ وہ احمد شاہ کے ہم زلف ہیں تو سید سرفراز علی نے وہ ترپ کا پتا کھیلا، جو انور صاحب اور احمد شاہ کے بیچ بنے رشتے کو فوراً تباہ کر سکتا تھا۔

اور اب اِس تباہی کی واضح جھلک انور صاحب کے چہرے پر دیکھ رہے تھے۔ سید سرفراز علی کا دِل چاہ رہا تھا کہ وہ زور زور سے قہقہے لگائیں، بہت دِنوں بعد انہوں نے کسی کو بے بس دیکھا تھا اور یہ تو اُن کا بے حد دل پسند منظر تھا۔

''میری بیٹی لاکھوں میں ایک اور کروڑوں کی جائیداد کی مالک ہے، عادات کی بے حد پیاری ہے اِس کے علاوہ ایک لڑکا اور کیا چاہیے گا؟ کیوں انور صاحب میں درست کہہ رہا ہوں نا؟'' اُن کا سوال انور صاحب کے دِل کو چیرتا ہوا گیا تھا۔

علیزے؟ میری بچی! اُس کا کیا ہوگا؟ اُن کے تصور میں ایک دم شرمیلی مسکان لیے علیزے کا چہرہ گھوما جو اِس رشتے پر بے حد خوش نظر آتی تھی۔ پھر دیکھتے دیکھتے یہ ہنستا مسکراتا چہرہ آنسوؤں میں ڈوب گیا، پھر سارے چہرے ایک دوسرے میں ضم ہونے لگے، پہلے منزہ کا چہرہ تھا، پھر کاشف کا اور اب علیزے کا تھا۔

''نہیں۔نہیں!'' اُن کے دِل نے زور سے چیخ ماری تھی اور اُن کو لگا کہ اُن کا دِل پھٹ گیا ہے! انور صاحب بُری طرح لہرا کر زمین پر گر گئے۔

''ابو! ابو جی!'' علیزے اور غزالہ کی چیخیں مشترکہ طور پر بلند ہوئی تھیں۔ وہ تیزی سے انور صاحب کی طرف بڑھیں جب کہ حسن آرا بیگم سکتے کے عالم میں یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھیں اور سامنے بیٹھے سید سرفراز علی نے بہت آرام سے ٹانگ پہ ٹانگ چڑھاتے سامنے کا منظر دیکھا تھا اور اپنے سامنے پڑا لیمن سکواش کا گلاس اٹھا کر مسکراتے ہوئے گھونٹ گھونٹ بھر کر اپنے اندر لذت کو اُتارا تھا!

❖❖○❖❖

پھر کبھی خواب ہی میں سہی
وہ بھرا گیت یوں گنگناؤ
کہ ساری حدیں ٹوٹ جائیں
ازل اور اَبد کی
زمانے ہم آغوش ہو جائیں
خواہش کی دہلیز پر
ہم تمنا سے سرشار
پھر اِک نیا عزم لے کر اٹھیں
زندگی کرنے کو
پھر سے ہم زندگی کی طرف چل پڑیں

رات کے اِس پہر جب ہر طرف خاموشی تھی سناٹا تھا لیکن دو دل اور اُن کی گفتگو باقاعدہ سنی جا سکتی

تھی۔

طارق نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھولیں تو قریب نگینہ کو سویا پایا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں تسبیح تھی ا ایک ہاتھ طارق کے بازو پر تھا۔ یوں، جیسے کوئی اپنی قیمتی ترین چیز کو سوتے میں تھام کر رکھتا ہے۔

طارق کو اپنے سارے جسم میں بے حد درد محسوس ہو رہا تھا لیکن نگینہ کا وجود کسی مرہم اور آسودگی طرح اس کے دِل کو محسوس ہوا۔ اس نے اپنے جسم کو تھوڑی حرکت دینے کی کوشش کی لیکن کراہ کر رہ گیا نگینہ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''طارق بھائی! اللہ کا شکر ہے آپ کو ہوش آ گیا۔'' وہ اپنی نرم دھیمی آواز میں بولی، شکر سے اُس آنکھوں میں آنسو تھے۔

''اگر تم نے یہ لفظ ''بھائی'' نہ ہٹایا تو مین اس کے درد سے پھر بے ہوش ہو جاؤں گا۔'' طارق نقاہت بھرے لہجے میں کہا تو نگینہ روتے میں مسکرا پڑی۔

''سائرہ آپی آپ کی دوا لینے گئی تھیں، باہر جو بھائی موجود تھے اُن کو شاید بتانے گئی ہیں، میں آپی کو بتا کر آتی ہوں۔'' نگینہ اُٹھنے لگی تو طارق نے اُسے روکا۔

''نگینہ! میرے قریب آؤ۔'' طارق نے اپنی تکلیف ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''جی!'' نگینہ نے پاس آ کر کہا۔

''میرے ماتھے پر ہاتھ رکھو۔'' طارق کے کہنے پر نگی نے اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

''جی؟'' وہ پوچھ رہی تھی۔

''تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟'' وہ پھر پوچھ رہا تھا۔

نگینہ اُس کے لیے اتنا روئی، اتنا تڑپی تھی کہ اب اُس کا اپنے دِل سے کوئی حجاب باقی نہ رہا تھا کچھ چھپا پاتی کسی سے یا اپنے آپ سے، نگینہ نے نم آنکھوں سے اقرار کیا۔ وہ جان گئی تھی کہ طارق کھو کر وہ جی نہ سکے گی۔

''تھینک یو!'' طارق نے اُس کو جذب سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اور ادھ کھلے دروازے پر کھڑی سحرش کو یوں لگا کہ اُس کی کشتی بیچ سمندر میں ڈوبنے لگی ہے، اُسی طرح جیسے اُس کا دِل ڈوب رہا تھا۔

وہ روشنی جو طارق کی آنکھوں کا کچھ عرصے سے حصہ بنی تھی۔ وہ ہی روشنی وہ اِس وقت بھی آنکھوں میں دیکھ سکتی تھی۔

اور یہ روشنی اُس لڑکی کی وجہ سے تھی جو اِس وقت طارق کے بے حد قریب کھڑی اُس کا ہاتھ اپنی محبت کا اقرار کر رہی تھی۔ جوں جوں طارق کی آنکھوں کی روشنی بڑھ رہی تھی سحرش کے دِل میں اندھیرا اور سناٹا پھیلتا گیا تھا۔ پھر!

وہ ایک دم تیزی سے واپس پلٹی۔

❁

اس کے ساتھ اگر بے اعتباری بھی شامل ہو جائے تو زندگی کا سارا رس ہی کڑوا ہو جاتا ہے۔ دِل غلط، ت کی پہچان کرنے کی ساری خود اعتمادی سے محروم ہو جاتا ہے۔

علیزے بھی کچھ اِسی طرح کی کیفیت سے گزر رہی تھی اندر آئی سی یو میں اُس کا باپ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا اور باہر.... باہر وہ سب مُردوں سے بھی بدتر حالت میں کھڑے بے یقینی کی تُند و تیز دھوپ کو جھیل رہے تھے۔

سرفراز علی نے جو تُرپ کا پتا کھیلا تھا وہ اُن کے سارے خاندان کا دِل توڑ گیا تھا۔ انوار صاحب کو یقین ہی نہ آیا کہ احمد شاہ پہلے اُن کی بیٹی سے رشتہ کر کے بعد میں اپنی برابری کی سطح پر رشتہ کریں گے، اگر کلاس کا پرابلم تھا تو انہوں نے پہلے کیوں نہ سوچا؟ اگر اُن کے بیٹے کی کمٹمنٹ کہیں اور تھی تو وہ میری بیٹی کے دل سے کیوں کھیلا؟ بیٹی کا دُکھ اُن کے دِل سے برداشت نہ ہوا اور اب وہ آئی سی یو میں تھے، حُسن آرا سب سے زیادہ گلہ روشن آرا بیگم سے تھا۔ انہوں نے بہن ہو کر سب کچھ جانتے ہوئے بھی کیسے یہ سب ہونے دیا۔

علیزے کی نگاہوں میں ولی کی شدت بھری نگاہیں، اُس کی محبت بھری تحریریں، اُس کا پائل گفٹ کر کے پروپوز کرنا پھر آسٹریلیا جا کر اپنی بے چینیوں اور بے تابیوں کا اظہار کرنا سب کچھ گھوم گیا۔ یہ سب کچھ اُس کی زندگی تھا وہ اپنے خوابوں کی دنیا میں ولی کا ہاتھ تھامے بہت آگے نکل آئی تھی پھر کیسے! یہ بے اعتباری اندھیرے کی طرح ہر چیز پر چھا گئی، کیسے اُس کے خواب کوئی چکنا چُور کر گیا۔

اُس میں بدگمانی اِس قدر تھی کہ علیزے کے دِل پر غبار چڑھ آیا، ایسے میں ہر اچھا لمحہ دھند کے پار چلا گیا تھا اور وہ دُکھ کی شدت سے رو رہی تھی کیا سچ تھا کیا جھوٹ! اُس کا دِل سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہو رہا تھا۔

"آپی! اب کیا ہوگا۔" غزالہ نے بہن سے پوچھا، غزالہ نے خالی نگاہوں سے اسے دیکھا، اُس کی آنکھوں میں چھوٹی سی عمر میں ڈھیروں وسوسے اور اندیشے ہلکورے لے رہے تھے۔ وہ خود اِس قدر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی تھی کہ اُس کے پاس تسلی و تشفی کا کوئی لفظ نہ تھا۔

غزالہ روتے ہوئے آئی سی یو کے دروازے کے پاس کھڑی ہوگئی، علیزے نے آنسو صاف کر کے بیگ سے موبائل نکالا، یہ وہ رابطہ تھا، جو ولی، علیزے کو گفٹ کر کے گیا تھا، اب تک تو یہ رابطہ اُن کے درمیان رشتے کو پکا کرتا آیا تھا آج یہی رابطہ ولی سے اُس رشتے کی سچائی پوچھنے والا تھا۔

''زہے نصیب! آج یہ روزہ کیسے توڑلیا محترمہ نے۔'' ولی کی آواز اتنی دُور سے بھی بہت واضح تھی اُس میں موجود چہک اور خوشی کا عنصر صاف محسوس ہوسکتا تھا۔

علیزے نے لب بھینچ کر گہری سانس بھری، وہ خود کو کمپوز کررہی تھی کہ بات کیسے شروع کرے۔

''ولی! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔'' علیزے نے آخر ہمت کرہی لی۔

''جی فرمایئے! ارشاد کیجیے!'' عبدالولی نے شوخی سے کہا۔

علیزے کی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ! کیوں کہ عبدالولی کا لہجہ اور رویّہ بالکل جیسا تھا۔ پاس کھڑی غزالہ نے بہن کا منہ دیکھا جو عبدالولی کو سچائی بتانے سے گھبرا رہی تھی۔

''لایئے آپی! میں بات کرتی ہوں، باپ ہمارا بستر مرگ سے جالگا اور آپ کو ابھی تک مروّتیں رہی ہیں۔'' غزالہ نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

علیزے اپنی ہی جگہ چور ہوگئی تھی غزالہ نے فون پکڑ کر عبدالولی سے بات شروع کی تو علیزے کو رُکنا دوبھر ہوگیا۔ وہ گھبرا کر باہر کھلی فضا میں نکل آئی۔

''یااللہ! میں کیا کروں؟'' علیزے ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رودی۔ عبدالولی جس کو اُس نے اپنا آف لائف جان لیا تھا، کیا وہ اُس سے چھن جائے گا؟

کتنی مشکل سے اُس نے خود کو یقین دلایا تھا کہ وہ آسمان کا چاند جس کی صرف تمنا ہی کی جاسکتی سچ مچ اُس کے نصیب کی روشنی بن چکا ہے اور جب دل بے قرار کو یقین آنے لگا تو یہ سب کیوں روتے روتے اُس کا حلق خشک ہورہا تھا وہ نڈھال سی وہیں ہسپتال کے لان کے بینچ پر بیٹھ گئی۔ حالت علیزے کو اپنی جگہ مجرم بنا رہی تھی اُسی کی وجہ سے آج اُس کا باپ وہاں بستر پر موجود تھا۔

''یا اللہ جی! پلیز مجھے اِس منجدھار سے نکال لیں اور میرے ابو کو بھی صحت اور زندگی عطا کردیں'' علیزے نے نم آنکھوں سے دُعا کر کے ہاتھ منہ پر پھیرتے ہوئے سامنے دیکھا۔

روشن آرا خالہ اور احمد شاہ خالو تیز تیز قدم اُٹھاتے اُسی کی جانب آرہے تھے، بے شک اللہ کسی کو اُس کی قوت سے زیادہ آزمائش میں نہیں ڈالتا۔

''السلام علیکم بیٹا۔'' احمد شاہ نے علیزے کے پاس آکر حسب عادت سلام کرنے میں پہل کی۔

''السلام علیکم خالہ، السلام علیکم خالو۔'' علیزے نے دونوں کو باری باری سلام کیا۔

''جیتی رہو۔'' روشن آرا بیگم نے علیزے کو عجلت کے ساتھ اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ اُن کا دماغ اِس وقت بہن اور بہنوئی کی طبیعت کے لیے فکر مند تھا۔

غزالہ نے اُن کو ادھوری بات بتا کر انور میاں کی طبیعت کی خرابی بتائی تھی، سارے راستے روشن بیگم غزالہ کی ادھوری باتوں پر اُلجھی اور اٹکی رہی تھیں۔

''بھائی صاحب کدھر ہیں؟'' روشن آرا نے دریافت کیا۔

''آئی سی یو میں ہیں۔'' علیزے کا لہجہ بھی نم تھا۔

روشن آرا بیگم نے غور سے علیزے کا چہرہ دیکھا، پہلی بار اُن کو علیزے کے چہرے پر کچھ دبا دبا اور ناراضی نظر آئی، انہوں نے بات کی شدت کو شدت سے محسوس کیا تھا اور چھوٹے چھوٹے قدم

شاہ اور علیزے کے پیچھے چل دیں جو تیزی سے آئی سی یو کی جانب بڑھے۔ سامنے ہی بینچ پر حُسن غزالہ اور گڈو بیٹھے نظر آئے تینوں کے چہرے پر ایک چیز کامن تھی، تینوں ہی ہراساں تھے۔ روشن مہری سے بہن کی جانب بڑھیں لیکن انہوں نے بے حد سرد مہری سے ان کو راستے میں ہی روک دیا۔ آرا کے لیے یہ رویہ کسی صدمے سے کم نہ تھا۔

''حُسن آرا؟'' روشن آرا نے حیرت سے اُن کو دیکھا۔

حسن آرا بیگم نے سختی سے انہیں بات کرنے سے روک دیا۔

''میرا قصور کیا ہے؟'' روشن آرا بیگم نے ٹوٹے لہجے میں پوچھا، جو بہن ساری عمر واری صدقے جاتی تھی آج پہلی مرتبہ اُس کا اتنا سرد رویّہ انہوں نے دیکھا تھا اس لیے برداشت بھی نہ ہورہا تھا۔

''قصور آپ کا نہیں آپا، ہمارا ہے۔'' حُسن آرا بیگم نے غصّے سے کہا۔

''قصور ہماری غربت کا ہے، قصور تو ہماری بے وقوفی کا ہے جو آپ کے اور اپنے واضح طبقاتی فرق باوجود اپنی بیٹی کا رشتہ طے کردیا یہ جانے بغیر کہ بڑے لوگ اپنی برابری میں ہی رِشتہ نبھاتے ہیں، سے کم تر جگہ پر تو وہ کسی بھی وقت کسی بھی پَل ہر رشتے، ہر زبان سے مکر جاتے ہیں، یہی کچھ آپ ہمارے ساتھ کیا ہے۔ کیوں کیا ایسا، میں تو آپ کی سگی بہن تھی نا۔'' حُسن آرا بیگم نے روتے ہوئے کہا۔

''خدا کے لیے حُسن آرا! اس قدر بدگمانی اچھی نہیں ہوتی، پوری بات تو پتا چلے بِنا جرم کے تم کیسے کسی قصوروار ٹھہراسکتی ہو؟'' روشن آرا نے بہن کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں! کیا یہ غلط ہے کہ آپ علیزے اور ولی کی منگنی کے باوجود ولی کا رشتہ کسی بہت امیر کبیر گھرانے میں کرنے جارہی ہیں۔'' حسن آرا نے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا خرافات ہیں کس نے کہا آپ سے یہ سب؟'' روشن آرا بیگم نے استفسار کیا۔

''انہوں نے خود ہمیں بتایا ہے، آپ کے ہی گھر میں کہ آپ اُن کی بیٹی کے ساتھ ولی کا رشتہ پکا کرنے جارہی ہیں۔'' حُسن آرا بیگم نے حیرت سے روشن آرا کو دیکھا، جس کے چہرے پر اس بات کی بے خبری بے حد واضح تھی۔

''لاحول ولاقوۃ!'' روشن آرا بیگم نے پوری بات سن کر ایک دم کہا۔

''علیزے میری بہو بنے یہ میرا برسوں پرانا خواب ہے اور اس خواب سے آپ بھی تو بے خبر نہ تھیں پھر اس رشتے کے لیے بھلا کوئی دباؤ تھا جو ہم وقتی طور پر کر کے کہیں اور آگے بڑھ جائیں گے، ایسا کچھ نہیں ہے حُسن آرا!'' روشن آرا نے بہن کو یقین دلانے کی کوشش کی۔

''اِدھر دیکھو! میری آنکھوں میں دیکھو، کیا تم کو اپنی بہن کا یقین نہیں ہے؟'' روشن آرا بیگم نے حسن آرا کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب موڑتے ہوئے پوچھا۔

''آپا! کیا یہ یقین آپ اُس مرتے ہوئے شخص کو دلاسکتی ہیں جس کو آپ کا یقین ہی موت کی دہلیز پر لے گیا ہے!'' حسن آرا بیگم کا گلا رندھ گیا۔

''ہاں! میں اُسے یہ یقین ضرور دلاؤں گی اور تم دیکھو گی کہ تمہاری بہن اپنے قول کی کتنی پکی ہے۔''

روشن آرا بیگم نے ایک دم ٹھوس اور مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

حُسن آرا بیگم نے ایک دم چونک کر بہن کی آنکھوں میں دیکھا۔

''لیکن کیسے؟'' اُن کے ہونٹوں پر سوال تھا۔

''میں علیزے اور ولی کا نکاح کردوں گی۔'' روشن آرا بیگم نے کسی اہم فیصلے پر پہنچ کر کہا۔

''نکاح! لیکن ولی تو باہر ہے نا؟'' حسن آرا بیگم کو ڈوبتے میں سہارا ملا تھا اس لیے وہ فوراً سوال ک
کے بھی قابل ہوئی تھیں۔

ٹیلی فون پر بھی تو نکاح ہوتے ہیں نا!'' روشن آرا بیگم نے تجویز پیش کی۔

''نہیں آپا! وہ اس قدر بے اوسان ہوئے بیٹھے ہیں کہ ان کو ٹیلی فون پر نکاح تسلی کے لیے کافی
جب تک خود ولی راضی وخوشی آ کر اپنی مرضی علیزے کے ابو کو نہیں بتائے گا، وہ کہاں یقین کریں
عرصے سے مسلسل اولاد کا دُکھ ان کو اندر سے کھوکھلا کر گیا ہے!'' انہوں نے گہری سانس بھری۔

''وہ بے حس نظر آنے والا باپ جس کو کسی سے سروکار نہ ہوتا تھا ایک دم اپنی اولاد کے لیے ا
حساس ہوگیا ہے کہ آج اُس کے غم میں ڈھے گیا، اُسے پکا یقین چاہیے۔ آپ اُسے یہ یقین دلا
گی؟'' حُسن آرا نے روشن آرا کے سامنے ایک مشکل سوال رکھا۔

''لیکن جن کے دل صاف ہوتے ہیں، اُن کے لیے کوئی چیز ناممکن اور مشکل نہیں ہوتی۔'' روش
بیگم کو ایک پَل سے بھی کم عرصہ لگا تھا فیصلہ لیتے ہوئے۔

''ٹھیک ہے اگر ایسی بات ہے تو یہ یقین میں بھائی صاحب کو ضرور دلاؤں گی انشاء اللہ تعالیٰ!''
آرا بیگم نے ٹھوس لہجے میں کہہ کر حُسن آرا بیگم کے مردہ وجود میں زندگی پھونک دی تھی۔

❖❖○❖❖

''تم کچھ کہتی کیوں نہیں ہو؟ پلیز کچھ تو بولو، تمہاری تکلیف میرے اندر آگ لگا دیتی ہے جانے
کیوں مجھے اپنے اور تمہارے درمیان رشتہ سا محسوس ہوتا ہے، تم میرے نصیب میں نہیں ہو یہ میں ج
ہوں پھر بھی میرا دِل تمہاری جانب کیوں کھنچتا ہے، تمہاری تکلیف پر کیوں تڑپتا ہے؟'' سمعان کتنی د
چپ چاپ ٹکر ٹکر دیکھتی مسکان سے باتیں کر رہا تھا۔

پہلے پہل وہ مایوس ہونے لگا تھا لیکن پھر ڈاکٹر اکرم زبیر نے اُس کو حوصلہ دیا تھا کہ وہ سُن سکتی
سمجھ بھی رہی ہے لیکن اپنے خول سے باہر نہیں آ رہی، صرف ہمارا Concern اُسے اِس خول س
نکالے گا اس لیے ایک گھنٹہ سید سرفراز بھی روز مسکان کے ساتھ گزارنے لگے تھے اُس کے بچپن کی
چھوٹی باتیں دہراتے، اسی طرح آپا امّاں بھی گھنٹوں مسکان سے باتیں کرتی تھیں یہی حال سمعا
وہ بھی مسکان کے پاس وقت گزارا کرتا تھا۔

اُسی وقت موبائل کی بیپ نے سمعان علوی کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

''السّلام علیکم ڈیڈی حضور!'' سمعان نے کچھ شوخی سے کہا۔ قاسم علوی صرف اُس کے باپ
دوست بھی تھے۔

''کدھر ہو جناب عالی۔'' قاسم علوی نے پوچھا۔

''کدھر! اُدھر اپنی چندا کے پاس؟'' قاسم علوی کی شوخ شرارت سمعان کا دِل اُداس کر گئی۔ مسکان تو
ں کے ہاتھ آنے سے پہلے ہی کھو گئی تھی۔

''جی!'' سمعان نے مختصراً کہا۔

''تو کیا ہمیں نہیں ملواؤ گے اس سے جو ہمارے اتنے شاندار بیٹے کے دِل میں آن بسی ہے۔'' سمعان
لی سی ہلکی ہنس دیا۔

''ڈیڈی! ابھی تو وہ خود بھی خود سے بچھڑی ہوئی ہے آپ سے اُسے کیا ملواؤں؟'' سمعان نے سوچا۔

''کم آن ینگ بوائے! بار بار کدھر کھو جاتے ہو۔'' قاسم علوی نے فون پر ہی اُس کی کیفیت کو محسوس
لیا تھا۔

جو لوگ آپ کے اندر بستے ہوں، آپ چاہے کتنے ہی فاصلے پر بیٹھے ہوں وہ دِل کا حال فوراً جان
لیں۔ قاسم علوی بھی تو سمعان کے اندر بستے تھے سمعان کی ہر ہر ادا اُن کے فنگر ٹپس پر رہتی تھی۔

''کہیں نہیں پاپا! میں نے کہاں کھونا ہے!'' سمعان نے اپنی آواز کو بشاش بنانے کی کوشش کرتے
ہوئے کہا۔

''تو پھر ریڈی ہو جاؤ ہم تمہاری ''گولڈن گرل'' کو ملنے آ رہے ہیں۔'' قاسم علوی نے سمعان علوی
سرپرائز دیا۔

''مطلب؟'' سمعان نے پوچھا۔

''مطلب تم دس تک گنو، میں تمہارے لیے ایک سرپرائز بھی لا رہا ہوں۔'' قاسم علوی آج سمعان کو
ہر طرح سرپرائز کرنے کے موڈ میں تھے۔

''پاپا پلیز! پہلے میری بات تو سنیں۔'' سمعان اُن کو کچھ بتانا چاہ رہا تھا لیکن وہ ان سنی کر کے فون بند
کر چکے تھے۔

جس گولڈن گرل کا وہ قاسم علوی سے ذکر کر چکا تھا مسکان تو اس وقت اُس کی ایک پرچھائیں بنی
پڑی تھی۔ سمعان نے بے اختیار گہرا سانس بھرا۔

''سرپرائز!'' قاسم علوی زبیدہ بیگم کا ہاتھ تھامے اندر داخل ہوئے، سمعان نے ہاتھ اونچے کر کے بے
ں سا طویل سانس لیا۔

''ارے! تم ہمارے آنے پر خوش نہیں ہوئے؟'' قاسم علوی نے سمعان سے کہا۔

''پاپا! آپ ممی کو یہاں کیوں لائے؟'' سمعان نے زبیدہ بیگم کو کندھوں سے تھام کر کرسی پر لا بٹھایا، وہ
کسی موم کی گڑیا کی طرح چپ چاپ بیٹھ گئیں۔

''کیوں! نہیں لانا چاہیے تھا۔'' قاسم علوی نے الٹا اُس سے سوال کر دیا۔

''پاپا! زبردستی کی مہمان نوازی کروانے کا موڈ ہے کیا؟'' وہ اپنے باپ سے ایسا ہی فرینک تھا۔

''آف کورس! اچھا کہاں ہے تمہاری گولڈ گرل!'' قاسم علوی نے مسکان کی جانب بڑھتے ہوئے
پوچھا۔

''السلام علیکم بیٹا۔'' انہوں نے حسب عادت تکلف کی پہلی دیوار پھاند لی تھی۔

''مائی گارڈ! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم کو بھی کوئی اتنی پیاری لڑکی مل سکتی ہے۔'' قاسم علوی نے شرارت سے سمعان سے کہا۔

''کیوں زبیدہ! دیکھو کتنی پریٹی ہے نا؟'' زبیدہ نے مسکان کو خالی نظروں سے دیکھ کر سر ہلایا۔

سمعان کے دِل کو ایک دم سے کچھ ہوا، اُس کے باپ نے ساری عمر ایک پتھر اور روبوٹ نما عورت کے ساتھ گزار دی، جو اُن کے احساسات کو کبھی پذیرائی نہ دے سکی تھی۔

''مائی گاڈ! مسکان اور ممی کے چہروں میں کس قدر مماثلت تھی چپ چاپ ... گم سم! اجنبی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے، کیا میں اپنے باپ کی طرح اتنی بہادری سے جی سکتا ہوں؟'' اُس کے اندر سے سوال اُٹھا۔

''نہیں! میں ایسا کبھی نہیں کر پاؤں گا، مجھے تو زندگی سے بھرپور وجود کی ضرورت ہے جو میری برسوں کی پیاس بجھادے، اس ویرانے جیسے دِل کو زندہ کردے، محبت کی قبر پر راکھ ہوئی عورت ساری زندگی قبر کی مٹی کی طرح رہتی ہے وہ کبھی کسی کو کچھ نہیں دے سکتی۔'' سمعان نے ایک نظر مسکان پر ڈالی۔

وہ اُسے جان سے زیادہ عزیز تھی لیکن کیوں اس کا دِل اُس کی خاطر رکنے اور جوگ لینے کو تیار نہ تھا وہ پرائی امانت ہی محسوس ہوتی تھی وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ احساس اُس پر کیوں اُترا تھا لیکن یہ بالکل الگ احساس تھا، جو اَن جانے میں بہت ساری حقیقت اُس پر واضح کر گیا تھا۔

''تمہاری گولڈن گرل بولتی نہیں۔'' قاسم علوی نے پریشانی سے پوچھا، سمعان اُن کو اِس پریشانی میں بالکل نہ دیکھ سکتا تھا۔

''پاپا! شی از مائی بیسٹ فرینڈ! بٹ شی از ناٹ مائی گولڈن گرل۔'' سمعان نے کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔ سمعان کو حیرت ہو رہی تھی کہ یہ سب کچھ وہ کہہ رہا تھا۔

''تو پھر کہاں ہے تمہاری ''گولڈن گرل؟'' قاسم علوی نے اس سے سوال کیا۔

سمعان کی آنکھوں کے سامنے ایک دم معصوم اور بے حد سادہ سی سائرہ کا چہرہ لہرا گیا، اس کو بس ایک پَل کو حیرت کا سامنا کرنا پڑا پھر اسموک اسکرین ایک دم سے صاف ہوگئی۔ برسوں کی خاموش محبت ایک دم پردہ پھاڑ کر سامنے آ کر اپنا وجود منوا گئی تھی۔

''اُس کا نام سائرہ ہے!'' سمعان کے اندر تک سکون اُترا گیا اس نے مسکان کا بیڈ ایزی کر کے اس طرح سنبھال کر بیڈ پر لٹایا جیسے کسی کانچ کے کھلونے کو سنبھالتے ہیں۔ مسکان بھی روبوٹ کی مانند چپ چاپ لیٹ گئی۔

''لیکن مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے تم نے تو مجھے مسکان نام بتایا تھا۔'' قاسم علوی نے سمعان کو حیرت سے دیکھتے پوچھا۔

''پاپا! کبھی کبھی ہم اُس دروازے پر دستک کرنے دینے لگتے ہیں جو ہمارے گھر کا نہیں ہوتا لیکن اگر خوش قسمتی سے اپنے گھر کا دروازہ مل جائے تو اُسے کبھی مِس نہیں کرنا چاہیے۔'' سمعان نے کسی اسکالر کی طرح جواب دیا تو علوی صاحب نے اُس کو چونک کر دیکھا۔

''پاپا!'' سمعان نے زبیدہ کے گم سم وجود کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ ایک عظیم انسان ہیں اور میں ایک عام سا بندہ! میرے اندر آپ جیسی برداشت نہیں ہے لیکن پہلی محبت خاص ہو نہ ہو، میرا انتخاب ضرور آپ کی طرح خاص ہے۔'' سمعان کی نظروں میں سائرہ کا چہرہ اور آنکھیں گھوم گئیں۔ وہ لڑکی اُسے کس قدر محبت سے دیکھتی تھی اور اُس نے آج تک اُس کی بات کو اَون ہی نہ کیا تھا۔

''آر یو شیور! کہ تمہارا فیصلہ درست ہے؟'' قاسم علوی نے گہری سانس بھرتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں!'' سمعان نے بیڈ پر لیٹی مُسکان اور چیئر پر بیٹھی ماں کو باری باری دیکھتے ہوئے ایک طویل سانس بھر کے کہا۔

''پاپا! میرے اندر جواء کھیلنے کی ہمت نہیں۔'' سمعان نے باپ کا کندھا دباتے ہوئے بے حد یقین سے کہا۔

''بعض اوقات انسان ساری عمر سوچتا رہتا ہے اور فیصلہ نہیں کر پاتا اور کبھی کبھی صرف ایک پَل میں ہمارے فیصلے ہو جاتے ہیں، ایسے فیصلے عموماً ننانوے فیصد درست نکلتے ہیں بیٹا جی!'' قاسم علوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیوں بیگم جان! آپ کا کیا خیال ہے؟'' قاسم علوی نے حسبِ عادت زبیدہ بیگم سے دریافت کیا۔ وہ جواب دیتیں یا نہ دیتیں لیکن علوی ان کو اپنی گفتگو اور فیصلوں میں ہمیشہ شامل کرتے آئے تھے یہی وجہ تھی کہ انہوں نے زبیدہ بیگم کے وجود کو آج تک زندوں میں شامل کر رکھا تھا۔

''ہاں! ٹھیک کہتے ہو تم، ہمیں درست فیصلہ کرنے میں ایک پَل لگتا ہے اور غلط فیصلے پر رونے کو ساری عمر بھی ناکافی ہوتی ہے۔'' زبیدہ بیگم ایسی ہی تھیں اپنی مطلب کی بات سنتی اور کرتی تھیں۔

''اوکے بیٹا! مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنی زندگی کا ایک اہم فیصلہ بے حد سوچ سمجھ کیا۔'' قاسم علوی نے سمعان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔

''تھینکس پاپا!'' سمعان نے کہا۔

''بیٹا! آپ کی دوست کو کیا ہوا ہے؟'' علوی صاحب نے پوچھا۔

''پاپا! آپ نے سانپ کا ڈسا ہوا انسان تو سُنا ہوگا میری اس پیاری سی، چھوٹی سی دوست کو تو انسانوں نے ڈسا ہے اس کے لیے دعا کیجیے گا کیوں کہ یہ آپ کے بیٹے کو بے حد بے حد عزیز ہے اس کی تکلیف میرے دِل کو ہمیشہ بے چین رکھتی ہے۔'' سمعان نے مسکان کو جوس پلا کر اُس کے منہ کو دھیرے سے پونچھا۔

''انسانوں کا ڈسا انسان!'' علوی کے چہرے پر دُکھ بھری مسکراہٹ آن ٹھہری، اُن کی نگاہ زبیدہ بیگم کے چہرے پر آن ٹکی تھی۔

''سانپ کا زہر تو اتنا خطرناک نہیں ہوتا، جتنا انسانوں کا، تم اپنی ماں کو ہی دیکھ لو!'' قاسم علوی نے دِل میں کہا۔

''تم ہمارے ساتھ چلو گے یا پھر رکو گے؟'' علوی صاحب نے سوال کیا۔

''میں رُکوں گا پاپا! اس کے بابا آنے والے ہوں گے وہ اِس کے پاس رکیں گے پھر میں چلا جاؤں

گا، اس کے پاس مسلسل کوئی نہ کوئی رہتا ہے۔'' سمعان نے مسکان کے ماتھے پر آئے بال سمیٹ کر کیے۔

''سمعان! تم جس طرح اس کی کیئر کر رہے ہو، جس طرح تمہارے ہاتھ، تمہارا دِل اس کی بے چینی بے چین ہے کیا یہ صرف تمہاری بیسٹ فرینڈ ہے؟'' قاسم علوی نے سوال کیا۔

''پاپا! کوئی رشتہ ہے ضرور! محبت سے بھی بڑھ کر، یہ تو میں سمجھتا تھا کہ اِس سے محبت ہے لیکن جانا کیا بات ہے کہ جب یہ پرائی ہوئی تو بھی میرے دِل کے لیے پرائی نہ ہوسکی۔'' سمعان دھیرے دھیرے بولتے ہوئے مسلسل مسکان کو دیکھ رہا تھا، جیسے کوئی سِرا تلاش کر رہا ہو۔

''اوکے! ہم چلتے ہیں۔'' علوی نے گہری سانس بھر کر زبیدہ بیگم کی جانب رخ کیا اور اُن کو ہاتھ تھام کر اُٹھالیا۔

''یہ.. یہ دونوں گھر نہیں آرہے؟'' زبیدہ بیگم ایک دم چونک کر بولیں، جیسے ابھی ابھی وہ اس کمرہ میں آئی ہوں، اُن کا کھویا دماغ جو زیادہ تر ماضی میں گھومتا تھا عموماً اسی طرح گاہے بگاہے حال سے رابطہ جوڑتا تو وہ گفتگو میں حصہ لے پاتی تھیں۔

''لے چلیں ان کو؟'' قاسم علوی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں!'' زبیدہ نے جواب دیا۔

''سمعان کا تو وہ گھر ہے اس کا کیا کرو گی؟'' علوی عموماً اِسی طرح سوال کر کے اُن کو حاضر دماغی پر مجبور کر دیتے تھے۔

''اِس کو میں اپنی بیٹی بناؤں گی۔'' زبیدہ بیگم کے سپاٹ چہرے پہ ہلکی سی کرن جیسی مسکراہٹ دَر آئی۔

''میرے پاس بیٹی نہیں ہے نا اِس لیے۔'' وہ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتیں مسکان کے قریب آ کھڑی ہوئیں، مسکان چپ چاپ سامنے دیکھ رہی تھی۔

''تم بولتی نہیں ہو نا! تم ہنستی بھی نہیں ہو! تم کو بھی کیا سید سرفراز نے دلدل میں دھکیل دیا تھا۔'' زبیدہ بیگم نے مسکان کے کان کے قریب آ کر سرگوشی کی۔

''زبیدہ! چلو گھر چلتے ہیں، اس کو کیا معلوم کہ تم کس کا پوچھ رہی ہو!۔'' قاسم علوی نے بے بس سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''رُکو نا قاسم! یہ دیکھو اِس کی آنکھیں میری طرح رو رو کر خالی ہوگئی ہیں، تمہیں یہ میرا آئینہ نہیں لگتی تمہیں یہ زبیدہ جیسی نہیں لگتی جس کی ہنسی، خواب کسی نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھین لیے۔'' زبیدہ بیگم نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

''مما! ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں؟'' سمعان ہمیشہ سے اپنی ماں کو اوٹ پٹانگ بولتے یا چپ دیکھتا آرہا تھا لیکن آج وہ ہمیشہ سے مختلف نظر آرہی تھی اسی لیے اُس نے چونک کر پاپا سے سوال کیا۔

''یہ ہمیشہ سے ایسی باتیں کرتی ہے تم فکر مند نہ ہو۔'' علوی صاحب نے سمعان کو تسلی دے کر ٹالا۔

''لیکن یہ!'' سمعان ابھی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ دروازہ کھول کر ایک قیامت اندر آئی۔

''السلام علیکم سر!''

''یہ میرے پاپا قاسم علوی اور یہ ہیں میری ماما۔'' سمعان نے اندر آنے والے سے اپنے والدین کا تعارف کروایا۔

''اور یہ ہیں مسکان کے بابا سید سرفراز۔'' سمعان نے مڑ کر علوی صاحب کی طرف دیکھا لیکن اُسے حیرانی نے آن گھیرا، قاسم علوی کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

''تم...!'' قاسم علوی باقاعدہ غرائے۔

سرفراز علی کو اس شخص کا چہرہ جانا پہچانا لگا، انہوں نے اُسے کہاں دیکھا؟

ابھی وہ پوری طرح سوچ بھی نہ پائے تھے کہ علوی کے کندھے سے جھلکتا ایک چہرہ اُن کو پتھر کا کر گیا۔

''زبیدہ!'' انہوں نے خشک ہوتے حلق کے ساتھ کہا۔

یہ چہرہ! بلال کی موت کے بعد اُن کو ہر روز ڈرانے آتا تھا۔ اپنی زیادتی کا حساب مانگتا تھا، وہ اِس سے بہت ڈرنے لگے تھے۔

''کیا یہ سچ ہے یا پھر میرا ہمیشہ کی طرح تصور؟'' انہوں نے خشک ہوتے حلق کو تھوک سے تر کرتے ہوئے سوچا۔

''سید سرفراز!'' زبیدہ بیگم کی ہمیشہ سے اجنبی اور سپاٹ نگاہیں اِس وقت شعلے برسا رہی تھیں۔

سارے درد! گزشتہ ستائیس سال کے درد... ستائیس سال کی وہ بے حسی جس نے زبیدہ بیگم کو کوئی خوشی، دکھ محسوس نہ ہونے دیا تھا کوئی رشتہ نبھانے نہ دیا تھا وہ ساری تکلیف جو خود سے بچھڑ کر انہوں نے جھیلی تھی، وہ پچھتاوا جو ستائیس سال انہوں نے بھگتا تھا ہر دُکھ، درد اور تکلیف بھرا لمحہ اُن کے چہرے اور آنکھوں میں آ کر اکٹھا ہوگیا تھا۔

وہ غصّے سے چند قدم آگے بڑھیں، سید سرفراز کو زندگی میں پہلی بار لگا کہ وہ شاید اس بار خود کو بچا نہ سکیں۔

لیکن اگلے ہی پَل زبیدہ بیگم بُری طرح لہرا کر گریں۔ سمعان اور علوی تیزی سے زبیدہ کی جانب بڑھے۔

''زبیدہ!!

زبیدہ! اُٹھو زبیدہ!'' علوی نے فکر مندی سے زبیدہ بیگم کو اُٹھانے کی کوشش کی پھر وہ ایک دم بپھرے ہوئے شیر کی مانند سرفراز علی کی جانب مڑے۔

''آج ...اگر اس کو کچھ ہوگیا تو خدا کی قسم میں تم کو نہیں چھوڑوں گا۔'' وہ غرائے۔

''ستائیس سال... ستائیس سال سے میں نے جس زندہ لاش کو سنبھال کر رکھا ہوا تھا، تمہاری وجہ سے آج اُس میں چلتی So-Called زندگی بھی منہ موڑ رہی ہے۔ میں تم کو تمہارا یہ قصور کبھی معاف نہ کروں گا، تم نے اُسے جو زخم دیا تھا اُس نے ستائیس سال اُس کی تکلیف کاٹی، اب تمہاری باری ہے سید سرفراز علی۔'' انہوں نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

''اب تمہاری باری ہے، اِسے دیکھ رہے ہو؟'' انہوں نے زبیدہ بیگم کے اُوپر جھکے ہوئے سمعان کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ ہے تمہاری ناجائز اولاد...''

''ناجائز اولاد!'' قاسم علوی نے سرفراز علی کے سر پر ایک اور بم دھماکہ کیا۔

''ہاں! وہی بچہ اور لڑکی جسے آج سے ستائیس سال پہلے تم اپنی جانب سے قتل کروا چکے تھے لیکن یہ ز
ہیں اور تم سے حساب بھی باقی ہے۔'' سید سرفراز علی کے ماتھے پر پسینہ چمکا۔

''سمعان! اُٹھاؤ اپنی ماں کو، ان کو ایمرجنسی وارڈ میں لے کر چلتے ہیں۔'' وہ اِس وقت ہسپتال میں
تھے اِس لیے سمعان نے زبیدہ بیگم کو اُٹھایا اور تیزی سے باہر دوڑا۔

قاسم علوی بھی تیزی سے اُس کے پیچھے لپکے... پھر ایک دم رُک کر سید سرفراز علی سے مخاطب ہوئے

''یاد رہے تم سے ابھی حساب باقی ہے۔'' انہوں نے انگلی اُٹھا کر کہا۔

وہ کہہ کر باہر نکل گئے جب کہ سید سرفراز علی اپنے ماتھے پر آیا پسینہ پونچھتے ہوئے کرسی پر ڈھے گئے
گہری سانس بھر کر انہوں نے سامنے دیکھا۔ اُن کے دِل کو ایک دم سے کچھ ہوا کیوں کہ مسکان سامنے
دیوار کو تکتے ہوئے مسکرا رہی تھی، اُس کی مسکراہٹ ابنارمل اور بے معانی بالکل نہ تھی۔

''تو کیا مسکان؟'' سرفراز علی کو اپنی ذات کے اونچے قلعے میں دراڑیں پڑتیں محسوس ہوئیں۔

❖❖○❖❖

''آگ لگے اِس ساری دنیا کو، مرجائیں اللہ کرے سب!'' سحرش ہر چیز اِدھر اُدھر پھینکتے ہوئے ہذیانی
انداز میں بول رہی تھی۔

مرینہ آنٹی نے پریشانی سے سحرش کو دیکھا اُن کو ڈر تھا کہ اُس کے دماغ پہ کوئی الٹا سیدھا اثر نہ
ہو جائے، جس طرح کی کیفیت سے وہ گزری تھی کوئی بھی بڑا صدمہ اُس کے لیے بے حد نقصان دہ تھا۔

''سحرش! خدا کے واسطے بیٹا خود کو سنبھالو!'' مرینہ آنٹی اُسے سنبھالتے سنبھالتے تھکنے لگی تھیں۔

''وہ.. وہ لڑکی.. طارق اُسے! اُسے کتنے پیار سے دیکھ رہے تھے، کتنے پیار سے۔'' سحرش پھوٹ پھوٹ
کر رو دی۔

''اتنے پیار سے انہوں نے کبھی مجھے نہیں دیکھا میرے لیے تو اُن کی نگاہوں میں ہمیشہ ہمدردی
اور شفقت نما پیار ہوتا تھا جیسے کسی بچے کو بہلانے کے لیے دیا جاتا ہے۔''

''آنٹی! طارق صرف میرے ہیں۔ میں اُن کو کسی کو چھیننے نہیں دوں گی۔'' وہ ایک دم بُری طرح چیختے
ہوئے بولی۔

مرینہ آنٹی نے سہم کر اُسے دیکھا۔

''میں طارق کو اور خود کو شوٹ کرلوں گی لیکن اسے کسی اور کے حوالے نہیں کروں گی... نہیں کروں گی۔''
سحرش نے ایک بار پھر چیخ کر کہا اور اپنے کمرے میں جا کر دھڑ سے دروازہ بند کرلیا۔

مرینہ آنٹی نے ایک گہری تاسف بھری سانس بھری، وہ فی الحال سحرش کے پیچھے نہ گئی تھیں کیوں کہ
ابھی ابھی جو کچھ سحرش بول کر گئی تھی اُس لحاظ سے سحرش طارق سے حساب لیے بغیر خود کو کچھ نہیں کرنے
والی تھی۔

''لیکن جب طارق آئے گا تو پھر کیا ہوگا؟'' یہ سوال کسی بھوت کی طرح اُن کو ڈرا رہا تھا، اُن کے دل
کو

اُبھار رہا تھا۔

❖❖○❖❖

''آج آپ کو ہسپتال سے چھٹی مل جائے گی بھائی لیکن مجھے کب چھٹی ملے گی؟'' آصف نے طارق
کے سامنے آ کر پوچھا۔ طارق نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں آصف کو دیکھا۔

''مطلب؟'' طارق نے پوچھا۔

''صدقے جاؤں، قربان جاؤں سر جی آپ کے۔'' آصف نے باقاعدہ زچ ہو کر کہا۔

''سر جی! شوٹنگ میں یادداشت تھوڑی سی کم ہو جاتی ہے اور اگر کم ہوگئی ہے تو میں ہی بتا دیتا ہوں،
میری تو جان پر بن آئی ہے ایک عدد لڑکی کو میرے گھر چھوڑ رکھا ہے اوپر سے میرے ابا جی شہر آرہے ہیں
آنکھوں کا چیک اپ کروانے، سر جی میرا یقین مانیے اُن کی نظر کتنی بھی کمزور کیوں نہ ہو خ وہ ہم بھائیوں
کے آس پاس لڑکی سونگھ کر بھی پکڑ لیتے ہیں اس لیے برائے مہربانی وہ مدعا تو میرے گھر سے واپس
لے جائیں۔'' مدعا وہ عظمیٰ کو کہہ رہا تھا یہ وہی لڑکی تھی، جس کی بازیابی کے دوران طارق زخمی ہوگیا تھا۔

''لڑکی کے والدین نے اس کی گمشدگی کی رپورٹ تھانے میں لکھوائی تھی اس لیے تمہیں فوراً اُن سے
رابطہ کرنا تھا۔'' طارق نے فوراً حل پیش کیا۔

''لے کر گیا تھا سر جی میں لڑکی کو اُس کے گھر! لیکن اس کے والدین نے اُس رسوائی کو قبول کرنے
سے صاف انکار کر دیا۔ لڑکی کی اپنی دلی و ذہنی حالت بھی بہت بُری ہے، وہ چوبیس میں ساڑھے تیئس گھنٹے
رو کر گزارتی ہے اب بتایئے اُس لڑکی کا کیا کرنا ہے کہاں بھجوانا ہے؟ میرے تو ابا جی گاؤں سے آرہے
ہیں، میں مزید اُسے گھر نہیں رکھ سکتا۔'' آصف نے ہر بات کی وضاحت کرتے ہوئے اپنی مجبوری بتائی۔

''اوہ!'' طارق نے گہری سوچ میں ڈوبتے ہوئے کہا۔

''جی!'' آصف ہمہ تن گوش تھا کہ مزید کیا حکم ملتا ہے۔

''تم اُس کو روز دیکھتے ہو، کیسی لڑکی ہے؟'' طارق کا سوال آصف کو حیران کر گیا۔

''اچھی ہے، خوب صورت ہے۔'' آصف نے سچائی سے جواب دیا۔

''تمہیں کیسی لگتی ہے؟'' بھلا یہ کیا سوال ہوا۔ طارق کے سوال پر آصف نے زچ ہو کر اُسے دیکھا۔

''سر جی! بھلے گھر کی لڑکی ہے، بے شک وہ وقتی طور پر بہک گئی تھی لیکن میں نے اپنی اِس نوکری میں
رہتے ہوئے یہ تو سیکھ ہی لیا ہے کہ کھرا کیا ہے، کھوٹا کیا ہے۔ وہ نہ صرف بے حد معصوم ہے بلکہ بے داغ
بھی ہے اور میں اپنے دل میں اُس کے لیے ہمدردی محسوس کرتا ہوں کہ لڑکی ذات ہو کر وہ اپنی چار
دیواری سے محروم ہوگئی... اللہ جانے اب قسمت اُس کے ساتھ کیا سلوک کرے۔'' آصف کو طارق کی ہر
بات پر تفصیلی رپورٹ دینے کی عادت تھی۔ اِس پَل بھی وہ عظمیٰ کے متعلق بالکل رپورٹنگ کے انداز میں
گفتگو کر رہا تھا۔

''سنو آصف! اگر ہم لڑکی کو دارالامان بھجواتے ہیں تو مجھے ساری عمر دکھ رہے گا کہ جس لڑکی کو گندگی
سے نکالنے کے لیے ہم تینوں نے اپنی جان خطرے میں ڈال دی تھی اُسے ہم یوں لاپروائی سے دنیا کے
حوالے اور بھیڑیوں کی نظروں کا شکار ہونے کے لیے اس طرح لاوارث چھوڑ دیں۔ دوسرے ہماری

زندگیاں اتنی غیر اہم نہیں ہیں کہ لڑکی کو صرف دارالامان میں ڈالنے کے لیے رسک میں ڈالی جائیں۔" طارق نے اپنی بات کو درمیان میں روک کر آصف کی جانب دیکھا۔

''مطلب سر؟'' آصف پوچھے بغیر نہ رہ سکا لیکن طارق کے گھورنے پر فوراً بولا۔

''جی.. جی سر! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''تو پھر تمہارا کیا خیال ہے اُس لڑکی کو مکمل تحفظ نہ دے دیا جائے؟'' طارق نے پوچھا۔

''بالکل سر!'' آصف نے زور زور سے سر ہلا کر جواب دیا۔

''تو پھر آصف! تم اس لڑکی سے شادی کرلو!'' طارق نے عام سے لہجے میں کہہ کر بم پھوڑا۔

''جی؟'' آصف کی حیرت سے آنکھیں کھل گئیں۔

''کیوں! تمہیں وہ اچھی نہیں لگتی؟'' طارق نے سوال کیا۔

''یہ بات نہیں ہے سر!''

''وہ! میں برادری والا ہوں، میرے والد صاحب تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہماری اِس عمر میں بھی ا... کردیتے ہیں، وہ کہاں مانیں گے اِس رشتے پر۔'' آصف نے سچائی سے کہا۔

''میں صرف تم سے پوچھ رہا ہوں، کیا تم اس رشتے پر راضی ہو، تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں؟'' طارق نے اُسے باقاعدہ گھیرا۔

''پلیز سر! میں کیسے... اُس سے؟'' آصف بوکھلا گیا۔

''آئی وانٹ اونلی یور آنسر!'' طارق نے انگلی اُٹھا کر کہا۔

''مجھے اِس رشتے پر اعتراض؟'' آصف سوچ میں ڈوب گیا، دو گہری جھیل جیسی آنکھیں آنسوؤں سے جھلملاتی اس کے سامنے لہرائیں۔

بس ایک پَل لگا تھا فیصلہ کرنے میں۔

''جی مجھے اِس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں۔'' جب جب ہم کوئی فیصلہ کرتے ہیں تو اِس کے ساتھ ہوئے ہر خوف سے بھی بے نیاز ہوجاتے ہیں، یہی کچھ آصف کے ساتھ ہوا۔

''آصف! آئی ریئلی پراؤڈ آف یو!'' طارق نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر خود سے لگالیا۔

اگر میری کوئی کمٹ منٹ نہ ہوئی ہوتی تو میں بھی کسی ایسی ہی لڑکی کی زندگی کا سہارا بننا پسند کرتا" طارق نے سچائی سے کہا۔ یہ اور بات تھی کہ طارق نے آج تک کسی کو نہ بتایا تھا کہ وہ ایک ایسی ہی لڑکی کا سہارا بن چکا ہے۔

''اِٹس مین کہ آپ کسی سے کمیٹڈ ہیں۔'' آصف نے شوخی سے پوچھا۔

''یس!''

نگی کے اصرار کے بعد طارق کا دل ویسے ہی ہر وقت پَر لگائے اُڑنے لگا تھا ہر وقت چھپا کر رکھے ہوئے جذبے کو طارق نے خوش دلی سے عیاں کیا۔

''کون ہے وہ خوش قسمت جو اِس پارس کی زندگی میں قدم رکھ رہی ہے۔'' آصف نے بے حد عقیدت بھری نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے دیکھا ہے اُسے!'' آصف نے مسکرا کر کہا۔

''اگر میں غلط نہیں ہوں تو احمد شاہ فیملی کا یہ گوہر نایاب ہے، جو آپ کی آنکھوں کی روشنی بنا ہے۔'' آصف کے ذہن میں نگی کا فکر مند چہرہ گھوم گیا۔ رات وہ طارق کی بہن کے ساتھ جاگی تھی۔

''بالکل درست!'' طارق مسکرایا۔

''السلام علیکم لالہ!'' سائرہ نگی اور روشن آرا بیگم کے ساتھ داخل ہوئی۔ طارق کے چہرے کے رنگ دیکھ کر کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ اُس کا دِل کس کے لیے دھڑکتا ہے۔

''چلیں جناب! اب گھر تشریف لے جانے کی تیاری کریں۔'' سائرہ نے طارق کا پیک سامان آصف کو گاڑی میں رکھنے کے لیے دیتے ہوئے کہا۔

''میں خود بہت اُکتا چکا اِس ہسپتال سے۔'' طارق نے بیزاری سے کہا۔

''حیرت ہے اتنی پیاری اور دِل پسند اٹینڈنٹ کے ہوتے ہوئے بھی ایسے بیانات دیے جارہے ہیں۔'' سائرہ نے شوخی سے طارق کے پاس آکر سرگوشی کی۔

طارق کھل کر مسکرایا۔

''کیسے ہو بیٹا! کیسا محسوس کررہے ہو؟'' روشن آرا بیگم نے پوچھا۔

''الحمدللہ! بے حد اچھا محسوس کررہا ہوں۔'' طارق نے جواب دیا۔

''تم گھر چلو، شہباز بھائی تمہاری صحت کی خوشی میں فنکشن کرنا چاہتے ہیں اس کے علاوہ بھی ایک گڈ نیوز تمہاری منتظر ہے۔'' روشن آرا بیگم نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' طارق کو بے حد تجسس ہوا کیوں کہ روشن آرا آنٹی نے آج تک اس طرح کا سسپنس پھیلایا ہی نہ تھا۔

''ولی کا نکاح ہونے جارہا ہے۔'' روشن آرا بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مطلب! ابھی تو ولی کا سمسٹر مکمل نہیں ہوا نا!'' طارق نے پوچھا۔

''ہاں! لیکن انور بھائی کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے ہمیں یہ فیصلہ لینا پڑا، عبدالولی اپنی ایگزامینیشن کے فوراً بعد آرہا ہے۔ تقریباً دو ہفتوں کے بعد! تو انشاء اللہ یہ کام بھی انجام بخیر پائے گا۔'' روشن آرا بیگم کے چہرے پر بے حد خوشی نمایاں تھی۔

''واؤ! کتنا مزہ آئے گا...'' سائرہ نے خوشی کا اظہار کیا لیکن اس کی نگاہوں میں مسکان کا بے روح چہرہ گھوم گیا وہ تکلفاً بھی نہ مسکرا سکی۔

''مبارک ہو آنٹی آپ کو!!'' طارق نے مسکرا کر اُن کو مبارک باد دی۔

''خیر مبارک بیٹا! اللہ تمہیں بھی دین و دنیا کی خوشیاں عطا فرمائے۔'' روشن آرا بیگم نے حسبِ عادت دعا دی۔

''انور صاحب کو کیا ہوا؟'' طارق نے پوچھا۔

''اُن کی طبیعت خراب ہوگئی تھی، اٹیک ہوا تھا۔'' روشن آرا بیگم کا موڈ کوئی بات سوچ کر بے حد خراب ہوگیا۔

''ایک عاقبت نااندیش شخص کی وجہ سے دو گھرانوں کے تعلقات اور ایک شخص کی زندگی داؤ پر لگ گئی۔''

''اوہو!!

''چلیں اللہ کی ذات اُن پر اپنا کرم کرے اور اُن کو صحت زندگی عطا کرے، اللہ کی ذات جو کرتی ہے بہتر ہی کرتی ہے۔ شاید ولی کا نکاح اِسی طرح ایمرجنسی میں ہونا تھا۔'' طارق نے کہا۔

''ہاں بیٹا! ہم ارادے باندھتے ہیں، فیصلے کرتے ہیں لیکن ہوتا وہی ہے، جو اللہ رحمٰن کو منظور ہوتا ہے اس لیے ہمیں ہمیشہ اُس کی رضا پر راضی ہونا سیکھنا چاہیے کیوں کہ وہ جو کرتا ہے اُس میں بڑی مصلحت ہوتی ہے وہی ہم سب کے لیے بہترین ہوتا ہے۔'' روشن آرا بیگم نے بہت بڑی بات کہی تھی۔

''بالکل! آپ ٹھیک کہتی ہیں انسان تو ارادے ہی باندھتا رہ جاتا ہے۔'' طارق کی نگاہوں میں سحرش کا چہرہ گھوم گیا۔ کیا وہ سوچ سکتا تھا کہ سحرش بھی اُس کی زندگی کا اہم ترین حصہ بن سکتی ہے۔

طارق کو ایک دم سحرش یاد آئی۔ اس کو حیرت کے ساتھ ساتھ دُکھ بھی تھا کہ وہ اتنے دِن کیسے اپنی ذمہ داری سے لاپروا رہا۔ نگینہ کی موجودگی اُس کے پاس کسی روشنی کی طرح رہی تھی تب ہی تو سحرش کا جاگتا وجود پر چھائی بن گیا تھا۔ طارق کو ایک دم سحرش کا خیال آیا اور پھر بے چین کر گیا۔

''وہ لڑکی! جس کا سینٹر آف سرکل اینڈ لائف اُس کی خود کی ذات تھی، اُس کے بِنا سحرش کا کیا حال ہوگا۔''

طارق کے دل فوراً نے کہا کہ وہ اُڑ کر سحرش کے پاس پہنچ جائے، احساس جرم تھا کہ بے چینی بڑھاتا جا رہا تھا۔

''سائرہ! میں گھر جانے سے پہلے آفس کا ایک چکر لگانا چاہتا ہوں۔'' طارق نے آصف کے سہارے گاڑی کی جانب جاتے ہوئے ایک دم کہا۔

''کیا! پاگل ہوگئے ہیں لالہ! گھر میں ابو جی اتنی شدت سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں، ویسے بھی ابھی آپ کی حالت نہیں ہے کہیں آنے جانے کی؟'' سائرہ نے بڑی بوڑھیوں کی طرح طارق کو ڈانٹا۔

''دادی اماں! پلیز میری مجبوری سمجھو، میرا جانا بے حد ضروری ہے۔'' طارق نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

''پھر میرے ساتھ یہ نوجوان ہے نا۔'' طارق نے آصف کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ میرا خیال رکھے گا، میں زیادہ وقت نہیں لگاؤں گا لیکن میرا جانا بے حد ضروری ہے۔'' طارق نے سائرہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے دھیرے دھیرے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اور ابو؟'' سائرہ بے قراری سے بولی۔

''لو یہ بھی میں بتاؤں؟ میں اپنی پیاری سی گڑیا کو کیوں سمجھا رہا ہوں۔'' طارق نے یہ ذمے داری بھی سائرہ کے سر ڈال دی۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' نگینہ نے بھی پاس آ کر طارق سے پوچھا جو آصف کی گاڑی میں بیٹھا تھا۔

''بس تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔'' طارق نے نگینہ کا ہاتھ دبا کر اُسے تسلی دی۔

''لالہ! ابو بہت ناراض ہوں گے۔'' سائرہ نے کہا۔

''پلیز! میری پیاری بہنا! تم تھوڑی دیر کو سنبھال لینا۔'' طارق نے سائرہ کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھ دیا۔

''نگی! تم اور سائرہ گھر چلو، میں بھی بس آ رہا ہوں۔'' طارق نے مسکرا کر نگی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''او کے!'' سائرہ نے طویل سانس بھرا۔

وہ جانتی تھی اُس کا بھائی اپنے کام کے معاملے میں بے حد کریزی ہے، وہ جائے بغیر نہیں مانے گا اس لیے اس نے نہ چاہتے ہوئی بھی طارق کو جانے دیا۔ طارق کی نظریں مسلسل نگی کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ آصف نے طارق کی نظروں کے محور کو دیکھا اور چپکے سے مسکرا دیا۔

''سر! ایسا کیا ضروری کام ہے، ابھی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' آصف نے گاڑی کو احتیاط سے سڑک پر ڈالتے ہوئے طارق سے پوچھا۔

''آصف! ہم آفس نہیں جا رہے، مجھے کہیں اور جانا ہے بے حد ضروری کام ہے اس ایڈریس پر۔'' اس نے بِنا کسی بحث اور سوال کے گاڑی دوسرے راستے پر ڈال دی۔

طارق نے جیب سے موبائل نکالا اور اُسے آن کیا اتنے دن سے موبائل بند پڑا تھا، آج بھی اسے سائرہ ہی گھر سے چارج کر کے لائی تھی۔

''السلام علیکم آنٹی!'' طارق نے مؤدبانہ انداز سے کسی کو سلام کیا۔

''آنٹی! میں گھر جانے سے پہلے اِدھر سے چکر لگاتا جاؤں گا صرف دس منٹ کے لیے، اس لیے اُسے بتا دیجیے گا، میں یہاں رک نہیں پاؤں گا... گھر میں سب میرا انتظار کر رہے ہیں۔''

''بس میں آ رہا ہوں کوئی سات آٹھ منٹ میں ... او کے اللہ حافظ!'' طارق نے کسی کو اپنے آنے کی اطلاع دی۔

اور جیسے ہی گاڑی آصف نے ایک بڑے سے بنگلے کے سامنے روکی۔ چوکیدار نے گیٹ سے باہر منہ نکال کر اُن کو دیکھا پھر تیزی سے گیٹ کھول کر سلام کیا۔

آصف نے گاڑی بڑے سے پورچ میں لے جا کر کھڑی کی تو سامنے سے ایک لڑکی تیزی سے دوڑتی ہوئی اُن کی جانب بڑھی، آصف نے طارق کو سہارا دے کر باہر نکالا ہی تھا کہ وہ لڑکی سیدھی طارق کے سینے سے آ لگی اور اُس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

''آپ! ٹھیک ہیں نا؟'' سحرش ہر ناراضی بھلائے بچوں کی طرح طارق سے لگی پوچھ رہی تھی جب کہ طارق اُسے تسلی دے رہا تھا اور... اور آصف کی آنکھیں حیرت اور پریشانی سے پھٹ رہی تھیں۔

''میری نگی کے ساتھ کمٹمنٹ ہے۔'' طارق کا جملہ آصف کے کانوں میں گونجا۔

''یہ...؟'' آصف پوچھے بِنا نہ رہ سکا۔

وہ اُس لڑکی کو پہچان گیا تھا۔ آج سے تین سال پہلے انہوں نے اس لڑکی کو تقریباً مردہ حالت میں ... اب کیا تھا۔

''سر! یہ وہی لڑکی تھی، جسے مارک کے گروہ نے بری طرح بے آبرو کر کے بُری حالت میں اُسے ایک ویرانے میں پھینک دیا تھا۔''

''یہ میری بیوی ہے آصف!'' طارق کے الفاظ تھے کہ بم! آصف تو پورا کا پورا ہل گیا۔

''کیا...؟'' آصف کے منہ سے حیرت سے نکلا۔

''ہاں!'' طارق نے اقرار کیا۔

''لیکن یہ!'' آصف کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''اِس کی حالت عظمٰی سے بُری تھی لیکن دیکھو یہ بھی زندگی کی طرف پلٹ آئی، اب تمہیں بھی اپنا فرض نبھانا ہوگا۔'' طارق نے دھیرے دھیرے اُسے کچھ سمجھانے کی کوشش کی، اور اگر طارق منہ سے نہ بھی کہتا تو آصف طارق کی آنکھوں سے سب پڑھ سکتا تھا۔

''لیس سر! انشاء اللہ!'' آصف نے طارق کو یقین دہانی کروائی۔

آصف کی نظروں میں طارق کا مقام پہلے سے بھی زیادہ بلند ہوگیا تھا۔

❖❖❖○❖❖❖

''یہ کدھر کی تیاریاں ہیں بڑے بھائی!'' عبداللہ نے ولی کو پیکنگ کرتے دیکھ کر کہا۔

''پاکستان کی!'' ولی نے آج کی ہوئی شاپنگ کو الگ کرتے ہوئے کہا۔

''ہیں! لیکن آپ کا سمسٹر...اور ایگزیمینیشن اُس کا کیا ہوگا؟'' عبداللہ نے پریشانی سے پوچھا۔

''وہ دے کر ہی جاؤں گا۔'' ولی نے نہایت اطمینان سے کہا۔ اپنے کالج میں اُسے پریشر میں کام کرنے کی ٹریننگ تھی۔ لوڈ آف ورک کبھی اُس کی کوالٹی آف ورک پر فرق نہ ڈالتا تھا۔

''ویسے خیریت ہے، جو یوں پاکستان اچانک جا رہے ہیں؟'' عبداللہ نے ولی کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں! میرا نکاح ہے۔'' ولی نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا، وہ جانتا تھا عبداللہ اتنی بڑی خبر چھپانے پر ناراض ہوجائے گا۔

''آپ نے یہ بات مجھ سے کیوں چھپائی؟'' عبداللہ نے ناراضی سے پوچھا۔

''یار! تم اپنے گھر کی شفٹنگ اور فیملی کو سیٹل کرنے میں مصروف تھے میں نے سوچا تم آ جاؤ گے تو تمہیں بتا دوں گا۔'' ولی نے سچائی سے کہا۔

''بہت بری بات ہے بڑے بھیا! میں آپ کو بڑا بھائی کہتا ہی نہیں سمجھتا بھی ہوں۔ آپ کی زندگی کی اتنی بڑی خوشی اور آپ نے مجھے جھوٹے منہ بھی پاکستان چلنے کو نہیں کہا۔'' عبداللہ نے سچ مچ ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

ولی نے حیرت سے عبداللہ کو دیکھا۔ وہ واقعی ولی کے معاملے میں بہت سنجیدہ رہنے لگا تھا، پل پل اُس کا خیال کرتا تھا، ولی جہاں ہوتا اُس کا پیچھا کرتا تھا۔

''تم! تم اگر میرے ساتھ پاکستان چلو گے تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔'' ولی نے اُس کے پاس آ کر کہا۔

''میں تو تمہاری فیملی کمٹ منٹ کی وجہ سے تمہیں دعوت دینے سے رک گیا تھا۔'' یہ سچائی بھی تھی کیوں کہ عبداللہ نے ایک بار ولی کو بتایا تھا کہ اُس کے والدین پاکستان جانے سے کتراتے ہیں۔

''اگر آپ کہیں تو میں ضرور چلوں گا بلکہ میری خواہش بھی ہے کہ میں آپ کے ساتھ پاکستان جاؤں۔'' عبداللہ نے کہا۔

''اور تمہاری فیملی؟'' عبدالولی نے سوال کیا۔

''ایک بار آپ امی اور پاپا سے مل لیں گے تو مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے آپ کے ساتھ پاکستان جانے کی اجازت دے دیں گے۔'' عبداللہ نے بے حد یقین سے کہا۔

''اِس لیے آپ فوراً میرے ساتھ گھر چلنے کی تیاری کریں میں تو ویسے بھی آج آپ کو ہی لینے آیا تھا کیوں کہ میں امی اور زہرہ کے سامنے آپ کا اس قدر ذکر کرتا ہوں کہ آج انہوں نے بے حد اصرار سے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ ڈنر ہم گھر میں ہی کریں گے۔'' عبداللہ کی یہ پرانی عادت تھی کہ وہ ہمیشہ اپنا پروگرام ترتیب دیتا اور دوسروں کو صرف اطلاع دینے آتا تھا۔

''یار! آج مجھے ڈارک روم میں بہت سارا کام کرنا ہے تم نے پہلے مجھ سے پوچھ لینا تھا۔'' ولی کہے بنا نہ رہ سکا۔

''پہلے میں نے کبھی آپ سے پوچھا ہے؟'' عبداللہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''وہ بے چاری لنڈا میرا انتظار کرتی رہے گی ہو سکتا ہے مجھے گالیاں بھی دیتی رہے، آج مجھے اُسی کے ساتھ ڈارک روم میں کام کرنا تھا۔'' لنڈا، ولی کی گروپ فیلو تھی اور یہ اسائنمنٹ اُن کو اکٹھی کرنے کے لیے ملی تھی۔

''آئے ہائے! چھوڑیں بھی، آپ کو کہاں صنف نازک کا خیال...اگر ہوتا تو شاید میں رعایت کر دیتا۔ ورنہ یہ آپ کا اسٹائل ہے ٹائم دے کر نو لفٹ کرانا! تو اب بھی کچھ نہیں ہوگا۔ بس آپ جلدی سے تیار ہو جائیں وہاں والدہ حضور نے میرے والد کو سارے شہر کی سیر کروا دی ہے ایشین سبزیاں اور مصالحے خرید کر لانے کے لیے۔ اگر ہم دیر سے پہنچے اور اُن کے کھانوں کو فوراً جا کر شرف قبولیت نہ بخشا تو میری شامت آ جائے گی۔'' عبداللہ نے مسخرے پن سے کہا۔

''یار اتنی اچھی اردو بولتے ہو یقین ہی نہیں آتا کہ تم کبھی پاکستان نہیں گئے۔'' ولی نے تیار ہوتے ہوئے کہا۔

''بڑے بھائی! آپ ہمارے گھر چل کر دیکھیں، آپ کو اس انگریز ملک میں مکئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ کی اپنائیت نہ ملی تو میرا نام بدل دیجیے گا۔'' عبداللہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یار! میرا دل کر رہا ہے کہ آنٹی اور بہنا کے لیے کوئی تحفہ لے کر چلوں، تم بتاؤ اُن کو کیا پسند ہے؟'' اُس نے عبداللہ سے پوچھا۔

عبداللہ نے ایک دم چونک کر ولی کو دیکھا۔

''اوہو... فارمیلٹرز!'' عبداللہ نے کہا۔

''نہیں یار! سچ.. میں کچھ لے کر جانا چاہتا ہوں یہ میرے دل کی خوشی ہے۔'' اُس نے عبداللہ سے کہا۔

''تو پھر آپ وہ کپڑے پہن جائیں جو پاکستان میں آپ نے پہنے ہوں لیکن اُن کی دھلائی نہ کی ہو۔ میری ماں کو اپنے وطن کی خوشبو اور مٹی سے عشق ہے، اُس کے لیے ہر پاکستانی کسی بھی پیر سے کم نہیں۔'' عبداللہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

ولی نے غور سے عبداللہ کو دیکھا اور دھیمے سے مسکرادیا اور اپنے کمرے سے ایک پینٹنگ اُٹھالایا۔ دراصل اُس کے زمانۂ طالب علمی کی تھی، اُس نے اس پر کلچرل کمپوزیشن پن اینڈ انک سے بنائی تھی۔ یہ ایک گاؤں کے گھر کا منظر تھا جس کے پس منظر میں کھیت اور کچے گھر تھے جس کے فرنٹ پر کھلا صحن تھا۔ ایک بوڑھی ماں گندم صاف کررہی تھی جب کہ چارپائی پر ایک آدمی بیٹھا کھانا کھارہا تھا اور اُس کی بیوی اسے رنگین پنکھا جھل رہی تھی، چارپائی پر ہی اُن کا گود کا بچہ بیٹھا تھا۔ نیچے اسٹیل کا گلاس رکھا تھا۔ صحن کے ایک حصے میں مرغیاں دانہ چگ رہی تھیں کمپوزیشن میں ہلکی سی جھلک بکری اور بھینس کی بھی تھی اور اُن کی ایڈیشن ہاف میں تھی جو کمپوزیشن کو مزید خوب صورت بنارہی تھی۔ اس کمپوزیشن کو ولی نے اس خوب صورتی سے پورٹریٹ کیا تھا کہ ایک ہی منظر میں کتنے ہی منظر بول رہے تھے یہ اُس کی بہترین پینٹنگ تھی جس پر اُسے پرائز بھی ملا تھا، اس پینٹنگ کی ٹرانسپرنسی ایک بینک نے خرید کر اپنی ڈائری اور کیلنڈر میں استعمال کی تھی۔

''یہ میرے پاکستان کا ایک گھر ہے، یہ میں آنٹی کو گفٹ کروں گا۔ یہ وہ پینٹنگ ہے جس کو اور بھی میں کئی لوگ خریدنا چاہتے تھے لیکن میں نے اسے بہت دل سے بنایا تھا اس لیے میں نے ٹرانسپرنسی تو سیل کردیں لیکن اوریجنل کو سیل نہ کرسکا۔ آج مجھے لگا کہ اس کی اصل حق دار وہ عورت ہے جو رہتی پردیس میں ہے لیکن جیتی وہ اپنے ہی دیس میں ہے۔'' ولی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آئی ہوپ یہ اُن کو پسند آئے گی۔'' ولی نے کہا۔

''یقیناً! ٹرسٹ می! اٹس ریئلی اے بیوٹی فل گفٹ!'' عبداللہ نے ولی کا ہاتھ دبا کر اُسے یقین دہانی کروائی۔

❖❖○❖❖

''آپ ٹھیک نہیں ہوں گے تو ہم سب بیمار پڑجائیں گے خدارا جلدی ٹھیک ہوکر گھر آئیں اب سب کچھ آپ کی خواہش کے مطابق ہورہا ہے۔'' حسن آرا بیگم نے انور صاحب سے کہا۔

''حسن آرا! جانے کیوں دل کو قرار نہیں آرہا...'' انور صاحب نے اپنے سینے کو مسلتے ہوئے کہا۔

''ناشکری نہ کریں۔ اُس مولا نے سارے ہی کام سنوار دیے ہیں۔'' حسن آرا بیگم نے انور صاحب کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''خدا کی ذات مجھے معاف فرمادے اور مجھے اپنے شکرگزار بندوں میں سے کردے میں خوش ہونا چاہتا ہوں پر خوشی اندر سے پھوٹتی ہی نہیں، یوں جیسے دل کی زمین بنجر پڑگئی ہو۔'' انور صاحب نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''آپ وہم نہ پالیں اور خود کو پرسکون رکھیں انشاءاللہ سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔'' حسن آرا نے انور صاحب کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے محبت سے کہا۔

برسوں کی رفاقت میں کبھی حسن آرا گاڑی کا رواں پہیہ نہ بن پائیں اور کبھی انور صاحب! زندگی کی گاڑی ٹھیک سے چل نہ پائی تھی، بہت بار حسن آرا نے اکیلے ہی تکلیف کو جھیلا تھا۔ رفیق زندگی کا سکھ وہ کبھی نہ پاسکی تھیں لیکن آج! آج دونوں پہیے ایک دوسرے کی رمزوں کو جان کر چل رہے ہیں تو مشکل میں بھی حسن آرا کا حوصلہ بلند تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک کڑی آزمائش اور دھوپ کے بعد سایہ دے ڈالا تھا اور اب اُن کو زندگی کے دکھ بھی دُکھ نہ لگتے تھے۔

''اللہ کرے جیسا تم کہتی ہو ویسا ہی ہوجائے۔'' انور صاحب نے تکیے پر سر رکھتے ہوئے دعائیہ انداز میں کہا۔

لیکن جانے کیوں اُن کی چھٹی حس کے ریڈار پر سگنل اچھے نہ آرہے تھے۔

❖❖○❖❖

''کمال ہے امی! آپ ابھی تک کچن میں ہوئی ہیں۔'' زہرہ نے تیار ہوکر ماں کو تلاش کیا تو وہ اُس کو ابھی کچن میں کھڑی نظر آئیں۔

''بس ہوگیا۔'' انہوں نے گاجر کے حلوے کو ڈونگے میں نکال کر اُس پر پستے بادام کی ہوائیاں ڈال کر زہرہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم کوئی اچھا سا سوٹ پہن لیتیں۔'' انہوں نے زہرہ کو بلیک فل سلیو ٹاپ اور بلیک لانگ اسکرٹ جو ٹخنوں تک آتا تھا اور بلیک ہی اسکارف لیے دیکھ کر کہا۔

''امی! آپ بھی کمال کرتی ہیں، وہ عبداللہ کا دوست ہے، کوئی لڑکی تھوڑی ہے جو ڈریسنگ وغیرہ دیکھے گا۔'' زہرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن وہ پاکستان سے آیا ہے۔'' انہوں نے بہت عقیدت سے کہا۔ پاکستان اور پاکستانی اُن کے لیے سب سے زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔

''اوکے امی! پر اب دیر بہت ہوگئی! آپ بھی جلدی جلدی تیار ہوجائیں۔'' زہرہ نے ان کو ان کے کمرے کی جانب دھکیلتے ہوئے کہا۔ اُسی پل باہر بیل ہوئی۔

''میرا خیال ہے بھائی آگئے۔ آپ بھی جلدی جلدی تیار ہوکر آجائیں۔'' زہرہ نے دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے کہا جب کہ امی سر ہلاتی ہوئی اندر چلی گئی۔

''السلام علیکم!'' زہرہ نے دروازہ کھولتے ہی کہا۔ وہ Spy eye سے پہلے ہی دیکھ چکی تھی کہ باہر عبداللہ کھڑا ہے اسی لیے اُس نے بلا جھجک دروازہ کھول دیا۔

''وعلیکم السلام!'' عبداللہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

''بڑے بھائی! یہ میری آپی ہیں زہرہ بی بی! ویسے اِن میں کوئی اچھا پن ہے نہیں، اگر کوئی بات ناگوار گزرے تو برداشت نہ ہو تو... اللہ توبہ اِن کے ہاتھ ہیں بہت بھاری! محترمہ ڈاکٹر بن رہی ہیں، والد صاحب کے نقش قدم پر چل رہی ہیں اور ان کے میاں بھی ڈاکٹر ہیں، لیکن ابھی تک وہ ان کے عتاب سے بچے ہوئے ہیں کیوں کہ رخصتی ڈگری کے بعد ہوگی۔'' عبداللہ نے وہیں کھڑے کھڑے تعارف کروایا۔

جواباً زہرہ نے اُس کی کمر پر ایک دھول جمائی۔

''ہائے مرگیا۔'' عبداللہ نے کراہتے ہوئے کہا۔

''دیکھا بڑے بھائی! آپی کے فن کا مظاہرہ!''

''تم بھائی کو دروازے پر ہی کھڑے رکھو گے کہ اُن کو اندر بھی آنے دو گے؟'' زہرہ نے اُس کی غلطی کی طرف نشان دہی کروائی کہ وہ Excitment میں مہمان کو اندر بھی نہ لایا تھا۔

''کیسی ہیں آپی آپ؟'' ولی نے سلام کے بعد زہرہ کی خیریت دریافت کی۔

''شکر الحمدللہ! آپ ٹھیک سے بیٹھو بھائی۔'' زہرہ نے ولی کو ٹھیک سے بیٹھنے کو کہا۔

''عبداللہ آپ سب کا اس قدر ذکر کرتا ہے کہ میرا بہت دل کرتا تھا آپ سے ملنے کو۔'' ولی نے سوال سے کہا۔

''ارے جناب! آپ سے زیادہ تو میری امی بے قرار ہورہی تھیں آپ سے ملنے کے لیے۔'' زہرہ نے گرم گرم کافی کے مگ اُن کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''کافی امی تیار کرگئی تھیں اس لیے جناب جھٹ پٹ کافی حاضر ہے۔'' زہرہ نے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''آپی! امی اور پاپا کدھر ہیں؟'' عبداللہ نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''پاپا کو تو ہسپتال سے ایمرجنسی کال آگئی تھی، اس لیے اُن کو فوراً جانا پڑا لیکن ڈونٹ وری، وہ ڈنر پر ضرور جوائن کریں گے۔'' زہرہ نے کہا۔

''اور امی تو آتی ہی ہوں گی وہ ذرا چینج کرنے گئی ہیں یہ کیا ہے ولی بھائی؟'' زہرہ نے ایک بڑی پیکنگ میں لپٹی پینٹنگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ میں آنٹی کے لیے لایا ہوں، مجھے یقین ہے کہ یہ ان کو پسند بھی آئے گی اور اُن کے دل کو چھوئے گی کیوں کہ جب میں اس کو پینٹ کررہا تھا تو میری اپنی بھی کچھ ایسی فیلنگز تھیں۔'' ولی نے کہا۔

''گڈ! چلیں امی آئیں گی تو وہ ہی کھولیں گی۔'' باوجود بے حد اشتیاق کے زہرہ نے صبر کیا۔

''لیں امی بھی آگئیں۔'' زہرہ نے ولی کے پیچھے سے آتی امی کی جانب اشارہ کیا۔

جیسے ہی ولی اُن کو سلام کرنے کے لیے پلٹا امی کے پاؤں ایک دم زمین سے اکھڑے اور لڑکھڑائیں گئیں۔

''لالہ! عبداللہ بھائی؟'' وہ بے اختیار بولی تھیں۔

''یا میرے اللہ! یہ میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں؟'' وہ بولیں، اُن کے چہرے کے تاثرات سب کو پریشان کرگئے، خود ولی بہت بے چینی محسوس کررہا تھا۔

''وہی قد، وہی جسم، وہی رنگت اور وہی آنکھیں! میرے مولا یہ کیسا معجزہ ہے؟'' وہ دل ہی دل میں بولیں۔

اُن کا دِل ڈوبنے لگا تھا۔

''یہ؟'' امی نے ولی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہی تو میرے بڑے بھیا ہیں۔'' عبداللہ نے کہا۔

''کیا نام ہے بیٹا تمہارا؟'' اُن کی آواز گہرے کنویں سے آئی تھی۔ آج تک وہ عبداللہ کے منہ سے ل بڑے بھیا کا ذکر سنتی آئی تھیں، عبداللہ نے نام اُن کے سامنے بھی نہ بتایا تھا۔

''جی میرا نام عبدالولی ہے۔'' ولی نے نام بتایا۔

''عبد..عبدالولی!'' امی نے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے دہرایا۔

''جی!'' ولی نے عبداللہ کی والدہ کی عجیب وغریب حالت دیکھ کر پریشانی سے کہا۔

''تمہاری ایک بہن بھی ہے نا؟'' انہوں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''ہاں جی!'' ولی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ن..نگینہ ہے نا اُس کا نام؟'' انہوں نے دِل تھام کر پوچھا۔

''جی!'' اب چونکنے کی باری ولی کی تھی کہ وہ نگینہ کو بائے نیم کیسے جانتی تھیں۔

''یا میرے اللہ! اب تو کسی شک کی گنجائش نہ تھی۔'' اُن کے دل کو ایک دم دُکھ اور خوشی کی شدت نے لہرا جو اُن کا دل برداشت نہ کرسکا۔

''عبدالولی!!

نگینہ!!

سید عبداللہ! میرا بھائی!'' وہ ایک دم سے لہرائی اگر ولی اُن کو بڑھ کر تھام نہ لیتا تو وہ یقیناً زمین پر رجاتیں۔

''امی! امی کیا ہوا؟'' زہرہ پریشانی سے آگے بڑھ کر ماں کو دیکھنے لگی۔

''عبداللہ دوڑ کر اندر سے میرا بی پی آپریٹس لاؤ۔'' زہرہ نے پریشانی سے کہا۔

عبداللہ اندر کی جانب دوڑا جب کہ ولی حیران و پریشان اُن کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ جانے کیوں ے یہ نقش جانے پہچانے لگے تھے۔ اتنے جانے پہچانے جیسے، وہ اُن کے بہت قریب رہ چکا ہو۔

''کون ہیں یہ؟'' ولی نے دوبارہ اُن کو دیکھتے ہوئے اپنے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے خود ہی سے سوال کیا۔

❖❖○❖❖

''جی! کیا میں آپ کو جانتا ہوں؟'' احمد شاہ نے مہمان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

اتنے رکھ رکھاؤ والا انسان اور چہرے پر بے حد رعب موجود تھا۔ احمد شاہ نے پہلی نظر میں ہی جائزہ لیا۔

''جاننے کے لیے جناب ایک دوسرے کے قریب آنا پڑتا ہے، ہم بھی آپ کے قریب آنا چاہتے ہیں۔'' مہمان نے مسکرا کر کہا۔

''معاف کیجیے گا میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا، دوسری معذرت اس لیے بھی ہے کہ میں بے حد مصروف ہوں اب سے کچھ دیر بعد میری بہت ضروری میٹنگ ہے۔'' احمد شاہ نے ساتھ ہی معذرت کر لی۔

''میں بھی آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا، میں مسکان کا باپ ہوں، یہ وہ لڑکی ہے، جسے آپ کے بیٹے

نے پہلے محبت بھرے خواب دکھائے اور پھر کسی اور لڑکی کی طرف چلا گیا، آج میری بیٹی نہ زندوں میں، نہ مُردوں میں اور اُس کا ذمے دار صرف اور صرف آپ کا بیٹا ہے۔'' سید سرفراز علی نے وہ پتّا استعمال جو تھا تو حقیقت لیکن استعمال ایسے کیا تھا کہ وہ اُن کے حق میں چلا گیا۔

انہوں نے مسکان کی ساری حالت کا ذمے دار ولی کو ٹھہرا دیا۔

احمد شاہ کا سارا خون چہرے پر آن جما تھا۔

''میرا بیٹا ایسا بالکل نہیں ہے، وہ ایسا بیٹا ہے، جس کی قسم میں فخر سے کھا سکتا ہوں میں نہیں مانتا میرے بیٹے نے کوئی ایسا قدم اِٹھایا ہو۔'' احمد شاہ کے لہجے میں بے حد اعتماد تھا۔

''اگر آپ کو یقین نہیں ہے تو چلیں میں آپ کو ایک زندہ لاش سے ملواتا ہوں، پھر اِس سار معاملے کی گواہ آپ کے ہی دوست کی بیٹی سائرہ ہے جو مسکان کی بھی بہترین دوست ہے۔'' سید سر نے اتنے اعتماد سے کہا تھا کہ احمد شاہ کو اپنا اعتماد ڈگمگاتا محسوس ہوا۔

''میں بیٹی کا باپ ہوں، مجبوری میری قسمت ہے لیکن کیا ایک لڑکی کی زندگی تباہ کرنے کا حق آپ بیٹے کو دے دینا چاہیے؟'' سرفراز علی نے مزید ضرب لگائی۔

احمد شاہ کا چہرہ پھیکا پڑنے لگا اُن کا دل ماننے کو تیار ہی نہ تھا کہ ولی ایسی بھی کوئی حرکت کر سکتا ہے۔

''اگر یہ بات غلط نکلی تو؟'' احمد شاہ نے پوچھا۔

''نہیں نکلے گی آپ اپنے بیٹے سے پوچھ لیجیے۔'' سید سرفراز نے اطمینان سے کہا۔

''میری مجبوری تو مجھے آپ کے گھر بھی لے گئی تھی، میں آپ سے آپ کے بیٹے ولی کا رشتہ اپنی مسکان سرفراز علی کے لیے مانگتا ہوں امید ہے ایک مجبور باپ کی مجبوری کو آپ سمجھیں گے۔'' سید سر علی نے بہت درد سے کہا۔

''میں معافی چاہتا ہوں جناب! جو ہوا وہ میرا دِل ماننے کو تیار نہیں اور اگر ہوا بھی ہے تو بھی میں ہوں۔ عبدالولی کا اگلے ہفتے نکاح ہے اور میں اس رشتے کو توڑ نہیں سکتا۔'' احمد شاہ نے صاف لفظوں سرفراز علی سے معذرت کر لی۔

''آپ کو وہ رشتہ توڑنا ہوگا۔'' سرفراز علی نے غصّے سے اِٹھتے ہوئے اصرار سے کہا۔

''سوری جناب! یہ نہیں ہو سکتا۔'' احمد شاہ نے اٹل اور برد بار لہجے میں کہا، جو سید سرفراز علی کو آ لگا گیا۔

''شادی تو عبدالولی کی مسکان کے ساتھ ہی ہوگی آپ نہیں جانتے میں کون ہوں؟ میرا نام سید سر علی ہے اور ...اور مُسکان میری بیٹی ہے، آپ میرے دیئے رشتے کو رَد نہیں کر سکتے۔'' سید سرفراز علی ہانپتے ہوئے کہا۔

''سید سرفراز علی صاحب! یہ میرا آفس ہے اور میں آپ کو اس طرح اونچا بولنے کی اجازت ہرگز نہ دوں گا۔'' احمد شاہ نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔

''اور ہاں! ولی کی شادی علیزے سے ہی ہوگی، ہماری طرف سے آپ کو معذرت ہے۔''

''میں دیکھتا ہوں کیسے ولی کی شادی کہیں اور ہوتی ہے آپ ابھی سید سرفراز علی کو نہیں جانتے۔''

السّلیوزمی! مجھے میٹنگ میں جانا ہے۔'' احمد شاہ نے اپنے ضبط کی حد پر جاتے ہوئے نہایت تحمل یا۔

اگلے ہفتے میں سات دن ہیں اور سات دن میں بھی آپ کو دیتا ہوں، اگر آپ نے ہمارا رشتہ قبول نتائج کے ذمے دار آپ خود ہوں گے۔'' سید سرفراز علی دھمکی دے کر دھپ دھپ پاؤں مارتا باہر یا جب کہ احمد شاہ ماتھے پر بل ڈال کر اُسے جاتے دیکھتے رہے۔

ہونہہ!'' احمد شاہ کو شاید زندگی میں پہلی بار غصہ آیا تھا۔

''لی کی شادی صرف علیزے سے ہوگی۔'' انہوں نے بے حد اٹل لہجے میں کہا۔

"امی جان! کیسی ہیں آپ؟" عبداللہ نے جھک کر پوچھا۔

وہ ساری رات نیم بے ہوشی میں بھول بھلیوں میں گھومتی رہیں، اُن کا ماضی بھی تو بھول بھلیاں
جس میں وہ گم ہو جاتیں تو باہر آنے کو راستا نہیں ملتا تھا۔ بار بار وہ مختلف ناموں کو پکارتی اور بلاتی
تھیں۔ یہ الفاظ اِس قدر واضح تھے کہ پاس بیٹھا ولی بھی بار بار چونک کر اُن کو دیکھتا رہا۔

"امی! پلیز آنکھیں کھولیں اور بتائیں آپ کیسی ہیں آپ نے تو ہمیں ڈرا کر رکھ دیا۔ پلیز
بولیں۔" زہرہ نے اُن کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

لیکن وہ بند آنکھوں سے مسلسل روئے جا رہی تھیں۔

ولی نے بے حد بے چینی سے پہلو بدلا، اُس کی ذات کسی کے لیے آزار کا باعث بنی، یہ بات اُ
کے لیے بے حد تکلیف کا باعث تھی۔

"امی! دیکھیں میں اور آپی دونوں آپ کے قریب ہیں، بتائیں آخر کیا بات ہوئی؟"

"ولی! کیا عبدالولی چلا گیا؟" وہ ایک دم تڑپ کر اُٹھیں۔

"امی پلیز ریلیکس! ولی اِدھر ہی ہمارے ساتھ ہے۔ وہ دیکھیں۔" زہرہ نے ولی کی جانب اشا
کر کے کہا۔

"دیکھیں آپ کی طبیعت کی وجہ سے وہ بھی کتنا پریشان کھڑا ہے۔" زہرہ نے ماں کو محبت اور اط
سے تھام کر دوبارہ لٹاتے ہوئے کہا۔ امی نے ہاتھ کے اشارے سے ولی کو اپنے قریب بلایا۔ وہ
ہوئے آگے بڑھا۔

پھر وہی ایک دم ان کے رویے پر حیران نہیں ہوا بلکہ وہاں موجود عبداللہ اور زہرہ کے لیے بھی یہ
حیران کن تھا۔ امی ولی کو سینے سے لگائے زار زار رو رہی تھیں، اُسے بے اختیار چوم رہی تھیں۔

"میرا بچہ! میرا عبدالولی، میرے بھائی کی نشانی!" اُن کے منہ سے نکلنے والے الفاظ ولی کے سا
ساتھ سب ہی کو چونکا رہے تھے۔

"آپ؟" ولی نے بے اختیار سوال کیا۔

"میں تیری پھوپو! تیری پھوپو ہوں بیٹا!" ان کا یہ انکشاف چونکا دینے والا تھا۔

"پھوپو! میری! لیکن بابا نے تو بتایا تھا کہ وہ اکلوتے بیٹے تھے۔" ولی نے پُرسوچ انداز میں با آواز
کہا۔

"نہیں بیٹا! ہمارے بھائی اکلوتے ضرور تھے لیکن اُن کی دو بہنیں تھیں۔" عبداللہ کی امی سانس لینے کو
رکا۔

"ہم بدقسمت اُن کی دو بہنیں تھیں سدرہ بی بی اور مریم بی بی! جو اُن کی خوشیوں اور نئی بنائی دنیا کو
کھا گئیں!" عبداللہ کی امی نے منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر کہا۔

"دو بہنیں؟ کمال ہے بابا جان نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی۔" ولی نے حیرت سے سوچا۔

"میں پاکستان جاؤں گا تو بابا سے ضرور پوچھوں گا!" ولی نے اُن کے سینے سے لگتے ہوئے کہا۔

"بابا؟" اس بار چونکنے کی باری اُن کی تھی۔

"عبداللہ بھائی اور عائشہ بھابی کو تو زندہ جلا دیا گیا تھا پھر یہ کس کی بات کر رہا ہے؟" وہ سوچے بنا نہ رہ
سکیں۔

اسی پل باہر گاڑی کا ہارن بجا۔

"پاپا آ گئے۔"

"پلیز امی! یہ ملکہ جذبات بن کر جو آپ اپنی ہر بار طبیعت خراب کر لیتی ہیں اس کو پاپا کے سامنے
کنٹرول میں رکھیے گا۔ وہ چھ گھنٹوں پر مشتمل اتنا بڑا آپریشن کر کے آ رہے ہیں بے حد تھکے ہوئے ہوں
گے، آپ کی طبیعت بگڑی دیکھ کر وہ پریشان ہو جائیں گے۔ سو پلیز بی اے گڈ بے بی۔" زہرہ نے ماں
کے آنسو صاف کرتے ہوئے اُن سے نارمل رہنے کی گزارش کی۔

عبداللہ کے ساتھ جو شخص کمرے میں داخل ہوا، وہ بے حد خوبرو تھا۔ عبداللہ تو اُن کے سامنے کچھ بھی
نہیں تھا۔

"واقعی عبداللہ کے پاپا بے حد گریس فل ہیں۔" ولی کے دماغ میں پہلی بات یہ آئی۔

"السلام علیکم! آج صبح صبح ہمارے کمرے میں دھاوا بول رکھا ہے خیر ہے؟" عبداللہ کے پاپا نے زہرہ
کو اپنے کمرے میں پا کر ہلکے پھلکے انداز میں استفسار کیا۔

"جی پاپا! بالکل خیریت ہے۔" زہرہ نے جواب دیا۔

اُسی پل اُن کی نگاہ کمرے میں موجود ایک اور شخص پر پڑی، وہ گنگ رہ گئے۔

"یا میرے اللہ!" وہ حیرت سے ولی کو دیکھے جا رہے تھے۔ سامنے کھڑا لڑکا ہو بہو سید عبداللہ کی کاربن
کاپی تھا اُن کے دل کی حالت تو مختلف ہونی ہی تھی۔

"پاپا! یہ میرے وہی دوست ہیں، جن کو میں اپنا بڑا بھائی مانتا ہوں۔" اُن کی حالت بھی اپنی بیوی سے
زیادہ مختلف نہ تھی۔

"تم! آپ سید عبداللہ کے ہی بیٹے ہو نا۔" وہ دھیمے لہجے میں پوچھ رہے تھے ایسے کہ اُن کی آواز کنویں
سے آ رہی تھی۔

"نہیں! میرے بابا سائیں کا نام احمد شاہ ہے اور میرے دادا کا نام عمر شاہ تھا۔" ولی کو محسوس ہوا کہ
اسے ان لوگوں کی وہ غلط فہمی ختم کرنی چاہیے، جو کسی مشابہت کی وجہ سے پیدا ہو رہی تھی۔

"احمد شاہ؟" عبداللہ کی امی نے تڑپ کر اُسے دیکھا۔

"نہیں نہیں! تم میرے بھائی کے بیٹے ہو، میرا دل کہتا ہے اور دل ہمیشہ سچی گواہی دیتا ہے۔"

"یا خدا... اس قدر کسی میں کیسے مشابہت ہو سکتی ہے؟" عبداللہ کے پاپا نے حیرت سے دل ہی میں کہا۔

انہوں نے ایک بار پھر ولی کا بھرپور جائزہ لیا لیکن اُن کو تو بس یہی لگ رہا تھا کہ سامنے اُن کا دا سید عبداللہ ہی کھڑا ہے۔

"فیصل! یہ ہمارا ولی ہی ہے نا؟" اُن کی بیوی نے اُن سے تائید چاہی۔

"دل تو یہی کہتا ہے۔" وہ دھیمے سے بولے۔

ولی نے نہایت بے چینی سے پہلو بدلا۔ خود عبداللہ اپنی جگہ پریشان تھا کہ اُن کے ماں باپ اس طر کا بی ہیو کیوں کر رہے ہیں؟

"ولی بھائی! میں بہت شرمندہ ہوں، ہم نے بلایا تو آپ کو ڈنر پر تھا لیکن صورتِ حال ایک دم چینج ہوگئی۔ آپ بھی ہمارے ساتھ ساری رات بے آرام رہے۔" زہرہ نے ولی سے معذرت کی۔

"مجھے اجازت دیں آنٹی، انکل! انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی میں شرمندہ ہوں کہ کسی غلط فہمی کی وجہ آپ سب کو دقت کا سامنا کرنا پڑا۔" ولی نے جانے اجازت چاہی۔

"فیصل! اُسے روکیں یہ کہاں جا رہا ہے؟" عبداللہ کی امی تڑپ کر بیڈ سے اُتریں۔

"امی پلیز! یہ کیا کر رہی ہیں؟" زہرہ نے اُن کو کندھوں سے تھاما۔

"وہ ہمارا مہمان ہے، دیکھیں آپ نے اُسے کتنا تنگ کیا ہے وہ کیا سوچے گا؟" زہرہ نے اُن سمجھاتے ہوئے کہا۔

"زہرہ! اِسے جانے نہ دو، یہ میرا عبدالولی ہے۔" وہ تڑپ کر بے قراری سے بولیں۔

ڈاکٹر فیصل گم صم بس سب کو دیکھ رہے تھے اُن جانے میں ماضی کے زخم اُدھڑ گئے تھے۔

"میں کہیں نہیں جا رہا، ابھی آسٹریلیا میں ہی ہوں آپ سے دوبارہ ملنے آؤں گا۔ آپ آرام کریں ا طرح آپ کی طبیعت بگڑ جائے گی۔" ولی نے اُن کے ہاتھوں پر بوسہ لیتے ہوئے کہا۔ وہ اُس کا ہا چھوڑنے پر تیار نہ تھیں لیکن زہرہ نے اُن کو الگ کر کے دوبارہ لیٹنے پر مجبور کیا اور اُن کو جوس کے ساتھ ن کی گولی دے دی تھی۔

عبداللہ، ولی کو لیے باہر آیا۔

"سوری بڑے بھیا! سوری فار ان کونینس۔"

"اٹس او کے یار! کبھی کبھی ہمارے ساتھ ہماری زندگیوں میں وہ بھی شامل ہو جاتا ہے جس کو ہم ا نہیں کرتے، جن کو ہم پلان نہیں کرتے اور اگر یہ ہمارے سامنے آجائیں تو منہ نہیں بنانا چاہیے۔" ا نے اُسے ہلکے پھلکے انداز میں کہا، تب کہیں جا کر عبداللہ کے چہرے کے تاثرات دُرست ہوئے۔

"خدا حافظ۔" وہ کہہ کر باہر نکل آیا۔

لمبے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے جب وہ پیدل ہی سڑک پر نکلا تو گھر کی اوپر والی منزل ک ایک کھڑکی کھلی، کسی نے بے حد اُداس نظروں سے اُسے جاتے دیکھا۔ جب تک وہ دور جاتے جا

ب کی طرح غائب نہ ہو گیا وہ اُسے دیکھتے رہے وہ بہت تھکے ہوئے تھے لیکن اُن کو نیند نہیں آ رہی تھی، وہ تھک کر ایزی چیئر پر جا بیٹھے، انہوں نے ماضی کی یادوں کے سامنے سرنڈر کر دیا تھا وہ اُن سے دور بھاگتے بھاگتے اب تھک گئے تھے پھر ایک دم اُن کے کمرے میں جہاں روشنی نہ تھی شعاعوں کی طرح روشنی بھر گئی اس روشنی کے ساتھ بہت سارے منظریوں چلنے لگے جیسے پروجیکٹر پر فلم چلتی ہے۔ انہوں نے دھندلی آنکھوں سے آنسو صاف کیے تو منظر واضح ہوتے چلے گئے۔ یہ منظر اُن کے گھر کا تھا۔

"دیکھ فیصل! مجھے تو رانی بہت پسند ہے بڑی پیاری بچی ہے!" ماسی صابراں نے فیصل کے سامنے بھنا گوشت اور ساتھ گھی سے چپڑی روٹی رکھی۔ آج اس نے اپنی سب سے عزیز مرغی حلال کر کے بیٹے کے لیے خاص طور پر بھنا گوشت بنایا تھا، یہ اُس کی محبت کے اظہار کا ایک طریقہ تھا۔

"اماں پلیز!" فیصل اِس موضوع پر بات نہ کرنا چاہ رہا تھا۔

"یہ پولیس پولیس ماں کو کیوں سنا رہا ہے اس معاملے میں بھلا پولیس کہاں سے آ گئی؟" ماسی صابراں نے معصومیت سے کہا۔ فیصل جو اِس موضوع پر بُرا سا منہ بنا کر بیٹھا تھا ایک دم مسکرا دیا۔

"اوہ میری بھولی پیاری ماں! میں پولیس نہیں پلیز کہہ رہا ہوں جس کا مطلب ہے اے میری پیاری ماں "براہِ مہربانی" ابھی شادی کا موضوع نہ چھیڑیں، میں ہسپتال کے کام میں بے حد مصروف ہوں، ابھی تو ہسپتال کی عمارت تیار ہو رہی ہے تو اِس قدر مصروفیت ہے پھر اُس کے لیے مشینری اور عملے کا انتظام بھی کرنا ہے یہ ساری ذمے داری سید عبداللہ نے مجھ پر ڈال دی ہے، اگر وہ مخلص معاشی اور اخلاقی طور پر میرا اِس قدر ساتھ دے رہا ہے تو میرا بھی فرض ہے کہ میں پوری ایمان داری اور توجہ سے اس کام کو مکمل کروں۔"

"لیکن پتر! میں تو صرف رشتے کی بات کر رہی ہوں بیاہ تو پھر سال چھ مہینے بعد سہی۔" ماسی صابراں کو بیٹے کا بار بار اِس موضوع سے جان چھڑانا فکرمند کر رہا تھا۔

"اماں! مجھے کچھ سال شادی نہیں کرنی۔" فیصل نے آخر دوٹوک جواب دے دیا۔

"لیکن کیوں! اگلے سال تُو پورے اٹھتیس کا ہو جائے گا یعنی بلقیس کے پتر جتنا، جس کا پہلا بیٹا پانچویں میں پڑھتا ہے، نہ پتر! میں نے اب تجھے بڈھا کر کے نہیں بیاہنا، لوگوں کے بیٹوں کے ہاں بچے بھی آ گئے اور تو ابھی تک کنوارا کا کنوارا ہی پھر رہا ہے۔"

"اماں! آپ کو پتا ہے کہ باہر کے ممالک میں چالیس سال شادی کے لیے بہترین عمر سمجھی جاتی ہے۔" فیصل کی بات نے ماسی صابراں کو دہلا کر رکھ دیا۔

"ہائے ربا!"

"نہ پتر! اِس عمر میں تو بندہ اپنے بچے بیاہنے کی سوچتا ہے توبہ توبہ انگریز بڈھے ہو کر شادی کرتے ہیں تو نہیں کرنی، اُن کی رِیس (نقل) میں تو تیری شادی جلد از جلد کر دوں گی۔ اگر تو باہر پڑھنے نہ جاتا تو اب ضرور تیرا بیاہ وقت پر کر دیتی۔" ماسی صابراں نے یوں کہا، جیسے بہت سارا وقت گزر گیا ہو۔

"اماں! مہربانی کریں، اب بس کریں میں سکون سے کھانا کھا لوں؟"

"کھا پتر! رج رج کھا لیکن... یہ تیرے بیاہ کا معاملہ میں نئیں ٹالنے والی۔" ماسی صابراں کے ارادے خطرناک حد تک اٹل تھے۔ فیصل نے شدت سے محسوس کیا۔

"لمّاں! آپ قیصر بھائی کی شادی پہلے کردیں۔" فیصل نے اپنی جان چھڑانے کے لیے قیصر کا ا کردیا۔

"لو بھلا! میں اُس کی شادی پہلے کیسے کردوں؟ ٹھیک ہے وہ صرف دو سال تم سے چھوٹا ہے پر شادی کی باری پہلے تمہاری ہے۔" ماسی صابراں نے پریشانی سے بیٹے کو دیکھا جو بالکل اُلٹ پلٹ کر تھا۔

"کبھی بھلا چھوٹوں سے بھی شادیاں شروع ہوئی ہیں؟" وہ معصوم عورت حیرت سے بیٹے کی با سوچ رہی تھی۔

"لمّاں! تم باریوں کا انتظار نہ کرو بلکہ سب سے پہلے نفیسہ کی شادی کرو۔" فیصل کو نئی سوجھی۔

"باہر سے پڑھ کر آیا ہے جانتی ہوں میں، لیکن یہ پٹی مجھے نہ پڑھا۔" ماسی صابراں کو فیصل کا آ ذرا نہ پسند آیا۔

"بس مجھے رانی پسند ہے! اگر تجھے کوئی اور کُوی پسند ہے تو بتا ورنہ میں رانی سے تیرا رشتہ پکا کر گی۔" ماسی صابراں کی دھمکی پر فیصل پہلی بار گڑ بڑا گیا۔

"فیصل پتر! اپنی ماں کی دھمکیوں کو ایویں نہ سمجھنا یہ جو کہتی ہے وہ کردیتی ہے اور بندہ اس کے د دلیے پر گزارہ کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔" فیصل کے بابا جو دوسری چارپائی پر لیٹے ماں بیٹے کی گ خاموشی سے سن رہے تھے بیچ میں لقمہ دے کر فیصل کو ڈرا دیا۔

"وہ جو محلوں میں رہنے والی رانی ہے، میرے دِل میں آن بسی ہے، اُس کے بعد تو کسی اور کا تصور ممکن نہیں ہے۔" فیصل نے دِل میں کہا۔

"لمّاں! مجھے کوئی اور پسند ہے۔" فیصل نے بم پھوڑ ہی دیا جو تباہی بھی لاسکتا تھا، وہ اپنے دل کی ہا کہنے جارہا تھا۔

"کون ہے وہ؟" ماسی صابراں بیٹے کی شادی کے ارمان میں کوئی ناراضی نہ دکھانا چاہتی تھیں اس. انہوں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"آپ اُسے جانتی ہیں اور اُسے دیکھا بھی ہے۔" فیصل نے گلا کھنکھارتے ہوئے کہا۔

"کون ہے وہ؟" ماسی صابراں نے کچھ سوچتے دوبارہ پوچھا۔ فیصل کے بابا بھی اشتیاق سے اس کو ت رہے تھے۔

"وہ... اُس کا نام... اُس کا نام سدرہ ہے، وہ سید عبداللہ کی چھوٹی بہن ہے۔" فیصل نے دھماکا کیا.

ماسی صابراں کے ہاتھ میں پکڑا اسلور کا گلاس ایک دم چھوٹ گیا اور بابا ایک دم لیٹے سے اُٹھ بیٹھے

"دماغ خراب ہوگیا ہے تمہارا..." وہ دھاڑے۔

"اگر سید عبداللہ دو لفظ پیار کے بول کر تجھے اپنے برابر بٹھالیتا ہے تو اِس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ان کی برابری کرنے اُٹھ کھڑے ہو۔" بابا کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا اُن کا بیٹا ایسی حماقت کرے گا، اُ

ہیں نہیں آرہا تھا۔

"پتر! مخمل میں کبھی ٹاٹ کا پیوند لگا ہے۔" ماسی صابراں جوان بیٹے کو رام کرنے کی کوشش کررہی تھیں۔

"اماں! کسی کو پسند کرنے کا حق تو سب کو ہے۔" فیصل نے دھیمی آواز میں کہا۔

"تم اس بارے میں سوچنا بھی مت! سید نوازش علی کو تمہارے ارادے کی خبر مل گئی تو وہ تمہارے وجود کے اتنے ٹکڑے کروائے گا کہ ہمیں، تمہیں رونے کے لیے کوئی قبر بھی نہ مل سکے گی۔" بابا نے دھاڑتے ہوئے کہا۔

"کیسی خوف ناک باتیں کررہے ہیں فیصل کے ابا!" ماسی صابراں نے دہل کر شوہر کو ٹوکا۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں، اسے کہو اپنی اِس ناسمجھی کو اپنے دل میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کردے ورنہ ہمیں اس عمر میں زندہ درگور کرنے کے لیے تیار ہوجائے۔ سیدوں کی لڑکیاں ہمیشہ خالص رہتی ہیں وہ باہر شادی نہیں کرتے پھر ہم جیسے کمّیوں کے ساتھ تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، کیوں تو اِس عمر میں میرے سر خاک ڈلوانا چاہتا ہے؟" بابا کی آواز ایک دم رندھ گئی۔

فیصل جو سر جھکائے اُن کی ڈانٹ سُن رہا تھا ایک دم تڑپ کر اُن کے پاس آبیٹھا۔

"بابا! میں جانتا ہوں کہ میں نے آسمان کا چاند مانگا ہے لیکن بابا اللہ جب اِس دل میں اُس کا عشق ڈال دے تو پھر وہ کیا کرے؟" فیصل نے بے بسی سے سوال کیا۔

"کیا مطلب!" بابا نے چونک کر اُس کی آنکھوں میں دیکھا اور جو انہوں نے دیکھا وہ لرز کر رہ گئے۔

"نہیں بیٹا! تم کو ہر صورت اِس راستے سے واپس آنا ہوگا میں تمہیں اپنے سامنے موت کے کنوئیں میں چھلانگ نہیں لگانے دوں گا۔" بابا نے اِدھر اُدھر سر ہلا کر نفی میں جواب دیا۔

"بابا میں مجبور ہوں!" فیصل نے اپنا سینہ مسلتے ہوئے کہا۔

"اگر تم اس قدر مجبور ہو تو اِس سے میرا اور اپنی ماں کا سر کاٹ ڈالو۔" انہوں نے لکڑیوں کے ڈھیر سے کلہاڑی اُٹھا کر فیصل کے ہاتھ میں دے دی۔

"بابا!" فیصل نے لرز کر انکار کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہی بہتر ہے، تمہاری ضد ہمیں تمہارے بعد بھی مار دے گی، اِس سے بہتر ہے کہ تم ہمیں اپنے ہاتھوں سے ختم کردو۔" بابا نے تھک کر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

فیصل نے دُکھ بھری نگاہ اپنے ماں باپ پر ڈالی جن کی آرزوؤں اور تمناؤں کا محور اُن کی اولاد تھی اور آج اُس کی بے بسی نے انہیں دُکھی کردیا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اُٹھا اور بنا کچھ کہے باہر نکل گیا۔

"فیصل!" ماسی صابراں نے پیچھے سے آواز دی۔

"جانے دو اُسے۔" بابا نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"جوان بیٹے سے یوں بات کی جاتی ہے تھوڑی نرمی رکھتے ہیں۔" ماسی صابراں نے گھبرا کر کہا۔

"وہ بے حد دُکھی ہوکر نکلا ہے، اُسے پیار سے سنبھالتے۔"

"نہیں! اُسے اِس راستے سے روکنا ہوگا یہ کون سا دور، ہے جہاں ہیر رانجھا یا سسی پنوں کی محبت کی

طرح جان گنوادی جائے۔ اُسے ہماری خاطر اِس سے دور رہنا ہوگا وہ نہیں جانتا کہ سید نوازش اور م سرفراز وہ ظالم بھیڑیے ہیں، جن کے پاس دِل نہیں ہے۔'' بابا نے بیوی کو سمجھایا۔

تم جورے کو بھول گئی ہو کیا؟ اُس کے معصوم بچے کے ساتھ اُس ظالم شخص نے کیا کیا؟ صرف اُس کتوں کی خوراک سے ایک بوٹی کھانے کا گناہ گار تھا وہ ننھا سا بچہ اور اُس بچے کی بوٹی بوٹی اُس کے کھا گئے تھے۔ ایک انسان کے بچے کو سید نوازش علی نے کتوں کے سامنے ڈال دیا۔ وہ کس قدر جابر ظالم ہے اِس سے اندازہ کرلو۔''

''جو شخص اپنے کتوں کے معاملے میں اتنا سخت ہے تم سوچو اپنی بیٹی کے معاملے میں تو وہ ہم سب ذلیل کر کے مار ڈالے گا۔'' بابا نے ماسی صابراں کو حقیقت بتائی۔

''تمہیں اُسے روکنا ہوگا۔ یہ میرا فیصلہ ہے اِسی میں ہم سب کی زندگی اور بھلائی ہے۔'' بابا کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر نکل گئے۔

ماسی صابراں اپنے پیروں میں گرے سلور کے گلاس کو دیکھ رہی تھی جس میں سے پانی چھلک کر مٹی میں جذب ہوگیا تھا اُن داستانوں کی طرح جو سید نوازش علی کے ظلم سے پیدا ہوئی تھیں اور ایک کے بعد ایک اس پانی کی طرح مٹی میں جذب ہوگئی تھیں اور اُسے کوئی کچھ کہنے والا نہ تھا۔

❖❖○❖❖

فیصل نہیں جانتا تھا کہ اُس کے قدم بے اختیار درگاہ کی جانب کیوں اُٹھ رہے تھے بوڑھے برگد تلے وہ سر نہواڑ کر بیٹھ گیا یہ وہی جگہ تھی جہاں سے اُسے عمر بھر کا روگ لگ گیا تھا، وہ موتیا سے ملا تھا۔ بس کچھ پل، کچھ جادو اثر پَل اُس کی زندگی کو بدل گئے تھے، وہ خوشبو جیسی لڑکی اُس کے حواسوں پر ایسی چھائی کہ اُسے ہمیشہ کے لیے بے بس کرگئی۔

''یا میرے اللہ! اچھی خاصی زندگی تھی تو نے اُس سے کیوں ملوایا اور پھر اِس دل میں اُس کی اتنی طلب کیوں ڈالی کہ... میں خود اپنی شدتوں پر حیران ہوں... کیا چند پَل زندگی پر اِس طرح بھی حاوی ہو سکتے ہیں؟''

''ہو سکتے ہیں؟'' وہ سوال جو اُس نے خود سے کیا تھا، اُس کا جواب اُسے اُس کی پشت پر کھڑے کسی شخص نے دیا تھا۔

فیصل نے ایک دم سر اُٹھا کر پیچھے دیکھا۔ وہی درویش کھڑا تھا۔

''محبت ایک ایسا احساس ہے جو کسی کو چھو جائے تو وہ ربّ کو پہچان لیتا ہے، محبت ہی انسان کو انسان کی پہچان دیتی ہے، محبت کا فیض بھی کسی کسی کو ملتا ہے عشق مجازی ہی عشق حقیقی کی پہلی سیڑھی ہے، محبت ہی خالق کے ساتھ تعارف کرواتی ہے ایک ایسے جذبے سے جو بالکل سچا ہے۔'' درویش حسبِ عادت اپنے آپ میں نہ تھا۔ فیصل کسی معمول کی طرح اُسے دیکھ رہا تھا۔

''یہ شخص ہمیشہ میرے دل کے بھید پڑھ لیتا ہے یہ کون ہے؟'' فیصل نے سوچا۔

''نہ... نہ ایسا نہ کہہ۔'' درویش نے اپنی لاٹھی زمین پر ماری، جس کے ساتھ گھنٹی بندھی تھی گھنگرو سے بجنے لگے۔

''بھید سارے صرف ایک ذات جانتی ہے، وہ جانتا ہے کہ کل کیا ہونے والا ہے اور کوئی کچھ نہیں جانتا!'' درویش کہتا ہوا مست انداز میں آگے بڑھا۔

''بابا، بابا!'' فیصل ایک دم اُس کے پیچھے بھاگا۔

''تم میرے متعلق اتنا کچھ جانتے ہو تو اتنا تو بتاؤ کیا مجھے میری محبت ملے گی۔'' فیصل نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہٹ پرے... تجھے کہا نا کہ جاننے والا صرف ایک ہی ہے، میں بھلا کیا جان سکتا ہوں؟'' فقیر نے بُرا مناتے ہوئے کہا۔

''بابا پلیز! میری مدد کرو میں اِس جذبے کی تپش سے جھلس رہا ہوں کہ تن من عجیب سے اوپرے اوپرے لگتے ہیں۔'' فیصل کو اپنے احساسات کو ٹھیک سے بتانا بھی نہ آرہا تھا۔

''تن میں لگی ہے؟'' فقیر نے مڑ کر ایک دم دِلچسپی سے پوچھا۔

''ہاں!'' فیصل نے اقرار کیا۔

''من میں بھی لگی ہے؟''

''ہاں بابا ہاں...'' فیصل بولا۔

''تو پھر ٹھیک ہے تیرا جذبہ سچا ہے تُو ضرور پائے گا۔'' فقیر کے منہ سے یہ سُن کر فیصل ایک دم خوش ہوگیا۔

''لیکن!'' فقیر کہتے کہتے رُکا۔

''لیکن یہ ضروری نہیں کہ تُو اپنی مرضی ہی کی مراد پائے، یہ تو دینے والے پر منحصر ہے کہ وہ کیا دیتا ہے، وہ تجھے بھی دے گا، ضرور دے گا اُس کی بہت قدر کرنا کیوں کہ وہ تیرے مقدر میں لکھ دی گئی ہے!''

''تو ضرور پائے گا! ضرور پائے گا اب یہ دینے والے پر منحصر ہے وہ تجھے کیا دیتا ہے۔'' فقیر اپنی بات مسلسل دُہرا رہا تھا، فیصل اُس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ ایک بار پھر اپنے چہرے پر ازلی اجنبیت سجائے بڑے بڑے قدم اُٹھاتا چلا گیا۔

الف اللہ! بس تو ہی سچا۔

الف اللہ اک تیرا رشتہ، بس وہ ہی سچا۔

الف اللہ! بس تو ہی سوہنا!

الف اللہ! بس تو ہی سوہنا!

الف اللہ! بس تو ہی ہے باقی رہنا

الف اللہ! بس تو ہی سچا

فقیر کی آواز میں بے حد مٹھاس تھی، جیسے وہ اپنے محبوب سے دُلار کررہا ہو، اپنے پیار کا اظہار کررہا ہو۔

الف اللہ! تُو ہی سب سے بڑا۔

فقیر کی آواز دور جارہی تھی۔ فیصل بالکل سیدھا کھڑا ہاتھ چھوڑے اُسے جاتا دیکھ رہا تھا۔

''مجھے دل کی لگی ہے بابا، تم دعا کرو کہ وہ مجھے مل جائے۔'' فیصل نے اپنے سینے کو مسلتے ہوئے کہا۔
سینے کے دائیں جانب ہر وقت خُلا کیسی آگ لگائے رکھتا تھا کوئی اُس سے پوچھتا۔
''موتیا! تم اگر مجھے نہ ملیں تو میں ادھورا رہ جاؤں گا۔'' فیصل نے آہ بھرتے ہوئے بے حد دُکھ سے کہا۔

❖❖○❖❖

''وہ ہر وقت چپ چپ رہتا ہے فیصل کے ابا، میرا تو بہت جی گھبراتا ہے۔'' ماسی صابراں نے مٹھائی کا تھال چارپائی پر رکھتے ہوئے فکرمندی سے کہا۔
''رہنے دے اُسے اُداس! آج کی اُس کی آنکھوں کی اُداسی کل کی ہمارے گھر کی ویرانی کو بچائے گی، ہماری اتنی اوقات نہیں ہے کہ سید نوازش علی کے ساتھ کوئی کھڑاک پالیں، رہنے دے اُسے اُداس۔'' فیصل کے بابا نے حقے کی نلی کو منہ لگا کر حقے کو گڑگڑایا۔
''چل تُو بھی اُٹھ، ہر وقت اِسی مسئلے کو لیے لسّی بناتی رہتی ہے، جس راہ جانا نہیں اُس کا پتا کاہے کا پوچھنا، جوان خون ہے وقت کے ساتھ ہی ٹھنڈا ہوگا نا! اُٹھ اتنا سارا کام پڑا ہے مہمان آتے ہوں گے شگنوں کی گھڑیوں میں اوپرے قصّے نہیں چھیڑتے۔'' فیصل کے بابا نے فوری طور پر بیوی کو اُٹھایا، آج اُن کے گھر کا بہت خاص دِن تھا۔
آج نفیسہ اور میرو کی منگنی تھی۔ نہ نہ کرتے بھی خاصے مہمان اکٹھے ہوگئے تھے گھر میں خوب چہل پہل تھی لیکن جب ماسی صابراں فیصل کا اُترا اُترا چہرہ دیکھتی تو دُکھی ہوجاتی۔
''رب سوہنے میرے پُتر کے من کی مراد پوری کردے۔'' وہ ماں تھیں ایسی ہی دُعا دے سکتی تھیں کیوں کہ دنیا میں دو ہی لوگ ہوتے ہیں، جو جمع تفریق اور حاصل کے بغیر دُعا کرسکتے ہیں ان کی دعائیں اِس لیے پوری ہوتی ہیں کیوں کہ وہ ربّ کی بڑائی پر یقین کرتے ہیں، اُن کے سامنے مسئلے کی بڑائی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔
''امّاں! دیکھو نا رانی کا حال، گھر جا ہی نہیں رہی۔ اِدھر ہی جم کر بیٹھی ہے۔'' نفیسہ نے آکر ماں سے شکایت لگائی۔ رانی سہیلی کی محبت میں دو دن سے یہاں تھی اُدھر میرو کی ضد تھی کہ رانی کے بغیر رسم کے لیے نہیں نکلنا۔
صبح سے کتنی بار انہوں نے بلا بھیجا تھا لیکن رانی کو یہاں مزا آرہا تھا سب سہیلیاں یہاں اکٹھی تھیں۔
''کیوں جی! تم کو ویر کی انگوٹھی پہننے کا بڑا شوق ہورہا ہے بڑی جلدی ہورہی ہے۔'' رانی نے شرارت سے نفیسہ کو کہا تو نفیسہ کی سرخ و سفید رنگت حیا سے مزید دہکنے لگی۔
ماسی صابراں نے دِل ہی دِل میں اپنی بیٹی کی نظر اُتاری۔
''ربّ تیرے چہرے اور آنکھوں کی خوشیاں آباد رکھے۔'' انہوں نے دعا دی۔
''چل پُتر! گھر جا وہاں سب تیرا انتظار کررہے ہوں گے۔'' انہوں نے رانی کو فوراً جانے کو کہا۔
''یہ نمی کی ماں اُدھر ہی جارہی ہے تجھے بھی گھر چھوڑ دے گی، چل جا شاباش۔'' وہ اُن کو کہہ کر باہر کی طرف لپکیں جہاں دیگوں والا آدمی آواز دے رہا تھا۔

اندر آنگن میں لڑکیاں ڈھولک پر ایک نیا گیت اُٹھا چکی تھیں۔ رانی مچلی۔
''بس نفیسہ! یہ آخری گیت، پھر چلتی ہوں۔'' وہ کہہ کر اندر کی طرف بھاگی تو نفیسہ بے بس طویل سانس بھر کر رہ گئی۔
''یہ لڑکی تو بس پاگل ہے! اُدھر جانے میرو کتنا بے چین ہوگا۔'' نفیسہ نے دھیمی مسکان کے ساتھ کہا، میرو کا نام لیتے ہی اُس کے دِل کی دھڑکنیں تیز ہوجاتی تھیں۔

سوہے وے چہرے والیا میں کینی آں
کر چھتری دی چھاں میں چھانویں بہنی آں
ماپیاں نے چن لیا ساتھی تینوں میرا
چندری توں پیارا ہن پیار مینوں تیرا
رکھ قدماں دے نال میں پیریں بنی آں
کر چھتری دی چھاں...

رانی کی آواز سب لڑکیوں میں نمایاں تھی۔
''اِس لڑکی کو تو زبردستی اُٹھانا پڑے گا، چاچی تو لگتا ہے نکل گئیں، ہائے ربا اب یہ کیسے جائے گی؟'' نفیسہ پریشانی سے اندر کی جانب لپکی۔
''رانی کی بچی! امّاں کو پتا چلا کہ تو اب تک نہیں گئی تو وہ بہت خفا ہوں گی۔'' نفیسہ نے رانی کو کھینچ کر محفل سے باہر نکالا۔
''ہائے ربا!'' رانی نے بھی فکرمندی دکھائی۔ اُسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ خود بھی بہت لیٹ ہوگئی ہے۔
''چاچی تو چلی گئی رانی اب تُو کیسے جائے گی؟ کسی اور کو کہا تو امّاں کو پتا لگ جائے گا، تُو بھی نا پوری ایک مصیبت ہے۔''
''توبہ توبہ! ابھی تُو گھر آئی نہیں اور بھر جائیوں والا سلوک ابھی سے شروع کردیا میرے ساتھ۔'' رانی پریشانی میں بھی نفیسہ کو چھیڑنے سے باز نہ آئی۔
''وے جیدے تُو آنا ذرا اِدھر!'' نفیسہ نے دس گیارہ سالہ بچے کو جو اُن کے ہاں مہمان آیا تھا بلایا۔
''ہاں جی!'' جیدا اِس وقت گُڑ کی پٹیاں پکڑے کھڑا تھا۔
''ذرا باجی کو اُس کے گھر تو چھوڑ آ، اُسی گھر میں جہاں تُو کل گیا تھا امّاں کے ساتھ۔'' نفیسہ نے ذمّے داری بچے پر لگائی۔
''نا۔ نہ باجی! اُدھر پگڈنڈی کے پار بہت کتے ہوتے ہیں یہ اونچے اونچے بھیڑیوں جیسے، مجھے اکیلے ڈر لگتا ہے۔ اگر میرے ساتھ کوئی اور ہو تو چلا جاتا ہوں۔'' جیدے نے شرط کے ساتھ حامی بھری۔
''لو کر لو گل! اب ایک راکھا اس کے ساتھ بھی چاہیے۔'' نفیسہ نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔
''چلو ہٹو، تم لوگوں کا مسئلہ لگتا ہے مجھے ہی حل کرنا ہوگا۔'' نفیسہ اندر سے مخملی سبز چادر اوڑھ کر آئی، سارا چہرہ چھپانے کے باوجود اُس کے مہندی سے رچے ہاتھ بہت نمایاں تھے۔
''تو باہر چلے گی ہمارے نال؟'' رانی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں! اب تجھے ڈانٹ سے بھی تو بچانا ہے۔'' نفیسہ نے باہر نکلنے کی کوشش کی، کہیں امّاں کی نظر پڑ گئی تو لینے کے دینے پڑ جانے تھے۔

''نفیسہ! تجھے پتا ہے نا، بڑے کہتے ہیں کہ ورے دنوں میں دلہن یا دولہے کو باہر نہیں نکلنا چاہیے انہونی ہمیشہ تاڑ میں رہتی ہے۔'' رانی نے تیز تیز چلتی نفیسہ کے ساتھ قدم ملانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''چل دفع ہو، نہ تو اتنی دیر کرتی نہ مجھے مجبوراً نکلنا پڑتا۔ اُدھر تیرے ویر نے ضد پکڑی ہے کہ تُو آ ـ ـ ـ ـ گی تو وہ آئے گا، اِدھر تُو دماغ خراب کیے جاتی ہے۔'' نفیسہ نے پھولی سانس کے ساتھ کہا۔

ہر طرف گھپ اندھیرا تھا، چاند کی آخری تاریخیں تھیں بندے کو بندا نہ دکھائی دے رہا تھا دور ـ ـ ـ ـ اتوں کی غراہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔

''بچپن سے ہی مجھے یہاں کے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے۔'' رانی نے ہمیشہ کی طرح اپنا مخصوص جملہ بولا جو وہ سالوں سے کہتی آ رہی تھی۔

''چل جلدی قدم اُٹھا، اُدھر امّاں کو میں نہ ملی تو شور پڑ جائے گا۔'' نفیسہ کو اس اندھیرے سے زیادہ امّاں کی ڈانٹ اور ناراضی سے ڈر لگ رہا تھا۔

''باجی! مینوں وی بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' جیدے نے بھی اپنے جذبات پہنچانا عین فرض جانا۔

''لو ایک نہ شد دو شد۔'' نفیسہ نے زِچ ہو کر کہا۔

جیسے ہی وہ پگ ڈنڈی سے اُترے اُسی پَل کچے پر جیپ کی لائٹیں روشن ہوئیں، رانی کے ساتھ ساتھ نفیسہ کا دِل بے اختیار دھڑکا کیوں کہ گاؤں میں صرف اور صرف ایک گھرانہ تھا جس کے پاس جیپیں تھیں وہ تھا سید نوازش علی کا گھرانا۔

''یا اللہ! وہ منحوس آدمی نہ ٹکر جائے۔'' رانی کو سید سرفراز علی کا خیال فوراً آیا۔

روشنی عین اُن کے چہروں پر پڑی تھی تینوں نے بے اختیار آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے، دودھیا روشنی میں نفیسہ کے مہندی لگے ہاتھ اِس قدر خوب صورت لگے کہ سید سرفراز علی کے منہ میں پانی بھر آیا۔

''اوئے رفیق! جس لڑکی کے ہاتھ اتنے خوب صورت ہوں وہ خود کتنی سوہنی ہوگی۔'' سید سرفراز علی نے کہا۔

جواباً رفیق اور بشیر دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑے، جو جانتے تھے کہ اس جملے کا اصل مطلب کیا ہے۔

''حضور ساتھ والا دانہ بھی برا نہیں ہے، بس رنگ سے مار کھا گیا، یہ لڑکی آپ کچھ عرصے پہلے طلب کر چکے ہیں کہیں تو اِس کو بھی ساتھ ہی لے آئیں۔'' رفیق نے جیپ سے اُترتے ہوئے کہا۔

''نہیں! وہ مہندی کے ہاتھوں والی چاہیے۔'' سید سرفراز کے منہ میں مسلسل پانی آ رہا تھا۔

رانی، نفیسہ اور جیدے تینوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے تیزی سے نکلنے کی کوشش کرنے لگے، جب ـ ـ ـ ـ شیر اور رفیق دونوں نے اُن کی راہ روکی تھی۔

''کدھر جناب! پہلے مالکوں سے تو مل لو اُن کا بلاوا ہے!'' ایک خباثت سے ہنسا۔

نفیسہ فوراً اُن کا مطلب سمجھ گئی۔

''رانی بھاگ۔'' اُس نے رانی کا ہاتھ پکڑ کر دوڑ لگائی، وہ جانتی تھی سید سرفراز کے ہاں جنگل کا قانون ـ ـ ـ ـ ابھی اگر وہ خود کو نہ بچا سکیں تو ماری جائیں گی۔ دونوں نے تیز دوڑ لگائی تھی۔

ـ ـ ـ ـ ابھی پیچھے بھاگا لیکن رفیق نے بچے کو پکڑ لیا۔

ـ ـ ـ ـ انی ایک پَل کو رُکی جب کہ نفیسہ آگے بھاگ گئی تھی۔ بس وہ ایک پَل رُکنا ہی رانی کی قسمت کو گرہن لگا ـ ـ ـ ـ اتھا۔

ـ ـ ـ ـ فیسہ نے فوراً کھیت میں گھس کر پناہ لی تھی۔

ـ ـ ـ ـ سامنے جیپ کی پڑتی روشنی میں وہ واضح طور پر دیکھ سکتی تھی کہ سید سرفراز علی کے بندوں نے رانی کو اُٹھا ـ ـ ـ ـ جیپ میں ڈال لیا تھا۔

''ہائے ربا!'' نفیسہ نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا۔ جیسے ہی جیپ آگے بڑھی وہ دوڑ کر باہر نکلی، جیدا بے ـ ـ ـ ـ پڑا تھا، راستے پر اس وقت اُس کی خبر گیری سے زیادہ ضروری رانی کی خبر دینا ضروری تھا۔ رانی کا ـ ـ ـ ـ پہلے قریب تھا وہ اندھا دھند بھاگتی وہاں پہنچی۔

ـ ـ ـ ـ مشعل جلا کر اُن کی گلی میں روشنی کر رکھی تھی میرو نے نفیسہ کے لیے اپنے ارمان بہت سنبھال کر رکھے ـ ـ ـ ـ تھے لیکن گھر کی سجاوٹ سے اُس کی خوشی ہر ہر کونے میں دکھائی دے رہی تھی، اتفاق سے سامنے ـ ـ ـ ـ گھوڑے پر کاٹھی ڈالتے نظر آ گیا۔

ان کے گھر بھی ڈھولک کی آواز آ رہی تھی۔

''اس رانی کی بچی کو خود ہی لانا پڑے گا۔'' میرو بڑبڑاتا ہوا کاٹھی کس رہا تھا لیکن سامنے ہانپتی کانپتی ـ ـ ـ ـ کو ننگے سر ننگے پاؤں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''نفیسہ؟'' اس کا یہاں اِس حالت میں سامنے ہونا کسی انہونی کی اطلاع دے رہا تھا۔

''نفیسہ!'' میرو نے آگے بڑھ کر لرزتی کپکپاتی نفیسہ کو تھاما۔

''کیا ہوا، کیا بات ہے؟'' اُس نے ہچکیوں کے ساتھ روتی نفیسہ سے پیار سے پوچھا۔

''وہ۔ را۔ رانی!''

''میرو! رانی کو۔ رانی کو بچاؤ!'' نفیسہ نے بہ مشکل اپنا جملہ پورا کیا۔

''کیا ہوا رانی کو؟'' میرو کے چہرے کی رنگت بدل گئی تھی۔

اُسی پَل رانی کی ماں بھی کچھ لڑکیوں کے ساتھ باہر نکلی تھی تا کہ وہ لوگ آہستہ آہستہ پیدل کا رستہ طے ـ ـ ـ ـ کریں لیکن سامنے کا منظر دیکھ کر وہ پہلے ٹھٹکیں اور پھر لپک کر آگے بڑھیں۔

''نفیسہ پتر خیر اے؟''

''رانی کو بچاؤ میرو! اُسے سید سرفراز علی اُٹھا کر لے گیا ہے۔'' نفیسہ اتنا کہہ کر میرو کی بانہوں میں ـ ـ ـ ـ جھول گئی۔

''امّاں! اِس کو سنبھالو۔'' میرو نفیسہ کو ماں کو پکڑا کر دوڑ کر گھوڑے کی طرف لپکا۔

گھوڑے پر چڑھنے سے پہلے وہ درخت کے ساتھ لگی کلہاڑی لینا نہ بھولا تھا۔

''لڑکیو! پانی لاؤ۔'' رانی کی ماں نے روتے ہوئے کہا۔

لڑکیوں نے نفیسہ کے منہ پر پانی چھڑکا اُس کی ناک دبا کر اُسے ہوش دلایا تھا۔

''رانی! ہائے میری رانی کا کیا ہوگا؟'' رانی کی امّاں پھُوٹ پھُوٹ کر رو دی۔

''رانی کو بچالو ماسی!'' نفیسہ نے ہذیانی انداز میں کہا۔

پھر وہ باہر کو دوڑی، جانے اُس میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔

''ارے اس باوَلی کو پکڑو۔'' رانی کی ماں نے روتے ہوئے لڑکیوں کو نفیسہ کو پکڑنے کے لیے دوڑا

''رانی کو بچالو... میری بہن کو بچالو۔'' نفیسہ لڑکیوں کی گرفت میں پھڑ پھڑا رہی تھی۔

رانی کی ماں نے روتے ہوئے نفیسہ کو دیکھا۔

''ہائے ربّا، خیر کرنا۔'' باہر کسی نے دین محمد کو بھی اطلاع دے دی تھی وہ بھی پریشانی سے اندر آیا۔

''میں، میں بڑی حویلی ہو کر آتا ہوں۔'' دین محمد نے دو ایک اور محلے کے لوگوں کو ساتھ لیا۔

سید نوازش علی کے قتل کے بعد سید عبداللہ کے نام سے اب یہ حویلی چل رہی تھی۔

''سید عبداللہ نیک روح ہے وہ ہماری مدد کرے گا۔'' دین محمد نے جلدی جلدی باہر نکلتے ہوئے اُ

تسلی دی یا پھر خود کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

نفیسہ نے چاچا دین محمد کے لڑکھڑاتے قدموں کو غور سے دیکھا اور بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو

اُس کا دل کسی بڑی انہونی کی خبر دے رہا تھا۔

❖❖○❖❖

جیدے کو ہوش آیا تو وہ سیدھا گھر بھاگا، جہاں نفیسہ کی گمشدگی سب کو پریشان کیے ہوئے تھی

فیصل، نفیسہ کو تلاش کرنے اپنے دوسرے بھائی قیصر کے ساتھ باہر نکلا ہوا تھا۔ جیدے کی خبر لرزا

والی تھی۔

''ہائے ربّا! اِن کڑیوں کو اکیلے نکلنے کی کیا ضرورت تھی۔'' ماسی صابراں نے سینے پہ دوہتڑ مار کر کہا

ماسی صابراں کے ساتھ بہت ساری مہمان عورتیں اور مرد بھی ساتھ ہو لیے تھے وہ کھیتوں میں لڑک

تلاش رہے تھے کیوں کہ جیدے نے بے ہوشی سے پہلے لڑکیوں کو کھیتوں کی طرف بھاگتے دیکھا تھا۔

''میرے مولا کرم کرنا۔'' ماسی صابراں لالٹین تھامے روتے ہوئے آگے بڑھیں۔

بیٹیاں تو دل کی رانیاں ہوتی ہیں اور آج اُن کو لگ رہا تھا، جیسے کسی چیل کوے نے اُن کا دل اُچک

ہو۔

❖❖○❖❖

صبح کا سورج قیامت ساتھ لایا تھا۔ سید سرفراز نے میرو کے سامنے اُس کی بہن کو بے لباس کر ک

پرانا بدلا اُتارا تھا۔

جواباً میرو آپے سے باہر ہوگیا اُس نے اُن بھیڑیوں پر حملہ کر دیا تھا رفیق، بشیر کو عین موقع پر مار

تھا جب کہ سید سرفراز علی نے پستول نکال کر میرو کے سینے میں چھ کی چھ گولیاں اُتار ڈالی تھیں۔

اپنی عزت کے کھونے اور بھائی کی لاش دیکھ کر رانی کو سوائے موت کے کوئی پناہ نہ نظر آئی، وہ ڈ

کے کنویں میں کود گئی تھی۔

سید سرفراز علی نے سارا الزام رفیق اور بشیر پر ڈال دیا اور خود کو معصوم اور بے خبر بتایا تھا۔ وہ سب

اسے صاف بچ نکلا تھا۔

''نہیں! میں سید سرفراز علی کو بچنے نہیں دوں گی، میں پنچایت اور پولیس کو گواہی دوں گی کہ رانی کو

سرفراز علی نے اُٹھایا تھا اسی نے اُس کے ساتھ زیادتی کی اور اُسے مار ڈالا، اُسی نے میرو کو مار

ڈالا۔'' نفیسہ نے بین کرتے ہوئے اٹل لہجے میں کہا تو ماسی صابراں نے دوڑ کر اُس کے منہ پر ہاتھ

رکھ دیا۔

''چپ! چپ کر جا... آواز گھونٹ لے کچھ نہیں بولے گی تو!'' انہوں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

''نہیں! میں چپ نہیں رہوں گی!'' نفیسہ نے ماں کا ہاتھ ہٹا کر چیخ کر کہا تھا۔

جواباً ماسی صابراں نے کھینچ کر اُس کے منہ پر تھپڑ مارا۔

''خبردار! دوبارہ میں نے تیری آواز بھی سُنی۔'' وہ اُسے سختی سے کہتے ہوئے وہاں سے اُٹھ کھڑی

ہوئیں۔

''نہیں امّاں! میری بہنوں جیسی سہیلی اور میرے محبوب کا خون اتنا سستا نہیں ہے کہ میں سید سرفراز کو

معاف کردوں، میں کل پنچایت ضرور جاؤں گی!'' نفیسہ نے دل ہی دل میں اٹل فیصلہ کیا تھا۔

❖❖○❖❖

''امّاں جان! کیوں آئے ہیں یہ لوگ؟'' سید عبداللہ نے عبدالولی کو اپنے کندھے پر بٹھا رکھا تھا وہ

ولی سے بے حد پیار کرتے تھے اس وقت بھی وہ جب ماں کے پاس آئے تو انہوں نے بچے کو اُتار کر اُس

کا موڈ خراب کرنا بہتر نہ سمجھا، اِسی لیے اُس کو ساتھ لے آئے تھے۔

''مہمان ہیں بیٹا! اور اس کو نیچے اُتارو اب یہ بڑا ہو گیا ہے تم ابھی تک اِس کو ایسے اُٹھاتے ہو، جیسے

کوئی اپنے گود کے بچے کو اُٹھاتا ہے۔'' زلیخا بی بی نے بیٹے کو پیار سے کہا کہ کہیں اتنے بڑے بچے کو

کندھے پر اُٹھانے سے اُن کے بیٹے کی کمر یا کندھوں میں تکلیف نہ ہو جائے۔

''چل شیر جوان نیچے اُتر۔'' سید عبداللہ نے ولی کو نیچے اُتارا۔

''بابا ہم ہیرے سے کھیلنے جائیں؟'' ولی نے اپنے گھوڑے کے متعلق پوچھا تھا۔ یہ گھوڑے کا بچہ خاص

طور پر ولی کی دِل چسپی کو دیکھتے ہوئے منگوایا گیا تھا۔

''بشیراں، او بشیراں۔'' زلیخا بی بی نے ملازم کو آواز دی۔

''جی بی بی!'' ملازمہ نے آ کر تابع داری سے پوچھا۔

''بچے کو اصطبل لے جاؤ، خود بھی ساتھ رہنا اور راکھے کو بھی کہنا کہ خاص دھیان کرے، ابھی ہمارے

پوتے کو ٹھیک سے گھڑ سواری نہیں آتی۔''

ملازمہ بچے کو لے کر باہر نکل گئی۔

''کون مہمان ہیں اور اُن کے آنے کا مقصد؟'' سید عبداللہ نے ماں سے پوچھا تھا۔

''تیری بہن کا رشتہ لینے آئے ہیں، اپنی ہی برادری کے ہیں۔'' زلیخا بی بی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا کون؟'' سید عبداللہ نے دِل چسپی سے پوچھا۔

''تیری بڑی امی کے رشتے دار ہیں۔'' زلیخا بی بی نے دھیمے لہجے میں بتایا۔

سید نوازش علی کی موت کے بعد سید سرفراز علی میں خاصا فاصلہ آ گیا تھا بے شک آج تک یہ ثابت نہ ہوسکا تھا کہ اُن لوگوں کی گاڑی پر کس نے حملہ کروایا تھا لیکن سدرہ بی بی نے جب سید سرفراز کا نام لیا تو سید سرفراز علی نے اپنے حق میں سارے گواہ اکٹھے کر لیے تھے اور اپنے ہاتھ صاف ثابت کر دیے تھے اس لیے ابھی تک اُن کے بیچ کھل کر دشمنی نہ ہوئی تھی لیکن خاموشی اور گریز کی دیوار بہت بلند ہو گئی تھی۔

''آپ کو کیا ضرورت تھی بڑی امی کی مدد لینے کی؟'' سید عبداللہ کا منہ بن گیا تھا۔

''اچھا بتائیں لڑکا کیا کرتا ہے؟'' سید عبداللہ نے ماں کا اُترا چہرہ دیکھ کر بات کو وہیں ختم کر دیا تھا کیوں کہ یہ اُن کی بہنوں کی زندگی اور خوشیوں کا سوال تھا وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی بدمزگی پیدا ہو۔

''تم مل کر تو آ رہے ہو بھا عبدالغنی سے ...'' لمّاں کی آواز بہت دھیمی ہوگئی تھی۔

''لمّاں جان!'' سید عبداللہ غصّے میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''یہ غیر انسانی سلوک آپ نے کیسے سوچ لیا۔'' عبداللہ نے کہا۔

''اگر یہ نہ ہوا تو وہ ہمیشہ کنواریاں بیٹھی رہیں گی۔'' ماں نے کہا۔

''لیکن میں نہیں مانتا۔''

''بیٹا! یہ پشتوں سے چلا آ رہا ہے، باپ اور بھائی اپنے ہاتھوں سے اپنی بیٹیوں کو قربان کرتے آئے ہیں یہ زمینیں ہمیشہ بیٹیوں کے خوابوں کا خون مانگتی آئی ہیں۔ مجھے ہی دیکھ لو اگر میرا کوئی بھائی ہوتا تو آج میری بھی شادی نہ ہوتی لیکن میں اپنے باپ کی تین بیویوں سے واحد اولاد تھی میرے بابا سائیں کو لاکھ چاہنے سے مزید اولاد نہ مل سکی اِس لیے مجھے اہمیت دینے پر وہ مجبور ہو گئے اور پھر میری شادی تمہارے بابا سائیں کے ساتھ ہوئی جو پہلے سے شادی شدہ تھے مجھے ساری عمر سوکن کا خطاب ملا۔ تمہاری بڑی لمّاں ہمیشہ مجھ سے نفرت کرتی رہیں لیکن میں پھر بھی خوش ہوں کہ تنہائی کاٹنے کے لیے دیواریں نصیب میں نہیں لکھی گئیں میری گود میں تمہاری صورت میں اور سدرہ، مریم کی صورت میں اولاد کا سکھ ملا۔ ربّ سائیں نے میری زندگی تم لوگوں کے وجود سے ہری بھری کر دی اور میں ہر بات بھول گئی۔'' زلیخا بی بی نے گہرا سانس لیا۔

''اولاد ایسی نعمت ہے جو ہر عورت کو مکمل کر دیتی ہے، اُس کے مَن کے خالی پن کو بھر دیتی ہے۔ ٹھیک ہے سدرہ، مریم کے جوڑ خاندان میں نہیں ہیں لیکن لیکن بے شک بھا عبدالغنی شادی شدہ اور بڑی عمر کا ہے لیکن سدرہ کنوارے پن کی تنہائی سے تو بچ جائے گی۔'' انہوں نے آہ بھر کر کہا۔

''اوہ مائی گاڈ!'' سید عبداللہ نے باقاعدہ اپنا سر تھام لیا۔

''لمّاں جان پلیز! میری پھول سی بہنوں کے متعلق آپ کیا سوچے بیٹھی ہیں اگر بابا سائیں آج زندہ نہیں ہیں تو آپ بھی تو اُن کے لیے مشکل زندگی کا انتخاب سوچے جا رہی ہیں، کیا یہ انصاف ہے۔'' سید عبداللہ کی گوری رنگت ایک دم غصّے سے سرخ پڑ گئی۔

''پتر! تو کیوں نہیں سمجھتا، کم از کم وہ اِن دیواروں کی قید سے تو بچ جائیں گی میں تو کچھ عذاب والا راستا دیکھ رہی ہوں۔ اُن کے پاس اچھی زندگی کا راستا ہے ہی نہیں تو پھر ایسے میں کم عذاب والا راستہ

...ری کی کچھ خوشیاں اُن کی جھولی میں ڈال سکتا ہے، اُن کو اولاد مل سکتی ہے، گھر داری کی مصروفیت مل سکتی ... یہ بہت کافی ہوگا اُن کے لیے...'' زلیخا بی بی نے آخری سطح کو سوچ کر یہ فیصلہ کیا تھا۔ اپنی نند کی ...لمہ پھوپو) کی عبرت ناک زندگی اُن کو اِس طرح کا فیصلہ کرنے پر مجبور کر گئی تھی۔

''پلیز لمّاں جان!'' سید عبداللہ شدّت جذبات سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''پہلے میں سمجھتا تھا کہ یہاں صرف دوسرے لوگوں کے حقوق کی پامالی کی جاتی ہے لیکن نہیں یہاں تو ... ہی گھر کی بیٹیوں کو بھی کوئی حق حاصل نہیں، یہ سب کیا ہے۔''

''پتر! یہ تو ہماری پشتوں سے چلا آ رہا ہے اور اِس سارے نظام کو آج تک کوئی نہیں بدل سکا۔'' زلیخا بی بی نے بات سنبھالنے کی کوشش کی، وہ نہیں چاہتی تھیں کہ برادری یا سید سرفراز علی، سید عبداللہ سے اس معاملے پر اُلجھیں۔

''لیکن میں ایسے نظام کو نہیں مانتا، جو انسان کو انسان نہ سمجھے، نظام انسانوں کے لیے بنائے جاتے ہیں نہ کہ نظاموں کو چلانے کے لیے انسانوں کی بھینٹ چڑھا دی جائے، میں اپنی بہنوں کی شادی خود اپنی جگہ کروں گا چاہے مجھے اس کے لیے کسی سے بھی ٹکر لینی پڑے۔ یہ میرا خود سے وعدہ ہے اور آپ سے بھی کہ میں اِس ظلم کو روکوں گا۔'' یہ بات کہتے ہوئے سید عبداللہ کو علم نہ تھا کہ سید نوازش علی کے بعد ہی اُس کے اصولوں سے ٹکرانا اِس قدر آسان نہ تھا۔ بہتے دھارے کے ساتھ بہنا چاہیے پانی صاف ہو یا گدلا! ہمیشہ آسان ہوتا ہے اِس کی مخالف سمت تیرنے کے لیے مضبوط قوتِ ارادی کی ہی نہیں مضبوط اعصاب کی بھی بے حد ضرورت ہوتی ہے۔

جاگیرداروں اور زمینداروں کے ہاں نسل در نسل ماننے والے، اطاعت کرنے والے ہی پیدا ہوتے ہیں وہ چاہے اولاد ہو یا ملازم! ہر دو صورتوں میں اِن کی اور صورتیں اکثر اپنے بڑوں کی پیروی کرنے اور رضا پانے کی جستجو میں ویسی ہی ہو جاتی ہیں!

بے شک ان سب میں سید عبداللہ کی صورت اور سوچ دونوں اِن کی اپنی تھیں، یہ اُن کی مضبوطی بھی تھی اور کمزوری بھی۔

''آپ فوراً اِن مہمانوں کو واپس کر دیں۔'' سید عبداللہ نے اٹل لہجے میں کہا۔

اُسی پَل باہر شور سنائی دیا۔

''یہ کیسا شور ہے؟'' زلیخا بی بی نے پوچھا تھا۔

''سائیں باہر گاؤں کے لوگ اکٹھے ہوئے ہیں، وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' اندر آ کر ملازمہ نے اُن کو اطلاع دی۔

''کیوں؟'' سید عبداللہ نے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

''دین محمد کا بیٹا اور بیٹی مارے گئے وہ انصاف کے لیے آئے ہیں، آج یا کل وہ پنچایت کے لیے بھی فیصلہ لیں گے۔'' ملازمہ نے اطلاع دی۔

''کس کے خلاف الزام ہے؟'' سید عبداللہ نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''وہ۔ وہ سائیں!'' ملازمہ نے ہچکچا کر کہا۔

''وہ سائیں سرفراز کے خلاف!'' ملازمہ نے بم پھوڑا۔

❖❖○❖❖

''سرفراز پتر! یہ سب میں کیا سن رہی ہوں؟'' ریحانہ بی بی نے سرفراز علی کو گھیرا، وہ اُس کے لیے بے حد پریشان تھیں۔

''کیا اماں جان؟'' سید سرفراز علی نے بے فکری سے پوچھا اُس کے چہرے پر کوئی پریشانی کے آثار نہ تھے۔ وہ ہمیشہ ہی بڑے سے بڑا کام کر کے بہت پُراعتماد رہتا تھا۔

''یہی ڈیرے سے دین محمد کے پتر کی لاش ملی ہے اور اُس کے کنویں سے گوی کی لاش ملی ہے۔'' ریحانہ بی بی نے حیرت سے بیٹے کی شکل دیکھی تھی کہ وہ کیسے اتنا بے خبر ہو سکتا ہے؟

''اماں! ہر انسان اپنے اپنے عمل کا جواب دہ ہے۔''

''جنہوں نے یہ حرکت کی وہ خود بھی مارے گئے۔'' سید سرفراز علی نے سارا الزام رفیق اور بشیر کے سر ڈال دیا۔

''تو نہ پریشان ہو پیاری ماں! تیرے بیٹے پر آنچ بھی نہ آئے گی۔'' سید سرفراز علی نے بے نیازی سے کہا۔

''سید سرفراز! اب تو سُدھر جا، تو بھی اب بال بچوں والا ہو گیا ہے، تیرے گھر والی کیا سوچے گی؟'' ریحانہ بی بی کے لہجے میں سچی تشویش موجود تھی۔

سید نوازش علی کی موت کے بعد وہ بالکل بدل کر رہ گئی تھیں، اب وہ سید سرفراز علی کو اُس کی ہر حرکت پر ٹوکنے لگی تھیں اُن کا دل ہر وقت ہولتا رہتا تھا لیکن سید سرفراز علی اپنی بُری عادتوں میں اِس قدر پکا ہو چکا تھا کہ اُسے ماں کی نصیحت بُری لگنے لگی تھی۔ کبھی تو وہ مڑ کر جواب دے دیتا ورنہ وہ اُن کی بات کو یونہی اُڑا دیتا تھا۔

''او چھوڑیں اماں جان! بیویوں کو کون اتنا سر چڑھاتا ہے اُن کو مرد کے کاموں اور باتوں میں بولنے کا کوئی حق نہیں۔'' سید سرفراز علی نے نخوت سے کہا تھا۔

''رب کو مان پتر! بیویوں کے بڑے حقوق ہوتے ہیں۔'' ریحانہ بی بی نے بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کی۔ انہوں نے خود ہی اپنے بیٹے کو اتھرا گھوڑا اور بپھرا سمندر بنایا تھا، جواب کسی طور قابو نہ آ رہا تھا۔ اب اکثر پچھتاتی تھیں۔

''آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ ہر وقت وعظ کے موڈ میں رہتی ہیں۔'' سید سرفراز علی نے بیزاری سے کہا۔

''بیٹے اگر ان دونوں بچوں کے خون سے تیرے ہاتھ رنگے ہیں تو اتنا یاد رکھنا خون کبھی چھپتا نہیں، سالوں بعد بھی اپنا بدلہ لے لیتا ہے۔'' ریحانہ بی بی نے سید سرفراز علی کو ڈرانے کی کوشش کی۔

''اماں جان! مجھے زمینوں پر نکلنا ہے بہت ضروری کام ہے، اجازت دیں۔'' سید سرفراز علی نے حسبِ عادت ماں کے پاؤں چھوئے اور باہر نکل گیا۔

جب کہ ریحانہ بی بی مٹی کے ڈھیر کی طرح کرسی پر ڈھیر ہو گئیں پھر ایک دم چونک کر سیدھی ہوئیں، سامنے صائمہ کھڑی تھی اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

''تو کیوں غم کرتی ہے! تیری تو پہلے ہی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' انہوں نے بہو کو اُٹھ کر تسلی دی۔

''خالہ! کس کس بات کا غم کروں اور کس کس کو چھوڑوں۔ وہ بدنظر ہے اِس کا دُکھ مناؤں کہ کوئی لڑکی اس کی بھیڑیا صفت سے بچ نہیں پاتی، ہر لڑکی سے وہ اپنے کھونے کے احساس کا بدلہ لیتا ہے یا پھر اِس بات کا دُکھ مناؤں کہ وہ انسان کو انسان ماننے پر تیار نہیں لیکن خود کو سب کا خدا مانتا ہے۔'' صائمہ ٹوٹے کانچ جیسی ہنسی، ہنسی تھی۔

''یا پھر اس بات پر دُکھ مناؤں کہ وہ دنیا میں صرف ایک عورت سے محبت کرتا ہے اور باقی سب سے اس کے نہ ملنے کا انتقام لیتا ہے۔'' صائمہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''بھابی عائشہ کی یہ بڑی سی تصویر ہمارے کمرے میں لگی ہے اور میری اِن چار سالوں میں مجال نہیں ہے کہ اِس تصویر کو ہٹا سکوں۔ سید سرفراز علی کے دو بیٹے پیدا کرنے کے بعد بھی میں اُس کے دل اور زندگی میں کوئی مقام نہ حاصل کر پائی۔ اِن چار ساڑھے چار سالوں میں، میں اُس کے تیسرے بچے کو جنم دینے جا رہی ہوں پھر بھی میری کوئی اہمیت نہیں، ایسے پتھر کے ساتھ جی کر کیا کرنا۔'' وہ آہ بھرتی وہاں سے اُٹھ گئی جب کہ ریحانہ بی بی ٹکر ٹکر اُسے جاتا دیکھتی رہ گئی تھیں۔ اُن کے پاس کوئی ایسا لفظ نہ تھا، جو جھوٹی تسلی کا بھی بھیس بنا پاتا۔ سید سرفراز علی کی اتنی سچائیاں ہر تسلی کو توڑ دیتی تھیں۔

''کاش! کاش! میں نے لالچ میں آ کر سید سرفراز کو ایسا نہ بنایا ہوتا! کاش میں نے اُس کی پہلی غلطی پر شاباشی دینے کے بجائے سزا دی ہوتی تو آج میرا ضمیر اس مسلسل سزا سے بچ جاتا جس میں، میں دِن رات جل رہی ہوں۔'' انہوں نے اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے آہ بھرتے ہوئے بے حد پچھتاوے سے سوچا تھا۔

''یا اللہ! میں کیوں بھول گئی کہ اگر اولاد نیک ہو تو مرنے کے بعد صدقہ جاریہ بن جاتی ہے اور اگر بد ہو تو عذابِ مسلسل کا سبب بنتی ہے! مجھ سے کتنی بڑی بھول ہو گئی میں نے اپنے ہی بیٹے کو بُرا آدمی بنا دیا۔ اب وہ اتنا بُرا بن گیا ہے کہ سب لوگ اِس کو گاؤں میں فرعون سمجھنے لگے ہیں اور فرعون کی تو ہدایت قسمت سے نکال دی گئی تھی۔ تباہی اور عبرت انگیز انجام اُس کے اعمال کی وجہ سے لکھ دیا گیا تھا۔

''تو کیا میرا بیٹا بھی تباہی اور عبرت انگیز انجام پائے گا!''

''نہیں خدایا! اِس سے پہلے مجھے موت آ جائے!'' انہوں نے شدت سے دعا کی تھی۔

اُن کے اعصاب پر اِس قدر بوجھ پڑا کہ وہ لڑکھڑا کر گر پڑیں، اُن کی زبان اور جسم کے زیریں حصے پر فالج کا زبردست اٹیک ہوا تھا۔

❖❖○❖❖

''یہ تو بہت بُری خبر ہے!'' فیصل نے اطلاع دینے والے آدمی سے بے اختیار کہا۔

''اچھا یار! تم بیٹھو میں اندر اطلاع دے کر آتا ہوں۔'' فیصل نے آدمی کو گھر کے باہر بچھی چارپائی پر بٹھایا اور خود اندر کی جانب بڑھا۔ اُس کے قدم بے حد بوجھل تھے، اُس کا دل تو اِس سے بھی زیادہ بوجھل تھا۔

''کون ہے باہر؟'' فیصل کے بابا نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے پوچھا تھا۔

''چاچا دین محمد کے محلے سے آیا ہے!'' فیصل کا حوصلہ نہ پڑ رہا تھا کہ کیسے اگلی اطلاع دے لیکن مجبوری تھی کہ بات پوری کیے بغیر گزارہ نہ تھا۔

''اب کیا ہوا؟ ویسے اب اور کتنا بُرا ہوگا؟ میرے یار کا تو سارا گھر ہی اُجڑ گیا۔'' فیصل کے بابا نے لمبی آہ بھری تھی۔

''ماسی کا ایک گھنٹے پہلے انتقال ہوگیا۔'' فیصل نے آخر وہ خبر دے ہی ڈالی۔

بے چاری ماں سے اپنی اولاد کا دُکھ جھیلا نہ گیا تھا جس بیٹی کو رانیوں کی طرح رکھا تھا وہ یوں اذیت بھری موت مرے گی یہ سوچا بھی نہ تھا اور جس بیٹے کے شگن کرنے وہ نکلنے لگی تھی اُس کی لہولہان لاش اُس کے سارے حواس ختم کرگئی تھی اور اب! اُس کی زندگی تمام کرگئی تھی۔

چار دن سے سید سرفراز علی مسلسل اپنے اثر رسوخ سے پنچایت منسوخ کروا رہا تھا۔ دین محمد پاگلوں کی طرح کبھی تھانے جاتا اور کبھی پنچایت کے لوگوں کے پاس جاتا، آخر سید عبداللہ نے تین دن بعد حتمی طور پر کہا کہ پنچایت ضرور بیٹھے گی اور انصاف کرے گی اور پنچایت کی بیٹھک اب مزید منسوخ نہیں ہوگی۔ بے چارا دین محمد انصاف حاصل کرنے میں ایسا مصروف ہوا کہ اُسے بیوی بھول گئی جو گیلی لکڑی کی طرح اتنے دن سے چیخ رہی تھی اور آج وہ ایسی چیخی کہ اُس کا دِل چیخ کر پھٹ گیا اور اُس نے دم دے دیا۔

''ہائے ربّا!'' ماسی صابراں نے یہ اطلاع سن کر اپنے سینے پر دو ہتڑ مارے تھے۔

''برباد ہوں اُن کی نسلیں جنہوں نے میری بہن پر یہ ظلم اُٹھایا تھا۔ ہائے ربّا میری بہن کا تو سارا گھر برباد ہوگیا وہ خود چلی گئی اور ہمیں ایک اور دُکھ رونے کو دے گئی۔'' ماسی صابراں کی وہ خالہ زاد بہن ہی نہیں بلکہ بچپن کی سہیلی بھی تھی، شادی کے بعد بھی اُن میں کبھی دوری نہ آئی کیوں کہ دونوں کے شوہر پہلے سے بہت اچھے دوست تھے۔

چند دن پہلے وہ اِس دوستی کو ہمیشہ کی رشتے داری میں بدلنے والے تھے لیکن ایسی بُری نگاہ اُس کم بخت سرفراز علی کی پڑی کہ اُس کا پورے کا پورا گھر برباد کردیا تھا۔

نفیسہ کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں، اُس کے ارادے مزید مصمم ہوگئے تھے کہ وہ آئندہ دنوں میں گواہی ضرور دے گی، چاہے اُسے چوری ہی جانا پڑے۔

❖❖○❖❖

رانی کی ماں کے آج قُل تھے جب فیصل چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا گھر کی جانب جا رہا تھا اُسے بڑی حویلی کا ملازم ملا تھا۔

''آپ کو سید عبداللہ نے یاد کیا ہے۔'' وہ پیغام دے کر آگے بڑھ گیا جب کہ ڈاکٹر فیصل بوجھل دل اور قدموں سے بڑی حویلی کی جانب پڑا تھا۔

حویلی کے مین گیٹ پر ہی اُسے سید عبداللہ مل گئے تھے جو اُسے اپنے کمرا خاص میں لے آئے۔

''مجھے تم سے بے حد اہم بات کرنی ہے۔'' سید عبداللہ نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

''جی کہیے!'' ڈاکٹر فیصل نے مرجھائے لہجے میں کہا۔

اُس کا دل اندر تک مرجھایا ہوا تھا گزشتہ دنوں کے حادثات نے اُسے اندر تک ہلا دیا تھا۔

''سرفراز کا نام دین محمد کے معاملے میں لیا جا رہا ہے مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہاری بہن موقعے کی گواہ تھی، میں چاہتا ہوں تم اپنی بہن کو لاؤ گواہی کے لیے، کل پنچایت ہے اُس بوڑھے آدمی کی ساری دنیا اُجڑ کر برباد ہوگئی اسے انصاف ضرور ملنا چاہیے اور ایسا تمہاری بہن کی گواہی سے ممکن ہوگا۔'' سید عبداللہ نے گم صم ڈاکٹر فیصل کو بہ غور دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''میری بہن کو اِس کمزور معاملے میں نہ ڈالیں۔ دُکھ نے اُسے اعصابی طور پر بہت کمزور کردیا ہے وہ بار بار بے ہوش ہوجاتی ہے۔'' ڈاکٹر فیصل نے معذرت کی تھی۔

''پلیز! تم اچھے انسان ہو، تم تو اچھائی کا ساتھ دو۔'' سید عبداللہ نے اُسے جذباتی طور پر گھیرا تھا۔

''پلیز عبداللہ بھائی! میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں لیکن میں اپنی بہن کو جانتے بوجھتے کیوں مشکل میں ڈالوں جب کہ میں جانتا ہوں کہ سید سرفراز علی اپنے سامنے کھڑے ہونے والے کو ہی نہیں اُس کے سارے گھرانے کو ختم کردیتا ہے۔'' ڈاکٹر فیصل نے صاف لفظوں میں معذرت کی تھی۔

''پلیز فیصل! یہ کوئی جنگل کا قانون تھوڑی ہے، ہم گواہ سامنے رکھ کر انصاف کریں گے۔'' سید عبداللہ نے بے حد خوشی سے کہا۔

''عبداللہ بھائی! آپ بھول رہے ہیں کہ یہ چند روز پہلے جو کچھ ہوا وہ جنگل کا قانون ہی تھا مجھے اجازت دیں، مجھے اور میری بہن کو اِس معاملے سے دور رکھیں۔'' ڈاکٹر فیصل کہہ کر جانے کے لیے اُٹھا۔

''فیصل پلیز! ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچو، اِن روایات کو اور اُس کے آسیب کو ختم کرنے کے لیے ارتقاء کا پہلا قطرہ تو کسی کو بننا ہی ہوگا پھر اس نیک کام کے لیے تم کیوں نہیں! میں کل تمہارا پنچایت میں انتظار کروں گا۔'' سید عبداللہ نے اُسے پیچھے سے کہا۔

جب کہ فیصل تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔

❖❖○❖❖

''اُس لڑکی کی اتنی جرأت کہ اُس نے میرے خلاف گواہی دی۔'' سید سرفراز علی کو آج کی پنچایت کے فیصلے کی اطلاع ملی تو وہ آدم خور شیر کی طرح غرایا تھا۔

''سائیں! یہ وہی لڑکی ہے، جو ڈاکٹر فیصل کی بہن ہے۔'' خادم خاص نے جلتی پر تیل ڈالا تھا۔ سید سرفراز علی کو گاؤں میں ہسپتال کی تعمیر بہت ناپسند تھی لیکن وہ سید عبداللہ کی زمین پر ہسپتال بنا رہا تھا اس لیے وہ اُسے فوری طور پر نہ روک سکتے تھے لیکن وہ اس فیصل کے دشمن ہوگئے تھے، جس نے اس گاؤں کی ترقی کے لیے پہلا خطرہ بننے کی کوشش کی تھی۔'' اِس طرح اُن کے خادموں کے اندر آگہی پیدا ہوسکتی تھی۔

آگہی کا غلامی سے بیر ہوتا ہے! اور یہی غلامی تو اتنے برسوں سے اتنی نسلوں سے اُن کو آقا کا درجہ دلاتی رہی تھی اس کو اپنے سروائیول کے لیے اِس آگہی پر پابندی لگانی ضروری تھی اور سید عبداللہ اور ڈاکٹر فیصل اِس پابندی کی راہ میں حائل ہو رہے تھے، سید سرفراز زبانی کلامی کئی بار ڈاکٹر فیصل کو دھمکا چکا تھا کہ

وہ اِس کام سے رک جائے لیکن ڈاکٹر فیصل نے بہت سختی سے انکار کیا تھا اور یہ انکار سید سرفراز علی کو اپنے لفظوں میں منہ زوری محسوس ہوتی تھی اس لیے فیصل اُن کے ناپسندیدہ ترین بندوں میں تھا، آج اُس کی بہن نے بھی منہ زوری کر ڈالی تھی۔ سید سرفراز علی کا نام اِس معاملے میں لے لیا تھا۔

پنچایت نے جو فیصلہ کیا تھا وہ سید سرفراز علی کے لیے کسی شکنجے سے کم نہ تھا۔ اگلی پنچایت میں پولیس نے بھی آنا تھا اور بیان اکٹھے کرنے تھے جو سید سرفراز علی کے لیے پھانسی کا پھندا بن سکتے تھے۔

''اِس لڑکی کو اپنا بیان بدلنا ہوگا ورنہ اِس کا اور اس کے خاندان کا انجام بہت بُرا ہوگا۔'' آج تک سید نوازش اور سید عاشق علی نے سیاہ سفید کیا، اُس کو کوئی بھی روکنے ٹوکنے والا نہ تھا اِس لیے ظلم ہوتے، خون بہتے اور گواہی نہ ہونے کے سبب اُن پر کبھی الزام نہ آیا تھا، لیکن آج یہ اِس گاؤں کی تاریخ کا پہلا واقعہ تھا کہ گاؤں کے مالکوں کے خلاف کسی نے آواز اُٹھائی تھی۔

''سائیں! باہر ایس ایچ او صاحب آئے ہیں۔'' ملازم نے اندر آ کر اطلاع دی۔

''ہاں لے آؤ!'' سید سرفراز نے ماتھے پر تیوری ڈال کر کہا۔ وہ کسی گہری سوچ میں مبتلا تھا اُس کا شیطانی دماغ بہت تیزی سے چل رہا تھا۔

''السّلام علیکم سر!'' ایس ایچ او نے اندر آ کر باقاعدہ جھک کر سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔'' سید سرفراز نے نہایت خراب موڈ میں جواب دیا۔

''سائیں! میں کوئی تفتیش نہیں کرنے آیا نہ ہی کوئی اور بات ہے میں تو بس اتنا کہنے آیا ہوں کہ بڑے سر نے کہلوایا ہے کہ پنچایت نے آپ کو پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا ہے آپ بتائیے اب کیا کرنا ہے؟ اس لڑکی اور بچے کی گواہی پھانس کی طرح اٹک گئی ہے۔'' ایس ایچ او نے فکری مندی سے کہا تھا۔

''گاؤں کا مولوی کہاں مرگیا تھا، عورت کی گواہی آدھی ہوتی ہے اور بچے کی گواہی تو پونی بھی نہ ہوگی۔

لیے پھرتے ہیں یہ گواہ!

پھر یہ گواہ پورے نہیں ہیں تو... کہاں کا کیس کیسی پنچایت!

معاملے کو بگاڑ ڈالو، کچھ حامی پیدا کرو شرعی طور پر گواہی کا مسئلہ اُٹھائیں، نمبر دو اُس لڑکی اور اُس کے خاندان کو مزا چکھاؤ کہ آئندہ وہ گواہی کے لیے کبھی سوچ بھی نہ سکیں۔

تنویر الٰہی!'' سید سرفراز علی نے خادم خاص کو مخاطب کیا۔

''جی سائیں! حکم۔'' خادم خاص نے سینے پر ہاتھ رکھ کر تابع داری سے پوچھا۔

''دو لاکھ صاحب کو دے دو۔'' یہ رقم اُس دور کے حساب سے بیس لاکھ کے برابر تھی۔

''دو لاکھ؟'' خادم خاص کے منہ سے تو کچھ نہ نکلا تھا البتہ چہرے پر حیرت ہی حیرت رقص کر رہی تھی۔

دوسری جانب تھانے دار نے بے اختیار لبوں پر زبان پھیری تھی۔ وہ دِل ہی دِل میں اپنے حصے کے متعلق حساب لگا رہا تھا کہ اُس کے حصے میں کیا آتا ہے۔

''سر! کام ہوجائے گا آپ بے فکر رہیں۔'' تھانے دار سیلوٹ کے انداز میں کھڑے ہوتے ہوئے

...ا، یہ سیلوٹ اُس رقم کو تھا جو اُسے اِس کمرے سے باہر نکلتے ہی ملنے والی تھی۔ سید سرفراز کے چہرے ...ادہ مسکراہٹ تھی۔

...ہ ایک بار پھر شطرنج کی بساط بچھا چکا تھا اور اپنا من پسند کھیل شروع کر چکا تھا، جہاں بازی صرف ...ا لی ہی تھی۔

❖❖○❖❖

...ی کی گواہی! خاص طور پر نابالغ لڑکی کی گواہی کی شریعت میں کوئی حیثیت نہیں ہے عورت کی تو ...ہی ہوتی ہی آدھی ہے! اسلام میں کسی پر جرم تب تک ماننے سے منع کیا گیا ہے، جب تک دو گواہ ...ے نہ ہوجائیں، اگر ادھوری گواہی پر کسی کو سزا سنائی جائے تو وہ سراسر گناہ ہوتا ہے! توبہ کرو توبہ ...ہاں کے خاندان پر الزام؟

اگلے دن گاؤں میں جگہ جگہ لوگ ٹولیاں بنائے یہ باتیں کر رہے تھے۔ ان ٹولیوں کو بنانے والے سید ...راز علی کے حامی تھے جو باقاعدہ لوگوں کی سوچ کے دھارے کو بدلنے کے کام پر معمور ہوئے تھے۔

...تیجہ حسب توقع ملا تھا!

...ین محمد کے بعد بیٹے، بیٹی کا خون شام کے سائے میں دھندلا گیا تھا جب ''خالص'' میں شک کا پانی ...لسل ڈالیں تو بات کا تاثر اور مسئلے کی شدت اور نوعیت بدل کر رہ جاتی ہے اور یہی کچھ سید سرفراز علی ...ا کروایا تھا۔

کل تک ہر گاؤں کا آدمی ایک دم سے اُس کے خلاف کھڑا ہو رہا تھا آج وہ لوگ کسی جھاگ کی مانند ...ھ گئے تھے۔

بہت ساری عورتیں ماسی صابراں کو بھی دہلا آئی تھیں کہ اُن کی بیٹی نے جھوٹا الزام سید سرفراز پہ لگایا ...ہ یقیناً اللہ کا قہر اُن پر نازل ہونے والا ہے۔

ماسی صابراں نے سہم کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھا تھا وہ دیکھ رہی تھیں کہ یہ قہر کس کی جانب سے نازل ...ہونا تھا۔

...اکٹر فیصل تو ہسپتال کے سامان کے لیے کچھ ہی دیر پہلے نکلا تھا۔ انہوں نے اپنے دوسرے بیٹے قیصر ...شہر میں کالج میں اردو کا استاد ہوگیا تھا اور میرو نفیسہ کی منگنی کے لیے گاؤں آیا ہوا تھا لیکن مسلسل ...الات، ماں باپ اور بہن کی غیر حالت اور حالات کی سنجیدگی و پیچیدگی کی وجہ سے واپس نہ جاسکا تھا ...ے فوراً تیار کیا کہ وہ نفیسہ کو لے کر شہر اُن کی سہیلی کے ہاں چلا جائے اور اُن کو پیغام دے کہ وہ نفیسہ کو ...ھ عرصے کے لیے اپنے ہی پاس رکھیں، اُن کی یہ سہیلی اُن کی ماں کی خالہ زاد بہن کے ہاں بیاہی گئی تھی ...صرف وہ اُن کی رشتے کی بھابی لگتی تھیں بلکہ اُن کے بچپن کی سہیلی بھی تھیں، اس لیے وہ نفیسہ کو وہاں ...ھیجنے پر بالکل یک سو تھیں۔

''لیکن امّاں! یہ فیصلہ کیوں؟'' قیصر نے اُن کو نفیسہ کا اتنا سارا سامان اکٹھے کرتے دیکھ کر پوچھا۔

''تو چپ کر... پہلے بڑے نے بہادری کے ڈنگے بجا کر بہن کو لے جا کر پنچایت میں کھڑا کر دیا اور ...ب چھوٹا سوال کر رہا ہے۔ ارے ایسی بے وقوف اولاد میرے ہی نصیب میں تھی۔'' ماسی صابراں نے

ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

قیصر نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی تھی۔

''چلوتم لوگ صبح ہونے سے پہلے گاؤں سے نکل جاؤ، میں نے تانگہ منگوایا ہے ابھی آتا ہی ہوگا''
ماسی صابراں اٹل فیصلہ ہی نہیں مکمل تیاری بھی کر کے بیٹھی تھی۔

ماں کا دل ایک ایسی معجزانہ مشین ہے، جو ہر انہونی کا سگنل بہت پہلے سے ریسیو کر لیتی ہے۔

کچھ ایسے ہی سگنلز نے ماسی صابراں کو الرٹ کر دیا تھا۔

❖❖○❖❖

فضا میں مینڈکوں اور ٹڈیوں کی آواز نمایاں تھی بیچ میں کہیں کہیں کتوں کے بھونکنے کی آواز اِن آوازوں کے تسلسل کو توڑتی تھی۔

سدرہ بی بی کا دل اب نہیں ڈرتا تھا۔ وہ تو اب اِن کچے پکے راستوں پر آنکھیں بند کر کے چل سکتی تھی۔ اس کے قدموں میں بہت تیزی تھی۔ بشیراں جو پیغام لائی تھی اُس کے مطابق وہ دو گھنٹے لیٹ تھی وہ کیا کرتی امّاں اور بھابی سوئی ہی اتنی دیر سے تھیں کہ اُسے نکلنے کا موقع اب ملا تھا۔

''یا میرے اللہ! کہیں ڈاکٹر باؤ چلا نہ گیا ہو۔'' دل میں وسوسے آرہے تھے کیوں کہ بہ قول بشیراں کے ڈاکٹر باؤ شہر کے لیے نکلنے والے تھے اور شہر سے نکلنے سے پہلے وہ اُس سے ملنا چاہ رہا تھا۔

کنویں کے پاس خالی جگہ دیکھ کر سدرہ کا دل دھک کر کے رہ گیا اُسے ایک دم بہت کچھ کھونے کا احساس ہوا تھا۔ اُس کی روح کی پیاس مزید بڑھ گئی جو ڈاکٹر باؤ کو دیکھنے سے بجھ سکتی تھی۔

''خدایا! وہ تو چلے گئے۔'' سدرہ کی جھیل جیسی براؤن آنکھوں میں بے اختیار موٹے موٹے آنسو آگئے۔

''موتیا!'' تبھی اُس کے پیچھے سے جو آواز آئی وہ اُس کے اندر زندگی دوڑا گئی۔

''ڈاکٹر باؤ!'' وہ دوڑ کر اُس کے کندھے سے جالگی۔

''موتیا!'' ڈاکٹر فیصل کا لہجہ کس قدر تڑپ رکھتا تھا وہ سدرہ کے تن من کو شانت کر گیا۔

''کیا ہوا پگلی! رو کیوں رہی ہو؟'' ڈاکٹر فیصل نے سدرہ کے چہرے پر آنسو محسوس کر کے پوچھا۔

''میں ڈر گئی تھی کہ کہیں میں آپ سے ملے بغیر نہ رہ جاؤں۔'' سدرہ نے معصومیت سے کہا۔

جواباً ڈاکٹر فیصل نے اُس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

''یار اب اور برداشت نہیں ہوتا! یہ دوری یہ جدائی مجھے اندر ہی اندر سلگا کر کھوکھلا کر دے گی۔ میں ہسپتال کے مکمل ہوتے ہی عبداللہ بھائی سے تمہارا ہاتھ مانگوں گا۔'' فیصل نے سدرہ کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''کمال ہے فیصل باؤ! اتنے عرصے سے ایک ہی بات آپ کو سمجھا رہی ہوں کہ ہمارے ہاں خاندان سے باہر شادی نہیں کرتے چاہے لڑکی بوڑھی ہو کر مر جائے۔''

''تو پھر تم ہی بتاؤ، اب کیا کریں؟''

''کیا تم میرے بِنا رہ لوگی؟'' ڈاکٹر فیصل نے کہا تو سدرہ نے تڑپ کر اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''میرا ہاتھ تھام کر مجھے اتنی دور لے آئے ہو اب تو تمہارے بِنا مرجاؤں گی تمہارے بِنا جینا ناممکن ہے۔'' سدرہ نے سچائی سے اعتراف کیا۔

''ہم یہاں سے کہیں دور چلے جاتے ہیں!'' سدرہ نے ہمیشہ کی طرح اپنی بات دہرائی۔

''کہاں! ڈھونڈنے والے تو پاکستان کے ہر کونے سے ڈھونڈ نکالیں گے، پھر میں اپنے والدین بہن بھائی سب کو چھوڑ کر کہاں جاسکتا ہوں اور یوں چوروں کی طرح بھاگنا ہوتا تو اتنے سال کیوں ضائع کرتا۔ نہیں موتیا! میں تمہیں سب کے سامنے اپناؤں گا... سب کے سامنے حاصل کروں گا۔''

''تو پھر ڈاکٹر باؤ! میری لاش تمہیں مل سکتی ہے، میں نہیں! کاش ہم کسی دوسرے ملک چلے جاتے، اپنا گھر بسا لیتے۔'' موتیا نے دُکھی لہجے میں کہا۔

''کہاں چلے جاتے؟'' فیصل نے اُس کا موڈ بحال کرنے کے لیے دلچسپی سے پوچھا۔

''ولایت! جہاں سے ویر عبداللہ تعلیم حاصل کر کے آیا ہے، وہاں سے لوگ اچھے بن کر آتے ہیں، جیسے میرا ویر عبداللہ۔'' سدرہ نے معصومیت سے کہا تھا۔

ڈاکٹر فیصل مسکرائے بنا نہ رہ سکا، وہ اِس بھولی معصوم روح کو بھلا کیا سمجھاتا کہ اچھائی تو انسان کے اندر سے اُگتی ہے اُسے کسی اور ملک کی ہوا یا پانی نہیں اُگا سکتا۔

''میری جان! تم صرف اور صرف میری ہو میرا نصیب ہو میرے دل کی دھڑکن اور میرے اندر بسنے والی زندگی ہو، جسم سے روح کو کوئی جدا نہیں کرسکتا نہ کوئی روایت نہ کوئی رسم! میں ہر چیز سے تم کو چرالوں گا۔'' ڈاکٹر فیصل کی اٹل باتیں سدرہ کے ''ناممکن'' کی دیوار کو کمزور کر رہی تھیں اور سدرہ اِس دیوار کے کمزور ہونے پر اندر ہی اندر بے حد خوش تھی۔

''شکریہ ڈاکٹر باؤ!'' وہ بے اختیار بولی۔

''اچھا یہ دیکھو میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں؟'' ڈاکٹر فیصل نے گولڈ کی چین جس میں لاکٹ لٹک رہا تھا اس کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''میرے لیے؟'' سدرہ جس کے پاس کلو کے حساب سے سونا تھا یہ چین پا کر بے حد خوش تھی۔

''ہاں میری جان! اِس کے باہر سدرہ لکھا ہے اور جب تم اِسے کھول کر دیکھو گی تو اندر میری تصویر ہے۔'' ڈاکٹر فیصل نے خاص طور پر یہ دل کی شکل کا لاکٹ بنوایا تھا، جس کے باہر سدرہ کا نام کندہ تھا اور اس کو کھولنے پر ڈاکٹر فیصل کی تصویر نظر آتی تھی۔

''ابھی اندھیرے میں نظر نہیں آئے گا تم اس کو گھر جا کر روشنی میں دیکھنا کہ سدرہ کے دل کے اندر اول اور صرف فیصل کی تصویر ہے۔'' ڈاکٹر فیصل نے چین کا لاک لگاتے ہوئے کہا۔

سدرہ کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ در آئی چہرہ اور کانوں کی لویں تک شرم سے دہکنے لگی تھیں۔

''چلو موتیا! تمہیں چھوڑ آؤں، مجھے شہر بھی نکلنا ہے۔'' موتیا کو بشیراں آدھے راستے پر مل جاتی تھی پھر دونوں اکٹھے حویلی واپس جاتی تھیں۔ اس ساری راز داری اور کام کا بشیراں کو منہ مانگا انعام ملتا تھا اس لیے وہ یہ کام بے حد راز داری اور خوشی سے کر رہی تھی۔

اسی پل مسلسل اور بھیانک قسم کی فائرنگ کی آواز فضا میں گونجی تھی، ڈاکٹر فیصل نے تشویش اور سدرہ

نے پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

''یہ آواز تو اِدھر سے آ رہی ہے، پگ ڈنڈی کے اُس پار! اُدھر تو ڈاکٹر باؤ آپ کا گھر ہے۔'' سدرہ نے پریشانی سے کہا۔ وہ جانتی تھی کہ اس گاؤں میں اسلحے کا استعمال صرف حویلی والے کرتے تھے اس لیے اس کا دل بے حد ڈرا تھا۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

''اللہ خیر کرے گا تم جاؤ میں دیکھتا ہوں۔'' ڈاکٹر فیصل نے موتیا کو اُس کے راستے بھیج کر تیزی سے اپنے گھر کی جانب دوڑ لگائی۔

جوں جوں وہ گھر کے قریب پہنچ رہا تھا، اُس کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا کیوں کہ فائرنگ کی آواز اور رفتار بڑھ گئی تھی۔ فیصل کا دِل بُری طرح ڈوبا، سامنے اُس کے گھر کے باہر کتنے ہی گھڑ سوار موجود تھے اور وہ اُس کے گھر کے اندر فائرنگ کر رہے تھے، دور سے کہیں کھیتوں سے اسپیکر پر پولیس کے ہرکارے اعلان کر رہے تھے۔

''چھمو ڈاکو تجھے چاروں جانب سے گھیر لیا گیا ہے اپنے ہتھیار پھینک دو۔'' یہ اعلان بار بار کرنا سے سب گھروں میں سنائی دے گیا تھا۔

لیکن ڈاکٹر فیصل کی آنکھیں مختلف منظر دیکھ رہی تھیں۔ گھوڑوں پر سوار بھی پولیس کی وردی میں تھے جو اُن کے گھر کو گھیرے کھڑے تھے اور شاید اندر بھی گھسے ہوئے تھے اور کھیتوں میں کھڑا سپاہی اسپیکر پر اعلان کر رہا تھا۔ وہ بہت سکون سے اعلان کر رہا تھا۔

''میرے خدایا! یہ کیا ڈراما ہے؟''

ڈاکٹر فیصل کا دماغ ابھی یہ ڈراما سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ایک سنسناتی گولی اُس کے آ کر لگی، وہ بے اختیار چیخا، ایک اور گولی کمر میں لگی تھی اور پھر اُس کے اندر آگ لگا کر جسم کو جلا گئی۔ وہ لہرا کر گرا۔

ڈاکٹر فیصل نے شدت کرب سے ہونٹ کاٹے تھے۔

''پاپا، پاپا!'' ایک دم سامنے کا منظر فضا میں تحلیل ہو گیا، جہاں ڈاکٹر فیصل خون میں لت پت پڑا تھا باہر سے زہرہ کی مسلسل آواز اور دستک جاری تھی۔

''پاپا!'' زہرہ کی آواز آئی۔

ڈاکٹر فیصل ماضی کا طویل سفر کر کے واپس آئے تھے اس لیے پسینے سے شرابور تھے انہوں نے بہ مشکل اُٹھ کر دروازہ کھولا، زہرہ نے پریشانی سے باپ کو دیکھا تھا جو ہانپ رہا تھا۔

''پاپا آر یو آل رائٹ؟''

زہرہ نے پریشانی سے اپنے باپ کو دیکھا۔ اُس کا اتنے مضبوط اعصاب والا باپ، یورپ کا مشہور ہارٹ سرجن، کسی چھوٹے بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

''وہ۔ وہ۔ اُس نے میرے بابا کو، اماں کو، بھائی کو مار ڈالا۔ سب کو مار ڈالا۔''

وہ جانے کس کی بات کر رہے تھے۔ برسوں کے رُکے آنسو سیلاب کی طرح اُمڈ آئے تھے، ہر باندھے گئے بند کو توڑتے ہوئے۔ پھر وہ ایک دم ہی دو زانو بیٹھ کر منہ پر ہاتھ رکھ کر پاگلوں کی طرح روتے ہوئے چیخے۔

''میرے بابا! میری اماں!

''بابا۔ اماں!'' انہوں نے اپنے والدین کو پکارا۔

''قیصر۔ قیصر! میرا بھائی۔'' آہ دِل سے نکلی تھی۔

''نفیسہ میری پیاری بہن! سب کو ظالموں نے مار ڈالا۔''

برسوں پرانا دُکھ جو ہمیشہ سے تازہ تھا، آج منہ کھول بیٹھا تھا اور وہ رو رہے تھے۔ زار زار رو رہے تھے کہ زہرہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے پریشانی سے اپنے پہاڑ جیسے مضبوط باپ کو نمک کی طرح گھلتے دیکھ رہی تھی۔

یہ سب ہے اک فریب نظارہ نہیں جیے
جو مر گئے تھے لوگ دوبارہ نہیں جیے
آخر میں جب حساب کیا تو پتا چلا
اپنے لیے تو ایک بھی لمحہ نہیں جیے
اکثر ہی رائیگاں چلی جاتی ہے زندگی
زندہ تھے بے ثبات لہٰذا نہیں جیے
جینے کی خوب ڈھیر دُعائیں ملیں ہمیں
سو بڑھ گیا گمان ہمارا ، نہیں جیے
یہ لذتِ یقین کہ زندہ ہیں دوستو
کچھ اس قدر بڑھی کہ زیادہ نہیں جیے
ہر ایک لمحہ جیے تشنگی کے ساتھ
پھر یہ دُعا کہ کوئی بھی پیاسا نہیں جیے

’’کیوں پاپا! آپ نے ہم سے یہ سب کچھ کیوں چھپایا؟‘‘ زہرہ نے اپنے باپ کے ہاتھوں کو ہاتھوں میں لے کر سوال کیا۔

’’پیاری بیٹی! انسان اچھی باتیں اور یادیں تو شیئر کرلیتا ہے درد اور تکلیف سے چور لمحوں کو وہ کیسے شیئر کرکے اپنے پیاروں کو بھی درد آشنا کردے۔‘‘ ڈاکٹر فیصل نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

’’پاپا! آپ اتنے سالوں سے اتنا بڑا بوجھ دل پہ لیے جی رہے ہیں کیا آپ کی اولاد صرف آپ کی خوشیاں، پیسہ اور وراثت شیئر کرنے دُنیا میں آئی ہے، کیا اُسے اپنے ماں باپ کا غم شیئر نہیں کرنا چاہیے؟‘‘ زہرہ نے اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

ڈاکٹر فیصل اُسے چپ چاپ دیکھتے رہے، وہ ہو بہو سدرہ جیسی باتیں کرتی تھی پھر زہرہ کی آنکھیں آنکھیں اور ٹھوڑی پہ موجود تل بالکل سدرہ جیسا تھا۔

’’فاصلے اور دوری ہم کو دور نہیں لے جاسکتے! ہم کہیں نہیں جاتے، اگر ہم دل میں رہتے ہوں تو ساتھ رہتے ہیں اور پھر جب کوئی ہمارا اپنا ہماری محبت کا حصے دار بنتا ہے تو ہمیں اپنے محبوب کی ادا اُس کا چہرہ اُن میں نظر آنے لگتا ہے۔ ہم اُن کے چہروں میں کبھی چھلک کر اور کبھی چھپ کر خود

...کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ ہم کہیں نہیں جاتے، ہم تو آس پاس ہی رہتے ہیں۔‘‘ ڈاکٹر فیصل کو ...کی کہی بات یاد آئی، اُن کا دل مسوس کر کے رہ گیا تھا۔

’’پاپا! آپ نے میرے پیارے پاپا اور امی پہ یہ ظلم کرکے اچھا نہیں کیا! اتنے برس آپ لوگ پاکستان ...کرتے رہے، لیکن پاکستان جانے کے نام سے بھاگتے رہے، خود پہ ظلم کرتے رہے۔‘‘ زہرہ کا انداز ...اور خوب صورت اور پیارا تھا کہ ڈاکٹر فیصل کو بے اختیار اُس پہ پیار آ گیا۔ انہوں نے اُسے بہت ...پیار کیا۔

...یاں تو ہوتی ہی Absorbing Paper کی طرح ہیں جو غموں کو چوس کر ہماری زندگیوں کو ...شفاف رکھنے کا باعث بنتی ہیں، کبھی کبھی یہ پین کُشن بن جاتی ہیں، ہمارے تکلیف دہ رازوں کی ...اپنے اندر کھبو کر بھی چپ رہتی ہیں، بِنا کسی ڈیمانڈ اور ناخوشی کا اظہار کیے۔

’’پاپا! اب آپ کی طبیعت ٹھیک ہے۔‘‘ زہرہ نے باپ کو کافی کے ساتھ سینڈوچ زبردستی کھلایا تھا اور ...وہ اُن سے اُن کی طبیعت پوچھ رہی تھی۔ برسوں کے رُکے سارے آنسو اور یادیں ڈاکٹر فیصل نے ...اُس کے کندھے پر سر رکھ کر بہائی تھیں۔

...آج وہ اُن کی محرم راز ہوگئی تھی۔

’’ہاں اب میں ٹھیک ہوں!‘‘ انہوں نے بستر پر لیٹتے ہوئے آرام کی غرض سے آنکھیں بند کرتے ...ئے کہا۔

’’ٹھیک ہے آپ کچھ دیر آرام کرلیں تب تک میں امی کو دیکھ لوں۔‘‘ زہرہ نے کہا پھر جاتے جاتے ...

’’پاپا! اگر مائنڈ نہ کریں تو آپ مجھے بتائیں گے نا کہ سدرہ بی بی اب کہاں ہیں؟‘‘ مریم نے پُرتجسس ...میں پوچھا۔

’’ہوں۔‘‘ ڈاکٹر فیصل نے آنکھیں موندھے موندھے ہی حامی بھری۔ وہ ابھی مزید کوئی بات نہ کرنا ...چاہتے تھے وہ اندر تک تھکے ہوئے تھے۔

’’اوکے پاپا! آپ آرام کریں۔‘‘ زہرہ نے کمرے کی لائیٹ آف کرکے دروازہ بند کرتے ہوئے ...

لیکن ڈاکٹر فیصل اپنے دل کا کیا کرتے جو سدرہ کے نام پہ پھر یادوں کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا تھا۔ ...بھلا کہاں کی نیند اور آرام ہونا تھا۔

...وہ بیڈ سے اُتر کر ایک بار پھر راکنگ چیئر پر آبیٹھے، سدرہ کا مسکراتا چہرہ چھم سے اُن کے سامنے ...آیا۔

...کچھ سپنے تو
...تاروں کے پنچھی جیسے ہوتے ہیں
...آنکھ اڑاؤ آنکھ سے اُن کو
...پھر واپس آجاتے ہیں

پھر .... لوٹ کر واپس آ جاتے ہیں!

ماضی ایک بار پھر زندہ ہو کر ڈاکٹر فیصل کے اِرد گرد چلنے لگا!

''کون ہے وہاں؟'' سید سرفراز علی نے اونچی آواز میں پوچھا۔

سدرہ بی بی اور بشیراں دم سادھے جھاڑیوں کی آڑ میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ آ... کی آخری تاریخوں کا اندھیرا ہی ہر جانب نہیں ہے بلکہ اُس کے مقدر کی سیاہی بھی اُس کے اِرد گر... ہوئی تھی۔

''بی بی جی! اب کیا ہوگا؟'' قریب بڑھتے ہوئے قدموں کی آہٹ پر بشیراں نے گھگھیا کر... بی بی سے پوچھا۔

سدرہ بی بی اُسے کیا تسلی دیتی وہ تو خود سر سے پاؤں تک لرز رہی تھی۔ ایک وقت تھا کہ وہ ہر... زندگی سے بیزار رہتی تھی۔ ہر پَل اُس کا دل کرتا تھا کہ کاش!

کاش وہ مر جائے!

ہر آنے والا دن اُسے خود پہ بھاری محسوس ہوتا تھا لیکن اب! اب زندگی میں محبت شامل ہو گئی... زندگی کا مفہوم ہی بدل کر رہ گیا تھا۔ اُسے زندگی سے پیار ہونے لگا تھا، اُس کے لیے زندگی اہم ہو... تھی، وہ جینا چاہتی تھی یہی وجہ تھی کہ اپنی جانب بڑھتے قدموں کی آہٹ سن کر وہ بُری طرح لرز رہی...

''میں پوچھ رہا ہوں کون ہے وہاں؟'' سید سرفراز علی جو ڈاکٹر فیصل کے گھر پولیس کا حملہ کروا کر... کی کارروائی کا آنکھوں دیکھا حال دیکھ کر واپس آ رہا تھا تو اُس نے دو زنانہ سائے بڑی حویلی کے... کی جانب تیزی سے بڑھتے دیکھے تھے۔

سید سرفراز علی نے جب اُن کا پیچھا کیا تو وہ جھاڑیوں میں چھپ گئی تھیں۔ اس نے ٹارچ کی... جھاڑیوں پہ ڈالی۔ روشنی کے لپکے نے جو منظر لپک کر پکڑا تھا وہ سید سرفراز علی کا سارا خون کنپٹیوں... اکھٹا کر گیا۔

''سدرہ؟'' اُن کی آنکھیں خون رنگ ہوئی تھیں۔

سدرہ گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی جب کہ بشیراں کی تو اتنی ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی کہ وہ کھڑی ہو... اُس کی تو گھگھی بندھ گئی تھی۔

''سدرہ! تم اس وقت! رات کے اس پہر حویلی کے باہر؟'' سید سرفراز علی کی آواز میں غراہٹ... نمایاں تھی۔

سدرہ کو اپنے گلے میں کانٹے اُگتے محسوس ہوئے۔

❖❖○❖❖

''اللہ جانے یہ نمانی روئے کیوں جا رہی ہے؟'' بچوں کی آیا نے نگینہ کو کندھے سے تھپکتے ہوئے ب... بلند کہا۔

نگینہ تو بہت پُرسکون بچی تھی بلکہ عائشہ بی بی کے دونوں بچے ہی بہت اچھے تھے۔ انہوں نے کبھی... نہ کیا تھا۔

آیا اماں کو سید عبداللہ شہر سے لائے تھے وہ میٹرک پاس تھیں، بیوہ تھیں، بے سہارا تھیں۔ سید عبداللہ کو ...اں کی نوکرانیوں سے ہٹ کر اپنے بچوں کی کیئر ٹیکر چاہیے تھی۔ آیا اماں اس نوکری کے لیے بالکل ...ل تھیں اُن کی بول چال اور تربیت بے حد اچھی تھی پھر وہ بچوں سے بے حد محبت بھی کرتی تھیں ...اس سالہ یہ خاتون چاق و چوبند تھیں۔ بڑی عمر کی ہونے کی وجہ سے سب اُن کو اماں کہنے لگے تھے۔

نگینہ بے حد سکون سے حسبِ معمول سو رہی تھی، جب اچانک ہی اُٹھ کر وہ رونے لگی۔

آیا اماں نے اُسے بہت کوشش کی سلانے کی لیکن بچی تو جیسے ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھی۔ تبھی وہ گھبرا ...ر سید عبداللہ کے کمرے کی جانب لپکیں۔

''خیریت اماں؟'' سید عبداللہ تو گھر میں نہ تھے اس لیے دروازہ ذرا سی دستک پہ کھل گیا۔ عائشہ بی بی ...یہ کی آواز پہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھیں۔

''بی بی! یہ رو رہی ہے، شاید پیٹ میں درد نہ ہو!'' آیا اماں نے پریشانی سے روتی ہوئی بچی عائشہ ...بی کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

اسی پَل باہر بلی کے رونے کی آواز آئی، ساتھ ہی گھر میں موجود کتے اُونچی آواز میں رونے لگے۔

''اللہ خیر کرے! یہ بے زبان کس دکھ پہ رو رہے ہیں!'' آیا اماں نے دہل کر سینے پہ ہاتھ رکھتے ...ہوئے کہا۔

خود عائشہ بی بی بھی گھبرا گئی تھیں۔

''عائشہ! عائشہ پتر!'' زلیخا بی بی ہانپتی کانپتی کمرے میں داخل ہوئیں۔

''جی تائی جی!'' عائشہ نے نگینہ کو سینے سے لگاتے ہوئے پوچھا۔

''وہ .... وہ سدرہ حویلی میں نہیں ہے!'' زلیخا بی بی نے ایک نظر آیا اماں پہ ڈالتے ہوئے بے حد سر...راتے لہجے میں کہا۔

''حویلی میں نہیں ہے؟''

''وہ بھلا حویلی کے علاوہ کہاں جائے گی؟'' عائشہ نے حیرت سے دریافت کیا۔

''اس حویلی کی عورتیں زنان خانے سے مردانے میں نہیں جا سکتی پھر حویلی سے باہر کیسے جا سکتی ...یں۔'' یہ ایسا ناممکن تھا جس پہ عائشہ فوراً کیسے یقین کر لیتیں۔

''پتر! مریم نے بتایا ہے کہ وہ کمرے میں نہیں ہے بلکہ ہم نے پوری حویلی دیکھ ڈالی اور وہ بشیراں بھی کہیں نہیں ہے۔ حویلی کا پچھلا پھاٹک کھلا پڑا ہے، وہاں کا تالا کنڈی سے لٹک رہا ہے!'' زلیخا بی بی دل ...ام کر وہیں بستر پر بیٹھ گئیں۔

اُسی پَل باہر فائرنگ ہوئی۔

''ہائے میں مر گئی، عائشہ یہ گولیاں تو اپنے ہاں ہی چلی ہیں نا۔'' زلیخا بی بی نے ہراساں ہو کر پوچھا۔

''آواز تو بہت قریب سے آ رہی ہے۔'' عائشہ نے بچی آیا اماں کے پاس چھوڑی اور ساس کو لیے باہر ...کل گئیں۔

اس وقت عبداللہ گھر میں نہ تھے اس لیے عائشہ ہی باہر نکلی تھیں۔

"بی بی جی باہر!" اللہ رکھی کا رنگ فق ہو رہا تھا۔

"کیا ہوا! بولتی کیوں نہیں!" زلیخا بی بی کے اعصاب جواب دے رہے تھے۔

"سید.... سرفراز نے بی بی جی.... بی بی جی کو!" اللہ رکھی سے بولنا دشوار ہو گیا تھا۔

زلیخا بی بی نے اللہ رکھی کی بقیہ بات سُنے بغیر ہی اُسے پرے دھکا دیا اور باہر نکل دوڑیں۔

زنان خانے کے باہر صحن میں کنویں کے پاس بشیراں کی خون میں لت پت لاش پڑی تھی جب کہ سدرہ کے اُوپر اُس کی پھوپو فاطمہ خونم خون پڑی تھیں۔ وہ بے زبان سدرہ کو بچاتے بچاتے اپنے بھتیجے ہی کی گولی کا نشانہ بن گئی تھیں۔

"سرفراز!" زلیخا بی بی کسی چیل کی طرح سرفراز پر جھپٹیں۔

"ظالم! یہ کیا کیا؟" وہ دھاڑیں مار کر روئی تھیں۔

"ہٹو چھوٹی اماں... اس بے غیرت کو میں مار ڈالوں گا اس کی اتنی ہمت کہ یہ حویلی کی عزت کو رات کے اندھیروں میں پامال کرے۔" سید سرفراز نے جھٹکے سے زلیخا بی بی کو پرے کیا۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے، یہ میرا گھر ہے، میرے بیٹے کی حویلی ہے! اس حویلی کا مرد وہ ہے۔ وہ ہی ہر طرح کے فیصلے لینے کا حق رکھتا ہے!" زلیخا بی بی نے حلق کے بل چیخ کر کہا۔

"ہونہہ! وہ بے غیرت کیا کرے گا!" سید سرفراز علی نے غصے سے زمین پہ تھوکتے ہوئے کہا۔

"وہ تو اپنی غیرت ولایت چھوڑ آیا ہے اور .... میں اس کم بخت کو ہرگز نہ چھوڑوں گا۔ اس نے ہماری روایات کو توڑنے کی جو کوشش کی ہے اس کا خمیازہ تو اسے بھرنا ہی پڑے گا۔" سید سرفراز علی نے بندوق کا رخ سدرہ کی جانب کرتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی ٹریگر دبا دیا۔

عائشہ نے کسی شیرنی کی طرح جھپٹ کر بندوق کا رخ موڑا تھا۔

سید سرفراز علی، عائشہ کا چہرہ دیکھ کر یوں مدھم پڑا جیسے جلتی ہوئی آگ پر ٹھنڈا پانی پڑ جائے۔

وہ جانتا تھا کہ عائشہ واحد عورت ہے جو سید سرفراز علی کے غرور کا توڑ تھی، جس کے آگے سید سرفراز کا دل اور وجود ہمیشہ جھک جاتا تھا۔

"چوکیدار! کہاں مر گئے ہیں سارے ملازم!" عائشہ نے چیخ کر کہا۔ لیکن اندر کوئی نہ آیا تھا۔ سید سرفراز علی کے رکھوالوں نے سب کو گن پوائنٹ پر محصور کر رکھا تھا۔

"لے جاؤ اس کو اور باندھ کر رکھو اس جانور کو، یہ اب بنا حساب دیے اس حویلی سے نکل نہیں سکتا۔" عائشہ کے لہجے میں پھنکار تھی۔

جواباً سید سرفراز علی بڑی مختلف ہنسی ہنسا۔

"یہ ہمارے گاؤں ہیں عائشہ بی بی! یہاں طاقت کی حکمرانی چلتی ہے اور طاقت ور صرف یہاں سرفراز علی ہے!" اس نے اتنی خطرناک سچویشن میں بھی عائشہ کو گہری گہری نظروں سے دیکھا تھا۔

"دفع دور۔" زلیخا بی بی نے سید سرفراز کو گالی دیتے ہوئے سدرہ بی بی کی طرف دیکھا، جو درد اور تکلیف سے لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی تھی اُس کی گردن سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔

"ہائے میری بچی!" انہوں نے روتے ہوئے سدرہ کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

سید سرفراز علی نے ایک نگاہ سدرہ پہ ڈالی اور اُس کے زخموں کا گہرا جائزہ لیا۔

"ہوں... یہ نہیں بچے گی!"

ان کے دل کو بے حد سکون محسوس ہوا کہ وہ جو کام کرنے آیا تھا وہ اُدھورا نہ گیا تھا۔ اس لیے وہ مزید وقت ضائع کیے بغیر بڑے مضبوط قدموں سے باہر کی جانب بڑھا۔

"سرفراز! تیرا بیڑہ غرق ہو، تو نے میری معصوم بچی پہ گولیاں چلائیں۔ آگ لگے ایسے بھائی کو جو بہن کا خون بہاتا ہے۔" زلیخا بی بی سدرہ بی بی کا بھل بھل خون دوپٹے سے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے الی انداز میں بولی۔

"کدھر جا رہے ہو خونی.... قاتل!" عائشہ بی بی نے اُسے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میرے رستے سے ہٹ جاؤ عائشہ بی بی! تم مجھے نہیں روک سکتیں، سید سرفراز علی اتنا کمزور ہرگز نہیں کہ اُسے باندھ کر روک لیا جائے اس لیے تم مجھ پر وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنی آخری سانسوں کی فکر کرو۔" سید سرفراز علی بے نیازی سے کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

جب کہ عائشہ نے نہایت بے بسی محسوس کی وہ غصے میں ایک بار پھر سید سرفراز کے پیچھے بھاگی۔ سراور لپیٹے وہ ملازموں کو آوازیں دے رہی تھیں۔ جب سید سرفراز علی کی جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی ملازم اندر داخل ہوئے۔

"کہاں مر گئے تھے تم لوگ، تم نے سرفراز کو روکا کیوں نہیں؟" عائشہ نے چیختے ہوئے کہا۔

"بی بی! سائیں کے بندوں نے ہم پہ بندوقیں تان رکھی تھیں۔" ملازم نے سر جھکا کر کہا۔

"میرے خدایا!" عائشہ بی بی نے بے اختیار اپنا ماتھا مسلا اُن کے آنگن میں دو لاشیں پڑی ہوئی تھیں سدرہ کی حالت بھی کچھ اچھی نہ تھی۔

"تم ڈرائیور سے کہو فوراً گاڑی نکالے، اسپتال جانا ہے!" عائشہ بی بی نے اندر کی جانب دوڑتے ہوئے کہا۔

"جی بی بی!" ملازم نے فوراً حکم مانتے ہوئے کہا تھا۔

"عائشہ پتر! ہائے میری بیٹی!" زلیخا بی بی نے روتے ہوئے کہا۔

سدرہ کا خون بہت بہہ چکا تھا اور وہ نڈھال ہو کر بے ہوش ہو گئی تھی۔

"اس وقت سید سرفراز سے نمٹنے کے بجائے سدرہ کو فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔" عائشہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ اُسی پل اس افراتفری کے دوران عائشہ کی نظر مریم پہ پڑی، جس کی آنسوؤں سے ہچکی بندھی ہوئی تھی اور وہ بری طرح لرز رہی تھی۔

"پھوپو مر گئیں!

پھوپو مر گئیں!" مریم مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔

"آپی.... آپی بھی مر جائے گی! ہم سب مر جائیں گے! ہمیں سرفراز بھائی مار ڈالیں گے۔" وہ بچوں کی طرح گھٹنوں میں منہ چھپا کر رو رہی تھی۔

عائشہ کے اپنے آنسو بند نہ ہو رہے تھے لیکن عبداللہ کی غیر موجودگی میں اُسے ہی سارے کام دیکھنے

تھے۔ ہمت کرنی تھی تا کہ سدرہ کی جان بچائی جاسکے۔

''مریم! حوصلہ کرو، انشاء اللہ سدرہ ٹھیک ہو جائے گی۔'' عائشہ بی بی نے اپنے پرس میں رقم چیک کرتے ہوئے مریم سے زیادہ خود کو تسلی دی، اسپتال شہر میں تھا اور اُن کو موت سے لڑائی کر کے زندگی کی جانب کا راستا جلد از جلد طے کرنا تھا۔

''بھابی.... پھوپو! پھوپو مر گئیں نا؟'' مریم نے ہچکیوں میں فاطمہ پھوپو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

عائشہ نے فاطمہ پھوپو کی خون میں لت پت لاش کو دیکھا، اُن کا چہرہ عائشہ نے پہلی بار بے حد سکون سے دیکھا تھا۔ اس کا دل چاہا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہیں بیٹھ کر رونے لگے لیکن وہ مجبور تھی۔ سدرہ کو اسپتال لے جانا بھی بے حد ضروری تھا۔

عائشہ جب زلیخا بی بی کے ساتھ پاؤں گھسیٹتی گاڑی میں بیٹھی تو اُن کو لگا کہ اُن کی بھی روح پرواز کر جائے گی۔

سدرہ کا سر انہوں نے گود میں لے لیا تھا اُس کی گردن پہ بہتے خون پر جو دوپٹا رکھا ہوا تھا، وہ خون سے نچڑ گیا تھا۔

سدرہ نے اپنی نم آنکھیں کھولیں، گاڑی بے حد تیز رفتاری سے چل رہی تھی۔ زلیخا بی بی دل تھامے دعا کر رہی تھیں۔

''بھا... بھا.. بی!'' سدرہ نے بہ مشکل عائشہ کو پکارا۔

''ہاں جی آپی!'' عائشہ نے نے پیار سے اُس کے بال سہلائے، جو خون سے چپ چپ کر رہے تھے۔

''بھابی! میرا قصور... ہی بڑا تھا، مم... مجھے سزا تو ملنی ہی تھی!'' سدرہ کی آنکھوں سے آنسو درد کی تکلیف سے مسلسل نکل رہے تھے۔

''یہ... یہ میری اما... نت!'' سدرہ نے خون آلود مٹھی کھولتے ہوئے عائشہ کے سامنے کی تو زلیخا بی بی نے بھی چونک کر اُسے دیکھا کہ اُن کی بیٹی کچھ کہنے کچھ بتانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''یہ کیا ہے پتر؟'' زلیخا بی بی نے سونے کا لاکٹ سدرہ سے لیتے ہوئے پوچھا۔

''میری...! میرا... اُدھورا خواب ہے اماں!'' سدرہ نے روتے ہوئے کہا۔

اس کی تعبیر اور حقیقت کو جینے کی تیری بیٹی نے کتنی دعائیں اور کتنی منتیں کی تھیں پر! میرے خواب بھول گئے کہ حویلی کی لڑکی کی آنکھوں میں خواب نہیں، صرف تنہائی اور اُداسی کو اُترنے کی اجازت ملی ہے!'' سدرہ کا سانس بری طرح اُکھڑا تھا۔

''نہ بول پتر! تیری تکلیف بڑھے گی!'' زلیخا بی بی نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا اُن کی آنکھیں چھلک چھلک جا رہی تھیں۔

''بو... لنے!

بولنے... دیں اماں! اس کے... بعد... کہاں بولنے کا موقع آئے گا!'' سدرہ اُکھڑتی سانسوں کے باوجود بولنے سے باز نہ آ رہی تھی۔

''اماں! کاش... کاش اس حویلی میں... آئندہ کوئی لڑکی پیدا نہ ہو!'' سدرہ کی بات پہ زلیخا بی بی کی چیخیں نکل گئیں۔

''میری مریم... میری نگی کی قسمت... میرے جیسی... پھوپو جیسی نہ ہو!

بھا... بی! یہ میری خواہش نہیں ہے! یہ تو... میری دعا ہے ایک مرتی... ہوئی لڑکی... کی دعا!'' سدرہ نے روتے ہوئے کہا۔

جواباً عائشہ نے روتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''ایک... ایک دعا میں اور کرتی ہوں... کہ سرفراز کے ہاں بیٹی ہو... اور اُس کے دل میں رب سوہنا... بیٹی کی محبت ڈال دے...!

اور پھر... اُس کو بیٹی کے... دکھ... میں ڈال دے!'' سدرہ کہہ کر بے ہوش ہو گئی۔

زلیخا بی بی کے رونے میں مزید اضافہ ہو گیا تھا جب کہ عائشہ گم سم سدرہ کے نچڑے ہوئے وجود کو دیکھ رہی تھی۔ اُس نے دھیرے سے زلیخا بی بی کے ہاتھ سے لاکٹ پکڑ کر کھولا۔

''فیصل...! ڈاکٹر فیصل! اگر میں غلطی نہیں کر رہی تو یہ تو عبداللہ کے دوست ہیں! وہی دوست، جس کی مدد سے عبداللہ اس گاؤں میں اسپتال بنانے کا سوچ رہے ہیں۔''

عائشہ نے کئی بار جیپ میں بیٹھے ہوئے سید عبداللہ کو فیصل کے ساتھ ملتے دیکھا تھا۔ کالے شیشوں والی اس جیپ میں اندر سے سب دکھائی دیتا تھا۔

''تو کیا؟ تو کیا سدرہ آپی رات کے اس پہر ڈاکٹر فیصل سے ملنے گئی تھیں! اگر سدرہ آپی کی یہ حالت سرفراز نے کی ہے تو ڈاکٹر فیصل کو کہاں چھوڑا ہوگا۔'' عائشہ بی بی نے دکھ سے سوچا۔

کاش آپی! آپ ہمیں اعتماد میں لے لیتیں!

کاش! آپ ہمیں بتاتیں تو شاید آج یہ قیامت صغریٰ نہ برپا ہوتی۔'' عائشہ نے پچھتاوے سے سوچا۔

''لیکن سدرہ آپی آپ کا بھی کوئی قصور نہیں ہے! جب سارے دروازے بند ہو جائیں تو چور کھڑکیاں تو آپ ہی آپ کھل جاتی ہیں۔'' عائشہ نے سدرہ بی بی کا سر احتیاط سے سیدھا کرتے ہوئے سوچا۔

''عبداللہ کو پتا چلے گا تو اُن کا کیا تاثر ہوگا؟ وہ کیسے یہ سب کچھ برداشت کریں گے۔'' عائشہ کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ انہیں لگا کہ آج کی یہ تاریک گہری رات صدیوں پہ پھیل گئی ہے، جس کا اندھیرا جانے کیا کیا نگل جائے گا...

❖❖○❖❖

''وہ اپنی بھابی سے بات کرنا چاہ رہی ہیں۔'' نرس نے باہر آ کر کہا تھا۔

ڈاکٹرز نے سدرہ کے لیے جواب دے دیا تھا۔

سدرہ کی حالت خطرے کی آخری حدوں کو چھو رہی تھی، اس کا خون بہت زیادہ بہہ چکا تھا۔ گولی گردن کو چھو کر گزری تھی لیکن بہت گہرا زخم بناتے گزری تھی۔

ڈاکٹرز نے بہر حال اُس کو ایڈمٹ تو کر لیا تھا کیوں کہ ابھی اُس کے وجود میں جان باقی تھی وہ سانس

تو لے رہی تھی۔ نا اُمیدی کے باوجود وہ اپنی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے کہ مریضہ بچ جائے۔

سدرہ کو بیچ بیچ میں تھوڑا سا ہوش آتا تھا پھر غنودگی میں چلی جاتی تھی۔

عائشہ پاؤں گھسیٹتے ہوئے نرس کے ہم راہ اندر داخل ہوئیں۔ انہوں نے آنکھیں بند کیے ہوئے سد کو دیکھا وہ ہلدی کی طرح پیلی پڑی ہوئی تھی جیسے اُس میں خون کی بوند اور زندگی کی کوئی رمق باقی نہ ہو

''سدرہ!'' عائشہ نے سدرہ کا ہاتھ تھام کر اُسے پکارا تھا۔

''سدرہ۔'' عائشہ کے کتنی ہی بار پکارنے پر سدرہ نے نقاہت سے آنکھیں کھولیں۔

''بھابی!'' سدرہ نے آنکھیں کھول کر عائشہ کو دیکھا۔ اس کو اپنے کمرے کی لائیٹ اور اِرد گرد کی ا نیلی اور کچھ دھندلی دکھائی دے رہی تھیں۔

''بھابی! میرا دل اس نیلی روشنی کو دیکھ کر گھبراتا ہے مجھے... مجھے سب کچھ صحیح اور پورا کیوں نظر نہیں رہا؟'' سدرہ کی آواز میں بے چینی تھی۔ وہ اپنا سر اِدھر اُدھر پٹخ رہی تھی۔

''سب... سب... نیلا... نیلا کیوں ہے؟

''بھابی!'' سدرہ ایک دم ہی ایسے اُٹھ بیٹھی، جیسے اُسے کچھ نہ ہوا ہو۔ جیسے اُس کے بدن میں بہا طاقت ہو۔

بھابی!'' سدرہ نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِردگرد دیکھا پھر ایک دم اُس کے دماغ میں سنسناہٹ ہوا اور اُسے روشنی پہلے جیسی دکھائی دی، وہ ایک دم سے ہی بے حد پرسکون ہوگئی تھی۔

''اوہ میرے خدایا! مجھے لگا کہ میں مرنے لگی ہوں!'' وہ عائشہ کا ہاتھ تھام کر بے حد اُونچی آواز میں بولی۔

عائشہ اُسے کندھے سے تھام کر دوبارہ لٹانے لگی۔ خود عائشہ کو بھی حیرت ہو رہی تھی کہ سدرہ میں اتنی طاقت کیسے آ گئی؟ اور اسے اپنے زخم کے درد کا احساس کیوں نہیں ہو رہا ہے، گردن پہ پٹی کرنے کے باوجود خون رس رہا تھا۔

''ڈاکٹرز تو کہہ رہے تھے کہ سدرہ کی زندگی کی اُمید نہیں تو پھر یہ ایسے کیسے بھلی چنگی ہوش میں ہے؟'' عائشہ کا اپنا دماغ ان سوالات کے جوابات دینے سے قاصر تھا۔

''بھابی! میں جینا چاہتی ہوں!'' سدرہ نے معصوم بچوں کی طرح عائشہ کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''میں... بچ جاؤں گی نا!'' وہ پوچھ رہی تھی جب کہ عائشہ آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے اُسے مسلسل تک رہی تھیں۔

''انشاء اللہ تم بالکل ٹھیک ہو کر ہمارے ساتھ گھر چلو گی۔'' عائشہ نے سدرہ کو دعائیہ انداز میں تسلی دی۔

''ہوں!'' سدرہ نے دوبارہ سر تکیے سے ٹکاتے ہوئے کہا۔

''بھابی! میں زندگی کی کبھی حریص نہ تھی۔'' سدرہ بنا اکھڑے سانس کے بول رہی تھی۔

''لیکن اب میں جینے کی تمنا کر رہی ہوں تو زندگی مجھ سے ہٹ ہٹ کر دور جاتی ہے! جانے کیوں موت کی آہٹ بہت قریب سے سنائی دے رہی ہے!'' سدرہ نے یوں کان لگا کر سنا، جیسے وہ واقعی کسی آہٹ کو محسوس کر رہی ہو۔ عائشہ نے اُسے بہت دکھی نظروں سے دیکھا۔

''بھابی مجھے کاغذ قلم چاہیے۔'' سدرہ نے فرمائش کی تھی۔

''اچھا تم لیٹ جاؤ، میں تمہیں دیتی ہوں۔'' عائشہ نے پاس پڑی ٹیبل سے ڈاکٹرز فائل نکالی، جس میں ڈاکٹر سدرہ کی ہسٹری لکھ کر گیا تھا۔

''سدرہ اس میں تو کوئی صفحہ خالی نہیں، میں باہر کسی سے منگوا لیتی ہوں۔'' عائشہ نے جلدی سے اُٹھتے ہوئے کہا تھا۔

''نہیں یہ... یہی دے دیں!'' سدرہ کے چہرے پہ ایک بار پھر درد کے آثار واپس آ گئے تھے۔

''یہ لو!'' عائشہ نے بال پوائنٹ اور فائل آگے رکھ دی اور سدرہ کا بیڈ گھما کر اُونچا کیا، تا کہ وہ آسانی سے لکھ سکے۔

سدرہ نے صفحے کے پیچھے بچی خالی جگہ پر مختصراً ایک تحریر لکھی تھی۔

''بھا... بی!'' سدرہ نے درد کو ضبط کرتے ہوئے عائشہ کو مخاطب کیا۔

''یہ خط! اگر میں نہ رہوں تو... یہ میری امانت ہے! وہ لاکٹ اور یہ خط آپ ڈاکٹر باؤ کو دے دینا۔'' سدرہ نے ایک دم پسینے پسینے ہوتے ہوئے کہا۔

''بھا... بی!'' سدرہ کے ہاتھ پاؤں ایک دم ٹھنڈے ہو کر چھوٹے۔

''اماں... اماں کو دیکھنا ہے۔'' سدرہ کی سانس ایک بار پھر بے ترتیب ہو گئی تھی۔

''اماں!'' سدرہ نے لب پھڑ پھڑائے۔

''تائی جان!'' عائشہ نے دروازے کے باہر جھانک کر تائی اماں کو آواز دی، زلیخا بی بی دوڑتی ہوئی اندر آئیں۔

''اماں!'' سدرہ کے نیلے پڑتے ہونٹ ماں کو دیکھ کر بس ایک پل کو ہی مسکرائے تھے۔

''جی میری جان!'' زلیخا بی بی نے سدرہ کو بڑھ کر تھاما۔

''اماں! دم کر کے پھونکو نا! میں مم... جے... ڈر... لگ... رہا ہے!'' پھر درد کی لہر اُٹھنے پر سدرہ نے اس قدر مضبوطی سے ماں کا ہاتھ دبوچا کہ زلیخا بی بی کی ''سی'' نکل گئی تھی۔

''میرے بچے! میں تیرے پاس ہوں، ابھی دم کر دیتی ہوں!'' زلیخا بی بی کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ سدرہ کی گرفت ڈھیلی پڑ کر ایک دم ریت کی مانند پھیلی۔

''سدرہ!'' انہوں نے متوحش آنکھوں سے عائشہ کی جانب مڑ کر دیکھا، جیسے وہ اس حقیقت سے انکار کردے گی۔ جواباً عائشہ منہ پہ ہاتھ رکھ کر اپنی چیخیں روک رہی تھی۔

''سدرہ!'' زلیخا بی بی نے سدرہ کو جھنکا دیا لیکن وہ تو اُن کو چھوڑ کر جا چکی تھی۔

زلیخا بی بی سر پہ ہاتھ رکھے نیچے بیٹھتی چلی گئیں، ان کا کلیجے کا ٹکڑا اُن سے جدا ہو گیا تھا۔

''میری سدرہ!...... میری سدرہ!'' وہ سدرہ کو پکارتے ہوئے مسلسل سسک رہی تھیں۔

عائشہ نے بے اختیار سدرہ کی بند آنکھوں کو پیار سے چھوا، وہ کس قدر حسین تھیں۔

''کیا سدرہ آپی کا خون خاموش رہے گا!'' عائشہ کو بے حد شدت سے کسی ایسے طوفان کی آہٹ محسوس ہو رہی تھی، جو شاید سب کچھ تہس نہس کرنے والا تھا۔

❖❖○❖❖

ہم لوگ سمندر کے بچھڑے ہوئے ساحل ہیں
اِس پار بھی تنہائی اُس پار بھی تنہائی

ساری رات آنکھوں میں جل جل کر پگھلی تھی۔ ڈاکٹر فیصل کے جسم کا بند بند دکھ رہا تھا۔

اسپتال کے پیجر پہ مسلسل پیغام آرہے تھے، یہ پیجرز ڈاکٹر کو اسپتال کی جانب سے دیے جاتے تھے، اسپتال کا اپنا میسج سسٹم تھا جو ڈاکٹر کو پَل پَل ہر مریض کی اطلاع دیتا تھا اس لیے پرسنل موبائل صرف پرسنل کام کے لیے رکھے جاتے تھے، ان پیجر سروس کی وجہ یہ تھی کہ کوئی بھی ڈاکٹر اپنے موبائل آف ہونے کا ایکسکیوز نہ کرسکے اس لیے یہ پیجرز چوبیس گھنٹے ایکٹو رہتے تھے۔

ڈاکٹر فیصل بھی مسلسل میسجز کی بزر پہ چونک کر اُٹھے تھے، اسپتال سے کال تھی اُن کو نکلنا تھا، دوپہر میں ایک بہت بڑا آپریشن تھا۔

وہ بہت بڑے سرجن تھے، بہت نام اور پیسہ کمایا تھا جانے اتنے برسوں میں قسمت کیوں ان پہ اتنی مہربان رہی تھی کہ مشکل سے مشکل اور کم سے کم پرسنٹ چانس رکھنے والا آپریشن بھی اُن کے ہاتھوں سے کامیاب ہو جاتا تھا۔

قسمت نے اُن کے نام کے ساتھ ''کامیاب سرجن'' کا ٹیگ لگا دیا تھا، آج تک اُن کا ایک بھی آپریشن ناکام نہ ہوا تھا۔ قسمت نے اُن کی زندگی کے پہلے ہاف میں اُن سے اُن کا سب کچھ چھین لیا تھا۔ ماں باپ بہن بھائی، وطن کی مٹی اور... اور ان کا دل... ان کی محبت بھی!

وہ جب بالکل خالی ہاتھ، خالی دامن ننگے پاؤں اور ننگے سر کھلے آسمان تلے کھڑے ہو کر روئے تھے تب اللہ نے اُن کی قسمت بدل ڈالی۔ وہ قسمت جو ان کا سب کچھ چھینتی آئی تھی اسے بدل کر اللہ نے ان کو قسمت عطا کی جس نے آج تک ان کو اتنا دلوایا تھا کہ وہ اکثر حیران رہ جاتے تھے۔

انہوں نے اپنے آنے کی اطلاع اسپتال میں کنفرم کی اور تیار ہونے کے لیے اُٹھنے لگے۔

وارڈ روب کھول کر جیسے ہی وہ کھڑے ہوئے تو بے اختیار ان کے ہاتھ اندرونی سیف کی جانب بڑھے، انہوں نے سیف کھولا اور اُس میں سے ایک چھوٹا سا جیولری بکس نکالا، بکس میں ایک چھوٹی سی ڈبیا پڑی تھی انہوں نے احتیاط سے ڈبیا کھولی جس میں سرخ و سبز کانچ کی چھوڑیوں کے ٹکڑے تھے، اُس پرفیوم کی خالی شیشی تھی جو انہوں نے کبھی سدرہ کو دی تھی اور شرارت سے اُس پر پوری کی پوری چھڑک دی تھی۔

ایک لاکٹ تھا اور ایک کاغذ تھا۔

انہوں نے لرزتے ہاتھوں سے وہ لاکٹ نکالا اور پھر اس کو ہاتھ میں تھام کر کتنی ہی دیر دیکھتے رہے۔

''موتیا!'' ایک سسکی کی طرح یہ نام ان کے لبوں سے نکلا۔

لاکٹ پہ سدرہ کا نام کندہ تھا بالکل اُسی طرح جیسے ان کے دل پہ کندہ تھا۔ انہوں نے خط کھولا، یہ ان کی موتیا کی آخری تحریر تھی، اس کی وصیت تھی۔

''ڈاکٹر بابو! میری زندگی میں ربّ سے ایک ہی شکوہ تھا کہ آخر حویلی کی لڑکی کی قسمت ہی کیوں سیاہ

سے لکھی جاتی ہے! نسلوں سے حویلی کی لڑکیاں ان آسیب زدہ دیواروں میں چنی جاتی رہی ہیں، مجھے بچپن سے ان دیواروں، ان آئینوں سے ڈر لگتا تھا کہ میرا انجام کہیں سب جیسا نہ ہو جائے۔ اور آج میں بھی آپ کی موتیا مرجھا رہی ہے، کسی پَل موت کا سامنا ہو جائے گا میں نے کہا تھا نہ کہ مجھے یہاں سے اس ملک سے لے چلو، پر تم نہ مانے، لیکن میری ایک بات ضرور مان لینا، میری روح پر پڑا بوجھ اُتر جائے گا میں تمہارے ربّ سے ناراض ہو کر نہیں جاؤں گی۔ تم میری مریم سے شادی کر لینا، اُسے اس زندان سے نکال کر لے جانا ورنہ ریت رسموں کا آسیب اُسے بھی کھا جائے گا، مریم کو وہ پیار دینا، جو تم مجھے دینا چاہتے تھے۔

مریم کو لے جانا! مرتی ہوئی لڑکی کی یہ خواہش ضرور پوری کر دینا۔ تمہاری موتیا!'' ڈاکٹر فیصل کی آنکھوں سے دو موتی نکلے، یہ بہت قیمتی تھے۔ وہ کہتی تھی کہ آنکھ سے نکلنے والا ہر آنسو، آنسو نہیں ہوتا ڈاکٹر بابو جو دل سے نکلے وہ پانی تو جیسے سیپوں میں بارش کا قطرہ جا کر موتی بنتا ہے ویسے ہی دل سے نکلا آنسو بھی موتی ہی ہوتا ہے۔ آج یہ موتی وہ موتیا کی یاد میں اُسے نذر کر رہے تھے۔

انہوں نے موتیا کی بات رکھ لی تھی اور مریم کو اپنی جان جوکھم میں ڈال کر یہاں لے آئے تھے انہوں نے اُسے ہمیشہ پیار سے رکھا تھا۔ لیکن وہ اپنے دل سے مجبور تھے جو آج بھی صرف اور صرف موتیا کا تھا۔

کچھ وعدے ایسے بھی پورے ہوتے ہیں
جو زندگی بھر کے سودے ہوتے ہیں

❖❖○❖❖

''امی جان! آپ کیسی ہیں؟'' زہرہ نے مریم کے کمرے میں آکر پوچھا۔

''ٹھیک ہوں!'' وہ کہتی ہوئی جائے نماز سے اُٹھیں۔

''تمہارے پاپا آگئے؟''

باہر گاڑی کے رکنے کی آواز آئی تھی، گزرے دنوں میں مریم بی بی نے ڈاکٹر فیصل کو کسی دیوتا کی طرح پوجا تھا وہ ان کی زندگی کا سینٹر آف انٹرسٹ تھے۔ وہ اُن کی زندگی کا ایسا محور تھے، جس سے وہ خود کو زندہ محسوس کرتی تھیں۔ اتنے سالوں میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ تین روز سے وہ اپنی اپنی ہی سوچوں اور ماضی کے محور میں گھوم رہے تھے۔

آج مریم کو احساس ہوا تھا کہ وہ ٹھیک نہیں کر رہیں۔ جس شخص نے ساری عمر ان کو ہتھیلی کا پھپھولا بنا کر رکھا وہ اپنے ماضی کے درد میں اُن کو اگنور کر گئی تھیں۔

میاں بیوی تو شریکِ زندگی ہوتے ہیں، اگر وہ سکھ آپس میں بانٹ کر جیتے ہیں تو دکھوں کے موسم اکیلے کیوں جھلیں؟ دکھ میں ساتھ ہو تو دکھ آسانی سے کٹ جاتے ہیں۔

''امی! پاپا تو کب کے آگئے، آپ کا پوچھ رہے تھے میں نے کہا کہ نماز پڑھ رہی ہیں تو وہ اپنی اسٹڈی میں چلے گئے ابھی ان کو کافی دے کر آرہی ہوں۔'' زہرہ نے کمرے میں موجود بے ترتیبی کو درست کرتے ہوئے کہا۔

یہ اُن کی زندگی میں پہلی بار ہوا تھا کہ وہ ایسے بے ترتیب کمرے میں بے حد بے نیازی سے رہ رہی

تھیں۔

جب من کے اِردگرد انتشار ہو تو دکھ دکھائی نہیں دیتا چاہے وہ کتنا بھی ترتیب ہو یا بے ترتیب!

''میں اُن سے مل لوں۔تم نے ڈنر میں کیا بنایا ہے؟'' انہوں نے اتنے دن بعد کسی کام میں دل

تھی۔

''روسٹ پوٹیٹو اور چکن گرل کیا ہے عبداللہ ہی فرمائش کر کے گیا تھا۔'' زہرہ نے بیڈ شیٹ درست کرتے ہوئے جواب دیا۔

''زہرہ! عبداللہ کہاں گیا، آج تو اُس کی کلاس نہ تھی۔فرائی ڈے کو عبداللہ کا آف ہوتا تھا۔'' وہ جاتے رک کر پوچھ رہی تھیں۔

''وہ ولی بھائی کے ہاں گیا ہے ان کی کوئی ایگزیبیشن ہے اور ان کو پاکستان اسی ویک جانا ہے لیے عبداللہ ان کو ڈسپلے میں ہیلپ کرنے گیا ہے۔'' زہرہ نے لفظ لفظ ماں کے گوش گزار کر دیا وہ بتاتی تو مریم نے سوال کر کر کے پوچھ ہی لینا تھا۔

''ولی پاکستان جا رہا ہے!''

''نہیں! وہ کیسے جا سکتا ہے!'' وہ دل ہی دل میں بولیں۔

''میں تمہارے پاپا سے مل لوں!'' وہ ایک بار پھر کھوئی کھوئی سی تھیں۔

''السلام علیکم!'' مریم نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''وعلیکم السلام! آپ نماز پڑھ رہی تھیں میں نے آپ کو ڈسٹرب کرنا اچھا نہ سمجھا اس لیے، آ گیا۔'' ڈاکٹر فیصل نے راکنگ چیئر سے اُٹھتے ہوئے اسٹڈی روم کی مین لائیٹ آن کر دی، وہ بہت کم روشنی میں بیٹھے ہوئے تھے۔

مریم نے بہ غور ان کو دیکھا۔رتجگوں سے آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں، ان کی آنکھیں ہمیشہ کی چغلی کھاتی تھیں۔

''آپ سوئے نہیں نا!'' مریم نے فلور کشن پہ بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''تم بھی تو جاگتی رہی تھیں!'' وہ دھیرے سے ہنسے۔مریم نے ایک دم نگاہ چرائی۔

''آئی ایم سوری! میں شاید خود میں نہ تھی، کبھی کبھی گہرے زخم اچانک ہی منہ کھول بیٹھتے ہیں کہ آپ بس میں نہیں ہوتا۔''

''نیور مائینڈ! تم دل پہ نہ لو!'' ڈاکٹر فیصل نے حسبِ معمول ان کو ہمیشہ کی طرح کسی بھی وضاحت بچاتے ہوئے کہا۔

''جانے کیسا ہے یہ شخص، ساری عمر بس دیتا ہی آیا ہے اور بدلے میں کبھی ایک پل بھی نہیں مانگا'' مریم نے ڈاکٹر فیصل کو بے حد پیار سے دیکھتے ہوئے سوچا۔

یہ شخص اَن مول ہیرا تھا جو ان کی آپی کی محبت تھا اور... اس کی بڑے دل والی آپی اپنی جان گنوا کر ہیرا ان کی جھولی میں ڈال گئی تھیں اور کتنے بڑے دل والا یہ شخص تھا کہ آج تک اپنے دل کی کہے صرف اور صرف ان کے دل کی سنتا اور دیکھتا آیا تھا، ان کے اپنے دل میں کیا چل رہا ہے کبھی نہ بتا

ہے۔

''آپ نے مجھے ساری عمر اتنا کچھ دیا ہے فیصل کہ میں آپ کی کتنی بھی مشکور رہوں کم ہے۔'' مریم نے کہا۔

''استغفراللہ! میں کون ہوتا ہوں دینے والا۔'' ڈاکٹر فیصل نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

''نہیں فیصل! مجھے کہنے دیں، جو اللہ کے بندوں کا شکر ادا نہیں کر سکتا وہ بھلا اللہ کا شکر کیسے ادا کرے گا۔'' مریم نے دھیرے سے جواب دیا۔

''فیصل پلیز! ایک اور چیز! آخری بار!'' وہ رک رک کر بولیں۔

''آپ پلیز پاکستان جانے کی بندش ختم کر دیں۔'' مریم نے بے حد آس بھری نظروں سے ڈاکٹر فیصل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر فیصل نے بے حد گہری نظروں سے ان کو دیکھا۔

''اب وہاں کیا رہ گیا ہے اور کس کے لیے جائیں؟'' ڈاکٹر فیصل کی نگاہوں میں اماں ابا اور بھائی بہن کی لاشیں گھوم گئی تھیں اور نفیسہ! اس کی تو لاش بھی نہ مل سکی تھی۔

''مٹی! مٹی کا رشتہ تو سب سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے نا، وہ ہمارا وطن ہے وہاں کے سارے لوگ ہمارے اپنے ہیں۔'' مریم نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

''ہونہہ! اپنے!'' ڈاکٹر فیصل نے ''اپنے'' کو لمبا کھینچتے ہوئے کہا۔

''تم بھول رہی ہو تو میں یاد کروا دیتا ہوں ان اپنوں نے ہمارے پیاروں کو کس بے رحمی سے مار ڈالا تھا۔میرے پیاروں کو ان اپنوں نے مارا تھا نا! سید سرفراز علی نے پولیس بھیج کر چھمو ڈاکو کا ڈراما رچا کر ان کے پورے خاندان کو مروا ڈالا اور گاؤں کے کسی ایک فرد نے ان کے قتل کی گواہی نہ دی تھی کیوں کہ ہمارے گاؤں والے ایک گواہی دینے والے کے گھر کو عبرت کا نشانہ بنا دیکھ چکے تھے۔اور تمہارے... تمہارے گھر والوں کو بھی تو سب کے سب کو زندہ جلا ڈالا گیا تھا۔'' ڈاکٹر فیصل کی بات پہ مریم کا چہرہ سیاہ ہو گیا۔

''میرا دوست عبداللہ! اس کا اتنا ہی قصور تھا نا کہ وہ صدیوں سے چلی آئی خون آشام رسموں کے خلاف تھا۔'' ڈاکٹر فیصل کا سید عبداللہ کا تصور آتے ہی لہجہ بھیگ گیا تھا۔

''سنیے، وہ بچہ! وہ عبدالولی ہمارا بچہ ہے، میرا دل کہتا ہے۔''

''لاکھ کسی کی شکل کسی سے کتنی کیوں نہ ملتی ہو وہ اپنا نہیں ہوتا مریم!'' ڈاکٹر فیصل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''نہیں فیصل! میں نے اس کی شکل میں کچھ نہیں پایا بلکہ میں نے تو اسے اس کی خوشبو سے پہچانا ہے، اور خوشبو دھوکا نہیں دے سکتی۔'' مریم نے بے حد وثوق سے کہا۔

ڈاکٹر فیصل نے چونک کر ان کی جانب دیکھا بالکل یہی احساس انہوں نے بھی ولی سے مل کر پایا تھا۔

''اور اگر تم کو وہاں جا کر مایوسی ہوئی تو؟'' ڈاکٹر فیصل نے پوچھا۔

''نہیں! میرا دل کہتا ہے کہ وہ ہماری پہچان ہے!'' مریم نے کہا۔

"پلیز آپ جانے کی حامی بھرلیں، میرا دل کرتا ہے کہ میں اڑ کر وہاں پہنچ جاؤں۔" مریم نے شدت سے اظہار کیا۔

ڈاکٹر فیصل نے بہ غور اُن کو دیکھا، کیا کچھ نہ تھا اُن کی آنکھوں میں۔ ڈاکٹر فیصل کو لگا کہ اگر انہوں نے انکار کردیا تو مریم کے دل میں ساری عمر کسک اور محرومی رہ جانی تھی۔

"ٹھیک ہے، ہم چلیں گے۔" مریم کو یوں لگا جیسے ان کو دوبارہ زندگی مل گئی ہو۔

"شکریہ فیصل۔" مریم نے فوراً ممنون ہوتے ہوئے کہا۔

"میں ایک بات اور کہنا چاہتی ہوں!" مریم نے جاتے جاتے کہا۔

"کیا؟" ڈاکٹر فیصل نے تھکے تھکے انداز میں پوچھا۔

"میں جلد از جلد جانا چاہتی ہوں۔" مریم نے کچھ ہچکچاہٹ سے کہا تھا۔

"ٹھیک ہے!" ڈاکٹر فیصل نے بے جان ہوتے دل سے کہا۔ بعض اوقات وعدے نبھانے میں انسان خود پہ بہت ظلم کر جاتا ہے۔

مریم کو ہمیشہ خوش رکھنے کا وعدہ کر کے وہ اب تک نبھاتے آئے تھے اور آج بھی اُسی وعدے کو نبھانے کے لیے انہوں نے دل پہ بے حد جبر کر کے پاکستان جانے کی ہامی بھرلی تھی۔

ہیں خزاں کے دن کوئی گل کھلا نہیں سکتا
دل میں جو بس جائے دل سے جا نہیں سکتا
ہم اُسی کی یادوں میں رات دن رہیں کھوئے
لوٹ کر جو جیون میں اپنے آ نہیں سکتا

"میں وہاں کبھی نہیں جانا چاہتا تھا۔ اُن فضاؤں میں جہاں تم نے آخری سانسیں لی تھیں لیکن تم ہی کیا وعدہ پورا کروں گا، مریم کی خوشی کی خاطر جاؤں گا۔"

کچھ فیصلے یوں بھی ہوتے ہیں!
دل پہ پاؤں رکھ کر پورے ہوتے ہیں۔

❖❖❍❖❖

"السلام علیکم خالہ!" دروازہ غزالہ نے کھولا تھا روشن آرا بیگم کو دیکھ کر وہ خوشی سے کھل گئیں۔

"وعلیکم سلام! جیتی رہو۔" روشن آرا بیگم نگی کے ساتھ اندر داخل ہوتے بولیں۔

"امی! روشن خالہ آئی ہیں، نگینہ باجی بھی ہیں۔" غزالہ تقریباً اچھلتی ہوئی اندر اطلاع دینے گئی۔

"ارے! آپا آئی ہیں؟" حسن آرا، انور صاحب کو سیب کاٹ کر دے رہی تھیں ایک دم ہی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

"السلام علیکم خالہ!" نگینہ نے کمرے میں قدم رکھتے ہی سلام کیا۔

"السلام علیکم خالو! آپ کیسے ہیں؟" نگینہ نے حسن آرا بیگم کے گلے لگتے انور صاحب کا دریافت کیا۔

"السلام علیکم بھائی صاحب!" روشن آرا بیگم نے بہنوئی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"وعلیکم السلام!" انور صاحب نے نقاہت سے جواب دیا، وہ بے حد کمزور ہو گئے تھے، ان کا چہرہ ایسا لگتا جیسے جسم کا سارا خون نچڑ گیا ہو چہرے کی پیلاہٹ اور پھیکا پن بے حد واضح تھا۔

"حسن آرا! علیزے کو بلواؤ میں اُس کا جوڑا لائی ہوں، اللہ کرے بچی کو پسند آ جائے۔" انہوں نے کہتے ہوئے سی گرین اور مسٹرڈ کلر کا شرارہ سوٹ سامنے پھیلا دیا۔

اس قدر شاندار اور آنکھوں کو خیرہ کرنے والا کام حسن آرا بیگم نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

"بلاشبہ علیزے اس لباس میں شہزادی لگے گی۔" یہ خیال فوری تھا جو حسن آرا بیگم کے دل میں آیا۔

انور صاحب نے بھی بے حد دلچسپی سے لباس کو دیکھا، یہ صرف شادی کا جوڑا نہیں بلکہ انور صاحب کی بیٹی کا سب سے بڑا ارمان تھا۔

"آپا! کیوں نہیں پسند آئے گا! آپ اتنے پیار سے لائی ہیں اور پھر اتنا خوب صورت ہے کہ علیزے اسے پہن کر شہزادی لگے گی۔"

"ارے! علیزے تو پہلے ہی شہزادی ہے، میری شہزادی کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ پر وہ میری اتنی پیاری بیٹی ہے کہ میرا دل کرتا ہے میں اُس کے لیے دنیا کی سب سے بہترین چیز خریدوں۔" روشن آرا کو علیزے اور ولی سے بے حد محبت تھی اور وہ اس شادی میں ہر ہر موقعے پر اپنی محبت کا اظہار عملی طور کرنا چاہتی تھیں۔

"اللہ کتنا پیارا ہے! ہے نا آپی؟" غزالہ نے اپنی عمر کی طرح اپنے شوق اور پسندگی کا اظہار کیا۔

وہ اور علیزے دونوں چائے اور کچھ لوازمات ٹرے میں اُٹھائے اندر آئی تھیں، علیزے نے گڈو کو ارجنٹ سروس کا الگ انعام دیا تھا، جو بازار سے بھاگ کر اشیا خرید کر لایا تھا۔

"السلام علیکم خالہ جان!" علیزے نے چائے کی ٹرے تپائی پہ رکھتے ہوئے اپنا سر روشن آرا بیگم کے سامنے جھکاتے ہوئے کہا۔

"وعلیکم السلام! اللہ تمہیں زندگی کی ہر ہر نعمت سے نوازے۔" روشن آرا بیگم نے حسب عادت دُعا کے ساتھ سلام کا جواب دیا۔

"بیٹا! اِدھر میرے پاس آ کر بیٹھو!" انہوں نے ہاتھ تھام کر علیزے کو اپنے پاس بٹھالیا۔

"یہ تمہارا شادی کا جوڑا ہے، تمہیں پسند آیا، اگر کلر میں کوئی پرابلم ہو تو وہ بدلا جاسکتا ہے۔" روشن آرا نے جوڑا علیزے کے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔

جواباً علیزے کے چہرے پہ شرم وحیا کا عکس تھا وہ دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا گئی۔

اور یہی شرم وحیا ولی کا دل چرا گئی تھی ساری عمر لڑکیوں کے لیے ہاٹ کیک کی طرح رہنے کی وجہ سے وہ لڑکی پُرکشش لگی تھی، جو دل بھر کر حیا دار تھی۔ اُسے علیزے میں روشن آرا بیگم کی جھلک نظر آتی تھی۔

"بھابی کو پسند آ گیا ہے اماں جان!" نگینہ نے مسکراتے ہوئے علیزے کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

"اللہ تعالیٰ تم دونوں کی جوڑی سلامت رکھے۔" روشن آرا بیگم نے علیزے کے ماتھے پہ بوسہ دیا۔

علیزے نے شرما کر سر مزید جھکالیا تھا۔

''بھائی آرہے ہیں بھابی!'' نگینہ نے علیزے کے کان میں سرگوشی کی، جواباً علیزے کے چہرے پہ بہت شرمیلی مسکان تھی۔

''بس کریں بھابی! اور کتنا سرخ ہوں گی۔'' نگینہ نے ہنستے ہوئے کہا تو علیزے نے وہاں سے اُٹھنے کی، کی۔

''بھابی! جلدی جلدی تیار ہو جائیں، ابھی جیولر کے ہاں جانا ہے۔'' نگینہ نے اُس کے پیچھے آتے ہوئے کہا۔

''نہیں چندا! تم جو چوائس کروگی یقیناً بہترین ہوگا پلیز مجھ سے نہیں ہوتی یہ جیولری کی شاپنگ۔'' علیزے نے بے حد سہولت سے انکار کیا۔

''جانا تو پڑے گا، اماں جان کا حکم ہے۔'' نگینہ نے بسکٹ کا ٹکرا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''ہاں بیٹا! چلی جاؤ، آپا اتنے پیار سے کہہ رہی ہیں انکار کرنا اچھی بات نہیں۔'' حسن آرا بیگم بھی اُن کے پیچھے چلی آئیں۔

''امی پلیز! مجھے کہاں کوئی تجربہ ہے سونے کے زیور خریدنے کا، خالہ تو بہت بہترین شاپنگ کرتی ہیں۔'' علیزے نے اپنے من کی بات کہی۔

''چلی جاؤ بیٹا! بات پسند نہ پسند کی نہیں ہے بات تو اُن کی چاہت کی ہے تمہارا ساتھ ان کی خوشی کو بڑھائے گا۔'' حسن آرا بیگم کی بات پہ علیزے نے اثبات میں سرہلایا اور لباس تبدیل کرنے اندر کی جانب بڑھ گئی۔

انور صاحب کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے سامنے کھڑکی سے نظر آتا منظر اُس کے قدم روک گیا۔

انور صاحب ہاتھ جوڑے روشن آرا بیگم کے سامنے لیٹے تھے۔

''شرمندہ نہ کریں بھائی صاحب!'' روشن آرا بیگم نے نم آنکھوں سے کہا۔

''کتنے سال میں نے آپ کو اس راز کے لیے بلیک میل کیا ہے، کتنا ہی پیسہ میں نے کھایا لیکن آپ نے کبھی کچھ نہیں کہا، کبھی بھی کسی بات کی تردید کی نہ تائید، بس مجھے دیتی ہی چلی گئیں۔'' انور صاحب کے لہجے میں بے حد دُکھ تھا۔

''سوچتا ہوں کہ میں نے آپ کو کتنے برس کتنا زیادہ ستایا۔'' انور صاحب کے لفظ لفظ میں شرمندگی تھی۔

''جو بیت گیا وہ بیت گیا، اب اُس دکھ پر مزید دکھی ہونا کہاں کی عقل مندی ہے۔'' روشن آرا بیگم نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

واقعی! کتنے سال انور صاحب اُن کو عبدالولی اور نگینہ کے راز کو لے کر بلیک میل کرتے آئے تھے یہ بات نہ احمد شاہ کو معلوم تھی اور نہ ہی حُسن آرا بیگم کو... لاکھوں کے حساب سے انور صاحب نے پیسہ لے کر اُڑایا تھا لیکن آج وقت نے ان کے دل پہ اتنی کاری ضرب لگائی تھی کہ وہ بے اختیار بلبلا اُٹھے تھے۔

''درد جب تک خود پہ نہ اُترے کہاں اپنا احساس کروا پاتا ہے، میں بہت شرمندہ ہوں۔'' انور صاحب ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''آپ مجھے معاف نہ کریں گی تو میں خود کو پُرسکون محسوس نہیں کرسکوں گا۔'' انور صاحب نے بے حد ملال سے کہا۔

''اگر آپ کو میرے کہنے سے تسلی ملتی ہے تو ٹھیک ہے میں آپ کو معاف کرتی ہوں۔'' روشن آرا بیگم گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

انور صاحب کا چہرہ ایک دم پُرسکون ہوگیا۔

''یہ کس راز کے متعلق بات کر رہے ہیں اور کس بات کے لیے معافی مانگ رہے ہیں؟'' علیزے نے دل سے سوچا۔

''بھابی! دیر ہورہی ہے آپ کہاں گم ہیں؟'' نگینہ نے علیزے کے پیچھے آ کر کندھے سے لگتے ہوئے کہا۔

''آں... ہاں! بس دو منٹ!''

علیزے ابھی تک اُلجھی ہوئی تھی لیکن نگینہ کی جلدی جلدی پکار پر آخر وہ اندر کی جانب بڑھ گئی۔

اور جب وہ روشن آرا بیگم اور نگینہ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی ہوئی تھی تو اس نے روشن آرا بیگم کا چہرہ بغور دیکھا۔

''یہ عورت! جو میری ماں کی ماں جائی ہے ہمیشہ ہمارے خاندان کی مدد کرتی آئی ہے، اس بار کون سے قصور کی معافی دے کر یہ مزید بلندی کا سفر طے کرگئی ہے۔'' علیزے نے اُن کے چہرے پہ کچھ کھوجنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ نہ حاصل کر پائی کیوں کہ وہاں ہمیشہ کی طرح نرم سی مسکراہٹ تھی۔

علیزے کا بے اختیار دل چاہا کہ وہ زیادہ نہیں تو تھوڑی سی ضرور ان جیسی بڑے دل والی بن جائے۔

اچھے لوگ تو خوشبو کی طرح ہوتے ہیں جس کے پاس ہوں دل و دماغ کو معطر کر دیتے ہیں۔ برے لوگوں کی مثال بالکل گندے جوہڑ کی طرح ہوتی ہے، جو دل و دماغ کے لیے سڑاند بھری فضا جیسے ثابت ہوتے ہیں۔

علیزے نے بھی روشن آرا بیگم جیسی خوشبو دار شخصیت بننے کی شدت سے دعا کی، گاڑی ہلکے سے جھٹکے سے رکی۔

''بیٹا اُترو! یہ شیخ عبدالرحمن ہمارے خاندانی جیولر ہیں، تم جیسا زیور چاہو گی یہ ڈیزائن کر دیں گے۔'' روشن آرا نے دکان کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے علیزے سے کہا۔

اسی پل علیزے سامنے سے آتے ہٹے کٹے شخص سے ٹکرائی تھی۔

''آپ کو نظر نہیں آتا؟'' نگینہ نے فوراً علیزے کا ہاتھ تھام کر اسے سہارا دیا اور سامنے والے شخص سے کہا جو اُلجھ رہا تھا سی تھی۔

''معافی چاہتا ہوں خاتون!'' بظاہر بدمعاشوں جیسے حلیے والے شخص نے معذرت کر کے علیزے اور نگینہ دونوں کو حیران کر دیا۔

اس آدمی کے ساتھ موجود عورت جو کہ نیم برہنہ ساڑی میں ملبوس نگینہ کو بہ غور دیکھ رہی تھی۔ اُس کی

آنکھوں کی چمک نگینہ کو دیکھ کر کچھ اور بڑی تھی۔

جیسے ہی نگینہ اور علیزے جیولر شاپ میں گئیں وہ عورت اُس مرد کی جانب دیکھ کر بہت معنیٰ خیز انداز میں مسکرائی۔

ایسا حُسن! یہاں بازاروں میں کیا کرتا پھر رہا ہے۔ دونوں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں!'' وہ گاڑی کی جانب بڑھی تو تھی لیکن گاڑی میں جا کر بیٹھی نہ تھی۔

اُس کی نگاہیں مسلسل شیشے کے پار موجود لڑکیوں پہ تھی۔

''اُف توبہ! کیا گڑیا جیسی ہیں۔ اتنا حُسن اور معصومیت بہت کم ایک ساتھ ہوتی ہیں۔'' وہ تقریباً ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔

''جی میڈم! لڑکیاں واقعی بہت زبردست ہیں۔''

''اور اس میں بھی ایک بڑی زبردست اطلاع ہے آپ کے لیے۔'' مرد نے سنسنی خیز انداز میں کہا۔

جواباً عورت نے اَبرو چڑھا کر اشارے سے پوچھا۔

''وہ یہ کہ ان میں سے ایک اَن مول ہیرا طارق صاحب کی بہن ہے!'' پرویز نے ہنستے ہوئے اطلاع دی تھی۔

''اوہ!'' میڈم راگنی نے اپنی آنکھیں تھوڑی سی میچ کر پُرسوچ نگاہوں سے شیشے کی دیوار کے پار دیکھا۔

''ان میں سے کون سی والی ہے؟'' اس بار اُس کا لہجہ انگارے بھرا ہوا تھا۔

''وہ جس نے نیلے رنگ کے کپڑے پہن رکھے ہیں۔'' پرویز نے نگینہ کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

''جس وقت انہوں نے طارق پہ حملہ کیا تھا تو نگینہ اُس کے ساتھ تھی، پھر کئی بار جب انہوں نے طارق کا پیچھا کیا تھا تو نگینہ ہی اُس کے ساتھ تھی اس لیے وہ نگینہ کو سائرہ کی جگہ سمجھ بیٹھے تھے۔''

''پرویز! سانپ کا وار تب بھی خالی نہیں جاتا جب اُس کے اندر بدلے کی آگ اُسے جھلسا رہی ہو۔'' میڈم راگنی نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

''پرویز!'' میڈم راگنی نے ایک دم اُس کی جانب مڑ کر اُسے پکارا۔

''جی میڈم!'' پرویز نے فوراً تابع داری سے پوچھا۔ وہ اپنی مالکن کے ہر تیور کو پہچانتا تھا وہ جان گیا کہ میڈم راگنی کی آنکھوں سے نکلنے والے شرارے یقیناً اب کسی کو ضرور بھسم کریں گے۔

''مارک کو کہو کہ انڈر گراؤنڈ سے نکل آئے، بدلے کا اور کام کا وقت آ چکا ہے۔'' میڈم راگنی کا لہجہ بے حد سرد تھا۔

پھر اُس نے نگینہ کی جانب انگلی سے اشارہ کر کے پرویز کی جانب دیکھا۔

''او کے میڈم! میں سمجھ گیا۔'' پرویز نے اپنے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

دور جیولر کی شاپ میں بیٹھی معصوم نگینہ کے تو فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ کسی کی میلی نگاہ اُس کے گرد آزمائش کا شکنجہ کس رہی تھی۔

وہ کسی کی غلط فہمی کا شکار ہونے جا رہی تھی۔

میڈم راگنی نے تسلی سے گاڑی میں بیٹھ کر ایک بار پھر لڑکیوں کی جانب دیکھا۔

''انمول ہیرے ہمارے ہاں ہی جچتے ہیں!'' وہ با آواز بلند بولی۔

''اُن کے قدر دان بھی ہمارے ہاں ہیں اور صحیح قیمت بھی!'' اور آگے بیٹھا پرویز دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ اُس نے اتنی اہم اطلاع میڈم راگنی کو دی تھی یقیناً بگ باس تک اُس کی رپورٹ اچھی جائے گی۔

بعض اوقات جو کسی کے لیے اچھا ہوتا ہے، وہ دوسرے کے لیے بہت برا ہوتا ہے۔

❖❖❖○❖❖❖

احمد شاہ عشا کی نماز پڑھ کر ابھی لیٹے ہی تھے کہ ان کے موبائل پر مسلسل بیل ہوئی۔ احمد شاہ نے موبائل اُٹھا کر اسکرین پر آئے نمبر کو دیکھا، یہ اَن نون نمبر تھا۔

''یہ کس کا نمبر ہے؟'' انہوں نے سوچا پھر اُسے اگنور کر دیا وہ اَن نون نمبر لیا نہیں کرتے تھے۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر انہوں نے فون اٹینڈ کر لیا۔

شاید دفتر میں کسی کو ضرورت پڑی تھی ورنہ اس وقت اُن کو کس نے فون کرنا ہے۔

انہوں نے جیسے ہی فون اُٹھایا، دوسری جانب سے بے حد بھاری آواز میں سلام کیا گیا۔

''وعلیکم السلام! کون صاحب بات کر رہے ہیں۔'' احمد شاہ نے پوچھا، دوسری جانب سے کوئی ہنسا تھا۔

''کمال ہے اب تو رشتے داری ہونے والی ہے، آپ ہمیں کیسے بھول گئے۔'' سید سرفراز نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کون؟'' احمد شاہ کے ماتھے پر تیوری بے حد واضح تھی وہ شاید ٹھیک بندے تک پہنچ گئے تھے۔

''سید سرفراز علی عرض کر رہا ہوں!'' اس نے بے حد خوش گوار موڈ میں کہا اور دوسری جانب احمد شاہ کا اضطراب ہونے لگا۔

''مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی، حیرت ہے میرا پرسنل نمبر آپ تک کیسے آ گیا۔'' احمد شاہ نے سرد لہجے میں کہا۔

''وہی تو! اس سے اندازہ کر لیں کہ ہم جو پانا چاہیں وہ ہمیشہ پا لیتے ہیں۔'' سید سرفراز نے رعونت سے کہا۔

''ہونہہ! فون نمبر حاصل کرنا کوئی بہت بڑی بات نہیں۔'' احمد شاہ نے کہا۔

''جناب! آپ سید سرفراز کو بہت انڈر اسٹیمیٹ کر رہے ہیں، آپ مجھے جانتے نہیں ہیں۔'' سید سرفراز نے بے حد پُرسکون انداز میں کہا۔

''اور میں آپ کو جاننا بھی نہیں چاہتا۔'' یہ کہہ کر احمد شاہ نے فون بند کر دیا، لیکن فوراً سید سرفراز علی کا فون پھر آ گیا۔

''فون بند نہ کیجیے گا جناب! میری بات ابھی مکمل نہیں ہوئی۔'' وہ کڑک کر بولا۔

احمد شاہ نے ناگواری سے فون کو دیکھا۔

''آپ سے میں جو بات کر کے آیا تھا آپ نے اُس بات کے متعلق کیا سوچا؟'' سید سرفراز علی نے

پوچھا۔

''میرا خیال ہے آپ سمجھ دار انسان ہیں انکار کا مطلب انکار ہی ہوتا ہے۔'' احمد شاہ نے بے حد ٹل سے کہا۔

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے!'' سید سرفراز علی نے اونچی آواز میں کہا۔

''آپ کا بیٹا میری بیٹی کی زندگی تباہ کر کے کسی اور سے شادی نہیں کرسکتا۔'' سید سرفراز نے فون پر گرجتے ہوئے کہا۔

''میرا بیٹا ہے عبدالولی! اور میں جانتا ہوں کہ میرے بیٹے نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس پر مجھے شرمندگی ہو یا پریشانی اُٹھانی پڑے۔'' احمد شاہ نے بے حد مضبوط لہجے میں کہا۔

''تو آپ آرام سے میری بات نہیں مانیں گے۔'' سید سرفراز علی نے کہا۔

''عبدالولی کا نکاح ہماری بھانجی سے ہو رہا ہے اس کے علاوہ اور کوئی دوسری صورت نہیں ہے۔'' احمد شاہ نے کہہ کر فون کال پہلے بند کی اور پھر فون سیٹ بھی بند کردیا۔

سید سرفراز علی نے ہاتھ میں تھاما فون سیٹ زور سے کھینچ کر دیوار پہ دے مارا۔

''پاشا!'' انہوں نے گرج کر اپنے خادم خاص کو آواز دی تو ایک نہایت اونچی اور مضبوط ڈیل ڈول کا مرد اندر داخل ہوا۔

''جی سائیں!'' وہ ہاتھ باندھ کر پوچھ رہا تھا۔

''پاشا! عبدالولی کی ایک بہن ہے نا!'' انہوں نے پرسوچ انداز میں پوچھا۔

''کسی کالج میں پڑھتی ہے سائیں!'' پاشا نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے اُسے اُٹھالو۔'' سید سرفراز علی نے بے حد ظالمانہ لہجے میں کہا۔

''جی سائیں؟'' خادم خاص نے حیران ہو کر سید سرفراز کی شکل دیکھی، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ سید سرفراز اس خاندان میں چھوٹی بی بی کی شادی کرنا چاہتے ہیں تو پھر وہ دشمنی مول کیوں لے رہے ہیں۔

''سائیں چھوٹی بی بی کے لیے مسئلہ نہ بن جائے۔''

اُس نے وفاداری نبھاتے ہوئے مشورہ دیا۔

''وہ لوگ رشتہ نہیں دے رہے اور سید سرفراز کو زبردستی ہر چیز لینی آتی ہے... میں دیکھتا ہوں کہ اپنی لڑکی کو بچانے کے لیے کیسے یہ رشتہ نہیں کرتے۔ اگر نہ کیا تو میں اس لڑکی کے ساتھ وہ کروں گا کہ احمد شاہ کی سات نسلیں یاد کریں گی کہ اُس نے کس کو انکار کیا تھا۔'' سید سرفراز نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے سائیں! کام ہو جائے گا۔''

پاشا کہہ کر باہر نکل گیا جب کہ سید سرفراز علی اپنی مونچھیں مروڑتے مسلسل ایک شیطانی منصوبہ بنا رہا تھا۔

❖❖○❖❖

''ہیلو میڈم! مارک بول رہا ہوں، آپ نے یاد کیا تھا۔'' مارک نے راگنی میڈم کو فون کیا۔

''ہاں! تمہارے لیے کام آیا ہے اور مجھے اُمید ہے کہ تم اس کام کو ضرور کرنا چاہو گے۔''

اور پھر میڈم راگنی نے جو کچھ مارک سے کہا تھا اُس کو سُن کر مارک نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔

''مان گئے اُستاد راگنی! آپ تو واقعی بہت بڑا دماغ رکھتی ہیں۔'' مارک نے خوش ہو کر میڈم راگنی کی تعریف کی، وہ بگ باس کا خاص بندہ تھا اور میڈم راگنی کا بھی منہ چڑھا تھا۔

''میڈم! آپ نے کمال کا بدلہ سوچا ہے کہ طوطے میں پھنسی طارق کی جان اب تو ضرور نکلے گی کیوں کہ اس کا طوطا تو ہم اُٹھا لائیں گے۔'' جواباً میڈم راگنی اور مارک کا قہقہہ ایک ساتھ بلند ہوا۔

❀

تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں
تم مجھے اچھے لگتے ہو
بہت زیادہ
بہت ہی زیادہ!

طارق نے مسکرا کر کارڈ بند کیا، اُس کا چہرہ کسی ستارے کی طرح دمک رہا تھا۔ بے حد نمایاں، خوشیاں دِل سے تعلق رکھتی ہیں، وہ چہرے پر بھی چمکتی ہیں۔

یہ ننھا منا اور بے حد سادہ الفاظ میں اظہار نگینہ کی جانب سے تھا۔

رات شہباز صاحب نے طارق کی صحت یابی کی خوشی میں اپنے احباب کو ڈنر دیا تھا۔ نگینہ بھی آئی تھی۔ بہ ظاہر وہ اُسے Get well soon کا کارڈ سب کے سامنے دے کر گئی تھی لیکن طارق کے دل کو خوش گمانی تھی کہ کارڈ میں اُس کے لیے کچھ اور بھی ہوگا اِس لیے اُس نے یہ کارڈ فوراً الگ کر کے جیب میں رکھ لیا۔

خوش گمانیاں جو دُعا کے ریپر میں لپٹی ہوں، وہ ہمیشہ پوری ہوتی ہیں۔ کارڈ کھولتے ہی طارق کے چہرے پر بے اختیار سی مسکراہٹ تھی۔

واقعی نگینہ کا چھوٹا سا اظہار طارق کو بے حد خوشی دے گیا تھا۔

''لالہ! کس بات کو لے کر اتنا مسکرایا جا رہا ہے۔'' سائرہ ہاتھ میں چائے کا مگ اُٹھائے کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے مسکراتے بھائی سے پوچھا۔

''گیس؟'' طارق نے خوش دلی سے اُسی سے پوچھا۔

''نگی؟'' سائرہ نے گرم گرم چائے کا کپ طارق کو تھماتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''زبردست! مبارک ہو آپ تو ولی ہوگئی ہیں، الہامی طاقت تو بہت اچھی ہے آپ کی۔'' طارق نے ہنستے ہوئے اقرار کیا۔

''میں کیا ولی اللہ ہوں گی، آپ کے تو چہرے پر ساری کہانی لکھی ہے، کوئی ان پڑھ بھی جان سکتا ہے۔'' سائرہ نے بے حد اطمینان سے بیڈ سے کمر ٹکاتے ہوئے کہا۔

''کیا اتنا Obvious ہے؟'' طارق نے چونک کر پوچھا۔ کیوں کہ آج کل سحرش بھی بہت کریدنے لگی تھی۔ شاید طارق کا چہرہ ہی راز افشا کرتا رہا تھا۔

''جی جناب!'' سائرہ، بھائی کی بوکھلاہٹ پر محظوظ ہوئی۔

''اوہ!'' طارق نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

بھائی کو یوں پریشان دیکھ کر سائرہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''لالہ! آپ سے ایک بات کہوں؟'' سائرہ نے پوچھا۔

''ہوں!'' طارق نے صرف ہوں کہہ کر اجازت دی۔

''لالہ! بہت انتظار کرلیا آپ نے نگینہ کا، اب آپ کو کوئی لیگل اسٹیپ اُٹھالینا چاہیے، آئی مین اب پرپوزل بھیجنے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ ابھی تو یہ بالکل پراپر ٹائم ہے لیکن مزید ویٹ کریں گے تو سو لیٹ! کیوں کہ اچھی لڑکی ہے کوئی بھی لے کر اُڑ سکتا ہے۔'' سائرہ نے بے حد اہم پہلو کی جانب توجہ دلائی تھی۔

''میں نہیں چاہتی کہ میرے لالہ کی اتنے برسوں کی محبت کسی Loss کو فیس کرے۔'' سائرہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو۔'' (اب تو ہم سے دور بھی نہیں رہا جا رہا ہے) طارق نے بات کا دوسرا حصہ دِل میں کہا۔

''تو پھر ٹھیک ہے، دیر تو ایک دن کی کیا ایک پَل کی بھی نہیں ہونی چاہیے میں ابھی ابّو سے بات کروں اس سے پہلے کوئی اور پروپوزل آپ کی محبت میں ظالم سماج بن کر آجائے۔'' سائرہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''تم ابھی بات کروگی؟'' طارق نے حیرت سے اُس کی جلد بازی کو دیکھا۔

''بالکل جناب! نیک کام میں ویسے بھی دیر نہیں کرنی چاہیے یہ کام تو آل ریڈی آپ کی شرم و حیا کی وجہ سے بہت لیٹ ہوچکا۔'' سائرہ نے اَٹل لہجے میں جواب دیا۔

''ارے! رکو تو سہی۔'' طارق اس کی جلد بازی پر بوکھلا کر رہ گیا۔

''اگر کوئی ٹیکنیکل پرابلم نہیں ہے تو پلیز! پلیز لالہ لیٹ می گو۔'' سائرہ چاہتی تھی کہ مسکان کے بعد جو دل کا خانہ زندگی سے خالی ہوگیا، وہ نگی کی ذات سے بھر جائے، اس لیے وہ بہت جلد باز ہو رہی تھی۔

''نہیں! کوئی ایسا ویسا پرابلم تو نہیں ہے لیکن...''

طارق کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیسے سحرش والے پرابلم کو ڈس کلوز کرے، وہ بُری طرح پھنس گیا تھا۔ نگینہ اُس کی زندگی تھی اور وہ اپنی زندگی سے دست بردار ہونے کو تیار نہ تھا۔

اس لیے اُس نے سوچا کہ اُسے سائرہ کو روکنا نہیں چاہیے۔

''اوکے! کرلو بات!'' طارق نے حتمی فیصلے پر پہنچ کر مسکرا کر کہا۔

''دیٹس گریٹ!'' سائرہ خوش ہوکر باہر کی جانب لپکی۔

طارق کچھ دیر تو بے چینی سے کمرے کے چکر لگاتا رہا۔ پھر جب اُس سے برداشت نہ ہوا تو وہ بھی سائرہ کے پیچھے لپکا۔ سامنے لان میں ڈاکٹر شہباز چیئر پر بیٹھے تھے اُن کا پالا ہوا مور کا بچہ جو اب کچھ بڑا ہوگیا تھا اُن کے اِردگرد منڈلا رہا تھا۔ سائرہ ان کے کندھے سے لگی راز و نیاز کرنے میں مشغول تھی،

طارق جیسے بااعتماد شخص کو ایسے موقعے پر بے حد جھجک محسوس ہوئی۔
طارق پر پہلی نظر شہباز صاحب کی ہی پڑی۔
''یار! اِدھر آجاؤ، وہاں کیوں کھڑے ہو؟'' شہباز صاحب نے میٹھی نظروں سے طارق کو دیکھتے ہوئے کہا اُن کے چہرے پر خوشی بے حد نمایاں تھی۔ طارق چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا ان کے سامنے آ بیٹھا طارق کا شدت سے دِل چاہا کہ وہ اپنے والد کے تاثرات جان سکے کہ وہ اِس رشتے کے حامی ہیں یا نہیں۔
''طارق! یار تمہارا انتخاب بالکل اچھا نہیں ہے۔'' شہباز صاحب کی بات پر سائرہ اور طارق کے چہروں کا رنگ بے اختیار بدل گیا۔
''انتخاب اچھا نہیں ہے! لیکن لاجواب ضرور ہے۔ یار نگی تو بہت پیاری اور نیک بچی ہے۔'' شہباز صاحب کی بات پر دونوں کے رُکے سانس اور پھیکے چہرے بحال ہوگئے۔
''لو جان! آپ خوش ہیں نا؟'' طارق نے ایسے سوال کیا جیسے کوئی چھوٹا بچہ آس سے پوچھتا ہے۔
''بالکل! پھر احمد شاہ تو میرا بہت پیارا دوست ہے اُس کی ذات کی روشنی اُس کی اولاد میں سے جھلکتی ہے وہ لڑکی ہمارے گھر کا نصیب بنے اِس سے زیادہ ہماری خوش قسمتی کیا ہوگی۔'' شہباز صاحب نے طارق کی پسند کو اپنے لفظوں سے مزید مان دے ڈالا۔
''تھینک یو لو جان!'' سائرہ نے اُن کے سر پر اپنا چہرہ جما کر کہا۔ وہ اِس وقت اُن کی کرسی کے ہاتھ پر اُن کے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔
اُسی پَل باہر سے ایک دم شور کی آواز بلند ہوئی۔ چوکیدار کسی پر برس رہا تھا۔
''یہ کیسا شور ہے؟'' طارق نے کھڑے ہوتے ہوئے باآواز بلند کہا۔
''کیا بات ہے خان! کیوں شور مچا رکھا ہے؟'' طارق چوکیدار سے سوال کرتے کرتے ایک دم رُک گیا۔
دل کو کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔
وہ سامنے کھڑی تھیں، کس قدر بدل گئی تھیں، نہ اُن کی شخصیت کی وہ شائننگ باقی رہی تھی جو اُن کی شخصیت کا خاصہ رہی تھی، سادہ کاٹن کی شلوار قمیص میں وہ ایک عام سی عورت لگ رہی تھیں، ساری زندگی انہوں نے ایک سے بڑھ کر ایک ساڑی کا استعمال کیا تھا۔
اور آج وہ اتنے عام سے حلیے میں تھیں کہ اُن کو پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔
''آنی!'' طارق کے لب پھڑ پھڑائے۔
اِس عورت سے طارق نے کس قدر پیار کیا تھا! اِس سے نفرت کرنے کے چکر میں وہ خود کو ہمیشہ ہوا محسوس کرتا تھا۔
''طارق! طارق میری جان!'' نیلوفر کسی پیاسی ہرنی کی طرح اُس کی جانب لپکیں، چوکیدار نے رکاوٹ ڈالنی چاہی تو اُس نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک دیا۔
''صیب! بڑے صیب نے اِس بی بی کو یہاں آنے سے روکا ہے لیکن یہ مانتا ہی نہیں، پھر آجاتا ہے۔'' چوکیدار بولا۔
''تم جاؤ۔'' طارق نے اُسے بھیج دیا۔
''طارق! پلیز میری بات سُن لو ورنہ میں مرجاؤں گی۔'' نیلوفر بلک بلک کر رو رہی تھیں۔
طارق کا دِل اُن کے آنسوؤں پر پگھلنے لگا لیکن پھر بھی وہ گیٹ میں راستہ روکے منہ دوسری جانب کیے کھڑا تھا اس بے نیازی میں بھی اُس کا سارا دھیان آنی ہی کی جانب تھا۔
''یوں منہ نہ موڑو، ایسے نہ کرو میری جان! تمہاری اجنبی نگاہیں مجھے مار دیں گی۔'' وہ ہاتھ جوڑے کھڑی تھیں۔
ساری زندگی غرور سے گردن اکڑا کر کھڑی رہنے والی عورت آج خود کو اور اپنی عزتِ نفس کو زیرو کر کے کھڑی تھی لیکن آج اُسے کسی پلس مائنس کی پروا نہ تھی، اُسے پروا تھی تو بس اتنی کہ طارق اُسے معاف کردے۔
''آپ پلیز یہاں سے چلی جائیں، میں آپ سے بات نہیں کرنا چاہتا۔'' طارق نے بے حد ضبط سے کہا۔ اُسے ان کا یوں ہاتھ جوڑے کھڑے رہنا بُرا لگ رہا تھا۔
''طارق! میں شہباز کی، تمہاری اور سائرہ کی گناہ گار ہوں، میرا سب سے بڑا قصور تو سارہ کے کھاتے میں کھلتا ہے، جب مجھے یہاں کوئی معاف کرنے پر تیار نہیں تو وہاں، وہاں کیسے معافی ملے گی۔'' انہوں نے آسمان کی جانب اشارہ کر کے کہا۔
طارق کا دِل کوئی اندر سے مسلنے لگا، دانت دانت پر جمائے اُس کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ وہ نہیں جان پا رہا تھا کہ اُسے آنی پر اِس بات پر غصہ آ رہا ہے کہ انہوں نے اُن سب کی زندگی کے ساتھ سازش کی یا اِس بات پر غصہ تھا کہ یہ عورت جس نے ہمیشہ ماں کی طرح اُن کی ہر ضرورت پوری کی تھی، زمانے کے سرد گرم سے بچایا تھا وہ یوں اُن کے دروازے پر آمرزش کی بھیک مانگنے کے لیے بھکارن بنی کھڑی تھی۔
اُس کی ہر بات جھوٹ سے شروع اور جھوٹ پر ختم ہوتی تھی لیکن اِس عورت کی زندگی کا ایک سچ یہ بھی تھا کہ اُس نے طارق اور سائرہ سے شدید ترین محبت کی تھی۔ بے شک شروع میں اُس نے یہ محبت Planed رکھی تھی لیکن آہستہ آہستہ یہ بچے اُس کی کمزوری بن گئے تھے اور آج وہ دنیا کی سب سے کمزور عورت بنی کھڑی تھی۔
''پلیز طارق، چندا! میرے بچے مجھے معاف کردو! میں تم سب کے بغیر نہیں رہ سکتی... میں تم لوگوں کی محبت نفرت میں بدلتے دیکھ کر جی نہیں پا رہی۔'' نیلوفر نے طارق کے دونوں ہاتھ کو تھام کر بوسہ دیا۔
طارق کی آنکھوں سے دو ضدی آنسو ہر طرح کی بندش توڑ کر باہر نکل آئے جن کو چھپانے کے لیے اُس نے دوسری جانب منہ موڑ لیا۔
''کون ہے لالہ؟'' سائرہ کی آواز طارق کی پشت پر سنائی دی۔
نیلوفر کی طبیعت میں بے چینی شدید ہوگئی۔
''گڑیا! سائرہ گڑیا! میں... میں تمہاری آنی!'' نیلوفر نے اُچک اُچک کر طارق کے پیچھے سائرہ کو دیکھنے

کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

طارق نے تاسف بھری نظروں سے انہیں دیکھا اور دوسری جانب ہوکر انہیں دیکھنے کے لیے راستہ دے دیا۔

''سائرہ! اِن سے کہو اگر ابّو اِن کو معاف کر دیتے ہیں تو ہم دونوں کی جانب سے بھی معافی مل جائے گی اور اگر ابو معافی نہیں دیتے تو یہ یہاں آ کر اپنا وقت برباد نہ کریں۔'' طارق کہہ کر رُکا نہیں بلکہ گیٹ کے باہر کھڑی جیپ اسٹارٹ کر کے تیزی سے نکل گیا۔

نیلوفر پشیمانی سے اُسے جاتا دیکھتی رہ گئیں۔

''گڑیا! سائرہ! پلیز مجھے معاف کر دو۔'' آنی نے مڑ کر اس سے کہا۔

''آنی! آپ نے شاید لالہ کی بات غور سے نہیں سُنی، آپ کی معافی ابو کی معافی سے مشروط ہے۔'' سائرہ نے دھیرے دھیرے کہا۔

خود سائرہ کو لگ رہا تھا، جیسے اُس کی آواز کسی کنویں سے آ رہی ہو، آنی کی محبت بھول جانا ممکن نہ تھا۔

''سائرہ بیٹا! آپ اندر جائیں۔'' شہباز صاحب نے جب دیکھا کہ طارق اور سائرہ کو گیٹ پر بہت دیر ہوگئی ہے تو وہ بھی وہیں چلے آئے۔

''جی ابو۔'' سائرہ نظریں چُرا کر اندر چلی گئی۔

آنی نے اُسے ایسے دیکھا، جیسے کسی بچے کی آنکھوں میں اُس کی من پسند چیز چھن جانے پر شکوہ اُتر آئے۔

''خطاوار ہوں شہباز! معاف کر دو۔'' نیلوفر اب شہباز صاحب کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی تھیں۔

''میں تم کو تمہارے وکیل کے ذریعے تحریری معافی دے چکا ہوں، اب تم کو مزید کیا چاہیے جاؤ، چلی جاؤ یہاں سے اور ہماری زندگیوں سے، ہم اب تم کو دوبارہ سوچنا بھی نہیں چاہتے۔'' شہباز صاحب کے لہجے میں دُکھ ہی دُکھ تھا۔

''نہیں شہباز! مجھے دِل سے معافی چاہیے، تم لوگ مجھے معاف کر دو، میں بچوں کے بِنا بنجر ہوگئی ہوں، میں نے اِن سے ہمیشہ سچی محبت کی ہے، مجھ میں لاکھ برائیاں سہی! لیکن یہ سچ ہے کہ میں نے ان سے بے حد محبت کی ہے۔''

''تم مجھے معاف کر دو تا کہ! تا کہ بچے بھی مجھے معاف کر دیں۔'' نیلوفر نے بلکتے ہوئے کہا۔

جواباً شہباز صاحب نے ایک زخمی نگاہ اُن پر ڈالی اور واپس اندر جانے کو مڑے۔

''تمہارا قصور چھوٹا نہیں ہے، تم نے میاں بیوی کو الگ کیا، اُن کے بچوں کے اندر زہر بھرا، کیا کچھ نہیں کیا تم نے اور اب تم معافی کے نام پر دوبارہ ہماری زندگیوں کا حصہ بننا چاہتی ہو۔ نہیں! یہ بالکل نہیں ہوگا۔'' وہ با آواز بلند کہہ کر گیٹ بند کر کے اندر چلے گئے۔

''دروازہ کھولو، دروازہ کھولو شہباز! میں معافی لیے بغیر نہیں جاؤں گی۔'' نیلوفر نے گیٹ بجاتے ہوئے زور سے کہا۔

یہ پوش ایریا تھا، یہاں کنالوں پر پھیلے گھروں کے اندر مکین اپنی زندگی میں اتنے مگن تھے کہ کوئی بھی

کی آواز سُن کر باہر نہ آیا تھا، وہ کیسی تہی داماں تھیں کہ ہر جانب سے دھتکار اور تنہائی مل رہی تھی۔

ان کی تو اِس عبرت ناک حالت کو دیکھنے کے لیے بھی کوئی نہ تھا۔

"شہباز! میں نہیں جاؤں گی!

"میں معافی کے بغیر نہیں جاؤں گی۔'' نیلوفر کا گلا چیخ چیخ کر بیٹھ گیا تھا وہ تھک کر وہیں گیٹ کے ساتھ لگ کر زمین پر بیٹھ گئیں، اُن کی آنکھیں آسمان کی جانب تھیں۔

سمندر آگ ہے، وحشت ہوا ہے
تو جدا ہے مجھ سے، اے میرے خدا!
لا انتہا پھیلا خُلا ہے
خوف نے جکڑا ہے دل کو
میری آنکھوں سے رواں، اشکوں کی صورت
روز و شب کا سلسلہ ہے
میں نے زخموں کا چراغاں
تیری راہوں میں کیا ہے
تو کہاں ہے؟

نیلوفر کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے، نگاہیں آسمان پر تھیں اب وہ اپنے ربّ سے مجسم طلبِ آمرزش تھیں۔

❖❖○❖❖

سائرہ مسلسل گلے میں موجود چین کو بے چینی سے ہاتھ میں لیے گھما رہی تھی، آنی کی آوازوں نے اُس کا اضطراب کر دیا تھا اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ دوڑ کر جائے اور آنی کو گلے سے لگا لے۔

''یا اللہ! اگر تو نے ہمارے دلوں سے آنی کی محبت ختم نہیں کی تو اُس کا مطلب ہے اُن کا وجود ہماری زندگیوں سے نہیں نکلا۔ اب تُو ہی کوئی راستہ نکال! لاکھ اُس عورت نے برائی کی ہے لیکن اب وہ معافی مانگ رہی ہے اور تُو تو مڑ کر آنے والے کو ہمیشہ محبوب رکھتا ہے۔ اے اللہ کوئی راہ نکال!'' سائرہ نے بے اختیار ہاتھ اُٹھا کر دُعا کی، جب جب معاملات انسان کے دِل کے آگے بے بس ہو جاتے ہیں وہ شاید تاہی کمزور پڑ جاتا ہے۔

اُسی پَل سائرہ کا سیل فون بجا۔

''جی لالہ!'' فون طارق کا تھا۔

''کیوں لالہ! ٹھیک ہے!'' سائرہ نے اُداسی سے فون بند کر دیا۔

طارق جس قدر اپ سیٹ ہو کر گھر سے نکلا تھا اُس کا گھر آنے کا موڈ نہ تھا اُس نے اطلاع دی تھی کہ وہ گھر نہیں آ رہا، رات کو آفس میں کام کرے گا۔

سائرہ سر تھام کر بیٹھ گئی وہ بے حد بے چین تھی پھر ایک دم اُٹھی اور موبائل پر ایک نمبر ملانے لگی۔ اُسے ایک راستہ اللہ نے دکھا دیا تھا۔

وہ احمد شاہ انکل کو فون کر رہی تھی۔

❖❖○❖❖

”یہ کیا انسانیت ہے خان؟“ احمد شاہ چوکیدار پر برس رہے تھے۔

”وہ بڑے صیب کا حکم تھا جی!“ چوکیدار منمنایا۔

”ایک عورت گزشتہ پندرہ سولہ گھنٹے سے دروازے پر بیٹھی ہے اور تم اُسے اندر نہیں جانے دے رہے۔“ وہ مسلسل سات آٹھ گھنٹے کا سفر طے کر کے ابھی ابھی شہر پہنچے تھے اور سیدھے شہباز کی طرف آ گئے تھے۔

”اُٹھیے نیلوفر!“ احمد شاہ نے ان کے قریب جا کر کہا جن کا رو رو کر گلا بیٹھ چکا تھا، آنکھیں اور منہ سوجا ہوا تھا۔

احمد شاہ کو بے حد تکلیف اور شرمندگی ہوئی۔ وہ عورتوں کو ہمیشہ اونچا درجہ اور مقام دیتے آئے تھے نیلوفر کی حالت دیکھ کر اُن کو زندگی میں پہلی بار شاید اتنا غصہ آیا تھا۔

”نہیں! میں واپس نہیں جاؤں گی۔“

نہیں! مجھے معافی چاہیے۔“ نیلوفر نے وحشت بھری آنکھیں اُٹھا کر اُن کو دیکھا جو کچھ اُن کی آنکھوں میں تھا احمد شاہ جیسا صاحب نظر بھی لرز گیا۔

”اگر اِس عورت کو انصاف نہ ملا تو اللہ مجھے کبھی معاف نہ کرے گا۔“ احمد شاہ نیلوفر کو وہیں چھوڑ کر آگے بڑھے۔

”کہاں ہیں تمہارے صاحب؟“ انہوں نے ملازمہ سے پوچھ کر بیڈ روم کا رُخ کیا۔

انہوں نے جب دروازہ کھولا تو شہباز صاحب ایزی چیئر پر بیٹھے کہیں گم تھے۔

”شہباز!“ انہوں نے شہباز صاحب کو پکارا۔

شہباز صاحب نے ایک دم چونک کر انہیں دیکھا۔

”ارے احمد تم! کب آئے تم؟“ شہباز نے احمد شاہ کی اچانک آمد پر حیران ہو کر پوچھا کیوں کہ وہ جانتے تھے احمد شاہ صبح ہی تو گاؤں روانہ ہوئے تھے اور اب ایک دم یہاں کیسے؟

”مجھے آنا ہی پڑا۔“ احمد شاہ نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے کمرے کی باقی لائٹیں بھی آن کر دیں۔

”کبھی کبھی ہم اپنے اِرد گرد کچھ اہم چیزوں کو اِس لیے بھی نہیں دیکھ سکتے کیوں کہ ہم وہاں سے روشنی گزرنے نہیں دیتے۔ تم اگر اندھیرا کر کے کمرا بند کر کے بیٹھے رہو گے تو کیا اللہ کے احکامات اور زندگی حقیقتیں بدل جائیں گی۔“ احمد شاہ نے اُن کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”مطلب؟“ شہباز صاحب نے پوچھا۔

”مطلب یہ ظالم آدمی! وہ کمزور عورت گزشتہ پندرہ سولہ گھنٹے سے باہر زمین پر تمہارے گیٹ پر کسی بھکارن کی طرح بیٹھی ہے۔“ احمد شاہ نے غصّے سے کہا۔ احمد شاہ تو بے حد دھیما بولنے والے تھے لیکن شہباز کی حرکت اور بے نیازی اُن کو تپا گئی تھی۔

”میرا اُس سے کوئی لینا دینا نہیں، تمہارے کہنے پر میں نے تحریری طور پر اُسے معاف کر دیا تھا اب

ہائے یہاں کیا کر رہی ہے۔“ شہباز صاحب نے سلگتے لہجے میں کہا۔

”تم جانتے ہو وہ اپنے ضمیر اور بچوں کی محبت سے مجبور ہو کر آئی ہے، کیوں جان کر بھی اَن جان بن رہے ہو؟“ احمد شاہ نے شہباز کو بہ غور دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”تو... تو میں کیا کروں؟“ شہباز صاحب نے پوچھا۔

”تم اُسے معاف کر دو! جو وہ چاہتی ہے۔“ احمد شاہ نے رسان سے کہا۔

”احمد! وہ میری بہت خطہ کار ہے! میری سارہ کا خون اُس کی گردن پر ہے۔“

”شہباز! تم جانتے ہو جب فرعون اللہ کے حکم اور حضرت موسیٰ علیہ سلام کی بددعا کی وجہ سے زمین میں دھنس رہا تھا تو فرعون نے بہت معافی مانگی تھی، یہاں تک کہ وہ زمین میں دھنس کر مر گیا۔ جانتے ہو اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اپنے نبی سے کیا کہا؟“

اللہ رحمان کریم نے فرمایا ”اے موسیٰ! تیرا دل کتنا سخت ہے! کتنا سخت ہے! قسم ہے مجھے اپنی بڑائی کی اگر فرعون ایسے گڑگڑا کر مجھ سے ایک بار بھی معافی مانگتا تو میں بے شک اُسے پہلی بار ہی معاف کر دیتا۔“

اے موسیٰ! تیرا دِل کتنا سخت ہے۔

”شہباز! وہ اللہ جب سب کچھ معاف کرنے پر تیار رہتا ہے تو ہم کیوں نہیں، انسان ہو کر جن کی کوئی اوقات ہی نہیں کسی دوسرے کو معاف کرتے؟“ شہباز صاحب نے چونک کر احمد صاحب کو دیکھا، اُن کا دِل بے اختیار پشیمانی اور شرمندگی میں ڈوب گیا تھا۔

شہباز صاحب جو اِس قدر کٹھور اور سخت دِل ہوئے بیٹھے تھے، کسی کی بات ماننے کو تیار نہ تھے، احمد شاہ نے اُن کو بے حد مختصر الفاظ میں قائل کر لیا تھا۔

یہ احمد شاہ صاحب کی خاصیت تھی کہ وہ کبھی بنا دلائل کے بے وزن بات نہ کرتے تھے۔

انسان کے پاس لاکھ دلائل کا ڈھیر موجود ہو، لیکن اچھی نیت کا وزن موجود نہ ہو تو اُس کی بات کبھی دِل پر اثر نہیں کرتی اور احمد شاہ تو ہر کام میں اپنی اچھی نیت ضرور شامل کرتے تھے۔

شہباز صاحب کے چہرے کا رنگ جب بدلا تو احمد شاہ نے اُن کو مزید کچھ کہنے نہ دیا۔

”چلو، باہر چلو! اللہ تعالیٰ کی ذات کو راضی کرو ہم ساری عمر دوسروں اور اپنے دل کو راضی کرنے میں لگا دیتے ہیں اور ہمارے ہاتھ خالی رہتے ہیں اور جب اللہ کو راضی کرتے ہیں تو ہمیشہ پاتے ہیں۔“ احمد شاہ دھیرے دھیرے کہتے ہوئے شہباز صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھے باہر کی جانب بڑھے۔

شہباز صاحب کے دل میں احمد شاہ کی باتوں نے یوں جھاڑو پھیر دی تھی کہ اب وہاں کوئی غصہ، بدلہ ناراضی باقی نہ بچی تھی، وہ اپنا آپ بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے۔

کون کہتا ہے کہ ہم کسی دوسرے کو معاف کرتے ہیں بلکہ خود کو معاف کرتے ہیں، خود کو آسانی دیتے ہیں۔

”اُٹھو نیلوفر!“ شہباز صاحب نے نیلوفر کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

نیلوفر نے بے یقینی سے شہباز صاحب کو دیکھا کہ کہیں یہ اُس کا وہم تو نہیں؟

لیکن یہ حقیقت تھی۔
اُن کو معافی مل گئی تھی۔
''تم نے مجھے معاف کردیا؟'' وہ بے یقینی سے پوچھ رہی تھیں۔
''ہاں! میں تم کو ہر گناہ، ہر بات کے لیے معاف کرتا ہوں۔'' شہباز صاحب نے بڑے دِل سے کہا۔
نیلوفر نے ایک بار پھر ہاتھ جوڑ دیے۔
''میں سارہ باجی کی، تمہاری اور بچوں کی قصوروار ہوں۔'' وہ سسک رہی تھیں۔
''بس اب رونا بند کرو، تمہاری حالت پہلے ہی بہت خراب ہوگئی ہے میں نے کہا نا کہ میں نے تم کو معاف کردیا۔'' شہباز صاحب نے دھیرے سے کہا۔
احمد شاہ نے بے حد مطمئن نظروں سے اُن دونوں کو دیکھا پھر انہوں نے موبائل پر وہیں کھڑے کھڑے فون ملایا۔
''سائرہ بیٹا! فوراً باہر آؤ اور اپنی آنی کو سہارا دے کر اندر لے جاؤ، اُن کی حالت اچھی نہیں ہے انکو آرام کی ضرورت ہے۔'' سائرہ نے جواب میں کچھ کہا تو وہ ایک دم مسکرا دیے اور فون بند کردیا۔
''زندگی میں ہر ایک کو موقع ملتا ہے کہ وہ اچھا کام کرے لیکن اس قافلے میں شامل ہونے کا حوصلہ توفیق ہی سے ملتا ہے۔ اور یہ توفیق احمد شاہ کو رب العزّت نے انعام کی صورت میں ہمیشہ کے لیے دے رکھی تھی۔

❖❖○❖❖

محبت کیا نہیں ہوتی
محبت پھول ہوتی ہے، محبت خار ہوتی ہے
محبت بوند بھر پانی، محبت دھار ہوتی ہے
محبت کونج اکلوتی، محبت ڈار ہوتی ہے
محبت یار ہوتی ہے، محبت جیت بھی شاید
محبت ہار ہوتی ہے
محبت بخت ہوتی ہے، محبت وار ہوتی ہے
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
محبت پاس رکھتی ہے، مگر اُس پار ہوتی ہے

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب ہم ساری زندگی اپنے خول میں بند رہ کر گزارتے ہیں تو کبھی محسوس نہیں کرپاتے کہ ہم زندگی کی ہر ہر نعمت اور خوشی سے دور ہوچکے ہیں اور زندگی اپنا بڑا حصّہ گزار کر جا بھی چکی ہوتی ہے، پھر جب یہ خول ہاتھ سے شیشے کے برتن کی طرح چھوٹ کر گرتا ہے تو ہمیں ایک دم سے ہر چیز واضح نظر آنے لگتی ہے، تب وقت کے ضیاع کا احساس بہت شدید ہوتا ہے۔ زبیدہ بیگم کا وہ سخت خول جو سالوں سے نہ ٹوٹا تھا ایک دم کسی شیشے کے برتن کی مانند ٹوٹ گیا تھا۔ زبیدہ کو یوں لگتا تھا جیسے وہ گہری نیند سے جاگی ہوں، اور نیند کے دوران مسلسل ایک ڈراؤنا خواب دیکھتی رہی ہوں۔

پچھتاوے کا احساس اُن کی زندگی پر اس طرح حاوی ہوا تھا کہ انہوں نے ساری عمر جلتے کوئلوں پر گزاری تھی اور اُن کے ساتھ اِس راہ پر قاسم علوی برابر چلے تھے۔
اِن کی تکلیف شاید زبیدہ سے زیادہ تھی کیوں کہ انہوں نے اپنے لیے زبیدہ کی آنکھ میں کبھی محبت نہ دیکھی تھی اور ایک غیر کی ناجائز اولاد کو اپنا نام دے کر پالتے رہے تھے جو اُن کو کبھی بھی چھوڑ کر جاسکتا تھا۔

''چاند!''

زبیدہ بیگم ٹی وی لاؤنج میں آئیں تو قاسم علوی کو ٹی وی کی آواز مکمل بند کیے بیٹھے دیکھا۔ وہ شاید ذہنی طور پر موجود ہی نہ تھے، لیکن زبیدہ بیگم کی آواز اور تخاطب سُن کر ایک دم مڑے۔ وہ گلابی لباس پہنے کھڑی تھیں، ان کی رنگت لباس کے ہم رنگ محسوس ہو رہی تھی۔ قاسم علوی کو پہلی بار محسوس ہوا کہ سامنے والی مری ہوئی نہیں بلکہ زندہ عورت کھڑی ہے۔
''میں... مم... مجھے تم سے بات کرنی ہے!'' زبیدہ بیگم جھجک رہی تھیں۔
''کہو...!'' قاسم علوی نے اپنے قریب صوفے پر جگہ خالی کر کے پاس پڑی سفید چادر جو زبیدہ بیگم کے لیے بچھائی جاتی تھی، اُسے بچھانے لگے تو انہوں نے ایک دم ان کا ہاتھ تھام کر انہیں روکا اور پھر وہیں ان کے ساتھ بنا چادر کے بیٹھ گئیں۔
قاسم علوی نے بے حد حیرت سے زبیدہ بیگم کو دیکھا۔
''کیوں؟'' ساتھ ہی انہوں نے سوال کیا۔
''جو گندگی میں اپنی روح پر محسوس کرتی رہی تھی وہ اِن چیزوں میں نہ تھی قاسم! یہ میں جان گئی ہوں۔'' وہ رُک رُک کر بولیں۔
قاسم صاحب نے بے حد حیرت سے زبیدہ کو دیکھا، وہ اتنی نارمل نظر آرہی تھیں کہ قاسم علوی کو وہ نارمل لگیں ساری عمر اِس عورت کی سرد نگاہیں اور رویّے جھیلتے جھیلتے اُن کو اپنا آپ برف محسوس ہونے لگا تھا۔ اور آج...
''وہ! اچانک...!
''قاسم! کیا میں تم کو اِس گندگی کے ساتھ قبول ہوں؟'' وہ معصوم بچوں کی طرح پوچھ رہی تھیں۔
''کیا اللہ کو میں اِس گندگی کے ساتھ قبول ہوں گی؟'' اب وہ خوف زدہ ہوکر پوچھ رہی تھیں جب کہ قاسم صاحب بہت نرم نظروں سے اُن کو دیکھ رہے تھے۔
''واپس آجانے والے لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں زبیدہ!'' قاسم علوی کے لہجے میں خوشی کی آمیزش تھی۔
''مم... مجھے معاف کردو قاسم!''
''جس شخص نے میرے ہر عیب کو ڈھانپا، میری اولاد کو اپنا نام دیا، اپنی ساری زندگی کو انتظار بنالیا، میں نے اُسے کچھ... کچھ بھی نہیں دیا۔'' زبیدہ بیگم نے اپنے دونوں ہاتھوں کو یوں سامنے کیا جیسے اُن کے ہاتھوں سے کوئی چیز چھوٹ گئی ہو۔

قاسم علوی نے ایک دم اُن کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''زبیدہ! آج سے پچیس سال پہلے میں نے تمہاری سالگرہ پر ایک پوئم کہی تھی، یاد ہے؟''

دل اک خواب نگر ہے
جس میں لمحہ لمحہ اُس کے سپنے
بند آنکھوں میں نئے دریچے وا کرتے ہیں
ہر چہرے میں اُس کا چہرہ رکھ دیتے ہیں
میرے اور اُس کے بیچ ہزاروں دیواریں ہیں
رسموں اور رواجوں کی
بیگانوں کی قاتل نظروں اور اپنوں کی باتوں کی
اُس کی بے پروائی کی اور اپنی پاگل سوچوں کی
کالی، دشمن راہوں کی
میں اِس ظالم، اندھی اور منہ زور فضا
میں ایک بے مایہ ذرہ تھا
جو اپنے سے لاکھوں میں گم تھا۔
اُس کے خواب نے میری آنکھیں روشن کی ہیں
خاموشی میں جادو ہے تو پھر وہ جادوگر ہے
اُس کی چپ نے میرے دل کو نطق دیا ہے
میں قطرہ تھا اُس کی ذات سمندر ہے
اُس کی محبت نے مجھ کو تخلیق کیا ہے
ارمانوں کی بانجھ ہوائیں
آنکھوں کے گمنام جزیروں میں چلتی ہیں
اور خواہش کے خشک درختوں کی شاخوں میں
سائیں سائیں کرتی ہیں
موسم آنکھیں پھیر کے
دل کے در دنگر سے چل دیتے ہیں
بادل ویرانے پر گھر کر بن برسے چل دیتے ہیں
اُس کے بنا آواز کی کرنیں
آنکھیں، پھول، ستارے، پتھر
دِل اک شہرِ سنگ ہے
جس میں گلیاں، باغ، منارے، پتھر
خواہش جادو کی بستی ہے

ے کے دیکھو، سارے پتھر
پاؤں کے دھارے پتھر!
وائے تو پتھر کو آواز ملے
شہرِ سنگ کے دروازوں کو وا کرنے کا راز ملے
شہرِ سنگ!

قاسم علوی کی آواز بھرا گئی، پچیس سال پہلے کیا گیا اظہارِ محبت محبوب کے ہاں آج مقبول ہوا تھا۔

دل اک خواب نگر ہے
اس کے خوابوں کو آغاز ملے۔

قاسم علوی تو آج بھی آس اور یقین کے اُس کنارے پر کھڑے تھے جہاں برسوں پہلے زبیدہ بیگم کا ہاتھ اُن کے ہاتھوں سے چھوٹا تھا۔

بہت بار لفظ چھوٹے پڑ جاتے ہیں اور بات آنکھیں کہہ جاتی ہیں اور تفصیل اِن سے بہنے والے آنسو کہہ جاتے ہیں۔ زبیدہ بیگم، قاسم علوی کے ہاتھوں پر اپنا سر گرا کر اِس شدت سے روئیں کہ اِس میں ہر ا غم، دُکھ اور نارسائی کی شدت دُھل گئی۔

قاسم علوی نے آگے بڑھ کر زبیدہ بیگم کو اپنے کندھے سے لگا لیا۔

''میں نے اپنا ہر معاملہ اللہ کے سپرد کیا سید سرفراز علی۔'' زبیدہ بیگم نے قاسم علوی کے کندھے پر سر رکھے دِل میں کہا۔

وہ ایک دم پُرسکون ہو گئی تھیں۔

''انسان جب جب خود جزا اور سزا کے چکر میں پڑتا ہے ہمیشہ مارا جاتا ہے خود کو سزا سنانے والا ہر انسان ایک ایسے شکنجے میں پھنس جاتا ہے، جو کبھی نہیں کھلتا، جب کہ ہر بات کو اللہ رحمان کے سپرد کر کے سچے دِل سے معافی مانگنے والا ہمیشہ ہی نواز دیا جاتا ہے۔''

زبیدہ بیگم نے خود کو اُس سزا سے نکال لیا تھا جو انہوں نے ایک مدت سے خود کو سنا رکھی تھی اتنی سزا بھگتنے کے بعد بھی وہ غیر مطمئن تھیں۔ اُن کا دِل ہر وقت سید سرفراز علی کی زیادتی پر انصاف کا تقاضا کرتا تھا، نہ وہ اُسے سزا دے پائیں اور نہ خود کو سرخرو کر سکیں، اپنی ہی کھڑی کی اِس عدالت میں انہوں نے بہت سزا بھگتی تھی لیکن آج یہ!

The local court is adjurned!

اُن کے دِل اور ضمیر نے کہا تھا اور فیصلہ وانصاف ''بڑی عدالت'' کو فارورڈ کر دیا تھا۔

اور بڑی عدالت نے اُن کو تو معاف کر دیا تھا کیوں کہ اُس بڑی سرکار نے قاسم علوی کے دِل میں زبیدہ بیگم کی محبت اور مقام کو کم نہ کیا تھا بلکہ ایک نئی زندگی، خوشیوں بھری زندگی کی شروعات تھما دی تھی۔

ہاں! ابھی انصاف باقی تھا!

سید سرفراز کے کھاتے کا انصاف تو باقی تھا۔

❖❖○❖❖

محبت کے سفر میں
زندگانی سے محبت پہلی منزل ہے
مگر کم لوگ ہیں جو جانتے ہیں
یہ پڑاؤ آخری بھی ہے بھلانا کارِ مشکل ہے
مگر تسلیم کرلینا تو آسان ہے
ہمیشہ خواہشوں کو
خالی ہاتھوں کا حوالہ کیوں بنائیں ہم
بہت کچھ ہے جو بے چاہے ملا ہے
ابھی جینے کے تابندہ حوالے اور آئیں گے
جو شب سے سرخرو نکلا، اسے معلوم ہوجائے
اُجالا اب ہے جو
ایسے اُجالے اور آئیں گے!

ڈاکٹر فیصل نے کاغذات اور ٹکٹ لاکر مریم بی بی کو تھمائے تو انہوں نے بے حد حیرت سے دیکھا۔

''اتنی جلدی! یہ سب کیسے ہوگیا؟'' وہ پوچھے بِنا نہ رہ سکیں۔

''کیوں! آپ ہی نے تو کہا تھا کہ آپ پاکستان جلد از جلد جانا چاہتی ہیں۔'' ڈاکٹر فیصل نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں! لیکن یہ سب کچھ کیسے ہوگیا؟''

''اتنی جلدی بھی....!'' مریم بی بی اپنی حیرت کا اظہار کیے بِنا نہ رہ سکیں۔

''آپ کا پاسپورٹ Duel Nationality والا ہے آپ کے لیے فوراً ویزا حاصل کرنا مشکل ہے پھر ویسے بھی پیسہ خود میں خاصی طاقت رکھتا ہے، جتنا پیسہ لگائیں اتنی جلدی کام کروالیں، یہ دنیا ہر جگہ چلتا ہے ایشین ممالک تو خوامخواہ بدنام ہیں۔'' ڈاکٹر فیصل نے حسبِ عادت مریم بی بی کو ہر تفصیل سے بتائی تا کہ وہ مطمئن ہوجائیں۔

''وہ مریم بی بی کا ضرورت سے زیادہ خیال کرتے تھے، یوں جیسے کسی بچے کی ہر ہر فرمائش پوری فرض ہو، وہ بے حد باوفا انسان تھے، وعدے پورے کرنا بہت اچھی طرح جانتے تھے۔

''میں آپ کا کیسے شکریہ ادا کروں، آپ نے ہمیشہ میری ہر بات مان کر اوپر کا درجہ حاصل کیا آپ اتنی سیڑھیاں چڑھ گئے ہیں کہ مجھے اکثر اپنا آپ بونا لگنے لگتا ہے میں تو کبھی آپ کا ٹھیک سے تک نہیں ادا کر پائی۔'' مریم بی بی نے اُن کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ایسا نہ کہو مریم! تمہارے میرے بیچ شکریہ کا کوئی رشتہ نہیں ہے، ہم لائف پارٹنر ہیں، اگر تمہارے لیے کچھ کرتا ہوں تو یہ تمہارا حق ہے۔'' ڈاکٹر فیصل نے رسان سے کہا اور اپنے کپڑوں کی الماری میں سر گھسا کر کھڑے ہوگئے، پھر ایک ڈائری سے ایک ایڈریس نکالا۔

''یہ ڈاکٹر جواد کا ایڈریس ہے، ویسے تو تم لوگ ہوٹل میں رہائش رکھنا، لیکن وہاں کوئی مسئلہ درپیش ہو تو ے رابطہ کرنا۔ ویسے میں پیشگی تم لوگوں کے پہنچنے کی اطلاع بھی کردوں گا۔''

اکٹر جواد ڈاکٹر فیصل کے بہت قریبی دوستوں میں سے تھے، دو سال پہلے وہ اپنی بچیوں کی تربیت اور ل کی وجہ سے پاکستان شفٹ ہوگئے تھے لیکن وہ مسلسل رابطے میں رہتے تھے۔

''آپ ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے؟'' مریم نے اُن کے چہرے کو بہ غور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اکٹر فیصل کے چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا وہ اُس ملک میں، اُس زمین میں دوبارہ جانے کا خود صلہ بالکل نہ رکھتے تھے، جہاں انہوں نے اپنی ''زندگی'' ہار دی تھی۔

''تم جانتی ہو میرے مریضوں کے آپریشن کی ڈیٹ شیٹ مہینہ پہلے ہسپتال بنالیتا ہے ایسے میں، میں جاسکتا ہوں، یہ بہت ساری زندگیوں کا مسئلہ ہے۔'' ڈاکٹر فیصل نے تصویر کے ایک رخ کی سچائی تھی، دوسرے رُخ کی سچائی اُن کے دِل کی تھی، جو پاکستان جانے کے نام سے ڈوبنے لگتا تھا۔

انہیں محسوس ہوتا تھا کہ جس تکلیف میں انہوں نے پاکستان کو چھوڑا تھا وہاں جاکر وہ تکلیف دوبارہ ری ہوجائے گی اور وہ اِس درد کو دوبارہ جھیلنے کی خود میں ہرگز سکت نہ رکھتے تھے۔

''جی! آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن آپ اگلے مہینے کوئی آپریشن نہ رکھیے گا اور ہمارے پاس چلے آئیے'' مریم بی بی نے مزید فرمائش کی۔

''کیا آپ کا اتنی زیادہ دیر رُکنے کا پروگرام ہے، ہم تو آپ کے بِنا اُداس ہوجائیں گے جناب!'' فیصل نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا، غالباً وہ مریم کو ٹالنا چاہ رہے تھے۔

''تو آپ.. پاکستان نہیں آئیں گے۔'' مریم اپنے سوال سے دستبردار نہ ہوئیں۔

''یاد رہے! آپ بھی کچھ عرصے کے لیے جارہی ہیں ہمیں وہاں جاکر بھول نہ جائیے گا۔'' ڈاکٹر فیصل شرارت سے کہا۔

''اگر اجازت ہو تو میں چینج کرلوں؟ نماز کا وقت نکلا جارہا ہے۔'' ڈاکٹر فیصل نے اپنے کپڑوں کی ب اشارہ کر کے کہا۔

''جی!'' مریم نے اثبات میں سر ہلایا۔

اکٹر فیصل نے وہاں سے ہٹنے کی بہت جلدی کی تھی۔

''جانتی ہوں آپ کس سے بھاگتے ہیں۔''

''میں جانتی ہوں کہ آپ ساری عمر آپا کو نہیں بھلا پائے اور میں یہ چاہتی بھی نہ تھی کہ آپ ان کو لتے، یہ اُن کا حق تھا کہ آپ کی محبت تا عمر وہی حاصل کرتیں لیکن آپ اتنے اچھے ہیں، کیا اتنے اچھے ن کا حق نہیں ہے کہ جس پہلو سے اُن کے دل میں درد اُٹھتا ہو، وہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غم کا نکل جائے، جیسے مُردے کو دفن کر آنے کے بعد ہر انسان یہاں تک کہ ماں کو بھی صبر آجاتا ہے اسی ح کچھ باتوں، کچھ ناآسودہ یادوں کو دفن کردینا چاہیے ورنہ، نہ تو صبر آتا ہے اور نہ ہی سکون ملتا ۔'' جانے کیوں مریم کو لگ رہا تھا کہ ڈاکٹر فیصل ایک بار پاکستان کی زمین کو چھولیں گے تو اُن کے درد ، اُس کی شدت میں کمی آجائے گی۔

لیکن وہ تو کسی طرح قابو ہی نہ آ رہے تھے۔
''فیصل کو کیسے پاکستان لے کر چلوں؟''
گویا وہ با آواز بلند خود سے پوچھ رہی تھیں۔

❖❖❖ ❖❖❖

''یو آر ریئل آرٹسٹ عبدالولی۔'' یہ کمپلمنٹ عبدالولی کی ایگزیبیشن پر اُس کے ٹیچر نے دیا تھا۔ اس کا پروجیکٹ بے حد پسند کیا گیا تھا کوئی یقین نہیں کر رہا تھا کہ پاکستان جیسے ملک سے آئے ہوئے طالب علم نے اتنا آؤٹ اسٹینڈنگ کام پریزنٹ کیا ہے۔
''سر! ہمارے ملک میں بے حد ٹیلنٹ ہے اتنا کہ شاید کہیں اور اتنی Creativity کم ہی نظر آئے لیکن بہتر مواقع کی کمی اور ناسازگار ماحول کی وجہ سے یہ ٹیلنٹ کم ہی سامنے آپاتا ہے ورنہ تو مجھ سے کہیں بڑے بڑے جینئس وہاں موجود ہیں۔ میرے اپنے اساتذہ میں کچھ ایسے ہیں، جو حیران کر دینے والوں میں سے ہیں لیکن وسائل کی کمی کی وجہ سے وہ باہر آ کر اپنے کام کو سامنے لانے سے قاصر ہیں۔ لیکن اب بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ طالب علموں کے لیے کچھ گولڈن چانسز پیدا ہوئے ہیں تو ہم لوگ بھی اس قابل ہوئے کہ یہاں آ کر کچھ سیکھ پائیں اور اپنے ٹیلنٹ Creativity اور آرٹ کو باقی لوگوں کے سامنے لا سکیں۔'' عبدالولی نے عام لوگوں کی طرح سارا کریڈٹ خود کی ذات پر لینے کے بجائے ایک مختلف جواب دے کر سب کو حیران کر دیا۔
ایگزیبیشن بے حد کامیاب گئی تھی، آرٹ اسکول نے عبدالولی کی پانچ عدد پینٹنگز اسکول گیلری کے لیے رکھ لی تھیں اور یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔
''مان گئے بڑے بھیا آپ کو!'' عبداللہ نے عبدالولی کے ساتھ گیلری سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ ان کے ساتھ لیزا اور الفریڈ بھی تھے۔
''واقعی ولی! تم ایک بہت بڑے جینئس ہو۔'' لیزا نے کہا۔
جواباً عبدالولی کے چہرے پر بہت مدھم مسکراہٹ تھی۔
''ارے! آپ کو تو ان Comments پر پھول کر کُپا ہو جانا چاہیے تھا لیکن آپ پر تو کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا'' عبداللہ نے ٹیڑھا سا منہ بنا کر کہا۔
''یار! انسان تو اتنا بے بس ہے اگر اُس کی ایک چھینک رک جائے تو اُس کا سارا سسٹم درہم برہم ہو جاتا ہے، پھر کیا اوقات ہے ہماری!'' عبدالولی نے چلتے چلتے بالکل احمد شاہ کے اسٹائل میں کہا۔
(ایک وقت آتا ہے کہ بیٹا ہو بہو باپ جیسا نظر آنے لگتا ہے)
''لیکن بڑے بھیا! اسی انسان نے چاند پر بھی قدم رکھا، جو اس نے سوچا وہ کیا۔ تو اُسے ماننے میں کیا حرج ہے۔'' لیزا بھی کہے بنا نہ رہ سکی۔
''دوستو! میرے بابا کہتے ہیں کہ اگر ''سپر پاور'' کی اجازت نہ ہو تو ہم اپنے اندر کی کسی قسم کی پاور تک کو محسوس کرنے سے قاصر ہیں، آج تک انسان نے جو کچھ کیا وہ ''سپر پاور'' کی مرضی سے کیا اگر وہ نہ چاہتا تو ہم ابھی تک بغیر کسی پروگریس کے Cave civilization (غاروں کی تہذیب) میں رہ رہے

ہوتے، اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں ہے اگر اُس نے پہلے سے Progress ہمارے دماغوں میں Design کر کے فیڈ نہ کی ہوتی تو ہم یہ سب کچھ نہ کر پاتے۔'' عبدالولی نے لوجک کے ساتھ کہا۔
''تو اس کا مطلب ہے کہ انسان خود کچھ نہیں ہے ہم جو سوچتے ہیں وہ سپر پاور کی وجہ سے ہے ورنہ ہم زیرو ہیں۔'' الفریڈ نے بھی عبدالولی کے نقطۂ نگاہ پر اعتراض کیا تھا وہ اپنے اپنے ممالک کے اسکول میں ٹیلنٹ کو بہترین طور پر پریزنٹ کرنے والوں میں سے تھے بے حد ذہین اور کچھ کر دکھانے کا جذبہ رکھنے والے، لیکن اُن کو عبدالولی کی بات ہرگز ہضم نہ ہوئی تھی۔
''یار! انسان ایک کمپیوٹر جب Design کرتا ہے تو اُس میں ہر چیز فیڈ کر دیتا ہے اگر ہم اُس میں اس کی کمانڈ فیڈ کریں گے تو وہ پرنٹ آؤٹ نکالے گا ورنہ ہم لاکھ چاہیں اچھے سے اچھا پرنٹر اُس کے ساتھ اٹیچ کر لیں، لیکن اگر اُس کے سسٹم میں یہ کمانڈ نہیں ہے تو وہ کبھی بھی پرنٹ آؤٹ نہیں نکالے گا۔''
عبدالولی کی بات پر لیزا ایک دم چلتے چلتے رک گئی۔
''مطلب ہم سب Puppet's ہیں اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتے؟''
''نو! ہم Puppet ہرگز نہیں ہیں بلکہ ہم کو تو ہمیشہ چوائس ملتی ہے۔'' عبدالولی نے بے حد اعتماد سے کہا۔
اس وقت عبدالولی کی آنکھوں میں خاص طرح کی چمک تھی وہ عام اداروں سے پڑھا ہوا نہ تھا بلکہ دنیا کے بہترین اداروں سے تعلیم یافتہ تھا، جس نے اس کے اندر خود اعتمادی کا ایسا قلعہ بنا دیا تھا جو روز بہ روز بلند اور مضبوط ہوتا جا رہا تھا۔
عبدالولی کی سب سے اسٹرانگ طاقت اس کا سچا Religion تھا، اس کی اپنے ربّ اور اصل سپر پاور سے محبت اور تعلق تھا۔
''اسلام ایک ایسا مذہب ہے، جو فل آف لاجک ہے۔ یہ ایسا مذہب ہے جو ہر سوال کا جواب رکھتا ہے۔''
عبدالولی کے خود اعتمادی کے قلعے کی سب سے مضبوط بنیاد اُس کا اپنے مذہب پر یقین تھا وہ لندن میں ہی ایسی کئی بحثیں کر کے بہت سے گوروں کو اصل سوچنے پر مجبور کر چکا تھا۔
''اگر سب کچھ Super Power کا ہی Design کردہ ہے تو ہم تو صرف ڈمیز ہیں اور کچھ بھی نہیں۔'' الفریڈ نے غصے سے کہا تو عبداللہ کو فکر ہوئی کہ کہیں کوئی مسئلہ نہ پیدا ہو جائے لیکن جب اُس نے عبدالولی کا چہرہ دیکھا تو وہ بے حد پُرسکون تھا۔
''سپر پاور نے ہمارے اندر برائی اور اچھائی دونوں فیڈ کر دی ہیں، اب یہ ہماری چوائس ہے کہ ہم کس کو سلیکٹ کرتے ہیں۔ اچھا بننا اور بُرا بننا ہمارے ہاتھ میں ہے۔'' عبدالولی نے کہا۔
''تو جو ہم اچھا کرتے ہیں وہ صرف ہماری کوشش سے ہی ہوتا ہے نا، اس کا مطلب ہے کہ ہم اپنے ٹیلنٹ، اپنی کوشش، اپنی اچھائی اور اپنے اچھے کام کا کریڈٹ خود لے سکتے ہیں۔'' الفریڈ نے فاتحانہ انداز میں کہا، جیسے وہ عبدالولی کو ہرا چکا ہو، جیسے وہ عبدالولی کو اُس کے ہی جواب میں مات دے چکا ہو۔
''پیارے دوست! تم میری بات کا پہلا حصہ بھول رہے ہو۔'' عبدالولی کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

''کیا؟'' الفریڈ نے پوچھا۔

''یہ ہی کہ سپر پاور نے ہمارے اندر اچھائی کا سسٹم رکھا تھا تو ہم اچھے ہوئے، ہمارے اا Creativity کا سسٹم رکھا تو ہم Creative ہوئے نا۔'' عبدالولی کی بات پر الفریڈ کے چہرے کا ا جس طرح بدلا تھا عبداللہ کا اپنی ہنسی ضبط کرنا دشوار ہوگئی تھی۔

''کیا ہر مسلم تمہاری طرح ہی اتنا اسٹرانگ بِلیو رکھتا ہے۔'' لِزا مسمریزم میں تھی۔

''لو یہ تو گئیں!'' عبداللہ نے ولی کے کان میں سرگوشی کی۔

''ہاں! ہر سچا مسلمان اِس پر یقین رکھتا ہے۔'' ولی کی آنکھیں بے حد شفاف تھیں، جن کے من ہوتے ہیں اُن کی آنکھیں ہمیشہ شفاف ہوتی ہیں۔

''دراصل یہ زندگی کی بہت بڑی حقیقت ہے اگر انسان اُسے شروع سے ہی Realize کرلے تو ا کے لیے بہترین ہوتا ہے وہ تعریف اور خود پسندی کے جال میں پھنس کر Average پرسن بننے سے جاتا ہے۔'' ولی نے الفریڈ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا، جہاں کچھ کچھ غصّہ بے حد نمایاں تھا۔

''میرا خیال ہے ہم اب چلتے ہیں، ہمیں دیر ہورہی ہے۔'' عبداللہ نے بیچ میں آتے ہوئے کہا۔

''یس! او کے گائز، اللہ حافظ!'' عبدالولی نے شائستہ انگریزی میں کہا۔

''ون منٹ ولی! تم ہمیں اپنے گاڈ یعنی اللہ کے سپرد کیوں کررہے ہو؟'' الفریڈ نے غصّے سے اعترا کیا۔

''یار ڈونٹ مائنڈ! میں مسلم ہوں اور میرے Structure میں اللہ فیڈ ہیں، تمہارے ہاں اللہ کا ا بدل کر گاڈ کا لفظ فیڈ ہے ورنہ ایسی کوئی بات نہیں۔'' عبدالولی نے ہلکے پھلکے انداز میں کہہ کر اُس کے کندھے کو دبایا اور عبداللہ کے ساتھ باہر کا رخ کیا۔

لِزا چپ چاپ عبدالولی کے شان دار سراپے کو جاتے دیکھتی رہی، جب کہ الفریڈ کسی اور ہی بڑائی میں تھا۔

اللہ؟

واٹ اللہ؟

کون ہے یہ اللہ؟

اور اسے ولی کیوں سپر پاور کہہ رہا تھا۔

کیا مسلمز کا گاڈ ہی سپر پاور ہے؟

الفریڈ کے اندر جو سوال اُٹھے تھے، وہ اُسے اب سکون سے کہاں بیٹھنے دینے والے تھے۔

وہ اگر ان سوالوں کو Positive چوائس کرتا تو یقیناً اُس کی گڈ لک شروع ہونے والی تھی کیوں کہ اُس کو مسلمانوں کے قافلے میں شریک کرنے کے لیے کافی تھے۔

اللہ۔ اللہ۔ اللہ!

الفریڈ کے دماغ میں یہ لفظ جیسے پہلے سے فیڈ تھا۔

(روحوں کے اندر تو ہمیشہ سے یہ لفظ فیڈ ہوتا ہے)

الی کا اللہ؟

لی اس کو جاننا چاہتا ہوں جس کو ماننے والا اتنا کامیاب ہے۔ یقیناً یہ ایک کامیاب Religion ا۔

الفریڈ نے خود سے کہا تھا۔

❖❖○❖❖

"تم پاکستان آرہے ہو، مجھے یقین نہیں آرہا!'' ولی نے واقعی بے یقینی سے کہا۔

"کیوں! آپ کی شادی ہے تو میں نہ آؤں، ورنہ تو ہر بیگانی شادی میں عبداللہ دیوانہ ہوتا ہے نا۔'' اللہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"لاحول، یار! محاورتاً نام عبداللہ استعمال کیا جاتا ہے۔'' عبدالولی کو اپنی ہنسی ضبط کرنا مشکل ہورہی ا۔

"اور جناب میرا نکاح ہے، شادی نہیں۔'' عبدالولی نے کپڑوں کی تہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"تو آپ نہیں چاہتے کہ میں آؤں؟'' عبداللہ نے روٹھے روٹھے لہجے میں پوچھا۔

"لاحول ولا! میں کیوں منع کروں گا یار! تمہیں دِل کی ساری گہرائیوں اور سچائیوں سے ویلکم بلکہ مجھے تو اا ہے بہت زیادہ خوشی ہورہی ہے۔'' ولی نے بے حد سچائی سے کہا۔

"اوکے! تو پھر وعدہ کریں آپ مجھے پاکستان دکھائیں گے!'' عبداللہ نے کہا۔

"ان!'' ولی نے خوش دلی سے کہا۔

"وعدہ کریں کہ میرا بھی ٹانکا کسی اچھی سی مشرقی بالکل بھابی علیزے جیسی لڑکی سے جڑوا دیں گے۔'' اللہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہیں! یہ بات ٹریول پیکیج میں کب سے شامل ہوگئی؟'' ولی نے ہنستے ہنستے پوچھا۔

"ہے بھیا! شادی کرنی ہے تو پاکستانی لڑکی سے ورنہ نہیں۔'' عبداللہ نے کہا۔

"لیکن کیوں؟''

"کیوں کہ میری ماں پاکستانی ہیں اور وہ دنیا کی بہترین عورت ہیں۔'' عبداللہ نے ایمان داری سے پ دیا۔

"اوہو! لیکن موجودہ دور کی لڑکیاں مختلف ہیں بھائی۔'' ولی نے شرارت سے کہا۔

"کیوں! آپ کو علیزے بھابی اِسی دور میں دستیاب ہوئی تھیں کیا!'' عبداللہ نے دو بہ دو جواب دیا۔

"باتوں میں تم سے کوئی نہیں جیت سکتا۔'' ولی نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

"تو پھر ڈن! میرے لیے بھی اچھی سی لڑکی آپ ہی تلاش کریں گے۔'' عبداللہ نے اصرار کیا۔

"لیکن میں ہی کیوں؟'' ولی نے حیرت سے پوچھا۔

"کیوں کہ آپ میرے بھائی ہیں۔'' عبداللہ نے آسانی سے کہا۔

"ٹھیک ہے میں لمّاں جان کے سپرد کردوں گا تمہارا کام، اُمید ہے کہ اچھا ہی ہوگا لیکن اب جب کہ ا جارہے ہو تو تم بھی آنکھیں اور دل کھول کر رکھنا تا کہ کوئی تمہاری آنکھوں کے رستے دل میں جگہ

بنا سکے۔'' ولی نے مشورہ دیا۔

''لیکن اُسے بھی آپ او کے کریں گے تب ہی وہ او کے ہوگی۔'' عبداللہ نے کہا۔

''یار! تم بہت عجیب ہو۔'' ولی نے اُس کی اتنی بے انتہا محبت کو دیکھ کر بے اختیار کہا۔

''جو بھی ہوں آپ کا بھائی ہوں۔'' عبداللہ نے کہا۔

''واقعی تم میرے ہی بھائی ہو۔'' ولی کا دل بھی اندر سے گواہی دے رہا تھا۔

❖❖○❖❖

''بھائی کتنے بجے کی فلائٹ ہے۔'' نگینہ نے پُر جوش انداز میں پوچھا، اتنے مہینوں بعد اُن کی ملا[قات] ہوئی تھی۔

''میں تم کو فلائٹ کا ٹائم نہیں بتا سکتا، خوامخواہ امّاں جان اور بابا جان بے آرام ہوں گے۔'' ولی جواب دے دیا۔

''بھائی پلیز!'' نگینہ نے ضد کی۔

''نو! آرام کرو، میں گھر آ جاؤں گا بلّی، مجھے گھر کا راستہ معلوم ہے۔'' ولی نے پیار سے کہا۔

''بھائی اتنے دنوں بعد ملنا تھا۔ اٹس ناٹ فیئر۔'' نگینہ نے اصرار کیا۔

''نو۔'' ولی نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا۔

''اگر علیزے بھابی کو لانے کی آفر کروں تب بھی نہیں۔'' نگینہ نے شرارت سے کہا۔

''تب بھی نہیں! میری فلائٹ رات کو ہو سکتی ہے یا پھر فجر کے وقت پاکستانی ٹائم کے مطابق اور نہیں چاہتا کہ تم سب ساری رات بے آرام رہو۔'' ولی نے سچائی سے کہا۔

''او کے!'' نگینہ نے سرینڈر کیا۔

''اچھا بتائیں بھابی کے کس کلر کے کپڑے ہیں؟'' نگینہ نے پوچھا۔

''یار پلیز! میں آسٹریلیا سے بات کر رہا ہوں، یہاں پنڈی سے نہیں۔''

''اچھا بچو! آپ لاہور واپس تشریف تو لائیں سارے حساب بے باق کریں گے۔'' نگینہ نے [...] ہوئے کہا۔

''میری پیاری بلّی! تمہارے لیے تمہارے بھائی کی جان بھی حاضر ہے، مانگو کیا چاہیے۔'' ولی [نے] پوچھا۔

''استغفر اللہ بھائی! آپ بس خیریت سے آ جائیں اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور زندگی عطا کرے، یہ [کیسی] باتیں کرتے ہیں۔'' نگینہ نے دہل کر کہا۔

''وقت آنے پر تیرا یہ بھائی تیرے لیے جان دے سکتا ہے اور اللہ نہ کرے کبھی کوئی بُرا وقت آئے'' ولی نے دل میں کہا۔ اس کی نگاہوں میں ایک منظر گھوم گیا تھا، ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔

''اللہ حافظ بھائی!'' نگینہ نے کہا۔

''اللہ حافظ بلّی!'' ولی نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہہ کر فون رکھ دیا۔

''یہ خواب آخر میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتا؟''

''کچھ نامعلوم، نا آشنا سے چہرے کیوں اس دماغ میں گھومتے ہیں؟'' ولی سر تھام کر بیٹھ گیا پھر وہ [...]ا دم اُٹھا اور اپنے ایزل کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ولی نے ساری رات کام کیا تھا صبح جب وہ سونے کے [...] لیٹا تو اُس کے ایزل پر کچھ منظر بے حد واضح تھے، کچھ چہرے بے حد واضح تھے، اُس نے اپنا سارا [...]اب اور اُن کے کردار کینوس پر اُتار دیے تھے۔ ولی کی قسمت جانتی تھی لیکن وہ نہ جانتا تھا کہ اُس نے [...]ی پہچان کو رنگ دیے ہیں، جو بہت جلد حقیقت کا روپ دھارنے والے تھے۔ [...]پودا اپنے اصل کی جانب مڑ رہا تھا۔

❖❖○❖❖

''اِس وقت کس کا فون ہے؟''

روشن آرا بیگم عشا کی نماز سے فارغ ہو کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہی تھیں کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی [...]ب تک وہ وہاں تک پہنچتیں، دوسری جانب سے احمد شاہ فون اُٹھا چکے تھے۔

''میں نے آپ کو شریفوں کی زبان میں سمجھایا تھا کہ آپ ولی کا پیچھا چھوڑ دیں۔'' احمد شاہ کی غصّے اور [...]ل سے بھری آواز روشن آرا بیگم نے پہلی بار سنی تھی ان کا دل ایک دم سہم گیا۔

''یہ کون ہے جس سے شاہ صاحب اس لہجے میں بات کر رہے ہیں۔

''سوچ لیں! اگر اِس کے نتائج بُرے نکلے تو میں ذمّے دار نہ ہوں گا۔'' سید سرفراز نے سلگتے لہجے میں [...]ا۔

''ہمارے ہاں خون کا بدلہ خون، بیٹی کا بدلہ بیٹی ہوتی ہے۔'' سید سرفراز نے ڈائریکٹ دھمکی دی۔

''بکواس بند کرو، ہم نے کیا چوڑیاں پہن رکھی ہیں اور کیا میں تمہیں بے ہڈی کا انسان لگتا ہوں جس کی [...]اثرے میں عزت، مقام اور طاقت نہیں ہے، تم نے میری شرافت کو میری کمزوری جان لیا ہے، غور سے [...]سید سرفراز علی! اگر تم نے میری اولاد پر بُری نگاہ ڈالی تو میں تمہاری بدمعاشی کا کچومر نکال دوں گا، میں [...]ای بار بتا رہا ہوں۔ Take your way! اگر میں سانپ کو شرافت سے نکلنے کا موقع دے رہا ہوں [...]میری چوائس ہے ورنہ مجھے اس کا سر کچلنا بھی آتا ہے۔'' احمد شاہ نے کہہ کر فون پٹخ دیا۔

''بہت پچھتاؤ گے!

''لیکن تم نہیں جانتے کہ شادی تو ولی کی مسکان سے ہی ہوگی۔'' سید سرفراز علی نے اٹل لہجے میں کہا

❖❖○❖❖

''آج تم کالج نہ جاتیں بیٹا!'' روشن آرا بیگم نے جلدی جلدی نگینہ کو ناشتا کرتے دیکھ کے کہا۔

''امّاں! آج میں اپنا اسائنمنٹ جمع کروا آؤں، کل یا آج رات بھائی کی آمد متوقع ہے اور میں بھائی [...]ہنی اور نکاح بھرپور انجوائے کرنا چاہتی ہوں میں اپنی کچھ سہیلیوں کو بھی آج انوائٹ کر آؤں گی۔'' [...]ہ نے سر پر دوپٹا جما کر کہا۔

[...]سفید لباس میں وہ حور لگ رہی تھی۔ اس کی معصومیت اس کے حسن کو چار چاند لگا دیتی تھی۔

''اچھا اللہ کی امان میں۔'' روشن آرا بیگم نے اُسے حسبِ معمول جاتے ہوئے دعا دی۔

''لمّاں جان! بابا کو میرا اسلام دے دینا، وہ ابھی تک واش روم میں ہیں۔'' نگینہ نے باہر نکلتے ہو
کہا۔

''توبہ ہے آج بھائی کی خوشی میں یہ لڑکی گھوڑے پر سوار ہے، آیت الکرسی بھی نہیں پڑھی اور چلی ورنہ تو آندھی آئے طوفان آئے دیر ہو یا سویر! ہرصورت وہ اُس وقت تک ٹھہرتی تھی، جب تک روشن بیگم آیت الکرسی پڑھ کر اس پر دم نہیں کر لیتی تھیں۔

''اللہ کے سپرد!'' روشن آرا بیگم کو نگینہ کی جلد بازی اچھی نہیں لگی تھی لیکن وہ بات بے بات ناپسند کا اظہار کرنا پسند نہیں کرتی تھیں۔

❖❖ ○ ❖❖

''نگینہ! یہ تیرا دوپٹا بہت پیارا ہے۔'' کاشفہ نے کہا۔

''تمہیں اچھا لگا؟'' نگینہ نے مسکرا کر پوچھا۔

''بہت!''

کاشفہ مڈل کلاس سے تعلق رکھتی تھی اور نگینہ اُسے ہمیشہ تحفوں سے نوازتی رہتی تھی۔

''تم رکھ لو کاشفہ!'' نگینہ نے فوراً اس کا دوپٹا خود لے کر اپنا اُسے دے دیا جس پر بھرپور دھاگے شیشے کا کام کیا بنا ہوا تھا۔ روشن آرا بیگم نے بہت شوق سے اُسے لے کر دیا تھا لیکن وہ نگینہ تھی، دیالو باپ کی بیٹی جو قیمتی سے قیمتی چیز بھی عزیز نہ رکھتی تھی۔ ہمیشہ چیریٹی کے لیے تیار رہتی تھی۔

''ارے، ارے! یہ کیا؟ میں تو یوں ہی تعریف کر رہی تھی۔'' کاشفہ نے بہ ظاہر تکلف سے کہا، لیکن سے وہ دوپٹا پا کر خوش ہو گئی تھی۔

''میری جان! رکھ لو، تمہیں اچھا لگ رہا ہے۔'' نگینہ نے عام شکل وصورت کی کاشفہ کو بھی پیار دیکھ کر کہا۔ اُس کی نظر میں خوب صورت بدصورت کبھی الگ الگ نہ تھے۔ اُس کی تربیت ہی ایسے پ پر ہوئی تھی کہ ہر انسان کو وہ اہم جانتی تھی۔

''تھینک یو نگی! تم بہت اچھی ہو۔'' کاشفہ نے سچائی سے کہا۔

''اچھا میں چلتی ہوں، میری بس آ گئی ہو گی۔'' کاشفہ نے ایک دم گھڑی دیکھ کر بیگ اُٹھایا اور سے مل کر گیٹ پار کر گئی۔

سامنے سڑک پار واپڈا کی بس کھڑی تھی، کاشفہ کے ابو واپڈا میں تھے، اس لیے واپڈا کی بس اُسے سے پک کر کے گھر کے پاس ڈراپ کرتی تھی ابھی اُس نے سڑک پار کی ہی تھی کہ بلیک شیشوں والی جیپ اُس کے پاس رُکی۔ بس ایک پَل لگا تھا۔

دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایک پَل میں وہاں سے لڑکی غائب تھی۔

''السلام علیکم رحیم چاچا!'' نگینہ نے اپنا بیگ اور فائل گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھتے ہوئے ڈرائیور سے
ا۔

''وعلیکم السلام بیٹا! جیتی رہو، چلیں؟'' رحیم چاچا نے نگینہ سے پوچھا۔

''جی چاچا!'' نگینہ نے پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''بیٹا جی! صبح آپ کے اس سفید سوٹ کے ساتھ بڑا اچھا شیشوں والا دوپٹا تھا، وہ کہاں گیا؟'' رحیم ا نے نگینہ سے پوچھا۔ اُس نے کاشفہ کا پنک کلر کا دوپٹا اوڑھ رکھا تھا۔

''ارے واہ چاچا! آپ کو یاد ہے صبح میں نے کس کلر کا دوپٹا لے رکھا تھا۔'' نگی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بیٹا! تم تو ہمارے ہاتھوں کی پوروں میں ہو نہ چاہتے ہوئے بھی تمہارا دھیان گیان رہتا ہے۔'' رحیم ا نے ایمان داری سے جواب دیا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

''وہ میری ایک دوست کو پسند آ گیا تھا، میں نے اُسے دے دیا اور اُس کا رکھ لیا۔'' نگینہ نے بے حد ی سے جواب دیا۔

''رحیم چاچا! مجھے پہلے مارکیٹ لے چلیں، ولی بھائی کی کل صبح کی فلائٹ ہے میں اُن کے کمرے کو ڈیکوریٹ کرنا چاہتی ہوں اور اُن کی پسند کا بلیک فارسٹ کیک اپنے ہاتھ سے بنانا چاہتی ہوں مجھے چیزیں چاہئیں۔'' نگینہ، ولی کی آمد پر بے حد پُرجوش دکھائی دے رہی تھی۔

''جی اچھا بیٹا!'' رحیم چاچا نے گاڑی سپر مارکیٹ کی طرف جانے والی روڈ پر ابھی ڈالی ہی تھی کہ ایک وی ٹی آئی اُن کے سامنے آ کر راستا روک گئی۔

''خانہ خراب! ابھی ایکسیڈنٹ ہو جاتا تو اپنے ساتھ ساتھ ہمارا بھی کام خراب کروانا تھا۔'' رحیم چاچا بروقت بریک پر پاؤں رکھتے ہوئے غصّے سے کہا۔

ابھی نگینہ یا رحیم چاچا مزید کچھ سوچتے کہ گاڑی سے کئی اسلحہ بردار لوگ نکلے اور ایک دم اُن پر حملہ دیا۔ رحیم چاچا نے ڈیش بورڈ سے پستول نکال لی تھی۔ وہ ایک وفادار اور بہادر انسان تھے، ہمت نے والے تھے نہ حوصلہ ہارنے والے۔ لیکن وہ اتنے سارے مسلح اسلحہ بردار کا مقابلہ نہ کر سکے، غنڈوں نگینہ کے منہ پر رومال رکھا اور اُسے کھینچ کر باہر نکال لیا۔ نگینہ بے ہوش ہو چکی تھی، رحیم چاچا نے پور مزاحمت کی لیکن وہ چھ لوگ تھے، جاتے جاتے انہوں نے رحیم چاچا کو گولی مار دی، خون زیادہ بہہ نے سے وہ بے ہوش ہو چکے تھے لیکن بے ہوش ہونے سے پہلے مسلسل لوگوں کو مدد کے لیے پکار رہے

تھے۔ بے شک یہ سڑک زیادہ گنجان نہیں تھی لیکن ویران بھی نہ تھی اکّا دُکّا لوگ تھے، جنہوں نے یہ حا دیکھا اُن کو لگا کہ پرائے پھڈے میں کیوں پڑیں وہ بالکل آگے نہ بڑھے۔

غنڈوں نے نگی کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور زن سے گاڑی بھگا کر لے گئے کسی راہ گیر نے فوراً پولیس کو اطلاع کی تھی، پولیس ریسکیو پانچ سات منٹ میں وہاں آ گئی تھی لیکن بے سود تھا۔ یہ سب کچھ کوئی پانچ چھ منٹ میں ہوا ہوگا، نگی کی گاڑی کھلی پڑی تھی، اُس کی فائل سیٹ سے نیچے اور بیگ روڈ پر گرا ہوا تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر رحیم چاچا خون سے لت پت پڑے تھے۔

"بزرگ کو ایمبولینس میں ڈالو" ریسکیو کے ایک جوان نے ماتحتوں کو کہا اور خود جھک کر زمین سے بیگ اُٹھایا، بیگ کے اندر موجود ڈائری اور نیم پلیٹ سے وہ جان گئے کہ یہ بیگ نگینہ احمد کا تھا۔ ریسکیو ملازم نے جیب سے موبائل نکال کر ڈائری سے نمبر لیا۔

"ہیلو! جی ہم ریسکیو پولیس ہیں، ہمیں ابھی ابھی ایک حادثے کے پاس آپ کی بیٹی کا بیگ پڑا ملا ہے!"

"جی! جی..جی..اور ڈرائیور کی حالت بھی تشویش ناک ہے، بہ ظاہر یہی لگتا ہے آپ کی بیٹی کا اغوا ہوگیا ہے۔"

اُس نے اور ایک دھماکا کیا تھا۔

❖❖○❖❖

"اب آئے گی عقل اُس احمد شاہ کے بچے کو!" سید سرفراز علی نے فون بند کر کے باآواز بلند کہا اور آیا امّاں کے کمرے میں آ گئے، وہ سجدے میں گری دُعا کر رہی تھیں۔

"اُٹھ جا نفیسہ! لگتا ہے تیری دعاؤں میں دم ہی نہیں، اتنے برسوں سے میرے خلاف دعائیں مانگ رہی ہے لیکن مجال ہے مجھے کچھ ہوا ہو، تیری دعائیں تو مسکان کی قسمت نہیں بدل سکیں لیکن دیکھنا اُس کے باپ کی وجہ سے اب کیسے اُس کی قسمت بدلتی ہے!" سید سرفراز علی نے ہنستے ہوئے وہیں قریب پڑی ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

آیا امّاں نے تسلی سے منہ پر ہاتھ پھیرے اور آمین کہہ کر سید سرفراز علی کی جانب دیکھا۔

"ضروری نہیں کہ صرف آنکھیں رکھنے سے ہی اِردگرد کے منظر نظر آئیں، اس کے لیے دل کی آنکھ کھلا رہنا ضروری ہے۔ اگر تم دیکھ سکتے تو تم نے دیکھنا تھا کہ مسکان کی تو واقعی قسمت تمہاری وجہ سے بدل کر رہ گئی۔" آیا امّاں نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔

"لیکن تم دیکھ نہیں پا رہے کہ یہ قسمت سیاہی میں بدلی ہے!"

ایک بیس سال کی بچی کو تم نے اُس کی عمر سے دُگنے دکھ دیے ہیں کیسی قسمت ہے اُس بے چاری کی کہ وہ اب تک اپنے باپ کا کیا بھگت رہی ہے۔" آیا امّاں نے دُکھ سے کہتے ہوئے جائے نماز لپیٹا۔

"لو پھر لیکچر شروع ہوگیا! لیکن کوئی مسئلہ نہیں ابھی میرا موڈ بہت اچھا ہے اِس لیے مجھے تمہاری باتیں بُری نہیں لگ رہیں۔" سید سرفراز نے کمال مہربانی سے کہا۔

"نفیسہ! مجھے اپنی فتح قریب نظر آ رہی ہے۔" سید سرفراز علی کا لہجہ کھنک رہا تھا۔

آیا امّاں نے سرد نگاہوں سے اُس کو دیکھا، سید سرفراز علی کو اس وقت کسی کی پروا نہیں تھی۔

"میں نے اُس لڑکے ولی کی بہن کو اغوا کروالیا ہے۔" سید سرفراز علی نے مسکراتے ہوئے آیا امّاں کے سامنے بم پھوڑا۔

"میرے خدا!" آیا امّاں نے بے اختیار دل تھاما۔

"تیرے ہاتھوں سے دنیا کی کوئی لڑکی محفوظ نہیں ہے، چاہے وہ تمہاری خود کی بیٹی ہو یا پھر کسی اور کی۔" آیا امّاں نے اپنا سر تھام لیا۔

"یہ میں نے اپنی بیٹی کے لیے ہی کیا ہے۔" سید سرفراز لی نے دلیل دی۔

"اپنی بیٹی کے لیے دوسرے کی بیٹی کی زندگی برباد کرنا کہاں کا انصاف ہے؟" آیا امّاں نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کہاں ہے وہ؟ کیا تم نے اُسے دیکھا ہے؟" آیا امّاں نے پوچھا۔

"کچھ ہی دیر بعد وہ حویلی پہنچ جائے گی اور بے فکر رہو مجھے اتنی عقل ہے کہ جہاں میں نے اپنی بیٹی رکھی ہے وہاں کی لڑکی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ تم اُسے اپنی نگرانی میں رکھ سکتی ہو مجھے کوئی اعتراض نہیں، بے شک ہم اُسے زبردستی اُٹھا کر لائے ہیں لیکن وہ رہے گی یہاں ایک مہمان کے طور پر۔" سید سرفراز علی نے بے حد مطمئن لہجے میں کہا۔

"سرفراز! تم نے کبھی عبدالولی کو دیکھا ہے؟" آیا امّاں نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں! لیکن اگر مسکان کو وہ پسند ہے تو وہ مسکان کا ہی ہوگا یہ میرا فیصلہ ہے۔" سید سرفراز علی نے بے نیازی سے کہا۔

"سرفراز! تم عبدالولی کا سامنا نہیں کرسکتے۔" آیا امّاں کا لہجہ کچھ عجیب ہی معنی لیے ہوئے تھے۔

"اوہ! کرلیں گے سامنا بھی، اس کی بہن یہاں مہمان بن کر رہے گی، ہم نے کون سا اُسے کچھ کہنا ہے۔" سید سرفراز علی نے کہا۔

"اچھا تم لڑکی سے مل لینا اور میں شہر جا رہا ہوں آج مسکان کو ہسپتال سے چھٹی مل جائے گی اُس کو لانا ہے۔" سید سرفراز علی کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

"سید سرفراز علی! اللہ کی اس زمین پر تم ایسے موذی ہو، جس کے شر سے کوئی محفوظ نہیں۔" آیا امّاں کی آنکھوں میں نگینہ کا بھولا بھالا حسین چہرہ گھوم گیا۔ مسکان، سائرہ کی سالگرہ پر جو تصویریں کھینچ کر لائی تھی اُن میں عبدالولی اور نگی کی تصویریں بھی تھیں۔

عبدالولی کا چہرہ سید عبداللہ کے چہرے کی ہو بہو کاپی ہے اور سید سرفراز کیسے اس چہرے کا سامنا کرے گا، اس اتفاق میں کوئی راز موجود ہوا کہ عبدالولی اور نگینہ کے نام اور شکلیں سید عبداللہ کے مرے ہوئے بچوں سے ملتی ہیں تو حقیقت کا کیا رنگ ہوگا؟

آیا امّاں وہیں سر تھام کر بیٹھ گئی۔

❖❖○❖❖

''شاہ صاحب! میری بچی!'' روشن آرا بیگم کو تو ایک غش آتا اور جاتا تھا۔

''میری بچی! میری پھولوں جیسی پاکیزہ بچی، جانے اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہوگا؟'' احمد شاہ کا اپنا دل کسی نے مٹھی میں لے رکھا تھا۔

'میرے خدا! یہ آزمائش میری برداشت سے زیادہ ہے۔'' انہوں نے بے اختیار اپنے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے فون ملایا۔ کمشنر اُن کا دوست تھا وہ چھوٹی موٹی رپوٹ لکھوا کر خود کو تسلی دے کر نہ بیٹھ سکتے تھے، اُن کا تو دل کوئی اندر سے نوچ رہا تھا۔

''میری گڑیا! اللہ اُسے اپنے حفظ و امان میں رکھنا۔'' وہ دل ہی دل میں مسلسل دُعا کر رہے تھے۔

''طارق بیٹا! کچھ پتا چلا؟'' جیسے ہی طارق گھر میں داخل ہوا، روشن آرا بیگم اُس کی جانب لپکیں۔ ضبط کرتے کرتے طارق کی آنکھیں شدت سے سرخ ہو رہی تھیں، نگینہ تو اُس کے دل کی دھڑکن تھی اُسے اپنا دل بند ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

''آنٹی! میری ساری ٹیم بے حد متحرک ہے، اِن شاء اللہ نگی چند گھنٹوں میں مل جائے گی۔'' طارق نے اپنے ماتحت کو اشارہ کیا جس نے احمد شاہ کے پی ٹی سی ایل فون کو ٹیپ پر لگایا اور سیل فون میں ایک ننھا آلہ نصب کیا، جو بتاتا تھا کہ فون کتنی دوری کی رینج پر کیا جا رہا ہے۔

طارق کو اب ایک عدد کال کا انتظار تھا جو اُس کے خیال میں فوراً احمد شاہ کے فون پر آنی چاہیے تھی لیکن وہ نہ جانتا تھا کہ یہ کال احمد شاہ کے فون پر نہیں اُس کے خود کے موبائل پر آنے والی تھی۔

''انکل! آپ کو کسی پر شک ہے؟'' طارق نے معمول کی تفتیش شروع کی تھی۔

''شک؟'' احمد شاہ کے کانوں میں سید سرفراز علی کی دھمکی آمیز فون کال گونجی۔

''مجھے سید سرفراز علی پر شک ہے! ہوسکتا ہے اُس نے ایسی گھٹیا حرکت کی ہو لیکن کوئی شخص ایسی حرکت کیسے کرسکتا ہے خالصتاً ایک بیٹی کا باپ دوسرے کی بیٹی کو کیسے اٹھا سکتا ہے؟'' احمد شاہ جیسا نرم دل اور نیک انسان تو ایسے ہی سوچ سکتا تھا۔

''کیوں کہ جو اچھا ہے وہ برائی کی حد کو محسوس نہیں کرسکتا، اسی طرح جو بُرا ہے وہ بھی اچھائی کی حد نہیں جان سکتا۔''

''سید سرفراز علی!''

''کون؟'' طارق کو لگا اُس نے یہ نام کہیں سُن رکھا ہے۔

''مسکان کا باپ!'' احمد شاہ نے دھماکا کیا۔

''کیا؟''

''اوہ مائی گاڈ!'' طارق نے تاسف سے کہا۔

''آئی کانٹ بلیو!'' طارق حیران تھا۔

''کیا انہوں نے آپ سے ایسی کوئی بات کہی تھی۔'' طارق نے پوچھا۔ جواباً احمد شاہ نے اپنی اور سرفراز کی ملاقات سے فون کال تک ساری گفتگو اے ٹو زیڈ تک کہہ سنائی۔

طارق کا غصے سے حال بے حال ہوگیا تھا۔

''انکل! آپ نے یہ بات مجھے پہلے کیوں نہ بتائی؟ آپ نے اِس ساری بات کو کیسے اتنا غیر اہم جان لیا۔'' طارق نے فکرمندی سے کہا۔

''میرا خیال تھا کہ وہ بیٹی سے رشتے سے انکار کی وجہ سے غصے سے ایسی باتیں کر رہا ہے۔'' احمد شاہ نے طویل اور گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''ایسے لوگ!'' طارق جی بھر کر گالی دینے کے موڈ میں تھا۔

''میں ابھی سرچ وارنٹ کا بندوبست کرتا ہوں، ہمیں لیگلی اور بہت احتیاط سے یہ کام آگے بڑھانا ہوگا کہ نگی کو کوئی نقصان نہ ہو۔'' طارق کہتا ہوا وہاں سے نکلا تھا۔

احمد شاہ وہیں ڈھے گئے ان کو لگ رہا تھا کہ اُن کی ٹانگوں میں جان ہی نہیں، انہوں نے مڑ کر روشن آرا کو دیکھا جو گھٹی گھٹی سسکیوں سے مسلسل رو رہی تھیں۔

آج عبدالولی پاکستان پہنچ رہا تھا اور گیارہ بجے اُس کا نکاح تھا اور یہ حادثہ پیش آ گیا تھا۔ جانے قسمت اُن کے لیے کیا لے کر بیٹھی تھی۔

یہ پنڈورا باکس اب کھل ہی جاتا تو اچھا تھا۔ احمد شاہ اور روشن آرا بیگم نگی کی بازیابی کے لیے بے حد پریشان تھے۔

❖❖()❖❖

''میں! میں..کہاں ہوں؟'' نگی تڑپ کر اُٹھ بیٹھی۔

ایک شان دار کمرا تھا، جہاں نگی کو لا کر لٹایا گیا تھا سامنے کیمرا اور شوٹنگ اسپاٹ وغیرہ بھی موجود تھے جیسے یہاں تصویریں وغیرہ کھینچی جاتی ہیں۔

نگی نے چکراتے سر کے ساتھ کھڑے ہو کر کمرے کا جائزہ لیا، کمرے میں کوئی کھڑکی نہ تھی۔ وہ دروازے کی جانب بڑھی۔

''کھولو! دروازہ کھولو!'' نگی کی گھبراہٹ اور خوف سے آواز بہ مشکل نکل رہی تھی۔

''کھولو! دروازہ کھولو!'' نگی کو جیسے ہی اپنے اغوا کے پل دماغ میں آئے، وہ بدحواس ہو کر اونچی آواز میں دروازہ کھولنے پر اصرار کرنے لگی ساتھ ہی دروازہ دھڑ دھڑانے لگا۔

''میرے اللہ! مجھے بچا! میں کہاں ہوں اور مجھے کیوں اغوا کیا گیا ہے۔'' وہ ننھی چڑیا جیسا دل رکھنے والی خوف سے کانپتے ہوئے خود سے سوال کر رہی تھی۔

تھک کر بیٹھ گئی لیکن کچھ ہی پل بعد وہ پھر زور شور سے دروازہ دھڑ دھڑا رہی تھی کوئی خوف، کوئی نقصان کی آہٹ کا احساس اُسے وحشت زدہ کر کے زور آور کر رہا تھا۔

❖❖()❖❖

''ارے بھیا! بڑی رنگت نکالی ہے۔'' عبداللہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اوہو یار بس کرو!'' ولی نے ہنستے ہوئے کہا کیوں کہ عبداللہ مسلسل عبدالولی کو چھیڑ رہا تھا۔

''اچھا تم لوگ کب پہنچ رہے ہو؟'' ولی نے پوچھا۔

''آپ کے پاکستان پہنچنے کے تین گھنٹے بعد ہم بھی پہنچ رہے، ہیں میں نے کوشش تو کی تھی کہ آپ کی

اور ہماری سیم فلائیٹ ہو جائے لیکن ممکن نہ ہو سکا۔'' عبداللہ نے کہا۔

''اوکے یار! یہ بھی اچھا ہے کہ میں تم کو خود ویلکم کرنے کے لیے موجود ہوں گا، اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ ہوگی نہ کوئی اچھی مصلحت کہ میں تم کو پہنچ کر ویلکم کروں گا۔'' ولی نے خوش دلی سے کہا۔

''بھائی میاں! آپ کی نکاح کی تقریب کب ہے؟ کہیں میں لیٹ نہ ہو جاؤں۔'' عبداللہ نے پُر جوش انداز میں کہا، اُسے فکر لگی ہوئی تھی۔

''یار! مِس علیزے کا نکاح عبداللہ کی غیر موجودگی میں ہرگز نہ ہوگا۔ تُو ہوگا تو نکاح ہوگا۔ بس خوش!'' ولی نے اندر جانے سے پہلے کہا۔

''اور تم بھی فوراً گھر جاؤ، جاکر آنٹی کو لاؤ کہیں اِس آنی جانی میں تمہاری فلائٹ نہ مِس ہو جائے'' ولی نے ڈپارچر لاؤنج کی جانب بڑھنے سے پہلے عبداللہ کو گلے لگایا اور پھر اندر بڑھ گیا۔

''یار عبداللہ! تُو تو دولہے کی طرح وی آئی پی ہو گیا ہے، تیرے بغیر مِس علیزے مسز نہیں بنے گی'' عبداللہ ہنستے ہوئے گاڑی کی جانب بڑھا، گھر پر سب اُس کا ویٹ کر رہے تھے خود کچھ دیر بعد اُس کی امی کی فلائٹ پاکستان کے لیے تھی لیکن وہ ولی کی محبت میں باؤلا ہوئے ایئر پورٹ اُسے سی آف کرنے آ گیا تھا۔

ولی نے کہا بھی کہ تم کیوں آئے لیکن یہ اُس کا نظریہ تھا کہ سی آف اور ویلکم کے لیے کوئی موجود ہو تو انسان کو لگتا ہے کہ اُس کا اپنا کوئی ہے ورنہ تو عجیب خالی خالی زندگی لگتی ہے۔

''پاکستان! لینڈ آف مسٹری!

لینڈ آف فینٹسی! لینڈ آف مائی مدر اینڈ پاپا!

آئی ایم کمنگ!'' عبداللہ مسکراتے ہوئے کہا، وہ بہت خوش تھا۔ جانے کون سی چیز اُسے پاکستان کی طرف کھینچ رہی تھی، کوئی مقصد تھا یا ذمے داری!

لیکن اللہ نے اِن میں سے کچھ اُس کے لیے لکھ دیا تھا۔

❖❖◯❖❖

''کمال کرتی ہیں آپی! صبح سے کام میں لگی ہیں، رات ہوگئی لیکن آپ کے کام ختم نہیں ہو رہے۔'' غزالہ نے اندر آکر علیزے کو ٹوکا، جو کھیر کے بڑے سے دیگچے کے ساتھ لگی کھیر پکا رہی تھی۔

''یہ دیگ پکانے سے بہتر تھا کہ آپ امی سے کہہ کر بازار سے منگوالیتیں۔'' غزالہ نے بیزاری سے کہا۔

''پھر تقریب تو ہوٹل میں ہے، کھانا وانا تو خالہ لوگوں نے ارینج کیا ہے پھر یہ کیوں؟'' غزالہ بیزاری سے اِس سارے بکھیڑے کو دیکھا۔ دس کلو کی کھیر سنبھالنا خاصا مشکل کام تھا۔

''میری پیاری بہنا! نکاح ابو کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے اِدھر گھر میں ہوگا، جس میں صرف گھر کے لوگ شامل ہوں گے اور بعد میں ہال میں مہمانوں کے لیے ریسپشن وغیرہ ہے۔ خالہ اور خالو کے مہمان ہال میں ہی آئیں گے لیکن گھر کے افراد کو منہ تو میٹھا کروانا ہوگا نا! اور تم جانتی ہو کہ اُن کو کھیر بہت پسند ہے

اِس لیے امی نے کہا کہ کھیر بنالیتے ہیں سب خوش ہو کر کھالیں گے۔'' علیزے نے شرماتے ہوئے کہا۔

''اوہو! تو یہ سب تردد صرف ولی بھائی کے لیے ہو رہا ہے۔'' غزالہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بالکل!'' علیزے نے کچھ استحقاق بھرے انداز میں کہا۔

''آپی! آپ ولی بھائی کو بہت چاہتی ہیں نا!'' غزالہ نے اُس کے چہرے پر اَن گنت رنگ دیکھ کر بے اختیار سوال کیا۔

''آں.. ہاں!'' علیزے نے مسکرا کر کہا، کچھ چولھے کی تپش اور کچھ علیزے کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا غزالہ کو وہ بنا کسی ہار سنگار کے دلہن سی لگی تھی۔

''کون کہتا ہے کہ سرخی پوڈر کا سنگار کرنے سے دلہن کو روپ آتا ہے! روپ تو سچی خوشی سے آتا ہے، اِس وقت علیزے کے انگ انگ سے چھلک رہا تھا تبھی تو اتنی رات گئے بھی وہ مسلسل کام میں مشغول تھی اور تھکن کا رَتی بھر احساس تک نہ تھا۔''

''اچھا پیاری بہنا! مہربانی کر کے جلدی فارغ ہو کر ذرا ریسٹ کرلیں، کل کا سارا دِن آپ کو دلہن بن کر بیٹھنا ہوگا امی نے کہا ہے کہ آپ اب آرام کریں اور کوئی کام ہے تو ہم کو بتائیں۔'' غزالہ نے امی کا پیغام علیزے کے گوش گزار کیا۔

''ارے میں نہیں تھکتی، تم جاکر امی کو دوا دو اور اُن کو سلا دو، ان کا وقت پر سونا ضروری ہے۔'' علیزے نے غزالہ سے کہا۔

''اوکے! مرضی ہے! میں ابھی امی کو بتاتی ہوں کہ آپی کو تو دلہن بننے کی خوشی میں تھکن اور نیند بالکل بھول گئی ہے۔'' غزالہ شرارت سے کہتی وہاں سے بھاگی کیوں کہ علیزے نے گھورتے ہوئے کفگیر اُٹھالیا تھا۔

❖❖◯❖❖

اپنے گھر کی کھڑکی سے میں آسمان کو دیکھوں گا
جس پر تیرا نام لکھا ہے اُس تارے کو ڈھونڈوں گا
تم بھی ہر شب دیا جلاکر پلکوں کی دہلیز پر رکھنا
میں بھی روز اک خواب تمہارے شہر کی جانب بھیجوں گا
ہجر کے دریا میں تم پڑھنا لہروں کی تحریریں بھی
پانی کی ہر سطر پر میں کچھ دِل کی باتیں لکھوں گا
جس تنہا سے پیڑ کے نیچے ہم بارش میں بھیگے تھے
تم بھی اُس کو چھو کے گزرنا، میں بھی اُس سے لپٹوں گا
خواب مسافر لمحوں کے ہیں، ساتھ کہاں تک جائیں گے
تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے، میں بھی اب کچھ سوچوں گا

''ہیلو!'' ولی نے ایئر پورٹ پہنچتے ہی موبائل آن کیا اور علیزے کو فون کیا۔

ایک مختلف سا احساس گھیرے ہوئے تھا مسکراہٹ خوامخواہ چہرے کا بار بار احاطہ کر رہی تھی پتہ

پالینے کا احساس، خوشی کا احساس اُس کے انگ انگ سے پھوٹ رہا تھا۔

"السلام علیکم!" علیزے کی مدھر آواز ولی کو اندر تک خوش کر گئی۔

"وعلیکم السلام! کیسی ہو؟" ولی نے مسکرا کر یوں کہا، جیسے علیزے سامنے کھڑی ہو۔

"اچھی ہوں!" علیزے کی دھیمی آواز اُس کے اندر بہت سارے سُر جگا گئی۔

"یار! تمہاری آواز میں کیا جادو ہے زندگی جاگ اٹھتی ہے، صبح بخیر!" ولی نے اپنا مختصر سا سا
کلیئرنس سے اُٹھایا اور ٹرالی میں لا کر رکھا۔

"صبح بخیر!" علیزے نے بے حد خوشی سے جواب دیا۔

"بہت جلد تمہاری قسمت بدلنے والی ہے میری جان! بس چند گھنٹوں بعد آپ مسز ہو جاؤ گی۔" ولی نے شوخ سی شرارت کی۔

علیزے کے اندر کوئی چیز گدگدائی تھی، جو اُس کے ہاتھوں تک کی ہتھیلیوں کو پسینے سے بھگو گئی۔

"میں آپ کا انتظار کر رہی ہوں ولی!" علیزے نے اقرار کی پہلی گرہ کھولی۔

"جناب! تمہارا دولہا پاکستان پہنچ گیا ہے، چند گھنٹوں بعد تم تک بھی پہنچ جائے گا۔ اچھا بتاؤ کس لباس پہن رہی ہو؟"

"خالہ لائی ہیں بہت اچھا ہے، پہن کر ہی آپ کو دکھاؤں گی۔"

"صرف دیکھنے پر ہی گزارا کرنا ہوگا یا چھونے کی بھی اجازت ہوگی؟" ولی کی اتنی شوخ باتیں علی کیسے سنبھلتی تھیں۔

"میں... میں فون رکھتی ہوں!
او کے اللہ حافظ!" علیزے نے کہہ کر فون بند کر دیا۔ اُس کی اس حرکت پر ولی نے ہلکا سا قہقہہ لگا
فون بند کر کے وہ جیسے ہی ایئرپورٹ سے باہر نکلا کہ ٹیکسی کرے تو اس کا موبائل دوبارہ بج اُٹھا۔
ولی نے مسکراتے ہوئے فون آن کیا اسکرین پر طارق کا نام جگمگا تا وہ دیکھ چکا تھا۔

"السلام علیکم جناب یار من!" ولی کا موڈ بہت اچھا تھا وہ باقاعدہ چہکا۔

"کیا؟" اگلے ہی پل ولی کے منہ سے بے یقینی سے نکلا۔

"طارق! کہو یہ جھوٹ ہے! میری بہن کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہو سکتا۔" ولی کی آواز تو باقاعدہ ر ہو گئی تھی۔

نگینہ میں تو ولی کی جان ہوئی تھی۔

"میں... میں گھر ہی آ رہا ہوں۔" ولی نے عجلت سے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

وہ اس قدر پریشان تھا کہ اُسے سانس لینے میں بھی دشواری ہو رہی تھی۔ ایک بار پھر اُسے وہ ہی خود پر حاوی ہوتا محسوس ہوا تھا۔ آگ کے شعلے لپک لپک کر اُس کی جانب اور نگینہ کی جانب بڑھ تھے۔

"نہیں!" ولی نے بے اختیار اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھا۔

"کیا ہوا صاحب! یہی روڈ تو ڈیفنس جاتا ہے۔" ٹیکسی ڈرائیور نے سمجھا کہ وہ غلط راستے پ

"آں.. ہاں! یہ ٹھیک راستا ہے۔" ولی نے اتنی سردی میں بھی اپنے ماتھے پر پسینا پونچھا۔

"میری بہن کو جس نے اغوا کیا ہے میں اُس کی جان نکال دوں گا۔" ولی کا خون غیرت سے کھولنے

❖❖○❖❖

"یہ کیسا شور ہے؟" ترنم نے ماہی سے پوچھا جو نقاہت سے بستر پر پڑی تھی۔

"کوئی بدنصیب پھر ان کے ہاتھ چڑھ گئی ہوگی۔" ماہی نے نقاہت سے کہا۔

ترنم ایک دم بے چین ہوگئی ابھی کچھ عرصے پہلے اُس نے یہاں سے ایک لڑکی بھگائی تھی اور طارق اموت کے منہ میں جاتے جاتے بچا تھا اس کے علاوہ بھی یہاں آج کل بے حد سختی ہوگئی تھی۔

کسی لڑکی کی مدد کرنے کا مطلب موت کو کھلے ہاتھوں دعوت دینا تھا۔

"میرا دل کرتا ہے کہ میں اُس لڑکی سے مل کر آؤں!" ترنم نے رات گہری ہونے پر اپنی خواہش کا ظہار کیا۔

"چلی جاؤ! یہ تو ایسا قید خانہ ہے کہ اگر وہ قید ہے تو ہم بھی قید ہیں! جانے کب اِس قید خانے سے ان چھوٹے گی۔ شاید موت واحد دروازہ ہے لیکن ترنم! یہ دروازہ پار کرنا کس قدر مشکل ہے نا!" ماہی کی از میں خوف بے حد نمایاں تھا۔

"ترنم! ہم جیسوں کو تو موت بھی سخت آتی ہوگی نا؟" ماہی نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

"نہیں! کیوں کہ ہر **Hidden Reality+Non Hidden** کی پاور صرف اللہ کے پاس ہے **Taste Of Death** کس پر کیسا اُترے گا یہ اس کے ہاتھ میں ہے ہمارے ہاتھ میں صرف **Confessio** ہے اور اس سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔" ترنم نے بے حد مضبوط لہجے میں کہا۔

"ترنم! میں کوئی ایسا کفارہ کرنا چاہتی ہوں، جس سے مجھ پر **Taste Of Death** آسان اُترے۔ میں کس قدر آرام اور آسائش والی زندگی جی چکی ہوں، موت کی سختی **Face** کرنے کا مجھ میں حوصلہ ں، مجھے شارٹ کٹ چاہیے!" ماہی نے آس سے کہا۔

"ماہی! تم تو یوں کہہ رہی ہو، جیسے تم ابھی مرنے والی ہو۔" ترنم نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ڈیئر! موت کا شیڈول بھی اللہ کے ہاں **Hidden** ہوتا ہے۔" ترنم نے کہا۔

"لیکن اُس کی تیاری تو ہر وقت رکھنی چاہیے نا!" ماہی کی بات پر ترنم چونکی۔

"ماہی! تم مجھے اپنی دوست سمجھتی ہو نا؟" ترنم نے اُس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"دوست سے زیادہ، بہن سے زیادہ، شاید ایک ماں کا آسرا بھی تمہارے وجود میں ڈھونڈتی ہوں۔" ی نے نم آنکھوں سے کہا۔

"تو پھر مجھے بتاؤ، آخر تجھے کیا ہوا ہے؟" ترنم نے بے حد پیار سے پوچھا۔

"کیوں ایسی ہوگئی ہو تم، تمہیں کیا بیماری ہے اور یہ کیا ہے؟" ترنم نے دراز میں موجود دواؤں کی ف اشارہ کر کے پوچھا۔

''یہ کس مرض کی دوا کھا رہی ہو؟'' ترنم نے اکٹھے کتنے ہی سوال کر ڈالے تھے۔

''مرض! موت کا مرض کہلاتا ہے یہ! مجھے ایڈز ہے ترنم!'' ماہی نے دھما کا کیا تھا۔

''ک...کیا؟'' ترنم نے حیرت و دکھ سے اس کی جانب دیکھا۔

''کیوں ڈر گئیں؟ دور ہٹ کر بیٹھو!'' ماہی نے ٹوٹے کانچ جیسی ہنسی ہنستے ہوئے پوچھا تھا۔

''بکواس بند کرو!'' ترنم نے غصّے سے اُسے دیکھا۔

''اگر چھوت کا مرض بھی ہوتا تو میں تم کو کبھی نہ چھوڑ کر جاتی، تم نے مجھے اتنا گھٹیا سمجھا ہوا ہے۔'' ترنم نے سلگ کر کہا۔

''لیکن مجھے دُکھ یہ ہے کہ تم نے اپنا درد اور مرض مجھ سے چھپایا، کیا اتنے سالوں کی ''روم میٹ'' کا بھی حق نہ تھا کہ میں تمہاری تکلیف کو تھوڑا سا ہی بانٹ سکتی!'' ترنم نے غصّے سے ''روم میٹ'' پر زور دیتے ہوئے کہا تھا۔

''اب تم روم میٹ کا لفظ استعمال کر کے خود کو پرایا بنا رہی ہو۔'' ماہی نے نقاہت بھرے لہجے میں کہا۔

''تو پھر میری جان! کیوں تم نے اکیلے اس درد کو جھیلا؟'' ترنم کی سمجھ نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے، ا مہینوں سے وہ ماہی کو کسی موم کی طرح پگھل پگھل کر ختم ہوتے دیکھ رہی تھی لیکن وجہ آج جان پائی تھی۔

''ماہی میری جان! تم اِن شاء اللہ ٹھیک ہو جاؤ گی، ہم تمہارا بہت اچھے ڈاکٹروں سے علاج کروا گے۔'' ترنم نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''کیوں! تم کو نہیں لگتا کہ میں نے اپنے علاج کے لیے دوڑ دھوپ نہ کی ہوگی۔'' ماہی ہنسی۔

''مجھے تو زندگی سے پیار ہی بہت تھا، میں تو زندگی کے لیے اتنا بھاگی ہوں ان دنوں کہ مجھ پر ساری کی تھکن حاوی ہو گئی ہے۔'' ماہی نے اپنے بکھرے بالوں کی لٹوں کو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

''میں بہت تھک گئی ہوں! آرام کرنا چاہتی ہوں اور یہ آرام اب موت ہی سے حاصل ہوگا ا اکٹھا ہی آرام کرنا ہے۔'' ماہی نے کہا، ترنم نے بے حد دکھ سے اُسے دیکھا۔

''تم!'' ترنم کو الفاظ نہ مل رہے تھے۔

بعض اوقات تسلی اور یقین کے لیے ہر طرح کے الفاظ ختم ہو جاتے ہیں، ترنم خود کو بھی اس وقت ا تہی داماں محسوس کر رہی تھی۔

''بہت بُری ہوں نا! دراصل ہم بری لڑکیوں کی نمائندہ ہیں، ہم ہی سے تو بیڈ گرلز کا Concept ہوتا ہے۔''

درد انسان کو زندگی کا ہر طرح کا سبق سکھا دیتا ہے اور اُسے زندگی کی ہر معانی سمجھ آنے لگتے ہیں، بھی شاید اس لیے اتنی گہری باتیں کرنے لگی تھی۔ ترنم ایک دم سسک پڑی۔

ماہی نے ترنم کو گلے لگا کر پیار کیا۔

''یار! صرف تمہارا وجود ہے جو مجھے احساس دلاتا ہے کہ میں لاوارث نہ مروں گی دنیا میں ایک ص تم ہوگی جس کو میرے مرنے کا دُکھ ہوگا اور میرے مرنے کے بعد میرے لیے دعا کے لیے ہاتھ اُ گے۔'' ترنم کی سسکیوں میں اضافہ ہو گیا تھا اُسے پہلے دن سے لے کر اب تک کا وقت یاد آ گیا تھ

اں نے ہر پل اُس کا پاگل پن خوش دلی سے بھگتا تھا، کیسے اُس کے آنسو ہر بار صاف کیے تھے اس الی دنیا میں ماہی کا وجود صرف اس کو احساس دلاتا تھا کہ کوئی خیال کرنے والا ابھی تک موجود

ہ روترنم! تمہارے آنسو جہاں مجھے دُکھ دیتے ہیں، وہاں خوشی بھی دے رہے ہیں کہ یہ آنسو میرے ں لیکن پلیز تم نہ رو۔'' ماہی نے کہا۔

م چپ چاپ صرف اُسے دیکھ رہی تھی۔

زلم! آج کل ہر وہ کام کرنے کو دل کرتا ہے جو آج سے پہلے میں نے کبھی نہ کیا، میں آج کل د کرتی ہوں لوگوں کے لیے اچھا سوچتی ہوں اور مختلف بکس پڑھتی ہوں۔ اس طرح ویٹ فار دِس) ٹائم ذرا آسان لگتا ہے ابھی کل ہی میں نے ایک واقعہ پڑھا تھا۔

پہلی جنگ عظیم کا واقعہ ہے، لڑائی کے دوران سپاہی نے اپنے جگری دوست کو گرتے ہوئے دیکھا ب و دہشت سے بے حواس ہو گیا، وہ خود اُس وقت ایک مورچے میں تھا اور سنسناتی گولیوں کی مسلسل اُس کے سر سے گزر رہی تھی، سپاہی نے اپنے افسر لیفٹیننٹ سے پوچھا کہ کیا وہ مورچے اہر جا کر خندقوں کے درمیان ''نومینز لینڈ'' سے اپنے گرے ہوئے ساتھی کو اُٹھا کر لے آئے۔

م جا سکتے ہو۔'' لیفٹیننٹ نے کہا۔

لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اس ایثار سے کچھ حاصل ہوگا تمہارا دوست غالباً مر چکا ہے اور تم بھی اپنی ے ہاتھ دھو سکتے ہو۔'' لیفٹیننٹ کے مشورے کی پروا کیے بغیر سپاہی مورچے سے نکل گیا، معجزاتی ر وہ اپنے دوست تک بنا کسی رکاوٹ اور بغیر زخمی ہوئے پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر اُس نے د کو شانوں پر اُٹھایا اور گولیوں کی بوچھاڑ سے گزرتا اُسے واپس اپنی کمپنی کے مورچے میں لے آیا۔

ب وہ گرتا پڑتا مورچے کے نشیب میں پہنچا تو افسر نے زخمی سپاہی کا معائنہ کیا اور پھر ہمدردی سے سپاہی کی طرف دیکھا، جسے اُس کا دوست جان ہتھیلی پر رکھ اُٹھا کر لایا تھا۔

میں نے تم سے کہا تھا نا کہ اس جاں بازی سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔'' لیفٹیننٹ نے کہا۔

تمہارا دوست مر چکا ہے اور تم بھی شدید زخمی ہو۔''

نا ب! اس کے باوجود میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔'' سپاہی نے کہا۔

رائیگاں نہیں گئی سے تمہارا کیا مطلب ہے؟'' افسر نے پوچھا۔

تمہارا دوست مر چکا ہے۔''

جی جناب!'' سپاہی نے جواب دیا۔

لیکن میری محنت کا پھل مجھے مل گیا کیوں کہ جب میں اُس کے پاس پہنچا تو وہ اُس وقت تک زندہ اُس کے منہ سے یہ سن کر مجھے جو تسکین ہوئی، اُس کا آپ اندازہ نہیں لگا سکتے۔'' اُس نے کہا!

جم! میں جانتا تھا، تم آؤ گے۔''

اہی نے ترنم کی نم آنکھوں میں غور سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا اور اپنے بازو کھول دیے۔

رنم فوراً اُس کے گلے لگ گئی۔

پھر وہ دونوں گلے لگ کر اس قدر روئیں کہ ہوا اور دھوپ کو بار بار شک ہوا کہ شاید ساون آ گیا ہے۔ ماہی کچھ نہ کہہ کر بھی ترنم کے لیے جو احساس رکھتی تھی، وہ جتا گئی تھی۔

''مجھے بھی یقین ہے کہ تم اس دنیا کی واحد ذی روح ہوگی، جو مجھ سے Concern، میرے مرنے سے Concern رکھے گی۔'' ماہی نے فخر سے کہا۔

ترنم ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ رو دی۔

اس سمندر جیسی لہروں جیسے وقت میں کب کیسے دونوں کے ہاتھ چھوٹ جائیں وہ دونوں ہی نہ جانتی تھیں۔

❖❖○❖❖

''کیا... کیا بنا؟'' سائرہ نے بھائی کی شکل دیکھ کر اندازہ تو کر لیا تھا لیکن پھر بھی پوچھ بیٹھی۔

طارق ایک دم سر تھام کر بیٹھ گیا۔

''ساری رات! ساری رات اُس کو اس شہر کے چپے چپے میں تلاش کیا ہے لیکن وہ کسی سوئی کی طرح جانے کہاں کھو گئی۔'' طارق کی آواز روہانسی تھی۔

محبت جہاں انسان کو طاقت ور کرتی ہے وہیں اُسے کمزور بھی بناتی ہے۔ طارق جیسا مضبوط اعصاب کا مالک خود کو اس وقت بے حد کمزور محسوس کر رہا تھا۔

''سائرہ! میں اِس وقت تم سے کچھ خاص معلومات لینے آیا ہوں، مجھے مسکان کے والد کی اُن رہائشی جگہوں کے پتے درکار ہیں جو تم جانتی ہو اور کیا تم سید سرفراز علی کے گھر سے کسی کو اتنا اچھا جانتی ہو کہ وہ ہماری مدد کر سکے، یعنی کچھ انفارمیشن دے سکے کہ نگینہ کو کہیں سید سرفراز نے تو نہیں اغوا کیا۔'' طارق کی بات سن کر سائرہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''میرے خدا! کیا واقعی مسکان کے بابا نے یہ اغوا کروایا ہے۔'' سائرہ نے حیرت سے پوچھا۔ اس کی حیرت چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔

''حیران بعد میں ہو لینا، جو میں نے پوچھا ہے اُس کا جواب دو!'' طارق نے پریشانی سے سائرہ کو دیکھا۔

''ہاں میں مسکان کی آیا اماں سے رابطہ کر کے پوچھ سکتی ہوں، وہ بہت خوف خدا رکھنے والی خاتون ہیں اور مسکان کے بابا کی حرکتوں کو نہایت ناپسند کرتی ہیں۔'' سائرہ نے کہا۔

''تو پھر ٹھیک ہے اُن سے فوراً پوچھو۔'' طارق نے بے صبری سے کہا۔

سائرہ نے اپنا فون اُٹھا کر آیا اماں کو ملایا۔ طارق نے بے حد بے چینی سے سائرہ کو دیکھا۔ اُس بے چینی اس قدر زیادہ تھی کہ وہ انتظار نہ کر پا رہا تھا اس لیے اُس نے بڑھ کر سائرہ کے موبائل کا لاؤڈ اسپیکر آن کر دیا، اب وہ بھی سائرہ کے ساتھ ساتھ فون پر ہونے والی گفتگو سن سکتا تھا اسی دوران طارق کا اپنا سیل بجا۔

طارق نے بیزاری سے اسکرین پر آتا نمبر دیکھا اور اُسے ریجیکٹ کر دیا، وہ یہ نمبر صبح سے اگنور کر رہا تھا لیکن سحرش تو جیسے کریزی ہوئی جا رہی تھی اُس سے بات کرنے پر، وہ مسلسل کال کر رہی تھی۔

طارق نے تھک کر فون اُٹھایا اور باہر نکل آیا۔

''کیا تکلیف ہے؟'' طارق غرایا۔

طارق نگی کے لیے اتنا پریشان تھا کہ اُسے کوئی چیز اچھی نہ لگ رہی تھی۔

''میرا فون تو اُٹھاؤ!'' سحرش چہکی تھی۔

طارق نے بے حد غصہ خود کے اندر محسوس کیا۔ اُس کا دِل ناخوش تھا، اُسے سحرش کا خوش ہونا بے حد بُرا لگا تھا۔

''میں تم کو ہر وقت فارغ لگتا ہوں کہ تمہارا فون اٹینڈ کرتا پھروں، کام کے وقت تو فون اٹھانا مشکل ہے اور پلیز تم تب تک فون نہ کرنا جب تک میں خود رابطہ نہ کروں۔'' طارق باقاعدہ چلایا۔

''طارق پلیز اتنا تو بتا دو کہ ایسا کیا ہو گیا ہے کہ میرا طارق اپنی نرمی تک بھول گیا۔'' سحرش نے لاڈ سے کہا۔

''دیکھ... دیکھو بُرا نہ منانا، میں تو اس لیے کہہ رہی ہوں کہ دُعا کروں گی اور میرے جیسی کملی کی دعا تو ضرور پوری ہوتی ہے۔''

سحرش کی بات پر طارق کو ایک دم سے یقین ہو گیا تھا اس لیے وہ جھجکتے ہوئے بولا کہ تم دعا کرو کہ مجھے میرا پیار مل جائے) یہ بات اس نے دل ہی دل میں کہی تھی۔

''تم دعا کرو کہ میں جس لڑکی کے کیس پر کام کر رہا ہوں وہ خیر و عافیت سے جلد از جلد مل جائے، اگر اُسے کچھ ہو گیا تو میں ساری عمر خود کو معاف نہ کر سکوں گا!'' یہ کہتے ہوئے طارق نے فون بند کر دیا اس کے لہجے میں ایسا کچھ ضرور تھا، جس پر سحرش باقاعدہ چونک گئی بلکہ بے حد اُداس ہو گئی تھی۔

طارق ہاتھ میں فون پکڑے گم سم کھڑا تھا۔ وہ شاید کسی گہری سوچ میں مبتلا تھا۔

''لالہ... لالہ!'' سائرہ نے اُسے پیچھے سے آ کر چونکایا۔

''آں... ہاں!'' طارق نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''آپ کا شک بالکل درست ہے مجھے تو حیرت اور دُکھ دونوں ہو رہا ہے کہ مسکان کے بابا ایسی کریمنل حرکت بھی کر سکتے ہیں انہوں نے ہی نگی کو اغوا کروایا ہے۔'' سائرہ نے باقاعدہ دھماکا کیا تھا۔

''آیا اماں باقاعدہ رو رہی تھیں لیکن انہوں نے مجھے تسلی دی ہے کہ وہ نگینہ کا بھرپور خیال رکھنے کی کوشش کریں گی۔'' سائرہ نے کہا۔

''یہ سید سرفراز علی کی زندگی کی سب سے بھیانک غلطی ہوگی کیوں کہ اس کا اُسے بھیانک انجام بھگتنا ہوگا۔'' طارق باقاعدہ پھنکارتے ہوئے باہر نکلا۔

❖❖○❖❖

''کیوں؟'' دلی زندگی میں پہلی بار احمد شاہ سے شکوہ کر رہا تھا۔

''کیوں کہ میرے نزدیک اس ساری بات کی کوئی اہمیت نہ تھی مجھے اپنی اولاد پر پورا یقین تھا کہ وہ کسی لڑکی کی زندگی تباہ کر ہی نہیں سکتا اس لیے میں نے اُس کی کسی بات کو اہمیت ہی نہ دی تھی۔'' احمد شاہ نے سچائی سے کہا۔

"لیکن بابا! آپ کو مجھے تو بتانا چاہیے تھا نا! آج میری بہن میرے نام پر سولی چڑھا دی گئی۔" ولی سر اپنے ہاتھوں پر گراتے ہوئے کہا۔

"صاحب! بڑی بی بی کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔" ملازمہ نے اندر آ کر اطلاع دی۔

احمد شاہ اور ولی دونوں آگے پیچھے روشن آرا بیگم کے کمرے کی جانب بڑھے۔

جیسے ہی ولی، احمد شاہ کے پیچھے کمرے میں داخل ہونے لگا تو اُس کا موبائل فون بج اُٹھا۔

"جی!" ولی نے فون آن کر کے پوچھا۔

نمبر اَن نون تھا۔

جیسے جیسے ولی مقابل کی گفتگو سنتا جا رہا تھا اُس کے چہرے پر تناؤ آ رہا تھا وہ چپکے سے باہر آ گیا۔ ڈور کے پار وہ اپنی ماں کی غیر ہوتی حالت کو ٹھیک سے دیکھ سکتا تھا۔

"اگر میری بہن کو کچھ ہوا تو یہ دیکھ لیجیے گا کہ میں ساری دنیا کو تباہ کر دوں گا۔" ولی نے شدت سے کہا۔

"تو پھر میری بات مان لو!" سید سرفراز علی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ زبردستی میں نہ مانوں تو؟" ولی نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"تو پھر سوچ لو کہ تمہاری بہن ہمارے پاس ہے یہ تم تو جانتے ہو، لیکن قانونی طور پر اس کو ثابت کرو گے۔ یہ میری دنیا ہے میری دنیا کی سرحدوں میں میری مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوتا ہے۔" سید سرفراز علی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ دنیا اور اس کی سرحدیں سب اللہ کی ہیں، آپ نے کیا خود کو خدا سمجھ رکھا ہے۔" ولی نے بڑا سے کہا۔

"ہم کچھ ہیں تو یہ سب کچھ ہو رہا ہے نا! تم بتاؤ تم کو ہماری بات قبول ہے، تمہاری بہن باعزت طریقے سے واپس پہنچ جائے گی۔" سید سرفراز علی نے کہا۔

تمہارا خیال ہے کہ ہم بغیر ہڈی کے لوگ ہیں جو اپنی بہن کو بازیاب نہیں کروا سکتے اور ہمیں ہر صورت تمہارے ساتھ کمپرومائز کرنا پڑے گا۔" ولی نے کہا۔

"یہ تم نہیں جانتے کہ میں کون ہوں اور میرے ساتھ پنگے کے سائیڈ ایفیکٹس کیا ہیں، تم اگر پولیس انوالو کرو گے تو Difinatly اپنی بہن کی Dignity کو برباد کروا لو گے۔" سید سرفراز علی کی بات پر ولی غصے سے چیخ اُٹھا۔

"شٹ اپ... شٹ اپ...!"

"خبردار میری بہن کو کسی نے ہاتھ بھی لگایا۔"

"تو پھر آؤ اور ہمارے ساتھ ڈیل کر لو۔"

"کیا گارنٹی ہو گی کہ میں اپنی بہن کو چھڑانے کے بعد آپ کی بیٹی کے ساتھ اچھا سلوک کروں گا۔" ولی نے سید سرفراز علی کو دھمکی دی۔

"سیکورٹی اور گارنٹی کی شرائط نکاح نامے پر میں لکھوا چکا ہوں، تم کو ان شرطوں کے ساتھ ہی مسکان کے ساتھ نکاح کرو گے۔" سید سرفراز علی بے حد چالاک آدمی تھا۔

"تمہارا وقت شروع ہوتا ہے اب، دو گھنٹے تمہیں میں سوچنے کو دیتا ہوں، چلو میں تم کو سوچنے اور ہر طرح کی کوشش کرنے کے لیے دو دن اور ایک رات دیتا ہوں۔ اگر اس سے زیادہ ایک منٹ بھی زیادہ لیا تو میں تمہاری بہن کی سلامتی کی کوئی گارنٹی نہیں دیتا۔" سید سرفراز علی نے اتنا کہہ کر فون رکھ دیا۔

ولی نے بے اختیار ماتھا مسلا اور فوراً طارق کو فون کیا اور اے ٹو زیڈ ساری بات اُسے بتا دی۔

لیکن وہ خود میں اِس قدر اُلجھ گیا تھا کہ وہ یہ تک بھول گیا کہ آج اُس کا نکاح ہے۔

"میں!"

سید سرفراز مسکان کے کمرے میں آئے لیکن اُن کو الفاظ نہ مل رہے تھے کہ وہ کیا بات کریں کیوں کہ مسکان اُن کو ایسی نظروں سے دیکھتی تھی کہ وہ اندر تک شرمندہ ہو جاتے تھے۔

کتنی عزیز تھی وہ اُن کو... کیسے آنکھ کا تارا بنا کر انہوں نے اُسے پالا تھا۔ لیکن اُن کے ایک غلط قدم سے ہر چیز ہر بات غلط ہو گئی تھی اور اب وہ چاہتے تھے کہ جلد از جلد ہر چیز ٹھیک کر لیں۔ لیکن وہ یہ جانتے تھے بلکہ وہ اپنی فطرت کی وجہ سے زندگی بھر جان بھی نہ سکتے تھے کہ "رشتے" کوئی پنسل سے لگی لائن تھوڑا ہی ہوتی ہے، جو خراب ہونے پر ربڑ سے مٹا کر ٹھیک کر لیں۔ رویے اگر خراب ہو جائیں تو یہ تو اُلجھے ہوئے دھاگوں کی طرح بن جاتے ہیں کہ اگر احتیاط نہ کی جائے تو یا تو ٹوٹ جاتے ہیں یا پھر مزید اُلجھ جاتے ہیں۔

"میں بیٹا! یہ کہنا چاہتا تھا کہ..." سید سرفراز علی مسلسل اٹک رہے تھے وجہ مسکان کی اجنبی نگاہ اور رویہ تھا۔

"میں تمہیں زندگی دوں گا! وہ زندگی جو میری وجہ سے تم سے چھن گئی تھی یہ میرا وعدہ ہے تم سے... ہو سکے تو اپنے باپ کو معاف کر دینا۔" سید سرفراز علی جس کی لائف ڈکشنری میں "معافی" کا لفظ نہ تھا لیکن وہ مسکان سے اس قدر پیار کرتے تھے کہ انہوں نے ادھار مانگ کر یہ لفظ استعمال کیا تھا۔

لیکن اب وہ ہر صورت اپنی بیٹی کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دینا چاہتے تھے۔

"مسکان بس تھوڑا سا اور انتظار! بہت تھوڑا سا! تمہارا باپ تمہاری زندگی کی خوشیاں بہت جلد واپس لے آئے گا۔" وہ کہہ کر باہر نکل گئے۔ مسکان نے اُلجھی اُلجھی نگاہوں سے اُن کو جاتے دیکھا۔

❖❖○❖❖

"انور صاحب گیارہ بج گئے آپ کے مہمان کدھر ہیں؟" محلے داروں میں سے انور صاحب نے ایک معزز بزرگوں کو بلایا تھا۔ ان ہی میں سے ایک بولا۔

"کمال ہے روشن آرا آپا اور بھائی صاحب تو بہت وقت کے پابند ہیں۔" انور صاحب منہ ہی منہ میں بڑبڑائے۔

"ارے جناب! یہ کون سا دور ہے کہ مہمانوں کا دُور بیٹھ کر خالی خولی انتظار کیا جائے، یہ تو موبائل کا دور ہے آپ موبائل سے فون کریں۔ ابھی معلوم پڑ جائے گا کہ وہ لوگ گھر سے نکلے بھی ہیں کہ نہیں...." دوسرا محلے دار بولا۔

''وہ دراصل مجھے ہی خیال نہیں رہا کہ ہمارا فون خراب ہے اُسے ٹھیک کروالوں۔'' انور صاحب
شرمندگی سے کہتے ہوئے اندر کی جانب بڑھے۔

وہ اب کیا بتاتے کہ منزہ کی موت اور کاشف کی حالت کی وجہ سے وہ ہر وقت اتنے پریشان اور سوچا
میں گم رہتے تھے کہ ان کا دھیان عام ضروریات زندگی کی طرف بہت کم جاتا تھا اس لیے انہوں نے ا
شاہ صاحب کو ایک بار بھی خود سے فون نہ کیا تھا حالاں کہ وہ جانتے تھے کہ علیزے کے پاس موبائل
سہولت تو گھر میں موجود ہے۔ بے شک ان کا لینڈ نمبر مہینوں سے خراب پڑا تھا۔

حسن آرا بیگم بھی بے حد سادہ عورت تھیں وہ تو ویسے ہی بہت بوکھلائی پھر رہی تھیں۔

بس دونوں میاں بیوی میں سے کسی نے یہ غیر معمولی پن بالکل محسوس نہ کیا کہ آخر احمد شاہ اور را
آرا بیگم کی جانب سے کوئی فون کیوں نہیں آیا۔

''ارے بیگم صاحبہ! بچیوں سے کہو کہ بھائی صاحب کے موبائل کا نمبر مجھے ملا کر دیں۔ دیکھیں تو م
کہ وہ کتنی دوری کے فاصلے پر ہیں، ساڑھے گیارہ ہونے کو ہیں، نکاح خواں بھی آکر بیٹھے ہیں، ا
دوپہر کے کھانے کا وقت ہال والوں کو دیا ہوا ہے کب سارے کام نمٹیں گے۔'' انور صاحب نے حسن آ
بیگم سے کہا۔

''جی اچھا!''

حسن آرا بیگم جو علیزے کے لیے اپنے کنگن الماری سے نکال رہی تھیں شوہر کا حکم سن کر بچیوں
کمرے کی جانب بڑھیں۔ واقعی یہ درست تھا کہ ٹائم خاصا زیادہ ہو چکا تھا۔

''علیزے بیٹا! تمہارے ابو موبائل مانگ..'' حسن آرا بیگم کہتے کہتے ایک دم سے رک گئیں۔

سامنے علیزے تیار کھڑی تھی، وہ تو کسی ملک کی شہزادی لگ رہی تھی اس قدر حسین کہ خود حسن آرا
کی نگاہ نہ ٹک رہی تھی۔

''ماشاء اللہ، ماشاء اللہ! چشم بد دور!'' انہوں نے چٹ پٹ بیٹی کی بلائیں لے ڈالیں۔

''میری بیٹی بہت بہت زیادہ پیاری لگ رہی ہے۔''

''امی میں ٹھیک لگ رہی ہوں۔'' علیزے نے پوچھا۔

''میرے چاند! آج تو تم سچ مچ کا چاند لگ رہی ہو۔'' وہ ہنستی ہوئی بولیں، حسن آرا بیگم شاید برس
بعد یوں ہنسی تھیں، آج بیٹی کی خوشی ان کے انگ انگ میں پھوٹ رہی تھی۔

''آج تو ولی بھائی آپی کو پہچان نہیں پائیں گے۔'' غزالہ بھی ہنسی۔ علیزے نے شرما کر سر نیچے کرلیا۔

''اچھا بیٹا! اپنا موبائل دو، تمہارے ابو نے احمد بھائی سے بات کرنی ہے۔'' حسن آرا بیگم فون لے
پلٹیں۔

غزالہ مٹھائی کی پلیٹ لے کر کچن کی جانب گئی جب کہ علیزے سامنے لگے آئینے میں خود کو دیکھنے لگ
ولی کے بہت سے جملے اُس کے کانوں میں گونجنے لگے تھے اور وہ خود کو دیکھتے ہوئے خود سے ہی
...نی

❖❖) ❖❖

''صاحب! یہ کوئی سی ڈی دے کر گیا ہے۔'' ولی کی ملازمہ نے آکر کہا۔

اس وقت ولی اور طارق بے حد پریشانی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ طارق نے ہر وہ جگہ دیکھ لی تھی، جہاں
کے ہونے کا امکان تھا۔
لتاں نے بتایا تھا کہ نگی اُن کے ہی پاس ہے اس لیے طارق نے سید سرفراز کی ہر رہائش پر نگی کو
ل کیا تھا لیکن بے سود تھا۔ وہ وارنٹ لے کر بڑی حویلی تک ہو آیا تھا لیکن ناکام ہوا تھا اب وہ اور ولی
ہاں بیٹھے تھے طارق نے اپنے مخبر گاؤں میں اور سید سرفراز کے شہر کے ہر ٹھکانے کے اِرد گرد چھوڑ
ے تھے لیکن ابھی تک حوصلہ افزا کوئی خبر نہ تھی۔

''کون دے کر گیا سی ڈی؟
تم نے ایسے ہی لے لی؟
اسے روکا نہیں؟
اور یہ واچ مین کہاں ہے کوئی کیسے... کیسے کوئی بھی چیز اندر دے جائے گا؟'' طارق نے سارا غصہ
المہ پر اُتار دیا۔

''وہ... وہ صاحب! لال شرٹ والے موٹر سائیکلوں پر جو ڈا کیے ہوتے ہیں نا! واچ مین کہہ رہا تھا کہ وہ
ے کر گیا ہے۔''

''ولی! دیکھو پھر تو سینڈر کا ایڈریس ضرور ہوگا۔'' طارق نے سی ڈی کا لفافہ ولی سے لیا۔

''کوئی فائدہ نہیں! کڈنیپر بہت چالاک ہے، اُس کا بندہ بھیس بدل کر سی ڈی ڈلیور کر گیا ہے۔'' ولی
ے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

''تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ کڈنیپر کی ہی طرف سے سی ڈی ہے۔'' طارق نے پوچھا۔

''اس پر لکھا ہے نگینہ کا نام!'' ولی نے روہانسے لہجے میں کہا۔

''اگر نگی کو کچھ ہو گیا تو طارق... میں... میں مر جاؤں گا، وہ میرے وجود کا حصہ ہے۔'' ولی نے چھوٹے
ں کی طرح کہا۔

''کیا... کیا ہوگا اس سی ڈی میں، آخر کیا ہو سکتا ہے؟'' ولی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''شاید کوئی پیغام وغیرہ!'' طارق نے سی ڈی آن کرتے ہوئے کہا۔

لیکن اگلے ہی پل دونوں کے چہروں پر بہت دُکھ تھا۔

نگی کا فل اسکیپ چہرہ اسکرین پر تھا رو، رو کر اُس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

''بابا... بابا.. اماں.. بھیا!
بھیا! بچاؤ! مجھے یہاں سے لے جاؤ!
طارق... طارق آپ مجھے ڈھونڈھ لو! پلیز لے جاؤ!
یہ لوگ بہت برے ہیں! یہ... یہ!...
بُرے!...'' ساتھ ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

ولی بے اختیار اسکرین کی جانب بڑھا، جیسے بہن کو گلے لگا کر اُس کے آنسو پونچھنے لگا ہو۔

لیکن سی ڈی ختم ہوگئی تھی۔ ولی وہیں بیٹھتا چلا گیا۔
ضبط شدت سے اُس کی آنکھیں خون رنگ ہورہی تھیں، یہی کچھ حالت طارق کی تھی۔
''آئی ول کل ہم!'' طارق غرایا۔
''نو.. طارق.. نو! ہم کچھ نہیں کرسکتے ہماری بہن اُن کے پاس ہے، مجھے اس سے پہلے اندازہ نہ تھا ہمارے ہاتھ اِس بُری طرح بندھے ہوئے ہیں۔'' ولی نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔
''اب تم میں سے کوئی سید سرفراز علی کو کچھ نہیں کہے گا مجھے اتنی دیر کرنی ہی نہیں چاہیے تھی، میں تو نگی سے کہتا تھا کہ میں اُس کی خاطر جان دے سکتا ہوں تو پھر طارق میں نے اُس کا مان کیوں توڑا؟! یہاں بیٹھا کیا کررہا ہوں؟ کیا اپنی بہن کے لیے اپنی خوشی کی قربانی نہیں دے سکتا۔ مجھے خود پر شرم آ ہے کہ وہ ایک دن اور ایک رات سے مسلسل آنسوؤں اور خوف میں ہے اور میں اپنے کہے تک کی لاج نہ رکھ سکا۔
نو.. نیور! میں ایسا کیسے سیلفش ہوسکتا ہوں۔'' ولی کی آواز شدت جذبات سے بھاری ہورہی تھی۔
''تم کہاں جارہے ہو؟'' طارق نے پوچھا۔
''مجھے روکنا مت، میں رکوں گا نہیں!'' ولی نے ایک چھوٹے سے بیگ میں اپنا ریوالور، لائسنس ا پیسے رکھے، پھر موبائل اور گاڑی کی چابیاں لے کر باہر کو لپکا۔
''اسٹاپ اٹ ولی! کہاں جارہے ہو!'' طارق اُس کے پیچھے دوڑا تھا۔
''تم یہ سی ڈی دیکھنے کے بعد بھی پوچھ رہے ہو کہ کہاں جارہا ہوں، میں نگی کو لینے جارہا ہوں۔'' ا نے بے ٹھوس لہجے میں کہا۔
''تم اکیلے؟'' طارق نے غصّے سے پوچھا۔
''مجھ اکیلے سے ہی سید سرفراز، مسکان کا نکاح چاہتا ہے۔'' ولی نے دھماکا کیا۔
''مائی گاڈ! تم خودکشی کررہے ہو۔'' طارق نے بے اختیار کہا۔
''اور اگر نگی کو کچھ ہوگیا تو میں ویسے بھی مرجاؤں گا... میرا ضمیر مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا، میرا غیرت مجھے کبھی جینے نہ دے گی۔'' ولی نے طارق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔
''اور علیزے بھابی!'' طارق نے ایسا سوال کیا تھا، جس کا جواب ولی کے پاس نہ تھا۔
''بابا اور امّاں جان کو نہ بتانا۔'' ولی نے کہہ کر گاڑی اسٹارٹ کردی، واچ مین گیٹ کھول چکا تھا اور ا کی گاڑی باہر نکل گئی تھی۔
طارق نے بے اختیار سر تھاما تھا۔
احمد انکل روشن آنٹی کے پاس ہسپتال میں تھے۔
''اب کیا ہوگا؟''
بے اختیار یہ سوال طارق کے سامنے آیا تھا۔

❖❖○❖❖

''ک... کیا؟'' موبائل فون بے اختیار انور صاحب کے ہاتھوں سے چھوٹا۔

''میری علیزے!'' وہ لہرا کر گرے۔
دوسری جانب احمد شاہ ہیلو ہیلو کررہے تھے لیکن ان کو مختلف آوازیں آرہی تھیں۔ افرا تفری کی آوازیں...
اس وجہ سے ہی انہوں نے ابھی تک انور صاحب کو اطلاع نہ کی تھی کہ ان کی طبیعت اچھی نہیں رہتی تھی لیکن کیا وہ اتنے غیر ذمے دار ہوسکتے تھے کہ ان کو نکاح کے پوسٹ پون ہونے کی بھی اطلاع نہ کرتے۔
انہوں نے فوراً گھر فون کیا کہ ولی سے بات کرسکیں کیوں کہ وہ ولی کے ذمے یہ کام لگا کر آئے تھے کہ وہ علیزے کی جانب خود جا کر سارے حالات گوش گزار کرے اور وقتی طور پر نکاح کی ڈیٹ بدلنے کا ائے۔
''پھر ولی ابھی تک وہاں گیا کیوں نہیں؟''
وہ بے حد پریشانی سے سوچ رہے تھے فون طارق نے اٹھایا تھا وہ بھی ولی کے پیچھے نکلنے والا تھا۔ لیکن پہلے اپنے ماتحتوں کو کچھ کام سونپ رہا تھا کہ وہ ہر فون کال کی لوکیشن وغیرہ سے مسلسل طارق کو انفارم رکھیں گے کہ احمد انکل کا فون آ گیا تھا۔
''ولی کہاں ہے؟'' احمد شاہ نے عجلت سے پوچھا۔
''وہ انور صاحب سے معذرت کرنے اور سارے حالات بتانے کیوں نہیں گیا؟'' احمد شاہ نے غصّے سے پوچھا۔
وہ اندازہ کرسکتے تھے کہ دل کے مریض انور صاحب کو کوئی بھی خبر اچانک سننے سے جان لیوا اٹیک ہوسکتا تھا اس لیے وہ بے حد فکرمند تھے۔
''ولی.. انکل وہ!'' طارق ہچکچایا۔
''بولو یار! کیا مسئلہ ہے۔'' احمد شاہ اتنے مسئلوں سے واقعی گھبرائے ہوئے تھے۔
''وہ.. انکل!'' طارق نے گہرا سانس بھرا تھا تا کہ وہ خود کو کمپوز کرسکے۔
''وہ سید سرفراز کی حویلی گیا ہے۔'' طارق نے دھماکا کیا۔
''کیوں؟'' احمد شاہ نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا۔
''ڈیل کرنے!''
''کیسی ڈیل؟'' احمد شاہ نے پوچھا۔
''اپنی زندگی بیچ کر نگی کی زندگی خریدنے۔'' طارق نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔
احمد شاہ کو لگا، وہ ایک دم خسارے کے پلڑے میں جھول رہے ہیں جہاں کھڑے ہوکر وہ جانے کیا کیا ہونے والے تھے۔

❖❖○❖❖

''کیسے ہو مارک؟'' راگنی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔
''کیسے ہوسکتے ہیں جناب!'' مارک نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ فتح کا نشہ اُس کے انگ انگ میں پھوٹ رہا تھا۔

''چڑیا پھنس گئی؟'' راگنی نے پوچھا۔
''بالکل.....اور کم بخت اتنی حسین ہے کہ جب جب پھڑ پھڑاتی ہے اپنا تو حال خراب ہوجاتا ہے مما
بس ایک رات اور انتظار کروں گا، جب تک اُسے دیکھ نہ لوں تب تک مزا کہاں آئے گا۔ دیکھتا ہوں ا
طارق کیا کرتا ہے؟''
اب اُسے اندازہ ہوگا کہ کس زہریلے سانپ کو اُس نے چھیڑا تھا۔ نہ سارا زہر اُس کی زندگی میں گ
گیا تو میرا نام مارک نہیں!...'' مارک نے قہقہہ لگایا۔
''میڈم راگنی! تم نے مارک کو دوبارہ زندہ کیا ہے۔ اس طارق سے بدلا نہ لیتا تو شاید میں زندگی
تڑپتا رہتا۔ لیکن اب تڑپے گا، طارق۔ اور یاد کرے گا کہ کس کے بل میں ہاتھ ڈالا تھا، میں اس کی ا
کے ساتھ وہ کروں گا کہ نہ وہ جی سکے گا نہ مر سکے گا!'' مارک کا لہجہ بے حد خوف ناک تھا۔
''میری جان! ٹیک یور ٹائم! جو چاہتے ہو کرو میری طرف سے کھلی اجازت ہے اِس طارق کم ب
نے میرا بڑا نقصان کیا ہے اِس کو سزا تو ملنی ہی چاہیے۔'' راگنی کے لہجے کی پھنکار کسی معصوم کی زن
جلانے والی تھی۔

❀

''وہ ایسا کیسے کرسکتے ہیں؟'' علیزے نے ہاتھوں میں لگی مہندی کو بہ غور دیکھتے ہوئے اُداسی سے
ا۔
لیکن وہ اپنے دل کا کیا کرتی جو ولی کے اِس قدر فیور میں تھا کہ ہر شک ہر سوال پلٹ پلٹ کر واپس
اتھا۔ لیکن حقیقت اس سے بالکل مختلف تھی اُس کا باپ ایک بار پھر اپنی زندگی اُس کی زندگی کے لیے
ے میں ڈال چکا تھا۔
''یا اللہ! تیرا وعدہ ہے کہ تُو انسان پر اُس کی برداشت سے زیادہ آزمائش نہیں ڈالتا، یہ آزمائش میری
اشت سے زیادہ ہے!'' علیزے مہندی لگے ہاتھ منہ پر رکھ کر بلک بلک کر رو دی۔
''علیزے! مجھے ولی کا نمبر ملا کردو۔'' حُسن آرا اس کے قریب چلی آئیں، اُن کی آنکھیں رو رو کر
ل ہوچکی تھیں اور آواز بُری طرح بیٹھ گئی تھی۔
''آپ! آپ کیا بات کرنے والی ہیں۔'' علیزے نے ماں سے سوال کرتے ہوئے نمبر ڈائل کیا۔
''تم مجھے نمبر ملا کر دو، آج اگر نکاح نہ ہوا تو تمہارا باپ سکون سے جینا تو کیا مر بھی نہیں سکتا۔'' حسن
بیگم نے بے حد سرد لہجے میں کہا۔
''امی! ابو آئی سی یو میں ہیں اور آپ نکاح کی بات کرنے کے لیے اصرار کررہی ہیں۔'' علیزے نے
رکہا۔
''وہ سامنے شیشے کے پار اپنے باپ کو دیکھ رہی ہو نا؟ وہ بڑا مضبوط اور ضدی انسان تھا۔ بڑی سے
مشکل کو وہ کبھی سر پر سوار نہ کرتا تھا لیکن آج اپنی اولاد کی محبت میں وہ کم زور ہوچکا ہے محبت اگر
ا دیتی ہے تو مار بھی دیتی ہے۔'' انہوں نے دکھ سے طویل سانس بھرتے ہوئے فون تھاما۔ فون ری
اپر تھا کیوں کہ ولی فون نہ اٹھا رہا تھا۔
''آج تمہارا باپ مر رہا ہے! میں اُسے ایسے کیسے مرنے دوں، میں ولی سے ضرور بات کروں گی۔ آج
ں نے تیرے ساتھ نکاح نہ کیا تو خدا کی قسم میں تیرا ہاتھ کسی اور کے ہاتھ میں دے دوں گی چاہے وہ
لتا کوئی فقیر ہی کیوں نہ ہو۔'' حُسن آرا غصّے اور توہین کے احساس سے اپنے حواس کھورہی تھیں۔
''امی پلیز! یہ آپ کیسی باتیں کررہی ہیں۔'' علیزے نے روہانسی ہوکر پوچھا۔
''کیوں! عزت اور دل اُن کا ہی ہے، ہماری کوئی عزت نہیں، کیا ہمارے دل روئی سے بنے ہیں کہ
بھی ریشہ ریشہ کرکے اڑادے۔
''نہیں ایسا نہیں ہے! ہم غریب ضرور ہیں لیکن انسان ہیں اور میں ان کو یہی محسوس کروانے کے لیے

فون کرنا چاہ رہی ہوں۔'' حسن آرا بیگم نے غصّے سے کہا۔

فون مسلسل ری ڈائل پر تھا۔ ولی کا دیر سے فون اٹھانا بھی اُن کو بُرا لگ رہا تھا لیکن وہ مصمم ارادہ کیے ہوئے تھیں کہ آر یا پار! جو ہوگا آج ہی ہوگا۔ ابھی ہوگا۔

اِس فیصلے کی نوک پر انور صاحب کی زندگی جھول رہی تھی وہ آج ایک ماں بن کر نہیں صرف ایک بیوی بن کر سوچ رہی تھیں چاہے اس کا نقصان کچھ بھی ہوتا۔

❖❖○❖❖

''نفیسہ بیگم...... نفیسہ بیگم!'' سید سرفراز علی خوشی اور فتح سے گلنار چہرہ لیے آیا اماں کے کمرے میں داخل ہوا۔

نفیسہ بیگم نے قرآن پاک بند کر کے منہ پر اُنگلی رکھ کر سید سرفراز علی کو اشارہ کیا کہ وہ شور نہ مچائیں۔ مسکان اُن کے پاس ہی تو سو رہی تھی۔

''کیا ہوا؟'' نفیسہ بیگم نے ماتھے پر تیوری چڑھا کر پوچھا۔

''وہ مان گیا ہے!'' سید سرفراز علی خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔

''کون... اور کیا مان گیا؟'' نفیسہ بیگم نے نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔

''وہ۔ ولی! ولی آ رہا ہے اور وہ مسکان سے شادی کرنے کو تیار ہے! میں نہ کہتا تھا کہ وہ ضرور آ گا!'' سید سرفراز علی نے چہکتے ہوئے کہا۔

''کیا! وہ مان گیا ہے!'' نفیسہ بیگم نے حیرت سے پوچھا۔ پھر ایک بھرپور نگاہ مسکان کے معصوم چہرے پر ڈالی، وہ سوتے ہوئے کسی ننھے بچے کی طرح لگ رہی تھی، کس قدر پاکیزہ چہرہ تھا اُس کا۔

''سید سرفراز علی! کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ زبردستی کا بندھن آئندہ دنوں میں مسکان کی خوشی کا باعث بنے گا۔'' نفیسہ بیگم نے خدشے کا اظہار کیا۔

''ہاں! وہ اِس سے پیار کرے گا! آخر مسکان میں کیا کمی ہے؟ کوئی خرابی ہے کیا اِس میں؟'' سید سرفراز علی نے بے حد مطمئن لہجے میں جواب دیا۔

''مسکان کی ایک خرابی یہ ہے سید سرفراز علی! کہ وہ تمہاری بیٹی ہے اور آج تک اس کے لیے جو بُرا ہے وہ اِس لیے ہوا کہ وہ تمہاری اولاد ہونے کا خمیازہ بھگت رہی ہے اور تم پوچھتے ہو کہ مسکان میں کیا ہے ہونہہ! اُس کی قسمت کی کمی ہے کہ وہ دنیا میں تمہاری بیٹی بن کر آئی ہے۔'' نفیسہ بیگم نے غصّے سے کہا۔

''لو! پھر شروع ہوگئیں! بہت خر دماغ عورت ہو تم، ساری زندگی تم نے میرے خلاف محاذ بنائے رکھا کیا اِس جنگ کا فائدہ ہوا؟'' سید سرفراز علی نے بے تحاشا ہنستے ہوئے نفیسہ بیگم کا مذاق اڑایا۔

''آج تک سوائے ہار کے، تمہیں کچھ نصیب ہوا، تم کیوں نہیں اِس ہار کو مان لیتیں؟ حالاں کہ یہ آج سے بائیس سال پہلے تمہارے مقدر کا حصہ بن چکی تھی۔'' سید سرفراز علی نے نفیسہ بیگم کے تار چہرے کا مزہ لیتے ہوئے کہا۔ ان کو بے بس چہرے، خوف زدہ آنکھیں ہمیشہ سرور دیتی تھیں۔

''اچھا تم جلد از جلد مسکان کو ذہنی طور پر تیار کرو اور اُسے بتاؤ کہ اُس کے باپ نے قسمت کے ہوئے پہیے کو الٹا چلا دیا ہے اب خوشیاں اُس سے دور نہیں۔'' سید سرفراز علی نے چہکتے ہوئے کہا اور

کیا جب کہ نفیسہ بیگم کا چہرہ بے حد سرخ ہوگیا اور دل ابھی تک سید سرفراز علی کے ''ہار'' والے جملے پر ا رہا تھا۔

''کیا یہ ضروری ہے کہ ہار ہمیشہ میرا ہی مقدر ہو؟'' نفیسہ بیگم نے عجیب طرح مسکراتے ہوئے با آواز اور مڑ کر مسکان کو دیکھا۔ اُس کے ماتھے پر آئے بالوں کو انہوں نے بے حد پیار سے سمیٹا۔

''اس بار ہار تمہارا مقدر ہے سید سرفراز علی!''

وہ سوچ کر آپ ہی آپ مسکرائیں۔

❖❖○❖❖

''ہیلو!'' ولی نے گاڑی کا موڑ کاٹا، ساتھ ہی موبائل آن کیا۔ وہ کتنی دیر سے مسلسل سارے نمبرز اگنور تھا۔ وہ ذہنی طور پر اِس قدر پریشان تھا کہ اُس نے کسی قسم کی کال اٹینڈ نہ کی تھی لیکن احمد شاہ کی کالز کو وہ اگنور نہ کر سکا۔

''السلام علیکم بابا سائیں!'' ولی کا لہجہ بے حد بجھا ہوا تھا۔

''علیکم السلام! بیٹا جی آپ کہاں ہیں؟'' احمد شاہ نے بے حد فکرمندی سے پوچھا۔

ولی نے دکھ سے گہری سانس بھری، وہ کیا بتاتا کہ وہ کہاں ہے، وہ تو ایک ایسی منزل کی طرف گامزن تھا اپنی زندگی کی سب سے بڑی بازی ہارنے جا رہا تھا۔ دل کی بربادی زندگی کی سب سے بڑی ہار

''بابا سائیں! میں نگینہ کو لینے جا رہا ہوں۔'' ولی نے جواب دیا۔

''پاگل ہوگئے ہو کیا، وہاں تنہا کیوں جا رہے ہو اور کیا یہ شیور ہے کہ واقعی وہ ہماری بیٹی کو اغوا کر چکا ہے۔'' احمد شاہ نے ولی کو روکنا چاہا۔

''جی بابا سائیں! وہ قبول کر چکا ہے کہ اُس نے نگینہ کو اغوا کیا ہے، میں اُس سے بات کر چکا ہوں اور میرے لیے میری بہن سے بڑھ کر کوئی رشتہ نہیں۔'' ولی نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

''ولی بیٹا! تم رکو، اکیلے نہ جاؤ، وہ شخص کریمنل ہے اور ہرگز کوئی سودے بازی نہ کرنا۔'' احمد شاہ نے اسے روکنا چاہا۔

''بابا سائیں! میں نے ساری زندگی جب سے ہوش سنبھالا ہے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ آپ کا کہنا ۔ پلیز آج میری درخواست قبول کریں اور کوئی ایسا حکم نہ دیں جو میرے ظرف سے بڑھ کر ہو، ری اتنی عرصے کی تابع داری داؤ پر لگ جائے گی... میں اتنے بڑے خسارے کا سودا کرنے جا رہا کہ ماں باپ کی نافرمانی کے خسارے کا بوجھ اٹھانا میرے لیے بہت تکلیف دہ ہوگا!'' ولی کے لہجے ت تھی۔ احمد شاہ تو تڑپ ہی اٹھے۔

''بیٹا! مجھے ہمیشہ تم پر ناز رہا ہے، تم میرا فخر ہو، تم ہمیشہ میرے تابع دار رہے ہو لیکن پلیز تم وہاں اکیلے ۔'' احمد شاہ نے بے حد فکرمندی سے کہا۔

''بابا جان! آپ ہمارے لیے دعا کیجیے گا کہ میں اور نگینہ خیر و عافیت سے آپ کے پاس آ جائیں، سل آپ سے رابطے میں رہوں گا۔'' ولی نے باپ کو تسلی دی۔

’’ولی! تم کنویں میں چھلانگ لگانے جارہے ہو، اُس لڑکی سے رشتہ بنا تو لوگے لیکن نبھاؤ گے؟‘‘ احمد شاہ نے ولی کو دوسری جانب سے گھیر کر روکنے کی کوشش کی۔

’’اللہ مالک ہے! اس وقت نگینہ کی زندگی سے اہم کوئی چیز نہیں۔‘‘ ولی نے کہا۔

’’اور علیزے! وہ کیا کہے گی! اُس کے تم جواب دہ ہو!‘‘ احمد شاہ نے پوچھا۔

’’بابا جان! پلیز دعا کیجیے گا۔‘‘ ولی نے اُن کے سوال سے کنی کترا کر کہا اور فون بند کردیا۔ اس نے فون بند ہی کیا تھا کہ علیزے کا نمبر سیل پر جگمگانے لگا۔

ولی نے ایک دم ہی فیصلہ کیا کہ بجائے کال اگنور کرنے کے اُسے بات کرنی چاہیے۔

’’السلام علیکم!‘‘ ولی نے فون آن کرکے سنجیدگی سے کہا۔

’’کیسی سلامتی اور کیسی خیر و عافیت! تمہاری غیر موجودگی نے ہمیں کیسی مشکل میں لا کھڑا کیا ہے، اندازہ ہے تمہیں ولی؟‘‘ حسن آرا بیگم نے چھوٹتے ہی کہا۔ اُن کے تو من کو لگی ہوئی تھی اسی لیے اُن کے لہجے میں انگارے دہک رہے تھے۔

’’حسن خالہ! میں واقعی آپ کا قصوروار ہوں، مجھے معاف کردیں، میں مجبور ہوں!‘‘ ولی نے عاجزی سے التجا کی۔

’’تمہاری مجبوری نے میرے شوہر کو موت کی دہلیز پر دوبارہ لا کھڑا کیا ہے اور اگر آج تم نہ پہنچے تو علیزے کا نکاح کسی سے بھی کردوں گی، چاہے وہ کوئی ایرا غیرا ہو۔ تم نے ایک بار بھی سوچا کہ ایک دلہن بنی اپنے باراتی اور دولہے کا انتظار کررہی ہو اور دلہا اچانک غائب ہوجائے، لاکھ دولہے کی غلطی ہو لیکن بدنامی تو لڑکی کے کھاتے میں تاعمر آجاتی ہے، تم غیر سنجیدہ تھے تو پہلے بتاتے۔‘‘ حسن آرا نے غصے سے چلا کر کہا۔

’’حسن خالہ! پلیز ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں مجبور تھا اور میری مجبوری سن لیں، سنیں گی تو آپ مان جائیں گی کہ میں غلط نہیں ہوں۔‘‘ ولی نے بہ مشکل اُن کو ٹوک کر اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کی کوشش کی۔

’’ولی! مجھے تمہاری کوئی مجبوری نہیں سننی، تم کو میں دو گھنٹے دیتی ہوں فوراً پہنچو اور علیزے سے نکاح کرو۔ ورنہ میں اس کا نکاح کسی سے بھی کردوں گی اُس کا باپ اپنی بیٹی کی بدنامی کے خوف سے موت کے منہ میں جارہا ہے اور میں آج کا سورج ڈوبنے سے پہلے اپنی بیٹی کا نکاح کردوں گی کیوں کہ اگر آج کا دن نکل گیا تو یہ رات کی سیاہی نہ ہوگی بلکہ اُس کے مقدر کی سیاہی بن جائے گی اِس لیے میں سورج کے ڈوبنے سے پہلے اپنی بچی کے مقدر کو بچاؤں گی۔ تم نہ آئے تو سمجھ لینا کہ ہم سب تمہارے لیے مرچکے اور مرے ہوئے لوگ کوئی رشتہ نہیں نبھاتے ہیں۔‘‘ حسن آرا بیگم نے کہہ کر فون بند کردیا۔ آج وہ کچھ بھی سننے کے لیے آمادہ نہ تھیں۔

ولی نے ایک دم جھٹکے سے گاڑی روک دی، اُس نے ضبط کرنے کے لیے بے اختیار لب کاٹے۔ ساڑھے تین گھنٹے کا سفر وہ طے کرچکا تھا اور تقریباً دو ڈھائی گھنٹے کا سفر مزید باقی تھا۔

وہ بہت آگے نکل آیا تھا۔ واپسی تو ویسے بھی ناممکن تھی وہ خود تو اِس منجدھار میں کھڑا تھا کیا وہ نگینہ کو بھی بیچ راہ میں چھوڑ دیتا، تاکہ اُس کی ماں اُس کی زندگی کے ساتھ کوئی بھی کھیل کھیل جائیں۔

...ں کرسکتا، وہ تو علیزے سے محبت کرتا تھا اور محبت کرنے والے کانٹوں میں گھسیٹتے نہیں بلکہ راہ کے ...ُن لیتے ہیں چاہے بدلے میں اُن کے ہاتھ لہولہان ہوجائیں۔ ولی نے بھی ایک فیصلہ کیا تھا کہ ...ے اور اُس کی زندگی کو کانٹوں میں الجھنے نہ دے گا۔

...ہ نے بہت سوچ سمجھ کر ایک نمبر ملایا۔ آج یہ نمبر وقت پر نہ ملا تو اُسے تاعمر علیزے سے دستبردار ...ا تھا۔

...بر مل گیا تھا دوسری جانب بیل جارہی تھی۔

❖❖○❖❖

...ھوڑ دو... مجھے چھوڑ دو!‘‘ سارا وقت یہ آوازیں ترنم اور ماہی کو ڈسٹرب کرتی رہی تھیں۔ جب مارک ...ے چلا گیا تھا تو ترنم کے ساتھ ماہی بھی اُس اغوا شدہ لڑکی کو دیکھنے اُس کے کمرے میں آئی تھی۔

...کیا ہم اِس لڑکی کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکتے؟‘‘ ترنم نے دروازے پر پہنچ کر ماہی سے پوچھا۔

...م جانتی ہو کہ اس پنجرے سے نکلنا ناممکن ہے۔‘‘ ماہی نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

...تو کیا اِس طرح ایک اور لڑکی کی زندگی تباہ ہونے دیں؟‘‘ ترنم نے سلگ کر پوچھا۔

...اس کی زندگی کے لیے ہم میں سے کسی کی زندگی کا داؤ پر لگنا ضروری ہے۔‘‘ ماہی نے صاف لفظوں ...اور ہینڈل پر دباؤ ڈال کر دروازہ کھولا۔

...منے جو لڑکی بکھری ہوئی حالت میں نظر آئی تھی اُسے دیکھ کر ان کو بہت زور دار جھٹکا لگا۔

...نگینہ! تم...؟‘‘ ترنم نے بے حد دُکھ سے خشک ہوتے گلے کے ساتھ حیرت سے پوچھا۔

...کو بہت عرصے بعد ایک بار پھر ساری کائنات گھومتی محسوس ہوئی، بے بسی، دکھ، خوف اور کسی ...کی تکلیف کا احساس اُسے اندر تک سے کاٹ رہا تھا۔

...ینہ چندا تم... تم یہاں کیسے؟‘‘ ماہی تڑپ کر نگینہ کے پاس آئی۔ نگینہ کالج میں اُن کی بہترین ...ں میں رہی تھی ماہی ہمیشہ اُسے پسند کرتی آئی تھی۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ نگی جیسی بے حد ...اور پاکیزہ لڑکی مارک کے ہاتھ لگ سکتی ہے۔

...نے پہلے اُن دونوں کو سہمی سہمی نظروں سے دیکھا، چند پَل اُس کی نظروں میں پہچان کی رمق باقی ...ن جیسے ہی اُس نے ماہی اور ترنم کو پہچانا، وہ لپک کر ماہی کے گلے جالگی۔

...ہم... مجھے بچالو! میں، گھر... مجھے گھر جانا ہے۔‘‘ نگی نے بلک بلک کر روتے ہوئے کہا۔

...ہوں نے تمہارے ساتھ.... میرا مطلب ہے تمہارے ساتھ کچھ کیا تو نہیں؟‘‘ ماہی نے اٹک اٹک ...چھا۔

...جاننا چاہ رہی تھی کہ نقصان کس حد تک ہوچکا ہے، نگی نے روتے ہوئے اپنی کلائیاں سامنے کردیں ...گریٹ سے داغا گیا تھا۔

...کو جہاں نگی کی جلی ہوئی کلائیاں دیکھ کر دُکھ ہوا، وہیں اُسے ایک دم سکون میسّر ہوا کہ صرف ...ں ہی داغ دار ہوئی تھیں، نگی کی روح ابھی داغ دار ہونے سے بچ گئی تھی۔ لیکن کب تک؟ یہ تو ...ے کا اپنا ہی ٹھکانا تھا وہ کبھی بھی کسی بھی وقت نگی کا بہت بڑا نقصان کرسکتا تھا اُن کو اگر نگی کو بچانا تھا

تو ہر صورت ابھی سے کچھ کرنا تھا۔

ترنم نے بے اختیار نظروں ہی نظروں میں ماہی سے سوال کیا جو نگی کو گلے لگائے چپ کروانے کی کوشش کر رہی تھی۔

نگی روتے روتے بے ہوش ہو چکی تھی۔

"ترنم! ہمیں اِسے بچانا ہوگا۔" ماہی نے دھیمی آواز میں کہا۔

ترنم نے لب کچل کر اثبات میں سر ہلایا۔

ماہی ٹھیک کہتی تھی کہ انہیں نگی کی زندگی بچانے کے لیے اپنی زندگی کو داؤ پر لگانا ہوگا اور وہ نگی کی خا کچھ بھی کرنے کو تیار کھڑی تھیں۔

❖❖○❖❖

"بڑے بھیا! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" عبداللہ نے ولی کی بات سُن کر اٹک اٹک کر کہا۔

"دیکھو! تم نے کہا تھا کہ تم اُسی لڑکی سے شادی کرو گے، جو مجھے پسند ہوگی اب تم کیوں انکار کر ہو؟" ولی نے سوال کیا۔

"استغفراللہ! میں نے کب انکار کیا؟ اور بڑے بھیا! میں نے تو صرف اتنا کہا ہے کہ علیزے بھا کیوں! وہ تو آپ کی محبت ہیں پھر کیا وہ خود مان جائیں گی؟" عبداللہ نے حیرانی و پریشانی سے سوال

"اُس کے پاس چوائس نہیں ہے! مجھے معلوم ہے کہ وہ بہت دُکھی ہو جائے گی لیکن مجھے یہ بھی م ہے کہ تم اُس کے سارے ملال دھو دو گے۔" ولی نے ٹوٹتے لہجے میں کہا۔

"لیکن میں ہی کیوں؟" عبداللہ نے پوچھا۔

ولی نے بے اختیار گہرا سانس بھرا۔

"تم جب آسٹریلیا میں مسلسل مجھ سے اصرار کر رہے تھے کہ تم صرف میری پسند کی ہوئی لڑکی سے شادی کرو گے تو میرے دل میں خیال آیا تھا کہ تم اتنے بہترین انسان ہو تو کیوں نہ تم باقاعدہ ہماری کا حصہ بن جاؤ، میں نے نگینہ کے لیے تمہارا سوچا تھا۔ نگینہ مجھے بہت عزیز ہے اُس کے لیے میں ہ بہترین سوچتا اور چاہتا ہوں۔ نگینہ کے لیے آج تک طارق جو میرا بہترین دوست ہے اُس کا انتخ ذہن میں آتا تھا یا پھر اب تمہارا...

تم جو مجھے بہت عزیز ہو گئے ہو! مجھے تم پر یقین ہے کہ تم کسی بھی فرد کے لیے آسودگی اور خوشی کا با بن سکتے ہو اِس لیے میں نے علیزے کی خوشیوں کے لیے تم کو منتخب کیا ہے۔ کیا میں تسلی رکھوں کہ تم ا قول سے نہیں پھرے اور میری پسند کی ہوئی لڑکی سے ہی شادی کرو گے۔" ولی نے بے چینی سے پوچ

"میں اپنے قول سے نہیں پھرا!" عبداللہ نے سرنڈر کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر پلیز تم جلد از جلد حُسن خالہ کے پاس پہنچو، میں اُن کا ایڈریس تم کو سینڈ کر دیتا ہوں تم اُن مل کر بتاؤ کہ میں نگی کی وجہ سے مجبور ہوں، ساری بات کلیئر کر کے تم اپنا پرپوزل آنٹی کے ذریعے دو وہ کوئی غلط فیصلہ کرنے سے رک جائیں، تم میرے بعد علیزے کے لیے بہترین انتخاب ہو، اور میر بھائی دِل میں ملال لائے بغیر جان لو کہ علیزے بھی تمہارے لیے بہترین انتخاب ثابت ہوگی وہ

یت سادہ دِل اور پاکیزہ لڑکی ہے کوئی بھی اُس کو اپنی شریک زندگی بنا کر فخر محسوس کر سکتا ہے۔" ولی نے اللہ کا کوئی بھی متوقع وسوسہ ختم کرنے کے لیے کہا۔

"بڑے بھیا! مجھے آپ پر اعتبار ہے، مجھے خوشی ہوگی کہ میں آپ کے کام آیا، آپ کے اعتبار کے ل ہوا۔" عبداللہ نے بے حد سچائی سے کہا۔

"ٹھیک ہے پیارے بھائی! اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے، تم نے واقعی ایک بھائی ہونے کا ثبوت دیا۔" ولی نے کہا۔

"اچھا میں فون بند کرتا ہوں، اللہ حافظ!" ولی نے اُسے کہہ کر فون بند کر دیا اور گاڑی کی سیٹ سے سر ا کر آنکھیں بند کر لیں۔

اُس کے اپنے کانوں میں اپنی ہی آواز کسی بازگشت کی طرح گونجی۔

"یار میرے! مِس علیزے کا نکاح عبداللہ کی غیر موجودگی میں ہرگز نہ ہوگا۔ تُو ہوگا تو نکاح ہوگا۔" ولی نے ٹھنڈی سانس بھری، اُسے اپنی ماں کی بات یاد آ گئی تھی کہ لفظ اور جملے ہمیشہ سوچ سمجھ کر منہ سے لنے چاہئیں جانے کون سی گھڑی قبولیت کی ہو۔

ولی کو اپنی کہی بات یاد آئی تھی جب اُس نے آسٹریلیا سے چلنے سے پہلے کہا تھا کہ یار عبداللہ تُو تو لہے کی طرح وی آئی پی ہو گیا ہے، تیرے بغیر مِس علیزے کو میں مسز نہیں بننے دوں گا۔

واقعی یار عبداللہ! تُو تو دولہے ہی کی طرح وی آئی پی ہو گیا ہے۔"

ولی نے اپنی نم آنکھیں جھپک جھپک کر صاف کیں اور گاڑی ایک بار پھر سے اسٹارٹ کر کے سفر روع کیا۔

❖❖○❖❖

چھونے سے قبل رنگ کے پیکر پگھل گئے
مٹھی میں آ نہ پائے کہ جگنو نکل گئے
پھیلے ہوئے تھے جاگتی نیندوں کے سلسلے
آنکھیں کھلیں تو رات کے منظر بدل گئے
کب حدتِ گلاب پہ حرف آنے پائے گا
تتلی کے پَر اُڑان کی گرمی سے جل گئے
آگے تو صرف ریت کے دریا دکھائی دیں
کن بستیوں کی سمت مسافر نکل گئے

"یہ سب کیا ہے ولی! آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔" علیزے نے سسکتے ہوئے ولی سے سوال کیا۔

وہ سید سرفراز علی کے گاؤں سے آدھے پونے گھنٹے کے فاصلے پر تھا، جب علیزے کا روتے ہوئے فون آیا۔

"یہ سب کچھ میں نہیں چاہتا تھا علیزے! یہ تم بھی جانتی ہو۔" ولی نے بے حد پشیمانی سے ماتھا مسلتے

ہوئے کہا۔

جب آپ کا دل تسلی سے محروم ہو تو آپ کسی اور کو بھی تسلی نہیں دے سکتے، ولی کا دِل بھی پھوڑے کی مانند دُکھ رہا تھا وہ علیزے کو کیسے تسلی دیتا۔

"لیکن! مجھے یہ قبول نہیں ہے۔" علیزے نے پہلی بار اونچی آواز میں بات کی۔

"ہمیں بعض اوقات جو چیزیں اور رشتے ناپسند ہوتے ہیں پھر بھی قبول کرنا پڑتے ہیں کیوں کہ وہ ہماری قسمت میں لکھ دیے جاتے ہیں اور علیزے یہ ہماری قسمت ہے اسے ہمیں قبول کرنا ہوگا کیوں کہ قسمتیں تو اللہ جی Design کرتے ہیں، ہمیں اِن کو خوش دلی سے قبول کرنا چاہیے۔" ولی نے بہت سبھاؤ سے علیزے کو قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کے اپنے دل کا ملال علیزے کے دُکھ کو بڑھا دے۔

"ولی! میں نے صرف آپ کو چاہا ہے۔" علیزے بلک بلک کر رو رہی تھی۔

ولی کو لگا اُس کا ضبط علیزے کے آنسوؤں میں بہہ جائے گا۔

"اگر تم نے مجھے چاہا ہے تو میری مجبوری بھی سمجھو، میری بہن اور تمہاری کزن کی زندگی صرف میری وجہ سے داؤ پر لگی ہوئی ہے، کیا ہم اتنے سیلفش ہو سکتے ہیں کہ اپنی خوشیوں کی خاطر اپنی بہن کو تباہ کردیں۔" ولی نے اُسے بہت رسان سے سمجھایا۔

"ولی! پلیز ولی! میں آپ کا انتظار کرلوں گی، آپ امی کو کسی طرح روک لیں۔" علیزے نے منت کی تو خود ولی کا دل پسیج گیا۔ اُس نے بے اختیار اپنا ماتھا مسلا۔

"انتظار! علیزے میں کیسے تم کو انتظار کرنے کے لیے کہوں... میں تو خود اتنا Uncertain ہو رہا ہوں، کیسے تم کو کوئی یقین دے سکتا ہوں اپنے لیے میں تمہاری زندگی کو کیوں برباد کروں، میرا کوئی حق نہیں ہے۔" ولی نے دِل توڑنے کی حد تک سرد لہجے میں کہا۔

"اور یہی حسن خالہ کا بھی خیال ہے۔" اس بار ولی کا لہجہ مدھم تھا۔

"حق...؟"

"کیا ہمارا رشتہ اتنا کم زور تھا کہ ہم ایک دوسرے پر حق جتا نہیں سکتے۔" علیزے نے تڑپ کر پوچھا۔

"علیزے پلیز! تم بات کو سمجھو تو سہی!" ولی نے غصے سے کہا۔

"میری بہن نگینہ کی زندگی کی قیمت ایک دوسری لڑکی کے ساتھ شادی ہے اور وہ ایک سر پھرے اور طاقت ور انسان کی بیٹی ہے جس کا مستقبل محفوظ کرنے کے لیے اُس نے اپنی شرائط پر مبنی نکاح نامہ Design کروایا ہے، وہ کہاں برداشت کرے گا کہ کوئی اور لڑکی میری زندگی میں آئے، میں تم کو کوئی آس نہیں دلا سکتا لیکن دعا دیتا ہوں کہ تمہیں زندگی میں اتنی خوشیاں ملیں کہ تمہارے سارے ملال ڈھل جائیں۔" ولی نے دعا دی۔

"آپ نہ ملے تو خوشیاں کیسے ملیں گی؟" علیزے نے تڑپ کر ہچکیوں کے ساتھ روتے ہوئے کہا۔

ولی کا ضبط بھی ٹوٹ گیا تھا وہ گاڑی چلاتے ہوئے ایک بار پھر رک گیا اُس کے منہ سے بھی ایک دم سسکاری نکلی۔

"تم جو قریب ہوتیں تو!
تمہیں گلے لگا لیتا...
تمہارے آنسوؤں کو اپنی پوروں پر لے لیتا...
اور تمہارے دِل کی ساری کرچیاں چن کر
پیار سے جوڑ دیتا...
لیکن...
تم میرے کیوں پاس ہوتے؟

قریب تو وہ لوگ ہوتے ہیں نا، جن سے کوئی رشتہ ہوتا ہے! اور میں قسمت کی اِس شرارت پر بے بس ایسا ہوں میں تو یہ حق بھی کھو چکا ہوں کہ تمہارے نکلے آنسو ہی اپنے دل پر لے لیتا، اپنی پوروں پر محسوس کرلیتا!" ولی نے ٹوٹتے ضبط کے ساتھ کہا۔

علیزے کے رونے میں مزید تیزی آ گئی تھی۔

ولی کا سمجھانا اُسے وہ کچھ سمجھا نہ سکا تھا، جو وہ اُسے سمجھانا چاہ رہا تھا۔ لیکن ولی کا اظہار اُسے ایک دم بے شانت کر گیا تھا۔

محبت کا بچھڑنا اتنا تکلیف نہیں دیتا جتنا محبت کا ریجکٹ ہونا تکلیف دیتا ہے، ولی کا اظہار علیزے کو محسوس کروا گیا تھا کہ وہ بدلا نہ تھا۔

"سنو لڑکی!" ولی نے اپنے آنسو پیتے ہوئے اُسے پکارا۔

"جی!" علیزے نے سوں سوں کرتے پوچھا۔

"تم عبداللہ ہی سے شادی کرنا، میں چاہتا ہوں کہ تم ایسے شخص کے پاس رہو، جو تمہیں سینت سینت کر بہت پیار اور خیال سے رکھے اور وہ ایسا ہی ہے۔" ولی نے علیزے سے کہا۔

"لیکن وہ آپ نہ ہوں گے!" علیزے کے لہجے میں اِس بار تڑپ ضرور تھی لیکن آمادگی بھی موجود تھی۔

"اور ایک وعدہ کرو کبھی روؤ گی نہیں، ہمیشہ زندگی کو انجوائے کرو گی!" ولی نے اچھے دوستوں کی طرح کہا۔

"اب آپ جدا کر کے زبردستی خوش رہنے کی گارنٹی بھی مانگیں گے؟" علیزے نے ٹوٹے کانچ جیسی ہنسی ہنستے ہوئے پوچھا۔

"تم مجھے بہت عزیز ہو اور ہمیشہ رہو گی، رشتہ بدلنے کے باوجود ہمیشہ تمہارے لیے دعا گو رہوں گا۔"

"ولی! سنیں، ابھی فون بند نہیں کیجیے گا!" علیزے نے ایک دم فرمائش کی۔

ولی پوچھ نہ سکا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہی ہے۔

"میں آپ کو چند پَل جی بھر کر محسوس کرنا چاہتی ہوں!" علیزے نے دِل ہی دِل میں کہا۔

"ولی! میں آپ کو ہمیشہ مِس کروں گی!" اس بار بھی اُس نے یہ ولی سے نہ کہا۔ دوسری جانب ولی فون پر کان لگائے گاڑی اسٹارٹ کر رہا تھا۔

"او کے اللہ حافظ!" علیزے کی آواز آئی۔

"اللہ حافظ! پلیز اپنا خیال رکھیے گا۔" پھر اُس نے فون بند کر دیا۔

ولی نے بے اختیار سانس بھرنے کی کوشش کی لیکن اُسے ایک دم آکسیجن کی کمی کا احساس ہوا۔

❖❖○❖❖

میں دھڑکن ہوں
اور اپنا سینہ توڑ کے اُس کے دِل میں سمانا چاہتی ہوں جو میری حدوں سے باہر ہے
میں دھرتی ہوں
بادل کے لیے آغوش کشا
اور دھوپ میں جلتی رہتی ہوں
میں پچھلی رات کا سپنا ہوں
اور جاگنے والی آنکھوں سے
ہونے کی گواہی مانگتی ہوں
میں شام ازل کی تنہائی
انجان کسک مرے تن من میں
اور خوف کے سائے دُور افق تک لرزاں ہیں
میں کون سی رُت میں زندہ ہوں
میں کون سی رُت میں زندہ ہوں!

"آیا لتاں! مجھے یقین نہیں آرہا۔" مسکان نے معصومیت سے کہا۔

آیا لتاں پھیکی سی ہنسی ہنسی اور بڑھ کر مسکان کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

"یہ ہونے جارہا ہے! لیکن یہ کیسے ہورہا ہے یہ نہ پوچھنا!" آیا لتاں نے اُس کے ماتھے پر آئی لٹوں کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

"آیا لتاں! میں نے اُسے بہت چاہا تھا، بہت مانگا تھا۔" مسکان نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

وہ مرجھا کر رہ گئی تھی اُس کے چہرے کی ازلی شگفتگی ختم ہوگئی تھی اتنی بیماری اور اعصابی جنگ کے بعد وہ بالکل کم زور ہوگئی تھی۔

پہلے جو اُس کی آنکھیں ہر وقت قمقموں کی طرح روشن رہتی تھیں اب بجھی بجھی، بنا چمک کے تھیں لیکن اتنے عرصے بعد صرف ولی کے ذکر پر دوبارہ کچھ روشن ہوئی تھیں لیکن یہ جوت بھی اتنی کم تھی کہ آیا لتاں کو بے حد افسوس ہورہا تھا۔

مسکان نے اپنی زندگی کی ڈور ولی سے باندھی تھی اِسی لیے تو جب وہ اُس سے محبت کررہی تھی تو خوش اور صحت مند تھی۔ پھر اُس سے نفرت کرنے لگی تو قطرہ قطرہ پگھلنے لگی کیوں کہ وہ صرف تب ہی خوش رہ سکتی تھی جب وہ ولی سے محبت کرتی رہتی۔ اِس جنون کی راہ میں روک ٹوک اور بندشوں نے اُسے توڑا ضرور تھا لیکن وہ اُسے اُس کی بے خودی سے باہر نہ نکال سکی تھی۔

"تیری چاہت میں اِس قدر شدت تھی کہ اُس نے تقدیر کے بہاؤ کو بدل دیا ہے۔" آیا لتاں نے کہا۔

"میری دعا ہے کہ اب اِس شادی کے جو منفی اثرات ہیں، وہ بھی تیری محبت کی سچائی کی وجہ سے مثبت ہوجائیں کیوں کہ تُو تو خود بہت اچھی ہے۔" انہوں نے دِل میں سوچا۔

"آیا لتاں! وہ اب بھی اُس لڑکی کو چاہتا ہے؟" مسکان نے سوال کیا۔

"ہاں!" آیا لتاں نے اُسے پہلے ہی بتادینا بہتر سمجھا تاکہ وہ آئندہ کسی مزید صدمے سے نڈھال نہ ہوجائے۔

"تو پھر اب وہ میرے لیے کیوں آرہا ہے؟" مسکان نے معصومیت سے پوچھا۔

"مجبور ہوکر۔" آیا لتاں نے آدھی بات کرکے خاموش رہنا بہتر جانا۔

"اُسے کیا مجبوری ہوگئی؟ آپ ہی تو کہتی تھیں کہ مجبوری کے رشتے کبھی مضبوط نہیں ہوتے۔" مسکان نے بہ غور اُن کو دیکھتے پوچھا۔

پہلے اور اب والی مسکان میں زمین آسمان کا فرق آچکا تھا۔

پہلے والی مسکان "ناممکن" پر غصہ کرتی تھی اُس پر ضد کرتی تھی، بے صبری تھی جب کہ اب کی مسکان ناپسندیدگی کی بات پر بھی تحمل سے بات کرتی تھی۔ اُس کے اندر ضد اور غصہ دم توڑ چکے تھے وہ اب صابر ہوگئی تھی وہ بالکل بدل کر رہ گئی تھی۔

"وہ تیری محبت کی شدت سے مجبور ہوکر آرہا ہے یہ تیری راتوں کو تڑپ تڑپ کر اُٹھ اُٹھ کر ہوئیں دعائیں ہیں جس کی وجہ سے تیری محبت قسمت کی لکیروں سے لڑکر اُسے یہاں آنے پر مجبور کررہی ہے۔" آیا لتاں نے کسی حد تک سچائی کہی تھی۔

"لیکن بیٹا! اُس کی مجبوری کو تُو اپنی محبت سے رضا میں بدل دینا۔ ہوسکتا ہے وہ پہلے جیسا ولی نہ ہو، اُسے تم پر بہت غصہ آتا ہو، وہ تم کو اہمیت دینے سے انکار کرے گا، یہ سب کچھ ہوسکتا ہے لیکن تم اپنے اللہ اور اپنی محبت پر یقین رکھنا، اگر وہ کسی معجزے کی طرح تیرا ہونے جارہا ہے تو یقیناً اللہ نے اُسے تیرے ہی لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ اب تمہیں اپنی جگہ اللہ کی مدد سے اور اپنی محبت سے حاصل کرنی ہوگی۔" آیا لتاں نے اُس کا حوصلہ بڑھایا۔

"آیا لتاں! اللہ نے میری پہلے کیوں نہ سنی، مجھے اتنا درد اور آنسو کیوں دیے اگر اُسے میری دعا قبول کرنی تھی تو پہلے کیوں نہیں کی، میں احساس کم تری اور کم اعتمادی کی اِس دلدل میں نہ پھنستی!" مسکان نے شکوہ کیا۔

"وہ اللہ ہے نا! اس کائنات کو ازل سے چلا رہا ہے، وہ بہتر جانتا ہے کہ کون سی چیز کا وقت کون سا بہتر ہے، بہترین ہے! وہ جو کرتا ہے، بہترین کرتا ہے کیوں کہ وہ مکمل ہے، وہ کبھی کم کر ہی نہیں سکتا۔" آیا لتاں نے بے حد مضبوط اور ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

"بہت سال پہلے میں بھی بے یقینی کی دلدل میں دھنسی تھی مجھے بھی شکووں نے توڑ ڈالا تھا لیکن تب جتنا میں خود پر زیادتی کو سوچتی اور جتنا میں شکوہ کرتی بے سکونی میں گھرتی جاتی تھی۔

لیکن جب میں نے شکوہ کرنا چھوڑ دیا تو اُس نے مجھے سکون بھی عطا کردیا اور مجھے یقین ہے کہ میرے آنسو رائیگاں نہیں جائیں گے اور ظالم کی رسی ہمیشہ دراز نہیں رہے گی۔" آیا لتاں نے کھوئے کھوئے لہجے

میں کہا۔

''تو کیا اللہ مجھے بھی سکون اور ولی کی محبت دے دیں گے؟'' مسکان نے پوچھا۔

''جب اُس نے نہیں دینی تھی تو تجھے لاکھ تڑپنے پر کچھ نہ ملا! اب وہ دینا چاہتا ہے اِسی لیے تُو قسمت کا پہیہ الٹا چلا ہے ورنہ تیرے باپ کو تو سب سے زیادہ زمین پیاری تھی اور غیر خاندان میں لڑکی بیاہنے پر کبھی راضی نہ ہوتا۔ لیکن بلال کی موت نے اُس کو تم سے دوبارہ اس طرح قریب کر دیا کہ وہ تمہاری خوشیوں کے لیے جنونی ہوگیا ہے دِل، قسمتیں، تقدیریں سب اللہ بدل دیتا ہے تم بھی بس ہمیشہ اللہ کا بھروسا پکڑے رکھنا۔'' آیا اماں نے پیار سے کہہ کر اُس کے سامنے شادی کا لباس پھیلا دیا۔

''واہ! کس قدر خوب صورت ہے نا!'' مسکان نے جوڑے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ تمہاری ماں نے تمہارے لیے رکھا ہوا تھا۔'' آیا اماں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ وہ شاید ماضی میں کھوئی ہوئی تھیں۔

''یہ میری امی کا ویڈنگ ڈریس ہے کیا؟'' مسکان نے پیار سے جوڑے کو چھوا۔

''نہیں! یہ ایک بہت نیک بخت عورت کا جوڑا ہے، جس کے متعلق تمہاری ماں کا خیال تھا وہ اللہ کی بہت منظورِ نظر تھی، جیسے تیرے باپ کا بھی پیار ملا تھا۔'' آیا اماں نے دھیرے سے راز سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''مطلب؟'' مسکان سمجھ نہ پائی کہ اُس کی ماں کو وہ عورت کیوں محبوب تھی، جو اُن کے شوہر کے دل میں بستی تھی، بجائے اُس سے حسد کرنے کے وہ اُس کی ماں کو کیوں عزیز تھی۔

''تیری ماں جانتی تھی کہ وہ نیک بخت تھی اور اُس کا تو کوئی دوش بھی نہ تھا۔ ہاں لیکن وہ اُسے خوش قسمت ضرور تصور کرتی تھی! اِسی لیے اُس نے مرنے سے پہلے مجھ سے خواہش کی تھی کہ یہ جوڑا تجھے تیری شادی پر پہناؤں تاکہ تجھے بھی اپنے شوہر کی اتنی ہی زیادہ محبت اور قدر ملے جو، اِس جوڑے کی دلہن کو ملی تھی۔ میں جانے کیوں تیرے پہلے نکاح پر یہ جوڑا بھول گئی، شاید میں ذہنی طور پر اُس نکاح کے لیے آمادہ نہ تھی، تیری ماں اس جوڑے کو خوش قسمت سمجھتی تھی۔ تُو اس کو بے شک خوش قسمتی جان کر نہیں اپنی ماں کی خواہش جان کر پہن لینا۔'' آیا اماں نے اپنی نم آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

مسکان بھی کھوسی گئی تھی وہ بھی شاید اپنی ماں کے تصور کو محسوس کرنا چاہتی تھی۔

''تو اسے پہنے گی نا؟'' آیا اماں نے پوچھا۔

جواباً مسکان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تو اِسے پہن کر دیکھ، اگر کوئی کم زیادہ کرنا ہے تو درزن آئی بیٹھی ہے ٹھیک کر دے گی۔'' آیا اماں نے اُسے جوڑا پکڑاتے ہوئے کہا۔

مسکان جوڑا پکڑے ڈریسنگ روم میں گھس گئی۔ گئے دنوں میں سید سرفراز علی نے حویلی کو بالکل مختلف کر دیا تھا وہ جدید زمانے کی ہر ضرورت کو پورا کرتی تھی، باتھ رومز، ڈریسنگ رومز وغیرہ جدید طرز کے بنوائے گئے تھے۔

جب مسکان شادی کا جوڑا پہنے باہر آئی تو آیا اماں حیرت سے گنگ رہ گئیں! وہ جوڑا مسکان کے تن پر

اس طرح تھا جیسے اُس کے ہی ناپ کا بنا ہو۔ بنا ہار سنگار کے بھی وہ بہت موہنی لگ رہی تھی لیکن اِن سب سے بڑھ کر جو بات نمایاں تھی وہ یہ کہ وہ ہو بہو عائشہ بی بی جیسی لگ رہی تھی۔

''آیا اماں! آپ مجھے اُن کا نام بتائیں گی، جن کا یہ جوڑا ہے۔'' مسکان نے خود کو حیرت سے شیشے میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اُن کا نام عائشہ بی بی تھا۔'' آیا اماں نے مختصراً جواب دیا۔

''وہ کون تھیں اور میری امی کی کیا لگتی تھیں؟''

''وہ تمہاری امی کی جیٹھانی تھیں اور تمہارے بابا کی چچازاد بہن بھی تھیں۔'' آیا اماں نے کہا۔

''آپ نے پہلے کبھی نہیں بتایا!''

''ابھی میں نے تجھے بتایا تھا نا کہ ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔'' آیا اماں نے کہا۔

''اور ہاں تیرا نکاح ہو جائے تو میں تجھے یہ بھی بتاؤں گی کہ اِس جوڑے سے صرف تمہارا ہی نہیں ولی کا بھی تعلق ہے!'' آیا اماں نے دِل میں کہا۔

انہوں نے مسکان کو ایک بار پھر دیکھا، کچھ ہی منٹوں میں اُس کا چہرہ اور آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

''یا اللہ! مسکان پر اب کوئی اور آزمائش نہ ڈالنا۔'' انہوں نے بے اختیار دعا کی۔

❖❖○❖❖

اور اُس کی آنکھیں گواہ بنتیں
کہ آ اُداس سرزمیں پہ آؤ
یہاں جزیروں کی سرمئی شام کا سکون ہے
یہاں ستاروں کی چھاؤں، پھولوں کی دھوپ
لہروں کی نغمگی ہے اور اَن کہے اَن سنے
بہت سے حسیں خیالوں کی نرم خوشبو
جب اُس کے سانسوں کی ریشمی گھاس میں
ہوا بن کے تیر جاتی
تب اُس کے ہونٹوں پر ساحلوں کا گمان ہوتا
نہ اُس کی آنکھوں میں جھوٹ تھا
اور نہ اُس کی باتیں فریب آسا
جزیرہ آنکھیں تھیں
بات خوشبو تھی
ہونٹ ساحل
مگر یہ سب جیسے خواب سا تھا
میرے مقدر میں پانیوں کا سفر لکھا تھا

ملیزے نے ولی کی دی ہوئی وہ Painting جو اس نے منگنی کے وقت دی تھی، اُسے بہ غور دیکھا۔

آج بھی اُس Painting پر لکھے گئے لفظ جگمگا رہے تھے اُس پر علیزے کا بنا آدھا چہرہ اپنے سار
رنگوں کے ساتھ موجود تھا۔ پھر کیوں کہانی چلتے چلتے رُک گئی؟

کیوں وہ اختتام کی جانب نہ بڑھ سکی۔
تیری اور میری قسمتیں تو...
کیسی پکی سہیلیوں جیسی تھیں
ہاتھ تھامے...
کچے پکے رستوں پر چلتے انہوں نے یہ قسم کھائی تھی
کہ ہمیشہ ساتھ رہیں گے!
ہمیشہ ساتھ نبھائیں گے
لیکن!
ہم میں سے کس کی قسمت نے دغا دے دی
منزل کے قریب!
بیچ سمندر، بیچ راہ میں
ہاتھ چھوڑ دیا
ساتھ چھوڑ دیا!

علیزے منہ پر ہاتھ رکھ کر بلک بلک کر رو دی، اُسی پل کمرے کا دروازہ کھول کر غزالہ، حُسن آرا بیگم اور محلے کے ایک بزرگ حاجی صاحب نکاح خواں کے ساتھ داخل ہوئے۔

حُسن آرا بیگم نے جلدی سے آگے بڑھ کر اُس کے دوپٹے کا آنچل منہ کے آگے کر دیا۔

''علیزے انور آپ کو عبداللہ فیصل سے حق مہر بیس لاکھ اور دس تولے سونا قبول ہے۔'' نکاح خواں پوچھ رہا تھا۔

وہ دوسری بار پھر پوچھ رہا تھا۔

''علیزے انور آپ کو عبداللہ فیصل سے حق مہر بیس لاکھ، دس تولے سونا قبول ہے؟'' علیزے کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو تیزی سے بہنے لگے۔

حسن آرا بیگم نے علیزے کے کان کے پاس آ کر سرگوشی کی۔

''تیرا باپ ہسپتال میں تیری وجہ سے زندگی اور موت کی کش مکش میں ہے، دنیا کا کوئی علاج اُسے زندگی کی جانب کھینچ کر نہیں لا سکتا سوائے تیری اِس ہاں کے، بول دے علیزے! اور یہ رشتہ ولی نے بھیجا ہے اور ولی تیرے لیے بہترین ہی سوچتا ہے! علیزے ہاں کر!'' حسن آرا بیگم نے سرد لہجے میں کہا۔

''قبول ہے!'' علیزے نے بجھی بجھی آواز میں کہا۔

''مجھے قسمت کی یہ زیادتی، یہ ستم ظریفی قبول ہے!'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی، حُسن آرا بیگم نے نڈھال ہو کر اُسے گلے لگالیا۔

''مبارک ہو!

مبارک ہو! بہن جی آپ کو مبارک ہو۔ اللہ بچی کی قسمت اچھی کرے۔'' حاجی صاحب نے علیزے
سر پر ہاتھ رکھ کر کہا اور نکاح خواں کو لیے باہر نکل گئے جہاں دولہے کے ساتھ اُس کی والدہ بھی بیٹھی
اور بے حد خوش تھیں۔ اب نکاح خواں دولہے کو کلمے پڑھوا کر اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کو گواہ
دولہے کی منظوری لے رہے تھے۔

"مبارک ہو بہن جی!'' مریم بی بی نے آگے بڑھ کر حسن آرا کو گلے سے لگایا۔

"آپ کو بھی مبارک ہو!'' حسن آرا بیگم نے اپنی نم آنکھیں صاف کرتے کہا۔

کل تک اُن کے خواب و خیال میں نہ تھا کہ اُن کی بیٹی کی قسمت ایسے لڑکے کے ساتھ جڑ جائے گی جو
زندگی میں پہلی بار پاکستان آیا تھا جن کو انہوں نے نکاح سے کچھ دیر پہلے پہلی بار دیکھا تھا جس کو
طرح جانتی تک نہ تھیں لیکن عبداللہ کی شفاف آنکھیں اور تابع دار لہجہ اُن کے بہت سارے وسوسے
گیا تھا۔

بے شک اپنے شوہر کی بیماری اور اپنی بہن سے رشتے داری چھٹنے پر پریشان تھیں لیکن علیزے کے
کی جانب سے مکمل مطمئن تھیں اُن کا دِل گواہی دے رہا تھا کہ یہ لوگ بہت اچھے ہیں تب ہی تو
نے اتنے کم عرصے میں فیصلہ لے لیا تھا اور علیزے کا ہاتھ اُن کو دے دیا تھا۔

"عبداللہ بیٹا! یہ شادی اتنی اچانک ہے کہ میں ٹھیک سے خوش بھی نہیں ہو پائی۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ ولی
ہے جس نے یہ رشتہ جھٹ پٹ کروایا۔'' مریم بی بی نے عبداللہ سے پوچھا۔

عبداللہ نے بہت ساری باتیں اپنی ماں سے چھپائی تھیں اور حقیقت کو کچھ اپنے رنگ پہنا کر اپنی ماں کو
کہ علیزے ولی کی خالہ زاد ہے اور اُس کے والد کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے اُن کی خواہش ہے کہ فوراً
بیٹی کا نکاح کروا دیا جائے اور چوں کہ ولی کا نکاح تو ہو رہا ہے اِس لیے وہ خود یہ قربانی نہیں دے
اور اِس اچھے کام کے لیے اُس نے عبداللہ سے درخواست کی ہے اور گارنٹی دی ہے کہ علیزے سے
لڑکی اُس کو نہیں ملے گی۔ پھر جب مریم بی بی علیزے سے ملیں تو اُن کا دِل بھی بے حد مطمئن
ان کو چاند سے چہرے والی وہ بے حد حسین اور نازک لڑکی پہلی ہی نظر میں اِس قدر پیاری لگی کہ وہ
نہ سوچ سکیں اور فوراً ہاں کر دی۔

عبداللہ! بیٹا میں نے پوچھا ہے کہ ولی کہاں ہے؟ اور اُس کے والدین، مجھے اُن سے ملنا ہے۔''
نے بے چینی سے سوال کیا۔

ولی کی پہچان جاننے کے لیے ہر صورت جلد از جلد اُس کے والدین سے ملنا چاہتی تھیں۔

میرا ہی خون ہے! میرا دل گواہی دیتا ہے۔'' انہوں نے دل ہی دل میں کہا۔ جب سے وہ ولی
تھیں اُن کو پہلی ہی نظر میں جو اپنے بھائی کا احساس ملا تھا وہ اُسے اگنور نہ کر پائی تھیں۔

جان! ولی کی والدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اِس لیے وہ لوگ آ نہ سکے۔ انور انکل کی ضد کی وجہ
سے کا نکاح فوراً کیا، اِس لیے ہم لوگ اُن سب کا ویٹ نہیں کر سکتے تھے۔ میں آپ کو خود ملوا دوں
عبداللہ نے اُن کو تسلی دی۔

ں! میں اُن سب سے فوراً ملنا چاہتی ہوں اب تو تھوڑا سا بھی انتظار نہیں ہوتا۔'' مریم بی بی نے

لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔
''انشاء اللہ جلدی ملیں گے!'' عبداللہ نے ماں کو تسلی دی۔
''لیکن ولی بھائی خود کہاں ہیں؟'' عبداللہ نے خود سے سوال کیا۔

❖❖○❖❖

''نفیسہ بیگم! نفیسہ بیگم!'' سید سرفراز علی نے زنان خانے میں آ کر اُن کو پکارا۔
''میں نے کتنی بار کہا ہے کہ مجھے اس طرح نہ پکارا کرو!'' نفیسہ بیگم نے کچن سے باہر آتے ہوئے ا
وہ اِس وقت نگینہ کے لیے کھانا بنوا کر ٹرے میں رکھوا رہی تھیں، ملازمہ نے آ کر نفیسہ بیگم کو بتایا ک
لڑکی شاہ صاحب کے بندے چھوڑ گئے ہیں، اُس نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا اور وہ مسلسل رو رہی ہے
لیے نفیسہ بیگم نے سوچا کہ وہ نگینہ سے خود مل لیں تا کہ لڑکی کا خوف دور ہو جائے اور اُسے کچھ کھلا
دیں۔
''کیوں تم کو احساس ہوتا ہے کہ تم میری گھر والی ہو؟'' سید سرفراز کا موڈ اچھا تھا اِس لیے انہوں
نفیسہ بیگم سے شرارت کی تھی۔
''لاحول ولا! میری زندگی کا تو یہ دُکھ ہی سب سے بڑا ہے کہ تم، تمہارے جیسے خبیث انسان کے
میرا تعلق ہے!'' نفیسہ بیگم نے جل کر کہا۔
''تم کچھ بھی کر لو لیکن تم میری گھر والی ہونے سے انکار نہیں کر سکتیں۔'' سید سرفراز علی نے قہقہہ ل
اُسے تو دوسروں کو تکلیف دے کر ہمیشہ خوشی ہوتی تھی۔
''ہونہہ!'' نفیسہ بیگم نے ہنکارا بھرا۔
''اچھا چھوڑ! میں تم کو بتانے آیا تھا کہ ولی پہنچ گیا ہے میری ابھی ابھی اُس سے بات ہوئی ہے،
اُسے لینے جا رہا ہوں، آخر وہ میرا داماد ہے اور میرے پروٹوکول کا حق دار ہے۔'' سید سرفراز علی
رہے تھے۔
''سنو سرفراز علی!'' نفیسہ بیگم اُس گھڑی سے گھبرا گئیں، جس کا اُن کو خود شدت سے انتظار تھا۔
سید سرفراز علی نے رُک کر مڑ کر پوچھا۔
''تمہارے خاندان میں ایک رسم ہے تمہاری ہی ماں نے بتائی تھی کہ دولہے کو سہرا پہنایا جاتا۔
اُسے تب تک نہیں دیکھا جاتا جب تک نکاح نہ ہو جائے اور دولہا دولہن آرسی مصحف کی رسم میں
دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ اگر دولہے کا چہرہ کوئی اور پہلے دیکھے گا تو وہ بدشگونی ہو گی۔'' نفیسہ بیگم نے
جلدی بات بنائی اور یوں کہا کہ سید سرفراز علی کو ایک پل کے لیے بھی شک نہ گزرا کہ نفیسہ بیگم ا
لینے کے لیے جھوٹ بول رہی ہیں۔
''یہ کیسی رسم ہے اِس سے پہلے میں نے تو نہیں سنی؟'' سید سرفراز علی نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔
''یہ رسم ہے! اور تم لوگوں کے ہی خاندان کی ہے۔'' نفیسہ بیگم نے جان بوجھ کر بے نیازی دکھائ
سید سرفراز علی کو کسی قسم کا شک نہ گزرے۔
''اور اگر اِسے نہ مانا جائے تو؟''

''تو پھر دولہا یا دولہن میں سے کسی ایک کی موت جلدی ہو جاتی ہے اور جوڑی اَدھوری رہ جاتی ہے۔''
بیگم کی بات سن کر سید سرفراز علی کی ہنسی نکل گئی۔
''تم عورتیں دقیانوسی ہوتی ہو۔'' سید سرفراز علی نے نفیسہ بیگم کا مذاق اڑایا۔
''دقیانوسی!''
''ہونہہ! یہ لفظ میرے اوپر استعمال کرنے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو کہ کون دقیانوسی
تمہاری روایات، تم، یہ حویلی! کس کس کو اس لفظ سے بچاؤ گے؟'' نفیسہ بیگم نے ماتھے پر بل ڈال کر

''عورت خوشی کے موقعے پر بھی لڑنے سے باز نہیں آتی!'' سید سرفراز علی نے غصّے سے کہا۔
''اب تم کیا چاہتی ہو؟'' سید سرفراز علی نے پوچھا۔
''صرف اتنا کہ مسکان کو ترس ترس کر کوئی خوشی ملنے جا رہی ہے تم اِس کے لیے تھوڑا سا خیال کر لو تا کہ
ابھی کے ساتھ مزید بُرا نہ ہو۔'' نفیسہ بیگم نے سختی سے کہا۔
کتنا مشکل ہوتا ہے کسی ناپسندیدہ شخص کے ساتھ زندگی گزارنا اور اِس سے بھی زیادہ مشکل ہوتا ہے
سے اپنی بات کو منوانا۔
''اگر ہمارے ساتھ دھوکا ہو گیا تو!'' سید سرفراز علی خود ہمیشہ غلط سوچتا اور کرتا تھا اس لیے اُسے کسی
پے پر اعتبار نہ تھا۔
''کیسا دھوکا؟'' نفیسہ بیگم نے پوچھا۔
''کہ وہ کوئی اور ہوا یعنی ولی نہ ہوا، اُس کی جگہ کوئی اور بھی تو ہو سکتا ہے، ہم نے اُسے پہلے نہیں دیکھا،
ہاں مسکان کے باڈی گارڈز نے دیکھا ہے وہ اُسے پہچان لیں گے۔'' سید سرفراز علی اعتراض کرتے
ئے خود ہی اُس کا حل جان گئے۔
''چلو ٹھیک ہے میرے بندے مجھے بتا دیں گے کہ وہ ہی ٹھیک بندہ ہے، تم بندھوا دو اُسے سہرا!'' سید
علی مسکان کی خوشی کی خاطر مان گئے۔
''ہم پھر اُسے نکاح کے بعد ہی دیکھ لیں گے! تم مسکان کو تیار کروا دو، میں نے بہت اچھی بیوٹیشن
ہے وہ آتی ہی ہو گی۔''
سید سرفراز علی کے گاؤں سے پونے گھنٹے کے فاصلے پر شہر موجود تھا عموماً ہر طرح کی چیز اور سہولت اِس
سے حاصل کی جاتی تھی۔ سید سرفراز علی مسکان کو خوش کرنے کے لیے ہر کام کر رہا تھا۔ بلال کی موت
سے مسکان کی جانب دوبارہ دھکیلا تھا وہ ہر صورت مسکان کے نقصان کا خمیازہ ادا کرنا چاہ رہا تھا۔
''سنو سرفراز علی! ذرا تحمل اور نرمی سے بات کرنا وہ تمہارا داماد ہو گا۔ پھر تم نے اُس کی بہن کو اغوا کیا
ہے وہ غصّے میں بھی ہو گا۔'' نفیسہ بیگم نے اُن کو نصیحت کی۔
''ارے ہم نے اُس کی بہن کو پوری عزت و احترام سے گھر میں مہمان رکھا ہوا ہے، غصّہ کس بات
کا، وہ ہماری بات مان رہا ہے تو ہم اُس کو پوری عزت و احترام سے جانے بھی دیں گے۔'' سید
سرفراز علی نے بے نیازی سے کہا۔

''ہونہہ! زبردستی کا مہمان!'' نفیسہ بیگم نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔
''تم پھر شروع ہوگئیں! جاؤ اپنا کام کرو، مجھے جلدی ہے۔'' باہر نکلتے ہوئے انہوں نے کہا۔
سید سرفراز علی صرف مسکان کی خاطر نفیسہ بیگم کی اتنی باتیں سن رہے تھے یہ ایک بہت بڑی تبدیلی
ورنہ تو وہ صرف حکم دینا ہی جانتے تھے۔

❖❖○❖❖

''السلام علیکم انکل!'' طارق نے جیپ چلاتے چلاتے کہا۔
''وعلیکم السلام!'' احمد شاہ نے مرجھائے مرجھائے انداز میں جواب دیا۔
''انکل! میں نے سرچ وارنٹ اور گرفتاری کے وارنٹ نکلوا لیے ہیں اب میں سید سرفراز علی کے گا
کی جانب روانہ ہوں، میں بہت دیر سے آپ کا نمبر ٹرائی کر رہا تھا لیکن آپ کا نمبر بند پڑا تھا۔'' طا
نے کہا۔
''بیٹا! تمہارا خیال ہے کہ یوں ریڈ کرنا نگینہ کے لیے سیف ہوگا؟ سید سرفراز ایک کریمنل مائنڈا
ہے۔'' احمد شاہ نے کہا۔
''انکل میں جانتا ہوں، پھر نگینہ جتنی مجھے عزیز ہے میں بہت احتیاط کروں گا!'' طارق کا بے اختی
سے اظہار منہ سے نکلا۔
احمد شاہ بھی ذہنی طور پر پریشان تھے، ورنہ شاید وہ بھی نوٹس لیتے۔
''ٹھیک ہے بیٹا! اللہ کے سپرد، مجھ سے رابطے میں رہنا اور ولی کو منع کرو وہ کسی قسم کی سودے
سے رُک جائے۔'' احمد شاہ نے طارق سے اصرار کیا۔
''جی انکل! میں کوشش کروں گا کہ وہ باز آجائے ہم پہنچ ہی رہے ہیں۔'' طارق نے اُن کو تسلی دی
''اچھا انکل اللہ حافظ! دعا کرتے رہیے گا''
طارق نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

❖❖○❖❖

''سائیں! رحیم بخش کو ہوش آ گیا ہے اور وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے!'' ملازم جو رحیم بخش کے ساتھ
شاہ نے رکھا تھا اُس نے آ کر اطلاع دی۔
اتفاقاً روشن آرا بیگم بھی اِسی ہسپتال میں تھیں، اس لیے احمد شاہ کو پَل پَل کی خبر مل رہی تھی،
بخش کی جانب سے بھی بے فکر تھے۔
''اچھا! اُسے ہوش آ گیا؟ الحمدللہ!'' احمد شاہ ملازم کے ساتھ رحیم بخش کے کمرے کی جانب بڑھ
رحیم بخش نے جیسے ہی احمد شاہ کو دیکھا تو روتے ہوئے لرزتے ہاتھوں کو جوڑ دیا۔
''میم۔ مجھے معاف کر دیں! میں بٹی کو نہیں بچا پایا۔'' رحیم بخش کو اپنی جسمانی تکلیف سے زیا
تکلیف تھی کہ نگینہ کو وہ نہیں بچا پایا۔
''رحیم بخش! تم نے پوری کوشش کی تھی۔ تم تو اپنی جان پر بھی کھیل گئے، بس آزمائش آنی تم
کرو کہ یہ آزمائش اب ختم ہو جائے، تمہاری بی بی اور میں اِس آزمائش کے قابل نہیں۔'' احمد شا

لموں کے ساتھ کہا۔
''بٹی، کو، کس نے اغوا کیا؟'' رحیم بخش نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔ اُسے بولنے میں بے حد تکلیف
ہو رہی تھی۔
''سید سرفراز علی ہے اُس کا نام اور وہ اُدھر تمہارے گاؤں والے ایریا میں رہتا ہے، اپنی بیٹی کی وجہ سے
اس نے ہماری بیٹی کو اغوا کر ڈالا، کیسا باپ ہے؟'' احمد شاہ نے تاسف سے کہا۔ وہ اپنی بات کے دوران
رحیم بخش کے تاثرات نہ دیکھ سکے، جس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں۔
''کیا ہوا رحیم بخش! تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟'' احمد شاہ نے اُس کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھ کر
کہا۔
''سید۔ سرفراز علی!'' رحیم بخش کے ہونٹ پھڑ پھڑائے۔
''ہاں!'' احمد شاہ نے نہ سمجھنے والے انداز میں ہامی بھری۔
''وہ، وہ۔ تو عبدالولی اور نگینہ بٹی کا چاچا ہے شاہ جی! وہی چاچا، جس نے سید عبداللہ اور اُس کے
سارے خاندان کو جلا ڈالا تھا۔''
''شاہ جی! ولی بیٹا کو روکیں!!
روکیں اُن کو!!'' رحیم بخش کی سانس بے ترتیب ہونے لگی، احمد شاہ کو محسوس ہوا، جیسے ہسپتال کی عمارت
اُن پر آ گری ہو، یہ کیسی آزمائش تھی جس کے ساتھ مزید آزمائشوں کی کڑیاں تھیں۔
''یا اللہ!'' احمد شاہ نے بے اختیار سر تھاما۔
''لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔'' احمد شاہ نے کچھ سوچتے ہوئے خود کو تسلی دی۔
''آپ بھول رہے ہیں شاہ صاحب! آپ بھول رہے ہیں!'' رحیم بخش نے سر اِدھر اُدھر مارتے
ہوئے بے چینی سے کہا۔
''کیا؟'' احمد شاہ پریشانی سے رحیم بخش کو دیکھ رہے تھے۔
''یہی کہ... کہ ولی بیٹا کی شکل ہو بہو اپنے باپ جیسی ہے، اتنی مماثلت کہ... سید سرفراز علی جیسا گھاگ
ضرور اِس بات کو جاننے کی کوشش کرے گا کہ ولی کی پہچان کیا ہے، وہ ضرور ولی کو پہچان جائے گا۔
ولی کی ساری ادائیں اپنے باپ سے ملتی ہیں جو سید عبداللہ کے قریب رہ چکا ہوگا وہ فوراً سے جان
جائے گا کہ یہی اُن کا بیٹا ہے۔'' رحیم بخش اتنی بڑی بات کہہ کر ہانپ رہا تھا جب کہ خود احمد شاہ کا دِل بھی
ڈوبنے لگا تھا۔
اپنی اولاد بہت بڑی آزمائش ہے، مضبوط سے مضبوط اعصاب والے مالک انسان کو کم زور کر دیتی
خود احمد شاہ کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔
''یا اللہ مدد کر! رحم کر!'' ایک طرف بٹی اور دوسری جانب بیٹا دونوں ہی کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔
''اللہ رحمان! مدد کر!'' احمد شاہ نے ولی کو مسلسل فون ملاتے ہوئے دعا کی، اس بار وہ ہر صورت ولی کو
چاہتے تھے لیکن ولی کا فون مسلسل بند جا رہا تھا۔
احمد شاہ نے بے اختیار ماتھا پکڑا، زندگی بھی تو ایک دم سے بند گلی میں آن کھڑی ہوئی تھی۔

PAKISTANIPOINT
WWW.PAKISTANIPOINT.COM
پاکستانی پوائنٹ

اور سامنے کوئی راستہ نہ تھا۔

❖❖○❖❖

طارق نے اپنے موبائل کی اسکرین کو دیکھا جہاں مسلسل ایک نام آ رہا تھا۔

طارق کو حیرت ہوئی کہ ان کی تو ایک دوسرے کے ساتھ Commetment تھی کہ ابھی کچھ ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ نہیں کریں گے حالات بہتر ہونے پر مزید کارروائی کا آغاز کریں گے فون کیوں آ رہا تھا۔

طارق نے کچھ سوچتے ہوئے فون آن کیا۔

''جی!'' طارق نے محتاط انداز میں کہا۔

''طارق ایک بہت بڑی خبر ہے، مارک نے کل ایک اور لڑکی اغوا کی ہے۔'' ترنم کہہ رہی تھی۔

''ترنم! دیکھو اس وقت ہم کسی اور کیس کے لیے جا رہے ہیں اور میں اتنے زیادہ فاصلے پر ہوں نہیں آ سکتا اس کے علاوہ ہم میں Understanding ہوئی تھی کہ ہم ابھی بات نہیں کریں گے۔

''طارق! وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے۔'' ترنم کی آواز سرگوشی میں تھی۔

''ترنم پلیز! میں ابھی تمہاری بات نہیں سن سکتا، میں پرسنلی ایک کیس کے لیے مصروف ہوں۔'' نے کچھ زچ ہو کر جواب دیا۔

''طارق! وہ نگینہ ہے، نگی کو مارک نے اغوا کیا ہے اس کی زندگی اور آبرو خطرے میں ہے۔'' تر دھماکا کیا تھا۔

طارق کی گاڑی ایک جھٹکے سے رکی، ساتھ ہی اُس کے پیچھے آتی دو جیپیں بھی رکی تھیں۔

''کا...کیا؟'' طارق ایک دم چیخا۔

''نگی کو مارک نے اغوا کیا ہے؟''

طارق کے اِرد گرد دھماکے ہوئے تھے۔

❖❖○❖❖

پھر نئے خواب اُترنے لگے آنکھوں پہ مری
پھر مری جان سسکنے لگی تعبیروں کو
دل میں جو درد تھا، اب حد سے بڑھا جاتا ہے
آگ سینے میں جو تھی، آہ و فغاں تک پہنچی
چارۂ غم نہیں کچھ پاس، بجز حرفِ دعا
گریۂ شب میں جو آفاق کو چھو لیں
وہ حرف لڑیاں ہیں موتیوں کی
نذر گزاروں سرِ دربارِ قبول
اے خدا! تو میری تنہائی میں شامل یوں ہے
پھول جیسے سدا آباد رہے خوشبو سے

نے دیکھا ہے مرے اشکوں کا سیل بے حد
سے پوشیدہ نہیں شدتِ غم، شوقِ فزوں
تو ہی تو ہے ہم راز مرا، چارہ ساز!
نیازانہ نہ سن حرفِ دعا کو میرے
ترے در پہ زمانوں سے جھکی ہوں، مجھ کو
الطاف و کرم بخش دے، اتنا کہ میں پھر
ت بے وقت!
نالہ بے تاب سنا بھی نہ سکوں
در چھوڑ کے جا بھی نہ سکوں!

نے سجدے سے سر اٹھا کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے پھر دُعا مکمل کر کے وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنا چیک کیا، اُس میں موجود ریوالور پہلی بار جیب میں رکھا۔ اُسی پل ترنم اندر داخل ہوئی۔

ماہی! طارق تو دور ہے آنے میں وقت لگے گا، اب کیا کرنا ہے؟'' ترنم نے پھولی سانسوں کے اندر آتے ہوئے کہا۔

اب کچھ نہیں ہو سکتا اِس کے بعد موقع نہیں ملے گا ہمیں فوراً نکلنا ہے ورنہ بہت مشکل ہو جائے گی۔'' نے اٹل لہجے میں کہا۔

لیکن یوں نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔'' ترنم نے ماہی کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

خطرہ، زندگی کے لیے ہے نا! موت کو تو کوئی خطرہ نہیں ہوتا نا؟'' ماہی نے ہنستے ہوئے کہا۔

نم نے دُکھ سے اُسے دیکھا۔

کیا ہوا چندا! ارے تم کو تو خوش ہونا چاہیے کہ میں بہادر ہو گئی ہوں اور بہادری کے ساتھ اپنی موت Fac کرنے جا رہی ہوں۔'' ماہی نے کہا۔

کچھ نہیں ہو گا تمہیں! طارق پہنچ جائے گا وہ دیر سے یا جلدی، کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

میں مرتی ہوں، جیتی کوئی فرق نہیں پڑتا، فرق صرف یہ پڑتا ہے کہ ہماری محنت رائیگاں نہ جائے، یہ بچ جائے، چلو جلدی کرو وقت کم ہے۔'' ماہی نے ترنم کے ساتھ باہر نکلتے ہوئے کہا۔

اللہ حافظ!'' ترنم نے کہا۔

الوداع!!'' ماہی نے کہا۔

نم کو اس کے یوں الوداع کرنے پر جھرجھری آ گئی۔

ہ جانتی تھی کہ ماہی جان بوجھ کر اپنی مرضی سے اِس راستے پر جا رہی ہے۔

اے اللہ نگینہ کو بچا لینا۔ ہماری قربانی کو بچا لینا۔'' ترنم نے بے اختیار دعا کی۔

در وہ نہیں جانتی تھی کہ ساری دعائیں فوراً قبول نہیں ہوا کرتیں۔

"طارق! آپ کدھر ہیں؟" ترنم کی گھبرائی ہوئی آواز طارق کے دل کی دھڑکن تیز کرگئی۔

"میں آرہا ہوں انشاء اللہ بہت جلد! لیکن پھر بھی مجھے وقت لگے گا کیوں کہ فاصلہ بہت زیادہ ہے پلیز نگی کا خیال رکھنا!" طارق نے ہونٹ کچلتے ہوئے کہا۔

احساس بے بسی تھا کہ مار مار کر طارق کو غصہ دلا رہا تھا۔ فاصلہ تھا کہ ہر میل دگنا ہوگیا تھا اور وقت لگا کر اُڑنے لگا تھا۔ طارق، سید سرفراز کے ہاں ریڈ کرنے اپنے سارے کارآمد بندے لے کر نکلا تھا اُسے سمجھ نہ آرہا تھا کہ نگی کو نکالنے کے لیے کس کے سپرد یہ کام کرے کہ وہ اس کو بہ حفاظت بازیاب کروالائے۔ اگر وہ سول پولیس کو کہتا تو نگی کی جان کو خطرہ تھا کیوں کہ سول پولیس میں راگنی کے بہ سارے بندے تھے جو اُسے ہر ریڈ کی پہلے سے خبر کردیتے تھے اِس کے علاوہ کوئی بھی کام کرنے کے لیے Process چاہیے ہوتا ہے اجازت، نفری کا تیار ہونا وغیرہ وغیرہ! اور نگی کی بازیابی اگر جلد از جلد نہ کی گ تو بہت سارے نقصان ہوسکتے تھے۔ اور جسم فروشی کروانے والے یہ بھیڑیے کب تک ایک لڑکی کو چھو سکتے تھے۔

"نگی! وہ۔ نگینہ!" ترنم کی آواز میں موجود خوف طارق کے اردگرد بہت سارے وسوسوں کے کا اُگا گیا۔

"کیا ہوا نگی کو؟" طارق کی آواز بے چینی سے پھٹ رہی تھی۔

"اُسے ماہی لے کر نکل گئی!" ترنم نے دھماکہ کیا۔

"کیا! یہ کیا کہہ رہی ہو؟ تم نے تو کہا تھا تم میرا انتظار کرو گی۔" طارق نے پریشانی سے پوچھا۔

"موقع! طارق موقع تو قسمت سے ملتا ہے نا! انتظار کرتے تو موقع ہاتھ سے نکل جاتا۔" ترنم سمجھایا۔

"اوہ! لیکن وہ اُسے کہاں لے کر گئی؟ میں کہاں ملوں؟" طارق نے پوچھا کیوں کہ بہ قول ترنم کے ا کا ٹھکانا شہر سے خاصا دُور تھا۔

"وہ اُسے اُسی جگہ تمہارا انتظار کرے گی، جہاں میں آپ سے پہلی بار ملی تھی، اچھا میں بعد میں با کرتی ہوں۔" ترنم نے کمرے کے باہر قدموں کی آواز سن کر فوراً فون بند کردیا۔

طارق نے زور سے مکا اسٹیئرنگ پر مارا تو گاڑی ایک دم لہرا گئی، وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مار

لیہ کو اُس کی بہن سمجھ کر اغوا کرے گا، یوں انتقام لینے کی کوشش کرے گا۔ آج نگینہ کی جگہ اگر سائرہ ہوتی بھی اُس کی حالت ایسی ہی بُری ہونی تھی۔

"مارک! یہ تم نے اچھا نہیں کیا، میں تمہیں وہ سزا دوں گا کہ تمہاری سات نسلیں بھی گناہ سے باز رہیں ی۔" غصہ، بے بسی طارق کے مضبوط اعصاب کو بُری طرح جھنجوڑ رہی تھی۔

"اور یہ ولی! اِس نے کیوں فون بند کردیا یہ سید سرفراز علی کے بنائے جھوٹے جال میں کیوں پھنس رہا ہے؟ کیوں اُلّو کا پٹھا بننے جارہا ہے، فون اٹھاؤ ولی، کم آن! پک اپ دا فون!" طارق با آواز بلند بڑبڑایا تھا۔

"اگر آج تم نے فون نہ اٹھایا تو بہت پچھتاؤ گے! کسی کے پھیلائے جھوٹے جال میں پھنس کر بہت کچھ گنوا دو گے اس لیے فوراً فون اٹھاؤ یار۔" طارق کو ایک ہی وقت میں دو جگہوں پر محاذ آرائی کرنا بہت مشکل ہوگیا تھا۔

اُس نے اپنی زندگی کی اِس مختصر نوکری میں بہت زیادہ اعصابی، جسمانی اذیتیں اور مشقتیں جھیلی تھیں لیکن جس لڑائی میں اپنے شامل ہوں وہاں انسان خود کو حساس ہونے سے نہیں روک سکتا، یہی طارق کے ساتھ بھی ہورہا تھا۔ وہ نازک سی، معصوم سادہ لڑکی! جس کے دُکھ بھی اُس کی خوشیوں کی طرح سادہ اور معصوم تھے۔ وہ اب کے بار کیسے ایسا دُکھ جھیلے گی، جو اُس کے ہر دُکھ اور تکلیف سے انوکھا اور بڑا ہے! ظالم ہے!

"اے اللہ! تو اُس کو اپنی حفظ و امان میں رکھ لے، ہم سب یہاں بیچ رستوں میں بے بس بیٹھے ہیں، صرف تو ہی اُسے بچا سکتا ہے۔"

"اے اللہ نگی کو اپنی حفاظت میں رکھنا۔" طارق نے بے حد صدق دل سے دُعا کی اور جیپ کی ریس پر دباؤ مزید بڑھا دیا۔

❖❖○❖❖

میں رنگ میں دیکھتی تھی
خوشبو میں سوچتی تھی
مجھے گماں تھا
کہ زندگی اُجلی خواہشوں کے چراغ لے کر
میرے دریچوں میں
روشنی کی نوید بن کر اُتر رہی ہے
مجھے کہر میں چاندنی پہن کر
بنفشی بادلوں کا ہاتھ تھامے
فضا میں پرواز کررہی تھی
ساعتوں میں سحاب لمحوں کی بارشیں تھیں
بصارتوں میں گلاب چہروں کی روشنی تھی

ہوا کی ریشم رفاقتیں تھیں
صبا کی شبنم عنایتیں تھیں
حیات خوابوں کا سلسلہ تھا
کھلی جو آنکھ تو سارے منظر
دھنک کے اس پار رہ گئے
نہ رنگ میرے، نہ خواب میرے
ہوئے تو بس کچھ عذاب میرے
نہ چاند راتیں، نہ پھول باتیں
نہ نیل صبحیں، نہ جھیل شامیں
نہ کوئی آہٹ، نہ کوئی دستک
حروف مفہوم کھو چکے تھے علامتیں بانجھ ہو گئی تھیں
گلابی خوابوں کے پیرہن راکھ ہو چکے تھے
حقیقتوں کی برہنگی اپنی ساری سفاکیوں کے ہمراہ
جسم و جاں میں اُتر رہی ہے وہ مہرباں سایہ دار بادل
عذاب کی رُت میں چھوڑ کر مجھ کو جا چکا ہے
زمین کی تیز دھوپ آنکھوں میں چبھ رہی ہے

''بیٹا! جاؤ اندر!''

''علیزے! تمہارے ابو تم کو دیکھنا اور ملنا چاہتے ہیں۔'' حُسن آرا بیگم نے باہر آ کر کہا۔ اُن کے ہمراہ عبداللہ اور مریم بی بی بھی تھیں، جو ابھی ابھی انور صاحب سے مل کر آئے تھے۔

انور صاحب کو نئی زندگی ملنے کے ساتھ ساتھ اُن کو کچھ نئے رشتے بھی ملے تھے۔ لیکن وہ اپنی بیٹی سے مل کر اُس کی آنکھوں میں دیکھنا چاہتے تھے کہ اُس کے لیے یہ نئے رشتے کس حد تک خوشی کا باعث ہے اور باعث بننے والے تھے۔

علیزے نے سیاہ چادر اوڑھ رکھی تھی اور کچھ اس طرح سے کہ اس کا آدھا چہرہ اُس میں چھپ چکا تھا وہ گم سم اپنی ہتھیلیوں کو کھولے جانے کیا سوچ رہی تھی، جب یہ لوگ باہر آئے تھے اپنی ماں کی آواز سن کر وہ ایک دم چونک کر اُٹھی۔

عبداللہ کا علیزے کا جائزہ لینا بے اختیار تھا۔

''ماشاءاللہ!'' عبداللہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

وہ مجسم اُس کے آئیڈیل جیسی تھی، بے حد حسین اور معصوم، نگاہوں میں محسوس کیا جانے والا حیا کا عکس! ایک مکمل مشرقی تصور جو عبداللہ کے خیالوں میں چلتا رہتا تھا آج مجسم حقیقت بن کر اُس کا نصیب بن چکا تھا۔ وہ ولی کی منگیتر رہ چکی تھی یہ ملال بھی علیزے پر نگاہ پڑتے ہی جانے کہاں گم ہو گیا تھا۔

تم میرا نصیب تھیں میری دعا تھیں۔

تم کو تو میرا ہی ہونا تھا!

عبداللہ کا دِل بے اختیار پکارا۔ علیزے کے پیچھے اِس قدر دعائیں تھیں کہ اُس کی زندگی کا مشکل ترین مرحلہ اللہ نے خود ہی آسان کر دیا تھا۔ عبداللہ کے دل کے اندر، مریم بی بی کے دل کے اندر، علیزے کے لیے محبت اور گنجائش پہلی ہی نظر میں ڈال دی تھی کیوں نہ ڈلتی! کسی نے بے حد دل سے علیزے کی خوشیوں کو مانگا تھا اپنے دل کو دار پر چڑھا کر اُس کا مستقبل محفوظ کیا تھا، علیزے جب انور صاحب کے کمرے کی جانب بڑھنے لگی تو حسن آرا بیگم نے ایک دم اُسے کندھے سے پکڑ کر روکا اور سا سائیڈ پر لے جا کر اُس کا چہرہ اوپر کیا۔ وہاں اتنی اُداسی تھی کہ حُسن آرا بیگم کا اپنا دِل بھی لرز گیا۔

''علیزے! میں تجھ سے کچھ نہیں کہوں گی سوائے اِس کے کہ اگر باپ کی زندگی کی خاطر تم نے اپنے دل کی قربانی دے ہی ڈالی ہے تو اُسے ہنسی خوشی نبھا کر بھی دکھاؤ۔ تیری آنکھوں کی یہ اُداسی تیرے باپ کو دوبارہ مار ڈالے گی، اگر تو چاہتی ہے کہ وہ زندگی کی دہلیز کے کنارے لگ جائے تو اپنی آنکھوں کی اداسی کسی ضائع شدہ چیز کے چھلکے کی طرح اُتار کر اِسی دروازے کے باہر پھینک کر جا، ورنہ تیری قربانی بھی ضائع جائے گی اور تیرے باپ کی زندگی بھی!'' حسن آرا بیگم کی بات پر علیزے نے بے اختیار لب اٹھے۔

''امی!'' دو آنسو ضبط کرتے کرتے بھی نکل آئے۔

''بس!'' حسن آرا بیگم نے اُس کی آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

''کام بڑا کیا ہے تو دِل بھی بڑا کر! دیکھنا تیری اِس تابع داری کو اللہ سوہنے نے اتنے بھاگ لگانے ہیں کہ سارے ملال دُھل جائیں گے انشاء اللہ!'' ماں کی تسلی پر علیزے نے اثبات میں سر ہلایا اور اندر چلی گئی۔

عبداللہ تھوڑے فاصلے پر کھڑا مسلسل اُسے دیکھ رہا تھا۔

''ارے! تم دلہن کو کیسے دیکھ رہے ہو اب تو وہ تمہاری اپنی ہے۔'' مریم بی بی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''امی! یقین نہیں آ رہا کہ جسے میں تصور میں کئی بار دیکھ چکا تھا وہ مجسم حقیقت میں بھی موجود تھی حیرت کی بات ہے نا والدہ!'' عبداللہ نے مسکراتے لبوں سے سرگوشی کی۔

''دعائیں جب قبول ہوتی ہیں تو حیرت نہیں شکر ادا ہونا چاہیے، یہ تمہارے پاپا کہتے ہیں۔'' مریم بی بی نے کہا تو عبداللہ نے مسکرا کر ماں کو دیکھا۔

''آپ پاپا کو بہانے بہانے سے یاد کر رہی ہیں، اُن کو Miss کر رہی ہیں نا؟'' عبداللہ نے ماں سے کہا۔

''ہاں!'' اُن کے ساتھ اور اُن پر Depend کرنے کی اس قدر عادت ہو چکی ہے کہ ہر لمحہ جو اُن کے بغیر زندگی میں آتا ہے بالکل ادھورا لگتا ہے۔'' مریم بی بی نے بے حد جذب سے کہا۔

''ارے یہ کیا کر رہے ہو؟'' مریم بی بی نے عبداللہ کے ہاتھ میں موبائل دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''والدہ! آپ کے جذبات پاپا تک ڈائریکٹ جا رہے ہیں۔'' عبداللہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مطلب؟'' مریم بی بی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''مطلب میں نے آپ کے کہے کو ریکارڈ کر کے پاپا تک پہنچادیا۔'' عبداللہ نے مسکراتے ہو
موبائل دوبارہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔

''امی! ایک بات پوچھوں؟'' عبداللہ نے ماں کے چہرے کو بہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں کہو!'' مریم نے اجازت دی۔

''پاپا بھی آپ سے اتنا ہی پیار کرتے ہیں جتنا کہ آپ؟'' عبداللہ نے پوچھا تھا۔

''جو وہ کرتے ہیں اور جو وہ نبھا چکے ہیں وہ محبت کے درجوں سے کہیں بلند ہے!'' مریم بی بی
کھوئے لہجے میں کہا۔

''مطلب؟'' اِس بار عبداللہ الجھا تھا۔

وہ باتیں کرتے کرتے ہسپتال کے لان میں آبیٹھے کیوں کہ اندر زیادہ افراد کا رُکنا منع تھا اِس لی
مریضوں کے بہت سارے عزیز، رشتے دار لان میں بیٹھے تھے کچھ تیز دھوپ میں لیٹے دھوپ سینک رہ
تھے۔ مریم اور عبداللہ بھی اُن کے بیچ موجود ایک بینچ پر جابیٹھے۔

''وہ تو ایک شجر سایہ دار جیسے ہیں!'' مریم بی بی کے چہرے پر محبت بھرے رنگ تھے۔

''Husband Worship؟'' عبداللہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''نو! یہ اِن باتوں، اِن رشتوں سے زیادہ ہے کیوں کہ تمہارے پاپا نے جو رشتہ نبھایا ہے اُس کا مقا
بھی بہت بلند ہے، تمہارے پاپا بے حد عظیم انسان ہیں۔'' مریم بی بی نے صدق دِل سے ڈاکٹر فیصل ک
گواہی دی۔ عبداللہ اُن کی کسی بات کے بیک گراؤنڈ کو نہیں جانتا تھا لیکن پھر بھی ماں کو دیکھ کر عقید
سے مسکرادیا۔

''میں بھی! میں بھی علیزے کے ساتھ اتنا اچھا Relation Ship بناؤں گا کہ وہ بھی میرے لی
بہترین گواہی دے گی! میں اُسے بہت پیار دوں گا، جیسے میرے پاپا نے میری امی کو دیا۔'' عبداللہ ن
عہد کیا۔

❖❖○❖❖

میں اب
سو جانا چاہتی ہوں!
میں اور میری روح تمام زیست
مسلسل مشقت
مسلسل حالت سفر رہی ہے!
اب میں تھک گئی ہوں!
میں اب
سونا چاہتی ہوں!
میری زندگی جو ایک کڑے دن کی طرح
گزری ہے!

جس میں میری کوئی اپنی رات نہ تھی
ز مانے چیختے رہے میرے کانوں میں
لوشی کیسے ہوتی
مری آنکھوں میں سورج آبسے تھے
رات کیسے ہوتی؟
لیکن اب
میں اب سو جانا چاہتی ہوں!

''ہیلو!''

''ترنم!'' ماہی کی آواز میں عجیب طرح کا جوش تھا ترنم نے واضح طور پر محسوس کیا۔

''کیا حالات ہیں۔'' ماہی نے سوال کیا۔

''بہت بُرے ہیں! باہر کی سیکورٹی کو تھوڑی سُن گُن مل گئی ہے کہ کوئی لڑکی مس ہے اِس لیے تمام
لیوں کی ڈیوٹی لسٹ دیکھی جارہی ہے کہ آج کون کون سی لڑکی کی Booking تھی۔'' ترنم نے اپنی
آواز مدھم کر کے کہا۔

''اوہو! یہ تو بہت بُرا ہوا۔'' ماہی نے کہا۔

''کیوں کہ آج میری کوئی بکنگ نہیں ہے اور میں بھی اپنی جگہ سے غائب ہوں اس طرح تو صاف
یں پکڑی جاؤں گی۔'' ماہی نے صاف آواز میں کہا اِس وقت اُس کے لہجے میں بے حد بے خوف تھا۔

''تم جلد از جلد نگی کو پہنچا کر واپس آؤ، ابھی مارک اور میڈم نہیں آئے۔'' ترنم نے کہا۔

''میری جان! واپس آنے کے لیے کون یہاں سے نکلا تھا۔'' ماہی کی ہنسی بہت دنوں بعد اتنی کھل کھلاتی
تھی۔

''تو پھر؟'' ترنم نے گھبرا کر پوچھا۔

''ترنم! میری بات غور سے سنو! تمہارے پاس بہت کم وقت ہے اگر تم نے یہ وقت نہ پکڑا تو اپنی موت
کو بھی ضائع کر دو گی، ساری زندگی تو گناہ میں ضائع کر ڈالی، کم از کم ہماری موت تو با مقصد ہو، کچھ آسانی
پنی روح کے برتن میں بھی آئے۔''

''مطلب؟'' ترنم نے الجھے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''مطلب یہ کہ میں یہاں سے غائب ہوں گی تو سب سے پہلے تم کو پکڑ کر مارا جائے گا کہ تم ہی میری
احد دوست اور قریب ترین روم میٹ تھیں، یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے اِس لیے تمہارا بھی اب
ہاں رُکنا خطرے سے خالی نہیں، دوسری بات مارک کے ساتھی کسی نہ کسی طرح مجھ تک پہنچ سکتے ہیں، اُن
کے ہاتھ لمبے ہیں ہم صرف اُس صورت میں بچ سکتے ہیں، جب ہم اُن کو تھوڑا دھوکہ دیں۔ جب تک
طارق آ نہیں جاتا ہم میں سے ایک نگی کو لے کر محفوظ مقام تک پہنچے اور دوسرا مارک کو اپنے پیچھے لگائے
رکھے، اس طرح وہ لوگ فوری طور پر ہم کو ٹریس نہیں کر پائیں گے اور نگی بچ جائے گی۔ دوسری صورت
یں ہم تینوں کا انجام بہت بُرا ہوگا۔'' ماہی نے بے حد سمجھ داری سے ساری صورت حال بیان کی۔

''لیکن میں نکلوں کیسے؟'' ترنم نے گھبرا کر پوچھا۔

''تم میڈم راگنی کے کمرے تک کسی طرح پہنچو وہاں پر اُن کی ڈریسنگ کے پیچھے سے راستہ نکلتا ہے اِس کے ساتھ کوئی سیکورٹی الارم نہیں لگا ہوا، یہ تمہیں فوراً باہر کا راستہ دے گا۔''

''لیکن ان کے کمرے کے چپے چپے پر کیمرے لگے ہیں۔'' ترنم نے کہا۔

''وہ تو ویسے بھی پتا چل جانا ہے کہ ہم دونوں نے ہی یہ بغاوت کی ہے، کیمرے میں آ گئیں تو کیا کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' ماہی نے پُرسکون ہو کر کہا۔

''تمہیں اس راستے کا کیسے پتا چلا؟'' ترنم پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

''تم بہت بھولی ہو! اگر مجھے موت کی لذت کی آشنائی نہ ہوئی ہوتی تو میں نے کہاں سُدھرنا تھا میں بھی تو اِس سسٹم کا حصہ بن کر خوش تھی۔ بہر حال تم جلدی کرو۔'' ماہی نے کہا۔

''لیکن ماہی! میں وہاں سے بنا گاڑی کے کیسے نکلوں گی؟'' ترنم نے پریشانی سے کہا۔

''جمی باہر گاڑی چھوڑ کر جا چکا ہے، چابی گاڑی کے میٹ کے نیچے ہے۔'' ماہی نے عجلت میں کہا۔

''اور تم؟'' ترنم نے سوال کیا۔

''میں تم سے دوبارہ رابطہ کرتی ہوں، اللہ نگہبان۔'' ماہی نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

اور وہ جو ہمیشہ کہتی تھی کہ اِس بند قلع میں باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے آج وہاں اُسے بھی دروازہ مل ہی گیا تھا اور وہ اُسے کسی صورت گنوانا نہیں چاہتی تھی۔

ترنم نے اپنا بیگ گلے میں ڈالا اور جاگرز پہن کر ایک چادر سے خود کو لپیٹا اور باہر بھاگی، اُس کے پاس چند منٹ سے زیادہ نہ تھے کیوں کہ سکیورٹی کسی بھی وقت اِس منزل پر پہنچ کر لڑکیاں گننے والی تھی۔ اللہ کا شکر تھا کہ مارک اور میڈم راگنی قسمت سے کسی بڑے پروجیکٹ کے لیے اکٹھے باہر تھے ورنہ تو چند منٹ کیا چند پَل بھی نصیب نہیں ہونے تھے۔

''اللہ جی! مدد کریں!'' ترنم نے پھولی سانسوں اور کپکپاتے ہاتھوں سے راگنی کے کمرے کے دروازے کو کھولتے ہوئے دُعا کی۔ اُس کے کان موت کی آہٹ کو واضح طور پر سُن سکتے تھے۔

''جلدی کرو ترنم!'' اُس نے خود کو حوصلہ دیا اور دروازہ پار کر گئی۔

❖❖○❖❖

''بی بی جی!'' وہ بی بی کچھ نہیں کھا رہی، بیخ دہاڑ سے بھوکی ہے، کہتی ہے اُسے گھر جانا ہے۔'' ملازمہ نے آ کر نفیسہ بیگم کو اطلاع دی۔

''چلو میں چلتی ہوں، مسکان کی بیوٹیشن کے ساتھ مصروف ہو گئی تھی ورنہ تو میں پہلے ہی جا رہی تھی جانے دماغ سے یہ بات کیوں نکل گئی۔'' نفیسہ بیگم نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''تم ایک اور تازہ کھانے کی ٹرے لاؤ، میں ابھی چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔'' نفیسہ بیگم بھی اُس کے ساتھ فوراً چل دیں۔

''جی بی بی جی!'' ملازمہ نے تابع داری سے سر ہلایا اور باہر نکل گئی جب کہ نفیسہ بیگم خراماں خراماں نگینہ کے کمرے کی جانب بڑھی تھیں۔

مجھے پہلے ہی بچی سے مل کر اُسے تسلی دینی چاہیے تھی بھلا وہ کیا سوچتی ہوگی اور کتنی ڈر بھی گئی ہوگی! کس ،ر بڑی کوتاہی کی، میں نے بہت بُرا کیا ہے۔'' وہ تاسف سے باآواز بلند بول رہی تھیں اور خود کو ادہ کوس رہی تھیں۔

یسے ہی انہوں نے ملازمہ کے بتائے ہوئے کمرے میں قدم رکھا وہ تو جیسے بُت بن گئیں۔

''یہ! یہ کون ہے؟'' بے اختیار انہوں نے پوچھا۔

''جی وہی لڑکی جو بڑے سائیں لائے ہیں۔'' ملازمہ نے جواب دیا۔

''لیکن یہ! یہ تو نگینہ نہیں ہے!'' نفیسہ بیگم کی آواز میں شاک تھا۔

انہوں نے ایک نگاہ اُس سانولی سی روتی بلکتی لڑکی کو دیکھا جو مرغی کی طرح بیٹھی تھی اور زار زار رو رہی تھی۔

''یہ! یہ کون ہے؟'' نفیسہ بیگم نے تھک کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

''یا اللہ! اب کوئی اور امتحان؟ اگر ولی کو اپنی بہن نہ ملی تو مسکان کا نکاح کیسے ہوگا۔''

''وزیراں!'' انہوں نے ملازمہ کو آواز دی۔

''جی! بی بی جی!'' ملازمہ تابع داری سے آگے بڑھی۔

''سید سرفراز علی کو فوراً بلاؤ! کہنا غضب ہو گیا!'' انہوں نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر اُس الی لڑکی کو دیکھا اور ماتھا بے اختیار پکڑ لیا۔

''اب۔ اب کیا ہوگا؟''

یہ سوال بھوت بن کر اُن کو ڈرا رہا تھا۔

❖❖○❖❖

''سائیں! دولہا آپ سے پہلے ملنا چاہتا ہے!'' سید سرفراز علی کے ملازم خاص نے آ کر کہا۔

''کیوں؟ تم نے بتایا نہیں کہ ہمارے ہاں دولہے کو نکاح سے پہلے دیکھنا بدشگونی ہوتی ہے۔'' سید رفراز علی نے گردن اکڑا کر کہا۔ کیسے سب کچھ اُن کی مرضی سے ہونے جا رہا تھا۔

''سائیں! وہ نہیں مان رہا، آپ اُس سے فون پر بات کر لو۔'' ملازم خاص نے اپنے مالک کو اچھا شورہ دیا تھا۔

''لاؤ کر لیتے ہیں بات بھی!'' سید سرفراز علی کا موڈ بے حد اچھا تھا۔

''ہاں بچے! کیا ہم پر اعتبار نہیں ہے؟'' سید سرفراز علی نے چہکتے ہوئے کہا۔

''اعتبار! ہونہہ!!''

''جس طرح آپ نے مجھے یہاں بلوایا ہے میری بہن کو اغوا کر کے مجھے مجبور کیا ہے ایسے میں، میں پ پر اعتبار کیسے کر لوں۔'' ولی نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

سید سرفراز علی بے اختیار ہنسے، اُن کو اِس وقت کوئی بات بُری نہ محسوس ہو رہی تھی۔

''ارے نہ کرو غصہ! اب تو خوشی کی بات ہونے جا رہی ہے، سب ملال ختم کرو۔ اگر تمہارے باپ نے ہری بات عزت سے رکھ لی ہوتی تو مجھے کبھی دوسرا رستہ اختیار نہ کرنا پڑتا اس میں ہمارا قصور کم ہے۔''

سید سرفراز علی نے مطمئن انداز میں کہا تو عبدالولی نے بے اختیار ہونٹ بھینچ لیے وہ کوئی سخت بات کہ
حالات خراب کر کے اپنی بہن کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا کرنا نہ چاہتا تھا۔

''مجھے اپنی بہن سے بات کرنی ہے، اُس سے ملنا ہے میں پھر ہی اِس نکاح نامے اور آپ کی ہ
بھر شرائط پر سائن کروں گا۔'' عبدالولی نے اٹل لہجے میں کہا تو سید سرفراز علی کچھ دیر کو سوچ میں پڑ گئے
لڑکا اُن کی سوچ سے زیادہ تگڑا، ہوشیار اور بہادر تھا اِس کے ساتھ ساتھ بے حد ذہین بھی تھا۔

''تم اس سے ابھی بات کرسکتے ہو، ہاں نکاح کے فوراً بعد ہم تمہاری ملاقات تمہاری بہن کروادیتے ہیں۔'' سید سرفراز علی نے بے حد سفاک لہجے میں کہا۔

عبدالولی کا شدت سے دِل چاہا کہ کاش اُس نے زندگی میں کوئی گالی سیکھی ہوتی، وہ اِس وقت
گالی کا استعمال سید سرفراز علی کے لیے کرتا۔

''مجھے اپنی بہن سے بات کرنی ہے۔'' ولی نے غصّے سے اصرار کیا۔

''ٹھیک ہے بات کرلو، لیکن ملاقات نکاح کے بعد!'' سید سرفراز علی نے بے حد فیاضی دکھائی۔

ولی کے اندر اِس قدر غصّے کا ابال اٹھا کہ اُس سے برداشت کرنا مشکل ہوگیا۔ غیرت کو رشتے کی
میں جب جب باندھا جاتا ہے تب تب بہت تکلیف ہوتی ہے۔ ولی کے ہاتھ اور زبان اپنی بہن کی سا
کی وجہ سے بندھے ہوئے تھے ورنہ وہ اتنا مجبور تو ہرگز نہ تھا کہ سید سرفراز علی کو منہ توڑ جواب نہ دے سکا

''ٹھیک ہے پہلے میری نگی سے بات کروائیں۔'' ولی نے تھک کر ہتھیار ڈالے۔

''کروادیتے ہیں جناب، ابھی کروادیتے ہیں میرا بندہ آپ کے پاس فون لے کر آرہا ہے آپ
کریں، جتنی مرضی تسلی کریں لیکن آپ کے پاس صرف پانچ منٹ ہیں۔'' سید سرفراز علی نے مسکرا کر
بند کردیا۔

❖❖○❖❖

''ماہی! تم ایسا کیوں کررہی ہو؟'' ترنم نے اس کو کندھوں سے تھام کر بے چینی سے پوچھا۔

''یہ ضروری ہے یار!'' ماہی نے بے حد احتیاط سے نگی کے نڈھال وجود کو بانہوں میں لے کر تر
گاڑی میں لٹایا۔

''لیکن تمہاری جگہ میں بھی تو جاسکتی تھی!'' ترنم نے ماہی کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔

''نہیں! ابھی تم کو بہت جینا ہے میری جان!'' ماہی نے ترنم کے گلے لگ کر کہا۔

''ماہی!'' ترنم نے اُسے دوبارہ گلے سے لپٹا کر پیار کیا۔

''نہ جاؤ! ہم دونوں اکٹھے ہی چلتے ہیں۔'' ترنم نے اُسے ایک بار پھر روکا۔

''اگر میں نہ گئی تو ہم تینوں مارے جائیں گے، اگر میں جاؤں گی تو تم دونوں بچ جاؤ گی اور پلیز
معصوم روح پر ترس کھاؤ اور فوراً یہاں سے نکل جاؤ، اگر یہ لڑکی اُن بھیڑیوں کے ہاتھ لگ گئی تو
ساری محنت بیکار جائے گی۔'' ماہی نے گہرا سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''ترنم! اب فوراً نکلو ورنہ بہت مشکل ہوجائے گی، نگی کے زخموں سے بہت زیادہ خون بہہ چکا
میڈیکل ایڈ کی فوراً ضرورت ہے، دیکھو بخار سے اِس کی آنکھیں تک نہیں کھل رہیں اور ہاں یہ کچھ

ات ہیں اور یہ موبائل! اس میں موجود سم ابھی استعمال نہیں ہوئی اس کے میموری باکس میں میرے
ا کے نمبر ہیں اور لاکرز کی چابیاں تم کو سکارنا بازار کی مصباح سے ملیں گی۔ تم اُس رقم سے یہاں سے
کر بہت اچھی زندگی گزار سکتی ہو، یہ رقم میں نے اپنے بڑھاپے کے لیے محفوظ کی تھی!'' ماہی نے ٹوٹے
کا جیسی ہنسی ہنستے کہا۔

''انسان کتنا کچھ پلان کرتا ہے نا ترنم!'' ماہی نے ترنم کے لگاتار بہتے آنسو اپنی پوروں میں لیتے
ئے روہانسی آواز میں کہا۔

''لیکن انسان بھول جاتا ہے کہ مین پلانر تو صرف اللہ ہے! یہاں وہی کچھ ہوتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔''

''ہم پہلے کیوں نہیں سوچتے کہ ضروری نہیں ہے ہر انسان بچپن، جوانی اور پھر بڑھاپے کی Stage کو
Meet کرے۔'' ماہی کے اندر بہت سارے پچھتاوے اکٹھے ہو کر بول رہے تھے۔

''اچھا! الوداع!'' ماہی نے اُس کے ہاتھوں کو زور سے دباتے ہوئے کہا۔

''الوداع؟'' ترنم نے سوالیہ نظروں سے کہا۔

''ہم پھر ملیں گے!'' ترنم نے شاید خود کو حوصلہ دیا تھا۔

''نہیں چندا! تم Reality کو کیوں اگنور کررہی ہو، تم میرے لیے دعا کرنا کہ میری منزل آسان
۔'' ماہی کہہ کر رکی نہیں بلکہ فوراً گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی ریورس کی اور تیزی سے نکال لے گئی۔ اُڑتی
ل نے ترنم کی آنکھوں میں ایک بار پھر مرچیں بھر دیں۔ وہ وہیں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی، جانتی
ا کہ وہ ماہی کو آخری بار زندہ دیکھ رہی ہے۔ ترنم کچھ منٹ وہیں بیٹھی روتی رہی پھر چادر سے اپنا منہ
ل کر کے گاڑی کی جانب بڑھی، جہاں نگی زخموں اور بخار کی شدت سے چُور بے ہوش پڑی تھی۔

''یا اللہ! طارق کو جلدی بھیج دے، میں اکیلی ہسپتال بھی نہیں جاسکتی، مارک کے بندے یقیناً نگی کی
حالت کی وجہ سے ہسپتالوں میں چیک کررہے ہوں گے۔ اب جب تک نگی محفوظ ہاتھوں میں نہیں
مجھے اِس کو لے کر کہیں چھپنا ہوگا۔ لیکن کہاں؟'' ترنم خود کلامی کرتے ہوئے ڈرائیو کررہی تھی۔

اُس نے ایک بار پھر نگی کو دیکھا، جو بالکل بے سُدھ تھی ترنم کے دماغ میں مسلسل جوڑ توڑ چل رہے
۔ اُس نے ایک بار پھر طارق کو فون کیا لیکن شاید اس کا فون اِس وقت Out of singale تھا اس
رابطہ نہ ہو رہا تھا۔

ترنم نے فون آف کر کے فوراً ایک خطرناک فیصلہ لیا۔ اُس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ
جائے اور نگی کو خود اُس کے گھر پہنچا کر آئے۔

شہر جانا بہت خطرناک تھا لیکن اُس کے پاس اِس کے علاوہ کوئی آپشن نہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ماہی کچھ
تک مارک اور اُس کے ساتھیوں کو بھٹکا کر رکھے گی، اتنی دیر تک ترنم کے پاس مہلت تھی۔

''اے اللہ! میری مدد کرنا! ترنم نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھاتے ہوئے دُعا کی۔

''ترنم! وہاں وہ بھی ہوگا!'' اس کے دل میں بیٹھے کسی چور نے کہا۔

''کون؟'' ترنم نے سوال کیا۔

''وہی جس میں تم کو پہلی بار انسان نظر آیا تھا، وہی جس کے نام پر تمہارا دِل دھڑکتا ہے تو تم کو احساس

ہوتا ہے کہ تم زندہ ہو، وہی واحد ہے جس سے تم اپنا یہ غلاظت بھرا ماضی چھپانا چاہتی ہو، وہی مم
سامنے تم ایک اچھی لڑکی بنے رہنا چاہتی ہو۔'' اُس کے اندر بیٹھے چور نے کہا۔

''تم اگر نگینہ کو اُس کے گھر چھوڑ کر آ ؤ گی تو تمہاری اصلیت تو کُھل جائے گی نا۔'' اُس کے اند
چور نے اُسے ڈرایا۔

''زندگی ایک پُر خار کی طرح گزری ہے کچھ خار، کچھ کانٹے اور کچھ خاک اوڑ سہی!'' ترنم نے ا
صاف کر کے خود سے کہا۔

''تمنا کی وادی میں حریص ہمیشہ منہ کی کھاتے ہیں، میں نے تو سارے سودے ہی نقصان کے
تھے پھر ڈر کیسا؟ یہ پہلا سودا ہوگا، جو میری ذات سے ہٹ کر ہے شاید کچھ خسارے کا احساس ہو
جائے گا۔'' ترنم نے خود کو تسلی دی، اُسے ایک دم گاڑی روکنی پڑی، اُسے شک سا ہوا تھا کہ سڑک پر
موجود گاڑیوں میں سے ایک گاڑی راگنی میڈم کے کارندوں کی ہے۔

''میرے اللہ! کیا کروں؟''

ترنم کا دل پسلیاں توڑ کر باہر آنے کو تھا۔

❖❖○❖❖

نشاں اس کے ہیں سب اور بے نشاں وہ ہے
چراغ اور اندھیرے کے درمیاں وہ ہے
میں ہوں درد کی دستک، درِاماں وہ ہے
زبانِ اشک سے میں مانگتا ہوں دعا
بے شک بے شک بے شک وہ ہے
بڑا رحیم، نہایت ہی مہرباں وہ ہے

احمد شاہ نے سر سجدے سے اٹھایا تھا کہ انہیں محسوس ہوا شاید روشن آرا بیگم نے اُن کو پکارا ہے۔ ا
کے کمرے میں ہی جانماز بچھا کر نفل حاجت ادا کر رہے تھے۔

''شاہ جی!'' روشن آرا بیگم نے اپنی سوجی آنکھیں بہ مشکل کھول کر اُن کو پکارا۔

''روشن! تم ٹھیک ہو؟'' احمد شاہ نے بے حد محبت سے اُن کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔

''شاہ جی! اب آزمائش جھیلی نہیں جاتی، اب صبر نہیں ہوتا۔'' روشن آرا بیگم نے بے بسی سے سر
ادھر اُدھر پٹخا۔

''روشن! تم تو بہت بہادر ہو، بہت صبر والی ہو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کریں گے، کچھ صبر کرلو۔'' احم
نے اپنے دل کی پریشانی کو دبا کر کہا۔ خود اُن کا دل تھا کہ گھبرائے جا رہا تھا۔

''آپ کے اندر ہے اتنا صبر، آپ بہت ظرف والے ہیں میرا ظرف بہت چھوٹا ہے میں، میں
ہوں۔'' روشن آرا کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''آج سے بیس سال پہلے میں نے جو دنیا بنائی تھی جس میں، میں نے اپنی مرضی کے رنگ بھرے
آج وہ پرائے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے میں اپنے بچوں کو نہیں بچا پائی۔'' روشن آرا بیگم کے دل

رہ آ رہا تھا۔

ں! نہ کہو ایسے! تم تو میری مضبوطی ہو۔ تم ہمیشہ میرے کم زور لمحوں کی مضبوطی اور مضبوط لمحوں کی
اری رہی ہو، لیکن تمہاری مضبوطی ہی نے مجھے آج تک احساس نہیں ہونے دیا کہ میں لاولد ہوں۔
اس اللہ نے ہمیں پہلے بے نام و نشان نہیں رہنے دیا اب کیوں وہ ہمیں اکیلا کرے گا، تم اُس پر
رکھو دیکھنا، وہ تو ہمیشہ بھروسے قائم رکھنے والا تو ہے، بس تھوڑا سا انتظار۔'' احمد شاہ سمجھا تو روشن آرا
رہے تھے لیکن آگ اُن کے من میں بجھ رہی تھی، کوئی چیز اُن کے اندر کو شانت کر رہی تھی۔

انہونی کے آنے کا احساس وقت سے پہلے اندر سے صاحب حال لوگوں کو ان شانت کر دیتا ہے
رح سے اب سب ٹھیک ہو جائے گا کا احساس بھی سب سے پہلے اِن ہی لوگوں کو ملتا ہے۔ جانے
یہ احساس احمد شاہ کو اسی پل ہوا تھا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

سب ٹھیک ہو جائے گا نا؟''

ری بچی مل جائے گی نا؟''

ل سلامتی سے واپس آ جائے گا نا؟''

ن آرا بیگم نے بچوں کی طرح سوال کیا۔

ں! انشاء اللہ تعالیٰ!'' احمد شاہ نے ٹھوس اور مضبوط لہجے میں کہا۔

ی پل اُن کے موبائل پر طارق کی کال آئی۔

رق کی کال تھی کہ دھماکہ!

ٹھیک ہے بیٹا! تم نمبر میسج کرو، میں اُس بچی سے بات کرتا ہوں اور اُن کو خود لے کر آتا ہوں۔'' احمد
نے بے چینی سے کہا۔

رق نے احمد شاہ کو ترنم کا نمبر سینڈ کیا تا کہ وہ اُس کی لوکیشن پتا کر کے نگی کو فوراً لے آئیں، وہ اتنے
فاصلے پر تھا کہ فوراً آنا ممکن نہ ہو رہا تھا۔

کیا ہوا شاہ صاحب؟'' روشن آرا بیگم نے نڈھال لہجے میں پوچھا۔

گی کو سید سرفراز علی نے اغوا نہیں کیا۔'' احمد شاہ نے ماتھے کو پریشانی سے مسلتے ہوئے دھماکہ کیا۔

ک۔ کیا؟''

تو پھر میری بچی کہاں ہے۔'' روشن آرا بیگم نے پھٹی پھٹی آواز میں پوچھا۔

وہ کسی لڑکیاں اغوا کرنے والے گروہ کے پاس تھی لیکن وہاں موجود ایک بچی نے جان پر کھیل کر
وہاں سے نکال لیا ہے، اب وہ نگی کو بہ حفاظت ہم تک لانا چاہتی ہے لیکن وہ بچی بھی شہر سے باہر
س لیے طارق کا فون تھا کہ میں فوراً اُن تک پہنچوں، ورنہ خدانخواستہ اُن کی جان کو خطرہ ہے۔'' احمد
ی بات پر روشن آرا بیگم کا رنگ فق ہو گیا۔

میرے اللہ! اب کیا ہوگا؟'' روشن آرا بیگم نے بے اختیار کہا۔

آپ اکیلے جاؤ گے؟'' روشن آرا بیگم نے پوچھا۔

دیکھتا ہوں۔''

"تم پریشان نہ ہونا، دُعا کرنا، میں نیجر کو کہتا ہوں اُس کی وائف آجائے گی تمہارے پاس، کچھ دیر
سائرہ بھی آجائے گی، میں تم سے رابطے میں رہوں گا، تمہارا موبائل سائیڈ ٹیبل پر ہے۔" احمد شاہ
ہوئے تیزی سے باہر نکل گئے۔

"اے اللہ! تیرا ہی آسرا ہے! اگر یہ مشکل تیری جانب سے آئی ہے تو اس مشکل سے نکالنے والی ذات بھی تیری ہے۔ مدد کر، میرے خاندان کی حفاظت فرما۔" روشن آرا بیگم نے صدق دل سے دُعا کی

❖❖○❖❖

عصر کے کناروں تک
آفتاب آپہنچا
اور صحنِ دل میں بھی شام ہونے والی ہے
یاد کے درختوں پر جھنڈ ہیں پرندوں کے
آنکھ میں گزرتے پل خواب جیسے لگتے ہیں
کوئی دھیان کی انگلی تھام کر لے جائے
بارشوں میں، پھولوں میں
چاندنی میں، تاروں میں
بچپنے کے موسم میں محفلیں بہت سی ہیں
بے خودی کے عالم میں
میں تو جانا چاہوں گی
ہر طرف مگر اب تو
عصر کے کناروں تک آفتاب آپہنچا
اور صحنِ دل میں بھی شام ہونے والی ہے

"بتاؤ تم نے لڑکی کہاں بھگائی ہے؟" مارک نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔ وہ ماہی کو مار مار کر تھک گیا تھا لیکن اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا تھا۔

ماہی کی آنکھیں مار کھا کر نیل پڑنے سے سوجی ہوئی تھیں ایک آنکھ تو کھلی ہی نہ رہی تھی اُس نے مشکل ایک آنکھ کھول کر مارک کو دیکھا اور مسکرادی۔

"تو سالی!" مارک نے اپنے بوٹوں سے ماہی کو مزید کچلا، اُسے اس کی مسکراہٹ آگ لگا گئی تھی۔

"بول! کہاں ہے لڑکی؟" وہ تو غصے سے ایسے ناگ کی طرح بل کھا رہا تھا جو شکار نہ ملنے پر پاگل ہو مزید زہریلا ہو جاتا ہے۔

"وہ اب تمہاری پہنچ سے دور ہے، اب وہ تم کو کہیں نہیں ملے گی۔" ماہی نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

"تو تُو نہیں بتائے گی کہ طارق کی بہن کہاں ہے؟" مارک نے غصے سے چلا کر پوچھا۔

"طارق کی بہن؟" ماہی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں! اُس طارق کے بچے نے ہمیں اِس قدر نقصان پہنچایا ہے کہ اب اُسے سبق سکھانا بہت ضرور

تھا۔ اُس کی بہن کے ساتھ ہم نے وہ سلوک کرنا تھا کہ وہ کسی ریتیلے پہاڑ کی طرح نیچے آجاتا، لیکن تم را بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔" مارک نے ماہی کو ایک اور ٹھوکر ماری۔

"بول کہاں ہے لڑکی؟ کیوں کہ لڑکی اتنی جلدی اِن حدود سے نہیں نکل سکتی اِس لیے وہ ہماری پہنچ سے یں نکل سکتی۔" مارک باآواز بلند جوڑ توڑ کر رہا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم!" ماہی نے پیٹ پر دونوں ہاتھ رکھ کر کراہتے ہوئے کہا۔ اُس کے منہ سے خون نکل تھا۔

"یہ ایسے نہیں بتائے گی۔" مارک نے غصے سے تیزاب کی بوتل کا ڈھکن کھولا۔ یہ تیزاب وہ آخری ے کے طور پر استعمال کرتا تھا۔

اس تیزاب کے ڈر سے ضدی سے ضدی لڑکی ان کے کہے کو ماننے لگتی تھی اور کبھی جو ایک آدھ نے ی وہ ہمیشہ کے لیے عبرت کا نشان بن کر رہ گئی تھی۔

کھولتے تیزاب کو ماہی نے بغور دیکھا۔

"اے اللہ! تو نے حضرت ابراہیم کو آگ کی تکلیف سے بچایا تھا، مجھ گناہ گار کے ساتھ بھی معاملہ اچھا انا۔" ماہی نے زمین پر سر رکھتے ہوئے دعا کی۔

اور پھر واقعی مارک نے دیکھا کہ کچے گوشت کی طرح تبدیل ہوتی ماہی نے ایک سی بھی نہیں کی، اُس نے آخری بار مسکرا کر آنکھیں بند کی تھیں، ایسے جیسے اُس کے منہ سر اور جسم پر تیزاب نہیں عرق گلاب ل کر ٹھنڈک پہنچادی گئی ہو۔ مارک نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے ماہی کو دیکھا اُسے لگا کہ آج شکستوں ن ہے پہلے ایک لڑکی بھاگی، ایک ایسی قید جو بند موری کی طرح تھی، جہاں سے نکلنا ناممکن تھا لیکن ہ جانتا تھا کہ ناممکن کو ممکن کی گیم میں بدلنے والی صرف اور صرف ایک ہی باکمال ذات ہے اُس کے گے بڑے بڑے ہی مین (He man) ڈھیر بن جاتے ہیں۔ ایک اور لڑکی اس بری طرح مار کھا کر اور اب سے جھلس کر مرگئی اُس نے مرنا پسند کیا لیکن مارک کے آگے سرنڈر کرنا پسند نہیں کیا اور ریت کی اُس کے ہاتھوں میں آ کر پھسل گئی۔

"یہ! یہ تم نے کیا کیا؟" مارک کے ساتھی نے پریشانی سے پوچھا۔

اُسے بھی یقین نہ آرہا تھا کہ ماہی نے اتنی آسانی اور خوش دلی سے موت قبول کرلی۔ اُس نے مارک اتنا زیادہ غصہ دلا دیا کہ وہ خود پر کنٹرول نہ رکھ سکا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے بُری طرح ماہی کو ڈالا۔ اُسے ایک دم شدید قسم کی شکست کا احساس ہوا، اُس نے بے اختیار پورے زور سے تیزاب کی دیوار پر دے ماری، سارے کمرے میں جلے ہوئے گوشت کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

"میڈم رانگی کو کیا بتائیں گے، یہ تو مرگئی!" مارک کے ساتھی کے لہجے میں پریشانی اور خوف بے حد اں تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ میڈم رانگی کے نرم و نازک وجود کے اندر بے حد ظالم اور پتھر دل رہتا جس کے فیصلوں کے آگے چھ چھ فٹ کے سانڈ بھی سر جھکاتے تھے اُس کی ناراضی پر کانپ کانپ تے تھے۔

"تم اپنے ساتھیوں کو آگاہ کرو کہ طارق کے گھر کی سخت نگرانی کریں، جو بھی اُس لڑکی کو لے کر گیا ہے

وہ ضرور طارق کی بہن کو اُس کے گھر پہنچانا چاہے گا۔'' مارک نے پرسوچ انداز میں کہا۔

''لیکن یہ دوسرا شخص کون ہے اور کس نے ماہی کی مدد کی تھی۔'' مارک نے سوال کیا۔

''سر! پانچ لڑکیاں ڈیوٹی پر ہیں، صبح تک معلوم ہوگا کہ اُن میں سے کوئی ماہی کے ساتھ تو نہیں ملی ہوئی۔'' مارک کے پاس شاکر نے آ کر اطلاع کی۔

''کیوں! تم ابھی اُن کے کلائنٹس اور ڈرائیوروں کو فون لگاؤ، اگر ہر لڑکی ٹھکانے پر ہے تو پھر یہ ہماری کسی لڑکی کا نہیں بلکہ باہر سے کوئی بندہ انوالو ہے۔'' مارک نے شاکر کو حکم دیا۔

''سر! تین تو ٹریس ہو گئیں، وہ اپنے کلائنٹس کے ساتھ ہیں لیکن روحا، ترنم اور اُن کے ڈرائیوروں کے فون نہیں مل رہے اور دونوں کی ڈیوٹی آؤٹ آف سٹی تھی میں نے وہاں پر موجود اپنے کچھ ساتھیوں کو اُن کے ٹھکانوں پر بھیجا ہے یقیناً جلد اطلاع آ جائے گی۔ لیکن کچھ وقت لگے گا، شاید صبح ہو جائے۔'' شاکر نے کہا تو مارک نے کھا جانے والی نظروں سے اُسے دیکھا۔

''اوئے! میں تم کو وہاں جانے کو نہیں کہہ رہا، وہاں ہمارے جو سورس بیٹھے ہیں وہ تو ہمیں اطلاع کر سکتے ہیں؟ تم جلد از جلد مجھے باقی دو لڑکیاں بھی کنفرم کرو، قسم ہے مجھے عیسیٰ کی اگر ان میں سے کوئی لڑکی اس معاملے میں شامل ہوئی تو اُس کا انجام ماہی سے بھی ابتر ہوگا۔'' مارک نے اس کے جلے ہوئے وجود کو دیکھا۔ اُسے اب تک ماہی کی مرتے دم کی مسکراہٹ اور پُرسکون آنکھیں نہیں بھول رہی تھیں۔

''جاؤ مجھے جلد از جلد اطلاع دو، اس لڑکی کے جانے کا دکھ اتنا بڑا نہیں، ہمیں اس بات کی سزا مل ہے کہ ہمارے Set up میں جھول آ چکا ہے، Security اس قدر ناقص ہو چکی ہے کہ دو کم زور لڑکیاں ہمیں ڈاج دے کر فرار ہو گئیں اور ابھی تک اُن میں سے ایک ہمارے ہاتھ میں نہیں آئی، جاؤ فوراً اور ہر طرح کی حکمت عملی کام میں لاؤ۔ اور مجھے رزلٹ لا کر دینا، خالی اپنا چہرہ دکھانے مت آ جانا۔'' مارک دھاڑا، شاکر نے اُلٹے قدموں مڑنا ہی بہتر جانا۔

❖❖○❖❖

''یہ کچھ گڑبڑ ہے!'' مارک نے شوکت الفریڈ سے کہا، جو ابھی ابھی ایک چونکا دینے والی خبر لایا تھا مارک نے طارق کے گھر نگرانی کروانے کا کہا تو شوکت نے آ کر عجیب سی بات بتائی کہ شاکر نے نگی کی بتائی ہوئی ڈی جس گھر میں ڈیلیور کی تھی وہ طارق کا نہیں بلکہ اُس کے دوست کا گھر ہے کیوں کہ جو ایڈریس شوکت طارق کے دفتر سے لایا تھا وہ مختلف تھا۔

''ایڈریس کی گڑبڑ کیوں ہوئی شاکر؟'' مارک نے شاکر کو ایک بار پھر لائن حاضر کر لیا تھا۔

''کیوں کہ جو لڑکی ہم نے اغوا کی تھی وہ اُسی گھر سے صبح نکلی تھی اور ہم اُسے اتنے دنوں سے دن سے آتے جاتے نوٹ کر رہے تھے۔ آپ نے اُسی لڑکی کو اٹھانے کا آرڈر دیا تھا۔'' شاکر نے مطمئن انداز میں جواب دیا۔

''تو پھر! طارق کی بہن اُس کے دوست کے ہاں کیوں رہ رہی تھی۔'' مارک نے سوال کیا۔

''کہیں ہم نے غلط لڑکی تو اغوا نہیں کر لی؟'' شوکت نے بے حد اہم نکتہ اٹھایا۔

''نہیں، نہیں! لڑکی تو وہی تھی، جس کو میں نے طارق کے ساتھ دیکھا تھا۔'' مارک نے یقین سے

کہا کہ وہ کتنی ہی بار نگینہ کو طارق کے ساتھ دیکھ چکا تھا اس لیے اُس کا خیال تھا کہ نگینہ ہی طارق کی بہن ہے۔

''تو پھر وہ لڑکی طارق کے دوست کے گھر کیا کر رہی تھی؟'' شوکت نے پھر نکتہ اٹھایا۔

''ہوں! کچھ مختلف ہے ضرور!'' مارک نے اقرار کیا۔

''تم ایک بار پھر ٹھیک سے معلوم کرو، آخر بات کیا ہے ورنہ میڈم نے ہم سب کی تکہ بوٹی کروا دینی ہے۔'' مارک نے الجھتے ہوئے کہا۔

''جی سر!'' شاکر اور شوکت دونوں اکٹھے باہر نکلے۔

''خود تو لاٹ صاحب ایک کمرے میں بیٹھے رہتے ہیں اور حکم چلاتے رہتے ہیں، پہلے کہا لڑکیوں کے بارے معلوم کروں، اب یہ نیا کام بھی سونپ رہا ہے۔ میں انسان ہوں، جن تھوڑی کہ ایک وقت میں کئی کام کروں۔'' شاکر نے بیزاری سے کہا۔

''اوپر سے اُس ہٹلر کی ماں کا ڈر الگ ہے ابھی آئی نہیں ہے، جب آئی اور گڑبڑ کی بھنک اُسے ملی تو ہم میں سے کسی کی خیر نہیں ہوگی۔'' شوکت نے میڈم رانی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''چل یار! دیکھی جائے گی ابھی تو پتا کر لڑکیوں کا ٹھکانہ، میں طارق کے ایڈریس والا معاملہ دیکھ لیتا ہوں۔'' شوکت نے خود ہی کام تقسیم کیے اور جا کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

❖❖○❖❖

''السلام علیکم بیٹا!'' احمد شاہ نے کوئی تیسویں بار فون ملایا تھا تب جا کر ترنم نے ریسیو کیا۔

''آ۔ آپ کون بول رہے ہیں؟'' ترنم کی آواز سہمی ہوئی تھی، یہ نمبر صرف طارق کے پاس تھا کیوں کہ ترنم نے آخری بار طارق سے ہی بات کی تھی۔

''بیٹا! میں احمد شاہ بول رہا ہوں عبدالولی اور نگینہ بیٹی کا والد۔'' احمد شاہ نے فوراً وضاحت کی۔ انہیں ڈر تھا کہیں لڑکی ڈر کر فون بند نہ کر دے، طارق اُن کو تفصیل بتا چکا تھا کہ جس کے پاس نگینہ ہے وہ اس وقت اپنے گروہ کے کارندوں سے چھپتی پھر رہی ہے اور بے حد خوف زدہ بھی ہے۔

''جی، انکل! آپ نگینہ کو لے جائیں یہاں سے۔'' ترنم نے عجلت سے کہا۔

''میں نہیں چاہتی کہ اگر میں پکڑی جاؤں تو ساتھ میں دوبارہ نگینہ اُن کے ہاتھ لگ جائے اور ہماری ساری محنت بے کار چلی جائے۔'' ترنم نے جلدی جلدی کہا۔

''آپ اس وقت کہاں ہیں؟'' احمد شاہ نے سوال کیا۔

''شہر سے دور ہائی وے کے قریب ایک کچی بستی ہے، فی الحال میں نے یہاں پناہ لی ہے کیوں کہ شہر میں تو ہر رستے پر مارک کے آدمی گھوم رہے ہیں۔ وہ تو اللہ نے بال بال بچایا اور میں بہ مشکل گاڑی یہاں سے موڑ کر لائی ہوں۔'' ترنم نے لمبی بات کے اختتام پر طویل گہرا سانس بھرا۔

''نگی کیسی ہے، میری اُس سے بات کروا سکتی ہیں؟'' احمد شاہ نے ایڈریس سمجھ کر بیقراری سے کہا۔

''وہ بُری طرح زخمی ہے، مارک نے اُس کے بازوؤں اور پیروں کو سگریٹ سے جلایا تھا۔ زخموں کی وجہ سے اُسے بخار ہے اور وہ بے سدھ سی ہے آپ سے کیا بات کرے گی، آپ بس جلدی آئیں اور

اُسے لے جائیں تا کہ کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا سکیں۔'' احمد شاہ کے آنسو بے اختیار نکل آئے۔

''وہ تو نازک سی گڑیا تھی، جس کو انہوں نے سنبھال سنبھال کر، سینت سینت کر رکھا تھا۔ اُس کی معمولی تکلیف پر انہیں خود کتنی تکلیف ہوتی تھی، وہ کیسے سہہ سکتی تھی یہ درد اور تکلیف۔ میری گڑیا جانے کس حال میں ہوگی۔'' انہوں نے بے حد فکر مندی اور تکلیف سے سوچا۔ فون بند کر کے انہوں نے الماری سے ریوالور اور رقم نکالی اور اپنے دفتر کا گن مین بلایا۔ ساتھ میڈیکل ایڈ گاڑی میں رکھوایا۔

گن مین کو انہوں نے گاڑی کے پیچھے بیٹھنے کو کہا اور خود گاڑی چلانے کا فیصلہ کیا۔ یہ سب کچھ انہوں نے بے حد راز داری اور خاموشی سے کیا تھا کہ اُن کے گھر میں موجود نگرانی کرتے پولیس اہلکار بھی محسوس کر سکے کہ کچھ غیر معمولی تھا۔ یہ ہدایت طارق کی تھی کیوں کہ وہ نگی کے ملنے کی خبر کسی طور لیک آؤٹ نہیں کروانا چاہتا تھا تا کہ آسانی اور حفاظت سے نگی تک پہنچا جا سکے۔ احمد شاہ جیسے صابر اور مضبوط اعصاب کے مالک کا سارا وجود اِس وقت بے حد بے چین تھا۔ واقعی انسان اولاد کی آزمائش پر کمزور پڑ جاتا ہے انہوں نے چلنے سے پہلے ایک بار پھر ولی کو فون ملایا تا کہ وہ فوری طور پر اس کو سید سرفراز علی کی چال میں پھنسنے سے روک سکیں لیکن ولی کا فون مسلسل بند جا رہا تھا۔

احمد شاہ کو زندگی میں پہلی بار اِس قدر بے بسی کا سامنا ہوا تھا انہوں نے ماتھا مسلتے ہوئے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ نگینہ کی زندگی ہر بات سے اہم تھی۔

''یا اللہ! سید سرفراز کو ولی سے ملنے کے بعد کسی قسم کا شک نہ ہو، ورنہ میرے بچے کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ اے اللہ تو سید سرفراز علی کی عقل اور آنکھوں پر پردہ ڈالے رکھنا تا کہ وہ ولی کی شکل میں اُس کی پہچان کو نہ ڈھونڈ لیں۔'' احمد شاہ نے صدق دِل سے دُعا کی۔

❖❖○❖❖

میری نگاہوں کے سامنے
آگ کا اک الاؤ بھڑک رہا ہے
یہ آگ میری وصیت ہے
یہ شعلے میرا گناہ
یہ سیاہی میری نافرمانی
یہ سب میری سزا ہے
اور میری سزا یہی ہونا چاہیے تھی
میری سرکشی اور وعدہ خلافی مجھے لے ڈوبی
میں نے تو وہ مہلت بھی گنوا دی
جو ڈوبتے لمحوں میں اپنے معبود سے مانگی تھی
نیکی، معافی، دہائی کے
ایثار، عظمت، عبادت کے
سارے عزم بھول کر

اپنے دل کی معبد خانے میں
پھر سے بت سجا بیٹھی تھی!!

ترنم، نگی کے بال سہلاتے ہوئے مسلسل اِسی فکر میں تھی کہ اگر نگی کو عبدالولی لینے آیا تو وہ کبھی اِس دُکھ سے نہ نکل پائے گی کہ عبدالولی اُس کی سچائی جان گیا ہے کہ وہ ایک بُری لڑکی ہے۔ یا اللہ صرف ایک شخص! صرف ایک شخص کے سامنے میں چاہتی ہوں کہ کبھی میرا بھرم نہ ٹوٹے۔'' ترنم نے بے چینی سے سوچا۔

''باجی!'' اُسی پل پیچھے آ کر کسی نے آواز دی۔

''آؤ رانی آ جاؤ!'' ترنم نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''باجی! میں اتنی خوش ہوں آپ کے آنے سے کہ مجھے تو سمجھ ہی نہیں آ رہی میں کیا کروں؟'' رانی نے چمکتے چہرے کے ساتھ کہا۔

''رانی! تم بہت اچھی ہو!'' ترنم کہے بنا نہ رہ سکی۔ اُسے واقعی رانی بہت اچھی لگی تھی تب ہی تو جب وہ اِس علاقے میں آئی تو وہ خود بہ خود رانی کے گھر آ گئی تھی اُسے اپنا گھر ابھی تک یاد تھا۔

اُسے اُس کے گھر گزاری وہ رات اور پڑھی نماز اب تک یاد تھی۔ اُسے رانی کا معصوم اور پاکیزہ چہرہ بھی یاد تھا۔

جب وہ رانی کے پاس آئی تو اس کو ایک بار پھر یقین نہ آیا کہ وہ حسین پری جس کے حسن کو وہ اب تک نہ بھلا پائی تھی ایک بار پھر اُس کے گھر آئی ہے خوشی اور حیرت نے اُسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا اِس بار اُس کے ساتھ ایک بیمار لڑکی بھی تھی، وہ بھی رج کر سوہنی تھی۔ رانی، ترنم کو دوبارہ دیکھ کر بے حد خوش تھی۔

''جاوید کب تک آ جاتا ہے؟'' ترنم نے احتیاط کے طور پر پوچھا۔ کچھ بھی تھا جاوید، میڈم راگنی کا بندہ تھا ایسے میں جب سب اُسے تلاش کر رہے تھے جاوید کے گھر رکنا خطرے سے خالی نہ تھا وہ کسی بھی پل یہاں اُن کی موجودگی جان کر مخبری کر کے اُن کو پھنسا سکتا تھا۔ بے شک جاوید باقی سب سے مختلف تھا لیکن پھر بھی ترنم اُس پر اعتبار نہ کر سکتی تھی۔ جو شخص مذہب اور روایات کے اتنے قریب رہ کر بھی گناہ کا ساتھ دیتا تھا، وہاں کی روزی کھاتا تھا اُس کا اعتبار کرنا ترنم کے لیے مشکل تھا۔ لیکن اُسے رانی پر اعتبار تھا وہ سادہ دِل اور بہت اچھی لڑکی تھی پھر اتفاق سے وہ اُن کے علاقے میں تھی رانی کے علاوہ وہ یہاں کسی اور کا گھر بھی نہ جانتی تھی، اس لیے اُس نے مجبوراً سہی لیکن فیصلہ لیا تھا کہ وہ چند گھنٹوں کے لیے رانی کے ہاں پناہ لے گی۔

''باجی! جیدا تو رات گزار کر صبح سرگی ویلے آتا ہے جانے کیسا کام ہے، جو ساری رات ہوتا ہے اور سرگی ویلے جا کر ختم ہوتا ہے۔'' رانی کی بات پر ترنم نے بے اختیار نگاہیں چُرائیں۔ وہ کیا بتاتی کہ ساری رات لڑکیوں کو گناہ کے بعد وہ اِن پوٹلیوں کو اٹھا کر اُن کے ٹھکانے پہنچا کر واپس گھر آتا ہے۔

''لیکن وہ تم سے محبت کرتا ہے تمہاری خاطر ہی تو محنت کر رہا ہے۔'' ترنم نے گہرا سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک کہتے ہو باجی تُسی! خالہ کہتی ہے کہ ہم ساری عورتیں نا بڑی ناشکری ہوتی ہیں، اپنے مردوں کی

ساری اچھائی بھول جاتی ہیں اگر وہ کوئی ایک شے بھی بھول جائیں، جس پر اللہ سوہنا بہت ناراض ہوتا ہے۔ اللہ سوہنا کہتا ہے کہ شوہر کی ناشکری نہ کرو۔" رانی نے یہ بات جھوم جھوم کر بتائی۔

وہ ترنم رانی کو بہت دِل چسپی سے دیکھ رہی تھی اُسے اُس کی باتوں میں کسی بہت اپنے کی گونج سنائی دی تھی۔

"ارے واہ! تم تو بہت اچھی باتیں کرتی ہو، کہاں سے سیکھی ہیں؟" ترنم نے کھوئے کھوئے لہجے میں پوچھا۔

"بتایا تو ہے باجی اپنی خالہ جی سے سیکھی ہیں۔" رانی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تمہاری خالہ کہاں ہیں، پچھلی بار اُن کا پکایا کھانا بھی تم نے کھلایا تھا بہت مزے کا تھا۔" ترنم کی بات پر رانی ایک دم کھل اُٹھی۔

"آپ کو! آپ کو ابھی تک یاد ہے!" رانی کو خوشی کے ساتھ حیرت بھی ہو رہی تھی۔

"ہاں! میں اُس کھانے کی لذت کو کیسے بھول سکتی ہوں! ایسا کھانا میری امّاں پکایا کرتی تھیں، میں نے اُس روز برسوں بعد بالکل اپنی ماں جیسا کھانا کھایا تھا رانی۔ میں اُسے کیسے بھول سکتی تھی۔" ترنم کسی اور ہی ٹرانس میں تھی۔ رانی نے بے اختیار ترنم کو چونک کر دیکھا۔

"وہ، میری خالہ نے آپ کی ایک جھلک دیکھی تھی۔" رانی نے بہ غور ترنم کو دیکھا۔ وہ اِس سوچ میں تھی کہ اتنی بڑی میڈم کو اُسے اپنی خالہ کی کہانی سنانی چاہیے بھی یا نہیں۔

"تو پھر؟" ترنم کے چہرے پر بہت نرم تاثرات دیکھ کر رانی کو کچھ ہمت ہوئی تھی۔

"میری خالہ کچھ جھلی سی ہے کبھی کبھی تو بالکل جھلی ہو جاتی ہے اُسے ارد گرد کی سُدھ بدھ نہیں رہتی، لیکن کبھی کبھی وہ بالکل ہوش میں رہتی ہے اور بڑی اچھی باتیں کرتی ہے لگتا ہی نہیں کہ وہی جھلی خالہ ہے، وہ گھنٹوں ایک ہی نقطے پر ٹکٹکی باندھے چپ چاپ بیٹھی رہتی ہے جب آپ آخری بار آئی تھیں تو اُس نے آپ کو دیکھا اور اپنی کھوئی بیٹی سمجھنے لگی، میں نے لاکھ سمجھایا پر وہ نہ مانی، کہتی تھی کہ یہی میری ایمان فاطمہ ہے!"

"یہی میری ایمان فاطمہ ہے!" ترنم یوں جھٹکے سے اُٹھی، جیسے اُسے کرنٹ لگا ہو۔

"کیا! کیا کہا تم نے؟" ترنم کی آنکھوں سے زار زار آنسو بہہ رہے تھے۔

"خالہ آپ کو اپنی کھوئی بیٹی سمجھی تھی۔" رانی، ترنم کے آنسوؤں سے سہم گئی اس لیے اُس نے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔

"تم نے ابھی کیا نام لیا تھا؟" ترنم نے اُس کے ہاتھ تھام کر پوچھا۔

"جی۔ باجی! وہ ایمان فاطمہ!" رانی نے کچھ گھبرا کر ترنم کو دیکھا۔

ترنم اب رانی کے پیروں میں بیٹھی رو رہی تھی۔

"آپ کیوں رو رہی ہو باجی! وہ خالہ تو جھلی ہے، کراچی سے یہاں تک آ گئی اپنی کھوئی بیٹی کو ڈھونڈنے، لیکن جب وہ سُدھ بُدھ کھوتی ہے تو اُسے ہر خوب صورت کڑی میں اپنی ایمان فاطمہ نظر آتی ہے۔" رانی نے ترنم کے رونے سے ڈر کر وضاحت کی۔

"آہ! میری ماں ہے وہ۔ میری ماں ہے وہ رانی!" ترنم نے ہچکیوں میں کہا۔

"آپ کی ماں؟" اس بار رانی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں! میں ہی وہ گناہ گار ہوں جس کا اتنا پاکیزہ نام تھا، میں ہی وہ سیاہ کار ہوں جس کا اتنا اُجلا نام تھا ایمان فاطمہ! میں ایمان فاطمہ ہوں!" ترنم نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھوتے ہوئے کہا۔ پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی، جیسے وہ خود سے ہی بہت برسوں بعد ملی ہو۔

"پر خالہ کی بیٹی تو کھو گئی تھی باجی!" رانی نے اُس کے برابر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں! میں اس دنیا کی بھیڑ میں کھو گئی تھی ایک ایسی دلدل میں پھنس گئی تھی، جہاں موت کے سوا نکلنا ممکن نہیں تھا۔" ترنم نے زیر لب کہا۔

"تم مجھے میری ماں سے ملوا دو رانی!" ترنم نے اُس کے ہاتھ تھام کر منت سے کہا۔

"وہ یہاں نہیں ہے باجی! ہسپتال میں ہے، سرکاری ہسپتال میں، اُسے سونے کے انجکشن لگانے پڑتے تھے نا اِس لیے اُسے داخل کروانا پڑا۔ اِس خالی گھر میں مجھے خالہ کا آسرا بہت ہوتا ہے۔ بے شک مہینوں نہ بولے پر گھر میں جی تو ہوتا ہے نا! ورنہ اِس اکیلے پن میں تو میں بھی کملی ہو جاتی جی۔" رانی کو لمبی چوڑی بات کرنے کی عادت تھی۔ ترنم تو ویسے بھی کان بنی بیٹھی تھی یہ ذکر تو اُس کی ماں کا تھا۔

میری ماں زندہ ہے!

میں اُس سے مل سکوں گی!

"آہ میرے خدایا! اے میرے مہربان رب۔"

"اے اللہ! میں کچھ عرصہ زندہ رہنا چاہتی ہوں تا کہ اپنی ماں سے مل سکوں۔" ترنم نے لب کاٹتے ہوئے با آواز بلند دُعا کی۔

اُسی پل باہر رانی کو گاڑی رکنے کی آواز آئی۔

"رانی! یہ کس کی گاڑی ہو سکتی ہے؟" ترنم نے اپنا چہرہ چادر سے صاف کرتے ہوئے پوچھا۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں جاوید نہ آ جائے۔

ترنم نے بے ہوش نگی کو دیکھا، جو ایک قدم بھی نہ چل سکتی تھی، اُسے اٹھا کر لے جانا خاصا مشکل کام تھا۔

"یہ گاڑی! شاید جیدا نہ آ گیا ہو!" رانی نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں! جیدا ہی ہے، ایسے ریس دے کر تو وہی گاڑی بند کرتا ہے۔" رانی کے انکشاف پر ترنم کی روح فرساں ہو گئی۔

"با۔ باہر تو میری گاڑی بھی کھڑی ہے، وہ جان جائے گا کہ میں اندر ہوں، میں نے گاڑی گلی کے پیچھے کھڑی کی تھی اللہ کرے اُس کی نظر نہ پڑے لیکن اگر اُس کی نظر پڑ گئی تو؟"

"اے اللہ! اب کیا کروں؟" ترنم نے نگی کو اچھی طرح چادر میں لپیٹا اور کھڑا کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ لڑھک گئی۔ نگی بالکل بے سُدھ تھی۔

یا اللہ میں نگی کو کیسے باہر نکالوں۔

باہراب دروازہ کھٹک رہا تھا۔

''باجی! تم کہاں جارہی ہو؟'' رانی نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے، مجھے باہر جانا ہے کیا یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟'' ترنم نے نگی کو بہ مشکل اٹھایا جو گرگر جارہی تھی۔

''ان کو کدھر لے جارہی ہو باجی؟ یہ بیمار ہے، جیدا آیا ہے وہ آپ کو ہسپتال لے جائے گا۔'' رانی کو ترنم کی عجلت سمجھ نہ آرہی تھی۔

''دیکھو رانی! میری بات غور سے سنو! مجھے جیدے سے نہیں ملنا مجھے اس سے جان کا خطرہ ہے ہمیں یہاں سے نکلنے کے لیے مدد کرو۔ اللہ کے واسطے مدد کرو۔'' ترنم نے مختصراً کہا۔

''لیکن جیدا کیوں آپ کا دشمن بنے گا؟'' رانی کی حیرت تھی کہ ختم ہی نہیں ہورہی تھی۔

''رانی! بعد میں سوال کرنا پہلے میری مدد کرو یہاں سے نکلنے کے لیے۔'' ترنم چلائی۔

باہر دروازہ اب بُری طرح بجایا جارہا تھا۔

''اچھا! میرے ساتھ چلو!'' رانی نے ترنم کے ساتھ نگی کو سنبھالا اور گھر کے پیچھے کی جانب لے آئی۔ یہاں ایک کھڑکی تھی، رانی نے کھڑکی کھولی تو اُس میں کوئی سلاخ یا جالی نہ تھی اس نے نگی کو ترنم کی مدد سے باہر نکالا اور کھڑکی بند کرنے سے پہلے تاکید کی کہ وہ یہاں بیٹھ کر اُس کا انتظار کریں، وہ کچھ کرتی ہے کہ آکر نگی کو اٹھوا کر گاڑی تک لے جائے گی۔ پھر وہ جلدی سے کھڑکی بند کرکے اندر کو پلٹی۔

باہر شدید سردی میں ترنم کے دانت بج رہے تھے گلی میں گھپ اندھیرا تھا، کتوں کے بھونکنے کی آواز بالکل قریب سے آرہی تھی۔

''اگر میں رانی کا انتظار کرتی ہوں کہ وہ مجھے گاڑی تک لے جائے تو کہیں ہم پکڑے نہ جائیں۔ مجھے خود ہی کچھ کرنا ہوگا!'' ترنم نے فیصلہ کیا اور نگی کو گھسیٹتے ہوئے لے کر چلنے لگی، گلی کے موڑ پر اُسے اپنی گاڑی نظر آئی۔ چند فٹ پر موجود گاڑی ترنم کو بہت دور لگ رہی تھی اس کا سانس پھول گیا تھا۔ نگی زمین پر گھسٹ گھسٹ کر کراہ رہی تھی۔

''میری بہن! پلیز تھوڑی ہمت کرو!'' ترنم نے نگی کے سر پر پیار کرتے ہوئے کہا۔

اُسی پَل دور بہت ساری روشنیاں ترنم کو نظر آئیں۔

''اتنی ساری گاڑیاں کس کی ہیں اور اِس کچی بستی میں کیا کرنے آرہی ہیں۔'' ترنم نے ایک پل کو اپنے آپ سے سوال کیا اور اگلے ہی پل اُسے کسی بہت بڑے خطرے کی بو آئی، سامنے جاوید کے آجانے کا خطرہ اتنا زیادہ نہ تھا جتنا کہ اِن گاڑیوں کے قریب آنے کا۔ ترنم نے اپنی پوری طاقت صرف کرکے نگی کو گاڑی تک گھسیٹا اور کانپتے ہاتھوں سے اُسے گاڑی میں ڈالا۔ گاڑی اسٹارٹ کی لیکن گھبراہٹ میں اُس سے گاڑی اسٹارٹ نہ ہورہی تھی۔

ترنم نے چیخ چیخ کر روتے ہوئے ایک بار پھر گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی۔

گاڑیاں کچھ قریب آتی محسوس ہوئی تھیں یہ گاڑیاں مارک کے بندوں کی ہوسکتی تھیں اس کا چانس اسی فیصد اِس لیے تھا کیوں کہ اُن کا ٹھکانہ یہاں سے دور نہ تھا۔ وہ لوگ ڈھونڈتے ہوئے یہاں آسکتے تھے۔

ر جاتے جاتے واپس پلٹ آئی تھی یہ بستی نما گاؤں ہائی وے سے نیچے اُتر کر تھا ترنم کوئی رسک نہیں اہتی تھی کہ وہ گاڑیاں قریب آجائیں۔

ں نے اللہ کا نام لیتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی اور نہیں جانتی تھی کہ اندھیرے میں رینگتی ہوئی اُس اڑی اُسے کس انجام سے دوچار کرنے والی ہے اُس نے گاڑی کی لائٹیں بند کر رکھی تھیں تا کہ دور اس کی گاڑی نظر نہ آئے لیکن اس وجہ سے اُسے راستہ دیکھنا دشوار ہورہا تھا۔

طرے کے قریب آنے کا احساس پل پل اُس کی سانس اور اعصاب بے ترتیب کررہا تھا۔

❖❖○❖❖

'کیا بات ہے نفیسہ؟'' کیوں اتنی جلدی بلایا ہے تم کو ہر وقت کیا افراتفری پڑی رہتی ہے۔ مسکان ل ہے نا؟ نکاح خواں اندر آتے ہی ہوں گے۔'' سید سرفراز علی نے آتے ہی غصّے کے ساتھ کہا۔

''اگر تمہاری خودساختہ تقریر ختم ہوچکی ہو تو میں تم کو کچھ بتاؤں؟'' آپا امّاں نے ماتھے پر تیوری ڈال کر

تا مشکل ہوتا ہے، جب دو اشخاص اکٹھے رہتے ہوں اور کچھ فیصلے بھی اکٹھے لینے پڑتے ہوں لیکن وہ وسرے کو ناپسند کرتے ہوں۔

'ہاں بولو؟'' سید سرفراز علی نے بے نیازی سے پوچھا۔

''تم نے جو لڑکی اٹھوائی ہے وہ عبدالولی کی بہن نہیں ہے!'' آپا امّاں نے کوئی بھی تمہید باندھے بغیر اہ کیا۔

'کیا؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟'' سید سرفراز علی نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا۔

''تمہارے آدمی کسی اور لڑکی کو اٹھا لائے ہیں میں ابھی ابھی اُسی لڑکی سے مل کر آرہی ہوں۔ یہ وہ لہیں ہے جو عبدالولی کی بہن ہے کیوں کہ عبدالولی کی بہن کو میں دیکھ چکی ہوں۔'' آپا امّاں نے مل سے جواب دیا۔

''تم۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو؟'' سید سرفراز علی کا چہرہ بے شک سپاٹ تھا لیکن اُن کی آنکھوں میں بے ا بے حد نمایاں تھی۔

''ہاں!'' آپا امّاں نے تھکے تھکے انداز میں اقرار کیا۔

''تم ہار گئے ہو سید سرفراز علی! تم اُس قسمت بنانے والے سے ہار گئے! تم مسکان کو اُس کی خوشی دینے ناکام ہوچکے ہو مان لو کہ تمہاری ہار کا وقت شروع ہوچکا ہے! اب تمہارا مکافاتِ عمل شروع ہوگیا، اں اس چیز کا ہے کہ اس سارے سفر میں میری مسکان کے حصے میں درد آرہا ہے اور یہ درد صرف اس ہے کیوں کہ تم اُس کے باپ ہو!'' آپا امّاں مسلسل بول بول کر ہانپنے لگی تھیں۔

''نہ اتنا کوسا کرو مجھے، اب تم میں جوانی جیسی ہمت کہاں رہ گئی، بوڑھی ہوگئی ہو مجھے کوسنے کے چکر تیری اپنی طبیعت خراب ہوجاتی ہے۔ تم نے سید سرفراز علی کو کم زور سمجھا ہے کیا؟ اگر جو چال ہماری کم زور پڑگئی ہے اس کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ ہم ہار جائیں گے۔ سید سرفراز علی نے ہارنا سیکھا ہی ل ہے۔''

سید سرفراز علی کے ایسا کہنے پر آپا امّاں طنزیہ ہنسیں۔

"جب تک نکاح نہیں ہو جاتا، عبدالولی اپنی بہن سے نہیں ملے گا۔" سید سرفراز علی نے کہا۔

"اور نکاح کے بعد؟" آپا امّاں نے سوال اٹھایا۔

"پہلے تمہاری زبردستی اور پھر تمہارا دھوکہ، یہ بنیاد رکھو گے اپنی بیٹی کی خوشیوں بھری زندگی کی؟" آپا امّاں کا سوال سید سرفراز علی جیسے مہر لگے دل پر کیا اثر کرتا۔

"تم بے فکر رہو! اسے کچھ نہیں ہوگا۔ اُس کا نکاح آج ہی ہوگا اُسے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا وہ میری بیٹی ہے!" سید سرفراز علی نے فخریہ انداز میں کہا اور باہر نکل گئے۔

"یہی تو دکھ ہے کہ وہ تمہاری بیٹی ہے!" آپا امّاں نے بے بسی سے سر تھاما۔

❖❖○❖❖

"ہیلو! گڑیا تم کیسی ہو؟" عبدالولی نے بے قراری سے فون تھام کر نگی سے بات کی، وہ نہیں جانتا تھا کہ دوسری جانب نگی نہیں بلکہ اُس کی دوست کاشفہ ہے جو ایک دوپٹے کی غلطی کی وجہ سے بے قصور ہوتے ہوئے بھی قید میں تھی۔

کاشفہ کو بتایا گیا تھا کہ اُس کا بھائی بات کرے گا۔ اس کو بے حد حیرت نے گھیرا تھا کہ اُس کا بھائی تو بے حد سخت انسان تھا کیا وہ واقعی اُسے بچانے آ گیا۔

واقعی خون تو خون ہوتا ہے! وہ اپنی بہن کی خاطر آیا ہوگا میرا بھائی آیا ہوگا۔ کاشفہ کو خوش گمانی نے گھیرا تھا۔

"بھائی۔ بھائی! مجھے لے جاؤ یہاں سے!" کاشفہ نے سسکیوں میں کہا تھا۔

"میں۔ مجھے گھر جانا ہے!" کاشفہ کی آواز آنسوؤں سے بھری ہوئی تھی اس لیے عبدالولی نگی اور کاشفہ کی آواز میں تفریق نہ کر سکا۔

"میری گڑیا! میں بہت جلد تم کو یہاں سے لے جاؤں گا تم فکر نہ کرو، بس میں ابھی آتا ہوں۔" عبدالولی نے بہن کو دلاسہ دیا۔

ساتھ ہی فون کاٹ دیا گیا۔ عبدالولی کو نہایت بے بسی کا احساس ہوا۔ اُسے لگا جیسے وہ اور اُس کی بہن قید خانے میں ہوں اور ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہو۔

ولی کا دل کراہ رہا تھا اس کا دل چاہا اس اونچی شان دار حویلی اور اس کے مکینوں کو تباہ و برباد کر دے۔

اُسی پل نکاح خواں اور سید سرفراز علی کے کچھ بندے ولی کے پاس آئے۔

"سائیں! اندر چلیں اور یہ سہرا باندھ لیں ہمارے ہاں دولہے کا چہرہ نکاح کے بعد دیکھا جاتا ہے۔" سید سرفراز علی کے خادم خاص نے آگے بڑھ کر کہا۔

عبدالولی کا روم روم تھکن سے چُور ہونے لگا جن کاموں میں دل مندا ہو وہاں ایسے ہی سفر اور وقت سے پہلے تھکن اُتر آتی ہے۔

عبدالولی نے اپنا آپ ڈھیلا چھوڑ دیا۔ جس وقت عبدالولی کے سر پر سہرا سجا کر اُسے اندر لے کر جایا جا رہا تھا اُسے پہلی بار احساس ہوا کہ شاید پھانسی والے قیدی کے پاؤں بھی ہر ہر قدم پر ایسے ہی منوں

ری ہوتے ہوں گے۔ اَن مانے جی سے جو رشتہ وہ بنانے جا رہا تھا، جانے وہ اُسے کیسے نبھائے گا یوں نبھائے گا!

بہن کی زندگی و آبرو داؤ پر نہ لگی ہوتی تو وہ اِس Crule گیم کا کبھی حصہ نہ بنتا۔ جس میں مسکان اور دونوں کی زندگی کا اناڑیوں کی طرح تہس نہس کیا جا رہا تھا۔

❁

مرے لہو کی روانیوں میں
نہاں ہے تُو ہی
مری نظر میں
اِک عالمِ بیکراں ہے تُو ہی
کلام میں سانس لے رہا ہے
بصولتِ اشک
رات، دن مجھ سے کہہ رہا ہے
دُعائیں تو ہی سُنے گا آخر!
کہ تُو ہی تو آسرا ہے
اس کربِ جاوداں میں
تو ہی علاج ہوگا

ترنم نے گاڑی کو تیزی سے ریورس کر کے کچھ گھروں کی آڑ لی، اگر وہ سڑک پر جاتی تو فوراً پکڑی جاتی۔

''یا اللہ! تیرا ہی آسرا ہے، اِس وقت یہ اندھیرا ہی ہمارا پردہ ہے، ورنہ یہ گھر بھی ہمیں نہیں چھپا سکتے۔'' ترنم نے گاڑی کا انجن بند کر کے دھڑکتے دل سے دُعا کی۔

''تو مدد فرما اے اللہ!'' گاڑیوں کے رُکنے اور دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آواز کی گونج رات کے سناٹے کی وجہ سے بہت زیادہ واضح تھی۔

''یا اللہ!'' ترنم کو اتنی شدید سردی میں ٹھنڈے پسینے آتے محسوس ہوئے، اُس نے بے اختیار اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نگی کو دیکھا، لیکن وہ بے سُدھ پڑی تھی۔

''جاوید کا گھر اگلی گلی میں ہے سر! یہ گلی نہیں ہے!'' کسی نے زور سے اونچی آواز میں کہا۔

یہ گھر خاصی نیچی جگہ پر تھے، ہائی وے تو بہت اونچی تھی۔ ترنم کو اندازہ ہوگیا کہ گاڑیاں سڑک کی اونچائی پر ہیں اور اگر یہاں اس بستی میں اتنا گھپ اندھیرا نہ ہوتا تو ترنم کے چھپنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا ابھی بھی وہ بُری طرح لرز رہی تھی۔

''اگر جو گاڑیوں کی روشنی اُس کی گاڑی پر پڑ گئی تو؟'' ترنم سے مزید کچھ سوچنا دُشوار ہو رہا تھا بے شک

گھروں کی آڑ میں تھی لیکن اونچائی سے اُس کی گاڑی کو دیکھنا بہت مشکل نہ تھا۔
ات کا یہ اندھیرا اور اِس کچی بستی میں بجلی کی سہولت کا فقدان اللہ نے اُس کے لیے رحمت بنا دیا تھا۔
سر! جاوید کو فون کیا ہے وہ آ رہا ہے۔'' ایک بار پھر کسی نے چیخ کر کہا۔ غالباً وہ سڑک پر کھڑے افراد
طلب تھا اس لیے اِس قدر اونچا بول رہا تھا۔
لم نے دھڑکتے دِل سے اُن گاڑیوں کی جانب دیکھا۔ گاڑیوں کی تیز روشنی جو سڑک پر موجود تھی وہ
دہلا رہی تھی۔
''کسی پل جو روشنی نے حرکت کر ڈالی تو؟'' یوں لگ رہا تھا، جیسے کوئی ایٹم بم ہے جو کسی بھی پل پھٹنے
تھا۔
لم کے ماتھے پر ننھے منے پسینے کے قطرے جگمگا رہے تھے حلق پیاس سے خشک ہو رہا تھا اپنی زندگی کی
لکل فکر نہ تھی اُسے تو صرف نگینہ کی فکر تھی کہ اُس کی عزت اور جان اِن درندوں سے بچ جائے۔ جس
لیہ پاکیزہ تھی اور نیک اور شریف خاندان سے تعلق رکھتی تھی ترنم نہیں چاہتی تھی کہ نگینہ اور اُس کے
ان کو یہ جان لیوا ظلم سہنا پڑے، کیوں کہ اگر وہ مارک کے ساتھیوں کے ہتھے چڑھ جاتی تو ترنم کے
ساتھ نگینہ کا انجام بھی عبرت ناک ہونا تھا۔
''اللہ جی مدد! اے اللہ اِن کی آنکھوں اور دِل و دماغ پر پردہ ڈال دے۔'' ترنم نے روتے ہوئے
الی۔
ابھی وہ پوری طرح دُعا بھی مکمل نہ کر پائی تھی کہ گاڑیوں کے دروازے بند ہونے کی واضح آواز سنائی
اور دھیرے دھیرے روشنیاں دُور ہوتی چلی گئیں۔
رنم نے دُعا کرتے کرتے ایک دم آنکھیں کھولیں، اللہ نے ایک بار پھر معجزانہ طور پر اُن کو بچا لیا تھا۔
''آہ! مجھ گناہ گار کی کیا دُعا قبول ہونی ہے، نگینہ تم بہت لکی ہو، تمہارے والدین کی دُعائیں ہیں کہ تم
انہ طور پر ایک ایسے جہنم سے نکلیں، جہاں سے ایک لڑکی کا نکلنا ناممکن تھا پھر تمہاری عزت محفوظ ہے
ے بڑھ کر اور کیا چاہیے!'' ترنم کا حلق نمکین پانی سے کڑوا ہوگیا تھا زندگی میں کچھ **Losser** ناسور
طرح بن جاتے ہیں، جو ہر وقت اپنے ہونے اور اپنی تکلیف کے ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ شہر
ہوئے مارک کے آدمیوں سے بچنا، جاوید کے گھر میں جاوید سے بچنا اور اب عین سر پر کھڑے اِن
ان سے بچنا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ واقعی جب کسی کی دعائیں اِنسان کو تھامتی ہیں تو تکلیف کی ہر
پار ہو جاتی ہے اور دشمن کی آنکھ اور دِل و دماغ پر پردہ پڑ جاتا ہے۔
''نگینہ! تم کس قدر لکی ہو نا۔'' ترنم نے پیچھے مڑ کر بے سُدھ نگی کو مخاطب کیا۔
رنم نے بے اختیار گہری سانس بھری اور موبائل پرس سے نکال کر احمد شاہ کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔
نا تو ترنم کو بھی محسوس ہوگیا تھا کہ اللہ نے یہ کام پار لگوانا تھا تو یہ سب ناممکن باتیں ممکن ہوتی جا رہی
۔ کسی کام کے ہونے میں اُس کی راہ کی کٹھنائیاں جس قدر دُور ہوتی ہیں، اُسی قدر وہ کام تکمیل کے
پہنچ جاتا ہے۔
''السلام علیکم انکل!'' ترنم نے بیٹھی بیٹھی آواز میں کہا۔ مسلسل خوف و دہشت سے اُ[illegible] آواز خراب

ہوگئی تھی۔

''بس آپ جس قدر جلد ممکن ہو آجائیں۔'' ترنم نے گھور اندھیرے میں دائیں بائیں یوں دیکھا، جیسے کوئی اُسے سُن یا دیکھ رہا ہو۔

''مجھے نہیں معلوم کہ آئندہ ایک گھنٹے میں، میں نگی کو کیسے بچا پاؤں گی ہر جانب خطرہ ہے وہ لوگ شکاری کتوں کی طرح ہماری بُو سونگھتے ہوئے تلاش کررہے ہیں۔'' ترنم نے بیٹھی بیٹھی آواز میں کہا۔

''تم فکر نہ کرو، ہم راستے میں ہیں جس قدر ممکن ہوا ہم آپ کے پاس ہوں گے بیٹا جی!'' احمد شاہ نے اُسے تسلّی دی۔

''جی انکل! میں آپ سے رابطے میں رہوں گی، ان کیس مجھے یہاں سے موو بھی کرنا پڑا تو میں آپ کو انفارم کروں گی۔''

''ٹھیک ہے بیٹا!'' احمد شاہ نے طویل سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''اللہ تم کو اِس کا اجر دے۔'' احمد شاہ نے ترنم کو دُعا دی۔

''اچھا انکل! فون رکھتی ہوں!'' ترنم کا دِل بھر آیا۔

باپ، ماں کیسے اَن مول رشتے تھے کتنی بے لوث محبت اور دُعائیں تھیں ان کی۔ آہ! میں نے ہی اُن کی قدر نہ کی! جب تک نعمتیں انسان کے پاس رہتی ہیں، وہ اُن کی قدر سے اَن جان رہتا ہے۔

''آہ! ایمان فاطمہ! یہ تم نے کیا کیا تھا!''

تیرا باپ جو ہر سانس کے ساتھ تیرے لیے دُعا گو رہتا تھا تم کو اُس کی قدر کبھی نہ ہوئی۔ اور آج !! آج ایک غیر آدمی کی دعا اُسے اتنی قیمتی لگی تھی کیوں کہ وہ بہت سال پہلے اپنی زندگی کو دُعاؤں کے سہارے سے محروم کرچکی تھی ایسے میں ایک بالکل اجنبی شخص کی دُعا کیسے اُسے اہم لگی تھی جب کہ وہ جان گئی تھی کہ اجنبی لوگوں کی دعاؤں کے Concern کا پیمانہ کس قدر زیادہ ہوسکتا ہے۔

جب ہم Concerns کھوتے ہیں تو رشتوں کی جان کو کھوجتے ہیں کیوں کہ ہر رشتے کی روح اُس کا Concern ہوتا ہے۔ آہ! مجھے کہاں پناہ ملے گی! کیا تھوڑا سا آسمان اور تھوڑی سی زمین جہاں دو قدم رکھ سکوں۔'' ترنم نے سسکتے ہوئے سوچا۔

مٹھی بھر
اِس زیست کی
بس اِک خواہش ہے
کہ ہاتھ بھر آسماں
اور دو قدم کی زمین
میسر ہوجائے
کہ مجھے خود کے ہونے کا احساس مل جائے

ترنم نے روتے روتے چادر سے آنسو صاف کیے اور پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر نگی کے پاس بیٹھ گئی اُس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اُس کے ماتھے کو بوسہ دیا۔

لو اپنی معصومیت، پاکیزگی اور اپنے اچھے دِل کی وجہ سے مجھے ہمیشہ اچھی لگی لیکن میرے دِل میں اس قدر جگہ کا حوالہ کوئی اور بھی ہے۔ پلیز اُسے میری اصلیت نہ بتانا!'' ترنم بے ہوش نگی سے ایسے بات کررہی تھی، جیسے کسی ہوش مند سے کرتے ہیں۔

''میں بھی کتنی پاگل ہوں نا کہ اتنے مشکل حالات میں بھی مجھ کو اپنے دل کے بھرم یاد آرہے ہیں۔ اے اللہ جیسی تیری مرضی!'' ترنم نے تھک کے سیٹ سے سر ٹکادیا۔

بالکل ایسی کشتی کی طرح جس کے چپّو تو سمندر میں کھو گئے ہوں لیکن جب انسان کی تقدیر تیرنا سیکھ لے تو پار لگنے کے لیے کسی چپّو کی ہرگز ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

❖❖○❖❖

لے یرغمال بنا کے
ہری آزادی کے بدلے
اد مجھے شرائط پیش کی گئیں
میں بے چارگی سے ہنس دیا
ہری ہنسی میں
کسی بجھے ہوئے چراغ کی آخری کراہ
اور موت کی سرد کڑکڑاہٹ تھی
ہر طرف گہرا اور پُر ہول سکوت پھیلتا چلا گیا

زندگی کو ہمیشہ جیتنے والے عبدالولی نے جب پہلی بار ہار کا سامنا کیا تو وہ اُس کی زندگی کی سب سے بڑی ہار تھی۔

''میں نے آج تک بہت ساری لڑکیوں کے دِل دُکھائے، میں سب کے لیے آئرن مین تھا، ایسا تھا جو کسی سے فتح نہ ہوسکتا تھا۔ ناقابل شکست شخصیت کو پروان چڑھانے کے لیے میں نے بے دلی کو منتخب ضرور کیا لیکن اِن سب لڑکیوں کی جو میری طرف کسی مقناطیس کی طرح کھنچی چلی آتی تھیں عزت کی، میں نے اگر اُن کو کبھی Positive رسپانس نہیں دیا تھا تو بھی ہمیشہ احترام تو دیا تھا۔ لیکن اللہ! کیا مجھے اس گناہ کی سزا ملی ہے کہ مجھے میری محبت نہیں ملی۔'' عبدالولی نے نکاح نامے کے ساتھ ایک قانونی دستاویز پر بھی سائن کیے تھے اُس وقت اِس جال میں باخوشی خود کو پھنستے دیکھ کر اُس نے بے اختیار سوچا۔ اُس کی آنکھوں میں مرچیں بھر آئی تھیں۔

کتنی بڑی بے بسی تھی کہ وہ مرد تھا اِس لیے رونے کی منادی تھی، دِل ہلکا کرنے کا حق اُس کے پاس نہ تھا۔

''کیا اب میں یہ Stupid سا پردہ سر سے اُتار سکتا ہوں؟'' عبدالولی نے جل کر سید سرفراز علی سے کہا۔

ہوا! سید سرفراز علی ہنس پڑا، خوشی اور فتح کا نشہ آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔

''غصہ تھوک دو یار! دیکھو یہ تو پہلے سے طے تھا کہ تم میرے ہی داماد بنو گے پھر غصّے میں رہنے کا

فائدہ؟'' سید سرفراز علی نے چہکتے ہوئے کہا۔

''آپ اپنی زبردستی کو اللہ کے فیصلوں کی آڑ نہ دکھائیں۔'' عبدالولی نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر

''لڑکا زوردار ہے، کیا بولتا ہے، مزہ آئے گا! سید سرفراز علی کو عبدالولی پر پیار آ رہا تھا سب کچھ اُ منشا کے مطابق ہوگیا تھا اُن کو سب کچھ اچھا لگ رہا تھا حتیٰ کہ ولی کا چیخنا اور غصہ کرنا بھی اچھا لگ تھا۔

''اچھا پہلے گلے تو ملو، پھر میں خود اپنے داماد کا سہرا اٹھاؤں گا، آخر اب تم میری بیٹی کے شوہ تمہاری عزت افزائی ہمارا فرض ہے۔'' سید سرفراز علی نے خوش اخلاقی سے کہا۔

''ہونہہ! عزت افزائی!'' ولی دِل ہی دِل میں تلملایا۔

اس سے پہلے کہ سید سرفراز علی، ولی کا سہرا اٹھاتا، وہ آگے ہی بڑھے تھے کہ ولی نے فوراً خود پرد دیا۔

''کیا مصیبت ہے گزشتہ گھنٹے سے یہ میرے سر پر ٹکا رکھا ہے۔'' ولی منہ ہی منہ میں بڑبڑایا جس سید سرفراز علی کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

''عبداللہ؟'' وہ منہ ہی منہ میں بدبدائے۔

''تم کون ہو؟'' سید سرفراز علی کے لہجے میں موجود جوش ختم ہو چکا تھا وہ زندگی میں پہلی بار ایک بہت ساری گھٹن محسوس کر رہے تھے۔

''میں؟'' عبدالولی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر تعجب سے پوچھا۔

''میں عبدالولی ہوں۔'' غالباً وہ سید سرفراز علی کے سوال پر حیران تھا۔

''کون عبدالولی؟'' سید سرفراز علی نے اس کے مقابل کھڑے ہو کر اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہ پوچھا۔ سید سرفراز علی کی سانولی رنگت ایک دم سیاہ پڑ گئی تھی۔

''تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو، تم عبداللہ نہیں ہو سکتے؟'' سید سرفراز علی تو یوں ہراساں تھا، جیسے بھوت دیکھ لیا ہو۔

''تم! تم عبداللہ!''

''نہیں! اُسے تو میں نے جلا کر مار ڈالا تھا۔'' سید سرفراز علی ایک دم ہذیانی انداز میں بولا۔

سید سرفراز علی کے خادم خاص بھی الرٹ ہوگئے وہ حیران تھے کہ اُن کا مالک جو کچھ دیر پہلے اِس خوش باش تھا ایک دم کیا ہوگیا۔

''عبداللہ! عبداللہ! یہ نام میں بہت سارے لوگوں سے سُن چکا ہوں، کون ہے یہ عبداللہ؟'' عبدا ایک بار پھر عبداللہ نام سُن کر چونکا تھا۔

وہ نہ جانتا تھا کہ جس کا چہرہ اوڑھے وہ گھومتا پھرتا ہے وہ اُس کا باپ ہے، اِس قدر ہم شکل ہونا ایسی حیرت کی بات نہ تھی۔ سید عبداللہ اُس کا باپ تھا لیکن صرف وہی یہ نہ جانتا تھا یہ نام اُس کی زند معمہ بن کر رہ گیا، اس نام سے اُسے پکارتے لوگ بہت مختلف رویے رکھتے تھے اُسے ہمیشہ بہت عج رویوں کا سامنا کرنا پڑا۔

''کون عبداللہ؟'' اس بار عبدالولی نے سوال کیا۔

''سید عبداللہ! میرا سوتیلا بھائی تھا۔'' سید سرفراز علی کسی اور ہی ٹرانس میں تھے عجیب سی ہیبت اور شت کا شکار۔

یوں لگتا تھا کہ سید عبداللہ زندہ سلامت اُن کے سامنے آن کھڑا ہوا ہو۔

سید سرفراز علی نے عبدالولی کو اُس کے کندھوں سے یوں پکڑا جیسے وہ اُسے چھو کر کسی حقیقت کی جانچ رنا چاہتے ہوں۔

''تم کیسے زندہ ہو سکتے ہو؟'' سید سرفراز علی کی آواز سرسرائی ہوئی تھی۔ پھر انہوں نے بہت بُری طرح ھینچ کر عبدالولی کے گلے میں موجود ہار توڑ ڈالا۔

''بولو تم کس کی سازش ہو؟'' سید سرفراز علی نے خون خوار نظروں سے عبدالولی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''سازش تو آپ نے میرے خلاف کی تھی میری بہن کو اغوا کر کے زبردستی میرا نکاح اپنی بیٹی سے ھایا، اب آپ پوچھ رہے ہو کہ میں کس کی سازش ہوں!'' عبدالولی نے زہر خند لہجے میں جواب دیا۔

''میں جو سوال کر رہا ہوں اُس کا جواب دو لڑکے!''

''یہ، یہ چہرہ! یہ چہرہ کسی سازش کے بغیر تھوڑی میرے سامنے ہے۔'' سید سرفراز علی پاگلوں کی طرح ہا تھا۔

''اور تم! تم نے مجھے اتنا بے وقوف سمجھ رکھا ہے کہ میں اِس سازش کا شکار ہو جاؤں گا۔''

''کہاں سے آئے ہو کس کے آدمی ہو۔ اور یہ چہرہ! کس سے تمہارا تعلق ہے؟'' سید سرفراز علی کی ھاڑ دُور تک پھیل رہی تھی۔

''مسٹر سرفراز! میں عبدالولی ہوں، بدقسمتی سے آپ کی بیٹی کی نگاہ کا ہیرو! جس کا دِل اور دماغ کسی اور رکی کا گرویدہ تھا لیکن اب میں ساری کشتیاں جلا کر آپ کی بیٹی سے نکاح کر چکا ہوں۔ اب آپ یہ ارامہ بند کریں اور مجھے میری بہن سے ملوئیں۔'' عبدالولی نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

''تم!'' سید سرفراز علی نے شہادت کی انگلی اٹھا کر اُس کو اشارہ کیا۔

''تم!'' وہ ایک دم سر تھام کر گھوما، وہ جس کیفیت سے گزر رہا تھا اُس کی کیفیت کا اندازہ عبدالولی ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔

''مسٹر سرفراز! میری بہن!'' عبدالولی نے سید سرفراز کو ہذیانی انداز میں دروازے سے باہر نکلتے دیکھ کر پیچھے سے تڑپ کر آواز دی۔

لیکن سرفراز علی شاید خود میں نہ تھا وہ تو ایسے بھاگا، جیسے کمرے میں بم رکھا ہو اور اگر وہ یہاں سے نہ نکلا تو بم پھٹ جائے گا۔

''نفیسہ!'' وہ سیدھا آیا اماں کے کمرے میں آیا۔

''وہ! وہ عبدالولی کون ہے؟'' سید سرفراز علی نے لبوں پر زبان پھیر کر کہا۔

''کون ہے؟ کیا مطلب، وہ عبدالولی ہے!'' آیا اماں نے سید سرفراز علی کی حالت سے لطف اندوز ہونے کا سوچا تھا لیکن اِس وقت وہ الگ پریشانی میں تھیں، نگینہ کی جگہ سید سرفراز علی کے بندے کسی غلط

لڑکی کو اٹھالائے تھے عبدالولی کو اس سچائی سے آگاہ کرنا اُن کو ایک بڑا مرحلہ لگ رہا تھا۔

''وہ! اُس کی شکل! وہ تو بالکل سید عبداللہ جیسا ہے!'' سید سرفراز علی نے چیخ کر کہا۔

''ہاں میں جانتی ہوں!'' نفیسہ بیگم نے بے حد سکون سے کہا۔

''کیا! کیا تم جانتی تھیں؟ پھر مجھے کیوں نہ بتایا؟'' سید سرفراز علی نے چونک کر پوچھا۔

''تو کیا ہوا اگر اُس کی شکل سید عبداللہ سے ملتی ہے صرف شکل ملنے سے وہ سید عبداللہ تھوڑی بن جا۔ گا۔ اس کو تو تم بُری طرح جلا کر مار چکے نہ صرف اُسے بلکہ اُس کے خاندان کے ایک ایک فرد کو مار ہو، تم نے تو کوئی بچہ تک زندہ نہ چھوڑا تھا۔'' نفیسہ بیگم نے جان بوجھ کر بچوں کا ذکر کیا لیکن سید سرفرا خوف زدہ ذہن نفیسہ بیگم کی اس گہری بات کو نہ پکڑ سکا۔

''ہاں! میں نے اس کے سارے خاندان کو ختم کر دیا تھا پھر! پھر میرا دل خوف زدہ کیوں ہے عبداللہ زندہ ہے یا پھر یہیں کہیں اُس کی روح بھی موجود ہے۔'' وہ دل ہی دل میں بولے۔

سید سرفراز نے خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کی اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

''عبدالولی! اور اُس کی بہن؟'' سید سرفراز علی جیسے کسی گہری سوچ میں تھا۔

''نفیسہ! سید عبداللہ کے دو بچے تھے ایک لڑکا اور ایک لڑکی، لڑکے کا نام عبدالولی تھا اور لڑکی کا نام تھا؟'' سید سرفراز علی نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے نہیں یاد!'' نفیسہ بیگم صاف مُکر گئیں۔

''اِس لڑکے کا نام بھی تو عبدالولی ہے اور اِس کی شکل ہو بہو سید عبداللہ جیسی ہے۔'' سید سرفراز علی بے حد گھاگ انسان تھا وہ کڑی سے کڑی ملا رہا تھا لیکن اُسے خود پر بہت زیادہ یقین تھا کہ وہ جو کام کرتا ہے وہ اِس قدر مکمل ہوتا ہے پھر کیسے ممکن تھا کہ سید عبداللہ کا بیٹا زندہ سلامت بچ جاتا۔

''نہیں، نہیں! سید عبداللہ اور اُس کے خاندان کو تو میں نے مار ڈالا تھا پھر اُس کا لڑکا کیسے بچ سکتا ہے ایک چھوٹے سے لڑکے کو کون بچا سکتا تھا، جہاں سارے بڑے جل کر مر گئے تھے، حویلی کا تو بہت کڑا پہرہ تھا پھر ایک چھوٹے سے لڑکے کو کون بچا سکتا تھا؟''

''سید سرفراز علی! تم اللہ کو بھول رہے ہو! وہ زندوں کو مردوں اور مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے، جو ایک پانی کے قطرے سے ایک مکمل انسان کو تخلیق کرتا ہے اُس کے لیے جلتی آگ سے سید عبداللہ کے بچے کو بچانا کہاں مشکل تھا۔'' نفیسہ بیگم نے دل میں کہا۔

''نہیں، نہیں! یہ کوئی اور عبدالولی ہے اِس کی شکل ملنا ایک اتفاق ہے انسان کتنا ہی ہوشیار چالاک کیوں نہ ہو اگر اللہ نہ چاہے تو سامنے کھڑا پہاڑ بھی انسان نہیں دیکھ سکتا۔''

سید سرفراز علی کی آنکھوں اور دِل پر اتنا موٹا پردہ پڑ چکا تھا کہ وہ بھی سامنے کھڑے پہاڑ کو نہ دیکھ سکا۔

اس لڑکے کے والدین کوئی اور ہیں۔ ہاں!

''ہاں میں جانتا ہوں!''

اس عبدالولی کے باپ کا نام عبداللہ نہیں ہے بلکہ احمد شاہ ہے! جو ایک کامیاب بزنس مین اور جاگیردار ہے! اُس کی لائف ہسٹری ہے وہ کوئی بے جڑ کا پودا نہیں ہے، جس کو لوگ جانتے نہ ہوں، وہ اتنے برسوں

ں سوسائٹی میں ہے ہر کوئی جانتا ہے کہ یہ والا ولی، احمد شاہ کا ہی بیٹا ہے!'' سید سرفراز علی مسلسل جوڑ ں لگا ہوا تھا۔

ہن نفیسہ بیگم کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ضرور تھی وہ سید سرفراز علی کے چہرے پر وہ خوف بھی ہی تھیں جو انہوں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا یہ خوف ان کو سکون مہیا کر رہا تھا۔

'دو چہرے ایک جیسے ہو سکتے ہیں نفیسہ بیگم!'' سید سرفراز علی جیسے خود کو لو جک کے ذریعے مائل کر رہا

'بعض اوقات ہم صرف وہی دیکھتے ہیں جو ہم دیکھنا چاہتے ہیں اور دو نام جب ایک جیسے ہوں تو؟'' بیگم نے مسکراتے اور مزہ لیتے ہوئے سید سرفراز علی سے پوچھا۔

'مطلب کیا ہے تمہارا؟''

'دنیا میں اتفاق نہیں ہوتے، کیا ایک نام صرف ایک شخص کا ہی ہو سکتا ہے؟ میرے نام کے بہت سے ہوں گے!'' سید سرفراز علی نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔

'دو چہرے اور دو نام ایک جیسے، واقعی اتفاق تو ہے!'' نفیسہ بیگم نے بے نیازی سے کہا۔

'لیکن یہ اتفاق تم کو کچھ یاد کروانے کے لیے تو اللہ نے کہیں بنا کر نہیں رکھا؟''

'کیا یاد کروانے کے لیے؟'' سید سرفراز علی نے پوچھا۔

'یہی کہ تم قاتل ہو! اور قاتل کو سزا یہاں اِس دنیا میں نہ ملے تو دوسری دنیا میں تو مل ہی جانی ہے، پھر یہ یاد دلانے کے لیے کہ معصوموں کا خون کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔'' نفیسہ بیگم نے کہا۔

''تم بھول رہی ہو کہ آج تک میرا کوئی پلان فیل نہیں ہوا، کبھی میرے کسی پلان میں غلطی نہیں ہوئی۔'' سرفراز علی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''غلطی سے مبّرا صرف اللہ کی ذات ہے، انسان تو ہے ہی غلطیوں کا پتلا اور تم جیسا شیطان صفت ان غلط راستے کا راہی ہے، وہ تو کرے گا ہی غلطیاں۔'' آیا امّاں نے حسب عادت سید سرفراز کے ل بھڑاس نکالی۔

''تم دو ٹکے کی عورت! ہر وقت میرے سامنے زبان چلاتی ہو، کسی دن میں نے تیرا قصّہ ہی پاک دینا ہے۔'' سید سرفراز علی نے غصّے سے آیا امّاں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

''ہونہہ! میں دو ٹکے کی عورت تھی تو پھر کیوں اپنے سر پر لا کر بٹھایا، کیوں پورے گاؤں کے سامنے اح پڑھوایا۔'' آیا امّاں نے برسوں پرانی سُلگن باہر نکالی۔

''اُس منحوس عبداللہ کی وجہ سے مجھے یہ سب کرنا پڑا تھا اگر وہ میرے گرد اتنا گھیرا تنگ نہ کرتا تو میں تو تم پر تھوکتا بھی نہ تھا لیکن پھر تم نے دیکھا نا اُس کا انجام! اگر اُس نے مجھے ذلیل کر کے سارے اُن کے سامنے تیرے جیسی دو ٹکے کی عورت سے نکاح پڑھنے پر مجبور کیا تھا تو میں نے بھی اُس کا اور ں کے سارے خاندان کا نام و نشان مٹا کر رکھ دیا۔'' سید سرفراز علی نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''جو تم نے ظلم کیے ہیں اُن کے حساب کا کھاتہ کھل چکا ہے سید سرفراز علی! ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو، لم کی یہ جنگ جیتنے والے کی عبرت ناک شکست کا دور شروع ہو چکا ہے تم اگر بھول رہے ہو تو میں یاد

کرواتی ہوں۔ بلال کی موت تمہاری پہلی بڑی شکست تھی پھر مسکان کی بربادی! زبیدہ کی تم سے رخی! کہتے ہیں اولاد کی تکلیف سے انسان کی آزمائش کا اندازہ لگایا جاتا ہے لیکن سید سرفراز علی اولا تکلیف سے تمہاری شکست کا اندازہ ہوگا۔'' آپا امّاں مسلسل بولتے بولتے ہانپ گئیں۔

''نفیسہ!'' سید سرفراز علی نے ایک زوردار چانٹا آپا امّاں کو رسید کیا۔

''بکواس بند کرو، میں نہیں ہارا۔ میں کبھی نہیں ہار سکتا! جو مجھے ہرانے کی کوشش کرتا ہے اُس کا حال عبداللہ جیسا ہوتا ہے، اُس کا حال سید اظہر علی جیسا ہوتا ہے۔'' سید سرفراز علی نے آپا امّاں پر پھنکار ہوئے کہا۔

''اور یہ مت بھولو کہ اُس کا حال تمہارے بھائی قیصر اور ڈاکٹر فیصل جیسا ہوتا ہے، جس جس نے کو کی وہ صفحہ ہستی سے مٹتا چلا گیا۔'' نفیسہ بیگم نے اپنے بھائیوں کا نام سن کر بے اختیار سسکی لی، کوئی بھالا میں اُترا تھا۔

''میں کبھی نہیں ہارتا سمجھی تم، میں نہیں ہار سکتا!'' سید سرفراز علی اِس قدر اونچا بولا کہ کمرے کے دیوار لرز گئے۔

''اگر غلطی سے کوئی اور لڑکی آ بھی گئی ہے تو کس کو پروا ہے! ہمارا کام تو ہوگیا، ہمارا مقصد تو ہمیں گیا ہے! اِس کا مطلب ہے کہ ہم کامیاب ہوگئے۔'' سید سرفراز علی، آپا امّاں کو اپنی حیثیت باور کرا چاہتا تھا۔

وہ غصّے سے دروازے کی جانب ابھی بڑھا ہی تھا کہ آپا امّاں کی پکار نے اُس کے قدم روک لیے۔

''سید سرفراز علی! کیا تم واقعی جیت چکے؟ ولی بہن کا سوال کرے گا تو تم اُس کا سوال کیسے حل کر گے؟ اُس کے ساتھ تمہاری بیٹی کی خوشیاں جڑی ہوئی ہیں، کیا تمہارا دھوکا تمہاری بیٹی کے نصیب م خوشیاں بھر سکے گا؟ میرا سوال تو اب بھی باقی ہے کیا تم واقعی جیت گئے ہو؟'' آپا امّاں نے بیڈ کا سہا لے کر اٹھتے ہوئے پوچھا۔

سید سرفراز نے عجیب نظروں سے آپا امّاں کو دیکھا۔ اُس کی حریف نے ایک ایسا پزل اُس کے سا لا رکھا تھا، جس کا جواب اور حل اُس کو فوری طور پر بالکل نہ سوجھ رہا تھا۔ کمرے سے نکلتے ہوئے اُس ک چال میں واضح لڑکھڑاہٹ تھی۔

آپا امّاں ہونہہ کہہ کر استہزائیہ ہلکی ہنسیں۔

''تمہاری ہار کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے، تم کو آج نہیں تو کل ماننا ہی پڑے گا۔'' آپا امّاں نے با آوا بلند کہا۔

❖❖○❖❖

''رانی! یہاں کون آیا تھا؟'' جیدے نے رانی کو کڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کو، کوئی نہیں! رانی نے بے اختیار نگاہ چُرا کر مکرتے ہوئے کہا۔

''بکواس نہ کرو، جھوٹ نہ بولو!''

''یہ جوتے کس کے ہیں اور یہ کان کی بالی سونے کی ہے، جو بستر پر پڑی تھی، تیری میری اوقات

اندی کے زیور کی نہیں، یہ سونے کی بالی کہاں سے آئی؟'' جیدے نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

''تو مجھ پر شک کر رہا ہے؟'' رانی نے روہانسے لہجے میں کہا۔

''دیکھ رانی تو بہت کم عمر ہے اور بہت سیدھی سادھی بھی، دنیا بڑی تیز ہے میں تجھ پر شک نہیں کر رہا، تو مجھے سچ کیوں نہیں بتاتی؟'' جیدے نے رانی کی موجودہ حالت کے پیش نظر بے حد نرمی سے کہا۔

ب سے رانی ماں بننے کے مراحل سے گزر رہی تھی جیدے نے اُس کے ساتھ پہلے سے بھی زیادہ اچھا لوک کرنا شروع کر دیا تھا۔ رانی سے اُسے بہت پیار تھا اِس لیے وہ اُس کے لیے محتاط بھی بہت تھا۔

''بول رانی! دیکھ تیری خاموشی مجھے پریشان کر رہی ہے۔'' جیدے نے رسان سے پوچھا۔

''جیدے! پہلے آج تو بتا کہ تو کیا کام کرتا ہے!'' رانی نے اُس کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا۔

''تو میری بات کے جواب میں سوال کرنے کیوں بیٹھ گئی، سیدھی طرح بتا یہ چیزیں کس کی ہیں۔'' یدے نے رانی کے سوال سے بچتے ہوئے کہا۔

''جیدے! تو کوئی غلط کام تو نہیں کر رہا؟'' رانی نے پھر سوال کیا۔

''نہیں!'' جیدا صاف مکر گیا۔

''کھا میری قسم!'' رانی نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر سر پر رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا بکواس ہے! اور تو یوں کیوں بول رہی ہے پہلے تو تُو نے کبھی ایسی بات نہیں کی۔'' جیدے نے اُس کے سر سے ایسے ہاتھ ہٹایا، جیسے اُس کے ہاتھ پر کسی نے جلتا ہوا کوئلہ رکھ دیا ہو۔

''تو جھوٹ بول رہا ہے نا!'' رانی نے کھوئے کھوئے لہجے میں پوچھا۔

''وہ پری باجی ٹھیک کہتی تھی کہ اُسے تجھ سے جان کا خطرہ ہے، تو یقیناً بُرے کام کرتا ہے تبھی تو وہ تجھ سے بھاگ گئی۔'' رانی نے روتے ہوئے کہا۔

''ک۔ کون پری باجی؟'' جیدے نے سہم کر سارے گھر پر نگاہ ڈال کر پوچھا، جیسے وہ کسی خطرے کی آہٹ کو محسوس کر رہا ہو۔

''وہی پری باجی جس کو تم ایک بار یہاں نماز پڑھنے کے لیے لائے تھے۔'' رانی نے دھما کہ کیا۔ جیدا تو اپنی جگہ سے یوں اُچھلا جیسے کسی بچھو نے کاٹ لیا ہو۔

''ت.......ترنم کی بات کر رہی ہو؟'' جیدے نے خشک ہوتے حلق کے ساتھ پوچھا۔

اگر میڈم راگنی کو ذرا سی بھنک بھی مل گئی کہ جیدے نے ترنم کو اپنے گھر پناہ دی تھی تو وہ اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کروا دے گی۔

''کہاں ہے وہ؟'' جیدے نے عجلت سے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔

''دو کنال کا گھر ہے نا جو ایسے ڈھونڈ رہا ہے، دو کمرے کے گھر میں اُس نے مکھی بن کر چھپ جانا تھا۔ چلی گئی ہے بے چاری!'' رانی نے دُکھ سے کہا۔

''تو نے اُسے اندر کیوں آنے دیا میری اجازت کے بغیر یہاں کیوں رہنے دیا؟'' جیدے نے ناراض ہو کر کہا۔

''شاباش ہے تیری!'' میں اُسے بھلا کیوں روکتی، پہلے جب تو اُسے لایا تھا تو کہا تھا کہ یہ تیری میڈم

ہے اِس کی رج کے سیوا کرو اور اُس کو بہت عزت سے رکھو۔ تب تو نے اُسے اتنا اہم بتایا تھا تو اب ال غیز ہوگئی۔ میں نے تو آج بھی تیری وجہ سے اُس پری باجی کو اندر آنے دیا تھا وہ تو جب تو آیا تو وہ ڈر کر بھاگ گئی، تب مجھے پتا چلا کہ میرا بندہ کتنا بُرا ہے کہ کسی کو اُس سے اپنی جان کا خطرہ ہے۔'' رانی لے روتے ہوئے کہا۔

''اوہو! لیکن وہ گئی کہاں، کیا وہ اکیلی تھی؟'' جیدے نے عجلت سے پوچھا۔

''کیوں بتاؤں تجھے؟'' رانی نے بدک کر کہا۔

''اِس لیے کملی کہ اُس کی وجہ سے ہم مصیبت میں پھنس سکتے ہیں، وہ ہماری بڑی میڈم سے بغاوت کرکے بھاگی ہے، اُس کے سارے کارندے شکاری کتوں کی طرح اُس کی بُو سونگھتے پھر رہے ہیں۔'' جیدے نے زچ ہوکر بوکھلا کر ایک دم سچائی اُگل دی۔

''تم اور تمہاری وڈی میڈم بندے مارتے ہیں؟'' رانی کے آنسوؤں میں مزید تیزی آ گئی تھی۔

''نہیں لیکن! چل چھوڑ تجھے کیا بتاؤں!'' جیدے نے اپنا سر پکڑلیا۔

''بول نا جیدے! میرا دل نہیں مانتا کہ جس جیدے سے میں نے اتنا پیار کیا وہ ایک لڑکی کو مار سکتا ہے، تو اتنا بُرا نہیں ہوسکتا۔'' رانی تو بس رو رو کر گرنے والی تھی۔

''کملی! میں بالکل ایسا نہیں، نہ میں نے کوئی ایسا کام کیا ہے میں تو ایک معمولی ڈرائیور ہوں۔ لیکن میری غلطی یہ ہے کہ چار پیسے زیادہ کمانے کے چکر میں، میں نے غلط لوگوں کے ہاں نوکری کر ڈالی۔ اب میں خود پچھتاتا ہوں، وہاں سے کیسے جان چھڑاؤں۔'' جیدے کے لہجے سے سچائی ٹپک رہی تھی۔

رانی کو تو اُس کے جھوٹ پر بھی اعتبار ہوتا تھا اب تو وہ سچ بول رہا تھا۔

''پھر وہ باجی کیوں تم سے ڈر رہی تھی۔'' رانی نے سوال کیا۔

''اِس لیے کہ وہ مجھے بھی میڈم کے وفاداروں میں سمجھتی ہوگی!'' جیدے نے سچائی سے کہا۔

''تمہاری وڈی میم کیا کام کرتی ہے؟'' رانی کا سوال جیدے کے لیے بہت کڑا تھا لیکن وہ جان گیا تھا کہ آج رانی سچ جانے بغیر کہاں مانے گی۔

''وہ لڑکیوں کو اغوا کراتی ہے ان کو زبردستی دھندے پر مجبور کرتی ہے اور اگر کوئی اُس کی بات نہ مانے تو اُسے جان سے مار دیتی ہے بہت ظالم ہے وہ، میں اُس کی نوکری چھوڑنا چاہتا تھا لیکن اُس ڈر سے کہ وہ کسی کو اپنے چنگل سے نکلنے نہیں دیتی بلکہ جو بغاوت کرے مار دیتی ہے، آج تک نوکری نہ چھوڑ سکا۔'' ؛یدے نے پسپا آواز میں کہا۔

''میرے ربا!'' رانی نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا۔

''اور وہ پری باجی تمہاری میڈم کی قید سے بھاگی ہے نا؟'' رانی نے پوچھا۔

''ہاں! اور ساتھ میں ایک سوچی (باکرہ) لڑکی بھی لے کر بھاگی ہے، میڈم تو اُسے ڈھونڈنے میں ہا ؤلی ہورہی ہے۔'' جیدے نے کہا۔

''ہائے، ہائے! کتنا ظلم ہے!'' رانی نے بے حد تکلیف سے کہا۔

''ہاں ہے تو!'' جیدے نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ وہ دِل سے اِس دھندے سے تنگ تھا۔

دیکھ جیدے! تجھے تیرے ہونے والے بچے کی قسم، تو میری ایک بات مانے گا؟'' رانی نے اُس کا ہاتھ لام کر پوچھا۔

''یہ قسمیں نہ دے، پہلے کیا کبھی تیری کوئی بات ٹالی ہے؟ اور یہ بار بار میرے بچے کو قسموں میں لے رمنہ میں نہ لے۔'' جیدے نے ایک دم غصے سے کہا۔ اُسے اپنے ہونے والے بچے سے بے حد پیار تھا ور اُس کو بے حد انتظار تھا اِس لیے اس کی باتیں قسمیں جیدے کو بُری طرح تپا گئیں۔

''دیکھ جیدے! اگر تیرے ہاں کُوی آئی تو کیا تو اپنی بٹیا رانی کو ایسے لوگوں سے نہیں بچائے گا؟'' رانی لے جیدے کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔

''سیدھی سیدھی بات کرنا، مجھے کنڈوں (کانٹوں) میں نہ اُلجھا۔'' جیدے نے زچ ہوکر کہا۔

''جیدے! رب سوہنا جانے کس بات پہ راضی ہو، تو پری باجی کی مدد کر، ربّ سوہنا تیرے سارے گناہ ھو دے گا، وہ بے چاری جانے کہاں کہاں ماری پھرے گی۔'' رانی نے بے حد لگاوٹ سے جیدے کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''میڈم راگنی بڑی خطرناک عورت ہے رانی! اُس کو بھنک بھی پڑگئی تو ہم مارے جائیں گے۔'' ہدے نے ڈر کر کہا۔

''دیکھ جیدے! اگر بُرے کام کی پردہ داری ہوجاتی ہے تو اچھے کام کی مدد تو خود اللہ کر دیتا ہے۔ یہ مجھے ماں نے کہا تھا خالہ کی باتیں سچائی سے بھری ہوتی ہیں، ہم اَن پڑھ جاہل سہی لیکن اچھی سچی بات کی پہچان تو دِل کرسکتا ہے نا!''

''وہ بھلا مجھے کہاں ملے گی میں اُسے کہاں ڈھونڈتا پھروں گا۔'' جیدا اندر سے ترنم کی مدد کرنے کے لیے راضی ہوگیا تھا۔

''تُو پچھلی گلی میں جا، وہاں شاید ہو ورنہ اِس بستی سے اتنی جلدی کیسے جائے گی، اتنی تو چکری گلیاں ہیں اِس کی، پر تیرے لیے اُن کو ڈھونڈنا آسان ہوگا۔ فرض کرو وہ جا بھی چکی ہوگی تو ہمارا دِل تو سوکھا ہوگا، ہم تو رب سوہنے کے ہاں سچے ہوں گے کہ ہم نے اُن کی مدد کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔''

رانی کی باتیں جیدے کے دِل پر اثر کر رہی تھیں اُس نے اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی کی چابی لی اور باہر تیزی کی جانب بڑھا۔ جس قدر تیزی سے وہ گلیوں میں گھومتا جارہا تھا وہ خود حیران تھا کہ ایسی توانائی اُس کے جسم میں کیسے آ گئی۔

جب جب انسان کی نیت سچی ہو وہ ہمیشہ اللہ کی جانب سے خاص مدد اور طاقت حال کرلیتا ہے پھر اُس کی یہ پھرتی اور تیزی اِس لیے بھی تھی کہ کوئی ہاتھ اٹھائے زار زار روتے ہوئے اللہ سے مدد مانگ رہا تھا اور اللہ جی اپنے سے سوال کرنے والے کو کبھی نہیں لوٹاتے۔

❖❖○❖❖

''کم آن ولی! فون اٹھاؤ!'' طارق نے مسلسل ولی کا نمبر ری ڈائل پر رکھا ہوا تھا۔ وہ جلد از جلد ولی کو سید سرفراز کے دھوکے سے آگاہ کرنا چاہتا تھا کہ اُس نے نگینہ کو اغوا نہیں کیا بلکہ وہ صرف ڈرامے بازی کر رہا تھا۔

جب طارق بالکل ولی کی جانب سے مایوس ہونے لگا تو دوسری جانب سے ایک دم فون اٹھالیا گیا۔

''ہیلو ولی! پلیز یار میری بات سُنو!'' طارق نے بے چینی سے کہا۔

''یار کہو، میں سُن رہا ہوں!'' ولی کی مرجھائی آواز کو طارق میلوں دُور ہوتے ہوئے بھی شدت سے محسوس کرسکتا تھا۔ جو لوگ دِلوں میں رہتے ہیں، وہ چاہے سات سمندر پار بیٹھے ہوں اُن کے من کی خوشی اور دُکھ کے سگنل فوراً محسوس ہوجاتے ہیں۔ جواباً طارق نے جو کچھ بتایا وہ ولی کے لیے زمین آسمان برابر کردینے کے برابر تھا۔ ولی کو لگ رہا تھا جیسے اُس کا دِل پھٹ جائے گا۔

''ہیلو ولی! آر یو او کے؟'' طارق نے اُس کی خاموشی سے گھبرا کر پوچھا۔

جواباً ولی فوراً کچھ بول بھی نہ پایا۔

''سنو! تم اُس کی بیٹی سے نکاح ہرگز نہ کرنا!'' طارق نے کہا۔

''طارق! جب انسان اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی اور بازی ہی ہار جائے تو چھوٹی چھوٹی بازیاں کیسے اُسے خوش کرسکتی ہیں، میں نے علیزے کو کھودیا! طارق میں نے اپنے ہی ہاتھوں سے اُس کا ہاتھ چھڑا کر کسی اور کے ہاتھ میں دے دیا اور اب! اب اتنے بڑے Loss کے بعد میں چھوٹے Loss سے بچ بھی جاؤں تو کیا فرق پڑتا ہے! تمہارے لیے بس اتنی سی اطلاع ہے کہ میں Trap ہوچکا ہوں میرے نام کے ساتھ کسی اور کا نام جڑ چکا ہے۔'' ولی نے ہارے ہوئے جواری کی طرح کہا۔ طارق کو ایک بار پھر گاڑی روکنی پڑی۔

''کیا؟ اوہ نو!'' طارق کو شدت سے دُکھ نے آن گھیرا۔

''مائی گاڈ!'' طارق کو فوری طور پر سمجھ نہ آرہا تھا کہ وہ ولی کو کوئی تسلی دے یا پھر کوئی نصیحت کرے، وہ شدت سے بے بسی محسوس کررہا تھا۔

''تم اب کیا کرو گے؟ کیا تم اتنے بڑے دھوکے کے بعد اُس لڑکی کے ساتھ زندگی گزار لو گے؟'' طارق نے سوال کیا۔

''یار طارق! کبھی کبھی تو کچھ سوالوں کے جواب فوراً انسان خود بھی حاصل نہیں کرپاتا، مجھے نہیں معلوم کہ اب اِس رشتے کو لے کر مجھے کیا کرنا ہے۔ شاید اِسے ہی قسمت کہتے ہیں جب آپ کی عقل، تدبیریں اور مناجاتیں سب دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔'' ولی نے بے حد اُداسی سے کہا۔ طارق کو یہ اُداسی اپنے اندر تک اُترتی محسوس ہوئی۔

''تم مجھے نگی کا فوراً بتانا۔ میری بہن ابھی تک لاپتہ ہے یہ بات مجھے ایک بار پھر کانٹوں میں گھسیٹ چکی ہے۔'' ولی نے تڑپ کر کہا۔

''یار نکلو وہاں سے، میں بھی تم سے رابطے میں رہوں گا جیسے ہی کوئی اطلاع ملے گی، میں تم سے رابطہ کر کے بتادوں گا۔'' طارق نے کہہ کر فون رکھ دیا۔

طارق کو اپنا آپ بے حد ٹوٹا ہوا محسوس ہورہا تھا۔

''اے اللہ! اچھے لوگوں کے ساتھ تو اچھا ہونا چاہیے نا! پھر میرے بھائی جیسے دوست کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟'' طارق نے بے اختیار اپنے رب سے سوال کیا۔

اچھے لوگوں کی اچھائی کبھی کبھی آزمائی بھی تو جاتی ہے۔

❖❖○❖❖

مجھے اس تیرگی کے دشت سے
اب جنگ لڑنا ہے
ِرے چاروں طرف وحشی درندے ہیں
ِرا زادِ سفر بھی کھو چکا ہے
اور میرا دیپ بھی آندھی کی زد میں ہے
ِرا خیمہ مرا مسکن
ھی مجھ سے چھن چکا ہے
اور اس یلغار میں
ِھائیوں کی آخری حد پر
ِسم بے بسی ہوں
ِر بھی میرا عزم کہتا ہے
مجھے اس تیرگی کے دشت سے
ِبر پیکار ہونا ہے
ِرے اندر یقیں کی روشنی ہی میری قوت ہے
ں اِس ایمان کی قوت سے
ِ تاریک شب سے
ِینا جیت جاؤں گی

ِنم نے نگی کو پانی پلا کر احتیاط سے لٹا دیا تھا اس کو شدید بخار تھا۔ پہلے وہ بے سُدھ تھی لیکن اب مسلسل ِے کراہ رہی تھی ترنم کا بس نہ چل رہا تھا کیسے اُس کی تکلیف کو اپنی پوروں میں چن لے۔

ِبس میری بہن! تھوڑا سا صبر اور، بہت جلد تو اپنوں میں ہوگی اپنے گھر میں ہوگی۔'' ترنم نے نگی کے ِاتھے پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

ِپانی، پانی!'' نگی کو بے حد پیاس لگی ہوئی تھی چھوٹی سی بوتل جو گاڑی میں تھی وہ کب کی ختم ہوچکی

ِنم یہاں سے نکلنا نہیں چاہتی تھی، قریب ہی تو راگنی کا ٹھکانہ تھا اگر پکڑی جاتی تو۔ راگنی کے ِے بو سونگھتے پھر رہے تھے۔

ِپانی کہاں سے لاؤں؟ کیا کہیں پیدل جا کر لاؤں؟ نہیں نہیں، میں نگینہ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی ہر جانب ِت کے اندھیرے میں خطرہ ہے۔'' ترنم کافی دیر سے پلس مائنس میں لگی ہوئی تھی۔

ِ ہلکی ہلکی سی روشنی اُن کی گاڑی پر پڑی۔ ترنم کی ٹانگوں سے جان نکل گئی، بے اختیار اُس نے بیگ ِ ریوالور نکال لیا۔

''اگر نگینہ! مجھے تم کو بچانے کے لیے لڑنا بھی پڑا تو میں لڑوں گی، تم تو میری بقا ہو تم کو بچانے کا مطلب ہے کہ میں نے خود کو بچالیا۔'' ترنم نے اُس ہلکی سی روشنی کو گھورتے ہوئے مصمم ارادے سے سوچا۔ روشنی دھیرے دھیرے قریب آ رہی تھی۔ ترنم پستول تان کر باہر نکل آئی۔

''باجی! یہ میں ہوں!'' جیدا سامنے کھڑا تھا۔ ترنم کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر اُس کی آواز خوف زدہ ہوگئی۔

''تم! تم بھی تو میڈم کے ملازم ہو، تم نے یقیناً ہماری مخبری کی ہے میں رانی کو کتنا اچھا سمجھتی تھی لیکن اُس نے ہمارے راز کو کھول کر بہت بُرا کیا۔'' ترنم نے خشک ہوتے گلے کے ساتھ کہا۔

''نہ باجی! اُس کو بُرا نہ کہیں، مجھے اُس نے ہی آپ کی مدد کو بھیجا ہے۔'' جیدے کے لہجے میں سچائی تھی لیکن ترنم کو تو چلتی ہواؤں پر اعتبار نہ تھا۔

''میں کیسے تمہارا اعتبار کرلوں؟'' ترنم ابھی بھی پستول تانے کھڑی تھی۔

''میں اپنے ہونے والے بچے کی قسم کھاتا ہوں کہ مجھے رانی نے آپ کی مدد کے لیے بھیجا ہے'' جیدے نے کہا۔

ترنم کے تنے ہوئے اعصاب ایک دم ڈھیلے پڑ گئے اس نے بے حد تھکا ہوا سانس خارج کیا۔

''تم میری کیا مدد کرسکتے ہو؟'' ترنم نے پوچھا۔

''میں آپ کو شہر لے جانے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ میرا علاقہ ہے اس کا ہر شارٹ کٹ میں جانتا ہوں۔'' جیدے نے کہا۔

''تم اگر شارٹ کٹ اور چھپے ہوئے رستوں کو جانتے ہو تو میڈم کے بندے بھی تو جانتے ہوں گے مجھے لگتا ہے کہ میں جیسے مکڑی کے جال میں پھنس گئی ہوں، مجھے اپنی زندگی کی پروا نہیں، اِس معصوم روح کو اُس کے گھر پہنچانا اس وقت میرا زندگی کا مقصد ہے۔'' ترنم نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر جیدے کو دکھایا جہاں نگینہ شدت سے کراہ رہی تھی۔

''باجی! آپ پیچھے بیٹھو اِس باجی کے ساتھ، گاڑی کی چابی دو، بس اللہ مدد کرنے والا ہے میں آپ کو لے کر چلتا ہوں، یہاں تو بہت خطرہ ہے اتنی قریب تو آپ بہت جلد پکڑی جاؤ گی، پھر دن کی روشنی تو گھنٹوں میں پھیل جائے گی، سوئے ہوئے لوگ جاگ جائیں گے اس طرح گلی میں کیسے کھڑی رہ سکتی ہو۔'' جیدے کی باتیں حقائق پر مبنی تھیں۔ ترنم مزید الجھ گئی۔

''باجی! وقت نہ ضائع کرو، اللہ کا نام لے کر نکلتے ہیں۔'' جیدے نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی، جبکہ ترنم نے نگی کا سر اپنے زانوں پر رکھ لیا۔

''ٹھیک ہے جاوید! چلو۔'' ترنم خود بہت زیادہ تھک چکی تھی اِن اَن جان راستوں پر گول گول گاڑی گھما گھما کر۔ اِس طرح وہ کیسے احمد شاہ تک پہنچ سکتی تھی یہاں سے نکلنے کا رسک تو لینا ہی تھا۔

''اتنی دیر سے ترنم کو کوئی راستہ دکھائی نہ دیا تھا اب اللہ نے خود اُس کے پاس مدد بھیج دی تھی۔ گاڑی چل پڑی تھی ترنم نے خود کو کافی حد تک پُرسکون محسوس کیا۔

جاوید بہت احتیاط سے بے حد سنسان راستے پر گاڑی چلا رہا تھا۔ ان راستوں میں ڈاکوؤں کا خطرہ ہوتا تھا اِس لیے عام طور پر رات کو کیا دِن میں بھی اِس رستے پہ سفر نہ کرتے تھے لیکن جاوید نے جان بوجھ کر یہ راستہ اختیار کیا تھا۔

اُسے سانپ سے بچنے کے لیے بچھو کا سامنا کرنا آسان لگ رہا تھا کیوں کہ یہاں تو بچنے کے چانس تھے کہ شاید کوئی انہونی اُن کے انتظار میں ہو۔ باقی رستوں پر یقیناً پہرہ تھا۔

ترنم نے احمد شاہ کو فون کر کے اپنی درست لوکیشن بتائی، مسلسل آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ اُس پٹرول پمپ پہنچ چکے تھے، جہاں کا احمد شاہ نے اُن کو بتایا تھا کہ وہ وہاں اُن کا انتظار کریں گے۔

''باجی! پمپ تو آ گیا لیکن آپ اِس باجی کے ابو کو کیسے پہچان پاؤ گی؟ کیا آپ اُن سے ملی ہو؟'' جاوید نے سوال کیا۔

''ہاں!'' ترنم نے بے حد یقین سے کہا۔ میں ولی سے تو ملی ہوں نا، اُس کی آنکھوں کی وہ پاکیزگی اور ماتھے کی روشنی جو اُس قبیل کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ اِس دنیا میں ہر مرد صرف مرد نہیں ہوتا باپ، بھائی، بیٹا اور شوہر ہونے کے علاوہ پاکیزہ دِل و نگاہ رکھنے والا مردِ مومن بھی ہوتا ہے۔'' ترنم نے دل میں کہا۔ اس نے ہر جانب نگاہ دوڑائی صبح کی پو پھوٹنے میں وقت تو باقی تھا لیکن رات کی گہرائی میں کمی آچکی تھی اِکا دُکا ٹرک پمپ پر موجود تھے البتہ پمپ کے ساتھ موجود ڈھابے پر کچھ رونق تھی، مسافر چائے پینے کی غرض سے وہاں موجود تھے۔ ترنم نے پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن اُسے کہیں بھی احمد شاہ نہ نظر آئے۔

''السلام علیکم بیٹا!'' ترنم کو اپنے پیچھے بے حد نرم آواز سنائی دی۔

''احمد شاہ؟'' ترنم نے بے ساختہ پوچھا۔

''جی بیٹا! آپ ترنم بیٹا ہو نا؟'' احمد شاہ کے لہجے کی نرمی ترنم کو اندر تک محسوس ہوئی۔

''جی!'' ترنم پیاسی نظروں سے اُن کو دیکھ رہی تھی۔

''کیا ہر باپ کی شکل ایسی ہی ہوتی ہے؟ آہ میں نے اپنے کرتوتوں سے اپنے باپ کو منوں مٹی تلے رہنے پر مجبور کردیا!'' ترنم کے دِل میں ہوک سی اُٹھی۔

''نگینہ؟'' احمد شاہ کی نگاہ اور زبان سوال کررہی تھی۔

''وہ اندر ہے!'' ترنم نے گاڑی کی پچھلی سیٹ کی جانب اشارہ کیا، جہاں چادر دے کر نگینہ کو چھپا دیا گیا تھا۔ بظاہر بالکل محسوس نہ ہو رہا تھا کہ گاڑی میں کوئی لیٹا ہے۔

احمد شاہ دیوانہ وار نگینہ کی جانب بڑھے۔

''میری گڑیا!'' وہ نگینہ کو سینے سے لگائے بے آواز روئے، پھر انہوں نے کسی کانچ کی گڑیا کی طرح اُس کو اٹھا کر اپنی گاڑی میں ڈالا، گارڈ جو اُن کے آفس سے آیا تھا اُس نے اگلی سیٹ پر جا کر ڈرائیونگ سنبھال لی تھی۔

احمد شاہ جو بیگ لائے تھے وہ لے کر ترنم اور جاوید کی طرف آئے۔

''بیٹا! احسان اُتارنے والی ذات صرف اور صرف اللہ رحمان کی ہے انسان کسی کا نہ احسان اُتار سکتا ہے اور نہ ہی ذمّے داری اٹھا سکتا ہے یہ سب اللہ کی مدد سے ممکن ہوتا ہے۔ آپ نے جو ذمے داری اپنی

زندگی سے کھیل کر میری بیٹی کی اٹھائی، میں یہ احسان زندگی بھر نہیں اُتار سکتا۔ لیکن میں اپنی بیٹی کو دعا دے سکتا ہوں کہ اللہ رحمان آپ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے راضی ہو جائے، آپ کو دین و دنیا کی خوشیاں اور آسانیاں حاصل ہوں۔'' احمد شاہ کے الفاظ تھے کہ کوئی دوا! ترنم کو لگا سوئیوں سے بھرے اُس کے وجود سے ایک دم سے بہت ساری سوئیاں نکل گئی ہوں۔

ترنم کی آنکھیں بے اختیار نم ہوئیں۔ جواباً کوئی بات کہنا اُس سے مشکل ہو گیا، گلا آنسوؤں سے بھرا پڑا تھا۔

''آپ ہمارے ساتھ چلیں!'' احمد شاہ نے آفر کی۔

''نہیں! یہ ٹھیک نہیں ہوگا!'' ترنم نے دھیمی آواز میں انکار کر دیا۔

''بیٹا! آپ میرے ساتھ میری بیٹیوں کی طرح رہو!'' احمد شاہ نے اصرار کیا۔ وہ جانتے تھے کہ اس خطرناک گروہ سے بھاگ کر ترنم کے پاس کوئی پناہ نہ ہوگی۔

''انکل! ابھی میرا جانا ٹھیک ہے آپ خیریت سے گھر پہنچ جائیں اور نگینہ کو فوراً کسی ڈاکٹر کو دکھائیں، میں نکلتی ہوں۔'' ترنم نے رُک رُک کر کہا۔

''بیٹا! میں آپ کو کسی احسان کے زمرے میں نہیں، تحفتاً کچھ رقم دینا چاہتا ہوں آپ کے کام آئے گی۔'' احمد شاہ نے بے حد پیار بھرا اصرار کیا۔

ترنم کو اُن کا اتنی فکر کرنا بے حد اچھا لگا تھا۔

''انکل! پیسہ میرا پرابلم نہیں ہے، میری دوست نے بہت ساری رقم میرے حوالے کی ہے اگر مجھے ضرورت محسوس ہوئی تو استعمال کر لوں گی۔'' ترنم نے رسانیت سے انکار کیا۔

''پھر بھی بیٹا! مجھے خوشی ہوگی اگر آپ یہ رقم رکھ لیں ایک باپ کا تحفہ سمجھ کر!'' احمد شاہ اپنے اصرار پر ڈٹے رہے۔

''انکل! میرے ساتھ جو لڑکا ہے، وہ بھی اپنی جان پر کھیل کر آیا ہے غربت اور لمبی چوڑی عیال داری کی وجہ سے وہ میڈم راگنی جیسے بُرے لوگوں میں پھنس کر رہ گیا ہے اگر یہ رقم آپ اُسے دے دیں تو اُس کو اُن لوگوں سے جان چھڑانے میں مدد مل جائے گی۔ ویسے بھی آج یہاں میرا پہنچنا صرف اِس لڑکے کی وجہ سے ممکن ہو پایا ہے۔'' ترنم نے سچائی سے کہا۔

''ٹھیک ہے بیٹا! آپ یہ رقم اُس کو دے دو۔'' احمد شاہ نے فیصلہ کرنے میں سیکنڈ لگایا تھا۔ نیکیوں کو جو لوگ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپناتے ہوں، وہ نیکی کرنے میں اِسی طرح جلدی کرتے ہیں۔

''چلیے اپنے ہاتھ سے ہی دے دیں۔'' ترنم اُن کو لیے گاڑی کی جانب بڑھی، جہاں جاوید مسلسل اِدھر اُدھر نگاہ گھما رہا تھا بے شک یہاں میڈم کے بندے نہ آ سکتے تھے لیکن جاوید بے خبری میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔

''السلام علیکم!'' احمد شاہ نے جاوید سے مصافحہ کیا۔ جاوید نے گھبرائے ہوئے انداز میں احمد شاہ سے ہاتھ ملایا۔

''بیٹا! آپ نے آج جو کیا، اللہ نے آپ کو بہت بلند درجات عطا کرنے ہیں، یہ میری جانب سے

قبول کر لیں۔'' احمد شاہ نے عاجزی سے کہا۔

''میں! نہیں، نہیں جی! ایسی کوئی بات نہیں، میں نے یہ کام اللہ کی رضا کی لالچ میں کیا ہے۔'' جاوید ان پڑھ ہو کر بھی بہت بڑی بات کی تھی۔

''جاوید! رکھ لو، اپنی باجی کی بات تو مانو گے نا!'' ترنم نے اُسے بے احد اصرار سے رقم کا بیگ دیا۔

''یہ کتنے ہیں؟'' جاوید نے تھوڑی سی اِس بیگ کی زِپ کھول کر اتنی زیادہ رقم دیکھ کر گھبرا کر پوچھا۔

''بیس لاکھ!'' احمد شاہ نے آہستہ سے یوں کہا جیسے وہ کم رقم لائے ہوں، اُن کو واقعی شرمندگی تھی۔ جس احسان اُن لوگوں نے اُن کی ذات پر کیا تھا یہ تحفہ تو واقعی اُن کو حقیر لگ رہا تھا۔

''بیس لاکھ!'' جاوید نے بے اختیار لبوں پر زبان پھیری۔

''سر! میں اتنی رقم نہیں رکھ سکتا۔'' جاوید نے گھبرا کر کہا۔

''بیٹا پلیز!'' احمد شاہ نے عاجزانہ کہا۔

''رکھو جاوید! یہ میری بہن رانی اور تمہارے بچے کا حق ہے۔'' ترنم نے جاوید کو زبردستی بیگ تھمایا۔

''اچھا انکل! اب ہم چلتے ہیں آپ بھی فوراً نکلیں۔'' ترنم نے اُن کے آگے سر کرتے ہوئے کہا۔ ...ہا اُس نے بے اختیار کیا تھا۔ ایسا وہ ہمیشہ تب کرتی تھی، جب وہ کہیں جانے سے پہلے اپنے بابا سے ...ی۔

احمد شاہ نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا اور پیار دیا۔ ترنم اس قدر بے خود ہوئی کہ اُس نے اُن کے ...کر بوسہ دیا۔ اُس کی یہ حرکت غیر ارادی تھی احمد شاہ کو سنبھلنے میں بس ایک پل لگا، وہ اتنی عمر میں ...کو بہت اچھی طرح پڑھنا جان چکے تھے۔

...نم کی آنکھوں میں جو حسرت تھی، وہ باپ کی محرومی کی تھی۔

''انکل! آپ نے بُرا تو نہیں مانا۔'' ترنم کو ایک دم احساس ہوا کہ وہ ایک بہت جذباتی حرکت کر بیٹھی

''بیٹیوں کا پیار قسمت والوں کو ملتا ہے۔'' احمد شاہ نے ایک بار پھر اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُسے ...دعا کی۔

''انکل! جس طرح حجرِ اسود کو بوسہ دے کر ہر مسلمان خود کو گناہوں سے پاک سمجھتا ہے، میں نے بھی ...کے اندر کی آلودگی کو کم ہوتے محسوس کیا ہے۔'' ترنم نے دل میں کہا اور اُن کو بے حد عقیدت سے

''میں چلتی ہوں انکل!'' ترنم نے ایک بار پھر ان کو جی بھر کر دیکھا۔ اس کو اپنے باپ کا چہرہ احمد شاہ ...رے میں ضم ہوتا محسوس ہوا۔

''بابا!'' ترنم کے دل سے سسکی اُبھری۔

...وہ تیزی سے تقریباً دوڑتی ہوئی گاڑی میں جا بیٹھی۔

احمد شاہ نے واضح طور پر ترنم کے منہ سے لفظ بابا سنا تھا اُن کے دل سے اِس بچی کے لیے ڈھیر ساری ...ئیں نکلیں۔ وہ کچھ لمحے تو اُن لوگوں کی دھول اڑاتی گاڑی کو دیکھتے رہے پھر اپنی گاڑی میں آ بیٹھے،

گاڑی چل پڑی تھی انہوں نے نگینہ کا سر اپنے زانوں پر رکھ لیا اور اُس کے جلتے ماتھے پر بوسہ دیا۔
نازوں پلی اُن کی گڑیاں کیسے کملا کر مرجھا گئی تھی، اُن کا دل کسی نے مٹھی میں لے کر مسلا۔
''یا اللہ! اگر یہ تیری آزمائش ہے تو مجھ پر یہ آزمائش آسان کر دے، اولاد کی آزمائش جھیلی نہیں جا[...]
''احمد شاہ نے اللہ سے یوں فریاد کی جیسے دو دوست بیٹھے گفتگو کرتے ہیں۔
''اللہ رحمان! میرے بچے ولی کو بھی بحفاظت گھر پہنچا دے۔'' احمد شاہ نے صدق دل سے دعا کی

❖❖○❖❖

اسی بے بسی کی شال اوڑھے
اگرچہ تیرگی کے جنگلوں میں
راستہ تک کھو چکی ہے
پھر بھی یہ امید رکھتی ہے
جسے مچھلی نگل لے
اور مچھلی بحر کی تاریکیوں میں
راستے کے نور سے محروم ہو جائے
اسے جس نے دیا تھا روشنی کا استعارہ
وہ مجھے بھی ایک جگنو ایک تارہ
راستے کا اِک سہارا
جنگلوں کے بیچ بخشے گا

''باجی! آپ کو کہاں پہنچاؤں؟'' جاوید نے گم سم بیٹھی ترنم سے سوال کیا۔
ترنم اِس قدر کھوئی ہوئی تھی کہ جاوید کی بات سُن نہ پائی، اِس لیے خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھ[...] لگی۔
''وہ دراصل باجی! میں ڈیوٹی پر ٹائم پر پہنچنا چاہتا ہوں تاکہ میڈم کے لوگ مجھ پر شک نہ کریں، [...] شک میں اُن کے گروہ میں عملی طور پر کوئی کام نہیں کرتا لیکن ڈرائیور ہوں، وقت کی پابندی نہ کی تو وہ [...] پر بھی شک کر سکتے ہیں۔ آپ تو جانتی ہیں نا؟'' جاوید کو سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کیسے ترنم کو بتائے کہ [...] میڈم راگنی کی نظر میں آ سکتا ہے
''تم ٹھیک کہتے ہو جاوید! تم کو فوراً نکلنا چاہیے تم جاؤ۔'' ترنم نے گلا کھنکھارتے ہوئے کہا۔
''باجی! آپ بُرا مان گئیں؟
''نہیں جاوید! میں تم سے حقیقت میں کہہ رہی ہوں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو وہ ظالم عورت کسی کو معاف نہیں کرتی۔'' ترنم نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔
نگینہ کو اُس کے گھر پہنچانا تھا، محفوظ ہاتھوں میں دینا تھا، وہ دے دیا، اب مجھے کوئی فکر نہیں اگر میڈ[...] کے بندے مجھے پکڑ بھی لیتے ہیں تو!'' ترنم نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔
''نہیں باجی! ایسے نہ کہو، جان بچانا فرض ہے بے شک موت کا ایک وقت مقرر ہے لیکن یوں مو[...]

[...]نہ جانا تو خودکشی ہے اور خودکشی حرام ہوتی ہے۔'' جاوید نے مولانا کے انداز میں کہا۔
''اچھا!'' ترنم عجیب سی ہنسی ہنسی۔
''ساری عمر حرام زندگی گزاری ہے، اب مزید حرام ہونا کیا بچا ہے؟'' ترنم نے آنکھیں صاف کرتے [...]ہ کہا۔
''باجی! حرام زندگی تو گزر گئی، حرام موت سے تو بچنا چاہیے نا؟'' جاوید کی بات پہ ترنم نے ایک دم چونک کر دیکھا۔
''تم ٹھیک کہتے ہو! میں اور ماہی حلال موت کی خاطر تو وہاں سے بھاگی تھیں، میں کیسے اپنا مقصد [...]ل سکتی ہوں؟ ترنم نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔
''جاوید! تم مجھے کسی ٹرین میں بٹھا دو میں اِس شہر سے نکل جانا چاہتی ہوں، اِن لوگوں سے دُور بہت [...]'' ترنم نے آنکھیں میچ کر کہا۔
''لیکن باجی وہ لوگ ہر بس اسٹینڈ اور اڈے پر کھڑے ہوں گے، یہ خطرناک ہوگا۔'' جاوید نے حقائق [...]ن ڈالی۔
''پھر! کیا کروں؟'' ترنم خود اِس وقت بہت سُست رفتار سے کچھ سوچ پا رہی تھی، ڈرگز کے مسلسل [...]ل سے اُس کا دماغ اب ہر وقت سویا سویا رہتا تھا وہ جسمانی طور پر بھی بے حد کمزور ہو چکی تھی۔ [...]لک اب اُس نے ڈرگز کا استعمال چھوڑ دیا تھا لیکن پھر بھی اتنے عرصے کا نشہ کرنے کی عادت نے [...]ے جسم و دماغ پر بہت زیادہ اثرات مرتب کیے تھے۔
''آپ یوں کریں کہ نان اے سی والی گاڑی میں بیٹھیں اور نقاب کر کے بیٹھیں۔ نان اے سی غریبوں [...]یاں بنا کسی سہولت کے ہوتی ہیں اُن لوگوں کے دماغ میں آئے گا کہ نازک پریاں مہنگی گاڑی سے [...]ہا گی۔ بس یہاں سے وہ دھوکا کھائیں گے اور آپ کا نکلنا آسان ہو جائے گا۔'' جاوید کے پاس عملی [...]ھی بہت تھا اُس کی ترکیب میں خطرہ کم تھا۔
''ٹھیک ہے تم مجھے ایسی ہی گاڑی میں بٹھا دو۔'' ترنم نے فوراً حامی بھرتے ہوئے کہا۔
''لیکن آپ جائیں گی کہاں؟'' جاوید نے گاڑی چلاتے ہوئے پوچھا۔
''ملتان!'' ترنم نے بے اختیار کہا۔ پھر وہ خود بھی چونکی کہ اُس نے ایسا کیوں کہا۔
[...]لمیں نے ایسے ہی اِس شہر کا نام لیا ہے یقیناً وہاں میرے لیے کوئی کام ہے ورنہ میں اِس سے پہلے [...] ایک وڈیرے سے ملنے گئی تھی۔'' ترنم کے ذہن میں بدمست گورمانی کی شکل گھومی۔
''ٹھیک ہے باجی! میں آپ کو اڈے پر اتار کر آتا ہوں۔'' جاوید نے فوراً حامی بھری اور تیزی سے [...] دوڑا دی۔
''[...]م جاؤ جاوید۔'' ترنم نے گاڑی کی کھڑکی سے لگے جاوید سے کہا۔
''[...]جی! تم بہت اچھی ہو، کیسے اِن بھیڑیوں کے گروہ میں آ گئیں؟'' جاوید نے افسوس سے کہا۔ ابھی [...]ے میں وقت تھا وہ مسلسل کھڑکی کے پاس کھڑا تھا، ایک شاپر میں وہ کچھ سیب مالٹے اور جوس وغیرہ [...]نم کو زبردستی تھما چکا تھا۔

"بس بعض اوقات!" ترنم کچھ بتاتے بتاتے رک گئی۔ خود کی رسوائی خود سے کرنا بے حد دُشوار ہوتا ہے، ترنم کو بھی یہ مشکل درپیش تھی۔ پھر اُس نے گہرا سانس بھرا۔

"میں نے کہیں پڑھا تھا کہ انسان بعض اوقات شر بھی ایسے مانگتا ہے جیسے خیر مانگتا ہے، بس میری زندگی کی تباہی بھی ایسی ہی ایک دُعا اور حرکت کی وجہ سے ہے۔" ترنم نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"دراصل انسان کو صبر نہیں آتا، وہ جلد بازی کرتا ہے اور اللہ سے وہ مانگتا ہے جو اُس کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔" ترنم کی نگاہوں میں "ڈاکٹر جی" کا چہرہ گھوم گیا۔

"ہم کو اللہ کے دیے پر مطمئن ہونا چاہیے جاوید! کیوں کہ وہی ہمارے لیے بہترین ہے، یہ بات میں نے اپنے وجود اور روح کو تار تار کر کے پائی ہے کاش! کاش اس بات کو میں تب محسوس کر لیتی جب میں تحفظ میں تھی۔" ترنم کے لہجے میں بہت سارے دُکھ اکٹھے بول رہے تھے۔ جاوید نے بے حد دُکھ سے اُس کو دیکھا۔

"جاوید! میرا بس چلے نا تو میں ہر غریب لڑکی کو پکڑ پکڑ کر بتاؤں کہ اللہ کا دیا بہترین ہے کیوں کہ وہ ہمیشہ اپنے بندوں کو "دی بیسٹ" دیتا ہے، چاہے وہ غربت ہی کیوں نہ ہو! چاہے وہ کم علمی ہی کیوں نہ ہو! دِل! یہ دِل ہے نا انسان کا، اگر اس بات کو محسوس کر لے تو کبھی کوئی لڑکی ترنم نہیں بنے گی، غربت، کم علمی! بہ ظاہر بہت تکلیف دہ چیزیں ہیں لیکن اِس میں چھپی **Hidden Blessing** کو میں نہ جان سکی تھی، میں نے اللہ کے دیے کو بہترین نہ جانا اور اپنے لیے بہترین ڈھونڈنے نکل کھڑی ہوئی تو دیکھو! اب نہ میرے سر پر آسمان ہے نہ پیروں تلے زمین، نہ عزت ہے نہ آبرو! ایک خالی ڈبے جیسا وجود ہے جو لڑھکتا ہوا جانے کہاں چلا جائے۔" ترنم بولتے بولتے ہانپنے لگی۔

"باجی! آپ بہت اچھی ہو، اللہ بھی بہت اچھا ہے وہ معاف کر دے گا، آپ توبہ کر لو، بس اللہ انسان سے چاہتا ہے وہ توبہ کرنے والوں کا روز انتظار کرتا ہے۔" جاوید نے کم پڑھے لکھے ہونے کے باوجود بہت گہری بات کی تھی۔

"جاوید! تم کو یہ سب باتیں کس نے بتائیں؟" ترنم چونکے بغیر نہ رہ سکی۔

"ہماری خالہ نے، بہت نیک اور اچھی عورت ہے برسوں پہلے اُس نے میری جان بچائی تھی، اب کبھی کبھار دوروں کی وجہ سے مہینوں کملی ہو جاتی ہے لیکن جب ہوش میں ہوتی ہے تو بہت اچھی باتیں کرتی ہے۔ جب اُس نے میری جان بچائی تھی تو میں اُسے اپنے گھر لے آیا تھا بعد میں رانی کا اُس سے دل لگا کہ اُس نے اُسے کبھی جانے ہی نہیں دیا۔" جاوید کو لمبی چوڑی باتیں کرنے کی عادت تھی۔

ترنم سسکیوں سے رو رہی تھی۔ جاوید کا فون نمبر تو لے چکی تھی کہ وہ کہیں پہنچ کر اپنی ماں کے بارے میں پوچھے گی لیکن اُس نے جاوید کو یہ نہ بتایا تھا کہ وہی اُس نیک عورت کی بدبخت بیٹی ہے۔

ترنم نے باتوں باتوں میں جاوید سے اُس ہسپتال کا ایڈریس بھی لے لیا تھا، جہاں وہ آج کل داخل تھیں۔

"جاوید! تم اُن کا بہت خیال رکھنا" وہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔ جاوید نے ترنم کے اِس جملے کو بھی اُس کی اچھائی پر مامور کیا، وہ جان نہ پایا کہ ترنم اتنی دیر سے آخر اُس کی خالہ کا ٹاپک چھیڑے کیوں بیٹھی ہے۔

"بالکل باجی! میں تو اُس کا خیال بالکل اپنی سگی ماں جیسا کرتا ہوں، میری خود کی ماں سوتیلی ہے میری سگی چار بہنوں اور میرے لیے وہ بہت سخت ہے ایسے میں خالہ کا وجود نعمت کی طرح لگتا ہے۔" جاوید نے کہا۔

"چلو بھئی چلو! بس چلنے لگی ہے۔" کنڈیکٹر نے اونچی آواز میں ہانک لگائی۔

"اچھا باجی! خیریت سے پہنچ کر اطلاع کرنا" جاوید نے رینگتی بس کے ساتھ دوڑتے ہوئے کہا۔

"تم بھی رانی کو میرا پیار دینا۔" ترنم نے کہا۔

"اچھا باجی پھر ملیں گے۔" جاوید نے اونچی آواز میں کہا اور ساتھ ہی ہاتھ ہلایا۔

"بشرطِ زندگی۔" ترنم نے ڈبڈبائی نگاہوں سے اِس شہر پر آخری نگاہ ڈال کر زیرِ لب کہا۔

❖❖○❖❖

کچھ لوگ اتنے خاص کیوں ہوتے ہیں؟
جسم میں جاں کی طرح کیوں ہوتے ہیں
کچھ لوگ اتنے خاص کیوں ہوتے ہیں؟
جسم میں دِل کی طرح ہوتے ہیں
کہ دل نہ ہو تو پھر ہم بھی نہیں ہوتے ہیں

طارق نے اپنے ماتحتوں کو مختلف ہدایات دے کر آفس بھیجا اور خود اِس پرائیویٹ کلینک چلا آیا، جہاں اُس کی دُشمنِ جاں تھی۔

تقریباً دوڑتے ہوئے اُس نے ریسپشن سے نگینہ کے کمرے کا راستہ پار کیا، جس بے چینی سے اُس نے دروازہ کھولا تھا سامنے احمد شاہ کو جو جانماز بچھائے شاید نوافل ادا کر رہے تھے اُسے اپنی بے چینی کو وہیں روکنا پڑا۔ عجیب سی بے بسی تھی۔ دِل تو کرتا تھا کہ سامنے لیٹی بے ہوش لڑکی کو اپنے سینے میں یوں چھپالے کہ پھر کوئی اُس کو اُس سے جدا نہ کر سکے۔

وہ نگینہ کو تب سے چاہتا آرہا تھا، جب اُسے محبت کا مطلب بھی معلوم نہ تھا اِس لیے وہ اُس کے اندر خون کی طرح دوڑتی تھی۔ وہ بے آواز وہ نگینہ کے قریب آ کھڑا ہوا تھا اُس کے بازوؤں اور پیروں پر سگریٹوں کے داغ کے نشان تھے طارق کا فشارِ خون بڑھ گیا تھا۔

نگینہ کے سنہری بالوں کی لمبی چوٹی کو کاٹ دیا گیا تھا چہرہ اور جسم نیلوں نیل تھا۔ ایک بازو پر پلاسٹر چڑھایا گیا تھا۔

"نگینہ کی آبرو کا موتی محفوظ ہے طارق صاحب! لیکن اُن ظالموں نے اُسے جسمانی طور پر بہت مارا ہے۔" طارق کے کانوں میں ترنم کی آواز گونجی۔

طارق نے بے اختیار نگینہ کے ہاتھ کو تھاما۔

"تمہارے ایک ایک زخم کا حساب لوں گا، وہ سسکی جو تم نے اِن زخموں پر بھری ہوگی اُس سسکی بھرے لمس کی قسم میں اُن لوگوں کی سانسیں اُن کے وجود میں دو بھر کر دوں گا۔" طارق دھیمی آواز میں بولا۔ بے شک اُس نے سرگوشی کی تھی لیکن احمد شاہ جو دُعا مانگ رہے تھے انہوں نے بہ خوبی سُن لیا تھا۔

انہوں نے چونک کر طارق کو دیکھا لیکن طارق خود میں نہ تھا، وہ جن نگاہوں سے نگینہ کو دیکھ رہا تھا اُس کے حال دِل کا ماجرا اُس کے چہرے پر لکھا تھا۔

احمد شاہ طارق کا راز جان گئے تھے۔

''حیرت ہے آج سے پہلے طارق نے کبھی بھی واضح نہیں ہونے دیا۔'' احمد شاہ کے اندر سوال اُٹھا تھا

''نگینہ!'' طارق نے اُس کے ماتھے سے بال پیچھے کرتے ہوئے پکارا۔

لیکن وہ بے ہوش تھی، دواؤں کے زیرِ اثر تھی۔ طارق کو کیسے سُن سکتی تھی۔

''بیٹا! نگینہ کو نیند کا انجکشن دیا گیا ہے وہ سو رہی ہے۔'' احمد شاہ نے پیچھے سے آواز دی۔

طارق ایک دم پیچھے پلٹا اور کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ وہ احمد شاہ کو نوافل میں مصروف جان کر نگینہ کے بے حد قریب کھڑا تھا، ان کی آواز سنتے ہی طارق نے خود کے جذبات کو ایک گہری سانس لے کر کمپا کیا۔

''ترنم نے کچھ کہا تھا؟'' طارق نے سوال کیا۔

''نہیں! لیکن اُس نے ہمارے اُوپر بہت بڑا احسان کیا ہے وہ بہت اچھی بچی ہے، اللہ اُس کی آسانیاں اُتارے۔'' احمد شاہ نے سچے دِل سے ترنم کو دُعا دی۔

''آمین!'' طارق نے با آواز بلند کہا۔

''ڈاکٹر! ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟'' طارق نے اپنے لب کچلنے کے عمل کو روکا، وہ اپنے جذبات کسی پر عیاں نہ کرنا چاہتا تھا لیکن وہ نہ جانتا تھا کہ اُس کی چوری احمد شاہ نے پکڑ لی ہے۔

''بہت سارے زخم ہیں، لیکن نگینہ کی ذہنی حالت بہت خراب ہے ایک بار ہوش میں آئی تھی تو ڈرا خوف سے بہت بُری حالت تھی اُس کی۔'' احمد شاہ کا لہجہ بے حد غمگین تھا۔

''جانے روشن کیسے نگینہ کی یہ حالت سہہ پائے گی!''

''انکل! میں اُن جانوروں کو جنھوں نے میری نگی میرا مطلب ہماری نگینہ کو اِس حال میں پہنچایا۔ بہت بُری سزا دلواؤں گا تاکہ آئندہ وہ کسی کی بہو بیٹی پر ہاتھ نہ ڈال سکیں۔'' طارق نے اپنے آپ اپنے جملے کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''خدا کرے ظالم اپنے انجام کو پہنچیں۔'' احمد شاہ نے تھکن سے کہا۔

''صد شکر ہے کہ ہمارا بڑا نقصان نہیں ہوا، اگر اللہ ہمیں اِس آزمائش میں ڈال دیتا تو۔'' احمد شاہ لرز کر کہا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں اللہ نے بہت زیادہ کرم کیا ہے ورنہ تو میں نے اس گروہ کے ہاتھوں لڑکیوں جو درگت بنتے دیکھی ہے وہ نا قابل بیان اور نا قابل برداشت ہے۔'' طارق کی نگاہوں میں سحرش کا گھوم گیا۔

''بے شک میں اپنے اللہ کا بہت احسان مند ہوں۔'' احمد شاہ نے سچے دل سے کہا۔

جب کہ طارق نے ایک بار پھر نگینہ کو بھرپور نظر سے دیکھا۔ کاش وہ جاگتی ہوتی تو وہ اُس سے با کر سکتا۔ اُسے فوراً کام سے نکلنا تھا اِس لیے اُسے نگینہ سے بات کرنے کی بے چینی تھی۔

''ابھی سائرہ آجائے گی تو آپ انٹی کے پاس چلے جایئے گا، آنٹی اگر بہتر ہوں تو اُن کو ڈسچارج روا کر ادھر نگینہ سے ملوا دیجیے گا، اُن کے دِل کو تسلی ملے گی۔'' طارق نے مصروف سے انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے بیٹا!'' احمد شاہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''طارق بیٹا! ولی سے کوئی رابطہ ہے؟'' احمد شاہ نے طارق سے سوال کیا۔

''جی ہو گیا تھا۔'' اس نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''اُسے روکنا تھا کہ وہ شخص اُسے Trape کر رہا تھا۔'' احمد شاہ نے جلدی سے کہا۔

''سر! زندگی بہت مختلف ہے نا؟'' طارق نے ایک دم بے حد مختلف سوال کیا۔

''کیوں ایسا کہہ رہے ہو؟'' احمد شاہ نے سوال کیا۔

''اِس لیے کہ یہ سوال بارہا میرے سامنے آتا ہے کہ جن سے انسان کے دِل ملتے ہیں، اُن سے لکیریں کیوں نہیں ملتیں اور جن سے ہمارے دِل نہیں ملتے اُن کو ہماری زندگیوں کا ایک بڑا حصہ کیسے مل جاتا ہے۔'' طارق کے دماغ میں خود کی کیفیت گھومی تھی کہ کیسے سحرش کو اُسے اپنی زندگی میں شامل کرنا پڑا تھا اور اب ولی کو مسکان کو اپنی زندگی میں شامل کرنا پڑا۔

''اس لیے کہ اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے اور انسان فوری طور پر اُس مصلحت کو جان نہیں پاتا لکوہ کناں سوالوں کی ڈور میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔'' احمد شاہ نے بے حد سوچ کر جواب دیا۔

''انکل! ولی مسکان سے نکاح کر چکا ہے۔'' طارق کو احمد شاہ کی بات سے حوصلہ ملا تھا اِس لیے اُس نے سچ کہہ دیا۔

''انا للہ وانا الیہ راجعون!'' احمد شاہ نے بے اختیار کہا۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ وہ بوجھ اور غم، جو انسان خود نہیں سنبھال سکتا اُسے اللہ کی جانب واپس لوٹا دینا چاہیے۔

بے اختیار ہو کر انسان اگر اللہ کے اختیار کو سمجھ سکے تو وہ کوئی سمجھ نہیں ہوتی، اللہ کو نعمتوں اور اختیارات کے زمانے میں سب سے بڑا اختیار والا، ماننے والا ہمیشہ احمد شاہ کی طرح پھل پاتے ہیں اللہ کے ہاں اور دُنیا میں کامیاب ہوتے ہیں اِسی لیے تو اللہ ایسے لوگوں کے دُکھوں کو بھی خوشیوں میں بدل دیتا ہے۔ نگینہ جس طرح معجزانہ طور پر بچ کر آئی تھی اُسے احمد شاہ کی دعائیں محافظ بن کر جہنم سے نکال لائی تھیں، اُن کا ایمان تھا کہ اُن کا بیٹا بھی بہت جلد اُن کے پاس ہوگا۔

''انکل! آپ پریشان نہیں ہیں؟ طارق نے سوال کیا۔

''میری پریشانیوں کو دیکھنے والا اللہ ہے نا!'' احمد شاہ نے اطمینان سے کہا۔

''انسان کو جب جب پریشانی کے طاقت ور ریلے کو Face کرنا ہو تو ہمیشہ اُسے ایک کشتی کی ضرورت ہوتی ہے جو اُسے محفوظ رکھتی ہے اور یہ کشتی صرف مانگنے والوں کو اللہ دیتا ہے، مدد کے لیے غیر اللہ کو پکارنے والے ہمیشہ ڈوب جاتے ہیں، غرق ہو جاتے ہیں۔'' احمد شاہ دھیرے دھیرے بول رہے تھے اور طارق تو جیسے کسی اور ہی ٹرانس میں تھا۔

''سر! مجھے کہنے دیں کہ میں نے اپنی زندگی میں آپ جیسا بہتر اور صابر انسان نہیں دیکھا۔ آپ نے نا صبر کرنا کیسے سیکھا۔'' طارق نے بے حد عقیدت سے سوال کیا۔

جواباً احمد شاہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''بیٹا! کوئی بھی چیز انسان خود سے نہیں سیکھ سکتا اور نہ ہی حاصل کر سکتا ہے۔ جیسے نیکی کی توفیق اور برائی سے بچنے کی طاقت اللہ نوازتا ہے اُسی طرح ہر ہر مشکل معاملے میں استقامت اُسی اللہ کی جانب سے ملتی ہے، صبر ہو یا رزق! دونوں سے اللہ ہی نوازتا ہے بس یہ مانگنے اور خواہش کرنے والے کی شدت پر منحصر ہے، میں نے زندگی کی ہر فریاد اللہ سے کی ہے شاید اِسی لیے میں ہمیشہ عطا کیا گیا ہوں، ورنہ میں کیا اور کیا میری ہستی! اُس اللہ نے مجھے ہر ہر نعمت سے نوازا، اولاد جیسی دولت سے بھی جو میری زندگی میں ناممکن تھی۔'' احمد شاہ کھوئے کھوئے سے تھے وہ نگینہ کے سرہانے بیٹھ کر اُس کے سر کو سہلاتے ہوئے بولے۔

طارق کے تڑپتے پھڑکتے دِل کو قرار آ گیا تھا وہ گزشتہ کچھ گھنٹوں سے اعصابی جنگ سے نبرد آزما تھا ایسے میں اُس نے ایک ایسے شخص کے منہ سے اتنے اچھے خیالات سنے، جو آزمائش کی رسی پر کھڑا تھا لیکن اُس کے منہ سے شکوے کے، آگ کے گولے نہ نکل رہے تھے بلکہ شکر کی ٹھنڈی پھوار برس رہی تھی۔

ایسے شخص کو بھلا کیوں اللہ نہ نوازتا۔

''سر! میں آپ کے گلے مل سکتا ہوں۔'' طارق نے عجیب سی فرمائش کی، پھر اُن کی بات سنے بغیر ہی اُن کے سینے سے جا لگا۔

''تھینک یو سر۔'' طارق نے بے اختیار کہا۔

''یہ کس بات پر تھینک یو ہو رہا ہے؟'' احمد شاہ نے پوچھا۔

''بس آپ کے ہونے کا سر!'' طارق نے اُن کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''سر! مجھے بہت ضروری کام ہے ابھی نکلنا ہے میں شام میں چکر لگاتا ہوں۔'' طارق اُن سے اجازت لے کر باہر نکل آیا۔

اُس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا، اُس نے مسلسل ترنم کو فون ملایا، لیکن اُس کا فون بند پڑا تھا۔

''یہ لڑکی کدھر نکل گئی، یہ تو بہت کام کی تھی۔ کم آن، پک اپ دا فون!'' طارق نے مسلسل ترنم کا نمبر ملایا لیکن فون بند تھا۔

طارق چاہ رہا تھا کہ وہ ایسی حکمت عملی بنائے، جس میں کم سے کم غلطیوں کا امکان ہو۔

''مارک! تم تیار ہو جاؤ عبرت ناک انجام کے لیے۔'' طارق نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا۔

طارق نے جیسے ہی ترنم کا نمبر ٹرائی کرنا بند کیا تو سحرش کا نمبر اسکرین پر جگمگایا گیا۔ اس نے ابھی فون آن ہی کیا تھا کہ سحرش بنا سلام دُعا کے بولی۔

جب وہ کہتے ہیں۔
تنہائی سے سمجھوتا نہیں ہوتا
تب میں ہنستی ہوں
کیسے نہیں ہوتا!
یہ تنہائی ہی تو ہے

وہ ہمیشہ ساتھ رہتی ہے
اس کے علاوہ کون ہے
جو ساتھ دے
جو کل ہے
تنہائی کا ساتھ بھی چھوٹ گیا
تو کیا ہوگا؟
یہ اس کو کون بتائے
جس کے بعد اِک سناٹا ہے

سحرش کی بے حد اُداس آواز موبائل سے اُبھر رہی تھی کوئی اور موقع ہوتا تو شاید طارق زِچ ہو کر سحرش کو کچھ سخت کہہ ڈالتا۔ لیکن ابھی ابھی وہ احمد شاہ کی باتیں سُن کر سکون کا ایک عجیب سا فلیور چکھ کر آیا تھا وہ بہت شانت تھا۔ طارق کے کانوں میں ابھی تک احمد شاہ کے الفاظ گونج رہے تھے کہ اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے اس مصلحت میں اچھائی ہوتی ہے اور انسان فطرتاً بے صبرا ہے اور فوری طور پر اُس مصلحت کو جان نہیں پاتا تو شکوہ کناں سوالوں کی ڈور میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے، جو لوگ نصیب میں لکھ دیے گئے ہیں ہم اُن کو اپنے رویوں سے بھی کبھی دُور نہیں کر سکتے۔ طارق نے بے اختیار طویل سانس بھری۔

''السلام علیکم۔'' طارق نے اُسے شرمندہ کرنے کے لیے جواباً سلام کیا۔

''گندی بچی! کیوں ایسی چیزیں پڑھتی ہو اور خود ساختہ اُداسی اور پریشانی کو دعوت دیتی ہو، کچھ اچھا پڑھا کرو اور مجھے بھی سُنایا کرو، میں دن بھر، رات بھر تھکا رہتا ہوں یار! تم تو اچھی دوست رہو۔'' طارق نے بے اختیار کہا۔

یہ احمد شاہ کے الفاظوں کا اثر تھا کہ وہ سحرش سے عام دنوں سے ہٹ کر بے حد نرمی سے بات کر رہا تھا سحرش کو اپنی سماعتوں پر یقین نہ آ رہا تھا کہ یہ طارق ہے اِس قدر اپنائیت! اس قدر اپنائیت نے اُس کی ساری تنہائی، اُداسی اور منہ میں بھرے سب شکوؤں کو چوس لیا تھا۔

''آپ اتنے اتنے دِن شکل نہیں دکھاتے، رابطے میں نہیں رہتے تو میرے دِل میں بھانبھڑ جلنے لگتے ہیں۔'' سحرش نے بے بسی سے کہا۔

''دِل میں کوئی چنگاری اگر پھوٹ بھی پڑے تو اُسے فوراً بجھاتے ہیں نہ کہ اُسے آگ بناتے ہیں یہ نہ صرف خود کو جلاتی ہے بلکہ آپ کے پیاروں کو بھی جلاتی ہے اور میرا خیال ہے تم مجھے آگ میں جلانا پسند نہیں کرو گی۔'' سحرش کو اُس کا اپنے آپ کو سحرش کا پیارا کہنا بے حد بھایا تھا۔

''کیا میری دعائیں قبول ہو رہی ہیں؟'' سحرش نے بے اختیار سوچا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں میں آئندہ خیال کروں گی۔'' سحرش نے تابعدار بچوں کی طرح کہا۔

''لیکن اگر!'' وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔

''لیکن اگر کیا؟'' طارق نے پوچھا۔

''اگر آپ کو دیکھنے اور ملنے کو دِل چاہے اور آپ دستیاب نہ ہوں تو کیا کرنا چاہیے؟'' سحرش نے

بے بسی سے کہا۔

"تو پھر گیٹ پر جانا چاہیے اور گیٹ کھلوانا چاہیے۔" طارق نے شرارت سے کہا۔

"سچی! سحرش فون تھامے تھامے باہر پورچ کی طرف بھاگی۔

"مچی!" طارق نے نرمی سے جواب دیا۔

چوکیدار نے دروازہ کھولا تو طارق کی گاڑی اندر داخل ہوگئی، سحرش دوڑتی ہوئی طارق کے ساتھ جا لگی

"میں نے آپ کو بہت مس کیا۔" سحرش کے لہجے میں بہت سی شدتیں بول رہی تھیں۔ جواباً طارق نے گرم جوشی سے اُس کا ہاتھ دبایا۔ سحرش کو خود پر یقین نہ ہو رہا تھا۔

"یا اللہ! یہ طارق کا کیسا روپ ہے، یہ تو میرے خوابوں جیسا ہے۔" اُس نے دِل میں کہا۔

"آپ کے لیے چائے لاؤں یا کھانا؟" سحرش نے حسبِ عادت طارق سے پوچھا۔

اُس کی کوشش ہوتی تھی کہ طارق کا ہر کام خود کرے۔

"جو کچھ کھلانا ہے کھلا دو، میرے پاس کھانے کے لیے آدھا گھنٹہ اور تم سے ایک اہم بات کرنے کے لیے ایک گھنٹہ ہے۔" طارق نے بستر پر جوتوں سمیت لیٹتے ہوئے کہا۔

سحرش نے بہت پیار سے اُس کے جوتے اتارے وہ اُسے ایسے تک رہی تھی، جیسے کوئی داسی کسی دیوتا کو دیکھتی ہے۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" طارق نے شرٹ کے اوپر کے بٹن کھول کر کروٹ لی اور سر تکیے پر ڈال دیا۔

"کچھ نہیں!" سحرش نے نگاہیں جھکا کر کہا۔

سحرش سرہانے بیٹھ کر دھیرے دھیرے طارق کا سر دبانے لگی، طارق کو غنودگی آ گئی تھی۔

کچھ غیر معمولی سا لمس تھا جو طارق نے نیند میں محسوس کیا۔ اس نے ایک دم آنکھیں کھول دیں۔

کچی نیند کی وجہ سے اُس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے، طارق کا ذہن سویا ہوا تھا وہ فوری طور پر جان نہ سکا کہ وہ کہاں ہے۔ اُس کے بے حد قریب کوئی لیٹا ہوا تھا۔

انسان جس کو چوبیس گھنٹے سوچے وہی تصور اور وہی چہرہ حقیقت بن کر سامنے گھومتا ہے۔ طارق کو بھی وہ نگینہ کا چہرہ لگا۔ نگینہ مسکراتی تو وہ بھی مسکراتا تھا۔ بس ایک پل تھا کہ وہ شاید آگے بڑھتا، تصور کسی پانی کی تصویر کی طرح ایک دم ٹوٹ گیا۔

سامنے سحرش تھی۔ طارق ایک دم اُٹھ بیٹھا۔ اُس کے گھنے بال ماتھے پر آن گرے۔ اس نے اپنے بالوں اور شرٹ کو درست کیا اور بیڈ سے نیچے اُتر آیا، اُسے یہ سب کچھ اچھا نہ لگا تھا۔

"کیا ہوا؟" سحرش دوسری جانب سے اُتر آئی۔

"کچھ نہیں!" طارق نے گلا کھنکھار کر کہا۔

"مرد کو اتنا نہیں آزمانا چاہیے سحرش!" طارق نے ایک دم مڑ کر کہا۔

"آپ میرے شوہر ہیں، میں آپ کو کیوں آزماؤں گی آپ پر میرا پورا حق ہے، کوئی نامحرم تھوڑی ہیں میرے لیے۔" سحرش نے استحقاق بھرے لہجے میں کہا۔

طارق نے بے اختیار سر پر ہاتھ پھیرا۔

"سحرش تم!" طارق اُسے کہتے کہتے رُکا کہ وہ حد سے بڑھ رہی ہے۔

"سحرش ادھر میرے پاس آ کر بیٹھو، مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔" طارق نے اُسے اپنے پاس صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا۔

"آپ کے پاس آ کر بیٹھتی ہوں تو آپ مجھ سے دوڑتے ہیں!" سحرش نے نروٹھے پن سے کہا۔

"سحرش پلیز! تم اب بڑی ہوچکی ہو Kindly باتوں کو سمجھنے کی کوشش کیا کرو نہ کہ اُن کو مزید الجھاؤ۔" طارق کی اس قدر سنجیدگی دیکھ کر سحرش کو خاموشی سے اُس کے پاس آنا ہی پڑا۔

"جی کہیے!" وہ قریب بیٹھ کر نگاہ جھکا کر اپنے ناخنوں سے کیوٹکس کھرچنے لگی۔ ایسا وہ اپنا دھیان بٹانے کی کوشش میں کر رہی تھی، طارق کے وجود سے آتی خوشبو اُسے پاگل کر دیتی تھی وہ خود کو بے بس محسوس کرنے لگتی تھی۔

"سحرش! تم میری بہت اچھی دوست ہو اور مجھے بہت عزیز بھی ہو، مجھے یہاں آ کر عادت ہوگئی ہے کہ ایک لڑکی مجھ پر واری صدقے جاتی ہر وقت میرے گرد منڈلاتی ہے، یقین مانو میں تمہاری محبت کا دِل سے قدر دان ہوں۔ لیکن!" طارق کہتے کہتے رُکا۔

سحرش کا سانس بے ترتیب ہونے لگا۔

آج طارق کچھ اپنے معمول اور عادت سے ہٹ کر کر رہا تھا۔ وہ ایسا کیا کہنا چاہ رہا ہے، جس کے لیے اُسے اتنی بڑی تمہید باندھنی پڑ رہی تھی۔

"زندگی میں ہم کو وہ حاصل ہونا ضروری نہیں ہے جو ہم چاہتے ہیں۔" طارق نے ٹھہر ٹھہر کر سنبھل سنبھل کر لفظ ادا کیے۔ سحرش یک ٹک اُسے دیکھ رہی تھی۔

"طارق ٹھیک ٹھیک بات کریں، میں آپ کی دوست نہیں، بیوی ہوں آپ صرف یہ بات یاد رکھا کریں۔ تانیہ آنٹی کہتی ہیں کہ میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں اُن کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا۔ دوستوں میں تو لاکھ پردے اور بھرم چلتے ہیں، مجھے آپ صرف دوستوں کی کیٹگری میں نہ رکھا کریں۔" سحرش کا لہجہ صاف تھا۔

طارق کو ایک دم محسوس ہوا کہ سحرش ضرورت سے زیادہ باخبر اور پوزیسو ہوچکی ہے۔

لیکن آج وہ ارادہ باندھ کر آیا تھا کہ ایک پل صراط تو ضرور آج طے کر لینا ہے، چیزوں کو چھپانا بھی کھوٹ ہوتا ہے اور وہ اب جھوٹ سے نکلنا چاہتا تھا، اِس لیے اُس نے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"سحرش! میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں!" طارق نے اپنی جانب سے دھماکہ کیا جب کہ سحرش کا چہرہ سپاٹ تھا ایسے جیسے اُس کے لیے یہ خبر کوئی اہمیت نہ رکھتی ہو۔

"تم کو حیرت نہیں ہوئی؟" طارق کو اُس کے حیرت نہ کرنے پر حیرت ہوئی تھی۔

"نہیں!" سحرش نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

"کیوں؟" طارق نے سوال کیا۔

"اِس لیے کیوں کہ میں آپ دونوں کو ہسپتال میں اظہار محبت کرتے دیکھ چکی ہوں، میں سمجھتی تھی کہ آپ میرے ساتھ دھوکہ نہیں کریں گے لیکن آپ تو عام مردوں کی طرح نکلے۔" سحرش نے سپاٹ لہجے

میں کہا۔
"تم اگر بدگمانی کے فلاسک میں خود کو بند کر کے میری بات سنو گی تو اصل بات کبھی نہ سمجھ پاؤگی" طارق نے خائف ہو کر کہا۔
"نگینہ میری بچپن کی محبت ہے اور رہے گی، اگر میں اُس سے محبت کرنا چھوڑ دوں گا تو میں تا م طرح کی محبت سے محروم ہو جاؤں گا۔ وہ میرا محبت کا جنکشن ہے، جہاں سے میری روح چارج ہوتی سمجھو اگر تم چاہتی ہو کہ تم کو مجھ سے محبت ملے تو میرے پاس نگینہ کی محبت ضروری ہے ورنہ میرا دل ڈبے کی طرح ہو جائے گا اور میں کسی کے ساتھ انصاف نہ کر پاؤں گا۔" طارق نے سچائی سے کہا۔
سحرش کو اپنا دِل پھٹنے کے قریب محسوس ہو رہا تھا۔
"آپ نے آج سے پہلے مجھے یہ کچھ نہیں بتایا تھا اب کیوں بتا رہے ہیں؟" سحرش نے ڈوبتے سے پوچھا۔
طارق نے بہ غور اُسے دیکھا۔
"اس لیے کہ میں نگینہ سے شادی کرنے جا رہا ہوں۔" طارق نے دھماکہ کر دیا تھا۔
"نہیں طارق! نہیں!" سحرش ایک دم سر ہلاتی اُٹھ کھڑی ہوئی۔
"آپ میرے ہو، صرف میرے، میں کسی کے ساتھ آپ کو شیئر نہیں کروں گی۔" سحرش نے خود انداز میں کہا۔
"میں تم کو پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ وہ میری زندگی میں محبت کا جنکشن ہے۔ اگر وہ نہ رہی تو میں سے پیار نہ کر پاؤں گا تم سے بھی نہیں۔" طارق نے سچائی سے کہا۔
"سو واٹ! مجھے پروا نہیں ہے مجھے تو بس آپ کو کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرنا۔" سحرش نے ضدی میں کہا۔
"سحرش! میں تمہارے ساتھ انصاف کروں گا ایک دن اگر اُس کو دوں گا تو ایک دن تم کو دوں طارق نے اُسے نرمی سے تھام لیا۔
"آگ لگیں یہ دن اور راتیں! مجھے آپ پورے کے پورے چاہئیں۔" سحرش نے غصّے سے کہا۔
"سحرش! تم ناانصافی کر رہی ہو، میری نرمی اور تحمل کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہو۔" طارق نے اِس بار سخت لہجے میں کہا۔
"میں آپ کی بیوی ہوں اور مجھے حق ہے کہ آپ سے اِس بابت سوال کروں۔" سحرش نے چلا کہا۔
"سحرش! میں تم کو پورا کیا آدھا بھی نہیں مل سکتا اگر تم یوں کرو گی، تم مجھے اور میرے احساسا سمجھو۔" طارق نے نرمی سے کہا۔
"مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں تھی لیکن میں تم کو خفا کر کے کوئی قدم بھی نہ اٹھانا چاہتا، میں تمہارے احساسات کا خیال کر سکتا ہوں تو تم کو بھی کرنا چاہیے۔"
"میں کیا سمجھوں طارق! یہ سب کچھ میری برداشت سے باہر ہے۔" سحرش رو دینے کو تھی۔

"سحرش! میں تم کو تمہارے پورے حقوق دوں گا۔" طارق نے اُس کو کندھوں سے تھام کر کہا۔
"وہ تو آج تک مجھے نہ ملے، لیکن میں بولی نہیں تھی لیکن اب بھیک میں مجھے میرا حق بھی نہیں چاہیے۔" سحرش نے اِس قدر ضد سے کہا کہ طارق ایک دم اُٹھ کر جوتے پہننے لگا۔
"کہاں جا رہے ہیں؟"
"جہنم میں!" طارق نے جل کر کہا۔
"آپ اُس حرافہ کے پاس جا رہے ہیں نا؟" سحرش نے چیخ چیخ کر کہا۔
"شٹ اپ سحرش! شٹ اپ! تم اُس پاکیزہ لڑکی کے متعلق ایسا اِس لیے کہہ رہی ہو کہ وہ میرے دل میں بستی ہے، تم کو شرم آنی چاہیے اپنی زبان اور خیالات پر، وہ تمہاری طرح بے آبرو نہیں ہوئی، باعصمت ہے وہ تمہاری طرح گھر سے نہیں بھاگی تھی اُس کی وجہ سے اُس کے ماں باپ اور خاندان کو کبھی سر نہیں جھکانا پڑا۔ وہ نہایت معصوم اور سادہ دِل ہے اور تم! تم اُسے حرافہ کہہ رہی ہو۔" طارق شاید اپنے آپ میں نہ تھا۔
سحرش پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی، اُس نے طارق کو اِس قدر بے بس کر دیا تھا کہ وہ اتنا کچھ کہنے پر مجبور ہو گیا تھا ورنہ تو وہ آج تک اُس کا بھرم رکھتا آیا تھا کبھی اُس کو اُس کا ماضی نہ یاد دلایا تھا۔
کسی کو اتنا نہیں ستانا چاہیے کہ وہ اپنی عادت اور مزاج سے ہٹ کر React کرے۔
لیکن سحرش یہ غلطی کر چکی تھی۔
طارق اپنی بات کہہ کر رُکا نہیں بلکہ غصّے سے جیکٹ اٹھا کر باہر نکل گیا جب کہ سحرش ابھی تک طارق کے جلتے ہوئے الفاظ میں گھری ہوئی تھی، اُسے ہوش تو تب آیا جب گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔
وہ ایک دم نیند سے جاگی اور باہر کو دوڑی، لیکن تب تک طارق گاڑی لے کر باہر جا چکا تھا۔
اور وہ گیٹ کے پاس ایسے کھڑی اُسے جاتا دیکھ رہی تھی، جیسے اُسے آخری بار دیکھ رہی ہو!

❖❖○❖❖

سید سرفراز جب کمرے میں داخل ہوا تو ولی نے بے حد سپاٹ نظروں سے اُس کو دیکھا۔
اس نے بات کی تمہید کے لیے گلا کھنکھارا۔
"آپ غالباً مجھے میری بہن سے ملوانے جا رہے تھے؟" ولی نے چبھتی ہوئی نظروں سے سید سرفراز علی کو دیکھا۔
"ہاں! وہ بس ابھی تم مل لینا!" سید سرفراز علی نے کہا۔
جواباً ولی عجیب سی ہنسی ہنسا اور اُس سے زیادہ عجیب نظروں سے دیکھا۔
"بیٹا! ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" سید سرفراز علی پہلی بار کسی کی نظروں سے گھبرائے تھے، شاید اِس لیے بھی کہ اُس کے دیکھنے کا انداز اور شکل کسی سے بہت ملتی تھی۔
"میں دیکھ رہا ہوں کہ جھوٹے لوگوں کے کتنے چہرے اور زبانیں ہوتی ہیں۔" ولی نے ٹھہر ٹھہر اور چبا چبا کر ایک ایک لفظ ادا کیا۔

''مطلب؟''

''مطلب میں جان چکا ہوں کہ آپ نے میری بہن کے اغوا کا ڈرامہ رچا کر مجھے Trapped کر کے دھوکے سے اپنی بیٹی سے میرا رشتہ جوڑا ہے۔''ولی نے سید سرفراز علی کو اپنی باخبری کا بتا کر ایک دھماکہ کیا۔ ولی اُن کی جانب جن نظروں سے دیکھ رہا تھا، سید سرفراز علی کے ذہن سے ایک دم سارے الفاظ اُڑ گئے۔

''آپ اب کیوں چپ ہیں، میں سُننا چاہتا ہوں آپ کے نادر خیالات کہ ایک جھوٹا شخص آخر کتنی زبانیں بدلتا ہے۔''ولی نے انگارے چبائے۔

Man to man fight شاید اسے ہی کہتے ہیں!

سید سرفراز علی کو بے حد شدت سے محسوس ہوا کہ وہ پہلی بار Man to man finght میں بُری طرح شکست کا سامنا کرنے والا تھا۔

ہنگامۂ روز و شب سے ہٹ کر
کچھ دیر کو ذات سے نکل کر
احساس ملے جو ماورائی
بے ساختہ دل یہ چاہتا ہے
وہ ہاتھ جو لکھ رہا ہے سب کچھ
تقدیر کا کھول کر نوشتہ
جب اپنے ہی دھیان میں مگن ہو
چپکے سے اٹھا کے ایڑیوں کو
ہولے سے ورق الٹ کے دیکھوں
اس وقت میں جو ہے آنے والا
جان لیوا مسافتوں کے رستوں پر
کون کہاں تلک چلا ہے

ولی نے تیزی سے چلتی گاڑی کو ایک دم روکا، ٹائروں کی چرچراہٹ دور تک سنائی دی۔ ولی کی اندر حبس اُترا ہوا تھا، اُسے زندگی میں پہلی بار سانس لینے میں اتنی دُشواری محسوس ہو رہی تھی۔ ولی نے اِدھر اُدھر سر گھما کر جگہ کا جائزہ لیا کہ وہ کہاں ہے گاڑی بیچ راستے میں کھڑی کر کے بنا لاک کیے وہ قریب آتی ایک چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھ آیا، جیب سے اس نے فون سیل نکالا، طارق کا میسج سامنے تھا نگینہ حفاظت گھر پہنچ چکی ہے، میں تمہارے پہنچنے کا منتظر ہوں، اپنی خیریت کی اطلاع دو!

لمحہ لمحہ ارمانوں کی قربانی تھی
لمحہ لمحہ جرأت کی آزمائش تھی

وہ سودا کرنے گیا تھا اور سارے خسارے باندھ کر لے آیا تھا۔ یہ احساس بے بسی اُس کے اندر گھور اندھیرے جیسی گھٹن اور حبس کو بڑھا رہا تھا۔

''کیوں؟ کیوں اے اللہ میں نے سب کچھ کیوں کھویا؟'' Why Im The Loser

Why——Why I Am——!

میں ایسے جال میں پھنسا؟''

''کیا کسی گناہ کی سزا تھی؟''

''یا کسی غلطی کی آزمائش تھی؟''

''اے اللہ! کیا میں بُرا ہوں۔''

''میں اِس احساس سے مر رہا ہوں کہ میں نے تو زندگی میں ہمیشہ Fair Dealing کی، پر میں چوک گیا اور یہ رزلٹ میری تقدیر کی شیٹ پر درج ہوگیا۔'' ولی با آواز بلند آسمان کی طرف منہ کرکے بولا۔

''پلیز اللہ! ٹیل می! پلیز اللہ!'' ولی ہانپنے لگا وہ آنکھیں موندھے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ولی کے سوال اِس قدر شور مچا رہے تھے کہ اس نے بے اختیار کانوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

''زندگی وہ نہیں، جو ہم سوچتے ہیں، زندگی وہ ہے، جو ہم جیتے ہیں بے شک اس کا ایک سرا ہمارے ہاتھ میں ہے تو مین ڈور اُوپر ہوئی اتھارٹی کے پاس ہے اور جب جب وہ اتھارٹی اپنا ووٹ یوز کرتی ہے فیصلہ اُس کا ہی چلتا ہے۔'' ولی کے کانوں میں اپنے ٹیچر سربٹ کی بات گونجی۔

''میں بیٹی کا باپ ہوں، میری بیٹی لمحہ لمحہ زندگی سے دور ہو رہی تھی تم اُس کے جینے کی آخری اور پہلی کشش ہو، میں نے خودغرضی کی لیکن! لیکن میں بحیثیت باپ مجبور تھا۔'' یہ آواز سید سرفراز علی کی تھی۔

''ایک اور جھوٹ!'' ولی نے بے اعتباری سے کہا۔

''میرے پاس یہ آخری راستہ تھا، یہی آخری چوائس تھی میں مجبور تھا۔'' سید سرفراز کے لہجے میں نہ کہے لفظوں میں التجا تھی۔

''برائی اور دھوکہ اگر آخری راہ ہوں تو کیا اُسے اپنا لینا چاہیے؟'' ولی نے بے حد چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا تھا۔

سید سرفراز علی کے لیے اچھائی بُرائی کبھی کوئی معنی نہ رکھتی تھی لیکن وہ اس وقت ولی کو اپنے دام میں رکھنا چاہتا تھا اس لیے کھل کر اپنے دِلی جذبات اور سوچ کی عکاسی نہ کرسکتا تھا کہ اُسے کسی سے کوئی مطلب تھا اپنے فائدے کے لیے وہ ہر طرح کا بہروپ بھرتا تھا۔ اب جس قدر مکاری سے ولی کے سامنے موم، تھا کوئی بھی یقین کرلیتا کہ وہ ایک بے حد سچا اور Devoted باپ ہے، جس نے کوئی بھی حد سے بڑا قدم اٹھانے میں اِس لیے گریز نہ کیا کیوں کہ وہ خود کو بیٹی کی محبت میں مجبور پاتا تھا۔

اپنی مجبوری سے مجبور ہوکر جو لوگ کسی پر ظلم کرتے ہیں وہ تو صرف ظلم کرنے پر ہی مجبور ہو سکتے ہیں۔

''مسٹر سید سرفراز علی صاحب!'' ولی کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ کوئی بھی Compromise کرنے کو آمادہ نہیں۔

''تم جو بھی کہو بیٹا! لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ سب کچھ ایک باپ نے اپنی بیٹی کی محبت سے مجبور ہوا اُس کے پَل پَل گھلتے وجود کو دیکھ کر یہ انتہائی قدم اٹھایا۔'' سید سرفراز علی نے بے حد نرمی سے کہا۔

سید سرفراز علی جان گیا تھا کہ یہ لڑکا غصّے یا دولت کی طاقت سے ہرگز قابو آنے والا نہیں، پھر اگر اس کے پاس نگینہ ہوتی تو سید سرفراز علی کی چال اور حکمت عملی مختلف ہوتی تھی، قسمت سے خوش نصیبی سے حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ اُن پر الزام ہوتے ہوئے بھی ختم ہوگیا تھا۔

عبدالولی کی بہن کو انہوں نے اغوا نہیں کیا تھا بلکہ وہ تو اپنی بیٹی کی خوشیوں کی خاطر ڈرامہ رچا رہے تھے۔

عبدالولی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنے لاوے جیسے غصّے کو کس طور نکالے، ساری عمر ویلیوز پر لیکچر سننے والا، انسانیت کے درس لیتا اور عمل کرتا انسان اپنی شیپ کو کتنا ڈی شیپ کرسکتا ہے، وہ بُرے سے بُرے حالات میں بھی آخر کتنا بُرا بن سکتا ہے۔ سید سرفراز علی کی باتیں عبدالولی کو کوئی بھی حتمی بات کہنے سے روک رہی تھیں کیوں کہ اُس نے ساری عمر احمد شاہ سے اچھائی کرنا سیکھا تھا پھر وہ بُرا کیسے بن جاتا؟ لیکن وہ تو اچھا بھی نہ بن پا رہا تھا اندر ہی اندر گھٹن تھی کہ شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔

''تم جانتے ہو بیٹا! میں نے تمہاری بہن کو بھی نہیں اغوا کروایا، میں نے تم سے غلط بیانی کی، جھوٹ بولا اور! تم کہہ سکتے ہو کہ میں نے دھوکہ کیا لیکن میں نے یہ سب کچھ اپنی بیٹی کے لیے کیا اب وہ تمہاری ہوی ہے اور اس سارے معاملے سے بالکل بے خبر، معصوم ہے، تم اُسے کوئی ایسی سزا نہ دینا کہ وہ جیتے جی مرجائے۔'' سید سرفراز علی نے کمال کامیابی سے پینترا بدلا۔ وہ تو ایسا خودغرض کیڑا تھا، جو وقت اور ماحول کے ساتھ ساتھ رنگ ڈھنگ اور شکل و صورت سب کچھ بدل لینے کا کمال رکھتا تھا۔

عبدالولی نے شدت سے محسوس کیا کہ کوئی اُسے باقاعدہ زنجیروں میں باندھ کر مار رہا ہے۔

''مجھے ابھی فوراً واپس جانا ہے، آپ کی اس حرکت کی وجہ سے میرا سارا خاندان ڈسٹرب ہوگیا ہے بہت سارے لوگوں کے ارمان تو داؤ پر لگ کر تباہ ہوئے ہی ہیں، بہت ساروں کی زندگیاں بھی داؤ پر لگی ہیں۔'' عبدالولی نے سید سرفراز علی کو صاف جتادیا۔

''اور مسکان؟'' سید سرفراز علی کو سمجھ نہ آرہا تھا کہ وہ کیسے مسکان کے مستقبل کی سیکورٹی کو شیور کریں۔

''آپ جانتے ہیں آپ کی حرکت نے کیسے حالات پیدا کیے، مجھے آپ فوراً جانے دیں، میں اپنے والدین سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں، اُن کو تسلی دینا چاہتا ہوں اور اُن کے ٹوٹے ہوئے اعتبار کو بحال کرکے ہی کوئی حتمی قدم اٹھا سکتا ہوں۔'' عبدالولی نے بغیر کوئی بات رکھے صاف جتادیا۔

''تم بھول رہے ہو کہ تم حتمی قدم تو اٹھا چکے ہو تمہارا نکاح ہوچکا ہے۔'' سید سرفراز علی کے لہجے میں نا چاہتے ہوئے بھی سختی تھی۔

''لیٹ می گو مسٹر سرفراز علی!''

''مجھے کچھ اچھا کرنے کے لیے آپ مجبور نہیں کرسکتے لیکن میں آپ جیسا بھی نہیں ہوں، لیکن یہ سب آفٹر سم ٹائم والی باتیں ہیں، جو ابھی کی بات ہے مجھے آپ یہاں سے جانے دیں، میری فیملی کو میری بے حد ضرورت ہے۔'' عبدالولی نے نہ چاہتے ہوئے بھی سید سرفراز علی سے درخواست کی کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ وہ مکمل طور پر اُن کے رحم و کرم اور حراست میں ہے۔

سید سرفراز علی نے بہ غور عبدالولی کا جائزہ لیا۔

یہ لڑکا کسی طوفان کی طرح اُن کے اندر تک کی بنیادوں کو ہلا گیا تھا، اس کا چہرہ اُن کے دِل میں عجیب سی وحشت پیدا کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے تم جاسکتے ہو!'' سید سرفراز علی نے ایک اور جواء کھیلنے کا فیصلہ کیا۔

کبوتر کو تب اڑنے دینا چاہیے جب وہ اُڑنا چاہتا ہو اگر اُس سے اُس کی آزادی چھیننے کی کوشش کی جائے تو اُس کی واپسی ناممکن ہوتی ہے، جو رسک اٹھاتے ہیں اُن کے کبوتر واپس بھی آتے ہیں، سرفراز علی کے پاس رسک اٹھانے کے سوا کوئی چوائس نہ تھی۔

حیرت کی بات تھی کہ عبدالولی جب وہاں سے نکلا تو اُس کے اندر ایک فیصد بھی آزادی کا احساس نہ تھا بلکہ وہ خود کو ان دیکھی زنجیر میں جکڑا محسوس کر رہا تھا۔ جوں جوں وہ وہاں سے جا رہا تھا گھٹن نے اُس کے اندر دھواں سا بھر دیا تھا اُس نے گھبرا کر گاڑی روکی اور گاڑی چھوڑ کر وہ اِس پہاڑی پر آ بیٹھا۔ وہ اپنے اندر کی گھٹن اور ان سوالوں سے گھبرا کر اللہ سے سوال کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

''پلیز اللہ!''

''پلیز ٹیل می!'' عبدالولی وہیں مٹی میں سر نہواڑے رو رہا تھا۔

''کون ہے وہاں؟'' نرم اور مہربان آواز ولی کو اپنے پیچھے سنائی دی، اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

بہت برس پہلے ایک ایسی ہی چمک دار صبح اُس نے اسی طرح کسی کی نرم مہربان آواز پر مڑ کر دیکھا تھا تب بھی اُس کی زندگی بدل گئی تھی، اُسے یہ سب کچھ یاد نہ تھا لیکن آج بھی اُس کی زندگی بدلنے والی تھی اور یہ بات اب وہ دوبارہ بھول نہ سکتا تھا کیوں کہ وہ اب چھوٹا سا بچہ نہ تھا بلکہ ایک خوب رو ذہین نوجوان تھا۔

''کون ہے؟'' سوال دوبارہ ہوا۔

''میں! میں عبدالولی ہوں!'' اس نے بہت برس پہلے بھی یہی جواب دیا تھا۔

''تُو اگر ولی نہ ہوتا تو اور کون ہوتا! تیرے چہرے کی آنکھیں بتاتی ہیں کہ تو اللہ کا دوست ہے! تُو ولی ہے!'' عبدالولی کے ذہن پر جھماکہ سا ہوا۔

''یہ بات کس نے کہی تھی؟'' ایک جھماکے بعد دوسرا جھماکا ہو رہا تھا، یوں جیسے وہ بچپن سے ایک خواب دیکھتا آ رہا تھا جو بہت دُھندلا تھا وہ واضح ہو رہا تھا۔

''عبدالولی بیٹا! تم اس ویرانے میں یہاں کہاں؟'' بابا جی اپنی لاٹھی ٹیکتے آگے بڑھے۔

عبدالولی کے ذہن پر ایک اور جھماکہ ہوا۔

''اے پاکیزہ روح! اے بخت والے تُو ایسے ویرانے میں یہاں کیسے؟'' کوئی چھوٹے سے بچے سے سوال کر رہا تھا۔

''میرا نام عبدالولی ہے، یہ میری بہن نگینہ گڑیا بیمار ہے۔'' بچے نے اپنی گود میں اٹھائی بچی اُس مہربان بزرگ کے حوالے کرتے ہوئے بتایا تھا۔

''بابا جی! نگینہ گڑیا ٹھیک تو ہو جائے گی نا؟''

''میری کیا مجال جو کہہ دوں کہ ''کام ہو جائے گا۔''

''بات بن جائے گی، ہونے کی بات تو صرف اور صرف ''اُس'' کے بس میں ہے ''وہ'' ہی کہہ سکتا ہے کہ ''ہو جا''۔ عبدالولی کو دھیرے دھیرے سارا دھندلا خواب واضح یاد آیا، وہ کسی اور ہی ٹرانس میں تھا۔

''عبدالولی؟'' بابا جی نے قریب آ کر اُس کا کندھا تھاما۔

''بیٹا! تو اِدھر کدھر ہے؟'' عبدالولی نے سر اٹھا کر غائب دماغی سے اُن کو دیکھا۔ یاد داشت کے ے پر ایک خواب اپنی پوری جزئیات سے اُبھرا، وہ خواب، جسے دیکھ کر وہ بچپن میں روشن آرا کی گود گھس جاتا تھا اور وہ اُسے دعائیں اور سورتیں پڑھ کر پھونکتی تھیں، پھر دھیرے دھیرے یہ خواب دھندلا نے لگا اور روشن آرا کی محبت ہر جگہ حاوی اور نمایاں تھی۔

روشن آرا بیگم اور احمد شاہ نے اپنی محبت کے بل بوتے پر اُس کی زندگی میں نئے رنگ بھرے تھے کبھی ی یہ خواب اُسے اتنا ستاتا کہ وہ اس کو اگنور نہ کر پاتا، لیکن آج جیسے ذہن کی بہت سی گرہیں کھل رہی تھیں۔

''ولی!'' بابا جی نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا کہ آخر اُسے کیا مسئلہ تھا۔ وہ حیران تھے کہ ولی ال کیوں ہے اور کیوں اُن کو اجنبی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔

''عبدالولی!'' انہوں نے لاٹھی کا سہارا لے کر اُس کے قریب بیٹھتے ہوئے اُسے پکارا۔ ولی نے اس بار لا ایسے چونک کر دیکھا، جیسے وہ ایک دم ہوش میں آیا ہو۔

''بابا جی؟'' اُس کے لبوں پر سوال پھڑ پھڑایا۔

''بیٹا جی! آپ یہاں ایسے کیوں بیٹھے ہو، اللہ آپ پر اپنی ساری اچھی رحمتوں کا سایہ رکھیں۔'' بابا جی حسب عادت اپنی بات کے ساتھ دُعا شامل کی۔

وہ ایسے انسان تھے، جن کے اندر خیر ہی خیر بھری ہوئی تھی وہ ہر چیز، ہر انسان، ہر جاندار کے لیے دُعا گو رہتے تھے۔

''میں! میں گھر جا رہا تھا!'' ولی نے لبوں پر زبان پھیر کر کہا، یوں جیسے وہ خود بھی یہاں موجود ہونے پر ان ہو۔

''اٹھو بیٹا! میرے ساتھ آؤ!'' انہوں نے ولی کو اٹھایا۔

''میں تم کو اتنا یاد کرتا تھا اللہ نے شاید میرے دل کی تڑپ کی لاج رکھ لی کہ تم خود چل کر یہاں لے۔'' بابا جی نے دل میں کہا۔

الی لڑکھڑاتے قدموں سے اُٹھ کھڑا ہوا، وہ ابھی تک خود میں نہ تھا۔

''وہ گاڑی آپ کی ہے پیارے بیٹے؟'' بابا جی نے بیچ راستے میں کھڑی گاڑی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آں۔ جی! جی یہ میری گاڑی ہے!'' ولی کچھ ایسی کیفیت میں تھا کہ اُسے سامنے موجود ہر چیز لنے میں کچھ دقت کا سامنا تھا۔ جب آپ کا دل اور دماغ کسی خاص نقطے پر مرکوز ہو تو باقی جانب توجہ نام رہ جاتی ہے۔

''بیٹا! اسے ایک طرف کر دو تاکہ کسی اور کو گزرنے میں دُشواری نہ ہو۔'' بابا جی اُسے ہاتھ تھام کر گاڑی ریب لے آئے۔ ولی نے میکانیکی انداز میں ان کا کہنا مانا۔

ا جی اُسے ہاتھ تھامے دھیرے دھیرے چلتے اپنے گھر لے آئے، یہ گھر آج بھی اتنا ہی خستہ حال تھا نا ہی سادہ جتنا کہ سالوں پہلے تھا۔

''آپ تو بیرون ملک تھے نا بیٹے؟'' بابا جی نے سوال کیا۔

ولی چار پائی پر بیٹھا گم صم اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔
آج سے پہلے وہ کتنی بار احمد شاہ کے ساتھ آچکا تھا لیکن وہ یہاں موجود کشش کو کبھی Digonese نہیں کرسکا تھا کہ آخر یہاں کی ہوائیں اُسے خود سے بات کرتے کیوں محسوس ہوتی ہیں لیکن آج تو یہ احساس بہت سوا ہوکر اُسے بہت کچھ کہہ رہا تھا۔
”جی میں آسٹریلیا میں تھا مجھے آئے زیادہ دن نہیں ہوئے۔“ ولی نے تھکے تھکے لہجے میں جواب دیا۔ بابا جی نے شدت سے ولی کی اس کیفیت کو محسوس کیا۔
”یہاں کیسے آنا ہوا؟“ بابا جی اتنا تو جان گئے تھے کہ وہ یہاں اُن سے ملنے نہیں بلکہ کسی اور مقصد سے آیا ہے وہ بہ غور اُسے دیکھ رہے تھے جیسے کوئی سچائی کھوجنا چاہتے ہوں۔
”میں! میں یہاں خود کو تباہ کرنے آیا تھا؟“ ولی ایک بار پھر خود میں نہ تھا۔
”کیا ولی اپنی حقیقت، اپنی پہچان جان چکا ہے؟“ بابا جی نے کچھ سوچتے ہوئے اُسے آرام کا کہا۔ انھوں نے زبردستی ولی کو گرم دودھ پلایا اور اُسے لٹا کر آرام کرنے کا کہا۔ اُن کے لمس کا اثر تھا جو ولی چند ہی پَل میں ہوش سے بیگانہ ہوگیا تھا۔
اِس قدر اعصابی جنگ سے گزر کر وہ اندر تک تھک گیا تھا لیکن اتنی تھکن کے باوجود وہ خود کو ریلیکس کر پا رہا تھا اگرچہ بابا جی کے ہاتھوں میں جادو تھا، اُس کی آنکھیں بھاری ہوکر بند ہوگئی تھیں وہ گہری نیند میں چلا گیا تھا۔
”اے پیارے بیٹے! تم پر اللہ کی ساری رحمتیں اور نعمتوں کی برسات رہے، نیند بھی ان نعمتوں میں سے ایک ہے، نیند میں اللہ رحمان نے شفا رکھی ہے، وہ جسم کی ساری تھکن اور غصّے کو چوس لیتی ہے اللہ تم کو بھی شفا عطا کرے، سو جاؤ، سو جاؤ پیارے بیٹے!“ سونے سے پہلے اُس کے کانوں میں بابا جی کے کہے الفاظ دُعا کی طرح اُس کے دل پر اثر کر رہے تھے۔
ولی کے گہرے سانس اُس کی گہری نیند کی نشان دہی کر رہے تھے۔
بابا جی بہت آرام سے اُس کے پاس سے اٹھے اور اپنی جانماز پر بیٹھ کر تسبیح کرنے میں مشغول ہوگئے لیکن اُن کی توجہ ابھی تک ولی کے سوئے ہوئے چہرے کی جانب تھی۔
”بچہ بخار سے تپ رہا ہے کیوں کہ اُس کا دِل و دماغ تپ رہا ہے!“ وہ کڑی سے کڑی ملا کر اصل بات تک جا رہے تھے۔
”اللہ تم کو مضبوطی عطا کرے کہ تم اپنی پہچان کے سفر کو خیر و عافیت سے طے کرو، ورنہ یہ تمہارا معصوم دِل کو تباہ کرسکتا ہے۔“ بابا جی، عبدالولی کے لیے بے حد فکر مند تھے۔

❖❖○❖❖

جس وقت روشن آرا بیگم نے ہسپتال کے کمرے میں پاؤں رکھا نگینہ بُری طرح چلاّ رہی تھی، اُس سے نرسوں سے بھی قابو نہ آ رہی تھی۔
”مجھے چھوڑ دو، چھوڑ دو مجھے!“
”مجھے گھر جانا ہے، مجھے گھر جانے دو۔ امّاں جان، بھیا، بابا۔ مجھے لے جاؤ!“ پہلے وہ چیخ چیخ کر

رونے سسکنے لگی۔
روشن آرا بیگم لپک کر اُس کی جانب گئیں۔
”یہ۔ یہ کیا کیا؟“
”کس نے کیا ہے شاہ صاحب؟“ انھوں نے روتے ہوئے نگی کے سر پر ہاتھ پھیرا، ظالموں نے اُس کی لمبی چوٹیاں کاٹ ڈالی تھیں۔
نگینہ کے بہت خوب صورت بال تھے مارک نے اس کو طرح طرح سے اذیتیں دی تھیں اور اُن میں سب سے زیادہ اذیت ناک حرکت اُس نے نگی کے بال کاٹ کر کی تھی۔ مارک نگینہ کو طارق کی بہن سمجھتا تھا اس لیے وہ اُسے عبرت کا نشان بنانا چاہتا تھا۔
”روشن! دھیرج، حوصلے سے کام لو!“
”اس پاک پروردگار نے بیٹی کی آبرو کا نگینہ بچالیا اس سے بڑھ کر اور کیا ہے ہمارے لیے، یہ دُکھ وقتی ہے مولا جلد ہر بات کے لیے کرم کریں گے۔“ احمد شاہ نے اس مشکل گھڑی میں بھی ضبط کا دامن نہ چھوڑا تھا مگر اُن کا دل بیٹی کے ہر ہر زخم پر رو رہا تھا۔
”شاہ صاحب! میری پھول سی بچی کے ساتھ ظالموں نے بہت ظلم کیا ہے!“ روشن آرا بیگم نے نگی کے بے ہوش وجود کو دیکھتے ہوئے کہا۔ نرس نے اُسے ایک بار پھر نیند کا انجکشن دے دیا تھا۔
”ہر ظالم اپنے کیے کا ضرور بھگتے گا!“ احمد شاہ کا لہجہ کھویا کھویا تھا۔ روشن آرا بیگم نے بے اختیار سسکی لی، نگینہ کے معصوم چہرے کو دیکھتے ہوئے اُن کو لگ رہا تھا کہ انھوں نے اُسے اپنے پیٹ سے جنا ہے اُس کے ہر زخم پر ان کی اپنی رگیں کھنچتی تھیں۔
”روشن! اِدھر آ کر بیٹھو میرے پاس!“ احمد شاہ نے انہیں اپنے قریب صوفے پر بلایا۔
روشن آرا بیگم نے نگینہ کے گرد چادر درست کی اور اُن کے پاس آ کر بیٹھ گئیں دِل تھا کہ دُکھ سے پھٹا جا رہا تھا۔
”مجھے آپ کو کچھ بتانا تھا۔“ احمد شاہ نے گلا کھنکھار کر تمہید باندھی۔ روشن آرا بیگم نے سہم کر انہیں دیکھا۔
احمد شاہ نے فوراً اُن کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ کا یقین دلایا، روشن آرا بیگم کا سہما ہوا دِل جو سمٹا جا رہا تھا اپنے رفیق زندگی کی تسلی پر دوبارہ نارمل انداز میں دھڑکا۔
”زندگی ہمیشہ وہ کچھ نہیں دیتی جس کی عموماً ہم تمنا کرتے ہیں کیوں کہ کچھ باتیں تدبیر سے نہیں تقدیر سے تعلق رکھتی ہیں۔“ احمد شاہ نے باقاعدہ تمہید شروع کی۔
روشن آرا نے اُن کو بہ غور دیکھا، آخر وہ کیا کہنے جا رہے تھے۔
”خیر تو ہے نا؟ ولی کدھر ہے مجھے دو دن سے نظر نہیں آیا۔“ روشن آرا بیگم نے پریشانی سے دریافت کیا۔
”بیگم! مجھے آپ کو کچھ اور بھی بتانا ہے۔“ احمد شاہ نے گہری سانس بھر کر کہا۔
”کیا؟“ روشن آرا بیگم نے ایسے سانس بھرا جیسے اُن کے سر پر کوئی بم دھماکہ ہونے والا تھا۔

''حُسن آرا بیگم کا فون آیا تھا!'' احمد شاہ کہہ کر چپ ہوگئے۔

''ہاں نا! اُن کو اطلاع کرنی تھی نگینہ مل گئی ہے اب اللہ خیر کرے، جیسے ہی ہسپتال سے ڈسچارج ہو
ہے ہم نکاح کی تاریخ بھی کوئی سی رکھ لیں گے۔'' روشن آرا بیگم نے اپنے شوہر کے جملے کو اپنی سوچ
مطابق پورا کیا۔

''علیزے کا نکاح ہوچکا ہے!'' احمد شاہ نے دھیمی سی آواز میں انکشاف کیا۔

''ہیں؟'' روشن آرا بیگم کو یوں لگا جیسے انہوں نے سننے میں شاید غلطی کی تھی۔

''انور بھائی کی طبیعت بہت خراب ہوگئی تھی اس لیے حسن آرا بیگم کو علیزے کے نکاح کا قدم اٹھا
پڑا۔'' روشن آرا بیگم کے اندر تک حیرانی تھی۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی؟'' روشن آرا بیگم کو یقین نہیں آیا۔

''ولی! ولی کہاں ہے اور علیزے کا نکاح کس سے ہوگیا؟'' روشن آرا بیگم نے بے چینی سے پوچھا۔

''بیگم! علیزے کا نکاح ولی کے ہی کہنے پر اُس کے دوست عبداللہ سے ہوا ہے۔'' روشن آرا بیگم
پریشانی سے احمد شاہ کو دیکھا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ وہ تو ہماری بہو تھی پھر وہ تو ولی کی محبت تھی، ولی کیسے اُس کو کسی اور
سپرد کرسکتا ہے؟ وہ میرے بیٹے کے دِل کی خوشی، آنکھوں کی جوت تھی، وہ کیسے ایسا کرسکتا ہے؟'' روشن
آرا بیگم نے تڑپ کر پوچھا۔

''ہم سب تقدیر کے آگے ہار جاتے ہیں!'' احمد شاہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''پھر حسن آرا! وہ میرے بچے کے ساتھ ایسا نہیں کرسکتی!'' روشن آرا بیگم کو ابھی تک یقین نہ آرہا تھا

''انور صاحب اب بھی آئی سی یو میں ہیں، وہ بے یقینی کی اِس حد تک پہنچ گئے تھے کہ ان کی حالت
وجہ سے اُن کی زندگی کا یقین ختم ہوگیا تھا ایک بیٹی کی اِس قدر دُکھ بھری موت کے بعد وہ اپنی اولاد
معاملے میں بہت بے صبرے اور بچّی ہوگئے ہیں، علیزے کی شادی کو زندگی موت کا مسئلہ بنا کر وہ
موت کی دہلیز کو چھو آئے ہیں، حسن آرا بیگم اُن کی طبیعت کی وجہ سے مجبور ہوئی تھیں۔ میں بھی
ہوں، اُن کی کیفیت سمجھ سکتا ہوں کسی بھی نارمل انسان کے لیے اُن کا یہ قدم ابنارمل ہوسکتا ہے لیکن
باپ ہی سمجھ سکتا ہے کہ اُن کا اس قدر شدّت پسند ہونا نیچرل اور انتہائی نارمل تھا۔

''لیکن! اتنی بے اعتباری کیوں کی انہوں نے؟ آپ نے نہیں بتایا اُن کو کہ ہم پر کس دُکھ کا پہاڑ
ہے۔'' روشن آرا بیگم نے زندگی میں پہلی بار غصّے سے کہا۔

''بس! قسمت کو منظور نہ تھا اِسی لیے یہ سب ہوگیا۔ ہم سب نگی کی گمشدگی اور تمہاری حالت کی وجہ
اِس قدر پریشان تھے کہ فوری اطلاع نہ دے سکے، پھر میں نے یہ کام ولی کو سونپا تھا وہ بہن کی خاطر قر
دینے کے چکر میں ہر معاملے کو سلجھاتے سلجھاتے بگاڑ بیٹھا۔'' احمد شاہ نے سانس لینے کے لیے توقف
''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ ہم سب کا خیال تھا کہ نگینہ کو سید سرفراز علی نے اٹھوایا ہے کیوں کہ وہ اس قسم کی دھمکیا
دے رہا تھا، عبدالولی نے اپنی بہن کو اُس کی حراست میں جان کو خود کو اُس کے سامنے پیش کیا، اس

ے علیزے سے اپنی Commetment توڑنی پڑی، ایسے میں انور صاحب کو سارے حالات
ھائے نہ جاسکتے تھے وہ بے حد بدگمان ہوگئے تھے، اِس وجہ سے سب کچھ جو کوئی بھی نہ چاہتا تھا ہوتا چلا
لیا۔'' احمد شاہ روشن آرا بیگم کو بتا رہے تھے جب کہ وہ زار زار رو رہی تھیں۔

''بہت ساری انہونیوں کو چوں کہ ہونا تھا اس لیے سارے دھاگے الجھتے گئے اور دِلوں میں اتنی گرہیں
لگیں۔'' احمد شاہ نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

''میرے بیٹے کے دل پر کیا بیتی ہوگی! وہ کہاں ہے کیا وہ نہیں جانتا کہ اُس کی بہن گھر واپس آ چکی
ہے۔'' روشن آرا بیگم نے آنسوؤں سے منہ صاف کرکے کہا۔

''وہ۔!'' احمد شاہ کچھ کہتے کہتے رُک گئے۔

''وہ کہاں ہے شاہ صاحب؟'' روشن آرا بیگم نے گھبرا کر پوچھا۔

''وہ تو خیریت سے ہے نا۔''

''میرا تو اُس نے ایک بار بھی فون نہیں اٹھایا، البتہ طارق سے اُس کی بات ہوئی تھی وہ خیریت سے
ہے۔'' احمد شاہ، روشن آرا بیگم کو ایک ساتھ اتنے سارے ذہنی شاک نہ دینا چاہتے تھے لیکن اُن کے بچوں
کے متعلق وہ اُن کو بے خبر بھی نہ رکھ سکتے تھے۔

''اللہ پر بھروسہ رکھو، جس اللہ نے ہم کو اس آزمائش میں ڈالا ہے، وہی مولا ہم کو اس سے بھی باہر
نکالے گا۔'' احمد شاہ نے بے حد یقین سے کہا۔

''آمین!'' جواباً روشن آرا بیگم نے اپنی چادر میں آنسو جذب کرکے کہا۔ وہ گہری سوچ میں کھوگئی تھیں
ان کا دِل کچھ مختلف قسم کی آہٹوں کو محسوس کررہا تھا۔
وہ بار بار اِن آہٹوں کو رد کررہی تھیں لیکن یہ آہٹیں اس قدر واضح تھیں، جیسے زندگی واقعی کچھ بہت
مختلف روپ میں اُن کے سامنے آنے والی ہو۔

''اے اللہ! میں اپنے وسوسے بھرے دِل کو تیرے یقین کی پناہوں میں دیتی ہوں۔'' روشن آرا بیگم
نے من ہی من میں شدت سے دعا کی۔

❖❖○❖❖

''بابا، امّاں!'' ولی نے وہ خواب پھر اپنی پوری شدت کے ساتھ دیکھا۔ وہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا،
اُس کے موزے اور جوتے اُتار کر بابا جی نے نیچے رکھ دیے تھے اور کمبل اوڑھا دیا تھا۔ ولی کو کچھ دیر لگی یہ
سمجھنے میں کہ وہ کہاں تھا۔ یاد آنے کے باوجود وہ موجود اور ناموجود کے بیچ والی کیفیت میں تھا۔

''پیارے بیٹے! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' بابا جی ہاتھ میں کچھ پکڑے اُس کے قریب آئے۔

''یہ کھالو، تمہیں تقویت دے گا۔ مجھ بوڑھے کے ہاں تم کو لذتوں والا کھانا تو نہیں ملے گا یہ جو کا دلیہ
ہے ذائقے میں ذرا مختلف لیکن تاثیر میں اچھا ہے۔ کھالو بیٹا اللہ رحمٰن اِس کے قطرے قطرے میں تمہارے
لیے شفا بھر دیں اور تم اِس دنیا میں لوگوں کے لیے آسانی اور رحمت بن کر رہو۔'' بابا جی کی گفتگو تو ساری
کا ساری دعاؤں پر مشتمل ہوتی تھی، ولی نے اُن کے ہاتھ سے پیالہ تھام کر دلیہ کھانا شروع کردیا۔ گڑ
اور دودھ میں بنا ہوا یہ دلیہ بے حد لذیذ تھا، ولی کو دلیہ کھاتے ہوئے محسوس ہوا کہ وہ تو گذشتہ کتنے گھنٹے

سے بھوکا ہے۔

پیٹ میں کچھ گیا تو ولی کو اپنے حواس بھی اپنی جگہ آتے محسوس ہوئے۔

''میں گھر جا رہا تھا!'' ولی نے گلا کھنکھار کر کہا۔

''گھر میں سب خیریت ہے نا؟ احمد شاہ اور بیٹی روشن، گڑیا نگینہ سب ٹھیک تو ہیں نا؟'' بابا جی نے ا... کو بہ غور دیکھ کر پوچھا۔ بابا جی ایسی شخصیت تھے کہ ولی اُن کے سامنے کسی قسم کا جھوٹ بولنے کا تصور... نہ کر سکتا تھا۔

''نگینہ کو کوئی اغوا کر کے لے گیا تھا۔'' ولی نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

بابا جی کے چہرے پر بے چینی بے حد نمایاں تھی۔

''میں نے احمد شاہ سے بارہا کہا تھا کہ نگینہ کا خاص خیال رکھیں، آزمائش حویلی کی بیٹیوں کی ق... میں مسلسل چلی آرہی ہے جو کچھ وہاں کے مردوں نے عورت ذات کے ساتھ کیا، اُس کا خمیازہ اُن ل... اولاد بھگتتی آرہی ہے۔'' بابا جی منہ ہی منہ میں بڑبڑائے، لیکن ولی اُن کی گفتگو کا کچھ حصہ سن چکا تھا۔

''بابا جی! آپ حویلی والوں کو پرسنلی جانتے ہیں؟'' ولی کا سوال ایک دم تھا۔

بابا جی کچھ پل کو ایک دم چپ رہ گئے۔

''بیٹا! انسان ایک ہی گاؤں، شہر کا ہو تو ایک دوسرے کو جاننا عام سی بات ہوتی ہے۔'' بابا جی نے ... حد نرمی سے جواب دیا، وہ مقابل کا جواب یوں ہی اتنی نرمی سے دیتے تھے کہ اُس شدت پر ٹھنڈے پا... کی بوندیں پڑ کر اُس کی شدت کو مدھم کر دیتی تھیں۔

''تم بتاؤ بیٹا! نگینہ کی خیریت معلوم ہوئی؟''

''بابا جی!'' ولی نے ٹھنڈی آہ بھری اور پھر اُن کو سب کچھ بتانے کا فیصلہ کر ڈالا۔

''یہاں کے لینڈلارڈ کی بیٹی مسکان میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی وہ مجھ میں شدت سے دلچسپی رکھتی تھی لیکن میں اُس میں Interested نہ تھا۔ اُس کے فادر نے عین میرے نکاح والے دن نگینہ ا... اغوا کروایا اور مجھے یہاں بلا کر اپنی بیٹی کے پلے باندھ دیا تاکہ میں۔'' بابا جی نے بے حد فکر سے ولی کا چہرہ دیکھا جو شدت جذبات سے تنا ہوا تھا۔

''لیکن میرے ساتھ دھوکہ یہ ہوا کہ نگینہ کو سید سرفراز علی نے کڈنیپ نہیں کیا تھا اُس نے تو میری مجبوری سے فائدہ اٹھا کر یہ نکاح کروایا ہے۔'' ولی نے ہاتھ کی ہتھیلی پر زور سے مُکا مار کر کہا۔

''اگر سید سرفراز علی نے نگینہ کو اغوا نہیں کیا تو پھر کس نے کیا تھا؟'' بابا جی نے سوال کیا۔

''اور ایسا اتفاق کیوں ہوا کہ سید سرفراز علی نے آپ کی مجبوری سے فائدہ اٹھایا۔'' بابا جی کا سوال اس قدر اہم تھا کہ ولی کے دماغ میں بھی نہ آیا تھا۔

''ایکچوئلی وہ بابا سائیں کو بہت دنوں سے ایسی دھمکیاں دے رہا تھا، ایسے میں نگینہ کے ساتھ یہ حادثہ ہوا تو ہم سب کا شک سید سرفراز پر ہوا کیوں کہ وہ دھمکیاں دے رہا تھا۔ میرے رابطہ کرنے پر اُس نے ایسا ہی محسوس کروایا، جیسے نگینہ اُس کی حراست میں ہو۔'' ولی نے ایک ایک بات سوچ کر بتائی۔

''ہوں! یقیناً اُس نے کچھ کیا تھا جس کی بنیاد پر وہ اتنا بڑا کھیل کھیل رہا تھا۔'' بابا جی نے کہا۔

''اب نگینہ بیٹی کیسی ہے اور کہاں ہے؟'' بابا جی نے فکرمندی سے سوال کیا۔

''وہ ٹھیک ہے، اُسے ایک ایسے گروہ نے اغوا کیا تھا، جو کالج میں پڑھتی لڑکیوں کو موقع ملنے پر ...لیتے ہیں کچھ گنگ ٹائپ لوگ تھے۔ اللہ نے ساتھ دیا اور نگینہ بروقت مل گئی مجھے میرے دوست جو آئی ...الی میں ہے اُس نے بتایا ہے، زیادہ تفصیل تو معلوم نہیں لیکن نگینہ باحفاظت گھر آ گئی۔'' ولی نے گہری ...س بھرتے ہوئے کہا۔

''شکر الحمدللہ!'' بابا جی نے ہاتھ اٹھا کر شکر ادا کیا۔

''بابا جی! میں نے آپ سے سوال کیا تھا آپ حویلی والوں کو جانتے ہیں، آئی مین پرسنلی!'' ولی نے ...تابی سے پوچھا۔

''براہِ راست نہیں، لیکن میرے کچھ پیاروں کا وہاں سے تعلق تھا، اس لیے اُن کو جانتا ہوں۔'' بابا جی ...سچائی سے جواب دیا۔

''بابا جی! میں بچپن سے خواب دیکھتا تھا مختلف مناظر تھے، یہی گاؤں تھا یہاں پر جو کھنڈر حویلی ہے ...میں آگ لگے دیکھتا تھا، پھر کچھ چہرے تھے سب کچھ الم غلم ہو جاتا تھا لیکن ابھی یوں لگتا ہے، جیسے یہ ...کچھ خواب نہ تھا حقیقت تھا اس جگہ سے میرا کوئی رشتہ ہے!'' ولی نے کھوئے کھوئے انداز میں اِدھر ...سر گھماتے ہوئے کہا۔

''میرا کوئی رشتہ ہے نا؟'' اُس نے ایک دم بابا جی سے پوچھا۔

''بے شک ہر چیز اپنے اصل کی جانب واپس آجاتی ہے یہی قانون قدرت ہے۔'' بابا جی نے بے ...یار کہا۔

''ہاں تمہارا اس جگہ سے بہت گہرا رشتہ ہے۔'' بابا جی نے اقرار کیا۔

''اور اُس کھنڈر حویلی سے؟'' ولی نے بے قراری سے پوچھا۔

''ہاں اُس سے بھی!'' بابا جی نے اثبات میں سر ہلایا۔

ولی کی سانس ایک دم اُتھل پتھل ہو گئی۔

''اور اُس حویلی میں آگ بھی لگی تھی نا؟'' ولی نے ایک بار پھر سوال کیا۔

''ہاں! تم درست کہہ رہے ہو۔'' بابا جی نے سچائی سے جواب دیا۔

''اور اُس میں بہت سے لوگ جل گئے تھے نا؟'' ولی نے پھر پوچھا جیسے سب کچھ اُس کی آنکھوں کے سامنے اب بھی چل رہا ہو۔

''ہاں!'' بابا جی نے گہری سانس بھری۔ اُن کے کچھ بھی بتانے سے پہلے ہی ولی سب کچھ بتا رہا تھا۔

''وہ! وہ کون لوگ تھے بابا جی! اور میرا اُن سے کیا رشتہ تھا؟'' ولی نے سر تھام کر پوچھا۔

''اُن کو کس نے جلایا تھا؟'' ولی سوال پر سوال کر رہا تھا۔ بابا جی نے بہ غور اُسے دیکھا۔

''میرے پاس تمہارے ہر سوال کا جواب ہے سب ضروری اور غیر ضروری جزئیات کے ساتھ! لیکن ...ان سوالوں کا جواب آپ کے والد کے سامنے دے سکتا ہوں کیوں کہ جتنے یہ جواب آپ کی امانت ...اُسی طرح آپ کے والد کی بھی امانت ہیں۔ اِس لیے پیارے بیٹے تم احمد شاہ کے ساتھ آنا، تمہاری

امانت میں خود لوٹا دینا چاہتا ہوں میری زندگی کا چراغ تو بس اب بجھا جاتا ہے اور میں ایک اچھے مسلمان کی طرح مرنے سے پہلے ہر امانت لوٹا دینا چاہتا ہوں۔''

''بیٹا! آپ کو جس قدر جاننے کی جلدی ہوگی، مجھے اُس سے زیادہ آپ کو بتانے کی جلدی ہے۔'' باباجی نے بے حد سچائی سے کہا۔ وہ ولی سے زیادہ خود کو عجلت میں پاتے تھے۔

''میری زندگی کا حال تو الجھا ہی ہوا تھا اور اب ماضی بھی الجھ گیا تھا۔'' ولی ایک بار پھر سر تھام کر بیٹھ گیا۔

''آخر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟'' اب ولی شکووں میں الجھ رہا تھا۔

''بیٹا! اللہ رحمان کسی کو اُس کی ہمت سے زیادہ نہیں آزماتا، میں تمہارے ہر جواب کے لیے حاضر ہوں اور خود کو اس کا ذمہ دار پاتا ہوں مجھے احمد شاہ کا انتظار ہے، وہ بھلا آدمی برسوں سے ایک عبادت جیسے عمل میں مشغول ہے، میں کیسے عجلت دکھا کر اُس کی عبادت کو زائل کرسکتا ہوں، یہ اُس کے ساتھ زیادتی ہوگی۔'' باباجی نے کچھ ایسے ٹھوس اور پیارے انداز میں کہا کہ ولی کے پھڑکتے دل کو کچھ دیر کے لیے قرار آگیا۔

''میں کیسے آپ کو ٹال سکتا ہوں، آپ کی بات تو کبھی میرے باپ نے نہیں ٹالی، جیسا آپ مناسب جانو۔''

''اجازت دیں باباجی! مجھے ابھی نکلنا ہوگا راستہ طویل ہے اور بہت ساری باتوں کو لے کر میرا صبر مختصر ہوگیا ہے۔'' ولی نے بوٹ جرابیں پہن کر باباجی کے ہاتھ پر بوسہ لیتے ہوئے اجازت مانگی۔

''کچھ دیر اور آرام کر لیتے۔'' باباجی نے پیار سے ولی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، حالاں کہ وہ پہلے ہی تین چار گھنٹے مسلسل نیند لے کر آرام کر چکا تھا۔ جب وہ یہاں آیا تھا تو اس کا ہارٹ ٹمپریچر بہت زیادہ تھا اس کی پور پور جل رہی تھی لیکن باباجی کی رہائش گاہ جانے کیسی تاثیر رکھتی تھی، یہاں آکر اُس کے اندر سکون اُتر آیا تھا۔

باباجی! جن کا ہر ہر لمحہ یادِالٰہی میں گزرتا تھا اُن کی رہائش گاہ اور وہاں پر موجود ہر چیز پر اللہ رحمان کے نام کا اثر موجود تھا۔

جب انسان کی روح اور جسم ایک ہی تال میں عشق کی لذت کو محسوس کرتے ہیں تو اُن کے اردگرد موجود ہر شے بھی اِس عشق کی حصے دار بن جاتی ہے۔

''نہیں باباجی! اور نہیں رک سکتا، بابا اور امّاں جان بے حد پریشان ہوں گے میں چلتا ہوں، انشاء اللہ بہت جلد حاضر ہوں گا۔'' ولی چلتے چلتے دروازے تک آیا۔

''جلدی آنا بیٹا! میری زندگی عمر کے اُس بے یقین حصے سے گزر رہی ہے، جہاں ہر پل واپسی کی طرف تیزی سے سفر ہو رہا ہوتا ہے، میں اپنی زندگی میں تم کو ہر الجھن، ہر آزمائش سے کامیاب نکلتے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''ایسا کیوں کہتے ہیں؟ کیا ہم جوان کوئی لائف وارنٹی کارڈ اللہ سے حاصل کر کے گھومتے ہیں، موت ہر ذی روح کو آسکتی ہے نا، بچے، جوان اور بوڑھے! اللہ آپ کو طویل عمر عطا فرمائے، آپ جیسے بزرگ ہماری زندگیوں میں نہ ہوں تو ہم دعاؤں جیسے لائف سکیورٹیز اور پیراشوٹ کیسے حاصل کریں، آپ تو ہماری زندگی میں رحمت ہیں آپ کی دعائیں ہم گرتے ہوؤں کے لیے پیراشوٹ، ہیں جو ہم کو محفوظ رکھتی ہیں۔'' ولی نے بے حد سچائی سے اقرار کیا۔

''اللہ تعالیٰ کی ذات تم کو ہمیشہ آسانیاں اور رحمتیں عطا فرمائے۔'' باباجی نے بے حد پیار سے اُسے دعا دے کر رخصت کیا۔

ولی نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اُن کو ہاتھ ہلاتا ہوا وہاں سے آگے بڑھ آیا۔ اس نے بیک ویو مرر سے دیکھا تو پیچھے دور موجود گاؤں چھوٹی سی تصویر کی طرح دکھائی دیا۔

''یہاں سے میرا بھی تعلق ہے باباجی نے کنفرم کردیا ہے۔'' ولی نے باآواز بلند کہا۔

''لیکن کیا تعلق ہے؟'' ولی نے پھر باآواز بلند خود سے سوال کیا۔

''ولی! ہو نہ ہو یہ جگہ تیری جنم بھومی ہے!'' کوئی اُس کے اندر سے الہامی طور پر بولا۔

''ہاں یہ بات درست ہے!'' ولی کو جیسے اس سوچ پر شانتی محسوس ہوئی۔

''بابا جان میرے بچپن سے یہاں باباجی سے ملنے آتے رہے ہیں، یہاں صرف باباجی سے تھوڑی تعلق ہوگا اُن کا، یقیناً اس جگہ سے بھی تعلق ہوگا۔'' ولی خود ہی جوڑ توڑ کرنے میں مصروف تھا۔

''مجھے اِسی لیے یہاں آکر ہمیشہ عجیب طرح کی کشش محسوس ہوتی تھی۔'' ولی نے دِل ہی دِل میں کہا۔

''باباجی سے اِس بار ضرور اِس جگہ کی اصلیت کا پوچھنا ہے کیوں کہ وہ آگ والا واقعہ اور جلتے ہوئے ہاتھ میرے دماغ کے پردے پر یوں جم کر رہ گئے ہیں، جیسے مجھ پر اُن کا کوئی قرض باقی ہو۔'' ولی نے تیز رفتاری سے گاڑی بھگاتے ہوئے سوچا۔

جوں جوں وہ اپنے شہر سے قریب ہو رہا تھا، اپنوں سے ملنے کی جلدی اُس کے دِل کو بے چین کر رہی تھی اُس کا دِل چاہ رہا تھا کہ ماں کی گود میں سر رکھ کر بہت سارا روئے اور سوئے تاکہ اُس کے دِل کا بوجھ اُتر جائے کیوں کہ یہ بوجھ اب اُس کے بس سے باہر ہوتا جارہا تھا۔

❖❖○❖❖

پرت در پرت
قبا در قبا
یہ پھیلا فسوں یہ خمار جنوں
جب پھنس رہا کسی گرداب میں
کسی دام میں، کسی زعم میں، کسی خواب میں
من کے اندھیرے اُسے لے اڑے
کبھی بھول بھلیاں کبھی دشت میں بھٹکیں
کبھی سراب کے پیچھے گھڑی کے کانٹے
گھومتے رہے سرکتے رہے

زندگی اک کھیل ہے
یہ انتہا سا انتہا
کہیں دیپ جلے کہیں سلگے جاں
زندگی لمبی سڑک تارکول پہ لپٹی ہوئی
سیاہی سے اٹی ہوئی
جو کاجل گھر میں بھڑک اٹھے اس کی لو تڑپ اٹھے
من کے اندھیرے میں چنگاری چمکے
کاسے میں پڑے سکے چھنکے
جب نقش سارے مٹ گئے
لفظ سبھی کھو گئے وہ مقام درد
جہاں اشک بولیں، اشک ہی تولیں
جو عیاں ہوئے، تو بیاں ہوئے
صفحہ عشق پہ لکھے راز
جس کی ''واپسی'' ہوئی
اسے ''آگہی'' ملی
اُس نے پالی آدرش
باقی سب ڈھونڈتے رہے
کالے سیاہ پاتال میں
رنگ نور کی آمیزش
جو نظر عتاب وہ نظر سیلاب
جو ''وہ'' منظورِ من ہو ساقی
تو اس کی پور پور بھگو دے بارش
جب کڑک چمک مدھم پڑی
ایک ہی گونج رہ گئی باقی
آمرزش، آمرزش، آمرزش

''باجی! یہ آخری اسٹاپ ہے ہماری بس کا، آپ کو کہاں اُترنا ہے؟'' کنڈیکٹر لڑکا ترنم سے مخاطب تھا۔

''مجھے یہیں اُترنا ہے۔'' ترنم چادر اور بیگ سنبھالتی ہوئی اتر آئی۔

یہ اسٹیشن زیادہ گنجان نہ تھا، اِکا دُکا مسافر اور ایک آدھ چائے پکوڑوں کا ٹھیلا تھا۔ ترنم نے ادھر اُدھر نظر گھمائی۔

''کہاں جاؤں؟ مجھے کہاں جانا ہے؟'' ترنم نے خود سے سوال کیا، پھر خود ہی فیصلہ کر کے پیدل چل

ال۔
جانے کتنے گھنٹے وہ پیدل چلی تھی، کتنی ہی سڑکیں وہ دائیں بائیں بلاوجہ اور بغیر جانے مڑی اور بہت
اُس اور کچھ ویران جگہ پر پہنچ کر پریشان ہوگئی، اندھیرا پھیل رہا تھا دن ڈھل گیا تھا لیکن اُن جان
وں کی مسافر سے ابھی تک اپنی منزل اور ٹھکانے کا فیصلہ تک نہ ہو پا رہا تھا۔
''یہ میں کہاں آنکلی، یہاں سے تو کوئی سواری تک نہیں گزر رہی، کدھر رُخ کروں؟'' ارد گرد مختلف
انوں، کھائیوں کو دیکھتے ہوئے ترنم نے سوچا۔
بھوک سے آنتیں لاسٹک کی طرح کھنچ کر رہ گئی تھیں قریب تھا کہ وہ بھوک و پیاس سے نڈھال ہو کر گر
ں، اُسے کچھ فاصلے پر ایک جھونپڑا نما گھر نظر آیا۔
''اللہ تیرا شکر! اس ویرانے میں تو نے انسان دکھا دیے، کیا عجیب بات ہے ہم انسانوں سے ڈر کر
اگتے ہیں اور پھر ساتھ کے لیے انسان ہی ڈھونڈتے ہیں۔'' ترنم کے دل کو کچھ آسرا ہوا اور وہ خود کو کچھ
چلنے کے لیے بامشکل آمادہ کر پائی۔
اس نے گھر کے دروازے پر دستک دی۔
''کون ہے؟'' آواز بہت نرم تھی۔
''کیا گھر میں کوئی عورت ہے۔'' ترنم نے کچھ ہچکچاہٹ سے پوچھا۔
''پیاری بیٹی! یہاں کوئی عورت نہیں رہتی۔'' اندر سے ایک ضعیف سے بزرگ نے نکل کر جواب دیا۔
ترنم کو تو رونا آرہا تھا بھوک پیاس تھکن! بڑھتا ہوا شام کا سایہ اَن جان جگہ، اُسے کسی بھوت کی طرح
زدہ کیے ہوئے تھے۔'' ترنم کے چہرے کی پریشانی بزرگ سے بالکل چھپی نہ رہ سکی۔
''پیاری بیٹی! یہاں بے شک کوئی عورت نہیں رہتی لیکن اللہ کی ذات جیسی بڑی ذات ضرور رہتی ہے،
اللہ پر اعتبار ہے تو اپنے دادا کی عمر کے شخص کو مہمان نوازی کا شرف بخش دو۔'' بزرگ نے نہایت میٹھے
میں کہا۔
ترنم نے حیرت سے بزرگ کو دیکھا۔ اس ویرانے میں یہ شخص ولی ہے، صوفی ہے، فلاسفر ہے یا پھر کوئی
کی طرح راندہ درگاہ!'' ترنم نے بے اختیار سوچا۔
''بیٹا! انسان کا پہلا خیال اللہ کی جانب سے الہامی اور سچا ہوتا ہے، دوسرا انسان کے اندر سے اُس
پرکھنے کا نظام بتاتا ہے اور تیسرا چوتھا خیال شیطان کی جانب سے ہوتا ہے۔'' بزرگ نے چارپائی کا
درست کر کے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا، ترنم نے چونک کر اُن کو دیکھا۔ وہ کیسے اُس کے من کی بات
گئے تھے۔
شکریہ!'' ترنم نے خود کو سمیٹتے ہوئے کہا۔
''بیٹا! آپ آرام سے بیٹھو، جوتے اتار لو۔'' بزرگ نے نرمی سے کہا۔
یہ! یہ جگہ بہت ویران ہے نا!'' ترنم نے کچھ بے چینی سے ادھر اُدھر دیکھ کے کہا۔
''نہیں بیٹا! یہ اتنی ویران جگہ نہیں! یہ گاؤں کا کم آباد علاقہ ضرور ہے لیکن یہاں پر بھی سب رہتے ہیں
جاتے ہیں، تھوڑے سے فاصلے پر گاؤں کا مدرسہ ہے، جہاں بچے اور بچیاں دینی تعلیم حاصل کرتے

ہیں، ہاں یہاں دیکھنے والی آنکھ کو رونق نظر آسکتی ہے کیوں کہ اس رونق میں ذرہ ذرہ اللہ کی ثنا میں مشغول نظر آتا ہے یہ تھوڑی سی خاموشی خود کو اور ''اُس کو'' محسوس کرنے میں نعمت لگتی ہے۔'' بزرگ کہتے کہتے تھک گئے تھے اِس لیے تھوڑی دیر کو چپ ہو گئے۔

''یہ لو پیاری بیٹی! یہ آپ کے حصے کی نعمت رکھی تھی۔'' بزرگ نے دودھ کے اندر کچھ روٹی کے ٹکڑے بھگو کر اُسے دیے، گرم دودھ میں ڈوبی یہ روٹی مٹھاس میں گڑ شامل تھا ترنم کے اندر تک توانائی اور سکون اُتر گیا۔

''سبحان اللہ!'' دودھ کی اتنی لذت پر ترنم کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''کیا دودھ کا ذائقہ اس قدر اچھا اور اتنا لذیذ ہوسکتا ہے۔'' ترنم نے بے اختیار خود سے سوال کیا۔

''اللہ کی نعمتیں ہیں ان کا ذائقہ بھی اُس نے بے مثال رکھا ہے۔'' بزرگ نے ایک بار پھر اُس کے دل کا حال جان لیا تھا۔

''آپ کو تازہ دم ہونا ہو یا پھر منہ ہاتھ دھونا ہو تو ادھر باہر غسل خانہ ہے بیٹا۔'' باباجی نے لالٹین جلا کر اُسے پکڑائی اور خود آگے آگے چلنے لگے۔ باباجی کا یہ جھونپڑا نما گھر ایک کمرے پر مشتمل تھا، چھوٹا سا اِ احاطہ تھا جس کے اردگرد باڑ لگی ہوئی تھی باڑ کے اندر یہ گھر اور ذرا سے فاصلے پر غسل خانہ تھا پاس ہی مرغیوں کا چھوٹا سا چھپر تھا اور وہیں پر دو بکریاں بندھی ہوئی تھیں دودھ غالباً اُن بکریوں کا ہی بزرگ استعمال کرتے تھے۔

''آپ کو میرے آنے پر پریشانی ہوئی ہوگی میں تو بن بلائی مہمان بن گئی ہوں۔'' ترنم فارغ ہو کر جب منہ ہاتھ دھو کر آئی تو مزید پرسکون ہوگئی تھی۔ اُسے یہ بزرگ بہت انوکھے اور اچھے لگے تھے شاید اِسی لیے وہ اتنی پرسکون تھی۔

''پریشانی نہیں بیٹا! خوشی ہوئی ہے حضرت موسیٰ نے ایک بار رب رحمٰن سے پوچھا، تُو جب خوش ہوتا ہے تو کیا کرتا ہے۔''

''اللہ رحمان نے کہا کہ میں بارش برساتا ہوں۔''

''اور جب تُو اور زیادہ خوش ہوتا ہے تو کیا کرتا ہے؟'' تو اللہ رحمان نے فرمایا ''میں بیٹیاں پیدا کرتا ہوں۔''

حضرت موسیٰ نے پھر سوال کیا اور سب سے زیادہ خوش ہو تو کیا کرتا ہے۔

اللہ کریم نے فرمایا کہ ''میں مہمان بھیجتا ہوں!''

''اور تُو مہمان ہے بٹیا! تیرے آنے سے اللہ جب خوش ہے تو میں تو ہمیشہ اپنے مولا کی خوشی پر خوش ہوتا ہوں! پھر پریشانی کیسی؟'' ترنم آنکھیں پھاڑے اُن کو دیکھ رہی تھی۔ اُن بزرگ کے من کی آنکھ کھلی تھی وہ ہر چیز میں اللہ کی رضا کو دیکھتے تھے۔

''آرام کرلو بیٹا!'' بزرگ نے ترنم سے پھر اصرار کیا۔

اس بار ترنم بنا کسی ہچکچاہٹ کے بستر پر لیٹ گئی، پھر ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''آپ نے مجھ سے نہیں پوچھا کہ میں کون ہوں، کہاں سے آئی ہوں اور یہاں کیا کر رہی ہوں'' ترنم نے بزرگ سے پوچھا۔

''بیٹا! مہمان تو مہمان ہوتا ہے چاہے وہ دو قدم سے چل کر آئے یا دو شہر چھوڑ کر! آپ تھکی ہوئی ہو آرام کرلو۔'' بزرگ نے بے حد سکون سے جواب دیا۔

''کیسی عجیب دنیا ہے مولا تیری، ویرانوں میں بھی تو نے فرشتے بٹھا کر رکھے ہیں، جن کو صرف تیری رضا کے علاوہ کوئی فکر نہیں۔'' ترنم جانے سوچتے سوچتے سوگئی تھی جب کہ بزرگ جانماز پر بیٹھے عبادت میں مصروف ہو گئے تھے۔

تو کٹھن اور دُشوار رستوں کی مسافر ہے۔
تھک گئی ہوگی!
کچھ گھڑی آرام کرلو۔
پھر لمبا سفر ہے۔
خدا کرے تیرا یہ سفر کامیاب ہو جائے۔
تیری لگن کامران ہو جائے
تیری مسافت کی کٹھنائیاں ''وہاں'' مقبول ہو جائیں
تو کٹھن اور دُشوار رستوں کی مسافر ہے
تھک گئی ہوگی
کچھ دیر آرام کرلو!

بزرگ نے ترنم کے سوئے ہوئے پاکیزہ چہرے کو دیکھ کر بے اختیار ڈھیروں ڈھیر دعائیں اُسے دے ڈالیں۔

❖❖○❖❖

مرینہ آنٹی! وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ وہ کسی اور لڑکی سے محبت کرتا ہے اور اُس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ مجھ سے ایسے اجازت مانگ رہا تھا، جیسے میں اُس کی بیوی نہیں ماں بہن ہوں، جس کو اس کی شراکت داری کی پروا نہ ہو۔'' سحرش نے سلگتے ہوئے کہا۔

''مرد کو اللہ نے جب چار شادیوں کی اجازت دی ہے تو ہم عورتوں کو اللہ کے حکم کی سرتابی نہیں کرنی چاہیے۔''

''آنٹی!'' سحرش بھڑک اٹھی۔

''یہ آپ کہہ رہی ہیں، میرے شوہر کے ساتھ یہ مذہبی قانون نہیں چلے گا۔'' سحرش نے روڈ ہوتے ہوئے کہا۔

''سحرش! اب بڑی ہو جاؤ، ہر وقت کی ضد، من مانی اور خود غرضی تم کو تنہا کردے گی تمہارے ساتھ طارق کا رشتہ خوف خدا کا ہے، تمہاری ماں نے اُس میں کچھ دیکھا تھا تو ہی تمہارے لیے اُسے چنا تھا نا، تم اُسے مجبور نہ کرو کہ وہ تم سے لاتعلق ہو جائے، مردوں کو کسی زنجیر سے باندھ کر نہیں رکھا جاسکتا، ماسوائے محبت، وفاداری اور تابعداری کی زنجیروں کے۔ اور۔''

''اور تم نے کبھی اُس کو ان زنجیروں سے باندھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔'' مرینہ آنٹی تو لگتا تھا آج سارے سچ بولنے پر آمادہ ہیں، وہ سحرش کا دل رکھنے کے چکر میں کوئی بات بھی لپیٹ کر نہ رکھ رہی تھیں اور ایسا وہ جان بوجھ کر کر رہی تھیں کیوں کہ جوں جوں سحرش کو زیادہ توجہ اور پروٹوکول ملا وہ نہ صرف ضدی بلکہ بے حد سیلفش بھی ہوتی جا رہی تھی، اُسے خود کے علاوہ کوئی دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔

''آنٹی! آپ ایسا کیوں بول رہی ہیں؟'' سحرش کو یقین نہ آ رہا تھا کہ مرینہ آنٹی ایسے بھی بول سکتی تھیں۔

''آنٹی جان! آپ تو طارق کی پارٹی بنتی جا رہی ہیں۔'' سحرش نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

''ہرگز نہیں! میں صرف سچائی کا ساتھ دے رہی ہوں تم میری بیٹی جیسی ہو اور ماں کبھی بیٹی کا بُرا نہیں چاہتی، لیکن میں تمہاری اگر ہر غلط بات کا ساتھ دوں گی تو یہ اچھا نہیں ہے پھر میں کب تک تمہارے سر بیٹھی رہوں گی۔'' مرینہ آنٹی نے اُسے رسان سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''وہ ایک اچھا انسان ہے، سب سے بڑھ کر بے حد تابعدار اور قدر دان ہے، اُسے اُس کی حد سے زیادہ نہ آزماؤ۔'' مرینہ آنٹی سحرش کو سوچ میں چھوڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئیں جب کہ سحرش کا تو دل و دماغ لاوے کی طرح مسلسل کھول رہا تھا۔ ایسے میں مرینہ آنٹی کی ساری باتیں بے سود ثابت ہوتی نظر آ رہی تھیں۔

❖❖○❖❖

''السلام علیکم ڈیئر فادر!'' سمعان علوی نے باپ کے کندھے سے لگتے ہوئے کہا۔

''وعلیکم السلام پاپا کی جان! اب تم کیسے ہو؟ قاسم علوی نے پیار سے سمعان علوی کا چہرہ تھام کر پوچھا

''آپ کو کیسا لگ رہا ہوں؟'' سمعان نے ایک دم قاسم علوی کے سامنے آتے ہوئے پوچھا۔

''بہت پیارے، ہمیشہ کی طرح بہت اچھے، اللہ تم کو بہت ساری خوشیاں عطا فرمائے۔'' قاسم علوی نے سمعان کو سینے سے لگا کر کہا۔

کتنے ڈھیر سارے دن سمعان نے تنہا گزارے تھے خاموش اور اکیلے، اب اتنے دنوں بعد وہ کسی چاند کی طرح طلوع ہوا تھا تو بظاہر خوش رہنے کی اداکاری کر رہا تھا۔

''امی کدھر ہیں؟'' سمعان نے اِدھر اُدھر سر گھما کر پوچھا۔

''وہ باہر لان میں ہیں مالی کے ساتھ کچھ نئے پودے لگوا رہی ہیں۔'' قاسم علی نے بیٹے کو بہ غور دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''سمعان!'' انہوں نے کرسٹل پیس پر نگاہیں جمائے ہوئے اسے پکارا۔

''جی پاپا!''

''سمعان! میرا دل کرتا ہے کہ میرا بیٹا ہمیشہ خوش رہے کیا اب بھی ایسا ممکن ہے؟'' انہوں نے سمعان کی آنکھوں دیکھتے ہوئے کہا۔

''آف کورس پاپا! میں خوش ہوں۔'' سمعان نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے اپنے بیٹے کی اوریجنل مسکراہٹ چاہیے اس کی آنکھیں اُداس ہوں اور لبوں پر مسکراہٹ! یار یہ تو Cheat ہے۔'' قاسم علوی نے کہا۔

''میں آپ کا Original بیٹا نہیں ہوں پھر بھی آپ کو میری Original مسکراہٹ کی فکر ہے! آپ کس دنیا کے انسان ہیں کس صبر کی مٹی سے بنے ہیں۔'' سمعان نے کچھ چڑ کر پوچھا۔

''تم ایسا کہہ کر مجھے ڈس آن کر رہے ہو۔'' قاسم علوی نے کچھ دکھ سے کہا۔

''کہاں پاپا! آپ تو ہمیشہ اونچے درجے پر رہیں گے آپ نے اپنے حصّے کا کردار اپنے دیے ہوئے لفظ سے زیادہ نباہ لیا ہے، آپ تو اِس سارے کھیل میں سب سے عمدہ کردار ہو سچائی بھلائی اور قربانی کا!'' سمعان ایک بار پھر اُکھڑ رہا تھا۔

''پاپا! میں تو مر کر بھی آپ کو کبھی ڈس آن نہیں کر سکتا۔ میں تو خود ڈس آن کیا ہوا انسان ہوں، جس کو میرے باپ نے آن ہی نہیں کیا تھا۔ پاپا خود کو ڈی گریڈ دیکھنا، ڈس آن محسوس کرنا بہت تکلیف دہ ہے، ایک ناجائز بچہ ہوں کس قدر کراہت آمیز احساس ہے یہ۔'' سمعان ایک دم پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رو دیا۔

قاسم علوی ایک دم حیرت زدہ رہ گئے اتنے دن خاموشی سے سمعان کے اندر کیا کچھ نہیں پل رہا تھا۔ انہوں نے اُسے کھل کر رونے دیا تاکہ اُس کے اندر کا غبار نکل جائے۔

''میں ناجائز ہوں! یہ احساس اگر مجھے مار رہا ہے تو اِس سے بڑا احساس مجھے جینے نہیں دے رہا کہ آپ کا بیٹا نہیں ہوں۔''

''پاپا! آپ میرے پاپا نہیں ہیں یہ بات مجھے جینے نہیں دے رہی!'' سمعان نے اُن کے ہاتھوں کو تھامتے ہوئے کہا۔

''کون کہتا ہے کہ میں تمہارا باپ نہیں ہوں۔ آئی ایم یور فادر! اگر صرف ہارمونز، بلڈ ریلیشنز ہی باپ ہونے کی Base ہیں تو میں ان سارے Rules کو نہیں مانتا، تم میرے بیٹے ہو صرف میرے۔'' قاسم علوی نے سمعان کو اپنے سینے سے لگا لیا بالکل اُسی طرح جب انہوں نے اُسے پہلی بار سینے سے لگایا تھا جب وہ صرف چند گھنٹے کا تھا۔

''تم پہلی بار میری گود میں آئے تو میرے اندر کی وحشت اور نفرت کو پی گئے، تم نے ہی مجھے وہ انرجی دی جس کی وجہ سے میں زبیدہ سے اس قدر پیار کر سکا، اتنا اُس کا خیال رکھ سکا۔ اللہ نے تمہارے وجود کے لمس میں میرے لیے بہت راحت، پیار اور خوشی بھر دی تھی تم میرے بیٹے ہو میں نے ماں کی طرح تمہارے لیے راتیں جاگی ہیں اور دن کو ایک باپ کی طرح تم کو ہر سرد گرم سے بچایا ہے، ایک قابل ذات بچے کو کوئی اپنے سینے سے لگا کر نہیں بڑا کرتا، تم میرے بیٹے تھے اور رہو گے۔ قاسم علوی نے اپنے ہاتھوں سے سمعان کا چہرہ صاف کیا۔

آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ ہم قیامت کے روز اُن ہی لوگوں کے ساتھ اُٹھیں گے، جن سے ہم پیار کرتے ہیں اور اگر تم کو قیامت کے روز تمہاری ماں کے نام سے پکارا جائے گا تو تم کو میرے ساتھ اٹھایا جائے گا کیوں کہ تم میرے پیارے ہو، اِن سارے بیچ میں سید سرفراز علی کہیں بھی نہیں ہے نہ ہوگا۔'' قاسم علوی نے سنجیدگی سے کہا۔

He was nothing! He is nothing!

''خبردار تم نے اُس کو اون کیا؟ اگر تم اُس کو اپنا باپ کہو گے تو اِس کا مطلب ہے کہ تم اُس کو اوا کر رہے ہو۔''

''نہیں پاپا! میں اُس شخص سے نفرت تو کرسکتا ہوں لیکن اُسے کوئی درجہ نہیں دے سکتا۔'' سمعان نے کھلے اور واضح لفظوں میں جواب دیا۔

''تو پھر میری جان! اپنی جان کیوں گھلاتے ہو، بھول جاؤ اس سارے قصّے کو۔''

''بھول جاؤں گا لیکن پاپا کیا ایسے شخص کو کوئی سزا نہیں ملنی چاہیے، جس نے ایک بچے کو اِس دنیا میں لاکر پھینک دیا اُسے اون نہیں کیا۔ اُس نے ایک لڑکی کی زندگی تباہ کی پھر اُس نے ایک ایسے شخص کی زندگی بھی تباہ کی جس کی بیوی نے برسوں دیوانگی کی نذر گزار دیے ہوں اور وہ شخص مسلسل آزمائش اور دُکھ میں رہا ہو۔ اور جو کچھ یہ ہوا اُس کا ذمہ دار ایک ہی شخص ہے اُسے کم از کم کچھ تو سزا ملنی چاہیے۔'' سمعان نے بے حد طیش سے کہا۔

''تم کیا کرنا چاہتے ہو؟'' قاسم علوی نے گھبرا کر عمر بھر کی نقدی کو دیکھا۔ وہ اُسے کسی بدلے کی آگ میں کودتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

''کم از کم میں ایک بار اپنی نفرت اُس شخص تک پہنچا کر آنا چاہتا ہوں میں اُسے بتانا چاہتا ہوں کہ میں اُس سے دنیا میں سب سے زیادہ نفرت کرنے والا انسان ہوں!'' سمعان نے غصّے سے مٹھیاں بند کرتے ہوئے کہا۔

''میں تم کو کسی غصّے اور بدلے کی بھینٹ چڑھنے نہیں دے سکتا۔'' قاسم علوی نے صاف انکار کردیا۔

''پلیز پاپا! میں ایک بار، پہلی اور آخری بار اُس سے ملنا چاہتا ہوں ورنہ میں ساری عمر سلگتا رہوں گا امی کی طرح!'' سمعان علوی کا آخری جملہ کارگر ثابت ہوا تھا۔

کچھ بھی تھا قاسم علوی، سمعان کو زبیدہ کی طرح سلگتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

''ٹھیک ہے لیکن میں بھی ساتھ جاؤں گا!'' قاسم علوی نے شرط باندھی۔

''پلیز پاپا! آپ ساتھ نہیں جاؤ گے۔'' سمعان نے منت کی۔

''کیوں؟'' قاسم علوی نے سوال کیا۔

''اس لیے کہ میں آپ کے سامنے تو اونچی آواز میں بات نہیں کرسکتا، کہاں میں کسی کو اپنی ساری نفرت پہنچانا چاہتا ہوں۔'' سمعان علوی نے دِل میں کہا۔

''بس پلیز!'' سمعان نے حتمی انداز میں کہا۔

''لیکن میں تو جاسکتی ہوں نا!'' زبیدہ بیگم نے سامنے آکر کہا۔

گزرے دنوں میں وہ بہت نارمل ہوگئی تھی، جیسے ہی **Illusion** کا گلاس ٹوٹا تھا وہ واپس ہوگئی تھی۔

''تم! تم وہاں نہیں جاؤ گی۔'' قاسم علوی نے سختی سے منع کیا۔

''پلیز چاند! تمہارے مجھ پر اتنے احسان ہیں کہ میں مر کر بھی نہیں اُتار سکتی، ایک اور احسان کردو مجھے بھی سمعان کی طرح موقع ملنا چاہیے کہ میں بھی اپنی نفرت کا اظہار اُس مکروہ آدمی سے کروں۔''

''یہ آخر اس گھر میں کیا ہو رہا ہے، کیا ہم اُس شخص کو بھولنے کی بات نہیں کرسکتے۔'' قاسم علوی نے ا ہو کر پوچھا۔

''نہیں قاسم! اُسے بھولنے کا مطلب ہے کہ میں نے اُسے معاف کردیا جب کہ میں اُسے کبھی معاف ں کرسکتی۔'' زبیدہ بیگم نے سرد لہجے میں کہا۔

''او کے! جیسی تم لوگوں کی مرضی، لیکن اگر تم دونوں کو اُس نے کوئی نقصان پہنچایا تو؟'' قاسم علوی نے مندی سے پوچھا۔

''پاپا! اِس کی فکر نہ کریں، اُس کی جرأت نہ ہوگی آج وقت بدل چکا ہے۔'' سمعان نے بے حد خود اری سے جواب دیا۔

سمعان کی آنکھوں میں ایک خاص طرح کی چمک تھی، قاسم علوی کو گرین سگنل دینا ہی پڑا۔

❖❖○❖❖

''بابا سائیں! میری ساری محنت کارت ہوگئی، میری ساری قربانی اکارت گئی۔'' عبدالولی باپ کے سینے سے لگا تو سسک ہی پڑا۔

''سب کچھ ضائع ہوگیا، میں نے سب کچھ کھودیا اپنے ہی ہاتھوں سے سب کچھ کھودیا۔'' ولی کے دل ں ایک بار پھر بھانبڑ جلنے لگے تھے۔

احمد شاہ نے عبدالولی کے سر کو پیار سے سہلایا۔

''نہیں بیٹا! اللہ کسی کی قربانی کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرتا۔'' احمد شاہ نے بے حد مضبوط اور ٹھوس لہجے ں اپنے بیٹے کو سمجھایا۔ وہ عبدالولی کا ہاتھ تھام کر اپنے قریب پڑے صوفے پر لے آئے۔

ابو حفص وعمر بن سالم الیشا الحدادی رحمتہ اللہ علیہ کسی لڑکی کی محبت میں مبتلا ہوگئے اور اپنے دوستوں ے مشورے کے مطابق نیشا پور کے ایک یہودی سے مدد کے طالب ہوئے، یہودی نے کہا چالیس دن ں نماز اور دعا کو ترک کرو، کوئی نیکی کا کام نہ کرو، کوئی نیکی کی نیت نہ کرو، پھر میرے پاس آؤ میں کچھ یا انتظام کروں گا کہ محبوب تمہارے قدموں میں ہو۔ ابو حفص نے یہودی کی ہدایات پر عمل کیا اور لیس دن کے بعد پھر اِس کے پاس پہنچے، اس نے حسب وعدہ ایک نقش بنادیا مگر یہ بالکل بے اثر بت ہوا۔ یہودی نے کہا معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان چالیس دنوں میں تم نے ضرور کوئی نیک کام کیا ہے۔

ابو حفص نے جواب دیا کوئی ایسا کام نہیں کیا سوائے اس کے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا پتھر پڑا ہوا وہ پرے ہٹایا تھا تاکہ کسی کو ٹھوکر نہ لگے۔

یہودی نے کہا۔

''اس خدا کی خلاف ورزی نہ کرو جس نے تمہاری اتنی سی نیکی کو ضائع نہیں ہونے دیا حالاں کہ متواتر لیس روز تک اس کے احکام سے روگرداں رہے ہو۔''

ابو حفص نے توبہ کی اور یہودی مسلمان ہوگیا۔

''عبدالولی! تم آج جو کر کے آئے ہو، وہ قیامت ہی ہے۔ میں تم کو اِس قیامت کی اصلیت بعد میں ؤں گا لیکن دوسری قیامت تو تمہارے دِل پر گزر ہی چکی ہے۔ ساتھ ہی علیزے کی دنیا میں بھی برباد

ہوئی لیکن پھر وہی بات کہ اللہ ہمارے کسی عمل کو ضائع نہیں ہونے دیتا بس کچھ انتظار۔'' احمد شاہ نے بالک
الگ طرح سے عبدالولی کے زخموں پر پھایا رکھا۔

اِس سارے دورانیے میں روشن آرا بیگم نفل نماز میں مصروف تھیں۔ جیسے ہی وہ دُعا سے فارغ ہوئی
بے تابی سے بیٹے کی جانب بڑھیں۔

وہ اپنے بیٹے کے دِل کے راز سے واقف تھیں، اُس کی محبت اُن سے ڈھکی چھپی نہ تھی بیٹا کیا کچھ
ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے وہ اچھی طرح جانتی تھیں، انہوں نے ولی کو سینے سے لگالیا۔

''میرا پیارا بیٹا! تو بہت خاص ہے، تونے اپنی قربانی کے ذریعے ایک مرتے ہوئے باپ کو بچایا۔ اُ
وقت جب حالات گنجلک تھے تم خودغرض ہوکر اگر نور بھائی کا خیال نہ کرتے تو آج وہ لوگ تم سے سخ
نفرت کرتے، انور بھائی اور حسن آرا دونوں حقیقت جان کر تمہارے گرویدہ اور احسان مند ہیں بیٹا
نے اُن کی لاج رکھ لی۔

اس وقت انور بھائی کچھ سمجھنے کو تیار نہ تھے اور موت کی دہلیز پر جا کھڑے ہوئے تھے تم نے بالکل اک
بیٹے کا کردار نبھایا۔ اللہ نے تمہارے اِس عمل کی وجہ سے تمہاری بہن کو ایسی آگ سے معجزانہ بچایا، جہا
سے اس کا صحیح سلامت آنا ناممکن تھا۔'' روشن آرا بیگم نے مختصراً سارا قصہ بتایا۔ عبدالولی نے بے اختی
گہرا سانس لیا۔

''یہ اللہ کی طرف سے آزمائش تھی اور اللہ ہی نے آسان کی ہے، ہم اُس کے تابعدار بندے ہیں،
کو اِس کی آسانیوں کا شکر ادا کرنا نہیں بھولنا۔'' انہوں نے بے حد بڑی بات کہی تھی اور ثابت کردیا تھا
وہ احمد شاہ کی بیوی ہیں۔

''تم میری بات سے متفق ہو بیٹا؟'' روشن آرا بیگم نے بیٹے کی خاموشی دیکھ کر بے اختیار سوال کیا۔

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے میری ماں جو کہے اور وہ غلط ہو!'' ولی نے اپنے آنسو اندر پی کر ان کا مان رکھا
اُس عمر میں دِل کہاں مانتا ہے مصلحتوں کو، لیکن وہ ساری عمر والدین کا تابعدار رہا تھا اس لیے اُس
ہمیشہ کی طرح ماں کا مان رکھا۔

''بیٹا! جیتے رہو، تم کو دین و دنیا کی ہر ہر نعمت ملے، اللہ راضی رہے تم سے، ہمیشہ خوش رہیں۔'' روش
آرا بیگم نے بے اختیار ہاتھ اٹھا کر اُسے دعا دی، اُس نے ماں کو روح تک خوش کردیا تھا۔

''ولی! میرے چاند، میں ایک ماں ہوں اور میں ایک بیٹی کی بھی ماں ہوں، ایک بیٹی کا معاملہ کس قد
نازک ہوسکتا ہے میں جانتی ہوں، میری بچی کو نیا جیون ملا ہے اللہ نے اُس کی آبرو بچائی، تم اپنی بہن کے
صدقے مسکان کو دل سے قبول کرلو، اُس کو اب کسی بدلے یا غصے کی آگ میں نہ جھونکنا، وہ بچی تمہا
نصیب تھی، اُس کا تیز نصیب تمہاری ساری تدبیروں اور تمہاری تقدیر سے لڑا ہے وہ اللہ کی رضا ہے اُ
قبول کرلو دِل سے، بے شک زبردستی سہی لیکن تم نے اُسے اللہ اور رسول کو گواہ بنا کر قبول کیا ہے تم اُ
گھر رخصت کروالانا اپنی بہن کی لاج کے صدقے میں۔'' روشن آرا نے اُسے اس ٹاپک پر سمجھانے
لیے دیر نہ کی تھی ابھی وہ اپنی بہن کے درد کو محسوس کررہا تھا بعد میں وہ باغی ہوسکتا تھا۔ بہر حال سید سرف
علی نے بہت بُرا کیا تھا۔ احمد شاہ نے گھبرا کر بیگم کو دیکھا۔

''وہ یہ کیا کررہی ہے، انہوں نے روشن آرا کو نہ بتایا تھا کہ ولی اپنے سوتیلے چچا سے مل کر آرہا ہے
،وہ اِس رشتے کی مضبوطی پر زور نہ دیتیں۔ وہ روشن آرا کو بے خبر رکھنا چاہتے تھے کہ کہیں وہ ولی اور
ہ کے لیے کوئی وسوسہ نہ پال لیں، آج تک ولی اور نگینہ کو سچائی نہ بتانے کی اور دیر کرنے کی وجہ روشن
بیگم ہی تھیں۔ ڈوریں ایک بار پھر گنجلک ہورہی تھیں احمد شاہ نے ولی کا چہرہ دیکھا جہاں عجیب سی بے
نی۔

''روشن! اولاد کی تابعداری کو اتنا نہیں آزمانا چاہیے۔'' احمد شاہ ایک دم بیچ میں کود پڑے۔

روشن آرا بیگم کا چہرہ ایک دم تاریک پڑ گیا۔

''مسکان بھی بیٹی ہے، لڑکی ذات ہے شاہ صاحب۔'' وہ مدھم آواز میں گویا ہوئیں۔

''اللہ کا خوف کرنا چاہیے، ہم کو ایک لڑکی کی زندگی تباہ کرنے کا کوئی حق نہیں۔'' ولی نے ماں کا چہرہ
ا۔

یک اور فیصلے کی گھڑی آن پہنچی تھی۔ پاکستان میں قدم رکھتے ہی وہ مسلسل ذہنی اور اعصابی مشقت
فا۔

یک اور فیصلہ!

یک اور قربانی! ولی کو دم گھٹتا محسوس ہوا۔

''ٹھیک ہے امّاں جان! جیسا آپ کہیں گی وہی ہوگا۔'' ولی نے سر جھٹک کر خود کو پرسکون کرنے کی
کوشش کی۔

''ولی! ابھی جلد بازی نہ کرو۔'' احمد شاہ نے سے کہا۔

''نہیں بابا سائیں! امّاں جان ٹھیک کہہ رہی ہیں پھر آپ نے ابھی تو بتایا ہے کہ اللہ ہمارا کوئی عمل
ع نہیں جانے دیتے، امّاں جان نے خوف خدا کا واسطہ دیا ہے، بیچ میں میری بہن کا صدقہ مانگا ہے تو
اللہ اور اپنی بہن کے لیے ہر چیز کرنے کو تیار ہوں۔'' ولی نے مضبوطی سے کہا۔ روشن آرا خوش ہوگئیں
شاہ نے بے اختیار گہرا سانس بھرا۔ لگتا تھا کہ وہ اِس ہونی کو کبھی نہیں ٹال سکتے۔

''واقعی مسکان تو اللہ کی ہی رضا ثابت ہورہی تھی۔''

’’بابا! وہ۔ وہ!‘‘ نگینہ جانے رات کے کس پہر اٹھی اور بھاگتی ہوئی ماں باپ کے کمرے میں آ گئی۔

’’کیا ہوا؟‘‘ روشن آرا بیگم نے لپک کر اُسے سینے لگالیا۔

’’ہمارے گھر میں کوئی ہے!‘‘ نگی نے سہمی سہمی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

’’کوئی... کوئی مجھے مارنے آیا ہے!‘‘ خوف سے نگی کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔

’’کوئی نہیں ہے بیٹا! دیکھو اِدھر!‘‘ احمد شاہ نے نگی کا چہرہ اپنی جانب کرتے ہوئے کہا۔

’’نہیں بابا! وہاں کوئی تھا، وہ مجھے مار ڈالے گا۔‘‘ نگی پہلے روہانسی ہوئی پھر ایک دم پھوٹ پھوٹ رودی۔

روشن آرا بیگم نے اُسے سینے سے لگالیا، اُس پر آیت الکرسی پڑھ کر پھونکی اور ساتھ لے کر بستر تک گئیں۔

’’بیٹا! آپ کے بابا اور بھائی کے ہوتے کسی کی مجال نہیں کہ کوئی آپ تک آئے۔‘‘ روشن آرا بیگم اُسے تسلی دی۔

’’تو پھر میں آپ کے پاس سوجاؤں۔‘‘ نگی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

’’سوجاؤ بیٹا! ادھر آؤ۔‘‘ احمد شاہ نے اپنی جگہ خالی کردی اور خود صوفہ کم بیڈ پر ہوگئے، یہ صوفہ کم بیڈ کے پڑھنے وغیرہ کے کام آتا تھا۔ اس کے پیچھے بک ریک تھا اور سر پر موبائل لیمپ تھا، جو اپنی مرضی ہر ڈائریکشن میں لائٹ دیتا تھا۔

نگی نے ایک پل بھی نہ لگایا اور دوڑ کر بستر میں چھپ گئی روشن آرا بیگم دھیرے دھیرے اُس کا سہلاتی رہیں، اُس پر آیات پڑھ پڑھ کر پھونکتی رہیں۔ نگی گہری نیند میں چلی گئی، بیس پاور کی بلیور میں نگی کا چہرہ بالکل پھیکا نظر آرہا تھا۔

’’شاہ صاحب!‘‘ روشن آرا بیگم نے کچھ دیر بعد اُن کو آواز دی۔

’’سو گئے کیا؟‘‘ انہوں نے پھر سوال کیا۔

’’نہیں بیگم! میں سویا نہیں، اپنی بیٹی کو تکلیف میں دیکھ کر باپ کو کیسے نیند آسکتی ہے۔‘‘ احمد شاہ بے اختیار طویل سانس بھرا۔

’’سنیے! ڈاکٹرز کہہ رہے تھے کہ نگینہ کو اعتبار کی ضرورت ہے، اعتماد کی ضرورت ہے اس کا اعتبار ٹو چکا ہے اس کو کسی رفیق... رفیق زندگی کی ضرورت ہے۔‘‘ روشن آرا بیگم اٹھ کر اُن کے پاس آ بیٹھیں۔

’’ہم کو نگی کی شادی کردینی چاہیے۔‘‘ روشن آرا بیگم جن کا دل نگی کی رخصتی کا سوچ کر ڈوبنے لگتا تھا اج اپنے منہ سے اُس کی شادی کے متعلق کہہ رہی تھیں۔

وہ ماں تھیں اور بیٹی کی ہر مشکل کو آسانی میں بدلنے کے لیے کچھ بھی کرسکتی تھیں۔

’’ایسے کیسے کسی کے حوالے کردیں، اُسے کچھ نارمل ہونے دو، وہ گھر اور عملی زندگی کی ذمّے داریاں لیے سنبھال سکتی ہے؟‘‘ احمد شاہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

’’شاہ صاحب! میں ذمّے داریوں کے لیے نہیں بلکہ!‘‘

وہ آج بھی اتنی عمر میں اپنے شوہر سے کھل کر کوئی بولڈ بات نہ کرسکتی تھیں، اُن کی اس فطری شرم نے ان کو بہت حُسن عطا کر رکھا تھا اور شاہ صاحب تو اُن کے ایک نقطے سے ہی سارلفظ جان جاتے تھے۔

وہ ان کی سانسوں میں اُن کے خون میں شامل تھیں پھر کیسے اُن کی آدھی ادھوری باتیں ان کو پوری لرح سمجھ نہ آتیں۔ Physical اذیت سہنے کے بعد نگی کو Physical محبت کی ضرورت تھی۔ ذہنی اذیت سہنے کے بعد نگی کو ذہنی ودلی محبت اور اعتبار کی ضرورت تھی اُسے ایسے ساتھی کی ضرورت تھی جو اُس لی ساری تلخیوں کو بھلانے میں اُس کی مدد کرتا، اُس کا حقیقی ساتھی اور دوست بن کر رہتا۔ یہ نگی کے سائیکاٹرسٹ نے اُن سے کہا تھا۔

’’بیگم تم ٹھیک کہتی ہو! نگی کو واقعی کسی محبت اور پیار کرنے والے شخص کی ضرورت ہے جو اُس کی ساری Insecurities کو اپنی Purity of love سے Secirity میں بدل دے۔‘‘ شاہ صاحب نے بے مدمدھم لہجے میں کہا جیسے وہ خود سے بات کررہے ہوں، ساتھ ہی کسی سوچ میں گم تھے کہ اُن کی نگاہوں میں طارق کا خوب صورت چہرہ گھوما۔ اُن کے دِل سے ایک دم بہت سارے بوجھ اُتر گئے۔

’’بیگم!‘‘ انہوں نے روشن آرا کو مخاطب کیا۔

’’جی!‘‘

’’میری نظر میں ایک بہت اچھا لڑکا ہے، جو ہماری نگی کو دِل و جان سے پھولوں کی طرح رکھے گا۔‘‘ احمد شاہ کی نظروں میں طارق کا چہرہ مسلسل گھوم رہا تھا، کیسے اُس کے چہرے پر نگی کے لیے رنگ تھے۔

’’کون ہے وہ؟‘‘ روشن آرا بیگم نے بے تابی سے پوچھا۔

احمد شاہ کے چہرے پر وسوسے بھی تھے، جاننے والا لڑکا یقیناً نگی کے ساتھ ہونے واقعے کو بھی جانتا ہوگا وہ کیوں کر ایسی لڑکی کو اپنائے گا۔ آج کل کے لڑکوں کے دل کہاں اتنے بڑے ہوتے ہیں۔

’’وہ! طارق ہے!‘‘ احمد شاہ کا انکشاف بہت خوش گوار تھا۔

’’لیکن اگر وہ نہ مانا تو؟‘‘ روشن آرا بیگم نے فکرمندی سے پوچھا۔

’’نہیں! ایسا کچھ نہیں ہوگا، وہ مان جائے گا۔‘‘

احمد شاہ نے مطمئن چہرے کے ساتھ اُن کو یقین دلایا۔ اُن کے چہرے پر ہلکی سی نرم لیکن پر یقین مسکراہٹ تھی۔

روشن آرا بیگم نے بے اختیار سوئی ہوئی نگی کو دیکھا۔ رات کا اندھیرا اُس کے اردگرد ضرور تھا لیکن اندھیرا چھٹنے والا تھا۔

''ٹھیک ہے میں شہباز صاحب سے کھل کر بات کرتا ہوں، دیکھنا وہ بھی خوش ہوگا۔'' احمد شاہ نے ہ
کو یقین دلایا۔

❖❖○❖❖

ہمیشہ ایسا ہوتا تھا
نگاہوں سے پرے ہوکر
ہمارے دل میں رہتے تھے
مگر اب کے ہوا ہے یوں
نگاہوں سے پرے ہو تم
ہمارا دل بھی خالی ہے

علیزے چولہے کے آگے کھوئی بیٹھی تھی دودھ اُبل اُبل کر کھویا بن گیا تھا لیکن اُسے ہوش نہ تھا۔

''باجی!'' غزالہ کچن میں آئی تو اُسے کچھ جلنے کی بو آئی، دودھ اُبل اُبل کر اب لگنے لگا تھا لیکن ! لگتا تھا کہ اُس کے حواسِ خمسہ اُس کے ساتھ تھے نہ وہ دیکھ پارہی تھی نہ ہی سونگھ پارہی تھی۔

''باجی! کدھر ہیں آپ؟'' غزالہ نے آگے بڑھ کر برنر بند کیا۔

''آں، ہاں! وہ میں ابو جی کے لیے دودھ گرم کرنے آئی تھی۔'' علیزے کو ایک دم ہوش آیا۔

''ابو بلا رہے ہیں!'' غزالہ نے تاسف سے اپنی بہن کی آنکھوں میں موجود دکھ کو ہلکورے لیتے دیکھ وہ بے اختیار ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئی۔

''میں آتی ہوں تم چلو! امی کیا کررہی ہیں؟'' ساتھ ہی علیزے نے سوال کیا۔

''امی گڈو کے پاس سوئی ہوئی ہیں اُس کا بخار بھی کم ہے میں بھی اُدھر ہی ہوں، تم ابو کے پاس ؛ جاؤ، وہ بار بار تمہارا پوچھ رہے ہیں۔'' غزالہ تفصیلاً جواب دیتی باہر نکل گئی۔

''ابو جان دودھ لے لیں!'' علیزے اُن کے کمرے میں داخل ہوئی، اُن کے ہاتھ البم تھا، یہ ا علیزے کے نکاح کا تھا۔

''علیزے! اِدھر میرے پاس بیٹھو۔'' انور صاحب نے اس کو ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا۔

''مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے!'' انور صاحب نے اسے بہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی ابو جان!'' علیزے نے اُن کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تم کوئی شکوہ کیوں نہیں کرتیں؟ میری وجہ سے تمہاری ماں نے ایک انتہائی قدم اٹھایا، جس کی وہ سے تمہاری دنیا تہس نہس ہوکر رہ گئی، میں تمہارا گناہ گار ہوں بیٹا۔'' انور صاحب نے دھیمی سی آواز میں کہا۔

''نہیں ابو! ایسا نہ کہیں، آپ تو میری وجہ سے زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہوئے۔ تکلیف ا باعث تو میں بنی تھی سب کے لیے۔'' علیزے روہانسی ہورہی تھی۔

''میرا بیٹا باپ کے سینے سے لگ کر روئے گا نہیں؟'' انور صاحب نے اپنی باہیں پھیلا کر کہا۔

علیزے اُن کے کندھے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رودی، انور صاحب نے اسے کافی دیر رونے دیا راُس کا سر سہلانے لگے۔

''میں جب تم کو دیکھتا تھا تو مجھے یہ احساس شدت سے ستاتا تھا کہ میری بیٹی نے پہاڑ جیسا دُکھ اپنے ں میں پال رکھا ہے، آج تمہارے آنسو مجھے مل گئے، دیکھنا یہ پہاڑ ذرا بھی نہیں رہے گا میں شرمندہ ہوں بیٹا اپنی وجہ سے، لیکن اس کے ساتھ میں فخر کرتا ہوں تمہاری وجہ سے، میری بیٹی نے وہ کیا جس نے ہرا سر ہمیشہ کے لیے بلند کردیا، اُس نے اپنے باپ کی عزت رکھی، اچھی بیٹیاں تو والدین کے لیے نعمت ے کم نہیں ہوتیں۔'' انور صاحب اُس کا سر سہلاتے ہوئے مسلسل اپنے دل کی کہہ رہے تھے اُن کے لندھے سے لگی علیزے کو بھی لگ رہا تھا کہ اُس کے ویران دل کی وحشت ختم ہوگئی، جو گھٹن کی طرح اُس کو جینے دیتی تھی نہ مرنے دیتی تھی۔

''علیزے! میں ولی کا ہمیشہ شکر گزار رہوں گا وہ اگر داماد بنتا تو بھی اتنی جگہ میرے دِل میں نہ بنا پاتا جتنی آج ہے۔ اپنی اپنی کشتی اور دنیا تو سب ہی بچاتے ہیں لیکن دوسروں کی کشتیاں اور زندگیاں بچانے کا وصف پیغمبروں اور اولیا کو ملتا ہے وہ اللہ کی بھیجی ہوئی نیک روح ہے، اُس نے اِس گھر کو ایک بار پھر تباہی کے کنویں میں گرنے سے بچایا۔ عبداللہ کو بھی اُس نے بھیجا تھا وہ جانتا تھا کہ تم اور تمہاری ماں اُس کے دِل کے لیے کس قدر اہم ہو، اِس لیے اُس نے اُس شخص کو تمہاری زندگی میں بھیجا، جو اُس جیسی نہ سہی لیکن اُس سے کم اہمیت تم کو ضرور دے گا، مجھے اُس کے کہنے پر یقین ہے اس نے ابھی کچھ دیر پہلے مجھ سے بات کی تھی۔'' انور صاحب نے ایک دم سے انکشاف کیا۔

''بیٹا! تم سارے ملال مجھے دے دو، سارے آنسو مجھے دے دو اور ایک نئی زندگی کا آغاز کرو، ہم سب کی بہترین دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔'' انور صاحب نے علیزے کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا وہ مسلسل بول بول کر تھک گئے تھے لیکن وہ آج اُس کے دل سے ہر طرح کی پھانس نکال لینا چاہتے تھے۔

''عبداللہ کو میں نے دیکھا ہے، اُس سے ملا ہوں وہ بہت اچھا لڑکا ہے، دیکھنا وہ تم کو اتنا خوش رکھے گا کہ تمہارے سارے ملال دھل جائیں گے یہ میرا یقین ہی نہیں میری دعا بھی ہے۔'' انور صاحب نے علیزے کو خود سے لگاتے ہوئے کہا۔

''جی ابو!'' علیزے نے دوپٹے سے اپنا منہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

باپ کے کندھے سے لگ کر رو کر اس کا دل بالکل ہلکا پھلکا ہوگیا تھا۔ بابل کی دہلیز ہو یا پھر بابل کا کندھا ہر لڑکی کے لیے وہ ہمیشہ طاقت کا باعث ہوتا ہے۔

زندگی جب جب اُسے کمزور کرتی ہے تو یہ دونوں آگے بڑھ کر اُسے ایک بار لڑنے اور خود کو بچانے کی طاقت دیتے ہیں، ہمت دیتے ہیں، علیزے کو بھی جینے، اپنے دل کو سمجھانے کی طاقت ملی تھی۔

دل کتنا بھی نادان کیوں نہ ہو لیکن وہ جن سے پیار کرتا ہے اُن کو کبھی دُکھ نہیں دیتا اور علیزے ایک اچھی بیٹی تھی وہ تو اپنے باپ کو کبھی دُکھ دینے کا سوچ بھی نہ سکتی تھی، جو بچے اپنے والدین کا دل رکھتے ہیں اللہ اُن کا ہمیشہ خیال رکھتے ہیں والدین کے لیے دی ہوئی کوئی چھوٹی سی بھی قربانی جہاد کا اجر دلا دیتی ہے، انعام سے نوازتی ہے اور علیزے کو آئندہ زندگی میں اندازہ ہونے والا تھا کہ عبداللہ واقعی اُس کے

لیے انعام تھا۔

❖❖○❖❖

''آپ تو ہمیں پاکستان جا کر بھول گئیں۔'' ڈاکٹر فیصل نے فون پر مریم بی بی سے شکوہ کیا۔

''اللہ نہ کرے! کیسی باتیں کرتے ہیں، میں سانس لینا تو بھول سکتی ہوں، آپ کو کبھی بھول نہیں سکتی۔'' مریم نے دھیمی، شرمیلی مسکراہٹ سے سچائی سے کہا۔ ہزاروں میل دور بیٹھے ڈاکٹر فیصل مریم کے چہرے پر دوڑنے والے رنگ یہاں تک محسوس کر سکتے تھے۔

''میں نے آپ کو بہت مس کیا! آپ آجائیں۔'' ڈاکٹر فیصل کا اظہار مریم کی روح تک کو سرشار کر گیا تھا دل پسندیدہ شوہر کے منہ سے اِس طرح کی بات سن کر عورت ویسا ہی محسوس کرتی ہے، جیسے سوکھے پودے کی جڑوں کو پانی ملنے پر زندگی محسوس ہوتی ہے۔

''فیصل! بہو دیکھنے پاکستان نہیں آئیں گے کیا؟'' مریم نے بے حد آس سے کہا۔

''اُسی کے لیے فون کیا ہے، عبداللہ سے کہو اُس کے ڈاکومینٹس پورے کر کے جلد از جلد بھجوائے تا کہ اُس کا ویزا لگ سکے، اس سے کہنا ٹائم نہ ضائع کرے، پاکستان میں اس طرح کے کام خاصا وقت لے لیتے ہیں۔'' ڈاکٹر فیصل نے مریم کی بات ٹالتے ہوئے کہا۔

''فیصل! پلیز ایک بار! ایک بار پاکستان آجائیں، کئی لوگوں کی قبریں منتظر ہوں گی کہ آپ اُن کی قبروں پر آ کر فاتحہ خوانی کریں۔'' مریم نے اُن کے زخم پھر چھیڑ دیے۔

''مریم! وہ لوگ جن سے دِل اور نیت کے رشتے ہوتے ہیں، اُن تک ہماری دعائیں، پیار، تڑپ اور پڑھائی سب کچھ پہنچ جاتا ہے، چاہے ہم کہیں بھی ہوں۔'' فیصل کی آواز میں حلول دُکھ کو مریم نے بہت شدت سے محسوس کیا۔

''وہ فاصلے اور قربتوں کی حدود سے نکل چکے ہیں مریم! یہ فاصلے اور قربتیں زندوں کے لیے میٹر کرتے رہیں نا کہ مردوں کے لیے!'' ڈاکٹر فیصل ایک لمحے کو رُکے، وہ مریم کی آنکھوں میں بول رہے تھے۔

''کیا ولی اور نگینہ کے لیے بھی نہیں آئیں گے؟ وہ بھی تو آپ کے جگری دوست کی نشانیاں ہیں۔'' مریم کسی نہ کسی طرح اُن کو ایموشنلی بلیک میل کر کے پاکستان بلانا چاہ رہی تھیں جب تک وہ یہاں سے دور تھیں رہ رہی تھیں لیکن یہاں آ کر اُن سے واپس جانا پردیس میں مشکل تھا جہاں کی نہ زمین، نہ آسمان، نہ انسان، نہ ہی ہوائیں اپنی لگتی تھیں سارے دن رات اجنبی لگتے تھے یوں لگتا تھا کہ اُن کو ابھی کہیں جانا ہے اور واپس جانا ہے، ہر وقت خود کا سفر میں محسوس ہوتا۔ اُن کو کوئی گھر، کوئی ملک اپنا لگا ہی نہ تھا اب پاکستان آ کر وہ ایک دم سے ایک بار پھر لالچی ہو رہی تھیں، بے شک سگے رشتے نہ سہی لیکن ایک اٹوٹ رشتہ مٹی کا رشتہ تو باقی تھا، جو اُن کو اپنی جانب کھینچ رہا تھا اِس مٹی نے ایک بار پھر اُن کے پاؤں جکڑنے شروع کر دیے تھے۔

''تم ہو نا میرا نائب! اُن دونوں کی خاطر میں نے تم کو پاکستان آنے دیا ورنہ تم جانتی ہو میں تم لوگوں میں سے کسی کو پاکستان نہ آنے دیتا۔'' ڈاکٹر فیصل نے حتمی لہجے میں کہہ کر بات ختم کر دی۔

پاکستان سے وہ جو زخم لے کر روانہ ہوئے تھے، اب وہ ناسور بن گیا تھا اس لیے مریم کا اصرار بے کار تھا۔

''آپ کو بہو کیسی لگی؟'' مریم نے ٹھنڈی آہ بھر کر ٹاپک بدلا۔ لاکھ اُن کی خواہش رہی ہو کہ فیصل ستان آئیں لیکن اُن کو دُکھ اور اذیت میں مبتلا کر کے وہ خوش نہیں رہ سکتی تھیں پھر اتنی دور بیٹھے وہ فوراً ن کا موڈ بھی ٹھیک نہیں کر سکتی تھیں اپنی بات کا ازالہ کرنے کے لیے انہوں نے ٹاپک بدل دیا۔

''جی ماشاء اللہ بہت پیاری ہے، مجھے بے حد پسند آئی، عبداللہ کو پسند ہے یا پھر دوست کی بات ہی مانی ہے۔'' ڈاکٹر فیصل کا دِل ڈرا ہوا تھا کہ اُن کا اکلوتا بیٹا اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کسی قربانی کی نذر نہ کر لے۔

وہ اپنے بیٹے کی زندگی کو **Compromise** کے تنے ہوئے رستے پر چلتے نہیں دیکھنا چاہتے تھے وہ پنے بیٹے کے لیے **Original** خوشیاں چاہتے تھے۔

''ایسا ویسا خوش ہے! وہ کہتا ہے علیزے تو بالکل اُس کے آئیڈیل جیسی ہے۔'' مریم نے ہنستے ہوئے اللہ کی بے چینیاں بتائیں۔

ڈاکٹر فیصل یہ سن کر اندر تک پرسکون ہو گئے۔

''اچھا میں فون رکھتا ہوں، تم عبداللہ کو علیزے کے کاغذات کے لیے لگاؤ۔'' ڈاکٹر فیصل نے فون کھتے رکھتے ایک بار پھر یاد دہانی کرائی۔

''جی اچھا! اللہ حافظ۔'' مریم نے تابع داری سے کہہ کر فون بند کر دیا۔

''کاش! کاش یہ بچی ہمارے لیے اتنی خوش قسمت ثابت ہو کہ بجائے اس کے کاغذات بنیں یہ ہم ب کو پاکستان ہی کھینچ لائے، اس کے رشتے اور مقدر کے صدقے ہم بھی پاکستان آجائیں۔'' مریم نے مدق دل سے دعا کی۔

''جب ہم اپنی دعاؤں کے یقین کو خود پر پلس مائنس کر کے اپلائی کرتے ہیں تو پھر ہمیں اپنی دعاؤں کے مقبول ہونے کا خدشہ لاحق ہو جاتا ہے، ایسے میں ہم وسیلوں کو ڈھونڈتے ہیں کہ کسی اور کے ذریعے ہماری خواہش، ہماری دعا قبول ہو جائے۔'' مریم نے خود سے مایوس ہو کر علیزے کے مقدر کی دعا کی کہ اُس کا مقدر اس قدر روشن ہو کہ وہ اُن سب کی زندگیوں کے لیے بھی روشنی کا باعث بن سکے۔

❖❖○❖❖

ولی کا کام کسی انسائیکلو پیڈیا سے کم نہیں تھا، جو دوسروں کے لیے ہمیشہ نئی سوچ پیدا کرتا تھا اس لیے ٹی ٹو نے اُس کے کام کی کاپی کی فرمائش کی تھی۔ ولی آرٹ کالج سے ودآؤٹ پے چھٹیاں لے کر گیا تھا لیکن آج اُس کے کالج میں قدم رکھتے ہی اُس کے بہت سے دوست، طالب علم اور پروفیسرز نے گھیر لیا تھا۔

سارا دن وہ لوگوں میں رہا، لیکن ٹی ٹو پھر بھی جان گیا کہ یہ وہ والا ولی نہیں، جس کو وہ جانتا تھا جس کی مسکراہٹ میں اُس کی آنکھیں بولتی تھیں لیکن آج تو یوں بجھا ہوا تھا، جیسے لائٹ ہاؤس سے پاور ختم ہو جاتی ہے پھر جب وہ تنہائی میں ملے تو ٹی ٹو نے فوراً اُسے گھیر لیا، جواباً ولی کی زندگی میں آنے والے اتنے بڑے طوفان کا سُن کر وہ کتنی ہی دیر دُکھ سے سکتے میں بیٹھا رہا۔

''تم نے ایسے شخص سے، آئی مین اب کیسے تم مسکان بھابی کے ساتھ زندگی گزارو گے۔ سب جانتے بوجھتے۔'' ٹی ٹو نے سوال کیا۔

''ایسے ہی جس طرح تمہارے جملے میں مسکان کے نام کے ساتھ بھابی لگ گیا۔''

''ایسا کیوں ہوا یار؟'' ٹی ٹو نے نڈھال، بے حال سے ولی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''میں خود نہیں جانتا!'' ولی نے فائل ٹی ٹو کو تھما دی۔ وہ آج کالج آئے ہوئے تھے ولی کو ریکارڈ سے کچھ ٹرانسپرنسی ملی تھیں یہ اُس کے مختلف تھیسز کے ڈسپلے کی تھیں ٹی ٹو یہ فائل کاپی کر کے رکھنا چاہتا تھا تا کہ اُسے آئندہ مدد مل سکے۔

''یہ **Change** اتنے نیچرل ہوتے ہیں کہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں، ضرور ہماری زندگی میں داخل ہوجاتے ہیں میں مانوں یا نہ مانو اب وہ میری بیوی ہے تم کو اُس سارے قصّے کا دکھ ہے لیکن تم لفظ بھابی پھر بھی استعمال کر گئے۔ تو اے پیارے دوست! میں تو یہ سب کچھ اب اپنی ماں کے لیے کر رہا ہوں، جس نے اللہ اور میری بہن کا واسطہ دیا ہے۔

اور میرے لیے یہ واسطے بہت بہت بڑے ہیں۔

''یار! میرا دل خالی سہی لیکن مطمئن ضرور ہوگا کہ میں نے خود غرضی کے بجائے **Sacrifice** کا راستہ چنا!'' ولی کہہ رہا تھا اور ٹی ٹو یک ٹک اُسے دیکھ رہا تھا۔ ولی کے چہرے، آنکھوں اور ماتھے سے اُسے روشنی پھوٹتی محسوس ہوئی، وہ اُسے اِس دنیا کا انسان نہ لگا بلکہ وہ بہت اعلیٰ مقام اور کسی اور ہی دنیا کا انسان لگا۔

ٹی ٹو کی نگاہوں میں اُس کے لیے بے حد عزت اور عقیدت تھی۔ جب وہ واپس جانے لگے تو ٹی ٹو نے بے اختیار اُسے گلے لگالیا۔

''تم خاص تھے اِس لیے اللہ نے تم سے خاص کام لیا ہے، پہلے یہ سب سن کر مجھے بے حد دُکھ ہوا تھا لیکن اب میرا دل چاہ رہا ہے کہ تم کو مبارک باد دوں **Selected People Are Gifted this type of special courage** اور اللہ نے تم کو مقام دلانے کے لیے ایسا کیا ہے۔ مبارک ہو یار۔"

ٹی ٹو جو کہہ رہا تھا وہ ولی کے لیے انوکھا تھا، جانے اُسے کیوں لگا کہ اُس کے اندر کا ملال کافی کم ہوگیا ہو۔ اللہ نے ٹی ٹو کے منہ سے وہ کہلوایا جو یقیناً اُس کی رضا ٹھہری ہوگی اسی لیے تو ولی نے اپنے اندر کے غبار کو کافی حد تک چھٹتے ہوئے محسوس کیا۔

''دراصل ہم جان نہیں رہے ہوتے کہ ہر کام کی مصلحت کیا ہے۔'' ٹی ٹو نے دھیمی سی مسکراہٹ سے کہا۔

میں تمہارے معاملے کو سن کر یقین کر رہا ہوں اس بات کے لیے اور شدت سے منتظر رہوں گا کہ رب جی نے اس میں کیا مصلحت رکھی ہے، یقیناً کسی کا بھلا ہی ہے اس میں۔ میرے دادا کہتے ہیں جو بھلا ہے وہ رب جی کی طرف سے ہے اور جو برائی ہے، وہ شیطان کی طرف سے ہے۔'' ٹی ٹو جو عام سا طالب علم رہا تھا آج بہت ساری خاص باتیں کہہ کر اپنے دوست کا بوجھ کافی حد تک بٹا گیا تھا۔

''اللہ نے بہت سارے رشتے پیدا کیے، ان رشتوں میں دوست کا رشتہ یقیناً بہت بڑی نعمت ہے اور

...تو ہمیشہ یہ نعمت بہت اچھی ملی تھی واقعی وہ خاص تھا اور خاص ہی کے لیے چنا گیا تھا۔

❖❖○❖❖

...شام سے کچھ سمے پہلے وہ وہاں پہنچی تھی، کہتے ہیں کہ اس سمے میں ملن اور جدائی دونوں پل اکٹھے ...تے ہیں۔

...دو وقت اکٹھے مل رہے ہوں تو مائیں اپنے بچوں کو اندر بلالیتی ہیں وہ کسی بھی آزمائش سے ڈرتی ہیں۔

...سائرہ نے سر جھکائے سمعان علوی کو دور سے ہی بیٹھے دیکھ لیا تھا وہ لیمن اور کوس موس کلر میں ملبوس ...ا۔ اُس کی گندمی رنگت سونے کی طرح چمک رہی تھی پہلی بار سمعان نے اُسے خود سے کہیں اکیلے میں ...تھا بے حد خود اعتمادی کے باوجود اُس کے اندر کی لڑکی کچھ گھبرا رہی تھی **Certain** اور **uncertain** ...جو راستہ ہوتا ہے، وہ دنیا کا سب سے اذیت ناک راستہ ہوتا ہے کیوں کہ وہ بنا کسی منزل کے طے ...ہے اس رستے کی خاک کھانے اور تکلیف جھیلنے کے بعد بھی منزل نہیں ملتی۔ سائرہ نے بہت عرصے ...صبر سے یہ راستہ طے کیا تھا لیکن اب اُس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تھا وہ آر یا پار ہوکر ایک نئے ...ے سے جینا چاہتی تھی، وہ شاید ہمیشہ اپنے دل کی سن کر یاد ماضی میں رہتی لیکن اُس نے اپنی آنی اور ...بری طرح اذیت جھیلتے دیکھا تھا۔

"برباد دِل کے مالک کبھی زندگی سے کچھ حاصل نہیں کر سکتے اور نہ کسی کو دے سکتے ہیں اِس لیے وہ ...کے ہاں کوئی **Status** نہیں پاتے۔ تم دِل برباد سے بچنا۔'' آنی کی آواز اُس کے کانوں میں گونجی۔

...نے خود کو اِس لاحاصل راستے پر چلنے سے روک لیا تھا لیکن آج سمعان کی صرف ایک کال پر وہ کسی ...طیس کی طرح کھنچی چلی آئی تھی تو اُسے ٹھیک سے اندازہ ہوگیا کہ دِل کا ریموٹ کنٹرول کوئی نہیں ہوتا، ...اللہ مدد نہ کرے تو خواری ہر صورت جھیلنی پڑتی ہے۔

"السلام علیکم سمعان!'' اُس نے اپنی اتھل پتھل ہوتی سانسوں پر کنٹرول کر کے قریب آتے ہوئے ...ا۔

سمعان اُسے دیکھ کر بہت پیاری مسکراہٹ کے ساتھ اُٹھ کر اُس کے قریب آیا۔

"کیسی ہو؟''

"میں! میں بہت اچھی ہوں! تم کو کوئی شک؟'' سائرہ نے خود کو کمپوز کرنے کے لیے ہلکے پھلکے انداز ...ا کہا۔

''تمہارے اچھے ہونے پر کوئی شک میں کیسے کر سکتا ہوں تمہاری اچھائی کو میں نے ہمیشہ دل سے ...س کیا ہے اِس کا مزہ لیا ہے!''سمعان نے بے حد کھل کر اظہار کیا۔

''اوہ رئیلی ؟'' سائرہ نے کچھ شرارت سے پوچھا۔ بے شک یہ مسکراہٹ اور شرارت کسی بھرم کی طرح ...ا اُس کے لیے۔

"تم جانتی ہو میں جھوٹ نہیں بولتا اور جھوٹ سے مجھے کس قدر نفرت ہے۔''سمعان نے اُس کے بے ...زیب کھڑے ہوکر کہا۔ سائرہ نے اُس کی آنکھوں کو دیکھا، جو بہت ساری باتیں بنا کہہ گئی تھیں۔

''اور آج میں نے تمہارے ساتھ کچھ سچ شیئر کرنے کے لیے تم کو بلایا ہے۔''

''کیا تم سننا چاہوگی!'' سمعان نے اُس سے بے حد گمبھیر لہجے میں پوچھا۔ اُس کی آنکھوں کی تپش سائرہ کے من پر جمی برف پگھلا رہی تھی۔

''ہاں! میں سننا چاہتی ہوں!'' سائرہ نے اپنی انا کے خود ساختہ سارے ہتھیار ڈال کر سرنڈر کرتے ہوئے ہاں میں جواب دیا۔

''سائرہ! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں!'' سمعان نے وہ کہا، جو وہ برسوں سے سننا چاہتی تھی سمعان اُس کی بچپن کی محبت تھا۔

''یہ تمہاری خواہش ہے یا پھر تم مجھے پرپوز کر رہے ہو؟'' سائرہ نے مصنوعی خفگی سے پوچھا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے؟'' سمعان نے اُس کے چہرے کو شہادت کی انگلی سے چھو کر پوچھا۔

''دیکھو ہر لڑکی چاہتی ہے کہ اُسے یادگار طریقے سے پرپوز کیا جائے تاکہ وہ اپنے گرینڈ سن اور گرینڈ ڈاٹرز کو اپنی لو اسٹوری گلیمر اور فخر سے سنا سکے۔''

''لیکن اس سب کے پیچھے سب سے اہم بات ہے کہ اسٹوری کے اندر Love ضرور ہو۔'' سائرہ کہتے کہتے ایک دم سنجیدہ ہوگئی۔

''جب کہ میں جانتی ہوں تم کسی اور سے پیار کرتے تھے۔'' سائرہ کے لہجے میں دُکھ آپوں آپ اُتر آیا۔

''سائرہ! میں تم پر ایک بات کلیئر کر دینا چاہتا ہوں کہ محبت اور پرچھائیوں کے پیچھے بھاگنے میں زمین آسمان کا فرق ہے وہ محبت نہ تھی، میں تو پرچھائی کے پیچھے بھاگ رہا تھا یہ بھی تو تم جانتی ہو!'' سمعان نے بے حد خود اعتمادی سے کہا۔

سائرہ یک ٹک اُسے دیکھ رہی تھی۔ سمعان کی آنکھوں کا رنگ اِس سے پہلے وہ نہ جانتی تھی کہ وہاں اُس کے لیے بھی اتنے رنگ اکٹھے ہو جائیں گے۔

''میں تم سے محبت کرتا ہوں اور شادی کرنا چاہتا ہوں!'' سمعان نے سائرہ کا ہاتھ تھام کر کہا۔

سائرہ کو اپنے کانوں پر یقین نہ آرہا تھا اس لیے اُسے سمجھ نہ آیا کہ وہ کیا بولے۔

''سائرہ! میرے اردگرد بہت دھند تھی اور جب یہ دھند چھٹی تو جو چہرہ سب سے پہلے دکھائی دیا وہ تمہارا تھا۔'' سمعان نے اُس کا ہاتھ تھام کر اُسے یقین کی ایک اور سیڑھی پر قدم رکھوایا۔ سمعان کے لہجے کی سچائیاں سائرہ کے اندر ست رنگی روشنیاں بھر رہی تھیں۔

''اور مسکان؟'' سائرہ کو ایک دم خیال آیا۔

''وہ؟'' سمعان کے ماتھے پر بل پڑ گیا۔

''That was not love that was just infectuation'' سمعان نے اتنی دھیمی آواز میں کہا کہ سائرہ بہ مشکل سن پائی۔ آج سمعان بہت سارے انکشاف کر رہا تھا۔

''بولو سائرہ! میں اس وقت اتنی مینٹل ڈسٹربنس میں ہوں کہ تمہاری ایک ''نہ'' میری جان نکالنے کو کافی ہے اور ایک ''ہاں'' میری مردہ زندگی کی سسکتی ہوئی خوشیوں کو زندہ کرنے کے لیے کافی ہوگی۔'' سمعان نے شدت جذبات سے کہا۔ سائرہ کا چہرہ شرم و خوشی سے گلنار ہوگیا۔

''کیا کہے بغیر کام نہیں چل سکتا!'' سائرہ نے اُس کے اصرار پر سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''پلیز سائرہ! میں اندر سے ترس رہا ہوں، مجھے تمہارا اقرار سننا ہے!'' اُسے سمعان کی شدتیں پاگل پن کو چھوتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

''ہاں!'' سائرہ نے بس ایک پل کو سر اور نگاہ اٹھا کر کہا۔

''تھینکس سائرہ! تم میری نہ صرف محبت ہو بلکہ میری رئیل دوست بھی ہو۔'' سمعان نے چہکتے ہوئے کہا۔

''میں کس قدر خوش قسمت ہوں گا کہ میرا رفیق اب صرف رفیق نہیں بلکہ رفیقِ زندگی ہو جائے گا۔'' سمعان نے بے حد خوش ہو کر کہا۔

''کیا دعائیں اس طرح بھی قبول ہوتی ہیں؟'' سائرہ نے سمعان کے دمکتے چہرے کو دیکھتے ہوئے بے اختیار سوچا۔

''یار! میں تم سے اپنی زندگی کا ایک اور بڑا سچ کہنا چاہتا ہوں، میری پہلے خواہش تھی کہ تم میرے پہلے سچ کو سن کر صرف ہاں میں جواب دو لیکن اس دوسرے سچ کو سننے کے بعد تم کو مکمل آزادی ہوگی کہ تم کوئی بھی فیصلہ کر کے جا سکتی ہو، یقین مانو میں دل و جان سے تمہارے فیصلے کو قبول کروں گا۔'' سمعان نے سچائی سے کہا۔

''ایسا دوسرا سچ کون سا ہے، جس سے وہ اب تک بے خبر ہے۔'' سائرہ الجھ گئی۔

''سائرہ! میں قاسم علوی صاحب کا حقیقی بیٹا نہیں ہوں، بے شک میرے دِل میں باپ کے مقام پر صرف اور صرف وہ رہیں گے لیکن بہر حال میری زندگی کا واحد اور سب سے بُرا پہلو یہ بھی ہے کہ میں سید سرفراز علی کا ناجائز بیٹا ہوں!'' سمعان کے انکشاف پر سائرہ نے حیرت سے اس کو دیکھا۔ وہ یہ کیا کہہ رہا تھا اُسے بالکل یقین نہ آرہا تھا۔

''مسکان کی جانب میری کشش شاید اِس لیے بھی ہو کہ وہ! کہ اُس سے میرا بلڈ ریلیشن بھی تھا۔'' سمعان کو کہنا بے حد مشکل لگ رہا تھا۔

''لیکن اگر تم مجھ پر اعتبار کرو تو میں سچ کہتا ہوں کہ میں نے تمہارے لیے فیصلہ اِس سچائی کو جاننے سے پہلے کر لیا تھا۔''

''میں مسکان سے مایوس ہو کر ہرگز تمہارے پاس نہیں آیا۔'' سمعان نے فکرمندی سے خاموش سائرہ کو دیکھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اُس کے اندر کیا چل رہا ہے۔

''ایک ناجائز لڑکے سے تم عمر بھر کا رشتہ جوڑنا چاہتی ہو تو یہ پہن لینا، اگر نہیں تو تم یہاں سے چلی جانا، میں تم سے کبھی شکوہ نہیں کروں گا، تم ہر طرح کے فیصلے کے لیے آزاد ہو۔'' سمعان نے سچائی سے کہا اور ایک بریسلیٹ سائرہ کی جانب بڑھا دیا۔

کتنے ہی خاموش پل اُن دونوں کے بیچ آ کر گزر گئے سمعان کی دھڑکن پہلے بہت شدت سے تیز ہوئی۔

''اسے اپنے ہاتھ سے نہیں پہناؤ گے کیا؟'' سمعان نے بے یقینی سے اُسے دیکھا اور اُس نے بے

اختیار اپنی رُکی سانس بحال کی اور فوراً بریسلیٹ جس کے سینٹر پر چھوٹا سا پھول بنا ہوا تھا، جس کے اندر ہیرے لگنے کی وجہ سے خوب چمک پھوٹ رہی تھی اُس کی نازک کلائی میں پہنا ڈالا۔

''پاپا بہت جلد تمہارے گھر آئیں گے اور تمہارے ابو سے ہمیشہ کے لیے تمہیں میرے لیے مانگ لیں گے، تم میری زندگی میں بہار بن کر آؤ گی نا؟'' سمعان نے پھر پوچھا۔ جواباً سائرہ نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

سمعان کو لگا گویا وہ ایک بار پھر زندہ ہوگیا ہو۔

❖❖○❖❖

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے، جب احمد شاہ بابا جی کے ہاں پہنچے، وہ بہت ارجنٹ وزٹ پر آئے تھے۔

''تم چائے وغیرہ پیو میں بابا جی سے مل کر آتا ہوں۔'' احمد شاہ نے تھرماس ڈرائیور کو تھماتے ہوئے کہا اور خود بابا جی کے چھوٹے سے گھر کی جانب بڑھ گئے۔

حسب معمول دروازہ بند ضرور تھا لیکن لاک نہیں تھا۔ احمد شاہ نے ہلکی سی دستک دی۔

''اندر آ جاؤ بیٹا!'' بابا جی نے آواز دی۔

''السلام علیکم بابا جی۔'' احمد شاہ فوراً اندر چلے گئے، انہوں نے آگے بڑھ کر اُن کے ہاتھ کا بوسہ لیا۔

''خوش رہو، جیتے رہو، اللہ ہمیشہ تمہیں بلند مقام عطا فرمائیں۔'' بابا جی نے محبت سے اُن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیسے ہیں آپ؟'' احمد شاہ نے اُن کی طرف فکرمندی سے دیکھتے ہوئے پوچھا، وہ بہت ضعیف ہوتے جا رہے تھے۔

''الحمدللہ! اللہ کا لاکھ شکر ہے کہ اُس نے کسی بھی قسم کی محتاجی سے بچائے رکھا ہے۔'' بابا جی نے کہا۔

احمد شاہ نے اُس بوڑھے آدمی کو دیکھا، جو بڑی سے بڑی تکلیف پر شکر کا دامن کبھی نہ چھوڑتا تھا۔ جو اُن سب کے لیے مشعل راہ تھا۔

''وہ میں آپ سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔'' احمد شاہ نے رات کا کھانا بابا جی کے ہاں ہی کھایا، کھانے کے بعد وہ اُن کے قریب آ بیٹھے۔

گاؤں سے بابا جی کی کسی شاگرد نے دیسی مرغی کا شوربہ بنا کر بھیجا تھا۔ احمد شاہ جو ملک ملک گھومے تھے اُن کو اِس سالن میں بے حد مزہ آیا، انہوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔

''یہ تمہارے نام کی نعمت ہے گاؤں کے لوگ جانتے ہیں کہ میں اِس عمر میں ثقیل غذا نہیں کھا سکتا، زیادہ تر دودھ کا استعمال کرتا ہوں لیکن بچی اتنی خوشی سے بنا کر لائی تو تب ہی میرے خیال میں آیا کہ یہ کھانا آیا ہے تو اِس کے کھانے والے بھی آئیں گے۔'' بابا جی نے بہت پیار سے اُن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کی محبتوں کا میں اسیر ہوں!'' احمد شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اللہ تعالیٰ کی ذات تم کو خوش رکھے۔'' بابا جی نے حسب عادت دعا دی۔

''میں آپ کو کچھ بتانا چاہ رہا تھا۔'' احمد شاہ نے ایک بار پھر ٹاپک پر آتے ہوئے کہا۔

''جی پیارے بیٹے! کہیے!'' بابا جی نے مکمل متوجہ ہو کر پوچھا۔

جواباً احمد شاہ نے اب تک ہونے والی ہر بات اُن کے گوش گزار کر دی۔

''ہوں!'' بابا جی نے ہنکارا بھرا۔

''تمہارا دِل کیا کہتا ہے؟'' بابا جی نے سوال کیا۔

''جی! میں دو طرح کی مشکل میں خود کو محسوس کرتا ہوں، خوف خدا کہتا ہے کہ ایک لڑکی کے ساتھ کسی لم کی زیادتی نہ ہو اور دوسری جانب دل ڈرتا ہے کہ وہ بھیڑیا جس نے ولی کے ماں باپ کو زندہ جلا دیا تھا ولی کی اصلیت جان کر اُس کی جان کا بھی نہ دشمن بن جائے۔''

''یہ شادی! میں کیسے روکوں؟'' احمد شاہ نے پریشانی سے کہا۔

''تو نہ روکو!'' بابا جی نے بے حد آسانی سے جواب دیا۔

''آپ سب جانتے ہوئے بھی کیسے یہ کہہ رہے ہیں؟'' احمد شاہ نے سوال کیا۔

''ہونی کو ہونے دینا چاہیے کیوں کہ اِس کی لگامیں انسانوں کے پاس نہیں ہوتیں۔''

''کہاں تم ہزاروں میل دور ولی اور نگینہ کو لے گئے تھے، باہر کے ممالک میں اُن کی پرورش ہوئی لتان آ کر بھی تم نے اُن کو اتنی دور رکھا، لیکن ولی کا رشتہ اور پہچان جو مٹی تھی اُس نے بالآخر اُسے اپنی ال کھینچ ہی لیا۔ اب تم اللہ کی امان میں اِس سارے معاملے کو دے کر ہونے دو اِس شادی کو، جب ہم لہ کے سپرد خود کو اور خود کے معاملات کو کر کے انتظار کرتے ہیں تو اللہ جی اُس میں خیر کرتے ہیں۔'' احمد ہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''لیکن یہ بہت رسکی ہے، میرے بچوں کی زندگی کے لیے اُن کی ذہنی توڑ پھوڑ الگ ہوگی۔'' احمد شاہ ل بھی ہچکچاہٹ کا شکار تھے۔

''احمد! تم ولی کو اُس کی پہچان بتا دو، وہ اتنا ذہین ہے کہ وہ کب کا جان جاتا کہ اُس کا یہاں سے کوئی لہ ہے اگر وہ اپنی ذہانت سے زیادہ تابعدار نہ ہوتا، اُس کی تابعداری اُس کے آگے بند باندھ دیتی ہے ان تم کب تک چھپاؤ گے۔''

''احمد شاہ تم اِس چیز کے امانت دار ہو کہ تم اُن کی پہچان اُن تک ضرور پہنچاؤ۔'' بابا جی بہت لمبی بات رکے تھک سے گئے تھے۔ احمد شاہ کافی دیر نگاہیں جھکائے بیٹھے رہے بالآخر ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئے۔

''ٹھیک ہے بابا صاحب! میں جان گیا ہوں کہ اب پل صراط طے کرنے کا وقت آ گیا ہے، آپ پلیز رے لیے دعا کیجیے گا کہ کوئی ناقابل تلافی نقصان سامنے نہ آئے۔'' احمد شاہ فیصلے تک پہنچ گئے۔

کبھی کبھی ہمارے فیصلے کی کشتی کو کسی دوسرے کے مشورے اور سہارے کا چپوار درکار ہوتا ہے، ایسے میں ے اپنی طاقت دوہری لگتی ہے اور زیادہ طاقت اور توانائی سے کشتی کو بہتر رخ اور منزلیں ملتی ہیں۔

❖❖○❖❖

''کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟'' شہباز صاحب نے کھلے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر پوچھا۔

نیلوفر جانماز پر بیٹھی قرآن پاک پڑھ رہی تھیں۔

''آ جائیے!'' نیلوفر نے قرآن پاک بند کر کے کہا اور اُٹھ کر صوفے پر آ بیٹھیں، اُن کا چہرہ بہت ز ،

ہور ہا تھا وہ بے حد حسین تھی اور لاکھوں اُن کے چاہنے والے تھے لیکن انہوں نے صرف ایک ہی شخص ا
چاہا تھا اور وہ اُن کی بہن کا نصیب بن گیا ایسے میں اپنی توہین کا بدلا انہوں نے سب کو الگ کر کے لیا۔
لیکن آج کی نیلوفر کل کی نیلوفر سے بالکل مختلف تھیں، اُن کا دِل اللہ سے معافی مانگتے مانگتے ایسا ہ
کہ باقی سب غیر بن گئے اور ملا صرف اللہ کا رشتہ، ایسے میں وہ بے حد شانت ہوگئی تھیں، اب اُن
دل میں انگارے نہیں دہکتے تھے، جہاں ربّ جی کا نام ہو وہاں تو بس ٹھنڈ ہوتی ہے۔

''میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہ رہا تھا۔'' شہباز صاحب نے کچھ ہچکچا کر کہا۔ لگتا تھا کہ ا
کے اندر بہت ساری باتیں اکٹھی چل رہی ہیں۔

''جی کہیے!'' نیلوفر نے کہا۔ اب وہ نہ اُن کی طرف دیکھتی تھیں نہ اُن کے لہجے میں تڑپ باقی تھی۔
سائرہ کے لیے سمعان علوی کا رشتہ آیا ہے، میری قاسم علوی کی فون پر بات ہوئی ہے۔ وہ باقاعد
اجازت لے کر رشتہ لے کر آنا چاہ رہے ہیں۔'' شہباز صاحب نے کہا۔

''یہ تو اچھی بات ہے، سمعان بہت پیارا لڑکا ہے اور سائرہ کا بچپن کا دوست بھی ہے ہم جہاں پہلے
کرتے تھے سمعان کی فیملی ہماری ہمسایہ تھی پھر یہ دوستی قربت میں بدلی، مجھے لگتا تھا کہ وہ بھی میر
بچوں جیسا ہے۔ دراصل اُس کی ماں ذہنی مریضہ تھی اور وہ جب جب سارہ سے ملتا تو اُسے ماں کا احسا
ملتا تھا۔ سارہ کے بعد بھی وہ آتا رہا، پھر کوئی تین سال پہلے وہ باہر پڑھنے چلا گیا تھا۔ تعلیم کے بعد
اپنے والد کی ہی ایڈ ایجنسی میں کام کر رہا ہے برائٹ فیوچر اور اُس کی اچھی عادات خود اُس کی سفا
ہیں۔'' نیلوفر نے تفصیلاً جواب دیا۔

''لیکن میں آپ کی مرضی جاننا چاہتا ہوں۔'' شہباز صاحب نے نیلوفر کو بہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔
سے وہ بدلی تھیں اُن کو بہت معصوم اور پاکیزہ لگنے لگی تھیں، اُن کا دِل خود بہ خود اُن کی جانب مائل ہوگ

''میری مرضی؟'' وہ پھیکی سی ہنسی ہنسیں۔
لالچ اور خود غرضی کی سزا میں نے پالی، کسی اور کی اولاد پر میرا حق اور مرضی نہیں چلنا چاہیے آپ
ہیں خود فیصلہ کریں۔'' انہوں نے شرمندگی سے کہا۔

اپنی غلطیوں کو ماننے والا جب اللہ کو اتنا زیادہ پیارا ہو جاتا ہے کہ وہ اُس کے سارے گناہ معاف
ہے تو وہ انسانوں میں بھی درجے پا لیتا ہے نیلوفر بھی ان درجوں کی بلندی کو تیزی سے طے کر چکی تھیں

''جی! ہر چیز کو دور رکھ کر سوچا جائے تو یہ ٹھیک نہیں ہے آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ نے ما
کر ان دونوں بچوں کو پالا ہے آپ کا بھی حق ہے!'' شہباز صاحب نے جب سے نیلوفر کو معاف
اُن کے سامنے اُن کی بہت ساری اچھائیاں بھی آ گئی تھیں۔

''اسی لیے تو اللہ نے معافی کو بہت درجہ دیا ہے یہ تو ایسی دعا ہے، جو دینے اور لینے والے کو
اجرت بن کر نئی زندگی دے دیتی ہے۔ ناراضی کی دھند چھٹنے کے بعد ہمیشہ منظر صاف اور اُجلا دکھا
ہے سامنے والے کی اچھائیاں بھی دکھائی دے جاتی ہیں۔'' نیلوفر کے چہرے پر زلزلے کی کیفیت تھی

''آپ کا بہت شکریہ شہباز! آپ نے میری اتنی غلطیوں کے بعد بھی حق مجھ سے نہیں چھینا، آپ
اچھے ہیں۔'' نیلوفر نے تشکر سے کہا۔

کل کی نیلوفر غرور اور تنفر سے بھری رہتی تھی، جو کسی کو مانتی ہی نہ تھی اور آج جب وہ اللہ کو ماننے لگی تھی
ہر درجہ پا گئی تھی۔ آج اُسے ماں کا درجہ اعلانیہ مل گیا تھا۔

''سمعان بہت اچھا لڑکا ہے اور دونوں بچے ذہنی طور پر اٹیچڈ بھی ہیں اس لیے یہ رشتہ بہت اچھا رہے
آپ سائرہ اور طارق کی رضا بھی ڈال کر اِس کو او کے کر دیں۔'' نیلوفر نے خوشی سے کہا۔

''سائرہ اور طارق سے آپ پوچھیں اور مجھے بتا دیجیے۔'' شہباز صاحب نے ایک بار پھر اُن کا حق
ا۔

''جی اچھا!'' نیلوفر نے دھیمے سے مسکراتے ہوئے کہا۔ شہباز صاحب بات ختم کر کے چپ بیٹھے تھے
ے کچھ اور کہنا چاہتے ہوں۔

''میں سوچتا ہوں کہ سائرہ کی شادی کے بعد طارق کی شادی کر دینی چاہیے۔'' شہباز صاحب نے کہا۔

''جی بالکل! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' نیلوفر نے بے حد خوشی سے کہا۔

''آپ کی نظر میں کوئی لڑکی ہے یا پھر طارق کی کوئی پسند، آپ تو بہتر جانتی ہوں گی۔'' طارق اپنی
اہش کا اظہار اُن سے کر چکا تھا۔ وہ اُس کی پسند بھی اچھے سے جانتے تھے لیکن پھر بھی وہ نیلوفر سے
دیق کرنا چاہ رہے تھے۔

''جی وہ نگینہ کو پسند کرتا ہے اور میرے خیال میں نگینہ بہت پیاری بچی ہے۔'' نیلوفر اُن کی دی اِس
ت افزائی پر بہت زیادہ خوش ہوگئی تھیں۔

''اُس بچی کے ساتھ جو حادثہ ہوا ہے اُس سے وہ کچھ ڈسٹرب ہے کیا ابھی رشتہ لے جانا اچھا ہوگا؟''
باز صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

''شادی خوشی کا نام ہے جب اُسے خوشیاں ملیں گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا، آپ اللہ کا نام لے کر یہ
ڈال دیں۔'' نیلوفر نے انہیں بالکل بیویوں کی طرح تسلی دی۔

''ہوں!'' انہوں نے ہنکارا بھرا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں اگر طارق کو وہ پسند ہے تو ہمیں اپنے بچے کی خوشی ضروری پوری کرنی
ہے، ویسے بھی احمد شاہ تو میری جان کی طرح ہے اُس کے ساتھ رشتے داری میری خوش نصیبی ہے میں تو
سائرہ کے لیے ولی کا سوچتا تھا لیکن ولی کی منگنی علیزے سے ہونے کے بعد میں نے صبر کر لیا تھا۔
بیٹی دے کر نہ سہی لے کر تو میں یہ رشتہ قائم و دائم رکھ سکتا ہوں۔'' شہباز صاحب نے پُر جوش ہوتے
ے کہا۔

''جی بالکل!'' نیلوفر نے بھی حامی بھری۔ شہباز صاحب ہر طرح کی بات کر کے پھر بیٹھے تھے نیلوفر کو
ا ہونے لگی کہ اب وہ مزید کیا کہنا چاہتے ہیں۔

''میں حج پر جانا چاہتا ہوں!''

''میری بہت بڑی خواہش ہے!'' شہباز نے کہا۔

''ضرور جائیں، اللہ یہ خوش قسمتی ہر شخص کو نصیب کرے۔'' نیلوفر نے آہ بھر کہا۔

خود دیارِ حبیب اور اللہ کے گھر جانا چاہتی تھیں لیکن کیا کرتیں محرم کے بغیر وہ کیسے جاتیں۔

طارق نے حامی تو بھری تھی لیکن Special Service میں ہونے کی وجہ سے اُسے فوری اجازت ن
مل رہی تھی، بات اگلے سال یا اُس سے اگلے سال پر جا پڑی تھی اور نیلوفر کے اندر تو آگ لگی ہوئی تھی ا
وہ کسی طرح اللہ کے گھر کو اپنی نگاہوں سے دیکھ اور محسوس کرلیں۔

"آپ بھی ساتھ چلیں، کاغذ جمع ہو رہے ہیں آج کل۔" شہباز صاحب نے اُن سے کہا۔

"میں؟ میں بھلا آپ کے ساتھ کیسے جاسکتی ہوں؟" بات وہی محرم اور نامحرم کی تھی۔

"کیوں! آپ جانا نہیں چاہتیں، طارق نے تو کہا تھا کہ وہ بہت شرمندہ ہے کہ آنٹی کی اس خواہش
اس سال پورا نہیں کرسکتا۔ لیکن آپ شاید جانا نہیں چاہتیں۔" شہباز نے آہستگی سے کہا۔

"نہیں! ایسی بات نہیں ہے میں تو ہر پل بہت تڑپ کے ساتھ گزار رہی ہوں، لیکن آپ کے سا
کیسے جاسکتی ہوں آپ تو نامحرم ہیں اور حج تو محرم کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔" نیلوفر کو مجبوراً کھل کر کہنا پڑا۔

"ہاں تو آپ اپنے محرم کے ساتھ ہی جائیے گا۔" شہباز صاحب نے بالآخر وہ کہہ ہی دیا، جس ک
لیے وہ ایک گھنٹے سے بیٹھے تھے۔

"مطلب؟" نیلوفر نے حیرانی سے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ ساری زندگی خسارے میں گزر گئی اب چند دن جو باقی ہیں وہ کم از کم خسارے میں
گزریں۔" شہباز صاحب نے گہری سانس بھری۔

نیلوفر سوچ میں مبتلا ہوگئیں۔

"اب جب مجھے کسی چیز اور رشتے کی طلب نہیں رہی تو پھر یہ کیوں؟" نیلوفر نے بے اختیار کہا۔

"اس لیے کہ مجھے اور تمہیں اب ایک دوسرے کے سہارے کی ضرورت ہے۔" شہباز صاحب
کہا۔

"نہیں شہباز صاحب! اب میرے لیے اللہ ہی کافی ہے۔"

"جب دو مسافروں کی منزل ایک ہی ہو تو ہاتھ تھام کر چلنے میں اللہ کی جانب سے آسانیاں اور رحم
زیادہ ملتی ہیں۔ نیلوفر عمر کا سنہری دور گزر چکا، شام سے کے اس مسافر کو نراش نہ کرو، میں کہیں نہ کہیں ط
بھی تمہارا قصور وار مانتا ہوں، مجھے تمہاری انا، نسوانیت کو یوں پیروں تلے نہیں روندنا چاہیے تھا، م
سے اچھے دوستوں کی طرح بھی تو معاملے کو بگڑنے سے بچا سکتا تھا۔ مگر اب ختم ہونی چاہیے یہ تنی ہوئی
پر چلنے کی آزمائش! لیکن اگر تمہارا دل نہیں مانتا تو میں مجبور نہیں کروں گا۔" شہباز اُٹھ کر کھڑے ہوئے
باہر نکلنے لگے کہ نیلوفر ایک دم اٹھیں۔

"سنیں! وہ والی تو بات ادھوری رہ گئی!" نیلوفر نے انہیں بہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔

"کون سی؟" شہباز صاحب نے پوچھا۔

"یہی کہ میرے کاغذات کب جمع کروائیں گے، میں تو اسی سال حج پر جانا چاہتی ہوں اور وہ بھی ا
محرم کے ساتھ۔" نیلوفر نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

شہباز جن کا چہرہ ایک دم تاریک پڑ گیا تھا نیلوفر کی بات سن کر ایک دم چمک اٹھا اور وہ بھی خوش
سے مسکرا دیے۔

"جب روشنی کی لو کم ہو جائے تو ساتھی کے دیے کا تیل لو کو بڑھا دیتا ہے نا۔"

❖❖☽❖❖

"گڑیا! تم نے بتایا ہی نہیں کہ تمہارے پیپر اتنے شان دار ہوئے۔" ولی نگینہ کا سر گود میں رکھے بیٹھا
تھا۔

"پیپر؟" نگینہ نے غائب دماغی سے پوچھا۔

"تمہارے فائنل پیپر؟" ولی نے یاد دلایا۔

"ہاں!" نگینہ کو یاد آیا۔

"لیکن آپ کو کیسے پتا چلا بھیا؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"وہ اس طرح کہ نگینہ نے اپنے کالج میں ٹاپ کیا ہے۔" طارق نے ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوتے
ہوئے کہا۔

طارق کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ اور پھول تھے اُسی نے کچھ دیر پہلے ولی کو فون کر کے بتایا تھا کہ نگی کا
شان دار رزلٹ آیا ہے۔

"سچ!" نگینہ اتنے دنوں میں پہلی بار مسکرائی تھی اپنوں کی محبتیں اُسے ہاتھ تھام کر واپسی کے رستے پر
لائی تھیں۔

سفر سست سہی لیکن بہرحال جاری تھا اور نگینہ کے پیاروں کو یقین تھا کہ اُن کا پیار اور دعائیں اُسے
جلد نارمل کر دیں گی۔

"سچی یار!" ولی نے بہن کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

وہ چھوٹی سی گڑیا ہی تو تھی اس کے لیے، ہر چیز سے ڈرتی ہوئی معصوم چڑیا، جو اچانک بھیڑیوں میں
پھنسی تھی۔ ولی کا بس چلتا تو اُس کا ہر غم اپنے اوپر اوڑھ لیتا اور ساری خوشیوں کی ردا اُسے اوڑھا دیتا۔

"بھائی! میں پاس ہوگئی؟" نگینہ پھر پوچھ رہی تھی۔

"صرف پاس! یار تم نے کالج میں ٹاپ کیا ہے!" ولی نے بہن کو کندھے سے لگایا، اس دوران طارق
راتے ہوئے مٹھائی کھول چکا تھا۔

"ابھی تو آپ مٹھائی ہماری طرف سے کھائیں لیکن ہمیں تو آپ کے کھاتے میں سے باہر ٹریٹ لینی
" طارق نے مطالبہ کیا۔

"کیوں نہیں یار! جہاں کہو گے، وہیں ڈنر کر لیتے ہیں، نگینہ تم بھی اپنی کسی دوست کو انوائٹ کر لینا۔"
نے پُرجوش انداز میں کہا۔

"باہر کھانا؟ دوستوں کو انوائٹ۔" نگی کی آنکھیں کسی خوف سے پھیل گئیں۔ ولی اور طارق دونوں نے
کے اس خوف کو شدت سے محسوس کیا۔

"باہر کھانا کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" ولی جانتا تھا کہ وہ گئے دنوں میں باہر جانے پر خوف زدہ
رہی ہے، ایک آدھ بار ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا تو وہ سارے راستے روشن آرا کی گود میں گھسی رہی

’’میں باہر نہیں جاؤں گی۔ وہ مارک، وہ مجھے پکڑ لے گا!‘‘ نگی نے ناخن چباتے ہوئے کہا۔

’’کسی کی مجال نہیں ہے کہ تمہیں نگاہ اٹھا کر دیکھے، ہم دونوں تمہارے ساتھ ہوں گے پھر یہ تو پولیس ہے اس کے پاس پستول ہوتی ہے یہ غلط لوگوں کو مار دیتا ہے۔‘‘ ولی نے طارق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

’’ان کے پاس پستول ہے؟‘‘ نگی نے دھیرے سے پوچھا۔

’’ہاں! یہ دیکھو۔‘‘ طارق نے اپنی پاکٹ سے ریوالور نکال کر سامنے کیا۔

’’اس سے کوئی بھی مر سکتا ہے؟‘‘ نگی نے پوچھا۔

’’ہاں!‘‘ جواب ولی نے دیا، لیکن طارق نے بہت چونک کر اُسے دیکھا، وہ خاموشی سے نگی کا جائزہ لے رہا تھا۔

’’تو پھر میں اِس سے اُس کو ماردوں گی!‘‘ نگی نے اچانک طارق کے ہاتھ سے پستول جھپٹ کر لے لیا۔

’’نگی! یہ کیا حرکت ہے؟‘‘ طارق اور ولی دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

’’پستول واپس کرو!‘‘ ولی نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

’’نہیں!‘‘ نگی نے ضدی بچوں کی طرح انکار کیا۔

احمد شاہ اور روشن آرا دونوں حسن آرا بیگم کے ہاں گئے ہوئے تھے گھر میں کوئی اور نہ تھا، ولی بے حد پریشان ہوگیا۔ اچھی بھلی نگی اچانک عجیب سی حرکتیں کرنے لگتی تھی۔

’’تم اس سے کس کو مارنا چاہتی ہو؟‘‘ طارق باتیں کرتا کرتا اُس کے قریب آیا۔

’’مارک کو، اُس کے ساتھیوں کو، اس گندی عورت راگنی کو، سب کو!‘‘ وہ چند دن وہاں رہ کر سب بھیڑیوں کے نام جان گئی تھی۔ اُس نے اُن کے شدید قسم کے مظالم بھی دیکھے تھے، دوسری لڑکیوں پر ہوتے بھی اور خود پر بھی۔

’’ٹھیک ہے اُن سب کا ختم ہونا اچھا ہے۔‘‘ طارق نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اُس نے نظروں سے ولی کو اشارہ کیا کہ وہ آگے نہ بڑھے، سحرش جیسی جنونی لڑکی کے ساتھ رہتے رہتے طارق کو اچھی خاصی پریکٹس ہوگئی تھی کہ ایسے حالات سے کیسے نپٹا جاتا ہے۔

اُس نے نگی کو باتوں میں لگا کر اُس کے ہاتھ سے پستول ایک دم اُچک لی۔

’’مجھے دے دو، میں اس سے اُن کو ماروں گی!‘‘ وہ چلائی اور پھر چلاتی ہی چلی گئی۔ ولی نے اُسے ا... کر لاکھ سمجھایا لیکن وہ چپ نہ ہوئی۔ طارق نے آگے بڑھ کر نگینہ کے منہ پر تھپڑ مارا۔ نگی ایک دم چپ ہوگئی۔

’’چپ!‘‘

’’چپ!‘‘

’’خبردار، جواب پاگلوں کی طرح چیخی۔ ’’تم نارمل ہو، نارمل رہو! خبردار جو تم نے ابنارمل behave کیا!‘‘ طارق ولی کا لحاظ کیے بغیر بولا، آج وہ ولی پر بھی ایک دم کھل گیا تھا۔

’’تم ایک مسلمان لڑکی ہو! اگر تم کو اللہ پر یقین ہے تو یقین رکھو کہ اللہ ہی نے تمہاری حفاظت وہاں کی ...کوئی لڑکی کبھی بچ کر نکل نہ سکی تھی، لیکن تم بچ کر آئی ہو، اس کا مطلب ہے کہ وہ ہمیشہ تمہارے ساتھ ...اور جن کے ساتھ اللہ رہتا ہے وہ کبھی نہیں ڈرتے، اگر انکار نہیں ہے تو تم ثابت کرو کہ تم اس کو اور ...کی رحمتوں کو مانتی ہو اور شکرگزار بھی ہو۔‘‘ طارق نے بات کرتے کرتے پانی کا گلاس بھرا اور اُسے ...یا۔

...کی چہرے پر یک ٹک ہاتھ رکھے اُسے دیکھ رہی تھی، اُس کے پانی پکڑانے پر چپ چاپ پانی پی گئی۔ ...نے حیرت سے نگی کو دیکھا۔ اتنے دنوں کی وحشت جو اُس کی آنکھوں اور چہرے پر تھی وہ اِس وقت ...تھی ولی کو ایک دم ایک واضح منظر نظر آ رہا تھا۔

’’صرف طارق ہی ہے، جو نگی کے لیے بہترین پارٹنر ثابت ہوسکتا ہے، کیا ایسا ہوسکتا ہے؟‘‘ ولی نے ...ا۔

’’میں بابا امّاں سے ضرور اس ایشو پر بات کروں گا۔‘‘

’’جناب! آپ بھی مراقبے سے واپس آجائیں!‘‘ طارق نے مٹھائی کا ایک ٹکڑا ولی کو تھماتے ہوئے ...ا۔

’’نارمل رہو یار تم سب اور نارمل رہنے دو سب کو!‘‘ طارق تھک کر صوفے پر ڈھے گیا۔

...گی ہلکے ہلکے سُڑک سُڑک کر رہی تھی ولی کو ایک دم ہنسی آ گئی، کچھ دیر پہلے اُس کی بہن بھوکی شیرنی بنی ...تھی اور اب کیسے بھیگی بلی بنی ہوئی تھی۔

’’تم کو کیا ہوا ہے؟‘‘ ولی نے طارق سے پوچھا۔

’’کچھ نہیں یار! زندگی نہ ہوئی آزمائش مسلسل ہوگئی ہے، میرے لیے خاص دعا کرو یار، میں اس آزمائش سے نکل جاؤں۔‘‘ ایسا کہتے ہوئے طارق کی نگاہوں کے سامنے سحرش کا چہرہ گھوم گیا۔

عجیب بے بسی تھی پہلے سحرش کا پاگل پن وہ جھیلتا رہا اب نگینہ بھی ہوش گم کرلیتی تھی۔

وہ زندگی کو نارمل اور خوش ہوکر جینے کا شدت سے خواہاں تھا۔

’’مجھ سے زیادہ Critical ہے تمہاری Situation؟‘‘ ولی نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

’’تم تو دو کشتیوں کے سوار نہیں ہو میری طرح! میری تو مجبوری ہے کہ مجھے دونوں کشتیوں پر ہر صورت سوار ہوکر زندگی گزارنی ہے، میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چوائس ہے بھی نہیں!‘‘ طارق نے دل میں ...لے کر ٹھنڈی آہ بھری۔

’’یار کہاں ہیں تمہارے سارے ملازم! کوئی جوس پانی چائے نہیں پلائی، پلیز نگینہ اگر آپ ہی بنا دو کچھ میں زیادہ مشکور ہوں گا۔‘‘ طارق نے جان بوجھ کر نگینہ کو کہا۔

گزشتہ کچھ عرصے سے نگینہ نے روزمرہ زندگی میں حصہ لینا بند کیا ہوا تھا۔ لاکھ کہنے پر بھی وہ گم رہتی تھی لیکن آج طارق کے کہنے پر وہ چپ چاپ اٹھ کھڑی ہوئی۔

’’معجزہ ہوگیا!‘‘ ولی نے خوش ہوکر کہا۔

’’یار! معجزے بھی تو دنیا میں ہی ہوتے ہیں!‘‘ طارق نے ہنستے ہوئے کہا۔

’’لیکن سوری! میں نے نگی کو مارا!‘‘ طارق نے ولی سے معافی مانگی۔

’’اللہ کرے نگی اتنے حواسوں میں آئے کہ وہ خود لڑے کہ تم نے اُسے مارا، پھر تم اُسی سے معافی مانگنا۔‘‘ ولی نے خوش دِلی سے کہا۔

نگینہ کے نارمل Behave کی قیمت اگر ایک تھپڑ تھا تو وہ باخوشی قبول کر سکتا تھا۔

’’اور کوئی نئی تازی!‘‘ ولی نے طارق سے پوچھا۔

’’میرے ہاں بیٹا ہوا ہے۔‘‘ طارق نے جل کر کہا۔

وہ سحرش کے روّیے سے بہت اپ سیٹ تھا۔

’’مبارک ہو!‘‘ ولی نے مسکرا کر کہا۔

کافی عرصے بعد اُن کے درمیان نوک جھوک ہوئی تھی۔

’’ویسے تمہیں یاد دلانا تھا کہ ترتیب سے کام کیا کرو، پہلے شادی کرنی تھی پھر بیٹا پیدا کرنا تھا۔‘‘ ولی نے اُسے چھیڑا۔

’’میں تو شادی کر ہی لوں گا، تم بتاؤ یہ کیا تماشا ہے؟‘‘ طارق نے اپنی جیکٹ سے ایک کارڈ سامنے کرتے ہوئے کہا۔

’’کارڈ ہے!‘‘ ولی نے بے نیازی سے کہا۔

’’جانتا ہوں، لیکن یہ شادی کا کارڈ ہے!‘‘ طارق نے غصّے سے کہا۔

’’تو کیا ہوا؟‘‘ ولی نے بے حد پُرسکون ہو کر کہا۔

’’کیا ہوا؟‘‘

’’تم نہیں جانتے؟‘‘

’’تم جان بوجھ کر خودکشی کر رہے ہو، تم اُس فراڈ انسان کی بیٹی سے شادی کر رہے ہو!‘‘ طارق نے غصے سے کہا۔

’’اس میں اُس لڑکی کا کیا قصور ہے! پھر یہ امّاں جان کی خواہش ہے کہ اُسے رخصت کروا کر لے آیا جائے، میں اپنی ماں کی خواہش کو حکم مانتا ہوں۔‘‘ ولی نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

’’اور علیزے؟‘‘ طارق نے حیرت سے پوچھا۔

’’وہ اب نامحرم ہے میرے لیے، کسی اور کی عزت ہے میرے لیے اگر وہ میری محبت تھی تو آج، میرے دِل میں محرم ہے یہی اصولِ زندگی ہے، جو اللہ کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔‘‘ ولی کی بات پر طارق کا بے اختیار دِل چاہا کہ ایسے مضبوط انسان کو سلام کرے۔

’’تم بھی نا!‘‘ طارق کچھ کہہ نہ پایا اور اُٹھ کر اُسے گلے لگالیا۔

’’سدا خوش رہو یار! تیرے جیسے انسان ہی انسانیت کا سمبل ہوتے ہیں، ہم جیسے لوگوں کے لیے سبق آموز ہوتے ہیں۔‘‘ طارق کہے بنا نہ رہ سکا۔

’’یار! میں کیا ہوں، میں خود نہیں جانتا لیکن بس اپنی سی کوشش کی ہے، تم میرے لیے دعا کرنا کہ میں اس آزمائش پر پورا اتروں۔‘‘ ولی نے دھیرے سے کہا۔

’’صاحب باہر مہمان آئے ہیں۔‘‘ اُسی پل ملازمہ نے آ کر کہا۔

’’کون ہیں؟‘‘ ولی نے پوچھا۔

’’عبداللہ صاحب اور اُن کی والدہ ہیں۔‘‘ ملازمہ نے جواب دیا۔

’’بھیج دو!‘‘ ولی نے ملازمہ کو جواب دیا۔

’’السلام علیکم! چشم ماہ روشن دِل ناشاد!‘‘ ولی نے بہت خوش دلی سے عبداللہ کو ویلکم کیا۔

’’السلام علیکم آنٹی!‘‘ ولی نے مریم بی بی کو سلام کیا۔

مریم بی بی یک ٹک ولی کو دیکھ رہی تھیں اُن کی تو نظروں کی پیاس ہی نہ ختم ہو رہی تھی آج وہ زبردستی عبداللہ کو لے کر یہاں آئی تھیں، وہ ولی کے ماں باپ سے ملنا چاہتی تھیں تا کہ سچائی تک جائیں، وہ سچائی جو اُن کا دِل انہیں بتاتا تھا۔

’’وعلیکم السلام! جیتے رہو، شاد رہو، آباد رہو!‘‘ مریم بی بی نے آگے بڑھ کر ولی کو سینے سے لگالیا۔ ولی کو ان سے بہت مانوس خوشبو آئی۔

’’آپ بیٹھیں پلیز!‘‘ ولی نے انہیں بٹھایا اور ملازمہ کو چائے لانے کا کہا۔

’’یہ میرے بہت پیارے دوست طارق ہیں!‘‘ ولی نے طارق کا تعارف کرایا۔ کچھ دیر وہ ہلکی پھلکی گپ شپ کرتے رہے نگینہ بھی اُن کے پاس آ بیٹھی تھی۔

’’اچھا یار! میں چلتا ہوں۔‘‘ طارق نے نگینہ کو ایک نظر دیکھ کر کہا اور اجازت لے کر باہر نکل آیا۔

’’آپ کی امی کب تک آجائیں گی بیٹا؟‘‘ مریم بی بی نے بے صبری سے سوال کیا۔

’’ابھی کچھ دیر میں آجائیں گی۔‘‘ نگینہ نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا، جس طرح پیار سے یہ خاتون اُس کو بار بار لپٹا کر پیار کر رہی تھی۔ نگینہ کو نا جانے کیوں بہت اچھا لگ رہا تھا۔

’’صاحب باہر اور مہمان آئے ہیں۔‘‘ ملازمہ نے ایک بار پھر آ کر کہا۔

’’بڑے بھائی! ہم آئے بہار آئی، ساتھ رحمت کی لہر بھی آئے مزید مہمان آگئے ہیں، آپ کیا کہیں گے مہمان در مہمان!‘‘ عبداللہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

’’یار! نہ اُردو کی ٹانگ توڑا کرو۔‘‘ ولی نے خوش دِلی سے کہا اور ملازمہ کو مہمانوں کو اندر ہی لانے کا کہا۔

’’سامنے سے نفیسہ بیگم ملازماؤں کے ساتھ بڑے بڑے تھالوں میں کچھ لیے اندر آئی تھیں غالباً وہ کوئی شگن قسم کی رسم کی غرض سے آئی تھیں۔ سید سرفراز علی نے مکان کے معاملے میں اُن کو آگے آگے کیا تھا۔ اب تک وہی اُن کے ہاں آئی تھیں، دولہا کے کپڑوں کا ناپ اور بیڈروم ڈیزائنز وغیرہ کے ساتھ سید سرفراز علی نے ایک Designer ہائر کیا تھا کہ وہ سارے Event کو ڈیزائن کرے آج وہ کچھ شگن لے کر آئی تھیں یہ اُن کے ہاں کی رسم تھی کہ سات قسم کی مٹھائیاں اور دولہا کے کپڑوں کے ساتھ سارے افرادِ خانہ کے کپڑے اور چاندی یا سونے کی تھالی پر دولہا دولہن کے نام کے ساتھ نیوتا دیا جاتا تھا دولہا کے گھر والوں کو۔

جیسے ہی نفیسہ بیگم مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئیں، سامنے بیٹھی مریم بی بی کو دیکھ کر ایک دم سے چکرا

گئیں۔

وقت بدلا ضرور تھا لیکن اتنا نہیں کہ وہ مریم بی بی کو نہ پہچانتیں!

''مریم بی بی!'' نفیسہ بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

''نہ۔ نفیسہ؟ تم زندہ ہو؟'' مریم بی بی نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُن کو دیکھا۔

اُن کو یقین نہیں آرہا تھا کہ سامنے ڈاکٹر فیصل کی سگی بہن نفیسہ کھڑی ہے، جس کو برسوں پہلے ڈاکٹر فیصل نے مرا جان کر سالوں اُن کے لیے آنسو بہائے۔ آج وہ زندہ اُن کے سامنے تھیں۔

❁

برسوں کا سفر دونوں نے لمحوں میں طے کیا تھا کیا کچھ نہ تھا دونوں کی آنکھوں میں! بے بسی، دُکھ، وقت اور رشتوں کو کھو دینے کا دُکھ! لیکن اس کے ساتھ اُن کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھی جھلملا رہے تھے۔

''نفیسہ! تم زندہ ہو! یا میرے اللہ یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں۔'' مریم بی بی نے نفیسہ بیگم کے گلے لگتے ہوئے کہا۔

''اگر سانسیں لینے کو زندہ کہتے ہیں تو پھر میں زندہ ہوں۔'' نفیسہ بیگم نے بھی زار زار آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

''میں! مجھے یقین نہیں آرہا کہ میں تمہیں زندہ سلامت دیکھ رہی ہوں۔'' مریم بی بی نے نفیسہ کے چہرے کے ایک ایک نقش کو ہاتھ سے چھوتے ہوئے کہا جیسے وہ یقین کرنا چاہتی ہوں کہ یہ ایک حقیقت ہے کوئی خواب نہیں۔

''وہ جو اُوپر اللہ بیٹھا ہے نا، جو بار بار یہ کہتا ہے کہ اُس کے لیے مُردوں کو دوبارہ زندہ کرنے میں کوئی مشکل نہیں، وہی زندوں کو بچانے والا ہے، کوئی کیسے کسی کو موت دے سکتا ہے۔'' نفیسہ بیگم نے مریم بی بی کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

وہاں موجود ہر شخص کو بھولے وہ بس آپس میں مگن کھڑی تھیں۔

''امی یہ سب کیا ہے؟'' عبداللہ سے آخر رہا نہ گیا تو وہ آگے بڑھا۔

مریم بی بی نے آگے بڑھ کر بیٹے کو دیکھا پھر وہ نفیسہ بیگم کی جانب دوبارہ مڑیں۔

''نفیسہ یہ، اِس کو دیکھو! کیا تم اِس میں کسی اور کو دیکھ سکتی ہو؟'' مریم بی بی نے عبداللہ کا ہاتھ پکڑ کر اُسے نفیسہ بیگم کے سامنے کرتے ہوئے پوچھا۔ نفیسہ بیگم کو بس ایک پل لگا تھا۔ وہ عبداللہ کو یک ٹک دیکھتی رہ گئیں۔

''فیصل!!''

''فیصل بھائی؟'' نفیسہ بیگم کا رُکا ہوا سانس ایک دم غیر متوازن تنفس میں تبدیل ہوا۔

''میں۔ میرا بھائی فیصل؟''

''مریم وہ۔ وہ زندہ ہے؟'' نفیسہ بیگم دیوانوں کی طرح مریم بی بی سے پوچھ رہی تھیں۔

جواباً مریم بی بی نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اثبات میں سر ہلایا۔

''یہ عبداللہ ہے میرا اور فیصل کا بیٹا!'' مریم بی بی کا انکشاف نفیسہ بیگم کے لیے شادیٔ مرگ کی کیفیت کو

اکٹھا کر گیا۔ وہ ایک دم ہی کھڑے سے بیٹھ گئیں۔

''بھائی! یہ سب کیا ہے؟'' نگینہ نے عبدالولی کا ہاتھ ہلا کر پوچھا۔

خود عبدالولی کچھ عجیب سی کیفیت میں مبتلا تھا اُسے صاف محسوس ہو رہا تھا، جیسے کوئی پنڈورا باکس کھلنے والا ہو۔

''نفیسہ! یہ عبداللہ بھائی کا بیٹا ولی اور نگینہ ہے نا؟'' مریم بی بی نے نفیسہ بیگم کے قریب بیٹھتے ہوئے بے صبری سے پوچھا۔

نفیسہ بیگم نے ایک نظر سامنے دیکھا تو ولی اور نگینہ کے علاوہ وہاں سب افراد تجسس سے کھڑے انہیں دیکھ رہے تھے۔ نفیسہ بیگم کی نظروں کے سامنے احمد شاہ اور روشن آرا بیگم کے نرم اور عاجزی سے بھرے چہرے گھومے۔

''مریم! احمد شاہ بھائی اور روشن آرا بیگم، ولی اور نگینہ کے والدین ہیں۔'' نفیسہ بیگم نے بے حد ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

''نفیسہ! تم جانتی ہو کہ یہ سچ نہیں ہے شکلوں کا ملنا، ناموں کا ملنا کوئی اتفاق تو ہو سکتا ہے لیکن ان کے وجود سے اٹھتی خوشبو بتاتی ہے کہ یہی میرے عبداللہ بھائی کی نشانیاں ہیں۔'' مریم بی بی نے ضدی لہجے میں کہا، وہ زار زار رونے لگیں۔

''امی پلیز! آپ اِس بات کو لے کر نہ صرف خود ڈسٹرب ہوئی ہیں بلکہ سب کو ڈسٹرب کر دیا ہے۔'' عبداللہ نے آگے بڑھ کر ولی سے سوری کیا۔

''اِدھر آؤ عبداللہ۔'' نفیسہ بیگم نے اس کو گلے لگاتے ہوئے ڈھیروں ڈھیر پیار کیا۔

''یہ تمہاری پھوپو ہیں عبداللہ!'' مریم بی بی نے ایک بہت بڑا انکشاف کیا۔ عبداللہ نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔

''لیکن! پاپا تو بتاتے تھے کہ اُن کا دنیا میں کوئی بہن بھائی زندہ نہیں رہا۔'' عبداللہ سوال کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''یہ خوش خبری تو وہ خود بھی نہیں جانتے۔'' مریم بی بی نے آنسوؤں میں کہا۔

''مبارک ہو عبداللہ! تم کو اپنی پھوپو سے ملنا مبارک ہو۔'' ولی نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

نگینہ بھی سارا منظر بے حد دل چسپی سے دیکھ رہی تھی۔

''شکریہ۔'' عبداللہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے آنٹی! پھر چائے پیتے ہیں اِس خوشی میں۔'' نگینہ نے سب کو چائے سرو کی۔

مریم بی بی اب بھی ولی اور نگینہ کو بے صبروں کی طرح دیکھے جا رہی تھیں۔

''نفیسہ! مجھے تو اب تک یقین نہیں آ رہا کہ ولی اور نگینہ میرے عبداللہ بھائی کے بچے نہیں ہیں۔'' مریم بی بی نے نفیسہ بیگم کی طرف مڑ کر کہا۔

''میں نے یہ کب کہا کہ وہ عبداللہ بھائی کے بچے نہیں ہیں، میں نے تو یہ کہا ہے کہ احمد شاہ صاحب بھائی اور روشن بہن اِن کے والدین ہیں۔'' نفیسہ بیگم کا لہجہ مریم بی بی کے اندر تک زندگی اُتار گیا۔

''تو پھر تم نے یہ کیوں کہا بچوں کے سامنے کہ وہ؟'' مریم بی بی کہتے کہتے رُک گئیں۔ ولی اور عبداللہ اُن میں مشغول تھے، جب کہ نگینہ ملازمہ کے ساتھ کچن میں تھی لیکن ولی کے چہرے کا رنگ بتا رہا تھا کہ اندر تک ڈسٹرب ہے وہ باتیں کر رہا تھا لیکن اُس کے چہرے پر موجود پریشانی بہت واضح تھی۔

''مریم! اِس لیے کہ ولی اور نگینہ کو احمد شاہ بھائی اور روشن بہن نے اپنے جگر گوشوں کی طرح پالا ہے یہ کیسے اور کس معجزے کے تحت اُن تک پہنچے، میں نہیں جانتی لیکن اب ہم کو بھی ان پر کوئی حق نہیں ہے کہ اُن کو اپنے والدین سے پل میں اجنبی کروا دیں۔'' نفیسہ بیگم نے کچھ دھیمی سرگوشیوں میں مریم بی بی سے بات کی۔

''میں جانتی تھی، میرا دل کہتا تھا کہ یہ ہمارے نگینہ اور ولی ہیں۔'' مریم بی بی نے پیاسی نگاہوں سے ولی کو ایک بار پھر دیکھا۔

''میں ابھی آتا ہوں عبداللہ۔'' ولی مہمانوں کو کچھ دیر کے لیے چھوڑ کر اندر چلا گیا، وہ روشن آرا بیگم اور احمد شاہ کو تنہائی میں فون کرنا چاہتا تھا اُن کو فوراً یہاں بلانا چاہتا تھا، وہ اُن کو عبداللہ اور اُس کی امی سے ملوانا چاہتا تھا۔

دوسری طرف مریم بی بی عبداللہ کے سامنے بہت سارے راز افشا کر رہی تھیں عبداللہ حیرت اور دُکھ سے ماں اور پھوپو کی باتیں سُن رہا تھا۔

''میرا نکاح تمہارے پاپا سے بھائی عبداللہ نے رات کے اندھیرے میں کروا کر ہمیں راتوں رات اُن سے باہر بھیج دیا تھا، ہم کچھ روز شہر میں رہے۔ بھائی عبداللہ اور عائشہ بھابی ہم سے شہر ملنے صرف ایک بار آئے تھے، بھائی عبداللہ نے اپنی روایات کے خلاف جاتے ہوئے میرے نام کی زمین میرے حوالے کر دی تھی۔ انہوں نے ہم دونوں کا باہر جانے کا پورا پورا بندوبست کروایا تاکہ کچھ عرصے تک ہم سید سرفراز جیسے وحشی اور ظالم انسان سے دُور رہ سکیں۔ فیصل کی ذہنی حالت بہت زیادہ خراب تھی لیکن انہوں نے سدرہ آپی سے کیا وعدہ پورا کیا اور مجھ سے نکاح کیا اور ہم باہر چلے گئے کچھ عرصے بعد بھائی عبداللہ کے دوست کے ذریعے معلوم ہوا کہ سارے خاندان کو سید سرفراز علی نے زندہ جلا کر مار ڈالا، وہ گاؤں، جو اِس ملک میں میرا میکہ تھا، میری جڑیں تھا، میرا تعلق تھا جب وہی نہ رہا تو میرے لیے پاکستان میں اپنا علاقہ سوائے ایک ناسور کے کچھ نہ رہا تھا۔ پھر فیصل تھے، جن کا خاندان مارا جا چکا تھا جب کچھ نہ رہا تو ہم نے مُڑ کر نہ دیکھا کہ پاکستان جانا بھی ہے۔ لیکن اللہ نے سالوں سے چلتے اِس چھپے زخم کو شاید بھرنا تھا اِس لیے عبدالولی سے میری ملاقات کروائی۔ وہ کہاں سے مجھ سے آ کر ملا یہ سوائے اللہ کی Plannin[g] کے کچھ نہ تھا میں اُس کی کشش کو لیے یہاں آئی اور بہو حاصل کی، ایک اور رشتہ یہاں سے ملا۔ آج جب میں فیصل کو بتاؤں گی کہ اُن کی بہن زندہ ہے تو اُن کے دِل کا وہ کونا جو مر چکا ہے وہ پھر زندہ ہو جائے گا وہ اب ضرور پاکستان آئیں گے۔'' مریم بی بی نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

''جس رات سید سرفراز علی نے ہمارے گھر اپنے بندوں کے ذریعے حملہ کروایا تھا، اُس رات وہ سب مار گئے تھے سوائے میرے، مجھے وہ اٹھا کر لے گئے تھے فیصل بھائی کو اس لیے پتا نہ چلا کیوں کہ وہاں گھر جلا دیا گیا تھا، سب گاؤں والوں کا خیال تھا کہ پولیس نے ڈاکوؤں کو پکڑنے کے لیے فائرنگ کی

ہے، جس کی زد میں میرے گھر والے آ گئے اور ڈاکوؤں ہی میں سے کوئی جاتے جاتے ہمارے گھر آ گ لگا گیا، لیکن جس کو اللہ بچانا چاہتا ہے اُسے کوئی نہیں مار سکتا، سید سرفراز علی نے مہینوں تہہ خانے میں رکھ کر مجھے جسمانی ذہنی اذیت دی، پھر جانے کیسے سید عبداللہ تک میری خبر پہنچ گئی، انہوں نے ہی مجھے آزاد کروایا اور پنچایت کے سامنے لا کھڑا کیا۔

میری حالت اِس قدر غیر تھی کہ شاید میں زندہ نہ بچ پاتی اور اگر بچ بھی جاتی تو میرا ٹھکانا کہاں ہوتا سید سرفراز علی نے اس مکاری سے اپنا کیس لڑا کہ میرے حق میں کوئی گواہ نہ مل سکا، لیکن میری حالت بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا پنچایت نے سید سرفراز علی کے خلاف ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے اُسے کیا اور میری حالت کی خرابی کی وجہ سے اور میرے مستقبل کو بچانے کے لیے مجھے اُس ظالم کے حوالے کر دیا اور میرا نکاح سید سرفراز علی سے کر ڈالا۔ اس نکاح کے حق میں پیش پیش عبداللہ بھائی تھے انہوں نے بہت پیار سے مجھے بتایا تھا کہ میری بدنامی کا سانپ اتنا زہریلا ہے کہ میں کبھی بھی باہر نکل اس سے بچ نہ پاؤں گی لیکن سید سرفراز علی نے پنچایت کے پریشر میں آ کر یہ فیصلہ لیا ہے وہ مجھے مزید نقصان پہنچائے گا، پھر انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ حالات بہتر ہوتے ہی وہ مجھے فیصل بھائی تک پہنچا دیں گے لیکن وہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے کیوں کہ سید سرفراز علی نے انہیں مار ڈالا تھا لیکن وہ جاتے جاتے سرفراز علی کو بہت ساری سے کر گئے تھے۔'' نفیسہ بیگم نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

عبداللہ شاک کی کیفیت میں تھا ابھی تو اُس نے اِن سب باتوں کا پس منظر نہ جانا تھا تو وہ اِس قدر دُکھی تھا اگر وہ سب جان جاتا تو یقیناً اُسے اپنے جذبات پر قابو نہ رہتا۔

''اور بڑے بھائی۔؟''

''میرا مطلب ہے عبدالولی بھائی کے ساتھ ہمارا کوئی تعلق ہے کیا، کوئی بلڈ ریلیشن! جیسا کہ امی بتا لی ہیں کہ وہ؟'' عبداللہ دروازے میں کھڑے عبدالولی کو دیکھ کر چپ ہو گیا، سب کی نظریں سامنے کھڑے ولی پر تھیں، جو بہت چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا کمرے کے عین وسط میں آ کھڑا ہوا تھا، اُس نے بے اختیار لب کچلے تھے۔

''آنٹی مریم! میں اور نگینہ صرف احمد شاہ کے بچے ہیں ہمارے والدین ہماری زندگیوں کا بہت بڑا سرمایہ ہیں، گواہیاں تو دِل دیتا ہے نا! میرے دِل نے کبھی یہ گواہی نہیں دی کہ وہ ہمارے والدین نہیں ہیں۔'' عبدالولی نے تابع داری اور محبت کی ساری سرحدیں پھلانگ دی تھیں سارے Facts سارے احساسات، ساری سکس سینس ہر چیز کو اُس نے اِس بھرم پر قربان کر دیا تھا۔ اندر آنے کے لیے کھڑے احمد شاہ نے بہت واضح انداز میں یہ ساری باتیں سنی تھیں۔

ولی کی اس قدر محبت نے اُن کو Speechless کر دیا تھا۔ وہ بہت اعتماد سے اندر داخل ہوئے اور سب کو با آواز بلند سلام کیا۔

''معافی چاہتا ہوں، آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی، میری بیگم تو اپنی بہن کے ہاں موجود ہیں، ولی نے مجھے بہت ارجنٹ آنے کی درخواست کی تھی۔'' احمد شاہ نے صوفے پر عبدالولی کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا۔ اُن کی مخاطب نفیسہ بیگم تھیں۔

احمد شاہ اور عبدالولی کے چہروں میں ایک ایسے نقش کی مماثلت تھی کہ وہ کسی اندھے کو بھی کافی تھی، جاننے کے لیے کہ وہ دونوں باپ بیٹا بے چین تھے، دونوں کے چہرے بے حد روشن اور آنکھوں میں بے حد پاکیزگی تھی۔

''بابا جان! یہ عبداللہ ہے یہ اُن کی ماما ہیں۔'' عبدالولی نے اُن کا تعارف کروایا۔ عبداللہ نے باقاعدہ قریب آ کر احمد شاہ سے ہاتھ ملایا۔

احمد شاہ نے بے حد کھلے دل سے عبداللہ سے ہاتھ ملا کر سلام دُعا کی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ عبداللہ اب علیزے کا شوہر ہے، وہ علیزے جس کے متعلق آج اُن کی بیوی نے راستے میں بتایا تھا کہ وہ ولی کی محبت تھی لیکن وہ اللہ کے ہر فیصلے کو ماننے والوں میں سے تھے، دل کی ساری رضا کے ساتھ پھر وہ کیوں اپنے دِل میں بال برابر بھی ملال لاتے۔

''میں کچھ شگن لے کر آئی تھی لیکن یہ نہ جانتی تھی کہ یہاں سے جاتے ہوئے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی بھی حاصل کر کے جاؤں گی۔'' نفیسہ بیگم نے نم آنکھوں کو صاف کر کے مسکرا کر کہا۔

''مریم بی بی میری بھابی ہیں، میرا بھائی ڈاکٹر فیصل جو برسوں پہلے مجھ سے بچھڑ گیا تھا آج اُس کا پتا چل گیا ہے۔ احمد بھائی آپ کا گھر اور آپ لوگ اتنے بابرکت ہیں کہ میرے دِل میں جلتی برسوں کی آگ آپ کے یہاں آنے سے بجھ گئی ہے۔'' نفیسہ بیگم نے بہت پیار سے مریم بی بی اور عبداللہ کو دیکھا۔

''آپ کو بے حد مبارک ہو! اللہ تعالیٰ کی ذات کا لاکھ لاکھ شکر ادا کریں کہ اُس مولا نے آپ کو ایسی خوشی دی، جس کی اُمید بھی آپ کو نہ تھی۔'' احمد شاہ نے نفیسہ بیگم کو مبارک باد دی۔

نفیسہ بیگم نے احمد شاہ سے شگن کی رسم کی اور چلنے کو اُٹھ کھڑی ہوئیں، اس ساری رسم کو عبداللہ نے اپنے موبائل فون کے کیمرے سے کوّر کیا۔

''پاپا! آج رات ایک گڈ سرپرائز کے لیے تیار رہیے گا۔'' عبداللہ نے تصویریں اور ویڈیو بناتے ہوئے دِل میں کہا۔

دوران تقریب احمد شاہ نے بہت پیار سے ولی کو دیکھا۔

''میں تم پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے بیٹا!'' احمد شاہ نے ولی کو گلے لگا کر کہا۔ ولی کے جلتے دِل پر کسی نے ٹھنڈی پھوار ڈالی۔

''تھینکس بابا!'' ولی نے بے اختیار کہا۔

''اچھا بھابی میں چلتی ہوں۔'' نفیسہ بیگم کا دِل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ مریم بی بی سے الگ ہوں، اُن کو مریم بی بی اور عبداللہ کے وجود سے اپنے بھائی کی خوشبو آ رہی تھی۔

''نہ جاؤ اُس جہنم میں واپس نفیسہ! ہمارے ساتھ چلو!'' مریم بی بی نے بے حد پیار سے نفیسہ بیگم کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''بھابی! میری ذات کے جتنے نقصان ہونے تھے اور میری زندگی کا جتنا حصہ برباد ہونا تھا، وہ تو ہو چکا اب ڈر کیسا؟ لیکن اب مجھے اپنی ذات کے علاوہ کسی اور کی زندگی بھی پیاری ہے۔'' نفیسہ بیگم کے دماغ

کے پردے پر مسکان کا معصوم چہرہ گھوم گیا۔

''کون ہے وہ؟'' مریم بی بی پوچھے بنا رہ نہ سکیں۔

''مسکان! سید سرفراز اور صائمہ بی بی کی اکلوتی بیٹی۔'' نفیسہ بیگم نے کہا۔

''تم! تم اُس ظالم شخص کی بیٹی کے لیے فکر مند ہو، جس نے تمہاری ساری زندگی تباہ کر ڈالی۔'' مریم بی بی نے غصّے سے کہا۔

''مریم! وہ سید سرفراز کی بیٹی نہیں ہے وہ صرف اور صرف حویلی کی بیٹی ہے!'' نفیسہ بیگم نے بے اختیار ٹھنڈی سانس بھری۔

مریم بی بی دُکھ سے نفیسہ بیگم کو دیکھ کر رہ گئیں۔

''مسکان، سید سرفراز کی بیٹی نہیں ہے وہ تو حویلی کی بیٹی ہے اُس منحوس اور خونی حویلی کی بیٹی، جہاں پر پیدا ہونے والی ہر بیٹی کی قسمت ایک جیسی ہوتی ہے، اُن کے دُکھ بھی ایک جیسے ہوتے ہیں اور اُن کے آنسو بھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ میری مسکان نے بھی ہر جہنم کو جھیلا ہے کیوں کہ وہ بھی تو حویلی کی بیٹی تھی نا!'' نفیسہ بیگم نے نم آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے بھیگی بھیگی آواز میں کہا۔

کچھ فاصلے پر کھڑے عبدالولی، عبداللہ اور احمد شاہ باتیں کررہے تھے نفیسہ بیگم اور مریم بی بی دروازے کے پاس کھڑی مدھم لہجے میں باتیں کررہی تھیں، نفیسہ بیگم نے بے حد پیار سے عبدالولی کو دیکھا۔

''وہ۔ وہ عبدالولی ہے! تم جانتی ہو نا کہ اُس کی رگوں میں کس پیارے انسان کا خون دوڑ رہا ہے وہ اپنے باپ کا ادھورا چھوڑا ہوا کام کرنے جارہا ہے قدرت نے اُسے خود منتخب کیا ہے، یہ بچہ اُس حویلی کا نجات دہندہ بنے گا مریم۔'' نفیسہ بیگم نے کچھ پُرجوش انداز میں کہا۔

''سید سرفراز علی کے ظلم کا اتنا لمبا دور دیکھ کر لگتا تھا کہ اُمید کا سورج شاید اب کبھی اُگے گا ہی نہیں کہ جس دن روزِ حساب روشن ہوگا۔ لیکن دیکھو آج تم اور میں بھی مل رہے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ اوپر والا ''بے نیاز'' سہی لیکن وہ اپنے بندے کو ستر ماؤں کے پیار سے زیادہ پیار بھی کرتا ہے وہ کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہونے دیتا۔'' نفیسہ بیگم نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

''مسکان تب میری گود میں آئی، جب یہ چند دن کی تھی میں اپنے بچے کو کھو چکی تھی۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ دُنیا میں نہ رہا ورنہ اُس کا وجود مجھے ایک کالی رات اور اپنے کالے ماضی کی یاد دلاتا رہتا۔'' نفیسہ بیگم نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

''لیکن میں نے اِس بچی کو سینے سے ہمیشہ لگا کر رکھا مگر میں اُس کی قسمت نہ بدل سکی، جانے اب کیوں لگتا ہے کہ وقت بدل جائے گا!''

''وہ بچہ بدلے گا سب کچھ!'' نفیسہ بیگم نے ایک بار پھر عبدالولی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ تینوں اُن کی جانب ہی آرہے تھے۔

نفیسہ بیگم ایک بار پھر عبداللہ کو گلے لگا کر ملیں، دوسری جانب مریم بی بی بھی اپنی تڑپ پر قابو نہ رکھ سکیں انہوں نے بھی عبدالولی کو خوب لپٹا لپٹا کر پیار کیا۔

''ہم چلتے ہیں بڑے بھائی!'' عبداللہ نے ماں کو کندھوں سے تھام کر الگ کیا۔

''آپ لوگ ہوٹل سے یہاں کیوں نہیں شفٹ ہو جاتے۔'' احمد شاہ نے کھلے دل سے اُن کو آفر دی۔

''نہیں بھائی صاحب! آپ اِس تکلف میں نہ پڑیں ہم وہاں آرام سے ہیں۔'' مریم بی بی نے گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے کہا۔ یہ گاڑی عبداللہ نے پاکستان آتے ہی رینٹ پر لے لی تھی لیکن وہ پاکستان میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے ہمیشہ گھبرا جاتا تھا، جہاں کوئی بھی رولز اینڈ ریگولیشن ماننے کو تیار نہ تھا۔

''تکلف تو آپ کررہی ہیں! بھائی بھی کہہ رہی ہیں لیکن بھائی ہونے کا مان بھی نہیں دے رہیں، بھائیوں کے گھر ہوتے ہوئے بھلا بہنیں ہوٹلوں میں ٹھہرا کرتی ہیں؟'' احمد شاہ کا اصرار اس قدر پیارا تھا کہ مریم بی بی کو حامی بھرنا ہی پڑی کہ وہ یہاں شفٹ ہو کر عبدالولی کی شادی کی تقریبات کو انجوائے کرسکیں گی۔

جب عبدالولی اور احمد شاہ سب کو رخصت کر کے اندر آئے تو نگینہ کو شگن کی لائی ہوئی چیزوں کو دِل چسپی سے دیکھتے دیکھا تو احمد شاہ نے بے اختیار اللہ کا شکر ادا کیا کہ اُن کی بیٹی اب نارمل Behave کرنے لگی تھی۔

''ولی بیٹا! نگینہ میں یہ مثبت روّیہ کتنا اچانک ہے نا۔'' احمد شاہ کہے بغیر نہ رہ سکے۔

''بالکل! ہے تو سہی! لیکن اِس کا پراپر علاج ہوا تھا اور آپ جانتے ہیں کہ وہ علاج کیا ہوگا۔''

''وہ ہے دِل سے مارا ایک عدد تھپڑ!'' ولی نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' احمد شاہ نے پوچھا۔

''ایک ڈاکٹر نے ایک عدد تھپڑ سے محترمہ کا علاج کیا ہے۔'' جواباً عبدالولی نے ساری بات کہہ سنائی۔

''اوہو؟'' احمد شاہ جانے کتنے عرصے بعد مسکرائے تھے۔

''ولی! میں تم سے ایک اہم بات کرنا چاہ رہا تھا۔ شہباز نے طارق کے لیے نگینہ کا رشتہ مانگا ہے میں اور روشن تو اِس رشتے سے مطمئن ہیں بس تمہاری اور نگینہ کی مرضی جاننا باقی رہ گئی۔ تمہارا کیا خیال ہے اس بارے میں؟'' احمد شاہ نے ساری عمر اپنے بچوں کو اپنے فیصلوں میں شامل کر کے گزاری تھی، اب کیسے وہ اتنے بڑے فیصلے کو اکیلے کر ڈالتے۔

''بابا جان! یہ اتنا اچھا رشتہ ہے کہ اِس سے تو انکار ممکن ہی نہیں، آپ فوراً ہاں میں جواب دے دیں، ہاں نگینہ سے البتہ ضرور پوچھ لینا چاہیے۔'' ولی نے اپنی مرضی بتاتے ہوئے بہن کی مرضی کا بھی بھرپور خیال کیا۔

''کس بارے میں میری مرضی درکار ہے بھائی۔''

نگینہ ملازموں سے ساری چیزیں کمرے میں رکھوا کر واپس آئی تھی، وہ بے حد نارمل نظر آرہی تھی اور سب کو حیران کررہی تھی۔ طارق نے اُس کے گرد Unsecurity کا خول توڑ ڈالا تھا۔ وہ دوبارہ لوگوں پر اعتبار کرنا سیکھ رہی تھی، اس لیے اُس کا روّیہ بہت حد تک نارمل محسوس ہو رہا تھا۔

''میری بہن کی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ ہونے جارہا ہے اُس بارے میں اُس کی مرضی درکار ہے۔'' عبدالولی نے بالکل سہیلیوں کی طرح پوچھا۔ احمد شاہ عبدالولی کو روکنا چاہتے تھے کہ پوچھنے کا یہ کام مائیں زیادہ بہتر کرلیتی ہیں لیکن ولی کی Excitment دیکھ کر وہ چپ رہے۔

"مطلب بھائی؟" نگینہ نے بڑی حیرت سے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ طارق بھائی کا رشتہ میری بہن کے لیے آیا ہے۔" ولی نے بغور بہن کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

"طارق بھائی کا؟" نگینہ نے سوال دہرایا۔

ولی کا دِل اپنا ماتھا پیٹنے کو چاہا۔ وہ طارق کے ساتھ "بھائی" کا لفظ استعمال کر رہی تھی۔

"جی! اور آپ کی ہاں یا نا ہم سب کو درکار ہے۔"

"بھائی! میرا تو اغوا ہو گیا تھا نا! اور کتنی بدنامی ہوئی، میری اپنی دوستیں مجھ سے کالج میں بات نہیں کرتیں کہ میں گندی لڑکی ہوں تو پھر طارق بھائی کیوں؟" نگینہ نے بے شک اپنا جملہ پورا نہ کیا تھا لیکن وہ اپنا مطلب سمجھا گئی تھی۔

"میری بہن پاکیزہ ہے، یہ ہم سب جانتے ہیں اور وہ خود بھی جانتا ہے تم آئندہ کبھی یہ بات کہنا، سوچنا، اس بُری بات کو ہمیشہ کے لیے دل سے نکال دو۔" وہ بہن کو تسلی دے رہا تھا اور دِل احمد شاہ کا ... رہا تھا۔

"اب بولو نا کہ ہاں؟" ولی نے ایک بار پھر سوال کیا۔

نگینہ نے سر جھکالیا۔

"جیسی سب کی مرضی!" وہ کہہ کر رُکی نہیں، اُٹھ کر باہر بھاگ گئی۔

"مبارک ہو بابا جان!" ولی نے مسکرا کر کہا۔ کتنے ہی دِنوں بعد وہ یوں مسکرایا تھا، ورنہ جس طرح اُس کی آنکھیں بجھ کر رہ گئی تھیں، مسکراہٹ کی کوئی کرن اُس کے چہرے پر بالکل نہ آتی تھی۔

"آپ کو بھی مبارک ہو بیٹا!" احمد شاہ نے مسکرا کر کہا۔

"یوں لگتا ہے کہ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔" احمد شاہ نے دعائیہ انداز میں کہا اور گہری سانس لی۔

"انشاءاللہ!" عبدالولی نے بے اختیار کہا۔

واقعی اب خوشیاں اُن کے دروازے پر کھڑی دستک دینے کو تیار تھیں۔

❖❖○❖❖

"السلام علیکم بابا جی!" ترنم کے ساتھ ایک مقامی لڑکی بھی تھی۔ ترنم نے بھی مقامی لباس پہنا ہوا تھا، وہ پہچانی نہ جا رہی تھی بالکل گڑیا لگ رہی تھی۔ اُس کو بابا جی نے گاؤں کے ایک گھر جہاں اُن کی شاگرد اور شاگرد رہتے تھے میں پناہ دلوادی تھی، بابا جی نے کچھ مصلحتوں کی وجہ سے ترنم کو وہاں بھیجا تھا، آج ترنم کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔

"وعلیکم السلام! جیتی رہو، خوش رہو، آباد رہو، اللہ رحمان رحیم ہمیشہ تم لوگوں سے خوش رہیں۔" بابا جی نے بے حد پیار سے ترنم کو دُعا دی۔

ترنم نے اُن کا سر پر رکھا ہاتھ بہت دیر تک اپنے سر پر رکھے رکھا، اُسے لگ رہا تھا، جیسے اُس کے دماغ سے اندر تک نور اور ٹھنڈک اُترتی جا رہی ہے، مقامی لڑکی بابا جی سے اجازت لے کر جا چکی تھی۔

"بابا جی! ماں کا کچھ پتا نہیں چل رہا، اگر میں واپس جاتی ہوں اور ماں کو ڈھونڈتی ہوں تو میں پکڑی

...گی۔" ترنم نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں اپنی موت سے نہیں ڈرتی، میں بے کار زندگی گزارنے کے بعد چاہتی ہوں کہ میری موت کم از کم ...آمد ہو، تاکہ اللہ کے ہاں کچھ آسانیاں پا سکوں۔" ترنم نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔

"اس لیے اپنی بے کار زندگی کی قیمتی موت کو سنبھالے، چھپائے پھرتی ہوں بابا جی!" ترنم نے طویل ...س بھری۔

"میں چاہتی ہوں کہ اُس گروہ نے کتنی ہی لڑکیوں کی زندگی تباہ نہیں کی بلکہ بہت سارے گھروں کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ میں اُس گروہ کو ختم کرانا چاہتی ہوں تاکہ میرے جیسی لڑکیاں ترنم نہ بن سکیں۔" ترنم ...لفظ سے دُکھوں کا لہو رِس رہا تھا۔ بابا جی نے ایک بار پھر ترنم کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا انشاءاللہ! اُس مولا نے سب ٹھیک کر دینا ہے بس تو خود کو، اپنی زندگی کو، اپنی ...کو، سب کو اُس اللہ رحمان کے حوالے کر دے۔ باقی وہ سب کچھ خود دیکھ لے گا۔" بابا جی کی بات میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ ترنم کی روح تک میں سکون اُتر آیا۔

"میں جس رستے پر نکل آئی ہوں وہاں تو اُس کی تھکن تک اپنی نہیں ہے!" ترنم نے سوچا۔

...ٹھیک ہے بابا جی! میں خود کو اور سارے معاملات کو رب سوہنے کے حوالے کرتی ہوں، آپ بھی میرے لیے دعا کریں کہ اللہ میرے سارے معاملوں کو آسان کر دے۔" ترنم نے بے اختیار کہا۔

"آمین! اللہ تجھے قبول کرے۔" بابا جی نے بہت اہم اور بڑی دُعا دی تھی اُسے۔

"میں چلتی ہوں بابا جی! مجھے بس اجازت دے دیں جب میرا جی زیادہ گھبرائے تو میں آپ کے پاس آ جایا کروں؟" ترنم نے جاتے جاتے بے حد معصومیت سے سوال کیا۔

"اے پیاری بیٹی! تیرے لیے اس بوڑھے باپ کے سارے دروازے ہمیشہ اور ہر وقت کھلے رہیں گے، یہ تیرا گھر ہے جب مرضی آؤ اور رہو! تم کو گل بانو کے گھر اِس لیے پناہ دلوائی تھی کہ تم کو رہنے کی ساری سہولتیں ملیں، ورنہ یہاں اِس بوڑھے کے پاس تو مہمان نوازی کے لیے دُودھ اور دلیے کے علاوہ ...ہی کیا ہے۔"

"ایسا نہ کہیں! یہاں تو میں نے دنیا کے سب سے لذیذ کھانے کھائے ہیں، جس کے آگے دنیا کی ہر ...ت ہیچ ہے۔" ترنم نے بے حد پیار سے کہا۔

"کتنے برسوں بعد رزق حلال کھایا ہے!" ترنم نے بے حد دُکھی انداز میں کہا اور سر جھکا کر باہر نکل ...ا۔

بابا جی نے اُس پر ایک گہری نگاہ ڈال کر بے اختیار آسمان کی طرف دیکھا۔

"بے شک تُو بہت مہربان ہے کسی کو وہ مقام ساری عمر عبادت کرنے پر دے دیتا ہے اور کسی کو اُس کی ...ل اچھی نیت پر بھی مل جاتا ہے بے شک تو بہت مہربان ہے! کاش ہم سب اچھی نیت والے ہی ...جاتے۔" بابا جی نے بے اختیار کہا۔ لیکن زندگی کی کامیابی کا راز کہہ ڈالا تھا۔

❖❖○❖❖

"ہیلو! یہ آپ ہی ہیں نا ترنم؟" طارق نے ترنم کی آواز سن کر پہچان لی تھی۔

"جی طارق صاحب! میں ترنم بات کر رہی ہوں۔" اس نے طویل سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"آپ نے ہم سے ساتھ کچھ وعدے کیے تھے ترنم۔" طارق نے اُس کو اُس کے Coopration کرنے پر یاد دلایا۔

"مجھے اپنا وعدہ اچھی طرح یاد ہے طارق صاحب! لیکن میں نگینہ کو وہاں سے جب لے کر بھاگی تھی تو میڈم راگنی کے کارندے بھوکے کتوں کی طرح میرا پیچھا کر رہے تھے اب میں کچھ Safe جگہ پر ہوں میں آپ کو کچھ basic انفارمیشن دے رہی ہوں۔" ترنم نے طارق کو اُن افسروں کے نام دیے، جو پاکستان کے Futurictic پلانز راگنی کو بیچتے ہیں اور اُن فائلز کا بھی بتایا جو راگنی میڈم نے اپنی لڑکیوں کے ذریعے چوری کروائی تھیں یہ فائلز پاکستان کی Stretegic Asserts کے متعلق تھیں۔

جوں جوں ترنم بتاتی جا رہی تھی، طارق کے ماتھے پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح پھوٹ رہے تھے۔

ترنم دوبارہ فون کرنے کا کہہ کر کب کا فون بند کر چکی تھی جب کہ طارق بے حد فکر مندی سے سر پکڑے بیٹھا تھا۔

"یا میرے اللہ! میں تو اِس گینگ جو Buttfies Kidnapers کہلاتے تھے اُن کو پکڑنا چاہ رہا تھا لیکن یہاں تو بات ہی اتنی خطرناک نکلی ہے، ہمارے ملک کے Stretegic Aseerts کا باہر دشمنوں تک پہنچانے کا مطلب! اُف! مجھے تو ہوم ورک مکمل کر کے فوراً ہائی کمان سے بات کرنی ہوگی۔" طارق نے فوراً فون کر کے اپنے اسسٹنٹ کو حکم دیا کہ وہ ایگلز اور ٹائیگرز کی ارجنٹ میٹنگ رکھے، یہ نام طارق کے دو گروپوں کے تھے، جو ٹائیگرز فارم کمانڈوز تھے اور ایگلز ہوم ورک کر کے لاتے تھے۔

طارق مسلسل بے چینی سے گھوم رہا تھا۔

اسے فوراً ہائی کمان سے بات کرنی تھی اُسے کوئی سینئر افسر بھی چاہیے تھا، جو ایسی پلاننگز کرواتا کہ طارق اپنی ٹیم کے ساتھ ہر راگنی کے گرد گھیرا تنگ کر کے اُسے پکڑ سکتا۔ لیکن جب تک وہ ہائی کمان سے بات کرتا، ان کو چیف آف پروجیکٹ بھی نہیں مل سکتا تھا۔ طارق اِس وقت بہت پریشر میں تھا اور طارق ایسا انسان تھا جو پریشر میں ہمیشہ ہاتھی جتنی طاقت اور اس جتنا کام کرتا تھا اب دیکھنا تھا کہ اِس طاقت کا استعمال ٹھیک وقت پر کب ہونا تھا اور وہ ٹھیک وقت طارق کو بنا ہوم ورک کے نہیں مل سکتا تھا۔

"مجھے ترنم سے Detail میں ملاقات بھی کرنی ہوگی!" طارق نے پُرسوچ انداز میں خود سے کہا اور ایک بار پھر موبائل پر ترنم سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

❖❖O❖❖

"مریم!! مریم کیا واقعی! کیا واقعی یہ سچ ہے؟" ڈاکٹر فیصل کی آواز خوشی سے کپکپا رہی تھی۔

"جی بالکل سچ ہے!" مریم بی بی نے نم آنکھوں سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم نفیسہ کو فوراً آسٹریلیا کے لیے تیار کرو، میں یہاں سے اُس کی اکاؤنٹ گارنٹی دے دوں گا" ڈاکٹر فیصل نے بے تاب ہوتے ہوئے کہا۔

"کیوں فیصل! کیا اب بھی آپ کو پاکستان کی زمین میں وہ کشش محسوس نہیں ہوتی، جو آپ کو کھینچ

یہاں لا سکے؟ بس کریں اپنا یہ خود ساختہ بن باس!" مریم بی بی رو ہی تو پڑیں۔

"برسوں گزر گئے اپنے وطن، اپنی مٹی سے دُور رہ کر۔ اِس زمین سے بہت دور رہ لیے جس کے سینے میں ہمارے بہت سارے پیارے سو رہے ہیں۔ پلیز اب قسم توڑ دیں!" مریم بی بی سسک ہی تو پڑیں۔

بہت سارے پَل دوسری جانب خاموشی رہی، مریم بی بی کو یوں لگا جیسے شاید رابطہ کٹ گیا ہے۔

"ہیلو! ہیلو فیصل!!" مریم بی بی نے بے اختیار پکارا۔

"آں۔ ہاں۔ مریم!!"

"آئی ایم آن دی لائن!" ڈاکٹر فیصل کی روئی روئی آواز ماؤتھ پیس سے اُبھری۔

"میں پاکستان آ رہا ہوں۔" ڈاکٹر فیصل کے الفاظ جیسے مریم بی بی کے جلتے دِل پر پھوار کی طرح برسے۔

وہ بِنا کچھ کہے مسلسل ایسے سر ہلا رہی تھیں، جیسے وہ فون پر نہیں ڈاکٹر فیصل کے سامنے بیٹھی ہوں، دوسری جانب فون بند ہو چکا تھا اور مریم بی بی مسلسل فون تھامے روئے جا رہی تھیں۔ عبداللہ نے گھبرا کر ماں کا کندھا تھاما۔

"کیا ہوا امی! خیریت تو ہے؟ پاپا تو ٹھیک تھے نا؟" عبداللہ نے فکر مند لہجے میں کہا۔

"آں۔ ہاں! وہ ٹھیک ہیں اور باقی جو ٹھیک نہیں تھا وہ بھی ٹھیک ہونے والا ہے۔" مریم بی بی نے اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"مطلب؟" عبداللہ کچھ سمجھ نہ پایا۔

"مطلب یہ کہ تمہارے پاپا پاکستان آ رہے ہیں۔" مریم بی بی نے بھیگے بھیگے لہجے میں کہا۔

"ریئلی؟" وہ حیران ہوا۔

"ہاں! سچ!"

"تو پھر ہم ضرور نانا، نانی کے گاؤں بھی جائیں گے سدرہ خالہ کی قبر پر بھی جائیں گے۔" عبداللہ نے گلا پلان بنایا۔ جواباً مریم بی بی کھو گئیں، اُن کی آنکھوں کے سامنے زندگی سے بھرپور ایک چہرہ مسکرایا۔

"وہ مجھ سے، ڈاکٹر باؤ مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ وہ دُنیا کے کسی بھی کونے میں چلا جائے مجھے نہیں بھول سکتا۔ وہ میرے اندر روح کی طرح رہتا ہے! روحوں سے جڑے ناتے بھی بھلا کبھی ٹوٹتے ہیں؟" سدرہ آپی کی برسوں پہلے کہی بات اُن کے کانوں میں گونجی۔

"ہاں عبداللہ! سدرہ آپی کا قرض، بہت ساری دعائیں جو ہمیں اُن کی قبر پر کرنی تھیں وہ باقی ہے۔ ہم وہاں ضرور جائیں گے۔" مریم بی بی نے ایک دم ہی فیصلہ کر لیا۔

❖❖O❖❖

روشن ولا آج صحیح معنوں میں روشنی سے دمک رہا تھا۔

روشن ولا کے پھل دار لان کو ولی کے دوست یاسر جو سیٹ ڈیزائنر تھا، اُس نے بہت Facinate کر کے سجایا تھا اور یہ تحفہ اُس کی جانب سے تھا کیوں کہ Decoration کا سامان وہ خود لے کر آیا تھا۔

آج ولی کی مہندی اور نگینہ کے نکاح کی رسم ساتھ ساتھ تھی لیکن اس قدر سج دھج کے باوجود دونوں دلہا بجھے بجھے تھے ایک اپنی اعصابی جنگ سے لڑتے لڑتے بے حال ہوچکا تھا اور دوسرا ذہنی طور پر اپنے پروجیکٹ کی جانب انگیجڈ تھا۔ ولی کے سارے دوستوں نے مل کر خوب بھنگڑا ڈالا، لڑکیوں نے خوب ڈھولکی بجائی، پٹوں اور گانوں کا خوب تبادلہ ہوا۔

روشن آرا بیگم اور احمد شاہ نے کسی کو نہ روکا، لڑکے لڑکیاں ہلّہ گلّہ کررہے تھے لیکن وہ تو مسلسل اپنے بیٹے کی جانب دیکھ رہے تھے جو بہت مشکل سے مسکرا رہا تھا۔

اُن کا خیال تھا کہ ولی شاید اپنے دوستوں کی شوخیوں شرارتوں سے ہی بہل جائے وہ جس طرح اس شادی کے لیے تیار ہوا تھا وہ اچھی طرح جانتے تھے۔

نگینہ کے لیے نیلوفر بیگم بلیو کنٹراسٹ کے ساتھ بلیو کلر کا شرارہ سوٹ لائی تھیں۔ ییلو نیٹ کے دوپٹے پر چھ چھ انچ کی چوڑی پٹی جو بلیو کلر کی تھی اُس پر گولڈن ییلو، بلیو اور کہیں کہیں مپجنڈا کلر کے زرقون اور بیڈز کے ساتھ کام تھا۔

سائرہ نے یہ سوٹ خاص طور پر اپنی ایک فیشن ڈیزائنر دوست سے ڈیزائن کروایا تھا، پوری دو راتیں لگا کر دونوں نے مختلف Ideas کو مکس کرکے یہ سوٹ ڈیزائن کیا تھا اور بے حد خوب صورت تھا کڑھائی وغیرہ بھی کالج کے کاریگروں نے کی تھی، اِس لیے یہ سوٹ اتنا خوب صورت اور یونیک تھا، جس نے دیکھا تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا نگینہ کو تیار کرنے کے لیے بیوٹیشن گھر آئی تھی لیکن نگینہ نے اپنا رو رو کر حال بُرا کیا ہوا تھا اِس لیے بے چاری بیوٹیشن انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔

”آج تو تمہاری رخصتی نہیں ہے پھر بھلا کیوں رو رہی ہو؟“ بیوٹیشن پوچھے بنا رہ نہ سکی۔

”لیکن میرے جانے کا سلسلہ تو آج سے شروع ہو جائے گا، میں امّاں بابا کو چھوڑ کر کیسے جاؤں گی پھر بھیا! کیا یہ سب لوگ میرے ساتھ نہیں جاسکتے۔“ نگینہ نے معصومیت سے پوچھا۔

بیوٹیشن نگینہ کی بات سن کر مسکرائے بنا نہ رہ سکی۔

”کیا اِس دور میں بھی اتنی سادہ اور معصوم لڑکیاں ہوسکتی ہیں؟“ بیوٹیشن سوچ رہی تھی۔

اُسی پل روشن آرا بیگم کچھ گھبرائی سی اندر آئیں۔

”آپ پلیز دو منٹ کے لیے باہر تشریف رکھیں میں آپ کو بعد میں بلاتی ہوں۔“ جس طرح انہوں نے بیوٹیشن کو باہر بھیجا تھا اُس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کوئی اہم بات کرنا چاہتی تھیں۔

”نگینہ بیٹا! مجھے تم سے ایک بہت اہم بات کرنی تھی۔“

”جی امّاں جان کہیے۔“

”بیٹا تم جانتی ہونا کہ طارق کی نوکری کس نوعیت کی ہے۔“

”جی ہاں!!“ نگینہ نے ماں کا چہرہ بغور دیکھا کہ آخر وہ کیا کہنے جارہی تھیں۔

”بیٹا! آج طارق کو اچانک محکمے کی جانب سے کال آئی تھی اُسے فوراً نکلنا پڑا، اب وہ نہیں آسکتا اِس لیے مجبوراً تم دونوں کے نکاح کا دِن پرسوں مقرر ہوا ہے۔ بیٹا طارق کی زندگی میں یہ سب کچھ مسلسل چلتا رہے گا اگر تم کو اس کی کسی بات پر اعتراض ہے تو فوراً بتادو، ابھی تو وقت ہے نا!“ روشن آرا بیگم نے اُس

گھبرائے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کہا۔

”نہیں امّاں جان! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ نگینہ نے سر جھکا کر کہا۔

”پھر آپ ہی تو سمجھاتی ہیں کہ موت تو ہوا میں بھی آنی ہے، زمین پر بھی آتی ہے تو پھر اِس سے ڈرنا کیا۔“ نگینہ نے بے حد سمجھ داری سے کہا۔

”مجھے آپ کے کسی فیصلے پر اعتراض نہیں ہے اور نہ ہی کبھی ہوسکتا ہے آپ فکرمند نہ ہوں۔“ نگینہ نے ماں کا ہاتھ تھام کر کہا۔ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ابھی یہ لڑکی بچوں کی طرح رو رہی تھی اور ابھی کتنی سمجھ داری کی باتیں کررہی تھی۔

”میری پیاری بیٹی سدا خوش رہو!“ روشن آرا بیگم نے آگے بڑھ کر نگینہ کا ماتھا چوما اور ہلکی پھلکی ہوکر چل گئیں اُن کا دماغ بہن کی جانب بھی اٹکا ہوا تھا ابھی تک اُن کے گھر سے کوئی نہ پہنچا تھا۔ اُن کے دماغ میں یہ کشمکش بھی تھی کہ اگر علیزے آجاتی ہے تو اُن کے بیٹے کی ذہنی حالت کیا ہوگی؟ کیا وہ ایسا بے ہیو کرے گا؟

بہت سارے سوال اُن کے گرد کھڑے شور مچا رہے تھے لیکن فی الحال اُن کے پاس کسی ایک کا بھی جواب نہ تھا۔

❖❖○❖❖

”آپ میرا فون کیوں نہیں اٹھاتے؟“ سحرش نے طارق سے لڑتے ہوئے پوچھا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے میں مصروف تھا۔“ طارق نے گاڑی پہلے آہستہ کی اور پھر بند کرکے فون سننے لگا، گزشتہ کچھ عرصے سے سحرش کی گفتگو کسی امتحان سے کم نہ ہوتی تھی اور اِس اعصابی پریشانی میں کم از کم اُس سے گاڑی چلانا مشکل ہوجاتا تھا۔

”آپ کہاں مصروف تھے؟“

”میں نے بتایا نا کہ کام میں مصروف تھا۔“

”نہیں! آپ اُس لڑکی کے ساتھ تھے۔“ سحرش نے سنگی انداز میں کہا۔

”بے فکر رہو، بنا شادی کے میں اُس کے ساتھ وقت صرف نہیں کرسکتا اور تمہیں تو اِس بات پر خوش ہونا چاہیے کہ میرے پاس تو سرے سے وقت ہوتا ہی نہیں، تو میں کتنا وقت اس کو دے پاؤں گا۔“ طارق نے ٹھنڈی آہ بھری۔

وہ عجیب سی کیفیت میں تھا اگر نگینہ کو سحرش کے متعلق پتا چلتا تو شاید وہ کبھی اُس کی زندگی میں نہ آتی۔ لیکن اُس سے چھپا کر اُسے بے ایمانی کا احساس ہو رہا تھا۔

”آپ اُس لڑکی کو چھوڑ نہیں سکتے؟“ سحرش نے غصّے سے پوچھا۔

”نہیں سحرش! میں اِس معاملے میں مجبور ہوں۔“ طارق نے نہایت تحمل سے جواب دیا۔

”پلیز طارق!“ سحرش نے اس بار کچھ نرمی سے کہا۔

”تم طارق سے اُس کی جان مانگ لو، لیکن نگینہ سے دوری کا امتحان نہ مانگنا۔“ طارق نے بے حد نرمی سے درخواست کی۔

سحرش کو نگینہ سے بے حد حسد ہوتا تھا لیکن آج پہلی بار اُسے نگینہ پر رشک آ رہا تھا۔

''میں آپ سے صرف ایک ہی چیز مانگ رہی ہوں، وہ ہے آپ کا اپنا آپ پورا، کیوں کہ میں آپ کو کسی اور کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتی۔'' سحرش نے ایک بار پھر جنونی ہو کر کہا

''سحرش! یہ بحث لا حاصل ہے بہرحال تمہاری اطلاع کے لیے میں اپنے گھر والوں کی رضامندی سے نگینہ سے بہت جلد نکاح کرنے والا ہوں، تم بھی خود کو ذہنی طور پر تیار کر لو۔'' طارق نے بے حد صاف لہجے میں کہا اور ساتھ ہی فون بند کر دیا۔

''دیکھتی ہوں کیسے تمہارا نکاح ہوتا ہے!'' سحرش نے پاؤں پٹخے۔

❖❖○❖❖

''السلام علیکم کون؟'' نگینہ نے فون پر آ کر کہا۔ یہاں ذرا شور کم بھی تھا ورنہ سارے گھر میں مہمان تھے شادی کا گھر ہونے کی وجہ سے چہل پہل مختلف تھی۔

''میں طارق بات کر رہا ہوں۔'' طارق نے نگینہ کو حیران کیا۔

''ارے! آپ تو کسی کام سے گئے تھے نا؟''

''ہاں بس! کچھ دیر میں یہیں سے چلا جاؤں گا گھر سے تو میں اپنے کام سے ہی نکلا تھا لیکن مجھے یاد آیا کہ ایک اور کام بہت اہم ہے، پہلے اُس کو نمٹایا جائے ورنہ شاید مجھ سے کوئی کام نہ ہوگا۔'' طارق کے لفظوں میں نگینہ کے لیے الجھن موجود تھی۔

''آپ کہاں ہیں؟'' نگینہ نے بے اختیار پوچھا۔

''میں اوپر بالکونی میں ہوں ولی کے اسٹوڈیو کی بالکونی میں، مجھے ولی نے ہی چابی دی ہے یہاں بیٹھ کر تم سے بات کرنے کے لیے۔''

ولی بے شک طارق سے بہت محبت کرتا تھا، بھروسہ کرتا تھا اسی لیے بنا پوچھے چابیاں اُس کے حوالے کر دی تھیں۔

''میں آتی ہوں!'' نگینہ نے فون رکھا، اُس کے مہندی لگے ہاتھوں میں پسینہ آ گیا۔

''ایسی کون سی بات ہے جو طارق مجھ سے کرنا چاہتے ہیں۔'' نگینہ نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سوچا۔

نگینہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی یہ تیسری منزل پر موجود بڑا سا اسٹوڈیو تھا، جہاں ولی نے باہر سے کچھ کیمرے منگوائے تھے، جو رات اور دن کی لائٹ کے لیے خاص طرح کے Creative Effects دیتے تھے۔

عبدالولی پاکستان میں نہ تھا لیکن پھر بھی روشن آرا بیگم اُس کے اسٹوڈیو کا بہت خیال کرتی تھیں۔

''طارق بھا!'' نگینہ نے باقی کا لفظ منہ میں ہی کھا لیا تھا وہ اتنا عرصہ اُسے بھائی کہتی آئی تھی کہ اب بھی اُس کے منہ سے لفظ ''بھائی'' اکثر بے اختیار نکل جاتا تھا۔

''نگینہ! ادھر ہی آ جاؤ۔''

بالکونی کی چھت پر ملٹی کلرز کے زیرو پاور کے بلب لگے ہوئے تھے، جب وہ اکٹھے جلتے تو بہت ہی پیاری اور خوب صورت روشنی پیدا ہو جاتی تھی۔

''جی کہیے!!'' اُن کے بیچ جب بہت ساری خاموشی گزری تو نگینہ نے ہی گھبرا کر پوچھا۔

''نگینہ! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں! اپنی زندگی کا ایک ایسا سچ، جو میری خواہش نہ ہونے کے باوجود میرے وجود کا حصہ ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تم کو کوئی اور کسی غلط طریقے سے بتائے۔'' طارق نے اپنا گلا کھنکارتے ہوئے کہا۔

''ایسی کون سی اہم بات تھی جو وہ بتانے چلا آیا، اُس کے پاس اپنی نکاح کی اہم تقریب کے لیے وقت نہ تھا یقیناً یہ بات سب سے بڑھ کر اور اہم تھی۔'' اُس نے سوچا۔

''تم میرے پاس آؤ!'' طارق نے نگینہ کا ہاتھ تھام کر اُس کو اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔

نگینہ کچھ ہچکچاہٹ کے ساتھ اُس کے قریب کھڑی ہوگئی۔

''کہتے ہیں ہم جب سچ بولنا چاہتے ہیں تو ہمیں حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ نگینہ میرا ہاتھ تھام لو کہ مجھ میں وہ حوصلہ پیدا ہو جائے جو تمہارے سامنے میں سچ بول سکوں۔'' طارق کی بات پر نگینہ نے بے اختیار اُس کا ہاتھ تھاما۔ طارق نے بے حد مشکور نظروں سے اُسے دیکھا۔ یقیناً اُس کی چوائس بے حد اعلیٰ اور کروڑوں میں ایک تھی تب ہی تو نگینہ نے بنا کچھ پوچھے اُس کا ہاتھ تھام لیا تھا اُسے وہ حوصلہ دیا تھا جو وہ چاہتا تھا۔

❖❖○❖❖

''یہ زبیر فون کیوں نہیں اٹھا رہا؟'' سید سرفراز علی نے غصے سے فون دیوار پر پٹخ دیا۔ نتیجتاً فون ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔

''غلام نبی!!'' انہوں نے دروازے کی جانب منہ کر کے آواز لگائی۔

''جی سائیں۔'' غلام نبی اُن کے لہجے کی گرج سن کر سہما سہما اندر آیا۔

''زبیر کو رقم تم دینے گئے تھے نا؟'' انہوں نے سوال کیا تھا۔

''جی سائیں۔'' اُس نے نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔

''کیا کہا تھا اُس نے؟'' سید سرفراز علی نے کڑے تیوروں سے پوچھا۔

''جی!! جی بتایا تھا۔'' غلام نبی نے سر جھکا کر کہا، جیسے اس سارے معاملے میں اُس کا اپنا قصور ہو۔

''وہ کہہ رہے تھے کہ!!'' غلام نبی ہچکچا گیا۔

''بولو۔'' سید سرفراز علی نے حکم دیا۔

''جی وہ کہہ رہے تھے کہ وہ اپنا منحوس سایہ اپنی بہن کی خوشیوں پر نہیں ڈالنا چاہتے۔'' غلام نبی نے من و عن سارے الفاظ دہرا دیے۔

''کیا بکواس ہے!!'' سید سرفراز علی کو بہت غصہ آیا۔ وہی تو اُن کا اکلوتا وارث تھا وہ کیسے اِس جاگیر اِس سسٹم سے بد دل ہو سکتا تھا۔ سید سرفراز کو کبھی بھی اپنا کوئی بچہ اتنا عزیز نہ تھا جتنا کہ اس حکمرانی کے سسٹم کی فکر رہتی تھی۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ گدی نشین اس سسٹم کی اہمیت اور اس کے نشے کو محسوس کرتا ہو، لیکن زبیر کا بیزار رویہ اُن کے لیے ایک نیا چیلنج پیدا کر رہا تھا۔

اُن کو اپنی زندگی اور موت دونوں سے زیادہ اس سسٹم کا نشہ اور اُس کی لذت عزیز تھی۔

''غلام نبی! سید زبیر علی کو فوراً حویلی لے کر آؤ اگر وہ اپنی مرضی سے نہ آئیں تو ہماری مرضی سے اُن کو یہاں لے آنا۔'' سید سرفراز علی نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔

''جی سائیں!'' خادم خاص نے فوراً تابع داری سے کہا اور باہر نکل گیا۔

❖❖○❖❖

''یہ کیا بات ہوئی، میں تمہارے بغیر نہیں جاؤں گا۔'' عبدالولی نے طارق سے ناراضی سے کہا۔

''یار سمجھا کرو نا!'' طارق نے بے بسی سے کہا۔

''میں بہت مشکل کام میں پھنسا ہوا ہوں!''

''میرے تو اپنے نکاح کے لیے یہ لوگ بامشکل کل چھٹی دیں گے۔'' طارق کو واقعی ولی کی شادی پر پہنچنے کا بے حد دُکھ تھا۔

''یار یہ تو بتاؤ اتنی دور بارات لے جانا مشکل تو ہوگا نا؟''

''تم نے لگتا ہے کارڈ غور سے نہیں پڑھا۔ بارات ہم لوگ یہاں ہی ایک ہال میں لے کر جائیں گے سید سرفراز علی نے ہماری ہر بات کو مانا ہے وہ لوگ خود یہاں دوپہر تک پہنچ جائیں گے اور رات کو ہم لوگ بھی وہاں ہال میں پہنچ جائیں۔''

''چھوڑو یار! اُس شخص نے سب سے بڑی بات منوالی، اب اگر وہ کچھ مانتا بھی ہے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' طارق نے نروٹھے پن سے کہا۔

عبدالولی کا چہرہ ایک دم سے تاریک ہوگیا۔

''اچھا یار! پھر ملاقات ہوتی ہے۔''

''اِن شاءاللہ جلدی!'' طارق نے جواباً کہا۔ فون بند ہو چکا تھا اور ولی گم سم ہوگیا تھا۔

جو خیال تھے نہ قیاس تھے
وہی لوگ مجھ سے بچھڑ گئے
جو محبتوں کی اساس تھے
وہی لوگ مجھ سے بچھڑ گئے
جنہیں مانتا ہی نہیں یہ دِل
وہی لوگ میرے ہیں ہم سفر
مجھے ہر طرح سے جو راس تھے
وہی لوگ مجھ سے بچھڑ گئے
مجھے لمحہ بھر کی رفاقتوں کے سراب اور ستائیں گے
میری عمر بھر کی جو پیاس تھے
وہی لوگ مجھ سے بچھڑ گئے

یہ خیال سارے ہیں عارضی
یہ گلاب سارے ہیں کاغذی
گلِ آرزو کی جو باس تھے
وہی لوگ مجھ سے بچھڑ گئے
جنہیں کرسکا نہ قبول میں
وہ شریکِ راہ سفر ہوئے
جو مری طلب، مری آس تھے
وہی لوگ مجھ سے بچھڑ گئے
مری دھڑکنوں کے قریب تھے
مری چاہ تھے، مرا خواب تھے
وہ جو روز و شب میرے پاس تھے
وہی لوگ مجھ سے بچھڑ گئے

''ولی!!'' ولی کو کسی نے آواز دی تھی وہ اپنے خیالات کی دنیا سے ایک دم چونک کر نکلا، سامنے احمد شاہ کھڑے تھے۔

''بیٹا! دیکھو کون آیا ہے۔'' احمد شاہ نے سامنے سے ہٹتے ہوئے کہا۔ بابا جی نگینہ کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے چلے آرہے تھے۔

''بابا صاحب!!'' ولی کی بجھی آنکھوں اور بجھے چہرے پر رونق آگئی۔ وہ ایک دم اُن کی جانب بڑھا احمد شاہ بھی مسکراتے ہوئے اُس کے پیچھے لپکے۔

''بابا صاحب! آپ یہاں؟'' ولی نے حیرت اور خوشی سے اُن کے گلے لگتے ہوئے پوچھا۔

''میرے پیارے بیٹے کا بہت بڑا دِن تھا مجھے تو آنا ہی تھا۔'' انہوں نے بظاہر ہشاش بشاش انداز میں کہا لیکن اُن کی آواز کی نقاہت بھی واضح تھی۔ وہ جو اپنے مقام سے کبھی باہر نہ نکلتے تھے لیکن آج وہ ولی کی وجہ سے اتنا لمبا سفر طے کر کے آئے تھے۔

''بڑا دن!!'' وہ بے اختیار ہنسا۔ بابا صاحب کے ساتھ سب نے اُس کے چہرے کے تاثرات نوٹ کیے۔

''کیوں بڑا دِن نہیں ہے بیٹا؟'' احمد شاہ نے پوچھا۔

''آپ! آپ اندر چلیں نا، آرام سے بیٹھیں گے تو بات بھی کریں گے۔'' ولی نے بابا صاحب کو مخاطب کیا۔

وہ اپنے اندر کے جوڑ توڑ سے اِس قدر گھبرایا ہوا تھا کہ سامنے والوں کے بہت سے سوالات کو اگنور کر رہا تھا۔

''آپ آگئے ہیں تو مجھے سکون مل گیا کہ اب سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔'' احمد شاہ بابا جی کا ہاتھ تھامے اندر داخل ہوئے تو روشن وِلا کی روشنیوں میں بابا صاحب کے بابرکت وجود کی وجہ سے مزید اضافہ ہوگیا۔

کچھ لوگ واقعی خوشی، خیر اور روشنی جیسے ہوتے، ہیں جو انسانوں کی زندگیوں کے اندھیرے ہمیشہ لیے ختم کرنے کے لیے آتے ہیں بابا صاحب بھی ایسے ہی لوگوں میں شمار ہوتے تھے یہی وجہ تھی عبدالولی کے دِل میں خوشی اور سکون تو اُترا ہی تھا احمد شاہ کو بھی پہلی بار اتنے عرصے میں محسوس ہوا تھا وہ جو کچھ عرصے سے خُلا میں محوسفر ہیں اُن کے پاؤں بھی زمین پر لگنے والے ہیں۔

❖❖○❖❖

روشن آرا بیگم نے بہت ساری دیگیں پکوا کر یتیم خانے بھجوادی تھیں اور ایک دارالامان کی بچیوں کپڑے بھجوائے تھے وہ اپنا ہر کام شروع کرنے سے پہلے صدقے پر بہت Belive کرتی تھیں یہی تھی کہ اللہ رحمٰن کی ذات اُن کے رزق اور خوشیوں میں ہمیشہ دوگنا اضافہ کردیتی تھی۔

''ماشاء اللہ، ماشاء اللہ! میرا بیٹا اس شیروانی سوٹ میں تو کسی ملک کا شہزادہ لگ رہا ہے۔'' روشن آرا بیگم عبدالولی کو مجبور کرتی رہیں کہ اپنے دوستوں کا کہا مان لو اور پارلر چلے جاؤ، لیکن ولی کو مصنوعی زندگی کے رنگ بالکل پسند نہ تھے اس لیے اُس نے گھر رہ کر ہی تیار ہونا پسند کیا اور جب وہ تیار ہوکر باہر نکلا ہر کسی کی نگاہ جیسے اُس پر جم کر رہ گئی۔

اُس کی خوب صورتی اور مردانہ وجاہت تو اُس کے عام سے عام کپڑے کو خاص بنادیتی تھی۔ لیکن آج کے اسپیشل ڈریس نے اُس کی Special Personality کو بھی چار چاند لگادیے تھے۔

''بھائی! امّاں جان سچ کہہ رہی ہیں کہ آپ تو سچ میں شہزادے لگ رہے ہیں۔'' نگینہ نے بھی بہت پیار سے بھائی کو دیکھا۔

''نظر تو پیار کی بھی لگ جاتی ہے، کہیں میری ہی نظر نہ لگ جائے میرے بیٹے کو!'' روشن آرا بیگم نے آگے بڑھ کر عبدالولی کے گرد آیت الکرسی پڑھ کر حصار کھینچا۔

عبدالولی نے اُن کو کندھوں سے تھام کر بے حد پیار سے دیکھا۔

''آپ بہت پیاری ماں ہیں!'' عبدالولی نے بے اختیار ہوکر ماں کو کہا۔

کس قدر پرفیکٹ منظر تھا ماں، ممتا اور اُس کے بچے! احمد شاہ، جو دروازے میں کھڑے تھے گہری سانس بھر کر رہ گئے۔

بابا صاحب نے اُن کو بھیجا تھا کہ وہ سب کو بلا لائیں اور جو قرض اُن پر ہے عبدالولی اور نگینہ کی پہچان کا وہ اُسے اُتار سکیں۔

''روشن! بچوں کو لے کر بابا جی کے کمرے میں چلو!'' احمد شاہ خود کو کم زور نہ کرنا چاہتے تھے اب شاید وہ خود بھی اندر سے چاہتے تھے کہ یہ پُل صراط عبور ہو ہی جائے۔

جب وہ بابا جی کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ جانماز پر بیٹھے تسبیح کررہے تھے ذکر الٰہی اُن کو اپنی روح کی غذا محسوس ہوتا تھا، اسی لیے وہ ہر وقت اپنی غذا کا انتظام کرتے رہتے تھے۔

''آؤ بچو!'' بابا جی نے سب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

نگینہ تو لاڈ سے بالکل اُن کے قریب بیٹھ گئی۔

''قرآن پاک میں بار بار ذکر آیا ہے کہ جو امانت آپ کے پاس ہو، اُسے اُسی طرح لوٹادو!'' سب اُن کی جانب متوجہ تھے احمد شاہ بالکل خاموش تھے جب کہ روشن آرا بیگم اُن کی تمہید سے ہراساں سی ہوگئی تھیں۔

''عبدالولی اور نگینہ بیٹا! مجھے بتاؤ گے کہ تم لوگوں نے احمد شاہ اور روشن بیٹی کو کیسے والدین پایا؟'' بابا جی نے شاید روشن آرا بیگم کے چہرے پر موجود خوف کو آسانی پڑھ لیا تھا اسی لیے اُنھوں نے اپنی تمہید کا ٹریک چینج کرلیا۔

''بے شک ہمارے والدین دنیا کے سب سے بہترین والدین ہیں۔'' عبدالولی نے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر کہہ ڈالا۔

''بالکل! امّاں جان اور بابا دی بیسٹ ہیں!'' نگینہ نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

''لو روشن بیٹی! اتنی مضبوط گواہیاں ہیں، میرا خیال ہے کہ تم اپنا ڈر ختم کردو تاکہ ہم باآسانی بچوں کو بتاسکیں کہ!'' بابا جی نے آدھی بات چھوڑ کر اُن کو دیکھا۔

''جی اچھا!'' روشن آرا بیگم نے بامشکل خود کو سنبھالا۔

''عبدالولی اور نگینہ بیٹا! آپ دونوں احمد شاہ اور روشن بیٹی کے آنکھوں کے تارے ہو اور اِس کے ساتھ ساتھ سب سے بڑی سچائی یہ بھی ہے کہ آپ اِن کی سگی اولاد نہیں ہو!'' بابا جی کی بات پر نگینہ ایک دم ڈر کر روشن آرا بیگم کے ساتھ آ لگی، جیسے اُس سے اُن کو کوئی چھین لے گا جب کہ عبدالولی کے چہرے پر کسی قسم کی کوئی حیرت نہ تھی جیسے وہ بہت پہلے سے یہ بات جانتا ہو، جیسے وہ دھند کے پار موجود منظر کو پہلے سے دیکھ چکا ہو۔

''آپ لوگ! آپ دونوں کی جنم بھومی وہی ہے، جہاں میں رہتا ہوں اُس کے قریبی گاؤں میں۔ وادی سون سکیسر سے نیچے اُترائی ہر دس گاؤں اور اونچائی میں موجود پانچ گاؤں جو آپ کی والدہ کی میراث تھی وہ سب آپ کی ملکیت ہے۔ احمد شاہ کے پاس آپ کے والدین کی زمینوں کے کاغذات اور اُن کے نکاح نامے، آپ کی پیدائش کے سرٹیفکیٹ سب موجود ہیں ان کاغذات کے ذریعے آپ اپنی زمینوں کی ملکیت پر دعویٰ کرسکتے ہیں۔''

بابا جی یہ کیا بتارہے تھے عبدالولی اور نگینہ دونوں کو رتی بھر بھی زمینوں اور دولت کی خواہش نہ تھی اُن کو تو بس اپنے والدین چاہئیں تھے۔

''آپ کے والد سید عبداللہ بہت نیک اور پیارے انسان تھے آپ کی والدہ کا نام عائشہ بی بی تھا۔ آپ کی دو پھوپھو تھیں۔ دادی تھیں، پھوپو کا نام مریم بی بی اور سدرہ بی بی تھا، جب کہ دادی حضور کا نام زلیخا بی بی تھا اور دادا کا نام سید نوازش علی تھا۔ آپ کا نصیب بہت اچھا تھا۔'' بابا جی کچھ پل کو سانس لینے کو رُکے۔

''ایک حادثے میں آپ کے والدین اور اہل خانہ انتقال کرگئے تو احمد شاہ بیٹے نے آپ کو خاندانی دشمنی سے بچانے کے لیے اپنالیا تھا اور اپنی اولاد جان کر پالا، یہ دونوں آپ کے ہمیشہ والدین رہیں گے لیکن یہ حقیقت ہے کہ آپ کو جنم دینے والے کوئی اور تھے اور بے حد اچھے نیک انسان تھے، آپ کے

اچھے اعمال اور دُعاؤں کے پورے پورے حصے دار بھی ہیں اُن کا حق ہے کہ اُن کی اولاد کا صدقۂ جاریہ اُن کو بھی جائے۔'' باباجی کہہ رہے تھے اور عبدالولی اور نگینہ گم سم اُن کی باتیں سن رہے تھے۔

''آپ کے ایک سوتیلے چچا ہیں آج کل ساری زمینیں وغیرہ اُن کی ہی تحویل میں ہیں۔'' باباجی کہتے کہتے تھک گئے تھے۔

''بابا، امّاں جان! میں ساری عمر آپ لوگوں کی پوجا کرتا آیا ہوں لیکن آج لگتا ہے وہ بھی کم تھی. آپ نے بے شک بہت بڑا احسان کیا ہم پر۔'' عبدالولی نے دونوں کے سینے سے لگ کر کہا۔ احمد شاہ کا چہرہ پرسکون ہوگیا اور روشن آرا بیگم اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر رہی تھیں کہ اللہ نے اتنی بڑی بات جس کو وہ سوچ سوچ کر گھبراتی رہتی تھیں کس قدر آسانی سے اُن کے بچوں تک پہنچادی تھی اور اِس کو پہنچانے کے لیے اس قدر بابرکت انسان کو بھیجا تھا، جس نے اِس ساری بات کی ہسٹری میں سے ہر طرح کی پریشانی، بےچینی اور بےاعتباری چُن لی تھی۔

نگینہ نے ماں کا مضبوطی سے ہاتھ تھام رکھا تھا وہ عبدالولی کی طرح بہت زیادہ Expressive نہ تھی لیکن اُس کا ایک ایک ایکشن بتا رہا تھا کہ وہ کس قدر زیادہ احمد شاہ اور روشن آرا کو چاہتی ہے۔

''نہیں بیٹا! احسان کا لفظ استعمال کر کے ہمیں پرایا نہ کرو، تم کیا جانو جب تم دونوں ہمیں بابا امّاں کہہ کر پکارتے تھے تو کیسا بڑا احسان ہمارے دِلوں اور زندگیوں پر کرتے تھے۔ وہ اندھیرے جن میں کھو کر میں اپنے اللہ سے روٹھنے لگی تھی تم دونوں نے آ کر وہ اندھیرے روشنی میں بدل دیے، میں نے تو تم دونوں کو پا کر اپنے خُدا کو اپنے یقین کو دوبارہ پایا ہے!'' روشن آرا بیگم نے بھیگی بھیگی پلکوں سے کہا۔

''بابا صاحب! ہمارے والدین کو کیا حادثہ پیش آیا تھا؟'' عبدالولی نے ایک دم ہی وہ سوال کر دیا جس کے جواب سے باباجی خود بھی بچنا چاہ رہے تھے کیوں کہ یہ وہ سوال تھا، جو عبدالولی کو بدلے اور غصّے کی آگ میں دھکیل سکتا تھا۔ لیکن سچ کب تک چھپ سکتا تھا بالآخر ایک نہ ایک دِن تو سچ کو سامنے آنا ہی تھا اور اُس کا سب کو سامنا کرنا ہی تھا۔

''اُن کی حویلی کو آگ لگ گئی تھی اور سب افرادِ خانہ اُسی حادثے میں جل کر ختم ہوگئے تھے۔''

''اوہ! تو وہ خواب، خواب نہ تھے حقیقت تھے وہ چہرے اجنبی نہ تھے وہ تو اپنوں کے چہرے تھے۔'' عبدالولی کے دِل میں ہوک سی اٹھی۔

بچپن سے وہ جو خواب دیکھتا تھا اُن میں کچھ چہرے درد اور تکلیف میں دیکھتا تھا تب وہ اُن کی تکلیف کو محسوس نہ کر سکتا تھا لیکن آج وہ یہ تکلیف اپنے دل پر محسوس کر رہا تھا۔

وہ تکلیف جن سے اُس کے اپنے گزرے تھے!

عبدالولی کے دل پر بہت عرصے سے ایک اَن جانا خوف اور دُکھ موجود تھا، آج اُس کو بھی شناخت مل گئی تھی۔

''اس حادثے میں کوئی نہ بچا تھا۔'' باباجی نے بے حد دُکھ سے کہا۔

''نہیں باباجی! اِس حادثے میں، میں اور نگینہ بچے تھے، میری پھوپو مریم بی بی زندہ ہیں!'' ساری کڑیاں کھلنے پر عبدالولی کے لیے اس حقیقت سے پردہ اٹھانا آسان ہوگیا تھا کہ وہ عورت، جو دیوانوں کی طرح اُس کے پیچھے پاکستان تک چلی آئی تھی وہ اُس کی سگی پھوپوتھی اور عبداللہ!!

عبداللہ جس کے وجود سے اُسے کتنی اپنی اپنی خوشبو محسوس ہوتی تھی وہ اُس کا پھوپوزاد بھائی تھا۔

''پیارے بیٹے! اُمید ہے نئے رشتوں کے ساتھ آپ پرانے رشتوں کو بھی لے کر چلیں گے۔'' باباجی نے عبدالولی سے کہا۔

''رشتے جتنے پرانے ہوجاتے ہیں اتنے ہی مضبوط بھی ہوجاتے ہیں پھر میں اپنے جنم دینے والے کو تو بھول سکتا ہوں، لیکن میری زندگی کو زندگی کا مطلب دینے والوں کو کیسے بھول سکتا ہوں؟'' عبدالولی نے بے اختیار کہا۔

آج اُس کی زندگی کچھ نئے رشتے لینے جا رہی تھی اور اب اُسے کچھ پرانے کھوئے رشتے بھی مل گئے تھے۔ اتنا تو وہ جانتا تھا کہ ہر رشتہ چاہے وہ نیا ہو یا پھر پرانا! ذمے داری مانگتا ہے، قربانی مانگتا ہے ایک رشتے کو پانے کے لیے اُس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی قربانی دے ڈالی تھی اور اب جو بن مانگے رشتے ملے ہیں تو وہ بھی تو اُس سے خراج مانگیں گے۔

''بی بی جی! باہر چھوٹی بٹیا کے سسرال والے آئے ہیں!'' اُسی پل ملازمہ نے آ کر اطلاع دی۔

''کون! شہباز بھائی اور نیلوفر؟'' روشن آرا بیگم نے پوچھا۔

''جی ہاں!'' ملازمہ نے تابع داری سے کہا۔

''بیٹا! وقت تیزی سے نکلتا جا رہا ہے سب مہمان آچکے ہیں میرا خیال ہے اب بس نکلنے کی کرنی چاہیے۔'' روشن آرا بیگم نے چادر کے پلو سے منہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

ولی کے دل میں اب بھی ڈھیروں ڈھیر سوال تھے لیکن اب ہر کوئی افراتفری میں تھا بارات لے جانے کا وقت ہوگیا تھا مگر اُس کو تو اپنے سوالوں کے جواب تفصیلاً چاہئیں تھے۔ لیکن اب وقت باقی نہ تھا۔

ولی کو لگ رہا تھا کہ وہ ایک دم اپنی عمر سے بہت بڑا ہوگیا ہے زندگی جانے اُس کے لیے مزید اور کتنے انکشاف اپنے دامن میں لیے کھڑی تھی۔

❖❖○❖❖

''جانے میں ہر بار کیوں لیٹ ہوجاتی ہوں، آنی سے بہت جھاڑیں پڑیں گی۔'' سائرہ نے تیزی سے ہائی ہیل جوتے کا بکل بند کرتے ہوئے کہا۔

ابو اور آنی تو نکل چکے تھے اور وہ لیٹ ہوجانے کی وجہ سے ابھی یہیں پر تھی۔

گیلے بالوں کو بلو ڈرائی کر کے وہ انہیں کھلا چھوڑ کر اپنا جھلملاتا دوپٹہ لے کر جب باہر نکلی تو ملازمہ ٹی وی لاؤنج میں ایک مہمان لڑکی کے ساتھ کھڑی تھی۔

''کون؟'' سائرہ نے بغور اُسے دیکھا لیکن اُسے یاد نہ آیا کہ وہ ہے کون؟

''سوری! میں جلدی میں ہوں۔'' سائرہ نے بے اختیار گھڑی دیکھی، ڈرائیور گاڑی نکال کر باہر کھڑا تھا۔

''اب یہ مہمان کون ہے؟'' سائرہ کا دماغ الجھا ہوا تھا۔

"کیا میں آپ کو جانتی ہوں؟" سائرہ نے پوچھا۔

"نہ جاننے سے کیا رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔" لڑکی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"جی!" سائرہ نے جی کو کچھ زیادہ ہی کھینچ دیا تھا۔

"بعض اوقات دو لوگوں میں بے حد قریبی رشتہ ہوتا ہے لیکن بے خبری کی وجہ سے وہ رشتہ دور ہوتا ہے۔" لڑکی بولی۔

"پلیز اپنا تعارف آسان لفظوں میں کروادیں اور یہ بھی کہ اِس وقت گھر میں کوئی نہیں ہے۔" سائرہ نے زچ ہوکر کہا۔

"میرا نام سحرش ہے!" لڑکی نے چونکانے والے انداز میں کہا۔

سائرہ نے عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھا۔

"اگر وہ سحرش ہے تو اِس میں کیا انوکھا ہے۔"

"میرا پورا نام سحرش طارق ہے اور طارق میرے شوہر کا نام ہے!" سحرش نے ایک دم بم دھماکا کیا۔

"ک۔کیا؟ کیا مطلب ہے آپ کا؟" سائرہ نے حیرت سے پوچھا۔

"اِس میں حیران ہونے والی کیا بات ہے، میں آپ کی بھابی ہوں اور میری اور طارق کی شادی کو بہت عرصہ ہو چکا ہے۔" لڑکی نے ساتھ ہی کچھ تصاویر نکال کر سامنے رکھ دیں۔

"لالہ!" سائرہ حیرت سے تصویر پکڑے کھڑی تھی اُس کا تو دماغ گھوم کر رہ گیا۔

"لالہ! جو نگینہ کو بچپن سے پیار کرتے آئے تھے، جن کا اُس سے کل نکاح تھا وہ۔ وہ کیسے شادی کر سکتے ہیں؟ یا میرے اللہ!" سائرہ نے بے اختیار سامنے بیٹھی اُس روڈ سی لڑکی کو دیکھا۔

"کیا واقعی ایسا ہے؟"

سائرہ کا دِل آنے والے بہت سارے لوگوں کی زندگی میں اِس بات کا جو منفی اثر ہونے والا تھا اُس کو سوچ کر ہی سہم گیا تھا۔

❖❖○❖❖

سید سرفراز علی ہال میں پہنچ کر ریسیپشن کے انتظامات کا جائزہ لے رہے تھے وہ کسی چیز کی کمی نہیں چاہتے تھے۔

مسکان کو تیار کر کے ابھی ابھی برائیڈل سویٹ میں لے جایا گیا تھا یہ کمرہ پورا سویٹ تھا جہاں بیڈ، صوفے، باتھ روم اور ٹی وی وغیرہ سب موجود تھا تا کہ دلہن ریلیکس کر سکے۔ بہت عمدہ Comfortable روم تھا۔

سید سرفراز علی، نفیسہ بیگم اور مسکان کو وہاں چھوڑ کر ریسپشن پر چلے آئے۔

بارات آنے میں کچھ وقت تھا لیکن بارات کے کچھ مہمان جو بارات کے ساتھ نہ آئے تھے وہ بھی گاہے بگاہے آرہے تھے۔

سید سرفراز علی کی ملازمائیں ہر آنے والے مہمان کو پھولوں کے ہار پہنا رہی تھیں اور اُن کو چاندی کے

Coins گفٹ کر رہے تھے یہ چاندی کے Coins بہت پیاری ٹرانسپیرنٹ Packing میں تھے اور عام Coins کی نسبت سات آٹھ گنا بڑے اور چوڑے تھے۔

جب ہر مہمان یہ تحفہ لے کر مرعوب ہوتے ہوئے اردگرد کی سج دھج دیکھ کر اندر جا رہا تھا تو سید سرفراز علی کی گردن مزید تن جاتی تھی۔

اُسی پل اُس کی نگاہ سامنے پڑی۔

کیا یہ کوئی بھیانک خواب تھا؟

سامنے سے مریم بی بی اور ڈاکٹر فیصل چلے آرہے تھے۔ سید سرفراز علی نے بے اختیار آنکھیں ملیں۔

"کیا مر جانے والے دوبارہ زندہ ہو کر آرہے ہیں۔" جوں جوں وہ لوگ قریب آرہے تھے سید سرفراز علی کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

جوں جوں ڈاکٹر فیصل اور مریم بی بی سید سرفراز کے قریب آ رہے تھے، سید سرفراز علی کے کٹھور اور جس دِل پر بے انتہا دباؤ بڑھ رہا تھا۔ اُن کے دل میں باقاعدہ درد اُٹھا تھا۔

ہر منظر میں چاہے وہ حقیقت کا ہی کیوں نہ ہو اُس میں ہر وقت کچھ نہ کچھ **Illusion** ضرور ہو ہیں یہ **Illusions** ہمارا دِل اور دماغ ہر وقت پیدا کرتے ہیں یہ کبھی خوش فہمی اور کبھی کبھار غلط فہمی لبادہ اوڑھ لیتے ہیں لیکن سامنے جو منظر تھا، وہ نہ ہی کوئی الوژن تھا اور نہ ہی اُس نے کسی غلط قسم کا لبا اوڑھ رکھا تھا۔ وہ ایک ایسی حقیقت تھا جس کو اُن کا دِل بے شک نہیں مان رہا تھا لیکن اُن کا دماغ بتا تھا کہ سامنے والا منظر سچ ہے۔

''کیا دیکھ رہے ہو سید سرفراز علی؟'' کوئی اُن کے اندر سے بولا۔

''کیا شکست اور وہ بھی ایسی!'' ساتھ ہی اندر سے جواب بھی آیا۔

''نہیں! میں نہیں ہار سکتا، میں نہیں ہار سکتا۔'' سید سرفراز علی ایک دم چلاّئے۔

اُن کے پاس کھڑے سب لوگ متوجہ ہوئے، مریم بی بی اور ڈاکٹر فیصل دونوں عین اُن کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

''تم؟'' سید سرفراز علی نے اپنے بائیں بازو میں درد روکتے ہوئے کہا، لیکن درد تھا کہ سینے تک چلا آ رہا تھا۔

''کیوں! حیرت ہوئی یہاں دیکھ کر یا پھر زندہ دیکھ کر!'' ڈاکٹر فیصل نے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے یوں پوچھا، جیسے اُن کے بیچ اتنے سال اتنے پل آئے ہی نہ ہوں۔

سید سرفراز علی کا منہ کھلا کچھ کہنے کے لیے لیکن وہ ایک دم نیچے آ گرے، ایک دم حاضرین میں بھگدڑ مچ گئی۔

خادمِ خاص اپنے مالک کی جانب تیزی سے لپکے۔

''کیا ہوا سائیں؟'' کسی نے پوچھا۔

''ہارٹ اٹیک!'' ڈاکٹر فیصل نے سنجیدگی سے جواب دیا اور اُن کو فرسٹ ایڈ دینے کے لیے نیچے بیٹھ گئے۔

''سید سرفراز علی! خبردار تم یوں مرے تو! میں تم کو اتنی آسانی سے مرتے نہیں دیکھنا چاہتا۔'' ڈاکٹر فیصل نے ابتدائی طبی امداد دیتے ہوئے سید سرفراز علی کے کان میں کہا۔

جب کہ مریم بی بی بالکل ساکت کھڑی تھیں، جیسے اِس چلتے منظر میں وہ ایک صرف بے جان مورت ہوں۔

''ابھی تو بہت سارے کھاتے کھلنے ہیں، تم ایسے کیسے مر سکتے ہو؟'' وہ دِل ہی دِل میں بولیں۔

❖❖○❖❖

''کیسے؟'' نفیسہ بیگم کے ماتھے پر شکنیں تھیں۔ ملازمہ نے آ کر ایک بالکل مختلف خبر سنائی دی تھی۔

''آیا امّاں کیا ہوا، یہ سب لوگ کیوں اتنے پریشان کیوں ہیں؟'' مُسکان کو کسی نے کچھ نہیں بتایا تھا وہ سب کے چہروں پر پھیلی پریشانی سے بخوبی سمجھ رہی تھی۔

اس کا سارا دھیان تو عبدالولی کی ہی طرف لگا تھا۔

''کچھ نہیں بیٹا! باہر روڈ پر کوئی حادثہ ہو گیا تھا اب ٹھیک ہے، ایمبولینس لے گئی ہے متاثرین کو۔'' آیا ں نے گہری سانس بھر کر اپنے اندر کو پُرسکون کرنے کی کوشش کی۔ ہال سارا مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا تھا اور مسکان! اُس کے ارمان تو مچل مچل کر باہر آ رہے تھے۔

''بیٹا! میں ابھی آتی ہوں، تم بیٹھو کچھ آرام کر لو، سارا وقت بیٹھ بیٹھ کر تم نے تھک جانا ہے، بہتر ہے دیر ٹانگیں اُوپر کر کے ٹیک لگا لو۔'' آیا امّاں اُسے مشورہ دیتی ہوئیں باہر نکل گئیں جب کہ مُسکان نے ت سے اُن کو دیکھا۔

''آج اُس کی شادی کا دن تھا، وہ اُسے آرام کرنے کا مشورہ کیوں دے رہی تھیں۔'' وہ اپنی حیرت پر پاتی سامنے لگے قدِ آدم شیشے میں اپنا عکس دیکھنے لگی۔

وہاں تو کسی شہزادی کا عکس تھا۔

مسکان خوشی اور بے یقینی سے اپنے آپ کو ہر ہر اینگل سے دیکھ رہی تھی اُس کا دل مختلف رفتار سے کا تھا وہ اپنا عکس ولی کی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھی۔

اُسے حیران اور مبہوت دیکھنا چاہتی تھی۔

وہ جس کے سامنے اُس نے اپنا دِل اور زندگی ہار دی تھی آج وہ اُسے جیت کر خود کو دوبارا پانا چاہتی تھی نے اس پانے کے کھیل میں بڑے خسارے سہے تھے اور اب وہ صرف جیت کی منتظر تھی اور ایسے میں اماں کے مشورے کہ تم آرام کر لو اُسے بہت بُرے لگ رہے تھے۔

❖❖○❖❖

ایسا کیا ہوا کہ سید سرفراز علی کا پہاڑ جیسا دِل کم زور پڑ گیا؟

نفیسہ بیگم ایمبولینس تک تیزی سے پہنچیں کیوں کہ سید سرفراز علی اُن سے ملے بغیر ہسپتال نہ جانا چاہتے۔ وہ اندر آ کر بیٹھیں تو سید سرفراز نے آکسیجن ماسک منہ سے ہٹا لیا۔

''نفیسہ! اگر میں مر جاؤں تو بھی مسکان کی رُخصتی ادھوری نہیں رہنی چاہیے، اُسے میرے متعلق کل رات ہا چلنا چاہیے۔ و۔ ولیمے کے بعد۔'' سید سرفراز علی نے اُکھڑتی سانسوں کے ساتھ حکم دیا۔

''لیکن وہ! اُسے کیا کہوں گی تمہارے متعلق؟''

''کچھ بھی!''

''تم جاؤ!'' سید سرفراز علی نے بری طرح ہانپنا شروع کردیا، سانسیں پھر اُکھڑنے لگیں تو ڈاکٹر نے فورا آکسیجن ماسک لگادیا۔

ایک ہی وقت میں سید سرفراز علی کی ایمبولینس روانہ ہوئی اور دوسری جانب مسکان کی بارات ڈھیروں گاڑیوں کی لائن میں پارکنگ سلوبز کراس کررہی تھی۔

پارکنگ بھی بہت Creative لائنز میں ڈیزائن کی گئی تھی، یہ ویڈنگ وینو وزیروں کی پارٹیز کے لیے مخصوص تھی لیکن سید سرفراز جیسے شخص کے لیے یہاں شادی افورڈ کرنا بالکل مشکل نہ تھا وہ مسکان سے زیادتیوں کا ازالہ کرنے کے لیے ہر چیز اور ہر کام کو دی بیسٹ کے خانے میں سیٹ کرنا چاہتے تھے۔

سنوبری تو اُن کی نیچر میں تھی ہی لیکن یہ سب کچھ انہوں نے مسکان کے لیے کیا تھا۔

لیکن قسمت تھی کہ جس بارات کو انہوں نے تقدیر کا رُخ موڑ کر اپنے راستے پر آنے پر مجبور کیا تھا اُس فتح کو دیکھنے کے لیے وہ موجود نہ تھے، جوں جوں بارات گیٹ کے قریب آرہی تھی ایمبولینس کی تیز آواز وہاں موجود بینڈ کی آواز میں دبتے دبتے ختم ہوگئی تھی۔

انسان خود کو بہت بڑا Planner سمجھتا ہے لیکن دنیا کے سب سے بڑے Planner کے سامنے زمیرو ہو جاتا ہے۔

❖❖○❖❖

''پیارے بیٹے! بسم اللہ کرکے اپنا دایاں پاؤں باہر رکھو!'' روشن آرا بیگم کی آواز خوشی اور جذبات سے کپکپارہی تھی۔

اُن کا شہزادوں جیسا بیٹا آج واقعی شہزادہ لگ رہا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ زندگی کی جانب اس کا یہ قدم اتنا بابرکت ثابت ہو کہ زندگی کے پودے سے لگے سارے کانٹے جھڑ جائیں اور اُس کی ڈال پھول اور پھل سے جھک جائے اور یہ ایسا کوئی ناممکن بھی نہ تھا کیوں کہ یہ ایک ماں کی دعا تھی اور ماں کی دعا تو ایک فائٹر کی طرح ہوتی ہے جو ہر مشکل اور ناممکن سے لڑجاتی ہے۔ عبدالولی نے جیسے ہی اپنا قدم باہر رکھا۔ اس کے دوستوں نے بھنگڑا ڈالتے ہوئے اُسے گھیرے میں لے لیا۔

روشن آرا بیگم، جو بہت خوب صورت چادر میں مکمل طور پر لپٹی ہوئی تھیں مسکرا کر ذرا پیچھے کھڑی ہوگئیں۔ احمد شاہ نے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو بے اختیار انہوں نے بھی مُڑ کر دیکھا۔

''روشن! دیکھو، یہ وہ منظر ہے جو آج سے اکیس سال پہلے ناممکن تھا ہماری اولاد نہ تھی لیکن آج! آج اِس منظر نے بتادیا ہے کہ اگر ہماری سگی اولاد بھی ہوتی تو یقیناً اُتنی وفادار اور تابعدار ہرگز نہ ہوتی، اللہ نے انعام کے طور پر ہم کو یہ بچے نوازے تھے، آج میرا دل بھی اِن بچوں کی طرح جھومنے کو کررہا ہے اتنا خوش ہے کہ میرا دِل کرتا ہے میں بھی اپنے ربّ کا اِسی طرح جھوم جھوم کر شکریہ ادا کروں، جس نے ہماری ادھوری زندگی کو ایسے پورا کیا کہ یوں لگا، جیسے دِل کو اب کسی اور بات کی حسرت نہیں۔'' احمد شاہ کہہ رہے تھے اور روشن آرا بیگم سامنے کا منظر دیکھ کر اپنی آنکھوں میں بہتے آنسو بے اختیار صاف کرنے لگیں۔

''واقعی آج کا منظر اکیس سال پہلے ناممکن بن چکا تھا لیکن اُس بڑی سرکار نے، رب العزت نے اُن کی زندگی اِس خوب صورت منظر سے رنگنی ہی تھی کیوں کہ وہ خود سے درخواست کرنے والے کی کبھی نہیں

تا اور مانگنے والے کو ہمیشہ عطا کرتا ہے۔

❖❖○❖❖

''بی بی جی! باہر آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔'' ملازمہ نے برائیڈل سوئیٹ میں داخل ہوکر کہا۔

''کون ہے، میں ابھی تو سب مہمانوں سے مل کر آئی ہوں۔'' نفیسہ بیگم نے نقاہت سے کہا۔ وہ اندر اتنی پریشان تھیں کہ اُن کی طبیعت خراب ہونے لگی۔

''آیا امّاں! آپ ٹھیک تو ہیں نا؟'' مسکان نے بھی بے حد فکرمندی سے پوچھا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے اُس نے کھڑکی سے عبدالولی کو دولہا بنے دیکھا تھا، سہیلیوں کا کہنا تھا کہ دلہن ری سے دولہے کو دیکھ لے تو وہ ہمیشہ بیوی کی مانتا ہے۔

عبدالولی جو کبھی اُس کے ماننے میں ہی نہ تھا، مسکان نے یہ سن کر اُسے بہت حرص سے دیکھا۔

اُس کی اندر تک یہ خواہش تھی کہ اب وہ اپنا پیا من بھائے اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اُس کا بن کر رہے، اُس کا ہمیشہ مانتا رہے۔ اُس نے عبدالولی کو کتنی ہی دیر دیکھا لیکن جیسے ہی وہ کمرے میں آئی تو آیا امّاں کو پسینے دیکھ کر وہ بے حد فکرمند ہوگئی۔

''تم! دُور جارہی ہو نا، اِس لیے دل کم زور پڑرہا ہے بس اتنی سی بات ہے۔'' آیا امّاں نے گہری سانس بھر کر خود کو کمپوز کرتے ہوئے کہا۔

''بی بی! وہ لوگ، جو آپ سے ملنا چاہتے ہیں اُن سے کیا کہوں؟'' ملازمہ منتظر تھی اُس نے اپنا سوال دہرایا۔

''اُن کو بابا سائیں سے ملوادو، آیا امّاں تھکن کی وجہ سے اچھا محسوس نہیں کررہیں۔'' جواب مسکان نے دیا۔

''نہیں! رُکو، میں آتی ہوں۔'' نفیسہ بیگم نے گھبرا کر اُٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا کہ کہیں مسکان کو باپ کی خبر نہ مل جائے کہ وہ ہسپتال ہیں۔ ساتھ ہی اُٹھ کر وہ باہر نکل گئیں۔

سامنے جو شخصیت کھڑی تھی اُسے دیکھ کر نفیسہ بیگم کو یوں لگا، جیسے اُن کا پورا وجود آنسو بن کر رہ گیا ہو، ب سے وہ سید سرفراز علی کی زندگی میں آئی تھیں ہر وقت کا رونا تو تب ہی سے قسمت میں لکھ دیا گیا لیکن یہ آنسو ہمیشہ کسی اپنے کے انتظار میں اُن کے دل پر گرتے رہے اور پہاڑوں کا سا بوجھ لیے وجود تھے، لیکن آج سامنے اپنے ماں جائے کو دیکھ کر اُن کے اندر آنسوؤں کے بنے گلیشیر کچھ ایسے پگھلے کہ اُن کا سارا وجود بس آنسو بن کر رہ گیا۔

جانے کتنی دیر وہ بھائی کے سینے سے لگیں دھاڑیں مار کر روتی رہیں، آج انہوں نے اپنی بھری جوانی کو بہایا تھا جو سید سرفراز کے ہاتھوں تباہ ہوئی تھی، ماں باپ بھائی سب کے آنسو ڈاکٹر فیصل کے کندھے سے لگ کر بہالیے تھے خود ڈاکٹر فیصل کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی تھی وہ پھانس، وہ بوجھ جو برسوں سے وہ اپنے دِل پر لیے گھوم رہے تھے، اپنی ماں جائی سے ملنے پر کچھ کم ہوگیا تھا۔

''بھائی! میرا بھائی زندہ ہے!'' نفیسہ بیگم نے ڈاکٹر فیصل کا چہرہ تھام کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''جس رات سید عبداللہ کو اور اُس کے سارے خاندان کو سید سرفراز نے آگ لگوائی تھی اس کی صبح

عبداللہ مجھ سے ایک خوشی کی خبر کا وعدہ کر گئے تھے... آج آپ کو دیکھ کر میں جان گئی ہوں کہ وہ خوش خبری آپ تھے۔"

آج! سید عبداللہ نے اپنا وعدہ پورا کر ڈالا، وہ دنیا میں نہیں ہیں لیکن میرا روم روم اُن کا شکر گزار اور دُعا گو ہے۔" نفیسہ بیگم نے دوپٹے کے پلو سے اپنا منہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"وہ ہم سب پر قربان ہوگیا، وہ اپنے لوگوں کے لیے آسانی اور برابری کا سسٹم بنانا چاہتا تھا لیکن! اُسے اِس کی سزا موت کی صورت ملی۔" ڈاکٹر فیصل کے چہرے پر آج بھی اتنا ہی دُکھ تھا جتنا سید عبداللہ کی موت کا دُکھ برسوں پہلے ہوا تھا۔

"خدا کی لاٹھی بے آواز ہے بھائی!" نفیسہ بیگم نے روئے روئے لہجے میں کہا۔

سید سرفراز علی کا مکافاتِ عمل کا دور شروع ہو چکا ہے لیکن میرا دل خوش نہیں ہوا، کیوں کہ سید سرفراز علی کی سزا کے حصے دار اُس کے بچے بنے ہیں۔ یہ بچے مجھے اپنی اولاد کی طرح عزیز تھے کیوں کہ یہ ہمیشہ سے معصوم تھے لیکن قسمت کے بہت بد بخت نکلے، کیوں کہ اِن کا باپ سید سرفراز علی ہے اور اُن کو ہر صورت یہ سزا بھگتنی ہے۔" نفیسہ بیگم نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

اِس سارے دورانیے میں مریم بی بی کے ساتھ زہرہ اور عبداللہ خاموشی سے پھوپو اور باپ کو دیکھتے رہے، اُن سب نے موقع دیا کہ وہ دونوں برسوں سے لدا بوجھ دِل سے اتار دیں۔

"نفیسہ! تم سید سرفراز علی اور اُس کی اولاد سے کوئی ہمدردی نہ رکھو کیوں کہ سانپ کا بچہ سانپ ہی ہوتا ہے اُسے ڈسنا سکھانا نہیں پڑتا کیوں کہ یہ اُس کی فطرت میں ہوتا ہے۔" ڈاکٹر فیصل نے بے حد سفا کی سے کہا۔

سید سرفراز علی نے اُن کے دِل میں اتنے چھید لگائے تھے کہ ان کو اپنا دِل ایک چھلنی کی طرح لگنے لگا تھا تبھی تو اتنے سوراخوں کی وجہ سے کوئی اعتبار اُن کے دِل میں ٹھہر نہ پاتا تھا۔

"بھائی! اگر دِل میں معاف کر دینے کا احساس نہیں ہوگا تو اُس مولا سے ہم ہر وقت جو اپنی معافی اور بخشش کی دُعا کرتے رہتے ہیں کیسے اُس سے سوال کر پائیں گے؟"

"تم سید سرفراز علی کو معاف کرنا چاہتی ہو؟" ڈاکٹر فیصل نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

وہ لوگ اِس وقت ہال کے ایک جانب کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ہر فیملی کے لیے الگ سے ٹیبل لگائے گئے تھے جتنے انوی ٹیشن تھے اتنے ہی ٹیبل بھی لگائے گئے تھے، ہر ٹیبل پر ہر مہمان کا نام موجود تھا لوگ اپنے اپنے نام دیکھ کر میزوں پر بیٹھے تھے۔

"معافی! بھائی معافی تو اُسے ملتی ہے جو اُس کا طلب گار ہوتا ہے۔ بنا طلب کے یہ کبھی نہیں ملتی، جس کو اِس کی طلب ہوتی ہے وہ اپنے روّیوں سے، اپنی زبان سے، اپنے دل سے اِس کا طلب گار ہوتا ہے اور اُسے یہ مل بھی جاتی ہے اور سید سرفراز! اُسے تو اپنی غلطی کا ہی احساس نہیں ہوتا تو وہ معافی کیوں مانگے گا؟" نفیسہ بیگم کھوئے کھوئے لہجے میں بولیں۔

"جو معافی چاہتا نہیں اُسے نہیں ملے گی، میں تو!" نفیسہ بیگم نے لب کچل کر آنسو پینے کی کوشش کی، آنسوؤں کی وجہ سے وہ بات مکمل نہ کر پا رہی تھیں۔

"میں تو آپ ﷺ کی دی ہوئی بات سے اپنی اندھیروں میں ڈوبی زندگی میں کچھ روشنی کی امید بھرنا ہتی ہوں وہ دنیا کے بہترین انسان تھے، جنھوں نے فرمایا تھا کہ اگر کچھ بھی نہ کر سکو تو کم از کم ایک پودا رور لگا دینا تا کہ جب وہ درخت بنے تو اُس کا صدقہ جاریہ پھل اور سایہ جو وہ دوسروں کو دے گا تمہیں ملے۔"

"میرے پاس بھی اپنے اعمال اور اولاد نہیں ہے جو صدقہ جاریہ بنتے، میں مسکان کو اُس کے ساتھ تریں اچھائی کر کے اُسے بچا کر اپنے لیے صدقہ جاریہ کا بندوبست کر رہی ہوں۔ میرے لیے اگر وہ رف دشمن کی بیٹی ہوتی تو میں کب کی بربادی کی انتہاؤں اور خسارے کے ڈھیر اپنے دامن میں بھر لیتی، بکن میرے مولا نے مجھے ایسا کرنے سے روک کر میرے لیے آسانیاں پیدا کر دیں، اب مجھے کوئی بھی لے کہ میں سید سرفراز علی کو معاف کر رہی ہوں تو میں اُسے نہیں بتاؤں گی کہ میرا دل کیا سوچتا ہے کیوں کہ بہترین سوچ کو پیدا کرنے والا صرف اللہ ہے۔" نفیسہ بیگم شدتِ جذبات سے سُرخ چہرہ لیے بولیں۔

ہرہ نے پانی کا گلاس بھر کر اُن کو تھمایا، جسے وہ بنا سانس لیے پی گئیں۔

ڈاکٹر فیصل کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو کر بھیگ گئی انہوں نے نظر بھر کر اپنی بہن کو دیکھا، جو اُن کو بے حد بلندی پر محسوس ہوئیں۔ وہ عورت ہو کر اتنی چھوٹی بات جان گئی تھی اور اُس نے اپنے راہ کے کانٹے پھولوں میں تبدیل کر لیے تھے۔ اور انہوں نے اتنی زہریلی باتوں کو سینے سے لگا رکھا تھا اور اُن کی ساری زندگی پھوڑے کی طرح دُکھتی رہتی رہی تھی۔

"ہم جب کسی کو معاف کرتے ہیں نا بھائی! تو دراصل ہم خود کو معاف کرتے ہیں۔ غصہ اور کرودھ (بغض) دراصل ہم کو اندر اندر ہی اندر جلاتا ہے، سزا دیتا ہے جتنی آگ کسی کو دیتے ہیں اتنی ہی آگ خود کے اندر بھی جلتی ہے۔" نفیسہ بیگم پانی پی کر، آنسو بہا کر شانت سی ہوگئیں۔ مریم بی بی نے ڈاکٹر فیصل کا برسوں کا تڑپنا اور سسکنا اُن کو بتا دیا تھا اِس لیے وہ چاہتی تھیں کہ اُن کا بھائی اس بھانبڑ سے نکل آئے اور دیکھے کہ یہاں سے نکل کر اللہ نے باہر کتنی ٹھنڈک رکھی ہے۔

"نفیسہ! تم نے میرے جلتے دِل پر آج پانی ڈال کر میرا اندر تک شانت کر دیا، شکریہ میری بہن!" ڈاکٹر فیصل نے نفیسہ بیگم کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"وہ آگ جو سرفراز علی نے ہمارے گھر اور زندگیوں کو برسوں پہلے لگائی اُسے میرے آنسو اور آہیں ہمیشہ تازہ کرتی رہیں، میں نے کبھی یہ آگ بجھائی ہی نہیں۔" ڈاکٹر فیصل نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"وطن سے دور اپنی مٹی سے دُور! اپنوں کی قبروں سے دُور، میں کہیں بہت دُور کھو گیا تھا لیکن آج میری بہن تم نے مجھ پر ایک بہت بڑا احسان کیا ہے، تم نے میرے وجود کو مجھ سے ملا دیا ہے، جو برسوں پہلے مجھ سے بچھڑ گیا تھا۔" ڈاکٹر فیصل دھیرے دھیرے بولے۔

مریم بی بی نے بے حد احسان مند نظروں سے نفیسہ بیگم کو دیکھا۔ بظاہر جس کی زندگی کی کشتی میں ڈھیروں سوراخ ہو گئے تھے وہ آج تک اِسی لیے نہ ڈوبی تھی کیوں کہ اُس نے اپنی کشتی سب سے بڑے نگہبان کے حوالے کر ڈالی تھی اور آج ایک بظاہر ٹوٹی پھوٹی عمارت نے کسی اور گرتی عمارت کو سہارا دے کر اُٹھا ڈالا تھا۔

نفیسہ بیگم نے وہ کام کر ڈالا تھا جو مریم بی بی برسوں میں بھی نہ کر سکی تھیں۔

''میں! آج اپنا سارا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں وہ جو چاہے فیصلہ کرے، فیصلہ جزا کا ہو یا سزا کا میں اُس کی رضا میں راضی رہوں گا۔'' ڈاکٹر فیصل نے بے حد پُر سکون ہو کر کہا۔

''انسان واقعی کم عقل ہے وہ بار اُٹھالیتا ہے جو اُسے اٹھانا نہیں چاہیے جب وہ جزا اور سزا کا فیصلہ کرنے کا مختار نہیں ہے تو پھر کیوں ساری عمر دوسروں کی زیادتی کو خود پر سزا کی طرح لاگو رکھتا ہے۔'' ڈاکٹر فیصل نے دِل میں کہا۔

''ہم مُسکان بیٹی کو اپنی دعاؤں اور پیار کے سائے میں خود رخصت کریں گے۔'' مریم بی بی نے جلدی سے بارش کی پہلی بوند بنتے ہوئے کہا، ساتھ ہی انہوں نے دھڑکتے دِل سے شوہر کو دیکھتے ہوئے تائید چاہی۔

''انشاء اللہ!'' ڈاکٹر فیصل نے کہا تو مریم بی بی کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ برسوں سے ایک دُھند کے بھرے موٹے سے غلاف میں بند زندگی گزار رہی تھیں، وہ غلاف اُن کے اردگرد سے پھٹ کر ختم ہو گیا ہو اور تازہ ہوا اور زندگی کی حرارت اُن تک پہنچ گئی ہو۔

''آپ مسکان بیٹی کو بتائیں کہ اُس کی پھوپو مریم بی بی اور تمہاری نسبت سے تمہاری بیٹی ہونے کی وجہ سے اُس کے ماموں اُس کو دعائیں اور پیار دینے کے لیے آئے ہیں۔'' یہ ڈاکٹر فیصل کہہ رہے تھے، جو آئے تو ہر چیز تہس نہس کرنے کے ارادے سے تھے لیکن اب وہ بالکل ایک بدلا ہوا بیان دے رہے تھے۔

اللہ نے اُن کے دِل پر بھی رحمت کردی تھی، اُن پر آمرزش کی بارش کر کے اُن کے دل میں بھڑکتی آگ کو بجھا ڈالا تھا۔ نفیسہ بیگم چہرہ صاف کر کے دھیمے سے تبسم کے ساتھ اندر بڑھیں تا کہ مسکان کو بتا سکیں کہ اُس کی شادی کا دِن اُن کے لیے بھی ڈھیروں خوشیاں لے کر آیا تھا۔

❖❖○❖❖

آنچل سے دھوپ جھٹکی
اوک میں تارے بھر لائے
کیکر بو کر بیر توڑے
ایسا جگ میں ہو نہ پائے
چنری پہ اتنے تارے چمکیں
جتنی جھمل مکیش لگائیں
چاش میں ڈوبی لکھی کافی
پھر نہ لکھے کوئی چاؤ مصرے
ڈونگا ہے جب دریا ڈونگا
دِل پتوار سہار لے تیرتا جائے
رانجھن ڈھیر اڈیکھتے ہی

ن کوئل بن کے کوکتا جائے
لا کبوتر بن کے ڈالے
گھمن گھمن گھمیریا
ن کی چادر میں پھوٹیں پھوٹیں
آگ کی بڈی مائیاں
چھن چھن چھن چھن امبر سے
بن کے موتی برسیاں
لس لس کھلی سوڈے کی بوتل
روم روم بھیگا چھلکی اکھیاں
اکھیاں اور نہ ترسیاں

عبدالولی کے پہلو میں بیٹھے کیمروں کی لائیٹس میں چمکتی ہوئی مسکان تو کسی اور ہی جہان میں کھوئی ی تھی کہ بعض سچائیاں بھی خواب سی لگنے لگتی ہیں۔

جب زہرہ اور اُس کی دوسری سہیلیاں اُسے اسٹیج پر لے کر آئیں تو عبدالولی احتراماً کھڑا ہو گیا۔ اُس ی دلہن کو یہ ویلکم پروٹوکول دیا تھا، شکرانے سے مسکان کا دِل جھک جھک جا رہا تھا یہ وہی عبدالولی تھا ں کے لیے اُس کا ہونا یا نہ ہونا کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔

جس ربّ سے وہ نراش ہو گئی تھی، روٹھ گئی تھی اُس نے اُس کی سرکشی کے باوجود معجزانہ طور پر وہ کچھ ے دیا تھا، جس کی اُس کو خواہش تو تھی لیکن اُمید باقی نہ رہی تھی۔

وہ دلہن بنی چوری چوری عبدالولی کو ہی دیکھ رہی تھی اِس شخص کو اُس نے اتنا پوجا تھا اُسے وہ بہت بلند رُور محسوس ہوتا تھا لیکن آج کا دِن مختلف تھا!

پجارن کی قسمت بدل گئی تھی!
اُس کی پوجا مکمل ہو گئی تھی۔
اُس کی ''کہی'' سب سے بڑے دربار میں ''سُنی'' گئی تھی۔
اُس کی دعائیں مقبول ہو گئی تھیں۔

''تو مُسکان عبدالولی! یہ خواب نہیں، یہ سچ ہے!'' اُس نے اپنے اندر خوشی سے پھوٹتے اناروں کی ململ کو محسوس کرتے خود سے کہا۔

❖❖○❖❖

''بابا سائیں کہاں ہیں آپا اماں؟'' مسکان نے وقت رخصت اِدھر اُدھر کچھ تلاش کرتے پوچھا۔

''وہ؟'' نفیسہ بیگم کچھ پل کو چپ سی رہ گئیں، اُن کے کانوں میں سید سرفراز علی کی آواز گونجی۔

''مسکان کو میرے متعلق کچھ پتا نہ چلے، اُسے اچھی یا بُری خبر ویسے کی رات کو دی جائے۔'' نفیسہ بیگم نے بے اختیار گہری سانس لی، وہ خود سید سرفراز علی کے انجام سے بے خبر تھیں۔

''زبیر کا مسئلہ تھا ہوسٹل سے کچھ ڈرگ ملی تھیں، کوئی پولیس کیس تھا اُس سلسلے میں ارجنٹ نکلنا پڑا۔''

نفیسہ بیگم نے وہ بہانہ بنایا جو زیادہ ٹھوس تھا کیوں کہ اِس سے پہلے بھی کئی بار زبیر ڈرگز کی وجہ سے ہا سائیں کے لیے مسئلہ بن چکا تھا۔ وہ تھرل کے لیے ڈرگز استعمال کرتا تھا اور سید سرفراز علی نے اُسے کبھی تھرل کے لیے بھی نہ روکا تھا۔

''زیادہ مسئلے کی تو بات نہیں ہے نا؟'' مُسکان نے بہت دھیمی آواز میں پوچھا۔

''نہیں! تم بے فکر رہو، ویسے بھی سید سرفراز کے لیے عموماً کوئی مسئلہ، مسئلہ نہیں ہوتا! کیوں کہ وہ تو خو مسئلوں کی جڑ ہوتا ہے۔'' آخری جملہ دِل میں کہتے آپا امّاں نے مُسکان کو تسلی دے کر رخصت کیا۔

''بچی نے بہت دُکھ جھیلے ہیں، آپ کے گھر کے سُکھ کچھ اِس کی جھولی میں پڑ جائیں گے تو اِس کے سارے ملال ڈھل جائیں گے اور مہمان، بیٹیوں، بارش کو جو خوش آمدید کہتا ہے اللہ کا بہت پیارا ہوتا ہے۔'' نفیسہ بیگم نے روشن آرا بیگم کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''آپ بے فکر رہیں، اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے بعد میں ہمیشہ اِس کا بہت خیال رکھوں گی، میں خود بیٹی کی ماں ہوں اور بیٹی کتنی نازک ہوتی ہے، اچھی طرح جانتی ہوں، میرا بیٹا لاکھوں میں ایک ہے، اس کو ہمیشہ خوش رکھے گا۔'' روشن آرا بیگم نے کہا تو نفیسہ بیگم جھلملاتی آنکھوں سے ایک دم مسکرا دیں۔

''ہاں! میں جانتی ہوں، وہ واقعی لاکھوں میں ایک ہے۔'' نفیسہ بیگم نے بے حد یقین سے کہہ کر مسکان کو رخصت کیا۔

بعض لوگوں میں جیسے شرافت خاندانی پہچان ہوتی ہے، ویسے ہی بعض لوگوں کا خون بولتا ہے کہ وہ بے حد قابل اعتبار انسان ہیں اور ولی اُن خوش نصیبوں میں ہمیشہ شامل رہا تھا۔

❖❖○❖❖

کافر نہ ریاکار، نہ صوفی، نہ ولی ہیں
اللہ نے جو ہم کو بنایا ہے وہی ہیں
مصری ہیں نہ شامی ہیں، نہ ہندی ہیں نہ عربی
ہم رشتہ توحید سے اعلیٰ نسبی ہیں
وہ اصل حقائق کو چھپانے کے لیے ہیں
تحریر میں جو لفظ بانداز جلی ہیں
اللہ نے سونپا تھا ہمیں کارِ نیابت
وہ چھوڑ کر ہم کشتۂ آساں طلبی ہیں
یہ حکم مشیت تھا کہ دُنیا کو سنوارو
اور ہم ہیں کہ برگشتہ دنیائے دنی ہیں
تھا حکم کہ گلزار کرو دشتِ جنوں کو
اور ہم ہیں کہ ہاتھوں کو دھرے منتظری ہیں
اُٹھتا ہی نہیں اب تو قدم راہِ عمل میں
اس طور سے فالج زدہ خوفِ بدی ہیں

کہنے کو تو ہم راندۂ فردوس ہیں لیکن
یہ یاد رہے، ہم میں ہی نبیوں کے نبی ہیں

طارق نے ہائی کمان کو بھرپور Presentation دی تھی، جس کی وجہ سے اُسے کچھ زیادہ مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑا، اُسے بھرپور آپریشن کی اجازت اور سہولیات دی گئی تھیں۔

طارق بہت پُرجوش تھا اور جلد باز بھی!

ہر چیز بہت اچھی ہوئی تھی اور رزلٹ بھی اُس کی اپنی پسند کا مل گیا تھا بس اُسے ایک بات کا اختلاف تھا کہ اُسے آپریشن کی اجازت پانچ روز بعد ملی، جو ڈپٹی ہائی کمان میں Directers تھے اُن کا خیال تھا کہ اتنے بڑے آپریشن کے لیے ضروری ہے کہ چوہوں کے سارے پوپ ہولر بند کر دیے جائیں تاکہ جب پکڑ دھکڑ شروع ہو تو کسی کو بھاگنے کا موقع نہ ملے۔

بات تو اُن کی بھی درست تھی لیکن طارق کی کوئی سِنس الارم ہر وقت کھڑی رہتی تھی، جو اُسے مسلسل وارن کر رہی تھی کہ اتنا لمبا گیپ کسی نقصان کا باعث بن سکتا ہے، لیکن اِس ساری بات کو ماننے کے سوا اس کے پاس کوئی اور آپشن بھی تو نہ تھا۔

اِس لیے وہ ''یس سر'' کہہ تابعداری سے اپنی فائلز اور اسسٹنٹ کو لے کر باہر آ گیا۔

دماغ کتنا ہی فکر مند تھا لیکن اُس کا دِل اُس سے زیادہ پُرسکون تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اچھی نیتوں کے ساتھ اللہ کا ساتھ ہوتا ہے اور جس کے ساتھ اللہ ہوتا ہے، جیت صرف اُس کی ہوتی ہے۔

❖❖○❖❖

''مجھے اجازت دو بیٹا!'' بابا جی تیار بیٹھے تھے واپس جانے کو جیسے ہی عبدالولی کی بارات گھر آئی، انہوں نے ہاتھ اُٹھا کر مشترکہ دُعا کی اور پھر اجازت چاہی۔

''کیوں بابا صاحب! یہاں کوئی تکلیف ہے، ہم سے کوئی کوتاہی ہو گئی؟'' احمد شاہ نے اُن کے سامنے دوزانوں ہو کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں پیارے بیٹے! میں یہاں اہم کام کے لیے آیا تھا اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اُس مولا نے امانت لوٹانے میں بھرپور مدد کی۔ اب وہاں بھی کوئی منتظر ہے، کچھ کام ادھورے ہیں، میرا جانا ضروری ہے، کوئی دِل کے بھنور میں دھنسا ہے اور اُسے نکالنے کا کام اللہ نے مجھے سونپا ہے مجھے جانے دو۔'' بابا جی نے اتنے دھیمے لہجے میں کہا کہ اُن کے پاس بیٹھے احمد شاہ بامشکل اُن کی بات سُن پائے۔

اُن کی بات میں کچھ ایسا تھا کہ احمد شاہ اُن کو روک نہ پائے۔ انہوں نے اپنی سب سے اچھی گاڑی اور ڈرائیور اُن کے ساتھ کر دیے تاکہ اُن کا سفر کچھ بہتر گزر سکے۔

وہ بابا جی کے جانے پر خوش نہ تھے۔

لیکن اُن کو بابا جی کی خوشی بہت عزیز تھی۔

''میری دعائیں اور پیار ہمیشہ تم لوگوں کے ساتھ رہے گا اللہ تعالیٰ تم کو ہمیشہ آسانیاں دے اور تم اُس کے دیے سے ہمیشہ دوسروں کو دیتے رہنا!'' بابا جی اُن سب کو پیار بھری دُعا اور نصیحت کر کے سفر کے لیے نکل پڑے اُن کو جانے کی جلدی تھی کیوں کہ کوئی اُن کی مدد کا شدت سے منتظر تھا۔

❖❖○❖❖

کمرے کی ڈیکوریشن دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

مسکان خود ایک ڈیزائنر تھی اور کریٹو لوگ ہمیشہ کریٹو کو پسند کرتے ہیں۔

کمرے میں ماحول کو لائٹیس کے ذریعے Facimate کیا گیا تھا۔

گولڈن کلر کے بڑے بڑے برتنوں میں خوش بودار پھول تھے، جن کی مہک نے اُسے اندر تک تازہ کر دیا تھا سفید گلابوں کے ساتھ پنک اور سرخ گلابوں کا امتزاج کر کے فلاور ڈیکوریشن ارینج منٹ کے ساتھ اس قدر خوب صورت تھی کہ اسے مبہوت کر رہی تھی۔

عبدالولی اُن خوش قسمت لوگوں میں شامل تھا جس کے چاؤ اور ارمان کرنے والے بہت سارے لوگ تھے اُس کی ایک ایک چیز کا خیال رکھنے کے لیے بہت سارے لوگ ہر وقت دِل سے موجود رہتے تھے۔

''مسکان بیٹا!'' روشن آرا بیگم نے کمرے میں داخل ہو کر اُسے پکارا۔ مسکان نے چونک کر اُن کو دیکھا، وہ کمرے کے ماحول میں اِس قدر گم تھی کہ وہ اُن کی موجودگی کمرے میں فوری طور پر محسوس نہ کر پائی۔

''السلام علیکم!'' مسکان نے اُن کو باقاعدہ سلام کیا۔ حالاں کہ گھنٹہ پہلے تو وہ اُن کے ساتھ ہی یہاں آئی تھی لیکن اُسے فوری طور پر تکلف کی دیوار توڑنے کا یہی راستہ نظر آیا اِس لیے وہ سلام کر کے آگے بڑھی۔

''جیتی رہو بیٹا!'' روشن آرا بیگم نے دُعا دیتے ہوئے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

نگینہ ہاتھ میں ایک ڈبہ اُٹھائے اندر آئی، اُس کے پیچھے پیچھے عبدالولی بھی تھا۔

''اماں جان! دیکھیں بھائی نے مجھے کیا دیا۔'' نگینہ نے جیولری کا باکس کھول کر دکھایا۔ یہ پینڈل تھا جس میں بہت بیش قیمت ہیرا جڑا ہوا تھا۔

عبدالولی کو اسکالرشپ میں ہر مہینے ٹھیک ٹھاک پیسے ملتے تھے احمد شاہ عبدالولی کے اکاؤنٹ میں ہر وقت ہینڈسم اماؤنٹ رہنے دیتے تھے اس وجہ سے روزمرہ ضروریات پوری کرنے کے بعد بھی عبدالولی کے پاس بہت زیادہ رقم پیچھے رہ جاتی تھی۔ علیزے کے تصور کو سامنے رکھتے ہوئے اُس نے نگینہ اور علیزے دونوں کے لیے ڈائمنڈ کے یہ لاکٹ خریدے تھے۔

''بہت خوب صورت ہے، اللہ آپ کے نصیب میں کرے۔'' روشن آرا بیگم بھائی کی بہن کے لیے محبت دیکھ کر کھل اُٹھیں۔

''اماں جان! یہ آپ کے لیے چھوٹا سا تحفہ لیا تھا۔'' عبدالولی نے ایک چھوٹا سا باکس کھول کر بہت نازک سا بریسلٹ نکالا، جس کے سینٹر میں بہت ہی خوب صورت ہیرا موجود تھا۔

''بیٹا! آپ ہی تو میری اصل دولت ہو، میرے لیے کیوں اتنی قیمتی چیز خریدی؟'' روشن آرا بیگم کو واقعی بہت خوشی ہوئی تھی۔

بیٹے جب ماؤں کے لیے کچھ خریدتے ہیں تو ماؤں کو الگ ہی طرح کا فخر محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے بیٹے نے اُن کو سوچ کر خاص طور پر اُن کے لیے کوئی چیز خریدی۔

''دنیا میں جتنی دولت موجود ہے وہ ساری خرچ کر دی جائے پھر بھی میری ماں کے شایانِ شان کوئی چیز خریدی نہیں جا سکتی۔'' عبدالولی نے اُن کے ہاتھ پر بوسہ دے کر وہ بریسلٹ پہنا دیا۔ اِس سارے دورانیے میں وہ اپنی نئی دلہن کو بالکل بھولے بیٹھا تھا۔

''عبدالولی!''

''بیٹا! آپ اِدھر آؤ۔'' انہوں نے مسکان کے برابر اس کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

عبدالولی نے ایک نظر مُسکان کو دیکھا اور ٹھٹک کر رہ گیا۔ وہ بے حد خوب صورت تھی لیکن آج تو روپ ٹوٹ کر اُس پر اُترا تھا۔ ولی کو حیرت ہوئی کہ ایک دم اُسے کیا ہوا، اُس نے اُسے کیوں نوٹس کیا؟

اُس کے اردگرد تو ہمیشہ ہی بہت خوب صورت لڑکیاں رہی تھیں پھر اُس نے اُسے کیوں نوٹس کیا؟

شاید یہ نکاح کے بولوں کا اثر تھا۔

نکاح کے بول ایسے جادو اثر ہوتے ہیں جو دو اجنبیوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک کر دیتے ہیں۔

''یہ لو!'' روشن آرا بیگم نے ڈبے سے ایک نازک سا تاج نکالا۔

''یہ شاہ صاحب نے مجھے شادی کی رات تحفہ دیا تھا، یہ احمد کی پڑدادی کا ہے اس میں کچھ نگینوں کو میں نے بڑھایا تھا ورنہ یہ ویسے کا ویسا ہے، جب سب خواتین اس کو اپنے بیٹوں کی دلہنوں کے لیے سنبھالتی آئی ہیں تو میرا دل بھی کیا کہ اِسے میرے ولی کی دلہن پہنے۔'' روشن آرا بیگم نے ولی کو تاج پکڑا دیا۔

''اِس کا میں کیا کروں، یہ تو مسکان کے لیے ہے نا؟'' ولی نے سادگی سے ماں سے پوچھا۔

''بدھو! پہنا دو میری بہو کو۔'' روشن آرا بیگم نے حوصلے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

دس پندرہ سال مسلسل آپ ایک ہی خواب دیکھیں لیکن جب حقیقت مختلف ہو جائے تو بہت مشکل ہوتا ہے اُس کا سامنا کرنا۔ انہوں نے بھی علیزے کا تصور کر کے یہ تاج سنبھال کر رکھا تھا انہوں نے مسکان کو دیکھا، ولی نے اُسے تاج پہنا دیا۔ مسکان کے چہرے سے اِس قدر خوب صورت روشنیاں پھوٹ رہی تھیں کہ روشن آرا بیگم کے سارے ملال ڈھل گئے۔

''اللہ تعالیٰ کی ذات تم دونوں کی جوڑی ہمیشہ سلامت رکھے، تم دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے دِلوں میں بستے رہو، اللہ تعالیٰ تم دونوں کو نیک اور صالح اولاد عطا فرمائے۔'' دُعا کے آخری حصے جہاں پر ولی پہلو بدل کر رہ گیا تھا، وہاں مُسکان کا چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا۔

''خوش رہو!'' انہوں نے دونوں کو دُعا دی اور نگینہ کا ہاتھ تھام کر باہر نکل گئیں۔

کمرے میں کتنی ہی دیر خاموشی کا راج رہا، یہاں تک کہ مسکان نے بے چین ہو کر ولی کو دیکھا، جو کسی بہت گہری سوچ میں بیٹھا تھا۔

مسکان نے تھک کر پہلو بدلا تو اُس کی چوڑیوں کی کھنک کسی بہت خوب صورت موسیقی کی طرح کمرے میں گونجی، عبدالولی نے چونک کر اُسے دیکھا۔

وہ ایک دم مسکان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

''مسکان!'' ولی نے اُسے بلایا۔

مُسکان کا دِل اُچھل کر حلق میں آپڑا۔

''جی!'' مسکان بامشکل بول پائی۔

''جن حالات میں ہماری شادی ہوئی، تم کو خبر ہوگی۔'' ولی تو تمہید باندھنے لگا تھا، لیکن مسکان کے نفی میں سر ہلانے پر وہ چونکا۔

''مطلب تم نہیں جانتیں کہ تمہارے فادر نے میری بہن کو کڈنیپ کرنے کا ڈرامہ رچا کر تاوان میں ہمارا نکاح کروایا۔'' مُسکان حیرت اور دُکھ سے ایک دم اُٹھ کھڑی ہوئی، اُس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ سچی ہے۔

''بابا سائیں ایسا کریں گے، میں نہیں جانتی!'' مسکان نے صفائی دینے کی کوشش کی تو عبدالولی نے اُسے مزید صفائی دینے سے روک دیا۔ وہ عورتوں کی عزت کرتا تھا اور اُسے اچھا نہ لگتا تھا کہ اُس کے سامنے کوئی عورت گڑگڑائے یا پھر اپنی صفائیاں دے۔

''جو ہوگیا وہ اب بدلا نہیں جاسکتا، میں نے مان لیا ہے یہی حقیقت ہے لیکن میرے دل کو ماننے میں کچھ وقت درکار ہے۔'' ولی نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ مسکان کا دِل بے اختیار ڈوبا، آنسو اُس کی آنکھوں میں اُبھر آئے۔

''لیکن بے فکر رہو، یہ وقت زیادہ نہ ہوگا کہ تمہارے صبر کا دامن چھوٹ جائے۔'' ولی نے اُس کا ہاتھ تھام کر اُس کے بے حد قریب ہو کر کہا۔ مسکان کے تو سارے مسام پھوٹ پڑے، نگاہیں جھک کر سجدے میں جو گئیں تو اُٹھنا محال ہوگئیں۔

وہ جسے اُس نے دِن رات مانگا تھا وہ اُس کے اِس قدر قریب تھا، اُس کی قربت اُسے موم کی طرح پگھلا رہی تھی۔

''میں! آپ کے ساتھ، آپ کے ہر احساس کے ساتھ ہمیشہ رہوں گی، میرے لیے تو یہی بہت ہے کہ میں جس نے آپ کو اتنا چاہا کہ میں، میں نہ رہی آپ ہوگئی اب ہمیشہ کے لیے آپ کی ہوگئی ہوں، اب مجھے کوئی ڈر نہیں ہے، میں انتظار کروں گی!'' مسکان نے رُک رُک کر ٹھہر ٹھہر کر کہا تو ولی کے اندر طمانیت بھری لہر دوڑ گئی۔

''یعنی راستہ اتنا کٹھن نہ تھا۔'' اُس نے بے اختیار مسکان کا ہاتھ گرم جوشی سے دبایا۔ اور مسکان کا دل بھی اتنی ہی شدت سے ایک بار پھر دھڑکا۔

ابھی ایک کا دِل تال پر تھا اور دوسرے دِل کو اِس تال پر آنے کے لیے کچھ وقت درکار تھا لیکن پہلے دل کو یقین تھا کہ محبت کا سُر ایک دن ضرور چھڑے گا۔

❖❖○❖❖

سائرہ ساری تقریب میں غائب دماغ رہی تھی حالاں کہ اُس کی عزیز ترین سہیلی کا وہ خاص دِن تھا لیکن وہ بھرپور طریقے شامل نہ ہوسکی تھی۔ وہ مسلسل ذہنی کشمکش میں تھی۔

''بیٹا! تم سوگئیں کیا؟'' آنی نے اندر داخل ہو کے پوچھا۔

''نہیں آنی! آجائیں۔'' سائرہ کپڑے بدل چکی تھی اب وہ سلیپنگ ڈریس میں گم سم آئینے کے سامنے بیٹھی میک اپ اُتار رہی تھی، لیکن اُس کا سارا دھیان اُن تصویروں میں تھا، جو آج وہ لڑکی سحرش

لے کر آئی تھی۔

سائرہ کو سمجھ نہ آرہی تھی کہ یہ بات کس سے شیئر کرے اور کس سے کنفرم کرے۔ ابو اور آنی کو بتانا بہت رسکی تھا دونوں کی طبیعت دھوپ چھاؤں کی طرح ہونے لگی تھی، دونوں کو ہی الی پرابلم ہوجاتا تھا۔

''کل کی تقریب کے لیے میں نے اپنی بہو کو یہ سلامی ڈالنے کا فیصلہ کیا ہے۔'' آنی نے ست لڑا ہار ال کر سائرہ کے سامنے لہرایا۔

''واہ! بھابی کے تو عیش ہوگئے۔'' سائرہ نے بمشکل مسکراتے ہوئے کہا۔

''بہت زبردست چیز ہے آنی! کہاں چھپا رکھا تھا اسے؟'' سائرہ نے خود کو ہشاش بشاش کرنے کی اشش کرتے ہوئے کہا۔

''تم فکر نہ کرو، تیرے لیے بھی میں نے بہت یونیک چیزیں سنبھال کر رکھی ہیں۔'' آنی نے مسکراتے ائے ہار دوبارہ ڈبے میں بند کرتے ہوئے کہا۔

''یہ ہار میرا ہے! ویسے تو آپا کا سارا زیور بھی پڑا ہے، جو میں نے کبھی نہیں تڑوایا، وہ زیور میں تم کو ان گی اور میرا زیور جو ابا نے میرے لیے بنا کر رکھا تھا وہ میں اپنی بہو کو ڈالوں گی، بے شک نئے دور کی ڑیں بھی تم لوگ بنوانا، لیکن میں نے جو سوچ رکھا ہے وہ تم لوگوں کو ضرور دوں گی۔'' آنی کی آنکھیں ات کرتے ہوئے چمک رہی تھیں۔

''کیوں نہیں آنی! یہ زیور تو ہمارے لیے اُن دعاؤں کی طرح ہیں، جو آپ نے ہمارے لیے سنبھال لر رکھیں ہوئی تھیں۔'' سائرہ نے اُن کا دِل سچے دِل سے بڑھایا۔

''اچھا اب تم سوجاؤ، صبح بہت سارے انتظام کرنے ہیں آخر میرے بیٹے کا نکاح ہے۔'' آنی خوشی وشی باہر نکلیں تو سائرہ ایک دم بستر پر ڈھے گئی۔

''اللہ! یہ خوشی راس آجائے ہمیں، آنی اور ابو کس قدر خوش ہیں، خدانخواستہ کوئی بھی بدمزگی اُن کو کتنا کھ دے گی، ایک تو لالہ ابھی تک نہیں آئے۔'' سائرہ طارق کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی جو ہر فون کال پر کہہ رہا تھا کہ وہ بس ابھی پہنچنے والا ہے۔

جب وہ غصّے سے بالکل پھٹنے والی ہوگئی، تب اسے باہر گیٹ پر ہارن سنائی دیا۔ یہ ہارن طارق کی بیب کا تھا۔

سائرہ کے پاس مزید انتظار کا صبر نہ تھا اِس لیے وہ تیزی سے باہر بھاگی۔

❖❖○❖❖

''نفیسہ! تم ہمارے ساتھ چلو۔'' ڈاکٹر فیصل اور مریم بی بی نے مشترکہ اصرار کیا۔

نفیسہ بیگم نے بے اختیار گہری سانس بھری۔

''بھائی! میرا اُس مینڈک جیسا حال ہوگیا، جو اپنے کنویں تک ہی رہنے کا عادی ہوچکا ہوتا ہے، میری زندگی تو گزر چکی اب اس ''عصر وقت،، میں، میں کیسے زندگی کے رُخ کو بدل دوں، مجھے ایسے ہی رہنے دیں۔'' نفیسہ بیگم نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

’’نفیسہ! میری بہن! تم زندہ ہو یہ جان کر میرا دِل جو برسوں سے مردہ پڑا تھا اُس میں زندگی دوڑنے لگی ہے، تم میری خاطر اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرلو۔‘‘ ڈاکٹر فیصل نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

’’پلیز پھوپو!‘‘ عبداللہ نے اُن کا ہاتھ تھاما۔

پلیز پھوپو۔‘‘ زہرہ اُن کے کندھے سے جا لگی۔ جانے کیوں!

نفیسہ بیگم کے دِل پر جمی برسوں کی برف پگھلنے لگی۔

’’کیا کچھ رشتے واقعی زندگی جیسے ہوتے ہیں، جو ہاتھ رکھتے ہی دِل و جان میں زندگی دوڑانے لگتے ہیں۔‘‘

’’ٹھیک ہے! میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔‘‘ نفیسہ بیگم نے حامی بھری۔

ڈاکٹر فیصل کا چہرہ خوشی سے جگمگانے لگا۔

’’میں مُسکان کی شادی کی آخری تقریب کے بعد آپ کے ساتھ چلوں گی۔‘‘ نفیسہ بیگم کا اشارہ ولیمے کی تقریب کے متعلق تھا۔

ڈاکٹر فیصل کچھ پَل سوچ میں پڑ گئے پھر طویل سانس بھر کر مان گئے۔

’’ٹھیک ہے، جہاں اتنا عرصہ میں نے دِل پر پتھر رکھے رکھا، وہاں دو دِن اور سہی!‘‘ ڈاکٹر فیصل نے کہا۔

’’پھوپو اب ہمارے ساتھ رہیں گی نا!‘‘ زہرہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ جواباً نفیسہ بیگم نے جی بھر کر اپنے پیاروں کے چہرے دیکھے۔

’’ہاں! اب میں ہمیشہ تم لوگوں کے ساتھ رہوں گی۔‘‘ نفیسہ بیگم کے دل نے فیصلے کی سیڑھی بالآخر چڑھ ہی لی۔

❖❖○❖❖

وہ جو مربعوں زمین کا مالک تھا، جس نے اپنی حکومت قائم کر رکھی تھی، جو برسوں سے دوسروں کی زندگیوں سے کھیلتا آرہا تھا کہ خود کو خدائی کا دعویٰ کرنے سے بھی اُسے گریز نہ تھا آج وہ آئی سی یو میں تنہا موجود تھا۔

اتنا تنہا جیسے کہ کوئی لاولد یا پھر لاوارث انسان ہوسکتا ہے۔

وہ جس نے دولت کو اپنے گھر کی باندی بنا رکھا تھا وہ اتنا کنگال تھا کہ اُس کے لیے دُعا کرنے کے لیے کوئی رشتہ اِس آئی سی یو کے دروازے پر نہ تھا۔ بیٹے کے ہوتے، بیوی کے ہوتے ہوئے بھی آج وہ بالکل تنہا تھا۔

باہر خادمین بیٹھے تھے لیکن اُن کو لاکھ Concern اپنے مالک سے سہی لیکن اُن کا خون کا رشتہ تو سید سرفراز علی سے نہ تھا۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹرز اور نرسیں آئی سی یو سے باہر نکلیں تو سید سرفراز علی کا خادم ڈاکٹر کی جانب لپکا۔

’’سائیں! بڑا سائیں اب کیسا ہے؟‘‘ ملازم نے سوال کیا۔

’’اب وہ خطرے سے باہر ہیں۔‘‘ ڈاکٹر کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

پہاڑ کو ٹوٹنے میں وقت لگتا ہے، ابھی تو پہاڑ صرف اپنی جگہ سے ہلا ہی تھا اور پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں تو تباہ ہونا اُن کے مقدر میں ہوتا ہے۔

❖❖○❖❖

مرے لہو کی روانیوں میں
نہاں ہے تُو ہی
مری نظر میں
اِک عالم بے کراں ہے
تُو ہی
کلام میں سانس لے رہا ہے
بصورتِ اشک
رات، دن مجھ سے کہہ رہا ہے
دُعائیں تُو ہی سُنے گا، آخر کو تُو ہی
اس کرب جاوداں کا سبب ہے
تو ہی علاج ہوگا

ترنم سر جھکائے بابا جی کے سامنے بیٹھی تھی، رات کے اِس پہر وہ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

’’کیا ہوا؟‘‘ بابا جی نے قریب آ کر اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

’’وہ! میری ماں! بابا جی بس ایک نظر میں اپنی ماں کو دیکھنا چاہتی ہوں، یوں لگتا ہے اگر میں اپنی ماں سے نہ ملی تو مر بھی نہ سکوں گی۔‘‘ ترنم نے سسکتے ہوئے کہا۔

’’بیٹی! وہ مالک جو اوپر بیٹھا ہے نا! وہ ستر ماؤں سے زیادہ بندے سے پیار کرتا ہے اگر ایک ماں اپنے بچے کی ذرا سی تڑپ کو محسوس کرلیتی ہے تو وہ مولا کیسے تیری تڑپ کو محسوس نہیں کرتا ہوگا۔ بے شک وہ سب سے زیادہ سننے والا ہے، اُسے ’’یا سمیع،، کہہ کر جب پکارتے ہیں تو وہ ضرور سُنتا ہے، وہ تیری ماں سے تجھے ضرور ملوائے گا۔‘‘ بابا جی نے اُسے تسلی دی۔

’’بابا جی! آخر انسان آخری دم تک حریص کیوں رہتا ہے؟ اس دُنیا سے اتنے غم لینے کے باوجود اِس دنیا سے خوشیاں لینے کی آس اُسے کیوں رہتی ہے، یہ حرص آخر کیوں نہیں مرتی؟‘‘ ترنم نے مٹھیاں بھینچ کر بامشکل کہا۔

اپنی خواہش کے آگے سب بے بس ہوتے ہیں، بے بس انسان بے چارہ تو گول گول گھمن گھیریاں ہی کھاتا رہتا ہے۔ ترنم بھی اکثر حیرت زدہ ہوتی تھی کہ آخر اُس کی زندگی ختم ہوگئی تو اُس کے اندر خواہش کیوں ختم نہیں ہوتیں۔

خواہشیں!!

’’بیٹا! تو پریشان نہ ہو، جس طرح سب کے حصے کا رزق اُترتا ہے نا، اُسی طرح صحت، خوشیاں، غم اور یہ خواہشیں بھی ہمارے حصے کی اُترتی ہیں۔‘‘ بابا جی کی بات پہ ترنم یک ٹک انہیں دیکھے گئی۔

''کیا اللہ کبھی مجھ پر میری لرزشوں کو اِس طرح معاف کردے گا؟''

''بیٹا! بے بسی لاکھ ان چیزوں کے ساتھ انسان محسوس کرتا ہو لیکن اُس اللہ کی بندگی کے لیے تو اُس کا دِل اُس کے بس میں ہوتا ہے نا!''

''بابا جی! میری ساری زندگی سیاہ کاری میں گزری ہے، ایسے میں کسی شخص کی طلب کرنا حیرت کی بات ہے نا؟'' ترنم شاید ابھی تک نیند میں تھی، جو اپنے آپ میں نہ تھی اِسی لیے تو ایسے سوال کررہی تھی۔

''خواہش کرنا بُری بات نہیں ہے لیکن خواہش کا گھوڑا اتنا سرپٹ نہیں بھگانا چاہیے کہ اردگرد کی ساری چیزیں تباہ ہوجائیں۔'' بابا جی کا تحمل دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

''پر میری خواہشوں کے گھوڑے تو ہمیشہ ہی سرپٹ دوڑے ہیں اور میں ہر بار بُری طرح گری ہوں۔'' ترنم نے غائب دماغی میں اپنے دونوں ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''عزت! جو واحد میری ماں باپ کے پاس تھی اور مجھے اُس کی قدر نہ رہی تھی پھر میں نے اُسے کھو کر اُس کی قدر جانی تھی، اب میرا روم روم اُس عزت کا طلب گار ہے آہ! کاش وقت لوٹ آتا اور میں اپنی غلطی سُدھار لیتی۔'' ترنم نے پچھتاوے سے کہا۔

''ایمان فاطمہ سے ترنم کا سفر نہ کرتی۔'' ترنم نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ وہ کفارے کی راہ پر چلنے کے باوجود کبھی کبھی اِسی طرح ڈی ٹریک ہوجاتی تھی۔

بابا جی نے اُس کے چہرے پر پھونک ماری اور اُسے سونے کا اشارہ کیا۔ لیکن ترنم کی آنکھوں سے نیند کہیں دور نکل گئی تھی۔

''مرنے سے پہلے میں ماں سے اور اُس بشر سے ملنا چاہتی ہوں، جو مجھے اِن انسانوں کی دُنیا میں واحد انسان نظر آیا تھا۔'' ترنم کی آنکھوں کے سامنے ولی کا چہرہ لہرایا۔

ترنم منہ ہی منہ میں بدبدا رہی تھی۔

بابا جی نے پھر کچھ پڑھ کر اُس پر پھونکا۔ اُسے ایک دم سکون کا احساس ہوا اور اُس کی روٹھی نیند بھی واپس آ گئی اور اُس کی آنکھیں نیند سے بند ہونے لگ گئیں۔

''آہ! میری ماں!!''

''آہ! وہ میرا عزت دار زندگی گزارنے کا خواب!'' نیند سے بوجھل ہوتی آنکھوں سے جو آخری منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے ذہن کے پردے پر لہرایا وہ عبدالولی کا چہرہ تھا۔

❖❖○❖❖

''مارک! اُس کو ڈھونڈ کر لاؤ!''

''وہ! اُسے!!'' میڈم راگنی نے غصّے سے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ اُس سے جملہ پورا کرنا دُشوار ہو رہا تھا۔

''جانے اُسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا، بے شک وہ اب ہمارے کام کی نہ رہی لیکن اُس کا مرنا ضروری ہے بہت ضروری ہے، وہ گھر کا بھیدی ہے لنکا ڈھا سکتا ہے۔'' راگنی میڈم نے غصّے سے پھنکارتے ہوئے کہا۔

''کیا معلوم کہ وہ کوئی بھید جانتی بھی تھی کہ نہیں۔'' مارک نے اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہوئے

کہا۔

''وہ ماہی کے ساتھ رہتی تھی اور ماہی جس نے میرا بہت اعتبار حاصل کرلیا تھا اور بہت کچھ جان گئی تھی تبھی تو وہ اتنی جرأت کرپائی کہ یہاں سے لڑکیاں نکال سکے، یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ترنم اِن سب باتوں سے لاعلم ہو، مارک ہر شہر میں اپنے کارندوں کو اُس کی تصویر Send کرو، اُس کو چھان کر نکال کر لاؤ، اُسے میں اپنے ہاتھوں سے ایسی بھیانک سزا دینا چاہتی ہوں کہ سب لڑکیاں یاد رکھیں، اُسے میں ایسا عبرت کا نشان بنانا چاہتی ہوں کہ آئندہ کوئی بغاوت کا تصور تک نہ کرسکے۔'' میڈم راگنی نے شعلہ بار نگاہوں سے پھنکارتے ہوئے کہا۔

''اوکے میڈم! جیسا آپ کا حکم۔'' مارک کہہ کر باہر نکل گیا جب کہ میڈم راگنی جلے پیر کی بلّی بنی مسلسل کمرے کے چکر کاٹتی رہی۔

''ترنم ترنم! یو آر فنشڈ ناؤ!'' اُس نے اپنی ہتھیلی پہ مکّا مارتے ہوئے کہا۔

وہ اِس وقت بل کھاتی زخمی ناگن بنی بیٹھی تھی جو ہر صورت بدلہ لینا چاہتی تھی۔

❖❖○❖❖

بی بی جی! مبارک ہو سائیں کو ہوش آ گیا ہے۔'' نفیسہ بیگم گم سم بیڈ پر لیٹی تھیں جب ملازمہ نے آ کر اطلاع دی، لیکن نفیسہ بیگم کے فلیٹ تاثرات دیکھ کر ایک دم اُس کے جوش و خروش میں کمی آ گئی۔

''آپ بی بی جی! آپ سائیں کو دیکھنے ہسپتال نہیں جاؤ گے کیا؟'' ملازمہ خود کو کہنے سے پھر نہ روک سکی۔

نفیسہ بیگم نے غائب دماغی سے ملازمہ کو دیکھا، یوں لگتا تھا وہ وہاں موجود ہو کر بھی موجود نہ تھیں۔

''بی بی جی!'' ملازمہ نے اُسے سہہ بار پکارا۔ وہ بھی اپنی ہٹ کی پکی تھی۔

''ہوں!'' نفیسہ بیگم جیسے واپس آ گئیں۔

بہت سارے چہرے اُن کے سامنے لہرا رہے تھے بہت ساری یادیں ناگن بنی اُن کو ڈس رہی تھیں۔

رانی، میر، ماسی، امّاں، بابا، قیصر بھائی! شہر بانو، بلال کیسے چاند چہرے دِل کے پیارے اُن سے چھوٹ گئے تھے اور یہ سب سید سرفراز کی وجہ سے تھا۔ انہوں نے ساری عمر سید سرفراز علی سے اِس قدر نفرت کی تھی کہ جب وہ زندگی موت سے لڑ رہا تھا تو بھی وہ وہاں نہیں گئیں اور نہ ہی کوئی فون کیا۔ اُن کا دل عجیب دوراہے پر تھا۔ اُس شخص کی اولاد جس سے وہ دنیا میں سب سے زیادہ نفرت کرتی تھیں اُس کی اولاد کو انہوں نے ہمیشہ پیار کیا تھا۔

پہلے وہ اپنے اِس پیار پہ جو اُن بچوں کے لیے دل میں اُمڈتا تھا حیران ہوتی تھیں کہ اللہ نے یہ پیار اُن کے دل میں کیوں رکھا پھر وہ اللہ کی شکر گزار ہوئیں کہ اگر نفرت کی اِس جلتی آگ میں جس میں اُن کا خود کا وجود بھی جلتا تھا اگر یہ پیار نہ ہوتا تو وہ اِس آگ میں جل جل کر بالکل راکھ ہوچکی ہوتیں، ان بچوں کا کوئی قصور تھا نہیں لیکن اگر ہوتا بھی تو وہ معاف کردیتیں، لیکن سید سرفراز علی کا وہ کوئی بھی قصور معاف کرنے پر تیار نہ تھیں۔

وہ کل جا رہی تھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لیکن وہ جانے سے پہلے اُس شخص کو مل کر جانا چاہتی تھیں، جس

نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا اور اُن کی زندگی سے کھیلا تھا۔ وہ اُسے بتانا چاہتی تھیں کہ ہر فرعون کی قسمت میں بالآخر غرق ہونا ہی لکھا ہوتا ہے۔

❖❖O❖❖

کس نے دیکھا آنے والے دن کا روپ
کس نے چھوا ہے شام کی بھیگی زلفوں کو
کس کے مقدر میں ہے پورے چاند کی رات
کون صبح کے جھونکوں میں ہوگا بے دار
جانے دو
کل کی باتیں اُجلے اُجلے خوابوں کی پہچان سہی
اِس لمحے سے روشن کون سا پَل ہوگا
یہ لمحہ جو ہم دونوں کا حصہ ہے
اِس سے پہلے تاریکی تھی
اِس کے بعد کا علم نہیں
بیتے وقت کی اِس ساعت خاموش رہو
تم سے اگر ہو
مجھ پر یہ احسان کرو
اپنا چہرہ میرے سامنے رہنے دو

مدھم روشنیوں میں وہ عبدالولی کا چہرہ دیکھے جا رہی تھی، وہ جاگتے میں کتنا مختلف ہوتا تھا Attitude کے ساتھ! لیکن سوتے میں تو وہ بالکل معصوم بچہ دکھائی دے رہا تھا۔ گہرے براؤن بال بکھر کر ماتھے پر آ گئے تھے سنہری آنکھیں بند تھیں لیکن گھنی پلکیں مڑی ہوئی تھی جیسے مسکارا لگا رکھا ہو۔

مسکان کے اندر تک خوشی اور سکون اُتر رہا تھا۔

وہ اُس کی وہ دُعا تھا، جو اُسے ناممکن لگتی تھی لیکن آج وہ اُس کے ساتھ ایک کمرے، ایک ہی بستر پر اتنے قریب سو رہا تھا کہ وہ اُسے چھو سکتی تھی، محسوس کر سکتی تھی۔

بے شک ابھی فاصلے برقرار تھے لیکن مسکان کو کوئی پروا نہ تھی۔ جس ربّ نے یہ ناممکن، ممکن کر دیا تھا۔ تو فاصلے نزدیکیوں میں بدلتے کب دیر لگتی ہے۔

اس لیے وہ بے حد اطمینان سے اپنے دیوتا کو دیکھ رہی تھی، جس کو اُس نے اپنی سُدھ بُدھ کھو کر پوجا تھا وہ جو کل تک اُس کا نہ تھا لیکن آنے والے کل میں صرف اُس کا تھا۔

❖❖O❖❖

''کیسے ہو چھوٹے صاحب!'' رحیم بخش نے بہت پیار سے عبدالولی کو دیکھا۔

''آپ کے سامنے ہوں، بڑوں کی دُعاؤں کا اعجاز ہے۔'' عبدالولی نے اُن کو ہاتھ تھام کر کرسی پر بٹھایا۔

''بٹیا کیسی ہے، نظر نہیں آئی!'' رحیم بخش نے نگینہ کو اِدھر اُدھر اتنے لوگوں میں تلاش کرنے کی کوشش

'رحیم بابا! وہ اب ٹھیک ہے خواتین کی سائیڈ پر ہے۔''

عبدالولی نے آف وائٹ کلر کا سوٹ زیب تن کیا تھا جس میں اُس کا دراز قد اور دراز لگ رہا تھا اُس اجلی رنگت کے ساتھ میچ ہو رہا تھا آج وہ اِس قدر اچھا لگ رہا تھا کہ روشن آرا بیگم جب جب اُسے یکھتیں آیت الکرسی پڑھ کر اُس پر پھونکتیں۔

''بیٹا! شادی بہت بہت مبارک ہو، علیزے بیٹی سے ملوا دو میں اُس کو پیار دینا چاہتا ہوں۔'' رحیم بخش ات ہسپتال سے چھٹی ملی تھی، گھر آنے پر اُسے پتا چلا کہ صبح عبدالولی کا ولیمہ ہے، جہاں سب ملازم امیں آئے تھے رحیم بخش بھی آیا تھا۔

یہ دو بچے اُسی کی توسط سے اِس خاندان کا حصّہ بنے تھے وہ اِن بچوں کو اپنے بہت قریب محسوس کرتے ان کی خوشیوں میں شامل ہونا اپنا فرض سمجھتے تھے۔

علیزے کے نام پر عبدالولی کے چہرے کے تاثرات ایک دم بدل گئے۔

''تو رحیم بابا کو کچھ نہیں معلوم!!'' عبدالولی پھیکی سی ہنسی ہنس دیا۔

''میری دلہن سے ملیں گے؟'' وہ رحیم بابا سے پوچھ رہا تھا۔

''ہاں! میری دعائیں اور پیار اُس کا بھی حق بنتا ہے، مجھے لے چلو گے بیٹا؟'' رحیم بخش نے کہا۔

''چلیے!'' وہ رحیم بخش کو لیے اسٹیج کی جانب چلا آیا۔ اِس طرف بزرگ یا پھر بہت اہم لوگ تھے، جو شاہ کے قریبی تھے، وہ لوگ جو دلہن کو خود سے پیار اور منہ دکھائی دینا چاہتے تھے اِسی لیے وہ اس ب تھے ورنہ مرد حضرات کی سیٹنگ شیشے کی دیوار کے پار تھی، خواتین کی جانب سے دوسری جانب کا نظر آ رہا تھا جب کہ مرد حضرات کی طرف شیشہ Blind تھا۔

''ولی! بیٹا دیکھو تم سے کون ملنے آیا ہے۔'' روشن آرا بیگم نے مریم بی بی کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

''پھوپو!'' ولی نے پہلی بار اُن سے اپنے رشتے کو قبول کیا، بہت خوب صورت زرقون لگن چادر میں مریم بی بی بہت حسین لگ رہی تھیں انہوں نے ہمیشہ کی طرح اُسے دیکھتے سینے سے لگا لیا۔

''تمہیں تو دیکھتے ہی میرے دِل نے گواہی دے دی تھی کہ تم ہی میرے عبدالولی ہو۔'' مریم بی بی نے آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''تم ہو بہو میرے بھائی جیسے ہو۔'' مریم بی بی ہمیشہ کی طرح اُس کو دیکھ کر اپنا جی نہ بھر پا رہی تھیں۔

عبدالولی نے ایک نظر ماں کے چہرے کو دیکھا کہ کہیں اُن کے چہرے پر کوئی Insisecurtiy تو ں ہے کیوں کہ عموماً ایسے موقعوں پر پالنے والی ماں زیادہ کانشس ہو جاتی ہے کہیں اُس کا بیٹا نئے وں کی وجہ سے پُرانے رشتوں میں الجھ کر اُن کو بھول نہ جائے۔

لیکن وہ روشن آرا بیگم تھیں احمد شاہ کی بیوی! جنھوں نے ساری عمر ربّ العزت کے بھروسے پر گزاری ی اور اپنی بیوی کو بھی اپنے جیسا بنا ڈالا تھا۔ روشن آرا بیگم کا چہرہ شانت تھا، جس نے ولی کو بھی پُرسکون دیا۔

اب وہ مریم بی بی کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ میں دے رہا تھا۔

''آپ کل کہاں تھیں؟'' ولی نے بے اختیار پوچھا کیوں کہ ڈاکٹر فیصل اور عبداللہ سے اُس کی ملاقا
رخصتی کے وقت ہوئی تھی لیکن مریم بی بی اور زہرہ نظر نہ آئی تھیں۔

''میں؟''

''بیٹا میں آئی تھی لیکن میری طبیعت کچھ بگڑ گئی تھی، میں ہائی بی پی کی مریضہ ہوں، فوراً خوشی اور
میرے دِل سے سہارا نہیں جاتا، کل اللہ نے میرے خاندان کو مکمل کر دیا تو اتنی بڑی خوشی مجھ سے سنبھل
پائی، اِس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے زہرہ کے ساتھ واپس جانا پڑا۔'' وہ دھیرے دھیرے ولی سے ا
بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں اور کچھ فاصلے پر کھڑا رحیم بخش حیران و پریشان کبھی مریم بی بی کو دیکھتا اور کبھ
اسٹیج پر بیٹھی مسکان کو دیکھتا!

''تو کیا ولی نے سید سرفراز علی کو معاف کر دیا، ماننا پڑے گا فرشتوں کا خاندان ہے یہ!'' رحیم بخش
بے حد حیرت سے سوچا۔

''بہت بہت بڑا دِل چاہیے اتنا کچھ معاف کرنے کے لیے!

کمال ہے، معاف کر دیا!

معافی اچھی بات ہے! لیکن ظالم کو اُس کے کیے کی سزا نہیں ملے گی تو اُن مظلوموں کی روحوں
انصاف کیسے ملے گا، جو بے گناہ اِس ظالم کے ہاتھوں مارے گئے، یہ بڑے لوگ ہیں اِن کے تو دِل بھ
بڑے ہیں!'' رحیم بخش دِل ہی دِل میں اُلجھتے ہوئے آگے بڑھا۔

''السلام علیکم بی بی جی!'' اُس نے آگے بڑھ کر روشن آرا بیگم کو سلام کیا۔

''بیٹا! اپنی دلہن کے پاس نہیں لے جاؤ گے؟'' رحیم بخش نے عبدالولی سے پوچھا۔

روشن آرا بیگم نے مسکرا کر سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا۔

''چلیے بابا!'' عبدالولی اُن کو لیے اسٹیج پر آ گیا جہاں مسکان نگینہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔

''السلام علیکم رحیم بابا!'' نگینہ نے کھڑے ہو کر اُن سے پیار لیا، اِس وقت وہ بھی تیار تھی اور بہ
پیاری لگ رہی تھی۔

''جیتی رہو، سدا خوش رہو!'' انہوں نے اُس کے سر پر پیار دیا اور جیب سے دو ڈبیا نکالیں۔

''اِس میں چاندی کے کڑے تھے، بہت پرانے ڈیزائن کے ہاتھ کے بنے ہوئے، پر کڑے انتہا
لگ رہے تھے۔

''یہ ہماری ماں کے ہیں، تین تھے ایک ہم نے اپنی بیٹی کو اُس کے بیاہ پر دیا تھا۔ دو سنبھال لیے
ایک ولی بیٹا کی دلہن واسطے اور ایک بٹیا کے لیے۔'' رحیم بخش نے کڑے اُجلوا لیے تھے اور بہت اچھے لگ
رہے تھے اُن کا دِل بہت بڑا تھا بے شک وہ غریب تھے۔

''ارے! یہ تو بہت خوب صورت ہیں!'' ولی اور نگینہ دونوں نے یک زبان کہا۔

''ہیرے پہننے والے اگر یوں چاندی کی قدر کرتے ہیں تو اُن کو ہیرے ملتے ہیں نا!'' رحیم بخش کا چہ
خوشی سے جگمگا رہا تھا۔

''مسکان! رحیم بابا ہمارے بزرگ ہیں۔'' ولی نے مسکان کو مخاطب کر کے کہا۔

جواباً مسکان نے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر آداب کیا۔

''جیتی رہو، شاد رہو، آباد رہو سدا سہاگن رہو۔ حیرت بھی ہے لیکن اللہ کے کام سب سے زیادہ بہتر
ہوتے ہیں، انسان کو ماننا پڑتا ہے!'' وہ دھیرے سے بولے اور آہستہ سے اسٹیج سے اُتر آئے۔ اُن کے
بدلتے موڈ کو ولی نے شدت سے محسوس کیا، اِس لیے اُن کے پیچھے پیچھے ہی آ لپکا۔

''کیا ہوا بابا! آپ کچھ پریشان ہیں میری شادی علیزے سے نہیں ہوئی اِس لیے؟'' ولی نے پوچھا۔

''بیٹا! جوڑے تو آسمانوں میں بنتے ہیں، لیکن میں حیران ہوں تم پر، بلکہ میں تو بس حیران ہوں کہ تم
نے اتنا بڑا دِل کیا، تم نے اپنے ماں باپ کے قاتل کی بیٹی سے شادی کی، میں حیران تھا اِس لیے میں
پریشان تھا۔''

''مطلب؟'' ولی نے چونک کر پوچھا۔

''تم جانتے ہو نا کہ سید عبداللہ اور عائشہ بی بی سمیت تمہارے سارے خاندان کو آگ لگا کر مار دیا گیا
تھا۔'' رحیم بابا نے کہا۔

''آگ نہیں، حادثے میں انتقال ہوا تھا!'' ولی نے کہا۔

''نہیں! اُن کو سید سرفراز علی جو تمہارا سوتیلا چچا ہے اور مسکان تمہاری بیوی کا باپ، اُس نے تمہارے
خاندان کو آگ لگا کر مارا تھا۔'' رحیم بخش نے دھماکا کیا۔

''عبدالولی کے ذہن کے پردے پر وہ چیختے چلّاتے چہرے ایک بار پھر اُبھرے۔

''ظالم نے بہت ظلم کیا تھا، وہ بہت ظالم شخص تھا لیکن تم بہت بڑے دِل کے مالک ہو جس نے تم کو
اور تمہاری بہن کو بھی اپنی طرف سے موت دے ڈالی تھی، تم نے بیٹا اُس شخص کی بیٹی کو اپنی عزت بنا کر
حکمران کر ڈالا، کاش! میں بھی اپنا دِل اتنا بڑا کر سکوں، لیکن بیٹا میں اپنے دِل میں اُس شخص کے لیے نرم
احساسات نہیں رکھ سکتا، میرا دِل مجبور ہے، اگر مجھ سے کوئی کوتاہی ہو جائے تو میرے دِل کی بے بسی کی
وجہ سے معاف کر دینا۔'' رحیم بخش سر جھکائے ہاتھ جوڑتا وہاں سے نکل گیا۔

اور عبدالولی کے پاس تو اتنی بھی ہمت نہ تھی کہ وہ رحیم بابا کو روک سکے۔

ماں اور باپ کے حصّے کی محبت روشن آرا بیگم اور احمد شاہ نے اتنی دی تھی کہ کبھی کسی کمی کا احساس نہ ہوا
تھا لیکن اِس پَل اُس کے دماغ کے پردے پر ایک بے حد خوب صورت چہرہ اُبھرا، لوری سُناتے اور اُسے
کہانیاں سناتے سینے سے لگا کر کھیلتے!

یہ چہرہ اُس کی ماں عائشہ بی بی کا تھا۔

گھوڑے پر سواری کرواتے کندھے پر اُٹھا کر پھیرنے والا ایک شخص کا چہرہ تھا، یہ سید عبداللہ تھے اُس
کے بابا!

پھر وہ دونوں آگ میں گھر گئے اور کوئی عورت اُن دونوں کو اِس آگ سے بچا کر بھاگ گئی تھی۔

''آیا امّاں! میرے بچوں کو بچائیے!'' ماں اور باپ دونوں آگ کے کمروں میں بند تھے باہر تالے
لگے ہوئے تھے۔

لیکن وہ موت میں کھڑے ہو کر بھی مسلسل اُن کو بچانے کی بات کر رہے تھے۔

''لمّاں، بابا!!'' ولی سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ وہیں ایک کرسی پر ڈھے گیا۔

وہ آگ جو برسوں پہلے جلی تھی اُس کی تپش ولی بھرپور اپنے دِل پر محسوس کررہا تھا۔

اُس کا دِل مُرمرا کر راکھ ہو رہا تھا۔

وہ بے اختیار رو پڑا، بالکل اُسی طرح، جب وہ بچپن میں بابا کے کہیں باہر جانے پر رو پڑتا تھا، امّاں کے نظر نہ آنے پہ رو پڑتا تھا۔

آہ! یہ یاد کے خانے! جو تب تک نہ کھلتے تھے، جب تک کوئی اُن کو کھٹکھٹانے والا نہ آیا تھا اور آج رحیم بابا ان دروازوں پر دستک ہی نہیں دے کر گئے تھے بلکہ وہ تو ان کو دھکا دے کر مکمل کھول گئے تھے۔

ہال میں کچھ مختلف شور اُٹھا۔

''ولی! چلو طارق آ گیا، انکل بُلا رہے ہیں۔'' ٹی ٹو نے اُس کا کندھا ہلایا۔ پھر ولی کی روئی روئی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر چونکا۔

''کیا ہوا! تم تو بہادر انسان ہو، پھر علیزے بھی مجھے اِس ساری تقریب میں نظر نہیں آ ئیں۔'' ٹی ٹو نے اپنا اندازہ لگایا۔

''علیزے؟'' ولی نے غائب دماغی سے کہا۔

پھر جیسے بات کو سمجھتے ہوئے اُس نے بے اختیار گہری سانس بھری۔ اِس دوران وہ جیب سے رومال نکال کر منہ پونچھ کر خود کو کمپوز کر چکا تھا۔

''اٹس او کے یار! چلو طارق کو ویلکم کرتے ہیں۔'' عبدالولی نے خود کو ہشاش بشاش کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اور ٹی ٹو کا ہاتھ تھام کر باہر کی جانب لپکا جہاں طارق کو ویلکم کیا جارہا تھا۔

طارق کے چہرے پر خوشیوں کے رنگ اتنے خوب صورت تھے کہ دیکھنے والوں کی آنکھوں کو ہکا چونک کررہے تھے، جب من کی مُراد ملتی ہے تو ہر آسی کا چہرہ شاید ایسے ہی چمکنے لگتا ہے۔

عبدالولی عجیب سی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔

لیکن آج اُس کے کام احمد شاہ کی دی ہوئی تربیت کام آ گئی تھی یہ وہ تربیت تھی جو عبدالولی کو کھڑا کیے ہوئے تھی اُس کے اندر طوفان برپا تھا لیکن اس تربیت ہی کی وجہ سے اِس طوفان سے سب بے خبر تھے ورنہ کم زور لوگوں پر تو غم کا ایک لمحہ بھی اُتر آئے تو وہ اپنے اردگرد شور مچا کر مجمع اکٹھا کر لیتے ہیں، لیکن وہ کمزور نہ تھا کیوں کہ اُس کا استاد احمد شاہ جیسا اللہ پر مضبوط یقین رکھنے والا مضبوط انسان تھا۔

نکاح کے ولیوں میں احمد شاہ اور عبدالولی تھے۔

نکاح خواں جب نگینہ سے منظوری لے کر طارق کی جانب جارہے تھے اُسی پَل سحرش نا جانے کہاں سے پیچھے کرسیوں سے نکل آئی تھی۔

سب سے پہلے سائرہ نے اُسے دیکھا اور اُس کا رنگ فق ہوگیا۔ اُسے لگ رہا تھا، خوشیوں کے یہ رنگ ابھی تباہ و برباد ہو جائیں گے اور ہوا بھی یہی، سحرش نے بنا لحاظ کیے سب سے پہلے وہ تصاویر اور نکاح نامہ احمد شاہ اور شہباز صاحب کو دکھایا جو اُس کے پاس موجود تھا۔

اِس دوران وہ مسلسل مسکراتے ہوئے سب کو دیکھ رہی تھی۔ شہباز صاحب کا تو ایک دم رنگ متغیر ہو

گیا۔

''طارق! یہ لڑکی درست کہہ رہی ہے؟''

''ابو! کوئی بھی سوال کرنے سے پہلے یہ ضرور یاد رکھیے گا کہ برسوں کے لیے آنی کی بنائی تصویر سے اپ کا گھر تباہ ہوگیا تھا، اپنی سچائی کی Justification دینا آپ کے لیے کس قدر مشکل ہوگیا تھا میرا لیال ہے جتنا آپ اِس درد کو اچھے سے سمجھ سکتے ہیں کوئی اور نہ سمجھے گا۔'' طارق ٹھہر ٹھہر کر بات کررہا تھا۔

''میں آپ کی بیوی ہوں کیا یہ درست نہیں ہے؟'' سحرش نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

''بہت ساری درست باتیں اور سچائیاں بالکل جھوٹ کی طرح ہوتی ہیں سحرش بی بی۔'' طارق کے ساتھ آئے مہمانوں کے ساتھ ڈاکٹر زبیر بھی تھے، پہلی بار سحرش کا چہرہ پھیکا پڑا تھا۔

''احمد صاحب! آپ ایک عقل مند انسان ہیں امید ہے آپ گھر کی بات ہجوم میں کرنا پسند نہیں کریں گے۔'' زبیر صاحب کے کہنے پر احمد شاہ طارق کو لیے برائیڈل روم میں لے آئے، وہیں پر سحرش بھی آ گئی۔

نیلوفر، سائرہ، نگینہ کو لیے آ ئیں، جب کہ روشن آرا بیگم سہمی سہمی سی احمد شاہ کے ساتھ آ ئی تھیں۔

''میرا نام ڈاکٹر زبیر ہے، میں ماہر نفسیات ہوں، سحرش بی بی میرے پاس گزشتہ دو سال سے زیر علاج ہیں یہ اُن کی فائل ہے۔'' یوں لگتا تھا کہ وہ بائے پلان ساری تیاری کر کے آئے تھے۔

''طارق صاحب نے اِن سے کن حالات میں شادی کی، میں آپ کو ضرور بتانا چاہتا ہوں، باقی فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔'' ڈاکٹر زبیر نے الف سے یے تک ساری کتھا کہہ سنائی، اِس کے ساتھ ہی وہ سحرش کی ذہنی کیفیت بتانا نہ بھولے تھے۔ جب وہ ساری بات سنا رہے تھے سحرش کی جرأت نہ ہورہی تھی کہ وہ کچھ بولے۔

کچھ وہ طارق کی آنکھوں میں عجیب سے رنگ دیکھ کر سہم گئی تھی۔

''زندگی تم سے پہلے ہی بہت کھیل چکی ہے سحرش! اب تم اِس سے نہ کھیلنا۔'' مرینہ آنٹی کی بات اُس کے کانوں میں گونجی۔

لیکن اب کیا ہوسکتا تھا وہ ایک خطرناک کھیل کھیل چکی تھی اور اِس کا رزلٹ کتنا خطرناک ہوسکتا ہے اُسے اب احساس ہوا تھا جب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ایک مرتی ہوئی عورت کے سامنے مجبور ہوکر اُس کی بیمار بیٹی سے شادی کرنا، یہ جانتے بوجھتے کہ جس حادثے سے وہ گزر چکی ہے اُس کی وجہ سے اُس لڑکی سے اولاد کی نعمت بھی اُس کو حاصل نہیں ہوسکتی۔

''طارق کے قدم کے پیچھے تو بہت سارے مضبوط دلائل ہیں احمد صاحب!'' ڈاکٹر زبیر ماہر نفسیات تھے اِس بات کو جس اچھے طریقے سے Convey کر سکتے تھے کوئی اور شاید سب کی نفسیات کے مطابق بیان نہ کرسکتا۔

طارق نے بے حد ممنون نظروں سے ڈاکٹر زبیر کو دیکھا۔

''شہباز صاحب! آج نہیں تو کل طارق کی دوسری شادی آپ خود اپنے ہاتھوں سے کرتے کیوں کہ آپ کو اپنی نسل کے لیے یہ قدم اٹھانا پڑتا، پھر اس میں اگر طارق کی مرضی شامل ہوجاتی ہے تو کیا بُرا

ہے؟'' ڈاکٹر زبیر نے سب کے چہروں پر نگاہ ڈال کر سوال کیا۔

''اگر یہ بات طارق ہم سب کو پہلے بتا دیتا تو زیادہ بہتر ہوتا، تا کہ یہ تماشہ نہ لگتا۔'' احمد شاہ کا موڈ اب بھی بہتر نہ ہوا تھا آخر وہ بیٹی کے باپ تھے۔

''سوری انکل! بے شک اِس میں میری کوتاہی اور کم زوری ہے میں اِس کے لیے بے حد معذرت خواہ ہوں، میں آپ کا قصور وار ہوں اگر سزا ملے گی تو میں قبول کروں گا، لیکن میں اِس سزا کو سہہ نہیں پاؤں گا انکل! بیٹا جان کر معاف کر دیں!'' طارق نے آگے بڑھ کر اُن کے ہاتھ تھامے اور احمد شاہ تو بنے ہی پیار سے تھے ایک دم موم کی طرح پگھل گئے۔

انہوں نے ایک نظر روشن آرا اور ولی کو دیکھا جن کی نظروں میں صاف لکھا تھا کہ وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی اُن کے فیصلے کے ساتھ ہیں۔

احمد شاہ بے اختیار مسکرا دیے، لیکن!!

نگینہ؟

احمد شاہ نے مڑ کر نگینہ کو دیکھا۔

''نگینہ کی دی ہوئی طاقت سے تو آج میں اپنا اتنا کم زور کیس مضبوطی سے لڑ سکا ہوں! نگینہ جانتی ہے انکل!'' طارق نے دھیرے سے یوں اقرار کیا، جیسے کوئی جرم کا اقرار کرتا ہے۔

بہر حال **Explaination** اِس بات پر بھی ہو سکتی تھی کہ نگینہ نے کیوں اُن کو نہیں بتایا، لیکن طارق اُن کو یہ نہیں سمجھا سکتا تھا کہ غلطی کو درست کرتے ہوئے ضروری نہیں ہے کہ ہر اینگل بیک وقت درست ہو جائے، آسان طریقہ تو یہی تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوا سب سے معافی مانگ لیتا۔ بعض مسئلوں کا کوئی حل نہیں ہوتا کوئی **Daring** حل ہو سکتا ہے تو وہ معافی مانگ لینا ہے۔

ربّ کے سامنے بھی تو یہ ہی معاملہ چلتا ہے نا!

گناہ کیوں کیا، تھوڑا کیا زیادہ کیا، مجبوری سے کیا اِس کی کیا معافی دینی، اُس سے تو بس معافی ہی چاہیے ہوتی ہے۔ اگر انصاف مانگا جائے تو ہمیشہ پکڑ ہی ہوگی، اِس لیے انصاف کی دلدل میں ٹانگ نہیں پھنسانی چاہیے، طارق نے بھی عقل مندی کی تھی اور یوں سب کی نظروں میں بھی سرخرو ہو گیا تھا۔

لیکن جہاں سب لوگوں کا فیور طارق کے ساتھ ہو گیا تھا وہیں سحرش کو ایک دم سے وہاں بے حد گھٹن کا احساس ہوا، اُسے اپنا آپ اِس قدر اکیلا اور اجنبی لگا کہ سانس لینا دُشوار ہو گیا اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا اُس کی نظریں شرمندگی اور بے بسی سے اُٹھ نہ پا رہی تھیں۔

''تُو طارق کو ایسے کھو دے گی!'' مرینہ آنٹی کی گونج نے اُس کا پھر حصار کھینچ کر اُسے شکنجے میں جکڑا۔

سب کی نظروں میں اُس کی کوئی وقعت نہ تھی وہ طارق کو بادشاہ مان کر ملکہ بن سکتی تھی لیکن اُس نے اُسے گرا کر خود کو بھی گرا لیا تھا۔

''تاؤ؟'' اُس نے بے حد شرمندگی سے طارق کو دیکھا۔ طارق کی نظریں بھی اُس کے اوپر تھیں۔

''بے فکر رہو سحرش! اگر اللہ کسی کو سہارا دے کر نہیں چھینتا تو اُس کے ماننے والے بھی سہارا دے کر کسی سے نہیں چھینتے اور میں دنیا میں کسی چیز کو، کسی بات کو مانوں یا نہ مانوں، اللہ کو ہمیشہ مانتا رہوں گا۔'' طارق

کہہ کر باہر نکل گیا۔

باقی سب تو کب کے باہر جا چکے تھے اب سحرش کمرے میں اکیلی رہ گئی تھی۔

اُس نے بے اختیار اپنے لب کچلے، وہ اِس گیم میں سدا کی طرح پھر جیت گیا تھا۔

واقعی اُس کی مرتی ماں نے اُس میں وہ خاص بات دیکھ لی تھی، جس کی وجہ سے اُس نے جاتے جاتے سحرش کا بھرم ایک بار پھر رکھ لیا تھا۔

سحرش تھکے تھکے قدموں سے ہال سے باہر نکل آئی۔

وہ آخر کس بات کو لے کر طارق پر آئندہ کوئی حق جتا سکتی تھی یہ تو طارق کی ہی عظمت تھی کہ وہ اُس کو اپنی زندگی پر کوئی حق دے سکتا تھا، زندگی صرف اُن لوگوں کے لیے اپنی روڈ کے لیے راستہ دیتی ہے جو دوسروں کو اوورٹیک کرنے کے چکر میں کبھی بھی نو انٹری میں داخل نہیں ہوتے اور جو نو انٹری میں داخل ہو جاتے ہیں وہ واپس بھی نہیں آ سکتے اور آگے بھی نہیں جا سکتے۔ ایسے میں وہ کہاں ہوتے ہیں؟

''وہ تو ان فیکٹ کہیں بھی نہیں ہوتے نہ زندگی کی راہ میں نہ ہی دلوں میں!''

❖❖○❖❖

ایک انداز سے دیکھوں تو ہمایوں تم ہو
اور اک طرز کی بابر میں ہوں
روز و شب درد کے پھیروں میں رہیں
بارِ غم خود پہ اٹھانے کی دعاؤں کے سوا
مستجابی کا کوئی ڈھنگ نہ ہو
تندرستی بھی کوئی طاق عدد ہو جیسے
دو پہ تقسیم نہیں ہو سکتی
میرے آزار میں جتنا بھی اضافہ ہوگا
اِس قدر تم کو شفا پہنچے گی

مُسکان آنکھیں پھاڑے عبدالولی کو دیکھ رہی تھی اُس کی قسمت میں صرف ایک رات اعتبار کی آئی تھی، جانے اُس کی قسمت میں کیسے چکر تھے، جو ختم ہونے کو ہی نہ آ رہے تھے۔

وہ آنکھیں پھاڑے ولی کا انکشاف سُن رہی تھی۔

''کیا واقعی! کیا واقعی بابا سائیں اتنا بڑا ظلم کر سکتے ہیں؟'' اُس کا دل بُری طرح ڈوبا۔

کیوں کہ اُس کے دِل نے جواب ہاں میں دیا تھا کیوں کہ دِل بھی تو اُن کے ظلم کو سہہ چکا تھا۔ سید اظہر علی سے اُس کی شادی کر کے پھر اُس کے گھر میں جو ذلت سہی اُس نے، اُن کے ایک ظالمانہ فیصلے کی وجہ سے ہی تو تھا لیکن وہ ایک بار پھر بدلے تھے، انہوں نے ولی کی صورت میں اُسے زندگی دوبارہ لوٹائی تھی۔

تو وہ پھر بہل گئی تھی!

لیکن آج ایک بار پھر ایک سچائی منہ پھاڑے کھڑی تھی۔

''یا خدایا!''

مُکدی نہیں رات ہوندا نہیں سویرا!!

اے کیسا نیرا اِے!!!

میری قسمت نوں جانے سویرے راس نہیں آندے

یا نیریاں نوں میری قسمت راس آ گئی ہے

''مسکان! میں ایسی رسی پر چل رہا ہوں جس پر چلتے چلتے میرے پاؤں آبلہ پا ہو گئے ہیں!''

''تم...!'' عبدالولی سے بولنا مشکل ہو گیا۔

''ولی! لیکن میرا قصور؟''

''تمہارا قصور اُسی طرح ہے جیسے قابیل کو تاقیامت ہر قاتل کے حصے سے گناہ کا حصہ دار بنایا جائے گا۔''

''تم سید سرفراز علی کی بیٹی ہو، تم بھی! تم کو بھی اپنے باپ کے کیے کا بدلہ سہنا پڑے گا۔'' ولی تیزی سے باہر نکل گیا جب کہ مسکان رو دینے والی تھی۔

آپا اماں آج نہ آئی تھیں پھر بابا سائیں بھی نہ آئے تھے وہ خود کو بالکل تنہا محسوس کر رہی تھی۔

لیکن روشن آرا بیگم نے اُسے یہ سب محسوس نہ ہونے دیا تھا وہ اُسے بہت پیار سے گھر واپس لے آئی تھیں اُسے تسلی دے کر وہ جا چکیں تو ولی ایک دھماکے کے ساتھ آیا اور سب اُڑا کر چلتا بنا۔

مسکان مسلسل آپا اماں اور سید سرفراز علی کے موبائل ٹرائی کر رہی تھی، بابا سائیں کا موبائل تو بند جا رہا تھا لیکن آپا اماں کا موبائل رنگ لے رہا تھا پھر وہ کیوں نہیں اُٹھا رہی تھیں۔

''یا اللہ! نہ باپ، نہ ماں نہ ہی بھائی آیا!''

کیسے بے جڑ کے پودے کی طرح کا احساس ہے۔

اب یہ ولی کیا سُنا گیا تھا۔ وہ سر تھام کر گر گئی تھی۔

یہ کیسا موڑ ہے، جو زندگی نے اِس قدر بُری طرح کاٹا کہ اُس کے اندر ٹوٹ پھوٹ ایک بار پھر شروع ہو گئی تھی۔

❖❖○❖❖

''آخر کدھر چلا گیا ولی؟'' روشن آرا بیگم اور احمد شاہ ایک دوسرے سے فکر مندی سے پوچھ رہے تھے۔

گارڈ نے اندر انٹر کام پر اطلاع دی تھی کہ چھوٹے صاحب بہت بُرے انداز میں گاڑی باہر نکال کر گئے ہیں جو اطلاع اُس نے دی تھی وہ بہت چونکا دینے والی تھی، ولی کے ہاتھ میں اُس کا پسٹل بھی تھا جو اُس نے ڈیش بورڈ پر رکھا تھا۔

''خدا کے لیے پتا کریں، میرے اعصاب مسلسل شاک سے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔'' روشن آرا بیگم نے ڈھلتے ہوئے کہا۔

''کاؤنٹ ڈاؤن روشن! زندگی گزشتہ دنوں اُس کے لیے اِس قدر جھٹکے لے کر آئی ہے کہ اُس کا پاؤں کہیں بھی پھسل سکتا ہے، لیکن وہ تب ٹھیک رہا تو اب!'' وہ جیسے باآواز بلند خود ہی سوچ رہے تھے۔

''اب کیا ہوا؟ تم دلہن سے جا کر پوچھو!'' انہوں نے روشن آرا بیگم کو کہا۔

''ہاں وہ سید سرفراز علی کی کیا خبر ہے؟ احمد شاہ نے پوچھا۔

''اب وہ خطرے سے باہر ہیں، میرا خیال ہے بہو کو بتا دیتے ہیں وہ اپنے گھر والوں کی غیر موجودگی سے بہت پریشان ہے۔'' روشن آرا بیگم نے جاتے جاتے مُڑ کر پوچھا۔

''ٹھیک کہتی ہیں، آپ بہو کو بتا دیں۔'' احمد شاہ نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

روشن آرا بیگم سر ہلاتی باہر نکل گئیں۔

❖❖○❖❖

سید سرفراز علی شاید غنودگی میں تھا اِسی لیے اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ نفیسہ بیگم نے سارا دِن خود سے لڑتے گزارا تھا اب وہ یہاں موجود تھیں۔

سید سرفراز علی کے پاس جب آئی تھیں تو وہ تکلیف سے تڑپ رہے تھے اور نفیسہ بیگم وہیں رُک گئی تھیں اُس کو تڑپتے دیکھنے کی کتنی خواہش تھی، وہ یہ موقع کیسے جانے دیتیں، اِس تڑپ کے دیکھنے کے کھیل میں وہ مسکان کے پاس بھی نہ جا پائیں۔

ڈاکٹرز نے سید سرفراز علی کو نیند کا انجکشن دے دیا تھا اور وہ اُن کے پاس کھڑی رہی تھیں، خود سے لڑتے لڑتے اِس شخص سے نفرت کرتے کرتے تھک گئی تھیں۔

''سید سرفراز!'' سید سرفراز کے جسم ذرا سی حرکت ہوئی تو نفیسہ بیگم نے اُن کو پکارا۔

سید سرفراز علی نے آنکھیں کھول دیں، اب اُن کی طبیعت خاصی سنبھلی ہوئی لگ رہی تھی۔

''نفیسہ! مسکان کیسی ہے؟ وہ خوش تو ہے نا؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''ہاں بہت خوش ہے، تمہارے منحوس سائے سے نکل کر اُسے ضرور خوش رہنا چاہیے۔'' نفیسہ بیگم پھنکاریں۔

''تم! تم پھر شروع ہو گئیں!'' وہ ہنسے۔

ایسے حالات میں سید سرفراز جیسا ہی شخص ہنس سکتا تھا۔

''میں تم کو بتانا چاہتی ہوں کہ میں تم سے شدید نفرت کرتی ہوں، میں جتنا عرصہ تمہارے ساتھ رہی اللہ سے تمہاری بربادی مانگتی رہی، تم پر کوئی عذاب مانگتی رہی! اب میں اپنا سارا حساب اللہ کے سپرد کر کے تم کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جا رہی ہوں اپنے بھائی کے پاس، جس کو تم اپنے طور پر مار چکے تھے، میں تم کو ہمیشہ کم زور لگی ہوں نا! ہاں میں کم زور ہوں، میں تم سے بدلہ نہیں لے پائی لیکن میرا اللہ بڑا طاقتور ہے، میں نے اپنے سارے معاملے، سارے حساب اُس کے سپرد کر دیے ہیں اب تم جانو یا پھر وہ! میں جا رہی ہوں، اب میں ایک پل کے لیے تمہارا نام اپنے نام سے جُڑا نہیں دیکھ سکتی، جا رہی ہوں!'' وہ ایک لمحے کو رکیں پھر گویا ہوئیں۔

''طلاق کے کاغذوں پر سائن کر دینا ورنہ میرا بھائی آ کر کروالے گا اور اگر وہ آیا تو اور بھی کھاتے کھولے گا بہتر ہو گا اُن کاغذات پر دستخط کر دینا!'' نفیسہ بیگم کے لفظ لفظ میں پھنکار تھی۔ سید سرفراز حیرت سے اُن کو دیکھ رہے تھے۔

''کیا واقعی یہ نفیسہ بیگم تھیں؟''

''سید سرفراز علی!'' وہ جاتے جاتے پلٹیں۔

''مت بھولنا میں نے اپنا مقدمہ اوپر دے دیا ہے۔'' نفیسہ بیگم نے مسکراتے ہوئے آسمان کی طرف شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا اور باہر نکل گئیں۔

سید سرفراز علی کو اپنے دِل پر ایک بار پھر کوئی پتھر کی طرح بوجھ محسوس ہوا، جو اُن کے دِل کو چُرمُرا رہا تھا۔

وہ دِل جس میں زخم یا محبت کبھی نہ رہ پائی تھی۔

❖❖○❖❖

''چلیں!'' نفیسہ بیگم نے باہر گاڑی میں آ کر بیٹھتے ہی ڈاکٹر فیصل سے کہا۔ انہوں نے نفیسہ بیگم کا ہاتھ گرم جوشی سے دبا کر گاڑی اسٹارٹ کردی۔

''نفیسہ! ہم آج ہی گاؤں کے لیے نکلیں گے۔'' ڈاکٹر فیصل نے لب بھینچ کر کہا۔

نفیسہ بیگم نے ڈاکٹر فیصل کا چہرہ دیکھا، جہاں بہت سارا کرب تھا۔

''لمّاں، بابا اور قیصر بھائی سے ملنا ہے، تم ملتی رہتی تھی؟'' ڈاکٹر فیصل نے پوچھا، وہ بہت احتیاط سے گاڑی چلا رہے تھے۔

''جی بھائی! میں جاتی تھی۔'' نفیسہ بیگم نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''برسوں تو سید سرفراز علی نے مجھے اُن کی قبروں پر جانے نہ دیا، نہ نشانی بتائی۔ ذرا ذرا بات کے لیے بہت تڑپاتا تھا، میں نے اپنے ماں باپ بھائی کی قبریں بہت مشکلوں سے پائی تھیں۔'' نفیسہ بیگم نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ اُن کا لہجہ جس تکلیف کو ظاہر کر رہا تھا وہ اُن کے ماضی کے متعلق بتا رہا تھا۔

''بس نفیسہ! اب اور دُکھ نہیں!'' ڈاکٹر فیصل نے بہن کا کندھا تھپتھپایا۔

جواباً نفیسہ بیگم نے آنسو ضبط کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

❖❖○❖❖

عبدالولی مسلسل چھ گھنٹے کی ڈرائیو کر کے یہاں پہنچا تھا، فاصلہ اب بھی آدھ پونے گھنٹے کا موجود تھا دن کی روشنی پھیلنے سے پہلے جو اندھیرا روشن سا لگتا ہے وہ اندھیرا ٹھنڈی ہوا کے ساتھ شدت سے محسوس کیا جا سکتا تھا۔

وہ وہاں سے اِس لیے بھاگ آیا تھا کہ احمد شاہ اور روشن آرا بیگم کی تابع داری اور پیار اُسے ایک بار پھر پچھاڑ کر نہ رکھ دے۔ وہ اپنے اندر کے لاوے سے گھبرا کر دوڑ آیا تھا وہ اُس شخص کو ختم کر دینا چاہتا تھا، وہ اُس شخص کے وجود کے ایک ایک حصّے پر زخم دینا چاہتا تھا۔

ولی نے پیٹرول پمپ سے گاڑی فل کروائی اور سفر پھر شروع کر دیا۔

جب اُس کی گاڑی رُکی تو وہ خود حیران تھا کہ اُس کی گاڑی حویلی رُکنے کے بجائے بابا جی کے حجرے کی پہاڑی پر آ کر کیوں رُکی۔

ولی تڑپ کر دوڑتا پہاڑی پر چڑھا تھا، جیسے بچہ ماں کی آغوش کے لیے بلکتا ہے، سکون کے لیے

ہنے کے لیے! بنا دستک دیے وہ اندر آ گیا، عجیب دروازہ تھا ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ رہنے والے کو کسی باہر والے سے ڈر نہ لگتا تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اندر اُس کے ساتھ اللہ کی ذات ہتی ہے۔

''بابا صاحب! آپ نے مجھے یہ کیوں نہ بتایا، یہ کیوں نہ بتایا کہ مسکان کے باپ نے میرے خاندان کو جلا کر مارا تھا۔ وہ اُس خونی کی بیٹی ہے، میں نے اُسے اپنی بیوی کا درجہ دیا۔'' عبدالولی اُن کے سامنے بیٹھا بلک بلک کر رو رہا تھا۔ ہاتھ میں پکڑا پستول اب فرش پر پڑا تھا۔

بابا جی نے سلام پھیر کر اُس کو کندھوں سے تھاما۔

''ایمان بیٹا! ولی کو پانی پلاؤ۔'' انہوں نے ولی کے پیچھے کھڑی ترنم سے کہا۔

ولی کو تو اپنی بے خودی میں وہاں کوئی اور دکھائی ہی نہ دیا تھا۔

''یہ لیں، پانی پی لیں!'' ترنم نے کچے پیالے میں پانی ولی کو دیا۔ ولی ایک ہی سانس میں پی گیا۔

''بابا صاحب! میں اُسے مار کر خود مر جانا چاہتا ہوں ورنہ میرے اندر کی آگ مجھے جلا کر مار دے گی۔'' ولی نے غصّے سے کہا۔

''پیارے بیٹے!'' بابا صاحب نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

ولی لمبے لمبے سانس لے کر وہیں زمین پر لیٹ گیا۔

''جل رہا ہوں میں!!

جل رہا ہوں میں!!

''پیارے بیٹے یہ آگ نہیں ہے، یہ بدلے کا زہر ہے جو تم کو جلا رہا ہے۔'' بابا جی نے اُس کے جلتے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا۔'' ولی بخار سے پھنک رہا تھا۔

''ولی! تم کو بخار ہے بیٹا!'' بابا جی نے فکرمندی سے کہا۔

''ایمان بیٹا اور پانی لاؤ، پٹیاں کرتے ہیں۔'' بابا جی نے پانی لے کر ململ کا اپنا رومال پھاڑ کر اُسے پٹیاں کی تھیں۔

ساری رات ولی بخار میں تپتا رہا اور ایمان فاطمہ اور بابا جی اُسے پٹیاں کرتے رہے۔ صبح اُس کا بخار ٹوٹا تو وہ گہری نیند سو گیا ایمان فاطمہ اُس کے سرہانے سے نہ ہٹی۔

چند سال پہلے وہ اُسے زندگی موت کی کشمکش میں مبتلا موٹر وے پر خون سے لت پت ملا تھا اور آج ایک بار پھر وہ ایسی ہی کشمکش میں تھا۔

''اے اللہ! میں بہت گناہ گار ہوں، اتنی کہ دُعا مانگتے بھی شرم آتی ہے، لیکن اے اللہ کتنے ہی گناہ گار سیاہ کار کیوں نہ ہوں ہمارا اللہ تو تُو ہی ہے تیرے پاس ہی ہم نے آنا ہے، تجھ سے ہی مانگنا ہے، تجھ سے نہیں مانگیں گے تو کس سے مانگیں گے، پلیز اللہ جی! ولی کو آسانی عطا کر دیں۔'' ایمان فاطمہ نے بے حد دِل سے دُعا کی۔

وہ مسلسل ولی کے سرہانے بیٹھی رہی، بس بیچ میں نماز کے لیے اٹھی تھی۔

صبح صبح بابا جی حسبِ عادت احاطے میں بکریوں کا دُودھ دوہنے نکلے تو بھی ایمان فاطمہ اُن کے ساتھ

نہ گئی ورنہ عموماً وہ اُن کے ساتھ بکریوں کا دُودھ دوہنے اور پرندوں کو دانہ ڈالنے نکلتی تھی، اپنی دادی کی ر
سے بڑے بزرگ سے اُسے بے حد پیار ہوگیا تھا۔

وہ سمجھتی تھی کہ اُسے صرف دو لوگوں سے دنیا میں غرض ہے ایک اپنی ماں اور دوسرا ولی! جو اُسے ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اُس نے اب تک دو ہی طرح کے مرد دیکھے تھے یا تو اُن کی نگاہوں میں ہوس ہوتی تھی یا پھر شک کے ساتھ نفرت دیکھی تھی۔ وہ عزت کی ترسی ہوئی لڑکی تھی اور ولی کو وہ ہمیشہ ویرانوں میں تنہائی میں ہمیشہ اوکورڈ طریقے سے ملی تھی، لیکن پھر بھی اُس کی نگاہوں میں وہ عزت ختم نہ ہوئی تھی اُس کی اِسی ادا پر اُس کا دِل اِس قدر اُس پر فدا ہوگیا تھا۔

''امّاں۔ بابا!'' ولی غنودگی میں بڑبڑا رہا تھا۔

ایمان نے اُس کے قریب ہوکر سننے کی کوشش کی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، جیسے ہی اُس نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بخار چیک کرنے کی کوشش کی، ولی نے اُس کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام لیا۔ ایمان کا سارا وجود ہولے ہولے کانپنے لگا۔

ولی کے چھوتے ہی، اُسے محسوس ہوا، جیسے اُس کا وجود پاکیزہ ہورہا ہو، عجیب طرح کی خوشی اور پاکیزگی کا احساس تھا۔

اُسے اب تک اتنے مردوں نے چھوا تھا لیکن اُسے سب کے چھونے پر بس یہی محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اُس کے وجود کو سانپ ڈس رہے ہوں لیکن ولی واحد مرد تھا، جس کے لمس نے اُس کی روح کو چھولیا تھا۔

''امّاں، بابا!'' وہ غنودگی میں بھی اپنے والدین کو پکار رہا تھا۔ رات باباجی نے عبدالولی کے والدین کی جو کہانی سنائی تھی، ایمان کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے تھے۔

تبھی تو اُس نے ولی کے لیے شدت سے آسانیوں کی دُعا مانگی تھی۔

''پانی!'' ولی نے بند آنکھوں سے لبوں پر زبان پھیر کر کہا۔ ایمان فاطمہ نے دھیرے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر اُسے سہارا دے کر پانی پلایا۔

''آپ؟'' پانی پینے کے بعد ولی نے حیرت سے اُس سے پوچھا۔

''جی! میں ہی ہوں ترنم!'' ایمان فاطمہ نے دھیرے سے جواب دیا۔

ولی کو پہلے تو سمجھ نہ آیا کہ وہ کہاں ہے پھر دھیرے دھیرے اُسے ساری باتیں یاد آنے لگیں تو وہ ایک بار پھر اذیت میں مبتلا ہوگیا۔

''آپ یہاں کیسے؟'' عبدالولی نے سوال کیا۔

''بن رہے ہیں یا سچ مچ نہیں پتا!'' ایمان فاطمہ نے حسبِ معمول بدگمان ہوتے ہوئے کہا۔ ایسا کیسے ہوسکتا تھا کہ نگینہ، طارق اور احمد شاہ میں سے کسی نے اُس کی اصلیت کا ذکر ولی سے نہ کیا ہو۔

''آپ کی مرضی ہے، مانیں یا نہ مانیں۔'' ولی نقاہت سے ایک بار پھر لیٹ گیا۔

''وہ میرا مطلب تھا کہ اب تو نگینہ بھی بتا چکی ہوگی کہ میں کیسی لڑکی ہوں، میں بُری لڑکی ہوں لیکن اِس بُری لڑکی نے بہت ایمان داری سے ایک اچھی لڑکی کی عزت بچا کر اُسے خیر و عافیت سے اُس کے پیاروں کے حوالے کردیا تھا۔'' ایمان فاطمہ نے دھیرے سے سر جھکا کر کہا۔

''اوہو!'' ولی جیسے ساری بات سمجھ گیا، اُسے دُکھ ہوا تھا۔

ترنم ایک کال گرل ہے، وہ اپنے چہرے کی معصومیت کی وجہ سے کبھی اپنی اصلیت کھول نہ پائی تھی تبھی وہ ترنم کی ہر بار اُلجھی اُلجھی گفتگو سمجھ نہ پاتا تھا۔

''کون کہتا ہے کہ آپ بُری لڑکی ہیں۔'' ولی نے دُکھتے سر کے ساتھ کہا۔

''آپ میری اصلیت تو جانتے ہیں نا؟'' ایمان نے کٹیلے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں! کہ تم ایک اچھی لڑکی ہو!''

''تم اچھی نہ ہوتی تو کیا جان پر کھیل کر نگینہ کو بچا کر پاتیں۔ تم کیا جانو تمہارا احسان تا عمر ہماری زندگیوں پر رہے گا۔'' ولی نے آخری جملے دِل میں کہے تھے کہ وہ انا پرست لڑکی کہیں احسان والی بات کو دل پر نہ لے لے۔

''اچھا کتنی اچھی لڑکی؟'' ایمان نے چڑ کر کہا۔

وہ بُری تھی اور اچھی نہیں تھی اس کا اُسے بہت زیادہ کمپلیکس تھا یہ وہ بات ہے جو اُس کی کم زوری تھی اس لیے اِس بات کو لے کر ہمیشہ وہ ولی سے بحث کیے جاتی تھی۔

''چلیے مان لیا کہ آپ پہلے میری اصلیت نہ جانتے تھے اِس لیے آپ مجھے اچھی لڑکی کہتے تھے اور اب جب کہ میرا پول کُھل گیا ہے کہ میرا تعلق کہاں سے ہے تو بھی کیا آپ اپنے بیان پر قائم رہیں گے؟'' ایمان نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''آپ کا تعلق انسانیت سے ہے یہی آپ کا تعارف ہے اور آپ ایک اچھی لڑکی ہیں۔'' ولی بے شک بے حد نقاہت میں تھا لیکن اُس نے یہ بات اپنے پورے ہوش و حواس میں بے حد مضبوط اور ٹھوس لہجے میں کہی تھی۔

جواباً ایمان فاطمہ کچھ پَل اُسے حیرت سے دیکھتی رہی اور پھر اِس شدت سے پھُوٹ پھُوٹ کر روئی کہ ولی بوکھلا کر اُٹھ بیٹھا۔ اُس کا سر اُس قدر بُری طرح چکرایا تھا کہ وہ سمجھ نہ پایا کہ آخر اُس نے ایسا کیا کہہ دیا کہ یہ لڑکی رو رو کر پانی بنتی جارہی ہے۔

''پلیز ترنم! مجھے بتایئے میں نے ایسا کیا کہہ دیا! میں نے کچھ غلط کہا ہے تو پلیز مجھے معاف کردیجیے گا۔'' ولی اپنی feelings کو بھول کر اُسے چپ کروانے لگا۔

''ایک بار پھر کہیں کہ میں اچھی لڑکی ہوں!'' اُس نے روتے روتے رُک کر بے حد پیار سے ولی سے کہا۔

''ہاں! تم بہت اچھی لڑکی ہو، میرا دِل گواہی دیتا ہے۔'' ولی نے سچائی سے کہا۔

''کتنی اچھی؟'' وہ دیوانوں کی طرح سوال کررہی تھی۔

''بہت اچھی! بہت زیادہ!'' ولی نے کہا۔

''اچھا!'' وہ استہزائیہ ہنسی۔

''بالکل سچ ہے! بے شک اللہ جانتا ہے۔'' ولی نے اُسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

''اتنی اچھی ہوں کہ آپ جیسا عزت دار، خاندانی شخص مجھ سے شادی کرلے؟'' ایمان نے طنزیہ

پوچھا۔

''ولی نے چونک کر بے حد سنجیدگی سے اُسے دیکھا۔

بات اب اُس کی انسانیت کی قدر اور Values کی آ گئی تھی، جواب دینا تو بہت ضروری ہو گیا تھا۔

''ہاں! کرسکتا ہے۔'' ولی نے بے حد مضبوطی سے جواب دیا۔

''تو پھر آپ مجھ سے شادی کریں گے؟'' ایمان فاطمہ نے اُس کو جن آس بھری نظروں سے دیکھا ا ولی کو لگا اگر وہ نہ کر گیا تو وہ خدا کی خدائی کو نہ کروادے گا۔ اُس لڑکی کا اعتبار ختم ہو جائے گا۔

''ہاں!'' جانے ولی کو کس طاقت نے ہاں کروائی تھی۔

یہ وہی طاقت تھی جو غالباً اُسے ہزاروں میل سے اُٹھا کر یہاں لے کر آئی تھی اور یہاں لا کر اُ ہوش وحواس سے بیگانہ کر ڈالا تھا۔

ایمان کو یقین نہ آیا کہ واقعی وہ ''ہاں'' سن رہی ہے۔

''سوچ لیں! کہیں آپ مکر تو نہ جائیں گے!'' ایمان نے یوں پوچھا، جیسے مرتے ہوئے انسان کو وسائی ہوتی ہے کہ کہیں اُس سے بچی کھچی سانسیں تو نہیں چھین لی جائیں گی۔

''نہیں! لیکن ترنم! میں تو اِس قدر اُلجھا ہوا ہوں کہ میری زندگی کس موڑ پر جا رُکے، میں خود نہیں جانتا، تم نہیں جانتیں کہ میں یہاں، کس ارادے سے آیا ہوں؟'' ولی نے بے شک ترنم کی آس نہ توڑی تھی لیکن اُسے تمام حقائق سے آگاہ کر دیا تھا۔

''میں یہاں اپنے باپ کے قاتل کو مارنے آیا ہوں ترنم! اگر میں نے اُسے نہ مارا تو بچپن سے ز چہروں کو میں آگ میں جلتے دیکھتا رہا ہوں، اُن کی آگ ساری زندگی مجھے جلا جلا کر راکھ کرتی رہے گی پہلے میں نہیں جانتا تھا ساری حقیقت لیکن اب میں جانتا ہوں اور اب جب تک میں بدلہ نہیں لوں گا اُن ا قرض بھی نہیں ادا ہوگا۔'' ایسی باتیں کرتا وہ بالکل اپنے آپ میں نہ تھا۔ وہ عبدالولی نہ لگ رہا تھا۔

ترنم چپ چاپ اُسے سنتی رہی۔

''ایسے میں، ایسی ذہنی حالت میں، میں کیسے شادی کر لوں؟ لیکن یاد رکھنا میں صرف ذہنی حالت کی، سے انکار کر رہا ہوں۔''

''صاحب! یہ تو بہانہ ہو گیا! لاکھ آپ جواز دیں، انکار تو ہو گیا نا!'' ترنم نے رُندھی آواز میں کہا۔

''یا اللہ! عجیب لڑکی ہے، مسئلہ سمجھتی ہی نہیں!'' ولی کو بخار کی وجہ سے پہلے ہی سر میں درد ہو رہا تھا مزید اُس کی باتوں سے بڑھ گیا تھا۔

''پیاسا تو پانی ہی مانگے گا بیٹا! وہ کہاں صرف پانی کی تسلی سے صبر کر سکتا ہے۔'' بابا جی کب آئے، دونوں ہی جان نہ پائے تھے۔

''یہ لو بیٹا! اللہ کی دی ہوئی نعمت کو سنبھالو۔'' بابا جی نے دودھ کا برتن ترنم کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! اب کیسی ہے طبیعت؟'' انہوں نے ولی کا ماتھا چھو کر بخار کا اندازہ کرنے کی کوشش کر پوچھا۔

''ٹھیک ہوں!'' ولی نے گلا کھنکھارتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! وہ عزت کی اتنی بھوکی ہے کہ جب تک اُس کی بھوک نہ مٹے گی، وہ کیسے تمہاری بات کو سمجھ سکتی ہے۔ وہ تم سے تمہارے نام کی عزت چاہتی ہے!''

''بابا جی! آپ اس کی فیور کر رہے ہیں، آپ جانتے ہیں کہ میں یہاں کس مقصد سے آیا ہوں، جس مقصد کے لیے آیا ہوں اُس کی وجہ سے میں کسی اور کو اپنی ذات سے اٹیچ کر کے کیسے؟

میرا مطلب ہے جب میں خود کے!!

پلیز بابا جی!

آپ سمجھیں نا!'' عبدالولی نے ایک دم سر تھام لیا۔

''میں جس سیریس مسئلے میں!''

''آپ اِس بات کو Serious اور اہم کیوں نہیں لے رہے کہ میں قتل کرنے جا رہا ہوں۔'' عبدالولی نے ایک دم زچ ہو کر کہا۔

''بیٹا! تم کو اللہ نے ایسا بنایا نہیں ہے تو پھر خود پر کیوں ظلم کرتے ہو، تم ایسے کاموں کے لیے نہیں بنے، تم جانتے ہو کل سے لے کر اب تک جو تم تڑپ رہے ہو، وہ صرف بدلے کے لیے نہیں تڑپ رہے بلکہ تمہارے اندر کی جنگ تم کو تڑپا رہی ہے، تمہارے اندر کا اچھا انسان تمہارے دِل کی برائی سے لڑ رہا ہے وہ تم کو روکتا ہے تم رکتے نہیں ہو، بس سارا مسئلہ یہ ہے۔'' بابا جی ایک لمحے کو رکے۔

''مان جاؤ، خود کو سمجھا لو! اِس آگ کو تم ہی ختم کر سکتے ہو۔'' بابا جی کی باتیں اُس کے اندر کے الجھاؤ کو اور الجھا رہی تھیں۔ وہ واقعی اپنے اندر کو سمجھ نہ پا رہا تھا۔

''بابا جی! مجھے جانے دیں۔'' ولی نے بامشکل اٹھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے جاؤ۔'' بابا جی نے حیرت انگیز طور پر اُسے اجازت دے دی۔ ولی کا خیال تھا کہ وہ اُسے روکیں گے لیکن انہوں نے اُسے نہ روکا۔

اور ایسا کر کے انہوں نے اُس کے اندر کے زور کو بہنے دیا تھا، اُس کے زور کو توڑ دیا تھا۔

''میں چلتا ہوں!'' ولی نے اپنی پسٹل اِدھر اُدھر تلاش کی، بابا جی نے تکیے کے نیچے سے پسٹل نکال کر ولی کے ہاتھ میں تھما دی۔ ولی کو ایک اور جھٹکا لگا۔

''میں تم کو نہیں روکوں گا پیارے بیٹے!'' بابا جی نے بے حد سکون سے کہا۔

''ولی بیٹا! جانے سے پہلے کچھ کھالو، یہاں سے کوئی کھائے پیے بغیر جاتا ہے تو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔'' بابا جی کے اصرار پر ولی ایک بار پھر وہیں بیٹھ گیا۔

''ایمان بیٹی! دودھ کے اندر گندم کا دلیہ ڈال لو۔'' بابا جی نے دودھ اُبالتی ترنم سے کہا۔

ترنم نے چپ چاپ ہدایات پر عمل کیا۔ وہ رو رو کر ہلکان ہو چکی تھی، وہ بالکل کھوکھلی ہوئی جا رہی تھی۔

بابا جی نے تاسف سے اُسے دیکھا۔

ولی نے چپ چاپ دلیہ کھایا اور اجازت لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

''ولی!'' بابا جی نے اُسے جاتے جاتے پھر پکارا۔

''جب تم اپنا کام مکمل کر لو تو یاد رکھنا کوئی تمہاری دی ہوئی زبان کے پورے ہونے کا منتظر ہے۔''

بابا جی نے ترنم کی جانب اشارہ کرکے کہا۔

ولی کچھ کہنے کے لیے رُکا، لیکن اُسے کسی طاقت نے بالکل چپ کروادیا اور اُس نے ایک بار پھر اس طاقت کے زیرِاثر اثبات میں سر ہلایا اور باہر نکل گیا۔

جب کہ ترنم کی آنکھوں میں جھڑی لگ گئی تھی۔

''بیٹا! بھروسہ رکھو، اُس پر نہیں۔

اللہ پر بھروسہ رکھو!!''

❖❖○❖❖

''جی ترنم بی بی! طارق بات کررہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے!

ٹھیک ہے۔ آپ یوں کریں دو دن لے لیں اور ہمیں پیپر ورک دے دیں، لیکن پلیز اپنی لوکیشن تو دیں، ہم آپ کو دیں گے آپ کا یوں Protection کے بغیر کہیں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔'' طارق نے اصرار کیا۔

''طارق صاحب! کبھی کسی نے حفاظت کی ہے کیا؟ میں اللہ کی حفاظت میں ہوں، میں جانتی ہوں، جب تک میرا کام مکمل نہیں ہوگا مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ آپ کو آپ کا Paper Work بھی مل جائے گا۔'' ترنم نے کہہ کر فون بند کردیا۔

''بابا جی! میرے موبائل میں بیٹری لو ہوگئی ہے، گاؤں جاکر چارج کروانی ہوگی!'' ترنم نے بابا جی سے کہا۔

''لیکن اگر میں Paper Work کرنے بیٹھوں گی تو اِسے کیسے چارج کرواؤں گی۔''

تم بیٹا اپنا کام کرو، میں آپ کے موبائل کا مسئلہ دیکھتا ہوں۔'' بابا جی نے اُسے تسلی دی تو وہ بال پین لے کر کام کرنے بیٹھ گئی۔

اُس کا ہر ہر لفظ راگنی کی قبر مزید گہری کررہا تھا۔

❖❖○❖❖

ولی بڑی حویلی کے اُس کھنڈر میں پہنچ کر وہیں بیٹھ گیا، آنکھیں بند کرکے۔ یہاں کبھی جب زندگی تھی اُس کو Visualize کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

پھر وہ سیدھا سید سرفراز علی کی حویلی پہنچ گیا۔

''سید سرفراز صاحب! باہر آئیے۔'' وہ غصّے سے بولا۔

''سائیں آپ یہاں؟'' وہاں موجود ملازم اُسے دیکھ کر حیران ہورہے تھے۔

''سائیں تو بیمار ہے، ہسپتال میں ہے آپ کو نہیں معلوم؟'' ملازم نے ولی کو بتایا۔

''مطلب؟'' ولی نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا۔

جواباً ملازم نے ساری حقیقت کہہ سنائی۔

ولی نے غصّے سے زور سے زمین پر ٹھوکر ماری، جیسے وہ زمین نہ ہو بلکہ سید سرفراز علی ہو!

''اب؟'' کوئی اُس کے اندر سے پوچھ رہا تھا۔

''میں سید سرفراز کو دُکھ دینا چاہتا ہوں! اتنا دُکھ کہ اُسے دُکھ کا احساس بہتے خون کی طرح ہوجائے۔'' ولی نے اپنے اندر کو جواب دیا۔

''ہر شخص کی جان کسی نہ کسی طوطے میں بند ہوتی ہے، میری بھی کمزوری میری بیٹی ہے، میں نے بحیثیت ایک باپ جو کیا، میں تمہارے ساتھ زیادتی نہ کرنا چاہتا تھا، میں نے اپنی بیٹی کی خوشی کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا۔'' سید سرفراز علی کی آواز ولی کے کانوں میں گونجی۔ ولی کو جیسے ایک دم راستا مل گیا۔

وہ واپس جارہا تھا۔ وہ بابا جی کے حجرے جارہا تھا۔

وہ ترنم سے نکاح کرنے جارہا تھا۔ وہ سید سرفراز علی کو دُکھ دینے جارہا تھا۔ وہ اپنے اندر کی آگ بجھانے کے لیے پہلی بوند پانی کی لینے جارہا تھا۔

❖❖○❖❖

''میڈم خبر ملی ہے۔'' مارک نے میڈم راگنی کو فون پر کہا۔

''کہاں ہے؟'' میڈم راگنی پھنکاری۔

''میڈم ابھی اُس کی کچھ Location ٹریس ہوئی ہے، میں آپ کو کچھ دیر بعد Exact خبر دوں گا۔ بہرحال گڈ نیوز ہے، چڑیا پھنسنے والی ہے۔'' مارک خباثت سے ہنسا۔ خون کا کھیل کھیلنا درندگی کا تماشہ لگانا اُس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

ترنم کی جانب موت کے سائے بڑھ رہے تھے وہ اس لیے بہت خوش تھا۔ وہ اُسے پکڑ کر مزہ چکھانا چاہتا تھا۔

لیکن اُسے تو ابھی سے مزہ آرہا تھا ایک اور چڑیا پھنسنے والی تھی۔

❖❖○❖❖

یہ سب تم نے کیا، کیا؟'' ٹی ٹو فون پر چیخ رہا تھا۔

ولی یو ور سو کمپوزڈ Composed پرسن!

پلیز ولی!'' ٹی ٹو نے اُسے روکنا چاہا۔

''نو!'' ولی نے مصمم ارادے سے انکار کیا۔

''بس دعا کرو میرے لیے۔'' ولی نے کہہ کر فون بند کردیا۔

''تم ابھی تک راستے میں ہو!'' ولی نے طارق سے پوچھا۔

''تم بھی نا، نمونے ہو۔'' طارق نے زچ ہوکر کہا۔ لیکن بہرحال وہ ولی کی ایک کال پر نکل پڑا تھا۔

''آجاؤ، پھر ہی تم کو اصل بات بتاؤں گا!'' ولی نے بہت سکون سے کہا اور فون بند کردیا۔

❖❖○❖❖

''آنٹی السلام علیکم!'' ٹی ٹو نے مؤدب ہوکر روشن آرا بیگم کو کھڑے ہوکر سلام کیا۔

''خیریت سے ہو بیٹا!''

''بیٹھو!'' روشن آرا بیگم بہت نڈھال ہوگئی تھیں لیکن بہرحال گھر آئے مہمان کو Attend کرنا بھی

بے حد ضروری تھا۔

''میں مسکان بھابی سے ملنے آیا تھا، اُن سے ضروری کام تھا۔'' ٹی ٹو سے بولنا دُشوار ہو رہا تھا۔ ولی نے اُس پر بہت اہم ذمہ داری ڈال دی تھی۔

دو دن کی دلہن کو یہ بتانے کے لیے کہ اُس کا دولہا کہیں اور شادی کر رہا ہے!

''بیٹا! وہ تو شاہ صاحب کے ساتھ ہسپتال گئی ہے، اُس کے والد ہسپتال میں ایڈمٹ تھے وہ ڈسچارج ہو کر اپنے گھر جا رہے ہیں تو وہ مسکان کو بھی ساتھ لے جانا چاہ رہے تھے۔ ویسے تو رسم ہوتی ہے دلہن شادی کے بعد اپنے گھر اپنے میکے جاتی ہے اور پھر دولہا جا کر اُسے واپس لاتا ہے، میں نے اُسے اُس کے والد کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے وہیں سے ہی جانے کی اجازت دے دی۔ اب تک تو شاید وہ لوگ نکل گئے ہوں۔'' روشن آرا کی بات پر وقتی طور پر ٹی ٹو نے سکون کا سانس لیا۔

چلو وقتی طور پر مسکان کو بُری خبر سنانے سے وہ بچ گیا تھا۔

''کوئی خاص بات؟'' روشن آرا بیگم براہ راست ولی کا نہ پوچھنا چاہتی تھیں لیکن اِس ساری بات میں وہ مسلسل ٹی ٹو کو دیکھ رہی تھیں کہ شاید وہ ولی کی اطلاع دے۔

لیکن جب وہ خود سے نہ کچھ بولا تو بالآخر انہوں نے اُس سے پوچھنے کا فیصلہ کر لیا۔

''بیٹا! ولی کہاں ہے؟'' انہوں نے ایک دم ٹی ٹو سے پوچھا، جس طرح ٹی ٹو کے چہرے کا رنگ بدلا تھا وہ بتا گیا تھا کہ وہ جانتا تھا کہ ولی کہاں ہے۔

''تم ولی کا کوئی پیغام مسکان کو دینے آئے تھے نا؟'' روشن آرا بیگم نے بغور اُسے دیکھا۔

ٹی ٹو کو اپنا آپ بُری طرح ڈولتا محسوس ہوا۔

روشن آرا کے سامنے وہ جھوٹ نہ بولنا چاہتا تھا اُسے سچائی بتانا ہی پڑی۔

روشن آرا بیگم کا سارا جسم پسینے میں بھیگ گیا۔

اُن کے اپنے گھر پر قیامت گزری اور اُن کو پتا ہی نہ چل سکا!

❖❖○❖❖

میں اِس بستی میں رہتا ہوں
جہاں سب لوگ
اندیشوں کے کمبل اوڑھ کر
خوابوں سے اتنی جنگ کرتے ہیں
کہ سانسیں پھول جاتی ہیں
جہاں سہمے ہوئے سب پالتو کتے
اِک ایسے خوف کو محسوس کرتے ہیں
کہ اکثر بین کرنا بھول جاتے ہیں
جہاں بچوں کے بستے تختیاں
سہمے کھلونے، چوڑیوں کی کرچیاں

سب گندگی کے ڈھیر میں ہی
عافیت محسوس کرتی ہیں
جہاں پینے کے پانی میں
لہو کا ذائقہ تحلیل ہوتا ہے
میں اِس بستی سے باہر کی
کسی دنیا کو جب بھی سوچتا ہوں
تو میرے اجداد کہتے ہیں
میں باغی ہوں!!
میں باغی ہوں!!

ڈاکٹر فیصل کے کانوں میں اپنی ہی کہی نظم گونجی۔ وہ مسلسل سفر کر کے گاؤں پہنچ گئے تھے۔

اب وہ کتنی دیر سے سر جھکائے آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے، اُن میں ہمت نہ ہو رہی تھی کہ! کہ گاڑی باہر نکل کر اُس زمین پر پاؤں رکھیں جس کے اندر اُن کے پیارے دفن تھے۔

''فیصل باہر آئیں!'' مریم بی بی نے گاڑی آبائی قبرستان کے باہر رکوائی۔

یہ حویلی والوں کا بہت خوب صورت قبرستان تھا ظاہری آن بان رکھنے والے اپنے قبرستان کو بھی ویسا ہی سجا کر رکھتے تھے۔

''پاپا باہر آئیں۔'' عبداللہ نے باپ کو آواز دی۔

ڈاکٹر فیصل نے طویل سانس بھر کر خود کو مضبوط کرتے ہوئے زمین پر پاؤں رکھا۔

تیز ہوا کا جھونکا اُن کے چہرے کو چھو کر گزر گیا۔ ساتھ ہی فضا میں ایک بہت مانوس خوشبو اُن کو محسوس ہوئی۔

''موتیا!'' وہ بے اختیار بولے۔

''ہاں! یہ خوشبو اُن کی موتیا کی تھی۔'' دو آنسو بے اختیار اُن کی آنکھوں سے بہے۔

''میں جانتا ہوں تم میرے قریب یہیں کہیں ہو۔'' ڈاکٹر فیصل نے اُس خوشبو کو گہرا سانس لے کر اپنے اندر اُتارتے ہوئے اپنے دل میں کہا۔

''اگر میں تم کو نہیں بھولا تو تم بھی تو ہمیشہ میرے دِل میں رہی ہو! ہر پل زندہ! دیکھو اِن بچوں کو، عبداللہ کو، زہرہ کو! یہ تمہارے ساتھ کیے ہوئے وعدے کی نشانیاں ہیں، میں نے تمہاری مریم کو بچا لیا تھا موتیا!'' وہ آنسو صاف کرتے قبرستان میں داخل ہو گئے۔

نفیسہ بیگم نے جہاں اُن کو لے جا کر کھڑا کیا تھا، وہاں بہت ساری قبروں کے بیچ ایک قبر پر کتبہ سیدہ سدرہ بی بی کے نام سے جگمگا رہا تھا۔

ڈاکٹر فیصل کو یوں لگا اُن کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے ہوں۔ قبر کے ارد گرد کتنے ہی ''موتیے'' کے پھول پودے لگے ہوئے تھے۔

''یہ! یہ پودے کس نے لگوائے؟'' ڈاکٹر فیصل نے رُندھی آواز میں بہن سے پوچھا۔

''سائیں! میں نے تو یہاں سایہ دار درخت کا پودا لگایا تھا لیکن اللہ کی قدرت ہے کوئی بھی پودا یہاں لگاؤ، سوائے موتیے کے پھولوں کے کچھ نہیں اُگتا۔'' مالکن کو یہاں دیکھ کر گورکن بھی دوڑا آیا، وہ یہاں سب قبروں کی حفاظت کرتا تھا۔

ڈاکٹر فیصل نے ایک بار پھر قبر کو دیکھا، جو جگہ جگہ سے موتیے کے پودے سے بھری پڑی تھی، جس پر بے انتہا پھول اُگے ہوئے تھے۔

''موتیا!'' ڈاکٹر فیصل اِس قدر پھوٹ کے روئے کہ اُن کو اپنے اردگرد کی خبر نہ رہی۔

مریم بی بی نے اُن کو کھل کر رونے دیا اور نفیسہ بیگم کو بھی روکا تھا کہ وہ اُن کو رونے سے نہ روکیں۔

''آپ نہیں جانتیں یہ آنسو باہر آنے کتنے ضروری تھے، کون کہتا ہے کہ مر جانے سے محبت مر جاتی ہے جو لوگ دلوں میں زندہ ہوں، وہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

اُن کی محبت زندہ رہتی ہے۔

❖❖○❖❖

''آپ نے اتنی دیر کہاں لگادی، آپ کا موبائل بھی بند پڑا ہے۔'' روشن آرا بیگم احمد شاہ کو دیکھتے ہی لپکیں۔

''میں واپسی پر شہباز کی طرف گیا تھا کہ طارق کو شاید ولی کی کوئی خبر ہو، خیریت تم کو کوئی خبر ملی۔''

''ہاں جی!'' روشن آرا بیگم نے جو کچھ بتایا، احمد شاہ پریشانی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''میں، مجھے وہاں جانا ہوگا ورنہ ولی کوئی غلط کام نہ کر بیٹھے، اگر وہ بدلہ لے گا تو ہر صورت قاتل بن جائے گا اور میں! اپنی برسوں کی کمائی یوں ختم ہونے نہیں دوں گا۔''

''میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔'' روشن آرا بیگم نے کہا۔

''لمّاں جان! پلیز میں بھی جاؤں گی، ورنہ یہاں ڈر ڈر کر مر جاؤں گی۔'' نگینہ جو ابھی ابھی آئی تھی ساری بات سن کر وہ بھی اصرار کرنے لگی۔

احمد شاہ چند پل سوچ میں مبتلا ہو گئے۔

''ٹھیک ہے چلو! میں گارڈ کو کہلوادوں اُن کی گاڑیاں جانا ضروری ہیں۔'' احمد شاہ موبائل پر کوئی نمبر ڈائل کرتے باہر نکلے جب کہ روشن آرا بیگم اور نگینہ فوراً سفر کی تیاری کے لیے اندر چلی گئیں۔

❖❖○❖❖

''سوچ لو یار!'' طارق ساری بات سُن کر بوکھلا گیا۔

''میں نے تمہاری مجبوری سمجھی تھی، تم میری سمجھ لو۔'' ولی بھیگی ہنسی ہنس کر بولا۔

''اِس لیے تو اِس کنویں میں چھلانگ مارنے سے روکا تھا، تم جانتے ہو وہ لڑکی کون ہے؟'' ولی نے طارق سے پوچھا۔

''کمال ہے یار! شادی تم کر رہے ہو اور پوچھ مجھ سے رہے ہو۔'' طارق بدمزگی سے بولا۔

''وہ ترنم ہے۔'' ولی نے طارق کے سر پر دھماکہ کیا۔

''کک۔ کیا؟'' طارق ایک دم حیرت سے بولا۔

''ولی! تم نہیں جانتے وہ لڑکی کس گروہ سے آئی ہے؟''

''خود تم سحرش کے نام پر نیکی کر گئے اور مجھے لڑکی کا بیک گراؤنڈ سنانے لگے۔'' ولی نے اُس کی بات کاٹ کر طنز کیا۔

''نہیں یار! تم غلط سمجھ رہے ہو، یہ تو اللہ جانتا ہے، کون گناہگار اور کون نیک ٹھہرایا جائے گا۔ میں ذرا تکلف بات کر رہا ہوں، دراصل اُس لڑکی کے پیچھے ایک پورا گینگ ہاتھ دھو کر پڑا ہے، پھر وہ بہت ساری باتوں میں سرکاری گواہ بننے جارہی ہے تاکہ راگنی کو سزا ہو سکے۔'' طارق نے فکرمندی سے کہا۔

''تو کیا سرکاری گواہ بننے والی لڑکی سے شادی پر پابندی ہوتی ہے؟'' ولی نے پوچھا۔

''ولی۔ ولی! اوہ اللہ کے بندے سمجھا کرو یار، اُس کے دشمن تمہارے بھی دشمن بن جائیں گے۔''

''یار موت تو جب آنی ہے وہ ہر جگہ آجاتی ہے۔'' ولی کی بے نیازی دیکھ کر طارق چونکا۔

''ولی! تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟''

''اِس لیے کہ ایک عزت کے لیے تڑپتی بلکتی لڑکی نے اللہ کا واسطہ دے کر مجھ سے عزت مانگی ہے، یار میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں نے اُس کا سوال نہ پورا کیا تو کہیں وہ مجھ سے واپس نہ لے لے۔'' ولی کی بات پر طارق نے بے اختیار جھرجھری لی۔

''تم ٹھیک ہو ولی!'' طارق نے ایک سیکنڈ لگایا تھا اور فوراً چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔

❖❖○❖❖

یہ گھر باباجی کی ایک شاگردہ اور شاگرد کا تھا، یہاں نکاح کی تقریب کا انتظام کیا گیا تھا۔

طارق گواہوں میں شامل تھا باباجی نے خود اُن کا نکاح پڑھایا تھا۔ جب ترنم کو باباجی نے ایمان فاطمہ بنت عبدالرحمان کہہ کر پکارا تو اُس کی ہچکی بندھ گئی۔

''میرا باپ! میرا پاکیزہ باپ! عزت دار باپ آج دوبارہ اُس کا نام میرے نام کے ساتھ تمہاری وجہ سے پکارا گیا ہے عبدالولی!

تیرا شکریہ۔ تیرا شکریہ!

اے اللہ تو کتنا مہربان ہے!

تیرا شکریہ۔ تیرا شکریہ! وہ روتی جارہی تھی اُس اللہ نے اُس کی وہ خواہش پوری کردی تھی، جو اُس نے آخری خواہش کی طرح مانگی تھی۔

وہ ایمان فاطمہ بنت عبدالرحمان، آج عزت دار باپ کی بیٹی پکاری گئی تھی، ایک عزت دار شخص کی زوجیت میں دے دی گئی تھی۔

''اے اللہ تیرا شکریہ، تیرا شکریہ! میری آخری خواہش تھی یہ تو پوری ہوگئی، تو کیا یہ میری زندگی کا آخری دِن ہوگا!'' جانے کیوں یہ خیال اُس کے من میں دوڑا آیا، پھر خود ہی وہ اپنے خیال پر ہنس پڑی۔

''ارے اِس آخری خواہش کا آدھا حصہ باقی ہے، اللہ جی میری ماں سے بھی ملوادیں اب!

❖❖○❖❖

''جب سے تم آئی ہو میں پوچھ پوچھ کر تھک گیا ہوں بٹیا آخر کیوں اتنی چپ ہو!'' وہ پراڈو جیسی بہت

luxries اور بڑی آرام دہ گاڑی میں سفر کر رہے تھے۔

سید سرفراز کی طبیعت کی خرابی کے پیشِ نظر ڈرائیور بہت محتاط ہو کر گاڑی چلا رہا تھا۔

''میری کسی بات کا جواب نہیں دے رہی ہو!'' سید سرفراز نے بُت بنی مسکان سے کہا۔

''کیا عبدالولی نے تم سے بُرا سلوک کیا ہے؟'' وہ اَن جانے اندیشوں سے پہلی بار ڈرے تھے، ساتھ ہی شدید غصے نے اُن کو آ گھیرا۔

مسکان نے بے حد تاسف سے اپنے باپ کو دیکھا۔ اُسے دُکھ تھا کہ وہ اُس کا باپ تھا کاش اُسے اپنا باپ چننے کی چوائس ہوتی تو وہ اُسے کبھی بھی نہ چنتی۔

ایک اجنبیت کی لہر اُس کے اندر اُٹھی، اگر نفرت کی اُٹھتی تو بھی خیر تھی، جہاں نفرت ہو تو بھی کوئی نہ کوئی Concern تو ضرور ہوتا ہے نا! لیکن یہ کیا تھا اُس کے اندر تو اجنبیت ہی لہریں لے رہی تھی۔

وہ ایک دم اُن سے بہت دور جا کھڑی ہوئی۔

''مسکان! میری بات کا جواب دو۔'' وہ دبی دبی آواز میں چیخے۔

اُسی پَل مسکان کا موبائل فون زور زور سے بجا۔

''ہاں بولو ٹی ٹو!''

''مسکان! تمہارا فون سگنل نہیں لے رہا تھا۔ تم سے بات نہ ہو پا رہی تھی، اِس لیے تم تک یہ پیغام دیر سے پہنچا رہا ہوں۔'' پھر جو کچھ ٹی ٹو نے مسکان کو بتایا وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''کیا ہوا، کون ہے فون پر؟'' سید سرفراز علی نے فون پکڑ کر پوچھا۔

جواباً ٹی ٹو نے ساری بات اُن کو بھی کہہ سنائی۔

''میں ولی کو مار ڈالوں گا اگر اُس نے میری بیٹی کے ساتھ زیادتی کی۔'' سید سرفراز علی زور سے دھاڑے۔

ڈرائیور نے ڈر کر گاڑی روکی، شاید صاحب کو کوئی کام ہے۔

''کس کس کو ماریں گے بابا؟'' مسکان استہزائیہ ہنسی ہنسی۔

''کس کس کو ماریں گے!'' مسکان روتے روتے ایک دم اُن کے بازوؤں میں جھول گئی۔

سید سرفراز نے پریشانی سے مُسکان کو دیکھا۔

اپنی ہار کو دیکھا۔

❖❖○❖❖

''بھابی! یہ میری طرف سے رکھیں، فی الحال یہی تھا میرے پاس۔'' طارق نے لفافے میں کچھ کیش رقم دی تھی۔ بابا جی کی شاگردہ سے کہہ کر ویڈنگ ڈریس منگوا کر گفٹ کیا تھا۔

''بھابی!''

''یا اللہ! کیا واقعی مجھے عزت مل گئی ہے۔''

''رشتے میرے ساتھ جڑ گئے ہیں؟ میں ترنم کے بجائے کسی رشتے سے پکاری جاؤں گی؟''

''یہ رکھ لیں طارق بھائی!''

اگر اُس نے بھابی لفظ سے ترنم کو عزت دی تھی تو ترنم نے بھی طارق صاحب سے طارق بھائی کا فاصلہ بہت جلد طے کیا تھا۔

''یہ فائل ہے، میں نے اِس میں تمام انفارمیشن لکھ دی ہے، یہ سی ڈی ہے۔ یہ لیس پن ڈرائیو، باقی کا ڈیٹا آپ کو اِس میں سے مل جائے گا اور یہ Diary ہے۔'' ترنم نے ایک بیگ ساری چیزوں سمیت طارق کے حوالے کر دیا۔

''پیارے بیٹے! اللہ آپ کو کامیابی عطا کرے۔'' بابا جی نے طارق کو دُعا دی۔

''بابا جی! یہاں ہمارے ملک میں تو ہر جگہ ہر طرف ارد گرد کرپشن ہی کرپشن ہے، ہم تو بس اپنی کوشش کر سکتے ہیں۔ ایک جگہ کو صاف کرتے ہیں تو دوسری جگہ بھری پڑی ہوتی ہے۔'' طارق بے اختیار بولا۔

''پیارے بیٹے! اِس ملک کے فرد ہونے کی نسبت ہمارا فرض ہے، ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم سب اپنی اپنی ذمے داری کو محسوس کریں اور ایک دُوسرے پر تنقید کیے بغیر بس اپنے اپنے حصّے کا جھاڑو لگائیں، پہلے اپنے من میں جھاڑو پھیر کر وہاں اللہ کو بساؤ پھر اپنے ارد گرد لگاؤ اور انسانیت کے لیے جگہ بناؤ۔'' کہتے کہتے بابا جی جیسے کھو گئے۔

''ہمت نہ ہارو، اپنا فرض پورا کرتے رہو۔'' بابا جی کی بات پر ترنم اور طارق دونوں کے ہی دلوں کو بے حد سکون ملا۔

''شکریہ بابا جی!'' طارق نے اُن کے ہاتھوں کو بے اختیار پکڑ کر بوسہ دیا۔

''جاؤ بیٹا! اللہ تمہیں کامیاب کرے گا۔'' بابا جی نے اُسے دُعا دی۔

''اچھا بھابی! چلتے چلتے پوچھ لوں، ولی نے آپ کو تحفے میں کیا دیا؟''

''طارق بھائی! میرے لیے تو وہ پورے جہان کی دولت سے زیادہ ہے، انہوں نے مجھے عزت جیسی دولت دی ہے اور ظاہری چیزوں کو پوچھ رہے ہیں تو وہ یہ ہے۔'' ترنم نے ایک بہت خوب صورت انگوٹھی دکھائی، یہ ولی کی پرسنل انگوٹھی تھی اور ترنم کو ڈھیلی تھی لیکن ترنم نے کسی خزانے کی طرح سنبھال کر رکھی تھی۔

''بیٹا! میں اپنی جگہ جانا چاہتا ہوں!'' بابا جی نے ترنم سے کہا وہ لوگ ابھی تک بابا جی کی شاگردہ کے گھر تھے، وہ کھاتے پیتے بڑے گھر کے لوگ تھے انہوں نے دو تین کمرے فوراً اُن کو دے دیے۔

''ولی آتے ہیں تو پھر چلے جایئے گا۔'' ترنم نے کہا۔ ولی باہر گاؤں میں گیا ہوا تھا۔

باہر ایک دم گاڑیاں رکنے کا شور سنائی دیا۔

''کون ہے باہر؟'' ترنم گھبرا گئی۔

''باباجی! ولی بھائی کے امی ابو آئے ہیں۔'' باہر سے اُس گھر کی ایک لڑکی نے اندر آ کر کہا۔

''کمال ہے! ولی نے انکل انٹی کو بھی بلا لیا۔'' طارق حیران ہوا۔ وہ لوگ سب آگے پیچھے باہر نکلے۔

''بابا صاحب! آپ یہاں؟''

''السلام علیکم!'' احمد شاہ، روشن آرا بیگم جہاں بابا جی کو دیکھ کر حیران ہوئے، وہیں اُن کو سکون ہوا کہ جہاں بابا جی موجود ہوں گے وہاں سوائے خیر کے بھلا کیا ہوگا۔

''علیکم السلام! جیتے رہو بیٹا! قسمت میں لکھا تھا کہ ہماری ملاقات بہت جلد ہوگی۔'' بابا جی نے سب کو

پیار کرتے ہوئے کہا۔

''باباولی کہاں ہے؟''

''ولی خیریت سے، تم اپنی بہو کو پیار نہیں دو گے؟'' باباجی نے پیچھے کھڑی ترنم کی جانب اشارہ کیا۔

''باباجی! آپ نے ایسا کیوں ہونے دیا، آپ تو ولی کو روک سکتے تھے نا!'' روشن آرا بیگم نے ترنم کے جھکے سر کو دیکھ کر شکوہ کیا۔

''بیٹی! اگر میں اِس نکاح میں شامل ہوا ہوں اور میں نے خود پڑھایا ہے تو اِس کا صاف مطلب ہے کہ میں اس کو ٹھیک سمجھتا تھا اِس لیے ایسا کیا۔'' باباجی نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔

''پھر بھی باباجی!'' روشن آرا بیگم ناراض تھیں۔

''دو دو بہوئیں! اور دونوں میری پسند کی نہیں!'' روشن آرا بیگم کو ملال ہوا۔

''ملال نہ کرو، یہ اللہ کی رضا ہے قبول کرو۔'' باباجی نے روشن آرا بیگم کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''ایمان فاطمہ بیٹا! آگے بڑھ کر ساس کو سلام کرو۔'' باباجی نے ترنم کی ہمت بندھائی۔

''خوش رہو آباد رہو!'' روشن آرا بیگم نے ایک شکوہ کناں نظر طارق پر ڈال کر ترنم کو پیار دیا۔

احمد شاہ بیوی کے روٹھے روٹھے انداز دیکھ کر بے اختیار مسکرائے۔

''آپ نے لتاں جان کو ناراض کردیا! آپ ہی خبر کر دیتے۔'' نگینہ نے پاس کھڑے طارق کو کہا۔

''مجھے تو خود یہاں آ کر خبر ہوئی لیکن کوئی نہیں مانے گا اس لیے میں صفائی نہیں دوں گا۔''

''یہ بیٹی ہماری اللہ کی بہت پیاری ہے، اللہ نے اِس کو بڑے درجے عطا کیے ہیں۔'' باباجی نے سب کے دِلوں سے ملال کم کرنے کی کوشش کی۔

اُسی پَل ایک دم گولیوں کے چلنے کی آواز کے ساتھ ایک دم سنسناتی گولیاں قریب سے گزری تھیں۔

''یا اللہ!'' ترنم ایک دم نیچے گری۔

''سب زمین پر لیٹ جائیں!'' طارق زور سے چلّایا اور جوابی فائر کرنے لگا لیکن اُس کے پاس ایک ہی گن تھی وہ تو شکر تھا احمد شاہ کے ساتھ آئے گارڈز نے جوابی حملہ کردیا تھا۔

''طارق! سب کو اندر لے کر جاؤ۔'' ولی اپنی گن لیے سب کو کوَر کررہا تھا وہ ابھی ابھی آیا تھا۔ وہ تو گزشتہ دو دن سے اپنا پسٹل اپنی جیب میں لیے گھوم رہا تھا۔

''ولی ہٹ جاؤ!'' طارق بُری طرح چلایا کیوں کہ ولی کوئی بھی آڑ لیے بغیر سب کو کور کررہا تھا۔

''سب کو اندر لے کر جاؤ!'' ولی چیخا۔

طارق نے بمشکل سب کو اندر کیا، لیکن جب وہ باباجی کو کھینچ کر اندر لایا تو اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔

''باباجی! طارق کو اِس بزرگ سے ایک دم سے پیار ہوگیا تھا اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

باباجی کی ساری قمیض خون سے لت پت تھی۔

''باباجی!'' احمد شاہ کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے سب باہر گولیوں کا طوفان بھولے اُن کے گرد بیٹھے۔

''کیوں روتے ہو! سب کو موت آنی ہوتی ہے، میں تو خوش قسمت ہوں دو دہائیاں جی کر، بے شک اولاد نہیں تھی پھر بھی اتنے سارے لوگ میرے لیے موجود ہیں۔'' باباجی نے نقاہت سے کہا۔

''لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔'' باباجی مسلسل کلمہ پڑھ رہے تھے۔

''میں آپ کو ہسپتال لے کر جاؤں گا۔'' طارق نے کہا۔

''تم نہ بھولنا، ہمت نہ ہارنا! اپنے اپنے حصّے کا جھاڑو پھیرنا نہ بھولنا۔'' باباجی کے چہرے پر بہت خوب صورت مسکراہٹ تھی۔

''طارق میرے قریب آؤ۔'' اُن کی آواز مدھم تھی اِس لیے طارق نے اپنے کان اُن کے منہ پر لگا دیے۔

پھر سب نے واضح طور پر اُن کے منہ سے کلمہ طیبہ سنا اور انہوں نے یوں مسکرا کر آنکھیں بند کیں، جیسے کوئی بہت بڑی خوشی مل گئی ہو۔

ساری عمر شہادت کی موت مانگنے والے کو اللہ نے شہادت جیسی موت دے دی تھی وہاں موجود ہر شخص سسک پڑا تھا طارق نے بہت احتیاط سے اُن کو زمین پر لٹا دیا تھا۔ باہر گولیوں کی آواز بند ہوگئی تھی۔

طارق نے کمرے میں نگاہ دوڑائی سب موجود تھے، سوائے ترنم اور ولی کے۔

''ترنم۔ ولی!'' طارق باہر بھاگا۔

''ولی!'' طارق کا دِل حلق میں آ گیا۔

ولی سامنے خون سے لت پت موجود تھا۔

❖❖○❖❖

''مُسکان کو ہوش آ جائے گا سائیں! بس ڈپریشن سے بچائیں، میں نے نیند کا انجکشن لگا دیا ہے۔'' لیڈی ڈاکٹر جسے قریبی قصبے سے ڈرائیور لایا تھا، اُس نے کہا۔

''مُسکان!'' سید سرفراز علی کے دِل کو تڑپ لگی تھی۔ حیرت تھی پتھر کو دیمک لگی تھی، حیرت تھی!

❖❖○❖❖

''نہ جاؤ تم لوگ میں پہلے بھی منع کر چکا ہوں۔'' قاسم علوی نے گاڑی میں سے نکل کر کہا۔

''بس پاپا! یہاں تک لے آئیں ہیں تو اندر تک بھی جانے دیں آج سید سرفراز علی کا روزِ حساب نہ سہی! لیکن میں اپنے دل کا بوجھ اُس پر لاد کر آنا چاہتا ہوں۔'' سمعان علوی نے اُن کے کندھے سے لگ کر کہا اور زبیدہ بیگم کا ہاتھ تھام کر حویلی کے اندر داخل ہوگیا۔

جب کہ قاسم علوی نے پریشانی سے اُن دونوں کو دیکھا۔

جیسے وہ لوگ شیر کی کچھار میں داخل ہورہے ہوں۔

''میں تم سے یہ نہیں کہنے آیا کہ میرا کوئی ڈی این اے ٹیسٹ کروالو اور مجھے بیٹا مان لو، مجھے تو ساری عمر دُکھ رہے گا تم میرے باپ ہو! میں تو صرف تم سے اتنا کہنے آیا ہوں کہ میں تم پر تھوکتا ہوں! پھر واقعی سمعان نے سید سرفراز پر تھوک دیا۔

زبیدہ بیگم بھرپور طریقے سے مسکرائیں۔

''تم! تم کو میں ابھی مزہ چکھاتا ہوں!'' سید سرفراز علی نے غصّے سے چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

''چکھاؤ!'' سمعان نے نڈر ہو کر کہا۔

اُس کی آنکھوں کی چمک سے سید سرفراز کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ جانے وہ کون سی طاقت تھی کہ سید سرفراز علی چاہ کر بھی اُن کو روک نہ سکا نہ رکوا سکا۔

''سید سرفراز علی! تم ہار گئے ہو، دیکھا میں خسارے میں نہیں، خسارے میں تم ہو بیٹے کے ہوتے ہوئے تمہیں بیٹا نہیں ملے گا۔'' زبیدہ بیگم نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا اور سمعان علوی کا ہاتھ تھام کر مضبوط قدموں سے باہر نکل گئیں۔

اُن کے قدموں کی دھمک سید سرفراز علی کو اپنے دِل پر سُنائی دی تھی۔

تم ہار گئے ہو!

تم ہار گئے ہو!

حویلی کی دیواروں سے لٹکے حنوط شدہ جانوروں کے سر زور زور سے بول رہے تھے، سید سرفراز علی نے گھبرا کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

❖❖○❖❖

جب اپنا قافلہ عزم و یقیں سے نکلے گا
پھر آسماں کا سورج زمیں سے نکلے گا
مری زمیں مجھے ایڑیاں رگڑنے دے
مجھے یقین ہے کہ چشمہ یہیں سے نکلے گا

''ولی.... ولی!'' طارق دیوانوں کی طرح اُس کی جانب بھاگا۔

ولی کا سارا جسم خون سے لت پت تھا! یہ خون ترنم کا تھا، جو اُسے بچانے کے لیے خود اُس کے سامنے آ گئی تھی۔

''ترنم!'' طارق نے دُکھ سے اُسے پکارا۔

''طارق بھائی! اُن لوگوں کو پایۂ انجام۔ تک۔ ضرور، پہنچانا!

تا۔ تا کہ کوئی ایمان۔ فاطمہ دہلیز۔ کے پا۔ پار۔ تت۔ ترنم نہ بن سکے۔''

''ولی اسے اِٹھاؤ، یہاں تو کوئی قریب ہسپتال بھی نہیں ہے۔'' طارق نے پریشانی سے کہا۔

ولی نے اپنے آنسو صاف کر کے اُسے اٹھانے کی کوشش کی تو ترنم نے اُس کے بازوؤں پر اپنا سر رکھ کر اُسے ایسا کرنے سے منع کیا۔

''ولی! کیا میں اِن آنکھوں کو چوم سکتی ہوں، جنہوں نے مجھے کبھی بُری۔ نگاہ۔ یا حقارت سے نہیں دیکھا۔'' ترنم کی فرمائش ولی نے فوراً پوری کی۔

ترنم کو واقعی اللہ نے نواز دیا، جو علیزے کو نہ مل سکا، مسکان کو نہ مل سکا وہ سب سے پہلے ترنم کو ملا تھا۔

ولی نے اُس کے ماتھے کا بوسہ لیا۔

''پلیز ہمت کرو، ہم تمہیں لے کر چلتے ہیں۔'' ولی نے ترنم کو گود میں اُٹھایا اور طارق نے گاڑی سنبھال

لی۔

ولی ترنم کا سر گود میں رکھے پیچھے سیٹ پر تھا۔

''ولی! میں۔ نے۔ سنا تھا موت۔ درد۔ دیتی ہے!!

لیکن۔ مجھے۔ درد کیوں نہیں ہو رہا؟ مجھ کو اپنے سارے جسم پر۔ اتنی ٹھنڈک کیوں محسوس ہو رہی ہے؟ یہ اتنی خوشبو کہاں سے آ۔ رہی ہے؟ مجھے اتنی نیند کیوں۔ آ۔ رہی ہے؟'' ولی نے اُس کے ماتھے کا بوسہ ایک بار پھر لیا اور اُسے سینے سے لگا لیا۔

یہ لڑکی ایک بار پھر اُس کی جان بچا گئی تھی!

اپنی جان گنوا کر وہ اُسے بچا گئی تھی۔

وہ اُسے ایک دم اپنے دِل کے بے حد قریب محسوس ہو رہی تھی۔

''ولی! میں نے۔ تم کو۔ اللہ سے مانگا تھا!'' اُس نے سرگوشی کی۔

''بہت سال پہلے ہی مانگا تھا۔'' اُس کے چہرے پر بہت خوب صورت مسکراہٹ تھی، اتنی خوب صورت کہ ولی مبہوت ہو گیا۔ اِس وقت ترنم کا چہرہ پریوں کے چہرے کو بھی مات دے رہا تھا۔

''یا اللہ! یہ اتنی حسین کیسے ہو گئی؟'' ولی خود سے سوال کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''اب۔ میں تم سے وہاں پر۔ ملوں گی!'' وہ پھر مسکرائی۔

''اُف! کتنی۔ میٹھی۔ نیند۔ ہے!!

آ۔ آنکھیں نہیں۔ کھل رہیں!

سنو ولی! میری ماں۔ کا۔ خیا۔ خیال رکھنا!'' ترنم سے بولا نہ جا رہا تھا لیکن نان اسٹاپ بولے جا رہی تھی۔ ایسے جیسے وہ اپنے لفظ دُنیا میں پورے کر کے جانا چاہ رہی تھی۔

''ولی سنو! میری ایک خواہش اور پوری کر دو گے؟'' ترنم نے بند ہوتی آنکھوں کو ایک بار پھر بھرپور کھول کر کہا۔

''کہو؟'' ولی نے پیار سے اُس کے بکھرے بال پیچھے کرتے کہا۔

''مسکا۔ مسکان کو معاف کر دینا۔ اُس کا قصور صرف۔ یہ ہے۔ کہ وہ۔ قاتل کی بیٹی ہے! اُس کا قصور معاف۔ کر دینا۔! مسکان کو بہت پیار کرنا!

بہت زیادہ!

تم۔ تم۔ پیار کرتے کتنے اچھے لگو گے!

وہ ہنسی تھی۔!

ولی کو حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اتنا کیسے بولے جا رہی ہے، اتنی گولیاں لگنے کے باوجود ذرا بھر بھی اُس کے چہرے پر تکلیف کیوں نہیں ہے۔

''بولو، کرو گے نہ اُس سے پیار؟'' یہ سوال اُس سے کون سی طاقت کروا رہی تھی وہ نہ جانتی تھی وہ بس اتنا جانتی تھی کہ وہ بہت میٹھی نیند محسوس کر رہی ہے۔ اتنی ٹھنڈی ہوا اور خوشبو ہے کہ اُس کا من سونے کو مچل رہا ہے۔

''بولو نا ولی! مجھے نیند آ رہی ہے۔''

''ہاں! کروں گا۔''

اتنا زیادہ پیار کہ تمہارا اندر، باہر بس پیار بن جائے!

تمہارا لمس۔ تمہارا پیار قسمت والی کو ملے گا۔ ولی!

ولی! میں بھی بہت۔ قسمت۔ والی ہوں!

ولی نے بے اختیار اُس کی آنکھوں کو چوما۔ اس نے ایک بہت خوب صورت چیز محسوس کی تھی، جیسے اُس نے چاند کو چھولیا ہو۔ روشن چمک دار۔!!

ترنم کا سارا وجود خوشبو کی لپیٹ میں تھا۔

اُس نے ایک بار آنکھیں کھول کر مسکرا کر ولی کو دیکھا اور ولی کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور ہلکے سے ہنس کر آنکھیں ایسے بند کیں، جیسے کوئی چھوٹے سے بچے کو دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے۔

کافی دیر ولی یک ٹک اُسے دیکھے گیا۔

''گڑیا چپ کیوں ہوگئی۔'' وہ گھبرا کر بولا۔

''ایمان۔ ایمان!'' لیکن اس کی پری تو پرستان سونے چلی گئی تھی یا شاید معافی سے مہکی اس حوروں کی خوشبو جیسی لڑکی کو اُس کی نئی حور سہیلیاں کھیلنے لے گئی تھیں۔

''ایمان!'' ولی نے سسکاری بھری اور اُسے کسی خزانے کی طرح اپنے سینے سے لگالیا۔

''طارق! گاڑی واپس لے چلو، ہسپتال جانے کا فائدہ نہیں۔'' ولی نے کہا اور ایمان کو سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

طارق نے نم آنکھوں سے ایمان فاطمہ کو دیکھا، جسے اللہ نے بہت ساری نشانیاں دُنیا کو دے کر اپنی امان میں لے لیا تھا۔

ساری گاڑی ڈھیر ساری خوشبو سے بھری پڑی تھی۔ ولی کے ساتھ ساتھ طارق نے بھی شدت سے محسوس کیا تھا۔

❖❖○❖❖

سید سرفراز علی کا سر جھکا ہوا تھا۔

لوگ حیرت سے دیکھ رہے تھے!

وہ جو کبھی زندگی میں نہ رویا تھا، آج رو رہا تھا۔ لوگ حیرت سے انگلیاں منہ میں دبائے دیکھ رہے تھے۔

زبیر کی میت حویلی کے آنگن میں پڑی تھی، وہ ایڈز سے مرا تھا۔ مرنے سے پہلے اُس نے اپنے باپ کو ایک خط لکھا تھا۔

''ربّ کرے دنیا میں تم سا کوئی باپ پیدا نہ ہو۔

سید سرفراز علی!!

تیرے پیسے نے میرے لیے تھرل نہیں، موت خرید کر دی!

تم کیسے باپ تھے، جس نے کبھی مجھے نہ روکا!

کسی آگ میں کودنے سے نہ روکا!!

تم باپ تھے کہ دشمن!! میری وصیت ہے کہ کوئی دشمن میری قبر کو مٹی نہیں دے گا۔'' زبیر اور سید سرفراز علی پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ پہاڑ روپڑا تھا پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگیا تھا، اُس کا وارث مر گیا تھا۔

اور مرا بھی ایسے جیسے کوئی لاوارث مرتا ہے، وہ اُس سے نفرت کرتا مرا تھا، جس سے اُس نے بہت پیار کیا تھا۔

''اُٹھ جاؤ زبیر!

زبیر! سید سرفراز علی ڈھے گیا۔

تم نہیں مر سکتے!'' تم سید سرفراز علی کے بیٹے اتنے کم زور نہیں ہو سکتے، تم ایسی موت نہیں مر سکتے۔

''ہا۔ ہائے زبیر! سید سرفراز علی کی غصّے کی دھاڑیں تو زمانے نے سنی تھیں لیکن روتے ہوئے کی دھاڑیں پہلی بار سنی تھیں۔

مسکان ایک کونے میں لگی عورتوں میں بیٹھی تھی۔ زندگی میں ہر رشتے کا خانہ خالی ہوگیا تھا۔

''آہ! میرا بھائی!''

جنازہ اٹھنے لگا تو سید سرفراز علی کھڑے سے گر پڑا۔ لوگوں نے سہارا دے کر ساتھ چلایا۔

''بھائی!'' مسکان چیخی۔

''میرے پاس کوئی رشتہ نہیں رہا، میں اکیلی رہ گئی، میں اکیلی رہ گئی۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

تبھی دو مضبوط بازوؤں نے اُسے اپنے حصار میں لے لیا۔

مُسکان نے چونک کر سر اٹھا کر دیکھا۔

''و۔ ولی!''

ولی کی آنکھیں روئی ہوئی تھیں۔ سفید لباس میں اُس کا چہرہ پھیکا پڑ چکا تھا۔

''ولی! میرا بھائی مرگیا! میں، میرے پاس کوئی نہیں رہا، سب مر گئے یا چھوڑ گئے میں، میں کیوں زندہ ہوں!''

''سب تمہارے پاس ہیں، میں ہوں تمہارے پاس۔'' ولی نے مسکان کو سینے سے لگالیا۔

مسکان اتنا روئی کہ پانی ہوگئی۔

ولی نے اُسے رونے دیا۔

لوگ زبیر کا جنازہ اُٹھا کر لے کر جا رہے تھے۔

ولی بھی ساتھ ہولیا۔ زبیر کو دفنانے کے بعد جب سب چلے گئے سوائے سید سرفراز علی اور اُس کے چند خاص ملازمین کے تو ولی آگے بڑھا!

مرے کو گدھ کھاتا ہے!!

اور میں گدھ نہیں ہوں۔!!

سید سرفراز علی! آیا تو تھا تم سے بدلے لینے، لیکن مرے کو کون مارے۔!!
جاؤ تم پر اللہ کی مار!!
ولی نے نفرت سے کہا اور تیزی سے واپس چلا گیا۔
سید سرفراز سودائیوں کی طرح اُسے جاتا دیکھتا رہا۔

❖❖○❖❖

سید سرفراز علی! میں جا رہی ہوں!
جانے سے پہلے میں تم کو باپ ہونے سے عاق کرتی ہوں۔
تمہارے ''سرنیم'' Sir Name کی وجہ سے میں نے بہت دُکھ اٹھالیے۔
میں جا رہی ہوں، اور آئندہ سے میرا کوئی باپ نہیں ہے نہ میں تمہاری بیٹی ہوں۔'' مسکان، ولی کا ہاتھ تھام کر حویلی سے باہر نکل آئی، جہاں خوشیاں اُس کا انتظار کر رہی تھیں۔

''مسکان!!
مسکان! مسکان مجھے نہ چھوڑ کر جاؤ۔''
''عبدالولی میرے پاس بہت دولت ہے میری ساری دولت لے لو اور مجھے معاف کر دو۔'' سید سرفراز علی نے اُن کو روکا لیکن وہ بنا مڑے چلے گئے۔
''نہ رُکو۔ نہ رکو!''
''مجھے کوئی نہیں چاہیے، کوئی نہیں! میں سید سرفراز علی اکیلا ہی سب پر بھاری ہوں!'' سید سرفراز علی ایک دم ہذیانی انداز میں ہنسا۔
''تم اکیلے کہاں ہو سید سرفراز علی! ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔'' ایک دیوار سے سید عبداللہ اور عائشہ بی بی نکل آئیں۔
دوسری جانب سے زلیخا بی بی، سدرہ بی بی، مریم پھوپھو نکلیں، سید سرفراز علی کی آنکھیں خوف سے اُبل رہی تھیں۔
''مجھے تو نہیں بھول گئے سُسر جی!'' ایک دیوار سے شہر بانو نکل کر ہنسی۔
''لیکن! تم سب تو مر گئے ہو! تم کیسے میرے ساتھ رہ سکتے ہو!'' سید سرفراز علی ڈر کر دیوار سے جا لگا۔
لیکن حویلی کا یہ ہال کمرہ لوگوں سے بھرتا جا رہا تھا۔
جورا۔ جورے کی بیوی، وہ ساری لڑکیاں جو اُس کی ہوس کا نشانہ بن کر مر چکی تھیں۔
سید عبداللہ اور عائشہ بی بی سکون سے صوفے پر جا بیٹھے اور سب اُس کے اردگرد کھڑے ہنس رہے تھے۔
''میں! میں تم سب کو مار دوں گا۔ جلا کے ماروں گا تاکہ تم دوبارہ مجھے تنگ نہ کر سکو۔'' سید سرفراز علی غصے سے بڑبڑاتا ہوا تیزی سے گاڑیوں کے گیراج کی طرف لپکا۔
زبیر کی موت کے بعد زیادہ تر ملازم خود ہی سید سرفراز علی نے نکال دیے تھے، جو چند تھے وہ اس وقت اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ سید سرفراز علی کو، اُس کے پاگل پن کو روکنے کے لیے کوئی نہ تھا۔

سید سرفراز علی پیٹرول کی یہ گیلن گیراج سے نکال کر لایا تھا یا کسی گاڑی سے، وہ غصے میں ہذیان بکتا بڑبڑاتا بھاگتا واپس آیا، اب وہ دیوانوں کی طرح پیٹرول چھڑک رہا تھا۔
''میں تم سب کو جلا کر مار ڈالوں گا!''
وہ چیخا اور ساتھ ہی اُس نے ان سب ہنستے ہوئے لوگوں پر آگ کی تیلی پھینک دی۔ ایک زور کا دھماکا ہوا اور ہر طرف آگ کے شعلے اٹھنے لگے۔ اب سید سرفراز علی خوشی سے ناچ رہا تھا۔
''اب تم سب کیسے بچو گے، میں نے سب کو جلا کر مار دیا۔ مار دیا!'' وہ تالیاں بجا رہا تھا آگ اُسے چاروں طرف سے لپیٹ میں لے رہی تھی اور پھر کچھ ہی پلوں بعد اُس کی ہنسی کی آواز دِل دوز چیخوں میں بدل گئی۔
خدائی کا دعویٰ کرنے والا جل گیا تھا۔
وہ آگ جو برسوں پہلے اُس نے لگائی تھی اُس کی لپیٹوں نے آج خود اُس کو بھی پکڑ لیا تھا۔

❖❖○❖❖

بابا جی کا حجرہ پھر آباد ہو گیا تھا۔ بابا جی اور ترنم دونوں کی قبریں وہاں بنادی گئی تھیں، حجرے کے ساتھ کی ساری جگہ لے کر ولی نے ایمان فاطمہ ٹرسٹ ہسپتال بنادیا تھا۔ وہ آخری پلوں کی بے بسی کیسے بھول سکتا تھا، جب وہ ایمان کو بچانا چاہتا تھا اور قریب کوئی ہسپتال نہ تھا۔ دوسروں کو ہسپتال کی سہولت دے کر ایمان کے لیے صدقہ جاریہ کا ایک راستہ بنادیا تھا، اسی طرح ولی نے ہسپتال کے ساتھ متصل زمین پر بچوں کا مدرسہ بنوایا، ساتھ ہی علاقے کی سب سے خوب صورت مسجد ڈیزائن، کی تھی وہ جگہ جو برسوں سے بابا جی کی عبادت سے اللہ کے نام سے زندہ تھی۔
ولی نے اُس جگہ کو ویسے ہی اللہ کے نام سے آباد کروا دیا تھا مسجد اور مدرسہ بنوا کر، بابا جی ہی نہیں اپنے والدین سید عبداللہ اور عائشہ بی بی کے لیے صدقہ جاریہ کا انتظام کر دیا تھا، جہاں ہر آنے والا نماز تو پڑھتا تھا، ساتھ فاتحہ بھی پڑھ کر جاتا۔ ساتھ ہی قبروں کا مجاور وہاں کے سادہ لوگوں کو سختی سے منتیں مانگنے اور سجدہ کرنے سے منع کرتا تھا اس ڈیوٹی کے پیسے مجاور کو الگ دیے جاتے تھے وہ نہیں چاہتا تھا کہ دوسرے بزرگوں کی طرح بابا جی کی قبر کہیں سجدہ گاہ نہ بن جائے اور وہ اس کام میں کامیاب بھی ہو گیا تھا۔
طارق نے میڈم راگنی اور اُس کے گروہ کو کامیاب طریقے سے پکڑا تھا۔ مارک تو آن دا اسپاٹ مر گیا تھا البتہ راگنی کو طارق نے جان بوجھ کر آن دا اسپاٹ مارا تھا۔ ایسا اُس نے ترنم کی وجہ سے کیا تھا کیوں کہ ترنم نے بتایا تھا کہ وہ ایسا سانپ ہے، جسے بھاگنے کا سوراخ ضرور مل جاتا ہے اور وہ باہر نکل کر انڈے بچے پیدا کر کے پھر اپنا سیٹ اپ بڑھا لیتی ہے۔ طارق نہیں چاہتا تھا کہ اس بار سانپ کو کوئی اور سوراخ میسر ہو۔
طارق غیر سرکاری طور پر جتنی چیزیں اور سیٹ اپ تباہ کر سکتا تھا، اُس نے کیے تھے۔ بابا جی نے مرنے سے پہلے اُسے وہ نام بتایا تھا، جو اِس گروہ کے ہائی کمان کا تھا۔
طارق کو حیرت تو تھی کہ وہ کیسے جانتے ہیں کیوں کہ ترنم کے سب ثبوتوں کے باوجود وہ ہائی کمان باس کا نام نہ جان پایا تھا لیکن بابا جی نے مرتے ہوئے وہ نام بتا کر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ وہ اپنے حصے کا

جھاڑو پھیر گئے تھے اب اُس کی باری تھی اور اُس نے اپنی ذمے داری بھرپور طریقے سے ادا کی تھی۔

❖❖○❖❖

''یہ تمہاری امانت ہے!'' علیزے نے مسکان کو وہ پائل لوٹائی، جو کبھی ولی نے اُسے گفٹ کی تھی۔ وہ عبداللہ کے ساتھ آسٹریلیا چلی گئی کیوں کہ عبداللہ کی پڑھائی ابھی باقی تھی۔

''اِسے بنا کسی ملال کے پہننا اور اس کی جھنکار میری محبت کو محسوس کر کے سننا!'' ولی نے وہ پائل مسکان کی ڈریسنگ ٹیبل پر پڑی دیکھ کر کہا۔

مسکان نے اپنے دیوتا کو دیکھا، وہ واقعی بہت اونچا تھا۔ وہ واقعی ایک سچا مرد تھا۔

وہ بشر کی پہچان تھا۔

اُس نے معاف کر کے آمرزش کا وہ بیج بویا تھا، جس کے لیے بہت بڑے دِل کی ضرورت ہوتی ہے۔

اور ولی واقعی بہت بڑے دِل والا انسان تھا۔ بڑے دِل والے ہی اللہ کے ہاں بڑا مقام پاتے ہیں۔

اِسی لیے تو وہ ایمان کی ماں کو طارق کے ذریعے تلاش کر کے گھر لے آیا تھا اور اُسے گھر میں گھر کے افراد کی طرح رکھا ہوا تھا۔

احمد شاہ کا بتایا یہ روشنی کا، نیکی قافلہ ولی نے رُکنے نہ دیا۔

پرت در پرت
قبا در قبا
یہ پھیلا منوں پہ خمار جنوں
جب پھنس رہا کسی گرداب میں
کسی دام میں، کسی زعم میں، کسی خواب میں
من کے اندھیرے اُسے لے اُڑے
کبھی بھول بھلیاں کبھی دشت میں بھٹکیں
کبھی سراب کے پیچھے گھڑی کے کانٹے
گھومتے رہے سرکتے رہے
زندگی اک کھیل ہے
یہ انتہا سا انتہا
کہیں دیپ جلے کہیں سلگے جاں
زندگی لمبی سڑک تارکول پہ لپٹی ہوئی
سیاہی سے اٹی ہوئی
جو کاجل گھر میں بھڑک اٹھے اس کی لو تڑپ اٹھے
من کے اندھیرے میں چنگاری چمکے
کاسے میں پڑے سکے چھنکے
جب نقش سارے مٹ گئے

لفظ سبھی کھو گئے وہ مقام درد
جہاں اشک بولیں، اشک ہی تولیں
جو عیاں ہوئے، تو بیاں ہوئے
صفحہ عشق پہ لکھے راز
جس کی ''واپسی'' ہوئی
اسے ''آ گہی'' ملی
اُس نے پالی آدرش
باقی سب ڈھونڈتے رہے
کالے سیاہ پاتال میں
رنگ نور کی آمرزش
جو نظر عتاب وہ نظر سیلاب
جو ''وہ'' منظور من ہو ساقی
تو اس کی پور پور بھگو دے بارش
جب کڑک چمک مدھم پڑی
ایک ہی گونج رہ گئی باقی
آمرزش، آمرزش، آمرزش

ترجمہ:

(اے اللہ! تو ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہمارے مظالم کو بھی، ہمارے دِل لگی کے طور پر کیے ہوئے اور بغیر دل لگی کے کیے ہوئے گناہوں کو بھی اور بلا ارادہ کیے ہوئے گناہوں کو بھی اور سب ہی قسم کے گناہ ہم سے سرزد ہوئے ہیں۔ تُو سب کو بخش دے)

(تمت بالخیر)